خیر و شر کا ازلی تصادم، ہنگامے جگاتی پراسرار داستان
دیدبان
1
شمیم نوید

پیش لفظ

ہم نے اب تک متعدد سلسلہ وار ناول لکھے ہیں۔ اِن میں پُراسرار ناول بھی شامل ہیں۔ زیرِ مطالعہ پُراسرار ناول ہمارے تحریر کردہ دیگر پُراسرار ناولوں سے قطعی مختلف و منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ ناول دنیا کے بلند ترین سلسلۂ کوہ ہمالیہ کی اُن حیرت ناک بستیوں سے شروع ہوتا ہے جہاں عرصہ دراز تک مہذب دنیا میں بسنے والے انسانوں کے قدم نہیں پہنچ سکے۔ پھر جب یہ واقعہ رونما ہوا، یعنی تہذیب یافتہ دنیا کے کچھ شاطر اِن بستیوں تک پہنچ گئے تو صورتِ حال بدل گئی۔

اِس حیران کُن پُراسرار ناول کا مرکزی کردار ایک ایسی دوشیزہ ہے جس نے اپنی سرگذشت خود بیان کی ہے۔ اُس کی ساحرانہ قوتیں بدی کے خلاف ایک سپر تھیں۔ خیر و شر کے اِس معرکے میں آخری فتح کسے نصیب ہوئی؟ اِس سوال کا جواب آپ کو ناول پڑھ کر ہی معلوم ہو تو بہتر ہے۔

عہدِ قدیم میں، خصوصاً غیر مہذب معاشروں میں آدمی کے اندر چھپا ہوا درندہ کس کس روپ میں ظاہر ہوتا تھا اور وہ اپنے ہی جیسے دوسرے آدمیوں کو کس قدر ہولناک سزائیں دیتا تھا، کس طرح تڑپا تڑپا کر مارتا تھا، یہ تاریخی حقائق اِس ناول میں بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اِس بیان کا مقصد سنسنی خیزی کے بجائے سبق آموز ہے۔

نفرت و انتقام کی اِس کہانی میں گداز و محبت کے ایسے پہلو بھی ہیں جنہیں پڑھ کر انسان اور انسانیت پر یقین آنے لگتا ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ تو نہیں مگر امید ضرور ہے کہ اس پُراسرار اور سنسنی خیز ناول کے صرف چند صفحات پڑھنے کے بعد آپ اسے ہاتھ سے نہیں رکھیں گے۔

اگر آپ کو ہماری یہ کاوش پسند آئے تو ہمارے حق میں دعائے خیر کیجیے گا کہ اِس سے بڑی کوئی اور دولت نہیں۔

طالبِ دُعا

شمیم نوید

ہمیشہ پڑھا جانے والا قلمکار

ایک مفکر کا قول ہے۔ "اگر تمہیں دنیا میں زندہ رہنا ہے تو ایسا کام کرو جس پر ہمیشہ لکھا جائے یا پھر ایسی تحریریں لکھو جو ہمیشہ پڑھی جاتی رہیں۔" اگر اس قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ یہ قول شمیم نوید پر پورا اترتا ہے کیوں کہ انہوں نے ایسی کہانیاں تخلیق کی ہیں جو انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

جب بھی مؤرخ پاکستانی جرائد کے حوالے سے تاریخ مرتب کرے گا' اُس میں شمیم نوید کا نام نمایاں ہو گا۔

شمیم نوید کی کہانیاں ڈائجسٹوں کے لئے ایک بلینک چیک کی حیثیت رکھتی ہیں' اِدھر کہانی آئی' اُدھر کیش ہوئی اور اُدھر ہی شائع ہوئی۔ کسی بھی رسالے کی کامیابی میں جہاں پبلشر اور رائٹروں کا حصہ ہوتا ہے وہیں شمیم نوید کے نام کا حصہ اِن سب میں زیادہ ہوتا ہے۔ جس طرح شمیم نوید کی ذات میں مختلف شخصیتیں پوشیدہ ہیں اسی طرح ان کی کہانیاں بھی مختلف موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں جن میں تاریخی کہانی' معاشرتی کہانی' جرائم کی کہانی' پُراسرار کہانی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی بے شمار کہانیاں اور سلسلہ وار ناول فرضی موں سے بھی ڈائجسٹوں میں شائع ہوئے ہیں۔ شمیم نوید حقیقت پسند' اصول پرست اور نسان دوست شخص ہیں اور یہی رنگ ہمیں اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ متحرک نظر آتا ہے۔

محمد ابراہیم غوری
مدیر معاون ماہنامہ "مسٹری میگزین" کراچی

("ایک شام شمیم نوید کے نام" میں پڑھے جانے والے مضمون سے ایک اقتباس)

وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی۔ پُراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں۔ اس کی آنکھوں میں موت کی کڑکتی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر تھی نہ موت کی۔ وہ سانپ سے زیادہ زہریلی تھی۔ وہ اپنے دشمن کی کٹی ہوئی گردن دیکھنا چاہتی تھی۔
پُراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں۔

پُراسرار قوتوں کی مالک ایک دوشیزہ کی ہنگاموں سے بھرپور داستانِ عجیب

اس وقت میری عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی جب پہلی بار میں نے پُراسرار سرگوشیاں سنیں اور میں سہم گئی۔ پھر بند آنکھوں سے بھی میں نے وہ سب ہولناک مناظر دیکھے جن کے بارے میں سرگوشیاں کی گئی تھیں۔ یہ مناظر دیکھ کر میری روح تک لرز گئی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اپنی ماں سے سب کچھ کہہ دیا۔ میری باتیں سن کر ماں کے چہرے پر بھی خوف کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ پھر وہ مجھے تسلیاں دینے لگی۔

"اے معبلہ یہ سب تیرا وہم ہے' تُو ان باتوں کو اپنے دماغ سے نکال دے۔" ماں نے مجھے سمجھایا' مگر اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"تُو بابا کو بتا کیوں نہیں دیتی کہ وہ ژیان کی طرف سے ہوشیار رہے۔" میں بولی۔

پھر اسی شام جب ژیان میرے بابا سے ملنے آیا اور باپ کی تعظیم میں جھک کر سیدھا کھڑا ہوا تو پہلی بار مَیں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"اے ژیان کیا تجھے خبر ہے کہ ہماری بیٹی معبلہ نے کیا پیشگوئی کی ہے؟" میرے بابا نے اپنے چوڑے چکلے سینے پر اُگے ہوئے گھنے بالوں کو انگلیوں سے مروڑ کر کہا۔ بابا کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

"اے سردار! تُو ہی بتا کہ وہ پیشگوئی کیا ہے' تیرا یہ غلام اس سے بے خبر ہے۔" ژیان نے ادب سے جھک کر کہا۔

"معبلہ نے یہ پیشگوئی کی ہے اے ژیان کہ تُو ہم سے غداری کرے گا۔" بابا نے ہنستے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا اور وہ ہولناک باتیں اسے نہیں بتائیں جن کا اظہار میں اپنی ماں سے کر چکی تھی۔

بابا کی بات سن کر ژیان فرش پر گھٹنوں کے بل جھک کر کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے اپنی تلوار نیام

سے نکال کر بابا کے قدموں میں رکھ دی۔

"اگر تجھے اپنے اس غلام کی وفاداری پر ذرا سا بھی شک ہے اے سردار! تو اسی تلوار سے میرا سر اڑا دے۔ تُو دیکھے گا کہ تیرے اس غلام کی گردن اسی طرح جھکی رہے گی چاہے اسے تن سے جدا ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔"

"اپنی تلوار اٹھا لے اے ژیان! ہمیں تجھ پر پورا بھروسا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم تجھ سے تیری بے وفائی کا ذکر ہرگز نہ کرتے۔ دوسری صورت میں ہم اپنے کسی بھی محافظ کو حکم دیتے کہ وہ تیرا سر کاٹ لائے اور ہمارے قدموں میں ڈال دے۔" یہ کہہ کر بابا اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے ژیان کے جھکے ہوئے سر پر اپنا لمبا چوڑا ہاتھ رکھ دیا۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ اسے ژیان پر اعتماد ہے۔

ژیان سیدھا کھڑا ہوا اور پھر اس نے جھک کر بابا کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ یہ گویا اس کی طرف سے اظہار وفاداری تھا۔ پھر ژیان نے اپنی تلوار فرش سے اٹھا کر نیام میں رکھتے ہوئے چند قدم کا فاصلہ الٹے قدموں طے کیا اور ادب سے دور جا کھڑا ہوا۔

وادی سبز کے بعض معاملات میں ژیان' بابا کے احکام لے کر چلا گیا تو ماں نے بابا سے کہا۔ "اے معبلہ کے باپ! تجھے اس سے پیشگوئی کا ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اگر کچھ اور نہیں تو معبلہ کی طرف سے اس کے دل میں کھوٹ ضرور پیدا ہو جائے گا۔"

بابا یہ سن کر زور سے ہنس پڑا' پھر بولا۔ "بڑی بھولی ہے تُو اے معبلہ کی ماں! مَیں دراصل اس طرح ژیان کی وفاداری کا امتحان لے رہا تھا۔"

"کیا وہ تیرے امتحان پر پورا اترا؟" ماں نے پوچھا۔

"ہاں .... کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ اس نے اپنی تلوار میرے قدموں میں رکھ دی تھی اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا تھا؟" بابا کے لہجے سے تفاخر کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر یہ اندوہ ناک واقعہ اسی رات کا ہے کہ کسی کھٹکے سے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں اپنی ماں کے سینے سے لگی ہوئی سو رہی تھی۔ میں نے اپنی ماں کی خواب گاہ میں کچھ سیاہ پوشوں کو داخل ہوتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھے۔ ان سب میں جو سیاہ پوش سب سے آگے تھا' اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اسے میں نے پہچان لیا۔ وہ میرے بابا کا وزیر ژیان تھا۔ میں بالکل وہی منظر دیکھ رہی تھی جو پہلے ہی بند آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ژیان کا اب اگلا قدم کیا ہو گا اس نے میری پیشگوئی کے عین مطابق مسہری کے قریب آ کر اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ دوسرے ہی لمحے میری ماں کے سر کے کھلے ہوئے بال اس نے اپنی مٹھی میں جکڑ لئے اور پھر اسے مسہری سے نیچے گھسیٹ لیا۔ ماں کے منہ سے چیخ نکل گئی اور پھر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مسلح سیاہ پوشوں کو دیکھتی رہی۔

"معبلہ کو یہاں سے لے جاؤ۔" ژیان نے حکم دیا۔ "معبلہ کو میرے گھر پہنچا دو اور اس کی ماں تمہارا حصہ ہے' تم سب کا حصہ۔ اس عورت کو خود اسی کی خواب گاہ میں بے آبرو کرو مگر اس قدر کہ یہ مر نہ جائے بس اس قدر کہ کل صبح یہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے۔ چاہو تو تم اسے اس

طرح باندھ لو کہ یہ مزاحمت کرنے کے قابل نہ رہے اور سنو کہ تم آپس میں اپنی باری کے لئے لڑو گے نہیں۔"

دو سیاہ پوشوں نے ژیان کا حکم سنتے ہی میرے دونوں بازو اپنی گرفت میں لے لئے اور مجھے وہاں سے تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگے۔ میرے جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی اور صدمے کی وجہ سے میری قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔

ژیان کا بڑا سا گھر ہماری محل نما حویلی کے زیر سایہ ہی تھا۔ بار بار رات کا سناٹا میری ماں کی کرب ناک چیخوں سے مجروح ہوتا رہا۔ مجھے اس عمر میں آبرو یا بے آبروئی کا مطلب تو معلوم نہیں تھا مگر اتنا احساس ضرور تھا کہ یقیناً میری ماں پر ظلم کیا جا رہا تھا۔ میں اسی لئے رات بھر نہ سو سکی۔ میں اپنے دل میں دعا کر رہی تھی کہ بند آنکھوں سے میں نے جو کچھ مزید دیکھا تھا' وہ پورا نہ ہو' مجھے جو سرگوشیاں سنائی دی تھیں' کاش وہ سچ نہ ہوں۔

صبح ہوتے ہی مجھے اس کمرے سے باہر نکالا گیا جس میں رات کو بند کر دیا گیا تھا پھر مجھے اس جگہ لے جایا گیا جہاں ایک بڑے سے کمرے میں ژیان ایک اونچی مسند پر بیٹھا تھا۔

"اے معبلہ' جھک جا عظیم ژیان کے سامنے کہ شاید خوش ہو کر وہ تیری جان بخش دے۔" مجھے ساتھ لانے والوں میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔

"نہیں!" خوف کے باوجود نہ معلوم کیسے خود بخود میرے منہ سے نکل گیا۔ "یہ میرے بابا کا غلام ہے اور میں آقا زادی ہوں۔ آقا کبھی غلاموں کے آگے نہیں جھکتے۔"

اس پر ژیان بڑے زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ "آقا زادی .... ہاں کبھی تُو آقا زادی تھی مگر اب تُو ہماری لونڈی ہے۔ اسے اس کی ماں کے پاس لے جاؤ اور اس کا حشر دکھاؤ' میں نے اس کی ماں کے بارے میں جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرو!"

"اور خود اس کے بارے میں تیرا کیا حکم ہے اے عظیم سردار!" مجھے لے کر آنے والوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"اسے آسان موت نہیں مارا جائے گا۔ اسے ہمارے لئے پالا جائے گا۔ جب یہ جوان ہو جائے گی تو ہم اسے اپنی بیوی بنائیں گے اور پھر جب اس سے ہمارا جی بھر جائے گا تو ہم اس کا بھی وہی حشر کریں گے جو حشر اس کی ماں کا ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے۔ ہم اس کی بھرپور جوانی کو تم سب کا حصہ بنا دیں گے اور پھر........" ژیان نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ "اور پھر تمہیں خبر ہی ہے کہ اس کے بعد کیا ہو گا" یہ کہتے ہی ژیان نے دائیں ہاتھ کا مخصوص اشارہ کیا۔

"چلو اے معبلہ!" ایک شخص نے میرا بازو پکڑ کر مجھے گھسیٹا۔

ژیان میری قسمت کا فیصلہ سنا چکا تھا' مگر مجھے اپنے زندہ بچ جانے کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ وہ پُراسرار سرگوشیاں جو میں نے سنی تھیں' ان کے مطابق میرا بابا' ژیان کی قید میں تھا۔ ابھی اسے قتل نہیں کیا گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی' کاش گزشتہ روز بابا نے میری پیشگوئی پر یقین کر لیا ہوتا تو اس نے غدار ژیان

پر بھروسا نہ کیا ہوتا! میں یہی سب کچھ سوچتی ہوئی دونوں محافظوں کے ساتھ چلتی رہی۔

وہ دونوں مجھے میری محل نما حویلی میں لے آئے۔ اب وہ مجھے لئے ہوئے میری ماں کی خواب گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قریب پہنچ کر میں نے خواب گاہ کے دروازے پر کئی مسلح محافظوں کو دیکھا۔ انہوں نے ہمیں اندر جانے کا راستہ دے دیا۔

میری نگاہ جیسے ہی اپنی ماں پر پڑی' میں نے چیخ کر اس کی طرف دوڑنا چاہا' مگر محافظوں نے مجھے روک دیا۔

میں نے دیکھا' سامنے فرش پر گٹھڑی کی صورت پڑی ہوئی میری ماں کے جسم میں میری چیخ سن کر حرکت ہوئی اور اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی نظروں وحشت تھی۔ لمحے بھر کو مجھے یوں لگا جیسے وہ میری ماں کا چہرہ نہ ہو۔ اس چہرے کے سارے حُسن اور ساری شادابی کو حزن و ملال کی نقاب نے اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔ اس کے سارے جسم کو روئی کی طرح دھن دیا گیا تھا۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا کہ وہ اٹھ کر کھڑی ہونے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے رات بھر اس کے جسم کو پاگل کتے کاٹتے اور بھنبھوڑتے رہے ہوں۔

"مم .... میری بچ .... چی .... میری بچی!" اس کے ہونٹ لرزے اور مجھے اس کی زخمی آواز سنائی دی۔

"ماں!" میرے ہونٹ بھی کانپے۔

اسی وقت میرے ساتھ آنے والے محافظوں میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے میری ماں کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "اٹھ کر کھڑی ہو جا!"

ماں اس شخص کا حکم سن کر لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہوئی اور پھر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اس شخص نے ماں کی کلائی چھوڑ کر اس کے سر کے بال پکڑ لئے اور اسے دروازے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ ماں کے منہ سے آہیں نکلنے لگیں۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہوا۔ میں ایک بار پھر اس شخص کی گرفت سے نکلنے کے لئے مچلنے جو مجھے پکڑے ہوئے تھا' مگر اس نے میرا بازو نہ چھوڑا۔ ماں دوبارہ اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

ماں کو اسی حالت میں گھسیٹ کر حویلی سے باہر لے آیا گیا۔ اب چند اور محافظ بھی ساتھ ہو لئے۔ حویلی کے باہر وادی کے مرد و زن کا ایک ہجوم تھا جو یہ روح فرسا تماشا دیکھنے جمع ہو گئے تھے۔ ماں کا جسم جگہ جگہ سے نظر آ رہا تھا۔ ہجوم میں سے نہ جانے کس نیک دل عورت نے ماں کی طرف ایک چادر پھینک دی اور ماں نے اس چادر سے اپنے نیم برہنہ جسم کو ڈھانپ لیا۔

وادی کی جنوبی سمت بانسوں کا گھنا جنگل تھا۔ محافظ اسے اسی بانسوں کے جنگل کی طرف لے جا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جو میں پہلے ہی بند آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ میرا دل اس کے لئے خون کے آنسو رو رہا تھا۔ پھر وہی دیکھا ہوا منظر اپنے آپ کو دہرانے لگا۔

جنگل کے کنارے پہلے ہی سے کچھ محافظ موجود تھے۔ زمین میں کچھ ہی فاصلے پر ایک لکڑی گڑی

ہوئی تھی۔ اسی کے قریب بانس کا ایک کلا پھوٹا ہوا تھا۔ ماں کو اس کلے پر بٹھا دیا گیا اور پھر اس کے پیچھے گڑی ہوئی لکڑی سے اسے کس کر باندھ دیا گیا' اتنا کس کر کہ وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش نہ کر سکے۔ بانس چوبیس گھنٹے کے اندر بڑھ کر تقریباً آٹھ دس فٹ بلند ہو جاتا ہے۔ بانس کے نوکیلے کلے پر میری ماں کو بٹھا کر باندھا جا چکا تھا اور میں اس کا مقصد اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ میری ماں کو ایک انتہائی اذیت ناک موت کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

ماں کی وہ الوداعی نظریں مَیں کبھی نہیں بھول سکتی جب مَیں اسے آخری بار زندہ دیکھ کر لوٹ رہی تھی۔

سارے دن یہ کوشش کی جاتی رہی کہ میں کچھ کھا لوں کیوں کہ ژیان مجھے زندہ رکھنے کا حکم دے چکا تھا۔ جب وہ کسی طرح کامیاب نہ ہوئے تو انہوں نے مجھ پر سختی شروع کر دی۔ مجبوراً مجھے کھانا زہر مار کرنا ہی پڑا۔ تمام دن بھوکے رہنے کی وجہ سے مجھ پر نقاہت سی طاری ہو گئی تھی۔ کھانا کھا کر میرے حواس پر غشی سی طاری ہو گئی اور پھر میں جانے کب گہری نیند سو گئی۔

دوسرے روز صبح ہی صبح مجھے جگا دیا گیا۔ جگانے والی ژیان کی خادمائیں تھیں۔ انہوں نے مجھے نہلایا' میرے بال سنوارے' نئے کپڑے پہنائے اور پھر دلہنوں کی طرح میرا سنگھار کرنے لگیں۔ میں حیران تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے!

میرے پوچھنے پر مجھے ایک خادمہ نے بتایا۔ "خوش نصیب ہے تُو اے معبلہ! کہ آج تجھے وادی سبز کے نئے سردار ژیان کی بیوی بنا دیا جائے گا۔"

"نہیں' وہ سردار نہیں' میرے بابا کا غلام ہے اور میں اس کی بیوی نہیں بنوں گی۔" میں نے غصے کے عالم میں چیخ کر کہا۔

"وہ تو تجھے بننا ہی پڑے گا کیوں کہ اب تیرا بابا وادی سبز کا سردار نہیں رہا اور تُو دیکھے گی کہ آج اس کی گردن پر دہکتا ہوا توا رکھ دیا.........."

"نہیں.........." میں نے چیخ کر اس خادمہ کی بات کاٹ دی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ گزشتہ روز ژیان نے کچھ اور کہا تھا۔ پھر یہی بات میری زبان پر آ گئی۔

"ہاں پہلے اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ تجھے جوان ہونے کے بعد اپنی بیوی بناتا مگر اب اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ وہ تیرے جوان ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ پجاریوں نے سردار ژیان کو یہ مشورہ دیا ہے کہ تجھے آج ہی اپنی بیوی بنا لے تو یہ نیک شگون ہو گا۔ مہا پجاری نے اس سے اختلاف کیا تھا مگر سردار ژیان نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے آج ہی رسوم کی ادائیگی کا حکم دے دیا۔ مہا پجاری تجھے لینے آتا ہی ہو گا۔ تُو اب اس وقت تک مہا پجاری کی پناہ میں رہے گی جب تک سردار ژیان کے ساتھ تیری رسمیں پوری نہیں ہو جاتیں پھر مہا پجاری تجھے سردار ژیان کے حوالے کر دے گا۔" ایک خادمہ نے تفصیل کے ساتھ مجھے ساری بات بتائی۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مہا پجاری پیلا لبادہ اوڑھے اپنے دو نائبوں کے ساتھ آیا اور مجھے وہاں

سے لے گیا۔ اس کا چہرہ چھلے ہوئے انڈے کی طرح تھا۔ سر پر ایک بال بھی نہیں تھا' نہ چہرے پر۔ یہاں تک کہ اس کی بھنویں بھی منڈی ہوئی تھیں۔ یہی حال اس کے نائبوں کا تھا۔ مہا پجاری میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں نے اسے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا۔ وہ میرے بابا کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔

محافظوں کی نسبت مہا پجاری کا رویہ میرے ساتھ نرم اور مشفقانہ تھا۔ وہ مجھے اپنی عبادت گاہ میں لے آیا اور اپنے ساتھ ناشتہ کرایا۔ پھر دن نکل آیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ بانسوں کے جنگل کی طرف لے گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں گزشتہ روز بھی آ چکی تھی۔ یہیں میری ماں کو باندھ کر بانس کے نوکیلے کلے پر بٹھایا گیا تھا۔ وہاں میری آنکھوں نے بڑا روح فرسا منظر دیکھا۔ بانس میری ماں کے جسم کو چھید تا ہوا اس کے سر کی ہڈی پھوڑ کر باہر نکل گیا تھا۔ ماں کا چہرہ مجھے انتہائی بھیانک نظر آ رہا تھا۔ مہا پجاری کے حکم پر وہاں موجود محافظوں نے میری ماں کے مردہ جسم کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کیا اور پھر اس بانس کو ماں کے جسم سے نکالنے کی بجائے بانس کو نیچے سے کاٹ دیا گیا۔ ماں کے جسم کو محافظوں نے ایک بڑی سی چادر میں ڈالا' پھر چادر کے چاروں کونوں کو باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ لکڑی زمین سے اکھاڑ لی جس سے ماں کو باندھا گیا تھا۔

مَیں یہ سارا منظر حواس باختگی کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ محافظوں نے چادر کے کونوں کے نیچے سے وہ لکڑی گزاری اور پھر دو محافظوں نے آگے پیچھے سے اس لکڑی کو اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔ مہا پجاری آگے آگے تھا اور محافظ میری ماں کی لاش کو اٹھائے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ میں مہا پجاری کے ساتھ تھی۔

اونچے نیچے پہاڑوں سے گھری ہوئی اس ہری بھری وادی کے بیچوں بیچ بڑا سا ایک میدان تھا۔ اسی میدان کی طرف سے ڈھول بجنے کی بلند آوازیں آ رہی تھیں۔ ڈھول بجنے کی آوازیں اس بات کی علامت تھیں کہ آج اس [illegible]ان میں بستی کے لوگوں کا اجتماع ہے۔ ایسے ہی ایک اجتماع میں اپنے بابا کے ساتھ میں [illegible] ایک مرتبہ شرکت کر چکی تھی۔

مہا پجاری مجھے اور میری ماں کو ساتھ لئے اسی میدان کے قریب پہنچ گیا۔ لوگ دائرے کی صورت میں [illegible] دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں بچے' بوڑھے' مرد اور عورتیں سبھی تھے۔ زیادہ تر لوگوں نے بچور [illegible] کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ ہم جنوبی سمت سے میدان تک پہنچے۔ ہمارے ساتھ چلنے والے محافظوں نے [illegible] کر ان لوگوں سے کچھ کہا جو میدان کے اس حصے کے کنارے پر کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے پلٹ کر ہمار[illegible] طرف دیکھا اور پھر راستے سے ہٹ گئے۔ ہم ان لوگوں کے درمیان سے گزر کر میدان میں پہنچے۔ سا[illegible] ہی شمالی رخ پر بڑا سا ایک تخت بچھا تھا۔ اس تخت کے بالکل سامنے ایک اونچی سی کرسی پر ژیان بیٹھا تھا۔ [illegible]ت کے اوپر ژیان کی پندرہ بیویاں اور گھر کی دوسری عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

میدان کا درمیانی حصہ خالی تھا۔ مہا پجاری کے اشارے پر بیچ میدان میں میری ماں کی لاش کو پھینک [illegible] دیا گیا۔ چادر کے چاروں کونے کھول کر چادر گھسیٹ لی گئی۔ بانس میں ماں کی لاش پروئی ہوئی پڑی تھی۔ [illegible] سے دیکھتے ہی مجمع فلک شگاف نعرے لگانے لگا۔ وہ نئے سردار ژیان کے حق میں نعرے لگا رہے

تھے۔ اس عرصے میں مہا پجاری مجھے ساتھ لئے تخت کے قریب پہنچ گیا۔

"نئے سردار کو تعظیم دے اے معبلہ! اس کے سامنے جھک جا۔ جھک جا کہ یہی تیرا ہونے والا شوہر بھی ہے۔" مہا پجاری کے ایک نائب نے سرگوشی کی۔

میں نے اس کی سرگوشی پر کان نہیں دھرے اور اسی طرح سر اٹھائے ژیان کے سامنے کھڑی رہی۔ ژیان کا دایاں ہاتھ بلند ہوا اور پھر مہا پجاری مجھے ژیان کی کرسی کی دائیں جانب لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دونوں نائب میرے پیچھے تھے۔

"اے معبلہ! تُو خوش نصیب ہے کہ رحم دل سردار نے تجھے سر جھکانے پر مجبور نہیں کیا۔" مہا پجاری کے نائب نے پھر مجھ سے سرگوشی کی۔

"بوڑھے قیدی کو حاضر کیا جائے۔" ژیان کی آواز بلند ہوئی۔

تخت کے پیچھے سے زنجیریں کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور پھر میں نے بابا کو پا بہ زنجیر دیکھا۔ اسے کئی محافظوں کے درمیان ژیان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور نظریں نیچی تھیں۔ وہ کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسے آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کر لوں مگر صدمے کے زیر اثر میں گنگ سی ہو کر رہ گئی تھی۔

"اسے ہمارے قدموں میں اوندھا گرا دو۔" ژیان نے حکم دیا۔

ژیان کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ بابا کو اوندھا گرا کر اس کا سر زبردستی ژیان کے قدموں میں رکھ دیا گیا۔ ژیان اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اس نے اپنا دایاں پیر اٹھا کر بابا کے سر پر رکھ دیا۔ مجمع ایک بار پھر ژیان کے حق میں نعرے بلند کرنے لگا۔ میں سوچنے لگی' یہ کیسے بے حس اور بے وفا لوگ ہیں؟ کل تک یہی لوگ میرے بابا کے حق میں نعرے لگاتے تھے اور آج ان کی وفاداریاں تبدیل ہو گئی تھیں۔ کیا طاقت و اقتدار ہی سب کچھ ہے؟ کیا وہی شخص قابل تعظیم ہے جو کرسی پر ہو؟

ژیان نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اب بھی میرے بابا کے سر پر پیر رکھے کھڑا تھا۔

"رسم ادا کی جائے۔" ژیان کی بلند آواز ابھری۔

اسی کے ساتھ میں نے میدان کے درمیان کچھ لوگوں کو شعلے بھڑکاتے دیکھا۔ پتھر رکھ کر ایک چولھا سا بنا لیا گیا تھا جس میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ان شعلوں پر لوہے کا توا رکھ دیا گیا۔ اسی وقت مہا پجاری نے اپنے ایک نائب کو اشارہ کیا۔ نائب نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لبادے میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑی قینچی نکالی اور بابا کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے بابا کے سر پر بڑے بڑے بال تھے جو اس کے شانوں پر بکھرے رہتے تھے۔ مہا پجاری کے نائب نے ان بالوں کو قینچی سے کاٹنا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں بابا کی گدی صاف ہو گئی اور گردن کا پچھلا حصہ صاف نظر آنے لگا۔ مہا پجاری نے مجھے اپنے دوسرے نائب کے حوالے کیا اور پھر وہ بھی آگے بڑھا۔

میں جیسے دیکھا ہوا ایک بھیانک خواب دوبارہ جاگتی آنکھوں دیکھ رہی تھی۔ میری توقع کے مطابق مہا

پجاری نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پوشاک میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبیا نکالی۔ ڈبیا کھول کر اس میں سے مہا پجاری نے چٹکی بھر ایک سفوف نکالا اور جھک کر وہ چمکیلا سفوف میرے بابا کی گردن کے پچھلے حصے پر مل دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر مہا پجاری پھر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

ژیان نے اب میرے بابا کے سر سے پیر ہٹا لیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ بابا کو زمین سے اٹھا کر کھڑا کر دیا گیا۔ سر کے بڑے بڑے بال کٹ جانے کی وجہ سے مجھے اس کا چہرہ نامانوس اور عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کا سر اور نگاہیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

"اسے اس کی بیوی کا آخری دیدار کرا دو۔" ژیان کی آواز پھر ابھری۔

محافظ میرے بابا کو لے کر میدان کے درمیان اس جگہ پہنچ گئے جہاں ماں کی لاش بانس میں پروئی ہوئی پڑی تھی۔ میں نے بابا کو جھکتے دیکھا۔ اس نے ماں کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا اس کے دونوں ہاتھ سورج کی طرف بلند ہوئے۔ معلوم نہیں وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے سوچا، شاید وہ آخری دعا مانگ رہا ہے۔

"آخری رسم ادا کی جائے۔" ژیان نے بلند آواز میں حکم دیا۔

پھر میں نے دیکھا ایک جانب سے سیاہ لباس پہنے ہوئے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا برچھا تھا جس کا دل موٹا، دھار تیز اور چمکیلی تھی۔ دھوپ میں وہ برچھا چمک رہا تھا۔ گٹھے ہوئے جسم والا وہ شخص میرے بابا کے پیچھے برچھا لے کر کھڑا ہو گیا۔ قریب ہی چولھے پر رکھا ہوا توا دہک کر سرخ ہو گیا تھا۔ اس توے کو دو محافظ، دو بڑے چمٹوں سے پکڑے ہوئے تھے۔

برچھے والے شخص کی نظریں ژیان کی طرف تھیں۔ اچانک ژیان کا دایاں ہاتھ بلند ہو گیا۔ برچھے والے کا ہاتھ تیزی سے گھوم کر اونچا ہوا اور پھر برچھا پوری قوت سے میرے بابا کی گردن کے پچھلے حصے پر اسی جگہ پڑا جہاں مہا پجاری نے چمکیلا سفوف ملا تھا۔ چشم زدن میں بابا کا سر کٹ کر سامنے گرا اور زمین پر اچھلنے لگا۔ عین اسی لمحے دہکتے ہوئے لوہے کے توے کو بابا کی کٹی ہوئی گردن پر رکھ دیا گیا۔ کٹی ہوئی گردن سے خون کا جو فوارہ بلند ہوا تھا، رک گیا۔ سب کچھ انتہائی تیزی کے ساتھ اور لمحوں میں ہو گیا تھا۔ ادھر بابا کا سر کٹ کر گرا تھا، ادھر کٹی ہوئی گردن پر دہکتا سرخ توا رکھ دیا گیا تھا۔ اخراج خون رک جانے کی وجہ سے بابا کا سر بریدہ جسم رقص کے انداز میں اِدھر اُدھر حرکت کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور جسم تھرک رہا تھا۔

لوگ مبہوت سے وہ خونی تماشا دیکھ رہے تھے اور "رقص بسمل" جاری تھا۔ کھڑا کر کے سر کاٹنے کی وجہ اب میری سمجھ میں آئی تھی۔

ژیان کے معنی درندے کے ہیں اور اس نے واقعی درندہ بن کر دکھا دیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں میرے بابا کی روح آسمانوں کی طرف پرواز کر گئی اور اس کا روح سے خالی جسم ڈھیر ہو گیا۔

میدان کے ایک سرے پر پہلے ہی سے کچھ گھڑسوار کھڑے تھے۔ بابا کا بے جان جسم زمین پر گرتے

ہی وہ نیزے بلند کئے سرپٹ گھوڑوں کو بھگاتے ہوئے میدان میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں میری ماں اور بابا کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

پھر ایک وحشیانہ کھیل شروع ہو گیا۔ ان میں سے ایک قوی ہیکل شخص نے گھوڑے سے جھک کر میرے بابا کے جسم کو اپنے لمبے نیزے میں پرو لیا، مگر اسی وقت ایک اور گھوڑسوار نے اس کے نیزے پر نیزہ مارا۔ اسی اثنا میں ایک گھڑسوار نے بابا کے کٹے ہوئے سر پر نیزہ مارا اور سر کو لے کر ایک طرف بھاگا۔ دو گھڑسوار اس کے تعاقب میں دوڑے۔ چند گھڑسوار میری ماں کی لاش کے ساتھ یہی کھیل کھیلنے لگے۔

ابھی یہ ظالمانہ اور بے رحمانہ کھیل جاری ہی تھا کہ اچانک گہرے بادل چھا گئے جن کی وجہ سے ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل گیا۔ پھر ایک دم بجلی کا زبردست کڑکا سنائی دیا اور تند و تیز ہوا چلنے لگی۔

کالی آندھی سے وہ سبھی ڈرتے تھے اور اسے اپنے خود ساختہ دیوتاؤں کا قہر سمجھتے تھے۔ میں نے ژیان کو کرسی سے اٹھ کر سجدے میں گرتے دیکھا اس کے بعد سارے وادی والے سجدہ ریز ہو گئے۔

"چل اے معبلہ! دیوتاؤں نے یہ موقع شاید اسی لئے فراہم کیا ہے۔" مہا پجاری میری طرف جھک کر آہستہ آواز میں بولا۔

مہا پجاری کے دونوں نائب بھی سجدے میں پڑے تھے۔ وہ میرے بازو کو اپنی گرفت میں لئے میدان کی طرف دوڑا۔ گھڑسوار بھی اپنے اپنے گھوڑوں کی پشت سے کود کر سجدہ ریز ہو چکے تھے۔ مہا پجاری نے ایک زور سے ہنہنانے والے ایک گھوڑے کی لگام تھام لی اور پھر مجھے گود میں لے کر اس گھوڑے پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد مہا پجاری نے بھی گھوڑے پر بیٹھنے میں دیر نہیں کی۔

گھوڑے پر بیٹھتے ہی مہا پجاری نے ایڑ لگائی۔ گھوڑا زقندیں بھرتا ہوا ایک طرف دوڑا۔ میدان کے چاروں طرف لوگ سجدہ ریز تھے، صرف تخت کی دائیں جانب تھوڑی سی جگہ تھی جہاں سے میرے بابا کو اس مقتل میں لایا گیا تھا۔ مہا پجاری گھوڑا دوڑتا ہوا اسی جگہ سے نکل گیا۔ شاید کئی افراد اس احتیاط کے باوجود گھوڑے کی جھپٹ میں آ گئے تھے کیوں کہ میں نے کئی چیخیں سنی تھیں۔

حلقہ میدان سے نکل کر گھوڑے کی رفتار میں اور تیزی آ گئی۔ وہ پہاڑوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ ہوا کے جھکڑ پہلے سے بھی زیادہ تیز تھے۔ یا تو مہا پجاری نے دانستہ گھوڑے کو ہوا کے رخ پر رکھا تھا یا پھر یہ محض اتفاق تھا۔ اس کی وجہ سے گھوڑے کی رفتار لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔

ایک طویل پہاڑی درہ عبور کر کے گھوڑا ایک ہموار میدان میں دوڑنے لگا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ مہا پجاری کا قصد کدھر کا ہے۔ میں بس اتنا سمجھ سکی تھی کہ وہ مجھے ظالم ژیان کے چنگل سے نکال کر کہیں لے جا رہا ہے۔

کچھ دیر کے بعد ہوا کی تندی و تیزی میں کمی آ گئی اور اندھیرا بھی چھٹنے لگا۔

"اے معبلہ!" مہا پجاری نے مجھے پہلی بار مخاطب کیا۔ "تُو کسی کو اب یہ نہیں بتائے گی کہ تُو وادی ژر کے سردار کی بیٹی ہے۔"

"پھر.......... کسی نے پوچھا تو میں کیا کہوں گی؟" میں نے مہا پجاری سے معلوم کیا۔

"تُو یہ کہنا اے معبلہ کہ اس راہ سے گزرنے والے ایک قافلے سے بچھڑ گئی تھی۔ میں نے تجھے تنہا بھٹکتے دیکھا اور اپنے ساتھ لے لیا۔"

"مگر اے مہا پجاری' یہ تو جھوٹ ہے اور ماں کہتی تھی کہ جو شخص جھوٹ بولتا ہے' دیوتا اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔" میں بھولپن سے بولی۔

"تُو جانتی ہے کہ میں دیوتاؤں ہی کا خدمت گزار ہوں۔ میں جب تجھے ایسا کہنے کے لئے کہہ رہا ہوں تو یہ ذمے داری تجھ پر نہیں مجھ پر ہے۔ میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ دیوتا ہرگز تجھ سے ناراض نہیں ہوں گے۔" مہا پجاری نے مجھے نرمی سے سمجھایا۔

"تُو ایسا کہتا ہے تو پھر ٹھیک ہے' مگر وہ مجھ سے میرے باپ کا نام بھی پوچھ سکتے ہیں نا! پھر میں کیا کہوں گی؟"

"ان پہاڑی بستیوں میں تیرے بابا کے ہم نام بہت سے ہوں گے۔ تُو کہہ دینا کہ تیرے باپ کا نام اشم ہے' مگر یہ ہرگز نہ کہنا کہ تیرا باپ وادی سبز کا سردار تھا۔ میری باتیں تیری سمجھ میں آ رہی ہیں نا اے معبلہ؟ اور سن کہ اب سے تیرا نام معبلہ نہیں رہا' تُو آتون ہے۔"

"آتون .... مگر اے مہا پجاری یہ تو میرا نام نہیں ہے۔" میں حیرت سے بولی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے اے میری بچی!" مہا پجاری نے نرمی سے کہا' پھر مجھے نام تبدیل کرنے کی وجہ بتانے لگا۔

مہا پجاری نے مجھے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ ژیان میری گمشدگی پر خاموش نہیں بیٹھے گا۔ وہ یقیناً اردگرد کی بستیوں میں مجھے تلاش کروائے گا اس لئے نام بدلنا بہت ضروری تھا۔ نام ہی کے ساتھ مہا پجاری میرا حلیہ بھی بدل دینا چاہتا تھا' مگر یہ اسی وقت ممکن تھا کہ جب وہ اس مطلوبہ پہاڑی بستی میں پہنچ جاتا جہاں اسے وقتی طور پر پناہ لینا تھی۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہاں اس کا کوئی دوست عارج رہتا تھا۔

سفر کرتے کرتے خاصے فاصلے پر ایک پہاڑ نظر آیا۔ مہا پجاری کے خیال میں مطلوبہ پہاڑی بستی اسی ڑ کے عقب میں تھی۔ اسی پہاڑ کے قریب ایک چشمہ بہتا نظر آیا۔ مہا پجاری نے وہاں رک کر گھوڑے پانی پلایا' پھر مجھے پانی پلا کر اس نے خود بھی پانی پیا۔ گھوڑے کو اس نے چشمے کے کنارے اُگی ہوئی گھاس مانے کے لئے چھوڑ دیا' پھر خود بھی گھاس پر لیٹ کر دم لینے لگا۔ اس نے مجھ سے بھی لیٹ جانے کو کہا۔ وڑے پر اتنی دیر بیٹھے بیٹھے میں بھی خاصی تھک گئی تھی۔ اس لئے مہا پجاری کے مشورے پر عمل ےتے ہوئے اس کے قریب ہی لیٹ گئی۔

پھر مہا پجاری کو جانے کیا خیال آیا کہ وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑبڑایا۔ "یہ تو میں بھول ہی گیا ۔" پھر اس نے مجھ سے بھی اٹھنے کو کہا اور میرے دائیں شانے کو فراک ہٹا کر دیکھنے لگا۔ وہ پھر خود کلامی ، سے انداز میں بڑبڑانے لگا۔ "اس طرح تو یہ فوراً پہچان لی جائے گی' یہ تو خطرے کی بات ہے!"

"کیا ہوا اے مہا پجاری؟" میں نے اس کے چہرے پر پریشانی اور فکر مندی کے آثار دیکھ کر دریافت یا۔

"تُو جانتی ہے نا کہ میں تجھے ظالم ژیان کے ظلم سے بچانا چاہتا ہوں' تجھے اس کی نظر سے چھپانا چاہتا ہوں مگر تیرے دائیں شانے پر گدا ہوا یہ نشان ساری حقیقت کھول دے گا کہ تُو کون ہے!"

"ہاں میرے شانے پر سانپ کے پھن کا نشان ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ نشان مٹانا پڑے گا .... ہر قیمت پر مٹانا پڑے گا۔" مہا پجاری کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"کیا کرے گا تُو؟" میں کچھ اس کی فکر مندی کا سبب سمجھ رہی تھی۔

"تُو فکر نہ کر' تجھے تکلیف نہیں ہو گی۔" مہا پجاری نے یہ کہہ کر اپنے لباس کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں نکالیں' ان میں ایک تیز دھار خنجر بھی تھا۔ خنجر دیکھ کر میں ڈر گئی۔ مہا پجاری نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے دلاسا دیا۔ "ڈر مت' میں نے کہا نا کہ تجھے تکلیف نہیں ہو گی۔"

مہا پجاری نے پیلی سی ایک بوٹی چشمے کے پانی میں بھگوئی اور پھر اسے میرے دائیں شانے پر رگڑنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد مجھے اپنا شانہ سن محسوس ہوا۔ مہا پجاری نے مجھ سے اس کی تصدیق چاہی۔ پھر اس نے تصدیق کے بعد میری فراک اتار دی۔

خنجر اٹھا کر اس نے آہستہ سے میرے شانے پر چرکا لگایا اور بولا۔ "تجھے کچھ محسوس تو نہیں ہوا؟"

"نہیں' بالکل نہیں۔" میں نے جواب دیا اور گردن گھما کر شانے کو دیکھنے لگی جس پر خون کی ایک لکیر نظر آ رہی تھی۔

"تُو ادھر نہ دیکھ اور مجھے اپنا کام کرنے دے۔" مہا پجاری کے لہجے میں محبت تھی۔ میں نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر اس نے کوئی سفوف میرے شانے پر چھڑکا' پھر کوئی اور دوا لگائی اور پٹی باندھ دی۔ اس دوران میں خون آلود کپڑے کو اس نے میری نظروں سے چھپا کر بہتے ہوئے چشمے کے پانی میں پھینک دیا' مگر پھر بھی میں نے وہ کپڑا دیکھ ہی لیا۔ شاید وہ یہ چاہتا تھا کہ خون دیکھ کر میں ڈر نہ جاؤں۔

"تیرے سر کے بال بھی کاٹ دوں تو اچھا ہے۔" مہا پجاری پھر بڑبڑایا' انداز خود کلامی کا تھا۔

مجھے اپنے سنہری بال بہت عزیز تھے' مگر میں کچھ نہیں بولی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ یہ سب کچھ مجھے میرے دشمنوں سے چھپانے کے لئے کر رہا ہے۔

ہم وہاں سے چلنے ہی والے تھے کہ اچانک فضا گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی۔ وہ چار گھڑ سوار تھے جنہوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔

"اے پجاری! تُو اس لڑکی کو کہاں سے لے کر آیا ہے اور اسے کہاں لے جا رہا ہے؟" ایک گھڑ سوار نے مہا پجاری سے سوال کیا۔ یقیناً وہ گھڑ سوار اس کا حلیہ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ وہ پجاری ہے۔ میرے جسم پر موجود زیورات اور کپڑوں سے انہوں نے یہ اندازہ لگایا ہو گا کہ میں لڑکی ہوں۔

مہا پجاری نے وہی کہانی سنا دی جو مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ ان لوگوں نے مجھ سے تصدیق چاہی اور میں نے تصدیق کر دی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ وہ لوگ میرے زیورات کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"اب تیرا ارادہ کدھر کا ہے' تُو نے یہ نہیں بتایا؟" ایک گھڑسوار بولا۔

"اس پہاڑ کی دوسری طرف کچھ ہی فاصلے پر ایک بستی ہے' وہاں میرا دوست عارج رہتا ہے' میں اسی کے پاس جا رہا ہوں۔" مہا پجاری نے جواب دیا۔

"تُو کہتا ہے کہ تجھے یہ لڑکی راستے میں بھٹکتی ہوئی ملی تھی اور یہ اپنے قافلے سے بچھڑ گئی ہے۔ تُو اسے ہمارے حوالے کر دے۔ ہم آس پاس کی بستیوں میں اسے لے جائیں گے اور اس کے ماں باپ کو ڈھونڈ کر اسے ان کے سپرد کر دیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ تُو ہمیں یہ نیکی کمانے دے گا۔" ایک گھڑسوار نے کہا جس کی نظریں بار بار میرے زیورات پر پڑ رہی تھیں۔ اس کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔

مہا پجاری کے چہرے سے فکر و تردد کا اظہار ہونے لگا۔ ان گھڑسواروں نے یقیناً اسے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

"اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔" آخرکار مہا پجاری سوچ بچار کے بعد بولا۔ "یہ لڑکی اگر تمہارے ساتھ جانا چاہے تو لے جاؤ' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"یہ تو بچی ہے اور ناسمجھ ہے۔ اسے کیا معلوم کہ اس کی بھلائی کس کے ساتھ رہنے میں ہے۔ تُو اس پر فیصلہ کیوں چھوڑتا ہے؟" گھڑسوار نے بحث کی۔ "کیا یہ اچھا نہیں کہ اسے اس کے اپنوں میں پہنچا دیا جائے؟"

"یہی نیکی تو خود میں بھی کمانے والا تھا۔" مہا پجاری نے نرم آواز میں کہا۔

"تُو بوڑھا ہے اور اکیلا بھی ہے' تجھ سے یہ کام نہ ہو گا۔" گھڑسوار کی آواز میں سختی آ گئی۔ "ہم چار ہیں اور جوان ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تُو مان جا اور لڑکی کو ہمیں دے دے ورنہ ہم تجھ سے زبردستی بھی کر سکتے ہیں۔" پھر وہ اپنے گھوڑے سے کودا اور میرا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔

"چھوڑ دے مجھے .... چھوڑ دے۔ میں تیرے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس ہاتھ پر کاٹ لیا' مگر فوری طور پر اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا اور جواباً میرے منہ پر دوسرے ہاتھ سے ' نچہ مارا۔

چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ اس گھڑسوار کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ پچھاڑ کھا کر زمین پر گر . اس کا سارا جسم نیلا پڑتا جا رہا تھا اور وہ زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

یہ واقعہ اتنی تیزی کے ساتھ اور خلاف توقع رونما ہوا تھا کہ گھڑسوار کے ساتھی جیسے پتھر کے بن گئے۔ ن کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں ان کا ساتھی دیکھتے ہی دیکھتے ایڑیاں رگڑ ر رگیا تھا۔ اسے مرتے دیکھ کر خود میں بھی خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"اے لوگو! تم نے دیکھ لیا ظلم اور زبردستی کا نتیجہ؟" مہا پجاری کی آواز ابھری۔ وہ گھڑسواروں سے مخاطب تھا۔ "اپنے ساتھی کی لاش اٹھا لے جاؤ۔"

گھڑسواروں کو مہا پجاری کی آواز سن کر جیسے ہوش آ گیا۔ پھر ان میں سے ایک سخت غصے میں

یری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اے پجاری! یہ لڑکی نہیں بلکہ زہریلی ناگن ہے جس نے میرے وست کو ڈس لیا ہے اور یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔ نہ تُو حجت کرتا نہ جھگڑا بڑھتا۔ اب ہم تجھ سے پنے دوست کی موت کا انتقام لیں گے۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی۔ اس کے بقیہ دو اتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

"تم لوگ پھر ظلم پر کمر باندھ رہے ہو' اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔" مہا پجاری ہاتھ اٹھا کر بولا۔

انہوں نے مہا پجاری کی ایک نہ سنی اور اپنے اپنے گھوڑوں سے کود کر تلواریں بلند کئے مہا پجاری ی طرف لپکے۔

پھر میں نے دیکھا کہ ان میں سے جو آگے تھا' وہ اپنا سینہ پکڑے چیختا ہوا گر پڑا۔ مہا پجاری نے اپنی یب میں ہاتھ ڈال کر انتہائی سرعت کے ساتھ خنجر نکالا تھا اور پھر آگے آنے والے کا سینہ چھید دیا تھا۔

ایسے مواقع پر عموماً بچے سہم کر الگ کھڑے ہو جاتے ہیں اور میں بھی بچی ہی تھی' مگر کوئی جیسے مجھ ے کہہ رہا تھا کہ مجھے مہا پجاری کی مدد کرنا چاہئے۔ وہ شخص جو میرے کاٹنے سے مر گیا تھا' قریب ہی پڑا ما۔ میں نے اس کی کمر سے بندھی ہوئی تلوار کھینچ لی۔ مہا پجاری پر حملہ کرنے والوں کے چہرے میری لرف نہیں تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کے پہلو میں تلوار کی نوک گھسیڑ دی۔ اسی وقت اس کے اتھی نے مہا پجاری پر تلوار کا وار کیا۔ مہا پجاری اچھل کر ایک طرف ہو گیا اور وہ اپنے جسم کا توازن قرار نہ رکھتے ہوئے گر گیا۔ وہیں ایک نوکیلا پتھر پڑا تھا۔ مہا پجاری نے وہ پتھر تاک کر تلوار والے کے سر مارا۔ تلوار والا تیورا کر زمین پر آ رہا۔ مہا پجاری کے جسم میں بوڑھا ہونے کے باوجود خاصی پھرتی تھی۔ ہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ جس شخص کے سر پر پتھر پڑا تھا' وہ اب سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مہا پجاری نے میرے ہاتھ سے خون آلود تلوار جھپٹ لی اور اٹھنے کی کوشش کرنے والے کے سر پر پہنچ گیا۔

"مجھے زندگی بخش دے اے پجاری!" وہ شخص گڑگڑانے لگا اور مہا پجاری کو دیوتاؤں کا واسطہ دینے ا۔

مہا پجاری نے اس پر رحم کھا کر اسے وہاں سے زندہ جانے دیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ ی طرف اس طرح بھاگا جیسے موت اس کے تعاقب میں ہو۔ وہ شخص جس کے پہلو میں' میں نے تلوار ھسیڑ دی تھی' زمین پر اپنا پہلو دبائے پڑا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔

"اگر اسی طرح خون بہتا رہا تو یہ بھی زندہ نہیں بچے گا۔" مہا پجاری بڑبڑایا۔ پھر اس نے اپنی ایک ی سی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہی ڈبیا نکالی جو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ ڈبیا کھول کے چٹکی بھر سفوف ال کر اس نے ڈبیا پھر جیب میں ڈال لی اور زخمی شخص کے قریب جا بیٹھا اس نے زخم سے ہاتھ ہٹانے کو ہا۔ جب زخمی شخص نے ہاتھ ہٹایا تو خون اور تیزی سے بہنے لگا۔

میں نے مہا پجاری کو زخم پر سفوف چھڑکتے دیکھا اور پھر یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ لمحوں میں زخم ے خون بہنا بند ہو گیا۔ مہا پجاری نے جیب سے کوئی اور دوا نکال کر زخم پر لگائی' اس کے بعد پٹی باندھ ی۔

"میں تیرا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا اے پجاری کہ تُو نے مجھے مرنے سے بچا لیا۔" زخمی شخص دھیمی آواز میں بولا۔

پھر اسی زخمی شخص کے ایما پر مہا پجاری نے اسے گھوڑے پر بٹھا دیا۔ یوں وہ بھی وہاں سے چلا گیا۔ اس کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں بھی لے جا سکتا۔ لاشیں اسی لئے وہیں پڑی رہیں۔ مہا پجاری نے ایک لاش کے سینے سے اپنا خنجر کھینچ لیا تھا۔ خنجر بائیں طرف سینے میں پیوست تھا۔

"آؤ اب ہم بھی یہاں سے چلیں۔" مہا پجاری مجھ سے بولا۔

ایک بچی اور ایک بوڑھے کے مقابلے میں چار مسلح جوان تھے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے دو مارے گئے تھے اور دو زخمی ہو کر گئے تھے۔ یہ سب قدرت کے کھیل تھے۔ کیا خبر وہ چاروں میرے ساتھ کیا سلوک کرتے! ممکن ہے، میرے زیورات اتار کر وہ مجھے مار ہی ڈالتے۔

مہا پجاری اپنے گھوڑے کی لگام تھام کر میرے پاس آ گیا اور پھر اس نے مجھے گھوڑے پر بٹھا دیا۔

"اے میری بچی!" مہا پجاری نے خود بھی گھوڑے پر سوار ہو کر مجھے مخاطب کیا۔ "کیا تجھے اپنا نام معلوم ہے؟"

"ہاں اے مہا پجاری! میں معبلہ ہوں۔" مَیں نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

"نہیں اے میری بچی! اب تُو وادی سبز کے سردار اشم کی بیٹی معبلہ نہیں رہی۔" مہا پجاری نے یاددہانی کرائی۔ "تُو اپنے قبیلے سے بچھڑی ہوئی ایک بچی ہے اور تجھے نہ اپنی بستی کا نام معلوم ہے نہ قبیلے کا۔ تیرا نام آتون ہے۔ بس اسی نام کو یاد رکھ اور باقی سب کچھ بھلا دے۔"

"ہاں میں آتون ہوں۔" میں نے اپنا نیا نام دہرایا۔ "اور میں اپنے قبیلے سے بچھڑ گئی ہوں۔"

"شاباش!" مہا پجاری نے میری پیٹھ تھپکی اور بولا۔ "اب میں بھی تجھے آتون کہہ کر ہی پکاروں ." یہ کہتے ہوئے اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ "اور اے آتون! سن کہ جب دیوتاؤں نے تجھ پر یہ ز ظاہر کر ہی دیا ہے تو میں بھلا چھپانے والا کون، تجھے معلوم ہے نا کہ تیرے کھانے پینے کے برتن الگ ، اور کبھی کسی نے تیرا جوٹھا پانی نہیں پیا؟"

"ہاں اے مہا پجاری! مجھے معلوم ہے۔" میں نے تصدیق کی۔

"میں تجھے اے آتون! اس کی وجہ بتاتا ہوں۔ کیا تُو یقین کرے گی کہ اگر کوئی تیرا جوٹھا پانی پی لیتا تو جاتا۔"

مجھے سن کر واقعی شدید حیرت ہوئی اور بولی۔ "تُو کہتا ہے تو ایسا ہی ہو گا۔"

"یہ میں تجھے اس لئے بتا رہا ہوں میری بچی کہ تُو اپنی آئندہ زندگی میں وقت پڑنے پر اپنی حفاظت کر لے۔ یہ راز اب تک صرف دو سینوں تک محفوظ تھا اور اب اسے میں تیرے سینے میں منتقل کر رہا ہوں۔ ن میں سے ایک وادی سبز کا سردار اشم، یعنی تیرا باپ تھا اور دوسرا میں ہوں۔ کیا خبر کب میں تجھ سے ھڑ جاؤں اس لئے سن کہ دنیا کا خطرناک سے خطرناک زہر تجھے ہلاک نہیں کر سکتا اور........"

"مگر ایسا کیوں ہے اے مہا پجاری!" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"جس دن تو پیدا ہوئی تھی، اسی دن سے تیری حفاظت کی خاطر تجھے تھوڑی تھوڑی مقدار میں زہر دیا جانے لگا تھا۔ جب تو دو سال کی ہوئی اور تو نے اپنی ماں کا دودھ پینا چھوڑ دیا تو زہر کی مقدار رفتہ رفتہ بڑھائی جانے لگی۔ پانچ سال کی ہوتے ہوتے تو اس قدر زہریلی ہو چکی تھی کہ اگر کوئی تیرا جوٹھا پانی بھی پی لے تو زندہ نہ بچے۔ پھر تجھے زہر کھلانا بند کر دیا گیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ سو تو نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جس شخص کو تُو نے کاٹا تھا، چند ہی لمحوں میں مر گیا۔ دشمنوں کے خلاف یہ تیرے پاس ایک ہتھیار ہے۔ کوئی زہریلا سانپ بھی اگر تجھے ڈس لے تو زندہ نہ بچے۔"

میں حیرت سے مہا پجاری کی باتیں سنتی رہی۔ اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ خود میرے تجربے میں آ چکا تھا۔ اس لئے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

ہم پہاڑ کے قریب پہنچنے والے تھے کہ عقب سے چیخنے چلانے کی تیز آوازیں آئیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ آٹھ دس گھڑسوار تھے جو چیخ چیخ کر رک جانے کو کہہ رہے تھے۔ مہا پجاری نے اپنے گھوڑے کو اور تیزی سے دوڑانا شروع کر دیا۔ میں نے گھوڑے کی پسلیوں پر اس کے گھٹنوں کا واضح دباؤ محسوس کیا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک درہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے گھوڑے کا رخ اسی طرف تھا۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ مردود ژیان ادھر بھی ہماری تلاش میں اپنے سواروں کو بھیج دے گا ورنہ میں راستے میں رک کر ہرگز آرام نہ کرتا۔" مہا پجاری خودکلامی میں مبتلا تھا۔ اس سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ مجھے بھی خطرے کی نوعیت کا علم ہو گیا تھا۔

مہا پجاری سے واقعی غلطی ہو گئی تھی۔ وہ اجنبی لوگوں کو تو میرا حلیہ اور نام بدل کر دھوکا دے سکتا تھا، مگر وادی سبز میں تو ہر شخص چہرے سے مجھے جانتا پہچانتا تھا۔ ان لوگوں کو دھوکا دینا ممکن نہیں تھا۔

گھوڑا دوڑاتا ہوا اب مہا پجاری پہاڑی درے میں داخل ہو چکا تھا۔ کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد بائیں جانب ایک پتلی سی دراڑ نظر آئی۔ مہا پجاری نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ وہ دراڑ اتنی تنگ بہرحال نہیں تھی کہ اس میں گھوڑا داخل نہ ہو سکتا۔ قدرت ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ دراڑ آگے جا کر دائیں طرف مڑ گئی۔ اب اگر کوئی درے میں اس دراڑ کے سامنے رک کر دیکھتا تو ہم اسے نظر نہ آتے۔

معلوم نہیں کیا سوچ کر مہا پجاری نے گھوڑا روک لیا حالانکہ آگے راستہ موجود تھا اور وہ دراڑ آگے کچھ اور چوڑی ہوتی چلی گئی تھی۔ دراڑ میں نیم تاریکی تھی۔ مہا پجاری نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ لگتا تھا جیسے وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ دیر اور ہوئی تھی کہ دور کہیں دھمک سی سنائی دی جو بتدریج قریب ہوتی گئی۔ پھر یہی دھمک ذرا واضح ہو کر گھوڑوں کی ٹاپوں میں تبدیل ہو گئی۔ میں سمجھ گئی کہ دشمن درے میں داخل ہونے کے بعد اسی دراڑ کے قریب ہوتا جا رہا ہے جس کے اندر ہم داخل ہوئے تھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں سوچنے لگی کہ اگر انہیں یہ شک ہو گیا کہ ہم دراڑ میں چھپے ہوئے ہیں تو کیا ہو گا؟

میرے سارے اندیشے اور وسوسے غلط ثابت ہوئے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں قریب آ کر دور ہوتی گئیں اور پھر بالکل معدوم ہو گئیں۔ خطرہ ٹل گیا تھا۔ دشمن نے اس دراڑ پر توجہ نہیں دی تھی۔

"ہمیں ابھی کچھ دیر یہیں رکنا پڑے گا اے میری بچی!" مہا پجاری نے مجھے مخاطب کیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے وہیں رکے رہنے کی وجہ پوچھتی' وہ خود ہی بولا۔ "جب تک وہ لوگ' یعنی ہمارے دشمن بستی میں ہماری تلاش کے بعد ناکام ہو کر نہ لوٹ جائیں' ہمارا بستی میں داخل ہونا خطرناک ہو گا۔ وہ اسی راستے سے واپس جائیں گے اور ہمیں گھوڑوں کی ٹاپیں سن کر اندازہ ہو جائے گا کہ دشمن واپس چلے گئے۔ میرے اندازے کے مطابق واپسی میں انہیں زیادہ دیر نہیں ہو گی کیوں کہ اسی پہاڑ کے دامن میں وہ بستی آباد ہے۔ درے سے کچھ ہی فاصلے پر وہ بستی ہے جہاں خود ہمیں بھی پہنچنا ہے اور جہاں میرا دوست عارج رہتا ہے۔ ہم اس کے پاس پہنچ کر محفوظ ہو جائیں گے۔"

میں پھر کچھ نہ بولی اور گھوڑے ہی پر اس کے ساتھ بیٹھی رہی کیوں کہ پورے طور پر ابھی خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ ہمارا دشمن قریب ہی موجود تھا اور جب تک ہمیں اس کی واپسی کا یقین نہ ہو جاتا' ہم مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

انتظار کے وہ لمحے مجھے بہت طویل محسوس ہوئے' مگر آخرکار وقت کو گزرنا ہی تھا اور وقت گزر گیا۔ ہم نے درے کے اندر دشمن کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنیں جو پہلے قریب آئیں' پھر دور ہو گئیں۔ مہا پجاری نے طویل سانس لیا۔

وہ دراڑ اس قدر چوڑی بہرحال نہیں تھی کہ گھوڑے کو واپسی کے لئے موڑا جا سکتا۔ مجبوراً ہم اسی میں آگے بڑھتے رہے۔ آگے جا کر وہ خاصی چوڑی ہو گئی تھی۔ اب گھوڑے کو احتیاط کے ساتھ واپسی کے لئے موڑا جا سکتا تھا' مگر مہا پجاری نے ایسا نہیں کیا۔ وہ آگے ہی بڑھتا رہا۔ اس دراڑ کا اختتام ایک ایسی جگہ ہوا جہاں سے آگے بڑھنے کا راستہ نہیں تھا۔ وہاں خلا تھا۔ مہا پجاری نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور نیچے اتر گیا۔ مجھے اس نے گھوڑے ہی پر بیٹھا رہنے دیا۔ مجھے سامنے دور تک ایک کھلا میدان نظر آ رہا تھا اور وہ میدان خاصا نیچے تھا۔

"یہاں سے نیچے جانا ممکن نہیں ہے۔ ہم قدرے بلندی پر ہیں۔ پھر یہ کہ ہمارے ساتھ گھوڑا بھی ہے۔ ہمیں واپس اسی طرف چلنا پڑے گا جہاں سے اس دراڑ میں داخل ہوئے تھے۔" مہا پجاری نے بتایا پھر گھوڑے کو موڑنے لگا۔

جگہ ہرچند کہ تنگ تھی مگر وہ گھوڑا موڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ واپسی کا سفر شروع ہو گیا اور ہم کچھ ہی دیر بعد دراڑ سے نکل کر درے میں پہنچ گئے اب مہا پجاری نے گھوڑے کو تیزی سے دوڑانا شروع کر دیا۔

جلدی ہی ہم درے سے نکل آئے اور ہمیں درختوں کے درمیان چھوٹے بڑے جھونپڑے اور کچے پکے گھر نظر آنے لگے۔

مہا پجاری کے دوست عارج کا گھر بستی کی مشرقی سمت میں تھا۔ بستی میں داخل ہو کر ہم اسی طرف

جا رہے تھے کہ گلی کی مخالف سمت سے کئی گھڑسوار اچانک ہماری جانب آتے دکھائی دیئے۔

"رک جاؤ۔" انہوں نے دور ہی سے کہا۔

مہا پجاری نے گھوڑا روک لیا اور ان گھڑسواروں نے قریب آ کر ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"کیا تم عارج کے دوست ہو اور اسی کے گھر جا رہے ہو؟" ایک گھڑسوار نے مہا پجاری سے سوال کیا۔

مہا پجاری' گھڑسوار کے اس سوال پر چونک اٹھا' مگر اسے اقرار میں جواب دینا ہی پڑا۔

"اگر تم وہی ہو تو پھر خود کو زیر حراست سمجھو۔" گھڑسوار نے سخت لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟ تم لوگ ہمیں کس لئے اور کس جرم میں گرفتار کر رہے ہو؟" مہا پجاری نے دریافت کیا۔

"اس لئے کہ تم دونوں ہماری بستی کے دو نوجوانوں کے قاتل ہو۔ بولو' کیا تم نے انہیں قتل نہیں کیا؟"

"ہاں' مگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ہمیں قتل کر دیتے۔ ہم نے اپنی زندگی بچانے کی خاطر.........."

"یہ صفائی تم ہمارے سردار اشر کے سامنے پیش کرنا۔" گھڑسوار نے مہا پجاری کی بات کاٹ دی۔ "اب ہم جدھر کہتے ہیں چلو' اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی اے پجاری! تو ہم تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے چلو۔" مہا پجاری کو مجبوراً ان گھڑسواروں کی بات ماننا ہی پڑی۔

وہ گھڑسوار ہمیں اپنے حلقے میں لئے بستی کی ایک بلند و بالا عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ اس عمارت کو دیکھ کر مجھے اپنی محل نما حویلی یاد آ گئی۔ میں نے سوچا کہ اس عمارت میں بستی کا سردار ہی رہتا ہو گا اور پھر میرا خیال درست ہی ثابت ہوا۔

حویلی کے بلند دروازے کے سامنے ہمیں گھوڑے سے اتار لیا گیا۔ ہمارا گھوڑا ایک محافظ نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

"تم لوگ یہیں ٹھہرو' میں سردار سے حاضری کی اجازت لے کر آتا ہوں۔" گھنی مونچھوں والے ایک محافظ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اگر اس وقت حاضری کی اجازت نہ ملی تو مجبوراً ان دونوں کو قیدخانے میں ڈالنا پڑے گا۔ اچھا ہے کہ ان کا فیصلہ ابھی ہو جائے۔" پھر وہ حویلی کے بلند دروازے میں داخل ہو گیا۔ وہاں پہرے پر جو محافظ کھڑے تھے' انہوں نے اسے نہیں روکا۔

مہا پجاری کے وہم و گمان میں بھی شاید یہ بات نہیں رہی ہو گی کہ بستی میں داخل ہوتے ہی یہ افتاد پڑ جائے گی ہمیں دو افراد کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اگر مہا پجاری کو ذرا سا بھی یہ شک ہو جاتا تو وہ یقیناً اس بستی کا رخ نہیں کرتا۔ بستی کے دو افراد ہمارے ہاتھوں مارے گئے ہیں' بستی والوں کو اس کا علم انہی دو آدمیوں سے ہو سکتا تھا جنہیں مہا پجاری نے رحم کھا کر زندہ چھوڑ دیا تھا۔ ان میں سے ایک زخمی شخص کی تو اس نے مرہم پٹی بھی کی تھی۔

محافظ کی واپسی تک میرے ذہن میں یہی خیالات چکراتے رہے۔ محافظ نے ہمیں آ کر بتایا کہ بستی کا سردار ہم سے اسی وقت ملنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ ہم محافظوں کے نرغے میں حویلی کے اندر پہنچے۔ ایک بڑے سے کمرے میں مسند پر قوی ہیکل سردار بیٹھا ہوا تھا۔ مہا پجاری' سردار کا اشارہ پا کر میرا بازو تھامے آگے بڑھا اس نے جھک کر سردار کو تعظیم دی۔

"اے پجاری! بتا کہ تُو نے ہماری بستی کے دو آدمیوں کو کیوں مار دیا؟" سردار نے بھاری آواز میں مہا پجاری سے سوال کیا۔

"وہ چار تھے اور میں اس بچی کے ساتھ اکیلا تھا۔ اے سردار! تُو ہی انصاف کر کہ حملہ آور کون ہو گا؟" مہا پجاری نے نرمی سے جواب دیا۔

"تفصیل سے بتا کہ کیا ہوا تھا؟" سردار نے حکم دیا۔

"میں یہاں اپنے دوست عارج سے ملنے آ رہا تھا کہ راستے میں مجھے یہ بچی آتون بھٹکتی ہوئی ملی جو اپنے قافلے سے بچھڑ گئی تھی۔ میں نے اسے ساتھ لے لیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔ پہاڑ کے قریب پہنچ کر چشمے کے کنارے میں دم لینے کو رکا تو اس بستی کے چار مسلح گھڑسواروں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہ زبردستی مجھ سے اس بچی کو چھین لینا چاہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس بچی کے جسم پر زیورات دیکھ کر لالچ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انہوں نے زبردستی کی تو میں نے مزاحمت کی کیوں کہ یہ بچی ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ سو یوں وہ مارے گئے اور بقیہ دو آدمیوں پر بھی برتری حاصل ہونے کے باوجود میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ تُو ان سے میرے بیان کی تصدیق کر سکتا ہے۔ ان میں سے ایک خون بہنے سے مر جاتا' اگر میں اس کے زخم پر دوا لگا کر پٹی نہ باندھتا۔" مہا پجاری نے مختصر الفاظ میں واقعہ بیان کر دیا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ اس نے دانستہ اس واقعے میں میرا یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ مرنے والوں میں سے ایک میرے کاٹنے کے سبب مرا تھا۔

سردار نے دونوں افراد کو پیش کرنے کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ وہ قید میں تھے۔ ایک محافظ' اپنے سر ر کا حکم سن کر وہاں سے چلا گیا۔

"اے پجاری! اس بچی کے بارے میں تیرا بیان یہ ہے کہ تجھے راستے میں بھٹکتی ہوئی ملی تھی' مگر ہم ـ بچھ اور ہی سنا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ بچی وادی سبز کے سردار اشم کی بیٹی ہے اور تیرا تعلق بھ سی وادی سے ہے۔ تُو اس سردارزادی کو وہاں سے لے کر فرار ہوا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر تو گزری ہے کہ سردار اشم کے بھیجے ہوئے سپاہی یہاں آئے تھے اور انہوں نے ہمیں سردار اشم کا زبانی پیغام دیا تھا۔ سر ر اشم کا پیغام یہ تھا کہ وادی سبز کا مہا پجاری ہماری بیٹی کو اغوا کر کے فرار ہو گیا ہے۔ اگر وہ تیری بستی میں آئے تو اسے گرفتار کر کے فوراً ہمارے پاس بھیج دے۔ میں سردار اشم کی عزت کرتا ہوں۔ اس نے بر سا پہلے میری مدد کی تھی جب میرے دشمن قبیلے نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ مجھے لگتا ہے اے پجاری کہ تُو ں جان بچانے کے لئے جھوٹ بول رہا ہے اور نہیں جانتا' ہر صورت میں تیری سزا موت ہے! چاہے تو وا ی سبز کا مفرور ہو یا اس بستی کے دو افراد کو قتل کرنے کا مجرم۔" یہ کہہ کر سردار مہا پجاری کو گھورنے

لگا' یو ں جیسے اس سے سچ اگلوانا چاہتا ہو۔

ژیان کی عیاری پر مجھے حیرت ہوئی۔ اس نے میری بازیابی کے سلسلے میں سچ کو چھپا لیا تھا۔ اس بستی کا سر ار' میرے بابا کا ممنون احسان ہے' یہ بات یقیناً ژیان کو بھی معلوم ہو گی تبھی اس نے یہ چال چلی تھی۔

"اے سردار! میں سچ بولنے پر راضی ہوں' مگر اسی کے ساتھ میں تجھ سے ایک التجا بھی کرنا چاہتا ہو ں کہ تُو وادی سبز کے محترم سردار اشم کی بیٹی معبلہ کو اپنی امان میں لے لے۔" مہا پجاری بول اٹھا۔

"سردار اشم کی بیٹی معبلہ!" سردار حیرت سے بولا۔ "یہ تُو کیا کہہ رہا ہے؟ کیا تُو ہوش میں ہے؟ اور کیا نہیں جانتا کہ اس جرم کی کتنی بھیانک سزا ہے؟ کیا تجھے اعتراف ہے کہ تُو وادی سبز کا مفرور مہا پجار ی ہے اور سردار اشم کی بیٹی کو وہاں سے لے کر فرار ہوا ہے؟"

"ہاں اے سردار' مجھے اعتراف ہے' مگر تجھے دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ وادی سبز کا وہ محترم سرد ر اشم کہ تُو جس کی عزت کرتا ہے' اپنے عیار وزیر ژیان کے ہاتھوں قتل کیا جا چکا ہے۔" مہا پجاری کی واز میں یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ تھا۔

"مگر کب اور کیسے؟" سردار نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

جواب میں پہا پجاری نے وادی سبز میں پیش آنے والے ہولناک واقعات پوری تفصیل کے ساتھ بیا کر دیئے۔

"اے مہا پجاری! اگر تُو سچا ہے تو پھر سردارزادی کے دائیں شانے پر سردار کی مہر ہونا چاہئے۔ ہمیں سردارزادی کا شانہ کھول کر دکھا۔" سردار بولا۔

"اے سردار! جیسا کہ میں تجھ سے بیان کر چکا ہوں' مجھے ڈر تھا کہ ژیان سردارزادی کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا سو میں نے اس کے دائیں شانے پر موجود مہر کو خنجر سے چھیل دیا' اس کے سنہ ے بالوں کو کاٹ کر اس کا حلیہ بدل دیا' یہاں تک کہ اس کی جان بچانے کے لئے اس کا نام تک معبلہ کی بجائے آتون رکھ دیا۔ میرے اس سچ کی گواہی سردارزادی کا زخمی شانہ ہے اور خود سردار زادی ہے۔ تُو ا سے تصدیق کر سکتا ہے۔" مہا پجاری یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

سردار کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر وہ ذرا دیر کے بعد بولا۔ "ممکن ہے کہ تُو نے اپنے بچاؤ کی خاطر پہلے ہی سے اس بچی کو ڈرا دھمکا لیا ہو کہ تُو جو بھی کہے' وہ اس کی تصدیق کر دے۔ تیر ے بیان کی صداقت کا اسی وقت علم ہو سکتا ہے جب ہمارا کوئی بھیدی وادی سبز جا کر وہاں کے حالات معلو م کرے اور تیرے بیان کی تصدیق کر دے۔ اس بچی کا بیان کافی نہیں ہے۔"

اسی دوران میں وہ دونوں افراد وہاں لائے جا چکے تھے جن میں سے ایک کے پہلو میں خود میں نے تلو ر گھسیڑی تھی۔

"سچ بتاؤ کہ کیا بچی کے زیورات کے لالچ ہی نے تمہیں اندھا نہیں کر دیا تھا؟" سردار نے ان دو ں کو مخاطب کیا۔

مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ ان دونوں نے اعتراف کر لیا۔ اسی کے ساتھ اپنی جان بخشی پر مہا پجاری کے ممنون احسان ہونے کا ذکر بھی کیا۔

"ہاں کھوٹ ہمارے ہی دلوں میں تھا۔" انہوں نے کہا تھا۔

پھر معلوم ہوا کہ اگر وہ بستی میں آکر اصل واقعہ بیان نہ کرتے تو انہیں انہی کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں سزائے موت ہو جاتی۔ اس پر بھی انہیں قید کر دیا گیا تھا کیوں کہ ان کے بیان کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔

"مہا پجاری نے اپنی جان بچانے کی خاطر بستی کے دو نوجوانوں کو قتل کر دیا اور اسے اپنی جان بچانے کا حق تھا۔" بستی کا سردار فیصلہ سنا رہا تھا۔ "سو اسے باعزت طور پر اس الزام سے بری کیا جاتا ہے مگر کیوں کہ اس پر ایک سردار زادی کے اغوا کا بھی الزام ہے اسی لئے وہ زیر حراست رہے گا اور اسی وقت رہا کیا جائے گا جب اس الزام سے بری کر دیا جائے۔ مشتبہ سردار زادی اس وقت تک ہماری حویلی پر رہے گی جب تک مہا پجاری کے بیان کی تصدیق نہیں ہو جائے۔ وہ جنہوں نے لالچ کیا' انہیں تین تین کی سزا دی جاتی ہے کہ وہ دونوں اپنے جرم کا اعتراف کر چکے ہیں۔"

سردار کے حکم کی تعمیل میں مہا پجاری کو وہاں سے محافظ لے گئے اور سزا یافتہ دونوں افراد کو بھی محافظوں نے وہاں سے ہٹا دیا۔ پھر سردار نے مجھے اپنی حویلی کی ایک خادمہ کے سپرد کر دیا۔ خادمہ نے میرے بے ترتیب کاٹے ہوئے بالوں کو قینچی سے درست کیا اور مجھے نیا لباس پہننے کو دیا۔ میں جو زیورات پہنے ہوئے تھی' اسے اتار کر محافظ خانے میں جمع کرا دیا گیا۔ حویلی کا ایک کمرہ میری بود و باش کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اور ایک خادمہ میری خدمت پر مامور تھی۔ حویلی کے اندر کہیں بھی آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی' مگر مجھے یہ تاکید کر دی گئی تھی کہ حویلی سے باہر قدم نہ رکھوں۔

وادی سبز سے فرار ہونے کے بعد آخرکار مجھے اس بستی میں پناہ مل گئی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ اس بستی کا سردار' میرے بابا کا ممنون احسان تھا ورنہ کیا خبر' کیا صورت پیش آتی! مجھے یقین تھا کہ بہت جلد مہا پجاری کے بیان کی تصدیق ہو جائے گی اور اسے باعزت طور پر میرے اغوا کے الزام سے بری کر دیا جائے گا۔ اسی روز رات کو بستی کے سردار نے مجھے اپنی خلوت میں بلوایا اور شفقت و محبت کے ساتھ کرید کرید کر مجھ سے تمام واقعات کی تصدیق چاہی۔ میں نے جب اپنی ماں اور بابا کے قتل کا واقعہ بیان کیا تو بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سردار نے محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور تسلی دی۔

"اے میرے عزیز دوست سردار اشم کی بیٹی معبلہ! تیرے ساتھ جو ظلم ہوا ہے' یقین کر کہ اس پر تیرے باپ کا دوست خاموش نہیں بیٹھے گا۔ وادی سبز کی تُو وارث ہے اور میں تجھے تیرے حق سے محروم نہیں ہونے دوں گا۔" سردار کے لہجے میں سچ کی خوشبو تھی۔

پھر سردار نے مجھے میرے کمرے میں سونے کے لئے بھیج دیا۔ اس کی محبت و شفقت نے مجھے متاثر کیا تھا۔

دوسرے ہی دن صبح مہا پجاری کو میرے اغوا کے الزام سے بھی بری کر دیا گیا حالانکہ ابھی سردار کا کھوجی وادی سبز سے لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ سردار کو میرے بیان پر یقین آگیا تھا۔ اس بستی میں بھی مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے ایک پجاری موجود تھا۔ مہا پجاری کو اسی کے ہم پلہ قرار دے کر عبادت گاہ میں بھیج دیا گیا۔ دوپہر ہونے تک کھوجی بھی لوٹ آیا۔ اس نے بھی مہا پجاری کے بیان کی تصدیق کر دی۔

ابھی مجھے اور مہا پجاری کو اس بستی میں سکون و اطمینان کے ساتھ رہتے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک رات پھر مجھے پُراسرار سرگوشیاں سنائی دیں۔ کوئی مجھ سے سرگوشیوں میں کہہ رہا تھا کہ اے معبلہ! یہاں سے بھاگ جا کہ یہاں خون برسنے والا ہے۔ ژیان کو اپنے مخبر عارج کے ذریعے معلوم ہو چکا ہے کہ تُو یہاں اس بستی میں ہے۔ تُو وادی سبز کی وارث ہے اس لئے ژیان تجھے ختم کر دینا چاہتا ہے۔ یہی مقصد حاصل کرنے کی خاطر وہ کل رات اس بستی پر شب خون مارنے والا ہے۔ دیکھ' تُو خود ہی اپنی بند آنکھوں سے دیکھ کہ کل رات کیا ہونے والا ہے۔ پھر میں نے جو کچھ دیکھا' وہ بہت ہولناک تھا۔ میں نے بچوں کو نیزوں پر اچھالے جاتے دیکھا۔ مرد مجھے عورتوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹتے نظر آئے۔ گاؤں سے مجھے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیئے۔ یہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر میں دہشت زدہ ہوئی۔ وہ شاید خود میری ہی چیخوں کی آوازیں تھیں جن سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔

میں نے آنکھ کھلتے ہی خوفزدہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ سامنے طاق پر چراغ جل رہا تھا جس کی لو مدھم تھی۔ اکیلے مجھے اس کمرے میں ڈر لگنے لگا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی' مگر خوف کم نہ ہوا۔ جب میں نے اس کمرے میں اپنا دم گھٹتا محسوس کیا تو مجبوراً دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کچھ ہی فاصلے پر دائیں جانب جو حویلی کا باغ تھا جدھر سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی' میرے قدم جیسے خود بخود اس طرف اٹھنے لگے۔ باغ کی سمت جاتے ہوئے مجھے قدرے سکون سا محسوس ہوا۔ میں ایک راہداری عبور کر کے باغ میں پہنچ گئی۔ میں باغ میں داخل ہو کر ایک جانب بڑھ رہی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی۔ میری سماعت سے ایک جانی پہچانی آواز ٹکرائی تھی۔ یہ آواز بستی کے سردار کی تیسری نوجوان بیوی ایرسا کی تھی۔

"دیکھ تُو یہاں نہ آیا کر۔" ایرسا کسی سے کہہ رہی تھی۔ "اگر سردار کو معلوم ہو گیا کہ تُو مجھ سے ملنے یہاں آتا ہے تو وہ تجھے قتل کر دے گا اور پھر شاید وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ کیا تجھے اس سے خوف نہیں آتا؟"

"نہیں اے ایرسا!" جواب میں ایک مردانہ آواز ابھری۔ "تیرے عشق نے مجھے بے خوف کر دیا ہے۔ کیا تُو بھول گئی کہ اگر اس بوڑھے کی رال تجھ پر نہ ٹپک جاتی تو میں تجھے ہی اپنی بیوی بناتا۔ میری بات مان لے ایرسا! میرے ساتھ اس بستی سے نکل چل۔"

"مگر اے عارج! ہم یہاں سے فرار ہو کر جائیں گے کہاں؟" ایرسا نے سوال کیا۔

"میں تجھے یہاں سے وادی سبز لے جاؤں گا۔ وہاں کے نئے سردار ژیان سے میں نے بات کر لی

ہے۔ وہ ہم دونوں کو پناہ دینے پر راضی ہو گیا ہے۔"

"اور اگر سردار نے ژیان سے ہماری واپسی کا مطالبہ کیا تو کیا ژیان ہمیں سردار کے سپرد نہ کرے گا؟"

"نہیں' ایسا نہیں ہو گا۔" عارج پُریقین آواز میں بولا۔ "تُو سوچ لے کل رات تک۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم کل رات یہاں سے فرار ہو جائیں۔" تو یہ وہی شخص عارج ہے جس نے ژیان سے میری اور مہا پجاری کے بارے میں مخبری کی ہے۔ میں نے سوچا۔ مہا پجاری اسے اپنا دوست سمجھتا ہے مگر وہ دوست نہیں دشمن ہے۔ ایرسا اور عارج کی گفتگو سن کر میں اتنا تو سمجھ ہی گئی تھی کہ اس طرح ان دونوں کا چھپ کر ملنا یقیناً کوئی بڑا جرم ہے جس کی سزا قتل ہو سکتی ہے۔ عارج نے ژیان سے مخبری کر کے اس بستی میں میرا مزید رہنا ناممکن بنا دیا تھا۔ اس نے مجھ سے دشمنی کی تھی' میری زندگی خطرے میں ڈال دی تھی اس لئے مجھے اس شخص سے انتقام لینے کا پورا حق تھا۔

میں یہی سب کچھ سوچ کر دبے قدموں باغ سے نکل آئی۔ حویلی میں سردار کی خواب گاہ کہاں ہے مجھے اس کا علم تھا۔ مختلف راہداریوں سے گزرتی ہوئی میں وہاں پہنچ گئی۔ خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دینا شروع کر دی۔ آہستہ دستک دینے سے میرا مقصد یہ تھا کہ حویلی کے اور لوگوں کی نیند خراب نہ ہو۔

ذرا ہی دیر کے بعد مجھے دروازے کی دوسری سمت بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔

"تُو!" سردار مجھے دیکھ کر حیرت سے بولا۔ "اس وقت؟"

"ہاں اے سردار!" میں نے اعتماد کے ساتھ کہا اور پھر اسے جلدی جلدی بتا دیا کہ اس کی تیر نوجوان بیوی ایرسا حویلی کے باغ میں ایک شخص عارج کے ساتھ موجود ہے۔

"مگر اے معلبہ! تجھے اس بات کی خبر کیسے ہو گئی؟" سردار نے بے یقینی کے سے لہجے میں پوچھا۔

"سوتے سوتے اچانک میری آنکھ کھل گئی تھی اے سردار!" میں نے بتایا۔ "کمرے میں میرا دل گھبرایا تو میں باغ کی طرف ٹہلنے نکل گئی اور پھر وہیں میں نے ان دونوں کی آوازیں سنیں۔"

"اے معلبہ! مجھے اس جگہ لے چل' مگر ٹھہر جا۔" یہ کہہ کر سردار لپکتا ہوا اپنی خواب گاہ میں گیا اور لوٹا تو اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔

سردار مجھے اپنے ساتھ لئے باغ کی طرف چل دیا۔ چاند کی وہ بارہویں تاریخ تھی۔ باغ میں ہر طرف چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ میں سردار کو لے کر اس کنج کے قریب پہنچ گئی جہاں سے میں نے عارج اور ایرسا کی آوازیں آتی ہوئی سنی تھیں۔ یہ ان دونوں کی بدقسمتی ہی تھی کہ وہ ابھی تک وہیں موجود تھے۔

"اے ایرسا! تیرا جسم بستر دیبا و حریر ہے۔" عارج کی خواب ناک آواز ابھری۔

اسی دوران میں سردار ان دونوں کے سر پر برہنہ تلوار لئے پہنچ گیا۔ میں نے عارج کو اٹھ کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اس کنج سے نکلنے والا مرد عارج ہی ہو سکتا تھا۔ سردار نے پیچھے سے جھپٹ کر اس کے سر

پر تلوار کا کھڑا وار کیا۔ ضرب یقیناً بہت بھرپور تھی کیوں کہ تلوار کاسۂ سر کو توڑتی ہوئی اندر اتر گئی تھی۔ وہ چیخ بھی نہ سکا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ سردار خون آلود تلوار تھامے پلٹا۔ ایرسا اپنا بے ترتیب لباس درست کرتی ہوئی کنج سے باہر نکلی ہی تھی کہ سردار کا ہاتھ بلند ہوا۔ ایرسا کی نرم و نازک گردن پر تلوار کی ضرب پڑی اور پھر اس کا سر کٹ کر دور جا گرا۔ ایرسا کو بھی چیخنے کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔

عارج نے ژیان سے مخبری کر کے میری زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ میں نے اس سے انتقام لے لیا تھا۔

پھر میں نے دیکھا کہ سردار نے حویلی کے محافظوں کو طلب کر کے کسی غیر ضروری شور اور ہنگامے کے بغیر عارج اور ایرسا کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا حکم دے دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے حویلی کے باغ کی رات پہرا دینے والے دو محافظوں کی گرفتاری کا حکم بھی دیا۔ اس کے خیال میں وہ دونوں محافظ ایرسا یا عارج سے ملے ہوئے تھے۔ ان محافظوں کی نظر میں آئے بغیر عارج حویلی کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں ابھی تک وہیں تھی۔ سردار خود مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے آیا اور دروازے پر رک کر بولا۔ "اے معلبہ! میں تیرا ممنون ہوں کہ تُو نے مجھے ایک بے وفا اور بدکار عورت سے نجات دلائی۔ جا اب تُو جا کر سو جا۔"

"اور اے سردار! ایک غدار سے بھی تجھے چھٹکارا مل گیا۔" میں بولی۔

"غدار!" سردار نے حیرت سے کہا۔ "کیا تُو کچھ اور بھی جانتی ہے؟"

"ہاں اے سردار! عارج غدار تھا اور کل رات تجھے اس کی غداری کا ثبوت مل جائے گا۔" میں نے کہا۔

سردار میرے ساتھ ساتھ کمرے میں آ گیا اور بولا۔ "مجھے بتا اے معلبہ کہ معاملہ کیا ہے؟ یقیناً تُو بہت کچھ جانتی ہے۔"

"بہت کچھ تو نہیں مگر مجھے یہ ضرور معلوم ہے' اے سردار! کہ عارج' ژیان کا مخبر تھا۔ اسی نے ژیان کو یہ خبر پہنچائی تھی کہ میں نے اور مہا پجاری نے تیری بستی میں پناہ لی ہے۔ ہم تیری پناہ میں ہیں۔ ژیان آنے والی رات کو اپنی پوری قوت سے اس بستی پر شب خون مارنے والا ہے۔" میں نے سردار کو خطرے سے آگاہ کر دیا۔

"تُو نے یقیناً یہ ساری باتیں عارج ہی کی زبانی سنی ہوں گی۔ وہ ایرسا کو یہ سب کچھ بتا رہا ہو گا' اسی کے ساتھ اسے اپنے ساتھ فرار کی ترغیب دے رہا ہو گا؟" سردار کا لہجہ تصدیق طلب تھا۔ اس نے خود ہی میری معلومات کے ذریعے کا اندازہ لگا لیا تھا جو غلط تھا' مگر میں نے اس کی تردید نہیں کی۔ میں اسے پُراسرار سرگوشیوں کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اگر بتا بھی دیتی تو وہ شاید میرے مقتول بابا کی طرح میری بات پر یقین نہ کرتا۔

"ہاں اے سردار! عارج تیری بیوی کو فرار ہی کی ترغیب دے رہا تھا۔" میں نے اس کے اندازے

کی جزوی تائید کر دی جو غلط نہیں تھی۔

"یقیناً وہ شب خون سے پہلے ہی ایرسا کو لے کر بستی سے نکل جانا چاہتا ہو گا۔" سردار خود کلامی کے انداز میں بولا' پھر مجھ سے کہا۔ "تو نے اے معبلہ! مجھے آنے والے خطرے سے آگاہ کر کے بہت اچھا کیا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھے تھے۔

اس وقت رات کو تو میں سردار کی فکرمندی کا سبب نہ جان سکی' مگر دوسرے دن صبح مجھے اس کی وجہ معلوم ہو گئی۔ وادی سبز کے مقابلے میں اس بستی کی افرادی قوت بہت کم تھی۔ یہ اہم بات مجھے مہا پجاری سے معلوم ہوئی تھی جسے میں نے حویلی میں ایک خادم کو بھیج کر بلوایا تھا۔ وہ اس وقت میرے کمرے میں تھا اور کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے اسے پُراسرار سرگوشیوں اور پیشگوئی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ گزشتہ رات جو واقعات پیش آئے تھے' وہ بھی مختصراً میں نے مہا پجاری سے بیان کر دیئے تھے۔

مہا پجاری کو پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ مجھے پُراسرار سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں اور جو کچھ آئندہ پیش آنے والا ہوتا ہے مجھے قبل از وقت اس کی خبر ہو جاتی ہے۔ وادی سبز میں جو ہولناک واقعات رونما ہوئے تھے ان کے بارے میں بھی میں نے اسے بتایا کہ پہلے ہی سے مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔

"تو پھر اے میری سردارزادی! تجھے اپنے بابا سردار اشم کو خطرے سے آگاہ کر دینا چاہئے تھا۔" مہا پجاری دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"میں نے بابا کو تو نہیں' ہاں ماں کو ساری باتیں بتا دی تھیں اور اس نے بابا سے وہ باتیں کہہ بھی دی تھیں..........." پھر جو کچھ ہوا تھا میں نے بتا دیا کہ بابا نے ان باتوں پر یقین نہیں کیا تھا اور خود ژیان کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا تھا۔

"کاش سردار اشم نے تجھ پر یقین کیا ہوتا' اے معبلہ!" مہا پجاری پُر تاسف آواز میں بولا' پھر کہا۔ "تو اپنی پیشگوئی کی سچائی کا ثبوت دے چکی ہے اس لئے مجھے یقین ہے کہ ژیان اس بستی پر شب خون ضرور مارے گا اور .... اور ہماری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ بستی کا سردار ہماری حفاظت نہیں کر سکے گا۔ عارج نے بُرا کیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ سردار اشم کی موت کے بعد ژیان کے لئے بھی مخبری کرے گا۔"

"تو کیا عارج میرے بابا کے لئے مخبری کرتا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" مہا پجاری نے جواب دیا۔ "وہ میرا دوست تھا اور میں نے ہی اسے اس پر راضی کیا تھا۔ اے معبلہ! بستی کے سرداروں کو اردگرد کی بستیوں کے حالات سے باخبر رہنے اور اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"تو کہتا ہے کہ اس بستی کا سردار ہماری حفاظت نہیں کر پائے گا تو پھر کیا ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"ایسی صورت میں تو صرف ایک ہی راستہ ہے اے معبلہ کہ ہم یہاں سے فرار ہو جائیں۔" مہا پجاری نے جواب دیا۔

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ان پہاڑوں سے اتر کر کھلے میدانوں کی آبادیوں کی طرف' وہاں پہنچ کر ہم ژیان کے خطرے سے باہر آ جائیں گے۔" مہا پجاری بولا۔

اب حویلی سے میرے نکلنے پر کوئی پابندی نہیں رہی تھی۔ گھومنے پھرنے کی خاطر کبھی میں صبح اور کبھی شام' کسی خادمہ کو ساتھ لے کر بستی تک یا پھر پہاڑی درہ عبور کر کے چشمے تک چلی جاتی تھی۔ مہا پجاری سے کافی دیر گفتگو کے بعد یہی طے ہوا کہ میں آج شام کسی خادمہ کے ساتھ چشمے کے کنارے پہنچ جاؤں۔ مہا پجاری پہلے ہی سے ضروری سامان کے ساتھ وہاں موجود ہو گا۔ کسی پر اپنے ارادے ظاہر کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

سارے دن بستی میں متوقع شب خون سے نمٹنے کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ اس عرصے میں سردار مجھے ایک بار بھی نظر نہیں آیا۔ وہ حویلی سے باہر ہی رہا۔ معرکے کے تمام انتظامات کی وہ خود ہی نگرانی کر رہا تھا۔

شام ہوتے ہی جب میں نے حویلی کی ایک خادمہ سے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو وہ بولی۔ "حالات ٹھیک نہیں ہیں اے سردارزادی! ہمیں آج حویلی سے نہیں نکلنا چاہئے۔" پھر اس نے مجھے رازدارانہ انداز میں شب خون کے متعلق بتایا۔

اسے شاید یہ توقع رہی ہو گی کہ میں ڈر جاؤں گی' مگر ایسا نہ دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ میں اس سے ساتھ چلنے کے لئے ضد کرتی رہی۔ خادمہ میری حیثیت سے اور مرتبے سے واقف تھی اس لئے اسے میری بات ماننا ہی پڑی۔ میں اگر تنہا حویلی سے نکلتی تو محافظ میری حفاظت کے خیال سے باہر نہ جانے دیتے۔ میں ذہنی طور پر کتنی ہی سمجھدار سہی' بہرحال ایک سات آٹھ سالہ بچی ہی تھی اس لئے حویلی کی کسی خادمہ کا میرے ساتھ ہونا ضروری تھا۔

میں اس خادمہ کے ساتھ حویلی سے نکلی تو سورج ڈھلا نہیں تھا۔

"آج چشمے کے کنارے چلیں گے۔" میں نے خادمہ کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو بہت دور ہے اے سردارزادی! وہاں سے واپسی میں تو اندھیرا ہو جائے گا۔ کسی روز صبح کے وقت ادھر چلیں گے۔" خادمہ مجھے سمجھانے لگی۔

"نہیں' ادھر ہی چلنا ہے۔ اگر تو ساتھ نہیں چلے گی تو میں اکیلی چلی جاؤں گی۔" میں نے اسے گویا دھمکی دی۔

"ایسا نہ کہہ سردارزادی! سردار کو معلوم ہو گیا کہ میں تجھے تنہا چھوڑ کر واپس حویلی پہنچ گئی تھی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" خادمہ خوفزدہ ہو کر بولی۔

میں نے خادمہ کو یقیناً مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اگر میں اسے حویلی میں ہی یہ بتا دیتی کہ کہاں چلنا ہے تو وہ شاید ہرگز میرے ساتھ نہ آتی۔ اس کا کہنا غلط نہیں تھا۔ چشمے سے واپسی میں واقعی اندھیرا ہو جاتا' مگر مجھے واپس کب ہونا تھا! خادمہ پر میری دھمکی کا متوقع اثر ہوا اور وہ قہراً و جبراً میرے ساتھ ہو لی۔ میں نے

دانستہ ایسا راستہ اختیار کیا تھا کہ مجھے خادمہ کے ساتھ بستی سے باہر جاتے ہوئے کم سے کم لوگ سکیں۔

جب ہم پہاڑی درے میں داخل ہو رہے تھے تو دھوپ خاصی پھیل پڑ چکی تھی۔ خادمہ نے ایک پھر واپسی کے لئے کہا، مگر میں سنی اَن سنی کر کے آگے بڑھتی رہی۔ اسے مجبوراً میرا ساتھ دینا پڑا۔ در میں جس جگہ دراڑ تھی اور جہاں میں نے ژیان کے محافظوں سے بچنے کے لئے مہا پجاری کے ساتھ تھی، وہاں پہنچ کر غیرارادی طور پر میری نگاہ دراڑ کی طرف اٹھ گئی۔ میں چونک اٹھی۔ دراڑ کی دیوار ساتھ میں نے کسی کو چھپے ہوئے دیکھا اور پہلی نظر میں پہچان نہ سکی کہ وہ کون ہے۔ خادمہ میری جانب چلی رہی تھی۔ دراڑ سے چند قدم آگے بڑھتے ہی اچانک مجھے عقب میں ہلکی سی آہٹ سنائی د میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ مہا پجاری تھا اور خادمہ کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پاتی، مہا پجاری نے آگے بڑھ کر خادمہ کے سر کے پچھلے حصے پر ایک پتھر سے ضرب لگائی۔ دوسرے لمحے خادمہ کا جسم لہرا کر زمین پر آ رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ مہا پجاری وہاں درے میں کیا کر رہا تھا۔ اس تو مجھ سے چشمے کے کنارے ملنے کو کہا تھا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی مہا پجاری لپک کر دراڑ کے ا غائب ہو گیا۔ ذرا دیر میں وہ ایک گھوڑے کی لگام تھامے دراڑ سے نمودار ہوا۔ پھر اس نے خادمہ کے کو اٹھا کر دراڑ میں ڈال دیا۔

"اے معلبہ! تُو مجھے یہاں ملنے پر حیران لگتی ہے۔" مہا پجاری بولا۔ "میں دراصل چشمے ک طرف ادھر سے جا رہا تھا کہ مجھے خیال آیا، تیرے ساتھ یقیناً حویلی کی کوئی خادمہ بھی ہو گی۔ میرے ذ میں اس کا بندوبست کرنا بھی ضروری تھا تاکہ فوری طور پر ہمارے فرار کا راز افشا نہ ہو، سو مجھے یہ جگہ کام کے لئے مناسب معلوم ہوئی اور میں یہاں رک گیا۔ چل اب تُو گھوڑے پر بیٹھ جا، ہم آج ہی اس بستی سے بہت دور نکل جائیں گے۔"

پھر مہا پجاری نے مجھے گھوڑے پر سوار کرایا اور خود بھی سوار ہونے کے بعد ایک انجانی منزل سفر کا آغاز کر دیا۔ میں دیکھ چکی تھی کہ گھوڑے پر خاصا سامان لدا ہوا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ وہی ضر اشیاء ہو سکتی تھیں جو سفر میں ہمارے کام آتیں۔

روانگی کے وقت اس بستی والوں کے لئے میرے دل میں رحم اور محبت کے جذبات تھے۔ ان نے مجھ مظلوم اور بے سہارا کو پناہ دے کر اپنی بقا اور سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ان کا قصور پناہ دینا تھا جس کی سزا انہیں آج رات خون خرابے کی صورت میں ملنے والی تھی۔ کاش میں ان لوگوں اس خون خرابے سے بچا سکتی، مگر میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں تو خود بے آسرا تھی۔ اچا میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ اس طرح اس بستی کے لوگ ژیان کے ظلم و ستم سے بچ تھے۔ پھر میں نے اپنے اس خیال کا اظہار مہا پجاری سے کر دیا۔

"تُو یہ کیا کہہ رہی ہے اے معلبہ!" مہا پجاری حیران ہو کر بولا۔ اسے یقیناً مجھ جیسی عمر کی کس سے ایسی بات کی توقع نہیں ہو گی۔

"اے مہا پجاری! میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "ژیان اس طرح بستی پر حملہ کرنے سے رک جائے گا۔ پھر خون خرابہ نہیں ہو گا۔ بتا، میری زندگی دوسرے لوگوں سے زیادہ قیمتی تو نہیں؟"

"اے عظیم سردار اشم کی بیٹی معلبہ! تُو بھی اپنے باپ کی طرح عظیم ہے، مگر تُو شاید یہ بھول گئی کہ ظالم ژیان اس کے باوجود ہمیں پناہ دینے کی سزا اس بستی والوں کو ضرور دے گا۔ وہ ایسا ہی ظالم ہے۔ اس کے علاوہ اے میری سردارزادی! جو کچھ آج رات ہونے والا ہے، اسے ٹالنا ممکن نہیں۔ کیا تُو نے ہونی کو پہلے ٹال دیا اور تیرا باپ زندہ بچ گیا؟ تُو نے جو پیشگوئی کی ہے اور جو سرگوشیاں سنی ہیں، بند آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے، وہ ہر حال میں پورا ہو کے رہے گا۔ تیرا کہنا ہے کہ ہم وادی سبز کی طرف چلیں اور خود کو ژیان کے حوالے کر دیں تاکہ بے گناہ لوگ نہ مارے جائیں، سو اس سے کچھ بھی نہ ہو گا۔" مہا پجاری نے مجھے دلیل دے کر سمجھایا۔ اس کے لہجے میں میرے لئے احترام بھی تھا اور محبت بھی۔

مہا پجاری کی بات سن کر میں نے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی دلیل میں وزن تھا۔ سردار اشر کو ژیان کے ظلم سے بچانا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس پر صبر ہی کیا جا سکتا تھا، سو میں نے صبر کیا۔

☆======☆======☆

رات بھر ہم سفر ہی میں رہے۔ اس دوران میں صرف دو مرتبہ گھوڑے کو ستانے کے لئے کچھ دیر ہی مہا پجاری رکا۔ سردار اشر کی بستی سے مہا پجاری جلد از جلد دور نکل جانا چاہتا تھا۔ جب صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تو ہم ایک پہاڑی کے دامن میں تھے۔ مہا پجاری نے وہاں آرام کرنے کی غرض سے ایک غار تلاش کر لیا۔ اس نے اِدھر اُدھر سے گھاس پھوس جمع کر کے اس پر ایک کپڑا بچھا دیا اور مجھ سے لیٹ جانے کو کہا، پھر وہ خود بھی لیٹ گیا۔ نیند سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ گزشتہ رات بھی میں بے آرامی کا شکار رہی تھی۔ آدھی رات سے زیادہ جاگتی گزری تھی اور آج تو پوری رات میں نے پلک نہیں جھپکی تھی۔ ساری رات گھوڑے پر سواری کی وجہ سے مجھے تھکن الگ تھی اس لئے جلد ہی بے خبر سو گئی۔ مہا پجاری نے گھوڑے کو غار سے باہر ایک بڑے سے پتھر سے باندھ دیا تھا اور اس پر جو سامان لدا ہوا تھا، غار میں رکھ لیا تھا۔

ہم نے اسی طرح مسلسل دو راتوں کو سفر کیا۔ دن کا بیشتر حصہ ہم نے سوتے اور آرام کرتے ہوئے گزارا تھا۔ سفر کرتے ہوئے ہمیں وہ تیسری رات تھی۔ مہا پجاری نے بتایا تھا کہ ہم جنوب کی طرف سفر کر رہے تھے۔ چاندنی راتیں ہونے کی وجہ سے ہمیں سفر میں زیادہ دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

اس روز نصف شب تک سفر کرنے کے بعد خلاف توقع مہا پجاری نے ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "اے معلبہ! اب ہم خطرے کی حدود سے خاصی دور نکل آئے ہیں، اب رات کے وقت سفر کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ کل سے ہم دن میں سفر کریں گے۔"

دن کے وقت ہم کیوں کہ خاصی دیر سو لئے تھے اس لئے مجھے جلدی نیند نہیں آئی۔

صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کا سبب نیند پوری ہونا نہیں تھا بلکہ وہ دھمک تھی جو چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھی اور لحہ بہ لحہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ مہا پجاری بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں تیر کمان نظر آ رہا تھا۔ قریب ہی تلوار رکھی تھی۔ ہم نسبتاً بلندی پر تھے اور دور دور تک دیکھ سکتے تھے۔ اب تک ہمیں سفر کے دوران میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لئے میں ذہنی طور پر کسی ایسے واقعے کے لئے تیار نہیں تھی جو ہمیں پیش آنے والا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہمیں چاروں طرف سے گھڑسوار آتے دکھائی دیئے۔ جب وہ کچھ اور قریب آ گئے تو میں نے ان کے ہاتھوں میں عجیب طرح کے لمبے لمبے سے ہتھیار دیکھے۔ مہا پجاری کے چہرے سے تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا۔ غالباً وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ان گھڑسواروں پر تیروں کی بارش کرے یا نہ کرے؟ چاروں طرف سے حملہ کرنے والوں کو وہ بہرحال روک نہیں سکتا تھا۔

"معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟" مہا پجاری آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "مجھے بہرحال ان پر حملہ کرنے میں پہل نہیں کرنا چاہئے۔"

میرے خیال میں مہا پجاری کا فیصلہ درست ہی تھا۔ عجیب ہتھیاروں والے ان گھڑسواروں کو مشتعل کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنا حلقہ تنگ کرتے ہوئے قریب آ رہے تھے۔ ان کے تیور یہی بتا رہے تھے کہ وہ ہمیں گھیر کر پکڑنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسا کیوں کر رہے تھے' اس سلسلے میں کوئی اندازہ لگانا' ممکن نہیں تھا۔ ان کی تعداد پندرہ سولہ سے کم نہیں ہو گی۔

ان کے عجیب ہتھیار کو میں نے نزدیک آنے پر غور سے دیکھا۔ وہ لوہے کا بڑا سا سوراخ والا ڈنڈا تھا جسے لمبی سی ایک پھونکنی بھی کہا جا سکتا تھا۔ اس کے پیچھے کی طرف موٹا لکڑی کا دستہ تھا۔ اسی دستے میں وہ پھونکنی پیوست تھی۔ اس کے درمیان میں نیچے کی طرف لوہے کا ایک آنکڑا سا تھا جس پر انگلی رکھی تھی۔ ان کے گلوں میں چمڑے کی پیٹیاں پڑی تھیں۔ پیٹی کے آر پار سوراخوں میں کسی قدر موٹی اور لمبی سی کوئی چیز تھی۔

وہ سب ہمارے چاروں طرف دائرے کی صورت میں آ کر رک گئے۔ اسی وقت مہا پجاری نے مجھ سے سرگوشی کی۔ "اے معبلہ! یہ کچھ پوچھیں تو انہیں اپنی حقیقت نہیں بتانا' نہ اپنا اصلی نام۔ تمہارا نام ہی پہلے والا یعنی آتون ہے اور تم میری بیٹی ہو۔ ہمارے قبیلے والوں نے ہمیں نکال دیا ہے اور اب ہم میدانوں کی طرف جا رہے ہیں۔"

مہا پجاری نے جو کچھ کہا اس سے زیادہ کچھ بھی کہنے کا نہ وقت تھا' نہ مہلت۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

اسی وقت ان گھڑسواروں میں سے ایک نے اپنا عجیب ہتھیار ہماری طرف کر دیا۔ پھر اچانک زبردست دھماکہ ہوا اور اس ہتھیار کے سوراخ سے ایک شعلہ نکلا۔ مہا پجاری کے قریب ہی کچھ فاصلے پر بڑا سا ایک پتھر پڑا تھا' گھڑسوار نے اسی پتھر کو نشانہ بنایا تھا اور پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تھا۔

میں یہ عجیب تماشا دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ مہا پجاری نے مجھے اپنے ایک بازو کے حصار میں لے لیا۔

"تُو نے دیکھ لیا اے بوڑھے کہ پتھر کس طرح ٹوٹ کر بکھر گیا؟" گھڑسوار نے مہا پجاری کو مخاطب کیا۔ "تیرا اور تیرے ساتھ جو لڑکی ہے' اس کا بھی یہی حشر ہو سکتا ہے اس لئے ہم جو کہیں اس پر عمل کر۔" اس شخص کا لہجہ قدرے اجنبی تھا' مگر وہ زبان وہی بول رہا تھا جو پہاڑی بستیوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

"تم لوگ کون ہو اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟" مہا پجاری ہمت کر کے بولا۔ اس کا اظہار مہا پجاری کے لہجے سے ہو رہا تھا۔

"ہم تیرے سوالوں کے جواب دینے کے پابند نہیں۔" گھڑسوار نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم تجھے حکم دیتے ہیں کہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر چل۔"

"مگر کہاں؟" مہا پجاری نے پھر سوال کیا۔

"ہم تجھے اپنے سردار صارم کے پاس لے جا رہے ہیں اور سن کہ اب تُو کوئی اور سوال نہیں کرے گا۔"

ہمارا گھوڑا قریب ہی ایک پتھر سے بندھا ہوا تھا۔ مہ پجاری نے اس پر سامان لادا پھر پہلے مجھے گھوڑے پر سوار کرایا' اس کے بعد خود بیٹھا اور ان لوگوں کے نرغے میں ایک طرف چل دیا۔ کچھ گھڑسوار ہمارے آگے تھے' کچھ پیچھے چل رہے تھے اور کچھ دائیں بائیں تھے۔ ایسی صورت میں فرار ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔

خلافِ توقع ان لوگوں نے ہم سے ہمارے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ نہ یہ کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آ رہے ہیں' نہ یہ کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ میرے نزدیک یہ صورت حال خاصی تشویشناک تھی۔ اس وقت تو میرے جسم پر قیمتی زیورات بھی نہیں تھے جو یہ سمجھ لیتی کہ وہ زیورات کے لالچ میں مجھے پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے جا رہے ہیں جس کا نام انہوں نے صارم بتایا تھا۔

وہ سفر خاصی دیر تک مغرب کی طرف جاری رہا تب ایک آبادی کے آثار نظر آئے۔ ہم قدرے بلندی پر تھے اور وہ آبادی نشیب میں تھی۔ دور تک وہ آبادی پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اب تک میں نے وادی سبز اور سردار اشر کی بستی ہی دیکھی تھی۔ یہ بستی ان دونوں بستیوں سے کہیں بڑی معلوم ہو رہی تھی۔ آبادی کے درمیان میں دو بلند و بالا عمارتیں دور ہی سے دکھائی دے رہی تھیں جو اپنی طرز تعمیر میں دوسری عمارتوں سے مختلف تھیں۔ دونوں عمارتوں میں سے ایک کا اوپری حصہ مندر کی طرح تھا جو نیچے سے چوڑا اور اوپر سے پتلا ہوتا چلا گیا تھا۔ دوسری قریبی عمارت اس سے قدرے چھوٹی لگ رہی تھی۔

ہم بستی میں داخل ہوئے تو خلاف توقع بستی والوں میں مجھے ایک عجیب جوش و خروش سا نظر آیا۔ ان کے چہروں سے انتہائی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ میری طرف انگلی اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے سے نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی پھر مزید حیرت اس وقت ہوئی جب عورتیں گھروں سے اپنے اپنے ہاتھوں میں دف لئے نکل آئیں اور ہمارے آگے آگے دف بجاتی اور رقص کرتی

ہوئی چلنے لگیں۔ اسی کے ساتھ وہ بلند آواز میں ایک گیت گا رہی تھیں۔ اس گیت کے عجیب الفاظ اس طرح تھے۔

اے دیوتا!
ہماری ساتویں قربانی قبول کر
ہم تیری شان و جبروت کے حضور میں قربانی پیش کرنے آ رہے ہیں
ہماری فصلوں کو ہرا بھرا کر دے
اور تلوار کی سی تیز دھار رکھنے والے کی بیوی نخبہ کی گود بھر دے.........!

میں صرف اتنا ہی سمجھ سکی کہ وہ کوئی دعائیہ گیت ہے۔ صارم کے ایک معنی تلوار کی سی تیز دھار رکھنے والے کے بھی ہیں۔ شاید ان کا اشارہ اپنے سردار ہی کی طرف تھا اور نخبہ' سردار صارم کی بیوی جس کے لئے دعا کی جا رہی تھی۔

آگے آگے دف بجاتی اور گیت گاتی ہوئی عورتوں کا ہجوم تھا' اس کے پیچھے گھڑسواروں کے نرغے میں ہم تھے۔ رفتہ رفتہ اس ہجوم نے ایک بڑے جلوس کی سی شکل اختیار کر لی تھی جس میں عورتیں اور بچے سبھی تھے۔ یہ جلوس اس وقت بستی کی ایک بڑی شاہراہ سے گزر رہا تھا۔

یہ جلوس جب بستی کے درمیان بنی ہوئی دو بڑی عمارتوں کے سامنے پہنچا تو گیت کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ قدرے چھوٹی عمارت کے صدر دروازے تک پہنچنے کے لئے گھڑسواروں نے راستہ بنایا۔ عمارت کے بلند صدر دروازے میں دور ہی سے مجھے ایک عورت اور ایک دراز قامت مرد کھڑے ہوئے نظر آ گئے۔

ایک گھڑسوار نے اپنے گھوڑے سے اتر کر ہمارے گھوڑے کی لگام تھام لی اور اسے آگے بڑھنے کے لئے راستہ دے دیا گیا۔ یہ وہی تھا جس نے مہا پجاری سے بات کی تھی۔ یہی شخص اس گھڑسوار دستے کا سالار معلوم ہوتا تھا۔ دف بجاتی عورتیں' عمارت کے دروازے کی دائیں جانب سر جھکا کر ادب سے کھڑی ہوئی تھیں۔ بائیں جانب مردوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ سب ایک دم اس وقت خاموش ہو گئے تھے جب گھڑسواروں کے سالار نے ہمارے گھوڑے کی لگام تھام کر آگے بڑھنا شروع کیا تھا۔ وہاں اتنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود ایک غیر فطری سا سکوت طاری ہو گیا تھا۔

میری نگاہیں دروازے پر کھڑے ہوئے مرد اور عورت پر جمی ہوئی تھیں جو اپنے اپنے جسم پر ڈھیلے ڈھالے لباس پہنے ہوئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مرد اس بستی کا سردار اور عورت اس مرد کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ مرد اپنے سر پر عجیب وضع کی اونچی اور چوکور سی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ ٹوپی کا نچلا حصہ گول اور اوپری حصہ چوکور تھا۔

دروازے تک پہنچنے کے لئے پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ گھڑسواروں کے سالار نے سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر اور گھٹنوں کے بل زمین پر جھک کر سردار کو تعظیم دی' پھر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "تلوار کی سی تیز دھار رکھنے والے! تیرا یہ خادم' عظیم دیوتا کے لئے ساتویں نذر لے آیا ہے' اسے قبول کر لے!" پھر وہ مڑا اور مہا پجاری سے مخاطب ہوا۔ "اے بوڑھے! لڑکی کو میرے حوالے کر دے۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیئے۔

"اے عظیم سردار! مجھے کچھ کہنے کا موقع دے!" اچانک مہا پجاری نے سردار کو مخاطب کیا۔ پھر وہ گھوڑے سے کودا اور گھٹنوں کے بل جھک کر سردار کو تعظیم دی۔ اس نے بالکل گھڑسوار کے سالار کی نقل کی تھی۔

"آج خوشی کا دن ہے اس لئے تجھے بولنے کی اجازت دی جاتی ہے۔" سردار کی گونجیلی آواز سنائی دی۔ "بول تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"اے سردار! ہمیں زبردستی یہاں کس لئے لایا گیا ہے؟" مہا پجاری نے دریافت کیا۔

"تو سن اے اجنبی بوڑھے شخص! اب تک پھنکارنے والے ناگ دیوتا کے حضور چھ معصوم روحوں کی قربانیاں دی جا چکی ہیں۔ ہماری بستی ایک طویل عرصے سے ناگ دیوتا کے قہر کا شکار تھی' سو ہمارے پجاریوں نے گیان دھیان کر کے اس کی وجہ معلوم کر لی۔" سردار بلند اور واضح آواز میں کہہ رہا تھا۔ "انہیں گیان دھیان کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ ناگ دیوتا قربانی چاہتا ہے۔ گزشتہ سات سال کے عرصے میں کوئی قربانی نہیں دی گئی تھی۔ سو پجاریوں نے کہا کہ سات معصوم جانوں کی قربانیاں اگر دی جائیں تو ناگ دیوتا کا قہر اس بستی کے اوپر سے ٹل جائے گا۔ قربانیوں کے لئے یہ شرط رکھی گئی کہ جو بچے' ناگ دیوتا پر قربان کئے جائیں' ان کا تعلق کسی اور قبیلے سے ہو۔ اس کے علاوہ یہ کہ ایک مہینے کے اندر صرف ایک ہی قربانی دی جائے۔ گزشتہ چھ مہینے سے ہم یہ قربانیاں دے رہے ہیں اور اب ہمیں ساتویں قربانی دینا ہے۔ پجاری کہتے ہیں کہ اس آخری قربانی کے بعد بستی سے قہر ٹل جائے گا۔ ابھی تک اس بستی کا کوئی وارث پیدا نہیں ہو سکا۔ ایسا بھی دیوتا ہی کے قہر کی وجہ سے ہوا۔ قہر ٹل جانے کے بعد میری بیوی نخبہ کی گود بھر جائے گی جو اب تک خالی ہے۔ یہ معصوم بچی جو تیرے ساتھ یہاں لائی گئی ہے' اسے تنہا ناگ دیوتا کے پاس چھوڑ دیا جائے گا اور جب ناگ دیوتا اسے ڈس لے گا' اس کی قربانی قبول کر لے گا تو پھر اس کے جسم کو جلا دیا جائے گا۔ اس کے بعد قربانی کی راکھ سب سے پہلے نخبہ اپنی مانگ میں بھرے گی' پھر زیر کاشت زمین پر یہ راکھ بکھیر دی جائے گی۔ پجاری کہتے ہیں کہ پھر ہماری کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی اور نخبہ کی گود بھر جانے سے اس بستی کو اس کا وارث بھی مل جائے گا۔ بول اے اجنبی بوڑھے! کیا تو خوشی خوشی اس نیک کام میں ہماری مدد نہیں کرے گا؟" سردار نے پوری تفصیل بیان کر کے آخر میں مہا پجاری سے سوال کیا۔

خلاف توقع مہا پجاری ایک بار پھر گھٹنوں کے بل سردار کے سامنے جھک گیا اور اس نے کہا۔ "اے عظیم و دلیر سردار! تو نے جو نیک مقصد بیان کیا ہے' میں اس کے لئے اپنی معصوم بیٹی آتون کو ناگ دیوتا پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔ میری دعا ہے کہ ناگ دیوتا' میری بیٹی کی قربانی قبول کر لے۔"

"اے اجنبی بوڑھے! تو یقیناً دیوتاؤں کا سچا پجاری ہے۔ ہم تجھے ناگ دیوتا کے پجاریوں میں شامل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔" سردار خوش ہو کر بولا۔

سردار کے یہ کہتے ہی مہا پجاری کے حق میں نعرے بلند ہوئے۔ کسی کو بھی شاید مہا پجاری سے یہ

امید نہیں تھی کہ وہ خوش خوشی قربانی کے لئے راضی ہو جائے گا۔ بھلا کون اپنی اولاد کو قربانی کے لئے پیش کر سکتا تھا۔

مہا پجاری سیدھا کھڑا ہوا ہی تھا کہ سردار نے اسے مخاطب کیا۔ "اے معزز نئے پجاری! اپنی آتون کو نخبہ کے پاس لے کر آ تاکہ نخبہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر قربانی کی رسم کا آغاز کر سکے۔"

سردار کے حکم کی تعمیل میں مہا پجاری ادب سے اس کے سامنے جھک کر پلٹا اور گھوڑے کے قریب آ کر مجھ سے سرگوشی کی۔ "اے میری بچی! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تیرا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تُو زندہ رہے گی' مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد کیا ہو گا؟"

"اے مہا پجاری! میری طرف سے فکرمند نہ ہو' مجھے تیری کہی ہوئی تمام باتیں یاد ہیں۔" میں دھیمی آواز میں بولی۔

مہا پجاری نے مجھے گھوڑے سے اتار کر اپنی گود میں لے لیا اور پھر عمارت کے دروازے کی طرف بڑھا جہاں سردار صارم اور اس کی بیوی نخبہ کھڑے ہوئے تھے۔ سیڑھیوں کے نیچے مہا پجاری نے مجھے اپنی گود سے اتار دیا۔

"جا اے میری بیٹی! عظیم سردار کی بیوی نخبہ سے دعا لے!" مہا پجاری مجھ سے بولا۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر حسین نخبہ کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے مسکرا کر میرے سر پر ہاتھ رکھا اور جھک کر میری پیشانی پر اپنے خوبصورت ابھرے ابھرے ہونٹ رکھ دیئے۔ مجمع خوشی سے بے قابو ہو گیا اور عورتوں نے وہی گیت گانا شروع کر دیا جو میں نے راستے میں سنا تھا۔

میں سیڑھیوں کی طرف پلٹی تو نیچے مجھے سات قوی ہیکل افراد دکھائی دیئے جن کے جسموں پر گیروے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے لبادے تھے اور پیشانیوں پر سانپ کے پھن بنے ہوئے تھے۔ اپنی گول گول اور چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں کی وجہ سے خود وہ بھی مجھے سانپوں کی طرح لگ رہے تھے۔ مہا پجاری ہی کی طرح ان کے سر کے بال کٹے ہوئے تھے پھر ایک شخص کوئی پیالہ لے کر مجمع سے نکلا اور مہا پجاری کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

اپنے حلیوں سے وہ سبھی مجھے ناگ دیوتا کے پجاری معلوم ہو رہے تھے۔ بعد میں میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ پجاری جو پیالہ لئے ہوئے مہا پجاری کے قریب رکا تھا' اس نے پیالے میں موجود گاڑھے پیلے رنگ سے مہا پجاری کے ماتھے پر بھی سانپ کا پھن بنا دیا۔ یوں گویا مہا پجاری کو بھی ناگ دیوتا کے پجاریوں میں شامل کر لیا گیا تھا۔

جیسے ہی میں سیڑھیوں سے اتری' پجاریوں نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا۔ ان لوگوں میں اب خود مہا پجاری بھی شامل تھا۔ قریب ہی بستی کی سب سے بلند عمارت ناگ دیوتا کا مندر تھی جس کا کلس مجھے دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ دائیں جانب جو عورتیں کھڑی تھیں' وہ پجاریوں کو راستہ دینے کے لئے ادھر اُدھر ہو گئیں۔ اب وہ پھر دف بجا بجا کر گیت گا رہی تھیں۔ میں پجاریوں کے نرغے میں ان دو رویہ کھڑی

عورتوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ مہا پجاری کے سب کچھ بتا دینے کے باوجود میں خوفزدہ تھی۔ اگر میرے دل کو کچھ اطمینان تھا تو صرف اس وجہ سے تھا کہ مہا پجاری اب تک میرے ساتھ تھا۔

وہ لوگ مجھے ساتھ لئے دائیں جانب موجود ناگ دیوتا کے مندر تک پہنچ گئے۔ مَیں نے مندر کے دروازے پر اوپر کی جانب پتھر سے تراشی ہوئی ایک سانپ کی تصویر دیکھی جو پھن کاڑھے ہوئے تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم اندر پہنچے جہاں دن کے وقت بھی نیم تاریکی سی تھی۔ ذرا ہی دیر میں میری آنکھیں اس نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر سانپ کا بڑا سا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ دونوں جانب کی دیواروں پر بھی پتھروں کو تراش کر سانپ بنائے گئے تھے اور سانپوں کے ساتھ ہی بے لباس عورتوں کے نقوش بھی ابھارے گئے تھے جن کے جسموں سے سانپ لپٹے ہوئے تھے۔

مجھے لے جا کر اس مجسمے کے سامنے جھکا دیا گیا اور پھر گھنٹا بجایا گیا جو چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ سانپ کا وہ بڑا مجسمہ ایک بلند چبوترے پر رکھا ہوا تھا۔ اسی چبوترے کے سامنے کے رخ پتھریلی سیڑھیاں نیچے کی طرف کسی تہہ خانے میں جاتی نظر آ رہی تھیں۔ اندر اندھیرا تھا۔

ایک پجاری نے دیوار میں پیوست مشعل روشن کر دی اور پھر مشعل کو اپنے ہاتھ میں تھام کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ دوسرے پجاری نے میرا بازو تھاما اور آگے بڑھا۔ بقیہ سارے پجاری اوپر ہی رہ گئے' صرف دو پجاری مجھے ساتھ لئے اس تہہ خانے میں اترے جن میں سے ایک مشعل اٹھائے آگے آگے اور دوسرا میرے ساتھ تھا۔ مہا پجاری بقیہ پجاریوں کے ساتھ اوپر ہی رہ گیا تھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک دروازہ تھا جسے کھول دیا گیا۔

پہلے کی نسبت اب میرے خوف میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اوپر ہی کی طرح نیچے بھی بالکل وہی منظر تھا۔ اسی طرح ایک چبوترے پر سانپ کا مجسمہ رکھا ہوا تھا مگر چبوترے کے سامنے مزید نیچے اترنے کے لئے سیڑھیاں نہیں تھیں۔

یہاں بھی دیواروں پر بے لباس عورتیں اور سانپ' پتھروں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ اوپر کے مقابلے میں یہ جگہ خاصی چھوٹی تھی۔ میں اس چھوٹے سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جس پجاری کے ہاتھ میں مشعل تھی' اس نے مشعل کو کمرے کی ایک دیوار کے سوراخ میں پیوست کر دیا تھا۔

جلد ہی میں نے یہ بات محسوس کر لی کہ وہ دونوں پجاری مجھے وہاں چھوڑ کر آہستہ آہستہ اس کمرے کے دروازے کی طرف کھسک رہے تھے جس کے بعد اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میرے لئے یہ سمجھنا زیادہ دشوار نہیں تھا کہ وہ دونوں مجھے اس کمرے میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود بھی میں اپنی جگہ کھڑی رہی۔ مجھے وہاں کہیں بھی کوئی سانپ نظر نہیں آ رہا تھا حالانکہ خود مَیں نے سردار کی زبانی یہ سنا تھا کہ مجھے ناگ دیوتا ڈس لے گا۔

دونوں پجاری اب دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے تیزی کے ساتھ باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ اب میں اس چھوٹے سے کمرے میں بالکل اکیلی تھی۔ چند ہی لمحے

گزرے ہوں گے کہ میں نے ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنی۔ یہ اس طرح کی آواز تھی جیسے کوئی پتھر کی بھاری سل اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہو۔ وہ آواز مجسمے کی عقبی دیوار کی طرف سے آئی تھی۔ اس دیوار کا نچلا حصہ مجسمے کے چبوترے اور خود مجسمے کی وجہ سے میرے احاطہ نظر میں نہیں تھا۔ میں نے دائیں جانب ہو کر ادھر دیکھا تو فرش سے ایک بالشت اوپر مجھے ایک محرابی کٹاؤ نظر آیا اور اسی وقت میری سماعت سے تیز پھنکاروں کی آوازیں ٹکرائیں۔ جیسے بہ یک وقت کئی سانپ پھنکار رہے ہوں۔

میری نگاہیں اسی محرابی کٹاؤ پر جمی ہوئی تھیں کہ میں ایک دم اچھل پڑی۔ مَیں نے اس محرابی کٹاؤ سے ایک سیاہ رنگ کے سانپ کو رینگ کر باہر آتے دیکھا۔ پھر تو جیسے اس جگہ نے سانپوں کو اگلنا شروع کر دیا۔ سیاہ ہرے، بھورے سانپ کمرے میں بھر گئے۔ میں خوفزدہ ہو کر چبوترے پر چڑھ گئی۔ فرش پر ہر طرف سانپ ہی سانپ رینگ رہے تھے۔ پھر انہی سانپوں میں سے کچھ چبوترے پر چڑھنے لگے۔ اب ان سے بچنا میرے لئے محال ہو چکا تھا۔ کمرے میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں میں ان کی پہنچ سے بچ سکتی۔

"اے معبلہ! ان سانپوں سے نہ ڈر کہ یہ تیرا کچھ نہ بگاڑ پائیں گے۔" مَیں نے وہی پُراسرار سرگوشی سنی جو دو مرتبہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ اس پُراسرار سرگوشی نے پہلے دو مرتبہ مجھے آنے والے خطرات سے آگاہ کیا تھا، مگر آج مجھے کوئی خطرہ نہ ہونے کی خبر دی تھی۔

عالم ہوش اور مکمل بیداری کی حالت میں پہلی بار میں نے یہ مانوس و آشنا سرگوشی سنی تھی۔ سرگوشی سن کر مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کا سارا خوف یکسر ختم ہو گیا۔ میں اطمینان سے چبوترے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ میرے پیر فرش سے خاصے اوپر تھے۔

ذرا ہی دیر میں کئی سانپ چبوترے پر چڑھ آئے۔ ان میں سے ایک سانپ میری گود میں آ بیٹھا۔ پھر میں نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔ دوسرا ایک اور سانپ میرے قریب آیا تو میری گود میں بیٹھے ہوئے سانپ نے زبردست پھنکار مار کر اس پر حملہ کیا، یوں جیسے وہ مجھے صرف اپنی جاگیر سمجھتا ہوں پھر تو کئی سانپ میرے قریب آنے کی خاطر ایک دوسرے سے الجھ گئے۔ ایک سانپ اس کوشش میں کامیاب ہو کر میری گردن سے لپٹ گیا۔ اس کے بعد میرے دونوں بازوؤں پر بھی دو سانپ لپٹ گئے، مگر ان کی گرفت سخت نہیں تھی۔

میں نے ایک حیرت انگیز بات اور یہ محسوس کی کہ سارے ہی سانپ میری اطراف جمع ہو گئے تھے، کمرے کے فرش پر اب کوئی لسانپ نہیں تھا۔ سبھی سانپ چبوترے پر چڑھ آئے تھے اور کچھ ابھی تک ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی اب تک مجھے ڈسنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سبھی مجھ سے اظہار محبت و عقیدت کر رہے ہوں۔ پُراسرار سرگوشی پر میرا یقین اور بھی بڑھ گیا۔ ان سانپوں نے واقعی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ میرے لئے بالکل بے ضرر ثابت ہوئے تھے۔ وہ سانپ میرے جسم کے مختلف حصوں سے اسی طرح لپٹے ہوئے تھے جس طرح کی تصویر کشی دیواروں پر کی گئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں بے لباس نہ تھی اور نہ ہی دیواروں پر بنی ہوئی عورتوں کی طرح جوان تھی۔

سانپوں کے لمس سے اوّل اوّل مجھے قدرے گھن محسوس ہوئی تھی مگر کچھ دیر گزر جانے کے بعد یہ احساس ختم ہو گیا۔

مجھے خاصی دیر اسی طرح بیٹھے ہوئے گزر گئی تو جسم میں تناؤ اور اکڑن سی محسوس ہونے لگی۔ خوف تو اب دل میں نام کو نہیں تھا اس لئے میں نے اپنی گود میں بیٹھے ہوئے سانپوں کے ایک جوڑے کو پہلی بار ہاتھ لگایا اور اسے اٹھانا چاہا۔ وہ جوڑا میری کلائی سے لپٹ گیا۔ ایک ہی حالت میں بے حس و حرکت بیٹھنے سے مجھے اپنے جسم میں تناؤ محسوس ہوا تھا۔ میں اسی لئے چبوترے سے نیچے کود گئی۔ جو سانپ میری گردن، بازوؤں اور کلائیوں سے لپٹے ہوئے تھے، وہ اسی طرح لپٹے رہے اور میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔

ٹہلتے ٹہلتے تھک کر میں پھر چبوترے پر آ بیٹھی۔ اب مجھے اس کمرے میں خاصا وقت گزر چکا تھا۔ گزشتہ شام کو میں نے کچھ پھل کھائے تھے، اب اسی لئے بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں وغیرہ مہا پجاری، سردار اشرہی کی بستی سے لے کر چلا تھا جنہیں وہ بہت احتیاط کے ساتھ خرچ کر رہا تھا۔ وہ خود تو برائے نام کھاتا پیتا تھا مگر مجھے پیٹ بھر کے کھلاتا تھا۔ راستے میں ایک جگہ پانی ختم ہو گیا تھا جو اس نے دوبارہ ایک پہاڑی چشمے سے چمڑے کی مشک میں بھر لیا تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء احتیاط سے صرف کرانے کی وجہ یہ تھی کہ کچھ معلوم نہیں تھا، کتنی مدت سفر مزید جاری رہے!

میں اب یہ سوچ رہی تھی کہ اگر مجھے اسی طرح اس کمرے میں بند رکھا گیا تو سانپوں کے ڈسنے سے نہیں البتہ بھوک سے ضرور مر جاؤں گی، معلوم نہیں پجاری کب اس کمرے کا دروازہ کھولیں گے؟ یہ تو یقین تھا کہ اس کمرے کا دروازہ کھولا ضرور جائے گا، مگر کب اور کتنی دیر کے بعد کھولا جائے گا، یہ معلوم نہیں تھا۔ میں نے اب وقت گزاری اور جی بہلانے کی خاطر سانپوں سے یہی کھیل کھیلتی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ میرے قریب آنے اور جسم سے لپٹ جانے کے لئے اب بھی وہ ایک دوسرے سے الجھ پڑتے تھے۔

میں اسی کھیل میں مصروف تھی کہ اچانک میری سماعت سے بین بجنے کی آواز ٹکرائی۔ یہ آواز کسی سمت سے آ رہی تھیں میں اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر مجھے یہ سراغ لگانے میں دیر نہ لگی کہ بین کی آواز محرابی کٹاؤ ہی کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پھر میں نے سانپوں کو تیزی کے ساتھ چبوترے سے اتر کر محرابی کٹاؤ میں جاتے دیکھا، مگر جو سانپ میرے جسم سے لپٹے ہوئے تھے، بین کی آواز کے باوجود مجھ سے الگ نہیں ہوئے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ انہوں نے پھن کاڑھ کر جھومنا شروع کر دیا تھا۔

میں کٹاؤ کے سامنے کھڑی بین کی آواز سن رہی تھی کہ کچھ ہی دیر کے بعد ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ پتھر کی ایک سل دیوار کے اندر سے اس محرابی کٹاؤ پر آ گری۔ اب دیوار سپاٹ نظر آنے لگی تھی۔ میرے جسم سے لپٹے ہوئے سانپوں کے سوا بقیہ تمام سانپ محرابی کٹاؤ میں داخل ہو کر اور پھر راستہ بند ہو جانے کے بعد میری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس تہہ خانے تک آنے والی سیڑھیوں پر

قدموں کی چاپ ابھری ہو۔ بین کی آواز آنا اس وقت بند ہو چکی تھی جب محرابی کٹاؤ ایک سِل کے گرنے کے سبب نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

میں اس وقت چبوترے کے سامنے کھڑی تھی جب تہہ خانے کا دروازہ کھلا۔ آنے والا وہی جسیم اور دراز قد پجاری تھا جو مشعل لئے ہوئے آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے وہی دوسرا پجاری نظر آ رہا تھا۔ یہی دونوں مجھے اس تہہ خانے میں بند کر کے گئے تھے۔ دروازہ کھولتے ہی وہ دونوں جیسے پتھر کے مجسموں کی طرح بے حس و حرکت ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا اور آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ حیرت کے ساتھ ہی ان کے چہروں پر خوف و دہشت کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ دونوں یقیناً ذہنی جھٹکے سے دوچار ہوئے تھے۔ انہیں یہ توقع نہیں رہی ہو گی کہ مَیں زندہ حالت میں ملوں گی اور سانپ میرے جسم سے لپٹے ہوں گے۔

معلوم نہیں ان دونوں کو اچانک کیا ہوا کہ وہ آگے بڑھ کر میرے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ سجدے سے اٹھ کر وہ دو زانو بیٹھ گئے۔ ہاتھ جوڑ کر انہوں نے میرے سامنے سر جھکا لئے اور پھر بلند آواز میں کہنے لگے۔ "اے دیوتاؤں کی چہیتی' اے ناگ دیوی! ہمیں معاف کر دے۔ ہم تجھ سے بے خبر تھے۔ تُو نے ہمیں اپنا دیدار کرایا' سو ہم خوش نصیب ہیں۔ آ ہمارے ساتھ کہ ساری بستی تیرا دیدار کر سکے۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

پھر ان میں سے ایک نے دیوار میں پیوست مشعل ہاتھ میں لے لی اور آگے آگے قدم بڑھانے لگا۔ دوسرا پجاری اس کے عقب میں تھا۔ معلوم نہیں کیسے میری ایک کلائی پر لپٹے ہوئے سانپ کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور وہ تیزی سے رینگ کر پیچھے والے پجاری کے پیروں سے لپٹ گیا۔ اس پجاری کی چیخ نکل گئی۔ آگے والے نے مڑ کر صورت حال کا اندازہ لگایا تو اس کے چہرے پر بھی مردنی چھا گئی۔ سانپ نے دوسرے پجاری کی پنڈلی پر ڈس لیا تھا۔ پجاری چیخ مارتے ہی زمین پر گر گیا تھا اور پھر چند ہی لمحوں میں تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ جس سانپ نے اسے ڈسا تھا' وہ یقیناً انتہائی زہریلا رہا ہو گا۔ پجاری کی ناک اور دونوں کانوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس عرصے میں سانپ دوبارہ میری کلائی سے آ کر لپٹ چکا تھا۔

"اے دیوی! تُو نے ساتویں قربانی قبول کر لی' ہم تیرا شکر بجا لاتے ہیں۔" زندہ بچ جانے والا مشعل بردار پجاری خوفزدہ سی آواز میں بولا۔ "اگر ہمیں خبر ہوتی کہ ناگ دیوتا اس بار اپنے کسی پجاری کو نذر میں قبول کرے گا تو ہم ایسا ہی کرتے۔ کیا تُو بستی والوں کو اپنا دیدار کرانے پر راضی ہے؟"

میں اب خود اس جگہ سے نکلنا چاہتی تھی' پجاری کی موت نے میرے دل کو اداس کر دیا تھا۔ میں نے اسی لئے اقرار میں سر ہلا دیا۔

مشعل بردار پجاری اپنے ساتھی کی لاش کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے اس طرح سیڑھیاں چڑھنے لگا جیسے موت اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ میرے جسم پر جو سانپ لپٹے ہوئے ہیں' کہیں ان میں سے کوئی اور مشعل بردار پجاری کو بھی نہ ڈس لے مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ پجاری اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلتی ہوئی اوپر آ گئی۔

اوپر کئی پجاری اور موجود تھے۔ جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی تو مشعل بردار پجاری بلند آواز میں بولا۔ "ناگ دیوی کو تعظیم دو!"

مشعل بردار پجاری کے الفاظ سنتے ہی وہ سبھی سجدہ ریز ہو گئے اور ان میں مہا پجاری بھی تھا۔

جب وہ سجدے سے اٹھے تو مشعل بردار پجاری ان سے پھر مخاطب ہوا۔ "ناگ دیوتا نے ساتویں قربانی قبول کر لی' مبارک ہو! اس نے ہمارے ایک ساتھی کی نذر لے لی۔ جاؤ نیچے سے اس کی لاش اٹھا لاؤ!"

پجاری سیڑھیاں اتر کر نیچے چلے گئے' مگر ان میں مہا پجاری نہیں تھا۔ وہ میرے قریب آ گیا تھا اور سرگوشیوں میں مجھے کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ اس عرصے میں مشعل بردار پجاری نے مشعل بجھا کر دیوار میں پیوست کر دی تھی۔

مردہ پجاری کی لاش کو نیچے سے لا کر چبوترے پر رکھ دیا گیا۔ مہا پجاری کی ہدایت کے مطابق میں بھی چبوترے پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ سانپ ابھی تک میرے جسم سے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ سانپ انتہائی خطرناک اور زہریلے تھے جس کا عملی مشاہدہ مجھے ہو چکا تھا۔ مہا پجاری نے مجھے ان سے نجات پانے کی صورت بتا دی تھی جس پر مجھے حیران تو ہوئی تھی مگر میں نے زبان سے کچھ کہا نہیں تھا۔

نیچے تہہ خانے میں جانے والا جو پجاری زندہ بچ گیا تھا' وہ بستی کے سردار کو نئی صورت حال سے آگاہ کرنے جا چکا تھا۔ اسی کے ساتھ مردہ پجاری کی لاش بھی وہاں سے اٹھا کر لے جائی جا چکی تھی۔ اس وقت وہاں مہا پجاری کے علاوہ دو پجاری اور موجود تھے جو دو زانو چبوترے کے سامنے سر جھکائے ادب سے بیٹھے ہوئے تھے۔ بھوک مجھے اب بھی لگ رہی تھی' مگر اس کے لئے مجھے مزید کچھ دیر انتظار کرنا تھا۔

اچانک زور زور سے ڈھول بجنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ پھر ڈھول بجنے کی آواز میں دف بجائے جانے کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں اور یہ آوازیں قریب آنے لگیں۔

میری نظریں دروازے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں کیوں کہ دف بجنے کی آوازیں اسی طرف سے آ رہی تھیں۔

پہلے مجھے مندر کے دروازے سے اندر داخل ہونے والا عورتوں کا ایک گروہ نظر آیا۔ ان کے پیچھے مَیں نے بستی کے سردار صارم اور اس کی حسین بیوی نخبہ کو دیکھا۔ وہ سب کے سب اندر آتے ہی سجدے میں گر گئے۔

پھر آگے والی عورتیں سجدے سے اٹھ کر سامنے سے ہٹ گئیں۔ وہ دائیں جانب دو زانو ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ سردار صارم اپنی بیوی کا ہاتھ تھامے چبوترے کے سامنے دو زانو ہو کر ادب سے بیٹھ گیا۔

"اے ناگ دیوی! میں تیرا پجاری اور اس بستی کا سردار صارم تجھے خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہم تجھ سے عہد کرتے ہیں کہ تیری اطاعت گزاری میں کمی نہیں کریں گے تاکہ تُو ہم سے خوش رہ سکے اور تیری برکتیں اس بستی پر اپنا سایہ کئے رہیں۔" بستی کے سردار نے مجھ سے کہا۔

سردار اور اس کی بیوی کے پیچھے مندر کے پجاری بھی دو زانو بیٹھے ہوئے تھے۔

"اے سردار! ایک بڑے برتن میں دودھ منگوا!" میں نے کہا۔ مہا پجاری کی ہدایات پر میں نے عمل شروع کر دیا تھا۔ میرا لہجہ تحکمانہ تھا۔

ذرا ہی دیر میں میرے حکم کی تعمیل کر دی گئی اور سردار صارم بذات خود دودھ کا برتن لے کر چبوترے کی طرف بڑھا۔

"بس! اب مزید آگے نہ بڑھ اور اسے فرش پر رکھ دے۔" میں بولی۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ میرے جسم پر لپٹے ہوئے زہریلے سانپوں کی موجودگی میں سردار صارم قریب آئے۔ کوئی زہریلا سانپ اسے ڈس سکتا تھا۔

چبوترے سے آہستگی کے ساتھ اتر کر میں نے وہ بڑا سا پیالہ اٹھا لیا جس میں دودھ بھرا ہوا تھا۔ کھڑے کھڑے میں نے وہ دودھ کا پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور پینے لگی۔ آدھا پیالہ پی کر میں نے منہ ہٹا لیا اور پھر وہ پیالہ چبوترے پر رکھ دیا۔ کلائیوں، بازوؤں اور گردن سے لپٹے ہوئے سانپوں کو میں نے ایک ایک کر کے دودھ کے پیالے سے قریب ہی ڈال دیا۔ سانپ اس پیالے کی طرف رینگنے لگے۔ میں قریب ہی کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔

وہ پانچ زہریلے سانپ تھے جو اس پیالے میں بچا ہوا دودھ پی گئے۔ چند لمحوں کے بعد ہی میں نے انہیں تڑپتے اور بل کھاتے دیکھا اور پھر ان کے جسم ساکت ہو گئے۔ وہ پانچوں زہریلے سانپ میرا جوٹھا دودھ پی کر مر چکے تھے۔ مہا پجاری نے مجھ سے یہی کہا تھا اور اس کی بات سچ ثابت ہوئی تھی۔

مہا پجاری کے سوا وہاں موجود تمام ہی افراد کے چہروں پر حیرت تھی اور خوف بھی!

"انہیں یہاں سے اٹھاؤ اے سردار!" میں نے سانپوں کی طرف اشارہ کیا۔ "انہیں اسی پجاری کی لاش کے ساتھ جلا دیا جائے کہ جس کی قربانی کی جا چکی ہے۔ آج کے بعد اب کوئی قربانی نہیں دی جائے گی!" بات ختم کرتے ہوئے میں نے حکم دیا۔ "اس کے ساتھ یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ مندر کے تہہ خانے میں جو زہریلے سانپ ہیں، انہیں دور پہاڑوں میں چھوڑ دیا جائے۔"

میرا حکم سنتے ہی مردہ سانپوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا، پھر ایک پجاری مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے دیوی! ناگ بڑے زہریلے ہیں اور انہیں پکڑ کر پٹاریوں میں بند کرنا مشکل ہے۔ اس طرح پجاریوں کی جانیں جانے کا خطرہ ہے۔"

اسی وقت میں نے مہا پجاری کی آواز سنی۔ "ہم دیوی سے التجا کریں گے کہ یہ مقدس فرض وہ خود انجام دے۔ کیا دیوی اس التجا کو قبول کرتی ہے؟"

"ہاں۔" میں نے اقرار کیا۔ "قربانی کی رسم آج سے ختم کی جا رہی ہے اس لئے ان سانپوں کو یہاں پالنا ختم کیا جاتا ہے۔"

پھر بڑی بڑی پٹاریوں کا بندوست کیا گیا اور مجھے پجاری، مندر کے ایک عقبی خفیہ راستے سے اس مقام کی پشت پر لے گئے جہاں سے سانپوں کو خوراک دی جاتی تھی اور بین بجا کر انہیں تہہ خانے والے

کمرے سے بلایا جاتا تھا۔ یہاں ایک آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ اس جالی کے نچلے حصے میں ایک خانہ بنا ہوا تھا جسے کھولا جا سکتا تھا۔ قطار میں پٹاریاں رکھ دی گئیں جن کے ڈھکنے کھول دیئے گئے تھے۔ جالی کا نچلا خانہ ایک پجاری نے کھول دیا۔ پھر دوسرے پجاری نے میرے اشارے پر بین بجانا شروع کی۔ سانپ ایک ایک دو دو کر کے خانے سے باہر آنے لگے اور بین کی دھن پر پھن کاڑھ کر جھومنے لگے۔ میں انہیں جلدی جلدی پٹاریوں میں ڈالنے لگی۔ بین بجتی رہی اور سانپ باہر آتے رہے۔ ان کی تعداد درجنوں میں تھی۔ میں بلا خوف و خطر انہیں پکڑ لیتی تھی۔ کسی بھی سانپ نے مجھے ڈسنے کی کوشش نہیں کی اور میں نے ان سب کو پٹاریوں میں بند کر دیا۔ یہ سب کچھ میں نے مہا پجاری کی ہدایات کے مطابق کیا تھا۔

اسی روز سے مجھے قابل تعظیم سمجھا جانے لگا۔ بستی والے سردار صارم سے بھی زیادہ میرا احترام کرتے تھے۔ مہا پجاری نے کیوں کہ خود کو میرا باپ ظاہر کیا تھا اس لئے اسے بھی عزت و احترام دیا جاتا تھا۔

مہا پجاری ہی کے ایما پر میں نے مندر میں رہنے کی بجائے سردار کی بڑی سی حویلی کے ایک حصے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مہا پجاری بھی وہیں میرے ساتھ رہتا تھا۔ بستی کے سردار نے میرے وہاں قیام کو اپنے لئے باعث عزت و توقیر سمجھا تھا۔ مجھے اور مہا پجاری کو باعزت طور پر رہنے کے لئے ایک ٹھکانہ مل گیا تھا اس لئے مہا پجاری نے وہاں سے کہیں اور جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

بستی والے اپنے دن کا آغاز میرے دیدار سے کرتے تھے۔ میں حویلی کے ایک دریچے میں بیٹھ جاتی تھی اور دریچے کے نیچے سے بستی والے میرا دیدار کر کے گزرتے رہتے تھے۔ ان میں خود بستی کا سردار اور اس کی بیوی بھی شامل ہوتے تھے۔

میں کیوں کہ ابھی بچی ہی تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلوں کودوں، مگر میرے گرد عقیدت و احترام کا ایک ایسا نادیدہ حصار قائم تھا جو میری یہ خواہش پوری نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسی غرض سے میں کئی بار حویلی سے نکل کر بستی کے گلی کوچوں میں نکل گئی لیکن بچے تو بچے کسی بڑے نے بھی میرے قریب آنے کی ہمت نہیں کی۔ میں جدھر سے گزرتی وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر ادب سے سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے۔ وہ مجھے "آتون دیوی" کہتے تھے۔ انسانوں سے میرا درجہ ان کے نزدیک بلند تھا۔

مجھے وہاں رہتے چالیس دن گزرے تھے کہ ایک روز میں نے سنا، سردار صارم کا کوئی مہمان حویلی کے مہمان خانے میں آ کر ٹھہرا ہے۔ پھر اسی روز شام کو سردار صارم اپنے اس مہمان کو مجھ سے ملوانے کے لئے آیا۔

حسب معمول سردار نے گھٹنوں کے بل جھک کر مجھے تعظیم دی، مگر مہمان نے ایسا نہیں کیا۔ اس پر سردار نے مہمان کی طرف سے معذرت کی اور بولا۔ "اے آتون دیوی! یہ میرا دوست اجدر ہے، یہ اپنے دیوتا کے سوا کسی اور کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ اس لئے اسے معاف کر دے۔"

میں نے اس شخص کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اس کا رنگ گورا، چہرہ کتابی اور قد لمبا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مجھے عجیب سی مسکراہٹ نظر آئی۔

"اے سردار! تیرا مہمان ہمارا بھی مہمان ہے۔" میں بولی۔

"شکریہ اے آتون دیوی!" مہمان نے کہا۔ اس نے وہی زبان بولی تھی جو اس علاقے کے لوگ بولتے تھے۔

پھر سردار نے اپنے مہمان اجدر کا تفصیلی تعارف کرایا۔ وہ بھی ایک پہاڑی بستی ازیرے سے آیا تھا۔ اجدر بستی والوں کو وہی عجیب ہتھیار اور ان میں استعمال ہونے والا سامان فراہم کرتا تھا جو ہتھیار محافظوں کے پاس میں نے دیکھے تھے۔ اس کے عوض وہ سونے کی شکل میں سردار سے قیمت وصول کرتا تھا۔ اس وقت بھی اجدر کے ہاتھ میں ویسا ہی ایک ہتھیار نظر آ رہا تھا۔

"اے آتون دیوی! میں بطور تحفہ یہ رائفل تجھے نذر کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تُو میرا یہ تحفہ قبول کرلے گی؟" اجدر نے مجھے مخاطب کیا۔

سردار صارم نے حیرت سے اپنے مہمان کی طرف دیکھا' پھر کہنے لگا۔ "اے میرے دوست! دیوی دیوتاؤں کو ہتھیاروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

اگر سردار درمیان میں نہ بول اٹھتا تو میں یقیناً اجدر کا تحفہ قبول کرلیتی۔ میرے دل میں یہ تجسّس موجود تھا کہ وہ ہتھیار کس طرح چلایا جاتا ہے جس کا نام اس نے رائفل بتایا تھا۔ مجھے وہ ہتھیار چلا کر دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ اسی جذبے کے زیر اثر میں نے سردار سے کہا۔ "اپنے مہمان کا دل نہ توڑ' ہم اس کا تحفہ قبول کرتے ہیں۔ اسے ہمارے پاس سے مایوس نہیں لوٹنا چاہئے۔"

اجدر نے آگے بڑھ کر وہ ہتھیار میرے قدموں میں رکھ دیا' پھر شانے سے لٹکی ہوئی چمڑے کی پیٹی بھی رائفل کے قریب رکھ دی۔

"اے آتون دیوی! میں تیرا ممنون ہوں کہ تُو نے میرا تحفہ قبول کرلیا۔" اجدر بولا۔

"اے سردار! اس بستی میں جو شخص یہ ہتھیار سب سے بہتر چلانا جانتا ہو' تو اسے ہمارے پاس بھیجے۔" میں نے سردار سے کہا۔

"خود میرا یہ دوست بھی ایک اچھا نشانے باز ہے۔ دیوی کا حکم ہو تو یہ بھی دیوی کا ہر حکم بجا لانے میں یقیناً خوشی محسوس کرے گا۔" سردار بولا پھر اس نے تصدیق طلب نظروں سے اجدر کی طرف دیکھا۔

"بالکل اے سردار!" اجدر نے تائید کی۔

"ٹھیک ہے' جب ہمیں ضرورت ہوئی تمہیں مہمان خانے سے بلوالیں گے۔" میں نے کہا۔

پھر وہ دونوں مجھ سے رخصت کی اجازت لے کر اٹھ گئے۔

دوسرے دن صبح اجدر کے بارے میں مجھے مہا پجاری سے مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ میدانوں کی طرف سے ہتھیار لا کر پہاڑی بستیوں میں فروخت کرتا تھا۔ یہ اس کا صرف کاروباری دورہ نہیں تھا بلکہ اس مرتبہ سیر و تفریح کی غرض سے بھی آیا تھا۔ اپنے ساتھ اسی لئے وہ اپنی بیوی اور بچے کو بھی لے کر آیا تھا۔ میرے لئے اس اطلاع میں دلچسپی کا سبب اجدر کا بیٹا تھا جس کی عمر دس گیارہ سال تھی۔ بستی کے بچے میرے ساتھ کھیلنے سے گریز کرتے تھے اس لئے میں اجدر کے بیٹے کے ساتھ کھیل سکتی تھی۔ میرا

عقیدت و احترام اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ بستی والے جب میرا دیدار کر چکے تو میں خود حویلی کے مہمان خانے میں چلی گئی۔

اجدر وہاں موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ "اے آتون دیوی! تُو نے مجھے بلوا لیا ہوتا' میں حاضر ہو جاتا۔"

وہ مہمان خانے کا بیرونی کمرہ تھا۔ اجدر کی بیوی اور اس کا بیٹا شاید اندرونی کمرے میں تھے۔

"میں تجھ سے نہیں تیرے بیٹے سے ملنے آئی ہوں اے اجدر بابا!" میں نے اسے بتایا۔

"میرے بیٹے سے!" اجدر نے حیرت سے کہا۔

"ہاں' میں اس کے ساتھ کھیلوں گی۔" میں نے مسکرا کر اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"اچھا میں اسے بلاتا ہوں۔" اجدر نے مطمئن انداز میں سر ہلایا' پھر آواز دی۔ "احرس بیٹے!"

جواب میں اندرونی کمرے سے ایک نسوانی آواز ابھری۔

"میرا بیٹا احرس کپڑے بدل کر ابھی آ رہا ہے۔" اجدر نے مجھے بتایا۔ "اے دیوی! میری بیوی بھی تجھ سے ملنا چاہتی ہے۔"

کچھ ہی دیر میں اجدر کی بیوی اور اس کا بیٹا احرس اندرونی کمرے سے نکل آئے۔ اجدر نے مجھ سے اپنی بیوی کا تعارف کرایا۔ اس کا نام تیما تھا۔

احرس اور میرے درمیان ابتدا میں کچھ اجنبیت رہی' مگر ہم دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ اجدر پورے دو ہفتے بستی تریال میں رہا۔ اس بستی کا نام سردار صارم کے جد امجد تریال کے نام پر تھا۔ ایک روایت کے مطابق تریال ہی نے وہ بستی بسائی تھی۔ پندرہ دن کے دوران میں اجدر سے میں نے رائفل چلانا سیکھ لیا۔ اس نے مجھے ایک اور چھوٹا ہتھیار بھی تحفے میں دیا تھا جسے چلانا زیادہ آسان تھا۔ اس ہتھیار کو وہ ریوالور کہتا تھا۔ اس میں بہ یک وقت چھ گولیاں بھری جاتی تھیں۔ بستی کے چند ہی لوگوں کے پاس ریوالور تھا۔ اجدر کو میں "اجدر بابا" کہنے لگی تھی۔ جب وہ بستی سے رخصت ہو رہا تھا تو میں نے اس سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ آئندہ بھی احرس کو اپنے ساتھ لائے گا۔ میں نے یہ بھی چاہا تھا کہ وہ احرس کو کچھ عرصے کے لئے وہیں چھوڑ جائے لیکن اس نے معذرت کرلی تھی۔

دو ہفتے ہی میں احرس جیسے میری عادت بن گیا تھا۔ وہ چلا گیا تو میرا دل اچاٹ رہنے لگا۔ میں تنہا ہی پہاڑیوں کی طرف نکل جاتی اور گھنٹوں بعد بستی کی طرف لوٹتی۔ مہا پجاری نے بھی یہ بات محسوس کرلی اور میرا دھیان بٹانے کی خاطر مجھے جڑی بوٹیوں کا علم سکھانے لگا۔ مجھے یہ علم بہت دلچسپ معلوم ہوا۔ ایک جڑی بوٹی تو کمال کی تھی۔ اس کے سفوف کو پانی میں گھولنے کے بعد وہ کچھ دیر میرے ہاتھ اس سفوف گھلے ہوئے پانی میں ڈالے رکھتا۔ پھر وہ آگ جلاتا اور مجھ سے آگ میں ہاتھ ڈالنے کو کہتا۔ پہلی بار تو میں ایسا کرتے ہوئے ڈری تھی لیکن پھر میں نے اسے ایک کھیل بنا لیا تھا۔ آگ سے میرا ہاتھ نہیں جلتا تھا۔ مختلف جڑی بوٹیوں کے مختلف خواص تھے۔ چند ہی روز میں مجھے اتنی مہارت حاصل ہو گئی کہ ان جڑی بوٹیوں کو الگ الگ پہچاننے لگی۔ ایک جڑی بوٹی کا سفوف ایسا تھا کہ جسم کو قطعی سن کر

دیتا تھا۔ پھر چاہے جسم کا وہ حصہ کاٹ کر ڈال دیا جائے ذرا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس کا عملی تجربہ خود مجھے بھی ایک بار ہو چکا تھا جب مہا پجاری نے میرے دائیں شانے پر موجود سانپ کے پھن کی مہر کو چھیل دیا تھا۔ خنجر سے کھال چھیلے جانے کا مجھے قطعی احساس نہیں ہوا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہوئی تھی کہ زخم بھر جانے کے بعد وہ نشان جوں کا توں میرے شانے پر باقی رہا تھا۔ ایک جڑی بوٹی بہتے ہوئے خون کو روکنے کے لئے تھی اور میں اس کا مشاہدہ بھی کر چکی تھی۔ یہ تمام جڑی بوٹیاں انہی پہاڑی علاقوں میں پائی جاتی تھیں۔ مہا پجاری نے اب تک جتنا علم بھی سیکھا تھا مجھے بھی رفتہ رفتہ سکھا دیا۔ مجھے وقت گزاری کا ایک مشغلہ مل گیا تھا۔ مہا پجاری میرا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ جڑی بوٹیاں تلاش کرنا اس علاقے میں ایک دشوار طلب کام تھا' مگر مجھے اس دشوار کام میں لطف محسوس ہونے لگا تھا۔

جڑی بوٹیوں کے علم ہی کے ساتھ ساتھ مہا پجاری کو ہاتھ کی لکیروں کا علم بھی آتا تھا۔ یہ علم بھی اس نے مجھے سکھانا شروع کر دیا۔ اسی علم کی روشنی میں کچھ عرصے کے بعد جب میں نے خود اپنے ہاتھ کی لکیروں کا غور سے جائزہ لیا تو حیران رہ گئی۔ میرے ہاتھ میں موت کی لکیر نہیں تھی۔ مَیں نے یہ بات پجاری کو بتائی تو وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔ "میں بچپن ہی میں تیرے ہاتھوں کی لکیریں دیکھ چکا تھا۔ موت کی لکیر تو اسی وقت ابھرتی جب اس ہاتھ میں زندگی کی لکیر ہوتی۔ ایسے ہاتھ والے افراد عام انسانوں سے مختلف اور حیرت انگیز قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ پُراسرار سرگوشیاں سنائی دینا اور جو ہونے والا ہے پہلے ہی سے اسے دیکھ لینا ایسی ہی حیرت انگیز قوتوں کا ثبوت ہے۔ تُو چاہے تو اپنی ان قوتوں کو اپنے ارادے کا پابند کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ تیری عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ تجھ میں خود بہ خود یہ صلاحیت پیدا ہو جائے' یعنی تُو مستقبل میں جھانک سکے۔ جب چاہے تُو یہ جان لے کہ کل کیا ہو گا۔"

اپنے بارے میں مجھے مہا پجاری کی یہ باتیں بڑی عجیب معلوم ہوئیں۔ اپنے اندر موجود ان حیرت انگیز قوتوں کو اپنے ارادوں کا پابند بنانے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی وجہ شاید میری کم عمری تھی۔ مجھے پوری طرح یہ شعور ہی نہیں تھا کہ یہ حیرت انگیز قوتیں قدرت کا کتنا بڑا عطیہ ہیں۔

وہ پورا سال انہی مشغلوں اور دلچسپیوں میں گزر گیا' مگر مجھے جس کی آمد کا بے چینی سے انتظار تھا وہ نہیں آیا۔ اجدر بابا ہی جب نہ آیا تو اس کا بیٹا احرس کہاں سے آ جاتا۔ مزید چھ مہینے گزرنے کے بعد ایک روز مجھے سردار نے بتایا کہ آئندہ ہفتے اس کا دوست اجدر آنے والا ہے۔ اجدر نے کسی آدمی کے ذریعے یہ پیغام بھیجا تھا۔ میں بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے احرس کو بھی لائے گا۔ یہی اس نے وعدہ بھی کیا تھا' مگر جب وہ آیا تو اکیلا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا دل بجھ گیا۔

"اے اجدر بابا! تُو نے اپنا وعدہ وفا کیوں نہیں کیا؟" مَیں نے اس سے پہلا سوال یہی کیا۔ "تُو احرس کو اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں آیا؟"

"وہ بیمار پڑ گیا تھا اے آتون دیوی!" اجدر بابا نے جواب دیا۔ "ورنہ میں اسے ضرور ساتھ لاتا۔"

احرس بیمار ہے' یہ سن کر میں بے چین ہو گئی۔ میں نے اجدر بابا سے پوچھا۔ "تُو کب یہاں سے واپس جائے گا؟"

"اے دیوی! کیوں کہ احرس بیمار ہے اس لئے میں کل ہی یہاں سے چل دوں گا۔" اجدر بابا نے جواب دیا۔ "اگر میرا یہاں آنا ضروری نہ ہوتا تو شاید کچھ عرصے اور ادھر کا رخ نہ کرتا۔" اس کا لہجہ سچائی کا غماز تھا۔

اجدر بابا کے علاوہ وہاں سردار صارم بھی موجود تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اے سردار! کل ہم بھی اجدر بابا کے ساتھ اس کی بستی ازیر جائیں گے۔"

"لیکن اے دیوتاؤں کی چہیتی! یہ سفر طویل اور تھکا دینے والا ہے۔" سردار بولا۔

"ہم احرس کو ہر قیمت پر دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

"اس طرح تو اے آتون دیوی! بستی والے تیرے روزانہ کے دیدار سے محروم ہو جائیں گے۔" سردار نے ایک اور وجہ بیان کی۔

بستی والوں کے اظہار عقیدت نے مجھ میں تھوڑی سی خودسری بھی پیدا کر دی تھی۔ میں اسی کے زیر اثر بولی۔ "اے سردار! ہم تیری بستی والوں کے پابند تو نہیں ہیں کہ یہاں سے کہیں نہ جائیں۔ ہم اپنا فیصلہ سنا چکے ہیں۔ ہمیں یہ فیصلہ بدلنے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔"

میری بات سن کر سردار صارم سہم گیا' پھر بولا۔ "تیرے حکم کی تعمیل ہو گی اے آتون دیوی! اجازت دے کہ تیرے ساتھ بستی کے چار جوان مردوں کو بھی بھیجا جائے تاکہ وہ تیری خدمت کریں اور تُو انہیں جو حکم دے' بجا لائیں۔"

"اجازت ہے۔" میں نے کہہ دیا' پھر بولی۔ "مہا پجاری بھی ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔" ہرچند کہ مہا پجاری نے خود کو میرا باپ ظاہر کیا تھا مگر میں اسے مہا پجاری ہی کہتی تھی۔

اسی دن جب مہا پجاری کو یہ معلوم ہوا کہ میں اجدر بابا کے ساتھ ازیر کی طرف جانے کا ارادہ رکھتی ہوں تو وہ فکرمند ہو گیا اور مجھے سمجھانے لگا۔

میں نے اس کی ایک نہ سنی اور کہا۔ "کیا خبر کہ وہ علم جو تُو نے ایک عرصے مجھے سکھایا ہے' وہاں جا کر کام آ جائے۔" میرا اشارہ جڑی بوٹیوں کے علم کی طرف تھا۔ ان سے بہت سی بیماریوں کا علاج ہو سکتا تھا۔

"مگر اے آتون! وہ بستیاں ہمارے لئے بالکل اجنبی ہیں۔" مہا پجاری بولا۔ وہ بھی اب مجھے میرے اصل نام کی بجائے آتون ہی کہتا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "کیا خبر ہمیں وہاں کن حالات کا سامنا کرنا پڑے!"

"تُو اندیشہ نہ کر اور میرے ساتھ چلا چل۔ ہاں تجھے اپنے ساتھ جڑی بوٹیاں لے کر چلنا ہے' ان کی وہاں ضرورت پیش آ سکتی ہے۔" مَیں نے مہا پجاری کو تاکید کی۔

آخرکار مہا پجاری کو میری بات ماننا ہی پڑی۔ دوسرے ہی دن صبح دیدار عام کے بعد ہمارا قافلہ بستی تریال سے ازیر کی طرف روانہ ہو گیا۔ تقریباً ساری ہی بستی کے لوگ مجھے آبادی کے آخری سرے تک الوداع کہنے آئے تھے۔ ان لوگوں میں سردار صارم اور اس کی بیوی نخبہ کے علاوہ ناگ مندر کے پجاری

بھی تھے۔

میرے ساتھ مہا پجاری کے علاوہ چار قوی ہیکل مسلح محافظ بھی تھے۔ جنہوں نے ضرورت کا سامان اپنے گھوڑوں پر لاد رکھا تھا۔ خود مہا پجاری اور میرے پاس رائفلیں اور ریوالور موجود تھے۔ اس عرصے میں مہا پجاری نے بھی یہ ہتھیار چلانا سیکھ لئے تھے۔ ہم چھ افراد کے علاوہ ساتواں صرف اجدر بابا تھا۔ اپنے بیٹے احرس کے لئے میری فکرمندی اور طویل سفر پر آمادگی سے وہ بہت متاثر ہوا تھا۔

بستی سے روانگی کے وقت سردار صارم نے مجھ سے جلدی واپسی کا وعدہ کرا لیا تھا۔ بستی تریال کی حیثیت اب میرے لئے وادی سبز کی طرح ہو گئی تھیں جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ جیسے جیسے میری عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا' میرا سینہ دھواں دینے لگا تھا۔ میرے ماں باپ کو بڑی بے دردی سے خود میری آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا تھا۔ میں وہ روح فرسا مناظر بھلا کیسے بھول سکتی تھی۔

دن بھر سفر کے دوران میں دوپہر کو بس ایک مرتبہ قیام کیا گیا تھا۔ پھر جب سورج اونچے پہاڑوں کے پیچھے چلا گیا تھا تو پڑاؤ ڈالا گیا تھا۔ ایک اونچی سی اور ہموار چٹان پر خیمہ لگا دیا گیا۔ کھانے سے فراغت پا کر چہل قدمی کے بعد جب ہم سونے کے لئے لیٹے تو میری ایک جانب اجدر بابا کا بستر تھا اور دوسری طرف مہا پجاری لیٹا ہوا تھا۔ چاروں محافظ چاروں سمتوں میں دراز تھے۔ ایک طرف مشعل کو زمین میں پیوست کر کے روشن کر دیا گیا تھا۔ اس میں بڑی دشواری پیش آئی تھی کیوں کہ زمین پتھریلی اور سخت تھی۔

معلوم نہیں' رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ خیمے کے باہر بندھے ہوئے گھوڑے زور زور سے ہنہنانے لگے اور میری آنکھ کھل گئی۔ دن بھر سفر کی تکان کے سبب سبھی بے خبر سو رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ خیمے کے در کی طرف اٹھی اور میں چونک اٹھی۔ یقیناً کسی نے خیمے کے اندر جھانک کر دیکھا تھا اور پھر اس کا چہرہ غائب ہو گیا تھا۔ میں اس کے چہرے کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکی تھی۔ وہ کسی عورت کا چہرہ تھا جس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔

اس غیر آباد علاقے میں یہ عورت کہاں سے آ گئی؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ اسی کے ساتھ میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر مہا پجاری کو جگا دیا۔

"کیا ہوا اے آتون!.......... کیا بات ہے؟ تیری آنکھ کیسے کھل گئی؟" مہا پجاری اپنی آنکھیں ملتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"خیمے کے باہر کوئی ہے اے مہا پجاری!" میں نے اسے بتایا۔

وہ چونک اٹھا اور پھر کہنے لگا۔ "مگر یہاں کون ہو سکتا ہے؟ یہاں تو آس پاس کسی آبادی کا نام و نشان نہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ٹھہرو' میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔" مہا پجاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے قریب رکھی ہوئی رائفل اٹھا لی تھی۔

"اے مہا پجاری! وہ کوئی عورت معلوم ہوتی ہے۔" میں بولی۔

"عورت!" مہا پجاری نے حیرت سے کہا۔

"ہاں وہ عورت ہی ہے۔ میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس نے خیمے کے اندر جھانک کر

دیکھا تھا۔"

اسی وقت اجدر بابا کی آنکھ کھل گئی اور اسے بھی حقیقت حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ پھر اجدر بابا اور مہا پجاری دونوں خیمے سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ دور کہیں سے دھماکے کی آواز سنائی دی جیسے گولی چلائی گئی ہو۔ اسی کے ساتھ ایک دہشت زدہ سی عورت خیمے کے اندر تقریباً بھاگتی ہوئی آ گئی۔ یہ وہی تھی جس کا چہرہ کچھ دیر پہلے مجھے خیمے کے در میں نظر آیا تھا۔

اس کی حالت بڑی خراب و خستہ معلوم ہوتی تھی جیسے وہ بہت دور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو۔ سر کے کھلے ہوئے بالوں میں مٹی تھی۔ قمیض بھی میلی تھی اور کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی جس سے اس کے جسم کی جلی رنگت ظاہر ہو رہی تھی۔ میرے لئے سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے جسم کا آدھا نچلا حصہ بے لباس تھا۔ اس ہیئت کذائی کے باوجود بلاشبہ وہ حسین تھی اور نوجوان بھی۔

خیمے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ "مجھے بچا لیں بچا لیں مجھے ورنہ ...... ورنہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" اس نے یہ الفاظ پہاڑوں پر بولی جانے والی زبان ہی میں ادا کئے تھے' مگر اس کے لہجے سے اجنبیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ بیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔

لڑکی کے چیخنے چلانے سے چاروں محافظ بھی جاگ اٹھے تھے اور حیرت سے نیم برہنہ لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔

"کون ہو تم؟" اجدر بابا نے سوال کیا۔ "اور وہ کون لوگ ہیں جو تمہیں مار ڈالنا چاہتے ہیں؟" میں نے محسوس کیا کہ یہ سوالات کرتے ہوئے اجدر بابا کی نظریں لڑکی کے چہرے پر نہیں جسم کے نچلے حصے پر تھیں۔

میری ہی طرح شاید مہا پجاری نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ اس نے لڑکی کی ستر پوشی کے لئے جھک کر بستر سے چادر اٹھائی اور لڑکی کو دیتے ہوئے بولا۔ "اسے اپنے جسم پر لپیٹ لے!" پھر اس نے کہا "چادر لپیٹ کر یہاں بیٹھ جا اور بتا کہ تجھ پر کیا گزری ہے؟"

لڑکی نے چادر لے کر اپنے جسم کے نچلے حصے پر باندھ لی' پھر کچھ جھجکتی ہوئی سی میرے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے سے ابھی تک خوف جھلک رہا تھا۔

"مطمئن رہو' تم یہاں ہر طرح محفوظ ہو۔" اجدر بابا نے لڑکی کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے مخاطب کیا

پھر اس لڑکی نے اپنے جو واقعات بیان کئے' وہ بہت عجیب اور دردناک تھے۔ اسے میدانی علاقے کی ایک آبادی سے اغوا کر کے وہاں لایا گیا تھا۔ اس واقعے کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ جہاں ہمارا خیمہ لگا تھا' وہاں سے تقریباً دس بارہ میل شمال مشرق میں پہاڑیوں سے گھرا ایک علاقہ تھا۔ اس چھوٹے سے علاقے کی حیثیت ایک بڑے قید خانے کی سی تھی جہاں مختلف علاقوں سے لڑکیاں اغوا کر کے لائی جاتی تھیں اور پھر وہاں ہفتے میں ایک روز عورتوں کا بازار لگتا تھا۔ اس بازار میں عورتوں کو بالکل جانوروں کی طرح سجا بنا کر لایا جاتا تھا۔ اردگرد پھیلی ہوئی پہاڑی بستیوں کے مرد وہاں عورتیں خریدنے کے لئے آتے

تھے۔ وہ عورتوں کو خریدنے سے پہلے ان کے جسموں کو ٹٹول کر اور کھول کر اچھی طرح دیکھتے تھے' پھر ان کے دام لگاتے تھے۔

عورتوں کو جب وہاں لایا جاتا تھا تو زبردستی ان کی عزت و آبرو کو پامال کر دیا جاتا تھا۔ انہیں مارا پ جاتا تھا۔ ان کی عزت نفس کو پوری طرح کچل دیا جاتا تھا تاکہ اندر موجود بغاوت کے جذبات ختم ہو جائیں۔ انجلا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اس لڑکی کا نام انجلا ہی تھا جسے بارہ سے زیادہ مرد اب تک کئی بار پامال کر چکے تھے۔ روز رات کے وقت ان لڑکیوں کے جسموں کے نچلے حصوں کا لباس اتار لیا جاتا تھا تا وہ اس حالت میں وہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکیں۔ انجلا نے اب تک اپنے نہ بکنے کا سبب بتایا تھا کہ اس کی قیمت خاصی تھی۔ اتنی مہنگی لڑکیاں عموماً جلدی نہیں بکتی تھیں۔ وہ کافی دن سے ف ہونے کے منصوبے بنا رہی تھی اور آج رات اسے یہ موقع مل گیا تھا۔ وہ فرار ہونے میں تو کامیاب ہو گ تھی مگر نہ جانے کیسے ان لوگوں کو اس کے فرار کا علم ہو گیا اور اس کے پیچھے لگ گئے۔

انجلا کی داستان ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ مہا پجاری چونک اٹھا۔ پھر اس نے اپنا ایک کان زمین سے لگا دیا۔

"کچھ گھڑسوار اسی طرف آ رہے ہیں۔" مہا پجاری نے سیدھا بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "مجھے دھمک سنا دے رہی ہے۔"

"یہ وہی لوگ معلوم ہوتے ہیں جو اس مظلوم لڑکی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔" اجدر بابا کے لہ سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہاں یہ وہی ہو سکتے ہیں۔" مہا پجاری نے اجدر بابا کے خیال سے اتفاق کیا۔

"ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ یہ تو بڑا ظلم ہو گا کہ ہم اس بے سہارا لڑکی کو ان کے حوالے کر دیں۔" اجدر بابا نے کہا۔

"تو کیا ہم اس لڑکی کے لئے ان سے جنگ کریں گے؟" مہا پجاری بولا۔ "میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ہمیں اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہئے۔"

مہا پجاری کا یہ مشورہ مجھے خودغرضانہ اور بے رحمانہ محسوس ہوا۔ اسی کے ساتھ میں بول اٹھی۔

"نہیں اے مہا پجاری! تیرا مشورہ غلط ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر اس لڑکی کی مدد کرنا چاہئے۔ یہ دوبارہ ا لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ وہ اس پر بہت ظلم کریں' اسے فرار ہونے سزا دیں گے۔"

"اے آتون دیوی! میں بھی تیرے خیال سے متفق ہوں۔" اجدر بابا جلدی سے بولا۔

مہا پجاری کو مجبوراً خاموش ہو جانا پڑا۔ اب گھوڑوں کی ٹاپیں ایک تسلسل کے ساتھ پتھریلی زمین پڑتی سنائی دے رہی تھیں۔ ان کا رخ ہمارے خیمے ہی کی طرف معلوم ہوتا تھا کیوں کہ ٹاپوں کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کی ایک وجہ خیمے کے اندر جلتی ہوئی مشعل بھی سکتی تھیں اس پورے علاقے میں خیمے کے سوا دور دور تک کہیں روشنی نہیں تھی۔

پھر مجھے اور انجلا کو تو اسی خیمے کے اندر رہنے دیا گیا اور سارے مسلح افراد باہر چلے گئے۔ خلاف توقع انجلا کے چہرے سے خوف کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ اس وقت تو انجلا کو پہلے سے زیادہ خوفزدہ ہونا چاہئے تھا۔

کچھ ہی دیر میں یوں لگا کہ آنے والے گھڑسوار چٹان کے قریب آ کر رک گئے ہوں۔ پھر ایک بلند آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ "ہماری ایک عورت بھاگ گئی ہے اور ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔ وہ اس طرف آئی ہے اور ہمیں شک ہے کہ تم لوگوں نے اسے اپنے خیمے میں چھپا لیا ہے۔ ہم تمہارے خیمے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"اے اجنبی لوگو!" جواب میں اجدر بابا کی آواز ابھری۔ "تمہیں ہمارے خیمے کی تلاشی لینے کا کوئی حق نہیں۔"

"ہم حق مانگتے نہیں بلکہ چھین لیتے ہیں اے شخص!" اجنبی آدمی کی سخت آواز میں نے سنی۔ اس کی آواز سے لگتا تھا جیسے وہ لڑنے بھڑنے پر آمادہ ہو۔ کچھ دیر تک اجدر بابا اور اس شخص کے درمیان تند و تیز الفاظ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ پھر میں نے اجدر بابا کی آواز سے اندازہ لگایا کہ وہ نرم پڑتا جا رہا ہے۔ میں نے اجدر بابا کو کہتے سنا۔ "تم اسے بیچنا ہی تو چاہتے ہو اور اسی لئے واپس لے جانا چاہتے ہو؟"

"تمہاری اس بات سے ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ تمہارے ہی خیمے میں ہے۔"

"ہاں اسے ہم نے پناہ دی ہے۔ تم اس کی قیمت بتاؤ۔"

"پانچ ڈلی سونا۔" جواب ملا۔

"یہ بہت ہے' کچھ کم کرو۔" اجدر بابا نے کہا۔

"چار ڈلی سے کم نہیں لیں گے ہم ورنہ اسے ہمارے حوالے کر دو۔"

"میں دو ڈلی دے سکتا ہوں۔"

"بالکل نہیں۔ وہ بالکل کھرا مال ہے' اسے اب تک کسی نے نہیں چھوا۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم! اس کی آبرو بہت سے لوگوں نے پامال کی ہے۔ وہ ہمیں سب کچھ بتا چکی ہے۔ تم ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے۔"

جواب میں اس شخص نے انجلا کو گالی دی اور پھر تھوڑی دیر دیر بھاؤ تاؤ کے بعد تین ڈلی سونے کے عوض انجلا کا سودا ہو گیا۔ اجدر بابا اندر آیا اور اس نے اپنے سرہانے رکھے ہوئے تھیلے میں سے سونا نکالا اور باہر چلا گیا۔ وہ سونا ڈلیوں کی شکل میں تھا۔ وہ تین ڈلیاں لے گیا تھا۔ سردار صارم بھی اسلحہ کے عوض اجدر بابا کو سونا ہی دیتا تھا۔

وہ طوفان ٹل گیا تو تمام افراد خیمے کے اندر آ گئے۔ میرے بستر کے برابر ہی انجلا کے لئے بستر بچھا دیا گیا۔ اجدر بابا نے اپنا بستر ذرا ہٹا کر بچھا لیا تھا۔ دوبارہ سب کو سونے میں زیادہ دیر نہیں لگی' مگر مجھے نیند نہیں آئی۔ میں آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔

ذرا دیر اور گزری تھی کہ میں نے ہلکی سی سرسراہٹ سنی۔ میں نے گوشہ چشم سے دیکھا۔ انجلا کا

بستر خالی تھا۔

"ارے تُو .... یہ تُو ہے؟" میں نے اجدر بابا کی سرگوشی سنی۔

"ہاں میں ہوں۔" انجلا نے سرگوشی کی۔ "کیا تُو اپنی ادا کی ہوئی قیمت وصول نہیں کرے گا؟"

"مگر.......... مگر کسی کی آنکھ کھل گئی تو؟"

"تو باہر چلا چل!" انجلا نے تجویز پیش کی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اجدر بابا کی آواز سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

پھر میں نے ان دونوں کو خیمے سے باہر جاتے دیکھا۔ عمر کے اس حصے میں مجھے یہ علم تو نہیں تھا انجلا' اجدر بابا کو کس لئے خیمے سے باہر لے جا رہی تھی مگر اتنا احساس ضرور تھا کہ وہ کوئی غلط کام ہی ت جسے دوسروں کی موجودگی میں انجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہ دونوں خیمے سے باہر چلے گئے۔

دوسرے دن صبح دیر سے سفر شروع ہوا کیوں کہ سبھی رات کو خلاف توقع جاگنے کی وجہ سے د میں اٹھے تھے۔ انجلا کے بارے میں اب میرے خیالات بڑی حد تک بدل چکے تھے۔ اس کا سبب رات ا واقعہ تھا اور انجلا کا ایک دم بدلا ہوا رویہ بھی۔ وہ اب قطعی مظلوم یا دکھی لڑکی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بات بات پر ہنس رہی تھی۔ روانگی کے وقت بھی اس کا رویہ ایسا تھا کہ مہا پجاری کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

"میں تو تیرے گھوڑے پر سواری کروں گی۔" اس نے ایک ادا سے اجدر بابا کو مخاطب کیا تھا۔

"تو آ جا نا' روکا کس نے ہے تجھے؟" اجدر بابا کھل اٹھا تھا۔ پھر اس نے انجلا کی پتلی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا تھا۔

"میں ڈر رہی تھی کہ تُو کہیں مجھے اس بوڑھے کے ساتھ نہ بٹھا دے۔" انجلا نے یہ الفاظ دھیمی آواز میں ادا کئے تھے' مگر میرا گھوڑا قریب تھا اس لئے میں نے یہ الفاظ سن لئے تھے۔ انجلا کا اشارہ مہا پجاری کی طرف تھا۔

جب ہم دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے رکے تو اس دوران میں بھی انجلا اور اجدر بابا کے درمیان چھیڑخانی جاری رہی۔ انجلا کے انداز و اطوار اب ایسی محبوباؤں کے سے ہو گئے تھے جنہیں اپنے حُسن و جوانی پر ناز ہوتا ہے اور جو اپنے عاشقوں کو چھیڑ کر خوش ہوتی ہیں۔

رات کو جب پڑاؤ ڈالا گیا تو اجدر بابا سب کو جلد سو جانے کی تاکید کر کے اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ بستروں کی ترتیب وہی تھی جو گزشتہ رات تھی۔ میں سمجھ گئی کہ اجدر بابا کس لئے جلد سو جانے کی تاکید کر رہا ہے۔ یقیناً گزشتہ رات والا کھیل وہ آج رات بھی کھیلنا چاہتا تھا۔ میں نے لاکھ سونے کی کوشش کی مگر مجھے نیند نہیں آئی۔ مجھے ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے حالانکہ بظاہر ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔

اس رات پہل اجدر بابا نے کی اور دھیمی آواز میں انجلا سے کہنے لگا۔ "بن مت' مجھے معلوم ہے تُو جاگ رہی ہے۔ اٹھ جا!"

جواب میں دھیمی سی ہنسی کی آواز ابھری۔ اجدر بابا کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ انجلا جاگ رہی تھی۔ وہ آہستہ سے بولی۔ "آج رات رہنے دے' کل سہی!"

"نخرے نہ دکھا میں جانتا ہوں کہ تیرا بھی دل چاہ رہا ہو گا' بس مجھے تنگ کر رہی ہے۔ کل تو خود آ گئی تھی اور آج میں کہہ رہا ہوں تو.........."

"اچھا چل!" یہ کہہ کر انجلا نے اجدر بابا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

پھر وہ دونوں گزشتہ رات کی طرح خیمے سے باہر چلے گئے۔ میں ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

نیند اور بیداری کی ملی جلی سی کیفیت میں اچانک مجھے آشنا پُراسرار سرگوشی سنائی دی۔ "اے معبلہ! بیدار ہو جا اور دوسروں کو بھی بیدار کر دے کہ انجلا تیرے اجدر بابا کا سارا سونا لے کر فرار ہو رہی ہے۔"

میں نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور انجلا کا خالی بستر دیکھتے ہی چیخ اٹھی۔ "اجدر بابا.......... اجدر بابا! اٹھو کہ وہ فرار ہو رہی ہے' تمہارا سارا سونا لے کر بھاگی جا رہی ہے۔"

اجدر بابا ایک دم ہڑبڑا کر اٹھا اور دوسرے لوگ بھی جاگ گئے۔ کسی گھوڑے کی ٹاپوں کی دور ہوتی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اجدر بابا کا وہ تھیلا سرہانے سے غائب تھا جس میں سونا تھا۔

چاروں محافظ اپنی اپنی رائفلیں لے کر خیمے کے در کی طرف دوڑے۔ مہا پجاری اور اجدر بابا کے ساتھ میں بھی خیمے سے باہر نکل آئی۔ انجلا ایک گھوڑا بھی کھول کر لے گئی تھی۔ چاروں محافظ تیزی کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اسی سمت دوڑے جدھر ایک متحرک دھبا سا نظر آ رہا تھا۔ انجلا ابھی خیمے سے زیادہ دور نہیں جا سکی تھی ورنہ اس کی تلاش مشکل ہو جاتی۔

"وہ .... وہ ایسی لگتی تو نہیں تھی۔" اجدر بابا خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا' پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "مگر تجھے .... اے آتون دیوی! تجھے بروقت انجلا کے فرار ہونے کا علم کیسے ہو گیا؟"

"تُو اسے دیوی بھی کہہ رہا ہے اور یہ بھی پوچھ رہا ہے کہ اسے کس طرح انجلا کے فرار کی خبر ہو گئی؟" میرے بجائے مہا پجاری بول اٹھا۔ "اے اجدر! میں نے تجھ سے کل رات ہی کہا تھا کہ تُو اس چکر میں نہ پڑ مگر تُو نے میری بات نہیں مانی۔ وہ لڑکی فریبی تھی اور انہی لوگوں کی آلہ کار بن کر آئی تھی جو پہلے تو تین ڈلی سونا لے گئے' پھر سارے مال پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے لڑکی کو یہاں چھوڑ گئے۔"

"لیکن اے مہا پجاری! اس نے تو بڑی دکھ بھری کہانی سنائی تھی۔" اجدر بابا کے لہجے میں تاسف تھا۔

"اگر وہ ایسی پتا بیان نہ کرتی تو تجھے دھوکا کیسے دیتی!"

مہا پجاری کی بات ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ دور سے دھماکے کی آواز سنائی دی اور پھر بہ یک وقت کئی دھماکے ہوئے اور خاموشی چھا گئی۔

ہم خاصی دیر تک تذبذب کے عالم میں کھڑے رہے' مگر پھر کوئی دھماکہ نہ ہوا۔

محافظ جب پلٹ کر آئے تو ان دھماکوں کا عقدہ کھلا۔ ان میں سے ایک زخمی تھا جس کے شانے پر

گولی لگی تھی اور اس پر گولی چلانے والی انجلا تھی۔ زخمی محافظ کو جلدی جلدی خیمے کے اندر لایا گیا۔ شانے سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔ مہا پجاری اس کی نگہداشت کرنے لگا۔ اس نے زخم پر سفوف چھڑک کر خون کا بہنا بند کر دیا تھا۔ غنیمت یہ ہوا تھا کہ گولی شانے میں پیوست نہیں تھی ہوئی بلکہ زخمی کرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی ورنہ مہا پجاری کو دشواری پیش آتی اور وہ اتنی جلدی مرہم پٹی کر کے فارغ نہ ہو جاتا۔

لوٹ کر آنے والے محافظوں کے ساتھ وہ گھوڑا بھی تھا جو انجلا کھول کر لے گئی تھی اور اجدر بابا کا وہ تھیلا بھی جس میں سونا تھا۔ اس کے علاوہ اجدر بابا کی رائفل بھی وہ لے آئے تھے' مگر ان کے ساتھ انجلا نہیں تھی جو نہ جانے کب سے اس راستے سے گزرنے والے مسافروں کو اپنی مظلومیت کی داستان سنا سنا کر لوٹ رہی تھی۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ اسے اس کے گناہوں کی سزا مل گئی تھی۔ ہرچند کہ اس نے ہمیں فریب دیا تھا' اس کے باوجود مجھے اس کی موت کا دکھ ہوا۔ ساری رنجشیں زندگی تک ہوتی ہیں۔ اب میرے دل میں انجلا کی طرف سے کوئی رنجش نہیں تھی۔

محافظوں نے بتایا تھا کہ وہ انجلا کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے انجلا سے رک جانے کے لئے کہا تھا۔ جواب میں انجلا نے خلاف توقع پلٹ کر گولی چلا دی تھی۔ پھر بقیہ تینوں محافظوں نے ایک ساتھ انجلا کو نشانہ بنایا تھا۔ ایک محافظ کی گولی انجلا کی دائیں کلائی پر لگی تھی۔ رائفل انجلا کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔ دوسرے محافظ کی گولی نے انجلا کا سینہ چھید دیا تھا اور تیسری گولی اس کے سر میں لگی تھی۔ اس کے ساتھ انجلا کا جسم گھوڑے کی پشت سے اچھل کر بائیں جانب گہرے کھڈ میں غائب ہو گیا تھا۔ جس تھیلے میں سونا تھا وہ اس نے گھوڑے کی زین کے نیچے دبا رکھا تھا ورنہ اگر تھیلا اپنے ساتھ رکھا ہوتا تو اس کی لاش کے ساتھ ہی تھیلا بھی گہرے کھڈ میں چلا جاتا پھر وہ تھیلا مل پاتا یا نہیں' کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس اندوہ ناک واقعے کے بعد پھر بقیہ سفر کے دوران میں اور کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

چوتھے روز دوپہر سے کچھ پہلے ہم ایک بستی میں داخل ہوئے۔ اس بستی کا ایک شخص جزیل اجدر بابا کا دوست تھا۔ ہم اسی کے بڑے مکان کے ایک حصے میں ٹھہرے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے جزیل نے خاطر مدارت میں کوئی کمی نہیں کی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ہم سب ایک بڑے کمرے میں آرام کرنے لیٹ گئے۔

"اب ہم یہاں سے کل صبح روانہ ہوں گے۔" اجدر بابا نے بتایا۔

شام کو ہم نے اس بستی کی سیر کی۔ وہ پہاڑی بستی ہی تھی' مگر ہموار علاقہ وہاں زیادہ تھا۔ پتھروں کو کاٹ کر آمدورفت کے لئے راستے بنا لئے گئے تھے۔

پھر دوسرے دن صبح ہی صبح ناشتہ کر کے ہم اس بستی سے چل دیئے۔

ہم اب جن بل کھاتے پہاڑی راستوں سے گزر رہے تھے' وہ راستے اور وہ سارا علاقہ بہت خوبصورت تھا۔ کہیں بادل چھائے نظر آتے اور ہلکی ہلکی پھوار ہمیں بھگو دیتی اور کہیں دھوپ نکلی ہوتی اور

...ستہ بالکل خشک ہوتا۔ دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل مجھے بڑا اچھا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پہاڑوں ... دھوپ جھولا جھول رہی ہو۔ جگہ جگہ پہاڑی چشمے اور آبشار نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ...الی دیتی تھی۔ یہ ہریالی مجھے اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی۔ دن بھر ہم انہی سرسبز و شاداب علاقوں سے ...رتے ہوئے آخر کار ایک بڑی سی بستی میں پہنچ گئے اور یہی ہماری منزل تھی۔

اجدر بابا کا مکان بستی کی مغربی سمت میں تھا۔ ہم وہاں تک پہنچ گئے۔ میری توقع کے مطابق مکان ...ا وسیع و عریض تھا۔

ہمیں مکان کے ایک حصے میں ٹھہرا دیا گیا۔ میں فوری طور پر مکان کے اندر جا کر احرس سے ملی۔ وہ ...ے دیکھ کر کھل اٹھا۔ مسلسل بیمار رہنے کی وجہ سے اس کی صحت خاصی خراب ہو گئی تھی۔ مہا پجاری بھی ...رس کی عیادت کرنے اندر آ گیا۔ اجدر بابا کی بیوی تیبا کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم نے اتنا دور دراز کا سفر ...ف احرس کی خاطر کیا ہے تو وہ بڑی محبت سے پیش آئی۔

معلوم ہوا کہ احرس گزشتہ چھ ماہ سے بستر پر پڑا تھا اور اس کا علاج جاری تھا۔ اس کا بخار ٹوٹتا نہیں ...ا اور بخار کی وجہ سمجھنے سے معالج قاصر تھے۔

"کل سے اس کا علاج میں کروں گا۔" مہا پجاری نے احرس کی نبض دیکھ کر اجدر بابا سے کہا۔ ...اسے کوئی اور دوا نہ دی جائے۔ صرف تین دن میری دوا کھلا کر دیکھ لے' اس کا بخار ٹوٹ جائے گا۔" مہا ...پجاری کے لہجے میں یقین تھا۔

پھر وہی ہوا جو مہا پجاری نے کہا تھا۔ اس کا دعویٰ سچ ثابت ہوا تھا۔ تیسرے دن احرس کا بخار اتر گیا ...تھا۔ ان تین دنوں کے دوران میں میرا زیادہ تر وقت احرس کے ساتھ ہی گزرا تھا۔

میں دو ہفتے اجدر بابا کی بستی میں رہی۔ اس عرصے میں میرے تجربات میں بہت اضافہ ہوا۔ میں نے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا۔ مجھے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ اجدر بابا' مہا پجاری کا بے حد ممنون تھا جس کے علاج سے احرس صحت یاب ہو گیا تھا۔ اس نے چلتے وقت مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی احرس کو لے کر ہماری بستی آئے گا۔

جو چار محافظ ہمارے ساتھ تھے' ان میں سے ایک کئی بار اجدر بابا کی بستی جا چکا تھا۔ اسے راستوں کا علم تھا اور واپسی میں وہی ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ اگر وہ ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو ممکن ہے' ہم راستہ بھٹک جاتے۔

راتوں کو قیام کرتے اور دن میں سفر کرتے ہوئے ایک دوپہر ہم اپنی بستی تریال واپس پہنچ گئے۔ ساری بستی میں جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کی آتون دیوی واپس آ گئی تھی۔ اس خوشی میں دوسرے دن سردار صارم نے ایک جشن منانے کا اعلان کیا۔

دوسرے دن صبح سے ہی کے باہر میدان میں جشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جشن کا آغاز شام کو ہونا تھا۔

شام کو ناگ مندر کے پجاری' حویلی میں آئے اور جشن میں شرکت کے لئے درخواست کی۔ میں

پہلے ہی سے لباس تبدیل کر کے تیار ہو چکی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں بستی کے کسی جشن میں شرکت کر رہی تھی۔

اس موقع پر میں نے مندر کے بڑے پجاری کے پاس ایک پٹاری دیکھی تو چونک اٹھی۔ اسے میں پہچانتی تھی۔ یہ انہی دو پجاریوں میں سے ایک تھا جو مندر کے تہہ خانے میں مجھے لے گئے تھے۔ "اے بڑے پجاری! اس پٹاری میں کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس میں آتون دیوی کا زیور ہے۔" بڑے پجاری نے یہ کہہ کر وہ پٹاری میرے سامنے رکھ دی اور چند قدم دور ہٹ گیا۔

مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ اس پٹاری میں کیا ہو سکتا ہے۔ پھر بھی میں نے پٹاری کھول کر اس کا جائزہ لیا اور میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اس پٹاری میں سانپوں کا ایک جوڑا ہی تھا۔ معلوم نہیں میرے جسم میں سانپوں کے لئے ایسی کیا کشش تھی کہ پٹاری کھلتے ہی وہ میرے جسم سے لپٹ گئے۔ ان میں سے ایک میرے دائیں بازو سے لپٹ گیا تھا اور دوسرا میری گردن سے۔

بڑا پجاری شاید بستی والوں کو یہ تماشا دکھانا چاہتا تھا کہ سانپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگا، مگر ان لوگوں کی عقیدت و احترام کو مدنظر رکھتے ہوئے میں خاموش ہی رہی۔ اسی وقت مہا پجاری وہاں پہنچ گیا۔ پھر سردار صارم اور اس کی بیوی نخبہ بھی وہیں آ گئے اور میں ان لوگوں کے ساتھ حویلی کے دروازے تک پہنچی۔ دروازے کے باہر سیڑھیوں کے نیچے کرسی نما ایک پالکی رکھی تھی جس کے نیچے دو لمبے لمبے ڈنڈے لگے ہوئے تھے۔ میں نے دروازے کے باہر دائیں بائیں عورتوں اور مردوں کا ہجوم دیکھا۔ وہ شاید میری ہی آمد کے منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری تعریف و توصیف میں نعرے بلند کرنے لگے۔ عورتوں کے ہاتھوں میں مجھے دف بھی نظر آئے۔

بڑے پجاری نے مجھ سے اس پالکی میں بیٹھنے کو کہا۔ میں سیڑھیاں اتر کر پالکی میں بیٹھ گئی۔ پھر پجاریوں نے وہ پالکی اپنے کاندھوں پر اٹھا لی۔ سردار صارم اور نخبہ پیدل اس پالکی کے آگے آگے چلنے لگے۔ مہا پجاری پالکی کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس کے پیچھے عورتیں اور پھر مرد تھے۔ عورتوں نے دف بجا کر اپنی آتون دیوی کی شان میں گیت گانا شروع کر دیئے۔

میری سواری کا جلوس اسی طرح بستی سے گزرتا ہوا کچھ ہی دیر میں بڑے میدان تک پہنچ گیا۔ وہاں شمال کی سمت ایک تخت بچھا تھا۔ اس تخت پر میری پالکی رکھ دی گئی اور میرے قدموں میں سردار صارم کے ساتھ اس کی بیوی نخبہ بیٹھ گئی۔ پجاری میری پالکی کے دائیں بائیں بیٹھ گئے تھے۔ دائیں جانب مہا پجاری بیٹھا ہوا تھا۔

میری اجازت سے جشن کا آغاز ہوا۔ گھڑسواری، نیزہ بازی، شمشیرزنی، تیراندازی، نشانہ بازی وغیرہ کے مقابلے ہوئے اور جیتنے والوں کو سردار صارم نے انعامات سے نوازا۔ ہر جیتنے والا میری پالکی کے سامنے آ کر پہلے سجدہ ریز ہوتا تھا، پھر سردار صارم سے انعام لے کر الٹے قدموں واپس ہو جاتا تھا۔

نوجوان دوشیزاؤں نے دف بجا کر رقص کا مظاہرہ کیا۔ بستی کی یہ حسین ترین منتخب کنواریوں کا

رقص تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو انعام دیا گیا۔

جب سورج ڈوب گیا تو مشعلیں روشن کر لی گئی تھیں۔

جشن کے آخر میں ایک شخص کو پابہ زنجیر تخت کے سامنے لایا گیا اور میں چونک اٹھی۔ مجھے وادی سبز کا وہ منظر یاد آ گیا تھا جب بالکل اسی طرح میرے بابا کو زنجیروں میں جکڑ کر ژیان کے روبرو لایا گیا تھا۔

میرا سینہ دھواں دینے لگا۔

سردار کے نائب نے تخت کی دائیں جانب کھڑے ہو کر بلند آواز میں اس شخص کی فرد جرم سنائی۔ فرد جرم کے مطابق اس شخص نے کسی بات پر غصے میں آ کر اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ بستی کے قانون میں قتل کی سزا قتل ہی تھی، سو اس شخص کو قتل کیا جانا تھا۔ قتل کا طریقہ کار سردار متعین کرتا تھا۔

فرد جرم سنا دی گئی تو سردار صارم نے طریقہ کار کا اعلان کیا۔ "اس قاتل کے جسم کو اس وقت تک تیروں سے چھیدا جاتا رہے جب تک یہ مر نہ جائے۔"

میرے خیال میں مجمع کے سامنے ایسی کوئی سزا اس لئے دی جاتی تھی کہ دوسرے لوگ اس سزا سے عبرت حاصل کریں۔ قتل کے بدلے قتل کی سزا سے مجھے کوئی اختلاف نہیں تھا مگر سزا کے طریقہ کار سے اتفاق نہیں تھا۔ میرے نزدیک اس طرح سزا دینا درندگی تھی۔

محافظ اس شخص کو تخت کے سامنے سے لے جانے ہی والے تھے کہ میں بلند آواز میں بولی۔

"ٹھہرو!"

محافظوں کے بڑھتے قدم رک گئے اور مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ سب میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔

پھر میرے حکم پر اس شخص کو زنجیروں کی گرفت سے آزاد کر دیا گیا۔ اس کے بعد میرے حکم پر ایک برتن میں دودھ لایا گیا۔ میں نے اس برتن سے چند گھونٹ دودھ پی کر بڑے پجاری کو وہ برتن تھما دیا۔

"جاؤ اسے یہ دودھ پلا دو!" میں نے بڑے پجاری کو حکم دیا۔

بڑا پجاری، دودھ کا برتن لے کر اس شخص کے پاس پہنچا۔ اس شخص نے میرے حق میں بلند نعرہ لگایا اور پھر پجاری کی ہدایت کے مطابق برتن سے منہ لگا دیا۔ وہ تخت کے سامنے کھڑا ہوا میرا پیا ہوا دودھ پی رہا تھا۔ مشکل سے ابھی اس کے حلق سے ایک ہی گھونٹ اترا ہوگا کہ وہ جھومنے لگا۔

"اس کے ہاتھ سے دودھ کا برتن لے لو اے بڑے پجاری!" میری آواز بلند ہوئی۔

بڑے پجاری نے لپک کر برتن اس شخص سے لے لیا جو اب گرنے ہی والا تھا۔ میں نے اس کی موت آسان بنا دی تھی۔ اسے مرنے میں چند ہی لمحے لگے تھے۔ وہ زمین پر گرا تھا اور پھر چند لمحے ایڑیاں رگڑ کر مر گیا تھا۔

میرے اشارے پر بڑا پجاری دودھ کا برتن لے کر پھر میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے اپنی گود میں دودھ کا برتن رکھ لیا اور اپنے جسم سے لپٹے ہوئے سانپوں کو پکڑ کر ان کے منہ اس برتن میں ڈال دیئے۔ نتیجہ وہی نکلا جس کی مجھے توقع تھی۔ سانپ کا جوڑا بھی مر گیا۔

میرے حکم پر ان دونوں سانپوں کو بھی مردہ شخص کے جسم پر ڈال دیا گیا اور پھر بقیہ دودھ بھی انہی پر چھڑک دیا گیا۔

صرف میرا جوٹھا دودھ پی کر اس شخص اور زہریلے سانپوں کا مرجانا بستی والوں کے لئے اس بات کا گویا ثبوت تھا کہ میں دیوی ہوں۔ وہ دیر تک تعریفی نعرے بلند کرتے رہے۔ پھر سردار نے مجھ سے اجازت لے کر جشن کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ سانپوں سمیت سزایافتہ شخص کی لاش وہاں سے اٹھالی گئی۔

جس طرح میری سواری حویلی سے چلی تھی' اسی طرح واپس ہوئی۔

ایک سال کے دوران اجدر بابا' احرس کو ساتھ لے کر دو ہفتے کے لئے آیا تھا۔ صرف احرس ہی سے میں بے تکلف تھی اور اسے برابری کا درجہ دیتی تھی۔

پھر سال پر سال گزرتے گئے میری عمر سولہ سال کی ہو گئی اور احرس بھی جوان ہو گیا۔ اس عرصے میں مجھے بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ میں اور احرس چھ ماہ سے زیادہ ایک دوسرے کی جدائی برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ کبھی وہ آ جاتا تھا اور کبھی میں اس تک پہنچ جاتی تھی۔

بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ اب میرے سینے میں انتقام کا الاؤ پوری طرح بھڑک اٹھا تھا۔ میں ظالم ژیان سے اپنے ماں باپ کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اب تک میری حقیقت کا علم صرف مہا پجاری ہی کو تھا۔ صرف وہی میرے ماضی سے واقف تھا۔ احرس کو بھی اس سلسلے میں مَیں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے خلوت میں ایک روز مہا پجاری سے کہا۔ "اے مہا پجاری! کیا تُو اپنے سردار اشم کو بھول گیا؟ بول' کیا تجھ پر اس کا انتقام قرض نہیں؟ کیا تُو نے سردار اشم' میرے باپ کے قاتل ژیان کو معاف کر دیا؟"

"نہیں اے میری بچی! یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اس ظالم درندے کو بھول جاؤں! مجھے تو ایک طویل عرصے سے اسی دن کا انتظار تھا کہ تُو جوان ہو اور اپنے باپ کا بدلہ لے۔" مہا پجاری جواب میں بولا۔

"تو پھر اس کی کیا صورت ہو اے میرے باپ اشم کے وفادار؟" مَیں نے دریافت کیا۔

"تُو حکم کر اور دیکھ کہ کس طرح اس بستی کے مرد اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھے تیرے ساتھ چلتے ہیں!" مہا پجاری نے مشورہ دیا۔

"مگر اے مہا پجاری' یہ معاملہ تو صرف تیری اور میری ذات تک محدود ہے۔ کیا یہ مناسب ہو گا کہ اس کے لئے بستی کے جوانوں کی جانیں خطرے میں ڈالی جائیں؟ پھر یہ کہ انہیں کیا بتایا جائے گا' وادی سبز پر کیوں حملہ کیا جا رہا ہے؟" میں نے اس کے مشورے پر اعتراض کیا۔

"مجھے بتا' کیا کوئی اس بستی میں ایسا ہے جو تجھ سے یہ سوال کرے کہ وادی سبز پر حملے کا حکم تُو کیوں دے رہی ہے؟ کیا ان کے لئے صرف تیرا حکم ہی کافی نہیں؟ کیا صرف یہ جواز کافی نہیں کہ ان کی دیوی ایسا چاہتی ہے؟ اور کیا وہ اپنی دیوی کی خوشنودی حاصل کرنا نہیں چاہیں گے؟"

"تجھے تو معلوم ہے اے مہا پجاری کہ میں کوئی دیوی نہیں ہوں اور مجھ پر کوئی زہر کیوں اثر نہیں کرتا' یہ بھی تُو اچھی طرح جانتا ہے۔ تو پھر کیا مجھے یہ زیب دیتا ہے کہ میں ان کی عقیدت و محبت سے ناجائز فائدہ اٹھاؤں؟"

"اے میری بچی! تُو شاید یہ بھول گئی کہ گزشتہ برسوں میں کئی بار تُو نے سچی پیشگوئیاں کر کے بستی والوں کو آنے والے خطروں سے بچایا ہے۔ مجھے بتا' کیا تُو دیوتاؤں کی چہیتی نہیں؟ اگر نہیں تو پھر تجھے پُراسرار سرگوشیاں کیوں سنائی دیتی ہیں اور جو کچھ ہونے والا ہوتا ہے تجھے کس طرح پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے؟ تو اگر بستی والے تجھ سے عقیدت رکھتے ہیں' تجھے دیوتاؤں کی چہیتی اور دیوی کہتے ہیں تو کیا غلط کہتے ہیں؟"

مہا پجاری سے کافی دیر تک بحث و مباحثے کے بعد آخرکار میں ایک نتیجے پر پہنچ ہی گئی۔ یہی ایک صورت تھی کہ جس سے میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہوتا۔ مَیں نے جو فیصلہ کیا تھا' اس سے مہا پجاری کو بھی آگاہ نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مزید بحث کر کے میرے فیصلے کو بدلنے کی کوشش کرے۔ وہ لوگ جو مجھ سے عقیدت و محبت رکھتے تھے' انہیں میں اپنا ساتھ دینے کے لئے مجبور کرنا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے جو فیصلہ کیا تھا' اس کے مطابق بستی میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ آئندہ روز شام کو سارے بستی والے بڑے میدان میں جمع ہو جائیں۔ اعلان میں اس کی وجہ بھی بتا دی گئی کہ میں ان سے خطاب کروں گی۔ میرے سوا کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ میں بستی والوں سے کیا کہنے والی ہوں۔ ساری بستی میں تجسس کی ایک لہر دوڑ گئی' مگر کسی اور کا تو کیا ذکر سردار صارم کی بھی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال کر سکتا۔

میں دوسرے روز وقت مقررہ پر سردار صارم' نخبہ اور مہا پجاری کے ساتھ بڑے میدان میں پہنچ گئی۔ میرے ایما پر میدان کے درمیان میں تخت لگایا گیا تھا اور بستی والے اس تخت کے چاروں طرف مؤدب کھڑے تھے۔ ایسا میں نے اس لئے کیا تھا کہ میری آواز زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔

وہاں پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔ "اے تریال کے لوگو! آج میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں کون ہوں اور تمہاری بستی میں کہاں سے آئی ہوں۔ تو سنو کہ یہاں سے کئی دن اور کئی راتوں کی دوری پر پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک بستی ہے جسے وادی سبز کہا جاتا ہے۔ وہاں کا سردار میرا باپ اشم تھا۔ میری عمر اس وقت سات آٹھ سال ہو گی جب پہلی بار مجھے دیوتاؤں کی سرگوشیاں سنائی دیں اور مجھے وہ سب کچھ بتایا گیا جو ہونے والا تھا۔" اس کے بعد میں نے ژیان کی غداری اور اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کی دردناک داستان بیان کرنے کے بعد وادی سبز سے اپنے فرار کا واقعہ بیان کیا' سردار اشر کی بستی میں پناہ لینے اور وہاں سے بھی ایک رات فرار کی روداد سنائی۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ بات بھی راز نہیں رکھی کہ مہا پجاری میرا باپ نہیں بلکہ اس نے میری حقیقت کو راز میں رکھنے کی خاطر مجھے اپنی بیٹی ظاہر کیا تاکہ ژیان کو کسی طرح یہ علم نہ ہو جائے' میں کہاں ہوں۔ مہا پجاری نے اسی غرض سے میرا اصل نام بھی تبدیل کر دیا' میں نے یہ بات بھی نہیں چھپائی۔

سب کچھ بیان کرنے کے بعد میں نے آخر میں کہا۔ "سوائے لوگو! ایک مدت ہوئی کہ میرا سینہ انتقام کی آگ سے جل رہا ہے اور میں ظالم ژیان سے اپنے بے گناہ ماں باپ کے قتل کا بدلہ لینا چاہتی ہوں' مگر اس کے لئے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی کہ میرا ساتھ ضرور دو۔ تم میں سے ہر ایک میری طرف سے آزاد ہے۔ یقین کرو کہ میرا ساتھ دینے کے لئے تم پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ میں وادی سبز پر حملہ کرنا چاہتی ہوں' چاہے میرے ساتھ تم میں سے چند ہی لوگ کیوں نہ ہوں۔"

اس بستی والوں نے یقیناً پہلی بار ہی اس طرح کی باتیں سنی تھیں کہ انہیں کوئی اختیار دیا گیا تھا۔ وہ سرداری نظام کا معاشرہ تھا جہاں سردار کے حکم کو قانون کا درجہ حاصل تھا اور میری حیثیت تو سردار سے بھی افضل تھی۔ نتیجتاً ان کے سر ممنونیت سے جھک گئے اور پھر انہوں نے بہ یک زبان ہو کر عہد کیا کہ میرا ساتھ دیں گے۔ مجھے ان سے یہی توقع بھی تھی۔

میں پوری قوت کے ساتھ وادی سبز پر حملہ کرنا چاہتی تھی۔ بستی تریال میں اسلحہ موجود تھا' اس کے باوجود مزید اسلحہ کا بندوبست کیا گیا اور اس سلسلے میں اجدر بابا سے رابطہ قائم کیا گیا۔ میں کوئی کمی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ جو لوگ اجدر بابا کی بستی تک گئے تھے' ان کے ذریعے احرس کو بھی جنگی تیاریوں کا علم ہو گیا اور اس کا پس منظر بھی معلوم ہو گیا۔ چند روز بعد بستی میں اسلحہ پہنچا تو اس کے ساتھ احرس بھی تھا۔ وہ بھی اس جنگ میں میرے شانہ بہ شانہ لڑنے کا آرزومند تھا۔ میں نے اسے منع بھی کیا' مگر وہ نہیں مانا۔

چند ہی دن میں تمام جنگی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ تیر کمانوں' نیزوں اور تلواروں کے مقابلے میں جدید ہتھیاروں سے مسلح میرے ساتھیوں کو اور مجھے فتح حاصل ہو گی۔ ژیان میرے سامنے نہیں ٹک سکے گا۔ اسے میں زندہ گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ میری تمنا تھی کہ میں بھی ژیان کو اسی طرح موت سے ہمکنار کروں جس طرح اس نے میرے باپ کو بے دردی سے قتل کیا تھا۔

پھر میں نے روانگی کا دن بھی مقرر کر دیا۔ مہا پجاری' وادی سبز تک اس لشکر کی رہنمائی کے لئے موجود تھا۔

جس رات کے گزرتے ہی صبح دم لشکر بستی سے روانہ ہونے والا تھا' اس رات مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ اب تک پیش آنے والے پُراسرار واقعات کا تجربہ ہونے کے سبب میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوا کہ یہ بے چینی بلاوجہ نہیں ہو سکتی۔

اس رات میں نے طویل عرصے کے بعد پُراسرار سرگوشیاں سنیں اور پھر بند آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھا جو ہونے والا تھا۔ اسی کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میرا سارا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ میں نے کچھ ایسا ہی سنا اور دیکھا تھا کہ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔

"نہیں' میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ "یہ نہیں ہو سکتا' کل صبح لشکر روانہ نہیں ہو گا۔"

ایک چیخ سینہ شب میں کسی تیز دھار خنجر کی طرح پیوست ہو گئی۔ یہ مشعر کی آخری چیخ تھی۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ مشعر' بستی تریال کے سردار صارم کے چچا کا بیٹا تھا۔ یہ بات کسی کے علم میں بھی

نہ (?) تھی کہ مشعر کے دل میں بدی جڑ پکڑ چکی ہے۔ سردار صارم کا قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے بستی میں (?) مشعر کو بھی عزت و احترام حاصل تھا۔ معلوم نہیں کب اس کے دل میں ہوس اقتدار جاگی اور اس نے تریال (?) کے ایک قدیمی دشمن سمیر سے اقتدار کا سودا کر لیا۔ وہ سمیر کی مدد سے تریال کا سردار بننا چاہتا تھا۔ اس (?) کے لئے وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا اور یہ موقع اسے مل گیا تھا۔ تریال والے اپنی پوری قوت (?) سے میری اور سردار صارم کی رہنمائی میں وادی سبز پر حملہ کرنے والے تھے۔ مشعر نے یہ خبر سمیر کو دی تھی۔ اسی کے ساتھ وقت اور دن سے بھی آگاہ کر دیا تھا کہ کب بستی تریال سے لشکر کوچ کرے گا۔ مشعر کا مطلب خبر دینے والا ہے اور مشعر نے دشمن کو خبر دے دی تھی۔ بستی تریال کی مشرقی سمت ایک (?) دن اور ایک رات کی مسافت پر وہ پہاڑی بستی تھی جس کا سردار سمیر تھا۔ سردار صارم کی غیر موجودگی (?) میں مشعر اقتدار پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا۔ اس کے عوض مشعر نے سمیر کو بستی کا آدھا خزانہ دینے کا وعدہ (?) کر لیا تھا۔

مجھے ان تمام باتوں کا علم اسی رات سرگوشیوں کے ذریعے ہوا' فوری طور پر میں نے اس سازش سے سردار (?) صارم کو آگاہ کر دیا۔ سردار صارم نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی ثبوت طلب نہیں کیا۔ اس کے لئے (?) میرا کہنا ہی سب کچھ تھا۔ سردار صارم نے اپنے محافظ دستے کے سالار کو طلب کر کے مشعر کو قتل کرنے کے (?) لئے حکم دے دیا اور یوں مشعر مارا گیا۔ غداری کی سزا یہی تھی۔

مشعر کو قتل کئے جانے کے بعد سردار صارم نے دشمن قبیلے کے متوقع حملے سے بچنے یا اس کا کوئی تدارک کرنے کی خاطر مجھ سے مشورہ طلب کیا۔

نصف شب کے بعد منعقد ہونے والے اس اہم اجلاس میں سردار صارم کے علاوہ اس کی سپاہ کے اہم سالار بھی تھے۔ میرے ایما پر مہا پجاری اور احرس کو بھی اجلاس میں شریک کر لیا گیا تھا۔

ہرچند کہ پُراسرار سرگوشیوں میں مشعر کے سوا کسی اور کو غدار نہیں کہا گیا تھا مگر مجھے ایک شخص پر شک (?) تھا کہ وہ بھی اس سازش میں شریک رہا ہو گا وہ سردار صارم کا ایک بااعتماد سالار مقبل تھا۔ مقبل پر میرے (?) شک کی وجہ یہ تھی کہ بستی کی حفاظت کے لئے چند سپاہیوں کے ہمراہ اسی کو تریال میں رہنا تھا اور یہ بات (?) مشعر کے علم میں بھی تھی۔ وادی سبز کی طرف جو لشکر روانہ ہونے والا تھا اس میں مشعر کا نام بھی شامل (?) نہیں تھا۔ اسے لشکر کے ساتھ نہ جانا پڑے' اس کے لئے اس نے اپنی بیماری کا بہانہ کر دیا تھا۔

جب تمام لوگ جمع ہو گئے تو میں نے مقبل کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے چہرے سے قدرے فکرمندی (?) کا اظہار ہو رہا تھا مگر اس کا سبب اس وقت خلاف توقع طلبی بھی ہو سکتا تھا۔ مشعر کو قتل کیا جا چکا تھا (?) ابھی تک اس کا علم صرف چند افراد کو تھا۔ ان میں مقبل شامل نہیں تھا۔ محافظ دستے کے افراد کے علاوہ (?) مجھے اور سردار صارم ہی کو یہ بات معلوم تھی۔

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے میں نے اچانک مقبل کو مخاطب کیا۔ "کیا تجھے معلوم ہے کہ مشعر (?) کو قتل کیا جا چکا ہے؟"

مقبل میرے اس سوال پر تقریباً اچھل پڑا۔ وہاں موجود دوسرے افراد بھی چونکے تھے مگر مقبل پر

اس اطلاع کا ردعمل کچھ زیادہ ہی شدید ہوا تھا۔

"تُو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اے مقبل!" میں نے اسے خاموش اور حواس باختہ دیکھ کر کہا۔ میری آواز میں چبھن تھی۔

اچانک خلاف توقع مقبل اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے پیروں میں گر پڑا۔ پھر وہ گڑگڑانے لگا۔ "اے آتون دیوی! مجھے معاف کر دے۔ معاف کر دے مجھے کہ مجھ سے بڑی کوتاہی سرزد ہوئی۔ میں خطاکار ہوں اور تُو ہی میری خطا معاف کر سکتی ہے۔"

"مگر یہ تو بتا اے مقبل کہ تجھ سے کیا خطا ہوئی ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ میرا انداز درست معلوم ہو رہا تھا۔ سوال کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے مقبل کو اٹھ کر بیٹھنے کا حکم بھی دیا تھا۔ مقبل نے فوراً اس حکم کی تعمیل میں اپنا سر میرے پیروں سے اٹھا لیا تھا۔ جب وہ میرے حکم پر اٹھ کر بیٹھا تو میں نے دیکھا اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"اس نے .... مشعر نے مجھ سے کہا تھا کہ.........." مقبل نے رک رک کر بات شروع کی۔ "میں نے اگر اس کی بات نہ مانی یا راز کھول دیا تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ اسی کے ساتھ میری بہن بھی قتل کر دے گا جو اس کی بیوی ہے۔ مجھے اپنی جان کی پرواہ تو نہیں تھی مگر.......... مگر اپنی بہن کو قتل ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور.......... اور شاید یہی میری خطا تھی کہ.......... کہ میں اپنی زبان بند رکھنے پر راضی ہو گیا۔"

"مشعر نے تجھ سے کیا ایسی بات کہی تھی کہ جس کے چھپانے کو اب تُو خطا کہہ رہا ہے؟" میں نے خود اسی کی زبان سے اعتراف جرم کرانے کی خاطر دریافت کیا۔

"آتون دیوی دلوں کے بھید جانتی ہے اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔" مقبل بولا۔ "اگر ایسا ہوتا تو مشعر کو قتل نہ کر دیا گیا ہوتا پھر بھی دیوی کا حکم ہے تو میں بتاتا ہوں کہ مشعر نے مجھ سے کہا تھا .... وہ بوڑھے اور بے اولاد سردار صارم کی جگہ خود تریال کا سردار بننا چاہتا ہے اور.........."

"اور اس نے تجھ سے یہ بھی کہا ہو گا کہ سمیر بہت جلد تریال پر حملہ کرنے والا ہے۔" میں نے تصدیق طلب انداز میں مقبل کی بات پوری کر دی۔

"ہاں اے آتون دیوی! تُو ٹھیک کہتی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر بستی والے اسے سردار تسلیم نہ کریں اور بغاوت پر آمادہ ہو جائیں تو سمیر کی سپاہ اس بغاوت کو کچل دے۔ مجھ سے اس کی غرض یہ تھی کہ میرے زیر کمان جو سپاہی ہوں وہ سمیر کے سپاہیوں سے جنگ نہ کریں۔"

"اور اے مقبل! تُو نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ ایسا ہی تھا نا؟" میں بولی۔

مقبل کا جھکا ہوا سر میرے سوال کا جواب تھا۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ باغی مقتول مشعر اور مقبل کے درمیان اتنی قریبی رشتے داری تھی۔

"اے مقبل! تیرے علاوہ بھی کیا کوئی اس سازش میں شریک تھا؟" میں نے احتیاطاً پوچھا اس نے انکار میں سر ہلا دیا تو میں نے مزید سوال کیا۔ "سمیر کو بستی پر کب حملہ کرنا تھا؟"

"اس وقت تک وہ اپنی بستی سے چل چکا ہو گا اور کل دوپہر کے بعد تک یہاں پہنچ جائے گا۔" مقبل نے جواب دیا۔ "مشعر نے سمیر کو خبر کر دی تھی کہ تریال سے وادی سبز کی طرف لشکر کب روانہ ہو گا؟"

اب تک وہاں موجود تمام افراد خاموشی اور حیرت سے میرے اور مقبل کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ سردار صارم کے چہرے پر مجھے شدید غصہ نظر آ رہا تھا' یہ غصہ شاید اس اعتماد کی شکست کا تھا جو اسے مقبل پر تھا۔ اس کے باوجود سردار صارم نے اب تک گفتگو میں مداخلت نہیں کی تھی۔

"تو اے مقبل! تُو نے خود اعتراف کر لیا ہے کہ تجھے سازش کا علم تھا مگر تُو نے اپنی زبان بند رکھی اور اپنے سردار کو سازش سے آگاہ نہ کیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ تُو نے کسی بھی مجبوری کے تحت اس سازش میں شرکت پر اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ بول کیا ایسا ہی نہیں ہوا جیسا میں نے کہا؟"

"اے آتون دیوی! مَیں تو پہلے ہی اپنی خطا مان چکا ہوں اور تجھ سے معافی.........."

"ہرگز نہیں۔" میں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "تُو اچھی طرح جانتا ہے کہ غداروں کو معافی نہیں ملتی۔"

"اگر تیرا یہی فیصلہ ہے اے آتون دیوی تو پھر ٹھیک ہے .... مجھے اپنی موت قبول ہے۔" مقبل نے کہا۔

پھر اس سے پہلے کہ کوئی مقبل کے ارادے کو بھانپ سکتا اس نے انتہائی تیزی کے ساتھ خنجر نکالا اور اسے اپنے سینے کی بائیں جانب دل میں اتار لیا۔ کچھ ہی دیر میں مقبل کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا اور اس کی لاش ہٹا کر فرش سے خون صاف کر دیا گیا۔ اس نے خودکشی کر کے خود اپنی موت کو گلے لگا لیا تھا شاید اس کی موت پر وہاں موجود افراد میں سے میرے سوا کسی کو بھی دکھ نہیں تھا۔

فضا پر ایک بوجھل سی خاموشی مسلط تھی کہ میری ہی آواز نے اس خاموشی کو توڑا۔ مَیں نے جنگی حکمت عملی بیان کی۔ سبھی نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ "اگر کسی شخص کے ذہن میں کوئی اور تجویز ہو تو بیان کر دے۔" یہ بات مَیں نے اس لئے کہی کہ میری پیش کردہ تجویز کو وہ لوگ میرا حکم تصور نہ کریں۔

"نہیں' اے آتون دیوی! اس سے بہتر کوئی اور راستہ نہیں۔" سردار صارم نے میری تجویز پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

پھر وہ اجلاس ختم ہو گیا۔ میں خواب گاہ میں آ کر سونے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ ابھی خاصی رات باقی تھی۔

دوسرے دن طلوع آفتاب سے قبل ہی ساری بستی جاگ اٹھی پھر ادھر سورج طلوع ہوا ادھر طے شدہ منصوبے کے مطابق بستی تریال سے لشکر روانہ ہوا۔ اس لشکر کی قیادت کرنے والوں میں مہا پجاری' بن' اخرس اور سردار صارم بھی تھے۔ بستی سے کچھ دور نکل آنے کے بعد میری تجویز کے مطابق لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ لشکر کا ایک حصہ سردار صارم کی قیادت میں بستی کے قریب ہی رک گیا اور دوسرا نصف حصہ آگے بڑھ گیا۔

دوپہر ہونے سے پہلے پہلے لشکر کا یہ نصف حصہ بھی آگے بڑھنے کی بجائے بستی کی طرف پلٹ گیا۔ اس سے پہلے میں نے اپنے کچھ مخبروں کو آگے بھیج دیا تھا۔ دوپہر ہوتے ہوتے ہم بستی تریال سے صرف ایک پہر کی مسافت پر رہ گئے۔ میرے حکم پر لشکر کی رفتار کم کر دی گئی تھی۔ مجھے مخبروں کی واپسی کا انتظار تھا۔

ہم نے کچھ ہی فاصلہ اور طے کیا ہو گا کہ مخالف سمت سے دو گھڑسوار آتے دکھائی دیئے۔ میری توقع کے مطابق وہ میرے مخبر ہی تھے۔

"سمیر نے بستی پر اپنی پوری قوت سے حملہ کر دیا ہے۔" ایک مخبر نے قریب آ کر اطلاع دی۔

"سردار صارم نے اسے بستی کے باہر ہی روک لیا ہے۔" مجھے اسی خبر کا انتظار تھا۔ میرا لشکر آندھی طوفان کی طرح بستی تریال کی طرف بڑھا۔

اچانک ہی میں نے عقب سے دشمن کے سر پر پہنچ کر بھرپور حملہ کیا تھا۔

"آتون دیوی زندہ باد!" کے فلک شگاف نعروں سے سارا میدان جنگ گونج اٹھا تھا یقیناً بستی تریال کے جنگجو جوانوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میری وہاں موجودگی نے ان کے حوصلوں کو یقیناً بڑھا دیا تھا۔ وہ دشمن پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے۔

ادھر میرے ساتھ جو تازہ دم سپاہ پہنچی تھی اس نے بھی دشمن پر جہنم کے دہانے کھول دیئے۔ دشمن کے سپاہی بیچ میں گھر گئے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ جلد ہی دشمن کے پیر اکھڑ گئے اور وہ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح دشمن کا کافی جانی نقصان ہوا اور اس کے سپاہیوں کو بڑی تعداد میں گرفتار کر لیا گیا۔

ابھی یہ ہنگامہ جاری ہی تھا کہ اچانک میرا گھوڑا بدک گیا اور ایک جانب سرپٹ دوڑنے لگا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو قابو میں کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ بستی تریال کی مشرقی سمت دوڑا چلا جا رہا تھا۔ یہ وہی سمت تھی جدھر دشمن کے سپاہی فرار ہو رہے تھے۔ ابھی تک گھوڑے کی لگام میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک بار پھر گھوڑے کو روکنے کے لئے پوری قوت سے اس کی لگام کھینچ لی۔ اس قدر تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی لگام کھینچنا بہت خطرناک ہوتا ہے عموماً گھوڑا یا تو زمین پر گر پڑتا ہے اور اپنے سوار کو شدید زخمی کر دیتا ہے یا پھر پچھلے دونوں پیروں پر کھڑے ہو کر سوار کو زمین پر پھینک دیتا ہے۔ مجھے اس خطرناک صورت حال کا احساس تھا۔ میں نے اسی لئے اپنے دونوں پیر رکابوں میں سے نکال لئے تھے تاکہ گھوڑا بھاگتے بھاگتے کسی بھی پہلو زمین پر گرے تو میرے پیروں کی ہڈیاں ٹوٹنے سے محفوظ رہیں۔ اسی کے ساتھ میں گھوڑے کی پشت پر اوندھی لیٹ گئی تھی اور اپنے دونوں بازوؤں سے گھوڑے کی گردن جکڑ لی تھی۔ اس طرح اگر گھوڑا مجھے اپنی پشت سے نیچے گرانے کی کوشش کرتا اور اپنی دونوں پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا تو میں گرنے سے بچ جاتی۔ یہ سب کچھ چند ہی لمحوں میں ہو گیا تھا۔

بھاگتے بھاگتے گھوڑا الف ہو گیا تاکہ مجھے اپنی پشت سے نیچے پھینک دے۔ اس وقت تک مد

گھوڑے کی گردن سے لپٹ چکی تھیں۔ عین اسی وقت دائیں اور بائیں جانب سے تیز رفتار گھوڑے قریب پہنچ گئے جیسے ہی میرے گھوڑے نے دوبارہ دوڑنا شروع کیا اور میں نے اٹھ کر دائیں بائیں نظر دوڑائی، رسی کا ایک پھندا میرے شانوں سے پھسلتا ہوا کمر کے گرد آ کر تنگ ہو گیا پھر ایک جھٹکے سے میرا جسم بھاگتے ہوئے گھوڑے سے نیچے آ رہا اور میری آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ میرا سر کسی پتھر سے ٹکرایا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر پھیل گئی تھی۔ ہوش کھونے سے پہلے میرا آخری احساس یہ تھا کہ میں اپنے بہی خواہوں یا پرستاروں کے درمیان نہیں ہوں۔ میں نے اپنے اردگرد اجنبی چہروں کو دیکھا تھا۔

دوبارہ جانے کتنی دیر کے بعد میرے حواس بحال ہوئے کچھ دیر تک مجھے یاد ہی نہ آ سکا کہ میں کہاں ہوں آنکھیں کھولتے ہی میں نے بھاگتے ہوئے آسمان کو دیکھا مگر یہ صرف میرا احساس تھا آسمان نہیں بلکہ میرا جسم متحرک تھا۔ میں نے اپنے جسم کو حرکت دینا چاہی تو مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میرے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ میرا جسم رسوں کی گرفت میں تھا۔ میں ایک گھوڑے کی پشت سے بندھی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی لگام آگے بھاگتے ہوئے ایک گھڑسوار کے ہاتھ میں تھی۔ میرے دائیں بائیں بھی گھوڑے دوڑ رہے تھے۔

یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں جو مجھے اس طرح باندھ کر اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں؟ میں نے سوچا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ ہاں مجھے اتنا احساس ضرور تھا کہ وہ جو بھی ہوں، میرے دوست نہیں ہیں ورنہ مجھے کسی قیدی کی طرح گھوڑے کی پشت سے نہ باندھا جاتا۔

رفتہ رفتہ دھوپ کی تمازت کم ہوتی گئی اور پھر سورج ڈوبنے لگا۔

پوری طرح تاریکی پھیلنے سے پہلے ان لوگوں نے ایک بڑی سی چٹان کے نیچے پڑاؤ ڈال دیا۔ مجھے بھی گھوڑے کی پشت سے کھول لیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ لوگ تعداد میں خاصے تھے۔ ان کی گنتی سو سے اوپر ہی ہو گی۔ مجھے گھوڑے سے کھولتے ہی چند افراد نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا تھا اور ان کی رائفلوں کا رخ میری طرف ہو گیا تھا۔ میرے پاس کوئی بھی ہتھیار نہیں تھا یہاں تک کہ میری پیٹی سے خنجر تک نکال لیا گیا تھا۔ انہوں نے غالباً میری بے ہوشی کے دوران میں مجھے غیر مسلح کیا تھا۔

"جا اور سردار سے پوچھ کہ اس لڑکی کو باندھ کر ڈال دیا جائے یا اسی طرح پہرے میں رکھا جائے۔" میرے سامنے کھڑے ہوئے دراز قد شخص نے اپنے برابر کھڑے ہوئے بڑے بڑے بالوں والے سے کہا۔

بڑے بالوں والا ایک طرف چلا گیا اور پھر کچھ دیر کے بعد لوٹ کر آنے کے بعد بولا۔ "سردار کا حکم ہے کہ اسے اس کے سامنے پیش کیا جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" دراز قد شخص نے اثبات میں سر ہلایا، پھر رائفل کی نال سے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

مجھے نرغے میں لینے والے میرے آگے پیچھے چلنے لگے۔ چند مشعلیں روشن کر لی گئی تھیں کیونکہ

اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ وہ لوگ مجھے ساتھ لئے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں نسبتاً ایک بلند جگہ پر کوئی باریش بوڑھا بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں قطاروں میں بہت سے افراد مؤدب بیٹھے تھے۔ میں نے اس بوڑھے شخص کو غور سے دیکھا جس کے سر اور داڑھی کے بے ترتیب بال بری طرح بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے حلقوں میں جیسے دو شعلے چمک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر کھال جیسے منڈھی ہوئی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہو رہا تھا۔

اس بوڑھے نے نظر اٹھا کر میرا جائزہ لیا اور مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی نظریں میرے جسم کے کچھ مخصوص حصوں میں چبھ رہی ہوں۔ اس کے دیکھنے میں عجب ندیدہ پن سا تھا۔

"اسے اور قریب لے کر آؤ۔" بوڑھے نے حکم دیا۔ بوڑھے کی آواز غیر انسانی سی اور انتہائی بھاری تھی جو اس کے وجود کا حصہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ بوڑھے کے حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ مجھے اس بلند جگہ کے قریب لے جایا گیا۔ اب اس بوڑھے اور میرے درمیان صرف دو نیزوں کا فاصلہ تھا۔ اب اس بوڑھے کی نظریں کچھ اور شدت کے ساتھ مجھے اپنے جسم میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"اچھی ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "اور ہماری بیویوں میں شامل ہونے کے قابل ہے۔" بوڑھا اس طرح بولا جیسے مجھے اس کے سامنے اسی لئے پیش کیا گیا ہو کہ وہ اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کر سکے۔ پھر اس بوڑھے نے مجھے براہ راست مخاطب کیا۔ "تجھے خوش ہونا چاہئے کہ سردار سمیر نے تجھے اپنی بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

میں بوڑھے کی بات سن کر چونک اٹھی۔ تو یہ وہی ہے جو بستی تریال سے شکست کھا کر فرار ہوا تھا۔ میں نے سوچا' یہ میری بدقسمتی ہی تھی کہ مَیں اس کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ وہ منحوس و مدقوق بوڑھا مجھـ، اپنی بیوی بنانے کی بات کر رہا تھا جبکہ اس کی اور میری عمر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسی کے ساتھ ا یہ بھی سوچ رہی تھی کہ شاید ان لوگوں میں سے کوئی بھی میری حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ چند ہی ے بعد اس کا ثبوت بھی مل گیا۔

"کیا نام ہے تیرا؟" بوڑھے نے مجھ سے سوال کیا۔

"اے سمیر! میرا نام سن کر تُو اچھل پڑے گا اور اپنے فیصلے پر ملامت کرے گا کہ تُو نے ایک دیوی شان میں ایسی گستاخی کی۔"

"دیوی!" بوڑھا حیرت سے بولا۔ "مگر تُو تو مجھے عام انسانوں جیسی لگتی ہے۔"

"یہ تیری نظر کا دھوکہ ہے۔" میں نے پُراعتماد آواز میں کہا۔ "سن اے سمیر! کہ میرا نام آتون وی ہے۔"

"آتون دیوی!" کئی حیرت زدہ آوازیں سنائی دیں۔

ان لوگوں نے یقیناً بستی تریال کی دیوی آتون کا نام سنا تھا۔

"مگر میں کس طرح مان لوں کہ تُو ہی آتون دیوی ہے؟" بوڑھے نے کہا۔

"اگر اے سمیر! تجھے یہ ثبوت مل جائے تو کیا تُو مجھے میری بستی کی طرف لوٹ جانے دے گا؟" میں بولی۔

"ہاں!" بوڑھے نے کہا۔ "دیویاں کسی بھی قبیلے کی ہوں سبھی کے لئے قابلِ عزت ہوتی ہیں مگر تیری واپسی سے قبل اے دیوی! میں تیرا شوہر بننے کا اعزاز ضرور حاصل کروں گا تاکہ تریال والوں کی نظر میں' میں بھی قابلِ عزت ہو جاؤں۔ میں پھر فخر سے یہ کہہ سکوں گا کہ ان کی دیوی کا شوہر ہوں پھر برسوں پرانی دشمنی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ یوں بستی تریال والے جس طرح تیرا حکم مانتے ہوں گے میرا حکم بھی مانیں گے۔" بوڑھے سمیر کے لہجے سے عیاری کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں اب بھی میرے جسم میں چبھ رہی تھیں۔

"کیا کبھی تُو نے سنا ہے اے سمیر کہ کسی دیوی نے کسی انسان سے شادی کی ہو جو تُو یہ خواہش کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"ضروری نہیں کہ جو پہلے کبھی نہیں ہوا' وہ اب بھی نہ ہو .... اور پھر ابھی تو یہ بھی فیصلہ نہیں ہوا کہ تُو واقعی آتون دیوی ہے۔" بوڑھا کسی بھی طرح مجھ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھا خواہ میں یہی کیوں نہ ثابت کر دیتی کہ میں ہی آتون دیوی ہوں۔

"تُو اپنے اس فیصلے پر پچھتائے گا اے سمیر! اب بھی وقت ہے کہ مجھے میرے لوگوں میں لوٹ جانے دے۔"

"بھول جا اب اپنے لوگوں اور اپنی بستی کو۔" بوڑھے کے لہجے میں سختی آ گئی پھر اس نے اپنے محافظوں کو حکم دیا۔ "اسے باندھ کر رکھنے کی ضرورت نہیں ہے' مگر کڑی نگرانی میں رکھو۔ یہ فرار نہ ہو سکے لے جاؤ اسے۔"

محافظوں نے مجھے پھر اپنے نرغے میں لے لیا اور وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ لا کر بٹھا دیا۔ یہاں ان محافظوں اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر انہی محافظوں میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "اگر یہ واقعی دیوی ہوئی تو پھر ہم دیوتاؤں کے قہر سے نہیں بچ سکیں گے۔"

"ہاں تُو ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے۔" دوسرے محافظ نے خوفزدہ آواز میں پہلے محافظ کی تائید میں کہا۔

"بوڑھا سردار سمیر شاید سٹھیا گیا ہے کہ دیوی کو اپنی بیوی بنانے کی بات کر رہا ہے۔ اس طرح تو ہم سب اس کے ساتھ دیوتاؤں کے قہر کا شکار ہو جائیں گے۔" تیسرے محافظ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

قریب ہی ایک محافظ نے مشعل روشن کر رکھی تھی۔ میں ان سب کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان سبھی کے چہروں سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"پھر کیا بھی کیا جائے؟" پہلا محافظ بولا۔

"تم لوگ تو بلا سبب ڈرے جا رہے ہو۔" ایک اور محافظ نے گفتگو میں مداخلت کی۔ "ابھی یہ بھی تو

نہیں معلوم کہ واقعی یہ دیوی ہے!"

ابھی اس محافظ کے الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ اچانک وہ زور سے چیخ اٹھا۔ "سانپ .... مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے .... وہ دیکھو۔" اس نے ایک طرف انگلی اٹھائی۔

میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ قدرت نے مجھے یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ میں خود کو دیوی ثابت کر سکوں۔ وہ سانپ اس محافظ کو ڈس کر تیزی کے ساتھ میری ہی طرف بڑھ رہا تھا جس نے مجھ پر شک کا اظہار کیا تھا۔

سانپ خاصا بڑا اور سیاہ رنگ کا تھا۔ وہ میرے قریب آ کر میرے دائیں ہاتھ پر رینگتا ہوا گردن میں لپٹ گیا۔ اس دوران میں جس محافظ کو اس سانپ نے ڈسا تھا اس پر بے ہوشی طاری ہو چکی تھی اور جسم کی رنگت نیلی پڑنے لگی تھی۔ وہ سانپ بہت زہریلا معلوم ہوتا تھا۔

میرے گلے میں سانپ کو لپٹے دیکھ کر میرے اطراف موجود محافظ سجدہ ریز ہو چکے تھے۔

ذرا سی دیر میں وہاں بھیڑ ہو گئی۔ جو شخص بھی میرے گلے میں سانپ کو لپٹا دیکھتا سجدہ ریز ہو جاتا۔

"اٹھو اے لوگو! آتون دیوی کی بات سنو!" میں نے ان سجدہ ریز لوگوں کو مخاطب کیا۔

ان سبھی نے سجدوں سے سر اٹھالئے اور سر جھکا کر مؤدب میرے سامنے دو زانو بیٹھ گئے۔

"اپنے بوڑھے سردار سمیر کو یہاں لے کر آؤ۔ ہمارا حکم ہے کہ وہ بھی تم لوگوں کی طرح ہمیں تعظیم دے۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

فوراً ہی کچھ محافظ اٹھ کر اس طرف چلے گئے جہاں نسبتاً بلندی پر کئی مشعلیں روشن تھیں۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سردار سمیر سے میری گفتگو ہوئی تھی۔ وہ جگہ کچھ ہی فاصلے پر تھی۔ میں قدرت کے اس کھیل پر سخت حیران تھی۔ صرف ایک سانپ کی وجہ سے ساری بازی پلٹ گئی تھی۔ نہ وہ سانپ ایک محافظ کو ڈستا اور میرے گلے سے آ کر لپٹتا نہ ان لوگوں کو میرے دیوی ہونے پر یقین آتا۔ وہ خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ سانپ مجھے نہیں ڈس رہا تھا۔

جس محافظ کو سانپ نے ڈسا تھا وہ کچھ فاصلے پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تو وہ اب تک مر چکا تھا۔

ذرا دیر کے بعد میں نے بوڑھے سردار سمیر کو اس طرف آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ بقیہ اور افراد تھے جو پہلے وہاں نہیں پہنچے تھے۔ لوگوں نے سردار سمیر کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھ کے میرے سامنے سجدے میں گر گیا اور اس کے ہمراہیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

"اٹھ اے سمیر! اور توبہ کر اس پر جو تُو نے کچھ دیر پہلے کہا تھا۔" میں نے سردار سمیر سے کہا۔

اس نے سجدے سے سر اٹھاتے ہی اپنی مخصوص آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "اے آتون دیوی! میں اپنے کہے پر پشیمان ہوں، مجھے معاف کر دے۔"

"تو ناحق مشعر کی باتوں میں آیا اے سمیر! تُو نے اپنے لوگوں کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا، ایک ایسے شخص کے کہنے پر جو حق پر نہیں تھا۔ بتا مجھے، کیا تیری بستی کے جوان نہیں مارے گئے؟ تُو نے کتنے

بچوں کو یتیم کیا، کتنی سہاگنوں سے ان کے سہاگ چھین لئے؟ بول کیا ملا تجھے ایسا کر کے؟ .... مجھے تُو یہ بھی بتا کہ بستی تریال والوں سے تیری کیا دشمنی ہے؟" میں نے سمیر سے پوچھا جو مجھ سے کچھ فاصلے پر دو زانو بیٹھ گیا تھا۔

"اے آتون دیوی! سردار صارم کے باپ سردار اقوی نے نے میری بستی پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ سردار اقوی نے میری ماں کو قتل کر دیا۔ میرا باپ استیلا مجھے لے کر فرار ہو گیا۔ اس کے پیچھے بستی تریال کے سردار اقوی نے میری بستی کو خوب لوٹا اور پھر وہ میری چھوٹی بہن کو جو میری ماں کی گود میں تھی، اسے اغوا کر کے لے گیا۔ جب تک میرا باپ سردار استیلا زندہ رہا، وہ بستی تریال پر حملے کرتا رہا اور جب وہ مر گیا تو میں نے بھی اسی کی راہ اپنائی۔ پھر بڑا ظلم ہوا۔ بستی تریال کے سردار اقوی نے اپنی موت سے پہلے میری بہن نخبہ سے اپنے بیٹے صارم کی شادی کر دی۔ میری بہن نخبہ دشمن کی بیوی بن گئی اس پر میں نے بڑا ملال کیا اور اسی کے ساتھ عہد کیا کہ صارم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا سو اب یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔" سردار سمیر نے قدیمی دشمنی کی وجہ تفصیل کے ساتھ بیان کی جو برسوں پر محیط تھی۔

"جیسا کہ تُو نے بیان کیا اے سمیر! تو واقعی سردار صارم کے باپ سردار اقوی نے تیرے قبیلے پر بڑا ظلم کیا مگر شاید تجھے یہ نہیں معلوم کہ دیوتا انصاف کرنے والے ہیں سو انہوں نے انصاف کیا۔ تیرے بعد شاید تیرا وارث ہو جو تیری نسل کو قائم رکھے مگر سردار اقوی کی نسل صارم ہی پر ختم ہو گئی۔ وہ آج تک بے اولاد ہے۔ اس کی وجہ وہی ظلم، زبردستی اور ناانصافی ہے جو تیرے قبیلے کے ساتھ ہوئی۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ سردار صارم بے اولاد ہے؟" میں بولی۔

"ہاں اے آتون دیوی! مجھے یہ معلوم ہے مگر یہ خبر نہیں تھی کہ اس کی وجہ سردار صارم سے دیوتاؤں کی ناراضگی ہے۔" سردار سمیر نے کہا۔

"ناراضگی نہیں اے سمیر! اسے انصاف سمجھو!" میں نے اسے ٹوکا پھر کہنے لگی۔ "اب سن غور سے کہ میں کیا چاہتی ہوں .... دیوتاؤں کی جو مرضی تھی سو ہوا، نہ اسے تُو بدل سکا نہ کوئی اور۔ سردار صارم تیری بہن کا شوہر یعنی تیرا بہنوئی ہے۔ کیا تُو چاہے گا کہ تیری بہن نخبہ بیوہ ہو جائے؟ .... سو میری خواہش یہ ہے کہ تُو انتقام کا خیال اپنے دماغ سے نکال دے۔ ان پہاڑی بستیوں میں جنگی قوانین کے مطابق جنگی قیدیوں کو تیسرے دن کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوتا انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تیری بستی کے بہت سے جوانوں کو بھی جنگی قیدی بنا لیا گیا ہے اور انہیں روایات کے مطابق قتل کر دیا جائے گا مگر میں آتون دیوی ان سب کو معاف کرتی ہوں۔"

میرے ان الفاظ کے ساتھ ہی "آتون دیوی زندہ باد" کے نعرے ہر طرف سے بلند ہوئے۔

"تُو اے سردار سمیر! ان سب کو زندہ اپنی بستی کی طرف واپس لے جائے گا اور اس کے لئے تجھے اپنے ان تمام ساتھیوں کے ہمراہ بستی تریال چلنا پڑے گا۔"

"اے آتون دیوی! کیا ہمارے دشمن ہمیں کاٹ نہیں ڈالیں گے؟" سردار سمیر نے سوال کیا۔

"کسی کی مجال نہیں کہ وہ آتون دیوی کے مہمانوں پر ہاتھ اٹھا سکے اور اے سمیر! تُو تو اپنی بہن نجمہ کے گھر جا رہا ہے۔ ایک بھائی کو اس کی بہن کے گھر سے محبت ملتی ہے' موت نہیں۔"

میری باتیں سردار سمیر اور ان سب لوگوں کے لئے بڑی عجیب ہی رہی ہوں گی۔ برسوں پر محیط دشمنی کس طرح ختم ہو سکتی ہے' یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ اسی لئے مجھ سے پے در پے سوالات کرتے رہے اور میں انہیں اطمینان دلاتی رہی کہ اگر وہ میرے ساتھ بستی تریال میں داخل ہوں گے تو کوئی ان پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔

"کل صبح تم سب میرے ساتھ بستی تریال چلو گے' یہ میرا حکم ہے میں اب کچھ اور سننا نہیں چاہتی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے بات ختم کر دی۔

میرے سونے کے لئے سردار سمیر نے وہ جگہ چھوڑ دی جہاں نسبتاً بلندی پر خود اس کے لئے بستر بچھایا گیا تھا۔ میں نے دانستہ اب تک سانپ کو اپنے گلے سے جدا نہیں کیا تھا مگر جب لیٹنے لگی تو سانپ کے بل کھول کر اسے اپنی دائیں کلائی سے لپیٹ لیا۔

معلوم نہیں' رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ اچانک زوردار دھماکوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس چٹان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا جس کے نیچے سردار سمیر اور اس کے سپاہی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ چاروں طرف سے ان پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور اب وہ بھی جواب فائرنگ کر رہے تھے۔

حملہ آور کون ہو سکتے ہیں' یہ اندازہ لگانا میرے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ یہاں سے قریب ترین پہاڑی بستی تریال ہی تھی۔ میرے غائب ہونے کے بعد یقیناً ہر طرف میری تلاش میں سپاہیوں کے دستے روانہ کر دیئے گئے ہوں گے۔ یہ دستہ بھی جو اس وقت چٹان کو گھیرے ہوئے تھا انہی دستوں میں سے ہو سکتا تھا۔ مسلح سپاہیوں کے اس پڑاؤ کو دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ یہ میدان جنگ سے فرار ہونے والے سپاہی ہی ہو سکتے ہیں۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد میرے لئے خاموشی سے یہ تماشا دیکھتے رہنا ممکن نہیں تھا۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر سردار سمیر موجود تھا۔ میں سینے کے بل رینگتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ سانپ اب بھی میری داہنی کلائی سے لپٹا ہوا تھا۔ اپنے سپاہیوں کے ساتھ ہی سردار سمیر بھی جوابی فائرنگ کر رہا تھا۔

"اے سمیر! جوابی فائرنگ بند کرا دے۔" میرا لہجہ تحکمانہ تھا۔

"مگر اے آتون دیوی! اس طرح تو ہمارا نادیدہ دشمن ہمیں بھون ڈالے گا۔" بوڑھے سردار کی آواز میں قدرے احتجاج شامل تھا۔

"نہیں' وہ ایسا نہیں کریں گے۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"اگر دشمن نے ہمیں زندہ بھی چھوڑ دیا اے آتون دیوی! تو وہ ہمیں گرفتار کر لے گا اور اس طرح گرفتار ہو جانا بزدلی ہے۔" سردار سمیر نے بحث کی۔

"دیکھ سمیر! تیری بھلائی حکم ماننے ہی میں ہے۔ مَیں تجھے یقین دلاتی ہوں کہ تیرے سپاہیوں کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔"

ہرچند کہ ان لڑاکا لوگوں کی یہ روایات نہیں تھیں کہ ان پر حملہ کیا جائے تو وہ خاموشی سے ہتھیار ال دیں مگر انہیں میری بات ماننا ہی پڑی۔

کچھ دیر تک صرف یک طرفہ فائرنگ ہوتی رہی اور پھر یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ حملہ آوروں نے سمجھا تھا کہ محصور سپاہیوں کے پاس گولیوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے اسی لئے فائرنگ روک دی گئی۔ نایدیہ ی غلط فہمی کی بنا پر وہ زمین سے اٹھ کر سیدھے کھڑے ہو گئے اور محصوروں کی طرف بڑھنے لگے۔

یہ منظر دیکھ کر بوڑھا سردار سمیر برداشت نہ کر سکا اور مجھ سے بولا۔ "اے آتون دیوی! یہ موقع ت اچھا ہے ہمیں اجازت دے کہ ہم دشمنوں کے سینے چھید دیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی رائفل ی نال آنے والوں کی طرف سیدھی کر لی۔

"نہیں اے سمیر! ہرگز نہیں۔" میں نے اس کی رائفل کی نال جھکا دی۔ "میں تجھے اس کی اجازت ہیں دوں گی۔"

حملہ آوروں سے یقیناً یہ بھیانک غلطی ہوئی تھی۔ انہیں اس طرح دھوکہ دے کر ٹھکانے بھی لگایا ا سکتا تھا۔ اگر میں وہاں موجود نہ ہوتی تو شاید ایسا ہی ہوتا۔ حملہ آور ہر طرف سے قریب آ گئے تو میں نے اندازہ لگایا کہ محصور ہونے والوں سے ان کی تعداد کچھ کم ہی تھی۔ سامنے سے آنے والوں میں ایک راز قد نوجوان بھی تھا جسے میں نے اس کے انداز خرام ہی سے پہچان لیا۔ وہ احرس کے سوا کوئی اور نہیں و سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ میرے لئے وہ بھی پہاڑوں کی خاک چھان رہا تھا میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور ر بے اختیار اس کا نام میرے ہونٹوں پر آ گیا۔

"آتون!" جواب میں اس کی آواز بھی بلند ہوئی پھر وہ دوڑتا ہوا میرے قریب آ گیا اور میری دائیں لائی سے لپٹے ہوئے سانپ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ "تُو .... تُو ٹھیک .... ٹھیک تو ہے آتون!" وہ یک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "یہ .... یہ کون لوگ ہیں؟" اس کا اشارہ سردار سمیر کی طرف تھا جو میرے ریب ہی کھڑا تھا۔ احرس مجھے "آتون دیوی" کی بجائے صرف "آتون" ہی کہتا تھا اور میں نے اس پر کبھی تراض نہیں کیا تھا۔

"تُو شاید سردار سمیر کو نہیں پہچانتا احرس!" میں مسکرا کر بولی۔

"سردار سمیر؟" احرس چونک اٹھا۔ "وہی دشمن قبیلے کا سردار جس نے بستی تریال پر.........."

"دشمن نہیں' دوست کہہ۔" مَیں نے احرس کی بات کاٹ دی۔ "اب سردار سمیر اور اس کے ک بھی تیری آتون دیوی کے تابع ہیں اور اس رشتے سے بستی تریال والے اور یہ لوگ آپس میں دست ہیں۔"

"تُو ایسا کہہ رہی ہے تو پھر یہی ہو گا۔" احرس شاید کچھ سمجھنے سے قاصر معلوم ہو رہا تھا۔ "مجھے تو یہ یکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ تُو ٹھیک حالت میں مل گئی۔ میں نے تیرے گھوڑے کو بدک کر ایک طرف اگتے دیکھا تھا اور میں نے اس کا پیچھا بھی کیا تھا مگر جلد ہی تُو میری نظروں سے اوجھل ہو گئی پھر میں نے ٹ کر مہا پجاری اور سردار صارم کو خبر کی.........." پھر احرس نے وہی باتیں بتائیں جن کا اندازہ میں پہلے

ہی لگا چکی تھی۔

سردار سمیر نے دشمن کے تعاقب کے خوف سے اپنی بستی کی طرف سیدھے جانے کی بجائے راستہ بدل دیا تھا۔ احرس کو اور دوسرے دستوں کو میری تلاش میں اسی لئے اتنی دیر ہوئی تھی ورنہ شاید وہ بہت پہلے مجھے تلاش کر چکے ہوتے۔

میرے ایما پر اسی وقت چار افراد پر مشتمل ایک دستے کو بستی تریال کی طرف روانہ کر دیا۔ میں نے ان لوگوں کو کچھ خصوصی ہدایات بھی دیں جن سے صرف میں ہی واقف تھی۔ میری تلاش میں احرس اور اس کے ساتھی خاصے تھک گئے تھے۔ احرس کو میں نے اپنے قریب ہی رکھا تھا۔ میرے بستر کے پاس ہی اس کے لئے ایک چادر بچھا دی گئی تھی جس پر وہ اس وقت نیم دراز تھا۔ رات کو آرام کرنے کے بعد ہم سبھی کو بستی تریال کی طرف کوچ کرنا تھا۔

"آتون! اس .... اس سانپ کو تو اپنی کلائی سے کھول کر دور پھینک دے۔" احرس نے میری کلائی پر لپٹے ہوئے سانپ کی طرف دیکھا۔ "کیا خبر یہ زہریلا اور خطرناک ہو اور کیا معلوم یہ کب ادھر میری طرف رینگ آئے۔" وہ مجھے کچھ خوف زدہ سا لگ رہا تھا۔

"یہ سانپ واقعی زہریلا ہے احرس!" میں نے دھیرے سے ہنستے ہوئے اسے بتایا۔ "یہ ایک شخص کو ڈس کر ہلاک کر چکا ہے۔"

"نہیں!" احرس بے یقینی کے سے انداز میں بولا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تو .... تو پھر میں .... میں یہاں تیرے قریب نہیں سو سکتا۔"

"ڈر گیا!" میں ہنس دی۔ "ارے یہ میرے پاس سے کہیں نہیں جائے گا تُو آرام سے سو جا۔ تیرے حملہ کرنے سے پہلے بھی یہ اسی طرح میری کلائی سے لپٹا ہوا تھا اور نہ صرف میں بلکہ اردگرد موجود افراد بھی سکون و اطمینان سے سو رہے تھے۔"

میری پُراسرار شخصیت کے بہت سے گوشوں سے احرس واقف تھا اس لئے ایک زہریلے سانپ کی موجودگی میرے پاس اس کے نزدیک زیادہ حیران کن نہیں تھی۔ مصلحتاً میں ابھی اس سانپ کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ سردار سمیر اور اس کے آدمیوں پر اس سے رعب قائم تھا جو میرے خیال میں اک ضروری تھا۔ وہ سانپ گویا میرے دیوی ہونے کا ایک ناقابل تردید ثبوت تھا۔

"تجھے اندازہ نہیں احرس کہ تجھ سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی تھی جب تُو فائرنگ بند ہو جانے کے کچھ ہی دیر بعد سامنے آ گیا تھا۔ کیا فائرنگ رک جانے سے تُو یہ سمجھا تھا احرس کہ یہاں گولیوں کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"تو کیا ایسا نہیں تھا؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں احرس! ایسا نہیں تھا فائرنگ تو میرے حکم پر روکی گئی تھی کیونکہ میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔ حملہ آور یقیناً بستی تریال ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں میری ہی تلاش ہو سکتی ہے۔"

"پھر تو واقعی مجھ سے بڑی بھیانک غلطی ہوئی آتون! اس طرح تو ...."

"ہاں اس طرح دشمن تم سب کو بھون کر رکھ دیتا اگر واقعی وہ دشمن ہی ہوتا اور میرا حکم نہ مانتا۔" میں نے احرس کی ادھوری بات پوری کر دی۔ "اچھا خیر جو ہوا' سو ہوا چھوڑ .... تُو خاصا تھکا ماندا معلوم ہو رہا ہے' سو جا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف سے کروٹ لے لی۔

مجھے سونے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور پھر صبح دم ہی میری آنکھ کھلی۔ سردار سمیر کے پاس کھانے پینے کا زیادہ سامان نہیں تھا اس لئے جو کچھ تھا اسی پر گزارہ کر لیا گیا پھر ادھر سورج طلوع ہوا ادھر تقریباً دو سو افراد پر مشتمل یہ قافلہ بستی تریال کی طرف روانہ ہو گیا۔ سردار سمیر نے یہیں سے اپنے دو قاصدوں کو اپنی بستی کی جانب روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ فرار ہو کر بستی پہنچنے والوں کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیں۔

دوپہر ہوتے ہوتے ہم بستی تریال کے قریب جا پہنچے پھر کچھ اور آگے بڑھتے ہی بستی کے باہر موجود لوگوں کا ہجوم مجھے نظر آ گیا۔ ان لوگوں نے بھی یقیناً ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے حق میں تو نعرے لگا ہی رہے تھے مگر سردار سمیر اور اس کے ساتھیوں کے لئے لازماً یہ امر حیرت کا باعث رہا ہو گا کہ "سردار سمیر زندہ باد" کے نعرے بھی فضا میں گونج رہے تھے۔ میری دائیں جانب سردار سمیر اور بائیں جانب احرس تھا۔ مزید کچھ آگے بڑھ کر ہم گھوڑوں سے اتر گئے اور پیدل ہی قدم بڑھانے لگے۔ ہجوم میں سب سے آگے سردار صارم اور اس کی بیوی نخبہ نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں جنگلی پھولوں کے ہار تھے۔ مجھے خوشی تھی کہ سردار صارم نے میری ہدایات پر پورا عمل کیا تھا۔ یہ ہدایات میں نے ان چاروں افراد کے ذریعے سردار صارم تک بھیجی تھیں جنہیں گزشتہ رات ہی کو بستی تریال روانہ کر دیا گیا تھا۔

"یہ .... یہ سب کیا .... کیا ہے اے آتون دیوی!" بوڑھا سردار سمیر میرے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔"

"اے سمیر! یہ کوئی خواب نہیں' حقیقت ہے۔" میں نے کہا۔ "آگے بڑھ اور اپنی بہن نخبہ کو گلے سے لگا لے کہ وہ بچپن ہی سے ماں باپ اور بھائی کی محبت سے محروم رہی ہے۔ سردار صارم کے ساتھ کھڑی ہوئی تیری بہن نخبہ ہی ہے۔"

میں نے اس لمحے سمیر کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں روشنی سی دیکھی پھر وہ نخبہ کی طرف "میری بہن" کہتا ہوا لپکا۔

وہ منظر واقعی بہت رقت انگیز تھا جب ایک بہادر سردار کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اپنی بہن کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ نخبہ کے بعد وہ سردار صارم سے گلے ملا۔ دو قدیمی دشمن اب محبت اور دوستی کے رشتے میں بندھ گئے تھے۔

"میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ .... کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" سردار سمیر کی آواز مزید بھاری ہو گئی وہ اپنی بہن نخبہ اور بہنوئی سردار صارم سے مخاطب تھا جو باری باری جنگلی پھولوں کے ہار اس کے گلے میں ڈال چکے تھے۔

"اے سمیر! میں سخت شرمندہ ہوں کہ میرے باپ نے تیرے باپ کے ساتھ ظلم کیا۔ اب وہ دونوں ہی دیوتاؤں کے پاس جا چکے ہیں اور دیوتا ہی ان کا انصاف کریں گے۔ مگر میں بستی تریال کا سردار

"صارم تجھ سے اپنے باپ اقوئی کی طرف سے معافی مانگتا ہوں' مجھے معاف کر دے!" سردار صارم نے یہ کہہ کر اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔ پھر وہ سردار سمیر کے سامنے ادب سے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

سردار سمیر نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر اٹھا لیا۔ "مجھے خبر نہیں تھی اے صارم کہ تیرے اندر اتنی بڑائی موجود ہے۔ میں نے اور میرے دیوتاؤں نے تجھے معاف کیا۔ آ اے میری بہن کے ... میرے گلے سے لگ جا۔"

وہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ دشمنی' دوستی میں بدل گئی اور بستی سے ہمیشہ کے لئے ایک خطرہ ٹل گیا۔ ہجوم سردار سمیر اور سردار صارم کے حق میں نعرے لگانے لگا۔ یہ لوگ جلوس کی شکل میں بستی کے اندر پہنچے تو عورتوں نے دف بجا بجا کر رقص کرتے ہوئے استقبال کیا۔ اپنی حویلی میں قدم رکھتے ہی میرے ایما پر سردار صارم نے سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ جنگی قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے اور یہ کہ اب ان کی حیثیت مہمانوں کی ہو گی۔

ساری بستی میں اس روز جشن کا سا سماں تھا شام کو اس خوشی میں جشن کا اعلان کیا گیا تھا۔

اس روز پہلی بار نخبہ نے بھی عملی طور پر جشن میں حصہ لیا۔ پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اچھی شمشیر زن اور تیرانداز ہو گی۔ اس نے بیک وقت دو شمشیرزنوں سے مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی تھی۔ اس کے علاوہ نخبہ نے تیراندازی کا بھی کمال دکھایا تھا۔ اس نے ایک تیر فضا میں چھوڑا اور پھر لمحے بعد دوسرے تیر سے پہلے تیر کے دمبالے کا نشانہ لیا۔ اس کا چلایا ہوا دوسرا تیر پہلے تیر کے ... میں پیوست ہو گیا اور پھر دونوں تیر زمین پر ایک ساتھ آ کر گرے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر اور نعرے ... نخبہ کے فن کی داد دی۔ ان لوگوں میں خود میں بھی شامل تھی۔ خاصی عمر ہونے کے باوجود اب تک ... جسم بے حد متناسب تھا۔ اس کے چہرے پر اب تک نوجوان دوشیزاؤں جیسی تازگی اور حسن تھا' سر ... بال بھی سفید نہیں ہوا تھا۔ سردار صارم البتہ اس کے مقابلے میں خاصا بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔ یوں ... نخبہ سے عمر میں دس سال بڑا تھا۔

جشن میں ایک نوجوان مقدام بھی شریک تھا جس کے معنی دلیر اور شجاع کے ہیں۔ اس کی ... سردار صارم کے نائب کی تھی۔ وہ بھی تخت پر میرے بائیں جانب بیٹھا تھا۔ اکثر مواقع پر میں نے ... کیا تھا کہ سردار صارم کی حسین بیوی نخبہ کے لئے مقدام کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہو جا ... جسے پسندیدگی اور محبت کا نام ہی دیا جا سکتا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ یہ محبت یک طرفہ تھی یا نخبہ کا دل ... مقدام کے لئے دھڑکتا تھا۔ اس وقت بھی مقدام کی آنکھوں میں مجھے ایسی ہی چمک نظر آئی۔ نخبہ ... کا مظاہرہ کر کے تخت کی طرف لوٹ رہی تھی۔

بستی کی روایات اور قوانین کے مطابق کسی دوسرے شخص کی عورت پر کوئی بھی ایسی صورت ... اپنا حق جتا سکتا تھا کہ وہ عورت اپنے شوہر سے صاحب اولاد نہ ہوئی ہو۔ نخبہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ... اب تک ماں نہیں بن سکی تھی مگر کسی نے بھی اس پر حق نہیں جتایا تھا۔ کسی ایسی عورت کو جو ... سکی ہو یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ اپنے دوسرے دعویدار کو رد کر دے ایسا غالباً اب تک اس لئے نہیں ...

موت اور زندگی کا کھیل تھا۔ ایسی کسی عورت پر حق جتانے والے کو اس عورت کے شوہر یا اس کے کسی شخص سے فیصلہ کن مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ یہ مقابلہ فیصلہ کن اس اعتبار سے ہوتا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک ہی زندہ بچتا تھا۔ مقابلہ اس وقت تک جاری رہتا تھا جب تک کسی ایک شخص کو فتح حاصل نہ ہو جائے۔

نخبہ ابھی اپنے شوہر سردار صارم کے پہلو میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ میں نے اچانک مقدام کو اپنی جگہ سے اٹھتے دیکھا۔ وہ اٹھ کر سیدھا نخبہ کے سامنے پہنچا اور دو زانو بیٹھ کر نخبہ کا دایاں ہاتھ چوم لیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے نخبہ کا پورا وجود اس کے دائیں ہاتھ میں منتقل ہو گیا ہو' جیسے مقدام کے ہونٹوں کے لمس سے وہ پگھل گئی ہو۔ یہ نخبہ پر اپنا حق جتانے کا برملا اظہار تھا۔ ایسی کسی عورت کو جس پر کوئی دوسرا مرد اپنا حق جتائے اور اس کے حصول کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دے قابل عزت و احترام سمجھا جاتا تھا۔ مقدام نے نخبہ کو یہ عزت بخش دی تھی۔

اس لمحے سردار صارم کے چہرے پر مجھے غیظ و غضب کے آثار دکھائی دیئے۔ مقدام کے اس غیر متوقع عمل سے سارے مجمع میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بستی کے کسی سردار کی بیوی پر کسی دوسرے مرد نے اپنا حق جتایا تھا۔

مقدام پلٹ کر میری کرسی کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ "اے آتون دیوی! مجھے اجازت دے کہ نخبہ پر اپنا حق ثابت کر سکوں۔"

میرے لئے یہ صورت حال انتہائی عجیب تھی۔ میں نے پہلی بار نخبہ کی آنکھوں میں مقدام کے لئے محبت کی تحریر پڑھی تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ ایک عمر گزارنے کے باوجود وہ عورت اس کی نہیں ہو سکی تھی۔

جسمانی طور پر مقدام کے مقابلے میں سردار صارم بوڑھا اور کمزور تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مقدام کے مقابلے پر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکتا مگر اس کے باوجود میں نے اسے اپنے پہلو سے تلوار نکالتے دیکھا۔ وہ مقدام سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار تھا اور میرے نزدیک یہ خودکشی ہی تھی۔ میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ سردار صارم مارا جائے۔

"اے سردار صارم! میں آتون دیوی تجھے حکم دیتی ہوں کہ اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھا رہ۔" میں نے اسے حکم دیا۔

"مگر اے آتون دیوی! صارم بے غیرت نہیں کہ اس کے سامنے کوئی دوسرا مرد اس کی عورت کا ہاتھ تھام لے اور وہ خاموش رہے۔" صارم رقت آمیز آواز میں بولا۔ "میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اپنی عزت بچانے کا موقع دے۔"

"اے سردار! قانون کے مطابق تجھے اپنی جگہ کسی اور شخص کو نامزد کرنے کا حق حاصل ہے اور تیرے لئے میرا یہ حکم ہے کہ تو اپنا یہ حق استعمال کر۔ مقدام سے تو نہیں بلکہ تیرا نامزد شخص مقابلہ کرے گا۔" میں نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے آتون دیوی! کہ تُو یہ چاہتی ہے کہ میں اپنی تقدیر کسی اور کے حوا دوں؟" سردار صارم کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"ہاں اے صارم! میں اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔" میرا لہجہ قطعی تھا میں نے اپنی بات جاری ہوئے مزید کہا۔ "اگر تیرا نامزد کردہ شخص' مقدام کے ہاتھوں مارا گیا تو قانون کے مطابق تیری جگہ مقد اس بستی کا سردار بنا دیا جائے گا اور اگر مقدام اپنی جان ہار گیا تو پھر تُو ہی نخبہ اور اس بستی کا مالک ر اور پھر کبھی تیری عورت کا ہاتھ تھامنے کا کسی اور کو حق نہیں ہو گا۔"

"مگر مقدام میری بیوی سے عمر میں بہت چھوٹا ہے اور اس کا جوڑ نہیں۔" سردار صارم نے اور اعتراض کیا۔

"عورت اور مرد کی عمروں کا فرق ان کے ملاپ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ کیا خبر اے صار دیوتاؤں کو یہی منظور ہو اور اس بستی کو وارث مل جائے۔" میں نے سردار صارم کی بات کا جواب د مقدام کو مخاطب کیا جو ابھی تک میرے قدموں میں دو زانو بیٹھا ہوا تھا۔ "اے مقدام! تجھے بھی میں کی طرح یہ حق دیتی ہوں کہ تُو اپنی جگہ کسی اور کو نامزد کر سکتا ہے۔"

"اے آتون دیوی! تیرا یہ پجاری مقدام اپنی محبت کی جنگ خود ہی لڑنا چاہتا ہے۔" مقدام بولا۔

اسی وقت خلاف توقع بوڑھا سردار سمیر اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ اس نے سر اٹھایا تو میں نے حیرت کے ساتھ اس سے دریافت کیا۔ "اے سمیر! کیا تُو بھی اس معاملے کچھ کہنا چاہتا ہے؟"

"ہاں اے آتون دیوی! میں اپنی بہن نخبہ پر حق جتانے والے جواں مرد مقدام کی طرف سے کا خواہش مند ہوں۔" سمیر نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں نے سوچا کہ سردار سمیر کے دل میں اب بھی سردار صارم انتقام لینے کا جذبہ چھپا ہوا ہے جس کا اس نے بالواسطہ اظہار کر دیا تھا۔ اس نے اپنی بہن پر گویا صارم کے حق کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ سردار صارم کو میں یہ حکم دے ہی چکی تھی کہ وہ اپنی جگہ اور کو نامزد کر دے۔ یہی حکم میں مقدام کو بھی دے سکتی تھی۔ سو میں نے ایسا ہی کیا اور مقدام کی ط سے سردار سمیر کی نامزدگی کو قبول کر لیا۔

بوڑھے سردار سمیر کے مقابلے میں سردار صارم کی طرف سے محافظ دستے کا قوی ہیکل نگران نامزد کیا گیا تو میں نے مقدام کے چہرے پر اداسی کے بادل منڈلاتے دیکھے۔ بوڑھے سمیر اور یو درمیان واضح جسمانی فرق تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ میں نے قریب ہی ہوئی نخبہ کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں اور مجھے اس کی وجہ تھی۔ نخبہ دہرے رنج میں گرفتار تھی۔ طویل عرصے کے بعد پہلی بار اس کا بڑا بھائی سمیر اس سے ملا یوں لگ رہا تھا کہ وہ پھر ہمیشہ کے لئے اس سے بچھڑ جانے والا ہو۔ دوسری جانب شاید اسے مقدام کے ہو جانے کا ملال تھا۔ سمیر مارا جاتا تو اسے مقدام کا قرب بھی حاصل نہ ہوتا۔

خود مجھے بھی پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ صورت حال یہ نیا رخ اختیار کر لے گی۔ میں اسی لئے اب پچھتاوا سا محسوس کر رہی تھی۔ کہیں اندر سے میری یہ خواہش تھی کہ نخبہ اور مقدام ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں نے ان دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت کی تحریر پڑھ لی تھی۔ میں دو دلوں کا ملاپ چاہتی تھی مگر اب یہ ناممکن سا لگ رہا تھا۔ میدان سے سمیر اور یوح کسی ایک کی لاش اٹھائی جاتی اور میرے خیال میں وہ لاش بوڑھے سمیر ہی کی ہوتی۔ براہ راست مقابلے سے پہلے مجھے اس کا انجام نظر آ رہا تھا۔

روایت کے مطابق یہ مقابلہ تلواروں سے ہونا تھا۔ دونوں افراد کو تلوار کے ساتھ ایک ایک ڈھال بھی دی گئی تھی۔

میری اجازت ملتے ہی سمیر اور یوح میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ بوڑھے سمیر پر پہلا وار یوح نے کیا جسے سمیر نے پیچھے ہٹ کر اپنی ڈھال پر روک لیا۔ پھر تو یوح نے بوڑھے سمیر کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ پے در پے سمیر پر وار کئے جا رہا تھا۔ اتنی تیزی کے ساتھ کہ سمیر کو ایک بار بھی اس پر وار کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس کے باوجود حیرت انگیز بات یہ تھی کہ قوی ہیکل یوح ابھی تک اپنے حریف کو زیر نہیں کر سکا تھا۔ ابتدا میں یہی معلوم ہو رہا تھا کہ اس مقابلے کا فیصلہ بہت جلد ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا بہرحال محسوس اب بھی یہی ہو رہا تھا کہ یوح کسی بھی لمحے اپنے مقابل کو پچھاڑ لے گا۔ خلاف توقع مقابلہ طول کھینچتا چلا گیا۔ میں نے اور وہاں موجود سبھی افراد نے واضح طور پر یہ بات محسوس کر لی کہ اب قوی ہیکل یوح کے حملوں میں پہلے جیسی شدت نہیں رہی تھی۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا معلوم ہو رہا تھا۔ بوڑھے سمیر نے اسے خاصا تھکا دیا تھا۔ یوح گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس کے جسم میں حرکت کرتے ہوئے تیزی نہیں رہی تھی۔ اب صورت حال ایسی تھی کہ سمیر جواباً تھکے ہوئے یوح پر حملہ کر سکتا تھا لیکن اب تک اس نے صرف اپنا بچاؤ کیا تھا۔ ایک مرتبہ بھی بوڑھے سمیر نے یوح پر اپنی تلوار بلند نہیں کی تھی۔

مزید کچھ دیر بوڑھا سمیر اپنے حریف کو حملہ ۔آور ہونے کا موقع دیتا رہا یوح اب نمایاں طور پر ہانپنے لگا تھا۔ وہ سمیر پر حملہ کرنے سے گریز کرنے لگا تھا۔ ایک موقع پر جب قوی ہیکل یوح اپنے حریف سمیر کے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر دم لینے لگا تو سمیر نے اسے چڑایا۔ "اے یوح! بزدلی نہ دکھا اور آ مجھ بوڑھے کو قتل کر دے کہ تیرے لئے ایسا کرنا بہت ہی آسان ہے ہاں شاباش آ جا.......... اور یہ دیکھ' میں اپنی ڈھال بھی پھینکے دے رہا ہوں' اب تو شرم کر لے اے پلے ہوئے بھینسے!" یہ کہتے ہی بوڑھے سمیر نے واقعی اپنی ڈھال ایک طرف پھینک دی۔

یوح کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ چیخ اٹھا۔ "اے میرے سردار کے قدیمی دشمن! مجھے بزدلی کا طعنہ نہ دے اور سنبھل کہ تیرا آخری وقت آ گیا۔"

پھر یوح بوڑھے سمیر پر پل پڑا۔ سمیر اس کے وار اپنی تلوار پر روکتا رہا۔ کبھی وہ قوی ہیکل یوح کے وار سے بچنے کے لئے پیچھے ہٹتا' کبھی دائیں جانب جھک جاتا' کبھی بائیں طرف ہو جاتا کبھی اچھلتا اور کبھی

تیزی کے ساتھ سر جھکا لیتا۔ وہ بجلی کی طرح کوند کوند کر یوح کے حملوں سے خود کو بچا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بوڑھے سمیر کے جسم میں کوئی بدروح حلول کر گئی ہو۔

آخر ایک بار پھر یوح پر نقاہت طاری ہونے لگی وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

"اپنے آقا! اپنے سردار کا حق نمک ادا کر اے بزدل! نمک حرامی پر کمر نہ باندھ۔" بوڑھے سمیر نے پیچھے ہٹ کر ستانے والے یوح کو پہلے کی طرح چڑایا۔ اس مرتبہ یوح نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ دور کھڑا ہانپتا رہا اور اپنے حریف کو خونخوار نظروں سے گھورتا رہا۔

"اے نمک حرام! مجھے یوں لگتا ہے کہ اب تیرا آخری وقت قریب آگیا ہے۔" یہ کہتا ہوا بوڑھا سمیر کسی عقاب کی طرح جیسے اڑتا ہوا یوح کے سر پر پہنچ گیا۔ پہلی بار بوڑھے سمیر نے اپنے قوی ہیکل حریف پر تلوار بلند کی۔ یوح نے جیسے بے دلی کے ساتھ سمیر کا وار اپنی ڈھال پر روکنا چاہا مگر ناکام رہا۔ سمیر نے اس کا ایک بازو لہولہان کر دیا تھا اور یوح چیخ اٹھا۔

میں نے واضح طور پر یہ بات محسوس کر لی کہ بوڑھا سمیر اپنے حریف سے چوہے اور بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ چاہتا تو اب تک کبھی کا یوح کو قتل کر چکا ہوتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ یوح کے جسم پر زخم سجاتا رہا یہاں تک کہ یوح کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر دور جا گری۔ بوڑھے سمیر نے خلاف توقع اس موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا اور اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

"اپنی موت کو آسان نہ بنا اے یوح! اٹھ اپنی تلوار ہاتھ میں لے اور میرا مقابلہ کر۔" بوڑھے سمیر نے یوح کو مخاطب کیا۔

مجبوراً یوح کہنیوں کے بل اٹھا اور تقریباً گھسٹتا ہوا اپنی تلوار تک پہنچا ہی تھا کہ سمیر لپک کر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے تلوار کو ٹھوکر مار کے یوح سے دور کر دیا۔

"ہاں شاباش کوشش کر۔" یہ کہتے ہوئے بوڑھے سمیر نے یوح کے سر پر ٹھوکر ماری۔

ضرب اتنی شدید تھی کہ یوح آگے بڑھتے بڑھتے کراہ کر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد سمیر نے یوح کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ پہلے ہی لہولہان اور نڈھال تھا اور اپنے سر پر پڑنے والی ضربوں نے اسے مزید ہلکان کر دیا۔ بار بار بوڑھا سمیر اس سے اٹھنے کو کہتا اور جب وہ اٹھنے لگتا تو ٹھوکر مار کر اسے گرا دیتا۔ کچھ ہی دیر میں یوح پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور شاید بوڑھا سمیر یہی چاہتا بھی تھا۔ وہ بے ہوش یوح کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اے آتون دیوی! تُو نے اور یہاں موجود سب لوگوں نے دیکھ لیا کہ مَیں نے اپنے حریف کو مار گرایا ہے۔ یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں اس کا سر کاٹ لوں۔ سبھی دیکھ رہے ہیں کہ یہ مجھے ایسا کرنے سے روکنے کا اہل نہیں رہا سو میں جیت گیا۔ کیا تُو مجھے جیتا ہوا مانتی ہے؟ اگر تیرا حکم ہو تو میں اس کا سر کاٹ دوں۔ مگر یہ شاید اس پر ظلم ہو گا اور مجھ پر بھی کہ میں نے کبھی گرے ہوئے لوگوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔" بوڑھا سمیر مجھ سے مخاطب تھا۔ "میرا خیال ہے کہ یوح نے اپنے آقا صارم کا حق نمک ادا کر دیا ہے وہ صارم کہ جو اب اس بستی کا سردار نہیں رہا' وہ یہ حق کھو چکا ہے کہ بول اے آتون دیوی! تیرا کیا

ظلم ہے؟ کیا تُو میری بہن نخبہ کو جواں مرد مقدام کی بیوی بن جانے کی اجازت دے دے گی اور صارم کی بستی کا سردار مقدام کو بنا دے گی؟ ہم تجھ سے انصاف کے طالب ہیں۔"

لہ اس خلاف توقع وہی ہو گیا تھا جو میری خواہش تھی۔ مقدام کو نخبہ مل گئی تھی اور اب تک کسی کا خون ی اس کے لئے نہیں بہا تھا۔ سردار صارم بھی زندہ بچ گیا تھا اور مقدام بھی۔ سردار سمیر بھی زندہ سلامت رہا تھا۔ اگر یوح کی گردن کاٹ لی جاتی تو اس سے کسی کو کوئی نفع نہ ہوتا۔ یوں بھی وہ براہ راست اس معاملے میں ملوث نہیں تھا۔ سمیر نے غلط نہیں کہا تھا کہ یوح کا سر کاٹ لینا ظلم ہوتا اصولاً سمیر جیت گیا تھا۔ وہ اپنے حریف پر غالب آگیا تھا۔ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ سمیر کو جیتا ہوا قرار دے دیا جاتا۔ اس کے لئے یوح کا قتل ہونا ضروری نہیں تھا خاص طور پر ایسی صورت میں کہ خود غالب آنے والا شخص اپنے حریف کی جاں بخشی پر آمادہ تھا۔

معاملے کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے فیصلہ سنا دیا۔ "اے سمیر! تجھے فتح مند قرار دیا جاتا ہے۔ میں تجھے یوح کا سر کاٹ لینے پر مجبور نہیں کرتی۔" یہ کہہ کر میں نے میدان سے بے ہوش یوح کے جسم کو اٹھا لینے کا حکم دیا۔ پھر بولی۔ "یوح کو سردار صارم نے اپنی جگہ نامزد کیا تھا اور یوح مقابلہ ہار گیا' سو سردار صارم کو شکست خوردہ قرار دیا جاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی نخبہ پر اور اس بستی کی سرداری کا اپنا حق کھو چکا ہے۔ سو اب سے بستی تریال پر سرداری کا حق مقدام کو ہے اور وہی آج سے نخبہ کا شوہر ہے۔ بڑے پجاری کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ مقدام اور نخبہ کو ایک دوسرے کا پردہ بنا دے۔"

اسی وقت سردار صارم جو میرے حکم کے مطابق معزول کیا جا چکا تھا اپنی جگہ سے اٹھا اور بھرائی ہوئی بلند آواز میں بولا۔ "مجھے آتون دیوی کا فیصلہ قبول ہے۔ اس لمحے سے نخبہ مجھ پر حرام ہوئی۔ میں نے نخبہ کو آزاد کیا۔" یہ کہتے ہی سردار صارم میرے سامنے سجدہ ریز ہوا اور پھر اس سے پہلے کہ مجھے یا کسی اور کو اس کے ارادے کا علم ہوتا اس نے میری دائیں کلائی پر لپٹے ہوئے زہریلے سانپ پر ہاتھ ڈال دیا۔ سانپ نے توقع کے مطابق اسے ڈس لیا مگر میں نے دیکھا سردار صارم کے چہرے پر تکلیف و اذیت کی بجائے بڑی آسودہ مسکراہٹ تھی۔

"اے صارم! تُو نے یہ کیا کیا؟" میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔

"وہی اے آتون جو ایک غیرت مند مرد کو کرنا چاہئے۔" صارم کی آواز دھیمی تھی۔ "میں بے آبرو ہو کر زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا اے آتون دیوی! اس مرد کو جینے کا کوئی حق نہیں جس سے اس کی بیوی کو چھین لیا جائے اور .... اور اقتدار سے بھی اسے محروم کر دیا جائے .... مقدام اور نخبہ کو .... میں نے اور .... اور میرے دیوتاؤں نے معاف کیا۔ میری دعا ہے کہ نخبہ کی گود .... بھر جائے اور .... اور اس بستی کو وارث مل جائے .... مجھے نیند .... گہری نیند آ رہی ہے۔ اے دیوی! میں .... سو رہا ہوں .... ہمیشہ کے لئے سو رہا ہوں۔" یہ کہتے کہتے صارم تخت پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس لمحے میں نے نخبہ کے چہرے کا جائزہ لیا وہ مجھے انتہائی مضطرب نظر آ رہی تھی۔ مقدام اب اس

کے پہلو میں آ بیٹھا تھا۔ نخبہ کا نرم و نازک ہاتھ مقدام نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

کچھ دیر تک صارم پر غفلت طاری رہی اور پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کا جسم سانپ کے زہر کی وجہ سے نیلا پڑ گیا تھا۔ میرے نزدیک مرنے والے کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ وہ شاید اس ذلت کے بعد کہ اس کی بیوی اس سے چھن گئی تھی اور بستی کا سردار بھی نہیں رہا تھا ایک روز بھی زندہ نہ رہتا۔ وہ جیتے جی مر گیا تھا۔ میرے حکم پر اس کی لاش وہاں سے ہٹا دی گئی اور بڑے پجاری نے اسی جگہ میرے قدموں میں بیٹھ کر مقدام اور نخبہ کی رسوم ادا کیں۔ ان دونوں نے رسوم کے آخری مرحلے میں ایک دوسرے کی پیشانی چوم کر یہ تصدیق کی کہ وہ اس نئے رشتے پر راضی ہیں۔ اس موقع پر نئے سردار مقدام کے حق میں لوگوں نے نعرے بلند کئے پھر سردار سمیر نے رسم کے مطابق اپنی بہن کی جھولی میں کئی ڈلی ڈالا۔ مجھے اس بوڑھے کے جسم میں کوئی شیطانی روح معلوم ہوتی تھی۔ وہ حسب سابق ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس کی حلقوں میں دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں شعلوں کی طرح دہک رہی تھیں۔

وہ سانپ جو میری دائیں کلائی سے اب تک لپٹا ہوا تھا وہ جیتے جاگتے انسانوں کی جان لے چکا تھا۔ میں نے قریب ہی بیٹھے ہوئے نئے سردار مقدام کے پہلو سے ذرا جھک کر خنجر کھینچ لیا اور پھر کئی جگہ سے سانپ کے ٹکڑے کر دیئے۔ بل کھل گئے تو میں نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ کٹے ہوئے سانپ کے ٹکڑے چند لمحے تڑپ کر ساکت ہو گئے۔ اس کے بعد میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور جشن کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔

☆======☆======☆

سردار مقدام، صارم کی جگہ حویلی میں آ گیا۔ نخبہ اور مقدام نے خواب گاہ میں جانے سے پہلے مجھے تعظیم دی۔ میں نے نخبہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی۔ "اے نخبہ! میری دعا ہے کہ دیوتا تیری گود بھر دیں اور تو اس بستی کے وارث کو جنم دے، تجھے نئی زندگی مبارک ہو!"

اس وقت احرس بھی میرے پاس موجود تھا۔ جب وہ نوبیاہتا جوڑا دعا لے کر چلا گیا تو احرس مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے آتون! کیا تیرا دل نہیں چاہتا کہ دیوتا تیری گود بھی بھر دیں؟" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"تو شاید اس لئے پھر چہکنے لگا ہے اے احرس کہ میری کلائی خالی ہو چکی ہے۔" میرا اشارہ اس سانپ کی طرف تھا جو میری کلائی سے لپٹا رہتا تھا۔

"تیری کلائی میں سانپ نہیں سہاگ کی چوڑیاں اچھی معلوم ہوں گی۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "اور چوڑیاں میں تجھے پہناؤں گا۔"

"کیا تو مجھ سے ڈرتا نہیں؟" میں نے بھی مسکرا کر اس سے پوچھا۔

"تجھ سے ڈروں گا؟" وہ آہستہ سے ہنسا۔ "تجھے تو میں خود بچپن سے ڈراتا آیا ہوں۔ بھول گئی کہ تو چوہے سے کتنا ڈرتی ہے؟"

"ڈرتی نہیں جی، ہاں فضول نہ بکو......... مجھے گھن آتی ہے چوہوں سے۔"

"سنا ہے کہ سانپ بڑے مزے سے چوہے کو نگل جاتا ہے اور تو اسی سانپ کو اپنے گلے میں ڈال ... ندی کبھی نہیں کی۔"

"اب یہ چوہے کا قصہ چھوڑ دے ورنہ جانتا ہے تو مجھے .... ناراض ہو جاؤں تجھ سے۔"

"بس تیرے پاس ایک یہی تو سب سے بڑا ہتھیار ہے میرے خلاف۔ تو جانتی ہے کہ میں تجھے نہیں دیکھ سکتا دراصل جب تو ناراض ہوتی ہے آتون تو بڑے سڑے سڑے منہ بناتی ہے، بالکل .... اچھا چوہیا کا نام نہیں لیتا ورنہ تو ناراض ہو جائے گی۔"

میں اور احرس اس رات دیر تک ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے تنگ کرتے رہے پھر وادی سبز پر ذکر چھڑ گیا اور ہم سنجیدہ ہو گئے۔

دوسرے دن صبح سردار صارم کی آخری رسوم ادا کر دی گئیں جس میں پوری بستی ہی نے شرکت کی تک سردار سمیر، بستی تریال ہی میں تھا۔ اسے میرے آئندہ اقدامات کے بارے میں نئے سردار سے معلوم ہوا تو وہ مجھ سے ملا۔

"اے آتون دیوی! اگر تیرا حکم ہو تو میں بھی تیرے ساتھ چلوں! تو بس مجھے میری بستی تک جانے اور لوٹ کر آنے کی اجازت دے دے۔" سمیر بولا اس کے لہجے سے میرے لئے عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا تو اپنی بستی سے لڑاکا لوگوں کو ساتھ لانے کے لئے جانا چاہتا ہے اے سمیر! اگر ایسا ہی ہے تو ضرورت نہیں۔ بستی تریال میں میرے ساتھ جانے والوں کی کمی بھی نہیں اور اسلحہ بھی خاصا ہے۔" میں نے سمیر سے کہا۔

"ایک وجہ لڑنے والوں کو ساتھ لانے کی بھی تھی۔" وہ کہنے لگا۔

"کیا دوسری کوئی وجہ بھی تھی، وہاں جانے کی؟" میں نے معلوم کیا۔

میرا سوال سن کر بوڑھا سمیر عورتوں کی طرح شرمانے لگا تو میرے دل میں اور بھی تجسس پیدا ہوا۔ جب میں نے وجہ بتانے پر اصرار کیا تو وہ نظریں جھکا کر بولا۔ "وہ .... وہ آتون دیوی .... میں ن .... اپنی بیویوں سے جدا نہیں رہ سکتا اگر مجھے تیرے ساتھ وادی سبز کی طرف جانا پڑا تو ان کا میرے ساتھ ہونا ضروری ہو گا۔" اس نے رک رک کر اور شرماتے ہوئے بتایا۔

اس بوڑھے کی مجھے یہ بات بہت دلچسپ اور عجیب معلوم ہوئی جو اپنی بیویوں کے بغیر زیادہ دن اکیلا نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے خیال میں تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ اپنی کسی ایک بیوی کے ساتھ بھی انصاف کر سکتا اور وہ بیوی کی بجائے بیویوں کی بات کر رہا تھا۔

"کتنی بیویاں ہیں تیری اے سمیر! اور کیا وہ بھی تیری ہی طرح بوڑھی نہیں ہوں گی؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں اپنی بیویوں کی تعداد کبھی نو سے زیادہ نہیں بڑھنے دیتا۔" اس نے میری بات کا جواب دیا۔ "ان میں سے کوئی بھی بیس سال سے زیادہ عمر کی نہیں۔"

"کیا؟" میں حیران رہ گئی۔ "تُو کیا کہہ رہا ہے اے سمیر!"

"میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں اے آتون دیوی!" اس نے بتایا۔ "جب میری کسی بیوی کی ع سال سے تجاوز کر جاتی ہے تو میں اسے آزاد کر دیتا ہوں۔ اسے میری طرف سے اجازت ہوتی آزاد ہونے کے بعد وہ کسی کو بھی اپنا شوہر بنا لے۔ میں پھر کوئی نئی بیوی اپنی حویلی میں لے آتا ہوں۔"

"اور اگر تیری آزاد کردہ عورت تیرے بچے کی ماں بن چکی ہو تو؟"

"تو اسے بچہ اپنے ساتھ لے جانے کی بھی اجازت ہوتی ہے مگر صرف اس وقت تک جب تک بچہ اس کا دودھ پیتا رہے پھر اسے بچہ واپس کرنا پڑتا ہے۔"

"تیرے کتنے بچے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک سو سے کچھ اوپر ہوں گے .... شاید ایک سو بارہ یا پندرہ۔"

"تیری عمر کتنی ہے اے سمیر!"

"زیادہ نہیں ستر سال کے قریب ہے۔" اس نے بتایا۔ "میری بہن نخبہ مجھ سے تیس سال ہو گی۔ وہ میرے باپ استیلا کی سب سے چھوٹی بیوی کی اولاد ہے اور میں اپنے باپ کی پہلی بیوی سے بڑا بیٹا ہوں۔ میرے باپ کی گیارہ بیویاں تھیں۔"

سمیر کی باتیں میرے لئے عجیب بھی تھیں اور دلچسپ بھی، میں اسی لئے اس سے گفتگو کر رہی وہ تو خود مجھے بھی اپنی بیوی بنانے کے چکر میں تھا۔ اگر قدرت میری مدد نہ کرتی تو نہ جانے اس کے میرا کیا حشر ہوتا وہ ستر سالہ بوڑھا مجھے چار سال کے بعد اپنی حویلی سے نکال دیتا۔ اس سے گفتگو ہوئے میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا پھر وہ سوال میری زبان پر بھی آ گیا۔ میں نے کہا۔ "اے یہ بتا کیا تُو نے دل سے سردار صارم کو معاف نہیں کیا تھا؟"

"میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا اے آتون دیوی! میرے دل سے برسوں پرانی دشمنی نہیں دھل سکا تھا۔ میں کوشش کے باوجود یہ بات نہیں بھلا سکا تھا کہ صارم کے باپ اقوئی کو یہ حق نہیں تھا وہ میری بہن نخبہ کو اپنے بیٹے کی بیوی بنا لے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نخبہ پر مقدام نے اپنا حق تو مجھے خوشی ہوئی اور پھر تُو نے دیکھا کہ میں نے صارم سے اپنی بہن کو چھین لیا۔ تُو شاید یہ جانتی اے آتون دیوی کہ برسوں کی دشمنی یوں لمحوں میں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس دشمنی کو ختم ہونے میں لمبا عرصہ لگتا ہے۔ تیرے حکم سے قطع نظر مجھے یقین ہے کہ صارم کا دل بھی میری طرف سے صاف ہو گا۔" سمیر نے تفصیل سے جواب دیا۔

"مجھے خوشی ہے اے سمیر کہ تُو نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ اب مجھے ایسی ہی سچائی کے بھی بتا دے کہ صارم کی موت کے بعد تو بستی تریال کی طرف سے تیرے دل میں کوئی نفرت با نہیں؟"

"اے آتون دیوی! بستی تریال اب میری بہن نخبہ کا گھر ہے اور بھائیوں پر اپنی بہنوں کی حفاظت بھی اپنے ہی گھر کی طرح فرض ہے۔ اگر تُو یہ کہے گی کہ پہلے بھی تو یہ بستی میری بہن کا گھر

میں نے اسے اپنی بہن کا نہیں اپنے دشمن کا گھر سمجھا تھا جس نے زبردستی میری بہن کو اپنے گھر میں ڈال لیا۔"

سمیر نے میرے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اسی وقت مقدام اور نخبہ آ گئے۔ وہ دونوں ہی بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ بقول سمیر کے نخبہ چالیس سال کی ہو چکی تھی مگر ہرگز اتنی عمر کی نہیں لگتی تھی۔ مقدام پچیس سال سے زیادہ کا نہیں تھا یوں وہ اپنی بیوی سے پندرہ سال چھوٹا تھا مگر عمروں کے اس فرق کے باوجود وہ میاں بیوی ہی لگ رہے تھے۔ نخبہ کے چہرے پر ایسی تازگی اور شگفتگی میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"اے آتون دیوی! ہم دونوں اس لئے تیرے پاس آئے ہیں کہ میرے ساتھ میری بیوی نخبہ بھی وادی سبز جانا چاہتی ہے کہ تیرے شانہ بشانہ لڑ سکے۔" سردار مقدام نے ادب سے جھک کر گویا التجا کی۔ "اسے تجھ سے اجازت چاہئے۔"

"مگر اے مقدام! تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں تجھے اپنے ساتھ وادی سبز لے جا رہی ہوں؟ تُو اور تیری بیوی نخبہ یہیں بستی تریال میں رہیں گے۔" میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ میرے خیال میں اس نو بیاہتا جوڑے کو اپنے ساتھ لے جانا ظلم ہوتا۔

"لیکن تُو پہلے تو مجھے اپنے ساتھ لے جا رہی تھی پھر اب کیوں محروم کر رہی ہے اے آتون دیوی!" مقدام عاجزی سے بولا۔

"پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے، پہلے نہ تُو نخبہ کا شوہر تھا اور نہ اس بستی کا سردار اور سن اے مقدام! دیوی دیوتاؤں کے فیصلوں کو دل سے قبول کر لیا کرو جو کچھ کرتے ہیں تمہاری ہی بھلائی میں ہوتا ہے۔"

میری بات سن کر مقدام اور نخبہ نے اظہار فرماں برداری میں اپنے سر جھکا لئے۔

جب ان دونوں کا معاملہ طے ہو گیا تو بوڑھا سمیر ایک بار پھر بول اٹھا۔ "اور میرے لئے کیا حکم ہے اے آتون دیوی!"

"تو جب تک چاہے اپنی بہن کے پاس رہ اور جب چاہے اپنی بستی کی طرف لوٹ جا۔ میں تجھے بھی اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گی۔" میں نے فیصلہ سنا دیا۔

"پھر اجازت دے مجھے کہ میں آج ہی اپنی بستی.........."

نخبہ نے اپنے بھائی سمیر کی بات کاٹ دی اور بول اٹھی۔ "اے میرے سب سے بڑے بھائی سمیر! میں تجھے اتنی جلدی خود سے جدا نہیں کروں گی۔ میں نے تو ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی بار تجھے دیکھا ہے۔" پھر نخبہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "اے آتون دیوی! تُو اسے ابھی واپسی کی اجازت نہ دے۔"

میں بھلا ایک بہن کو اس کے بھائی کے بارے میں کیسے بتاتی کہ اس کا بھائی زیادہ دن اپنی نوجوان بیویوں سے جدا نہیں رہ سکتا۔ میں نے اسی لئے یہ کہہ کر اپنا دامن بچا لیا۔ "یہ تم دونوں بہن بھائیوں کا معاملہ ہے تم جانو، میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

بوڑھا سمیر بہت گھاگ تھا۔ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "اے دیوی! تجھ سے میرے دل کا حال چھپا ہوا نہیں' تو خود جانتی ہے کہ اپنی بستی کی طرف جلد لوٹنے میں میری کس مجبوری کو دخل ہے؟ تو ہی نخبہ اور میرا فیصلہ کر دے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ بہت جلد آؤں گا اور اس کی بھابیوں کو بھی ساتھ لاؤں گا جنہیں اب تک اس نے نہیں دیکھا۔"

بوڑھے سمیر کا اشارہ میں اچھی طرح سمجھ گئی۔ میں نے اسی لئے بات کو ختم کرنے کی خاطر کہا۔ "اے نخبہ! اس وقت اپنے بھائی کو لوٹ جانے دے' جلدی ہی یہ اپنا وعدہ پورا کرے گا اور تو بھابیوں کو بھی دیکھ سکے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" نخبہ مان گئی۔ "اگر یہ بھابیوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر آنے کا وعدہ کر رہا ہے تو میں اس وقت اسے نہیں روکتی۔"

سمیر نے گہرا سانس لیا جیسے کوئی بڑا بوجھ سر سے ٹل گیا ہو۔ پھر وہ سبھی مجھے تعظیم دے کر چلے گئے۔ اسی وقت میں نے مہا پجاری کو آتے دیکھا۔

"اے آتون! مجھے بتا کہ اب یہاں سے ہماری روانگی کب ہے؟ کیا تو نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے؟" مہا پجاری نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"ہاں' اب کوئی مسئلہ نہیں رہا ہم کل صبح روانہ ہو سکتے ہیں۔ تمام تیاریاں پہلے ہی ہو چکی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ صرف روانگی کا اعلان کافی ہے۔ اب تو بستی تریال پر حملے کا خطرہ بھی ہمیشہ کے لئے ٹل گیا ہے۔" میں نے مہا پجاری کی بات کا جواب دیا۔

"ظاہر ہے کہ اب سردار صارم کی جگہ ہمارے ساتھ نیا سردار مقدام جائے گا اگر تو کہے.........."

"نہیں۔" میں نے مہا پجاری کی بات کاٹ دی۔ "اسے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں مقدام سے کہہ چکی ہوں۔"

"کوئی وجہ اس کی اے آتون! تو نے ہی تو ابھی کہا ہے کہ اب خطرہ نہیں رہا۔"

"اس کی وجہ کوئی خطرہ نہیں اے مہا پجاری!" میں بولی۔ "مقدام نے ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے۔ وقت اس کے لئے پھر واپس نہیں آئے گا۔"

اس پر مہا پجاری نے طویل سانس لی پھر کہنے لگا۔ "تو ٹھیک کہتی ہے اے آتون! مجھے خوشی ہے کہ تو دوسروں کے جذبات کا بھی خیال رکھتی ہے اور تیری سرشت میں خودغرضی نہیں اب اگر تیری اجازت ہو تو میں کل صبح روانگی کا اعلان کرا دوں؟"

میں نے مہا پجاری کو اس کی اجازت دے دی۔ حملے کا خطرہ ٹل جانے کی وجہ سے اب سپاہیوں کو بستی میں چھوڑنے کی ضرورت نہیں رہی تھی پھر بھی بطور احتیاط میں نے کل سپاہیوں کی نفری کا چوتھائی حصہ بستی ہی میں چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور اس سے سردار مقدام کو آگاہ کر دیا۔

دوسرے روز صبح ہی صبح "دیدار عام" کے بعد لشکر روانہ ہو گیا۔ سردار مقدام' نخبہ' مہا پجاری اور بستی والے ہمیں بستی کے باہر تک چھوڑنے آئے تھے۔ لشکر کے آگے آگے تین گھوڑے تھے

جن میں سے ایک پر میں سوار تھی اور میرے دائیں بائیں مہا پجاری اور احرس کے گھوڑے تھے۔ اس میرے لئے گھوڑے کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیا گیا تھا۔ میری سواری میں وہ گھوڑا تھا جو کبھی مرتبہ سردار صارم کے لئے مخصوص تھا۔ یہ صحت مند و تندرست مشکی گھوڑا تھا۔

ہمیں سفر کرتے ہوئے وہ تیسرا دن تھا ہم ایک پہاڑی گھاٹی میں سفر کر رہے تھے۔ ہماری دونوں جانب اونچے اونچے پہاڑ تھے اچانک ہمیں اپنے راستے میں بہت بڑے بڑے پتھر نظر آئے جن کی وجہ سے راستہ تقریباً مسدود ہو گیا تھا۔ پتھروں کی ایک دیوار سی ہماری راہ میں حائل تھی۔

"پتھر اس طرح ترتیب سے چنے ہوئے ہیں جیسے انہیں دانستہ کسی نے ہمارا راستہ روکنے کے لئے یہاں رکھا ہو۔" احرس نے اظہار خیال کیا۔

مہا پجاری نے بھی احرس کے خیال سے اتفاق کیا اور اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آنے لگے۔

"ان پتھروں کو اپنے راستے سے ہٹائے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پتھروں کو راستے سے ہٹانے کا کام شروع.........."

ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ پتھروں کی اس مصنوعی دیوار کی دوسری جانب سے دو گھڑسوار آتے دکھائی دیئے۔ جلد ہی وہ دیوار کی دوسری طرف آ کر رک گئے۔ ان میں سے ایک جس کا چہرہ لمبوترا تھا بلند آواز میں کہنے لگا۔ "اے اجنبی لوگو! ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو مگر راہداری ضرور طلب کریں گے۔ ادھر سے کوئی بھی قافلہ یا لشکر راہداری ادا کئے بغیر نہیں گزر سکتا کیونکہ یہ علاقہ عظیم سردار ہمام کا علاقہ ہے۔ ہمام جو سرداروں کا سردار اور مرد بزرگ ہمت و خوش تدبیر ہے۔"

"اے شخص! راہداری سے تیری کیا مراد ہے بیان کر؟" میں نے اس کی بات سن کر وضاحت چاہی۔

"اے عورت! تو چپ رہ۔" لمبوترے چہرے والے نے حقارت سے مجھے ڈانٹ دیا پھر بولا۔ "عورتوں کے بال لمبے اور عقل کوتاہ ہوتی ہے تو کسی مرد کو مجھ سے بات کرنے دے۔ عورتوں کو ہم صرف بچے پالنے اور مردوں کے دل بہلانے کا حق دیتے ہیں کہ اس سے زیادہ کی وہ اہل نہیں ہوتیں۔"

"اپنی زبان سنبھال اے اجنبی!" احرس غصے میں چیخ اٹھا اور پھر اپنی رائفل اس کی طرف سیدھی کر دی۔

"اے نوجوان! کوئی احمقانہ قدم اٹھانے سے پہلے اپنی دائیں اور بائیں جانب ضرور دیکھ لے۔" لمبوترے چہرے والے نے جواب میں کہا۔

احرس اور میری نگاہیں بیک وقت پہاڑوں کی طرف اٹھیں۔ دونوں طرف سے ہمیں رائفلوں کی نالیں اپنی جانب اٹھی ہوئی نظر آئیں جو لوگ بھی ہمیں اپنے نشانے پر لئے ہوئے تھے' ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔

"سن اے اجنبی اور بے وقوف نوجوان!" لمبوترے چہرے والا پھر بولا۔ "ہم انہیں کھوکھلے پہاڑ کہتے ہیں ان پہاڑوں میں ہم نے ایسے مضبوط مورچے بنائے ہیں کہ عظیم سردار ہمام کے غلام ہر طرح محفوظ رہیں ان پر نیچے سے کیا جانے والا ہر حملہ ناکام رہے اور وہ اپنی زد پر آ جانے والوں کو بڑی آسانی سے ساتھ بھون کے رکھ دیں اب سمجھ گیا تُو؟ .... اپنی رائفل کی نال جھکا لے کہ اسی میں تیری بہتری ہے۔"

صورت حال کی سنگینی کا مجھے پوری طرح احساس ہو گیا۔ لمبوترے چہرے والا غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ہم اپنی نظروں سے اوجھل دشمنوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ہمارے دشمنوں کو ہم پر برتری حاصل تھی۔ مجھے آج صبح کا واقعہ یاد آ گیا۔ کچھ سپاہیوں نے روانگی سے قبل یہ بتایا تھا کہ رات کے وقت لشکر کے اردگرد کچھ پُراسرار سی نقل و حرکت دیکھی گئی تھی۔ سپاہیوں کو شبہ تھا کہ کچھ نامعلوم افراد ان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ مہا پجاری نے اسے سپاہیوں کا وہم کہہ کر ٹال دیا تھا کیونکہ انہوں نے واضح طور پر کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ موجودہ غیر متوقع واقعہ پیش آنے کے بعد اب میرے نزدیک رات والا واقعہ تو وہم نہیں رہا تھا یقیناً گزشتہ رات ہی سے سردار ہمام کے آدمی ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

لمبوترے چہرے والے کی دھمکی کے بعد مہا پجاری نے ہاتھ بڑھا کر احرس کی اٹھی ہوئی رائفل کی نال جھکا دی پھر وہ سوال اپنی زبان سے دہرایا جو میں نے کیا تھا۔ لمبوترے چہرے والے نے "راہداری" کی وضاحت کر دی۔ "تمہاری جتنی بھی گنتی ہے اس میں سے چوتھا حصہ ہمارے عظیم سردار ہمام کا ہے۔ تم میں سے بہترین اور مضبوط جسموں والے جوانوں کا انتخاب ہم خود کریں گے۔ تمہارے پاس عورتیں نہیں ہیں ورنہ ان کا نصف حصہ وصول کیا جاتا' یعنی تمہاری عورتوں کی جتنی بھی گنتی ہوتی اس میں سے آدھی عورتیں ہم رکھ لیتے۔ تمہارے ساتھ صرف ایک عورت ہے اور اس کا نصف ممکن نہیں اس لئے ہم اسے بھی بطور راہداری اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

اس شخص کی شرائط بڑی اشتعال انگیز تھیں پھر بھی مہا پجاری نے صبر و تحمل کا ثبوت دیا اور بولا۔ "تم لوگ ہمارے جوانوں کا کیا کرو گے انہیں روک کر تمہیں کیا مل جائے گا؟ کچھ تو معلوم ہو؟"

لمبوترے چہرے والا عجیب سے انداز میں ہنسا' پھر بتایا۔ "ہم ان نوجوانوں کو اپنا غلام بنا لیں گے اور دوسرے غلاموں کی طرح ان کے سیدھے پیروں میں آہنی کڑے ڈال دیں گے تاکہ ہر شخص انہیں پہچان سکے اور ان سے بیگار لے سکے۔ ہم اسی لئے ہمیشہ مضبوط جسموں والے نوجوانوں کو منتخب کرتے ہیں۔ رہ گئیں عورتیں تو ان پر پہلا حق عظیم سردار کا ہوتا ہے پھر اس کے نائبوں کا اور دوسروں کا۔ ایسی عورتوں کو کسی مرد کی بیوی بننے کا حق نہیں ہوتا۔ اے خبطی بوڑھے! تجھے اور کچھ پوچھنا ہے کہ ہم اپنا کام شروع کریں؟"

میں دیکھ رہی تھی کہ احرس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اسے یقیناً لمبوترے چہرے والے کی باتیں انتہائی ناگوار محسوس ہو رہی تھیں یہی کیفیت خود میری بھی تھی مگر میں مصلحت وقت کے پیش نظر برداشت سے کام لے رہی تھی۔ بہرحال ان لوگوں کا پلہ بھاری تھا۔ ہم تینوں میں سے مہا پجاری عمر اور تجربے کے سبب افضلیت رکھتا تھا۔ اس نے اسی لئے بردباری کا ثبوت دیا اور اس مسئلے کے حل کی ایک راہ نکالنا چاہی۔

"اے شخص! کیا یہ ممکن ہے کہ ہم تیرے عظیم سردار ہمام سے مل سکیں؟" مہا پجاری نرمی سے بولا۔

مہا پجاری کی بات سن کر یوں لگا جیسے وہ شخص سوچ میں پڑ گیا ہو پھر چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "معلوم نہیں سردار تم لوگوں سے ملنا پسند بھی کرے گا یا نہیں؟ آج تک ایسا ہوا تو نہیں اس لئے اب بھی نہ ہو تو بہتر ہے۔"

"تُو ایسا کر کہ ہمیں اپنی بستی تک لے چل۔ اگر عظیم سردار ہمام نے ہم سے ملنا پسند نہ کیا تو ہم لوٹ آئیں گے۔"

"ہاں اے بوڑھے یہ ٹھیک ہے ہم تجھے لے چلتے ہیں صرف تُو ہی ساتھ چلے گا کہ کوئی اور بھی تیرے ساتھ؟"

"اے مہا پجاری! میں بھی تیرے ساتھ سردار سے ملنے چلوں گی۔" میں بول اٹھی۔

"نہیں اے آتون' تُو ساتھ نہ چل دور اندیشی کا تقاضا یہی ہے۔ میں احرس کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔" مہا پجاری نے مجھے سمجھایا۔

"تو پھر ہم تینوں ہی چلتے ہیں۔" میں نے گویا فیصلہ سنا دیا۔ "ممکن ہے کہ یوں کوئی بہتر صورت نکل آئے۔"

پھر مہا پجاری نے لاکھ چاہا کہ میں اس کے ساتھ نہ چلوں مگر میری ضد کے آگے اسے مجبور ہونا ہی پڑا ان دونوں گھڑسواروں نے ہمارے سپاہیوں کو اجازت دے دی کہ وہ پتھروں کی دیوار کے ایک سرے سے بھاری پتھر ہٹا دیں تاکہ ہمارے گھوڑے دیوار کی دوسری سمت پہنچ سکیں۔ ہمارے سپاہیوں نے بدقت تمام یہ کام کیا کیونکہ وہ پتھر خاصے بڑے اور بھاری تھے پتھر ہٹنے سے راستہ بن گیا تو ہم تینوں نے اپنے گھوڑے آگے بڑھائے اور دیوار کی دوسری جانب پہنچ گئے۔

"اب ان پتھروں کو دوبارہ ان کی جگہ رکھ دو تاکہ راستہ بند ہو جائے۔" لمبوترے چہرے والے نے ہمارے سپاہیوں کو حکم دیا۔

سپاہی سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگے تو مہا پجاری نے ان سے کہا۔ "یہ جو کہہ رہا ہے وہ کرو اور سنو!" اس کی آواز بلند ہو گئی۔ "ہم سردار ہمام سے گفتگو کرنے جا رہے ہیں۔ اگر ہم شام تک لوٹ کر نہ آئیں تو تم لوگوں کو اختیار ہے جو مناسب سمجھو سو کرنا۔"

"اے بوڑھے! تُو نے اپنے لوگوں سے یہ کیا کہا؟" لمبوترے چہرے والا بگڑ گیا۔ "کیا مطلب ہے تیرا اس بات کا؟" اس کا انداز جواب طلبی کا سا تھا۔

اس بدکلام شخص کے ہتک آمیز رویے کے باوجود مہا پجاری نے اپنے لہجے میں نرمی برقرار رکھی اور بولا۔ "تُو شاید کچھ غلط سمجھ رہا ہے اے شخص! میں نے اپنے لوگوں سے کوئی ایسی بات نہیں کی جو قابل

اعتراض ہو۔ ہم تینوں ان کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں کہ ہم یہاں موجود نہ ہوں اُن اختیار دینا ضروری تھا۔"

"تُو بہت عیار لگتا ہے اے بوڑھے!" اس شخص نے مہا پجاری کو گھور کر کہا پھر اپنے ساتھ مخاطب ہوا۔ "تُو یہیں رہ' اگر یہ لوگ کوئی فساد کھڑا کریں تو تجھے یہ اختیار دیتا ہوں کہ تُو کھلے میں موجود محافظوں کو ان پر گولیاں برسانے اور انہیں بھون ڈالنے کا اشارہ دے دے۔ اس کے لئے ایک گولی چلانا ہی کافی ہو گا۔" یہ کہہ کر اس نے ہمارے سپاہیوں کو بلند آواز میں متوجہ کر کے دھمکی "اگر تم نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی یا کوئی گڑبڑ پھیلائی تو کھلے پہاڑوں میں موجود ہمارے محافظ تمہیں بھون کے رکھ دیں گے اور کوئی غیر ذمے دارانہ قدم اٹھانے سے پہلے یہ بھی نہ بھولو تمہارے تینوں بڑے ہمارے قبضے میں ہیں پھر تم انہیں زندہ نہیں پاؤ گے تمہیں ان کی لاشیں ہی ملیں گی۔" اتنا کہنے کے بعد وہ ہماری طرف پلٹا۔ "میرے پیچھے آؤ۔" اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

ہم نے اس کے پیچھے گھوڑے ڈال دیئے۔ گزشتہ دو روز سے ہم اطمینان کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ اور پریشانی کے سفر کرتے آ رہے تھے موجودہ آفت خواہ مخواہ ہی ہمارے گلے پڑ گئی تھی۔ اس گھاٹی کا چکر کاٹ کر ہم پہاڑوں کی دوسری سمت پہنچ گئے۔ خاصی دور تک چھوٹی بڑی چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا ہم اونچے نیچے راستوں سے گزرتے ہوئے لمبوترے چہرے والے کی رہنمائی میں آگے بڑھتے رہے۔

چٹانوں کا وہ سلسلہ ختم ہوا تو نسبتاً ہموار میدان نظر آنے لگا۔ کچھ فاصلے پر ہمیں ایک آبادی کے آثار دکھائی دیئے۔ ذرا ہی دیر کے بعد ہم اس آبادی میں داخل ہو گئے۔ خلاف توقع وہ آبادی بہت مختصر سی تھی۔ پوری آبادی میں صرف ایک عمارت سرخ اور ناہموار سے پتھروں سے بنی ہوئی نظر آئی۔ باقی آبادی چھوٹے بڑے جھونپڑوں پر مشتمل تھی۔ ان جھونپڑوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم پتھروں والی عمارت تک پہنچ گئے جس سے انتہائی قدامت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس عمارت کے دروازے پر صرف ایک مسلح شخص نظر آیا۔ لمبوترے چہرے والا اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اتر گیا۔

"عظیم سردار ہمام سے جا کر کہہ کہ جس لشکر کا راستہ روکا گیا ہے اس کے چند افراد ملنا چاہتے ہیں اور ان ملاقات کے لئے آنے والوں میں ایک نوجوان لڑکی بھی شامل ہے۔ اگر ہمام اجازت دے تو ان لوگوں کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔" لمبوترے چہرے والے نے مسلح شخص سے کہا۔

وہ مسلح شخص عمارت کے چھوٹے سے دروازے سے اندر چلا گیا۔ ہم تینوں اب تک اپنے گھوڑوں پر ہی سوار تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر جانے کیوں کچھ اطمینان سا محسوس ہوا کہ وہ آبادی اتنے افراد پر مشتمل معلوم نہیں ہو رہی تھی جتنے سپاہی ہمارے ساتھ تھے۔ مقابلہ اگر کسی کھلے میدان میں ہوتا تو بہت آسانی سے انہیں زیر کر سکتے مگر مجبوری یہ تھی کہ ہماری سپاہ کو انہوں نے دو طرف سے گولیوں کے نشانے پر لے رکھا تھا اور خود ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔ ہمارے سپاہی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

میں انہی خیالوں میں گم تھی کہ مسلح شخص لوٹ آیا۔ وہ آتے ہی بولا۔ "سردار ہمام کہتا ہے کہ

آنے والوں میں سے ایک کو ملنے کی اجازت دے سکتا ہے مگر صرف اسے جو عمر میں سب سے کم ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف نگاہ اٹھائی۔

میں اشارہ سمجھ گئی۔ یقیناً سردار ہمام صرف مجھی سے ملنا چاہتا تھا۔ مسلح شخص نے اسے بتا دیا ہو گا کہ تینوں میں سے میں ہی کم عمر ہوں۔

"ٹھیک ہے' میں سردار سے مل آتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں گھوڑے سے اترنے لگی۔

"نہیں۔" احرس بول اٹھا۔ "تُو اکیلی اندر نہیں جائے گی اے آتون! میں تیری جگہ جاؤں گا۔"

"ہرگز نہیں۔" لمبوترے چہرے والے نے مداخلت کی۔ "تُو عمر میں اس لڑکی سے بڑا ہے۔ سردار کا حکم ہے کہ تم تینوں میں سے کم عمر............"

"مگر ہم تمہارے سردار کی یہ شرط کیوں مانیں؟" احرس سخت لہجے میں بولا۔ "تمہارے سردار نے اسی لڑکی کو تنہا اندر بلانے کے لئے یہ شرط لگائی ہے۔"

"شرط تو اب ماننا ہی پڑے گی۔" لمبوترے چہرے والے نے بھی سختی کا جواب سختی سے دیا۔ "اگر تُو نے خوشی سے شرط قبول نہ کی حکم ماننے سے گریز کیا تو میں زبردستی اس لڑکی کو اندر اٹھا کے لے جاؤں گا۔"

پھر اس سے پہلے کہ بات مزید بگڑتی میں نے احرس کو سمجھایا۔ "میری فکر نہ کر اے احرس! میں اپنی حفاظت کرنا اچھی طرح جانتی ہوں' مجھے اندر جانے دے۔"

مہا پجاری کے چہرے سے بھی الجھن اور فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تُو کیا یہ بھول گیا اے مہا پجاری کہ تیری آتون اس سے بھی زیادہ مشکل مراحل سے گزر چکی ہے۔ اندیشوں کو اپنے دل سے نکال دے۔ کیا خبر تنہا میرا ہی اندر جانا بہتر ثابت ہو۔"

موجودہ صورت حال میں شاید مہا پجاری کی قوت فیصلہ کام نہیں کر رہی تھی۔ وہ اسی لئے بجھی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "اے آتون! دیوتا تیری حفاظت کریں تُو جو بہتر سمجھے سو کر............ ویسے بھی بات اب ہمارے اختیار کی نہیں رہی اچھا ہوتا اگر تُو ہمارے ساتھ نہ آئی ہوتی۔"

"تو پھر اے مہا پجاری' یہ بھی ممکن تھا کہ سردار ہمام تم دونوں میں سے کسی کو ملاقات کی اجازت نہ دیتا۔" میں گھوڑے سے اتر کر اب نیچے کھڑی تھی۔

"بہت باتیں کر لیں تُو نے اے کم عقل لڑکی!" لمبوترے چہرے والا اپنی عادت کے مطابق توہین آمیز انداز میں بولا۔ "اپنے سارے ہتھیار یہیں چھوڑ جا۔"

میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے اپنی رائفل' کارتوسوں کی پیٹی' خنجر' تلوار اور تیر کمان' تمام ہتھیار مہا پجاری کے حوالے کر دیئے پھر لمبوترے چہرے والے کے ساتھ عمارت کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ وہ عمارت کچھ اس بے ڈھنگے پن سے بنی ہوئی تھی کہ دن کے وقت بھی اندر نیم تاریکی سی تھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا لمبوترے چہرے والا میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ دالان سا ختم ہوا تو وہ دائیں جانب مڑ گیا۔ میری آنکھیں اب نیم تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو چکی

تھیں کچھ ہی فاصلے پر ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

اس پردے کے قریب پہنچ کر خلاف توقع لمبوترے چہرے والا رک گیا اور بلند آواز میں بولا۔ "اے عظیم سردار! میں لڑکی کو لے آیا ہوں تیری اجازت ہو تو میں اسے اندر تیرے پاس بھیج دوں؟"

"آں .... ہاں! بھیج دے اندر۔" نشے میں ڈوبی ہوئی سی ایک آواز پردے کی دوسری طرف سے آئی۔ "خوب صورت ہے نا؟"

"ہاں اے سردار! خوبصورت بھی ہے اور جوان بھی۔" لمبوترے چہرے والے نے جواب دیا۔

مجھے خطرے کی گھنٹی بجتی سنائی دی مگر میں نے فی الحال خاموشی رہنا ہی مناسب سمجھا۔

"تو پھر تُو ایسا کر کہ یہیں دروازے کے باہر کھڑا ہو کر پہرہ دیتا رہ .... کک .... کیا خبر کہ .... کہ وہ بھاگنے کی کوشش کرے۔" اندر سے آواز آئی۔

"بہتر ہے اے سردار! میں یہیں پہرہ دیتا ہوں۔ اے سردار ہامم تُو مجھے غافل نہ پائے گا۔"

"بھیج دے اسے اندر!"

"جا اندر' اور دیکھ تُو سردار کو خوش کر دے گی تو ممکن ہے وہ صرف تجھے بطور راہداری اپنے پاس رکھ لے اور تیرے لشکر کو آگے جانے کی اجازت دے دے لیکن تُو نے اسے ناراض کر دیا تو پھر تُو اور تیرے ساتھی اس کے قہر و غضب سے نہیں بچ سکیں گے۔" دھمکی دینے کا یہ انداز بالکل بچگانہ تھا۔

میں کچھ کہے بغیر پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کمرے کے وسط میں زمین پر موٹا سا گدا بچھا ہوا تھا جس پر چادر تھی۔ وہاں مجھے تکیے کے سہارے ایک نوجوان نیم دراز نظر آیا۔ تین نوجوان عورتیں اس کے علاوہ وہاں موجود تھیں جن کے جسموں پر باریک کپڑے کا لباس تھا۔ بستر کے قریب ہی ایک صراحی اور مٹی کے کوزے رکھے تھے۔ ایسا ہی ایک کوزہ اس نوجوان کے ہاتھ میں تھا جس میں کوئی مشروب معلوم ہوتا تھا۔

"آ .... تُو بھی ہمارے قریب آ کر بیٹھ جا .... واقعی تُو حسین ہے' ہمیں اچھی لگی۔" نوجوان مجھ سے مخاطب ہوا تو میں سمجھ گئی کہ یہی سردار ہامم ہو سکتا ہے جب میں باہر کھڑی تھی تو یہی آواز سنی تھی۔ اسی کو لمبوترے چہرے والے نے سردار ہامم کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

میں اس نوجوان کو دیکھ کر حیران تھی کہ وہ اس بستی کا سردار تھا اس کی عمر تو احرس سے بھی کم معلوم ہو رہی تھی۔

"تُو ابھی تک ہمارے پاس نہیں آئی اے لڑکی!" نوجوان ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے کوزے سے مشروب کا ایک گھونٹ بھرا۔ میں بے خوفی سے آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"اگر تُو ہی اس بستی کا سردار ہامم ہے تو میں تجھ سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تُو نے میرے لشکر کو کیوں روکا ہے؟"

"کیا میرے آدمیوں نے تجھے .... تجھے اس کی وجہ نہیں بتائی؟ مگر تُو پہلے بیٹھ تو جا' اپنا نام تو بتا۔" وہ بولا۔

"میرا نام آتون ہے اور تیرے آدمی مجھے لشکر کو روکنے کی وجہ بھی بتا چکے ہیں لیکن میں اسے ظلم سمجھتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"ہاں .... واقعی [illegible] ظلم [illegible] مگر ظلم [illegible] کیا نام بتایا تُو نے؟ خیر جو [illegible] .... میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ظلم سے بڑی کوئی طاقت نہیں۔ اب تُو ہی بتا......... اگر میں اپنے باپ پر ظلم نہ کرتا اسے قید میں نہ ڈال دیتا .... تو آج اس طرح عیش کر رہا ہوتا؟ .... بالکل نہیں' تجھے نہیں معلوم کہ میں کتنا عقلمند ہوں۔" وہ بہکی بہکی سی باتیں کر رہا تھا۔

مجھے وہ نوجوان بے وقوف معلوم ہوتا تھا شاید کچھ خودغرضوں اور موقع پرستوں نے اس کا ساتھ دے کر اسے سردار بنا دیا تھا۔ غالباً انہی لوگوں کے مشورے پر اس نے اپنے باپ کو قید میں ڈال رکھا تھا۔ بے وقوف ہونے کے علاوہ وہ خودستائی کا شکار بھی لگتا تھا اور چہرے سے عیاش اور نشے کا عادی بھی غالباً وہ کوئی نشہ آور مشروب ہی اس وقت بھی پی رہا تھا۔

"مجھے تو بالکل عقلمند نہیں لگتا تُو!" میں نے دانستہ اسے چڑانے والے انداز میں کہا۔ میرا خوف اب بڑی حد تک کم ہو چکا تھا شاید میں نے اسی لئے اسے چڑانے کا خطرہ مول لیا تھا کیونکہ نشے میں اس کی ذہنی رو بہک بھی سکتی تھی اور وہ مجھے گرفتار کرنے کا حکم بھی دے سکتا تھا۔

"اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ عقلمند ہوں پھر؟ تو پھر تُو میرے پہلو میں آ کر مجھے یہ مشروب اپنے ہاتھوں سے پلائے گی؟ بول۔" اس نے کہا۔

اسی وقت میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا میں نے سوچا یقیناً عمارت کے اندر اس وقت لمبوترے چہرے والے کے سوا کوئی اور محافظ موجود نہیں ہے ورنہ وہ نوجوان اس سے پہرہ دینے کے لئے نہ کہتا میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا مگر کوئی بھی قدم اٹھانے میں یہ بات مانع تھی کہ میرا لشکر گولیوں کی زد پر ہے میرے سپاہیوں کی زندگی خطرے میں ہے۔

"ہاں اے عظیم سردار ہامم!" میرا لہجہ بدل گیا۔ "اگر تُو نے خود کو عقلمند ثابت کر دیا تو میں نہ صرف تجھے اپنے ہاتھوں سے یہ مشروب پلاؤں گی بلکہ خود بھی پیوں گی۔ تُو پہلے یہ ثابت کر کہ واقعی عقلمند ہے۔"

وہ جیسے کھل اٹھا اور خوش ہو کر کہنے لگا۔ "یہ بتا کہ اگر صرف دو آدمیوں کے ذریعے ایک بڑے لشکر کا راستہ روک لیا جائے تو یہ عقلمندی ہے یا نہیں؟"

میں چونک اٹھی۔ "مگر کیسے؟ .... یہ ممکن ہی نہیں۔" میں نے دانستہ اسے مزید کریدنے کی خاطر کہا۔

"ممکن ہے' یہی تو تجھے نہیں معلوم۔" وہ ہنس پڑا۔ "اسی کو تو عقلمندی کہتے ہیں۔"

"تو پھر اے عظیم اور عقلمند سردار! بتا کس طرح؟"

"جس طرح میں نے تیرے لشکر کو روک لیا۔" اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ "کھوکھلے پہاڑوں میں لوہے کی نالوں کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں ایک آدمی بھی نہیں۔ وہ سب ڈراوا اور دکھاوا ہے۔ یہاں اس بستی میں اتنے آدمی ہی نہیں ہیں اب مان گئی تُو میری عقلمندی کو۔"

اس بے وقوف نوجوان سے یہ سن کر میرا جیسے سیروں خون بڑھ گیا میرے اندر ایک نئی طاقت و ہمت آ گئی۔

"اب اپنا وعدہ پورا کر۔ ادھر میرے پہلو میں آ اور پلا مجھے .... اے! تُو ہٹ جا یہاں سے۔" اس نے پہلو میں بیٹھی ہوئی نوجوان عورت کو کہنی ماری۔ وہ عورت اپنے چہرے پر ناگواری کے آثار لئے دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔

میں اب سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قریب جا بیٹھی۔ اس کا کوزہ خالی ہو چکا تھا جو اس نے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے قریب رکھی ہوئی صراحی سے کوزے میں مشروب انڈیلا۔ پھر وہ کوزہ میں نے اس غبی نوجوان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

وہ ایک گھونٹ بھر کر کہنے لگا۔ "تُو نے یہ بھی تو کہا تھا کہ خود بھی پیئے گی۔ تجھے میں پلاؤں گا اپنے ہاتھ سے۔" یہ کہہ کر گویا اس نے خود ہی اپنی موت کو دعوت دے دی۔ جس کوزے سے اس نے گھونٹ بھرا تھا اسی کو وہ اب میرے ہونٹوں کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"لا مجھے دے' میں خود پی لیتی ہوں۔" میں نے کوزہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں' میں پلاؤں گا۔" وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔

مجبوراً مجھے اس تلخ اور بدبودار مشروب کا ایک گھونٹ بھرنا پڑا۔ ایسا کرتے ہوئے میں روک لیا تھا پھر جہاں میں نے اپنے ہونٹ رکھے تھے اسی جگہ اس نے بھی اپنے ہونٹ رکھ دے۔ مجھے اس پر رحم آیا کیونکہ اب وہ صرف چند لمحوں کا مہمان تھا۔

اس کے بعد وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ ذرا ہی دیر کے بعد نوجوان سردار ہامم کے ہا کوزہ چھوٹ گیا۔ اس کے ساتھ وہ بستر پر ڈھے گیا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

"ارے .... یہ سردار کو کیا ہوا؟" نوجوان عورتیں گھبرا گئیں۔

"میں کسی کو بلاتی ہوں۔" یہ کہتے ہی میں کھڑی ہو گئی اور پھر تیزی سے لپکتی ہوئی پردہ اٹھا کر گئی۔

"اچھا.......... بھاگ رہی ہے تُو!" لمبوترے چہرے والے نے مجھے دیکھتے ہی کہا اور مجھ پر جھپٹا۔

میں پہلے ہی سے اس کے لئے تیار تھی۔ میں نے فوراً ہی اس کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے۔ اس نے چیخ کر دوسرے ہاتھ سے میرے سر کے بال پکڑ لئے پھر اس سے پہلے کہ وہ میرے بالوں کو کھینچتا میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ میں اپنا کام کر چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں یہ میرا دوسرا شکار تھا جسے ڈھیر ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ میں اسے ایڑیاں رگڑتے ہوئے مرتا چھوڑ کر پہلے دالان میں پہنچی اور پھر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔

میں دروازے سے باہر نکلی تو مسلح شخص نے مجھے حیرت سے دیکھا شاید اسے میری اتنی جلدی واپسی کی امید نہیں ہوگی۔ اس نے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا اسے غالباً لمبوترے چہرے والے کی تلاش

جہنم کے سفر پر روانہ کر آئی تھی۔ میں اسے نظرانداز کرتی ہوئی تیزی سے مہا پجاری کے ی جسے میں پہنچی اور اس سے اپنی رائفل لے لی پھر میں مسلح شخص کی طرف پلٹی اور یوں اس کی طرف بڑھی یب ے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"تیرا ساتھی اندر دالان میں بے ہوش پڑا ہے' اسے اٹھا لا۔" میں نے مسلح شخص سے کہا۔

"کیسے؟ کہاں پڑا ہے وہ؟" اس نے ایک بار پھر مڑ کر دروازے کے اندر غور سے دیکھنے کی کوشش اور یہی کوشش اسے مہنگی پڑی۔

دوسرے ہی لمحے رائفل کا دستہ اس کے سر پر پڑا اور وہ لہرا کر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے دانستہ اس پر لی چلانے سے گریز کیا تھا کہ دھماکے کی وجہ سے بستی والے اس طرف متوجہ نہ ہو جائیں۔ وہ عمارت ی کے ایک سرے پر بنی ہوئی تھی اور شاید بستی والوں کو ادھر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ آس پاس لئے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ عمارت کے اندر اگر کچھ اور لوگ ہوں تو مجھے نہیں معلوم۔

مسلح شخص کے ڈھیر ہوتے ہی دوڑ کر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ مہا پجاری اور احرس یقیناً ان ہوں گے انہیں اب تک نہ میں نے کچھ بتایا تھا اور نہ ہی کچھ پوچھنے کی مہلت دی تھی۔

"نکل چلو یہاں سے۔" میں نے حیرت زدہ مہا پجاری اور احرس سے چیخ کر کہا اور اپنے گھوڑے کو لگا دی۔

ان دونوں نے بھی میرے ساتھ ساتھ اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔ بستی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے جب باہر آ گئے تو احرس اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے کے قریب لے آیا اور بولا۔ "اے آتون! کچھ بتا کہ کیا ہوا؟"

"دھوکہ۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر کس کے ساتھ؟" اس نے پوچھا۔

"ہمارے ساتھ۔" میں بولی۔ "میں نے اتنا بڑا دھوکہ پہلے کبھی نہیں کھایا۔" پھر میں نے اسے مختصر فاظ میں کھوکھلے پہاڑوں کے فریب سے آگاہ کر دیا۔

"مگر تجھے اے آتون! یہ بات کیسے معلوم ہو گئی؟" احرس بے یقینی کے سے انداز میں بولا۔

"سب کچھ بتا دوں گی پہلے تو اس لمبوترے چہرے والے کے ساتھی کو ٹھنڈا کرنا ہے پھر یہاں سے نا لشکر لے کر جلد سے جلد دور نکل جانا ہے تاکہ وہ لوگ ہم سے بھڑنے کی یا ہمیں روکنے کی کوشش نہ ریں۔ وہ اپنے نوجوان سردار ہامم کی موت پر مشتعل بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے بتایا۔

"کیا؟" احرس چونک کر کہنے لگا۔ "کیا کہا' تُو نے اسے ٹھکانے لگا دیا؟"

"مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔" میں نے جواب دیا۔

احرس پھر کچھ نہیں بولا اسے شاید صورت حال کی نزاکت کا کچھ احساس ہو گیا تھا کہ یہ وقت باتوں نہیں ہے۔ چھوٹی بڑی چٹانوں کے ناہموار علاقے کو عبور کرتے ہی میں نے اپنی رائفل شانے سے اتار کر تھ میں لے لی۔ اب ہم گھاٹی میں اتر چکے تھے۔

دور ہی سے صرف ہم تینوں کو آتے دیکھ کر لمبوترے چہرے والے کے ساتھی نے ہماری طرف رائفل سیدھی کرلی مگر اسے گولی چلانے کی مہلت نہ مل سکی۔ اس سے پہلے ہی میں نے اس کا سینہ چیر دیا۔ اگر وہ ہماری طرف اپنی رائفل سیدھی نہ کرتا تو شاید میں اسے بے ہوش کر کے وہاں چھوڑ جاتی۔ کر کے خود اس نے اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ جلد ہی ہم تینوں تیزی سے گھوڑے دوڑاتے اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہمارے راستے میں پتھروں کی دیوار حائل تھی۔

"ان پتھروں کو راستے سے ہٹادو۔" احرس نے چیخ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں کھلے پہاڑوں میں کوئی نہیں ہے۔"

سپاہیوں نے فوراً آگے بڑھ کر پتھر ہٹانا شروع کر دیئے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے مہا پجاری اور احرس کو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے مختصراً آگاہ کر دیا۔ وہ دونوں حیرت سے میری باتیں سنتے رہے۔

"کمال ہے۔" احرس بولا۔ "تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ واقعی اتنا بڑا دھوکہ کبھی کسی نے کسی کو نہیں دیا ہو گا۔"

راستے سے پتھروں کی وہ دیوار ہٹتے ہی ہم نے گھاٹی میں تیزی سے اپنے گھوڑے دوڑانا شروع کر دیئے۔ اس بستی کو بہت جلد ہم پیچھے چھوڑ آئے۔ میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا تھا کہ بستی والے ہم پر حملہ کر سکتے ہیں شاید حملہ نہ کئے جانے کی وجہ یہ ہو کہ وہاں اب حکم دینے والا ہی نہیں رہا تھا اور نئے سردار کا انتخاب اتنی جلد ممکن نہیں تھا۔ یہ بات واقعی حیران کن ہی تھی کہ صرف دو افراد نے ہمارے لشکر کو وہاں اتنی دیر روکے رکھا تھا۔

اس بستی کے تین افراد کو ٹھکانے لگانا پڑا تھا اور تینوں ہی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ مجبوری کے باوجود اس پر مجھے دکھ تھا اس معاشرے میں جہاں انسانی زندگی کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ معلوم نہیں کیوں میرا ذہن اس وحشت و درندگی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے میں اس معاشرے اور اس کی دیرینہ روایات کا حصہ نہیں ہوں۔ جیسے یہ سب کچھ میرا ورثہ نہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب بھی انسانی خون بہتا تھا مجھے اس پر رنج ہوتا تھا خواہ وہ خون دوست کا ہو یا دشمن کا۔ ان بستیوں میں مجھے ایک بات جو سب سے زیادہ کھٹکتی تھی وہ عورتوں کے ساتھ مردوں کا سلوک تھا۔ عورت کو وہ صرف حصول لذت کا ذریعہ سمجھتے تھے اور کسی حسین عورت کو حاصل کرنے کی خاطر اکثر ایک دوسرے کا خون بہانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں تک کو میں نے حسین و جوان عورتوں کے لئے رال ٹپکاتے دیکھا جو اپنی زندگی کی ساری بہاریں دیکھ چکے تھے اور عمر کی آخری منزل میں تھے۔ عورت کو خود سے کمتر اور بے حقیقت جاننے کے باوجود وہ ہمیشہ اسی کمتر و بے حقیقت صنف کے طالب رہتے تھے۔ میں جو خود کو اسی معاشرے کا ایک فرد ہونے کے باوجود اس کا حصہ نہیں سمجھتی تھی اس کی تصدیق ایک شب جب پُراسرار سرگوشیوں سے بھی ہو گئی تو میرے تجسس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میں درحقیقت کون ہوں؟ یہ سوال میرے لئے اہمیت اختیار کر گیا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں وادی سبز کی طرف سفر کر رہی تھی۔ دن بھر تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرنے کے بعد سورج کے غروب ہوتے ہوتے ہم نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ ہوا میں کیونکہ خنکی بڑھ گئی تھی اس لئے مہا پجاری احرس اور میری خاطر ایک خیمہ لگا دیا گیا تھا۔ مجھے جب نیند آنے لگی تو میں بستر پر دراز ہو گئی۔ احرس اور مہا پجاری بھی سونے کے لئے لیٹ چکے تھے۔

نیند اور بیداری کی وہ ملی جلی سی کیفیت تھی جب میں نے آشنا پُراسرار سرگوشیاں سنیں۔ "اے عبلہ! تُو جو یہ سوچتی ہے کہ اس معاشرے اور اس کی دیرینہ روایات کا حصہ نہیں ہے تو ایسا سوچنے میں تُو حق بجانب ہے۔ یقیناً تُو وہ نہیں ہے جو بنا دی گئی ہے۔ ایک روز ایسا آئے گا جب تجھے اپنی حقیقت کا علم ہو جائے گا اور وہ دن تیری زندگی میں ضرور آئے گا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی سرگوشیاں معدوم ہو گئیں۔ دوسرے دن صبح جب میں بیدار ہوئی تو رات کو سنائی دینے والی سرگوشیوں کا ایک ایک لفظ مجھے یاد تھا۔

مزید دو روز سفر کرنے کے بعد ہم اس بستی کے قریب پہنچ گئے جو مہا پجاری اور میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔

"اے مہا پجاری! وہ رہا پہاڑی چشمہ۔" میں نے ایک طرف انگلی اٹھاتے ہوئے پُرجوش آواز میں مہا پجاری کو مخاطب کیا۔ "یہی وہ جگہ ہے نا جہاں وادی سبز سے فرار ہونے کے بعد میں نے اور تُو نے پہلا پڑاؤ کیا تھا؟"

"تُو نے ٹھیک پہچان کی اے آتون! ہاں یہ وہی جگہ ہے اور کچھ فاصلے پر وہ پہاڑی درہ نظر آ رہا ہے جسے عبور کر کے ہم سردار اشر کی بستی میں پہنچ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں چشمے کے کنارے پڑاؤ ڈال دینا چاہئے۔ اس کے بعد ہم دونوں سردار اشر سے ملنے بستی میں جائیں گے۔"

"اور کیا مجھے یہیں چھوڑ جائیں گے؟" احرس درمیان میں بول اٹھا جو میری بائیں جانب اپنا گھوڑا روک چکا تھا اور ہم دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، تم بھی چلے چلنا۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تجھے اس بستی کے سردار اشر سے ملواؤں گی۔ وہ ہمارا محسن ہے۔ اس نے مجھے اور مہا پجاری کو پناہ دی تھی۔"

پھر اسی پہاڑی چشمے کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا گیا جس سے میرے بچپن کی کئی ہولناک یادیں وابستہ تھیں۔ اسی چشمے کے کنارے پہلی بار ایک شخص میرے اندر موجود زہر کا شکار ہوا تھا اور یہیں مہا پجاری اور میں نے چار مسلح افراد کا مقابلہ کیا تھا جن میں سے دو مارے گئے تھے۔ ایک کے سینے میں مہا پجاری کا خنجر ترازو ہوا تھا۔

خیمہ لگایا جا چکا تھا اور میں کھانا کھا کر احرس کے ساتھ چشمے کے کنارے ٹہل رہی تھی۔ احرس کو میں اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات سے آگاہ کر رہی تھی اور وہ بڑی توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا۔ یہیں پہلی بار میں نے اس پر یہ راز افشا کیا کہ مجھ پر کوئی زہر کیوں اثر نہیں کرتا۔

"اے آتون! مجھے پہلے خبر نہیں تھی کہ تُو اتنی زہریلی ہے۔" احرس کے لہجے میں حسب عاد
شرارت عود کر آئی۔

"اگر تجھے پہلے سے بھی خبر ہوتی تو کیا کر لیتا تُو؟" میں مسکرا کر بولی۔

"کم سے کم اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ تیری آرزو نہ کرتا۔"

"تو اب بھی کیا بگڑا ہے اے احرس! نہ کر میری آرزو۔"

"اب یہ میرے بس میں نہیں رہا۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو گا کہ تُو کبھی مجھ سے خفا ہو کر مجھے کا
کھائے گی اور میں مر جاؤں گا۔ تیری خاطر مجھے یہ بھی قبول ہے مرنا تو ایک دن ہے' اسی طرح سہی۔"
اس نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت ایک جانب سے مہا پجاری آتا دکھائی دیا۔ قریب آ کر وہ مجھ سے بولا۔ "کیا بستی نہ
چلنا اے آتون؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے جواب دیا اور احرس کے ساتھ خیمے کی طرف بڑھی جس کے سامنے
ہمارے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد احرس' میں اور مہا پجاری اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر پہاڑی درے میں
داخل ہو رہے تھے۔ ہم جیسے ہی وہ درہ عبور کرنے کے بعد کھلے میدان میں پہنچے تو ذرا ہی دور ایک قطا
میں مشعلیں روشن نظر آئیں۔

"شاید بستی کی حفاظت اور نگرانی کے خیال سے سردار اشر نے بستی کے باہر محافظ مقرر کر دیۓ
ہیں۔" مہا پجاری نے اظہار خیال کیا۔

میں نے اور احرس نے مہا پجاری کے کہنے پر اپنے گھوڑوں کی رفتار آہستہ کر لی۔ خود مہا پجاری نے
بھی ایسا ہی کیا تھا۔ جلد ہی ہم مشعل بدست ان محافظوں کے قریب پہنچ گئے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔
انہیں دیکھ کر میرے ذہن کو پہلا جھٹکا یہ لگا کہ ان کے شانوں سے رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ میرے لئے یہ
بات خلافِ توقع ہی تھی کہ گزشتہ آٹھ سال کے دوران میں جدید اسلحہ دور دراز بستی تک بھی پہنچ سکتا
ہے۔ میں نے یہی دیکھ کر سوچا ممکن ہے وادی سبز تک بھی یہ جدید اسلحہ پہنچ چکا ہو۔ ایسی صورت میں
اپنے دیرینہ دشمن ژیان کو زیر کر لینا یقیناً میرے لئے آسان نہ ہوتا۔

"کون ہو تم لوگ؟" ایک محافظ نے درشت آواز میں سوال کیا۔ "اور کہاں جا رہے ہو؟"

"ہم اس بستی کے مہربان سردار کے دوست ہیں اور اسی سے ملنے جا رہے ہیں۔" مہا پجاری نے
درشتی کا جواب نرمی سے دیا۔ "مہربان سردار اشر ہمیں اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہے یقیناً وہ ہم سے مل کر
خوش ہو گا۔"

"تجھے شاید یہ نہیں معلوم اے اجنبی بوڑھے کہ مُردے خوش یا ناخوش نہیں ہوا کرتے۔" محافظ
طنزیہ انداز میں آہستہ سے ہنسا۔

میں چونک اٹھی اور غالباً مہا پجاری کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ میرے لئے یہ سمجھنا

مشکل نہ تھا کہ سردار اشر زندہ نہیں تھا پھر اب اس بستی کا سردار کون ہے؟ میں نے سوچا اور پھر مہا
پجاری کے کچھ کہنے سے پہلے یہی سوال میری زبان پر آگیا۔

"اے اجنبی لڑکی! کیا تُو نے کبھی سرداروں کے سردار ژیان کا نام سنا ہے؟" محافظ بولا۔

"ہاں.......... سنا ہے۔" میری بجائے مہا پجاری نے جواب دیا۔ "مگر وہ تو وادی سبز کا سردار تھا۔"

"اور اب وادی سبز کے آس پاس جتنے قبیلے بھی آباد ہیں اور جتنی بستیاں ہیں سب پر سرداروں کے
سردار ژیان ہی کی حکمرانی ہے۔ اس نے ہر بستی میں اپنا ایک نائب مقرر کر دیا ہے۔ یہاں کا نائب سردار
واہب ہے۔" محافظ نے بتایا پھر وہ عجیب سی نظروں سے میرا جائزہ لے کر اپنے ایک ساتھی سے مخاطب
ہوا۔ "تیرا کیا خیال ہے' نائب سردار واہب کو کیا یہ تحفہ پسند آ جائے گا؟"

"یہ تحفہ تو اتنا قیمتی معلوم ہوتا ہے کہ سرداروں کے سردار ژیان کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں نے
سنا ہے کہ ژیان ایسے تحفے لانے والوں کو مالامال کر دیتا ہے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔"
دوسرا محافظ مجھے ندیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ہم تینوں ان محافظوں کے نرغے میں تھے۔ اس
حصار سے نکل جانا آسان معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میرے لئے یہ خبر بھی باعث تشویش تھی کہ آس پاس کی
تمام بستیوں پر بھی ژیان کا قبضہ ہو چکا ہے۔ گویا گزشتہ آٹھ سال کے عرصے میں ژیان نے اپنے اقتدار کو
بے حد مضبوط کر لیا تھا۔ اس کی مملکت کی حدود اب آس پاس کے علاقوں تک بھی پھیل گئی تھیں۔ اس
کے علاوہ جدید اسلحہ بھی اس تک پہنچ گیا تھا۔ نادانستگی میں ہم دشمن کے علاقے میں داخل ہو گئے تھے اور
یہ بات پہلے ہمارے سان گمان میں بھی نہیں تھی۔

"اے اجنبی بوڑھے! اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر دے۔" پہلے محافظ نے مہا پجاری کو سخت لہجے
میں مخاطب کیا۔

"اگر تُو نے ہماری بات مان لی تو ہم تجھے اور تیرے ساتھی نوجوان کو یہاں سے زندہ واپس جانے
دیں گے ورنہ.........." دوسرے محافظ نے دھمکی دینے کے انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی پھر چند
لمحے بعد بولا۔ "بول کیا کہتا ہے' زندگی چاہئے یا موت؟"

اس سے پہلے کہ مہا پجاری کوئی جواب دیتا میں بول اٹھی۔ "زندگی .... تم ان دونوں کو جانے
دو میں تمہارے ساتھ رکنے پر آمادہ ہوں۔" اس وقت مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔ اگر وہ دونوں لشکر میں
واپس نہ جاتے تو پھر میری بازیابی کے لئے کس طرح کوشش کر سکتے تھے مگر احرس میری بات کی تہہ تک
نہیں پہنچ سکا اور مرنے مارنے پر تُل گیا۔

"تم اسے نہیں روک سکتے۔" وہ چیخ کر محافظوں سے بولا۔ "یہ بھی ہمارے ساتھ واپس جائے گی۔"

"لیکن میں یہیں رکنا چاہتی ہوں۔" مجبوراً مجھے مداخلت کرنا پڑی۔ "میں سرداروں کے سردار
ژیان کی بیوی بن کر فخر کروں گی۔"

"آتون! یہ تُو کیا کہہ رہی ہے؟ ژیان تو.........."

"ژیان تُو عظیم ہے۔" مہا پجاری نے احرس کی بات کاٹ دی۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ احرس جوش جذبات میں کوئی غیر دانش مندانہ بات اپنی زبان پر لانے والا تھا غالباً اس نے میرے بدلے ہوئے رویے کو بھی محسوس کر لیا تھا اور اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ وہ اسی لئے احرس کو سمجھانے لگا۔ "اے میرے بچے! جب خود آتون ہی ہمارے ساتھ واپس چلنے سے انکار کر رہی ہے تو پھر ہمیں زبردستی نہیں کرنا چاہئے۔ آ واپس چلیں۔"

"اسے اپنے ساتھ واپس لے ہی جا اے اجنبی بوڑھے! ورنہ یہ ہمارے ہاتھوں مارا جائے گا۔ اسے شاید عظیم ژیان کی عظمت کا اندازہ نہیں۔" محافظ نے مہا پجاری سے کہا۔ "میں نے اب تک بہت برداشت کیا ہے وہ بھی اس لڑکی کی وجہ سے جو عظیم سردار ژیان کی بیوی بننا چاہتی ہے مگر اب حد گزر رہی ہے۔ بہتر ہو گا کہ تُو حد گزرنے سے پہلے اسے لے جا۔"

جاتے جاتے احرس نے مجھے سخت نظروں سے دیکھا یقیناً جذبات نے اس کی عقل کو خبط کر دیا تھا اور شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں واقعی ژیان پر ریجھ گئی ہوں اور یہاں آنے کے مقصد کو بھلا بیٹھی ہوں۔

جب میں نے مہا پجاری کے ساتھ احرس کو پہاڑی درے کی طرف واپس جاتے دیکھا تو اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ مجھے یقین تھا کہ مہا پجاری' احرس کو میرے بدلے ہوئے رویے کی اصل وجہ سے آگاہ کر دے گا۔

مہا پجاری اور احرس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی پہلے محافظ نے ہاتھ کے اشارے سے بقیہ محافظوں کو پیچھے ہٹا دیا مگر اپنے ساتھی دوسرے محافظ کو اپنے پاس ہی روک لیا۔ پہلا محافظ اس دستے کا سالار معلوم ہوتا تھا اور دوسرا محافظ شاید اس کا نائب تھا۔ دوسرے محافظ جب پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے تو پہلے محافظ نے اپنے ساتھ کو مخاطب کیا۔ "میرا خیال ہے کہ اگر نائب سردار واہب کو اس حسین تحفے کی سن گن ہو گئی تو وہ اسے ہم سے چھین لے گا۔ پھر معلوم ہے کیا ہو گا؟ ہم اس انعام سے محروم ہو جائیں گے جو ہمیں سردار ژیان سے ملنے کی امید ہے' تُو بتا کہ اس تحفے کو فی الحال سب کی نظروں سے اور خاص طور پر نائب سردار واہب کی نظروں سے چھپا کر کہاں رکھا جائے؟"

"اگر تُو یہ چاہتا ہے کہ یہ حسین تحفہ سردار ژیان تک بحفاظت پہنچ جائے اور ہم مالا مال ہو جائیں اور اس پر نائب سردار واہب کی نظر نہ پڑے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ وہ صورت یہ کہ ہم اسے جتنی جلدی ممکن ہو سردار ژیان تک پہنچا دیں۔" دوسرے محافظ نے مشورہ دیا۔

"پھر تو ہمیں صبح ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔" پہلا محافظ سر ہلا کر بولا۔ "اگر ہم اس تحفے کو لے کر اسی وقت وادی سبز کی طرف روانہ ہو جائیں تو .... تو شاید نصف شب گزرنے تک وہاں پہنچ جائیں گے مگر رات کو تو شاید ہم سردار ژیان سے نہ مل سکیں۔"

"تو کیا ہوا کم از کم وہاں پہنچ کر ہم نائب سردار سے تو محفوظ ہو جائیں گے۔"

"ہاں یہ تو تُو ٹھیک ہی کہتا ہے۔" پہلا محافظ یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ "اور یہاں .... ہم

دونوں کی جگہ کون ذمے داری سنبھالے گا؟ یہ بھی سوچا؟" دوسرے محافظ نے کسی کا نام لیا اور پہلے محافظ نے اس سے اتفاق کیا۔

"مگر اسے یہاں سے اپنی غیر موجودگی کے سلسلے میں' اعتماد میں لینا پڑے گا۔" یہ کہتے ہی دوسرے محافظ نے مڑ کر اس نامزد شخص کو پکارا۔

تھوڑے سے انعام کے لالچ میں نامزد محافظ اس پر آمادہ ہو گیا کہ ان دونوں کی وہاں سے غیر موجودگی کو راز میں رکھے گا۔

آخرکار سارا معاملہ طے ہو گیا۔ وہ دونوں مجھے اسی وقت اپنے ساتھ وادی سبز لے جانا چاہتے تھے اور یہ خلاف توقع صورت حال میرے لئے تشویش کا سبب تھی۔ اب تک میں ان دونوں کی گفتگو پورے صبر و تحمل کے ساتھ سنتی رہی تھی اور مداخلت نہیں کی تھی مگر ایسا مزید ممکن نہیں تھا۔

"سنو!" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "میں نے دن بھر گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کیا ہے اور بہت تھک گئی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم لوگ مجھے سردار ژیان کے پاس لے جانا چاہتے ہو اور اسی وقت سفر کا ارادہ رکھتے ہو' مگر .... مگر میں .... میں مزید سفر کرنے کے قابل نہیں ہوں۔"

"سفر نہیں کرے گی تو پھر .... پھر تُو سرداروں کے سردار ژیان کی بیوی کیسے بنے گی؟" پہلے محافظ نے اپنی دانست میں گویا مجھے لالچ دیا۔

"تم لوگ رات کو مجھے آرام کرنے دو' صبح میں سفر کے قابل ہو جاؤں گی۔" میں بولی۔ میں کسی بھی طرح اتنا وقت وہیں گزار دینا چاہتی تھی کہ مہا پجاری اور احرس لشکر تک پہنچ جائیں پھر اس بستی پر حملہ کر دیں۔ اس بستی پر اب حملہ کرنا یوں بھی ضروری ہو گیا تھا کہ بہرحال یہ بستی' ژیان ہی کے زیر نگیں تھی۔

"دیکھ اے لڑکی! ضد نہ کر اور اپنی مرضی سے چلی چل ورنہ ہم تجھے اس پر مجبور بھی کر سکتے ہیں۔" پہلے محافظ نے مجھے دھمکی دی۔

"سن اے شخص! میں جب سردار ژیان کی بیوی بن جاؤں گی اور یوں میرا مرتبہ بلند ہو جائے گا تو میں تجھے یاد رکھوں گی' تجھے سردار ژیان کی نظروں میں اونچا کر دوں گی تجھے اس سے انعام و مراعات بھی دلواؤں گی۔ کیا تُو ژیان کی نظروں میں اونچا ہونا نہیں چاہتا؟" میں نے بھی اسے لالچ دیا۔

وہ بڑا کائیاں نکلا اور کسی بھی طرح میری باتوں میں نہیں آیا۔ اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ مجبوراً مجھے ان دونوں کے ساتھ راضی بہ رضا چلنے پر آمادہ ہونا پڑا۔ میں اندازہ لگا چکی تھی کہ اگر ان کے ساتھ خوشی خوشی چلنے پر آمادگی کا اظہار نہ کیا تو وہ مجھے باندھ کر لے جائیں گے۔

انہوں نے مجھے درمیان میں لے لیا اور دائیں بائیں اپنے گھوڑے دوڑانے لگے۔ میرے دل میں امید کا آخری چراغ یہی روشن تھا کہ میرے لشکر والوں میں سے کسی کی نظر مجھ پر پڑ جائے۔ میرا خیال تھا کہ وہ وادی سبز تک پہنچنے کے لئے وہی راستہ اختیار کریں گے جو کبھی اس بستی تک آنے کے لئے مہا پجاری نے اختیار کیا تھا۔ اس کے لئے درے سے گزر کر پہاڑی چشمے کی طرف جانا پڑتا اور چشمے کے

کنارے ہی میرا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ موجودہ حالات میں ان لوگوں کو محتاط اور چوکنا ہونا چاہئے تو مجھے پورا یقین تھا کہ ان لوگوں کی نظروں میں آئے بغیر اس راستے سے گزرنا ممکن نہیں تھا مگر اس امید کا آخری چراغ بھی بجھ گیا جب ان دونوں نے درے کا رخ نہیں کیا۔

جلد ہی مجھے ان دونوں کی گفتگو سے یہ معلوم ہو گیا کہ وادی سبز تک پہنچنے کے لئے انہوں نے راستہ بدل دیا تھا۔ یہ راستہ طویل تو تھا مگر ان کے نزدیک محفوظ تھا۔ وہ تیزی سے گھوڑے بھگاتے رہے اور میں بھی ان کے ساتھ اپنا گھوڑا دوڑاتی رہی۔

ابھی ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ کافی دور سے دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازیں اسی طرف سے آ رہی تھیں جدھر سے ہم آ رہے تھے۔

"یوں لگتا ہے جیسے کسی نے بستی پر حملہ کر دیا ہے۔" ان میں سے ایک محافظ نے اظہار خیال کیا۔

"ہاں' یہی معلوم ہوتا ہے۔" دوسرے محافظ نے پہلے کی تائید میں کہا۔ "اچھا ہوا کہ ہم اس لڑکی کو لے کر پہلے ہی وہاں سے نکل آئے ورنہ حملہ ہونے کی صورت میں ہمارے لئے اسے چھپا کر رکھنا مشکل ہو جاتا اور یہ نائب سردار واہب کی نظر میں آ جاتی۔"

"مگر بستی پر شب خون مارنے والا کون ہو سکتا ہے؟"

"یہ کارروائی مقتول سردار اشر کے بیٹے نضار ہی کی ہو سکتی ہے جو بچ کر نکل گیا تھا۔ دو سال پہلے بھی تو نضار ہی نے ہماری بستی پر حملہ کیا تھا سنا ہے کہ وہ اب چھوٹے چھوٹے قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر بہت طاقت پکڑ گیا ہے۔"

ہر چند کہ ان لوگوں کی قیاس آرائی قطعی غلط تھی مگر اس سے میرے علم میں یہ ایک نئی بات آ گئی اس علاقے میں سردار ژیان کا کوئی حریف بھی ہے۔ دشمن کا دشمن' دوست ہی ہوتا ہے آئندہ کسی بھی موقع پر نضار میرے کام آ سکتا تھا۔

مہا پجاری نے اس بستی پر حملہ کر دیا تھا مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ اب اس کے لئے میری بازیابی ممکن نہیں رہی تھی۔ میں تو اس بستی میں تھی ہی نہیں پھر بھلا وہ مجھے کیسے بازیاب کرتا؟ ہاں یہ ممکن تھا کہ اس بستی کی فتح آئندہ کامیابی کی راہ میں سنگ میل ثابت ہوتی لیکن لشکر سے میرا بچھڑ جانا خود میرے لئے کسی سانحے سے کم نہیں تھا۔ یوں وہ فتح بے معنی ہو کر رہ گئی تھی یقیناً مجھے تلاش کئے بغیر مہا پجاری کوئی اگلا قدم نہ اٹھاتا۔

موجودہ صورت حال میں میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں' کیا نہ کروں۔ وہ دونوں مجھے اس طرح اپنے درمیان میں لئے ہوئے تھے کہ ان سے بچنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ میری خواہش تھی اشر کی بستی سے اتنی دور نہ نکل جاؤں کہ واپسی ممکن نہ رہے۔ دھماکوں کی آوازیں بھی اب معدوم ہوتے ہوتے گم ہو گئی تھیں مجھے اب تک وہ موقع نہیں مل سکا تھا میں جس کی تلاش میں تھی۔

یہ میرے حق میں بہتر ہوا تھا کہ مصالحانہ رویے کی وجہ سے انہوں نے مجھے غیر مسلح کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا یا وہ مجھ پر زیادہ سختی کے حق میں نہیں تھے۔ میرے ساتھ نرمی کی وجہ صرف یہی ہو سکتی تھی

کہ ان کی دانست میں آئندہ میں' سردار ژیان کی بیوی بن کر ان کے کسی کام آ سکتی تھی۔

گھوڑے دوڑتے رہے اور ان سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ میرا ذہن کام کرتا رہا۔ مجھے اشر کی بستی بہت پیچھے رہ جانے کا پورا احساس تھا لیکن اس کے باوجود میں کسی ممکنہ موقع کی تلاش میں تھی اور یہ موقع مجھے خود قدرت نے فراہم کر دیا۔ میرا گھوڑا دن بھر سفر کرنے کی وجہ سے خاصا تھکا ہوا تھا۔ راستے میں ایک بڑے سے پتھر کی ٹھوکر لگنے سے وہ اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ گھوڑے نے جیسے ہی ٹھوکر کھائی میں نے اس کی پشت سے چھلانگ لگا دی۔ میں دائیں جانب ڈھلوان پر گری اور لڑھکتی چلی گئی پھر اسی وقت رکی جب ایک بڑی سی چٹان میری راہ میں حائل ہو گئی۔

ان دونوں محافظوں نے بھی یقیناً میرے گھوڑے کو ٹھوکر کھاتے دیکھا تھا کیونکہ وہ میرے ساتھ ساتھ ہی چل رہے تھے لیکن گھوڑے کی پشت سے اچھل کر میں کدھر گئی یہ شاید وہ نہیں دیکھ سکے اندھیرے میں یہ ممکن بھی نہیں تھا۔

نشیب سے وہ مجھے واضح طور پر نظر آ رہے تھے کیونکہ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں روشن تھیں۔ انہوں نے اپنے گھوڑے روک لئے تھے میں نے اب چٹان کی آڑ لے لی تھی اور ان میں سے ایک کا نشانہ لے رہی تھی۔ اس کے سوا اب میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ ان سے جان چھڑانے کے لئے انہیں اپنے راستے سے ہٹا دوں۔ جیسے ہی میں نے نشانہ لے کر فائر کیا عین اسی لمحے وہ محافظ اپنی جگہ سے آگے بڑھ گیا۔ یوں میری چلائی ہوئی گولی رائیگاں چلی گئی۔ اس سے ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ وہ دونوں چوکنا ہو گئے۔ ان دونوں ہی کو میں نے گھوڑوں کی پشت سے چھلانگ لگاتے دیکھا تھا۔ اسی دوران میں مَیں نے دوسرا فائر کر دیا تھا اور مجھے ایک چیخ سنائی دی تھی۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میری گولی نے اس شخص کا کام تمام کر دیا تھا یا وہ محض زخمی ہوا تھا۔ گھوڑوں سے چھلانگ لگاتے ہوئے ہی انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مشعلیں پھینک دی تھیں۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ مَیں نے اپنی طرف ایک شعلہ لپکتے دیکھا اور فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ میں نے ان پر دو گولیاں چلائی تھیں۔ انہوں نے یقیناً یہ اندازہ کر لیا تھا کہ فائر کس سمت سے ہوئے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے چٹان کی آڑ میسر آ گئی تھی ورنہ کوئی بھولی بھٹکی گولی میرا قصہ پاک کر سکتی تھی۔ مجھ پر ایک مرتبہ پھر فائر کیا گیا اور اس مرتبہ میں نے بھی سمت کا اندازہ کر کے جوابی فائر کر دیا۔

رات کے اندھیرے میں دو مسلح دشمن میری جان کے درپے تھے۔ اس معرکہ آرائی کا کیا نتیجہ نکلتا مجھے معلوم نہیں تھا۔

ہم ایک دوسرے پر فائر کرتے رہے مگر اس عرصے میں مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ان میں سے ایک جس کی چیخ میں نے سنی تھی یا تو مر چکا ہے یا پھر شدید زخمی ہے۔ جوابی فائر صرف ایک ہی شخص کر رہا تھا اور شاید وہ بھی آڑ میں تھا۔

کچھ دیر بعد میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس طرح بات نہیں بنے گی' مجھے اس شخص کو ٹھکانے

لگانے کے لئے کوئی اور راستہ سوچنا پڑے گا۔ معاً مجھے کھوکھلے پہاڑوں والا واقعہ یاد آگیا۔

"دھوکہ۔" میں زیر لب بڑبڑائی۔ میں اسے دھوکہ دے کر ہی اپنے راستے سے ہٹا سکتی تھی۔

پھر میں نے اس کی طرف فائر کیا جواب میں اس نے بھی گولی چلائی اسی کے ساتھ میں پوری قوت سے چیخ اٹھی دیر تک میری چیخ کی بازگشت سنائی دیتی رہی اس کے بعد کئی بار گولی چلائی گئی مگر میں نے جوابی فائر سے گریز کیا۔

آخرکار میں اس شخص کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ میں نے اسے کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی مشعل اٹھاتے دیکھا لیکن جلدبازی سے کام نہیں لیا اور دم سادھے اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ وہ مشعل ہاتھ میں اٹھائے نشیب میں اترنے لگا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں مشعل تھی اور دائیں ہاتھ میں اس نے رائفل تھام رکھی تھی۔ اس کا چہرہ مجھے واضح نظر آ رہا تھا' وہ پہلا محافظ ہی تھا۔ شاید وہ میری لاش دیکھ کر یہ یقین کرلینا چاہتا تھا کہ میں مرچکی ہوں یا اگر زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئی ہوں تو ہوش میں آنے سے پہلے مجھے باندھ لینا چاہتا تھا۔

اس کے اور میرے درمیان جب چند نیزوں کا فاصلہ رہ گیا تو میں نے اس کے سینے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ وہ اچھل کر گرا اور پھر نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ جسم اچھلنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھوں سے رائفل اور مشعل دونوں ہی چھوٹ گئی تھی۔

میں چٹان کی آڑ سے نکل آئی اور نشیب میں لڑھکتی ہوئی مشعل کو ایک پتھر سے ٹکرا کر رکتے دیکھا۔ میں احتیاط کے ساتھ نشیب میں اس جگہ پہنچ گئی اور مشعل اٹھالی۔ خاصے نیچے جہاں ڈھلان کا اختتام تھا وہاں میں نے اس شخص کے بے حس و حرکت جسم کو دیکھا اور کچھ دور ہی سے لوٹ آئی۔ میں نے ایک لاش دیکھ کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ میرا ایک دشمن ختم ہو چکا ہے۔ اب مجھے دوسری لاش کی تلاش تھی۔

اوپر پہنچنے کے بعد مجھے اپنا دوسرا دشمن بھی نظر آگیا۔ وہ اوندھا پڑھا تھا اور اس کے اردگرد خون پھیلا ہوا تھا۔ میں نے جھک کر اسے سیدھا کیا اور سینے کے خفیف سے زیر و بم کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ ابھی مرا نہیں تھا' زندہ تھا۔ اس کا سانس بہت آہستہ چل رہا تھا۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اب اس کا بچنا بھی مشکل ہی تھا۔ میں اسے مرنے سے نہیں بچا سکتی تھی سو سیدھی کھڑی ہو گئی۔ تینوں گھوڑوں میں سے ایک بھی مجھے آس پاس نظر نہیں آیا۔ وہ شاید فائرنگ سے بدک کر کسی طرف دوڑ گئے تھے۔ کسی سواری کے بغیر اس ویرانے سے کسی طرف جانا میرے لئے ناممکن ہی تھا۔ ان تینوں گھوڑوں میں سے کسی ایک کو تلاش کرنا میرے لئے بے حد ضروری تھا۔

اس کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ مجھے یہ مسئلہ بھی درپیش ہو سکتا ہے۔ قدرت نے مجھے میرے دونوں مسلح دشمنوں پر غلبہ دے دیا تھا لیکن سواری نہ ہونے کی وجہ سے میں قطعی بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ انہیں کہیں آس پاس ہی ہونا چاہئے' یہ سوچ کر میں گھوڑوں کی تلاش میں مشعل لئے ایک طرف چل دی۔ اس سمت خاصا فاصلہ طے کرنے کے باوجود جب مجھے کامیابی نہ ہوئی تو پلٹ کر دوسری سمت رخ کیا۔

تقریباً مزید ایک پہر رات گزرنے کے بعد مجھے کامیابی نصیب ہوئی مگر اب میں سمتیں بھول چکی تھی۔ مجھے قطعی اس سمت کا اندازہ ہی نہیں رہا تھا جدھر اشر کی بستی تھی۔ میں تو اب اس جگہ بھی واپس نہیں پہنچ سکتی تھی جہاں سے پیدل سفر کا آغاز کیا تھا۔

آخرکار میں اس گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گئی جسے بدقت تمام تلاش کیا تھا۔ بے سمت سفر میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا مگر اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ میں بھٹکتی ہوئی کہیں اپنے دشمن کے علاقے میں داخل نہ ہو جاؤں یا کسی اور مشکل میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ صنف نازک سے تعلق ہونا میرے لئے قدم قدم پر نئی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ اس پر میری نوجوانی اور حُسن نے اور بھی قیامت ڈھا رکھی تھی۔ اگر میں واجبی شکل و صورت کی کوئی لڑکی ہوتی تو شاید مجھے اس قدر دشواریاں پیش نہ آتیں۔

اس رات کا بقیہ حصہ ایک بے سمت و بے منزل سفر میں گزر گیا۔ میں نے دانستہ گھوڑے کو تیز نہیں دوڑایا تھا تاکہ وہ زیادہ نہ تھک جائے کیونکہ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ کب تک یہ سفر جاری رہتا۔

صبح کے آثار نمودار ہو گئے تو میں نے مشعل پھینک دی۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں جہاں تھی وہاں مجھے دور تک چھوٹی بڑی چٹانوں کے سلسلے میں پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ کچھ دیر گھوڑے کو ستانے اور اپنے اکڑے ہوئے جسم کو آرام دینے کی خاطر میں گھوڑے سے اتر گئی۔ ذرا فاصلے پر ایک بڑا پتھر نظر آیا تو میں اس پر جا کر دم لینے کو بیٹھ گئی۔

اب مجھے صحیح اندازہ ہو رہا تھا کہ جو لوگ اپنے قافلوں سے بچھڑ جاتے ہیں' ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔

سورج پوری طرح نکل آیا اور دھوپ ہر طرف پھیل گئی تو فضا میں دھیرے دھیرے تمازت بڑھنے لگی۔ میں سوچنے لگی کہ مجھے اس بے سایہ جگہ سے چل دینا چاہئے مگر کس طرف' اس سوال پر مزید سوچنے کی ضرورت تھی۔

سوچتے سوچتے اچانک میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ مجھے یاد آگیا کہ جب میرا لشکر اشر کی بستی کے قریب پہنچا تھا تو سورج پہاڑی درے کی دوسری جانب غروب ہو رہا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اشر کی بستی مغربی سمت میں تھی گویا جدھر سے سورج طلوع ہو رہا تھا مجھے اس کی مخالف سمت میں اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے تھا۔ اسی سمت اشر کی بستی کے ملنے یا ہونے کا امکان تھا۔

میں نے سوچا' قدرت نے سمتوں کے تعین کا بندوبست بڑی واضح علامتوں کے ذریعے کیا ہے جن میں کسی بھول چوک کا امکان نہیں۔ سمت کھو جانے یا بھول جانے کے باوجود ایک بار پھر مجھے سمت سفر مل گئی تھی۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

گھوڑے پر سوار ہو کر میں نے سورج کی مخالف سمت سفر کا آغاز کر دیا۔ اب میں نے گھوڑے کی رفتار بڑھا دی تھی۔ امید کی ایک کرن نمودار ہونے سے میرے اندر جوش پیدا ہو گیا تھا۔ اسی سمت سفر

کرتے کرتے میری راہ میں ایک پہاڑی چشمہ حائل ہو گیا۔ اب صبح سے دوپہر ہو چکی تھی۔ میں چشمے کے کنارے رک گئی۔ میں بھی پیاسی تھی اور میرا گھوڑا بھی۔ چشمے کے کنارے ہلکی سی روئیدگی بھی تھی۔ میری بھوک تو خیر نہیں مٹ سکتی تھی ہاں گھوڑے کا کچھ بھلا ہو سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے اپنی پیاس بجھا کر گھوڑے کو کچھ دیر کے لئے چرنے چھوڑ دیا۔ میرے سامان سفر میں ہتھیاروں کے علاوہ ایک چھوٹا مشکیزہ بھی تھا جو خالی ہو چکا تھا۔ وہ مشکیزہ میری کمر سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنی کمر سے کھول کر اس میں پانی بھر لیا۔

ابھی میں مشکیزے میں پانی بھر کے فارغ ہوئی تھی کہ سامنے سے اچانک ایک گھڑسوار کو چشمے کی طرف آتے دیکھا اور ٹھٹک گئی۔ وہ نووارد گھڑسوار میرے لئے کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اسی خیال کے تحت میں نے تیزی کے ساتھ شانے پر لٹکی ہوئی رائفل اتار کر ہاتھ میں لے لی۔

وہ گھڑسوار غیر مسلح نہیں تھا۔ مجھے رائفل سیدھی کرتے دیکھ کر اس نے بھی رائفل سنبھالنے میں دیر نہیں کی۔ گھوڑا دوڑاتا ہوا وہ چشمے کے دوسرے کنارے پر آ کر رک گیا۔ صورت حال یہ تھی کہ اس کی رائفل میری طرف اٹھی ہوئی تھی اور میری رائفل کا رخ اس کی جانب تھا۔

گٹھیلے جسم کا وہ گھڑسوار چبھتی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کون ہے تو؟"

"ایک مسافر۔" میں نے جواب دیا پھر اس سے سوال کیا۔ "اور تو کون ہے؟"

"میں بھی تیری ہی طرح سفر میں ہوں اس لئے مجھے بھی تو ایک مسافر ہی سمجھ سکتی ہے۔" گھڑسوار کا لہجہ معنی خیز تھا وہ یقیناً میرے بارے میں کچھ جاننے سے پہلے اپنے متعلق بتانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پہلا اجنبی شخص تھا جس کی نظریں میرے جسم کے مخصوص حصوں پر مرکوز نہیں تھیں یا پھر وہ اپنے دلی جذبات پوشیدہ رکھنے پر قادر تھا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے چہروں کے تاثرات اور حرکات و سکنات سے ان کے اندر کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ وہ اجنبی شاید ایسے ہی لوگوں میں سے تھا ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میرے قیامت خیز حسن کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

"تو اے مسافر! اپنی راہ لے۔" میں نے اس کی بات سن کر کہا۔ "ہاں اگر تجھے نائب سردار واہب کی بستی کا راستہ معلوم ہو تو مجھے ضرور بتا دے کیونکہ میں راہ بھٹک گئی ہوں۔" دانستہ میں نے سردار اثراں کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔

معلوم نہیں کیوں وہ اجنبی' واہب کا نام سن کر چونک اٹھا۔ پھر کہنے لگا۔ "تو مجھ سے مدد بھی چاہتی ہے اور میرے سینے کی طرف اپنی رائفل کی نال بھی اٹھا رکھی ہے۔" اس کی آواز میں چبھن تھی۔ "عجیب لڑکی ہے تو!"

میں نے اسے اعتماد میں لینے کی خاطر اپنی رائفل کی نال جھکاتے ہوئے کہا۔ "اور کیا تو نے بھی مجھ پر رائفل نہیں تان رکھی؟"

"یہ لے۔" اس نے رائفل اپنے شانے پر لٹکائی پھر گھوڑے کو ایڑ لگا کر چشمے میں اتر گیا۔ چشمہ اس جگہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ چشمہ عبور کر کے وہ میری جانب آ گیا اور گھوڑے سے اترتے ہوئے بولا۔

"واہب کی بستی کیوں جانا چاہتی ہے؟ کیا تجھے اس کا احساس نہیں کہ تو کتنی حسین ہے؟"

"تو اس سے کیا ہوا؟" میں جان کر انجان بن گئی حالانکہ اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

"اس سے یہ ہو گا کہ تجھے واہب کی حویلی میں قید کر دیا جائے گا اور پھر تو اسی وقت وہاں سے نکل سکے گی جب تیرے سرخ رخساروں پر زردی پھیل جائے گی' تیرا حسن ماند پڑ جائے گا اور تیری جوانی ڈھل جائے گی۔ وہ تجھے کسی رس دار پھل کی طرح نچوڑنے کے بعد اپنی حویلی کے باہر پھینک دے گا۔ وہ بڑی ہی خبیث روح ہے۔ تو شاید اس سے واقف نہیں ہے ورنہ کبھی ادھر جانے کو نہ کہتی۔" اجنبی شخص کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہا ہو وہ میرے قریب بیٹھ گیا تھا۔

"اے اجنبی! کیا تو مجھے خوفزدہ کرنا چاہتا ہے؟" میں بولی۔ "مجھے تو بس یہ بتا دے کہ تو واہب کی بستی کا راستہ جانتا ہے یا نہیں؟"

"جانتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر تجھے راستہ بتا کر یا وہاں تک تیری رہنمائی کر کے تجھ سے دشمنی نہیں کروں گا۔"

"بات یہ ہے اے میرے اجنبی ہمدرد کہ واہب کی بستی کے باہر جو پہاڑی چشمہ ہے وہاں میرا قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور مجھے اپنے قافلے تک پہنچنا ہے نہ میں نے واہب کو دیکھا ہے' نہ اسے جانتی ہوں اور نہ ملنے کی خواہشمند ہوں۔" میں نے نرمی سے اس اجنبی کو سمجھایا۔

"تیرا قافلہ وہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور تو یہاں اتنی دور بھٹک رہی ہے؟" اجنبی کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"دراصل میں گرد و نواح کا جائزہ لینے کے لئے کل شام ایک طرف نکل گئی تھی۔ جیسے ہی میں نے چشمے کے قریب موجود پہاڑی درہ عبور کیا کہ دیکھوں دوسری طرف کیا ہے مجھے مشعل بدست گھڑسواروں نے گھیر لیا۔" میں اس اجنبی کو حقیقت سے قریب تر کہانی سنا رہی تھی تاکہ اسے میرے بیان پر جھوٹ کا گمان نہ ہو۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اسے مزید بتایا۔ "پھر ان میں سے دو مجھے زبردستی اپنے ساتھ کسی اور بستی کی طرف لے جانے لگے تاکہ وہاں کے سردار کو خوش کرنے اور اس سے انعام پانے کے بعد مجھے اس کے پاس چھوڑ آئیں۔" میں نے دانستہ وادی سبز اور ژیان کا ذکر نہ کیا پھر بات کو مختصر کر دیا۔ "راستے میں ایک جگہ مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔"

"کیا ان دونوں نے تیرا پیچھا نہیں کیا؟ انہوں نے تجھے آسانی سے فرار ہو جانے دیا؟" اجنبی کی آواز سے اب بھی بے یقینی جھلک رہی تھی۔

"پیچھا کیوں نہیں کیا مگر میں ان کے ہتھے نہیں چڑھ سکی۔ رات کا اندھیرا میرا معاون ثابت ہوا۔" میں نے اندھیرے کو جواز بنایا۔ اس اجنبی کو میں یہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ دونوں میرے ہاتھوں مارے گئے۔

"ہوں۔" میری بات سن کر اجنبی نے گہرا سانس لیا' پھر بولا۔ "یہاں سے شمال کی طرف ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں میری بہن رہتی ہے۔ مجھے خبر ملی تھی کہ وہ بہت بیمار ہے۔ میں اس وقت اسی کو

دیکھنے جا رہا تھا۔ ہم جس جگہ موجود ہیں یہاں سے واہب کی بستی بہت دور ہے۔ تُو میری رہنمائی سے بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکے گی۔ تجھے وہاں تک پہنچانے کی صرف ایک ہی صورت ہے' اگر تُو اس پر راضی ہو تو میرے ساتھ میری بہن کی بستی تک چل۔ یہاں سے وہ بستی بس ایک پہر کے فاصلے پر ہے۔ شام ہوتے ہوتے ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ رات بھر میں اپنی بہن کے گھر رہ کر اور اس کی عیادت کرنے کے بعد کسی پہر تیرے ساتھ واہب کی بستی چلا چلوں گا اور پھر تجھے وہاں پہنچا کر اپنی بستی کی طرف لوٹ جاؤں گا۔ بول کیا کہتی ہے' چلنا ہے تجھے میرے ساتھ؟"

میں سوچ میں پڑ گئی۔ قدرت نے مجھے اس اجنبی کے روپ میں اشر کی بستی تک پہنچنے کے لئے راہبر عطا کر دیا تھا مگر اس راہبر کی ایک مجبور تھی۔ وہ براہ راست مجھے میری مطلوبہ منزل تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میں اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ پہلے وہ مجھے میری منزل تک پہنچا دے۔ یہی بہت تھا کہ اپنی بہن کی عیادت کرنے کے بعد اس نے مجھے اشر کی بستی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ میرے تذبذب کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مہا پجاری آخر کب تک میری وہاں واپسی کا انتظار کرتا؟ یہ ضروری نہیں کہ وہ میرے انتظار میں وہیں رکا رہتا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ واہب پر فتح پانے کے بعد وہ مشعل بردار محافظوں سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کرتا اور اسے حقیقت کا علم ہو جاتا۔ مہا پجاری کو جب یہ معلوم ہوتا کہ دو محافظ مجھے اپنے ساتھ لے کر وادی سبز کی طرف روانہ ہو چکے ہیں تو پھر اس کے وہاں مزید رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ فوری طور پر وہ میری بازیابی کے لئے وادی سبز کا رخ کرتا مگر یہ سب محض قیاسات ہی تھے۔ ضروری نہیں کہ سب کچھ اسی طرح پیش آتا جیسا میں نے سوچا تھا۔ کیا خبر جنگ کے دوران میں مشعل بدست دستہ مارا جاتا یا فرار ہو جاتا یا پھر کوئی اور ہی صورت پیش آتی پھر بھی یہ طے تھا کہ مہا پجاری میری گمشدگی کے بعد خاموش نہ بیٹھتا۔

"تُو کیا سوچنے لگی اے لڑکی!" اجنبی نے مجھے خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر مخاطب کیا اور میں چونک اٹھی۔ "میں زیادہ دیر تیرے ساتھ یہاں نہیں رک سکتا کیونکہ سورج ڈوبنے سے پہلے اپنی بہن کی بستی تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ تُو جلد کوئی فیصلہ کر' تجھے میرے ساتھ چلنا ہے تو چل ورنہ میں چلتا ہوں۔"

"کچھ دیر اور ٹھہر جا' میں ابھی تجھے جواب دیتی ہوں۔" میں نے سوچنے کے لئے کچھ اور وقت مانگا۔

"تُو نے سب کچھ تو بتا دیا مگر اپنا نام نہیں بتایا۔" اجنبی بولا۔ "ویسے تُو کہے گی کہ میں نے بھی اپنا نام کب بتایا ہے۔ تو سن میرا نام طریر ہے۔"

"اور اے طریر! میں آتون ہوں۔" میں نے بھی اس سے اپنا تعارف کرا دیا۔

"آتون۔" اس نے زیر لب میرا نام لیا۔ "اچھا نام ہے۔"

"اور تیرا نام بھی اے طریر!" اخلاقاً میں نے بھی تعریف کر دی۔

مزید کچھ دیر غور و فکر کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچی کہ مجھے طریر کے ساتھ روانہ ہو جانا چاہئے۔ یہاں بے مقصد رکے رہنا فضول ہی تھا یا اپنی منزل کی تلاش میں بھٹکنا بھی موجودہ حالات میں بے معنی تھا۔ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ میں بھٹکتی ہوئی اپنی منزل پر پہنچ جاتی۔

"اے طریر! میں تیرے ساتھ چلنے پر راضی ہوں۔" میں نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ میرے اس فیصلے کی بڑی وجہ طریر کا رویہ بھی تھا۔ عام مردوں کی طرح اس نے مجھے للچائی ہوئی نظروں سے اب تک نہیں دیکھا تھا۔

"تیرے پاس کھانے کو تو کچھ بھی نہ ہو گا آتون!" اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

"ہاں کچھ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور تُو یقیناً بھوکی بھی ہو گی؟"

"ہاں بھوکی بھی ہوں' کل شام میں نے اپنے قافلے والوں کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔" میں نے اس سے یہ بات نہیں چھپائی۔

"میں تو اپنے ہی لئے کھانا لے کر چلا تھا مگر تُو بھوکی ہے تو دونوں آدھا آدھا کھا لیں گے۔" طریر نے خلوص کے ساتھ کہا۔

"نہیں۔" میں نے انکار کر دیا۔ "تُو بھلا میری خاطر آدھے پیٹ کیوں کھائے؟"

"اس "کیوں" کا میں تجھے کیا جواب دے سکتا ہوں اگر ایسا ہی ہے تو پھر میں کیوں تجھے اپنے ساتھ اپنی بہن کے گھر لے جاؤں اور پھر کیوں تجھے واہب کی بستی تک پہنچاؤں؟ .... بول ہے نا ٹھیک بات! کیوں تو پھر کیوں؟" وہ یہ کہتے ہوئے آہستہ سے ہنس دیا اور اٹھ کر اپنے گھوڑے کی پشت سے ایک پوٹلی کھول لی۔ دوبارہ میرے قریب آ کر بیٹھنے کے بعد اس نے کہا۔ "چل آ! جو کچھ دیوتاؤں نے دیا ہے' اس پر شکر کرتے ہیں۔"

میرا کھانا پینا بچپن ہی سے الگ تھا۔ اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا یا ایک ساتھ کھانا خطرناک تھا۔ میں اسی لئے بولی۔ "تھوڑا سا کھانا مجھے الگ دے دے۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا مگر کچھ بولا نہیں اور جو میں نے کہا تھا اس پر عمل کر دیا۔ طریر نے میرے منع کرنے کے باوجود اپنا آدھا کھانا میری طرف سرکا دیا تھا۔ قدرت بھی اپنی مخلوق کو کس کس طرح رزق پہنچاتی ہے' میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ویرانے میں کچھ کھانے کو مل جائے گا مگر قدرت نے اس کا بندوبست کر دیا تھا۔ گزشتہ سارا دن سفر میں گزرا پھر ساری رات اور آدھا دن اسی حالت میں کٹا تھا مجھے آرام نہیں ملا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اسی لئے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ گہری نیند سو جاؤں..........!

"اب چل اٹھ جا اے آتون!" طریر نے مجھے مخاطب کیا۔ "ورنہ دیر ہو جائے گی اور ہم شام سے پہلے اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے۔"

کسلمندی دور کرنے اور نیند بھگانے کے لئے مَیں نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ مسلسل سفر نے مجھے بہت تھکا دیا تھا۔

ذرا سی دیر کے بعد میں طریر کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ کچھ دور چل کر اس نے اپنا رخ شمال کی طرف کر لیا۔ وقت کا جبر مجھے کہیں سے کہیں لے جا رہا تھا اور میرے اختیار میں بھی نہیں تھا۔ میں کسی

برگ آوارہ کی طرح ہوا کے رخ پر اڑی جا رہی تھی۔

کہیں بھی رکے بغیر ہمارا سفر جاری رہا اور ہم آخرکار ایک پہاڑ کے دامن میں آباد بستی تک پہ گئے۔ اس بستی میں داخل ہوتے ہی میرے دل میں ایک اندیشہ ابھرا کہ کہیں یہ بستی بھی ژیان کی حد مملکت نہ ہو؟ اسی اندیشے کے تحت میں نے طریر سے پوچھا۔ "یہاں کا سردار کون ہے اے طریر؟"

"کیا کرے گی تُو یہ معلوم کر کے؟" خلاف توقع اس نے چونک کر کہا۔

"بس یوں ہی پوچھ رہی ہوں۔ کیا تجھے کوئی اعتراض ہے بتانے میں؟" میں بولی اور طریر کے چہر کا جائزہ لینے لگی۔

"اس بستی کا بظاہر سردار تو ادل ہے مگر.........." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"مگر کیا؟ بتا۔"

کچھ جھجکتے ہوئے طریر نے بتا ہی دیا۔ "اصل سردار نضار ہے' ادل کو تُو نضار کا نائب سمجھ لے ہے۔ یہ بستی چند ہی برس پہلے نضار نے بسائی ہے۔ تجھے معلوم ہے' یہ نضار کون ہے؟" طریر نے سوال کر کے خود ہی اس کا جواب بھی دے دیا۔ "یہ اسی سردار اشر کا بہادر بیٹا ہے جس کی بستی پر اب ظالم سردار ژیان نے قبضہ کر لیا ہے اور وہاں اپنے ایک نائب واہب کو مقرر کر دیا ہے۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے جب بے رحم و سنگ دل ژیان کے حکم پر نیک اور دلیر اشر کو کھڑا کر کے اس کی گردن مار دی گئی اور پھر ہوئی گردن پر دہکتا ہوا لوہے کا توا رکھ دیا گیا۔ اشر کا بہادر بیٹا نضار مار کاٹ کرتا ہوا اپنے کچھ جاں نثار ساتھیوں کی مدد سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔"

میں بڑی توجہ سے طریر کی باتیں سن رہی تھی۔ نضار پر جو کچھ بیتی' وہ میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے بڑی حد تک مماثل واقعات تھے۔ یہ میری خوش بختی ہی تھی کہ اپنے دشمن کے دشمن کی بستی میں آ پہنچی تھی۔

"اگر سردار اشر کا بیٹا نضار ہی اس بستی کا اصل سردار ہے تو پھر اس نے ادل کو اپنی جگہ کیوں رکھا ہے؟" میں نے طریر سے سوال کیا۔

اسی وقت طریر نے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنے ہوئے ایک گھر کے سامنے اپنا گھوڑا روک مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔ "تیرے سوال کا جواب میں پھر دوں گا آ گھوڑے سے اتر آ اے آتون! یہ میری بہن ناشی کا گھر ہے۔"

میں طریر کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو دو بچوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ان میں سے ایک دس بارہ سالہ لڑکا تھا دوسری لڑکی جو لڑکے سے چھوٹی تھی۔ وہ دونوں طریر کو دیکھ کر کھل اٹھے۔ شاید وہ طریر کی بہن ناشی کے بچے تھے۔ وہ ہمیں ساتھ لئے ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گئے جہاں ایک بستر پر عورت لیٹی ہوئی تھی۔ چہرے ہی سے وہ بیمار معلوم ہو رہی تھی۔ وہی طریر کی بہن ناشی تھی۔ طریر کو دیکھ کر ناشی اٹھنے لگی۔

"نہیں اے ناشی! تُو لیٹی ہی رہ اور بتا کہ اب تیرا کیا حال ہے؟" طریر نے کہا۔

"ٹھیک ہوں بس۔" ناشی نے بجھی ہوئی سی آواز میں جواب دیا پھر طریر سے اپنے ماں باپ کا حال پوچھنے لگی۔

طریر نے ناشی کے سوال کا جواب دے کر اس سے میرا تعارف کرایا۔

اسی وقت باہر سے کسی مرد کے چیخنے کی آواز آئی۔ "ارے کہاں مر گئے سب؟"

"جا دیکھ' تیرا بابا آ گیا۔" ناشی نے اپنے بیٹے سے کہا۔

لڑکا بھاگتا ہوا باہر چلا گیا۔ ذرا ہی دیر کے بعد اس لڑکے کے ساتھ ایک دراز قد شخص کمرے میں داخل ہوا۔ طریر اس سے گلے ملا۔ وہ دراز قد شخص اس کی بہن کا شوہر تھا۔ گلے مل کر طریر نے میری طرف مڑ کر بتایا۔ "یہ ثمین ہے اور یہ.........."

"بتانے کی ضرورت نہیں' میں سمجھ گیا۔" دراز قد ثمین بھونڈے انداز میں ہنسا۔ "یہ تیری بیوی ہو گی اور تُو اسے اپنی بہن سے ملوانے لایا ہو گا!"

"نہیں اے ثمین! یہ ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے تُو غلط سمجھ رہا ہے۔" طریر نے کہا پھر مختصراً ثمین کو میرے بارے میں بتانے لگا۔

اس دوران میں ثمین بار بار میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں میں وہی آوارگی تھی جو مجھے ناپسند تھی' للچائی ہوئی سی ندیدی اور چبھتی ہوئی نظریں۔

ثمین مجموعی طور پر مجھے پسند نہیں آیا تھا مگر مجھے اس سے کیا لینا تھا میں نے اپنے دل کو سمجھایا' مجھے اس گھر میں ایک ہی رات تو گزارنا ہے۔ اس گھر میں بس دو ہی کمرے تھے۔ ایک کمرے میں طریر کے اور میرے سونے کا بندوبست کر دیا گیا۔ ہاتھ منہ دھو کر ہم نے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے ایک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں نے پانی پی کر برتن رکھا ہی تھا کہ طریر کی بھانجی نے برتن میں بچا ہوا پانی پینے کے لئے برتن اٹھا لیا۔ اس وقت میں کھانے کی طرف متوجہ تھی۔ ادھر اس بچی نے پانی کا برتن اپنے منہ سے لگانے کو اٹھایا ادھر میں نے جھپٹ کر برتن اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ بچی نہ جانے کیا سمجھی کہ ایک دم رونے لگی۔

"کیا ہوا اے آتون! تُو نے برتن کیوں چھین لیا؟" طریر نے حیران سا ہو کر مجھ سے پوچھا۔ ثمین بھی جو ساتھ کھانا کھا رہا تھا حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

مجھے ایسے ہی کسی سوال کی توقع تھی۔ میں نے اسی لئے بلا جھجک جواب دیا۔ "مجھے ایک ایسی خطرناک بیماری ہے کہ کوئی دوسرا شخص میرا جوٹھا پانی پی لے تو اسے بھی وہ بیماری لگ جاتی ہے۔ اس معصوم بچی کو میں نے اسی لئے اپنا جوٹھا پانی نہیں پینے دیا۔ اے طریر! تجھے شاید یاد ہو گا کہ راستے میں بھی میں تیرے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوئی تھی اور اس وقت بھی اپنے برتن میں نے تجھ سے الگ ہی رکھے ہیں۔ اس کی وجہ وہی خطرناک بیماری ہے اور میں نہیں چاہتی کہ کسی دوسرے کو مجھ سے یہ بیماری لگ جائے۔"

بچی کو ایک اور برتن میں پانی دے کر طریر مجھ سے بولا۔ "اے آتون! بظاہر تُو صحت مند و

تندرست ہی لگتی ہے!"

"ہاں، مگر اکثر بس اچانک ہی میرے منہ، ناک اور کانوں سے خون بہنے لگتا ہے پھر میں کافی دن بستر پر پڑی رہتی ہوں۔" میں نے بات بنائی اور سوچا طریر کا اور میرا ساتھ ہی کتنا ہے کہ میرا جھوٹ اس پر کھل جائے گا۔

رات کو سونے سے پہلے ثمین بھی اسی کمرے میں آ گیا جہاں میں اور طریر تھے۔ میں سمجھ گئی کہ ثمین کا مقصد آنکھیں سینکنے کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ میں اس وقت طریر سے نضار کے بارے میں باتیں کرنا چاہتی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ثمین وہاں سے چلا جائے تو یہ ذکر چھیڑوں، مگر وہ جلدی ٹلنے والا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے اسی لئے اپنا وہ سوال دہرایا جس کا جواب طریر نے نہیں دیا تھا۔

"اے آتون! نضار نے اس لئے ادل کو اس بستی کا سردار بنا رکھا ہے کہ عموماً وہ روپوش رہتا ہے۔ اسے ژیان کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ ژیان نے نضار کو گرفتار کرانے والے یا اس کا سر کاٹ کر لانے والے کے لئے ایک بڑا انعام مقرر کر رکھا ہے۔ اسی غرض سے اس کے جاسوس اور بھیدی ہر بستی میں موجود رہتے ہیں۔ کیا خبر کب کسی کے دل میں لالچ آ جائے اسی لئے نضار احتیاط سے کام لیتا ہے۔ اس کے بارے میں کبھی کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب کہاں ہوگا۔" طریر میرے سوال کا جواب دے رہا تھا۔ "اس کے علاوہ نضار کی روپوشی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ اس طرح روپوش رہ کر چھوٹے چھوٹے قبیلوں کو یکجا کر رہا ہے تاکہ ایک روز یہ تمام قبیلے اپنی چھوٹی چھوٹی رنجشیں بھلا کر ژیان کے خلاف متحد ہو جائیں جو کسی نہ کسی بہانے انہیں آپس میں لڑا کر کمزور کرتا رہتا ہے۔"

"کاش میں اشر کے اس بہادر بیٹے نضار سے مل سکتی۔" غیر ارادی طور پر یہ بات میرے منہ سے نکل گئی۔

"ادل اگر چاہے تو اے آتون! تیری ملاقات نضار سے ہو سکتی ہے۔" طریر بولا۔ "مگر تو اس سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟"

ظاہر ہے میں طریر کی بات کا صحیح جواب نہیں دے سکتی تھی اس لئے بات بنائی۔ "اس کی بہادری کے قصے سن کر میرا دل اس سے ملنے کو چاہتا ہے۔"

"تیری یہ خواہش پوری ہونا زیادہ مشکل نہیں اے آتون!" ثمین نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا تو میں اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"وہ کس طرح؟" میں نے ثمین سے سوال کیا۔

"میں تجھے کل صبح ادل سے ملوا سکتا ہوں۔ تو اگر نضار سے ملاقات کی کوئی مناسب وجہ ادل کو بتا سکی تو وہ تیری ملاقات نضار سے کرا دے گا لیکن صرف یہ وجہ جو تو نے بیان کی ہے، کافی نہیں ہے کیونکہ تو کل ہی صبح طریر کے ساتھ یہاں سے روانہ ہونے والی ہے ممکن ہے نضار سے ملنے کے لئے تجھے ادل کے کسی خاص نمائندے کے ساتھ اس بستی سے کہیں اور جانا پڑے یا یہیں چند روز رکنا پڑے۔" ثمین نے تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دیا۔

"یہ بتا اے ثمین کہ اگر میں پھر کبھی یہاں آؤں تو کیا تو سردار ادل سے مجھے ملوا سکتا ہے؟" کچھ سوچتے ہوئے میں نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں، ضرور!" ثمین نے وعدہ کیا۔ "کیا تیرا پھر کبھی ادھر آنے کا ارادہ ہے؟" یہ سوال کرتے ہوئے ثمین کے لہجے میں اشتیاق تھا جیسے وہ چاہتا ہو میں وہاں ضرور آؤں۔ "اگر تو آئی تو مجھے بے حد خوشی ہوگی تو میرے گھر کو اپنا گھر سمجھ سکتی ہے۔"

"تیرے خلوص کا شکریہ اے ثمین! ممکن ہے کہ جلدی ہی میں ادھر آؤں۔" میں نے کہا۔

"بس تو کوئی اچھا سا بہانہ نضار سے ملاقات کے لئے سوچ لے گی تو کام بن جائے گا۔" ثمین نے مجھے مشورہ دیا۔

ثمین کو خبر نہیں تھی کہ نضار سے ملاقات کے لئے مجھے کسی بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ادل کو اتنا ہی بتا دینا کافی ہوتا کہ میں وادی سبز کے مقتول سردار اشم کی بیٹی ہوں اس کی بیٹی جس کو قتل کر کے ظالم ژیان وادی سبز کا سردار بن بیٹھا تھا۔ مجھے اگر مہا پجاری تک پہنچنے کی جلدی نہ ہوتی تو سردار ادل سے ضرور ملتی اور پھر اس کے ذریعے نضار سے ملاقات کی کوئی سبیل نکل آتی۔

اب تک میرے علم میں جو حالات آئے تھے ان کی روشنی میں ژیان پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہو چکا تھا۔ اس پر ہاتھ ڈالنا اب آسان نہیں رہا تھا ایسی صورت میں ژیان کے ایک اور بڑے دشمن کو اپنے ساتھ ملا لینا دانشمندی ہوتی۔ نضار تن تنہا یقیناً ابھی اس قابل نہیں ہو سکا تھا کہ ژیان کا مقابلہ کر سکے۔ اس کے ساتھ اگر میری فوجی قوت بھی مل جاتی تو شاید ہم دونوں مل کر ژیان کو زیر کر سکتے۔

ثمین کبھی کا اٹھ کر جا چکا تھا اور مجھے طریر کے خراٹے بھی سنائی دے رہے تھے۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن پر بھی غنودگی طاری ہو گئی یوں بھی میں بے حد تھکی ہوئی تھی اور گزشتہ رات پل بھر کو بھی نہیں سو سکی تھی اس لئے جلد ہی غافل ہو گئی۔

اچانک مجھے دم گھٹنے کا احساس ہوا تو میری آنکھ کھل گئی۔ میرے منہ پر مضبوطی سے کسی کا ہاتھ جما ہوا تھا۔ اس شخص نے مجھے اپنے بازوؤں پر اٹھا رکھا تھا اور کمرے سے باہر صحن میں قدم رکھ رہا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا وہ بدنیت ثمین ہی تھا۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ مجھ پر دست درازی کی ہمت کرے گا۔

"اگر تو خاموش رہے تو میں تیرے منہ سے ہاتھ ہٹا لوں۔" ثمین نے میرے کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی کی۔ یقیناً وہ میرے مچلنے سے سمجھ گیا تھا کہ میں جاگ چکی ہوں۔ "اور سن! میرے پاس خنجر بھی ہے اگر تو نے منہ سے ہاتھ ہٹاتے ہی شور مچایا تو میں تجھے ذبح بھی کر سکتا ہوں۔" اس نے دھمکی دی۔

اب وہ مجھے صحن کے ایک گوشے میں لے آیا تھا۔ اس نے مجھے وہاں زمین پر لٹا دیا اور اسی کے ساتھ میرے منہ سے ہاتھ بھی ہٹا لیا۔ میں گہرے گہرے سانس لینے لگی پھر اس کے ہاتھوں کو جھٹک دیا جو میری طرف بڑھ رہے تھے۔

"دیکھ خاموشی سے مان جا! کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا ورنہ............" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ

کر نہ جانے کہاں سے خنجر نکال لیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ محض دھمکی نہیں دے رہا تھا اس کے پاس واقعی خنجر موجود تھا۔

اندر جس کمرے میں ثمین کی بیوی ناشی سو رہی تھی وہاں چراغ روشن تھا اور کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہاں سے کچھ روشنی صحن میں بھی آ رہی تھی مجھے اسی لئے نیم تاریکی کے باوجود کچھ نہ کچھ نظر آ رہا تھا۔

"اے ثمین! بدکاری سے باز آ جا اور اپنے بچوں پر رحم کر۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ "تو کیوں یہ کوشش کر رہا ہے کہ تیرے بچے یتیم ہو جائیں۔"

"تو مجھے دھمکی دے رہی ہے۔" وہ غرایا کسی درندے کی طرح اور پھر اس نے خنجر کی نوک میری گردن پر رکھ دی۔ "بول مرنا چاہتی ہے یا چپ پڑی رہنے پر راضی ہے؟" اس پر شیطان سوار تھا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سمجھانے بجھانے کی حد سے آگے نکل چکا ہے۔ ہوس نے اسے اندھا کر دیا ہے۔

"راضی ہوں مگر یہ خنجر تو میری گردن سے ہٹا لے۔" میں مصلحت وقت کے تحت بولی۔

"مجھے معلوم تھا......... معلوم تھا مجھے کہ تُو نخرے کر رہی ہے۔" اس کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی، اسے شاید اتنی جلدی اپنی کامیابی کا یقین نہیں ہو گا۔

اس نے خنجر میری گردن سے ہٹا لیا۔ مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا، میں اچھل کر ایک دم کھڑی ہو گئی اس نے مجھے پکڑنا چاہا مگر میں اسے دھکا دے کر اس کمرے کی طرف بھاگی جہاں طریر سو رہا تھا۔ جب تک وہ سنبھل کر میرے پیچھے بھاگا میں کمرے میں پہنچ کر اندر سے دروازے میں کنڈی ڈال چکی تھی۔

میرے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے جسم میں اپنا زہر اتار دیتی مگر اس پر میرا دل آمادہ نہ ہوا۔ میری آنکھوں میں اس کے دونوں معصوم بچوں اور بیمار بیوی کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ میں نے اسی لئے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا جو ممکن تھا۔ اگر وہ مجھے بھاگتے ہوئے دبوچ لیتا تو پھر مجبوری تھی۔ مجھے انتہائی قدم اٹھانا ہی پڑتا۔ اس سے قطع نظر ثمین کی موت میرے لئے کئی اور مسئلے بھی پیدا کر سکتی تھی۔ اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مجھے اس کے قتل کرنے پر گرفتار کر لیا جاتا۔ اگر ایسا بھی نہ ہوتا تو کم از کم آئندہ روز صبح طریر مجھے اشر کی بستی نہ لے جا پاتا۔ وہ اپنے بہنوئی کی آخری رسوم ادا کئے بغیر میرے ساتھ کیسے چل دیتا۔

دوبارہ سونے کے لئے مجھے خاصی دیر کروٹیں بدلنا پڑیں۔ بار بار میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم جاتا تھا جب ثمین نے میری گردن پر خنجر کی نوک رکھی تھی بہرحال جو کچھ بھی ہوا تھا بہتر ہی ہوا تھا۔ ثمین بھی رسوا ہونے سے بچ گیا تھا اور میری عزت و آبرو بھی محفوظ رہی تھی۔ طریر اسی طرح اس دوران میں گہری نیند سوتا رہا تھا جس طرح پہلے سو رہا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں ہوئی تھی کہ رات کے اندھیرے میں مجھ پر کیا واقعہ گزر چکا ہے۔

صبح جب سارے گھر والے ساتھ ناشتہ کر رہے تھے تو ثمین کی نگاہیں نیچی تھیں۔ وہ مجھ سے نظریں

چرائے جھک رہا تھا اور اس کی وجہ گزشتہ رات پیش آنے والا واقعہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے دل میں چور تھا۔ ناشتہ کرتے ہی ثمین اٹھ کھڑا ہوا۔ طریر نے بھی اس کی تقلید کی اور ثمین سے گلے ملا۔ چلتے وقت اس نے مجھ پر بھی ایک اچٹتی نظر ڈالی اور رخصتی کے انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر کہ طریر کو اس کے اور میرے درمیان کشیدگی کا علم نہ ہو، اخلاقاً جوابی انداز میں ہاتھ اٹھا دیا۔ ثمین نے جلدی ناشتہ کر لیا تھا حالانکہ ابھی ہم لوگ ناشتے سے فارغ نہیں ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ اسے سردار اول کی حویلی پہنچنا تھا جہاں دن کے پہریداروں کو اپنے فرائض سنبھالنا تھے۔ ثمین، سردار اول کی حویلی کے محافظوں میں سے ایک تھا۔ کچھ دنوں اسے رات کے وقت اپنے فرائض انجام دینا پڑتے تھے اور کچھ دنوں دن کے وقت۔ آج کل وہ دن کے وقت اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ رات کے محافظوں کو صبح تبدیل ہونا تھا اور دوسرے محافظوں کو ان کی جگہ سنبھالنا تھی۔ ثمین کو اسی لئے جلدی تھی یہ جاننے کے بعد مجھے امید ہو گئی تھی کہ ثمین باآسانی مجھے اس بستی کے سردار اول سے ملوا سکتا تھا۔ ناشتہ کرتے ہی میں اور طریر بھی روانگی کی تیاری کرنے لگے۔

طریر نے مجھے بتایا تھا کہ اس بستی سے اشر کی بستی تک کا سفر سارے دن کا تھا۔ اس نے اسی سبب سے راستے کے لئے کھانے پینے کا بندوبست کر لیا تھا۔ ہمارے گھوڑے صحن میں ایک جانب بندھے ہوئے تھے۔ ناشی سے رخصت ہو کر اور اپنے اپنے گھوڑوں کی لگام تھامے ہوئے طریر اور میں گھر کے دروازے سے نکلے ہی تھے کہ میں تیزی سے لپک کر ثمین کو ادھر آتے دیکھا اور چونک اٹھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کیا تھا۔

ثمین ہمارے قریب آیا تو اس کا سانس تقریباً پھولا ہوا تھا۔ اس نے معلوم نہیں کیسے ہمت کر کے رات کے بعد مجھے مخاطب کیا۔ "اے آتون! اگر تُو چاہے تو تیری آرزو پوری ہو سکتی ہے۔ یہ تیری خوش قسمتی ہے کہ نضار گزشتہ رات ہی یہاں آیا ہے۔ میں نے تیری خاطر سردار اول سے گزارش کی کہ میری مہمان عظیم نضار سے ملنے کی آرزو مند ہے، پہلے تو اول نے مجھے ٹال دیا مگر جب میں نے منت کی تو راضی ہو گیا۔"

قدرت نے نضار سے ملنے کا یہ بہت اچھا موقع فراہم کر دیا تھا۔ ثمین اس طرح شاید گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے کی تلخی کو کچھ کم کرنا چاہتا تھا ورنہ اس کو اول کی منت سماجت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں ثمین کے ساتھ سردار اول کی حویلی چلنے پر راضی ہو گئی۔

"اے طریر! تُو یہاں اپنی بہن کے پاس ٹھہر کر میرا انتظار کر، میں نضار سے مل کر ابھی آتی ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے اپنے گھوڑے کی لگام بھی اسے تھما دی۔

"جلد کرنا اے آتون! ہمارا سفر خاصا طویل ہے۔" طریر نے تاکید کی۔

"میں کوشش کروں گی کہ جلد لوٹ آؤں۔ تجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" میں بولی اور پھر ثمین کے ساتھ چل دی۔

راستے میں ثمین نے مجھے مخاطب کیا۔ "اے آتون! رات کے واقعے پر میں سخت شرمندہ ہوں مجھے

معاف کر دے‘ دراصل ناشی بہت دن سے بیمار ہے۔"

"تیری بیوی ناشی کی بیماری اور رات کو پیش آنے والے واقعے کا آپس میں کیا تعلق ہے؟" تیوریوں پر بل ڈال کر بولی۔ دراصل میں اس کی بات پوری طرح سمجھ نہیں سکی تھی ورنہ یہ سوال نہ کرتی۔

"دونوں باتوں کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے مگر تُو .... تُو شاید اس تعلق کو نہیں سمجھ سکے گی اے آتون! .... میں تو بس یہ چاہتا ہوں تُو مجھے معاف کر دے........."

"تجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا یہی کافی ہے۔ میں نے اور میرے دیوتاؤں نے تجھے معاف کیا۔" میں نے واقعی فراخ دلی کے ساتھ اسے معاف کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم پتھروں سے بنی ایک بلند عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ عمارت کے دروازے پر مسلح محافظ موجود تھے۔ انہوں نے مجھے روک لیا۔

"اے آتون! اپنے ہتھیار یہیں چھوڑ دے۔" ثمین نے مجھ سے کہا۔

میں نے اپنے بدن پر سجے سارے ہتھیار ایک ایک کر کے محافظوں کے حوالے کر دیئے۔ میرے لئے یہ کوئی غیر متوقع یا نئی بات نہیں تھی۔ عموماً سردار کے پاس ملنے کی خاطر جانے والوں سے ہتھیار ہی رکھوا لئے جاتے ہیں۔

وہ عمارت اندر سے بھی بہت صاف ستھری اور اچھی تھی۔ مجھے وادی سبز کی اپنی حویلی یاد آ گئی جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ وہ بھی اس حویلی کی طرح ہوا دار‘ روشن اور صاف ستھری تھی۔ میں ثمین کے ساتھ کئی راہداریوں سے گزر کر ایک بلند دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازے کے باہر مجھے ایک مسلح محافظ دکھائی دیا۔

"سردار ادل سے جا کر کہہ دے کہ میں اپنی مہمان کو اس سے ملوانے لے آیا ہوں۔" ثمین نے اس محافظ سے کہا۔

"ٹھیک ہے‘ تُو یہیں رک کر انتظار کر۔ میں سردار کو خبر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ محافظ دروازے پر پڑا ہوا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ باہر آ کر بولا۔ "اے ثمین! سردار نے ملاقات کی اجازت دے دی ہے‘ اپنی مہمان کو اندر بھیج دے۔"

"تُو جا اے آتون!" ثمین مجھ سے کہنے لگا۔ "میں یہاں تیری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

میں اثبات میں سر ہلا کر آگے بڑھی اور دروازے پر پڑا ہوا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ایک مسند پر تخیم شحیم شخص بیٹھا تھا۔ میں بطور تعظیم اس کے سامنے پہنچ کر جھکی۔ وہ بھاری آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے آتون! میں عظیم سردار نصار کا نائب ادل ہوں۔" میں اس کی زبان سے اپنا نام سن کر حیران ہوئی تو اس نے کہا۔ "مجھ سے اپنا نام سن کے حیرت نہ کر۔ ثمین نے مجھے تیرا نام اور تیرے بارے میں اسے معلوم تھا بتایا ہے۔ اب تُو مجھے بتا کہ عظیم سردار نصار سے تجھے کیوں ملنا ہے کہ اس سے تیری ملاقات کا سبب صرف اسے دیکھنا تو نہ ہو گا؟"

"اے عظیم سردار نصار کے نائب ادل! تُو ٹھیک کہتا ہے کیا تم نے سردار اشم کا نام سنا ہے؟"

"اس نیک اور بہادر سردار اشم کو کون نہیں جانتا۔" ادل چونک کر بولا۔ "اسی کو قتل کر کے محسن کش اور ظالم ژیان نے وادی سبز پر قبضہ کیا تھا۔"

"اور کیا اے ادل‘ تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مقتول سردار اشم کی کوئی بیٹی بھی تھی؟"

"ہاں‘ مجھے یہ بھی خبر ہے جس روز وادی سبز کے بڑے میدان میں سفاک ژیان نے رحم دل سردار اشم کی گردن کٹوائی اور پھر کٹی ہوئی گردن پر جلتا ہوا توا رکھوایا تو دیوتاؤں کا قہر جاگ اٹھا۔ دیوتاؤں نے کالی آندھی اور تند و تیز ہواؤں کے ذریعے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ دیوتاؤں سے رحم کی بھیک مانگنے کے لئے بستی کے لوگ سجدے میں گر پڑے۔ اسی دوران میں بستی کا مہا پجاری‘ سردار اشم کی آٹھ سالہ بیٹی کو لے کر غائب ہو گیا۔ مہا پجاری اور سردار اشم کی بیٹی نے عظیم سردار نصار کے عظیم باپ سردار اشر کی بستی دونوں اتحادی مخبروں نے یہ خبر ظالم ژیان تک پہنچا دی۔ ژیان نے سردار اشر کی بستی پر شب خون مارا۔ خیر......... یہ الگ بات ہے کہ کہیں مہا پجاری ملا نہ سردار اشم کی بیٹی‘ اس دن کے بعد آج تک ان دونوں کا کوئی پتا ہے تُو کہاں پر کیا گزری۔ آس پاس بسنے والے قبائل کا خیال ہے کہ ظالم و سنگ دل ژیان نے ان دونوں کو خاموشی کے ساتھ ٹھکانے لگوا دیا ہے۔ میں نے تجھ سے یہ تمام واقعات اس لئے بیان کئے اے آتون کہ تُو اس سلسلے میں مزید کوئی سوال نہ کرے اور جان لے‘ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اب تُو مجھے بتا اے آتون کہ ان واقعات سے تیرا کیا تعلق ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان واقعات سے تیرا کوئی تعلق نہ ہوتا تو مظلوم سردار اشم اور اس کی یتیم بیٹی کے بارے میں کوئی سوال نہ کرتی۔" نائب سردار ادل نے تفصیل کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات سے اپنی واقفیت کا ذکر کیا۔

"اے ادل! کیا تُو یقین کرے گا کہ اس وقت تیرے سامنے مظلوم و مقتول سردار اشم کی بیٹی کھڑی ہے؟" میں نے اس پر خود کو ظاہر کر دیا۔

"مگر جہاں تک مجھے علم ہے‘ سردار اشم کی بیٹی کا نام آتون نہیں کچھ اور تھا۔" ادل چونکتے ہوئے بولا پھر کہا۔ "کیا تُو یہ ثابت کر سکتی ہے کہ تیرا دعویٰ........."

اسی وقت اس کمرے کا اندرونی دروازے کا پردہ اٹھا اور ادل کی بات ادھوری رہ گئی۔ پردہ اٹھا کر ایک وجیہہ و پُرکشش نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کا قد لمبا اور سینہ چوڑا تھا۔ ادل نے اس طرف مڑ کر دیکھا اور آنے والے کو جھک کر تعظیم دی۔ میں بھی نووارد کی تعظیم میں جھک گئی۔ اس نوجوان کی شخصیت میں رعب و دبدبے کے ساتھ عجیب سی کشش تھی۔ اس کے روبرو خود ہی دل جھک جانے کی ترغیب دیتا تھا۔ کسی اور کا تو مجھے علم نہیں‘ ہاں اپنے بارے میں ضرور معلوم ہے۔ میری یہی کیفیت تھی۔ اس نوجوان کی عمر زیادہ نہیں تھی اور وہ احرس کا ہم عمر معلوم ہوتا تھا مگر بعد میں یہ بات غلط ثابت ہوئی وہ احرس سے سات آٹھ سال بڑا تھا۔ اس کی صحت اتنی اچھی تھی کہ وہ اپنی عمر سے خاصا چھوٹا لگتا تھا۔

"اس کے دعوے کا ثبوت .... اگر یہ سچی ہے تو اس کے دائیں شانے پر ہونا چاہئے اے ادل!" اس نوجوان نے کہا جو میرے اندازے کے مطابق سردار اشر کا بیٹا نصار ہی ہو سکتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو

ادل اسے تعظیم دینے کے لئے اپنی مسند سے نہ اٹھتا۔

میں نے مزید وقت ضائع کئے بغیر اپنا دایاں شانہ کھول دیا جس پر سانپ کا پھن گدا تھا۔ اس نے میرے قریب آکر نشان کا جائزہ لیا۔

"عظیم سردار اشر کا بیٹا' مظلوم و نیک دل سردار اشم کی بیٹی معبلہ کو خوش آمدید کہتا ہے۔" ہوئے نوجوان تعظیماً گھٹنوں کے بل میرے سامنے جھک گیا۔ اس کی تقلید میں ادل نے بھی جھک تعظیم دی۔ پھر اس نوجوان نے کہ جس کے سر کے بال شانوں تک بڑھے ہوئے تھے مجھ سے مسند کی درخواست کی۔

"شکریہ اے عظیم باپ کے بیٹے نضار!" یہ کہہ کر میں مسند کی طرف بڑھ گئی۔

نضار نے مجھے اتنا احترام دیا کہ خود میرے قریب مسند پر نہ بیٹھا اور اس کے نائب ادل نے بھی ہی کیا۔ وہ دونوں مسند کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے تھے پھر نضار مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔ "مجھے تک یاد ہے اے معبلہ کہ میرے بابا سے تُو نے ہی شب خون کی پیشگوئی کی تھی۔ مجھے خود بابا ہی بات بتائی تھی۔ میں بھی اپنے بابا کے ساتھ ہی جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ میں جب بابا کے ساتھ ڈھل جانے کے بعد حویلی لوٹ کر آیا تو وہاں تُو موجود نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ تُو حویلی کی کسی خادمہ ساتھ سیر کو نکلی تھی۔" نضار مجھے اس دن کا واقعہ بتا رہا تھا جب میں اس کی بستی سے فرار ہوئی تھی۔

بچپن کی باتوں اور یادوں میں بڑا جادو ہوتا ہے' یہ جادو اس وقت بھی میرے سر پر چڑھ کر بول تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ نضار یہی باتیں کرتا رہے۔ میں اسی لئے نضار کے خاموش ہوتے ہی بول اٹھی

"تو اے نضار! کیا تیرے عظیم باپ نے مجھے تلاش نہیں کرایا؟"

"کیوں نہیں۔" نضار نے بتایا۔ "تیری تلاش میں یہ راز بھی کھل گیا کہ مہا پجاری بھی غائب ہے پھر حویلی کی وہ ملازمہ بھی بے ہوشی کی حالت میں مل گئی تُو جس کے ساتھ سیر کو نکلی تھی۔ اسے پہاڑ درے میں بے ہوش پایا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ جب وہ تیرے ساتھ اس درے سے گزر رہی تھی تو کسی نے اس کے سر پر پیچھے سے ضرب لگائی اور پھر اسے کچھ خبر نہیں کیا ہوا تُو کہاں گئی۔ بابا کے حکم پر آس پاس کے علاقے میں تجھے تلاش کیا گیا مگر نہ تُو ملی نہ مہا پجاری کا کوئی سراغ ملا .... شاید .... یہ اچھا ہی ہوا اے معبلہ! ورنہ آج تُو زندہ نہ ہوتی۔ یقیناً ظالم ژیان تجھے اور مہا پجاری کو قتل کرا دیتا۔ اس رات ظالم ژیان نے ظلم و بربریت کی انتہا کر دی۔ اس نے صبح ہونے پر میرے بابا کے وفاداروں کو قتل کرایا اور پھر.........." نضار کی آواز بھرا گئی۔ "پھر مجھے معلوم ہوا کہ صبح ہوتے ہی میرے بابا کی گردن مار دی گئی اور .... اور اس کی کٹی ہوئی گردن پر.........."

"تُو اس وقت کہاں تھا؟" میں نے دانستہ نضار کی بات کاٹ دی۔

"صبح ہونے سے پہلے میں اپنے بابا کے چند جاں نثاروں اور اپنے کچھ وفادار دوستوں کے ساتھ بھڑتا بستی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔" نضار نے میرے سوال کا جواب دیا پھر مزید بتایا۔ "بستی پر ژیان نے قبضہ کر لیا اور اپنی جگہ اپنی ہی طرح ظالم ایک سالار واہب کو اپنا نائب مقرر کر دیا۔"

"کیا تُو نے واہب سے اپنے حق کے لئے جنگ نہیں کی اے نضار!"

"متعدد بار جنگ کی' مگر میں اس کی طاقت کو نہ توڑ سکا۔"

"اس کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں۔" نضار بولا۔ "قریبی دو بستیوں کے سرداروں نے بھی ژیان کی طاقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ ...نا ے ژیان نے یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ ان پر کسی دشمن کی طرف سے حملہ ژیان پر حملہ سمجھا جائے گا۔ ...ی کے ساتھ ژیان کے زیر نگیں کسی بھی علاقے پر حملے کو ان دونوں قبیلوں پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ ...نے تحفظ اور سلامتی کی خاطر دونوں قبائل نے ژیان سے اتحاد کر لیا ہے۔ جنگی نقطہ نظر اور محل وقوع ...ے اعتبار سے دونوں قبائل کا یہ اتحاد ہمیشہ ژیان کے نائب واہب کے لئے سومند ثابت ہوتا رہا ہے۔ عین ...رکہ کارزار کے وقت حملہ آور فوج پر عقب سے حملہ ہو جاتا ہے اور یہ حملہ کرنے والے دونوں اتحادی ...یلے ہوتے ہیں۔ اس طرح ہماری فوج دو طرف سے دشمن کے نرغے میں پھنس جاتی ہے۔ خیر.......... یہ ...نیں تو ہوتی رہیں گی اے معبلہ! تُو یہ بتا کہ اچانک یہاں کس طرح نمودار ہو گئی اور اتنے عرصے تُو کہاں ...ہی؟"

مختصراً میں نے نضار سے اپنی روداد بیان کر دی۔

"کاش' تُو مجھے پہلے مل گئی ہوتی۔" نضار کے لہجے میں تاسف تھا۔ "تُو نے اپنے لشکر کی جو گنتی بتائی ...ہے وہ ژیان یا اس کے زیر نگیں کسی علاقے پر حملہ کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ ہاں اگر تیری اور میری سپاہ ...یک ہو جائے تو شاید .... شاید ہم ژیان سے ٹکر لے سکیں مگر اب .... اب تیرے بیان کردہ ...اقعات کے مطابق میری آبائی بستی پر رات ہی مہا پجاری نے حملہ کر دیا ہو گا اور .... اور وہ ....دھوکہ کھا گیا ہو گا دیوتا اس کی مدد کریں۔"

"اے نضار! کیا تیرے خیال میں .... واہب کے مقابلے پر میرے لشکر کو شکست.........." میں ...نا جملہ پورا نہ کر سکی میری آواز بجھی ہوئی سی تھی۔ ذہنی طور پر میں اپنے لشکر کی شکست قبول کرنے پر ...آمادہ نہیں تھی۔

"تُو رنج نہ کر اے معبلہ!" نضار نے مجھے تسلی دی۔ "دیوتاؤں کی مرضی کے آگے کسی کی کچھ ...نہیں چلتی۔"

"میرا ارادہ طریر کے ساتھ ادھر جانے کا تھا اے نضار!" میں بولی۔ نضار کو میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے ضمن میں طریر کے متعلق بھی بتا چکی تھی مگر دانستہ گزشتہ رات کے واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا میں ثمین کو معاف کر چکی تھی۔ اگر نضار کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ثمین نے مجھ پر دست درازی کرنا چاہی تھی تو پھر ثمین کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی جو میں اب نہیں چاہتی تھی۔

"اب میں تجھے ادھر جانے کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گا اے معبلہ!" نضار نے میری بات سن کر کہا۔ "اب یہ معلوم کرنا کہ تیرے لشکر پر کیا گزری' میری ذمے داری ہے اور یہ ذمے داری بھی میری ہی ہے اے معبلہ کہ مہا پجاری کو خبر کر دی جائے تُو اپنوں میں ہے۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ جب

تک مہا پجاری اور تیرے لشکر کی کوئی خبر نہ مل جائے تُو یہیں قیام کر۔"

میں نے سوچا کہ مجھے نضار کی درخواست قبول کر لینا چاہئے۔ طریر کے ساتھ اشر کی بستی پہنچ مجھے مہا پجاری اور اپنے لشکر ہی کے بارے میں تو معلوم کرنا تھا یہ ذمے داری نضار نے سنبھال لی تو میرے بارے میں وہ مہا پجاری کو یہ اطلاع بھی پہنچا سکتا تھا کہ میں خیریت سے ہوں اور اپنے ہی خواہ میں ہوں۔ یہی سب کچھ سوچ کر میں نے نضار کو مخاطب کیا۔ "تُو نے جو کچھ کہا ہے اے نضار! مجھے منظور ہے مگر موجود حالات کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہے کہ میرا یہاں قیام راز میں رہے تُو بتا کہ اس کی صورت ہو؟"

کچھ دیر غور و فکر کے بعد نضار نے ایک تجویز پیش کی جو میں نے قبول کر لی۔ اس طرح اس بستی میں میرا قیام راز رہ سکتا تھا۔ پھر اسی تجویز کے مطابق میں فوری طور پر مسند سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نضار ادل اور میرے سوا کسی کو یہ خبر نہیں ہو سکی تھی کہ اس کمرے میں کیا باتیں ہوئی تھیں۔

میں اس کمرے کے دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر آئی تو ثمین کو اپنا منتظر پایا وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "بڑی دیر کر دی تُو نے آتون!"

"اچھا۔" میں نے یوں حیرت کا اظہار کیا جیسے مجھے دیر ہو جانے کا احساس نہ ہوا ہو۔

"ہاں اور کیا۔" وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "طریر بڑی بے چینی سے تیرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

ثمین کے ساتھ میں حویلی سے نکل آئی وہ مجھے چھوڑنے کے لئے اپنے گھر تک آیا اور رخصت ہوتے وقت کہنے لگا۔ "اے آتون! تُو نے کہا تھا کہ آئندہ ادھر ضرور آئے گی۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی اے ثمین! مجھے نضار سے ملنے یہاں آنا تھا' سو مل چکی۔" میں نے کہا۔

"پھر.......... پھر تو یہ اچھا نہیں ہوا اے آتون کہ .... کہ میں نے تجھے آج ہی نضار سے ملوا دیا۔" ثمین کے لہجے میں اداسی تھی۔ اس نے شاید ابھی میرے حصول کی آرزو کو اپنے دل سے نہیں نکالا تھا۔ اب وہ مجھ پر احسان جتا کر میری توجہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میں نے سوچا کہ اگر اسے آئندہ اس بستی میں میری آمد کی توقع سے خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو میرا کیا جاتا ہے کسی سے اس کی خواہشیں اور خواب نہیں چھیننا چاہئیں۔ یہی سوچ کر میں نے اس سے آئندہ آنے کا وعدہ کر لیا اور اس کے چہرے پر بہار سی آ گئی۔

"تُو بہت اچھی اور مہربان ہے اے آتون!" اس نے یہ کہتے ہی خلاف توقع میرا دایاں ہاتھ تھام لیا اور پھر اس پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے ثمین کا سارا وجود اس کے ہونٹوں میں سمٹ آیا ہوں

پھر اس سے پہلے کہ میں ثمین کی اس حرکت پر اپنے کسی ردعمل کا اظہار کرتی وہ تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اسی راستے پر چلا گیا جو ادل کی حویلی تک جاتا تھا۔ میں نے سوچا آدمی کسی طرح

خواہشوں کے کھلونوں سے بہل جاتا ہے یہی سوچتی ہوئی میں ثمین کے گھر میں داخل ہو گئی۔

طریر اندر اپنی بہن ناشی کے کمرے میں تھا۔ بچوں نے جب مجھے دیکھ کر میری آمد کا شور مچایا تو وہ باہر نکل آیا۔ اس نے بھی میرے دیر سے لوٹنے کی شکایت کی۔ "تُو نے بہت دیر کر دی اے آتون! اب ہمیں سورج غروب ہونے سے پہلے اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے تیز رفتاری کا ثبوت دینا پڑے گا۔"

ذرا ہی دیر کے بعد طریر کے ساتھ میں گھوڑے پر سوار اس بستی سے نکل رہی تھی۔

"رات کو وہاں رک کر ہی کل صبح میں اپنی بستی کے لئے روانہ ہو سکوں گا۔" طریر نے میرے ساتھ ساتھ اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے کہا۔

"تیری شب بسری کا انتظام وہاں ہو جائے گا۔" میں نے بات کو ٹالنے کے لئے کہہ دیا حالانکہ اب اس کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔

ہم دونوں کو سفر کرتے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک نقاب پوش گھڑسواروں کے ایک گروہ نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا انہوں نے اتنی مہلت بھی نہیں دی تھی کہ طریر اپنے شانے سے رائفل اتار سکتا پھر ان میں سے ایک نے طریر کے سینے پر اپنی رائفل کی نال رکھ دی۔

"کون لوگ ہو تم؟ .... کیا چاہتے ہو؟" طریر کی احتجاجی آواز بلند ہوئی۔

اسی لمحے ایک اور نقاب پوش نے عقب سے آ کر اپنی رائفل کا دستہ طریر کے سر کے پچھلے حصے پر مارا ہاتھ بڑا جچا تلا تھا' طریر اوندھے منہ اپنے گھوڑے کی پشت پر ڈھیر ہو گیا۔ ایک نقاب پوش جو میرے قریب ہی موجود تھا اس نے میری طرف ایک سیاہ نقاب اور بڑی سی ایک چادر بڑھا دی۔ میں نے نقاب اپنے چہرے سے لگا لی اور پھر چادر میں اپنا سارا جسم چھپا لیا۔ اب مجھے بحیثیت آتون پہچاننا مشکل تھا۔

طریر کو اسی حالت میں وہیں چھوڑ دیا گیا اور واپسی کا سفر شروع ہوا۔ بستی میں ہم اس مرتبہ عقبی سمت سے داخل ہوئے۔ بستی میں داخلے کے وقت صرف ایک نقاب پوش میری رہنمائی کے لئے ساتھ تھا۔ اس نے اب اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دی تھی اور یوں میرے آگے آگے چل رہا تھا جیسے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو۔

بحیثیت آتون گویا اب میں اسی بستی سے جا چکی تھی۔ طریر ہوش میں آنے کے بعد کچھ دیر مجھے آس پاس تلاش کرتا اور پھر بستی میں لوٹ کر اپنے بہنوئی ثمین کو میرے اغوا کی کہانی سناتا اور بس۔ پھر تو اسے اپنی بستی کے لئے روانہ ہو ہی جانا تھا۔

حویلی کے عقبی راستے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق میں اندر پہنچ گئی۔ اپنا گھوڑا حویلی کے عقبی دروازے پر میں نے اس شخص کے حوالے کر دیا تھا جس نے یہاں تک میری رہنمائی کی تھی۔ حویلی میں داخل ہوتے ہی ایک خادمہ نے مجھے ایک اندرونی کمرے میں پہنچا دیا۔ وہاں نضار میرا منتظر تھا۔

"اے معبلہ! کوئی دشواری یا پریشانی تو نہیں ہوئی یہاں تک آتے ہوئے؟" نضار نے خادمہ کے جاتے ہی پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے چادر اتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں اس بے چارے طریر پر

مجھے ضرور رحم آیا جسے زخمی اور بے ہوش کر کے بستی سے باہر چھوڑ دیا گیا۔"

"مجبوری تھی ورنہ ایسا نہ کیا جاتا۔" وہ بولا۔

"میں سمجھتی ہوں' یہ بتا کیا اشر کی بستی کی طرف تیرے قاصد روانہ ہو گئے؟" میں نے دریافت کیا۔

""ہاں اے معبلہ! دو قاصدوں کو روانہ کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ تیری ہدایت پر ان سب محافظوں کو بھی تبدیل کر دیا گیا ہے جنہوں نے آتون کی حیثیت سے تجھے اس حویلی میں آتے دیکھا تھا اور ... میں ثمین بھی ہے۔ اب ان محافظوں میں سے کسی کو حویلی میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔" نضار نے بتایا پھر کہنے لگا۔ "اول تجھے حویلی میں موجود خواتین سے ملوا دے گا' وہ بھی اگر تیری مرضی ہوئی۔ ورنہ کسی کو بھی سوائے چند خادماؤں کے حویلی کے اس حصے میں آنے کی اجازت نہیں ہو گی۔"

"کیا تُو بھی اے نضار انہی میں شامل ہے جو ادھر نہیں آ سکتے؟" میں مسکرا کر بولی۔

"اگر تیری اجازت نہ ہوئی تو میں بھی اس طرف نہیں آؤں گا۔" اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"کب تک تیرے قاصدوں کے لوٹنے کی امید ہے؟" میں نے پوچھا۔

"انہیں تیز رفتاری سے جانے اور واپس آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کل صبح تک انہیں لوٹ آنا چاہئے۔"

"تُو اس بستی کے علاوہ اور کہاں رہتا ہے؟"

"یہ تو اے معبلہ راز کی بات ہے تجھے اتنی آسانی سے کیسے بتا دوں۔ کیا خبر تُو ثریان سے انعام لینے کی خاطر مجھے گرفتار کرا دے یا میرا سر کاٹ کر اس کی خدمت میں جا کے پیش کر دے' ہے نا!" یہ کہہ کر وہ ہنس دیا پھر سنجیدہ ہو کر بتایا۔ "اس بستی کے علاوہ ایک اور چھوٹی سی پہاڑی بستی ہے اور اسے بھی میں نے ہی بسایا ہے۔ وہاں بھی میرا ایک نائب احزم مقرر ہے جو بہت ہوشیار اور عقلمند ہے اور اس کے نام کے معنی بھی ہوشیار و عقلمند کے ہیں تو یقیناً اس سے مل کر خوش ہو گی۔ سو میں کبھی وہاں اور کبھی یہاں رہتا ہوں مگر شہرت یہی دی گئی ہے کہ میں ان دونوں ہی بستیوں میں عموماً نہیں ہوتا اور اپنا زیادہ تر وقت غاروں میں رہ کر گزارتا ہوں۔"

"مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟ کیا تجھے تیری دونوں بستیوں کے باسی پہچانتے نہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"پہچانتے ہیں کیوں نہیں' مگر بظاہر وہ مجھے ان بستیوں میں آنے کے بعد جاتا ہوا بھی دیکھتے ہیں جس طرح آج شام کو دیکھیں گے۔" نضار نے وضاحت کی۔ "آج شام بظاہر میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ بستی والے مجھے میرے حفاظتی دستے کے ساتھ یہاں سے جاتے دیکھیں گے اور پھر میں رات کو کسی وقت دوبارہ اسی حویلی میں لوٹ آؤں گا۔ میں نے تجھے اسی لئے تو اپنا آزمودہ نسخہ فوراً بتا دیا تھا۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔ "اسے تُو میری روپوشی کا زمانہ کہہ سکتی ہے میں پھر حویلی سے باہر نہیں نکلتا اور حویلی میں میری موجودگی کا علم بھی اول اور میرے چند خاص محافظوں کے سوا کسی اور کو نہیں ہوتا' اب سمجھ گئی تو؟"

"ہاں سمجھ گئی تُو بھی مجھے اپنے نائب احزم سے کم ہوشیار اور عقلمند نہیں لگتا۔" میں ہنس کر بولی۔

"اسی ہوشیاری و عقلمندی کی وجہ سے دیوتا مجھ پر مہربان ہیں ورنہ تو مجھ پر کئی بار قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔ میری روپوشی کی ایک بڑی وجہ یہ قاتلانہ حملے بھی ہیں۔ غریب لوگ انعام کے لالچ میں آ جاتے ہیں۔" نضار نے بتایا۔

معلوم نہیں کیوں غیر ارادی طور پر ایک سوال میری زبان پر آ گیا۔ "یہ بتا اے نضار کہ تیری کتنی بیویاں ہیں؟"

"ایک بھی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" مجھے اس کے جواب پر حیرت ہوئی۔ "کیا تجھے اور دوسرے سرداروں کی طرح بیویاں رکھنا پسند نہیں؟"

"اس کی ایک وجہ ہے اے معبلہ!" یہ کہتے ہوئے اس نے گہرا سانس لیا۔

"کیا وجہ ہے؟" جب وہ کچھ دیر چپ ہی رہا تو میں نے پوچھا۔

"میں نے عہد کیا ہے اے معبلہ کہ جب تک ظالم ثریان سے میں اپنے بابا کے قتل کا بدلہ نہیں لے لوں گا اور اس کی کٹی ہوئی گردن پر بھی دہکتا ہوا توا رکھا نہیں دیکھ لوں گا مجھ پر زندگی کا عیش حرام ہے۔" یہ کہتے ہوئے نضار کی آواز جوش سے بھر گئی۔

"تجھے یقیناً یہ سن کر خوشی ہو گی اے نضار کہ ایسا ہی منظر دیکھنے کی آرزو مجھے بھی ہے۔ میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے اپنے بابا پر یہ ظلم ہوتے دیکھا ہے۔ اے نضار! یقین کر کہ آج تک وہ ہولناک منظر میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔" میری آواز بھرانے لگی۔ پھر میں نے بھی جوش میں آ کر نضار کے روبرو عہد کیا۔ "گواہ رہنا اے نضار کہ جب تک میری آنکھیں ثریان کا سر کٹ کر گرتے ہوئے نہیں دیکھ لیں گی اپنے شوہر کی شکل نہیں دیکھیں گی۔"

"دیوتا تجھے تیرے کئے ہوئے عہد پر قائم رہنے کا حوصلہ عطا کریں اے معبلہ!" نضار نے بڑے خلوص سے مجھے دعا دی۔

کچھ دیر کو کمرے میں بوجھل سا سکوت طاری ہو گیا۔ میں بھی اپنی سوچ میں گم تھی اور نضار بھی معاً میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا اور زبان تک آ گیا۔ "ثریان کو بھی یقیناً یہ خبر ہو گی کہ تُو ہی ان دونوں بستیوں کا اصل سردار ہے اول اور احزم تیرے ہی نائب ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ وہ تیری بستیوں پر حملہ نہیں کرتا؟" میری نظریں اس کے وجیہہ چہرے پر مرکوز تھیں۔

"وہ خود کو غاصب' ظالم اور جارحیت پسند کہلوانا نہیں چاہتا۔ سن اے معبلہ! کوئی بھی چھوٹا بڑا قبیلہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی قبیلے کی بستی پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا جائے یا بلا سبب کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلے پر ٹوٹ پڑے۔ ہوا یہ کہ ثریان نے برسر اقتدار آتے ہی وادی سبز کے اردگرد جو چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں ان پر قبضہ کر لیا اور پھر وہاں اپنے نائب مقرر کر دیئے۔ اس سے پہاڑی بستیوں میں آباد

قبائل' ژیان کے خلاف ہونے لگے پھر اس سے پہلے کہ یہ مخالفت بڑھ جاتی ژیان نے ان قبیلوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا اور خود کو امن پسند ظاہر کرنے لگا۔ ژیان کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ تمام قبائل متحد ہو کر اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ اب اس نے گزشتہ کئی سال سے عہد نامہ امن کا ڈھونگ رچا کر چھوٹے قبائل کو اپنا ہمنوا بنانا شروع کر دیا ہے۔ سو اے معبلہ! میری بستیوں پر براہ راست حملہ نہ کرنے کا یہی سبب ہے۔" نضار نے تفصیل کے ساتھ ان بستیوں کی سیاست اور حالات سے آگاہ کیا۔

"مگر میں نے ایک بات اور سنی تھی کہ تُو نے دو سال پہلے اس کے نائب واہب پر حملہ کیا تھا تو پھر قبائل تیری طرف سے برگشتہ کیوں نہیں ہوئے؟"

"اس لئے اے معبلہ کہ تمام ہی قبیلے اس بستی پر میرا حق تسلیم کرتے ہیں۔ میں تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ متعدد بار اپنے حق کی خاطر جنگ کر چکا ہوں۔"

"جب تمام قبیلے تیری اس آبائی بستی پر تیرے حق کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر تیرا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟"

"اکثر تو ژیان کے ساتھ عہد نامہ امن کی وجہ سے مجبور ہیں اور جو دوسرے ہیں' وہ اپنی سلامتی کی خاطر پرائی آگ میں کودنا نہیں چاہتے۔"

انہی مسائل پر نضار سے گفتگو کرتے ہوئے دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ ادل نے خود آ کر کھانے کے لئے پوچھا۔

"اے ادل! خادماؤں کو ہدایت کر دے کہ معبلہ کے زیر استعمال برتن الگ رہیں گے۔" نضار نے ہدایت دی۔

"تجھے ابھی تک یہ بات یاد ہے اے نضار!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں یاد ہے پہلے تُو میرے بابا کی مہمان تھی اور اب برسوں بعد میری مہمان ہے مگر پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی ہیں کسی شب تُو خاموشی کے ساتھ یہاں سے بھی تو غائب نہیں ہو جائے گی؟ یہ سمجھ لے اے معبلہ کہ ایک بار تُو اپنا اعتماد کھو چکی ہے۔" نضار یہ کہہ کر ہنسا۔

"اس مرتبہ تجھے بتا کر جاؤں گی۔" میں بھی ہنسنے لگی۔

پھر ہم تینوں نے کھانا کھایا۔ میرے برتن الگ ہی تھے۔ کھانا کھا کر وہ دونوں چلے گئے اور میں آرام کرنے بستر پر لیٹ گئی۔ ابھی میری تھکن پوری طرح اتری نہ تھی گزشتہ رات بھی ثمین کے گھر میں پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے رات کا بڑا حصہ بے آرامی ہی میں گزرا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جلد ہی میرے ذہن پر غنودگی چھانے لگی ابھی میری آنکھیں بند ہی ہوئی تھیں کہ مجھے آشنا پُراسرار سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔

سرگوشیوں میں مجھے ایک خطرے سے آگاہ کیا گیا مگر وہ خطرہ میرے لئے نہیں تھا۔ سرگوشیوں میں مجھ سے کہا جا رہا تھا۔ "سن اے معبلہ! اسی بستی کے ایک گھر میں نضار کے قتل کی سازش ہو رہی ہے۔ تُو اس سازش کو ناکام بنا سکتی ہے۔ آج شام جب نضار بظاہر اس بستی سے رخصت ہونے کے لئے اپنے

محافظ دستے کے ساتھ حویلی سے نکلے گا تو ژیان کا ایک پروردہ سفاک شخص انتہائی مہلک اور خطرناک زہر میں بجھا ہوا تیر نضار کے جسم میں پیوست کر دے گا۔ اس سے نضار موقع ہی پر ہلاک ہو جائے گا یا یوں سمجھ کہ ہلاک ہو سکتا ہے۔ اے معبلہ! تُو اپنے محسن نضار کو اس ممکنہ قاتلانہ حملے سے بچا لے کہ ایسا تیرے اختیار میں ہے۔"

"مگر کس طرح؟" میں جیسے خواب کے عالم میں بڑبڑائی۔

"اس طرح کہ تُو اس قاتل کا چہرہ دیکھ لے اور اپنی آنکھوں سے بستی کے اس گھر کو بھی دیکھ لے جہاں وہ قاتل چھپا ہوا ہے۔ وہ قاتل گزشتہ روز ہی اس بستی میں وادی سبز سے آیا ہے۔ ژیان کے مخبروں نے اسے خبر دی تھی کہ جلد ہی نضار وہاں پہنچے گا مگر وہ دن کے اجالے کی بجائے رات کو آیا اور قاتل کو اس پر قاتلانہ حملے کا موقع نہیں مل سکا۔ یہاں وہ قاتل اسی بستی کے ایک شخص کے گھر میں آ کر ٹھہرا ہے اور یہ شخص' ژیان کا مخبر ہے۔ تُو اس کا چہرہ بھی دیکھ لے پہچان لے۔" سرگوشیاں بند ہو گئیں اور پھر میں نے جیسے ایک سچا خواب دیکھا۔

میں خود کو حویلی کے دروازے سے نکلتے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دور سیدھا چلنے کے بعد میں سیدھے ہاتھ ہی کو مڑ گئی پھر میں نے ایک چھوٹا سا میدان عبور کیا۔ وہ میدان عبور کر کے میں بائیں جانب ایک گلی میں داخل ہوئی اور دائیں جانب بنے ہوئے ایک کچے گھر میں پہنچ گئی۔ اس گھر کی ایک کوٹھری میں تندرست اور مضبوط جسم والا شخص لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہی وادی سبز کا وہ جلاد تھا جس نے میرے بابا کی گردن ماری تھی۔ گزشتہ برسوں کے دوران میں اس کے اندر صرف اتنی تبدیلی ضرور ہوئی تھی کہ اس کے سر پر نظر آنے والے بڑے بڑے بال بڑی حد تک سفید ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھیں برسوں پہلے کی طرح اب بھی سرخ اور ڈراؤنی تھیں۔ پھر اسی کوٹھری میں مجھے ایک اور داڑھی والا داخل ہوتا دکھائی دیا۔

"یہی ہے ژیان کا مخبر!" مجھے ایک بار پھر پُراسرار سرگوشی سنائی دی۔ "جس بستر پر قاتل اس وقت دراز ہے اسی کے نیچے زہر میں بجھا وہ تیر رکھا ہے جس سے نضار پر قاتلانہ حملہ کیا جانے والا ہے۔ آ اے معبلہ! اب واپس چل اور ایک بار پھر اس گھر تک پہنچنے کا راستہ دیکھ لے۔"

پھر جس طرح میں اس گھر تک پہنچی تھی اسی طرح واپس ہوئی۔ مجھے اس گھر کا راستہ یاد ہو گیا۔

چند ہی لمحوں بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اپنے حواس پر قابو پانے میں کچھ وقت لگا چلتے ہوئے ادل مجھے بتا گیا تھا کہ اس کمرے کے باہر ایک خادمہ موجود ہے اور جب بھی ضرورت ہو میں اسے طلب کر سکتی ہوں۔ میں اٹھی اور کمرے کے دروازے سے نکل کر خادمہ کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دروازے سے کچھ دور راہداری میں مستعد چوکنا کھڑی تھی۔ میرے اشارہ پر وہ لپک کر آ گئی۔

"جا اور نضار کو اسی وقت میرے پاس بلا کر لا۔" میں نے خادمہ کو حکم دیا۔

"وہ تو اس وقت سو رہا ہے اے محترم خاتون!" خادمہ بولی۔ شاید اسے پردہ پوشی کی خاطر میرے نام

سے ناآشنا رکھا گیا تھا۔

"اور ادل؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ بھی اپنی خلوت گاہ میں جا چکا ہے۔"

"جگا دے .... ان دونوں کو جا کر جگا دے اور ان سے کہہ دے کہ میں نے اسی وقت انہیں بلایا ہے۔" میری آواز پُرجوش تھی۔

"بہتر ہے اے معزز خاتون!" خادمہ نے ادب سے سر جھکایا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی تقریباً دوڑتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

نصار اور ادل کو میرے پاس پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے ان دونوں کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا مگر اپنی معلومات کا ذریعہ نہیں بتایا۔ وہ دونوں میری بات سن کر کچھ دیر کو گنگ سے ہو کر رہ گئے۔

"مگر اے معبلہ! اتنی بڑی بستی میں یہ کس طرح معلوم ہو گا کہ وہ گھر کون سا ہے جس میں قاتل چھپا ہوا ہے؟ اس قاتل اور اسے پناہ دینے والے ژیان کے مخبر کو کیسے پہچانا جا سکتا ہے؟" آخرکار نصار کی آواز نے سکوت توڑا۔

"وہ قاتل وادی سبز سے یہاں آیا ہے اور میں اسے اچھی طرح پہچانتی ہوں اے نصار! یہ وادی سبز کا وہی جلاد ہے جس نے ژیان کے حکم پر میرے بابا کی گردن کاٹی تھی۔ میں اس قاتل اور ژیان کے مخبر کی نشاندہی کروں گی۔ تجھے میں اس گھر تک لے جاؤں گی جہاں وہ قاتل چھپا ہوا ہے۔"

"مگر اس طرح اے معبلہ! تُو چھپی نہ رہ سکے گی اور یہ اچھا نہیں ہو گا۔" نصار بولا۔ "تجھے کسی بھی قیمت پر حویلی سے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔"

"میری جان' تیری جان سے زیادہ تو نہیں اے نصار!" میں نے پُرجوش آواز میں کہا۔ مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ نصار پردہ پوشی برقرار رکھنے کے لئے میرا حویلی سے باہر قدم رکھنا منظور نہیں کرے گا۔ میں اسی لئے پہلے ہی اس مسئلے کا حل سوچ چکی تھی وہی حل میں نے نصار کو بتا دیا۔

"ہاں' یہ ممکن ہے۔" نصار نے رضامندی ظاہر کر دی۔ ادل نے فوری طور پر ضروری بندوبست کر دیا۔

پھر جب کچھ ہی دیر کے بعد میں نصار اور اس کے محافظ دستے کے ساتھ حویلی سے باہر نکل رہی تھی تو شاید مجھے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کوئی لڑکی ہوں۔

میرے جسم پر ڈھیلا ڈھالا لباس تھا اور سر کے بال پگڑی میں چھپے ہوئے تھے۔ میں' نصار کے محافظ دستے ہی کا کوئی نوعمر و نوجوان محافظ معلوم ہو رہی تھی۔

جلد ہی میں ان لوگوں کو لے کر اس کچے گھر تک پہنچ گئی جسے میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ وادی سبز کے جلاد اور اسے پناہ دینے والے ژیان کے مخبر کو چوہوں کی طرح گھیر کر پکڑ لیا گیا۔ میں نے وہاں سے وہ زہر میں بجھا تیر بھی برآمد کر لیا جو بستر کے نیچے چھپا ہوا تھا۔

ان دونوں کو حراست میں لے کر ہم حویلی لوٹ آئے پھر میرے ایما پر اسی شام بستی کے باہر میدان بستی والوں کو جمع کیا گیا۔ میں بدستور مردانہ لباس میں نصار کے محافظ دستے میں شامل تھی ساری بستی میں پہلے ہی یہ اعلان کیا جا چکا تھا کہ سردار نصار پر قاتلانہ حملہ کرنے کی غرض سے آنے والے ایک شخص کو سزا دی جائے گی۔ لوگوں کے سامنے سزا دینے کا مقصد دوسروں کو عبرت دلانا تھا مگر اس کا ایک مقصد اور بھی تھا جس سے میرے علاوہ نصار اور ادل ہی واقف تھے۔ اس طرح شاید میں اپنے سینے میں بھڑکتے ہوئے انتقام کے شعلوں کو خون کے چھینٹوں سے وقتی طور پر کچھ سرد کرنا چاہتی تھی۔

نصار نے جو تخت پر بیٹھا تھا' اس شخص کی فرد جرم بیان کی جو زنجیروں میں جکڑا سر جھکائے سامنے کھڑا تھا۔

میدان کے بیچوں بیچ چولہے پر لوہے کا توا دہک کر سرخ ہو چکا تھا۔ اس بستی کے لوگوں کے لئے وہ "تماشا" بالکل نیا تھا۔ چولہے کے پاس چمٹے لئے دو محافظ موجود تھے جنہیں پہلے ہی میں نصار کے ذریعے ضروری ہدایات دے چکی تھی کہ انہیں کب کیا کرنا ہے۔

پھر اس جلاد کو پچھاڑ کر اس کے سر کے بال کاٹ دیئے گئے اور گدی صاف کر دی گئی۔ اس کے بعد گردن کے پچھلے حصے پر سفید نشان لگا دیا گیا شاید وہ شخص سمجھ چکا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہولناک واقعہ پیش آنے والا ہے۔

"آخری رسم ادا کی جائے۔" نصار کی آواز بلند ہوئی۔

محافظ دستے کے دو سپاہیوں کے ساتھ میں آگے بڑھی۔ دونوں سپاہی' مجرم کو بازوؤں سے پکڑ کر میدان کے درمیان اس جگہ لے گئے جہاں چولہے پر لوہے کا توا رکھا تھا۔ مجرم کی پشت چولہے کی جانب رکھی گئی تھی۔

میں اس کے پیچھے پہنچ گئی۔ میرے ہاتھ میں تیز دھار اور موٹے دل والا بڑا برچھا تھا۔ میری نظریں اس تخت کی طرف تھیں جس پر نصار بیٹھا تھا۔ اچانک میں نے نصار کے ہاتھ کو فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ میرا برچھے والا ہاتھ تیزی سے گھوما اور پھر برچھا پوری قوت سے اس جلاد کی گردن کے پچھلے حصے پر پڑا جو نہ جانے اسی طرح خود کتنے سر قلم کر چکا تھا۔ اس کا سر کٹ کر زمین پر گرا اور اچھلنے لگا۔ عین اسی لمحے اس کی کٹی ہوئی گردن پر دہکتا ہوا لوہے کا توا رکھ دیا گیا۔ کٹی ہوئی گردن سے بلند ہونے والا خون کا فوارہ رک گیا۔ خون کا اخراج رک جانے کے سبب مقتول کا جسم رقص کے انداز میں حرکت کرنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور جسم تھرک رہا تھا۔ "وہ رقص بسمل" دیکھ کر میرا جی چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگانے لگوں۔ میرے اندر جو درندہ چھپا بیٹھا تھا اسے یہ خونی تماشا دیکھ کر بہت تسکین مل رہی تھی۔ شاید ہر آدمی کے اندر ایک ایسا ہی درندہ چھپا ہوتا ہے جو اپنی درندگی کا اظہار کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے وہ منظر دیکھ کر میرے دل کو بڑا سکون ہوا شاید اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آج میرے ہاتھوں اس شخص کا قتل ہوا تھا جس نے ژیان کے حکم پر میرے بابا کا سر قلم کیا تھا۔

ادھر اس شخص کا سر بریدہ جسم ڈھیر ہوا ادھر دوسرا "تماشا" شروع ہو گیا۔ اب میں ایک گھوڑے سوار تھی اور میرے ہاتھ میں لمبا سا نیزہ تھا۔ اس تماشے میں میرے ساتھ نصار کا محافظ دستہ شریک تھا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو تیزی سے بھگاتے ہوئے اس شخص کا کٹا ہوا سر اپنے نیزے میں پرو لیا پھر اس کو مجھ سے چھیننے کے لئے دوسرے محافظ دوڑے۔ کچھ محافظوں نے "یہی کھیل" اس شخص کے جسم کے ساتھ شروع کر دیا۔ ذرا ہی دیر میں اس شخص کے جسم کو نیزوں سے چھلنی کر دیا گیا اور پھر تلواروں سے جسم کے ٹکڑے کر کے یہی کھیل کھیلا جانے لگا۔

پھر ژیان کے مخبر کو لایا گیا اور اس کا بھی یہی حشر ہوا مگر میں نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ میں تو اس وقت جیسے کہیں اور ہی تھی۔ میں چشم تصور سے اس مخبر کی جگہ خود ژیان کو دیکھ رہی تھی۔

اس رات مجھے صبح ہونے کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ صبح ان قاصدوں کو لوٹ کر آنا تھا جنہیں نصار نے اپنی آبائی بستی کی طرف بھیجا تھا۔

اور پھر اس رات کی صبح ہو گئی مگر یہ صبح میرے لئے بہت ہولناک ثابت ہوئی۔ قاصد جو روح فرسا خبر لائے تھے' اسے سن کر جیسے میرا سانس رک گیا۔

آخر کار وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ نصار نے ظاہر کیا تھا۔ قاصدوں کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق ابتدا میں مہا پجاری اور احرس کا پلہ بھاری رہا تھا اور ایسا ہونا قرین قیاس بھی تھا۔ عموماً ابتدا میں حملہ آور فوج ہی کو برتری حاصل ہوتی ہے۔ ژیان کے نائب واہب کو سنبھلنے میں دیر لگی تھی' اس لئے بھی کہ یہ حملہ غیر متوقع اور قطعی اچانک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ واہب کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس پر میرے لشکر کا دباؤ لحہ لحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ پسپا ہو جاتا' عقب سے میرے لشکر پر زبردست حملہ ہوا۔ میرا لشکر پسپا ہونے والوں اور نئے حملہ آوروں کے درمیان آ گیا۔ واہب کی پسپا ہوتی سپاہ کے قدم پھر جم گئے۔ کچھ ہی دیر میں میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ میرا لشکر جس کا پہلے پلہ بھاری تھا' دشمن کو کمک مل جانے کے بعد سخت مشکل میں پھنس گیا۔ اب وہ دشمن کے لشکر کا ہم پلہ نہیں رہا تھا' برتری تو دور کی بات تھی' نتیجہ ظاہر تھا۔ میرے لشکر کے پیر اکھڑ گئے۔ اسے دشمن کے مقابلے سے راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ اس کوشش میں لشکر کے خاصے سپاہی مارے گئے۔ احرس شدید زخمی ہو کر اپنے گھوڑے سے گر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دشمن کے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا جاتا یا پکڑا جاتا مہا پجاری نے جان پر کھیل کر اسے دشمن کے نرغے سے نکال لیا۔ اس آخری معرکے میں خود مہا پجاری بھی زخمی ہو گیا۔ میرے لشکر کے بچے کھچے سپاہی قریبی پہاڑوں میں روپوش ہو گئے تھے اور فتح مند دشمن انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر رہا تھا۔

ان ہولناک خبروں نے میرے ہوش گم کر دیئے تھے۔ اسی کے ساتھ مجھے نصار کی دور اندیشی کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے طریر کے ساتھ ادھر جانے سے روک دیا تھا۔ اگر میں وہاں چلی گئی ہوتی تو شاید واپس نہ آتی۔ مجھے یا تو قتل کر دیا جاتا یا پھر گرفتار ہو جاتی۔

نصار اس وقت میرے ہی پاس موجود تھا۔ اسی نے آ کر مجھے قاصدوں کی فراہم کردہ اطلاعات سے آگاہ کیا تھا۔ میرے چہرے سے میری دلی کیفیت کا اندازہ لگا لینا یقیناً اس کے لئے مشکل نہیں رہا ہو گا۔

نے مجھے اسی لئے کچھ دیر بعد مخاطب کیا۔ "اے معبلہ! جو کچھ بھی ہوا اس پر یقیناً تجھے ملال کرنا چاہئے' مگر اس قدر بھی نہیں کہ آئندہ کے لئے تیرا حوصلہ پست ہو جائے۔ یقین کر کہ نصار تیرے ساتھ ہے اور وہ اس ضرب لگانے میں تجھ سے پیچھے نہیں رہے گا۔ تیرا لشکر جس طرح برباد ہوا اس پر مجھے بھی رنج ہے زبان پر لیکن اس کی وجہ تیرے لوگوں کی بزدلی نہیں بلکہ دشمن کی جنگی حکمت عملی ہے۔ تیری میری ملاقات اگر پہلے ہو جاتی تو شاید آج ہم اپنی فتح کا جشن منا رہے ہوتے۔ ہم دشمن کی چال اسی پر الٹ دیتے۔ جس طرح دشمن نے تیرے لشکر کو گھیر کر مارا ہے اسی طرح ہم اسے شکار کرتے۔"

میں جواب میں کچھ نہ بولی۔ میں اب نصار کی اس بستی میں بحفاظت اور عیش و آرام سے رہنے پر ذلت محسوس کر رہی تھی۔

"تُو کچھ بول نا اے معبلہ! خاموش نہ رہ۔ یوں تیرے دل کا غبار نہیں نکلے گا۔" نصار میرے خاموش رہنے پر دوبارہ بولا۔

اس کی بات سن کر میں نے گہرا سانس لیا پھر کہا۔ "میں کیا کہوں اے نصار کہ اب کہنے کو کیا رہ گیا ہے مگر صرف اس قدر کہ اب میرا مزید اس بستی میں رکنا بہادری نہیں بزدلی ہے۔ میرے لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے بھٹکتے پھر رہے ہیں اور میں یہاں بے غیرتوں کی طرح چھپی بیٹھی ہوں۔ بتا اے نصار! کیا مجھے ایسا کرنا زیب دیتا ہے؟ کیا میں اسی لئے ان لوگوں کو اپنے ساتھ لائی تھی کہ انہیں یہاں لا کر دشمن کے ہاتھوں کٹوا دوں اور خود آرام سے رہوں؟"

"دیکھ اے معبلہ! ایسے معاملات میں عقل کو دل پر ترجیح دینا پڑتی ہے۔ تیرے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس میں تیرا نہیں حالات کا دخل ہے۔" نصار مجھے سمجھانے لگا۔ "تُو خود یہاں نہیں آئی۔ تیری مرضی کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ دیوتاؤں کی مرضی تھی۔"

"جو بھی ہو اے نصار مگر اب میں یہاں نہیں رک سکتی۔" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"پھر تُو کہاں جانا چاہتی ہے' اے معبلہ!"

"وہیں جہاں میرے اپنے لوگ ہیں۔" میں نے رو میں یہ بات کہہ دی اور سوچا نہیں کہ ان الفاظ کا نصار پر کیا ردعمل ہو گا۔

"تو کھلا یہ اے معبلہ کہ تُو نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔" یہ کہتے ہوئے نصار کی آواز میں دکھ تھا۔

میں چونک کر بولی۔ "نہیں اے نصار' میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ مجھے تو ان بدنصیبوں پر ملال ہے جو صرف میری وجہ سے دربدر ہو گئے۔ میں ان کے پاس پہنچ کر ان کے دکھوں میں حصے دار بننا چاہتی ہوں۔"

"اے معبلہ! اگر تیرا یہی فیصلہ ہے تو پھر نصار بھی تیرے ساتھ چلے گا۔" اس نے کہا۔

"لیکن تُو میری خاطر اپنی زندگی کو کیوں خطرے میں ڈالنا چاہتا ہے؟"

"میری زندگی اب میری نہیں رہی اے معبلہ! یہ زندگی تو تیری عطا ہے اور تُو نے ہی مجھے بخشی ہے ورنہ وادی سبز سے آنے والا قاتل مجھے قتل کر چکا ہوتا۔"

"تجھے شاید یہ نہیں معلوم اے نضار کہ تیری زندگی دیوتاؤں نے بچائی ہے' میں نے نہیں۔"

"لیکن میں تو اسے تیری ہی دین سمجھتا ہوں۔ مجھ پر میری زندگی تیرا قرض ہے۔ جب بھی تجھے کی ضرورت پڑی' یہ قرض میں ادا کر دوں گا اے معبلہ!" نضار کی آواز میں خلوص اور سچائی کی [illegible] تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے اپنے ساتھ چلنے سے نہ روک۔ اگر تُو خود ادھر جانے کا فیصلہ نہ کر لیتی تو میں تیرے لوگوں کے لئے کچھ اور ہی سوچا تھا۔ اگر تُو کہے تو بیان کر دوں؟ ممکن ہے کہ تُو اس طرح اپنا [illegible] بدل دے۔ میرا خیال ہے کہ تُو اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالے بغیر اس طرح اپنا مقصد حاصل کر [illegible] ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر تُو نے اپنا فیصلہ تبدیل نہ کیا تو میں ضد نہیں کروں گا۔"

"کہہ دے اے نضار کہ تُو نے میرے لوگوں کے لئے کیا سوچا تھا؟" میں نے اسے اس کو دل [illegible] بات کہنے کی اجازت دے دی۔

"میں اس طرف تیرے لوگوں کی تلاش میں ایک فوجی دستہ بھیجنا چاہتا تھا۔ یہ فوجی دستہ تیرے [illegible] کے بچ جانے والے سپاہیوں کو لے کر یہاں آ جاتا اور پھر ہم ازسرنو جنگ کی تیاریاں کرتے۔" نضار [illegible] اپنی تجویز بیان کر دی۔ "یوں وہ بھٹکنے سے بھی بچ جاتے دشمن کے متوقع حملوں سے بھی محفوظ ہو جاتے تیرے پاس بھی پہنچ جاتے اور آئندہ کے لئے ہماری افرادی جنگی قوت میں اضافے کا سبب بھی بنتے۔"

ہرچند کہ نضار کی تجویز بہت مناسب تھی اس طرح مجھے خود کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت [illegible] نہیں تھی مگر اس وقت واقعی میں عقل پر دل کو ترجیح دے رہی تھی۔ احرس میری خاطر شدید زخمی ہوا تھا' میرے دل کو مضطرب کرنے کے لئے صرف یہ خبر بھی بہت کافی تھی۔ احرس محض میرے ہی لئے ساری صعوبتیں برداشت کر رہا تھا۔ میں اس کے ایثار' اس کی محبت کو کس طرح نظرانداز کر دیتی۔ مجھے [illegible] ہر حال میں اس تک پہنچ جانا چاہئے تھا۔ پھر مہا پجاری تھا جس کے مجھ پر ان گنت احسانات تھے۔ بچپن [illegible] اب تک اس نے متعدد بار میری زندگی بچائی تھی۔ اسے مصائبوں میں گرفتار چھوڑ کر میرا اس بستی [illegible] قیام کئے رہنا احسان فراموشی کے ضمن میں آتا تھا۔ پھر وہ میرے جاں نثار و پرستار تھے جو مجھے آتون [illegible] کہتے تھے اور میری خاطر ان ویرانوں میں بھٹک رہے تھے۔ کیا ان کی پرستش' ان کی وفاؤں کا یہی صلہ [illegible] کہ میں انہیں بے سہارا چھوڑ دوں۔

"نہیں۔" سوچتے سوچتے بے اختیار میں بول اٹھی۔ میرا یہ انکار گویا نضار کی تجویز سے اختلاف [illegible]

"مجھے اندازہ تھا اے معبلہ کہ تُو میری تجویز سے اتفاق نہیں کرے گی۔" نضار میرا انکار سن کر بولا

"ٹھیک اے نضار! اگر تُو میرے ہی ساتھ چلنے پر بضد ہے تو پھر دیر نہ کر اور یہاں سے روانگی [illegible] تیاری کر۔"

نضار میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ مجھے پھر اندیشوں اور وسوسوں نے گھیر لیا۔ اپنے دشمن کو [illegible] سمجھ کر یقیناً میں نے غلطی کی تھی۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ میں نے جلد بازی کی ہے۔ اگر میں [illegible] تریال میں دو ایک روز مزید رک کر سمیرا اور اس کے لشکر کو بھی اپنے ساتھ لے لیتی تو بہتر ہوتا۔ یوں [illegible] وہ عیار بوڑھا میرے لئے بہت سودمند ثابت ہوتا۔ یقیناً اس نے متعدد جنگیں لڑی تھیں وہ تجربہ کار تھا [illegible]

ہم میں سے کسی کو بھی جنگ کا تجربہ نہیں تھا۔ مہا پجاری' احرس اور خود میں' تینوں ہی اس معاملے میں ناتجربہ کار تھے۔ نضار کو جنگ کا وسیع تجربہ تھا تو اس سے اب ملاقات ہوئی تھی جب بازی الٹ چکی تھی۔ اگر مجھے پہلے مل گیا ہوتا تو شاید یہ صورت حال نہ ہوتی۔

اس بستی سے اشری کی بستی کے لئے روانہ ہونے میں مجھے اور نضار کو زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ نضار کا یہ مشورہ میں نے قبول کر لیا تھا کہ میرے جسم پر مردانہ لباس ہی ہونا چاہئے۔ احتیاط کے پیش نظر یہ مشورہ غلط نہیں تھا۔

میں سمجھ رہی تھی کہ نضار کے ساتھ کم از کم اس کا محافظ دستہ ضرور ہو گا جو بہترین جنگ آزما سپاہیوں پر مشتمل تھا' مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں نضار کے ساتھ تنہا حویلی کے عقبی دروازے سے نکلی تھی۔ نضار نے وہاں سے اپنی روانگی کو بھی راز میں رکھا تھا۔ وہ بڑی سی ایک چادر اوڑھے ہوئے تھا' جس سے اس نے اپنے چہرے کا بڑا حصہ چھپا رکھا تھا۔ جب تک ہم دونوں بستی سے نکل نہ آئے' ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کیا نہ قریب آئے۔ نضار اجنبیوں کی طرح مجھ سے کچھ فاصلے پر آگے آگے جا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے تھی۔ بستی سے کافی دور نکل آنے کے بعد نضار نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کی اور میں اپنا گھوڑا دوڑاتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ اب شاید وہ میرے ساتھ ساتھ چلنا چاہتا تھا۔

اب تک نضار سے میں نے جو بات نہیں پوچھی تھی وہ زبان پر آ ہی گئی۔

"اے معبلہ! تُو جو کہہ رہی ہے' وہ بھی ٹھیک ہے مگر میں نے جو کیا ہے وہ بھی غلط نہیں۔" نضار نے کہا۔

"میں تیری بات سمجھ نہیں سکی اے نضار! وضاحت کر۔"

"اپنے ساتھ بھیڑ بھاڑ سے ہم دشمنوں کی نظر میں آ سکتے ہیں۔" نضار بتانے لگا۔ "میں نے اسی لئے اپنے محافظ دستے کو بھی ساتھ نہیں رکھا۔ رہا اے معبلہ! تیرا یہ کہنا کہ حفاظت کی خاطر یہ ضروری تھا تو میں اس سے غافل نہیں رہا۔"

"کیا مطلب اے نضار!" میں چونک کر بولی۔

"حفاظتی دستہ ہم دونوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اگر دشمن سے ہمارا آمنا سامنا ہو گیا یا ہم کسی اور مشکل میں گرفتار ہو گئے تو حفاظتی دستے کو ہم تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اب تو تجھے اطمینان ہو گیا؟" نضار نے مجھے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "ہاں اے نضار! میں اب مطمئن ہوں۔"

اس کے بعد تیز رفتاری سے سفر جاری رہا۔ راستے میں ہم نے صرف ایک جگہ کچھ دیر کو قیام کیا اور کھانا کھا کے چل دیئے۔ اب میں نے بھی کچھ فاصلے پر لوگوں کی نقل و حرکت کو محسوس کر لیا تھا۔ یہ نضار کے محافظ دستے کے سپاہی ہی ہو سکتے تھے' مگر میں نے نضار سے اپنے قیاس کی تصدیق نہیں چاہی۔

ہم ابھی اشری کی بستی سے خاصے دور تھے کہ سورج غروب ہونے لگا۔ ہم نے اپنے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی تاکہ مکمل طور پر اندھیرا پھیلنے سے پہلے بستی کے اردگرد موجود پہاڑی علاقے میں پہنچ جائیں۔ وہ

پہاڑی علاقہ بھول بھلیوں کی طرح تھا اور اس میں دور تک پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ اس علاقے میں بہ آسانی سپاہیوں کی خاصی بڑی تعداد چھپ سکتی تھی اور قیاس غالب یہی تھا کہ میرے لشکر کے زندہ بچ جانے والے سپاہیوں نے وہیں پناہ لی ہو گی۔ وہاں انہیں تلاش کر لینا دشمن کے لئے بہت دشوار تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے نضار ہی نے بتائی تھیں۔ وادی سبز سے فرار ہو کر جب میں مہا پجاری کے ساتھ اس کی بستی پہنچی تھی تو یہ علاقہ راستے میں نہیں پڑا تھا۔ اسی سبب یہ علاقہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ اگر میں اکیلی ہوتی تو شاید راستہ بھٹک جاتی۔ وہ اونچے نیچے اور غیر ہموار راستے اتنے ہی پُر پیچ تھے۔ تیز رفتاری کے باوجود اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی سورج غروب ہو گیا اور پھر جلد ہی تاریکی پھیلنے لگی۔ مشعل روشن کئے بغیر پہاڑی راستوں پر سفر کرنا خطرناک تھا۔ سفر کرنے والا اچانک راستے میں آ جانے والے کسی گہرے کھڈ میں بھی گر سکتا ہے اور کسی چٹان سے ٹکرا کر زخمی بھی ہو سکتا ہے۔ اس خطرے کے باوجود نضار نے مشعل روشن نہیں کی۔ ویسے بھی ابھی اتنی تاریکی نہیں پھیلی تھی کہ راستہ بالکل ہی نظر نہ آتا۔ ہاں اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار ضرور کم کر دی تھی اور میں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا تھا۔

سامنے کے رخ پر نیم تاریکی میں وہ پہاڑی سلسلے اب ہمیں نظر آنے لگے تھے۔ وہ بڑے پُرہیبت نظر آ رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ بظاہر وہ پہاڑی سلسلے جتنے قریب نظر آ رہے ہیں درحقیقت اتنے نزدیک ہیں نہیں۔ ان تک پہنچتے پہنچتے ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔

وہاں ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ ہمیں صرف اپنے ہی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے گھوڑوں کی رفتار اب بہت کم ہو گئی تھی ہم نے اس علاقے میں داخل ہونے کے بعد دانستہ ایسا کیا تھا تاکہ اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھیں اور کہیں کسی بھی طرف روشنی کی ہلکی سی بھی لکیر نظر آئے یا خفیف سی آہٹ سنائی دے تو اس طرف چل دیں۔

خاصی دیر ہم اس علاقے میں چلتے رہے مگر ہمیں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دی، نہ کہیں آہٹ سنی یوں لگتا تھا جیسے ہمارے سوا وہاں کوئی نہ ہو۔ اب ہم گھوڑوں سے اتر کر ان کی لگامیں تھامے ہوئے ناہموار راستوں پر پیدل چل رہے تھے۔

"اے معبلہ!" اچانک نضار نے مجھے دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔ "یہ پہاڑی سلسلے وسیع و عریض علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں شاید ہم اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکیں۔"

"پھر اے نضار! ہمیں کیا کرنا چاہئے؟" میں مضطرب ہو کر بول اٹھی۔

"اب تو صرف یہی ایک صورت ممکن ہے کہ ہم رات گزارنے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کریں اور جب رات گزر جائے تو دن کے اجالے میں تیرے لشکریوں کی تلاش شروع کریں۔" نضار نے جواب دیا۔

"اے نضار! کیا تجھے اپنی بستی سے روانہ ہوتے وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں یہاں تک پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی اور اندھیرا پھیلنے کے بعد لشکر والوں کی تلاش ممکن نہیں ہو گی؟" میں نے سوال کیا۔

"مجھے بالکل اس کا اندازہ تھا مگر اس وقت تُو کچھ بھی سننے کی روادار نہیں تھی۔ اگر میں تجھ سے یہ کہتا کہ دن بھر وہیں آرام سے گزار لے اور یہ کہ ہم رات کو چلیں گے تو کیا تُو اس پر آمادہ ہو جاتی؟" نضار نے پوچھا۔

نضار ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں واقعی اس پر تیار نہ ہوتی۔ جواب میں یہی میں نے نضار سے کہہ دیا۔

پھر ہم نے ایک پہاڑی کے دامن میں نسبتاً ہموار جگہ دیکھ کر اپنے گھوڑے ایک بڑے پتھر سے باندھ دیئے۔ اس کے بعد نضار گھوڑوں کی پشت سے بندھا ہوا سامان اتارنے لگا۔ سامان میں کھانا بھی تھا، چند برتن بھی اور پانی سے بھرا مشکیزہ بھی۔ نضار نے اس جگہ ایک موٹی سی چادر بچھا دی۔ ہم نے کھانا کھایا اور پانی پی کر لیٹ گئے۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ دور تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔

"تیرا حفاظتی دستہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا اے نضار!" میں بولی۔

"اسے میں نے یہی ہدایت دی ہے کہ ہمارے قریب نہ رہے۔" اس نے بتایا۔

میں مطمئن ہو گئی۔ دن بھر گھوڑے کی پشت پر سفر کرنے کے بعد خاصی تھکن ہو گئی تھی اس لئے جلد ہی نیند نے میری آنکھوں میں جال بننے شروع کر دیئے۔ ابھی غنودگی پوری طرح میرے ذہن پر طاری نہیں ہوئی تھی کہ ایک تیز نسوانی چیخ نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ دیا اور میں اچھل کر بیٹھ گئی۔ نضار کو بھی میں نے اسی طرح اچھل کر بیٹھتے دیکھا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اسی طرح پھر ایک گھٹی گھٹی سی نسوانی چیخ ابھری اور یوں لگا جیسے کسی نے اس چیخنے والی کا منہ بند کر دیا۔ دونوں چیخیں عقب سے اور قدرے بلندی سے سنائی دی تھیں اور پھر ایک دم غیر فطری سا سناٹا چھا گیا تھا جیسے کچھ نہ ہوا ہو۔

"تُو نے .... تُو نے سنیں چیخیں اے نضار!" یہ بالکل بے مقصد سوال تھا اگر اس نے چیخیں نہ سنی ہوتیں تو اٹھ کر کیوں بیٹھتا۔ شاید اس سے یہ سوال کر کے میں اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتی تھی یا میرا مقصد کچھ نہ کچھ بولنا تھا۔

"ہاں اے معبلہ!" نضار جواب میں بولا۔ "لگتا ہے کہ یہاں وحشت و درندگی کا کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔" نضار کی آواز میں سختی تھی۔ "تُو اے معبلہ! یہیں رہ، میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں شاید یہاں کوئی غار قریب ہی موجود ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے قریب ہی رکھی ہوئی رائفل اٹھا لی۔

"نہیں، میں بھی تیرے ہی ساتھ چلوں گی اے نضار!" میں نے کہا اور اپنی رائفل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

نضار نے مجھے اپنے ساتھ چلنے سے منع کیا مگر میں نہیں مانی۔ مجبوراً وہ مجھے بھی ساتھ لے چلنے پر راضی ہو گیا۔

کچھ دور چل کر ہمیں ایسی جگہ مل گئی جہاں سے اس پہاڑی پر چڑھنا ممکن تھا۔ ہم دونوں بہت سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھ رہے تھے۔ اس کے باوجود ایک جگہ میرا پیر پھسل گیا۔ میں نے خود کو فوراً

سنبھال لیا لیکن اس سے کئی چھوٹے بڑے پتھر نیچے لڑھکتے چلے گئے۔ ان پتھروں کے لڑھکنے کی آواز نے سناٹے کو مجروح کر دیا۔ اسی وقت ذرا بلندی سے فضا کے دوش پر تیرتی ہوئی ایک مدھم سی آواز ابھری جیسے کسی نے کسی کو مخاطب کیا ہو' کچھ کہا ہو' مگر کیا؟ یہ مجھے سنائی نہیں دیا۔ یقیناً اوپر کچھ لوگ موجود تھے۔ میں اب مزید احتیاط سے اوپر چڑھ رہی تھی۔ نضار مجھ سے آگے تھا۔

"تیرا وہم ہو گا۔" اس مرتبہ واضح طور پر ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "پتھر تو ہوا کی رگڑ سے بھی........"

"مگر مجھے اسی سمت دو ہیولے بھی حرکت کرتے نظر آئے تھے۔" دوسری آواز ابھری۔

"اچھا تو پھر چل دیکھ لیتے ہیں۔ بھلا اس وقت یہاں کون آ سکتا ہے؟" پہلی آواز والا بولا۔

میں نے دیکھا کہ نضار اوپر چڑھتے چڑھتے ایک دم اوندھا لیٹ گیا ہے۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔ ہم دونوں بے حس و حرکت ہو گئے۔ خطرہ ہم سے زیادہ دور معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لیٹنے کے باوجود میری نظریں اوپر ہی اٹھی ہوئی تھیں۔ میرے دائیں ہاتھ میں موجود رائفل کی نال بھی اوپر کی طرف ہی تھی۔ کسی بھی لمحے میں خطرہ سامنے آنے کی صورت میں گولی چلا سکتی تھی۔

ہمیں اس حالت میں اوندھے لیٹے ہوئے ذرا ہی دیر گزری تھی کہ اوپر کچھ بلندی پر مجھے دو ہیولے نظر آئے۔ وہ یقیناً دو افراد تھے جو کسی قدر نیچے اتر کر رک گئے تھے۔ ان کے اور ہمارے درمیان صرف پندرہ بیس نیزوں کا فاصلہ ہو گا۔

"دیکھ لے یہاں دور تک کوئی نہیں ہے۔ تجھ پر تو بس مفرور دشمن سپاہیوں کا خوف غالب آ گیا ہے۔ ارے انہیں تو خود اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس پہاڑی سلسلے میں کہیں بہت اندر چھپے ہوئے ہوں گے۔ یہاں وہ کہاں سے آ جائیں گے۔ چل آ' واپس چلیں ہماری باری آنے ہی والی ہو گی۔" یہ آواز وہی تھی جو میں نے پہلے سنی تھی۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ پڑی رہی۔

"مگر جب معلوم تھا کہ دشمن سپاہی یہاں چھپے ہوئے ہیں تو لڑکی لے کر ادھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" دوسرا شخص بولا۔

"لڑکی کو بھی تو ٹھکانے لگانا تھا نا! اگر اسے ٹھکانے نہ لگایا گیا تو وہ ہماری نشاندہی کر دے گی تیرا تو نام بھی جانتی ہے۔"

"لیکن........ پہلے تو مجھے تم لوگوں نے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ ورنہ میں........ میں اس لڑکی کو دھوکہ دے کر بستی کے باہر نہ لاتا۔"

"ہمیں معلوم تھا کہ تو بزدل ہے۔" پہلا شخص آہستہ سے ہنس دیا۔ "اگر تجھے ہم پہلے سے بتا دیتے کہ بعد میں لڑکی کو مار ڈالنا ہے تو کبھی تو ہمارے ساتھ نہ ملتا اور نہ لڑکی کو بہکا کر لانے پر آمادہ ہوتا۔"

ان دونوں کی باتوں سے بہت کچھ واضح ہو گیا تھا۔ وہ اشر کی بستی کے باشندے تھے اور کسی لڑکی کو اپنی ناپاک خواہشات کی بھینٹ چڑھانے کے لئے اغوا کر کے یہاں لے آئے تھے۔ اس کے بعد ان کا ارادہ لڑکی کو قتل کر دینے کا تھا۔ ان کی تعداد دو افراد سے یقیناً زیادہ تھی۔ وہ دونوں پہرا دے رہے تھے اور ان

کے ساتھی اس وقت اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کر رہے تھے۔ میں نے بمشکل اپنی اس خواہش پر قابو پایا اور ان پر گولی نہیں چلائی ورنہ تو میرا دل یہی چاہ رہا تھا کہ ان دونوں کو پھونک دوں۔ وہ اب پلٹ کر جا رہے تھے۔ اسی وقت نضار نے پلٹ کر ہاتھ سے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور سینے کے بل اوپر رینگنا شروع کر دیا۔ وہ غالباً ان دونوں کے تعاقب میں جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی سینے کے بل رینگتے ہوئے اوپر نگاہ اٹھائی۔ دونوں افراد کے ہیولے کچھ اوپر جا کر غائب ہو گئے تھے' کدھر؟ یہ میں نہیں دیکھ سکی تھی۔ اوپر غالباً دائیں یا بائیں جانب کوئی کٹاؤ تھا۔ وہ ہیولے اسی کٹاؤ کی آڑ میں چلے گئے تھے ورنہ اس طرح اچانک غائب نہ ہو جاتے۔

کچھ ہی دیر بعد میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ دائیں جانب ذرا سی بلندی پر پہاڑی کٹاؤ موجود تھا۔ ابھی تک ہم سینے کے بل رینگتے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ کٹاؤ تک پہنچ کر ہم جیسے ہی دائیں جانب مڑے ہمیں کچھ فاصلے پر روشنی دکھائی دی۔ یہ روشنی ایک غار کے دہانے سے باہر آ رہی تھی جو بائیں جانب تھا۔ دو افراد دہانے کے قریب ہی کھڑے تھے اور دونوں ہی مسلح تھے۔ ان کے جسموں پر موجود مخصوص لباس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دونوں سپاہی تھے۔ یہ تو ہمیں پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا تعلق دشمن سے ہے' اب یہ نئی بات پتا چلی تھی کہ وہ سپاہی بھی ہیں۔ میرے خیال میں یہ وہی تھے جن کے ہیولے ذرا دیر پہلے ہم نے دیکھے تھے اور انہی کا تعاقب کرتے ہوئے ہم یہاں پہنچے تھے۔ ان کے ساتھیوں کا تعلق بھی ہمارے دشمن سپاہ ہی سے ہو سکتا تھا۔ ہم زمین پر رینگتے ہوئے مزید آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ بات ہمارے حق میں تھی کہ ان دونوں کے چہرے ہماری طرف نہیں تھے۔ اندازے کے مطابق ان دونوں کے ساتھی اسی غار میں ہو سکتے تھے جس سے کچھ روشنی باہر آ رہی تھی۔

میں نے نضار کو رک کر رائفل اوپر اٹھاتے دیکھا وہ اب یقیناً ان دونوں کا قصہ پاک کر کے ان کے ساتھیوں کے چنگل سے لڑکی کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ یہ دیکھتے ہی ان میں سے ایک کا نشانہ میں نے لیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں یہ سوچ رہی تھی کہ نضار نے دوسرے شخص کا نشانہ لیا ہو تو اچھا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جو سوچتا ہے' پورا ہو جاتا ہے۔ تقریباً ایک ساتھ نضار کی اور میری رائفل نے شعلے اگلے اور وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ ایک شخص میری گولی کا نشانہ بنا تھا' دوسرے کو نضار کی گولی نے ٹھکانے لگایا تھا۔ ان دونوں کے گرتے ہی نضار اٹھ کر غار کے دہانے کی طرف بھاگا۔ میں نے بھی اٹھ کر نضار کے پیچھے بھاگنے میں دیر نہیں کی۔

ابھی ہم غار کے دہانے سے دور ہی تھے کہ ایک سپاہی اندر سے بھاگتا ہوا باہر آیا اور نضار کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ معلوم نہیں اس غار میں ابھی اور کتنے سپاہی موجود تھے۔ میں آگے بڑھی تو نضار نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید آگے جانے سے روک دیا۔ اب ہم غار کے دہانے تک پہنچ چکے تھے لیکن دہانے کے بالکل سامنے نہیں گئے تھے جہاں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ ایسا کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ہمیں غار کے اندر سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ نضار نے مجھے آگے بڑھنے سے روک کر اسی ممکنہ خطرے سے بچایا تھا۔

خلاف توقع غار کے اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی جیسے وہاں کوئی موجود نہ ہو۔ میرے نزدیک

ایسا ممکن نہیں تھا اگر وہ صرف تین افراد ہی تھے تو کم از کم اس لڑکی کو وہاں ضرور موجود ہونا چاہئے تھا کی میں نے چیخیں سنی تھیں۔ پھر مجھے یہ خیال آیا' ممکن ہے انہوں نے لڑکی کا منہ باندھ دیا ہو تاکہ وہ مزید نہ چیخ سکے۔ اس غار کے دہانے سے ہم اچانک فائر کرتے ہوئے بھی اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ طرح لڑکی کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی جسے بچانے کے لئے ہمارے ہاتھوں تین افراد قتل ہو چکے تھے۔

میں نصار کے بالکل قریب ہی چوکنا کھڑی تھی۔ اس کی طرف جھکتے ہوئے میں نے سرگوشی کی "غار کے اندر تو موت کی سی خاموشی طاری ہے۔ اب تیرا کیا ارادہ ہے اے نصار! ہم یہاں اس طرح کب تک کھڑے رہیں گے؟"

"میں آگے سینے کے بل رینگ کر جاتا ہوں' تُو یہیں ٹھہر!" نصار نے میری طرف منہ کر کے سرگوشی کی۔

"تُو ٹھہر............ میں دیکھتی ہوں آگے جا کر۔"

"نہیں۔" اس نے مجھے روک دیا اور پھر تیزی کے ساتھ اوندھا لیٹ کر آگے رینگ گیا۔

میں نے بھی وہاں رکے رہنے کی بجائے اس کے پیچھے جانا مناسب سمجھا اور اسی کی طرح سینے کے بل رینگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ نصار اب غار کے دہانے سے رینگتا ہوا اندر جا رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد مجھے بھی غار کا اندرونی حصہ واضح طور پر نظر آنے لگا اور میں چونک اٹھی۔

غار خالی تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ غار کی دائیں جانب ایک دراڑ میں روشن مشعل کا دستہ پیوست تھا۔ غار نہ زیادہ بڑا تھا' نہ بہت چھوٹا۔ سامنے کے رخ پر قدرے بائیں جانب دراڑ نظر آ رہی تھی جو خاصی چوڑی تھی۔ اس کا کچھ ہی حصہ روشن تھا' جہاں تک مشعل کی روشنی پہنچ رہی تھی۔ دراڑ اندر سے تاریک تھی۔ اس کے باوجود کہ غار میں کوئی نہیں تھا' نصار فوراً اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ چند لمحے ہم دونوں اسی طرح ساکت پڑے رہے۔ پھر نصار آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دائیں جانب بڑھ کر غار کی دراڑ میں پیوست مشعل نکال لی۔

میں جیسے ہی اٹھ کر کھڑی ہوئی' میری نظر غار کے فرش پر اس جگہ پڑی جہاں بڑے بڑے بالوں کا ایک گچھا پڑا ہوا تھا۔ میں نے جھک کر بال اٹھا لئے اور نصار سے بولی۔ "یہ بال اسی مظلوم لڑکی کے معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر یقیناً تشدد کیا گیا ہو گا۔"

"مگر وہ لڑکی گئی کہاں اے معبلہ!" یہ کہتا ہوا نصار اس چوڑی دراڑ کی طرف بڑھا جو اندر سے تاریک تھی۔

میں بھی ادھر لپکی دراڑ اتنی چوڑی تھی کہ نصار اس میں باآسانی داخل ہو گیا تھا۔ اب مشعل کی روشنی دور تک دراڑ کو روشن کر رہی تھی۔ میں نے دراڑ کے سرے پر پہنچ کر دیکھا وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

"اے معبلہ! یقیناً کوئی یہاں تھا اور وہ لڑکی کو لے کر اسی راستے سے فرار ہوا ہے۔ یہ دراڑ شاید پہاڑی کے دوسرے رخ تک گئی ہو گی۔" نصار نے قیاس آرائی کی۔ "آگے جا کر یہ کچھ اور چوڑی ہو گئی ہے۔ آ' آگے چل کر دیکھتے ہیں۔"

میں نے نصار کی تجویز سے اتفاق کیا اور دراڑ میں داخل ہو گئی۔ ہم دونوں آگے پیچھے بڑھتے چلے گئے۔

وہ دراڑ ایک اور غار کے اندر جا کر ختم ہوئی جس کا دہانہ دوسری طرف تھا۔ پھر جب ہم اس غار سے باہر نکلے تو دائیں جانب خاصے فاصلے پر نشیب میں دو ہیولے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔

"وہ رہے۔" نصار نے تیز سرگوشی کی۔ اسی کے ساتھ اس نے ادھر اشارہ کیا۔

"ہاں' میں بھی دیکھ چکی ہوں۔" میں بولی۔ "ایک ہیولا سیدھا آگے بڑھ رہا ہے اور دوسرا جیسے گھسٹتا ہوا چل رہا ہے۔"

وہ جو کوئی بھی تھے ہم سے اتنے فاصلے پر تھے کہ مشعل کی روشنی ان تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

پھر نصار نے جلتی ہوئی مشعل پلٹ کر غار کے دہانے میں پھینک دی اور میرا ہاتھ تھام کر تیزی سے آگے بڑھا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے اس نے خود ہی بتا دیا۔ "مشعل ہاتھ میں لے کر ان کا تعاقب کرنا ہمارے لئے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح مسلح ہو گا۔ ایسی صورت میں اگر وہ مڑ کر دیکھ لیتا یا خود کسی طرف مڑتے ہوئے اس کی نظر ہماری جانب اٹھ جاتی تو آسانی سے ہمیں نشانہ بنا سکتا تھا۔"

تیزی سے ہمارے نشیب میں اترنے کی وجہ یہ تھی کہ کہیں وہ ہیولے ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں! ذرا ہی دیر میں ہم ان کے خاصے قریب پہنچ گئے۔ اب یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ ان میں سے ایک ہیولا مرد کا تھا دوسرا لڑکی کا۔ مرد اس لڑکی کا ہاتھ تھامے آگے کی طرف تقریباً گھسیٹ رہا تھا یا پھر لڑکی دانستہ گھسٹتی ہوئی چل رہی تھی اس کے پیروں میں تکلیف تھی۔

ہم اب انتہائی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے اور ہماری رائفلوں کا رخ مرد کی طرف تھا کہ جیسے ہی اسے اپنے تعاقب کا شبہ ہو وہ مڑ کر دیکھے یا ہم پر گولی چلانے کی کوشش کرے' ہم اسے بھون دیں۔ مجھے اس کے ہاتھ میں رائفل نظر آ رہی تھی۔

شاید کوئی پتھر نصار کے پیر کی ٹھوکر سے لڑھکا تھا کہ چند نیزوں کے فاصلے پر آگے جاتا ہوا شخص تیزی سے مڑا اور عین اسی وقت میں نے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا۔ گولی اس نے بھی چلائی تھی مگر میرے اور اس کے گولی چلانے میں شاید ایک لمحے کے دسویں حصے کا فرق تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئی تھی۔ غنیمت یہ ہوا کہ اس طرف نصار نہیں تھا ورنہ گولی اسے لگتی۔

گولی کھا کر وہ شخص نشیب میں لڑھکتا چلا گیا اور لڑکی ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گئی۔ نصار اور میں لپک کر اس کے قریب پہنچے تو وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ اس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا اور جسم پر لباس کی جگہ چیتھڑے جھول رہے تھے۔ اس میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول

لیتی۔ میں نے سختی سے بندھا ہوا وہ کپڑا کھولا تو لڑکی نے گہرے گہرے سانس لئے۔

اسی وقت نشیب میں دائیں جانب روشنیوں کی قطار سی متحرک نظر آئی۔ وہ روشنیاں ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے حرکت کر رہی تھیں۔ لڑکی کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھولنے کے لئے میں نے اپنی رائفل شانے پر لٹکا لی تھی البتہ نضار کی رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔

نضار نے اس طرف اپنی رائفل سیدھی کی ہی تھی کہ ایک تیز سرسراتی ہوئی آواز گونجی۔ "تم لوگ دیکھ لئے گئے ہو اور ہمارے نشانے پر ہو۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو اپنے ہتھیار پھینک دو۔"

میں اور نضار کھلے میں تھے۔ آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی کہ ہم اس کی آڑ لے سکتے اور وہ جو ہم سے ہتھیار پھینک دینے کو کہہ رہا تھا خود چٹان کی آڑ میں تھا۔ حرکت کرتی روشنیوں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دقت پیش نہیں آئی تھی کہ وہ شخص اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھی بھی چٹان کے پیچھے موجود تھے۔ اچانک نضار میرے ہاتھ کو جھٹکا دے کر تیزی سے سینے کے بل لیٹ گیا۔ میں بھی اس کا اشارہ سمجھتے ہی لیٹ گئی مین اسی لمحہ فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔ میں نے چٹان کی طرف شعلے لپکتے دیکھے۔ جواب میں چٹان کی جانب سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی مگر فائرنگ کا رخ ہم سے قدرے ہٹ کر بائیں سمت تھا۔ ادھر ہی سے چٹان کی طرف گولیاں چلائی گئی تھیں۔

چٹان کی جانب فائرنگ کرنے والا نضار کے محافظ دستے کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔

"اے معبلہ! اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔" نضار نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہمیں اسی راستے سے واپس چلنا ہے جس سے یہاں تک پہنچے تھے۔ اسی غار کی طرف سینے کے بل رینگتی ہوئی چل جس کے اندر میں نے جلتی ہوئی مشعل پھینکی تھی۔ اس دوران میں میرا محافظ دستہ ان لوگوں کو الجھائے رکھے گا جو چٹان کی آڑ لئے گولیاں چلا رہے ہیں۔"

"مگر اے نضار! وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟" جو سوال میرے ذہن کو پریشان کئے ہوئے تھا' زبان پر آ گیا۔

"کیا خبر کون لوگ ہیں .... تُو کیا سوچ رہی ہے؟ یہ وقت زیادہ سوچنے کا نہیں اے معبلہ!" نضار بولا۔

"اے نضار! میں ایک خطرہ مول لینا چاہتی ہوں۔ اپنے محافظ دستے کے نگران کو فائرنگ بند کر دینے کا حکم دے۔"

"کیسا خطرہ .... کیا چاہتی ہے تُو اے معبلہ! کچھ تو بتا۔"

"کیا تُو نے اس پر غور نہیں کیا اے نضار کہ ان پہاڑوں میں میرے لوگوں نے پناہ لی ہے اور بھلا یہاں کون اس وقت آ سکتا یا ہو سکتا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ میرے ہی لوگ ہیں اور میں اپنے اس قیاس کی تصدیق چاہتی ہوں۔"

"مگر کس طرح اے معبلہ! یہ کیسے ممکن ہے؟" نضار کے لہجے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تُو یہ مجھ پر چھوڑ دے اور اپنے محافظ دستے سے فائرنگ رکوا دے۔"

نضار کو مجبوراً میری بات ماننا پڑی۔ اس کے محافظ دستے کی طرف سے گولیاں چلنا بند ہو گئیں مگر چٹان کی طرف سے فائرنگ جاری رہی۔

تھوڑی دیر بعد "اے چٹان کی آڑ میں چھپے ہوئے لوگو! میں آتون دیوی تمہیں حکم دیتی ہوں کہ آڑ سے نکل کر سامنے آ جاؤ۔" فائرنگ رکتے ہی میری آواز گونجی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم اپنی آتون دیوی کی آواز اچھی طرح پہچانتے ہو۔"

پھر اس لمحے میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا جب چٹان کے پیچھے سے میرے حق میں نعرے بلند ہوئے۔ اس کے فوراً بعد مشعل بدست سپاہی' چٹان کی آڑ سے نکل نکل کر تیزی کے ساتھ اس طرف آنے لگے جدھر میں تھی۔

وہ لڑکی ہم سے کچھ فاصلے پر خوفزدہ سی بیٹھی تھی جس کی ہم نے جان بچائی تھی' مگر شاید آبرو نہیں بچا سکے تھے۔ غالباً اس کے اندر مزید کھڑے رہنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں اب اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور نضار بھی میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں آخرکار اپنے لوگوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ چٹان کی آڑ سے نکل کر آنے والوں کی گنتی ایک سو کے قریب تھی۔ ان کے ہاتھوں میں موجود مشعلوں کی وجہ سے ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو گئی تھی۔ اس وقت باہر بھی روشنی تھی اور میرے اندر بھی۔

میرے قریب پہنچ کر انہوں نے مجھے تعظیم دی' پھر میرے کسی حکم کے انتظار میں دو رویہ گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ نضار نے یقیناً ایسا احترام اور اظہار عقیدت کسی سردار کے لئے نہیں دیکھا ہو گا۔ ان میں سے کسی کی بھی یہ جرأت و ہمت نہیں ہوئی تھی کہ مجھ سے پوچھ سکتا' میں کہاں چلی گئی تھی؟ یا وہاں اچانک کیسے نمودار ہو گئی؟ دیوی دیوتاؤں سے اس طرح کے سوالات کرنا حد سے تجاوز خیال کیا جاتا تھا۔

"اے لوگو!" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "تم پر جو گزری تمہاری آتون دیوی اس سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اب تم مجھے اپنے مہا پجاری اور احرس کے پاس لے چلو۔"

پھر وہ لوگ مجھے اور نضار کو اس پہاڑی سلسلے کی اندرونی سمت لے چلے۔ میں نے راستے میں ان کے سالار سے دریافت کیا کہ وہ لوگ اس طرف کس طرح آ نکلے تھے جہاں میں اور نضار تھے؟ سالار نے جواب دیا۔ "اے آتون دیوی! ہمیں مہا پجاری نے ان اطراف میں پہرے پر مقرر کیا تھا۔ ہم نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنیں تو ادھر متوجہ ہو گئے۔"

یہی میرا بھی خیال تھا۔ میرے کہنے پر اس مظلوم لڑکی کو بھی ساتھ لے لیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ سارا ہنگامہ ہوا تھا۔ وہ لڑکی میرے لئے نیک فال ثابت ہوئی تھی۔ چند سپاہیوں کو میں نے اپنے اور نضار کے گھوڑوں نیز سامان اٹھا کر لانے کے لئے بھیج دیا تھا۔

اندرونی سمت ایک پہاڑی درے کے اندر جو خاصا چوڑا اور لمبا تھا' میرا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اسی درے کے قریب ایک بڑے سے غار میں مہا پجاری اور احرس کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ غار کے

دہانے پر مسلح محافظ پہرا دے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے ادھر آتے دیکھ کر تعظیم دی اور اندر جانے کا راستہ دے دیا۔ نضار اور پہریدار دستے کے سالار کو ساتھ لئے میں غار میں داخل ہو گئی۔ غار میں دو مشعلیں روشن تھیں۔ مہا پجاری اور احرس دونوں ہی اس وقت تک سوئے نہیں تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی کھل اٹھے۔ احرس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی وہ دونوں ایک دم اپنے بستروں سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"آ .... آتون! میری .... میری بچی!" مہا پجاری اٹھ کر میری طرف بڑھا اور پھر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے ایک ہاتھ پر بھی پٹی بندھی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد میں' نضار' مہا پجاری اور احرس ایک بستر پر بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے۔ پہریدار دستے کے سالار کو میں نے لڑکی کی مناسب دیکھ بھال کی تاکید کر کے وہاں سے بھیج دیا تھا تاکہ وہ اپنے فرائض انجام دے سکے۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ احرس شدید زخمی نہیں تھا جیسی کہ مجھے خبر ملی تھی۔

"اے آتون! مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ میں کوئی حسین خواب نہیں دیکھ رہا؟" احرس نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ "کیا تُو واقعی آ چکی ہے؟"

"ہاں۔" میں مسکرا کر بولی۔ "اور اپنے ساتھ میں سردار اشر کے عظیم بیٹے نضار کو بھی لائی ہوں۔" میں نے نضار کی طرف اشارہ کیا۔

"سردار اشر کا بیٹا!" مہا پجاری نے چونک کر کہا۔

"اے مہا پجاری! مین نے تجھے پہچان لیا ہے مگر شاید تُو میری صورت بھول گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ تُو دبلا ہو گیا ہے اور کسی قدر بوڑھا بھی' تجھ میں اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔" نضار بول اٹھا اور پھر بڑی گرم جوشی کے ساتھ اٹھ کر مہا پجاری سے گلے ملا۔

احرس سے بھی میں نے نضار کا تعارف کرایا اور وہ دونوں بھی گلے ملے۔ اس کے بعد مجھ پر اس دوران جو کچھ بیتی تھی اس سے میں نے احرس اور مہا پجاری کو آگاہ کر دیا۔ میرے اسی بیان میں نضار اور اس کی دونوں بستیوں کا ذکر بھی آ گیا۔ میں نے اسی کے ساتھ پہاڑی بستیوں کے سیاسی حالات سے بھی مہا پجاری کو آگاہ کر دیا جن کا علم مجھے نضار سے ہوا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں مہا پجاری کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں رہا ہو گا کہ اس کی شکست کا سبب کیا تھا۔

"تُو نے جو حالات بیان کئے اے آتون! ان سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ژیان اب اس پورے علاقے میں ایک ناقابل شکست طاقت بن چکا ہے۔ اب اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں رہا۔ مجھے پہلے اس کا اندازہ نہیں تھا۔" مہا پجاری نے میری پوری روداد سن کر اظہار تشویش کیا۔

اس موقع پر نضار نے پھر اپنی وہی بات دہرائی جس کا اظہار وہ مجھ سے دو مرتبہ کر چکا تھا یعنی اگر ہم سے اس کی ملاقات پہلے ہو جاتی تو شاید یہ صورت حال نہ ہوتی۔

"مگر سوچنا یہ ہے اے نضار کہ اب کیا ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں اب کیا ہو؟" مہا پجاری بھی بے اختیار غیر ارادی طور پر بڑبڑانے لگا۔ اس کے چہرے سے

فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر مہا پجاری سے معلوم ہوا کہ ہمارے لشکر کا زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ نضار کے بھیجے ہوئے مخبروں کی معلومات کا ذریعہ واہب کے سپاہی تھے جنہوں نے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا۔ لشکر کا صرف ایک چوتھائی سے بھی کم حصہ پامال ہوا تھا۔ مخبروں کی فراہم کردہ اطلاعات سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ نصف سے زیادہ لشکر ختم ہو گیا۔ اس سے مجھے بڑی تقویت ملی۔

"اے معبلہ! اور اے مہا پجاری! ژیان سے ٹکر لینے کی صرف اور صرف ایک ہی صورت ہے۔" نضار نے آخرکار ایک تجویز پیش کی۔ "وہ صورت یہ ہے کہ ہم اس کی قوت کو رفتہ رفتہ ختم کریں اور اس معاملے میں بے صبری نہ دکھائیں۔"

"تیرے نزدیک اے نضار اس کی حکمت عملی کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وادی سبز کے بعد ژیان کے زیر نگیں علاقے میں دوسری بڑی قوت میری ہی آبائی بستی ہے۔ اس بستی پر فتح حاصل کرنے کا مطلب ہی ہو گا اے معبلہ کہ ہم نے اپنے دشمن کی آدھی طاقت توڑ دی مگر جیسا کہ تُو بھی جانتی ہے اور مہا پجاری کو بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے' یہ آسان بات نہیں۔"

نضار تفصیل کے ساتھ جنگی حکمت عملی بیان کرنے لگا۔ "اس بستی پر فتح' ایک بستی پر نہیں بلکہ تین بستیوں پر فتح ہو گی جہاں تک میرا اندازہ ہے اگر واہب کو دو قبیلوں کے فوجیوں کی طرف سے کمک نہ مل جاتی تو مہا پجاری اسے شکست فاش دینے میں کامیاب ہو جاتا۔" نضار نے تصدیق طلب نظروں سے مہا پجاری کو دیکھا۔

"تُو ٹھیک کہتا ہے اے سردار اشر کے عظیم بیٹے!" مہا پجاری نے نضار کے خیال کی تصدیق کر دی۔

"اور تھوڑے سے جانی نقصان کے باوجود میں کہتا ہوں کہ اب بھی یہ لشکر واہب کا ہم پلہ ہے۔" نضار تصدیق کے بعد کہنے لگا۔ "دراصل اب ہمیں اس بستی پر یقینی فتح حاصل کرنے کی غرض سے بیک وقت تین محاذ جنگ کھولنا پڑیں گے۔ ہمیں ان مددگار قبیلوں کی بستیوں اور اس بستی پر ایک ساتھ اور ایک ہی وقت میں حملہ کرنا پڑے گا۔ میرا نائب ادل' ایک قبیلے کی بستی پر حملہ آور ہو گا اور دوسرا نائب احزم' دوسرے قبیلے کی بستی پر حملہ کرے گا۔ اسی کے ساتھ اے معبلہ تیرا لشکر واہب پر ٹوٹ پڑے گا۔ یوں دونوں قبیلے میرے دونوں نائبوں کی سپاہ سے الجھے رہیں گے یا انہیں الجھائے رکھیں گے اور وہ دونوں ہی واہب کی مدد کو نہیں آ سکیں گے۔"

"اور اے نضار! تُو بذات خود ان تینوں محاذوں میں سے کس محاذ پر ہو گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اصل محاذ پر۔" اس نے مسکرا کر بتایا۔ "یعنی تیرے ساتھ اے معبلہ۔"

اس لمحے میں نے احرس کے چہرے پر ناگواری کے آثار محسوس کئے شاید اسے نضار کا یہ انداز بیان پسند نہیں آیا تھا اور نضار سے رقابت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اسی لئے بات بنانے کو فوراً کہا۔ "ہاں اے نضار! تیرا اصل محاذ یہی ہے کہ یہ تیرے بہادر باپ سردار اشر کی میراث ہے۔ ایک بات اور رہ گئی' تُو نے مجھ سے کہا تھا کہ عموماً قبائل کسی قبیلے کی بستی پر دوسرے قبیلے کے قبضے کو ناگواری و ناپسندیدگی کی نظر

سے دیکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں واہب کے مددگار قبیلوں پر تیرے قبضے سے کیا تجھے بھی ژیان کی طرح جارحیت پسند نہیں کہا جائے گا؟ تو بھی کیا ان قبائل کی ہمدردیاں نہیں کھو دے گا جو اب تک تجھے مظلوم اور حق پر سمجھتے ہیں؟ کیا تُو نے اس پر غور نہیں کیا؟"

"کیا ہے اے معبلہ!" نضار نے جواب دیا۔ "ان قبیلوں پر غلبہ پانے کے بعد میں ان کے سرداروں سے خفیہ معاہدہ کروں گا کہ وہ آئندہ کبھی ژیان یا اس کے نائبوں کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اسی کے ساتھ ژیان ہی کی طرح میں بھی ان سے عہدنامہ امن کروں گا یعنی ان کی بستیوں پر حملہ مجھ پر اور مجھ پر کیا ان پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ شکست کھانے والوں کو جب یہ پیشکش کی جائے گی کہ ان شرائط پر ان کے علاقے واپس کر دیئے جائیں گے تو وہ یقیناً خوشی خوشی تمام شرائط ماننے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ یوں آج جو طاقت و قوت ژیان کے حصے میں ہے وہ ہمارا حصہ بن جائے گی۔ ژیان کی طرح ہم ان بستیوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھے بغیر ان کی افرادی قوت کو اپنا حصہ بنا لیں گے۔ بتا اے معبلہ! کیا یہ حکمت عملی درست نہیں ہو گی؟"

میں نے اور پھر مہا پجاری نے نضار سے اتفاق کیا مگر احرس خاموش ہی رہا۔ اس پر میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تُو کیا کہتا ہے اے احرس؟ ابھی تک اس معاملے میں تُو نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔" اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ کہیں احرس یہ خیال نہ کرے کہ ہم اسے نظرانداز کر رہے ہیں یا اہمیت نہیں دے رہے۔

"تُو اچھی طرح جانتی ہے کہ میں جنگی معاملات میں ناتجربہ کار ہوں۔" احرس بولا۔ "تُو جو بھی فیصلہ کرے گی' مجھے اپنا ہمنوا پائے گی۔" پھر اس کے لہجے میں کسی قدر تلخی سی آ گئی۔ "ویسے نضار نے جو تجویز پیش کی ہے' اس طرح اسے تو اپنا حق مل جائے گا یعنی وہ اپنی آبائی بستی حاصل کر لے گا مگر تو .... تُو کیا کرے گی؟ تجھے تیرا حق کیسے ملے گا؟ تُو کب اور کیسے وادی سبز یعنی اپنی آبائی بستی کو ظالم ژیان کے قبضے سے چھڑا سکے گی اس بارے میں نضار نے کچھ نہیں کہا۔"

"اے میرے بھائی احرس!" نضار بول اٹھا۔ "تُو شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ میں صرف اپنی آبائی بستی حاصل کرنے کے لئے نہیں کر رہا یہ تو اس بڑی اور آخری فیصلہ کن جنگ کا ایک مرحلہ ہے۔ آخری معرکہ تو ہمیں ژیان ہی سے کرنا ہے۔ مگر اپنے قدم جما لینے کے بعد۔"

میں نے بھی یہ بات محسوس کر لی کہ احرس نے نضار کی نیت پر شبہے کا اظہار کر کے اچھا نہیں کیا۔ میں اسی لئے بولی۔ "اے احرس! تجھے شاید معلوم نہیں کہ نضار کی اور میری جنگ ایک ہے۔ ہم دونوں کا دشمن ایک ہے اور ہم ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ژیان نے جو ظلم مجھ پر اور میرے بابا پر کیا' وہی نضار اور سردار اشر پر ہوا۔ ہم دونوں کی آرزو ایک ہے کہ اپنے مشترکہ دشمن سے انتقام لے سکیں۔ یقیناً اب تیری غلط فہمی دور ہو جانا چاہئے۔"

"میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا' میں نے تو صرف اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔" احرس کے لہجے سے خجالت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسے شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے مخالفت برائے مخالفت

والا رویہ اپنایا تھا اور اس کا سبب محض نضار سے رقابت کا احساس تھا کچھ اور نہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر احرس کو کچھ بولنے پر مجبور نہ کرتی تو بہتر ہوتا۔ بہرحال کمان سے نکلا ہوا تیر اور منہ سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آتی۔ میں نے اسی لئے اس بات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اب میں نے نضار کی جنگی حکمت عملی کے سلسلے میں متوقع اقدامات پر غور شروع کر دیا۔

"دو صورتیں ہیں اس کی۔" نضار نے آئندہ اقدامات پر گفتگو شروع کی۔ "ایک تو یہ کہ چند روز بظاہر خاموش رہا جائے تاکہ دشمن اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ ہارا ہوا لشکر منتشر ہو چکا ہے اور دوبارہ حملہ نہیں کرے گا۔ اس طرح اے مہا پجاری' تیرے سپاہیوں کو بھی آرام مل جائے گا۔ چند دن آرام کے لئے بہتر یہ ہے کہ تُو اپنا لشکر لے کر میرے ساتھ چل۔ میری بسائی ہوئی دونوں بستیوں میں سے کسی ایک میں تیرا لشکر قیام و آرام کر سکتا ہے۔ یہاں کی طرح وہاں ان بستیوں میں تیرے لشکر کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ تیرا لشکر اور میری دونوں بستیوں کے لشکر ایک ساتھ چند روز کے بعد دوبارہ ادھر آئیں اور پھر تینوں لشکر تینوں طے شدہ محاذ کھول دیں۔ دوسری صورت یہ ہے اے معبلہ!" نضار نے مجھے مخاطب کیا۔ "کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس پر دوبارہ حملہ کر دیا جائے۔ اس کے لئے تیرے لشکر کو یہیں رک کر میرے دونوں لشکروں کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ہم یہاں سے تین مختلف سمتوں میں ایک ساتھ روانہ ہوں گے اور دشمن پر ٹوٹ پڑیں گے۔ مجھے یہاں سے جانے اور پھر واپس آنے میں کم سے کم بھی دو دن اور ایک رات لگ جائیں گے کیونکہ سپاہ کو تیاری اور روانگی میں بھی وقت لگے گا۔ یوں ہم اب سے تیسری رات کو دشمن پر شب خون مار سکیں گے' مگر میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ میں نے اے معبلہ! اور اے مہا پجاری! اور اے میرے بھائی احرس! دونوں صورتیں تمہارے سامنے رکھ دی ہیں۔" اس مرتبہ نضار نے احرس کو بھی مخاطب کر لیا تاکہ وہ خود کو کمتر محسوس نہ کرے یا اس معاملے سے خود کو الگ نہ سمجھے۔ مجھے نضار کی اس اعلیٰ ظرفی پر خوشی ہوئی۔ وہ اب کہہ رہا تھا۔ "دونوں ہی صورتیں قابل عمل ہیں تم لوگ جس پر متفق ہو جاؤ اسی پر عمل کیا جائے۔"

نضار کے بعد میں نے ہی بولنے میں پہل کی۔ "جو لشکر ایک مرتبہ شکست کھا جاتا ہے اے نضار! اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ یہ تُو بھی جانتا ہو گا کہ حوصلہ ہار جانے والے کبھی فتح مند نہیں ہوتے۔ اس وقت ہمارے لشکر کو ایک نئے حوصلے کی ضرورت ہے اور میرے نزدیک اس کی واحد صورت یہ ہے کہ اسے امید کے نئے چراغ روشن نظر آئیں۔ امید کے یہ نئے چراغ اسی وقت روشن ہوں گے جب اس بار لشکر والوں کو اپنی فتح کا یقین ہو جائے۔ یقین میں بڑی قوت ہے اور یہ یقین انہیں اس وقت ہو گا جب وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ اس علاقے میں بھی ان کے دوست اور مددگار موجود ہیں' وہ اکیلے نہیں ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ہمیں جلدبازی سے کام نہ لے کر نضار کے ساتھ یہاں سے اس کی کسی ایک بستی کی طرف چل دینا چاہئے۔"

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے احرس کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈالی کہ دیکھوں ان الفاظ کا اس پر کیا ردعمل ہے۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق ہی نکلا تھا۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی ہی کے آثار

تھے۔

پھر اس سے پہلے کہ مہا پجاری کچھ کہتا احرس بول اٹھا۔ "میرے نزدیک یہ نامناسب ہے جب ہم یہیں لوٹ کر آنا ہے تو پھر یہاں سے جانے کی ضرورت کیا ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ لشکر کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لئے اسے مددگاروں کو آنکھوں سے دکھانا ضروری ہے۔ ان باتوں سے لشکر والوں کو یہاں رہ کر بھی آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ رہی یہاں خطرے کی بات' تو میرا خیال ہے کہ اگر لشکر کے قیام میں یہاں خطرہ ہوتا تو وہ گزشتہ رات سے اب تک پیش آ چکا ہوتا۔ ہم یا ہمارا لشکر یہاں آرام کرنے نہیں آیا۔ ہم لڑنے آئے ہیں اور آخر دم تک لڑیں گے۔" احرس کی آواز پُرجوش ہو گئی۔

یہ صورت حال میرے لئے کوئی بہتر نہیں تھی۔ احرس بلاسبب مخالفت کر رہا تھا۔ اگر اس کا کوئی مقصد تھا تو صرف یہ کہ میں نضار سے دور ہی رہوں' لیکن اس کے جذبہ رقابت کی وجہ سے میں نضار کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں اسی لئے بات کو سنبھالنے کی خاطر بولی۔ "اے احرس! ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو یہ کہہ چکا ہے کہ میں جو بھی فیصلہ کروں گی تجھے اپنا ہمنوا پاؤں گی پھر تُو کیوں میری تجویز کی مخالفت میں بول رہا ہے؟"

"تو پھر اے آتون! مجھ سے مشورہ نہ لے۔" اس کا لہجہ بگڑا ہوا تھا۔ "تُو وہی کر جو نضار کہتا اور چاہتا ہے۔" اس نے برملا نضار سے اپنی رقابت کا اظہار کر دیا۔

بات بننے کی بجائے مزید بگڑنے لگی تو مجھے دل پر جبر کر کے سختی سے کام لینا پڑا۔ میں نے احرس سے کہا۔ "ہاں میں وہی کروں گی جو نضار کہے گا۔ وہ تجربہ کار اور عقلمند ہے' دل کو دماغ پر ترجیح نہیں دیتا۔"

"اور میں ناتجربہ کار اور بے وقوف ہوں' دل کو دماغ پر ترجیح دیتا ہوں۔ تُو یہی کہنا چاہتی ہے نا!" احرس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اے احرس! تُو اپنا دل چھوٹا نہ کر۔" مہا پجاری نے اسے سمجھایا۔ "ہم سب کے حق میں وہی بہتر ہے جو آتون چاہتی ہے۔"

"اور آتون اب وہی چاہتی ہے جو نضار چاہتا ہے' یہی بات ہے نا!" احرس کی آواز اور چہرے کے تاثرات سے یہی لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے رو دے گا۔

"اس لئے اے احرس کہ نضار ہمارا بھلا چاہتا ہے۔" مہا پجاری نے پھر اسے نرمی سے سمجھانا چاہا مگر شاید مہا پجاری یہ بات بھول گیا تھا کہ جو شخص خود کوئی بات سمجھنا نہ چاہے' اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا۔

"اسے چھوڑ اے مہا پجاری!" میں بول اٹھی۔ "تُو اپنا خیال ظاہر کر کہ نضار نے جو دو صورتیں بیان کی ہیں' ان میں سے کس پر عمل کرنا بہتر رہے گا؟"

"میرے نزدیک یہی مناسب ہے اے آتون کہ ہم فی الحال جلد بازی نہ کریں۔" مہا پجاری نے جواب دیا۔ "ممکن ہے کہ ہمیں مزید غور و فکر کا موقع مل جائے تو ہم کوئی اور بھی بہتر راستہ نکال سکیں۔"

"تو پھر ہمیں کل ہی صبح نضار کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔" میں نے گویا فیصلہ سنا دیا۔ مہا پجاری نے میری رائے سے اتفاق کیا مگر احرس خاموش ہی رہا۔ اس کی نظریں نیچی تھیں اور

نئی سوچ میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ میں نے دانستہ اس کی تائید حاصل کرنے سے گریز کیا کہ کہیں وہ کوئی مزید نئی پیدا نہ کر دے۔

اس دوران میں سپاہی میرے اور نضار کے گھوڑے لے کر آ چکے تھے۔ گھوڑوں کو انہوں نے اس میں باندھ دیا تھا جہاں مہا پجاری اور احرس کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ سامان وہ ہمارے ہی پاس رہ گئے تھے۔ مظلوم لڑکی کے لئے میں نے حکم دیا تھا کہ اسے بستی کے قریب چھوڑ دیا جائے۔

میرے اور نضار کے لئے اسی غار میں بستر لگا دیئے گئے۔ میں نے احرس کے قریب اپنا بستر بچھوایا مہا پجاری کا بستر پہلے ہی سے کونے میں بچھا تھا' پھر احرس کا بستر تھا۔ میری دائیں جانب احرس اور بائیں جانب نضار تھا۔ احرس نے لیٹتے ہی میری طرف اپنی پشت کر لی تھی۔

میں نے نضار کے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ احرس کے رویے سے اس کی دل شکنی ہوئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال کو کس طرح قابو میں کروں جذباتی احرس نے مجھے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اب وہ دوسری طرف کروٹ لے کر یہ ظاہر کر رہا تھا کہ مجھ سے خفا ہے۔ ہرچند کہ احرس کا جذبہ رقابت مجھ سے تعلق خاطر اور وابستگی ہی کی دلیل تھا مگر اس کا یوں برملا اظہار مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنی عزت و وقار کو نضار کی نظروں میں گرتے محسوس کیا تھا۔ غالباً اسی احساس کے زیر اثر میں نے احرس کے ساتھ سخت رویہ اختیار کر لیا تھا۔ احرس میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ میں نے آج سے پہلے کبھی اس کے ساتھ اتنے تلخ لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ مجھے اس پر ملال بھی تھا لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

احرس ہی کی وجہ سے اس رات مجھے دیر تک نیند نہیں آ سکی۔ میں سونے کی کوشش کرتی رہی اور آنکھیں بند کئے کروٹیں بدلتی رہی۔ اچانک میں نے ہلکی سی سرسراہٹ سن کر آنکھیں کھول دیں تو دیکھا احرس اپنے بستر سے اٹھ رہا ہے۔ اس پر مجھے حیرانی ہوئی' مگر میں نے احرس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ جاگ رہی ہوں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پلکوں کے درمیان جھری سے میں بھی اس کا جائزہ لیتی رہی کچھ دیر تک میرے چہرے کو دیکھنے کے بعد وہ دبے قدموں غار کے دہانے کی جانب بڑھ گیا۔ احرس اس وقت کہاں جا رہا ہے؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ پھر وہ جیسے ہی غار کے دہانے سے نکلا میں بھی تیزی سے اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی۔ میں نے اسے دائیں جانب والے ایک غار میں جاتے دیکھا اور اسی وقت کوئی گھوڑا ہنہنایا۔ میں چونک اٹھی۔ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز اسی غار سے آئی تھی جس میں احرس داخل ہوا تھا۔

باہر زیادہ اجالا نہیں تھا۔ میں غار کی بیرونی دیوار سے چپک کر کھڑی ہوئی تھی۔ ذرا ہی دیر کے بعد احرس ایک گھوڑے کی لگام تھامے اس غار سے نکلا۔ اب میرا یہ قیاس یقین میں بدل چکا تھا کہ احرس مجھے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ انتہائی قدم بھی اٹھا سکتا ہے جو میرے نزدیک خودکشی کے مترادف تھا۔

گھوڑے کی لگام تھامے وہ میری ہی طرف بڑھ رہا تھا مگر مجھے اب دیکھ لئے جانے کا اندیشہ نہیں

تھا۔

"ٹھہر جا احرس!" وہ جیسے ہی میرے قریب سے گزرنے لگا میں نے اسے مخاطب کیا۔

خلاف توقع میری آواز سن کر وہ تقریباً اچھل پڑا۔ وہ رک تو گیا مگر اسی کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "مجھے نہ روک' جانے دے آتون!"

"کہاں جا رہا ہے تُو؟" میں نے سوال کیا۔

"واپس جا رہا ہوں۔" اس نے بدستور بھاری آواز میں جواب دیا۔

"کیا تجھے واپسی کا راستہ معلوم ہے؟ اور کیا تیرے پاس مناسب سامانِ سفر ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ .... مجھے اب ساری زندگی بھٹکنا ہی تو ہے' سو بھٹک جاؤں گا کہیں .... اگر بھوک پیاس سے مرنا ہوگا تو .... تو مر جاؤں گا .... میری زندگی کی پرواہ بھی کسے ہے .... ہاں تیری زندگی سے نکل جاؤں گا تو شاید .... تُو بہتر زندگی گزار سکے۔"

"پاگل ہو گیا تُو! .... بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ میں کہتی ہوں تجھ سے کہ یہ پاگل پن چھوڑ' گھوڑا باندھ کر آ' غار میں اور چل کر سو۔"

"تُو آخر مجھے کیوں روک رہی ہے اے آتون!"

"اس لئے کہ مجھے حق ہے تجھے روکنے کا .... بول' کیا تُو مجھ سے میرا یہ حق چھین لے گا؟" میری آواز بھی بھرا گئی۔

"میں تیری زندگی سے نکلنے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر .... مگر تُو نے اپنا حق مجھ پر جتا کر میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ ٹھیک ہے' فی الحال ...." وہ یہ کہہ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر مڑا اور اسی غار کی طرف چلا گیا جس سے گھوڑا کھول کر لایا تھا۔

ذرا دیر کے بعد وہ گھوڑا باندھ کر آ گیا تو میں نے کہا۔ "آ کہیں اکیلے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"چل!" وہ میرے ساتھ ہو لیا۔

میں اسے ساتھ لئے ان غاروں کے علاقے سے کچھ دور نکل آئی اور ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔

"اے احرس! مجھے یوں لگتا ہے کہ تُو کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"ہاں آتون!" اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "نضار کا بھی یہی خیال ہے۔"

"تُو پھر وہی بکواس کرنے لگا۔" میں نے اسے محبت سے ڈانٹا' پھر بولی۔ "دیکھ' وہ شخص میرے محسن کا بیٹا ہے جس نے مجھے پناہ دی تھی اور سن کہ وہ ہم سبھی کا بہی خواہ ہے۔ وہ ہم سب سے زیادہ تجربہ کار ہے۔ تجھے اس سے آخر کیا رنجش ہے؟ وہ تو تجھے اپنا بھائی کہہ رہا تھا۔"

"میں تیرے ساتھ کسی اور کو نہیں دیکھ سکتا۔" احرس نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ "اور نہ میں تیرے منہ سے کسی اور کی تعریف سن سکتا ہوں اے آتون!"

"مگر میرے ساتھ تو مہا پجاری بھی ہے اور دوسرے لوگ بھی.........."

"ان لوگوں کی بات اور ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "نضار میں اور دوسرے لوگوں میں فرق ہے۔"

"تو بتا بھی کیا فرق ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا' ہاں مَیں نے اتنا ضرور محسوس کیا ہے کہ جن نظروں سے وہ تجھے دیکھتا ہے' میرے سوا کسی اور کو دیکھنے کا حق نہیں۔"

"وہم ہے یہ تیرا اور کچھ بھی نہیں۔ تجھے شاید یہ خبر نہیں کہ وہ کسی بھی عورت کو اپنی بیوی نہ بنانے کا عہد کر چکا ہے۔" میں نے دانستہ مصلحت کے پیش نظر آدھا سچ بولا۔ "تُو خواہ مخواہ نہ جانے اس کے لئے کیا کیا سوچنے لگا ہے۔"

میری بات سن کر احرس چونک اٹھا اور پھر خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑانے لگا۔ "تو پھر .... پھر وہ .... وہ میرا وہم ہی ہوگا۔"

احرس نے غلط محسوس نہیں کیا تھا اور شاید محبت کرنے والے کبھی غلط محسوس نہیں کرتے۔ نضار کی آنکھوں میں اپنے لئے پسندیدگی کو میں نے خود محسوس کیا تھا مگر اسے کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔ بہرحال اس وقت احرس نے اسے اپنا وہم ہی سمجھا اور یوں میں اسے راہ راست پر لانے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح چہکنے لگا' نضار کے لئے میرے دل میں بھی کہیں کوئی چور دروازہ ضرور کھل چکا تھا مگر احرس ہی کی طرح میں خود کو یہ باور کرانے کی کوشش میں تھی کہ یہ میرا محض وہم ہے' حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔

"اچھا اب اٹھ۔" میں احرس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "اگر مہا پجاری کی آنکھ کھل گئی اور اس نے ہم دونوں ہی کو غار میں نہ پایا تو نہ جانے کیا سمجھے گا۔"

"زیادہ سے زیادہ یہی سمجھے گا کہ ایک نوجوان لڑکی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ.........."

"بکواس نہ کر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

پھر ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے غار کی طرف لوٹ آئے۔ نضار اور مہا پجاری بدستور محو خواب تھے۔ ہم دونوں بھی اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ میرے ذہن سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا تھا اور میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے مجھے سونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

ہم سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی بیدار ہو گئے۔ رات ہی کو لشکر کے سالاروں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ صبح کوچ کرنا ہے۔ سورج طلوع ہوتے ہوتے ہمارا لشکر اول کی بستی کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ نضار کا محافظ دستہ بھی اب ہم سے آ ملا تھا۔ اس کے الگ سفر کرنے کی اب ضرورت نہیں رہی تھی۔

صبح اٹھتے ہی میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ نضار کچھ چپ چپ سا تھا۔ غالباً اس کی وجہ احرس کا رویہ ہی ہو سکتا تھا۔ جب لشکر روانہ ہوا تو میرے دائیں بائیں مہا پجاری اور احرس تھے۔ ہمارے پیچھے سارا لشکر تھا۔ نضار اور اس کا محافظ دستہ ہماری رہنمائی کے لئے آگے آگے تھا۔ میں نے احرس کی

توجہ نضار کی طرف مبذول کرائی اور جو محسوس کیا تھا اسے بتایا۔

"تیرے دل میں اے آتون! پھر اس کے لئے درد اٹھنے لگا۔" احرس آہستہ سے ہنسا۔ "اگر یہ وجہ سے اس کا منہ سوجا ہوا ہے تو میں رات کے رویے کی معذرت کئے لیتا ہوں۔ بول اور کیا چاہتی ہے اس عشق کے مارے سے؟"

"پٹڑی سے اترنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے جھڑکا۔ "مت بھول کہ مہا پجاری بھی ہمارے ساتھ ساتھ ہی چل رہا ہے۔ ویسے تیری یہ تجویز بری نہیں۔"

"تو پھر میں چلا تیرا حکم بجالانے۔" یہ کہہ کر احرس ہم سے آگے اپنا گھوڑا نکال لے گیا۔

احرس کچھ دیر تک نضار کے ساتھ ساتھ اپنا گھوڑا دوڑاتا رہا اور پھر ہم سے آملا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا رہا؟"

"وہی جس کی توقع تھی۔" احرس مسکرا کر کہنے لگا۔ "بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو معاف کر دیا۔"

""یہ اچھا ہوا۔" میں نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا پھر مسکرا کر بولی۔ "اگر تیرے سینے پر سانپ نہ لوٹنے لگے تو میں بھی اس کا حال احوال معلوم کر آؤں؟"

"میرے جانے سے تیری تسلی نہیں ہوئی کیا؟ .... دیکھ تُو نے خود ہی سانپ کا ذکر چھیڑ دیا ہے اب اگر میں سانپ کے ساتھ چوہے........."

"اتر آیا گندی باتوں پر۔" میں نے یہ کہتے ہی اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا اور پھر نضار کے قریب پہنچ گئی۔

"اب کیا تُو بھی احرس کی طرح مجھ سے معذرت کرنے آئی ہے اے معبلہ!" نضار نے مجھے اپنے قریب دیکھ کر عجیب سے لہجے میں بولا۔

"ہاں اے نضار! میری ہی وجہ سے تجھے گزشتہ رات شرمندگی اٹھانا پڑی۔" میں نے کہا۔ "ہرچند کہ احرس خود تجھ سے معذرت کر چکا ہے پھر بھی میں........"

"اس کی ضرورت نہیں۔" نضار میری بات کاٹ کر بولا۔ "مجھے تُو نے یہ نہیں بتایا تھا کہ احرس تیرے اس قدر قریب ہے ورنہ میں اس کے سامنے تجھ سے گفتگو کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیتا۔ معذرت تو مجھے تجھ سے کرنا چاہئے کہ میری وجہ سے احرس تجھے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اسے میری طرف سے مطمئن کرنے کے لئے تجھے یہاں تک کہنا پڑا کہ میں شادی نہ کرنے کا عہد کر چکا ہوں۔" آخری الفاظ کے ساتھ نضار کی آواز سے دکھ جھلک رہا تھا۔

میں چونک اٹھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ نضار نے میری اور احرس کی باتیں چھپ کر سنی تھیں۔

"اس پر بھی اے معبلہ! میں تجھ سے معذرت خواہ ہوں کہ تیرے اور احرس کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نے سنی۔" نضار نے مزید کہا۔

"تُو یہ کیسی بیگانوں جیسی باتیں کر رہا ہے اے نضار!" میں بولی۔ "سن! احرس ایک جذباتی نوجوان

مگر اس کے دل میں کینہ نہیں' جو بھی اس کے دل میں ہوتا ہے زبان پر لے آتا ہے۔ وہ کھلا دشمن کھلا دوست ہے۔ یہ میں تجھ سے اس کی وکالت نہیں کر رہی بلکہ یہی حقیقت ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ گیا ہے اور اسے سمجھانا مشکل ہے' مجبوراً میں نے اسی لئے اس سے آدھا سچ بولا۔ تجھے اگر یہ بات بری لگی ہے تو میں تجھ سے........"

"نہیں' بہت ہو چکی معذرت۔ اب اے معبلہ! بھول جا اس واقعے کو۔ یقین کر کہ میرے دل میں تیری طرف سے قطعی میل نہیں۔" نضار بول اٹھا۔ "میں تو تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ زندگی تو نے ہی مجھے دی ہے' یہ تیرا قرض ہے مجھ پر۔"

"ایسا کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کر اے نضار کہ میں پہلے ہی تجھ سے بہت شرمندہ ہوں۔" میں بولی اور پھر دانستہ موضوع گفتگو بدل دیا۔ "اے نضار! میں تجھ سے ایک مشورہ اور چاہتی ہوں۔ تیری آبائی بستی کی فتح کے بعد ہم براہ راست ژیان سے ٹکر لیں گے۔ ژیان پر حملہ آور ہونے کا ہمارے پاس مناسب جواز بھی موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ وادی سبز کی وارث میں ہوں' وہ نہیں۔ اس پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لئے اگر ہم اپنی افرادی قوت میں اضافہ کر لیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہو گا؟ یوں بھی تیرا کہنا ہے کہ پہلی فتح کے بعد اپنے قدم جمانے کی ہمیں ضرورت پڑے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارے پاس وقت ہو گا' اس عرصے میں ہم اپنی افرادی قوت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے لئے ہمیں ابھی سے منصوبہ بندی کرنا پڑے گی۔"

"مگر کس طرح اے معبلہ! کیا اس کی کوئی صورت ہے؟" نضار نے دریافت کیا۔

میں نے جواب میں اسے سمیر کے بارے میں بتایا پھر کہا۔ "سردار سمیر خود بھی ایک تجربہ کار شخص ہے۔ اس کے لشکر کو یہاں لانے کے لئے مہا پجاری اور احرس کو روانہ کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کی غیر موجودگی میں اپنے لشکر کی کمان میں خود کر سکتی ہوں۔ پھر تُو بھی میری مدد کے لئے موجود ہے۔"

"یعنی اے معبلہ! تُو یہ چاہتی ہے کہ پہلے معرکے سے قبل ہی ان دونوں کو سمیر کے پاس کمک لانے کے لئے بھیج دیا جائے؟"

"ہاں میں یہی چاہتی ہوں اے نضار!" میں نے اپنی مرضی ظاہر کی۔ "کیونکہ انہیں وہاں جانے اور پھر واپس آنے میں خاصا وقت لگ جائے گا۔"

"تیری تجویز بہت مناسب ہے اے معبلہ! لیکن........" نضار کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں بول نا' تُو رک کیوں گیا؟" میں نے کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد کہا۔

"چھوڑ' رہنے دے۔ یہ تیرا ذاتی معاملہ ہے اور .... اور تجھے خود ہی معلوم ہو جائے گا۔" اس نے کچھ بتانے سے گریز کیا۔

جب یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی بات چھپائی جا رہی ہے تو تجسس اور بڑھ جاتا ہے۔ میں نے اسی لئے نضار سے اصرار کیا۔

"میں تجھ سے یہ بات کہنا نہیں چاہتا تھا مگر اے معبلہ تُو ضد کر رہی ہے تو پوچھ لیتا ہوں۔ کیا احرس

تیری جدائی برداشت کر لے گا اور کیا وہ تجھے میرے پاس چھوڑ جانے پر آمادہ ہو جائے گا؟" یہ کہتے ہوئے نضار کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ تھی۔

مجھے نضار کی یہ بات کچھ گراں گزری اور شاید اسی لئے میں نے کہہ دیا۔ "اے نضار! میں احرس کی پابند نہیں ہوں اور نہ اس کی بیوی ہوں کہ وہ مجھے یہاں چھوڑ کر جانے پر راضی نہ ہو یا مجھے یہاں رہنے کی خاطر اس سے اجازت لینا پڑے۔ تُو شاید میرے اور اس کے درمیان گزشتہ رات ہونے والی گفتگو کر کسی غلط نتیجے پر پہنچ گیا ہے۔ میں تجھے صاف صاف بتا دوں کہ احرس میرے بچپن کا ساتھی اور دوست ہے۔ ہمارے تعلقات آج تک دوستی کی حدود سے آگے نہیں بڑھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ خوش مزاج ہے اور اسی سبب مجھے چھیڑتا رہتا ہے۔" پھر میں نے نضار کو اپنی اس مجبوری سے آگاہ کیا جو بچپن ہی سے میرے گلے کا ہار بن گئی تھی۔ "کوئی بھی فرد صرف اپنی پرستش نہیں چاہتا' برابر کی سطح پر بھی کسی سے اور بات کرنا چاہتا ہے۔ سو احرس نے میری اس ضرورت کو پورا کر دیا اور میں نے خود ہی اسے برابری کی اجازت دی۔ میرے اور احرس کے درمیان جو کچھ تعلق ہے اور اس کی جو نوعیت ہے' اس سے میں نے تجھے آگاہ کر دیا۔ اس کے باوجود اگر تُو احرس اور میرے تعلق کو کسی اور زاویے سے دیکھنے پر ضد کرے مجھے دکھ ہو گا۔"

"تجھے میری بات شاید ناگوار محسوس ہوئی اے معبلہ! میں اسی لئے یہ بات کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ سوچ خود ہی کہ میں تجھے دکھ پہنچا سکتا ہوں؟ اے معبلہ! میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں کیوں تیرے اور احرس کے تعلقات کو کسی اور زاویے سے دیکھنے لگا۔"

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ موضوع گفتگو بدل جانے کے باوجود پھر احرس کا ذکر چھڑ گیا تھا۔ نضار نے ابھی جو کچھ کہا تھا اس میں خلوص اور سچائی کی جھلک تھی۔ اتنا اندازہ تو میں بھی لگا سکتی تھی کہ نضار مجھے دکھ نہیں پہنچا سکتا۔ سو یہی بات بطور تصدیق میں نے زبان سے بھی کہہ دی۔ اس کے بعد' میں احرس اور مہا پجاری کے پاس آ گئی۔ احرس نے مجھے سنجیدہ دیکھ کر شاید چھیڑنا' مناسب نہیں سمجھا ورنہ میں نے اس کے ہونٹوں پر بڑی شریر مسکراہٹ دیکھی تھی۔

راستے میں کچھ دیر کو ہم نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ افراد اگر کم ہوں تو سفر تیزی سے ہوتا ہے لیکن لشکر ساتھ ہونے کی صورت میں رفتار کم ہو جاتی ہے۔ ہمیں اسی وجہ سے نضار کے نائب' ادل کی بستی تک پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔

لشکر کو بستی کے باہر ہی روک لیا گیا۔ نضار کا محافظ دستہ بھی لشکر کے ساتھ ہی رک گیا۔ اس نے صرف ایک محافظ کو نضار نے کچھ ہدایات دے کر آگے بھیج دیا۔ وہ بستی میں اپنی اور میری آمد کو راز رکھنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں جس طرح راز داری کے ساتھ بستی سے روانہ ہوئے تھے' اسی طرح سے خاموشی کے ساتھ بستی میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ احرس اور مہا پجاری کو بھی نضار حویلی ہی میں ٹھہرانا چاہتا تھا۔ لشکر کے پڑاؤ کی خاطر اس نے بستی کے باہر موجود میدان تجویز کیا تھا۔ یہ وہی میدان تھا جہاں میں نے وادی سبز کے جلاد کا سر قلم کیا تھا۔

میرے نزدیک یہ بڑی بات تھی کہ لشکر کو ایک محفوظ جگہ پڑاؤ کے لئے میسر آ گئی تھی جہاں دشمن کا خطرہ نہیں تھا۔

مہا پجاری بھی کیونکہ ژیان اور وادی سبز والوں کے لئے ایک معروف شخصیت تھا اور اس کا حلیہ بھی سب سے الگ تھا اس لئے نضار نے بطور خاص اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ حویلی کی حدود سے باہر قدم نہ رکھے۔ اس بستی میں بھی وادی سبز کا کوئی مخبر آ سکتا تھا' اس لئے مہا پجاری کو احتیاط سے کام لینا تھا۔ اسے آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔ یہ صورت میرے ساتھ بہرحال نہیں تھی کیونکہ جب میں وادی سبز سے مہا پجاری کے ساتھ فرار ہوئی تھی تو بچی تھی۔ اب اپنے چہرے اور جسمانی ساخت کی تبدیلی کے بعد کسی کا مجھے پہچان لینا ناممکن ہی تھا۔ سو میرا نام ہی بدلنا کافی تھا۔ رازداری ہی کے پیش نظر نضار نے اب یہ طے کیا تھا کہ وہ خود بھی میرا اصل نام معبلہ نہیں لے گا اور دوسرے لوگوں کی طرح مجھے آتون ہی کہے گا۔ یہ ساری باتیں حویلی تک پہنچتے ہوئے میرے' نضار کے اور مہا پجاری کے درمیان ہوئیں۔ رات کا وقت تھا اس لئے نضار کو چادر اوڑھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہم چاروں خاموشی کے ساتھ حویلی کے عقبی دروازے سے داخل ہوئے جو ہمیں کھلا ہوا ملا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ادل نے ہمیں تعظیم دی اور اپنے ساتھ حویلی کے اندر لے گیا۔ گھوڑے ہم نے دروازے ہی پر محافظوں کے حوالے کر دیئے تھے۔

ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھانے کے بعد ہم بستروں پر دراز ہو گئے۔ حویلی کے اس حصے میں مخصوص خادموں اور خادماؤں کے سوا کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ تھکن کی وجہ سے ہم تینوں ہی خوب گہری نیند سوئے اور پھر صبح ہی ہماری آنکھ کھلی۔ وہ ایک بڑا کمرا تھا جہاں احرس' مہا پجاری اور میرے بستر لگائے گئے تھے۔ نضار بھی حویلی کے اسی حصے میں تھا مگر اس کا قیام کسی اور کمرے میں تھا۔

ادل اور نضار بھی ناشتے میں ہمارے شریک تھے۔ وہ دونوں ہمارے ہی کمرے میں آ گئے تھے۔ میں نے موقع دیکھ کر بات چھیڑ دی۔ وہ بات جو گزشتہ روز نضار سے کی تھی۔ مہا پجاری نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "تُو بالکل ٹھیک کہتی ہے اے آتون! اگر سمیر بھی ہمارے ساتھ آ ملے تو پھر ہماری افرادی قوت میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ پھر ہم ژیان پر ایسی بھرپور ضرب لگا سکیں گے کہ ہماری فتح یقینی ہو جائے۔"

"میرا خیال ہے اے مہا پجاری! تُو آج ہی احرس کو اپنے ساتھ لے کر کسی وقت یہاں سے روانہ ہو جا اور پھر جلد از جلد سمیر کے لشکر کو ساتھ لے کر یہاں لوٹنے کی کوشش کر۔" میں یہ کہہ کر نضار سے مخاطب ہوئی۔ "اے نضار! مہا پجاری اور احرس کی حفاظت کے لئے تُو اپنے چند سپاہیوں کو ان دونوں کے ساتھ کر دے تاکہ سفر کے دوران میں کوئی انہیں پریشان نہ کر سکے۔"

"اگر تُو اپنے لشکر کے سپاہیوں میں سے چند کو ان دونوں کے ساتھ کر دے تو زیادہ بہتر ہو گا۔" نضار بولا۔

مہا پجاری نے بھی اس تجویز کی تائید میں کہا۔ "ہاں' یہ ٹھیک رہے گا۔"

اب تک اس معاملے میں دانستہ میں نے احرس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ خود وہ بھی خاموش ہی

رہا تھا۔ پھر یہ طے ہوا کہ احرس لشکر میں جا کر چند سپاہیوں کو منتخب کر لے۔ مہا پجاری اس حویلی سے نہیں نکلنا چاہتا تھا۔

ادل اور نضار ناشتے کے بعد رخصت ہو گئے۔ احرس کو حویلی کے دو محافظوں کے ساتھ بستی کے باہر میدان کی طرف جانا تھا۔

"اے آتون! تُو بھی میرے ساتھ چل۔" احرس نے مجھ سے کہا۔

"نہیں اے احرس! بس تُو ہی چلا جا۔" میں بولی۔ "حویلی سے میرا بھی نکلنا مناسب نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے مناسب؟" وہ بضد ہو گیا۔ "مجھے تجھ سے اکیلے میں کچھ بات کرنا ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی کیونکہ کمرے میں مہا پجاری بھی موجود تھا۔

"تجھے جو کچھ کہنا ہے' یہیں کہہ لے۔ میں باہر تیرے ساتھ نہیں جا سکتی۔" میں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ "اس بستی کے کچھ لوگ مجھے پہچانتے ہیں اور میں ان کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔ تجھے معلوم ہے کہ میں پہلے بھی اس بستی میں آ چکی ہوں۔ ایسا کر کہ ادھر کونے میں چل کر بات کئے لیتے ہیں۔"

"نہیں۔" احرس کی آواز میں سختی آ گئی۔ "مجھے اب تجھ سے کوئی بات نہیں کرنا۔"

"ذرا ذرا سی بات پر تُو بچوں کی طرح ضد کرنے لگتا ہے آخر کیا ہو گیا ہے تجھے؟ پہلے تو ایسا نہیں تھا تُو۔"

"سینگ نکل آئے ہیں میرے .... پاگل ہو گیا ہوں میں۔" اس کی آواز تیز ہو گئی۔

"اے احرس! کیا بات ہے؟ تُو کیوں بگڑ رہا ہے؟" مہا پجاری بولا' جو کچھ ہی فاصلے پر بیٹھا تھا۔

"کچھ نہیں اے مہا پجاری!" میں بول اٹھی۔ "یہ مجھے اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہتا ہے اور میں .... میں جانے کو تیار ہوں۔"

"کیوں اب کیا ہوا؟ اب تجھے کوئی نہیں دیکھے گا؟" احرس ہاتھ اٹھا کر بولا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ایک خادمہ کو بلا کر مردانہ لباس لانے کو کہا۔ "لباس کسی محافظ کا ہو تو بہتر ہے۔" میں نے تاکید کی۔

"بہتر ہے۔" خادمہ ادب سے جھک کر چلی گئی۔

احرس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ اسے اس کے سوال کا جواب مل گیا تھا کہ اب میں چلنے پر کیوں آمادہ ہوں۔

پھر دو محافظوں کی بجائے ایک ہی محافظ کو رہنمائی کے لئے ساتھ لیا گیا۔ میں مردانہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں احرس کے ساتھ تھی۔

حویلی سے نکلتے ہی دانستہ میں آہستہ چلنے لگی تاکہ ہمارے ساتھ چلنے والا محافظ کچھ آگے نکل جائے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ محافظ' میرے اور احرس کے درمیان ہونے والی گفتگو سنے۔ جب آگے آگے چلنے والے محافظ اور ہمارے درمیان مناسب فاصلہ ہو گیا تو میں نے احرس کو مخاطب کیا۔ "ہاں بول' کیا بات ہے؟ تجھے کیا کہنا تھا مجھ سے؟ .... اب تو کہہ سکتا ہے؟"

"ہاں مجھے تجھ سے صرف اتنا کہنا تھا کہ اب تو اپنے اور نضار کے درمیان سے تُو نے میرا کانٹا نکالنے کا بندوبست کر لیا نا! اب تو تجھے سکون آ گیا ہو گا۔" وہ بولا اس کی آواز میں کسی تیز نشتر کی سی کاٹ تھی۔

"تو پھر فضول باتیں کرنے لگا۔" مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ "تجھے پہلے بھی میں سمجھا چکی ہوں' مگر کوئی بات تیری عقل میں نہیں بیٹھتی' بتا چکی ہوں تجھے کہ نضار کسی کو بھی اپنی بیوی نہ بنانے کا عہد کر چکا ہے اور پھر اگر وہ یہ عہد نہ بھی کرتا تو اس سے کیا فرق پڑ جاتا۔"

"پھر مجھے تُو مہا پجاری کے ساتھ کیوں بھیج رہی ہے؟"

"اے احرس! میں تو تجھے قطعی بے وقوف سمجھ رہی تھی مگر تُو بڑا عقلمند نکلا۔" میں نے اس پر طنز کیا۔ "تُو ٹھیک سمجھا کہ میں اسی لئے تجھے مہا پجاری کے ساتھ بھیج رہی ہوں کہ نضار کو عہد شکنی پر مجبور کر کے اس کی بیوی بن جاؤں۔ مجھے بتا اے عقل کل' کہ اگر میری یہی مرضی ہو تو تیری موجودگی میں کیا میں ایسا نہیں کر سکتی؟ کیا تُو مجھے روک لے گا؟ بول' کیا میں تیری پابند ہوں؟ کیا میں نے تجھ سے کبھی یہ عہد کیا ہے کہ تیری بیوی بنوں گی؟"

"ہاں اے آتون! تُو ٹھیک ہی کہتی ہے۔" احرس کی آواز دکھ بھری تھی۔ "تُو نے کبھی مجھ سے کوئی ایسا عہد نہیں کیا۔ میں .... میں غلط سمجھا تھا۔"

"دیکھ نہ تُو کچھ غلط سمجھا تھا اور نہ میں غلط سمجھی ہوں۔ تُو میرا دوست تھا اور دوست ہے۔" اسے اداس دیکھ کر میں کچھ نرم پڑ گئی۔ "اے احرس! دوستی میں جبر نہیں ہوتا۔ صرف تجھے دوستی کی بنا پر میں نے برابری کا حق دیا جو کسی اور کو حاصل نہیں' نضار کو بھی نہیں۔ ورنہ تجھے خود معلوم ہے کہ میرے سامنے سر جھکے ہی رہتے ہیں' اٹھتے نہیں۔"

"میں اب .... اب اے آتون! .... میں اس .... اپنے اس حق سے دستبردار ہونا چاہتا ہوں۔" اس نے رک رک کر کہا۔ "مجھے یہ بھیک نہیں چاہئے۔"

احرس مجھے بہت دل برداشتہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس وقت میری ہر بات اس کے سر سے گزر رہی تھی۔ وہ کچھ سمجھنے کا اہل نہیں لگتا تھا۔ میں نے اسی لئے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔ "تُو چاہے اپنا یہ حق استعمال کر یا نہ کر' مگر میں تیرے اس حق کو تسلیم کرتی ہوں۔"

"تیری بڑی مہربانی اے آتون دیوی!" احرس نے پہلی بار مجھے "آتون دیوی" کہا تو مجھے بہت عجیب سا محسوس ہوا۔

باتیں کرتے ہوئے ہم بستی سے باہر اب اس میدان میں آ گئے تھے جہاں ہمارا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ احرس نے بڑی بے دلی کے ساتھ وہ کام انجام دیا جو اس کے سپرد کیا گیا تھا اور پھر حویلی کی طرف واپس چل دیا۔ راستے بھر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

حویلی میں واپس آ کر میں نے لباس تبدیل کر لیا۔ سورج غروب ہونے کے بعد مہا پجاری اور احرس کو خاموشی کے ساتھ حویلی سے نکل کر بستی کے باہر پہنچنا تھا اور وہاں سے سپاہیوں کو ساتھ لے کر طویل سفر پر روانہ ہو جانا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد جب ہم آرام کرنے کو لیٹے تو میں نے ایک بار پھر احرس سے بات کی۔
"اے آتون دیوی! اگر میں لوٹ کر نہ آسکوں تو .... تو مجھے معاف.........."
"یہ تُو نے کیا "دیوی' دیوی" کی رٹ لگا رکھی ہے' میں تیرے لئے اب بھی صرف آتون ہوں۔"
میں بولی۔ "اور سن! تُو لوٹ کر ضرور آئے گا۔"

مہا پجاری لیٹتے ہی سو چکا تھا یا پھر آنکھیں بند کئے پڑا تھا اس لئے میں بلاجھجک بات کر رہی تھی اور
سے قطع نظر بات بھی کوئی ایسی نہیں تھی کہ مہا پجاری سن بھی لیتا تو مجھے کوئی شرمندگی ہوتی۔ اے مرز
یہ معلوم ہو جاتا کہ کس سبب احرس مجھ سے خفا ہو گیا ہے۔

"اب تُو دوسروں کی طرح میرے لئے بھی ایک دیوی ہے اور دیویوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ میں
کوئی دیوتا نہیں کہ تیرے پانے کی تمنا کروں! میرے لئے یہ فخر و اعزاز بھی کم نہیں کہ میں .... میں
بھی تیرے ان گنت پرستش کرنے والوں میں سے ایک ہوں۔" احرس بدستور اپنی بات پر قائم رہا۔

"تو پھر اے میری پرستش کرنے والے! تیری دیوی تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ تجھ کو یہیں لوٹ کر آنا
ہے۔"

"میں آتون دیوی کے اس حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کروں گا۔" احرس کو آخر کہنا ہی پڑا اور
میں یہی چاہتی تھی۔

دن ڈھلے تک سفر کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ ادل' نضار اور میں نے مہا پجاری اور احرس کو
حویلی سے رخصت کیا۔ رخصت ہوتے وقت احرس مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس منظر کو اپنی
آنکھوں میں محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔ میں نے اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

چلتے چلتے احرس نے پھر ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میری اور اس کی نظریں ملیں اور جھک
گئیں۔ احرس کو خود سے جدا کرتے ہوئے میرا دل اداس تھا' پھر بھی میں نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا
لی۔ مہا پجاری اور احرس' حویلی کے عقبی دروازے سے باہر نکل کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور میں
دروازے پر کھڑی ہوئی انہیں جاتے ہوئے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل
نہ ہو گئے۔

مجھے خبر نہیں تھی کہ نضار اب تک میرے ہی قریب کھڑا ہوا میرے چہرے کا جائزہ لے رہا ہے۔
اس نے مجھے مخاطب کیا تو میں اسی لئے چونک اٹھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا۔ "اے آتون! تُو کچھ ملول
معلوم ہوتی ہے؟"

"نن .... نہیں تو اے نضار!" میں اس طرح بولی جیسے میری چوری پکڑ لی گئی ہو۔ "میں
.... میں کیوں ملول ہوتی؟"

"تیرا چہرہ' تیری اس بات کی نفی کر رہا ہے کہ تُو ملول نہیں۔" اس نے کہا۔ "تجھے شاید احرس کے
بچھڑ جانے کا رنج ہے۔"

"رنج ہوتا تو پھر.......... پھر میں اسے جدا ہی کیوں کرتی۔" میں اس کے ساتھ ساتھ حویلی کے اس

حصے کی طرف لوٹنے لگی جو میرے لئے مخصوص تھا۔

نضار میرے ساتھ ہی کمرے میں چلا آیا۔ میرے اور اس کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ میرے بستر
کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پھر خلاف توقع خواب ناک سی آواز میں کہنے لگا۔ "تجھے دیکھنے سے پہلے اے
آتون! میرا دل کسی عورت کے لئے اس طرح نہیں دھڑکا۔ معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں نے بہت
چاہا' بڑی کوشش کی کہ تیرے حصول کی خواہش کو اپنے دل سے نکال دوں مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ سو
میں نے گزشتہ رات ایک فیصلہ کیا کہ تجھ سے اپنے دل کا حال بیان کر دوں۔ شاید اس طرح میرے بے
قرار دل کو قرار آ جائے۔ ایسا سوچتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید .... شاید تُو .... تُو احرس
کو چاہتی ہو۔ تو پھر کیوں نہ تجھ سے صاف صاف بات کر لی جائے۔ مجھے بتا اے آتون کہ اگر تجھے یہ اختیار
ہو کہ احرس اور .... مجھ میں سے کسی ایک کو اپنا شوہر بنا لے تو تُو کسے تُو .... کسے منتخب کرے
گی؟" اپنی بات ختم کر کے نضار مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

نضار کی بات سن کر میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ نضار وہ پہلا مرد تھا جس نے مجھے
میرا شوہر بننے کی پیشکش کی تھی۔ احرس نے بھی کبھی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے اس
کے سوال کا جواب دینے کی بجائے بمشکل اتنا کہا۔ "مگر اے نضار' تُو نے یہ عہد کیا تھا کہ .... کہ کسی
کو بھی اپنی بیوی نہیں بنائے گا؟"

"لیکن میرا وہ عہد مشروط تھا۔" نضار نے جواب دیا۔ "میں نے یہ عہد کیا تھا کہ جب تک ثریان
سے انتقام نہیں لے لوں گا کسی کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گا اور میں اپنے اس عہد پر اب بھی قائم ہوں اور
تُو نے بھی تو یہی عہد .... کیا تھا؟"

"اے نضار!" میں نے ہمت کر کے کہا۔ "یقیناً کوئی بھی عورت تیری بیوی بن کر فخر محسوس کرے
گی مگر میں شاید .... ابھی .... ابھی کوئی فیصلہ نہ کر سکوں۔ احرس اس معاملے میں نہیں آتا کہ
اس نے کبھی ایسی کوئی بات اپنی زبان سے نہیں کہی اور نہ ہی میں نے اس سے کوئی عہد کیا۔ یہ بات پہلے
بھی تجھے میں بتا چکی ہوں مگر ہاں اتنا ضرور ہے کہ .... کہ بچپن سے اب تک وہ میرے ساتھ رہا ہے۔
میں نے اس کی جدائی کو زیادہ عرصے برداشت نہیں کیا۔ ایسا کیوں ہے؟ کبھی میں نے اس پر غور نہیں کیا۔
اے نضار! ابھی سے میرے پیروں میں وعدے کی زنجیر نہ ڈال۔ مجھے خود ہی اس سوال کا جواب سوچنے
دے' جو تُو نے مجھ سے کیا ہے۔"

☆======☆======☆

اس دن کے بعد سے میں' نضار کو اور ہی نظروں سے دیکھنے اور محسوس کرنے لگی۔ اس کی شخصیت
میں ایک عجیب سا سحر' ایک عجیب سی کشش تھی جو میرے دل کو اس کی طرف کھینچتی تھی۔ میں غیر محسوس
طور پر اس کے قریب ہوتی گئی۔ اس کے باوجود ابھی تک میں اس سوال کا جواب نہیں سوچ سکی تھی جو
اس نے مجھ سے کیا تھا۔ میں اکثر تنہائی میں اپنے آپ سے یہ سوال کرتی' نضار یا احرس؟ اور دونوں ہی میرا
دامن دل اپنی طرف کھینچنے لگتے۔ ان دنوں میری حالت عجب سی تھی۔ عموماً میرے ذہن میں عجیب اور

ناممکن سی باتیں آتیں مثلاً یہ کہ نضار اور احرس کیا دونوں ہی میرے قریب نہیں رہ سکتے؟ کسی عورت کے لئے یہ سوچنا کہ وہ بیک وقت دو شوہروں کی بیوی ہو، یقیناً قابل شرم بات ہی تھی مگر اسی کے ساتھ میرے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرتا کہ کسی مرد کے لئے یہ بات قابل شرم کیوں نہیں ہے؟ مرد کو یہ اختیار کیوں ہے کہ وہ بیک وقت کئی کئی بیویاں رکھ سکے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات میرے ذہن پر بوجھ بنے ہوئے تھے۔ ہرچند کہ احرس نے کبھی نضار کی طرح مجھے اپنی بیوی بنانے کی پیشکش نہیں کی تھی مگر میں خود ہی اس کے بارے میں ایسا سوچنے لگی تھی۔ زندگی میں پہلی بار احرس کے متعلق بھی نضار کی طرح نئے احساس نے میرے دل میں جنم لیا تھا۔ پھر نضار نے کبھی اپنا سوال نہیں دہرایا تھا۔ ہاں اس نے پہلے ہی روز مجھ سے یہ ضرور کہہ دیا تھا کہ اے آتون تیرے سوا کسی اور کو میں اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کروں گا، چاہے تیرا جواب انکار ہی میں کیوں نہ ہو۔ میرے لئے تو پھر بھی انتخاب کی ایک راہ موجود تھی مگر نضار نے خود پر میرے سوا تمام راہیں بند کر لی تھیں۔ اس واقعے کے آٹھویں روز نضار نے مجھے بتایا کہ اس کے زیرِ نگیں دوسری پہاڑی بستی کا نائب سردار احزم آنے والا ہے۔ احزم کو خود نضار نے طلب کیا تھا۔ وہ اب اپنی آبائی بستی اور اس کے مددگار قبیلوں پر حملہ کرنے کے لئے تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔

دوسرے دن شام کو احزم آ گیا جسے نضار نے بڑا ہوشیار اور عقلمند بتایا تھا۔ میرے دل میں اس سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ اس شام پہلی بار نضار مجھے اپنے ساتھ اس کمرے میں لے گیا جہاں حویلی میں اس کا قیام تھا۔ پھر اس نے ایک خادم کے ذریعے ادل اور احزم کو طلب کر لیا۔

احزم کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کوئی گھاگ قسم کا بوڑھا ہو گا مگر جب وہ مجھ سے ملا تو میں حیران رہ گئی۔ احزم نوجوان تھا اور احرس کا ہم عمر لگتا تھا۔ گفتگو شروع ہوئی تو بہت جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ نضار نے احزم کی غلط تعریف نہیں کی تھی۔ احزم کی باتوں سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ احزم کی تجویز یہ تھی کہ جس محاذ پر میرا لشکر ایک مرتبہ شکست کھا چکا ہے، اسے دوبارہ اسی محاذ پر لڑایا جائے۔

"تیرے پاس اس کا کوئی جواز تو ہو گا اے احزم! تُو ایسا کیوں چاہتا ہے؟" نضار نے پوچھا۔

"ہاں اے نیک دل مظلوم سردار اشر کے عظیم بیٹے! عموماً فوجیں ایک مرتبہ کسی وجہ سے بھی جس محاذ پر شکست کھا جاتی ہیں، دوبارہ اسی محاذ پر لڑتے ہوئے ان کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ اس محاذ پر پہلے وہ ہار چکی ہیں۔ جنگی نقطہ نظر سے ان کے ذہنوں میں یہ خیال رہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔" احزم نے اپنی پیش کی ہوئی تجویز کا سبب بیان کیا۔

"مگر یوں تو اے احزم بڑی پریشانی ہو جائے گی۔" ادل نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیا۔ "ہماری دونوں بستیوں کی فوج اور عظیم آتون کی فوج تقریباً برابر ہے۔ ہمارے لئے بڑا محاذ محترم سردار نضار کی آبائی بستی ہے۔ تُو اس محاذ پر عظیم آتون کی فوج کو لڑانا نہیں چاہتا تو اس کا مطلب یہ نکلا کہ دونوں بستیوں کی فوج بڑے محاذ پر لڑے گی۔ اب بقیہ دو چھوٹے محاذوں کے لئے عظیم آتون کا لشکر رہ جائے گا۔ اس صورت میں اس لشکر کو دو حصوں میں بانٹنا پڑے گا۔ لشکر کی یہ تقسیم میرے خیال میں جنگی اعتبار سے

مناسب نہیں ہو گی۔"

اس سے پہلے کہ وہاں موجود افراد میں سے کوئی اور بولتا میں نے گفتگو میں مداخلت کی۔ احزم کی تجویز بری نہیں تھی مگر اس میں ایک خرابی تھی۔ شاید احزم کے علم میں وہ بات نہیں تھی جو میں جانتی تھی ورنہ احزم یہ تجویز پیش نہ کرتا۔ میں بولی۔ "اے احزم! تُو نے یہ بھی سوچا کہ اگر میری فوج کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تو میں بیک وقت دو محاذوں پر اس کی کمان کس طرح کروں گی؟"

"اے عظیم آتون! تیرے لشکر کے ان دو حصوں میں سے ایک کی کمان میں اور دوسرے کی کمان ادل کرے گا۔ تجھے اپنے لشکر کی کمان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تُو ہمارے سردار نضار کے ساتھ اصل محاذ پر رہ سکتی ہے۔" احزم نے جواب دیا۔

نضار یقیناً اس نکتے کو سمجھ گیا تھا جو میں احزم کو سمجھانا چاہتی تھی۔ وہ اسی لئے بول اٹھا۔ "اے احزم! تجھے یہ نہیں معلوم کہ معزز خاتون آتون کا اپنے لشکر کی کمان کرنا یا یوں کہہ لے کہ لشکر کے ساتھ رہنا یقینی فتح کی دلیل ہے۔ اس کے سپاہی اس کی پرستش کرتے اور دیوی جانتے ہیں۔ یہ ان کے لئے آتون دیوی ہے۔ کسی بھی بڑے سے بڑے سردار سے اس کے سپاہیوں کی وفاداری کا مقابلہ، عظیم آتون کے لشکر کی جاں نثاری سے نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ واہب کے ساتھ پہلی جنگ میں بھی اگر عظیم آتون محاذ پر ہوتی تو اس کے لشکر کو ہرگز شکست نہ ہوتی۔ اس کی پرستش کرنے والے اپنی دیوی کی خاطر جان دے دیتے مگر قدم پیچھے نہ ہٹاتے۔ تو جو منصوبۂ جنگ پہلے بنایا گیا تھا وہی برقرار رہے گا۔ تُو اور ادل اپنی اپنی بستیوں کے جوانوں کو ساتھ لے کر مددگار قبائل کی بستیوں پر حملہ آور ہوں گے۔ میں عظیم آتون کے لشکر کے ساتھ رہ کر اصل محاذ پر لڑوں گا۔"

"اے عظیم سردار نضار! مجھے علم نہیں تھا کہ معزز آتون کی حیثیت ایک دیوی کی بھی ہے۔" احزم کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

نضار، ادل یا احزم! کسی کو بھی اب تک میرے دیوی ہونے کا کوئی عملی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ ہاں نضار کو میں نے اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات کے بیان میں سرسری طور پر یہ ضرور بتا دیا تھا کہ سانپ مجھے ڈسنے سے گریز کرتے ہیں۔ کیوں؟ میں اس کی تفصیل میں نہیں گئی تھی۔ یہ ذکر بھی اس ضمن میں آ گیا تھا کہ اشر کی بستی سے فرار ہو کر میں جس بستی میں پہنچی اس بستی والوں نے میری یہی صفت دیکھ کر مجھے دیوی سمجھ لیا۔ یہ کہ زہر مجھ پر اثر نہیں کرتا اور اس کی وجہ کیا ہے یا یہ کہ میرا جوٹھا پانی، دودھ وغیرہ پی لینے والا زندہ نہیں رہتا، نضار کو میں نے یہ سب کچھ نہیں بتایا تھا۔

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ محاذ پر میری موجودگی میرے لشکر کے حوصلے بلند رکھے گی، میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ وقت آنے پر میں ایسا ہی کروں گی۔

احزم جس بستی کا نائب سردار تھا، ادل کی بستی سے اس کی مسافت ایک پہر ہی کی تھی۔ طے یہ ہوا کہ احزم اپنے لشکر کو لے کر آئندہ روز صبح ہم سے آ ملے گا۔ اگلے روز صبح تینوں لشکروں کو روانہ ہونا تھا۔

اول اور احزم' نضار سے اجازت لے کر چلے گئے کیونکہ اجلاس ختم ہو چکا تھا۔ میں ابھی نضار کے کمرے میں تھی۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا اس پر عمل کرنے کا وقت ابھی تو نہیں آیا تھا مگر سامان کا حصول آج ہی ضروری تھا کیونکہ کل صبح روانگی تھی۔

"اے نضار! کیا تیری بستی میں سانپوں کو پکڑ کر لانے والے ہیں؟" میں نے نضار سے پوچھا۔

"ہاں دو ایک ضرور ہوں گے۔ مگر تُو ان کا کیا کرے گی؟"

"میں ان سے آٹھ دس سانپ پکڑوا کر منگوانا چاہتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تُو کیا کہہ رہی ہے اے آتون! تُو ان سانپوں کا کیا کرے گی؟"

"تُو یہ مجھ پر چھوڑ دے اے نضار! کہ میں کیا کروں گی؟ میں چاہتی ہوں کہ آج سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے سانپ پکڑ لئے جائیں۔ ابھی کچھ وقت باقی ہے' سورج ڈوبنے میں۔ تُو فوراً حکم دے۔"

"مگر تجھے شاید خبر نہیں کہ اس علاقے میں عموماً انتہائی زہریلے سانپوں کی ایک قسم پدمن پائی جاتی ہے۔ یہ سانپ اڑ بھی سکتا ہے۔ تیرا کہنا یہ ہے کہ تجھے سانپ نہیں ڈستے' مگر کیا خبر یہ خطرناک سانپ تجھے ڈس ہی لیں۔" نضار نے مجھے بتایا۔

"ڈس بھی لیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا اے نضار!" میں مسکرا کر بولی۔

"تُو شاید سمجھ نہیں رہی اے آتون! تجھے خبر نہیں کہ سانپوں کی یہ قسم کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ آدمی کا گوشت پانی بن کے بہنے لگتا ہے اس.........."

"بس بس!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے زیادہ ڈرانے کی کوشش نہ کر اے نضار! سن میری بات' اگر کسی سانپ نے مجھے ڈس بھی لیا تو وہ خود زندہ نہیں بچ سکے گا۔"

یہ سن کر نضار اس طرح ہنسنے لگا جیسے اسے میری دماغ صحت پر شبہ ہو۔

"تُو ہنس کیوں رہا ہے؟" میں تیوریوں پر بل ڈال کر بولی۔ "کیا تُو سمجھ رہا ہے میں تیرے ساتھ ٹھٹول کر رہی ہوں؟" مجھے سنجیدہ دیکھ کر اس کی ہنسی رک گئی۔

"کیا تُو سمجھتا ہے بچپن سے بلا سبب ہی میں الگ کھاتی پیتی ہوں' خواہ مخواہ میرے زیر استعمال برتن الگ رہتے ہیں۔" میری آواز میں تیزی آ گئی۔ "اس کی وجہ یہ ہے اے نضار کہ اگر کوئی میرا جوٹھا بھی پی لے تو چند لمحے سے زیادہ زندہ نہیں رہے۔"

نضار نے بے یقینی کے سے انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر غالباً بات کو ٹالنے کی غرض سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بندوبست کرتا ہوں۔" وہ بولا۔

"میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں وہیں تجھے اطلاع کرا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ ہی کمرے سے نکلا۔ سامنے والی راہداری ہی میں میرا کمرا تھا۔ میں اس طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد اطلاع کے بجائے خود نضار ہی میرے کمرے میں آ گیا۔

"سانپ پکڑوانا ممکن نہیں اے آتون!" اس نے آتے ہی بتایا۔ "بستی میں ایک ہی سپیرا ہے جو یہ کام چھوڑ چکا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا باپ سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تھا۔ تبھی سے اس نے یہ خطرناک کام چھوڑ دیا ہے۔"

"وہ بین بجانا تو جانتا ہو گا اے نضار!" میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ظاہر ہے کہ وہ سپیرا رہ چکا ہے' اسے بین بجانا تو آتا ہی ہو گا مگر اے آتون! خالی بین بجانے سے کیا ہو گا؟"

"وہ بین بجائے گا اور میں سانپ پکڑوں گی۔" میں نے اسے جو بات تھی بتا دی۔

"لیکن میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی اور نہ تُو نے بتائی اے آتون کہ تُو ان سانپوں کا کرے گی کیا؟"

"میں ان سانپوں کو اپنے گلے' بازوؤں اور کلائیوں پر لپیٹوں گی۔"

"مگر اس کی آخر ضرورت کیا ہے؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"وہ جو مجھے دیوی کہتے اور مانتے ہیں ان کی خاطر میں ایسا کروں گی۔ جب وہ مجھے اس روپ میں دیکھیں گے تو ان کے حوصلے مزید بلند ہو جائیں گے۔"

نضار نے میری بات سن کر گہرا سانس لیا' پھر بولا۔ "تُو اس کے لئے اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈال اے آتون! تیرا محاذ جنگ پر رہنا ہی کافی ہے۔"

میری ضد کے آگے نضار کی ایک نہ چلی۔ ہاں غروب آفتاب کا وقت ضرور ہو گیا۔ اس کے باوجود میں نے ہار نہیں مانی اور اس مسئلے کا حل بھی نکال لیا۔ میں اب اپنے ساتھ مشعل برداروں کو بھی لے جانا چاہتی تھی۔

سپیرے کو حویلی میں بلوا لیا گیا اور دو مشعل بردار بھی ساتھ ہو لئے۔ ہمیں بستی سے باہر کچھ فاصلے پر مغرب کی سمت جانا تھا جہاں سپیرے کی اطلاع کے مطابق پہاڑوں کے دامن میں سانپوں کے ملنے کی امید تھی۔ نضار بھی میرے ساتھ چل رہا تھا۔

ادھر سورج غروب ہوا ادھر ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ سپیرا کچھ خوفزدہ سا تھا۔ شاید اس کے خوف کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس کا باپ سانپ کے ڈسنے سے مرا تھا۔

ہم کیونکہ گھوڑوں پر سوار تھے اس لئے ہمیں منزل تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میرے ایما پر ایک بڑی سی ٹوکری بھی ساتھ لے لی گئی تھی جو سپیرے ہی کے پاس تھی۔ سپیرے کا معاملہ "حکم حاکم مرگ مفاجات" کے مصداق تھا۔ اگر کوئی اور یوں رات کے وقت اس سے ساتھ چلنے کو کہتا تو یقیناً وہ انکار کر دیتا مگر یہ حکم تو بستی کے سردار کا تھا۔ پھر وہ بھلا کس طرح یہ حکم ٹال سکتا تھا۔

ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر ہم گھوڑوں سے اتر گئے۔ دونوں مشعل بردار' سپیرے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور اس نے بین بجانا شروع کر دی۔ ٹوکری بھی اس کے قریب ہی رکھی تھی۔ نضار

میرے پاس کھڑا ہوا تھا۔

بین کی آواز اس ماحول میں بڑی عجیب اور پُراسرار لگ رہی تھی۔ میں نے اس وقت شعل برداروں کے چہروں پر بھی خوف کے آثار محسوس کئے جب ایک جانب سے سرسراہٹ سی سنائی دی ذرا ہی دیر میں بھورے رنگ کے سانپوں کا ایک جوڑا پھنکاریں مارتا ہوا سپیرے کے سامنے آکر لگا۔ وہ سانپ لمبائی میں زیادہ بڑے نہیں تھے۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر ان کا جائزہ لیا وہ پھن کر جھومتے ہوئے ایک دم اچھلے۔ ایک مشعل بردار جو میرے قریب ہی کھڑا تھا چیخ اٹھا مگر ان سانپوں نے اچھل کر اس پر حملہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو جیسے اڑتے ہوئے میرے دونوں شانوں پر رینگتے ہوئے گردن سے لپٹ گئے تھے۔

مشعل بردار کی چیخ سنتے ہی سپیرے نے بھی شاید خوفزدہ ہو کر بین بجانا بند کر دی تھی۔

"بین بجا۔" میں نے اسے حکم دیا پھر مشعل بردار کو بھی ڈانٹا۔ "ہوش میں ہو کر کھڑا رہ۔"

"جج .... جی!" وہ ہکلایا اور پھر دوبارہ بین ہونٹوں سے لگالی۔ سناٹا ایک بار پھر بین کی آواز سے گونجنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں وہاں کئی سانپ آ گئے۔ میری گردن سے لپٹے ہوئے سانپ نیچے نہیں اترے گردن سے لپٹے لپٹے ہی پھن کاڑھے جھومتے رہے۔ میں دانستہ کچھ پیچھے ہٹ گئی تاکہ دوسرے سانپ میری خوشبو محسوس کر کے میرے گلے کا ہار نہ بن جائیں۔ نضار اب مجھ سے دور ہٹ کر کھڑا تھا۔

جب مطلوبہ سانپ جمع ہو گئے تو میں نے انہیں پکڑ پکڑ کر ٹوکری میں بند کرنا شروع کیا۔ چھ سانپوں کو میں ٹوکری میں ڈال چکی تھی۔ وہ دو سانپ ان کے علاوہ تھے جو ابھی تک میری گردن سے لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں بھی ٹوکری میں بند کر دیا۔ احتیاط کے طور پر اس ٹوکری کو ایک چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ سپیرا اب اس ٹوکری کو اپنے ساتھ گھوڑے پر لے جاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ یہ محسوس کر کے اس ٹوکری کو میں نے اپنے گھوڑے سے باندھ لیا اور مسکرا کر سپیرے کی طرف دیکھا۔

ان سانپوں میں خاصی بلندی تک اچھلنے کی حیرت انگیز قوت تھی جسے لوگوں نے بڑھا چڑھا کر مشہور کر دیا تھا۔ وہ سب ایک ہی قسم کے سانپ معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے کسی کا رنگ سیاہ نہیں تھا۔ سبھی بادامی یا بھوری رنگت لئے ہوئے تھے۔

حویلی لوٹ کر آنے کے بعد وہ ٹوکری میں نے اپنے ہی کمرے میں رکھوا دی۔ نضار میرے ساتھ ہی تھا۔

"تُو مجھے بہت ڈرا رہا تھا یہاں کے سانپوں سے۔" میں نے مسکرا کر نضار کو مخاطب کیا۔ "دیکھا تُو نے اے نضار! کہ میں نے کس طرح انہیں پکڑ لیا؟"

"ہاں دیکھا۔" وہ بولا۔ "اور ایسا حیران کن منظر زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا کہ سانپ اچھل کر تیرے شانوں پر چڑھ گئے پھر تیری گردن سے لپٹ کر جھومنے لگے۔ اے آتون! تجھے سانپوں سے ڈر نہیں لگتا؟"

"اے نضار! آدمی ڈرتا اس چیز سے ہے جس سے اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔" میں نے جواب دیا۔

پھر نضار نے وہیں میرے کمرے میں کھانا منگوا لیا۔ میں نے اس دوران میں اسے اس راز سے آگاہ کر دیا کہ بچپن ہی سے مجھے زہر دیا گیا ہے۔ مجھ پر اسی لئے کوئی زہر اثر نہیں کرتا۔ اس پر نضار بولا۔

"لیکن تیرے ساتھ ایسا کیوں کیا گیا؟"

"مجھے مہا پجاری نے اس راز سے آگاہ کیا تھا۔" میں نے بتایا۔ "ایسا میرے تحفظ کی خاطر کیا گیا کہ کوئی مجھے زہر دے کر نہ مار سکے اور میں بھی چاہوں تو آڑے وقت پر اپنی جان بچا سکوں۔"

"وہ کیسے اے آتون!" نضار نے سوال کیا۔

"تجھے بتایا نا میں نے کہ میرے اندر بہت زہر بھرا ہوا ہے۔ اتنا کہ کوئی خطرناک زہریلا سانپ اگر مجھے کاٹ لے تو مر جائے اور میں زندہ رہوں۔ شاید کوئی سانپ مجھے اسی لئے نہیں ڈستا۔ قدرت نے جانوروں میں انسان سے زیادہ یہ حس رکھی ہے کہ وہ خطرے کو بھانپ لیتے ہیں۔ تُو نے شاید محسوس کیا ہو' دیکھا ہو کہ آفاتِ ناگہانی سے پہلے پرندے اس جگہ سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ جب تُو سانپوں کو بلا کسی ظاہری سبب کے ان کے بلوں سے نکل کر جاتا دیکھے تو سمجھ لے وہاں زمین ہلنے والی ہے' زلزلہ آنے والا ہے۔" میری باتیں نضار حیرانی سے سنتا رہا۔ "یہی وجہ ہے اے نضار کہ میرا جوٹھا پانی یا دودھ یا کوئی شروب پی لینے کے بعد کوئی ذی روح زندہ نہیں بچ سکتا؟ کئی بار میں نے اپنی زندگی اور عزت و آبرو بچانے کی خاطر یہی ہتھیار استعمال کیا ہے۔ اس کا پہلا تجربہ مجھے تیری ہی آبائی بستی کے باہر چشمے کے کنارے ہوا تھا اس وقت جب میں بچی تھی۔ اس کے بعد مہا پجاری نے مجھ پر یہ راز ظاہر کیا تھا۔" پھر میں نے اپنے بچپن کا وہ واقعہ بیان کر دیا جب ایک شخص کی گرفت سے نکلنے کے لئے اس کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے تھے اور وہ ایڑیاں رگڑ کر چند ہی لمحوں میں مر گیا تھا۔ پھر میں نے نضار کو یہ بھی بتایا کہ میرا جوٹھا پانی یا شروب پی کر بھی لوگ مر چکے ہیں اور سانپوں کو بھی میں اپنا جوٹھا دودھ پلا کر مار چکی ہوں۔ میں نے نضار کو یہ باتیں اس لئے بھی بتائی تھیں کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جان لے۔ وہ مجھے اپنی بیوی بنانے کی پیشکش کر چکا تھا۔ میرے خیال میں اسے میرے متعلق تمام باتیں پہلے سے جان لینا چاہئے تھیں۔ میں نے اسی خیال کے تحت اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا "اے نضار! یہ جان لینے کے باوجود کہ میں اتنی خطرناک اور اس قدر زہر بھری ہوں' کیا تُو اب بھی اپنی پیشکش پر قائم رہے گا۔ مجھے اپنی بیوی بنا لے گا؟"

"ہاں اے آتون!" وہ پُریقین آواز میں بولا۔ "اگر مجھے پہلے سے بھی یہ بات معلوم ہوتی تو میں تیری آرزو ضرور کرتا۔ اب یہ ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو بتا دے کہ تُو نے میری قسمت کا کیا فیصلہ کیا؟"

"سچی بات یہ ہے اے نضار کہ میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔"

اس نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اے آتون! میں اپنی زندگی کے آخری لمحے تک تیرے فیصلے کا انتظار کروں گا اور تُو مجھے اس میں ثابت قدم پائے گی۔"

نضار اٹھ کر چلا گیا تو دیر تک میری سماعت میں اس کے کہے ہوئے الفاظ گونجتے رہے۔ اس رات

پہلی بار میں نے خواب میں نضار کو دیکھا۔ میں اس کی دلہن بنی ہوئی سیج پر بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے آغوش میں سمیٹ لیا اور پھر میرے احساس میں جیسے اس کے قرب کی خوشبو اترنے لگی۔ اس کے وجود کی حرارت میرے وجود کا حصہ بن رہی تھی کہ اچانک اس کے جسم کی رنگت نیلی پڑنے لگی۔ وہ نڈھال ہو کر ایک طرف گر پڑا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں۔ میرے قرب نے اسے موت سے ہمکنار کر دیا تھا۔

"نضار! .... نضار!" میں چیخ اٹھی اور نہ جانے کب تک نضار کے مردہ جسم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر چیختی رہی۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے اردگرد کئی خادماؤں کو دیکھا۔ وہ حیرت اور پریشانی سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسی اثنا میں مجھے نضار دکھائی دیا جو دوڑتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ یقیناً کوئی خادمہ اسے بھی خبر کر آئی تھی۔

"کیا ہوا اے آتون!" نضار نے میرے قریب آکر دریافت کیا۔ وہ بھی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"کچھ .... کچھ نہیں۔" میں اٹھ کر بیٹھ گئی میں سمجھ چکی تھی کہ خواب کے عالم میں میرے چیخ اٹھنے کی وجہ سے ہی ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ تُو میرا نام لے رہی تھی .... مجھے زور زور سے پکار رہی تھی۔" وہ بولا اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے معنی خیز انداز میں خادماؤں کی طرف دیکھا تو نضار میرا اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے خادماؤں کو کمرے سے جانے کا حکم دیا۔

"دراصل میں خواب دیکھتے دیکھتے چیخنے لگی تھی۔ میرے ارادے کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔" میں نے بتایا۔

"میں اور تُو جو باتیں کر رہے تھے انہی کا ردعمل تھا یہ خواب۔ شاید میرے دماغ میں کہیں دبی یہ اندیشہ موجود ہے کہ اگر کسی نے مجھے اپنی بیوی بنا لیا تو .... تو میرا قرب اسے زندہ نہیں رہنے دے گا۔ خواب میں تجھے اے نضار! میں نے خود سے بہت قریب دیکھا اور پھر .... پھر جب تُو مجھ سے دور جانے لگا تو میں چیخ اٹھی۔ مم .... میں تیرے مردہ جسم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر تجھے پکار رہی تھی۔" میں نے اسے چیخنے کی وجہ بتا دی۔ "یہ اسی اندیشے کا اظہار ہے جس کا ابھی میں تجھ سے ذکر کر چکی ہوں۔ تو اپنی نیند خراب نہ کر اور جا کر سو جا کہ صبح ہمیں سفر پر بھی روانہ ہونا ہے۔"

"تُو اگر .... اگر کہے تو .... تو میں یہیں تیرے پاس اس کمرے میں سو جاؤں؟" وہ رک کر جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں اے نضار!" میں نے انکار کر دیا۔ "اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" پھر میں مسکرائی۔ "اب تجھے پکار کر نہیں جگاؤں گی۔"

وہ بھی مسکرایا۔ "مجھے تو یہ خوشی ہے اے آتون کہ تُو نے مجھے پکارا تو' چاہے خواب میں ہی سہی۔"

کچھ دیر نضار میرے پاس بیٹھ کر چلا گیا اور میں سونے کی کوشش کرنے لگی۔

رات کا وہ آخری پہر ہو گا کہ زبردست شور' ہنگامے اور پے در پے دھماکوں کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھی اور خادمہ کو پکارا۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ شور' ہنگامہ اور دھماکے کیسے ہیں؟"

"ہمارے کسی دشمن نے شب خون مارا ہے اے معزز خاتون!" خادمہ نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"کون ہے وہ دشمن؟" میں نے سوال کیا۔

"اس سلسلے میں ابھی کچھ پتا نہیں چل سکا۔"

"نضار .... محترم سردار نضار کہاں ہے؟"

"عظیم و محترم سردار حویلی سے محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور اس کا نائب ادل بھی اس کے ساتھ ہے۔" خادمہ نے بتایا۔

"میرے لئے بھی فوراً گھوڑے کا بندوبست کرو' میں بھی دشمن سے جنگ کرنے جاؤں گی۔" یہ حکم دیتے ہی میں جلدی جلدی اپنے جسم پر ہتھیار سجانے لگی پھر اچانک میری سماعت سے سانپوں کی پھنکار ٹکرائی تو میرا دھیان ادھر چلا گیا۔

ہتھیار اپنے جسم پر سجاتے ہی میں نے ٹوکری سے دو سانپ نکال لئے۔ ان میں سے ایک سانپ کو میں نے اپنی گردن میں لپیٹ لیا اور دوسرے کو دائیں بازو پر۔ اس کے بعد میں تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ ایک خادمہ کی نظر مجھ پر پڑی تو حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں حویلی کے اس حصے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس عرصے میں مجھے حویلی کے جتنے ملازمین اور محافظوں نے دیکھا اس کا ان پر مختلف ردعمل ہوا۔ کوئی گنگ ہو کر رہ گیا' کسی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور کوئی سجدے میں گر گیا۔ میں ان سب سے بے نیاز آگے بڑھتی رہی۔

حویلی کے دروازے پر ایک محافظ میرے لئے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا تھا۔ گھوڑے کی پشت پر زین کسی ہوئی تھی۔ اس محافظ نے بھی مجھے حیرت اور خوف سے دیکھا اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں لپک کر گھوڑے کی پشت پر سوار ہوئی اور اسے ادھر دوڑا دیا جدھر سے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ جلد ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ جگہ محاذ جنگ بنی ہوئی ہے جہاں بستی کے باہر میرے لشکر نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

اپنا گھوڑا دوڑاتی ہوئی میں جلد ہی وہاں پہنچ گئی۔ مشعلوں کی روشنی کی وجہ سے وہاں دن کا سا سماں تھا۔ کہیں کہیں میں نے آگ لگی ہوئی بھی دیکھی۔ میں جیسے ہی میدان میں پہنچی اور میرے سپاہیوں نے مجھے دیکھا تو سارا میدان فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔ وہ میرے حق میں نعرے لگا رہے تھے ہر طرف "آتون دیوی' آتون دیوی" ہی کا شور تھا۔ میں نے بھی مورچہ سنبھال لیا اور دشمن پر آگ برسانے لگی۔

ذرا سی دیر میں نہ جانے کدھر سے نضار میرے پاس پہنچ گیا۔

دشمن پر فائرنگ کرتے ہوئے میں نضار سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کچھ

معلوم ہوا حملہ آور کون لوگ ہیں؟"

اسی وقت سامنے سے فائر ہوا۔ نضار نے فائر کا جواب دے کر مجھے بتایا۔ "حملہ آور واہب ہے ثژیان کا نائب۔"

"شاید پہلی بار اس نے تمہاری کسی بستی پر حملہ کیا ہے؟" یہ کہتے ہوئے میں نے دشمن کی طرف فائر کیا۔

"ہاں اے آتون!" وہ بولا۔ "لگتا ہے مخبری ہوئی ہے۔ واہب کو خبر ملی ہو گی کہ یہاں اجنبی لشکر نے پناہ لی ہے اور اسے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی ہو گی کہ یہ لشکر وہی ہو سکتا ہے جس نے اس پر شب خون مارا تھا۔"

کچھ ہی دیر کے بعد صبح کے آثار نمودار ہونے لگے اور پھر اسی کے ساتھ میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ پھر واہب کے ساتھ وہی ہوا جو ہمارے ساتھ ہو چکا تھا احزم کے لشکر کو آج ہی صبح وہاں پہنچنا تھا۔ واہب کی یہ بدنصیبی تھی کہ یہ لشکر وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا۔ اس لشکر نے آتے ہی واہب پر عقب سے بھرپور حملہ کیا۔ ادھر سے ہم نے دشمن کو رگیدا اور وہ درمیان میں پھنس گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سورج طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ دشمن پسپا ہونے لگا۔ اسے بھاری جانی نقصان اٹھا کر فرار کی راہ اختیار کرنا پڑی۔ ہر طرف دشمن کی لاشیں ہی لاشیں میدان میں نظر آ رہی تھیں۔ ہمارے لشکر کو بھی اچانک حملے کی وجہ سے خاصا جانی نقصان ہوا تھا مگر یہ نقصان دشمن کے مقابلے میں کم ہی تھا۔ لاشوں کی گنتی کی گئی تو دشمن کی لاشیں زیادہ تھیں۔

غیر متوقع معرکہ آرائی کی وجہ سے اس روز لشکر کی روانگی ملتوی کر دی گئی۔ بہت سے لوگ زخمی تھے جنہیں مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ فرار ہوتے وقت دشمن کے خاصے سپاہیوں کو قیدی بھی بنا لیا گیا تھا۔ موجودہ صورت حال پر غور کرنے اور یہ طے کرنے کی خاطر کہ اب لشکر کب روانہ ہوں، چار رکنی اجلاس دوپہر کے بعد شروع ہوا۔ احزم نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دشمن کو سنبھلنے کی مہلت نہ دی جائے اور آئندہ روز ہی صبح تینوں لشکر روانہ ہو جائیں۔ ادل کو اس تجویز سے اتفاق نہیں تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ فوری طور پر روانگی کی صورت میں جو سپاہی زخمی ہو گئے ہیں اور لڑنے کے قابل نہیں، انہیں چھوڑ جانا پڑے گا۔

"اس طرح ہماری افرادی قوت کم ہو جائے گی۔" ادل نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا "ہمیں کم از کم زخمی سپاہیوں کے صحت یاب ہونے کا انتظار کرنا چاہئے۔"

"جو صورت حال ہمارے ساتھ ہے، دشمن کے ساتھ بھی ہے۔" احزم بولا۔ "کیا اس کے سپاہی زخمی نہ ہوں گے اور کیا اس طرح دشمن کی افرادی قوت کم نہ وہ گی؟"

"احزم ٹھیک ہی کہتا ہے اے ادل!" میں نے بھی گفتگو میں شرکت کی۔ "آئندہ روز روانگی ٹھیک ہے اس سے ہماری افرادی قوت پر جتنا اثر پڑے گا اس سے کہیں زیادہ دشمن پر فرق پڑے گا۔ اے ادل! یہ بھی تو سوچ کہ دشمن کے سپاہی بھی تو ہماری قید میں ہیں۔"

"قانون کے مطابق انہیں تیسرا دن شروع ہونے سے پہلے قتل کرنا ہو گا۔" ادل نے

سردار نضار کا یہی فیصلہ ہو کہ ہم کل ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں تو پھر آج ہی ان قیدیوں کو بھی ٹھکانے لگانا پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے ادل نے نضار کی طرف یوں دیکھا جیسے اس مسئلے میں نضار کے حکم کا منتظر ہو۔

نضار کے کچھ بولنے سے پہلے ہی احزم نے ان جنگی قیدیوں کے بارے میں ایک نئی تجویز پیش کی۔ "اگر ہم ان جنگی قیدیوں کو اپنے ساتھ لے چلیں تو کیا مضائقہ ہے؟ ہم انہیں دشمن پر حملہ کرتے وقت اپنی فوج کے آگے آگے رکھیں گے۔ یوں دشمن کا جوابی حملہ خود اسی کے خلاف ہو گا۔ اس کے جوابی حملے کا پہلا شکار خود اسی کے سپاہی ہوں گے۔" احزم معنی خیز نظروں سے میری اور نضار کی طرف دیکھنے لگا۔

"اے احزم! پہلے کبھی ایسا ہوا تو نہیں مگر تیری تجویز جنگی نقطہ نظر سے ہے بڑی انوکھی اور سود مند۔" نضار نے اعتراف کیا۔

اب میں ہی اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لئے باقی رہ گئی تھی کیونکہ وہ تینوں ہی اپنے اپنے خیال کا اظہار کر چکے تھے۔ ان بستیوں میں جو روایات عرصہ دراز سے چلی آ رہی تھیں عموماً قانون کا درجہ حاصل کر چکی تھیں۔ مگر یہ بات بھی حقیقت تھی کہ کسی بھی بستی کا سردار اپنے لئے کوئی نیا قانون وضع کر سکتا تھا۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قانون بن جاتے تھے۔ اس کی ایک مثال بستی تریال میں ظاہر ہو چکی تھی۔ اس کا تعلق بھی جنگی قیدیوں ہی سے تھا۔ میرے ایما پر سمیر کے جنگی قیدیوں کو سردار صارم نے رہا کر دیا تھا۔ میں نے یہ مثال دہرائی پھر بولی۔ "مجھے احزم کی رائے سے اتفاق ہے۔ اگر ان قیدیوں کو زندہ رکھنے سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ فائدہ ضرور اٹھایا جائے۔"

اس پر احزم نے میرا شکریہ ادا کیا اور پھر نضار نے فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ احزم کی پیش کردہ نئی تجویز کے حق میں تھا۔ یہ چار رکنی اجلاس نضار کے کمرے میں ہو رہا تھا۔ نضار نے اجلاس ختم ہونے کا اعلان کر دیا تو ادل اور احزم کے ساتھ میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اے آتون! تُو رک جا۔" نضار مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں بیٹھ گئی۔ ادل اور احزم چلے گئے تو میں نے نضار سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تُو نے مجھے کیوں روکا ہے اے نضار!"

"میں تجھے اے آتون! یہ بتانے والا تھا کہ پہاڑوں میں رہنے والے مہین کی طرف سے مجھے ایک پیغام ملا ہے۔ عظیم مہین نے تجھے اور مجھے اپنی بارگاہ میں آج شام کو طلب کیا ہے۔ اس کی ایک کاہنہ خجیرہ پیغام لے کر آئی تھی۔" نضار نے بتایا۔

"مہین کون ہے اے نضار! میں نے پہلے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔"

"اس کے بارے میں سنا گیا ہے کہ وہ دیوتاؤں کا چہیتا ہے اور صدیوں سے انہی پہاڑوں میں رہتا ہے۔ میں نے اپنے بابا سے بھی اس کا نام سنا تھا۔ مہین کو کسی نے نہیں دیکھا۔ ہاں اس کی کاہنہ خجیرہ کو اکثر پہاڑوں میں بھٹکتے دیکھا گیا ہے۔ خجیرہ ہمیشہ سے جوان ہے۔ آج بھی جب وہ آئی تو میں نے اسے حسین اور جوان ہی دیکھا۔ وہ جس طرح ایک خواب کی طرح آئی تھی اسی طرح عظیم مہین کا پیغام دے

کر چلی گئی۔ نہ اسے کسی نے حویلی میں داخل ہوتے دیکھا نہ ہی وہ کسی کو یہاں سے جاتی نظر آئی۔ میں نے محافظوں اور خادموں سے اس کی تصدیق کر لی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آنے اور جانے والی عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ ہی تھی۔" نضار مجھے ایک عجیب اور ناقابل یقین واقعہ سنا رہا تھا۔

"مگر تُو نے خجیرہ سے طلبی کی وجہ معلوم نہیں کی؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں اے آتون!" نضار نے بتایا۔ "میں خجیرہ کے سامنے صرف سن سکتا تھا کچھ کہنا یا اس سے کچھ پوچھنا شاید میرے بس میں نہیں تھا۔"

"کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"خجیرہ جیسے کسی تیز نشے کی طرح میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری قوت گویائی کسی نے سلب کر لی ہو۔" نضار بولا۔

"اے نضار! تجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تُو نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا' تُو ہوش میں تھا؟"

"نہیں اے آتون! وہ کوئی خواب نہیں تھا۔ جب وہ میرے کمرے میں آئی تو میں اسے تعظیماً کھڑا ہونے کے لئے اٹھا۔ اس نے خود ہی مجھے بتایا تھا کہ اس کا نام خجیرہ ہے اور وہ عظیم مہین کا پیغام لائی ہے۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر اس کا آگے بڑھا ہوا دایاں ہاتھ تھام لیا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا۔ اسی دوران میں اس نے مجھے مہین کا پیغام دیا۔ کہتے ہیں کہ جو خجیرہ کا ہاتھ تھام کر اس طرح بوسہ دیتا ہے تو تین دن تک اس کے ہاتھ اور ہونٹوں سے خوشبو نہیں جاتی۔ سو دیکھ لے کہ ابھی تک میرے ہاتھوں سے خوشبو آ رہی ہے۔" نضار نے یہ کہہ کر اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے نضار کے ہاتھ کو اپنی ناک کے قریب لاکر سونگھا۔ اس کے ہاتھ سے واقعی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک ایسی خوشبو جو اس سے پہلے کبھی میں نے محسوس نہیں کی تھی۔ نضار نے خجیرہ کی آمد کے سلسلے میں ناقابل تردید ثبوت پیش کر دیا تھا۔ مجھے اس کی باتوں پر حیرت تھی۔

"کیا خجیرہ نے بتایا کہ ہمیں کہاں جانا ہے؟ یا تجھے پہلے سے معلوم ہے کہ عظیم مہین پہاڑوں میں کہاں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں انہی پہاڑوں کے درمیان پہنچنا ہے جہاں سے کل تُو نے سانپوں کو پکڑا تھا۔ خجیرہ نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ خود ہمیں ہماری رہنمائی کے لئے وہاں مل جائے گی۔ مجھے حیرت اس پر ہے کہ خجیرہ نے تیرا اصل نام لیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اشم کی بیٹی معبلہ کو بھی اپنے ساتھ لانا جو تیری مہمان ہے ... دیوتاؤں کی اس چہیتی معبلہ کو عظیم مہین کا پیغام پہنچا دینا۔" نضار نے مجھے بتایا۔ "بول اب تُو کیا کہتی ہے؟"

"اے نضار! میں تیرے ساتھ ضرور چلوں گی۔" میں نے جواب دیا اور پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اپنے کمرے میں آ کر میرا ارادہ سو جانے کا تھا مگر میں سو نہیں سکی۔ میرے ذہن میں پُراسرار مہین اور اس کی پُراسرار کاہنہ خجیرہ کے متعلق طرح طرح کے سوالات ابھرتے رہے۔ وہ مجھ سے اور نضار سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟ جسے کسی نے نہیں دیکھا تھا کیا وہ ہمارے سامنے آ جاتا؟

شام کو میں نضار کے ساتھ جب بستی سے نکل کر پہاڑوں کی طرف جا رہی تھی تو کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ ہم دونوں کہاں اور کیوں جا رہے ہیں؟ یہ غروب آفتاب کا وقت تھا۔ سورج ان پہاڑوں کے پیچھے آہستہ آہستہ غائب ہو رہا تھا جو ہمیں کچھ فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔

ان پہاڑوں کے درمیان پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ابھی ہم نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچی ہی تھیں کہ دائیں جانب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "خوش آمدید' اے عظیم مہین کے مہمانو!"

میں نے اس طرف نگاہ اٹھائی جدھر سے آواز آئی تھی مگر مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

"یہ کاہنہ .... اسی کاہنہ خجیرہ کی آواز ہے۔" نضار پُرجوش آواز میں بولا۔

"آؤ' خجیرہ کے پیچھے چلے آؤ .... خجیرہ کی خوشبو تمہاری رہنمائی کے لئے کافی ہے اور اپنی سواریوں سے اتر آؤ۔" نسوانی آواز پھر گونجی۔

ہم دونوں گھوڑوں سے اتر گئے۔ دائیں جانب ایک پہاڑی درہ نظر آ رہا تھا۔ خجیرہ کی آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ گھوڑوں کو ہم نے وہیں پتھروں سے باندھ دیا اور پھر چند قدم چل کر درے میں داخل ہو گئے۔ درے میں قدم رکھتے ہی میں نے وہی نامانوس خوشبو محسوس کی جو نضار کا ہاتھ سونگھ کر محسوس کی تھی۔ اس خوشبو میں عجیب سی کشش تھی' بلاوا تھا۔ ہمارے قدم جیسے خود بخود اٹھتے رہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں خواب میں چل رہی ہوں۔ کچھ دور چل کر درہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ دائیں اور بائیں جانب دو راستے نظر آ رہے تھے۔ مجھے دائیں جانب خجیرہ کی خوشبو محسوس ہوئی اور اس طرف مڑ گئی۔ نضار بھی میرے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ درہ اب تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

معلوم نہیں میں اور نضار کب تک اس درے میں دائیں بائیں مڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب ہلکا ہلکا اندھیرا سا ہو چلا تھا۔ خجیرہ کی خوشبو اب تک ہمارے ساتھ تھی۔ نیم تاریکی میں ہمیں ایک جانب روشنی سی دکھائی دی جو دائرے کی صورت تھی۔ ہم اسی طرف بڑھ رہے تھے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ کسی غار کا دہانہ تھا۔ روشنی اسی دہانے سے نکل رہی تھی۔

"جاؤ اے عظیم مہین کے مہمانو! اب تمہیں میری رہنمائی کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے خجیرہ کی آواز غار کے دہانے سے آتی سنی۔

نضار نے میرا ہاتھ تھام لیا اور اس غار میں داخل ہو گیا۔ اس دودھیا سی روشنی کا مخرج نظر نہیں آ رہا تھا۔ غار کے اندر قدم رکھتے ہی یوں لگا جیسے ہم کسی پہاڑی سرنگ میں آ گئے ہوں۔ ہمارے قدم اب جیسے خود بخود آگے بڑھ رہے تھے۔

غار میں یا اس پہاڑی سرنگ کے اندر ٹھنڈک سی تھی۔ سرنگ آگے جا کر بائیں جانب مڑ گئی۔ کچھ فاصلے پر سامنے ہی بڑے رقبے میں کہر کی ایک دیوار سی نظر آئی جس کی وجہ سے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اسی کہر کے درمیان چمکیلا سا غبار ایک انسانی ہیولے کی صورت میں گردش کر رہا تھا۔

"آ اے معبلہ! اے دیوتاؤں کی چہیتی!" کہر کے درمیان سے ایک آواز ابھری اور میں تقریباً اچھل پڑی۔ یہ وہی آواز تھی جس کی سرگوشیاں مجھے بچپن سے اب تک سنائی دیتی رہی تھیں۔ پھر اسی آواز نے نضار کو مخاطب کیا۔ "آ اے نضار! تو بھی آ جا۔"

میرے قدم کہر کی جانب اٹھے اور نضار کو بھی میں نے اپنے ساتھ ہی بڑھتے دیکھا۔

"دیوتا تم دونوں کو عام انسانوں سے بلند کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں اسی لئے میں نے یہاں بلایا ہے۔" وہی آواز پھر ابھری۔ "اس مقدس کہر میں غسل کرنے کے بعد تمہارے جسموں میں حیرت انگیز پُراسرار قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔ یہ قوتیں دیوتاؤں نے ہر انسان کو عطا کی ہیں اور وہ چاہے تو انہیں بیدار کر سکتا ہے اور دیوتا جسے چاہیں اس کے اندر ان قوتوں کو بیدار کر دیں۔ سو تم دونوں خوش نصیب ہو کہ تمہیں دیوتاؤں نے اس کے لئے چن لیا۔ سنو کہ جسم اصل طاقت کا سرچشمہ نہیں۔ انسان کی اصل اس کی روحانی قوت ہے جسم فنا ہو جاتے ہیں مگر روح کو فنا نہیں۔ میرا جسم بھی فنا ہو چکا ہے مگر روح زندہ ہے کہ میں نے بدی کو خود پر حاوی نہیں آنے دیا۔ سو تم دونوں بھی جب تک بدی کا شکار نہ ہوئے، تمہارے اندر یہ قوتیں بیدار رہیں گی اور سنو! اس زمین پر بہت سے جسم ایسے ہیں کہ جن کی روحیں مر چکی ہیں۔ زمین پر اترا کر چلتے ہوئے یہ بے جان لاشے ہیں۔ یہ تمہیں اپنے ہی جیسا بنا لینا چاہیں گے۔ تم بڑے امتحانوں سے گزرو گے مگر حوصلہ نہ ہار جانا کہ آخری فتح تمہارا مقدر کر دی گئی ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ چمکیلا غبار غائب ہو گیا۔

اب میں نضار کے ساتھ اس کہر میں داخل ہو چکی تھی۔ ایسی لذت، ایسا کیف و سرور میں نے پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا جو اس وقت محسوس ہو رہا تھا۔ میرا وجود جیسے اس خوشبودار کہر میں گردش کر رہا تھا۔ معلوم نہیں کب تک میں اسی لذت و سرشاری کے عالم میں رہی، اچانک مجھے یوں لگا جیسے ہر طرف اندھیرا پھیل گیا ہو۔ مجھے اب کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کہر، وہ خوشبو، وہ دودھیا روشنی سب کچھ پُراسرار طور پر غائب ہو چکا تھا۔

اسی وقت میرے اندر سے ایک آواز ابھری۔ میں اندھیرے میں دیکھ سکتی ہوں۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی اور پھر اندھیرے مجھ پر روشن ہو گئے۔ میں اب اندھیرے میں دیکھ سکتی تھی۔ نضار مجھے اپنی بائیں جانب کھڑا دکھائی دیا اس کی نظریں بھی میری ہی طرف تھیں۔

"اے معبلہ! میں تجھے اندھیرا ہونے کے باوجود دیکھ سکتا ہوں۔" نضار نے مجھے مخاطب کیا۔

"اور میں بھی تجھے اے نضار دیکھ سکتی ہوں۔" میں نے بھی اسے بتایا۔

عین اسی لمحے اپنے عقب سے میں نے خجیرہ کی آواز سنی۔ "اے عظیم مہین کے مہمانو! اب لوٹ جاؤ۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ذرا سے فاصلے پر مجھے ایک حسین ترین اور جوان عورت کا جسم نظر آیا جو ایک ڈھیلے ڈھالے نیلے رنگ کے لبادے میں ملبوس تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس سے پہلے کبھی کوئی اتنی حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ اس کے جسم سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔

پھر ہم جس راستے سے وہاں تک پہنچے تھے خجیرہ کی رہنمائی میں اسی راستے سے واپس اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہمارے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ مہین کی پُراسرار کاہنہ درے میں جا کر غائب ہو چکی تھی۔ میرے لئے عجیب و غریب احساس یہ تھا کہ مجھے اندھیرا محسوس بھی ہو رہا تھا اور میں اندھیرے میں دیکھ بھی رہی تھی۔ میں جس طرف اندھیرے میں نگاہ اٹھاتی دور تک واضح طور پر اندھیرے میں شگاف سا پڑ جاتا۔ ادھر سے نظریں ہٹاتی تو بدستور اندھیرا پھیل جاتا۔ میں نے اپنی یہ کیفیت نضار سے بھی بیان کی۔

"اے معبلہ! میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ شاید یہ بھی انہی پُراسرار قوتوں میں سے ایک قوت ہے جو ہمیں دیوتاؤں نے عطا کی ہیں۔" نضار نے کہا۔

"ہاں، شاید ایسا ہی ہے۔" میں جواب میں بولی۔

"آ چل اے معبلہ! اب ہم بستی میں واپس چلتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم بغیر مشعل کے اس اندھیرے میں سفر کر سکتے ہیں۔"

نضار کے کہنے پر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ مجھے بھی راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس دوران میں نضار بھی گھوڑے پر چڑھ چکا تھا۔

حویلی میں واپس آنے کے کچھ دیر بعد ہم نے کھانا کھایا۔ ادل اور احزم بھی ہمارے ساتھ تھے۔

وہ رات گزرنے کے بعد ہی صبح ہمیں روانہ ہو جانا تھا اس لئے میں جلد ہی آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی مجھے ان سانپوں کا خیال آیا جنہیں ٹوکری میں بند کر رکھا تھا۔ میں دودھ منگوا کر انہیں پلا رہی تھی کہ نضار آ گیا۔ وہ روانگی کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ شاید وہ مجھ سے پہلے ہی جاگ گیا تھا۔

"اے آتون! میں ادل اور احزم کو لے کر بستی سے باہر میدان کی طرف جاتا ہوں تاکہ تینوں لشکروں کا معائنہ کر سکوں۔ تو ادھر آ جا، تیار ہو کر۔" نضار نے مجھ سے کہا۔ "جو ان میں سفر کے قابل نہیں یا جنگ نہیں کر سکتے اور شدید زخمی ہیں انہیں الگ چھانٹ دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، تو جا میں آ جاؤں گی۔" میں نے ایک سانپ کو اپنی کلائی سے لپٹتے ہوئے دیکھ کر کہا جو دودھ پی چکا تھا۔

تیار ہو کر، ناشتہ کر کے میں نے سانپوں کو آزاد کر دیا وہ اِدھر اُدھر جانے کی بجائے میرے جسم کے مختلف حصوں سے لپٹ گئے۔ مجھے یہی توقع بھی تھی کہ وہ کہیں نہیں جائیں گے۔ سانپوں کا ایک جوڑا میرے پیروں سے لپٹ گیا تھا۔

"اے! اب ایسا تو نہ کرو کہ میں چل نہ سکوں۔" میں بڑبڑائی اور جھک کر ان کے بل کھول دیئے۔ وہ دونوں اوپر رینگ آئے۔

حویلی کے ملازمین کے لئے یہ تماشا نیا نہ ہونے کے باوجود دلچسپ اور عجیب تھا۔ وہ میرے جسم سے لپٹے ہوئے سانپوں کو حیرت زدہ ہو کر دیکھتے رہے اور میں حویلی کے صدر دروازے تک پہنچ گئی۔ ہتھیار بھی

میرے جسم پر سجے تھے۔

اس روز پہلی بار طریر کا بہنوئی ثمین مجھے نظر آیا۔ وہ محافظ جو میرے لئے گھوڑا لئے کھڑا تھا، ثمین اسی کے نزدیک کھڑا ہوا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا تو وہی آتون ہے جو میرے گھر مہمان ٹھہری تھی؟" جھجکتے ہوئے اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں اے ثمین! میں وہی ہوں۔" میں نے بلا سبب اسے جھٹلانے سے گریز کیا۔

"گزشتہ روز بھی میں نے سردار نضار کے ساتھ تجھے بستی سے باہر جاتے دیکھا تھا مگر اسے میں اپنا وہم سمجھا تھا۔ اسی تصدیق کے لئے آج میں دانستہ ادھر آیا تھا۔ یہ تو بتا کہ جب تُو طریر کے ساتھ یہاں سے گئی تھی تو تجھے کون لوگ اغوا........"

"اے ثمین! یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر محافظ سے گھوڑے کی لگام لے لی۔ "کیا تُو لشکر کے ساتھ نہیں چل رہا؟"

"جن محافظوں کو اے آتون! بستی کی حفاظت ذ نگرانی کے لئے چھوڑا گیا ہے میں بھی انہی میں سے ہوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میری بیوی بیمار ہے اور میرے گھر میں اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بڑا نہیں' بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ میری اس مجبوری کا علم سالاروں کو ہے۔" ثمین نے جواب دیا۔

میں گھوڑے پر سوار ہو چکی تھی۔ مزید کچھ کہے اور سنے بغیر میں نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

بستی کے باہر میں جب میدان میں پہنچی تو تینوں لشکر روانگی کے لئے تقریباً تیار تھے۔ مجھے آتا دیکھتے ہی میرے لشکریوں نے "آتون دیوی زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے بلند کئے۔ دونوں دوسرے لشکروں کے سپاہی بھی ان کی دیکھا دیکھی یہی نعرے لگانے لگے۔

شدید زخمی سپاہیوں کو چھانٹ کر الگ کیا جا چکا تھا۔ ان میں تینوں ہی لشکروں کے سپاہی تھے۔ جنگی قیدیوں کی گنتی دو سو سے کچھ اوپر تھی۔ وہ بھی گھوڑوں پر سوار تھے مگر غیر مسلح تھے۔ انہیں مسلح سوار اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھے تاکہ وہ فرار نہ ہوں۔ ان میں سے جو شدید زخمی تھے انہیں الگ کر لیا گیا تھا تاکہ بطور شگون لشکر کی روانگی کے وقت انہیں گولی مار دی جائے۔ ان کی تعداد بارہ تھی۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ ان کے چہروں پر ابھی سے موت کی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں یقیناً علم تھا کہ ان کا آخری وقت قریب آ چکا ہے۔

میں اگر کچھ اور نہیں تو ان کی موت کو آسان تو بنا ہی سکتی ہوں۔ میں نے سوچا اور اپنا گھوڑا دوڑاتی ہوئی نضار کے قریب پہنچ گئی۔

"اے نضار! وہ جنگی قیدی جو شدید زخمی ہیں انہیں اگر قتل ہی کرنا ہے تو کیا ضروری ہے کہ انہیں گولیاں ہی ماری جائیں۔" میں نے کہا۔

"پھر تُو کیا چاہتی ہے اے آتون!" وہ پوچھنے لگا۔

"ایک برتن میں دودھ یا پانی منگوا دے۔"

"میں سمجھ گیا۔" اس نے سر ہلایا۔

نضار تو سمجھ گیا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں مگر ادل اور احزم یقیناً کچھ نہیں سمجھے تھے۔ ان کے چہروں پر اسی لئے حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔

پھر مجھے ایک بڑے برتن میں پانی دے دیا گیا۔ میں نے دو ایک گھونٹ پانی پی کر برتن ایک محافظ کے حوالے کر دیا۔ "جا ان سب زخمی جنگی قیدیوں کو ایک ایک گھونٹ یہ پانی پلا دے۔" میں نے اس محافظ کو حکم دیا۔

وہ محافظ میرا جوٹھا پانی لے کر ان بدنصیبوں کے گروہ کی طرف چلا گیا جو کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے تھے۔ انہیں گمان بھی نہ ہو گا کہ میرا جوٹھا پانی پی کر وہ سفر آخرت پر روانہ ہو جائیں گے۔ انہوں نے ایک ایک گھونٹ پانی پی لیا۔ محافظ جب آخری قیدی کو پانی پلا رہا تھا تو پہلا قیدی آخری سانس لے رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سارے قیدی چند ہی لمحوں میں ختم ہو گئے۔

"انہیں کیا........ کیا ہوا؟" احزم حیرانی سے بولا۔

"وہ مر گئے۔" میری بجائے نضار نے جواب دیا۔ "کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ انہیں عظیم آتون کا جوٹھا پانی پلایا گیا تھا؟"

"مگر صرف پانی........ جوٹھا پانی پی لینے سے اے سردار نضار! وہ کس طرح........"

"تُو لاکھ بڑا ہوشیار اور بڑا عقلمند سہی اے احزم! مگر یہ نہ سمجھ پائے گا کہ ایسا کس طرح ہو گیا؟" نضار ہنس کر کہنے لگا۔ "سن! کچھ باتیں عقل سے ماورا ہوتی ہیں' یہ جو کچھ تُو نے دیکھا ایسا ہی ہے۔ اب یہی بتا دے کہ عظیم آتون کے جسم سے لپٹے ہوئے زہریلے سانپ اسے ڈستے کیوں نہیں؟"

روانگی سے قبل لاشیں وہاں سے آخری رسوم کے لئے ہٹا دی گئیں کہ وہیں نہ سڑتی رہیں۔

اب ہر طرف دھوپ پھیل چکی تھی۔ تینوں لشکروں کی روانگی کا حکم دے دیا گیا۔ سب سے آگے میرا لشکر تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے لشکروں کی کمان کر رہے تھے۔ تینوں لشکروں کے درمیان تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑا گیا تھا۔ جنگی قیدی میرے لشکر کے عین درمیان میں تھے۔ انہیں معرکہ شب میں اس وقت سامنے لانا تھا جب دشمن کی طرف سے جوابی حملہ ہوتا۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیوں وہ قتل نہیں کئے گئے اور کس وجہ سے ساتھ لے جائے جا رہے ہیں۔ ان سے بس اتنا کہا گیا تھا کہ خاموشی سے ساتھ چلیں اور سفر کے دوران میں فرار ہونے کی کوشش نہ کریں ورنہ انہیں گولی مار دی جائے گی۔

دوپہر کو ایک مناسب جگہ دیکھ کر کھانا کھانے کے لئے پڑاؤ ڈالا گیا اور پھر فوراً ہی سفر شروع کر دیا گیا۔

سورج ڈوب رہا تھا جب تینوں لشکر جدا ہوئے۔ اب ان کے راستے الگ الگ ہو گئے تھے۔ ادل نے اپنے لشکر کو لئے شمال مشرقی سمت اور احزم شمال مغربی جانب لشکر لئے بڑھا۔ انہی دونوں سمتوں میں نضار کی آبائی بستی کے مددگار قبائل بستے تھے۔ میں اور نضار سیدھے بڑھتے رہے۔

کچھ دیر میں اندھیرا ہو گیا مگر مشعلیں روشن نہیں کی گئیں۔ لشکر کو ہدایت دے دی گئی تھی کہ وہ ہم دونوں کے پیچھے بڑھتا رہے۔ جس طرح مجھے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے کوئی دقت محسوس نہیں ہو رہی

تھی' مجھے یقین تھا کہ نضار کو بھی کوئی پریشانی نہ ہو گی۔ مشعلیں روشن نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ راز داری کے ساتھ جس حد تک بستی کے قریب پہنچ سکیں' پہنچ جائیں اور دشمن کو علم نہ ہو کہ اس پر حملہ ہونے والا ہے۔

درے سے گزر کر بستی پر شب خون مارنے کی بجائے نضار نے وہ طویل راستہ اختیار کیا جس سے میں پہلے بھی ایک بار گزر چکی تھی۔ یہ وہی راستہ تھا جدھر سے دو محافظ مجھے وادی سبز کی طرف لے کر چلے تھے تاکہ ژیان کی خدمت میں ایک "حسین تحفہ" پیش کر کے انعام حاصل کر سکیں۔ بستی کا یہ دایاں پہلو تھا۔ خاصے فاصلے پر چند مشعلیں روشن نظر آ رہی تھیں۔ انہیں ایک جانب چھوڑتا ہوا ہمارا لشکر آگے بڑھتا رہا۔ یہ وہی مشعل بردار محافظوں کا دستہ ہو سکتا تھا جس سے پہلے میری' مہا پجاری اور احرس کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔

نضار کی ہدایت پر اب جنگی قیدیوں کو لشکر کے اگلے حصے میں لے آیا گیا تھا تاکہ جب ضرورت پڑے آئے انہیں لشکر کے آگے کر دیا جائے۔ آخرکار وہ وقت آ ہی گیا جب اچانک میرے لشکر نے اس بستی پر آگ برسانا شروع کر دی اور فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔ سوئی ہوئی بستی جیسے جاگ اٹھی۔ نضار نے مجھے ساتھ لئے واہب کی حویلی کی طرف پیش قدمی شروع کی ہی تھی کہ اچانک حویلی کی طرف سے بھی فائرنگ کا آغاز ہو گیا۔ یہی وہ موقع تھا جب جنگی قیدیوں کو آگے لے آیا گیا اور جلتی ہوئی مشعلیں قیدیوں کے ہاتھوں میں دے دی گئیں۔

کچھ دیر کو حویلی کی طرف سے گولیاں چلنا بند ہو گئیں۔ ہم حویلی کے کچھ اور قریب ہو گئے تو میری آنکھوں نے ایک ظالمانہ منظر دیکھا۔ ان نہتے قیدیوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ حویلی کے دروازوں' دریچوں اور چھت سے ہم پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ بستی کے اکثر گھروں کی چھتوں سے بھی آگ برس رہی تھی۔ بستی والوں کو گھروں سے باہر نکلنے کی موقع نہیں مل سکا تھا۔ شب خون اتنا اچانک اور اتنی بھرپور طاقت سے مارا گیا تھا کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ذرا ہی دیر میں بستی کا ہر کوچہ گویا میدان جنگ بن گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق لوگ گھروں سے لڑنے نکل آئے تھے۔

اسی وقت نضار نے ایک ایسی چال چلی کہ فتح یقینی ہو گئی۔

ہمارے سپاہی بستی کے بلند مقامات پر چڑھ کر بار بار ایک ہی اعلان کرنے لگے۔ "جو بھی ہتھیار پھینک دے گا اور مقابلہ نہیں کرے گا اس کی جان کو امان ہے۔" ہر طرف سے اطلاعات موصول ہونے لگیں کہ بستی والے تیزی سے ہتھیار ڈال رہے ہیں۔

امان طلب کرنے کی شرط یہ رکھی تھی کہ جسے امان چاہئے وہ اپنے گھر کا دروازہ کھول دے۔ رفتہ رفتہ ساری بستی میں پھیلی ہوئی فوج سمٹ کر حویلی کی اطراف میں جمع ہونے لگی۔ حویلی پر دباؤ بڑھ گیا۔ واہب کے بارے میں قیاس یہی تھا کہ وہ حویلی ہی میں ہو گا۔

اچانک حویلی کا صدر دروازہ بھی کھول دیا گیا اور اسی کے ساتھ گولیاں چلنا بند ہو گئیں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ حویلی کے اندر موجود سپاہ بھی امان طلب کرنے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ یہ وہی حویلی

تھی جہاں میں نے برسوں پہلے پناہ لی تھی۔ اسی حویلی کے باسی آج خود پناہ مانگ رہے تھے۔

نضار مجھے ساتھ لئے گھوڑے سے اتر کر حویلی کے صدر دروازے پر پہنچا تو حویلی کے محافظ دستے کا سالار آگے بڑھا اور اس نے ہمارے قدموں میں اپنے ہتھیار ڈال کر سر جھکا دیا پھر اس کی تقلید دوسرے بھی کرنے لگے جو یکے بعد دیگرے حویلی سے نکل رہے تھے۔

"ٹھہرو!" نضار ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں بولا۔ پھر وہ محافظ دستے کے سالار سے مخاطب ہوا۔ "واہب کہاں ہے؟"

"وہ حویلی میں نہیں ہے' اے سردار!" سالار نے ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔ "ہاں واہب کے بچے اور بیویاں حویلی میں ضرور موجود ہیں۔"

"کیا مطلب؟" نضار کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "واہب کہاں گیا؟"

"آج شام ہی وہ وادی سبز کی طرف گیا ہے۔ اسے سرداروں کے سردار ژیان نے طلب کیا تھا۔" سالار نے بتایا۔

اسی لمحے مجھے پُراسرار سرگوشی سنائی دی۔ "سالار جھوٹ بول رہے ہیں۔ واہب اس وقت ایک خفیہ سرنگ کے ذریعے فرار ہو رہا ہے۔ حویلی کے اندر یہ سرنگ اس نے کسی ایسے ہی بُرے وقت کے لئے کھدوائی تھی۔ سرنگ کا دوسرا دہانہ بستی کے باہر پہاڑی درے سے پہلے ان محافظوں کی کوٹھریوں میں سے ایک کوٹھری میں ہے جو رات کو پہرا دیتے ہیں۔ وہاں بارہ کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں۔ ساتویں کوٹھری خالی رہتی ہے اور اسی میں سرنگ کا دہانہ ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی آواز آنا بند ہو گئی۔

مجھے عیار سالار پر سخت غصہ آیا جو نضار کو کھلا فریب دے رہا تھا۔ وقت ضائع کئے بغیر میں مڑی اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "محافظ دستے کے اس جھوٹے سالار کو حراست میں لے لو۔" یہ کہتے ہوئے غصے کے عالم میں میرا ہاتھ سالار کی طرف اٹھا اور اسی وقت ایک غیر متوقع واقعہ رونما ہو گیا۔

میری کلائی پر لپٹے ہوئے سانپوں میں سے ایک اچھل کر سالار کے شانے پر جا پڑا اور پھر اس نے سالار کے رخسار پر اپنا منہ مارا۔

سالار کے منہ سے دہشت زدہ چیخ نکلی اور خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ سانپ ایک دم پلٹا اور اچھل کر دوبارہ میری کلائی سے لپٹ گیا۔

وہ منظر بڑا ہی ہولناک تھا جب سالار زمین پر گرا اور اس کے چہرے کا گوشت موم کی طرح پگھل کر بہنے لگا۔ یقیناً یہ اس سانپ کے زہر ہی کا اثر تھا جس نے سالار کو ڈسا تھا۔ یہ روایت سچ ثابت ہوئی تھی کہ وہ سانپ جسے بھی ڈس لیتا تھا اس کے جسم کا گوشت پانی بن کر بہنے لگتا تھا۔

وہاں مزید وقت ضائع کئے بغیر میں نے نضار کو مخاطب کیا۔ "اے نضار! واہب فرار ہو رہا ہے' آ ہم اسے روک لیں۔" میں یہ کہتے ہی مڑ کر اپنے گھوڑے کی طرف لپکی۔ نضار کو بھی میں نے اپنے پیچھے جھپٹتے دیکھا۔

سپاہیوں کا ایک دستہ ہمارے ساتھ ہو لیا۔ شاید نضار نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔

جب میں اس بستی میں رہتی تھی تو وہ کوٹھریاں تعمیر نہیں ہوئی تھیں۔ واہب ہی نے شاید انہیں تعمیر کرایا تھا کہ ان کی آڑ میں سرنگ کا دوسرا دہانہ لوگوں کی نظر سے چھپا رہ سکے۔ مجھے درے کی سمت کا بخوبی اندازہ تھا اس لئے تیزی سے اسی طرف اپنا گھوڑا دوڑا رہی تھی۔ نضار کا گھوڑا مجھ سے دو ایک نیزے پیچھے تھا' پھر سپاہی تھے۔ نضار کو مجھ سے کچھ پوچھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ واہب کی تلاش میں میرا رخ کدھر ہے اور نہ اسے یہی معلوم تھا کہ مجھے واہب کے فرار ہونے کا علم کس طرح ہو گیا۔ وہ تو بس یہ سنتے ہی میرے پیچھے دوڑ پڑا تھا کہ واہب فرار ہو رہا ہے اور اسے روکنا ہے۔

میں ان کوٹھریوں سے ابھی دور ہی تھی کہ مجھے اس طرف روشنی سی نظر آئی۔ وہ روشنی کسی مشعل کی معلوم ہوتی تھی۔ متحرک روشنی کوٹھریوں کی طرف درے کی جانب تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ میں نے سوچا وہ کوئی گھڑسوار ہی ہو سکتا ہے جو مشعل ہاتھ میں لئے درے کی طرف دوڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ گھڑسوار واہب کے سوا اور کون ہوتا۔ گھوڑا شاید اسی کوٹھری یا کسی دوسری کوٹھری میں ہو گا جس پر سوار ہو کر وہ فرار ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھانے کی خاطر اس کی پسلیوں پر گھٹنوں کا دباؤ مزید بڑھا دیا اور گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا۔

اب یہ ممکن نہیں تھا کہ میں دشمن کو فرار ہو جانے دیتی۔ وہ پہاڑی درے میں داخل ہو چکا تھا۔ درے کی طرف میرا گھوڑا اتنی تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ نضار کے اور میرے درمیان اب کئی نیزوں کا فاصلہ ہو گیا تھا۔

گھوڑا دوڑاتی ہوئی جب میں درے میں داخل ہوئی تو چونک اٹھی۔ وہاں دور تک روشنی کا نام و نشان نہیں تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ واہب اتنی جلدی درہ عبور کر کے فرار ہو جاتا۔ میری آنکھیں دور دور تک اندھیرے کا سینہ چیر رہی تھیں۔ اندھیرے کے باوجود مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو روک لیا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد نضار بھی مجھ تک پہنچ گیا اور مشعل بردار سپاہی بھی۔ اب درہ دور دور تک روشن ہو چکا تھا۔

نضار کی نظر میں بھی وہ مشعل بدست گھڑسوار آ چکا تھا جس کا تعاقب کرتی ہوئی میں اس درے میں داخل ہوئی تھی۔

"اے آتون! ہمارا شکار کہاں گیا؟ کیا وہ بچ کر فرار ہو گیا؟" نضار نے مجھ سے پوچھا۔

اسی لمحے مجھے برسوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا اور اسی کے ساتھ جیسے مجھ پر یہ منکشف ہو گیا کہ واہب اچانک کہاں اور کیسے غائب ہو گیا۔ اتنی جلدی کچھ اور ممکن ہی نہیں تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے دھیمی آواز میں نضار سے کہا۔ "کیا تجھے معلوم ہے کہ اس درے میں آگے جا کر دائیں جانب ایک دراڑ ہے جو ابتدا میں تنگ اور پھر دائیں جانب مڑ کر چوڑی ہوتی گئی ہے؟"

"ہاں اے آتون! مجھے معلوم ہے۔" نضار نے جواب دیا۔ "میں اپنے بچپن میں دوستوں کے ساتھ یہاں آ کر کھیلا کرتا تھا اور اس دراڑ میں چھپ جاتا تھا۔ جب وہ مجھے تلاش کر لیتے تھے تو میں دوسری جانب سے میدان میں کود کر بھاگ جاتا تھا۔ تو کیا.......... کیا وہ.........."

"اس کے سوا کچھ اور ممکن نہیں اے نضار!" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "یہی دراڑ ایک مرتبہ مجھے اور مہا پجاری کو بھی پناہ دے چکی ہے۔ تُو چند سپاہیوں کو اس طرف مقرر کر کے آ جا' جہاں سے میدان میں کود کر بھاگا جا سکتا ہے تاکہ وہ ادھر سے پیدل ہی فرار ہو جانے کی کوشش نہ کرے۔ ویسے یہ امکان کم ہے کہ وہ گھوڑا یہیں چھوڑ کر بھاگ جائے۔ وہ تو شاید اس امید میں یہاں چھپا ہو گا کہ ہم مایوس ہو کر لوٹ جائیں تو فرار ہو جائے۔"

نضار تو چند سپاہیوں کو لے کر درے سے باہر نکل گیا اور میں درے میں بقیہ سپاہیوں کے ساتھ دراڑ تک پہنچ گئی۔ اب دشمن کے فرار کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ میں نے دراڑ کے اندر جھانک کر دیکھا' مگر ظاہر ہے کہ دراڑ کے دائیں جانب مڑ جانے کی وجہ سے مجھے دراڑ کا بقیہ حصہ نظر نہیں آ سکا۔ جہاں تک میری نظر گئی دراڑ خالی تھی۔ اب مجھے نضار کی واپسی کا انتظار تھا۔

میرے اندازے کے مطابق واہب کو غیر مسلح نہیں ہونا چاہئے تھا۔ دراڑ میں بیک وقت دو آدمی داخل ہو سکتے تھے۔ اس سے زیادہ جگہ نہیں تھی۔ ایسی صورت میں واہب بڑی آسانی سے انہیں نشانہ بنا لیتا۔ جب تک اس کے پاس اسلحہ موجود تھا کوئی اس کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔ جیسے ہی دراڑ میں داخل ہو کر کوئی بھی دائیں جانب مڑتا واہب کی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ اسے دراڑ سے کس طرح باہر نکالا جائے؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جب نضار دراڑ کے دوسرے سرے پر سپاہیوں کو متعین کر کے میرے پاس پہنچا تو یہی سوال میری زبان پر آ گیا۔

"یہ کوئی ایسا مشکل نہیں اے آتون!" میرا سوال سن کر نضار نے جواب دیا۔ "تُو میرے ساتھ آ' اس طرح یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ اسی جگہ چھپا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح وہ زندہ ہاتھ آ جائے ورنہ اسے اسی دراڑ کے اندر بھون دینا بھی مشکل نہیں۔"

نضار گھوڑے سے اتر آیا اور اس نے ایک سپاہی کے ہاتھ سے مشعل لے لی۔

"تم لوگ یہاں سے ہلو گے نہیں۔" نضار نے سپاہیوں کو تاکید کی۔ "ممکن ہے تمہیں دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں لیکن یہ جگہ چھوڑ کر نہیں جانا۔ اس دراڑ سے جو بھی نکلے اسے تم ہلاک نہیں کرو گے بلکہ زندہ پکڑو گے۔"

میں بھی گھوڑے سے اتر کر نضار کے ساتھ ہو لی۔ وہ درے کے آخری سرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"تُو نے اے نضار! یہ مشعل کیوں لے لی؟" میں اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ "کیا تُو بھول گیا کہ اندھیرے تجھ پر روشن کر دیئے گئے ہیں؟"

"ہاں اے آتون! مجھے یاد نہیں رہا تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔

درے سے نکل کر ہم کچھ دور تک دائیں جانب چلتے رہے اور پھر اس پہاڑی پر چڑھنے لگے جو درے کی وجہ سے دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ میں نضار کا بایاں ہاتھ تھامے چڑھتی رہی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں مشعل تھی۔ رائفل اس نے شانے سے لٹکالی تھی۔ اس لمحے نہ جانے کیسے میرے ذہن سے یہ

بات محو ہو گئی کہ میرے جسم سے اب بھی سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔ نضار بھی شاید یہ بھول گیا تھا۔"

جس لمحے مجھے اپنے جسم سے لپٹے ہوئے انتہائی خطرناک زہریلے سانپوں کا خیال آیا تو میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میری دائیں کلائی سے لپٹے ہوئے سانپوں سے نضار کا ہاتھ دور نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ سانپ اچھل کر بھی دوسرے شخص کے جسم پر چڑھ سکتے ہیں۔ میں نے نضار ہاتھ تھام کر گویا اس کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"کیا ہوا اے آتون!" وہ رک کر پلٹا۔ "تُو رک کیوں گئی؟"

"دور رہ مجھ سے۔" میں تیزی سے پیچھے ہٹی۔ "کیا تُو بھول گیا کہ میرے جسم سے موت لپٹی ہو ہے؟"

اس نے گہرا سانس لیا اور پھر پلٹ کر مجھ سے آگے آگے چڑھنے لگا یقیناً اس نے خطرے کا احسا کر لیا تھا۔

جلد ہی ہم دونوں اس پہاڑی پر اس جگہ پہنچ گئے جہاں دراڑ نظر آ رہی تھی۔ میں نے دراڑ اندر جھانکا تو بہت نیچے مشعل کی روشنی نظر آئی۔ روشنی کے قریب ہی ایک شخص اور گھوڑا دکھائی د مشعل ایک پتھر پر رکھی تھی۔

اچانک نضار نے دراڑ میں موجود شخص کو مخاطب کیا۔ "اے واہب! تجھے کسی چوہے کی طرح گم گیا ہے۔ اگر تُو عزت کی موت چاہتا ہے تو دراڑ سے باہر آ جا' تُو بھی جانتا ہو گا کہ دیکھ لئے جانے کے تیرا یہاں چھپا رہنا بے سود ہے۔"

اس شخص نے منہ اوپر کیا تو میں نے دیکھا وہ ایک باریش بوڑھا تھا۔ اسی کے ساتھ میں تیزی پیچھے ہٹ گئی میں بوڑھے واہب کو رائفل کا رخ اوپر کرتے دیکھ چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے دھماکہ ہوا ہمارے قریب چنگاریاں سی اڑیں۔

"کیا تُو چاہتا ہے کہ ہم تجھے یہیں بھون دیں اے واہب!" نضار کی آواز پھر گونجی۔

"تُو اگر مجھے جان کی امان دینے کا وعدہ کرے اے نضار! تو میں باہر آ سکتا ہوں۔" بوڑھے کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے یقیناً نضار کو آواز سے پہچان لیا تھا۔ "میرے سوال کا جواب دے کہ مجھے امان دیتا ہے؟"

"نہیں اے واہب! میرا نام نضار ہے۔ میں دھوکا دینے والوں میں سے نہیں کہ تجھ سے جھوٹا کر لوں۔ تُو اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا' سو اپنی تقدیر کے فیصلے کو قبول کر لے۔ ہاں یہ میرا وعدہ کہ تجھے عزت کی موت نصیب ہو گی۔" نضار نے جواب دیا۔

عزت کی موت کا مطلب مجھے معلوم تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ واہب کی بیویوں اور بچوں کو ا دی جائے گی۔ اس کی بیویوں کو بے آبرو نہیں کیا جائے گا۔ اس کے تمام عزیز و اقارب انتقام سے رہیں گے۔

"جب میں ہی نہ رہا تو پھر میری عزت کیا؟" بوڑھے واہب کی آواز نیچے سے آئی۔ "مجھے عزت کی موت قبول نہیں اے نضار! جو تیرے جی میں آئے سو کر۔ میں اس پناہ گاہ سے باہر نہیں نکلوں گا۔"

میں بھی نیچے دیکھ رہی تھی۔ واہب نے شاید یہ سوچ کر مشعل بجھا دی کہ اندھیرے میں اسے شکار نہیں کیا جا سکتا۔ دراڑ تاریک ہو گئی' مگر مجھے وہ بوڑھا اب بھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں نضار سے پوچھا۔ "کیا تجھے بھی وہ نظر آ رہا ہے؟"

"ہاں اے آتون!" نضار نے جواب دیا۔ "میں اسے اندھیرے کے باوجود دیکھ سکتا ہوں۔"

"پھر اب تُو اسے دراڑ سے نکالنے کی کیا تدبیر کرے گا اے نضار!" میں نے دریافت کیا۔ دانستہ میں اس سے کچھ ہٹ کر کھڑی ہوئی تھی کہ کہیں کوئی سانپ اچھل کر اس پر نہ جا پڑے۔

"میں پہلے اس کی رائفل کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تو پھر وہ اندھیرے میں اسے نہیں ڈھونڈ سکے گا۔ اس کے بعد ہی دوسرا قدم اٹھاؤں گا۔" نضار کی آواز دھیمی تھی۔ "میرا خیال ہے کہ رائفل قبضے سے نکل جانے کے بعد وہ آدھا حوصلہ تو ہار ہی جائے گا۔"

پھر میں نے نضار کو نشانہ لیتے دیکھا اور چند ہی لمحے بعد دھماکہ ہوا۔ نضار نے بوڑھے واہب کی رائفل کا نشانہ لیا تھا جسے وہ اپنے دائیں ہاتھ میں تھامے ہوا تھا۔ نضار کا نشانہ بڑا سچا تھا۔ میں نے بوڑھے کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر کچھ فاصلے پر گرتے دیکھی۔ بوڑھا واہب جس جگہ موجود تھا وہاں سے دراڑ کا دوسرا سرا قریب تھا' وہ جو میدان کی طرف تھا۔ رائفل ادھر ہی گری تھی۔ اس کے فوراً بعد نضار نے دوسرا فائر کیا اور اس امکان کو بھی ختم کر دیا کہ کہیں واہب رائفل ڈھونڈ نہ لے۔ دوبارہ بھی اس نے واہب کی رائفل ہی کو نشانہ بنایا تھا۔ رائفل اب دراڑ کے میدانی سرے والے خلا میں گر گئی تھی۔

"اب اسے فائر کر کے کسی ایک طرف ہانکنا پڑے گا۔" نضار کی آواز سنائی دی۔

پھر وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ میدانی حصے والا خلا بوڑھے واہب سے قریب تھا۔ نضار نے اسے مجبور کر دیا کہ اسی طرف جائے۔ وہ پے در پے دراڑ میں فائر کر رہا تھا۔ بوڑھے واہب کو یہ گمان بھی نہ ہو گا کہ اندھیرے کے باوجود کسی کو نظر آ رہا ہے۔ گولیوں کی زد سے بچتا ہوا اب وہ خلا کے قریب پہنچ چکا تھا پھر چند ہی لمحے بعد اسے گویا اپنی جان بچانے کی خاطر خلا میں چھلانگ لگا دینا پڑی۔

"آ اے آتون! آخر ہم اسے دراڑ سے نکالنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔" نضار کے لہجے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

پہاڑی پر چڑھنے میں ہمیں جتنی مشقت جھیلنا پڑی تھی' اترنے میں اتنی دشواری نہ ہوئی اور ہم جلد نیچے درے میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد ہمیں اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر درے سے نکل کر میدان میں پہنچتے ہوئے دیر نہ لگی۔

نضار نے عین اس خلا کے نیچے سپاہیوں کو متعین کیا تھا۔ بوڑھے واہب نے جیسے ہی نیچے چھلانگ لگائی تھی' اسے چھاپ لیا گیا تھا۔ اس طرف موجود سپاہیوں کو بھی وہ یہ تاکید کر گیا تھا کہ واہب کو زندہ پکڑنا ہے۔ اسے رسیوں سے کس کر ایک گھوڑے کی پشت سے باندھا جا چکا تھا۔

دیکھ لے اے واہب! تجھے عزت کی موت قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔" نضار اس کے قریب کر بولا۔

"مگر اس سے پہلے تُو نے مجھ سے جاں بخشی کا وعدہ کر لیا تھا اے نضار!" بوڑھے واہب کی آوا سے عیاری جھلک رہی تھی۔

"تُو نے کوئی خواب دیکھا ہو گا اے ملعون بوڑھے!" نضار نے حقارت سے کہا۔ پھر اس نے بستی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔

ہم بستی میں داخل ہوئے تو ایک مشعل بردار جلوس نے ہمارا استقبال کیا۔ "سردار اشر زندہ باد اور "سردار نضار زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے ساری بستی گونجنے لگی۔ اسی جلوس کے ساتھ حویلی تک پہنچے۔

حویلی کے سامنے مجھے مختلف عمروں کی عورتوں کا ایک گروہ نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ بوڑھے واہب اور اس کے بیٹوں کی بیویاں تھیں۔ انہی کے قریب بچے اور چھ نوجوان دکھائی دیئے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیر ہوئی کہ واہب کے کوئی بیٹی نہیں تھی۔ یا اگر تھی تو انہی عورتوں کے گروہ میں تھی جن کے چہروں ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ یہ خبر بھی میرے لئے اندوہناک تھی کہ سنگ دل بوڑھا اپنی بیٹیوں کو پیدا ہو۔ ہی مروا ڈالتا تھا۔ وہ چھ نوجوان واہب کی مختلف بیویوں سے تھے۔ واہب کے سب سے کم عمر بیٹے کی ع صرف دو سال تھی جو ایک نوجوان عورت کی گود میں تھا۔ واہب کی یہ سب سے چھوٹی بیوی تھی۔

عورتوں نے جب واہب کو گھوڑے کی پشت سے کھولتے دیکھا تو بلند آواز میں بین کرنے لگیں نضار نے ان عورتوں کو خاموش رہنے کا حکم دیا' پھر کہنے لگا۔ "تم سب کو تمہارے بیٹوں سمیت جان امان دی جاتی ہے۔ سنو کہ تم پر کوئی ظلم نہیں ہو گا اور تم اپنے بیٹوں کو لے کر جہاں جانا چاہو گی تمہیں جانے دیا جائے گا۔ اگر تم اسی بستی میں عزت و آبرو کے ساتھ رہنا چاہو تو تمہیں یہ اجازت بھی ہو گی۔"

بوڑھے واہب کے گھر والوں کو مسلح سپاہیوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ پھر نضار کے حکم ان سبھی کو حویلی کے ایک حصے تک محدود کر دیا گیا اور وہاں سخت پہرا بٹھا دیا گیا۔ بوڑھے واہب کو پابہ زنج کر کے حویلی کے خاص زنداں میں ڈال دیا گیا جو زیر زمین تھا۔

بستی میں موجود سپاہ کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔

تمام ضروری احکام سے فارغ ہو کر نضار مجھے اپنے ساتھ لئے حویلی میں داخل ہوا۔ اس وقت نضا کی حالت عجب تھی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے آنسو تیرتے دکھائی دیئے۔ شاید اسے اپنا بوڑھا باپ سردا اشر یاد آ رہا تھا یا پھر وہ سارے دن جو اس نے بچپن سے نوجوانی تک اسی حویلی میں گزارے تھے۔ یادوں کی دھوپ چھاؤں سے اس کا چہرہ جیسے جل بجھ رہا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لئے وہ دیوانوں کی طرح ساری حویلی میں چکراتا پھر رہا تھا۔ پھر میں نے اسے ایک کمرے کے دروازے پر رکتے دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"تجھے یاد ہے اے آتون کہ یہ .... یہ میرے بابا کا کمرہ تھا؟" نضار کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"ہاں اے نضار! مجھے یاد ہے' صبر کر۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "دیوتاؤں کا شکر ادا کر کہ انہوں نے تجھے تیرے دشمن پر غالب کیا۔"

"نہیں اے آتون! مجھے جھوٹی تسلی نہ دے کہ تیرا اور میرا دشمن ژیان ابھی ہماری دسترس سے بہت دور ہے۔"

"مگر کب تک اے نضار! اس کا وقت بھی اب آنے ہی والا ہے۔ تُو دیکھے گا کہ وہ دن دور نہیں جب میرے اور تیرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ دشمن کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ بوڑھے عیار واہب کی طرح وہ بھی ہم سے اپنی زندگی کی امان چاہے گا اور اسے امان نہیں دی جائے گی۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں بھی تیری ہی طرح انتقام کی آگ میں جل رہی ہوں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں اے آتون .... جانتا ہوں۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑانے لگا۔

عام معافی کا اطلاق حویلی کے ملازمین پر بھی ہوتا تھا۔ ان میں خادم بھی تھے اور خادمائیں بھی۔ ان کا نگران ہمیں تلاش کرتا ہوا وہاں تک آ گیا۔ وہ نضار کے سامنے جھک کر بولا۔ "اے سردار! بتا کہ تُو کہاں سوئے گا؟"

"اس کمرے میں۔" نضار نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

نگران ہی سے معلوم ہوا کہ وہ کمرہ ژیان کے بوڑھے نائب واہب کے تصرف میں تھا۔ وہیں میرے اور نضار کے سونے کا عارضی طور پر بندوبست کر دیا گیا۔ ہم دونوں نے وہیں کھانا بھی کھایا۔ نضار کا محافظ دستہ بھی میرے لشکر کے ساتھ تھا۔ اس نے حویلی کی حفاظت کا بندوبست سنبھال لیا تھا۔ کھانے کے لئے بیٹھنے سے پہلے ہی میں نے ان زہریلے سانپوں سے بھی جان چھڑا لی تھی۔ میں نے انہیں اپنا جوٹھا دودھ پلا دیا تھا۔

اس رات میں نے نضار کو بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے دیکھا۔ معلوم نہیں اس حویلی میں آنے کے بعد اسے کیا کیا یاد آنے لگا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "اے آتون! اگر آج رات تُو میرے ساتھ نہ ہوتی تو شاید میں .... میں اس کمرے کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگتا۔"

صبح ہوتے ہوتے یہ خوشخبری بھی مل گئی کہ ادل اور احزم بھی فتح یاب ہو چکے ہیں۔ خبر رسانوں نے خبر دی تھی کہ وہ زیر حراست قبائل کے سرداروں کو جلد اپنے ساتھ لے کر آنے والے ہیں۔ میں اور نضار دونوں ہی اب تک نہیں سو سکے تھے۔ میں نے دہری فتح کی خبر پر نضار کو مبارک باد دی۔

سورج کو طلوع ہوئے ابھی کچھ دیر ہوئی تھی کہ یکے بعد دیگرے ادل اور احزم کے آنے کی خبر ملی۔

سردار اشر جس بڑے کمرے میں اجلاس کیا کرتا تھا نضار مجھے ساتھ لئے وہاں پہنچ گیا۔ ادل اور احزم دونوں زیر حراست سرداروں کو لئے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ نضار کو اور مجھے انہوں نے تعظیم

"اے معزز محترم سردارو!" نضار نے دونوں قبائل کے سرداروں کو نرمی سے مخاطب کیا تو ان
چہروں سے حیرت کا اظہار ہونے لگا۔ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے سامنے کھڑے تھے۔ "میں کہ سردار
اشر کا بیٹا نضار تم سے مخاطب ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' میرے باپ سے تمہاری کوئی رنجش
تھی' نہ کوئی ایسا اختلاف تھا کہ تم میرے خلاف ہتھیار اٹھاتے۔ مگر تم نے ایسا کیا اور مجھے خبر ہے کیوں
کیا۔ تم ظالم ژیان کے خوف میں مبتلا تھے کہ کہیں وہ تمہاری بستیوں پر بھی قبضہ نہ کر لے۔ بولو' کیا
ہی نہیں تھا؟"

"ہاں اے عظیم سردار اشر کے بہادر بیٹے! ہم اسی خوف سے مجبور ہو کر ژیان کے نائب واہب
ساتھ دیتے رہے۔" ایک سردار نے بھاری آواز میں اعتراف کیا اور دوسرے نے بھی اس کی تائید میں
ہی کہا۔

"ہم اس پر پشیمان ہیں۔" دوسرے سردار نے تائید کے بعد بات آگے بڑھائی۔ "اے دلیر و جوا
سردار! ہم تجھ سے صرف عزت کی موت کے طلبگار ہیں۔"

"محترم سرداروں کی زنجیریں کھول دی جائیں۔" نضار نے ان سپاہیوں کو حکم دیا جو سرداروں
پیچھے کھڑے تھے۔

سپاہیوں نے فوراً تعمیل حکم کر دی۔

"آؤ اے معزز سردارو! میرے قریب آ کر بیٹھو۔" نضار پھر ان سے مخاطب ہوا۔ "میں تمہ
عزت کی زندگی دیتا ہوں۔"

چند لمحے وہ دونوں حیرت زدہ سے کھڑے رہے جیسے انہیں اپنی سماعتوں پر یقین نہ آ رہا ہو کہ انہو
نے جو کچھ سنا ہے' خواب نہیں حقیقت ہے۔ ان بستیوں میں یہ روایت نہیں تھی کہ کوئی غالب نہ صر
کسی مغلوب کی جاں بخشی کر دے بلکہ اسے عزت و احترام بھی دے۔ نضار نے انہیں ایک بار پھر مخاط
کیا تو وہ چونک اٹھے' پھر نضار کے قریب پہنچ کر تعظیم میں جھک گئے۔

"اے عظیم باپ کے عظیم بیٹے! آج سے میری زندگی تیری امانت ہے۔ میں خود کو سردار نضار
غلام کہلوانے میں فخر محسوس کروں گا۔" پہلے سردار نے پُرجوش آواز میں اپنی اطاعت کا اظہار کیا۔

"اور میں بہادر باپ کے بہادر بیٹے سے یہ اجازت طلب کروں گا کہ وہ مجھے میری ہی بستی میں
ماتحت کہلوانے کا اعزاز بخش دے۔" دوسرا سردار بولا۔

"سنو! میں تم دونوں کو تمہاری بستیوں میں اپنا نائب مقرر کرتا ہوں۔ آج سے تم میرے لئے ا
اور احزم کی طرح ہو جو میرے دائیں اور بائیں بازو ہیں۔ کیا تم وفادار رہنے کا عہد کرتے ہو؟"

"ہم عہد کرتے ہیں کہ اپنے سردار نضار کے وفادار رہیں گے۔ ہم اگر عہد سے پھریں تو دیوتاؤں
قہر ہم پر نازل ہوں" وہ دونوں بیک زبان بولے۔

"تو پھر عزت و آبرو کے ساتھ اپنی اپنی بستیوں کی طرف لوٹ جاؤ۔" نضار نے انہیں مخاطب کیا۔
ان دونوں نے ایک بار پھر تعظیم دی اور ان سپاہیوں کے ساتھ چلے گئے جو انہیں یہاں تک

زنجیر لائے تھے۔ نضار کے اشارے پر سپاہی زنجیریں بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ ان کے جاتے ہی میں نے
نضار کو مخاطب کیا۔ "مبارک ہو تجھے اے نضار کہ تُو نے جتنا چاہا تھا' اس سے زیادہ مل گیا۔ یہ دونوں پہلے
ژیان کے حلیف تھے اور اب اس کے حریف بن گئے۔ انہوں نے خود ہی تیری ماتحتی میں آنا چاہا اور تجھے
ژیان کی طرح ان سے عہد نامہ امن نہیں کرنا پڑا۔ تُو نے اتنی نرمی اور محبت کا سلوک کیا کہ ان کے دل
جیت لئے۔"

ادل اور احزم نے بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔

"اب تم دونوں بستی کا انتظام سنبھالو! گلی کوچوں میں ایک بھی لاش نظر نہیں آنا چاہئے۔" نضار نے
اپنے دونوں نائبوں کو حکم دیا پھر بولا۔ "میں عظیم آتون کے ساتھ واہب کے گھر والوں سے ان کی مرضی
معلوم کرتا ہوں' جا کر۔"

ادل اور احزم چلے گئے تو نضار مجھے لئے حویلی کے اس حصے میں پہنچ گیا جس پر سخت پہرا تھا۔ اس
حصے کے صحن میں محافظوں نے واہب کے تمام اہل خاندان کو جمع کر دیا۔ ان کے چہروں سے صاف پتا چل
رہا تھا جیسے وہ رات بھر نہ سوئے ہوں۔

"گزشتہ رات میں نے تم سب سے کہا تھا کہ تمہیں جان کی امان دی جاتی ہے' مگر شاید تمہیں اس
کا یقین نہیں آیا؟" نضار نے انہیں مخاطب کیا۔

"ہاں اے ہمارے دشمن! ہمیں تیری کسی بات کا یقین نہیں۔" ایک عورت بولی۔ "دشمن پر اعتبار
کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں اور ہم بے وقوف نہیں ہیں۔ اگر تُو اپنے قول میں سچا ہے تو پھر ہم پر
پہرے کیوں بٹھا رکھے ہیں؟ ہم جہاں بھی جانا چاہیں ہمیں جانے دے۔"

"میں پھر کہتا ہوں کہ مجھ پر یقین کرو۔ میں ایک شریف دشمن ہوں' تم سے دھوکہ نہیں کروں گا۔
بولو' تم سب کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"ہم سرداروں کے سردار ژیان کے پاس وادی سبز جانا چاہتے ہیں۔" بوڑھے واہب کے بیٹوں میں
سے ایک بولا۔

"اے نوجوان! کیا تُو کسی رہنمائی کے بغیر وہاں اپنے گھر والوں کو لے جا سکتا ہے؟"

"ہاں' میں بھی وادی سبز کا راستہ جانتا ہوں' وہاں جا چکا ہوں اور میرے دو بھائی بھی راستے سے
واقف ہیں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ نضار کچھ کہتا' ایک نوجوان و خوبصورت عورت اٹھی اور اس نے نضار کو
مخاطب کیا۔ "مگر اے سردار! میں اپنی بستی چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی اور تجھ سے انصاف کی طالب ہوں۔"
پھر اس نے اسی نوجوان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا جو وادی سبز کا راستہ جاننے کا دعویدار تھا۔ "اس نے مجھ پر
بڑا ظلم کیا اور زبردستی مجھے اپنی بیوی بنا لیا۔ یہ میرے شوہر کا قاتل ہے۔"

"تو کیا تُو اسے اپنا شوہر تسلیم نہیں کرتی؟" نضار نے اس سے پوچھا۔ "کیا رسوم کے مطابق تُو نے
اسے اور اس نے تجھے قبول نہیں کیا؟"

"نہیں اے سردار! کوئی رسم ادا نہیں ہوئی۔" نوجوان عورت نے دعویٰ کیا۔

"یہ جھوٹ بولتی ہے۔" ایک بوڑھی عورت چیخ کر کہنے لگی۔ "یہ میرے بیٹے پر الزام لگا رہی ہے۔"

"تُو کیونکہ اس کی ماں ہے اس لئے تیری گواہی تسلیم نہیں کی جائے گی۔" نضار نے گویا فیصلہ سنایا پھر اس نوجوان کو مخاطب کیا جس پر الزام لگایا گیا تھا۔ "کیا تُو اپنی ماں کے سوا کسی اور کو گواہی میں پیش کر سکتا ہے کہ تُو نے زبردستی اس عورت کو بیوی نہیں بنایا؟"

"میں ژیان کے نائب واہب کا بیٹا ہوں اور بزدل نہیں کہ جھوٹ بولوں۔" نوجوان بلا جھجک بولا۔ "یہ عورت مجھے پسند آ گئی تھی۔ سو میں نے اس سے کہا کہ اپنے شوہر سے آزادی حاصل کر لے' میں تجھے اپنی بیوی بنا لوں گا مگر یہ نہیں مانی۔ میں نے پھر اس کے شوہر کو مجبور کرنا چاہا لیکن وہ بھی اسے آزاد کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مجبوراً میں نے اسے قتل کر دیا اور اس عورت کو زبردستی حویلی میں اٹھا لایا۔ تجھے خبر ہے اے سردار کہ رسمیں عورت اور مرد دونوں کی رضامندی سے ادا کی جاتی ہیں سو جب یہ رضامند ہی نہ تھی تو بھلا میں کس طرح رسمیں ادا کرتا؟"

"اے نوجوان! کیا تجھے خبر ہے کہ رسموں کی ادائیگی کے بغیر کسی عورت کو زبردستی اپنی بیوی بنا لینے کی سزا کیا ہے؟" نضار نے پوچھا۔

"ہاں اے سردار! مجھے معلوم ہے پھر کسی ایسے مرد کی زندگی پر عورت کو اختیار حاصل ہو جاتا ہے خواہ وہ عورت اسے زندہ رہنے دے یا قتل کر دے۔"

"تو اے عورت! میں تجھے اس نوجوان کی زندگی پر اختیار دیتا ہوں۔ تُو چاہے اس کی زندگی بخش دے کہ اسے مار دے۔" نضار کی آواز بلند ہوئی۔ "اس نے تجھ سے زبردستی کی اور تجھے کوئی بھی رسم ادا کئے بغیر اپنے گھر میں بیوی بنا کے ڈالے رکھا' یہ سزا کا مستحق ہے۔"

اس نوجوان و حسین عورت کو میں نے کہتے سنا۔ "یہ میرے شوہر کا قاتل ہے' میں اس کی زندگی کیسے بخش سکتی ہوں۔ اے سردار! لا مجھے اپنا خنجر دے کہ اس نے میرے شوہر کے دل میں خنجر اتارا تھا' آج میں اس کا دل چھید دوں۔"

بوڑھی عورت نے جھپٹ کر اس نوجوان عورت کو گھسیٹ لیا اور کسی درندے کی طرح غرائی۔

"میں تیرا خون پی جاؤں گی!" نضار نے پلٹ کر محافظوں کو اشارہ کیا' جنہوں نے بڑی مشکل سے نوجوان عورت کو بوڑھی عورت سے چھڑایا۔ پھر نضار ہی کے حکم پر محافظوں نے مجرم نوجوان کو گرفت میں لے لیا۔ اس نوجوان نے مزاحمت نہیں کی۔

"آج مجھے انصاف مل گیا.......... انصاف مل گیا۔" نوجوان عورت بڑبڑا رہی تھی۔

"اس کے ہاتھ میں خنجر دے دیا جائے۔" نضار نے حکم دیا۔

ایک محافظ نے اپنی پیٹی سے خنجر نکال کر نوجوان عورت کو تھما دیا۔ خنجر ہاتھ میں آتے ہی وہ نوجوان کی طرف جھپٹی۔ اس نازک اندام سی عورت میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ جب پہلے وار

کے بعد خنجر نوجوان کی پسلی میں پھنس گیا تو ایک ہی جھٹکے میں اس نے خنجر باہر کھینچ لیا۔ اس عورت پر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ نوجوان کی گردن ڈھلک جانے کے باوجود وہ عورت خنجر آزمائی کرتی رہی۔

نوجوان کی لاش کو نضار کے اشارے پر محافظ وہاں سے اٹھا کر لے گئے۔ اس عورت کو بھی اسی وقت بستی میں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کے والدین اسی بستی کے باسی ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ عورتوں کے اس گروہ سے تقریباً آدھی عورتوں نے وادی سبز جانے سے انکار کر دیا' وہ اسی بستی کی تھیں' اور وہیں رہنا چاہتی تھیں۔ یہ سبھی جوان تھیں۔ ان میں کئی کے چھوٹے بچے بھی تھے جنہیں وہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان عورتوں میں واہب کی سب سے چھوٹی بیوی بھی تھی جس کی گود میں دو سال کا بچہ تھا۔ اگر اس کی گود میں بچہ نہ ہوتا تو شاید ہی کوئی اسے بچے والی یا شادی شدہ کہتا۔

نضار نے حکم دیا کہ فی الحال ان عورتوں کو حویلی ہی میں رہنے دیا جائے۔ باقی عورتوں کو واہب کے پانچوں بیٹوں اور بچوں کے ساتھ وادی سبز جانے کی اجازت دے دی گئی۔ نضار کے حکم پر ان کے لئے سواری کے گھوڑوں کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔

گزشتہ روز دن بھر سفر کرنے اور پھر ساری رات جاگنے کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سو میں اسی کمرے میں جا کر سو گئی جہاں رات گزاری تھی۔ نضار بستی کا معائنہ کرنے چلا گیا تھا۔ سوتے سوتے ایک مرتبہ میری آنکھ کھلی تو میں نے کچھ فاصلے پر نضار کو بھی بے خبر سوتے دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ وہ دن اور پھر ساری رات یونہی سوتے جاگتے گزری۔ رات کا کھانا بھی جیسے میں نے نیند ہی کی حالت میں کھایا تھا۔

اگلے روز صبح جاگنے کے بعد میں تر و تازہ تھی۔ میں حویلی کے باغ میں بھی ٹہلنے گئی۔ سورج طلوع ہونے لگا تو میں نے واپسی کا ارادہ کیا۔ اس حویلی کا ایک ایک گوشہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ ابھی میں باغ سے نکل ہی رہی تھی کہ نضار کو ادھر آتے دیکھا۔

"تُو یہاں ہے اے آتون! اور میں تجھے حویلی میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔" نضار میرے قریب آ کر بولا۔ "آ' کچھ دیر بیٹھتے ہیں یہیں۔"

میں نضار کے ساتھ ایک کنج کے قریب جا بیٹھی اور بولی۔ "تُو مجھے کس لئے تلاش کر رہا تھا؟"

"مجھے تجھ سے یہ مشورہ کرنا تھا کہ اس ملعون بوڑھے واہب کا قصہ کب ختم کیا جائے؟ دوم یہ کہ کیا اول اور احزم کو ان کے لشکروں کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے؟ اب یہاں ان دونوں کا رہنا ضروری نہیں رہا۔" نضار نے گفتگو شروع کی۔

"میں تجھے اپنے دل کی بات بتاؤں اے نضار! یہ جو میلہ لگا کر دشمنوں کے سر کاٹے جاتے ہیں مجھے قطعی پسند نہیں۔ میلہ اب صرف ایک شخص کے لئے لگے گا کہ وہی اس کا اصل حق دار ہے اور وہ ہے ژیان۔" میں نے کہا۔

"تو پھر دل بے قرار کی ایک اور صورت ہے۔" نضار معنی خیز لہجے میں بولا۔

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کمینے کے نائب کا سر کاٹ کر اسی کو بھیج دیا جائے۔ اس پیغام کے ساتھ کہ اس کے دوسرے نائبوں کا حشر بھی بہت جلد یہی ہو گا۔ اس سے یہ ہو گا کہ وادی سبز کے قریب جو چھوٹے چھوٹے قبیلے آباد ہیں اور جہاں ژیان نے اپنے نائب مقرر کر رکھے ہیں وہ بھی خوفزدہ ہو جائیں گے۔ ہمیں آئندہ اس سے فائدہ ہو گا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ وادی سبز کی اطراف جو بستیاں ہیں وہاں اپنے مخبروں کا جال بچھا دوں۔"

"ہاں تیری یہ تجویز مناسب ہے اے نضار!" میں نے تائید کی۔ "مگر واہب کا کٹا ہوا سر لے کر تُو کسے وادی سبز روانہ کرے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ تیرا ہی آدمی ہو گا اور اسے ژیان زندہ نہیں چھوڑے گا۔ کیا تُو اس کے لئے اپنے ایک آدمی کی قربانی دے گا؟"

"تجھے شاید نہیں معلوم اے آتون کہ سفیروں کو قتل کرنا دیوتاؤں کے قہر کی نشانی سمجھا جاتا ہے' چاہے وہ دشمن کی طرف سے جنگ کا پیغام لائیں یا امن کا۔"

"ہاں میرے علم میں یہ بات نہیں تھی۔" میں بولی۔ "اور تُو نے جو دوسرا مشورہ چاہا تُو اول اور احزم کو ان کی بستیوں کی طرف واپس بھیج دے۔ یہاں میرا لشکر کافی ہے اور پھر اب تو اس بستی کی سپاہ بھی تیری ہے۔ اس کے علاوہ دونوں شمالی بستیوں کے قبائل بھی تو اب تیرے ہی ہیں۔"

"مجھے تجھ سے ایک بات اور بھی معلوم کرنا تھی' اے آتون!" نضار نے کہا۔ "مجھے اب اکثر یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مجھ سے سرگوشیاں کر رہا ہو' مگر کیا کہا جاتا ہے واضح نہیں ہوتا۔ ایسا اس وقت سے ہے جب میں عظیم مہین کی طلبی سے لوٹا تھا۔ کیا تیرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے؟"

"ہاں' اے نضار!" میں نے جواب دیا۔ اب میں نضار کو بھی اپنا رازدار بنا لینا چاہتی تھی کیونکہ میں اور وہ ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اسے بتایا۔ "تجھے یاد ہو گا کہ جب ژیان اس بستی پر شب خون مارنے والا تھا' میں نے اس سے پہلے ہی تیرے بابا کو اس سے آگاہ کر دیا تھا۔ سن کہ بچپن ہی سے مجھے واضح طور پر سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ پہلی بار مجھے.........."

پھر میں نے اسے برسوں پہلے کا وہ واقعہ سنایا جب میری عمر صرف سات آٹھ سال تھی۔ "یہ سرگوشیاں مجھے آنے والے خطروں سے آگاہ کر دیتی تھیں۔ کاش میرے بابا نے میری پیشگوئی پر یقین کر لیا ہوتا۔" برسوں پہلے کی یادیں میرے دل میں نشتر اتارنے لگیں اور میری آواز بھرانے لگی۔ "تجھے شاید میں نے یہ نہیں بتایا کہ سفاک ژیان کو دو مرتبہ موت کے گھاٹ اتاردوں گی۔ ایک بار اس طرح جیسے اس نے میری ماں کو مارا اور دوسری مرتبہ یوں جیسے اس نے میرے بابا کو قتل کیا۔" پھر میں ہولناک یادوں میں کھو گئی اور میری ماں پر جو ظلم ہوا تھا' اس کی تفصیل سے نضار کو آگاہ کرتی رہی۔ "میں اپنی ماں کی وہ آخری الوداعی نظریں شاید کبھی نہیں بھول سکوں گی اے نضار! جب میں اس سے رخصت ہو رہی تھی۔" چند لمحے کو میری قوت گویائی جیسے جواب دے گئی۔ میں کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکی۔

نضار نے بھی غالباً میری کیفیت کو محسوس کر لیا اور میری توجہ دوسری طرف مبذول کرانے کی خاطر

کہنے لگا۔ "اے آتون! میں تجھ سے ایک بات تو پوچھنا بھول ہی گیا۔ تجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ واہب فرار ہو رہا ہے اور اس کے محافظ دستے کا سالار جھوٹ بول رہا ہے؟"

میں اس عرصے میں بڑی حد تک اپنے حواس پر قابو پا چکی تھی۔ اپنی آنکھوں میں بھر آنے والے آنسو پونچھتے ہوئے میں نے نضار کو بتایا۔ "مجھے اس سلسلے میں بھی پُراسرار سرگوشیاں ہی سنائی دی تھیں۔" پھر میں نے نضار کو حویلی میں موجود سرنگ کے متعلق آگاہ کر دیا جس کا دوسرا دہانہ بستی کے باہر بنی ہوئی کوٹھریوں میں سے ساتویں کوٹھری کے اندر تھا۔

"یہ سرنگ حویلی میں کس جگہ ہے اے آتون! اس کا سراغ لگانا پڑے گا۔" نضار کے لہجے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "اس طرح تو یہ حویلی محفوظ نہیں رہی۔ جس طرح سرنگ کے ذریعے باہر نکلا جا سکتا ہے اسی طرح اندر بھی آنا ممکن ہے۔ ہمارا کوئی بھی دشمن اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"ہاں تُو نے ٹھیک کہا' مگر مجھے سرنگ کے ایک دہانے کا تو علم ہے۔ ہم اسی سے داخل ہو کر حویلی تک آ جائیں گے۔" میں نے گویا مسئلے کا حل پیش کر دیا۔ "پھر تُو چاہے تو سرنگ کو بند کرا دینا۔"

نضار کی باتوں سے میرے دل میں بھی یہ تجسس پیدا ہو گیا تھا کہ سراغ لگایا جائے حویلی میں سرنگ کا دہانہ کہاں ہے۔ طے یہ ہوا کہ ہم آج ہی ژیان کے نائب واہب کا قصہ تمام کر کے بستی سے باہر جائیں گے۔ حویلی میں آ کر ہم دونوں نے ناشتہ کیا اور پھر نضار نے اپنے ایک خاص آدمی شیرویہ کو طلب کیا۔ شیرویہ کا تعلق اس کے محافظ دستے ہی سے تھا۔

"اے شیرویہ! تجھے میں ژیان کے نائب واہب کا کٹا ہوا سر دے کر وادی سبز بھیجنا چاہتا ہوں۔" نضار اسے ہدایات دینے لگا کہ ژیان کو کیا زبانی پیغام دینا ہے۔ اس کے بعد نضار نے کہا۔ "تُو اپنے چند ساتھیوں کو لے کر حویلی کے زیر زمین زنداں میں جا اور اس مردود بوڑھے کا سر کاٹ کر لے آ۔"

حکم سن کر شیرویہ چلا گیا اور جب کچھ دیر کے بعد پلٹا تو اس کے ہاتھ خالی تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے بمشکل بتایا۔ "اے سردار! زیر زمین زنداں سے واہب فرار ہو گیا۔" مجھے اپنی سماعت پر جیسے اعتبار نہ آیا۔

واہب کا فرار ہو جانا میرے نزدیک تعجب خیز بات تھی۔ شیرویہ اب تک سر جھکائے نضار کے سامنے کھڑا تھا اور نضار کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار تھے۔

"یقیناً حویلی میں موجود افراد ہی بوڑھے واہب کو فرار ہونے میں مدد دے سکتے ہیں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد نضار بولا۔ "یوں لگتا تھا جیسے اس نے بہت جلد اپنے غصے پر قابو پا لیا ہو۔ "اس حویلی میں واہب کے وفادار موجود ہیں جو کسی بھی وقت ہمارے لئے بھی خطرہ بن سکتے ہیں۔ حویلی میں موجود تمام غلاموں اور خادموں کو حویلی کے بڑے صحن میں جمع کر' معلوم کر کہ گزشتہ رات کون واہب کو کھانا پہنچانے زنداں میں گیا تھا۔ جا اور جب وہ سب صحن میں جمع ہو جائیں تُو خبر دے۔"

شیرویہ ادب سے سر جھکا کر الٹے قدموں لوٹ گیا۔

اسی وقت مجھے حویلی میں موجود سرنگ کے دہانے کا خیال آیا۔ میں نے نضار کو مخاطب کیا۔ "وہ

خبیث بوڑھا حویلی کے اندر موجود سرنگ کے ذریعے فرار ہوا ہے۔"

نضار چونک کر بولا۔ "مگر تُو یہ بات یقین سے کس طرح کہہ سکتی ہے اے آتون!"

"اگر تیرے محافظ دستے کے کسی سپاہی کی نظر اس پر پڑ گئی ہوتی تو ظاہر ہے' وہ فرار نہ ہو پاتا۔" یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اور خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور میں نے کہا۔ "وہ تیرے محافظوں سے اسی صورت میں چھپ کر فرار ہو سکتا تھا کہ زیرِ زمین زنداں سے باہر نہ آتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرنگ کا دہانہ زیرِ زمین زنداں ہی میں کہیں ہے۔"

"لیکن تیرے مفروضے کو درست مان لیا جائے تو پھر وہ اب سے پہلے کیوں فرار نہیں ہو گیا؟" نضار نے سوال کیا۔ "اگر وہ گزشتہ رات سے پہلے فرار ہو جاتا تو یہ بات راز نہ رہتی۔ کل رات تک وہ یقیناً زیرِ زمین زنداں ہی میں ہو گا ورنہ جو خادم اسے کھانا پہنچانے گیا تھا اس کے فرار سے محافظوں کو آگاہ کر دیتا۔"

نضار نے جو سوال کیا تھا ذہن کو الجھا دینے والا تھا۔ اگر واقعی سرنگ کا دہانہ زیرِ زمین زنداں ہی میں تھا تو واہب نے فرار ہونے میں دیر کیوں کی؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس لئے میں خاموش ہی رہی۔ پھر بھی میرا دل یہی گواہی دے رہا تھا کہ میں نے جو کچھ سوچا ہے' وہی درست ہے۔

کچھ ہی دیر میں شیرویہ نے آ کر یہ خبر دی کہ حویلی کے تمام خادموں اور خاداؤں کو بڑے صحن میں جمع کر دیا گیا ہے۔ نضار کے ساتھ میں بھی مختلف راہداریوں سے گزرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ میں نے ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑتے دیکھیں جنہیں عام معافی دی جا چکی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص ان سب سے الگ کھڑا تھا۔ وہ بھی خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ شیرویہ نے یہ بتایا کہ گزشتہ رات وہی شخص' واہب کے لئے کھانا لے کر گیا تھا۔

نضار اس شخص کے قریب پہنچ کر بولا۔ "تُو جب کل واہب کے لئے کھانا لے کر گیا تو کیا وہاں تُو نے اسے موجود پایا؟"

"ہاں اے سردار! وہ بہت ملول تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ کھانا نہیں کھائے گا۔" ادھیڑ عمر شخص لرزیدہ سی آواز میں بتانے لگا۔

"پھر.......... پھر تُو نے کیا کیا؟" نضار نے اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میں نے کھانا اس کی کوٹھری کے فرش پر رکھ دیا اور واپسی کے لئے مڑا۔ اسی وقت واہب نے مجھ سے روتے ہوئے ایک التجا کی۔ اس نے کہا کہ کوٹھری بہت چھوٹی اور تنگ ہے' یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ تُو مجھ پر اتنی مہربانی کر کہ برابر والے کمرے کا دروازہ دوسری طرف سے جا کر کھول دے۔ اس طرح مجھے چلنے پھرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ پہلے تو میں نے واہب کی بات نہیں مانی' مگر جب وہ رو رو کر فریادیں کرنے لگا تو میرا دل پگھل گیا۔ میں نے سوچا کہ اوپر تو سخت پہرا ہے۔ یہ بھلا یہاں سے نکل کر جائے گا بھی کہاں۔ سو میں نے دوسری طرف سے جا کر برابر والے کمرے کا دروازہ کھول دیا جو اس کی تنگ کوٹھری اور اس کمرے کے درمیان تھا۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر میں نے باہر نکلتے ہوئے اس کمرے

کا بیرونی دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اب واہب اس تنگ کوٹھری اور کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔"

ادھیڑ عمر خادم نے گزشتہ رات کی پوری روداد بیان کر دی۔

"کیا تم میں سے کسی کو خبر ہے کہ اس حویلی سے فرار کا کوئی خفیہ راستہ بھی موجود ہے؟" نضار نے بلند آواز میں ان سے سوال کیا۔

کسی نے بھی خفیہ راستے سے واقفیت کا اظہار نہیں کیا۔ اس دوران میں میرا ذہن ایک نتیجے تک پہنچ چکا تھا۔ مجھے نضار کے اس سوال کا جواب مل گیا تھا جو اس نے مجھ سے کیا تھا کہ واہب اس سے پہلے کیوں فرار نہیں ہوا؟

"آ اے نضار! میں تجھے بتاتی ہوں کہ وہ عیار بوڑھا کیسے فرار ہو گیا۔" میں نے نضار کو مخاطب کیا۔

پھر نضار کو اپنے ساتھ لے کر میں زیرِ زمین زندان میں پہنچ گئی۔ میں نے اس کوٹھری سے ملحق کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ سامنے والی دیوار پر دو آہنی کنڈے لگے ہوئے تھے۔ بظاہر وہ کنڈے کسی قیدی کو ہاتھ اوپر کر کے باندھنے کے لئے معلوم ہوتے تھے۔

میں آہستہ قدمی سے چلتی ہوئی دائیں جانب والے کنڈے کے نیچے پہنچی اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس سے لٹک گئی۔ نضار حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر اس کنڈے سے لٹکنے کے بعد اسے میں نے چھوڑ دیا اور پھر بائیں جانب والے کنڈے پر زور آزمائی کی۔ چند ہی لمحے کے بعد ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور میں نے نضار کو اچھل کر ایک طرف ہوتے دیکھا۔ نضار جس بڑے سے چوکور پتھر پر کھڑا تھا' وہ پتھر زمین میں دھنس کر ایک طرف غائب ہو گیا تھا۔ فرش میں اتنا خلا پیدا ہو گیا تھا کہ ایک آدمی باآسانی اس میں اتر سکتا تھا۔

خلا میں تاریکی تھی۔ مشعل منگوا کر اس کا جائزہ لیا گیا تو وہاں نیچے اترنے کے لئے چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں نظر آئیں۔ ان سیڑھیوں کے ذریعے سرنگ میں اترا جا سکتا تھا۔ اب یہ راز کھل چکا تھا کہ واہب وہاں سے کب اور کیسے فرار ہوا۔ سیڑھیوں کے نیچے بھی دو آہنی کنڈے لگے ہوئے ملے۔ ان میں سے ایک کو کھینچنے سے خلا بند ہو جاتا تھا اور دوسرے کے ذریعے خلا کو کھولا جا سکتا تھا۔ اسے واہب کی خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا تھا کہ اسے کہیں اور قید کئے جانے کے بجائے زیرِ زمین تہہ خانے میں رکھا گیا ورنہ وہ فرار ہونے میں ہرگز کامیاب نہ ہوتا۔

اسی وقت نضار نے سرنگ کے دونوں دہانوں کو پاٹ دینے کا حکم جاری کیا اور مجھے ساتھ لئے وہاں سے نکل آیا۔

گزشتہ رات جو ادھیڑ عمر خادم' واہب کے لئے کھانا لے کر گیا تھا' اپنے بیان کی روشنی میں بے قصور ہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا نادانستگی میں کیا' مگر جانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ عموماً یہ نہیں ہوتا۔ جس شخص کے بارے میں خادموں کو معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ عتاب ہے' اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی کوئی نرمی یا رعایت نہیں کرتے۔ وہ تو اپنے حاکموں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کسی معتوب شخص پر مزید سختیاں کرتے ہیں۔ بظاہر یہ معاملہ جتنا سیدھا نظر آ رہا تھا' میرے نزدیک اتنا سیدھا

نہیں تھا۔ کہیں نہ کہیں اس میں کوئی پیچ ضرور تھا۔ میں نے انہی خیالات کا اظہار نضار سے بھی کیا اور پ میرے ہی ایما پر فوراً یہ حکم دے دیا کہ حویلی کے خادموں میں سے کسی کو بھی باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ تا حکم ثانی ان پر یہ پابندی لگا دی گئی تھی کہ کوئی بھی حویلی سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔

"ہاں اب یہ بتا اے آتون کہ تجھے کس پر اور کیا شبہ ہے؟" نضار نے مجھ سے دریافت کیا۔ "میرے تیری اب تک کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ تجھے ادھیڑ عمر خادم کے بیان پر یقین نہیں ہے۔" نضار نے سوالیہ نظریں میری طرف اٹھائیں۔

"میں تجھ سے جو کہوں' سو کرتا جا اے نضار!" میں جواب میں بولی۔ "پھر حقیقت خود ہی سامنے آ جائے گی۔"

پھر میرے کہنے پر ایک ایک کر کے مطلوبہ افراد کو طلب کیا جانے لگا۔ یہ وہ افراد تھے جو اب تک کسی نہ کسی سبب سے قید کے دوران میں بوڑھے واہب سے ملتے رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ احتیاط کے پیش نظر صرف کسی ایک ہی خادم کو واہب کے پاس کھانا لے کر نہیں بھیجا جاتا تھا۔ ہر مرتبہ خادم تبدیل کر دیا جاتا تھا تاکہ قیدی کسی سے سازباز نہ کر سکے۔ حویلی کے نگران کے حکم پر ان خادموں کو بھیجا گیا تھا۔

تفتیش کے دوران میں ایک اور خادم نے ایسی بات بتائی کہ میں چونک اٹھی۔

"اس نے مجھ سے بھی فراڈی کی تھی اور .... اور اسی کے ساتھ........." خادم کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"آگے بتا' یقین کر کہ اگر تُو بے قصور ہوا تو تجھ سے کچھ نہیں کہا جائے گا۔" میں نے اسے قدرے خوفزدہ دیکھ کر دلاسا دیا۔

"وہ مجھ سے بھی تنگ کوٹھری .... جگہ کی تنگی کا گلہ کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کے لئے برابر والے کمرے کا دروازہ کھول دوں' مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس پر وہ .... وہ مجھے لالچ دینے لگا کہ .... کہ اپنی سونے کی انگوٹھی مجھے دے دے گا۔ میں پھر بھی نہ مانا تو وہ کہنے لگا کہ اگر اس کی سونے کی انگوٹھی لے کر سردار ژیان کے پاس چلا جائے گا تو .... تو تجھے مزید سونا اور انعام ملے گا۔ میں ڈر گیا اور پھر وہ مجھے آوازیں دیتا رہ گیا مگر میں نہیں رکا۔" خادم نے تفصیل سے ساری بات بتا دی۔

"پھر تُو نے یہ ذکر اوپر آ کر اپنے دوسرے ساتھیوں سے بھی کیا؟" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

"جج .... جی!" خادم ہکلایا۔

"اور ان میں وہ ادھیڑ عمر خادم بھی شامل تھا جو گزشتہ رات' واہب کے لئے کھانا لے کر گیا تھا؟" میں فوراً سوال کر دیا۔

"ہاں اے .... اے عظیم آتون! ان میں وہ بھی تھا لیکن رات کو اسے .... اسے نہیں جانا تھا۔"

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

خادم نے ادھیڑ عمر خادم کے بجائے کسی اور کا نام لیا کہ اسے گزشتہ رات کھانا لے کر جانا تھا۔

"پھر وہ کھانا لے کر کیوں نہیں گیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ .... کہ ایسا کیوں نہیں ہوا۔ حویلی کے نگران کو معلوم ہو گا اے معزز آتون!" خادم نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تُو جا' کسی کو بھی یہ نہیں بتائے گا کہ تجھ سے کیا پوچھا گیا اور تُو نے کیا بتایا۔" میری آواز میں سختی تھی۔

خادم سر جھکا کر چلا گیا۔ میں نے حویلی کے نگران کو طلب کر لیا۔ اس نے استفسار پر بتایا کہ جس خادم کو بھیجا جانا تھا اچانک وہ بیمار ہو گیا اور اس کی جگہ ادھیڑ عمر خادم کو واہب کے پاس کھانا لے کر بھیجا گیا۔

"اس نے خود ہی تجھ سے کہا ہو گا کہ وہ قیدی کو کھانا پہنچا کر آئے گا۔ ہے نا؟" میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔ میں اب بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔

"جی .... جی ہاں .... جی نہیں۔" نگران گھبرا گیا۔ "اسے .... اسے تو میں نے خود .... خود یہ حکم دیا تھا۔"

"جھوٹ نہ بول۔" میں نے نگران کو ڈانٹ دیا۔

پھر ذرا ہی دیر میں سارا معاملہ کھل گیا۔ نگران کو اسی ادھیڑ عمر خادم نے ایک مرصع خنجر رشوت میں دے کر آمادہ کیا تھا کہ اسے ہی واہب کے پاس کھانا لے کر بھیجا جائے۔ جو خادم کھانا لے کر جانے والا تھا اسے بھی ادھیڑ عمر خادم نے بیماری کا بہانہ بنانے پر راضی کیا تھا۔ اسے رشوت میں خادم نے اپنی تلوار دے دی تھی۔

سارا چکر انعام کے لالچ اور سونے کی انگوٹھی کا تھا۔ وہ سونے کی انگوٹھی بھی ادھیڑ عمر خادم کی کوٹھری سے برآمد کر لی گئی تھی۔ اب اس کا ارادہ وہ انگوٹھی لے کر وادی سبز جانے کا تھا جہاں سے اسے مزید انعام ملنے کی توقع تھی۔

اس ادھیڑ عمر خادم کے لالچ کی وجہ سے عیار واہب فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اس لئے نضار نے اسے بیس کوڑے مارے جانے کی سزا سنائی۔ حویلی کے سامنے اسے کوڑے لگائے گئے۔ کوڑے کھا کر وہ نیم جاں سا ہو گیا اور پھر اسی حالت میں اسے قیدخانے میں ڈال دیا گیا۔ سال بھر قید سخت کی اسے سزا بھی دی گئی تھی۔ سزا میں یہ نرمی نضار نے میرے ہی کہنے پر کی تھی کہ ورنہ اس کا جرم ایسا تھا کہ اسے موت کی سزا دی جاتی۔ حویلی کے نگران کو بھی اس کے عہدے سے معزول کر کے رشوت لینے کے جرم میں چھ ماہ قید کی سزا دی گئی تھی۔ جس خادم نے رشوت لے کر بیماری کا بہانہ کیا تھا' اسے بھی یہی سزا ہوئی۔

☆======☆======☆

یہ اسی رات کا واقعہ ہے کہ اچانک سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا' مگر میں اندھیرے میں واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ وہ ایک دیو قامت بلا تھی جو میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ کوئی انسان نہیں غیرانسان معلوم ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ بن

مانس جیسا تھا۔ اس کے چہرے اور جسم کا زیادہ تر حصہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بھیانک چہرے پر دونوں آنکھیں جیسے باہر ابلی پڑ رہی تھیں' ہاتھوں کے ناخن بڑھے ہوئے اور جانوروں کی طرح آگے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ سب سے عجیب اور حیرت ناک بات یہ تھی کہ اس کے چار ہاتھ تھے۔ دو ہاتھ اس کے دونوں شانوں سے موٹی موٹی شاخوں کی طرح اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ اس کی ابلی ہوئی سرخ آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے بڑے خوفناک انداز میں منہ کھولا اور مجھے اس کے بڑے بڑے دانت نظر آئے جن کے درمیان جھریاں تھیں۔

اس نے جھک کر کسی کھلونے کی طرح مجھے اٹھا لیا۔ میں پھر چیخ اٹھی۔ عین اسی وقت مجھے نضار کی آواز سنائی دی اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی آئی۔ اس بلا نے ایک ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ میرے منہ سے نکلنے والی دوسری چیخ میرے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ دیو قامت مجھے اٹھائے ہوئے ہوا کے کسی تند و تیز جھونکے کی طرح کمرے سے نکلا اور مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا حویلی سے نکل گیا۔ وہ مجھے اٹھائے حویلی کے پائیں باغ میں آیا تھا اور پھر ایک پیڑ پر چڑھ کر اس نے حویلی کی اونچی دیوار کی طرف جست بھری تھی۔ وہ ایک ہی جست میں حویلی کی اونچی دیوار عبور کر گیا تھا اور مجھے سنبھالے ہوئے زمین پر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ حویلی کا یہ عقبی حصہ تھا۔ وہ مجھے اٹھائے ہوئے ایک طرف دوڑنے لگا۔ ابھی تک اس کا ایک بھاری ہاتھ میرے منہ پر تھا جس سے میرا منہ ہی نہیں' سارا چہرہ چھپ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ ہی اتنا بڑا تھا۔ مجھے سانس لینے میں بڑی دشواری ہو رہی تھی اور دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اسی لئے اس کی آغوش میں مچلنے لگی۔ وہ غرایا اور میرے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔

منہ سے ہاتھ ہٹتے ہی میں پھر چیخی اور اسی لمحے مجھے عقب سے کسی گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ یقیناً کوئی گھڑسوار تعاقب میں تھا۔ اس دیو قامت نے دوڑتے دوڑتے پلٹ کر دیکھا اور پھر مزید تیز رفتاری کے ساتھ قریبی پہاڑی کی طرف بھاگنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق تعاقب کرنے والا نضار ہی ہو سکتا تھا۔ اس کی رہنمائی اور سمت کے تعین کی خاطر میں نے پھر چیخنا شروع کر دیا۔ بھاگتے بھاگتے غرا کر اس دیو قامت نے پھر ایک بار میرے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ میں نے یہ موقع ضائع نہیں کیا اور منہ کھول کر اس کی ہتھیلی میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ اس نے اپنا وہ ہاتھ اوپر اٹھا لیا۔ اس کے منہ سے غراہٹیں سی نکل رہی تھیں۔ وہ جن دونوں ہاتھوں سے مجھے اٹھائے ہوئے تھا' انہی میں سے ایک کی کلائی پر میں نے منہ مارا۔

اس مرتبہ وہ اچانک بھاگتے بھاگتے رک گیا اور پھر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اسی دوران میں تعاقب کرنے والا گھڑسوار قریب آ گیا۔ اسے میں نے گھوڑا روک کر کودتے دیکھا۔ اس کے سر کے بڑے بڑے بالوں کو شانوں پر پڑے دیکھ کر میں اسے فوراً پہچان گئی۔ کسرتی اور گٹھا ہوا جسم رکھنے والا وہ نوجوان نضار ہی تھا۔ جلدی میں وہ شاید اپنی رائفل لانا بھول گیا تھا۔ ہاں اس کی کمر سے بھاری دو دھاری تلوار ضرور بندھی ہوئی تھی۔ اپنی دو دھاری تلوار نیام سے کھینچ کر وہ اس دیو قامت کی طرف جھپٹا اور اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ دیو قامت پر میرے زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میرے

دانتوں کے ذریعے زہر یقیناً اس کے خون میں شامل ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے اب اس کے ہاتھ کانپنے لگے ہیں جن پر وہ مجھے اٹھائے ہوئے تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھے گرا دیتا' میں خود ہی اچھل کر زمین پر آ رہی' مگر اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور یہ میرے حق میں اچھا ہی ہوا۔ میں نے اسی لمحے نضار کو اس دیو قامت پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ دو دھاری بھاری تلوار کو اس نے دونوں ہاتھوں میں تول کر گھمایا اور دیو قامت کے سر پر بھرپور ضرب لگائی۔ دیو قامت اس وقت زہر کے زیر اثر کچھ جھک گیا تھا' مگر جیسے وہ دانت نکال کر نضار پر حملہ کرنے والا تھا' ایسا ہی لگ رہا تھا۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے اوپری دونوں ہاتھوں میں سے ایک میں گانٹھوں دار نوکوں والا لمبا سا ایک ہتھیار تھا' دوسرے اوپری ہاتھ میں کسی پتھر کا لمبا ٹکڑا تھا۔ وہ ٹکڑا کسی پتھریلی چٹان کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ نیچے دونوں ہاتھوں کے پنجے اس نے حملہ کرنے کے سے انداز میں سکیڑ رکھے تھے۔ میں زمین پر گری ہوئی دیکھ رہی تھی کہ نضار کی دو دھاری تلوار سے خون بہہ کر گر رہا تھا اور وہ دوبارہ دیو قامت پر حملہ کرنے کے لئے اپنی تلوار دونوں ہاتھوں سے تھام کر سینہ سپر تھا۔ نضار کا بایاں پاؤں ابھرے ہوئے ایک بڑے سے پتھر پر رکھا تھا۔ نضار نے اس دیو قامت کے سر پر دوسری ضرب لگائی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے اپنے سارے جسم میں ایک تیز قسم کی سنسنی سی دوڑتی محسوس کی اور پھر میری دونوں آنکھوں میں بجلی سی کوندی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تیز روشنی سی نکلتے دیکھی جو اس دیو قامت کے جسم پر مرکوز ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دیو قامت کے جسم میں آگ لگتے دیکھی۔ اس کا جسم کسی سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح جل رہا تھا اور اس کی چیخوں سے رات کا سناٹا گونج رہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

ذرا ہی دیر میں وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور پھر جلتا ہوا ڈھانچا ہی رہ گیا۔ نضار دم بخود سا کھڑا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

"نضار!" میں نے نضار کو آواز دی۔

نضار میری آواز سن کر اس طرح چونک اٹھا جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے ایک دم جاگ اٹھا ہو۔

"یہ .... یہ سب کیا .... کیا تھا اے آتون!" نضار رک رک کر کہنے لگا۔ "میں نے تیری آنکھوں سے لو دیتی روشنی اس .... اس کے جسم میں آگ لگی گئی .... وہ زندہ .... جل گیا۔ یہ سب کس طرح ہو گیا اے آتون! مجھے بتا۔"

"مجھے خود کچھ نہیں معلوم اے نضار! .... تو پھر میں .... میں تجھے کیا بتاؤں .... مگر ایسا لگتا ہے کہ .... عظیم مہیمن نے مجھے اور تجھے جو طاقتیں .... پُراسرار طاقتیں عطا کی ہیں' یہ پُراسرار طاقت .... کسی کو جلا دینے کی طاقت بھی انہی میں سے ایک ہے۔" یہ کہہ کر میں نے نضار کو بتایا کہ اس وقت مجھ پر کیا کیفیت گزری تھی۔

"لیکن .... لیکن اے آتون! ایسا میرے ساتھ کیوں نہیں ہوا؟" نضار نے سوال کیا۔ "کیا

میرے اندر یہ پُراسرار قوت موجود نہیں؟"

"یقیناً تیرے اندر بھی یہ پُراسرار قوت موجود ہو گی' مگر شاید ابھی وہ قوت تیرے اندر بیدار ہو[...] وقت نہیں آیا۔" میں نے قیاس آرائی کی۔ "ابھی تُو جس طرح پُراسرار سرگوشیوں کو سننے کا اہل [...] اسی طرح یہ معاملہ معلوم ہوتا ہے' لیکن میرا خیال ہے کہ رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تجھ [...] بھی یہ پُراسرار قوتیں پوری طرح بیدار ہو جائیں گی۔ تُو یہ کیوں بھول گیا کہ میری ہی طرح تجھے اندھیرے میں دیکھنے کی پُراسرار قوت حاصل ہے۔ تیرے لئے .... اندھیرا اب اندھیرا نہیں رہا۔ [...] اس وقت بھی مجھے دن کے اجالے کی طرح نہیں دیکھ رہا؟"

"ہاں اے آتون! عظیم تمہیں نے اندھیرے کو میرے لئے روشنی بنا دیا ہے۔" نضار نے اعتر[...] کیا۔

"آ اب لوٹ چلیں۔" میں نے نضار کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر میں' نضار کے ساتھ اس کے گھوڑے پر بیٹھ کر حویلی کی طرف چل دی۔ راستے میں نضار کے [...] استفسار میں نے اسے بتا دیا کہ سوتے سوتے اچانک میری آنکھ کھلی تو مجھے کیا نظر آیا اور پھر نضار کی [...] مداخلت سے پہلے مجھ پر کیا گزری۔

ابھی حویلی دور تھی کہ معاً مجھے وہی پُراسرار سرگوشیاں سنائی دینے لگیں جو بچپن سے اب تک [...] چلی آئی تھی۔ میں نے نضار کو بھی چونکتے ہوئے دیکھا اور پھر وہ بولنے لگا۔ "ہاں میں .... میں [...] سرگوشیاں سن رہا ہوں۔"

سرگوشیوں میں کہا جا رہا تھا۔ "سنو کہ بدی کی قوتیں تمہارے خلاف برسرپیکار ہو چکی ہیں [...] تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ لعنتی ژیان کے پروردہ بوڑھے ساحر زعیم کی طرف سے تم پر یہ پہلا [...] تھا جو تم نے ناکام بنا دیا۔ سنو کہ ازل ہی سے خیر و شر کا یہ تصادم جاری رہا اور جاری رہے گا۔ ممکن [...] آئندہ کبھی وقتی طور پر شیطانی قوتیں تم پر غالب آ جائیں' مگر تم ثابت قدم رہے تو آخری فتح تمہاری ہو گی۔ اے معبلہ! اور اے نضار! بے شک آخری فتح تمہارا مقدر کر دی گئی ہے لیکن تمہیں اس کے لئے صبر' ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہو گا۔ تم بڑی آزمائشوں سے گزرو گے' مگر تمہیں سرخرو ہونا ہے۔ تم نے آج خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خیر' شر پر غالب آ گیا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی سرگوشیاں ختم ہو گئیں۔

"اے آتون! آج .... آج میں نے بھی پُراسرار سرگوشیاں سن لیں۔" نضار کی آواز جذ[...] کے زیر اثر کانپ رہی تھی۔ "یہ آواز .... یہی آواز تو اس وقت میں نے سنی تھی جب .... عظیم مہیمن ہم سے مخاطب تھا۔ کیا نہیں اے آتون!"

"ہاں اے نضار! تُو ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے نضار کی تصدیق کر دی۔ اس وقت میرے ذہن [...] بہت سے خیالات تیزی سے گردش کر رہے تھے بہت سے سوالات ذہن میں ابھر رہے تھے۔ میں نضار [...] انہی خیالات و سوالات پر گفتگو کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی' مگر اب حویلی بہت قریب آ چکی [...]

[...]نے سوچا کہ یہ گفتگو حویلی میں چل کر اطمینان سے کی جا سکتی ہے۔ حویلی میں ہم عقبی دروازے ہی [...]ے داخل ہوئے تھے جس کا دروازہ ہمیں کھلا ہوا ہی ملا تھا۔

میرے لئے تعجب خیز امر یہ تھا کہ وہاں اس وقت کوئی محافظ نظر نہیں آیا تھا۔ نضار نے اندر داخل ہو کر دروازے ہی سے متصل اصطبل میں گھوڑا باندھ دیا۔ میں اس عرصے میں وہاں مسلح محافظوں کو دیکھ چکی تھی' مگر ان پر غیر فطری سی نیند طاری تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے جیسے سو رہے تھے۔ نضار گھوڑا باندھ کر میرے قریب آیا۔ میں کھلے ہوئے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ نضار نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

"اے اٹھو!" نضار نے بلند آواز میں خوابیدہ محافظوں کو مخاطب کیا۔ پہلی آواز کا ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تو نضار نے دوسری مرتبہ سخت آواز میں انہیں پکارا' پھر جھک کر جھنجھوڑ دیا۔ اس کے چہرے سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ دونوں اس طرح چونک کر بیدار ہو گئے جیسے گہری نیند سے اٹھے ہوں۔ پھر جیسے ہی ان کی نظریں نضار کے چہرے پر پڑیں' وہ تیزی سے اٹھے اور تعظیم دینے کی خاطر نضار کے سامنے جھک گئے۔ وہ دونوں ہی سخت گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔

"کیا ہوا تمہیں؟ تم لوگ پہرا دے رہے تھے یا سو رہے تھے؟" نضار کی آواز میں سختی اور جواب طلبی تھی۔

"مجھے .... مجھے نہیں معلوم اے معزز سردار کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔" پہلا محافظ بولا۔ "بس اچانک ہی میں نے اپنے دماغ کو بوجھل ہوتے محسوس کیا اور یوں لگا کہ بیٹھ نہ گیا تو چکرا کر گر پڑوں گا۔ پھر مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں گرنے سے بچنے کے لئے بیٹھ گیا تھا اس کے بعد کیا ہوا' کچھ نہیں معلوم۔"

تقریباً یہی بیان دوسرے محافظ کا تھا۔ وہ دونوں ہی اپنی نادانستہ غفلت پر نضار سے معافی کے خواستگار تھے۔

"اے نضار! انہیں معاف کر دے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے نضار سے ان دونوں کی سفارش کر دی۔

"تُو .... تُو کہہ رہی ہے اے آتون! تو میں انہیں معاف کرتا ہوں ورنہ ان کی غفلت سزا کی مستحق ہے۔" نضار نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید اسے یہ توقع نہیں ہو گی کہ میں ان محافظوں کی سفارش کروں گی۔ وہ میرے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ آیا۔

"اے نضار! میرا خیال ہے کہ ان پر غفلت طاری کر دی گئی تھی۔ اس غفلت کے یہ لوگ ذمے دار نہیں ہیں۔" میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"تیرا اندازہ غالباً ٹھیک ہی لگتا ہے اس لئے کہ جب میں تیرے تعاقب میں روانہ ہوا تھا تو بھی ان کا یہی حال تھا اور مجھے خود اصطبل سے گھوڑا کھول کر لانا پڑا تھا۔ اس وقت میرے پاس جواب طلبی کی مہلت نہیں تھی۔" نضار نے بتایا۔ "تیری چیخیں سن کر میری آنکھ کھلی تھی اور .... اور مجھے حیرت ہے کہ

تیری چیخیں سن کر کوئی محافظ' خادم یا خادمہ اس طرف متوجہ نہیں ہوئی۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے اب حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہو چکے تھے۔ راستے میں ہمیں جتنے محافظ' خادم اور خادمائیں نظر آئیں ان سبھی پر ایسی ہی غیر فطری نیند طاری تھی جس کا شکار عقبی دروازے کے محافظ ہوئے تھے۔ ہم نے پھر کسی کو جھنجھوڑ کر نہیں جگایا۔

"مجھے تجھ سے کچھ باتیں کرنا ہیں اے نضار!" میں بولی۔ "آ میرے ہی کمرے میں آ جا۔"

میں' نضار کو اپنے کمرے میں لے آئی اور چراغ روشن کر دیا۔

"تُو نے دیکھا اے نضار کہ دوسرے محافظوں اور خادموں پر بھی نیند طاری ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں اے آتون! میں نے دیکھا۔" نضار بولا۔ "یہ معاملہ مجھے پُراسرار ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اور مجھے حویلی سے نکلتے کسی نے نہیں دیکھا اور شاید واپس آتے بھی کوئی نہیں دیکھ سکا۔ میں نے جب عقبی دروازے کے محافظوں کو جھنجھوڑ کر جگایا تھا تو وہ دروازہ بند کر چکے تھے۔ وہ بھی نہ جان سکے ہوں گے کہ ہم دونوں باہر سے آئے ہیں۔ اگر میں انہیں بیدار نہ کرتا تو وہ یہ بھی نہ جان پاتے کہ ادھر کوئی آیا تھا۔ یہ سب کچھ اسی سحر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے جس کے بارے میں ہم نے پُراسرار سرگوشی سنی تھی۔"

میں نے نضار کے خیال سے اتفاق کیا' پھر کہا۔ "ہمارے دشمن ژیان کے پروردہ بوڑھے ساحر زعیم کا یہ پہلا پُراسرار اور خطرناک حملہ کیا اس طرف اشارہ نہیں کرتا کہ وہ ہماری طرف سے باخبر اور چوکنا ہو چکا ہے۔"

"ظاہر ہے اے آتون! کہ واہب یہاں سے فرار ہو کر ژیان ہی کے پاس وادی سبز پہنچا ہو گا اور یقیناً اس نے ژیان کو تیرے بارے میں بتایا ہو گا۔"

"مگر اے نضار! واہب میری حقیقت سے آگاہ نہیں تھا کہ میں دراصل کون ہوں۔" میں بولی۔

"اس کے لئے شاید اتنا ہی جان لینا کافی ہو گا کہ دشمنوں میں ایک حسین و نوجوان دوشیزہ بھی ہے جو یقیناً کچھ پُراسرار قوتوں کی مالک ہے۔ واہب نے بھی تیرے جسم سے زہریلے سانپوں کو لپٹے دیکھا ہو گا اور وہ ساری باتیں ژیان کو بتائی ہوں گی۔ اسی کے بعد ژیان نے بوڑھے ساحر زعیم کو بلایا ہو گا اور اس کے ذریعے تجھ پر حملہ کرایا ہو گا۔" نضار نے اپنے قیاس کا اظہار کیا۔

"کیا ساحر زعیم نے اپنے سحر کے ذریعے میری حقیقت کا سراغ لگا لیا ہو گا؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔" نضار نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تُو کیسے کہہ سکتا ہے اے نضار!"

"اس طرح کہ اس دیو قامت نے تجھے ہلاک نہیں کیا۔ تجھے ہلاک کرنے کے لئے اے آتون! یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ تجھے حویلی سے باہر لے جاتا۔"

"پھر اس کا مقصد اور کیا تھا؟"

"اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تجھے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہو گا۔ اسے شاید اس لئے

بھیجا گیا تھا۔ اگر ژیان کو بوڑھے ساحر زعیم کے ذریعے تیری حقیقت کا علم ہو جاتا کہ تُو وادی سبز کے عظیم سردار اشمر کی بیٹی معبلہ ہے تو ایسا نہ ہوتا۔ پھر وہ تجھے اغوا کرنے کے بجائے قتل کرا دیتا۔ تجھے اغوا کرانے کا مقصد اس کی عیاش مزاجی کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہوتا۔ اس نے جب واہب سے تیرے بلا خیز حسن کا ذکر سنا ہو گا تو تیرے حصول کی خاطر بوڑھے ساحر زعیم کی مدد لی ہو گی۔"

نضار کی باتوں میں وزن تھا۔ اس نے پیش آنے والے واقعے کے سلسلے میں جو قیاس آرائیاں کی تھیں اور جو دلائل دیئے تھے' درست ہی معلوم ہوتے تھے۔ پُراسرار سرگوشی کے مطابق گویا بدی کی قوتیں ہمارے خلاف برسرپیکار ہو چکی تھیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بات اطمینان بخش تھی کہ ہمارے اندر ان قوتوں سے ٹکرانے اور انہیں شکست دینے کی طاقت موجود تھی۔ ہمارے لئے نئے خطرات پیدا ہو چکے تھے اور ان خطرات کی نوعیت مختلف تھی لیکن ہم ان کا تدارک کر سکتے تھے۔ ہم اپنے اندر موجود معلوم و نامعلوم پُراسرار قوتوں کے ذریعے خطرات کا مقابلہ کرنے کے اہل تھے۔

مزید کچھ دیر نضار میرے پاس بیٹھ کر اپنی خواب گاہ میں سونے چلا گیا۔ آج ہی دن میں نضار کے حکم پر میرے لئے ایک الگ کمرے کا بندوبست کیا گیا تھا جو نضار کی خواب گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ نضار نے اپنی خواب گاہ کے لئے بھی ایک اور کمرے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اب اپنے باپ سردار اشمر کے کمرے میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اس کمرے سے وابستہ یادیں اسے ماضی کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں اور وہ اداسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس رات سونے سے پہلے مجھے یہ فکر تھی کہ بوڑھا ساحر زعیم اپنے ایک حملے کی ناکامی کے بعد مجھ پر دوسرا حملہ بھی کر سکتا ہے۔ میں بھلا نیند کی حالت میں کس طرح اس کے حملے سے اپنا بچاؤ کر سکتی ہوں۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک آشنا پُراسرار سرگوشی ابھری۔ "تُو فکرمند نہ ہو اے معبلہ! اب سوتے میں تجھ پر حملہ نہ کیا جا سکے گا۔ آنکھیں .... اپنے اندر کی آنکھیں کھول کر دیکھ کہ تیرے گرداگرد ایک حفاظتی حصار قائم ہے۔ اس حصار کے اندر تُو قطعی محفوظ ہے۔ اس حصار میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا اور اگر کسی نے یہ کوشش کی تو جل کر راکھ ہو جائے گا۔ حصار تیری نظروں سے چھپ کر بھی تیرے گرد قائم رہے گا۔"

سرگوشی ہی کے دوران میں اپنے چاروں طرف میں نے ایک دودھیا چمکیلا حصار دیکھا۔ جب سرگوشی معدوم ہوئی تو وہ حصار نادیدہ ہو گیا۔

مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا اس لئے جلد ہی میرے ذہن پر نیند کا غبار چھا گیا اور میں گہری نیند سو گئی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح میں سو کر اٹھی تو مجھے ایک تشویش ناک خبر ملی۔ یہ خبر مہا پجاری اور احرس کے متعلق تھی۔ بستی تریال کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک وحشی قبیلے نے ان کے قافلے کو لوٹ لیا

تھا۔ ان دونوں کے ساتھ جو سپاہی تھے‘ ان میں سے کچھ لڑتے ہوئے مارے گئے تھے‘ کچھ زخمی ہو‘ تھے‘ کچھ کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ یہ روح فرسا خبر لے کر آنے والا بھی ایک سپاہی تھا جو زخمی ہونے کے باو فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق مہا پجاری اور احرس کو بھی قیدی بنا لیا گیا تھا کیوں کہ وہ سپاہی زخمی تھا اور اس کی سواری کا جانور بھی لڑائی میں زخم کھا چکا تھا اس لئے اسے واپسی اتنی دیر ہوئی تھی۔ پھر یہ کہ وہ براہ راست اشر کی بستی نہیں آیا تھا بلکہ اسی بستی میں پہنچا تھا جہاں روانگی ہوئی تھی۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ اشر کی بستی اب دشمن کے قبضے میں نہیں رہی۔ اسے نضار نائب ادل نے اپنے ایک محافظ کے ساتھ ہمارے پاس بھیجا تھا کیوں کہ اسے اشر کی بستی کا محل وقوع معلوم نہیں تھا۔ واپسی میں دیر کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی تھی کہ دشمن کے خوف سے اس نے راستہ ب دیا تھا کہ کہیں پکڑا نہ جائے۔ اسی چکر میں وہ راستہ بھول گیا تھا اور بڑی مشکل سے دوبارہ وہ راستہ تلاش پایا تھا جس سے گیا تھا۔ پہاڑی راستوں پر سفر کرنے والے عموماً اپنے ذہن میں کچھ ایسی نشانیاں رکھتے ہو چلتے ہیں کہ دوبارہ اس راستے پر سفر کرنا ان کے لئے مشکل نہ ہو۔ خبر لانے والے سپاہی کی اطلاع مطابق ادل کی بستی سے اس وحشی قبیلے کی مسافت صرف دو دن اور دو راتوں پر مشتمل تھی جب کہ را کے وقت پڑاؤ بھی ڈالا گیا تھا۔ یوں وہ وحشی قبیلہ گویا ادل کی بستی سے تقریباً دو ہی دن کی مسافت پر ت اشر کی بستی سے ادل کی بستی ایک دن کی مسافت پر تھی۔ مہا پجاری کو اشر کی بستی ایک طرف چھوڑ ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔ اس حساب سے وہ وحشی قبیلہ‘ اشر کی بستی سے تقریباً ایک ہی دن کی مسا پر تھا۔ خبر لانے والا سپاہی ہمیں وہاں تک لے جا سکتا تھا مگر اس کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ ہما رہنمائی کر سکتا۔ زخمی ہونے کی وجہ سے فوری طور پر اس کے علاج کی ضرورت تھی۔ ادل نے خبر اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے کسی تاخیر کے بغیر ہمارے پاس بھیج دیا تھا اور یہ پرواہ نہیں کی تھی کہ زخمی ہے۔

”اے نضار! اب تُو ہی بتا کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ اس کی حالت تو تجھے نظر ہی آ ر ہے۔“ میں نے زخمی سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مضطرب آواز میں نضار سے سوال کیا۔

”سب سے پہلے تو اسے علاج کی ضرورت ہے تاکہ یہ اس وحشی قبیلے کی بستی تک ہماری رہن کے لئے زندہ رہ سکے۔“ نضار نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے بستی کے ماہر جراحوں ا طبیبوں کو طلب کر لیا۔

میرا ذہن سخت پریشان تھا اس لئے میں سب کچھ خاموشی سے دیکھتی رہی۔ نضار نے بذات خ جراحوں اور طبیبوں کو تاکید کی کہ اس سپاہی کا علاج پوری توجہ سے کیا جائے تاکہ وہ جلد از جلد صح یاب ہو کر سفر کے قابل ہو سکے۔

تیسرے دن اس سپاہی کی حالت کچھ سنبھلی۔ طبیبوں نے بتایا کہ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ میں نے یہ تین دن انتہائی اضطراب اور بے چینی کے عالم میں گزارے‘ مگر سپاہی کی صحت یابی انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہی اس وحشی قبیلے تک ہماری رہنمائی کر سکتا تھا جس نے

پجاری اور احرس کو قیدی بنا لیا تھا۔ میں اس خوف میں مبتلا تھی کہ کہیں مہا پجاری اور احرس کو قتل نہ کر دیا گیا ہو۔ میرے لئے یہ تصور بھی انتہائی اذیت ناک تھا۔ اسی روز نضار نے طبیبوں کو بلا کر پوچھا کہ کیا اس حالت میں زخمی سپاہی سفر کر سکتا ہے؟

”ہم نے اس کے جن زخموں کو سیا ہے‘ سفر کرنے کی صورت میں ان کے ٹانکے ٹوٹنے کا اندیشہ ہے۔“ ایک طبیب نے جواب دیا۔

”اگر وہ خود اپنے گھوڑے کی لگام نہ تھامے بلکہ کوئی دوسرا شخص اسے اپنے گھوڑے پر ساتھ بٹھا کر سفر کرے تو؟“ نضار نے سوال کیا۔

”تو بھی بات وہی رہے گی‘ ہاں خطرہ .... زخم کھل جانے کا خطرہ کسی قدر کم ہو جائے گا۔ اگر گھوڑے کو تیز رفتاری سے نہ دوڑایا جائے‘ رفتار کم رکھی جائے تو بھی خطرہ کم ہو سکتا۔ بہرحال دونوں صورتوں میں میرا مشورہ اے سردار! یہی ہے کہ ابھی مزید دو ایک روز............“

”نہیں۔“ میں طبیب کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں اب مزید صبر نہیں کر سکتی۔ میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔

”تو پھر اس کی یہی صورت ہے کہ طبیبوں کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔“ نضار نے کہا۔ ”اگر اس کے زخم کھل جائیں تو دوبارہ سی دیئے جائیں۔“

”تُو کچھ بھی کر اے نضار! مگر اب دیر نہ کر۔“

نضار کو بھی میری بے چینی اور اضطراب کا اندازہ تھا اس لئے وہ سر ہلا کر بولا۔ ”اے آتون! تُو فکر نہ کر‘ ہو گا وہی جو تُو چاہے گی۔ احزم بھی آتا ہی ہو گا۔ ہم اس کے یہاں پہنچتے ہی روانہ ہو جائیں گے۔ آج شام تک اسے آ جانا چاہئے۔“

گزشتہ تین دن کے دوران میں نضار نے ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ وہ مجھے کسی صورت اس وحشی قبیلے کی طرف تنہا بھیجنے پر آمادہ نہیں تھا۔ خود وہ بھی میرے ساتھ چلنا چاہتا تھا۔ اس کی حیثیت سردار کی تھی اور یوں وہ کسی کو اپنا نائب مقرر کئے بغیر وہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔ اپنی نیابت کے لئے اس نے احزم کو منتخب کیا تھا اور اسے پیغام بھیج دیا تھا کہ اپنی جگہ وہاں کسی کو نائب مقرر کر کے اشر کی بستی پہنچ جائے۔ اشر کی بستی سے احزم کی بستی کا فاصلہ خاصا تھا اس لئے فوری طور پر احزم نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اگر خبر لانے والا سپاہی شدید زخمی بھی نہ ہوتا تو شاید نضار کو احزم کا انتظار کرنے کے لئے رکنا پڑتا۔ دشمن کی طرف سے کسی خطرے کے امکان کو بہرحال نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تمام باتیں میری نظر میں بھی تھیں۔ میں اسی لئے اب تک کسی نہ کسی طرح اپنے اضطراب پر قابو پائے ہوئے تھی لیکن اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہو رہا تھا۔

شام ہوتے ہوتے احزم بھی پہنچ گیا۔ طے یہ پایا کہ آئندہ روز صبح ہی ہمارا لشکر روانہ ہو جائے گا۔ رات ہی کو نضار نے یہ حکم جاری کر دیا تھا۔

اس رات کو میں بہت بے چین تھی اسی لئے حویلی کے پائیں باغ میں ٹہلنے کے لئے نکل گئی۔

کمرے میں مجھے وحشت سی ہو رہی تھی۔ احرس کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا' اسی کے ساتھ بار بار مہا پجاری کا خیال بھی آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہی میرے لئے بہت اہم تھے۔ احرس میرے بچپن کا دوست اور مہا پجاری میرا محسن' وہ دونوں قید میں تھے' ان کی زندگی خطرے میں تھی تو بھلا مجھے کس طرح قرار سکتا تھا۔

وہ چاندنی رات نہیں تھی اور باغ میں دور تک تاریکی تھی' مگر میں اپنے اندر موجود پُراسرار قوت کے طفیل دور دور تک اندھیرے کے سینے میں شگاف ڈال سکتی تھی۔ میں اندھیرے میں دیکھنے کی اہل تھی۔

باغ میں کچھ دیر چہل قدمی کے بعد میں واپسی کے لئے قدم اٹھا رہی تھی کہ اچانک ایک سرگوشی سن کر چونک اٹھی۔ کسی نے میرا ہی نام لیا تھا۔

"ہاں آتون بھی!" یہ شاید کسی سوال کا جواب تھا۔ "سردار نضار' اس کے نائب احزم اور آتون بیک وقت حملہ کرنا ہے۔"

یہ سرگوشی سن کر میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یقیناً یہ تین اہم افراد کے قتل سازش ہو رہی تھی۔ یہ سرگوشی جس کی بھی تھی' اس کی آواز میرے لئے اجنبی ہی تھی۔ پہلے تو مجھے گمان ہوا کہ وہ سازش کرنے والے وہیں باغ ہی میں موجود ہیں' مگر جلد ہی میرا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ جو کوئی بھی تھے' باغ میں نہیں تھے۔ ان کی سرگوشیاں حویلی کی طرف سے آ رہی تھیں۔ یہ بات میرے لئے خاصی تعجب خیز تھی کیوں کہ میں باغ میں جس جگہ موجود تھی' وہاں سے عمارت اتنی دور تھی کہ عمارت میں ہونے والی سرگوشیاں باغ کے اس حصے تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

"یہ لو۔" وہی سرگوشی پھر ابھری۔ "یہ تینوں خنجر خطرناک زہر میں بجھے ہوئے ہیں۔ جسم کے کسی بھی حصے پر معمولی سی خراش بھی کافی ہے' کام ہو جائے گا۔ نصف شب کے قریب تم تینوں کو ایک ساتھ ان تینوں کو شکار کرنا ہے۔ حملہ کرنے کے بعد تم تینوں حویلی کی چھت پر چڑھ کر اپنی اپنی مشعلیں جلا کر بلند کرو گے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟" ایک اور سرگوشی سنائی دی۔

"واہب کو اس سے معلوم ہو جائے گا کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہو۔" جواب دیا گیا۔ "اندھیرے میں مشعلوں کی روشنی دور سے بھی دکھائی دے جائے گی۔ بستی کے باہر درے والی پہاڑی پر واہب کے دو مخبر انہی مشعلوں کے بلند ہونے کا انتظار کریں گے اور پھر وہ واہب کو جا کر خبر دیں گے کہ کام ہو چکا ہے۔ واہب یہاں سے ایک پہر کے فاصلے پر لشکر لئے موجود ہو گا۔ صبح ہونے سے پہلے ہی وہ بستی پر حملہ کر دے گا۔ احزم' آتون اور نضار کی موت کے بعد بستی میں کوئی بھی فوج کی کمان کرنے والا نہیں رہے گا۔ یہ دو دو ڈلی سونا جو میں نے تم تینوں کو دیا ہے' اتنا ہی سونا تمہیں اس وقت مزید ملے گا جب واہب دوبارہ اس بستی میں سرداروں کے سردار ژیان کی نیابت سنبھال لے گا۔ اس کے علاوہ تمہیں واہب کی طرف سے اعلیٰ عہدے بھی ملیں گے۔ کل کا سورج تمہارے لئے خوش بختی کی نوید لانے والا

ہے۔"

اسی دوران میں جیسے میرے قدم خود بخود حویلی کی طرف اٹھتے رہے تھے۔ میں اب حویلی میں تھی اور اس طرف بڑھ رہی تھی جدھر سے وہ سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ میں اب اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ میرے اندر ایک اور پُراسرار قوت بیدار ہو چکی ہے۔ فاصلوں کی طنابیں میرے لئے کھینچ دی گئی ہیں۔ میں کافی فاصلہ ہونے کے باوجود سرگوشیاں سن سکتی تھی جن کا سن لینا کسی بھی عام آدمی کے لئے قطعی ناممکن تھا۔

میرے قدم اب حویلی کے اس حصے کی طرف اٹھ رہے تھے جو خادموں اور خادماؤں کے لئے مخصوص تھے۔ سرگوشیاں اب بھی میری رہنمائی کر رہی تھیں۔ وہاں تک پہنچتے ہوئے مجھے کئی جگہ مسلح محافظ نظر آئے جنہوں نے مجھے تعظیم دی۔ وہ مستعد اور چوکنا معلوم ہو رہے تھے۔ حویلی کا وہ حصہ چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں پر مشتمل تھا۔ انہی میں سے ایک کوٹھری کے بند دروازے کے باہر میرے قدم رک گئے۔

میرے اندازے کے مطابق اس کوٹھری میں چار افراد موجود تھے جن میں سے ایک یقیناً واہب کا آلۂ کار تھا۔ یہ وہی شخص تھا جسے سازش کا سربراہ کہا جا سکتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "واہب نے وعدہ کیا ہے کہ تمہارے بیوی بچوں اور دوسرے لواحقین کی ذمے داری واہب پر ہو گی۔ بولو' اب کوئی بات ایسی تو نہیں رہی جو تم سمجھ نہ سکے ہو؟"

اس وقت میں یہ سوچ رہی تھی کہ رحم دلی کا مظاہرہ صرف انہی لوگوں کے ساتھ کرنا چاہئے جو اس کے مستحق ہیں۔ حویلی میں موجود تمام خادموں اور خادماؤں کو عام معافی دے کر نضار نے یقیناً اچھا نہیں کیا تھا۔ یہ لوگ واہب کے وفادار رہ چکے تھے اور قابل اعتماد نہیں تھے۔

اچانک میں نے آگے بڑھ کر کوٹھری کے بند دروازے پر ٹھوکر ماری اور پھر بلند آواز میں بولی۔ "دروازہ کھولو۔"

"یہ .... یہ تو اسی .... آتون کی آواز لگتی ہے۔" اندر سے کسی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں .... وہ اکیلی معلوم ہوتی ہے۔"

یہ آواز اس سازش کے سربراہ کی تھی۔ "اگر اس کی موت وقت سے پہلے ہی اسے یہاں تک کھینچ لائی ہے تو ہمیں اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔" اس کی سرگوشی دھیمی ہوتی گئی۔ اس کے باوجود بھی میں ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔ وہ شخص نہایت دھیمی سرگوشیوں میں اپنے تینوں ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ "دروازہ میں کھولوں گا اور پیچھے ہٹ کر اسے تعظیم دوں گا۔ وہ کوٹھری میں داخل ہو جائے گی اور اسی وقت تم تینوں بیک وقت دروازے کی آڑ سے نکل کر اس پر حملہ کر دو گے۔ یہ خیال رہے کہ اسے چیخنے کا موقع نہیں دینا ہے ورنہ حویلی میں موجود محافظ اس طرف متوجہ ہو جائیں گے اور پھر اس کے بعد ہمارا راز' راز نہیں رہ سکے گا۔ تم میں سے کوئی ایک پیچھے سے جھپٹ کر پہلے اس کی گردن دبا لے گا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ میں دروازہ بند کر دوں گا۔"

وہ چار مسلح افراد تھے اور میں اکیلی تھی۔ یقیناً میں نے انہیں چوکنا کر کے غلطی ہی کی تھی، مگر اب کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ اب قدم پیچھے ہٹانا، ممکن نہیں تھا۔ میں کوٹھری کے دروازے کے پیچھے قدموں کی چاپ ابھرتے سن رہی تھیں دروازہ کھولا جانے والا تھا۔ اس وقت میں بالکل غیر مسلح تھی۔ میرے پاس اس لئے کوئی ہتھیار نہیں تھا کہ میں سونے کے لئے لباس تبدیل کر چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ چیخ کر حویلی کے محافظوں کو اس طرف متوجہ کر لوں جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ میں اگر بلند آواز میں انہیں پکارتی تو ان تک میری آواز پہنچ سکتی تھی، مگر مجھے یہ فعل بزدلانہ سا محسوس ہوا۔ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اسی وقت کوٹھری کا دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھولنے والا ایک دم پیچھے ہٹا اور میری تعظیم میں جھک گیا، مگر میں اپنی جگہ کھڑی رہی۔ میں نے آگے قدم نہیں بڑھائے۔

"سنو اے احسان فراموش!" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "تمہیں عام معافی دے دی گئی تھی۔ خیال تھا کہ اس احسان کے بدلے سردار نضار کے وفادار ہو گے، مگر تم نہیں بدلے۔ تمہاری سازش کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔"

اسی لمحے میں نے اپنے جسم میں تیز قسم کی سنسناہٹ محسوس کی جو میری دونوں آنکھوں پر مرتکز ہو گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تیز روشنی اس شخص کی طرف لپکتے دیکھی جو کوٹھری میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ روشنی اس شخص کے جسم پر پڑی اور اسی کے ساتھ وہ چیخ اٹھا۔ اس کا جسم اس طرح جلنے لگا تھا جیسے پگھلی ہوئی چربی چھڑک کر اس کے جسم کو آگ لگا دی گئی ہو۔

میری آنکھوں سے نکلنے والی تیز روشنی پھر واپس آ کر میری ہی آنکھوں میں سما چکی تھی۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جس شخص کے جسم میں آگ لگی تھی، وہ اپنی جگہ کھڑا ہوا چیخے جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اسی جگہ جکڑ کر کھڑا کر دیا گیا ہو اور وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے قاصر ہو۔ بالکل ایسا ہی ایک نظارہ چند روز پہلے بھی میں دیکھ چکی تھی۔ بوڑھے ساحر زعیم کا فرستادہ دیو قامت بھی میری آنکھوں سے نکلی ہوئی روشنی کا شکار ہو کر اپنی جگہ سے نہیں ہل سکا تھا۔ میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سن رہی تھی۔

دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے تینوں خادموں پر یقیناً وہ حیرت انگیز و دلدوز منظر دیکھ کر اثر ہوا اور وہ دروازے کی آڑ سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے خنجر میرے قدموں میں ڈال دیئے اور پھر میرے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

"اے آتون دیوی! ہم سے بھول ہوئی، ہمیں معاف کر دے۔" وہ سجدے میں پڑے گڑگڑا رہے تھے۔

جلتے ہوئے شخص کی چیخیں اب معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ فرش پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ اسی کے ساتھ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بالکل قریب آ گئیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ حویلی کے مسلح محافظ ہی ہو سکتے تھے جو چیخیں سن کر ادھر دوڑ اٹھے تھے۔

چند ہی لمحوں بعد میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ آنے والے مسلح محافظ ہی تھے۔ وہ حیرت زدہ ہو کر کوٹھری کے اندر اور باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔ کوٹھری کے اندر ایک شخص زندہ جل رہا تھا اور باہر تین افراد میرے قدموں میں سجدہ ریز تھے۔

"ان تینوں کو گرفتار کر لو۔" میں نے تینوں سجدہ ریز افراد کی طرف اشارہ کیا۔ میں مسلح محافظوں سے مخاطب تھی۔

محافظ آگے بڑھے اور اسی وقت ان تینوں نے سر اٹھائے۔ ان کے چہرے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ وہ ایک بار پھر مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے، میرے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"تم نے اپنی مہلت خود ہی ختم کر دی۔ لالچ نے تمہیں اندھا کر دیا اور سونے کی چمک نے تمہیں احسان فراموشی پر آمادہ کر لیا۔" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "کیا تم اس پر شکر گزار نہیں تھے کہ تمہیں عام معافی کا حق دار سمجھا گیا؟"

"اے معزز آتون دیوی! ہم سے غلطی ہوئی۔" ان میں سے ایک بھاری آواز میں بولا۔

"اور غلطی کی سزا تمہیں ضرور ملے گی۔ بولو، تم میں سے کس کو کس کے قتل پر مامور کیا گیا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اے آتون دیوی! تیرا گناہگار میں تھا۔" گٹھے ہوئے جسم والے ایک خادم نے جواب دیا۔ پھر بقیہ دونوں خادموں نے بھی اعتراف جرم کر لیا۔ ان میں سے ایک نضار کو آج رات قتل کرنے والا تھا اور دوسرا احزم کو۔"

"تو پھر اپنی سزا سنو! یہ زہر میں بجھے ہوئے خنجر اٹھاؤ اور خود انہیں اپنے سینوں میں اتار لو۔" میں نے انہیں حکم دیا۔

"نہیں۔" وہ خوفزدہ آواز میں چیخ اٹھے۔

"ٹھیک ہے۔" میں بظاہر پُرسکون آواز میں بولی، پھر دو محافظوں کو حکم دیا کہ جا کر نضار اور احزم کو بلا لائیں۔

دونوں محافظ میرے حکم کی تعمیل میں فوراً دوڑ گئے۔ تینوں خادم پھر میرے سامنے گڑگڑانے لگے۔ میں نے ان کی التجاؤں اور فریادوں کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور کوٹھری کے اندر نظر ڈالی۔ اب جلنے والے کی ہڈیوں میں آگ لگ چکی تھی۔ وہ آگ شاید اس شخص کے جسم کو راکھ میں تبدیل کئے بغیر نہیں بجھنے والی تھی۔ اب صرف اس شخص کے جسم کا ڈھانچا باقی رہ گیا تھا، بقیہ جسم کو آگ پہلے ہی چاٹ چکی تھی۔

نضار اور احزم کو وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے مختصر الفاظ میں ان دونوں کو سازش سے آگاہ کیا، پھر بولی۔ "اس سازش کے سرغنہ کا ڈھانچا اندر جل رہا ہے اور یہ تینوں اس کے آلۂ کار بن گئے تھے۔ انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تو میں نے انہیں سزا سنائی کہ یہ خود زہریلے خنجر اپنے سینوں میں اتار لیں، مگر یہ بزدل ثابت ہوئے۔ سو میں نے سوچا کہ ان میں جو بھی ہم تینوں کا مجرم ہے، وہ

اسی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے۔ میں نے اسی لئے تم دونوں کو بلایا ہے اے نصار! اور اے احزم!"

"مگر اے عظیم آتون! تجھے اس سازش کی خبر کس نے دی؟" احزم نے مجھ سے سوال کیا۔

اس سے پہلے کہ میں احزم کی بات کا جواب دیتی' نصار بول اٹھا۔ "اے احزم! یہ احمقانہ سوال کر کے خود کو کم عقل کیوں ثابت کر رہا ہے؟ کیا تجھے نہیں معلوم کہ عظیم آتون پُراسرار قوتوں کی مالک ہے؟"

"میں اپنے سوال پر شرمندہ ہوں اے سردار! اور اے عظیم آتون!" احزم نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

"اور وہ .... اس سازش کا سرغنہ تیری آنکھوں سے نکلنے والی تیز روشنی سے جل اٹھا ہو گا۔" نصار کا لہجہ تصدیق طلب سا تھا۔

"ہاں اے نصار! ایسا ہی ہوا تھا۔" میں جب یہ کہہ رہی تھی تو احزم کے چہرے سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ یقیناً اس کی عقل میں یہ بات نہیں سما رہی ہو گی کہ میری آنکھوں کی روشنی نے اس شخص کے جسم کو جلا دیا ہو گا۔ اپنی بات پوری کر کے میں نے سامنے پڑے ہوئے تین زہر آلود خنجروں میں سے ایک اٹھا لیا۔ "اب تم دونوں بھی ایک ایک خنجر اٹھا لو۔"

میرے کہنے پر نصار اور احزم نے بھی جھک کر خنجر اٹھا لئے۔ پھر پہل میں نے ہی کی۔ میں نے اپنے مبینہ قاتل کو ہلاک کرنے میں کسی درندگی کا اظہار نہیں کیا۔ زہر آلود خنجر کی نوک میں نے اس کے دائیں بازو میں اتار دی تھی۔

نصار اور پھر احزم نے بھی میری تقلید میں ایسا ہی کیا تھا۔ ان مجرموں کو سزائے موت دینے کے لئے ان کے سینوں کا نشانہ بنانا ضروری نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر میں خطرناک زہر نے اپنا کام کر دکھایا اور وہ تینوں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ ڈھانچا بھی اب جل کر راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے محافظوں کو وہاں سے ان تینوں کی لاشیں اٹھانے کا حکم دیا اور پھر واپسی کے لئے مڑ گئی۔ نصار اور احزم دونوں ہی میرے ساتھ تھے۔ میں ان دونوں کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں بیٹھ گئی اور وہ دونوں بھی میرے سامنے بیٹھ گئے۔

"یہ اچھا موقع ہے اے نصار!" میں نے گفتگو شروع کی۔ "یہاں سے ایک پہر کی مسافت پر عیار واہب اپنا لشکر لے کر موجود ہے۔ ہم اسے آسانی سے شکار کر سکتے ہیں۔" پھر میں نے تفصیل کے ساتھ نصار اور احزم کو واہب کی سازش سے آگاہ کر دیا۔ "ہم اس کی چال خود اسی پر الٹ سکتے ہیں اور اسے دو طرف سے گھیر کر مار سکتے ہیں۔"

نصار اور احزم دونوں ہی نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ پھر فوری طور پر مددگار قبائل کی طرف قاصد روانہ کر دیئے گئے۔ اسی کے ساتھ بستی میں موجود سپاہیوں کو تیاری کا حکم دے دیا گیا۔ اس کے بعد میں' احزم اور نصار خود تین جلتی ہوئی مشعلیں لے کر حویلی کی چھت پر چڑھ گئے۔ ہماری نظریں دور والی پہاڑی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی ہم نے مشعلیں بلند کیں' ادھر سے بھی ایک مشعل بلند ہوئی۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ہمارا پیغام پہاڑی پر موجود واہب کے مخبروں تک پہنچ گیا ہے۔ اس خاموش اشارتی پیغام کا مطلب یہ تھا کہ سازش کامیاب ہو چکی ہے' یعنی مجھے' نصار اور احزم' تینوں کو قتل کیا جا چکا ہے اور اب اشر کی بستی میں کوئی ایسا نہیں جو سپاہیوں کو کوئی حکم دینے کا اہل ہو اور واہب کے خلاف انہیں آمادہ جنگ کر سکے۔

حویلی کی چھت سے نیچے اترتے ہوئے احزم نے مجھے مخاطب کیا۔ "اے آتون دیوی! موجودہ حالات میں حویلی کے اندر موجود خادموں اور خادماؤں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سبھی واہب کے نمک خوار رہ چکے ہیں۔ جو کچھ آج ہوا آئندہ بھی اسے دہرایا جا سکتا ہے اس لئے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ.........."

"میں تیری بات کا مطلب سمجھ گئی اے احزم!" میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "نصار نے انہیں جو عام معافی دی ہے وہ بدستور برقرار رہے گی۔ ضروری نہیں کہ ان میں سے سبھی لالچی اور نمک حرام ہوں۔ سن اے احزم! کبھی کبھی آدمی اس لئے بھی ایماندار اور باوقار رہتا ہے کہ اسے بے ایمانی یا بے وفائی کا موقع نہیں ملتا۔"

احزم نے میرے اس خیال کی بہت تعریف کی۔ "اے آتون دیوی! تُو نے یقیناً بڑے پتے کی بات کی ہے۔"

"سو یوں کر کہ حویلی میں موجود محافظ دستے کو چھوڑ کر جتنے بھی خادم اور خادمائیں ہیں' ان کی جگہ دوسروں کو رکھ لے۔ جنہیں تُو حویلی سے نکالے انہیں بستی میں کسی ایسے کام سے لگا دے کہ وہ واہب کے آلہ کار نہ بن سکیں اور ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھ۔" میں نے گویا اس مسئلے کا حل پیش کر دیا۔

نصار نے بھی احزم کے ساتھ اس تجویز سے اتفاق کیا اور بولا۔ "مگر یہ سب کچھ واہب سے نمٹنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے اے آتون کہ شاید واہب کی عبرت ناک موت ہی اسے یہاں کھینچ کر لائی ہے۔"

"کاش ایسا ہو سکے۔" میں نے کہا۔

پھر تقریباً ساری رات ہی جنگی تیاریاں ہوتی رہیں۔ اندازہ تھا کہ واہب رات کے آخری پہر میں بستی پر حملہ آور ہو گا اور یہی ہوا۔

اپنی دانست میں واہب اچانک ہم پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ہمیں خبر مل چکی تھی کہ مددگار قبائل کے لشکر پہنچ چکے ہیں۔ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ حملے میں جلدی نہ کریں اور جب دشمن ہم پر حملہ کر دے تو اس کے بعد ہی عقب سے بھرپور حملہ کریں۔

غلط فہمی کی بنیاد پر کہ ہم بے خبر ہیں' واہب اپنے لشکر کو ساتھ لئے خاصا آگے بڑھ آیا۔ ہم نے اسے دیکھ لیا تھا اس کے باوجود آگے بڑھنے سے نہیں روکا' مگر ہم بہرحال یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ وہ بستی میں گھس آئے۔ ہمارا لشکر نیم دائرے کی صورت میں بستی کے باہر صف آرا تھا۔ ہماری جنگی حکمت عملی یہ تھی کہ دشمن کچھ اور آگے بڑھ آئے تو نیم دائرہ بڑھ کر دائرے کی شکل اختیار کر لے' یوں دشمن کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے لیکن دشمن بڑی زیادہ تعداد میں اور ہماری توقع کے خلاف حملہ آور ہوا

تھا۔ ہمیں امید نہیں تھی کہ واہب کے ساتھ اتنے زیادہ سپاہی ہوں گے۔ ہمیں اسی لئے فوری طور پر جنگی حکمت عملی تبدیلی کر دینا پڑی۔ اب نیم دائرے کو دائرے کی شکل دینا خود ہمارے حق میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اس طرح ہمارا لشکر بکھر کر رہ جاتا اور ہم دشمن کی اکثریت کے سامنے کمزور پڑ جاتے۔ بلاشبہ ژیان نے اس جنگ میں اپنی قوت جھونک دی تھی۔ دشمن لشکر کی تعداد ہمارے مددگار قبائل کے دونوں لشکر ملا کر بھی ہم سے کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ وہ ایک سیل بلا کی طرح ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔

دشمن کے لشکر پر پہلی گولی چلانے والا نضار ہی تھا۔ دشمن کے لشکر میں سے ایک گھوڑے کی پشت خالی ہو گئی۔ نضار کا نشانہ بڑا سچا تھا۔ دوسری گولی میری طرف سے چلی تھی اور میرا نشانہ بھی خطا نہیں گیا۔ میں دشمن کے دائیں پہلو پر تھی اور بائیں پہلو پر احزم تھا۔ نیم دائرہ اپنی جگہ برقرار تھا' مگر نئی جنگی حکمت عملی کے تحت اسے دائرے میں تبدیل نہیں ہونا تھا۔ اب دائرہ ایک اور صورت میں بننا تھا کہ عقب سے مددگار قبائل کے دونوں لشکر دشمنوں پر ٹوٹ پڑتے۔ انہیں نئی صورت حال کے تحت فوری طور پر حملے کا حکم دے دیا گیا۔

تین طرف سے دشمن پر آگ برس رہی تھی۔ اس کے سامنے نضار تھا' دائیں پہلو سے میں دبا رہی تھی اور بائیں طرف سے اس پر احزم آگ برسا رہا تھا۔ دشمن کے لشکر کا اتنا آگے بڑھ آنا' اس کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہوا تھا۔ اس طرح وہ تین طرف سے ہمارے نرغے میں آ گیا تھا اور کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود اچانک حملے سے اس کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ وہ جو یہ سوچ کر آئے تھے کہ انہیں میدان خالی ملے گا' مزاحمت نہیں ہو گی' ان کے لئے یہ غیر متوقع حملہ بہت تباہ کن ثابت ہوا۔ حملے میں پہل کیونکہ ہماری طرف سے ہوئی تھی اس لئے دشمن کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ کے پہلے ہی مرحلے میں اس نے حوصلہ ہار دیا اور عین اس وقت جب وہ پلٹ کر راہ فرار اختیار کرنے والا تھا مددگار قبائل کے دونوں تازہ دم لشکر اس پر ٹوٹ پڑے۔ پھر تو وہ رن پڑا کہ ہر طرف خون ہی خون برسنے لگا۔

دشمن کی بہت قلیل تعداد فرار ہو کر جان بچانے میں کامیاب ہو سکی۔ اسے بھون کر رکھ دیا گیا۔ واہب کو خود میں نے زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتے دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ عیار بوڑھا فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

فتح کا شادیانہ بجنے لگا۔ میدان جنگ جیسے لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی موت کو زندگی پر یوں رقص کرتے نہیں دیکھا تھا۔

نضار کے حکم پر لاشوں اور زخمیوں کے درمیان بوڑھے واہب کی تلاش شروع کر دی گئی۔ صبح ہوتے ہوتے لاشوں میں دبا ہوا واہب شدید زخمی حالت میں مل گیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ فوری طور پر اسے طبی امداد فراہم کی گئی۔ اس کے جسم میں کئی گولیاں پیوست تھیں جنہیں نکال دیا گیا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی اور اس پر مسلسل بے ہوشی طاری تھی۔

"اے طبیبو! اور اے جراحو! اس بدبخت بوڑھے کو اتنی آسانی سے نہ مرجانے دینا۔" نضار نے

حکم دیا۔ "اس سے ہمیں بہت سے قرض چکانا ہیں۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے نضار کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔

"اے عظیم سردار! ہم اپنی پوری کوشش کریں گے کہ یہ مرنے نہ پائے۔" طبیب خاص نے اپنے ساتھیوں کی نمائندگی کی۔ "دراصل زخموں سے زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یوں بھی اس کا جسم بوڑھا اور کمزور ہے۔"

مال غنیمت کے طور پر دشمن کا جو اسلحہ اور گھوڑے ہاتھ لگے' انہیں برابر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ نضار نے اشرکی بستی کے لئے رکھ لیا اور دوسرے حصے میں سے پھر برابر برابر دو حصے کئے گئے۔ یہ دونوں حصے مددگار قبائل کو دے دیئے گئے اور انہیں واپس ان کی بستیوں کی طرف بھیج دیا گیا۔ آج تک کسی بھی جنگ میں اتنا مال غنیمت نہیں ملا تھا۔

میری شدید خواہش کے باوجود اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ فوری طور پر ہم وحشی قبیلے کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو سکتے اور احرس و مہا پجاری کو اس کی قید سے چھڑا سکتے۔ یوں بھی میں رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اور ذہن پر نیند کا شدید غلبہ تھا۔ میں اسی لئے ناشتہ کرتے ہی بے خبر سو گئی۔ پھر تیسرے پہر ہی میری آنکھ کھلی اور مجھے واہب کا خیال آیا۔ میں نے اس کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا اسے ہوش آ چکا ہے اور اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ طبیبوں اور جراحوں کی مشترکہ کوششوں نے اسے بچا لیا تھا یا پھر یہ کہا جا سکتا تھا کہ ابھی اس کا وقت پورا نہیں ہوا تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ نضار کچھ دیر پہلے بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے خادموں کو حکم دیا تھا کہ میں جب خود سو کر اٹھ جاؤں تو مجھے بتا دیا جائے' وہ میرا منتظر ہے۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کیا اور نضار سے ملنے اس کے کمرے کی طرف چلی دی حالانکہ بیدار ہونے کے بعد مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

میں' نضار کے کمرے میں داخل ہوئی تو احزم کو بھی وہاں دیکھا۔ ان دونوں ہی نے اٹھ کر مجھے تعظیم دی۔ پھر نضار مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے عظیم آتون! ہم نے تیرے ہی انتظار میں اب تک کچھ نہیں کھایا۔ اگر تُو کہے تو کھانا منگوا لیا جائے۔"

"ہاں منگوا لے اے نضار!" میں بولی۔ "مجھے بھی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔"

نضار نے ایک خادمہ کو طلب کر کے کھانا لانے کا حکم دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"اے آتون! میں نے تجھے اس لئے بلایا ہے کہ تیری مرضی جان سکوں۔" نضار نے مجھ سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تُو اس وحشی قبیلے کی طرف جانے کے لئے کس قدر بے چین ہے جس نے احرس اور مہا پجاری کو قید کر لیا ہے۔ واہب کی گرفتاری کے بعد اب اسے سزا دینا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ یہ دیوتاؤں کی مہربانی ہے کہ انہوں نے دشمن پر ہمیں ایک بار پھر غلبہ دے دیا ہے اور دشمن ہمارے قبضے میں آ چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بار عیار بوڑھے کو سزا دینے میں تاخیر نہ کی جائے۔ میں جلد از جلد اس کا کٹا ہوا سر اپنے اصل دشمن ژیان کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ عیار واہب کو سزا دینے کے سلسلے میں احزم نے ایک تجویز رکھی ہے' مگر اس تجویز پر اسی وقت عمل ہو گا جب تُو اس کی منظوری دے دے گی۔ احزم! تو

خود عظیم آتون کو اپنی تجویز سے آگاہ کر۔"

"اے آتون دیوی!" احزم اپنے سردار کا حکم پا کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تیرے آنے سے پہلے سردار نے مجھے بتایا تھا کہ پہلے جب واہب ہماری قید میں تھا اور اسے سزا دی جانے والی تھی تو اس سے تُو نے ہی اختلاف کیا تھا کہ واہب کو مجمع عام میں سزا دینے کی ضرورت نہیں لیکن اے آتون دیوی! تب سے اب تک صورت حال خاصی بدل چکی ہے۔ دشمنوں یا غداروں کو اس لئے سب کے سامنے سزا دی جاتی ہے کہ اس سے دوسرے عبرت حاصل کریں۔ واہب کے فرار اور پھر گزشتہ رات پیش آنے والا واقعہ اس کا گواہ ہے کہ ہمارے درمیان دشمن کے نمک خوار یا بہی خواہ موجود ہیں۔ سو ایسے میں یہ ضروری ہے کہ واہب کو عبرت ناک سزا دی جائے۔ اس کے جسم کو درمیان سے چیر دیا جائے اور اس کے لئے دو طاقتور گھوڑے استعمال کئے جائیں جو مخالف سمتوں میں دوڑائے جائیں۔ واہب کو یہ سزا کل صبح ہی دے دی جائے اور پھر اس کا سر کاٹ کر ژیان کو بھیج دیا جائے۔"

موجودہ حالات میں احزم کی تجویز مناسب ہی تھی۔ میں نے اسی لئے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

اسی شام ساری بستی میں یہ اعلان کرا دیا گیا کہ کل صبح بستی کے باہر والے میدان میں واہب کو سزائے موت دی جائے گی۔

طے یہ ہوا تھا کہ آئندہ روز کے بعد آنے والی صبح کو ایک لشکر نضار اور میری قیادت میں وحشی قبیلے کی طرف روانہ ہو گا۔

دوسرے دن صبح نضار اور احزم کے ساتھ میں گھوڑے پر سوار ہو کر بستی کے باہر میدان میں پہنچ گئی جہاں پہلے ہی سے سارے بستی والے جمع ہو چکے تھے۔ کچھ جنگی قیدی بھی تھے جو گزشتہ روز کی جنگ میں زندہ پکڑ لئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ زخمی قیدی بھی تھے۔

زخمی قیدیوں کو نشانہ بازی کی مشق کے لئے تختہ مشق بنایا گیا۔ ایک ایک کر کے انہیں میدان میں لایا جاتا رہا اور سپاہی ان پر نشانہ بازی کرتے رہے۔ ان کی تعداد پچاس سے اوپر تھی۔ انہیں تیروں' گولیوں' خنجروں اور دوسرے ہتھیاروں سے نشانہ بنایا گیا اور پھر ان کی لاشیں میدان سے اٹھوا دی گئیں۔ عیار بوڑھا واہب اس تخت کے نیچے رسیوں سے بندھا پڑا تھا جس پر نضار اور احزم کے ساتھ میں بیٹھی تھی۔ اسے یہ خونی تماشا دکھانے کے لئے ہی وہاں باندھ کر ڈالا گیا تھا' مگر میرا خیال یہ تھا کہ وہ عیار بوڑھا اب تک نہ جانے کتنے ایسے خونی تماشے دیکھ چکا تھا۔

زخمی قیدیوں کا قصہ پاک ہونے کے بعد ان جنگی قیدیوں کو میدان میں لایا گیا جو صحت مند اور تندرست تھے۔ جنگ میں زخمی نہیں ہوئے تھے۔ نضار کے حکم پر انہیں دو بڑے گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پھر ان دونوں گروہوں کو قدیم ہتھیاروں سے مسلح کر دیا گیا۔ تلواریں' تیر کمان' نیزے اور خنجر' ان کے پاس یہ سبھی ہتھیار تھے۔ ان کے علاوہ خاردار آہنی گولے بھی تھے جو بڑی بڑی زنجیروں سے منسلک تھے۔ انہیں مسلح کرنے کے بعد سپاہیوں نے ایک وسیع دائرے میں ان کے گرد رائفلوں سے ایک حصار سا بنا لیا تھا تاکہ ان میں سے کوئی فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے گولی مار دی جائے۔ انہیں یہ حکم دیا گیا

تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس حصار سے باہر قدم نہیں نکالے گا جو زمین میں نیزے گاڑ کر ان کی اطراف قائم کر دیا گیا تھا۔ حکم سے انحراف کی صورت میں انہیں بتا دیا گیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔ کچھ کچھ فاصلے پر میدان میں گڑے ہوئے نیزوں کا وہ حصار ان جنگی قیدیوں کے لئے گویا موت کا حصار تھا۔

جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو نضار کا دایاں ہاتھ بلند ہوا اور اسی کے ساتھ وہ دونوں گروہ ایک دوسرے پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ وہ جو کبھی ایک تھے اور دشمن کے خلاف شانے سے شانہ ملا کر لڑتے تھے' اب خود ہی ایک دوسرے کے دشمن بن چکے تھے۔ ان کی زندگی کا انحصار اپنے مقابل کو موت کی نیند سلا دینا تھا۔ تلواروں سے تلواریں ٹکراتی رہیں' نیزے ایک دوسرے کے جسموں میں پیوست ہوتے رہے' خاردار آہنی گولے گردش کرتے رہے' لاشیں گرتی رہیں اور اشر کی بستی والے خوش ہو ہو کر چیختے رہے۔ آخر ایک گروہ نے دوسرے کے اوپر فتح پا لی۔ مغلوب گروہ کے زخمیوں کو چھید ڈالا گیا۔ جنہوں نے ہتھیار ڈال دیئے انہیں بھی قتل کر دیا گیا۔ اب ان کی تعداد نصف سے بھی کم رہ گئی تھی۔ فاتح گروہ میں بھی زخمی تھے۔ انہیں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا اور پھر اس موت کے حصار سے لاشیں باہر نکال لی گئیں۔

زندہ بچ جانے والے قیدیوں کو پھر دو گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک بار پھر موت اور زندگی کا وہ کھیل شروع ہو گیا' مگر اس بار دونوں ہی گروہوں کے حملوں میں پہلی سی شدت نہیں تھی۔ وہ تھک چکے تھے اور جو ان سے کم تھکے تھے' ان تھکے ہوئے لوگوں کے لئے فرشتہ اجل ثابت ہو رہے تھے۔

یہ معرکہ پہلے والے معرکے کی نسبت جلد اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اب ان کی تعداد گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم رہ گئی تھی۔ ڈھائی سو سے زیادہ قیدیوں میں سے اب صرف ساٹھ ستر قیدی زندہ بچے تھے جن میں سے تقریباً پندرہ زخمی قیدیوں کو گولی مار دی گئی۔ اب صرف پچاس جنگی قیدیوں کے قریب موت کے اس حصار میں ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے۔ موت کے حصار میں بے تحاشا خون بہنے کے سبب کیچڑ سی ہو گئی تھی۔ لڑنے والوں میں سے جو بھی پھسل کر ایک بار گر جاتا' اسے پھر اٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ اس کا خون بھی اسی کیچڑ کا حصہ بن جاتا۔

اس لڑائی میں زندہ بچ جانے والے صرف بیس افراد تھے۔ ان میں سے بھی تقریباً آدھے زخمی تھے جنہیں گولیاں کھا کر جان دینا پڑی۔ اب گنتی کے دس افراد کے درمیان زندگی اور موت کا مقابلہ تھا اور وہ بہت سنبھل سنبھل کر لڑ رہے تھے۔ ان کی لڑائی جارحانہ نہیں مدافعانہ تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دور دور رہنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ ان کے لئے کافی جگہ تھی' مگر وہ تیروں سے تو نہیں بچ سکتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آ کر لڑنے کے بجائے تیراندازی پر اکتفا کر رہے تھے۔ یہ معرکہ نسبتاً زیادہ دیر جاری رہا۔ دس میں سے چھ قیدی مارے گئے اور دو زخمی ہو گئے۔ دونوں زخمیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ آخری معرکے کے لئے اب صرف دو تنومند قیدی بچے تھے۔

"سنو اے ایک دوسرے کے خون کے پیاسو!" نضار نے بلند آواز میں زندہ بچ جانے والے دونوں جنگی قیدیوں کو مخاطب کیا۔ "تم میں سے جو بھی اس آخری معرکے میں زندہ بچ گیا' اس کی جان کو امان ہے' خواہ وہ لڑتے لڑتے یا اپنے حریف کو موت کی نیند سلاتے ہوئے زخمی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ زخمی ہو جانے والے کو اب گولی نہیں ماری جائے گی بلکہ اسے ضروری علاج کے بعد وادی سبز کی طرف زندہ بچ کر جانے کی اجازت ہو گی۔ وہ زندہ بچ جانے والا اپنے سردار ژیان کے لئے ایک خوبصورت تحفہ لے کر جائے گا اور وہ خوبصورت تحفہ واہب کا کٹا ہوا سر ہو گا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی نضار نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کا خون بہانے کے لئے آزاد ہیں۔

آدمی کو اپنی زندگی کس قدر عزیز ہوتی ہے' اس کا صحیح اندازہ مجھے وہ آخری معرکہ دیکھ کر ہوا۔ وہ دونوں جیسے ایک دوسرے کے لئے وحشی درندے بن گئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں دونوں ہی زخمی ہو گئے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ موت کے اس حصار سے کس کو زندہ بچ کر نکلنا نصیب ہو گا۔ ایک مرحلے پر ایک نے دوسرے کی طرف نیزہ پھینکا۔ پھینکا ہوا نیزہ دوسرے شخص کے جسم میں پیوست ہو گیا اور وہ چیخ مار کر زمیں پر گر گیا۔ وہ پہلو کے بل گرا تھا۔ نیزہ اس کی ران کے آر پار ہو گیا تھا۔ وہ پہلو کے بل بے حس و حرکت اس طرح پڑا تھا جیسے بے ہوشی طاری ہو گئی ہے۔ نیزہ پھینکنے والا بھی شدید زخمی تھا۔ اس کی تلوار گر چکی تھی مگر خنجر اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے خنجر ایک جھٹکے سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جھومتا جھامتا بے حس و حرکت پڑے ہوئے اپنے حریف کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ اپنے حریف کے قریب پہنچ کر خنجر آزمائی کے لئے جھکا' زمین پر پڑے ہوئے شخص نے تیزی کے ساتھ پلٹا کھایا اور اپنی تلوار جھکے ہوئے شخص کے سینے میں اتار دی۔ اسی کے ساتھ وہ بڑے وحشیانہ انداز میں چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر تلوار کا دوسرا وار گرتے ہوئے شخص کی گردن پر کیا۔ گرنے والے کی گردن کٹ کر ایک طرف جا پڑی۔

فاتح قیدی نے یقیناً انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایسی حالت میں جب کہ اس کی ران میں نیزہ پیوست تھا' وہ کافی دیر تک بے حرکت پڑا رہا تھا اور اس نے اپنے حریف کو قریب آنے کا موقع دیا تھا۔ اس نے اپنے حریف کو طاقت کے بجائے ذہانت سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ بلاشبہ طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ذہین بھی تھا اور اسی لئے موت کے حصار سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ڈھائی سو سے زیادہ جنگی قیدیوں میں وہ شخص واحد خوش نصیب تھا جو زندہ بچ گیا تھا۔

نضار کے حکم پر اسے فوری طور پر طبی امداد فراہم کر دی گئی۔

اب آخری تماشا باقی تھا' خونی تماشا! میدان سے نیزے اکھاڑ لئے گئے۔ خون پر مٹی ڈال دی گئی اور پھر اسی مٹی پر بوڑھے واہب کو چت لٹا دیا گیا۔ اس کے دونوں پیروں میں آہنی حلقے ڈال دیئے گئے تھے جن سے زنجیریں منسلک تھیں۔ یہ زنجیریں قریب ہی کھڑے ہوئے دو صحت مند گھوڑوں کی زینوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں گھوڑوں کو مخالف سمتوں میں دوڑنا تھا اور گھڑسوار' نضار کے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھ رہے تھے جو کسی بھی لمحے بلند ہونے والا تھا۔

آخر وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جب نضار کا دایاں ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ سپاہی کے بارے میں معلوم کیا جسے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور انہیں مخالف سمتوں میں دوڑا دیا۔ بوڑھے واہب۔ اس کے باوجود احتیاط کا تقاضا کھنچنے لگیں اور پھر اس کے منہ سے بھیانک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ گھڑسوار تیز رفتاری سے نہ دوڑایا لگامیں کھینچ لیں اور پھر آہستگی سے گھوڑوں کو تھوڑا سا آگے بڑھایا۔ شدید تکلیف و اذ واہب چیخے جا رہا تھا۔

اسی وقت میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میدان کے کنارے کنارے کھڑے ہوئے بستی والوں کے درمیان سے نکل کر ایک بوڑھی عورت میدان میں آ گئی اور وحشیانہ انداز میں قہقہے لگاتی ہوئی رقص کرنے لگی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس عورت کے جوان بیٹے کو بوڑھے واہب نے اسی طرح بیچ میں سے چِروا دیا تھا۔ اس نوجوان کی خطا صرف یہ تھی کہ اس نے واہب کا ایک حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ واہب کا حکم یہ تھا کہ وہ نوجوان' اپنی حسین و نوجوان بیوی کے ساتھ پہلی رات گزارنے سے پہلے اپنی بیوی کو ایک رات کے لئے واہب کی حویلی میں بھیج دے۔ اپنے شوہر کی موت کے بعد اس باوفا بیوی نے خود کو واہب کے دست ہوس سے بچا لیا تھا۔ اس کے لئے اسے خود کشی کرنا پڑی تھی۔

آج اسی ظالم کو وہی سزا دی جا رہی تھی' سو وہ بوڑھی عورت خوشی سے نیم پاگل سی ہو کر بر سر میدان رقص کر رہی تھی۔

بوڑھا واہب آخر کب تک شدید اذیت برداشت کرتا رہتا۔ وہ تو پہلے ہی سے شدید زخمی تھا اور طبیبوں نے بڑی مشکل سے اس کی جان بچائی تھی۔ نتیجتاً وہ بے ہوش ہو گیا اور پھر بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لایا گیا۔

ہوش میں آتے ہی وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ "مار دو مجھے .... قتل کر دو .... میرے جسم کو درمیان سے چیر کر دو ٹکڑے کر دو' میرا قصہ ختم کرو۔"

مگر اس ظالم کا قصہ اتنی جلدی ختم نہیں ہوا۔ چیختے چیختے شدید کرب و اذیت برداشت کرنے کے سبب وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔ اب اس کا جسم ٹانگوں کے عین درمیان سے تھوڑا سا چِر گیا تھا اور وہاں سے خون بہنے لگا تھا۔ سزا دینے سے پہلے اسے بے لباس کر دیا گیا تھا۔ ایسا محض اس کی توہین کی خاطر کیا گیا تھا۔ دوبارہ اسے پھر ہوش میں لے آیا گیا اور اس کا جسم جہاں سے چِرنا شروع ہوا تھا' وہاں نمک اور مرچ چھڑک دیا گیا۔ اسی کے ساتھ اس کی کرب ناک چیخوں سے میدان گونجنے لگا۔ گھوڑوں نے پھر مخالف سمتوں میں سفر شروع کر دیا اور واہب کے دونوں پیروں میں بندھی ہوئی زنجیریں تن گئیں۔ چِرا ہوا جسم تھوڑا اور چِر گیا۔ واہب کے منہ سے چیخیں ابل رہی تھیں اور بوڑھی عورت اس کے چاروں طرف رقص کر رہی تھی' قہقہے لگا رہی تھی۔

اس بوڑھی عورت کی وجہ سے لوگوں کو وہ منظر دیکھنے میں دشواری ہو رہی تھی اسی لئے "ادھر سے ہٹو!" کی صدائیں بار بار سنائی دے رہی تھیں۔ نضار کے حکم پر اس عورت کو میدان سے ہٹا دیا گیا۔ چلتے چلتے اس عورت نے واہب کے منہ پر تھوک دیا تھا۔

"سنو اے ایک دوسرے ... چیختے چیختے پھر بے ہوش ہو جاتا اور بے ہوشی کے دوران ہی میں سز
جنگی قیدیوں کو مخاطب کیا۔ "تمز سواروں کو مخصوص اشارہ کیا۔ اسی کے ساتھ گھڑسواروں نے پوری قوت
خواہ وہ لڑتے لڑتے یا ا۔ مخالف سمت میں دوڑا دیا۔ چند ہی لمحوں میں واہب کے جسم کے دو ٹکڑے ہو
والے کو اب گوارمیان میں سے چر گیا۔ اس کے بعد نضار کا اشارہ پا کر شیرویہ میدان میں گیا اور واہب کا
سر کاٹ لیا۔

واہب کے سر کو بالوں کی طرف سے پکڑے ہوئے شیرویہ تخت کی طرف پلٹا اور کٹے ہوئے سر کو نضار کے قدموں میں لا کر پھینک دیاں جو جنگی قیدی آخری مقابلے میں زندہ بچ گیا تھا اور جسے طبی امداد دی جا چکی تھی' وہ تخت کے نیچے زمین پر بیٹھا تھا۔ نضار نے اسے حکم دیا۔ "اٹھ اور لعنتی ژیان کے اس غلام کا کٹا ہوا سر وادی سبز لے جا۔ مردود ژیان کو میرا یہ پیغام ضرور پہنچانا کہ اس کے دوسرے نائبوں کا حشر بھی بہت جلد یہی ہو گا اور اب خود اس کا انجام بھی زیادہ دور نہیں جب اس کی کٹی ہوئی گردن پر دہکتا ہوا توا رکھا جائے گا۔"

نضار کا حکم سن کر زخمی قیدی' تخت کا کنارہ پکڑ کر اٹھا۔ اسی وقت نضار نے واہب کے کٹے ہوئے سر پر ٹھوکر ماری۔ کٹا ہوا سر لڑھکتا ہوا تخت سے نیچے جا گرا۔ زخمی قیدی نے جھک کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

پھر نضار کے حکم پر زخمی کے لئے ایک گھوڑا فراہم کر دیا گیا۔ گھوڑے پر بیٹھتے ہی وہ زخمی قیدی اس طرح وہاں سے ہوا ہو گیا جیسے موت اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ اسے جانے کے لئے مجمع نے راستہ دے دیا تھا۔ جو کام شیرویہ کو انجام دینا تھا' زندہ بچ جانے والے قیدی سے لے لیا گیا تھا۔

اس کے بعد وہ خونی تماشا ختم ہو گیا۔ میں' نضار اور احزم کے ساتھ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی اور بستی میں لوٹ آئی۔ اب تک میری سماعت میں واہب کی آخری چیخیں گونج رہی تھیں۔ اسے بہت تڑپا تڑپا کر مارا گیا تھا۔ اس کی ہلاکت یقیناً عبرت ناک تھی۔ احزم کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اشرکی بستی میں ژیان یا واہب کے قدیم نمک خواروں کے لئے واہب کو دی جانے والی سزا سامان عبرت ہی تھی۔

اس روز میرا دل کچھ بجھا بجھا سا رہا۔ میں نے وحشت و بربریت کا جو خونی تماشا دیکھا تھا' اسے اپنے ذہن سے جھٹکنے میں مجھے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جو مارے گئے' اچھے یا بُرے ہونے سے قطع نظر میری ہی طرح انسان تھے۔ اگر انہیں انسان نہ بھی کہا جائے تو آدمی بہرحال کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ آدم ہی کی نسل سے تھے۔ معلوم نہیں آدمی کب آدمی سے انسان بنے گا؟ کب تک آدمی ہی کے ہاتھوں آدمی کا خون بہتا رہے گا؟ میں دن بھر یہی سب کچھ سوچتی رہی اور خود میں بھی تو ایک آدمی کے خون کی پیاسی تھی' مگر کیا واقعی وہ آدمی ہے؟ .... نہیں' وہ آدمی نہیں ہے' ژیان ہے' درندہ ہے' میرے ذہن نے جواب دیا۔ آدمیوں کو اپنی بقا کی خاطر درندوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہی پڑتا ہے۔ درندہ اور آدمی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ یہ آدمی کی مجبوری بھی ہے اور درندے کی بھی۔

دوسرے دن صبح مجھے اور نضار کو لشکر لے کر اس وحشی قبیلے کی تلاش میں روانہ ہونا تھا جس نے

احرس اور مہا پجاری کو قید کر رکھا تھا۔ شام کو میں نے اس زیر علاج سپاہی کے بارے میں معلوم کیا جسے ہماری رہنمائی کرنا تھی۔ اس کی حالت اب پہلے سے خاصی بہتر ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ اسے کسی دوسرے گھڑسوار کے ساتھ بٹھایا جاتا اور گھوڑے کو بھی تیز رفتاری سے نہ دوڑایا جاتا۔

میں نے اس رات جلد سو جانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ میرا مقصد محض یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ دیر آرام کر لوں کیوں کہ اگلا پورا دن سفر میں گزرنا تھا۔ میں دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر نہ جانے کیسے میرے ذہن میں یہ خیال در آیا کہ میں بظاہر جو کچھ ہوں' یعنی اپنے متعلق جو کچھ جانتی ہوں' درحقیقت وہ نہیں ہوں۔ یہ بھی مجھے پُراسرار سرگوشیوں ہی کے ذریعے معلوم ہوا تھا۔ وہ سرگوشیاں جو مجھے بچپن سے سنائی دے رہی تھیں اور کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ پھر میں کون ہوں؟ اپنی ذات کی یہی گتھی سلجھاتے سلجھاتے نہ جانے کب میں الجھ کر سو گئی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح ادھر سورج طلوع ہوا ادھر ہمارا لشکر وحشی قبیلے کی طرف روانہ ہوا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ژیان' اشرکی بستی پر حملہ نہ کر دے' سپاہیوں کی زیادہ تعداد ساتھ نہیں لی گئی تھی۔ یہ صرف وہی سپاہی تھے جو میرے ساتھ تریال سے یہاں آئے تھے۔ ان میں کوئی بھی مقامی سپاہی نہیں تھا۔ زخمی سپاہی کو ہم نے لشکر کی رہنمائی کے لئے آگے رکھا تھا۔ اسے اگلے دستے کا سوار اپنے گھوڑے پر بٹھائے ہوئے تھا۔

دوپہر تک ہمارا لشکر کسی قابل ذکر واقعے کے بغیر سفر کرتا رہا اور ہم نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کے اور کچھ دیر آرام کے بعد لشکر پھر روانہ ہو گیا۔ میں اپنا گھوڑا اس زخمی سپاہی کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑا رہی تھی۔ میں نے ایک اچٹتی سی نظر اس کے چہرے پر ڈالی تو چونک اٹھی۔ واضح طور پر میں نے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھے تھے۔ وہ بار بار اس طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے راستے کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کیوں' کیا بات ہے؟ تُو مجھے کچھ پریشان سا لگتا ہے۔" میں نے سپاہی کو مخاطب کیا۔

"نن .... نہیں تو اے .... اے آتون دیوی!" وہ چونک کر بولا۔

"تُو یقیناً کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔" میں نے پھر کہا۔ "بتا دے کیا بات تجھے پریشان کر رہی ہے؟"

"مجھے شبہ ہو رہا ہے اے آتون دیوی کہ .... کہ شاید یہ .... یہ وہ راستہ نہیں ہے۔" ڈرتے ڈرتے آخر زخمی سپاہی نے بتا ہی دیا۔

اس پر مجھے غصہ تو بہت آیا' مگر مصلحت کے پیش نظر برداشت کر گئی' پھر صرف اتنا ہی کہا۔ "اگر تجھے یقین نہیں کہ یہ وہی راستہ ہے تو پھر سارے لشکر کو کیوں غلط راستے پر ڈال رہا ہے؟" اپنے اوپر قابو پانے کے باوجود بھی میری آواز میں سختی آ گئی۔ میری آواز بھی قدرے بلند ہو گئی تھی۔

مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر نضار اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس نے میری تیز آواز سنی تو اپنا گھوڑا قریب لے آیا اور بولا۔ "کیا ہوا اے آتون!"

"اسے یقین نہیں کہ یہ ٹھیک سمت میں ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔" میں نے زخمی سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چبھتی آواز میں کہا۔

"کیا؟" نضار چونک اٹھا۔ "یہ تُو کیا کہہ رہی ہے اے آتون!" اس کے لہجے میں فکرمندی کا اظہار ہونے لگا۔

"وہی کہہ رہی ہوں اے نضار جو یہ کہہ رہا ہے۔"

"غیر یقینی سمت میں سفر جاری رکھنے سے یہ بہتر ہے اے آتون کہ لشکر کو مزید آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔" نضار نے مشورہ دیا۔

"ہاں' فی الحال تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔" میں نے نضار کے مشورے سے اتفاق کیا۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ کر دیا جائے جو اسے اپنے ساتھ لے جا کر اردگرد کے علاقے اور راستوں کا جائزہ لے۔ پھر جب صحیح راستہ مل جائے تو سفر شروع کیا جائے۔"

پھر لشکر کو روک دیا گیا اور راستے سے ذرا ہٹ کر پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ زخمی سپاہی سخت پریشان اور ہراساں دکھائی دے رہا تھا۔ اسے سپاہیوں کے دستے کے ساتھ اردگرد کے علاقے کا جائزہ لینے کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

میرے اور نضار کے لئے سپاہیوں نے ایک خیمہ لگا دیا اور ہم خیمے کے اندر آ گئے۔ وہ نسبتاً ہموار زمین تھی جہاں ہمارے بیٹھنے کے لئے ایک دری بچھا دی گئی تھی۔ نضار دری پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اس کا تو اندازہ ہی نہیں تھا اے آتون کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر صحیح راستہ نہ ملا تو کیا ہو گا اے نضار!" میں اس کے قریب بیٹھ کر بولی۔

"ہاں واقعی۔" نضار نے سر ہلایا۔ "پھر تو واقعی مسئلہ ہو جائے گا۔"

ہم دونوں اسی مسئلے پر گفتگو کرتے رہے اور خاصی دیر ہو گئی۔ مجھے اس دستے کی طرف سے فکر ہونے لگی جو زخمی سپاہی کو لے کر راستے کی تلاش میں گیا تھا۔ میں نے اپنی اس تشویش کا اظہار نضار سے بھی کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ کیا جواب دیتا' وہ تو خود فکرمند نظر آ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر اور ہوئی تھی کہ زخمی سپاہی کے ساتھ بھیجے گئے دستے کا سالار گھبرایا ہوا سا خیمے کے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔

"تجھے کیا ہوا؟" نضار نے سالار کو مخاطب کیا۔

"وہ .... وہ اے سردار! وہاں .... وہاں۔"

"کیا ہوا وہاں؟ کچھ کہے گا بھی تو۔" نضار نے اسے سخت نظروں سے دیکھا۔

"کھوپڑیاں ہی کھوپڑیاں .... اور .... اور گوشت خور چوہے .... وہاں ہمیں نظر آئے

اے سردار!"

پھر جب سالار کے حواس کچھ بجا ہوئے تو اس کی وحشت کا سبب معلوم ہوا۔ اردگرد کے علاقے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ دستہ نشیب سے قدرے بلندی پر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں ایک میدان میں انسانی کھوپڑیاں اور ڈھانچوں کی ہڈیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان گوشت خور چوہے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کھوپڑی کا اوپری حصہ میدان میں لکڑی گاڑ کر اس کے اوپر لگا دیا گیا تھا۔ وہ دور ہی سے نظر آتا تھا۔

"تو اس میں اتنے گھبرانے کی یا خوفزدہ ہونے کی کیا بات ہے؟" نضار نے کہا۔ "وہاں اس میدان میں کبھی کوئی جنگ لڑی گئی ہو گی اور مرنے والوں کی لاشیں وہیں چھوڑ دی گئی ہوں گی۔"

"اگر ایسا ہوتا اے سردار تو وہاں مرنے والوں کے ہتھیار بھی پڑے ہوتے۔" سالار بولا۔

"کیا تُو اتنی سی بات بھی نہیں جانتا کہ مرنے والوں کے ہتھیار زندہ بچ جانے والے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ تُو اس قصے کو چھوڑ اور یہ بتا کوئی راستہ ایسا ملا جو زخمی سپاہی کا پہلے سے دیکھا بھالا ہو؟" نضار نے دریافت کیا۔

"وہ اسی راستے کے بارے میں پُریقین تھا کہ اس کا دیکھا ہوا ہے جس پر ہمیں ایک میدان میں آگے چل کر کھوپڑیاں ملیں۔ اس کا کہنا ہے کہ جب وہ چند روز پہلے اس راستے سے گزرا تھا تو وہاں کھوپڑیاں نہیں تھیں۔" سالار نے بتایا۔

"اس کا دماغ چل گیا ہے۔" میں بول اٹھی۔ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ "چند روز کے اندر اندر لاشیں' ڈھانچوں میں تبدیل نہیں ہو سکتیں۔"

"میں نے بھی اس سے یہ بات کہی تھی تو وہ بولا کہ اس وقت رات تھی ممکن ہے اسے اندھیرے میں کھوپڑیاں نظر نہ آئی ہوں۔" سالار نے کہا۔

میں غصے میں بل کھا کر رہ گئی' پھر چڑ کر بولی۔ "جی تو یہ چاہ رہا ہے کہ اس کا سر بھی کاٹ کر وہیں ان کھوپڑیوں کے درمیان پھینک آؤں' مگر مجبوری ہے۔ اس وحشی قبیلے تک پہنچنے کا ہمارے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں۔ اسے لے کر آ! میں خود اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

میرا حکم سن کر سالار باہر چلا گیا اور جب لوٹا تو زخمی سپاہی بھی اس کے ساتھ تھا۔ سالار اسے سہارا دیئے ہوئے خیمے میں داخل ہوا تھا۔

میرے کچھ پوچھنے یا کہنے سے پہلے زخمی سپاہی نے مجھ سے کہا۔ "اے آتون دیوی! میں تجھ سے سخت شرمندہ ہوں اور معافی کا طلبگار ہوں کہ محض میری وجہ سے تجھے' سردار نضار اور سارے لشکر والوں کو پریشانی اٹھانا پڑی' مگر .... مگر اب شاید ایسا نہیں ہو گا کیوں کہ صحیح راستہ مل گیا ہے۔"

"تجھے یقین ہے کہ وہی صحیح راستہ ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اے آتون!" زخمی سپاہی نے جواب دیا۔ "اگر وہاں .... وہ کھوپڑیاں پڑی نہ ہوتیں تو شاید میں نہ چکراتا' لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے جب میں اس راستے سے گزرا تھا تو میری نظر اندھیرے

کی وجہ سے ان کھوپڑیوں پر نہ پڑی ہو۔"

"سوچ لے' اب بھی وقت ہے۔ بعد میں کہیں تیری رائے بدل نہ جائے۔"

"راستہ وہی ہے اے آتون دیوی! .... کیوں کہ مجھے کوئی اور راستہ اس کی طرح جانا پہچانا نہیں لگا۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ جب تُو راہ بھٹک گیا ہو تو اس راستے سے گزرا ہو؟" میں نے اسے مزید کریدنے کی خاطر سوال کیا۔

خلاف توقع میرے اس سوال پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ راستہ بھول جانے کے بعد وہ کئی دن تک بھٹکتا رہا تھا۔ میں نے اس سے جو سوال کیا تھا' اسے اسی لئے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔

"تُو چپ کیوں ہو گیا؟ میرے سوال کا جواب دے۔" جب وہ بولا ہی نہیں تو میں نے اسے ٹوکا۔

"اے آتون دیوی! سچی بات یہ ہے کہ میں حتمی طور پر تیرے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ ممکن ہے کہ تُو نے جس اندیشے کا اظہار کیا ہے' ایسا ہی ہوا ہو یا.......... یا پھر ایسا نہ ہو۔" اس کے چہرے سے تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا۔

مجھے انتہائی شدید غصہ آ رہا تھا' جی چاہ رہا تھا کہ اپنی بوٹیاں نوچنے لگوں یا اس زخمی سپاہی کے ٹکڑے کر دوں۔ اس نے مجھے سخت الجھن کا شکار کر دیا تھا۔ یقینی طور پر وہ کچھ کہنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ میں نے بڑی بے بسی کے عالم میں نضار کی طرف دیکھا کیوں کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

"تُو جا۔" نضار نے زخمی سپاہی کو مخاطب کیا۔ "جو کچھ ہوا' اس میں تیرا کوئی قصور نہیں۔"

سپاہی ادب سے جھک کر خیمے کی طرف مڑ گیا۔ نضار نے سپاہی سے جو کچھ کہا تھا' میرے لئے خلاف توقع تھا۔

"اس کے اعتماد کو بحال کرنے کی ضرورت ہے اے آتون!" جب سپاہی چلا گیا تو نضار بولا۔ "ہمارا اظہار ناراضگی اس کے ذہن کو اور بھی الجھا دے گا' پھر وہ کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکے گا جو ظاہر ہے کہ ہمارے ہی لئے نقصان دہ ثابت ہو گا۔ ہمیں بہرحال صحیح راستہ تلاش کرنا ہے۔ اگر اس کے لئے بھٹکنا بھی پڑے تو کوئی حرج نہیں۔"

"یعنی وہ ہمیں جدھر بھی بھٹکائے پھرے' ہم بھٹکتے رہیں؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"مجبوری ہے۔" نضار نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "اس کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟"

کچھ ہی دیر کے بعد لشکر ایک بار پھر روانہ ہو گیا۔ جلد ہی ہم اس جگہ تک پہنچ گئے جس کے بارے میں سالار نے بتایا تھا' وہی میدان جہاں کھوپڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ منظر یقیناً بہت لرزہ خیز تھا۔ اس میدان کو ہم اپنی دائیں جانب چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ہمارا سفر زخمی سپاہی کی رہنمائی میں جاری رہا۔

سورج غروب ہونے کے قریب تھا کہ میرا جی چاہا کہ اس زخمی سپاہی کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دوں۔ وہ ہمیں گھما پھرا کر دوبارہ اسی جگہ لے آیا تھا جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ سامنے ہی کھوپڑیوں والا میدان نظر آ رہا تھا۔ آدھے دن سفر کرنے کا یہ انجام ہوا تھا۔

رات کے وقت تو سفر کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ جب دن کی روشنی میں صحیح راستہ ملنا محال ہو رہا تھا تو رات کو تو راستے کی تلاش میں مارے مارے پھرنا قطعی حماقت ہوتا۔ پھر اب تو یہ بھی طے کرنا تھا کہ بلاوجہ بھٹکا جائے یا واپسی کا سفر اختیار کیا جائے۔

سپاہی کی حالت قابل دید تھی۔ وہ کسی سے بھی نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

میں نے آخرکار کھوپڑیوں والے میدان ہی کے قریب پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔

جب ہمارے لئے خیمہ لگا کر اس میں بستر لگا دیئے گئے تو ہم بجھے ہوئے چہرے لئے خیمے کے اندر داخل ہو گئے۔

کچھ دیر نضار بھی چپ رہا اور میں بھی خاموش بیٹھی رہی۔ آخر نضار کی آواز ہی نے یہ خاموشی توڑی۔ وہ بولا۔ "ایسا کرتے ہیں اے آتون کہ ہم لشکر کو ساتھ لے کر واپس اپنی بستی کی طرف چلتے ہیں۔ خواہ مخواہ پورے لشکر کو بھٹکنے سے بچانے کی یہی ایک صورت ہے کہ صرف ایک دستے کو زخمی سپاہی کے ساتھ یہاں چھوڑ دیا جائے۔ جب یہ لوگ صحیح راستہ تلاش کر لیں' اس وحشی قبیلے کی بستی تک پہنچ جائیں تو واپس آ کر ہمیں اپنے ساتھ وہاں لے جائیں۔ پھر صرف ایک شخص کے بجائے پورے دستے کے سپاہیوں کو راستے کا علم ہو گا اس لئے ہم نہیں بھٹکیں گے۔ صبح ہوتے ہی ہم اپنی بستی کی طرف چل دیں گے۔"

بادل ناخواستہ مجھے نضار کی یہ تجویز قبول کرنا ہی پڑی۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد نضار نے اہل لشکر کو بھی اپنی تجویز سے آگاہ کر دیا۔ سپاہیوں کے چہروں سے اطمینان کا اظہار ہونے لگا۔ یقیناً وہ بھی اس بے مقصد سفر سے بیزار ہو گئے تھے۔

خیمے کے اندر جلتے ہوئے چراغ کی لو دھیمی کر کے نضار اپنے بستر پر آ کے لیٹ گیا۔ میں پہلے ہی سونے کے لئے لیٹ چکی تھی۔

ہوا میں اس روز کچھ تیزی تھی اور فضا میں بھی قدرے خنکی تھی۔ میں نے اسی لئے چادر اوڑھ لی تھی۔ ابھی میری آنکھ نہیں لگی تھی کہ اچانک کئی چیخیں بیک وقت بلند ہوئیں اور میں ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

نضار بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رائفل اٹھاتے ہوئے مجھ سے بولا۔ "اے آتون! تُو یہیں رہ' میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں' میں بھی چلوں گی۔" میں نے بھی جھک کر اپنے سرہانے رکھی ہوئی رائفل اٹھا لی۔

خیمے کے در پر پڑا ہوا پردہ اٹھا کر ہم دونوں باہر آ گئے۔ عین اسی وقت میری نگاہ کھوپڑیوں والے میدان کی طرف اٹھی اور میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ لشکر کے سپاہی بھی تصویر حیرت بنے ہوئے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔

کھوپڑیوں والے میدان میں جیسے چمکیلی بدروحیں رقص کر رہی تھیں۔ ان کے رقص سے مختلف ہیبت ناک شکلیں بن اور بگڑ رہی تھیں۔ وہ منظر واقعی خوفزدہ کر دینے والا تھا۔ یقیناً اسی منظر کو دیکھ کر کچھ سپاہیوں کے منہ سے چیخیں نکل گئی تھیں۔

اسی وقت مجھے پُراسرار سرگوشی سنائی دی۔ "اے معبلہ! ڈر مت۔ یہ بدروحیں نہیں ہیں بلکہ ہوا کی رگڑ سے ہڈیوں کے ریزے فضا میں بلند ہو کر چمک پیدا کر رہے ہیں۔ ہوا کی گردش ہی کے سبب اس سے مختلف بھیانک شکلیں بن رہی ہیں۔ تُو وہاں جا اور اپنے ساتھ نضار کو بھی لے جا تاکہ تیرے سپاہیوں کا خوف ختم ہو .... اور سن کہ وحشی قبیلے تک تیری رہنمائی اب خجیرہ کرے گی۔ وہ کل صبح تیرے پاس پہنچ جائے گی۔ دیکھ لے کہ تیرے دل سے خوف بالکل ختم ہو گیا ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی سرگوشی معدوم ہو گئی۔ مجھے ہمیشہ میرے اصل نام ہی سے مخاطب کیا جاتا تھا۔

"تُو نے کچھ سنا اے آتون! .... وہ پُراسرار سرگوشی .... اس نے مجھے مخاطب کیا تھا اور ان بدروحوں کا راز.........." نضار کی آواز دھیمی تھی۔ "اس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ .... وہ بدروحیں نہیں ہیں بلکہ.........."

"مجھے بھی سب کچھ بتایا جا چکا ہے اے نضار!" میں بولی اٹھی۔ "کیا اس نے تجھے تیرا نام لے کر مخاطب کیا تھا؟"

"ہاں' مجھے میرے ہی نام سے مخاطب کیا گیا تھا اے آتون!" نضار نے جواب دیا۔

میں چونک اٹھی۔ میرے لئے یہ بات مزید حیران کن تھی کہ وہ پُراسرار سرگوشی ایک ہی وقت دو افراد کو الگ الگ سنائی دی تھی۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اب مجھے کھوپڑیوں والے میدان میں نظر آنے والے منظر سے قطعی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"سنو!" میں نے بلند آواز میں سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ "وہ بدروحیں نہیں ہیں بلکہ صرف نظر کا دھوکا ہے۔" یہ بات میں نے سپاہیوں کو سمجھانے کے لئے کہی تھی۔ "میں ان کے قریب جا رہی ہوں' تم دیکھو گے کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔"

"مگر .... مگر اے آتون دیوی! تُو .... تُو تو خود ایک دیوی ہے۔" لشکر میں کوئی بولا۔ "پھر بھلا بدروحیں تیرا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔"

"لیکن نضار .... سردار نضار تو کوئی دیوتا نہیں۔ وہ بھی میرے ساتھ وہاں تک جائے گا۔" میں نے جواب میں کہا۔

اس کے بعد کسی نے کچھ نہیں کہا اور میں نے نضار کا ہاتھ تھام کر کھوپڑیوں والے میدان کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ سپاہیوں کی حیرت زدہ نظریں ہم دونوں کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں جلد ہی اس میدان میں پہنچ گئے۔ ہوا اب بھی ان کھوپڑیوں اور انسانی ہڈیوں کے درمیان سرسرا رہی تھی۔ اب بھی زمین کی طرف سے چمکیلا غبار سا اٹھ رہا تھا اور مختلف شکلیں اختیار کر رہا تھا۔

چند لمحے ہم وہاں کھڑے رہنے کے بعد پلٹ آئے۔

"اب تم لوگ اطمینان و آرام سے سو جاؤ اور سنو' کل صبح ہم وحشی قبیلے کی طرف اپنے سفر کا آغاز ریں گے۔" میں بلند آواز میں سپاہیوں سے کہہ رہی تھی۔ "اب تمہاری رہنمائی خود میں کروں گی۔"

ان میں سے کسی کی یہ جرأت نہیں تھی کہ پوچھ سکتا' اب تک میں نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا۔

سپاہی آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے اور میں' نضار کے ساتھ خیمے کے اندر چلی آئی۔

اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد مجھے گہری نیند سو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

دوسرے روز صبح اٹھ کر ناشتے کے بعد مجھے خجیرہ کی آمد کا انتظار تھا۔ وہ اب تک نہیں آئی تھی۔ لشکر روانگی کے لئے تیار تھا۔

"تُو کس سوچ میں ہے اے معبلہ!" اچانک مجھے خجیرہ کی آواز سنائی دی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا' گر وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ خجیرہ کی آواز پھر ابھری۔ "میری خوشبو کے پیچھے پیچھے چلی آ۔ میں تجھے تیری منزل تک پہنچا دوں گی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے خجیرہ کی مخصوص خوشبو محسوس کی۔

میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ نضار نے بھی میری تقلید میں ایسا ہی کیا اور پھر ہمارا لشکر مخالف سمت میں روانہ ہو گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم اسی طرف سے کل آگے بڑھے تھے۔ گویا ہمارا سفر اشر کی بستی کی طرف تھا۔

گزشتہ روز دوپہر کو ہم نے پڑاؤ ڈالنے کے بعد جہاں سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا' ہم تقریباً نصف پہر کی مسافت طے کر کے وہیں پہنچ گئے۔ وہاں سے دو راستے دائیں اور بائیں جانب جاتے تھے۔ گزشتہ روز ہم نے بائیں جانب سفر کا آغاز کیا تھا' مگر اب ہمارا لشکر دائیں جانب بڑھ رہا تھا۔ گویا یہی وہ مقام تھا جہاں سے ہم راستہ بھٹکے تھے۔ خجیرہ کی خوشبو مجھے اب تک محسوس ہو رہی تھی اور میں اسی کی رہنمائی میں لشکر کے آگے آگے چل رہی تھی۔ میرے ہی ساتھ نضار بھی تھا۔ معلوم نہیں' اسے بھی خجیرہ کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی یا نہیں' مگر اس کے چہرے پر مجھے اطمینان کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دوپہر کو ہم نے ایک گھاٹی میں پڑاؤ ڈالا اور اسی کے ساتھ خجیرہ کی خوشبو غائب ہو گئی۔

اس وقت میں اور نضار کھانا کھا رہے تھے۔ جیسے ہی خوشبو غائب ہوئی' نضار چونک کر دھیمی آواز میں مجھ سے بولا۔ "وہ تو چلی گئی۔" اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے بھی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں۔" میں نے سر ہلا کر تائید کی۔ "مگر مجھے یقین ہے اے نضار کہ جب ہم یہاں سے روانگی کے لئے تیار ہوں گے تو وہ پھر آ جائے گی۔"

اور پھر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ جب ہم چلنے کے لئے تیار ہو گئے تو خجیرہ کی خوشبو لوٹ آئی۔

"وہ آ گئی اے آتون!" نضار اپنے گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے پُرمسرت آواز میں بولا۔

"ہاں' میں نے بھی محسوس کر لیا ہے۔" میں نے کہا۔

اسی وقت پیچھے سے ایک گھڑسوار آگے بڑھ کر میرے قریب پہنچ گیا۔ میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ وہی زخمی سپاہی تھا جس کی وجہ سے اب تک اتنی خواری ہوئی تھی۔

اسے ایک اور گھڑسوار اپنے گھوڑے پر بٹھائے ہوئے تھا۔

"اے آتون دیوی!" زخمی سپاہی میری سوالیہ نظروں کے جواب میں بولا۔ "میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ .... یہی صحیح راستہ ہے اور .... اور میں یہاں سے لشکر کی رہنمائی کر سکتا ہوں۔"

"اب مجھے تیری رہنمائی کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔ "واپس جا اور لشکر کے ساتھ خاموشی سے چلا چل۔"

وہ خجل سا ہو کر مڑ گیا۔ جس گھڑسوار کے گھوڑے پر وہ بیٹھا تھا' اس نے میرا اشارہ پاتے ہی گھوڑا موڑ لیا تھا۔

اگر زخمی سپاہی صحیح راستے کی تصدیق نہ بھی کرتا تو مجھے یقین تھا کہ خجیرہ میرے لشکر کو صحیح راستے لے جا رہی تھی۔

سفر پھر شروع ہو گیا۔ ہم وہ گھاٹی عبور کر کے نسبتاً بلندی کی طرف بڑھنے لگے۔ شام ہونے سے پہلے ہم پہاڑیوں سے گھری ہوئی ایک وادی میں داخل ہو گئے۔ ہم اب تک نسبتاً بلندی پر تھے۔ دور تک نشیب میں ہمیں جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

اچانک خجیرہ کی آواز مجھے سنائی دی۔ "اے معبلہ! تیری منزل آ گئی۔ یہی اس وحشی قبیلے کی بستی ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔"

خجیرہ کی خوشبو غائب ہو گئی۔ میں نے ہاتھ بلند کر کے لشکر کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ جھونپڑیاں ابھی وہاں سے خاصے فاصلے پر تھیں۔ ان تک ہماری چلائی ہوئی گولیاں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ کم از کم میرا اندازہ یہی تھا اور میں نضار سے بھی اپنے اندازے کی تصدیق چاہتی تھی۔ ان پر آگ برسانے کے لئے ہمارا مزید آگے بڑھنا ضروری تھا۔ اگر وہ ہماری بات نہ مانتے تو پھر مجبوری تھی۔ ہم ان پر حملہ کر سکتے تھے۔

میں نے نضار سے اپنے انہی خیالات کا اظہار کیا تو اس نے میری بات سے اتفاق کیا اور تجویز پیش کی۔ "میں امن کی علامت کے طور پر سفید جھنڈا لہراتا ہوا ان کی طرف جاتا ہوں اور ان سے بات کرتا ہوں۔ اپنے ہمراہ میں دو سپاہیوں کو بھی لے جاتا ہوں۔"

"نہیں' میں تجھے ان کی طرف اکیلا نہیں جانے دوں گی۔" میں بولی۔ "تیرے ساتھ میں بھی چلوں گی۔"

نضار نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے سے منع کیا' مگر میں نہیں مانی۔ طے یہ ہوا کہ ہم دونوں کے ساتھ صرف ایک سپاہی سفید پرچم بلند کر کے چلے گا۔ پھر لشکر کو وہیں رکے رہنے کا حکم دے کر ہم تینوں جھونپڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ خلاف توقع ہمیں وہاں کوئی عمارت بنی ہوئی نظر نہیں آئی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ کم سے کم بستی کا سردار' پتھروں سے بنی کسی عمارت میں رہتا ہو گا۔ میرے خیال میں وہ لوگ بہت ہی پسماندہ تھے جو انہوں نے اپنے لئے کوئی ایسی عمارت نہیں بنائی تھی۔

ابھی ہم بستی میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ اچانک جھونپڑیوں کی طرف سے تیز قسم کی وحشیانہ "ہو ہو' ہو ہو" کی آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بیک وقت سینکڑوں افراد اپنے منہ سے یہ وحشیانہ

آوازیں نکال رہے ہوں۔

کسی متوقع خطرے کے پیش نظر ہم نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں اور تیزی کے ساتھ بندوقیں اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔

چند ہی لمحے بعد میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جھونپڑیوں میں رہنے والے اپنی اپنی جھونپڑیوں سے نکل کر ایک طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔ ان میں عورتیں' مرد اور بچے سبھی شامل تھے۔ جو بچے دوڑنے کے قابل نہیں تھے' انہیں مردوں اور عورتوں نے اپنی گودوں میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ ہم سے اتنے فاصلے پر تھے کہ اگر ہم پوری قوت سے بھی چیختے تو شاید ہماری آوازیں ان تک نہ پہنچتیں۔

"یہ انہیں کیا ہوا؟ اور یہ اچانک اپنی جھونپڑیاں چھوڑ کر کدھر بھاگے جا رہے ہیں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"شاید انہوں نے ہمارے لشکر کو دیکھ لیا ہے اے آتون! کیوں کہ وہ خاصی بلندی پر ہے۔" نضار نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "ان کا رخ پہاڑوں کی طرف ہے۔ شاید وہ وہاں چھپنا چاہتے ہیں۔"

"پھر......... پھر کیا کیا جائے؟" میں بولی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں ان کا تعاقب کر کے معلوم کرنا چاہئے' یہ کہاں چھپ رہے ہیں یا چھپنے لگے ہیں۔" نضار نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہی میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پھر نضار کے ساتھ ہی پرچم بردار کے گھوڑے بھی میرے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔

جو صورت حال پیش آئی تھی' قطعی خلاف توقع اور حیران کر دینے والی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ لوگ ہمیں دیکھ کر یوں اپنی جھونپڑیاں چھوڑ کر بھاگ اٹھیں گے۔ اس سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ہم سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔

ذرا ہی دیر میں ہم اس بستی میں داخل ہو گئے جس کی جھونپڑیاں اب خالی پڑی تھیں۔ جھونپڑیوں کی تعداد سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی آبادی کم نہیں تھی۔ ہم وہاں رکے بغیر اپنے گھوڑے دوڑاتے رہے۔ ہمارا رخ اب مخالف سمت کے پہاڑوں کی طرف تھا۔ ہم نے بستی والوں کو اسی طرف بھاگتے دیکھا تھا۔ بستی سے جب ہم نکلے تو ان لوگوں کو پہاڑیوں سے بالکل قریب پایا۔ وہ ہمیں دور تک پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے' مگر اب ان کی تعداد پہلے کی نسبت کم معلوم ہو رہی تھی۔ یقیناً ان کی خاصی تعداد پہاڑوں میں داخل ہو چکی تھی۔

پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ابھی تک ہم ان پہاڑوں کے قریب نہیں پہنچ سکے تھے۔ یہ صورت حال ہمارے لئے الجھا دینے والی تھی۔ انہیں ہم نے پہاڑوں پر چڑھتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر وہ سب کہاں غائب ہو گئے تھے؟ اپنے اس سوال کا جواب ہمیں پہاڑوں کے قریب پہنچ کر ہی مل سکتا تھا اس لئے ہم آگے بڑھتے رہے۔

ان پہاڑوں کے دامن میں پہنچ کر ہم پر ایک حقیقت اور منکشف ہوئی کہ ان پر چڑھنا بے حد دشوار تھا۔ ہمارے راستے میں وہ کسی بلند اور اونچی دیوار کی طرح حائل ہو گئے تھے۔ دور تک ہم پہاڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے گھوڑے دوڑاتے رہے، مگر ہمیں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ سکی جس کے بارے میں کہا جا سکتا کہ بستی والے وہاں جا کر چھپ گئے ہیں۔

ہمیں اپنے لشکر سے چلے کافی دیر ہو چکی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ لشکر والے ہماری طرف سے فکرمند ہوں گے۔ اس خیال کا اظہار میں نے نضار سے بھی کر دیا۔

"ایسا کرتے ہیں اے آتون کہ اسے لشکر کی طرف واپس بھیج دیتے ہیں۔" نضار نے پرچم بردار کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ نضار نے پرچم بردار کو اس ہدایت کے ساتھ واپس بھیج دیا کہ لشکر والے اسی جگہ رک کر ہماری واپسی کا انتظار کریں۔ پرچم بردار گھوڑا دوڑاتا ہوا واپس چلا گیا تو میں نضار سے بولی۔ "وہ لوگ ہماری آنکھوں کے سامنے یہاں آ کر غائب ہوئے ہیں۔ یہاں یقیناً کوئی کوئی ایسی جگہ موجود ہے جہاں وہ چھپے ہوئے ہیں اور ہمیں وہی جگہ تلاش کرنا ہے۔"

"یوں لگ رہا ہے جیسے انہیں ان پہاڑوں نے نگل لیا ہے اے آتون!"

نضار کی بات سن کر میں چونک اٹھی۔ "کہیں یہ پہاڑ اندر سے کھوکھلے تو نہیں۔" میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے اے آتون تو ان کے داخل ہونے کا راستہ بھی ہونا چاہئے جب کہ بالکل سپاٹ معلوم ہو رہے ہیں۔ پھر بھی چل ایک بار بالکل قریب جا کر اور گھوڑوں سے اتر کر ہم ان کا جائزہ لیتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے نضار نے اپنے گھوڑے سے اتر کر اس کی لگام تھام لی۔

میں بھی گھوڑے سے اتر کر نضار کے ساتھ قریبی پہاڑ کے دامن کی طرف بڑھی۔ ہم پہاڑ کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ اسے ہاتھ بڑھا کر چھو سکتے تھے۔

"کچھ ہی دیر میں سورج بھی ڈوب جائے گا اے نضار!" میں بولی۔ "ہمیں تلاش کا کام ہر حال میں سورج غروب ہونے سے پہلے کر لینا چاہئے۔"

"ہاں اے آتون!" نضار نے میری بات سے اتفاق کیا۔ "اگر اندھیرا پھیل گیا تو مجبوراً ہمیں لشکر کی طرف واپس جانا پڑے گا۔"

اسی وقت میں نے آگے بڑھتے ہوئے ایک خاص بات محسوس کی۔ پہاڑی کی جڑ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کوہان سے ابھرے نظر آ رہے تھے۔ بچپن سے اب تک میں پہاڑوں ہی کی آغوش میں پلی بڑھی تھی۔ مجھے اسی لئے وہ ابھار غیر معمولی اور غیر فطری سے لگے۔ میں ایک ابھار کے قریب رک کر زمین پر بیٹھ گئی اور اس پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ پھر میرا ہاتھ اس ابھار کے ایک نشیبی کنارے تک پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری چاروں انگلیاں اندر داخل ہو سکتی ہیں، سو میں نے انگلیاں داخل کر دیں۔ پھر میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں ابھار کی دوسری جانب والے کنارے میں داخل کیں اور اسے اٹھانے

کوشش کرنے لگی۔

نضار میرے قریب کھڑا ہوا حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ مجھ سے کچھ بولا نہیں۔

اچانک زور لگاتے ہوئے میں پیچھے کی طرف لڑھک گئی۔ خلاف توقع وہ سنگی ڈھکنا ہلکا ثابت ہوا تھا۔ اسی لئے اپنے ہی زور میں پیچھے لڑھک گئی تھی۔ زمین سے میں نے اٹھنے میں دیر نہیں کی۔ وہ سنگی ڈھکنا میرے قدموں میں پڑا تھا۔ اس کے اندرونی حصے سے ایک آہنی زنجیر اس خلا میں جا کر غائب ہو گئی جو ڈھکنا ہٹنے سے پہاڑ کی جڑ میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ خلا ایک بڑے سے سوراخ کی طرح تھا جس کے ذریعے کوئی بھی شخص با آسانی داخل ہو سکتا تھا۔ اس کے اندر تاریکی نظر آ رہی تھی۔

نضار بھی اب میرے قریب ہی بیٹھ کر اس خلا کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اے نضار وہ لوگ یقیناً انہی سوراخوں کے ذریعے پہاڑ کے اندر داخل ہوئے ہیں۔ فاصلے کی وجہ سے ہم انہیں سنگی ڈھکنے اٹھاتے اور خلا میں اترتے نہیں دیکھ سکے تھے۔ خلا میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے سنگی ڈھکنوں سے منسلک زنجیریں کھینچ کر ڈھکنوں کو دوبارہ سوراخوں پر رکھ لیا ہو گا۔"

ابھی نضار میری تائید یا تردید میں کچھ نہ کہہ سکا تھا کہ میں اچھل پڑی۔ میرے جسم سے کوئی شے ٹکرائی تھی۔ وہ شے اوپر سے آ کر نضار اور مجھ پر گری تھی۔ جب تک مجھے اس شے کی حقیقت کا علم ہوا، میرے پیر زمین سے اوپر اٹھ چکے تھے۔ میرے جسم کے گرد وہ جال اتنی مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت قائم کر چکا تھا کہ میں اپنے ہاتھ پیر ہلانے سے بھی قاصر تھی۔ ایسے ہی ایک دوسرے جال میں مجھے نضار قید نظر آیا۔ دونوں جال آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے جا رہے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھے انہوں نے ہمیں بہت آسانی سے گرفتار کر لیا تھا۔

جال اوپر کھینچے جاتے رہے اور میں بے بسی سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ چند ہی لمحے بعد میرے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ یا تو اوپر سے کوئی وزنی چیز میرے سر پر ماری گئی تھی یا پھر اوپر کھینچتے ہوئے میرا سر کسی ابھرے پتھر سے ٹکرا گیا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے ستارے ناچ گئے تھے۔ پھر میرا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا اور میں اپنے حواس کھو بیٹھی۔

☆======☆======☆

تاریکی، خاموشی، سکون اور پھر چہرے پر ٹھنڈک کا احساس ہوا تو میرے احساسات دوبارہ انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگے۔ میرے ذہن پر اب تک غنودگی سی چھائی ہوئی تھی کہ کھلی آنکھوں میں نے ایک خواب سا دیکھا۔ ایک ملیح چہرہ، سیاہ آنکھیں اور پرکشش و تیکھے خد و خال اور خوبصورت ہونٹ جن پر مسکراہٹ تھی۔ جب میرا شعور اس کے لمس سے بیدار ہو گیا تو میں نے دیکھا وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا جو میرا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھا تھا۔ کسی جانور کی کھال میں ملبوس اس کے جوان اور گٹھیلے جسم کا تناؤ بہت نمایاں معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں اور سر پر بڑے بڑے بال تھے جو شانوں تک آ رہے تھے۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ پھر اس نے احتیاط سے میرا سر اٹھا کر پانی سے بھرا ہوا چھوٹا

سا مشکیزہ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پانی پی کر مجھے بڑا سکون محسوس ہوا۔ وہ نوجوان مجھے ترحم آمیز نگاہوں س دیکھ رہا تھا۔

"تُو .... تُو کون ہے؟" میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"حصیف کا خدمتگار۔" نوجوان کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔

"تیرا نام؟" میں نے پوچھا۔

"سامر۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"تیری طرح تیرا نام بھی مجھے اچھا لگا۔" میں نے دانستہ اس کی تعریف کی اور اس کے چہرے پر لڑکیوں کی طرح سرخی سی پھیل گئی۔ اس نوجوان کی حیا میرے لئے تعجب خیز تھی۔ پھر میں نے اس سے دریافت کیا۔ "کیا میں تجھے اسی جگہ اور اسی حال میں بے ہوش ملی تھی؟"

"نہیں۔" نوجوان بتانے لگا۔ "تُو حصیف کے غلاموں کی قید میں تھی۔ تُو مجھے بہت بھولی اور اچھی لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ تجھے بہت جلد حصیف کے سامنے پیش کر دیں گے اور پھر تُو حصیف کی ہوس کا شکار ہو جائے گی۔ وہ تجھے پامال کر دے گا۔ سو میں نے حصیف کے غلاموں کو مست کر دینے والا مشروب پلا کر قتل کر دیا اور تجھے یہاں اٹھا لایا کہ موقع ملتے ہی تجھے فرار کرا دوں۔ تُو زخمی پڑی تھی اور تیرے سر کے زخم سے خون بہہ کر جم گیا تھا۔ تجھے دیکھ کر پہلی نظر میں مجھے یہ شبہ ہوا کہ تُو مر چکی ہے' مگر تیرے دل میں لوتھڑا پھڑک رہا تھا۔"

"کیا وہاں میرے علاوہ بھی کوئی اور قید تھا اے سامر!" میں نے بے چینی سے سوال کیا۔ مجھے نفا کا خیال آ گیا تھا۔

"وہاں تُو اکیلی ہی تھی' مجھے کوئی اور نظر نہیں آیا۔" سامر نے بتایا۔

"تُو اگر مجھے وہاں سے نکال نہ لاتا اے سامر تو شاید میری زندگی نہ بچتی۔ میں تیری ممنون ہوں۔"

"لیکن تُو شاید اب بھی زندہ نہیں بچے گی۔" نوجوان سامر پُر تشویش آواز میں بولا۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ جلد ہی قتل ہونے والے تینوں غلاموں کا راز کھل جائے گا اور پھر تیری تلاش شروع ہو جائے گی۔ تُو ان کی نگاہوں میں آ گئی تو وہ تجھے ہی اپنے ساتھیوں کا قاتل سمجھیں گے پھر زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ بہت سفاک اور بڑے بے رحم ہیں۔"

میں اس دوران میں یہ دیکھ چکی تھی کہ میرے جسم پر ایک بھی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ یقیناً انہوں نے مجھے بے ہوشی ہی کے دوران میں بالکل غیر مسلح کر دیا تھا۔ میں نے اس عرصے میں اردگرد کا جائزہ لے لیا تھا۔ ایک طرف مجھے ایک بڑا سا سوراخ نظر آ رہا تھا جس میں روشنی تھی۔ میں سمجھ چکی تھی حصیف اس وحشی قبیلے کا سردار ہے جو اس پہاڑ کے اندر رہتا ہے۔ سامر مجھے اپنے بارے میں بتا ہی چکا کہ وہ حصیف کا خدمتگار ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ بھی گویا دشمن ہی کا آدمی تھا اور اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا' نہ اس سے حصیف کے خلاف کوئی بات کی جا سکتی تھی۔

غار کے بارے میں بھی اسے کچھ بتانے سے گریز کرنا تھا۔

"کیا یہ سوراخ سردار حصیف کے ٹھکانے تک جاتا ہے؟" میں نے محتاط لہجے میں سامر سے پوچھا۔

"ہاں۔" سامر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس طرف سے حصیف کے غلام آ سکتے ہیں۔ اب اٹھ اور میرے ساتھ چل۔ میں تجھے محفوظ جگہ دکھاتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے بھی سہارا دے کر اٹھایا۔

میں نے اپنے سر کے زخم کو ٹٹولا اور ہلکی سی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ اِدھر اُدھر بالوں میں غالباً خون جما ہوا تھا جو سخت ہو رہے تھے۔ اس وقت بار بار میرے ذہن میں یہی سوال گردش کر رہا تھا کہ آخر سامر مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں جتا رہا ہے؟ یہ سب کچھ بے مقصد تو نہیں ہو سکتا تھا اس نے میری خاطر بہرحال تین افراد کو قتل کر دیا تھا۔ میں پوری طرح چوکنا تھی۔ سامر اب مجھے اس غار میں اندر کی طرف لے جا رہا تھا۔

غار کا دہانہ آخر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گھوم پھر کر میں' سامر کے ساتھ ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں دائیں بائیں اوپر کی طرف بہت سے چھوٹے بڑے سوراخ تھے۔ یہ کھلی جگہ عام گزرگاہ سے ہٹ کر تھی۔ دونوں طرف ایک پتلا سا راستہ بل کھاتا ہوا اوپر سوراخوں تک جاتا تھا۔ دن کی روشنی دیکھ کر اب میں سمجھ چکی تھی کہ میں ساری رات بے ہوش رہی ہوں۔ ابھی دن کا آغاز ہی معلوم ہوتا تھا۔

"ان میں سے کسی سوراخ کے اندر چھپ جا۔ یہاں تُو محفوظ رہے گی۔" سامر نے رکتے ہوئے کہا۔

"میں اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟" وہ مسکرایا۔

"تُو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں جتا رہا ہے؟" میں اپنے اندیشے کو زبان پر لے آئی۔

"مجھے شک کی نظر سے مت دیکھ۔ سامر تجھے دھوکا نہیں دے گا۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "تُو اوپر چلی جا۔ میں ابھی آتا ہوں۔ تیرے لئے میں کچھ کھانے کو بھی لے آؤں گا .... اور تُو زخمی بھی تو ہے۔"

میں نے سامر کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی' پھر سوراخوں تک جانے کے لئے بائیں جانب کے تنگ سے راستے پر چڑھ گئی۔ اونچائی پر پہنچ کر میں نے سامر کو دیکھا اور ایک سوراخ میں گھس گئی۔ پہاڑ کا یہ حصہ دوسرا رخ معلوم ہوا تھا کیوں کہ دور تک اونچے نیچے ٹیلوں اور چٹانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مجھے باہر سامر کی آشنا آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ میں اٹھ کر دہانے کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے سامنے کے سوراخوں سے سامر کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ میں نے سر نکال کر نیچے کا جائزہ لیا اور پورا اطمینان کر لینے کے بعد سامر کو آواز دی۔ "میں یہاں ہوں اے سامر!"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا کیوں کہ اس دوران میں کسی ممکنہ خطرے سے بچنے کے لئے میں نے وہ سوراخ بدل دیا تھا جہاں سامر مجھے چھوڑ کر گیا تھا۔ اب میں ایک اور سوراخ میں تھی۔ پھر وہ میرے پاس پہنچ گیا۔ میں سوراخ کے اندر کھسک گئی۔ وہ بھی اندر آ گیا۔

"تُو ادھر کیوں چلی آئی؟ میں تجھے وہاں نہ پا کر پریشان ہو گیا تھا۔" وہ پوٹلی کھولتے ہوئے بولا۔

"میں یہ اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ کہیں کوئی اور تو تیرے پیچھے لگ کر یہاں نہیں پہنچ گیا۔" م نے بات بنا دی۔

"بڑی چالاک ہے تُو!" وہ مسکرایا اور پھر میرے سامنے بھنا ہوا گوشت رکھ دیا۔

گوشت کھا کر میں نے پانی پیا۔ مشکیزہ اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ پھر معاً خیال آیا کہیں سام اس میں سے میرا جوٹھا پانی نہ پی لے' ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ زندہ نہیں بچ سکتا تھا اور ابھی مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ معلوم نہیں پہلے مجھے خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ پہلے بھی ہوش میں آ کر م اس مشکیزے سے منہ لگا کر پانی پی چکی تھی۔ اگر اس دوران میں سامر کو پیاس لگ جاتی تو پھر جانے ا ہوتا۔ میں اسی سوراخ میں اس کا انتظار کرتی رہتی اور وہ سفر آخرت پر روانہ ہو جاتا۔ میں نے دل ہی د میں فیصلہ کیا کہ اسے مشکیزہ نہیں لے جانے دوں گی۔

جب میں گوشت کھا کر پانی پی چکی تو سامر نے ایک بے ڈھنگی سی چوبی ڈبیا پوٹلی سے نکالتے ہو۔ کہا۔ "تُو زخمی بھی تو ہے۔"

پھر وہ ڈبیا سے جڑی بوٹیوں کا سیاہ بدبودار ملغوبہ نکال کر میرے سر کے زخم پر تھوپنے لگا۔ سام گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر میرے سر پر دوا لگا رہا تھا یوں اس کا گٹھا ہوا جسم مجھ سے بہت قریب آ گیا تھا۔

"اب کے میں تیرے لئے کھال بھی لیتا آؤں گا تاکہ تُو سردی سے بچ سکے۔" سامر نے بیٹھ کر ڈ کو ایک طرف رکھ دیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

میری اور اس کی نظریں آپس میں الجھ گئیں۔ میں نے محسوس کر لیا کہ سامر کی آنکھوں میں ا کہے جذبوں کی داستان تھی۔ پھر اچانک اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر اس کی پشت پر ا خوبصورت کانپتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کے ہونٹوں کی حرارت میں نے اپنے سارے جسم م پھیلتی محسوس کی۔ میں نے دانستہ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔

وہ لمحے شاید سامر کی زندگی کا حاصل تھے' مگر اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا اور سر اٹھا کر بولا۔ "تُو مجھے اپنا نام نہیں بتائے گی؟" اس کی آواز مرتعش تھی۔

"تُو مجھے آتون کہہ سکتا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"پھر میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ "آتون! .... کیا تیرا .... تیرا یہی نام ہے؟" اس کے ل سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیوں .... تُو خوفزدہ کیوں ہو گیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس لئے کہ .... کہ میں نے حسیف کی زبان سے کئی بار یہ نام سنا ہے۔" سامر نے بتایا۔

"تیرے دائیں شانے پر سانپ کے پھن کا نشان بھی ہے کیا؟"

"ہاں ہے۔" میرا تجسس بڑھ گیا۔

"تو پھر .... پھر تُو وہی .... وہی آتون ہے جس کا انتظار وہ ایک مدت سے کر رہا ہے۔ و

وہ کئی بار کہہ چکا ہے کہ تُو .... تُو ایک دن ضرور آئے گی اور پھر .... پھر وہ جوان ہو جائے دوبارہ جوان ہو جائے گا۔" سامر نے رک رک کر بتایا۔

"مگر کیوں اور کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم' مگر چند روز سے اسے یہی کہتے سنا گیا ہے کہ آتون بہت جلد یہاں پہنچنے والی ہے' میں نے اس کی روح کو قید کر لیا ہے اور وہ اپنی روح کو میری قید سے آزاد کرانے ضرور آئے گی۔"

سامر کی بات سن کر میں چکرا کے رہ گئی۔ آخر حسیف کو میرا نام کیسے معلوم تھا؟ نہ صرف نام بلکہ وہ بھی جانتا تھا کہ میرے دائیں شانے پر سانپ کے پھن کا نشان ہے۔ اسے کیوں یقین تھا کہ ایک روز میں ضرور آؤں گی؟ البتہ اس کا ایک اشارہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ میری روح کو قید کرنے سے اس کی مراد شاید مہا پجاری اور احرس سے تھی جو اس کی قید میں تھے۔

"اچھا اے آتون! اب میں چلتا ہوں۔" سامر اچانک بولا۔ "میری زیادہ دیر غیر حاضری حسیف کے لوں کو میری طرف سے شک و شبہے میں مبتلا کر سکتی ہے۔ میں پھر آؤں گا' مگر تُو یہاں سے باہر مت نا۔"

پھر وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ میں نے مشکیزہ اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے اس سے کہا۔ "اسے یہیں چھوڑ مجھے پیاس لگی تو پانی پی لوں گی۔"

اس نے مشکیزہ میرے پاس ہی چھوڑ دیا۔ میں ابھی اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی' مگر اسے رے پاس واقعی بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مشتبہ ہو جائے۔ میں رفتہ رفتہ اس سے ت کچھ معلوم کر سکتی تھی۔ جلد بازی سے کام بگڑ بھی سکتا تھا۔ اب میں نہ صرف مہا پجاری اور احرس کی رف سے فکرمند تھی بلکہ نضار کی جانب سے بھی پریشان تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بھی اب حسیف کا قیدی بن چکا تھا۔ اب ان تینوں ہی کو حسیف کی قید سے رہائی دلانا میری ذمے داری تھی۔

☆======☆======☆

اس پناہ گاہ میں مجھے دو دن گزر چکے تھے۔ سامر اس عرصے میں وہاں کئی بار آیا تھا۔ وہ اب پوری طرح میرے دامِ محبت میں گرفتار ہو چکا تھا' مگر میں نے اسے اب تک حد سے تجاوز نہیں کرنے دیا تھا۔ اسے بھی بڑی حد تک اپنے جذبات پر قابو تھا۔ میرے ماتھے پر خفیف سی شکن دیکھ کر بھی وہ سنبھل جاتا تھا۔ اس کی دوا نے حیرت انگیز اثر دکھایا تھا۔ میرے سر کا زخم بھر گیا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں سامر سے میں نے بعض اہم معلومات حاصل کر لی تھیں۔ یہ معلومات مہا پجاری' احرس اور نضار کی آزادی کے لئے اور ہندی میں مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔ سامر نے مہا پجاری اور احرس کا ذکر کیا تھا جنہیں چند روز پہلے حسیف ہی کے حکم پر قید کر لیا گیا تھا۔ خود حسیف نے اپنے غلاموں کو اس طرف بھیجا تھا جہاں سے مہا پجاری کا قافلہ گزرنے والا تھا۔ حسیف کے غلام پہلے ہی سے ان کی گھات میں وہاں بیٹھ گئے تھے۔ مہا پجاری کے قافلے پر حملہ کرنا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ حسیف کو اس قافلے کی آمد کا پہلے سے علم کس طرح ہو گیا تھا۔ اس سوال کا جواب میرے پاس صرف یہی تھا کہ حسیف یقیناً کچھ

پُراسرار قوتوں کا مالک تھا۔

سامر سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ احرس اور مہا پجاری الگ الگ قید کئے گئے ہیں۔

ابھی تک میں نے سامر سے کوئی ایسا سوال نہیں کیا تھا کہ وہ بدک جائے لیکن مجھے یقین ہو چکا تو اس کی مدد سے میں اس جگہ تک پہنچ سکتی ہوں جہاں احرس اور مہا پجاری کو قید کیا گیا ہے۔ اب میں اسے مٹھی میں لینے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن اس کے لئے بہرحال حد سے گزرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

دھوپ کی کرنیں سمٹ کر سوراخ سے باہر چلی گئیں اور اندر اجالا کم ہونے لگا۔ سورج پہاڑ کی او میں جا چکا تھا' مگر ابھی تک سامر نہیں آیا تھا۔ میں اب بے چین اور فکرمند ہونے لگی تھی۔ میرے ، میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے' مگر یہ اندیشے بے بنیاد ہی ثابت ہوئے اور وہ آ گیا۔

اب تک سامر ہی میرا ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں کی حرارت میرے جسم میں منتقل کرتا آیا تھا مگر ا وقت خود میں نے ہی اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں خودغرضی کے تحت اس جذبات سے کھیل رہی تھی اور یوں اس کی ہمدردی حاصل کر کے اسے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر آلۂ کار بنانا چاہتی تھی۔ وہ معصوم اور بھولا بھالا سا نوجوان میری محبت کے جال میں پھنس چکا تھا۔

جب اس کے ہونٹوں کی حرارت میرے اندر منتقل ہو گئی تو اس نے مجھے سرشار سی نظروں دیکھا۔ میں اس کے چوڑے چکلے سینے کے بالوں سے کھیلتی ہوئی فوراً مطلب کی بات پر آ گئی۔ "سام آج مجھے حسیف کے بارے میں کچھ بتا۔"

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار سے نظر آنے لگے۔ "وہ شیطان آج کیوں یاد آ گیا؟" اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ لئے۔ آج پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے آقا کے اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"میں اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں .... مگر لگتا ہے کہ تُو اس سے بہت نفرت ہے۔"

"ہاں!"

"مگر آج تُو مجھے اس کے بارے میں ضرور بتائے گا۔"

"لیکن کیوں؟ تُو آخر اس بھیڑیے کے بارے میں کیوں جاننا چاہتی ہے؟"

"میں تجھے اس سے نجات دلانا چاہتی ہوں۔ تیری خاطر میں اس سے ٹکر لوں گی اور اے سام ابھا تب ہی ممکن ہے کہ تُو مجھے اس کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دے جو تجھے معلوم ہے۔" یہ کہتے ہ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اس کے قریب ہو گئی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ میرا لمس اس کے جذبات کے لئے مہمیز کا کام کرے گا۔ میں اس کے جذبات کھیل رہی تھی۔ جلد ہی اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے تمتما اٹھا۔

"آتون!" وہ خواب کے سے عالم میں بولا۔ "کیا تُو .... تُو بھی مجھ سے محبت کرنے لگی ہے؟"

"ہاں اے سامر! تجھ پر اب میرا حق ہے اور .... اور میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں یہاں

نکل چلیں۔"

خلافِ توقع وہ مجھے پژمردہ سا دکھائی دیا۔ "کاش یہ ممکن ہوتا اے آتون!" اس کی آواز میں حسرت تھی۔ "میں جانتا ہوں وہ شیطان میری طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں اس کی ٹانگیں چیر سکتا ہوں' مگر وہ کبھی میرے مقابل نہیں آئے گا۔ وہ تو اپنی شیطانی قوتوں سے کام لے گا اور .... اور اے آتون! یقین کر کہ میں بے بس ہو جاؤں گا۔"

"کیا اس کے پاس ایسی قوتیں ہیں؟" میں نے اسے کریدنے کی خاطر سوال کیا۔

"ہاں۔"

""پہلے تو مجھے سب کچھ بتا اے سامر! پھر میں کوئی فیصلہ کر سکوں گی۔ ممکن ہے میں تجھے کوئی بہتر مشورہ دے سکوں۔"

"یہاں سے کچھ دور وہ سیاہ چوٹی والے پہاڑ کی دھواں اگلتی ہوئی چوٹی پر ظاہر ہوا تھا۔" سامر اپنے آقا کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ "اس نے خود کو ہرباش دیوتا کا ہرکارہ بتایا جو کبیت کے رہنے والوں کے لئے رحمت و برکت لے کر آیا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ کبیت کی عورتوں کو نر اولاد بخشے گا اور دشمن پر انہیں حاوی کر دے گا۔ تب کبیت والوں نے اسے سجدہ کیا اور اس نے ان پہاڑوں کے پیٹ میں ٹھکانا بنا لیا۔ کبیت والوں نے اپنے بچے اس کی غلامی میں دے دیئے اور اپنی کنواریاں اس کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اب بھی ہر کنواری پر پہلے اس کا حق سمجھا جاتا ہے۔ وہ جسے پسند کرتا ہے اپنی خدمت کے لئے رکھ لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے دوسروں کو بخش دیتا ہے۔" سامر کے لہجے میں نفرت و حقارت تھی۔ میں اس کے ایک ایک لفظ کو توجہ سے سن رہی تھی۔ "میں اب جان چکا ہوں کہ وہ کوئی شیطان ہے جو ہرباش دیوتا کا ہرکارہ بن بیٹھا ہے۔ اس کا ہر خدمتگار اور ہر خادمہ اس سے نفرت کرتی ہے' مگر سب مجبور ہیں۔ ہم اس کی شیطانی قوتوں سے خوفزدہ ہیں۔"

"کیا تُو اس کی اصلیت جانتا ہے؟ وہ درحقیقت کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں' میں یہ سب کچھ نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ ہم کبیت والوں کے لئے لعنت کا دیوتا بن کر آیا ہے۔"

"اچھا یہ بتا کہ جو نوجوان حسیف کی قید میں ہے اسے کیوں قید کیا گیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ بہت عرصے پہلے حسیف نے اپنے غلاموں کو حکم دیا تھا کہ وہ کبیت سے نکل کر دور دور تک پھیل جائیں اور کوئی ایسی کنواری تلاش کر کے لائیں جس کے دائیں شانے پر سانپ کے پھن کا نشان ہو۔ اس کے غلام عرصہ دراز کے بعد ناکام لوٹ آئے۔ پھر ابھی کچھ روز پہلے اس نے ایک قافلے کے ادھر سے گزرنے کی خبر دی۔ اس نے نوجوان قیدی اور اس کے ساتھی بوڑھے کا حلیہ بتایا اور کہا کہ اگر تم انہیں پکڑ کر لے آؤ گے تو وہ سانپ کے پھن والی کنواری آتون خود بخود ایک روز میرے پاس اس پہاڑ کے پیٹ میں پہنچ جائے گی۔" سامر نے بتایا۔

میری الجھن کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی۔ شاید سامر بھی اصل بات نہیں جانتا تھا' مگر مجھے یقین

تھا کہ یہ کوئی گہرا چکر ہے۔

"کیا وہ نوجوان ابھی تک محفوظ ہے؟" میں نے احرس کے بارے میں اپنے اطمینان کی خاطر پوچھا۔

"ہاں' حسیف ابھی تک اس سے نہیں ملا۔ اس نوجوان کو حسیف نے اپنے خدمتگاروں کی نگرانی میں رکھ چھوڑا ہے۔ ان میں خادمائیں بھی ہیں جو اس نوجوان کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ یہ حسیف کا حکم ہے کہ وہ نوجوان اگر ان سے جسمانی آسودگی بھی حاصل کرنا چاہے تو انکار نہ کیا جائے۔"

"تو کیا کبھی اس نوجوان نے کسی خادمہ سے.........." میں کوشش کے باوجود اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"میں سمجھ گیا اے آتون! کہ تو کیا پوچھنا چاہتی ہے۔" سامر بول اٹھا۔ "ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ ان خادماؤں کو اپنے قریب دیکھ کر اور بھڑک اٹھتا ہے۔" سامر سے یہ سن کر نہ جانے کیوں میرے دل کو ایک اطمینان سا ہوا۔ اب سامر کہہ رہا تھا۔ "اگر حسیف کے غلام اور خدمتگار بھی اس کی نگرانی نہ کر رہے ہوتے تو وہ اب تک ان خادماؤں کو ہلاک کر کے بھاگ چکا ہوتا۔"

"اے سامر! کیا تُو بھی اس نوجوان قیدی کے پاس جاتا رہتا ہے؟" میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ہاں' مجھے اس پر بہت رحم آتا ہے۔ اگر میں اس کی مدد کر سکتا تو اسے یہاں سے نکال دیتا۔ وہ بہت خوبصورت نوجوان ہے' کسی دیوتا کی طرح۔ نہ جانے وہ بوڑھا بھیڑیا اس کا کیا حشر کرے۔" سامر نے اظہار تاسف کیا۔

"وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔" بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔

سامر نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "یہ تُو نے کیسے کہہ دیا؟"

"اگر تُو میرا ساتھ دے اے سامر! تو ہم اس نوجوان کو یہاں سے نکال سکتے ہیں۔" میں دل کی بات زبان پر لے آئی۔

سامر کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ مجھے الجھی الجھی سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تجھے .... اے آتون! تجھے اس نوجوان سے کیا ہمدردی ہے؟" سامر نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"وہ میرے قبیلے کا نوجوان ہے۔" میں نے کہہ دیا۔

"یہ .... یہ تُو کیا کہہ رہی ہے اے آتون!" سامر کی آواز میں غیر یقینی کیفیت تھی اور کچھ عجیب سی سوگواری بھی۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اے سامر! وہ ہمارے سردار کا بیٹا ہے اور میں اسے حسیف کی قید سے رہائی دلانے کے لئے یہاں آئی ہوں۔" میں نے مصلحت کے تحت حقیقت کو جھوٹ کے لبادے میں چھپا لیا۔

"تُو نے یہ بات اب تک مجھ سے کیوں چھپائی؟" سامر نے شکوہ کیا۔

"پہلے تُو نے پوچھا ہی کب تھا؟" میں مسکرا دی۔

"اور تُو اپنے سردار کے بیٹے کو قید سے رہا کرانے کے لئے موت کے منہ میں چلی آئی؟"

"ہاں۔"

"میں نہیں مانتا۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "کیا.......... کیا تُو.......... تُو اسے چاہتی ہے؟" سامر کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔

میں نے اس کا ہاتھ بڑی محبت سے پھر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "تُو غلط سوچ رہا ہے اے سامر! میں نے اپنے سردار سے اپنی غلامی کا سودا کیا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اس کے بیٹے کو واپس لے آئی تو مجھے اور میری بہن کو آزاد کر دے گا جو اب اس کے پاس بطور یرغمال ہے۔ تُو اپنی کھوپڑی میں کسی وسوسے کو جگہ مت دے۔ یقین کر کہ مجھے سردار کے بیٹے سے کوئی رغبت نہیں۔ ایک معمولی سی کنیز ایسی کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتی۔" میں نے ایک من گھڑت کہانی سناتے ہوئے سامر کو دلاسہ دیا۔ اسے وسوسوں سے نجات دلانے کا یہی طریقہ سودمند بھی تھا۔

"آتون .... تُو نے مجھ پر سحر کر دیا ہے آتون!" اس نے مجھے اپنے ایک بازو کے حصار میں لے کر خود سے قریب کر لیا۔ "میں اسی لئے تیری بات سن کر تجھ سے بدگمان ہو گیا تھا۔ اے آتون! مجھے معاف کر دے۔ اگر تُو نے سچ کہا ہے تو میں تیری مدد ضرور کروں گا۔"

میں اس کے سینے کے بالوں سے کھیلنے لگی۔ اس نے مجھے رفتہ رفتہ تقریباً اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور پہلی بار میں نے اسے دانستہ یہ اجازت دے دی تھی۔

"اور میرا بھی وعدہ ہے اے سامر کہ کامیابی کے بعد تُو بھی میرے ساتھ جائے گا۔" میں ایک سادہ لوح نوجوان کو مقصد براری کے لئے سہانے فریب میں الجھا رہی تھی۔ اس پر مجھے دکھ تھا' مگر میں ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ سامر کی مدد کے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔

عورت ہمیشہ اپنی محبت کے سہانے خواب دکھا کر مرد کو قابو میں کر لیتی ہے۔ ازل سے مرد اس کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہا ہے۔ مرد کے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں جو عورت کے الفاظ کو پرکھ کر ان کی صداقت کا اندازہ لگا سکے۔ سو سامر بھی میرے وعدوں کے سحر میں کھو گیا۔

☆======☆======☆

مشعل کی زرد روشنی میں سامر کے ساتھ میں تنگ و تاریک سرنگ نما راستے پر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ سامر اس وقت بالکل خاموش تھا۔ وہ کچھ ہراساں معلوم ہو رہا تھا۔ میں یہ جانتی تھی کہ وہ محض میری خاطر جان ہتھیلی پر رکھ کر اتنا بڑا خطرہ مول لینے پر تیار ہو گیا تھا۔

میں بھی اپنے جسم میں سنسنی کی سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ میرے سر پر بھیڑیے کی خالی کھوپڑی تھی اور باقی کھال چاروں طرف اس طرح لٹک رہی تھی کہ میرا منہ بھی اس سے چھپ گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دو سوراخ تھے۔ میرے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں چوڑا کھانڈا تھا۔ یہ تینوں چیزیں میں نے حسیف کے ایک غلام کو قتل کر کے حاصل کی تھیں جسے سامر بہلا پھسلا کر میری پناہ گاہ تک لے آیا تھا۔ میں نے اسے باآسانی زیر کر لیا تھا۔ بھیڑیے کی یہ کھال مجھے اپنا چہرہ اور اوپری جسم

چھپانے میں بڑی کار آمد ثابت ہوئی تھی۔ اس طرح مجھ پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ وہاں حسیف کا ہر غلام خود کو اسی طرح چھپائے رکھتا تھا۔

یہاں تک میں اور سامر کسی مزاحمت کے بغیر پہنچ گئے تھے۔ حسیف کے غلاموں سے بہت کم ٹکرا ہوا تھا۔

پہاڑوں کے پیٹ میں تو جیسے ایک دنیا آباد تھی۔ عجیب پُر پیچ و دشوار گزار راستے بنے ہوئے تھے جن کی تعمیر میں انسانی ہاتھ بہت کم دخیل تھے۔ میں اگر اکیلی ہوتی تو سرنگوں کے اس جال اور راستوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتی۔ مجھے سامر کی رہنمائی حاصل تھی جو ہر پیچ و خم سے آگاہ تھا۔ چلتے چلتے اچانک سامر ایک کشادہ دراڑ کے قریب رک گیا۔

"کیوں' کیا بات ہے؟" میں نے سرگوشی کی۔

"اب یہاں سے تم اکیلی آگے جاؤ گی۔" سامر نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ "اس دراڑ کے خاتمے پر بائیں جانب وہ راستہ ہے جس سے گزر کر تم اس جگہ پہنچ جاؤ گی جہاں تمہارے سردار کا بیٹا قید ہے' مگر یہاں تمہیں قدم قدم پر حسیف کے غلاموں سے نمٹنا پڑے گا۔"

"میں ان سے نمٹ لوں گی' تم فکر نہ کرو۔" میں نے سامر کے شانے پر تھپکی دی۔

میں' حسیف کے دو غلاموں کو ٹھکانے لگا کر اس جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی جہاں احرس قید تھا۔ ان دو غلاموں کو مجھے اس لئے موت کی نیند سلانا پڑا تھا کہ انہوں نے مجھ سے میری شناخت طلب کی تھی اور کھال اتار کر چہرہ دکھانے کے لئے کہا تھا۔

دست قدرت سے تراشیدہ وہ ایک کوٹھری سی تھی جس کی اونچائی پر دیواروں میں کئی بڑے بڑے سوراخ تھے۔ چاروں طرف کئی مشعلیں روشن تھیں۔ کوٹھری کے وسط میں ایک بڑی سی چٹان پر نرم کھالوں کا بستر بچھا ہوا تھا اور اس پر احرس بے سدھ پڑا تھا۔ چند ہی دن میں اس کی صحت بُری طرح گر گئی تھی' اتنی کہ میں پہلی نظر میں پہچان ہی نہ سکی تھی' وہ واقعی احرس ہے۔ یا تو اسے خوراک بہت کم دی جاتی تھی یا پھر وہ خود ہی غصے اور جھنجلاہٹ میں کچھ کھاتا پیتا نہیں تھا۔ وہ بہرحال میرے بچپن کا ساتھی اور دوست تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔ چٹان کے ساتھ نیچے فرش پر چار حسین نوجوان لڑکیاں نیند میں کھوئی ہوئی تھیں۔

میں اندر داخل ہوئی تو احرس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا اور میرا دل کانپ اٹھا۔ وحشت زدہ اور کھوئی کھوئی سی سوگوار نگاہیں' بجھا بجھا چہرہ جس کی تر و تازگی سبزہ زاروں کو مات کر جاتی تھی' آج وہ چہرہ کسی خزاں رسدہ پھول کی طرح مرجھایا ہوا تھا۔

"احرس!" میں نے دل کی گہرائیوں سے اسے پکارا اور بھیڑیے کی کھال اتار دی۔

احرس ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ یقیناً مجھے وہاں دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا اس پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی' مگر یہ لمحاتی اثر تھا۔

"آتون!" اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"ہاں .... ہاں احرس! یہ میں ہوں' تمہاری آتون۔" میں کھانڈا (چوڑی دو دھاری تلوار) پھینک کر اس کی طرف لپکی۔ مشعل پہلے میں پھینک چکی تھی کیوں کہ اس کی وہاں ضرورت نہیں تھی۔ پہلے ہی وہاں خاصی روشنی تھی۔

احرس کرب آمیز انداز میں سسکتا ہوا اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ نقاہت سے اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ مجھے اس لمحے یہ شبہ بھی ہوا کہ شاید اسے کوئی نشہ آور مشروب بھی پلایا جاتا رہا ہے۔ یہ سوچ کر کہ وہ کہیں گر نہ جائے' اسے میں نے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ نڈھال سا مجھ سے لپٹ گیا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ احرس میرے اتنے قریب آ گیا تھا۔ چند لمحوں کو میرے ذہن پر اس کے قرب کا خمار سا چھا گیا اور میرے بازوؤں کی گرفت اس کے گرد مزید سخت ہو گئی۔ میں کچھ دیر کو سب کچھ بھول گئی تھی۔ مجھے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ خطرے کو محسوس کر سکتی جو بیدار ہو چکا تھا۔

وہاں محو خواب حسین و نوجوان لڑکیاں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھیں اور آنکھیں ملتے ہوئے حیرت و استعجاب سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔

"مجھے .... مجھے اے آتون! یقین تھا کہ تُو ضرور آئے گی۔" احرس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

احرس کی گرفت میرے جسم پر ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ اس کا ذہن شاید اچانک اتنی بڑی خوشی اور حقیقت کو برداشت نہیں کر پایا تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی۔ میں نے اسے سنبھال لیا اور پھر سہارا دے کر نرم کھالوں کے بستر پر لٹا دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

اسی وقت کچھ شور سا ہوا۔ میں نے چونک کر اوپر دیکھا۔ سوراخوں سے حسیف کے مسلح غلام نیچے کود رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے لپک کر اپنا کھانڈا اٹھا لیا۔

احرس تک پہنچنے کے بعد اب میں کوئی ایسی رکاوٹ برداشت نہیں کر سکتی تھی جو میری کامیابی کو ناکامی میں بدل دیتی۔ میری رگوں میں خون کھول اٹھا' بازوؤں میں بجلیاں تڑپنے لگیں اور آنکھوں میں آتش فشاں بھڑکنے لگا۔

میں حملہ آوروں کے لئے قہر کی دیوی بن گئی۔ میرا کھانڈا بجلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ حسیف کے غلام زندگی کی قید سے آزاد ہونے لگے۔ میرے حلق سے ایسی غراہٹیں نکل رہی تھیں جیسے کوئی شیرنی گیدڑوں کے ہجوم میں گِھر گئی ہو۔ سہمی ہوئی لڑکیاں ایک گوشے میں سمٹی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

میرے لئے حیران کن بات یہ تھی کہ حسیف کے غلام مجھے کوئی زخم لگانے کی بجائے مجھ پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے مگر میں غیظ و غضب میں ہونے کے باوجود ہر طرف سے باخبر تھی۔ کسی کو بھی میرے قریب پھٹکنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ غلاموں کی آمد کا تانتا بندھ گیا تھا۔ ایک مرنے والے کی جگہ چار غلام لے لیتے تھے۔ انہوں نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اب مجھے کھنڈا چلانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔

مرنے والوں کی چیخیں اور ہتھیاروں کے ٹکرانے کا ہیبت ناک شور احرس کو بھی جیسے ہوش میں لے

آیا۔ غالباً خلاف توقع صورت حال دیکھ کر ہی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے ٹھٹک کر اس طرف دیکھا اور یہی میری غلطی تھی۔ حصیف کے غلاموں نے مجھ پر دھاوا بول دیا اور میں بے بس ہو گئی۔ میں چیختی چلاتی ہی رہ گئی اور میری مشکیں کس دی گئیں۔ میری آنکھوں پر ایک چرمی ٹکڑا باندھ دیا گیا۔

وہ شیطان کی آنت کی طرح بل کھاتی ہوئی کوئی سرنگ ہی تھی جس میں مجھے کئی ہاتھوں نے زبردستی اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ میری مشکیں بندھی ہوئی تھیں اور میں لڑھکتے ہوئے پتھر کی طرح پٹخنیاں کھاتی نشیب کی طرف پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ چوٹوں اور ضربوں کی شدید اذیت نے مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔

سرنگ زیادہ طویل ثابت ہوئی۔ اس کے اختتام پر لمحے بھر کو میں نے اپنا جسم خلا میں محسوس کیا' کولہوں کے بل ٹھوس زمین پر جا گری۔ شدید چوٹ آئی تھی مگر میں برداشت کر گئی۔ پھر کئی ہاتھوں نے مجھے کھینچ تان کر کھڑا کر دیا۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے کسی طرف لے چلے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم جیسے کسی ستون کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا گیا ہے۔ پھر کسی نے میری آنکھوں پر بندھا ہوا چرمی ٹکڑا کھینچ لیا۔ تیز روشنی کے سبب میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ چند لمحوں کے بعد ہی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہو سکی تھی۔

میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یوں لگا جیسے مجھے پاتال میں پھینک دیا گیا تھا' مگر نہیں میں یقیناً کسی پہاڑ کے پیٹ میں تھی۔ کھردری اور کٹی پھٹی سنگی دیواروں سے گھری ہوئی وہ بہت کشادہ سی جگہ تھی' ہر طرف سے بند' جا بجا چٹانوں اور رخنوں میں مشعلیں روشن تھیں۔ کئی نیم برہنہ لڑکیاں' ننگی تلواریں لئے اِدھر اُدھر کھڑی تھیں۔ ان کے جسموں پر' لباس کے نام پہ مختصر سی کھالیں بندھی ہوئی تھیں جو ان کے جسم ہی کا حصہ معلوم ہو رہی تھیں۔ میرے سامنے کچھ فاصلے پر الاؤ دہک رہا تھا۔ بھڑکتی ہوئی آگ کے دوسری طرف مسند نما اونچی چٹان پر ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے سر پر کسی جانور کی کھال سے بنی ہوئی گول سی لمبی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں ایک عجیب سا عصا تھا۔ اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا مگر پُروقار لباس تھا۔ چہرے پر داڑھی اور مونچھیں بھی تھیں مگر اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس کی شخصیت مضحکہ خیز نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

اس شخص کے پیچھے تین حسین ترین جسموں والی لڑکیاں ساکت و جامد کھڑی تھیں۔ ان کے جسموں پر بھی لباس کسی تہمت کی طرح تھا۔ ان کے گداز و متناسب بدن آگ کی روشنی میں دہک رہے تھے۔ ان کے چہروں سے نیم برہنگی کا کوئی تاثر نہیں ملتا تھا۔

میری نظریں اِدھر اُدھر سے پلٹ کر جب اپنی دائیں بائیں اٹھیں تو میں چونک اٹھی۔ میری طرح دائیں جانب ایک سنگی ستون سے نضار بندھا ہوا نظر آ رہا تھا اور اسی کے بعد ذرا فاصلے پر ایک اور ستون سے مہا پجاری بندھا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے بے حد نڈھال نظر آ رہے تھے۔ بائیں جانب بھی سنگی ستون تھے۔ پہلے ستون سے احرس' پھر بقیہ دو ستونوں سے ایک بوڑھا اور ایک نوجوان بندھا تھا۔ وہ دونوں ہی میرے لئے قطعی اجنبی تھے۔ چھ ستونوں کے علاوہ وہاں نیم دائرے کی صورت میں ایک ستون

اور تھا مگر وہ خالی تھا۔

باری باری نضار اور مہا پجاری سے میری نظریں ملیں اور پلٹ آئیں۔ خلاف توقع ان کے چہرے سپاٹ اور بے تاثر تھے۔ جیسے وہ دونوں اپنے حواسوں میں نہ ہوں۔ احرس تو پہلے ہی سے نیم بے ہوش سا تھا۔ میرا یہ شبہ اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ ان تینوں کو کوئی ایسا مشروب پلایا گیا ہے جس نے ان کے جسموں کو شل اور ذہنوں کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا ہے۔ احرس اور مہا پجاری کی حالت تینوں میں زیادہ خراب لگ رہی تھی۔ وہ دونوں زیادہ عرصے سے قید میں تھے۔ نضار پھر بھی ان دونوں سے قدرے بہتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔

میری نظریں کچھ دیر میں گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد اس مضحکہ خیز صورت والے مدقوق و مجہول شخص پر مرکوز ہو گئیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہی حصیف ہو سکتا تھا جو خود کو ہرباش دیو کا ہرکارہ کہتا تھا۔

"خوش آمدید اے میری قربانیو! اور اے مجھے نئی زندگی دینے والو! تم سب اس وقت ہرباش کے ہرکارے حصیف کے سامنے کھڑے ہو۔" بوڑھے حصیف کے ہونٹوں سے کھرکھراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ "یہ وقت ایک مدت کے بعد آیا ہے کہ ساتوں قربانیاں' ہرباش نے میرے لئے یک جا کر دیں اور اے سانپ کے پھن والی! تیرا تو مجھے ایک مدت سے انتظار تھا۔" وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ میں اس پر حیران تھی کہ وہاں ستونوں سے صرف چھ افراد بندھے ہوئے تھے اور وہ سات کا ذکر کر رہا تھا' مگر کچھ دیر اور وہاں گزارنے کے بعد مجھے ساتویں قربانی کا علم بھی ہو گیا۔ حصیف اب اپنی غیر انسانی سی آواز میں کہہ رہا تھا۔ وہ میری ہی طرف متوجہ تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں دہکتے ہوئے انگارے میرے جسم کو جلائے دے رہے ہوں۔ "سن اے سانپ کے پھن والی! میں تجھے تیرے اسی نام سے پکاروں گا جس سے تُو جانی پہچانی جاتی ہے۔ میں تیرا اصل نام جانتا ہوں' مگر تیرا پردہ رکھوں گا۔ تجھے میں نے بڑی مشکل سے پایا ہے اور تُو ہی میری وہ آخری قربانی ہے کہ جس کے بعد ایک نئی زندگی مل جائے گی' لیکن ابھی میں یہ ذکر نہیں کرتا۔ تجھے تو اے سانپ کے پھن والی آتون! ابھی چند روز اور جی کر مجھ پر قربان ہونا ہے۔ آج تو پہلی قربانی کا دن ہے اور اس قربانی کو بہت جلد اس قربان گاہ تک لایا جانے والا ہے۔ بہت ہی حسین و نازک ہے وہ قربانی' میں اسے برت چکا ہوں۔"

"نہیں۔" اچانک میری بائیں جانب بندھا ہوا نوجوان پوری قوت سے چیخ اٹھا۔ "تُو ہرگز ایسا نہیں کر سکتا اے منحوس بوڑھے!"

"اے میرے دشمن کے بیٹے ژاغون! تیرے چیخنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ تیری حسین و نوجوان محبوبہ اب کنواری نہیں رہی۔ اس کے ساتھ میں کئی حسین و یادگار راتیں گزار چکا ہوں اور سن' اگر سننے کی تجھ میں تاب ہے اے ژاغون کہ تیری محبوبہ مجھ سے خوش تھی' مگر آج کیوں کہ ساتوں قربانیاں جمع ہو چکی ہیں اس لئے پہلی قربانی ضروری ہے اور آج ہی تیری محبوبہ مجھ پر قربان ہو جائے گی۔ سانپ کے پھن والی آ چکی کہ جس کا مجھے انتظار تھا ورنہ میں تیری محبوبہ کو مزید خوشیاں عطا کرتا اے

ژاغون! اے میرے دشمن اقوئی کے بیٹے!"

کچھ دیر کو بوجھل سا سکوت طاری رہا اور پھر وہی نوجوان کہ جسے ژاغون کہا گیا تھا' شکست خوردہ سی آواز میں بول اٹھا۔ "تُو غلط سمجھ رہا ہے۔ یقین کر کہ میں' اقوئی کا بیٹا نہیں ہوں۔"

حصیف کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا۔ پھر اس نے تمسخرانہ لہجے میں ژاغون سے کہا۔ "تو کیا پھر تُو دیوتاؤں کی اولاد ہے؟"

"سن' میں بھی پہلے خود کو اسی بوڑھے اقوئی کا بیٹا سمجھتا تھا' مگر یہ غلط ہے۔ میں آلوس زادہ ہوں۔" ژاغون نے اپنے بارے میں بتایا۔

میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ میں "آلوس زادہ" کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی اور میں ہی کیا' ان پہاڑی بستیوں میں رہنے والے سبھی لوگ اس کا مطلب سمجھتے تھے۔ "آلوس زادہ" اس انسانی بچے کو کہا جاتا تھا جسے کسی مادہ ریچھ نے دودھ پلایا ہو۔ ایسے کسی بچے کو دیوتاؤں کی عطا اور ان کی رحمت و برکت سمجھا جاتا ہے۔

"تُو اور آلوس زادہ! تُو جو چوہوں سے زیادہ کمزور ہے۔" حصیف ہاتھ نچا کر بولا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ "شاید تُو اپنی ناکامی پر عقل کھو بیٹھا ہے یا اپنے انجام سے خوفزدہ ہے۔"

"ژاغون موت سے نہیں ڈرتا۔" وہ زخمی شیر کی طرح دھاڑا۔ "مگر میں .... میں تجھے حقیقت سے ضرور آگاہ کروں گا۔"

"چل اپنی یہ حسرت بھی نکال لے ورنہ میں تیری زبان بھی بند کر سکتا ہوں۔" حصیف نے ژاغون کو بولنے کی اجازت دے دی۔

"سن اے بے خبر بوڑھے!" ژاغون کہنے لگا۔ "یہ اب سے برسوں پہلے کی بات ہے کہ تیرا دشمن اور میرا باپ کہلانے والا اقوئی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بیطال کے جنگلوں میں شکار کھیلتا پھر رہا تھا اور شرجیا بھی اس کے ساتھ تھا کہ جس نے مجھے یہ واقعہ بتایا۔ انہی تاریک جنگلوں میں وہ واقعہ پیش آیا جو میری زندگی اور بستی گوروس کا ایک اہم راز بن گیا۔ انجانے میں اقوئی ایک کھوہ کے منہ پر پہنچ گیا۔ اس کھوہ سے ایک ریچھنی غراتی ہوئی باہر نکل آئی جس کی چھاتیوں سے ایک انسانی بچہ چمٹا ہوا تھا اور .... اور وہ میں تھا' آلوس زادہ! کسی عورت کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ جسے ایک ریچھنی نے دودھ پلایا تھا۔"

میں پوری توجہ اور انہماک سے ژاغون کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ چند لمحوں سانس لینے رک گیا تھا۔

"دیوتاؤں کے قانون کے مطابق سردار اقوئی کا فرض تھا کہ وہ ریچھنی کو ہلاک کر کے اس سے مجھے چھین لیتا۔" ژاغون پھر اپنی داستان بیان کرنے لگا۔ "اب سردار اقوئی کا یہ فرض ہو گیا تھا کہ وہ باپ کی طرح میری پرورش کرتا۔ اقوئی اگر اکیلا ہوتا تو وہ کسی آلوس زادے کو دیکھ لینے کے باوجود شاید دیوتاؤں کے قانون سے بغاوت کر دیتا اور اپنی راہ لیتا' مگر وہ اپنے ساتھیوں کی وجہ سے مجبور تھا۔ اسے دیوتاؤں کا فیصلہ ماننا پڑا۔ یوں میں اقوئی کی گود میں آیا۔ میرے لئے پہلے ہی روز سے اس کے دل میں نفرت کی گرہ پڑ گئی تھی لیکن وہ بے بس تھا۔ اے حصیف! تُو بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہو گا کہ دیوتاؤں کو ماننے والے کسی آلوس زادے کے لئے اپنے دل میں کتنی عزت رکھتے ہیں' اس کا مرتبہ کتنا بلند ہوتا ہے۔ اس کی کسی خواہش کو رد نہیں کیا جا سکتا حتیٰ کہ پہلے سردار کی موت کے بعد قبیلے یا بستی کی حکمرانی بھی اسی کو ملتی ہے۔ یہی وہ بات تھی جو پہلے ہی دن سے اقوئی کے دل میں کسی کانٹے کی طرح اتر گئی تھی۔ اقوئی اس وقت خود ایک بیٹے کا باپ تھا جو اس کے بعد بستی کا سردار ہوتا' مگر اب آلوس زادہ اس کی گود میں آ چکا تھا۔ دیوتاؤں کے قانون کی رو سے اب اقوئی کے بیٹے سے جانشینی کا حق چھن چکا تھا' مگر اقوئی کا ذہن اس حقیقت کو ماننے پر تیار نہ تھا۔ وہ ایک آلوس زادے کے فتنے کو پالنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید وہ مجھے ٹھکانے ہی لگا دیتا مگر دیوتاؤں کے قہر سے ڈر گیا۔ تب اس نے میری اصلیت کو پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ بڑا نہ سہی مگر یہ بھی ایک جرم ہی تھا۔ اقوئی اپنے بیٹے کی خاطر یہ جرم کرنے پر تیار ہو گیا۔ تب اس نے ایک چال چلی اور شرجیا نے بھی جاں نثاری و وفاداری کے جوش میں اس کا ساتھ دیا۔ اقوئی اور شرجیا نے اپنے ساتھیوں کو وہیں جنگل میں زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ بستی میں واپس پہنچ کر انہوں نے ایک من گھڑت داستان سنا دی کہ ہمارے ساتھی ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور یہ کہ میں انہیں ویرانے میں ایک ایسی کٹیا میں بھوک سے بلکتا ملا جس کے باہر کسی عورت کی مسخ شدہ لاش پڑی تھی' اقوئی نے مجھے ترس کھا کر اٹھا لیا اور اپنا بیٹا بنا لیا۔ یوں اقوئی' آلوس زادے کی حقیقت کو چھپا گیا اور اس نے اپنے بیٹے کی جانشینی کا حق محفوظ کر لیا۔ مجھے اسی لئے آلوس زادہ ہونے کے باوجود وہ عزت و توقیر نہ ملی جو دیوتاؤں نے میرا مقدر کی تھی۔ بتا اے حصیف! اب تو تجھے یقین آ گیا کہ میں اقوئی کا بیٹا نہیں ہوں۔" ژاغون نے اپنی داستان کے آخر میں متوقع نظروں سے حصیف کی طرف دیکھا۔

"ہاں مجھے یقین آ گیا' مگر اس بات پر اے میرے دشمن اقوئی کے بیٹے کہ تُو مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے' مگر یاد رکھ کہ ہرباش دیوتا کے ہرکارے کو کوئی فریب نہیں دے سکتا۔" حصیف نے پُرنخوت لہجے میں کہا۔ "میں نے اقوئی کی نسلوں سے انتقام لینے کی قسم کھائی تھی اور میں انتقام ضرور لوں گا۔ یہ میرے انتقام کا پہلا حصہ ہے۔" حصیف کی آواز سے شدید نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"مجھے پھر کہنے دے کہ تُو دھوکہ کھا رہا ہے۔" ژاغون ایک مرتبہ پھر بول اٹھا۔ "اگر تُو واقعی ہرباش دیوتا کا ہرکارہ ہے' اقوئی کا دشمن ہے تو سن کہ میں تیرے ساتھ ہونے والے ظلم کی روداد سن چکا ہوں' مگر اس ظلم کا بدلہ تُو اقوئی اور اس کے بیٹے سے لے۔"

"تیری محبت میں اقوئی تیرے پیچھے کبیت تک چلا آیا اور پکڑا گیا کہ یہاں آ کر کوئی بچ کے نہیں نکل سکتا۔ کیا اب بھی تُو اسے باپ کہنے سے انکار کرے گا؟" حصیف نے ژاغون ہی کے قریب دوسرے ستون سے بندھے ہوئے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ "اچھا میں خود اقوئی سے یہ تصدیق کرائے دیتا ہوں اے ژاغون کہ تُو اسی کا بیٹا ہے۔" پھر حصیف نے اقوئی کو مخاطب کیا۔ "بول اے میرے دشمن! کیا یہ تیرا بیٹا نہیں؟"

"نہیں۔" بوڑھے اقوئی نے اطمینان سے جواب دیا۔

حصیف دھاڑتا ہوا اقویٰ کی طرف بڑھا۔ "کیا میری دہشت بھوت بن کر تم دونوں سے چمٹ گئی ہے کہ اپنا رشتہ بھی بھلا بیٹھے ہو؟"

"تُو خوب جانتا ہے کہ میں کبھی تجھ سے خوفزدہ نہیں ہوا۔" اقویٰ کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"تو پھر جھوٹ کو اپنی ڈھال کیوں بناتا ہے؟"

"حقیقت یہی ہے کہ یہ آلوس زادہ ہے۔ دیوتاؤں نے اسے میری جھولی میں ڈال دیا تھا۔" اقویٰ بولا۔

حصیف نے پھر گرجدار غیرانسانی سا قہقہہ لگایا' پھر کہنے لگا۔ "میں تیری کسی بات پر یقین نہیں کروں گا۔ تُو بہت مکار ہے اے اقویٰ! لیکن اب میں تیرے فریب میں نہیں آؤں گا۔ میں نے تیری نسلوں سے بھی انتقام لینے کی قسم کھائی تھی اور آج تُو میرا انتقام دیکھے گا۔"

اقویٰ تو قطعی پُرسکون معلوم ہو رہا تھا مگر ژاغون بہت بے چین نظر آ رہا تھا۔

"سن اے اقویٰ!" حصیف پھر بولا۔ "کیا تجھے وہ رات یاد ہے جب تُو اپنا لشکر لے کر اس بستی پر چڑھ دوڑا تھا' میں جو اس بستی کا تجھ سے پہلے نمبردار تھا؟ تُو نے میری بستی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ رات کی دیوی تیری مددگار بن گئی تھی اور میری بیوی ژینا بھی تیری بربریت کا نشانہ بن گئی تھی۔ یاد ہے اے اقویٰ! تجھے وہ رات؟" حصیف کی آواز سے شعلے لپک رہے تھے۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔ میں بھلا اپنے دشمن کی شکست و ذلت کی رات کو کیسے بھلا سکتا ہوں۔" اقویٰ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

حصیف الاؤ کے پاس آ کر رک گیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ماضی کے تلخ تصورات کا کرب و الم اس کی آنکھوں اور چہرے سے عیاں تھا۔ اس نے اقویٰ کی بات ختم ہوتے ہی کہا۔ "اے میرے دشمن! اس رات میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک زندہ رہوں گا' تیرے لئے قہر و غضب بنا رہوں گا' تجھے ہی نہیں تیری نسلوں کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا.......... تُو خوب جانتا ہے کہ مجھے اپنی بیوی ژینا سے کتنی محبت تھی۔ میں اسی لئے میدان چھوڑ کر بھاگا تھا کہ اپنی زندگی بچا سکوں اور میرے ساتھ میرا انتقام بھی زندہ رہے۔ میں پہاڑوں اور جنگلوں میں کسی بے چین روح کی طرح بھٹکتا رہا۔ آگ اگلنے والے کسی پہاڑ کی سی دہشت میرے اندر سمائی ہوئی تھی۔ میں انتقام کی خواہش میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ تب میں نے دیوتاؤں سے بلک بلک کر دعا مانگی کہ وہ اپنی قوتوں کا کچھ حصہ مجھے عطا کر دیں تاکہ میں اپنی قسم کا بوجھ اتار سکوں اور پھر مجھے دھواں اگلنے والے ایک پہاڑ کے اندر کنج دیوتا کا بیٹا ملا جو دہکتے ہوئے لاوے کے درمیان ایک چٹان پر صدیوں سے اپنے سینے پر ہاتھ باندھے بیٹھا تھا۔ اس کی کھوپڑی پر گوشت کا ایک ریشہ بھی موجود نہ تھا لیکن بدن جوان تھا۔ اسے میری دیوانگی پر رحم آ گیا۔ تب اس نے مجھے اپنی قوتوں کا ایک معمولی سا حصہ بخش دیا اور مجھے ہرباش دیوتا کا ہرکارہ بنا کر کیبت کے اس پہاڑ کی بلندی پر اتار دیا جس کے پیٹ میں تُو بھی اس وقت موجود ہے۔ میں نے کنج دیوتا کے بیٹے ہرباش سے صدیوں کی بھیک

مانگی تھی تاکہ جب تک اس زمین پر پہاڑ اور ان کے نیچے یہ زمین دبی رہے اور تیری نسل کے لوگ اس پر پنپتے نظر آئیں' میں ان سے تیرے ظلم کا انتقام لیتا رہوں۔ اس نے مجھے صدیوں کی زندگی اپنانے کا بھید بتا دیا تھا۔ تُو جانتا ہے اے اقویٰ کہ وہ بھید کیا ہے؟" حصیف نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا' پھر خود ہی جواب کا انتظار کئے بغیر بتانے لگا۔ "کنج کے بیٹے ہرباش نے کہا تھا کہ اس کے لئے مجھے سات دن تک سات قربانیاں دینا لازمی ہیں۔ پھر مجھے صدیوں زندہ رہنے سے کوئی نہ روک سکے گا۔ پہلی قربانی کے لئے ایک ایسی کنواری کو تلاش کرنے کی شرط تھی جس کے سینے پر بائیں طرف سورج دیوتا کی پجاری کے لبوں کا داغ ہو۔ مجھے اس کنواری کے بدن سے لہو کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر اس میں اشنغف کا سفوف اور ریدن کا رس ملا کر پینا ہو گا۔ اس کے بعد مسلسل پانچ دن تک روزانہ آگ اگلنے والے پہاڑ کے پیندے میں کھولتے لاوے کے اوپر ایک انسان کی قربانی دینا ہو گی۔ شرط یہ تھی کہ ان پانچوں کا تعلق کیبت سے نہ ہو۔ یہ پانچ قربانیاں دینے سے پہلے اور بعد میں مجھے آگ کی پرستش کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یوں بھی قربانیاں دینے کے بعد ساتویں قربانی کے لئے مجھے ایک ایسی کنواری کی ضرورت تھی جس کی کوئی نشانی قہر کے دیوتا مجھے خود بتا دیں کہ میں انہی کا پجاری ہوں۔ سو قہر کے دیوتاؤں نے برسوں پہلے مجھے اس کنواری کی نشانی بتا دی اور نام بھی۔ یہ بھی کہ وہ کس سمت میں ملے گی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس بار جس کنواری کو ساتویں قربانی کے لئے منتخب کیا گیا ہے' اس کے دائیں شانے پر سانپ کے پھن کا نشان ہے۔ سو مجھے ہرباش دیوتا نے بتایا کہ سات دن تک سات قربانیاں دینے اور آگ کی پرستش کرتے رہنے کے بعد نئی جوانی اور نئی زندگی مل جائے گی۔ میرا سوکھا سڑا بدن اپنی پہلی اور ساتویں قربانیوں' یعنی دو نشان زدہ کنواریوں کا خون پی کر بالکل ہرا بھرا ہو جائے گا۔" اس کے بعد حصیف دیوانوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔

حصیف کی یہ عجیب اور ہولناک داستان سن کر میرا دل دہل گیا۔ اب خطرہ پوری طرح مجھ پر واضح ہو گیا تھا۔ مہا پجاری' احرس اور نضار کے ساتھ میری زندگی بھی شدید خطرے میں تھی۔ یہ ایک الگ اور بڑا مسئلہ تھا کہ میرا زہریلا خون پی کر خود وہ شیطان بھی زندہ نہ بچتا' مگر اس سے پہلے وہ میرے جسم کا تو سارا خون نچوڑ کر مجھے ہلاک کر چکا ہوتا۔ وہ جن دیوتاؤں کے نام لے رہا تھا' میں نے اس سے پہلے کبھی یہ نام نہیں سنے تھے۔ اب مجھے اس پر یقین آ چکا تھا کہ حصیف پُراسرار شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔ اس نے اپنی انہی پُراسرار قوتوں کے ذریعے میرا سراغ لگایا تھا اور پھر مجھے زیر دام لانے کے لئے مہا پجاری اور احرس کو قید کر لیا تھا۔ تب ہی تو وہ چند روز سے یہ کہہ رہا تھا کہ میں ایک نہ ایک روز ادھر ضرور آؤں گی اور اس کا کہا بالکل سچ ہوا تھا۔ مجھے اپنی موت کا کوئی غم نہیں تھا' اگر رنج تھا تو صرف یہ کہ میں ژیان سے انتقام نہ لے سکوں گی۔ اقویٰ اور حصیف کے درمیان بھی انتقام ہی کا مضبوط رشتہ تھا جس کی تفصیل مجھے معلوم ہو چکی تھی۔ اس طرح ایک طرف تو حصیف کو قربانیاں پیش کر کے صدیوں کی زندگی ملنے والی تھی' دوسری جانب اس کے انتقام کا گویا پہلا حصہ بھی مکمل ہونے والا تھا۔ کیوں کہ وہ اقویٰ کی آئندہ نسلوں تک انتقام کے اس سلسلے کو پھیلانا چاہتا تھا۔ اس نے میرے تینوں ساتھیوں کو عضو معطل بنا دیا تھا ورنہ شاید فرار کی کوئی صورت نکل آتی۔ اگر میں ہی اس کے ہتھے نہ چڑھتی تو یقیناً اپنے ساتھیوں کو اس کی قید سے

رہائی دلانے کی کوشش کرتی۔

کچھ دیر تک سکوت طاری رہنے کے بعد اچانک ژاغون نے حسیف کو مخاطب کیا۔ "تو کیا شرجیا کی بیٹی اور میری محبوبہ کو تیرے غلام اسی لئے اٹھا کر لائے تھے؟"

"ہاں۔" حسیف نے جواب دیا۔ "جب مجھے اپنی ناتوانی کا احساس ہوا اور میرا جسم میری کوکھ سے نمک حرامی کرنے لگا تو میں نے کنج کے بیٹے کے بتائے ہوئے فعل کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ تب میرے حکم پر میرے غلام زمین پر پھیل گئے۔ یہ کام آسان نہ تھا' مگر مجھے یقین تھا کہ میرے غلام بہت جلد نشان زدہ دونوں کنواریوں کو تلاش کر لیں گے اور ناکام نہیں لوٹیں گے۔ میں بے چینی سے ان کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ تب ایک دن میرا ایک غلام واپس آیا۔ اس نے خبر دی کہ ایک نشان زدہ کنواری تلاش کر لی گئی ہے' مگر دوسری سانپ کے پھن والی نہیں ملی۔ مجھے بتایا گیا کہ جو کنواری مل چکی ہے' وہ گوروس میں رہتی ہے اور وہ تیرے بیٹے ژاغون کی محبوبہ ہے تو میرا انتقام جاگ اٹھا۔ میں نے ایک تدبیر سوچ لی۔ میرے غلام اس کنواری کو اٹھا کر گوروس سے یہاں لے آئے اور میرا ایک غلام خود میرے ہی حکم پر وہیں رک گیا تاکہ تجھے اے ژاغون میرے بارے میں خبر دے سکے .... اور اے اقویٰ! مجھے یقین تھا کہ میرے غلام کے سینے پر میرا مخصوص نشان دیکھ کر تو مجھے پہچان لے گا۔ پھر تو اپنے بیٹے کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا یہاں ضرور آئے گا اور گھیر لیا جائے گا۔ دیکھ لے اے میرے دشمن اقویٰ کہ تجھے اور تیرے بیٹے ژاغون کو گھیر لیا گیا۔"

"نہیں .... نہیں۔ میں' اقویٰ کی اولاد نہیں۔" ژاغون پوری قوت سے چیخ اٹھا۔ "تیری دشمنی اقویٰ سے ہے' تو انتقام بھی اسی سے لے۔ شرجیا کی بے گناہ بیٹی پر ظلم مت ڈھا۔ ورنہ میں تیرے لئے قہر کا نہ رکنے والا طوفان بن جاؤں گا۔" ژاغون کی آواز میں پھٹتے ہوئے آتش فشاں کی سی گرج تھی اور آنکھوں سے خون سا ٹپک رہا تھا۔

"قہر کا دیوتا تو اس وقت حسیف کے سر پر ناچ رہا ہے۔" حسیف' ژاغون کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ "اب تم دونوں باپ بیٹے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھو گے' مگر حرکت نہ کر سکو گے۔ تمہارے منہ میں موجود لوتھڑا پتھر کی طرح سخت ہو جائے گا تاکہ تم بول بھی نہ سکو اور میں تمہاری بے بسی دیکھنے کا لطف بھی اٹھاؤں۔" حسیف پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

"رک جا شیطان! باز آ جا اپنے ارادے سے۔" ژاغون کی آواز پھٹ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ چری بندھن توڑنے کی کوشش کر رہا ہے' مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر وہ چند لمحوں کے لئے بھی آزاد ہو جاتا تو حسیف کے جسم کی دھجیاں بکھیر دیتا۔ وہ چیختا چلاتا رہا' مگر حسیف پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اقویٰ سر جھکائے خاموش کھڑا تھا' قطعی پُرسکون۔ اس کی طمانیت میرے لئے تعجب خیز تھی۔

ژاغون کی طرف سے پلٹ کر خلاف توقع حسیف میرے سامنے آ کے رک گیا۔ اس کی تیز نظریں مجھے اپنے جسم میں نشتر کی طرح اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ معلوم نہیں میرے چہرے پر اس وقت کیسے تاثرات تھے۔ شاید رنج کے آثار رہے ہوں۔ وہ بوڑھا شیطان اسی لئے اپنے ہاتھ سے میری ٹھوڑی او

اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ارے تو کیوں ملول ہے؟" پھر اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ ناچنے لگی۔ "سن اے سانپ کے پھن والی! میں تجھے دنیا سے یوں ملول و افسردہ اور محروم نہیں جانے دوں گا۔ ابھی تیری زندگی میں کئی دن باقی ہیں اور یہ دن رائیگاں نہیں جائیں گے۔ اداس نہ ہو کہ تو اس دنیا سے کنواری رخصت نہیں ہو گی۔"

میری قوت برداشت جواب دے گئی اور میں بھی ژاغون کی طرح کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دھاڑنے لگی۔ میں اس شیطان بوڑھے کو برا بھلا کہہ رہی تھی اور وہ بے حیائی سے ہنس رہا تھا۔ انہی لمحات میں روشنی کی ایک کرن سی مجھے نظر آئی۔ میں زندہ بچ سکتی تھی۔ ابھی میرے پاس وقت تھا اور اگر میں زندہ بچ جاتی تو پھر احرس' نصار اور مہا پجاری کو بھی موت کے منہ میں جانے سے شاید بچا سکتی تھی۔ قرب کے لمحوں کو میں حسیف کے لئے موت کے لمحوں میں بدل سکتی تھی' مگر یہ خوش گمانی صرف چند ہی لمحے برقرار رہ سکی۔ امید کی کرن بجھ گئی۔

حسیف مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "سن' مجھے خبر ہے کہ تو ایک خوبصورت جنگلی بلی ہے۔ تو اپنے تیز ناخنوں سے میرے کئی غلاموں کے جسم ادھیڑ چکی ہے انہیں آخرت کے سفر پر روانہ کر چکی ہے۔ آج رات جب میں اپنی تنہائیوں کو تیرے قرب سے آباد کروں گا تو تیری حالت اقویٰ اور ژاغون جیسی ہو گی۔ ابھی تو خود ان دونوں کو اس حالت میں دیکھے گی۔ یہ دونوں مجسموں کی طرح بے حس و حرکت ہو جائیں گے۔ یہ سب کچھ دیکھیں گے' سنیں گے' محسوس کریں گے' مگر نہ کچھ بول سکیں گے' نہ اپنی جگہ سے خفیف سی حرکت بھی کر سکیں گے۔ اے سانپ کے پھن والی حسین آتون! قرب کے لمحوں میں تیرا حال بھی ایسا ہی ہو گا۔ کیوں' یہی ٹھیک رہے گا نا۔" پھر وہ پلٹا اور لڑکیوں سے مخاطب ہوا۔ "اے حسیف کے دل کی دھڑکنو! اقویٰ اور ژاغون پر حسیف کا عذاب مسلط کر دو تاکہ سانپ کے پھن والی کو میری سچائی کا یقین ہو جائے۔"

پھر میری آنکھوں نے اقویٰ پر حسیف کا عذاب مسلط ہوتے دیکھا اور یہ سوچ کر کانپ اٹھی کہ آج رات کے کسی حصے میں میرے ساتھ بھی یہی ہونے والا تھا۔

اقویٰ سے نمٹ کر اب دونوں لڑکیاں' ژاغون کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں تیز دھار خنجر تھا جو اقویٰ کے لہو سے سرخ ہو رہا تھا۔ دوسری لڑکی نے پتھر کا بنا ہوا کھلے منہ والا بے ڈھنگا سا برتن اٹھا رکھا تھا۔ دونوں لڑکیاں کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی ژاغون کے پاس آ گئیں۔ ان کے چہرے سپاٹ سے تھے حالانکہ انہوں نے ابھی چند ہی لمحے پہلے ایک ظالمانہ فعل انجام دیا تھا۔ ہاں مجھے ان کی آنکھوں میں ایک خواب ناک تاثر ضرور نظر آ رہا تھا جس کی تہہ میں ہلکی سی سراسیمگی تھی جو ان کے دلوں میں موجود وہاں حسیف کی موجودگی و خوف کا عکس ہو سکتا تھا۔

ژاغون دیوانوں کی طرح چلا رہا تھا۔ کبھی وہ فریاد کرنے لگتا اور کبھی وحشی عفریت کی طرح دھاڑنے لگتا۔ وہ اقویٰ کو بھی گالیاں دے رہا تھا اور اقویٰ اب کسی مجسمے کی طرح ساکت و جامد کھڑا تھا۔ لڑکیاں' ژاغون کے قریب پہنچیں تو وہ انہیں سخت نظروں سے گھورنے لگا۔ لڑکیوں کی آنکھوں میں پل بھر

کے لئے جذبہ ترحم کی جھلک ابھر کر معدوم ہو گئی۔ پھر ایک لڑکی نے پوری قوت کے ساتھ بڑی بے دردی سے ژاغون کے دائیں بازو میں خنجر گھونپ دیا۔ خنجر اس کے ٹھوس جسم کو چیرتا ہوا نصف تک اندر دھنس گیا۔ ژاغون کا بدن یکبارگی اینٹھ گیا اور ماتھے پر پسینے کے قطرے روشنی میں موتیوں کی طرح جھلملانے لگے۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ چبا ڈالا تھا۔

"اے حسیف! تو میرے جسم سے بوٹیاں اتار لے مگر تجھے دیوتاؤں کا واسطہ کہ تو اپنے ارادے سے باز آ جا۔ میری محبوبہ کی جان نہ لے۔" ژاغون لجاجت آمیز انداز میں چیخا، مگر حسیف ان سنی کر گیا۔ وہ تو ایک نوخیز لڑکی کو آغوش میں سمیٹے بیٹھا تھا۔

ژاغون کے بازو سے جب خنجر ایک جھٹکے سے باہر کھینچا گیا تو گہرے زخم سے خون کا آبشار بہہ نکلا۔ تب دوسری لڑکی نے برتن سے سفوف کی مٹھی بھری اور پھر وہ سفوف زخم میں بھر دیا۔ ژاغون بے اختیار سسک اٹھا تھا۔ اتنی اذیت شاید اسے زخم کھا کر بھی نہیں ہوئی تھی۔

اسی وقت لڑکی نے ژاغون کے دوسرے بازو میں بھی ایک گہرا شگاف ڈال دیا اور اس زخم میں بھی سفوف بھر دیا گیا۔ حیرت انگیز طور پر زخموں سے خون کا بہاؤ ایک دم رک گیا تھا۔ میرے لئے اس طرح بہتے خون کا رک جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ مہا پجاری نے بھی ایک مرتبہ میرے ہاتھوں زخمی ہو جانے والے کے زخم پر کوئی سفوف چھڑک کر بہتا ہوا خون روک دیا تھا۔ یہ واقعہ میرے بچپن کا تھا اور اشر کی بستی کے باہر پیش آیا تھا۔

چند ہی لمحے بعد ژاغون بھی اقوئی کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔

حسیف نے لڑکی کو بے دردی سے ایک طرف دھکیل دیا اور چٹان سے نیچے اتر آیا۔

"کیوں اقوئی! بتا کیا تو نے حسیف کے ایسے انوکھے انتقام کے بارے میں تصور بھی کیا تھا؟" حسیف ہنس پڑا۔ پھر وہ ژاغون کے پاس آ گیا۔ "اے اقوئی کے بدبخت بیٹے! تجھے اپنے باپ کی بوئی ہوئی ظلم کی فصل کاٹنا پڑ رہی ہے ورنہ تو ایسا نوجوان ہے کہ میں اپنے دل میں تیرے لئے رحم پاتا ہوں۔ دیوتاؤں کی قسم 'حسیف مجبور ہے۔ میں' اقوئی کی نسلوں سے بھی انتقام لینے کی قسم کھا چکا ہوں اور یہ سلسلہ اس کے دوسرے بیٹے کی نسل کے ساتھ جاری رہے گا۔" پھر حسیف وہاں سے ہٹ کر سامنے کی دیوار کے پاس چلا گیا۔ وہاں میں نے اسے ایک چھوٹے سے سوراخ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے دیکھا۔ وہ سوراخ میں منہ ڈال کر چلایا۔ "لڑکی کو لے آؤ اور غدار سامر کو بھی۔"

سامر کا نام سن کر میں چونک اٹھی۔ میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ لفظ غدار نے مجھ پر ساری حقیقت ظاہر کر دی تھی۔ وہ غریب بلا سبب صرف میری محبت کے فریب میں مبتلا ہو کر شاید مارا جانے والا تھا۔ غداروں کی سزا ان بستیوں میں عبرت ناک موت ہی تھی۔

احرس تو خیر تقریباً نیم بے ہوش سا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی بند تھیں، مگر مہا پجاری اور نضار دونوں ہوش میں ہونے کے باوجود بالکل لاتعلق سے تھے۔ وہ اس وقت بھی کچھ نہیں بولے تھے جب حسیف مجھ

سے بے حیائی کی باتیں کر رہا تھا۔ غالباً کسی نشے کے زیر اثر وہ یوں ہر شے سے بے خبر سے تھے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک طرف دیوار میں شگاف نمودار ہوا اور حسیف کے غلام اندر داخل ہوئے۔ سامر بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا، کسی وحشت زدہ اور سراسیمہ ہرن کی طرح پریشان جو بھیڑیوں کے غول میں پھنس گیا ہو۔ اس کی آنکھیں بالکل سرخ ہو رہی تھیں۔ اسے بھی شاید کوئی نشہ آور مشروب پلایا گیا تھا۔ حسیف کو شاید اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے سامر کی غداری کا علم ہو گیا تھا۔

دو غلاموں نے ایک تختہ اٹھا رکھا تھا جس پر کسی لڑکی کا نیم برہنہ بے ہوش جسم پڑا تھا۔ وہ سب اس بڑی چٹان کے سامنے جا کر رک گئے جو ژاغون کی نگاہوں کے عین سامنے تھی۔ لڑکی کو چٹان پر الٹ دیا گیا۔ سارے غلام حسیف کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ ان میں سامر بھی شامل تھا۔

"واپس جاؤ اور میری پکار کا انتظار کرو۔" حسیف نے پُرجلال لہجے میں حکم دیا اور غلام وہاں سے اٹھ کر نکل گئے۔ سامر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا بدن رعشے کا شکار تھا اور سر سینے پر جھکا ہوا تھا۔

حسیف کے حکم پر اس کی کنیزوں نے بے ہوش لڑکی کو چت لٹا دیا۔ میرے لئے یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں تھا کہ وہ بے ہوش لڑکی کون تھی۔ اتنی دیر سے حسیف اسی کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ ژاغون کی محبوبہ ہی ہو سکتی تھی۔ آج رات جسے قربان کیا جانے والا تھا۔ شیطان بوڑھا حسیف اس نرم و نازک اور حسین لڑکی کا خون پینے والا تھا۔

پھر دو لڑکیاں کہیں سے ڈھول کی طرز کے دو ایسے چوبی خول اٹھا لائیں جن کے ایک سرے پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ان ڈھولوں کو ایک دیوار کے قریب رکھ کر ان کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔

حسیف اپنی جگہ سے چلتا ہوا سامر کے پاس پہنچ گیا اور پھنکارا۔ "تو نے حسیف کو دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی۔ تو اپنے جرم سے خوب واقف ہے۔ کیا تو حسیف کے قہر کو بھول گیا تھا، تجھے اس بھول کی سزا ضرور ملے گی۔"

سامر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، مگر وہ نہ چیخا، نہ چلایا۔ نہ اس نے کوئی فریاد کی۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔

میری نظریں سامر ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا جو محض میری وجہ سے سنگدل حسیف کے عتاب کا نشانہ بننے والا تھا۔ میں اس کے لئے اپنے دل میں انتہائی دکھ محسوس کر رہی تھی اور اپنی خود غرضی پر شرمندہ بھی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، کاش اے سامر میں تیری جان بچا سکتی۔ تو نے چند لمحوں کی مسرت کے لئے اپنی پوری زندگی کھو دی۔

اچانک سامر نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ نگاہوں سے نگاہوں کا ٹکراؤ ہوا تو میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے افسردگی اور جذبہ ترحم کا رچاؤ پایا۔ گویا وہ اب بھی میرے لئے متفکر تھا اور اپنے انجام کی پرواہ نہیں تھی۔

اگر میں اس وقت سامر سے کچھ کہہ سکتی تو یہ ضرور کہتی کہ اے سامر! مجھے معاف کر دینا، میں محبت میں سچی نہیں تھی۔ تجھ سے مخلص نہیں تھی۔ میں نے صرف اپنے ساتھیوں کو رہا کرانے کے لئے تجھے

محبت کا فریب دیا تھا۔

اسی لمحے حسیف نے ہاتھ اٹھا کر ڈھولوں کے پیچھے کھڑی ہوئی لڑکیوں کو اشارہ کر دیا۔ لڑکیاں ڈھول پر تھاپ دینے لگیں۔ عجیب بے ہنگم سی آوازیں ابھریں اور حسیف کی تین کنیزیں خنجر لہراتی اس تھاپ پر رقص کرنے لگیں۔ حسیف اپنے سینے پر ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑا تھا۔ نیم برہنہ کنیزوں کا ناچ بھی ڈھولوں کی تھاپ کی طرح وحشیانہ ہوتا چلا گیا۔ وہ سامر کے گرد دائرے کی صورت میں رقص کر رہی تھیں۔ وہ بار بار خنجر تان کر سامر کی طرف یوں جھپٹتیں جیسے خنجر اس کے جسم میں اتار دیں گی۔ سامر جھرجھری لے کر رہ جاتا۔ اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

الاؤ کی روشنی میں رقاصائیں بدروحیں معلوم ہو رہی تھیں۔ ماحول خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ سامر خنجروں سے بچنے کے لئے کبھی ایک طرف گھوم جاتا' کبھی دوسری جانب۔ حسیف یہ وحشت ناک کھیل بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک تینوں رقاصائیں' سامر پر پل پڑیں۔ سامر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لڑکیوں نے اس کا لباس تار تار کر ڈالا۔ سامر کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ وہ میری خود غرضی کی بھینٹ چڑھ رہا تھا۔

ایک رقاصہ پنجوں کے بل تھرکتی ہوئی سامر کے پیچھے پہنچی۔ رقاصہ کا خنجر والا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے لہرایا اور سامر سسک کر گھوم گیا۔ اس کی پشت میری نظروں کے سامنے آ گئی۔ خنجر کی نوک نے اس کی شفاف پشت پر ایک گہری خراش ڈال دی تھی۔ لہو کی دھار اس کے کولھوں پر گر رہی تھی۔ اتنی ہی تیزی کے ساتھ دوسری رقاصہ نے سامر کے دائیں بازو پر چرکا لگایا اور سامر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

رفتہ رفتہ یہ کھیل بربریت کی حدود کو چھونے لگا تھا۔ ایذا رسانی کا یہ کھیل میرے دل کو تڑپا رہا تھا' مگر حسیف کے انداز و اطوار سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے قلبی سکون مل رہا ہو۔ سامر کی درد بھری چیخیں میرے کانوں میں پگھلے ہوئے لاوے کی طرح گھس رہی تھیں۔ اس بے چارے کا جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ رقاصاؤں نے ابھی تک کوئی گہرا زخم تو نہیں لگایا تھا' مگر لحہ بہ لحہ خراشوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ تشدد کی ایک انتہا تھی اور بربریت کی قابل نفرت مثال جس کی مجرم میں خود کو سمجھ رہی تھی۔

پھر جب سامر زخموں کی تاب نہ لا کر لڑکھڑانے لگا تو رقاصاؤں کے خنجر ایک ساتھ اس کے سینے میں پیوست ہو گئے اور میرا دل جیسے کسی نے کچل دیا۔

سامر گر پڑا اور ان بدروحوں نے خون آلود خنجر لہراتے ہوئے اس کے گرد رقص جاری رکھا۔ پھر سامر کے ساتھ ہی ڈھولوں کی تھاپ نے بھی دم توڑ دیا۔ رقص بھی رک گیا۔ حسیف کے حلق سے زوردار قہقہہ ابل پڑا اور میں آبدیدہ ہو گئی۔

حسیف کا اشارہ پا کر کنیزیں' سامر کی لاش کو بڑی بے دردی سے گھسیٹتی ہوئی ایک طرف لے گئیں۔ حسیف نے پلٹ کر اقوئی اور ژاغون کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کسی اندرونی جوش کے تحت چمک رہی تھیں۔ وہ شیطانی انداز میں مسکرایا' پھر اپنی جگہ سے چلتا ہوا بے ہوش لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ درندگی سے بھرپور ایک کھیل ختم ہو چکا تھا اور دوسرا شروع ہونے والا تھا۔

دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر حسیف نے آنکھیں بند کر لیں اور زیر لب کچھ بدبدانے لگا۔ اسی اثنا میں دو کنیزیں اس کے پاس پہنچ گئیں۔ ان میں سے ایک کنیز کے پاس خنجر تھا۔ دوسری کنیز کے ہاتھ میں کچھ برتن تھے جو اس نے جھک کر چٹان کے پاس فرش پر رکھ دیئے۔ ان میں سے ایک برتن کھلے منہ والا اور کافی بڑا تھا۔

حسیف نے آنکھیں کھول کر کنیز سے خنجر لے لیا اور ان دونوں کو پیچھے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ واپس چلی گئیں۔ تب حسیف نے ژاغون کی بے ہوش محبوبہ کا بازو پھیلا دیا۔ اس طرح وہ بازو چٹان سے نیچے لٹکنے لگا۔ حسیف زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور کھلے منہ والا برتن' بازو کے نیچے کر دیا۔ میری نگاہیں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں اس بے ہوش لڑکی کی جگہ خود کو محسوس کر رہی تھی اور گویا خود اپنا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کیوں کہ چند روز بعد حسیف میرا بھی یہی حشر کرنے والا تھا۔ اس وقت ظاہر ہے کہ میں اس لڑکی کی طرح بے ہوش ہوتی اور کچھ نہ دیکھ پاتی لیکن اب اس لمحہ موجود میں مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ میں جیسے اپنے مستقبل میں جھانک رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ہنگم ہو چکی تھیں' مساموں سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ حسیف نے بائیں ہاتھ سے لڑکی کا بازو پکڑ لیا۔

ہرچند کہ اس لڑکی سے میرا کوئی تعلق' کوئی رشتہ نہیں تھا' پھر بھی میں اچانک چیخ اٹھی کہ وہاں اس ظلم کے خلاف کوئی چیخنے والا بھی نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا جو میرے سوا صدائے احتجاج بلند کرتا۔ اقوئی اور ژاغون سے ان کی قوت گویائی خود میرے سامنے چھینی گئی تھی اور میرے تینوں ساتھی تو جیسے اپنے حواسوں ہی میں نہیں تھے۔ میں اگر کچھ اور نہیں تو زبان سے تو حسیف کو ظلم کرنے سے رکنے کے لئے کہہ سکتی تھی۔

"رک جا.......... رک جا اے شیطان! اے مجسم بدی! تُو ایک آلوس زادے کی محبوبہ پر ظلم کر رہا ہے.......... اپنے ناپاک ارادے سے باز آ جا ورنہ تجھ پر دیوتاؤں کا عذاب نازل ہو گا۔" میں چیخے جا رہی تھی۔ نہ جانے اس وقت ژاغون کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔

حسیف جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ وہ جیسے بہرا ہو گیا تھا' کچھ نہیں سن رہا تھا۔ میرے چیخنے چلانے کا اس پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس نے میرے دیکھتے ہی دیکھتے بڑی احتیاط سے بے ہوش لڑکی کی کلائی کی بڑی رگ خنجر سے کاٹ دی۔ کلائی سے خون کی دھار پھوٹ پڑی۔ لڑکی کے بے حس و حرکت جسم نے خفیف سی جنبش بھی نہیں کی تھی۔ یقیناً اس کی بے ہوشی بے سبب نہیں تھی۔ نیچے رکھے ہوئے برتن میں خون گرنے لگا اور مجھے وہ منظر مزید دیکھنے کی تاب نہیں رہی۔ کرب و الم نے میرے ذہن پر دھندلکا سا طاری کر دیا۔

میں نے ادھر سے اپنی نظریں ہٹا لی تھیں' مگر کب تک۔ میری نظریں ذرا ہی دیر کے بعد پھر اسی طرف اٹھ گئیں۔ لڑکی کے بدن کا خون کٹی ہوئی رگ سے بہہ بہہ کر برتن میں جمع ہو رہا تھا۔ حسیف قریب رکھے ہوئے ایک اور برتن سے زرد رنگ کا کوئی سفوف نکال کر خون والے برتن میں چٹکی چٹکی

پھینکتا جا رہا تھا۔ یہ یقیناً اسی سفوف کا اثر تھا کہ خون جم نہیں رہا تھا۔

لمحہ بہ لمحہ لڑکی کے جسم کی رنگت پھیکی پڑتی جا رہی تھی‘ چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ اس کی زندگی کو موت سے قریب تر لے جا رہا تھا۔ برتن میں خون کی مقدار بڑھتی گئی اور لڑکی کی زندگی کی گھڑیاں گھٹتی گئیں۔ پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ ژاغون کی محبوب ترین ہستی زندگی کی حدود پھلانگ گئی تھی۔

لڑکی کے جسم کا تمام خون نچڑ کر برتن میں جمع ہو چکا تھا۔ حصیف دوسرے برتن سے کوئی گاڑھا سیال اس میں ملا رہا تھا۔

پھر حصیف اٹھ کھڑا ہوا۔ خون سے بھرا ہوا برتن اٹھا کر اس نے اپنے منہ سے لگا لیا۔ وہ انسانی خون کو امرت کی طرح پی رہا تھا۔ برتن خالی ہو گیا تو وہ اس کے اندر منہ ڈال کر اسے کتے کی طرح زبان سے چاٹنے لگا۔ کوئی برتن زبان سے چاٹتے ہوئے جیسے کتے کے منہ سے آوازیں نکلتی ہیں‘ ایسی ہی "چپڑ چپڑ" کی آوازیں حصیف کے منہ سے نکل رہی تھیں۔

حصیف نے خون پی کر جب برتن ایک طرف رکھا تو اس کی باچھوں سے لہو کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس وقت وہ کوئی خوں آشام درندہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اتنا زیادہ خون ایک ہی وقت میں پی جانا بھی میرے نزدیک حیران کن بات ہی تھی۔ پھر حصیف نے اقوئی اور ژاغون کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا اور اچھل اچھل کر ناچنے لگا۔ اس مرحلے پر حصیف کی کنیزیں بھی سراسیمہ نظر آ رہی تھیں۔ اس کے شیطانی قہقہے میرے دماغ پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔

اچانک حصیف قہقہے لگاتے لگاتے چپ ہو گیا اور پھر میرے قریب آ کر کہنے لگا۔ "اے سانپ کے پھن والی! تُو نے اپنی قربانی کا منظر دیکھ لیا نا اب مجھے عبادت کرنے جانا ہے کہ میں پہلی قربانی کر چکا ہوں‘ مگر تو بھی میرے ساتھ چلے گی۔ اس طرح آگ کی پرستش کرنے میں میرا دل لگا رہے گا‘ اس خیال سے کہ پرستش کے بعد مجھے تیرا قرب نصیب ہو گا اور ہاں وہی جگہ تیرے ساتھیوں کی قبر بھی بنے گی۔ مشترکہ قبر‘ کیا تُو اپنے ساتھیوں کی مشترکہ قبر نہیں دیکھے گی؟.......... تجھے میں نے جب وقت سے پہلے تیری موت کا منظر دکھا دیا تو پھر اپنے ساتھیوں کی آخری آرام گاہ بھی دیکھ لے۔ یہ رات تیرے لئے بڑی خوشیوں کی رات ہے اور جب یہ رات ختم ہو گی تو تجھے ایک ایسی خوشی مل چکی ہو گی جس کا دنیا میں کوئی بدل نہیں .... ہاں تُو کنواری نہیں رہے گی۔ اقوئی اور اس کے بیٹے ژاغون کو بھی میں ان کی آخری آرام گاہ دکھانے لے جاؤں گا کہ آخر یہ کیوں محروم رہیں .... رہے تیرے ساتھی تو مقدس مشروب پی کر یہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔ انہیں وہاں لے جانا لاحاصل ہی ہے۔ جب میں تجھے ساتھ لے کر یہاں لوٹوں گا تو انہیں ہوش میں لے آؤں گا تاکہ یہ بھی تیری خوشی میں شریک ہو سکیں۔"

وہ شیطان بوڑھا مجھے احرس‘ نصار اور مہا پجاری کے سامنے بے آبرو کرنے کی بات کر رہا تھا۔ میری روح میں نشتر سے اتر رہے تھے۔ اپنی ذلت کے احساس سے میں چیخ اٹھی اور جو بھی برا بھلا منہ میں آیا حصیف کو کہنے لگی۔ مگر وہ جتنا برا تھا اتنا برا لفظ ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔

"چیخ .... جتنا چیخ سکتی ہے اے سانپ کے پھن والی چیخ کہ پھر تجھے چیخنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔" حصیف یہ کہہ کر زور سے ہنسا۔ اسے یقیناً دوسروں کی بے بسی پر قہقہے لگانے سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ پھر وہ ہنستے ہنستے جانے کیا سوچ کر چپ ہو گیا اور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "مگر تُو .... تُو تو جنگلی بلی ہے۔ تجھے یوں وہاں لے کر جانا تو خطرناک ہو گا۔ تُو ویسے بھی اچھی بھلی خوبصورت باتوں پر بلا سبب چیخنے چلانے لگتی ہے۔ کیوں نہ تجھے مہر بہ لب کر دیا جائے .... ہاں یہ ٹھیک رہے گا .... یہ کام بھی اسی وقت ہو جائے تو اچھا ہے۔ پھر نہ تُو یوں چیخ سکے گی‘ نہ زبان چلا سکے گی‘ مگر سب کچھ دیکھے گی‘ سنے گی اور محسوس کرے گی .... ہاں محسوس کرے گی‘ یقین کر کہ اس حالت میں تُو اس خوشی کو بھی پوری طرح محسوس کرے گی جو آج ہی رات میں تجھے بخشوں گا۔" وہ ایک بار پھر گھٹیا پن پر اتر آیا۔

"چپ ہو جا اے کمینے! اے گندی نالی کے کیڑے! اے بوڑھے شیطان! ورنہ .... ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔" میں پھر چیخنے لگی۔

وہ ہنس کر کہنے لگا۔ "اے سانپ کے پھن والی حسین کبوتری! تُو میرا خون پیئے گی تو .... تُو تو زبانی جمع خرچ ہی کر رہی ہے اور میں تو واقعی تیرا خون پیوں گا جس طرح اپنے دشمن اقوئی کے بیٹے کی محبوبہ کا خون پی چکا ہوں۔ تجھے کچھ اور کہنا ہے مجھ سے کہ میں تیری زبان بند کرانے کا حکم دوں؟ ویسے جب شدید غصے کی حالت میں تُو چیخنے لگتی ہے تو تیرا چہرہ خون کی سرخی سے جھلملانے لگتا ہے۔ تو اس لمحے مجھے کچھ اور ہی حسین نظر آنے لگتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ملعون میرے بالکل قریب آ گیا۔ "آخری بار .... بس آخری بار میں تجھے چیختے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ تیرا اصل حسن تیرے چہرے پر نمایاں ہو جائے۔"

اس کی بات سن کر میں نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیئے۔ میں اب فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ چاہے کچھ بکواس کرتا رہے‘ مجھے اب چیخنا نہیں ہے۔ میں چیخ کر‘ چلا کر اس کے لئے سامان راحت فراہم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس ملعون نے میرا بھینچے ہوئے ہونٹ دیکھ کر میرا ارادہ بھانپ لیا اور ہنس کر بولا۔ "اچھا تو اب تُو چیخے گی نہیں۔ مگر تُو شاید بھول گئی کہ میں ہرباش دیوتا کا ہرکارہ ہوں اور مجھے یہ فخر ہے کہ میں کسی کو بھی تشدد کئے بغیر بھی چیخنے پر مجبور کر سکتا ہوں .... اور تجھ جیسی کنواریوں کو چیخنے پر مجبور کرنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تو اب تُو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل دیکھ۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کا ایک ہاتھ میری طرف بڑھا اور پھر اس نے ایک ایسی حرکت کی کہ میرے فیصلے کی دیوار منہدم ہو گئی۔

میں پاگلوں کی طرح چیختے جا رہی تھی اور وہ بڑی بے حیائی سے ہنسے جا رہا تھا۔

"بس بس اے سانپ کے پھن والی! اتنا کافی ہے۔" اس خبیث بوڑھے نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اپنی کنیزوں کو حکم دیا کہ میری زبان بند کر دیں۔ اس کا حکم سن کر حرکت میں آ گئیں جنہوں نے اقوئی اور ژاغون کی زبانیں بند کی تھیں۔

مشاہدے اور تجربے میں کیا فرق ہوتا ہے' مجھے اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوا جب ایک کنیز نے خود میرے ایک بازو میں خنجر اتارا۔ لاکھ ضبط و برداشت کے باوجود میرے منہ سے بے اختیار چیخیں نکلنے لگیں۔ دوسری کنیز نے جب میرے زخم میں سفوف بھرا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے بازو کو ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیا گیا ہو۔ اتنی شدید اذیت مجھے خنجر کا زخم کھا کر بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر میرے دوسرے بازو پر بھی خنجر آزمائی کی گئی اور زخم میں سفوف بھر دیا گیا۔ چیخ چیخ کر میں بے حال ہو گئی۔

حیرت انگیز طور پر چند ہی لمحوں کے بعد مجھے اپنے بازوؤں کے زخموں میں فرحت انگیز ٹھنڈک اترتے محسوس ہوئی۔ اسی لمحے مجھے یوں لگا جیسے میں کسی بھنور میں گھر چکی ہوں یا کوئی گردبار مجھے اڑائے لئے جا رہا ہے۔ میری بصارت کھو سی گئی تھی۔ میرے اطراف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ جیسے میں کسی گہرے خلا میں گرتی چلی جا رہی تھی۔ پھر میرے قدم جیسے زمین پر جم گئے لیکن اب میرا انگ انگ جھنجھنا رہا تھا۔ اندھیرا چھٹنے لگا اور بصارت پھر لوٹ آئی۔ تب مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا جس کی تصدیق کے لئے میں نے اپنے سر کو جنبش دینے کی کوشش کی' مگر ایسا نہ کر سکی۔ میں مفلوج ہو چکی تھی' حرکت کرنے کی سکت چھن گئی تھی۔

میں نے وحشت زدہ ہو کر چیخنا چاہا' لیکن ناکامی ہوئی۔ میں سوچ سمجھ سکتی تھی میری سماعت و بصارت کی قوتیں کام کر رہی تھیں لیکن حرکت کرنے اور زبان ہلانے سے معذور تھی۔ بوڑھے شیطان حصیف کا عذاب مجھ پر مسلط ہو چکا تھا۔

حصیف نے دیوار کے مخصوص سوراخ میں منہ دے کر اپنے غلاموں کو پکارا اور جب غلام آ گئے تو اس نے انہیں ہدایات دیں۔ وہ مجھے اور میرے ساتھ ہی اقویٰ و ژاغون کو اپنے ہمراہ لے جانے کا بندوبست کر رہا تھا۔

ذرا ہی دیر میں اس غلام تین لکڑی کے تختے لے آئے۔ مجھے' ژاغون اور اقویٰ کو ستونوں سے کھول کر ان تختوں سے باندھ دیا گیا۔ پھر وہ غلام اپنے آقا حصیف کی رہنمائی میں تختوں پر ہمارے جسموں کو اٹھائے پیچ در پیچ راستوں اور سرنگوں سے گزرتے رہے۔

رفتہ رفتہ مجھے گرمی اور تپش کا احساس ہونے لگا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد تپش اتنی شدید ہو گئی جیسے غلاموں کے اٹھنے والے قدم مجھے جہنم کے قریب لے جا رہے ہوں۔ میرا جسم پھنک رہا تھا اور جسم پر آبلے پڑتے محسوس ہو رہے تھے' نہ جانے مجھے کہاں لے جایا جا رہا تھا؟ .... شاید کسی آتش فشاں پہاڑ کے پیٹ میں۔ میرے ذہن نے جواب دیا۔ جہاں اس بوڑھے شیطان کو سیال آگ کی پرستش کرنا تھی۔ حدت اب میرے لئے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ پھر میں روشنی میں آ گئی' سرخ روشنی میں' مگر اب حدت میں اور بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ میرے اطراف سرخ اور ناگوار روشنی تھی اور بہت اوپر آسمان پر ستارے چمکتے نظر آ رہے تھے۔ کہیں قریب ہی ہلکے ہلکے دھماکے ہو رہے تھے۔

میرا جسم بری طرح جل رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرا بدن چند ساعتوں میں خود بخود بھڑک اٹھے گا اور جل کر راکھ ہو جائے گا۔ اذیت اب حد سے تجاوز کر گئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ میری

زندگی کے آخری لمحات ہوں' مگر نہیں۔ میں نے سوچا' وہ بوڑھا شیطان مجھے ابھی کیسے مر جانے دے گا۔ ابھی تو اسے میرے جسم اور میری روح کو بڑے عذاب دینا تھے' لیکن کیا خبر اسے خبر ہی نہ ہو کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے اور یہ میرا آخری وقت آ چکا ہے۔

اوپر نیلا آسمان تھا اور نیچے سرخ روشنی۔ ان کے درمیان میں تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی بڑے اور گہرے کنویں کے درمیان معلق ہوں۔ یقیناً میں کسی آتش فشاں پہاڑ کے اندر تھی جس کا دہانہ اوپر تھا۔ آسمان اس دہانے پر نیلی چھت کی طرح لگ رہا تھا۔

"انہیں یہیں کھڑا کر دو اور تم سب واپس چلے جاؤ۔" میں نے حصیف کی آواز سنی۔

تختے کو اٹھانے والوں نے تختہ نیچے رکھ دیا اور مجھے اس سے کھولنے کے بعد اٹھا کر کھڑا کر دیا گیا۔ یوں لگا جیسے مجھے دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگے پاؤں کھڑا کر دیا گیا ہو۔ چٹان اتنی ہی تپ رہی تھی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر اقویٰ اور ژاغون کو بھی تختوں سے کھول کے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ان کے جسم ابھی تک مفلوج تھے۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ حصیف کے غلام اسی لئے ہم تینوں کو تختوں سے باندھ کر یہاں تک لائے تھے۔ غلام واپس جانے لگے اور پھر ان کے قدموں کی چاپ دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔

میں' ژاغون اور اقویٰ' تینوں ایک ایسی چٹان پر کھڑے تھے جو آگے کی طرف نوکدار شکل اختیار کر گئی تھی اور وہاں نیچے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ دھماکوں کی آوازیں بھی وہیں آ رہی تھیں۔ میں اب اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ میں ایک آتش فشاں پہاڑ کی گہرائی میں تھی۔ یہ اندازہ میں نے وہاں کے ماحول سے لگایا تھا۔ قریب ہی وہاں نیچے جوالا مکھی دہک رہا تھا۔ شدید حدت اسی کی وجہ سے تھی۔

انسانی جسم کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ہر ماحول کا خود کو عادی بنا لیتا ہے۔ اس کی قوت برداشت میں خود بخود اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حدت کی اذیت اب میرے لئے ناقابل برداشت نہیں رہی تھی۔

میں نے جو اندازہ قائم کیا تھا چند ہی لمحے بعد حصیف نے اس کی تصدیق کر دی۔ وہ ہم تینوں سے مخاطب تھا۔ "ہم اس وقت آگ اگلنے والے پہاڑ کے پیٹ میں ہیں۔ یہاں نیچے مقدس آگ بھڑک رہی ہے جو میرے سوکھے سڑے بدن کو نئی زندگی بخش دے گی۔" اس کی آواز پرجوش تھی۔ "پھر میں تم دونوں کو تو باری باری اس آگ میں پھینک دوں گا اور .... اور اس سانپ کے پھن والی کا خون پی جاؤں گا۔"

وہ بوڑھا شیطان قطعی پرسکون نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس جہنم میں اسے کوئی اذیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"اے سانپ کے پھن والی!" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تُو نے دیکھ لی اپنے ساتھیوں کی مشترکہ آخری آرام گاہ۔ کتنی خوبصورت ہے یہ جگہ؟" اس کے ہونٹوں پر بڑی شیطانی مسکراہٹ تھی۔ "اب میں آگ کی پرستش کروں گا اور یوں بیٹھوں گا کہ تیرا حسین چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رہے تاکہ پرستش کا وقت آرام سے گزر جائے۔ تیرے خوبصورت جسم پر میری نظر رہے گی تو میری کھوپڑی کے کسی حصے میں

یہ خیال بھی رہے گا کہ مجھے پرستش کے بعد تیرے مہربان جسم کی راحتیں ملنے والی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چٹان کے آخری سرے کی طرف بڑھا جہاں بیٹھ کر اسے آگ کی پرستش کرنا تھی آگے بڑھتے بڑھتے اس نے پلٹ کر ایک بار مجھے ندیدی نظروں سے دیکھا۔

خلاف توقع اسی لمحے اقوئی کی آواز گونجی۔ "رک جا اے حسیف! پہلے میری بات سن لے۔"
حسیف ٹھٹک کر رک گیا اور میں بھی چونک اٹھی۔

"اچھا تو تیرے لہو سے اپاتھ کا اثر ختم ہو گیا۔ تُو میرے مسلط کئے ہوئے عذاب سے آزاد ہو گیا۔" حسیف مسکرایا۔ "جلد کہہ دے جو کہنا ہے۔"

"ارے میرے گھٹیا دشمن!" اقوئی نفرت انگیز آواز میں کہنے لگا۔ "کیا تُو سمجھ رہا ہے کہ تُو نے ژاغون کی محبوبہ کا خون پی کر مجھ سے انتقام لیا ہے؟ جان لے اے حسیف کہ ژاغون واقعی میرا بیٹا نہیں ہے۔"

"تُو نے پھر یہ فضول بات کیوں چھیڑ دی؟" حسیف جھلا کر بولا اور پلٹا۔

"اے حسیف! آگ کی پرستش کرنے اور نئی زندگی پانے سے پہلے یہ حقیقت سن لے کہ ژاغون دراصل تیرا بیٹا ہے۔" اقوئی نے بلند آواز میں کہا۔ حسیف بڑی تیزی سے پلٹا اس کے چہرے سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس انکشاف پر میں بھی حیران رہ گئی تھی یقیناً اس انکشاف سے ژاغون کے ذہن کو بھی زبردست جھٹکا لگا تھا۔ اس کے چہرے سے میں نے یہی قیاس کیا تھا۔

"کیا موت کے خوف سے تیرا دماغ چل گیا ہے؟" حسیف' اقوئی سے مخاطب تھا۔

"نہیں' یہ اسی طرح حقیقت ہے جیسے کہ میں اس وقت موت کے منہ میں کھڑا ہوں۔" اقوئی جواب میں بولا۔

"لیکن میری بیوی ژینا تو تیرے ہاتھوں قتل ہو گئی تھی' پھر.......... پھر یہ میرا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہی تو تیری بھول ہے۔" اقوئی مسکرایا۔ "میں تیری بیوی ژینا پر ریجھ گیا تھا۔ میں نے اسی لئے اسے قتل کرنے کے بجائے اپنا قیدی بنا لیا تھا' مگر تُو یہی سمجھا کہ وہ قتل ہو گئی۔" اقوئی انکشاف پر انکشاف کئے جا رہا تھا اور حسیف ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے گم صم کھڑا تھا۔ اب اقوئی اپنے دشمن حسیف سے کہہ رہا تھا۔ "میں تیری بیوی کو گورس لے آیا تھا۔ تُو جانتا ہے کہ اس وقت ژینا کی کوکھ میں تیرا بچہ پل رہا تھا۔ مجھے ژینا کے لئے کچھ دن صبر کرنا پڑا پھر جب اس نے تیرے بیٹے کو جنم دیا تو میں نے اسے جنگل میں پھنکوا دیا۔ اس راز سے صرف میں یا طربی اور اس کی بیوی واقف تھے۔ طربی کی بیوی نے ژینا کو بچہ جننے میں مدد دی تھی۔ میں نے ان دونوں میاں بیوی کو قتل کرا دیا کیوں کہ بستی میں بغاوت ہو جاتی' اگر بستی والوں کو علم ہو جاتا' میں نے گوروس کے دشمن کی بیوی کو اپنے محل میں بچہ جننے کی اجازت دی تھی۔ اس کے باوجود میں تیری حسین بیوی ژینا سے اپنی خواہش پوری نہ کر سکا۔ تیری باوفا بیوی ژینا نے میرے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی خنجر سے اپنے سینے میں شگاف ڈال کر جان دے دی۔" اقوئی یہ کہہ کر رکا۔

"میں.......... میں تیرا خون پی جاؤں گا۔" حسیف دانت پیس کر غرایا۔

"پہلے میری بات سن لے اے حسیف! پہلے یہ جان لے کہ ہم دونوں کی دشمنی میں جیت کسے ہوئی۔" اقوئی عیارانہ انداز میں مسکرایا۔

"بول تُو کیا کہنا چاہتا ہے اے میرے دشمن! جلدی سے کہہ دے تاکہ میں تیرے انجام کو کچھ اور عبرتناک بنانے کا فیصلہ کر سکوں۔" حسیف ہاتھ مل رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ان دونوں دشمنوں سے انتقام کا کوئی نیا سبق لے سکوں تاکہ زندہ بچ جاؤں تو یہ سبق میرے کام بھی آ سکے۔ میرے سینے میں بھی تو انتقام کا آتش فشاں بھڑک رہا تھا۔

"ایک دن میں اپنے بہادروں کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلتا پھر رہا تھا کہ مجھے آلوس زادہ نظر آیا جو اپنی دوسری ماں کی چھاتیوں سے لپٹا ہوا تھا۔ سن اے میرے دشمن! وہ تیرا ہی بیٹا تھا جسے دیوتاؤں نے آلوس زادہ بنا دیا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔" اقوئی حقائق سے پردہ اٹھا رہا تھا۔ "اگر مجھے پہلے سے یہ اندیشہ ہوتا کہ وہ آلوس زادہ بن جائے گا تو میں اسے جنم لیتے ہی زمین میں دبا دیتا۔ میں اس وقت اپنی نادانی پر بہت پچھتایا لیکن مجھے دیوتاؤں کے فیصلے پر عمل کرنا پڑا اور آلوس زادہ میری گود میں آ گیا۔ اب اس کی تکریم مجھ پر فرض تھی مگر تُو ذرا یہ سوچ اے حسیف! میں اسے اپنی بستی میں یہ عزت کیسے دے سکتا تھا۔ بے شک وہ آلوس زادہ تھا' دیوتاؤں کا چہیتا مگر تھا تو تیرا خون۔ مجھے تیری قسم یاد تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تُو زندہ رہا تو مجھ سے انتقام لینے ضرور آئے گا۔ تب میری کھوپڑی میں ایک تدبیر آئی۔ میں نے آلوس زادے کی اصلیت کو چھپانے کا فیصلہ کر لیا۔ شرجیا نے بھی میرا ساتھ دیا حالانکہ وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آلوس زادہ تیری اولاد ہے۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ میں اپنے بیٹے کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ ژاغون تیرا بیٹا جوان ہو کر بھی خود کو میری ہی اولاد سمجھتا رہا۔ میں اس دن کا منتظر تھا جب تُو انتقام لینے آتا اور تیرا ہی بیٹا تیرے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوتا پھر تُو اس کے ہاتھوں مارا جاتا یا تیرا کھانڈا اس کی گردن اڑا دیتا لیکن شرجیا نے نمک حرامی کی اور ژاغون کو اس کی حقیقت سے آگاہ کر کے مجھ سے باغی ہو گیا۔ اس دوران میں تیرے غلام' شرجیا کی بیٹی کو اٹھا لایا جو تیرے ہی بیٹے کی محبوبہ تھی۔ تب میں نے تیرے بیٹے کو تیرے خلاف بہکا کر کبیت روانہ کر دیا۔ میں تیری لاعلمی سے فائدہ اٹھا کر اپنے دونوں دشمنوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شرجیا کو میں نے راستے ہی میں قتل کرا دیا تھا۔ میں اس کی نمک حرامی کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ژاغون تجھ پر قہر کے دیوتا کی طرح ٹوٹ پڑے گا۔ یہ اپنی محبوبہ کی خاطر دیوتاؤں سے بھی ٹکر لے سکتا تھا مگر مجھے کیسے خبر ہوتی کہ بیٹے نے باپ کی گردن اڑا دی یا باپ نے بیٹے کو قتل کر دیا۔ یہی سوچ کر میں نے بھی ادھر کا رخ کیا کہ تم دونوں میں سے جو زندہ بچے اسے میں ٹھکانے لگا کر یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں۔ دیوتاؤں نے میرا ساتھ نہ دیا اور میں پکڑا گیا۔ اس کے باوجود میں گھاٹے میں نہیں رہا۔ جیت میری ہی ہوئی۔ تُو نے میری نگاہوں کے سامنے اپنے بیٹے کی محبوبہ کا خون پیا اور اپنے بیٹے کی بے بسی پر قہقہے لگاتا رہا۔ تُو نے مجھے مفلوج کر دیا تھا ورنہ میں بھی اس وقت تیرے ساتھ قہقہے لگاتا لیکن تیری غلط فہمی اور اپنی چال کی کامیابی پر میرے دل نے تجھ سے زیادہ قہقہے لگائے تھے۔ اب

بتا اے میرے دشمن کہ تُو جیتا یا اقویٰ؟ انتقام تُو نے میری نسلوں سے لیا یا میں نے تجھ سے؟" اقویٰ نے یہ کہہ کر زوددار قہقہہ لگایا جس کی بازگشت خوفناک تھی۔

مکر و فریب کی یہ داستان ایک ایسا انکشاف تھا جس نے حسیف پر وحشت سی طاری کر دی۔ وہ ہاتھ پھیلا کر اقویٰ کی طرف بڑھا جیسے اس کی گردن مروڑ دے گا۔ اقویٰ جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر قہقہے لگائے جا رہا تھا۔

حسیف کے ہاتھوں نے آہنی شکنجوں کی طرح اقویٰ کی گردن جکڑ لی۔ اقویٰ کے قہقہے دم توڑ گئے۔ اچانک حسیف کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی' چہرے کے عضلات پھولنے لگے اور جسم اینٹھنے لگا۔ میری نظریں اسی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اندرونی طور پر کسی ناقابل برداشت اذیت سے دوچار ہو۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ اقویٰ بھی حیرت سے حسیف کو دیکھ رہا تھا۔

اچانک حسیف کے نتھنوں سے خون کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔ میں سمجھ گئی کہ یہ ایک کنواری کے گرم لہو اور جڑی بوٹیوں کا اثر تھا۔ حقیقت جان لینے کے بعد اس کے اپنے خون میں جو ابال آیا تو یقیناً یہ حدت اور تپش اس کے بدن کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے حسیف نے خون کی قے کی اور منہ کے بل گر پڑا۔ اس کی رگیں پھٹ گئیں حتیٰ کہ اس کے مساموں سے بھی لہو پھوٹ پڑا تھا۔ اس نے آخری بار اپنے بیٹے ژاغون کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں ژاغون کو انتہائی حسرت و یاس سے دیکھتے دیکھتے بے نور ہو گئیں۔ اس کا ایک طرف اٹھا ہوا سر گر گیا۔ اقویٰ دوبارہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ میں نے ژاغون کے جسم میں حرکت محسوس کی۔ یقیناً اب اس کا جسم بھی مفلوج نہیں رہا تھا۔ اس نے سر گھما کر عیار اقویٰ کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اقویٰ ہنستے ہنستے ایک دم سہم کر خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ ژاغون نے اتنی سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے کہ جبڑوں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"تُو .... تُو اس کہانی پر یقین نہ کر اے میرے بیٹے ژاغون .... جو .... جو میں نے حسیف کو سنائی۔" اقویٰ رک رک کر خوفزدہ سی آواز میں کہنے لگا۔ "میں نے .... اپنی اور .... اور تیری جان بچانے کے لئے فریب سے کام لیا تھا۔"

"کاش تیری خباثت پہلے ہی میں جان لیتا اے اقویٰ!" ژاغون نے اقویٰ کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا اور پھر وہ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ "پہلے تُو نے میرے باپ کی بستی اجاڑی' پھر میری ماں کی آبرو سے کھیلنا چاہا اور مجھ پر بھی ستم توڑتا رہا۔ تیری وجہ سے میرے باپ نے میری آنکھوں کے سامنے میری محبوبہ کا خون پیا جو معصوم اور بے گناہ تھی۔ اب .... اب تُو میرے باپ کی موت کا سبب بھی بنا۔ تُو نے مکاری اور عیاری سے درندگی کی ایسی داستان ترتیب دی جس کا انجام تُو خود بنا اور بننے والا ہے۔ اب تیری موت اتنی بھیانک ہو گی کہ پہاڑوں کے پیٹ میں دہکتی ہوئی یہ آگ بھی خوف سے سرد پڑ جائے گی۔" یہ کہتے ہی وہ دوڑتا ہوا اقویٰ کی طرف بڑھا۔ اسی دوران میں اس نے پشت پر بندھے ہوئے

اپنے ہاتھوں کے بندھن کو توڑنے کے لئے پورا زور لگا دیا تھا' مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اقویٰ کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے ورنہ وہ کوئی مدافعت کا حربہ استعمال کرتا۔ خود میرا بھی یہی حال تھا۔ بوڑھا شیطان حسیف اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا اور ان دونوں سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے جو بھی زندہ بچ جاتا وہ میرا راستہ نہ روکتا۔

"رک جا ژاغون!" اقویٰ زور سے چیخا۔ "ورنہ میرے ساتھ تُو بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔" یہ کہتے ہوئے اقویٰ پیچھے ہٹنے لگا جہاں نوکیلی چٹان کے نیچے کچھ فاصلے پر جوالامکھی دہک رہا تھا۔

ژاغون آگ اگلنے والے اژدھے کی طرح پھنکارتا ہوا اس کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ چند مختصر سی ساعتوں میں اقویٰ پیچھے ہٹتا ہوا چٹان کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک نظر پلٹ کر نیچے دیکھا اور اس کے چہرے پر دہشت پھیل گئی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تجھے دیوتاؤں کا واسطہ ژاغون! رک جا۔" پھر وہ چیخا۔

"نہیں .... نہیں۔" ژاغون بھی چیخ اٹھا۔

پھر ژاغون سر جھکا کر اقویٰ پر جھپٹا وہ شاید اقویٰ کے سینے پر اپنے سر کی ٹکر مارنا چاہتا تھا مگر جیسے ہی ژاغون' اقویٰ کے قریب پہنچا' اقویٰ اچانک تیزی کے ساتھ ایک طرف جھک گیا۔ ژاغون فوری طور پر رک نہ پایا۔ وہ چٹان کے آخری سرے تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور جسم کا توازن بگڑ گیا لیکن ان مختصر سے لمحوں میں اس کی بائیں ٹانگ بروقت اور تیزی سے حرکت میں آئی۔ ژاغون کی ٹانگ اقویٰ کی دونوں ٹانگوں میں الجھ گئی تھی۔ پھر اقویٰ بھی نہ سنبھل سکا۔ ان دونوں کی آخری چیخیں انتہائی وحشت ناک تھیں جن کی گونج ان کی زندگی سے زیادہ دیرپا ثابت ہوئی۔ میں نے ان دونوں کو چٹان سے آتش فشاں کی تہہ میں گرتے دیکھا تھا۔ ایک جھپاکا ہوا اور کھولتے ہوئے لاوے نے دونوں کو آغوش مادر کی طرح سمیٹ لیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے جسم پلک جھپکتے میں تحلیل ہو گئے تھے۔ ہلکا سا دھواں اٹھا اور چراند پھیل گئی۔ اس عرصے میں میرا مفلوج جسم بھی اپنی سابقہ حالت پر واپس آ چکا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر نوکیلی چٹان کے سرے تک جا پہنچی۔

چند لمحوں کو میں چٹان کے سرے پر سحرزدہ سی کھڑی کھولتے ہوئے لاوے کو دیکھتی رہی جس نے میری آنکھوں کے سامنے دو زندہ جسموں کو نگل لیا پھر میں پلٹی تو میری نگاہ حسیف کی لاش پر پڑی۔ وہ صدیوں زندہ رہنے کی آرزو اپنے دل میں لئے موت کی بھیانک وادی میں پہنچ چکا تھا۔

اب میں وہاں بالکل تنہا تھی اور مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے مجھے کس طرح نکلنا نصیب ہو گا۔ میرے لئے وہاں قدم قدم پر خطرہ تھا۔ دائیں جانب مجھے نیم تاریک سی ایک سرنگ نظر آ رہی تھی۔ مجھے یقیناً وہیں سے اس جہنم تک لایا گیا تھا۔ اپنی آزادی کے لئے وہاں سے فرار ہونے کے علاوہ میرے اوپر ایک ذمے داری اور بھی تھی۔ مجھے ہر قیمت پر اس جگہ تک پہنچنا تھا جہاں احرس' نضار اور مہا پجاری کو ان ستونوں سے بندھا ہوا چھوڑ کر آئی تھی۔ انہیں رہائی دلائے بغیر وہاں سے میرا فرار ہونا قطعی بے معنی تھا۔ میری سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھ بندھے

ہونے کی صورت میں میرے لئے کسی خطرے سے نمٹنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے باوجود خطرات کا سامنا کرنا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے قدم جیسے خود بخود نیم تاریک سرنگ کی طرف اٹھنے لگے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اس سرنگ سے گزر کر کہاں پہنچوں گی۔

کچھ دور جا کر وہ سرنگ دو حصوں میں بٹ گئی۔ دائیں جانب بالکل تاریکی تھی اور بائیں جانب خاصے فاصلے پر روشنی نظر آ رہی تھی۔ آدمی کی یہ فطرت ہے کہ عموماً وہ روشنی ہی کو ترجیح دیتا ہے' چاہے روشنی میں اس کے لئے تاریکی سے بھی زیادہ خطرات ہوں۔ شاید اسی سبب میرے قدم بائیں جانب اٹھنے لگے۔ میں روشنی کی طرف بڑھتی رہی اور آخرکار اس سرنگ سے نکل کر ایک چھوٹے سے دالان میں پہنچ گئی۔ وہاں دائیں جانب کی ایک دیوار میں مشعل پیوست تھی۔ سرنگ کے اندر سے مجھے اسی مشعل کی روشنی نظر آئی تھی۔

سامنے ہی مجھے سنگی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں جن کی بائیں جانب کسی کوٹھری کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ سیڑھیاں اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔

"چپ ہو جا۔" اس کوٹھری کی طرف سے مجھے ایک مردانہ سرگوشی سنائی دی۔ میں چونک اٹھی۔ سرگوشی پھر ابھری۔ "مجھے باہر کسی کے قدموں کی آواز.........."

"کہیں .... کہیں وہ سردار .... سردار نہ ہو۔" خوفزدہ سی نسوانی آواز آئی۔ آواز بہت دھیمی تھی۔ "اگر .... اگر وہ سردار ہوا تو .... تو پھر تیری اور میری خیر نہیں۔ وہ .... وہ ہم دونوں کو قتل .... قتل کر دے گا۔"

میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ان سرگوشیوں سے میں نے بخوبی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کوٹھری میں ایک مرد اور عورت ہیں جو چھپ کر شاید اپنی داستان محبت میں وصل کے رنگ بھر رہے تھے۔ وہ عورت' سیف کی کوئی کنیز اور مرد غلام ہو سکتا تھا یا پھر کوئی خدمتگار۔

"کیا تُو بھول گئی کہ سردار اس وقت آگ کی پرستش کر رہا ہو گا؟" مرد نے عورت سے کہا۔ "پھر جب وہ پرستش سے فارغ ہو گا اور اسے غلاموں کی ضرورت پڑے گی تو وہ وہاں موجود سوراخ میں منہ ڈال کر مخصوص آواز نکالے گا۔ اس کے منہ سے وہ مخصوص آواز نکلتے ہی مجھے یہاں سامنے والے سوراخ کے ذریعے فوراً خبر ہو جائے گی پھر میں فوراً اوپر جا کر سردار کا حکم اس کے غلاموں تک پہنچا دوں گا۔ میں اسی لئے تو تجھے اس کوٹھری میں لے کر آیا تھا مگر ٹھہر .... یہ تو میں بھول ہی گیا کہ .... باہر کوئی تھا۔ میں .... میں دیکھتا ہوں تُو اسی طرح پڑی رہ۔"

اب میرا وہاں مزید اسی جگہ کھڑا رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں اسی لئے لپک کر سیڑھیوں تک پہنچی اور دو سیڑھیاں چڑھ کر دیوار سے چپک گئی۔ عین اسی لمحے میری سماعت سے دروازہ کھلنے کی آواز ٹکرائیں میرے اعصاب تن گئے۔

"یہاں .... یہاں تو کوئی .... کوئی نہیں ہے۔" کوئی بڑبڑایا۔ "میرا وہم ہو گا۔"

اس شخص نے یقیناً دروازہ کھول کر دیکھا ہو گا اور ظاہر ہے کہ اسے دالان میں کوئی نظر نہیں آیا ہو

گا۔ میں تو زینے میں تھی۔ میں نے دوبارہ دروازہ بند کئے جانے کی آواز سنی اور اطمینان کا سانس لیا۔

میں نے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ سیڑھیاں خاصی تھیں۔ دو تین سیڑھیاں چڑھنا رہ گئی تھیں کہ میں سیڑھیوں کے اوپر ایک سپاٹ دیوار دیکھ کر چکرا گئی۔ آگے جانے کا راستہ ہی نہیں تھا۔

مگر وہ شخص جو نیچے کوٹھری میں کسی عورت کے ساتھ تھا' کہہ رہا تھا کہ میں اوپر جا کر سردار کا حکم اس کے غلاموں تک پہنچا دوں گا۔ میں نے سوچا۔ سوچتے ہوئے میں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی آخری سیڑھی تک پہنچ گئی اور اچھل پڑی۔ سامنے نظر آنے والی دیوار ایک طرف کھسک رہی تھی۔ دیوار کے کھسکتے ہی مجھے ایک طویل راہداری نظر آنے لگی جو سنسان پڑی تھی۔ راہداری کی دیوار میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے دو مشعلیں دیوار میں روشن نظر آ رہی تھیں۔ میں لپک کر راہداری میں پہنچ گئی۔

دیوار کے کھسکنے سے جو ہلکی سی آواز ہوئی تھی پھر سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دیوار کھسک کر پھر اپنی جگہ واپس آ گئی تھی۔ یقیناً مجھے اس راستے سے آتش فشاں تک نہیں لے جایا گیا تھا۔ یہ اندازہ میں نے اس طرح لگایا کہ وہ راہداری بہت کشادہ نہیں تھی۔ جاتے ہوئے میرے دائیں اور بائیں اقویٰ اور زاغون کو غلام تختوں پر اٹھائے ہوئے چل رہے تھے اور ایسا ایک بار بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ آگے پیچھے چلے ہوں۔ اگر وہ اس راہداری سے جاتے تو ان کا آگے پیچھے ہونا ضروری تھا یقیناً یہ کوئی اور ہی راستہ تھا۔

چند قدم چل کر دائیں اور بائیں جانب مجھے دو بڑے بڑے سوراخ نظر آئے۔ سوراخ اتنے بڑے تھے کہ ان میں باآسانی داخل ہونا' ممکن تھا۔ میں نے بائیں جانب والے سوراخ میں جھانک کر دیکھا۔ وہ بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ اس کے اختتام پر روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اوپر سے نیچے اس راہداری میں آنے کا راستہ تھا۔ اس کے ذریعے کوئی اوپر نہیں جا سکتا تھا پھر میں اس کے مقابل دائیں طرف والے سوراخ کی طرف متوجہ ہوئی اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ سوراخ نیچے کی طرف جا رہا تھا اور اس کے آخر میں بھی روشنی تھی۔

میں بہت احتیاط کے ساتھ اس سوراخ میں داخل ہو گئی۔ اس کی سطح بے حد چکنی تھی۔ میں نیچے کی طرف پھسلتی چلی گئی۔

سوراخ سے نکل کر میں ایک ہموار جگہ گری اور دوسرے ہی لمحے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ہلکی سی دہشت زدہ چیخ سن کر میں چونک اٹھی اور بائیں طرف مڑ کر دیکھا۔ مجھے وہاں فرش پر ایک عورت بیٹھی نظر آئی۔ جس کے جسم پر برائے نام لباس بہت بوسیدہ اور میلا نظر آ رہا تھا۔ اس عورت کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اور چہرے پر وحشت تھی۔ وہ مجھے خوفزدہ چیخ نکلی تھی۔

میں نے ایک ہی نظر میں اس جگہ کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس کا دروازہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا' مگر وہ بند تھا۔ میں لاعلمی میں جانے کہاں آ گئی تھی۔ اس سوراخ میں داخل ہونے سے پہلے راہداری کا مکمل جائزہ لینا ضروری تھا۔ مجھے اتنی جلدبازی سے کام نہیں لینا چاہئے تھا مگر اب وقت گزر چکا تھا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اس سوراخ کے ذریعے دوبارہ راہداری میں واپس نہیں جا سکتی تھی۔ دروازے کے باہر دیوار میں ایک روشن مشعل پیوست نظر آ رہی تھی۔ اسی مشعل کی روشنی کوٹھری

کے اندر بھی آ رہی تھی۔

"اے عورت! تُو کون ہے؟" میں نے اس پاگل سی عورت کو مخاطب کیا۔

"آ .... آ .... آ۔" اس عورت کے منہ سے آواز نکلی اور پھر اس نے اپنا منہ کھول دیا پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے جو اشارہ کیا' میں اسے سن کر لرز اٹھی۔ وہ شاید یہ سمجھی کہ میں اس کا اشارہ نہیں سمجھ سکی ہوں اسی لئے وہ دوبارہ وہی اشارہ کرنے لگی۔

"میں سمجھ گئی کہ تیری زبان کاٹ دی گئی ہے۔" میں بول اٹھی اور آگے قدم بڑھا کر اس کے پاس پہنچ گئی۔

عورت نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب تُو ایسا کر کہ میں تجھ سے جو کچھ پوچھوں تو اس کا جواب سر ہلا کر اقرار یا انکار میں دے۔" میں نے اس سے گفتگو کی ایک راہ نکال لی۔

اس کے سر نے اقرار میں حرکت کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھ سے تعاون کرنے پر آمادہ تھی۔

"کیا تجھے اس کوٹھری میں قید کر دیا گیا ہے؟" میں نے اس سے پہلا سوال کیا۔

مجھے میرے پہلے سوال کا جواب مل گیا جو اقرار میں تھا۔

"کیا کوٹھری کا دروازہ باہر سے بند رہتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

جواب پھر اثبات میں تھا۔ گویا میں وہاں آ کر اس عورت کی طرح قید ہو گئی تھی۔ یہ صورت حال میرے لئے تشویش ناک تھی پھر اسی وقت مجھے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کا خیال آیا۔ وہ عورت مجھ سے تعاون کر رہی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔

"کیا تُو میرے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دے گی؟" میں نے اسے پوچھا۔

عورت نے شاید ابھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میری پشت اس کی طرف نہیں تھی شاید اسی لئے وہ میرے ہاتھ نہیں دیکھ سکی تھی۔ میری بات سن کر وہ چونکی اور پھر زور زور سے اقرار میں سر ہلانے لگی۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف کر دیئے۔ میرے ہاتھ بہت مضبوطی سے باندھے گئے تھے گرہیں یقیناً بہت سخت تھیں اسی لئے اسے جلد کامیابی نہیں ہوئی مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور کوشش کرتی رہی۔ چند لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ گرہوں کو کھولنے کے لئے وہ اپنے دانت استعمال کر رہی ہے۔

اگر کچھ اور نہ سہی تو اس بند کوٹھری میں آ کر مجھے اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ پشت پر بندھے ہوئے میرے ہاتھ اب کھلنے والے تھے۔

آخر کار وہ عورت گرہوں کو ڈھیلا کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی اور پھر اس نے میرے ہاتھ کھول دیئے۔ میں نے اس کی طرف مڑ کر ممنون نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "تُو بہت اچھی ہے۔ میں تجھے اس قید سے رہائی دلا دوں گی۔"

وہ مجھے غیر یقینی سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اچھا اب مجھے یہ بتا کہ کوٹھری کا دروازہ کیا روز دو وقت کھلتا ہے؟ وہ تجھے کھانا تو دیتے ہوں گے نا۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

جواب میں اس نے ایک انگلی اٹھا دی۔

"دن میں بس ایک بار کھلتا ہے دروازہ' کیا وہ تجھے بس ایک وقت کھانا دیتے ہیں؟" میں نے معلوم کیا۔

"ہوں۔" اس کی ناک سے آواز نکلی۔

اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ کوٹھری کا دروازہ صبح کھلتا تھا دوپہر کو یا پھر شام کو؟ صبح کے بارے میں اس نے انکار کر دیا اور جب میں نے دوپہر کے متعلق سوال کیا تو بھی جواب انکار میں تھا۔

"اچھا میں سمجھی' وہ روزانہ بس شام ہی کو تجھے کھانا دیتے ہیں' یہی بات ہے نا؟"

اس نے پھر انکار کیا تو میں الجھن میں پڑ گئی۔ کچھ دیر کو میں چپ ہو گئی اور وہ عورت اشاروں سے مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے اشاروں سے میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ بھلا اس کوٹھری میں اس بے چاری عورت کو صبح' دوپہر یا شام کا اندازہ کس طرح ہو سکتا تھا؟ اس کے لئے تو نہ دن' دن تھا اور نہ رات' رات تھی۔ اس وقت اس کا جاگتے ہوئے ملنا بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے دن اور رات کی تمیز نہیں رہی تھی۔

میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ واقعی معلوم نہیں تھا۔

میں نے دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دروازہ لکڑی کا تھا اور اس کے اوپری حصے میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں مگر وہ سلاخیں اتنی اوپر تھیں کہ ان سے باہر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ ان سلاخوں سے باہر اونچائی پر دیوار میں لگی ہوئی مشعل کا ایک حصہ ضرور نظر آ رہا تھا۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ ان سلاخوں سے باہر دیکھنا اسی صورت میں ممکن تھا جب میں کسی چیز پر چڑھ کر باہر دیکھنے کی کوشش کرتی۔

دروازے کے قریب جا کر میں نے دوسری جانب کوئی آہٹ سننے کی کوشش کی مگر کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ رات کا وقت ہے لیکن اس سے بے خبر تھی کہ کتنی رات گزر چکی تھی اور کتنی باقی تھی۔

"یہاں آ۔" میں نے کچھ سوچ کر عورت کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیران حیران سی میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تو میں نے اس سے کہا۔ "میں دروازے کی ان سلاخوں کے ذریعے باہر دیکھنا چاہتی ہوں تُو بیٹھ جا' میں تیری کمر پر چڑھ کر سلاخوں تک پہنچ جاؤں گی' کیا تُو میرا بوجھ برداشت کر لے گی؟"

کوئی جواب دینے کی بجائے وہ دروازے کے قریب اس طرح سر جھکا کر بیٹھ گئی کہ میں اس کی پیٹھ پر چڑھ سکوں۔

"تُو بہت اچھی ہے۔" میں نے پھر اس کی تعریف کی اور پھر جھکی ہوئی عورت کے اوپر چڑھ گئی۔

میں نے سلاخوں سے باہر دیکھا تو مجھے دائیں اور بائیں جانب بھی دو کوٹھریاں نظر آئیں۔ ان میں بھی ویسے ہی دروازے نظر آ رہے تھے جیسا دروازہ وہ تھا جس سے میں باہر دیکھ رہی تھی۔ معلوم نہیں ان کوٹھریوں میں کوئی تھا بھی یا نہیں' بظاہر تو سناٹا ہی تھا۔ سامنے کچھ ہی دور چند سیڑھیاں دکھائی دے رہی تھیں جن کے بعد سپاٹ دیوار تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ دیوار بھی آخری سیڑھی پر قدم رکھنے کے بعد اپنی جگہ سے کھسک جاتی ہو گی۔ دروازے کے اوپر لگی ہوئی سلاخوں کے درمیان اتنی جگہ تھی کہ میں اپنا ہاتھ باہر نکال سکتی تھی۔ میں دائیں اور بائیں جانب کی کوٹھریوں کے دروازے دیکھ کر یہ جان چکی تھی کہ کنڈی دروازے کے درمیان میں تھی۔ دونوں کوٹھریوں کے دروازوں کی کنڈیاں باہر سے لگی ہوئی تھیں۔ میں نے سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ باہر نکال کر کنڈی تک لے جانا چاہا مگر ناکام رہی۔ میرا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

اسی وقت مجھے مشعل کا خیال آیا۔ اس تک میرا ہاتھ جا سکتا تھا لیکن اس سے فائدہ کیا ہو گا؟ میں نے سوچا میرے ذہن نے فوراً ہی اس کا جواب دیا۔ روشن مشعل کے ذریعے لکڑی کے دروازے میں آگ لگائی جا سکتی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرا ہاتھ مشعل کے دستے تک پہنچ گیا۔ میں نے ذرا سی کوشش کے بعد دیوار میں پیوست مشعل نکال لی۔

مشعل کے دستے کا ابتدائی حصہ تو سلاخوں کے درمیان سے اندر کوٹھری میں آ گیا مگر دستہ بتدریج موٹا ہوتا چلا گیا تھا اسی لئے درمیان تک اندر آنے کے بعد وہ سلاخوں کے درمیان پھنس گیا۔ اب اسے مزید اندر لانا' ممکن نہیں تھا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ وہ غریب عورت جو مجھے اپنی پشت پر اٹھائے ہوئے ہے' تھک گئی ہو گی۔ یہ سوچ کر میں نے مشعل کو سلاخوں کے درمیان پھنسا چھوڑ دیا اور اس کی پیٹھ سے اتر گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی پھر اس کی نگاہ اوپر اٹھی اور اس کی نظریں سلاخوں کے درمیان پھنسے ہوئے مشعل کے دستے پر مرکوز ہو گئیں۔

میں نے اسے بتا دیا کہ میرا ارادہ کیا تھا۔ وہ اس طرح سر ہلانے لگی جیسے کچھ سوچ رہی ہو پھر میں نے دیکھا کہ وہ اپنے جسم پر برائے نام موجود بوسیدہ لباس کی دھجیاں پھاڑنے لگی۔ پھر وہ اشاروں سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں بمشکل سمجھ سکی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

اس عورت نے بہرحال مجھے ایک راہ دکھائی تھی' مگر صرف ان دھجیوں سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ میں ان دھجیوں میں مشعل سے آگ لگا لوں۔ ان دھجیوں سے دروازے میں آگ لگانا مشکل تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے جسم کا اوپری لباس اتار لیا۔ اب میرے بالائی جسم پر صرف چمڑے کی بنی ہوئی ایک چولی رہ گئی تھی۔ میرے جسم کے زیریں حصے پر جو لباس تھا' اسے بھی میں نے بائیں جانب سے پھاڑ کر خاصا کپڑا نکال لیا۔ اس دوران میں اس عورت نے بھی میرے سامنے دھجیوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگا دیا۔ اب اس کے جسم پر صرف چند ہی دھجیاں رہ گئی تھیں جو ہونے اور نہ ہونے کے برابر تھیں بہرحال ان سے کسی حد تک اس کی ستر پوشی ضرور ہو رہی تھی۔

میں نے وہ ساری دھجیاں دروازے کے قریب جمع کر دیں۔ اس کے علاوہ اپنے جسم کا اوپری لباس اور جسم کے زیریں حصے کے لباس سے پھاڑا ہوا کپڑا بھی وہیں ڈال دیا پھر چند دھجیاں اپنے ہاتھ میں لے کر اس عورت سے بولی۔ "ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ آگ سے بچنا ہے۔ اب تجھے ایک بار پھر جھکنا پڑے گا تاکہ میں تیری پیٹھ پر چڑھ کر جلتی ہوئی مشعل سے ان دھجیوں میں آگ لگا سکوں۔"

وہ اقرار میں سر ہلا کر پھر دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی کمر پر چڑھ کر سلاخوں کے درمیان سے ایک ہاتھ باہر نکالا۔ مشعل کی لو تک میرا ہاتھ آسانی سے پہنچ گیا کیونکہ اس کا تقریباً آدھا دستہ کوٹھری کے اندر تھا۔ دھجیوں میں آگ لگ گئی تو میں نیچے اتر آئی اور بقیہ دھجیوں کے ساتھ دروازے کے پاس رکھے اپنے کپڑوں میں آگ لگا دی۔

میری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح دروازے میں آگ لگ جائے' مگر بمشکل اس کا کچھ حصہ ہی جلا ہو گا کہ کپڑوں کا ڈھیر جل کر راکھ ہو گیا۔ میں دروازے کے جلے ہوئے حصے کو پھونکیں مار مار کر مزید جلانے اور آگ بھڑکانے کی کوشش کرتی رہی لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ دروازے نے آگ نہیں پکڑی۔ چھوٹی سی کوٹھری میں دھواں ہی دھواں بھر گیا۔ اسی وقت کسی کے زور زور سے کھانسنے کی آواز مجھے سنائی دی۔

"کیا باہر موجود دونوں کوٹھریوں میں بھی قیدی ہیں؟" میں نے اپنے ساتھ کوٹھری میں موجود عورت سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ عورت انکار یا اقرار میں جواب دیتی ایک مردانہ آواز آئی۔ "ارے یہ دھواں کہاں سے آ رہا ہے؟"

میری کوٹھری کی سلاخوں سے یقیناً دھواں باہر گیا تھا۔ وہ مردانہ آواز باہر کی کسی کوٹھری ہی سے آئی تھی۔ اس دوران میں اس عورت کو بھی کھانسی اٹھ آئی تھی۔ کھانستے ہوئے اس نے ایک انگلی اٹھائی تھی۔

"باہر موجود کوٹھریوں میں سے ایک میں کوئی قیدی ہے؟" میں نے عورت سے تصدیق چاہی۔

عورت نے اقرار میں سر ہلا کر میرے سوال کا جواب دیا۔ اس مرد قیدی کی آواز میں نے سنی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی میری آواز سن سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔

"اے اجنبی قیدی! کیا تُو میری آواز سن رہا ہے؟" دروازے کے قریب جا کر میں نے بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"ہاں تیری آواز مجھ تک آ رہی ہے' مگر تُو کون ہے؟ پہلے تو کبھی تُو نے مجھے آواز نہیں دی۔" مجھے جواب ملا۔

میں سمجھ گئی کہ وہ قیدی مجھے وہاں موجود قیدی عورت جان رہا ہے۔ اسے شاید معلوم نہیں کہ قیدی عورت کی زبان کٹی ہوئی ہے۔

"سن' میں وہ نہیں ہوں جو تُو مجھے سمجھ رہا ہے۔" میں نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔ "یہاں جو عورت قید ہے' وہ بول نہیں سکتی کیونکہ اس کی زبان کاٹ دی گئی ہے پھر وہ بھلا تجھ سے کیسے بات کرتی؟"

"پھر تُو کون ہے؟" مجھ سے سوال کیا گیا۔

"میں بھی ایک مظلوم عورت ہوں اور بھولے سے اس کوٹھری میں آ پھنسی ہوں۔" میں نے جواب دیا پھر اس سے معلوم کیا۔ "اے اجنبی! تُو مجھے یہ بتا کہ یہاں محافظ کب آتے ہیں' کیا کسی طرح انہیں بلایا جا سکتا ہے؟"

"وہ بس ایک ہی وقت کھانا دینے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس وقت مجھے مارنے پیٹنے آتے ہیں جب مجھ پر دیوانگی کا دورہ پڑتا ہے اور میں چیخ چیخ کر ان کی نیندیں حرام کر دیتا ہوں۔" اجنبی قیدی نے بتایا پھر کہنے لگا۔ "تیری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تُو بھولے سے اس کوٹھری میں آ پھنسی۔ یہ بھی بتا کہ دھواں کہاں سے آ رہا ہے؟"

"میں یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی تھی کہ مجھے ایک سوراخ نظر آیا اور میں اس میں داخل ہو کر پھسلتی ہوئی اس کوٹھری کے اندر آ گری۔ یہاں آ کر میں نے کوٹھری کے دروازے میں آگ لگانے کے لئے کپڑے جلائے تھے مگر دروازے میں آگ نہیں لگی۔"

"تیرے پاس کوٹھری میں آگ کہاں سے آ گئی؟ اور تُو اس کوٹھری میں آ کر گرنے سے پہلے کہاں تھی؟"

میں نے اسے مشعل کے بارے میں بتا دیا پھر کہا۔ "میں نہیں جانتی کہ میں کہاں تھی' ہاں یہ معلوم ہے کہ وہ ایک راہداری تھی جس کے سوراخ سے میں اس کوٹھری میں آ گری۔ میں نے تیرے دونوں سوالوں کے جواب دے دیئے۔ اب تُو یہ بتا کہ کیا تیری آواز محافظوں تک پہنچ سکتی ہے؟"

"میری کوٹھری کی پچھلی دیوار میں کچھ اوپر کہ جہاں تک میں نہیں پہنچ سکتا' آہنی سلاخیں لگی ہوئی ہیں' وہاں سے مجھے اکثر محافظوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آتی ہیں۔ شاید میری چیخ و پکار بھی وہ وہیں سے سن لیتے ہوں گے۔"

"کیا اس وقت بھی تُو ان کی آوازیں سن رہا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں' اس وقت سناٹا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا تُو میرے کہنے پر اس وقت زور زور سے چیخ سکتا ہے؟ جیسے تجھ پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔"

"کیا مجھے ان کے ہاتھوں پٹوانا چاہتی ہے؟"

"نہیں بلکہ میں تجھے اس قید سے رہائی دلانا چاہتی ہوں۔ جب وہ آئیں گے تو میں خود چیخ چیخ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کر لوں گی۔ تُو اس وقت خاموش ہو جانا پھر وہ تیری کوٹھری کھول کر تجھے مارنے پیٹنے کے بجائے میری کوٹھری میں آ جائیں گے۔"

"اور پھر وہ میرے بجائے تیری کھال ادھیڑ دیں گے۔"

"تُو میری فکر نہ کر اور میں جو کہتی ہوں وہ کر۔ میری بات پر یقین کر کہ میں تجھے رہائی دلا دوں

گی۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"تُو شاید پاگل ہو گئی ہے۔ اس بوڑھے شیطان کی قید سے آج تک کوئی رہا نہیں ہو سکا۔ اسے اپنی شیطانی قوتوں کے ذریعے سب کچھ خبر ہو جاتی ہے اور پھر وہ فرار ہونے والوں کو پکڑ لیتا ہے پھر معلوم ہے فرار ہونے کی کوشش کرنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے .... بوڑھا شیطان انہیں آگ اگلنے والے پہاڑ میں پھنکوا دیتا ہے۔ میں ایسی بھیانک موت قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں۔"

میرا جی چاہا کہ اسے بتا دوں' وہ جس بوڑھے شیطان کے خوف میں مبتلا ہے' وہ جہنم رسید ہو چکا ہے مگر یہ بات میں نے خلاف مصلحت جانی۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا۔ "فرار ہونے کی کوشش تو میں کر رہی ہوں۔ اگر سزا ملی تو تجھے نہیں مجھے ملے گی' پھر تُو کیوں ڈر رہا ہے۔ ویسے یہ تو بتا کہ تجھے کس جرم میں قید کیا گیا ہے؟" میں اسے کسی نہ کسی طرح راہ پر لانا چاہتی تھی۔ اسی لئے باتوں میں لگائے ہوئے تھی۔

"تُو کیا کرے گی یہ جان کر۔ تُو بھی تو آخر ایک عورت ہی ہے اور عورت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔" اس کی آواز سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی عورت کے ہاتھوں چوٹ کھایا ہوا ہے اسی لئے بولی۔ "دیکھ ساری عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں۔"

"نہ ہوتی ہوں گی۔ اب زیادہ میرا مغز نہ چاٹ اور مجھے سو جانے دے۔" اس کے لہجے سے بیزاری ظاہر ہونے لگی شاید وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کیا تُو واقعی قید سے رہائی نہیں چاہتا؟" میں نے اسے پھر اکسایا۔ میں بھلا اتنی آسانی سے اس کی جان کیسے چھوڑ دیتی جب کہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی چیخ و پکار سے محافظ اس قید خانے میں آ سکتے ہیں۔

"میں تجھ سے کہہ چکا ہوں کہ رہائی ناممکن ہے' پھر تُو کیوں بحث کئے جا رہی ہے؟" اب اس کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔

"تجھ سے میں بس اتنا ہی تو کہہ رہی ہوں کہ چیخ و پکار کر کے محافظوں کو یہاں بلا لے۔ کیا تُو ایک مظلوم عورت کی اتنی بھی مدد نہیں کرے گا؟"

"عورت مظلوم نہیں' ظالم ہوتی ہے اور تُو بھی ایک عورت ہے۔" وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ "وہ بھی ایک عورت ہی تھی جس کی وجہ سے میں یہاں قید ہوں۔ اس نے بوڑھے شیطان کو بتا دیا یا پھر خود اسے شیطانی قوتوں کے ذریعے یہ معلوم ہو گیا کہ میں اس کی ایک کنیز کو بھگا لے جانا چاہتا ہوں۔"

"تیرا کہنا ہے کہ بوڑھے شیطان کو اپنی شیطانی قوتوں کے ذریعے سے بھی یہ بات معلوم ہو سکتی تھی اس میں اس کنیز کا کیا قصور؟"

"یہ کہ اس نے صاف انکار کر دیا' مجھے چاہتی ہے اور میری بنے گی۔ اس نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں اسے بھگا کر لے جانے کے لئے ورغلا رہا تھا۔ پھر وہ میری ہی آنکھوں کے سامنے بوڑھے شیطان کی

آغوش میں جا بیٹھی۔"

"مگر وہ بھی تو کوئی عورت ہی ہو گی جس نے تجھے جنم دیا ہو گا۔ اس نے تو عورت ہونے کے باوجود تجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا ہو گا؟"

"ہاں' اس نے بھی مجھ پر ظلم کیا۔" اس کی آواز سے پھر دکھ جھلکنے لگا۔ "کیا یہ ظلم نہیں کہ وہ مجھے جنم دیتے ہی مر گئی؟"

"اگر وہ زندہ رہتی تو شاید تُو عورت کو ظالم نہ کہتا۔" میں بولی۔ وہ محبت کو ترسا ہوا ایک شخص تھا جسے شاید کسی بھی شکل میں عورت کی محبت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اسے راہ پر لانے کے لئے بہت کوشش کرنا پڑی مگر آخر کار میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئی۔

وہ بری طرح چیخ چلا رہا تھا۔ میری کوٹھری بھی اس کی چیخوں سے گونج رہی تھی اور میں دروازے سے لگی محافظوں کے آنے کی منتظر تھی۔ کافی دیر کے بعد میں نے وہ آواز سنی جس کا اتنی دیر سے انتظار رہی تھی۔ وہ ایسی ہی آواز تھی جیسی میں پہلے بھی سن چکی تھی' دیوار کھسکنے کی آواز .... "وہ آرہے ہیں' اب تُو چیخنا بند کر دے۔" میں نے چیخ کر قیدی سے کہا مگر شاید اپنی چیخ پکار میں اس نے میری آواز نہیں سنی۔

میرے ساتھ جو عورت قید تھی' وہ زبان کٹ جانے کے باوجود چیخ سکتی تھی۔ میں اسے پہلے ہی [illegible] چکی تھی کہ جب اشارہ کروں' وہ چیخنے چلانے لگے۔ ادھر میں نے قدموں کی چاپ سنی ادھر عورت کو اشارہ کر دیا۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگی۔ قیدی مرد اب تک چیخے جا رہا تھا۔

"آج شاید اس زبان کٹی کی کھال بھی کھجا رہی ہے۔" میں نے باہر سے ایک مردانہ آواز آتے سنی۔ "تُو اس حرامزادے کو دیکھ' میں اس زبان کٹی کی خبر لیتا ہوں۔ کمبخت گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخے جا رہی ہے۔" وہ دو محافظ معلوم ہوتے تھے۔ یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ مرد قیدی آخر وقت تک چیختا رہا تھا۔ اس طرح ایک محافظ ادھر چلا گیا تھا۔

کوٹھری کا دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ میں دروازے کی ایک جانب کھڑی ہوئی تا کہ دروازہ کھلے تو پر کواڑ کی آڑ میں ہو جاؤں۔

عورت اب تک چیخ رہی تھی۔ جب میں نے کنڈی کھولے جانے کی آواز سنی تو اسے چپ ہو جانے کا اشارہ کر دیا۔

گٹھے ہوئے جسم اور گھٹے ہوئے سر والا دروازہ کھول کر قیدی عورت کی طرف جھپٹا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اس کی پشت میری طرف تھی۔ پھر جیسے ہی وہ قیدی عورت کے قریب پہنچ کر جھکا' میں نے دروازے کی آڑ سے نکل کر اس پر چھلانگ لگا دی اور اس کی گردن میں کلائی ڈال کر شانے میں دانت گاڑ دیئے۔ وہ تڑپ کر پلٹا اور مجھے اپنی پشت سے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ میں جان چکی تھی کہ میرا زہر دانتوں کے ذریعے اس کے خون میں شامل ہو چکا ہے اور اب وہ صرف چند لمحوں کا مہمان ہے پھر بھی اس میں بڑی جان تھی۔ وہ غراتا ہوا دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھا لیکن مجھ تک پہنچتے پہنچتے لہرا کر زمین پر گر

رہا۔

برابر والی کوٹھری سے چیخ پکار یک آوازیں آ رہی تھیں۔ دوسرا محافظ یقیناً مرد قیدی کو مارنے پیٹنے میں مصروف تھا۔ اسے خبر ہی نہیں ہو سکی تھی کہ اس کے ساتھ محافظ پر کیا گزر چکی ہے۔

"اب چیخے گا؟ بول .... بول حرامزادے۔" برابر والی کوٹھری سے دوسرے محافظ کی آواز آئی۔ میں قیدی عورت کا ہاتھ تھامے تیزی کے ساتھ باہر نکل آئی۔ اسی وقت میری نگاہ جلتی ہوئی مشعل پر پڑی جو ابھی تک کوٹھری کے دروازے کے اوپر سلاخوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ چیخ پکار کے سبب محافظوں نے شاید اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

"تُو یہیں کھڑی رہ' میں دوسرے محافظ کے ظلم سے اس قیدی کو بچاتی ہوں۔" میں نے قیدی عورت سے کہا۔

قیدی عورت کو کوٹھری کے باہر چھوڑ کر جیسے ہی میں آگے بڑھی تو دوسری کوٹھری کے دروازے سے دوسرے محافظ کو باہر نکلتے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنا لمبا سا خنجر کمر سے کھینچ لیا اور وحشیانہ انداز میں چیختا ہوا میری طرف لپکا۔ میرے لئے یہ سب خلاف توقع تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ مرد قیدی کو زد و کوب کر رہا ہو گا تو میں پیچھے سے جا کر پہلے محافظ کی طرح اسے بھی شکار کر لوں گی پھر جیسے ہی وہ میرے قریب آیا میں تیزی سے ایک طرف ہٹ گئی اور اس کی ٹانگ میں اپنی ایک ٹانگ پھنسا دی۔ وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل گرا۔ قیدی عورت کی یہ بدقسمتی ہی تھی کہ وہ محافظ کی جھپٹ میں آ گئی۔ گرے گرتے محافظ نے اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں قیدی عورت کو بچا سکتی' محافظ نے کہنیوں کے بل اٹھ کر قیدی عورت کے سینے میں خنجر اتار دیا تھا۔ اسی وقت میں نے کچکچا کر محافظ کے ایک بازو میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ اس نے قیدی عورت کے سینے سے خنجر نکال کر مجھ پر حملہ کرنا چاہا مگر اس وقت تک میں اچھل کر کھڑی ہو چکی تھی پھر اس محافظ کو اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ میرے زہر نے اس کا بھی کام تمام کر دیا تھا۔

مرد قیدی اپنی کوٹھری کے دروازے میں کھڑا ہوا حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ قیدی مرنے والے دوسرے محافظ سے کسی طرح کم طاقتور معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اسی لمحے مجھے قیدی عورت کا خیال آیا جو اپنے سینے سے ابلتے ہوئے خون کو دونوں ہاتھوں سے روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں اس کی طرف لپکی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے قید سے رہائی دلاؤں گی۔ قید سے تو میں نے اسے رہائی دلا دی تھی مگر اسی کے ساتھ وہ زندگی کی قید سے بھی آزاد ہو گئی تھی۔

اس نے ایک بار میری طرف دیکھ کر بڑی حسرت سے "آ .... آ" کہا اور پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ مرنے سے پہلے وہ مجھ سے نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس کی موت کا مجھے بہت دکھ ہوا۔

کچھ سوچ کر میں نے مرنے والے محافظ کے ہاتھ سے خون آلود خنجر لے لیا اور پھر چمڑے کا وہ خول

بھی اس کی کمر سے کھینچ کر نکال لیا جس میں خنجر رکھا جا سکتا تھا۔ لمبے خنجر پر لگے ہوئے خون کو میں نے محافظ کے کپڑوں سے صاف کیا اور پھر اسے خول میں رکھ کر آگے کی جانب اپنی کمر میں اڑس لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں سیدھی کھڑی ہوئی تو دیکھا' مرد قیدی کی نظریں میرے جسم کے بالائی حصے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میرے جسم کے بالائی حصے پر صرف چمڑے کی چولی بندھی ہوئی تھی۔ مجھ پر اس حالت میں کبھی کسی مرد کی نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ پہلا مرد تھا جس نے مجھے یوں نیم عریاں دیکھا تھا۔ یہ سوچ کر لمحے بھر کو مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔

مرد قیدی شاید میرے حُسن کے سحر میں اس بُری طرح گرفتار ہوا تھا کہ یہ بھی بھول بیٹھا تھا کہ وہیں اس کے سامنے دو لاشیں پڑی تھیں۔

"تُو یہ مجھے اس طرح کیوں دیکھے جا رہا ہے؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔

وہ اس طرح چونک اٹھا جیسے کوئی حسین خواب دیکھتے دیکھتے ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی ہو۔

"تُو .... کیا تُو وہی ہے جو .... جو مجھ سے باتیں کر رہی تھی .... اور جس نے مجھے چیخنے چلانے کو کہا تھا؟" وہ خواب کے سے عالم میں بول رہا تھا۔

"ہاں میں وہی ہوں۔ کیا تُو نے مجھے میری آواز سے نہیں پہچانا؟"

"مگر.......... مگر تیری کوٹھری کا دروازہ کس نے کھولا؟"

"اگر تُو اسے دیکھنا چاہتا ہے تو اس کوٹھری جا کر اس کی لاش دیکھ لے۔" میں نے دائیں جانب اس کوٹھری کی طرف اشارہ کیا جہاں میں مقتول قیدی عورت کے ساتھ بند تھی پھر میں نے اسے بتایا۔ "وہ تھے۔"

"تُو نے .... تُو نے اسے .... اسے بھی مار ڈالا۔" اس کی آواز میں بلا کی حیرت تھی۔

"ہاں' میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ تجھے قید سے رہائی دلاؤں گی۔ اب تُو آزاد ہے۔"

"مگر.......... مگر اب تک اس .... اس بوڑھے شیطان کو شیطانی قوتوں کے ذریعے سب کچھ پتہ چل گیا ہو گا اور .... اور اس کے غلام.........."

"اب اسے کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔" یہ کہتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اس قیدی کو اعتماد میں لینا میرے لئے سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ حصیف ہی کا کوئی خدمتگار معلوم ہوتا تھا اور مجھے اس جگہ تک لے جا سکتا تھا جہاں میں' احرس' نصار اور مہا پجاری کو چھوڑ کر آئی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ میں یہ اندازہ تو پہلے ہی لگا چکی تھی کہ وہ میرے حُسن سے مبہوت ہو کر رہ گیا ہے۔ اس موقع پر مجھے سامر یاد آیا' وہی سامر' وہی حصیف کا ایک خدمتگار جسے میں نے محبت کا فریب دیا تھا اور آخرکار وہ ایک عبرتناک موت سے دوچار ہوا تھا۔ میری ہی مدد کرنے کے جرم میں آج ہی رات حصیف نے اپنی کنیزوں سے اسے میری آنکھوں کے سامنے قتل کرا دیا تھا۔

میں سامر کے خیال میں کھوئی ہوئی تھی کہ اسی دوران میں قیدی نے دھیرے سے کچھ کہا جو میں نہ سن سکی۔

"تُو نے کچھ کہا مجھ سے؟" میں نے قیدی سے دریافت کیا۔

"ہاں' میں نے یہ کہا تھا کہ تُو یقیناً اس بوڑھے شیطان کی قوتوں سے آگاہ نہیں ورنہ یہ نہ کہتی کہ اسے کچھ پتہ نہیں چل سکتا یقین کر میری بات پر کہ اسے ہر بات کی خبر ہو جاتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ کچھ خوفزدہ سا تھا۔ "اس کے غلام اب یہاں آنے والے ہی ہوں گے۔"

"اب وہ نہیں آئیں گے۔" میں نے پھر اسے مسکرا کر دیکھا اور اس کے قریب ہو گئی۔ "سن' میں تجھے ایک ایسی خبر دینے والی ہوں جو کبیت کے کسی شخص کو اب تک نہیں معلوم۔" میری آواز دھیمی ہو گئی۔ "بوڑھا شیطان مر چکا ہے۔"

"نن .... نہیں۔" وہ اس طرح اچھل پڑا جیسے میں نے کوئی ناقابلِ یقین بات کہہ دی ہو۔ "وہ .... وہ نہیں مر سکتا۔ وہ تو صدیوں سے زندہ ہے اور صدیوں زندہ رہے گا۔ تجھے .... تجھے شاید کسی نے بہکا دیا ہے۔"

"یہ غلط ہے کہ وہ صدیوں سے زندہ تھا۔ ہاں وہ صدیوں زندہ رہنے کی آرزو ضرور رکھتا تھا اور اسی آرزو نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سن' مجھے کسی نے نہیں بہکایا بلکہ میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے مرتے دیکھا ہے۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"کب' کہاں' کیسے؟" اب بھی اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"آج ہی رات اور کچھ ہی دیر پہلے لاوا اگلنے والے پہاڑ کے اندر وہ خون اگل کر مر گیا۔" میں نے اس کے تینوں سوالوں کا جواب ایک ساتھ دے دیا۔

"مگر تُو .... تُو کون ہے؟ مجھے کبیت کی تو نہیں لگی۔"

"ہاں' میں کبیت کی نہیں' میرا نام آتون ہے۔" پھر میں نے مختصراً اسے اپنے کبیت آنے کی وجہ بتا دی۔ اسی دوران میں اس کا نام بھی میں نے پوچھ لیا۔ "تو اے بریسا! میں نے تجھے اپنی داستان سنا دی۔ اب تُو کیا مجھے اس جگہ تک لے جا سکتا ہے جہاں میرے تینوں ساتھی ستونوں سے بندھے ہوئے ہیں۔"

"مگر .... مگر ستونوں والے دالان تک تو اس .... اس کے غلام' کنیزیں اور خاص خدمتگار ہی جا سکتے ہیں جس کے بارے میں تُو کہتی ہے کہ مر چکا ہے۔"

"تُو وہاں تک میری رہنمائی تو کر سکتا ہے نا۔"

"لیکن ہمیں اگر راستے میں غلاموں نے دیکھ لیا تو .... تو پھر وہ .... وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" بریسا نیم راضی سا نظر آنے لگا۔

"کیا تُو اس بوڑھے شیطان کی موت کے بعد بھی ڈر رہا ہے؟ کیا تُو آزاد ہونا نہیں چاہتا؟ میں تجھے بتا چکی ہوں کہ میرا لشکر کبیت کے باہر پہاڑوں میں موجود ہے۔ حصیف کی موت کے بعد میں سارے غلاموں کو' سارے کبیت والوں کو آزادی دلا دوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ اس بوڑھے شیطان سے سارے کبیت والوں کو نفرت ہے۔ بول کہ کیا ایسا نہیں؟ سب اس کی شیطانی پُراسرار قوتوں سے خوفزدہ ہو کر اس کے خلاف زبان نہیں کھولتے تھے۔" میں سامر سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں بریسا سے یہ باتیں کہہ

رہی تھی۔

"اگر اے آتون! تُو سچ کہہ رہی ہے کہ بوڑھا شیطان حسیف مر چکا ہے اور .... اور اس کی موت کے بعد سارے کیبت والوں کو آزادی مل جائے گی تو پھر......... میرے دونوں بڑے بھائی بھی غلامی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائیں گے۔" بریسا کی آواز میں دبا دبا سا جوش تھا۔

"ہاں اے بریسا! یقین کر کہ پھر ایسا ہی ہو گا۔"

میری یقین دہانی کے بعد وہ کچھ بدلا بدلا سا نظر آنے لگا اس نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو پھر بریسا ہر قیمت پر تجھے ستونوں والے دالان تک لے کر جائے گا' چاہے اس کی زندگی ہی خطرے میں کیوں نہ پڑ جائے۔" اس کی آواز پُرجوش ہوتی گئی۔ "اگر .... اگر میں اس کوشش میں مارا بھی گیا تو مرتے ہوئے مجھے یہ سکون ہو گا کہ میں اپنے بھائیوں کو غلامی کی زندگی سے نجات دلاتے ہوئے مارا گیا۔"

بریسا کا جسم بھی گٹھا ہوا' قد لمبا اور بازو پُر گوشت تھے۔ جسامت' ڈیل ڈول اور قد کاٹھ میں وہ کسی بھی طرح نصار سے کم نہیں تھا۔ ہاں اگر فرق تھا تو یہ کہ نصار کا رنگ گورا تھا اور بریسا کے جسم کی رنگت گندمی تھی۔

"آ اے آتون! میرے ساتھ چل۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اب اس کے لہجے سے مردانگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے دانستہ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔ وہ مجھے ساتھ لئے سامنے نظر آنے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی میری نظر سامنے نظر آنے والی سپاٹ دیوار پر پڑی پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندازہ تھا۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی دیوار ایک طرف کھسک گئی۔

دیوار ہٹتے ہی ویسی ہی ایک راہداری نظر آئی جیسی میں پہلے دیکھ چکی تھی۔ دونوں راہداریوں میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ اس راہداری کے درمیان بھی دائیں بائیں مجھے ویسے ہی بڑے بڑے دو سوراخ ایک دوسرے کے مقابل نظر آئے جیسے اوپر والی راہداری میں دیکھے تھے۔ بریسا میرا ہاتھ تھامے ان کے سامنے سے گزر گیا۔ دور سے راہداری کے اختتام پر مجھے سیڑھیاں نظر نہیں آئی تھیں۔ قریب پہنچتے ہی پھر سیڑھیاں دکھائی دیں۔ وہاں تو یوں بھی راہداری کے ابتدائی حصے میں لگی ہوئی مشعلوں کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی۔

نیم تاریک سے زینے میں بریسا میرا ہاتھ تھامے اترتا چلا گیا۔ زینے سے اترتے ہی وہ دائیں جانب نظر آنے والی نیم تاریک سرنگ میں داخل ہو گیا۔ وہ سرنگ زیادہ بڑی نہیں تھی اور سامنے روشنی نظر آ رہی تھی۔ سرنگ کے باہر قدم رکھنے سے پہلے بریسا نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"تُو یہیں رک۔" اس نے سرگوشی کی۔ "یہاں کوئی نہ کوئی غلام ضرور پہرے پر موجود ہو گا۔ میں دیکھتا ہوں۔"

جب تک مجھے اپنی کمر میں اڑسے ہوئے خنجر کا خیال آیا' بریسا سرنگ سے باہر قدم رکھ چکا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ نہتا ہے' ایسی صورت میں اس کی زندگی کو خطرہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ اس وقت بریسا کی

زندگی میرے لئے بہت قیمتی تھی۔ اگر وہ مارا جاتا تو میں انجانے خطرات میں گھر سکتی تھی اور پھر عین ممکن تھا کہ ستونوں والے دالان تک میرے قدم نہ پہنچ پاتے۔ یہی سوچ کر میں پنجوں کے بل چلتی ہوئی سرنگ سے باہر آ گئی۔ خنجر خول سے کھینچ کر میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کسی بھی وقت مجھے اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

سرنگ سے نکل کر میں نے ایک گول سی کوٹھری میں قدم رکھا۔ سامنے ہی دیوار میں پیوست مشعل نظر آ رہی تھیں۔ خلاف توقع کوٹھری میں مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ کوٹھری کا کھلا ہوا دروازہ مجھے دائیں جانب نظر آ رہا تھا۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور اسی وقت مجھے کسی کی گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ کوٹھری سے نکلتے ہی میری نگاہ بریسا پر پڑی۔ وہ کسی سے بھڑا ہوا تھا۔ پشت کی طرف سے وہ کسی کے منہ پر اپنا ایک ہاتھ رکھے اسے پیچھے گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شخص' بریسا کی گرفت سے خود کو چھڑانے کے لئے مچل رہا تھا۔ بریسا کا لمبا چوڑا ہاتھ منہ کے ساتھ ہی اس کی ناک کو بھی دبائے ہوئے تھا جس کی وجہ سے یقیناً اس شخص کا سانس بھی گھٹ رہا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر بریسا کا ہاتھ اپنے منہ اور ناک پر سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور کسی بھی لمحے اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اگر وہ چیخنے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید خطرات بڑھ جاتے جن سے نمٹنا آسان نہ ہوتا۔ ممکن ہے آس پاس دوسرے پہریدار بھی موجود ہوں۔ بریسا نے بلا سبب تو اس کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا ہو گا۔ یہ سوچ کر میں تیزی سے آگے بڑھی اور سامنے پہنچ گئی۔

بریسا مجھے دیکھ کر چونک اٹھا۔ اسے شاید مجھ سے یہ توقع نہیں ہو گی کہ میں اس طرح سرنگ سے نکل کر وہاں تک پہنچ جاؤں گی۔ محافظ کے منہ پر اب تک اس کے ہاتھ کی گرفت موجود تھی جس کی وجہ سے محافظ کا سر پیچھے کی طرف تھا' ٹھوڑی اٹھی ہوئی اور گردن تنی ہوئی تھی پھر اس سے پہلے کہ بریسا مجھ سے سرنگ میں واپس جانے کو کہتا میں نے محافظ کی تنی ہوئی گردن پر خنجر کی تیز دھار رکھ دی۔ دوسرے ہی لمحے خنجر اس کی گردن کو کاٹتا ہوا اندر اترتا چلا گیا۔

محافظ کی کٹی ہوئی گردن سے "خرر' خرر" کی آواز نکلی اور خون ابلنے لگا۔

"اے بریسا! اسے اسی طرح پکڑے رہنا جب تک یہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔" میں نے بریسا کو ہدایت دی۔ "مگر ٹھہر' میں اس کا قصہ ہی ختم کئے دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے نصف کٹی ہوئی گردن پر دوبارہ خنجر پھیر دیا۔ اب صرف گردن کا کچھ پچھلا حصہ محافظ کے بقیہ جسم سے جڑا رہ گیا تھا۔

چند ہی لمحوں میں محافظ کا تڑپتا ہوا جسم بالکل ساکت ہو گیا تو بریسا اسے کھینچ کر گول کوٹھری میں لے آیا اور اس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ محافظ کے جسم پر موجود لباس حسیف کے خاص محافظوں کے لئے مخصوص تھا۔ مجھے یہ بات بریسا ہی نے بتائی تھی۔ اس لباس کو زیب تن کر کے وہ باآسانی ستونوں والے دالان تک پہنچ سکتا تھا۔ بریسا کے جسم پر اس لباس کی موجودگی میں اسے روکا نہ جاتا۔ اوپری جسم کے حصے کا لباس کسی جانور کی کھال کا بنا ہوا تھا۔ بریسا نے اس پر سے حتی الامکان خون صاف کر کے اسے پہن لیا پھر اس نے محافظ کے جوتے' دست بند اور سارے ہتھیار اپنے جسم پر سجا لئے۔ محافظ کا کھانڈا اس نے

اپنے ہاتھ میں لیا۔ بریسا کے سر پر لمبے لمبے بال تھے جو اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ نئے لباس میں اور ہتھیاروں کے ساتھ وہ مجھے بالکل بدلا ہوا سا لگ رہا تھا۔ محافظ کی لاش کو گھسیٹ کر وہ سرنگ میں پھینک آیا۔

"اب آ اے آتون! ہمارے لئے خطرہ کم سے کم ہو گیا ہے۔" بریسا مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہم اب آسانی کے ساتھ ستونوں والے دالان تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ راستے میں بوڑھے شیطان کے خاص محافظوں' غلاموں اور کنیزوں سے مڈبھیڑ کم سے کم ہو۔" اس نے آگے بڑھ کر کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔

میں' بریسا کے ساتھ مختلف پیچ در پیچ راستوں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی۔ راستے میں ایک جگہ دو کنزیں نظر آئیں جو ایک سوراخ میں گھس گئیں۔ انہوں نے ہمیں دور سے دیکھا تو تھا مگر شاید کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی پھر ستونوں والے دالان کا وہ مخصوص حصہ شروع ہو گیا جس میں حصیف کے صرف مخصوص غلاموں' کنیزوں اور محافظوں کو داخلے کی اجازت تھی۔ میں اور بریسا ایک سرنگ سے نکل کر اس وسیع و عریض حصے میں پہنچے تھے۔

جیسے ہی ہم دونوں سرنگ سے نکلے' مسلح غلاموں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں نیزہ' کسی کے پاس تلوار اور کوئی کھانڈا سنبھالے ہوئے تھا۔ یہ محاصرہ قطعی خلاف توقع تھا' مگر اس کی وجہ فوراً ہی سمجھ میں آ گئی۔

"اسے تو سردار کے ساتھ واپس آنا تھا۔" ایک غلام نے میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ یقیناً وہ مجھے پہچانتا تھا اور اسے اپنے سردار ہی کی آمد کا انتظار تھا۔ "پھر یہ سانپ کے پھن والی تیرے ساتھ کیوں ہے؟" وہ غلام بریسا ہی سے مخاطب تھا۔

اس دوران میں بریسا نے مجھے خود سے قریب کر لیا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کے چوڑے چکلے سینے پر تھا۔ میں بریسا سے لگی ہوئی سامنے سے نیزے ہاتھوں میں لئے کچھ اور غلاموں کو آتے دیکھ رہی تھی۔ بریسا کی نظریں سامنے ہی کچھ فاصلے پر کھانڈا اٹھائے ہوئے اس خادم کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو اس سے مخاطب تھا۔ دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف سے غلام کسی بھی لمحے ہم پر ٹوٹ پڑنے کے منتظر تھے۔ بریسا کے ہاتھ میں بھی کھانڈا تھا اور وہ بڑی خوں خوار نظروں سے سامنے کھڑے ہوئے غلاموں کو گھور رہا تھا۔ مجھے بریسا اس وقت کوئی ایسا مرد معلوم ہو رہا تھا جو شدید خطرے کے وقت اپنی عورت کو پناہ میں لے لیتا ہے' عورت کو بچانے کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ ستونوں والے دالان کے اس حصے کا فرش ہموار اور چوکور پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ اوپر نہ جانے کس لئے دو ستونوں کے درمیان کپڑے کی چھت سی بنائی گئی تھی۔ میں اس حصے میں قدم رکھتے ہی وہاں کا سرسری جائزہ لے چکی تھی۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ بپھرے ہوئے غلاموں کا وہ غول کسی بھی لمحے مجھے اور بریسا کو ٹکڑے کر سکتا تھا۔ بریسا کس کس سے مقابلہ کرتا۔ وہ سامنے والوں سے نبرد آزما ہوتا یا دائیں بائیں اور پیچھے سے حملہ کرنے والوں سے نمٹتا۔

پے در پے کچھ اس طرح حالات پیش آتے رہے تھے کہ مجھے اپنے اندر موجود پُراسرار قوتوں کا دھیان ہی نہیں آیا تھا۔ اب تک میں نے جو کچھ کیا تھا' وہ محض اپنی ذہنی صلاحیت اور قوت بازو کے بل پر کیا تھا۔ اس میں میری پُراسرار قوتوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میں نے جب سے اس بستی کی حدود میں قدم رکھا تھا اور خجیرہ رخصت ہوئی تھی' اس وقت سے اب تک میری کوئی پُراسرار قوت بیدار نہیں ہوئی تھی۔ ہر طرف سے خطرے میں گھر جانے کے بعد پہلی بار مجھے ان پُراسرار قوتوں کا خیال آیا جن کے بارے میں ابھی خود میں بھی پوری طرح آگاہ نہیں تھی۔

دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے سارے جسم میں تیز قسم کی سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی جس کا مرکز میری دونوں آنکھیں تھیں۔ میری دونوں آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی اور پھر دو باتیں بیک وقت ہوئیں۔ پہلی یہ کہ بریسا کے جسم کو جھٹکا سا لگا اور وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے یہ کہ میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے تیز روشنی سی نکلتے دیکھی جو سامنے کھڑے ہوئے غلاموں کے جسموں میں مرکوز ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے ان غلاموں کے جسم شعلہ دیتی ہوئی آگ کی طرح بھڑک اٹھے۔ میری آنکھوں سے تیز روشنی نکلتے اور سامنے موجود غلاموں کے جسموں کو جلتے یقیناً سبھی غلاموں نے دیکھا تھا۔

خلاف توقع اچانک تمام ہی غلام اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک کر سجدہ ریز ہو گئے۔

"اے آگ کی دیوی! اے زندہ جلا دینے والی! اپنے غلاموں کو معاف کر دے۔" سجدے میں گرے ہوئے کسی غلام نے باآواز بلند کہا اور پھر وہ سبھی یہ الفاظ بار بار دہرانے لگے۔

اب وہاں اپنے پیروں پر کھڑی رہنے والی صرف میں ہی تھی۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ بریسا بھی میرے سامنے سجدہ گزاروں میں شامل تھا۔ وہ مجھے آگ کی دیوی سمجھ کر میرے سامنے سجدہ ریز تھے۔ میرے لئے دیوی بن جانا کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ مجھے علم تھا کہ اب وہ سب میرے دام غلام بن چکے ہیں اور میں ان سے جو کچھ کہوں گی' اسے وہ دیوتاؤں کا فرمان ہی سمجھیں گے۔ میری ایک ہی پُراسرار قوت کے ظہور نے ساری صورت حال کو قطعی بدل دیا تھا۔ میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "اٹھو کہ تمہاری دیوی تمہیں حصیف کی غلامی سے آزاد ہو جانے کی خوشخبری دیتی ہے۔"

وہ سب میرا حکم سنتے ہی ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر میرے اطراف حلقہ سا بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اس دوران میں ان غلاموں کے ڈھانچے بھی جل کر راکھ بن چکے تھے۔ جو میری آنکھوں سے نکلنے والی تیز روشنی کی زد میں آ گئے تھے۔

"سنو کہ دیوتاؤں کو خبر ہو گئی تھی کہ تم اپنے سردار حصیف سے خوش نہیں ہو۔ تم اس سے نفرت کرتے ہو۔" میں پھر غلاموں سے مخاطب ہو گئی۔

"سو دیوتاؤں نے تمہارے دلوں کی پکار سن لی اور حصیف کو ایک عبرت ناک موت مار ڈالا۔ وہ اپنے منہ اور سارے جسم سے خون اگل اگل کر مر گیا۔ اس کی لاش آگ اگلنے والے پہاڑ کے پیٹ میں پڑی ہے۔ جاؤ اور پہاڑوں کے پیٹ میں آباد سارے کبیت والوں کو خبر کر دو کہ آج سے انہیں حصیف کی غلامی سے آزاد کر دیا گیا۔ وہ جو پہاڑوں کے اندر نہیں' انہیں بھی جا کر یہ خوشخبری دے دو۔"

میرا حکم سنتے ہی غلاموں نے بڑے پُرجوش نعرے لگائے اور مختلف سمتوں میں دوڑ پڑے۔ شاید اس حصے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جہاں سے وہ پہاڑوں کے اندر ہر طرف جا سکتے تھے۔

پھر میرے اور بریسا کے سوا وہاں کوئی نہیں رہا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا میری طرف خوفزدہ سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آ اے بریسا! اب ستونوں والے دالان کی طرف چل۔"

میں نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا تاکہ اس کا خوف کچھ کم ہو جائے۔

"اے آتون! مجھے خبر نہیں تھی کہ تُو دیوی ہے اور دیوتاؤں کی چہیتی ہے۔ میری گستاخیوں اور جرأت پر مجھے معاف کر دے۔" وہ گڑگڑایا۔

"مجھے معلوم ہے کہ دیویاں خود کو ظاہر نہیں کرتیں اور ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ سو میں خوش نصیب ہوں کہ میری نظریں تجھ پڑیں اور میں تیرے قدم سے قدم ملا کر چلا' تجھ سے باتیں کیں اور تجھے چھو کر دیکھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ جھجکتا ہوا سا میرے قریب آیا۔

"اور اب بھی چھو کر دیکھ سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں رعشہ سا محسوس کیا۔ شاید یہ میرے لمس کا اثر تھا اور غالباً اس یقین و احساس کا سبب کہ ایک دیوی نے اس کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔

احساس اور یقین ہی تو سب کچھ ہے۔ یقین سے بڑی شاید کوئی اور قوت نہیں جو آدمی کو پستیوں میں بھی دھکیل سکتی ہے اور بلندیوں کی طرف بھی لے جا سکتی ہے۔ سو میں نے یقین کیا کہ میرے اندر غیر معمولی پُراسرار قوتیں موجود ہیں اور پھر وہ قوتیں ظاہر ہو گئیں۔

اس کے بعد ستونوں والے دالان تک پہنچنے میں مجھے اور بریسا کو زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہاں کی فضا اب تک اسی طرح تھی۔ الاؤ' پرلے کی مانند ابھی تک بھڑک رہا تھا اور میرے تینوں ساتھی بھی ستونوں سے اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔

ہاں اس مرتبہ ایک تبدیلی ضرور ہوئی۔ میں نے جیسے ہی اس حصے میں قدم رکھا وہاں موجود کنیزیں اور غلام سجدے میں گر گئے۔

"خوش آمدید اے آتون دیوی! تیرے قدموں کی برکتوں سے ہمیشہ یہ پہاڑ آباد رہیں۔" وہ سب بلند آواز میں کہہ رہے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میری وہاں آمد سے قبل میرے دیوی ہونے کی خبر وہاں پہنچ چکی ہے۔

اسی وقت مجھے حسیف کے کہے ہوئے الفاظ یاد آئے۔ جب وہ مجھے یہاں سے آتش فشاں پہاڑ کے اندر لے جا رہا تھا تو اس نے کہا تھا کہ تیرے ساتھی مقدس مشروب پی کر ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔ جب میں تجھے ساتھ لے کر یہاں لوٹوں گا تو انہیں ہوش میں لے آؤں گا۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ میرے ساتھیوں کی وہ کیفیت ختم ہو سکتی تھی' انہیں ہوش میں لایا جا سکتا تھا۔

"اٹھو!" میں نے سجدے میں پڑی ہوئی نیم برہنہ کنیزوں اور غلاموں سے کہا۔ "تمہیں آزادی مبارک

ہو۔"

"یہ سب تیرے ہی قدموں کی برکت ہے اے دیوی!" وہ سب بیک زبان یہ کہتے ہوئے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

"انہیں ستونوں سے کھول کر ہوش میں لاؤ۔" میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

غلاموں نے میرا حکم سنتے ہی احرس' نضار اور مہا پجاری کو ستونوں سے کھول کر ہموار زمین پر لٹا دیا۔ اسی اثنا میں کئی کنیزیں تقریباً دوڑتی ہوئی ایک طرف گئیں۔ وہ لوٹ کر میرے ساتھیوں کے پاس بیٹھ گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں چرمی بٹوے تھے جو وہ ایک دیوار کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر نکال لائی تھیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے نوکدار مخصوص وضع کے چھوٹے خنجر بھی اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ میں ان کی حرکات کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ ان کنیزوں نے احرس' نضار اور مہا پجاری کے بازوؤں میں نوکدار خنجر سے شگاف ڈالے اور پھر فوراً ہی ان شگافوں میں چرمی بٹوؤں سے کوئی سفوف نکال کر بھر دیا۔ سفوف بھرتے ہی خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ مفلوج کرنے کے لئے میرے بازوؤں میں بھی تو خنجر اتارے گئے تھے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میری نظر اپنے ایک بازو پر پڑی۔ حیرت انگیز طور پر میرے دونوں بازوؤں میں کسی ایک پر بھی زخم کا کوئی نشان موجود نہیں تھا حالانکہ وہ زخم بہت گہرے تھے۔ مفلوج کرنے اور ہوش میں لانے کے لئے یقیناً مختلف قسم کے سفوف استعمال کئے جاتے تھے۔

کنیزیں اپنا فرض انجام دے کر اٹھی ہی تھیں کہ خلاف توقع مجھے پُراسرار سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ سرگوشیوں میں مجھ سے جو کچھ کہا گیا وہ مجھے لرزا دینے کے لئے کافی تھا۔ "سن کہ یہ رات ختم ہونے والی ہے اور سورج طلوع ہونے والا ہے۔ سورج طلوع ہونے کے ایک پہر بعد ہی پاتال میں دندناتا ہوا آتش فشاں بھڑک اٹھے گا۔ پھر مینار نما سیاہ پہاڑ کی چوٹی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ دیوتاؤں کا قہر' زمین کے پیٹ سے ساعت شکن دھماکوں کے ساتھ آسمان کی طرف بلند ہوتا چلا جائے گا اور جب پلٹے گا تو زمین پر سیال آگ کے ساتھ دہکتے ہوئے پتھروں کی بارش ہو گی۔ کبیت کی بستی صفحہ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی اور یہاں دور دور تک سیال آگ کا دریا بہہ رہا ہو گا۔ اس سے پہلے کہ ایسا ہو تُو کبیت والوں کو لے کر یہاں سے نکل جا اور اپنا لشکر بھی نکال لے جا کہ جو ابھی تک تیری اور تیرے ساتھیوں کی واپسی کا منتظر اسی جگہ کھڑا ہے جہاں تُو اسے کھڑا چھوڑ آئی تھی۔"

یہ ایک ایسی ہولناک تباہی کی پیشگوئی تھی جس کا تصور بھی دہلا دینے والا تھا۔ پھر میں نے اس پیشگوئی سے وہاں موجود کنیزوں اور غلاموں کو آگاہ کرنے میں دیر نہیں کی۔ حسیف نے سوراخوں کے ذریعے ان پہاڑوں میں ایک ایسا ترسیلی نظام مرتب کیا تھا کہ اس کے احکام چند ہی لمحوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جائیں۔

حسیف کی موت سے تو انہیں پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا اور یہ خوشخبری بھی دے دی گئی تھی کہ وہ آزاد ہیں' اب ان تک میرے نئے احکام بھی پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ سب میرے ساتھ چلیں گے۔

اس دوران میں نضار' احرس اور مہا پجاری کو ہوش آ چکا تھا اور وہ یہ دیکھ کر شاید حیران ہو رہے تھے کہ

اب وہاں میری حکمرانی ہے۔ ان کی حیرانی کا اظہار ان کے چہروں سے ہو رہا تھا۔ میں انہی کے ہوش میں آنے کی منتظر تھی۔

بریسا یہ سوچ کر غالباً ابھی تک میرے قریب ہی کھڑا تھا کہ دیوی گویا اس پر دوسروں کی نسبت زیادہ مہربان ہے۔ اس کے علاوہ حصیف کی خاص کنیزیں اور غلام بھی اپنے فرائض کی بجا آوری کے بعد میرے روبرو سر جھکائے ادب سے کھڑے تھے۔ انہوں نے میرے احکام تمام ہی کبیت والوں تک پہنچا دیئے تھے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ ان کنیزوں اور غلاموں نے حصیف کی موت کے بعد خود کو اپنے طور پر اب میری خدمت کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ میرے لئے یہ امر یقیناً حیران کن ہی تھا کہ ایک یقینی ہولناک تباہی کے بارے میں جاننے کے باوجود ان میں سے کوئی بھی مجھے وہاں تنہا چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ انہیں یقین رہا ہو گا کہ وہ گویا اپنی دیوی کی امان میں ہیں، جب تک وہ دیوی کے ساتھ ہیں، موت ان تک نہیں پہنچ سکے گی۔

نضار، احرس اور مہا پجاری کو اس وقت ہوش آیا جب میں کنیزوں اور غلاموں کو آنے والی ہولناک تباہی کی خبر دے چکی تھی۔ انہیں کچھ بھی خبر نہیں تھی کہ ساری بھاگ دوڑ کیوں ہو رہی ہے۔ ان کی سوالیہ نظریں اسی لئے میری طرف اٹھی ہوئی تھیں مگر میں نے انہیں کچھ بتانے میں وقت ضائع کئے بغیر وہاں موجود تمام کنیزوں اور غلاموں کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔

پھر میں اور میرے ساتھی، ان کنیزوں اور غلاموں کے جلو میں مختلف سرنگوں کے اس جال سے نکل کر سوراخوں کے ذریعے پھسلتے ہوئے پہاڑوں کی دنیا سے باہر آ گئے۔ بریسا رہنمائی کے لئے میرے ساتھ ساتھ موجود تھا۔

میں جیسے ہی باہر آئی سارے کبیت والے میرے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ ان میں عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے سبھی تھے۔ میرے حکم پر وہ سجدے سے اٹھے اور میرے حق میں نعرے بلند کرنے لگے۔ اس وقت تک سورج طلوع ہو چکا تھا۔ مجھے ان لوگوں کے ساتھ ان کی سواریاں بھی نظر آ رہی تھیں اور باربرداری کے جانور بھی۔ تباہی میں ابھی ایک پہر باقی تھا۔

ایک بڑے پتھر پر چڑھ کر میں نے بلند آواز میں انہیں مخاطب کیا۔ "اے کبیت والو! تمہیں آزادی مبارک ہو اور وہ نئی بستیاں بھی جہاں اب تمہیں آباد کیا جائے گا۔ کیا تم اس پر خوش ہو کہ تمہیں یہاں سے نکال کر کہیں اور بسا دیا جائے؟ کیا تم اپنی آتون دیوی کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو؟ تمہیں خبر کی جا چکی ہے کہ اس زمین کے حصے پر دیوتاؤں کا قہر ٹوٹنے والا ہے اور تم یہاں نہیں رہ سکتے۔"

ان سبھی نے بیک زبان میرے ساتھ چلنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ مجھے یہی ان سے توقع بھی تھی۔

پھر میں ان سب کو ساتھ لئے اپنے لشکر تک پہنچ گئی۔ لشکر میں جیسے زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے میرے ساتھ احرس اور مہا پجاری کو آتے ہوئے بھی یقیناً دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے سارے لشکر والے خوشی اور جوش میں "آتون دیوی" زندہ باد کے نعرے بلند کرنے لگے۔

☆======☆==☆

آن لائن پبلک لائبریری

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات ...

خیر وشر کا ازلی تصادم، ہنگامے جگاتی پراسرار داستان
دیدبان
2
شمیم نوید

آئیڈیل پیاک

دیدبان

وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی۔ پُراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں۔ اس کی آنکھوں میں موت کی کڑکتی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر تھی نہ موت کی۔ وہ سانپ سے زیادہ زہریلی تھی۔ وہ اپنے دشمن کی کٹی ہوئی گردن دیکھنا چاہتی تھی۔ پُراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں۔

پُراسرار قوتوں کی مالک ایک دوشیزہ کی ہنگاموں سے بھرپور داستانِ عجیب

کبیت کے جوانوں کی تعداد میرے لشکر سے زیادہ ہی تھی۔ عورتیں' بچے اور بوڑھے ان کے علاوہ تھے۔ وہ سبھی صحت مند اور تندرست و توانا تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہیں زخمی سپاہی نے وحشی قبیلے کا نام دیا تھا۔ اسی وحشی قبیلے کے افراد اب میرے مطیع و فرماں بردار بن چکے تھے۔ حصیف کی خاص کنیزوں اور غلاموں نے مجھے اور میرے تینوں قریبی ساتھیوں کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔ گویا ان کی حیثیت میرے محافظ دستے کی سی تھی۔ انہی میں بریسا بھی شامل تھا جسے یہ اعزاز حاصل تھا کہ میرے گھوڑے کے بالکل پیچھے اس کا گھوڑا تھا۔ میں نے اسے اشارے سے آگے بلا لیا اور وہ نضار کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میری دائیں جانب احرس اور پھر مہا پجاری کے گھوڑے تھے اور بائیں جانب نضار اور بریسا چل رہے تھے۔ میں نے بریسا کو جو عزت دی تھی' یہ ان لمحوں کا قرض تھا جب وہ مجھے ایسا مرد معلوم ہوا تھا جو شدید خطرے کے وقت اپنی عورت کو پناہ میں لے لیتا ہے۔ اس وقت جب غلاموں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور میں بریسا کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ میں بریسا کو عزت دے کر انہی لمحوں کا قرض ادا کرنا چاہتی تھی۔ اب ہم ہولناک تباہی کا شکار ہونے والی اس وادی سے نکل آئے تھے۔ اس کے باوجود میں وہاں سے مزید دور نکل آنا چاہتی تھی۔ اگر ہمارے ساتھ بار برداری کے جانور نہ ہوتے تو شاید ہم مزید تیز رفتاری سے اپنا سفر جاری رکھتے۔

اس دوران اپنے تینوں ساتھیوں کو میں نے مختصراً کچھ اہم باتوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہیں اب یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس قبیلے کا شیطان بوڑھا سردار حصیف مر چکا ہے اور آتش فشاں بھڑکنے والا ہے۔

پیشگوئی کے عین مطابق سورج طلوع ہونے کے ٹھیک ایک پہر بعد اچانک ہمیں زمین ہلتی محسوس ہوئی۔ لشکر کو روک دیا گیا۔ عقب سے زبردست دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ پہاڑوں کے اندر آباد وہ دنیا نیست و نابود ہو چکی تھی جسے شیطانی قوتیں رکھنے والے ایک بوڑھے نے اپنی

حکمرانی کا مرکز بنایا تھا۔

خجیرہ کی رہنمائی میں کبیت کی طرف جاتے ہوئے میں نے' نضار اور دستوں کے سالاروں نے راستے کو اپنے ذہن میں رکھا تھا تاکہ واپسی کے وقت ہمیں دشواری نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ہم راستہ نہیں بھٹکے۔ اب ہم ایسے راستے پر سفر کر رہے تھے جو ہمارا جانا پہچانا تھا۔

دوپہر کو ہم نے تقریباً اسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں جاتے ہوئے ٹھہرے تھے۔ حسب دستور ہمارے لئے خیمہ لگا دیا گیا۔ ہم نے خیمے ہی میں کھانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ میں نے خیمے میں بریسا کو بھی بلانے کا حکم دے دیا۔

"کیا بات ہے؟ دیوی اپنے اس نئے پجاری پر کچھ زیادہ ہی مہربان معلوم ہو رہی ہے۔" احرس نے اپنی عادت کے مطابق میری طرف جھک کر سرگوشی کی کیونکہ وہاں مہا پجاری اور نضار بھی موجود تھے۔

"بکو مت!" میں نے بھی حسب عادت اسے محبت سے ڈانٹا۔ میری آواز بھی دھیمی ہی تھی۔ "تُو ہر ایک کو اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے۔"

"مگر یہ تو بتا کہ وہ ہے کیا شے؟" وہ شرارت سے باز نہ آیا۔

"ہو گا کچھ' تجھے کیا لینا اور سن اگر تُو نے اپنی حرکتیں نہ چھوڑیں تو میں تجھے مہا پجاری کے ساتھ ایک بار پھر تریال بھیج دوں گی۔"

"لوٹ نہیں مچی ہوئی کہ پھر بھیج دے گی۔ ویسے بھی اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ جو تُو یہاں سے اپنے ساتھ ایک فوج ظفر موج لے جا رہی ہے' کس دن کام آئے گی۔" احرس مسکرایا۔

ہنسی ہنسی میں احرس نے واقعی پتے کی بات کہہ دی تھی۔ اب سمیر اور اس کے لشکر کی مجھے ضرورت نہیں رہی تھی۔ کبیت والوں کی وجہ سے میری افرادی قوت میں یقیناً خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ اب ژیان سے ٹکر لی جا سکتی تھی۔

"اے نضار! کیا تم نے ایک بات پر غور کیا؟" میں نے مسکرا کر اپنی دائیں جانب بیٹھے ہوئے نضار کو مخاطب کیا' پھر خود ہی اس سوال کا جواب دے دیا۔ "مہا پجاری اور احرس کو ہم نے ایک نیا لشکر لینے ہی تو بھیجا تھا۔ دیکھ لے یہ اپنے ساتھ ایک لشکر لے آئے ہیں۔"

"اس کے علاوہ حسین کنیزیں' خوبصورت عورتیں اور بچے منافع میں ہیں جو آئندہ ایک اور نئے لشکر کی راہ ہموار کر سکتے ہیں۔" احرس نے گویا گرہ لگائی۔ یہ بات اس نے اتنے بے ساختہ انداز میں کہی تھی کہ میرے ساتھ نضار اور مہا پجاری بھی زور سے ہنس پڑے۔

اسی وقت بریسا اندر داخل ہوا اور مجھے تعظیم دی۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بریسا کے آتے ہی کھانا بھی آ گیا۔

کھانا کھاتے ہوئے پھر وہی ذکر چھڑ گیا۔ نضار نے بھی سنجیدگی کے ساتھ اس معاملے میں اپنی رائے

کا اظہار کیا۔ "اے آتون! اب ژیان سے اگر ہماری افرادی قوت زیادہ نہیں تو اسے کم بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کبیت والوں کے تیرے ساتھ آ جانے سے صورت حال خاصی بدل گئی ہے پہلے صرف میرے زیر نگیں دو بستیاں تھیں۔ میری افرادی قوت دشمن کے مقابلے میں ایک چوتھائی کے قریب تھی پھر تو میرے ساتھ آ ملی اور ہماری افرادی قوت دگنی ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے اپنی آبائی بستی دوبارہ حاصل کر لی۔ اسی کے ساتھ دو اور قبیلے ہمارے زیر نگیں آ گئے۔ اب یہ کبیت والے بھی ہمارے ساتھ آ ملے ہیں۔ ان کے لئے یا تو اپنی بستی ہی کے قریب ایک الگ بستی بسانا پڑے گی یا پھر انہیں ادل اور احزم کی بستیوں میں اور کچھ کو اپنی بستی میں جگہ دینا پڑے گی۔"

اس موقع پر مہا پجاری بول اٹھا۔ "اے عظیم اشر کے عظیم بیٹے نضار! میری مان تو کبیت والوں کو الگ ہی بسا۔ اس سے ان کی شناخت برقرار رہے گی۔ درے والی پہاڑی کی ایک جانب تیری بستی ہے' دوسری جانب تُو انہیں بسا دے کہ وہاں کی زمین زرخیز اور عمدہ ہے۔ چشمے کا پانی بھی ان کے قریب رہے گا۔"

"اے مہا پجاری!" میں نے بھی اپنی تجویز پیش کی کیونکہ ان لوگوں کو بسانے کے لئے ایک بہت عمدہ جگہ میرے ذہن میں بھی محفوظ تھی۔ "یہ لوگ کیونکہ پہاڑوں میں رہنے کے عادی ہیں انہیں کیوں نہ اس جگہ .... اس پہاڑی سلسلے میں بسا دیا جائے جو اشر کی بستی سے صرف نصف پہر کے فاصلے پر ہے اور جہاں پلٹ کر تُو نے پناہ لی تھی۔"

"سب اپنی اپنی کہے جا رہے ہیں۔" احرس بھی پیچھے نہ رہا۔ "اور جس کو بسانے کے غم میں ہم اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں' اس غریب سے کوئی جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھ رہا کہ بول تُو خود کہاں بسنا یا اجڑنا چاہتا ہے؟" احرس نے بریسا کی طرف دیکھا۔

"اے احرس! بریسا یا کسی بھی کبیت والے کو کیا خبر کہ کون سی جگہ بہتر رہے گی۔" میں نے کہا۔ "یہ فیصلہ تو خود ہم ہی کو کرنا پڑے گا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ قبیلے کے کچھ بزرگوں کو وہ دونوں جگہیں دکھا دی جائیں جو ہمارے نزدیک ان کے بسنے کے لئے بہتر ہیں۔ مہا پجاری کی اس تجویز سے تو مجھے پورا اتفاق ہے کہ انہیں الگ ہی بسایا جائے' بانٹا نہ جائے۔ دوسری بات میرے ذہن میں یہ ہے کہ انہیں اشر کی بستی ہی کے کہیں قریب بسایا جائے۔ وہ جگہ درے والی پہاڑی کی دوسری طرف بھی ہو سکتی ہے اور پہاڑی سلسلہ بھی۔ دونوں مقامات مرکزی بستی سے قریب ہیں' میری مراد اشر کی بستی سے ہے۔"

میری بات سے مہا پجاری اور نضار دونوں ہی نے اتفاق کیا۔ رہا احرس تو اس کا کچھ کہنا نہ کہنا برابر ہی تھا۔ وہ کسی بھی معاملے میں کم ہی سنجیدہ ہوتا تھا البتہ فقرے بازی اور شرارت کا کوئی موقع نہیں چھوڑتا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اب اس کی خوش مزاجی پھر واپس آ گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب اسے مجھ سے بچھڑ جانے کا خطرہ نہیں رہا تھا۔

کھانے سے فراغت پا کر ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر اشر کی بستی کا رخ کیا۔

اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا جب ہم پہاڑی درے میں داخل ہوئے اور پھر درے سے گزر کر

بستی کی طرف چل دیئے۔

میرے حکم پر کبیت والوں نے فی الحال بستی کے باہر ہی پڑاؤ ڈال لیا اور لشکر بھی وہیں رک گیا۔ کنیزیں اور غلام بہرحال میرے ساتھ ہی رہے' بریسا بھی انہی میں شامل تھا۔ میرے قریبی ساتھیوں میں یہ بستی صرف احرس کے لئے نئی تھی۔ وہ پہلی بار ہی یہاں آیا تھا۔

حویلی سے باہر نکل کر احزم نے ہمارا استقبال کیا اور کامیاب لوٹنے پر مبارک باد دی۔

کنیزوں اور غلاموں کے رہنے کا بندوبست اسی حصے میں کیا گیا جو میرے لئے مخصوص تھا۔ میری خواب گاہ کی دائیں اور بائیں جانب والے کمرے انہیں دے دیئے گئے۔ حویلی کے اس حصے میں پہلے جو خادمائیں اور خدمت گار متعین تھے' انہیں وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ حویلی کے اسی حصے سے قریب تر وہ حصہ تھا جو نصار کے لئے وقف تھا۔ وہاں اتنی گنجائش تھی کہ احرس اور مہا پجاری کے لئے جگہ نکل سکے۔ سو ان کا بندوبست بھی ہو گیا۔ دن بھر کے سفر نے تھکا دیا تھا اس لئے کھانے سے فارغ ہو کر بس کچھ ہی دیر میں نے احرس کے ساتھ حویلی کے باغ میں چل قدمی کی اور پھر اپنی خواب گاہ کی طرف لوٹ آئی۔ اب میں آرام کرنا چاہتی تھی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح ناشتہ کر کے ہم سب اس بڑے کمرے میں جمع ہو گئے جو اجلاسوں کے لئے مخصوص تھا۔

اس اہم اجلاس میں نصار کے نائب ادل کی کمی محسوس ہو رہی تھی ورنہ سبھی موجود تھے۔ نصار پہلے ہی اپنے ایک قاصد کو گزشتہ رات ادل کی طلبی کا پروانہ لے کر روانہ کر چکا تھا۔ وادی سبز پر حملہ کوئی معمولی بات نہیں تھی جس کا فیصلہ ہم راستے میں کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں تمام اہم افراد سے مشورہ کرنا ضروری تھا اور ان افراد میں ادل کا نام بھی شامل تھا۔ ادل کو آج شام تک پہنچ جانا چاہئے تھا پھر بھی اس کی غیر موجودگی کے سبب ابتدائی اجلاس کو معطل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس اجلاس کا دوسرا اہم موضوع کبیت والے تھے۔ پہلے میں اسی دوسرے معاملے کو نمٹانا چاہتی تھی۔ وہ ایک الگ قبیلہ تھا۔ میرے نزدیک انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ان کا سردار ان میں سے ہو' چاہے وہ میری یا نصار کی نیابت ہی کیوں نہ کرے۔ ذاتی طور پر میرے دل میں اپنی نیابت کرانے کی کوئی ایسی خواہش نہیں تھی لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ کبیت کا سردار میرا ہی نائب کہلاتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نصار سے ان لوگوں کا کوئی ذہنی یا روحانی رشتہ استوار نہیں ہو سکا تھا پھر یہ کہ مجھے ان لوگوں کو ژیان کے مقابل لڑانا بھی تھا۔ وہ خود کو مجھ سے وابستہ کرتے تو گویا یہ جنگ خود ان کی جنگ ہوتی۔ انہوں نے مجھے دیوی تسلیم کر لیا تھا اور میں ان کی عقیدت سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ وہ بھی مجھے دیوی مانتے تھے۔ نصار' احزم اور ادل کو بھی اب اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ میدانِ جنگ میں یہ عقیدت کتنی سودمند اور کارگر ثابت ہوتی ہے۔ میں اسی لئے کبیت والوں سے اپنا یہ تعلق قائم رکھنا چاہتی تھی۔

اجلاس کے کمرے میں آنے سے پہلے ہی میں نے بریسا کو کبیت والوں کی طرف بھیج دیا تھا۔ اسے

قبیلے کے کچھ بزرگوں کو اپنے ساتھ لے کر آنا تھا۔ انہی کی موجودگی میں کوئی فیصلہ کرنا میرے نزدیک بہتر تھا۔

بریسا اپنے ساتھ ان سات بزرگوں کو لے آیا تو باقاعدہ اجلاس شروع ہوا۔

میں نے قبیلے کے ان سات بزرگوں کو مخاطب کیا جو مجھے تعظیم دے کر ایک طرف مؤدب بیٹھ گئے تھے۔ "اے کبیت کے بزرگو! تمہیں خبر ہے کہ میں تمہیں یہاں بسانے کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ لائی ہوں۔ سو میں نے تمہارے لئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں مختلف بستیوں میں بسانے اور بانٹنے کے بجائے کسی ایک ہی جگہ بسایا جائے تاکہ تمہاری الگ پہچان باقی رہے کہ تم کبیت والے ہو' دوسرا فیصلہ میں نے یہ کیا ہے کہ تم اپنی دیوی' یعنی مجھ سے زیادہ دور نہ رہو۔ سو میرا قیام اس بستی میں ہے۔" پھر میں نے انہیں ان دونوں جگہوں کے بارے میں بتایا جو ان کے لئے سوچی تھیں۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم یہ دونوں جگہیں دیکھ کر خود فیصلہ کرو کہ تمہارا کہاں بس جانا تمہارے لئے بہتر ہو گا۔ آج شام تک دونوں جگہیں دیکھ کر تم مجھے اپنے ارادے سے آگاہ کر دو۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ حسیف کی موت کے بعد میری خواہش ہے کہ تمہارا سردار تمہی میں سے ہو۔ اپنے قبیلے کی روایات کے مطابق تم جسے اپنا سردار بنانا چاہو گے' وہ تمہاری دیوی کے لئے قابل قبول ہو گا۔ میں اپنی بات کہہ چکی اب تم بولو۔"

کچھ دیر سکوت طاری رہا پھر ایک چوڑے دہانے والے بوڑھے نے میری اجازت سے بولنا شروع کیا۔ "اے آتون دیوی! تو نے ہمارے بارے میں جو دو فیصلے کئے' اس پر ہم تیرے شکرگزار ہیں۔ تیرا حکم ہو گا تو ہم تجویز کردہ دونوں جگہیں دیکھ آئیں گے مگر صدیوں سے ہم پہاڑوں کے قریب رہتے بستے آئے ہیں۔ پہاڑوں سے اتر کر جب بھی ہم نے میدانوں کا رخ کیا تو ہمیں میدان راس نہیں آئے اور پہاڑوں ہی کی طرف لوٹنا پڑا۔ سو اگر یہاں سے نصف پہر کے فاصلے پر پہاڑی سلسلے موجود ہیں تو ہمیں اجازت دے کہ ہم وہاں بس جائیں۔ وہ جو مر گیا' جس سے ہم نفرت بھی کرتے تھے اور ڈرتے بھی تھے' اس سے پہلے ہمارے قبیلے کا جو سردار تھا اور جسے حسیف نے قتل کر دیا تھا' قبیلے کی روایات کے مطابق سردار ہونے کا حق اسی کی اولاد کو تھا۔ اس کی اولادوں میں سے ظالم حسیف نے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑا۔ ہم خوش نصیب ہیں اے آتون دیوی کہ تُو نے ہم پر فضل کیا۔ اب تُو ہم میں سے جسے ہمارا سردار بنا دے گی' وہ ہمیں قبول ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ بوڑھا چپ ہو گیا۔

"مگر اے بزرگ! ایسی صورت میں قبیلے کی روایات کیا ہیں کہ جب سابق سردار کی اولادوں میں سے کوئی زندہ نہ بچے؟" نصار نے سوال کیا۔

"تو پھر بستی کے بوڑھے اپنے جوانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیتے ہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"اور ان بوڑھوں کو کون منتخب کرتا ہے؟" احرس نے شوشہ چھوڑا۔

"ان کی عمریں۔" بوڑھے نے بتایا۔ "جس کی جتنی زیادہ عمر ہوتی ہے' وہ اتنا ہی زیادہ قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ عمروں کے اعتبار سے سات بوڑھوں کو قبیلے والے منتخب کر لیتے ہیں کہ وہ جوانوں میں سے

کسی کو بھی قبیلے کی سرداری کے لئے چن لیں۔"

احرس میرے قریب ہی بیٹھا تھا' اس موقع پر اس نے سرگوشی کی۔ "اے آتون! بوڑھے یقیناً قابل احترام ہوتے ہیں مگر اکثر بوڑھے سٹھیا بھی تو جاتے ہیں۔ ان بوڑھوں کے ہاتھ میں جوانوں کی قسمت نہ دے اے آتون! جوان تجھے دعا دیں گے۔"

"تُو چپ بیٹھ۔" میں نے آہستہ سے جھڑک دیا اس طرح کہ وہ بُرا نہ مانے۔ ویسے اجلاس کے دوران میں احرس کا یوں مجھ سے سرگوشیاں کرنا کچھ بہتر نہیں تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی عادت سے مجبور ہے۔

اس عرصے میں وہ ساتوں بوڑھے آپس میں کچھ صلاح مشورہ کرتے رہے پھر ان ساتوں ہی نے مجھ سے بیک زبان التجا کی کہ خود میں ہی ان میں سے کسی کو سردار منتخب کر دوں۔

"تُو دیوتاؤں کی چہیتی ہے اے آتون!" آخر وہی چوڑے دہانے والا بوڑھا۔ "سوائے آتون دیوی! تجھ سے بہتر دیوتاؤں کی مرضی سے کون واقف ہو سکتا ہے۔ دیوتا ہمیں جانتے ہیں اور تُو دیوتاؤں کو جانتی ہے۔ ہم اپنا فیصلہ تجھی پر چھوڑتے ہیں۔"

ان بوڑھوں نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ دیوی کی حیثیت سے بھلا میں ان کے سامنے کس طرح یہ اعتراف کر لیتی کہ بریسا کے سوا تو کسی اور نوجوان کا ان میں سے نام بھی نہیں جانتی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ میں ان لوگوں کے جذبات عقیدت کو بھی مجروح کرنا نہیں چاہتی تھی۔ سو پھر میں نے اسی کا نام لے دیا جس کا قرض مجھ پر واجب تھا اور یہ بریسا ہی تھا۔

بریسا بھی وہیں موجود تھا۔ وہ شکرگزاری کے اظہار میں اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ اس موقع پر مجھے سامر بہت یاد آیا۔ میں اس کا قرض نہیں اتار سکی تھی جس نے ان پہاڑوں میں مجھے سب سے پہلے پناہ دی تھی۔ اگر وہ اس وقت زندہ ہوتا تو شاید میں قبیلے کی سرداری کے لئے اسی کا نام لیتی۔

"اٹھ اے بریسا!" میں نے بریسا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "دیوتا تجھے صحیح فیصلے کرنے والی عقل دیں اور تُو کسی کے ساتھ ظلم و ناانصافی نہ کرے۔"

پھر ان ساتوں بوڑھوں نے روایت کے مطابق بریسا کا دایاں ہاتھ باری باری تھام کر بوسا دیا۔ یہ گویا اسے سردار تسلیم کر لینے کا اعتراف تھا۔

"اب اے بریسا! تُو اپنی بستی کے ان بزرگوں کو لے کر یہاں سے نصف پہر کے فاصلے پر موجود پہاڑی سلسلوں کو دیکھ آ اور واپس آ کر مجھے بتا کہ تیرے قبیلے کے بزرگوں نے کیا فیصلہ کیا۔ درے والی پہاڑی کی دوسری جانب جو زمین ہے' وہ بھی دیکھ لے۔" پھر میں نے حکم دیا کہ ان لوگوں کی رہنمائی کے لئے دو سپاہیوں کو ساتھ بھیج دیا جائے۔

بریسا اپنے قبیلے کے بوڑھوں کو لے کر وہاں سے چلا گیا تو نضار نے گفتگو شروع کی جو وادی سبز پر حملہ کرنے کے متعلق تھی۔

"اے آتون!" نضار نے مجھے مخاطب کیا۔ "وادی سبز کے آس پاس جو مختلف قبائل آباد ہیں جنہیں ژیان نے زبردستی اپنے زیر نگیں بنا رکھا ہے' ہمیں وادی سبز پر حملہ کرنے سے پہلے ان کے پاس اپنے سفیر بھیجنا چاہئیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے سے قبیلے ہیں جن میں ژیان نے اپنے نائب مقرر کر رکھے ہیں۔ واہب کا حشر دیکھنے کے بعد یقیناً وہ سبھی خوفزدہ ہوں گے۔ ہم ان قبیلوں کو اس بنیاد پر امان دینے کا وعدہ کر سکتے ہیں کہ وہ ژیان کے ساتھ ہماری متوقع جنگ میں غیر جانبدار رہیں۔"

"اور اس کے باوجود انہوں نے وقت پڑنے پر ژیان کا ساتھ دیا تو؟" احرس نے پہلی بار کوئی سنجیدہ بات کی۔

"اے احرس! موجودہ صورت حال میں بھی تو وہ ژیان ہی کا ساتھ دیں گے۔" نضار بولا۔ "یہ تو ہماری ایک کوشش ہے کہ ان میں سے کچھ قبیلوں کو غیر جانبدار رہنے پر آمادہ کر لیں۔ اس کے باوجود ہم ایسی جنگی حکمت عملی ترتیب دیں گے کہ ان کی بدعہدی سے کوئی فرق نہ پڑے۔"

"ان چھوٹے چھوٹے قبیلوں کے علاوہ بھی کہ جن کا ذکر سردار نے کیا' ژیان نے چند اور قبیلوں کو بھی معاہدہ امن میں باندھ رکھا ہے۔" احزم نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ "ہمیں ان قبیلوں کی طرف بھی اپنے سفیر بھیجنا پڑیں گے۔"

"یہ سفیر کس کی طرف سے روانہ کئے جائیں گے؟" مہا پجاری نے ایک اہم سوال کیا۔

"ہمارے سردار نضار کی طرف سے۔" احزم نے جواب دیا۔

"نہیں۔" نضار بول اٹھا۔ "اے احزم! اگر ہم نے ایسا کیا تو یہ ایک بڑی غلطی ہو گی۔"

"تو پھر اے سردار!" احزم نے دریافت کیا۔

"یہ سفیر وادی سبز کی اصل وارث سردار اشم کی بیٹی اپنی طرف سے بھیجے گی۔" نضار نے جواب دیا۔ "تیرا سردار تو وادی سبز کا وارث نہیں اے احزم! پھر اسے بلا سبب وادی سبز پر حملہ کرنے کا کیا حق ہے۔ اگر سفیر میری طرف سے بھیجے گئے تو اسے جارحیت سمجھا جائے گا جسے کوئی بھی قبیلہ پسند نہیں کرتا۔ یہی سفیر مظلوم و مقتول سردار اشم کی بیٹی نے اپنی جانب سے روانہ کئے تو وادی سبز پر اس کے حملے کو اس کا حق سمجھا جائے گا۔ ایسی صورت میں عین ممکن ہے کہ وہ قبائل جنہیں معاہدہ امن کے تحت ژیان نے اپنے ساتھ باندھ رکھا ہے' اس معاملے میں ژیان کا ساتھ نہ دیں اور غیر جانبدار ہو جائیں۔"

"اس کا بالکل امکان ہے اے نضار!" مہا پجاری نے کہا۔ "اب تک وہ قبائل اس لئے ژیان کا ساتھ دیتے رہے ہوں گے کہ وادی سبز کا کوئی دعویدار ہی نہیں تھا۔ بطور خاص مجھے دو سرداروں سے یہ امید ہے کہ جب انہیں معلوم ہو گا کہ محترم سردار اشم کی بیٹی زندہ ہے اور اپنا حق حاصل کرنا چاہتی ہے تو وہ ژیان کا ہرگز ساتھ نہیں دیں گے' ایک تو سردار صاحی دوسرا سردار موسر۔"

"تو پھر اے مہا پجاری! کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ خود تُو ہی سردار صاحی اور سردار موسر کی طرف میرا سفیر بن کر جائے؟" میں بولی۔

"ان سفارتی کوششوں کے نتیجے میں کیا ژیان اس سے باخبر نہیں ہو جائے گا کہ تُو زندہ ہے اور اس

سے اپنا حق حاصل کرنے یہاں تک آ پہنچی ہے؟" احرس بول اٹھا۔ "اب تک تُو اس بات کو راز ہی میں رکھا گیا ہے کہ تُو دراصل سردار اشم کی بیٹی معبلہ ہے۔"

"ہاں اے میرے بھائی احرس! تُو ٹھیک کہتا ہے لیکن اب اس راز کو راز رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔" نضار نے کہا۔

"اب تو ہماری طویل جدوجہد کا آخری مرحلہ ہے اے احرس!" مہا پجاری بولا۔ "اب تو ہمیں معبلہ کو سامنے لانا ہی پڑے گا اور اے میری بچی!" مہا پجاری مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میں تیرا سفیر بن کر سردار صاحی اور سردار موسر کی طرف ضرور جاؤں گا۔"

اجلاس جاری رہا اور وادی سبز پر حملہ کرنے سے پہلے مختلف تجاویز اور ممکنہ اقدامات کے فیصلے ہوتے رہے۔ میں بھی اس گفتگو میں حصہ لیتی رہی' مگر بار بار مجھے جانے کیوں ژیان کے پروردہ بوڑھے ساحر زعیم کا خیال آتا رہا۔ ژیان اس بوڑھے ساحر کے ذریعے مجھ پر ایک مرتبہ حملہ کرا چکا تھا۔ اس وقت اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں۔ ورنہ بقول نضار کے وہ مجھے اغوا کرنے کے بجائے قتل کرانے کی کوشش کرتا۔ موجودہ صورت حال نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا تھا کہ اب میری اصل شخصیت سامنے آنے والی تھی۔ یقیناً ان سفارتی کوششوں کے بعد ژیان کو حقیقت کا علم ہو جاتا۔ میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا پھر ژیان خاموش بیٹھا رہ سکے گا؟ کیا وہ مجھ پر پہلے سے بھی زیادہ بھرپور حملہ نہیں کرائے گا" کیا وہ مجھے کسی بھی طرح قتل کرانے کے لئے اپنی پوری قوت صرف نہیں کر دے گا؟ اور کیا وہ اس سلسلے میں بوڑھے ساحر زعیم سے مدد حاصل نہیں کرے گا؟ یہ وہ سوالات تھے جو اس اجلاس کے دوران میرے ذہن کو پریشان کرتے رہے۔

موجودہ معاملے کی نوعیت ایسی تھی کہ میں' نضار کے سوا اس پر کسی اور سے گفتگو نہیں کر سکتی تھی۔

اجلاس ختم ہو گیا تو میں نے اسی لئے نضار سے کہا۔ "تُو میرے ساتھ چل۔" میری آواز دھیمی تھی کیونکہ پیچھے احرس بھی آ رہا تھا اور میں' نضار سے خلوت میں گفتگو کرنا چاہتی تھی۔

میرا ذہن اس وقت اتنا الجھا ہوا تھا کہ میں نے یہ خیال بھی نہ کیا احرس آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ جب میں نضار کو ساتھ لئے اپنے کمرے کی طرف جانے والی راہداری میں مڑنے لگی تو احرس بھی ادھر ہی مڑا۔ اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"اے نضارض تُو جا۔" مجھے احرس کی وجہ سے مجبوراً کہنا پڑا۔ "میں تیرے پاس آ جاؤں گی۔"

نضار نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر احرس پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے' میں تیرا انتظار کروں گا۔"

میں نے خود ہی اجلاس ختم ہونے کے بعد نضار سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا اور پھر خود ہی اس سے جانے کو کہہ دیا تھا۔ نضار کی عجیب سی نظروں کا یہی مطلب ہو سکتا تھا' پھر اس نے احرس پر نگاہ ڈالی تھی اور وہ بھی میرے نزدیک بے معنی نہیں تھا۔ گویا میں نے احرس کو اس پر ترجیح دی تھی۔ احرس نے پہلے ہی

کی طرح ایک بار پھر مجھے الجھن میں مبتلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ احرس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ سے کہا۔ "وہ نضار تیرا انتظار کر رہا ہو گا تُو اس کے پاس کب جائے گی؟" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"تجھے کیا' میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ تُو کہہ تجھے مجھ سے کیا کہنا ہے؟" میں نے کہا۔ "تجھے مجھ سے کچھ کہنا ہی ہو گا نا جبھی میرے ساتھ آیا ہے۔" میرے لہجے میں چبھن تھی جو ظاہر ہے' حالات کا تقاضا تھی۔

"تو میں اسی وقت تیرے ساتھ آیا کروں جب تجھ سے کچھ کہنا ہو؟ مجھے تو تجھ سے کچھ نہیں کہنا' بول اب۔" وہ میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگا۔ اس کا انداز لڑاکا عورتوں جیسا تھا۔ "بول نا' چپ کیوں بیٹھی ہے اب؟"

"زبردستی ہے کوئی کہ کچھ نہ کچھ ضرور بولوں' تُو کیوں فضول باتیں کر رہا ہے؟" میں بولی۔

"تجھے معلوم ہے کہ میں تجھ سے بچھڑ کر کتنا تڑپتا رہا ہوں اور اب تُو ملی ہے تو سیدھے منہ بات نہیں کر رہی۔ سچ بڑی ظالم ہے تُو۔"

احرس میرے جذبات و احساسات سے قطعی بے خبر ہو کر اپنی ہی ہانکتا رہا پھر جب اس نے محسوس کر لیا کہ میرا ذہن واقعی کسی مسئلے میں الجھا ہوا ہے تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ احرس نے شاید اپنی باتوں میں میری عدم دلچسپی سے میرے الجھے ہوئے ذہن کا اندازہ لگا کر میری جان بخش دی تھی ورنہ شاید ابھی وہ مزید بیٹھتا۔ اس کے علاوہ میں نے اسے یہ لالچ بھی دیا تھا کہ شام کو اس کے ساتھ گھومنے پھرنے چلوں گی۔ احرس چلا گیا تو میں اپنے کمرے سے نکلی اور نضار حویلی کے جس حصے میں تھا ادھر قدم بڑھانے لگی۔ ہر طرف میں نے کنیزوں اور غلاموں کو مستعد اور چوکنا پایا۔ وہ سبھی مسلح تھے۔ کنیزوں کے ہاتھ میں تلواریں اور غلام کھانڈے لئے ہوئے تھے۔ میں جدھر سے گزرتی وہ ادب سے جھک جاتے۔

نضار کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے میں انہی کنیزوں اور غلاموں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بریسا اب کبیت والوں کا سردار منتخب ہو چکا تھا' ان کنیزوں اور غلاموں کو رکھنے کا حق اسے تھا' مجھے نہیں۔ یوں بھی اس حویلی میں مجھے ان کی حفاظت و نگرانی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میں نضار کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ مجھے کچھ ملول و افسردہ سا دکھائی دیا۔ میں اس کے قریب جا بیٹھی اور پوچھا۔ "تُو کس سوچ میں ہے اے نضار!"

"کوئی .... کوئی ایسی خاص بات نہیں۔" اس نے مجھے ٹالنا چاہا۔ "تُو کہہ اے آتون! کیا بات ہے جس کے لئے مجھے اپنے کمرے میں لے جا رہی تھی؟"

"وہ بات تو خیر میں تجھ سے کروں گی ہی مگر پہلے اپنی اداسی کا سبب بتا۔ میرا خیال ہے کہ تُو احرس کی وجہ سے..........."

"ہاں اے آتون!" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "تجھے اب کوئی ایک فیصلہ کرنا ہی پڑے گا۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"یہ کہ تُو مجھے .... مجھے پسند کرتی ہے یا .... یا احرس کو مجھ پر ترجیح دیتی ہے؟" نضار کے دل کی بات اس کی زبان پر آ ہی گئی۔ یہ اندازہ میں نے لگایا تھا کہ وہ ایسی ہی کوئی بات کرے گا۔ اب بھاری سی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "یقین کر اے آتون! اگر تیرا فیصلہ میرے حق میں نہ بھی ہوا تو میں تُ سے گلہ نہیں کروں گا۔ تُو مجھے اپنا وفادار و جاں نثار ہی پائے گی۔"

"اے نضار! تُو غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔" میں بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں کہ میں نے احرس تجھ پر ترجیح دی ہو۔ دراصل مجھے تجھ سے جو بات کرنا تھی' وہ تجھی سے کی جا سکتی تھی۔" میں اِ سمجھانے لگی۔ "تیرے اور میرے سوا گفتگو کے دوران میں کسی اور کو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں نے اجلا کے بعد اسی لئے تجھ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا مگر جب احرس بھی میرے ساتھ ساتھ چلا آیا تو مجھ مجھے کہنا پڑا کہ میں خود تیرے پاس آ جاؤں گی۔ میں تجھے پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ وہ بچپن ہی سے میر ساتھ بے تکلف ہے اور تُو اس کی عادت بھی جانتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے محض تنگ کرنے کے لئے ا حرکتیں کرتا ہے تُو اس کا کوئی اور مطلب مت نکال۔ میں اس کی پابند نہیں ہوں اور نہ اس نے آج تک تیری طرح مجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ سو تجھے اس معا میں کسی طرح کے شک و شبے کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ رہی کسی فیصلے کی بات تو ابھی اس کا وقت نہیں ہے۔ میں کہہ چکی ہوں کہ خود تجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" میری بات سن کر اس نے طویل سانس لیا مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہوا۔

"دیکھ اے نضار! تیرے دل میں شاید یہ بات ہے کہ میں تیرے بجائے احرس سے بھی جانے کو کہ سکتی تھی۔ بول کیا ایسا ہی نہیں؟" میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میں اس کی یہ غلط فہ بہرحال دور کرنا چاہتی تھی کہ اس پر احرس کو ترجیح دی ہے۔

زبان سے تو نضار کچھ نہ بولا مگر اس کا چہرہ بول رہا تھا کہ میں نے غلط نہیں کہا۔

جب وہ خاموش رہا تو میں نے وضاحت کی۔ "میرے لئے یہ ممکن تھا لیکن ایسی صورت میں احر پر یہ ظاہر ہو جاتا کہ میں تجھ سے کوئی ایسی بات کرنے والی ہوں جو اس کی موجودگی میں نہیں کی جا سکتی میرے خیال میں یہ مناسب نہ ہوتا پھر تیری ہی طرح وہ بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا تھا۔ احرس تو احرس ہے' میں وہ بات مہا پجاری کی موجودگی میں بھی نہیں کر سکتی۔"

"آخر ایسی کیا بات ہے اے آتون!" نضار چونک کر بولا۔

"پہلے یہ بتا کہ تیرا دل صاف ہوا یا نہیں؟"

"اگر ایسا ہے تو پھر میں تجھ سے شرمندہ ہوں اے آتون!" اس کے لہجے سے سچائی جھلک رہی تھ شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ اسے میں نے احرس اور مہا پجاری دونوں ہی پر ترجیح دے دی تھی۔ مَیں اسے یہی احساس دلانا بھی چاہتی تھی جس سے میں مجھے کامیابی ہوئی تھی۔

"وہ بات جو احرس اور مہا پجاری سے بھی نہیں کی جا سکتی' غالباً اب تجھے اس نے یہ احساس ہو گا

چاہئے کہ بعض معاملات میں تُو ہی ان سے زیادہ میرے قریب ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تُو بھول گیا اے نضار کہ عظیم میبن نے میرے ساتھ صرف تجھی کو مقدس غبار میں غسل دیا تھا اور میری ہی طرح تجھے بھی بدی سے برسرپیکار ہونے کے لئے پُراسرار قوتوں سے نوازا تھا؟ کسی اور کو تو یہ اعزاز حاصل نہیں اور نہ اس کی خبر ہے۔" اب نضار کے چہرے پر بے اطمینانی نہیں تھی۔ میں نے اسے اس کی اہمیت اور خود سے قربت کا احساس دلا دیا تھا۔

"تجھے خبر ہے اے نضار کہ ہمارا دشمن ژیان ایک بار مجھ پر حملہ کرا چکا ہے۔" میں اصل موضوع پر آ گئی اور پھر وہ سب کچھ کہہ دیا جو سوچا تھا۔ نضار سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "پھر تو یہ غلط ہو گا کہ یہاں تیری موجودگی کا راز افشا ہو۔"

"اگر قبائل کی طرف سفیر نہ بھیجے جائیں تو یہاں میری موجودگی راز رہ سکتی ہے۔" میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "دشمن کو اگر لاعلمی میں شکار کیا جائے تو میرے نزدیک بہتر ہے۔ رہی جارحیت کی بات تو دشمن پر غالب آ جانے کے بعد قبائل کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ جب انہیں یہ معلوم ہو گا کہ وادی سبز پر حملہ کرنے والی مظلوم سردار اشم کی بیٹی تھی تو وہ میرے ہمنوا بن جائیں گے۔"

نضار نے میری رائے سے اتفاق کیا اور بولا۔ "ابھی تیرے معاملے میں رازداری ہی مناسب ہے۔ دشمن کو اپنی طرف سے چوکنا کرنا ہمارے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔ آج شام تک ادل بھی آ جائے گا پھر ہم اجلاس کریں گے۔ اس اجلاس میں ہم اپنی نئی حکمت عملی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں مہا پجاری کو مطمئن کرنا بھی ضروری ہے۔"

اس گفتگو کے بعد نضار کے پاس سے میں اٹھ آئی۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے کبیت کی کنیزوں اور غلاموں کو طلب کر لیا۔

"سنو! تمہارے قبیلے کا نیا سردار منتخب ہو چکا ہے۔" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "میری مرضی ہے کہ اب تم اس کی خدمت کرو۔ میری بجائے اب تم سے خدمت لینے کا حق اس کا ہے۔" پھر میں نے انہیں بریسا کے نام سے آگاہ کر دیا۔

"بریسا .... نیا سردار؟" کئی حیرت زدہ آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں انہیں یقیناً میری بات پر تعجب ہوا تھا۔

"ہاں وہی۔" میں بولی۔ "اسے میں نے ہی تمہاری سرداری کا اہل قرار دیا ہے۔"

اسی وقت ایک خوبصورت اور نازک اندام کنیز آگے بڑھ کر میرے سامنے سجدہ ریز ہو گئی۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی اور پھر اسے اٹھنے کا حکم دیا۔ مجھے اس کے چہرے پر خوف نظر آ رہا تھا۔

"بول کیا بات ہے؟ کیا تُو کچھ کہنا چاہتی ہے؟" میں نے اس کنیز سے کہا۔

"اے آتون دیوی! میں تجھ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کر کہ پھر میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔" کنیز خوفزدہ آواز میں بولی۔

"آخر کیوں .... تُو کیوں زندہ نہیں رہ سکے گی؟ تیرے دل میں جو کچھ بھی ہے' صاف صاف کہہ

دے۔"

"میں کبیت کے نئے سردار بریسا کی گنہگار ہوں۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا کہ میری ہی وجہ سے اسے قید کیا گیا تھا۔" کنیز نے انکشاف کیا۔

"اچھا وہ تُو ہے۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "وہی جس نے بریسا پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ تجھے ورغلا کر اپنے ساتھ بھگا لے جانا چاہتا ہے۔"

"ہاں اے آتون دیوی! میں وہی ہوں۔" کنیز نے اعتراف کیا۔

وہ واقعی اتنی ہی خوبصورت تھی کہ کوئی بھی مرد اس کی آرزو کر سکے۔

"بتا' کیا اس الزام میں صداقت تھی؟ بریسا نے کیا تجھے سابق سردار حسیف کے خلاف ورغلایا تھا" میں نے پوچھا۔

"اسے ورغلانا نہیں کہا جا سکتا اے دیوی! خود میری بھی یہی مرضی تھی' مگر میں نے اپنی جان کے خوف سے صرف بریسا پر یہ الزام لگا دیا۔ حسیف کو جانے کیسے ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا تھا۔" کنیز نے بتایا۔

"تیرے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تُو خود بھی بریسا کو چاہتی تھی۔" میں نے تصدیق طلب انداز میں کہاں

"یہ سچ ہے اے آتون دیوی! میں .... میں اسے چاہتی تھی اور .... اور اب .... اب بھی چاہتی ہوں مگر .... مگر شاید اب .... اب وہ سردار بن جانے کے بعد شاید .... شاید میری چاہت پر یقین نہ کرے اور .... اور مجھے قتل کرا دے۔"

"تجھے پہلے بھی اپنی جان کا خوف تھا کہ تُو نے بریسا کی چاہت سے انکار کر دیا اور آج بھی تو جان جانے کے خوف میں مبتلا ہے۔ کیا یہی خوف تو تجھے بریسا کی چاہت کے اقرار پر مجبور نہیں کر رہا؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ وہ کنیز یقیناً اس منزل تک نہیں پہنچی تھی کہ جہاں محبت میں جان جانے کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ یہ وہی تھی کہ جس کی وجہ سے بریسا نے کسی بھی عورت پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھے مظلوم ہی نظر آئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بہرحال ایک عورت تھی' کمزور عورت۔ ہر عورت اتنی دلیر یا بہادر بھی نہیں ہوتی کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکے۔

میرے سوال پر جب اس نے نظریں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' میں بول اٹھی۔ "مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ میں تجھ سے یہ وعدہ تو نہیں کرتی کہ بریسا میرے کہنے پر تجھے قبول کرے گا میں کسی پر جبر کی قائل نہیں' ہاں یہ کہہ سکتی ہوں تیرے ساتھ ظلم نہیں ہو گا۔ تجھے قتل نہیں کیا جائے گا۔ تُو اگر عورت پر بریسا کا اعتماد بحال کر سکی تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"اے دیوی! میں تیرا شکر بجا لاتی ہوں کہ تُو نے مجھے جینے کا حق دیا۔" وہ گھٹنوں کے بل میرے سامنے جھک گئی۔ "میں اپنے کئے پر پشیمان ہوں۔ میں نئے سردار بریسا کے سامنے بھی جھک کر اس سے اپنے قصور کی معافی مانگ لوں گی اور تیرا جو حکم ہے اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گی۔"

"اب تم سب جاؤ' بریسا جب آئے گا تو میں تمہیں اس کے حوالے کر دوں گی۔" میں نے کہا۔

شام سے پہلے بریسا مجھ سے ملنے آیا اور مجھے تعظیم دے کر بولا۔ "اے آتون دیوی! تُو نے مجھے جو حکم دیا تھا میں نے اس پر عمل کیا۔ بستی کبیت کے ساتوں بزرگوں کو دونوں جگہیں دکھا دیں اور خود بھی دیکھ لیں۔ بزرگوں کا فیصلہ پہاڑوں کے حق میں ہے۔"

"تو پھر اپنی بستی والوں کو لے کر وہیں بس جا۔ تجھے میری طرف سے اجازت ہے۔" یہ کہہ کر میں نے کنیزوں اور غلاموں کے بارے میں اس سے بات کی۔

"اے آتون دیوی! تُو انہیں اپنی ہی خدمت میں رکھتی تو اچھا تھا لیکن تیرا حکم ہے تو میں انہیں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔" وہ سر جھکا کر کہنے لگا۔

"ان میں وہ کنیز بھی ہے جس نے تجھے دھوکہ دیا تھا۔ اسی کی وجہ سے تجھے قید میں ڈالا گیا تھا۔ تُو اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر تُو نے مجھے میرے لوگوں کا سردار نہ بنایا ہوتا تو اے آتون دیوی! تو شاید میں اس سے انتقام لیتا لیکن اب .... اب میں اسے معاف کر دوں گا۔"

"تیرے فیصلے پر مجھے خوشی ہوئی اے بریسا! تُو نے سردار بن جانے کے بعد پہلا ہی فیصلہ درست کیا۔" میں نے یہ کہہ کر ان کنیزوں اور غلاموں کو طلب کر لیا اور انہیں بریسا کے حوالے کر دیا۔

مذکورہ کنیز نے بریسا کا دامن پکڑ کر اس سے معافی مانگی۔

"میں تجھے پہلے ہی معاف کر چکا ہوں۔" بریسا نے اظہار معافی کے طور پر کنیز کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

پھر میری اجازت پا کر بریسا ان کنیزوں اور غلاموں کو لے کر چلا گیا۔ ان کی جگہ خادموں اور خادماؤں نے لے لی۔

ادل کو آنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی اس لئے شام کا اجلاس معطل کر دیا گیا تھا۔ احرس سے میں نے شام کو اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کا وعدہ کیا تھا مگر اجلاس کا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا۔ وہ شام ہوتے ہی مجھ پر آ کر مسلط ہو گیا تھا۔ اب جو اسے اجلاس معطل ہونے کی خبر لگی تو پھر دوڑا دوڑا چلا آیا اور آتے ہی کہنے لگا۔ "مجھے پتہ چل گیا ہے کہ کوئی اجلاس نہیں ہو رہا ہے اب۔ نصار سے میں خود پوچھ کر آ رہا ہوں۔ تُو اب کوئی بہانہ نہیں کر سکتی۔ تجھے میرے ساتھ گھومنے چلنا پڑے گا۔" اس کا انداز ضدی بچوں کا سا تھا۔

"تُو کب بڑا ہو گا اے احرس! یا ہمیشہ بچہ ہی بنا رہے گا۔" میں مسکرا کر بولی۔

"تجھے ہی بڑا بن کر کیا مل گیا۔ مجھے بچہ ہی رہنے دے تو ٹھیک ہے' چل اب اٹھ جا۔"

ذرا ہی دیر بعد میں' احرس کو ساتھ لئے حویلی سے نکلی۔ میرے حکم پر خادم پہلے ہی دو گھوڑے لئے وہاں موجود تھا۔

"دو گھوڑوں کی آخر ایسی کیا ضرورت تھی' ایک ہی گھوڑا کافی تھا۔" احرس نے آہستہ سے کہا۔

میں اس کی بات سنی اَن سنی کر کے ایک گھوڑے پر سوار ہو گئی۔

بستی کا ایک چکر لگا کر میں نے درے کا رخ کیا۔ میں کچھ دیر چشمے کے کنارے بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کرنا چاہتی تھی۔

"یہ تُو کدھر جا رہی ہے؟" احرس نے بلند آواز میں کہا کیونکہ اس کا گھوڑا مجھ سے ذرا پیچھے تھا۔ "یہ راستہ تو شاید بستی سے باہر جاتا ہے۔"

"بس چلا آ۔" میں نے مڑ کر جواب دیا۔ "جہاں لے جا رہی ہوں' وہ جگہ تجھے اچھی لگے گی۔"

درے سے گزر کر میں چشمے کے کنارے آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں گھوڑوں کو ہم نے ایک پتھر سے باندھ دیا تھا۔ اس وقت سورج غروب ہونے والا تھا۔

"واقعی یہ جگہ تو بہت خوبصورت ہے۔ تُو نے غلط نہیں کہا تھا۔" احرس اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

احرس کے ساتھ مجھے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک ایک جانب سے ڈھول بجنے کی آواز آئی اور میں چونک اٹھی۔ ڈھول کی تھاپ کے ساتھ کچھ اور نامانوس سے سازوں کے بجنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ ایک عجیب سی لَے تھی جو میرے دل کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

"اے احرس! تُو نے کچھ سنا؟" میں نے احرس کو مخاطب کیا اور مخالف سمت دیکھنے لگی جدھر سے وہ آوازیں آتی سنائی دے رہی تھیں۔

"کیا؟" احرس حیران سا ہو کر بولا۔

"ڈھول بجنے کی آوازیں۔" میں نے اسے بتایا۔ "اور ڈھول کے ساتھ کچھ دوسرے ساز بھی بج رہے ہیں۔"

"مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا' کچھ نہیں بج رہا' تیرے کان بج رہے ہیں۔" احرس نے کہا۔

میں سمجھی کہ وہ دانستہ شرارت کر رہا ہے اور اس سے بولی۔ "چل' دیکھتے ہیں وہاں چل کر۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مگر کہاں؟"

"وہیں جہاں سے یہ آوازیں آ رہی ہیں۔" میں جھک کر پتھر سے بندھا ہوا گھوڑا کھولنے لگی۔

سورج غروب ہوتے ہی شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ میں جیسے ان آوازوں کی طرف کھنچتی چلی جا رہی تھی' اسی کے ساتھ گھوڑے کی پسلیوں پر بھی اپنے گھٹنوں کا دباؤ بڑھاتی جا رہی تھی۔ احرس کا گھوڑا میرے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔

"رک جا.......... رک جا اے آتون!" اچانک احرس چیخ اٹھا۔ "تُو یہ کہاں چلی جا رہی ہے؟"

میں نہیں رکی اور نہ احرس کی بات کا کوئی جواب دیا۔ میں اسے بتا چکی تھی کہ کہاں جا رہی ہوں' پھر بھی وہ مجھ سے یہ سوال کر رہا تھا۔ مجھے اس کی مداخلت گراں گزر رہی تھی۔ ڈھول کی تھاپ پہلے کی نسبت اور تیز ہو گئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جلد ہی میں اس جگہ پہنچ جاؤں گی جہاں سے وہ پُرکشش

لے سنائی دے رہی تھی۔

معاً میں نے ایک اجنبی آواز سنی۔ "آ اے آتون! چلی آ.......... چلی آ کہ زعیم تیرا منتظر ہے۔"

زعیم' میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ تو کیا یہ اس بوڑھے ساحر زعیم کی آواز ہے جو مجھے ایک بار اغوا کرنے کی کوشش کر چکا ہے۔

ڈھول کی تھاپ کے ساتھ وہی ایک آواز مجھے مزید آگے بڑھنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ کسی نے ہاتھ آگے بڑھا کر میرے گھوڑے کی باگیں کھینچ لی ہیں۔

میں جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے چونک اٹھی۔ میں نے بائیں جانب مڑ کر دیکھا۔ وہ احرس ہی تھا جس نے میرے گھوڑے کی باگوں پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ چیخ کر مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "تجھے کیا ہو گیا ہے اے آتون!"

مجھے محسوس ہوا کہ ایک دم جیسے ہر طرف سناٹا پھیل گیا ہے۔ ڈھول بجنے کی آوازیں بند ہو چکی تھیں اور اب زعیم کی ترغیبی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ میرا گھوڑا رک چکا تھا اور احرس بھی اپنے گھوڑے کو روکے مجھے حیرت سے دیکھے جا رہا تھا۔

شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ تاریکی میں مدغم ہو رہا تھا۔ اب مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ آج پھر بوڑھے ساحر زعیم نے مجھ پر اپنا سحر آزمایا تھا۔ اگر میرے ساتھ احرس نہ ہوتا تو شاید میں اسی طرح گھوڑا دوڑاتی ہوئی تنہا وادیٔ سبز تک جا پہنچتی۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ احرس کو وہ آوازیں کیوں سنائی نہیں دی تھیں۔ وہ شرارتاً انکار نہیں کر رہا تھا۔

"آ اے احرس! اب واپس چلیں۔" میں نے گھوڑے کو واپسی کے لئے موڑتے ہوئے کہا۔

"مگر تُو یہاں تک کس لئے آئی تھی؟ یہ تو بتا دے۔" احرس بولا۔

"تجھے گھمانے پھرانے لائی تھی۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ظاہر ہے' میں اسے اصل بات نہیں بتانا چاہتی تھی۔

"اچھا تو تُو نے جان بوجھ کر مجھے تنگ کیا ہے کہ میں پھر کبھی تیرے ساتھ گھومنے پھرنے کو نہ کہوں۔" احرس نے بھی اپنا گھوڑا موڑ کر کہا۔

"بڑی جلدی سمجھ گیا تُو۔ حالانکہ تیری صورت سے قطعی کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تُو اتنا عقل مند ہو گا۔" میں نے اس پر چوٹ کی۔

"وہ تو خیر میں ہوں ہی عقلمند' تیرے کان جو اچانک بجنا شروع ہو گئے تھے' بجنا بند ہوئے؟" وہ چڑ کر کہنے لگا۔

میں نے ہنس کر گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ اس بات کو ہنسی میں ٹال دینا ہی مناسب تھا اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔

واپس بستی تک پہنچنے میں ہمیں اتنی دیر ہو چکی تھی کہ نضار کو ہماری طرف سے فکر ہونے لگی تھی۔ وہ خادموں اور محافظوں سے ہمارے ہی بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ مہا پجاری بھی اسی کے ساتھ

تھا۔

"تُو کہاں چلی گئی تھی اے آتون! میں تو تیری طرف سے پریشان ہو گیا تھا۔" مہا پجاری مجھے آتے دیکھ کر بولا۔

"اے مہا پجاری! تھوڑا سا میرے لئے بھی پریشان ہو جاتا تو تیرا بھلا کیا بگڑ جاتا؟" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی احرس بول اٹھا۔ "میں بھی تو اسی کے ساتھ تھا۔"

"ہاں اے میرے بچے! میں تم دونوں ہی کے لئے فکرمند تھا۔ تُو میرے لئے غیر تو نہیں اے اجدر کے بیٹے!" مہا پجاری نے شفقت سے کہا۔

"احرس یہاں اس بستی میں پہلی بار آیا ہے۔ یہ گھومنے پھرنے کو کہہ رہا تھا۔ میں اسے چشمے کے کنارے لے گئی تھی۔" میں نے بتایا۔

"مگر اے آتون! محافظ تو تجھے وہاں تک جا کر بھی دیکھ آئے تھے۔" نضار بولا۔ "تُو انہیں وہاں نہیں ملی۔"

"سچی بات بتا دوں اے آتون!" احرس نے مجھے شرارت بھری نظروں سے دیکھا۔

"کیوں فضول باتیں کر رہا ہے۔" میں نے اسے جھڑکا۔

"اے مہا پجاری! دراصل اس کے کان بجنے لگے تھے اور یہ چشمے کے کنارے بیٹھے بیٹھے ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی، چل وہاں چلتے ہیں جہاں ڈھول بج رہا ہے حالانکہ وہاں دور دور تک مجھے کوئی ایسی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔" احرس، مہا پجاری سے اس طرح کہہ رہا تھا جیسے بچے اپنے بزرگوں سے ایک دوسرے کی شکایت کرتے ہیں۔ "بس اس نے گھوڑا دوڑانا شروع کر دیا۔ میں تو ڈر ہی گیا کہ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔ میں چیخ چیخ کر اس سے رکنے کو کہہ رہا تھا، مگر یہ کچھ سن ہی نہیں رہی تھی پھر اگر میں اس کے گھوڑے کی لگام کھینچ کر زبردستی اسے روک نہ لیتا تو یہ بستی تریال پہنچ کر ہی دم لیتی۔"

"میں اسے بس تھوڑا سا تنگ کر رہی تھی اے مہا پجاری!" میں ہنس کر بولی۔ "یہ شام سے میرے کان کھا رہا تھا کہ چل گھومنے پھرنے۔"

مہا پجاری کے لئے احرس کی اور میری نوک جھونک کوئی نئی بات نہیں تھی اس لئے وہ مطمئن نظر آنے لگا مگر نضار کے چہرے پر مجھے بے اطمینانی سی جھلکتی دکھائی دی۔ معلوم ہوا کہ ادل اس دوران میں آ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد رات کے کھانے پر اس سے میری ملاقات ہوئی۔ ہم سب نے ایک ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد مجھے موقع مل گیا کہ نضار سے خلوت میں بات کر سکتی۔ میں اسے ساتھ لئے چہل قدمی کے بہانے حویلی کے باغ میں آ گئی تھی

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، نضار بول اٹھا۔ "اے آتون! آج میں نے پُراسرار سرگوشیاں سنی ہیں۔ انہی کو سن کر میں تیری طرف سے فکرمند ہو گیا تھا۔"

"کب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس وقت جب تُو احرس کے ساتھ جا چکی تھی۔" وہ بتانے لگا۔ "میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا کہ مجھے سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ مجھے بتایا گیا کہ زعیم نے تجھ پر دوسری بار وار کیا ہے، مگر تُو اس کے وار سے بچ جائے گی کیونکہ تیرے ساتھ احرس بھی ہے۔"

"احرس جو کچھ کہہ رہا تھا اے نضار! وہ غلط نہیں تھا۔" میں نے یہ کہہ کر پورا واقعہ بیان کر دیا، پھر بولی۔ "اس نے مجھے آتون ہی کہہ کر پکارا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ابھی تک میری حقیقت کا علم نہیں۔"

"ہاں۔" نضار بولا۔ "ژیان نے واہب سے تیرا یہی نام سنا ہو گا اور اس بوڑھے ساحر زعیم کو تیرا یہی نام بتایا ہو گا۔ سرگوشیوں میں مجھ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہمیں ژیان سے پہلے اس بوڑھے ساحر سے نمٹنا چاہئے۔"

"مگر کیسے اے نضار!" میں نے سوال کیا۔

"یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔" نضار نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "مجھ سے جو کہا گیا، میں نے تجھے بتا دیا۔"

"ممکن ہے اس سلسلے میں مجھے بھی سرگوشیاں سنائی دیں۔" میں بولی اور پھر ہم باغ سے لوٹ آئے۔

☆======☆======☆

پھر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا اس رات سونے سے پہلے میں نے سرگوشیاں سنیں۔ اب تک میں یہی سمجھتی رہی تھی کہ بوڑھا ساحر زعیم بھی وادی سبز ہی میں رہتا ہو گا، مگر ایسا نہیں تھا۔ مجھے سرگوشیوں میں بتایا گیا کہ وادی سبز کے شمال میں نصف پہر کی مسافت پر دو پہاڑ ہیں، انہی میں سے ایک پہاڑ اس کا مسکن تھا۔ اس بوڑھے نے وہاں اپنی ایک الگ دنیا بسا رکھی تھی۔ اسے علاقے کے سب سے بڑے سردار ژیان کی سرپرستی حاصل تھی اسی لئے کوئی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا تھا۔ مختلف بستیوں کے عیاش نوجوانوں کا ایک گروہ، بوڑھے ساحر کے ساتھ ہی اس پہاڑ پر رہتا تھا۔ یہ نوجوان اس کے خدمتگار کہلاتے تھے۔ یہ خدمت گار آس پاس کی بستیوں سے کنواری اور خوبصورت لڑکیاں زبردستی اٹھا کر لے جاتے تھے۔ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ ان کے پاس زعیم کی نشانی ہوتی تھی۔ یہ نشانی ان کے سینوں پر کچھ آڑی ترچھی لکیروں کی صورت میں ہوتی تھی جسے سبھی جانتے پہچانتے تھے۔ یہ خدمت گار جس بستی میں پہنچ جاتے وہاں سے جو چاہتے اٹھا لاتے۔ ان کا ہاتھ کوئی نہ روکتا۔ یہ وہ بستیاں تھیں جن میں ژیان کے نائب مقرر تھے اور جہاں ژیان کا حکم چلتا تھا۔

سرگوشیوں میں مجھے تاکید کی گئی تھی کہ میں صرف نضار کو اپنے ساتھ لے جا سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ کہ مجھے اور نضار کو رازداری سے کام لینا ہے، کسی کو کچھ نہیں بتانا کہ ہمیں کہاں اور کس لئے جانا ہے۔

"معصوم اور بے گناہ لوگوں پر بوڑھے ساحر زعیم کی صورت میں جو عذاب مسلط ہے اے معبلہ! اسے تجھے اور نضار ہی کو ختم کرنا ہے۔ تُو نضار کو لے کر جلد ہی زعیم کی طرف جائے گی اور دیکھے گی کہ نیکی، بدی پر غالب آ گئی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی سرگوشیاں ختم ہو گئیں۔

مجھے بوڑھے ساحر زعیم سے ٹکرانے کا حکم مل چکا تھا اور یہ خوشخبری بھی پہلے ہی سنا دی گئی تھی کہ مجھے اور نضار کو اس پر غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ بدی پر نیکی کے غالب آ جانے کا میں یہی مطلب سمجھی تھی۔

نضار سے کہا گیا تھا کہ ہمیں ثریان سے پہلے زعیم سے نمٹنا چاہئے اس لئے فی الحال وادی سبز پر حملہ کرنا عظیم مہین کے حکم سے روگردانی کے مترادف تھا اور میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

یہ بھی اسی رات کا واقعہ ہے کہ سوتے سوتے اچانک میری آنکھ کھل گئی اور مجھے ایک بار پھر وہی سحرانگیز موسیقی سنائی دی۔ اسی کے ساتھ زعیم کی ترغیبی آوازیں بھی آنے لگیں۔ اب اس موسیقی کا راز مجھ پر کھل چکا تھا۔

"نہیں۔" میں بڑبڑائی۔ "یہ میری سماعت کا فریب ہے، مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا۔"

اسی کے ساتھ ڈھول بجنے کی آواز بند ہو گئی۔ گویا سحر ٹوٹ گیا۔ میں دوبارہ سو گئی۔ اس کے بعد مجھے وہ موسیقی سنائی نہیں دی اور نہ زعیم کی آواز آئی۔

دوسرے دن صبح حسب معمول اجلاس ہوا۔ اب اس اجلاس میں ادل بھی شریک تھا۔ اجلاس میں چھ افراد شامل تھے۔ میں بھی انہی چھ میں تھی۔

بات میں نے ہی شروع کی۔ "میرا خیال ہے کہ ہم کچھ جلدبازی سے کام لے رہے ہیں، ابھی ثریان پر آخری ضرب لگانے کا وقت نہیں آیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے تائید طلب انداز میں نضار کی طرف دیکھا۔

"کل سے اب تک اس پر میں نے بھی بہت غور کیا اور کھلا یہ کہ ہم نے کل جو فیصلے کئے تھے جن اقدامات کے بارے میں مل کر سوچا تھا، وہ مناسب نہیں ہیں۔" نضار نے محتاط انداز میں میری تائید کی۔ "ہم اس طرح اپنے دشمن کو قبل از وقت چوکنا کر دیں گے۔"

"اے میرے بھائی نضار! تُو کل کچھ اور کہہ رہا تھا، مگر آج اسی کہے سے انکاری ہے۔" احرس نے نضار کی نقل اتاری۔ "کوئی سبب اس کا؟" احرس مجھے غیر سنجیدہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔ "تیری یہ تجویز تھی کہ سفارتیں بھیجی جائیں۔ میں بولا کہ اس طرح یہ راز کھل جائے گا کہ دراصل آتون ہی سردار اشم کی بیٹی معبلہ ہے تو مجھ سے کہا گیا کہ اب اس راز کو راز رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ مہا پجاری نے تو معبلہ کا سفیر بن کر سردار صاحی اور سردار موسر کی طرف جانے کے لئے رختِ سفر بھی شاید باندھ لیا ہو گا۔ اس بارے میں بھی تو سوچ اے میرے بھائی نضار!"

"تیرے سوال کا جواب نضار پہلے ہی دے چکا ہے کہ یوں دشمن چوکنا ہو جائے گا۔" میں بول اٹھی۔ "اور سن احرس! ایسے معاملات میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ آپس میں صلاح مشورے اسی

لئے کئے جاتے ہیں کہ بہتر سے بہتر راہ نکل سکے۔ غور و فکر بھی ضروری ہے اور اس میں وقت لگتا ہے۔ فوری طور پر بغیر سوچے سمجھے کوئی فیصلہ کر لینا اور پھر اسی پر قائم رہنا دانش مندی نہیں ہے۔"

"میں تو بس اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دانش مندی تیری بات مان لینے میں ہے۔ اگر کوئی خود کو دانش مند ظاہر کرنا چاہے تو فوراً تیری تائید کر دے۔" احرس کے ہونٹوں پر بڑی شریر مسکراہٹ تھی۔ اس کا واضح اشارہ نضار کی طرف تھا کیونکہ اسی نے میری تائید کی تھی۔

"تو پھر تیرے حق میں یہی بہتر ہے کہ تُو بھی دانش مند بن جا اے احرس!" میں مسکرا کر بولی۔

"یعنی تیری ہاں میں ہاں ملاتا رہوں۔"

"کیا برائی ہے اس میں۔ تجھے اس طرح کچھ سوچنا سمجھنا تو نہیں پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اچھا اب تُو چپ بیٹھ، مہا پجاری کچھ کہنا چاہتا ہے۔" یہ بات میں نے محض احرس کو خاموش کرنے کے لئے کہہ دی تھی ورنہ تو مہا پجاری مجھے کسی سوچ میں گم معلوم ہو رہا تھا۔

"دھڑکا تو مجھے بھی تھا اے میری بچی!" مہا پجاری چونک کر بولا۔ "تیرا راز فاش کرنا تیرے لئے نئے خطرات کو جنم دے سکتا ہے۔ اس پر میں نے بھی غور کیا، مگر پھر یہ سوچا کہ جنگی معاملات میں نضار کو زیادہ تجربہ ہے۔ جب وہ اس طرح کے خطرات ظاہر نہیں کر رہا تو میرا اس معاملے میں کچھ کہنا عبث ہے۔ اب اگر نضار کہتا ہے کہ دشمن کو چوکنا نہیں کرنا چاہئے تو میری رائے اس کے حق میں ہے۔"

ادل کیوں کہ گزشتہ روز کے اجلاس میں موجود نہیں تھا اس لئے وہ چپ رہا البتہ نضار کا دوسرا نائب احزم بولا۔ "اے سردار نضار! کیا مختلف قبیلوں کی تائید اور حمایت حاصل کرنا اب ضروری نہیں رہا جو ہم نے کل سوچا تھا؟"

"اوّل تو اے احزم، یہ ضروری نہیں کہ ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں، دوسری بات یہ سن کہ اپنی جنگ خود لڑنا پڑتی ہے۔ کوئی کسی دوسرے کی آگ میں نہیں کودتا۔" نضار بولا۔ "ہمارے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم اچانک دشمن پر جا پڑیں اور اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیں۔ قبیلوں کی تائید حاصل کرنا اور اس غرض سے ان کے پاس اپنے سفیر بھیجنے کا مطلب دشمن کو چوکنا کرنا ہی ہو گا۔ اگر اسے پہلے سے یہ علم ہو گیا کہ درحقیقت اس کے مقابلے پر مظلوم و مقتول سردار اشم کی بیٹی معبلہ ہے تو وہ پھر ہمیں حملہ کرنے میں پہل کا موقع نہیں دے گا۔ تیری اور ادل کی بستیاں یہاں سے کافی فاصلے پر ہیں۔ ہم دور دور ہیں اور ثریان کے ساتھ یہ صورت نہیں۔ جن بستیوں میں اس کے نائب مقرر ہیں، وہ قریب قریب ہیں۔ اس کی نسبت ہمیں یکجا ہونے میں زیادہ وقت لگے گا۔ میں نے اسی لئے یہ کہا کہ وہ حملے میں پہل کرے گا تاکہ ہم یکجا نہ ہو سکیں۔"

ادل بھی غالباً بڑی حد تک معاملے کی نوعیت کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ یکجا ہو کر دشمن پر اچانک حملہ کیا جائے۔

اس روز بھی اجلاس ختم ہونے کے بعد مجھے خلوت میں نضار سے گفتگو کرنا تھی، مگر میں نے جلدبازی سے گریز کیا میں خود احرس اور مہا پجاری کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے گئی تاکہ گزشتہ روز کی سی

صورت حال پیدا نہ ہو جائے۔

ابھی میں نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ بریسا کے آنے کی خبر ملی۔ معلوم ہوا کہ وہ تنہا نہیں ہے' اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ میں نے انہیں بلوا لیا۔ بریسا کے ساتھ ساتھ بوڑھوں کے علاوہ قبیلے کے کچھ اور سرکردہ افراد بھی تھے۔ ان سب نے مجھے تعظیم دی اور دو زانو ہو کر ادب سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

"اے آتون دیوی! ہمیں خیر و برکت کی دعا دے کہ ہم پہاڑوں میں بسنے جا رہے ہیں۔" بریسا نے کہا۔

"جاؤ اے کبیت والو! دیوتا تمہاری حفاظت کریں اور جب میں تمہیں پکاروں تم دوڑتے ہوئے آؤ۔" میں بولی۔ "نئے ٹھکانے تمہیں راس آئیں۔" وہ سب باری باری مجھے تعظیم دے کر الٹے قدموں چلے گئے۔

"اے آتون! کبھی کبھی تو میں یہ سب کچھ دیکھ کر سوچنے لگتا ہوں کہ کہیں تُو واقعی تو دیوی نہیں ہے؟" احرس' کبیت والوں کے جاتے ہی بول اٹھا۔ "ایسے وقت مجھے خیال آتا ہے کہ کاش میں بھی کوئی چھوٹا موٹا دیوتا ہوتا۔"

"تو بن جا دیوتا' تجھے کس نے روکا ہے؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

"دیوتاؤں ہی نے ایک روز مجھے منع کر دیا تھا کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ اسی دن سے یہ خیال میں نے اپنے دماغ سے نکال دیا۔"

احرس کچھ دیر اسی طرح کی بے سر وپا باتیں کر کے مہا پجاری کے ساتھ اٹھ کے چلا گیا۔ میں نے ایک خادم کو بھیج کر نضار کو اپنے ہی کمرے میں بلوا لیا۔ گزشتہ رات مجھے جو سرگوشیاں سنائی دی تھیں' میں نے اسے ان کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ وہ پوری توجہ اور انہماک سے میری باتیں سنتا رہا۔ میں نے بات ختم کی تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "ایسی صورت میں تو فی الحال احزم کو مزید یہیں رکنا پڑے گا۔"

"مگر تُو اس سے کہے گا کیا کہ کہاں جا رہا ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "کوئی تو بہانہ کرنا پڑے گا۔"

"ہاں وہ بہانہ تو سوچنا پڑے گا کہ کیا ہو؟ پھر تیرا بھی معاملہ ہے۔ تُو احرس اور مہا پجاری سے کیا کہے گی؟"

"یہی کہ میں تیرے ساتھ جا رہی ہوں۔" میں نے بڑے اطمینان سے جواب دے دیا کیونکہ پہلے ہی اس مسئلے کا ایک حل سوچ چکی تھی۔

"اور میں کہاں جا رہا ہوں؟ یہ بھی تو تجھے بتانا پڑے گا۔" نضار مسکرا کر بولا۔

"تُو ادل کے ساتھ جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"کس لئے؟" اس نے پوچھا۔

"متوقع جنگ کی تیاریوں کا جائزہ لینے کے لئے۔ چند روز وہاں رک کر ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

"ٹھہر اے آتون! ایک اور بھی صورت ممکن ہے۔" نضار نے ہاتھ اٹھا کر مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔ "اس طرح ہم طویل سفر سے بچ جائیں گے۔ یہاں سے وادی سبز کی مسافت آدھے دن کی ہے جبکہ ادل کی بستی ایک دن کی مسافت پر ہے۔ تُو نے بتایا ہے کہ وادی سبز سے نصف پہر کی مسافت پر وہ پہاڑ ہیں جو ہماری منزل ہیں۔ ہم یہاں سے یہی کہہ کر چلیں گے کہ ادل کے ساتھ جا رہے ہیں پھر جب تقریباً نصف مسافت طے ہو جائے گی تو ادل سے واپسی کا بہانہ کر کے ہم وہاں سے وادی سبز کے شمال کی جانب چل دیں گے۔ اس طرح ہم اپنی منزل سے بھی قریب ہوں گے۔ احزم یہی سمجھے گا کہ ہم ادل کی بستی میں ہیں اور ادل یہ خیال کرے گا کہ ہم یہاں ہیں۔ یوں دونوں ہی ہماری طرف سے مطمئن رہیں گے۔"

"اور ہم دونوں جگہ میں سے کہیں نہیں ہوں گے۔" میں مسکرا کر بولی۔

"مجبوری ہے اے آتون! اگر رازداری کی ضرورت نہ ہوتی تو یہ سب نہ کرنا پڑتا۔"

ادل آئندہ روز صبح اپنی بستی کی طرف لوٹنے والا تھا اس لئے نضار نے اسی دن احزم کو بتا دیا کہ وہ بھی ادل کے ساتھ جائے گا۔ بہانہ وہی کیا تھا کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے اور اپنے سامنے جنگی تیاریوں کا جائزہ لینا چاہتا ہے۔ احزم کو ابھی مزید اشر کی بستی میں رکنا ہے۔ ادل کو بھی اس سے آگاہ کر دیا گیا۔ اب صرف میرا مسئلہ رہ گیا تھا۔ ابھی تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں بھی نضار کے ساتھ جانے والی ہوں۔ اس کے لئے مجھے مہا پجاری اور احرس کو اعتماد میں لینا تھا۔ مہا پجاری کی طرف سے تو مجھے کوئی خدشہ نہیں تھا کہ وہ اس پر اعتراض کرے گا البتہ احرس کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ احرس' نضار کے ساتھ میرے جانے پر خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے مہا پجاری اور احرس سے الگ الگ بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

اسی روز شام کو میں' احرس کے ساتھ حویلی کے باغ میں پہنچ گئی۔

"شکر ہے کہ تُو مجھے آج حویلی سے باہر نہیں لے گئی۔" احرس ہنس کر بولا۔ "ورنہ پھر تیرے کان بجنے لگتے تو میں تیرا کیا کر لیتا؟"

"کیا تجھے معلوم ہے کہ کل نضار' ادل کے ساتھ جا رہا ہے؟" میں نے بات چھیڑی۔

"ہاں کچھ سنا تو ہے میں نے۔"

"میں بھی اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔" میں نے اچانک کہہ دیا۔

"کس کے ساتھ؟" توقع کے مطابق احرس ایک دم چونک اٹھا۔

"ادل کے ساتھ۔" میں نے دانستہ نضار کا نام نہیں لیا۔ "میں بھی اس کی بستی میں جنگی تیاریاں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اور نضار وہاں کس لئے جا رہا ہے؟"

"جنگی تیاریوں کا جائزہ لینے اور کس لئے۔"

"پھر تجھے وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ نضار کو جانے دے۔"

"کیا تُو یہ بھول گیا کہ وہ ہماری خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہے؟ کیا مجھے اس کا ساتھ بھی نہیں دینا

چاہئے؟؟" میں نے کہا۔ "تُو مجھے خود غرضی کا سبق کیوں دے رہا ہے؟؟" میں نے نصار کے ساتھ جانے کے لئے ایسا بہانہ کیا تھا کہ وقتی طور پر احرس لاجواب سا ہو گیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر آخر اس نے کہہ ہی دیا۔ "تو اے آتون! تیرا کہنا دراصل یہ ہے کہ میں یہاں اکیلا رہ جاؤں۔"

"تُو یہاں اکیلا کب ہے' مہا پجاری بھی تو تیرے ساتھ ہے۔"

"ہاں تُو مجھے بس مہا پجاری کے ساتھ لٹکائے رکھنا چاہتی ہے۔" احرس کا منہ بن گیا۔ "پہلے بھی تو تُو نے مجھے اسی کے ساتھ بھیج دیا تھا اور اب اس کے ساتھ چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اگر میں کہوں گا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل تو فوراً انکار کر دے گی۔"

پھر بڑی مشکل سے میں' احرس کو راہ پر لائی اور یہ اندازہ مجھے پہلے سے تھا۔ احرس کو اعتماد میں لینے کے بعد میں نے مہا پجاری کو بھی آگاہ کر دیا کہ نصار کے ساتھ جا رہی ہوں۔ اس پر مہا پجاری نے خوشی ہی کا اظہار کیا۔ مجھے ثزیان کے خلاف سرگرم عمل دیکھنا ہی تو اس کا خواب تھا اور اس خواب کی تعبیر کے لئے اس نے بہت صبر کیا تھا۔ وہ میرے بابا کے سچے جاں نثاروں میں سے تھا۔ وفاداری کی ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ کون کسی کے ساتھ وفا کرتا ہے' وہ بھی ایسی صورت میں کہ وفا کا اجر دینے والا بھی زندہ نہ ہو مگر زندگی میں سب کچھ اجر ہی کے لئے تو نہیں کیا جاتا۔ اس نے ایک یتیم اور بے سہارا بچی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اسے ایسا کر کے جو راحت یا خوشی میسر آئی تھی' وہی شاید اس کا اجر تھا۔ اب وہ اس دن کی تمنا میں جی رہا تھا جب ایک ظالم اپنے انجام کو پہنچ جاتا۔

مہا پجاری سے بات کر کے میں نے نصار کے کمرے کا رخ کیا۔ نصار کے پاس اس وقت ادل اور احزم دونوں ہی بیٹھے تھے۔ موضوع گفتگو ثزیان ہی تھا۔ احزم کی تجویز یہ تھی کہ وادی سبز اور ان تمام بستیوں میں اپنے مخبر بھیج دیئے جائیں جو ثزیان کے زیر اثر ہیں۔

میں کمرے میں داخل ہو کر نصار کے قریب جا بیٹھی تھی۔ میری آمد سے احزم کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ ادل اور احزم دونوں ہی میرے احترام میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر جب میں بیٹھ گئی تھی تبھی احزم نے اپنی بات پوری کی تھی۔

"اے احزم! اے میرے دانشمند نائب! خود میں بھی یہی چاہتا تھا۔" نصار بولا۔ "مگر مجھے اس کی مہلت نہیں ملی۔ اب یہ کام تُو سنبھال لے۔"

"اے سردار! میں تیرے جاتے ہی اس کا بندوبست کر لوں گا۔ تُو کوئی اندیشہ نہ کر۔ تیرا نائب تجھے مایوس نہیں کرے گا۔ جب تُو ادل کی بستی سے لوٹ کر آئے گا تو تیرے سننے کو بہت کچھ ہو گا۔" احزم کے لہجے سے اعتماد کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا تیری نظر میں ایسے لوگ ہیں جو یہ اہم کام سرانجام دے سکیں؟" نصار نے سوال کیا۔

"ہاں اے سردار! مجھے اس کام کی اہمیت کا اندازہ ہے اور یہ خبر بھی ہے کہ یہ کام جان جوکھوں میں ڈالنے کا ہے۔ یہ خیال میرے ذہن میں آج ہی آیا تھا اس لئے فی الحال تو کوئی ایسا شخص میری نظر میں

نہیں، لیکن جلد ہی میں ایسے افراد کا انتخاب کر لوں گا۔" احزم نے جواب دیا۔

"دیکھ اے احزم! کسی مخبر کی بھیجی ہوئی خبر جہاں بعض اوقات فتح و کامرانی کا سبب بن جاتی ہے' وہیں کبھی کبھی بھیجی جانے والی کوئی غلط خبر بڑے بڑے لشکروں کو شکست سے بھی دوچار کر دیتی ہے۔" نصار کسی تجربہ کار جنگجو کی طرح بول رہا تھا۔ "سو جان لے کہ کسی خبر پر آنکھ بند کر کے بھروسہ نہیں کرنا اس کے لئے تُو ایسا کر کہ ایک ہی علاقے یا بستی میں اپنے دو مخبر بھیج۔ جب دونوں کی بھیجی ہوئی خبریں ایک دوسرے کی خبروں سے مل جائیں' دونوں خبروں سے ایک ہی بات کی تصدیق ہو تو سمجھ لے خبر صحیح ہے۔ میں یہ سب کچھ تجھے اس لئے بتا رہا ہوں کہ اس پر میں نے بہت غور کیا ہے۔ مخبروں کے بارے میں میرا ارادہ یہی تھا جو میں نے تجھ پر ظاہر کر دیا۔ ایسے ایک شخص کی نشاندہی میں کر سکتا ہوں کہ اس معاملے میں جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ شیرویہ اس کا نام ہے اور اس کا تعلق میرے محافظ دستے سے ہے۔ اس کام کی ابتدا تُو اسی سے کر۔"

"تُو نے اے سردار! جو طریقہ کار سوچا تھا' تیرا نائب اسی پر عمل کرے گا۔ تیری ہدایات ہمارے لئے روشنی ہیں اور ہم اسی روشنی میں آگے بڑھتے رہیں گے۔ تُو نے شیرویہ کا نام لے کر ابتدا کی ہے مگر کیا تُو اپنے محافظ دستے کو اپنے ساتھ ادل کی بستی نہیں لے جا رہا؟ جہاں تک مجھے علم ہے تُو شیرویہ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔" احزم نے کہا۔

"اوّل تو یہ کہ کسی ایک محافظ کے کم ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' دوسری بات یہ احزم کہ ادل کا محافظ دستہ ساتھ جا رہا ہے' وہ کافی ہے۔"

"مگر اے سردار! واپسی میں؟؟"

احزم کی بات پر نصار آہستہ سے ہنس کر بولا۔ "تجھے میری بڑی فکر ہے اے میرے دانش مند نائب! بول کیا تیرا سردار تنہا ادل کی بستی جا کر تنہا ہی واپس آنے کی ہمت نہیں رکھتا؟؟"

اس پر احزم لاجواب سا ہو گیا۔ وہ بھلا اپنے سردار کو کم ہمت کس طرح کہہ سکتا تھا۔

"اگر واپسی میں مجھے محافظوں کی ضرورت محسوس ہوئی اے احزم' تو انہیں ادل کی بستی سے ساتھ لے لوں گا۔" نصار اپنے نائب کو چپ دیکھ کر کہنے لگا۔ "میں سمجھتا ہوں اے احزم! تُو جو کچھ کہتا ہے اپنے سردار کی محبت ہی میں کہتا ہے۔" نصار یہ کہہ کر ادل کی طرف مڑا۔ "اے ادل! تُو بھی تو کچھ کہہ' تُو کیوں چپ چپ سا بیٹھا ہے؟؟"

"اے سردار! میرے پاس کچھ کہنے کو ہوتا تو اب تک کہہ چکا ہوتا۔" ادل بولا۔ "یوں بھی تُو میرے ساتھ ہی تو چل رہا ہے۔"

"بہت سے کام میں یہاں ادھورے چھوڑے جا رہا ہوں جن کے متعلق فی الحال میرے سوا کسی کو کچھ علم نہیں۔ اس کی وجہ اے میرے نائب احزم! تجھ پر میرے اعتماد کی کمی ہرگز نہیں مگر ان کا ذکر قبل از وقت مناسب نہیں۔" نصار کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میرے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہ ہوا کہ نصار راستے ہی میں ادل سے الگ ہو جانے کی راہ ہموار

کر رہا ہے۔ وہ کسی ایسے ہی ضروری اور ادھورے کام کا بہانہ کر کے نصف راستے ہی سے لوٹ سکتا تھا۔

اس وقت نضار کے پاس میں اس لئے آئی تھی کہ اسے احرس اور مہا پجاری کے بارے میں بتا سکوں۔ نضار نے مجھ سے کہا تھا کہ جب ان دونوں سے بات ہو جائے تو اسے بھی آگاہ کر دوں۔ اسے غالباً احرس کی طرف سے اندیشہ تھا کہ وہ کہیں کوئی مسئلہ کھڑا نہ کر دے۔

جب ادل اور احزم اس کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے آتون! وہ مان گیا نا؟" اس کا اشارہ احرس کی طرف ہی تھا۔

"ہاں اے نضار! میں تجھے یہی بتانے آئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"حیرت ہے کہ وہ تیری بات مان گیا۔" نضار آہستہ سے ہنس کر بولا۔ "وہ تو مجھے اے آتون! کسی سرکش گھوڑے کی طرح لگتا ہے۔ معلوم نہیں تُو نے کیسے اس پر قابو پا لیا ہے؟"

"کچھ بھی سہی اے نضار! مگر وہ اندر سے بہت کھرا اور سچا ہے۔" میں نے احرس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ تیرے ساتھ کیوں ہوتا۔" نضار نے کہا۔

نضار کے پاس سے میں اٹھنے ہی والی تھی کہ محافظ دستے کے سالار نے آ کر ایک تشویش ناک اطلاع دی۔ اس اطلاع کے مطابق بستی کی اطراف میں کچھ مشتبہ افراد کی نقل و حرکت محسوس کی گئی تھی۔ ان کا تعاقب کیا گیا تو وہ اس پہاڑی سلسلے کی طرف بھاگ گئے جہاں آج ہی کبیت والوں کو بسایا گیا تھا۔ میں خود نضار کے ساتھ ایک بار وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں تھا۔

"کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ؟" نضار کا انداز خودکلامی کا سا تھا پھر وہ سالار سے مخاطب ہوا۔ "تُو جا' میں دیکھتا ہوں۔"

محافظ دستے کا سالار چلا گیا تو میں بولی۔ "میرا خیال ہے اے نضار کہ کبیت والوں کو اس کی خبر کر دی جائے۔ وہ خود ہی ان مشتبہ افراد کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ ان کی شناخت یوں بھی آسان ہو جائے گی کہ ظاہر ہے' وہ کبیت والوں میں سے نہیں ہوں گے۔"

"تُو کہتی تو ٹھیک ہے اے آتون! مگر.........." نضار اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کچھ سوچنے لگا' پھر خود ہی بولا۔ "مگر وہ .... وہ تو خود اجنبی ہیں ابھی۔"

"وہ لاکھ اجنبی سہی' مگر پہاڑوں سے ان کی بڑی پرانی شناسائی ہے۔ وہ پہاڑوں کے کیڑے ہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ اجنبی ہونے کے باوجود وہ مشتبہ افراد کا سراغ لگا لیں گے۔" میں نے اپنی بات پر زور دیا۔

نضار نے میرا مشورہ قبول کر لیا اور پھر اس سلسلے میں ضروری حکم جاری کر دیا۔ اس نے کبیت کے سردار بریسا کو میری طرف سے پیغام بھیجا تھا جو ظاہر ہے کہ بریسا کے لئے حکم ہی کا درجہ رکھتا تھا۔

اچانک پُراسرار سرگوشی ابھری اور میں چونک اٹھی۔ "اے معبلہ! وہ مشتبہ افراد' بوڑھے ساحر زعیم کے خدمت گار ہیں۔ وہ کبیت والوں کے ہاتھ نہیں آئیں گے کہ بہت گھاگ ہیں۔ تُو نضار کو اپنے ساتھ

لے کر جا اور ان تینوں کو پکڑ لا۔ خجیرہ تیری رہنمائی کرے گی' اس غار تک کہ جہاں وہ چھپ کر بیٹھے ہیں۔ وہ تیری ہی تاک میں یہاں آئے ہیں کہ تجھ پر اب تک ساحر کا کوئی سحر کارگر نہیں ہو سکا تھا۔"

سرگوشی معدوم ہو گئی تو میں نے نضار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ نضار نے بھی میری ہی طرح پُراسرار سرگوشیاں سن لی ہوں گی۔

"کیا ہوا اے آتون! کیا تُو مجھ سے کچھ کہنا یا پوچھنا چاہتی ہے؟" نضار مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اے نضار! کیا تُو نے سرگوشیاں نہیں سنیں؟" میں حیران ہو کر بولی۔

"نہیں' اے آتون! مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔" اس نے جواب دیا۔

میں اور نضار ایک ہی جگہ بیٹھے تھے' دونوں ہی وہ سرگوشیاں سننے کی اہلیت رکھتے تھے مگر نضار نے کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ میرے لئے یہ بات حیران کن ہی تھی۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ شاید نضار کی نسبت مجھ میں وہ سرگوشیاں سننے کی اہلیت زیادہ ہے۔

"اگر تُو نے کچھ نہیں سنا اے نضار تو پھر اٹھ۔" میں نے کہا۔

میرے کہنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "مگر چلنا کہاں ہے اے آتون!"

"انہی پہاڑوں کی طرف اے نضار کہ جہاں جا کر مشتبہ افراد روپوش ہو گئے ہیں۔" میں نے بتایا۔

"لیکن تُو نے تو کبیت کے سردار بریسا کی طرف اپنا پیغام بھیجا ہے۔"

"تیرا خیال ٹھیک ہی تھا اے نضار!" میں بولی۔ "کبیت والے انہیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔"

پھر میں نے نضار کو سرگوشیوں سے آگاہ کر دیا۔ اس نے کہا۔ "ابھی خجیرہ تو نہیں آئی' پھر تُو کس لئے اٹھ کھڑی ہوئی؟"

"کیوں' کیا اس پہاڑی سلسلے تک پہنچنے کے لئے بھی ہمیں خجیرہ کی رہنمائی چاہئے؟"

"تُو ٹھیک کہتی ہے۔" نضار نے اعتراف کیا۔ "وہ شاید اس وقت ظاہر ہو گی جب ہمیں اس کی رہنمائی کی ضرورت پڑے گی۔"

ہم دونوں راہداری میں آئے ہی تھے کہ مخالف سمت سے احرس آتا دکھائی دیا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو لپک کر قریب آ گیا اور بولا۔ "میں تجھے تیرے کمرے میں دیکھنے گیا تھا۔ وہاں تُو نہیں تھی تو سوچا' نضار ہی کے پاس ہو گی۔ کیا آج تیرا ارادہ کھانا کھانے کا نہیں ہے؟"

"تُو کھا لے احرس! ہم لوٹ کر آنے کے بعد کھا لیں گے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"مگر تُو کہاں جا رہی ہے؟" اس نے اپنی عادت کے مطابق پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"اے میرے بھائی احرس! کچھ مشتبہ افراد کو بستی کے اطراف میں دیکھا گیا ہے۔" مجھ سے پہلے نضار بول اٹھا۔ "تعاقب کئے جانے پر وہ اسی پہاڑی سلسلے میں جا کر روپوش ہو گئے ہیں جہاں کبھی تُو بھی روپوش ہوا تھا۔ ہم دونوں انہی کو تلاش کرنے.........."

"اگر واقعی وہ مشتبہ افراد ہیں روپوش ہوئے ہیں تو پھر تم دونوں کی واپسی کئی دن بعد ہی ہو سکے گی۔" احرس بات کاٹ کر بولا۔ "میرا نیک مشورہ یہ ہے کہ تم لوگ کھانے پینے کو بھی کچھ ساتھ لیتے جاؤ

ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا کیونکہ اے میرے بھائی نضار! سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"تیرے مشورے کا شکریہ اے میرے بھائی احرس!" نضار خلاف توقع مسکرا دیا۔ "تُو دیکھے گا کہ ہم ایک پہر بعد ہی لوٹ آئیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' میں بھی تم دونوں کی واپسی کا انتظار کروں گا۔ اتنی دیر تک تو میں بھوک با آسانی برداشت کر سکتا ہوں۔" احرس کا لہجہ چڑانے والا تھا۔

"اچھا اب راہ کھوٹی نہ کر اور ہمیں جانے دے۔" میں احرس سے بولی۔ "اور سن' تُو نے وعدہ کیا ہے کہ ہماری واپسی تک بھوکا رہے گا' بھولنا مت۔"

"مگر وعدہ صرف ایک پہر تک بھوکا رہنے کا ہے' کئی دن تک نہیں۔" احرس نے کہا۔

میں آگے بڑھ گئی اور نضار بھی میرے پیچھے آ گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد میں اور نضار تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔ نصف پہر گزرنے سے بھی پہلے ہم اس پہاڑی سلسلے میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں داخل ہوتے ہی مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ کبیت والوں کو میرا پیغام مل چکا ہے۔ اِدھر سے اُدھر ایک بڑے دائرے میں مشعلیں حرکت کرتی نظر آ رہی تھیں۔ ابھی میری نگاہ انہی حرکت کرتی مشعلوں پر جمع ہوئی تھی کہ اچانک میں نے ایک آشنا آواز سنی۔ "اے معبلہ! ادھر نہ جا اور میرے ساتھ ساتھ آ۔" یہ آواز خجیرہ ہی کی تھی اور اب مجھے اس کی خوشبو بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

جس طرف متحرک مشعلیں نظر آ رہی تھیں' خجیرہ کی خوشبو اس کی مخالف سمت سے آ رہی تھی۔ میں نے ادھر اپنا گھوڑا موڑا تو نضار نے بھی میری تقلید کی۔ میرے اندر اندھیرے میں دیکھنے کی پُراسرار قوت بیدار ہو چکی ہے اور شاید نضار کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ ہم اسی لئے اپنے ساتھ مشعلیں لے کر نہیں چلے تھے۔ مجھے توقع تھی کہ پہاڑی سلسلے میں قدم رکھتے ہی میں اندھیرے میں دیکھنے کی اہل ہو جاؤں گی اور میری یہ توقع پوری ہوئی تھی۔

کچھ ہی فاصلے پر ایک روشن اور متحرک ہیولا سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ہیولا خجیرہ ہی کا تھا جو چند لمحوں بعد غائب ہو گیا اور صرف اس کی خوشبو رہنمائی کے لئے رہ گئی۔ میں اور نضار' خجیرہ کی خوشبو کے تعاقب میں گھوڑے دوڑاتے رہے۔ پہاڑوں کے درمیان یہ سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔

"رک جاؤ۔" خجیرہ کی سرگوشی ابھری۔ "اپنے گھوڑے یہیں کہیں باندھ دو ورنہ وہ چوکنا ہو جائیں گے۔"

ہم نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں اور ان سے اتر گئے۔ مجھے دن کی روشنی کی طرح سب کچھ واضح نظر آ رہا تھا۔

"اے نضار! کیا تجھے بھی اندھیرے میں سب کچھ دکھائی دے رہا ہے؟" میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"ہاں اے آتون!" اس نے جواب دیا۔ "اور میں عظیم میمن کی کاہنہ خجیرہ کی سرگوشیاں بھی سن

رہا ہوں۔ اس کی خوشبو بھی مجھے محسوس ہو رہی ہے۔"

اپنے گھوڑے ہم نے اسی پہاڑی کے دامن میں ایک بڑے سے پتھر سے باندھ دیئے جہاں رک جانے کے لئے کہا گیا تھا۔ خجیرہ کی خوشبو ابھی تک ہماری رہنمائی کر رہی تھی اور اب ہم دائیں جانب کی ایک پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ کچھ ہی اوپر ذرا بلندی پر مجھے روشنی سی نظر آئی۔ میں چونک اٹھی۔ بوڑھے ساحر زعیم کے خدمت گاروں سے مجھے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی کہ وہ اپنی نشاندہی کے لئے مشعل جلا کر سوئیں گے۔ ہم اسی روشنی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اچانک میری سماعت سے کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز ٹکرائی۔ یہ آواز بھی اسی روشنی کی طرف سے آئی تھی۔

"کیا تجھے وہ روشنی نظر آ رہی ہے اے نضار؟" میں نے دھیمی آواز میں نضار کو مخاطب کیا۔

"ہاں۔" وہ بھی آہستہ آواز میں بولا۔ "اسی طرف سے کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز بھی آئی ہے۔ اے آتون! ہم شاید ان کے قریب پہنچ چکے ہیں۔"

ہم کچھ اوپر ہی اور چڑھے ہوں گے کہ روشنی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ پُراسرا روشنی یقیناً کسی مشعل کی نہیں تھی ورنہ یوں اوجھل نہ ہو جاتی۔

"روشنی غائب ہو گئی۔" نضار نے سرگوشی کی۔

اسی وقت میری نگاہ بائیں جانب اٹھی۔ مجھے اس طرف ایک غار کا دہانہ نظر آیا۔ وہیں مجھے تین گھوڑے بندھے دکھائی دیئے۔

"تم دونوں اپنی منزل تک پہنچ چکے ہو۔" خجیرہ کی سرگوشی ابھری اور پھر اس کی خوشبو آنا بند ہو گئی۔

میں اور نضار دبے قدموں غار کے دہانے کی طرف بڑھے۔

"اب تُو سو جا' میں جاگ رہا ہوں۔" غار کے دہانے کی طرف سے ایک آواز آئی تو میں ٹھٹک کر رک گئی۔ نضار کو بھی میں نے رکتے دیکھا۔

"لیکن اس کی ضرورت کیا ہے؟" دوسری آواز ابھری۔ "یہاں کون آ سکتا ہے؟"

"تجھے شاید بوڑھے ساحر کی تاکید یاد نہیں رہی۔" پہلی آواز سنائی دی۔ "اس نے کہا تھا کہ رات ہو جائے تو کوئی نہ کوئی ضرور جاگتا رہے۔"

وہ دونوں کچھ دیر تک اسی طرح بحث کرتے رہے اور پھر دوسرے نے پہلے کو سو جانے پر آمادہ کر لیا۔ ان کا تیسرا ساتھی شاید سو رہا تھا۔

غار کا دہانہ ہم سے چند ہی قدم پر تھا۔ محتاط انداز میں بڑھتے ہوئے ہم وہاں تک پہنچ گئے۔ اندر سے ان کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ ہم خاصی دیر تک باہر رکے رہنے کے بعد آگے بڑھے تھے تاکہ وہ دونوں جو کچھ دیر پہلے تک جاگ رہے تھے' سو جائیں۔

جب ہم غار میں داخل ہوئے تو ان تینوں کو بے خبر سوتے ہوئے پایا۔ ان کے سرہانے ہمیں

رائفلیں بھی رکھی نظر آئیں۔ نضار نے آہستگی سے آگے بڑھ کر یکے بعد دیگرے تینوں رائفلیں اٹھالیں اور مجھے دے دیں۔ غار کے اندر تاریکی ہی تھی، مگر جدھر بھی میری نگاہ اٹھتی تھی، ادھر سے تاریکی چھٹ جاتی تھی۔ یہ تجربہ میرے لئے بڑا انوکھا، عجیب اور حیرت ناک ہی تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری نظریں اندھیرے میں شگاف ڈال رہی ہوں۔ نضار کو میں نے دائیں شانے سے رسی کا ایک لچھا اتارتے دیکھا جو حویلی سے وہ ساتھ لے کر چلا تھا۔ اس کے بائیں شانے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ اس نے تیزی کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے رسی میں تین پھندے بنائے اور جھک کر وہ تینوں پھندے ان تین افراد کے پیروں میں ڈال دیئے جو قریب قریب ہی سوئے ہوئے تھے۔ پھر نضار نے رسی کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ پھندے ان تینوں کے پیروں میں کس گئے اور وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔

"کوئی ہے .... غار میں کوئی ہے۔" ایک شخص کی خوفزدہ سی آواز ابھری۔

"اور .... اور اس نے ہمیں باندھ لیا ہے۔" دوسرا ڈری ڈری سی آواز میں بولا۔

تیسرا شخص شاید کچھ زیادہ ہی گھاگ تھا۔ اس کا ہاتھ سرہانے کی طرف بڑھا جہاں سے نضار نے اس کی رائفل اٹھائی تھی۔ وہ اندھوں کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگا۔ پھر وہ بھی بول اٹھا۔ "رائفل .... میری رائفل بھی غائب ہے۔"

پھر بقیہ دونوں کو بھی اپنی رائفلوں کا خیال آگیا۔ انہوں نے بھی یہی کوشش کی اور ناکام رہے۔

"سنو!" معاً نضار نے انہیں مخاطب کیا۔ "تم باندھے جا چکے ہو اور تمہارے ہتھیار ہمارے قبضے میں ہیں۔"

"کون .... تم کون ہو؟ .... کون لوگ ہو تم؟" ایک شخص نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا جدھر نضار کھڑا تھا۔ اس نے یقیناً نضار کی آواز ہی سے سمت کا اندازہ کیا تھا۔ اس شخص کے چہرے سے عیاری ظاہر ہو رہی تھی۔

"میرا نام نضار ہے، مگر تُو مجھے اپنی موت بھی کہہ سکتا ہے۔" نضار نے اس شخص کے سوال کا جواب دیا۔

"عظیم سردار اشر کا بہادر بیٹا نضار!" اس عیار شخص کے لہجے میں چاپلوسی تھی۔ "مگر احزم نے تو مجھے کچھ اور ہی کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا، تجھ سے احزم نے؟" نضار نے پوچھا۔ "تُو مجھے خاصا باخبر معلوم ہوتا ہے۔" نضار کی آواز میں چبھن تھی۔

"اس نے کہا تھا کہ آج کی رات تیری زندگی کی آخری رات ہوگی اور وہ کل صبح یہاں خود آتون کو لے آئے گا۔ احزم نے تیرے دشمن ثزیان سے آتون کا سودا کر لیا تھا۔" وہ عیار شخص، نضار کو باتوں میں لگا کر اپنے پیروں کا پھندا کھولنے کی ناکام کوشش کئے جا رہا تھا۔

"میری زندگی کی تو یہ آخری رات نہیں مگر اے بوڑھے ساحر زعیم کے عیار خدمت گار! تو شاید کل کا سورج نہ دیکھ سکے۔" نضار یہ کہتا ہوا میری طرف بڑھا اور رسی کا لچھا مجھے تھما دیا۔

"نہیں اے نضار! ہمارا زعیم سے کوئی تعلق نہیں۔" یہ کہہ کر وہ شخص پھر اپنے پیروں میں پڑا ہوا پھندا کھولنے میں الجھ گیا۔

نضار پھر کچھ نہیں بولا میں نے اسے شانے سے رائفل اتارتے دیکھا جسے وہ نال کی طرف سے پکڑے ہوئے تھا۔ نضار نے باری باری ان تینوں کے سروں کو نشانہ بنایا پھر ان کے بے ہوش جسموں کو انہی کے گھوڑوں کی پشت سے باندھ دیا گیا۔ گھوڑوں کی لگامیں تھامے ہم پہاڑی سے اتر آئے۔

ان گھوڑوں کی لگامیں ایک رسی سے باندھ کر نضار نے ہاتھ میں لے لیں اور اپنے گھوڑے کو کھولا۔ ان تینوں کی رائفلوں کو میں نے اپنے گھوڑے کے پہلو سے باندھ لیا۔ میں اور نضار تقریباً ایک ساتھ ہی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔

واپسی کا سفر اسی راستے سے ہوا جہاں ہمیں مشعلیں متحرک نظر آئی تھیں۔ اب بھی دور دور تک پہاڑوں میں وہی سماں تھا جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ ہم اس پہاڑی سلسلے سے نکل ہی رہے تھے کہ ہمیں گھیر لیا گیا۔ وہ مسلح مشعل بردار کبیت والے ہی تھے۔

"آتون دیوی!" کوئی حیرت زدہ سی آواز میں چیخا۔

پھر وہ سبھی میری تنظیم میں جھک گئے۔

"اپنے سردار بریسا سے کہہ دینا کہ مشتبہ افراد کو آتون دیوی باندھ کر لے گئی، وہ دیکھو۔" میں نے ان گھوڑوں کی طرف اشارہ کیا جو نضار کے ساتھ تھے۔ پھر میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

اس پہاڑی سلسلے میں ان تین افراد کو تلاش کر لینا ایسا ہی تھا جیسے صحرا میں سوئی کی تلاش۔ ان تینوں کو اس غار میں بھی موت کی نیند سلایا جا سکتا تھا انہیں باندھ کر ساتھ لانے کی ضرورت نہیں تھی، مگر نضار نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس پر میں نے بھی اسے نہیں ٹوکا تھا۔ اس طرح شاید وہ احرس کے طنز کا جواب دینا چاہتا تھا۔

میرا اندازہ یہ تھا کہ ہمیں واپسی میں خاصی دیر ہو گئی ہے، مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ احرس واقعی ہمارے انتظار میں جاگ رہا تھا اور اس نے اب تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ میرے لئے یہ بات بھی حیران کن ہی تھی کہ ابھی تک ایک پہر نہیں گزرا تھا۔

"اے میرے بھائی احرس! تُو نے دیکھ لیا کہ ہم کئی دن وہاں گزارے بغیر مقررہ وقت کے اندر واپس آگئے۔" نضار نے مسکرا کر احرس کو مخاطب کیا جو ہم دونوں کے ساتھ ہو لیا تھا۔

"یوں تو اے نضار! میں بھی کہیں جا کر خالی ہاتھ لوٹ سکتا ہوں۔" احرس بھلا کب ہار ماننے والا تھا۔ "بس جانا اور آنا ہی تو ہے۔ تُو ایک پہر میں وہاں جا کر پلٹا ہے، میں نصف پہر میں وہاں ہو کے آ سکتا ہوں، پوچھ کیسے؟"

"وہ کیسے احرس!" نضار حیرت سے بولا۔ "ہاں بتا۔"

"تجھ سے یہی کہہ کر جاؤں گا کہ پہاڑی سلسلے کی طرف جا رہا ہوں اور چشمے کے کنارے کچھ دیر ٹہل کر واپس آ جاؤں گا۔" احرس یہ کہہ کر ہنس دیا۔

"تیری ہی تسلی کے لئے اے میرے بھائی احرس! میں ان تینوں مشتبہ افراد کو اپنے ساتھ باندھ کر لایا ہوں ورنہ انہیں وہیں ٹھکانے لگا آتا۔"

احرس بے یقینی کے سے انداز میں نضار کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا یہ خیال درست ہی نکلا کہ احرس ہی کی خاطر نضار نے اتنی زحمت اٹھائی تھی۔

پھر ہم نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ اس کے بعد احرس کو بہ اصرار نضار اپنے ساتھ لے گیا۔ نضار کے حکم پر تینوں خدمت گاروں کے سر قلم کئے جانے والے تھے۔ یہ منظر نضار' احرس کو بھی دکھانا چاہتا تھا۔

نضار تو احرس کو لے کر چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ معلوم نہیں کیوں اس وقت مجھے بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس کے باوجود سونے کے لئے بستر پر لیٹ گئی۔ مجھے احساس تھا کہ مجھے پھر ایک طویل سفر درپیش ہے۔ مجھے اور نضار کو ادل کے ساتھ روانہ ہونا تھا۔

دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد جب مجھے نیند نہیں آئی تو میں اٹھ کر کمرے ہی میں ٹہلنے لگی۔ بے چینی کا سبب ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک کر میں لیٹی ہی تھی کہ راہداری میں کسی کے قدموں کی تیز آواز گونجی جیسے کوئی دور سے دوڑتا آ رہا ہو۔

آنے والا ایک خادم تھا۔ اس نے آ کر بتایا کہ اچانک مہا پجاری کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ میں فوراً لپکتی ہوئی اس کے کمرے تک پہنچی۔ اب میں اپنی بے چینی کی وجہ جان چکی تھی۔ وہ مجھے سخت اذیت کا شکار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ .... کیا ہوا اے مہا پجاری!" میں اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر ایک بار مجھے دیکھا اور پھر دوبارہ پلکیں جھک گئیں۔

اسی وقت ایک خادم' حویلی کے طبیب کو اپنے ساتھ لے کر آ گیا۔ میں پیچھے ہٹ گئی اور طبیب' مہا پجاری کا معائنہ کرنے لگا۔ اسی وقت مہا پجاری کا ہاتھ میں نے سینے کی بائیں جانب اٹھتے دیکھا۔ اسی دوران میں ایک خادم سے مجھے معلوم ہوا کہ مہا پجاری نے آواز دے کر بلایا تھا اور پھر سینہ تھام کر لیٹ گیا تھا۔ وہ خادم سے کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔

طبیب نے کوئی مشروب مہا پجاری کے ہونٹوں پر ٹپکایا اور پھر منہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ بمشکل وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوا اور اس مشروب کے چند قطرے منہ میں چلے گئے۔

"اے طبیب! اسے کیا ہو گیا؟" میں نے بھاری آواز میں طبیب سے پوچھا۔

"اس کی بائیں پسلیوں کے نیچے کچھ تکلیف معلوم ہوتی ہے' اے آتون!" طبیب نے جواب دیا۔

"کوئی .... کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟" میں بڑی مشکل سے یہ سوال کر سکی۔ "آج شام تک تو یہ .... یہ بالکل ٹھیک تھا اے طبیب!"

"اے آتون! ابھی میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔" یہ کہتے ہی اس نے جھک کر سینے پر اپنا ایک کان رکھ دیا پھر سیدھا ہو کر معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔ اپنی دواؤں کی صندوقچی اس نے دوبارہ کھول لی تھی۔

"کیوں' کیا ہوا؟" میں نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"اگر اسے ہوش آ گیا تو بچ جائے گا اے آتون!" طبیب نے بتایا۔ "اس کا جسم بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہے۔"

طبیب نے غالباً کسی اور دوا کے کچھ قطرے مہا پجاری کے منہ میں ڈالے۔ اسی وقت مہا پجاری کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔

"دوا کام کر گئی۔" طبیب کے چہرے پر رونق نظر آنے لگی۔

چند ہی لمحے بعد مہا پجاری نے آنکھیں کھول دیں۔ طبیب نے فوراً ہی وہ پہلا مشروب اسے پلا دیا جو غالباً بے ہوشی کے دوران پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے کہنے پر خود مہا پجاری نے منہ کھول دیا تھا۔

اسی وقت احرس اور نضار بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ دونوں بھی طبیب سے مہا پجاری کی کیفیت دریافت کرنے لگے۔

"اسے آرام اور نگہداشت کی ضرورت ہے اے سردار! اسے اکیلا نہ چھوڑا جائے۔" طبیب نے کہا۔

میں نے محسوس کیا جیسے مہا پجاری کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں اسی لئے جھک کر اس کی بات سننے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھیں وہ کہہ رہا تھا۔ "اے میری بچی! .... تُو فکرمند نہ ہو۔ ابھی دیوتاؤں کی طرف سے میرا بلاوا نہیں آیا۔"

برابر والا کمرہ احرس کا تھا۔ وہ مہا پجاری کے کمرے میں منتقل ہو گیا۔ ہرچند کہ طبیب نے مطمئن کر دیا تھا' اب مہا پجاری کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں پھر بھی مجھے بے چینی سی رہی۔ رات کو کئی بار میری آنکھ کھلی۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کرنے سے بھی پہلے میں' مہا پجاری کو دیکھنے چلی گئی۔ وہ اس وقت تک سو کر نہیں اٹھا تھا اور یہ دواؤں کا اثر معلوم تھا۔ احرس جاگ چکا تھا۔ "کیا حال ہے اب اس کا؟" میں نے احرس سے دریافت کیا۔

"طبیب کہہ گیا ہے کہ جب تک یہ سوئے اسے سونے دیا جائے۔" احرس بولا۔ "میں نے اسی لئے اسے نہیں جگایا۔ تیرے آنے سے ذرا پہلے ہی طبیب اسے دیکھ کر گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر سونے دے اسے۔" میں یہ کہہ کر مڑی۔

"اے آتون! کیا تُو مہا پجاری کو اس حالت میں چھوڑ کر نضار کے ساتھ چلی جائے گی؟"

"نہیں اے احرس! یہ کیسے ممکن ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اے آتون! تجھ سے مجھے اسی جواب کی امید تھی۔ نضار کو جانے دے۔"

"وہ بھی اب نہیں جائے گا' اے احرس!" میں یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دوسرے دن تک مہا پجاری کی حالت خاصی سنبھل گئی۔ ادل کو روک لیا گیا تھا۔ اسی دن شام کو

جب میں اور نضار تیسری بار اس کی عیادت کو پہنچے تو اس نے کہا۔ "اے نضار! اب میں بالکل ٹھیک ہو چکا ہوں۔ تو میری طرف سے کوئی اندیشہ نہ کر اور جہاں جا رہا تھا' جا۔"

"ہمارا جانا تیری زندگی سے زیادہ نہیں اے مہا پجاری!" میں بول اٹھی۔ "تو جب تک اٹھ کر چلے گا نہیں' میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"تو اگر کہتی ہے تو میں ابھی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔" وہ کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"بس بس' لیٹا رہ۔" احرس نے کہا۔ "طبیب نے چلنے پھرنے کی ابھی تجھے اجازت نہیں دی۔"

مہا پجاری کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ کچھ دیر ہم اس کے پاس مزید بیٹھ کر اٹھ آئے۔

"تیرا کیا خیال ہے اے آتون کہ ہم اول کو چلا ہی جانے دیں؟" اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے نضار نے مجھ سے پوچھا۔

میں چونک کر آہستہ بولی۔ "تو پھر؟"

"ہم اس کے بعد بھی تو یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔" نضار کا لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ اب اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی۔ اب وہ یہیں سے براہ راست بوڑھے ساحر زعیم کی طرف جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہو گئی اور بولی۔ "ہاں یہ بھی ممکن ہے اے نضار! مگر تیرا محافظ دستہ' میں تجھے بتا چکی ہوں کہ صرف تو ہی میرے ساتھ چلے گا۔"

"مجھے یاد ہے اے آتون!" اس نے کہا اور بیٹھ گیا۔ "آ بیٹھ کہ میں تجھے بتاؤں' وہ جو میں نے سوچا ہے۔" میں اس کے پاس بیٹھ گئی تو وہ کہنے لگا۔ "اس معاملے میں صرف ایک شخص کو اعتماد میں لینا پڑے گا اور وہ میرا نائب احزم ہے۔"

"مگر اے نضار! کیا تو رازداری کی شرط بھول گیا؟ کسی کو کچھ نہیں بتانا کہ ہمیں کہاں اور کس لئے جانا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"اعتماد میں لینے کا مطلب کسی کو رازدار بنانا تو نہیں اے آتون! احزم کو یہ معلوم نہیں ہو گا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کس لئے۔ بول کیا اس طرح رازداری کی شرط پوری نہیں ہو جاتی؟"

"یوں ہے اے نضار! تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی پھر بولی۔ "تو اول کو جانے دے ہم بہرحال اسی وقت یہاں سے چلیں گے جب طبیب' مہا پجاری کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو جائے گا۔"

"تو پھر میں آج ہی اول سے کہہ دیتا ہوں اے آتون کہ وہ اپنی بستی کی طرف لوٹ جائے۔" پھر جو کچھ نضار نے اس عرصے میں سوچا تھا' بتانے لگا۔

☆======☆======☆

رات کا آخری پہر تھا کہ میں اور نضار' حویلی کے عقبی دروازے سے باہر نکلے۔ ہمیں رخصت

کرنے والا وہاں صرف احزم تھا۔ محافظوں کو وہاں سے پہلے ہی ہٹا دیا گیا تھا۔ خود احزم کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں اور کیوں جا رہے ہیں' نہ یہ کہ ہماری واپسی کب ہو گی۔

نضار کے جسم پر معمولی لباس تھا۔ اس لباس میں وہ کسی پہاڑی بستی کا کوئی غریب اور بے حقیقت باشندہ لگ رہا تھا۔ میں نے بھی ایسا ہی لباس زیب تن کیا تھا مگر وہ بھی مردانہ لباس ہی تھا۔ ہم دونوں بہرحال ان بستیوں سے گزرنے والے تھے جن پر ہمارے دشمن کی حکمرانی تھی۔ وادی سبز کے شمال میں نصف پہر کی مسافت پر جو پہاڑ تھے' ان بستیوں سے گزرے بغیر وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ ان پہاڑوں کے گردا گرد کئی چھوٹے چھوٹے قبیلے آباد تھے۔ انہی میں سے ایک پہاڑ' بوڑھے ساحر زعیم کا مسکن تھا۔ نضار اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا۔

مہا پجاری کو گزشتہ روز ہی طبیب نے چلنے پھرنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اب مہا پجاری کی طرف سے مطمئن تھا۔ ہم نے تبھی روانگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ احرس اور مہا پجاری کو یہی معلوم تھا کہ ہم کسی بھی وقت اول کی بستی کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ ان کے سوا کسی اور کو یہ علم بھی نہیں تھا کہ ہم کب اور کہاں کے لئے روانہ ہوں گے۔ صرف احزم کو خبر تھی کہ رات کے آخری پہر ہماری روانگی ہے۔

صبح کے آثار نمودار ہوتے ہوتے ہم اشر کی بستی سے کافی دور نکل آئے تھے۔ ہم نے اپنے گھوڑوں کی رفتار اعتدال پر رکھی تھی کہ کسی کو ہم پر چوروں یا رہزنوں کا شبہ نہ ہو۔

ان پہاڑی بستیوں کے غریب باشندوں کے پاس عموماً پرانی طرز کے معمولی ہتھیار ہی ہوتے تھے۔ اپنے حلیوں کی مناسبت کے پیش نظر ہمارے پاس بھی یہی ہتھیار تھے۔ نضار ہی کی طرح میری کمر سے بھی ایک تلوار بندھی ہوئی تھی۔ اس تلوار کے علاوہ ایک خنجر تھا جو کمر کی پیٹی میں اڑسا ہوا تھا۔ میرے جسم پر ڈھیلا ڈھالا لباس تھا تاکہ میری نسوانیت ظاہر نہ ہو۔ سر کے بال اس چادر میں چھپے ہوئے تھے جو میرے سر پر پگڑی کی طرح بندھی ہوئی تھی۔ دوپہر ہونے سے کچھ پہلے ہی ہم دشمن کے علاقے کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔

"اب ذرا چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اے آتون!" نضار نے مجھ سے کہا تھا۔ "ہم خطرے میں بھی گھر سکتے ہیں۔ تجھے ایسے وقت کچھ نہیں بولنا!"

"ہاں مجھے تیری ہدایات یاد ہیں۔" میں آہستہ سے ہنس کر بولی۔

ہم محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہے کچھ ہی فاصلے پر نشیب میں کسی بستی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ہم جس راستے سے گزر رہے تھے' اس کی ایک جانب اونچی اونچی چٹانیں تھیں بس اچانک ہی ایک چٹان کی آڑ سے نکل کر دو گھڑسوار ہمارے سامنے آ گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن کے رخ ہماری ہی طرف تھے۔

"رک جاؤ!" ان میں سے ایک نے ہمیں حکم دیا۔

میں نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ نضار نے بھی اپنا گھوڑا روک لیا تھا پھر ایک گھڑسوار ہم سے فاصلے ہی پر کھڑا رہا اور دوسرا اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر ہمارے قریب آ گیا۔ یہ وہی تھا جس نے ہمیں رک

جانے کا حکم دیا تھا۔ اس کے لمبوترے چہرے پر نظر پڑتے ہی جانے کیوں مجھے کراہت محسوس ہوئی۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس شخص نے درشت آواز میں سوال کیا۔

"میرا نام مرطاق ہے اور یہ میرے چچا کا بیٹا رافع ہے۔" نضار نے نرمی سے جواب دیا۔

"تُو کہاں سے آ رہا ہے؟"

"اپنی بستی منیہ سے۔" نضار نے ایک بستی کا نام لیا جو وادی سبز کے مغرب میں واقع تھی۔

"ہوں۔" اس شخص نے ہنکارا بھرا اور تیز نظروں سے نضار کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "اور تُو اد[illegible] کہاں جا رہا ہے؟"

"وسیط کی بستی جو دو پہاڑوں کے درمیان آباد ہے۔" نضار پُرسکون آواز میں بولا۔

"وہاں تیرا کون ہے؟"

"میرے باپ کا بڑا بھائی ناسق۔" نضار نے بلا جھجک جواب دیا۔

اس شخص نے اپنے گھوڑے کا رخ میری طرف پھیرا اور کہا۔ "ہاں اب تُو بول۔" اس نے اپ[illegible] رائفل کی نال سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔

"یہ بول نہیں سکتا۔" نضار نے اس شخص کو بتایا۔ "یہ گونگا ہے۔"

"اچھا تو بولنے والا صرف تُو ہے۔" وہ مکروہ صورت شخص اچانک زور سے ہنس پڑا' پھر کہنے لگا۔ "[illegible] شاید اس گمان میں ہے کہ مجھے دھوکا دے کر آگے بڑھ جائے گا۔ بول کیا تُو ہمارے دشمن نضار کی طرف سے نہیں آیا؟" نضار سے اس نے یہ سوال اس طرح کیا تھا جیسے کوئی انکشاف کیا ہو پھر اس نے نضار کے چہرے پر نظریں گاڑ دی تھیں۔

"نہیں۔" نضار نے انکار کیا۔ "تُو ہمیں جانے دے اور ہم پر دشمن کے مخبر ہونے کا شبہ نہ کر۔"

"اگر تُو دشمن کا مخبر نہ ہوتا تو ہرگز اس راستے پر نہ آتا۔ چل اب تیرا فیصلہ قلاوز ہی کرے گا کہ [illegible] سرداروں کے سردار ژیان کا نائب ہے۔" پھر اس شخص نے اپنی رائفل کی نال سے ہمیں آگے بڑھنے [illegible] اشارہ کیا۔

نضار کو مجبوراً اپنا گھوڑا آگے بڑھانا پڑا اور میں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔ وہ دونوں ہمارے دائیں بائیں ہو گئے اور ہمیں اس بستی میں لے آئے جس کے آثار نشیب میں ہمیں دور ہی سے نظر آ گئے تھے۔

اس بستی میں پتھروں سے بنی ہوئی صرف ایک ہی عمارت تھی۔ وہ دونوں ہمیں ساتھ لئے اسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عمارت کا صدر دروازہ دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ جلد ہی وہ دونوں ہمیں گھیرے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے پھر ان میں لمبوترے چہرے والے کا ساتھی باہر ہی رک گیا۔ ہمیں گھوڑوں سے اتار لیا گیا تھا۔ ہمارے گھوڑے صدر دروازے پر متعین محافظوں نے اپنے قبضے میں لے لئے تھے۔ مکروہ صورت شخص اب ہمیں حویلی کے اندر لے جا رہا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ہمیں بھاری جبڑوں والے ایک دراز قد شخص کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ میں سمجھ گئی کہ یہی شخص' ژیان کا نائب قلاوز ہو سکتا ہے۔ نضار نے اس کے روبرو گھٹنوں کے بل جھک کر تعظیم دی' میں نضار کے عقب میں تھی۔ نضار تعظیم دے کر پیچھے آ گیا تو میں آگے بڑھی۔ یہ میرے لئے پہلا موقع تھا کہ میں یوں کسی کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ تعظیم دینے کے بعد میں بھی نضار کے قریب سر جھکا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"بول اے سمات! تُو انہیں کہاں سے پکڑ لایا ہے اور انہوں نے کیا جرم کیا ہے؟" بھاری جبڑوں والے نے لمبوترے چہرے والے مکروہ صورت شخص کو مخاطب کیا۔ اس کے لہجے سے قدرے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔ مکروہ صورت والے کا نام مجھے پہلی بار معلوم ہوا۔

"اے ژیان کے نائب قلاوز! انہیں میں نے ممنوعہ راستے سے پکڑا ہے۔"

"یہ اجنبی لگتے ہیں' راستہ بھٹک گئے ہوں گے۔" قلاوز نے کہا۔

"مگر اے قلاوز! مجھے ان پر نضار کے مخبر ہونے کا شبہ ہے۔"

"نضار کے مخبر' یہ تُو کیا کہہ رہا ہے؟" قلاوز حیرت سے بولا۔ "کیا تجھے ایسی خبر ملی ہے؟"

"خبر تو نہیں ملی اے قلاوز! مگر سرداروں کے سردار ژیان نے مجھے تیرے پاس اسی لئے بھیجا ہے کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھوں۔" سمات کے ان الفاظ نے مجھ پر اس کی اہمیت واضح کر دی۔ وہ کوئی کم رتبہ شخص بہرحال نہیں ہو سکتا تھا جیسا میں نے گمان کیا تھا۔ میں اسے کوئی معمولی محافظ سمجھی تھی۔ وہ قلاوز سے برابری کی سطح پر بات کر رہا تھا۔ اس نے قلاوز کو تعظیم بھی نہیں دی تھی۔

"اب میں سمجھا اے سمات کہ تُو حویلی میں رہنے کے بجائے کیوں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے۔" قلاوز ہنس کر بولا' پھر کہنے لگا۔ "تُو نے ان پر نضار کے مخبر ہونے کا شبہ کیا ہے تو یقیناً تیرے پاس اس کی کوئی دلیل بھی ہو گی۔"

"اے قلاوز! دیکھنا چاہتا ہے تو .... اچھا میں تجھے ایسی دلیل دیتا ہوں کہ جس کی تردید خود تُو بھی نہ کر سکے۔" سمات یہ کہہ کر پلٹا اور پھر اس نے جھپٹ کر میرے سر پر بندھی ہوئی چادر کھینچ لی۔

میرے لہریے دار بال کھل کر میری کمر تک پہنچ گئے۔ سمات کے جسم میں یقیناً کوئی خبیث روح تھی۔ اس نے اب تک مجھ پر شبہ ظاہر نہیں کیا تھا۔

"اس کے ساتھی کا کہنا یہ تھا کہ.........." پھر سمات نے وہ باتیں دہرائیں جو سوال جواب کے نتیجے میں اسے نضار سے معلوم ہوئی تھیں۔

قلاوز کے چہرے پر میں نے غصہ دیکھا۔ وہ بڑی سخت نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"بتا کون ہے تُو؟ اور یوں بھیس بدل کر میری بستی میں کیوں آئی تھی؟" قلاوز مجھ پر برس پڑا۔

"مجھے بولنے کی اجازت دے اے سردار! میں بتاتا ہوں۔" میرے بجائے نضار آگے بڑھ کر ادب سے جھکا۔

قلاوز نے نضار کی طرف بھی گھور کر دیکھا۔ "بول' تجھے بولنے کی اجازت ہے۔"

"یہ عورت میری بیوی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ راستے میں اسے مجھ سے کوئی چھین نہ لے۔ میں اسی

لئے اسے مردانہ کپڑے پہنا کر ساتھ لایا تھا۔"

"پھر تُو نے سمات سے جھوٹ کیوں بولا؟" قلاوز نے سوال کیا۔

"اے قلاوز! یہ اسی طرح ایک جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسرا جھوٹ بولتا رہے گا۔ تُو دونوں کو میرے حوالے کر دے۔ میں ان کی زبانیں کھلوا لوں گا۔ یہ خود ہی اقرار کریں گے کہ انہیں ہمارے دشمن نضار نے ادھر بھیجا ہے۔" سمات کے لہجے میں بے رحمی تھی۔

"ٹھیک ہے اے سمات! تُو انہیں اپنے ساتھ لے جا۔ تیرا شبہ مجھے بھی اب درست لگ رہا ہے۔" قلاوز نے گویا ہمیں سمات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سمات کی بات ماننے پر مجبور ہو۔

"چل اے عورت!" سمات نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

میری قوت برداشت اب جواب دے چکی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"تیری یہ مجال کہ تُو سمات کا ہاتھ جھٹک دے۔" سمات نے اس بار میرے سر کے بالوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے ایک نظر نضار کی طرف ڈالی اور پھر خود ہی لپک کر سمات کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے۔ اس وقت نضار نے پیچھے سے جھپٹ کر سمات کے دوسرے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔

پھر اس سے پہلے کہ نضار، سمات سے چھینی ہوئی رائفل کا رخ قلاوز کی طرف کرتا، محافظ اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ قریبی ستونوں کی آڑ میں کھڑے تھے۔ مجھے بھی مسلح محافظوں نے نرغے میں لے لیا۔

قلاوز اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سمات اس وقت تک ایڑیاں رگڑ کر مر چکا تھا۔ وہ حیرت زدہ سا ہو کر سمات کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس کی نگاہ میری طرف اٹھی اور وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ "تُو بھی نضار ہی کی طرح کوئی خطرناک مخبر لگتی ہے اے عورت!" پھر وہ نضار کی طرف پلٹا۔ "اور تُو.......... تُجھے بھی آج معلوم ہو گا کہ مخبروں کو قلاوز کیسی عبرت ناک سزا دیتا ہے۔ انہیں لے جاؤ اور زنداں میں ڈال دو۔"

مجھے اور نضار کو مسلح محافظ اپنے نرغے میں لئے ایک طرف بڑھے۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ مجھ سے دور ہی دور رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب انہوں نے میری کمر سے تلوار کھولی اور ... سے خنجر کھینچا تو بھی میری پشت سے دو رائفلوں کی نالیں لگی ہوئی تھیں۔

وہ قیدخانہ اسی حویلی کے اندرونی حصے میں تھا جہاں مجھے اور نضار کو ایک نیم تاریک کوٹھری میں دھکیل دیا گیا۔

ہمیں وہاں قید ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ قدموں کی چاپ سن کر میں پھر لپک کے سلاخوں تک پہنچ گئی۔ میں نے سیڑھیوں سے قلاوز کو اترتے دیکھا، پھر مجھے اس کے عقب میں مسلح محافظ نظر آئے۔ میں نے مڑ کر نضار کی طرف دیکھا۔ وہ کوٹھری کے فرش پر بیٹھا ہوا جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ قدموں کی چاپ یقیناً اس نے بھی سنی ہو گی، مگر وہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔

"تُو کس خیال میں ہے، اے مرطاق؟" میں نے دانستہ اس کا نام نہیں لیا تھا۔

غنیمت تھا کہ اسے اس بستی میں پہچاننے والا کوئی نہیں تھا ورنہ اب تک وہ زندہ نہ بچتا۔ پھر بھی اسے محافظوں نے خاصا زخمی کر دیا تھا۔

میرے مخاطب کرنے پر نضار نے نظر اٹھائی۔ "کیوں، کیا بات ہے؟"

اس وقت تک کوٹھری کا دروازہ کھولا جا چکا تھا۔ نضار کو اس کے سوال کا جواب عملی شکل میں مل گیا۔ مسلح محافظ اسے تیزی کے ساتھ گھسیٹتے ہوئے کوٹھری سے باہر لے گئے اور دوبارہ دروازہ بند کر دیا گیا۔ میری طرف سے وہ محتاط ہی رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے قریب نہیں آنے دیا تھا۔

میں ایک بار پھر جھک کر آہنی سلاخوں سے باہر دیکھنے لگی۔ کوٹھریوں کے درمیان صحن میں نضار پر تشدد کئے جانے کا بندوبست ہو رہا تھا۔ اسے ایک ٹکٹکی سے باندھ دیا گیا تھا جو غالباً محافظ اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔

اس عرصے میں کئی بار میں اپنے اندر چھپی ہوئی پُراسرار قوتوں کے بارے میں سوچ چکی تھی۔ میری کوئی بھی پُراسرار قوت بیدار نہیں ہو سکی تھی۔ اچانک میری سماعت سے دوڑتے ہوئے کچھ لوگوں کے قدموں کی آوازیں ٹکرائیں۔ یہ آوازیں سیڑھیوں کی طرف سے آ رہی تھیں۔

قلاوز کو میں نے چونکتے دیکھا۔ محافظ سیڑھیوں کی طرف لپکے۔

"ٹھہر جاؤ، مجھے یہ وہی لگتے ہیں۔ میری حویلی میں کوئی اور اس طرح داخل نہیں ہو سکتا۔" قلاوز نے ان محافظوں کو مخاطب کیا جو سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ وہ قلاوز کے حکم پر وہیں رک گئے۔

"اے قلاوز!" ایک بلند آواز سنائی دی اور پھر وہ شخص سیڑھیوں سے اتر کر سامنے آ گیا۔ اس کے پیچھے میں نے متعدد مسلح نوجوانوں کو آتے دیکھا۔ سیڑھیوں سے اتر کر آنے والا پہلا شخص، پھر قلاوز سے مخاطب ہوا۔ "دونوں قیدیوں کو ہمارے حوالے کر دے کہ وہ زعیم کے مہمان ہیں.........."

آنے والے مسلح افراد بوڑھے ساحر زعیم کے خدمتگار ہیں، میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا۔ زعیم نے یقیناً اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے میرے اور نضار کے بارے میں جان لیا ہو گا۔ میں کوٹھری کی سلاخوں سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ قلاوز نے سیڑھیوں سے اتر کر آنے والے دراز قد شخص سے زعیم کی نشانی طلب کی۔ اس پر دراز قد شخص نے اسے اپنا سینہ کھول کر دکھا دیا۔ میں نے اس شخص کے سینے پر آڑھی ترچھی لکیریں دیکھیں۔ قلاوز احتراماً اس شخص کے سامنے جھک گیا اور پھر اپنے محافظوں کو حکم دیا۔

"دونوں قیدیوں کو عظیم زعیم کے خدمتگاروں کے حوالے کر دیا جائے۔"

حکم سنتے ہی محافظوں نے نضار کو ٹکٹکی سے کھول لیا پھر انہوں نے کوٹھری کا دروازہ کھول کر مجھ سے بھی باہر آنے کے لئے کہا۔ محافظ اب بھی میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھے حالانکہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میری کمر سے تلوار کھولنے اور خنجر لینے کے بعد انہوں نے جامہ تلاشی کے دوران میں میرے جسم کا اوپری ڈھیلا ڈھالا لباس بھی تار تار کر دیا تھا۔ اب میرے جسم کے بالائی اور زیریں حصے پر صرف دو زیر جامے تھے۔ میرے سر پر بندھی ہوئی چادر سمات نے پہلے ہی کھول کر پھینک دی تھی۔ نضار کو زد و کوب کرتے وقت اس کے لباس کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔ وہ جانور کی کھال کا صرف ایک زیر جامہ

پہنے ہوئے تھا۔

قیدیوں کے بجائے اب ہماری حیثیت "مہمانوں" کی ہو چکی تھی اس لئے قلاوز نے محافظوں کو ہمارے ہتھیار لانے کا حکم دیا۔ جب محافظ ہتھیار لے کر آگئے تو اس نے کچھ سوچتے ہوئے صرف نضار کے دونوں ہتھیار یعنی دو دھاری تلوار اور خنجر' چمڑے کی پیٹی کے ساتھ اسے دلوا دیئے مگر مجھے ہتھیار واپس دینے سے محافظوں کو روک دیا۔ نضار نے چمڑے کی پیٹی اپنی کمر سے باندھ لی۔ اسی چمڑے کی پیٹی سے تلوار اور خنجر بندھے تھے۔

"اے عظیم ساحر کے خدمتگار!" قلاوز نے دراز قد شخص کو مخاطب کیا۔ "یہ عورت بہت خطرناک ہے۔ اس نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔ اس کے پاس ہتھیار ہونا خطرے کی بات ہے اسی لئے میں نے اس عورت کے ہتھیار واپس دینے سے محافظوں کو روک دیا ہے۔ تجھے اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"کیا یہ واقعی کسی کو قتل کر چکی ہے؟" دراز قد شخص میری طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "یہ تو مجھے بڑی نرم و نازک لگتی ہے۔"

"ہاں نرم و نازک تو ہے مگر خطرناک بھی ہے۔ میں نے غلط نہیں کہا کہ یہ ایک شخص کے خون سے ہاتھ رنگ چکی ہے۔ میں تجھے اس کی طرف سے چوکنا رہنے کی تاکید کرتا ہوں اے عظیم ساحر کے خدمتگار!" قلاوز نے سنجیدگی سے کہا پھر اس نے اپنے کاندھے پر پڑی ہوئی چادر دور ہی سے میری طرف اچھال دی اور مجھے مخاطب کیا۔ "لے' اسے اوڑھ لے۔"

"نہیں۔" دراز قد شخص بول اٹھا۔ "یہ اسی طرح اچھی لگ رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی ندیدی نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

چادر میرے پیروں کے قریب پڑی تھی' مگر جب زعیم کے خدمتگار نے انکار کر دیا تو میں نے چادر نہیں اٹھائی۔

ساحر زعیم کے خدمتگار ہمیں اس حویلی سے باہر لے آئے۔ وہاں پہلے سے گھوڑے موجود تھے۔ وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں تک پہنچے تھے۔

"لڑکی کو میں اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھاؤں گا۔" دراز قد شخص نے دائیں جانب مڑ کر ایک خدمتگار سے کہا جو اس کا نائب معلوم ہوتا تھا۔ "تو اس نوجوان کو اپنے گھوڑے پر آگے بٹھا لے' اور دیکھ' ہوشیار رہنا۔" اس نے اپنے نائب کو تاکید کی۔

ہمیں بہرحال بوڑھے ساحر زعیم تک پہنچنا تو تھا مگر اس طرح نہیں جس طرح ہمیں لے جایا جا رہا تھا۔ حقیقتاً ہماری حیثیت قیدیوں ہی کی تھی۔ دراز قد شخص نے ہمارے بارے میں قلاوز سے جو کچھ کہا تھا کہ ہم زعیم کے مہمان ہیں' اس سے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ ان حالات میں کیا قدم اٹھانا چاہئے؟ میرا ذہن اسی سوال میں الجھا ہوا تھا۔ زعیم کے سارے ہی خدمتگار مسلح تھے۔ ان کے نرغے سے نکل جانا آسان نہیں تھا۔

"چل بیٹھ گھوڑے پر۔" دراز قد شخص مجھ سے مخاطب ہوا اور میں خیالوں کی دنیا سے باہر آ گئی۔

پھر پہلے میں گھوڑے پر چڑھی اس کے بعد وہ دراز قد شخص سوار ہوا۔ نضار برابر والے گھوڑے پر دراز قد شخص کے نائب کے ساتھ پہلے ہی بیٹھ چکا تھا۔

"چلو۔" دراز قد شخص بلند آواز میں بولا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ میں اس کے آگے بیٹھی تھی۔

آگے آگے دراز قد شخص اور اس کے نائب کے گھوڑے تھے بقیہ گھڑسوار پیچھے تھے۔ جلد ہی ہم لوگ اس بستی سے باہر نکل آئے۔

بستی سے کچھ دور نکل آنے کے بعد میں نے دراز قد شخص کے ہاتھوں کی آوارگی کو محسوس کر لیا۔ میں اس کے دونوں بازوؤں کے درمیان تھی۔ اس کے علاوہ اس کا سینہ بھی میری پشت سے لگا ہوا تھا۔ اس کے سینے کے دباؤ سے بچنے کی خاطر میں اس حد تک آگے کھسک چکی تھی کہ اب میرے لئے مزید آگے بڑھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ گھوڑے پر سفر کرتے ہوئے مجھے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ الجھن کے ساتھ ساتھ ہی مجھے اب اس کی دست درازیوں پر غصہ بھی آنے لگا تھا۔ برداشت کی حد گزرنے لگی تو آخرکار مجھے اس سے کہنا ہی پڑا۔ "زیادہ بے قابو نہ ہو اور اپنی حد میں رہ۔"

"تجھے دیکھ کر بھلا کون قابو میں رہ سکتا ہے؟" وہ بے حیائی سے ہنس کر بولا۔

نضار جس گھوڑے پر تھا وہ بھی ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ نضار کی نظریں میری ہی طرف تھیں۔ اس نے بھی شاید صورت حال کا اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کس مشکل میں گرفتار ہوں۔ مجھے اس کے چہرے پر غصے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

دراز قد شخص اپنی نازیبا حرکتوں سے باز نہ آیا تو میں دانستہ چیخ کر اس سے مخاطب ہوئی۔ اسے چیخ کر مخاطب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ میں اس سے جو کچھ کہوں' نضار بھی سن لے۔ "دیکھ اے زعیم کے خدمتگار! اب بھی اگر تُو نہ مانا تو تجھے میری بات نہ ماننے کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔"

جواب میں وہ شاید میری بے بسی پر ہنسا اور پھر اس نے بڑے زور سے میرے جسم میں چٹکی بھر لی میرے منہ سے چیخ نکل گئی تو اس نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "اب اگر تُو نے کسی بات پر احتجاج کیا تو اس سے بھی زیادہ زور سے............"

پھر اس کی بات پوری نہ ہو سکی اور وہ چیخ اٹھا۔ اس کی ایک انگلی میرے دانتوں کے درمیان آ گئی تھی۔ میں نے اس کے خون کا ذائقہ اپنی زبان پر محسوس کیا۔ اس نے پیچھے سے میرے جسم پر دباؤ ڈالا اور میں نے اس کی انگلی چھوڑ دی۔ میرے نزدیک اتنا کافی تھا۔ کٹی ہوئی انگلی کے ذریعے اس کے خون میں میرا خطرناک زہر داخل ہو چکا تھا اور اب وہ صرف چند لمحوں کا مہمان تھا۔ میں نے گھوڑے کی لگام تھام لی اور نضار کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے ساتھ گھوڑے پر بیٹھے دراز قد شخص کو مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر تشنج کے آثار تھے اور چہرے کی رنگت تیزی سے نیلی پڑتی جا رہی تھی۔ زہر اس پر اثرانداز ہونے لگا تھا۔ میں نے اسے گھوڑے سے گرانے میں دیر نہیں کی۔ اسی وقت نضار نے تیزی کے ساتھ خنجر نکالا اور پلٹ کر دراز قد شخص کے نائب کا سینہ چھید دیا۔ اس نے سینے کے بائیں حصے ہی کو نشانہ

بنایا تھا۔ پھر نصار نے بھی اپنے شکار کو گھوڑے سے نیچے دھکا دے دیا تھا۔

زعیم کے ان دونوں خدمتگاروں کو اتنی تیزی کے ساتھ اور غیر متوقع طور پر قتل کیا گیا تھا کہ دوسرے مسلح خدمتگار غالباً بوکھلا گئے تھے۔ وہ سب میرا یا نصار کا تعاقب کرنے کے بجائے اپنے مقتول ساتھیوں کی لاشوں کے قریب رک گئے تھے پھر ان میں سے کسی کو ہمارا خیال آگیا تھا اور وہ چیخ اٹھا تھا۔

"وہ دونوں فرار ہو رہے ہیں۔"

اس وقت تک میں اور نصار اپنے اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے خاصے آگے نکل آئے تھے پھر میں نے خاصے فاصلے پر چند گھڑسواروں کو اپنے تعاقب میں آتے دیکھا۔ آدھے سے زیادہ گھڑسوار اپنے ساتھیوں کی لاشوں کے پاس ہی رک گئے تھے۔

ہمارے اور ان تعاقب کرنے والوں کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ اگر وہ ہم پر گولیاں چلاتے تو شاید ہم ان گولیوں کی زد میں آجاتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا انہیں غالباً یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہمیں زندہ گرفتار کر کے لائیں اور کسی طرح کی کوئی تکلیف نہ بھی پہنچائیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ہمیں باندھ کر بھی لے جا سکتے تھے۔ زعیم نے اگر انہیں واقعی ایسے ہی احکام دیئے تھے تو ہماری زندگی کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہم محفوظ تھے۔

ہم دونوں گھوڑوں کی پشت سے تقریباً چپکے ہوئے تھے اور ایسا تیز رفتاری کے سبب تھا۔ ہماری اس تیز رفتار کی وجہ سے تعاقب کرنے والوں اور ہمارے درمیان لحہ بہ لحہ فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے وہاں دور دور تک چھوٹی بڑی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ علاقہ ایسا تھا کہ ہم اپنے تعاقب میں آنے والوں کو آسانی سے دھوکا دے سکتے تھے۔ میں نے بلند آواز میں اپنے اس خیال کا اظہار نصار سے کیا۔ اس نے میری تائید کی اور پھر اسی کے ساتھ ہم نے بڑی تیزی سے راستہ بدل دیا اور ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے چلے گئے تھے۔

کافی دیر تک ہم دم سادھے وہاں چھپے رہے تو دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے قریب آنے کی آوازیں سنائی دیں پھر وہ آوازیں بالکل قریب آ کر دور ہوتی چلی گئیں۔ تعاقب کرنے والے' چٹان کی دوسری طرف سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے آگے چلے گئے تھے۔ جب وہ آوازیں بالکل معدوم ہو گئیں تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ زعیم کے خدمتگاروں کے چنگل سے نکلنے کے لئے خود بخود حالات ہمارے حق میں استوار ہوتے گئے تھے۔ خود ہم نے پہلے سے اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔

چٹان کی آڑ سے کچھ دیر کے بعد ہم نکلے اور اردگرد کا جائزہ لیا ایک جانب خاصے فاصلے پر مجھے پہاڑ قریب قریب نظر آئے۔

"وہ دیکھ اے نصار!" میں نے نصار کو اس طرف متوجہ کیا۔ "کہیں یہی پہاڑ تو ہماری منزل نہیں ہیں؟"

"ہاں اے آتون!" نصار جواب میں بولا۔ "محل وقوع سے تو یہ وہی پہاڑ لگتے ہیں جن میں سے ایک کی ہمیں تلاش ہے اور جہاں ساحر زعیم کا ٹھکانا ہے۔"

"وہاں تک پہنچنے کے لئے ہمیں پہاڑوں کے دامن میں آباد کسی نہ کسی بستی سے ضرور گزرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "ایسی صورت میں اے نصار! ہم ایک بار پھر کسی خطرے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"خطرات تو اے آتون! اب ہمارے لئے قدم قدم پر ہیں' ان سے ہم نہیں بچ سکتے اس لئے ان کا خوف ہمیں اپنے دل سے نکال دینا چاہئے۔ تُو کیا سوچ بھی سکتی تھی کہ قلاوز کی قید سے یوں نجات مل جائے گی اور پھر یوں ہم آزاد فضا میں سانس لے رہے ہوں گے۔"

میں ابھی نصار کی بات کا کوئی جواب دینے ہی والی تھی کہ میرے منہ سے خوفزدہ سی چیخ نکل گئی۔ میری آنکھوں نے ایسا ہی دہشت ناک منظر دیکھا تھا۔ پہاڑوں کی جانب سے اچانک ایک عجیب و غریب اور ڈراؤنی مخلوق نمودار ہوئی تھی۔ وہ مخلوق فضا میں پرواز کرتی ہوئی انتہائی تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس کی جسامت انسانی جسم سے زیادہ تھی۔ پشت پر کسی تتلی کی طرح بڑے بڑے پَر تھے۔ اس کا چہرہ بے حد خوفناک اور مکڑی جیسا تھا۔ چار ہاتھ تھے جن میں تین تین لمبی انگلیاں تھیں' ہتھیلی نہ ہونے کے برابر تھی' پیروں کی جگہ تین انگلیاں کسی تنے سے پھوٹی ہوئی شاخوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے دائیں دونوں ہاتھوں میں سے اوپر والے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک ڈنڈا تھا۔ ڈنڈے کے سرے کے پاس تین نوکیں ابھر ہوئی تھیں اس کے سر پر دو بڑے بڑے پَر سینگوں کی طرح اُگے ہوئے تھے۔ دونوں بڑی بڑی آنکھوں میں تیز روشنی تھی اور بدہیئت تھوتھنی آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ سینے اور پیٹ کی کھال پر جگہ جگہ موٹی سلوٹیں پڑی تھیں اور پیروں پر آہنی تاروں جیسے بال تھے۔ وہ بلا چند ہی لمحوں میں اتنے قریب آ چکی تھی کہ تفصیل سے اس کا جائزہ لے سکتی تھی۔ اچانک اسی عجیب مخلوق کے قریب ویسی ہی تین بلائیں اور دکھائی دیں جو شاید پہلے اس کے پیچھے تھیں اور اب دائیں جانب نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں نیزے اور ایک کے ہاتھ میں کلہاڑا تھا۔

"بھاگ چل اے نصار!" اچانک جیسے مجھے ہوش آگیا اور میں چیخ اٹھی۔ اسی کے ساتھ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

نصار نے میری تقلید کی۔ ابھی ہم گھوڑے دوڑاتے کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ آگے آگے پرواز کرنے والی بلا مجھ پر جھپٹی۔ وہ سامنے سے میری طرف آئی تھی۔ اس نے بڑی بڑی تین انگلیوں والا ہاتھ آگے بڑھا کر اچانک میرا دایاں بازو پکڑا اور گھوڑے کی پشت سے مجھے کسی پھول کی طرح اٹھا لیا۔ جس گھوڑے پر میں بیٹھی ہوئی تھی وہ اپنے زور میں آگے بھاگتا چلا گیا پھر اس بلا نے مجھے فضا میں اچھال دیا۔ میں سر کے بل زمین کی طرف گرنے لگی۔ نصار کو میں نے ادھر جھپٹتے دیکھا۔ وہ شاید مجھے زمین پر گرنے سے پہلے ہی فضا ہی میں لپک لینا چاہتا تھا۔ سر کے بل پتھریلی زمین پر گرنے کا مطلب یقینی موت ہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کے میں زمین پر گر جاتی اس عجیب مخلوق نے فضا میں غوطہ لگایا اور میرا دایاں پیر پکڑ لیا۔ میرے جسم کو جھٹکا سا لگا اور وہ مخلوق مجھے اسی طرح لٹکائے ہوئے ایک جانب پرواز کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ فضا میں بلند ہوتی جا رہی تھی۔

نضار کو گھوڑا دوڑاتے ہوئے میں نے ایک چٹان پر چڑھتے دیکھا مگر اس کٹاؤ دار بھربھری سی چٹان پر گھوڑے کے لئے چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ نضار گھوڑے کی پشت سے کود کر تیزی کے ساتھ چٹان پر چڑھنے لگا۔ ادھر نضار اس چٹان کی کئی چھوٹی اور اونچی نیچی بالائی سطح پر پہنچا ادھر وہ بلا مجھے لٹکائے ہوئے چٹان کے اوپر سے گزری۔ نضار نے مجھے اس بلا سے نجات دلانے کے لئے انتہائی تیزی کا ثبوت دیا تھا۔ میں نے نضار کو دو دھاری تلوار نکالتے دیکھا پھر وہ چٹان کے ایک نوکیلے اور ترچھے پتھر پر چڑھ گیا۔ اسی کے ساتھ اس نے اچھل کر اپنے بائیں ہاتھ سے اس کا بلا کا دایاں پیر گھٹنے کے پاس سے پکڑ لیا۔ اسی وقت میں نے بھربھری چٹان کے اس نوکیلے حصے سے پتھروں کو ٹوٹ کر بکھرتے دیکھا۔ نضار کا دایاں پاؤں ٹوٹتے ہوئے پتھروں پر تھا اور بایاں پاؤں فضا میں معلق تھا۔ بائیں ہاتھ سے وہ اس بلا کا ایک پیر پکڑے ہوئے تھا اور دایاں ہاتھ جس میں دو دھاری تلوار تھی' اس بلا پر حملہ کرنے کے لئے اٹھا ہوا تھا۔ عین اس لمحے میں نے نضار کی طرف بقیہ تین بلاؤں کو لپکتے دیکھا اور پھر میرا رخ بدل گیا۔ اب میری پشت نضار کی طرف ہو گئی تھی۔ میں اب اسے دیکھنے سے قاصر تھی۔

چند ہی لمحے بعد میری سماعت سے نضار کی چیخ ٹکرائی حالانکہ میں خود بھی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کے باوجود یہ سوچ کر کہ جانے نضار پر کیا گزری ہو' میرا دل بیٹھ گیا۔ اسی لمحے اچانک اس بلا نے فضا میں تیزی سے چکر کھانا شروع کر دیا۔ اس بلا کے ساتھ میں بھی فضا میں گردش کر رہی تھی۔ میرا سر گھومنے لگا اور پھر میں زیادہ دیر اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکی۔ میرے ذہن پر اندھیرے کی دبیز چادر پھیلتی چلی گئی۔

معلوم نہیں کب تک بے ہوش رہنے کے بعد مجھے ہوش آیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ کوئی غار معلوم ہو رہا تھا جہاں میں تنہا نہیں تھی۔ میرے سامنے مضحکہ خیز صورت والا ایک پستہ قد شخص کھڑا تھا جس کی ٹھوڑی سے گلہری کی دم جیسی داڑھی لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں رخسار پھولے ہوئے تھے اور تنگ ماتھے کے نیچے آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی سی تھیں' ہونٹ پتلے اور جسم گول مٹول سا تھا۔

"اے آتون! تجھے تیرا زعیم خوش آمدید کہتا ہے۔" پستہ قد شخص کے ہونٹ ہلے اور میں نے اس کی منمناتی ہوئی سی آواز سنی۔ یہ آواز میں پہلے بھی سن چکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ تُو اس قدر خوبصورت ہو گی ورنہ میں ہرگز ژیان سے یہ وعدہ نہ کرتا کہ تجھے اس کے حوالے کر دوں گا۔" بوڑھے زعیم نے جو کہ ژیان کا نائب تھا' کہا۔ "یقیناً تیرے حسن کی تعریف میں بخل سے کام لیا تھا۔ یقین کر اے آتون! اے جانِ زعیم! تُو اس سے کہیں زیادہ حسین اور پُرکشش ہے کہ جتنا مجھے بتایا گیا تھا۔ اب تجھے دیکھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ژیان سے کئے ہوئے وعدے کو بھلا دوں اور تجھے ہمیشہ کے لئے اپنے پاس ہی رکھ لوں۔ بول' کیا تُو اس پر خوش نہیں کہ عظیم ساحر زعیم کی محبوبہ کہلائے؟"

"تجھ پر دیوتاؤں کی لعنت ہو اے زعیم!" میں نفرت و حقارت سے بولی۔ "میں تیرے اوپر تھوکنا بھی پسند نہیں کروں گی۔"

"تجھے شاید خبر نہیں اے آتون کہ زعیم کے رو بہ رو آج تک کسی لڑکی کو یوں بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔" اس کا لہجہ بدل گیا۔ "تُو میری نرمی اور محبت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا ورنہ ہو گا وہی جو میں چاہوں گا مگر تو سامانِ عبرت بنا دی جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تُو خود اپنی مرضی سے خود کو میرے حوالے کر دے اور میری ہی بن کر رہنے میں فخر محسوس کر' اسی میں تیری بھلائی ہے۔"

معاً مجھے نضار کا خیال آیا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اس بوڑھے ساحر کو یقیناً نضار کے بارے میں معلوم ہو گا۔

"میرا ساتھی کہاں ہے؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ زعیم سے سوال کیا۔

"تیرا ساتھی۔" وہ زور سے ہنس پڑا۔ "تُو اس کا حشر دیکھنا چاہتی ہے؟"

"ہاں' مجھے بتا اے زعیم کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟" میں بے تابی سے بولی' پھر سخت لہجے میں اس سے کہا۔ "سن اے زعیم! اگر اسے کچھ ہو گیا تو .... تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

"تیرے ساتھی کے لئے میں نے اپنے خدمتگاروں کو حکم دیا تھا کہ اسے بھوکے آدم خور چوہوں کے غار میں پھینک آئیں۔" اس نے جواب دیا۔

"نہیں۔" میں پوری قوت سے چیخ اٹھی۔ "تُو ایسا نہیں کر سکتا۔"

"میں اپنا حکم واپس بھی لے سکتا ہوں' مگر صرف ایک صورت میں کہ تُو میری بات مان لے۔ کیونکہ ابھی وقت ہے۔ میرے خدمتگار ابھی چوہوں والے غار تک نہیں پہنچے ہوں گے۔ وہ غار برابر والے پہاڑ میں ہے۔ خدمتگاروں کو اب بھی روکا جا سکتا ہے۔ جلد فیصلہ کر اے آتون! ورنہ کچھ ہی دیر کے بعد تیرا ساتھی آدم خور بھوکے چوہوں کی خوراک بن جائے گا۔" زعیم کا لہجہ خوفزدہ کر دینے والا تھا۔ اس کے لہجے سے میرے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ نضار کے بارے میں اس نے مجھے جو کچھ بتایا ہے' وہ غلط نہیں ہے۔

میں سوچ میں پڑ گئی۔ مجھے کیا کرنا چاہئے' میں اس کی قید میں ہوں اور وہ زبردستی بھی مجھے اپنا ہر حکم ماننے پر مجبور کر سکتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں اور نضار' عظیم مہین کے ایما پر یہاں آئے ہیں۔ عظیم مہین نے ہمیں پہلے بوڑھے ساحر زعیم پر غالب آنے کی خوشخبری سنا دی تھی۔ ایسی صورت میں اگر میں مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر اس کی بات ماننے کا اقرار بھی کر لوں تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ فی الحال نضار کی زندگی بچانا بہت ضروری تھا' بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا۔ مجھے یہ فیصلہ کرنے میں صرف چند لمحے لگے۔

"اے زعیم! میرے ساتھی کو موت کے حوالے نہ کر کہ میں تیری بات ماننے پر آمادہ ہوں۔" میں بول اٹھی۔

"مجھے یقین تھا اے آتون کہ تُو یہی فیصلہ کرے گی۔" وہ آہستہ سے ہنس کر بولا۔ "میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ غار کے دہانے سے نکل گیا۔

میں اس غار میں پھر اکیلی رہ گئی۔ زعیم کے جاتے ہی میں جلدی سے اٹھی اور غار کے دہانے کی

طرف لپکی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اس غار سے باہر نکل سکتی ہوں یا نہیں۔ میں جیسے ہی غار کے دہانے سے نکلی چونک اٹھی۔ دہانے کے باہر بے حد گہری کھائی تھی۔ بہت نیچے نوکیلی چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ غار سے نکلتے ہوئے اگر میں چوکنا اور محتاط نہ ہوتی تو یقیناً اس گہری کھائی میں گر پڑتی اور پھر شاید زندہ نہ بچتی۔ نوکیلی چٹانوں سے ٹکرا کر میرا جسم پاش پاش ہو جاتا۔ مگر وہ زعیم .... وہ غار سے نکل کر کہاں گیا؟ میرے ذہن میں سوال جاگا۔ وہ اس کھائی میں کیوں نہیں گرا؟

اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب میرے پاس صرف یہی تھا کہ زعیم بہرحال ایک ساحر تھا۔ یہ اس کی دنیا تھی' اس کا طلسم کدہ تھا۔ یہاں وہ جو چاہتا کر سکتا تھا۔ یہی سوچتی ہوئی میں دوبارہ غار میں واپس آ گئی۔ اس غار سے فرار ہونا' ممکن نہیں تھا۔

زعیم کو واپس آنے میں خلاف توقع کچھ دیر لگی۔ وہ غار کے دہانے ہی سے اندر آیا تھا اور اب مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی۔ حیرت مجھے ایک اور بات پر ہوئی تھی۔ زعیم کے ساتھ نضار بھی تھا اور اس کے دو خدمتگار بھی۔ خدمتگاروں میں سے ایک کے ہاتھوں میں بڑا سا طباق تھا اور دوسرے کے پاس دوسرا سامان۔

"میں تیرے ساتھی کو اس لئے یہاں لے کر آیا ہوں اے آتون کہ تجھے اس کے زندہ ہونے کا یقین آ جائے۔" زعیم نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے نضار کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ عالم خواب میں ہو۔ یقیناً اس وقت وہ ساحر زعیم کے سحر میں تھا' بالکل گم صم خاموش اور بے حرکت۔ زعیم نے اسے جہاں کھڑا کر دیا تھا' وہ اسی جگہ نظر جھکائے کسی مجسمے کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ زعیم کے خدمتگاروں نے وہیں غار میں ہمارے لئے بستر بچھا دیئے پھر بڑا سا طباق' ایک برتن اور دو کٹورے بستر پر رکھ دیئے۔ طباق ایک کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ خدمتگار اپنے کام سے فارغ ہو کر زعیم کے اشارے پر غار سے باہر چلے گئے تو زعیم کے نے نضار کو مخاطب کیا۔ "اے نوجوان! بستر پر جا کے بیٹھ جا۔" زعیم کا حکم سنتے ہی نضار کے جسم نے حرکت کی اور پھر وہ جیسے نیند میں چلتا ہوا ایک بستر پر بیٹھ گیا۔

"اے آتون!" زعیم نے مجھے مخاطب کیا۔ "جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے تو اپنے ساتھی سے محبت کرتی ہے مگر سن کہ اب تیری ساری محبت صرف اور صرف میرے لئے ہے۔ اپنے زعیم کے لئے۔ میں اس نوجوان کو اسی لئے تیرے ساتھ اس غار میں چھوڑے جا رہا ہوں کہ تیرا امتحان لے سکوں اور دیکھ سکوں' تو میری امانت میں خیانت تو نہیں کرتی۔ اس کا نام شاید مرطاق ہے کہ اس نے یہی نام قلاوز کی بستی میں بتایا تھا۔"

"ہاں اے زعیم!" میں نے جلدی سے تصدیق کر دی۔ وہ بہرحال دشمن کا علاقہ تھا۔ وہاں نضار کی حقیقت ظاہر ہونا اس کے لئے انتہائی خطرناک تھا۔ "تو اور تیرا ساتھی دونوں ہی بھوکے اور تھکے ہوئے لگتے ہیں' سو اے آتون! پیٹ بھر اور کچھ دیر آرام کر لے پھر میں تجھے اپنی خلوت میں طلب کر لوں گا۔" یہ کہتے ہی زعیم جانے کے لئے غار کے دہانے کی طرف مڑ گیا۔

"سن اے زعیم! میرے ساتھی کی تو نے یہ کیا حالت بنا دی ہے؟ یہ مجھے ہوش میں نہیں لگتا۔" میں نے جاتے ہوئے زعیم کو مخاطب کیا۔

زعیم نے مڑ کر میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ "یہ میرے سحر کے زیر اثر ہے اے آتون! جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو یہ سحر سے آزاد ہو جائے گا۔"

پھر زعیم غار کے دہانے سے باہر چلا گیا۔ میں نے نضار کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے ایک دم اچھل پڑا تھا۔ چند لمحے وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اس کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ "اے آتون! ہم .... ہم یہ کہاں ہیں؟ تجھے .... تجھے تو ایک بلا آسمانوں کی طرف اڑائے لئے جا رہی تھی اور .... اور میں نے ایک چٹان پر چڑھ کر اس کا پیر پکڑ لیا تھا پھر .... پھر کیا ہوا تھا؟" نضار کے چوڑے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ہاں .... ہاں مجھے یاد آ گیا۔ میں اس لئے چیخ اٹھا تھا کہ مجھ پر حملہ آور ہونے والی بلاؤں میں سے ایک نے سر پر کسی بھاری چیز سے ضرب لگائی تھی اور .... اور اسی کے ساتھ میرے ہاتھ سے تلوار چھین کر نیام میں رکھ دی تھی۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں کیا ہوا؟ میں بے ہوش ہو گیا تھا اور .... اور اب .... اب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو اس غار میں تیرے ساتھ دیکھا۔" نضار نے رک رک کر بتایا۔

"مگر میں تیرے حواس واپس آنے سے پہلے بہت کچھ دیکھ چکی ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو نے کیا دیکھا اے آتون! اور .... اور تجھ پر کیا گزری؟" نضار نے بے چینی سے پوچھا۔

"یہ باتیں ہم کھانا کھاتے ہوئے بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" میں آگے بڑھ کر طباق کے قریب بیٹھ گئی۔

"ہاں بھوکا تو میں بھی ہوں۔" یہ کہہ کر نضار بھی قریب آ گیا۔

گزشتہ روز سے ہم نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانا لذیذ تھا اور بھوک بھی زور کی لگی تھی۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے میں نے نضار کو بتا دیا کہ ہم زعیم کی قید میں ہیں اور یہ کہ زعیم سے میری ملاقات ہو چکی ہے وہ ابھی اپنے خدمتگاروں کو لے کر یہاں سے گیا ہے۔ دانستہ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ زعیم مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی میں چھپا گئی تھی کہ اس کی زندگی بچانے کے لئے میں نے زعیم کی بات مان لی تھی۔ نضار کو میں نے بتایا تھا کہ اسی کی طرح مجھے بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ جب ہوش آیا تو میں نے اپنے علاوہ نضار کو بھی اسی غار میں دیکھا تھا جو زعیم کے سحر میں گرفتار تھا۔ زعیم غار سے چلا گیا تھا تو یہ سحر ٹوٹا تھا۔ میں اسے جان بوجھ کر مرطاق کے نام سے مخاطب کر رہی تھی۔

"پھر .... پھر تو وہ .... وہ بوڑھا ساحر تجھے ژیان کے حوالے کر دے گا۔" نضار کے لہجے سے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا۔ میری تمام باتیں اس نے پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ سنی تھیں۔ اسی

کے بعد اس نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تھا۔

"نہیں اے مرطاق!" میں نے اسے تسلی دی۔ "وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔"

"مگر .... مگر اے آتون! اسے .... اسے بھلا ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ .... وہ اسی لئے تو تجھے اغوا کرنا چاہتا تھا۔" نضار بولا۔

"کیا تُو بھول گیا اے مرطاق کہ آخرکار نیکی کو بدی پر غالب آنا ہے؟" میں نے اصل وجہ پر یہ کہ کر پردہ ڈال دیا۔ میں نضار کو حقیقت سے آگاہ کر کے مزید فکرمند نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرا اشارہ عظیم مہین کی پیشگوئی کی طرف تھا۔

"ہاں .... ہاں اے آتون!" نضار بڑبڑایا۔ "میں .... میں یہ بات بھول گیا تھا۔ وہ شاید ایسا نہیں کر سکے گا۔"

"شاید نہیں بلکہ یقیناً اے مرطاق! وہ بوڑھا ساحر مجھے ژیان کے حوالے نہیں کرے گا۔" میں پُر یقین لہجے میں بولی۔

"تُو ٹھیک کہتی ہے' آخری فتح نیکی ہی کو ہو گی۔" اس مرتبہ نضار کے لہجے میں بھی یقین کی جھلک تھی۔ اب وہ قدرے پُرسکون ہوتا جا رہا تھا۔

کھانا کھائے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اپنے ذہن پر غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ نضار کو بھی میں نے اونگھتے دیکھا۔

"کیا تجھے نیند آ رہی ہے .... اے مرطاق!" میں نے اپنے ذہن پر چھانے والی غنودگی سے لڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اے .... اے آتون! مجھے .... بہت .... زور کی نیند .... نیند آ رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بھرپور انگڑائی لی اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔

میری آنکھیں بھی جیسے خود بہ خود بند ہوئی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر میں نے کوشش کی کہ جاگتی رہوں اور پھر ایک طرف لڑھک گئی۔

دوبارہ جاگنے پر خود کو میں نے ایک نئی جگہ دیکھا۔ یہ وہ غار نہیں تھا جہاں میں سوئی تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی تیز روشنی سے میری پلکیں جھپک گئی تھیں۔ سامنے ہی دیوار میں ایک مشعل پیوست تھی جس کی روشنی براہ راست میری آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ میں ایک نرم و گداز بستر پر دراز تھی۔ پتھروں کو کاٹ کر بنایا ہوا وہ ایک چوکور سا دالان تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر اس جگہ کا جائزہ لیا وہاں مجھے ایک عجیب سی نامانوس خوشبو کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ بائیں جانب ایک سرنگ سی نظر آ رہی تھی۔ دالان میں جلنے والی مشعل کی روشنی کچھ دور تک سرنگ کو روشن کر رہی تھی' اس کے بعد نیم تاریکی اور پھر مکمل تاریکی تھی۔ میں زمین سے قدرے بلندی پر ایک چبوترے کے اوپر لیٹی ہوئی تھی۔ اسی پتھریلے چبوترے پر نرم و گداز بستر بچھا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور اسی وقت کسی کے قدموں کی چاپ سرنگ کی طرف سے آئی۔ میرے

اعصاب تن گئے۔ قدموں کی چاپ قریب آتی گئی۔ ذرا ہی دیر کے بعد سرنگ سے میں نے ساحر زعیم کو اس دالان میں داخل ہوتے دیکھا۔

"ساحر زعیم ساحرہ آتون کو اپنی خلوت گاہ میں خوش آمدید کہتا ہے۔" زعیم مسکراتا ہوا چبوترے کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ "تُو اٹھ کر کیوں بیٹھ گئی اے میری ساحرہ! لیٹی ہی رہ کہ تُو لیٹے ہوئے اور بھی حسین دکھائی دیتی ہے۔"

زعیم کے ارادے مجھے خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے مضحکہ خیز چہرے پر شیطانیت جھلک رہی تھی۔ معاً میں نے اپنے گرداگرد چمکیلا دودھیا حصار قائم ہوتے دیکھا۔ زعیم آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم ٹھٹک گیا۔ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور میری طرف پھونک ماری۔ دوسرے ہی لمحے وہ چمکیلا دودھیا حصار غائب ہو گیا۔ وہ حصار میرے لئے نیا نہیں تھا اور نہ اس کا یوں نادیدہ ہو جانا میرے لئے کوئی نئی بات تھی۔ وہ حصار پہلے بھی میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب ساحر زعیم نے پہلی بار مجھ پر پُراسرار حملہ کیا تھا مگر اس وقت حصار کے نادیدہ ہو جانے سے میں کچھ گھبرا گئی۔ دراصل ساحر زعیم نے منہ ہی منہ میں جو کچھ پڑھا تھا یہ اس کا ردعمل بھی ہو سکتا تھا۔ اسی خیال سے میں فکرمند ہو گئی۔

"دیکھا تُو نے اے آتون!" ساحر زعیم زور سے ہنس کر کہنے لگا۔ "میں نے تیرا حفاظتی حصار غائب کر دیا۔ مجھے بوڑھے واہب نے یہ بھی بتایا تھا کہ تو کچھ پُراسرار قوتوں کی مالک بھی ہے مگر اے جانِ زعیم! تیرے سامنے اس وقت کوئی معمولی آدمی نہیں کھڑا ہوا بلکہ اس زمانے کا سب سے بڑا ساحر کھڑا ہے۔ تیری کوئی بھی پُراسرار قوت میرے سامنے کارگر نہیں ہو گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ نپے تلے قدموں سے پھر آگے بڑھنے لگا۔

"اپنی موت کو دعوت نہ دے اے زعیم! رک جا۔" میں ہاتھ اٹھا کر زور سے بولی۔

"کیوں' کیا تُو مجھے اپنے وعدے کے مطابق قریب آنے کا موقع نہیں دے گی اے آتو.........."

اس کا جملہ پورا نہ ہو سکا۔ وہ چبوترے کے بالکل قریب آ چکا تھا زعیم کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اس کے جسم کو شاید زبردست جھٹکا سا لگا تھا۔ میں نے اسے اچھل کر پیچھے گرتے دیکھا تھا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

میں سمجھ گئی کہ ساحر زعیم میرے گرد کھنچے ہوئے حصار کو عبور نہیں کر سکا اور اس سے ٹکرا کر پیچھے جا پڑا ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ حصار نادیدہ ہو جانے کے باوجود اب تک قائم تھا۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ ساحر زعیم سے نبرد آزما ہونے کے لئے یقیناً عظیم مہین میری مدد کر رہا تھا۔

"تُو نے دیکھ لیا اے بوڑھے بوالہوس ساحر کہ میرے قریب آ کر تیرا کیا حشر ہوا۔ کیا اب بھی تُو اپنے ناپاک ارادوں سے باز نہیں آئے گا۔" میں نے ساحر زعیم کو مخاطب کیا جو زمین سے اٹھ رہا تھا۔

"اتنی سی بات پر غرور نہ کر اے ساحرہ!" زعیم اٹھتا ہوا بولا۔ "تُو مجھے ان معمولی چٹکلوں سے متاثر نہیں کر سکتی۔ میں تجھے ابھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہی زعیم نے باآواز بلند کسی اجنبی زبان

میں کچھ کہا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے دور کہیں سے کسی درندے کی سی غراہٹ سنائی دی اور پھر یوں لگا جیسے وہ درندہ تیزی سے دوڑتا ہوا قریب آتا جا رہا ہو۔ میں اس کے پیروں کی بھاری دھمک سن رہی تھی۔ دھمک سرنگ کی طرف سے سنائی دے رہی تھی۔

"کیوں' ابھی سے خوفزدہ ہو گئی اے آتون!" ساحر زعیم زور سے ہنسا۔ اس نے شاید میرے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ لئے تھے۔

"نہیں' میں خوفزدہ نہیں ہوں۔" بڑبڑاتے ہوئے میں نے خود کو تسلی دی۔ "یہ بوڑھا ساحر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ سرنگ سے ایک بھیانک مخلوق برآمد ہوئی۔ اس کا آدھا جسم ایک طاقتور بیل کا اور آدھا جسم کسی انتہائی تندرست انسان کا لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی گردن سے انسانی جسم کو جوڑ دیا گیا ہو۔ اس کی دم اٹھی ہوئی تھی اور وہ اپنے چاروں کھروں کو مجھ پر حملہ کرنے کے سے انداز میں پتھریلے فرش پر رگڑ رہا تھا۔ چار پیروں کے علاوہ اس کے انسانی جسم کے سر پر دو نوکیلے سینگ بھی تھے اور انسانوں ہی کی طرح مضبوط ہاتھ بھی تھے۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کے رک گیا تھا اور اپنی بڑی بڑی دہکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

"بول اے آتون! کیا میں اس خوفناک مخلوق کو تیرے اوپر حملہ کرنے کا حکم دے دوں؟ یا تُو میری بات ماننے پر آمادہ ہے؟" زعیم مجھ سے بولا۔

میں نے ساحر زعیم کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا پھر میرے اندر جانے کہاں سے اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ میں نے اس بھیانک مخلوق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس وقت کوئی جیسے مجھ سے کہہ رہا تھا' اے معلبہ! تُو اس مخلوق کو جلا کر خاک کر سکتی ہے۔ دیوتاؤں نے تجھے اتنی قوت دی ہے اے معلبہ! مجھے یہ آواز اپنے اندر ہی سے آتی محسوس ہو رہی تھی اور یہ آواز کسی دوسرے کی نہیں' خود میری اپنی آواز تھی۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنے سارے جسم میں بجلیاں سی دوڑتی محسوس کیں اور پھر ان کا مرکز میری دونوں آنکھیں بن گئیں۔ دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں سے تیز روشنی نکلی اور اس خوفناک مخلوق پر مرتکز ہو گئی۔ اچانک یوں لگا جیسے اس مخلوق کا جسم ایک دم بھڑک اٹھا ہو۔ اس کے جسم میں آگ لگ گئی تھی اور وہ بری طرح چیخنے لگا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ خوفناک مخلوق واقعی جل کر خاک ہو گئی۔ عین اسی لمحے ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس پتھریلے چوکور سے دالان میں ہر طرف دھواں ہی دھواں بھر گیا اور پھر میں نے اس دھوئیں میں ساحر زعیم کو غائب ہوتے دیکھا۔ بوڑھے ساحر کے چہرے پر مجھے سراسیمگی کے سے آثار نظر آئے تھے۔ میں نے اس دھوئیں میں اپنا دم گھٹتا محسوس کیا اور پھر میرے ہوش و حواس برقرار نہ رہ سکے۔

ہوش آنے پر میں نے خود کو اندھیرے میں محسوس کیا پھر یہ اندھیرے مجھ پر روشن ہو گئے۔ میرے اندر اندھیرے میں دیکھنے کی قوت بیدار ہو گئی تھی۔ میری نگاہ جس طرف اٹھتی' اندھیرے ادھر سے سمٹ

جاتے۔ میں پھر اسی غار میں آ گئی تھی جہاں نضار تھا۔ وہ ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ اسے یقیناً کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ کیا گزر چکی ہے۔ میرے لئے اب اسے حالات سے مزید بے خبر رکھنا مناسب نہیں تھا۔ یہی سوچ کر میں آگے بڑھی اور حصار کا خیال آ گیا تھا۔ کیا خبر وہ حصار میری اطراف اب بھی قائم ہو۔ وہ نادیدہ حصار' نضار کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ساحر زعیم نے میرے اندازے کے مطابق وقتی طور پر پسپائی اختیار کر لی تھی اور غائب ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں یہی وقت اس پر ضرب لگانے کا تھا۔ میں نے اسی خیال سے نضار کو جگانے کے لئے اسے آواز دینا شروع کر دی۔

نضار پر شاید بہت گہری نیند مسلط تھی۔ وہ خاصی دیر کے بعد جاگا اور نیند میں ڈوبی ہوئی اس کی آواز ابھری۔ "کیا.......... کیا بات ہے اے آتون!.......... تُو مجھے کس لئے آوازیں دے رہی ہے؟"

"جاگ جا.......... اٹھ کر بیٹھ جا اے مرطاق!" میں نے دانستہ اس وقت بھی نضار کا نام لینے سے گریز کیا۔

"رات.......... کیا رات ہو گئی اے آتون!.......... ہر طرف اندھیرا کیوں ہے؟" نضار کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔ وہ ابھی تک اٹھ کر نہیں بیٹھا تھا۔

"ہاں اے مرطاق! رات ہو چکی ہے اور ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا ہے' مگر تُو.......... تو اس اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہے' بالکل اسی طرح جیسے میں سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔" میں نے یہ کہہ کر گویا نضار کے اندر چھپی ہوئی پُراسرار قوتوں کو بیدار ہونے کی ترغیب دی۔

"اے آتون! مم.......... میں.......... ہاں میں اس اندھیرے میں دیکھ سکتا ہوں.......... مجھے.......... مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے نضار جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری توقع کے مطابق نضار کے اندر پوشیدہ پُراسرار قوتیں جاگ اٹھی تھیں۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ پہلے بھی کئی بار نضار پر اندھیرے روشن ہو چکے تھے۔

"لگتا ہے کہ اب تُو پوری طرح بیدار ہو چکا ہے۔" میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"ہاں اے آتون! اب میرے ذہن پر نیند کا بوجھ نہیں ہے۔" نضار نے جواب دیا۔ "بول کہ تُو نے مجھے کیوں سوتے سے جگایا ہے؟"

"کیا تُو بھول گیا کہ ہم یہاں کس لئے آئے ہیں؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"نہیں اے آتون! میں کچھ بھی نہیں بھولا۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔" اس نے کہا۔

"تو پھر ہمیں اس غار سے باہر نکلنا چاہئے۔ یہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہو گا۔"

"راستہ تو وہ سامنے ہی نظر آ رہا ہے اے آتون!" نضار نے غار کے دہانے کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں اے مرطاق! پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں نے اسی راستے سے بوڑھے ساحر زعیم اور اس کے خدمتگاروں کو آتے اور جاتے ہوئے دیکھا تھا' مگر.........." یہ کہہ کر میں نے نضار کو بتا دیا کہ جب ساحر زعیم چلا گیا تو مجھے غار کے باہر کیا نظر آیا۔

"گہری کھائی!" نضار حیرت زدہ سی آواز میں کہنے لگا۔ "مگر اے آتون! یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟

غار کے باہر اگر واقعی گہری کھائی ہے تو پھر وہ بوڑھا ساحر اور اس کے خدمتگار کس طرح ادھر سے آئے! پھر بقول تیرے اسی راستے سے واپس چلے گئے؟"

"مت بھول کہ اس کے لئے کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں' ہمیں اس بحث سے قطع نظر اس س نبرد آزما ہونا ہے اور سن کہ جب تُو سو رہا تھا' مجھ پر کیا گزری۔" یہ کہہ کر میں نے کچھ دیر پہلے پیش آ والے واقعے سے نضار کو آگاہ کر دیا۔ آخر میں اس سے میں نے کہا۔ "جب وہ دھوئیں میں غائب ہو رہا تو مجھے سراسیمہ سا لگ رہا تھا۔ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

"مگر تُو .... تُو اے آتون! کیا چاہتی ہے؟" نضار کے لہجے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"سوچ کہ جس طرح میری آنکھوں سے نکلنے والی تیز روشنی نے ایک خوفناک مخلوق کو جلا کر خا کر دیا تھا' کیا اسی طرح اس بوڑھے ساحر کو زندہ جلا دینا ممکن نہیں ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ وہ اسی خو سے چھپ گیا ہے۔ ہمیں اس غار سے نکل کر اسے تلاش کرنا چاہئے۔ شاید اس وقت میرے اندر مو پُراسرار قوتیں بیدار ہیں۔ یہ قوتیں کب دوبارہ میرے اندر سو جائیں' کیا خبر۔ میں اسی لئے تو اس مو سے فائدہ اٹھانے کو کہہ رہی ہوں۔" میں بولی۔

"لیکن تیرا ہی کہنا یہ بھی ہے کہ غار کے باہر کھائی ہے۔" نضار نے کہا۔ "پھر ہم کس طرح یہ سے نکل سکتے ہیں؟ اگر ہمارا اس غار سے نکلنا اتنا ہی آسان ہوتا اے آتون! تو وہ بوڑھا ساحر ہمیں یہ یہاں آزاد نہ چھوڑ دیتا۔"

نضار کی دلیل میں وزن تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اس غار سے نکلنے کی کوشش کرتی۔

"آ چل' ہم دونوں پھر غار کے دہانے سے باہر نکل کر دیکھتے ہیں۔ میں نے صرف سامنے کھائی دیکھ تھی' دائیں اور بائیں اطراف کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ کیا خبر وہاں سے کسی طرف جانا ممکن ہو۔" میں ا کھڑی ہوئی۔

نضار بھی میری تقلید میں کھڑا ہو گیا اور پھر میرے ساتھ ساتھ غار کے دہانے کی طرف بڑھا۔ کے دہانے سے باہر آتے ہی میں اچھل پڑی۔ اب وہاں مجھے کوئی کھائی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے یہ امر حیرت انگیز ہی تھا۔

"وہ .... وہ شاید میرا فریبِ نظر ہو گا۔" میں بڑبڑائی۔ "کسی ساحر کے لئے کسی کو فریبِ نظر مبتلا کر دینا دشوار نہیں ہوتا۔"

نضار میرے قریب ہی تھا اور اس نے بھی غالباً میری بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ اس نے میرے خیا تائید کی۔ "ہاں یہی ہو سکتا ہے اے آتون!"

"اور اس وقت ہم یا تو اس لئے فریبِ نظر کا شکار نہیں ہوئے کہ ہماری پُراسرار قوتیں بیدار اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم اندھیرے میں دیکھنے کے اہل بھی ہیں۔ بوڑھا ساحر یقیناً مطمئن ہو گا کہ ہم کے باہر کھائی دیکھ کر یہاں سے نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ آ' آگے چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

پھر میں نضار کو ساتھ لئے بائیں جانب مڑی اور آگے بڑھتی چلی گئی۔ میں نے نضار کو اپنے گرد کھنچے ہوئے نادیدہ حصار کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا تھا اور اس سے کہہ دیا تھا کہ مجھ سے دور ہی دور رہے' مگر نادانستگی میں وہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میرے قریب آ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس نادیدہ حصار سے نضار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ میں دانستہ اس کے کچھ اور قریب ہو کر چلنے لگی کہ دیکھوں اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا پھر میں نے اس کا ہاتھ بھی ہمت کر کے پکڑ ہی لیا۔

نضار نے چونک کر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا اور خوفزدہ سی آواز میں بولا۔ "وہ .... وہ اے آتون! حصار .... تیرے گرد تو حصار قائم ہے؟"

"لیکن اس حصار سے تجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا۔" میں نے کہا۔ "شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خود تیرے وجود میں بھی پُراسرار قوتیں خوابیدہ ہیں۔"

نضار نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ میں' نضار کو لئے اونچے نیچے ناہموار راستے پر قدم آگے بڑھاتی رہی۔ اچانک ایک جانب سے وحشیانہ قہقہے سنائی دیئے اور پھر کئی نسوانی خوفزدہ سی آوازیں ابھریں۔

"بس دو کو باہر گھسیٹ لا۔" ایک بھاری مردانہ آواز میں نے سنی۔

یہ آوازیں دائیں جانب کچھ فاصلے سے سنائی دی تھیں۔ میرے قدم جیسے خود بخود تیزی سے ادھر اٹھنے لگے۔ آگے چند قدم پر ایک موڑ تھا۔ اس موڑ تک پہنچ کر مجھے قدرے نشیب میں خاصے فاصلے پر روشنی نظر آئی۔ وہ کوئی غار ہی تھا جس کے دہانے سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ غار کے باہر مجھے ایک انسانی ہیولا سا دکھائی دیا۔ وہ تنہا تھا۔ میں نے غالباً اسی کی بھاری آواز سنی تھی۔ چند ہی لمحے بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس نے اپنے ساتھی سے پھر کچھ کہا تھا۔ اس کا ساتھی شاید اس غار میں تھا جس کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔

ذرا ہی دیر میں غار کے اندر سے ایک شخص باہر آیا۔ اس نے دو لڑکیوں کی کلائیاں تھام رکھی تھیں۔ لڑکیوں کے جسموں پر مختصر لباس تھے۔

"لے ایک کو تُو سنبھال۔" غار سے باہر آنے والا اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا اور ایک لڑکی کو آگے دھکا دے دیا۔

وہ لڑکی لڑکھڑائی مگر گرنے سے پہلے اسے غار کے باہر موجود شخص نے کلائی پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ لڑکی اس کے سینے سے آ لگی۔ وہ ایک ایسی سہمی ہوئی فاختہ کی طرح دکھائی دے رہی تھی جو کسی شکرے کی گرفت میں آ گئی ہو۔

"یہ دونوں ساحر زعیم کے عیاش خدمتگار ہی معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے نضار کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔

"ہاں۔" نضار نے اقرار میں سر ہلایا پھر دھیمی آواز میں قیاس آرائی کی۔ "اس غار میں شاید انہوں نے اغوا کی جانے والی لڑکیوں کو قید کر رکھا ہے۔"

"مگر یہاں سے یہ لڑکیاں فرار کیوں نہیں ہو جاتیں؟" میرے ذہن میں جو سوال پیدا ہوا' وہ زبا تک بھی آ گیا۔

"ظاہر ہے' اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی۔" نضار نے جواب دیا۔ "ممکن ہے بوڑ ساحر نے انہیں بھی فریب نظر میں مبتلا کر رکھا ہو۔ تیری ہی طرح انہیں بھی غار کے باہر گہری کھائی نظ آتی ہو یا کوئی خوفناک بلا دکھائی دیتی ہو۔"

وہ دونوں خدمتگار غیر مسلح تھے۔ ہم دونوں دبے قدموں ان کا تعاقب کرتے رہے۔ وہ ان دون لڑکیوں کو ایک غار میں لے کر داخل ہو گئے تھے۔

"لا' خنجر مجھے دے دے۔" میں نے نضار کو دو دھاری تلوار نیام سے نکالتے دیکھ کر کہا۔

"میں ان دونوں کے لئے کافی ہوں اے آتون!" نضار بولا اور اسی وقت غار کے اندر روشنی ہ گئی۔

میں نے خود آگے ہاتھ بڑھا کر نضار کی کمر سے بندھی ہوئی چمڑے کی پیٹی سے لمبا خنجر کھینچ لیا پو چند ہی لمحے بعد ہم دونوں بیک وقت اس غار میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک خدمتگار دہانے کے قریب ہی ہوس کا کھیل شروع کرنے والا تھا۔ میں اور نضار جیسے ہی غار میں داخل ہوئے وہ دونوں ہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ نضار اندرونی حصے کی طرف لپکا اور میں کچھ فاصلے پر موجود خدمتگار پر جھپٹی۔

اس سے پہلے کہ میں اس بوالہوس کے سینے میں خنجر اتارتی' اس کے منہ سے تیز سیٹی کی سی آواز بلند ہوئی۔ بالکل ایسی ہی آواز غار کے اندرونی حصے سے سنائی دی تھی۔ اس وقت میں اس تیز سیٹی جیسی آواز کا مطلب نہیں سمجھ سکی اور اپنے شکار کا سینہ چھید دیا۔ لڑکی اچھل کر ایک طرف ہو گئی تھی۔ سینے پر دوسرا وار کھا کر وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ گرا اور اس کے سینے سے خون ابل ابل کر آس پاس پھیلنے لگا۔ اسی دوران نضار غار کے اندرونی حصے والے خدمتگار کی گردن اڑا چکا تھا۔

ابھی ہم ان خوفزدہ لڑکیوں کو لے کر اس غار سے نکلے ہی تھے کہ چاروں طرف سے عجیب سا شور سنائی دینے لگا۔

"اے آتون! .... یہ آوازیں کیسی ہیں؟" میں نضار کی گھبرائی ہوئی سی آواز سنی۔

"مرنے سے پہلے شاید ان دونوں نے اپنے ساتھیوں کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔" میں بولی۔ اب میں اس تیز سیٹی کا راز سمجھ چکی تھی۔ نضار کو بھی میں نے اس سے آگاہ کر دیا۔ "پھر تو وہ ہمیں پکڑنے کی کوشش کریں گے۔" نضار نے خدشے کا اظہار کیا۔

"اب جو بھی ہو.........." میں نے کہا۔

کچھ ہی دیر میں وہ شور بالکل قریب آ گیا اور اسی کے ساتھ مجھے اپنے سارے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہونے لگی۔ یہ سنسناہٹ اب میرے لئے نئی نہیں رہی تھی۔ اسی وقت نضار نے مجھے مخاطب کیا۔

"اے آتون! مجھے نہ جانے کیا ہو رہا ہے؟ میرے جسم میں بجلیاں سی دوڑ رہی ہیں۔" وہ آواز سے گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"مبارک ہو تجھے کہ تیرے اندر خوابیدہ پُراسرار قوتیں بھی اب جاگنے لگی ہیں۔" میں نے پُرجوش آواز میں نضار کو بتایا۔ "اب تیری آنکھوں سے بھی تیز روشنی خارج ہو گی' پھر جو بھی اس کی زد میں آ گیا' جل کر خاک ہو جائے گا۔"

ہم اس وقت جہاں تھے' ہمارے دائیں بائیں پتھریلی دیواریں بلند ہوتی چلی گئی تھیں۔ حملہ آور دو سمتوں ہی سے آ سکتے تھے' سامنے سے اور عقب سے۔ دونوں خوفزدہ لڑکیوں کو میں نے ایک بڑے پتھر کی آڑ میں چھپا دیا۔

"تُو میری پیٹھ سے پیٹھ ملا کر کھڑا ہو جا۔" میں نے نضار کو مخاطب کیا۔ "اور اس خنجر کو پیٹی میں اڑس لے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور اپنی تلوار بھی نیام میں رکھ لے۔"

نضار نے میری ہدایت پر ایسا ہی کیا اور میری پیٹھ سے پیٹھ ملا کر کھڑا ہو گیا۔ اب ہم دونوں طرف سے آنے والوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

پھر چند ہی لمحے اور گزرے تھے کہ ساحر زعیم کے خدمتگاروں کو ان کی موت ہمارے سامنے لے آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں گھیر سکتے' پکڑ لیتے یا اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیتے' میری آنکھوں سے تیز روشنی نکل کر ان پر چھا گئی۔ اسی کے ساتھ ان کے جسموں میں آگ لگ گئی اور پہاڑ ان کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھا۔ عقب سے بھی مجھے ایسی ہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں پھر زوردار دھماکے ہونے لگے۔ یہ دھماکے اس اسلحہ کے تھے جو ان کے پاس تھا۔

ہر طرف جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ خدمتگاروں کے جسم سوکھی ہوئی لکڑیوں کی طرح جل رہے تھے۔ اچانک فضا میں بلندی کی جانب ایک نامانوس سنسناہٹ سی سنائی دی۔ میں نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اور اچھل پڑی۔ اسی پہاڑ کے ایک نشیبی حصے سے وہی چاروں بلائیں پرواز کرتی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھیں جو مجھے اور نضار کو اغوا کر کے یہاں تک لائی تھیں۔ انہی کے بڑے بڑے پروں کی حرکت سے وہ سنسناہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ انہی میں سے ایک عجیب مخلوق بوڑھے ساحر زعیم کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے تھی۔ اندھیرا ہونے کے باوجود واضح طور پر میں نے ساحر زعیم کو پہچان لیا تھا۔ ساحر زعیم کو جو بلا اٹھائے ہوئے تھی' اس کے پیچھے ویسی ہی دو بلائیں اور بھی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک بلا آگے آگے اڑ رہی تھی۔

معاً میری آنکھوں سے تیز روشنی خارج ہوئی اور ایک بلا پر چھا گئی۔ میری توقع کے عین مطابق اس کے پروں میں آگ لگ گئی اور پھر اس کا سارا جسم آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اسی لمحے میرے قریب ہی سے پھر تیز روشنی آسمان کی طرف لپکی اور دوسری بلا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اسی روشنی میں بقیہ دو بلائیں آسمان کی وسعتوں میں بلند ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ انہی میں سے ایک بلا ساحر زعیم کو اٹھائے ہوئے تھی۔

بوڑھا ساحر زعیم بچ کر نکل گیا اور تیز روشنی کا شکار ہونے والی دونوں بلائیں فضا ہی میں جل کر راکھ ہو گئیں۔

ساحر زعیم وہاں سے فرار ہو چکا تھا اور اب ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ ہم نے اس کا مکر اجاڑ کر اسے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہرچند کہ یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی مگر مجھے ساحر کے فرار ہو جانے پر بہت ملال تھا۔ معلوم نہیں وہ اب کب اور کہاں ہمارے ہتھے چڑھتا۔

"آ' اب یہاں قید معصوم و بے گناہ لڑکیوں کو آزاد کر دیں۔" میں نے تھکی تھکی سی آواز میں نضار کو مخاطب کیا۔

پھر ان دونوں لڑکیوں کی رہنمائی میں ہم نے قیدی لڑکیوں کی تلاش شروع کر دی۔ ان دونوں لڑکیوں کا تعلق اسی پہاڑ کے دامن میں آباد ایک بستی سے تھا۔ وہاں ہمیں مختلف غاروں میں سو سے زیادہ لڑکیاں قید ملیں۔ وہ سبھی نوجوان اور حسین تھیں۔ ان میں سے اکثر کا تعلق اردگرد آباد بستیوں سے تھا۔ یہ سب ساحر زعیم کے سحر کا شکار تھیں جو اب ٹوٹ چکا تھا۔ اسی کارروائی کے دوران میں زعیم کے چند خدمتگاروں کو ہم نے مزید موت کے گھاٹ اتارا۔ وہ ہمیں مختلف غاروں میں ملے تھے۔ کچھ خدمتگاروں کو تو سوتے ہی میں سفرِ آخرت پر روانہ کر دیا گیا تھا۔ دور نشیبی غاروں میں ہمیں تندرست اور بہترین گھوڑے بندھے ہوئے ملے۔ ہم نے ان میں سے دو گھوڑوں کو اپنی سواری کے لئے منتخب کر لیا۔ اس کے علاوہ ٹھکانے لگائے جانے والے خدمتگاروں میں سے دو کا اسلحہ بھی ہم نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ واپسی کے سفر میں یہ اسلحہ ہمارے کام آ سکتا تھا۔ ایک رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی میرے پاس تھی اور نضار کے شانے سے بھی رائفل لٹک رہی تھی۔ کارتوسوں کی پیٹی اس نے اپنے گلے میں ڈال لی تھی۔

ان نوجوان و حسین لڑکیوں میں سے صرف تین ایسی تھیں کہ جن کی عزت و آبرو محفوظ تھی۔ ان میں سے دو گزشتہ روز ہی زعیم کے خدمتگار اغوا کر کے لائے تھے اور ایک کو چند روز پہلے اغوا کیا گیا تھا مگر زعیم نے اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس لڑکی کے جسم کے کچھ خاص حصوں پر کسی بیماری کے نشان تھے اور وہ بیماری اس شخص کو بھی لگنے کا خطرہ تھا جو اسے اپنے تصرف میں لاتا۔ وہ لڑکی بے حد خوبصورت تھی اسی لئے زعیم اس کا علاج کر رہا تھا کہ وہ صحت یاب ہو جائے تو پھر اس کے قرب سے اپنی تنہائیاں آباد کر سکے۔ زعیم چاہتا تو اس لڑکی کو واپس اس کی بستی بھی بھیج سکتا تھا مگر اس نے لڑکی کی خوبصورتی کے سبب اس سے دستبردار ہو جانا قبول نہیں کیا تھا۔ وہاں اغوا کر کے لائی جانے والی لڑکیوں پر پہلا حق بوڑھے ساحر زعیم کا ہوتا تھا۔ ہر لڑکی کو چند روز وہ اپنے پاس رکھتا تھا' پھر کسی نئے شکار کی آمد پر یا اس لڑکی سے دل بھر جانے کے بعد اسے اپنے خدمتگاروں کے حوالے کر دیا کرتا تھا۔ کسی خدمتگار کو یہ حق نہیں تھا کہ مستقل طور پر کسی بھی لڑکی کو اپنے پاس رکھ سکے۔ ہر لڑکی پر ہر خدمتگار کا حق تھا۔ بوڑھے ساحر کے سحر ہی کا ایک اور کمال یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی لڑکی ماں نہیں بنتی تھی۔ لڑکیوں کا دور جوانی جب ختم ہونے لگتا تھا تو انہیں بستیوں میں چھڑوا دیا جاتا تھا۔ سارا عہد شباب گزار کر جب یہ لڑکیاں بستیوں میں لوٹتی تھیں تو انہیں کوئی بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں سے اکثر خود کو ہلاک کر لیتی تھیں۔

بوڑھے ہوس کار ساحر زعیم کے بارے میں انہی لڑکیوں سے ایک اور عجیب بات معلوم ہوئی تھی۔

لڑکیوں کو وہ اپنی آغوش کی زینت بنانے سے پہلے طرح طرح کی اذیتیں دیتا تھا۔ اکثر لڑکیوں کے جسموں پر ایسے داغ تھے جیسے گرم لوہے سے ان کے جسموں کو داغا گیا ہو۔ استفسار پر انہوں نے اس کی تصدیق بھی کی تھی۔ زعیم ایک ایسا ظالم درندہ تھا جسے دوسروں کو اذیت دے کر سکون ملتا تھا۔ زعیم کے بارے میں مجھے یہ سب کچھ جان کر اس سے شدید نفرت ہو گئی۔ میں سوچنے لگی' کاش اس سفاک درندے کو اس کے انجام تک پہنچا سکتی۔ زعیم کے فرار کے بعد اب میرا اور نضار کا وہاں رکنا لا حاصل ہی تھا۔ ابھی خاصی رات باقی تھی۔ رات کے وقت ہم دشمن کے جتنے بھی علاقے کو عبور کر لیتے ہمارے لئے بہتر تھا۔ ان پہاڑوں کے دامن میں آباد کسی نہ کسی بستی سے گزر کر ہی ہم آگے بڑھ سکتے تھے مگر یہاں سے نکلنے کے بعد یہ ضروری نہیں تھا۔ ہم بستیوں میں داخل ہوئے بغیر ان کے اطراف سے بھی گزر سکتے تھے۔

آزاد کی جانے والی لڑکیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم رات ہی کو روانہ ہو رہے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ ہی چلنے پر آمادہ ہو گئیں۔ وہ ہماری غیر موجودگی میں خود کو وہاں محفوظ نہیں سمجھ رہی تھیں۔ اکثر کا یہ خیال تھا کہ ہمارے جاتے ہی بوڑھا ساحر زعیم وہاں پھر لوٹ آئے گا۔

انہیں میں نے سمجھایا کہ وہ لعنتی بوڑھا اب لوٹ کر یہاں نہیں آئے گا' مگر وہ نہیں مانیں۔ مجبوراً انہیں بھی ساتھ لینا پڑا۔ گھوڑے کم تھے اس لئے اکثر گھوڑوں پر دو دو لڑکیاں سوار ہو گئی تھیں۔ چند مشعلیں بھی ساتھ لے لی گئی تھیں جن کی مجھے یا نضار کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں ان لڑکیوں کو مشعلوں کی بہرحال ضرورت تھی تاکہ وہ اونچے نیچے راستوں پر سفر کر سکیں۔

اس پہاڑ کے دامن میں جو بستی آباد تھی نضار نے اس کا نام وسیط بتایا تھا۔ یہ بستی اسی سردار کے نام سے منسوب تھی جو پہلے آزاد و خودمختار تھا مگر اب ژیان کا نائب کہلاتا تھا۔ ہمیں اسی بستی سے گزرنا تھا۔

وہاں سے نکلتے ہی ایک اور عجیب واقعہ رونما ہوا۔ زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر میں نے پلٹ کے دیکھا۔ پہاڑی کی بلندی پر مجھے عظیم مہین کی حسین کاہنہ نجیرہ کا ہیولا نظر آیا اور پھر وہ ہیولا چند لمحے نظر آ کے غائب ہو گیا۔ میں نے زمین ہلتی محسوس کی تو اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ پھر میری آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ وہ پہاڑ آہستہ آہستہ زمین میں دھنستا چلا گیا۔ حیرت کی زیادتی کے سبب کئی لڑکیوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ذرا ہی دیر میں اس پہاڑ کی جگہ شکستہ پتھروں کا ایک چھوٹا سا ٹیلا رہ گیا۔ بوڑھے ساحر زعیم کے گناہوں کا وہ ٹھکانا ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گیا تھا۔

نضار خوفزدہ آواز میں مجھ سے بولا۔ "اے آتون! اگر ہم اسی وقت وہاں سے نکل نہ آتے تو پہاڑ کے اندر ہی دب کر مر جاتے۔"

"نہیں۔" میں نے پُریقین آواز میں جواب دیا۔ "ہم اگر وہاں سے نہ نکلتے تو وہ پہاڑ ابھی زمین میں نہ دھنستا۔"

"مگر تُو اتنے یقین کے ساتھ یہ بات کس طرح کہہ سکتی ہے' اے آتون!" نضار حیرت سے بولا۔

"کیا تُو نے پہاڑی کی بلندی پر عظیم مہین کی کاہنہ نجیرہ کا روشن ہیولا نہیں دیکھا؟"

"مگر کب اے آتون!" اس نے پوچھا۔

"اس وقت جب گڑگڑاہٹ سنائی دی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "گڑگڑاہٹ سنتے ہی میں نے پلٹ کر پہاڑی کی طرف دیکھا تھا تو مجھے اس کی بلندی پر چند لمحوں تک خجیرہ کا ہیولا دکھائی دیا تھا۔ یقیناً خج بوڑھے ساحر کے اس ٹھکانے ہی کو نیست و نابود کرنے آئی ہو گی۔ ہم اگر اس پہاڑی پر ہوتے تو مجھے یق ہے وہ ایسا نہ کرتی۔"

"مڑ کر میں نے بھی دیکھا تھا اے آتون! مگر مجھے خجیرہ نظر نہیں آئی۔" نضار نے بتایا۔ "مگر تُو اسے دیکھا ہے تو وہ ضرور آئی ہو گی۔"

زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر اس پہاڑ کے دامن میں آباد ساری بستی ہی جاگ اٹھی تھ ہم اس بستی کے قریب ہی تھے۔ ہمیں کچھ ہی فاصلے پر جلتی ہوئی مشعلیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ نئی صور حال میرے لئے خلاف توقع تھی میں کچھ فکرمند سی ہو گئی۔ ہمیں بہرحال اس بستی سے ہو کر تو گزرنا تھا اس لئے مجبوراً اپنے گھوڑے آگے بڑھا دیئے۔ ہمارے پیچھے لڑکیوں کے گھوڑے تھے۔ زمین ہلی تھی انہوں نے بھی ہماری تقلید میں اپنے گھوڑے روک لئے تھے۔

بستی میں داخل ہوتے ہی ہمارے قافلے کو مسلح مشعل برداروں کے ایک دستے نے اپنے گھیر میں لے لیا۔ وہ اس بستی کے محافظ معلوم ہوتے تھے۔

"تم لوگ کون ہو؟ اور کدھر سے آ رہے ہو؟" ایک گھڑسوار ہمارے سامنے اپنا گھوڑا روک کر بلن آواز میں پوچھنے لگا۔ وہ غالباً اس دستے کا سالار تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی یا نضار کچھ بولتا ایک تیز نسوانی آواز پیچھے سے سنائی دی۔ "میں بتاتی ہوں تجھے کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آ رہے ہیں۔" اسی کے ساتھ میں نے ایک لڑکی کو گھو دوڑا کر آگے آتے دیکھا۔ میں اسے پہچان گئی۔ یہ وہی بیمار اور خوبصورت لڑکی تھی جو اپنی بیماری کے سب زعیم کے دست ہوس سے بچ گئی تھی۔ دستے کے سالار کے سوال کا جواب دینے وہ لڑکی گھوڑا دوڑا کر آگے آئی تھی اگلے ہی چند لمحوں میں مجھے یہ بات معلوم ہو گئی۔

اس لڑکی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی دستے کے سالار نے فوراً اپنے گھوڑے سے کود کر تعظیم دی پھر حیرت سے بولا۔ "اے سردار زادی تُو؟ .... تُو کہاں تھی؟ روتے روتے تیری ماں نے اپنی بینائی آنسوؤں میں بہا دی اور ہمارے بوڑھے سردار اور تیرے باپ کی کمر دکھ سے جھک گئی۔ ہم نے تجھے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا' مگر تُو ہمیں نہیں ملی۔ سردار نے تیری تلاش کے لئے عظیم ساحر زعیم سے بھی التجا کی تھی۔ عظیم ساحر نے سردار سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد.........."

بیمار لڑکی نے زور سے ہنس کر دستے کے سالار کی بات کاٹ دی اور کہا۔ "میرا بوڑھا بابا اور تمہارا سردار بھی کتنا بھولا ہے کہ اس نے ظالم ہی سے اس کے ظلم کی فریاد کی۔ کیا تمہارے سردار کو اور خو تمہیں یہ بات نہیں معلوم کہ اس بستی اور آس پاس کی بستیوں سے گم ہو جانے یا اغوا کی جانے والی حسین اور نوجوان لڑکیاں کہاں جاتی ہیں؟ انہیں کون اغوا کراتا ہے؟ پھر تم کس طرح اس خوش فہمی کا شکار ہ

ہتے کہ تمہارے سردار کی بیٹی اس ظلم سے محفوظ رہ سکتی ہے؟ کیا تمہارے اندر اتنی ہمت تھی کہ میری تلاش میں اس پہاڑ کا رخ کرتے جو دیوتاؤں کے قہر کا شکار ہو کر زمین میں دھنس گیا؟"

دستے کے سالار کا سر جھک گیا۔ اس کے چہرے سے شرمندگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ شاید اس کا جھکا ہوا سر ہی بیمار و حسین لڑکی کے سوالوں کا جواب تھا۔

پھر وہ قافلہ بستی کی واحد پختہ عمارت کی طرف بڑھا۔ اب نضار کے اور میرے درمیان وہ بیمار لڑکی بھی تھی۔ بستی میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ چند روز پہلے پُراسرار طور پر غائب ہو جانے والی سردار وسیط کی بیٹی شینا خود واپس آ گئی ہے اور اس کے ساتھ اغوا کی جانے والی بہت سی لڑکیاں ہیں۔ وسیط ہی کی بستی سے اغوا ہونے والی تین اور لڑکیاں بھی اس قافلے میں تھیں۔ ان کے گھر والے شینا کا شکریہ ادا کر کے انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

اسی حویلی کے اس حصے میں ان تمام لڑکیوں کو ٹھہرا دیا گیا اور شینا میرے اور نضار کے ساتھ ایک بڑے سے دالان میں اپنے باپ سردار وسیط سے ملی۔ بوڑھے سردار وسیط نے اپنی بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ غالباً وہ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا تھا یا شاید سارے ہی باپ اپنی بیٹیوں سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔ شینا اپنے باپ کے سینے سے لگی ہچکیاں لے رہی تھی۔ حویلی کے اندر جا کر اپنی ماں سے وہ پہلے ہی مل آئی تھی۔

سینوں کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو سردار وسیط کی بھاری آواز سنائی دی۔ "صبر کر اے بیٹی کہ تُو اب اپنے گھر لوٹ آئی ہے اور مجھے بتا کہ تُو کہاں تھی؟"

شینا اپنے آنسو پونچھتی ہوئی باپ کے قریب بیٹھ گئی اور پھر بتانے لگی۔ "بابا! مجھے ظالم زعیم کے خدمتگار اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اس روز شام کو جب میں سیر کرنے پہاڑ کی طرف نکل گئی تھی تو انہوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔"

"نہیں۔" بوڑھا سردار بے یقینی سے بولا۔ "زعیم کے خدمتگار کسی سردار زادی پر کس طرح ہاتھ ڈال سکتے ہیں؟"

"اسی طرح اے بابا! جس طرح وہ دوسروں کی بیٹیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔" شینا بولی تو اس کی آواز میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"تو پھر.......... کیا پھر اس کے خدمتگاروں نے تجھے .... تجھے بھی.........." بوڑھا سردار شاید احساس شرمندگی کے سبب اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

"نہیں اے محترم سردار!" شینا کے بجائے میں بول اٹھی۔ "دیوتاؤں کا شکر ادا کر کہ تیری بیٹی ظالم و سنگ دل زعیم یا اس کے خدمتگاروں میں سے کسی کے ظلم کا شکار نہیں ہو سکی اور اس کی وجہ ایک بیماری تھی جو اس سے دوسروں کو بھی لگ سکتی تھی۔ زعیم اسی لئے اس کا علاج کر رہا تھا۔" پھر میں نے محتاط اور مہذب الفاظ میں بوڑھے سردار وسیط کو زعیم کے سیاہ کارناموں سے آگاہ کر دیا۔

وسیط کے چہرے سے رنج و غم کا اظہار ہونے لگا پھر وہ دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ "کاش سردار ژیان

کے حکم سے ہم مجبور نہ ہوتے اور اس کھلے ظلم پر خاموش نہ رہتے۔ مگر.......... کبھی میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ .... کہ خود میرے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ وہ .... وہ کمینہ ساحر میری بیٹی کو بھی اغوا کر سکتا ہے۔" پھر بوڑھے سردار کو شاید یہ خیال آ گیا کہ زعیم کی قید سے رہائی کس طرح مل گئی؟ پھر یہی سوال اس کی زبان پر بھی آ گیا۔

بوڑھے سردار وسیط کے سوال کا جواب میرے بجائے شینا نے دیا۔ "یہ دونوں میرے اور سب اغوا کی جانے والی لڑکیوں کے نجات دہندہ ہیں۔" پھر خود میں نے ہی سردار وسیط سے اپنا تعارف کرایا۔ "اے محترم سردار! میرا نام آتون ہے اور یہ میرا ساتھی مرطاق ہے۔ مجھے اور میرے ساتھی کو اغوا کرنے والا وہی لعنتی ساحر زعیم تھا مگر اس نے مجھے خود اپنے لئے اغوا نہیں کرایا تھا۔"

"تو .... تو پھر؟" سردار وسیط نے حیرت سے پوچھا۔

"زعیم نے مجھے وادی سبز کے غاصب سردار ژیان کے لئے اور اسی کے ایما پر اغوا کرایا تھا پھر.........."

"لڑکی۔" سردار وسیط نے اچانک سخت لہجے میں میری بات کاٹ دی۔ "تو ہر چند کہ میری محسنہ ہے اور تُو نے میری بیٹی کی جان بچائی ہے مگر .... مگر تجھے اس کے باوجود میں یہ حق نہیں دے سکتا کہ تُو سرداروں کے سردار عظیم ژیان کو میرے سامنے غاصب کہے۔"

میں نے یہ جاننے کے باوجود سردار وسیط کے سامنے ژیان کو غاصب کہا تھا کہ وہ ژیان کا نائب ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بوڑھا مجھے شریف معلوم ہوا تھا۔

"اے محترم سرادر! کیا ژیان واقعی غاصب اور محسن کش نہیں ہے؟ کیا اس ظالم نے اپنے سردار آقا اشم کو قتل کر کے وادی سبز پر قبضہ نہیں کیا تھا؟" میں نے پُرجوش آواز میں کہا۔ میری آواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔

"آہستہ بول اے لڑکی۔" وسیط چونک کر بولا۔ "اور یہ نہ بھول کہ اس حویلی میں بھی سردار ژیان کا کوئی مخبر ہو سکتا ہے۔ مجھے بتا مگر پست آواز میں کہ تجھے برسوں پہلے پیش آنے والا یہ اندوہ ناک واقعہ کس طرح معلوم ہے؟" وسیط کے لہجے سے تجسس کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اندوہناک واقعہ" کہہ کر سردار وسیط نے میری دانست میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کر دیا تھا۔ اب میرا ذہن ایک اور ہی نہج پر کام کر رہا تھا۔ میں جو کچھ سوچ رہی تھی' اس میں خطرہ تو تھا مگر کامیابی کے امکانات بھی تھے۔ سردار وسیط کے بارے میں میرا قیاس اب تک درست ہی ثابت ہو رہا تھا۔

"میں تیرے سوال کا جواب ضرور دوں گی اے محترم سردار!" میں دھیمی آواز میں بولی۔ "مگر تُو پہلے وعدہ کر کہ میرے سوال کا جواب بھی سچائی سے دے گا؟"

"ٹھیک ہے' سوال کر کہ تُو وسیط کو جھوٹا نہیں پائے گی۔" سردار سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"مجھے بتا اے محترم سردار! کیا ژیان نے سردار اشم پر ظلم نہیں کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں وہ ظلم تھا' مجھے تسلیم ہے۔" سردار وسیط کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"سو ژیان ظالم ٹھہرا۔" میں نے سردار وسیط کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بات اور آگے بڑھائی۔ "کیا اپنے آقا و سردار کو قتل کرنا محسن کشی نہیں؟"

"بالکل ہے۔" اس مرتبہ وسیط کی آواز قدرے واضح تھی۔

"ظالم اور محسن کش ژیان نے اپنے سردار اشم کو قتل کر کے اس کی وادی پر قبضہ کر لیا' کیا یہ قبضہ غاصبانہ نہیں کہا جائے گا اور کیا ژیان کو غاصب کہنا درست نہیں ہے؟ وادی سبز ژیان کی میراث تو نہیں اے محترم سردار!"

"تُو جو کچھ کہہ رہی ہے اے لڑکی! وہ سچ ہے' مگر وادی سبز پر جو اپنے حق کا دعویٰ کر سکتی' وہ .... وہ سردار اشم کی بیٹی معبلہ پُراسرار طور پر غائب ہو گئی اور .... اور اسی کے ساتھ بستی کا مہا پجاری بھی نہ جانے کہاں چلا گیا۔ ورنہ .... ورنہ ژیان زیادہ عرصے وادی سبز پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکتا۔"

وسیط نے پہلی بار ژیان کے ساتھ "سردار" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس سے میرا حوصلہ اور بڑھا' میں بولی۔ "وہ کس طرح اے محترم سردار!"

"اگر مظلوم و مقتول سردار کی بیٹی زندہ ہوتی تو سردار اشم کے وفادار مختلف قبیلے' ژیان کو وادی سبز پر قابض نہ رہنے دیتے اور خود وادی سبز کے عوام بھی ژیان کو اپنا سردار تسلیم نہ کرتے اور اس کے خلاف بغاوت کر دیتے مگر .... اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟ شاید .... شاید ژیان نے مہا پجاری اور معبلہ کو قتل کرا دیا ہو گا ورنہ وہ .... سردار اشم کی بیٹی اپنے حق کے لئے ضرور لڑتی۔"

"اور اس لڑائی میں اے محترم سردار! تُو کس کی طرف ہوتا؟" میں نے بہت نازک اور فیصلہ کن سوال کیا۔

"ظاہر ہے کہ میں مظلوم ہی کی طرف ہوتا کہ میرا شمار بھی سردار اشم کے وفادار دوستوں میں تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا' اس نے مجھ سے انصاف کیا اور ہمیشہ مجھے دوست سمجھا.........." وسیط جیسے ماضی کی یادوں میں کھو گیا پھر اس نے ایک دم چونک کر پوچھا۔ "لیکن تُو .... تُو مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہے؟ .... اگر شینا .... شینا تیرے بارے میں یہ نہ بتا چکی ہوتی کہ تُو نے اسے زعیم کی قید سے رہائی دلائی ہے تو .... تو پھر میں .... میں تجھے ژیان کی کوئی چالاک مخبر سمجھتا۔" بوڑھا سردار یہ کہہ کر مجھے مشتبہ سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

بوڑھے سردار وسیط کو میں نے اپنی توقع کے مطابق کھرا پایا تھا۔ میرے خیال میں اس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ میرے بابا کے وفادار دوستوں میں سے ایک تھا۔ اس کی بات سن کر میں مسکرا دی اور پھر بولی۔ "اے مظلوم سردار اشم کے وفادار دوست اور محترم سردار! میں اگر تجھ سے یہ کہوں کہ مقتول سردار اشم کی بیٹی .... معبلہ زندہ ہے .... تو کیا تجھے میری بات پر یقین آ جائے گا؟" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

وسیط چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔ "ہاں میں یقین کر سکتا ہوں' مگر صرف ایک صورت

میں کہ ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔"

"کیسا ثبوت؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دریافت کیا۔

"معبلہ کے دائیں شانے پر سانپ کے پھن کا نشان تھا۔ وہ نشان میں نے اس کے بچپن میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے مظلوم سردار اشم نے ایک ضیافت میں وادی سبز بلایا تھا۔ برسوں پہلے کی یہ بات مجھے آج تک یاد ہے۔ معبلہ اس وقت مشکل سے دو سال کی رہی ہو گی۔ میں نے اسے اپنی گود میں اٹھا کر پیار کیا تھا۔" وسیط نے جواب دیا۔

میرے جسم پر اس وقت تک بھی مختصر اور ناکافی لباس ہی تھا۔ میرا دایاں شانہ کھلا ہوا ہی تھا مگر وسیط کی نظر یقیناً میرے دائیں شانے پر اب تک نہیں پڑی تھی۔ یوں بھی اس کے اور میرے درمیان کچھ فاصلہ بہرحال موجود تھا۔ اچانک میں اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھی اور اپنا دایاں شانہ اس کے سامنے کر دیا۔

"اے محترم سردار! تیرے مظلوم دوست سردار اشم کی بیٹی معبلہ تیرے سامنے ہے۔" میں تعظیماً اس کے سامنے جھک گئی۔

وہ تصویر حیرت بنا چند لمحے میرے شانے پر موجود نشان کو دیکھتا رہا پھر جذبات سے بوجھل بھاری آواز میں بولا۔ "میری بچی .... مظلوم بچی معبلہ! کتنا خوش نصیب ہوں میں کہ اپنے دوست کی بیٹی کو زندہ دیکھ رہا ہوں۔" پھر معاً وہ اپنی بیٹی شینا سے مخاطب ہوا۔ "اے شینا! یہ تیری بہن معبلہ ہے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر کہ اس کے جسم پر لباس بھی پورا نہیں مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔ پہلے تو اسے اپنے ساتھ لے جا اور پہننے کو پورا لباس دے اور سن اے میری بیٹی شینا! کسی کو بھی یہ ہرگز نہ بتانا کہ اس کا نام معبلہ ہے اور یہ میرے دوست سردار اشم کی بیٹی ہے۔"

میں اٹھ کر شینا کے ساتھ حویلی کے اندر چلی گئی۔ شینا مجھے ایک کمرے میں لے آئی اور پہننے کو پورا لباس دیا۔ اس کے اور میرے جسم میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا اس لئے کپڑے میرے جسم پر تقریباً ٹھیک ہی آئے۔ شینا یہ جان کر بے حد خوش تھی کہ میں اس کے بابا کے دوست کی بیٹی ہوں۔ جوش جذبات میں اس نے ایک بار مجھے اپنے سینے سے بھی لگا لیا۔ پھر میں شینا کے ساتھ دوبارہ اسی دالان میں آ گئی جہاں سردار وسیط اور نضار کو چھوڑ کر گئی تھی۔

اس دوران نضار بھی بے لباس نہیں رہا تھا۔ نضار کے جسم کا اوپری حصہ جانور کی کھال سے بنے ہوئے ایک لمبے سے کرتے میں چھپ گیا تھا۔ واپس پہنچنے کے بعد جب میں نے دھیمی آواز میں بوڑھے سردار وسیط سے نضار کا تعارف کرایا تو وہ تقریباً اچھل پڑا۔

"یہ .... یہ نوجوان سردار اشر کا بیٹا نضار ہے؟" وسیط کے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔

"ہاں، اے محترم سردار! یہ اشر کا بیٹا نضار ہی ہے۔" میں نے تصدیق کی۔

"وہی .... وہی نضار کہ جس نے بوڑھے عیار واہب کو شکست فاش دی اور .... اور پھر اس کا کٹا ہوا سر ثریان کو بھیجا مگر......... مگر........." وسیط کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر چند لمحے توقف کے

بعد خود ہی بولا۔ "اگر......... اگر یہ وہی نضار ہے تو پھر اس نے تن تنہا اپنے کھلے دشمن ثریان کے زیر اثر علاقے میں قدم رکھ کر یقیناً بہت بھاری غلطی کی ہے جو اس جیسے ذہین نوجوان سے متوقع نہیں تھی۔"

"اور اے محترم سردار! میرے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟" میں بول اٹھی۔ "کیا مجھ سے بھی یہی غلطی سرزد نہیں ہوئی؟"

"لیکن تُو نے تو بتایا تھا کہ تجھے اغوا کرایا گیا تھا۔" وسیط نے کہا۔ اس کی پیشانی پر غور و فکر کے سبب شکنیں پڑ گئی تھیں چہرے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی کہا تھا اے میرے بابا کے وفادار دوست کہ میرے ہی ساتھ اسے بھی اغوا کیا گیا تھا۔" میں نے بتایا۔

"اچھا!" وسیط نے لمبا سانس لیا۔ "میں سمجھ گیا کہ........."

"تُو نہیں سمجھا اے محترم سردار!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "زعیم کے خدمتگار ہمیں قلاوز کی بستی سے پکڑ کر لے گئے تھے اور وہاں تک ہم دونوں خود ہی پہنچے تھے کہ دیوتاؤں کا حکم اور مرضی یہی تھی۔"

"تم......... تم دونوں خود......... یعنی دانستہ اس علاقے میں داخل ہوئے تھے؟" وسیط کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

"ہاں۔" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اے محترم سردار! دیوتاؤں نے ہمارے خوابوں میں آ کر ہمیں یہ حکم دیا تھا کہ ہم دونوں تن تنہا بوڑھے ساحر زعیم کی طرف جائیں۔ ہمیں خوابوں میں یہ بشارت دی گئی تھی کہ نیکی، بدی پر غالب آ جائے گی۔ سو ہم اکیلے ہی ادھر چل پڑے۔" میں نے دانستہ خوابوں کا سہارا لیا تاکہ اصل بات ظاہر نہ ہو۔ "پھر دیوتاؤں ہی نے بدی پر ہمیں فتح دی۔ لعنتی زعیم فرار ہو گیا اس کے سارے عیاش و بدکار خدمتگار مارے گئے اور گناہوں کی جو دنیا زعیم نے اس پہاڑ میں بسا رکھی تھی، دیوتاؤں کے قہر سے زمین میں دھنس گئی۔ کیا تجھ تک یہ خبر نہیں پہنچی کہ جو پہاڑ زعیم کا مسکن تھا، نیست و نابود ہو گیا؟"

"میں نے خود گڑگڑاہٹ بھی اپنے کانوں سے سنی اور پھر مجھے پہاڑ کے زمین میں دھنس جانے کی خبر بھی مل گئی۔" وسیط نے بتایا، پھر کہنے لگا۔ "اگر تم دونوں، دیوتاؤں کی مرضی اور حکم سے اس علاقے میں داخل ہوئے تھے، تمہیں اگر دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل تھی تو پھر تم نے جرأت و ہمت سے کام لے کر یقیناً ثواب کمایا اور......... اور مجھے حقیقت میں بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ دیوتا تم دونوں پر مہربان ہیں ورنہ تم نہ تو اب تک زندہ بچتے اور نہ زعیم کا پہاڑ زمین میں دھنس جاتا۔ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ تم قلاوز کی بستی میں پہنچ کر کس طرح بچ گئے کہ وہاں تو عیاروں کا عیار سمات بھی موجود ہے۔"

"اے محترم سردار! سمات تیرے دوست کی بیٹی کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔" نضار پہلی بار وسیط سے مخاطب ہوا۔

"کیا......... تُو نے کیا کہا اے نضار؟......... سمات مارا گیا۔" بوڑھے وسیط کو شدید حیرت ہوئی۔

"سمات ہی کو قتل کرنے کے جرم میں ہمیں قلاوز نے قید کر دیا تھا کہ ساحر زعیم کے خدمتگار وہاں پہنچ گئے۔" نضار نے کہا اور پھر مختصراً اشر کی بستی سے دیوتاؤں کے حکم پر چلنے اور پکڑے جانے کے واقعات بیان کر دیئے۔ اس کے بعد زعیم کے پہاڑ تک پہنچنے اور وہاں سے دیوتاؤں کی مدد کے بعد آزادی ملنے تک کے حالات اختصار کے ساتھ وسیط کو بتا دیئے۔ یہ واقعات بیان کرتے ہوئے نضار نے کہیں کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ مجھے یا اسے کچھ پُراسرار قوتیں حاصل ہیں۔ میرے نزدیک نضار نے یہ راز افشا نہ کر کے ذہانت کا ثبوت ہی دیا تھا۔

"اے میری بچی! اے معبلہ! اب تُو یہ بھی بتا دے کہ اب تک کہاں رہی؟ اور تُو اس سے پہلے ظاہر کیوں نہ ہوئی؟"

سردار وسیط کے سوال کا جواب ہر چند کہ بڑا تفصیل طلب تھا مگر میں نے مختصر طور پر اسے اپنی روداد سنا دی۔ وہ یہ جان کر بہت خوش ہوا کہ مہا پجاری ابھی زندہ ہے اور یہ کہ اس نے حق نمک ادا کر دیا۔ میں نے بھی سردار وسیط کو صرف انتہائی ضروری باتیں ہی بتائی تھیں کہ جن کا بتانا ناگزیر تھا۔

"تو پھر اے معبلہ! تیرے بابا کا دوست بھی پردہ پوشی کی خاطر تجھے آتون ہی کہے گا۔" بوڑھا سردار پوری بات سن کر بولا۔ "تُو نے اور نضار نے پردہ پوشی کر کے بہت اچھا کیا۔ ژیان کو ابھی حقیقت کا علم نہیں ہونا چاہئے اور سن اے میری بچی! اب یہ صرف تیری جنگ نہیں رہی' وسیط کی جنگ بھی ہے۔ تُو دیکھے گی کہ تیرے بابا کا وفادار دوست بھی تیرے ساتھ ساتھ ژیان سے جنگ کرے گا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وسیط کی آواز جوش سے بھر گئی۔

وہاں قریب ہی چار قبیلے اور آباد تھے۔ ان قبیلوں کے سرداروں نے بھی ژیان کے ظلم سے بچنے کی خاطر خود کو ژیان کا نائب کہلوانا قبول کر لیا تھا؛ حالانکہ اس سے پہلے وہ خودمختار اور آزاد تھے لیکن اپنی سلامتی اور تحفظ کے خیال سے انہوں نے ژیان کی تمام شرائط قبول کر لی تھیں۔ یوں گویا انہوں نے ژیان کو اپنا بڑا اور سرداروں کا سردار تسلیم کر لیا تھا۔ وسیط کو یقین تھا کہ اگر ان چاروں قبیلوں کو نضار کی تائید و حمایت حاصل ہو گئی تو وہ ژیان کی ساری ذلت آمیز شرائط کو ٹھکرا کر نضار کے حلیف بن جائیں گے۔ ان چاروں قبیلوں سے وسیط کے اچھے تعلقات تھے اور وہ چاروں بھی میرے بابا کے ممنون احسان تھے کہ میرے بابا نے ہمیشہ آڑے وقتوں میں ان کی مدد سے منہ نہیں موڑا تھا' اس کے علاوہ انہیں دشمنوں کے شر اور حملوں سے بھی محفوظ رکھا تھا۔

"اے محترم سردار! اگر تجھے یقین ہے کہ انہیں اعتماد میں لیا جا سکتا ہے تو پھر اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے۔" نضار بولا۔ "اس طرح دشمن کے علاقے میں ہمارے حلیف پیدا ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر نضار نے میری طرف دیکھا۔ "تیرا کیا مشورہ ہے اے آتون!"

"اے نضار! اس وقت تُو اور میں دونوں ہی یہاں موجود ہیں۔ ان سرداروں کو اعتماد میں لینے کا بہترین موقع ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر یہ کہ محترم سردار وسیط بھی یہاں موجود ہے جو اس معاملے میں ہماری پوری مدد کرے گا۔ مجھے امید ہے اے نضار کہ ہم اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہیں گے۔"

دشمن کے علاقے میں ہمارا آنا بے سود نہیں رہا تھا۔ جنگ کئے بغیر ہمیں دشمن کے ایک علاقے پر گویا فتح حاصل ہونے والی تھی اور یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔ حالات کچھ اس انداز سے پیش آئے تھے کہ بات بنتی چلی گئی تھی ورنہ تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ دشمن کے زیر اثر علاقے میں ہمیں وسیط جیسا اپنا کوئی ہمنوا مل جائے گا۔ دشمن کے زیرِ نگیں ایک قبیلے پر صرف میں نے اور نضار نے فتح حاصل کر لی تھی اور اب بقیہ چار قبیلوں پر بھی ہمیں فتح حاصل ہونے کی قوی امید تھی۔

اس رات کا بیشتر حصہ ہم نے جاگتے ہوئے گزارا تھا اور اب صبح ہونے والی تھی۔ سو ہم نے سونے کا فیصلہ کیا۔ حویلی کے ایک کمرے میں میرے اور نضار کے سونے کا بندوبست کر دیا گیا۔ ہم دونوں آرام دہ بستروں پر دراز ہو گئے اور پھر بے فکری کی نیند سو گئے کیونکہ ہمیں وہاں کوئی خطرہ نہ تھا۔

دوپہر ہو رہی تھی کہ ہماری آنکھ کھلی۔ پہلے میں ہی جاگی تھی اور نضار کو جگایا تھا۔ سردار وسیط نے اپنی بیٹی شینا کے صحیح سلامت اور بخیریت واپس آ جانے کی خوشی میں گویا ہمسایہ قبائل کے سرداروں کو آج شام دعوت دی تھی۔

ہاتھ منہ دھو کر دوپہر کا کھانا ہم نے سردار وسیط ہی کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے دوران ہی میں وسیط نے ہمیں یہ خوشخبری سنائی کہ چاروں قبیلوں کے سرداروں نے اس کی دعوت قبول کر لی ہے اور آج شام وہ سبھی آ رہے ہیں۔

شام کی ضیافت میں دانستہ میں اور نضار شریک نہیں ہوئے۔ ہم نے بوڑھے سردار وسیط ہی کے مشورے پر ایسا کیا تھا۔ بوڑھا اور تجربہ کار سردار ہم دونوں کو فوری طور پر ان سرداروں کے سامنے نہیں لانا چاہتا تھا۔ وہ پہلے اپنے طور پر ان چاروں کو ذہنی طور پر گفتگو کے اس مرحلے تک لے آنا چاہتا تھا کہ جہاں اصل بات شروع کی جا سکے۔ وسیط کے خیال میں اسی کے بعد ہمارا ان چاروں کے سامنے آنا' مناسب تھا۔

ضیافت کے بعد سردار وسیط ان چاروں سرداروں کو ایک ایسے کمرے میں لے آیا جس کے برابر ہی ایک اور چھوٹا کمرہ تھا۔ میں اور نضار اسی چھوٹے کمرے میں پہلے سے موجود تھے۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ تھا جو ہماری جانب سے بند تھا۔ اس کے علاوہ ایک دریچہ تھا جسے دانستہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ ہم برابر والے بڑے کمرے میں ہونے والی ساری گفتگو سن سکیں۔

"اے میرے معزز اور محترم دوستو! کیا تمہیں خبر ہے کہ میری بیٹی شینا کہاں تھی؟" بوڑھے وسیط نے اپنی بیٹی کے اغوا سے بات شروع کی پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "یقیناً تم سب حیرت کرو گے جب میں حقیقت سے پردہ اٹھاؤں گا۔ سنو اے میرے دوستو! میری بیٹی کو اغوا کرنے والے ساحر زعیم کے خدمتگار تھے کہ جو دیوتاؤں کے قہر کا نشانہ بن گئے!"

بیک وقت ردعمل کے طور پر کئی حیرت زدہ آوازیں ابھریں اور پھر کوئی بلند آواز میں کہنے لگا۔ "مگر اے میرے دوست سردار وسیط! یہ تو کھلا ظلم ہے۔"

"اور کیا اے میرے محترم دوستو! خود ہمی نے سردار ژیان کے حکم پر اس کھلے ظلم کی اجازت نہیں

دے رکھی تھی؟ کیا ساحر زعیم کے خدمتگار ہماری بستیوں میں گھس کر نوجوان و حسین دوشیزاؤں کو اغوا کر کے نہیں لے جاتے رہے؟ کیا وہ اغوا ہونے والی کسی کی بیٹیاں نہیں تھیں؟ اور کیا ہم نے ہمیشہ اس کھلے صریحاً ظلم کو اب تک خاموشی سے برداشت نہیں کیا؟ بولو' بتاؤ۔ کیا ہم نے کبھی اس ذلت و بے حیائی پر شرمندگی محسوس کی؟ کیا ہم اس ظلم پر خاموش نہیں رہے؟ کیا ہم نے کبھی اس پر صدائے احتجاج بلند کی؟" وسیط کی آواز پُرجوش ہوتی گئی۔

"ہاں اے وسیط! تیرا کہنا بالکل درست ہے۔" کوئی جواب میں بولا۔ "ہم نے یقیناً اس ظلم پر مجرمانہ خاموشی اختیار کرلی مگر تجھے خود بھی اس کی وجہ معلوم ہے بتا کہ ہم سردار ژیان کے حکم کو کیسے ٹال دیتے .... اس کے باوجود اب سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ساحر زعیم کے خدمتگار کسی سردار زادی کو اغوا کر کے لئے گئے ہوں۔ سو اس پر ہم سردار ژیان سے احتجاج کر سکتے ہیں کیونکہ اب جو تیرے ساتھ ہوا آئندہ ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"اے میرے معزز دوست! تیرے خیال میں کیا سردار ژیان ہمارے احتجاج پر توجہ دے گا؟ اور وہ ہمارے اس احتجاج کو نافرمانی نہیں سمجھے گا؟ کیا تم اسے نہیں جانتے کہ وہ کس قدر سخت گیر اور اپنے احکام پر عمل درآمد کے بارے میں کتنا ضدی ہے؟" وسیط نے کہا۔

"سردار وسیط ٹھیک کہتا ہے کہ سردار ژیان ہمارے احتجاج کو نافرمانی سمجھ کر ہم پر باغی ہونے کا الزام عائد کر دے گا۔" کسی نے وسیط کے خیال کی تائید کی۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سب اس کے سامنے قطعی بے بس اور اس کا ہر حکم ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم زعیم اور زعیم کے خدمتگاروں کے متعلق سردار ژیان کا شرمناک حکم تسلیم نہ کر لیتے۔"

"اس کے علاوہ اے میرے دوستو! ایک اور بات بھی ہے۔" وسیط کی آواز آئی۔ "ہم نے خود اپنے آپ کو مجبور و بے بس بنا رکھا ہے ورنہ ہم جو چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں' اگر ایک ہو جائیں تو سردار ژیان ہم سے کوئی ذلت آمیز حکم نہیں منوا سکتا۔" وسیط آہستہ آہستہ مطلب کی بات پر آتا جا رہا تھا۔

"اے میرے دوست وسیط! تجھے خبر بھی ہے کہ تو کیا کہہ رہا ہے؟" کسی سردار نے کہا۔ "کیا تو نہیں جانتا کہ اگر ہم پانچوں قبیلے بھی سردار ژیان کے خلاف اتحاد کر لیں تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کیا میں نے یہ بات غلط کہی؟"

"ٹھیک کہا تو نے اے میرے محترم دوست!" وسیط نے جواب دیا۔ "مگر ہماری ہی طرح کچھ چھوٹے قبیلے بھی تو ژیان کے زیر اثر ہیں۔" میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ اس مرتبہ وسیط نے بڑی ہوشیاری سے ژیان کے ساتھ سردار نہیں کہا تھا۔ اب وہ کہہ رہا تھا۔ "مثلاً وادی سبز کے مغرب میں بھی ہماری ہی طرح تین چھوٹے چھوٹے قبیلے آباد ہیں۔ ہم ان سے بھی تو اتحاد کر کے اپنی قوت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ بطور خاص قبیلہ منعیہ کا سردار تو فوراً ہم سے اتحاد کرنے پر آمادہ ہو جائے گا کہ اس کی تیرہ سالہ بیٹی کو ژیان نے گزشتہ دنوں ہی زبردستی اپنی بیوی بنا لیا تھا اور پھر کسی بات پر خفا ہو کر اسے

قتل بھی کرا دیا تھا۔ بولو اے میرے محترم دوستو! کیا قبیلہ منعیہ پر ژیان نے یہ ظلم نہیں کیا؟"

"اے میرے دوست وسیط! سردار ژیان کے ظلم کی ایسی اور بہت سی داستانیں ہمارے علم میں ہیں مگر ہم کیا کر سکتے ہیں' اس کے سوا کہ خاموش رہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ظلم پر خاموشی اختیار کئے رہنا بھی ظالم' کے ظلم کو مزید ہوا دینا اور ظالم کا ساتھ دینے کے برابر ہے لیکن ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں' انہیں مدِنظر رکھتے ہوئے ہمارا خاموش رہنا ہی فی الحال مناسب ہے۔ ممکن ہے کہ دیوتا' ژیان کے مظالم سے تنگ آ کر خود اسے سزا دیں۔" کوئی بولا۔

"کیا دیوتاؤں نے سردار اشر کے بیٹے نضار کی صورت میں ژیان کو سزا دینے والا نہیں بھیج دیا؟" وسیط کی آواز سنائی دی۔ "کیا اے میرے محترم دوستو! تم نے نہیں سنا کہ نضار نے کس طرح ژیان کے دست راست اور مضبوط مہرے واہب کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا؟"

"ہاں اے سردار وسیط! دیوتاؤں نے یقیناً اس بہادر نوجوان کو ژیان سے ہمارا بدلہ لینے ہی کے لئے تیار کیا ہے۔" کسی نے وسیط کی تائید میں کہا۔

اس پر سردار وسیط نے بات کو مزید آگے بڑھایا۔ "تو کیا اے میرے معزز دوستو! ایسی صورت میں ہمیں اس بدلہ لینے والے کا ساتھ نہیں دینا چاہئے؟"

"مگر نہ تو ہم اس بہادر نوجوان کو جانتے ہیں اور نہ اس سے ہمارا کوئی رابطہ ہے پھر بھلا ہم اس کا ساتھ کس طرح دے سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری نہیں ہے وسیط کہ وہ بہادر نوجوان ہم پر بھروسہ کرلے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ واہب کو عبرت ناک شکست دے کر سردار اشر کے بیٹے نضار نے اپنی بہادری اور دلیری کا سکہ جما دیا ہے۔ اس نے اپنی آبائی بستی واپس چھین لی ہے۔ اس کے علاوہ پہلے ہی سے وہ اپنی بسائی ہوئی دو بستیوں کا سردار تھا جہاں اس کے نائب ادل اور احزم مقرر ہیں۔ پھر یہ بھی تصدیق ہو چکی ہے کہ اشر کی بستی کے شمال میں جو دو قبیلے پہلے سردار ژیان کے معاہدہ امن میں بندھے ہوئے تھے وہ بھی اب نضار ہی کے زیر نگیں آ چکے ہیں۔ یوں اس نے اپنی قوت بہت بڑھا لی ہے۔ میں یہ ساری باتیں اس لئے بھی کر رہا ہوں اے وسیط! کہ تو مجھے حالات سے غافل اور لاعلم نہ سمجھے۔ کسی کو اسی وقت اپنے قبیلے کی سرداری زیب دیتی ہے جب وہ پوری طرح اردگرد کے حالات سے باخبر ہو۔"

"اب میرے محترم دوستو! میں تم سے ایک اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔" وسیط بولا۔ "اور مجھے اپنے اس سوال کا جواب چاہئے۔ مجھے یہ جان کر واقعی خوشی ہوئی کہ تم سبھی کی حالات پر گہری نظر ہے۔ سنو کہ میں تم سے سوال کرتا ہوں' اگر ہمیں ژیان کے خلاف سردار اشر کے بہادر بیٹے نضار کی تائید و حمایت حاصل ہو جائے تو کیا تم ژیان کی نیابت ٹھکرانے پر آمادہ ہو جاؤ گے؟ کیا پھر سردار نضار کا ساتھ دو گے؟"

"لیکن میں پھر وہی بات کہوں گا اے وسیط کہ یہ ممکن کس طرح ہے؟" جو سردار' وسیط سے بول رہا تھا' پھر بول اٹھا۔

"فرض کرو نضار یہاں خود آئے اور تمہیں اپنی تائید و حمایت کا یقین دلائے تو تم ظالم ژیان کے

سامنے سینہ سپر ہو جاؤ گے؟" سردار وسیط نے دریافت کیا۔

"یقیناً وہ بہادر نوجوان نضار ایک ابھرتی ہوئی بڑی طاقت ہے اور اس میں ژیان سے ٹکرانے کا حوصلہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی بھی طرح اور کسی بھی ذریعے سے ہمیں اپنی حمایت کا یقین دلا دے تو ظاہر ہے کہ ہم اسی کا ساتھ دیں گے۔" ایک سردار نے جواب دیا' پھر بقیہ تینوں سرداروں نے بھی اس کی تائید کر دی۔

"اور اب میرے معزز و محترم دوستو! آخری بات سنو۔ کیا تمہیں وادی سبز کا بزرگ و محترم سردار اشم یاد ہے' وہی مظلوم سردار اشم کہ جسے قتل کر کے ظالم ژیان نے وادی سبز پر قبضہ کر لیا؟" وسیط کی آواز آئی اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ہاں اے سردار وسیط! ہم اپنے اس شریف و محترم سردار اشم کو نہیں بھولے۔" کسی نے کہا۔ "اس کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔"

"تو سنو! اسی محترم سردار اشم کی بیٹی معبلہ زندہ ہے۔ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کرو کہ جب تک سردار اشم کی بیٹی کو اس کا حق نہیں مل جاتا تم اس راز کو راز ہی رکھو گے۔" سردار وسیط بولا اور پھر اس نے وہاں موجود چاروں سرداروں سے رازداری کا عہد لیا۔ سبھی سرداروں نے بلند آواز میں عہد کرنے کے الفاظ بلند آواز میں دہرائے۔ اس کے بعد وسیط کی آواز پھر ابھری۔ "تمہیں ایک خوشخبری اور سناتا ہوں کہ محترم مقتول سردار اشم کی بیٹی معبلہ اپنی فوج لے کر نضار سے آ ملی ہے۔" وسیط نے قبیلے کے سرداروں کو بتایا۔

"مگر کب اے وسیط! ہم نے تو اس سلسلے میں کچھ نہیں سنا۔" کوئی سردار بولا۔

"ژیان کے دست راست واہب کے خلاف جنگ کرنے والوں میں نضار کے ساتھ معبلہ بھی تھی۔ کیا تم نے سردار نضار کے ساتھ واہب سے جنگ آزما ہونے والوں میں سانپ والی آتون کا ذکر نہیں سنا؟"

"ہاں ہم نے واہب کے حوالے سے ایسی ایک نوجوان اور حسین دوشیزہ کا ذکر سنا ہے جو خطرناک سانپوں کو زیور کی طرح اپنے گلے اور بانہوں میں ڈالے رہتی ہے اور اس پُراسرار دوشیزہ کو سانپ نہیں ڈستے۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ کچھ لوگ اسے آتون دیوی بھی کہتے ہیں جو حیرت انگیز قوتوں کی مالک ہے اور دیوتا اس پر مہربان ہیں' مگر آتون دیوی اور سردار اشم کی بیٹی معبلہ کا آپس میں کیا تعلق ہے اے سردار وسیط؟" کسی سردار نے سوال کیا۔

"وہی آتون یا آتون دیوی دراصل سردار اشم کی بیٹی معبلہ ہے۔" وسیط نے گویا انکشاف کیا۔ "اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دیوتا اس پر اپنا سایہ کئے ہوئے ہیں' وہ دیوتاؤں کی چہیتی ہے اور سنو کہ تن تنہا نضار کو اپنے ساتھ لے کر ہماری طرف آئی ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ وہ دیوتاؤں ہی کے حکم پر ہمیں عیار و عیاش اور بدکار ساحر زعیم سے نجات دلانے یہاں آئی تھی اور تم نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا کہ زعیم کا پہاڑ زمین میں دھنس گیا جہاں اس نے گناہوں کی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ اب ہماری بستیوں کی

کنواری اور حسین لڑکیاں اغوا نہیں کی جائیں گی۔"

"پھر تو اس نے یقیناً ہم پر احسان کیا اے وسیط!" ایک سردار کی آواز ابھری۔ "ہمیں بتا کہ وہ سانپوں والی آتون دیوی' وہ سردار اشم کی بیٹی کہاں ہے؟"

"وہ اسی حویلی میں ہے اور نضار بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ دونوں تمہاری ساری باتیں سن چکے ہیں کہ وہ پہلو والے کمرے میں موجود ہیں۔ میں اب ان دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تمہارے سامنے آجائیں تاکہ تم سب انہیں تعظیم دے سکو۔"

وسیط کے یہ الفاظ سنتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی اور درمیانی دروازہ کھول کر نضار کو ساتھ لئے بڑے کمرے میں داخل ہو گئی۔ کمرے میں موجود وسیط سمیت تمام سرداروں نے اٹھ کر ہمیں تعظیم دی اور پھر انہوں نے باری باری نضار کے اور میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہم سے وفاداری کا عہد کیا۔

"اے محترم سردار! نضار اور میں ژیان کے خلاف تمہیں اپنی تائید و حمایت کا یقین دلاتے ہیں۔" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "فی الحال ہم اپنے دشمن کو اپنی طرف سے چوکنا اور ہوشیار کرنا نہیں چاہتے اس لئے میں تم سے راز داری کا تقاضہ کرتی ہوں۔ جب تک وادی سبز فتح نہ کر لی جائے دشمن کو یہ خبر نہیں ہونا چاہئے کہ دراصل اس کے مقابلے پر کون ہے۔ اسے اسی دھوکے میں مبتلا رکھنا ہے کہ اس سے نبرد آزما ہونے والا صرف سردار نضار ہے۔ ژیان مجھے آتون دیوی کے نام سے جانتا ہے' سو اسے یہی غلط فہمی رہنے دو۔ تم بھی مجھے آتون ہی کہو اور آتون ہی جانو۔"

"ٹھیک ہے اے آتون دیوی! ہم تجھے اسی نام سے پکاریں گے۔" ایک سردار نے کہا اور بقیہ نے اس کی تائید کی۔

"سنو اے معزز سردارو!" نضار نے ان سرداروں کو مخاطب کیا۔ "فی الحال تمہیں اس وقت تک ژیان کے خلاف اعلان جنگ نہیں کرنا جب تک میں اور آتون' وادی سبز پر حملہ نہ کر دیں۔ ہمارے حملہ آور ہونے کی اطلاع تمہیں ہماری آمد کے ساتھ ہی ہو جائے گی کہ وادی سبز پر ہم اسی طرف سے حملہ کریں گے۔ اس طرف صرف ایک بستی ایسی ہو گی کہ جس سے ہمیں شاید گزرتے ہوئے مزاحمت کا سامان کرنا پڑے۔ میرے علم و اطلاع کے مطابق وادی سبز کے اردگرد کل نو قبیلے آباد ہیں جن میں سے چھ اس علاقے میں اور تین مغربی سمت میں ہیں۔ اے محترم سردارو! کیا مجھے درست معلومات حاصل ہیں؟"

"قطعی اے سردار نضار! تیری اطلاعات درست ہیں۔" وسیط نے جواب میں کہا' پھر بتانے لگا۔ "اس طرف جو چھ بستیاں ہیں ان میں سے پانچ بستیوں کے سردار یہاں موجود ہیں' صرف قلاوز یہاں نہیں ہے مگر میرے اندازے کے مطابق وہ بڑا موقع پرست ہے۔ جب اسے یہ معلوم ہو گا کہ اس طرف کے پانچوں قبیلے تجھ سے مل گئے ہیں اور وہ اکیلا رہ گیا ہے تو ہرگز اپنی اور اپنے قبیلے کی تباہی و بربادی کو آواز نہیں دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ژیان کا نائب ہونے کے باوجود تیرے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے گا۔ یوں تُو کسی مزاحمت کے بغیر اس طرف سے وادی سبز پر حملہ کر سکے گا اور جیسا کہ تُو سن چکا ہے' تین مغربی بستیوں میں سے ایک کا سردار صنعیہ بھی ہم سے اتحاد کر لے گا کہ وہ ژیان کا زخم خوردہ ہے۔ یوں

ژیان کی مدد پر مغرب میں آباد صرف دو چھوٹے قبیلے رہ جائیں گے۔ ان سے نمٹنا میرے خیال میں مشکل نہیں ہو گا۔" وسیط نے تفصیل کے ساتھ پورے علاقے کی صورت حال پر روشنی ڈالی اور آخر میں دریافت کیا۔ "اے سردار نضار! اگر تُو کہے تو میں تیری طرف سے سردار صنعیہ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کروں؟"

"تجھے میری طرف سے یہ اختیار ہے اے وسیط!" نضار نے اجازت دے دی' مگر اسی کے ساتھ تاکید کی۔ "رازداری بہرحال ضروری ہے' تجھے اس کا بہرحال خیال رکھنا ہو گا کیونکہ ہم اچانک دشمن پر ٹوٹ پڑنا چاہتے ہیں۔"

"اے سردار نضار! یہ بوڑھا تیری تاکید کا پورا خیال رکھے گا۔" وسیط نے یقین دہانی کرائی۔

"اے سردار اشر کے بہادر بیٹے!" ایک سردار نے نضار کو مخاطب کیا۔ "میری ایک خواہش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہاں موجود دوسرے قبیلوں کے سردار بھی یہی خواہش کریں گے کہ تُو اس علاقے میں ہمیں اپنا نائب کہلائے جانے کا اعزاز بخش دے۔"

اس پر دوسرے سرداروں نے بھی تائید کی۔

"اے محترم سردارو! میں تمہیں اپنا نائب نہیں دوست سمجھتا ہوں اور دوستی برابر کی سطح پر پروان چڑھتی ہے۔ میں اسے اپنے لئے اعزاز سمجھوں گا کہ تمہارا دوست کہلاؤں۔ میں حاکم و محکوم کے بجائے تم سے دوستی کا رشتہ استوار کرتا ہوں کہ محکوم تو ژیان کی طرح آنکھیں بھی پھیر لیتے ہیں مگر دوست ہمیشہ وفادار رہتے ہیں' دوست کبھی نہیں بدلتے۔" نضار کی آواز شدت جذبات سے بوجھل ہو گئی اور پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "آؤ اے میرے دوستو! میرے گلے سے لگ جاؤ کہ میں فخر کر سکوں' مجھے وفادار دوست میسر ہیں۔ ژیان پر فتح حاصل کرنے کے بعد تم سب پہلے ہی کی طرح اپنے اپنے علاقوں میں آزاد اور خودمختار رہو گے۔ سردار اشر کا بیٹا تم سے دوستی کا عہد کرتا ہے۔"

"اے بہادر باپ کے بہادر بیٹے! تُو نے ہمیں بے دام خرید لیا ہے۔" ایک سردار آگے بڑھتے ہوئے بولا اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ نضار سے گلے ملا۔

پھر وسیط سمیت باری باری نضار سبھی سے گلے ملا۔ ابھی کچھ دیر پہلے نضار کے متعلق ایک سردار نے اپنے جن جذبات کا اظہار کیا تھا' میرے خیال میں وہ ہے بھی ویسا ہی تھا۔ نضار نے واقعی ان سب کو بڑی ذہانت سے اپنا گرویدہ اور جاں نثار دوست بنا لیا تھا۔ بڑائی دراصل یہی ہے کہ جو حاصل ہو سکتا ہے' حاصل نہ کیا جائے اور اسے دوسروں کا حق سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔ نضار کو یقیناً ان سرداروں پر ہر اعتبار سے برتری حاصل تھی اور خود انہوں نے نضار کی نیابت کے لئے خود کو پیش کیا تھا۔ نضار انہیں خود انہی کی مرضی کے مطابق اپنا نائب بنا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ نضار نے انہیں برابری کا حق دے کر گویا ان کے دل جیت لئے تھے اور دلوں کو فتح کر لینا ہی تو اصل فتح ہے۔

جب وہ اہم اجلاس کچھ دیر بعد ختم ہوا اور چاروں قبیلوں کے سردار رخصت ہو گئے تو میں بہت خوش تھی۔ نضار اور میں نے بغیر جنگ کئے دشمن کی پانچ بستیاں فتح کر لی تھیں۔ سردار وسیط کیونکہ

مہمانوں کے ساتھ کھانا کھا چکا تھا اس لئے رات کے کھانے پر میرے اور نضار کے ساتھ صرف شینا تھی۔ اس نے بھی ہماری وجہ سے اب تک کھانا نہیں کھایا تھا۔

کھانے کے دوران پہلی مرتبہ میں نے یہ بات محسوس کی کہ شینا بار بار نظر بچا کر نضار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت شینا کے چہرے پر ایسے ہی جذبات کا عکس تھا کہ میں چونک اٹھی' یقیناً وہ نضار کی مردانہ وجاہت سے متاثر ہو گئی تھی اور شاید اسے اپنا دل دے بیٹھی تھی۔

"تُو پھر کب آئے گا اے نضار!" شینا جیسے نضار پر قربان ہو جانے والے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"شاید اب اسی وقت آنا ہو اے شینا جب دشمن سے آخری معرکے کی نوبت آئے۔" نضار نے پانی کا کٹورا اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اے نضار! تیرے آنے کا انتظار کروں گی۔" شینا خواب آلود سے لہجے میں بولی۔ "تُو شاید اس خیال سے جلد آ جائے کہ کوئی تیرا منتظر ہو گا۔" اس پر نضار نے چونک کر شینا کی طرف دیکھا۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی شینا کے لفظوں میں چھپے ہوئے جذبات کو سمجھ گیا ہو گا۔ حیرت کے بعد نضار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی پھر اس نے کہا۔ "تجھے معلوم ہے اے شینا کہ جب ہم دشمن کو مغلوب کر لیں گے تو کیا ہو گا؟"

میں نضار کے اس سوال کی گہرائی تک پہنچ گئی۔ یقیناً وہ اس معصوم اور بیمار لڑکی کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور کر دینا چاہتا تھا۔ شاید نضار اسے یہ بتاتا کہ اس جنگ کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے میرا ہو جائے گا' مگر میرے نزدیک یہ ظلم تھا۔ کسی کی امیدوں کے چراغ یوں ایک دم نہیں بجھائے جاتے۔ یوں بھی وہ بھولی لڑکی اچانک یہ صدمہ برداشت نہ کر پاتی کہ وہ تو پہلے ہی سے بیمار تھی۔

"دشمن کو زیر کر لینے کے بعد شاید .... شاید تُو کسی کی پیشانی پر بوسہ دے گا۔" شینا جذبات سے بوجھل آواز میں بولی۔ ان پہاڑی بستیوں میں ہمیشہ کے لئے مرد اور عورت ایک دوسرے کو قبول کرنے کا اظہار اسی طرح کرتے تھے۔

"تُو یقیناً بہت ذہین ہے شینا! تُو نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔" یہ کہتے ہوئے نضار نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔

پھر نضار کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ اچانک میں بول اٹھی۔ "وہ کس خوش نصیب دوشیزہ کی پیشانی ہو گی اے شینا! ابھی تک نضار نے مجھے بھی اس راز سے آگاہ نہیں کیا۔ شاید ابھی اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" میرے ان الفاظ کا مقصد نضار کو محض یہ باور کرانا تھا کہ وہ اظہار حقیقت سے گریز کرے۔

میری بات سن کر شینا نے بڑی قاتل نظروں سے نضار کو دیکھا اور کہنے لگی۔ "شاید اسے خود بھی معلوم نہیں ہو گا کہ اس کے ہونٹ کس کی پیشانی کو یہ عزت بخشیں گے' کیوں اے نضار! میں نے یہ اندازہ بھی ٹھیک ہی لگایا ہے نا؟"

نضار کچھ سٹپٹایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "ہاں شاید۔"

پھر جب شینا چلی گئی اور میں نضار کے ساتھ اس کمرے میں آ گئی جہاں ہمیں رات گزارنا تھی تو

میرے دل کی بات زبان پر آ گئی۔ "اے نضار! تُو وہی بات ابھی سے کسی پر کیوں ظاہر کرنا چاہتا ہے جو ابھی تک صرف تیرے اور میرے درمیان رہی ہے؟"

"مگر اے آتون! کیا تُو نے یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ .... وہ شینا مجھے کیسی نظروں سے دیکھ رہی تھی؟ کیا تُو یہ چاہتی ہے کہ اسے غلط فہمی کا شکار رہنے دیا جائے' اسے حقیقت نہ بتائی جائے؟" نضار کے لہجے میں بڑی بے بسی تھی۔

"مت بھول اے نضار کہ وہ معصوم لڑکی بیمار بھی ہے۔" میں بولی۔ "تُو اگر اسے یہ بتا دیتا کہ ژ پر فتح پانے کے بعد تیرا ارادہ مجھے اپنی بیوی بنانے کا ہے تو اس کے دل پر جانے کیا گزر جاتی' ممکن ہے کہ یہ صدمہ اسے مزید بیمار ڈال دیتا۔"

"لیکن اے آتون! اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس لڑکی کا دل رکھنے کی خاطر میں .... میں اپنے دل کا خون کر لوں۔" نضار نے کہا۔

"اے نضار! اگر وہ تیری محبت میں گرفتار ہو چکی ہے تو اس سے تیرے دل کے خون ہونے کا کیا تعلق۔ بھول جا اس کی باتوں کو' ہمیں کل ہی صبح تو یہاں سے چل دینا ہے۔ آنے والا وقت خود اسے بتا دے گا کہ محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔" میں نے نضار کو سمجھایا۔

پھر نضار نے اس معاملے میں کچھ نہیں کہا۔ معلوم نہیں وہ کچھ سمجھا تھا یا نہیں' میرا مقصد محض یہ تھا کہ شینا کی دل آزاری نہ ہو اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہی تھی۔

دوسرے دن صبح وسیط نے اغوا شدہ لڑکیوں کو ان کی بستیوں میں بحفاظت بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔ ہم نے بھی وسیط سے رخصت کی اجازت چاہی۔ اس نے مسلح محافظوں کا ایک دستہ بھی ہمارے ساتھ کر دیا کہ وہ ہمیں بحفاظت ژیان کے زیر نگیں علاقے سے نکلنے میں مدد دے سکے۔ وسیط نے دستے کے سالار کو یہ ہدایت دی تھی کہ قلاوز کی بستی میں داخل ہوئے بغیر ہمیں دوسرے راستوں سے سرحد عبور کرا دے۔

رخصت ہوتے وقت ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے نضار کو پریشان کر دیا۔ جس وقت ہم روانگی کی تیاری کر رہے تھے تو شینا آ گئی۔ اس نے اچانک آگے بڑھ کر نضار کی پیشانی چوم لی۔ پہاڑی بستیوں کی روایات کے مطابق جب کوئی عورت کسی مرد کی پیشانی کو یوں چوم لے تو اس کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ عورت اس مرد کی بیوی بننا چاہتی ہے۔ جواب میں اگر مرد بھی عورت کی پیشانی چوم لیتا ہے تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ مرد نے بھی عورت کی پیشکش کو قبول کر لیا ہے' مگر نضار نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ایسا کرتا تو بھی کیسے کہ مجھ سے عہد وفا باندھ چکا تھا۔ میں نے جس لمحے سے اب تک گریز کیا تھا' آخرکار وہ لمحہ آ ہی گیا۔ عموماً عورتیں خود پیش قدمی نہیں کرتیں لیکن کرتی ہیں تو پھر مرد کی طرف سے اس کا جواب نہ ملنے پر اسے اپنی توہین خیال کرتی ہیں' یعنی مرد نے انہیں قبول نہیں کیا یا ٹھکرا دیا۔

جواب میں نضار نے جب شینا کی پیشانی پر بوسہ نہ دیا تو وہ چند لمحے تصویر حیرت بنی اسے دیکھتی رہی پھر میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ اس کے بعد وہ رکی نہیں اور تیزی کے ساتھ کمرے

سے نکل گئی۔ میں نے چاہا بھی کہ اسے آگے بڑھ کر روک لوں مگر ایسا نہیں کر سکی۔ شاید اس خیال نے میرے قدم روک لئے تھے کہ میں شینا سے کہتی بھی تو کیا کہتی۔ اسے کس طرح دلاسہ دیتی۔ میرے بس میں تھا بھی کیا۔ غنیمت یہ تھا کہ شینا کو نضار کی پیشانی چومتے ہوئے میرے سوا کسی اور نے نہیں دیکھا تھا۔ کمرے میں اس وقت نضار کے ساتھ صرف میں ہی تھی۔

کچھ ہی دیر کے بعد میں اور نضار محافظوں کے ساتھ وسیط کی بستی سے روانہ ہو گئے۔

☆======☆======☆

راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور ہم دوپہر ہوتے ہوتے ژیان کے زیر اثر علاقے سے نکل آئے۔ اتنی دیر بھی اس لئے ہوئی تھی کہ قلاوز کی بستی سے نہ گزرنے کی خاطر ہمیں ایک طویل راستہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ جب ہم خطرے کی حدود سے باہر آ گئے تو وسیط کے محافظوں کو واپس بھیج دیا۔

تیسرے پہر ہم اشرکی بستی کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ یہ وہی پہاڑی سلسلے تھے جہاں کبیت والے آباد تھے۔ یہ پہاڑی سلسلے ہماری دائیں جانب تھے۔ ادھر سے گزرتے ہوئے مجھے بریسا کا خیال آیا جسے میں نے کبیت والوں کا سردار بنا دیا تھا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوا۔ اس طرف ابھی تک نہ میرا خیال گیا تھا اور نہ ہی نضار نے شاید اس طرف توجہ دی تھی۔ کبیت والے یقیناً بہترین لڑاکا تھے' مگر کیا وہ ژیان کے ساتھ ممکنہ جنگ میں ہمارے کام آ سکتے تھے؟ اس سوال کا جواب نفی ہی میں تھا۔ وجہ وہی کہ وہ قدیم طریقہ جنگ ہی کے عادی تھے اور قدیم ہتھیاروں سے لڑنا ہی جانتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی بندوق' ریوالور یا رائفل چلانا نہیں جانتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ ہمارے لئے بے سود ہو کر رہ گئے تھے۔ میرے خیال میں انہیں جدید ہتھیار چلانے کی تربیت دینا بہت ضروری تھا۔ اس جنگی تربیت کے بغیر وہ ہمارے شانہ بشانہ نہیں لڑ سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ بستی میں پہنچنے کے بعد یہ گفتگو نضار سے ضرور کروں گی۔ اس کے علاوہ میرے سامنے ایک اور مسئلہ بھی تھا جو ذہنی الجھن کا سبب بنا ہوا تھا۔ عظیم مہین کے حکم کے مطابق میں اور نضار بوڑھے ساحر زعیم کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے کیونکہ وہ فرار ہو گیا تھا۔ فرار ہو کر وہ کہاں گیا تھا ہم اس سے لاعلم تھے۔ سرگوشیوں میں ہمیں جو حکم دیا گیا تھا' وہ یہ تھا کہ ساحر زعیم سے نمٹنے کے بعد ہی ہمیں ژیان پر حملہ کرنا ہے۔ میری ذہنی الجھن کا سبب یہ سوال تھا کہ ہم ساحر زعیم کو ختم کئے بغیر کیا وادی سبز پر حملہ کر سکتے ہیں؟ ہمارے لئے ایسا کرنا کہیں عظیم مہین کے حکم سے سرتابی تو نہیں ہو گی؟ اس وقت بھی اشرکی بستی کی طرف جاتے ہوئے میرا ذہن اسی مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔

پہاڑی درے سے پہلے اور چشمے کے قریب پہنچتے پہنچتے اچانک مجھے پُراسرار سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ "اے معبلہ! اور اے نضار! تم دونوں کو مبارک ہو کہ تم نے بدی کا ٹھکانا اجاڑ دیا اور فتح مند ہوئے۔ بدی کا وہ ہرکارہ کہ اس پر دیوتاؤں کی لعنت ہو' فرار ہو کر وادی سبز پہنچ گیا ہے۔ اس نے اب وادی سبز کے گرداگرد موجود پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو اپنا مسکن بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ مینار نما پہاڑ وادی سبز کی مغربی سمت میں ہے اور یہ اپنی الگ ساخت اور بناوٹ کی وجہ سے باآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ وہ

یعنی ساحر اب وادی سبز کی مغربی سمت میں بسنے والی تین بستیوں کو اپنی شکارگاہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس مینار نما پہاڑ سے قریب ترین بستی صنعیہ ہے اور وہاں تم دونوں کو وسیط ہی کی طرح پناہ دینے والا موجود ہے۔ تمہیں اس طرف جانے کا حکم ہے' مگر سات دن گزر جانے کے بعد تم ادھر کا رخ کرو گے۔ اس تاخیر میں جو مصلحت ہے' وقت آنے پر خود ہی تمہیں اس کا علم ہو جائے گا۔ تم وہاں پہنچ کر اپنے دشمن کے بہت قریب ہو گے اور تمہیں اپنے دشمن کے بارے میں کچھ ایسی نئی باتوں کا علم ہو گا جو اب تک تمہارے علم میں نہیں تھیں۔ تمہارے لئے حکم اب بھی وہی ہے کہ جو پہلے تھا۔ تمہیں پہلے ساحر زعیم کو ختم کرنا ہے' اسی کے بعد وادی سبز پر حملہ کرنا تمہارے لئے مقدر کیا جا چکا ہے۔ اس مرحلے پر بھی تم آزمائشوں سے گزرو گے' مگر جی نہ ہارنا اور یقین رکھنا کہ نیکی ہی بدی پر غالب آئے گی۔......

ان الفاظ کے ساتھ ہی سرگوشیاں آنا بند ہو گئیں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اور نضار کو ایک ساتھ مخاطب کیا گیا تھا اور ہدایات دی گئی تھیں۔ میں اب تک جس ذہنی الجھن کا شکار تھی' وہ ختم ہو گئی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بوڑھا ساحر زعیم فرار ہو کر کہاں گیا ہے۔ موجودہ مرحلہ مجھے پہلے مرحلے سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک معلوم ہو رہا تھا۔ ہمیں اب وادی سبز کے بالکل قریب پہنچنا تھا' وہ بھی فوج کو ساتھ لئے بغیر۔ اس سلسلے میں اگر ہمارے دشمن کو ذرا سی بھی سن گن مل جاتی تو وہ ہمیں ہرگز زندہ نہ چھوڑتا۔ وادی سبز سے بستی صنعیہ کا فاصلہ خاصا کم تھا پھر ہمیں تو بستی صنعیہ سے بھی آگے بڑھ کر مینار نما پہاڑ تک پہنچنا تھا۔

"تو کیا سوچنے لگی اے آتون!" اچانک نضار نے مجھے مخاطب کیا۔

میں چونک کر بولی۔ "انہی سرگوشیوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں اے نضار جو تجھے بھی یقیناً سنائی دی ہوں گی۔"

"اے آتون! اگر بستی میں کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہے' یعنی یہ کہ ہم دونوں وادی سبز کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو جو بھی سنے گا شاید ہمیں پاگل ہی کہے گا۔" نضار یہ کہتے ہوئے آہستہ سے ہنسا۔

"اور شاید یہ بھی خیال کرے کہ ہمارا ارادہ خودکشی کرنے کا ہے۔" میں بھی ہنس کر بولی۔ "یہ تو خیر بعد کی بات ہے اے نضار! کسی کو اگر ہم یہی بتا دیں کہ کہاں سے آ رہے ہیں تو ہماری باتوں پر یقین نہ کرے گا لیکن ہم پُریقین ہیں کہ آخرکار فتح ہمی کو ہو گی۔ اس وقت بھی تو ہم دونوں بغیر کسی لشکر کی مدد کے دشمن کی پانچ بستیوں کو فتح کر کے آ رہے ہیں۔"

"میں تو بہت ڈرا ہوا تھا اے آتون کہ جب تو وسیط سے گفتگو کر رہی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ جیسے ہی وسیط کو معلوم ہو گا تو کون ہے اور میں کون ہوں تو وہ ہم دونوں کو گرفتار کر لے گا مگر تو بڑی مردم شناس ہے۔ تو نے وسیط کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔" نضار بولا۔

"اے نضار! میری مردم شناسی کا کیا یہی ثبوت کافی نہیں کہ میں نے تجھے پہچان لیا؟"

"میں تو پھر بھی تیرے سامنے کسی کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھا اے آتون! مگر وسیط کو پہچاننا واقعی

بہت مشکل تھا۔ بلاشبہ تو نے اسے پہچان کر کمال کر دیا اور پھر جس طرح دھیرے دھیرے تو اسے راہ پر لائی تیرے ہی لئے ایسا ممکن تھا۔ تیری جگہ اگر میں ہوتا تو ہرگز اتنی ہمت نہ کر سکتا۔"

اپنی تعریف کسے اچھی نہیں لگتی۔ مجھے بھی اچھی لگی' خاص طور پر نضار کی زبان سے۔ مگر اس وقت مجھے شرارت سوجھی اور نضار کو چھیڑنے کی خاطر شینا کا ذکر چھیڑ دیا۔ "مگر اے نضار! وسیط کی بیٹی کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ اسے تو میں بھی نہیں پہچان سکی تھی۔"

"چھوڑ اے آتون! اس کی بات نہ کر۔" یہ کہہ کر وہ اس طرح شرمانے لگا جیسے لڑکیاں عموماً اپنے عاشق یا شوہر کے ذکر پر شرما جاتی ہیں۔

اس لمحے نضار مجھے بہت اچھا لگا شاید سارے ہی مرد شرماتے ہوئے اچھے لگتے ہیں مگر صرف عورتوں کو۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "اے نضار! تیرا کیا بگڑ جاتا اگر تو بھی جواب میں شینا کی پیشانی چوم لیتا؟"

"تو کیوں مجھے تنگ کرنے پر تُلی ہوئی ہے اے آتون! تیرے سوا میں کسی کو اپنی بیوی بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"کیوں کیا ہوا؟ مرد تو ایک ساتھ کئی کئی عورتوں کو اپنی بیویاں بنا کر رکھتے ہیں؟"

"لگتا ہے اے آتون کہ اس وقت تیرے اندر احرس کی روح داخل ہو گئی ہے' جبھی تو ایسی باتیں کر رہی ہے۔" نضار نے احرس کا ذکر چھیڑ کر گویا مجھ پر جوابی حملہ کیا۔ "احرس ہی اس طرح کی باتیں کرتا ہے۔ تو اس کے ساتھ یوں بھی طویل عرصے سے رہی ہے' تجھ میں اس کا اثر تو آنا ہی تھا۔"

اب ہم پہاڑی درہ عبور کر کے اور درمیانی میدان سے گزرنے کے بعد بستی میں داخل ہو چکے تھے۔

"کیا تجھے احرس اب بھی اپنا رقیب معلوم ہوتا ہے؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"اس وقت تک تو معلوم ہو گا جب تک کہ تو ہمیشہ کے لئے میری نہیں ہو جائے گی۔ یوں بھی تو نے ابھی تک میری قسمت کا فیصلہ نہیں سنایا اے آتون!"

"ایسے فیصلے انسان نہیں دیوتا کرتے ہیں۔" میں نے اسے ٹال دیا۔

"مگر تو بھی تو دیوی ہے۔ تجھے بھی تو فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔" نضار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "وہی پرانی بات نہ کہہ دینا کہ ابھی فیصلے کا وقت نہیں آیا۔"

"وہ تو میں کہوں گی اے نضار!" میں ہنس کر بولی۔

حویلی اب سامنے ہی نظر آنے لگی تھی اس لئے نضار نے مزید کچھ نہیں کہا۔ احزم کو ہماری آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے حویلی کے باہر ہمارا استقبال کیا۔ اسے شاید ہماری واپسی کی اتنی جلد توقع نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر اسی لئے حیرت نظر آ رہی تھی۔ اس کی حیرت کا سبب شاید ہمارے جسموں پر موجود لباس بھی تھا اور ہمارے شانوں سے لٹکی ہوئی رائفلیں بھی۔ ہمیں احزم ہی نے رخصت کیا تھا۔ میں اس وقت مردانہ لباس میں تھی جبکہ اب ایسا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس رائفلیں بھی نہیں تھیں۔ معمولی لباس کے بجائے اب ہمارے جسموں پر قیمتی لباس تھا۔

"تُو جلد لوٹ آیا اے سردار!" آخر احزم نے کہہ ہی دیا۔ اب ہمارے ساتھ ساتھ حویلی میں داخل ہو رہا تھا۔ ہم نے اپنے گھوڑے حویلی کے دروازے پر موجود محافظوں کے حوالے کر دیئے تھے۔ "مجھے تیرے اور آتون کے اتنی جلدی لوٹ آنے کی امید نہیں تھی۔"

"ہاں اے میرے دانشمند نائب! خود ہمیں بھی اس قدر جلد کام ختم ہو جانے کا خیال نہیں تھا۔" نضار نے دھیمی آواز میں احزم سے کہا' پھر بولا۔ "مگر ہمیں سات روز بعد پھر اسی طرح یہاں سے روانہ ہونا ہے۔"

"کیوں اے سردار! کیا وہ کام ہوا نہیں جس کے لئے تُو گیا تھا؟" احزم نے بھی آہستہ آواز میں پوچھا۔

"کام ادھورا رہ گیا۔" نضار نے بتایا۔ "اسی ادھورے کام کو پورا کرنے کے لئے ہمیں دوبارہ جانا ہے۔ ہماری غیر موجودگی میں کوئی قابل ذکر بات تو نہیں ہوئی؟"

"اور تو کچھ نہیں اے سردار! ہاں احرس مجھ سے ضرور خفا ہے۔" احزم نے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟" اس مرتبہ میں بول اٹھی۔

"اس پر خفا ہے کہ میں نے اسے آپ دونوں کی روانگی سے کیوں مطلع نہیں کیا؟"

"پاگل ہے وہ بھی' ہے کہاں؟" میں نے معلوم کیا۔

"اپنے کمرے میں ہو گا یا پھر مہا پجاری کے پاس۔"

"ٹھیک ہے' میں اس کا دماغ درست کرتی ہوں' تُو فکر نہ کر۔" میں احزم سے بولی۔ "مہا پجاری تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں اے آتون! پہلے سے بہت بہتر ہے مگر طبیب اب بھی اسے دوائیں دے رہا ہے۔ معمولی جسمانی کمزوری باقی ہے جو عموماً بیماری کے بعد ہو جاتی ہے۔"

پھر نضار تو اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اور میں سیدھی اس طرف بڑھ گئی جہاں مہا پجاری اور احرس کے کمرے تھے۔ مہا پجاری کی صحت یابی کے بعد احرس اپنے کمرے میں منتقل ہو گیا تھا۔ پہلے میں اسی سے ملنا چاہتی تھی۔ میں اسی لئے مہا پجاری کے کمرے کے دروازے پر رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ خلاف توقع مجھے احرس کے کمرے کا دروازہ بند ملا تو حیرت ہوئی۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازے کے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا احرس نہیں بلکہ ایک خوبصورت خادمہ تھی۔ اس پر مجھے مزید حیرت ہوئی۔ احرس مجھے سامنے ہی بستر پر دراز نظر آیا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور پھر میرے بجائے خادمہ کو آواز دی۔

خادمہ پلٹ کر دوبارہ اس کے پاس پہنچ گئی تو احرس نے اس سے کہا۔ "اسی طرح بیٹھ کر سر .... سر دبا کہ جیسے دبا رہی تھی۔" اس کی آواز بھاری اور بوجھل سی تھی۔

مجھے احرس کے کمرے میں اس خوبصورت خادمہ کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں اس کے رویے پر بھی حیران تھی۔ احرس کے حکم پر وہ خوبصورت خادمہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور پھر

میری طرف چور نظروں سے دیکھ کر قدرے جھجکتے ہوئے اس نے احرس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور دبانے لگی۔

"احرس!" میں نے آگے بڑھ کر اسے مخاطب کیا۔ "مجھے تجھ سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"تو کر تجھے کس .... کس نے روکا ہے؟" وہ بدستور بھاری آواز میں بولا۔

"مجھے اس کے لئے تنہائی چاہئے۔" میں براہ راست اس خادمہ سے جانے کو نہیں کہنا چاہتی تھی۔

"تو پھر جب تُو مجھے تنہا دیکھے تو آ جانا۔" اس کے لہجے میں اجنبیت تھی۔

"احرس!" میری آواز میں احتجاج تھا۔ "تیرا دماغ تو درست ہے؟"

"ہاں اب .... اب درست ہو گیا ہے' پہلے شاید .... درست نہیں تھا۔" وہ بولا۔

مجبوراً مجھے ہی خادمہ کو وہاں سے جانے کا حکم دینا پڑا۔ اس پر خلاف توقع احرس کچھ نہیں بولا۔ خادمہ چلی گئی تو میں آگے بڑھ کر اس کے پاس پہنچ گئی اور کہا۔ "یہ سب کیا ہے اے احرس! .... اٹھ کر بیٹھ۔" مجھے کچھ بدبو سی بھی محسوس ہوئی۔

"مجھے یونہی لیٹا رہنے دے اے آتون! اس طرح زیادہ لطف محسوس ہو رہا ہے۔"

میں نے اس کے سرہانے بیٹھ کر دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں گہری سرخی نظر آئی' چہرہ بھی کچھ بدلا بدلا اور سوجا ہوا سا لگا۔

"تجھے ہوا کیا ہے؟" میں پھر بولی۔ "تیری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟"

"اس لئے اے آتون کہ میں نے نشہ کرنا شروع کر دیا ہے........." اس نے بتایا۔

"نشہ!" میں حیرت سے بولی۔ "کیسا نشہ؟"

"پھلوں کو سڑا کر یہاں کے لوگ ایک مشروب بناتے ہیں۔ میں نے ایک خادم کو یہ مشروب پیتے دیکھا تھا۔ اس کی بیوی حال ہی میں مر گئی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اپنی بیوی کو بھلانے کے لئے وہ مشروب پی رہا ہے۔" احرس بتانے لگا۔ مجھے .... مجھ کو بھی کسی .... کسی کو بھلانا تھا' سو میں نے بھی خادم سے وہ .... وہ مشروب منگوا کر پینا شروع کر دیا۔ تُو جب سے گئی تھی' اسی .... اسی وقت سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میں .... یہ مشروب پی رہا ہوں۔ خادم ہی نے بتایا تھا کہ اسے پینے سے نشہ ہوتا ہے .... سو میں اس .... اس وقت بھی نشے میں ہوں۔"

"اور وہ خوبصورت خادمہ تیرے کمرے میں کیوں تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"عورت ہر مرد کی ضرورت ہوتی ہے اور .... اور میرا خیال ہے کہ ساری ہی عورتیں کم و بیش ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ وہ مشروب پینے کے بعد پہلی مرتبہ مجھے یہ بات معلوم ہوئی۔ میں جب .... جب آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور .... اور وہ خادمہ میرے پاس ہوتی ہے تو مجھے یوں .... یوں لگتا ہے جیسے تُو میرے پاس ہے۔" احرس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بولے جا رہا تھا۔ "تیری جدائی .... یوں .... اس طرح مجھ پر گراں نہیں گزری۔"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ احرس میرے پیچھے یوں غلط راہ پر چل نکلے گا۔

"مم .... میں تجھے چاہتا ہوں .... تجھ سے محبت کرتا ہوں اور .... تجھی کو اپنی بیوی بنا
چاہتا ہوں۔ خود .... خود تجھے بھی یہ معلوم ہے' مگر .... تُو .... تُو اے آتون! یہاں ....
یہاں آ کر بدل گئی۔ تُو نے مجھے ٹھکرا دیا اور .... اور میرے بجائے تُو نضار کی ہو گئی..........." احر
کہہ رہا تھا' وہ سب کچھ جو اس نے اب سے پہلے نہیں کہا تھا۔ شاید نشے نے اس میں اتنی ہمت پیدا کر
تھی۔ مجھے اس کی زبان سے یہ سب کچھ سن کر انتہائی حیرت ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے
دوستی کا نام دیتی آئی تھی' وہ صرف دوستی نہیں تھی۔ اس کے دل کا بات زبان پر آ گئی تھی۔

"تُو اس وقت نشے میں ہے اے احرس!" میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تجھ سے اب میں ا
وقت بات کروں گی جب تُو نشے میں نہیں ہو گا۔"

"اب تو مم .... میں .... تجھے نشے ہی میں .... ملوں گا .... ہاں۔" وہ بڑبڑایا۔

"نہیں' اب تُو نشہ نہیں کرے گا اے احرس!" میں نے سخت آواز میں کہا۔

"تُو .... تُو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی؟ .... تجھ .... تجھ سے میرا کیا رشتہ؟
.... تُو اپنے عاشق کے ساتھ جا' وہ .... وہ مانے گا تیرا حکم۔" اس نے اپنی سرخ آنکھیں کھول
میری طرف دیکھا اور ہاتھ لہرایا۔ "جا .... اسی کے پاس جا' مجھے .... میرے حال پر چھوڑ دے۔"

اس حالت میں احرس سے کچھ کہنا لاحاصل ہی تھا۔ میں اسی لئے مزید کچھ کہے بغیر اس کے کمر
سے نکل آئی پھر میں نے مہا پجاری کے کمرے کا رخ کیا۔

"تُو آ گئی اے میری بچی!" مہا پجاری اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ بھی آرام کر رہا تھا اور مجھے کمرے م
داخل ہوتے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔

"لیٹا رہ اے مہا پجاری!" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا مگر وہ اس وقت تک اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

میں اس کے قریب جا بیٹھی اور پوچھا۔ "اب تیری طبیعت کیسی ہے؟"

"پہلے سے بہت اچھا ہوں میں تو' مگر وہ .... وہ اچھا نہیں ہے احرس اور .... اور اسے تُو ہ
سمجھا سکتی ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے میری بات نہیں مانی۔ دراصل
جاتے وقت تُو اس سے مل کر نہیں گئی تھی نا' اس پر وہ بہت برہم تھا۔ غصے کے عالم ہی میں اس نے احر
کو بھی بُرا بھلا کہہ دیا تھا۔ کسی خادم کو شفتالی پیتے دیکھ کر وہ بھی نشہ کرنے لگا ہے۔ وہ سڑے ہوئے پھلوں
سے بنایا جانے والا مشروب پینے لگا ہے۔" مہا پجاری نے بتایا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی احرس کی حرکتوں
سے غافل نہیں تھا۔ معلوم نہیں نشے کے علاوہ ایک خوبصورت خادمہ سے احرس کے تعلقات کا بھی مہ
پجاری کو علم تھا یا نہیں۔ مگر یہ ایسی بات تھی کہ مہا پجاری سے میں اس سلسلے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتی
تھی۔ سڑے ہوئے پھلوں سے بنائے جانے والے مشروب کو وہ "شفتالی" کہتے تھے۔

"میں اسی کے پاس سے آ رہی ہوں اے مہا پجاری!" میں بولی۔ "اب میں آ گئی ہوں' تُو احرس کی
طرف سے فکرمند نہ ہو۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا' مگر اس وقت وہ نشے میں ہے' کچھ نہیں سن رہا۔ میں اس کا
بندوبست کر دوں گی۔"

"اس کی ایک بات نے مجھے اور حیران کر دیا ہے میری بچی!" مہا پجاری نے کہا۔ "کل وہ نشے کی حالت میں مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تجھے نضار سے چھین لے گا اور اپنی بیوی بنائے گا' چاہے اس کے لئے اسے نضار کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

"کیا؟" میں چونک اٹھی۔ "وہ اس طرح کی باتیں کر رہا تھا؟"

"ہاں۔" مہا پجاری نے جواب دیا۔ "مجھے یہ خطرہ ہے کہ کہیں وہ نشے میں کسی اور کے سامنے ایسی باتیں نہ کرنے لگے۔ اگر نضار یا اس کے نائب احزم تک یہ بات پہنچ گئی تو بہت بُرا ہو گا۔ مجھے بتا' کیا اس نے کبھی تجھ سے بھی ایسی کوئی بات کی تھی؟"

"کبھی نہیں اے مہا پجاری! مجھے خود حیرت ہے کہ اچانک اسے کیا ہو گیا ہے؟ اگر اس نے تجھ سے نضار کو قتل کرنے کی بات کی ہے تو یہ بات ایسی نہیں کہ اسے نظرانداز کر دیا جائے۔ اسے قطعی طور پر بے لگام ہونے سے پہلے روکنا پڑے گا اور .... اور مجھے یقین ہے کہ میں روک لوں گی۔ تُو آرام کر' میں چلتی ہوں۔"

میں مہا پجاری کے پاس سے اٹھ آئی۔ مجھے پہلے بھی تھوڑا بہت اندازہ ضرور تھا کہ احرس کے دل میں میری محبت ہے مگر اس محبت میں اتنی شدت ہو گی' یہ معلوم نہیں تھا۔ نہ مجھے یہ خبر تھی کہ وہ زندگی بھر کے لئے میرا ساتھ چاہتا ہو گا۔ میں اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ نضار کو کوئی قطعی جواب نہ دے کر مجھ سے نادانستگی میں اچھا ہی ہوا ہے۔ اب احرس کے دل کی بات زبان پر آ جانے کے بعد مجھے کسی فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہوتی۔ پہلے تو میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو مطمئن کر دیا تھا کہ احرس نے براہ راست کبھی مجھے اپنانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا مگر اب ایسا نہیں تھا۔ وہ اظہار مدعا کر چکا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے اس خوبصورت خادمہ کو طلب کر لیا جسے احرس کے پاس دیکھا تھا۔ اس کا نام ذالی تھا۔

"اے ذالی! پہلے مجھے یہ بتا کہ احرس کو شفتالی کون لا کر دیتا ہے؟" میں نے خادمہ سے دریافت کیا۔

"پہلے دن تو اس نے زبون سے شفتالی لے کر پی تھی' پھر مجھ سے منگوانے لگا۔ میں کسی بھی خادم سے کہہ دیتی ہوں' وہ لا دیتا ہے۔" ذالی نے بتایا۔

"اور تُو .... تُو خود اس کے قریب ہوئی تھی یا اس نے ہی تجھے مجبور کیا تھا کہ..........."

ذالی نظریں جھکا کر کہنے لگی۔ "وہ .... وہ پہلے سے پئے ہوئے تھا۔ نشے میں اس نے مجھے حکم دیا کہ میں .... میں اسے اپنے ہاتھ سے پلاؤں اور .... اور پھر نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ .... وہ مجھے جانے کس لڑکی کے نام سے پکارنے لگا' شاید وہ مجھے معبلہ کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ مجھے معبلہ .... اے میری معبلہ کہتے ہوئے..........."

پھر ذالی نے ڈرتے جھجکتے وہ سب کچھ بتا دیا جو میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔ اس خادمہ کو میرا اصل نام معلوم نہیں تھا اسی لئے وہ یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ اسے زینت آغوش بناتے ہوئے دراصل

احرس مجھ سے اپنے ہجر کا ازالہ کر رہا تھا۔ وہ اس خادمہ زالی کو معبلہ سمجھ کر خود کو دھوکہ دے رہا تھا۔ ایک خادمہ تھی اور خادماؤں کا کام حکم ماننا ہوتا ہے۔ اسے احرس کی حیثیت کا اندازہ تھا اسی لئے احرس کی کسی خواہش کو ٹھکرانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں اس سلسلے میں اس سے جواب طلبی نہیں کر سکتی تھی۔ میرے نزدیک وہ بے قصور تھی۔

"کیا تیرے ساتھ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے؟" کچھ سوچ کر میں نے سوال کیا۔

"نہیں۔" زالی کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ "پہلی بار تو اب سے کئی سال پہلے جب میں چھوٹی ہی تھی تو .... تو میری ماں نے ایک رات سردار واہب کے پاس بھیجا تھا پھر .... پھر جب سردار حکم دیتا مجھے اس کے پاس جانا پڑتا تھا۔"

جانے کیوں مجھے یہ سوچ کر رنج سا ہوا کہ احرس نے ایک ایسی لڑکی کو معبلہ سمجھا جو پہلے ہی اپنا کنوار پن کھو چکی تھی۔ رنج کے ساتھ ہی مجھے اس پر شرمندگی سی بھی محسوس ہوئی۔ زرا دیر بعد میں نے اسے حکم دیا۔ "سن اے زالی! اب تُو احرس کے پاس تنہائی میں نہیں جائے گی۔ سمجھ گئی اس بات کا مطلب؟" زالی نے اقرار میں سر ہلا دیا تو میں نے اسے دوسرا حکم دیا۔ "اور اب تُو احرس کو شفتالی بھی منگوا کر نہیں دے گی۔ زبون اور دوسرے خادموں تک بھی میرا یہ حکم پہنچا دے کہ احرس کو کوئی بھی سڑے ہوئے پھلوں کا مشروب لا کر نہیں دے گا' سمجھ گئی؟"

"جی ہاں۔" زالی بولی۔

"اب تُو جا سکتی ہے۔" میں نے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔

"مگر......... مگر اے آتون! اگر......... اگر اس نے زبردستی کی تو؟" زالی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اس کے خوف کا اظہار آواز اور چہرے سے ہو رہا تھا۔

"جب اسے پینے کو شفتالی نہیں ملے گی تو وہ تجھ سے زبردستی نہیں کرے گا۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ میری دانست میں سارا فساد نشے ہی کا تھا۔ احرس نشے میں برے بھلے کی تمیز کھو بیٹھا تھا ورنہ وہ ایسا نہیں تھا کہ ایک خوبصورت خادمہ کو دیکھ کر اپنی حیثیت اور شرافت نفس کو بھول جاتا۔ میں اسے بچپن سے جانتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق زالی اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی۔ احرس کے قدم شاید اس سے پہلے نہیں ڈگمگائے تھے۔

زالی چلی گئی تو میں دیر تک احرس ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ رات کے کھانے پر نضار کے ساتھ احزم بھی تھا۔ میں نے مہا پجاری کو بھی بلوا لیا۔

"اور احرس کو نہیں بلوائے گی اے آتون!" نضار نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کے لئے کمرے ہی میں کھانا بھجوا دیا جائے گا۔"

"ہاں اے سردار!" احزم بولا۔ "میں نے بھی اسے کئی بار کھانے پر بلوایا مگر اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ مجھ سے خفا ہے اور اس وجہ سے یہاں نہیں آ سکتا تو میں الگ کھانا کھا لوں گا' تُو اے آتون! اسے بلوا لے۔"

"یہ بات نہیں ہے اے احزم! تُو بیٹھا رہ۔" میں نے احزم کو روک لیا۔

"پھر کیا بات ہے اے آتون! تُو اسے بلوا لے احزم اٹھ کر چلا جائے گا۔" نضار مجھ سے کہنے لگا۔

"بعد میں تجھے میں بتا دوں گی کہ کیا بات ہے' کھانا کھا۔" میں بولی۔

کھانا میرے ہی کمرے میں لگایا گیا تھا۔ احزم کو اپنے ساتھ لئے نضار خود میرے کمرے میں آ گیا تھا اور ایک خادم کو بلا کر کھانا لگانے کے لئے کہہ دیا تھا پھر میں نے مہا پجاری کو بھی وہیں بلوا لیا تھا۔ ابھی ہمیں کھانا کھاتے ہوئے کچھ دیر گزری تھی کہ میں نے کمرے کے باہر راہداری میں چیخ پکار سنی۔

"وہ کون ہوتی ہے مجھ پر پہرے بٹھانے والی .... چل' اسی کے سامنے چل کر بتا۔" احرس چیخ رہا تھا۔

"یہ .... یہ احرس کی آواز ہے شاید۔" نضار بولا۔ "مگر یہ کس پر چیخ رہا ہے؟ کیا بات ہو گئی ایسی؟"

نضار کی بات ختم ہوئی تھی کہ احرس' زالی کو گھسیٹتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور مجھ پر برس پڑا۔ "بول تُو نے اس سے منع کیا ہے کہ .... مجھے شفتالی لا کر نہ دے؟ بتا کہ تجھے کس نے یہ اختیار دیا جو تُو مجھے نشہ کرنے سے روک رہی ہے؟" پھر وہ نضار اور احزم کو گھورنے لگا جو میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

"اے احرس! ہوش میں آ۔" میں سخت لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔ "زالی کو چھوڑ دے' اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ میرا حکم ہے کہ تجھے نشہ نہ کرنے دیا جائے۔ سن لے کہ میں تجھے نشہ نہیں کرنے دوں گی اور تُو اپنی حد میں نہ رہا تو سختی کروں گی تجھ پر' مجھے حق ہے یہ۔"

کچھ لمحے احرس مجھے خالی خالی سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ لگتا تھا' اس کا نشہ ابھی اترا نہیں تھا اور وہ نشہ اترنے سے پہلے مزید نشہ کرنا چاہتا تھا۔ زالی کی کلائی اب اس نے چھوڑ دی تھی۔

"ہاں تجھے .... تجھے یہ حق تھا مگر .... مگر تُو نے خود .... خود ہی اپنا یہ حق کھو دیا۔" احرس خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑانے لگا۔ اب اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ اس نے آنسو پونچھے اور پھر بڑبڑایا۔ "اگر یہاں .... یہاں صرف تیرا ہی حکم چلتا ہے تو .... تو پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا .... نہیں رکوں گا میں یہاں .... تجھ سے دور چلا جاؤں گا' بہت دور......... " یہ کہہ کر احرس جانے کے لئے مڑا۔

"ٹھہر جا اے احرس!" میں نے اسے پکارا۔ ایک مرتبہ نضار ہی کی وجہ سے پہلے بھی وہ مجھے چھوڑ کر جا رہا تھا اور میں نے بڑی مشکل سے اسے روکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی کہ جب واہب سے شکست کھا کر مہا پجاری اور احرس اس پہاڑی سلسلے میں لشکر کو ساتھ لے کر چھپ گئے تھے جہاں اب کبیت والوں کو آباد کیا گیا تھا۔ میں اور نضار' ادل کی بستی سے وہاں ان لوگوں کی تلاش میں پہنچے تھے۔ آج پھر تقریباً ویسی ہی صورت حال سامنے آ گئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت احرس' رات کی تاریکی میں خاموشی کے ساتھ اٹھ کر جا رہا تھا اور اب اس نے سب کے سامنے یہ بات کہہ دی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ

عشق میں آدمی دیوانگی کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔ اب اس کا عشق میرے لئے راز نہیں رہا تھا جسے پہلے میں صرف اس کی جذباتیت سمجھتی رہی تھی۔ میرے کہنے پر وہ رک گیا تو میں نے مزید کہا۔ "اگر تیرے خیال میں اے احرس! میں اب تجھے کسی کام سے روکنے کا حق کھو چکی ہوں تو پھر آج کے بعد میں یہ حق استعمال نہیں کروں گی۔" پھر میں نے ذالی کو مخاطب کیا۔ "جو یہ کہتا ہے' وہ کرو' میں اپنا حکم واپس لیتی ہوں۔ ڈوب جانے دو اسے نشے میں۔" فی الحال احرس کو روکنے کا اس کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

میرا حکم سن کر ذالی چلی گئی تاکہ میرے حکم کی تعمیل کر سکے۔ احرس کو بھی بوجھل قدموں سے میں نے ذالی کے پیچھے جاتے دیکھا۔ وہ چلا گیا تو اس کے جاتے ہی میں نے حویلی کے محافظ دستے کے سالار کو بلا لیا۔ نضار یا کمرے میں موجود احزم یا مہا پجاری نے اس دوران میں کچھ نہیں کہا تھا۔ انہوں نے بھی میری طرح کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ محافظ دستے کے سالار کو میں نے حکم دیا کہ احرس کو حویلی سے نہ نکلنے دیا جائے۔

سالار تعظیماً سر جھکا کر بولا۔ "ایسا ہی ہو گا اے آتون دیوی! دستے کے تمام محافظوں کو میں تیرے حکم سے آگاہ کر دیتا ہوں۔"

میری اجازت پا کر سالار کمرے سے نکل گیا تو نضار نے مجھے مخاطب کیا۔ "اے آتون! آخر احرس کو کیا ہو گیا ہے' پہلے تو وہ ایسا نہ تھا۔"

"بتا دوں گی تجھے۔" میں طویل سانس لے کر بولی۔ "کھانا کھا۔"

کھانا کھانے کے بعد احزم اٹھ کر چلا گیا اور پھر مہا پجاری بھی وہاں نہیں رکا۔ وہ دونوں ہی سمجھ گئے تھے شاید کہ میں تنہائی میں نضار سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔

کچھ دیر کمرے میں بوجھل سا سکوت طاری رہا۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ نضار کو کیا بتاؤں' کیا نہ بتاؤں؟ پھر ایک نتیجے پر پہنچ کر میں نے ہی سکوت کو اپنی آواز سے توڑا۔ "اے نضار! تجھے تو معلوم ہے کہ وہ کس قدر جذباتی ہے' اسے رنج ہے کہ میں اس سے ملے بغیر خاموشی کے ساتھ تیرے.........."

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی نضار بول اٹھا۔ "مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں اے آتون کہ وہ خود کو نشے میں ڈبو کر ہم سب کو تماشہ بنا دے۔ معلوم ہے مجھے کہ وہ جذباتی ہے مگر ایسا بھی کیا کہ نہ اسے اپنی عزت کا کوئی خیال ہے' نہ تیری توقیر کا کوئی احساس۔" یہ کہتے ہوئے نضار کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

اس وقت نضار کے لہجے کی یہ ہلکی سی تلخی بھی مجھ سے برداشت نہ ہو سکی۔ میں اسی لئے اس سے بھی زیادہ تلخ آواز میں بولی۔ "تو پھر بتا کیا کروں میں؟ کیا اس سے کہہ دوں کہ یہاں سے چلا جائے؟ بول کیا چاہتا ہے؟ کیا اسے مجھ سے ناراض ہونے کا حق بھی نہیں..........؟"

"مگر کس بات پر اے آتون!" نضار کے لہجے میں اب بھی تیزی تھی۔

"میری خاطر اس نے اپنا گھر بار' عیش آرام چھوڑا ہے' یہاں آ کر اپنی زندگی داؤ پر لگائی ہے۔

اس لئے کہ اس سے رازداری برتی جائے' اسے غیر سمجھا جائے؟؟"

"اے آتون! تُو میرے سامنے اس کی یوں وکالت کر رہی ہے جیسے میں اس کے خلاف ہوں' کیا تُو خود اس رازداری کی مجبوری سے واقف نہیں؟؟"

"ہوں واقف' مگر اسے کچھ خبر نہیں۔ سوچ اگر تُو اس کی جگہ ہوتا اور تجھے یوں نظرانداز کیا جاتا تو تیرے دل پر کیا گزرتی؟" میں جذباتی ہو گئی۔ "اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ میرے ساتھ مخلص ہے' اس نے مجھ سے محب.........." میں کچھ کہتے کہتے اچانک رک گئی۔ جذبات کی رو میں مجھ سے یقیناً غلطی سرزد ہو رہی تھی۔ نضار کو مجھے یہ نہیں بتانا چاہئے تھا کہ احرس مجھ سے محبت کرتا ہے' مگر مجھ سے یہ غلطی ہو چکی تھی۔ جو بات میری زبان پر آ چکی تھی۔ اسے نہ کہہ کر میں نضار کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر سکتی تھی۔ میں نے اسی لئے اس سے کچھ بھی نہ چھپانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح شاید میں اور نضار بہتر طور پر اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کر سکتے تھے۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "اس نے مجھ سے محبت کی ہے اور .... اور آج پہلی بار اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ اس کے ذہن پر نشے کا غلبہ تھا اس لئے وہ سب کچھ کہہ گیا' وہ ساری باتیں جو اب تک نہیں کہہ سکا تھا' وہ .... وہ دیوانگی کی حد تک مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"اور تُو اے آتون!" نضار نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"آج سے پہلے کبھی میں نے اس کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جس بات کو وہ اب تک زبان پر نہیں لا سکا تھا' اس کے دل میں اتنی گہرائی تک اتر چکی ہو گی۔ میں تو اس کی باتوں کو اس کے مزاج کا کھلنڈرا پن سمجھتی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ہنسی ہی ہنسی میں وہ رو دے گا۔"

حقیقت کا علم ہو جانے کے بعد نضار کو چپ سی لگ گئی۔ یقیناً یہ لمحات اس پر بہت بھاری تھے۔ کوئی اگر کسی کی سب سے قیمتی شے پر اپنا ہونے کا دعویٰ کر دے اور معاملہ متنازع بن جائے تو شاید آدمی کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جس کا اظہار نضار کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

"خاموش رہنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا اے نضار!" میں اس کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے بولی۔ "ہم دونوں کو مل کر کچھ سوچنا پڑے گا۔"

"اس مسئلے کا حل تو اے آتون! تیرے ہی پاس ہے۔" نضار کی آواز بجھی ہوئی سی تھی۔ "شاید اب تجھے کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑے اور سن کہ تُو میری طرف سے کوئی بھی فیصلہ کرنے میں قطعی آزاد ہے۔ یوں بھی تیرے پیروں میں عہد و پیماں کی کوئی زنجیر نہیں۔ ہاں میں یک طرفہ طور پر ہی سہی' اپنے اس عہد پر قائم ہوں جو میں نے تجھ سے کیا تھا۔ میں اب بھی اپنے عہد پر قائم ہوں کہ اگر تیرا فیصلہ میرے حق میں نہ ہوا تو .... تو کوئی اور .... تیرے سوا کوئی اور میری زندگی میں داخل نہیں ہو گا۔ یہ زندگی تیری ہے اور ہمیشہ تیری ہی رہے گی' میں اس پر اپنا اختیار کھو چکا ہوں۔"

"اور تجھے میرا کچھ خیال نہیں اے نضار کہ میں کتنی بے اختیار ہوں۔ تُو جو میری خاطر اتنے دکھ جھیل رہا ہے' آخر کیوں؟ .... کیا محض اس لئے کہ .... کہ میں تجھے ٹھکرا دوں؟ تیرا دل توڑ دوں؟

تجھے زندگی کی ساری خوشیوں سے محروم کر دوں؟ اور ادھر احرس ہے کہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی معلو ہے۔ تم دونوں ہی میری مجبوری' میری ضرورت ہو' میں .... میں تم دونوں میں سے کسی کو بھی م نہیں چاہتی۔ شاید .... شاید اسی لئے کبھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکوں گی۔ تُو ہی بتا اے نضار! میں اگر تو سے یہ کہوں کہ میری محبت کو اپنے دل سے نکال دے تو کیا تیرے لئے ایسا ممکن ہو گا؟ میرا خیال ہے شاید دنیا کی کوئی اور عورت ایسی کسی صورت حال سے دوچار نہیں ہوئی کہ بیک وقت دو مرد اس کے دعوے ہوں اور وہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کر سکے۔ اگر میں عورت نہ ہوتی' مرد ہوتی اور تم دونوں تعلق صنف مخالف سے ہوتا تو شاید یہ مسئلہ حل ہو جاتا کہ ایک مرد' دو عورتیں یا اس سے زیادہ عورتیں بیک وقت رکھ سکتا ہے لیکن عورت کو دیوتاؤں نے یہ اختیار نہیں دیا۔ سو میں بھی دوسری عورتوں کی طرح بے اختیار ہوں۔ میں .... میں اے نضار! کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔"

"تو اے آتون! اس مسئلے کو آنے والے وقت پر چھوڑ دے کہ وقت سے بڑا کوئی اور منصف نہیں۔" نضار نے مجھے ایک راہ سجھائی۔

"ہاں اے نضار! تُو ٹھیک کہتا ہے کہ وقت سے بڑا انصاف کرنے والا اور کوئی نہیں۔ سو میں یہ فیصلہ وقت ہی پر چھوڑتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میرے ذہن سے جیسے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں نے اپنی طبیعت کے ہیجان میں قدرے سکون سا محسوس کیا۔

اس رات کو میں دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی۔ احرس کی نسبت نضار سنجیدہ اور بردبار تھا۔ میں نے جو باتیں بڑی صفائی اور کھلے دل کے ساتھ نضار سے کر لی تھیں' وہ شاید احرس سے نہیں کر سکتی تھی۔ نضار کو تو خیر میں نے یہ بتا دیا تھا کہ احرس مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن احرس سے نضار کے بارے میں کہتی تو غالباً وہ برداشت نہ کر پاتا۔

دوسرے دن صبح مجھے معلوم ہوا کہ میرے کمرے سے جانے کے بعد احرس اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ میں نے ذالی کو بلا لیا۔

"تُو نے رات کو احرس کو شفتالی دی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں اے آتون! مگر اس نے ہاتھ نہیں لگایا۔" ذالی نے بتایا۔

"کیوں؟" میں نے سوال کیا۔ "اس نے کیا کہا؟"

"اس نے مجھ سے کہا کہ وہ نہیں چاہتی' میں نشہ کروں۔ اس کا اشارہ تیری طرف تھا۔ وہ مجھ سے بولا' اسے لے جا اور تُو بھی مجھے اپنی صورت نہ دکھا کہ تُو نے مجھے دھوکہ دیا۔ تُو وہ نہیں تھی جو میں نے تجھے سمجھا اور تُو وہ ہو بھی نہیں سکتی۔ پھر اس نے مجھے اپنے کمرے سے یہ کہہ کر نکال دیا کہ آئندہ اس کے کمرے میں قدم نہ رکھوں۔ اس کے لئے دوسری ملازمہ کھانا لے کر گئی مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔" ذالی نے بتایا۔

"تو کیا .... اس نے رات سے کچھ نہیں کھایا پیا؟" میں حیرت سے بولی۔

"اس نے دروازہ کھولے بغیر ہی کھانا واپس کر دیا۔" ذالی نے جواب دیا۔ "صبح سے بھی اس کے

کمرے کا دروازہ بند ہے۔"

میں تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ احرس خود کو کس بات کی سزا دے رہا ہے' ذالی کو اپنی زینت آغوش بنا کر اس سے جو غلطی ہوئی تھی' اسی گناہ اور بے وفائی کے احساس نے اسے شاید خود کو سزا دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ گزشتہ روز سے اس نے شفتالی کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا' اس کا مطلب تھا کہ اب وہ نشے میں نہیں تھا۔ اس وقت احرس سے بات کی جا سکتی تھی۔ یقیناً وہ اپنے کئے پر پشیمان تھا ورنہ گزشتہ رات اس نے جو کچھ کہا تھا' اس پر ضرور عمل کرتا۔ وہ مجھے چھوڑ کر جانے کے لئے جو کہہ رہا تھا' اس پر عمل نہ کرنا' احساس پشیمانی ہی کا ثبوت تھا۔ اپنے کمرے سے نکل کر میں راہداری میں آ گئی اور پھر اس کے کمرے تک پہنچ گئی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اب تک اسے اٹھ جانا چاہئے تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا' ممکن ہے کہ رات بھر وہ جاگتا ہی رہا ہو۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور اسے پکارا۔

اس نے میری آواز پہچان لی اور دروازہ کھولے بغیر ہی اندر سے بولا۔ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ بھوکا پیاسا مر جانے دے مجھے کہ میری یہی سزا ہے۔"

"اے احرس! دروازہ کھول دے۔" میں نے بھی زور سے کہا۔ "اور نہ بھول کہ دروازہ توڑا بھی جا سکتا ہے۔"

"تُو آخر مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ نہ مجھے اپنی مرضی سے جینے دیتی ہے نہ مرنے دیتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا۔

میں نے اندر داخل ہو کر اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ میرا اندازہ درست ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر سویا نہیں ہے۔ بستر بھی بے شکن تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بستر پر اس کے ساتھ آ بیٹھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں' یوں جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو' شاید وہ مجھ سے نظریں ملاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"ادھر دیکھ۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ "نظریں اٹھا۔"

"یہ نظریں اب ہمیشہ تیرے سامنے جھکی ہی رہیں گی' اے معبلہ!" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"پاگل نہ بن اور جو ہو گیا اسے بھول جا۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "تُو نے نشے کی حالت میں جو کچھ کیا یا کہا' اس میں تیرا نہیں نشے کا قصور تھا۔"

"مگر .... مگر نشہ تو میں نے کیا تھا۔"

"نشہ کرنے میں بھی تیرا نہیں میرا قصور تھا۔ اگر میں تجھ سے مل کر گئی ہوتی تو ہرگز تُو اتنا دل برداشتہ نہ ہوتا۔ اس پر میں تجھ سے معافی مانگنے ....

"نہیں۔" احرس بول اٹھا۔ "معافی تو مجھے تجھ سے مانگنا ہے کہ .... کہ میں نے کسی اور پر تیرا تصور کیا اور تجھ سے بے وفائی کا مرتکب ہوا۔"

"دیکھ احرس! کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں تجھے ابھی نہیں بتا سکتی۔" میں اسے سمجھانے لگی۔ "تُو اسے دیوتاؤں کی مرضی سمجھ لے کہ مجھے رازداری کا حکم ملا ہے۔" میں نے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کر

دیا۔ "تجھے معلوم ہے کہ مجھے پُراسرار سرگوشیاں بچپن ہی سے سنائی دیتی ہیں اور بعض اوقات میرے
میں ایسی باتیں بھی آ جاتی ہیں جو کسی کو معلوم نہیں ہوتیں۔ مجھے پیش آنے والے واقعات کا علم بھی
کبھی پہلے سے ہو جاتا ہے' جانتا ہے نا تُو؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" آہستہ آہستہ احرس اعتدال پر آتا جا رہا تھا۔ "انہی پُراسرار سرگوشیوں نے
کئی دفعہ تیری جان بھی بچائی ہے۔"

"دیوتا مجھ سے کچھ کام لے رہے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے رازداری کا حکم دیا ہے' میں مجبور ہوں
نضار کو دیوتاؤں ہی نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دی ہے بلکہ تُو اسے حکم سمجھ سکتا ہے۔
اسی لئے نضار کو ساتھ لے کر گئی تھی اور یقین کر کہ جہاں گئی تھی' اس کا علم احزم تک کو نہیں تھا۔ نضار
کے سوا کسی سپاہی تک کو مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے
میں رازداری برتی۔"

"تو کیا اے آتون! تُو اول کی بستی نہیں گئی تھی؟" احرس نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"نہیں' میں نے تجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ نضار کے ساتھ وہاں جا رہی ہوں۔" میں نے اسے
دیا۔

"پھر کہاں گئی تھی؟"

"یہی تو بتانے کا حکم نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور اب پھر چند روز بعد مجھے ایک ایسے ہی سفر
جانا ہے۔"

"اور اس سفر میں بھی نضار ہی تیرے ساتھ ہو گا؟"

"دیوتاؤں کی یہی مرضی ہے۔"

"اگر یہ معاملہ اس طرح کا تھا تو مجھے تُو پہلے ہی سے بتا دیتی تاکہ میں تیری طرف سے بدگمان نہ
ہوتا۔" احرس کے لہجے میں ندامت تھی۔

"سن اے احرس! تیرے جنونِ عشق کا اب مجھے پوری طرح اندازہ ہو چکا ہے۔ اچھا ہوا کہ نشے کی
حالت میں تیری زبان پر وہ باتیں آ گئیں جو تیرے دل میں تھیں۔ اتنا سمجھ لے کہ تیری معبلہ ریاکار
منافق نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے میری آواز بوجھل ہو گئی۔

"معاف کر دے مجھے' اب .... اب میں تیری طرف سے بدگمان نہیں ہوں گا۔" احرس کی
آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"مرد روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے پاگل!" میں نے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔

"تیرا دل بہت بڑا ہے اے معبلہ کہ تُو نے مجھے قصوروار ہو کر بھی قصوروار نہیں سمجھا۔ میری بے
وفائی کا مجھے طعنہ نہیں دیا۔"

احرس راہِ راست پر آ گیا .... اور پھر میں نے اسی کے کمرے میں ناشتہ کیا۔ محبت میں بڑی
طاقت ہوتی ہے جو درندوں تک کو اپنا تابع فرمان بنا لیتی ہے' احرس تو خیر انسان تھا۔ میں بہت خوش تھی کہ

اسے راہِ راست پر لے آئی تھی۔

ناشتے کے دوران ہی میں احرس نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ اس کے دل میں نضار کی طرف سے
بدگمانی آ چکی تھی۔ اس پر بھی احرس نے شرمندگی کا اظہار کیا۔ پھر وہ بولا کہ اب نضار کے ساتھ اپنا رویہ
بدل دے گا۔ ناشتہ کر کے میں احرس کے پاس سے اٹھ آئی اور پہلے مہا پجاری کو یہ خوشخبری سنائی کہ
احرس اب اعتدال پر آ گیا ہے۔ پھر میں نضار سے ملنے روانہ ہو گئی۔

نضار مجھے احزم کے ساتھ اجلاس والے کمرے میں مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ "اے آتون!
ہماری غیر موجودگی میں احزم نے ایک دوراندیشی کا کام کیا۔ ہمیں اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس نے
گزشتہ روز سے کبیت والوں کی جنگی تربیت کا آغاز کر دیا ہے تاکہ وہ آئندہ فیصلہ کن جنگ میں ہمارے کام
آ سکیں۔"

"واقعی اے نضار! تیرا یہ نائب بڑا دانشمند ہے۔ میں خود تجھ سے اس کے لئے کہنے والی تھی۔" میں
نے احزم کی تعریف میں کنجوسی سے کام نہیں لیا۔

"یہ اس وقت پہاڑوں کی طرف ہی جا رہا تھا۔" نضار نے بتایا' پھر بولا۔ "کیا خیال ہے' ہم دونوں
بھی چلیں؟"

"ہاں چلے چلتے ہیں۔" میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ "احرس کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔"

میری بات سن کر نضار اور احزم دونوں ہی چونک اٹھے۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب گزشتہ رات کا
واقعہ ہی تھا۔

"احرس اب اعتدال پر آ چکا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اے نضار! اب تُو اسے بدلا ہوا پائے
گا۔ کل سے اس نے شفتالی کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ وہ نشہ نہیں کرے گا۔" یہ کہہ
کر میں نے ایک خادم کو بلایا اور احرس تک اپنا پیغام بھجوا دیا۔

"کمال ہو گیا یہ تو۔" نضار بولا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ اب وہ ہاتھوں سے گیا۔ تُو نے اے آتون
اسے سمجھایا ہو گا۔"

"ہاں' غلطی مجھی سے ہوئی۔ ہمیں احزم کی طرح اسے بھی اعتماد میں لے لینا چاہئے تھا۔ پھر یہ سب
کچھ نہ ہوتا جو پیش آیا۔" میں نے کہا۔

پھر جب احرس کچھ دیر بعد وہاں آیا تو واقعی بدلا ہوا تھا۔ اس نے نضار اور احزم دونوں ہی سے
معذرت کی۔ نضار نے اسے گلے سے لگا لیا اور بولا۔ "اے میرے بھائی احرس! میں بھلا تجھ سے خفا ہو سکتا
ہوں! اب ایسا گمان دل میں نہ لانا۔"

مجھے اس پر خوشی تھی کہ بات بگڑتے بگڑتے پھر بن گئی تھی۔ ذرا ہی دیر کے بعد احرس' نضار اور
احزم کے ساتھ میں پہاڑی سلسلوں کی طرف جا رہی تھی۔ احزم کو معلوم تھا کہ ان پہاڑی سلسلوں کے
کن حصے میں کبیت والے آباد ہیں۔ وہ ہمیں سیدھا ادھر ہی لے گیا۔ تربیت دینے والے احزم کے حکم پر
کبیت والوں کے ساتھ ہی رک گئے تھے۔ پہاڑوں سے گھرے ہوئے چھوٹے سے ایک میدان میں قبیلے

کے مرد جمع تھے۔ انہی میں سردار بریسا بھی تھا۔ ان لوگوں نے ہمیں آتے دیکھ کر مشق روک دی۔ ابھی نشانے بازی کی مشق شروع نہیں ہوئی تھی۔ تربیت دینے والے ان لوگوں کو رائفل کھولنا اور بند کرنا سکھا رہے تھے۔

بریسا نے آگے بڑھ کر میرے گھوڑے کی لگام تھامی اور گھٹنوں کے بل جھک کر مجھے تعظیم دی۔ اس وقت اچانک مجھے پُراسرار سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ ان سرگوشیوں میں مجھے جو کچھ بتایا گیا' اسے سن کر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ آج رات کبیت والے آپس ہی میں لڑ کر بڑی تعداد میں ختم ہو جاتے اگر مجھے اس سازش سے قبل از وقت ہی آگاہ نہ کر دیا جاتا جو بریسا کے خلاف پروان چڑھ چکی تھی۔

"اے بریسا! تیرا بڑا بھائی ژولو کہاں ہے؟" میں نے گھوڑے سے اترتے ہوئے پوچھا۔ اس کے دو بھائی تھے' یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے بڑے بھائی کا نام ابھی چند ہی لمحے پہلے مجھے معلوم ہوا تھا۔ میں اسے جانتی پہچانتی نہیں تھی۔ غالباً اسی لئے بریسا چونک اٹھا تھا۔

"اے آتون دیوی! اس کے پیٹ میں درد تھا اس لئے وہ اپنے غار ہی میں پڑا ہے اور یہاں نہیں آیا۔" بریسا نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"اسے بلوا تاکہ میں اسے صحت یاب کر دوں۔" میں نے کہا۔

احرس اس پر آہستہ سے بولا۔ "مگر اے دیوی! پیٹ کے درد کی دوا تو وہیں تُو بستی میں بھول آئی ہے۔" اس کی خوش مزاجی واپس آ گئی تھی۔

نضار اور احزم نے بھی احرس کی بات سن لی تھی اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ میں احرس کی بات کو نظرانداز کر گئی۔ ہمارے گھوڑے بریسا کے خادموں نے ایک طرف لے جا کر باندھ دیئے۔ ہم زمین پر بچھی ہوئی موٹی چادر پر بیٹھ گئے۔

"تم لوگ اپنی مشق جاری رکھو۔" میں نے تربیت دینے والوں کو بلند آواز میں حکم دیا۔

اس دوران میں بریسا نے اپنے ایک خادم کو پہاڑوں کی طرف بھیج دیا اور دو زانو ہو کر ادب سے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"اے آتون دیوی! میرا بڑا بھائی ژولو اس پر بہت خوش ہو گا کہ تُو نے اسے ملاقات کی عزت بخشی۔" بریسا مجھ سے مخاطب ہوا۔

"مگر اے بریسا! یہ دن شاید تیرے بھائی ژولو کے لئے خوشی کا دن ثابت نہ ہو۔" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

"صحت یاب ہو کر کون خوش نہیں ہوتا۔ پھر بھلا بریسا کا بھائی کیوں خوش نہ ہو گا؟" احرس پھر بول اٹھا۔

"ہے کچھ ایسی ہی بات جو اے احرس' تجھے ابھی کچھ دیر میں معلوم ہو جائے گی۔" میں بولی۔ بریسا کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔

ژولو کو آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جب وہ میرے سامنے جھک کر مجھے تعظیم دے رہا تھا تو اس

کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر دایاں ہاتھ رکھ دیا' پھر ہاتھ اٹھا لیا تو وہ ادب سے نظریں جھکا کر میرے سامنے سے اٹھنے لگا۔

"نہیں اے ژولو! یہیں بیٹھا رہ۔ مجھے تجھ سے کچھ پوچھنا ہے۔" میں نے اس سے کہا تو وہ کانپ کر وہیں بیٹھ گیا۔ "اے ژولو! اگر تجھے اس بات پر اعتراض تھا کہ تجھے بڑا بھائی ہونے کے باوجود قبیلے کا سردار کیوں نہیں بنایا گیا تو میرے پاس کیوں نہیں آیا؟ تُو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں نے جسے سردار بنایا ہے اس کی طرف سے غافل رہوں گی؟ کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ بریسا کو سردار بنانے والی ایک دیوی ہے اور دیوی دیوتاؤں کے فیصلے بدلنے کا اختیار انسانوں کو نہیں ہوتا؟"

"مگر اے آتون دیوی! میں نے بریسا کے سردار بنائے جانے پر کب گلہ کیا ہے؟" ژولو بولا تو اس کی آواز میں واضح طور پر ارتعاش تھا۔

"کیا زبان سے گلہ کرنا ضروری ہے' اے ژولو! کیا میں تیرے دل کا بھید تیرے بھائی کو بتا دوں جسے آج رات تُو قتل کرانے والا ہے؟"

"نن .... نہیں۔" ژولو نے گھبرا کر کہا۔

"تجھے معلوم نہیں کہ بریسا اگر قتل کر دیا جاتا تو تیرا چھوٹا بھائی تیرے خلاف ہو جاتا اور پھر کبیت والے دو حصوں میں بٹ کر ایک دوسرے کو کاٹنے لگتے۔ دولت اور اقتدار کے بھوکے! تجھے یہ شرم بھی نہیں کہ تُو آتون دیوی کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت کر رہا ہے۔" یہ کہتے ہی میں نے بریسا کے محافظ دستے کے دو محافظوں کو نام لے کر طلب کیا۔ بریسا کا ایک خادم ان دونوں کو بلا لایا۔

خلاف توقع وہ دونوں آتے ہی میرے سامنے سجدے میں گر گئے اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگے۔

"اٹھو اور اپنے سردار بریسا کو بتاؤ کہ تم نے دو خوبصورت کنیزوں کے لالچ میں ژولو کے کہنے پر آج رات بریسا کو قتل کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔" میں نے ان دونوں محافظوں کو سخت لہجے میں مخاطب کیا اور وہ میرے پیروں سے اپنے سر رگڑنے لگے۔ "اٹھو اور جو میں کہہ رہی ہوں' اس پر عمل کرو۔"

"یہ .... یہ اے آتون دیوی! میرے خلاف سازش .... کوئی سازش ہے۔ مم .... میں نے ہر.......... ہرگز ایسا کرنے کو نہیں کہا۔" ژولو بول اٹھا۔

"اے ژولو! تیرا اب بھی جھوٹ بولنا اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ تیرا ضمیر مردہ ہو چکا ہے اور تُو بھول گیا ہے کہ کسی دیوی کے سامنے جھوٹ بولنے کی سزا کیا ہے؟" پھر ان دونوں محافظوں نے اعتراف جرم کر لیا۔

"ژولو کو یہ غلط فہمی تھی کہ قبیلے کی روایات کے مطابق سردار کے بھائی یا اس کی اولاد کو سردار بنایا جاتا ہے' مگر کوئی سازشی اور قاتل کبھی سردار نہیں بنایا جاتا۔ تیری سازش چھپی نہ رہتی اے ژولو! پھر تیرے بجائے بریسا کے چھوٹے بھائی کو سردار بنا دیا جاتا کیونکہ ابھی وہ بے اولاد ہے۔" پھر میں نے قبیلے کے ان ساتوں بزرگوں کو طلب کر لیا جو بریسا کو سردار بناتے وقت موجود تھے۔ وہ تعظیم دے کر بیٹھ گئے تو میں نے انہیں سازش سے آگاہ کر دیا اور انہیں اس سازش کے نتیجے میں ہونے والے کشت و خون کے متعلق

بھی بتا دیا۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ ان پر چھوڑ دیا۔

"اے دیوی! تیری موجودگی میں ہم فیصلہ کرتے بھلے نہیں لگیں گے۔" ایک بوڑھے نے کہا۔

"تم قبیلے کی روایات کے مطابق فیصلہ سناؤ' یہ میرا حکم ہے۔"

میرے حکم پر ان کے سر جھک گئے اور پھر وہ آپس میں مشورے کرنے لگے۔ ایک فیصلے پر پہنچ کر بعد ایک بوڑھے نے اپنے ساتھیوں کی نمائندگی کی اور بولا۔ "باغیوں کی سزا موت ہے۔ ژولو اور سازش میں شریک دونوں محافظوں کی گردنیں مار دی جائیں۔"

اسی وقت اچانک ژولو نے اچھل کر اپنی نیام سے دو دھاری تلوار نکال لی اور اٹھ کر پہاڑوں کی طرف بھاگا۔ میرے شانے سے رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے دوسرے ہی لمحے ژولو کے پیروں کا نشانہ لے کر فائر کیا اور وہ اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔

"جاؤ اس بزدل کو اٹھا لاؤ۔" میں نے بریسا کے خادموں کو حکم دیا۔

خادم زخمی ژولو کو گھسیٹتے ہوئے میرے سامنے لے آئے۔ اس کی دائیں پنڈلی سے خون بہ رہا تھا۔

پھر ژولو پر رحم نہیں کیا گیا۔ سب سے پہلے اسی کا سر قلم کیا گیا۔ اس کے بعد دونوں محافظوں کو بھی نہ بخشا گیا۔

"ان کی لاشیں کسی پہاڑی پر پھینک آؤ۔" وہی بوڑھا' خادموں سے مخاطب ہوا جس نے فیصلہ سنایا تھا۔ "باغیوں کو مارنے کے بعد زمین میں نہیں دبایا جاتا۔"

خادم تینوں مقتولوں کی لاشیں اٹھا کر لے گئے تو بریسا میرے سامنے سجدہ ریز ہو گیا پھر وہ سجدے سے اٹھ کر کہنے لگا۔ "اے آتون دیوی! تُو نے میری زندگی بچا لی۔ دیوتا تیرا سایہ مجھ پر اور میرے قبیلے پر ہمیشہ قائم رکھیں۔"

پھر ہمیں بریسا نے دوپہر کا کھانا کھلا کر ہی رخصت کیا۔ پہاڑی پرندوں کا گوشت بہت لذیذ تھا۔

جب ہم پہاڑوں سے لوٹ کر بستی کی طرف جا رہے تھے تو احرس مجھ سے بولا۔ "تجھ سے تو اب مجھے خوف آنے لگا ہے۔ تُو نے مجھے پہلے یہ نہیں بتایا کہ تُو دلوں کے بھید بھی جان لیتی ہے۔ اس طرح تو تجھ سے جھوٹ بولنا بھی مشکل ہو جائے گا اے آتون دیوی!"

"تو بس توبہ کر لے آج سے کہ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ویسے ایک بات بتا دے کہ تجھے اس سازش کی خبر کیسے ہو گئی؟ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔" احرس نے بڑے بھول پن سے پوچھا۔

"اس میں کون سی راز کی بات ہے' تُو بھی جانتا ہے کہ مجھے آنے والے خطروں کا علم پہلے سے ہو جاتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"رفتہ رفتہ تُو سچ مچ کی دیوی بنتی جا رہی ہے۔ مجھے تو اب یہ ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں ایک روز کوئی دیوتا تجھے بہکا کر نہ لے جائے اور میں ٹاپتا ہی رہ جاؤں۔" احرس کی بات پر میں زور سے ہنس پڑی۔ [illegible] سابقہ روش پر لوٹ آیا تھا۔

☆======☆======☆

اشرکی بستی میں وسیط کی طرف سے واپس آئے وہ ساتواں دن تھا۔ آئندہ روز مجھے اور نضار کو یہاں سے ایک بار پھر دشمن کے علاقے میں داخل ہونا تھا۔ اس مرتبہ ہماری منزل وادی سبز کے مغرب میں آباد ایک بستی منعیہ تھی۔ وہاں سے ہمیں وادی سبز کی اطراف موجود پہاڑوں میں سے مینار نما پہاڑ کی طرف جانا تھا۔ میں نے اسی غرض سے احرس کو اپنے کمرے میں بلوا لیا تھا کہ اسے بتا دوں' آئندہ روز میری روانگی ہے۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔

"اے احرس! میں کل نضار کو ساتھ لے کر کسی بھی وقت روانہ ہو جاؤں گی یا ممکن ہے آج ہی رات نکل جاؤں۔ تجھے پہلے سے بتائے دے رہی ہوں کہ بعد میں جب میں لوٹوں تو پھر تیرا سر کسی خوبصورت خادمہ کے زانو پر دھرا ہو۔" یہ کہہ کر میں مسکرائی۔

"تُو اگر میرے سر کو بچانا ہی چاہتی ہے' پھر ایسا کر کہ اپنا زانو پیش کر دے۔ اس کے بعد کسی کے زانو کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔"

"تجھے اپنا سر عزیز ہے یا نہیں؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اب تُو اس طرح دیکھے گی تو میں ڈر جاؤں گا۔" احرس بولا۔

اسی وقت احزم آ گیا۔ مجھے تعظیم دینے کے بعد اس نے بتایا۔ "اے آتون دیوی! ایک اجنبی کو مشتبہ حالت میں پکڑا گیا ہے۔ وہ اجنبی لگتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آتون سے ملنے آیا ہوں۔ شبہ ہے کہ وہ دشمن کے علاقے سے ہمارے علاقے میں داخل ہوا ہے۔ اسے ادھر ہی سے آتے دیکھا گیا ہے۔" جب سے میں نے سردار بریسا کے بارے میں ہونے والی سازش کا انکشاف کیا تھا' احزم پہلے سے کہیں بڑھ کر میری تعظیم کرنے لگا تھا۔ وہ اب مجھے احتراماً "آتون دیوی" کہنے لگا تھا۔

احزم سے مشتبہ آدمی کے بارے میں سن کر اور یہ جان کر کہ اس مشتبہ فرد کو دشمن کے علاقے کی طرف سے آتے دیکھا گیا ہے' میرا ذہن کچھ اور ہی سوچنے لگا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس شخص نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی تھی۔

"اسے بھیج دے اجلاس والے کمرے میں اے احزم! میں وہیں آتی ہوں۔ محافظوں کو تاکید کر دینا کہ اس شخص کے ساتھ کوئی سختی نہ کی جائے اور نہ اسے پابند سلاسل کر کے لایا جائے۔ ہاں اپنے اطمینان کی خاطر محافظ اس کی تلاشی لے سکتے ہیں اور ہتھیار بھی حویلی کے باہر رکھ سکتے ہیں۔"

ایک مشتبہ شخص کے بارے میں میرے اس طرح کے احکام سن کر احزم کو لازماً حیرت ہوئی تھی جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا مگر وہ کچھ بولا نہیں اور احتراماً سر جھکا کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی احرس بول اٹھا۔ "یہ تُو نے کہاں کہاں اپنی زلفوں کے جال پھیلا رکھے ہیں' جسے دیکھو تیرے نام کا دم بھرتا چلا آ رہا ہے۔"

میرا ذہن کہیں اور ہی الجھا ہوا تھا اس لئے احرس کی بات کے جواب میں کچھ نہ بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں لباس تبدیل کرنا چاہتی تھی۔ احرس بھی مجھے کھونٹی کی طرف بڑھتے دیکھ کر سمجھ گیا اور کھڑا ہو

گیا۔

"میں چلتا ہوں' اگر وہ تجھے زیادہ ستائے تو اپنی مدد کے لئے مجھے بلاتے ہوئے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔" احرس چلتے چلتے بولا۔

"کون ستائے؟" میں نے بے دھیانی میں پوچھ لیا۔

"ارے وہی اور کون جو تجھ سے ملنے دشمن کے علاقے سے ادھر آیا ہے۔"

"ہاں بلالوں گی' اب تُو کھسک لے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

وہ جاتے جاتے رک گیا اور پلٹ کر کہنے لگا۔ "اور نہ کھسکوں تو؟"

"میں تجھے کھسکانا جانتی ہوں۔ ابھی بلاتی ہوں زالی کو۔" زالی کو میں نے اس کی چڑ بنا لیا تھا۔

زالی کا نام میرے ہونٹوں تک آتے ہی وہ مزید کچھ کہے بغیر تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

احرس چلا گیا تو میں لباس تبدیل کرنے کے بعد اجلاس والے کمرے میں پہنچ گئی۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں بار نضار کے باپ سردار اشر سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ محافظ دستے کے مسلح افراد کی موجودگی میں محسوس کر لیا تھا۔ وہ پردوں اور ستونوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ وہاں ایک جانب چوکی بچھی ہوئی جس پر دبیز اور آرام دہ بستر کے ساتھ تکیے بھی موجود تھے۔ میں اسی چوکی پر جا کر بیٹھ گئی اور پھر ذرا کے بعد دو مسلح محافظ ایک شخص کو لئے وہاں پہنچ گئے۔ محافظوں نے مجھے تعظیم دی اور وہ اجنبی شخص تعظیم دے کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اس شخص کے سراپے کا جائزہ لیا اور پھر محافظوں نے مجھے اس کے بارے میں وہی کچھ بتایا جو پہلے ہی مجھے احزم سے معلوم ہو چکا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں اس شخص سے کوئی سوال کرتی' وہ خود ہی بول اٹھا۔ "اے عظیم آتون میں شینا کے باپ کی طرف سے آیا ہوں۔"

میرا اندازہ قطعی درست نکلا تھا۔ وہ شخص یقیناً ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سردار وسیط کا نام سے گریز کیا تھا۔ سردار وسیط کی بیٹی شینا کا نام لے کر اس نے مجھ پر یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ کون ہے کہاں سے آیا ہے' اس کے علاوہ رازداری برتنے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

"تم لوگ جاؤ۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے محافظوں کو مخاطب کیا۔ "دروازے پر رک کر میرے دوسرے حکم کا انتظار کرو۔" اس کے بعد ستون اور پردوں کی طرف دیکھ کر میں نے مخصوص اشارہ میرا اشارہ پاتے ہی چار مسلح محافظ خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل گئے۔ میں نے اس شخص کو اشارے سے چوکی کے قریب بلایا اور کہا۔ "بیٹھ جا اور بتا کہ وسیط نے تجھے میرے پاس کیوں بھیجا ہے؟"

"سردار وسیط نے کہلوایا ہے اے عظیم آتون کہ اس نے تیرے حکم پر سردار صنعیہ کو اتحاد میں شامل کر لیا ہے۔ سردار وسیط کل ہی وہاں سے لوٹ کر آیا ہے۔ سردار نے کسی نئے حکم کے بارے میں بھی معلوم کیا ہے۔" اس شخص نے جو وسیط کا پیامبر تھا' مجھے بتایا۔

"اپنے سردار سے کہنا کہ آتون اس کی کارگزاری سے خوش ہوئی۔ فی الحال اس کے لئے کوئی حکم نہیں ہے۔" میں نے کہا' پھر پوچھا۔ "ظاہر ہے کہ تُو گزشتہ رات کے آخری پہر اپنی بستی سے چلا

اور مسلسل سفر کر کے تھک گیا ہو گا۔ تُو ایک رات رک کر آرام کرنے کے بعد لوٹے گا یا فوراً واپس جائے گا؟"

"عظیم آتون کا جو حکم ہو۔" وہ ادب سے بولا۔

اخلاق کا تقاضا یہی تھا کہ اسے روک لیا جاتا۔ مجھے وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ سو میں بولی۔ "ٹھیک ہے' ایک رات مہمان رہ اور کل صبح اپنی بستی کے لئے روانہ ہو جانا۔ میرا خیال ہے تجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تُو اپنی حقیقت کسی پر ظاہر نہ کرنا۔"

"ہاں اے عظیم آتون! مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا۔

میں نے آواز دے کر محافظوں کو کمرے میں بلا لیا اور انہیں حکم دیا۔ "سنو' کل صبح تک یہ تمہارا مہمان ہے۔ اسے مہمانوں کی سی عزت دو اور کل صبح عزت کے ساتھ ہی رخصت کر دو۔ اس کے کھانے پینے اور آرام و آسائش کا تمہیں خیال رکھنا ہے۔"

"بہتر ہے اے آتون! تیرے حکم کی تعمیل ہو گی۔" ایک محافظ بولا۔

دونوں ہی محافظوں کے چہروں سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا' مگر ظاہر ہے وہ مجھ سے کچھ پوچھ نہیں سکتے تھے۔ وسیط کے پیامبر کو اپنے ساتھ لے کر وہ دونوں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی مجھے پُراسرار سرگوشیوں کا خیال آیا۔ میں اور نضار جب وسیط کی بستی سے لوٹ کر اشر کی بستی میں داخل ہونے والے تھے تو سرگوشیوں میں جو ہدایات دی گئی تھیں' مجھے آج ان کی مصلحت کا اندازہ ہوا تھا۔ کہا گیا تھا کہ اس مینار نما پہاڑ سے قریب ترین بستی صنعیہ ہے اور وہاں تم دونوں کو وسیط ہی کی طرح پناہ دینے والا موجود ہے۔ تمہیں اس طرف جانے کا حکم ہے' مگر سات دن گزر جانے کے بعد تم ادھر کا رخ کرو گے۔ اس تاخیر میں جو مصلحت ہے' وقت آنے پر خود ہی تمہیں اس کا علم ہو جائے گا۔ سو مجھے اب وسیط کی طرف سے یہ پیغام ملنے کے بعد کہ سردار صنعیہ کو بھی اس نے اتحاد میں شامل کر لیا ہے' اس مصلحت کا علم ہو گیا تھا۔ اسی کے ساتھ کبیت کے لوگوں میں ہونے والی سازش کا بھی مجھے خیال آیا۔ اگر میں' اشر کی بستی میں نہ رکتی تو سردار بریسا کے خلاف پروان چڑھنے والی سازش ناکام نہ ہوتی۔

اجلاس والے کمرے سے اٹھ کر میں اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی تو راستے میں مجھے نضار مل گیا۔

"میں تیری ہی تلاش میں تھا اے آتون!" نضار مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "معلوم ہوا کہ تُو اجلاس والے کمرے میں ہے۔ احزم سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کوئی مشتبہ شخص بھی پکڑا گیا ہے جس کے بارے میں گمان ہے' دشمن کا کوئی مخبر ہو گا۔ اس نے تجھ سے ملنے.........."

"مل چکی ہوں میں اس سے۔" میں نے نضار کی بات کاٹ دی۔ "وہ بات بعد میں ہو گی' پہلے تُو بتا کہ تجھے میری تلاش کیوں تھی؟"

"آج ساتواں دن پورا ہو جائے گا۔" نضار دھیمی آواز میں بولا۔ "کیا ارادہ ہے تیرا؟"

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے راہداری میں آگے بڑھ رہے تھے۔ میرا رخ اپنے کمرے کی طرف ہی

تھا۔ میں بولی۔ "ابھی کمرے میں چل کر بات کئے لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" نضار نے کہا اور پھر کمرے میں پہنچنے سے پہلے کوئی بات نہیں کی۔

"ہمیں سات روز جن دو مصلحتوں کے تحت روکا گیا تھا یہاں اے نضار! وہ دونوں مصلحتیں ہو چکی ہیں۔" میں بستر پر بیٹھ گئی۔

"مصلحتیں کیسی اے آتون! میں سمجھ نہیں سکا تیری بات۔" نضار بھی میرے ہی قریب آ بیٹھا۔

میں نے اسے سرگوشیوں کے الفاظ یاد دلائے' پھر جو نتائج اخذ کئے تھے' ان سے بھی آگاہ کر اسی کے ساتھ میں نے اسے وسیط کے پیغام سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ "ان حالات میں اب ہم جب بستی منعیہ کی طرف روانہ ہو سکتے ہیں۔" میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"پھر تو ہماری روانگی آج رات کے کسی حصے میں بھی ہو سکتی ہے اور کل دن میں بھی۔" نضار

"ویسے مناسب یہی ہے کہ اے آتون! کہ ہم پہلے کی طرح رات ہی کو روانہ ہوں تاکہ ہمیں کوئی سے جاتے ہوئے نہ دیکھے۔ وادی سبز سے گزرے بغیر ہمیں بستی منعیہ تک پہنچنے کے لئے ایک لمبا چکر پڑے گا۔ اس راستے میں بستی صاحی بھی پڑے گی۔ ہم اگر اس بستی سے نہ گزرے تو ہمارا سفر مزید طوالت اختیار کر لے گا۔ سردار صاحی ہرچند کہ آزاد اور خودمختار ہے مگر اسے ژیان نے معاہدہ امن میں باندھ رکھا ہے۔ یوں ہم اسے ژیان کا حلیف ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے صرف یہ علاقہ ہمارے لئے نسبتاً غیر محفوظ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم رات کے پہلے ہی پہر میں یہاں سے روانہ ہو جائیں تو رات کے آخری پہر تک اس علاقے سے گزر سکتے ہیں۔ دن کی نسبت رات کو اس علاقے سے گزرنا ہمارے لئے زیادہ خطرناک نہیں ہو گا۔ اس علاقے سے نکل جانے کے بعد ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ اس کے بعد ہماری اگلی منزل بستی منعیہ ہی ہو گی۔

"اے نضار! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' مہا پجاری نے جن دو سرداروں کا ذکر کیا تھا ان میں سے ایک سردار صاحی بھی تھا۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کب اور کس سلسلے میں اے آتون!" نضار نے پوچھا۔

"اس وقت جب مختلف قبائل کی طرف سفیر بھیجے جانے کی مشاورت ہو رہی تھی۔" میں نے بتایا۔ "مہا پجاری نے ان دونوں سرداروں کے بارے میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ جب انہیں معلوم ہو گا کہ سردار اشم کی بیٹی زندہ ہے اور اپنا حق حاصل کرنا چاہتی ہے تو وہ ژیان کا ہرگز ساتھ نہ دیں گے۔ یاد آیا تجھے اے نضار!"

"ہاں اے آتون! یاد آ گیا' دوسرے سردار کا نام موسر تھا۔"

"ہاں یہی نام تھا۔" میں نے تصدیق کی' پھر بولی۔ "تو کہنا یہ ہے اے نضار کہ اگر ہم بستی صاحی سے گزرتے ہوئے پکڑے بھی گئے تو بھی اتنا بڑا خطرہ نہیں۔ جب سردار صاحی کو معلوم ہو گا' میں کون ہوں اور کس کی بیٹی ہوں تو معاملہ برعکس ہو جائے گا۔ تیرا مشورہ ہو تو اس سفر میں سردار صاحی سے ملا ہی کیوں نہ لیا جائے۔ ویسے بھی ہم سردار صاحی کے پاس مہا پجاری کو سفیر بنا کر بھیجنے والے تھے۔"

"سوچ لے اے آتون! ہمارے اس سفر کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔" نضار نے کہا۔

"پہلے بھی تو ہمارے سفر کا مقصد کچھ اور ہی تھا مگر اسی مقصد کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک اور بڑی کامیابی بھی حاصل ہو گئی۔"

"اس میں خطرہ صرف یہ ہے اے آتون کہ کہیں تیری حقیقت کا علم دشمن کو نہ ہو جائے۔"

"ہم اس سلسلے میں سردار صاحی سے رازداری کا عہد بھی تو لے سکتے ہیں۔"

"ہاں' اگر وہ رازداری کا عہد کر لے اور اس پر قائم بھی رہے تو کوئی خطرہ نہیں لیکن اے آتون! ایسے معاملات میں خطرہ مول لینا میرے خیال میں بہتر نہیں ہے۔"

"اے نضار! اگر تیرا مشورہ نہیں کہ سردار صاحی سے ملا جائے تو نہیں ملتے۔"

پھر یہی طے ہوا کہ ہم رات کے پہلے پہر ہی میں روانہ ہو جائیں گے۔ اس مرتبہ بھی ہم نے معمولی لباس ہی میں سفر کرنے کا قصد کیا تھا' مگر میں نے مردانہ لباس پہننے سے گریز کیا تھا۔ سات جیسا کوئی گھاگ شخص ہم سے دوبارہ بھی ٹکرا سکتا تھا جو مجھے مردانہ لباس پہننے کے باوجود پہچان لیتا۔ ایسی صورت میں ہم پر مخبری کا الزام بھی لگ سکتا تھا۔ جیسا کہ قلاوز کی بستی میں ہوا تھا۔

رات کے کھانے پر میرے اور نضار کے ساتھ احرس بھی تھا۔ میں نے احرس کو بتایا۔ "آج رات کے پہلے پہر ہم روانہ ہو رہے ہیں اے احرس!"

"واپسی کب تک ہو گی؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ خبر نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر بھی کتنے دن تک تم دونوں لوٹ کر نہ آؤ تو تمہیں صبر کر لیا جائے؟" احرس کی "رگ شرارت" جاگ اٹھی۔

"فی الحال تو تیری اس خواہش کے پورے ہونے کا امکان دور دور تک نہیں۔ ہم تجھے صبر کرنے کا موقع ہرگز نہیں دیں گے۔" میں مسکرا کر بولی۔

"خیر تجھے تو میں بہت دن پہلے صبر کر چکا ہوں۔ مجھے تو زیادہ فکر عزیز از جان نضار کی طرف سے تھی۔ تُو اس غریب کو ناحق اپنے ساتھ رگیدے پھر رہی ہے۔ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو اس کے نائب اول و دوم میری جان آفت میں کر دیں گے کہ ہمارے سردار کو تمہاری آتون ہی بہکا کر کہیں لے گئی تھی' اب کہیں سے بھی اسے پیدا کروں پھرتا کہ میں کیا کروں گا؟" احرس نے نضار کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اے میرے بھائی احرس!" نضار بولا اٹھا۔ "تُو میری طرف سے کوئی اندیشہ نہ کر۔ اگر واقعی کوئی خطرناک مرحلہ درپیش ہوا تو میں' آتون کو چھوڑ کر واپس تیرے پاس پہنچ جاؤں گا تاکہ میرے نائب تجھ سے جواب طلبی نہ کریں۔ رہا یہ کہ آتون اس خطرناک مرحلے سے کیسے بچے گی تو میں یہاں آ کر تجھے اس کے پاس بھیج دوں گا' ٹھیک ہے؟"

"اے میرے بھائی نضار! واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ تیری دانش مندی کا تو مجھے تہہ دل

سے قائل ہونا پڑے گا ورنہ گھاٹے میں رہوں گا۔"

احرس سے نضار کی اور میری نوک جھونک جاری رہی اور کھانا ختم ہوگیا۔ مہا پجاری سے شام میں کہہ چکی تھی کہ نضار کے ساتھ جنگی تیاریوں کے سلسلے میں جارہی ہوں اور نضار نے اپنے نائب کو روانگی سے مطلع کر دیا تھا۔

پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی ہمیں رخصت کرنے والا احزم ہی تھا۔ حویلی کے عقبی دروازے پر متعین مسلح محافظوں کو پہلے ہی وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ میں اور نضار خاموشی اور رازداری کے ساتھ حویلی سے نکل گئے۔ ہمارے پاس عام پہاڑی باشندوں کی طرح دو دھاری تلواریں اور لمبے خنجر ہی تھے۔ رائفلیں ساتھ لینے سے ہم نے گریز کیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہمارا تعلق کسی قبیلے کے ایسے خاندان سے ہوگا جو حکمراں ہو یا اعلیٰ طبقے سے ہو۔

یہ سفر ہمیں انتہائی تیز رفتار سے طے کرنا تھا تاکہ رات کے آخری پہر تک ہم بستی صابی سے گزر جائیں۔ صبح ہوتے ہوتے ہم بستی منعیہ پہنچ جانا چاہتے تھے پھر ہمارے لئے کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ ہمیں دشمن کے علاقے کی سرحدوں کے قریب سے گزرنا تھا۔ اس لئے محتاط اور چوکنا تھے۔ اپنے زیر تسلط علاقے سے ہم کسی رکاوٹ یا دشواری کے بغیر گزر گئے کیونکہ نضار کو معلوم تھا کہ رات کے وقت پہرہ دینے والے محافظ کدھر ہوتے ہیں اور کہاں نہیں، ہم ان کی نظروں میں آنا نہیں چاہتے تھے۔

اب وہ درمیانی علاقہ شروع ہو چکا تھا جس پر کسی کا دعویٰ نہیں تھا۔ یہ بے آب و گیاہ بنجر علاقہ تھا۔ یہ چھوٹی سی پتھریلی پٹی خاصی دور تک وادی سبز کے گرد موجود پہاڑوں سے کچھ فاصلے پر تھی اور بستی صابی کی سرحد تک چلی گئی تھی۔ ہم اسی پٹی پر تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کی ایک جانب دشمن کا علاقہ تھا اور دوسری طرف ہمارا علاقہ۔

جب سے ہم زعیم کے پہاڑ کو تہس نہس کر کے لوٹے تھے، زعیم نے مجھ پر کوئی حملہ نہیں کیا تھا۔ ساحر زعیم کی طرف سے یہ خاموشی میرے لئے ناقابل فہم تھی۔ یا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ میں اس کے بس میں آنے والی نہیں ہوں اور مجھے چھیڑنا خود اس کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے یا پھر یہ خاموشی کسی نئے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ بوڑھا ساحر زعیم مجھ سے نبرد آزما ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ میرا اندیشہ تھا کہ اس جیسے بدکار لوگ جلد اپنی شکست قبول نہیں کرتے۔ کب اور کس لمحے وہ بوڑھا ساحر ہمیں کسی نئی مصیبت میں گرفتار کر دیتا، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ سفر کرتے ہوئے جانے کیوں مجھے بوڑھے ساحر کی طرف سے کسی حملے کا اندیشہ رہا۔ رات اب اپنے آخری پہر میں داخل ہونے والی تھی۔ اب ہم بستی صابی کی حدود میں داخل ہونے والے تھے۔

اچانک ہی ایک تیز نسوانی چیخ سے فضا لرز اٹھی تھی پھر یوں لگا تھا جیسے بیک وقت کئی گھوڑے دوڑتے ہوئے ادھر لپک رہے ہوں جدھر سے وہ چیخ سنائی دی تھی۔ میں نے اور نضار نے تقریباً ایک ساتھ اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔ میں نے خطرے کی بو محسوس کر لی تھی۔ ہم دونوں دانستہ اپنے ساتھ مشعلیں لے کر نہیں چلے تھے۔ اندھیرے میں دور دور تک دیکھ لینے کی پراسرار قوت ہمارے اندر

بیدار تھی۔ نضار مجھے بتا چکا تھا کہ اسے بھی میری طرح اندھیرے میں دن کے اجالے کی طرح سب کچھ نظر آرہا تھا۔ معاً ایک جانب پہاڑی موڑ سے سات آٹھ مشعل بردار گھڑسوار نکل کر ہمارے سامنے آگئے اور ان کی مشعلوں کی روشنی میں گھوڑوں کے آگے بھاگتے ہوئے مجھے ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اور بھاگنے کی وجہ سے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ لڑکی کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا لباس تھا اور خوبصورت چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ غالباً یہ وہی لڑکی تھی جس کی چیخ ہم نے کچھ دیر پہلے سنی تھی۔ تعاقب میں آنے والے گھوڑے تیز نہیں دوڑ رہے تھے ورنہ وہ کبھی کے اس لڑکی تک پہنچ جاتے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دانستہ اس لڑکی کو بھگا رہے تھے۔

ہم جہاں رکے ہوئے تھے وہاں آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی کہ جہاں چھپا جا سکتا اور خطرہ لمحہ بہ لمحہ ہمارے قریب آتا جا رہا تھا۔ ہمارا اور ان گھڑسواروں کا درمیانی فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ کسی بھی لمحے ہم ان گھڑسواروں کی نظر میں آ سکتے تھے۔ اگر ہم پلٹ کر بھاگتے تو ہمارے گھوڑوں کی ٹاپیں انہیں ہماری طرف متوجہ کر لیتیں۔ ان گھڑسواروں میں جو قدرے آگے تھا میں نے اس کے ہاتھ میں رسی کا پھندا دیکھا۔ رسی کا پھندا اس نے بھاگتی ہوئی لڑکی کے اوپر پھینکا اور پھر پھندا لڑکی کے دونوں شانوں سے پھسلتا ہوا کمر تک آ کر تنگ ہوگیا۔ لڑکی کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ چیخ کر زمین پر گری۔ پھندا پھینکنے والے کے منہ سے وحشیانہ قہقہہ ابل پڑا۔ اب گھڑسواروں کی مشعلوں کی روشنی ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ ہم ساکت اپنی جگہ کھڑے تھے۔

"اے سردار زادے!" کوئی میری طرف دیکھ کر زور سے چیخا۔ "وہ ادھر ایک شکار اور موجود ہے۔"

جس شخص نے لڑکی پر پھندا پھینکا تھا، اس نے چونک کر میری طرف نگاہ اٹھائی۔

"تو اسے سنبھال میں اسے دیکھتا ہوں۔" اس لحیم شحیم شخص نے پھندہ ایک گھڑسوار کی طرف اچھال دیا اور اپنے گھوڑے کو ہماری طرف بڑھایا پیچھے پیچھے دوسرے گھڑسوار دوڑے۔ میں نے انہیں شانوں سے رائفلیں اتار کر اپنی طرف سیدھی کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ رائفلوں کی موجودگی میں تلواریں نکالنا حماقت ہی تھی، سو نہ میں نے تلوار نکالی، نہ نضار ہی نے ایسا کیا۔

"اے سردار زادے! اسے بھی بھگا کر شکار کرنا۔" کسی نے زور سے ہنس کر آگے آنے والے گھڑسوار سے کہا۔

اس کے چند لمحے بعد ہی ان مسلح گھڑسواروں نے ہمیں گھیر لیا جسے سردار زادہ کہا جا رہا تھا، وہ نضار سے مخاطب ہوا۔ "تیری بہن ہے یہ؟"

"نہیں، یہ میری بیوی ہے۔" نضار نے جواب دیا۔

سردار زادے نے اس طرح برا سا منہ بنایا جیسے کوئی کڑوا مشروب نادانستگی میں پی گیا ہو۔ اس نے حقارت سے کہا۔ "لعنت ہو تجھ پر، مجھے اترن پہننے کا کوئی شوق نہیں۔" پھر وہ آہستہ سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ "کاش یہ کنواری ہوتی!......... خیر میری نہ سہی، میرے دوستوں کی آرزو ضرور پوری ہو جائے

گی۔ انہوں نے بہت دن سے ایسا خوبصورت شکار نہ کیا ہو گا۔"

"اے سردار زادے! کیا خبر یہ اجنبی جھوٹ بول رہا ہو اور یہ اس کی بیوی نہ ہو۔" ایک گھڑسوار نے نیا شوشہ چھوڑا۔

"ہاں' یہ بھی ہو سکتا ہے۔" سردار زادے نے اثبات میں سر ہلایا' پھر مجھ سے بولا۔ "تو ان کی طرف دیکھ رہی ہے' سات ہیں یہ اور میں اکیلا ہوں۔ اگر تو کنواری ہے تو صرف تجھے میں برتوں گا ورنہ یہ ساتوں تجھے رگیدیں گے۔ تیرے لئے بہتر یہی ہے کہ سچ بول دے۔"

ان ساتوں کی نسبت اس ایک شخص سے نمٹنا میرے لئے زیادہ آسان ہوتا' یہی سوچ کر میں بول اٹھی۔ "ابھی میں اس کی بیوی نہیں بنی ہوں' ہاں بننے والی ہوں مگر میں نے یہ سچ اس لئے بولا ہے کہ تو مجھے بھگا کر شکار نہیں کرے گا۔"

"اگر تیری یہی خواہش ہے' تو ٹھیک ہے' میں تجھے نہیں بھگاؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"دوسری التجا تجھ سے یہ ہے کہ اے سردار زادے میرے ساتھی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"کیا تو اس سے محبت کرتی ہے؟" اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں۔" میں نے اقرار کیا۔

"تو پھر یقیناً یہ بھی تجھے چاہتا ہو گا۔ ٹھیک ہے' اسے تیری التجا پر قتل نہیں کرتا مگر اسے ایک خوبصورت تماشہ ضرور دیکھنا پڑے گا۔" سردار زادے کا لہجہ معنی خیز تھا پھر اس نے گھڑسواروں کو حکم دیا کہ نضار کو باندھ لیں۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اپنے ہتھیاروں کی پیٹی کھول کر نیچے ڈال دے۔" میں نے اپنی کمر سے چمڑے کی پیٹی کھول کر اس کے حکم پر نیچے پھینک دی۔

"آب اپنے گھوڑے سے اتر کر میرے گھوڑے پر بیٹھ جا۔" اس نے مجھے دوسرا حکم دیا۔

جب میں اس کے گھوڑے پر سوار ہو رہی تھی تو میں نے دیکھا' نضار کو باندھا جا چکا تھا۔ اسے اسی کے گھوڑے کی پشت سے باندھ دیا گیا تھا اور گھوڑے کی لگام ایک گھڑسوار نے تھام لی تھی۔ اسی دوران میں دوسری لڑکی کو جس پر پھندا پھینکا گیا تھا اسے ایک گھڑسوار نے اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا تھا اور آگے بڑھ کر اپنے ساتھیوں سے آملا تھا۔ پھر وہ قافلہ مخالف سمت روانہ ہو گیا۔

کچھ ہی فاصلہ طے کر کے مجھے پتھر سے بنی ہوئی چند کوٹھریاں نظر آئیں۔ یہ تقریباً ویسی ہی کوٹھریاں تھیں جیسی اشر کی بستی کے باہر واہب نے محافظوں کے لئے تعمیر کرائی تھیں۔ انہی کوٹھریوں کے قریب وہ لوگ رک گئے۔ نضار کو گھوڑے کی پشت سے کھول لیا گیا مگر اس کے ہاتھ پیر اب بھی بندھے ہوئے تھے۔ وہاں پہلے سے بھی کئی محافظ موجود تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بستی صاحی کی سرحدی چوکی تھی۔

مجھے اور اس لڑکی کو نسبتاً ایک بڑی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ بندھے ہوئے نضار کو بھی وہیں کوٹھری کے فرش پر لا کر ڈال دیا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد لحیم شحیم شخص کوٹھری میں داخل ہوا۔ کوٹھری میں ایک جانب بستر بچھا ہوا تھا۔ سردار زادے نے اپنے شانے سے رائفل اتار کر دیوار کے سہارے کھڑی کر دی۔ اب

میں نضار کی وہاں موجودگی اور "خوبصورت تماشے" کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔

"پہلے تو یا تو؟" سردار زادے نے مجھے اور دوسری خوفزدہ لڑکی کو مسکرا کر دیکھا پھر وہ مجھ سے بولا۔ "ویسے زیادہ خوبصورت تو ہے' لیکن پہلے میں نے اسے شکار کیا تھا۔" اس نے دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس لئے پہلا حق اس کا ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے خوفزدہ لڑکی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

لڑکی اس درندگی پر چیخ اٹھی اور وہ ہنس پڑا۔ میں جہاں کھڑی تھی اس کے قریب ہی دیوار سے لگی رائفل موجود تھی۔ میں تیزی سے پلٹی اور رائفل اٹھا لی۔ دوسرے ہی لمحے میں رائفل کی نال کا رخ اس شخص کے سینے کی طرف کر چکی تھی۔ وہ غیر یقینی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"چھوڑ دے اس لڑکی کو۔" میری آواز میں حکم تھا۔

"تو اس طرح اپنی اور اپنے ساتھی کی موت کو دعوت دے رہی ہے لڑکی! رائفل وہیں رکھ دے جہاں سے اٹھائی ہے۔" وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

"اے بے وقوف شخص! تیرے جسم کی طرح تیری عقل پر بھی چربی چڑھی ہوئی ہے ورنہ تو رائفل یوں نہ رکھ دیتا۔ میں نے تجھے جو حکم دیا ہے' اس پر عمل کر ورنہ تیری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گی' چھوڑ دے لڑکی کو۔" میں نے اپنا حکم دہرایا۔

اسی لمحے اس نے لڑکی کو ایک طرف دھکا دے کر اچانک میری طرف جست بھری۔ میں اسے قتل کر کے اپنے لئے مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے گولی چلانے سے گریز کیا اور اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں ادھر چھلانگ لگا رہی ہوں جدھر نضار بندھا پڑا تھا۔ اس کے جسم سے ٹکرا کر ہی مجھے یہ احساس ہوا۔ میں لڑکھڑا گئی۔ سردار زادے نے گرتے گرتے سنبھل کر دوبارہ مجھ پر جست لگائی۔ وہ جیسے پاگل ہو رہا تھا اور شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ یا تو میں رائفل چلانا نہیں جانتی یا پھر اس پر گولی چلاتے ہوئے ڈر رہی ہوں۔ یہی سوچ کر اس نے رائفل کی نال پکڑ لی اور اسے اپنی طرف کھینچا۔ میری انگلی رائفل کی لبلبی پر تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی گولی چل گئی۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ وہ جھٹکا سا کھا کر چیختا ہوا زمین پر گر پڑا۔ اس کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر رائفل ایک طرف رکھ کر نضار کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کرنا شروع کر دیا۔ یا تو میں بہت گھبرائی ہوئی تھی یا پھر رسی کی گرہیں سخت تھیں جو مجھے رسی کھولنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔

ابھی میں' نضار کے پیروں ہی کو رسی کی گرفت سے آزاد کر پائی تھی کہ اچانک کوٹھری کا دروازہ کھلا اور مسلح محافظ اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے یقیناً گولی چلنے کی آواز سن لی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں رائفل اٹھا سکتی' میرے سر کے پچھلے حصے پر ایک محافظ نے رائفل کی سخت نال رکھ دی۔

"اٹھ کر کھڑی ہو جا۔" محافظ نے مجھے حکم دیا۔

مجبوراً مجھے اٹھ کر کھڑا ہونا پڑا۔ سردار زادہ جلد بازی میں کوٹھری کے دروازے کو کنڈی ڈال کر اندر سے بند نہیں کر سکا تھا۔ اس نے دروازہ صرف بھیڑ دیا تھا۔ میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا ورنہ شاید پہلے

دروازے کی کنڈی ہی اندر سے لگاتی پھر مسلح محافظ شاید اتنی آسانی سے مجھے نہ پکڑ سکتے۔

اس دوران میں سردار زادہ دم توڑ چکا تھا۔ میں جس صورت حال سے بچنا چاہتی تھی' اسی کا شکار ہو گئی تھی۔ مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔

سرحدی چوکی سے بستی صاحی خاصے فاصلے پر تھی۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ مجھے اور نضار کو گھوڑوں کی پشت سے باندھ کر لایا گیا تھا۔ ہمارے ہی ساتھ ایک گھوڑے پر سردار زادے کی لاش بھی تھی۔ وہ لڑکی ہمارے ساتھ نہیں تھی جسے مجھ سے پہلے پکڑا گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اسے سرحدی چوکی ہی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ مقتول سردار زادے کو معصوم و بے گناہ ثابت کیا جا سکے۔

بستی صاحی خاصی ترقی یافتہ معلوم ہوتی تھی۔ وہاں میں نے پتھروں سے بنی ہوئی کئی عمارتیں دیکھیں۔ انہی عمارتوں میں سے ایک عمارت' بستی والوں کی عبادت گاہ تھی اور اسی سے کچھ فاصلے پر ایک بلند عمارت' بستی کے سردار کی قیام گاہ تھی۔

اس عمارت میں داخل ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ سردار صاحی' عبادت گاہ گیا ہوا ہے۔ سردار کی حویلی میں سردار زادے کی لاش پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ میں نے ایک نوجوان کو چیختے دیکھا۔ "بتاؤ میرے بھائی کو کس نے قتل کیا ہے؟ میں اسے خود عبرتناک موت ماروں گا۔"

مجھے اور نضار کو ایک بڑے سے دالان کے فرش پر باندھ کر ڈالا گیا تھا۔ محافظ ہمارے قریب کھڑے تھے۔ انہوں نے میری نشان دہی کر دی۔

"اسے حویلی سے باہر لے کر آؤ۔" مشتعل نوجوان نے محافظوں کو حکم دیا۔

محافظ جب مجھے وہاں سے اٹھا کر لے جا رہے تھے تو نضار نے بڑی بے بسی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ بے بسی کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

سردار زادہ اس مشتعل نوجوان کا بڑا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود بھی سردار زادے کو اپنا بھائی کہہ چکا تھا۔ اس کا چہرہ خاصی حد تک مقتول سے ملتا تھا۔ اس نے عبادت گاہ سے اپنے باپ سردار صاحی کے لوٹ کر آنے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ شاید زیادہ ہی جذباتی اور غصہ ور لگتا تھا۔ اسی کے حکم پر میرے پیروں کی رسیاں کھول دی گئیں صرف دونوں ہاتھ بندھے رہنے دیئے گئے۔ اسی رسی کا دوسرا سرا گھوڑے کی کمر سے باندھ دیا گیا۔ پھر مشتعل نوجوان اس گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ میں پتھریلی زمین پر اوندھی پڑی تھی اور میرے بندھے ہوئے دونوں ہاتھ کھنچی ہوئی رسی کی وجہ سے اٹھے ہوئے تھے۔

اچانک اس نوجوان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور میرے جسم کو زبردست جھٹکا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کلائیوں کے جوڑ کے پاس سے میرے ہاتھ الگ ہو جائیں گے۔ بمشکل ذرا ہی دور تک میرا جسم زمین پر گھسٹا ہو گا کہ یوں لگا' میرے جسم کو کسی نادیدہ قوت نے اوپر اٹھا لیا ہو۔ مجھے اپنے بہت قریب عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ کی مخصوص خوشبو محسوس ہو رہی تھی' مگر میں اسے دیکھنے سے قاصر تھی۔ گھوڑا تیز رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ مشتعل نوجوان دانستہ گھوڑے کو اونچے نیچے ناہموار راستوں پر دوڑا رہا تھا۔ کچھ

ی دیر کے بعد میں نے چند گھڑسواروں کو تیزی سے پیچھے آتے دیکھا۔ قریب آ کر ان میں سے ایک نے اس نوجوان کو بلند آواز میں مخاطب کیا۔ "اے سردار زادے! سردار تجھے واپس بلا رہا ہے۔"

"اس سے کہہ دے کہ میں اپنے بڑے بھائی کو قتل کرنے والی کی لاش کسی گہرے کھڈ میں پھینک کر ابھی واپس آتا ہوں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"لاش!" محافظ نے میری طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "کس کی لاش اے سردار زادے؟"

"اسی عورت کی لاش جو میرے گھوڑے سے بندھی ہوئی ہے۔" نوجوان نے بتایا۔ وہ شاید اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ اتنی دور اور اتنی دیر تک پتھریلی زمین پر گھسیٹے جانے کے بعد میں دم توڑ چکی ہوں گی۔

"مگر اے سردار زادے! وہ تو زندہ ہے۔" گھڑسوار محافظ نے گویا انکشاف کیا۔

"کیا؟" نوجوان اچھل پڑا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے؟ اسے تو میں حویلی سے یہاں تک گھسیٹتا ہوا لایا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے کود کر تقریباً دوڑتا ہوا میرے قریب آیا اور مجھے زندہ سلامت دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر اس نے میرے ہاتھ پکڑ کر زمین سے اٹھایا اور کھڑا کر دیا شاید وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں زخمی بھی ہوں یا نہیں۔ اس کے بعد وہ بڑبڑانے لگا۔ "اگر یہ اب تک زندہ بھی ہے تو........ تو میں اسے اب .... اب ہرگز زندہ نہیں رہنے دوں گا۔" کچھ دیر تک نوجوان مجھے گھور کر دیکھتا رہا پھر وہ محافظوں کی طرف پلٹا۔

اس نوجوان نے محافظوں کو جو حکم دیا تھا' اسے سن کر میں کانپ اٹھی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ شاید اب زندہ نہ بچ سکوں۔ میرے دونوں پیروں میں الگ الگ دو رسیاں باندھ دی گئیں اور ان رسیوں کے سرے مخالف سمت میں کھڑے کئے گئے دو گھوڑوں کی کمر سے باندھے گئے۔ مجھے اب زمین پر چت لٹا دیا گیا تھا۔ یوں وہ نوجوان میرے جسم کو درمیان سے چیر دینا چاہتا تھا۔

وہ نوجوان میرے قریب میری موت کا تماشہ دیکھنے کھڑا تھا۔ اگر یہ تماشہ' موت کا تماشہ بستی کے اندر ہوتا تو شاید وہاں تماشہ دیکھنے ساری بستی امنڈ پڑتی۔ وہ جگہ بستی سے باہر تھی جہاں تک نوجوان مجھے لے آیا تھا۔

"دوڑاؤ گھوڑے۔" نوجوان کے دونوں ہاتھ ایک ساتھ بلند ہوئے۔

گھوڑے مخالف سمتوں میں پوری قوت سے دوڑے' مگر جیسے ہی رسیاں تنیں اچانک گھوڑے الف ہو گئے اور انہوں نے اپنے سواروں کو نیچے پھینک دیا۔ خجیرہ کی خوشبو مجھے ایک بار پھر محسوس ہوئی۔ دوسرے گھڑسواروں نے بھڑکے ہوئے گھوڑوں کو سنبھالا۔ زمین پتھریلی تھی اور ایک سوار سر کے بل زمین پر گرا تھا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ دوسرا سوار اپنا ایک پیر پکڑے کراہ رہا تھا۔ اس کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ سکا ہو گا کہ ایک دم کیا ہوا؟ گھوڑے کیوں الف ہو گئے؟ ہاں میں ضرور یہ سمجھ گئی تھی کہ عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ میری مدد کر رہی ہے۔ زخمی ہونے والے سواروں کی جگہ دوسرے سواروں نے لے لی۔ دوبارہ وہی کھیل شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ دونوں گھوڑے چابک پر چابک برسائے جانے کے باوجود اپنی جگہ کھڑے رہے اور ذرا سے بھی آگے نہیں بڑھے۔

"گھوڑے بدل دو۔" نوجوان چیخا۔

نوجوان کے اس حکم کی بھی فوراً تعمیل کی گئی۔ رسیوں کے سرے دوسرے گھوڑوں کی پشت پر باندھ دیئے گئے۔ اسی وقت میں نے خجیرہ کی خوشبو قریب آتے محسوس کی۔ دونوں گھوڑے ذرا سی پوری قوت سے مخالف سمتوں میں بھاگتے چلے گئے مگر میرا کچھ نہیں بگڑا۔ دونوں گھوڑوں کے پیچھے میرے پیروں سے کھلی ہوئی رسیاں گھسٹ رہی تھیں پھر میں نے اپنے ہاتھوں کی رسیاں بھی جیسے خود بخود کھلتے دیکھیں۔

"اٹھ کر کھڑی ہو جا کہ اب تجھ پر تشدد نہیں ہو گا اے معبلہ!" میں نے خجیرہ کی آواز سنی مجھے نظر نہیں آئی۔

دوسرے ہی لمحے میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ مشتعل نوجوان نے میرے پیروں اور ہاتھوں رسیوں کو یقیناً خود بخود کھلتے دیکھا ہو گا اسی لئے اس کے چہرے پر شدید حیرت نظر آ رہی تھی۔ معاً اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "تُو .... کون .... کون ہے تُو؟"

"میں ایک بے گناہ لڑکی ہوں اے سردار زادے! دیوتاؤں نے اسی لئے میری مدد کی۔ تیرا بھائی میرے ہاتھوں مارا نہیں گیا بلکہ ایک حادثے کا شکار ہوا۔ میرا ارادہ ہرگز اسے قتل کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے رائفل چھیننا چاہی' رائفل کی نال اس کی طرف تھی۔ بس اسی وجہ سے گولی چل گئی۔" میں نے اسے حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

"تجھے یقیناً دیوتاؤں ہی نے ایک یقینی موت سے بچایا ہے۔ مجھے تو تیری بے گناہی پر یقین آ گیا شاید میرے باپ سردار صاحی کو اس پر یقین نہ آئے۔ چل' میں تجھے اسی کے پاس لے کر چلتا ہوں۔" نوجوان نے مجھ سے کہا۔

اس نوجوان نے مجھے اپنے ہی ساتھ گھوڑے پر بٹھا لیا۔ اسی دوران میں مخالف سمت دوڑنے والے گھوڑے لوٹ آئے۔ زخمی سواروں کو گھوڑوں پر ڈال لیا گیا اور پھر وہ سب حیرت زدہ محافظ' نوجوان کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ اپنے گھوڑے دوڑانے لگے۔

بستی میں داخل ہو کر سردار کی حویلی تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ نوجوان مجھے ساتھ لئے حویلی میں داخل ہوا۔

اسی دالان میں جہاں مجھے باندھ کر ڈالا گیا تھا وہ نوجوان مجھے پھر وہیں لے آیا اور اب وہاں کا منظر بدلا ہوا تھا۔ ایک طرف اونچی سی چوکی پر کوئی سفید ریش بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ چوکی کے قریب ہی دائیں جانب میں نے نضار کو دو زانو بیٹھے دیکھا اور چونک اٹھی۔ میں اسے چھوڑ کر گئی تھی تو وہ بندھا ہوا فرش پر پڑا تھا فوری طور پر میں اس تبدیلی کی وجہ نہیں سمجھ سکی۔ آگے بڑھتے ہوئے میں نے نضار اور اس سفید ریش بوڑھے کے چہرے پر بھی شدید حیرت کے آثار دیکھے۔ میں نے اس سفید ریش بوڑھے کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہی سردار صاحی ہو سکتا ہے۔ میں اسی لئے آگے بڑھ کر اس کی چوکی کے قریب پہنچ کر اور اسے تعظیم دی۔

"اے میرے بابا! یہ لڑکی بے گناہ ہے۔" نوجوان نے میری وکالت کی۔

"ہاں اے میرے بچے! مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ یہ بے گناہ بھی ہے اور مظلوم بھی۔" بوڑھے سردار صاحی نے نرم آواز میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہرچند کہ مجھے سردار اشر کے بیٹے کی بات پر پورا یقین ہے' پھر بھی میں تیرے دائیں شانے پر سانپ کے پھن کا خاندانی نشان ضرور دیکھوں گا۔ آ' میرے قریب آ۔"

میں سمجھ گئی کہ نضار نے میری زندگی بچانے کے لئے مجبوراً اپنی اور میری اصل شخصیتیں سردار صاحی پر ظاہر کر دی ہیں۔ شاید اسی لئے اس دالان میں کوئی محافظ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں مزید آگے قدم بڑھا کر گھٹنوں کے بل چوکی کے نیچے بیٹھ گئی اور اپنا دایاں شانہ کھول دیا۔

سردار صاحی نے جھک کر میرے شانے کو دیکھا' پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں ادب سے دو زانو ہو کر نضار کے قریب بیٹھ گئی۔

"میں جب عبادت کر کے لوٹا تو معلوم ہوا اے میرے بچے کہ تُو اس بے گناہ اور مظلوم لڑکی کو اپنے گھوڑے سے باندھ کر گھسیٹتا ہوا یہاں سے لے گیا ہے کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دے۔ پھر تیرا ارادہ کیوں بدل گیا اور تُو نے اسے زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ تجھے اس کی بے گناہ کا یقین کس طرح آ گیا؟" سردار صاحی نے اپنے چھوٹے بیٹے سے دریافت کیا۔ "مجھے تو یقین تھا کہ تو اس بے گناہ کو ٹھکانے لگا کر ہی لوٹے گا۔"

"ہاں اے میرے بابا! میں ایسا ہی کرتا اور ایسا ہی کرنے کی انتہائی کوشش بھی کی' مگر..........." پھر اس نوجوان نے پیش آنے والے واقعے سے سردار کو آگاہ کر دیا۔

"یقیناً دیوتا اس پر مہربان ہیں۔" سردار صاحی بولا' پھر کہنے لگا۔ "اے میرے بچے! میں نے تیرے آوارہ عیاش بڑے بھائی کو بہت سمجھایا کہ وہ بدکاری چھوڑ دے مگر وہ نہیں مانا۔ اس کا انجام ایک نہ ایک روز یہی ہونا تھا جو ہوا۔" بوڑھے سردار صاحی کے لہجے سے انتہائی دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر مقتول سردار زادے کی آخری رسوم ادا ہوئیں جن میں ہم نے بھی شرکت کی۔ سردار صاحی اپنے بڑے بیٹے کی موت پر بہت ملول نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کا خون تھا' یہ الگ بات کہ آوارہ اور بدکار تھا۔ دوپہر کا کھانا سردار صاحی نے ہمیں اپنے ساتھ کھلایا اور پھر ہم دونوں کو الگ ایک کمرے میں لے آیا جہاں ہمارے اور اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس کے استفسار پر مختصراً میں نے اپنی روداد حیات بیان کر دی۔ مہا پجاری اب بھی زندہ ہے' اس پر سردار صاحی نے خوشی کا اظہار کیا۔ وہ مہا پجاری سے اچھی طرح واقف تھا۔

"اے معبلہ' اے میری بچی! تُو مجھے اپنے باپ کی طرح جان' یقین کر کہ یہ بوڑھا بھی اس وقت تیرے ساتھ ہو گا جب تُو ظالم و غاصب ژیان سے اپنا حق طلب کرنے کے لئے ہتھیار اٹھائے گی۔" سردار صاحی کے لہجے میں خلوص و محبت کی گرمی تھی۔ "حق و باطل کی اس جنگ میں یہ بوڑھا صاحی محض تماشائی نہیں بنے گا۔"

میں نے اور نضار نے بھی سردار صاحی کا شکریہ ادا کیا' پھر نضار بولا۔ "اے محترم سردار! تم سے ہم اس وقت تک رازداری کی التجا کرتے ہیں کہ جب تک جنگ کے نقارے پر پہلی چوٹ نہ پڑ جائے' کیا تو ہماری یہ التجا قبول کر لے گا؟ دراصل ہم اچانک دشمن پر ضرب لگانا چاہتے ہیں تاکہ وہ سنبھل نہ سکے۔"

"اے سردار اشر کے بہادر بیٹے! ایسا ہی ہو گا کہ جیسا تو چاہتا ہے۔" سردار صاحی نے یقین دلایا۔ "ہاں میں یہ ضرور چاہوں گا کہ تو اور معبلہ جب حملہ کریں تو مجھے بھی اس سے بے خبر نہ رکھیں تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ اس جنگ میں شریک ہو سکوں۔"

میں نے اور نضار نے سردار صاحی سے یہ وعدہ کر لیا۔ مہا پجاری کا اندازہ غلط نہیں نکلا تھا کہ سردار صاحی ہمارا ہمنوا بن جائے گا۔ وہ تو ہمنوائی سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ حالات جیسے خود بخود ہمارے حق میں استوار ہوتے جا رہے تھے۔ وادی سبز کے اردگرد جو قبائل آباد تھے۔ اب ان کی اکثریت ہمارے ساتھ ہو چکی تھی۔ مشرق میں صرف قلاوز' ژیان کا حلیف رہ گیا تھا اور مغرب میں آباد قبیلوں میں صرف دو اس کے ساتھ تھے۔ یہ صورت حال ہمارے لئے بڑی امید افزا تھی۔ مزید کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہم نے سردار صاحی سے رخصت کی اجازت چاہی۔

"تمہارا ارادہ یہاں سے کدھر جانے کا ہے؟ تم چاہو تو میں تمہاری حفاظت کے لئے' سپاہیوں کا ایک دستہ تمہارے ساتھ کر دوں۔" سردار صاحی بولا۔

"تیرا شکریہ اے سردار!" نضار نے کہا۔ "ہمیں سپاہیوں کی ضرورت نہیں' ہم چلے جائیں گے۔ سپاہی ساتھ ہونے سے ہماری حیثیت مشتبہ ہو جائے گی۔ تو دیکھ ہی رہا ہے کہ ہمارے جسموں پر معمولی لباس ہے۔" نضار نے غالباً دانستہ سردار صاحی کے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اس میں سردار صاحی پر بے اعتمادی کو شاید دخل نہیں تھا بلکہ اس نے احتیاطاً غالباً سوال کا جواب دینے سے گریز کیا تھا۔

"ہاں اے نضار! میں یہ تو بھول ہی گیا تھا۔ اگر تمہیں سپاہی ساتھ لینے ہوتے تو اپنی بستی سے ساتھ لے کر چلے ہوتے۔" سردار صاحی نے کہا۔ "پھر بھی میں اپنے علاقے کی حدود سے بحفاظت نکلوانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔" دوبارہ سردار صاحی نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم کہاں جائیں گے۔

پھر سردار صاحی کا چھوٹا بیٹا اور چند سپاہی ہمارے ساتھ ہو لئے۔ کچھ فاصلہ طے کرتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ سردار صاحی کا نوجوان بیٹا ہمارے ساتھ کیوں چل رہا تھا۔ میرے دائیں جانب نضار کا گھوڑا تھا' وہ نوجوان بائیں جانب آ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا تو مجھے بتائے گی کہ تو کون ہے جسے میرے بابا نے اتنی عزت دی؟"

میرے بارے میں وہ نوجوان تجسس کا شکار تھا۔ اسی تجسس کے سبب اس کی زبان پر یہ سوال آ گیا تھا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا اور جواب میں بولی۔ "سن! اے محترم سردار صاحی کے چھوٹے فرزند! وقت آنے پر تجھے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنے متعلق کچھ بتانا نہیں چاہتی۔" اس نے ملول سے لہجے میں کہا۔

"میں ضرور بتاتی' مگر ابھی کچھ بتانا مصلحت کے خلاف ہے۔"

"ٹھیک ہے نہ بتا' میں بابا سے پوچھ لوں گا۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ اس کا انداز کسی ایسے بچے کی طرح تھا جو کسی بات پر روٹھ جائے۔

پھر اس کے اور میرے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے علاقے کی سرحد پر ہمیں الوداع کہا اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس ہو گیا۔

خلاف توقع ہمیں بستی صاحی میں رک جانے کی وجہ سے بستی منعیہ پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی مگر ہمارا وہاں رکنا رائیگاں نہیں گیا تھا۔ ہمیں سردار صاحی کو اپنا ہمنوا بنا کر ایک بڑی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔

ایک پہر گزرتے گزرتے ہم بستی منعیہ میں داخل ہو گئے اور وہاں پہنچتے ہی محافظوں کی نظر میں آ گئے۔ توقع کے برعکس ہمیں اس بستی کے گلی کوچوں میں ہر جگہ مسلح محافظ نظر آ رہے تھے۔ چند محافظوں نے اپنے گھوڑے آگے بڑھا کر ہمیں اپنے نرغے میں لے لیا۔

"کون ہو تم لوگ؟ کدھر سے آ رہے ہو؟" ایک گھڑسوار محافظ نے سوال کیا بلکہ سوال در سوال کیا۔

"ہم وسیط کی بستی سے آ رہے ہیں۔" نضار نے جواب دیا۔ "سردار وسیط نے ہمیں سردار منعیہ کے پاس بھیجا ہے۔ تم ہمیں اس کے پاس لے چلو۔"

"اس وقت ہم تمہیں اس کے پاس نہیں لے جا سکتے کیونکہ وہ اپنی حویلی میں نہیں ہے۔ وہ بستی سے نکل کر مشرق کی طرف گیا ہے تاکہ سرداروں کے سردار ژیان کا استقبال کر سکے جو اس طرف آباد تینوں بستیوں کے دورے پر نکلا ہے۔" گھڑسوار محافظ نے جواب دیا۔

اس بستی میں ہمارا دشمن ژیان آنے والا تھا' یہ سن کر میرے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی۔ محافظوں کی غیر معمولی نقل و حرکت کی وجہ اب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ ہم بڑے غلط وقت پر وہاں پہنچے تھے۔

"اے اجنبی! اگر تو سردار وسیط کا کوئی پیغام لے کر سردار منعیہ کے پاس آیا ہوتا تو یہ لڑکی تیرے ساتھ نہ ہوتی۔" ایک اور گھڑسوار محافظ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی یہ دونوں مشتبہ معلوم ہوتے ہیں۔" پہلے گھڑسوار محافظ نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "ایسے موقع پر کہ جب سرداروں کا سردار ژیان یہاں آنے والا ہے' ان دونوں اجنبیوں کی آمد خطرے سے خالی نہیں لگتی۔ میرا تو خیال ہے کہ جب تک سردار منعیہ لوٹ کر آئے' ہم انہیں قید خانے میں ڈال دیں۔ جب وہ عظیم سردار ژیان کے استقبال اور ضروری کاموں سے فارغ ہو جائے گا تو ان دونوں کو ہم اس کے سامنے پیش کر دیں گے۔"

"تم ایسا نہ کرو کہ اس کے لئے تمہیں بعد میں سردار منعیہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔" نضار نے محافظوں سے کہا۔

"دھمکی دے رہا ہے ہمیں۔" ایک گھڑسوار محافظ نے آنکھیں نکالیں۔ "تو شاید ہمیں اس بستی کے

محافظ سمجھ رہا ہے۔ سن اے احمق نوجوان! ہمارا تعلق وادی سبز سے ہے۔ ہم سردار منعیہ کے جواب دہ نہیں۔ جب بھی سرداروں کا سردار ژیان وادی سبز سے نکل کر اپنے زیر نگیں کسی علاقے میں جاتا ہے تو ہم پہلے ہی سے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اب تو سمجھا کچھ یا نہیں؟ ہمیں سردار منعیہ کی جواب دہی سے ڈرا رہا تھا' گھامڑ کہیں کا۔"

صورت حال مزید بگڑ جانے سے مجھے تشویش ہونے لگی۔ ان محافظوں کا تعلق براہ راست ہمارے دشمن سے تھا' اس بات نے مجھے مزید بوکھلا دیا تھا۔

"سنو! تمہیں ہماری طرف سے یقیناً غلط فہمی ہو گئی ہے۔" میں نے انہیں نرمی سے سمجھانا چاہا "دیکھ لو کہ ہمارے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے۔"

میری نرمی اور سمجھانے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بڑے خودسر معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پختہ عمارت سردار منعیہ کی حویلی ہی معلوم ہوتی تھی جس سے کچھ ہی فاصلے پر موجود دوسری پختہ عمارت میں وہ محافظ ہمیں لے کر داخل ہو گئے۔ وہ قید خانہ ہی تھا۔ قید خانے کے نگران سے بھی ان محافظوں کا رویہ حاکمانہ سا تھا۔

"انہیں مشتبہ سمجھ کر گرفتار کیا گیا ہے۔" ایک محافظ نے نگران کو مخاطب کیا۔ "ان کی زبانیں کھلوانا تیرا کام ہے کہ ہمارا کام انہیں یہاں پہنچا کر ختم ہو گیا۔"

"بہتر ہے' میں ان کی کھال ادھیڑ دوں گا۔" قید خانے کے نگران نے اظہار فرماں برداری کیا "میرے سامنے تو پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔"

جاتے جاتے وہ کم بخت محافظ ہماری جان کو ایک اور آفت ڈال گئے تھے۔ ان ظالموں نے نگران کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ ہم سردار منعیہ سے ملنا چاہتے تھے۔

محافظ چلے گئے تو قید خانے کے نگران نے باری باری ہم دونوں کو گھور کر دیکھا پھر غرایا۔ "اب شروع ہو جاؤ ورنہ.........." دھمکی کے انداز میں اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہم تو سردار منعیہ سے ملنے آئے تھے۔" میں بول اٹھی۔ "وہ محافظ خواہ مخواہ پکڑ کر ہمیں یہاں لے آئے۔ سردار وسیط نے ہمیں بھیجا تھا۔"

"ہونہہ! سردار وسیط سے اپنا تعلق بتاتے ہو تم لوگ۔ حالت دیکھی ہے تم نے اپنی۔ جسم پر ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں' چلے ہیں سردار منعیہ سے ملنے۔" نگران کا لہجہ حقارت آمیز تھا۔ "کس لئے ملنا تھا تمہیں سردار منعیہ سے؟ ذرا یہ بھی تو معلوم ہو۔"

"ہم اس کے لئے سردار وسیط کا ایک پیغام لے کر آئے تھے۔" اس مرتبہ میرے بجائے نضار نے جواب دیا۔

"اور وہ پیغام اتنا بھاری تھا کہ تجھ اکیلے سے نہیں اٹھا تو اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ لے آیا۔" نگران کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔ "واقعی تم دونوں اپنے حلیوں سے کسی سردار کے پیغامبر ہی ہو۔" پھر اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "دیکھو' اگر تم دونوں اپنی کھال ادھڑوانا نہیں چاہتے تو مجھے کہانیاں

سنا کر بہلانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہیں اندازہ نہیں ابھی کہ تم کس کے سامنے کھڑے ہو۔"

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ بستی منعیہ پہنچ کر بھی ہم کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ اس نگران پر مجھے سخت غصہ آ رہا تھا جو ہماری کوئی بات سننے کا روادار نہیں تھا۔ میں اسی لئے قدرے برہم لہجے میں بولی۔ "ٹھیک ہے' تو جو چاہے ہم پر ظلم کر مگر اتنا سن لے کہ تجھے اس کے لئے سردار منعیہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا' ہمیں اپنے بارے میں جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکے تو چاہے یقین کر یا نہ کر۔"

"لڑکی!" نگران نے چیخ کر مجھے رعب میں لینا چاہا۔ "تیری زبان بہت چل رہی ہے۔" پھر وہ فحش کلامی پر اتر آیا۔ میری دھمکی کا اس پر الٹا اثر ہوا تھا۔ اس نے چیخ کر کئی محافظوں کو وہاں بلا لیا۔ "ان دونوں کو اس وقت تک باندھ کر مارو جب تک یہ زبان کھولنے پر آمادگی کا اظہار نہ کر دیں۔ کھال ادھیڑ دو ان کی۔"

نضار نے ان محافظوں کو جواب دہی کی دھمکی دی تھی تو ہم قید خانے میں پہنچ گئے تھے اور اب نگران کو میں نے یہی دھمکی دی تو اس کا نتیجہ وہی نکلا تھا۔

قید خانے کے محافظ ہم دونوں کو نگران کے کمرے سے لے کر نکل رہے تھے تو ایک محافظ نے نگران کے قریب جا کر سرگوشی کی۔ معلوم نہیں اس نے کیا کہا تھا کہ نگران نے محافظوں کو آواز دے کر روک لیا پھر بولا۔ "لڑکی کو یہیں چھوڑ جاؤ' اس سے میں خود پوچھ گچھ کروں گا۔"

اپنے نگران کا حکم سن کر محافظوں نے مجھے دوبارہ کمرے میں دھکا دے دیا۔ میں گرتے گرتے بچی۔ وہ صرف نضار کو لے کر چلے گئے۔ جس محافظ نے نگران سے سرگوشی کی تھی' وہ بھی نگران کے اشارے پر کمرے سے نکل گیا۔

"دیکھ اے حسین لڑکی! تجھے قید سے رہائی مل سکتی ہے۔ میں تجھے ایسا راستہ بتاؤں گا کہ تو اپنے ساتھی کو بھی یہاں سے نکال سکے گی۔" نگران نے خلاف توقع نرم اور دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "بول' قید سے رہائی چاہتی ہے؟"

نگران کے بدلے ہوئے رویے سے مجھے کسی اور بڑے خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اسی لئے بے دلی سے کہا۔ "تو کہہ دے جو کہنا چاہتا ہے۔"

"تو سن۔" نگران کی آواز اور دھیمی ہو گئی۔ "یہ تیری خوش قسمتی ہے کہ سرداروں کا سردار ژیان اس بستی میں آنے والا ہے۔ وہ تجھ جیسی حسین اور نوخیز لڑکیوں کا بہت قدردان ہے۔ اگر تو مجھ سے وعدہ کر لے کہ اس سے میری ترقی کی سفارش کر دے گی تو آج رات میں تجھے اس کے پاس پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔ تو نے اگر اسے خوش کر دیا تو وہ تجھے مالا مال کر دے گا۔ سن' ایسا کوئی موقع زندگی میں بس ایک بار ہی ملتا ہے۔"

نگران کی بات سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ یقیناً اسے یہ راہ اسی محافظ نے سجھائی تھی جسے میں نے سرگوشی کرتے دیکھا تھا۔

"بول' چپ کیوں ہے؟" نگران نے مجھے خاموش دیکھ کر ٹوکا۔ "یقین کر تجھے سرداروں کے سردار

ژیان کے ساتھ ایک رات گزار کر بہت کچھ حاصل ہو جائے گا۔"

میرا خون کھولنے لگا۔ اسی غصے کے عالم میں اسے میں نے مخاطب کیا۔ "سن' میرے برابر اگر کوئی جوان بیٹی ہوتی تو کیا تو اسے بھی ژیان کے ساتھ رات گزارنے کے لئے بھیج دیتا؟ اپنی ترقی کی خاطر اس کی عزت و آبرو پامال کرانے پر............"

تڑاخ کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔ نگران کا الٹا ہاتھ میرے منہ پر پڑا تھا اور میں اپنی بات پوری نہ کر سکی تھی۔

"کمینی! تیری یہ ہمت کہ میری بیٹی کے لئے ایسی گری ہوئی بات اپنی زبان پر لائے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے سر کے بال پکڑ لئے۔

اس نے میرے بالوں کو جھٹکا دیا ہی تھا کہ میں نے طیش کے عالم میں اس کے ناک پر پوری قوت سے گھونسہ مارا۔ اس نے چیخ کر میرے بال چھوڑ دیئے اور دونوں ہاتھوں سے اپنی ناک پکڑ لی۔ میں نے اس کی ناک سے خون بہتے دیکھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا' میرا دوسرا گھونسہ اس کی کنپٹی پر پڑا۔ یہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ وہ چکرا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی وقت میری نگاہ دیوار سے لگی ایک رائفل پر پڑی۔ رائفل ہی کے پاس کارتوسوں کی پیٹی پڑی تھی۔ میں نے جھپٹ کر رائفل اٹھا لی اور پیٹی اٹھانے کے لئے جھک رہی تھی کہ میری سماعت سے نضار کے چیخنے کی آواز ٹکرائی۔ محافظوں نے یقیناً اس پر تشدد شروع کر دیا تھا۔ کارتوسوں کی پیٹی اٹھا کر میں کمرے کے دروازے کی طرف لپکی اور چشم زدن میں باہر راہداری میں پہنچ گئی۔ نضار کی چیخوں نے میری رہنمائی کی۔ وہ کوٹھری' نگران کے کمرے سے زیادہ دور نہیں تھی جہاں سے نضار کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں جیسے اڑتی ہوئی وہاں تک پہنچ گئی۔ یہ شاید میری خوش قسمتی کہ وہاں تک پہنچتے ہوئے راستے میں مجھ سے کوئی محافظ نہیں ٹکرایا۔ اس کوٹھری کا دروازہ مجھے کھلا ہوا ہی ملا تھا۔

وہ دو قوی ہیکل محافظ تھے جو چمڑے کے کوڑوں سے نضار کو زد و کوب کر رہے تھے۔ نضار کوٹھری کے فرش پر پڑا تھا۔ اس کے جسم کا اوپری حصہ بے لباس تھا۔ مجھے اس کے جسم پر نیلی نیلی دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔

"کوڑے اپنے ہاتھوں سے پھینک کر دیوار کی طرف منہ کر لو ورنہ میں تم دونوں کو گولی مار دوں گی۔" میں نے ان محافظوں کو مخاطب کیا۔

محافظوں کے اٹھے ہوئے ہاتھ اٹھے ہی رہ گئے اور انہوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر شدید حیرت کے آثار تھے۔

"زندگی چاہتے ہو تو میرے حکم کی تعمیل کرو۔ کوڑے پھینک دو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" میں پھر سخت آواز میں ان سے بولی۔

رائفل کی نال اپنی طرف اٹھی دیکھ کر انہوں نے شاید میرا حکم ماننا ہی غنیمت جانا۔ کوڑے ان کے

ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور پھر وہ دونوں کوٹھری کی سامنے والی دیوار سے جا لگے۔ اس دوران میں نضار کراہتا ہوا اٹھا۔ وہیں ایک طرف زمین پر اس کے جسم کا اوپری لباس پڑا تھا۔ اس نے وہ اٹھا کر پہن لیا۔

نضار کو ساتھ لئے میں تیزی کے ساتھ کوٹھری سے نکلی اور باہر نکلتے ہی کوٹھری کے دروازے کی کنڈی لگا دی پھر میں اسی راہداری کی طرف بڑھی جو نگران کے کمرے کے باہر تھی۔ اسی راہداری کے اختتام پر دوسری جانب وہ دروازہ تھا جس سے گزر کر ہم اس قیدخانے سے نکل سکتے تھے۔ راہداری اپنے اختتام پر بائیں جانب مڑ گئی تھی اور وہیں چند قدم کے فاصلے پر قیدخانے کا بڑا دروازہ تھا۔ قیدخانے میں داخل ہوتے وقت میں نے دو مسلح محافظوں کو دروازے پر پہرہ دیتے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک دروازے کے باہر اور ایک اندر تھا۔ مجھے انہی دونوں محافظوں سے نمٹنا تھا۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اگر قیدخانے سے نکلنے کے لئے مجھے ان دونوں محافظوں کو گولی بھی مارنا پڑی تو گریز نہیں کروں گی' مگر اس کی نوبت نہیں آ سکی۔

ابھی ہم نگران کے کمرے سے کچھ دور ہی تھے کہ اچانک دھماکہ ہوا۔ کسی نے پیچھے سے گولی چلائی تھی۔ گولی چلانے والے نے مجھے یا نضار کو نشانہ بنانے کے بجائے میرے ہاتھ میں موجود رائفل کو نشانہ بنایا تھا اور رائفل چھوٹ کر میرے ہاتھ سے دور جا گری تھی۔ محافظوں کو ہمارے فرار کی خبر دینے والے وہی دو قوی ہیکل محافظ ہو سکتے تھے جو نضار پر تشدد کر رہے تھے اور جنہیں میں کوٹھری میں بند کر آئی تھی۔ انہوں نے چیخ چیخ کر دوسرے محافظوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہو گا۔ مجھے یقیناً انہیں کم سے کم بے ہوش تو کر ہی دینا چاہئے تھا تاکہ ہمارے فرار سے دوسرے محافظ آگاہ نہ ہو سکتے' مگر اب وقت گزر چکا تھا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

ذرا ہی دیر میں عقب سے دوڑ کر آنے والے مسلح محافظوں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اسی وقت قیدخانے کے نگران کو میں نے کمرے کے دروازے سے نکلتے دیکھا۔ اسے یقیناً ہوش آ گیا تھا۔ اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے جو ظاہر ہے کہ میری ہی دین تھے۔ اس نے بڑی خون خوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک محافظ نے اس کے قریب پہنچتے ہی جلدی سے بتایا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

"انہیں صحن میں لے کر چلو۔" نگران پھنکارا۔

ذرا ہی دیر کے بعد قیدخانے کے صحن میں مجھے اور نضار کو اوندھا لٹا دیا گیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ اور پیر رسیوں سے باندھ کر رسیوں کے سرے ان کیلوں سے باندھے جانے لگے جو صحن میں پہلے ہی گڑی ہوئی تھیں۔ شاید ایسے تماشے وہاں پہلے بھی ہوتے رہتے تھے۔

"ان پر اس وقت تک کوڑے برساتے رہو جب تک یہ تڑپ تڑپ کر مر نہ جائیں۔" قیدخانے کے نگران نے ہمیں سزائے موت سنا دی۔

میرا دل ڈوبنے لگا اور میں نے سوچا' کیا یہ بستی میری زندگی کی آخری منزل تھی؟

اس جگہ سے کچھ ہی فاصلے پر نضار بندھا پڑا تھا جہاں مجھے زمین پر اوندھا لٹا کر باندھا گیا تھا۔ میں

نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ میری ہی جانب تھا۔ میری وجہ سے اسے بھی عذابوں کے اس سفر سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ اس لمحے مجھے احرس کا خیال آیا اور میں نے سوچا' کیا احرس بھی میری خاطر ایسی آزمائشوں سے گزر سکتا تھا جن میں ہر لمحہ اور قدم قدم پر موت کا سامنا تھا؟ وہ لمحات ایسے نہیں تھے کہ میں زیادہ دیر تک اس سوال پر غور کر سکتی۔ نگران میری اور نضار کی موت کا حکم سنا چکا تھا۔ بستی کے اس قید خانے میں ہم دونوں کو ایک عبرت ناک موت سے دوچار کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہ بڑی الم ناک صورت حال تھی کہ اس بستی کا سردار جو وسیط کی اطلاع کے مطابق ثریان کے خلاف اتحاد میں شامل ہو چکا تھا' اسی بستی کے ایک معمولی عہدیدار نے ہمیں سزائے موت سنا دی تھی اور اب اپنی نگرانی میں اس سزا پر عمل در آمد کرانے والا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد چار قوی ہیکل محافظ چمڑے کے کوڑے لئے صحن میں آ گئے' اور انہوں نے کوڑوں کو فضا میں لہرایا۔ "شائیں شائیں" کی آوازیں سن کر میں لرز اٹھی۔ ان محافظوں کا مقصد بھی شاید ہمیں خوفزدہ کرنا ہی تھا۔ مانوس خوشبو کا ایک جھونکا' میرے قریب آ کر دور ہوتا گیا۔ یہ مخصوص خوشبو کاہنہ خجیرہ ہی کی تھی۔

اچانک میں نے اپنے جسم میں غیر معمولی سی تبدیلی محسوس کی۔ میرے جسم میں جیسے شعلے سے لپک رہے تھے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جھٹکا دیا اور مضبوط موٹی رسیاں کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گئیں۔ دوسرے ہی لمحے میں اچھل کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اپنے دونوں پیروں میں بندھی ہوئی رسیوں کو توڑنے میں بھی مجھے دیر نہیں لگی۔ وہاں موجود محافظ غالباً شدید حیرت کے سبب جہاں کھڑے تھے' وہیں مجسموں کی طرح کھڑے رہ گئے۔ ان ہی میں قید خانے کا نگران بھی شامل تھا۔ میں خود بھی حیران تھی کہ میرے اندر اچانک اتنی طاقت کیسے پیدا ہو گئی۔ ان رسیوں کو اتنی آسانی سے توڑ دینا ناممکن سی بات تھی۔ یقیناً میرے اندر پیدا ہو جانے والی یہ طاقت بھی ان ہی پُراسرار قوتوں میں سے تھی جو مجھے عطا کی گئی تھیں۔ آج پہلی بار مجھے اپنے وجود میں چھپی ہوئی اس پُراسرار قوت کا تجربہ ہوا تھا۔ ان لمحات حیرت سے میں نے پورا فائدہ اٹھایا اور تیزی سے لپک کر نضار کے ہاتھ پیروں سے بندھی ہوئی رسیاں بھی توڑ دیں۔ نضار بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے سے بھی حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میرے قریب ہی وہ چاروں محافظ ساکت کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں کوڑے تھے۔ معاً میں چونک اٹھی اور مجھ پر حقیقت منکشف ہو گئی۔ وہاں موجود محافظ حیرت کی زیادتی کے سبب بے حس و حرکت نہیں کھڑے ہوئے تھے بلکہ ان پر ایک غیر فطری سی غفلت طاری تھی۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں' مگر وہ اپنی پلکیں نہیں جھپکا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کھڑے کھڑے سو گئے ہوں۔

میں نے تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھوں اور پیروں سے ٹوٹی ہوئی رسیوں کے ٹکڑے کھولے اور نضار نے بھی میری تقلید میں ایسا ہی کیا۔ پھر ہم وہاں رکے بغیر قید خانے کے صدر دروازے کی طرف بھاگے۔ راستے میں ہمیں کئی محافظ ملے' مگر ان سب کا ایک ہی حال تھا۔ وہ سبھی مجسموں کی طرح اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔ یہ منظر میرے لئے انتہائی عجیب تھا۔ ایک محافظ مجھے راہداری میں نظر آیا۔ اسے دیکھ کر

اندازہ ہوتا تھا کہ چلتے چلتے اچانک وہ ساکت ہو گیا ہے۔ اس کا دایاں پیر آگے بڑھا ہوا تھا اور بایاں پیر پیچھے تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے چل پڑے گا۔ ایک محافظ مجھے ایسا بھی دکھائی دیا جو شاید جماہی لے رہا تھا کہ ساکت ہو گیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ صدر دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہاں بھی مجھے ایک مسلح محافظ نظر آیا۔ وہ اپنے شانے سے لٹکی ہوئی رائفل اتار رہا تھا اور اسی حالت میں بے حرکت ہو گیا تھا۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے باہر بھی مسلح محافظ موجود تھا اور اس کی حالت بھی اندر والوں سے مختلف نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ ہی نے یقیناً ان محافظوں پر غفلت طاری کی تھی تاکہ ہم اس قید خانے سے فرار ہو سکیں۔ جہاں ہمیں سزائے موت دی جانے والی تھی۔ اپنے جسم میں غیر معمولی طاقت پیدا ہونے سے پہلے میں نے خجیرہ کی مخصوص خوشبو محسوس کی تھی' مگر وہ حسب سابق میری نظروں سے اوجھل ہی رہی تھی۔

وہ قید خانہ اس بستی کی آبادی کے ایک سرے پر واقع تھا۔ دوبارہ آبادی کا رخ کرنے کی صورت میں ہم پھر کسی خطرے میں گھر سکتے تھے کیونکہ وہاں ہر گلی کوچے میں مسلح محافظوں کو ہم خود دیکھ چکے تھے۔ ہم نے اسی لئے غیر آباد علاقے کا رخ کیا۔ کچھ ہی فاصلے پر ہمیں چھوٹی بڑی چٹانیں نظر آ رہی تھیں اور ہمارے قدم ان ہی کی طرف اٹھ رہے تھے۔ اب مجھے اپنے جسم میں شعلے سے لپکتے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ شاید وہ پُراسرار قوت میرے اندر پھر خوابیدہ ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے مجھ میں غیر معمولی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔

ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے پہنچ کر ہم رک گئے۔ اب آبادی کی طرف سے آنے والے کسی شخص کی نظر ہم پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ چٹان سے ٹیک لگا کر ہم دونوں آرام سے بیٹھ گئے تو نضار مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اے آتون! اب بھی جانے کیوں یقین سا نہیں آ رہا کہ ہم موت کے منہ سے نکل آئے ہیں۔ یقین کر کہ میں تو اپنی زندگی کی طرف سے قطعی مایوس ہی ہو گیا تھا۔ تُو یہ بتا کہ اس کوٹھری تک کیسے پہنچ گئی تھی جہاں مجھ پر کوڑے برسائے جا رہے تھے؟"

"وہاں تک پہنچنے میں تیری چیخوں نے میری رہنمائی کی ورنہ شاید میں اس کوٹھری تک نہ پہنچ سکتی۔" یہ کہہ کر میں نے نضار کو ان واقعات سے آگاہ کر دیا جو اس کے پیچھے رونما ہوئے تھے۔ آخر میں یہ اعتراف بھی میں نے کیا کہ اسی کی طرح مجھے بھی موت کا یقین ہو چکا تھا۔

"تُو نے اے آتون' وہ مضبوط موٹی رسیاں کس طرح توڑ ڈالیں؟" نضار نے مجھ سے معلوم کیا۔ "میں تو تجھے رسیاں توڑتے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔"

"اے نضار! تجھے اور مجھے جو پُراسرار قوتیں عطا کی گئی ہیں' ان ہی میں سے ایک یہ غیر معمولی طاقت ہے۔ اچانک ہی مجھے اپنے جسم میں شعلے سے لپکتے محسوس ہوئے تھے اور پھر........." میں' نضار کو اپنی اس کیفیت کے بارے میں بتانے لگی جس سے گزر چکی تھی۔ آخر میں نضار سے میں نے کہا۔ "وقت پڑنے پر شاید کبھی تیرے اندر چھپی ہوئی یہ پُراسرار قوت بھی ظاہر ہو جائے' جس طرح کہ بوڑھے ساحر زیم سے برسرپیکار ہوتے وقت تیرے اندر بھی تیز روشنی سے جلا دینے کی قوت پیدا ہو گئی تھی۔"

ہمارے وہاں پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد اندھیرا پھیلنے لگا۔ شام کا دھندلکا اب غائب ہو چکا تھا۔

"ہم یہاں کب تک چھپے رہیں گے اے آتون!" نضار نے ذرا دیر بعد سوال کیا۔

"اس وقت تک اے نضار کہ جب تک ہمارا دشمن ژیان یہاں سے چلا نہ جائے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں اس کی موجودگی میں اوّل تو ہم سردار صنعیہ کی حویلی تک ہی نہیں پہنچ سکیں گے۔ راستے میں ژیان کے محافظ ہمیں پہلے کی طرح بستی میں اجنبی جان کر پکڑ لیں گے۔ اگر ہم کسی طرح ان سے بچ کر حویلی تک پہنچ بھی گئے تو شاید حویلی کے اندر ہمیں داخل نہ ہونے دیا جائے، کیونکہ اسی حویلی میں ژیان کا قیام ہو گا۔ ژیان جب اپنے محافظوں سمیت یہاں سے دفع ہو جائے گا تبھی ہم سردار صنعیہ سے ملنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ میرا قیاس یہ ہے کہ ہمارا دشمن کل کسی وقت اس بستی سے اگلی بستی کے لئے روانہ ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ تینوں بستیوں کے دورے پر نکلا ہے تو کسی ایک بستی میں زیادہ دن نہیں رکے گا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں کم از کم کل تک یہیں چھپا رہنا ہے اے آتون! مگر کل ہمیں یہ کس طرح معلوم ہو گا کہ ژیان یہاں سے جا چکا ہے؟"

نضار کے سوال نے مجھے چکرا دیا۔ پھر میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "یہ معلوم کرنے کے لئے تو ہمیں بستی تک جانے کا خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ بستی کے گلی کوچوں میں اگر آج ہی کی طرح محافظ نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہو گا، ہمارا دشمن ابھی گیا نہیں۔ دوسری صورت میں ہمیں دوسرا نتیجہ اخذ کرنا ہو گا۔"

"لیکن اس کوشش میں ہم دوبارہ بھی تو محافظوں کی نظر میں آ سکتے ہیں؟"

"وہ تو ہے اے نضار! اسی لئے میں نے خطرہ مول لینے کی بات کی ہے۔"

پھر نضار کچھ نہیں بولا۔ موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی تو ہمارے لئے نہیں تھا۔ نضار شاید یہی سوچ کر چپ ہو گیا تھا۔

ابھی ہمیں خاموش بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دور کہیں سے دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور میں اچھل پڑی۔

"تُو نے کچھ سنا ہے اے نضار!" میں گھبرا کر بولی۔

"ہاں آتون!" نضار نے جواب دیا۔ اس کی آواز سے بھی گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ "کچھ گھڑسوار ادھر ہی آ رہے ہیں شاید۔"

پتھریلی زمین پر ایک تسلسل کے ساتھ گھوڑوں کی ٹاپیں پڑ رہی تھیں اور ٹاپوں کے زمین پر پڑنے کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک میرے اندر اندھیرے میں دیکھنے کی قوت بیدار ہو گئی۔ میں نے دور دور تک نگاہ ڈالی۔ وہاں کوئی ایسی جگہ مجھے نظر نہیں آ سکی جہاں ہم چھپ سکتے۔ شاید ہمارے فرار کی خبر قید خانے کے نگران نے ژیان کے محافظوں کو پہنچا دی تھی اور اب وہ ہماری تلاش میں ادھر آ رہے تھے۔ قید خانے سے فرار ہو کر ہمارے لئے چھپنے کی مناسب جگہ یہی چٹانی سلسلہ ہو سکتا تھا۔ میں نے پہلے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ جب قید خانے کے نگران اور محافظوں کی غفلت ختم ہو گی تو

کیا قدم اٹھائیں گے۔ اگر مجھے یا نضار کو پہلے یہ خیال آگیا ہوتا تو ہم ہرگز اس علاقے میں رک کر اتنا وقت ضائع نہ کرتے اور مزید آگے بڑھ کر کسی ایسی مناسب جگہ چھپنے کی کوشش کرتے جہاں باآسانی ہمیں تلاش کرنا ممکن نہ ہوتا۔ معاً میرے ذہن میں محافظوں کی نظروں سے بچنے کی ایک جگہ آ گئی۔

"اے نضار! اگر ہم کسی طرح اس چٹان کے اوپر چڑھ جائیں تو محافظ ہمیں نہیں دیکھ سکیں گے۔" میں نضار سے بولی۔

"تو ٹھیک کہتی ہے اے آتون!" نضار نے میری تائید کی۔ "یہ چٹان اتنی بلند ہے کہ اگر گھڑسوار یہاں سے گزرے بھی تو چٹان کے اوپر ان کی نظریں نہیں پڑ سکتیں، مگر.......... اس کے اوپر چڑھنا سخت دشوار لگتا ہے۔ شاید ہم اس پر نہ چڑھ سکیں۔"

"کوشش تو کی جا سکتی ہے نا!" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "یہاں تو وہ ہمیں فوراً دیکھ لیں گے۔"

پھر میں اور نضار اس چٹان پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس چٹان پر چڑھنا واقعی بے حد دشوار تھا۔ بار بار میرے پیر پھسل رہے تھے مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور اوپر چڑھنے کی کوشش کرتی رہی اور میری یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ نضار بھی بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہا تھا۔ عام حالات میں اس عمودی سی چٹان پر چڑھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دونوں چٹان کے وسط میں پہنچ چکے تھے، مگر ابھی نصف چٹان باقی تھی اور ہم اس وقت تک خود کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے جب تک چٹان کے اوپر نہ پہنچ جاتے۔

چٹان پر چڑھتے ہوئے میں نے بستی کی طرف نگاہ اٹھائی اور میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مشعل بردار مسلح محافظوں کا دستہ بہت قریب آ چکا تھا۔ پھر میں نے انہیں دور تک پھیلی ہوئی چھوٹی بڑی چٹانوں کے علاقے میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں جس بلند چٹان پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی، وہ چٹان اس علاقے کے وسط میں تھی۔ ان کی طرف دیکھنے کے باوجود میں بدستور اوپر چڑھتی جا رہی تھی۔ مجھ سے کچھ ہی نیچے نضار تھا۔

ایک چوتھائی چٹان کا حصہ ابھی باقی رہ گیا تھا کہ میں نے کسی پتھر کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ نضار کی تیز چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے گھبرا کر نضار کی طرف دیکھا اور سناٹے میں رہ گئی۔ وہ چٹان سے لڑھکتا ہوا نیچے گر رہا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر موجود گھڑسوار اچانک اس چٹان کی طرف دوڑے۔ میرے لئے نہ اب یہ ممکن تھا کہ مزید اوپر چڑھ سکتی اور نہ میں نضار کی کوئی مدد کر سکتی تھی۔ میں چٹان سے چپک گئی اور نیچے دیکھنے لگی۔ نضار کا بے سدھ جسم چٹان کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ نیچے لڑھکتے ہوئے نضار کا سر شاید کسی پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ مجھے بے ہوش معلوم ہو رہا تھا۔ قید خانے سے فرار ہوتے وقت ہم نے کوئی ہتھیار نہیں لیا تھا۔ اگر اس وقت میرے پاس کوئی رائفل ہوتی تو شاید میں ان گھڑسواروں پر گولی چلا کر انہیں ادھر آنے سے روک دیتی۔ ہرچند کہ اس طرح میری زندگی بھی شدید خطرے میں پڑ جاتی، مگر ایک امکان کامیابی کا بہرحال ہوتا۔ میں نے اس چٹان سے چپکے ہوئے ان گھڑسوار

محافظوں کی طرف دیکھا جو اب وہاں پہنچ چکے تھے۔

پھر کسی گھڑسوار کی نظر نضار کے بے ہوش جسم پر پڑ ہی گئی اور وہ چیخ اٹھا۔ "وہ رہا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چٹان کے نیچے آ کر رک گیا۔

"مگر اس کے ساتھ تو ایک لڑکی بھی تھی۔" کسی نے کہا۔

"لڑکی کو تلاش کرو' وہ بھی یہیں کہیں ہو گی۔" ایک اور گھڑسوار بولا۔ وہ اس دستے کا سالار لگتا تھا۔ اس کے لہجے میں حکم تھا۔

دو گھڑسوار اپنے گھوڑوں سے کود کر نضار کے قریب پہنچے بقیہ گھڑسوار پھر آس پاس کے علاقے میں بکھر گئے تھے۔ وہ اپنے سالار کی ہدایت پر مجھے تلاش کر رہے تھے۔ سالار وہیں رک گیا تھا۔ اس نے جھک کر نضار کے چہرے کو دیکھا۔ نضار کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔

"شاید یہ اس چٹان پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے گرا ہے۔" سالار نے اپنے ساتھی گھڑسوار سے کہا اور پھر بولا۔ "اسے اپنے گھوڑے پر اوندھا ڈال لے۔"

سالار کے حکم پر اس محافظ نے نضار کے بے ہوش جسم کو اٹھانے کی کوشش کی۔ نضار کو اکیلے اٹھا کر گھوڑے پر ڈالنا شاید اس محافظ کے بس میں نہیں تھا پھر بھی وہ کوشش کر رہا تھا۔ سالار نے شاید یہ بات محسوس کر لی اور پھر وہ بھی جھک کر محافظ کی مدد کرنے لگا۔

وہ لوگ میرے سامنے نضار کو وہاں سے اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ سردار صنعیہ کو فوری طور پر خبر تک نہ ہوتی اور نضار کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ سزائے موت کے لئے اتنا ہی جواز کافی ہوتا کہ وہ ایک اجنبی مشتبہ شخص تھا جو قید خانے سے فرار ہو گیا تھا۔ سردار صنعیہ کو غالباً اس کے بارے میں یہ بھی نہ بتایا جاتا کہ اس نے خود کو سردار وسیط کا پیامبر ظاہر کیا تھا۔ اے آتون! کیا تو نضار کو یوں موت کے منہ میں جاتا دیکھ لے گی؟ کسی نے جیسے میرے اندر سے سوال کیا۔

"نہیں۔" میرے منہ سے نکلا۔

دوسرے ہی لمحے میں احتیاط کے ساتھ مڑی اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ سالار اور ایک محافظ کے سوا وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ چٹان کے نیچے سالار اور محافظ نے اب نضار کے بے ہوش جسم کو اٹھا لیا تھا۔ سالار نے نضار کی دونوں ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں اور محافظ دونوں ہاتھوں کو اٹھائے ہوا تھا۔ ابھی وہ آگے بڑھے ہی تھے کہ میں نے چٹان سے چھلانگ لگا دی۔ سالار مجھ سے قریب تر تھا۔ میں اسی کے اوپر گری۔ ظاہر ہے کہ وہ اس اچانک افتاد کے لئے تیار نہیں ہو گا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گرا تھا اور میں اس کی پشت پر تھی۔ اس کے ہاتھوں سے نضار کی ٹانگیں چھوٹ گئی تھیں۔ اگر میں اس کے اوپر نہ گرتی تو شاید اتنی بلندی سے چھلانگ لگانے کے سبب زخمی ہو جاتی۔

گرتے ہی میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ محافظ نضار کے ہاتھ چھوڑ کر مجھ پر حملہ آور ہوتا' میں نے اس کے شانے سے لٹکی ہوئی رائفل گھسیٹ لی۔ سالار کا سر بڑے زور سے پتھریلی زمین سے ٹکرایا تھا۔ وہ فوری طور پر اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے اس دوران میں رائفل کو نال کی طرف

سے پکڑا اور پھر محافظ کے سر کو نشانہ بنا دیا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر وار کیا تھا۔ دانستہ ہی میں نے گولی چلانے سے گریز کیا تھا تاکہ گولی چلانے کا دھماکہ دوسرے محافظوں کو اس طرف متوجہ نہ کر دے۔ سالار کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اسے دوبارہ اوندھے منہ گرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے سر کو بھی میں نے رائفل کے دستے سے نشانہ بنایا تھا۔ اسی لمحے میں نے نضار کے کراہنے کی آواز سنی۔ یقیناً اسے ہوش آ رہا تھا۔ میں اس کی طرف لپکی۔

"اے نضار! ہوش میں آ .... نضار!" میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے ماتھے سے اب خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ میں اسے سہارا دے کر اٹھانے لگی۔ اس نے بھی ہمت کی اور میں اسے ایک گھوڑے پر سوار کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر میں نے بھی اسی گھوڑے پر سوار ہونے میں دیر نہیں کی تھی۔ رائفل کو میں نے شانے پر لٹکا لیا تھا۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ نضار کو ابھی تک پوری طرح ہوش نہیں آیا تھا' مگر وہ میرے دونوں بازوؤں کے درمیان تھا۔ میں اسے سنبھالے ہوئے تھی۔ اس کے گھوڑے سے گرنے کا ڈر نہیں تھا۔ چٹان کی آڑ سے نکل کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ میرے لئے اندھیرے پہلے ہی سے روشن تھے اور میں دن کے اجالے کی طرح واضح طور پر ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ صرف ایک سمت ایسی تھی کہ جدھر گھڑسوار محافظ نہیں تھے۔ یہ وہ راستہ تھا جس سے گزر کر ہم اس بستی تک پہنچے تھے۔ یہ راستہ بستی صاحی کی طرف جاتا تھا۔ میں نے گھوڑے کو اسی راستے پر ڈال دیا۔

میں کچھ ہی دیر میں خطرے کی حدود سے دور نکل آئی' مگر گھوڑے کو روکا نہیں۔ مجھے کسی ایسی محفوظ جگہ کی تلاش تھی جہاں چھپ سکوں۔ میں جانتی تھی کہ وہ محافظ اتنی آسانی سے میرا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ دستے کے سالار کو جب ہوش آتا تو پھر ایک بار ہماری تلاش شروع ہو جاتی۔ اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ محافظ ہمیں بستی صاحی کی طرف جانے والے راستے پر تلاش کرتے۔

ابھی میرے پاس وقت تھا اور میں اس وقت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ بستی صنعیہ کی طرف آتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹی سی پہاڑی مجھے نظر آئی تھی۔ وہ پہاڑی راستے سے ذرا ہٹ کر وادی سبز کی سمت تھی۔ اندازے کے مطابق وہ پہاڑی بستی صاحی اور بستی صنعیہ کے تقریباً درمیان میں تھی۔ وہاں سے دونوں بستیوں کا فاصلہ شاید برابر ہی ہو گا۔ اس پہاڑی کے کسی غار میں وہ رات گزاری جا سکتی تھی پھر آئندہ روز وہاں سے ہم دوبارہ بستی صنعیہ کی طرف جا سکتے تھے۔

ایک نتیجے تک پہنچنے کے بعد میں نے گھوڑے کو تیزی سے دوڑانا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں نضار کو پوری طرح ہوش آ چکا تھا۔

"اے آتون! ہم کدھر جا رہے ہیں؟" نضار نے قدرے دھیمی آواز میں مجھ سے سوال کیا "اس کی آواز سے نقاہت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"فی الحال ایک محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں۔" میں نے جواب دیا' پھر اسے پہاڑی کے بارے میں

بتایا۔

"ہاں یہ وہی راستہ معلوم ہوتا ہے جس سے ہم دن کے وقت گزرے تھے۔" نضار اردگرد نظر دوڑاتا ہوا بولا۔

"کیا تجھے بھی اندھیرے میں نظر آ رہا ہے اے نضار!" میں نے پوچھا۔

"ہاں' میری یہ قوت ذرا ہی دیر پہلے بیدار ہوئی ہے۔" نضار نے بتایا پھر گزرے ہوئے واقعے کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

مختصراً میں نے اسے پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا۔

"تُو نے میری خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں کیوں ڈالا اے آتون!" اس کی آواز میں محبت اور گلہ تھا۔ "تُو بھی پکڑی جاتی تو کیا ہوتا؟"

"تو کیا میں تجھے دیدہ دانستہ موت کے منہ میں چلا جانے دیتی؟ تُو بھی کبھی کبھی عجیب باتیں کرتا ہے اے نضار!"

"میری زندگی پر تیرے اتنے احسانات ہیں اے آتون کہ میں چاہوں بھی تو ان احسانات کو نہیں اتار سکتا۔"

"اچھا فضول باتیں نہ کر۔ ہم ایک دوسرے کی ڈھال ہیں۔ احسان اپنوں پر نہیں' غیروں پر ہوتا ہے اور تُو میرے لئے غیر نہیں اپنا ہے۔"

"کاش تُو بھی میری اپنی ہو سکتی۔" نضار نے دھیمی آواز میں کہا اور گہرا سانس لیا۔

میں اس کی بات سنی اَن سنی کر گئی۔ اس نے پھر وہی موضوع چھیڑ دیا جس پر گفتگو سے میں گریز کرتی تھی۔

پھر جب مجھے مطلوبہ پہاڑی نظر آنے لگی تو میں نے گھوڑے کا رخ بدل دیا۔ پہاڑی تک پہنچنے کا راستہ ناہموار اور بہت اونچا نیچا تھا۔ مجھے اسی لئے گھوڑے کی رفتار کم کرنا پڑی۔ اچانک نضار بول اٹھا۔

"اے آتون! ہم اس پہاڑی پر رات گزارنے کے بجائے بستی صاحی کی طرف کیوں نہ چلیں؟ وہاں ہمیں آرام بھی مل سکے گا اور ہم پوری طرح محفوظ بھی ہوں گے۔ وہاں میرے ماتھے کے زخم کی مرہم پٹی بھی ہو جائے گی جو یہاں ممکن نہیں۔ پھر تُو شاید یہ بھی بھول گئی ہے کہ ہم نے دوپہر سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔"

میں چونک اٹھی اور سوچنے لگی کہ میرے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی؟ نضار نے یقیناً بہت مناسب مشورہ دیا تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر پھر گھوڑے کو موڑا۔ اس دشوار گزار راستے سے دوبارہ ہموار راستے پر واپس آنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ نضار کا مشورہ ہر اعتبار سے درست تھا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں اپنے دشمن ژیان کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی تھیں کہ وہی بستی صنعیہ سے چلا گیا یا نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں خطرہ مول لینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

بستی صاحی کی سرحدی حدود میں داخل ہونے تک ہمیں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

جب ہم بستی میں داخل ہونے والے تھے تو دائیں جانب سے ہم نے دو گھڑسواروں کو اپنی طرف لپک کر آتے دیکھا۔ انہوں نے اپنی رائفلوں کا رخ ہماری طرف کر رکھا تھا۔ وہ یقیناً رات کے وقت پہرا دینے والے محافظ ہی ہو سکتے تھے۔

"رک جاؤ۔" ان میں سے ایک نے دور ہی سے چیخ کر کہا۔

میں نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ ان دونوں کو قریب آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتے' میں بول اٹھی۔ "ہمیں اپنے سردار کے پاس لے چلو۔"

"اے عورت! کیا تجھے معلوم نہیں کہ رات کا ایک پہر گزر چکا ہے؟" گھڑسوار کے لہجے میں خودسری تھی۔

"میں تیرے سردار کی مہمان ہوں اور مجھے اسی وقت اس سے ملنا ہے۔" میں نے جواب میں کہا۔

"رات بھر تو تجھے ہمارا مہمان رہنا پڑے گا۔" گھڑسوار بولا۔ اس کی نظریں میرے جسم کے مختلف حصوں پر رینگ رہی تھیں۔

مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ بستی صاحی پہنچ کر ایسی صورت حال بھی پیش آ سکتی ہے' ورنہ رات کے وقت میں ادھر کا رخ ہی نہ کرتی۔ میں نے محسوس کیا کہ نضار پہلو بدل رہا ہے ظاہر ہے کہ گھڑسوار کے ذومعنی جملے کو اس نے بھی سمجھ لیا ہو گا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں نے گھڑسوار کو سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "سن! میں نے تجھ سے جو کہا ہے' وہی کر ورنہ پچھتائے گا۔ سردار صاحی اپنے مہمانوں سے بدتمیزی کرنے پر تجھے سزا بھی دے سکتا ہے۔"

میرے لہجے کی سختی کام آئی اور کچھ دیر بحث و مباحثے کے بعد گھڑسوار ہمارے ساتھ ہو لئے۔ وہ ہمیں سردار صاحی کی حویلی تک لے جانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

ہمیں حویلی کے باہر ہی روک کر اندر خبر کرائی گئی۔ میں نے اپنا نام آتون ہی بتایا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد ہم دونوں کو حویلی میں بلوا لیا گیا۔ ایک محافظ ہمیں سردار صاحی کی خواب گاہ کے دروازے پر چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ ہم نے اندر داخل ہو کر اسے تعظیم دی اور سردار صاحی کے کچھ کہنے سے پہلے میں بول اٹھی۔ "اے محترم سردار! ہم تجھے رات کے وقت پریشان کرنے پر شرمندہ ہیں۔ تجھے ناحق ہماری وجہ سے جاگنا پڑا۔" میں اور نضار اس کے قریب جا بیٹھے۔

"میں جاگ ہی رہا تھا میری بچی!" سردار صاحی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "وہ لاکھ بُرا سہی مگر تھا تو میرا بیٹا ہی نا۔" اس کا اشارہ اپنے مقتول بیٹے کی طرف تھا۔ میں نے اس کے لہجے میں دکھ محسوس کیا پھر میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ ہماری غیر متوقع آمد پر اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ یقیناً اس باریش بوڑھے نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس کی نظریں ہماری طرف اٹھیں۔ "ارے اے سردار نضار! تیری پیشانی تو زخمی ہے۔ لگتا ہے کہ تم دونوں کے ساتھ کچھ اچھی نہیں گزری۔"

"ہاں اے سردار!" میں نے جواب دیا۔ سردار صاحی بہرحال ہم سے رشتہ دوستی استوار کر چکا تھا۔ میرے ہاتھوں اس کا بیٹا مارا گیا تھا' پھر بھی اس نے مجھے معاف کر دیا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اسے حقیقت

سے آگاہ کر دیا۔ "اے سردار! ہم یہاں سے بستی صنعیہ کی طرف گئے تھے، مگر........" جو باتیں ضروری تھیں میں نے اسے اختصار کے ساتھ بتا دیں۔ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے صاحی کو میری پُراسرار قوتوں کا علم ہو جاتا۔ اسے میں نے صرف اتنا بتایا تھا کہ مشتبہ سمجھ کر سپاہیوں نے ہمیں پکڑ لیا تھا اور پھر ہم بڑی مشکل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ اسی دوران میں نضار زخمی ہو گیا تھا۔

سردار صاحی نے مزید گفتگو سے پہلے حویلی کے جراح کو طلب کر لیا۔ جراح نے نضار کے زخم صاف کر کے دوا لگائی، پٹی باندھی اور چلا گیا۔

جراح کے جاتے ہی سردار صاحی نے مجھے مخاطب کیا۔ "اے میری بچی! کیا تجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ بستی صنعیہ بھی تیرے دشمن ژیان کے زیر نگیں ہے اور یہ کہ ژیان اس کا دورہ کرنے والا ہے؟ اگر تو مجھے وہاں جانے سے پہلے مجھ پر اپنا ارادہ ظاہر کر دیتی کہ کدھر جا رہی ہے تو میں ہرگز تجھے ادھر نہ جانے دیتا۔"

"ہاں، اے سردار! مجھے ژیان کے دورے کا علم نہیں تھا۔" میں نے اعتراف کیا، پھر بولی۔ "مجھے سردار صنعیہ سے ملنا تھا کہ وہ بھی ژیان کا ستایا ہوا ہے۔ اگر اس سے ملاقات ہو جاتی تو وہ سب کچھ نہ گزرتا جو ہم پر گزرا۔ جب ہم بستی میں داخل ہوئے تو سردار صنعیہ اس ظالم کا استقبال کرنے اپنی حویلی سے روانہ ہو چکا تھا۔"

"تو کیا سردار صنعیہ بھی میری ہی طرح........" بوڑھے سردار صاحی نے معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس ذکر کے بعد سردار صاحی کو اعتماد میں لینا ضروری ہو گیا تھا۔ تفصیل میں جائے بغیر میں نے مختصر بات کی۔ "سردار صنعیہ کے پاس، میں نے اپنے بھروسے کے ایک آدمی کو بھیجا تھا۔ وہ ساتھ دینے پر راضی ہے، مگر اس سے ہمارا ملنا ضروری تھا۔"

"میں سمجھ گیا میری بچی! ایسے معاملات میں صرف قاصدوں یا مخبروں کی طرف سے کسی طرح کی یقین دہانی کام نہیں آتی۔" باریش بوڑھا سردار سر ہلا کر بولا۔

بات نے دوسرا رخ اختیار کر لیا تھا۔ میں نے اسی لئے یہ ذکر بھی چھیڑ دیا کہ سردار صاحی کے پاس بھی میں اپنی سفارت بھیجنے والی تھی۔ مقصد، موضوع گفتگو بدلنا ہی تھا۔

سردار صاحی میری پوری بات سن کر کہنے لگا۔ "مہا پجاری کی بات اور ہے۔ اگر وہ میرے پاس تنہا سفیر بن کر آتا تو ہرگز میں اسے مایوس نہ لوٹاتا۔"

پھر خود میں نے ہی بقیہ گفتگو آئندہ روز صبح پر موقوف کر دی۔ میں اس بوڑھے کو مزید جگانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے حویلی کے مہمان خانے میں ہماری عارضی سکونت کا بندوبست کرا دیا۔ میں اور نضار ایک ہی کمرے میں تھے۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی حویلی کے دو ملازم کھانا لے کر آ گئے۔ سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر کمرے ہی میں ہم نے چہل قدمی کر لی اور بستروں پر دراز ہو گئے۔ چراغ کی لو نضار نے

دھیمی کر دی تھی۔ تھکن اس قدر تھی کہ کچھ ہی دیر میں نیند نے میری آنکھوں میں اپنا جال بننا شروع کر دیا۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر سوئی ہوں گی کہ اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی۔ میں نے نضار کے بستر کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سویا ہوا تھا۔ پھر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی غیر معمولی بات مجھے نظر نہ آئی۔ سونے سے پہلے نضار نے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا تھا، وہ بھی اسی طرح تھا۔ اس حویلی میں مجھے یا نضار کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرتے ہوئے ایک دم چونک اٹھی۔ بھڑے ہوئے دروازے کی دوسری سمت مجھے کوئی آہٹ سنائی دی تھی۔

ابھی میں اٹھ کر بیٹھنے ہی والی تھی کہ دروازے کا ایک پٹ آہستگی سے کھلا اور کسی نے اندر جھانک کر دیکھا۔ میرا رخ دروازے ہی کی طرف تھا۔ نیم باز آنکھوں سے میں نے اس پستہ قد عورت کو دیکھا۔ وہ اب کمرے میں قدم رکھ چکی تھی۔ کمرے میں کم روشنی ہونے کے باوجود میرے لئے یہ دیکھنا ممکن تھا کہ اس عورت کا دایاں ہاتھ پشت کی طرف ہے۔ اب وہ پنجوں کے بل چلتی ہوئی آہستہ آہستہ میری ہی طرف بڑھ رہی تھی۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ عورت کسی غلط ارادے ہی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ اب زیادہ نہیں رہا تھا۔ میں اچھل کر بیٹھ گئی۔ عین اسی لمحے اس عورت نے مجھ پر چھلانگ لگا دی اس کے دائیں ہاتھ میں اب مجھے خنجر نظر آ گیا تھا۔ پہلے یہی ہاتھ اس نے اپنی پشت کی طرف کر رکھا تھا۔ میری نگاہ اس کے اسی ہاتھ پر جمی ہوئی تھی۔ یہ وجہ تھی کہ اس کی کلائی پر ہاتھ ڈالنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ کلائی چھڑانے کے لئے زور لگاتے ہوئے غرائی۔ "اچھا ہوا کہ تو لوٹ آئی۔"

وہ ایک کمزور عورت تھی۔ اس کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ میری مضبوط گرفت سے اپنی کلائی چھڑا لیتی۔ ایک ہی جھٹکے میں خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کلائی پر زور پڑا تو اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اب تک مجھ سے نبرد آزما تھی۔ میں نے اب اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تھے۔

"کیا ہوا؟" نضار اس عورت کی چیخ سن کر جاگ اٹھا۔ وہ حیرت سے کمرے کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"اے نضار! اٹھ اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دے۔ چراغ کی لو بھی تیز کر دے تاکہ اس کا چہرہ تو صاف نظر آئے۔" میں نے نضار کو مخاطب کیا۔

نضار نے میرے کہنے پر عمل کیا اور قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں نڈھال ہو کر وہ ہانپنے لگی تھی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے لباس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی خادمہ نہیں ہے۔ مجھ سے اپنے ہاتھ چھڑانے کی جدوجہد بھی اس نے ترک کر دی تھی۔ میں نے خنجر کو پیر سے دور پھینک دیا اور پھر اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ خلاف توقع اس نے پھر مجھ پر حملہ نہیں کیا جس کے لئے میں تیار تھی۔ شاید

اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں اس کے بس میں آنے والی نہیں ہوں۔ میں نے نرمی کے ساتھ اس سے کہا۔ "چپ ہو جا اور بتا کہ تُو کون ہے؟"

"میں وہ بدنصیب عورت ہوں کہ جس کے شوہر کو تُو نے قتل کر دیا۔" وہ بولی اور اپنا چہرہ اٹھایا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ تھیں۔

اپنے دل پر میں نے دکھ کا بوجھ محسوس کیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ جب میں اور نضار حویلی پر آئے تھے تو وہ بھی جاگ رہی تھی۔

"اے میری بہن! مجھے معاف کر دے اور بتا کہ کیا تجھے اپنے شوہر کی بُری عادتوں کا علم نہیں تھا؟" میں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔ نضار اپنے بستر پر جا بیٹھا۔

"ہاں' مجھے سب خبر تھی۔ اس نے کبھی مجھے منہ نہیں لگایا۔ وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا' مجھے مارتا تھا مگر.......... مگر اب .... اب تو مجھے کوئی مارنے والا بھی نہیں رہا۔"

وہ ایک قابل رحم عورت تھی۔ اسے محبت کی ضرورت تھی۔ اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے تو میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب اس کے دل کا غبار کچھ دھل گیا تو میں نے خود اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور بولی۔ "میں نے تجھے اپنی بہن کہا ہے۔ سو جان لے کہ میں بھی تیرے دکھ میں برابر کی شریک ہوں۔ لگتا ہے کہ تجھے حقیقت کا علم نہیں ہو سکا یا تجھے کچھ بتایا بھی گیا ہو گا تو اس پر تُو نے دھیان نہیں دیا۔ وہ قتل نہیں' حادثہ تھا اے میری بہن!" پھر اسے میں نے بڑی نرمی اور محبت کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ میں نے آخر میں کہا۔ "یہی وجہ ہے کہ تیرے شوہر کے باپ محترم سردار صاحی نے بھی مجھے معاف کر دیا۔ بول اے میری بہن! کیا تُو بھی مجھے معاف نہیں کرے گی؟"

چند لمحے وہ مجھے کھوئی کھوئی سی نظروں سے دیکھتی رہی' پھر کہنے لگی۔ "میں نے .... بھی تجھے .... تجھے معاف کیا۔ میرے سات بھائی ہیں اور .... اور کوئی بہن نہیں .... تُو آج سے میری بہن ہے۔ میں نے لاعلمی کے سبب تجھے قصوروار سمجھا اور یہ نہ سوچا کہ خطا میرے شوہر کی ہو گی۔ اس حادثے نے شاید میری عقل گم کر دی تھی۔"

اس کے بعد وہ مجھ سے معذرت کرنے لگی تو میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "بھول جا اس بات کو کہ تُو کس ارادے سے اس کمرے میں آئی تھی' تُو یہاں کب آئی اور کب واپس چلی گئی کسی کو اس کا علم نہیں ہو گا۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔ "دعا کر اے میری بہن کہ دیوتا تیرے شوہر کی روح کو سکون دیں۔ اس کی روح آوارہ نہ بھٹکتی پھرے۔" میں اسے دیر تک تسلیاں دیتی رہی۔

"ہاں میں اس کے لئے دیوتاؤں کے سامنے گڑگڑاؤں گی۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

جب وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں نے اس سے کہا۔ "اے میری بہن! اس تلخ واقعے کی یادگار بھی یہاں سے لے جا۔" میرا اشارہ دور پڑے خنجر کی طرف تھا۔

"ٹھہر' میں اٹھا کر دیتا ہوں۔" نضار بولا۔ "خنجر اس کے بستر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ نضار نے اسے خنجر اٹھا کر دے دیا۔

"دیوتا تجھ پر اپنی برکتوں اور رحمتوں کا سایہ کریں اے میری بہن!" میں نے اسے دعا دی۔

"اور اے میری بہن! تجھ پر بھی۔" دروازے کے قریب پہنچ کر وہ پلٹی اور پھر باہر نکل گئی۔

"مجھ سے بھول ہوئی اے آتون کہ سونے سے پہلے دروازہ اندر سے بند نہیں کیا۔ مجھے کنڈی ڈال دینا چاہئے تھی۔" نضار یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ نضار بطور احتیاط ایسا کر رہا تھا۔ میں اسی لئے کچھ نہ بولی۔ دروازے میں کنڈی ڈال کر وہ میری طرف پلٹا اور کہنے لگا۔

"اور تو سب کچھ میں سمجھ گیا مگر یہ نہیں سمجھ سکا کہ تُو نیند میں ہونے کے باوجود بچ کیسے گئی؟"

"دیوتاؤں کی مہربانی سے اے نضار!" میں نے جواب دیا' پھر قاتلانہ حملے سے بچ جانے کی وجہ بتا دی۔

"تُو نے ٹھیک ہی کہا اے آتون کہ دیوتا ہم پر مہربان ہیں۔ اچانک سوتے سوتے تیری آنکھ کھل جانا اور پھر بے چینی محسوس کرنا بلا سبب ثابت نہ ہوا۔ قدم قدم پر دیوتا ہماری مدد کر رہے ہیں اور ہر مرتبہ اس مدد کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اگر دیوتاؤں کی نظر سیدھی نہ ہوتی تو ہم شاید اب تک زندہ نہ ہوتے۔"

کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد ہم دونوں دوبارہ سو گئے' پھر دوسرے دن صبح ہی ہماری آنکھ کھلی۔ سب سے پہلے حویلی کا جراح ہمارے کمرے میں آیا۔ وہ ہمارے کمرے کا دروازہ کھلتے ہی اندر آ گیا تھا جیسے اسی کا منتظر رہا ہو۔ اس نے شاید ہمارے آرام میں خلل نہ ڈالنے کے سبب دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔ جراح نے پٹی کھول کر زخم کا جائزہ لیا' دوا لگائی اور نئی پٹی باندھ دی۔ اس نے زخم کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

ناشتہ ہم نے سردار صاحی کے ساتھ ہی کیا۔ اسی دوران میں سردار نے ایک تجویز پیش کی۔ وہ میری طرف متوجہ تھا۔ "اگر تُو کہے اے میری بچی تو میں بستی صنعیہ کی طرف اپنا کوئی مخبر بھیج دوں؟ ژیان وہاں سے چلا جائے گا تو مخبر یہاں آ کر خبر دے دے گا۔"

میں نے سردار کی رائے سے اتفاق کیا اور نضار نے بھی کہا۔ "ہاں اے محترم سردار! اس طرح ہمارا سفر محفوظ ہو جائے گا۔"

گزشتہ روز میں نے جو قیاس کیا تھا' درست ثابت ہوا۔ شام ہوتے ہوتے سردار صاحی کا مخبر لوٹ آیا۔ معلوم ہوا کہ دوپہر کو ژیان اگلی بستی کے دورے پر روانہ ہو چکا تھا۔ سردار ساحی نے اگلے دن صبح تک کے لئے ہمیں روک لیا۔ ہم اس بوڑھے کی درخواست رد نہ کر سکے۔ میں اس دوران میں حویلی کی عورتوں سے بھی ملی۔ ان میں مقتول سردار زادے کی بیوہ بھی شامل تھی' جسے میں نے بہن بنا لیا تھا۔

رات کو کھانے پر سردار صاحی نے ہمیں ایک اور مشورہ دیا۔ وہ بوڑھا مشفق سردار بہت آگے تک کی سوچنے کا عادی لگتا تھا۔ وہ بولا۔ "بستی صنعیہ میں اب تمہیں یوں بے سپر داخل نہیں ہونا چاہئے۔" وہ نضار اور مجھ سے مخاطب تھا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم کل صبح جب یہاں سے چلو تو تمہارے جسموں پر

معمولی لباس نہ ہو۔ تمہارے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ بھی جائے‘ جو تمہیں بحفاظت سردار صنعیہ کی حویلی تک پہنچا دے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ دوبارہ کوئی خلاف توقع صورت حال پیدا نہ ہو۔ ژیان کی آمد کے موقع پر دو مشتبہ افراد کا بستی صنعیہ میں دیکھا جانا اور پھر فرار ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ کیا خبر بات اوپر تک پہنچ گئی ہو اور وہاں تم دونوں کی تلاش اب بھی جاری ہو۔"

"لیکن اے محترم سردار! اس طرح تو ہم فوراً بستی والوں کی نظر میں آ جائیں گے۔" نضار بول اٹھا۔

"بستی والوں کی پرواہ نہیں۔ مجھے زنداں کے نگران اور ان محافظوں کا خیال ہے جو تم دونوں کو دیکھ چکے ہیں۔ جو محافظ تمہیں دیکھ کر پہچان سکتے ہیں‘ انہیں بھی تو تمہاری تلاش پر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ سنو‘ میرا شمار ژیان کے حلیفوں میں ہوتا ہے۔ سو اگر میں‘ ژیان کی زیر نگیں کسی بستی کی طرف سفارت بھیجوں تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ بظاہر تم دونوں سردار صنعیہ کے پاس میرے سفیر بن کر جاؤ گے۔"

"اگر تُو نے یہ سوچا ہے اے محترم سردار تو پھر ہمارے ساتھ سپاہیوں کے جانے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔" میں نے چند لمحے توقف کے بعد نضار کی جانب تائید طلب نظروں سے دیکھا۔ موجودہ صورت حال میں میرے نزدیک سردار صاحی کا مشورہ مناسب تھا۔ نضار کو بھی سردار صاحی کا مشورہ پسند آیا۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کرتے ہی ہم بستی صنعیہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اب ہمارے جسموں پر پہاڑی باشندوں کا لباس نہیں تھا اور ہم غیر مسلح بھی نہیں تھے۔ ہمارے ساتھ مسلح محافظوں کا ایک دستہ تھا۔ اس دستے کے ایک محافظ کے پاس سردار صاحی کی سفارت کا نشان تھا۔ وہ محافظ آگے آگے چل رہا تھا۔

اس مرتبہ جب ہم ایک پہر گزرنے کے بعد بستی صنعیہ میں داخل ہوئے تو ہمیں وہاں کوئی غیر معمولی سرگرمی نظر نہ آئی۔ ہم سردار صنعیہ کی حویلی تک پہنچ گئے۔

حویلی میں خبر کرائی گئی کہ سردار صاحی کی طرف سے سفارت آئی ہے تو ہمیں فوری طور پر اندر بلا لیا گیا۔ اونچی چھت والے ایک بڑے سے دالان میں سردار صنعیہ نے ہم سے ملاقات کی۔ نضار اور میں نے آگے بڑھ کر اسے تعظیم دی۔ سردار صنعیہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کے چہرے سے سنجیدگی اور بردباری کا اظہار ہوتا تھا۔

"میں اپنے بزرگ دوست سردار صاحی کے سفیروں کو اپنی بستی میں خوش آمدید کہتا ہوں۔" سردار صنعیہ نے خوش اخلاقی کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔

سردار کو تعظیم دے کر میں اور نضار تھوڑا پیچھے ہٹ کر مؤدب بیٹھ گئے تھے۔ سردار کی سوالیہ نظریں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً ہمارے کچھ بولنے کا منتظر تھا مگر زبان سے اس نے کچھ نہ کہا۔ اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی الجھن میں مبتلا ہو۔

سردار صنعیہ کی الجھن کا سبب میں ہی ہو سکتی تھی۔ ان بستیوں میں عورتوں کو بطور سفارت کار

نہیں بھیجا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ پیغام رسانی یا سفیر کی حیثیت سے عموماً دو افراد کی آمد غیر ضروری سمجھی جاتی تھی۔ یہ اور اس سے متعلق دیگر باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کہیں آس پاس سردار صنعیہ کے محافظ دستے سے تعلق رکھنے والے مسلح افراد بھی موجود ہوں گے جو بظاہر نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہی سب کچھ مدنظر رکھتے ہوئے میں نے دھیمی آواز میں سردار کو مخاطب کیا۔

"اے معزز سردار! مشرق کی طرف سے آنے والا شینا کا باپ چند ہی روز پہلے تجھ سے مل کر گیا ہے۔ محترم سردار صاحی نے اسی کے متعلق بات کرنے ہمیں تیرے پاس بھیجا ہے۔" میں نے محتاط لہجے میں اشارہ کیا۔ مشرق اور شینا کے حوالے پر اسے میں نے چونکتے دیکھا۔

"وہی شینا کہ جو پراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی اور بستی بستی اس کی تلاش جاری تھی؟ تو اس شینا کے باپ کی بات کر رہی ہے نا؟" سردار صنعیہ بظاہر بے پرواہی سے بولا لیکن اس کے چہرے کا تغیر کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے مزید کچھ کہے بغیر اپنی جگہ سے اٹھ کر ساتھ چلنے کو کہا۔

میں اور نضار اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ ہمیں حویلی کے ایک ایسے کمرے میں لے گیا جہاں اس کے اور ہمارے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

"کہیں تُو وہی تو نہیں کہ جو سانپوں والی آتون کے نام سے مشہور ہے؟" سردار صنعیہ قدرے جھجکتے ہوئے بولا۔

"ہاں اے سردار! میں وہی ہوں۔ حیرت ہے کہ تُو نے مجھے فوراً پہچان لیا۔" میں مسکرائی۔

"اگر تُو آتون ہے تو پھر تیرے ساتھ آنے والا‘ مظلوم سردار اشر کا بہادر بیٹا ہی ہو سکتا ہے۔" وہ کچھ اور کھلا۔ جب نضار نے بھی یہ اقرار کر لیا تو سردار صنعیہ نے مجھے اور نضار کو اٹھ کر تعظیم دی‘ پھر بتایا۔ "سردار وسیط نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے کبھی تم دونوں کا گزر ادھر بھی ہو۔ پھر جب مجھے یہ خبر ملی کہ بوڑھا ساحر زعیم اپنے مسکن کی تباہی کے بعد مینار نما پہاڑ پر آ بسا ہے تو پھر تمہاری آمد کا یقین سا ہونے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ دیوتاؤں کی چہیتی آتون یہاں بھی لعنتی زعیم کے پیچھے پیچھے آئے گی۔ سردار وسیط نے مجھے تفصیل کے ساتھ زعیم کے پہاڑ کی تباہی اور بعد میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر دیا تھا۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ مظلوم اور بہادر سردار اشم کی بیٹی اور عظیم سردار کے عظیم بیٹے نضار نے یہاں آ کر مجھے عزت بخشی‘ لیکن میں دو باتوں پر حیران ہوں۔" وہ کچھ دیر کو بولتے بولتے رک گیا۔

"ان دونوں باتوں کا اظہار بھی کر دے اے سردار صنعیہ!" میں بول اٹھی۔

"پہلی بات تو یہ اے آتون کہ مجھے اتنی جلدی تیرے ادھر آنے پر حیرت ہوئی۔ دوسری حیرانی کی بات میرے لئے یہ ہوئی کہ تُو اور سردار نضار میرے پاس‘ سردار صاحی کے سفیر بن کر آئے۔ مجھے ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" سردار صنعیہ نے جواب میں کہا۔

"تجھے یہ سن کر شاید مزید حیرت ہو اے سردار کہ ہم ایک مرتبہ یہاں اس سے پہلے بھی آ چکے ہیں۔" میں مسکرا کر بولی۔

"کب اے آتون!" سردار صنعیہ واقعی اس انکشاف پر حیران رہ گیا۔

پھر میں نے سردار صنعیہ کو جو کچھ بتایا' اس پر اسے بڑی پشیمانی ہوئی اور وہ معذرت کرنے لگا۔

"اے سردار! اس میں تیرا کوئی قصور نہیں کہ تجھے ہماری آمد کی خبر ہی نہ تھی' پھر یہ کہ ہم بھی یہاں غلط وقت پر پہنچے تھے۔" نضار نے کہا۔

معلوم ہوا کہ ژیان کے محافظوں اور زندان کے نگران نے اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لئے نچلی سطح پر اس معاملے کو دبا دیا تھا۔ سردار صنعیہ یا ژیان کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ دو مشتبہ افراد بستی میں داخل ہوئے تھے اور پھر فرار ہو گئے۔

"اب مجھے پورا یقین ہو گیا اے آتون کہ تجھ پر واقعی دیوتاؤں کا سایہ ہے ورنہ تو اتنے بڑے خطرے میں گھر جانے کے بعد بچ کر نہ جا پاتی۔" سردار صنعیہ کے لہجے سے عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اب تک اس نے ایک مرتبہ بھی مجھے میرے اصل نام معبلہ سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ سردار وسید کی ہدایت ہی ہو سکتی تھی۔ میں اپنے دشمن ژیان کے لئے بحیثیت آتون اتنی خطرناک نہیں تھی جتنی معبلہ کی حیثیت سے اس کے لئے خطرہ بن سکتی تھی۔

میں نے سردار صنعیہ کو مختصراً صرف اتنا ہی بتایا کہ سردار صاحی بھی ہمارے ساتھ اتحاد کر چکا ہے۔ اس پر سردار صنعیہ نے خوشی کا اظہار کیا۔ پھر اس نے میرے اور نضار کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر رازداری کا عہد کیا۔ اسی رازداری کی خاطر اس ملاقات میں سردار صنعیہ سے کئی باتیں طے ہوئیں۔

ژیان کے زیر نگیں آنے سے پہلے سردار صنعیہ ہی اس بستی کے سفید و سیاہ کا مالک تھا۔ بستی والے اسی کے وفادار تھے' اب تک اسی کا دم بھرتے تھے۔ انہیں ژیان سے نفرت تھی۔ اس کے علاوہ وفاداروں کا ایک ایسا گروہ بھی سردار صنعیہ کی اطراف موجود تھا جس پر اسے پورا اعتماد تھا۔ وہ اس کے باوجود ژیان کے مخبروں سے چوکنا رہتا تھا۔ انتظامی امور میں بے جا عمل دخل کی وجہ سے سردار صنعیہ دشواریوں کا شکار تھا۔ کچھ لالچی اور خودغرض لوگ کسی بھی معاملے میں براہ راست ژیان سے رابطہ قائم کر لیتے تھے۔ سردار صنعیہ کو مجبوراً ژیان کے احکام کی پابندی کرنا پڑتی تھی۔ وہ بہرحال اس علاقے میں ژیان ہی کا نائب کہلاتا تھا۔ کچھ باتیں مجھے اس سے گفتگو کرتے ہوئے پتا لگیں اور کچھ میں نے خود محسوس کر لیں۔

سورج ڈوبنے سے کچھ پہلے سردار صنعیہ نے ہمیں رخصت کر دیا۔ مسلح سپاہیوں کے اس دستے کو ہماری روانگی سے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا جو ہمارے ساتھ آیا تھا۔ بستی صنعیہ سے نکل آنے کے بعد اور خاصا فاصلہ طے کر کے ہم رک گئے۔ سردار صنعیہ نے ہمیں سردار صاحی کے سفیروں کی حیثیت سے رخصت کیا تھا۔

"محترم سردار صاحی سے ہماری خیریت کہہ دینا۔" میں نے دستے کے سالار کو مخاطب کیا۔ "اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"

سالار ادب سے میرے سامنے جھکا اور پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر رخصت ہو گیا۔ ہم ذرا ہی دیر کے بعد دوبارہ بستی صنعیہ کی طرف پلٹے تو ہر طرف اندھیرے کی چادر پھیلنے لگی تھی ہمارا رخ بستی کی

بجائے اس چٹانی سلسلے کی طرف تھا جہاں ایک بار بستی سے فرار ہو کر ہم نے پناہ لی تھی۔

جلد ہی ہم اس چٹانی سلسلے تک پہنچ گئے' مگر اندر نہیں گھسے۔ ہمیں نصف پہر گزرنے کا انتظار تھا۔ احتیاطی تدابیر کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں بہرحال وہاں نصف پہر تک رکنا پڑا۔ اب ہر طرف سناٹا پھیل چکا تھا۔ دن کے ہنگامے رات کی گود میں سو گئے تو میں چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری نگاہ اس وقت بستی کی طرف ہی تھی۔ اندھیرے میں ایک مشعل کی روشنی مجھے دور ہی سے نظر آ گئی تھی۔

آنے والے دو گھڑسوار تھے۔ ان ہی میں سے ایک کے پاس مشعل تھی۔ چٹانی سلسلے کا یہ وہ حصہ تھا جہاں سے بستی صاحی کی طرف جانے والا راستہ مڑتا تھا۔ ہم اس موڑ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ ہم تک پہنچنے والے دو گھڑسوار تھے۔ انہوں نے ہمیں جھک کر تعظیم دی اور ہماری طرف دو بڑی چادریں بڑھا دیں۔ ہم نے ان چادروں میں اپنے جسم چھپا لئے اور ان گھڑسواروں کے ساتھ بستی کی جانب چل دیئے۔

سردار صنعیہ نے اپنی حویلی کے عقبی دروازے پر ہمارا استقبال کیا۔ وہ ہمیں اپنی حویلی کے اس حصے میں لے آیا جہاں صرف اس کے وفاداروں کا داخلہ ممکن تھا۔

"اے آتون اور اے نضار! تمہیں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟" سردار صنعیہ ہمارے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو کر بولا۔

"نہیں اے سردار! سب کچھ اسی طرح ہوا جو ہم نے طے کیا تھا۔" میری بجائے نضار نے سردار کی بات کا جواب دیا۔

ہماری وجہ سے سردار صنعیہ نے بھی رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب خادم کھانا رکھ کر چلے گئے۔ اس پر میں نے سردار صنعیہ کے خلوص و محبت کا شکریہ ادا کیا۔ آج تک میں نے وادی سبز کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ معلوم نہیں کیوں اس وقت میں نے سردار صنعیہ سے یہ ذکر چھیڑ دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے در و دیوار سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بچپن کی یادیں زندگی بھر آدمی کا پیچھا کرتی ہیں اور وہ چاہے بھی تو ان سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔ میں جب اپنی وادی سے چلی تھی تو بہت چھوٹی تھی۔ اس وقت میری عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں ہو گی' مگر مجھے ایک ایک بات یاد تھی' ایک ایک رستہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

"اے آتون! اب اگر تُو وادی سبز کو دیکھے تو شاید پہچان نہ سکے۔" سردار صنعیہ بولا۔ "گزشتہ چند برسوں میں اس کی حالت بدل گئی ہے۔ اب وہاں جگہ جگہ پختہ عمارتیں بن گئی ہیں جو علاقے ژیان کے زیر نگیں ہیں وہاں کی ساری دولت سمیٹ کر ژیان وادی سبز میں لے جاتا ہے۔ یہ ترقی گزشتہ دو برسوں میں زیادہ ہوئی ہے جب سے وادی سبز میں کچھ اجنبی لوگ آنے جانے لگے ہیں۔"

"اجنبی لوگوں سے تیری کیا مراد ہے اے سردار!" نضار نے چونک کر سوال کیا۔

"ان اجنبیوں کا تعلق پہاڑی بستیوں سے نہیں' کہیں اور سے ہے۔" سردار صنعیہ بتانے لگا۔ "وہ بڑے عجیب لباس پہنتے ہیں' عجیب زبان بولتے ہیں مگر آپس میں۔ میں نے سنا ہے کہ جب وہ ہماری زبان بولتے ہیں تو ان کے منہ بگڑ سے جاتے ہیں۔ لگتا ہے اے آتون کہ وہ دور دراز کے ہموار میدانوں کی

طرف سے ادھر آتے ہیں۔ وہ جدھر بھی جاتے ہیں ژیان کا محافظ دستہ ان کے ساتھ سائے کی طرح ہوتا ہے۔"

سردار صنعیہ جب یہ سب کچھ بتا رہا تھا تو مجھے پُراسرار سرگوشیوں کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ یہ سرگوشیاں مجھے اور نضار کو اس وقت سنائی دی تھیں جب ہم وسیط سے مل کر اشرکی بستی کے قریب پہنچنے والے تھے۔ "تم وہاں پہنچ کر اپنے دشمن کے بہت قریب ہو گے اور تمہیں اپنے دشمن کے بارے میں بہت ایسی نئی باتوں کا علم ہو گا جو اب تک تمہارے علم میں نہیں ہیں۔" اب سے بہت پہلے سرگوشیوں میں شاید اسی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔

"وہ اجنبی بڑی رازداری سے آتے ہیں اور رازداری کے ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں۔" سردار صنعیہ کا بیان جاری تھا۔ "ژیان کی حویلی سے انہیں نکلتے ہوئے کم ہی دیکھا گیا ہے۔ وہ کم ہی کسی سے بات کرتے ہیں' وہ بھی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ عورتوں کا لباس اور رویہ بھی ان کے مردوں سے مختلف نہیں۔"

ان پہاڑی بستیوں کے علاوہ ہموار میدانوں کی طرف بھی ایک دنیا آباد ہے' یہ ذکر میرے یا نضار کے لئے نیا نہیں تھا۔ ان بستیوں میں قصوں کہانیوں کی طرح اس ان دیکھی دنیا کے تذکرے ہوتے رہتے تھے جو کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ ان اجنبیوں سے سردار صنعیہ کی دلچسپی کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا۔

سردار صنعیہ ہمارے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تو میں اور نضار دیر تک ان ہی اجنبیوں کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ وہ رات اور اس کے بعد آنے والا دن ہم نے آرام کرتے ہوئے گزارا کیونکہ ہم مسلسل سفر کرنے کے علاوہ غیر متوقع حالات کا شکار رہے تھے۔ نضار کی پیشانی کا زخم بھی اب تقریباً بھر چکا تھا۔ پٹی کھل گئی تھی۔

"آج رات ہم تجھ سے رخصت ہو جائیں گے اے محترم سردار!" میں نے رات کے کھانے پر سردار صنعیہ کو بتایا۔

سردار صنعیہ کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ شاید اس گمان میں تھا کہ ابھی ہم وہاں مزید ٹھہریں گے۔ "مجھے کوئی حق تو نہیں اے آتون کہ تجھ سے معلوم کروں کہ تُو کدھر جائے گی مگر اتنا ضرور پوچھوں گا' ادھر لوٹ کر آئے گی یا نہیں؟"

"ابھی ہمیں بھی کچھ خبر نہیں اے سردار کہ ہم کدھر جائیں گے اور دیوتاؤں کا حکم ہمارے لئے کیا ہو گا۔" میں نے گول مول سا جواب دیا۔

سردار نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ ہم اسے کچھ بتانا نہیں چاہتے۔

"بُرا نہ مانیو اے سردار! دیوتاؤں نے ہمیں رازداری کا حکم دیا ہے۔" نضار نے وضاحت کی تاکہ سردار صنعیہ کے پُرخلوص دل کو ٹھیس نہ لگے۔

"میں سمجھتا ہوں' اے سردار نضار! مجھے تو تم دونوں کی حفاظت کا خیال تھا' مگر یہ سوچ کر کچھ نہیں بولا کہ تمہارے اوپر دیوتاؤں کا سایہ ہے۔" سردار صنعیہ بولا۔

وقت سے پہلے ہی سردار نے بستی سے ہماری روانگی کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہم نے اسے اپنی روانگی کے وقت سے بے خبر نہیں رکھا تھا۔ نصف شب کے قریب سردار کے وفادار محافظ ہمیں بحفاظت بستی کی حدود سے باہر چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

وہ چاندنی رات تھی اور دور دور تک مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ ہم گھوڑوں پر سوار وادی سبز کی طرف سفر کرتے رہے۔ ادھر بڑھتے ہوئے نہ جانے کیوں میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ وہ ناہموار سا اونچا نیچا راستہ تھا جس پر ہمارے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔

"اے نضار! تجھے کچھ اندازہ ہے کہ ہم کب تک وادی سبز کے گردا گرد موجود پہاڑوں تک پہنچ جائیں گے؟" میں نے اپنا دھیان بٹانے کی خاطر نضار کو مخاطب کیا۔

ابھی نضار میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ میرے حواس پر ایک چھناکا سا ہوا۔ میری آنکھوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا تھا۔ اچانک میرے سامنے دھواں سا پھیل گیا۔ اس دھوئیں کے فضا میں تحلیل ہوتے ہی ایک عورت نما عجیب و غریب مخلوق نمودار ہوئی۔ اس کے پیر گھٹنوں کے نیچے سے گھوڑے کے پیروں جیسے تھے۔ وہ ہمارے گھوڑوں کے آگے آگے بھاگ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے کھر بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کی پشت کے نچلے سرے پر چھوٹی سی دم بھی نظر آ رہی تھی۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور سر پر بڑے بڑے سینگ تھے۔ اس عورت نما مخلوق نے بھاگتے بھاگتے ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا۔ دہشت کے سبب میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ بقیہ جسم کی طرح اس کے چہرے پر نام کو گوشت نہیں تھا۔

میں نے چاہا کہ گھوڑے کی لگام کھینچ لوں' مگر معلوم نہیں کیوں میں اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکی۔ میرے ذہن پر ایک عجیب غیر فطری سی غنودگی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ میں جاگتی آنکھوں سے جیسے کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ اس پُراسرار عورت نما مخلوق سے اب مجھے خوف نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ غیر فطری غنودگی میرے ذہن پر اتنی غالب آ گئی کہ مجھے صرف اتنا ہی احساس رہ گیا کہ جیسے میرے اور اس عجیب مخلوق کے درمیان ایک کشش سی ہے جو مجھے اس کے پیچھے گھوڑا دوڑانے پر مجبور کر رہی ہے۔ پھر یہ کیفیت بھی رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مجھے یاد ہے کہ اسی خواب سے عالم میں آنکھیں بند ہونے سے پہلے میں نے ایک بار نضار کی طرف دیکھا تھا' اس کی حالت بھی مجھے مختلف نظر نہیں آئی تھی۔

☆======☆======☆

دوبارہ جب میرے حواس بحال ہوئے تو میری سماعت سے لعنتی ساحر زعیم کی آشنا آواز ٹکرائی۔ "اپنے نئے مسکن پر زعیم تجھے خوش آمدید کہتا ہے اے آتون!"

مجھ سے کچھ فاصلے پر مضحکہ خیز صورت والا بوڑھا ساحر زعیم کھڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ جگہ پتھروں کو کاٹ کر حال ہی میں بنائی گئی ہو۔ گول سے اس دالان میں دو چبوترے تھے۔ جن میں سے ایک پر میں دراز

تھی اور دوسرے پر نضار نظر آ رہا تھا۔ دونوں چبوتروں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ پستہ قد زعیم ان دونوں کے درمیان کھڑا ہوا میری جانب ندیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اتنی جلدی وہ اپنے نئے مسکن کو رہنے کے قابل بنا لے گا' اس پر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ ایک ساحر تھا اور میرے اندازے کے مطابق پُراسرار قوتوں کا مالک بھی تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی ناممکن بات نہیں تھی۔

"مجھے یقین تھا اے میری ساحرہ کہ تُو اپنے عاشق کو لے کر میرے پیچھے ضرور آئے گی۔" وہ بولا۔ "دیکھ لے میں نے تجھے یہاں کس طرح کھینچ کر بلا لیا۔"

"تُو اگر اتنا ہی بڑا بہادر تھا تو پھر میرے مقابلے سے اپنا پہلا مسکن چھوڑ کر کیوں بھاگ آیا؟" یہ کہتے ہی میں نے اٹھنا چاہا مگر ناکام رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری پشت اس چبوترے سے چپک گئی ہو۔ میں نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی اور پھر اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اٹھنے کی کوشش میرے نزدیک لاحاصل تھی۔

ساحر زعیم زور سے ہنس پڑا' پھر کہنے لگا۔ "آج تجھے اٹھ کر نہیں بیٹھنے دوں گا۔ تُو اسی طرح پڑی رہ اور یہیں پڑے پڑے پہلے اپنے عاشق مرطاق کو تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھ۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس کی کسی جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا ایک خنجر نکال لیا۔ دالان میں جلتی ہوئی مشعل کی روشنی خنجر کے پھل پر پڑی اور وہ چمکنے لگا۔ "مجھے چاہئے تھا کہ پہلے ہی اسے ختم کر دیتا۔" چند لمحوں کے توقف سے زعیم دوبارہ بولا۔

اس میں یقیناً دیوتاؤں کی مرضی ہی کو دخل ہو گا کہ وہ بوڑھا ساحر اپنی تمام تر پُراسرار قوتوں اور علم کے باوجود میری اور نضار کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ مجھے اب تک آتون اور نضار کو مرطاق ہی سمجھ رہا تھا۔ قلاوز کی بستی میں نضار نے اپنا یہی فرضی نام بتایا تھا' جہاں سے اس کے خدمتگار ہمیں لے گئے تھے۔

"رک جا اے زعیم!" میں نے اسے دوسرے چبوترے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر آواز دی۔

وہ پلٹ کر بولا۔ "اے جان زعیم! اس کانٹے کو اپنے اور میرے درمیان سے نکل ہی جانے دے تو اچھا ہے ورنہ یہ میری نظر میں کھٹکتا ہی رہے گا۔"

اس طرف دیکھتے ہوئے مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ نضار کے جسم کا اوپری حصہ بے لباس ہے۔ ساحر زعیم نے شاید پہلے ہی اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اوپری جسم کا لباس غالباً اس لئے اتارا گیا تھا کہ میں اس کا خون بہتے ہوئے دیکھ سکوں۔ نضار کو تڑپا تڑپا کر مارنے کا مطلب میں یہی سمجھ سکی تھی۔

"معاملہ تیرے اور میرے درمیان ہے اے زعیم! اس سے میرے ساتھی مرطاق کا کوئی تعلق نہیں۔" میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ "تُو اسے کیوں ہلاک کرتا ہے؟"

"چل تُو نے یہ تو مانا کہ تیرے میرے درمیان کوئی معاملہ ہے۔" وہ ہنسا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میری بے بسی پر خوش ہو۔

آدمی بھی کیا عجب شے ہے کہ جو خود کو بااختیار اور دوسرے کو مجبور دیکھ کر خوش ہوتا ہے' میں نے سوچا۔ ساحر زعیم اب لوٹ کر میرے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

"پہلے بھی تو نے ایک بار مجھے دھوکا دیا تھا' یاد ہے۔" زعیم اپنے ہاتھ میں موجود خنجر سے کھیلتے ہوئے بولا۔ "میں نے جب یہ کہا تھا کہ تیرے ساتھی کو آدم خور چوہوں والے غار میں پھنکوا دیا ہے تو اس کی جان بچانے کے لئے تُو میری ہر بات ماننے پر راضی ہو گئی تھی۔ بول آج تُو کیا کہتی ہے؟"

میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ شیخی بگھارنے کے باوجود اب تک اس نے اپنے اور میرے درمیان فاصلہ قائم رکھا تھا۔ اس سے میری ہمت بڑھی اور مجھے عظیم مہین کی پیشگوئی یاد آئی۔ "تیرے ناپاک ارادے کبھی پورے نہیں ہوں گے اے لعنتی زعیم! تجھے شاید یہ خبر نہیں کہ میں تیری موت بن کر تجھ تک آئی ہوں۔" میں نے اسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "نہ تُو میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے' نہ میرے ساتھی کو ہلاک کر سکتا ہے' جو بے ہوش اور بے بس پڑا ہے۔"

"لیکن ابھی تو کچھ اور کہہ رہی تھی تو۔" زعیم چونک کر بولا۔ "یہ اچانک تجھے کیا ہوا؟"

میں نے اسی لمحے دالان میں خجیرہ کی خوشبو محسوس کی اور ساحر زعیم سے کہا۔ "مجھے کیا ہوا ہے' یہ تجھے ابھی معلوم ہو جائے گا اے بدبخت ساحر! تیرا آخری وقت قریب آ چکا ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے جسم کو جھٹکا سا لگا اور میں اچھل کر بیٹھ گئی۔ میں نے نضار کو بھی دوسرے چبوترے سے اٹھتے دیکھ لیا تھا۔ اسے ہوش آ گیا تھا۔

ساحر زعیم کے چہرے پر مجھے خوف کے سے آثار دکھائی دیئے۔ اس سے زعیم کا مضحکہ خیز چہرہ اور بھی بگڑ گیا۔ وہ سر ہلا ہلا کر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھنے لگا۔ اس کی ٹھوڑی سے لٹکی ہوئی گلہری کی دم جیسی داڑھی اِدھر سے اُدھر ہل رہی تھی۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ دالان کے محرابی دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

محرابی دروازے سے اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ خجیرہ کی مانوس خوشبو اب معدوم ہو چکی تھی۔ "آ اے نضار! اس کا پیچھا کریں کہ وہ کہیں اس بار بھی فرار نہ ہو جائے۔" میں نے نضار کو آواز دی۔ وہ اپنی جگہ ساکت سا کھڑا ہوا حیرت سے اس دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جدھر ساحر زعیم گیا تھا۔ اس کے حواس شاید پوری طرح بیدار نہیں ہوئے تھے اسی لئے میری آواز سن کر چونک اٹھا تھا۔

نضار نے اپنے سر کو جھٹکا اور پھر تیزی سے لپک کر میرے قریب آ گیا۔ "چل اے آتون!" نضار نے کہا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں' نضار کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھی۔ محرابی دروازے میں داخل ہو کر ہم سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ اوپر ایک ناہموار سی جگہ پہنچ کر ہم بائیں جانب مڑے ہی تھے کہ بیک وقت دو آدمی ہماری طرف دوڑے۔ ان کے ہاتھوں میں چوڑے پھل والی دو دھاری تلواریں تھیں۔ انہوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ پھر ان میں سے ایک کو میں نے سنبھال لیا اور دوسرے سے نضار بھڑ گیا۔ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود ہم نے جلد ہی ان دونوں پر قابو پا لیا۔ ان کی دو دھاری تلواریں ہم نے چھین لیں اور وہ دونوں ہمارے

ہاتھوں مارے گئے۔ مجھے ان محافظوں کی وہاں موجودگی پر حیرانی تھی۔ میں یہ سمجھی تھی کہ ساحر زعیم مجھے وہاں اکیلا ہی ملے گا۔

ابھی ہم سنبھلے ہی تھے کہ بائیں جانب ہی سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کچھ لوگ اسی طرف دوڑتے آ رہے ہوں۔ ان کے قدموں کی دھمک واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ پتھروں کو کاٹ کر بنائے گئے اس راستے پر آگے بڑھنے کے سوا ہمارے لئے کوئی اور صورت نہیں تھی۔ ہمارے عقب میں وہ سیڑھیاں تھیں جن پر چڑھ کر ہم گول دالان سے نکلے تھے۔ وہ راستہ آگے جا کر مزید بائیں جانب مڑ گیا تھا۔ اسی وجہ سے آنے والے اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔

اس سے پہلے کہ خطرہ اچانک سامنے آ جاتا' میں نے تیزی کے ساتھ قدم بڑھائے اور اس راستے کے موڑ تک پہنچ گئی۔ نضار میرے عقب میں تھا۔ دو دھاری تلوار میرے ہاتھ میں تھی۔ چند ہی لمحے بعد مخالف سمت سے آنے والے مجھے نظر آ گئے۔ وہ چار محافظ تھے۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں نیزہ اور کسی کے پاس تلوار تھی۔ میں ان پر ٹوٹ پڑی۔ میری دو دھاری تلوار تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ کوئی زخمی ہو کر گرا' کوئی خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹا اور کوئی میرے ہاتھوں سفر آخرت پر روانہ ہو گیا' مگر میں ان کے نرغے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ آگے کی طرف بھاگتے ہوئے پلٹ کر میں نے نضار کی طرف دیکھا۔ نضار کی دو دھاری تلوار' بچ جانے والے ایک محافظ کے سینے کو چھید رہی تھی۔ وہ راستہ نیم دائرے کی صورت میں پھر کچھ سیڑھیوں تک جا کر ختم ہو گیا۔ سیڑھیاں نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ میں لپکتی ہوئی وہاں پہنچی تو مجھے سامنے موجود سیڑھیوں کے اختتام پر وسیع و عریض چوکور سا دالان دکھائی دیا۔ وہیں مجھے تقریباً دس بارہ مسلح محافظ نظر آئے۔ محافظوں کے علاوہ وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ انہوں نے چہروں پر کپڑے باندھ رکھے تھے۔ ان کی صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

سیڑھیوں کے قریب ناہموار دیوار سے چپکی ہوئی میں نیچے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جن لوگوں کے چہرے چھپے ہوئے تھے وہ دائرے کی صورت میں ایک بڑے سے پتھریلے کڑھاؤ کے گرد جمع تھے اور ہاتھ اٹھا کر کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ اس کڑھاؤ میں مجھے ہلکا گلابی سا کوئی مشروب بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ کسی پُراسرار عبادت میں مصروف ہیں اور مسلح افراد ان ہی کی حفاظت کر رہے ہیں۔ میں نے مزید آگے بڑھ کر دیکھا تو اس کڑھاؤ سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب ایک دروازہ نظر آیا جس کی دوسری جانب اندھیرا تھا۔ وہاں سے نکلنے کا وہی واحد راستہ ممکن تھا۔

نیچے کا جائزہ لینے میں مجھے چند ہی لمحے لگے ہوں گے۔ مجھے دروازے تک پہنچنے کے لئے بہرحال نیچے اتر کر مسلح محافظوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ساحر زعیم اسی دروازے سے نکل کر کہیں جا سکتا تھا۔

ابھی نیچے اترنے کے لئے میں نے چند ہی سیڑھیوں پر قدم رکھا ہو گا کہ محافظوں کی نظر میں آ گئی۔ محافظ سیڑھیوں کی طرف دوڑے۔ ان کے منہ سے وحشیانہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ مزید اترنے کے بجائے میں اپنی جگہ جم کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت عقب سے مجھے نضار کی آواز سنائی دی۔ "میں آ رہا ہوں

آتون!" نضار کی آواز سن کر میرا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ میں عالم جوش میں نصف کے قریب سیڑھیاں اتر کر اس طرح جھک کر کھڑی ہو گئی جیسے ان تینوں محافظوں پر حملہ کرنے والی ہوں جو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قریب آ چکے تھے۔ ان کے اور میرے درمیان کم ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ وہ بھی رک گئے تھے۔ معاً انہوں نے نعرہ لگایا اور ان کی تلواریں میری طرف اٹھیں۔ اسی لمحے میں اچھلی اور طویل زقند بھرتی ہوئی ان کے اوپر سے جیسے اڑتی ہوئی زینے کے نیچے پہنچ گئی۔ جو محافظ عبادت کرنے والوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے' ان میں سے کچھ پلٹے مگر میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میری دو دھاری تلوار تیزی سے گردش کرنے لگی۔ میں انہیں مارتی کاٹتی ہوئی کڑھاؤ سے آگے نکل آئی۔ میں اب اس دالان کے دروازے کی طرف لپک رہی تھی۔

اچانک میں نے اپنے عقب میں زبردست چھناکا سا سنا اور میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میری آنکھوں کے سامنے ایک حیران کن منظر تھا۔ کڑھاؤ کا مشروب ابلتے ہوئے پانی کی طرح کھول رہا تھا۔ کڑھاؤ کے اندر بجلیاں سی کوند رہی تھیں اور ہلکے ہلکے دھوئیں کے درمیان ایک ہیولا نمودار ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ہیولا اسی عورت نما مخلوق کا تھا جس کی کشش ہمیں بوڑھے ساحر زعیم کے اس نئے مسکن کی طرف کھینچ لائی تھی۔ اس وقت بھی عورت نما مخلوق کی پشت ہی میری طرف تھی۔ اس کا بھیانک چہرہ مخالف سمت میں تھا۔ اسی کڑھاؤ میں سے مجھے تین غیرانسانی سے ہاتھ بھی ابھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان ہاتھوں پر جانوروں کے پنجوں کی طرح بال تھے اور بڑھے ہوئے نوکیلے ناخن آگے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ دمدار عورت نما مخلوق کے دونوں ہاتھ سر پر موجود بڑے بڑے سینگوں پر رکھے ہوئے تھے۔ عبادت گزاروں کی آنکھیں جیسے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے خوف و دہشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ معاً ایک چیخ بلند ہوئی تو میری توجہ سیڑھیوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ چیخ اسی طرف سے سنائی دی تھیں اوپری سیڑھیوں پر مجھ ایک لاش پڑی نظر آئی۔ سیڑھیوں کے تقریباً اختتام پر میں نے نضار کو دیکھا۔ نضار نے دونوں ہاتھوں سے دو دھاری تلوار بلند کر رکھی تھی اور ایک نیزہ بردار سیڑھیوں سے نیچے دالان میں گر رہا تھا۔ دو دھاری تلوار کا زخم کھا کر شاید وہی چیخ اٹھا تھا۔ نضار سیڑھیوں سے کود کر بقیہ محافظوں کو ٹھکانے لگاتا ہوا اب میری طرف بڑھ رہا تھا۔

کڑھاؤ میں بجلیوں کی کڑک تیز ہو گئی۔ دالان میں جلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی ماند سی پڑ گئی۔ عورت نما اس مخلوق نے جیسے ہی میری طرف پلٹ کر دیکھا' میرے سارے جسم میں بجلیاں سی گردش کرنے لگیں اور پھر ان کی گردش میری دونوں آنکھوں میں آ کر تھم گئی۔ میرے لئے یہ کیفیت نئی نہیں تھی۔ عظیم مہیمن کی عطا کردہ پُراسرار قوتیں میرے وجود میں بیدار ہو چکی تھیں۔ عورت نما مخلوق کو میں نے اچھل کر کڑھاؤ سے باہر کودتے دیکھا۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں کے حلقوں میں دو انگارے سے دہکتے دکھائی دیئے۔ ادھر اس خوفناک مخلوق نے میری طرف قدم بڑھائے' ادھر میری دونوں آنکھوں سے تیز روشنی نکلی اور اس بلا پر محیط ہو گئی۔ عورت نما مخلوق کے منہ سے بھیانک چیخیں

ابل پڑیں۔ اسے میں نے شعلوں میں گھرے دیکھا جو خود اس کے جلتے ہوئے جسم سے اٹھ رہے تھے۔ پھر میں نے ان عبادت گزاروں اور بچے کھچے محافظوں کی طرف نظر اٹھائی تو وہ بھی میری آنکھوں سے نکلتی روشنی کی زد میں آ گئے۔ دالان میں جلتے ہوئے گوشت کی بدبو پھیل گئی۔ اب میری آنکھوں سے روشنی کا اخراج بند ہو گیا تھا۔ میرے وجود میں کوندتی ہوئی بجلیوں کی گردش کم ہونے کے باوجود ابھی تک برقرار تھی۔

میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے نضار کا ہاتھ تھاما ہی تھا کہ مجھے پُراسرار سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ "اے معبلہ! جا اور اس بوڑھے ساحر کو جلا کر خاک کر دے کہ جس کی شیطانی قوتیں، دیوتاؤں نے سلب کر لی ہیں۔ وہ کسی چوہے کی طرح اسی پہاڑی کے ایک غار میں چھپا بیٹھا ہے۔ خجیرہ کی خوشبو تیری رہنمائی کرے گی۔"

سرگوشی معدوم ہوتے ہی میں نے اس دالان کے دروازے کی جانب سے عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ کی مخصوص خوشبو آتے محسوس کی۔

نضار کا ہاتھ تھامے ہوئے میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "اے نضار! تُو نے بھی یہ سنا؟"

"کیا اے آتون!" نضار نے حیرت سے کہا۔

میں سمجھ گئی کہ اس بار میری طرح اسے پُراسرار سرگوشیاں سنائی نہیں دیں۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ میں نے اسے سرگوشیوں کے بارے میں بتایا۔

"ہاں اے آتون! کاہنہ خجیرہ کی خوشبو تو مجھے بھی آ رہی ہے اور .... اور میں دروازے کے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں دیکھنے کا اہل بھی ہوں۔" نضار کی آواز پُرجوش تھی۔ وہ اب میرے ساتھ دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو دالان میں خاک کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں مسلح محافظ، پُراسرار عورت نما مخلوق کے عبادت گزار اور خود وہ مخلوق، سبھی جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ میں ان محافظوں کے بارے میں یہی قیاس کر سکتی تھی کہ ساحر زعیم نے انہیں اپنے اس نئے مسکن کی حفاظت و نگرانی کے لئے اردگرد کی بستیوں سے وہاں جمع کر لیا ہو گا۔ وہ عام پہاڑی باشندے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے پاس جدید ہتھیار نہ ہونا بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ان عبادت گزاروں کو شاید بوڑھا ساحر آئندہ اپنا خدمتگار بنانے کا ارادہ رکھتا ہو گا۔ فی الحال زعیم انہیں غالباً اپنی ساحرانہ قوتوں سے مرعوب کر رہا تھا۔ یہی سب کچھ سوچتی ہوئی نضار کا ہاتھ تھامے خجیرہ کی خوشبو کے تعاقب میں ایک غار کے اندر آ نکلی۔ غار کا دہانہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔

وہ غار خاصا کشادہ تھا اور اس میں ایک طرف گھوڑے بندھے نظر آ رہے تھے۔ غار میں نیم تاریکی سی تھی۔ اس غار سے نکل کر میں نے دیکھا کہ رات گزر چکی ہے۔ صبح کا اجالا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں نے خجیرہ کی خوشبو قدرے بلندی کی طرف محسوس کی اور سر اٹھایا۔ مجھے اس پہاڑ کی مینار نما چوٹی دکھائی

دی۔ میں اور نضار اسی پہاڑ کے پیٹ میں سے نکل کر باہر آئے تھے۔ خجیرہ کی خوشبو نے ذرا ہی اوپر موجود ایک غار کے دہانے تک ہماری رہنمائی کی اور پھر غائب ہو گئی۔ اس غار کے دہانے کو اندر سے بند کرنے کی کوشش شاید بوڑھے ساحر زعیم ہی نے کی ہو گی۔ دہانے کا بڑا حصہ پتھروں اور سلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ نضار ان بڑے بڑے پتھروں کو اندر کی طرف لڑھکانے لگا۔ میں بھی اس کی مدد کرنے لگی۔

"ٹھہر جا اے آتون! .... ٹھہر جا۔" غار کے اندر سے ساحر زعیم کی منمناتی ہوئی سی خوفزدہ آواز سنائی دی۔ "مم .... میں خود .... خود باہر آ رہا ہوں۔"

"اے لعنتی ساحر! اب تُو خود باہر آ جائے یا اندر ہی رہ، مرنے سے نہیں بچ سکتا۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

پتھر ہٹ جانے سے اب اتنا راستہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں اور نضار اس غار میں داخل ہو سکتے۔

"مم .... مجھے معاف کر دے اے عظیم ساحرہ!" غار کے اندر سے پھر زعیم کی آواز ابھری۔ "میں زندگی بھر تیرا غلام کہلائے جانے پر فخر کروں گا۔"

"اب یہ مہلت گزر چکی ہے، اے بدکار بوڑھے! اور مہلت ہوتی بھی تو میں تجھ جیسے لعنتی کو اپنا غلام بنانا بھی پسند نہ کرتی۔ لگتا ہے کہ تُو جھوٹ بول رہا ہے اور باہر نہیں آئے گا۔" یہ کہتے ہی میں نضار کی طرف مڑی۔ "چل اندر ہی چلتے ہیں۔"

نضار نے اقرار میں سر ہلایا اور میرے ساتھ غار کے دہانے میں داخل ہو گیا۔ غار کے اندر، باہر کا اجالا آنے کے باوجود نیم تاریکی سی تھی، مگر مجھے واضح طور پر سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ نضار ہی کی طرح میرے اندر بھی اندھیرے میں دیکھنے کی قوت بیدار تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ دیکھوں زعیم کہاں ہے لیکن وہ مجھے نظر نہ آ سکا۔ ابھی ذرا ہی دیر پہلے تو میں نے غار کے اندر سے اس کی آواز آتے سنی تھی، اتنی جلدی وہ کہاں غائب ہو سکتا ہے؟ اب تو دیوتاؤں نے اس کی شیطانی قوتیں بھی سلب کر لی ہیں، معاً میرا دھیان ان بڑے بڑے پتھروں کی طرف گیا جو نضار نے غار کے دہانے سے اندر لڑھکائے گئے۔ وہ بزدل انہی پتھروں کے درمیان ایک بڑے پتھر کی آڑ میں چھپا بیٹھا تھا۔

"دیکھ اے نضار کہ جو دیوتاؤں کے قہر کو بھول کر خود کو اس زمانے کا سب سے بڑا ساحر کہتا تھا، آج کس حال میں ہے۔ وہ جو دوسروں کی بے بسی پر ہنستا تھا، آج اس کے لئے کوئی رونے والا بھی نہیں۔"

نضار سے یہ کہہ کر میں نے بوڑھے ساحر زعیم کو مخاطب کیا۔ "اٹھ کر کھڑا ہو جا اور اپنی موت کو خوش آمدید کہہ۔ تجھے دیکھ لیا گیا ہے اے لعنتی بوڑھے!" میری آواز میں سختی آتی گئی۔ میرے جسم میں گردش کرنے والی بجلیوں میں پھر ایک بار تیزی آنے لگی تھی۔

"اے .... اے عظیم ساحرہ! مم .... میرے پیروں میں اتنی طاقت نن .... نہیں رہی کہ .... کہ میں اٹھ کر کھڑا ہو سکوں۔ پھر .... پھر بھی تیرا حکم ہے تو .... تو میں کوشش کرتا ہوں۔" ساحر زعیم نے ہکلاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا۔ یقیناً موت کے خوف نے اس کی قوت گویائی پر اثر ڈالا تھا۔

میں نے دیکھا کہ وہ اٹھتے اٹھتے ایک بار پھر گر پڑا۔ اس وقت تک میرے وجود میں گردش کرتی بجلیاں میری دونوں آنکھوں کو اپنا مرکز بنا چکی تھیں۔ میری آنکھوں سے تیز روشنی نکلی اور ان پتھروں پر پڑی جن کے درمیان زعیم گرا تھا۔ ایک کڑاکا سا ہوا اور وہ پتھر پگھلنے لگے۔ پتھر سامنے سے ہٹ گئے تو زعیم نظر آیا۔ لمحے بھر ہی میں اس کے جسم نے آگ پکڑ لی اور دوسرے ہی لمحے پگھلے ہوئے پتھروں کا لاوا اس تک پہنچ گیا۔ بوڑھے ساحر زعیم کو چیخنے کی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی۔ دہکتے ہوئے لاوے میں اس کا بدکار وجود پلک جھپکتے غائب ہو گیا تھا۔

میرے جسم میں کوندتی ہوئی بجلیوں کی گردش تھم گئی۔ اب شاید ان کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ ایک بوڑھا شیطان اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

ساحر زعیم کا بھی وہی حشر ہوا تھا جس سے اس کی تخلیق کردہ بلائیں پہلے دوچار ہو چکی تھیں۔ آج میں نے اپنے دشمن ژیان کا ایک طاقتور بازو توڑ دیا تھا۔ اس پر میں اور نضار دونوں ہی خوش تھے۔ ہم دونوں اس غار سے نکل آئے۔ کچھ ہی فاصلے پر نیچے وہ غار تھا جس میں ہم نے گھوڑے بندھے ہوئے دیکھے تھے۔ یہ گھوڑے ان مسلح محافظوں اور عبادت گزاروں ہی کے معلوم ہوتے تھے جو ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔

پہاڑ سے اترتے ہی بے اختیار میری نگاہ وادی سبز کی طرف اٹھ گئی۔ کافی فاصلے پر مجھے آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ہم بلندی پر تھے اس لئے وادی میں نئی تعمیر ہونے والی پختہ عمارتیں کھلونوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ وادی سبز کی آبادی اور اس کے گرداگرد موجود اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ میں رک کر اپنی وادی کو دیکھ رہی تھی۔ میری وجہ سے نضار بھی ٹھہر گیا تھا۔

"تو دیکھ رہا ہے اے نضار کہ........" میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں اے آتون! وہ شاید کچھ گھڑسوار ہی ہیں جو آبادی سے نکل کر شاید اسی طرف آ رہے ہیں۔" نضار بول اٹھا۔

میں نضار سے کچھ اور ہی کہنا چاہتی تھی مگر وہ یہ سمجھا کہ ان گھڑسواروں کا ذکر کر رہی ہوں۔ انہیں میں نے نضار کے توجہ دلانے ہی پر دیکھا تھا ورنہ تو میری نظریں مشرق سے طلوع ہوتے سورج کا نظارہ کر رہی تھیں۔ دوسری جانب موجود اونچے پہاڑوں کے پیچھے سے سورج ابھر رہا تھا۔ میں' نضار کو یہی حسین نظارہ دکھانا چاہتی تھی۔ میں بچپن میں اپنی حویلی کی چھت پر چڑھ کر اکثر طلوع ہوتے سورج کا نظارہ کرتی تھی۔

ان گھڑسواروں کے ذکر نے میرے خیالوں کا سلسلہ توڑ دیا جو متحرک نقطوں کی طرح آگے بڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کے بارے میں صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا کہ وہ گھڑسوار ہوں گے۔

"اگر یہ واقعی گھڑسوار ہیں اے نضار تو ان کا رخ پہاڑوں کی طرف کیوں ہے؟" میں متجسس آواز میں بولی۔

"اے آتون! ابھی معلوم ہو جائے گا' انہیں ذرا قریب آنے دے۔" نضار نے جواب دیا۔ "وہ ژیان کے قاصد بھی ہو سکتے ہیں جو ان پہاڑوں سے نکل کر شاید مختلف بستیوں کا رخ کریں۔ اس کا اندازہ ان کے جسموں پر موجود لباس سے ہو جائے گا۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد تین ہے اور اس طرف ژیان کے زیر نگیں تین ہی بستیاں ہیں جن میں بستی صنعیہ بھی شامل ہے۔" نضار نے اپنے قیاسات کا اظہار کیا۔

تجسس کے تحت میں اور نضار وہیں ٹھہر گئے۔ تیزی سے قریب آنے والوں کی نظریں اگر پہاڑ کی طرف اٹھ جائیں تو ہم انہیں نظر نہ آ سکیں' اس خطرے سے بچنے کے لئے ہم نے بیٹھ کر ایک بڑے سے پہاڑی ابھار کی آڑ لے لی۔ میری نظریں وادی کی سمت ہی اٹھی ہوئی تھیں اور نظروں کا مرکز وہی متحرک نقطے تھے جو اب کافی حد تک واضح ہو گئے تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد نضار کا قیاس درست ثابت ہوا۔ آنے والے تین گھڑسوار ہی تھے۔

وہ ذرا اور قریب آئے تو میں چونک اٹھی۔ میں نے بے اختیار نضار کو مخاطب کیا۔ "اے نضار! یہ .... یہ تو مجھے اجنبی سرزمین کے باشندے لگتے ہیں اور .... اور ان کے ساتھ درمیان میں ایک عورت بھی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے جسموں پر عجیب .... عجیب سے لباس ہیں نا۔"

"ہاں اے آتون! میں .... میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ وہ .... وہ ہماری بستیوں کے نہیں لگتے۔" نضار بھی جواب میں رک رک کر بولا۔

"مگر .... مگر اے نضار! سردار صنعیہ نے تو بتایا تھا کہ ہموار میدانوں کی طرف سے آنے والوں کے ساتھ ژیان کا محافظ دستہ ہوتا ہے۔ ان .... ان کے ساتھ تو کوئی محافظ نہیں۔"

"ممکن ہے اے آتون! اس نے غلط سنا ہو۔" نضار نے کہا۔ "کیا خبر ہر وقت محافظ ساتھ نہ رہتے ہوں۔ ایسے معاملات میں لوگ افواہوں پر بھی تو یقین کر لیتے ہیں۔"

پھر کچھ دیر تک میرے اور نضار کے درمیان خاموشی رہی۔ ہم دونوں ہی اجنبی دنیا کے ان اجنبی باشندوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے جن کے قصے بچپن میں سنے تھے۔ اب وہ گھوڑوں سے اتر کر مینار نما پہاڑی کے دامن میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

"یہ لوگ شاید بستی سے نکل کر کھلی فضا میں چہل قدمی کے لئے آئے ہیں اے نضار!" میں ایک اندازہ قائم کر کے بول اٹھی۔

"اے آتون! تیرا کیا خیال ہے' انہیں قریب سے کیوں نہ دیکھا جائے۔" نضار کی آواز میں بچوں جیسا شوق اور دلچسپی تھی۔

پھر میں بھی بچی بن گئی اور نضار کی تائید میں بولی۔ "ہاں اے نضار! ان کی بولی بھی سنیں گے۔"

میں اور نضار بہت احتیاط کے ساتھ چھپتے چھپاتے مینار نما پہاڑ سے اتر آئے۔ قریبی پہاڑ اور مینار نما پہاڑ کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ اس جگہ چھوٹے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے اور جگہ جگہ سے زمین اونچی نیچی تھی۔ ہم اسی جگہ ایک پتھر کے پیچھے چھپ گئے جو شاید کسی پہاڑ سے ٹوٹ کر یہیں نیچے گرا ہو گا۔

اجنبی دنیا کے لوگ اب اسی طرف پلٹ رہے تھے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ میری نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ دور ہونے کی وجہ سے ابھی ان کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

"اے نضار! یہ اجنبی دنیا کے مرد تو بہت ہی دبلے پتلے اور کمزور لگتے ہیں۔" میں نے نضار سے سرگوشی کی۔ "ان کے جسموں پر تو نام کو بوٹی نہیں۔"

نضار نے اقرار میں سر ہلا دیا' پھر میرا ہاتھ تھام کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ "وہ ادھر ہی آ رہے ہیں اے آتون!" اس کی سرگوشی بہت دھیمی تھی۔

میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے مزید قریب آ گئے۔ اب ان کی آوازیں واضح طور پر مجھے سنائی دے رہی تھیں' مگر ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اتنا اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ وہ کسی موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ اس بحث میں وہ عورت بھی شامل تھی جو ان کے ساتھ تھی۔

اچانک میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ یہی کیفیت شاید نضار کی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ پر اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔ یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی کہ اجنبی دنیا کے لوگوں کی زبان پر میرا نام بھی آ سکتا ہے! وہ صرف ایک ہی لفظ تھا جو میرے لئے قابل فہم تھا' میرا اصل نام معبلہ! یقیناً میں ہی ان کا موضوع گفتگو تھی۔

وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے کافی آگے نکل گئے پھر وہ اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر بستی کی طرف واپس بھی چلے گئے' مگر میں اور نضار اسی طرح بیٹھے رہے۔ کافی دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ ہم گنگ سے ہو کر رہ گئے تھے۔ نضار نے پہلو بدلا تو میں جیسے ہوش میں آ گئی۔

"اے .... اے نضار!" خاموشی کا قفل ٹوٹ گیا۔ "تُو .... تُو نے سنا کہ وہ اجنبی سرزمین کے لوگ میرا نام لے رہے تھے۔"

"ہاں .... سنا میں نے۔" نضار نے طویل سانس لیا۔ "اور میں تب سے اسی پر غور کر رہا تھا۔"

"تو پھر تُو کس نتیجے پر پہنچا؟" میں نے بے تابی سے کہا۔

"کیا تُو یہ بھول گئی اے آتون کہ اجنبی دنیا کے لوگ ژیان کے مہمان ہیں؟" نضار میری طرف دیکھ کر بولا۔ "کیا خبر کبھی ژیان ہی نے تیرا ذکر ان سے کیا ہو۔"

"نہیں اے نضار!" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "اسے کیا پڑی کہ وہ گڑے مردے اکھیڑتا پھرے اور اپنے مہمانوں پر ظاہر ہونے دے کہ وہ ظالم و غاصب ہے۔"

میری دلیل مضبوط تھی اس لئے نضار لاجواب سا ہو گیا' پھر چند لمحے توقف کے بعد کہنے لگا۔ "کسی نہ کسی سے تو انہوں نے تیرا اصل نام سنا ہی ہو گا اب تو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ لوگ محافظوں کے بغیر بھی گھومتے پھرتے ہیں۔ کیا خبر وادی سبز کے کسی بوڑھے سے انہوں نے تجھ پر گزرنے والی بپتا سن لی ہو۔ بقول سردار صنعیہ وہ ہماری زبان بول سکتے ہیں' چاہے منہ بگاڑ کر ہی سہی' تو پھر سمجھ بھی لیتے ہوں گے۔"

"ہاں ایسا .... ایسا شاید ممکن ہے اے نضار!" میں نے اس معاملے پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"اے آتون! عظیم مہین کی طرف سے ہمیں جو حکم ملا تھا' وہ ہم نے پورا کر دیا۔ آ اب اپنی بستی کی طرف لوٹ چلیں۔" نضار یہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"کیا تجھے یاد نہیں رہا اے نضار کہ ہم اس وقت اپنے دشمن کے علاقے میں ہیں' کیا دن کے اجالے میں ہمارا سفر کرنا خطرناک نہ ہو گا؟"

"بستی صنعیہ کی طرف جانا بھی دن کے وقت خطرے سے خالی نہیں لگتا۔"

"ہم بستی صنعیہ کو ایک طرف چھوڑ کر کیا براہ راست بستی صاحی کی جانب نہیں بڑھ سکتے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ ممکن تو ہے اے آتون!" نضار نے جواب دیا۔ "مگر خطرہ بدستور رہے گا۔ یہ ژیان کے علاقے کی حدود ہیں۔ ہم سرحدی محافظوں کی نظر میں آ سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا اے نضار کہ ہم اگر یہاں سے سیدھے بستی صنعیہ کا رخ کریں تو ہمارے لئے خطرہ نسبتاً کم ہو گا۔"

"حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں اے آتون!" نضار کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

اس مسئلے پر ہمیں غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ ہماری واپسی کیسے اور کس راستے سے ہو گی۔ کچھ دیر بحث و مباحثے کے بعد ہم نے وہ دن مینار والے پہاڑ ہی پر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں سورج غروب ہونے کا انتظار تو کرنا ہی تھا۔ رات کے وقت ہمارے لئے سفر کرنا اتنا خطرناک نہ ہوتا۔ رات کو سفر کرنے والے عموماً اپنے ساتھ روشن مشعلیں لے کر چلتے ہیں کہ راستوں کے نشیب و فراز سے آگاہ رہیں اور کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں ہمارے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ ہم اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے تھے۔

مینار والے پہاڑ پر چڑھتے ہوئے ہم نے وادی سبز کی مخالف سمت کا رخ کیا۔ یہ سمت بستی صنعیہ کی تھی۔ ساحر زعیم کے برباد مسکن کی طرف ہم نے دانستہ جانے سے گریز کیا تھا۔ جلد ہی ہم نے چھوٹا سا ایک غار تلاش کر لیا۔ اس غار میں قدم رکھتے ہی مجھے پھنکار سی سنائی دی۔ نضار کو میں نے جلدی سے اپنے پیچھے کھینچ لیا۔

"تُو باہر جا اے نضار!" میں تیزی سے بولی۔ "مجھے خطرے کی بو محسوس ہو گئی تھی مگر وہ خطرہ میرے لئے نہیں تھا۔

نضار فوری طور پر الٹے قدموں غار سے باہر نکل گیا۔ اسی وقت میری نگاہ سبز رنگ کے سانپوں پر پڑی۔ سانپ کا وہ جوڑا تیزی کے ساتھ میری ہی طرف آ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اپنا دایاں ہاتھ سانپوں کی طرف بڑھا دیا اور وہ دونوں میری کلائی سے لپٹ گئے پھر میں نے پورے غار کا جائزہ لیا۔ ان دونوں سانپوں کے سوا وہاں مجھے کوئی اور سانپ نظر نہیں آیا۔ میں نے نضار کو آواز دے کر اندر بلا لیا۔ وہ میری کلائی سے سانپوں کو لپٹے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا۔ "اب تو اے آتون! تیرے قریب آنا بھی محال ہو جائے گا۔"

"نہیں اے نضار!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "کچھ دیر میں ان سے کھیل کر انہیں ختم کر دوں گی۔"

ہر سانپ زہریلا نہیں ہوتا۔ ان سانپوں کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ نے اسی لئے ان سے کچھ دیر کھیلنے کے بعد انہیں مار دیا اور غار سے باہر پھینک آئی۔ طویل عرصے سے سانپ میرے قریب آئے تھے اسی لئے ان کی قربت مجھے اچھی لگی تھی۔ میری زندگی میں سانپوں کی اہمیت تھی۔ ان ہی سانپوں نے تو مجھے دیوی بنا دیا تھا ورنہ تو کبھی کی ہلاک کر دی جاتی۔ وہ دن مجھے اچھی طرح یاد تھا جب تریال کی بستی کے لوگ میری جان کے درپے ہو گئے تھے' عبادت گاہ میں میری قربانی دی جانے والی تھی۔ اس وقت میں اپنی بچپن کی یادوں ہی میں کھوئی ہوئی تھی۔ شاید اس کا ایک سبب وادی ہر بھی تھی کہ میں جس کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔

اس غار میں پناہ لئے مجھے اور نضار کو ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی کہ میری سماعت میں پراسرار سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ "اے معبلہ اور اے نضار! اس سے پہلے کہ سروں کو نیزوں پر اچھالا جائے تمہیں حکم ہے' جتنی جلد ممکن ہو اشر کی بستی لوٹ جاؤ۔ خطروں سے نہ ڈرو کہ دیوتا تمہاری مدد پر ہیں۔ بستی اشر کی طرف لوٹ جانے میں کیا مصلحت ہے' یہ تم پر جلد ظاہر ہو جائے گی اور تمہیں مبارک ہو کہ تم بدی پر غالب آئے۔ وہ نیست و نابود ہوا کہ جو عذاب بن کر ان بستیوں پر مسلط تھا مگر اسی کو سب کچھ نہ جان لینا۔ دیوتاؤں کو ابھی تم سے اور بہت سے کام لینے ہیں۔ ابھی تمہیں بہت سے امتحانوں سے گزرنا ہے' سوچ نہ چھوڑ بیٹھنا کہ اس سے کچھ نہ ہو گا اور تم گھاٹے میں رہو گے۔"

سرگوشیاں معدوم ہو گئیں تو میری اور نضار کی نظریں بیک وقت ایک دوسرے کی طرف اٹھیں۔ پھر میں ہی بولی۔ "دیوتاؤں کی مرضی اس میں شامل نہیں اے نضار کہ ہم یہاں ٹھہریں۔ ہم سے یقیناً درست فیصلہ نہیں ہو سکا۔" مجھے اور نضار کو ایک ساتھ مخاطب کیا گیا تھا اس لئے اسے سرگوشیوں کے متعلق کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سرگوشیوں کے حوالے ہی سے میں' نضار کو مزید بتانے لگی۔ "سروں کو نیزوں پر اچھالے جانے کا مطلب تُو سمجھ ہی گیا ہو گا تُو اے نضار کہ یہ کسی ممکنہ جنگ کا اشارہ ہے جس سے ہمیں پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا ہے۔"

"میں بھی سمجھ گیا اے آتون! مگر تُو مجھ سے زیادہ سمجھتی ہے کہ تجھے سرگوشیاں سنتے ایک عرصہ ہو گیا۔" نضار نے میری بات سن کر کہا۔ "اور اب یہ بتا کہ کدھر چلنا ہے؟ یہاں سے قریب ترین بستی صنعیہ ہی کی ہے۔ ان پہاڑوں اور اس بستی کے درمیان اور کوئی آباد نہیں۔"

"تو پھر چل اٹھ اسی طرف چلتے ہیں۔" میں اٹھتے ہوئے بولی۔ "دیوتا جب ہماری مدد پر ہیں تو پھر ڈرنا کیا؟"

نضار بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس غار سے نکل کر ہمیں ایک بار پھر ساحر زعیم کے مسکن کا رخ کرنا پڑا۔ ہمیں بہرحال سواری کے لئے گھوڑے تو چاہئے تھے۔

میرے اور نضار کے پاس بطور ہتھیار اب صرف کھانڈے' یعنی دو دھاری تلواریں ہی تھیں۔ یہ تلواریں بھی ہم نے ساحر زعیم کے مسکن میں محافظوں سے چھینی تھیں۔ بستی صاحی سے ہم جدید ہتھیار لے کر چلے تھے۔ یہی ہتھیار ہمارے پاس بستی صنعیہ کے قیام میں بھی رہے تھے پھر جب ہم پہاڑوں کی

طرف بڑھے تھے تب بھی ہمارے کاندھوں سے رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ جب ہم زعیم کی ساحرانہ قوتوں کا شکار ہو گئے اور ہمیں ہوش آیا تو غیر مسلح تھے۔ امکان یہی تھا کہ بے ہوشی کے دوران ہی میں ہمیں غیر مسلح کر دیا گیا ہو گا۔ اب ہمیں ان ہتھیاروں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ ہمیں دشمن کے علاقے سے گزرنا تھا۔ ہمارا تجربہ یہی تھا کہ جدید ہتھیاروں کے سامنے تیر' تلوار' خنجر اور نیزے بے سود ہی ثابت ہوتے ہیں۔ نضار نے مجھے اس کا احساس دلایا۔

"ممکن ہے تلاش کرنے پر ہمیں زعیم کے مسکن میں کوئی رائفل وغیرہ مل جائے۔" میں نے سنبھل کر بڑھتے ہوئے کہا۔ "مگر اے نضار! ہمیں وہاں زیادہ دیر رکنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ بوڑھے ساحر کے پاس بہرحال ان لوگوں کی آمدورفت تو تھی ہی جنہیں وہ اپنی ساحرانہ قوتوں کے جال میں پھانس کر اپنا خدمتگار بنانا چاہتا ہو گا۔ کیا تُو ان عبادت گزاروں کو بھول گیا جو گلابی مشروب والے کڑھاؤ کے گرد جمع تھے۔ یہ تو بس ہم ہی کو خبر ہے کہ لعنتی ساحر اب اس دنیا سے اٹھ چکا ہے' ان لوگوں کو تو یہ علم نہیں ہو گا نا جو اس سے ملنے آتے رہتے ہوں گے۔ تو فی الحال ان ہی تلواروں کو غنیمت جان کہ جو ہمارے پاس ہیں۔"

پھر نضار نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا اور میرے ساتھ احتیاط سے آگے بڑھتا رہا۔ میں بھی چوکنا تھی اور نضار بھی کیونکہ دن کے اجالے میں ہمیں دور سے بھی دیکھ لیا جانا ممکن تھا۔ ہم جھک کر چھوٹے بڑے پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے چل رہے تھے اور ہماری نظریں وادی سبز ہی کی طرف تھیں کہ کوئی اُدھر سے آئے تو ہمیں پہلے ہی نظر آ جائے۔ زعیم کے مسکن تک پہنچ کر گھوڑوں والے غار میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے اندر کی سن گن لی۔

ایک آدھ بار کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز ضرور آئی' اس کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ ہم غار کے اندر جا کر دو گھوڑے کھول لائے۔

گھوڑوں کی لگامیں تھام کر پہاڑ سے اترنے کے بعد ہم نے بستی صنعیہ کی طرف روانگی میں دیر نہیں کی۔ میں تنہا ہوتی تو یقیناً مجھے زیادہ دشواریاں پیش آتیں کیونکہ مجھے اس علاقے کی جغرافیائی صورت حال اور راستوں کا علم نہیں تھا۔ نضار کی رفاقت نے یہ مشکل آسان کر دی تھی۔ اپنی بستی سے بے دخل کئے جانے کے بعد وہ مدتوں بستی بستی بھٹکتا پھرا تھا۔ اسی عرصے میں اس نے تمام ضروری معلومات حاصل کی تھیں جو اب کام آ رہی تھیں۔ عظیم مہین نے اسے میری ہمراہی کا حکم دیا تھا جو بلا سبب نہیں تھا۔ نضار ہر طرح اس کا اہل ثابت ہوا تھا۔ وہ باحوصلہ اور جری ہونے کے علاوہ میرا جاں نثار بھی تھا۔

پہاڑوں سے بستی صنعیہ کا فاصلہ نصف پہر سے کچھ کم ہی تھا' مگر ہمیں وہاں تک پہنچنے میں زیادہ ہی وقت لگا۔ اس کی وجہ یہ کہ ہم عام گزرگاہ سے ہٹ کر چلے تھے۔ بستی صنعیہ کی حدود شروع ہوتے ہی ہم مزید محتاط ہو گئے۔ آبادی ابھی دور تھی کہ چند گھڑسواروں کو ہم نے اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ انہوں نے شاید دور ہی سے ہمیں آبادی کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ ہرچند کہ اس بستی کا سردار ہمارا حلیف و ہمنوا بن چکا تھا' اس کے باوجود کوئی بھی خلاف توقع صورت حال پیش آ سکتی تھی۔ اس کا

تجربہ ہمیں پہلے بھی ہو چکا تھا۔ پھر بھی ہم نے گھوڑوں کو روکا نہیں اور بدستور آگے بڑھتے رہے۔

جب وہ گھڑسوار قریب آ گئے تو ہم نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔ ان میں سے صرف ایک آدمی مجھے کچھ دیکھا ہوا سا لگا۔ وہی ہم سے مخاطب ہوا۔ "کیا تم دونوں کو ہمارے سردار صنعیہ کی حویلی تک جانا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو ہم تمہیں وہاں تک پہنچا دیں گے۔"

میں نے ان مسلح محافظوں پر نگاہ ڈالی' ان کی تعداد پانچ تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی اب تک اپنے کاندھوں سے لٹکی ہوئی رائفلیں نہیں اتاری تھیں۔ میں اس آشنا چہرے والے محافظ کی بات کے جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ نضار بول اٹھا۔ "مگر تجھے کس طرح معلوم ہوا کہ ہمارا ارادہ کدھر جانے کا ہے؟"

"اے میرے سردار کے محترم مہمان! تُو نے شاید مجھے نہیں پہچانا۔ گزشتہ رات تجھے اس طرف چھوڑ کر جانے والوں میں سے ایک میں بھی تھا۔" محافظ نے جواب دیا۔ "سردار نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ادھر ہی رہوں اگر تیری ساتھی یا تُو اس طرف آئے اور تیرا ارادہ سردار کی حویلی تک جانے کا ہو تو تجھے بحفاظت وہاں تک پہنچا دیا جائے۔"

اس محافظ سے یہ سن کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرانی بھی۔ اس نے اپنی شناخت کرا دی تھی کہ وہ سردار صنعیہ کے وفاداروں میں سے ہے۔ سردار صنعیہ نے دوراندیشی کا ثبوت دیا تھا۔ اسے محافظوں نے بتا دیا ہو گا کہ ہم کس طرف گئے ہیں۔

ہم دونوں ان محافظوں کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ ہمیں ایسے راستے سے حویلی کی طرف لے گئے کہ ہم کم سے کم لوگوں کی نظر میں آ سکیں۔ حویلی کے عقبی دروازے ہی سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔ ہمیں فوری پر حویلی کے اس حصے میں پہنچا دیا گیا جہاں ہم کل رات تک ٹھہرے ہوئے تھے۔ سردار صنعیہ کو بھی انہی محافظوں نے ہماری آمد کی خبر دی ہو گی کیونکہ اس نے ہم تک پہنچنے میں دیر نہیں کی تھی۔ سردار کے ساتھ ایک خادم بھی تھا جس نے ادب سے آگے بڑھ کر نضار کو نیا لباس پیش کیا۔ اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہم بستی صنعیہ کی بجائے اپنی حویلی میں ہوں۔ اسی طرح ہماری خاطر برداریاں کی جا رہی تھیں۔ ہمارے لئے کھانا بھی لگا دیا گیا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے سردار صنعیہ کو مخاطب کیا جو ہمارے قریب ہی بیٹھا تھا۔ "اے مہمان نواز سردار! ہم تیری بستی میں زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔"

"جو تیرا حکم ہو اے آتون!" سردار بولا۔ "میں تیری اور سردار نضار کی روانگی کا بندوبست کرا دوں گا۔ میرے وفادار تمہیں اس علاقے کی حدود سے بحفاظت نکال آئیں گے۔ مجھے یہ گمان نہ تھا کہ میرے معزز مہمان اتنی جلدی لوٹ آئیں گے۔" سردار کے لہجے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ جاننے کے متجسس ہو۔

اس پر میں نے مسکرا کر کہا۔ "اگر اے سردار! تجھے یہ گمان نہ تھا تو پھر اپنے محافظوں کو پہلے ہی سے ادھر کیوں متعین کر دیا تھا کہ جدھر ہم گئے تھے؟"

"یقین کر اے آتون کہ آج ہی صبح جانے کیوں بار بار مجھے یہ خیال آیا کہ تُو ادھر ہی پلٹے گی' سو میں نے اپنے وفادار محافظوں کو ادھر بھیج دیا کہ جدھر تُو گئی تھی۔"

سردار صنعیہ کے دل میں یہ بات کس نے ڈالی؟ اس سوال کا جواب پُراسرار سرگوشیوں کی صورت مجھے پہلے ہی مل چکا تھا۔ دشمن کے علاقے سے بحفاظت نکلنے کا بندوبست ہو گیا تھا اور اس میں یقیناً ان کی مدد شامل تھی۔ پھر بھی نضار نے اس پر سردار صنعیہ کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے سردار کو اب یہ مصلحت نہ جانا کہ ہمارا ارادہ کدھر جانے کا ہے۔ گزشتہ رات ہم کہاں اور کیوں گئے تھے' اس بات کو میں ٹال گئی۔ چند روز میں خود اسے معلوم ہو جاتا کہ بوڑھا ساحر زعیم پُراسرار طور پر غائب ہو چکا ہے اور مینار نما پہاڑ میں اس کے نئے مسکن کو بھی اجاڑ دیا گیا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ چھپی رہ سکتی۔ ساحر زعیم دشمن کے علاقے میں کسی شیطان کی طرح مشہور تھا۔ اس کی لاش نہ ملنے کی صورت میں سمجھا جاتا کہ کسی سبب وہ خود ہی روپوش ہو گیا ہے پھر کچھ عرصے کے بعد لوگ اسے بھول بھال جاتے۔ یوں بھی کسی کو زعیم کے بارے میں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آ کر ان بستیوں پر ایک عذاب کی طرح مسلط ہو گیا تھا۔ پہلی بار اسے لوگوں نے ژیان ہی کی حویلی میں دیکھا تھا۔ اگر زعیم کے متعلق کوئی کچھ جانتا ہو گا تو وہ خود ژیان ہی ہو سکتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم نے بس کچھ ہی دیر آرام کیا کیونکہ ہم رات بھر کے جاگے ہوئے تھے اور ابھی ہمیں ایک طویل سفر درپیش تھا۔

سردار صنعیہ سے گفتگو کے دوران میں نے دانستہ اس کی معصوم تیرہ سالہ بیٹی کا ذکر نہیں چھیڑا تھا جسے کسی بات پر ناراض ہو کر ظالم ژیان نے قتل کرا دیا تھا۔ پہلا ظلم تو سردار صنعیہ پر یہ ہوا تھا کہ اس کی کم عمر بیٹی کو ژیان نے زبردستی اپنی بیوی بنا لیا تھا' دوسرا ستم یہ کہ اس معصوم کو موت کی نیند بھی سلا دیا۔ سردار صنعیہ کے دل پر اس سے کیا گزری ہو گی' یہ اندازہ لگانا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اندر ہی اندر انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ وہ یقیناً اسی لئے وسیط کی ترغیب پر ہمارا حلیف بننے پر باآسانی راضی ہو گیا تھا۔ میں یا نضار اگر سردار صنعیہ کی مقتول بیٹی کا تذکرہ کرتے تو اس سے اسے رنج ہی ہوتا۔ اس کے زخم ہرے ہو جاتے اور اسے بلاسبب دکھ میں مبتلا کرنا میری نظر میں مناسب نہیں تھا۔

رخصت ہوتے وقت ہم نے سردار صنعیہ سے بس چند ضروری باتیں ہی کیں۔ ان باتوں کا تعلق آئندہ حکمت عملی اور باہمی رابطے سے تھا۔ آخر میں نضار نے اس سے کہا۔ "اے سردار! خود کو ادھر اکیلا نہ جانو کہ تیری پشت پر سردار صاحی بھی ہے۔ تیرے خبردار ہونے کے لئے شاید اتنا ہی کافی ہو گا کہ مشرق کی طرف سے وادی سبز پر حملہ کر دیا گیا ہے پھر بھی اگر ضرورت سمجھی گئی تو حملے سے پہلے تجھے آگاہ کر دیا جائے گا۔"

"ایسی صورت میں اے سردار نضار! تُو دیکھے گا کہ صنعیہ کا خون اس کی ایڑیوں پر نہیں پنجوں پر گرے گا۔" سردار پُرجوش آواز میں بولا۔

سردار صنعیہ کے الفاظ بڑے بامعنی تھے۔ میں بولی۔ "ایڑیوں پر ان کا خون گرتا ہے اے سردار کہ

جو پشت پر زخم کھاتے ہیں اور یقیناً تُو ان میں سے نہیں۔" میں نے یہ بات سردار صنعیہ کے جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کے لئے کہی تھی۔

گرم جوشی کے ساتھ سردار صنعیہ نے ہمیں رخصت کیا۔ حویلی سے نکلتے ہی اس کے وفادار محافظ ہمارے ساتھ ہو لئے تھے۔

شام ہو رہی تھی جب ہم سردار صاحی کی سرحدی حدود تک پہنچ گئے۔ سردار صنعیہ کے محافظوں کو ہم نے صنعیہ واپس بھیج دیا۔ سرحدی چوکی پر ہم سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔ دو محافظوں کو ہمارے ساتھ کر دیا گیا کہ وہ بستی میں ہمیں سردار صاحی کی حویلی تک پہنچا دیں۔ ہم نے سرحدی چوکی کے نگران کو یہی بتایا تھا کہ ہمیں سردار صاحی سے ملنا ہے۔ رات کا وقت ہوتا تو شاید ہمیں اتنی آسانی سے آگے نہ بڑھنے دیا جاتا۔

سردار صاحی کے لئے ہماری آمد غیر متوقع نہیں تھی۔ اسے امید تھی کہ ہم جلد ہی سردار صنعیہ سے مل کر لوٹیں گے اور ہماری واپسی کا راستہ یہی ہو گا۔ اس نے ہم سے صرف اتنا ہی دریافت کیا کہ سردار صنعیہ سے ہماری ملاقات کامیاب رہی یا نہیں؟ اس وقت ہم بوڑھے سردار کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔

"ہاں اے محترم سردار! اسے یقین دہانی کرا دی گئی ہے۔" میں نے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے مختصراً جواب دیا۔

"مجھے بھی یہی امید تھی۔" سردار صاحی مطمئن آواز میں بولا۔

ہم خاصے تھکے ہوئے تھے۔ موجودہ صورت میں مزید رات بھر سفر کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ ہم نے اسی لئے وہ رات مجبوراً وہیں گزاری۔

دوسرے دن صبح ہم ناشتہ کرنے کے کچھ ہی دیر بعد اشر کی بستی کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ سردار صاحی کے محافظ تھے تاکہ اس علاقے کی حدود میں ہمیں کہیں نہ روکا جائے۔ اپنے دشمن کے علاقے میں اندر تک داخل ہو کر بحفاظت ہماری واپسی دیوتاؤں ہی کی مرہون منت تھی ورنہ کہیں بھی اور کسی مرحلے پر ہم زندگی کی بازی ہار سکتے تھے۔ اس دوران میں کئی مرحلے ایسے آئے بھی تھے مگر ہم بال بال بچ گئے تھے۔

وہ سارا ہی دن سفر میں گزرا۔ اس عرصے میں ہم نے دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے صرف ایک جگہ قیام کیا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم اپنے علاقے کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ سردار صاحی کے محافظ اس سے پہلے ہی واپس ہو گئے تھے۔

بستی اشر کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے نضار کو مخاطب کیا۔ "اب شاید وہ وقت قریب آ چکا ہے اے نضار کہ ہم اپنے دشمن پر آخری ضرب لگا سکیں۔"

"تیری زبان مبارک ہو اے آتون!" نضار میری تائید میں بولا۔ "دیوتاؤں کی مرضی شامل رہی تو ہم دشمن کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔"

"اور ہمیں اس کا اشارہ تو مل ہی چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اسی لئے جلد سے جلد بستی اشر پہنچنے کا حکم ملا ہے۔"

میں اور نضار اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے پہاڑی درے سے گزر کر بستی کی حدود میں داخل ہو گئے۔ اس وقت تک رات ہو چکی تھی۔

اب ہمیں رازداری کی ضرورت نہیں تھی اس لئے ہم نے حویلی کے عقبی دروازے کا رخ نہیں کیا۔

حویلی میں پہنچ کر میں نے سب سے پہلے احرس اور مہا پجاری سے ملاقات کی۔ احرس مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا اور پھر حسب معمول چہکنے لگا۔ وہ مجھے اپنے ہی کمرے میں لے آیا تھا۔ "تجھے خبر بھی نہ ہو گی اے آتون دیوی کہ تیری جدائی میں تیرے اس پجاری نے کتنی آہیں بھری ہیں۔"

"سب خبر ہے مجھے۔" میں ہنس کر بولی۔ "تو میری جدائی کا سارا احوال زالی کو سنا رہا ہو گا اور اسی کے سامنے آہیں بھرتے ہوئے.........."

"دیکھ اے آتون! اگر اب تُو نے میرے سامنے اس خادمہ کا ذکر کیا تو اس حویلی میں ایک عدد قتل ہو جائے گا اور اس قتل کی ساری ذمے داری تجھ پر ہو گی۔"

"اچھا اب مجھے جانے دے، دن بھر سفر کر کے بہت تھک گئی ہوں۔"

"کیا بہت دور سے منزلیں مارتی ہوئی آ رہی ہے؟" احرس معنی خیز لہجے میں بولا۔

"اگر تُو اس طرح مجھ سے کچھ پوچھنے کے چکر میں ہے تو دماغ سے نکال دے اس خیال کو۔" میں مسکرائی۔

"ویسے ایک بات تو بتا ہی دے اے آتون کہ تیرے یہ پُراسرار دورے ختم کب ہوں گے؟ تجھے یہ بتانے سے تو دیوتاؤں نے منع نہیں کیا ہو گا؟"

"بس اب ختم ہی سمجھ۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"یعنی تجھ پر دورے پڑنا بند ہو جائیں گے۔" احرس بدستور غیر سنجیدہ ہی رہا۔ "تُو نے یہ تو بڑی خوشی کی خبر دی۔"

"تُو نے ابھی پوری بات کہاں سنی۔" مجھے بھی شرارت سوجھی۔ "معلوم ہے اے احرس پھر کیا ہو گا.......... تجھ پر دورے پڑنے لگیں گے۔"

"ہرگز نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں بالکل اس پر تیار نہیں۔ تجھے ہی دیکھ دیکھ کر میں نے خاصی عبرت پکڑ لی ہے، خود تصویر عبرت بننا نہیں چاہتا۔"

"وہ تو بننا پڑے گا، جو حال میرا سو تیرا۔ تجھے بھاگنے نہیں دوں گی رسی تڑا کے۔"

"بھاگ چکا ہوتا کبھی کا۔ بس رحم آ گیا، یہ سوچ کر کہ میرے بغیر تُو کیسے جئے گی؟"

احرس سے کچھ دیر گفتگو کے بعد میرے کشیدہ اعصاب کو کچھ سکون سا ملا اور پھر اس کے پاس سے اٹھ کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہونے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا اور کچھ

دیر کو بستر پر دراز ہو گئی۔ میں گزشتہ دنوں پیش آنے والے واقعات پر غور کر رہی تھی۔ دشمن کے علاقے کا سفر میرے لئے بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا۔ ابھی میں ان ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ ایک خادم نے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔

"آ جا۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

خادم سے نضار نے کھانے کے لئے کہلوایا تھا۔ کھانا اسی کے کمرے میں لگایا جانے والا تھا۔ عموماً ایسا ہوتا تھا کہ مہا پجاری' احرس' نضار اور میں' ہم سب ایک ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ نضار کا نائب احزم بھی کبھی کبھار ہمارے ساتھ شریک ہو جاتا تھا۔ میں اور نضار کیونکہ کچھ دیر سے حویلی پہنچے تھے اس لئے مہا پجاری اور احرس دونوں ہی کھانا کھا چکے تھے۔ احزم البتہ کچھ ضروری امور میں الجھا ہوا تھا جس کا تعلق کبیت والوں کی تربیت سے تھا۔ اس وقت احزم' کبیت والوں ہی کی طرف گیا ہوا تھا جنہیں بستی اثرت سے نصف پہر کے فاصلے پر پہاڑی سلسلے میں بسایا گیا تھا۔ احزم سے اسی لئے اب تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جب میں' نضار کے کمرے میں پہنچی اور کھانا لگایا جانے لگا تو احزم بھی آ گیا۔ اس نے مجھے اور نضار کو باری باری جھک کر تعظیم دی اور ایک طرف بیٹھ گیا۔

"اے میرے دانشمند! ہمارے پیچھے کس حال میں رہا تُو؟" نضار نے احزم کو مخاطب کیا۔

"خیریت سے گزری اے میرے بہادر سردار! تُو بتا کہ جس کام سے گیا تھا' وہ پورا ہو گیا؟" احزم جواب میں بولا۔

نضار نے اسے کام پورا ہو جانے کی خوشخبری دی' پھر کہنے لگا۔ "مگر اے احزم! اصل کام تو اب شروع ہو گا۔"

احزم شاید یہ سمجھا کہ مجھے اور نضار کو پھر کوئی سفر درپیش ہے اسی لئے اس نے کہا۔ "تو پھر اب اے سردار! تیری روانگی کب ہے؟"

"کہاں اور کس لئے اے احزم!" نضار نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تو اے سردار مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ تُو اور آتون دیوی کہاں اور کس لئے گئے تھے' سو اب کیسے جان لوں گا۔"

"تُو شاید کچھ غلط سمجھ رہا ہے اے احزم!" میں بول اٹھی۔ "اصل کام سے نضار کی مراد کچھ اور ہے۔ اب جو ہم روانہ ہوں گے اے احزم تو ہمارے ساتھ تُو بھی ہو گا۔"

پھر اس سے پہلے کہ احزم مزید کچھ کہتا یا وضاحت چاہتا' نضار نے مجھ سے کہا۔ "میرا خیال ہے اے آتون کہ کل صبح ہم اجلاس کر لیں۔ اس میں مہا پجاری اور احرس بھی ہوں گے۔ جو مسئلہ اب درپیش ہے' اس پر اجلاس میں تفصیل سے گفتگو ہو جائے گی۔"

میں سمجھ گئی کہ اس وقت نضار کسی سبب اس گفتگو سے گریز کر رہا ہے جس کا اشارہ احزم سے میں نے کیا تھا۔

"اچھا اے احزم! اب تُو کھانا کھا اور مزید کسی سوچ میں نہ پڑ۔" نضار نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں کھانا کھانے کے دوران میں یہ سوچ رہی تھی کہ اجلاس میں نضار کے دوسرے نائب ادل کی شرکت بھی ضروری تھی۔ میرے اندازے کے مطابق آئندہ روز ہونے والے اجلاس میں نضار' وادی سبز پر حملہ کرنے کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

"کبیت والوں کا کیا حال ہے اے احزم!" نضار نے اپنے نائب سے پوچھا۔ شاید موضوع گفتگو بدلنے ہی کی خاطر نضار نے یہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔

"ان میں سے جو ذرا سمجھدار ہیں اے سردار! بڑی حد تک رائفل کھولنا بند کرنا اور اس میں گولیاں ڈالنا سیکھ گئے ہیں' مگر ابھی ان کے نشانے درست نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ وہ رائفل سے کچھ ڈرتے بھی ہیں۔ جو ایسے ہیں کہ جن کی عقل موٹی ہے ابھی پیچھے ہیں۔" احزم نے جواب دیا۔

نضار نے تو غالباً یہ ذکر یوں ہی چھیڑا تھا مگر میں کچھ اور ہی سوچنے لگی۔ وادی سبز پر حملہ کرنے کے لئے کبیت والوں کی تربیت پوری ہونے کا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے احزم سے دریافت کیا۔ "تیرا کیا خیال ہے اے احزم کہ انہیں تربیت حاصل کرنے میں کتنے دن لگ جائیں گے؟"

"اے آتون دیوی! ان کی حالت دیکھتے ہوئے تو یقینی طور پر ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" احزم نے بتایا۔

"اس کی ایک وجہ یہ بھی تو ہے اے آتون کہ انہوں نے پہلے کبھی جدید ہتھیار استعمال نہیں کئے۔" نضار میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"تیرا یہ کہنا بھی ٹھیک ہے اے نضار! مگر........." میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ ابھی وادی سبز پر حملے کا ذکر نہیں کرنا۔ میں نے اسی لئے بات بدل دی۔ "مگر انہیں ڈرنا تو نہیں چاہئے' میں کل ہی بریسا کو بلا کر بات کروں گی کہ وہ اپنے قبیلے والوں پر سختی کرے۔"

اس وقت تک ہم کھانا کھا چکے تھے۔ احزم اجازت لے کر اٹھ گیا تو نضار نے مجھ سے کہا۔ "آ اے آتون! کچھ دیر باغ میں چل کر ٹہلتے ہیں۔"

میں اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر نضار کے ساتھ حویلی کے باغ میں آ گئی۔

"اے آتون! دراصل میں تجھ سے کچھ بات بھی کرنا چاہتا تھا جو احزم کے سامنے تیرے مشورے کے بغیر مناسب نہ ہوتی۔" نضار میرے ساتھ ٹہلتے ہوئے بولا۔

"میں نے اندازہ لگا لیا تھا اے نضار کہ تُو فی الحال وادی سبز پر حملے کے ذکر سے گریز کر رہا تھا بتا کہ اس کی وجہ کیا تھی؟"

"تجھ سے اے آتون! میں یہ مشورہ کرنا چاہتا تھا کہ احزم' ادل اور دوسرے ذمے دار افراد کو اپنے منصوبوں کے بارے میں کچھ بتایا جائے یا نہیں؟"

"جنگی نقطہ نظر کو تُو مجھ سے بہتر سمجھتا ہے اے نضار!" میں بولی۔ "میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ انہیں اس بات سے بے خبر نہیں رکھنا چاہئے کہ دشمن کے علاقے میں بھی اب ہمارے حلیف موجود ہیں۔ ایک تو

یہ کہ اس سے ان کا حوصلہ بڑھے گا' دوسرے معلوم ہو گا کہ کس طرف سے خطرہ نہیں اور فوجوں کو حرکت دیتے ہوئے کس طرف دباؤ بڑھنا ہے۔ جہاں تک عظیم مہیمن کی ہدایات اور حکم کا تعلق ہے تو ہم اس پر عمل کر چکے ہیں۔ نہ ہم نے یہاں سے جاتے وقت کسی پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ کدھر جا رہے ہیں اور ہمارا ارادہ کیا ہے' نہ لوٹ کر آنے کے بعد کچھ بتایا۔ دونوں مرتبہ جب ہم گئے اور لوٹے تو ایسا ہی کیا۔ عظیم مہیمن کی طرف سے ہمیں بوڑھے ساحر زعیم اور اس کے ٹھکانے کو تباہ کرنے کا حکم ملا تھا' سو وہ ہم نے پورا کیا۔ وسیط اور دیگر چاروں قبیلوں سے ہمارا اتحاد حکم کا حصہ نہیں تھا۔ نہ ہمیں یہ ہدایت دی گئی کہ ہم اس کا ذکر بھی کسی سے نہ کریں پھر اس مرتبہ صنعیہ سے بھی مل لئے۔ یوں اب سات قبیلے ہمارے اتحادی بن چکے ہیں۔ ہمارے دشمن کی حمایت پر مشرق میں صرف ایک قلاوز کا قبیلہ ہے اور مغرب میں آباد دو اور قبیلے۔ اس طرح وادی سبز کی اطراف آباد قبائل کی اکثریت اب ہمارے ساتھ ہے۔ یہ ساری باتیں اپنے لوگوں کو نہ بتانا اور نہ سمجھانا میرے خیال میں بہتر نہیں۔

"تو نے تو کہا ہے اے آتون کہ جنگی نقطۂ نظر کو میں زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہوں' مگر تیری بات تو کچھ اور ہی انداز ہوا۔ تجھ میں تو مجھ سے زیادہ سمجھ بوجھ ہے۔"

نضار کی بات ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ میں نے احرس کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ادھر آتے دیکھا۔

"اے میرے بھائی نضار! اکیلے ہی اکیلے تُو ٹہل مچا رہا ہے اور اپنے عزیز از جان بھائی احرس کو گھاس ہی نہیں ڈال رہا۔" وہ قریب آتے ہوئے بلند آواز میں کہنے لگا۔

"میں اکیلا کب ہوں اے میرے بھائی احرس! کیا تجھے میرے ساتھ آتون نظر نہیں آ رہی؟" نضار آہستہ سے ہنس کر بولا۔

"دراصل احرس کو چاندنی راتوں میں کچھ کم بجھائی دینے لگتا ہے۔" میں بھی بول اٹھی۔

"بجھائی تو خیر سب دیتا ہے مگر.......... خیر چھوڑ' میں تو اپنے بھائی نضار سے یہ کہہ رہا تھا کہ آدمی کبھی کبھی کسی کے ساتھ ہو کر بھی تنہا ہی رہتا ہے۔" احرس نے کہا۔

"اے احرس! کبھی کبھی تو واقعی تیری اس طرح کی باتیں سن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تُو بڑا ہو گیا ہے۔" میں ہنس دی۔

اس سے پہلے کہ احرس میری بات کے جواب میں کچھ کہتا' نضار نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"میں اور آتون اس وقت کل صبح ہونے والے اجلاس کے بارے میں بات کر رہے تھے اے احرس!" نضار سنجیدگی سے بتانے لگا۔ "تجھے بھی اس اجلاس میں شرکت کرنا ہے۔"

"بس آج میری سمجھ میں آ گیا کہ یہ اجلاس وجلاس کا کیا چکر ہے؟" احرس کے لہجے میں اب بھی شوخی ہی تھی۔ وہ اب ہمارے ساتھ ساتھ ہی ٹہل رہا تھا۔

"کیا سمجھ گیا تُو.......... بتا نا؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"بتا دوں.......... اچھا چل آج میں اس سربستہ راز سے بھی پردہ اٹھا ہی دیتا ہوں۔ تم دونوں چپکے چپکے پہلے یہ طے کر لیتے ہو کہ اجلاس میں کیا بات منوانا ہے اور پھر بقیہ حاضرین اجلاس کو بڑی صفائی سے

تو بناتے ہو۔ اپنی ہی من مانی کرنا ہے تو اے میرے پیارے بھائی نضار اور اے دیویوں کی دیوی آتون! پھر اجلاس بلانے کی کیا ضرورت ہے؟ جو جی میں آئے سو کرو' تمہیں کون روکنے والا ہے۔ اگر کوئی یہ ناکام کوشش کرے تو مجھے بتاؤ' میں اس کے دماغ کی چولیں.........."

"بس کر۔" میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "میں جانتی ہوں تجھے اچھی طرح' بے تکی باتیں کرنے میں تیرا کوئی جواب نہیں۔"

"کسی معاملے میں تو لاجواب کہا تُو نے مجھے۔" وہ ہنسا۔ "ورنہ تو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ عمر عزیز یونہی رائیگاں جا رہی ہے۔"

احرس نے کچھ اس طرح یہ بات کی کہ نضار کو بھی ہنسی آ گئی۔ مجھے اور نضار کو جو بات کرنا تھی پہلے ہی ہو چکی تھی۔ ہم اسی لئے مزید کچھ دیر احرس کے ساتھ خوش گپیوں کے بعد باغ سے لوٹ آئے۔ بقیہ باتیں آئندہ روز صبح کے اجلاس میں بھی کی جا سکتی تھیں۔

اس رات میں خوب گہری نیند سوئی کہ میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

دوسرے روز اجلاس والے کمرے میں سبھی جمع تھے۔ ناشتے کے بعد ہی اجلاس طلب کر لیا گیا تھا۔ مجھے احرس کے ہونٹوں پر بڑی شریر مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ اس مسکراہٹ کی وجہ گزشتہ رات کی وہ گفتگو ہو سکتی تھی جو احرس نے مجھ سے اور نضار سے کی تھی۔ میں نے اسی لئے احرس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ اجلاس میں احزم اور مہا پجاری بھی شریک تھے۔

"اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی قوت کو یکجا کر لیں۔" نضار نے گفتگو شروع کی۔ اس کی نظریں مہا پجاری کی طرف اٹھی ہوئی تھیں کہ وہاں ہم سب میں وہی سب سے زیادہ عمر کا تھا۔ "تجھے مبارک ہو اے مہا پجاری کہ دیوتا ہم پر مہربان ہوئے اور ہم اپنے دشمن پر آخری ضرب لگانے کے قابل ہوئے۔"

"اے اشر کے بہادر بیٹے! تجھ سے یہی امید بھی تھی۔" جواب میں مہا پجاری محبت سے بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تُو نے اس عرصے میں تمام جنگی تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ میرے لئے وہ دن بڑی خوش نصیبی کا ہو گا کہ جب میں دوبارہ وادی سبز میں قدم رکھوں گا اور جب مظلوم سردار اشم کی بیٹی کو اس کا حق مل جائے گا۔ یہ تو بتا اے نضار! کیا اب پہلے کی طرح رازداری کی ضرورت نہیں رہی؟" مہا پجاری نے وضاحت چاہی۔

"ہم نے پہلے رازداری کا جو فیصلہ کیا تھا اے مہا پجاری! وہ اب بھی برقرار ہے۔ آتون ہی دراصل مبلغ ہے' یہ راز ابھی راز ہی رہے گا۔" نضار نے بتایا۔

"ظالم ژیان کو یہ خبر نہیں ہو گی کہ اس کے مقابلے پر صرف میں ہی نہیں' وادی سبز کی وارث بھی ہے۔ رہیں جنگی تیاریاں سو وہ ابھی تکمیل کو نہیں پہنچیں۔ اس کے لئے ادل اور احزم کی بستیوں سے نوجوانوں کو یہاں اکٹھا کرنا پڑے گا۔"

"تو پھر اے محترم سردار! مختلف قبائل کی طرف ہم اپنے سفیر تو اب بھی نہیں بھیج سکتے۔" احزم نے سوال اٹھایا۔ "وادی سبز کے اردگرد جو قبیلے آباد.........."

"اے میرے دانش مند نائب! تُو جو کہنا چاہتا ہے' میں سمجھ رہا ہوں۔" نضار اپنے نائب کی بات کاٹ کر بولا۔ "اب ان سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ تو یہ بتا کہ ان قبیلوں کی طرف جو مخبر بھیجے گئے تھے' کیا ان کی طرف سے کچھ خبریں ملیں؟"

"نہیں اے سردار! اب تک ان کی کوئی خبر نہیں آئی۔ ان میں سے صرف شیردیہ ہی لوٹ کر آیا ہے کہ جس کا نام تُو نے تجویز کیا تھا۔ اسے میں نے وادی سبز کی طرف بھیجا تھا' سو وہ شدید زخمی حالت میں لوٹا۔ اب تک وہ بیمار پڑا ہے۔ بڑی مشکل سے وہ جان بچا کر آ سکا۔ اسے لوٹے آج تیسرا دن ہے۔ شیردیہ سے بس ایک ہی کام کی بات معلوم ہو سکی اے سردار کہ وادی سبز اور ژیان کے زیر نگیں علاقوں میں اجنبیوں کے داخلے پر سخت پابندی ہے۔"

احزم جو کچھ بتا رہا تھا' اس کا عملی تجربہ مجھے اور نضار کو پہلے ہی ہو چکا تھا۔

"اصل مسئلہ وہ نو قبیلے ہیں اے سردار کہ جو وادی سبز کے مشرق اور مغرب میں ہمارے دشمن کی مدد پر موجود ہیں۔" احزم اب کہہ رہا تھا۔ "میں نے پہلے ان ہی کی طرف توجہ دی تھی اور وہاں مخبر بھیجے تھے۔ یہ وہ قبیلے ہیں کہ جن پر قبضہ کر کے وہاں کے سرداروں کو ژیان نے اپنا نائب بنا لیا ہے۔"

"اور تُو سردار صاحی کو تو بھول ہی گیا اے احزم کہ وہ بھی تو وادی سبز سے زیادہ فاصلے پر نہیں اور ژیان کا حلیف ہے۔" میں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہاں اے آتون دیوی! ژیان سے معاہدہ امن کے سبب وہ بھی ہمارا حریف ہی ہو گا۔" احزم نے میری بات کی تصدیق میں کہا۔

اس پر مہا پجاری کو میں نے کچھ مضطرب سا دیکھا' پھر وہ بول ہی اٹھا۔ "اگر اب بھی رازداری کی ضرورت نہ ہوتی تو اس شریف بوڑھے سردار صاحی کو اپنے حق میں استوار کرنا زیادہ مشکل نہ ہوتا۔ سردار صاحی اور سردار موسر کے بارے میں پہلے بھی میں نے یہ بات کی تھی۔"

"اور اس اجلاس میں یہ طے بھی ہو گیا تھا اے مہا پجاری کہ تجھے سردار صاحی کی طرف سفارت لے کر بھیجا جائے گا۔" احرس نے مداخلت کی۔ "مگر تیری چہیتی آتون نے دوسرے ہی روز فیصلہ بدل دیا اور میرے بھائی نضار نے بھی اسی کی تائید بہتر سمجھی۔"

"اس وقت حالات کا تقاضا یہی تھا اور اے میرے بھائی احرس!" نضار نرمی سے بولا۔

"مگر اب کون سے حالات بدل گئے' مجھے تو کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ جو صورت حال پہلے تھی اب بھی.........."

احرس کی بات پوری ہونے سے پہلے میں بول اٹھی۔ "تیرا خیال غلط ہے اے احرس! حالات میں اتنی بڑی تبدیلی آ چکی ہے جسے سن کر تُو حیران رہ جائے گا۔"

"تو پھر دیر کیوں کر رہی ہے اے آتون! حیران کر کہ میں حیران ہونے کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔" احرس کے لہجے میں شوخی آ گئی۔

"سن اے احرس!" میں پُرجوش آواز میں بولی۔ "وادی سبز کے گرداگرد جو نو قبیلے آباد ہیں' ان میں

سے چھ قبیلے اب ہمارا ساتھ دیں گے۔"

اس انکشاف پر احرس بھی چونک اٹھا۔ مہا پجاری اور احزم کے چہروں پر بھی حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔

"اور سردار صاحی بھی اب ہمارا ہمنوا بن چکا ہے۔" نضار نے بات آگے بڑھائی پھر وہ جنگی نقطۂ نظر سے صورت حال کی وضاحت کرنے لگا۔ "ہمیں مشرق کی طرف ہی سے وادی سبز پر حملہ کرنا ہے کہ اس طرف صرف سردار قلاوز مزاحمت کر سکتا ہے۔ وہ بھی مشرق میں آباد بقیہ پانچ قبیلوں کو ہماری حمایت پر دیکھ کر ممکن ہے' مزاحمت کا ارادہ ترک کر دے۔ مغرب میں سردار صاحی اور سردار صنعیہ ہماری مدد پر ہوں گے۔"

"پھر تو اے سردار! مشرق اور مغرب میں صرف تین ہی قبیلے ہمارے دشمن کے ساتھ رہ جائیں گے۔" یہ کہتے ہوئے احزم کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی اے آتون کہ یہ جادو کیسے ہو گیا؟" احرس نے پوچھا۔

"تو اسے دیوتاؤں کی مدد ہی کہہ سکتا ہے اے احرس!" میں مسکرا کر بولی۔ "بول اب تُو حیران ہوا کہ نہیں؟"

"تیرے اور نضار کے پُراسرار دوروں کا راز آج میری سمجھ میں آ گیا اے آتون!" احرس بھی مسکرایا۔

"مگر اے میری بچی! کیا تُو اور نضار.......... اس کے لئے دشمن کے علاقوں میں.........." مہا پجاری کو حیرت کے سبب شاید اپنی بات کہنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"اے مہا پجاری! دیوتاؤں کی مرضی یہی تھی کہ ہم یہ خطرہ مول لیتے۔" میں نے کہا۔

"اور آتون کی مجبوری یہ ہے کہ دیوتاؤں کی مرضی کے خلاف ایک قدم اِدھر اُدھر نہیں اٹھاتی۔ دیوتاؤں نے آخر اسے یوں ہی تو اپنی دیوی نہیں بنا لیا اے مہا پجاری!" کچھ دیر سنجیدہ رہ کر احرس پھر اپنی روش پر لوٹ آیا۔

اجلاس میں یہ طے ہوا کہ احزم آج ہی اپنی بستی کی طرف روانہ ہو جائے اور جلد از جلد اپنی فوج لے کر بستی اشر پہنچے۔ اسی کے ساتھ نضار کے دوسرے نائب اول کو بھی اپنی سپاہ کے ساتھ پہنچنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ اسی روز میں نے قریبی پہاڑی سلسلوں سے بریسا کو بھی بلوا لیا۔ مجھے اپنے کسی بڑے دشمن سے نبرد آزما ہونا ہے' یہ سن کر بریسا پُرجوش نظر آنے لگا۔ "تیری خاطر یہ تیرا غلام بریسا اور سارے کبیت والے جان دینے میں فخر محسوس کریں گے' اے آتون دیوی! اور تُو دیکھے گی کہ تیرے پجاری اپنے سینوں کو تیری خاطر ڈھال بنا دیں گے۔" بریسا نے اپنے جذبات اور عقیدت کا اظہار کیا۔

اس پر میں بولی۔ "اے بریسا! تجھے اور تیرے قبیلے کو بلا سبب کٹوا دینے سے تیری دیوی کو کچھ حاصل نہ ہو گا۔" پھر اس سے میں نے وہی کچھ کہا جو گزشتہ شب احزم اور نضار کے سامنے کہہ چکی تھی۔ "میں

چاہتی ہوں کہ کبیت والے جلد سے جلد نئے ہتھیار چلانا سیکھ لیں۔"

بریسا نے مجھے اپنے قبیلے والوں پر سختی کی یقین دہانی کرائی، پھر میری اجازت پا کر رخصت ہو گیا۔

اس روز شام کو میں اور نضار جنگی حکمت عملی پر گفتگو کر رہے تھے کہ مجھے شیرویہ کا خیال آیا۔ شیرویہ کا تعلق نضار کے محافظ دستے سے تھا۔ وہ ایک بہادر اور قابل اعتماد نوجوان تھا۔ دشمن کے علاقے سے زندہ بچ کر نکل آنا بھی اس کی بہادری کا ثبوت تھا۔ احزم نے اسے دشمن کے سب سے قریبی علاقے یعنی وادی سبز کی طرف بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور مخبر بھی تھا جو واپس نہیں آ سکا تھا۔ واپس نہ آنے والے دوسرے مخبر کے بارے میں یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ گرفتار ہو گیا یا پھر مارا گیا۔

احزم نے شیرویہ اور دوسرے مخبر کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ دو مختلف راستوں سے وادی سبز میں داخل ہوں۔ اس حکم کا مقصد یہی تھا کہ ان میں سے کسی ایک کو اگر کوئی دشواری پیش آئے یا وہ کسی مصیبت میں پھنس جائے تو دوسرا بچا رہے۔ احزم نے اجلاس کے دوران میں ان تمام باتوں کی وضاحت کر دی تھی۔ شیرویہ کو واپس آئے تیسرا دن تھا، مگر کیونکہ وہ شدید زخمی تھا اس لئے احزم اس سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کر سکا تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ شیرویہ سے تفصیلی گفتگو کے بعد کوئی اور کام کی بات بھی معلوم ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنے اسی خیال کا اظہار اس وقت نضار سے بھی کیا۔ نضار میرے ہی کمرے میں تھا۔

نضار نے میرے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے حویلی کے طبیب کو طلب کر لیا۔ استفسار پر طبیب نے بتایا کہ شیرویہ کی حالت اب خطرے سے باہر ہے مگر اسے مزید علاج اور آرام کی ضرورت ہے۔ گزشتہ دو روز سے اسے ایسی دوائیں دی جا رہی تھیں کہ اس پر غفلت طاری رہے تاکہ زخموں کی تکلیف کم محسوس ہو۔ آج صبح سے یہ دوائیں بند کر دی گئی ہیں۔ دواؤں کے اثر سے نکل کر اسے تکلیف تو ہے مگر یہ تکلیف اب اس کے لئے بڑی حد تک قابل برداشت ہے۔ طبیب نے نضار کے ایما پر تفصیل کے ساتھ شیرویہ کی حالت بیان کر دی۔ نضار نے طبیب کو جانے کا اشارہ کیا۔

طبیب رخصت ہو گیا تو نضار نے مجھے مخاطب کیا۔ "اے آتون! ہم خود اسے چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ اگر وہ اس قابل ہوا کہ بات کی جا سکے تو تیرا منشا پورا ہو جائے گا۔"

حویلی ہی کا ایک حصہ محافظ دستے کی سکونت کے لئے مخصوص تھا۔ نضار کے ساتھ میں وہاں گئی۔ نضار کا اور میرا اس طرف آنا خلاف معمول تھا اس لئے کھلبلی سی مچ گئی۔ محافظ دستے کا نگران ہمارے ساتھ ساتھ ہو لیا تھا۔ نضار نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا تو اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ پہلے اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ عموماً یہی ہوتا تھا کہ سردار کو جس سے ملنا ہوتا اسے طلب کر لیا جاتا۔ حویلی کے اس حصے میں کھلبلی مچ جانے کی وجہ یہی تھی۔ کسی محافظ کی عیادت کے لئے خود سردار کا آنا بھی غیر معمولی بات ہی تھی، مگر نضار سے یہ توقع کی جا سکتی تھی۔ ان پہاڑی بستیوں کے عام سرداروں کی نسبت اپنے ماتحتوں کے ساتھ نضار کا رویہ ذرا مختلف تھا اور اس سے میں بھی آگاہ تھی۔ محافظ دستے کے نگران نے آگے بڑھ کر شیرویہ کو ہماری آمد سے مطلع کر دیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو شیرویہ کی بیوی نے ہمیں تعظیم دی اور ادب سے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ سامنے ہی دیوار کے قریب بچھے ہوئے

بستر پر شیرویہ دراز تھا۔ اس کے ایک بازو، سینے اور سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے کراہتے ہوئے پہلو بدل کر اٹھنا چاہا تو میں بول اٹھی۔ "جس طرح لیٹا ہے یونہی پڑا رہ اے شیرویہ! اس حالت میں تجھ پر ہمیں تعظیم دینا فرض نہیں۔"

پھر میں اور نضار پاس ہی بچھے ہوئے دوسرے بستر پر جا بیٹھے۔ شیرویہ کی عیادت کرتے ہوئے میں نے محسوس کر لیا کہ اس سے پوچھ گچھ ممکن ہے۔

"تجھ پر کیا گزری اے شیرویہ کہ تُو اس حال کو پہنچا؟" میں نے کچھ دیر بعد نرمی سے سوال کیا۔

میرے سوال کے جواب میں شیرویہ ٹھہر ٹھہر کر اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بیان کرنے لگا۔ شیرویہ نے ایک ایسے شخص کا بھیس بھرا تھا جو بستی بستی اپنے کرتب دکھاتے اور روزی کماتے ہیں۔ رات کے وقت وہ سرحدی محافظوں کی نظر میں آئے بغیر ایک پہاڑی درے سے وادی میں داخل ہو گیا۔ یہی اس کی غلطی تھی۔ یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ سرحدی محافظوں کو اطمینان دلائے بغیر، کسی بھی اجنبی کو وادی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ وادی میں اگر کوئی اجنبی نظر آتا تھا تو اس کے متعلق سرحدی محافظوں سے پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ شیرویہ نے رات کا بقیہ حصہ آبادی سے باہر ہی گزارا، پھر صبح کے آثار نمودار ہوتے ہی آبادی میں داخل ہو گیا۔ اس سے یہی سمجھا گیا کہ وہ سرحدی محافظوں کی اجازت ہی سے وہاں آیا ہو گا۔ دن تو خیریت سے گزر گیا مگر شام ہوتے ہوتے وہ بستی کے محافظوں کی نظر میں آ گیا۔ شیرویہ پہلے ہی سے چوکنا تھا۔ جب محافظوں نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے اپنا تعلق ایک خانہ بدوش قبیلے سے بتایا۔ وہ چکرایا اس وقت کہ جب اس سے سرحدی محافظوں کو مطمئن کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا۔ اس کے باوجود شیرویہ نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ صورت حال کا اندازہ لگانے میں اس نے دیر نہیں کی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اب اس کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ کسی طرح وہاں سے جان بچا کر نکل آئے، سو اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ بظاہر انتہائی اطمینان کے ساتھ اس نے کہہ دیا کہ سرحدی محافظوں کی اجازت ہی سے میں وادی میں آیا ہوں۔ ابھی تک محافظوں نے اس پر کسی قسم کے شک و شبہے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ محض تصدیق چاہتے تھے۔ اسی کی خاطر دو محافظ، شیرویہ کے ساتھ ہو لئے۔ ان ہی میں سے ایک نے شیرویہ کو اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا اور اس سرحدی چوکی کی طرف چل دیئے کہ جس کا شیرویہ نے ذکر کیا تھا۔ شیرویہ کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور اسے یہ علم بھی تھا کہ جلد ہی اس کا جھوٹ کھل جائے گا۔ ابھی سرحدی چوکی دور ہی تھی کہ شیرویہ نے جان پر کھیل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آبادی سے اب وہ کافی دور نکل آئے تھے اور سامنے ہی پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ اچانک وہ پیٹ پکڑ کر چیخ اٹھا جیسے شدید درد اٹھا ہو پھر جیسے ہی محافظ نے گھوڑے کی لگام کھینچی، شیرویہ تڑپ کر نیچے گر گیا۔ اب بھی دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے وہ چیخے جا رہا تھا۔ محافظ دھوکہ کھا گئے۔ موقع ملتے ہی شیرویہ نے ایک محافظ پر چھلانگ لگا دی اور اس کی رائفل چھین لی۔ اس سے پہلے کہ دوسرا محافظ، شیرویہ پر گولی چلا دیتا، شیرویہ نے اسے ٹھنڈا کر دیا پھر اس محافظ کو بھی شیرویہ نے گولی مارنے میں دیر نہیں کی جس سے رائفل چھینی تھی۔ گولیاں چلنے کی آوازوں سے سرحدی محافظ چوکنا ہو گئے۔ شیرویہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر

پہاڑوں کی طرف بھاگا' مگر اسے دیکھ لیا گیا کیونکہ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد شیرویہ اور سرحدی محافظوں کے درمیان آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ پھر طویل جدوجہد کے بعد وہ سرحدی محافظوں کو جل دے کر نکلنے میں تو کامیاب ہو گیا مگر شدید زخمی ہونے سے نہ بچ سکا۔ اگر وہ پہاڑوں کے درمیان نہ پہنچ گیا ہوتا تو باآسانی شکار کر لیا جاتا۔ شیرویہ جب وادی سبز سے اپنے فرار کی داستان بیان کر رہا تھا تو میں اور نضار دونوں ہی اس سے سوالات کر رہے تھے۔ ان سوالات کا مقصد صرف یہی تھا کہ کوئی نئی بات معلوم ہو سکے۔

فرار کے لئے شیرویہ نے کیا جدوجہد کی اور کس طرح دشمن کے نرغے سے نکل آیا' اس سے قطع نظر مجھے دوسری باتوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ اس نے وادی سبز میں جو دن گزارا' وہاں کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا؟ میرے ایسے ہی سوالوں کے جواب میں ایک تو شیرویہ نے اجنبی دنیا کے لوگوں کا ذکر کیا' پھر اسی دوران میں اس کی زبان سے ایک ایسی بات نکلی کہ میں اور نضار دونوں ہی چونک اٹھے۔ شیرویہ کی اطلاع کے مطابق ژیان اس روز وادی سبز میں موجود تھا۔ یہی بات میرے لئے انتہائی حیران کن تھی۔ ایک ہی شخص' ایک ہی وقت میں دو جگہ کس طرح موجود ہو سکتا تھا؟

"اے شیرویہ! کیا تُو نے ژیان کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ یہ سوال کرتے ہوئے میں دنوں کا حساب لگا رہی تھی۔

"ہاں اے آتون دیوی! مگر دور سے۔" شیرویہ نے بتایا۔ "وہ اجنبی دنیا کے لوگوں کو ساتھ لئے زیر تعمیر ہونے والی ایک عمارت سے نکل کر اپنی حویلی کی طرف گیا تھا۔ اس کا محافظ دستہ بھی ساتھ ہی تھا۔ میں اس وقت ایک میدان میں کرتب دکھا رہا تھا اور لوگ مجھے گھیرے ہوئے تھے۔"

مختلف سوالات کے نتیجے میں شیرویہ سے جو کچھ معلوم ہوا' اس سے دن کا تعین بھی ہو گیا اور وقت کا بھی۔ یہ اس روز صبح کا ذکر تھا کہ جب ژیان بستی صنعیہ میں تھا۔ میں اور نضار اس وقت بستی صاحی میں تھے۔ سردار صاحی کے مخبر کی اطلاع کے مطابق دوپہر ہوتے ہوتے ژیان اگلی بستی کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ ژیان جب گزشتہ روز شام سے پہلے بستی صنعیہ پہنچ گیا تھا اور پھر وہاں اگلے روز دوپہر تک رہا تھا تو وہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ وادی سبز میں بھی موجود ہوتا؟ اسی سوال نے مجھے اور نضار کو چکرا دیا تھا۔ شیرویہ کے لئے جو بات غیر اہم تھی' میرے اور نضار کے لئے وہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔

شیرویہ کے پاس سے اٹھ کر آنے کے بعد نضار مجھے اپنے ساتھ لئے حویلی کے باغ کی طرف آ گیا۔ اس کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

"دنوں کے شمار میں یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے۔" نضار باغ میں میرے ساتھ ایک جگہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے نضار! شیرویہ جس دن وادی سبز پہنچا' اس سے ایک روز پہلے ہی ژیان' مغربی بستیوں کے دورے پر نکل چکا تھا۔ اگر یہ بات بھی مان لی جائے کہ ژیان اگلی بستی کی بجائے وادی سبز ہی لوٹ گیا ہو گا' تو بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ شیرویہ کو نظر آ جاتا۔ ایسا ہی ہے تو پھر دوبارہ دنوں کا

شمار کئے لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

کئی بار دنوں کا حساب لگانے کے باوجود ہم دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچتے رہے اور یہ نتیجہ ہمارے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کے لئے ہم گزشتہ واقعات پر گفتگو کرنے لگے۔ نضار بولا۔ "یوں سمجھ اے آتون کہ جب کل ہم یہاں پہنچے تو شیرویہ کو آئے تیسرا دن تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک روز پہلے وہ وادی سبز میں ہو گا۔ وہ دن اس نے وادی سبز میں گزارا۔ ہم اس روز بستی صاحی میں تھے۔ اس کے بعد جو رات اس نے مسلح سرحدی محافظوں سے نبرد آزمائی میں گزاری' ہماری وہ رات بھی بستی صاحی میں گزری۔ ٹھیک ہے نا اے آتون!"

"اور پھر اگلے دن ہم بستی صنعیہ پہنچ گئے۔" میں نے بات آگے بڑھائی۔ "شیرویہ اس روز یہاں واپس آ چکا تھا۔ اب اے نضار! باقی دو دن رہ جاتے ہیں۔ رات کو لعنتی زعیم کو اس کے انجام تک پہنچا کر بستی صنعیہ میں ہم کچھ دیر ٹھہرے اور اسی روز شام تک بستی صاحی پہنچ گئے۔ سو ایک دن یوں ہمیں سفر میں گزرا۔ اگلے ہی روز ہم اپنی بستی کے لئے چل دیئے اور یہاں آ کر ہی ہمیں شیرویہ کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس طرح دوسرا دن گزر گیا۔ اب تو مجھے یہ بتا اے نضار کہ دنوں کے حساب میں ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے؟"

کچھ دیر تک نضار چپ رہا' پھر کہنے لگا۔ "یوں تو اے آتون! صرف ایک ہی امکان باقی رہ جاتا ہے کہ شیرویہ نے جس شخص کو اجنبی سرزمین والوں کے ساتھ دیکھا' وہ ژیان نہیں کوئی اور ہو گا۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔"

معاً مجھے ژیان کے چھوٹے بھائی شامان کا خیال آ گیا جسے میں نے بچپن میں ہی دیکھا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں اپنے بڑے بھائی ژیان جیسا ہی تھا۔ اس زمانے میں شامان کو کوئی خاص حیثیت حاصل نہیں تھی۔ ژیان اسے ناپسند کرتا تھا۔ ناپسندیدگی کی وجہ اب میرے ذہن میں نہیں تھی۔ ہاں اتنا ضرور یاد تھا کہ اپنے قتل سے چند روز پہلے میرے بابا سردار اشم نے ژیان کے بھائی شامان کو فوج میں کوئی عہدہ دینے کے لئے کہا تھا۔ ژیان میرے بابا کی طلبی پر حویلی میں آیا تھا۔ میں اس وقت اپنے بابا کی گود میں بیٹھی تھی۔ بابا کی بات پر ژیان نے کہا تھا کہ میرا بھائی اس قابل نہیں' پھر بھی اگر سردار کا حکم ہے تو اس کی تعمیل ہو گی۔ بابا نے اپنے نائب ژیان کو صرف مشورے کے لئے طلب کیا تھا' سو بولا کہ یہ میرا حکم نہیں مشورہ تھا۔ تو اگر شامان کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تو رہنے دے۔

"تُو کیا سوچنے لگی اے آتون!" نضار نے مجھے ٹوکا تو میں چونک اٹھی۔

"اے نضار! شاید .... شاید میں نے حقیقت جان لی ہے۔" میں پرجوش آواز میں بولی۔ "وہ .... وہ جسے شیرویہ نے دیکھا' شامان ہو گا۔" پھر میں نے نضار کو شامان کے بارے میں بتایا۔ "کیا خبر ژیان نے اسے اپنا نائب بنا لیا ہو۔"

"ہماری مشکل یہ ہے اے آتون کہ وادی سبز کی حیثیت ہمارے لئے ایک ایسی دنیا کی سی ہے جس کے اندر کا حال ہم نہیں جانتے۔ شیرویہ کے سوا ہمارا کوئی مخبر وادی سبز میں داخل نہیں ہو سکا۔ پھر یہ کہ

اب تک ہم دشمن کے جن علاقوں میں بھی گئے' کہیں بھی کسی سے شامان کا ذکر نہیں سنا۔"

"مگر اے نصار! ہم نے بھی تو ژیان کے سوا کسی اور کے بارے میں بات نہیں کی۔ صرف سرراہ صنعیہ سے وادی سبز کے بارے میں ہمیں چند باتیں کرنے کا موقع مل سکا۔ حالات ہی کچھ اس طرح پیش آئے کہ ہم دونوں باہر کہیں سکون سے نہیں بیٹھ سکے۔ اس کے علاوہ یہ بھی اے نصار کہ ہمارے سفر کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔ ہماری اصل توجہ کا مرکز ساحر زعیم تھا' ژیان یا وادی سبز نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ژیان نے وقتی طور پر اپنے بھائی شامان کو نائب مقرر کر دیا ہو یا پھر اسے اجنبی سرزمین کے لوگوں کی خاطر مدارت کا فرض سونپ دیا ہو۔" میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"لیکن شیرویہ کا بیان تو یہ ہے کہ ژیان کا محافظ دستہ بھی اس شخص .... یعنی شامان کے ساتھ تھا۔" نصار بولا۔ "ژیان کا محافظ دستہ تو اس کے ساتھ بستی صنعیہ میں ہونا چاہئے تھا۔ کیا یہ بات غور کے قابل نہیں اے آتون!"

"یہ نہ بھول اے نصار کہ شیرویہ نے ان لوگوں کو دور سے دیکھا تھا۔ ضروری نہیں کہ وہ ژیان کا محافظ دستہ ہو' ممکن ہے اجنبی دنیا کے لوگوں کی خاطر ژیان نے کچھ محافظوں کو مخصوص کر دیا ہو اور وہ اس وقت کے ان کے ساتھ ہوں۔"

میری بات سن کر نصار کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا' اس نے کہا۔ "تیرا اندازہ درست ہی لگتا ہے' اے آتون! جو بات ممکن ہی نہیں اس پر ہمیں اب زیادہ سوچ بچار نہیں کرنا چاہئے۔ وہ شخص کہ جس پر شیرویہ کو ژیان کا گمان ہوا' شامان ہی ہو گا۔"

"یوں اور اے نصار کہ شیرویہ کسی سے اپنے خیال کی تصدیق بھی نہیں کر سکا ہو گا۔" میں نے یہ کہہ کر بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔ "ادل اور احزم اپنے ساتھ جو فوج لے کر آ رہے ہیں' اسے اس بستی کی بجائے ان پہاڑی سلسلوں میں کیوں نہ ٹھہرایا جائے کہ جہاں کبیت والوں کو آباد کیا گیا ہے؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا اے آتون کہ وادی سبز پر حملہ کرنے سے پہلے ان کی فوج وہیں رکے۔ وہیں تمام افواج کی ترتیب و تنظیم کی جائے۔ تیرے ساتھ جو فوج بستی تریال سے آئی ہے اور جو اس وقت بستی کے باہر پڑی ہے' اسے بھی اور اس بستی میں موجود بقیہ سپاہ کو بھی ان ہی پہاڑوں میں بھیج دیا جائے۔ فوجوں کو نقل و حرکت میں دیر لگتی ہے' یہ تجھے بھی معلوم ہے اس لئے میرا اندازہ ہے کہ ادل اور احزم کو یہاں پہنچنے میں دو تین دن تو لگ جائیں گے۔ جب وہ دونوں آ جائیں گے تب ہی یہ قدم اٹھانا ہمارے لئے مناسب ہو گا۔" نصار نے میری بات کی تائید میں کہا۔

شام اب ڈھل رہی تھی اور دھیرے دھیرے اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہم دونوں باغ سے اٹھ کر چلے آئے۔

☆======☆======☆

اگلے روز صبح ہی فوج کو نشانے بازی کی مشق کا حکم جاری کر دیا گیا۔ میرے ساتھ جو فوج تریال سے آئی تھی اور نصار کی فوج پہاڑی درے سے نکل کر دور تک پھیلے ہوئے کھلے میدان میں پہنچ گئی۔ نشانے

بازی کا آغاز میں نے پہلے گولی چلا کر کیا۔ نصار اور احرس دونوں ہی اس وقت میرے ساتھ تھے۔ میرے بعد نصار اور پھر احرس نے اپنے اپنے ہدف کو نشانہ بنایا۔ فوج کے سالاروں کو ضروری ہدایات دے کر ہم بستی میں لوٹ آئے۔ اسی دن تیسرے پہر نصار نے سپاہ کو صف بندی کی تربیت دی۔ فوج کے کسی حصے پر اچانک دشمن کا حملہ ہونے کی صورت میں وقتی طور پر کس طرح پسپا ہو کر پھر پلٹنا ہے' کیسے دشمن کی یلغار کو روکنا ہے' کب موقع ملتے ہی دشمن پر ٹوٹ پڑنا ہے' نصار دیر تک سالاروں کو یہ ساری باتیں سمجھاتا رہا۔ مجھے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ نصار ایک بہترین سپہ سالار ہے۔ احرس بھی اس کی صلاحیتوں سے متاثر نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے صبح اور پھر سہ پہر کو دانستہ اپنے ساتھ رکھا تھا۔

جب ہم واپس حویلی پہنچے تو احرس کہنے لگا۔ "اے آتون! تُو کچھ نہیں بولی۔" وہ ساتھ ساتھ میرے کمرے میں آ گیا تھا۔ نصار پہلے ہی اپنے کمرے کا رخ کر چکا تھا۔ احرس اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ تجھے بھی اتنے عرصے نصار کے ساتھ رہ کر کچھ جنگی.........."

"بس رہنے دے یہ باتیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "جس کا جو کام ہے' اسی کو بھلا لگتا ہے۔" میں سمجھ گئی کہ وہ شرارت پر آمادہ ہے۔

"مگر تجھے بھی تو کچھ بُرا بھلا لگتا ہی ہو گا .... اچھا چھوڑ' یہ بتا دے کہ تجھے کون زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے؟"

"اتر آیا تُو پھر فضول باتوں پر۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ "جا کے آرام کر اپنے کمرے میں اور مجھے بھی لیٹنے دے۔"

"تو لیٹ جا' میں کب منع کر رہا ہوں۔ لیٹی ہوئی تُو اور بھی اچھی لگتی ہے۔" احرس نشیلی سی آواز میں بولا۔ "معلوم نہیں کچھ کہ تُو کب وادی سبز کے بوڑھے گدھ ژیان کی گردن پر چھری پھیرے گی اور کب میرے دل کی کلی کھلے گی۔ اس سے پہلے تو ذرا مشکل ہی لگتا ہے کہ تُو.........."

اس سے پہلے کہ احرس کی بات پوری ہوتی' میں نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور بولی۔ "بکے جا' میں کچھ سن ہی نہیں رہی۔"

پھر بڑی مشکل ہی سے وہ ٹلا اور میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے لیٹ گئی۔ نہ جانے اس وقت مجھے کیوں کچھ بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود میں آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ میں نے اسی لئے احرس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لی تھی۔

مجھے بستر پر دراز ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک خادم نے مجھے نصار کا پیغام دیا۔ خادم نے اطلاع دی تھی کہ نصار اس وقت اجلاس والے کمرے میں ہے اور وہیں مجھے بلوایا ہے۔

میں اجلاس والے کمرے میں پہنچی تو وہاں نصار تنہا نہیں تھا۔ اس کے سامنے ایک محافظ کچھ فاصلے پر مؤدب کھڑا تھا۔ محافظ کے گرد آلود کپڑوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کہیں دور سے سفر کرتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔

"اے آتون! یہ ہماری ایک ایسی سرحدی چوکی کا محافظ ہے کہ جو وادی سبز کے گرداگرد موجود پہاڑوں سے زیادہ دور نہیں۔" نضار نے مجھے مخاطب کیا۔ میں اس دوران میں چلتی ہوئی نضار کی چوکی کے قریب پہنچ گئی۔ نضار نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بتایا۔ "اس نے خبر دی ہے کہ پہاڑوں کے اردگرد دشمن افواج کی غیر معمولی نقل و حرکت محسوس کی گئی ہے۔"

میں نضار کے قریب ہی چوکی پر بیٹھ گئی۔ اب مجھے اپنی بے چینی کا سبب معلوم ہو گیا تھا۔

محافظ سے مزید سوالات کے دوران میں یہ بھی معلوم ہوا کہ دشمن افواج کا رخ اپنے ہی زیر نگیں علاقے کی طرف ہے۔ نضار نے دشمن افواج پر نظر رکھنے کی ہدایت دے کر محافظ کو رخصت کر دیا۔ اگر دشمن کی فوج کا رخ ہمارے علاقے کی طرف ہوتا تو یقیناً یہ خطرے کی بات تھی' اس کے باوجود میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ میں نے نضار کو بھی اپنے احساس سے بے خبر نہیں رکھا۔

"کیا خبر اے آتون کہ دشمن بھی ہماری ہی طرح اپنی افواج کو کہیں یکجا کرنا چاہتا ہو۔" جواب میں نضار بولا۔

"پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا اے نضار کہ وہ بھی جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"ہاں اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا اے آتون!" نضار نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اسے بھی تو ہماری طرف سے خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"یوں تو یہ وقت اس پر حملہ کرنے کے لئے مناسب نہ ہوا۔ ہم نے تو سوچا تھا اے نضار کہ غفلت میں اسے شکار کریں۔"

"دیکھتے ہیں اے آتون کہ حالات کیا نیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ ان ہی حالات کے مطابق ہم کوئی قدم اٹھائیں گے۔ اپنی قوت کو یکجا کرنا بہرحال ہمارے لئے ضروری ہے' سو ہم یہ کر رہے ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہم فوری طور پر حملہ نہ کریں۔ خبر رساں سرحدی محافظ نے دشمن افواج کی نقل و حرکت کا جو رخ بیان کیا ہے' اس سے ایک ہی اندازہ ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ دشمن کی منزل قلاوز کی بستی ہے۔"

"اور ہم نے بھی اسی سمت سے دشمن پر حملے کا فیصلہ کیا تھا اے نضار!" میں نے یاددہانی کرائی۔

"حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اپنی جنگی حکمت عملی تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔" نضار نے جواب دیا۔

"ہاں اب مجھے اندازہ ہو چکا ہے اے نضار کہ جنگ میں پہلے سے کچھ بھی طے شدہ نہیں ہوتا' عین وقت پر بھی فیصلے بدلنا پڑتے ہیں۔" میں تائید میں بولی۔

"قلاوز کی طرف پیش قدمی کے علاوہ ہمارے لئے دوسرا راستہ بھی ہے۔ دشمن اپنی افواج کو مشرق میں یکجا کرلے اور ہم اسے ایک طرف چھوڑ کر وادی سبز پر عقب سے حملہ کر دیں۔ میری مراد مغرب کی سمت سے ہے۔ ہم خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے سردار صاحی اور سردار صنعیہ سے جا ملیں۔ ایسی صورت میں دشمن کو قلاوز کی بستی سے پلٹنے میں خاصا وقت لگ جائے گا۔ ہمارے مقابلے پر صرف دو

چھوٹے قبیلے ہوں گے۔ انہیں ہتھیار ڈالنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ پھر وادی سبز پر قبضہ کر لینا ہمارے لئے دشوار نہیں ہوگا۔" نضار نے تجویز پیش کی۔

"تیرا کہنا ٹھیک ہے اے نضار! یہ بھی ممکن ہے۔ مگر میں کچھ اور ہی سوچ رہی ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دشمن کو کسی طرح ہمارے ارادوں کا پتہ چل گیا ہو۔"

"اے آتون! ایسا بظاہر ممکن تو نہیں' پھر بھی ہم آئندہ کے لئے کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں۔ دشمن کی طرح ہم بھی اپنے علاقوں میں اجنبیوں کے داخلے پر پابندی لگا سکتے ہیں۔ تو فکرمند نہ ہو اے آتون کہ دیوتا ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔" نضار نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

پھر جب میں نضار کے پاس سے اٹھی تو وقتی طور پر میری بے چینی میں کمی آ چکی تھی۔

آئندہ روز سے ادل اور احزم کی فوجوں کا انتظار شروع ہو گیا۔ وہ سارا دن بڑی مصروفیت میں گزرا۔ نضار نے مختلف احکام جاری کئے جن کا تعلق ایسی احتیاطی تدابیر سے تھا کہ دشمن کو کسی بھی طرح ہمارے آئندہ اقدامات کی خبر نہ ہو سکے۔ یہ امکان بہرحال تھا کہ دشمن کے مخبر ہمارے علاقے میں موجود ہوں۔ میں اور نضار' کبیت والوں کی طرف بھی گئے۔ بریسا کو نئی صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا۔

دن بھر کی تھکن سمیٹ کر جب میں رات کو بستر پر دراز ہوئی تو خاصی حد تک مطمئن تھی۔ دھیرے دھیرے میرے ذہن پر غنودگی طاری ہوتی جا رہی تھی کہ مجھے اچانک اپنے جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا کہ میری سماعت کا دائرہ ایک دم بہت وسیع ہو گیا ہے۔ میں بہت دور دور کی آوازیں سن سکتی ہوں پھر میں نے جو کچھ سنا' اسے سن کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف سے مجھے "یلغار یلغار" کا شور سنائی دے رہا تھا پھر بند آنکھوں ہی سے میں نے میدان جنگ کا منظر دیکھا۔ یہ وہی میدان تھا کہ جہاں میری اور نضار کی فوجیں آج دن بھر جنگی مشقیں کرتی رہی تھیں۔ یہ شور کم ہوتے ہوتے ابھی ختم ہوا تھا کہ میری سماعت میں پُراسرار سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ "اے معبلہ! تو نے جو کچھ سنا اور دیکھا وہی آئندہ پیش آنے والا ہے۔ مینار والے پہاڑ پر تجھے اور نضار کو اسی لئے بستی اشر پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ سو تجھ پر اب یہ مصلحت کھل گئی اور سن کہ جو دیوتاؤں کے چہیتے ہوتے ہیں' انہیں آزمائشوں میں بھی ڈالا جاتا ہے۔ تیرے لئے یہ گھڑی آ پہنچی ہے۔ ادل اور احزم کی فوجوں کا انتظار نہ کر کہ تیرے دشمن نے انہیں وہیں الجھا لیا ہے۔ تیرے عیار دشمن نے بیک وقت کئی محاذ جنگ کھول دیئے ہیں کہ جن کی خبر تجھے مل جائے گی۔ وہ خود وادی سبز میں بیٹھا چالیں چل رہا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کی چالیں اسی پر الٹ دی جائیں گی۔ یوں اس نے تیری قوت کو یکجا ہونے سے روکنے کے لئے اپنی طاقت کو بھی تقسیم کر لیا۔ اس کا اصل ہدف نضار کی یہی آبائی بستی ہے۔ یہیں اس نے اپنا سارا زور لگا دیا ہے۔ ابھی تک وہ نضار ہی کو اپنا مدمقابل جان رہا ہے اور تیری حقیقت سے بے خبر ہے۔ اٹھ اے معبلہ کہ یہ آرام کا وقت نہیں۔"

سرگوشیاں معدوم ہوتے ہی میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مینار والے پہاڑ پر میں نے اور نضار نے جو سرگوشیاں سنی تھیں' انہیں سمجھنے میں ہم سے یقیناً غلطی ہوئی تھی' دشمن کو اپنی طرف سے غافل سمجھنے

کی غلطی۔ ژیان کے دوروں کا مقصد بھی اب مجھ پر واضح ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ارادوں کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ بڑی خاموشی اور رازداری کے ساتھ اپنی قوت کا اندازہ لگاتا رہا۔ اس نے وقت سے پہلے شاید اپنے کسی نائب کو بھی اس راز میں شریک نہیں کیا ورنہ سردار صنعیہ ہمیں متوقع بڑے حملے سے بے خبر نہ رکھتا۔

پُراسرار سرگوشیاں کا ایک ایک لفظ اب تک میری سماعت میں گونج رہا تھا۔ مجھے اسی لئے فوری طور پر اپنے حواس پر قابو پانے میں ذرا دیر لگی پھر میں ایک جوش کے عالم میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ رات ابھی اپنے پہلے پہر ہی میں داخل ہوئی تھی۔ حویلی پر ابھی سناٹا طاری نہیں ہوا تھا۔

اپنے کمرے سے نکل کر میں نے حویلی کے اندر پہریدار محافظوں کو چاق و چوبند پایا۔ میں جلد از جلد نصار کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ مجھ سے رخصت ہو کر وہ اپنے کمرے ہی کی طرف گیا تھا۔ تیز قدمی سے چلتی ہوئی میں وہاں پہنچ گئی۔ اس کے کمرے کا دروازہ مجھے کھلا ہوا ہی ملا۔ وہ شاید ابھی سونے کے لئے نہیں لیٹا تھا۔

"اے آتون تُو!" وہ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر حیرت سے بولا۔ "تُو سوئی نہیں ابھی؟"

"سونے کا وقت گزر چکا اے نصار! اب تو جاگنے کا وقت ہے۔" میں نے مزید آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"تُو بیٹھ تو سہی اور بتا کہ اتنی فکرمند کیوں ہے؟" نصار میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

میں سمجھ گئی کہ سرگوشیاں صرف مجھ ہی کو سنائی دی ہیں۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اے نصار! ہم حالت جنگ میں ہیں۔ ہمارے لئے آزمائش کی گھڑی آ چکی ہے۔ ہمارا دشمن کسی بھی وقت اپنی پوری قوت کے ساتھ ہم پر حملہ کرنے والا ہے۔ اب.........."

"پھر .... پھر تو اے آتون! میرے دونوں نائبوں ادل اور احزم نے یہاں پہنچنے میں دیر کر دی۔" نصار بولا۔ "انہیں آج رات تک پہنچ جانا چاہئے تھا۔"

"وہ اب نہیں آ سکیں گے۔ اپنے اپنے علاقوں میں وہ بھی دشمن سے برسرپیکار ہیں۔"

"تُو نے .... تُو نے .... اے آتون! یقیناً پُراسرار سرگوشیاں سنی ہیں۔" نصار نے ایک دم چونک کر کہا جیسے اب تک بے دھیانی میں بات کرتا رہا ہو۔ "مجھے بتا کہ تجھ سے کیا کہا گیا ہے؟ کیا بتایا گیا ہے؟" اس کے لہجے سے بے چینی ظاہر تھی۔

"ہاں اے نصار! سرگوشیاں سن کر ہی تو میں تیری طرف آئی ہوں۔" ابھی میں اتنا ہی کہہ پائی تھی اور نصار کو سرگوشیوں کے بارے میں بتانے والی تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ گونجی۔ جیسے کوئی تیز تیز چلتا اسی طرف آ رہا ہو۔ میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

آنے والا محافظ دستے کا نگران تھا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی کہا۔ "اے سردار! تیرے نائب ادل کا قاصد کوئی ضروری پیغام لایا ہے اور اسی وقت تجھ سے ملنا.........."

نصار اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "جا اور اسے یہیں لے آ۔" حکم سن کر محافظ دستے کا نگران الٹے قدموں لوٹ گیا تو نصار میری طرف مڑا۔ "یہی لگتا ہے اے آتون کہ ادل کا قاصد پہلے ہی کی خبر لایا ہو گا۔"

جب تک قاصد آتا' میں نے جلدی جلدی نصار کو پُراسرار سرگوشیوں سے آگاہ کر دیا۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ کسی اور شخص کی موجودگی میں سرگوشیوں کا ذکر ممکن نہیں تھا۔ اس کے لئے خلوت لازمی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا' اس کا علم نصار کو بھی ہو جاتا تو ہم بہتر لائحہ عمل مرتب کر سکتے تھے۔ ہنگامی صورت حال میں پُرسکون ذہن کے ساتھ تیزی سے سوچنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی پر کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہوتا ہے۔ میں نے اسی لئے اپنے جوش پر جلد ہی قابو پا لیا۔ اس وقت جوش کے ساتھ ہوش کی بھی ضرورت تھی۔ اس معاملے میں نصار مجھ سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ اب اس کے چہرے سے ہیجانی کیفیت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے تو ابھی صرف چند ہی جنگوں میں حصہ لیا تھا اور کم ہی ایسے مواقع سے گزری تھی' مگر نصار متعدد بار ایسے حالات سے گزر چکا تھا۔

ادل کے قاصد کی آمد سے پہلے نصار نے اپنے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ محافظ دستے کا نگران جلد اسے اپنے ساتھ لے کر لوٹ آیا تھا۔

قاصد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے اور نصار کو گھٹنوں کے بل جھک کر تعظیم دی۔ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ مجھے زیادہ بدحواس یا گھبرایا ہوا دکھائی نہ دیا۔ اس نے نصار کو مخاطب کیا۔ "اے سردار! کل سہ پہر کہ جب تیرا نائب ادل فوج کو کوچ کا حکم دے چکا تھا' دشمن نے اچانک حملہ کر دیا۔ ابتدا میں دشمن کا پلہ بھاری رہا لیکن اندھیرا پھیلتے پھیلتے صورت حال بدلنے لگی۔ رات کو جنگ میں شدت باقی نہ رہی' مگر صبح کے آثار نمودار ہوتے ہی دشمن کو رگید دیا گیا۔ ایسی ہی خبریں تیرے دوسرے نائب احزم کی طرف سے بھی ملیں۔ ایک ہی وقت میں تیرے دونوں نائبوں کی بستیوں پر دشمن نے حملہ کیا تھا۔ سو یوں احزم نصف پہر کے فاصلے پر موجود ہو کر بھی ادل کی مدد کو نہ آ سکا۔ میں جب چلا تو دشمن دونوں محاذوں پر پسپا ہو کر پیچھے ہٹ رہا تھا۔ تیرے دونوں نائب حکم کے منتظر ہیں۔ بول کہ ان کے لئے تیرا کیا حکم ہے؟ دشمن کو شکست فاش دے کر وہ وہیں رکیں یا کہ تیری طرف کوچ کر دیں؟"

"ادل اور احزم دونوں کے لئے یہی حکم ہے کہ ابھی وہیں ٹھہریں۔" پیغام سن کر نصار پُرسکون آواز میں بولا۔ "کوچ کرنے کی صورت میں عیار دشمن سنبھلنے کے بعد پلٹ کر دوبارہ بھی دونوں بستیوں پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ انہیں اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں۔" پھر نصار نے قاصد کو اس سے بھی آگاہ کر دیا کہ دشمن نے اپنی طاقت کو تقسیم کر کے بیک وقت کئی محاذ کھول دیئے ہیں اور ممکن ہے وہ بستی اشر پر بھی حملہ کر دے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے نصار نے مزید کہا۔ "ان دونوں کو تاکید ہے کہ وہ آئندہ میرا حکم ملنے سے پہلے اپنی جگہ ڈٹے رہیں اور سن کہ اگر تُو دوبارہ سفر کے قابل نہ ہو تو بتا دے۔ میں تیری جگہ کسی اور تازہ دم قاصد کو اپنا حکم دے کر ان دونوں کی طرف بھیج سکتا ہوں۔"

"نہیں اے سردار! کچھ آرام کر کے میں پھر سفر کر سکتا ہوں۔" قاصد نے پُراعتماد آواز میں جواب

دیا۔

"تو پھر جا.......... آرام کر اور پھر جتنی جلد ممکن ہو اس علاقے سے نکل جا۔" نضار نے ہاتھ اٹھا کر قاصد کو جانے کا اشارہ کیا۔

قاصد تعظیماً جھکا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔ محافظ دستے کا نگران کمرے کے باہر موجود تھا' وہ قاصد کے ساتھ ہو لیا۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد جیسے ساری حویلی جاگ اٹھی۔ اس سے پہلے نضار مجھے ضروری آئندہ اقدامات کے بارے میں بتا چکا تھا۔ ایک قاصد کو بریسا کی طرف دوڑا دیا گیا کہ وہ جلد اسے اپنے ساتھ لے کر لوٹے۔ اسی کے ساتھ نضار نے شمال میں دونوں شمالی قبیلوں کے سرداروں کو بھی پیغام بھجوا دیا۔ یکے بعد دیگرے تیزی کے ساتھ ضروری اقدامات پر عمل کیا جا رہا تھا۔ نصف شب سے پہلے ہی بستی اشر میں صرف وہی مرد رہ گئے جنہیں جنگ میں حصہ لینا تھا اور لڑنے کے قابل تھے۔ بستی کے بوڑھوں' بچوں اور عورتوں کو پہاڑی سلسلوں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ بستی خالی ہو گئی۔

آدھی رات کے قریب حویلی میں فوج کے سالاروں کا اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس میں کبیت والوں کا سردار بریسا' شمالی قبیلوں کے دونوں سردار اور تمام ہی اہم افراد شامل تھے۔ مہا پجاری' احرس اور میں نے بھی اس اہم اجلاس میں شرکت کی۔ احرس اس وقت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

اب تک جن اقدامات پر عمل کیا گیا تھا' ان سے یقیناً سبھی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ فوری طور پر کوئی خطرہ درپیش ہے۔ یہ سب کسی ممکنہ جنگ کی تیاریاں ہیں۔ اس کے باوجود صورت حال کی وضاحت ضروری تھی جس سے اب تک صرف چند ہی افراد واقف تھے۔ اسی کے ساتھ دفاعی جنگ کی حکمت عملی کا اظہار بھی ضروری تھا۔ نضار نے بات شروع کی تو سب ہی اس کی بات غور سے سننے لگے۔

"خبر ملی ہے کہ دشمن بہت جلد اپنی پوری قوت کے ساتھ ہم پر حملہ کرنے والا ہے۔" نضار مختصر الفاظ میں بولا پھر اس نے اپنے نائبوں ادل اور احزم کی بستیوں پر دشمن کے حملوں کا ذکر کیا۔ اسی وقت پہلی بار مجھے یہ بات یاد آئی کہ گزشتہ روز سہ پہر ہی کو میں نے بے چینی محسوس کی تھی۔ غالباً یہ وہی وقت تھا کہ جب دشمن نے حملوں کا آغاز کیا ہو گا۔ ہنگامی حالت کی وضاحت کے بعد نضار نے مجموعی سپاہ کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا۔

بریسا اور شمالی قبیلوں کے سرداروں کو اپنی سپاہ کے ساتھ میدان جنگ کی بائیں سمت رہنا تھا۔ تریال سے جو فوج میں اپنے ساتھ لائی تھی' اسے میری کمان میں دائیں جانب مورچہ سنبھالنا تھا۔ نضار وسط میں رہ کر دشمن کی پہلی یلغار روکنا چاہتا تھا۔ دائیں اور بائیں موجود سپاہ کو اسی وقت جنگ میں حصہ لینا تھا کہ جب نضار پر دشمن کا دباؤ بڑھ جاتا یا اس کی فوج پسپا ہونے لگتی۔

اجلاس زیادہ دیر جاری نہیں رہا اس لئے کہ دشمن کی طرف سے شب خون مارے جانے کا خطرہ بھی تھا۔

بریسا کے قبیلے والوں میں سے بمشکل ایک چوتھائی افراد جدید ہتھیار چلانے کے قابل تھے۔ انہیں

شمالی قبیلوں کے ساتھ آگے رکھنے کا فیصلہ ہوا تھا' بقیہ کو عقب میں رہنا تھا۔ ہتھیار کبھی حوصلوں کا نعم البدل نہیں ہوتے' اجلاس کے دوران میں اس کا اندازہ مجھے بریسا کی گفتگو سے ہو گیا تھا۔ اس نے صرف چند ہی جملے کہے تھے مگر ان ہی سے اس کے جذبات کی عکاسی ہو گئی تھی۔ تریال والوں کی طرح کبیت والوں کے نزدیک بھی میری حیثیت ایک دیوی ہی کی تھی۔ انہیں میں نے بہرحال ایک ظالم کے ظلم سے نجات دلائی تھی اور ان کے پورے قبیلے کو یہاں لا کر آباد کیا تھا۔ وہ میری پُراسرار قوتوں پر اسی طرح یقین رکھتے تھے جس طرح اپنے دیوتاؤں پر انہیں اعتماد اور بھروسہ تھا۔ تریال والوں کے مانند وہ بھی میرے جاں نثار تھے۔ میرے لئے کٹ مرنے کو وہ دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے۔

کبیت والوں کے علاوہ بستی اشر کے شمال میں آباد دونوں قبیلوں کے سرداروں کی حیثیت بھی اب نضار کے نائبوں کی تھی۔ نضار نے انہیں ایک بار مغلوب کر کے زندہ چھوڑ دیا تھا اور وہ یہ احسان نہیں بھولے تھے۔ نضار کے سامنے انہیں پابہ زنجیر پیش کیا گیا تھا۔ اپنی جاں بخشی کے بعد انہیں ہرگز یہ توقع نہیں رہی ہو گی کہ ان کے منصب بھی بحال کر دیئے جائیں گے۔ پہلے اس علاقے میں وہ ثیان کے نائب تھے۔ جنگ ہار جانے کے بعد انہیں جان ہار جانے کا بھی یقین تھا کہ دشمن اسی سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔ نہ صرف ان کے سرداروں کو تہ تیغ کر دیا جاتا ہے بلکہ ان کی بستیاں اجاڑ دی جاتی ہیں۔ جو فاتح ہوتا ہے اپنے پیچھے جلتی ہوئی بستیوں کا دھواں اور لاشیں چھوڑ جاتا ہے۔ بوڑھوں اور بچوں پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔ ہاں اگر زندہ بچ جاتی ہیں تو جوان اور خوبصورت عورتیں جنہیں فاتح سپاہی مال غنیمت جان کر آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ وہ کہ جن کے مرد مارے جا چکے ہوتے ہیں' انہیں بین کرنے اور سوگ منانے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ انہیں بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ہانک کر لے جایا جاتا ہے پھر وہ انہی کے پہلو آباد کرنے کے لئے مجبور کر دی جاتی ہیں کہ جن سے انہیں شدید نفرت ہوتی ہے' وہ جو ان کے بچوں اور مردوں کے قاتل ہوتے ہیں۔ ان روایات اور ایسے حالات میں اگر کسی فاتح کا رویہ قطعی برعکس ہو تو وہ لوگوں کو ان کے اندر سے بھی فتح کر لیتا ہے اور اصل فتح تو یہی فتح ہے .... سو نضار نے بھی ایسی ہی فتح حاصل کی تھی۔ شمالی قبیلوں والے اس پر جان قربان کر دیتے مگر ان کے قدم پیچھے نہ ہٹتے۔ دونوں قبیلے نضار کا پیغام ملتے ہی اپنے لڑاکا جوانوں کو لے کر پہنچ گئے تھے۔

جنگ اور اس کے نتیجے میں ہونے والی بھیانک تباہی کو میں نے ذہنی طور پر کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ "مال غنیمت" کے طور پر عورتوں کے ساتھ ہونے والا سلوک مجھے غیرانسانی معلوم ہوتا تھا۔ میں جو ان ہی قبیلوں کے درمیان پلی بڑھی تھی' ایسی وحشیانہ رسوم و روایات سے نفرت محسوس کرتی تھی۔ معصوم بچوں' بوڑھوں' کمزوروں اور عورتوں کے بارے میں شاید میں زیادہ ہی حساس تھی۔ غالباً اسی احساس کا ردعمل تھا کہ مجھے ظلم کے خلاف مجسم قہر بنتے ہوئے دیر نہیں لگتی تھی۔ وہ بھی ایسا ہی وقت تھا کہ جب ایک ظالم انسانی بستیاں اجاڑنے کے درپے ہو گیا تھا۔

حویلی رفتہ رفتہ خالی ہوتی جا رہی تھی۔ وہاں صرف چند مسلح محافظوں اور خادموں کو چھوڑا جانا تھا۔ خادماؤں کو بھی میرے ایما پر پہاڑی سلسلوں کی طرف بھیج دیا گیا تھا۔ پوری بستی میں میرے سوا کوئی

عورت نہیں تھی۔

میری اب بھی یہ خواہش تھی کہ مہا پجاری پہاڑی سلسلوں کی طرف چلا جائے۔ ایک تو یہ کہ وہ طویل علالت کے بعد اٹھا تھا' دوسرے ضعیف بھی ہو چکا تھا۔ اجلاس میں شرکت سے پہلے بھی اس سے میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا' مگر وہ نہیں مانا تھا۔ محاذ جنگ کی طرف روانگی سے قبل احرس کو اعتماد میں لے کر میں نے ایک بار پھر یہی بات چھیڑ دی۔

"اے میری بچی! کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں اپنی ساری زندگی کی کمائی گنوا دوں؟ .... تجھے دشمن کے مقابلے پر تنہا جانے دوں؟" مہا پجاری نے مجھے بڑی مظلوم سی نظروں سے دیکھا۔ "تو جانتی ہے کہ میں نے آج تک تیری کوئی خواہش رد نہیں کی' مگر اس وقت مجھے مجبور نہ کر' امتحان میں نہ ڈال۔"

"مگر اے مہا پجاری! ابھی تو آخری معرکہ باقی ہے۔" احرس بول اٹھا۔ "ابھی تو ہمیں وادی سبز پر بھی حملہ کرنا ہے اور اس وقت تو ہمارے ساتھ ہو گا۔"

"کون جانے اے احرس! کسے خبر کہ آخری معرکہ کون سا ہے۔ کب اور کہاں کسی کو آخری معرکہ پیش آ جائے۔ کس راہ میں زندگی کی شام ہو جائے' تو جانتا ہے؟ سو جب تک سانس ہے' آس ہے۔ میری آس کیوں توڑتا ہے؟ ابھی ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم باقی ہے کہ یہ اپنی آقازادی کی سپر بن سکیں۔" مہا پجاری کی یاس انگیز آواز رفتہ رفتہ تیز ہوتی گئی۔

خلاف توقع گفتگو نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا کہ میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اس سلسلے میں مزید کچھ کہنا' مہا پجاری کے جذبات محبت کو ٹھیس پہنچانا ہوتا۔ یوں بھی یہ وقت زیادہ بحث مباحثے کا نہیں تھا۔ ہمیں جلد از جلد میدان جنگ کا رخ کرنا تھا۔

میں' احرس اور مہا پجاری جب ہم تینوں اپنے جسموں پر ہتھیار سجائے حویلی سے نکلے تو خادم ہمارے لئے گھوڑوں کی لگامیں تھامے کھڑے تھے۔ نضار بھی اس وقت اپنے گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا۔ اس کا محافظ دستہ بھی ساتھ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ شاید وہ حویلی سے باہر ہمارا ہی منتظر تھا۔ دو محافظوں نے مشعلیں بھی روشن کر رکھی تھیں۔ نضار کے اشارے پر ایک مشعل بردار محافظ ہماری طرف بڑھ آیا۔ اسی لمحے نضار نے میری طرف پلٹ کر دیکھا۔ ہماری نظریں ایک دوسرے سے ملیں اس موقع پر نہ وہ کچھ بولا' نہ میں نے کچھ کہا اور کہنا ہی سب کچھ کب ہے۔ آنکھیں بھی تو بہت کچھ کہہ دیتی ہیں۔ یہ لمحات بھی ایسے ہی تھے۔ ہم دونوں رخصت ہو رہے تھے' کچھ ہی دیر بعد بستی سے نکلتے ہی ہمارے راستے مختلف ہو جاتے۔ پھر میدان جنگ میں کیا صورت پیش آتی' نہ اسے خبر تھی نہ مجھے۔ میں اس سے دور الگ محاذ پر ہوتی' وہ کہیں اور داد شجاعت دے رہا ہوتا۔ ہم دونوں میں سے تو کوئی کچھ نہ بولا' مگر مہا پجاری نے اپنے گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر نضار کو دعا دی۔

"اے بہادر باپ کے بہادر بیٹے! دیوتا تجھے فتح و نصرت سے ہمکنار کریں۔"

جواب میں نضار نے بھی ہمارے لئے دعائیہ کلمات ادا کئے اور پھر مہا پجاری بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ میں اور احرس پہلے ہی اپنے گھوڑوں پر بیٹھ چکے تھے۔

بستی سے نکلتے ہی ہمارے راستے مختلف ہو گئے۔ نضار سیدھا پہاڑی درے کی طرف بڑھتا چلا گیا اور ہم دائیں جانب مڑ گئے۔ ہمیں اس پہاڑی کو اپنی بائیں طرف چھوڑ کر اس سمت رخ کرنا تھا کہ جہاں پہلے ہی ہماری سپاہ مورچہ بندی میں مصروف تھی۔

جب میں اپنی سپاہ کے درمیان پہنچی تو اس کے جوش و خروش کا عالم عجیب تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر سپاہیوں کو نعرے بلند کرنے سے روک دیا۔ کہیں کہیں اکا دکا مشعلیں روشن تھیں۔ مورچہ بندی مکمل ہو جانے کے بعد انہیں بھی میری ہدایت کے مطابق بجھا دیا گیا۔ خندقیں کھودی جا چکی تھیں۔ وسیع و عریض میدان کے اس محاذ پر دور تک چھوٹے بڑے پتھر پھیلے ہوئے تھے۔ خندقوں کے اندر اور پتھروں کی آڑ میں مستعد چوکنا سپاہی موجود تھے۔ ان کے گھوڑے بھی قریب ہی تھے کہ جب ضرورت ہو گھوڑوں پر سوار ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑیں' پیش قدمی میں انہیں دشواری نہ ہو۔

احرس اور مہا پجاری کے ساتھ میں اگلے مورچے پر تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہونے کے باوجود مجھے دور تک سب کچھ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ میرے اندر اندھیرے میں دیکھنے کی پُراسرار قوت بیدار ہو چکی تھی۔ خاصے فاصلے پر اس میدان کی مخالف سمت مجھے مورچہ بندی نظر آ رہی تھی۔ یہ بربسا اور شمالی قبیلوں کی مشترکہ سپاہ تھی۔ وہ سب بھی دم سادھے پڑے تھے۔ ہدایات کے مطابق ادھر بھی کوئی مشعل روشن نہیں تھی۔

ادھر سے نگاہ ہٹا کر میں نے میدان کے درمیان دیکھا۔ دونوں محاذوں سے خاصا آگے نضار مورچہ بندی کئے ہوئے تھا۔

رات آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی کہ معاً میں نے اپنے وجود میں آشنا سنسناہٹ سی محسوس کی۔ میری سماعت کا دائرہ وسیع ہو گیا اور میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ "وہ .... وہ آ رہا ہے۔ ہمارا دشمن تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔" میرے اعصاب تن گئے۔

احرس اپنے گھوڑے کی لگام تھامے میرے قریب ہی موجود تھا۔ وہ میری بڑبڑاہٹ سن کر چونک اٹھا اور بولا۔ "کون .... کون اے آتون! مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔"

"ابھی تجھے بھی کچھ دیر بعد سب کچھ سنائی دینے لگے گا اے احرس!" میں نے جواب دیا اور پھر وہی سب کچھ ایک بار پھر سننے لگی جو رات کے پہلے پہر میں نے سنا تھا۔

"تو پھر اے میری بچی! ہمیں نضار کو اس سے آگاہ کر دینا چاہئے تاکہ وہ چوکنا ہو جائے۔" مہا پجاری بھی بول اٹھا۔

"نہیں اے مہا پجاری! وہ پہلے ہی سے چوکنا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کسی بھی وقت حملہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ عظیم مہین نے نضار کو بھی میری ہی طرح پُراسرار قوتیں عطا کر رکھی ہیں۔ جب بھی ضرورت ہو گی اور دیوتاؤں نے چاہا تو نضار کے وجود میں بھی یہ قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔ ساحر زعیم کے پہلے مسکن کی تباہی کے دوران میں مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ مہا پجاری اس راز سے آگاہ نہیں تھا کہ نضار پر بھی دیوتاؤں کا مہربان سایہ موجود ہے اسی لئے اس نے مجھے یہ مشورہ دیا تھا۔

دشمن یقیناً اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ وہ ہمیں غافل پا کر اچانک ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔ شاید ایسا ہوتا بھی، مگر دیوتاؤں کی نظر سیدھی تھی کہ مجھے آئندہ پیش آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ میرا جواب سن کر مہا پجاری پھر کچھ نہیں بولا تھا۔ ہاں وہ مجھے مضطرب سا ضرور نظر آ رہا تھا۔

صبح کے آثار ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوئے تھے کہ آخرکار وہ لمحات آ ہی گئے کہ جن کا انتظار تھا۔ دور تک مجھے متحرک مشعلوں کی روشنی پھیلی ہوئی نظر آئی تھی۔ یوں جیسے حدِ نگاہ تک کسی نے روشنی کی چادر سی بچھا دی ہو۔ اس سے دشمن کی تعداد کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

دشمن قریب سے قریب تر آتا گیا اور میری رگوں میں لہو کی گردش تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ وہ بے خبری میں تیزی سے آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اسے خبر بھی نہ ہو گی کہ اس کی راہ میں ایک مضبوط دیوار حائل ہے۔ منزل کے قریب آتے آتے اس کی تیز رفتاری سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی دانست میں ہمیں سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ جلد ہی دشمن ان حدود میں داخل ہو گیا کہ اسے شکار کیا جا سکے۔

پھر نضار نے دیر نہیں کی اور دشمن پر جہنم کے دہانے کھول دیئے۔ وہ اس مضبوط دیوار سے سر پھوڑ کر لہولہان ہو گیا کہ جس کی اسے خبر نہ تھی۔ پے در پے دھماکوں سے میدانِ جنگ گونج اٹھا۔ بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود دشمن گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق دشمن کی فوج کے مقابلے میں نضار کی سپاہ ایک چوتھائی بھی نہیں تھی۔

پسپا ہوتے دشمن کو دیکھ کر نضار کی سپاہ نے ہلہ بول دیا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ دشمن پسپا ہوتے ہوتے ایک دم سنبھل کر پلٹا اور نضار کی سپاہ پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے یقیناً اپنے مقابل فوج کی تعداد کا اندازہ لگا لیا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا کہ جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ نضار کی فوج کے پیر اکھڑ گئے۔ دشمن اسے رگیدتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس نے نضار کی فوج کو تین طرف سے گھیر لیا تھا اور مسلسل دباؤ ڈال رہا تھا۔

اب مزید انتظار کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اپنی رائفل کا رخ آسمان کی طرف کیا اور گولی چلا دی۔ میدان کی مخالف سمت سے بھی اسی وقت پہلی گولی چلی۔ اس کا اندازہ میں نے آسمان کی طرف لپکتے ہوئے شعلے سے لگایا ورنہ تو سارا ہی میدان جنگ دھماکوں سے گونج رہا تھا۔

"یلغار ہو۔" میں گھوڑے پر سوار ہوتے ہی چیخ اٹھی۔

"آتون دیوی .... زندہ باد! .... آتون دیوی .... زندہ باد!" کے نعرے گونجنے لگے۔

میں نے تیزی سے اپنی فوج کو آگے بڑھایا اور دشمن کے بائیں پہلو پر حملہ کر دیا۔ دوسری طرف سے بریسا اور شمالی قبیلوں والوں نے مل کر دشمن کے دائیں پہلو پر ضرب لگائی۔ اس افتاد نے دشمن کو وقتی طور پر خاصا جانی نقصان پہنچایا، مگر اس کی پیش قدمی نہیں رکی۔ اس نے بھی بہت جلد صورت حال کا اندازہ لگا کر اپنی فوج کو تین حصوں میں بانٹ لیا۔ اس نئی حکمت عملی کے سبب دشمن کا حوصلہ بڑھ گیا۔ کثرت تعداد کی بنا پر وہ اب بھی نضار پر دباؤ ڈالے جا رہا تھا۔ نضار کی فوج اب پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑی درے تک پہنچ گئی تھی۔

پانسا پلٹ رہا تھا۔ میری سماعت میں مرنے والوں کی آخری چیخیں نشتر کی طرح اتر رہی تھیں۔

اچانک ایک گولی کسی طرف سے سنسناتی ہوئی آئی اور اس نے احرس کے جسم کو چھید دیا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی اور وہ اوندھے منہ اپنے گھوڑے کی پشت پر گرا.........

"احرس .... میرے بچے!" مہا پجاری چیخ اٹھا۔ پھر وہ تیزی سے اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر احرس کی طرف لپکا۔

میں نے بڑی غضب ناک نظروں سے دشمن سپاہ کی طرف دیکھا۔ عین اسی لمحے بجلیوں کی گردش میری دونوں آنکھوں کا مرکز بن گئی۔ میرا غصہ جیسے قہر بن کر تیز روشنی کی صورت میں دشمن کی طرف لپکا۔ متحرک زندہ جسم سوکھی ہوئی لکڑیوں کی طرح جلنے لگے۔ جس طرف میری نگاہ اٹھ جاتی، شعلے ہی شعلے بھڑک اٹھتے۔ میں اس وقت جیسے اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ اپنی موت سے بے پرواہ ہو کر میں گھوڑا دوڑاتی ہوئی دشمن فوج کی صفوں میں گھس جاتی اور پھر ہر طرف شور مچ جاتا۔ "ساحرہ! .... ساحرہ! .... بھاگو! وہ ادھر ہی لپک رہی ہے۔"

"دوڑو، بھاگو........." کے شور سے میدان جنگ گونج رہا تھا۔ یہ وہ دشمن سپاہی تھے کہ جو میری آنکھوں سے نکلتی ہوئی تیز روشنی کی زد میں ابھی نہیں آئے تھے۔ اسی کے ساتھ "آتون دیوی، آتون دیوی" کے فلک شگاف نعرے میری سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ یہ میرے لوگ، میرے جاں نثار تھے جو بھاگتے ہوئے دشمن پر شاہینوں کی طرح لپک رہے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کب تک برق بے اماں بنی ہوئی میدان جنگ میں اِدھر سے اُدھر لپکتی رہی۔ میں اس وقت جیسے ہوش میں آئی کہ جب صرف میرے اپنے مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ شاید اس سے پہلے ہی موت کی وہ تیز روشنی میری دونوں آنکھوں میں سما کر میرے وجود کا حصہ بن چکی تھی۔ مجھے اس وقت یہ احساس بھی نہیں تھا کہ نئی صبح کی پہلی کرن میرے لئے ایک نئی خوشخبری لے کر آئی ہے۔ میں تو اور ہی دھیان میں تھی.........

"احرس .... احرس کہاں ہے؟ کیا .... کیا وہ........." اس سے زیادہ الفاظ میرا ساتھ نہ دے سکے۔

"وہ حویلی میں ہے اے آتون دیوی!" کسی نے میرے سوال کا جواب دیا۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ احرس زندہ ہے، میں نے سوچا۔ اسی کے ساتھ مجھے نضار کا خیال آیا۔ دوسرا سوال میں نے اسی کے بارے میں کیا۔

"اے آتون دیوی! سردار نضار بھی حویلی ہی میں ہے کہ وہ بھی احرس ہی کی طرح گولیاں لگنے سے زخمی ہو گیا ہے۔" جواب ملا۔

میں نے جواب دینے والے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ میرے ساتھ بستی تریال سے آنے والی فوج میں وہ شخص سالار تھا۔

"مبارک ہو تجھے اے دیوی کہ ہم تیری وجہ سے یہ جنگ جیت گئے۔ تیری برکتیں ہمیشہ ہمارے اوپر اسی طرح سایہ کئے رہیں۔" وہ پھر بولا۔

میں نے طویل سانس لے کر میدان جنگ کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وسیع و عریض میدان میں جگہ جگہ

راکھ کے ڈھیر اور لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ جان کی بازی ہار جانے والوں میں اپنے پرائے سبھی ہوں گے۔ میں نے سوچا اور پھر اپنے گھوڑے کا رخ پہاڑی درے کی طرف موڑ دیا۔ میں جلد سے جلد حویلی پہنچنا چاہتی تھی۔ کثرت تعداد کے باوجود دشمن کو شکست فاش ہوئی' اس پر میں یقیناً خوش تھی' مگر اس کے ساتھ مجھے احرس اور نضار کا خیال بھی تھا۔ وہ دونوں ہی زخمی ہو چکے تھے۔ جب تک میں انہیں خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتی کہ وہ کس حال میں ہیں' مجھے بھلا کس طرح سکون آ سکتا تھا۔

حویلی میں قدم رکھتے ہی مجھے غیر معمولی سرگرمی کا احساس ہو گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سرگرمی کا مرکز اجلاس والا بڑا کمرہ تھا۔ وقتی طور پر نضار اور احرس کو وہیں رکھا گیا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے وہاں حویلی کے طبیب خاص' اس کے معاون طبیب' جراح اور بستی کے دوسرے طبیب بھی نظر آئے۔ ان دوسرے طبیبوں کا تعلق فوج کے اس شعبے سے تھا کہ جو جنگ کے دوران میں زخمی ہو جانے والے سپاہیوں کا علاج اور نگہداشت کرتے تھے۔

کمرے کے فرش پر کچھ فاصلے پر آرام دہ بستر بچھے ہوئے تھے۔ طبیبوں کا ہجوم ان ہی دو بستروں کے قریب تھا۔ وہیں میں نے مہا پجاری کو بھی دیکھا۔ مجھے آگے بڑھتے دیکھ کر طبیبوں نے راستہ دے دیا۔ نضار پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی۔ اس کے جسم میں کئی گولیاں پیوست تھیں جنہیں نکالا جا رہا تھا۔ جراح اور طبیب اپنی کوشش میں مصروف تھے۔ میں نے نضار کے چہرے پر تکلیف و اذیت کے آثار دیکھے۔ پھر میں کچھ کہے بغیر دوسرے بستر کی طرف بڑھ گئی۔

اسی وقت مہا پجاری نے قریب آ کر مجھے مخاطب کیا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں میری بچی! طبیب خاص کہتا ہے کہ نضار کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔" اس کا انداز تسلی دینے والا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولا۔ "زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے احرس بے ہوش ہو گیا ہے اور طبیب اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گولی اس کے شانے سے نکالی جا چکی ہے۔ اس کے شانے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے' مگر جڑ جائے گی۔"

میں اسے وقت تک احرس کے بستر تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ بائیں شانے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

"آ اے آتون! ادھر اور طبیبوں کو اپنا کام کرنے دے۔" مہا پجاری نے دھیرے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

میں جواب میں کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ آئی۔ کمرے کی سامنے والی دیوار کے قریب وسط میں ایک چوکی پڑی تھی جو سردار کے لئے مخصوص تھی۔ مہا پجاری مجھے ساتھ لئے اسی چوکی کے قریب آ بیٹھا۔ نضار اور احرس دونوں کو زندہ دیکھ کر میرے دل کو بڑی حد تک قرار سا آ گیا تھا۔ اس کے باوجود میں ان کی طرف سے فکر مند تھی۔

"دیوتا مہربان تھے اے میری بچی کہ نضار یا احرس کے جسم میں کوئی گولی ایسی جگہ نہیں لگی جو ان کی زندگی کے لئے خطرناک ثابت ہوتی۔" مہا پجاری بتانے لگا۔ "احرس کو زخمی حالت میں ساتھ لئے میں

پچھلے مورچوں کی طرف چلا گیا تھا کہ جہاں طبیب و جراح موجود تھے.......... مگر تو.......... تو چپ کیوں ہے؟ کچھ بول نا!"

پھر مہا پجاری نے مجھے باتوں میں لگا لیا کہ میرا دھیان بٹا رہے۔ اسے نضار اور احرس سے میرے جذباتی لگاؤ کا یقیناً کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور تھا۔

دوپہر ہونے تک احرس اور نضار دونوں ہی کی حالت سنبھل گئی۔ احرس کو ہوش آ گیا تھا۔ نضار بھی اب اپنے بستر پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی مجھے بریسا اور دوسرے لوگوں کا خیال آیا۔

مجھے اس دوران میں معلوم ہوا کہ بریسا کے قبیلے والوں نے غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے قبیلے والے خاصی تعداد میں مارے گئے تھے مگر انہوں نے میدان جنگ سے منہ نہیں موڑا تھا۔ تقریباً یہی حال شمالی قبیلوں والوں کا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ ڈٹے رہے تھے۔ زیادہ جانی نقصان نضار کی فوج کا ہوا تھا کہ وہی دشمن کا اصل ہدف تھی۔ تریال سے آنے والی فوج کے جوان بھی کام آئے تھے مگر ان کی تعداد کم تھی۔ اس کے برعکس اطلاعات کے مطابق دشمن فوج کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس کی فوج کا چوتھائی حصہ ہی بمشکل زندہ بچ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ دشمن کے جو سپاہی زندہ ہاتھ آ گئے تھے' انہیں انتقامی جذبے کے زیر اثر فوری طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

میرے وجود میں جو پراسرار قوتیں پوشیدہ تھیں' اب اس کا عملی مظاہرہ بستی اشر والوں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ ان کے رویے میں بھی میں نے واضح طور پر تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ تریال والوں کی طرح وہ بھی مجھے دیوی تسلیم کرنے لگے تھے۔ صبح سے اب تک جو بھی مجھ سے ہم کلام ہوا' اس نے مجھے "آتون دیوی" ہی کہا۔ پہلے کی نسبت وہ مجھے کچھ زیادہ ہی مرعوب سے دکھائی دیئے۔ ان افراد میں طبیب و جراح بھی تھے اور فوج کے وہ سالار بھی شامل تھے جن سے مجھے حالیہ جنگ کی صحیح صورت حال کا علم ہوا۔ ان سالاروں کو خود میں نے ہی طلب کیا تھا۔ نضار کے ایما پر انہوں نے ضروری احکام بھی مجھ ہی سے حاصل کئے۔ عملاً نضار کی جگہ اب میں نے ہی سنبھال لی تھی کہ وہ بستر علالت پر پڑا تھا۔ اجلاس والے کمرے سے اب احرس اور نضار کو ان کے کمروں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ طبیب ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

سہ پہر تک میں نے تمام ضروری امور نمٹا دیئے۔ مرنے والوں کی لاشوں کو زمین میں دبا دیا گیا۔ بستی اشر پھر سے آباد ہو گئی۔ عورتوں' بچوں اور بوڑھوں کو پہاڑی سلسلوں سے واپس بلا لیا گیا تھا۔ جب مجھے اطلاع مل گئی کہ میرے تمام احکام پر عمل ہو چکا ہے تو میں اجلاس والے کمرے سے اٹھ آئی۔

پہلے میں' احرس کے کمرے میں گئی کہ جہاں مہا پجاری بھی موجود تھا۔ اس نے اپنا بستر وہیں لگوا لیا تھا۔

مجھے اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر احرس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اب کیسا ہے تو اے احرس!"

"ٹھیک ہوں۔" اس کی آواز نسبتاً دھیمی تھی۔ "بڑی دیر سے اے آتون! میں تیرا انتظار کر رہا

تھا۔"

"ہاں بول کیا بات ہے؟" میں اس کی دل جوئی کی خاطر محبت اور نرمی سے بولی۔

"سنا ہے کہ تُو نے تو کمال ہی کر دیا' ہاری ہوئی جنگ جیت لی۔" اس کے لہجے کی شوخی دھیرے دھیرے واپس آتی جا رہی تھی۔

پھر احرس کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ میں بول اٹھی۔ "معلوم ہے تجھے اے احرس کہ اس کی وجہ صرف تُو تھا۔ نہ تجھے گولی لگتی' نہ مجھے غصہ آتا اور نہ............"

"غصے میں تیری آنکھوں سے وہ روشنی نکلی کہ جس نے دشمنوں کو جلا ڈالا۔" احرس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں' یہ بات نہیں۔ میں کچھ اور کہہ رہی تھی۔ غصے کے ساتھ ہی مجھے دکھ بھی تھا۔ شاید اسی لئے دیوتا مجھ پر مہربان ہو گئے۔" پھر میں نے مصلحت کے تحت اصل بات کو چھپانے کی خاطر کہہ دیا۔ "مجھے تو خود نہیں معلوم کہ ہوا کیا۔ میں تو جیسے اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ مجھے تو دوسروں سے بعد میں یہ پتہ چلا کہ انہوں نے میری آنکھوں سے تیز روشنی نکلتے دیکھی تھی۔ دیوتا ہی جانیں کہ اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ہاں مجھے اتنا ضرور احساس ہے کہ میں شدید غصے کی حالت میں دشمنوں پر ٹوٹ پڑی تھی پھر میں جس طرف نگاہ اٹھاتی' مجھے شعلے ہی شعلے بھڑکتے دکھائی دیتے۔"

"اے میری بچی! بچپن ہی سے تُو دیوتاؤں کی چہیتی ہے۔" مہا پجاری کہنے لگا۔ "سو اب بھی دیوتا تجھ پر مہربان ہیں۔ یہی ہوتا ہے کہ دیوتا اپنے چہیتوں کے ذریعے نیکی کو بدی پر غالب کر دیتے ہیں۔ تجھے اس کے لئے دیوتاؤں نے اپنا ذریعہ بنا لیا ہے۔ کبیت والوں کے ظالم سردار حسیف پر بھی تو تجھے دیوتاؤں ہی نے غلبہ دیا تھا۔ وہ جو خود کو دیوتاؤں کا ہرکارہ کہلواتا تھا' کیا حشر ہوا اس کا۔ تیرے ہی ہاتھوں تو اسے دیوتاؤں نے نیست و نابود کرا دیا۔ اور اے احرس! تُو بھی تو نہ بھولا ہو گا وہ سب کچھ .... سو اب اگر ایسا ہوا تو اس پر کیا حیرانی' دشمن کو تو شرمناک شکست سے دوچار ہونا ہی تھا۔"

"مگر اے مہا پجاری' اس کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔" میں نے اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ "کتنی عورتوں کے مرد مارے گئے' کتنے بچے یتیم ہو گئے' کتنے بوڑھے اپنے جوان بیٹوں کو روئیں گے اور کتنی مائیں بین کر رہی ہوں گی۔"

"جنگ ہوتی ہے تو یہی سب کچھ ہوتا ہے میری بچی!" مہا پجاری نرمی سے بولا۔ "بھلا اس سے کیسے بچا جا سکتا ہے .... اور پھر یہ بھی تو سوچ کہ اس جنگ میں ظالم کون تھا اور مظلوم کون؟ تُو نے تو ابھی وادی سبز پر حملہ بھی نہیں کیا تھا کہ جو تیرا حق ہے' اس میں بھی دیوتاؤں کی کوئی مصلحت ہو گی کہ انہوں نے تیرے دشمن کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے تیرے آگے لا پھینکا۔"

میں چپ رہی تو احرس دھیمی آواز میں بولا۔ "اے مہا پجاری! اس کی باتوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ جنگ جیت لینے کی اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔"

"نہیں اے احرس! اس نے جو کچھ بھی کہا' وہ سچ ہے' اس کے دل کی آواز ہے .... اچھا؟

ے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ بول کیا تجھے مرنے والوں کا دکھ نہیں؟ کیا تُو ان یتیم بچوں کو دیکھ کر رنج کرے گا کہ جن کے باپ مارے گئے .... اور کیا خود آتون کے ماں باپ کو بے گناہ نہیں مارا گیا؟ کیا اس نے یتیمی کا دکھ نہیں جھیلا؟ .... تو پھر اسے یتیم ہو جانے والوں کا خیال کیسے نہ ہو گا؟"

مہا پجاری نے شاید دانستہ بات کا رخ بدل کر مجھے جیسے کہیں اور پہنچا دیا۔ مجھے اپنے بابا اور مظلوم ماں کی یاد آ گئی۔ ایک جذبہ دوسرے جذبے سے مغلوب ہو گیا۔ میری آنکھوں میں اپنی ماں اور بابا کا چہرہ گھومنے لگا۔ انتقام کا جذبہ پوری شدت کے ساتھ مجھ پر غالب آ گیا اور میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ "میں بدلہ ضرور لوں گی .... وہ .... وہ ظالم کہ جس نے صرف مجھ کو نہیں کتنوں کو یتیم کیا ہے' آخر کب تک دیوتاؤں کے قہر سے بچا رہے گا۔"

"ہاں اے میری بچی! وہ دن ضرور آئے گا۔" مہا پجاری آہستہ سے بولا۔

اسی وقت حویلی کا طبیب خاص اپنے معاونین کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ اس نے شانے پر بندھی ہوئی پٹیاں کھول کر زخم کا معائنہ کیا' پھر کوئی دوا زخم میں بھرنے کے بعد دوبارہ پٹیاں باندھ دیں۔ لکڑی کے ٹکڑوں کی مدد سے اس نے شانے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو سہارا دیا تھا۔ زخم میں جو دوا بھری گئی تھی' اس سے شاید احرس کو تکلیف محسوس ہوئی تھی اور وہ کراہنے لگا۔ طبیب کے معاونین دو صندوقچیاں ساتھ لائے تھے۔ انہیں کھول کر انہوں نے طبیب کے کہنے پر کچھ دوائیں نکالیں۔ ان سے طبیب نے ایک شروب بنا کر احرس کو پلایا اور پھر ایک دوا سونگھنے کو بھی دی۔

کچھ ہی دیر میں احرس نے کراہنا بند کر دیا۔ طبیب نے مہا پجاری کو بتایا۔ "اب یہ پُرسکون نیند سو جائے گا اور جب تک یہ سوئے اسے سونے دیا جائے۔"

"یہ بتا کہ اب نضار کا کیا حال ہے؟" میں نے طبیب سے پوچھا۔

"اے آتون دیوی! میں نے چاہا تھا کہ اسے بھی دوا دے کر سلا دوں' مگر وہ نہیں مانا۔ اس نے خود مجھ سے کہا کہ ابھی مجھے کوئی ایسی دوا نہ دے کہ جس سے مجھ پر غفلت طاری ہو جائے۔" طبیب نے جواب دیا پھر وہ اپنے معاون کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

نضار کی حالت سنبھلنے کے بعد مجھے ابھی تک اس سے گفتگو کا موقع نہیں مل سکا تھا شاید اس نے اسی لئے طبیب سے کوئی ایسی دوا دینے کو منع کر دیا تھا۔ یہ سوچ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے نزدیک احرس سے بھی زیادہ نضار کو اس وقت آرام اور نیند کی ضرورت تھی۔

مہا پجاری کو احرس کے پاس چھوڑ کر میں نے نضار کے کمرے کا رخ کیا۔

نضار کے کمرے میں پہنچ کر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ میرا ہی منتظر تھا۔ کمرے میں دو خادم اس کی نگہداشت کے لئے موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نضار نے انہیں کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تنہا خلوت میں مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔

"تجھے اب تک سو جانا چاہئے تھا' اے نضار!" میں اس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"مگر تُو .... تُو بھی تو اے آتون' ابھی نہیں سوئی۔" نضار نے کراہتے ہوئے کہا۔ "پھر ....

پھر مجھے تجھ سے کچھ کہنا بھی تھا۔"

"جو کہنا ہے تجھے جلدی کہہ دے کہ میں طبیب کو بلوا کر کوئی ایسی دوا پلوا دوں جسے پینے سے تو سکون کے ساتھ سو جائے۔" میرے لہجے میں محبت آمیز سختی تھی۔

"سو جاؤں گا اے آتون کہ تیرا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں .... تجھ سے مجھے یہ پوچھنا تھا کہ جب تک میں اٹھ کر کھڑا نہ ہو جاؤں' میری جگہ سنبھالے رہنا تجھ پر بار تو نہیں ہو گا؟ .... میری یہ خواہش تھی کہ .... کہ اس وقت تک تُو ہی ضروری احکام جاری کر۔"

"بس اتنی سی بات تھی کہ جس کی خاطر تُو نہیں سویا۔" میں مسکرا کر بولی۔

"باتیں تو اور بہت سی ہیں اے آتون! جو پھر بھی ہو سکتی ہیں .... مگر ان میں سب سے ضروری میرے نزدیک یہی بات تھی۔"

"تو سن کہ تُو اگر میرا حکم نہیں ٹال سکتا تو پھر بھلا میں تیرے حکم سے کس طرح انکار کر سکتی ہوں۔" میں دانستہ اس سے شگفتہ لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"میں تجھے حکم دینے کا اہل نہیں اے آتون! .... ہاں التجا کرنا ضرور.........."

اس کی بات کاٹ کر میں نے چپ رہنے کو کہا اور ایک خادم کو آواز دے کر بلا لیا۔ "جا اور طبیب خاص کو اپنے ساتھ لے کر آ۔" خادم چلا گیا تو میں نے نضار کو مخاطب کیا۔ "میرے سونے اور جاگنے کا غم نہ کر کہ میرا جسم تیری طرح زخم زخم نہیں ہوا۔"

میری بات سن کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی' مگر کراہ کر رہ گیا۔ نضار یقیناً بہت ضبط اور قوت برداشت کا مالک تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اتنی دیر بھی گفتگو کر لینا ممکن نہ ہوتا۔ نضار کے پاس میں اس وقت تک موجود رہی جب تک کہ طبیب خاص نہ آ گیا اور دوا پینے کے بعد اس پر غنودگی طاری نہ ہونے لگی۔

رات بھر جاگنے اور پھر دن بھر مصروف رہ کر مجھ پر بھی تھکن کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ نضار کے پاس سے اٹھ کر میں اسی لئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح جب میں تازہ دم ہو کر اٹھی تو احرس اور نضار کی عیادت کرنے کے بعد اجلاس والے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔ بستی کے انتظامی امور اور دیگر معاملات میں جو لوگ نضار کی نیابت کرتے تھے' اب وہ میرے احکام کے پابند تھے۔ یہ میرے لئے پہلا موقع تھا کہ کسی بستی کے سربراہ کی حیثیت سے میں اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔ مجھ سے پہلے ان پہاڑی بستیوں میں کسی عورت نے یہ فرائض انجام نہیں دیئے تھے۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ کسی سردار کا کوئی بیٹا نہ ہوتا تو اس کے بھائی کو سردار کی موت کے بعد بستی کا حاکم بنا دیا جاتا۔ سردار اگر اپنے ماں باپ کا اکلوتا ہوتا اور اس سے یہاں بیٹی ہوتی تو بھی بیٹی کو آخرکار یہ حق نہ ملتا۔ جب تک وہ جوان نہ ہو جاتی سردار کا نائب عملاً اس کی جگہ انتظامی امور سنبھالتا۔ پھر جب وہ کسی مرد کو اپنا شوہر بنا لیتی تو اس کا شوہر بستی کا حاکم بن جاتا۔ روایات کے مطابق جوان ہو کر

کسی کو اپنا شوہر بنا لینے سے پہلے اسے حاکمیت کا حق تھا' مگر محدود عرصے کے لئے۔ ان روایات کے باوجود اب تک کوئی ایسی مثال موجود نہیں تھی کہ کسی عورت نے محدود عرصے کے لئے ہی سہی کسی بستی کی سربراہی کی ہو۔ یہ ساری ہی باتیں میرے علم میں تھیں۔ مہا پجاری نے مجھے ان سے بے خبر نہیں رکھا تھا۔ مردوں کے اس معاشرے میں عورت کی حیثیت تیسرے درجے کی تھی' مگر میرا معاملہ مختلف تھا۔ مجھے کسی بستی کا سربراہ ہونے یا کہلوانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا مسئلہ وادی سبز کی سربراہ بننا نہیں' انتقام لینا تھا' ژیان سے انتقام۔ میرے نزدیک وادی سبز کی وراثت کا حق ایک ظالم سے انتقام لینے ہی کا ذریعہ تھا' اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ اس سے قطع نظر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ دیوتاؤں کے باب میں کسی بھی بستی کی کوئی روایت یا کوئی قانون نہیں چلتا۔ دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہر روایت' ہر قانون کو پس پشت ڈال دیا جاتا تھا۔ میرے ساتھ اب تک جو حالات و واقعات پیش آئے تھے' میں ان ہی کے سبب لوگوں کی نظر میں دیوی بن گئی تھی۔ پہلے بستی تریال والوں نے مجھے دیوی تسلیم کیا' پھر کبیت والوں نے مجھے یہ درجہ دیا اور اب اشر کی بستی والے بھی مجھے دیوی ماننے لگے تھے۔ اس میں خود میری مرضی و منشا کو کوئی دخل نہیں تھا۔ ان حالات میں روایات و قوانین کی حیثیت میرے لئے ثانوی ہو کر رہ گئی تھی۔ سو اگر میں چاہتی کہ کسی مرد کی بیوی بنے بغیر بھی وادی سبز کی سربراہ بن جاتی تو شاید کسی کو اس پر اعتراض نہ ہوتا۔ اس کا عملی تجربہ مجھے بستی اشر میں ہو رہا تھا۔

نضار کی جگہ میں اجلاس والے کمرے میں چوکی پر بیٹھی تھی اور جن لوگوں کو میں نے طلب کیا تھا میرے سامنے سجدہ ریز تھے۔

"اٹھو اور سنو کہ میں بستی کا دورہ کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے بلند آواز میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس روز میں نے ان بستیوں کی ایک اور روایت توڑ دی۔ بستی کا کوئی بھی حاکم جنگ میں مارے جانے والوں کے عزیز و اقارب کے پاس جا کر خود تعزیت نہیں کرتا تھا۔ سو میں نے یہ بھی کیا۔ بیواؤں اور یتیموں کے دکھ میں حصے دار بن کر میرے دل کو عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ لوگ جیسے اپنے رنج بھول گئے۔ ان کے لئے یہ بڑی بات تھی کہ ایک دیوی خود چل کر ان کے دروازے تک آئی تھی۔ وہ میرے سامنے سجدہ ریز ہوئے اور میں نے انہیں خیر و برکت کی دعائیں دیں۔ اسی کے ساتھ ایک اور اہم اعلان کیا کہ جو یتیم و بے سہارا ہو گئے ہیں' ان کی کفالت کی ذمے داری بستی کے سربراہ پر ہو گی۔ یہ اعلان بھی روایات کے خلاف تھا۔ سو اس پر ساری بستی میرے حق میں نعروں سے گونج اٹھی۔ نضار کی طرف سے یہ فیصلہ کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ نضار میرے اس فیصلے پر عمل درآمد کرتے ہوئے خوشی محسوس کرے گا۔

بستی کا دورہ کرنے کے بعد میں' پہاڑی سلسلوں کی طرف کبیت والوں سے ملنے اور تعزیت کرنے روانہ ہو گئی۔ دونوں شمالی قبیلوں کے سردار ابھی تک اپنی سپاہ کے ساتھ وہیں خیمہ زن تھے۔ انہیں بھی مجھے واپسی کے احکام دینا تھے۔

میں نے کبیت والوں کی بہادری و جاں نثاری پر انہیں شاباش دی اور شمالی قبیلوں والوں کی بھی

حوصلہ افزائی میں کمی نہیں کی۔ وہ سب ہی پہاڑوں میں میری آمد پر انتہائی خوش تھے اور میرے آگے بچھے جا رہے تھے۔ تعزیت و عیادت کے بعد وہاں بھی میں نے یتیم و بے سہارا لوگوں کے لئے وہی اعلان کیا کہ جو بستی اشر میں کر چکی تھی۔ بریسا اور شمالی قبیلوں کے نائبوں نے اس اعلان کو خوش دلی سے قبول کر لیا۔ میرا اعلان ان کے لئے حکم ہی کا درجہ رکھتا تھا۔

پہاڑوں سے بستی اشر کی طرف لوٹتے ہوئے میرے ذہن میں اچانک ایک انوکھا خیال آیا۔ پہلے اس کا دھیان ہی نہیں آیا تھا کہ اپنے دشمن کی طرف سے باخبر رہنے کے لئے دوسرے ممکنہ ذرائع بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اب تک ادھر توجہ نہ دینے کی شاید بڑی وجہ یہ تھی کہ مجھے یا نضار کو اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی۔ میں نے سوچا کہ حویلی واپس پہنچ کر پہلے طبیب خاص کو طلب کروں گی تاکہ اس سے نضار اور احرس کے بارے میں معلوم کروں‘ وہ دونوں کس حال میں ہیں۔ صبح اجلاس والے کمرے میں جانے سے پہلے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ دونوں اب تک دواؤں کے زیر اثر سو رہے تھے۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا‘ اس پر نضار سے مشورہ کئے بغیر بھی عمل کر سکتی تھی‘ مگر ایک فرد سے بہتر دو کی رائے ہوتی ہے۔ نضار کی حالت گزشتہ روز ایسی نہیں تھی کہ اس سے تفصیلی بات ممکن ہوتی لیکن آج مجھے یہ توقع تھی‘ اس سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔

میں جب حویلی پہنچی تو دوپہر ہو رہی تھی۔ نضار کا محافظ دستہ صبح سے اب تک میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اجلاس والے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے طبیب کو طلب کر لیا۔ میرے استفسار پر طبیب نے بتایا کہ کل کی نسبت آج احرس اور نضار کی حالت اطمینان بخش ہے۔ طبیب ہی سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں نصف پہر پہلے بیدار ہو چکے ہیں اور انہیں طاقت پہنچانے والی دوائیں دی جا رہی ہیں۔

”یہ بتا اے طبیب کہ ان کے ذہنوں پر اب غفلت طاری کرنے والی دواؤں کا تو اثر نہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”نہیں اے آتون دیوی! اب ایسا نہیں۔ ہاں جب وہ سو کر اٹھے تھے تو کچھ دیر تک ایسا ضرور تھا۔“ طبیب نے بتایا‘ پھر کہنے لگا۔ ”ہاں آج رات کو شاید ان دواؤں کی ضرورت پڑے تاکہ ان کے جسموں کو آرام مل سکے۔ اس سے ان کے جسموں میں قوت برداشت بڑھے گی۔“

”اچھا اب تُو جا اے طبیب اور جو بہتر جان سو کر۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے رخصت کر دیا۔

طبیب اپنی جگہ سے اٹھ کر بطور تعظیم میرے سامنے جھکا اور پھر چلا گیا۔ مجھے جو معلوم کرنا تھا‘ جان گئی۔ میری توقع رائیگاں نہ ہوئی۔ نضار سے مشورہ کرنا میرے لئے ممکن تھا۔ سو میں اجلاس والے کمرے سے اٹھ کر نضار کے پاس پہنچ گئی۔

وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز سا ہو کر کوئی مشروب پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے برتن خالی کر کے خادم کو تھما دیا اور بولا۔ ”سو کر اٹھتے ہی میں نے تیرے بارے میں معلوم کیا تھا اے آتون! پتا چلا کہ تُو حویلی میں نہیں ہے‘ کہاں گئی تھی؟“

”بتا دوں گی۔“ میں نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا‘ پھر خادموں کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

”پہلے تُو یہ بتا کہ اب کیسا ہے؟“

”کل سے بہت اچھا ہوں۔ دیکھ لے کہ آج تو میں کراہ بھی نہیں رہا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے تصدیق طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

اس دوران میں خادم کمرے سے جا چکے تھے۔ میں بولی۔ ”تکلیف تو خیر تجھے اب بھی ہو گی‘ پھر بھی کل سے بہت بہتر لگ رہا ہے۔“

”اور میرے بھائی احرس کا کیا حال ہے اے آتون!“ اس نے معلوم کیا۔

”وہ بھی ٹھیک ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”تجھ سے بات کر کے اسی کی طرف جاؤں گی۔“ پھر میں نے نضار کو مختصراً اپنے نئے اقدامات سے آگاہ کر دیا۔

نضار نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور کہنے لگا۔ ”مجھے خبر نہیں تھی اے آتون کہ تیرے سینے میں اتنا گداز دل ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے کبھی یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ یتیموں اور بے سہارا لوگوں کی کفالت بستی کے سردار ہی کا فرض ہونا چاہئے۔“

”اے نضار! تجھ سے مجھے ایسے ہی جواب کی توقع تھی کہ تیرا سینہ بھی دوسروں کے درد سے خالی نہیں۔“ یہ کہہ کر میں اصل موضوع گفتگو کی طرف آ گئی۔

نضار میری بات سن کر چونک اٹھا اور بولا۔ ”یہ تجھے اچھی سوجھی اے آتون! سردار صاحی‘ سردار منعیہ اور سردار وسیط‘ تینوں ہی پر اس سلسلے میں بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہمیں درست اطلاعات فراہم کر سکتے ہیں۔“

”میرا قیاس یہ ہے اے نضار کہ تینوں محاذوں پر شکست کھانے کے بعد دشمن کو بھاری جانی نقصان ہوا ہے‘ پھر بھی ہمارے حلیفوں کی طرف سے اس کی تصدیق ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ میری تجویز یہ تھی کہ ہمارے حلیفوں کے مخبر وادی سبز جا کر صحیح صورت حال کی خبر لائیں اور ہمیں اس سے آگاہ کریں۔ وادی سبز میں وہ اجنبی نہ ہوتے اور کسی بھی بہانے ہمارے حلیف انہیں با آسانی وہاں بھیج سکتے تھے۔ میں اسی سلسلے میں نضار سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔

”اے آتون! میرا دل بھی یہی کہتا ہے کہ دشمن کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ خاص طور پر یہاں اس کی سپاہ بڑی تعداد میں ماری گئی ہے۔ اس نے اپنی افرادی قوت کا بڑا حصہ بستی اشر کے محاذ پر ضائع کر دیا ...... اور ہاں‘ میں تجھے ایک اہم بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ میرے مقابلے میں ژیان کا بھائی شامان زخمی ہونے کے باوجود اپنی جان بچا کر لے گیا۔ اس محاذ پر وہی فوج کی کمان کر رہا تھا۔ میں نے اسے اس کے چہرے مہرے سے پہچانا۔ اندھیرے میں دیکھ لینے کی قوت میرے اندر اس وقت بیدار تھی اور وہ میرے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ اسی کی چلائی ہوئی ایک گولی کا زخم میری دائیں پنڈلی پر ہے۔“

”مگر اے نضار! تیرے اندر اندھیرے میں دیکھنے کی قوت کے سوا کیا کوئی اور پُراسرار قوت بیدار نہیں ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں اے آتون!“ نضار نے بتایا۔ ”مگر اس سے فرق بھی کیا پڑا‘ دیوتاؤں کو جو کام لینا تھا‘ وہ تجھ

سے لے لیا۔"

"اس سے فرق تو پڑا اے نضار کہ تیرا جسم زخموں سے بچ گیا۔ ساحر زعیم کے پہاڑ کی طرح اگر اِس بار بھی تیری آنکھوں سے موت کی تیز روشنی نکل کر دشمن سپاہ پر محیط ہو جاتی تو ابتدا ہی میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا ہوتا۔"

"دیوتاؤں کی مرضی میں کسے دخل ہے اے آتون!" نضار نے طویل سانس لیا۔ "اب یہی دیکھ لے کہ ہم تو وادی سبز پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور دشمن ہم پر ضرب لگانے کے لئے مستعد ہو چکا تھا۔"

"ہاں پہل اسی نے کی اور ہم سے زیادہ نقصان بھی اسی نے اٹھایا۔" میں بولی۔ "کیا خبر اس میں بھی دیوتاؤں کی کوئی مصلحت ہو اور یوں وہ ہمارے دشمن کو کمزور کرنا چاہتے ہوں۔ تاکہ جب ہم وادی سبز پر حملہ کریں تو دشمن ہماری ضرب نہ سہہ پائے۔"

"پھر تو دشمن پر حملے کے لئے یہ بہترین موقع تھا اے آتون! .... کاش میں اس قدر زخمی نہ ہوتا اور فوج کی کمان سنبھال سکتا۔" نضار بڑی حسرت سے کہنے لگا۔ "اگر .... اگر اے آتون! ہمارے حلیفوں نے بھی تصدیق کر دی کہ صورت حال واقعی یہی ہے تو .... تو پھر ایک ہی صورت ہے۔" نضار جذباتی سا ہو رہا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بول اٹھا۔ "میرے دونوں نائب ادل اور احزم بھی میری جگہ۔ تیری نیابت میں فوج کی کمان سنبھال.........."

"ایک بات اچھی طرح سن لے اے نضار!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تجھے اور احزم کو میں اس حال میں یہاں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی۔"

"سمجھ تو سہی اے آتون کہ اس طرح دشمن کو سنبھلنے کا وقت مل جائے گا۔" نضار نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"اے نضار! میں تو سب کچھ سمجھ رہی ہوں مگر تُو نہیں سمجھ رہا۔ کیا تُو بھول گیا کہ تیرا سینہ بھی تو ایک عمر سے انتقام کی آگ میں پھنک رہا ہے؟ کیا تُو میرے محسن اور اپنے باپ مظلوم سردار اشمر کا بدلہ نہیں لے گا؟ کیا تجھے یاد نہیں رہا کہ تیرا اور میرا دشمن ایک ہے؟"

"یاد ہے .... سب کچھ یاد ہے اے آتون! .... اور یہی یادیں تو میرے لئے سوہان روح بنی رہتی ہیں۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ اب اس کی آواز میں جوش سے زیادہ غم کا تاثر تھا۔ "میں بھلا اپنے دشمن کو کس طرح بھلا سکتا ہوں کہ جس نے برسوں مجھے دربدر بھٹکایا ہے .... میں تو تجھے صرف یہ سوچ کر ایسا مشورہ دے رہا تھا کہ .... کہ تیرے دل کی آگ تو بجھ جائے۔ کیا خبر میں کب تک صحت یاب ہو سکوں؟"

"سن کہ دیوتاؤں نے تیرے اور میرے لئے جو مقدر کر دیا ہے' وہی ہو گا .... اے نضار! ہم بڑے بے خبر ہیں' ہمیں کچھ بھی تو نہیں معلوم ہوتا اور ہم سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرتے رہتے ہیں .... ہم اپنی بساط سے بڑھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں اور پھر اوندھے منہ زمین پر آ گرتے ہیں۔ ہم جسے

لئے بہتر سمجھ لیتے ہیں' وہ بدتر نکلتا ہے۔ بتا اے نضار! کیا ایسا ہی نہیں ہوتا اور ایسا ہی نہیں ہوتا آیا؟ پھر کیوں اندیشے پالتا ہے .... اور ان آزمائشوں میں دیوتاؤں کی کیا مصلحت چھپی ہے .... تجھے سرگوشیوں کے الفاظ یاد نہیں رہے کہ ابھی ہم سے دیوتاؤں کو بہت سے کام لینا ہیں؟ .... سو میں تُو نے کس طرح ابھی سے یقین کر لیا کہ میرے دل کی آگ بجھ جائے گی؟"

"تُو نے جو کچھ کہا اے آتون' اس سے انکار ممکن نہیں۔" نضار نے اعتراف کیا' اسی کے ساتھ "پھر بھی ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا۔ ہم نے اپنے لئے جس منزل کا تعین کر لیا ہے' ہمیں تمام تر دشواریوں اور راستے کی رکاوٹوں کے باوجود اس کی طرف بڑھتے رہنا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے نضار کی آواز پھر پُرجوش ہو گئی۔ "بول اے آتون! کیا دیوتا انہیں اپنا چہیتا بناتے ہیں کہ جو حرکت سے محروم ہوتے ہیں' جدوجہد ترک کر دیتے ہیں؟"

"ہاں اے نضار! ایسوں کو دیوتا دھتکار دیتے ہیں۔" میں نے جواب میں کہا۔ "اور یہ تُو بھی جانتا ہے کہ ہم کبھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھے! اب بھی ہم ایسا ہی کریں گے .... جو عہد باندھا ہے وہ نہیں توڑیں گے۔" میری آواز بھی جذبات سے لبریز ہو گئی۔ جانے کب میں نے نضار کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پھر خاصی دیر تک کمرے میں سکوت طاری رہا۔ ہم دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بول سکا۔

خاموشی کی بھی تو اپنی ایک زبان ہوتی ہے' ایک انداز گفتگو یہ بھی تو ہے۔

دوسرے ہی روز میں نے پیغامبروں کو اپنے حلیفوں کی طرف ضروری ہدایات دے کر بھیج دیا۔ سردار وسیط کی جانب جانے والے پیغامبر کو میں نے تاکید کر دی تھی کہ وہ قلاوز کی بستی سے نہ گزرے' چاہے اس کے لئے اسے لمبا چکر کاٹنا پڑے۔

پہلی خبر ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد سردار صاحی کی طرف سے ملی۔ اس نے میرے اندازوں کی تصدیق کر دی تھی۔ سردار صاحی کے بھیجے ہوئے قاصد کو میں نے نضار کے کمرے ہی میں طلب کر لیا تھا تاکہ نضار بھی قاصد سے کوئی سوال کرنا چاہے تو کر سکے۔ میں اس وقت نضار کے پاس ہی تھی۔ قاصد کچھ ایسی خبریں بھی لے کر آیا تھا جو ہمارے لئے غیر متوقع تھیں۔ ان باتوں کا علم اس سے گفتگو کے بعد ہی ہو سکا۔

"اے سردار نضار! وادی سبز کے زیادہ تر جوان مارے جا چکے ہیں اور جو زندہ بچے ہیں' ان پر تیری دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔" قاصد بتا رہا تھا۔ "وہ جو حالیہ جنگ میں پسپا ہو کر وادی سبز میں لوٹے' انہوں نے وہاں اور بھی دہشت پھیلا دی۔ انہوں نے وادی والوں کو آتون دیوی کے عجیب و غریب قصے سنائے کہ وہ زندہ جلا دیتی ہے' وہ اسے کبھی دیوی کہتے ہیں اور کبھی ساحرہ۔ ابتدا میں جب تینوں محاذوں سے شکست کی خبریں ملیں اور زندہ بچ جانے والے وادی میں پہنچے تو ژیان گھبرا گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ اجنبی دنیا سے آنے والوں نے ژیان کو کچھ ایسے مشورے دیئے کہ جلد ہی صورت حال بدل گئی۔ وادی میں آتون کے ذکر کو جرم قرار دے دیا گیا۔ اس جرم میں کئی افراد کو سزائے موت بھی ہوئی۔"

قاصد کا بیان ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ میں بول اٹھی۔ اس کی وجہ اجنبی دنیا کے لوگ تھے۔ میں نے قاصد سے ان ہی کی تعداد کے بارے میں سوال کیا۔

"وادی میں ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔" قاصد نے جواب دیا۔ "وہ بڑے پُراسرار لوگ ہیں۔ کبھی تو وہ بس دو تین سے زیادہ نظر نہیں آتے اور کبھی ان کی تعداد بڑھ کر دس بیس تک پہنچ جاتی ہے۔ کبھی ان میں سے کوئی بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ان دنوں کہ جب میں سردار صاحی کی سفارت لے کر ژیان سے ملا تو اس کے ساتھ میں نے اجنبی دنیا کے پانچ افراد کو دیکھا۔"

"کیا ان میں کوئی عورت بھی تھی؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں' میں نے کسی عورت کو ژیان کی حویلی میں اس وقت نہیں دیکھا کہ جس کا تعلق اجنبی دنیا سے ہو۔" قاصد نے بتایا' پھر کہنے لگا۔ "ہاں یہ سنا ضرور کہ وادی میں اجنبی دنیا کی عورتیں بھی کبھی کبھار نظر آتی ہیں۔"

"اچھا اجنبی سرزمین کے لوگوں کا ذکر یہیں چھوڑ اے محترم سردار صاحی کے قاصد! تُو اپنا بیان جاری رکھ۔" نضار پہلی بار بولا۔ "بتا کہ صرف آتون دیوی کے ذکر کو جرم قرار دینے سے صورت حال بدل گئی یا ژیان نے اس کے لئے کچھ اور اقدامات کئے؟"

"جو سیاہ بستی اشر سے شکست کھا کر وادی میں لوٹی تھی' ژیان نے اسے بستی صنعیہ سے نصف پہر کے فاصلے پر بسانے کا حکم جاری کر دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے وادی کے اردگرد آباد قبیلوں کے جوانوں کو وادی میں آ کر بسنے کی اجازت دے دی کہ جس پر پہلے پابندی تھی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آس پاس کی بستیوں سے قافلے پر قافلے وادی سبز پہنچ رہے ہیں اور انہیں ژیان کی طرف سے مراعات مل رہی ہیں۔ ان نوواردوں کو پختہ عمارتوں میں بسایا جا رہا ہے اور بدلے میں کچھ طلب نہیں کیا جا رہا۔ سو یوں اے سردار نضار! رفتہ رفتہ صورت حال بدل رہی ہے اور بڑی حد تک بدل گئی ہے۔" قاصد نے تفصیل کے ساتھ نضار کے سوال کا جواب دیا' پھر سردار صاحی نے جو پیغام بھجوایا تھا' اس کے متعلق بتایا۔

سردار صاحی کا پیغام یہ تھا کہ وادی سبز کی موجودہ صورت حال سے فائدہ اٹھا کر جلد سے جلد دشمن پر حملہ کر دیا جائے۔

جواب میں نضار بولا۔ "اے سردار صاحی کے معتبر شخص! تُو نے خود اپنی آنکھوں سے میرا حال دیکھ لیا۔ حالیہ جنگ میں شدید زخمی ہونے کے بعد اب میں اس قابل ہوا کہ کسی کا سہارا لے کر چل سکوں۔ طبیبوں کا کہنا ہے کہ مجھے ابھی مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں مزید وقت لگ جائے گا۔ اس کا اندازہ قبل از وقت لگانا ان کے لئے مشکل ہے۔ تُو نے جو دیکھا سو محترم سردار کو بتا دیجیو۔ جیسے ہی میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے کے قابل ہو گیا' تیرے محترم و بزرگ سردار کو میرا پیغام مل جائے گا۔ اس عرصے میں وہ ژیان کی سرگرمیوں پر نظر رکھے اور مجھے بدلتے ہوئے حالات سے بے خبر نہ ہونے دے۔ اجنبی سرزمین سے آنے والوں کے بارے میں مزید کھوج کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی نئی بات ان کے متعلق معلوم ہو تو فو کر دی جائے۔"

"اے سردار نضار! تیرا سارا احوال میں اپنے بزرگ سردار سے کہہ دوں گا۔ تُو کچھ اندیشہ نہ کر کہ تجھے وادی سبز کی خبریں ملتی رہیں گی۔"

سردار صاحی کے قاصد کو شام تک کے لئے روک لیا گیا اس کے چہرے سے سفر کی تھکن کے آثار ظاہر تھے۔ قاصد جب ایک خادم کے ساتھ حویلی کے مہمان خانے کی طرف چلا گیا تو میں نضار سے مخاطب ہوئی۔ "ہمارا یہ اندازہ تو درست ثابت ہوا اے نضار کہ ہم نے دشمن کی کمر توڑ دی۔ ہاں یہ خبر ہمیں نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اور اس قدر تیزی کے ساتھ سنبھلنے کی کوشش کرے گا۔"

"اور اے آتون! اجنبی سرزمین سے آنے والے لوگ اب کچھ اور پُراسرار ہو گئے ہیں۔ قاصد نے بتایا ہے نا کہ ان ہی کے مشورے پر ژیان نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ آخر ان کے اور ہمارے دشمن کے درمیان کیا معاملہ ہے' یہ بات ابھی تک نہیں کھل سکی۔ ان پہاڑی بستیوں کے معاملات سے آخر انہیں کیا دلچسپی ہے؟"

"وہ دن بھی تو یاد کر اے نضار کہ جب ان ہی اجنبیوں کی زبان پر میرا نام آیا تھا۔ جانے کیوں رہ رہ کر مجھے یہ بات کھٹکتی ہے۔ تُو بھولا تو نہیں کہ جب ہم ساحر زعیم کے نئے مسکن کو تباہ کر کے وہاں سے روانہ ہونے والے تھے اور پہلی بار اجنبی سرزمین کے اجنبی لوگوں کو دیکھا تھا' چھپ کر ان کی بولی سنی تھی؟" میں نے نضار کو یاد دلایا۔ "اس وقت تُو نے مجھے یہ کہہ کر اطمینان دلایا تھا کہ اجنبی دنیا والوں نے وادی کے کسی بوڑھے سے میرا نام سن لیا ہو گا۔"

"ہاں مجھے وہ دن اور وہ باتیں یاد ہیں اے آتون! میں تو پھر ان ہی لوگوں کا ذکر سن کر الجھ سا گیا ہوں۔ اس میں کوئی نہ کوئی بھید ضرور ہے۔ ان اجنبیوں کی وادی سبز میں آمدورفت بلا سبب تو نہیں ہو سکتی۔" نضار اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

پھر میں اور نضار مختلف قیاس آرائیوں کے سوا کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

اگلے ہی روز سردار وسیط کا قاصد بھی آن پہنچا۔ وہ جو خبریں لے کر آیا ہمارے لئے بڑی حوصلہ افزا تھیں۔ ہمارے حلیف قبیلوں کے جوان بھی وادی سبز میں پہنچ چکے تھے۔ یوں گویا ہمارے دشمن نے بے خبری میں خود اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مار لی تھی۔

موجودہ صورت حال میں اگر وادی سبز پر حملہ کیا جاتا تو حلیف قبیلوں کے جوان اپنے سرداروں کا اشارہ پاتے ہی اندرونی طور پر بھی شورش برپا کر دیتے۔ سردار وسیط نے بھی یہی پیغام بھجوایا تھا کہ دشمن پر بھرپور ضرب لگانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ اسی روز رات کے پہلے پہر سردار صنعیہ کی طرف سے بھی تقریباً یہی پیغام ملا۔ ان دونوں قاصدوں کو بھی صورت حال سے آگاہ کر کے دوسرے دن رخصت کر دیا گیا۔

اسی دوران میں نضار کے دونوں نائبوں ادل اور احزم سے بھی رابطہ برقرار رہا۔ ان کی بستیوں پر اب دشمن کی طرف سے کسی نئے حملے کا خطرہ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ان دونوں ہی نے بستی اشر آنے کی اجازت طلب کی تھی۔ وہ نضار کی عیادت کو آنے کے لئے مضطرب تھے۔ اس پر میں نے نضار کو مشورہ دیا تو کہ انہیں یہ اجازت دے دی جائے۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ موجودہ صورت حال میں براہ

راست ان سے بھی مشاورت کی جا سکے۔ نضار نے میرا مشورہ قبول کر لیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق وہ دونوں جلد بستی اشر پہنچنے والے تھے۔

نضار کی نسبت احرس تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ اس کے شانے کی ہڈی تو ابھی نہیں جڑی تھی مگر وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ وہ اکثر میرے ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ اس کی شوخیاں جاری تھیں۔ ان ہی میں اس کی ایک شوخی یہ بھی تھی کہ جب صبح کے وقت میں اجلاس والے کمرے میں ہوتی تو وہ بھی دوسروں کی طرح مجھے تعظیم دینے پہنچ جاتا۔ اس پر میں نے اسے کئی بار ڈانٹا بھی مگر وہ احرس ہی کیا جو باز آ جاتا۔ ایک روز تو اس نے حد ہی کر دی۔ کبیت والوں کا سردار بریسا مجھ سے ملنے آیا۔ میرے سامنے سجدہ ریز ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ احرس بھی پہنچ گیا۔

"آتون دیوی پر سدا دیوتاؤں کا سایہ رہے۔" یہ کہتے ہی احرس بھی میری چوکی کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔

جب احرس سجدے سے اٹھا تو میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ بریسا کے علاوہ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے کیونکہ اس وقت میں اجلاس والے کمرے میں تھی۔ احرس کو گھور کر دیکھنے کے سوا اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میری اس مجبوری کا اسے بھی اندازہ تھا۔

"اے آتون دیوی! مجھے خیر و برکت کی دعا دے۔" احرس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھے پھر مخاطب کیا۔ "دعا دے مجھے اے دیوی کہ میری نسل خوب بڑھے۔ میری ہونے والی بیوی سے اتنی اولاد ہو کہ میں اپنا قبیلہ الگ بسا لوں۔"

مجھ سے زیادہ بھلا کون سمجھتا کہ "ہونے والی بیوی" کا اشارہ کس طرف ہے۔ سو میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ احرس بظاہر بڑا سنجیدہ بنا ہوا میری طرف منتظر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سو پھر میں نے بھی اسے "مایوس" نہیں کیا۔ میں اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے نرم آواز میں بولی۔ "اے احرس! اے میرے پجاری! تو ایسی آرزو نہ کر کہ جو تیرے نصیب میں نہیں۔ میں تجھے اولاد کی دعا کیسے دوں کہ تیری پیشانی پر ابھی کوئی بوسہ دینے والی ہی موجود نہیں ہے۔ کیا خبر دیوتاؤں کی مرضی یہی ہو کہ تو سدا کنوارا ہی رہے۔"

پھر اس سے پہلے کہ احرس جواباً کچھ کہتا میں بریسا کو مخاطب کر کے اس سے کبیت والوں کا حال پوچھنے لگی۔

احرس کی تمام تر شوخیوں اور شرارتوں کے باوجود میں نے ایک بات بطور خاص محسوس کی کہ وہ مجھے بااقتدار دیکھ کر خوش بہت تھا۔ جس روز احرس کو ادل اور احزم کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ مجھ سے بولا۔ "دیکھ اے آتون! اگر تو پھر کسی جنگ کے منصوبے بنا رہی ہے تو سن لے کہ میں تیرے عشق میں ایک بار گولی کھا کر خاصی عبرت پکڑ چکا ہوں۔ اب تک گلے میں پٹی باندھے پھر رہا ہوں۔ اگر ایسا ہی ہے تو اپنے بھائی نضار کے جسم میں گولیاں کھانے کی بڑی گنجائش ہے' اب کے تو اسے اپنے ساتھ رکھیو۔ چار چھ گولیاں تو اسے پتہ ہی نہیں چلتیں کہ کدھر سے گھسیں اور کدھر سے نکل گئیں۔ اپنا کام تو ایک ہی گولی

سے ہو گیا۔ اگر کہیں کوئی دوسری گولی لگ گئی تو کام ہی تمام ہو جائے گا۔ تجھے الگ یہ رنج ہو گا "کہ تجھے خود ہی گولی کیوں نہ مار دی۔ خواہ مخواہ اسی بات کے لئے دوسروں کا احسان مول لیا۔"

میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔ "تجھ سے بھلا اور امید بھی کیا ہے؟" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

اسی وقت ایک خادم نے آ کر اطلاع دی کہ نضار کے کمرے میں رات کا کھانا لگایا جانے والا ہے اور نضار ہم دونوں کا منتظر ہے۔ جب سے نضار بستر پر پڑا تھا' مہا پجاری' احرس اور میں عموماً اسی کے کمرے میں رات کو کھانا کھاتے تھے تاکہ وہ تنہائی محسوس نہ کرے۔ ہمارے سوا اس کا اور تھا بھی کون۔ اس کے خاندان کا کوئی فرد بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ ثریان نے ایک ایک فرد کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کہ بستی اشر کا کوئی وارث ہی نہ رہے۔ نضار کی یہ خوش قسمتی تھی کہ وہ دشمن کے ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا۔

اگلے دن صبح میں اجلاس والے کمرے میں پہنچی ہی تھی کہ مجھے ادل اور احزم کے آنے کی خبر ملی۔ وہ دونوں بستی اشر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔

طویل سفر کے بعد وہ بستی اشر پہنچے تھے۔ فی الحال انہیں آرام کی ضرورت تھی۔ جب وہ مجھ سے آ کر ملے تو میں نے اسی لئے انہیں زیادہ دیر اپنے پاس بیٹھنے پر مجبور نہیں کیا اور وہ میرے پاس سے اٹھ کر نضار سے ملنے چلے گئے۔ ان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے سردار سے ملے بغیر آرام کر لیتے۔ وہ نضار کے ایسے ہی جاں نثار تھے۔

پھر اسی روز شام کو ان دونوں سے نضار ہی کے کمرے میں میری تفصیلی ملاقات ہوئی۔ نضار نے احرس اور مہا پجاری کو بھی وہیں بلوا لیا اور اس ملاقات کی نوعیت اجلاس کی سی ہو گئی۔ ادل اور احزم دور بیٹھ کر بھی بڑی حد تک صورت حال سے واقف تھے' پھر بھی جو باتیں ان کے علم میں نہیں تھیں' بتا دی گئیں۔ ان باتوں میں حلیف سرداروں سے رابطے اور ان کی طرف سے ملنے والی خبریں بھی شامل تھیں۔ نضار کے دونوں نائب بڑی توجہ سے یہ باتیں سنتے رہے۔

جب یہ گفتگو ختم ہو گئی تو احزم نے بولنے میں پہل کی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ "اے آتون دیوی! جب تک ہمارا سردار نضار بستر سے نہیں اٹھ جاتا' تیرے اس فیصلے سے مجھے اتفاق ہے کہ وادی سبز پر حملہ کیا جائے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں کہ جو تو مجھ سے بہتر جانتی ہے۔ میں اور ادل کہ جو اس کے نائب اور اس کے تربیت یافتہ ہیں' اس کی لیاقت' جنگی مہارت اور تجربے کو نہیں پہنچ سکتے۔ یہ منہ دیکھے کی بات یا اپنے سردار کی چاپلوسی نہیں' میرے نزدیک اظہار حقیقت ہے۔ ان حالات میں ہم دشمن سے فیصلہ کن جنگ نہیں کر سکتے' یہ ضرور ممکن ہے' ہم اسے مزید کمزور کر دیں۔" یہ کہہ کر احزم چند لمحے کو رکا پھر بولا۔ "وادی سبز کے گرد مشرق میں جو قبیلے آباد ہیں' ان میں صرف قلاوز کا قبیلہ ہمارے حلیفوں میں شامل ہے۔ حالیہ جنگ میں بھی دشمن نے ہماری طرف پیش قدمی کرنے کی خاطر محل وقوع کی مناسبت سے اسی

بستی کو اپنا عارضی فوجی مرکز بنایا تھا۔ وہیں سے اس کی فوجوں نے ادل اور میری طرف کوچ کیا اور پھر اسی سے بستی اشر پر بڑا حملہ کرنے میں اسے آسانی ہوئی۔ یوں جنگی نقطہ نظر سے قلاوز کی بستی کو ایک بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سو اگر اس بستی کو دشمن کے تسلط سے آزاد کرا لیا جائے تو پھر وادی کے اس طرف ہمارا کوئی حریف نہیں رہے گا۔"

"تو اے میرے دانش مند نائب احزم! اس کا مقصد بھی تو جنگ چھیڑنا ہی ہوا۔" نضار نے کہا۔ "تیرے خیال میں کیا دشمن آسانی سے اپنی اس شکست کو قبول کر لے گا؟ کیا وہ اس اہم علاقے کو اپنے ہاتھ سے نکل جانے دے گا؟"

"ہاں اے سردار! وہ اپنے وقار کی خاطر' اپنی عزت اور رعب و دبدبہ برقرار رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں ضرور مارے گا' پھر اس کے نتیجے میں اسے مزید نقصان اٹھانا پڑے گا۔ حالات سے جو ظاہر ہے اس کی یہ کوشش گیدڑ بھبکی کے مترادف ہو گی۔ وہ قلاوز کی بستی کو بچانے کی خاطر کسی بھی صورت میں وادی سبز کو داؤ پر نہیں لگائے گا۔" احزم جواب دینے لگا۔ "ہم دشمن کو یہ تاثر دیں گے کہ اس معرکہ آرائی کی حیثیت ایک جھڑپ سے زیادہ نہیں پھر جب وہ دیکھے گا کہ ہم نے قلاوز کی بستی سے آگے پیش قدمی نہیں کی تو دھوکہ کھا جائے گا۔"

"مگر اے احزم! تُو ایک بات بھول ہی گیا۔" میں بولی۔ "کیا اس طرح تُو ہمارے حلیفوں کو آزمائش میں نہیں ڈال دے گا؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ژیان ادھر آباد ہمارے حلیف پانچوں قبیلوں کے سرداروں کو ہم سے نبرد آزمائی کا حکم دے دے۔ ایسی صورت میں سردار وسیط اور دوسرے حلیف سرداروں کے لئے کیا راستہ ہو گا؟ .... یہ تو طے ہے کہ وہ ژیان کے حکم پر ہمارے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے' پھر .... پھر کیا یہ بات راز رہ سکے گی کہ وہ ہم سے مل گئے ہیں؟"

میرا سوال اتنا اہم تھا کہ فوری طور پر احزم اس کا کوئی جواب نہ دے سکا اور سوچ میں پڑ گیا۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد ادل نے بولنے کی اجازت چاہی اور کہا۔ "یہ راز صرف ایک ہی صورت میں راز رہ سکتا ہے اے معزز آتون! اگر ہمارے حلیف قبیلوں کو ژیان کی طرف سے جنگ کرنے کا حکم ملے تو وہ تعمیل حکم تو کریں' مگر صرف بظاہر۔ وہ ہمارے مقابلے سے جلد پسپائی اختیار کر لیں اور اپنے علاقوں کی طرف لوٹ جائیں۔ یوں بھی اب ان کی افرادی قوت زیادہ نہیں رہی کہ ان کے جوان وادی سبز میں جا جا کر بس رہے ہیں۔ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ان کا پیچھا نہ کریں۔ اس طرح دشمن کو دھوکہ دینا آسان ہو جائے گا اور راز بھی راز رہ سکے گا۔"

"ادل کی یہ تجویز مناسب لگتی ہے اے نضار!" میں نضار کی طرف دیکھ کر بولی۔ "جس طرح ژیان خود وادی سبز سے نہیں نکلا اور حالیہ جنگ لڑی' اسی طرح تیرے دونوں نائب بھی تو دشمن سے پنجہ آزمائی کر سکتے ہیں۔"

"بات صرف اتنی ہے اے آتون کہ ہم پہلے سے جو کچھ سوچ لیتے ہیں' کبھی کبھی عملاً ویسا نہیں ہوتا۔" نضار نے جواب میں کہا۔ "یہ معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے اور بظاہر جتنا سیدھا نظر آ رہا ہے' دراصل ویسا

نہیں۔ ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں ہر ممکنہ صورت حال کے لئے پوری طرح تیار رہنا ہو گا۔ نتائج سے قطع نظر کیا خبر دشمن جھنجلا کر خود اپنی بچی کھچی طاقت سمیٹ کر میدان جنگ میں اتر آئے۔ پھر تو یہ دشمن سے آخری معرکے ہی میں تبدیل ہو جائے گی نا۔ تو کیا اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہماری افرادی قوت دشمن پر بھاری ہو؟ .... اس کے لئے پھر ویسی ہی تمام تیاریوں کی ضرورت ہو گی جن میں ہم حالیہ جنگ سے پہلے مصروف تھے۔ ادل اور احزم کی بستیوں سے سپاہ کو یہاں آنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہمیں سردار وسیط اور دوسرے حلیف سرداروں سے بھی مشاورت کرنا پڑے گی۔ کیا ہمارا دشمن اپنے نائبوں کی طرف سے غافل بیٹھا رہتا ہے؟ کیا دشمن کے مخبر ہمارے حلیفوں کے علاقوں میں موجود نہیں رہتے؟ اور کیا ایسی صورت میں حلیفوں سے مصنوعی جنگ کا راز نہیں کھل جائے گا؟ ان تمام باتوں اور سوالوں پر سوچنے کی ضرورت ہے۔"

پھر سوچ بچار شروع ہو گیا اور سبھی اپنی اپنی رائے کا اظہار کرنے لگے۔ مہا پجاری اور احرس نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ خلاف توقع اس روز احرس نے زیادہ غیر سنجیدگی کا ثبوت نہیں دیا۔ شاید اس نے معاملے کی نوعیت و اہمیت کا اندازہ کر لیا تھا۔

کافی دیر مشورے کے بعد ان تمام سوالوں کے جواب تلاش کر لئے گئے کہ جو نضار نے کئے تھے۔ افرادی قوت کو یکجا کرنا ضروری تھا تاکہ کسی ممکنہ بڑے خطرے سے نمٹا جا سکے۔ ایسا پہلے بھی سوچا گیا تھا مگر دشمن کے اچانک حملے کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہوا تھا۔ ادل اور احزم کی بستیوں کو بالکل غیر محفوظ نہ چھوڑا جائے' اس کے لئے یہ طے ہوا کہ وہاں فوجوں کا ایک چوتھائی حصہ ضرور رہے۔ اپنے تمام حلیف سرداروں کو اعتماد میں لینے اور پوری صورت حال سے مطلع کرنے کا فیصلہ بھی ہوا تاکہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ اسی کے ساتھ اس سے ممکنہ مشوروں اور تجاویز کی راہ ہموار کرنے کے طریقہ کار پر بھی بات ہوئی۔ اس مسئلے کا حل بھی تلاش کر لیا گیا کہ قلاوز کی بستی پر حملے کو مختلف قبائل نضار کی جارحیت پر محمول نہ کریں۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ فتح کے بعد قلاوز ہی کے قبیلے سے بستی کا کوئی اور سردار منتخب کیا جائے جس کے انتخاب پر اہل قبیلہ بھی متفق ہوں اور اسے ہمارا اعتماد بھی حاصل ہو۔ ژیان کی محکومی سے پہلے یہ قبیلہ جس طرح خودمختار تھا' اس کی وہی حیثیت بحال کر دی جائے۔ یہ قبیلہ' نضار کا محکوم نہیں بلکہ حلیف کہلائے تاکہ آئندہ کے لئے دشمن اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کا خواب نہ دیکھے۔ احزم کی تجویز بہرحال قبول کر لی گئی۔ اس تجویز پر اقدامات کے لئے تیزی سے حرکت میں آنا ضروری تھا۔ سو ایسا ہی کیا گیا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر تمام انتظامات ہو گئے۔ سردار صاحی اور سردار صنعیہ کو بھی آئندہ موجودہ جنگی حکمت عملی سے بے خبر نہیں رکھا گیا۔ حلیف سرداروں نے نئی تجویز سے پورے طور پر اتفاق کیا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ ژیان کے مخبران کی نظر میں تھے۔ مصنوعی جنگ کی آڑ میں انہیں وہ خود ہی ٹھکانے لگا دینے کا ارادہ رکھتے تھے تاکہ یہ اندیشہ بھی باقی نہ رہے' ژیان کے مخبر اسے شک و شبہے میں مبتلا نہ کر سکیں۔

ادل اور احزم کے ساتھ بظاہر تمام افواج کا ایک چوتھائی حصہ جانا تھا' بقیہ ایک چوتھائی حصے کو ان کی

کمک کے لئے پیچھے رکھا گیا۔ افواج کا نصف حصہ بستی اشرہی میں خیمہ زن رہا۔ مجھے بھی نضار کے ساتھ بستی اشرہی میں ٹھہرنا تھا۔ سو مہا پجاری اور احرس بھی وہیں رہے۔

قلاوز کی بستی پر شب خون مارنے کی خاطر ادل اور احزم سورج غروب ہوتے ہی مقررہ دن اپنی افواج کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ یوں وہ نصف شب کے قریب دشمن پر ٹوٹ پڑتے۔ نضار کے دونوں نائبوں کو میں نے بستی سے باہر نکل کر رخصت کیا اور پھر لوٹ آئی۔

یہ اسی شب کا واقعہ ہے کہ پُراسرار سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ میں' نضار کے کمرے سے اٹھ کر آنے والی ہی تھی۔ اس وقت ہم ہی دونوں کمرے میں تھے۔ نضار کو اور مجھے ایک ساتھ مخاطب کیا گیا۔ "سنو تم دونوں کی یہ جنگ محدود نہیں رہے گی۔ وقت آ چکا ہے کہ اب تمہارا پرچم وادی سبز پر بلند ہو۔ تم آخر بھول جانے کے مرض میں کیوں مبتلا ہو؟ اور تم نے اپنے حلیفوں کو تو شمار کر لیا' یہ بھلا ہی دیا کہ تمہارے دشمن کے حلیف بھی موجود ہیں اور وہ ان سے رابطے بحال کر چکا ہے۔ دشمن کو اتنا کمزور نہ جانو کہ جتنا وہ بظاہر نظر آتا ہے اور تم اسے جلد قابو میں نہ کر سکو گے۔ ابھی تمہاری آنکھوں پر بہت سے پردے پڑے ہیں جو دھیرے دھیرے ہی اٹھیں گے۔ اس میں جو مصلحت ہے وقت آنے پر ظاہر ہو جائے گی اور اے نضار! تُو جب کل صبح گہری نیند سے اٹھے گا تو خود کو ویسا ہی پائے گا کہ جیسا پہلے تھا۔ خجیرہ آنے رات تیری حویلی میں آئے گی۔ تُو میری کاہنہ خجیرہ کی خوشبو محسوس کرے گا اور پھر تیرے جسم پر صرف زخموں کے نشان ہی رہ جائیں گے۔ سو یوں تُو بھی معبلہ کی طرح اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر وادی سبز کی طرف جائے گا۔ نیکی اور بدی کی جنگ کو اتنا مختصر نہ جان۔ یہ جنگ ان ہی پہاڑی بستیوں اور قبیلوں تک محدود نہیں اور اس کا اندازہ آئندہ تم دونوں کو ہو جائے گا۔ ابھی وقت نہیں آیا کہ تم پر یہ بھید کھولے جائیں' تم حیران رہ جاؤ اور کچھ بھی نہ سمجھ پاؤ۔" پھر سرگوشیاں معدوم ہو گئیں۔

بار بار یہی الفاظ میری سماعت میں گونجتے رہے' وقت آ چکا ہے کہ اب تمہارا پرچم وادی سبز پر بلند ہو۔ ہمیں واضح الفاظ میں فتح کی خوشخبری مل گئی تھی' مگر اسی کے ساتھ کچھ باتیں ایسی بھی تھیں کہ جن پر ابھی پردہ پڑا تھا۔ ہم سے اندازوں میں جو غلطی ہوئی اس کی بھی نشاندہی کر دی گئی۔ ہم سے بھول ہوئی تھی۔ وادی سبز کے گرداگرد چھوٹے چھوٹے قبائل کی اکثریت کو اپنا حلیف بنا کر اور سردار صاحی کو اپنی ہمنوائی پر آمادگی کی خوشی میں ہم نے اپنے دشمن کے ان حلیفوں کو بھلا ہی دیا تھا جو ژیان کے ساتھ معاہدہ امن کر چکے تھے۔ نضار کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا تھا کہ احزم نے جسے محض معمولی جھڑپ کہا تھا' وہ دشمن سے بڑی جنگ میں بھی بدل سکتی ہے۔ دشمن اپنے حلیفوں سے رابطے بحال کر چکا ہے' یہ اشارہ ایک بڑی جنگ ہی کی طرف تھا۔ نضار کی علالت کے سبب وادی سبز پر حملہ کرنے میں جو رکاوٹ تھی' وہ بھی دور ہونے والی تھی۔ دیوتا ہم پر مہربان تھے' سو میں اور نضار شکر بجا لائے' پھر دیر تک سرگوشیوں کے الفاظ پر غور کرتے رہے کہ ان کی گہرائی تک پہنچ سکیں۔ اس کے بعد میں نے نضار کو آرام کرنے جانے کا مشورہ دیا اور اس کے پاس سے اٹھ آئی۔ کسی ممکنہ بڑی جنگ کے لئے پہلے ہی سے تیاریاں کرنی تھیں ورنہ وہ رات بھی جاگتے ہی گزرتی۔

اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے مجھے مہا پجاری اور احرس دونوں ہی کا خیال آیا۔ مہا پجاری کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ وہ وادی سبز میں قدم رکھے۔ اب اس کی یہ خواہش پوری ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ میں اسے یہ خوشخبری سنانا چاہتی تھی۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ احرس کے بائیں شانے کی ہڈی ابھی نہیں جڑی۔ وہ ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ وادی سبز پر حملے کے وقت میرے ساتھ ہوتا۔ میں اس تذبذب میں مبتلا تھی کہ عظیم مہیمن کی کاہنہ جب حویلی میں آئے گی تو احرس کی طرف بھی اس کا پھیرا ہو گا یا نہیں؟ سرگوشیوں میں یہ اشارہ نہیں تھا۔ سو یوں مجھے احرس کو بھی بستی اشر میں رکے رہنے پر آمادہ کرنا تھا۔ میرا ارادہ اسی وقت مہا پجاری اور احرس سے ملنے کا تھا مگر ان کے کمروں کی طرف میرے بڑھتے ہوئے قدم اچانک رک گئے۔ میں نے فی الحال اپنا ارادہ بدل دیا۔ ارادہ بدلنے کی وجہ یہ تھی' اس وقت میں' احرس کو کس طرح یقین دلا سکوں گی کہ نضار کل صبح تک پوری طرح صحت یاب ہو جائے گا؟ وہ جب یہ سنتا کہ نضار میرے ساتھ وادی سبز پر حملہ کرنے کے لئے جانے والا ہے تو اس کا جذبہ رقابت دوبارہ بھڑک اٹھتا پھر احرس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ قبل از وقت میں اس سے کچھ نہ کہتی اور وہ خود نضار کو صحت یاب دیکھ لیتا تو دوسری بات ہوتی۔ وہ بستی اشر میں رکنے اور نضار کے صحت یاب ہونے کو اپنی مجبوری اور دیوتاؤں کی مرضی جان کے حقائق کو شاید قبول کر لیتا۔ محض احرس کی ضد یا دل دہی کی خاطر عظیم مہیمن کے حکم سے روگردانی کا تصور بھی میرے لئے محال تھا۔

میں نے اسی اضطراب میں وہ رات سوتے جاگتے گزاری۔ ابھی میں بستر سے نہیں اٹھی تھی کہ میرے کمرے کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ جب میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو احرس کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی احرس بول اٹھا۔ "اے میری دیوی! تیری وجہ سے دیوتا مجھ پر بھی مہربان ہونے لگے ہیں۔ میں سو کر اٹھا تو شانے پر بندھی ہوئی پٹیاں تک غائب تھیں' یہ دیکھ۔" اس نے اپنے بائیں ہاتھ کو تیزی سے گردش دی۔

میں دل ہی دل میں دیوتاؤں کا شکر بجا لائی کہ جنہوں نے مجھے ایک مشکل سے بچا لیا۔

"چل' نضار کو چل کر دیکھتے ہیں۔ کیا خبر تیرے طفیل میں دیوتاؤں نے اسے بھی بھلا چنگا کر دیا ہو۔" احرس معصوم بچوں کی طرف خوش نظر آ رہا تھا۔

"تُو اس کے پاس جا' میں ابھی لباس تبدیل کر کے وہاں آتی ہوں۔"

احرس مزید کچھ کہے بغیر تیزی سے مڑ گیا۔

اس کے بعد سارے مراحل خوش اسلوبی سے طے ہوتے گئے۔ اسی روز صبح تیز رفتار قاصدوں کو حلیف سرداروں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ادل اور احزم کو بھی نئی صورت حال سے آگاہ کرنے کے لئے قاصد دوڑا دیئے گئے۔ وادی سبز پر حملے کا آغاز ادھر ہی سے کرنا تھا کہ جدھر وہ دونوں پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے۔ اب کسی ممکنہ مصنوعی جنگ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ سردار صاحی اور سردار صنعیہ' وادی کی مغربی سمت میں آباد دشمن کے زیر نگیں بقیہ دونوں قبیلوں کو شکست دے کر دشمن کے عقب سے دباؤ ڈالتے'

ادھر ہم مشرقی سمت سے یلغار کر دیتے۔

اسی روز ہم بستی اشر سے وادی سبز پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ افواج کو دو حصوں میں بانٹا گیا تھا۔ ان میں سے ایک حصے کی کمان تو نضار کر رہا تھا اور دوسرے حصے کی کمان میرے ہاتھ میں تھی۔ نضار کے اصرار پر میں نے اس کی یہ بات مان لی تھی کہ وہ اپنی افواج کو آگے رکھے اور میں اس کی کمک پر اپنی فوج لئے عقب میں رہوں۔ بریسا نے بھی روانگی سے قبل مجھ سے التجا کی تھی کہ اسے بھی نضار کے ساتھ اگلی صفوں میں جاں نثاری کا موقع دیا جائے۔ بریسا کی التجا بھی میں نے رد نہیں کی۔ اس کے قبیلے والے جدید اور قدیم سبھی ہتھیار ساتھ لے کر چلے تھے۔ ہمارے ساتھ اتنی کثیر فوج تھی کہ سب کو گھوڑے فراہم کرنا ممکن نہیں تھا۔ سو ہمارے ہمراہ پیدل فوج بھی تھی اور گھڑسوار فوج بھی۔ زیادہ تعداد بہرحال گھڑسواروں ہی کی تھی۔ پیدل فوج بھی ساتھ ہو تو پھر تیزی سے آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا مگر ہم اس لئے فکرمند نہیں تھے کہ ادل اور احزم کے ہمراہ ہماری افواج کا آدھا حصہ گزشتہ شب ہی روانہ ہو چکا تھا۔

جلد ہی ہماری سپاہ ان پہاڑی سلسلوں کے دامن میں پہنچ کر آگے بڑھنے لگی کہ جہاں بریسا کے قبیلے والوں کو آباد کیا گیا تھا۔

میری نگاہ دور دور تک بلند ہوتے پرچموں پر تھی۔ ہرچند کہ نضار اور میرے درمیان فاصلہ تھا مگر وہ مجھے دور سے بھی اپنے گھوڑے پر سوار نظر آ رہا تھا۔

اس وقت میں سوچ رہی تھی کہ میرا نام معبلہ ہے' چوڑے پھل والا پیکاں۔ میرے نام کے معنی بھی تو یہی تھے۔ کوئی جیسے مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "اے معبلہ! تُو وہ تیر ہے کہ جو بہت جلد اپنے دشمن کے سینے میں پیوست ہونے والا ہے۔"

انہی خیالوں کے دائرے میرے وجود میں لہو کی ردش کو تیز کرتے رہے۔ میرے اندر جوش اور ولولہ بڑھتا گیا۔ میری چشم تصور وہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی کہ جنھوں نے برسوں میرے دل کو بے چین رکھا تھا۔ میرے دائیں بائیں احرس اور مہا پجاری موجود تھے۔ ان کے چہروں سے بھی عزم کا اظہار ہو رہا تھا۔ بستی قلاوز کی طرف بڑھتے ہوئے ابھی ہم اپنی سرحدی حدود عبور کرنے والے تھے کہ ہمیں پہلی خوشخبری مل گئی۔ یہ خوشخبری لے کر آنے والا نضار کے نائبوں ادل اور احزم کی جانب سے بھیجا ہوا ایک تیز رفتار قاصد تھا۔ قلاوز کی بستی پر مارا جانے والا شب خون کامیاب رہا تھا۔ قاصد نے خبر دی تھی کہ قلاوز زندہ ہاتھ نہیں آ سکا اور مارا گیا۔ دوران جنگ میں قلاوز نے وسیط اور دوسرے قبیلوں کے سرداروں سے مدد طلب کی' مگر کسی بھی سردار کی کمک پہنچنے سے پہلے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ جب قاصد وہاں سے چلا گیا تو بستی قلاوز پر ہماری فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ یہ خبر ملتے ہی سارے لشکر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ سپاہی پُرجوش انداز میں فتح کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں اسی عرصے میں گھوڑا دوڑاتی ہوئی نضار کے قریب پہنچ گئی۔ احرس بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ وہ بھلا کیسے پیچھے رہ جاتا وہ تو جیسے میرا سایہ بنا ہوا تھا۔

نضار نے مجھے اپنے قریب دیکھتے ہی کہا "پہلی فتح مبارک ہو تجھے اے آتون!"

جواب میں اسے بھی میں نے مبارک باد دی اور بولی۔ "تیرے دونوں نائب یقیناً لائق اور جنگجو ہیں۔" پھر میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "اب تک یہ خبر ہمارے دشمن تک بھی پہنچ گئی ہو گی اور قوی امکان ہے اے نضار کہ قلاوز کی بستی تک ہمارے پہنچنے سے پہلے دوبارہ جنگ چھڑ چکی ہو۔"

"یعنی ژیان نے وادی سبز سے نکل کر بستی قلاوز پر حملہ کر دیا ہو؟" نضار نے وضاحت چاہی۔ میرے اقرار پر وہ کہنے لگا۔ "میرا قیاس یہ کہتا ہے اے آتون کہ موجودہ حالات کے پیش نظر ژیان وادی سبز سے باہر آنے کے بجائے مشرق میں آباد وسیط اور دیگر چاروں سرداروں کو قلاوز پر حملے کا حکم دے گا۔ ہوں ہمیں اتنی مہلت مل جائے گی کہ ہم سہ پہر کے بعد تک بستی قلاوز پہنچ جائیں۔ ہم نے آج ہی صبح اپنے قاصدوں کے ذریعے جو پیغامات بھیجے ہیں وہ پیغامات ہمارے حلیفوں کو ژیان کا حکم پہنچنے سے پہلے مل جائیں گے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو ہمارے گزشتہ پیغامات کی روشنی میں وسیط اور دوسرے چاروں سردار ہماری فوج سے مصنوعی جنگ کے لئے کوچ کر دیں گے۔ پھر جب وہ راستے ہی میں ہوں گے تو ہمارے قاصدوں کے ذریعے انہیں کھلے اعلان جنگ کی خبر مل جائے گی۔ سو یوں اے آتون! اس میں ہمارے لئے خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

نضار کے جواب سے بڑی حد تک میں مطمئن ہو گئی اور اسی وقت مجھے عظیم مہین کی سرگوشیاں یاد آئیں۔ میں اسی لئے بولی۔ "بستی قلاوز پر ہماری فوج کے قبضے کی خبر ملنے کے بعد کیا ہمارا دشمن اپنے حلیفوں کو مدد کے لئے نہیں پکارے گا کہ جن سے وہ پہلے ہی رابطے قائم کر چکا ہے؟"

"ہاں یہ بھی ہو گا اے آتون!" نضار نے میری تائید میں کہا۔ "مگر اس میں بھی وقت لگے گا۔ جب تک اس کے حلیفوں کی فوجیں پہنچیں گی ہم وادی سبز پر حملہ کر چکے ہوں گے۔ اس کے باوجود سارا دارومدار وقت اور پیش آنے والے حالات پر ہے۔ معرکہ تو سخت ہو گا ہی' یہ تُو بھی اچھی طرح جانتی ہے اور میں بھی اس سے غافل نہیں اور سن' اصل جنگ کا مزہ بھی تو اسی وقت آئے گا جب مقابلہ برابر کا ہو۔" نضار کے لہجے میں ایک جری سپہ سالار کے حوصلے کا طمطراق تھا جو اپنے کسی کمزور دشمن پر جھپٹنا کسرِ شان سمجھتا ہے۔

پھر میں کچھ نہ بولی اور احرس کو واپسی کا اشارہ کیا۔ میری اور نضار کی گفتگو کے دوران میں بھی سپاہ آگے بڑھتی رہی تھی۔ میں جلدی ہی فوج کے اس حصے سے آ ملی جو میری کمان میں تھا۔

پیش قدمی جاری رہی اور ہم سورج غروب ہونے سے پہلے بستی قلاوز پہنچ گئے۔ راستے میں کوئی خطرہ پیش نہیں آیا۔ ادل اور احزم نے ہمارا پُرجوش استقبال کیا۔ بستی قلاوز اور اس کے گرد و نواح میں ہر طرف ہماری ہی افواج نظر آ رہی تھیں۔

قلاوز کی وہ حویلی میرے لئے اجنبی نہیں تھی کہ جہاں کبھی مجھے اور نضار کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ اسی حویلی میں اب ادل اور احزم کا قیام تھا۔ نضار' احرس اور مہا پجاری کے ساتھ میں اب اسی دالان جیسے بڑے کمرے میں تھی جہاں پہلی بار قلاوز سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے عیار سمات بھی یاد آیا کہ جس نے مردانہ لباس میں ہونے کے باوجود مجھے پہچان لیا تھا۔

ہم سب وہیں بیٹھ گئے اور اپنے آئندہ اقدامات پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ قلاوز پر تازہ تفصیلات جاننے لگے۔ معلوم ہوا کہ جنگی قیدیوں کی تعداد خاصی ہے اور ان سبھی کا تعلق قلاوز ہی کے قبیلے سے ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ طے شدہ جنگی حکمت عملی کے مطابق ہماری فوج نصف شب کے قریب اچانک ان پر ٹوٹ پڑی تھی۔ جنگی قیدیوں کو ان بستیوں کے قوانین کی رو سے تین دن کے اندر اندر قتل کر دیا جاتا تھا۔ ان بدنصیبوں کے ساتھ بھی یہی ہونا تھا مگر میرا دل اسے قبول کرنے پر جانے کیوں آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں اس کی ایک ہی وجہ آئی۔

میں جب حویلی کی طرف آ رہی تھی تو اس بستی کے اکثر گھروں سے مجھے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ یہ وہی گھر ہو سکتے تھے کہ جن کے جوان یا تو مارے گئے یا پھر انہیں قیدی بنا لیا گیا تھا۔ جنگی قیدی بنا لئے جانے کا مطلب بھی بہ الفاظ دیگر ایک یقینی موت ہی تھا۔ ادل اور احزم کو یہ احکام دے کر روانہ کیا گیا تھا کہ ممکنہ فتح کے بعد بستی میں قتل عام سے گریز کیا جائے۔ سو انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس کا سبب وہ آئندہ اقدامات تھے جن کے بارے میں پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا۔ آئندہ اس قبیلے کی خودمختار حیثیت کو برقرار رکھنا تھا۔ قلاوز کی جگہ اب اسی قبیلے کے کسی فرد کو بستی کا سردار بنانا تھا۔ ان حالات میں اس قبیلے کے جنگی قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا مجھے کھل رہا تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب وہ خاصی تعداد میں تھے۔ گھیرا اس طرح ڈالا گیا تھا کہ کسی کو فرار ہونے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ یا تو وہ مارا گیا تھا یا پھر گرفتار ہو گیا تھا۔ اس بستی کے بہت سے خاندان بھی نقل مکانی کر کے وادی سبز میں جا بسے تھے۔ اس لئے بھی آبادی میں کمی آ گئی تھی۔ کچھ دیر تو میں یہ سوچتی رہی کہ جنگی قیدیوں کے متعلق اس وقت کچھ کہوں یا نہ کہوں؟ اس کا سبب یہی تھا کہ میرے دل میں جو کچھ تھا وہ قوانین و روایات کے خلاف تھا۔ پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ کہنا ہے کہہ ہی دوں۔

"اے نضار! کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم عام معافی کا اعلان کر دیں؟" میں نے نضار کو مخاطب کیا۔

"عام معافی سے تیری کیا مراد ہے اے آتون! میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔" نضار نے مجھ سے وضاحت چاہی۔

"اس بات کو یوں سمجھ کہ میرے اندازے کے مطابق بستی کے گھروں میں بوڑھے' بچے اور عورتیں ہی رہ گئی ہوں گی۔ اس بستی کے جوان مرد یا تو مارے گئے ہیں یا پھر انہیں قیدی بنا لیا گیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے تائیدی نظروں سے ادل اور احزم کو دیکھا۔ "کیا ایسا ہی نہیں ہے؟"

"ہاں اے آتون دیوی! واقعہ یہی ہے۔" احزم نے میری بات کا جواب دیا۔

"تو پھر اے نضار! ایسی صورت میں یہ تو بڑا ظلم ہو گا کہ جو قید کر لئے گئے ہیں انہیں قتل کر دیا جائے۔ اس طرح تو یہ قبیلہ تقریباً اپنا وجود ہی کھو دے گا۔"

"مگر اے معزز آتون! اب تک خود ہمارے ساتھ بھی تو یہی ہوتا رہا ہے' یہی ظلم ہمارے لوگ بھی تو برداشت کرتے آئے ہیں۔" ادل بول اٹھا اور پھر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ میں اس سے مخاطب نہیں تھی۔ اس مداخلت پر وہ مجھ سے معذرت کرنے لگا۔

میں نے اس پر درگزر اور نرمی سے کام لیا اور بولی۔ "اے ادل! ہم اس وقت اجلاس نہیں کر رہے بلکہ یہ غیررسمی گفتگو ہے۔ تُو اگر درمیان میں بول اٹھا تو اس سے کیا فرق پڑا؟" پھر میں نے وہ بات کہہ دی جو میرے دل میں تھی۔ "میرے خیال میں دشمن اس وقت تک دشمن ہے کہ اس کے ہاتھ میں ہتھیار ہو اور اسے زیر نہ کر لیا جائے۔ اے ادل! جب وہ مغلوب ہو گیا تو اس کی حیثیت بدل گئی کہ وہ ہتھیار اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ تو کیا ایسا شخص قابل رحم نہ ہوا؟"

"بے شک وہ قابل رحم ہے' مگر دشمن پر رحم کرنا کیا خود اپنے ساتھ ظلم نہیں ہے؟" ادل بولا۔ "موقع ملتے ہی وہ پھر دشمنی پر اتر سکتا ہے۔"

"بستی اشر کے شمال میں بسنے والے دونوں قبیلوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" میں نے سوال کیا۔ "ان کے سرداروں کو کیا نضار نے معاف نہیں کر دیا تھا؟"

"لیکن جنگی قیدیوں کو اس وقت بھی قانون کے مطابق زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا اے آتون!" اس مرتبہ احزم نے گفتگو میں شرکت کی۔

"قانون کون بناتا ہے' ہمی بناتے ہیں نا! تو پھر کیا ہمیں قانون میں ترمیم کرنے یا اسے بدلنے کا حق نہیں اے احزم!"

میری بات پر احزم لاجواب سا ہو گیا تو نضار نے کہا۔ "تُو شاید یہ چاہتی ہے اے آتون کہ جنگی قیدیوں کو معافی دے دی جائے۔ ہرچند کہ ان بستیوں میں کبھی ایسا ہوا نہیں لیکن یہ کوئی ناممکن بات بھی نہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو اب تک نہیں ہوا' آئندہ بھی نہ ہو۔ پھر یہ کہ اس بستی کا معاملہ بھی ذرا مختلف ہے۔ اوّل تو یہ کہ اس بستی کے قبیلے کی آبادی ویسے ہی خاصی کم ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا قبیلہ ہے۔ اگر یہاں کے سارے جوانوں کو مار دیا گیا کہ جو قیدی بنا لئے گئے ہیں تو پھر ایک طرح سے اس کا عدم وجود برابر ہی ہو جائے گا۔ اگر دیوتا ہم پر مہربان ہوئے اور انہوں نے ہمیں اس قبیلے پر غلبہ دیا تو کیا ہم ان پر مہربان نہ ہوں جو ہمارے ہی رحم و کرم پر ہیں؟ اے مہا پجاری! تُو فیصلہ کر' کیا اس طرح ہمیں دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل نہ ہو گی؟" آخر میں نضار نے مہا پجاری کو مخاطب کیا۔

مہا پجاری چند لمحے خاموش رہا' پھر کہنے لگا۔ "یقیناً دیوتاؤں کو ظلم پسند نہیں' مگر ظلم کیا ہے اور رحم کیا' اس کا تعلق مختلف حالات اور مختلف نوعیت سے ہے۔ اس بستی کے حالات کو دیکھتے ہوئے جنگی قیدیوں کی سزا معاف کر دینا ظلم معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ان میں سے جو اطاعت پر راضی نہ ہوں اور اب بھی دشمنی کا دم بھریں بلاشبہ ان کی گردن مار دی جائے۔"

"مگر اے مہا پجاری! موت سے بچنے کے لئے دھوکا بھی تو دے سکتے ہیں؟" احزم بولا۔ "دل سے اطاعت قبول نہ کریں اور زبان سے اقرار کر لیں۔"

"دلوں کے بھید تو دیوتا ہی بہتر جان سکتے ہیں' اس پر بھلا ہم کوئی حکم کیسے لگا سکتے ہیں؟ کیسے جان سکتے ہیں کہ کس کے دل میں کھوٹ ہے؟"

"تو پھر اے مہا پجاری! فیصلہ کیسے ہو؟" میں نے کہا۔ "ہم سب میں تُو ہی بڑا ہے' سو نضار نے اسی

لئے تجھ پر فیصلہ چھوڑا تھا۔"

"اور میں اے میرے بچی! یہ فیصلہ دیوتاؤں پر چھوڑتا ہوں۔" مہا پجاری بولا۔ "کھرا کھوٹا دیوتاؤں ہی پر چھوڑ دے کہ وہی بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔ تو وہی کر کہ جو ان حالات کا تقاضا ہے۔ مجھے تیری اور نضار کی بات سے اتفاق ہے۔"

سو یوں ان پہاڑی بستیوں کا ایک اور قانون توڑ دیا گیا۔ جنگی قیدیوں کے لئے جیسے ہی عام معافی کا اعلان ہوا بستی میں ایک جشن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حویلی کے سامنے عورتوں اور بوڑھوں کا ہجوم ہو گیا۔ وہ نضار کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ نضار ہم سب کے ساتھ حویلی سے باہر آیا اور پھر ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر لوگوں کو مخاطب کیا۔ اس سے پہلے ہاتھ اٹھا کر نضار نے لوگوں کو خاموش کر دیا تھا۔

"سنو اے بستی کے رہنے والو! ہم تمہارے دشمن نہیں دوست ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان حاکم و محکوم کا کوئی رشتہ نہیں کہ دوست صرف دوست ہوتے ہیں' حاکم نہیں۔"

نضار بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ "تم عام معافی کا اعلان سن چکے اور اب سے کچھ ہی دیر بعد تمہارے جوان' تمہارے بیٹے' بھائی اور شوہر اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔ مگر صرف وہی کہ جو دوستی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو حقارت سے نہ جھٹک دیں۔ ہم تمہیں ایک ظالم کی غلامی سے نجات دلانے آئے تھے۔ سو دیوتاؤں نے ہماری سن لی۔ ظالم و سنگ دل ژیان کی محکومی میں آنے سے پہلے تمہارا قبیلہ خودمختار تھا تو اب بھی اس کی وہی حیثیت ہو گی۔ تم جس طرح پہلے اپنے سرداروں کو منتخب کرتے تھے' اب بھی ویسا ہی کرو گے۔ دشمن پھر تم پر غلبہ نہ پالے اور تمہیں غلام بنا کر نہ رکھ سکے' سو ہم تمہاری پشت پر ہوں گے۔ وہ اب تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے گا اور ایک خوشخبری بھی سن لو کہ تمہاری ہی طرح وادی سبز کے مشرق میں جو مزید پانچ قبیلے بسے ہوئے ہیں وہ پہلے ہی دشمن کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں۔ ان کی طرف سے بھی تمہیں کوئی خطرہ نہ ہو گا۔"

اس پر پھر [illegible] مسرت میں پُرجوش نعرے بلند ہوئے۔

"تمہیں تمہاری آزادی مبارک ہو اور دیوتا ہمیشہ تم پر مہربان رہیں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی نضار کی مختصر تقریر ختم ہو گئی۔

ہم سب پھر حویلی میں آ گئے۔ نضار کے احکام پر عمل درآمد میں دیر نہ کی گئی۔ چند مشتبہ افراد کے سوا تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔

ان بستیوں میں عموماً یہ ہوتا کہ بستی کا حاکم اپنے ہی نام پر بستی کا نام رکھ دیتا یا پھر اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی کے نام سے وہ بستی جانی پہچانی جاتی۔ قلاوز سے پہلے اس قبیلے کا سردار شارز تھا اور یہ بستی "شارز" کہلاتی تھی۔ شارز ہی کی نسل سے ایک نوجوان نجید تھا کہ جس کے معنی دلیر کے ہیں۔ اسی دلیر نوجوان کو بستی والوں نے اپنا نیا سردار منتخب کر لیا۔ وہ بھی جنگی قیدیوں میں شامل تھا۔ اس نوجوان کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ بستی کے بوڑھے اسے ساتھ لئے حویلی میں آئے اور ہمیں تعظیم دی۔

"اے عظیم سردار!" ایک بوڑھے نے نضار کو مخاطب کیا۔ "ہماری خواہش ہے کہ یہ بستی پھر سے اسی بہادر نوجوان نجید کے دادا شارز کے نام سے منسوب ہو اور شارز کا یہ پوتا نجید ہمارے درمیان عدل کرے۔ ہم نے تیرے حکم سے اسے اپنا سردار منتخب کر لیا ہے اور ہم تیری رضامندی چاہتے ہیں۔"

میں نے نجید کی طرف دیکھا' اس کی چوڑی پیشانی سے اقبال مندی جھلکتی تھی۔

"اے بستی کے بزرگو! تمہاری خوشی میں ہماری خوشی ہے۔ بستی شارز کا صاحب نسب نیا سردار نجید یقیناً تمہاری توقعات پر پورا اترے گا کہ تم نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہوں گے۔" نضار نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

"اے محترم و عظیم سردار!" نجید پہلی بار بولا۔ "تُو نے ہماری بستی کو جو عزت بخشی' ہم پر جو احسان کیا' اس کا کوئی بدل ممکن نہیں۔ تجھ سے میری ایک ہی التجا ہے کہ مجھے اور میرے قبیلے والوں کو بھی اپنے زیر سایہ شانہ بہ شانہ عیار دشمن سے جنگ کرنے کی اجازت دے۔"

"تجھے اور تیرے قبیلے کو یہ اجازت ہے اے نجید!" نضار نے جواب میں کہا۔ "اور اسی کے ساتھ میری خواہش ہے کہ تُو بستی سے اٹھ کر اپنی حویلی میں آ جا کہ جہاں تیرا دادا شارز رہتا تھا۔ ہماری حیثیت اب تیرے دوستوں اور مہمانوں کی ہے۔" یہ کہتے ہی نضار اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

نوجوان نجید' نضار کے بازوؤں میں سما گیا۔ اس وقت میں نے نجید کی آنکھوں میں نمی سی تیرتے دیکھی۔ اظہار دوستی کے اس انوکھے انداز سے نضار نے اس دلیر نوجوان کا دل یقیناً جیت لیا تھا۔ اس بستی کی اصل فتح کا حقیقی لمحہ بھی وہی تھا۔ صاحب اختیار ہو کر اختیار کو اپنی مجبوری نہ سمجھنا ہی تو دراصل اختیار ہے۔ سو نضار نے میرے مشورے پر عمل کر کے ایسا ہی کیا تھا۔ ہمارے وفاداروں اور جاں نثاروں میں ایک اور دلیر نوجوان کا اضافہ ہو گیا تھا۔

اس بستی میں آئے ابھی ہمیں نصف پہر بھی نہ گزرا تھا کہ سردار وسیط اور ہمارے حلیف بقیہ چاروں قبیلوں کے سردار بھی یکے بعد دیگرے اپنی فوجیں لے کر ہم سے آ ملے۔ انہیں ہمارے نئے پیغامات مل گئے تھے۔ ان پیغامات سے پہلے ہماری توقع کے مطابق انہیں ژیان کے احکام ملے تھے کہ وہ پانچوں' بستی قلاوز پر حملہ کر کے اسے نضار کے قبضے سے چھڑا لیں۔ ژیان کا خود کیا قصد تھا' اس نے اپنے احکام میں ظاہر نہیں کیا تھا۔

اب یہ عقدہ کھل چکا تھا کہ عیار دشمن نے ہمارے خلاف کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا۔ وہ وادی سبز میں غالباً اس پر مطمئن بیٹھا تھا کہ ہمیں مشرق میں آباد پانچوں قبیلوں سے الجھا کر کوئی نیا سازشی منصوبہ بنائے یا پھر ہم پر اچانک موقع پاتے ہی عقب سے حملہ کر دے۔ اسے شاید اپنے حلیفوں کی فوجوں کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ مہلت چاہتا تھا اور ہم اسے یہ مہلت دینا نہیں چاہتے تھے۔ بستی اشر سے روانگی کے وقت ہم نے جس جنگی حکمت عملی کا فیصلہ کیا تھا' اس پر اب مزید غور و خوض کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں اپنے حلیفوں کو اعتماد میں لینا بھی ضروری تھا۔ اس کے علاوہ آئندہ اقدامات سے بھی ان کی آگاہی

ہمارے حق میں تھی۔ ہمارے مقابل ایک ایسا دشمن تھا جو کسی بھی مرحلے پر کوئی خلاف توقع چال چل کر یہ ظاہری جیتی ہوئی بازی کا رخ بدل دیتا۔ پُراسرار سرگوشیوں کے یہ الفاظ ابھی تک میرے ذہن میں تازہ تھے۔ ”اور تم اسے جلد قابو میں نہ کر سکو گے۔ ابھی تمہاری آنکھوں پر بہت سے پردے پڑے ہیں۔ جو دھیرے دھیرے ہی اٹھیں گے۔“ اسی کے ساتھ وادی سبز پر فتح کی خوشخبری بھی مجھے یاد تھی۔ میرے لئے سرگوشیوں کے الفاظ کی گہرائی تک پہنچنا ایک حد تک ہی ممکن تھا۔ دشمن جلد قابو میں نہیں آسکے گا' اس کا مطلب میرے نزدیک یہی تھا کہ جنگ طول پکڑ جائے گی۔ موقع نکال کر میں نے نضار سے خلوت میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا اور اسے سرگوشیوں کے الفاظ یاد دلائے۔ میرے ہی مشورے پر احرس اور مہا پجاری کچھ دیر آرام کرنے حویلی کے ایک کمرے میں چلے گئے تھے۔ ادل اور احزم بھی نضار کے احکام کی تعمیل میں مصروف تھے۔ ان احکامات کا تعلق افواج کی از سرنو ترتیب و تنظیم سے تھا۔ وسیط اور دیگر چاروں سرداروں کو بھی حویلی ہی میں ٹھہرایا گیا تھا۔ انہیں بھی سفر کے بعد آرام کی ضرورت تھی۔ ان کے علم میں تھا کہ نضار انہیں کسی بھی وقت اجلاس کے لئے طلب کر سکتا ہے۔ نجید بھی اپنے اہل و عیال کو لے کر حویلی کے ایک حصے میں آگیا تھا۔ عملاً اس بستی کا نیا سردار ہونے کے باوجود خود ہی نجید نے یہ درخواست کی تھی کہ حالت جنگ ختم ہونے تک نضار کے احکام کا پابند رہنے کی اسے اجازت دی جائے۔ اس کی یہ درخواست نضار نے قبول کرلی تھی کہ بہرحال نجید ابھی ناتجربہ کار تھا۔ اسے رہنمائی کی ضرورت تھی۔ اجلاس شروع ہونے سے پہلے نضار سے خلوت میں میری گفتگو اس لئے ضروری تھی کہ اسی کی روشنی میں آئندہ اقدامات پر گفتگو کی جاسکے۔ پُراسرار سرگوشیاں اس نے بھی سنی تھیں اور اس راز میں نضار کے سوا کسی اور کو شریک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ حویلی ہی کا ایک کمرہ تھا جہاں ہم دونوں موجود تھے۔

”دیکھ اے آتون! دیوتاؤں کی زبان سمجھنا میرے لئے تجھ سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔“ نضار میری بات کے جواب میں بولا۔ ”یہ بات شاید میں تجھ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ مینار والے پہاڑ پر ہم نے جو سرگوشیاں سنی تھیں' ہمیں ان کی گہرائی کا علم نہ ہو سکا۔ ہم نے اس کا مطلب کچھ اور ہی لیا' سو اب بھی کیا خبر نا سمجھی میں کوئی غلط قدم اٹھالیں۔ جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے' مجھے تیرا یہی خیال درست لگتا ہے کہ یہ جنگ جلد ختم ہونے والی نہیں۔“

”اب تو جو بھی ہو اے نضار!“ میں نے کہا۔ ”جنگ جلد ختم ہو جائے کہ طول پکڑے' کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آسکتا۔ ہمارے ہی پیغام کے مطابق کل صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی سردار صاحی اور سردار صنعیہ جنگ کا آغاز کر دیں گے۔ ہمیں بھی تیزی سے حرکت کر کے عین اسی وقت وادی پر حملہ کرنا پڑے گا۔ پھر یہ بھی نہ بھول کہ کل ہی صبح خود وادی سبز میں بھی شورش برپا ہو جائے گی۔ وادی میں آباد کئے جانے والے پانچوں قبیلوں کے لڑاکا نوجوان اپنے سرداروں کے حکم سے روگردانی نہیں کریں گے۔ سردار وسیط اور بقیہ چاروں سرداروں نے ہمارے ہی پیغام ملنے پر تو اپنے قبیلوں کے نوجوانوں کو یہ حکم بھیجا ہے۔ اس کی مزید وضاحت اجلاس میں ہو جائے گی کہ ابھی ان سے تفصیلی گفتگو کا موقع ہی کب ملا ہے؟“

”تو کھلا یہ آتون کہ حملہ تو ہمیں کل ہی صبح کرنا ہے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اس کے بڑے بھیانک نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ ہم سردار صاحی اور سردار صنعیہ کو دشمن کے مقابلے پر تنہا ہرگز نہیں چھوڑ سکتے' اس کے علاوہ وادی میں موجود قبیلوں کے نوجوانوں کو بھی بلا سبب نہیں کٹوا سکتے۔ پھر تو ہمارا دشمن شیر ہو جائے گا۔ اسے پلٹ کر ہم پر حملہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔“

نضار کے خیال سے میں نے اتفاق کیا اور اور بولی۔ ”اس میں دیوتاؤں کی مصلحت کیا ہے؟ وقت سے پہلے ہم نہیں جان سکتے۔“

پھر میرے اور نضار کے درمیان یہی طے پایا کہ اجلاس منعقد کرنے میں مزید دیر نہ کی جائے۔ اسی رات ہم نے کچھ اور اہم باتیں بھی کیں۔

رات کا ایک پہر گزر چکا تھا کہ وہ اہم اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس کا صدر نضار ہی تھا اور میں اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اس اجلاس میں صرف ایک شخص ایسا تھا کہ جو میری اصل شخصیت و حیثیت سے آگاہ نہیں تھا۔ وہ اس بستی کا نیا سردار نجید تھا' مگر اب اس سے بھی رازداری کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ قبیلہ کبیت کے سردار بریسا کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میں ”آتون دیوی“ ہونے کے علاوہ وادی سبز کی وارث بھی ہوں اور میرا اصل وطن وہی ہے۔ تریال والوں کو خود میں ہی بہت پہلے اس راز سے آگاہ کر چکی تھی۔ ادل اور احزم بھی یہ سب کچھ جانتے تھے۔ اب اگر دشمن پر یہ راز کھل بھی جاتا کہ ”آتون دیوی“ کے پردے میں دراصل کون ہے تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس کے برعکس درپیش جنگ پر اس کے خوشگوار اثرات ہی مرتب ہونے کا امکان تھا۔ ژیان کے حلیف یا تو تذبذب کا شکار ہو جاتے یا پھر ان میں سے کچھ مجھے حق پر جان کر دشمن کا ساتھ نہ دیتے۔

گفتگو کا آغاز صدر کی حیثیت سے نضار ہی نے کیا۔ ”اے قابل احترام سردارو اور اے میرے جاں نثار ساتھیو! اس بستی کے نئے نوجوان سردار نجید کے سوا تم میں سے ہر شخص کو یہ بات معلوم ہے کہ یہ جنگ' میری جنگ نہیں ہے اور نہ میں وادی سبز پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وادی سبز کی اصل وارث معبلہ کا اور میرا دشمن ایک ہی ہے' وہ کہ جس نے میرے سارے خاندان کو تباہ کر دیا اور وہ کہ جس نے معبلہ کے ماں باپ کو بھی قتل کرایا۔ تم سے یہ بھی چھپا نہیں کہ آتون اور معبلہ ایک ہی شخصیت کے دو رخ ہیں۔ سو اپنا حق حاصل کرنے کی خاطر معبلہ ہی دراصل وادی سبز پر حملہ کر رہی ہے اور میری حیثیت اس کے نائب کی ہے یا ایک سپہ سالار سے زیادہ مجھے کوئی اور درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ میں..........“

”نہیں اے بہادر باپ کے عظیم فرزند!“ مہا پجاری بول اٹھا۔ ”تُو نہ ہمارا نائب ہے' نہ سپہ سالار۔ تجھے ہم برابری کا حق دیتے ہیں۔ یہ تیری اعلیٰ ظرفی ہے کہ تُو نے خود کو معبلہ سے کم ظاہر کیا' مگر اس سے تیری بڑائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تُو اور تیرا بہادر مظلوم باپ سردار اشر جس طرح ہماری نظر میں پہلے تھے' سو آج بھی اتنے ہی قابل عزت ہیں۔ میں نے تجھے درمیان میں اس لئے ٹوک دیا کہ تُو مجھے اور میری بچی معبلہ کو احسان فراموش نہ سمجھ لے۔ سردار اشر نے بھی ہم پر احسان کیا اور اس وقت پناہ دی کہ جب

معبلہ بہت چھوٹی تھی۔ پھر جب وہ جوان ہو گئی اور اس طرف پلٹی تو وہ تُو وہی تھا کہ جس نے اپنے شریف خون کی روایت کو برقرار رکھا۔ سو جان لے اے نضار کہ یہ جنگ ہم سب کی جنگ ہے۔" مہا پجاری جذباتی ہو گیا۔ "تُو اپنے یہ الفاظ واپس لے کہ یہ جنگ' تیری جنگ نہیں۔"

"تیرا حکم بھلا میں کیسے ٹال سکتا ہوں اے وادی سبز کے مہا پجاری!" نضار مسکرا کر بولا۔ "میرا مقصد محض یہ واضح کرنا تھا کہ مجھے ان میں شمار نہ کیا جائے جو اپنے علاقوں کی سرحدوں میں توسیع کے لئے انسانی خون بہاتے ہیں۔"

"سو میں گواہی دیتا ہوں کہ سردار نضار ان میں سے نہیں۔" سردار وسیط بھی خاموش نہ رہا۔

"اور ہم بھی اس کے گواہ ہیں۔" سردار وسیط کے ساتھ آنے والے چاروں سردار بھی ہم آواز ہو کر بولے۔

"دیوتاؤں نے سردار نضار اور دیوتاؤں کی چہیتی معبلہ کو ایک ظالم کے دست ستم سے رہائی دلانے ہم تک بھیجا۔" سردار وسیط نے مزید کہا۔ "سو ہم نے اس پر فخر کیا اور رہائی پا گئے۔ میں وہ خوش نصیب ہوں کہ جسے پہلے یہ عزت بخشی گئی۔"

ممکن تھا کہ سردار وسیط کچھ اور کہتا کہ میں نے بول کر گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ "اے محترم سردار! یہ بتا کہ ہمارے پیغام کے مطابق وادی سبز میں آباد کئے جانے والے قبیلوں کے نوجوانوں تک تیرا اور تیرے ساتھی سرداروں کا حکم پہنچ گیا ہو گا؟"

"ہاں اے سردار اشم کی عظیم بیٹی!" سردار وسیط نے تصدیق کر دی۔ "کل ہی صبح وادی سبز میں شورش برپا ہو جائے گی۔"

"اور جن بستیوں یا علاقوں کے لوگ خود اپنے حاکموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو ان پر غلبہ پا لینا زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔" مہا پجاری نے کہا۔ "اس طرف سے ہم اپنے دشمن پر یلغار کریں گے اور عقب سے سردار صاحی' سردار صنعیہ کو اپنے ساتھ ملا کر دشمن کو مغربی قبیلوں کی کمک نہ پہنچنے دے گا۔ دیوتاؤں نے ہمارے لئے راستے ہموار کر دیئے ہیں اور اس پر ہم ان کا جتنا بھی شکر بجا لائیں سو کم ہے۔"

"مگر اے مہا پجاری! تیرے ذہن سے شاید ایک بات محو ہو گئی۔" میں بولی۔ "ہمارا دشمن بھی اب تک اپنے حلیفوں سے رابطہ قائم کر چکا ہو گا۔" میں نے دانستہ یہ الفاظ اس طرح ادا کئے کہ جیسے بطور قیاس یہ بات کہہ دی ہو۔ سرگوشیوں کے ذریعے مجھ پر پہلے ہی یہ انکشاف ہو چکا تھا مگر میں اجلاس میں یہ بات ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ "سو کیا خبر ہم نے جسے کمزور سمجھ لیا ہے' وہ درحقیقت کمزور نہ ہو اور اسے بروقت اپنے حلیفوں کی طرف سے مدد مل جائے۔ ایسی صورت میں یہ جنگ بہرحال آسان نہیں ہو گی۔ ہمیں کسی بھی ایسے امکان کے لئے پہلے ہی سے تیار رہنا ہے۔"

"وادی سبز کی وارث نے جس اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے' وہ یقیناً نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔" سردار وسیط میری تائید میں کہنے لگا۔ "یہ بات ہمارے علم میں بھی ہے کہ ژیان نے بہت پہلے اپنی قوت کے

طاقت کے بل پر اردگرد بسنے والے بہت سے قبیلوں سے امن کے پُرفریب معاہدے کئے تھے۔ ان معاہدوں کی رو سے وادی سبز پر حملے کو ان بستیوں اور قبیلوں پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ موجودہ صورت حال میں ژیان ان معاہدوں سے ضرور فائدہ اٹھائے گا کہ وہ بڑا عیار ہے۔"

"لیکن اے محترم سردار! جب انہیں خبر ہو گی کہ وادی سبز پر حملہ کرنے والا نضار نہیں بلکہ سردار اشم کی بیٹی معبلہ ہے اور یہ کہ نضار صرف حق کا ساتھ دے رہا ہے تو پھر شاید صورت حال بدل جائے۔" مہا پجاری نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو اے مہا پجاری! اور پھر جنگ کا نقشہ بدل جائے۔" نضار نے کہا۔ "مگر ہم اس پر انحصار نہیں کر سکتے۔ ہمیں بہرطور ژیان کے ان حلیفوں سے بھی نبرد آزمائی کے لئے تیار رہنا پڑے گا۔ میدان جنگ میں اچانک کیا نئی صورت حال پیش آ جائے' اس کی پیشگوئی ممکن نہیں۔"

احرس بھی اجلاس میں موجود تھا۔ وہ مہا پجاری کے قریب ہی بیٹھا تھا لیکن وہ اس وقت بڑی خاموشی اور سنجیدگی سے اجلاس کی کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا۔ اس کے رویے میں یہ تبدیلی یقیناً حالات کا تقاضا تھی۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا' بقا کی جنگ تھی۔ احرس کو شاید بخوبی اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کی خاموشی سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کا تعلق نہ تو قبائل کی باہمی یگانگت' سیاست یا چپقلش سے تھا' نہ کسی کی فتح و شکست سے اسے کوئی دلچسپی تھی۔ اس کا تعلق تو صرف مجھ سے تھا۔ میرا مفاد' اس کا مفاد اور میری جیت اس کی جیت تھی۔ اس وقت اجلاس میں موجود تمام ہی افراد میری فتح کے امکانات کے ہر پہلو کا جائزہ لے رہے تھے' اس پر بحث و مشورہ کر رہے تھے تو پھر وہ کیوں بولتا۔ ذاتی طور پر جری ہونے کے باوجود وہ بہرحال جنگی معاملات میں زیادہ تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا تجربہ محض انہی معرکہ آرائیوں تک محدود تھا جن میں بستی تریال سے چلنے کے بعد اب تک محض میری وجہ سے اسے شرکت کرنا پڑی تھی۔ احرس کی خاموشی مجھے اس وقت اسی لئے بڑی غنیمت معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے اس رویے پر وہ مجھے کئی بار داد طلب نظروں سے دیکھ چکا تھا اور میں مسکرا دی تھی۔

پھر مختلف تجاویز پیش کی گئیں اور ان کے روبہ عمل ہونے کے امکانات پر غور کیا گیا۔

نئی تجاویز اور حکمت عملی کے تحت مجھے اور نضار کو اپنے اپنے لشکر لے کر سب سے آگے رہنا تھا۔ ہمارے ساتھ نضار کے دونوں نائب ادل اور احزم بھی تھے۔ ان کے علاوہ قبیلہ کبیت کا سردار بریسا اور تریال سے میرے ساتھ آنے والی فوج کا سپہ سالار آنف اور بستی اشر کے شمال میں آباد دونوں قبیلوں کے سردار بھی ہماری سپاہ میں شامل تھے۔ افواج کے دوسرے حصے کی کمان سردار وسیط کے سپرد کی گئی۔ اپنے قبیلے کے ساتھ ساتھ سردار وسیط کو بقیہ پانچوں قبیلوں کو بھی لڑانا تھا۔ اس جنگ کا پہلا مرحلہ ان پہاڑوں پر عبور کرنا تھا جن کے دامن میں کھلا میدان تھا اور پھر اسی میدان کو عبور کر کے وادی کی آبادی پر حملہ کرنا ممکن تھا۔ تمام ہی سردار اس بات پر متفق تھے کہ پہاڑوں کے دامن میں دور تک پھیلا ہوا یہی میدان' دراصل میدان جنگ بنے گا۔

پہاڑوں پر چڑھنے کی بجائے مختلف دروں کے ذریعے وادی سبز میں داخل ہونا بہت آسان تھا مگر

دانستہ اس سے گریز کیا گیا۔ اس گریز کی وجہ دشمن کو اپنی طرف سے دھوکے میں رکھنا تھا۔ وہ یہی سوچتا کہ ہم وادی پر حملہ کرنے کے لئے آسان راستے کو ترجیح دیں گے۔ پہاڑوں پر چڑھنا اور پھر ان سے اتر کر دشمن پر حملہ کرنا بڑا مشقت طلب کام تھا۔ دشمن کو ہرگز یہ گمان نہ ہوتا کہ ہم یہ دشوار گزار راہ اختیار کریں گے۔ ان پہاڑوں پر قبضہ کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ہم صبح ہونے سے پہلے پہلے وہاں تک پہنچ جاتے۔

بستی قلاوز کہ اب جس کا نام بستی شارز ہو چکا تھا' وہاں سے پہاڑوں کا فاصلہ نصف پہر سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ ہم اسی لئے نصف شب گزرتے ہی اپنی سپاہ کو لے کر روانہ ہو گئے۔ صبح ہونے سے قبل ہم ان پہاڑوں پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے۔ اسی کے ساتھ ہم نے مزاحمت کے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا۔ شیرویہ کے ذریعے یہ بات ہمارے علم میں آ چکی تھی کہ وہاں دشمن کی سرحدی چوکیاں موجود ہیں۔ ایسی سرحدی چوکیوں پر کتنے سپاہی موجود رہتے ہیں' ہم اس سے بھی آگاہ تھے۔ سو ان سے نمٹنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہاں اس سے یہ ضرور ممکن تھا کہ دشمن چوکنا ہو جاتا' مگر اس وقت تک ہم پہاڑوں پر قبضہ کر چکے ہوتے۔

اس کے بعد سردار وسیط اپنی فوج کو ساتھ لے کر ایک طرف سے ان پہاڑوں کی طرف بڑھتا اور ہم دوسری جانب سے ادھر بڑھے۔ وہ پہاڑ نہ زیادہ بلند تھے اور نہ اتنے دشوارگزار کہ ان پر گھوڑوں کو چڑھانا ممکن نہ ہوتا۔ ہاں اس کے لئے گھوڑوں سے اترنا بہرحال ضروری تھا۔ اس کے باوجود ہم نے کوہ پیمائی سے متعلق تمام ضروری سامان اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

صبح ہونے سے بہت پہلے ہم ان پہاڑوں کے قریب پہنچ گئے۔ ان پہاڑوں میں دشمن کی سرحدی چوکیاں کہاں کہاں واقع ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی ہمیں جلد ہی مل گیا۔ پہاڑی دروں کے قریب خاصے خاصے فاصلے پر مشعلیں روشن تھیں۔

رات کے آخری حصے میں یوں بھی سرحدی محافظ زیادہ مستعد و چوکنا نہیں رہ پاتے۔ یہ صورت حال بھی ہمارے ہی حق میں گئی۔ کبیت کے سردار بریسا نے ان سرحدی چوکیوں پر حملہ کرنے کی اجازت چاہی کہ وہ تو بچپن ہی سے پہاڑوں کا کیڑا تھا۔ اس طرف صرف چار سرحدی چوکیاں تھیں۔ سو بریسا نے چار دستے ترتیب دیئے اور اجازت ملتے ہی پہاڑوں کی طرف رینگ گیا۔

ان پہاڑوں کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی نضار کے حکم پر تمام مشعلیں بجھا دی گئی تھیں۔ لشکر کو مزید پیش قدمی سے روک دیا گیا تھا۔

سارا لشکر جیسے سانس روکے ان پہاڑوں کے قریب رکا ہوا تھا۔ سرحدی چوکیوں پر قبضے کے بعد ہی لشکر اب آگے بڑھنا تھا۔

خاصی دیر انتظار کرنے کے بعد آخر وہ لمحات آ ہی گئے کہ بیک وقت کئی جگہ سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً بریسا کے فوجی دستوں نے سرحدی محافظوں کی چوکیوں پر حملہ کر دیا تھا۔ کچھ دیر دھماکے سنائی دیئے اور پھر پہاڑوں کی طرف سے مشعلوں کے ذریعے مخصوص اشارے ہوئے۔ اسی کے

ساتھ تیزی سے لشکر پہاڑوں کی طرف بڑھا۔ ان مخصوص اشاروں کا مطلب یہی تھا کہ بریسا سرحدی چوکیوں پر قبضہ کر چکا تھا۔

ان پہاڑوں پر چڑھنا مشکل تو ضرور تھا مگر ناممکن نہیں۔ سو ہمارا لشکر اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ میرے دائیں بائیں نضار اور احرس موجود تھے۔ نضار نے پُرجوش آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "اے معبلہ! ہم نے آدھی جنگ جیت لی۔" اب مجھے آتون کہنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی احرس بول اٹھا۔ "وہ کیسے اے میرے بھائی نضار! ابھی تک صرف چند گولیاں چلی ہیں۔" پھر اس کے لہجے میں روایتی شوخی عود کر آئی۔ "جلد بتا دے کہ کہیں میں یہ راز جاننے سے پہلے ہی اس دنیا سے کوچ نہ کر جاؤں۔"

"کبھی اپنی عقل بھی استعمال کر لیا کر کہ یہ دیوتاؤں نے اسی لئے تجھے دی ہے اے احرس!" میں بول اٹھی۔

"میری ساری عقل تو اے معبلہ! صرف آتون دیوی نے چاٹ لی' اب میرے پاس کیا بچا ہے کہ جسے استعمال کروں۔"

"اے میرے بھائی احرس! میں تجھے بتاتا ہوں۔" نضار نے احرس سے کہا۔ "ہم بلندی پر ہیں اور ہمارا دشمن نیچے کھلے میدان میں ہو گا۔ پھر ہم اسے بڑی آسانی سے نشانے پر رکھ لیں گے۔ اب تو سمجھ گیا کہ میں نے آدھی جنگ جیت لینے کی بات............"

نضار کا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اچانک اندھیرے مجھ پر روشن ہو گئے اور میں چونک اٹھی۔ میرے نزدیک ایسا بلاسبب نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے اندر اندھیرے میں دیکھنے کی پُراسرار قوت بیدار ہو جاتی۔ میں' نضار کو اس سے آگاہ کرنے والی تھی کہ معاً مجھے احرس کی موجودگی کا خیال آ گیا۔ پھر میں کچھ نہ بولی اور میری نظریں وادی سبز کی طرف اٹھ گئیں۔

معلوم نہیں اس وقت احرس کیا کہہ رہا تھا کہ نضار نے مجھے مخاطب کیا۔ "اے معبلہ! میں دور دور تک دیکھ رہا ہوں کہ مجھ میں............" پھر وہ ایک دم سے چپ ہو گیا۔

میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ نضار مجھے کیا بات بتاتے بتاتے رک گیا ہے۔ دور دور تک دیکھ لینے کا مطلب میں سمجھ گئی تھی۔ نضار بھی یقیناً اندھیرے میں دیکھنے کا اہل ہو چکا تھا۔ اس کی زبان بند ہو جانے کی وجہ بھی احرس ہی ہو سکتا تھا۔

ذرا ہی دیر گزری ہو گی کہ مجھے گھڑسواروں کا ایک دستہ بڑی تیزی کے ساتھ پہاڑوں کی طرف آتا دکھائی دیا۔ ان میں کسی کے پاس بھی مشعل نہیں تھی۔ انہوں نے غالباً دانستہ ایسا کیا تھا کہ انہیں دور سے نہ دیکھا جا سکے۔ ان پہاڑوں کی طرف گھڑسوار دستے کا خاموشی سے آنا ایک ہی اشارہ کر رہا تھا کہ دشمن نے کسی خطرے کی بو محسوس کر لی تھی۔ پہاڑوں میں گولیاں چلنے کی آوازیں شاید بستی میں موجود محافظوں نے بھی سن لی تھیں یا پھر کوئی سرحدی محافظ کسی طرح بچ کر بستی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہی ہوا تھا تو بچ کر نکل جانے والے محافظ نے یہی بیان کیا ہوا گا کہ چند نامعلوم افراد نے اچانک

چوکی پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ حملہ آور کون تھے اور کہاں سے آئے تھے' ظاہر ہے اس سلسلے میں وہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا ہو گا۔ ان حالات میں اس گھڑسوار دستے کی آمد تفتیش احوال کے سوا کچھ اور ممکن نہیں تھی۔ اگر اس واقعے کو کسی جنگ کا پیش خیمہ تصور کیا جاتا تو صورت حال مختلف ہوتی۔ پھر پہاڑوں کی طرف صرف یہی ایک دستہ نہ آتا۔ میرے ذہن نے انتہائی سرعت کے ساتھ متوقع نتائج اخذ کر لئے۔

نضار کی نظریں بھی انہی گھڑسواروں پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے بے اختیار اسے مخاطب کیا۔ "ان گھڑسواروں میں سے کسی کو بچ کر نہیں جانا چاہئے اے نضار!"

"انہیں ابھی گولیوں کی زد میں آ لینے دے اے معبلہ!" نضار نے اپنی رائفل شانے سے اتار لی۔

"میں سمجھ گیا کہ تُو کیا چاہتی ہے .... دشمن کو ابھی اصل خطرے کی خبر نہیں ملنا چاہئے۔ اسے صبح ہونے تک غافل رکھنا ہے۔ تُو یہی تو چاہتی ہے نا؟" نضار کا انداز تصدیق طلب تھا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے احرس بول اٹھا۔ "اے میرے بھائی نضار اور اے معبلہ! تم دونوں کو آج کیا ہو گیا ہے۔ کہیں تم کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟ .... کیسے گھڑسوار' اور ہیں کہاں وہ؟ مجھے تو کہیں بھی کوئی نظر نہیں آ رہا۔ نہ دور تک کوئی مشعل نظر آ رہی ہے۔"

"وہ تجھے نظر نہیں آئیں گے اے احرس کہ ان کے پاس مشعلیں نہیں ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

"پھر تم دونوں کو وہ کس طرح نظر آ گئے جب کہ رات بھی اندھیری ہے؟ چاندنی ہوتی تو خیر..........."

میں نے احرس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی نضار کو مخاطب کیا۔ "آنے والے محافظ' سرحدی چوکیوں پر اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر اگر بستی میں واپس پہنچ گئے تو پھر یہ خبر وہ یقیناً ژیان تک پہنچا دیں گے۔ اس کے بعد غیر متوقع طور پر صبح ہونے سے پہلے ہی جنگ چھڑنے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

"ایسی صورت میں بھی وہ نقصان ہی اٹھائے گا۔" نضار بولا۔ "مگر بہتر یہی ہے کہ جنگ کا آغاز اسی وقت ہو جب ہم چاہتے ہیں۔ ایک ساتھ وادی کی دونوں جانب سے اسے جنگ چھڑنے کی خبر ملے اور پھر خود وادی سبز میں بھی ہنگامہ ہو جائے تو پھر یقیناً وہ حواس باختہ ہو جائے گا۔"

"میرا خیال ہے نضار کہ وہ اب اتنے قریب آ گئے ہیں کہ ہم انہیں بھون کر رکھ دیں۔" میں نے گھڑسوار دستے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں اے معبلہ! .... ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں لگتی' بس آٹھ دس ہوں گے۔" نضار بولا۔

پھر بیک وقت نضار اور میری رائفلوں نے آگ اگلنا شروع کر دی۔ ہم نے ان کے سروں اور سینوں ہی کو نشانہ بنایا تھا تاکہ کوئی زندہ نہ بچ سکے۔ زخمی ہو کر ان میں سے کوئی بھی بچ کر نکل سکتا تھا۔ ہم جس پہاڑ پر تھے' اس کے دامن میں ان آنے والے محافظوں کی آخری چیخیں گونجیں اور معدوم ہو گئیں۔

"واقعی۔" احرس نے کہا۔ اس کی آواز میں شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "تم دونوں تو بڑے کمال دکھاتے ہو۔ تمہیں تو اندھیرے میں بھی سجھائی دیتا ہے۔"

قریب آ جانے کے سبب احرس نے شاید گھڑسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سن لی تھیں اور پھر ان کی چیخیں بھی۔

"اب تجھے یقین آیا کہ ہم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے تھے۔" میں احرس سے مخاطب ہوئی۔

"تُو اگر اب یہ بھی کہہ دے کہ سورج نکل آیا تو گھڑی بھر کو مجھے یہ سوچنا پڑ جائے گا' کیا خبر واقعی سورج نکل آیا ہو اور مجھے نہ نظر آ رہا ہو۔" احرس اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ نضار بھی ہنسنے لگا۔ اس پر احرس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "تم دونوں مجھ پر ہنس رہے ہو یا سورج پر؟"

"کیا تجھے اس وقت سورج نظر آ رہا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"خیر........ ابھی سورج تو دکھائی نہیں دیا' ہاں چاند ضرور یہیں کہیں موجود ہے۔ بس دیکھنے والی آنکھ چاہئے۔"

"جو ظاہر ہے کہ تیرے پاس نہیں۔" میں نے دانستہ احرس کے ذو معنی الفاظ کو ہنسی میں اڑا دیا کیوں کہ وہاں نضار بھی تھا۔ کبھی کبھی ان دونوں کی موجودگی میں میرے لئے صورت حال کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ عموماً صورت حال کو بگاڑنے میں احرس ہی کا ہاتھ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی احرس کی باتوں سے کچھ ایسی ہی فضا پیدا ہو سکتی تھی۔ میں نے اسی لئے فوری طور پر موضوع گفتگو بدل دیا اور ممکنہ جنگ کے امکانات پر بات کرنے لگی۔

پھر جب رات کا اندھیرا دھیرے دھیرے صبح کی آغوش میں سمٹنے لگا تو وادی میں کچھ غیر معمولی سرگرمی کا سا احساس ہوا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔

پہاڑوں اور آبادی کے درمیان نقل و حرکت سی دکھائی دینے لگی۔ یہ نقل و حرکت پھیلتے پھیلتے ہمارے دائرہ نظر تک آ گئی۔ میں نے چونک کر نضار کی طرف دیکھا اور بولی۔ "یقیناً یہ سپاہ جو اب پہاڑوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے' پہلے ہی سے آبادی کے باہر خیمہ زن ہو گی جو زیادہ فاصلہ ہونے کے سبب ہمیں نظر نہیں آئی تھی۔ لگتا ہے کہ ہمارا دشمن گزشتہ روز ہی کوچ کی تیاریوں کا حکم دے چکا ہو گا۔"

نضار نے میری تائید کی اور کہا۔ "ہمیں اس نے اپنی دانست میں مشرقی قبیلوں سے الجھا رکھا ہے اور اب گویا عقب سے ہم پر حملہ کرنے وادی سے نکلنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ رات کو ان پہاڑوں میں جو کچھ ہوا ممکن ہے اس کی خبر بھی دشمن کو مل چکی ہو۔ پھر بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ اس نے گزشتہ رات کے واقعے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی یا اسے اپنی بچت کے لئے رات کے پہرے پر موجود محافظوں نے لاعلم ہی رکھا ہے۔ تُو فوج کی کثرت دیکھ رہی ہے اے معبلہ!"

"ہاں میں نے دیکھا اے نضار کہ دشمن کے ساتھ کافی فوج ہے اور جان گئی' اس کی وجہ کیا ہے .... تیری خواہش پوری ہوتی نظر آ رہی ہے' مقابلہ تقریباً برابر کا ہو گا۔ اس نے یقیناً اپنی مدد کے لئے

اپنے حلیفوں کو جمع کر لیا ہے۔"

"اور غالباً اس کے حلیفوں کی یہ فوج وادی کی مغربی سمت سے یہاں تک پہنچی ہو گی کیوں کہ مشرق میں تو ہم خود موجود تھے۔"

"مگر اس کے حلیفوں میں تو سردار صاحی بھی شامل ہے۔" میں بولی۔ "کیا اس نے سردار صاحی کو مدد کے لئے نہیں پکارا ہو گا؟"

"ممکن ہے اس نے سردار صاحی کو بعد میں خبر کی ہو' سو وہ ہمیں پہلے سے آگاہ نہ کر پایا۔ یوں بھی اس کے حلیفوں میں قریب ترین حلیف سردار صاحی ہے۔ اس نے پہلے ان حلیفوں سے رابطہ قائم کرنا ضرور سمجھا ہو جو زیادہ فاصلے پر ہیں۔"

"لیکن سردار صنعیہ تو مغربی سمت ہی میں ہے' وہ ان فوجوں کی وادی میں آمد سے کس طرح بے خبر رہا؟" میں نے سوال کیا۔

"اے معبلہ! تُو نے ان دو قبیلوں کو کیوں بھلا دیا کہ جو سردار صنعیہ ہی کی طرح مغرب میں آباد ہیں اور ژیان ہی کے نائب وہاں مقرر ہیں۔ تُو نے اگر وہ علاقہ دیکھا ہوتا تو یہ سوال نہ کرتی۔ سردار صنعیہ کی بستی سے وادی تک پہنچنے کا راستہ زیادہ دشوار اور ناہموار ہے جب کہ بقیہ دونوں بستیوں کے درمیان سے گزرنے والی ایک شاہراہ فوجوں کی نقل و حرکت کے لئے بہت مناسب اور ہموار ہے۔"

"میں نضار کے جواب سے مطمئن ہو گئی تو احرس بول اٹھا۔ "اے میرے بھائی نضار! کیا اب پہاڑوں سے اتر کر لڑنا ہے یا.........."

"نہیں۔" نضار نے احرس کی بات کاٹ دی۔ "ہم اس وقت تک پہاڑوں ہی پر رہ کر لڑیں گے جب تک دشمن ہماری گولیوں کی زد میں رہے گا۔ پھر جب وہ پسپا ہو کر پیچھے ہٹنے لگے تو ہمیں پہاڑوں سے اترنا پڑے گا۔ ہم نے یہی طے بھی کیا تھا' شاید تجھے یاد نہیں رہا۔"

اس گفتگو کے دوران میں دشمن کی فوج کچھ اور آگے بڑھ آئی' مگر اب بھی وہ ہماری گولیوں کی زد سے خاصی دور تھی۔ مہا پجاری ایک اور قریبی پہاڑ پر احزم کے ساتھ تھا۔ میں نے چاہا کہ احرس بھی مہا پجاری کے ساتھ رہے لیکن احرس میرے اور نضار ہی کے ساتھ رہنے پر مصر تھا۔

دشمن پر شدید ضرب لگانے کے لمحات قریب سے قریب تر آتے گئے۔ وہ بے خبری میں اپنی موت کی طرف بڑھتا رہا۔ اسی کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں دل ہی دل میں دیوتاؤں سے ایک دعا کر رہی تھی اور یہ دعا بڑی عجیب تھی۔ اپنے دشمن کی زندگی کے لئے دعا کر رہی تھی کہ وہ میدان جنگ میں نہ مارا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بھی ژیان کو اسی طرح عبرت ناک موت سے دوچار کرنا چاہتی تھی جس طرح اس نے میرے بابا سردار اشم کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کرایا تھا۔ ژیان کا سر کاٹ کر اس کی گردن پر لوہے کا دہکتا ہوا توا رکھا جاتا اور وہ "رقص بسمل" پیش کرتا تو میری روح کو قرار آتا۔ اس کے بعد ژیان کے کٹے ہوئے سر اور بقیہ جسم کے حصوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک وحشیانہ کھیل کا آغاز ہوتا تو مجھے تسکین ملتی کہ میں نے اپنے بابا کا انتقام لے لیا۔ میری چشم تصور

"تماشا" دیکھنے میں محو تھی کہ نضار کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"اے معبلہ! تُو کن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہے کہ دشمن کے حلیفوں اور خود اس پر یہ ظاہر کرنے کا وقت آ گیا' اس کے مقابل کون ہے۔" نضار مجھ سے مخاطب تھا۔ "اسی کے بعد ہم اس پر گولیاں برسائیں گے۔ دیکھ کہ عقب سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔"

دشمن اب ہماری گولیوں کی زد پر آ چکا تھا۔ اس کا رخ ایک بڑے پہاڑی درے کی طرف تھا۔

نضار کے الفاظ ختم ہوئے ہی تھے کہ جیسے میں لمحہ موجود میں واپس آ گئی۔ پھر میرا ہاتھ آسمان کی طرف بلند ہوا۔ پہلی گولی میں نے چلائی۔ یہ دشمن پر حملہ کرنے کا اشارہ تھا۔ گولی کی آواز ابھی فضا میں معدوم نہیں ہوئی تھی کہ اردگرد کے تمام پہاڑوں سے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ "سردار اشم زندہ باد معبلہ زندہ باد!" ان نعروں کی گونج میں دشمن فوج پر گولیوں کی صورت میں ہر طرف سے گویا موت برس پڑی۔

ہمارے دشمن کے لئے یقیناً وہ حملہ اتنا اچانک' غیر متوقع اور بھرپور تھا کہ اسے بھاری جانی نقصان اٹھا کر جلد ہی پیچھے ہٹنا پڑا۔ ہماری فوج رفتہ رفتہ پہاڑوں سے نیچے اترنے لگی۔ اسی کے ساتھ وہ دشمن پر آگ بھی برساتی جا رہی تھی۔

ہم دشمن کو رگیدتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ عقب سے اس پر حملہ ہو گیا۔ یہ ان قبیلوں کے نوجوان تھے جنہیں حال ہی میں وہاں لا کر بسایا گیا تھا۔ پھر میری آنکھوں نے ایک اور عجیب تماشا دیکھا۔ دشمن کی حلیف فوج کا ایک حصہ جنگ سے کنارہ کش ہو کر خاصے فاصلے پر جا کے رک گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس طرف سے ہم نے ایک گھڑسوار کو سفید پرچم بلند کئے آتے دیکھا۔

اس گھڑسوار کو فوری طور پر میرے اور نضار کے پاس پہنچا دیا گیا کیوں کہ ہم دونوں ہی قلب لشکر میں تھے۔ اگلے مورچوں پر ادل اور احزم' دشمن کے لئے پیغام اجل بنے ہوئے تھے۔ ہماری دائیں جانب دو قبیلوں کے ساتھ سردار وسیط داد شجاعت دے رہا تھا اور بائیں جانب بریسا کے ساتھ تریال والے تھے۔ اس کے علاوہ عقب میں ان کی کمک پر شمالی قبائل کے دونوں سردار تھے۔

رقص اجل جاری تھا کہ اسی دوران سفید پرچم بردار گھڑسوار ہم تک پہنچ گیا۔ اس نے مجھے تعظیم دی اور پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔ "اے سردار اشم کی عظیم بیٹی معبلہ! مجھے تیری طرف میرے سردار موسر نے بھیجا ہے کہ جو تیرے مظلوم باپ سردار اشم کا دوست ہے۔ اجازت دے کہ وہ اپنی فوج لے کر تیرے ساتھ آ ملے۔ اسے خبر نہیں تھی کہ تُو زندہ ہے ورنہ وہ کبھی اپنے دوست کی بیٹی کے خلاف ہتھیار نہ اٹھاتا۔"

"جا اے محترم سردار موسر کے قاصد اور اپنے سردار سے کہہ دے کہ معبلہ اسے خوش آمدید کہتی ہے۔" میں نے جواب میں کہا۔

سردار موسر کے قاصد نے جھک کر ایک بار پھر مجھے تعظیم دی اور پھر سفید پرچم لہراتا ہوا جدھر سے آیا تھا' ادھر ہی لوٹ گیا۔

پھر یوں ہوا کہ دوپہر ہوتے ہوتے جنگ کا پانسا پلٹ گیا۔ دشمن کی فوج کا تین چوتھائی حصہ موت کے گھاٹ اتر چکا تھا اور بقیہ ایک چوتھائی فوج کو راہ فرار نہیں مل رہی تھی۔ وہ پسپا ہو کر آبادی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ نرغہ اتنا سخت تھا کہ مشکل ہی تھا جو کوئی جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔ سردار موبر اپنے ساتھ ژیان کے ایک اور حلیف سردار کو ملا کر ہمارے شانہ بہ شانہ دشمن سے برسرپکار تھا۔

اس موقع پر نصار نے ایک اور آزمودہ جنگی چال چلی۔ اعلان کیا گیا کہ دشمن کی جو سپاہ مزید جنگ کئے بغیر ہتھیار ڈال دے گی اس کے لئے امان ہے۔ اس اعلان کے کچھ ہی دیر بعد دشمن کی بقیہ فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔

دیر تک فتح کے فلک شگاف نعرے بلند ہوتے رہے۔ ہماری فاتح فوج آبادی میں داخل ہو گئی' مگر جانے کیوں میرے دل کو قرار نہیں تھا۔

ژیان کے بھائی شامان کی لاش تلاش کر کے میرے قدموں میں ڈال دی گئی۔ ژیان کی حویلی کو گھیرے میں لے لیا گیا جو دراصل میری وہی حویلی تھی کہ جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ حویلی کے محافظوں نے اپنے سر میرے قدموں میں جھکا دیئے۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ ژیان حویلی ہی میں ہے تو میں اور نصار بیک وقت اپنے گھوڑوں سے کود کر حویلی کے صدر دروازے کی طرف جھپٹے۔ ہمارے عقب میں آنے والا مہا پجاری تھا۔

"آج میرے انتقام کا دن ہے .... میرے انتقام کا دن ہے۔" مہا پجاری ایک جنون کے عالم میں چیختا ہوا ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

اس حویلی کا ایک ایک گوشہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ جلد ہی میں ژیان کو تلاش کرتی ہوئی اس بڑے کمرے تک پہنچ گئی کہ جہاں میرا بابا اشم اجلاس کرتا تھا۔ وہاں مجھے ایک تخت پر دور ہی سے ژیان بیٹھا نظر آ گیا۔ وہ ایک تکیے پر کہنی ٹیکے بڑے اطمینان سے نیم دراز سا بیٹھا تھا۔ اس کا اطمینان میرے لئے حیرت انگیز تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی عجیب سی پُراسرار مسکراہٹ تھی۔ مجھے اور نصار کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر بھی اس کے اطمینان و سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ برسوں گزر جانے کے سبب اس کے چہرے پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہو چکے تھے' پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

مہا پجاری بھی اس وقت ہمارے پیچھے وہاں پہنچ چکا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ژیان سے کچھ کہتی' مہا پجاری کی تیز آواز گونجی۔ "اے ژیان' اے غدار' اے احسان فراموش اور اے اپنے آقا کے قاتل! دیکھ لے کہ آج تیری موت کا دن آ ہی گیا۔"

"میں اور اپنے آقا کا قاتل۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔

عین اسی لمحے میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ یہ آواز ژیان کی نہیں تھی۔

"تُو نے شاید مجھے نہیں پہچانا اے مہا پجاری! .... میں تُو اپنے آقا پر جان قربان کرنے کے لئے یہاں رکا تھا۔ میرا آقا ژیان تو کل رات کے پہلے پہر ہی اجنبی سرزمین والوں کو ساتھ لے کر وادی سے نکل گیا تھا۔ مجھے پہچان اے مہا پجاری کہ میں تو اپنے آقا ژیان کا غلام جزیل ہوں۔ یہ سارا کمال تو اجنبی

بنا والوں کا ہے کہ جنہوں نے مجھے آواز بدل کر بولنا سکھایا اور .... اور میرا چہرہ .... اصل چہرہ بھی بدل دیا۔ یہ دیکھ۔" اس شخص نے اپنے لمبے بالوں میں ہاتھ ڈالا۔

پھر میری آنکھوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ گنجے جزیل کے بال اس کے ہاتھ میں آ گئے اور انہی بالوں سے ایک جھلی سے منسلک تھی جو چہرے سے اتر گئی۔ کچھ دیر میں تصویر حیرت بنی ہوئی جزیل کے کریہہ چہرے کو دیکھتی رہی۔ اس کے جسم پر پُروقار لباس اب انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا کریہہ چہرہ میرے ذہن میں کسی حد تک محفوظ تھا۔ اپنے بچپن میں اسے اکثر میں نے ژیان کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کی حیثیت ژیان کے ذاتی محافظ کی تھی۔ جزیل کا گھٹا ہوا پُراسرار چہرہ مجھے شاید اس لئے بھی یاد رہ گیا تھا کہ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ گھن محسوس ہوتی تھی۔

"ہاں میں تجھے پہچان گیا اے حرام زادے!" مہا پجاری کی غضب ناک آواز سنائی دی۔ "اور مجھے تیرے بارے میں وہ بھی معلوم ہے کہ جو خود تجھے بھی نہیں معلوم۔ سن کہ تُو واقعی حرام زادہ ہے۔ تُو ژیان کے باپ کی ناجائز اولاد ہے۔ یوں تُو ژیان کا سوتیلا بھائی ہوا اور ژیان اس راز سے واقف تھا۔ تیری ماں صرف اس لئے یہ وادی چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلی گئی کہ اس نے تیری زندگی کا عہد لے لیا۔ سو یوں تُو خود اپنے ہی باپ کے گھر میں غلاموں کی طرح پلا بڑھا۔ ژیان کے باپ نے اپنی موت سے پہلے ژیان کو اس راز سے آگاہ کر دیا تھا۔ تُو اسے اپنا آقا سمجھتا رہا .... اور دیکھ لے کہ وہ تجھے اپنی جگہ مرنے کو یہاں چھوڑ گیا۔"

"نہیں .... نہیں اے مہا پجاری!" جزیل اپنی جگہ سے اٹھ کر مہا پجاری کے قدموں میں آ گرا۔ "تجھے دیوتاؤں کا واسطہ' کہہ دے کہ یہ سچ نہیں ہے۔" جزیل کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ "میرا آقا ایسا .... ایسا نہیں تھا۔ اس .... اس نے تو مجھے اتنی عزت بخشی تھی کہ .... کہ اپنی جگہ .... وہ مجھے .... مجھے اس حویلی میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا .... اور ...." شدت جذبات کے سبب جزیل سے پھر کچھ نہ کہا گیا۔

مہا پجاری اس وقت اتنے غصے میں تھا کہ شاید وہ جزیل کو بلا دریغ قتل کر دیتا۔ میری کیفیت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ مگر نصار نے اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے۔ اس نے مہا پجاری یا میرے ہاتھوں جزیل کو قتل ہونے سے بچا لیا۔ جزیل کو نصار کے حکم پر حراست میں لے لیا گیا۔

"اے معبلہ! ہوش میں آ۔" نصار نے مجھے سمجھایا۔ "یہ شخص بہت اہم ہے' اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔" پھر وہ مہا پجاری کو سمجھانے لگا۔

میں اپنے اندر جیسے ڈھے گئی۔ میرا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ وادی سبز کو فتح کر لینے کی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔

یہ خبر ساری وادی میں جنگل کی آگ کے مانند پھیل گئی کہ ژیان فرار ہو گیا۔ لوگوں کے نزدیک یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ انہوں نے جنگ میں میری فتح کے بعد بھی ژیان کو حویلی میں دیکھا تھا۔ ژیان کب اور کیسے فرار ہوا' چند افراد کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ مصلحت کے پیش نظر اس راز پر فی الحال

پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ عام طور پر لوگوں کا خیال یہی تھا کہ حویلی میں کوئی سرنگ ہو گی جس کے ذریعے ژیان اپنی گرفتاری سے پہلے فرار ہو گیا۔ لوگوں کی ان قیاس آرائیوں کو نہ تو غلط کہا گیا نہ درست' ان چند افراد میں نضار' مہا پجاری اور میرے سوا اب تک کوئی دوسرا شخص شامل نہیں تھا جنہیں حقیقت کا علم تھا۔ ہم تینوں نے جزیل کو آخری بار ژیان کے بہروپ میں دیکھا تھا۔ نقلی بال اور اس سے منسلک عجیب و غریب جھلی نضار نے اپنے قبضے میں لے لی تھی' اسی کے بعد محافظوں کو جزیل کی گرفتاری کے لئے طلب کیا تھا۔ احرس بھی اس وقت حویلی کے باہر ہی تھا۔ اس لئے وہ بھی ان حقائق سے بے خبر ہی رہا۔ میں اور نضار تو بس جذبات سے مغلوب ہو کر بس اچانک ہی گھوڑوں سے کود کر حویلی کے صدر دروازے کی طرف جھپٹ پڑے تھے اور پھر مہا پجاری بھی ہمارے پیچھے لپکا تھا۔ احرس اس لئے سمجھ ہی نہیں سکا کہ حویلی کے محافظوں سے بات کرتے کرتے آخر ہم تینوں کو ہوا کیا۔ یوں بھی وہ ہم سے کچھ فاصلے پر تھا۔

حویلی میں نہ تو ژیان کی متعدد بیویاں ملیں' نہ ہی اس کے خاندان کا کوئی اور فرد ہی وہاں تھا۔ جزیل اور حویلی کے محافظوں' خادموں' خادماؤں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس لئے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ ژیان پہلے ہی سے فرار کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ اس نے نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا۔ اسے یقیناً اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس کے اقتدار کا سورج غروب ہونے والا ہے' نضار کی شکل میں ایک نئی ابھرتی ہوئی طاقت اس کے مقابل آ چکی ہے۔ جسے زیر کر لینا آسان نہیں۔

میں نے بڑی حد تک اب خود کو سنبھال لیا تھا۔ وقتی طور پر مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا تھا' اس کے تدارک کا یہی بہتر طریقہ تھا کہ میں بدلے ہوئے حالات کا تجزیہ کر کے آئندہ کے لئے کوئی مناسب لائحہ عمل مرتب کرتی۔ میری ذہنی حالت کا اندازہ نضار' احرس اور مہا پجاری سبھی کو تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وقتی طور پر انہوں نے خود میرے ہی ایما پر مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنی حویلی کی اسی خواب گاہ میں تھی کہ جس سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ یہیں سے میری ماں کو گھسیٹ کر لے جایا گیا تھا۔ ابتدا میں یہاں آ کر' اپنی حویلی میں قدم رکھنے کے بعد میری کیفیت بھی نضار سے مختلف نہیں تھی۔ جس کا مشاہدہ میں نے بستی اشر میں کیا تھا۔ نضار نے بھی طویل عرصے کے بعد اپنی حویلی میں قدم رکھا تھا۔ اس کے اور میرے حالات میں بڑی حد تک یکسانی کے باوجود ایک واضح فرق بہرحال موجود تھا۔ وہ اسی ماحول' اسی معاشرے اور اسی روایات سے ہم آہنگ تھا۔ مگر میں نہ جانے کیوں خود کو یہاں اجنبی محسوس کرتی تھی۔ میرا انداز فکر قطعی مختلف اور جداگانہ تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ اس سوال کا جواب خود میرے پاس بھی نہیں تھا۔ ہاں دو ایک بار پُراسرار سرگوشیوں میں اس طرف اشارہ ضرور کیا گیا تھا کہ میں دراصل کون ہوں؟ اس سوال سے قطع نظر اس وقت میرے نزدیک دوسرے سوالات زیادہ اہم تھے' جن کا تعلق ماضی یا مستقبل کے بجائے زمانہ حال سے تھا۔ پُراسرار سرگوشیوں کے مطابق وادی سبز پر میرا پرچم بلند ہو چکا تھا' مگر میرا دشمن قابو میں نہیں آ سکا تھا۔ میری آنکھوں پر پڑا ہوا ایک پردہ ہٹ گیا تھا۔ اب میں یہ جان چکی تھی کہ بیک وقت ایک ہی شخص دو جگہ کیسے نظر آیا تھا۔ میں نے غلط گمان کیا تھا کہ شیرویہ نے وادی سبز میں ژیان کے چھوٹے بھائی شامان کو دیکھا ہو گا۔ وہ شامان نہیں جزیل ہی رہا ہو گا۔ اجنبی سرزمین کے لوگوں

ے ژیان کا تعلق ابھی راز میں تھا۔ جزیل کی اطلاع کے مطابق ژیان انہی لوگوں کو ساتھ لے کر وادی ے نکلا تھا۔ کیا ژیان ان اجنبیوں کے ساتھ ہموار میدانوں کی طرف نکل گیا ہو گا؟ میں دیر تک اسی سوال غور کرتی رہی۔ پھر مجھے جزیل کا خیال آیا کہ شاید اس سلسلے میں اسے کچھ معلوم ہو۔ نضار نے اسے ہرے یا مہا پجاری کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا کر یقیناً دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔

اپنے منتشر حواس کو مجتمع کرنے کے بعد اپنے اندر میں نے ایک واضح تبدیلی محسوس کی۔ میں جو نی طور پر اپنے دشمن ژیان کے غیر متوقع فرار سے بکھر گئی تھی' سمٹ کر جیسے پھر جی اٹھی۔ مجھے یاد آیا کہ وران جنگ میں خود میں نے ہی تو دیوتاؤں سے اپنے دشمن کی زندگی کے لئے دعا کی تھی۔ میں اسے زندہ رفتار کر کے اس سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ محبت اور انتقام شاید یہی دو جذبے ایسے ہیں جو انسان کو جینے پر بور کرتے ہیں۔ سو ابھی میرے انتقام کی فصل نہیں کٹی تھی تو پھر میں کیسے جی ہار جاتی۔ سوچتے سوچتے میں اپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ "اے ژیان' اے میرے دشمن! میں اجنبی دنیاؤں کے آخری سروں تک تیرا قب کروں گی۔ اگر .... اگر تُو ہموار میدانوں کی طرف بھی جا چکا ہے تو معبلہ ایک نہ ایک روز ے دل میں کسی تیر کی طرح ترازو ہو جائے گی .... تُو میرے عتاب سے بچ نہیں سکے گا .... تو ھ سے کہاں تک بھاگ سکے گا اور کب تک بھاگتا رہے گا؟"

سو میں نے صبر کیا' صبر بھی قیامت کا اور پھر خود ہی اٹھ کر اپنی خواہ گاہ کا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے والی یہ وہ معبلہ نہیں تھی جو اپنے اندر ڈھے گئی تھی۔ مجھ میں اب جیسے ایک نئی معبلہ نے جنم لے لیا تھا۔ میں شاید اب وہ نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔

☆======☆======☆

میں اپنی خواب گاہ سے نکل کر اجلاس والے کمرے میں پہنچی تو وہاں نضار کے ساتھ سردار صاحی اور سردار منعیہ کو دیکھا۔ انہی کے قریب مہا پجاری کسی سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ وہ شاید میری ہی طرف سے فکر مند تھا۔ مجھے اجلاس والے کمرے میں آتے دیکھ کر سبھی کے چہروں پر حیرت سی نظر آئی۔ غالباً نضار نے سردار صاحی اور سردار منعیہ کو میری ذہنی کیفیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس وقت یقیناً میرا چہرہ میرے دلی جذبات کا آئینہ دار نہیں تھا۔ خلاف توقع میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ان میں سے کسی کو کیا خبر ہو گی اس مسکراہٹ کی تہہ میں کتنا درد چھپا تھا۔

میرے بابا سردار اشم کا تخت خالی تھا اور وہ سب تخت کے نیچے بیٹھے تھے کہ جہاں فرش پر دبیز غالیچہ بچھا تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی بوڑھا سردار صاحی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "اے میرے مظلوم دوست کی عظیم بیٹی .... تجھے بزدل دشمن پر غلبہ مبارک ہو۔"

سردار صاحی کو اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھ کر سبھی شاید میری دل جوئی کی خاطر کھڑے ہو گئے تھے۔

میں چند قدم آگے بڑھی اور سردار صاحی کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے دعا دی۔ "اے وادی سبز کی وارث! تجھ پر ہمیشہ دیوتاؤں کا سایہ رہے اور تیرے دشمن ذلیل د

رسوا ہوں۔ بزدل دشمن کے فرار ہو جانے پر ملال نہ کر اور میری ایک آرزو پوری کر دے۔" بوڑھے سردار صاحی کے لہجے میں بلا کی شفقت و محبت تھی۔

"بول اے محترم سردار! تیری آرزو کیا ہے؟" میں پُرسکون آواز میں بولی۔ "یقین کر کہ تیرے دوست کی بیٹی تجھے ناامید نہیں کرے گی۔"

جواب میں سردار صاحی نے نرمی سے میرا ہاتھ تھاما اور پھر مجھے لے جا کر تخت پر بٹھا دیا۔ میں نے مہا پجاری کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا اور کچھ ایسی ہی کیفیت کا اظہار نضار کے چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔

"میں کہ سردار صاحی' وادی سبز کی نئی حکمراں کو سب سے پہلے تعظیم دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہی سردار صاحی گھٹنوں کے بل جھکا اور ان بستیوں کی روایت کے مطابق مجھے تعظیم دے کر تخت کے دائیں جانب دو زانو بیٹھ گیا۔

اس کے بعد مہا پجاری' نضار اور سردار صنعیہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ سب میرے جاں نثار اور مجھ سے محبت کرنے والے تھے' سو میں ان کے دل کیسے توڑ دیتی۔ ان کا مجھ پر حق تھا اور میں یہ حق تسلیم کر چکی تھی کہ آدمی کو دوسروں کے لئے بھی تو جینا پڑتا ہے۔

سردار صاحی اور سردار صنعیہ کو حویلی میں آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ نضار کو وہ دونوں حالیہ جنگ میں مغربی محاذ پر پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنے والے تھے کہ میں وہاں پہنچ گئی۔ اس سے پہلے کہ سردار صاحی یہ گفتگو شروع کرتا مہا پجاری نے مجھے مخاطب کیا۔ "اے میری آقازادی! مجھے اجازت دے کہ میں وادی کی قدیم عبادت گاہ کے بند دروازے کھول دوں اور لوگ وہاں پھر سے دیوتاؤں کی عظمت کے گن گائیں' یوم نجات منائیں' شکر بجا لائیں۔"

"اے مہا پجاری! جا اور میرے لئے بھی دعا کر کہ میں عدل پر قائم رہوں اور دیوتاؤں کا حکم بجا لاؤں۔" میں نے جواب میں کہا۔

مہا پجاری مجھے تعظیم دے کر چلا گیا تو سردار صاحی نے بات شروع کی۔ مغرب میں آباد دونوں قبیلوں نے اطاعت قبول کر لی تھی۔ وہ اب گویا میرے زیر نگیں آ چکے تھے۔ سردار صاحی جب یہ سب کچھ بیان کر رہا تھا تو میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ مگر اس کا اظہار میں نے فوری طور پر مناسب نہیں سمجھا۔

سردار صاحی خاموش ہو گیا تو نضار نے بتایا' تمام قبائل کے سردار' جنہوں نے اس جنگ میں ہمارا ساتھ دیا تھا' وہ سبھی مجھ سے ملنے کے آرزومند ہیں۔ ان میں مغربی قبیلوں کے وہ دونوں سردار بھی شامل تھے جو اطاعت قبول کر چکے تھے۔

"اے سردار نضار! تمام سرداروں کا اجلاس طلب کر لے کہ مجھے ان سبھی سے کچھ کہنا ہے۔" میں نے نضار کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تیرے حکم کی تعمیل ہو گی اے سرداروں کی سردار!" نضار جواب میں بولا اور اس کے اس طرح

طالب پر خوشگوار حیرت ہوئی۔ نضار نے مجھ سے قربت کے باوجود میری موجودہ حیثیت کا پورا خیال رکھا تھا۔ شاید اس کا سبب وہ منصب تھا جس کی میں نے کبھی تمنا نہیں کی تھی۔

پھر میں تخت سے اتر آئی' مجھے وہاں بیٹھنا گراں محسوس ہو رہا تھا۔ اجلاس کے لئے رات کے ابتدائی پہر کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ اب تک مجھے آرام کرنے کا وقت نہیں ملا تھا اور نہ ہی نضار سویا تھا۔ احرس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سو رہا ہے۔ اسے میں نے سونے دیا اور نضار کو بھی سونے کا مشورہ دے کر اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔ بستی اشر سے روانگی کے بعد اب تک مجھے سونے یا آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اپنے دشمن ژیان کے بارے میں ایک فیصلہ کر لینے سے اب میرے ذہن پر بھی کوئی بوجھ نہیں رہا تھا۔ مجھے اسی لئے جلد نیند آ گئی۔ سونے سے پہلے میں نے ایک خادمہ کو تاکید کر دی تھی کہ مجھے کس وقت جگانا ہے۔

گہری نیند سو کر جب میں اٹھی تو خود کو مزید تازہ دم محسوس کیا۔ خادمہ سے معلوم ہوا کہ احرس مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے یہ جان کر لوٹ گیا تھا کہ میں سو رہی ہوں۔ اس وقت تک میں لباس تبدیل کر چکی تھی کیوں کہ سرداروں کا جو اجلاس میں نے طلب کیا تھا' اس کے شروع ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ خادمہ کے ذریعے میں نے احرس کو اپنی خواب گاہ میں بلا لیا۔

"کیا یہ خبر درست ہے اے معبلہ کہ اب تُو بھلی چنگی ہو گئی ہے؟" آتے ہی احرس نے حسب معمول مجھے بے تکلفی سے مخاطب کیا اور بیٹھ گیا۔

"مجھے کیا ہوا؟ میں تو پہلے بھی ٹھیک ہی تھی اور اب بھی ویسی ہی ہوں۔" میں مسکرا کر بولی۔

"دیکھ تُو مجھے بہلانے کی کوشش نہ کر۔ سب معلوم ہے مجھے۔ یہ نہ بھولا کر کہ میں تجھے بچپن سے جانتا ہوں اور تیری صورت دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ تیرے دل میں کیا ہے؟"

"اچھا تو پھر جلدی سے بتا' کیا ہے میرے دل میں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"دشمن سے انتقام نہ لینے کا ملال .... سچ بتا یہی بات تھی نا؟ اسی وجہ سے تُو یہاں آتے ہی اٹواٹی کھٹ پائی لے کر پڑ گئی؟"

میں نے یہ سن کر طویل سانس لیا اور بولی۔ "لعنت پڑھ اس بھگوڑے پر۔"

"چل تُو نے لعنت پڑھ دی تو میں نے بھی پڑھ دی۔" احرس نے مسکرا کر کہا۔ پھر بولا۔ "یہ جو آج اجلاس ہونے والا ہے' مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں' ہاں تجھ سے ضرور دلچسپی ہے۔ برا نہ مانیو اگر میں وہاں نہ پہنچوں۔"

"تُو بھی کچھ سیکھ ساکھ لے کہ اقتدار و سیاست کسے کہتے ہیں تو کیا برا ہے؟"

"اب تک جتنا سیکھ چکا ہوں تیرے ساتھ رہ کر اسی پر پچھتا رہا ہوں اور مزید پچھتانے کی گنجائش نہیں۔" وہ اپنی عادت کے مطابق بولا۔

"وہ تو تجھے پتا چلے گا اب۔" میں پھر ہنس دی۔ "بہت دن عیش کر لئے تُو نے۔"

"اگر اسی کو عیش کرنا کہتے ہیں تو دیوتا دشمنوں کو بھی ایسے عیش نہ کرائیں۔ اچھا میں تو چلا ذرا بستی

کا پھیرا لگانے، تو اجلاس نمٹا۔ ابھی تو میں نے تیری وادی کی قدیم عبادت گاہ بھی نہیں دیکھی۔ سنا ہے کہ پجاری نے وہاں اپنا ڈیرا پھر جمالیا ہے، اس سے بھی مل لوں گا۔" یہ کہہ کر احرس اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اسے تاکید کی کہ وہ اپنی رہنمائی کے لئے حویلی کے کسی خادم کو ساتھ لے جائے۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

رات کے پہلے پہر کا آغاز ہوا تو اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ تمام سردار مجھے تعظیم دے کر اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے۔ نضار کی حیثیت اور مرتبے کا خیال رکھتے ہوئے اسے میرے تخت کی دائیں جانب بٹھایا گیا تھا۔ نضار ہی کے ساتھ سردار صاحی، سردار موسر اور سردار الیف بیٹھے تھے۔ آخرالذکر سردار الیف وہ تھا کہ جو سردار موسر کے ایما پر عین دوران جنگ میں اپنی فوج لے کر ہم سے آ ملا تھا۔ بائیں جانب سردار وسیط، سردار صنعیہ، سردار نجید اور دوسرے وہ تمام سردار بیٹھے تھے کہ جنہوں نے میرے اور نضار کے ساتھ وفاداری کا حق نبھایا تھا۔ درمیان میں سردار بریسا، نضار کے دونوں نائب ادل اور احزم اور بقیہ وہ جاں نثار سردار تھے جو اب تک مختلف معرکوں میں داد شجاعت دیتے رہے تھے۔ انہی کے ساتھ مغربی قبائل کے وہ دونوں سردار تھے جو اطاعت قبول کر چکے تھے۔

ان تمام سرداروں کی موجودگی میں مجھے تخت پر نسبتاً بلند جگہ بیٹھتے ہوئے ایک ناقابل بیان سی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے اس احساس کے باوجود اسے اپنی مجبوری سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی اجلاس سے پہلے نضار اور میرے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہو سکی تھی۔ وقت اور حالات کے سبب ہمیں اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی۔ نضار کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ اجلاس میں نے کیوں طلب کیا تھا۔

سبھی میرے بولنے کے منتظر تھے۔ ابتدائی کلمات ادا کرتے ہوئے میں نے دشمن کے ساتھ جنگ میں ان کی جاں نثاری کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد میں نے یہ اعلان کیا کہ وادی سبز کے مشرق اور مغرب میں بسنے والے تمام قبیلے حسب سابق خود مختار ہوں گے۔ نضار یا میں ان کے اندرونی معاملات میں کسی بھی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے۔ ہماری حیثیت ان کے دوستوں اور پشت پناہوں کی ہو گی۔ جن دو مغربی قبائل نے اطاعت قبول کی تھی وہ بھی اسی اعلان کے ضمن میں آتے تھے۔ پھر بھی ان کا معاملہ دوسرے قبائل سے ذرا مختلف تھا۔ میں نے اسی لئے یہ بھی کہا کہ اگر وہ دونوں سردار اپنے قبیلوں کا اعتماد حاصل نہ کر سکے تو اہل قبیلہ کو اپنے نئے سردار منتخب کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ وہاں موجود تمام ہی سرداروں نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔

"اور اب اے محترم سردارو! میں آپ سب کے سامنے اپنے دل کی بات کہنا چاہتی ہوں کہ جس کے لئے آپ سب کو زحمت دی گئی ہے۔" میں نے ان سب کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔ "یہ جو ژیان جیسے عیار دشمن ہمارے درمیان پیدا ہو جاتے ہیں آئندہ کے لئے کس طرح ایسے عیاروں اور بدکاروں سے بچا جائے؟ وہ کیا تدبیر ہو کہ پھر کوئی ژیان ہماری آزادی سلب نہ کر سکے، نفاق کے بیج نہ بو سکے؟ سو اس سلسلے میں ایک تجویز میں نے سوچی ہے۔ اگر تمام محترم سرداروں نے اس تجویز پر اتفاق کر لیا تو یہ خطرہ ہمیشہ کے

لئے ٹل سکتا ہے۔" چند لمحے توقف کے بعد میں نے پھر بولنا شروع کیا۔ "مسئلہ دراصل یہ ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں اور قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان اتحاد و یگانگت کی فضا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے اقتدار کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے اسی اقتدار کو برقرار رکھنے کی خاطر ہم برے اور بھلے کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں۔ سو ہمارا اصل مرض یہی ہے کہ جس سے کوئی بھی عیار دشمن فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال چند ہی روز پہلے ژیان کی شکل میں موجود تھی۔ میری تجویز یہ ہے کہ وادی سبز کے مشرق اور مغرب میں آباد تمام قبیلے اپنی اپنی خودمختاری برقرار رکھتے ہوئے اپنے ہی درمیان سے دو سرداروں کو منتخب کر لیں ان میں سے ایک سردار اتفاق رائے کے بعد تمام مشرقی قبائل کا سردار اعلیٰ کہلائے اور دوسرا مغربی قبائل کا سردار اعلیٰ ہو۔" یہی وہ انوکھا خیال تھا جو سردار صاحی سے گفتگو کرتے ہوئے میرے ذہن میں آیا تھا۔

میری یہ تجویز ان قبائل کی روایات کے خلاف ہونے کے باوجود نئی اور حیرت انگیز تھی۔ انہوں نے شاید اس انداز میں پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس پر خاصی دیر بحث ہو مباحثہ جاری رہا۔ تجویز کیوں کہ مثبت تھی اس لئے سبھی کے دل کو لگی۔ جس کا اظہار واضح طور پر ان کے الفاظ سے ہو رہا تھا۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق ہی نکلا۔ انہوں نے میری تجویز اتفاق رائے سے قبول کر لی۔

پھر نوجوان سردار نجید اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "اے سرداروں کی سردار! تو نے اپنی نیک روح کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ ہمیں بھلائی کی راہ دکھائی اور ہم نے جان لیا کہ اس میں تیری کوئی غرض شامل نہیں۔ سو اب تو ہی ہم میں سے کسی کا نام لے کہ جو تیری نظر میں مشرقی قبائل کا سردار اعلیٰ بننے کا اہل ہو اور ہمارے درمیان عدل سے کام لے کہ ہمیں تجھ پر پورا بھروسا ہے۔" یہ کہہ کر نجید نے مشرقی قبائل کے سرداروں سے اپنی بات کی تائید چاہی۔

"ہم سبھی نوجوان سردار نجید کی تائید کرتے ہیں۔" کئی سرداروں کی آوازیں بیک وقت بلند ہوئیں۔

"میرے علاوہ یہاں سردار نضار بھی موجود ہے کہ میری ہی طرح اس پر بھی تم سب کو اعتماد ہے۔" ...نا بولی۔ "یہ ذمے داری میں اس پر ڈالتی ہوں۔ تم میں سے وہ کسی ایک کا نام لے دے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ تم سب اس پر متفق ہو جاؤ ورنہ کسی دوسرے سردار کا نام لو۔"

"سرداروں کی سردار معبلہ کا حکم ٹالنا میرے اختیار میں نہیں، سو میں اس کا حکم بجا لاتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ مجھے یہ عزت بخشی گئی۔" نضار نے کہا اور پھر مشرقی قبائل کے سردار اعلیٰ کے طور پر وسیط کا نام پیش کیا۔

سردار وسیط کے نام پر بقیہ متعلقہ سرداروں نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ یوں یہ مرحلہ تمام ہوا۔ پھر تمن مغربی قبائل کا سردار اعلیٰ صنعیہ کو منتخب کر لیا گیا۔ میری درخواست پر سردار ساحی نے اس کا نام تجویز کیا تھا۔ اس کے بعد سردار موسر نے ان تمام خود مختار اور بڑے قبائل کے اتحاد کی رائے پیش کی جو ژیان کی قوت و طاقت اور پُر فریب چالوں کے سبب "معاہدہ امن" پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان سرداروں کی

تعداد چھ تھی۔ جن میں سے تین اس اجلاس میں موجود تھے' سردار موسر کے علاوہ سردار صاحی اور سردار الیف' بقیہ تین حلیف سرداروں میں سے دو تو میدان جنگ میں مارے گئے تھے اور تیسرا شدید زخمی تھا۔ ژیان کا ساتھ دینے کی انہیں بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ ژیان نے بڑی عیاری کے ساتھ ان قبیلوں کی فوجوں کو کٹوا دیا تھا کیوں کہ خود اس کی اپنی فوجی قوت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اب کسی سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا تھا کہ ژیان نے کیا کھیل کھیلا تھا۔ ہاں انہیں صرف ایک بات کا علم نہیں تھا کہ ان کا "عیار دوست" یا دوست نما دشمن جنگ شروع ہونے سے بہت پہلے فرار ہو چکا تھا۔ سردار موسر کی تجویز کو بھی سراہا گیا لیکن دو قبیلوں کے سرداروں کی موت کے سبب اس پر فوراً عمل نہ ہو سکا۔ اس تجویز کو آئندہ کے لئے اٹھا رکھا گیا کہ جب حالات سازگار ہو جائیں تو یہ عظیم تر اتحاد روبہ عمل آسکے۔

اجلاس ختم ہونے والا تھا کہ سردار بریسا نے مجھ سے اپنی بابت سوال کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ میری نیابت کرے۔ وہ میرا ہی نائب کہلانے کا آرزومند تھا۔

"نہیں اے بریسا!" میں نے واضح طور پر انکار کر دیا۔ "تُو بھی خود مختار ہی رہے گا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ سردار نضار بدستور تیری پشت پناہی کرتا رہے گا۔"

"تیرا جو حکم اے آتون دیوی!" بریسا نے اطاعت سے سر جھکا لیا۔ "تُو چاہے معبلہ کہلائے یا آتون' ہمارے لئے تو دیوی ہی رہے گی۔"

میں نے اس پر خاموشی اختیار کر لی کہ بریسا کے جذبات عقیدت کو مجروح کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی اجلاس میں تریال کی فوج کا سپہ سالار آنف بھی شریک تھا۔ میں نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنی فوج کو لے کر تریال واپس چلا جائے۔ میرے نزدیک اب اس فوج کو ساتھ ساتھ لئے پھرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ضرورت پڑنے پر اب میں اس فوج کے بغیر بھی اپنے دشمن ژیان کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ ایک مفرور اور بزدل دشمن سے نمٹنا اب میرے لئے کوئی مشکل نہیں رہا تھا کہ وہ تو خود مجھ سے جان بچا کر بھاگ نکلا تھا۔ یوں اس نے تمام قبائل کی نظر میں خود ہی اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کر لیا تھا۔ اب ان پہاڑی بستیوں میں کوئی بھی اس کا ہمدرد اور ہمنوا نہیں رہا تھا اور یہ خود اس کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھا۔ قبائل کے اتحاد نے اس امکان کو اور بھی ختم کر دیا تھا کہ آئندہ کبھی ژیان کسی سازش کے جال بُن سکتا۔ وہ زندہ تو بچ گیا تھا مگر اس کی سیاسی موت ہو چکی تھی۔ اب اس غدار اور سازشی کو پہاڑوں میں بسنے والے کسی صورت قبول نہ کرتے۔

تریال کی فوج کو واپسی کا حکم دینے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ لوگ عرصہ دراز سے صرف میری عقیدت و محبت میں اپنے وطن سے دور رہے تھے۔ انہوں نے میری خاطر بڑی قربانیاں دی تھیں۔ یہ وہی تو تھے کہ جنہوں نے پہلی مرتبہ مجھے دیوی کا درجہ دیا تھا۔ بستی تریال اور وہاں کے باسیوں کو میں بھلا کیسے بھلا سکتی تھی۔ بچپن میں تقریباً سات آٹھ سال کی عمر سے نوجوانی کی عمر تک میں نے ایک دیوی کی حیثیت سے برسوں وہاں گزارے تھے۔ مجھے ایک ایک چہرہ یاد تھا' سردار صارم کو جو بے اولاد تھا اور جس نے آخرکار خود ہی اپنی موت کو قبول کر لیا تھا۔ سردار صارم کی پُروقار و حسین بیوی نخبہ اور اس کے

نیلے بوڑھے بھائی سمیر کو بھی میں نہیں بھولی تھی۔ وہ منظر بھی میرے پردہ ذہن پر محفوظ تھا کہ جب سردار صارم کی جگہ نوجوان مقدام' نخبہ کا شوہر بنا تھا۔

اجلاس ختم ہونے کے بعد یادوں کا ایک غبار سا تھا جو مجھے اپنے گھیرے میں لئے ہوا تھا۔ سب لوگ جا چکے تھے اور میں اجلاس کے کمرے سے اٹھ کر نضار کے ساتھ کھوئی کھوئی سی اپنی حویلی کی ایک راہداری سے گزر رہی تھی۔ میں چونکی اس وقت جب دھیرے سے نضار نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اے معبلہ! کیا تُو جزیل کو بھول ہی گئی؟ اس سے ژیان اور اجنبی دنیا کے لوگوں کا کوئی نہ کوئی سراغ مل سکتا ہے۔"

نضار کے حکم پر جزیل کو حویلی ہی کے ایک حصے میں قید کیا گیا تھا اور اس سے ملنے کی کسی کو بھی اجازت نہیں تھی۔ اسے سخت پہرے اور نگرانی میں رکھا گیا تھا کہ کہیں وہ فرار نہ ہو جائے۔ نضار نے اس کی حفاظت اور نگرانی پر اپنے محافظ دستے کے افراد کو متعین کیا تھا۔

حویلی کے اس حصے میں میرے اور نضار کے سوا کسی بھی شخص کا داخلہ ممنوع تھا۔ میں نضار کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔

جزیل کی حالت قابل رحم تھی۔ مہا پجاری نے اس کے بارے میں جو انکشاف کیا تھا کہ وہ ژیان کے باپ کی ناجائز اولاد ہے' اس انکشاف نے جیسے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جسے ساری زندگی اپنا آقا اور محسن سمجھتا رہا' وہی اس کے اعتماد کو ریزہ ریزہ کر گیا تھا۔

مجھے اور نضار کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ ہمارے قدموں میں آگرا اور گڑگڑانے لگا۔ "میں .... میں اس ذلت آمیز زندگی کی قید سے رہائی چاہتا ہوں .... مجھے قتل کر دو .... مار دو مجھے کہ .... کہ میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا۔ تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ مجھے .... مجھے موت کے گھاٹ اتار دو کہ .... کہ میں اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ میں .... میں اپنے باپ کی ناجائز اولاد ہوں .... کیا میں وادی والوں کی زبان سے یہ سن کر زندہ رہ سکوں گا؟"

"اٹھ اے جزیل کہ یہ بات ابھی تک راز ہے۔" نضار نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "مہا پجاری' معبلہ اور میرے سوا ابھی تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں اور نہ معلوم ہوگی۔ تجھ پر تیرے سوتیلے بھائی نے جو ظلم کیا اس پر مجھے بھی دکھ ہے۔ جائز اور ناجائز سے قطع نظر تیری اور ژیان کی رگوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا تھا' مگر اس نے تجھے اپنا بھائی سمجھنے کے بجائے زندگی بھر غلام بنا کے رکھا۔"

"اور میں .... اے سردار نضار! اتنا غافل' اتنا بے عقل' اتنا بڑا بے خبر نکلا کہ اسی کی خاطر جان دینے کے لئے راضی ہو گیا کہ جو میرا سب سے بڑا دشمن تھا۔" جزیل اب اٹھ کر بیٹھ چکا تھا اور اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ "تُو ہی بتا اے نضار کہ اس میں بھلا میرا کیا قصور تھا کہ میرے ظالم باپ نے میری ماں کو اپنی بیوی نہیں بنایا؟"

"ہاں اے جزیل! اس میں تیرا کوئی قصور نہیں۔ تُو نے کوئی جرم نہیں کیا تُو میری نظر میں بے گناہ ہے۔" نضار بدستور نرم آواز میں بولا۔

نضار کی طرف جزیل اپنی آنسو بھری آنکھوں سے یوں دیکھنے لگا جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ ہو۔ جزیل میرے نزدیک بھی قابل رحم ہی تھا' مگر ظالم بھی تھا۔ ظالم کا ساتھ دینے والا بھی ظالم ہی ہوتا ہے۔ اپنی ذاتی زندگی اور اپنے ماضی سے قطع نظر وہ ساری زندگی ایک ظالم ہی کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ جزیل قابل رحم ہونے کے باوجود میری نظر میں قابل معافی ہرگز نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نضار کے اور میرے نقطہ نظر میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔ وہ غالباً جزیل کی زبان کھلوانے کے لئے اس سے اظہار ہمدردی کر رہا تھا۔

"اے معبلہ! .... اے عظیم باپ کی عظیم اور مظلوم بیٹی!" جزیل نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "جنگ کے دوران ہی میں مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ تیرے شانہ بہ شانہ لڑنے والا ژیان کا سب سے بڑا حریف سردار نضار ہے۔ پھر جب میں نے اسے اجلاس والے کمرے میں مہا پجاری اور تیرے ساتھ دیکھا تو جان گیا کہ یہی سردار نضار ہو سکتا ہے۔"

"اچھا اے جزیل! یہ بتا کہ اجنبی سرزمین والوں کو ساتھ لے کر ژیان کہاں گیا ہے؟ تجھے تو اس نے بتایا ہی ہو گا۔" نضار اصل موضوع پر آ گیا۔

"نہیں اے سردار نضار! اس نے مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔" جزیل نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ذرا بھی جھجک نہیں تھی۔

"کیا تُو نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا؟" نضار نے پھر سوال کیا۔ نضار کی نظریں جزیل کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"مجھے بتاتا وہ۔" اس کے لہجے میں ژیان کے لئے حقارت تھی۔ "میں پوچھتا اس سے .... ایک غلام کی بھلا یہ جرأت کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے آقا سے ایسا کوئی سوال کر سکے۔ غلام تو سردار نضار' صرف قربان کئے جانے کے لئے ہوتے ہیں۔"

اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے نضار نے پوچھا۔ "تُو نے کب سے ژیان کا بہروپ بھرا تھا۔"

"اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا' شاید سال بھر پہلے کی بات ہے کہ جب اجنبی دنیا سے آنے والے ایک شخص نے میرے چہرے کو بدل دیا تھا اور میں حیران رہ گیا تھا۔ میرے سر پر بچپن ہی سے بال نہیں اگے تھے۔ میں اس پر اسی لئے بہت خوش ہوا تھا۔ وہاں ژیان' اس اجنبی اور میرے سوا کوئی اور نہیں تھا' مگر یہ صرف کچھ دیر کی بات تھی۔ اس اجنبی نے میرے سر اور چہرے سے بال اور وہ عجیب جھلی اتار لی تھی۔"

جزیل کا بیان جاری تھا۔ میں اور نضار پوری توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ "انہی دنوں میں نے ایک اجنبی اور ژیان کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو بھی سنی تھی کہ ژیان کس حد تک مجھ پر اعتماد کر سکتا ہے؟ اجنبی کے اس سوال پر ژیان نے اپنی پیٹی سے خنجر کھینچ کر میرے ہاتھ میں دیا اور مجھ سے بولا' اے جزیل! اس خنجر کو اپنے دل میں اتار لے۔ میں اپنا ہاتھ بلند کر کے تعمیل حکم کرنے ہی والا تھا کہ ژیان نے میری کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور خنجر پھینکنے کو کہا۔ میرے ہاتھ سے خنجر چھوٹ گیا۔ اس پر اجنبی نے اطمینان کا اظہار کیا اور پھر انہی میں سے ایک مجھے ژیان کی آواز میں بولنے کی مشق کرانے لگا۔ یہ نیا کھیل

بھی مجھے بڑا دلچسپ لگا۔ پھر جب میں اس کھیل میں طاق ہو گیا تو کئی بار مجھے ژیان اپنی جگہ حویلی میں چھوڑ کر گیا یوں اس نے اپنے چند خاص افراد پر یہ دہشت بٹھا دی کہ وہ بڑی پُراسرار قوتوں کا مالک ہے اور ایک ہی وقت میں دو جگہ بھی موجود ہو سکتا ہے۔ جب وہ وادی میں لوٹ آتا تو پھر میں ایک بار وہی بنا دیا جاتا کہ جو تھا۔" یہ کہہ کر جزیل کچھ دیر کو چپ ہو گیا۔

"کیا تجھے خبر ہے اے جزیل کہ اجنبی دنیا کے لوگوں اور ژیان کے درمیان کیا تعلق تھا؟" میں نے پہلی بار ایک اہم سوال کیا۔

"نہیں اے عظیم سردار اشم کی بیٹی! مجھے یہ بات معلوم نہیں۔" جزیل نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"تُو ژیان سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود کیسے بے خبر رہا؟" نضار نے پوچھا۔ اس کے لہجے سے شک کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اے سردار نضار! میری بات کو سچ جان کہ میں قریب ہو کر بھی ژیان سے بہت دور تھا۔ کبھی اس نے اجنبیوں سے میرے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کی کہ میں ژیان اور ان کے تعلقات کی وجہ سمجھ سکتا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میں ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ میں نے کبھی یہ کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی کہ ژیان کس سے ملتا ہے' کیوں ملتا ہے اور سازشوں کے کیا کیا جال بنتا رہتا ہے۔ میرا کام صرف اس کا حکم بجا لانا تھا' اس سوا کچھ نہیں۔ خود اسے بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی اور اسی لئے اس نے کبھی مجھ پر کسی شبہے کا اظہار نہیں کیا۔ اسے تو مجھ پر اتنا بھروسا تھا اے نضار کہ وہ مجھے اپنی بیویوں کے پاس چھوڑ جاتا۔ اسے یقین تھا کہ میں کبھی اس کی امانت میں خیانت نہیں کروں گا۔" جزیل نے تفصیل کے ساتھ نضار کے سوال کا جواب دیا۔

کیا ژیان کی بیویاں اور اس کے خاندان والے بھی اس کے ساتھ کل رات وادی سے گئے تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

جواب میں جزیل نے بتایا۔ "نہیں اے عظیم معبلہ! ان سب کو وہ پہلے ہی وادی سے کہیں بھیج چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب شامان' بستی اشر پر حملہ کرنے کے بعد لوٹا تھا۔ اس کے ساتھ بہت کم لوگ میدان جنگ سے واپس آ سکے تھے۔"

"کل رات جب وہ یہاں سے گیا تو اجنبی سرزمین کے کتنے لوگ اس کے ساتھ تھے؟" نضار بولا۔

"ان اجنبیوں کی تعداد چار تھی۔ ان میں سے ایک عورت بھی تھی۔"

"کیا ان میں سے تجھے کسی کا نام معلوم ہے؟" میں نے معلوم کیا۔

"بڑے عجیب عجیب سے نام تھے ان کے۔ میں نے کبھی کسی کا نام یاد رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں بھی ان میں سے صرف دو کے ساتھ میرا کچھ تعلق رہا' ایک تو وہ جو مجھے کوئی مسخرا لگتا تھا۔ وہ مجھے ژیان کی آواز میں بولنا سکھاتا تھا۔ نام تو اس کا نہ جانے کیا تھا' مگر میں اپنی آسانی کے لئے اسے ژو کہتا تھا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوتا تھا اور وہ جو مجھے ژیان بناتا تھا' اس سے بس دو چار مرتبہ ہی میری ملاقات

ہوئی' کل رات آخری مرتبہ .... ویسے وہ لمبو تھا بڑا کمینہ۔ جب بھی وہ میری کھوپڑی پر بال اڑھاتا تھا تو چند بار چپت ضرور مارتا تھا۔ اس پر وہ لمبو بھی ہنستا تھا اور ژیان کے بھی دانت نکل پڑتے تھے۔"

میں اور نضار جان بُوجھ کر جزیل کو بولے جانے کا موقع دے رہے تھے' اس امید میں کہ شاید اس کے منہ سے کوئی کام کی بات نکل جائے۔ اس سے تمام پوچھ گچھ کا مقصد دو بنیادی باتیں معلوم کرنا تھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ژیان وادی سے فرار ہو کر کہاں گیا ہے؟ دوم یہ کہ اجنبی سرزمین والوں کے بارے میں کچھ تو معلوم ہو جائے۔ جزیل سے کافی دیر مغز ماری کے باوجود ہمارا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔ مجبوراً ہم دونوں ہی حویلی کے اس حصے سے لوٹ آئے۔

واپسی میں نضار نے مجھ سے پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے اے معبلہ! جزیل سچ بول رہا ہے یا اس کی زبان کھلوانے کے لئے کوئی اور طریقہ آزمایا جائے؟"

"تُو نے اور میں نے اے نضار! اس سے جتنے بھی سوال کئے' بلا روک ٹوک ان کے جواب ملے۔ اس نے کسی جھجک کے بغیر اور بلا سوچے سمجھے جواب دیئے۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جھوٹا نہیں' اگر اس پر تشدد بھی کیا گیا تو فضول ہی ہو گا۔"

"پھر کیا کیا جائے اس کا؟ یہ بات زیادہ عرصے راز نہیں رکھی جا سکتی کہ حویلی کے ایک حصے میں کسی کو داخلے کی اجازت نہیں۔ خاص طور پر مجھے احرس کی طرف سے اندیشہ ہے۔ اسے اگر محافظوں نے ادھر جانے سے روک دیا تو وہ تیری جان آفت میں کر دے گا۔ تجھے خود بھی معلوم ہے کہ وہ کتنی جلدی بے قابو ہو جاتا ہے۔"

میں نضار سے باتیں کرتی ہوئی اپنی خواب گاہ تک آ چکی تھی۔ نضار نے جس اندیشے کا اظہار کیا تھا ادھر میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ احرس کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ وہ اجلاس شروع ہونے سے پہلے باہر گیا تھا۔ میں نے اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ایک خادم کے ذریعے معلوم کرایا کہ وہ لوٹ کر آیا یا نہیں؟ نضار کو ساتھ لئے میں اب اپنی خواب گاہ میں آ گئی تھی۔

"اے نضار!" میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ذاتی طور پر وہ لاکھ مظلوم سہی لیکن بہرحال وہ زندگی بھر ہمارے دشمن کا ہی آلہ کار بنا رہا۔ پھر یہ کہ اس پر جو ظلم ہوا اس کی ذمے داری نہ تجھ پر ہے نہ مجھ پر۔" میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

نضار یقیناً میرا اشارہ سمجھ گیا اور کہنے لگا۔ "پھر تو اے معبلہ! ایک ہی صورت ہے کہ جزیل کی بات مان لی جائے۔ اسی نے ہمیں دیوتاؤں کا واسطہ دیا تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ آج ہی رات خاموشی سے یہ کام ہو جائے تو بہتر ہے۔ ویسے مہا پجاری سے یہ توقع تو نہیں کہ وہ کسی کے سامنے اس سلسلے میں اپنی زبان کھولے گا' پھر بھی تُو اس سے رازداری برتنے کو کہہ سکتی ہے۔"

نضار کی بات ختم ہوئی تھی کہ وہ خادم اجازت لے کر اندر آ گیا جسے میں نے احرس کو دیکھنے بھیجا تھا۔ اس نے بتایا کہ جو خادم احرس کے ساتھ گیا تھا' حویلی میں لوٹ آیا ہے۔ احرس نے اس سے کہلوایا تھا کہ وہ آج رات مہا پجاری ہی کے ساتھ وادی کی قدیم عبادت گاہ کے اس حصے میں رہے گا جو پجاریوں کی

سکونت کے لئے مخصوص تھا۔ مہا پجاری کا قیام پہلے بھی وہیں تھا۔ خادم یہ اطلاع دے کر چلا گیا تو نضار نے اپنے محافظ دستے کے نگران کو طلب کر لیا۔ نضار نے اسے بدنصیب جزیل کے بارے میں وہ حکم دے دیا جس کا تذکرہ ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے کر چکا تھا۔

جزیل کے ساتھ جو کچھ بھی ہونے والا تھا' میری بھی مرضی اس میں شامل تھی۔ پھر بھی مجھے اس کے انجام پر چند لمحے کو دکھ سا ہوا۔ پھر نضار نے ژیان کا ذکر چھیڑ دیا تو میری توجہ اس طرف سے ہٹ گئی۔ ژیان کے بارے میں جو فیصلہ میں کر چکی تھی' اس سے فی الحال نضار کو بھی آگاہ نہیں کیا۔ مجھے علم تھا کہ نضار میرے اس فیصلے سے اتفاق نہیں کرے گا کہ میں اپنے دشمن کے تعاقب میں ایک ان دیکھی دنیا کی طرف جانے کا خطرہ مول لوں۔

"اے معبلہ! میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ہمارا دشمن' اجنبی دنیا والوں کے ساتھ ہموار میدانوں کی طرف نکل گیا ہے اور اب کبھی ادھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔" نضار کہہ رہا تھا۔ "بہرحال یہ رنج زندگی بھر رہے گا کہ ہم اسے اپنے ہاتھوں سے قتل نہ کر سکے۔" یہ کہہ کر نضار نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "پھر بھی ہم نے اسے اقتدار سے محروم اور ذلیل و رسوا تو کر ہی دیا ہے۔ مجھے میرا اور تجھے تیرا حق مل گیا ہے۔"

نضار سے یہ سن کر کوشش کے باوجود میں خود پر قابو نہ رکھ سکی اور بول اٹھی۔ "کیا ہماری جنگ صرف اپنے حقوق حاصل کرنے تک محدود تھی اے نضار!"

"نہیں اے معبلہ!" نضار نے کہا۔ "ہمارا مقصد اپنے سینوں میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ بجھانا بھی تھا' مگر........... مگر ان حالات میں تُو ہی بتا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم تو اپنے دشمن کی طرف سے بالکل اندھیرے میں ہیں۔ تُو نے بھی سنا ہو گا کہ پہاڑوں کے نیچے ہموار میدانوں کی دنیا بہت بڑی ہے۔ وہاں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں۔ تو پھر اگر ہم پہاڑوں سے اتر کر ادھر گئے بھی تو شاید ساری زندگی ژیان کو تلاش نہیں کر سکیں گے۔ پھر یہ بھی نہ بھول کہ اجنبی دنیا والوں سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں اور اطلاعات کے مطابق دشمن کا ان کے ساتھ رابطہ رہا ہے۔"

"تُو ٹھیک ہی کہتا ہے اے نضار!" میں نے اپنے دل کی بات چھپا لی۔ مجھے نضار کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ ژیان کو اقتدار سے محروم کر کے' اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ کر اور مجھے میرا حق دلانے کے بعد اس نے بڑی حد تک اپنے دل کو سکون دے لیا ہے۔ اس کے بعد نضار کی آرزو کیا تھی' یہ قیاس کرنا بھی میرے لئے زیادہ دشوار نہیں تھا۔ پھر میرا قیاس درست ہی ثابت ہوا' اس نے اظہار آرزو کر ہی دیا۔

نضار میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں کب مجھے خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مجھے اس کا احساس تب ہوا کہ جب نضار نے میرے ہاتھ پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور کہنے لگا۔ "اے معبلہ! کیا ہم اپنی ساری عمر اسی طرح گزار دیں گے؟ اگر ہم اپنے دشمن کو تلاش کر کے اس سے اپنا انتقام نہ لے سکے تو .... تو کیا یونہی رائیگاں جائیں گے؟ ہجر کی آگ میں اسی طرح جلتے سلگتے رہیں گے۔ ہمیں ہمارے خوابوں کی تعبیر کبھی نہیں ملے گی؟" نضار کی آواز شدت جذبات کے سبب

مرتعش سی تھی۔ "کیا .... کیا اے معبلہ! اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ تُو کوئی فیصلہ کر سکے؟"

میں نے آہستگی کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ میرے لئے یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ نہ میں اس سے اپنے دل کی بات کہہ سکتی تھی' نہ اس کے جذبات محبت مجروح کرنا میرے لئے ممکن تھا۔ میں اسی لئے کچھ دیر خاموش رہی۔

"وقت اور حالات آدمی کو کتنا بدل دیتے ہیں اے نضار!" میں دھیمی آواز میں بولی۔ "تجھے اس کا کچھ اندازہ ہے؟"

"ہاں اے معبلہ! وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ آدمی بدلتا جاتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں مگر تُو نے اس وقت ایسی بات کیوں کہی؟"

"اس لئے اے نضار کہ میں تجھے ان بدل جانے والوں میں شمار نہیں کرتی۔" میری آواز میں اب بھی نرمی تھی۔ میں جو کچھ اس سے کہنا چاہتی تھی اسے یاد دلانا مقصود تھا' اس کے لئے یہ تمہید ضروری تھی۔ مجھے احساس تھا کہ اس وقت نضار جذبات کے جس دائرے میں داخل ہو گیا ہے' اس پر کوئی شدید ضرب اچانک برداشت نہیں کر سکے گا۔

میرے الفاظ سن کر نضار کے چہرے کا رنگ قدرے بدل گیا اور اس نے کہا۔ "تو کیا اے معبلہ! تُو نے مجھے بدلا ہوا پایا؟"

"نہیں اے نضار! بدلنا بھی دو طرح کا ہے۔" میں بولی۔ "ایک تو بدل جانا دانستہ اور ایک نادانستگی یا بھول میں۔ اسی بھول میں آدمی کبھی کبھی وہ عہد بھی بھول جاتا ہے جو خود وہ اپنی روح سے کرتا ہے۔"

"پھر تو اے معبلہ! ایسا شخص عہد فراموش ہی ہوا' چاہے بھول ہی میں وہ ایسا کیوں نہ کرے۔" نضار کے تیور اب بدلتے جا رہے تھے۔

"تو اے نضار! تجھ سے بھی ایسی ہی بھول ہو رہی ہے مگر میں تجھے عہد فراموش پھر بھی نہیں کہوں گی۔"

"ہاں .... شاید مجھ سے کوئی بھول .... بھول ہوئی ہے۔" نضار بڑبڑانے لگا۔ "میں نے کوئی .... کوئی عہد بھلا دیا ہے۔"

اب وہ لمحات آ گئے تھے کہ میں نضار سے جو کچھ کہنا چاہتی' کہہ سکتی تھی۔ وہ لمحاتی جذبات کے دائرے سے باہر نکل آیا تھا۔ سو میں نے اسے پُرجوش آواز میں مخاطب کیا۔ "مجھے آج بھی وہ دن یاد ہیں اے نضار کہ جب ادل کی بستی میں تیری مہمان تھی۔ وہ الفاظ سننا چاہتا ہے تو سن اے نضار کہ جو تُو نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہے تھے۔ تُو نے مجھ سے کہا تھا' میں نے عہد کیا ہے اے معبلہ کہ جب تک ظالم ژیان سے میں اپنے بابا کے قتل کا بدلہ نہیں لے لوں گا اور اس کی کٹی ہوئی گردن پر بھی دہکتا ہوا توا رکھا نہیں دیکھ لوں گا' مجھ پر زندگی کا عیش حرام ہے۔ اس پر میں نے بھی عہد کیا تھا کہ گواہ رہنا اے نضار کہ جب تک میری آنکھیں ژیان کا سر کٹ کر گرتے ہوئے نہیں دیکھ لیں گی' اپنے شوہر کی شکل نہیں دیکھیں گی۔ پھر تُو نے اے نضار! مجھے بڑے خلوص سے یہ دعا دی تھی کہ دیوتا تجھے تیرے کئے

ہوئے عہد پر قائم رہنے کا حوصلہ عطا کریں اے معبلہ! .... سو میں بھی وہی معبلہ ہوں اور تُو بھی وہی نضار ہے۔ ہاں وقت اور حالات ضرور بدل گئے ہیں۔"

چند لمحے میری خواب گاہ میں بوجھل سا سکوت طاری رہا۔ پھر مجھے نضار کی بھرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ "ہاں اے معبلہ! مجھ سے بھول ہوئی۔ میں .... میں تجھ سے اور اپنے کئے ہوئے عہد سے شرمندہ ہوں۔ میں احسان مند ہوں تیرا کہ تُو نے مجھے میرا عہد یاد دلا دیا۔" میں نے نضار کی آنکھوں میں نمی تیرتے دیکھی۔ "میں نے کچھ دیر پہلے تجھ سے جو کچھ کہا' اسے میری نادانی سمجھ کر بھلا دے اور یقین کر کہ اب تُو مجھے عہد شکن نہ پائے گی۔"

پھر نضار میرے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھا اور اٹھ کر چلا گیا۔ اس کا سبب شاید احساس پشیمانی ہی تھا۔

دوسرے دن صبح میں نے بستی تریال کی فوج کو رخصت کیا تو یہ منظر وادی سبز والوں کے لئے بڑا عجیب تھا۔ میرے حلیفوں کی افواج بھی ابھی وادی سے رخصت نہیں ہوئی تھیں۔ وہ بھی یہ عجیب نظارہ کر رہی تھیں۔ میں گھوڑے پر سوار ہو کر آبادی سے نکل کر اس کھلے میدان میں پہنچی تھی جہاں افواج خیمہ زن تھیں۔ بستی تریال کی فوج اپنے گھوڑوں پر سوار ہونے سے پہلے میرے سامنے سجدہ ریز ہو گئی تھی۔ پھر جب انہوں نے سر اٹھائے تھے تو "آتون دیوی' آتون دیوی" کے نعروں سے سارا میدان گونج اٹھا تھا۔ اس کے بعد فوج کا سپہ سالار آنف آگے بڑھا اور اس نے میرے گھوڑے کی لگام تھام کر التجا کی۔ "اے آتون دیوی! ہم تریال والوں کو خیر و برکت کی دعا دے اور ہماری طرف جلد لوٹ آ کہ ہم تیرے دیدار سے محروم نہ رہیں۔"

"اے تریال والو! تم پر دیوتاؤں کا سایہ ہمیشہ بلند رہے۔ تم خوب پھولو پھلو! مقدام اور نخبہ تک میری دعا پہنچا دینا۔ تمہاری آتون دیوی کی دعا ہے کہ نخبہ کی گود بھر جائے اور تمہاری کھیتیاں سدا ہری بھری رہیں۔ تم مجھ سے دور ہو کر بھی مجھ سے دور نہ رہو گے کہ میرے دل کے قریب ہو۔"

انہوں نے ایک بار پھر نعرے بلند کئے اور اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

کچھ دیر بعد جب وہ مڑ کر وادی سے نکلنے کے لئے پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے ماضی کا ایک ورق میری آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت میرے ساتھ احرس اور نضار دونوں ہی تھے۔ احرس بھی میرے ساتھ بستی تریال سے اسی فوج کے ساتھ آیا تھا' مگر میں نے اسے روک لیا تھا۔ اگر میں اسے رکنے کو نہ بھی کہتی تو وہ شاید واپس نہ جاتا۔ اس کے باوجود اپنی عادت کے مطابق وہ مجھ پر بظاہر احسان جتا رہا تھا۔ اس وقت بھی مجھے سنجیدہ اور کھوئی کھوئی سی دیکھ کر احرس کی "رگ شرارت" پھڑک اٹھی۔

"اے معبلہ! تُو اس وقت یوں اداس نظر آ رہی ہے جیسے اپنے سسرال والوں کو رخصت کیا ہو۔ حالانکہ مجھے روک لیا ہے تُو نے۔" احرس نے مسکرا کر کہا۔

"ہر وقت فضول باتیں نہ کیا کر۔" میں نے اپنے گھوڑے کو موڑا اور احرس کو گھور کر دیکھا۔

"اب تو وقت گزر گیا۔" وہ ہنسا۔ "یہ فضول باتیں تو تجھے سننا ہی پڑیں گی۔ میں نے تیری خوشامد

نہیں کی تھی کہ مجھے روک لے اور پھر یہ تو سوچ کہ تیری وجہ سے مجھے مار کتنی پڑے گی۔ جب میں یہاں سے لوٹ کر جاؤں گا تو میرا بابا ڈنڈا لے کر بیٹھا ہو گا اور شروع ہو جائے گا دھنا دھن کہ اتنی دیر میں گم لوٹ کر کیوں آیا؟ بڑا ہی بُرا زمانہ آگیا ہے اے میرے بھائی نضار!" احرس' نضار کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "جس کی گردن دباؤ آنکھیں دکھانے لگتا ہے۔"

مجھے ہنسی آگئی اور نضار بھی مسکرا دیا۔ پھر ہم تینوں حویلی میں لوٹ آئے۔ احرس صبح ہوتے ہی مہا پجاری کے پاس سے حویلی پہنچ گیا تھا۔

جب نضار حویلی کے مہمان خانے میں سردار صاحی اور دوسرے مہمانوں سے ملنے چلا گیا تو احرس ہی میرے ساتھ رہ گیا۔

"ہاں یہ تو بتا اے معبلہ کہ اپنے بھائی نضار کی رخصتی کب ہے؟" احرس بدستور شرارت پر آمادہ تھا۔ وہ میرے ساتھ لگا ہوا میری خواب گاہ میں آگیا تھا۔

"کیوں' تیری آنکھوں میں کس لئے کھٹک رہا ہے وہ؟"

"تو کیا یہیں ٹکا رہے گا وہ؟ اب تو تجھے وادی سبز کی حکمرانی بھی مل گئی۔"

"بڑا ہی احسان فراموش ہے تُو! مطلب نکل گیا تو آنکھیں پھیر لوں اس کی طرف سے۔"

"جمائے رکھ اس پر آنکھیں اور ٹکائے رکھ اسے یہیں۔ میرا کیا ہے' نکل جاؤں گا گریباں چاک کر کے ایک دن کسی ویرانے کی طرف۔ آخرکار عشق میں کبھی نہ کبھی تو مجھ جیسے عاشق پر یہ وقت آتا ہی ہے۔" احرس نے سرد آہ بھری۔

"معلوم ہے مجھے تُو اتنا غیرت مند عاشق ہرگز نہیں ہے۔" میں نے جان کر اسے چڑایا۔

"دیکھ میری غیرت کو للکارنے کی ناکام کوشش کبھی نہ کیجیو اے معبلہ! ورنہ .... میں ہرگز اس دھوکے میں نہیں آؤں گا اور تیری للکار کو سنی ان سنی کر دوں گا۔"

وقتی طور پر احرس کی خوش گپیوں کے سبب تریال والوں سے بچھڑنے کا دکھ میں بھول گئی۔ مجھے احساس تھا کہ اب میں شاید اس بستی کی طرف نہیں لوٹ سکوں گی۔ میرا دشمن مجھ سے زیر ہو کر بھاگ نکلا تھا' مگر میرے قابو میں نہیں آیا تھا۔ اس کی تلاش مجھے کہاں کہاں بھٹکائے پھرے گی' میں خود بھی اس سے بے خبر تھی۔ ان حالات میں بستی تریال اب ایک طرح سے میرے ماضی ہی کا حصہ بن چکی تھی۔ وہاں پھر کبھی جانا یا نہ جانا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ اب بھی میں بااختیار ہو کر خود کو بے اختیار ہی محسوس کر رہی تھی۔ میری مجبوری یہ تھی کہ اپنے دشمن کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا ہے؟

آئندہ تین روز کے اندر تقریباً تمام ہی قبیلوں کے سردار اور ان کی سپاہ وادی سے چلی گئی۔ اب صرف نضار اور اس کے نائبوں کی افواج وادی میں رہ گئیں۔ کبیت والوں کے سردار برسیا کو بھی میں نے واپس بھیج دیا تھا۔

مشرقی اور مغربی قبائل کے جن خاندانوں کو ثریان نے وادی سبز میں لا کر بسا دیا تھا وہ بدستور وہیں

رہے۔ وادی کے قدیم باشندوں کی تعداد ثریان کی مسلسل شکستوں کے سبب خاصی کم رہ گئی تھی۔ وادی کے جن قدیم باشندوں کو بطور سزا اجنبی دنیا والوں کے مشورے پر ثریان نے جلاوطن کر دیا تھا' انہیں بھی میں نے وادی میں دوبارہ آ بسنے کی اجازت دے دی۔ اس پر انہوں نے بڑی خوشیاں منائیں۔ وادی کی قدیم عبادت گاہ ایک بار پھر دیوتاؤں کی حمد و ثنا سے گونجنے لگی۔ مہا پجاری کو وادی میں واپس آ کر جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔ بوڑھا ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر پھر سے رونق نظر آنے لگی تھی۔ اس دوران میں کئی بار میں خود بھی عبادت گاہ گئی۔ مہا پجاری تو خیر روز ہی دن میں ایک بار حویلی کا ایک پھیرا ضرور لگاتا تھا۔ جزیل کے متعلق میں نے ایک روز خلوت میں اسے حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ نضار کی توقع کے مطابق اس نے کسی سے بھی جزیل کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کا سینہ نہ جانے ایسے کتنے رازوں کا مدفن تھا۔

ان تمام سرگرمیوں میں وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ اس عرصے میں میرے ہی ایما پر نضار نے ادل اور احزم کو بھی ان کی سپاہ کے ساتھ وادی سے روانہ کر دیا۔ بستی اشر کے شمال میں آباد دونوں قبیلوں والے بھی ادل اور احزم ہی کے ساتھ وادی سے نکل گئے۔ بستی اشر کی جو سپاہ نضار کے ساتھ تھی وہی وادی میں رہ گئی۔ نضار ابھی تک اس لئے بھی وادی میں رکا ہوا تھا کہ وادی کی منتشر فوج کو از سرنو ترتیب دے سکے۔ اپنے اس مقصد میں اب تک وہ خاصا کامیاب ہو چکا تھا۔ خطرہ ٹل جانے کے باوجود نضار کی یہ خواہش تھی کہ وادی کی فوج بھی پہلے ہی کی طرح مضبوط و مستحکم ہو۔ اس پر احرس فقرے بازی کرتا رہتا اور مجھے چھیڑتا کہ اے معبلہ! یہ سب تیرے پاس رکے رہنے کے بہانے ہیں۔ میں اس کی باتوں کو ہنس کر ٹال جاتی۔

اپنے بابا سردار اشم کی جگہ روز اجلاس والے کمرے میں بیٹھنا' بستی کے انتظامی معاملات نمٹانا اور دیگر ضروری امور پر توجہ رکھنا اب میرے معمول میں شامل ہو چکا تھا۔ حکمرانی کے جو لوازم ہوتے ہیں' جو ذمے داریاں نبھانا پڑتی ہیں وہ میرے ساتھ بھی تھیں۔ میں یہ تمام فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میرے دل میں ایک خلش بدستور تھی۔ نرم و گداز بستر مجھے کانٹوں کی سیج معلوم ہوتا' ذہن پریشان اور دل بے قرار سا رہتا۔ احرس کی باتوں سے گھڑی دو گھڑی کو جی بہل جاتا' پر خلوت میں پھر ایک اضطراب مجھے آ گھیرتا۔

میری یہ کیفیت نہ تو احرس سے چھپی ہوئی تھی اور نہ نضار ہی اس سے بے خبر تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے طور پر میری دل بستگی کے سامان فراہم کرتے۔

پُراسرار سرگوشیاں بھی مجھے کافی دن سے سنائی نہیں دی تھیں۔ میں اکثر سوچتی' کیا دیوتاؤں نے مجھے بھلا دیا؟ ان کی مصلحتوں کو سمجھنا میری فہم سے بالاتر تھا' مگر ایسا نہیں تھا کہ دیوتا مجھے بھول گئے ہوں۔ اس کا احساس مجھے چند ہی روز کے بعد ہو گیا۔ میں ایک بار پھر پُراسرار تجربات سے گزرنے لگی۔ ان تجربات کی نوعیت میرے لئے گزشتہ تمام تجربوں سے مختلف تھی۔ مجھ پر حیرتوں کا ایک نیا جہاں کھل گیا۔ مجھے سرگوشیوں میں یہ تاکید کی گئی تھی کہ میں جو کچھ بند آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں' سن رہی ہوں' سمجھ رہی ہوں' نضار سے بھی اس کا ذکر نہ کروں۔

تقریباً ہر شب، بیداری اور خواب کی ملی جلی سی کیفیت میں مجھے اجنبی لوگ نظر آتے۔ میں بڑے عجیب اور ناقابلِ یقین مناظر دیکھتی، ایسی بولیاں اور زبانیں سنتی کہ جو پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ مجھے ایسی چیزیں دکھائی دیتیں کہ جنہیں دیکھ کر میں حیرت میں پڑ جاتی۔ عجیب و غریب سواریاں دیکھ کر میں دنگ رہ جاتی۔ لوہے کو عجیب عجیب شکلوں میں سڑکوں پر دوڑتے دیکھ کر مجھے وحشت سی ہونے لگتی۔ فاصلے پھیلتے اور سمٹتے نظر آتے تو میں حیران ہوتی۔

پھر جب میری آنکھ کھلتی، میرے حواس پوری طرح بیدار ہو جاتے تو مجھے ایک ایک بات یاد آتی۔ یہ سب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیوں؟ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ چند روز کے بعد ان پُراسرار تجربات میں ایک اور تغیر رونما ہوا۔ اجنبی لوگوں کی بولیاں اور زبانیں میری سمجھ میں آنے لگیں۔ حیرت انگیز اشیاء کے نام میرے ذہن پر نقش ہونے لگے۔ میں انہیں الگ الگ پہچاننے لگی۔ دہشت و حیرت کی جگہ شوق و تجسس اور آگہی نے لے لی۔

اسی کے بعد ایک رات میں نے پُراسرار سرگوشیاں سنیں۔ "اے معلبہ! تیری آنکھوں سے پردے اٹھائے جا رہے ہیں اور یاد کر وہ دن کہ جب تجھ سے کہا گیا تھا کہ نیکی اور بدی کی جنگ کو اتنا مختصر نہ جان! یہ جنگ ،انہی پہاڑی بستیوں اور قبیلوں تک محدود نہیں۔ سو وہ کہ جسے تُو نے سب کچھ سمجھ لیا، وہی تیرا دشمن ژیان، وہ تو تیرے راستے کا صرف ایک پتھر ہے۔ تجھے تو ابھی پہاڑوں سے ٹکرانا ہے۔ تجھ پر تو ابھی تیرے بہت سے بھید کھلنا باقی ہیں۔ تُو اپنی اصل کی طرف لوٹنے گی کہ ہر شے آخرکار اپنی اصل ہی کی طرف لوٹتی ہے۔ تُو دیوتاؤں سے روشنی کی طلب کرتی ہے، سو تجھے روشنی دکھائی جائے گی اور تیری آنکھوں کو اسی روشنی کی تاب لائے جانے کے قابل بنایا جا رہا ہے۔ تیری سماعت کو ان آوازوں کو سننے اور سمجھنے کا اہل کیا جا رہا ہے کہ جو تُو نے کبھی نہیں سنی اور سمجھی تھیں۔ تیری آنکھوں کو ایسے منظر دکھائے گئے کہ تُو نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اپنے اوپر قابو پانا سیکھ اور اس قدر جلد حواس نہ کھو دیا کر۔ سن کہ تجھے جلد ہی اجنبی دنیا کی طرف جانے کا حکم ملے گا اور تُو وہاں جائے گی اور تجھے ساحر زعیم یاد ہو گا مگر یہ خبر نہ ہو گی کہ وہ کہاں سے آ کر ان بستیوں پر عذاب کی صورت مسلط ہو گیا تھا۔ تو سن اے معلبہ کہ وہ لعنتی ساحروں کی ایک بستی سے آیا تھا اور تیرے دشمن ژیان نے بھی وادی سبز سے فرار ہو کر وہیں پناہ لی تھی۔ ساحروں کی وہ بستی جنوب میں دس روز کی مسافت پر ہے۔ مگر اب وہ ہموار میدانوں کی طرف جا چکا ہے۔ تجھے پہلے اس سے کیوں بے خبر رکھا گیا، اس میں بھی مصلحت ہی تھی۔ تیرے سینے میں جو ایک چنگاری ہے کہ تُو جسے بھڑکتا ہوا جہنم جان رہی ہے، وہ جہنم نہیں۔ تُو یوں انجان ہے کہ تُو نے جہنم ابھی دیکھا نہیں۔ یہ چنگاری بجھ جائے گی، تو اپنے دشمن کو اسی حال میں دیکھے گی کہ جس حال میں دیکھنا چاہتی ہے، مگر بے صبری نہ بن۔ پہلے بھی تجھ سے کہا گیا تھا کہ وہ جلد تیرے قابو میں نہ آئے گا۔ تجھ سے جو کہا جایا کرے اس پر غور کیا کر، سمجھا کر، دیوتاؤں نے تجھے نہیں بھلایا اور تُو بھی انہیں یاد رکھ کہ وہ تیری مدد پر ہیں۔ کیا تیرے لئے اتنا ہی جان لینا کافی نہیں۔ تیرے دشمن ژیان نے بھی ساحروں کی صحبت میں رہ کر کچھ شعبدے سیکھ لئے ہیں، کچھ شیطانی قوتیں حاصل کر لی ہیں اور نہیں جانتا کہ دیوتا جب اس کی رسی کھینچیں

گے تو اسے بھی ساحر زعیم کی طرح کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اسے خبر نہیں کہ اس کے پیروں سے جو رسی بندھی ہے، جب کھینچی جائے گی تو وہ اوندھے منہ زمین پر آ گرے گا۔ ڈھیل دیئے جانے پر وہ سمجھ رہا ہے کہ بھاگتا ہی چلا جائے گا اور دیوتا بدی کے ان ہرکاروں کو اسی طرح ڈھیل دیتے ہیں، پھر ایک دن انہیں عبرت کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔"

پُراسرار سرگوشیاں معدوم ہو گئیں تو دیر تک میں ایک سناٹے کے سے عالم میں رہی۔ مجھے اس پر پشیمانی محسوس ہوئی کہ میں نے سوچا، دیوتاؤں نے مجھے بھلا دیا ہے۔ رات کا وہ آخری پہر تھا کہ جب میں نے اپنے حواس کی مکمل بیداری کی حالت میں یہ سرگوشیاں سنیں۔

اس کے بعد کچھ دن اور گزرے اور میں پُراسرار تجربات سے گزرتی رہی، مجھ پر آگہی کے نئے در کھلتے گئے۔ اب اجنبی سرزمین اور اس پر بسنے والے میرے لئے اجنبی نہیں رہے تھے۔ مجھے اب ہموار میدانوں کی طرف جانے کے حکم کا انتظار تھا کہ ہدایات کے مطابق مجھے یہ سفر تن تنہا ہی کرنا تھا، مگر کب اور کیسے؟ میں اس سے ناآشنا تھی۔

مجھے اب کسی بھی وقت سفر کا حکم مل سکتا تھا، سو میری فکر کا محور یہ تھا کہ وادی سبز کو کس کے حوالے کر جاؤں؟ کبھی میرے ذہن میں نصار کا نام ابھرتا اور کبھی میں احرس کے بارے میں سوچنے لگتی۔ دونوں ہی میرے قریب تھے، دل کے قریب بھی۔ کون یہ ذمے داری سنبھال سکتا ہے؟ بار بار یہی سوال میرے ذہن میں ابھرتا۔ آخرکار میں نے ایک روز فیصلہ کر ہی لیا۔ اس فیصلے کے دوسرے ہی دن مجھے حکم مل گیا۔ مجھے روانگی کے لئے صرف سات روز کی مہلت دی گئی تھی۔ یہ حیرت ناک سفر مجھے کس سمت میں اور کس طرح کرنا تھا؟ اس سوال کا جواب مجھے آخری دن ملنا تھا، اس دن کہ جب میں ایک ایسی دنیا کی طرف روانہ ہوتی کہ جہاں قدم قدم پر میرے لئے نئے ہنگامے موجود تھے اور میں ابھی ان سے ناآشنا تھی۔ یہ سب کچھ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ اس وقت تو میں بہت خوش تھی کہ آخرکار مجھے وہ راستہ مل ہی گیا کہ جس پر چل کر اپنے دشمن ژیان تک پہنچ سکتی ہوں!

آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل! ان دنوں میں کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھی۔ مجھے کچھ بھی نہیں پتا تھا کہ مستقبل میں میرے لئے کیا کیا اسرار چھپے ہیں! مجھے کن کن آزمائشوں اور امتحانات سے گزرنا ہے۔ اب تک میں جن حالات سے گزری تھی، ان سے ایک نتیجہ بہرحال اخذ ضرور کیا تھا کہ بعض اوقات حالات کا قبل از وقت جان لینا خود انسان کے مفاد میں نہیں ہوتا۔ تقدیر، وقت اور حالات انسان کا تعین کرتے ہیں۔ اگر کسی کو پہلے سے یہ خبر ہو جائے کہ وہ جس منزل کی طرف پورے جوش و عزم اور ولولے سے بڑھ رہا ہے، وہاں پہنچ کر اسے گردِ کارواں کے سوا کچھ نہ ملے گا، اس کے خواب سراب ثابت ہوں گے تو پھر شاید اس کے قدم نہ اٹھ سکیں۔ ایسے میں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ یہی گردِ کارواں بھی اس کی منزل کے لئے ایک اشارہ ثابت ہوتی ہے۔ منزل کی طرف بڑھتے ہوئے راستے میں پڑاؤ بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ آدمی اپنی توانائیوں کو مجتمع کر سکے۔ یہی معاملہ تقریباً میرے ساتھ تھا۔ مجھے اگر پہلے سے علم ہو جاتا کہ وادی سبز پر حملہ کرنے اور فتح کر لینے کے باوجود میرے سینے میں

بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ سرد نہیں ہو سکے گی تو یقیناً میں قبل از وقت ہی اپنے اندر پسپا ہو جاتی۔ جو لوگ پہلے ہی اپنے اندر سے ہار جاتے ہیں' فتح ان کا مقدر نہیں بنتی۔ پُراسرار سرگوشیوں میں بار بار مصلحت کا لفظ اسی طرف نشان دہی کرتا تھا۔ اب اس لفظ کے معنی بڑی حد تک مجھ پر کھل چکے تھے۔ "دیوتاؤں کی اس میں کیا مصلحت ہے' یہ تجھے وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔" یعنی میری سمت سفر مستقبل میں کیا ہو گی؟ میری تقدیر کیا ہے؟ اس کا اندازہ مجھے آئندہ خود ہو جائے گا۔ وقت' حالات اور آدمی کا عمل اس کی تقدیر کا تعین کرتے ہیں۔ عمل اور اس کے ردعمل کے نتیجے کو آدمی کی تقدیر کہا جا سکتا ہے۔ کسی عمل کے ردعمل میں وقت اور حالات کی گردش سے کیا نتیجہ برآمد ہو گا' وہ نظروں سے چھپا ہوتا ہے اور آدمی قیاسات کے سہارے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اسی انداز فکر کے سبب اپنی زندگی میں بار بار وقتی شکستوں سے دوچار ہونے کے باوجود میرے وجود میں حوصلوں کی جو شمع روشن تھی وہ کبھی بجھی نہیں۔ مجھ میں زندگی سے پنجہ آزمائی کرنے کی امنگ برقرار رہی۔

چند روز پہلے پُراسرار سرگوشیوں کا ایک ایک لفظ مجھے یاد تھا۔ "نیکی اور بدی کو اتنا مختصر نہ جان! یہ جنگ انہی پہاڑوں اور بستیوں تک محدود نہیں۔" یہ الفاظ میں نے پہلے بھی سنے تھے۔ مگر ان پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد وہ اہم بات بھی میرے مدنظر تھی کہ جو واضح طور پر کہی گئی تھی۔ میری آئندہ زندگی سے بھی اس کا گہرا تعلق تھا۔ "سو وہ کہ جسے تُو نے سب کچھ سمجھ لیا' وہی تیرا دشمن ژیان' وہ تو تیرے راستے کا صرف ایک پتھر ہے۔ تجھے تو ابھی پہاڑوں سے ٹکرانا ہے۔" پھر یہ الفاظ کہ "تیرے سینے میں جو ایک چنگاری ہے' تُو جسے بھڑکتا ہوا جہنم جان رہی ہے' وہ جہنم نہیں۔ تُو یوں انجان ہے کہ تُو نے ابھی جہنم دیکھا نہیں۔" ان الفاظ کا مطلب یہی تھا کہ صرف ژیان سے انتقام لے لینا میری منزل نہیں ہے۔ اسے تو میرے راستے کا صرف ایک پتھر کہا گیا تھا اور مجھے پہاڑوں سے ٹکرانے کی خبر دی گئی تھی۔ میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کو "چنگاری" سے تعبیر کیا گیا تھا۔ یہ اشارے میرے مستقبل کی نشاندہی کر رہے تھے۔ اس روز کہ جب مجھے سات روز کی مہلت دی گئی' میں اس سے پہلے ہی ان تمام باتوں پر غور کر چکی تھی۔ اسی غور و خوض نے مجھے یہ فیصلہ کرنے میں مدد دی کہ وادی سبز کو کس کے حوالے کر جاؤں؟ متعدد وجوہ کی بنا پر یہ فیصلہ میں نے احرس کے حق میں کیا تھا۔ مگر فوری طور پر نہ میں نے نضار کو کچھ بتایا اور نہ احرس سے اس معاملے پر بات کی۔ دوسرے ہی دن جب مجھے وادی سے روانگی کے لئے سات روز کی مہلت ملی تو محدود وقت کے پیش نظر احرس کو ہموار کرنے کے لئے سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا' اسی لئے اسے راہ پر لانے کی غرض سے اسی شام میں نے کوشش شروع کر دی۔ نضار اس وقت حویلی میں نہیں تھا۔ میرے لئے یوں بھی یہ موقع غنیمت تھا۔ حویلی سے نضار کی غیر موجودگی کا سبب وادی کے انتظامی امور ہی تھے۔ خصوصاً وادی کی فوج کا وہ نظم و نسق کہ جس میں اسے بڑی حد تک کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔ نضار کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ آبادی کے باہر میدان میں نئی ترتیب دی جانے والی فوج کے درمیان تھا۔ سو احرس کو میں نے اپنی خواب گاہ میں طلب کر لیا تھا۔ احرس نے اپنی عادت کے مطابق آتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ کہنے لگا۔ "تو اپنے ان محافظوں

اور خادموں کو اچھی طرح میرے بارے میں بتا دے کہ میں کون ہوں .... مطلب یہ کہ تیرا ہونے والا کون ہوں! حکمراں ہو گی تُو ان کی! تجھ سے ملنے تک پر انہوں نے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ یہ کوئی شرافت ہے؟"

"تُو بتا' کیا چاہتا ہے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"تجھ سے جب بھی چاہوں' بلا روک ٹوک مل سکوں۔" احرس نے جواب دیا۔ "مجھے وہ کیا سمجھتے ہیں! میں اگر حکمراں نہ سہی تو میری ہونے والی جورو تو حکمراں ہے۔"

مجھے موقع مل گیا اور میں فوراً بول اٹھی۔ "تُو بالکل ٹھیک کہتا ہے اے احرس! انہیں تیری تعظیم کرنا چاہئے۔" اس کی بقیہ باتوں کو میں دانستہ اس وقت نظرانداز کر رہی تھی۔ "اگر تُو آج حکمراں نہ سہی تو آئندہ ہو سکتا ہے۔"

یہیں پر احرس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ "اے معبلہ! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"کیوں' کیا میں تجھے بیمار نظر آ رہی ہوں؟"

"بظاہر تو خیر ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہی ہے' مگر کیا خبر اندر سے بیمار ہو!" وہ اب بھی مجھے مشتبہ سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "اب سے پہلے کبھی تُو نے یوں میری باتوں کی تائید نہیں کی۔ مجھے اسی لئے شبہ ہوا کہ شاید تیری طبیعت آج کچھ خراب لگتی ہے۔ ہاں یہ بتا کہ اس وقت اچانک تجھے میری یاد کیسے آ گئی؟ تجھے تو اپنے قصے کہانیوں سے فرصت نہیں ملتی۔ ایسے میں بھلا میں اپنا قصہ عشق کسے جا کر سناؤں؟"

"ہاں یہ تو میں اکثر بھول جاتی ہوں کہ تُو اب بڑا ہو گیا ہے۔ تجھے کوئی چاہئے کہ جسے تُو دن رات اپنی بکواس سننے پر مجبور کر سکے اور وہ غریب تیری ہر بات سن کر سر جھکا دے۔ ویسے میری نظر میں ایک لڑکی ہے ایسی۔ بس یہ ہے کہ اسے ذرا دور سے بلوانا پڑے گا۔ اس کی طرف میں تجھے اتنا یقین ضرور دلا سکتی ہوں کہ وہ تیری بکواس جسے تُو قصہ عشق کہتا ہے خاموشی کے ساتھ سن لے گی اور اف نہ کرے گی۔" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"اب سمجھ گیا میں کہ تُو نے مجھے کس لئے بلایا ہے۔ تُو میرے دل کو تڑپا کر خوش ہونا چاہتی ہے' بتی اشر کی اس بدذات خادمہ کا ذکر کر کے جو میرے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے رہ گئی' بس تیری خاطر اس کو زندگی بخش دی۔"

"رہنے دے' تجھے میں خوب جانتی ہوں' تُو میری خاطر کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں زبانی دعوے کرنا اس کے لئے بہت آسان کام ہے۔"

"اچھا تو میں تیری دانست میں صرف زبانی دعوے کرتا ہوں .... میرے عشق پر اتنا بڑا الزام .... ذرا سوچ کہ میں اس الزام پر خفا ہو جاؤں تو تیرا کیا بنے گا؟ تیرا مستقبل اندھیروں میں ڈوب جائے گا یا نہیں اور پھر ڈوب کر ابھرنا آسان نہیں ہوتا۔"

"میرا مستقبل تو اسی روز تاریک ہو گیا تھا کہ جب تُو نے مجھے اپنا قصہ عشق سنانے کی ناکام کوشش کی تھی۔" میں جان بوجھ کر اسی کے انداز میں اس سے گفتگو کر رہی تھی۔ "اے احرس! اب تُو مجھے ایسی

باتوں سے نہیں ڈرا سکتا۔"

"میں نہیں مان سکتا اے معبلہ! .... ہرگز نہیں۔" وہ انکار میں گردن ہلانے لگا۔

"کیا نہیں مان سکتا؟" میں حیرت سے بولی۔ "یہ تُو کیا ہانکنے لگا؟"

"یہی کہ تیری طبیعت خراب نہیں ہے۔" اس نے بڑے مظلوم و مجروح سے لہجے میں کہا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تجھے میں نے اس وقت ایک ایسی خاص بات کرنے کو بلایا ہے کہ جو اب تک کسی سے نہیں کی۔" میں سنجیدہ ہو گئی۔

"تُو بڑی مطلبی ہے' مجھے معلوم ہے۔ رہا یہ کہ وہ بات تُو نے کسی سے نہیں کی تو اچھا ہی کیا ورنہ خواہ مخواہ فساد برپا ہو جاتا۔ کچھ لوگ اپنی لگائی یا ہونے والی لگائی کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ اگر کوئی خاص بات کسی اور سے کرتے دیکھ لیں اپنی لگائی یا جورو کو تو خون خرابے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مجھے بھی اے معبلہ! تُو ایسے ہی لوگوں میں سے سمجھ۔ میں ایسے معاملات میں ہرگز رعایت کا قائل نہیں۔ تبھی تو اپنے بھائی نضار سے بھی میں جلنے لگا تھا۔" احرس نے "خاص بات" کو ایک اور ہی معنی پہنا دیئے تھے۔ بات کو طول دینے اور کچھ سے کچھ رنگ دینے میں تو اسے خاص ملکہ حاصل تھا۔

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ میری بات کم سنے گا اور اِدھر اُدھر کی زیادہ اڑائے گا۔ میں اسی لئے جلد اس سے اپنے دل کی بات کہہ دینا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کی ذومعنی باتوں کو بھی نظرانداز کر رہی تھی۔ وہ اپنی بات کہہ چکا تو میں بولی۔ "تجھے یہ تو معلوم ہے احرس کہ دیوتا مجھ پر مہربان ہیں۔"

"تو اور کیا مجھ پر مہربان ہوں گے۔ کہاں تُو حسن و رعنائی کا پیکر اور کہاں میں اوبڑ کھوبڑ۔"

"بڑا ہی ناشکرا ہے تُو! کیا تجھ پر دیوتاؤں نے مہربانی نہیں کی؟ بھول گیا وہ دن کہ جب تُو گلے میں پٹی ڈالے پھرتا تھا اور پھر ایک صبح اٹھا تو ٹھیک تھا۔"

"وہ تو خیر تیری وجہ سے دیوتا مجھ پر اور نضار پر مہربان ہو گئے تھے کہ ہم دونوں تیرے شانہ بہ شانہ لڑ سکیں۔"

"چل یہی سہی' تُو نے مانا تو دیوتا تجھ اوبڑ کھوبڑ پر بھی مہربانی کر سکتے ہیں۔" میں بولی۔ "تجھ میں ایک بڑی خرابی ہے' اپنی ہانکے جاتا ہے' دوسرے کی نہیں سنتا۔"

"میں تو خیر تیری نظر میں ہوں ہی خراب۔ مگر یہ بھی تو سوچ کہ مجھے خراب کرنے والی بھی تو کوئی اور نہیں تُو ہے اور تیرے میرے بیچ یہ دوسرا کون آ گیا؟ میں تجھے دوسرا سمجھوں تو تیری بات سنوں بھی۔"

"تو پھر اپنا سمجھتا ہے نا؟" میں نے اسے گھیرا۔

"تُو کہتی ہے تو سمجھ لیتا ہوں۔ اچھا بول کیا کہہ رہی تھی؟ اب میں بیچ میں نہیں بولوں گا۔ تُو بھی کیا یاد کرے گی کہ کوئی فرماں بردار عاشق صادق ملا تھا۔"

"دیوتاؤں کی طرف سے مجھے ایک حکم ملا ہے جس کی تعمیل ضروری ہے۔ مجھے کچھ عرصے کے لئے وادی سبز سے کہیں جانا ہے اور..........."

"اور پہلے ہی کی طرح تیرے ساتھ نضار کو بھی جانا ہو گا؟ یہی بات ہے نا؟" احرس نے میری طرف

عجیب نظروں سے دیکھا۔

"اتنی جلدی اور پوری بات سنے بغیر تُو بیچ میں نہ بولنے کا وعدہ بھول گیا۔ کیا میں نے تجھ سے یہ کہا ہے کہ نضار بھی میرے ساتھ جائے گا؟ بول۔"

"نہیں کہا' مگر اندازہ بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے اور کیا تُو مجھے اپنے ساتھ لے جائے گی؟"

"نہ تو نضار میرے ساتھ جائے گا اور نہ تُو۔ اب تیری کھوپڑی میں کچھ آیا کہ نہیں۔"

میری بات سن کر احرس کے چہرے پر حیرانی سی نظر آنے لگی۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ بولا۔ "مگر ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ جو ابھی کہا۔" پھر وہ کہنے لگا۔ "ظاہر ہے تُو نہیں بتائے گی کہ دیوتا تجھے کہاں اور کیوں بھیج رہے ہیں۔ مگر ایک بات میں ضرور پوچھوں گا .... تیرے بعد یہاں کیا ہو گا؟" اب وہ قدرے سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔ "ابھی تجھے یہاں حکمرانی کرتے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟"

"میں نے تجھے اسی مسئلے پر مشورہ کرنے کو بلایا ہے۔" میں نے اس کی سنجیدگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً کہا۔ "نضار کی طرح میرا تو کوئی ایسا نائب بھی نہیں جو میری غیر موجودگی میں میری جگہ سنبھال سکے۔ پھر یہ کہ وہ تو خود اب ایک بڑے علاقے کا حکمراں ہے۔ اس کے اپنے مسئلے بھی کچھ کم نہیں۔ میں اس سلسلے میں نضار پر اب مزید کوئی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی۔ یہی کم نہیں کہ اس نے اتنے عرصے میں اپنے مسائل کو پس پشت ڈال کر وادی کے لئے ایک نئی فوج ترتیب دے دی ہے اور یہاں اتنے دن سے پڑا ہے۔ میرا ارادہ اس سے مشورہ کرنے کا بھی تھا لیکن تجھے اے احرس! فوقیت دی کہ پہلے تیری رائے لی جائے۔"

"تُو کہیں اس حیلے بہانے سے مجھے تو اس چکر میں پھانسنا نہیں چاہتی اے معبلہ!" اس نے میرے چہرے پر یوں نظریں مرکوز کر دیں کہ جیسے چہرے سے دل کا حال جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ لاکھ خوش مزاج و خوش گفتار اور غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود تھا بہرحال ذہین۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ بولا۔ "اگر تیرے دماغ میں ایسا کوئی خیال کلبلا رہا ہے تو میں ہرگز کھونٹے پر بندھنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"ابھی تو کچھ دیر پہلے تُو مجھ سے عشق کے دعوے کر رہا تھا اور اب ذرا سی دیر میں آنکھیں بدل لیں۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"عشق کا مطلب ہرگز میرے نزدیک یہ نہیں کہ جو محبوبہ دل نواز کہے مان لو اور پھر تیرا کیا بھروسا' میں یہاں ٹاپتا رہوں اور تُو یہ بھول ہی جائے کہ کوئی تیرے آنے کی امید میں آنکھیں بچھائے انتظار کر رہا ہو گا۔ دیوتاؤں سے میں ویسے بھی بہت ڈرتا ہوں۔ کیا خبر وہ تجھے کب تک میرے پاس لوٹ کر نہ آنے دیں۔ میرا تو ان سے ویسے بھی براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ تُو ایسا کر کہ اس معاملے میں اپنے بھائی نضار کو گھسیٹ۔ اسے یوں بھی ایسے کاموں کا بہت شوق ہے اور بقول تیرے وہ تجربہ کار بھی ہے' چٹکی بجاتے تیرا یہ مسئلہ حل کر دے گا۔"

"اور تُو باتیں بنانے کے سوا میرے کسی کام نہیں آئے گا؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ "مجھے

اچھی طرح معلوم ہے کہ تُو اگر چاہے تو یہ ذمے داری سنبھال سکتا ہے۔"

"کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں صورت سے تجھے چاہے جتنا گھامڑ نظر آؤں' درحقیقت ہوں نہیں۔"

"ٹھیک ہے' تو پھر جا عیش کر۔" میں نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ "تجھے مجھ سے اور میری مجبوریوں سے آخر واسطہ بھی کیا۔ میں کچھ اور سوچ لوں گی' کوئی اور راستہ نکال لوں گی۔ دیوتاؤں کا حکم ٹال کر مجھے تو گنہگار نہیں ہونا' نہ ان کے عتاب کو میں دعوت دینا چاہتی ہوں۔"

میری بات سنتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اچھا تو پھر میں چلا۔" یہ کہتے ہی اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ میری خواب گاہ کے دروازے تک پہنچ کر وہ رکا اور مڑ کر مجھے مخاطب کیا۔ "اے معبلہ! مجھے روکے گی نہیں جانے سے؟"

جواب میں دانستہ مَیں منہ پھلائے بیٹھی رہی اور کچھ نہ بولی۔

"اچھا خیر تُو اتنی کٹھور بن رہی ہے تو میں خود ہی پلٹ آتا ہوں۔ بس تھوڑی دیر کو اپنے دل میں یہی تو کہے گی تُو کہ دیکھا کیسا اُلّو بنایا۔ مگر جب آدمی خود ہی اُلّو بننے پر آمادہ ہو تو کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ نہ تجھ سے میں نے عشق کیا ہوتا۔ نہ آج یہ دن دیکھنا پڑتا۔" یہ کہتا ہوا وہ پھر میرے قریب آ بیٹھا۔ "دیکھ ایسا کرتے ہیں' ہم دونوں مل کر اس مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈتے ہیں۔ اب یہ اپنے ماتھے کے بل تو ٹھیک کر لے۔ اس طرح تُو بڑی بُری لگ رہی ہے مجھے۔ ہاں یہ بات ہوئی نا! اب تھوڑا بہت مسکرا بھی دے تو بالکل پہلے کی طرح نظر آنے لگے۔"

اپنے دوسرے حربے کی کامیابی پر میں واقعی خوش تھی اس لئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میری کوشش رائیگاں نہیں ہوئی تھی۔

"اے احرس! اس مسئلے کا کوئی اور حل ممکن نہیں۔" میں چند لمحے بعد بولی۔ "اس لئے نہ اپنا مغز کھا اور نہ میرا۔"

"اور سیدھے سیدھے تیری بات مان کر گلے میں یہ ڈھول ڈال لوں کہ جسے بجانا بھی مجھے نہیں آتا۔"

"کوشش کرے گا تو یہ ڈھول بجانا بھی آ جائے گا۔ میں نے ہی اس سے پہلے کب کہیں کی حکمرانی کی ہے۔"

"اپنی بات رہنے دے۔ تجھے تو بچپن سے عادت ہے اس کی۔ لوگوں کو ہمیشہ میں نے تیرے سامنے جھکتے ہی دیکھا ہے۔ حکمرانی اور کہتے کسے ہیں؟" احرس نے کہا۔ "بستی تریال والے کیا تجھے دیوی سمجھ کر نہیں پوجتے رہے؟ کیا نضار کی بیماری کے دوران میں تُو بستی اشر پر حکومت نہیں کرتی رہی' چاہے وہ چند روز ہی سہی۔ اب کیا اتنے دن سے میں تجھے اس وادی پر حکمرانی کرتے نہیں دیکھ رہا؟ تُو اس کی اہل ہے اور مجھے اپنی نااہلی پر کوئی ملال نہیں۔"

"ڈھیٹ بننے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ کوئی فخر کی بات نہیں کہ تجھے کچھ نہیں آتا یا تُو خواہ مخواہ اپنا

دامن بچانے کے لئے خود کو نااہل قرار دینے لگے۔"

"تو پھر کیا کروں؟ تُو ہی مجھے راہِ فرار کی کوئی صورت بتا دے۔ یقین کر اے معبلہ کہ میں تیرا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

کچھ دیر بحث و مباحثے کے بعد آخر احرس نے اپنی دانست میں ایک راہ فرار ڈھونڈ ہی لی۔ یہ ذمے داری وہ نضار کے سر تھوپنا چاہتا تھا اور نضار کے معاملے میں مجھے پورا یقین تھا کہ میری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرے گا۔ اسی رات میں نے نضار سے اس معاملے میں بات کی۔ نضار کو بھی میں نے تفصیل میں جائے بغیر صرف اتنی ہی بات بتائی تھی جو احرس کو بتا چکی تھی۔ احرس کی نسبت نضار ان معاملات سے زیادہ آگاہ تھا۔ اس کے چہرے سے غالباً اسی لئے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا۔ خاصی دیر وہ خاموش رہا' پھر بولا۔ "دیوتاؤں کی مصلحت تو خیر دیوتا ہی جانیں اے معبلہ! میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کاش مجھے بھی تیرے ساتھ جانے کا حکم ملتا۔ جہاں تک میرا دماغ کام کرتا ہے' یہ حکم مفرور ژیان ہی کے متعلق ہو سکتا ہے لیکن میں اس سلسلے میں تجھ سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ مجھے اندازہ ہے کہ تجھے رازداری کی تاکید بھی کی جا سکتی ہے۔ تیری روانگی میں کتنے دن باقی ہیں؟ اگر یہ نہ بتانے کی تاکید ہو تو اس کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں۔"

اس سلسلے میں کوئی تاکید تو نہیں کی گئی تھی' مگر کچھ باتیں یقیناً ایسی تھیں کہ جو میرے نزدیک نضار سے بھی رازداری کا تقاضا برتنے پر مجھے مجبور کر رہی تھیں۔ انہی میں سے سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں اس معاشرے اور اس کی دیرینہ روایات کا حصہ نہیں۔ میں یقیناً وہ نہیں جو بتا دی گئی تھی۔ چند روز پہلے سنائی دینے والی سرگوشیوں کے کچھ الفاظ میرے لئے بڑی گہرائی کے حامل تھے۔ "تُو اپنی اصل کی طرف لوٹے گی کہ ہر شے آخرکار اپنی اصل ہی کی طرف لوٹتی ہے۔" اپنے اس راز میں آج تک میں نے کسی کو بھی شریک نہیں کیا تھا اور نہ اب ایسا چاہتی تھی۔ نضار نے میری روانگی کے بارے میں جو سوال کیا تھا' اس کا تعلق رازداری سے نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے جواب دینے میں تاخیر نہیں کی۔ "روانگی کے لئے مجھے ایک ہفتے کی مہلت ملی ہے۔" اسی کے ساتھ یہ بھی میں نے بتا دیا کہ سمت سفر کا ابھی تعین نہیں کیا گیا۔ یہ مجھے آخری دن بتایا جائے گا۔ پھر میں نے نضار سے کہا۔ "میری خواہش ہے کہ میری غیر موجودگی کے دوران میں احرس وادی سبز کی ذمے داری سنبھالے۔ اس خواہش کی وجہ یقیناً تیرے لئے سمجھنا مشکل نہ ہو گا۔"

"سمجھتا ہوں اے معبلہ!" نضار دھیمی آواز میں بولا۔ "ایک تو یہ کہ تُو اسے ظاہر ہے' خود سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مجھے تُو اس بدنامی سے بچا لینا چاہتی ہے کہ وادی سبز پر قبضے کی خاطر میں نے تیرا ساتھ دیا تھا۔ یہ معاملہ بڑا نازک تھا۔ جسے تُو نے نہایت دانش مندی سے بگڑنے نہیں دیا۔ وادی سبز میں احرس کا تیرا نائب ہونا تیری دور اندیشی کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ اور وجوہ ممکن ہیں جو شاید بعد میں ظاہر ہوں۔"

"میں نے انہی تمام وجوہ کی بنا پر آج شام احرس سے بات کی تھی لیکن وہ راضی نہیں ہو رہا۔ تجھے

تو خبر ہے اے نضار کہ اس سے بات کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ وہ اس معاملے میں تجھے آگے کر کے اپنا دامن بچانا چاہتا ہے۔" میں نے بتایا۔

"اے معبلہ! تُو فکرمند نہ ہو' میں اسے اس معاملے کی نزاکت کا احساس دلا دوں گا۔ یہاں کے قبائل کی سیاست اور مزاج کا اسے علم نہیں۔ احرس کے معاملے سے قطع نظر مجھے تو ملال یہ ہے کہ .... کہ تُو جانے کب تک کے لئے میری نظروں سے دور ہو جائے گی۔" نضار کی آواز قدرے بوجھل ہو گئی۔

"ہاں اے نضار!" میں نے طویل سانس لیا۔ "کسے خبر کہ کون زندگی کے کس موڑ پر کس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ رنج تو اس پر مجھے بھی ہے مگر تقدیر کے فیصلے بدلنا انسانوں کے اختیار میں نہیں۔" یہ الفاظ اس لئے بھی میری زبان پر آ گئے تھے کہ مجھے حقیقت کا علم تھا۔ ابھی سمت سفر کا تعین نہ ہونے کے باوجود مجھے خبر تھی کہ میری واپسی کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے نہیں کہ میں پھر کبھی ان پہاڑی بستیوں کی طرف لوٹ بھی سکوں گی یا نہیں!

نضار کچھ دیر میرے پاس مزید بیٹھ کر چلا گیا۔ دوسرے دن جب میں اجلاس والے کمرے سے اٹھ رہی تھی تو مجھے نضار کے ساتھ احرس بھی نظر آیا۔

"اے معبلہ! اپنے بھائی احرس ہی کے کمرے کی طرف چلتے ہیں' وہیں بیٹھ کر بات ہو گی۔" نضار مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تُو بلاوجہ میرے بھائی کی طرف سے شک و شبہے میں مبتلا ہو رہی تھی۔ یہ تو بڑا دانش مند نکلا اور.........."

"اور فوراً میری باتوں میں آ گیا۔" احرس بول اٹھا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے اپنے بری طرح پھنس جانے کا احساس ہو چکا ہے۔

میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ "مجھے بھی احرس سے یہی امید تھی اے نضار! اس کے اندر بڑی صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ جنہیں یہ اب تک بروئے کار نہیں لا سکا۔ اب ان کا اظہار ہو گا۔"

"جانتا ہوں میں تم دونوں کو اچھی طرح .... اب مجھے پتا چلا کہ یہ تم دونوں کی مشترکہ سازش ہے۔ مگر میں اس سازش کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔"

"اے میرے بھائی احرس! یہ تُو کیا کہنے لگا۔ صبح سے تجھ سمجھاتے سمجھاتے یہ وقت ہو گیا اور تُو مان بھی گیا' پھر.........."

"پھر یہ اس لئے ایسی باتیں کر رہا ہے اے نضار کہ اس کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں۔ بڑا پلٹو ہے یہ۔" میں نے ہنس کر کہا۔

احرس میری بات کو سنی اَن سنی کر کے نضار سے مخاطب ہوا۔ "سن اے بھائی نضار! اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل ہے کہ ہم دونوں مل کر معبلہ کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیں۔ تُو معبلہ کے ساتھ سازش میں شریک نہ ہو اور مجھ سے مل جا۔"

"اے احرس! تُو نے تو یہ بڑی کمال بات کی۔" میں زور سے ہنس کر کہنے لگی۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ تم دونوں بھی مل کر میرے خلاف محاذ بنا سکتے ہو۔ کبھی کبھی اتنی عقلمندی کی باتیں کر کے تو حیران کر دیتا ہے مجھے۔"

احرس میری بات پر شاید پیچ و تاب کھا کے رہ گیا کیوں کہ خلاف توقع اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ حویلی میں احرس کے لئے جو کمرہ مخصوص تھا' ہم تینوں اس میں آ گئے تو احرس بولا۔ "اے معبلہ! جب تک تُو مجھے یہ نہیں بتائے گی کہ کتنے دن کے لئے اس ڈھول کو میرے گلے میں ڈالا جا رہا ہے' میں کس طرح ہای بھر لوں؟ یہ تو خوب زبردستی ہے۔ بھائی نضار کو قبائل میں اپنی بدنامی کا ڈر ہے' تجھے دیوتا یہاں نہیں ٹکنے دے رہے۔ اب رہ گیا میں' تین میں نہ تیرہ میں' مردنگ بجائے ڈیرے میں۔ ایک میری گردن تم دونوں کو پتلی نظر آ رہی ہے' لگا دو پھندا۔"

"تُو اتنا مظلوم کبوتر کیوں بن رہا ہے؟" میں نے احرس سے کہا۔ "تیری حالت تو اس وقت کسی ایسی لڑکی جیسی لگ رہی ہے جس کا ماتھا چومنے والا مرد اسے پسند نہ ہو۔ اچھا بھلا کڑیل جوان ہو کر جی چھوڑ رہا ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میری واپسی کب تک ہو گی تو بتا چکی ہوتی تجھے۔ پھر جہاں اتنے دن نضار اپنی بستی کی طرف نہیں لوٹا' کچھ روز کے لئے اور بھی رک سکتا ہے تاکہ تجھے کوئی دشواری نہ ہو یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تیری مدد کے لئے نضار اپنے کسی نائب کو یہاں چھوڑ دے۔ کیوں نضار! کیا یہ ممکن ہے نا؟" میں نے اپنی بات پوری کر کے نضار کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔

جواب میری توقع کے مطابق ہی ملا۔ "اے معبلہ! میں ہر دو صورتوں میں سے کسی کے لئے بھی راضی ہوں۔"

"تو پہلے کہا ہوتا نا یہ۔" احرس خوش ہو گیا۔ "پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ راج پاٹ بھی بھائی نضار یا اس کے کسی نائب کو سونپ کر جب چاہوں گا ٹہل لوں گا۔"

"نا' ٹہلنے نہیں دیا جائے گا تجھے۔" میں بول اٹھی۔ "کام چاہے کوئی کرے نام تیرا ہی ہو گا۔ اجلاس کے کمرے میں میری جگہ روز تجھی کو بیٹھنا پڑے گا۔"

"چل جہاں تیری اتنی باتیں مان لی ہیں' یہ بھی سہی۔" احرس کو آخر ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔

طے یہ ہوا کہ جتنے دن نضار وادی میں رہے گا احرس معاملات حکمرانی و اقتدار میں اس کے مشوروں پر عمل کرے گا۔ پھر نضار جانے سے پہلے اپنے نائب احزم کو احرس کی رہنمائی کے لئے وادی میں بلا لے گا۔ احزم کا نام خود احرس ہی نے لیا تھا۔ اس کی جگہ پہلے بھی کوئی اور شخص تمام ذمے داریاں سنبھالتا رہا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی کہ جب اسے نضار کی جگہ بستی اشر میں رہنا پڑا تھا۔

یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا تو اگلے ہی روز میں نے اجلاس والے کمرے میں احرس کو اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اس موقع پر نضار اور احرس تو دیگر اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ موجود تھے ہی' ان کے علاوہ مہا پجاری کو بھی میں نے بلوا لیا تھا۔ احرس کی نیابت کا اعلان ہوتے ہی رسم کے مطابق وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے تخت کے سامنے پہنچ کر مجھے تعظیم دی۔ پھر سب سے پہلے مہا پجاری نے احرس کو

مبارک باد دینے کے ساتھ دعا دی۔ "اے احرس! دیوتا تجھ پر اپنا سایہ قائم رکھیں اور تُو وادی والوں کے لئے ایک مثال ثابت ہو' خیر اور انصاف کی مثال۔"

آج نہیں تو چند روز کے بعد اس تخت پر احرس ہی کو بیٹھنا تھا۔ روایت یہ تھی کہ کسی حکمران کی موجودگی میں اس کا کوئی نائب تخت پر نہیں بیٹھتا تھا۔ اس روز میں نے یہ روایت توڑ کر وہاں موجود تمام ہی افراد کو حیران کر دیا۔ میں نے تخت سے اٹھ کر دائیں جانب بیٹھے ہوئے احرس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس وقت نضار' احرس کو مبارک باد دے رہا تھا۔ احرس میرے اشارے پر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

"اے لوگو! مجھے ان بستیوں کی روایات کا پوری طرح علم ہے۔ کوئی نائب اپنے سردار یا حکمراں کی موجودگی میں مسند اقتدار پر نہیں بیٹھتا' مگر یہ نوجوان کہ جس کا نام احرس ہے' صرف میرا نائب ہی نہیں' بچپن کا ساتھی بھی ہے میرا۔ سو میں اپنی موجودگی میں اسے وہ تکریم و عزت دینا چاہتی ہوں کہ جس کا یہ مستحق ہے' میں اسے اپنی جگہ اور اپنی موجودگی میں تخت حکومت پر بٹھا کر تعظیم دینا چاہتی ہوں۔ ہرچند کہ یہ اس کی وفاؤں کا صلہ نہیں مگر میری تمنا یہی ہے۔"

ایک مطلق العنان حکمراں کے رو بہ رو یوں بھی کسی کو کچھ کہنے کی مجال نہیں ہوتی' پھر میں تو یوں بھی ان کی نظر میں دیوتاؤں کی چہیتی تھی۔ کوئی کہتا بھی تو کیا' تائید میں بیک وقت کئی آوازیں ابھریں۔ ان آوازوں میں نضار اور مہا پجاری کی آوازیں نمایاں تھیں۔

احرس کی حالت اس وقت قابل دید تھی۔ جب میں نے اسے تخت پر بٹھایا اور تعظیم دی۔ اس کے بعد اجلاس برخاست کر دیا گیا کہ بقیہ کارروائی پہلے ہی پوری ہو چکی تھی۔ ان بستیوں میں اتنی تعظیم اب سے پہلے کسی نائب کو نہیں دی گئی تھی۔ دراصل یہ خیال اس وقت آیا تھا جب میرے نائب کی حیثیت سے احرس سر جھکا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بڑے عجیب سے تھے۔ جیسے بہ مجبوری اسے یہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہو۔ جواب میں اس کے سامنے سر جھکا کر اسے میں نے احساسِ کمتری کے حصار سے باہر نکال لیا تھا۔

ہرچند کہ ثریان کے بعد ان بستیوں میں امن و امان بحال ہو چکا تھا' پھر بھی طویل عرصے تک نضار کا اپنی بستی سے دور رہنا مناسب نہیں تھا۔ کسی بھی وقت کوئی سازشی ذہن اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ انہی حالات کے پیش نظر اس نے پہلے تو بستی اشر کی فوج کو وادی سے واپس بھیج دیا' پھر احزم کو وادی پہنچنے کا حکم دے دیا۔ احرس کو میری نیابت کرتے ہوئے وہ پانچواں روز تھا کہ احزم آ گیا اور اسی دن نضار اپنی بستی روانہ ہو گیا۔

جس رات کی صبح مجھے دی ہوئی مہلت کا آخری دن شروع ہونے والا تھا وہ رات میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں اپنی خواب گاہ میں اکیلی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے احرس اور احزم میرے پاس سے اٹھ کر گئے تھے۔ گزشتہ دنوں کے دوران میں مجھے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہوا تھا کہ احرس نے بڑی حد تک کاروبار حکومت کو سنبھال لیا تھا۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا کہ اس

میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔ وہ ذہین بھی تھا اور بظاہر جتنی بے پروائی اور غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتا تھا' درحقیقت ویسا تھا نہیں۔ اس کے اندر تیزی سے کچھ سیکھنے سمجھنے اور نئے حالات سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی خوبی بہ درجہ اتم موجود تھی۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ غیرذمے دار اور ناموزوں نظر آتے ہیں' مگر وقت پڑنے پر وہی انتہائی اہل ثابت ہوتے ہیں۔ احرس کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا۔ میں تو خیر اسے بچپن سے جانتی تھی۔ دوسروں کے لئے اس کا بدلا ہوا موجودہ رویہ حیران کن تھا۔ یہ بھی اس کی سوجھ بوجھ ہی تھی کہ اس نے احزم جیسے تجربہ کار کو وادی میں بلانے کی تجویز رکھی تھی۔ تاکہ ناتجربہ کاری کا ازالہ ہو سکے۔ میں اس کی کارکردگی پر خوش بھی تھی اور مطمئن بھی۔ مگر دانستہ اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بظاہر اس کا رویہ اب بھی غیر سنجیدہ ہی تھا۔ وہ احزم جیسے دانش مند کو فقرے بازی کر کے بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس سے قطع نظر جب انتظامی امور پر میں کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو آخرکار احزم کو بھی یہی تسلیم کرنا پڑتا کہ احرس کا فیصلہ درست تھا۔ میں نے جب سے اسے تخت پر بٹھایا تھا' رفتہ رفتہ معاملات سے ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنی موجودگی میں وادی والوں کو یہ احساس دلا دینا چاہتی تھی کہ اب ان کے معاملات کا ذمے دار احرس ہے' میں نہیں۔ اپنے اس مقصد میں مجھے کامیابی ہوئی تھی۔ کوئی بھی مسئلہ درپیش ہوتا تو میں جان بوجھ کر لوگوں کو احرس کے پاس بھیج دیتی۔ وہ ایک ہفتہ گویا احرس کی ذہنی تربیت کا تھا اور اس نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ اب تک نضار' احرس اور احزم کے سوا کسی پر یہ ظاہر نہیں کیا گیا تھا کہ مجھے کوئی سفر درپیش ہے۔ میں اسے کوئی غیر معمولی واقعہ ظاہر کرنے کے حق میں نہیں تھی۔

اس رات کو میں دیر تک جاگتی رہی اور خلاف توقع دوسرے دن صبح جلد ہی میری آنکھ کھل گئی۔ مشرق سے طلوع ہوتے سورج کا نظارہ کرنے میں اپنی حویلی کی چھت پر پہنچ گئی۔ صبح کی خوشگوار ہوا نے مجھے احساس فرحت بخشا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ مجھے پُراسرار سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ ایک نئی دنیا کے سفر کی خاطر مجھے ہدایات دی جا رہی تھیں۔ "تن تنہا" کا مطلب اب مجھ پر واضح ہوا تھا۔ اس تنہائی کی حد کہاں سے شروع ہوتی' یہ بھی مجھ پر کھل گیا۔ کیا چھپانا اور کیا ظاہر کرنا ہے' مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا۔ انہی ہدایات پر مجھے عمل کرنا تھا۔

طلوع ہوتے سورج کا حسین نظارہ کرنے کے بعد میں نیچے اتر آئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد ناشتہ کر کے میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر حویلی سے نکل گئی۔ میرا رخ بستی کی قدیم عبادت گاہ کی طرف تھا۔ دیوتاؤں کی حمد و ثنا کے لئے صبح ہی صبح وہاں خاصا ہجوم تھا۔ میں بھی عبادت میں شریک ہو گئی۔ مجھے اپنے درمیان دیکھ کر لوگوں نے انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ مہا پجاری نے اپنے نائبوں کے ساتھ مجھے تعظیم دی تھی اور پھر عبادت میں مصروف ہو گیا تھا۔

عبادت کا وقت طلوع آفتاب کے بعد اور پھر غروب آفتاب کے ساتھ شروع ہوتا تھا۔ کاروبار زندگی کے آغاز و اختتام کو عبادت سے وابستہ کیا گیا تھا۔ دن کا آغاز دیوتاؤں کی حمد و ثنا سے ہوا اور جب دن تمام ہو جائے تو ایسا ہی کیا جائے۔ بچپن سے میں یہی دیکھتی آ رہی تھی۔ اس سلسلے میں کسی پر کوئی جبر نہیں تھا۔

لوگ خود ہی عبادت گاہ کا رخ کرتے اور پھر خود ہی مقررہ مدت کے اندر واپس چلے جاتے۔ کسی حکمراں یا سردار کی طرف سے ان پر یہ پابندی کبھی عائد نہیں رہی کہ وہ عبادت گاہ میں حاضری ضرور دیں۔ نہ اس ضمن میں کوئی سردار یا حکمراں اس کا پابند تھا کہ روز عبادت میں شریک ہوتا۔ ثریان کے دور اقتدار میں البتہ عبادت گاہ کا رخ کرنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ یہ پابندی پہلے ہی روز وادی کی فتح کے بعد اٹھالی گئی تھی۔ لوگوں کی آزادی سلب کر لینے والا ظالم حکمراں راہِ فرار اختیار کر چکا تھا اور ایک عرصے کے بعد لوگوں کو اپنے دیوتاؤں کی عبادت کا حق ملا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عبادت گاہ میں خاصا ہجوم نظر آتا تھا۔

صبح کی عبادت کا وقت ختم ہو گیا تو لوگ رخصت ہونے لگے۔ مہا پجاری کو ساتھ لئے میں عبادت گاہ کی حدود ہی کے اس حصے میں آگئی جہاں اس کی سکونت تھی۔ میرے ہی ایما پر اس نے اپنے نائبوں کو حکم دے دیا تھا کہ جب تک میں اس کے پاس موجود ہوں' کوئی وہاں نہ آئے۔

خلوت میسر آتے ہی مہا پجاری نے میری طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہے اے میری بچی کہ تجھے خود چل کر میرے پاس آنا پڑا۔ مجھے حویلی میں بلا لیا ہوتا۔ عبادت کا وقت ختم ہوتے ہی میں خود وہاں آ جاتا۔"

"اے مہا پجاری! مجھے بھی تو عبادت کرنا تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "پھر جو بات مجھے تجھ سے کرنا تھی اس کے لئے حویلی سے زیادہ یہ جگہ مناسب تھی۔"

مہا پجاری نے چونک کر میرے چہرے کا جائزہ لیا' پھر فکرمندانہ سے لہجے میں بولا۔ "اے معبلہ' میری بچی! کہیں حویلی یا وادی میں تیرے خلاف کوئی سازش.........."

"نہیں اے مہا پجاری! ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے مسکرا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "بات صرف اتنی ہے کہ دیوتاؤں کی طرف سے مجھے ایک حکم ملا ہے۔ اس حکم کا تعلق تجھ سے ہی ہے' سو میں تجھے وہی بتانے آئی ہوں۔ تجھے کل صبح میرے ساتھ وادی سے روانہ ہونا ہے۔ اپنی جگہ تُو کسی اپنے نائب کو مقرر کر دے۔ ہماری پہلی منزل بستی اشر کے قریبی پہاڑی سلسلے ہوں گے کہ جہاں کبیت والوں کو آباد کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہم بستی اشر جائیں گے اور نضار سے ملیں گے۔"

"تو کیا نضار بھی ہمارے ساتھ چلے گا اے معبلہ!" مہا پجاری نے دریافت کیا۔

"نہیں' وہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا اے مہا پجاری!" میں نے بتایا۔ "بستی اشر سے تریال پہنچنا ہے اور پھر اس کے بعد اگلی منزل کی طرف بڑھنا ہے۔"

"تریال سے بھی آگے جانا ہے اے معبلہ! مگر کہاں؟" مہا پجاری حیرت سے بولا۔

"وہاں کہ جہاں تُو پہلے بھی ایک بار میرے ساتھ جا چکا ہے۔" میں نے جواب میں کہا۔ "کیا تُو احرس کے باپ اجدر بابا کو بھول گیا؟"

"اجدر کو بھلا میں کیسے بھلا دوں گا اے معبلہ! مجھے تو اجدر کی بستی کا نام بھی اب تک یاد ہے۔ اس بستی کا نام ازیر ہی تھا نا؟"

"ہاں۔" میں نے تصدیق کی۔ "پھر تُو اے مہا پجاری وہاں سے لوٹ آئے گا۔"

اس مرتبہ پھر مہا پجاری کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے اور اس نے سوال کیا۔ "اور تو اے معبلہ! کیا تُو میرے ساتھ نہیں لوٹے گی؟"

"مجھے ازیر سے بھی آگے جانا ہے اے مہا پجاری! وہاں سے دیوتا میری سمت سفر کی رہنمائی اور نشاندہی کریں گے۔"

"پھر تو تیری واپسی میں بہت دیر لگ جائے گی۔ میرے اندازے کے مطابق یہاں سے احرس دا جدر کی بستی ازیر دس دن سے بھی زیادہ مسافت پر ہے۔ اس دوران میں تجھے تین جگہ رکنا بھی ہے' سو مزید شب و روز لگ جائیں گے .... اور تُو کہتی ہے کہ .... کہ تجھے وہاں سے بھی آگے جانا ہے۔"

مہا پجاری کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں گم ہے۔ چند لمحے خاموشی کے بعد میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ "اے مہا پجاری! اگر دیوتاؤں کا یہ حکم نہ ہوتا تو میں تجھے اس بڑھاپے میں اتنے طویل سفر پر ساتھ نہ لے جاتی۔"

"اے میری آقازادی! میں یہ نہیں' کچھ اور سوچ رہا تھا۔" مہا پجاری شفقت سے بولا۔ "میں دراصل دیوتاؤں کی مصلحت پر غور کر رہا تھا۔ اسی کے ساتھ تیرے گزشتہ اقدامات بھی اب میری سمجھ میں آرہے ہیں۔ یقیناً دیوتاؤں کی ہدایت کے مطابق ہی تُو نے یہ اقدامات کئے ہوں گے۔ تُو نے جب احرس کو اپنی جگہ تخت پر بٹھا کر تعظیم دی تھی اور اسے نائب بنایا تو مجھے کچھ شبہ سا ہوا تھا۔"

"ہاں اے مہا پجاری! مجھے دیوتاؤں کی طرف سے سفر کا حکم اور سات دن کی مہلت مل چکی تھی' سو میں نے اپنی غیر موجودگی میں احرس کو وادی کا حاکم بنانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے بتا' کیا میرا یہ فیصلہ درست تھا؟" میں بولی۔

"اے میری بچی! جن فیصلوں کے پیچھے دیوتاؤں کا ہاتھ ہو' وہ کبھی غلط نہیں ہوتے۔"

"نضار اور احرس بھی جانتے ہیں کہ میں دیوتاؤں کے ہی حکم پر وادی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ مگر انہیں ابھی میری سمت سفر کا علم نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی اے مہا پجاری کہ آج صبح سے پہلے خود میں بھی اس سے لاعلم تھی۔"

اس کے بعد مہا پجاری نے بھی نضار کی طرح یہی قیاس آرائی کی کہ دیوتاؤں کے اس حکم کا تعلق مفرور دشمن ثریان سے ہو سکتا ہے۔ میں نے مہا پجاری کے اس قیاس کی تائید یا تردید نہیں کی۔ میں اٹھنے لگی تو مہا پجاری نے کہا۔ "میں کل ہی صبح کی عبادت کے بعد زادِ سفر لے کر حویلی پہنچ جاؤں گا۔ مجھے بوڑھا نہ جان میری بچی کہ یہاں وادی میں دوبارہ قدم رکھنے کے بعد تو میں خود کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ صحت مند محسوس کر رہا ہوں۔ دیوتاؤں کی نظر مجھ پر اور تجھ پر سیدھی رہے' بس یہ دعا کر۔"

میں حویلی واپس پہنچی تو اجلاس والے کمرے کے سامنے سے گزری۔ حسب معمول احرس میری جگہ تخت پر بیٹھا تھا اور دائیں جانب تخت کے نیچے احزم موجود تھا۔ وہاں وادی کے دوسرے حکام بھی تھے۔ میں رکے بغیر آگے بڑھتی چلی گئی۔

مجھے زاد سفر کے علاوہ اپنے ساتھ کچھ منتخب مسلح محافظوں کو بھی وادی سے لے جانا تھا۔ میں ان

تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ میں نے اپنے محافظ دستے کے پانچ نوجوانوں کو اس کے لئے منتخب کیا۔ ان کے علاوہ دو خادموں کو بھی طلب کر کے ضروری احکام دے دیئے کہ انہیں بھی میرے ساتھ چلنا تھا۔ اجلاس ہی کے دوران میں احرس اور احزم کو میں نے یہ پیغام بھجوا دیا تھا کہ جب اجلاس ختم ہو جائے تو دونوں مجھ سے آ کر مل لیں۔ میں آئندہ روز انہیں اپنی روانگی سے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ اب تک دونوں کو میں نے اپنی روانگی کے دن اور وقت سے مطلع نہیں کیا تھا۔

اجلاس ختم ہوتے ہی وہ دونوں میرے کمرے میں پہنچ گئے۔

"اے وادی سبز کی حکمراں! تیرا نائب احرس مع اپنے مشیر خاص کے تیری خدمت میں حاضر ہے۔" احرس کے لہجے میں شوخی تھی۔ "تیرے اس نائب کو سب خبر ہے کہ تو اسے یہاں پھنسا کر کہاں کہاں کد کڑے بھرتی پھر رہی ہے۔"

"تو اپنے مخبر تو نے میرے پیچھے بھی چھوڑ رکھے ہیں اے میرے نائب احرس!" میں ہنس کر بولی۔

"تیری جان کی پرواہ اگر ہم نہ کریں گے تو کون کرے گا۔ سو یہ سب کچھ تو کرنا پڑتا ہے اور معلوم ہے تجھے کہ یہ ساری راز کی باتیں مجھے کس نے بتائی ہیں۔ چل بتائے ہی دیتا ہوں' یہ جو تیرے سامنے بڑا بھولا بنا بیٹھا ہے' یہی احزم! اسی نے میرے کان بھرے تھے کہ حکمرانوں کی طرف سے ان کے نائبوں کو غافل نہیں ہونا چاہئے۔ اب تو یہ بتا اے ہماری حاکم اعلیٰ کہ مہا پجاری سے کیا راز و نیاز ہوئے؟" احرس چہکتا رہا۔

"یہی تو بتانے کے لئے تم دونوں کو بلایا ہے میں نے۔ کل مہا پجاری اور میں وادی سبز سے روانہ ہو جائیں گے۔" میں نے بتایا۔ "کل صبح ہماری روانگی ہے۔"

"سن رہا ہے تو اے میرے دانش مند مشیر احزم! اس مرتبہ تیرے سردار کا پتا بھی صاف ہو گیا۔ اب یہ اس غریب بوڑھے کی جان کو آ گئی ہے۔ پہلے تو خیر وہ کسی طرح بچ بچا کر وادی تک پہنچ گیا' مگر اب لگتا ہے کہ اس مرتبہ ضرور کہیں خرچ ہو جائے گا۔"

اس پر احزم بولا۔ "دیوتاؤں کی چہیتی معبلہ دیوی کی امان میں جو ہو' اسے کبھی اور کہیں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ تو دیکھے گا اے احرس کہ مہا پجاری اس بار بھی زندہ و سلامت لوٹے گا اور دیوی پر تو دیوتاؤں کا سایہ پہلے ہی سے بلند ہے۔"

"تو بڑا کائیاں ہے اے احزم!" احرس نے مسکرا کر کہا۔ "دیوی کے سامنے تو اس کا پجاری بن جاتا ہے اور پیٹھ پیچھے مجھ سے اس کی برائی کرتا ہے۔"

یہ سن کر احزم کے چہرے سے گھبراہٹ کا اظہار ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہتا میں بول اٹھی۔ "اے احزم! تو کیا اسے اب تک نہیں سمجھ سکا؟ یہ تو ہمیشہ سے ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے کہ کسی کو تنگ کر سکے۔ میں اس کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی ہوں۔"

"اور اس کی وجہ میں تجھے بتاتا ہوں اے احزم! اس کے دونوں کانوں کے درمیان اندر ہی اندر

ایک سوراخ ہے۔ بچپن ہی سے یہ حال ہے اس کا۔ کبھی کبھی تو بڑا ہی دکھ ہوتا ہے اس کی حالت پر۔ اس کے مغز میں اسی وجہ سے تو کوئی بات نہیں ٹھہرتی۔ اس کے ایک کان میں کوئی بات ڈالو تو خود بخود دوسری طرف سے نکل جاتی ہے۔"

"چہک لے خوب اے احرس کہ پھر آج کے بعد تجھے اس کا موقع نہیں ملے گا۔" میں ہنس کر بولی۔

"کیوں' کیا صبح تو میری چندیا پر ڈنڈا مار کر بھاگ جائے گی کہ جس کے صدمے سے میری چہکار بند ہو جائے گی۔"

"یہ تو تجھے پتا چلے گا بعد میں۔ فی الحال تو یہ بتا مجھے کہ اجدر بابا سے اور ماں سے تجھے کچھ کہلوانا ہے؟"

"کیا؟" میری توقع کے مطابق وہ چونک اٹھا۔ "تو .... تو کیا ازیر جا رہی ہے؟ اور مجھے .... مجھے یہیں چھوڑے جا رہی ہے؟ ارے اگر تیرا ایسا ہی ارادہ تھا تو پہلے سے مجھے بتا دیتی۔ پھر تو میں ہرگز تیرے دھوکے میں نہ آتا۔ یہ خوب رہی' خود تو اتنی دور دور کے دھارے بھرنے چلی دی اور مجھے کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی۔"

"میرے دونوں کانوں کے درمیان تو بقول تیرے سوراخ ہے' مگر تیرے پاس تو وہ کان ہی نہیں کہ تجھے کانوں کان کچھ خبر ہو سکے۔" موقع دیکھ کر میں نے اس سے بدلہ لے لیا۔

"کیوں کان کھا رہی ہے' جی جلا رہی ہے؟ خیر اگر تو ادھر جا رہی ہے تو میرے بابا اور ماں کو بتا دیجیو کہ مجھے صبر کر لیں۔ ویسے مجھے معلوم ہے کہ تو ان دونوں کے پاس کس لئے جا رہی ہے؟ ایسے معاملوں میں اگر بزرگوں کی مرضی بھی شامل ہو جائے تو آنے والی نسلوں کو دیوتا بڑی برکت دیتے ہیں۔"

میں سمجھ گئی کہ اس کے الفاظ کی تہہ میں کیا بات چھپی ہے۔ "ایسے معاملوں" کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس وقت میں نے دانستہ احرس کی مزید فقرے بازی سے بچنے کے لئے اس کی ان باتوں کو نظرانداز کر دیا۔ یوں بھی اب کیا خبر تھی کہ اس سے کب ملاقات ہو۔

اس روز میں عجیب کیفیت سے دوچار تھی۔ ایک طرف تو مجھے نئی دنیا دیکھنے کا شوق تھا' اپنے دشمن ہلان کو تلاش کر کے اس سے انتقام لینے کی تمنا تھی۔ بند آنکھوں سے جو حیرت انگیز مناظر دیکھے تھے' انہیں جاگتی آنکھوں دیکھنے کی آرزو تھی۔ تو دوسری جانب ایک حزن مجھ پر طاری تھا۔ میں اپنے در و دیوار کیسے چھوڑ دوں کہ شاید اب لوٹ کر آنا ہی نہ ہو۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ لوگ کبھی کبھی اپنے گھروں میں جلتے ہوئے چراغ چھوڑ جاتے ہیں اور گھر کے شب افروز روزنوں کو دیکھ کر یہی لگتا ہے' یہاں کوئی آباد ہو مگر گھر خالی ہوتا ہے۔ سو وادی سبز بھی میرا گھر ہی تھا اور یہاں میں ایک چراغ جلتا چھوڑے جا رہی تھی۔ میرا وہ چراغ احرس تھا۔

وہ دن تمام ہوا اور رات بھی سوتے جاگتے بیت ہی گئی۔ تمام تیاری گزشتہ روز ہی مکمل ہو چکی تھی۔ وقت مقررہ پر مہا پجاری بھی حویلی پہنچ گیا۔ دیکھنے والوں نے صرف یہی دیکھا اور جانا کہ ان کی

حکمراں کچھ دن کو کہیں جا رہی ہے۔ یہ نو افراد پر مشتمل ایک قافلہ تھا کہ جسے احرس و احزم وادی کی آبادی سے باہر تک چھوڑنے آئے۔

"اے احرس! دیوتا تجھے اپنی امان میں رکھیں۔" یہ رخصتی کلمات ادا کرتے ہوئے کوشش کے باوجود میری آواز بھرا گئی۔ پھر میں نے ایک نظر احرس کے چہرے پر ڈالی اور اسی کے ساتھ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ جواب میں احرس نے بھی یقیناً کچھ کہا تھا' مگر میں نہ سن سکی۔ سن کر بھی تو کبھی کبھی آدمی کچھ نہیں سن پاتا۔

مہا پجاری میرے ساتھ ساتھ دوسرے گھوڑے پر سوار تھا۔ ہمارے گھوڑے پہاڑوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ برسوں پہلے جب میں اس وادی سے ایک نامعلوم مدت کے لئے رخصت ہو رہی تھی تب بھی مہا پجاری میرے ساتھ تھا اور آج بھی وہی میرا ہم سفر تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُس وقت میں اپنی جان بچانے کے لئے وادی سے نکلی تھی اور اب کسی کی جان لینے کی خاطر جا رہی تھی۔ اسی شخص کی جان لینے کہ جو کبھی میری جان کے درپے ہو گیا تھا۔ ژیان کے سوا اور بھی بہت سے دھیان تھے جو مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ انہی دھیانوں کے بیچ سفر کرتی ہوئی میں اپنے قافلے کے ساتھ دوپہر ہونے سے کچھ پہلے ان پہاڑی سلسلوں تک پہنچ گئی کہ جہاں قبیلہ کبیت والوں کو آباد کیا گیا تھا۔

بریسا کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اتنی جلدی اس سے ملنے پہنچ جاؤں گی۔ "دیوی آ گئی' دیوی آ گئی۔" سارے غاروں میں شور مچ گیا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ شاید یہ ان کی دیوی کا آخری پھیرا ہے۔ اس روز پہلی بار میں نے ان لوگوں کو ایک ایسا حکم دیا کہ وہ دنگ رہ گئے۔ وہ سارا قبیلہ پہاڑوں سے گھرے ایک میدان میں میرے سامنے سجدہ ریز ہو کر اٹھا تھا اور میں اس سے مخاطب تھی۔ "سنو اے کبیت والو! میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اب تم میں سے کوئی بھی میرے سامنے سجدے میں نہیں گرے گا اور تم کبھی دیوتاؤں کے سوا کسی کے آگے یوں نہیں گرو گے۔ دیوتا مجھ پر مہربان سہی مگر میں بھی تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں۔" مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس وقت میں نہیں' میرے اندر کوئی اور بول رہا تھا۔

ان کے لئے یہ بڑا عجیب حکم تھا' مگر انہوں نے سر تسلیم خم کر دیئے۔ دوپہر کو میں نے پہاڑی پرندوں کا گوشت کھایا اور پھر ایک غار میں مہا پجاری کے ساتھ آرام کیا۔ میرے پانچوں مسلح محافظ اور دونوں خادم دوسرے قریبی غار میں تھے۔ بریسا نے اپنی کنیزوں کو میری اور مہا پجاری کی خدمت کے لئے بھیج دیا تھا' مگر انہیں میں نے واپس کر دیا۔ یہ وہی حسین و نازک اندام کنیزیں تھیں جو سوراخوں والے پہاڑ میں شیطان صفت سردار حصیف کی خدمت پر مامور رہتی تھیں۔ اب یہی بریسا کی خدمت کرتی تھیں۔ ایک مرد کی خواہشات کی تکمیل کے لئے اتنی ساری کنیزوں کی ضرورت میری فہم سے بالاتر تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد گیارہ سے زیادہ تھی۔ انہیں بھی آزادی ملنا چاہئے کہ یہ اگر چاہیں تو اپنے لئے دوسرے مرد منتخب کر سکیں۔ میرے ذہن میں خیال آیا' ضروری تو نہیں کہ ان میں سے بھی بریسا کو چاہتی ہوں' پھر اسے کیا حق ہے کہ ان پر جبر کرے' کچھ دیر آرام کر کے میں اٹھی تو بریسا کو اپنے

غار میں بلوا لیا۔ وہ آتے ہی اپنی عادت کے مطابق میرے سامنے سجدہ ریز ہونے والا تھا کہ میں نے اسے اپنا حکم یاد دلایا اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

"اے بریسا!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تجھے وہ لعنتی سردار حصیف یاد ہے کہ جو خود کو دیوتاؤں کا ہرکارہ کہتا تھا' کنج دیوتا کے بیٹے ہرباش کا نمائندہ ہی تو کہتا تھا وہ خود کو۔ وہی حصیف کہ جو تیرے قبیلے پر کہیں سے آ کر مسلط ہو گیا تھا۔"

"ہاں اے دیوی! میں اس کو بھولا نہیں' مگر آج وہ تجھے کیسے یاد آ گیا؟" بریسا حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

"اس لئے اے بریسا کہ میں نہیں چاہتی کہ تُو بھی اس کی روش پر چلے۔" میرے یہ الفاظ سن کر بریسا کے گندمی چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پھر اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا میں بولی۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں' تجھ سے کوئی قصور نہیں ہوا۔ اس شیطان کی یاد مجھے ان کنیزوں کو دیکھ کر آئی جنہیں تُو نے میری اور مہا پجاری کی خدمت کے لئے بھیجا تھا۔ تجھے یہ کنیزیں کیا اسی کے ورثے میں نہیں ملیں؟ ابھی سن' بول مت! حصیف تیرے قبیلے کے مردوں میں سے اپنے لئے غلام اور عورتوں میں سے کنیزیں منتخب کر لیتا تھا۔ سو یہ ظالمانہ رسم تجھ تک منتقل نہیں ہوئی۔ حصیف کے سارے غلام آزاد کر دیئے گئے کہ جن میں خود تُو بھی شامل تھا۔ تو پھر ان کنیزوں کو بھی تو آزادی کا اتنا ہی حق تھا جو انہیں نہیں مل سکا۔ وقت نے کبھی مجھے اتنی مہلت نہیں دی کہ میں ان کے لئے اس انداز میں سوچ سکتی تُو خود مجھے سوچ کر یہ بتا کہ کیا انہیں بھی مردوں کی طرح آزادی کا حق حاصل ہے یا نہیں؟"

"اے دیوی! ہمارے قبیلے میں اب تک یہی دستور صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ قبیلے کا جو بھی سردار منتخب ہوا' اس نے قبیلے کی حسین ترین دوشیزاؤں کو اپنی کنیزیں بنا کر رکھا۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے بھی سنا کہ قبیلے کے سردار کو دیوتاؤں نے یہ حق دیا ہے۔ اس کے باوجود میں بذات خود تیری بات سے متفق ہوں۔ تُو دیوی ہے اور تجھے دیوتاؤں ہی نے ہماری نجات کے لئے ہم تک بھیجا ہے۔ سو تُو جو حکم دے گی' اب سے وہی ہو گا۔ بریسا ہرگز ایک لعنتی کی روش پر نہیں چلے گا۔"

"تو میرا فیصلہ سن اے بریسا کہ اب سے سردار قبیلہ کا یہ حق باطل قرار دیا جاتا ہے۔ اپنے قبیلے کے بزرگوں تک میرا یہ حکم پہنچا دیجیو! اور یہ بھی سن کہ ان تمام کنیزوں میں سے رسم کے مطابق جو تیری بیویاں بن کر رہنا چاہیں' انہیں اس کا اختیار ہے۔ اسی طرح تجھے بھی یہ اختیار ہے کہ تُو ان میں سے جسے چاہے قبول کر۔"

وہ سبھی اس قبیلے کی حسین لڑکیاں تھیں اور ان کی عمریں بھی زیادہ نہیں تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی بیس سال سے زیادہ کی نہ تھی۔ میرے ایما پر ایک بڑے غار میں انہیں جمع کیا گیا اور پھر میں نے انہیں آزادی کی نوید دی۔ اس وقت دانستہ بریسا کو وہاں سے میں نے دور رکھا تھا تاکہ ایک عورت ہونے کے ناتے وہ مجھ سے کھل کر بات کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔ ان میں سے پانچ نے بریسا کی بیویاں بن کر رہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ان میں وہ کنیز بھی تھی کہ جس کی وجہ سے حصیف نے بریسا کو قید کر دیا تھا۔

"اس کا فیصلہ بریسا کرے گا کہ وہ تم پانچوں میں سے کس کس کو اپنی بیوی بنا کر رکھنے پر آمادہ ہے، جس طرح تمہیں اختیار دیا گیا' وہی حق اسے بھی ملا ہے۔" میں نے کہا۔

پھر بقیہ کنیزوں کو اپنے مرد منتخب کرنے کی آزادی مل گئی۔ بریسا نے ان میں سے تین کو اپنی بیویاں بنانے کی رسم ادا کی۔ وہ دن اس قبیلے کی عورتوں کے لئے انتہائی مسرت و شادمانی کا دن تھا۔ شام کو جب میں رخصت ہونے والی تھی تو انہوں نے میدان میں میرے گرد حلقہ ڈال کر رقص کیا۔ بریسا میرے گھوڑے کی لگام تھامے احتراماً پہاڑوں سے باہر تک آیا۔ اس کے پیچھے اس کی تینوں بیویاں اور بستی کے بزرگ بھی تھے۔

رخصت ہونے سے قبل میں نے اور مہا پجاری نے انہیں خیر و برکت کی دعائیں دیں اور پھر ہمارا قافلہ بستی اشر کی طرف چل دیا۔

"اے معبلہ! بڑی نیکیاں کما رہی ہے۔" مہا پجاری نے پہاڑوں سے کچھ دور نکل آنے کے بعد مجھے مخاطب کیا۔ "دیوتاؤں نے ہر شخص کو آزاد پیدا کیا ہے اور یہ ہم ہیں کہ جو ایک دوسرے کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ تجھ سے دیوتا جو کام لے رہے ہیں' یقیناً وہ لوگوں کی بھلائی میں ہے۔"

"دیوتاؤں کی خوشنودی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے' مجھ سے بہتر تو جانتا ہے اے مہا پجاری! میں تو وہی کہتی اور کرتی ہوں کہ جسے عدل کہا جا سکے۔" میں بولی۔

بستی اشر تک پہنچتے پہنچتے سورج غروب ہو چکا تھا۔ سرحدی محافظوں سے نضار کو ہماری آمد کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ نضار نے اسی لئے پہاڑی درے سے نکل کر چشمے کے کنارے ہمارا استقبال کیا۔ اس کے لئے بھی میری آمد غیر متوقع ہی تھی۔ میرے ساتھ مہا پجاری کو دیکھ کر بھی وہ چونکا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ ہم اس کے ساتھ بستی کی حویلی میں پہنچ گئے۔ آج کی شب مجھے وہیں گزارنا تھی۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور نضار حویلی کے باغ میں چہل قدمی کرنے نکل آئے۔

"یہ تو مجھے علم تھا اے معبلہ کہ تو دیوتاؤں کے حکم کی تعمیل میں جلد ہی وادی سے نکلے گی' مگر کچھ باتوں سے بے خبر تھا' مثلاً کہ تو اکیلی نہیں ہوگی اور یہ بھی کہ میری طرف آئے گی۔ شاید تجھے بھی اس کی خبر نہ ہو گی۔" نضار مجھ سے کہنے لگا۔

"ہاں اے نضار! بہت سی باتیں مجھے کل ہی صبح معلوم ہوئیں۔" میں نے اعتراف کیا۔ "کیا باتیں راز رکھنا ہیں' کیا نہیں' یہ ہدایات بھی مل چکی ہیں۔ سمت سفر کا تعین بھی ہو چکا ہے۔ میرا راستہ یہی تھا' سو یہ سوچا کہ تجھے بھی کم از کم ان باتوں سے آگاہ کر دوں جو بتانا ممکن ہیں۔ میرا سفر جنوب کی طرف ہے۔ یہاں سے مجھے تریال جانا ہے۔ اس کے بعد جنوب ہی میں ایک طویل سفر درپیش ہو گا۔ یہاں سے تریال اور پھر تریال سے بستی ازیر تک مہا پجاری میری رہنمائی کرے گا۔ پھر وہ وادی سبز کی طرف لوٹ آئے گا۔ مجھے وہاں تنہا آگے بڑھنا ہے' کہاں اور کس طرف' یہ ازیر پہنچ کر ہی خبر ہو گی۔" میں نے دانستہ نضار کو یہ بتانے سے گریز کیا تھا کہ پھر اجنبی دنیا ہی میری منزل ہو گی۔ وجہ یہ تھی نضار کو میں اپنی طرف سے فکر مند کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"تو نے دیوتاؤں ہی کے حکم پر سفر کا آغاز کیا ہے اے معبلہ! تو ان کی پناہ میں ہے اور وہی تیری حفاظت کرنے والے ہیں۔ مجھے اسی لئے تیری طرف سے کوئی اندیشہ نہیں۔ میں تیری واپسی کا انتظار کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ تو فتح مند کامران لوٹے گی۔ تجدید عہد کے طور پر میں تجھ سے پھر کہوں گا کہ میری زندگی تیری ہی عطا ہے اور یہ ہمیشہ تیری ہی رہے گی۔ تیرے سوا میری آغوش کبھی کسی کے لئے کشادہ نہ ہو گی۔ ہاں مگر اس دن کہ جب تو یا پھر میں' یا ہم دونوں بیک وقت اپنے مشترکہ دشمن کی کٹی ہوئی گردن پر دہکتا ہوا توا رکھا نہ دیکھ لیں گے۔" نضار کی آواز پُرجوش تھی۔

"دیوتاؤں نے چاہا اے نضار تو وہ دن جلد آئے گا۔" جواب میں میری زبان پر صرف یہی الفاظ آ سکے۔ اس سے زیادہ نضار کو کچھ اور بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

مزید کچھ دیر تک ہم باغ میں ٹہلتے رہے' باتیں کرتے رہے اور پھر حویلی میں لوٹ آئے۔

☆======☆======☆

دوسرے دن ادھر سورج طلوع ہوا' ادھر ہمارا قافلہ پہاڑی درے سے نکلا۔ نضار ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے کچھ اور محافظوں کو بستی تریال تک ساتھ بھیجنے کو کہا تھا' مگر میں نے انکار کر دیا۔ وہ منظر آج بھی میری نگاہوں میں محفوظ ہے کہ جب اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے میں نے پلٹ کر نضار کی طرف دیکھا تھا اور بس چند لمحوں کو ہماری نظریں ملی تھیں۔ آنکھیں بھی تو بہت کچھ کہہ دیتی ہیں۔ اگر کوئی سننے والا ہو۔ ان لمحوں میں نضار کی آنکھوں نے جو کچھ کہا' میں نے سن لیا اور پھر آگے بڑھ گئی کہ میری منزل ابھی بہت دور تھی۔ جانے پہچانے راستوں سے گزرتی ہوئی اور جگہ جگہ پڑاؤ ڈالتی ہوئی آخر کار کسی دشواری کے بغیر ایک روز شام سے پہلے میرا قافلہ اسی بستی میں داخل ہوا کہ جسے میرا وطن ثانی ہونے کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ وہ بستی تھی کہ جہاں پہلی بار مجھے ایک دیوی کا درجہ دیا گیا۔ یہ بستی تریال تھی کہ جہاں بچپن میں مجھے ناگ دیوتا پر قربان کرنے لایا گیا تھا۔ یہیں میں جوان ہوئی اور یہیں سے لشکر لے کر وادی سبز پر حملہ کرنے روانہ ہوئی۔ اب اس بستی کا سردار مقدام تھا۔ یہاں تقریباً سال بھر کے بعد میں لوٹ کر آئی تھی۔ حسین و پُروقار نخبہ کی گود میں مجھے اس بستی کا وارث نظر آیا۔ جسے اس نے میرے قدموں میں ڈال دیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اپنے دو ماہ کے بچے کو میرے قدموں میں ڈال کر نخبہ مجھے سجدہ کرنے جھکی تو میں نے اس کے دونوں بازو تھام لئے۔ اسی کے ساتھ مقدام بھی میرے قدموں میں جھک رہا تھا۔ ان دونوں کو میری آمد کی خبر مل گئی تھی۔ وہ حویلی کے دروازے پر میرا استقبال کرنے کھڑے تھے۔ انہی کے ساتھ دائیں بائیں وہاں ایک خلقت جمع تھی۔

"اے نخبہ! سیدھی کھڑی ہو جا اور تو بھی اے مقدام!" میرا حکم سنتے ہی انہوں نے تعمیل کی۔ پھر میں خود جھکی اور زمین پر پڑے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ بچہ روتے روتے میری گود میں آ کر چپ ہو گیا۔ "لے اس معصوم کو سنبھال' دیوتا اس کی عمر دراز کریں۔" میں نے بچے کو نخبہ کی طرف بڑھا دیا۔

نخبہ مجھ سے اپنے بچے کو لیتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اے آتون دیوی! کیا تو مجھ سے

اور میرے شوہر مقدام سے خفا ہے کہ جو تُو نے ہمیں شکرگزاری کا موقع نہیں دیا؟ تیری ہی دعاؤں سے تو میری گود بھری ہے۔ اس بستی کو وارث ملا ہے۔ ہماری کھیتیاں ہری بھری ہوئی ہیں۔"

"شکرگزاری کے اظہار میں تیرا یا تیرے شوہر کا میرے پیروں میں گر جانا ضروری نہیں اے نخبہ! میں تجھ سے ہرگز ناراض نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر میں کاہے کو یہاں آتی۔ کیا تُو نہیں جانتی کہ میں نے اس بستی میں اپنی عمر کا ایک حصہ گزارا ہے۔ اسے تو میں اپنا ہی گھر سمجھتی ہوں۔" میری آواز بلند تھی کہ دوسرے بھی جو لوگ اردگرد ہمہ تن گوش ہیں ان تک میری آواز پہنچ جائے۔

ردعمل کے طور پر لوگوں نے میرے حق میں نعرے بلند کئے۔ حویلی کے قریب ہی عبادت گاہ کے پجاریوں نے میرے اور مہا پجاری کے گھوڑوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان کی دل جوئی کی خاطر حویلی میں جانے سے پہلے مجھے عبادت گاہ کا رخ کرنا پڑا۔ "دیدار عام" کی خبر ساری بستی میں پھیل گئی۔ بڑے سے سانپ کا مجسمہ میرے عقب میں تھا۔ میں اسی مجسّمے کے چبوترے پر بیٹھی تھی۔ تریال والے گویا عرصہ دراز کے بعد اپنی دیوی کا دیدار کر رہے تھے۔ ان کی دانست میں یہ بڑی خوش قسمتی کا دن تھا۔ عبادت گاہ کے بڑے پجاری نے الفاظ کے ذریعے بستی والوں کے ان جذبات کا اظہار کیا تھا۔ چبوترے کے نیچے دائیں جانب سردار مقدام' اس کی بیوی نخبہ' فوج کا سپہ سالار آنف اور دیگر اعلیٰ حکام دو زانو بیٹھے تھے۔ اسی طرف مردوں کی بھیڑ تھی۔ دوسری جانب عورتیں تھیں۔ درمیان میں تھوڑی سی جگہ چبوترے تک پہنچنے کے لئے چھوڑی گئی تھی کہ لوگ "دیوی" کا دیدار کر کے سجدہ گزاری کے بعد وہاں سے لوٹ سکیں۔ اظہار عقیدت کے اس جوش کو وقتی طور پر میں نے برداشت کر لیا۔ مہا پجاری اور وادی سے میرے ساتھ آنے والے بھی سردار مقدام کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ شام سے ایک پہر رات گزرنے تک یہی "تماشا" جاری رہا۔ پھر میں عبادت گاہ سے اٹھ کر حویلی میں آ سکی۔ رات کی ضیافت میں بھی بستی کے تمام اہم حکام موجود تھے۔

مہا پجاری کے ساتھ مجھے حویلی کے اسی حصے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ جہاں میں برسوں رہی تھی۔ اس حویلی سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ میرے مسلح محافظوں اور خادموں کو حویلی کے مہمان خانے میں جگہ دی گئی تھی اور ایسا میرے ہی ایما پر ہوا تھا۔ وہاں نہ مجھے ان محافظوں کی ضرورت تھی' نہ خادموں کی۔ ان کی ضرورت تو سفر کے دوران میں پڑی تھی اور آئندہ بھی یہ ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

تریال سے ازیر کی مسافت خاصی تھی اور تمام باتوں سے قطع نظر یہ بات میرے علم میں تھی کہ تریال اور ازیر کے درمیان ہتھیاروں کی ترسیل کے سبب رابطہ قائم رہتا تھا۔ مہا پجاری نے صرف ایک مرتبہ میرے ساتھ وہاں تک کا سفر کیا تھا اور لوٹ کر تریال آیا تھا۔ اس موقع پر تریال ہی کے محافظوں نے ازیر تک راہنمائی کی تھی۔ اتنے طویل سفر میں یہ امکان بہرحال تھا کہ عرصہ دراز گزر جانے کی وجہ سے مہا پجاری راہ بھٹک جاتا۔ مجھے غالباً اسی لئے تریال پہنچنے کی ہدایت ملی تھی کہ میں وہاں سے چند ایسے افراد اپنے قافلے کے ساتھ لے لوں جو ازیر آتے جاتے ہوں۔ ساتویں روز سرگوشیاں سننے سے پہلے میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اجنبی سرزمین کی طرف سفر کرتے ہوئے میرا گزر تریال سے؟

ہ میں اپنے ماضی کے ہر اس دیار سے گزر رہی تھی کہ جو میری یادوں کا حصہ رہا تھا۔ معلوم نہیں اس ن دیوتاؤں کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ میں نے تو اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ایک نئی دنیا کے سفر سے پلے یوں میرے دل سے یادوں کا غبار نکالا جا رہا تھا۔ دل سے جب یادوں کا غبار نکل جاتا تبھی تو نئے در و دیوار اور نئی صورتوں کے لئے قبولیت کا جذبہ ابھرتا۔

میری ہی طرح مہا پجاری بھی پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ آدمی بیک وقت ماضی اور حال کے رمیان رہتا ہے اور شاید اسے اپنے اچھے یا بُرے ماضی سے بڑی گہری وابستگی ہوتی ہے۔ ہر گزرتا لمحہ ماضی ا جارہا ہے' وہ اس حقیقت سے بے خبر ماضی بعید کی یادوں میں گم رہتا ہے۔ ماضی اسے اپنی طرف کھینچتا ہتا ہے اور وقت کا جبر کشاں کشاں آدمی کو مستقبل کی طرف لئے چلتا ہے۔ سو یہی شاید زندگی ہے۔ دمی وقت کا قیدی ہے اور جب وہ اس قید سے رہائی پاتا ہے تو کچھ ہی عرصے میں خواب و خیال جاتا ہے۔ ں رات دیر تک میں یہی سب کچھ سوچتی رہی اور اسی دوران میں میری آنکھ لگ گئی۔

گزشتہ روز تریال والوں کے جوش عقیدت کو دیکھ کر اور ان کی دل جوئی کی خاطر میں کچھ نہیں لی تھی۔ مگر دوسرے دن خاموش نہ رہ سکی۔ کسی انسان کے سامنے دوسرے انسان کا یوں جھکنا ذہنی طور ں نے قبول نہیں کیا تھا۔ بچپن سے اب تک یہ مجبوری ہی میں یہ سب کچھ برداشت کرتی آئی تھی لیکن ب کوئی ایسی مجبوری نہیں تھی۔ میری روح اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ تعظیم کو حد اعتدال سے یں گزرنا چاہئے' سو اسی خیال کے تحت قبیلہ کبیت والوں ہی کی طرح دوسرے دن صبح "دیدار عام" کے ت سجدہ گزاری سے روک دیا۔ اپنی دیوی کے اس حکم کی تعمیل ان کے لئے بھی لازمی ٹھہری اور یوں ہری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو گئی۔ میں نے اپنی روح سے ایک بوجھ ساہٹتے محسوس کیا۔

وہاں مزید دو دن گزار کر میں اگلے روز ہی صبح ازیر کے لئے روانہ ہو گئی۔ ازیر تک رہنمائی کے ئے میرے ساتھ دو افراد موجود تھے۔ اب میرے مختصر سے قافلے کے افراد کی تعداد گیارہ ہو گئی تھی۔ انگی سے ایک روز پہلے تریال والوں نے میری آمد کی خوشی میں جشن منایا تھا۔ پھر دوسرے دن صبح نخبہ ر مقدام مجھے بستی سے باہر تک الوداع کہنے آئے تھے۔ اس دوران میں نخبہ سے میں نے اس کے بڑے ایلے بھائی سیمر کی خیریت بھی دریافت کی تھی۔ سال بھر کے عرصے میں وہ دو مرتبہ اپنی بیویوں اور بچوں کو لے کر تریال آیا تھا۔ نخبہ کے پہلے شوہر سردار صارم کا ذکر میں نے دانستہ نہیں کیا تھا۔ ہاں وہ مجھے تریال ں قیام کے دوران بار بار یاد آیا تھا۔ مقدام اسی کے بعد نخبہ کا شوہر بنا تھا۔ نوجوان مقدام اور نخبہ کی روں میں خاصا فرق تھا۔ نخبہ اپنے دوسرے شوہر مقدام سے عمر میں تقریباً پندرہ سال بڑی تھی۔ مگر بہ ل سیمر' عورت اور مرد کے ملاپ میں عمروں کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یوں بھی نخبہ اپنی عمر سے کم ہی ی تھی۔ ماں بننے کے بعد تو اس کا حُسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ مقدام یوں ہی تو اس پر نہیں مرمٹا تھا۔ نخبہ ے حُسن میں ایک وقار بھی تھا جسے محسوس ہی کیا جا سکتا تھا۔ مقدام اسے پرستش کی حد تک چاہتا تھا' مجھ سے یہ بات بھی چھپی ہوئی نہیں تھی اور نخبہ تھی بھی ایسی ہی۔

تریال سے روانگی کے بعد میرے ماضی کا ایک اور دیار میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ازیر پہنچنے

تک کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں دیا۔ یہ وہی راستہ تھا کہ جس کی تفصیلات کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں۔ یہ بستی تریال سے چھ دن کی مسافت پر تھی۔ دن میں دوپہر کے وقت میرا قافلہ مختصر قیام کے بعد آگے بڑھ جاتا اور رات کے وقت کسی مناسب جگہ پڑاؤ ڈال لیا جاتا۔

ازیر کے بارے میں غالباً پہلے بھی میں یہ بیان کر چکی ہوں کہ وہ ایک پہاڑی بستی ہی تھی' مگر وہاں پہاڑوں کو کاٹ کر ہموار راستے بنا لئے گئے تھے۔ اس بستی کے اردگرد کا سارا علاقہ سرسبز و شاداب تھا۔ وہاں نسبتاً ہموار زمین زیادہ تھی۔ میری عمر اس وقت شاید دس سال رہی ہو گی کہ جب میں پہلی بار وہاں احرس کی طویل علالت کے سبب آئی تھی۔ مہا پجاری نے احرس کا علاج کیا تھا اور دو ہفتے کے بعد میں پھر تریال کی طرف لوٹ گئی تھی۔ تقریباً سات برس کے عرصے میں وہ بڑی بستی مزید ترقی کر گئی تھی اس کے باوجود میں نے احرس کے گھر کو پہچان لیا اور اس پر مجھے عجیب سی خوشی ہوئی۔

احرس کے والدین' اجدر بابا اور تیبا مجھ کو دیکھ کر کھل اٹھے۔ پھر میں نے محسوس کر لیا کہ ان دونوں کی نظریں اپنے بیٹے کو تلاش کر رہی ہیں۔ احرس کو ان سے بچھڑے بہرحال ایک برس کے قریب ہو گیا تھا۔

"اے اجدر بابا! میں' احرس کو اپنے ساتھ نہیں لائی۔" میں نے بتا دیا' پھر مختصراً اس کی وجہ بھی بتا دی۔ اجدر بابا کے علم میں یہ بات تھی کہ میں تریال سے وادی سبز پر حملہ کرنے نکلوں گی۔ ازیر سے تریال کے لئے ہتھیاروں کی ترسیل اسی کے ذریعے عمل میں آئی تھی۔ احرس ہتھیار لے کر ہی اس موقع پر اپنی بستی سے تریال پہنچا تھا۔ اس نے اپنے والدین کو بتا دیا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ وادی سبز پر حملہ کرنے جائے گا۔

"تجھے مبارک ہو اے معبلہ کہ تیرا حق مل گیا۔" اجدر بابا نے فتح کی خوشخبری سن کر کہا۔

"مگر اے میری بچی! احرس یہاں کب واپس آئے گا؟" احرس کی ماں تیبا نے مجھ سے پوچھا۔

"جلد آ جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔ احرس کے والدین کو جھوٹی تسلی دینے کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ کار بھی تو نہیں تھا۔ احرس کو وادی میں اپنی جگہ چھوڑ آنے کی وجہ میں نے یہی بیان کی تھی کہ چند روز مجھے سیر و سیاحت میں گزارنا تھے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے انہیں مزید اطمینان دلانے کی خاطر کہا۔ "یہ بستی میری سیاحت کی آخری منزل ہے' اس کے بعد مجھے یہاں سے چل دینا ہے۔"

"پھر ظاہر ہے کہ جب تُو واپس اپنی وادی میں پہنچ جائے گی تو احرس کو یہاں بھیج دے گی۔" اجدر بابا نے یہ کہہ کر خود ہی میری مشکل آسان کر دی۔

مہا پجاری اس عرصے میں خاموشی اختیار کئے رہا کیوں کہ اسے حقیقت کا علم تھا۔

سات برس کے دوران میں اجدر بابا نے اپنے مکان کو دو منزلہ بنا لیا تھا۔ مکان خاصا بڑا تھا۔ نچلی منزل نشست گاہ کے علاوہ کئی کمروں پر مشتمل مہمان خانے پر مشتمل تھی۔ اوپری منزل پر احرس کے والدین کی سکونت تھی۔ میرے قافلے کے نو افراد کو نچلی منزل پر کئی کمرے قیام کے لئے دیئے گئے تھے۔

مجھے اور مہا پجاری کو اجدر بابا نے اوپری منزل کے ایک کمرے میں ٹھہرایا۔ احرس کے سوا اجدر بابا کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اس لئے بھی ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ سو کسی کا اکلوتا بیٹا اتنے طویل عرصے کے لئے ان سے جدا ہو جائے تو والدین کو اس کی طرف سے فکر ہونا لازمی ہے۔ مجھے اس کا احساس تھا۔ مگر وقت اور حالات کے ہاتھوں میں مجبور تھی۔ احرس کے والدین کو حقیقت سے آگاہ کرنا میرے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔

بستی ازیر میں دو روز قیام کے بعد تیسرے دن صبح میں نے اجدر بابا اور تیبا سے رخصت کی اجازت چاہی۔ تریال سے ازیر تک طویل سفر کے بعد قافلے والوں کے لئے آرام ضروری تھا۔ اجدر بابا نے مہمان نوازی کے خیال سے مجھے مزید روکنا چاہا' مگر میں نہیں مانی۔

ازیر سے بظاہر میں اپنے قافلے کے ساتھ وادی سبز کے لئے روانہ ہوئی تھی' مگر بستی سے کچھ دور نکل آنے کے بعد یہ قافلہ میرے ہی ایما پر رک گیا۔ سرگوشیوں کے مطابق اب مجھے تن تنہا سفر کرنا تھا۔ اب عظیم مہیمن کی کاہنہ خجیرہ میری رہنمائی کرتی۔ مگر اس وقت کہ جب مہا پجاری قافلے کو ساتھ لئے آگے بڑھ جاتا۔

"اے میری آقا زادی! اے میری بچی معبلہ!" مہا پجاری نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کی آواز دھیمی تھی۔ "میں نے تجھے دیوتاؤں کے حوالے کیا۔ میری دعا ہے کہ تیرا دشمن ذلیل و خوار ہو۔ تیرے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ دشمن کے خون سے بجھ جائے اور تُو جلد اپنوں کی طرف لوٹ آئے۔"

میں نے جواب میں سر جھکا دیا کہ مہا پجاری کا بڑھتا ہوا ہاتھ دیکھ لیا تھا۔ اس نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔ پھر مہا پجاری قافلے کو لے کر آگے بڑھ گیا اور میں وہیں اپنے گھوڑے پر سوار دیر تک اسے جاتے دیکھتی رہی۔

میرے پاس قدیم و جدید ہتھیاروں' دیگر سامان سفر کے علاوہ خاصا سونا بھی تھا۔ یہ سونا میں وادی سبز سے لے کر چلی تھی۔ ہموار میدانوں کی اجنبی سرزمین پر سونے کی کیا قدر و قیمت اور اہمیت ہے' اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہو گیا تھا جب میں پُراسرار تجربات سے گزر رہی تھی۔ یہ اس وقت کی بات تھی کہ جب میں وادی سبز ہی میں تھی اور میری آنکھوں سے پردے اٹھائے جا رہے تھے۔ مجھے اجنبی دنیا سے آشنا کرایا جا رہا تھا۔ مجھ پر آگہی کے نئے در کھل رہے تھے۔ سونے کے یہ ٹکڑے میرے لباس کی تہوں میں بھی سلے ہوئے تھے اور سامان سفر کے ساتھ بھی محفوظ تھے۔

ہدایات کے مطابق مجھے جنوب کی سمت اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔ مہا پجاری کا قافلہ جب شمال کی جانب میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے اپنے گھوڑے کا رخ موڑ لیا۔ معلوم نہیں کیوں اس وقت مجھے کچھ خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس کا سبب احساس تنہائی تھا۔ جنوب کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے خاصے فاصلے پر اچانک مجھے خجیرہ کی جھلک سی دکھائی دی۔ پھر اس کا ہیولا غائب ہو گیا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں صحیح سمت میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد مجھے اپنے قریب خجیرہ کی خوشبو محسوس ہوئی۔ میں اسی خوشبو کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ ہموار میدانوں تک خجیرہ

کی خوشبو میرے ساتھ رہے گی مگر جلد ہی میرا یہ خیال غلط ثابت ہوگیا۔ وہ کسی بستی ہی کے آثار تھے کہ جن کے نظر آتے ہی معاً خوشبو غائب ہو گئی تھی۔ میں ابھی اس پر حیران ہی تھی کہ میری آنکھوں نے ایک دہشت ناک منظر دیکھا۔ مجھے اپنے گھوڑے کی چاروں سمت ایک دائرے کی صورت میں عجیب و غریب انسانی ڈھانچے دوڑتے دکھائی دیئے تھے۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ اچانک ہی زمین کے اندر سے نکل آئے ہوں۔ وہ انسانی ڈھانچے اس اعتبار سے بھی عجیب تھے کہ ان کے کچھ حصے پر گوشت تھا اور بقیہ جسم پر صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ سبھی اپنی وضع اور ساخت میں تقریباً مختلف تھے۔ ان میں سے ایک کی پشت پر ریڑھ کی ہڈی کے پاس جانوروں کی طرح میں نے موٹی سی دم بھی دیکھی۔ کچھ کے چہروں اور سینوں کا گوشت غائب تھا اور صرف بازوؤں پر گوشت تھا۔ بعض صرف ہڈیوں کا پنجر تھے۔ انہی میں سے ایک ڈھانچے کے جسم پر لباس اور کمر سے چمڑے کی پیٹی بھی بندھی نظر آئی۔ استخوانی چہرہ ہونے کے باوجود مجھے اس کے سر پر بڑے بڑے بال بھی دکھائی دیئے۔ چند کے ہاتھوں میں قدیم وضع کے کلہاڑے اور تیر بھی میں نے دیکھے۔ ان کلہاڑوں کی دونوں جانب چوڑے آہنی پھل تھے۔ جن کے درمیان موٹی لکڑی کا دستہ پیوست تھا۔ میرے گھوڑے کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں وہ عجیب ڈھانچے رکے بغیر دوڑ رہے تھے۔ ان ڈھانچوں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے جسموں کا گوشت دھیرے دھیرے گل کر ہڈیوں سے کہیں الگ ہو گیا ہے اور کہیں ابھی باقی ہے۔

معاً مجھے کسی ناآشنا ساز کی مانوس سی لے سنائی دی۔ یہ بڑی مسحور کن آواز تھی اور اس میں تیز نشے جیسی کیفیت تھی۔ یہ مسحور کن آواز بستی ہی کی طرف سے آ رہی تھی اور اس میں انتہائی کشش تھی۔ ساحر زعیم سے برسرپیکار ہونے کے دوران میں بھی کئی بار ایسے ہی ساحرانہ حملوں کا شکار ہو چکی تھی۔ میں اس وقت صرف یہی جان سکی کہ کسی سحر میں گرفتار ہونے والی ہوں' مگر ساحر زعیم تو اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ پھر یہ کون ہے جو مجھے اسیر کر رہا ہے؟ یہ وہ آخری سوال تھا جو اپنے اوپر اختیار کھونے سے پہلے میرے ذہن میں آیا۔ اس کے بعد جیسے میں اپنے حواس کھو بیٹھی۔

"ترفیہ .... ترفیہ!" خواب کے سے عالم میں یہ صدائیں میری سماعت سے ٹکرائیں اور پھر میرے ذہن پر اندھیرے کی چادر پھیلتی چلی گئی۔

ترفیہ شاید کسی کا نام تھا' مگر کس کا؟ یہ مجھے فوری طور پر معلوم نہ ہو سکا۔ میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک نیم تاریک سی کوٹھری میں پایا۔ اس کوٹھری کا دروازہ آہنی سلاخوں سے بنایا گیا تھا جس کے باہر دیکھنا ممکن تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے چند سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ جن کے اختتام پر بائیں جانب چوڑی راہداری نیم دائرے کی صورت میں آگے جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اسی راہداری کی دائیں سمت پتھر کے ستون تھے جن کے درمیان سے قدرے بلندی پر چوکور پتھروں ہی کو جوڑ کر ایک راستہ سا بنا ہوا تھا۔ ستونوں کے عقب میں پتھر کی سلوں سے بنی ہوئی دیوار تھی۔ وہاں اس وقت ایک غیر فطری سا سکوت طاری تھا۔ جیسے میرے سوا کوئی موجود نہ ہو۔ میں نے اس کوٹھری کا جائزہ لیا جو خاصی بڑی تھی۔ وہیں زمین پر بچھے بستر پر مجھے لا کر ڈالا گیا تھا۔ میرے جسم پر وہی لباس موجود تھا جو میں

بے ہوش ہونے سے پہلے پہنے ہوئے تھی۔ مگر ہتھیار کوئی بھی میرے پاس نہیں رہنے دیا گیا تھا۔ میرے لباس کی تہوں میں سلے ہوئے سونے کے ٹکڑے بھی موجود تھے۔ مگر سامان سفر ظاہر ہے غائب تھا جو میرے گھوڑے کی پشت سے بندھا ہوا تھا۔

مجھے خبر نہیں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہی اور اس عرصے میں کیا ہوا؟ کس طرح مجھے وہاں اس جگہ لا کر قید میں ڈال دیا گیا؟ قیدی بنائے جانے کی وجہ سے بھی میں لاعلم تھی اور نہ مجھے یہ خبر تھی کہ وہ بستی کون سی تھی جس کے آثار مجھے نظر آئے تھے۔ ہاں یہ احساس ضرور تھا کہ غالباً مجھے اسی بستی میں لایا گیا تھا۔ اس احساس یا خیال کی وجہ یہ تھی کہ نامانوس اور پُرکشش ساز کی آواز بستی ہی کی طرف سے آتی سنائی دی تھی۔ پھر میں بستی کی طرف کھنچی چلی گئی تھی۔ اس سے پہلے مجھے جو انسانی ڈھانچے دکھائی دیئے تھے وہ بھی ساز کی لے ابھرتے ہی چند لمحے بعد اس وقت غائب ہو گئے تھے جب میں نے "ترفیہ' ترفیہ" کی صدائیں سنی تھیں۔ یہ تجربہ میرے لئے پُراسرار ہونے کے ساتھ دہشت ناک بھی تھا۔

ابھی میرے حواس بحال ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ مسحور کن ساز کی مخصوص آواز میرے اعصاب پر اثرانداز ہونے لگی۔ یہ آواز راہداری کی طرف سے ابھر رہی تھی۔ اس کی کشش مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ مجھ پر خواب کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میرا ذہن جیسے کسی تیز نشے میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس آواز میں ایک بلاوا تھا جو مجھے بے چین کئے دے رہا تھا' مگر درمیان میں آہنی دروازہ حائل تھا۔ میں اس کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے پکڑے کھڑی تھی اور لمحہ بہ لمحہ میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اگر وہ آہنی دروازہ کھلا ہوتا تو شاید میں لمحہ بھر بھی وہاں نہ رکتی اور اس پُرکشش ساز کی صدا کے تعاقب میں چل دیتی۔

کچھ دیر اسی عالم میں گزری اور پھر میں نے ایک انسانی ڈھانچے کو راہداری سے گزر کر سیڑھیوں سے اترے دیکھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب اس نے باہر سے آہنی دروازہ کھولا اور کب کہاں غائب ہو گیا۔ میں تو جیسے اپنے ہوش ہی میں نہیں تھی۔ دروازہ کھلتے ہی میں تیر کی طرف لپک کر کوٹھری سے نکلی اور سیڑھیاں چڑھ کر راہداری میں پہنچ گئی۔ ساز کی آواز کے تعاقب میں آگے بڑھتے ہوئے میں پتھروں سے بنے ایک بڑے سے کمرے میں جا پہنچی۔ ساز کی آواز اب دھیمی پڑتی جا رہی تھی' مگر میری کیفیت حسب سابق تھی۔ میں خواب کے سے عالم میں اس حسین عورت کو دیکھ رہی تھی کہ جس کے ہونٹوں پر بڑی پُراسرار سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے جسم پر ملکاؤں جیسا قیمتی لباس تھا۔ سر پر سونے کے ایک حلقے کے درمیان نیلا ہیرا چمک رہا تھا۔ سونے کے حلقے ہی کا ایک حصہ ہیرے کی اوپری سمت میں اس کی مانگ کے درمیان سے پیچھے کی طرف چلا گیا تھا۔ سر کے بال کھلے ہوئے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی عمر مجھ سے دگنی لگتی تھی اور جسم سڈول ہونے کے باوجود قدرے بھاری تھا۔ کمرے کے سامنے والی دیوار کے قریب ایک تخت پر وہ نیم دراز میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اے دوشیزہ!" معاً اس حسین عورت نے مجھے مخاطب کیا۔ میں اس کے تخت سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر جیسے خود بخود رک گئی تھی۔ اس کی آواز بھی اس کی طرح حسین اور پُرکشش تھی۔ اپنی بات جاری

رکھتے ہوئے اس نے میری طرف نظریں اٹھائیں۔ ”میں جان چکی ہوں کہ تُو کون ہے اور یہ حق میں تجھے بھی دیتی ہوں۔ میں ترفیہ ہوں اور تجھے خوش آمدید کہتی ہوں۔“

اسی لمحے میری نظریں اس کی نظروں سے ملیں اور میرے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی نظریں میری آنکھوں کے راستے میرے دماغ میں اترتی جا رہی ہوں۔ اس سے پہلے میں کبھی بھی ایسی کسی کیفیت سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔

”تُو سوچ رہی ہے اے معبلہ کہ اس بستی کا نام کیا ہے؟ اور یہ کہ میں کون ہوں؟“ ترفیہ کی آواز پھر میں نے سنی اور حیران رہ گئی کیوں کہ اس وقت میرے ذہن میں یہی دو سوال ابھرے تھے۔ ”تُو چاہے تو خود بھی مجھ سے سوال کر سکتی ہے اور نہ چاہے تو میں یہ جان لوں گی کہ تُو کس سوال کا جواب چاہتی ہے۔“ ترفیہ کہہ رہی تھی۔ ”تو سن اے کنواری معبلہ! یہ ساحروں کی بستی سارزوم ہے اور میں ساحروں کی ساحرہ ترفیہ ہوں۔ میں اسی طرح اس بستی کی سربراہ ہوں کہ تُو جس طرح یہاں دس روز کی مسافت پر واقع وادی سبز کی حکمراں ہے۔“

ترفیہ سے یہ سب کچھ سن کر میرے ذہن میں چھناکے سے ہونے لگے۔ پھر جیسے میری قوت گویائی مجھے واپس مل گئی۔

”اے ساحروں کی ساحرہ ترفیہ!“ میں پہلی بار اس سے ہم کلام ہوئی۔ ”کیا ساحر زعیم بھی تیری ہی بستی سے وادی سبز کی طرف گیا تھا؟“

”ہاں اے معبلہ! وہ میری بستی کا ایک ساحر تھا اور میری ہی اجازت سے وادی کی طرف گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دیوتاؤں نے اس کی ساحرانہ قوتیں سلب کر لی تھیں۔ سو وہ تیرے ہاتھوں مارا گیا اور پوچھ کیا پوچھنا چاہتی ہے؟ تجھے اجازت ہے۔“

”کیا تُو نے مجھے ساحر زعیم کا انتقام لینے کے لئے یہاں قید کیا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”نہیں، تُو غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ اس کی وجہ کچھ اور ہے جو میں تجھے بتا دوں گی۔“ ترفیہ ایک بار پھر عجیب معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

”کہیں اس کا سبب میرا دشمن ژیان تو نہیں کہ جس نے وادی سبز سے فرار ہو کر یہاں پناہ لی ہوئی تھی؟“ میں نے سوال کیا۔

میرے اس سوال پر ترفیہ آہستہ سے ہنس کر بولی۔ ”تیرے دشمن ژیان کی حیثیت میری نظر میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ نہیں۔ وہ تو میرے تلوے چاٹتا تھا۔ جب تک وہ یہاں رہا اس نے غلام کی طرح میری خدمت کی۔ مجھے خوش کرنا چاہا۔ مجھے اس پر رحم آ گیا تو میں نے اسے کچھ قوتیں بخش دیں۔ پھر وہ خوش ہو کر یہاں سے چلا گیا۔ میں بھلا اس غلام کی خاطر تجھے کیوں قید کراتی؟“

میرا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ نہ وہ مجھ سے ساحر زعیم کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ نہ میرے دشمن ژیان کی وجہ سے اس نے مجھے قید کرایا تھا۔ پھر اس نے مجھے اپنی ساحرانہ قوتوں کے جال میں کیوں پھانسا تھا؟ یہ سوال میرے لئے تشویش کا باعث تھا۔

اس سے پہلے کہ یہ سوال میری زبان پر شائستہ اور مہذب الفاظ کی صورت میں آتا، وہ خود ہی بول اٹھی۔ ”تجھے اپنے اس سوال کا جواب اب سے تین روز کے بعد مل جائے گا اب یہ تیری مرضی پر منحصر ہے کہ تُو میری قیدی بن کر رہ یا مہمان، مگر دونوں ہی صورتوں میں یہاں سے تیرا فرار ممکن نہیں۔“

”مگر کیوں اے ترفیہ!“ مجھے غصہ آنے لگا۔ ”تُو مجھے کیوں اپنا مجبور بنا کر رکھنا چاہتی ہے؟“

میری بات سن کر وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے چہرے پر موجود تاثرات بدلتے دیکھے۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی تھی۔

”لڑکی! تُو شاید یہ بھول گئی ہے کہ اس وقت کس سے مخاطب ہے۔“ اس کی آواز میں سختی تھی۔ ”تجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ مجھ سے یہ سوال کر سکے، ساحروں کی ساحرہ ترفیہ سے تُو جواب طلب کرے گی، کیا تجھے ابھی میری قوت و طاقت کا اندازہ نہیں ہوا؟“

جواب میں میرے اندر یہ خواہش تو ضرور پیدا ہوئی کہ اس مغرور ساحرہ کو دیوتاؤں کی عظمت کا احساس دلاؤں، مگر حیرت انگیز طور پر میری زبان نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میری قوت گویائی ترفیہ نے شاید پھر سلب کر لی تھی۔

”بول۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے غصے کی نظر سے دیکھا۔ ”بولتی کیوں نہیں، کیا ہوا تجھے، مجھے اپنے دیوتاؤں کی عظمت کا احساس کیوں نہیں دلاتی؟“ پھر وہ حقارت سے ہنسی۔ ”بے وقوف لڑکی میرے سامنے اترا رہی ہے۔ تیرے دیوتا اگر مجھ سے زیادہ عظیم ہوتے تو تجھے یہاں آنے سے روک نہ لیتے۔ تُو میری مہمان بننے کے قابل نہیں۔ تیرا مقدر وہی نیم تاریک کوٹھری ہے، جا اور وہیں تین دن تک پڑی رہ۔ خطیر اگر یہاں ہوتا تو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔“

خطیر.......... یہ کون ہے؟ میں نے سوچا۔ کیا یہ اس مغرور ساحرہ کا شوہر ہے؟

”نہیں!“ ترفیہ فوراً بول اٹھی۔ معلوم نہیں اسے کس طرح اپنی ساحرانہ قوتوں کے ذریعے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں، وہ مزید بولی۔ ”مجھ سے بڑا اس بستی میں کوئی نہیں اور نہ میں نے کسی کو اپنا شوہر بنایا۔ میرے احساس برتری کو یہ قبول ہی نہیں۔ تیرے لئے فی الحال اتنا ہی جان لینا بہت ہے۔ اب سے تین دن پورے ہونے تک تُو میرے سحر کے زیر اثر رہے گی۔ تُو خواب کے عالم میں سب کچھ دیکھے گی، محسوس کرے گی، مگر میری مرضی کے خلاف خود اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت دینے کی بھی اہل نہ ہو گی۔ جا اب تُو اسی کوٹھری میں چلی جا کہ جہاں سے چل کر یہاں تک آئی تھی۔ یہ ساحروں کی ساحرہ ترفیہ کا حکم ہے اور تُو یہ حکم ماننے پر مجبور ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

ترفیہ کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذہن پر طاری نشہ مزید گہرا ہو گیا۔ میں ہوش میں ہونے کے باوجود جیسے ہوش میں نہیں تھی۔ پھر میں نے وہی کیا کہ جو حکم مجھے ترفیہ نے دیا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد میں جن راستوں سے گزر کر ترفیہ تک پہنچی تھی انہی سے واپس ہوئی اور کوٹھری میں آ گئی۔ کوٹھری کا دروازہ مجھے کھلا ہوا ہی ملا تھا۔ واپسی میں مجھے کوئی بھی کہیں نہیں ملا۔ میں اسی عالم میں بستر پر آ کے دراز ہو گئی۔ پھر کتنے پہر بیتے، کب دن گزرا، کب رات ہوئی، مجھے نہیں معلوم۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ اس

عرصے میں انسانی ڈھانچے میرے پاس آتے جاتے رہے۔ وہ میرے کھانے پینے کا خیال رکھتے۔ میں خواب کی سی حالت میں چلتی پھرتی' اپنی ضرریات پوری کرتی' وہ ضرریات کہ جو زندگی کا لازمہ ہیں۔ مگر کھانے پینے اور چلنے پھرنے کے باوجود میرے ذہن پر ہر وقت ایک نشہ سا طاری رہتا۔ مجھے کوٹھری سے باہر بھی لایا گیا۔ درزاوہ اب کھلا ہی رہتا تھا کہ اسے بند رکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ترفیہ اور ان انسانی ڈھانچوں کے سوا مجھے اس عرصے میں کوئی دوسرا ذی روح وہاں نظر نہیں آیا۔ یا تو جہاں مجھے رکھا گیا تھا اس حصے میں کوئی اور نہیں آتا تھا یا پھر ترفیہ وہاں اس عمارت میں تنہا رہتی تھی۔ انہی انسانی ڈھانچوں کے ساتھ کہ جنہیں پہلی بار دیکھ کر میں دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ جب سے میں ترفیہ کے سحر میں گرفتار ہو کر اس جگہ آ گئی تھی مجھے انسانی ڈھانچوں سے ڈر نہیں لگتا تھا۔

مجھے خبر نہیں کہ اسی عالم مین کب میں نے مسحور کن ساز کی پُرکشش صدا سنی اور اٹھ کر چل دی۔ مجھے بس اتنا احساس ہے کہ ترفیہ نے ایک بار پھر میری طلبی کو ضروری سمجھا تھا۔ وہ مجھے اسی حالت میں اپنے تخت پر نیم دراز تکئے کا سہارا لئے نظر آئی کہ جس طرح اسے پہلی بار میں نے دیکھا تھا۔

میں اس تخت سے کچھ فاصلے پر رک گئی تو وہ بولی۔ "آج تجھے تیسرا دن ہے یہاں اے معبلہ!" اس کے ہونوں پر پہلے ہی جیسی پُراسرار معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ "آج خطیر ہموار میدانوں کی طرف سے آنے والا ہے' تجھے آج اپنے اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ وہ کون ہے۔ اسی کے ساتھ تُو یہ بھی جان لے گی کہ تجھے میں نے کیوں یہاں رہنے پر مجبور کیا۔"

کیوں؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا لیکن یہ سوال میری زبان تک نہ آ سکا۔ مجھے احساس تھا کہ ترفیہ نے اپنی شیطانی پُراسرار قوتوں کے ذریعے میری قوت گویائی سلب کر لی ہے۔

"بول کہ اب تُو بولنے کی اہل ہے۔" ترفیہ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "تیرے ذہن میں جو سوال ابھرا ہے' اس کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے اور شاید قبل از وقت ہے۔ مگر آج میرے لئے خوشی کا دن ہے' سو اے کنواری معبلہ! میں تجھے مایوس نہیں کروں گی۔ سن کہ اس دنیا میں بڑی راحتیں' بڑی لذتیں ہیں۔ زندگی بھر آدمی انہی کے حصول کی خاطر سرگرداں رہتا ہے۔ خواہشوں کی کوئی حد نہیں۔ خواہشوں کی تکمیل ہی راحتیں اور لذتیں فراہم کرتی ہے۔ تجھے شاید خبر ہو کہ کوئی حسین منظر دیکھ کر بھی آدمی کو فرحت و راحت ملتی ہے۔ سو یوں سمجھ کہ لذت دید بھی سامان عیش و طرب ہی کا ایک حصہ ہے......."

پھر ترفیہ نے جو کچھ کہا اور جو بتایا وہ میرے لئے اتنا ہی شرم ناک اور اشتعال میں مبتلا کر دینے والا تھا کہ میں شدید غصے میں چیخ اٹھی۔

خطیر بھی اس بستی کا ایک ساحر تھا جو ترفیہ کا شوہر نہیں' محبوب تھا۔ ترفیہ اسی کی خوشنودی اور اپنی آسودگی کی خاطر دوشیزاؤں کو اکثر اغوا کراتی رہتی تھی۔ ترفیہ مظلوم و مجبور دوشیزاؤں کی طرف خطیر کا دست ہوس دراز ہوتے دیکھ کر اپنی دانست میں سامان عیش و طرب فراہم کرتی تھی۔ یہ میری بد قسمتی تھی یا دیوتاؤں کی کوئی مصلحت تھی جو میں ترفیہ کے چنگل میں آ پھنسی تھی۔

میرے چیخنے چلانے اور بُرا بھلا کہنے کا رد عمل خلاف توقع ترفیہ کے غصے کی صورت میں ظاہر نہیں ہوا۔ اس کے برعکس میں نے اسے اپنی بے بسی پر قہقہے لگاتے دیکھا۔ اس وقت ترفیہ کا چہرہ مجھے بہت کریہہ نظر آ رہا تھا۔ شاید یہی اس کا اصل چہرہ بھی تھا۔

زور زور سے ہنستے ہنستے وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ پھر چند لمحے بعد اس نے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں اور کسی ناگن کی طرح پھنکاری۔ "بس! بہت سن چکی میں' اب چپ ہو جا' چلی جا یہاں سے اور اپنی کوٹھری میں واپس جا کے خطیر کی آمد کا انتظار کر۔ وہ جب آ جائے تو اسی طرح تُو خود ہی یہاں کھنچی چلی آئے گی کہ جس طرح اب تک آتی رہی ہے۔"

پھر وہی ہوا کہ جو ترفیہ چاہتی تھی۔ میں اس سے مزید کچھ نہ کہہ سکی اور اپنی کوٹھری میں لوٹ آئی۔

☆======☆======☆

خبر و بے خبری کے درمیان دیر تک میں اپنے بستر پر پڑی رہی' پھر ایک عجیب سے شور سے چونک اٹھی۔ میری نگاہ کوٹھری کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف گئی تو باہر میں نے بڑا نا قابل یقین اور ہولناک منظر دیکھا۔ پہلی بار میں یہی سمجھی کہ یہ میرا فریب نظر ہے۔ مجھے اپنی بصارت پر شبہ ہو رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ نضار کو تو بستی اشر میں چھوڑ کر آئی تھی وہ بھلا ساحروں کی اس بستی تک کس طرح پہنچ سکتا تھا؟ پھر چند لمحے بعد مجھے یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ کوئی خواب نہیں تھا۔ سیڑھیوں پر نضار انسانی ڈھانچوں سے برسرپیکار تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کسی انسانی ڈھانچے نے نضار کے جسم کا اوپری لباس پھاڑ ڈالا اور پھر اسے گھسیٹ لیا۔ نضار راہداری میں سیڑھیوں کے قریب گرا اور ڈھانچوں نے اس پر یلغار سی کر دی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے نضار کو چیختے ہوئے سنا اور پھر دوسرے ہی لمحے اسے اچھل کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس نے کسی ڈھانچے سے دو پھل والا کلہاڑا چھین لیا تھا اور اب جواباً ڈھانچوں پر حملہ کر دیا تھا۔ ایک ڈھانچے کی کھوپڑی لڑھک کر میں نے سیڑھیوں کے نیچے گرتے دیکھی۔ اسی وقت پُرگوشت بازوؤں والا ایک ڈھانچہ نضار کے دائیں پیر سے لپٹ گیا۔ اس نے اپنے تیز اور نوکیلے دانت نضار کی ران میں گھٹنے کے قریب گڑا دیئے۔ نضار نے چیخ کر کلہاڑے والا ہاتھ بلند کیا تو ایک اور ڈھانچہ اس کی طرف لپکا یہ وہی تھا کہ جسے پہلے بھی میں دیکھ چکی تھی۔ اس کے جسم پر لباس اور کمر سے چمڑے کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے تلوار بلند کرتے دیکھا۔ اسی لمحے میری نگاہ ذرا اور اوپر اٹھی اور پھر جیسے پلٹنا بھول گئی۔ سامنے سیڑھیوں کے اوپر ستونوں کے درمیان پتھروں کو جوڑ کر جو راستہ سا بنا ہوا تھا اسی پر میں نے ترفیہ کو دیکھا۔ وہ ایک ستون سے ٹیک لگائے مدہوش کن اور عجیب سے انداز میں بیٹھی نیچے ان انسانی ڈھانچوں کو نضار سے نبرد آزما ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ ستون کے نچلے حصے پر ٹکا ہوا تھا اور بایاں ہاتھ فضا میں بلند تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں کوئی عجیب سی شے تھی کہ جس سے جھالریں سی لٹکی ہوئی تھیں' بایاں پیر گھٹنے کے پاس سے مڑا ہوا اور پتھر پر ٹکا تھا۔ دائیں پیر کی پنڈلی پر سامنے کسی چمکیلی دھات کا خول سا چڑھا تھا۔ ترفیہ جس انداز میں بے خود سی بیٹھی تھی اس کی وجہ سے باریک ریشمی لباس بے ترتیب سا نظر آ رہا

تھا۔

"ترفیہ .... ترفیہ!" انسانی ڈھانچوں کی چیخیں بلند ہوتی رہیں۔ مگر ترفیہ کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح مدہوش سی بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ یوں جیسے وہ کوئی خوبصورت مجسمہ ہو۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی ان دیکھی قوت نے اسے مفلوج کر دیا ہو۔

انسانی ڈھانچوں کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ ان کی ہڈیاں اور جسم کے دوسرے حصے سیڑھیوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہرچند کہ انہوں نے نضار کے جسم کو جگہ جگہ سے لہولہان کر دیا تھا مگر اس پر قابو نہیں پا سکے تھے۔ دہرے پھل والا کلہاڑا تیزی سے گردش کر رہا تھا اور وہ ڈھانچے اِدھر اُدھر ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ نضار اور میری کوٹھری کے درمیان وہ کسی آہنی دیوار کی طرح حائل ہو گئے تھے۔ مگر اب اس دیوار میں شگاف پڑ گئے تھے۔ آخر کار موٹی دم والا وہ ڈھانچہ بھی اپنے انجام کو پہنچ ہی گیا کہ جو اب اکیلا رہ گیا تھا۔

"معبلہ!" کسی زخمی شیر کی طرح نضار کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اس آواز کے ساتھ ہی مجھے اپنے جسم میں چھناکے سے محسوس ہوئے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے آس پاس ہی عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ کی خوشبو چکرا رہی ہے۔ میرے اعصاب جیسے کسی ذہنی گرفت سے آزاد ہونے لگے۔ میرے ذہن پر جو گہرا نشہ طاری تھا لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا گیا۔ چند ہی لمحے بعد میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر جیسے ہی میں دوڑتی ہوئی کوٹھری سے نکل' میری آنکھوں نے ایک اور عبرت ناک منظر دیکھا۔ ساحروں کی ساحرہ مغرور ترفیہ کو نضار نے ٹانگ پکڑ کر اوپر سے نیچے راہداری میں گرا لیا اور پھر کلہاڑے سے اس کی گردن اڑا دی۔ میں جب تک نضار کے قریب پہنچی وہ ترفیہ کے حسین جسم کو کئی ٹکڑوں میں تبدیل کر چکا تھا۔ اسی وقت پُراسرار سرگوشیاں گونجیں۔ مجھے اور نضار کو جو ہدایات دی گئیں' اس پر ہم نے فوری طور پر عمل کیا۔

خجیرہ کی خوشبو کے تعاقب میں ہم دونوں اس عمارت کے بیرونی حصے میں آ گئے۔ وہیں سامان سفر اور ہتھیاروں کے ساتھ مجھے اپنا گھوڑا ایک اصطبل میں مل گیا۔ نضار کا سامان سفر اور گھوڑا بھی وہیں تھا۔ ہم اس عمارت سے باہر نکلے تو چونک اٹھے۔ ساری بستی پر دبیز اور گہرا دھواں اتر رہا تھا۔ وہ عمارت کہ جس سے ہم نکلے تھے' بستی کے ایک سرے پر تھی۔ نضار اور میں تیزی کے ساتھ اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور پھر انہیں پوری قوت سے دوڑا دیا۔ خجیرہ کی خوشبو اب ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ توقع کے مطابق ہمیں اپنے عقب میں آسمانی بجلی کی دل ہلا دینے والی کڑک سنائی دے رہی تھی۔

ساحروں کی اس بستی سارزوم سے کافی دور نکل آنے کے بعد میں نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی اور پلٹ کر دیکھا۔ ساحروں کی اس بستی پر آسمانی قہر ٹوٹ رہا تھا۔ اس بستی کو نیست و نابود کیا جانا تھا اسی لئے مجھے اور نضار کو وہاں سے نکل جانے کی ہدایت ملی تھی۔

وہ دوپہر کا وقت تھا میں اور نضار اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے ایک پہاڑی کے دامن میں جا پہنچے۔ وہاں سایہ تھا اور پھر ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آ رہا تھا۔ اپنے گھوڑوں سے ہم نے سامان اتار لیا اور انہیں چرنے کو چھوڑ دیا۔ اسی وقت پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ نضار کے جسم پر زخم کا کوئی نشان تک نہیں

تھا۔ میرے لئے اب یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں رہی تھی۔ یقیناً یہ عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ ہی کی پُراسرار قوتوں کا کمال تھا۔ ایک بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا کہ جب ایک جنگ میں نضار شدید زخمی ہو گیا تھا اور بستر علالت پر پڑا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی کہ جب ہم نے وادی سبز پر حملہ کیا تھا۔ اس حملے سے پہلے ایک شب نضار کے سارے زخم بھر گئے تھے۔ مجھے پُراسرار سرگوشیاں سنائی دی تھیں کہ حویلی میں خجیرہ کا پھیرا ہو گا۔ خجیرہ کے اسی پھیرے کے طفیل احرس بھی صحت یاب ہو گیا تھا۔ نضار کو میں نے اپنی آنکھوں سے لہولہان ہوتے دیکھا تھا اور اب وہ بالکل صحت مند نظر آ رہا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس سے قطع نظر میرے ذہن میں یہ تجسس ضرور تھا کہ نضار وہاں کس طرح پہنچ گیا؟ میں اس کے قریب بیٹھی تو یہی سوال میری زبان پر آ گیا۔

"تجھے بستی اشر سے روانہ ہوئے شاید وہ دوسرا یا تیسرا دن ہی تھا کہ جب مجھے پُراسرار سرگوشیاں سنائی دیں۔" نضار میرے سوال کے جواب میں بتانے لگا۔ "مجھے بھی تیرے پیچھے ہی پیچھے جنوب کی طرف جانے کا حکم ملا تھا۔ تریال تک میری رہنمائی عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ نے کی۔ وجہ یہ کہ میں پہلے کبھی اس طرف نہیں گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں ہدایت کے مطابق بستی تریال کے سپہ سالار آنف سے ملا کہ جو مجھے پہچانتا تھا۔ وہ تیرے ہی ساتھ تو تریال سے آیا تھا۔ اس نے جنوب میں واقع احرس کی بستی ازیر تک کے لئے تین راہبر میرے ساتھ کر دیئے۔ ازیر پہنچتے ہی گزشتہ شب میں نے پھر سرگوشیاں سنیں۔ میں نے دیوتاؤں کے حکم کی تعمیل میں آج ہی صبح اپنے راہبروں کو ازیر میں چھوڑا اور ساحروں کی بستی کے لئے روانہ ہو گیا۔ احرس کے باپ اجدر بابا نے میری بڑی مدارات کی۔ میں اس سے یہ کہہ کر چلا تھا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے لوٹ آؤں گا۔ سرگوشیوں کے ذریعے مجھے بتایا گیا تھا کہ تجھے اے معبلہ! ساحروں کی بستی میں قید کر لیا گیا ہے۔ کاہنہ خجیرہ نے اس بستی سارزوم تک کا راستہ مجھے دکھایا۔ راستے کو میں نے دھیان میں رکھا کہ واپس ازیر پہنچ سکوں۔ اجدر بابا سے میں نے تن تنہا اس علاقے کی سیر و سیاحت کا بہانہ کیا تھا کہ مجھے پردہ پوشی کا حکم تھا۔ پھر دیوتاؤں نے میری مدد کی اور انہوں نے تیری رہائی کا ذریعہ بتایا کہ دیوتا ایسا ہی کرتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ساحروں کی بستی کی حکمران ترفیہ نے تجھے اپنے سحر میں لے رکھا ہے اور تُو اس کے سحر سے نہیں نکل سکتی۔ شاید اسی لئے دیوتاؤں نے یہاں بھیجا تھا۔ اب تُو یہ بتا اے معبلہ کہ تیرا قصد کدھر کا ہے؟ میں تو یہاں سے واپس ازیر جاؤں گا اور پھر اپنی بستی کی طرف لوٹ جاؤں گا کہ مجھے یہی حکم ہے اور سن کہ اگر تجھے رازداری کی تاکید ہو تو میں اپنے سوال کے جواب میں اصرار نہیں کروں گا۔" یہ کہہ کر نضار خاموش ہو گیا۔

میرے ذہن میں جو تجسس تھا نضار کے بیان سے ختم ہو گیا۔ میں اس کے سوال کا جواب دینے کی اہل تھی' مگر پہلے ہی کی طرح مصلحت کے پیش نظر اسے حقیقت سے آگاہ نہیں کیا اور بولی۔ "اب مجھے کدھر جانا ہے' میری رہنمائی اس سلسلے میں دیوتا ہی کریں گے لیکن اس وقت جب میں تنہا رہ جاؤں گی۔"

میرا جواب سن کر نضار نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اے معبلہ! جب تُو میری بستی سے رخصت ہو رہی تھی تو مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی تجھ سے ملاقات ہو جائے گی۔ کیا خبر کہ پھر کبھی مجھے دیوتا

یہ موقع فراہم کر دیں۔" نصار کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی۔

اس پر میں نے دانستہ موضوعِ گفتگو بدل دیا اور بولی۔ "یاد کر اے نصار کہ اول کی بستی میں ایک بار میں نے دیوتاؤں کی مدد سے تیری جان بچائی تھی۔ تجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے ژیان نے اپنے جلاد کو بھیجا تھا۔ وہی کہ جس کا سر میں نے قلم کیا۔ تو اس وقت سے یہی کہتا آیا ہے کہ تیری زندگی میری ہی عطا ہے۔ اگر میں قبل از وقت تجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے کی نشاندہی نہ کر دیتی تو تیری زندگی نہ بچتی۔ سو آج اے نصار تُو نے وہ قرض اتار دیا۔ تُو نے بھی تو میری زندگی بچالی ہے۔ بول کیا ایسا ہی نہیں ہوا؟"

"لیکن اے معبلہ! اس میں میری کوشش کو تو کوئی دخل نہیں تھا۔" نصار نے پہلو تہی کی۔ "یہ تو دیوتاؤں کی مدد اور ان کے حکم پر ہوا۔"

"اور جیسا کہ میں ابھی کہہ چکی ہوں' پہلے بھی تیری جان بچانے میں دیوتاؤں ہی کی مرضی شامل تھی۔ اگر مجھے پُراسرار سرگوشیوں کے ذریعے ہدایت نہ ملتی تو میں تیرے اوپر قاتلانہ حملہ کرنے والے کی نشاندہی کیسے کر دیتی۔ سو کھلا یہ اے نصار کہ میں نے تجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔"

"یوں تو پھر میرا بھی تجھ پر کوئی احسان نہ ہوا۔" نصار برجستہ بولا۔ پھر کہنے لگا۔ "مجھے ازیر کی طرف لوٹنا ہے اور تیری منزل ابھی نامعلوم ہے۔ سو اے معبلہ! ہم پھر کبھی ملنے کے لئے بچھڑ جائیں۔" اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

پھر ہم دونوں ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے اپنا زادِ سفر اپنے اپنے گھوڑوں پر لادا اور پھر ایک دوسرے سے رخصت ہو کر مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد میں نے خجیرہ کی رہنمائی میں ہموار میدانوں کی طرف طویل ترین سفر کیا۔ وادی سبز میں جب پُراسرار تجربات کے ذریعے اجنبی سرزمین سے آشنا کرایا گیا اور میری آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھائے گئے تو مجھے ان پہاڑی بستیوں کے محل وقوع سے بھی آگاہ کیا گیا تھا۔ جن بستیوں میں میرا بچپن گزرا اور جہاں میں جوان ہوئی' وہ کوہستان ہمالیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ دنیا کے بلند ترین پہاڑ اسی خطے میں واقع تھے۔

اس طویل ترین سفر کی غیر ضروری تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے میں اپنی سمت سفر کے بارے میں یقیناً بتاؤں گی۔ تبت کا شہر لہاسہ میری پہلی منزل تھا۔ پھر میں وہاں سے اتر کر نیپال کے شہر کھٹمنڈو پہنچی۔ وہاں سے میں دارجلنگ کی طرف سفر کرتی ہوئی ہندوستان میں داخل ہوئی۔

اب میں پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں کی دنیا میں آ چکی تھی۔ میرا لباس' حلیہ اور وضع قطع سبھی کچھ اب بدل چکا تھا۔ ایسا سفر ہی کے دوران میں ہوا تھا۔ میری منزل ہندوستان کے ایک صوبے بنگال کا شہر کلکتہ تھا۔ بنگال کو جو سحر و افسوں کی سرزمین کہلاتا تھا' میں اب وہیں پہنچ چکی تھی۔

وادی سبز میں بند آنکھوں سے جو مناظر میں نے دیکھے تھے اب کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ جو بولیاں اور زبانیں سنی اور سمجھی تھیں۔ میں انہیں اب خود بول رہی تھیں سمجھ رہی تھی' جو سواریاں میرے لئے عجیب اور حیرت انگیز تھیں' میں انہی پر سوار تھی۔ جس دنیا کی اشیاء اور لوگ کبھی میرے لئے اجنبی تھے' وہ آشنا ہو گئے

تھے۔ یہ تمام مراحل پُراسرار تجربات کے ذریعے مجھے پہلے ہی طے کرا دیئے گئے تھے۔

بنگال کا وہ شہر جو کلکتہ کہلاتا ہے' دوران سفر میں مجھے اس کے ماضی و حال سے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا۔

شہر کلکتہ پہلے تین مختلف بستیوں پر مشتمل تھا۔ یہ تینوں بستیاں دریائے ہگلی کے کنارے آباد تھیں۔ ان بستیوں کے نام گوندپور' کالی کٹ اور کالی گھاٹ تھے۔ کالی کٹ ان میں بنیادی بستی تھی اور یہ بستی بقیہ دونوں بستیوں سے بڑی بھی تھی۔ گوندپور اس لئے کالی کٹ ہی میں ضم ہو گیا۔ یہ انضمام اس وقت عمل میں آیا کہ جب دونوں بستیاں بڑھتے بڑھتے ایک دوسرے سے مل گئیں۔ اسی کے بعد کالی کٹ "کیل کتا" بنا پھر کلکتہ کہلایا۔

میں جس زمانے میں کلکتے پہنچی' اوّل الذکر دونوں بستیوں کے اصل خدوخال ختم ہو چکے تھے' مگر کالی گھاٹ ایک الگ ہی بستی تھی۔ الگ ہونے کے باوجود اسے بھی کلکتے ہی کا ایک حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہ کلکتے کی ایک نواحی بستی کہلاتی تھی۔ دریائے ہگلی کے کنارے ایک گھاٹ تھا وہی کالی گھاٹ کہلاتا تھا۔ اس سے ملحقہ جو آبادی تھی وہ بھی اسی نام سے منسوب تھی۔ یہیں ایک قدیم مندر "کالی گھاٹ مندر" کہلاتا تھا۔ اس مندر میں "کالی مائی" کی پوجا ہوتی تھی اور ہر سال "مائی" کو نذر گزاری جاتی تھی۔ ہندوستان کے قدیم باشندے جو ہندو کہلاتے تھے' کالی مائی کو قہر و غضب کی دیوی سمجھتے تھے۔ "کالی کلکتے والی" سارے ملک ہندوستان میں مشہور تھی اور ہندو اس کی پوجا کرتے تھے۔ مندر میں دیوی کا بہت بڑا مجسمہ یا بت تھا جس کے سامنے نذر گزارنے کے لئے قربان گاہ بنی ہوئی تھی۔ یہاں بکرے کو کھڑا کر کے اس طرح اس کا سر قلم کیا جاتا تھا کہ خون کے چھینٹے دیوی کے بت پر پڑیں۔ دیوی کے ماننے والے کچھ انتہا پسند جانوروں کی بجائے یہاں انسانوں کی قربانیاں بھی دیتے رہے تھے۔ قربان کئے جانے والے انسانوں کا تعلق دوسرے عقائد اور مذاہب سے ہوتا تھا۔ یہ تقریباً ایسا ہی معاملہ تھا کہ پہاڑی بستیوں میں قربانی دینے کے لئے اور اپنے دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر دوسرے قبیلوں کے افراد کو منتخب کیا جاتا تھا۔ بچپن میں خود میرے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آ چکا تھا۔ بستی تریال والے مجھے ایک دیوتا کے مندر میں قربانی دینے ہی کے لئے تو پکڑ کر لے گئے تھے۔ مہذب دنیا کے لوگ بھی مجھے اپنے طور سے اتنے ہی غیر مہذب اور وحشی محسوس ہوئے جتنے پہاڑی بستیوں کے باشندے تھے۔ بنگال اور دنیا کے اس خطے کی فضا مجھے اسی سبب نامانوس ہو کر بھی کچھ مانوس سی لگی۔

ہندوستان پر وہ انگریزوں کی حکمرانی کا دور تھا کہ جب میں نے سرزمین بنگال پر قدم رکھا۔ ایک انگریز ہی نے بنگال کے شہر کلکتے کی بنیاد رکھی تھی کہ جس کا نام سرجاب چارلک تھا۔ اب میں ہموار میدانوں کی اس دنیا کے لوگوں کے ناموں سے مانوس ہوتی جا رہی تھی۔

اس ملک کی قدیم و جدید زبانوں کا علم مجھے پُراسرار تجربات ہی کے دوران میں حاصل ہو گیا تھا۔ مختلف علاقائی زبانیں بھی اسی میں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ مجھے حکمرانوں کی زبان بھی سکھائی گئی تھی۔ شاید اس زبان کے بغیر میں ہموار میدانوں کی اس دنیا میں اجنبی ہی رہتی۔ مختلف فرقوں' عقیدوں اور مذاہب پر یقین رکھنے والوں سے یہاں آ کر میرا سابقہ پڑا۔ ان کا ذکر میری آپ بیتی میں آگے آئے گا۔

یہاں کے باشندوں کی اکثریت ہندو مذہب کو ماننے والی تھی۔ اس کے بعد اسلام کے پیروکار مسلمان' عیسائی اور دوسرے مذاہب کے لوگ تھے۔ یہاں کی بود و باش ان بستیوں سے قطعی مختلف تھی کہ جہاں سے میں آئی تھی۔ یہی معاملہ لباس و معاشرت اور موسم کا تھا۔ ابتدا میں اس ماحول سے ہم آہنگی میرے لئے بڑا دشوار مرحلہ ثابت ہوئی تھی' مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ میں نے خود کو اس ماحول کا عادی بنا لیا۔ انسانی جسم اور انسان کی فطرت' وقت اور ماحول کے تغیر کو جلد ہی قبول کر لیتے ہیں۔ قبولیت کی یہ قوت و صلاحیت اس کے خمیر اور سرشت میں شامل ہے۔ آدمی خود کو وقت اور ماحول کے مطابق ڈھالنے پر قادر ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو شاید وہ جی ہی نہ سکے۔

کوہستان ہمالیہ کے دامن میں آباد اس ملک کے ایک خطے تک پہنچا کر عظیم ممین کی کاہنہ خجیرہ مجھ سے رخصت ہو گئی تھی۔ مجھے اس خطہ زمین تک کیوں پہنچایا گیا تھا' اس کا علم ابھی مجھے نہیں تھا۔ دیوتاؤں کی یہ مصلحت ابھی مجھ پر پوری طرح کھلی نہیں تھی۔ مجھے اگر کچھ خبر تھی تو صرف یہ کہ میں اپنی اصل کی طرف لوٹائی گئی ہوں۔ میری اصل کیا تھی؟ میں کون تھی؟ پہاڑی بستیوں میں پلنے بڑھنے کے باوجود وہاں کے رسوم و روایات اور قوانین سے میں کیوں باغی تھی؟ اس سلسلے میں مجھے صرف یہی معلوم تھا کہ ابھی مجھ پر میرے بہت سے بھید کھلنا باقی ہیں۔ مجھے پُراسرار سرگوشیوں کے ذریعے یہی بتایا گیا تھا۔ اس سے قطع نظر جس معاملے کو میرے نزدیک اولیت حاصل تھی وہ اپنے دشمن ژیان کی تلاش تھی۔ وادی سبز سے فرار ہو کر وہ ہموار میدانوں ہی کی طرف آیا تھا۔ ادھر آتے ہوئے اس نے ساحروں کی بستی سارزوم میں بھی کچھ عرصے قیام کیا تھا اور کچھ شیطانی قوتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ اس کی تصدیق ساحروں کی ساحرہ ترفیہ سے بھی ہو گئی تھی۔ ہموار میدانوں کی دنیا کے باشندوں سے ژیان کا کیا تعلق تھا؟ یہ بھی ابھی راز ہی تھا۔ یہاں کے لوگ طویل ترین سفر کر کے وادی سبز تک کیوں پہنچے تھے' مجھے اس کا علم بھی نہیں تھا۔ میں بہت کچھ جان لینے کے بعد بھی ابھی تک انجان تھی۔

وادی سبز میں جو سونا اپنے ساتھ لے کر چلی تھی' وہ ہموار میدانوں میں آ کر بہت کام آیا۔ اس سے مجھے ایک نئی زندگی اپنانے میں بڑی مدد ملی۔

سرزمین بنگال کے اس بڑے شہر کلکتے پہنچ کر میں نے ابتدائی چند روز ایک مسافر خانے میں گزارے۔ یہ مسافر خانہ ایک مسلمان سیٹھ موسیٰ کے نام سے منسوب تھا۔ لوئر چیت پور روڈ پر واقع اس مسافرخانے تک پہنچانے کے بعد خجیرہ کی خوشبو غائب ہو گئی تھی۔ پھر مجھے پُراسرار سرگوشیوں کے ذریعے مزید ہدایات ملی تھیں۔ میں نے انہی ہدایات کی روشنی میں اپنی مستقل سکونت کا بندوبست کیا۔ اس سے میں نے یہی قیاس کیا کہ مجھے طویل عرصے وہاں رہنا ہو گا۔

انشا ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران ڈائجسٹ

☆=====☆

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

خیر و شر کا ازلی تصادم، ہنگامے جگاتی پراسرار داستان
دیدبان
3
شمیم نوید

وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی۔ پُراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں۔ اس کی آنکھوں میں موت کی کڑکتی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر تھی نہ موت کی۔ وہ سانپ سے زیادہ زہریلی تھی۔ وہ اپنے دشمن کی کٹی ہوئی گردن دیکھنا چاہتی تھی۔
پُراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں۔

پُراسرار قوتوں کی مالک ایک دوشیزہ کی ہنگاموں سے بھرپور داستانِ عجیب

میں صبح ہوتے ہی مسافر خانے سے نکل جاتی اور پھر نئی سواریوں میں بیٹھ کر سارے شہر کا گشت لگاتی پھرتی۔ مجھے یہ سب کچھ نیا ہونے کے باوجود بہت اچھا لگتا۔ جلد ہی میں نے اپنی مستقل سکونت کے لئے اس شہر کے ایک علاقے کو منتخب کر لیا۔ بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوا شہر کا یہ مرکزی علاقہ دھرم تلہ تھا۔ مختلف مذاہب اور قومیتوں کے لوگ اس بڑے علاقے کے مختلف حصوں میں آباد تھے۔ یہ حصے اپنے الگ الگ ناموں سے بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔ ان آبادیوں کے علاوہ اہم سرکاری عمارتیں' یادگاریں' بڑے بڑے سبزہ زار اور باغ' بازار' تفریح گاہیں' سبھی کچھ یہاں تھا۔ میں کیوں کہ بچپن سے اب تک بڑی بڑی حویلیوں میں رہتی آئی تھی اسی لئے کسی ایسی ہی جگہ کی متلاشی تھی۔ پہاڑی بستیوں جیسی حویلیاں تو یہاں نہیں تھیں۔ مگر ان سے مماثل بڑے بڑے مکانات اسی علاقے کے ایک حصے میں نظر آئے۔ یہاں اس طرح کے مکانوں کو کوٹھیاں کہا جاتا تھا۔ یہ حویلیاں یا کوٹھیاں قدیم بنگلہ طرزِ تعمیر کا نمونہ تھیں۔ ان کوٹھیوں کی چھتیں اونچی تھیں۔ انہیں مقامی بولی میں "کھولا باڑیاں" کہا جاتا تھا۔ ان کی چھتیں کھپریل سے ملتی جلتی تھیں۔ کھپریل جیسے گول اور اندر سے کھوکھلے ٹکڑوں کو جوڑ کر ان کوٹھیوں کی چھتیں بنائی گئی تھیں۔ قدم طرز کی ان کوٹھیوں میں شہر کے دولت مند لوگ رہتے تھے۔ دھرم تلے کا یہ حصہ یا آبادی مجھے بہت پُرسکون لگی۔ آہنی دروازوں والی یہ کوٹھیاں اندر سے بہت کشادہ تھیں۔ اجلاس والے کمرے سے ملتا جلتا ایک بڑا کمرہ بھی ان کوٹھیوں کا لازمہ تھا۔ نشست گاہ اور خواب گاہ کے علاوہ ان بڑی کوٹھیوں میں دیگر کمرے بھی تھے۔ ان تمام تفصیلات کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ جب کوٹھیوں کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں بھی دیوتاؤں ہی نے میری مدد کی ورنہ تو میں اس شہر میں بالکل اجنبی تھی۔

مجھے مسافر خانے میں ٹھہرے ہوئے دو روز گزر چکے تھے کہ میرے برابر والے کمرے میں ایک نوجوان آ کر ٹھہرا۔ وہ مجھے آتے جاتے دیکھا کرتا۔ اپنے چہرے' لباس اور وضع قطع سے وہ مجھے شریف

مہذب اور تعلیم یافتہ ہی معلوم ہوا۔

میں یہ محسوس کر چکی تھی کہ اس نوجوان کی نظروں میں میرے لئے پسندیدگی ہے۔ اس اجنبی شہر میں وہ پہلا نوجوان تھا کہ جسے میں نے خود سے قریب آنے کا موقع دیا۔ میں حسب معمول ایک شام شہر کا گشت کر کے لوٹی تو اسے برابر والے کمرے سے نکلتے دیکھا۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ جیسے ہی پلٹا مجھ پر اس کی نظر پڑی اور آگے بڑھتے بڑھتے معاً ٹھٹک کر رک گیا۔ یہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی کیوں کہ پہلے ہی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ وہ مجھے اپنے روپ رنگ سے بنگالی نہیں لگتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ہندوستان کے کسی شمالی حصے سے وہاں آیا تھا۔

اس کے قریب پہنچ کر میں نے پہلی بار اسے مخاطب کیا۔ "تم چاہو تو کچھ دیر کو میرے کمرے میں آ سکتے ہو تاکہ تعارف ہو جائے۔" میں نے اسے اردو زبان ہی میں مخاطب کیا تھا۔ "اگر تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو تب! تم اکثر مجھے کچھ پریشان پریشان سے بھی لگتے ہو اور میں اس پریشانی کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے کہ میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔ مجھے اس سے خوشی ہو گی۔"

میری بات سن کر اس کا چہرہ کھل اٹھا اور پھر وہ جیسے کھنچا ہوا سا میرے ساتھ چلا آیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے اپنا نام شہزاد بتایا۔ اس کا تعلق شمالی ہندوستان کے ایک بڑے شہر دہلی سے تھا۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ کلکتہ میں اس کے کچھ عزیز و اقارب بھی تھے' مگر وہ ان کے یہاں نہیں رہا تھا۔ اس کے چند دوست احباب کی سکونت بھی یہیں تھی۔ جن کے ایما پر وہ تلاش روزگار میں ملک کے اس سب سے بڑے شہر میں آیا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ خوددار نوجوان تھا' دوسرے اس بڑے شہر میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے لئے جگہ کی کمی کا مسئلہ بھی تھا۔ شہزاد نے اسی لئے فی الوقت مسافرخانے میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کے گھر والے دہلی میں آباد تھے۔ دہلی کے مسلمانوں پر وہ دور ادبار کا تھا۔ اب وہ دوسرے شہروں کا رخ بھی کرنے لگے تھے۔ پہلے بھی شہزاد کئی بار کلکتے آ چکا تھا۔ مختلف سوالات کے جواب میں شہزاد سے مجھے ان تمام باتوں کا علم ہوا۔ وہ نوجوان کئی وجوہ کی بنا پر مجھے کام کا معلوم ہوا۔ اب تک میں نے اسے اپنے متعلق نام کے سوا کچھ نہیں بتایا تھا۔ میرا اصل نام معبلہ سن کر اس نے خلاف توقع زیادہ حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میرا نام نامانوس ہونے کے باوجود اس خطے کے رہنے والوں کے لئے قابل قبول ہی تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اب تک ہو چکا تھا۔ وجہ بھی میرے علم میں تھی۔ یہ لفظ عربی زبان کا تھا اور اس سے ملتے جلتے نام موجود تھے۔

"تم اگر چاہو تو برسرروزگار ہونے میں تمہاری مدد کرنا میرے لئے ممکن ہے۔" میں نے اس کی پوری روداد سننے کے بعد کہا۔

"آپ .... آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتی ہیں؟" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "آپ تو خود مجھے اس شہر میں اجنبی لگتی ہیں۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے تصدیق کر دی۔ "میرا تعلق ایک معزز اور اعلیٰ خاندان سے ہے۔ میرے کچھ لوگ مجھ سے بچھڑ گئے ہیں۔ جن کی مجھے تلاش ہے۔ امکان یہ ہے کہ وہ اسی شہر یا اسی

خطہ بنگال میں ہیں۔ میں انہی کی تلاش میں یہاں آئی ہوں۔ اسی کی خاطر مجھے اس شہر میں مستقل سکونت اختیار کرنا ہے۔ چند روز کے اندر اس شہر میں اپنی سکونت کے لئے میں ایک علاقہ منتخب کر چکی ہوں۔ تم مناسب خیال کرو تو میرے معاملات کی نگرانی اور ضروری امور کی انجام دہی کے لئے میری ملازمت میں آ سکتے ہو۔ تمہارے دوست احباب بھی اس شہر میں ہیں اور عزیز و اقارب بھی۔ تمہارے علاوہ بھی مجھے دیگر ملازمین کی ضرورت ہو گی۔ تمہاری ذمے داریوں میں سے ایک ذمے داری یہ بھی ہو سکتی ہے۔ فی الحال میرے لئے پہلا مسئلہ سکونت کا ہے۔"

"آپ نے کس علاقے کو اپنی سکونت کے لئے منتخب کیا ہے؟" وہ مرعوب کن لہجے میں بولا۔

"وہ بھی بتا دوں گی۔ مگر مجھے پہلے اپنے اس سوال کا جواب چاہئے کہ کیا تم میری ملازمت میں آنا پسند کرو گے؟" میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میں تو آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس شہر میں میری آمد کا مقصد ہی یہی ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ پھر کہنے لگا۔ "جو کام آپ مجھ سے لینا چاہتی ہیں' وہ میں کسی معاوضے کے بغیر بھی انجام دے کر خوشی محسوس کروں گا۔"

ضرورت مند ہونے کے باوجود یہ الفاظ اس کی شرافت کا ثبوت تھے۔ اس پر میں نے اسے سمجھایا۔

"دیکھو' ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہو رہا کہ میں نے تمہیں ملازمت کی جو پیشکش کی ہے اس میں تمہارے مسائل کا حل بھی پوشیدہ ہے اور میری ضروریات کی بھی ان سے تکمیل ممکن ہے۔ مثلاً اس وقت ہم دونوں ہی اس مسافرخانے میں قیام پذیر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملازمت ملنے ہی کے بعد تم اپنی سکونت کا کوئی بندوبست کرتے ہو۔ موجودہ صورت حال میں تمہیں ملازمت بھی مل جائے گی اور جہاں میں رہوں گی وہیں تم بھی رہ سکتے ہو۔ مجھے اپنے لئے کوئی معاون چاہئے جو نیک' شریف اور تعلیم یافتہ ہو۔ جس پر میں اعتماد کر سکوں۔ میرے نزدیک تم اس معیار پر پورے اترے ہو۔ آئندہ میرے ان اندازوں کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔"

کچھ دیر وہ خاموش رہا۔ اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ سوچ میں گم ہے اور شاید کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"ٹھیک ہے' مجھے آپ کی پیشکش منظور ہے۔ میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے اپنا فیصلہ آخر سنا ہی دیا۔

"تنخواہ کے علاوہ تمہارے قیام و طعام کی ذمے داری بھی مجھ پر ہو گی۔ اس سلسلے میں تمہاری تنخواہ سے کوئی رقم نہیں کاٹی جائے گی۔" میں نے اسے مزید بتایا۔ مجھے اس پر خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ میرا سمجھانا بجھانا رائیگاں نہیں گیا تھا۔

پھر جب میں نے کچھ توقف کے بعد اسے یہ بتایا کہ اپنی سکونت کے لئے کس علاقے کا میں نے انتخاب کیا ہے تو وہ چونک اٹھا اور بولا۔ "وہ تو بہت مہنگا علاقہ ہے۔ وہاں کوئی کوٹھی خریدنا.........." وہ تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ اسی لئے اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ "وہاں تو اس شہر کے امیر لوگوں کی کوٹھیاں

ہیں .... میرا مطلب یہ ہے کہ............"

"تم اس سلسلے میں رقم یا اخراجات کی پرواہ نہ کرو' یہ میری ذمے داری ہے۔" میں بول اٹھی۔

وہ حیران حیران سا میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ کا جو حکم ہے' میں کل ہی سے اس کی تعمیل کی کوشش میں لگ جاؤں گا۔"

پھر آئندہ کچھ دن میں تمام معاملات میری توقع کے مطابق طے ہو گئے۔ دھرم تلے کے اس علاقے میں ایک کوٹھی خرید لی گئی۔ کوٹھی کی مناسبت سے ضروری ساز و سامان بھی میرے ہی ایما پر شہزاد نے وہاں خرید کر پہنچایا۔ دیگر ملازمین کا انتخاب بھی شہزاد ہی نے کیا۔ ان میں ایک نیپالی چوکیدار یا محافظ' ایک باورچی جو مسلمان ہی تھا' ایک ہندو بنگالی ملازمہ کوٹھی کی صفائی اور نگہداشت کے لئے ایک دیسی عیسائی ولیم تھا۔ ولیم کی ذمے داری کوٹھی کے لئے ضروری اشیاء اور سودا سلف کی فراہمی تھی۔ یوں شہزاد سمیت کل پانچ ملازمین کے مصارف مجھے برداشت کرنا تھے۔ کوٹھی ہی کا ایک حصہ ان ملازمین کی خاطر میں نے مخصوص کر دیا تھا۔ شہزاد ان کا نگران اور گویا میرا دست راست تھا۔ وہ میری توقعات پر پورا اترا تھا۔ میں اب مسافرخانے سے اس کوٹھی میں منتقل ہو چکی تھی۔ اب مجھے اس شہر میں قدم جمانے کی جگہ مل گئی تھی۔

میرے ملازمین مجھے اپنے طور پر کسی ریاست [illegible] تصور کرتے تھے کہ جس کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ [illegible] ں سمجھا' مگر اس سلسلے میں کسی نے مجھ سے براہ راست کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کی۔ [illegible] تھی میں نے بھی اپنے رویے سے انہیں یہی تاثر دیا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں اور اس میں مجھے کامیابی ہوئی۔

عموماً جب میں کوٹھی سے نکلتی تو اکیلی ہی ہوتی۔ شہزاد کو کبھی کبھار ہی میں اپنے ساتھ لیتی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں وہ شہر اور اس کے باشندے میرے لئے اجنبی نہیں رہے۔ پاس پڑوس کی کوٹھیوں میں رہنے بسنے والوں سے بھی میری دید شنید کسی حد تک ہو گئی تھی۔ میں نے دانستہ ابھی تک کسی سے زیادہ رسم و راہ بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں اپنے متعلق لوگوں کو تجسس میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ہموار میدانوں کی اس دنیا میں آنے کے بعد بظاہر اب تک حالات پُرسکون ہی رہے تھے۔ کافی دن سے مجھے پُراسرار سرگوشیاں بھی سنائی نہیں دی تھیں۔ نہ کوئی ہدایت ملی تھی اور نہ کوئی خلاف توقع یا غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ صورت حال میرے لئے اطمینان بخش نہیں تھی۔ مگر شاید اس میں بھی دیوتاؤں کی کوئی مصلحت ہی پوشیدہ تھی۔ غالباً اسی کے سبب مجھے نئے ماحول کو سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کا موقع مل گیا۔ اس کے باوجود جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ ایسا پہلے بھی ایک بار ہو چکا تھا کہ جب وقتی طور پر دیوتاؤں کی طرف سے میرا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی کہ جب وادی سبز کو فتح کیا جا چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مضطرب ہونے کے باوجود میں دیوتاؤں کی طرف سے مایوس نہیں تھی۔ یہ خاموشی میرے نزدیک کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ کسی نئی آزمائش' کسی نئے امتحان' کسی نئے معرکے کی توقع کو میں نے اسی سبب نظرانداز نہیں کیا۔ پھر ایسا ہی چند روز کے بعد ہوا بھی' اس شہر میں یہ واقعہ میرے لئے غیر معمولی ہی تھا۔

☆======☆======☆

اس جٹا دھاری سادھو کی طرف مجھے شہزاد ہی نے متوجہ کیا تھا جو خاصی دیر سے ہمارے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ یہ اس شام کی بات ہے کہ جب میں شہزاد کے ساتھ وکٹوریہ میموریل کے سامنے وسیع سبزہ زار میں ایک جگہ بیٹھی تھی۔ "وکٹوریہ میموریل" کی حیثیت بھی ایک یادگار کی تھی۔ سنگ مرمر سے بنی ہوئی یہ انتہائی خوبصورت عمارت تھی۔ دھرم تلے کے وسیع و عریض علاقے میں چورنگی روڈ پر خاصا آگے جا کر دائیں جانب یہ عمارت واقع تھی۔ اس کے سامنے وسیع و عریض سبزہ زار تھے۔ جگہ جگہ انگریز سپہ سالاروں اور دیگر اہم شخصیتوں کے مجسمے نصب تھے۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں یہ میدان' رانی راش متی کی چراگاہ کہلاتا تھا۔ جہاں بعد میں وکٹوریہ میموریل کی تعمیر ہوئی۔ انگریز حکمرانوں کی ایک ملکہ کا نام وکٹوریہ تھا۔ اسی وسیع میدان میں ایک جگہ لوہے کا بلند مینار بھی تھا جو دور ہی سے نظر آ جاتا تھا۔ یہ مینار ایک انگریز لارڈ کلائیو کی یادگار تھا۔ دھرم تلے کے اس حصے کی حیثیت شہر والوں کے لئے ایک تفریح گاہ کی تھی۔ دن بھر کی تھکن سمیٹ کر شام کے وقت لوگ یہاں آ جاتے اور ایک میلہ سا لگ جاتا۔ کہیں ڈاب (کچا ناریل) لئے کوئی آوازیں لگاتا پھرتا۔ کچے ناریل کا پانی ذائقے دار بھی ہوتا اور اس سے ہاضمہ بھی درست رہتا۔ ڈاب بیچنے والوں کے علاوہ "مڑی" والے بھی جگہ جگہ دکھائی دیتے۔ چاول کے مرمروں میں بنگالی' کچا کڑوا تیل ملا کر نمک اور ہری مرچوں کے ساتھ بیچتے تھے اور اسے مڑی کہتے تھے۔ اوسط اور نچلے درجے کے لوگ "مڑی" بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ انناس کے خوانچے اور ٹھیلے بھی یہاں نظر آتے۔ یہ خوانچے والے انناس کاٹ کر اور اس پر مسالہ چھڑک کے گاہکوں کو دیتے۔ "یہ میلہ" مجھے بڑا بھلا لگتا تھا۔ کبھی میں تنہا اور کبھی شہزاد کے ساتھ ادھر نکل آتی۔ یہاں ہر قومیت و مذہب' رنگ و نسل اور دیسی بدیسی لوگ دکھائی دیتے۔ عورتیں بھی ہوتیں اور مرد بھی۔ تارک الدنیا سادھو سنت' فقیر اور بھکاری بھی اِدھر اُدھر چکراتے پھرتے۔ یہی وجہ تھی کہ گیروے کپڑوں میں ملبوس بڑے بڑے بالوں والے اس سادھو کو میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ شہزاد نے جس کی نشاندہی کی تھی۔

سادھو کے بائیں بازو سے ایک جھولی لٹکی ہوئی تھی اور ہاتھ میں لمبا سا چمٹا تھا۔ شہزاد کی نشاندہی پر میں نے اس کا جائزہ لیا۔ سادھو نے مجھے اپنی طرف متوجہ پایا تو "جے دیوی مائی" کا نعرہ لگایا اور چمٹا بجاتا ہوا بھیڑ میں گم ہو گیا۔ لفظ دیوی پر میں چونکی ضرور مگر شہزاد کو اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ میرے چونک اٹھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے کسی دیوی کا نام نہیں لیا تھا۔

"تمہیں اس بات کا احساس کیسے ہوا کہ وہ ہمارے ہی اردگرد چکر لگا رہا ہے؟" میں نے شہزاد سے پوچھا۔

"مجھے کئی بار یہ محسوس ہوا کہ اس نے قریب آ کر جیسے بغور آپ کے چہرے کو دیکھا ہو۔" شہزاد نے بتایا۔ "اس کے بعد وہ مجھے کچھ مشتبہ سا لگا اور میں نے اس پر نظر رکھی۔ ہم اس وقت جہاں بیٹھے ہیں اس کے آس پاس مجھے وہ سادھو پھر کئی مرتبہ دکھائی دیا۔ آپ اپنے خیالوں میں شاید کھوئی ہوئی تھیں۔ اسی لئے غالباً سادھو کی حرکتوں کی نہیں دیکھ سکیں۔ ابھی ذرا دیر پہلے جب وہ قریب آ کر دوبارہ آپ کو گھورنے

لگا تو میں نے یہ ضروری سمجھا کہ بتا ہی دوں۔"

"اتفاق ہوگا۔" میں یہ کہہ کر اس وقت بات کو ٹال گئی۔

"ان میں سے کچھ شیطانی علوم کے ماہر ہوتے ہیں' کچھ نشے کے عادی اور کچھ فریبی ہوتے ہیں۔ جو سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بنا کر لوٹ لیتے ہیں۔" شہزاد مجھے اپنی دانست میں ان سادھوؤں کے متعلق بتانے لگا۔

"مگر ان میں سے کچھ ایسے بھی تو ہوں گے جو واقعی عقائد کے مطابق راہ راست پر چلتے ہوں۔" میں نے دانستہ یہ بات کہی تا کہ شہزاد زیادہ فکرمند نہ ہو۔

"ممکن ہے' ایسے بھی ہوں۔" جواب میں وہ بولا۔ "میں نے تو ان کے بارے میں جو سنا ہے' وہ آپ کو بتا رہا ہوں۔ تا کہ ہوشیار اور چوکنا رہیں۔ یہ سادھو لوگوں کو اکثر ان کے مستقبل کا حال بتا کر بھی اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ لوگوں کے لباس سے یہ ان کی حیثیت کا اندازہ لگاتے ہیں کہ کون غریب ہے' کون دولت مند ہے' پھر یہ حیلوں بہانوں سے دولت مندوں پر اپنے ہتھکنڈے آزمانے لگتے ہیں۔ ان کا طریقہ واردات اسی طرح کا ہوتا ہے جیسا وہ سادھو عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ اس طرح یہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔"

"لیکن جب میں اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ چلا گیا۔" میں مسکرا کر بولی۔

"کیا خبر وہ پھر لوٹ کر آئے۔ یہ سب ان لوگوں کی چال بازیاں ہوتی ہیں۔ ظاہر یہی کرتے ہیں کہ یہ بڑے بے نیاز ہیں۔ انہوں نے دنیا کو تیاگ "چھوڑ" دیا ہے اور انہیں مال و متاع کا کچھ لالچ نہیں' مگر حقیقت عموماً برعکس نکلتی ہے۔" شہزاد اپنی بات پر قائم رہا۔ اپنے خیال میں وہ مجھے اس سادھو کے کسی ممکنہ فریب سے بچانے کے لئے یہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ سادھو کی نشاندہی کے بعد سے میرے اندر جو اضطراب سا پیدا ہوا تھا وہ کسی اور ہی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ شاید کوئی خطرہ دبے پاؤں میری طرف بڑھنے والا تھا جس سے میں ابھی لاعلم تھی۔

"خاک ڈالو اس سادھو پر۔" میں نے اپنے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے شہزاد سے کہا۔ "چلو اب واپس چلتے ہیں۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

شہزاد بھی میرے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اور وہ چہل قدمی کرتے ہوئے چورنگی روڈ تک آ گئے۔

شہزاد مجھ سے بولا۔ "آپ کہیں تو کوٹھی تک کے لئے ہاتھ رکشا کر لوں؟"

"نہیں۔" میں نے سڑک کے کنارے ہاتھ رکشا والوں کی طرف دیکھتے ہوئے انکار کر دیا۔ "ٹرام میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اگلے سٹاپ ہی تک تو جانا ہے۔"

"بہتر ہے۔" شہزاد نے جواب میں کہا اور پھر ٹرام کے سٹاپ کی طرف قدم بڑھا دیئے جو قریب ہی تھا۔

دھرم تلے کے ٹرام ڈپو سے بالی گنج کے لئے ٹرامیں اسی طرف جاتی آتی تھیں۔ سٹاپ پر پہنچ کر میں اور شہزاد بالی گنج سے دھرم تلہ ٹرام ڈپو تک جانے والی کسی ٹرام کا انتظام کرنے لگے۔ اگلے سٹاپ پر اترنے

کے بعد چورنگی روڈ عبور کر کے ہمیں کچھ دور پیدل چلنا پڑتا اور پھر ہم اپنی کوٹھی پہنچ جاتے۔ ہاتھ رکشا میں بیٹھ کر بس اتنا ہوتا کہ ہم پیدل چلنے سے بچ جاتے۔ رکشا ہمیں ہماری کوٹھی کے پھاٹک پر اتار دیتا۔ کچھ دیر میں ٹرام آ گئی اور ہم دونوں اس کے اگلے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ پھر اگلے سٹاپ پر اتر کر کوٹھی کی طرف بڑھ گئے۔

ہاتھ رکشا میں بیٹھتے ہوئے مجھے ایک عجیب سا احساس جرم ہوتا تھا کیوں کہ کسی جانور کی جگہ اس میں آدمی جتا ہوتا تھا۔ اس میں دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی تھی' مگر غریب رکشا والا زیادہ پیسے ملنے کے لالچ میں تین افراد کو بھی بٹھا لیتا تھا۔ ایسا عموماً اس وقت ہوتا کہ جب سفر گلیوں میں ہو اور چالان کا خطرہ کم ہو۔ قانوناً ہاتھ رکشا میں صرف دو افراد کو بٹھانے کی اجازت تھی لیکن غربت قانون کب دیکھتی ہے' اس ہاتھ رکشا کو آدمی کھینچتا۔ رکشا والے کے ایک ہاتھ میں گھنگرو جیسی گھنٹی ہوتی جسے وہ بھاگتے ہوئے بجاتا چلتا۔ اس پر سوار ہوتے اور اترتے وقت اونٹ کی سی سواری کا لطف آتا۔ بیٹھتے وقت مسافر نیچے کی طرف خود کو لڑھکتا محسوس کرتا اور پھر جب رکشا والا دونوں ہتھے اٹھاتا تو بیٹھنے والا ایک دم پیچھے ہو جاتا۔ جب رکشا چلتا تو بھی جھولا جھولنے کا سا مزہ آتا۔ اس مزے یا لطف سے قطع نظر میرا احساس اس سواری میں بیٹھنے کو قبول نہیں کر سکا۔ میں اس لئے عموماً ہاتھ رکشا میں بیٹھنے سے گریز کرتی تھی۔

ہاتھ رکشا کے علاوہ دوسری اور سواریاں بھی تھیں۔ سفر کے لئے انہیں ترجیح دیتی۔ گھوڑا گاڑی' ٹیکسیاں اور بسیں بھی سفر کے لئے موجود تھیں۔ پھر الیکٹرک ٹرام بھی تھی۔ بجلی سے چلنے والی ان ٹراموں کا جال سارے شہر میں بچھا ہوا تھا۔ شہر کی مختلف بستیوں میں ٹرام ڈپو تھے۔ اس میں پہلے اور دوسرے درجے کے دو ڈبے ہوتے تھے۔ اس ٹراموے کمپنی کی بنیاد شہر کی وسعت کو دیکھ کر انگریز حکمرانوں ہی نے رکھی تھی۔ ایک برطانوی فرم اس کی مالک تھی۔ ٹرام لائن کے ساتھ ساتھ مخصوص قسم کی سیاہ اینٹ بچھائی گئی تھی جو بہت مضبوط تھی۔ یہ اینٹ ٹرام لائن کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیتی تھی۔ سڑک پر جہاں ٹرام لائن ڈالی گئی تھی وہ آمدورفت کی دونوں سڑکوں کے درمیان حد فاصل کا کام دیتی تھی۔ کہیں کہیں ٹرام لائن کے ساتھ چھوٹے پودے اور گھاس بھی لگا دی گئی تھی۔ جہاں ٹرام کا سٹاپ قریب ہوتا' وہاں لائن بائیں جانب کی فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ ہو جاتی تا کہ مسافر چڑھ اور اتر سکیں۔ شہر میں نقل و حمل کا یہ سب سے بڑا ذریعہ تھا اور انتہائی سستا بھی۔ دھرم تلے میں مرکزی ٹرام ڈپو بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سے شہر کے تقریباً ہر علاقے کے لئے ٹرام مل سکتی تھی۔ اسی طرح کسی بھی جگہ یا آبادی سے دھرم تلے کے لئے ٹرام مل جاتی تھی۔ بسوں کی طرح ٹراموں کے بھی نمبر تھے۔ اس کے ساتھ انگریزی حروف میں اس آبادی یا مقام کی پلیٹ بھی لگی ہوتی جو اس ٹرام کا آخری سٹاپ ہوتا۔ پہلے درجے میں ٹیوب لائٹس اور بجلی کے پنکھے بھی لگے ہوتے' نشستیں بھی آرام دہ ہوتیں۔

وادی سبز میں جب میں پہلی بار پُراسرار تجربات سے گزری اور بند آنکھوں سے لوہے کو مختلف شکلوں میں سڑکوں پر دوڑتے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی تو یہی لوہے کی وہ مختلف شکلیں تھیں' ٹرامیں' بسیں' ریلیں' کاریں وغیرہ۔ ان سواریوں کے علاوہ اور دوسری سواریاں بھی مجھے نظر آئی تھیں کہ جو

پرندوں کی طرح آسمان پر اڑتی تھیں۔ میں جس شہر میں تھی اسے بستیوں کی بستی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ گھوڑے کی حیثیت یہاں وہ نہیں تھی جو پہاڑوں پر تھی اور نہ یہاں اس کی اتنی اہمیت و ضرورت تھی۔ لوہے اور لکڑی سے بنی ہوئی سواریوں نے اس کی جگہ لے لی تھی۔

تمام تر جدت کے باوجود ان بستیوں میں قدامت کا رنگ بھی جھلکتا تھا۔ خاص طور پر طریق عبادت میں۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا کرنے والے یہاں بھی تھے۔ ہندو مذہب کے ماننے والے اور انہی سے ملتے جلتے دوسرے مذاہب کے لوگ ایسی ہی سرگرمیوں میں مصروف نظر آتے تھے۔ پجاری اور مہا پجاری یہاں بھی تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کے مختلف درجے اور نام تھے۔ سادھو' سنت' رشی منی' گیانی دھیانی' تیاگی وغیرہ۔ پہاڑی بستیوں میں بھی مجھے دیوی دیوتاؤں کی حد سے بڑھی ہوئی پرستش گراں گزرتی تھی۔ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ دیوی دیوتاؤں کی آڑ میں کچھ شیطان صفت افراد انسانوں کو اپنا غلام بنا لیتے تھے' دیوتاؤں کا حکم اور مرضیٔ منشا کے نام پر اپنے مخصوص مفادات کی تکمیل کرتے تھے۔ اور تو اور خود مجھے دیوی کا درجہ دے دیا گیا تھا جسے میری روح نے کبھی قبول نہیں کیا۔ میں نے جب ان پہاڑی بستیوں میں پروان چڑھنے کے بعد وہاں کی روایات و قوانین سے بغاوت کی تو ہموار میدانوں میں آکر کس طرح انہی سے مماثل قدروں اور روایتوں کو تسلیم کرلیتی۔ پہاڑوں سے اتر آنے کے بعد خیر و شر کا مفہوم مجھ پر کچھ اور واضح ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ میرا دوسرا احساس یہاں آکر یہ تھا کہ جیسے میں پہلے کسی کنویں کی تہہ میں تھی اور کنویں کے باہر جو وسیع و عریض دنیا تھی مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ میرے نزدیک دیوتاؤں کو کسی نذر یا قربانی کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب انسانوں کے اپنے توہمات تھے۔ ان کا دیوتاؤں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے اس انداز فکر کا سبب وہ علم بھی تھا جو پُراسرار تجربات کے دوران میں مجھے حاصل ہوا تھا۔ نیکی اور بدی کی جنگ یہاں بھی جاری تھی۔ جیسا کہ مجھے سرگوشیوں میں بتایا گیا تھا۔ وہ سادھو جسے میں نے ایک نظر وکٹوریہ میموریل کے سبزہ زار پر دیکھا وہ مجھے بدی کی علامت ہی لگا تھا۔ اس شام اپنی کوٹھی پہنچ کر میں دیر تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔

دوسرے دن صبح اسی ضمن میں ایک اور غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ میں ناشتہ کر رہی تھی کہ "جے دیوی مائی" کا نعرہ سن کر چونک اٹھی۔ یہ اسی مشتبہ منحوس سادھو کی آواز لگتی تھی جو گزشتہ روز شام کو وکٹوریہ میموریل کے سبزہ زار پر نظر آیا۔ میں اچھل کر کھڑی ہو گئی اور بیرونی دروازے کی طرف لپکی۔ میرے ذہن میں بیک وقت کئی سوال ابھرے تھے۔ اسی کے ساتھ مجھے اس سادھو پر شدید غصہ بھی آیا تھا۔ شہزاد بھی میرے پیچھے پیچھے دوڑا تھا۔

میں باہر پہنچی تو کوٹھی کا آہنی پھاٹک مجھے کھلا ہوا نظر آیا۔ نیپالی گورکھا چوکیدار نریندرا' تیز آواز میں غالباً اس سادھو سے الجھا ہوا تھا۔ "تم نے پھاٹک پر ہاتھ کیوں مارا؟"

آگے بڑھ کر جب تک میں پھاٹک سے نکلی سادھو جواب بولا۔ "ہم تو دیوی کے درشن "دیدار" کی بھکشا "بھیک" لینے آئے تھے بچہ! تُو کون ہے ہمیں روکنے والا؟" پھر جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس نے پھر "جے دیوی مائی" کا نعرہ مارا۔ یہ وہی سادھو تھا جس کی نشاندہی شہزاد نے کی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی

سرخ آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے جسم پر لباس بھی وہی کل والا تھا۔

"کون دیوی؟" میں نے اسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "کیوں آیا ہے تُو یہاں؟"

"بھید کو بھید ہی رہنے دے دیوی تو اچھا ہے' ہمرا کیا ہے' درشن کر لئے سو چلے جاتے ہیں۔ بھکشا مل گئی' سورکھشا "حفاظت" کی چنتا "فکر" نہیں۔" سادھو نے یہ کہہ کر چمٹا بجایا اور پھر جانے کے لئے مڑنے لگا۔ اس کے الفاظ بڑے معنی خیز تھے۔

"رک جا!" میں چیخ اٹھی۔ "تُو اس طرح نہیں جا سکتا۔ تجھے بتانا پڑے گا کہ تُو یہاں کیوں آیا؟ کس نے تجھے میری کوٹھی کا پتا بتایا؟"

میرے چیخنے پر اس کے قدم رک گئے اور پھر وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "جانے والوں کو کس نے روکا ہے دیوی! جو تُو روک لے گی۔"

نریندرا کو اس پر غصہ آگیا اور اس نے جھپٹ کر سادھو کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ دوسرے ہی لمحے نریندرا چیخ کر یوں دور جا گرا جیسے اس کے جسم کو شدید جھٹکا لگا ہو۔ شہزاد اسے اٹھانے دوڑا اور اسی لمحے میں نے سادھو پر چھلانگ لگا دی۔ اب مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ سادھو یقیناً کچھ شیطانی قوتوں کا مالک ہے۔ ورنہ نریندرا کا یہ حشر نہ ہوتا۔ میں اب ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

میں نے اپنی دانست میں اندازے کی غلطی نہیں کی تھی' پھر بھی وہ جانے کیسے میری گرفت سے کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکل گیا۔ اس کا گیروا لبادہ میرے ہاتھ میں رہ گیا۔ اس کے جسم پر گیروے لبادے کے علاوہ لمبا سا سفید کرتا بھی تھا۔ اپنے کھڑاؤں اور جھولی چھوڑ کر وہ ایک قریبی کوٹھی کی طرف بھاگا۔ چمٹا اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کوٹھی کا آہنی پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ سادھو کو میں نے اس میں گھستے دیکھا۔ نریندرا کی طرح خلاف توقع میرے جسم کو جھٹکا نہیں لگا تھا۔ اس عرصے میں ولیم بھی باہر آگیا تھا۔

"تم یہ سامان سنبھالو ولیم! میں ابھی آئی۔" میں نے سادھو کی جھولی' گیروا لبادے اور کھڑاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا میم!" ولیم جواب میں بولا اور سڑک پر پڑا ہوا سامان اٹھانے لگا۔

وہ کوٹھی جس میں سادھو کو میں نے گھستے دیکھا تھا' میری کوٹھی کی دائیں طرف دو کوٹھیاں چھوڑ کر تھی۔ اس کا پھاٹک اب بھی اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں پہنچی تو ایک دراز قد انگریز کو نکلتے دیکھا۔

"وہاٹ ہیپنڈ؟" دراز قد انگریز نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا کہ کیا ہوا؟

مجھے معلوم تھا کہ اس کوٹھی میں کوئی انگریز خاندان رہتا ہے۔ مگر کوٹھی کے مالک سے میرا تعارف نہیں تھا۔ نہ میں نے یہ ضروری سمجھا تھا۔ اس کے جسم پر موجود لباس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کہیں جا رہا تھا۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر اسی کی زبان میں اسے مخاطب کیا۔ "میں تمہاری ایک پڑوسی ہوں اور

اس کوٹھی میں رہتی ہوں۔" میں نے اپنی کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا نام معبلہ ہے۔"

"مائی نیم از ڈیسوزا۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ "مابالا! گلیڈ ٹو میٹ یو۔" اس نے اپنا نام بتا کر مجھ سے ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا۔ "یور انگلش اینڈ پروناؤن سیشن از ویری گڈ مس! کم آن۔" ڈیسوزا نے میری انگریزی اور اس کے تلفظ کی تعریف کی' پھر مجھے اندر آنے کی دعوت دیتے ہوئے ایک طرف ہٹ گیا۔

"پہلے میری ایک بات سن لیں مسٹر ڈیسوزا!" یہ کہہ کر میں نے اس کی کوٹھی میں مشتبہ سادھو کے گھسنے کا واقعہ بیان کر دیا۔

"امپاسبل!" ڈیسوزا نے "ناممکن" کہا' پھر انگریزی ہی میں کہنے لگا۔ "مس! تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کسی اور کوٹھی میں گھسا ہو گا۔ پھر بھی دیکھے لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے کئی ملازمین کو یکے بعد دیگرے آوازیں دے کر بلا لیا اور انہیں کوٹھی میں سادھو کی تلاش کا حکم دیا۔ پھر وہ مجھے ساتھ لئے اپنی نشست گاہ میں آ گیا۔ میں اس کے کہنے پر بیٹھ گئی۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس سال کے درمیان تھی۔ میرے جسم پر موجود لباس سے ڈیسوزا کو شاید یہ گمان ہوا کہ میں عیسائی ہوں۔ سو اس نے اپنے اس خیال کی تصدیق چاہی۔

"سب انسان ایک ہیں اور سب کا خدا بھی ایک ہی ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ "ہندو' مسلمان' عیسائی اور دوسرے تمام مذاہب کے لوگوں کو پیدا کرنے والے نے انہیں تقسیم نہیں کیا۔ یہ تقسیم تو خود ہم نے کی ہے۔ اس سے محبت نہیں نفرت بڑھتی ہے۔ سو کون کسے مانتا ہے' کس کی عبادت کرتا ہے' کس مذہب یا عقیدے پر یقین رکھتا ہے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شاید سارے ہی مذاہب آدمی کو انسان بنانا چاہتے ہیں۔ زمین پر آدمی تو بہت ہیں مگر انسان کم ہیں۔"

میری بات سن کر وہ متاثر سا نظر آنے لگا' پھر وہ بولا۔ "تم تو مس مابالا! مجھے کوئی بڑی مفکر لگتی ہو' تمہاری باتیں سن کر مجھے بہت حیرت ہوئی اور اس پر ملال بھی ہوا کہ پہلے تم سے ملاقات کیوں نہیں ہوئی۔"

اپنے بارے میں اس کی رائے سن کر میں نے شکریہ ادا کیا اس سے میں نے جو کچھ کہا تھا یہ دراصل مختلف مذاہب کے بارے میں میرے اس علم کا نچوڑ تھا جس کی تعلیم مجھے پُراسرار تجربات کے دوران میں ملی تھی۔ اسی کو میں نے آگہی کے نئے در کھلنے سے منسوب کیا تھا۔

ڈیسوزا کے ملازمین نے آ کر بتایا کہ کوٹھی میں وہ مشتبہ سادھو نہیں ہے جس کا ذکر میں نے کیا تھا۔ اسی وقت مجھے کوٹھی کے عقبی دروازے کا خیال آیا۔

"ممکن ہے کوٹھی میں گھسنے کے بعد اسے عقبی دروازے سے فرار ہونے میں.........."

"اوہ یس!" ڈیسوزا میری بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھا۔ پھر اس نے ایک ملازم کو عقبی دروازہ دیکھنے کا حکم دیا۔

معلوم نہیں کیوں مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈیسوزا نے دانستہ اس مشتبہ سادھو کی تلاش میں کوئی

دلچسپی نہ لی ہو۔ جیسے اس نے مجھے جان بوجھ کر باتوں میں الجھا لیا ہو۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں یہ سوال بھی ابھر رہا تھا کہ بھلا اس سادھو اور ڈیسوزا کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ ایک حاکم' دوسرا محکوم' ایک دیسی' دوسرا بدیسی' ایک صاحب ثروت اور دوسرا بے وقعت۔ اس کے باوجود ڈیسوزا کا رویہ میرے لئے ناقابل فہم ہی سا تھا۔ یا تو اس نے میری بات پر یقین نہیں کیا یا پھر اس بہانے مجھ سے قربت و یگانگت پیدا کر رہا تھا۔ ہر چند کہ میں اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھی۔ پھر بھی اتنا ضرور معلوم تھا کہ مردوں کے لئے مجھ میں انتہائی کشش موجود ہے اور ڈیسوزا بھی ایک مرد ہی تھا۔ سادھو کی تلاش کے سلسلے میں ڈیسوزا کی عدم دلچسپی کا سبب کچھ بھی رہا ہو' مگر یہ بہرحال حقیقت تھی کہ خود ڈیسوزا میری نظروں میں مشتبہ ہو گیا تھا۔

جس ملازم کو ڈیسوزا نے عقبی دروازہ دیکھنے بھیجا تھا اس نے آ کر بتایا کہ اسے دروازہ کھلا ہوا ملا۔

یہ سنتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈیسوزا اپنے ملازم کو ڈانٹنے لگا۔ پھر اس نے مجھے اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی۔

"شکریہ! پھر کبھی سہی۔" یہ کہتے ہی میں تیزی کے ساتھ نشست گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے اپنے نیپالی گورکھا چوکیدار نریندرا کا خیال آ گیا تھا۔ وہ نہ جانے کس حال میں تھا۔ میں نے اسے جھٹکا کھا کر گرتے دیکھا تھا۔

میں ڈیسوزا کی کوٹھی سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اپنی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ پھاٹک سے ملحق ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں نریندرا رہتا تھا۔ میں سیدھی وہیں پہنچی۔ نریندرا کو میں نے چارپائی پر پڑے دیکھا۔ اس کا پیلا چہرہ مزید پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کے پاس شہزاد موجود تھا۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر نریندرا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"لیٹے رہو!" میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ پھر چارپائی کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ "تمہارے کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟"

"نہیں میم!" اس نے نحیف سی آواز میں جواب دیا۔ شہزاد کے سوا میرے بقیہ ملازم مجھے "میم" ہی کہتے تھے۔

"تم شاید کچھ کمزوری محسوس کر رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

میرے سوال کا جواب نریندرا کے بجائے شہزاد نے دیا۔ "آپ کی غیر موجودگی میں اس سے میں نے پوچھا تھا کہ اچانک اس سادھو کی کلائی پکڑتے ہی اسے کیا ہو گیا تھا؟ اس نے مجھے بتایا کہ اسے سادھو کی کلائی پکڑتے ہی یوں لگا جیسے بجلی کا تار چھو لیا ہو۔ تبھی سے یہ اتنی کمزوری محسوس کر رہا ہے کہ بات بھی نہیں کی جا رہی۔"

"اسے دودھ میں شہد ملا کر پلواؤ' ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اور جب تک یہ ٹھیک نہ ہو جائے ولیم کو پھاٹک کی نگرانی پر بٹھا دو۔"

پھر میں نریندرا کے کمرے سے نکل آئی۔ ابھی تک میں ناشتہ بھی نہیں کر سکی تھی' مگر ناشتے سے

زیادہ مجھے سادھو کی اس جھولی کا خیال تھا جو چھوڑ کر وہ بھاگ گیا تھا۔ اندر پہنچتے ہی میں نے دلیم سے وہ سارا سامان منگوا لیا جو اس کے حوالے کر گئی تھی۔ سادھو کے کھڑاؤں اور گیروا لبادے کو میں نے ایک طرف ڈال دیا کیوں کہ لبادے سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ سادھو کی جھولی میں پیتل کا ایک کٹورا' تھالی' پھٹی ہوئی چادر' منتروں کی بوسیدہ سی کتاب اور ایک سنکھ ملا۔ سنکھ کو ہندو پوجا کے وقت منہ سے لگا کر بجاتے ہیں۔ یہ ساری ہی چیزیں میرے لئے فضول تھیں۔ مگر منتروں کی کتاب میں رکھا ہوا ایک کاغذ میری نظر میں خاصا اہم تھا۔ اس کاغذ پر پنسل سے ایک ادھورا سا خاکہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے اس خاکے کو غور سے دیکھا تو مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وہ خاکہ بڑی حد تک مجھ سے مشابہہ تھا۔ میں نے کاغذ کو پلٹ کر دیکھا تو اس پر ہندی میں چند الفاظ لکھے ہوئے دیکھے۔ "بڑے مہاراج کی سیوا (خدمت) میں۔" اس کاغذ کو میں نے اپنے پاس رکھ کر بنگالن ہندو خادمہ شیتل کو آواز دی۔

شیتل آ گئی تو میں نے اس سے بنگلہ زبان میں کہا۔ "نیئے نین!" یعنی یہ لے۔ سادھو کا سامان میں نے اسے دے دیا اور بولی۔ "تم چاہو تو اسے اپنے پاس رکھ لو' چاہو تو پھینک دو۔" یہ الفاظ بھی میں نے اسی کی زبان میں ادا کیے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ مجھ سے اپنی زبان سن کر شیتل کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں روشنی سی نظر آنے لگتی تھی۔ عام بنگالی لڑکیوں کی نسبت اس کا قد ذرا نکلتا ہوا تھا۔ چہرہ سانولا ہونے کے باوجود پُرکشش تھا اور سر کے بال تو خیر کولھوں سے نیچے تک آتے ہی تھے۔ یہ شہزاد کے حسن انتخاب کا ثبوت تھا۔ میرے کہنے پر وہ صاف ستھری ساڑھی باندھنے لگی تھی۔ شیتل وہ سارا سامان اٹھا کر لے گئی۔

ڈیسوزا کی کوٹھی میں مشتبہ سادھو کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے گھستے دیکھا تھا۔ یہ امکان تو تھا کہ وہ کوٹھی کے عقبی دروازے سے نکل گیا ہو' مگر اس پر کسی کی نظر کیوں نہیں پڑی؟ یہ بہرحال میرے لئے ایک معمہ ہی تھا۔ جب کہ کوٹھی میں ملازمین بھی موجود تھے اور خود ڈیسوزا بھی کہیں جانے کے لئے نکل رہا تھا۔ سادھو کے اس کوٹھی میں داخل ہونے اور پھر میرے وہاں تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ اس معمے سے قطع نظر مشتبہ سادھو کی جھولی میں پایا جانے والا ادھورا خاکہ اور اس خاکے سے میری مشابہت بھی معنی خیز تھی۔ وہ خاکہ کسی "بڑے مہاراج" کی خدمت میں پیش کیا جانے والا تھا۔ تو یہ بڑا مہاراج کون تھا؟ انہی سوالوں اور خیالوں نے میرے ذہن کو الجھا کے رکھ دیا تھا۔

اسی الجھن کے ساتھ ساتھ میرے سامنے ایک اور مسئلہ درپیش تھا۔ اس مسئلے پر پہلے بھی میں کئی بار غور کر چکی تھی۔ پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں کی اس دنیا میں آنے کے بعد پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ حصول دولت بھی ایک مسئلہ ہے۔ اپنے علاوہ پانچ افراد کی کفالت بھی میری ذمے داری تھی۔ وادی سبزے میں جو سونا لے کر چلی تھی وہ اس عرصے میں تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ میں یہاں کسی ریاست کی حکمراں نہیں تھی کہ مجھے اس کی فکر نہ ہوتی۔ شہزاد یا اپنے دوسرے ملازمین کو میں اس کا احساس ہونے سے پہلے ہی کوئی راہ نکال لینا چاہتی تھی۔ میں اس وقت بھی اسی مسئلے پر غور کر رہی تھی۔ میری آنکھیں بند تھیں اور بایاں ہاتھ ماتھے پر رکھا ہوا تھا۔ اچانک، میری سماعت سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز ٹکرائی

اور پھر بند آنکھوں سے میں نے ایک منظر دیکھا۔ ہر طرف "کنگ 'کنگ" کا شور بلند ہو رہا تھا۔ پھر یہ شور دب گیا اور "کوئن 'کوئن" کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ اسی کے ساتھ میں نے جو منظر دیکھا۔ اس سے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو گئیں۔ میری آنکھوں میں خود میرا ہی چہرہ تھا۔ خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ۔ اسی لمحے اپنے کمرے میں مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں داخل ہونے والی میری ملازمہ شیتل تھی۔

"رحیم نے ناشتہ دوبارہ گرم کر کے میز پر لگا دیا ہے میم!" شیتل نے مجھے بتایا۔

"تم چلو میں آتی ہوں۔" میری آواز میں خوشی جھلک رہی تھی۔ "اور ہاں سنو! شہزاد سے کہو کہ میرے ساتھ اسے چلنا ہے' تیار ہو جائے۔"

شیتل چلی گئی تو میں نے اٹھ کر الماری کھولی اور تجوری میں موجود بڑے نوٹوں کی آخری گڈی نکال کر اپنے پرس میں رکھ لی۔ پھر میں وہ پرس الماری ہی میں رکھ کر اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔ میری الماری کی تجوری میں ابھی کچھ سونے کے ٹکڑے پڑے تھے' انہیں میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔

ناشتہ کرتے ہوئے میں نے شیتل سے زیندرا کا حال پوچھا۔ وہ میرے قریب ہی کھڑی تھی کہ کوئی ضرورت ہو تو میں اس سے کہہ سکوں۔

"میں اسے دیکھ کر آتی ہوں میم!" شیتل جواب میں بولی۔ "شہزاد بابو نے اسے دودھ میں شہد ملا کر پلا دیا تھا۔"

"ٹھیک ہے' تم دیکھ کر آؤ۔" میں نے کہا اور ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

کچھ ہی دیر کے بعد شیتل نے آ کر بتایا کہ زیندرا کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ میں اس وقت تک ناشتہ کر چکی تھی۔ لباس تبدیل کرنے کے لئے میں نے دوبارہ اپنے کمرے کا رخ کیا۔ پھر جب میں کمرے سے باہر آئی تو میرے ہاتھ میں وہ پرس بھی تھا کہ جس میں بڑے نوٹوں کی ایک گڈی رکھی تھی۔ اس گڈی کے علاوہ بھی پرس میں مزید رقم موجود تھی۔ شہزاد مجھے اپنا منتظر ہی ملا۔ میں اسے ساتھ لئے کوٹھی سے نکل آئی۔

"آج کدھر چلنا ہے خاتون!" شہزاد نے میرے ساتھ چلتے ہوئے سوال کیا۔ وہ مجھے احتراماً "خاتون" ہی کہتا تھا اور یہ لفظ "آتون" سے بہت قریب تھا۔ اسی کا ہم وزن اور ہم قافیہ۔ اسی لئے شہزاد کی زبان سے یہ لفظ سن کر مجھے اچھا لگتا تھا۔ "آتون" میرے ماضی کا حصہ بن چکا تھا اور "خاتون" میرا حال تھا۔ میں نے ایک عمر آتون اور پھر "آتون دیوی" کے نام سے بسری کی تھی۔ بچپن میں وادی سبزے سے فرار ہونے کے بعد میرے اصل نام کی پردہ پوشی کے لئے مہا پجاری نے میرا یہ نام رکھا تھا۔ اس کے معنی سلیقہ مند عورت کے ہیں۔ ایسی عورت جو بناؤ سنگھار میں بھی مہارت رکھتی ہو۔

شہزاد کے سوال کا اسے میں نے جواب دیا تو وہ چونک اٹھا' مگر بولا کچھ نہیں۔ میں نے مزید کہا۔ "کوئی ٹیکسی کر لو تاکہ ہم جلد وہاں پہنچ جائیں۔"

"جی بہتر ہے۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔ مگر اب بھی اس کے چہرے سے حیرت اور الجھن کا

اظہار ہو رہا تھا۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئے؟ کیا بات ہے؟ کہو نا!" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"دراصل میں .... میں پہلے کبھی کسی ایسی جگہ نہیں گیا اور .... اور وہ جگہ بہرحال آپ کے جانے کی نہیں۔" اس نے آخر دبی دبی زبان میں کہہ دیا۔

"کیوں' کیا وہاں عورتیں نہیں جاتیں؟" میں بولی۔

"جاتی ہیں' مگر جہاں تک میرے علم میں ہے وہاں غیر ملکی خواتین ہی نظر آتی ہیں۔"

"تو میں بھی' کون سی یہاں کی ہوں۔" میرے منہ سے غیرارادی طور سے یہ بات نکل گئی اور مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں نے بات بنانے کی خاطر مزید کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ میں بھی تو بنگال میں اجنبی ہوں۔"

"جی .... جی ہاں خاتون!" اس سے زیادہ وہ کچھ اور نہ کہہ سکا کہ اسے میرے بارے میں معلوم ہی کیا تھا۔

اس وقت تک ہم چورنگی روڈ پر نکل آئے تھے۔ شہزاد نے ایک خالی ٹیکسی دیکھ کر اسے روک لیا۔

بیل گچھیا' شہر کی ایک نواحی آبادی تھی۔ یہیں زولوجیکل گارڈن بھی تھا جو میں دیکھ چکی تھی۔ یہ علاقہ ہندو بنگالیوں کی اکثریت کا تھا اور یہاں بڑے بڑے بازار بھی تھے۔ ہماری منزل اسی آبادی سے کچھ پہلے تھی۔ دھرم تلے اور اس آبادی کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ ٹرام بھی یہاں کے لئے مل سکتی تھی مگر میں نے وقت کی تنگی کے سبب ٹیکسی کو ترجیح دی تھی۔

اپنی منزل پر پہنچ کر میں' شہزاد کو اپنے ساتھ لئے آگے بڑھ گئی۔ ٹیکسی کا کرایہ میں پہلے ہی ادا کر چکی تھی۔ وہاں ہر رنگ و نسل کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر طرف ایک ہیجان سا برپا تھا۔ مارواڑی سیٹھ بھی نظر آ رہے تھے اور غیر ملکی افراد بھی۔ ان میں چینی بھی تھے اور برطانوی بھی۔ ہر شخص جیسے اپنی دھن میں مگن اِدھر سے اُدھر پھر رہا تھا۔ میں نے ایک کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے کسی کی رازدارانہ آواز سنی۔ "کوئی ٹپ ملی؟"

"ہاں۔" دوسری آواز ابھری اور پھر یہ آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ جواب دینے والا شاید رازداری سے کام لینا چاہتا تھا۔

میں ان لوگوں پر توجہ دیئے بغیر اس کیبن کے کاؤنٹر پر پہنچ گئی کہ جہاں برائے نام لوگ تھے۔ اس سے کچھ فاصلے پر جو دوسرا کیبن تھا وہاں ایک ہجوم نظر آ رہا تھا۔ سبھی کے ہاتھوں میں کتابچے دکھائی دے رہے تھے۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر جب میں نے پرس کھول کر بڑے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اس شخص کے سامنے رکھ دی جو کاؤنٹر پر بیٹھا تھا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ "رقم گن لو' یہ پورے دس ہزار روپے ہیں۔" میں نے اس شخص کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

دس ہزار اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ کاؤنٹر والے نے گڈی اٹھالی اور نوٹ گننے لگا۔ شہزاد

میرے قریب ہی کھڑا حیران حیران سا مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ گھوڑی جس پر میں نے اتنی بڑی رقم لگائی تھی اس کا بھاؤ دس گنا تھا۔ یعنی مجھے دس ہزار کے ایک لاکھ ملتے۔ اسی گھوڑی کا نام "کوئن" تھا اس کا بھاؤ گرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آج تک وہ کسی ریس میں اول نہیں آئی تھی۔ یہ باتیں مجھے وہیں لوگوں کی گفتگو سے معلوم ہوئیں۔

یہ کلکتے کا ریس کورس تھا جہاں قسمت آزمائی کرنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ پہلی ریس شروع ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ معزز افراد کے لئے ریس ختم ہونے کے پوائنٹ سے ذرا پہلے نشستوں کا بھی بندوبست تھا۔ ریس کے میدان میں گھوڑے اتر چکے تھے۔ میں دانستہ نشستوں کا رخ نہیں کیا اور ایک خالی جگہ دیکھ کر ریلنگ کے پاس کھڑی ہو گئی کہ جہاں سے ریس دیکھ سکوں۔ شہزاد میرے قریب ہی تھا۔ میری بائیں جانب ایک چینی کھڑا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ شہزاد شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ سو میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ بولو' تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"اب کچھ کہنے سے کیا فائدہ خاتون!" اس کی آواز بجھی ہوئی سی تھی۔

"پھر بھی' کہہ دو جو دل میں ہے۔" میں بولی اور اس کی حوصلہ افزائی کے لئے مسکرائی۔

"مجھے خطرہ ہے خاتون کہ کہیں ساری رقم ڈوب نہ جائے۔ ہرچند کہ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں' مگر اب تک لوگوں کی گفتگو سے مجھے یہی اندازہ ہوا ہے کہ "کوئن" کے جیتنے کا امکان دور تک نہیں۔ یہ ریس بھی "کنگ" ہی جیتے گا۔" شہزاد نے اپنے اندیشے کا اظہار کر دیا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم میری ہمدردی ہی میں یہ بات کہہ رہے ہو' مگر اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی معلوم ہے' تمہیں کچھ دیر بعد بڑی حیرت ہو گی۔ اس وقت کہ جب "کوئن" یہ ریس جیت لے گی۔ سنو' یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ کنگ ہی کا پلا بھاری رہے کبھی کبھی کوئن کو بھی جیتنا چاہئے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر شہزاد تو خیر کچھ نہیں بولا۔ مگر بائیں جانب کھڑے ہوئے چینی نے میری تائید میں سر ہلایا۔ وہ یقیناً اردو سمجھتا تھا ورنہ تائید نہ کرتا۔ کسی تعارف کے بغیر وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور بتانے لگا کہ اس نے بھی "کوئن" ہی پر رقم لگائی ہے۔

"دیکھ لیا تم نے کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔" میں نے شہزاد کو مخاطب کیا کیوں کہ مجھے اس ریس کا نتیجہ پہلے سے معلوم تھا۔

"جی ہاں۔" شہزاد نے زبان سے تو یہی کہا' مگر اس کا چہرہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔

پھر ریس شروع ہو گئی اور اسی کے ساتھ لوگوں نے جیسے سارے ریس کورس کو سر پر اٹھا لیا۔ دوڑنے والے گھوڑوں اور گھوڑیوں میں "کوئن" پانچویں نمبر پر تھی۔ "رانی" نامی گھوڑی سب سے آگے تھی اور اس کے ساتھ ساتھ "کنگ" لگا ہوا تھا۔

"کہیں آپ کو "رانی" پر تو "کوئن" کا دھوکا نہیں ہو گیا خاتون! کیوں کہ دونوں ہی ہم معنی لفظ

ہیں۔" شہزاد ہیجان خیز آواز میں بولا۔

"دیکھتے رہو' کیا ہوتا ہے۔ ابھی ونگ پوائنٹ بہت دور ہے۔" میں نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

ماحول اور فضا آدمی کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ شہزاد پہلی مرتبہ ریس کورس آنے کے باوجود بھی غیر ارادی طور پر اسی ماحول کا حصہ بن گیا تھا۔ اس کا ہیجان قابل دید تھا۔ پھر جب "رانی" کو پیچھے چھوڑ کر "کنگ" آگے نکل گیا تو لوگ گلا پھاڑ کر چیخنے لگے۔ زیادہ رقم اسی پر لگی تھی۔ "رانی" کا دوسرا نمبر تھا۔ "کوئن" کسی شمار قطار میں نہیں تھی۔ مگر ریس کے آخری لمحوں میں اس نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس نے جست بھری اور "کنگ" سے آگے نکل گئی۔ معلوم نہیں اس پر کتنوں کے دل بیٹھ گئے ہوں گے۔ مگر میری بائیں جانب کھڑا ہوا چینی بار بار پھدک رہا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے "جوش جذبات" میں میرے شانے پر بھی ہاتھ مارنے سے کوئی گریز نہیں کیا۔ "جیت گئی .... کوئن جیت گئی۔" وہ خوشی سے چیخا۔

ایسے مواقع پر عموماً لوگ ہوش و حواس میں نہیں رہتے۔ میں نے اسی لئے پلٹ کر اسے صرف سخت نظروں سے دیکھا اور کچھ نہ بولی۔ کوئی اپنے ہوش میں نہ ہو تو اس سے کہا بھی کیا جائے۔ اس چینی کی طرح میرے لئے وہ کوئی غیر متوقع خوشی نہیں تھی جو ہیجان کا شکار ہو جاتی۔ ہاں شہزاد کا چہرہ خوشی سے ضرور تمتما رہا تھا۔

"آپ .... آپ خاتون! واقعی خوش قسمت ہیں۔" خوشی کی زیادتی کے سبب شہزاد سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

پھر جب میں کاؤنٹر سے کیش لے کر پلٹ رہی تھی تو ڈیسوزا پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھی۔ اس کی وہاں موجودگی میرے لئے خلاف توقع ہی تھی۔

"ہیلو مس ملابلا!" وہ قریب آتے ہوئے بولا۔ "یو آر ویری لکی!" وہ "معبلہ" کو ہمیشہ "ملابلا" کہتا تھا جو اس کے لہجے اور زبان کی مجبوری تھی۔

"مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا مسٹر ڈیسوزا کہ میں خوش قسمت ہوں؟" میرے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔ آج ہی صبح جو واقعہ رونما ہوا تھا اسے میں بھولی نہیں تھی۔

"ابھی کیش لیتے دیکھا ہے تمہیں۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔ "کمال کر دیا تم نے۔ میری تو ساری رقم چلی گئی۔ میں نے "کنگ" پر قسمت آزمائی کی تھی۔"

"میں نے تو اس میں کوئی کمال نہیں کیا' بس اتفاق سے جیت گئی۔" میں نے کہا اور آگے بڑھنے لگی۔

"نہیں' میں یقین نہیں کر سکتا۔" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔

"آپ جائیں۔" میں نے یہ کہہ کر شہزاد کی طرف دیکھا جو ڈیسوزا کو میرے ساتھ چلتے دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ "آؤ۔" میں نے شہزاد کو آگے آنے کے لئے اشارہ کیا مجھے ڈیسوزا کا اس طرح بے تکلف ہونا گراں گزر رہا تھا۔ پھر یہ کہ اس کے لہجے سے بھی صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہاں اس

کی موجودگی میرے لئے الجھن کا سبب ہی بن رہی تھی۔ کیوں کہ وہ پہلے ہی میری نظر میں مشتبہ ہو چکا تھا۔ اس سے یہ ملاقات میرے نزدیک محض اتفاق نہیں تھی۔

"تم کوٹھی ہی واپس چلو گی نا؟" اس نے پوچھا۔ وہ اب شہزاد کے آگے آ جانے کی وجہ سے میری دائیں جانب ہو گیا تھا۔

"آپ یہ سوال کس لئے کر رہے ہیں؟" میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"میری کار موجود ہے اور مجھے بھی واپس اپنی کوٹھی ہی جانا ہے' ساتھ چلتے ہیں۔" ڈیسوزا نے میری آواز کی سختی کو نظر انداز کرتے ہوئے پیشکش کر دی۔ مجھے واپس کوٹھی ہی جانا تھا مگر میں نے انکار کر دیا اور بولی۔ "دراصل اس وقت میرا گھومنے پھرنے کا موڈ ہو رہا ہے۔"

وہ میری بات پر ہنسا۔ "جیتنے کی خوشی میں! مگر تمہیں شاید یہ نہیں معلوم مس مابالا کہ یہ کلکتہ ہے۔ اتنا کیش لے کر گھومنا اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنا ہے۔" اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی کسی نادان بچے کو سمجھاتا تھا۔

"مگر مسٹر ڈیسوزا! آپ میری فکر میں کیوں دبلے ہوئے جا رہے ہیں؟" میرے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی۔

"اس لئے مس کہ میں تمہارا پڑوسی ہوں۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ٹھیک ہے' مجھے آپ کا مشورہ قبول ہے' مگر میں آپ کی کار میں نہیں جاؤں گی۔" میں نے آخر تنگ آ کر کہہ ہی دیا۔

"لیکن کیوں؟" وہ کسی طرح میری جاں بخشی پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"ضروری تو نہیں مسٹر ڈیسوزا کہ ہر سوال کا جواب دیا جائے۔" میرے لہجے میں مزید سختی آ گئی۔ اب ہم اس جگہ تک پہنچ گئے تھے جہاں کاریں اور ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے شہزاد سے کہا۔ "کوئی ٹیکسی دیکھو۔"

شہزاد فوراً ایک خالی ٹیکسی کی طرف لپکا۔ ٹیکسیوں میں عموماً دولت مند لوگ ہی سفر کرتے تھے ورنہ اپر مڈل کلاس تک کے لوگ آرام دہ ٹراموں کو ترجیح دیتے تھے۔ اپنی ذاتی سواریاں یا کاریں کم ہی لوگوں کے پاس تھیں۔ مگر وہ ریس کورس تھا اسی لئے کاریں نظر آ رہی تھیں۔ غریب آدمی کا بھلا وہاں کیا کام۔

میری بے اعتنائی آخرکار رنگ لے ہی آئی۔ ڈیسوزا نے میرا پیچھا چھوڑ دیا اور اپنی کار میں جا بیٹھا۔ میں اس دوران میں ٹیکسی کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔

دھرم تلے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں کئی بار مجھے ڈیسوزا کی کار نظر آئی۔ کبھی اس کی کار ٹیکسی سے آگے نکل جاتی' کبھی پیچھے اور کبھی ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے درشت رویے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جب میرا انکار سن کر اپنی کار کی طرف بڑھا تھا تو بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی تھی۔ پھر جب دھرم تلے پہنچ کر میں نے ٹیکسی کو اپنی کوٹھی کے سامنے رکوایا تب بھی اس نے اپنی کار میں آگے بڑھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ میں نے جواب میں اس کی

طرف سے منہ پھیر لیا اور ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے نیچے اتر آئی۔

کوٹھی پہنچ کر ایک اور حیران کن اطلاع مجھے ملی۔ ولیم نے بتایا کہ وہ مشتبہ سادھو پھر آیا تھا۔ میں نے رقم اپنی تجوری میں رکھی پھر نشست گاہ کا رخ کیا۔ مجھے اپنے تمام ہی ملازمین کچھ خوفزدہ سے دکھائی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں شہزاد شامل نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ میرے ساتھ تھا۔ نریندرا کے سوا میں نے سب کو بلا لیا تاکہ میری غیر موجودگی میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس کی تفصیل معلوم کر سکوں۔ نریندرا اس وقت سو رہا تھا۔ یہ بات مجھے ولیم نے بتائی تھی۔ میں نے اسے بیدار کرانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ نیند آ جانے سے یقیناً اس کے اعصاب کو سکون مل رہا ہو گا۔

نریندرا کی جگہ پھاٹک پر چوکیداری کے لئے میں نے ولیم کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ اسی لئے پہلے اسی سے پوچھ گچھ شروع کی۔ "ہاں ولیم! اب بتاؤ کیا بات تھی؟"

"میم! آپ کے جاتے ہی وہ پھر آ گیا اور پہلے کی طرح گیٹ پر ہاتھ مارنے لگا۔" ولیم نے بتایا۔ "میں نے گیٹ نہیں کھولا مگر وہ گیٹ پر چمٹا مارنے لگا۔"

"کچھ کہہ بھی رہا تھا وہ کہ صرف چمٹا مارے جا رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنا سامان مانگ رہا تھا۔" ولیم نے جواب دیا۔ "پھاٹک پر شور سن کر رحیم اور شیتل بھی پہنچ گئے۔ رحیم نے کہا اسے اس کا سامان دے کے دفع کرو۔ شیتل اس کا سامان اٹھا لائی۔ میں نے گیٹ کھولے بغیر اوپر سے اس کا سامان باہر پھینک دیا۔ پھر وہ چلا گیا۔"

"معلوم نہیں میم کہ وہ حرام زادہ کیوں ہمارے پیچھے لگ گیا ہے؟" رحیم نے منہ بنا کر کہا۔ پھر کہنے لگا۔ "میں نے بھی اس کا توڑ سوچ لیا ہے۔"

"تم نے کیا سوچا ہے؟" میرے کچھ پوچھنے سے پہلے شہزاد بول اٹھا۔

"ناخدا مسجد کے امام صاحب کے پاس جاؤں گا' ان سے تعویذ لے کر آؤں گا' پھر دیکھتا ہوں کہ یہ سادھو کا بچہ کیسے ادھر آتا ہے۔ بڑے اللہ والے ہیں وہ۔ ایک دفعہ میرے سالے کے کمرے پر کسی جن کا اثر ہو گیا تھا۔ چونا گلی میں رہتا ہے وہ۔ امام صاحب نے پوری بلڈنگ ہی کو کیل دیا۔ چار تعویذ دیئے تھے انہوں نے کہ انہیں بلڈنگ کے چاروں کونوں میں گاڑ دینا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے' جن' گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا۔"

وہ لوگ تو اپنی ہانک رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ سادھو کس لئے واپس آیا ہو گا؟ اس سوال کا جواب وہی کاغذ تھا کہ جس پر میرا خاکہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ کاغذ میں نے الماری میں رکھ دیا تھا۔ جو منتروں کی کتاب سے نکلا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ سادھو کو کس طرح معلوم ہو گیا کہ میں کوٹھی میں نہیں ہوں؟ میری موجودگی میں یقیناً اس کی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ میرے مقابلے ہی کا اہل ہوتا تو راہ فرار اختیار نہ کرتا۔

"تم لوگوں کو اس بہروپئے سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے اپنے ملازمین کو دلاسہ دیا۔ "دیکھا نہیں تھا صبح تم لوگوں نے کہ وہ کس طرح بھاگا تھا۔"

"یہ بات تو ہے میم!" شیتل میری تائید میں بولی۔ "نریندرا کی طرح وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔"

"میرا ایک مشورہ ہے خاتون! اگر آپ قبول کریں۔" شہزاد مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہاں بولو۔" میں نے کہا۔ "مگر تم بھی رحیم کی طرح کہیں سے تعویذ لانے کی بات نہ کرنا۔" میں دانستہ آہستہ سے ہنس دی' مقصد فضا کی کشیدگی کو کم کرنا ہی تھا۔

"یہ بات نہیں خاتون!" شہزاد سنجیدگی سے بولا۔ "میرا ایک دوست ہے آفتاب' پارک سرکس میں رہتا ہے۔ آپ کہیں تو اسے کچھ دن کے لئے یہاں رہنے کو بلا لوں۔ میرے کمرے میں سو جایا کرے گا وہ۔ کئی ایسے بہروپئے اس کے ہاتھوں پٹ چکے ہیں۔ وہ ان سے بالکل نہیں ڈرتا۔"

"تو کیا تمہارا دوست کوئی کام دھندا نہیں کرتا کہ یہاں رہے گا؟" میں بولی۔

"کام کیوں نہیں کرتا۔ کنگ اسٹریٹ میں چشمے کی ایک دکان پر ملازم ہے۔ میں دراصل رات کو یہاں اس کے سونے کی بات کر رہا تھا۔ دن کی تو خیر کوئی بات نہیں' رات کی مجھے فکر ہے کہ وہ پھر نہ آ جائے۔ آفتاب یہاں ہو گا تو اس سے نمٹ لے گا۔" شہزاد نے کہا۔

"لگتا ہے کہ تم بھی اس بہروپئے سے ڈر گئے ہو۔" میں مسکرائی۔ "رات کو کیا میں نہیں ہوں گی کوٹھی میں؟"

"خواہ مخواہ آپ کی نیند خراب ہو گی۔ میں تو اس لئے کہہ رہا تھا ورنہ تو ڈرتا میں بھی نہیں۔"

میں دل ہی دل میں ان کے بھول پن پر ہنس رہی تھی۔ انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ میں کون ہوں۔

"اس کی ضرورت نہیں' میں کافی ہوں اس سادھو کے لئے۔ تم فکر نہ کرو اور ہاں کھانا لگواؤ' بھوک لگ رہی ہے۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہرچند کہ میرا ذہن ان واقعات سے خاصا الجھا ہوا تھا جو گزشتہ روز سے اب تک پیش آئے تھے' مگر میں نے اپنے ملازمین پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر میں نے الماری کھول کر پہلے وہ کاغذ تلاش کیا جس پر میرا ادھورا خاکہ بنا ہوا تھا۔ میں نے الماری کے اوپر والے خانے میں کپڑوں کے نیچے وہ کاغذ رکھا تھا' مگر مجھے وہاں نہیں ملا۔ پورا خانہ خالی کرنے اور ایک ایک کپڑا جھاڑ کر دیکھنے کے باوجود مجھے وہ کاغذ نظر نہ آیا اور میں چکرا کے رہ گئی۔ الماری میں تالا لگا ہوا تھا اور اس کی چابی میرے پرس میں تھی۔ پھر وہ کاغذ کہاں غائب ہو سکتا تھا؟ ممکن ہے کہ میں نے کسی اور خانے میں وہ کاغذ رکھ دیا ہو' یہ سوچ کر میں نے الماری کے دوسرے خانے بھی دیکھنا شروع کر دیئے۔ اب میں ایک ایک خانہ خالی کر رہی تھی۔

"سمے سمے کی بات ہے دیوی مائی! کبھی تیرا پلہ بھاری کبھی میرا۔" اسی منحوس سادھو کی آواز میری خواب گاہ میں گونجی تو میں اچھل پڑی۔

آواز میرے عقب سے آئی تھی۔ میں تیزی سے پلٹی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر میں نے چمٹا بجنے کی آواز سنی۔ جو دور ہوتی چلی گئی۔ اپنے حواس پر قابو پانے میں مجھے چند لمحے لگے۔ مجھے ساحر زعیم یاد آیا۔ اس کی آواز بھی تو مجھے سنائی دیتی تھی۔ یہ سادھو بھی یقیناً ساحرانہ قوتوں کا مالک تھا' اب اس میں کوئی

شبہ باقی نہیں رہا تھا۔

"تجھے بھی دیکھ لوں گی کمینے!" میں بڑبڑائی اور پھر شیتل کو آواز دی۔

اب اس کاغذ کی تلاش لاحاصل تھی۔ سادھو کے الفاظ کا مطلب یہی تھا۔ شیتل کمرے میں آئی اور ہر طرف کپڑے بکھرے دیکھے تو حیران ہو کر پوچھنے لگی۔ "کیا ہوا میم! یہ کپڑے کس نے الماری سے نکال کر باہر پھینک دیئے؟"

"میں نے۔ چلو کپڑے اٹھا اٹھا کر دو۔" میں نے جواب دیا۔ "میں دراصل ایک چیز رکھ کر بھول گئی تھی' وہ ڈھونڈ رہی تھی' مل گئی۔"

شیتل نے اطمینان کے اظہار میں طویل سانس لیا اور پھر میری مدد کرنے لگی۔ الماری میں کپڑے رکھنے کے بعد میں نے اسے مقفل کیا اور پھر کمرے سے نکل آئی۔ اس روز دوپہر کا کھانا کھا کے میں حسب معمول سونے کو لیٹی تو مجھے نیند نہیں آئی۔ ذہن کسی الجھن کا شکار ہو تو ویسے بھی نیند نہیں آتی۔ میرے ذہن میں بار بار یہی سوال ابھر رہا تھا کہ آخر وہ سادھو ہے کون اور چاہتا کیا ہے؟ میں اس نتیجے پر تو پہنچ چکی تھی کہ سحر دافسوں کا کھیل شروع ہو چکا ہے لیکن اس کے سبب سے ناآشنا تھی۔ وہ سادھو میرا قلمی خاکہ بنا کر اپنے کسی "بڑے مہاراج" کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سوا ابھی تک مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں بالکل اندھیرے میں تھی۔ عظیم میمن کی طرف سے بھی اس سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔

شام کو کچھ دیر کے لئے میری آنکھ لگی ہو گی کہ شیتل نے آ کے جگا دیا۔

"کیا ہوا اب؟" میں کچھ جھنجلا گئی۔ "کیا پھر وہ کمبخت سادھو آ گیا؟"

"نہیں میم!" شیتل سہم کر بولی۔ "وہ انگریز صاحب ملنے آیا ہے' ڈیسوزا۔"

"تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں سو رہی ہوں۔" میری آواز میں اب بھی جھنجلاہٹ تھی۔

جواب میں شیتل نے نظریں جھکا لیں اور بولی۔ "کہہ دیتی ہوں جا کر' وہ صاب لوگ ہیں نا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ.........."

"نہیں' اب منع کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "آئندہ خیال رکھنا۔ وہ صاحب ہے تو ہوا کرے۔ بٹھاؤ اسے نشست گاہ میں' آتی ہوں میں۔"

ڈیسوزا کا تعلق اس قوم سے تھا جو ہندوستان پر حکمرانی کر رہی تھی اور شیتل غلام قوم سے تھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ کسی انگریز سے کوئی ایسی بات کہی جا سکتی ہے لیکن میں بہرحال اس کی محکوم نہیں تھی۔ ایک طرف تو میں اس سادھو کی شیطانی قوتوں سے پریشان تھی' دوسری طرف اس انگریز نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ صبح سے میری جان کو چپکا ہوا تھا۔ اب معلوم نہیں کیوں آن مرا تھا؟ یہی سوچتے ہوئے میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر نشست گاہ میں پہنچ گئی۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تشریف رکھیے۔" میں نے اخلاقاً کہا اور اس کے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرے اور اس کے

درمیان ایک میز تھی۔

"شکریہ مس مابالا!" یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گیا۔ وہ انگریزی ہی میں بات کر رہا تھا۔ "میں نے سوچا' شام کی چائے تمہارے ساتھ پی جائے۔ صبح تو تم نے انکار کر دیا تھا' میرے یہاں چائے پینے سے۔ اس کے علاوہ تم سے ایک بات بھی کرنا تھی۔"

"میں آپ کے لئے چائے منگواتی ہوں۔" میں نے کہا۔ پھر شیتل کو آواز دی۔ وہ آ گئی تو میں نے اس سے چائے اور پھل لانے کو کہا۔ ڈیسوزا بہرحال میرے گھر آیا تھا اور اس نے خود چائے کے لئے کہا تھا۔ میں اسے چائے پلائے بغیر ہی ٹرخا دیتی تو مناسب نہیں تھا۔

شیتل چلی گئی تو ڈیسوزا کہنے لگا۔ "آج رات کو تمہارا کوئی پروگرام تو نہیں؟"

"کیسا پروگرام؟" میں نے سوال کیا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ کہیں آنا جانا تو نہیں؟ کسی ہوٹل یا کلب میں انجوائے کرنے۔ جیسا کہ آج دوپہر کو تم سیر و تفریح کے لئے کہہ رہی تھیں۔"

"نہیں' فی الحال تو کوئی ایسا پروگرام نہیں۔" میں نے جواب دیا' پھر پوچھا۔ "کیا آپ کو یہی بات کرنا تھی؟"

"ہاں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "آج میرے ساتھ نائٹ کلب چلو' تم پارک ہوٹل کے نائٹ کلب میں گئی ہو کبھی؟ وہاں سے اچھا اسٹرپ ٹیز ڈانس کہیں نہیں ہوتا۔"

میں نے اب تک کوئی نائٹ کلب نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس ڈانس کا ذکر سنا تھا۔ اسی لئے بولی۔ "یہ کیسا ڈانس ہوتا ہے؟"

"حیرت ہے کہ تم نے ابھی تک اسٹرپ ٹیز ڈانس نہیں دیکھا۔ پھر تو تم میڈ ہاؤس میں کبھی نہیں گئی ہو گی۔" اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"ہاں نہیں گئی۔" میں نے اعتراف کر لیا' پھر کہا۔ "ویسے میں سوچ رہی تھی کبھی جانے کو کہ دیکھوں وہاں کیا ہوتا ہے۔ شہزاد کے ساتھ کسی روز جاؤں گی۔" اور اس طرح میں نے اپنی دانست میں ڈیسوزا کی پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔

"وہی جو تمہارا نوکر ہے؟ اس کے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔

"میں سمجھی نہیں مسٹر ڈیسوزا کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ اس وقت تک مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

"مس مابالا! تم بہت بھولی ہو۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "نوکروں کے ساتھ نائٹ کلب نہیں جاتے۔"

"تو میں آپ کے ساتھ بھی نہیں جاؤں گی۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "آپ کی دعوت کا شکریہ۔"

"خیر تمہاری مرضی......... ویسے میں تو تم سے ایک بات ضرور کہوں گا مس کہ دولت عیش کرنے کے لئے ہوتی ہے تجوری میں سڑانے کے لئے نہیں۔ جہاں تک تمہارے بارے میں میرا اندازہ ہے تم بھی دولت مند ہو' تمہارا تعلق کسی بڑے دولت مند خاندان سے ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم کلکتے کے اس

علاقے میں سکونت اختیار نہ کرتیں۔ یہاں کوئی کوٹھی خرید کر رہنا اور پھر بیک وقت پانچ ملازمین رکھنا' ان کے مصارف برداشت کرنا کسی دولت مند ہی کے بس کی بات ہے۔"

"میں دولت مند ہوں یا نہیں' اس بات سے آپ کا کیا واسطہ مسٹر ڈیسوزا! دوسروں کی ذاتی زندگی میں مداخلت کرنا' ان کی ٹوہ میں رہنا' آپ کے خیال میں کیا یہ کوئی غیر مہذب بات نہیں؟ میری کوٹھی میں کتنے ملازمین ہیں اور میں ان کے اخراجات کیوں اور کس طرح برداشت کرتی ہوں کیا یہ آپ کا مسئلہ ہے؟ میں کہاں جاتی ہوں' کہاں نہیں' اس سے آپ کو کیا مطلب؟ میں نے اس شہر میں کیا دیکھا ہے' کیا نہیں' آپ کا اس سے کیا تعلق؟ میں کسے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتی ہوں' آپ کون ہیں مجھے اس سلسلے میں مشورہ دینے والے؟ بُرا نہ مانیئے گا مسٹر ڈیسوزا! آج صبح سے میں آپ کے غیر شائستہ رویے کو برداشت کر رہی ہوں' صرف یہ سوچ کر کہ آپ کی دل آزاری نہ ہو لیکن آپ حد سے زیادہ ہی بڑھتے جا رہے ہیں۔ میں کسی کا اپنے ساتھ اس طرح بے تکلف ہونا قطعی پسند نہیں کرتی اور نہ میں آپ کو اس کی اجازت دوں گی۔ میری اور آپ کی عمر میں بھی خاصا فرق ہے' سو ہم ایک دوسرے کے دوست بھی نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سن لیں کہ میں آپ کو اپنا بزرگ یا سرپرست تسلیم کرنے پر بھی آمادہ نہیں۔ آپ کو ہرگز یہ حق نہیں کہ مجھے بچوں کی طرح کوئی بات سمجھانے کی کوشش کریں۔ پڑوسی ہونے کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ آپ اس سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے مراسم بڑھائیں۔ آپ ہی کی طرح یہاں دوسرے لوگ بھی میرے پڑوسی ہیں' ان میں سے تو کوئی بھی مجھ پر آپ کی طرح مسلط نہیں ہوا۔ آپ میرے گھر تشریف لائے' اسی لئے میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسی کوئی بات کہوں لیکن آپ نے خود مجھے اس پر مجبور کر دیا۔" میں نے ایک ہی مرتبہ سب کچھ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔

ڈیسوزا اس دوران میں خاموشی کے ساتھ میری باتیں سنتا رہا اور درمیان میں کچھ نہیں بولا۔ ہاں میں نے اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوتے ضرور دیکھی۔ میں نے بہرحال اسے شائستہ لہجے میں اپنی حیثیت کا احساس دلا دیا تھا۔ اسی کے ساتھ اسے میں نے ذلیل کرنے میں بھی کوئی کمی نہیں کی تھی۔

وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسی وقت شیتل ٹرے میں چائے' خشک میوے اور پھل لے آئی۔ ٹرے اس نے درمیانی میز پر رکھ دی اور چلی گئی۔

"سوری مس مابالا!" ڈیسوزا عجیب سے لہجے میں بولا۔

"کوئی بات نہیں' چائے پیجئے۔ آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔" میں نے چائے کا کپ ٹرے سے اٹھاتے ہوئے اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے "شکریہ" کہہ کر کپ لے لیا۔ پھر خلاف توقع سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "وہاٹ ڈو یو مین مس؟" یعنی کیا مطلب ہے تمہارا؟ اس کا لہجہ اب قطعی بدلا ہوا تھا۔ "کیسی غلطی؟ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ بہت جلد تمہیں اس بات کا علم ہو جائے گا۔" اس کا انداز دھمکی دینے کا سا تھا۔

"مائنڈ یور لینگویج مسٹر ڈیسوزا! آئی ایم ناٹ یور سلیو۔" میں نے کہا کہ اپنی زبان قابو میں رکھو' میں تمہاری غلام نہیں ہوں۔

"پھر کون ہو تم؟ کیا تمہارا تعلق ہندوستان سے نہیں؟" اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

براہ راست ڈیسوزا کے اس سوال نے وقتی طور پر مجھے گڑبڑا تو دیا' مگر جلد ہی میں نے خود پر قابو پا لیا اور بولی۔ "آج دوپہر کو ریس کورس میں بھی شاید میں نے آپ سے کہا تھا مسٹر ڈیسوزا کہ ضروری نہیں ہر سوال کا جواب دیا جائے۔" میری آواز میں طنز تھا۔ "آپ چائے پیئیں اور تشریف لے جائیں۔"

"او کے۔" وہ بولا اور معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "آئی ول سی یو مس!" یہ کہتے ہی اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے جانے سے نہیں روکا۔ نہ اس کی یہ دھمکی مجھ پر اثر انداز ہوئی کہ میں تمہیں دیکھ لوں گا۔

"وش یو گڈ لک مسٹر ڈیسوزا!" میں نے اسے مزید چڑانے کے لئے کہا۔

"تھینک یو!" وہ بولا اور پھر نشست گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ "تھینک یو" کہنے میں کسی بھی موقع پر انگریز بخل سے کام نہیں لیتا۔

چلو کسی طرح دفع تو ہوا میں نے سوچا۔ اب یقیناً یہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ چائے بھی اس نے دو ایک گھونٹ ہی پی تھی۔ میں نے شیتل کو بلا کر شہزاد کے بارے میں پوچھا۔ پھر کہا کہ اسے میرے پاس بھیج دو۔

"یہ سب لے جاؤں میم!" شیتل نے ٹرے کی طرف اشارہ کی۔

"ہاں لے جاؤ' میں صرف چائے پیوں گی۔" میں نے جواب دیا اور ٹرے سے صرف اپنی چائے کا کپ اٹھا لیا۔

شیتل ٹرے اٹھا کر لے گئی اور پھر ذرا ہی دیر بعد شہزاد نشست گاہ میں آ گیا۔

"نریندرا کا اب کیا حال ہے؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"وہ اب ٹھیک ہے خاتون!" شہزاد نے جواب دیا۔ "ولیم کو اب میں نے پھاٹک سے ہٹا دیا ہے۔"

"اچھا کیا۔" میں نے اطمینان ظاہر کیا' پھر بولی۔ "آج رات کہیں گھومنے پھرنے چلتے ہیں' کیا خیال ہے تمہارا؟ .... بیٹھ جاؤ۔" میں نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "کسی نائٹ کلب میں چلتے ہیں۔"

"جی .... جی خاتون!" شہزاد کے چہرے پر مجھے انتہائی حیرت کے آثار نظر آئے۔ جیسے میں نے کوئی خلاف توقع بات کہہ دی ہو۔ "آپ .... آپ خاتون' نائٹ کلب جائیں گی .... مم .... میں .... اور میں بھی آپ کے ساتھ.........." وہ شاید کوشش کے باوجود اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"تم عجیب آدمی ہو۔ آج صبح ریس کورس چلتے ہوئے بھی تم اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کیا بگڑ گیا میرا وہاں جا کر؟"

"مم .... مگر خاتون! ریس کورس اور نائٹ کلب میں بہت فرق ہے۔ آپ کا وہاں جانا ہرگز

مناسب نہیں۔"

"فضول باتیں نہ کرو' بس چلنا ہے مجھے وہاں۔" میرے لہجے میں حکم تھا۔ "وہاں مجھے اسٹرپ ٹیز ڈانس دیکھنا ہے۔ پھر کسی روز میڈ ہاؤس بھی چلیں گے۔" یہ سب کچھ میں ان معلومات کی روشنی میں کہہ رہی تھی جو مجھے ڈیسوزا سے حاصل ہوئی تھیں۔

شہزاد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ ہونقوں کی طرح میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس پر میں ذرا چونکی۔

"کیا ہے شہزاد! تم اتنے حیران و پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

چند لمحے توقف کے بعد اس نے بمشکل شاید خود پر قابو پا کے پوچھا۔ "آپ .... خاتون! کیا آپ پہلے کبھی کسی نائٹ کلب میں گئی ہیں؟"

"گئی ہوتی تو جانے کو کیوں کہتی؟" میں نے جواب دیا۔

اس پر مجھے شہزاد مطمئن سا دکھائی دیا۔ پھر اس نے نظریں نیچی کر کے ڈھکے چھپے الفاظ میں نائٹ کلب' اسٹرپ ٹیز ڈانس اور میڈ ہاؤس کے بارے میں بتایا۔ مجھے شہزاد سے جو کچھ معلوم ہوا' اسے سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ اس سے ڈیسوزا کا چہرہ میرے سامنے بے نقاب ہو گیا تھا۔ میں اب سمجھ چکی تھی کہ وہ مجھے کس راہ پر لگانا چاہتا تھا۔ اسٹرپ ٹیز ڈانس دراصل عورت کی بے حیائی کا تماشا تھا۔ رقص کرتے ہوئے رقاصہ اسٹیج پر موسیقی کی لے کے ساتھ رفتہ رفتہ بے لباسی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دوران میں روشنیوں کے دائرے اس کے جسم پر مرکوز رہتے اور پھر جب رقاصہ حیا سوزی کی آخری منزل پر پہنچ جاتی تو پردہ گر جاتا اور تماشائی اس شرمناک تماشے کو دیکھ کر تالیاں بجانے لگتے۔ ہال میں روشنی کر دی جاتی جو رقص کے دوران میں تاریک پڑا ہوتا۔ شہزاد نے کبھی خود بھی یہ رقص نہیں دیکھا تھا۔ اس کی معلومات کا ذریعہ دوست احباب تھے۔ مردوں کا قبیلہ عورتوں کو یوں بھی برسر عام تماشا بنا سکتا ہے' یہ بات بہرحال مہذب دنیا کے حوالے سے میرے لئے نئی ہی تھی۔ یہ نائٹ کلب' رقص و موسیقی کی آڑ میں ایک طرح سے عیاشی کے اڈے ہی تھے۔ جہاں دور ساغر بھی چلتا اور رقص حسن کی بھی نمائش ہوتی۔ "میڈ ہاؤس" اس سے بھی پست جگہ تھی کہ جہاں حسن بے لباس کو محو رقص دیکھنے لوگ جاتے تھے۔ میں نے قبیلہ کبیت کے لعنتی سردار حسیف کی کنیزوں کو نیم برہنگی کے عالم میں وحشیانہ رقص کرتے دیکھا تھا۔ بے حجابانہ رقص' یہاں معاملہ اس سے بھی دو قدم آگے کا تھا۔ مردوں کے ہاتھوں عورتوں کی یہ تذلیل بھلا میری روح کیسے گوارا کر لیتی۔ میں ہموار میدانوں کی اس دنیا کے رواج تو نہیں بدل سکتی تھی' مگر خود ان رواجوں کا حصہ بن جانا مجھے بہرحال قبول نہیں تھا۔ ایک عورت ہونے کے ناتے میں یہ سب کچھ سوچنے میں شاید حق بجانب تھی۔

شہزاد کو یقیناً یہ علم ہو گا کہ میں نے لاعلمی کے سبب نائٹ کلب جانے اور اسٹرپ ٹیز ڈانس دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اسی لئے اس سے صرف اتنا ہی کہا۔ "کچھ چیزوں کا نہ دیکھنا بھی بہتر ہوتا ہے۔ سو پروگرام کینسل۔"

میری بات سن کر شہزاد کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ پھر وہ بولا۔ "اگر آپ کہیں تو کل نیشنل میوزیم دیکھنے چلیں۔"

"وہاں کیا ہے؟" میں نے معلوم کیا۔

"آپ نے فراعنہ مصر کے بارے میں تو سنا ہی ہو گا۔ انہی میں سے ایک کی ممی وہاں محفوظ ہے۔" شہزاد نے جواب دیا۔

"ممی .... یہ کیا ہوتی ہے؟" میں نے سوال کیا۔ مجھے نہ تو فراعنہ مصر کے بارے میں کچھ معلوم تھا' نہ ان کی ممیوں کا ذکر اس وقت تک سنا تھا۔

میرے سوال پر شہزاد نے قدرے حیرت ظاہر کی' پھر مجھے بتانے لگا۔ "قدیم مصر کے لوگ اپنے بادشاہوں کو فرعون کہتے تھے۔ اسی کی جمع فراعنہ ہے۔ مصر والے اپنے انہی حکمرانوں کی لاشوں کو ایک خاص مسالا لگا کر محفوظ کر لیتے تھے اور انہی کو ممی کہا جاتا ہے۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود وہ لاشیں محفوظ ہیں۔"

شہزاد کی بات پر مجھے یقین نہ آیا۔ میرے خیال میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے شک کا اظہار نہیں کیا اور بولی۔ "اچھا کل صبح چلیں گے۔"

"چورنگی روڈ پر وہ عجائب گھر ایک قدیم عمارت میں واقع ہے۔" شہزاد نے محل وقوع بتایا۔

"پھر تو دھرم تلے ہی کے علاقے میں ہوا' یہ اور بھی اچھا ہے۔ صبح یاد دلانا مجھے۔"

شہزاد نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس وقت تک میں چائے پی چکی تھی۔ اس لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کہیں ٹہلنے یا گھومنے پھرنے جاؤں مگر اپنے ملازمین کے خیال سے رک گئی۔ میری غیر موجودگی میں شیطان صفت سادھو انہیں آ کے کسی پریشانی میں مبتلا کر سکتا تھا جو میں نہیں چاہتی تھی۔ وہ غریب تو پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے۔ میں کوٹھی میں رہتی تو ان کی ہمت بندھی رہتی۔

اس شام ڈیسوزا کی دھمکی تو میں نے وقتی طور پر نظرانداز کر دی لیکن اس کے چند الفاظ دیر تک میری سماعت میں گونجتے رہے۔ بنیادی غلطی میری ہی تھی۔ مجھے اس سلسلے میں محتاط رہنا چاہئے تھا۔ غصے میں میرے منہ سے وہ بات نکل گئی تھی جس کے نتیجے میں مجھے وہ الفاظ سننا پڑے تھے۔ ایک مرتبہ شہزاد کے سامنے بھی ایسی ہی کوئی بات روا روی میں میری زبان پر آ گئی تھی کہ میرا تعلق اس ملک سے نہیں۔ پھر میں نے بات بنا دی تھی' مگر ڈیسوزا سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے اس کے سوا کوئی اور راستہ نظر نہیں آیا کہ اس کے سوال کا جواب دینے ہی سے انکار کر دوں۔ میں نے کہا تھا کہ میں تمہاری غلام نہیں ہوں اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اس پر ڈیسوزا نے براہ راست یہ الفاظ کہے تھے کہ پھر کون ہو تم' کیا تمہارا تعلق ہندوستان سے نہیں؟

اب تک میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا کہ اگر مجھ سے یہ پوچھا گیا تو میرے پاس کیا جواب ہو گا؟ میں ہندوستان میں کیسے اور کہاں سے آئی؟ بدیسی حکمراں مجھ سے یہ سوال کر سکتے تھے۔ ڈیسوزا کا تعلق بھی تو حکمرانوں کی قوم سے تھا۔ اس پس منظر میں ڈیسوزا کی دھمکی معنی خیز تھی۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ

بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کون تھا' کیا تھا؟ اس کا تعلق برطانوی تاجر برادری سے بھی ہو سکتا تھا جو ہندوستان کو لوٹ کر اپنے ملک کے خزانے بھر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ حکمران طبقے کے کسی محکمے سے بھی وابستہ ہو سکتا تھا۔ مجھے اپنے دوسرے خیال میں زیادہ وزن محسوس نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر ڈیسوزا کا تعلق کسی سرکاری شعبے سے ہوتا تو وہ مجھے ریس کورس میں نظر نہ آیا ہوتا۔ وہ چھٹی کا دن بھی نہیں تھا کہ ڈیسوزا دفتر نہ جاتا۔

اب تک جو بات راز تھی اس کے لئے مزید راز رہنا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے لئے یہی امر تشویش کا سبب بنا ہوا تھا۔

مجھ سے ایک اور بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ ہندوستان آ کر میں نے اپنا اصل نام نہیں چھپایا تھا۔ اس کا تدارک اسی طرح ممکن تھا کہ میں وہ شہر ہی چھوڑ دیتی۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ میں کہیں بھی اور کسی بھی نئے نام سے ازسرنو اپنی بساط حیات جما سکتی تھی' مگر میرے لئے ایسا کرنا سرگوشیوں کے منافی ہوتا' مجھے اس ملک کے خطہ بنگال تک عظیم مہین کی کاہنہ خیرہ نے پہنچایا تھا۔ میں اگر وہ شہر چھوڑ کر اب کہیں اور بود و باش اختیار کر لیتی تو اس میں نیک روح عظیم مہین کی مرضی شامل نہ ہوتی۔ اتنے بڑے ملک میں اسی خطے اور پھر اسی شہر تک میری رہنمائی کا کوئی نہ کوئی سبب تو تھا۔ میں اس سے ناآشنا سہی مگر وہ نیک روح تو اس سے آگاہ تھی کہ جس کے ایما اور مدد سے میں یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ میں جن سوالوں سے دوچار تھی' اسی رات مجھے اس کا جواب مل گیا۔

☆======☆======☆

میں خواب اور بیداری کی ملی جلی کیفیت میں تھی اور ابھی نیند نے میری آنکھوں میں اپنے جال بنانا شروع کئے ہی تھے کہ مجھے ایک نئے پُراسرار تجربے سے گزرنا پڑا۔ میری آنکھوں نے بڑے عجیب مناظر دیکھے۔ میری بند آنکھوں نے ایک بوڑھے ترک سپہ سالار کو گھوڑے پر سوار دیکھا۔ وہ میدان جنگ میں اپنی شجاعت کے کارنامے دکھا رہا تھا۔ پھر مجھے پُراسرار سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ "اسے پہچان لو اے معبلہ کہ یہ وہ شخص ہے کہ جس نے ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط سے پہلے مغلیہ حکومت کے دور زوال میں دو سازشی بھائیوں کے سر پُر غرور کو تلوار کی نوک سے جھکا دیا۔ وہ دونوں سازشی بھائی کہ جنہوں نے مغل بادشاہوں کو یرغمال بنا رکھا تھا اور ہندوستان کی تاریخ انہیں سادات باریہہ کے نام سے جانتی ہے۔ خاندان مغلیہ کی سلطنت ازسرنو قائم کرنے والا یہی تھا کہ جسے تُو جنوبی ہند کے ایک خطے دکن میں داد شجاعت دیتے دیکھ رہی ہے۔ اس ترک امیر کا نام آصف جاہ اور خطاب نظام الملک تھا۔ یہی وہ بلند حوصلہ اور بیدار مغز امیر تھا کہ جس نے سلطنت مغلیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو تھام رکھا تھا۔ سادات باریہہ کی فتنہ انگیزیوں سے ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے تک یہی بوڑھا تورانی سردار' مغل دربار کے سامنے سینہ سپر رہا۔ اگر یہ سردار مغلیہ تاجدار ابوالمظفر ناصرالدین محمد شاہ کے عہد میں نہ ہوتا تو مرہٹے پورے جنوبی ہند پر قابض ہو جاتے۔ اے معبلہ! یہ تیرے لئے اس ملک کی گزشتہ تاریخ کا سبق ہے۔ سن کہ مغل سلطنت کے زوال کے بعد بھی اسی ترک سپہ سالار کی حکمت و تدبیر کی وجہ سے جنوبی ہند میں عرصہ دراز تک

مسلمانوں کا اقتدار قائم رہا۔ میسور کی سلطنت شمالی ارکاٹ کے مسلمان ناظم اور دکن کی آصف جاہی سلطنت اسی بوڑھے سردار کی فیض رسانیاں ہیں۔ اب بھی کہ جب سارے ہندوستان پر تقریباً انگریزوں کی حکمرانی ہے' دکن ہندوستان ہی کا ایک حصہ ہونے کے باوجود غلامی سے آزاد ہے۔ سو اس میں تیرے لئے ایک اشارہ ہے۔ اگر تُو سمجھ سکے' پر اسی کو اپنی اصل نہ جان لینا۔ اب سے تجھے آئندہ کے ساتھ گزشتہ کی تعلیم بھی دی جاتی رہے گی۔ تاریخ پڑھا کر کہ اس سے تیری آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھیں گے اور سن کہ خیر و شر کی جنگ شروع ہو چکی ہے اور تُو آزمائش میں ڈال دی گئی ہے۔"

سرگوشیاں معدوم ہوتے ہی میرے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے سرگوشیوں میں جو الفاظ سنے تھے اب ان پر غور کر کے نتائج اخذ کر رہی تھی۔ خیر و شر کی جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کا اندازہ میں نے پہلے ہی کر لیا تھا۔

میں ابھی سنائی دینے والی سرگوشیوں کے الفاظ پر غور کر رہی تھی کہ معاً چونک اٹھی۔ رات کا وہ تقریباً نصف پہر ہو گا۔ میں نے واضح طور پر ایسی آوازیں سنی تھیں جیسے کوئی کھڑاؤں پہنے میری خواب گاہ کے باہر چل رہا ہو۔ میں ایک دم سے اپنے بستر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ خواب گاہ میں اندھیرا تھا۔ مگر اب میرے اندر وہ پُراسرار قوت بیدار ہو چکی تھی کہ اندھیرا میرے لئے بے معنی تھا۔ میں اندھیرے میں بھی روز روشن کی طرح دیکھ رہی تھی۔

خواب گاہ کا دروازہ کھول کر میں دبے پاؤں باہر آئی۔ کھڑاؤں کی مخصوص آواز اب بھی مجھے سنائی دے رہی تھی پھر مجھے چمٹا بجنے کی آواز بھی سنائی دی۔ میں آواز کی سمت لپکی اور کوٹھی کا صحن عبور کرتے ہوئے عقبی دروازے تک پہنچ گئی۔ اب تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میری سماعت کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔ تو مجھے محسوس ہوا' وہ آواز کوٹھی کے باہر سے سنائی دے رہی تھی۔ میں نے تیزی سے عقبی دروازہ کھولا تو گلی میں دائیں جانب خاصے فاصلے پر مجھے مشتبہ سادھو کا ہیولا نظر آیا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اب میں تجھے بچ کر جانے نہیں دوں گی۔ پھر میں پنجوں کے بل اس سادھو کے ہیولے کی طرف دوڑی۔ معلوم نہیں اس نے کیسے محسوس کر لیا کہ میں اس کے تعاقب میں ہوں۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر تیزی سے جھکا۔ دونوں کھڑاؤں کو اس نے اپنی جھولی میں ڈالا اور پھر دوڑنے لگا۔ اس وقت مجھے قطعی یہ احساس نہیں تھا کہ میں اپنی کوٹھی کا عقبی دروازہ کھلا چھوڑ آئی ہوں۔ مجھ پر تو بس یہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح اس سادھو کو پکڑ لوں۔

کئی گلیوں سے گزر کر میں اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی چورنگی روڈ پر نکل آئی۔ اب تک وہ کمینہ میرے ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا۔ چورنگی روڈ عبور کر کے وہ اس وسیع و عریض میدان کی طرف دوڑنے لگا کہ جس کے ایک بڑے حصے پر درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان درختوں کی دائیں جانب کچھ فاصلے پر مِن ٹرام ڈپو تھا اور بائیں جانب وسیع سبزہ زار تھے کہ جو وکٹوریہ میموریل تک چلے گئے تھے۔

وہاں مکمل تاریکی تھی' مگر مجھے اپنے اندر بیدار ہونے والی پُراسرار قوت کی وجہ سے سادھو کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ وہ درختوں کے جھنڈ کے درمیان سے یوں گزر رہا تھا جیسے اسے بھی میری طرح اندھیرے

میں نظر آ رہا ہو۔ اب اس نے مجھے شاید چڑانے کے لئے بھاگتے ہوئے چمٹا بجانا بھی شروع کر دیا تھا۔

بہت جلد میں نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ دانستہ درختوں کے اس جھنڈ سے نہیں نکل رہا اور مجھے وہیں چک پھیریاں دے رہا ہے۔ مسلسل اتنی دور اور دیر تک بھاگنے کی وجہ سے اب میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ سادھو مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر جیسے ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔

یقیناً یہ مجھے تھکا کر شکار کرے گا' میں نے سوچا۔ اسی کے ساتھ میں رک گئی اور پھر ایک پیڑ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ میں اب لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

"تھک گئی دیوی مائی!" میری سماعت میں سادھو کے یہ الفاظ کسی تیز نشتر کی طرح اتر گئے۔ وہ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا عجیب بے ہودہ حرکتیں کر رہا تھا۔ ایسی حرکتیں کہ جن کا بیان شائستگی کی حدود میں نہیں آتا۔

"اگر تُو .... اتنا ہی دلیر ہے تو .... تو پھر بھاگ کیوں رہا ہے؟" میں ہانپتے ہوئے غصے کے سبب چیخ اٹھی۔

"ترنت (جلد ہی) اس کا تجھے گیان ہو جائے گا دیوی مائی! پرنتو (مگر) اس سے تُو اپنے درشن کی بھکشا دیتی رہ۔" سادھو نے یہ کہہ کر دوبارہ فحش حرکات شروع کر دیں۔ "دیکھ دیوی مائی کہ تیرے بھیتر کی آنکھ پرکاشت (روشن) ہے اور میں تیرے سم مکھ (روبرو) ہوں۔"

شدید غصے کے سبب میرے سارے جسم میں بجلیاں سی دوڑنے لگیں۔ غالباً میرے وجود میں چھپی ہوئی ایک اور حیرت انگیز پُراسرار قوت بیدار ہونے لگی تھی' کسی بھی شے کو جلا دینے کی قوت۔ عین اسی لمحے میں نے سادھو کو اچھل کر بھاگتے دیکھا۔ میں اس کے پیچھے دوڑی' مگر اچانک وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر میں دیر تک درختوں کے اس جھنڈ میں بھٹکتی رہی لیکن سادھو نظر نہیں آیا۔ اب خود بخود میرے اندر بجلیوں کی گردش تھم چکی تھی۔ اس مرتبہ میری آنکھوں سے تیز روشنی خارج نہیں ہوئی تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ میرا ہدف غائب، ہو گیا تھا۔

میں تھک ہار کر بوجھل قدموں سے واپسی کے لئے مڑی اور کچھ ہی دیر کے بعد درختوں کے اس جھنڈ سے نکل آئی۔ اندھیرے میں دیکھنے کی قوت بھی اب میرے وجود میں سو چکی تھی کہ اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔

جب میں ننگے پاؤں اپنی کوٹھی کے عقبی دروازے تک پہنچی تو میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ کوٹھی روشن تھی اور اندر ایک چیخ پکار سی مچی ہوئی تھی۔ اس چیخ و پکار میں نمایاں آواز میری بنگالی ملازمہ شیتل کی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ انتہائی خوفزدہ ہو کر چیخ رہی ہو۔

عقبی دروازہ اب تک کھلا ہوا تھا۔ میں لپک کر اندر داخل ہو گئی۔ میرے تمام ملازمین کوٹھی کے صحن میں جمع تھے۔

"کیا ہو گیا؟" میں نے بلند آواز میں اپنے ملازمین کو مخاطب کیا وہ کچھ ہی فاصلے پر صحن میں بدحواس سے کھڑے تھے۔

"میم .... میم!" شیتل پھر چیخ اٹھی۔

"چیخو مت!" میں نے اسے ڈانٹ دیا اور پھر پلٹ کر عقبی دروازہ بند کیا۔ شیتل خاموش ہو گئی۔

"قتل .... قتل ہو گیا خاتون!" شہزاد کی ہیجان خیز آواز سنائی دی۔

"قتل؟" میں پلٹی۔ "کون قتل ہو گیا؟"

"مم .... یہ اسی سادھو کی لا .... لاش لگتی ہے اور .... اور اس کا سر غائب ہے۔" یہ خوفزدہ آواز ولیم کی تھی۔

یہ سن کر میرے اعصاب پر ایک چھناکا سا ہوا۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے ملازمین کے قریب پہنچ گئی کیوں کہ وہ سربریدہ لاش عقبی دروازے سے خاصے فاصلے پر صحن میں پڑی تھی۔ اسی وجہ سے میری نظر اس پر اب تک نہیں پڑ سکی تھی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اس لاش اور میرے درمیان ملازمین حائل تھے۔ لاش کے جسم پر جو لباس تھا اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ اسی مشتبہ سادھو کی لاش تھی۔ اس کی گردن کسی تیز دھار آلے سے کاٹی گئی تھی۔ کٹی ہوئی گردن سے خون اب بھی بہہ رہا تھا۔

"یہ ناممکن ہے۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑائی۔ "یہ اس سادھو کی لاش نہیں۔ کوئی اور .... یہ کوئی اور ہو گا۔"

"مم .... مگر کون .... کون خاتون! کک .... کون ہو سکتا ہے؟" شہزاد جو میرے قریب ہی کھڑا تھا' ہکلا کر بولا۔

"تم لوگ دور ہٹ جاؤ' لاش سے۔" میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

میرے ملازمین فوراً ایک طرف ہو گئے۔ میں اس لاش کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ میرے لئے وہ منظر کوئی ایسا ہولناک نہیں تھا۔ میں تو اب تک نہ جانے کتنی لاشیں دیکھ چکی تھی اور نہ جانے کتنے مجرم اور بدی کے ہرکارے خود میرے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ لاش اور اس کے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے میری نظر ان خون کے قطروں پر پڑی جو ایک جانب تسلسل کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ میں ان پر نظر جمائے اس طرف بڑھنے لگی۔ خون کے ان قطروں کے تعاقب میں آگے بڑھتے ہوئے میں راہداری سے گزر کر اپنی خواب گاہ کے دروازے تک پہنچ گئی۔

اپنی خواب گاہ میں داخل ہو کر میں نے جیسے ہی روشنی کی میری نظر سامنے ہی اپنے بستر پر پڑی۔ میں جہاں کھڑی تھی' چند لمحے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ مجھے پھر ایک ناقابل یقین منظر دکھائی دیا تھا۔ میری مسہری کے بستر پر مشتبہ سادھو کا کٹا ہوا سر پڑا تھا۔ خون کے قطرے مسہری تک جاتے نظر آئے تھے۔ میرے نزدیک یہ قطعی ناممکن بات تھی۔ بظاہر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے سادھو کو صحن میں لٹا کر اس کا سر کاٹا اور پھر وہ سر میری خواب گاہ میں موجود مسہری پر لا کے پھینک دیا۔ میں اسی سادھو کے تعاقب میں اپنی کوٹھی سے نکلی تھی اور پھر وہ درختوں کے جھنڈ میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ پھر وہ دوبارہ میری کوٹھی میں کیوں پہنچا اور کس نے اسے قتل کیا؟ میرے بستر کی چادر بھی خون آلود تھی۔

میں نے کچھ سوچ کر خواب گاہ کی بتی بجھا دی اور اس کا دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔

صحن میں پہنچ کر میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔ "صحن کی لائٹ آف کر دو۔" پھر اپنے تمام ملازمین کو میں نے نشست گاہ میں چلنے کا حکم دیا۔ میں اب ان سے اپنی غیر موجودگی میں پیش آنے والے واقعے کے متعلق پوچھ گچھ کرنا چاہتی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد وہ سب میرے سامنے نشست گاہ کے فرش پر بچھے قالین پر آ کے بیٹھ گئے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھی۔

میرے استفسار پر سب سے پہلے نیپالی گورکھا نریندرا بولا۔ "میم! میں نے ایک چیخ سنا اور سوتے سے اٹھ کھڑا۔ چیخ اندر سے آیا تھا۔ اسی سمے شہزاد بابو بھاگ کر اپنے کمرے سے نکلا اور پھر سب لوگ جاگ گیا۔ روشنی کیا اور ادھر آنگن میں لاش پڑا ملا۔ اسی وقت آپ آ گیا میم!"

"شہزاد! تمہاری آنکھ بھی کیا چیخ سن کر ہی کھلی تھی؟" میں نے شہزاد کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"مم .... مجھے یوں لگا تھا خاتون کہ .... کہ جیسے کوئی میری گردن دبا رہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی اور میں گھبرا کر باہر بھاگا تو .... تو نریندرا بھاگ کر اندر آتا دکھائی دیا۔" شہزاد خوفزدہ آواز میں بتانے لگا۔ "پھر اسی نے مجھے کسی کی چیخ کے بارے میں بتایا اور اس کے بعد ...."

"ٹھیک ہے۔" میں پُرسکون آواز میں بولی۔ "اس کے بعد تم نے بتیاں جلائی ہوں گی۔" شہزاد نے اقرار میں سر ہلایا تو میں شیتل کی طرف متوجہ ہوئی۔ میں نے اسے سمجھایا۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے بنگلہ زبان ہی میں مخاطب کیا تھا۔ "تم بتاؤ' تمہیں کب اور کیسے سادھو کے قتل کی خبر ہوئی؟"

شیتل نے بڑی مشکل سے زبان کھولی۔ اس کا بیان سب سے زیادہ چونکا دینے والا تھا۔ شیتل نے بتایا کہ سوتے سوتے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس سے کہہ رہا ہو' تمہاری میم نے سادھو کو قتل کر دیا ہے اور کوٹھی سے بھاگ گئی ہے۔ پھر وہ ڈر کے مارے چیختی ہوئی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔

"اس نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔" ولیم بول اٹھا۔ "میں بھی اس کی چیخ سن کر اسی وقت اپنے کمرے سے نکلا تھا۔"

"تم نے سادھو کی چیخ نہیں سنی تھی؟" میں نے معلوم کیا۔ میرا لہجہ اب بھی پُرسکون ہی تھا۔

پھر میری ایما پر رحیم ڈرتے ڈرتے بتانے لگا۔ "میم! میں نے خواب میں آپ کو دیکھا کہ سادھو کو صحن میں پچھاڑ کر ایک تیز چھری سے ذبح کر رہی ہیں۔ اسی ڈراؤنے خواب کو دیکھ کر میری آنکھ کھل گئی۔ اسی وقت باہر سے شیتل کے چیخنے چلانے کی آواز آئی اور میں نکلا تو........."

"بقیہ لوگوں کو بھی باہر موجود پایا۔" میں نے خود ہی اس کی بات پوری کر دی۔

"جی .... جی ہاں میم!" رحیم نے تصدیق کی۔

میں نے اپنے تمام ملازمین کے بیانات سن کر طویل سانس لیا۔ ان سب کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مگر ایک بات تقریباً مشترک تھی۔ وہ سبھی ایک ہی وقت میں بیدار ہوئے تھے۔ اگر کوئی فرق رہا ہو گا تو وہ چند لمحوں سے زیادہ نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اس مشتبہ سادھو کا قاتل نہیں ہو

سکتا تھا۔

غالباً میرے پُرسکون رہنے کی وجہ سے ملازمین کے حواس قدرے بحال نظر آنے لگے۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد شاید اسی لئے شہزاد نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ "مم .... مگر خاتون' آپ .... آپ کہاں .... کہاں چلی گئی تھیں؟"

"شیتل کا بیان سن تو چکے ہو تم' اتنی بنگلہ تو تمہیں بھی آتی ہو گی۔" میں آہستہ سے ہنس دی۔ "ظاہر ہے کہ میں سادھو کو قتل کر کے کوٹھی سے بھاگ گئی تھی۔"

اس پر شیتل رونے لگی اور مجھے یقین دلانے لگی کہ اسے ہرگز میرے قاتل ہونے کا شبہ نہیں تھا۔ اس کے خیال میں کسی نے اس پر جادو کر دیا تھا۔

"لیکن رحیم نے بھی تو مجھے خواب میں سادھو کو قتل کرتے دیکھا تھا۔" میں پھر مسکرا کر بولی۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں میم! خواب تو خواب ہوتے ہیں' ان کا حقیقت سے کیا تعلق؟" رحیم اپنی صفائی میں بول اٹھا۔

""اب میں بتاتی ہوں کہ میری آنکھ کیسے کھلی اور میں کہاں گئی تھی۔" میں ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ یوں لگا جیسے کوئی آہنی پھاٹک پر زور زور سے دستک دے رہا ہو۔ میں نے نریندرا سے کہا۔ "جاؤ دیکھو کون ہے۔ مگر میری اجازت کے بغیر گیٹ نہ کھولنا۔"

نریندرا اٹھ کر چلا گیا۔ کچھ دیر کو نشست گاہ میں خاموشی چھائی رہی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے؟ صبح ہونے میں ابھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میرے اس سوال کا جواب نریندرا کی واپسی پر مل گیا۔ وہ چہرے سے سخت گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"میم! .... پو .... پولیس آ گیا۔ وہ بولتا دروازہ کھولو۔ کیا کروں؟" نریندرا نے پوچھا۔

"پولیس!" چند لمحوں کو میں گھبرا سی گئی۔ اس وقت پولیس کی آمد میرے لئے غیر متوقع ہی تھی۔ اگر میرے ذہن کے کسی گوشے میں ذرا بھی یہ خیال ہوتا تو سب سے پہلے سادھو کی لاش کو ٹھکانے لگاتی۔ میں نے سادھو سے جو سوال کیا تھا' وہ مجھے یاد آیا اور پھر اس کا جواب بھی۔ طیش کے عالم میں سادھو سے میں نے کہا تھا کہ اگر تُو اتنا ہی دلیر ہے تو پھر بھاگ کیوں رہا ہے؟ سادھو نے جواب دیا تھا کہ مجھے جلد ہی اس کا علم ہو جائے گا۔ تو کیا مجھے قتل کے الزام میں پھنسانے کے لئے .... میں اس سے زیادہ نہ سوچ سکی۔ کیوں کہ مجھے قتل کے الزام میں پھنسانے کے لئے وہ سادھو خود زندگی کی سرحد عبور نہیں کر سکتا۔ چند ہی لمحوں میں یہ سارے خیالات انتہائی تیزی سے ساتھ میرے ذہن میں آئے اور پھر میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے نریندرا سے کہا۔ "گیٹ کھول کر پولیس کو اندر آنے دو' اسے یہیں لے آؤ۔"

نریندرا یہ جواب سن کر تقریباً دوڑتا ہوا نشست گاہ کے دروازے سے نکل گیا۔

میرے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ حالات جو بھی ہوں' ان کا مقابلہ کروں۔ پولیس کی آمد تک میں اس سلسلے میں بہت کچھ سوچ چکی تھی۔

میری نشست گاہ میں داخل ہونے والا ایک پستہ قد بنگالی پولیس انسپکٹر تھا۔ جس کے ہاتھ میں

ریوالور تھا۔ اس کے ساتھ تین پولیس والے تھے۔ وہ بھی مسلح ہی تھے۔

"آشن دادو!" میں نے پولیس انسپکٹر کو بنگلہ زبان میں مخاطب کیا کہ آؤ بھائی! انہی الفاظ کے ساتھ میں اس کا استقبال کرنے کے لئے کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

پولیس انسپکٹر کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔ اسے شاید مجھ سے اپنی مادری زبان سن کر تعجب ہوا تھا۔ میں اپنے رنگ و روپ اور لباس سے قطعی بنگالی نہیں لگتی تھی۔ کسی بھی خطے کی زبان اس کے باسیوں پر خوشگوار اثر ہی ڈالتی ہے۔ سو پولیس انسپکٹر کے سیاہ چہرے کا تناؤ کچھ کم ہو گیا۔

"ہمیں ایک معزز شہری نے یہ اطلاع دی ہے کہ آپ کی کوٹھی میں کسی کا قتل کر دیا گیا ہے۔" پولیس انسپکٹر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ وہ بھی بنگلہ زبان بولنے لگا۔

"بوشن!" میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ پھر بولی۔ "میں اور میرے تمام ملازمین اسی کمرے میں موجود ہیں۔ ہم میں سے نہ کسی کے پاس کوئی ہتھیار ہے' نہ کوئی یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ انسپکٹر! میں اسی لئے آپ سے یہ درخواست کروں گی کہ اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھ لیں۔"

کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنا ریوالور' ہولسٹر میں رکھ لیا' پھر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "کوٹھی کی تلاشی لو' میں یہیں بیٹھا ہوں۔"

"ٹھہریں انسپکٹر!" میں جلدی سے بولی۔ "اپنے سپاہیوں کو تلاشی لینے سے روک دیں۔"

"وہ کیوں؟" انسپکٹر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرنے لگے۔

"اس سے پہلے میں تلاشی کا وارنٹ دیکھنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اسی کے ساتھ یہ بھی سوال کروں گی کہ وہ معزز شہری کون ہے جس نے یہاں قتل کی اطلاع آپ کو دی ہے؟ آپ قانون کے محافظ ہیں تو سب سے پہلے خود آپ کو قانون کا احترام کرنا چاہئے۔ آپ کے پاس میری کوٹھی کی تلاشی لینے کا وارنٹ ہونا چاہئے۔"

میری بات سن کر انسپکٹر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور پھر وہ قدرے سخت آواز میں بولا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم قانون کا سبق دینے کی کوشش کرو گی۔ ورنہ میں یہاں قدم رکھتے ہی تمہیں اور تمہارے سارے ملازمین کو گرفتار کر لیتا۔ تمہیں شاید پولیس کے اختیارات کا علم نہیں۔ ہم مصدقہ اطلاع ملنے یا نہ ملنے دونوں صورتوں میں کسی کے گھر کی بھی تلاشی لے سکتے ہیں۔ شبہے میں کسی کو بھی گرفتار کر سکتے ہیں اور یہ معاملہ تو انتہائی سنگین نوعیت کا ہے۔ اس کے علاوہ اطلاع دینے والا بھی کوئی معمولی آدمی نہیں' تمہارا ہی ایک پڑوسی ہے جس نے تمہاری کوٹھی سے چیخ و پکار اور "قتل قتل" کی آوازیں سنی تھیں۔" سپاہی جو پہلے رک گئے تھے اپنے انسپکٹر کا اشارہ پاتے ہی نشست گاہ کے دروازے سے نکل گئے۔ شہزاد کو رہنمائی کے لئے وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

قتل کی اطلاع دینے والا میرا کوئی پڑوسی ہے اور وہ معمولی آدمی نہیں' یہ سنتے ہی میں انسپکٹر سے بولی۔ "وہ معزز شہری یقیناً ایک انگریز ڈیسوزا ہے۔"

انسپکٹر کو میں نے چونکتے دیکھا جس سے میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ میری بات کو نظرانداز کرتے

ہوئے اس نے پوچھا۔ "یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تمہارا نام معبلہ ہے' میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کہاں کی رہنے والی ہو؟ بنگال سے تو تمہارا تعلق نہیں ہو سکتا۔ بہت سے غیر بنگالی بھی تمہاری طرح بنگلہ بول لیتے ہیں۔"

"میرا تعلق ایک آزاد ریاست حیدر آباد دکن سے ہے۔ میں سلطنت دکن کے بانی نظام الملک آصف جاہ کے خاندان سے ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

میرا جواب سنتے ہی پولیس انسپکٹر کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ مرعوب سا نظر آنے لگا تھا۔

"تو تم .... آپ دکن کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مجھے .... مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔ پرنسس معبلہ!" پولیس انسپکٹر کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ "انگریز سرکار کے تو نظام دکن سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ پرنسس! آپ نے بنگلہ کب سیکھی؟ آپ تو بڑی اچھی بنگلہ بولتی ہیں۔"

"بچپن ہی سے مجھے مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق ہے۔ ہندوستان بھر میں بولی جانے والی تمام علاقائی زبانیں میں اسی طرح بول سکتی ہوں۔" میں مسکرا کر بولی۔ پولیس انسپکٹر یہ جاننے کے بعد کہ میرا تعلق کہاں سے اور کس خاندان سے ہے' میری مدح و ستائش پر اتر آیا تھا اور اس نے مجھے خود ہی پرنسس' یعنی شہزادی کہنا شروع کر دیا تھا۔ آج ہی رات کو میں نے جو پُراسرار سرگوشیاں سنی تھیں انہی سے مجھے یہ اشارہ ملا تھا۔ جس سوال کا جواب میں' ڈیسوزا کو نہیں دے سکی تھی' انسپکٹر کو بہت اطمینان سے اس سوال کا جواب دے دیا تھا۔ موجودہ صورت حال میں پولیس انسپکٹر اپنے جسم پر موجود وردی کے تحفظ کی خاطر میری ہر بات سکون و اطمینان سے سنتا۔ میں اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی خاطر پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار تھی۔ میں اسے یہ باور کراتی کہ اگر میرے ہی ہاتھوں سادھو کا قتل ہوا تھا تو ہرگز اس کا کٹا ہوا سر اپنی خواب گاہ میں نہ لاتی۔ سادھو کو کسی اور شخص نے قتل کر کے مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ جس وقت سادھو کو میری کوٹھی میں قتل کیا گیا' میں کوٹھی میں موجود نہیں تھی۔ اس کا سبب بیان کرنا بھی میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ میں کہہ سکتی تھی کہ اچانک ایک کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی اور مجھے کوٹھی میں کسی چور کے گھس آنے کا شبہ ہوا۔ جو درست تھا۔ چور عقبی دروازہ کھول کر بھاگا اور میں نے دھرم تلہ گراؤنڈ تک اس کا پیچھا کیا۔ وہ ہاتھ نہیں آیا تو میں لوٹ آئی اپنی کوٹھی کے عقبی دروازے سے واپس آنے کی تصدیق میں اپنے ملازمین سے بھی کرا سکتی تھی۔

ابھی پولیس انسپکٹر میری مدح سرائی ہی میں مصروف تھا کہ تینوں پولیس والے نشست گاہ میں داخل ہوئے اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ انہوں نے لاش صحن میں پڑی دیکھ لی ہو گی۔ اس کے علاوہ انہوں نے میری خواہ گاہ سے سادھو کا کٹا ہوا سر بھی برآمد کر لیا ہو گا۔ انہی تینوں پولیس والوں کے ساتھ شہزاد بھی تھا مگر اسی کے چہرے پر شدید حیرت او. خوف کے آثار تھے۔ وہ گم صم سا تھا۔

"سر!" ایک پولیس والے نے اپنے انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ "ہم نے پوری کوٹھی دیکھ لی' یہاں کوئی لاش نہیں ہے۔"

یہ اطلاع میرے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ میں نے بمشکل اپنے اضطراب کو ظاہر نہ

ہونے دیا۔ نشست گاہ میں میرے ملازم بھی جیسے تصویرِ حیرت بن گئے تھے۔

پولیس انسپکٹر مجھ سے معذرت کرنے لگا۔ "میں آپ کو زحمت دینے پر سخت شرمندہ ہوں پرنس! .... پھر بھی ایک بات پر مجھے ضرور حیرت ہے کہ جب میں یہاں آیا تو آپ اپنے تمام ملازمین کے ساتھ اس کمرے میں موجود تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی کوئی وجہ ضرور ہو گی۔ مگر میں یہ نہیں پوچھوں گا' مجھے یہ اختیار نہیں۔"

"لیکن انسپکٹر! میں تمہیں اس کی وجہ ضرور بتاؤں گی۔" میں نے مسکرا کر کہا اور پھر کوٹھی میں کسی چور کے گھس آنے کی کہانی بیان کر دی۔

"تو پھر اسی شور شرابے کو سن کر مسٹر ڈیسوزا شاید غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔" پولیس انسپکٹر نے جھونک میں آ کر قتل کی اطلاع دینے والے نام بھی بتا دیا۔ پھر بولا۔ "پرنس! میں ایک بار پھر آپ سے معافی چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کوئی بات نہیں انسپکٹر! .... اب آپ آ ہی گئے ہو تو چائے پی کر جانا۔" میں نے اخلاقاً کہہ دیا ورنہ تو میں چاہ رہی تھی وہ گھڑی کی چوتھائی میں چلا جائے۔

"شکریہ پرنس! میں اجازت چاہوں گا۔ آپ مجھے اپنا خادم سمجھیں پرنس! میرا نام سبود مکرجی ہے اور میں پولیس ہیڈ آفس میں ہوتا ہوں۔ میرے لائق کبھی کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد کیجئے گا۔ مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہو گی۔"

پھر سبود مکرجی اپنے سپاہیوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے باقاعدہ سیلوٹ بھی کیا تھا۔ اس کے سپاہیوں کی ایڑیاں بھی یہ دیکھ کر بج اٹھی تھیں۔ پولیس انسپکٹر اور سپاہیوں کے جاتے ہی میں ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں اب خود صحن اور اپنی خواب گاہ کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ سادھو کی لاش صرف میں نے ہی نہیں میرے تمام ملازمین نے دیکھی تھی۔ پُراسرار طور پر لاش کے غائب ہو جانے کی وجہ سے وہ سب ہی انتہائی دہشت زدہ نظر آ رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب میں نشست گاہ سے نکلی تو وہ سب بھی میرے ساتھ تھے۔

صحن میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہاں نہ اب سادھو کی سربریدہ لاش تھی' نہ کہیں خون کا ایک قطرہ نظر آ رہا تھا۔ پھر میں اپنی خواب گاہ میں آئی تو بستر کی چادر بھی خون آلود نہیں ملی اور نہ سادھو کا کٹا ہوا سر کہیں نظر آیا۔ میں دوبارہ باہر آ گئی جہاں برآمدے میں میرے ملازمین موجود تھے اور اسی پُراسرار واقعے پر دھیمی آوازوں میں اپنی اپنی رائے زنی کر رہے تھے۔ مجھے خواب گاہ سے نکلتے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔

"سنو!" میں نے اپنے ملازمین کو مخاطب کیا۔ "تم میں سے اب کوئی بھی کسی کے سامنے سادھو کی لاش کا ذکر اپنی زبان پر نہیں لائے گا۔"

"مم .... مگر میم' وہ .... وہ لاش غائب کہاں ہو گئی؟" ولیم ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"یہ سب بنگال کے جادو ٹونے کا چکر ہے۔" میں نے ملازمین کو مطمئن کرنے کے لئے کہا۔ "وہ لعنتی سادھو یقیناً کچھ شیطانی قوتوں کا مالک ہے جو معلوم نہیں کیوں اس کوٹھی کے چکر لگا رہا تھا۔ مگر اب تو ظاہر

ہے کہ وہ قتل ہو چکا ہے۔ اس سے ڈرنے کا کوئی سوال نہیں رہا۔ یہ سوال کہ اس کی لاش کہاں اور کس طرح غائب ہو گئی؟ تو یہ خدا ہی بہتر جانے کہ جو غیب سے اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ اسے گوڈ کہہ لو' پرماتما سمجھ لو یا کوئی اور نام دے لو۔ بات ایک ہی ہے۔ وہی ہے کہ جو اپنے نیک اور بے گناہ بندوں کو ہر مشکل' ہر عذاب سے بچا لیتا ہے۔"

"بے شک!" رحیم میری تائید میں سب سے پہلے بولا۔ "میم! آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ ہمیں اللہ کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اسی نے ہمیں بچا لیا ہے۔"

اس پر ولیم بھی اشارے سے صلیب کا نشان بنانے لگا۔ شینتل بولی۔ "ایشور کی آپ پر دیا (کرم) ہے میم!"

گورکھا' نریندرا البتہ اب تک سہما سہما سا تھا۔ میں نے اسے بھی سمجھایا اور پھر سب کو سو جانے کی تاکید کر کے اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔

ہر چند کہ تقریباً پوری رات مجھے جاگتے ہوئے گزری تھی' پھر بھی نیند آنکھوں سے جیسے روٹھی ہوئی تھی۔ ملازمین کو تو خیر میں نے کسی طرح مطمئن کر دیا تھا لیکن میرا اضطراب اپنی جگہ برقرار تھا۔ میرے ذہن پر جیسے سوالوں نے یورش کر دی تھی۔

آخر اس واقعے کا مقصد کیا تھا؟ اگر بدی کے ہرکارے مجھے قتل کے الزام میں پھنسوانا چاہتے تھے تو پھر اپنے اس مقصد میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکے؟ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو پھر ایک عظیم اور نیک روح نے کہ جسے میں مہین کے نام سے جانتی پہچانتی تھی' اس سلسلے میں میری مدد کی تھی۔ سادھو کی لاش خود بخود وہاں سے غائب نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر مجھے ساحر زعیم کی قید میں پیش آنے والا ایک واقعہ یاد آیا۔ مجھے اور نضار کو زعیم نے اپنے پہلے مسکن کے جس غار میں قید کیا تھا' اس کے باہر انتہائی گہری کھائی نظر آئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا تھا کہ وہ محض فریب نظر تھا۔ غار کے باہر حقیقتاً کھائی نہیں تھی۔ فریب نظر یا نظربندی ساحرانہ قوتوں ہی کا کمال ہے۔ دیکھنے والوں کو وہ منظر یا مناظر نظر آنے لگتے ہیں جو درحقیقت اپنا وجود نہیں رکھتے۔ جو واقعہ پیش آیا تھا اس میں بھی یہ امکان نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو مجھ پر کھل چکا تھا کہ سادھو شیطانی قوتوں کا مالک تھا' اس سے یہ توقع ممکن تھی تو کیا وہ اس طرح مجھ پر اپنی شیطانی قوتیں ظاہر کرنا چاہتا تھا' مگر کیوں؟ اس کی کوئی تو وجہ ہو گی۔ اپنے ادھورے خاکے کی پشت پر لکھے ہوئے الفاظ دیکھ کر مجھ پر یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ وہ سادھو کسی "بڑے مہاراج" کا آلہ کار بھی ہو سکتا تھا۔ میں تو ابھی تک اس سادھو ہی کے بارے میں کچھ نہیں جان سکی تھی۔ تو "بڑے مہاراج" کے متعلق کس طرح کوئی نتیجہ اخذ کر لیتی۔ پھر جب نیند سے میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں تو مجھے ڈیسوزا کا خیال آیا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانا چاہا تھا' مگر اسے ناکامی ہوئی تھی۔ ڈیسوزا کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر میں نے اس روز سونے سے پہلے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ اپنے اس فیصلے پر میں جلد از جلد عمل کرنا چاہتی تھی۔

☆======☆======☆

پھر میں دانستہ کئی روز تک اپنی کوٹھی سے نہیں نکلی۔ سادھو کی طرف سے میں کسی ممکنہ شیطانی حملے کی منتظر تھی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ نہ وہ سادھو نظر آیا، نہ مجھ پر کوئی ساحرانہ حملہ ہوا۔ اب میں اپنے اس فیصلے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی جو چند روز پہلے کیا تھا۔

اگلے ہی روز سے میں نے تنہا نکلنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں نے کالی گھاٹ کا رخ کیا۔ جس کا ذکر پہلے کر چکی ہوں۔ کلکتے کی اس نواحی بستی کے باشندے کہ جو ہندو تھے مجھے حیرت سے دیکھتے تھے۔ ان کی اس حیرت کا سبب میرے جسم پر موجود لباس ہی تھا۔ ایسا لباس ان کے حکمرانوں ہی کے جسموں پر نظر آتا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر یہ وضع قطع اختیار کی تھی۔ اپنے لباس اور گوری رنگت کی وجہ سے وہ مجھے کوئی "میم" ہی سمجھتے ہوں گے۔ یہ لباس زیب تن کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں آزادی کے ساتھ جہاں چاہوں گھوم پھر سکوں۔ مقامی باشندوں کی غلط فہمی دانستہ میں نے دور نہیں کی۔ میں اب اس شہر کے قدیم مندروں کے پھیرے لگا رہی تھی۔

ابھی مجھے تین چار دن ہی ہوئے تھے کہ میں نے اپنے اردگرد کچھ افراد کی نقل و حرکت کو محسوس کر لیا۔ یوں جیسے کچھ لوگ میری سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہ اجنبی لوگ کون تھے؟ میں اس سے آگاہ نہیں تھی۔ چہرے بدلتے رہتے تھے لیکن میری نگرانی بہرحال جاری تھی۔ اس سے میں ایک عجیب سی الجھن کا تو شکار رہنے لگی، مگر اپنی روش نہیں بدلی۔ مجھے جہاں بھی جانا ہوتا، ضرور جاتی۔ میں نے جس شخص کی تلاش کا فیصلہ کیا تھا اس پر قائم تھیں

دریائے ہگلی کے ایک کنارے دور تک کلکتہ شہر آباد تھا اور دوسرے کنارے ہاوڑہ شہر۔ ہاوڑہ چھوٹا سا قدیم شہر تھا اور یہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ میں نے اپنی تلاش کا دائرہ اس قدیم بستی یا شہر تک پھیلا دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں بھی بہت سے قدیم مندر تھے۔ ان قدیم مندروں سے میری دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ ان کے اطراف سادھوؤں کے ڈیرے ہوتے تھے۔ سادھو ان ڈیروں کے اندر اور باہر چلم میں دم لگاتے نظر آتے۔ گانجا کم خرچ نشہ تھا جو سادھوؤں میں خاصا مقبول تھا۔ یہ سوکھی ہوئی ہری پتی تھی۔ سادھو اسے چلم میں بھر کے پیتے تھے۔ گانجے کی بو چھوٹی الائچی سے مماثل تھی۔ اس لئے ناگوار نہیں ہوتی تھی۔ سادھوؤں کے ڈیروں سے گزرتے ہوئے مجھے یہ بو اکثر محسوس ہوتی۔

ہاوڑہ شہر اور کلکتے کے درمیان دریائے ہگلی پر ایک عظیم الشان لوہے کا پل بنا ہوا تھا۔ انجینئرنگ کا کمال یہ پل "ہاوڑہ برج" کہلاتا تھا۔ پل کے نیچے کوئی ستون نہیں تھا اور اس پر خاصی چوڑی سڑک بنائی گئی تھی۔ پل کے دونوں جانب آہنی پیادہ رو (فٹ پاتھ) بنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ٹرام لائن تھی۔ ہاوڑہ ریلوے سٹیشن پر اترنے کے بعد اسی پل کو عبور کر کے آنے والے کلکتے میں داخل ہوتے تھے۔

میں اس روز ہاوڑہ شہر سے لوٹ کر پیدل پل پر چلتی ہوئی دریا کا نظارہ کرتی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ وہ ایک پرانا مندر تھا جو ایک مرتبہ ادھر سے گزرتے ہوئے مجھے نظر آیا تھا۔ یہ مندر کلکتے کی طرف ہاوڑہ برج کے نیچے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے بنا ہوا تھا۔ یہاں بھی سادھوؤں کے ڈیرے تھے۔ اب تک میں اس مندر کو قریب سے نہیں دیکھ سکی تھی اور آج میرا یہی ارادہ تھا۔

برج کے اختتام پر دائیں جانب نیچے اترنے کے لئے آہنی سیڑھیاں تھیں۔ میں فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی انہی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس دن بھی میں نے اپنے تعاقب میں ایک شیروانی پوش کو دیکھ لیا تھا۔ جو اپنے سر پر ترکی ٹوپی لگائے ہوئے تھا۔ وہ ہاوڑے ہی سے میرے ساتھ ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں اس کی پرواہ کئے بغیر سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر نیچے اترنے لگی۔

نیچے آ کے دریا کے کنارے کنارے میں آگے بڑھتی رہی اور پھر سادھوؤں کے ڈیروں تک پہنچ گئی۔

"جے دیوی مائی!" اچانک میری سماعت سے ایک آشنا آواز ٹکرائی اور میں اچھل پڑی۔ سامنے ہی مجھے سادھوؤں کا ایک گروہ بیٹھا نظر آیا تھا۔ یہ آواز اسی گروہ میں موجود کسی سادھو کی تھی۔ انہی سادھوؤں کے درمیان مجھے وہ چہرہ نظر آ گیا کہ اتنے دن سے جس کی تلاش میں تھی۔ یہ میرے دشمن ژیان کا چہرہ تھا۔ میں آخر کار اپنی تلاش میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔ میری رگوں میں جیسے لہو سنسنانے لگا۔ پھر مجھے نہ وہ سادھو یاد رہا کہ جس کی آواز سن کر میں اچھل پڑی تھی اور نہ وہ شیروانی پوش کہ جو میرے تعاقب میں تھا۔

اپنی زندگی میں جن لوگوں سے میں نے نفرت کی انہی میں سے ایک ژیان بھی تھا۔ یہ وہی تھا کہ جس کی خاطر پہاڑوں سے اتر کر میں ہموار میدانوں کی طرف آئی تھی۔ وہی ژیان کہ جس کی کٹی ہوئی گردن پر دہکتا ہوا توا رکھ کر مجھے "رقص بسمل" دیکھنے کی تمنا تھی۔ اسی ژیان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں اپنے قابو میں نہیں رہی تھی۔ مجھے اتنے دن سے اسی کی تلاش تو تھی۔ ہر خطرے کا احساس میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے اس پر جست لگانے میں دیر نہیں کی۔ اسی لمحے میری سماعت سے مشتبہ سادھو کی آواز ٹکرائی۔ "جے دیوی مائی!"

ژیان میری گرفت میں آ کر کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس کئے۔ ژیان تو پھر نہ جانے کدھر گیا، ہاں میں ریت پر پڑی رہ گئی۔ میرے گرد سادھو حلقہ بنائے چمٹے بجا بجا کے رقص کر رہے تھے۔ میں ایک خواب کے سے عالم میں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ میرے اعصاب اس طرح شل ہوئے تھے کہ میں اپنے جسم کو حرکت دینے سے بھی قاصر تھی۔ معلوم نہیں کہ یہ "کھیل" کب تک جاری رہتا کہ رقص کرتے ہوئے انہی سادھوؤں میں سے ایک نے نعرہ لگایا۔ "بولو بجرنگ بلی کی..........."

"جے!" بقیہ سادھوؤں نے نعرے کا جواب دیا۔

"بولو رادھے شیام کی..........." کوئی اور سادھو پوری قوت سے چیخا۔

جواباً سادھوؤں نے پھر میری سماعت کو مجروح کیا۔ "جے!"

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میرے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ میرے اعصاب کسی نادیدہ گرفت سے آزاد ہو گئے۔ میں دوسرے ہی لمحے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ان سادھوؤں کا بے ہنگم رقص اب بھی جاری تھا۔ میں نے تیزی سے ان سب کے چہروں کا جائزہ لیا۔ ان میں نہ تو ژیان تھا، نہ وہ جٹا دھاری سادھو جس نے

"جے دیوی مائی" کا نعرہ بلند کیا تھا۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا پرس کھولا اور چند سکے ان کی طرف اچھال دیئے۔ میرا اندازہ قطعی درست ثابت ہوا۔ وہ سب اپنا رقص چھوڑ چھاڑ کر ریت پر پڑے ہوئے سکوں کی طرف جھپٹ پڑے تھے۔ میں اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی ان کے درمیان سے نکل آئی۔ اس عرصے میں وہ شیروانی پوش بھی غائب ہو چکا تھا جو میرا تعاقب کرتا ہوا وہاں تک آیا تھا۔ ژیان یا مشتبہ سادھو کی تلاش اب میرے نزدیک بے سود ہی تھی۔ وہ دونوں' ان بھک منگے سادھوؤں کی آڑ میں مجھے جُل دے کر نکل گئے تھے۔ جنہوں نے شاید مجھے کوئی غیر ملکی سمجھ کر پیسوں کے لئے ڈھونگ رچایا تھا۔ ژیان یا مشتبہ سادھو کے بارے میں وہاں موجود سادھوؤں سے پوچھ گچھ بھی فضول ہی ثابت ہوتی۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں سے کوئی بھی کچھ نہ بتاتا۔ میں ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ مجھے اپنے سحر کی گرفت میں لینے والا وہی مشتبہ سادھو تھا جس کی شیطانی قوتوں کا اب تک مجھے کئی مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا۔

وہاں سے واپسی میں مجھے اپنے اردگرد کسی ایسے شخص کی تلاش تھی کہ جو شیروانی پوش کی جگہ میرے تعاقب میں ہو۔ اکثر ایسا ہی ہوتا تھا کہ جب ایک تعاقب کرنے والا غائب ہو جاتا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔ میں اسی لئے اپنے گرد و پیش سے غافل نہیں رہی تھی۔ دھرم تلے کے لئے ٹرام میں بیٹھتے ہوئے مجھے ایک شخص پر شبہ ہوا۔ اس شبے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ٹرام کے اسٹاپ پر میرے پہنچتے ہی مجھے کنکھیوں سے دیکھنے لگا تھا پھر وہ اس طرح لاتعلق ہو گیا تھا جیسے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ اپنی وضع قطع اور لباس سے وہ کوئی ہندو بنگالی نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ اسٹاپ پر اور بہت سے لوگ تھے۔ وہ بھی یقیناً میری ہی طرح ٹرام آنے کے منتظر تھے۔ میں بھی اس نوجوان کی طرف سے جان کر انجان بن گئی۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ ٹرام آئی تو میں نے پہلے درجے کے ڈبے میں چڑھتے ہوئے غیرارادی طور پر اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور اپنی جگہ کھڑا تھا۔ مجھے بیٹھنے کے لئے سیٹ مل گئی۔ پہلے درجے میں بھیڑ نہیں تھی کیونکہ دوسرے درجے کے ڈبے میں زیادہ لوگ سوار ہوئے تھے۔

ذرا ہی دیر کے بعد جب ٹرام آگے بڑھی تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ بنگالی نوجوان نے تیزی سے اپنی جگہ سے حرکت کی اور لپک کر ٹرام کے پہلے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ ڈبے میں دو تین سیٹیں اور بھی خالی تھیں مگر وہ اطمینان سے میرے برابر آ بیٹھا۔ اس کی لاتعلقی اب بھی برقرار تھی۔ میرا تعاقب کرنے والوں میں سے اب تک کسی نے اس قدر قریب آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عموماً وہ دور ہی دور رہتے تھے۔ میں اسی سبب اس کی طرف سے اور زیادہ چوکنا ہو گئی۔ ٹرام چلنے کے بعد لپک کر اس کا سوار ہونا بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ میرے ہی تعاقب میں ہے۔ ٹرام چلنے کا انتظار شاید اس نے اپنی یقین دہانی کے لئے کیا تھا کہ میں اپنا ارادہ بدل نہ دوں' یعنی ٹرام سے اتر نہ جاؤں۔ اب تک میں نے اپنی نقل و حرکت کی نگرانی کرنے والوں کو نہیں چھیڑا تھا اور نہ ہی انہوں نے مجھے اس کا موقع دیا تھا' مگر اب صورت حال بدل چکی تھی۔ میں چند روز سے جس الجھن کا شکار تھی اب اس کا سدباب ضروری ہو گیا تھا۔ یہ کون لوگ ہیں اور آخر ان کا کیا مقصد ہے؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں ابھرتا تھا۔ اس نوجوان نے آج مجھے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ میں اس سلسلے میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔

میں نے آہستگی سے پہلو بدلا اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ ٹرام کی کھڑکی سے باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔

"آپنی کوتھائے جاچین دادو؟" میں نے اسے بنگلہ زبان میں مخاطب کیا۔ میرے لہجے میں نرمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں نے اس سے ایک عام سا سوال کیا تھا' ایک ایسا سوال جو عموماً ہم سفر ایک دوسرے سے کر لیتے ہیں' یعنی بھائی! آپ کہاں جا رہے ہیں۔

میرے سوال پر وہ چونک اٹھا اور بولا۔ "امی؟" یعنی میں؟ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بن رہا ہے۔

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اپنا سوال دہرایا۔ میں آسانی سے اس کی جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔

"امی باڑی جائی بو۔" اس نے جواب دیا کہ میں گھر جا رہا ہوں۔

"آپنار باڑی کوتھائے؟" میں نے اسے مہلت دیئے بغیر پوچھا کہ آپ کا گھر کہاں ہے؟

"امار باڑی آچھے ٹالی گنج۔" جواب دیتے ہوئے وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ اس نے اپنا گھر کلکتے کی ایک نواحی بستی ٹالی گنج میں بتایا تھا۔

میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ میرے سوال کو خوبصورتی سے ٹال گیا ہے اور یقیناً ٹالی گنج میں نہیں رہتا۔ اس کے جسم پر موجود لباس جھوٹ کی نشاندہی کے لئے کافی تھا۔ وہ اپنے لباس سے متوسط طبقے کا کوئی فرد معلوم ہوتا تھا۔ ٹالی گنج اپر کلاس اور اپر مڈل کلاس ہندوؤں کی آبادی تھی۔ شاید اس نے مجھے اجنبی جان کر یا پھر اپنی دانست میں ٹالنے کی خاطر یہ جواب دے دیا تھا۔ اسے یہ توقع نہیں رہی ہو گی کہ میں اتنی باریک بینی سے اس کے جواب کا تجزیہ کروں گی۔

"مگر یہ ٹرام تو صرف دھرم تلے تک جا رہی ہے۔" میں بدستور بنگلہ بول رہی تھی۔

"وہاں سے میں ٹالی گنج کے لئے دوسری ٹرام پکڑ لوں گا۔" اس نے بھی بنگلہ ہی میں جواب دیا اور پھر گویا مجھ پر "جوابی حملہ" کیا۔ اس نے بھی میرا "انٹرویو" لینا شروع کر دیا تھا۔ "آپ تو بنگالی نہیں لگتیں' پھر آپ کو بنگلہ کیسے آتی ہے؟"

"بنگال میں رہنا ہے تو پھر بنگلہ تو سیکھنا پڑے گی نا!" میں مسکرا کر بولی۔

پھر دھرم تلے تک میرے اور اس کے درمیان سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ نہ وہ کھل کر دیا نہ میں نے اپنے بارے میں اسے کوئی صحیح جواب دیا۔ ہمارے درمیان بنگلہ زبان ہی رابطے کا ذریعہ بنی رہی۔ اسی نشست پر میرے دائیں جانب وہ تھا۔ نشست پر تین افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی' مگر کوئی تیسرا فرد وہاں آ کر نہیں بیٹھا کیونکہ دو ایک نشستیں اور بھی خالی پڑی تھیں۔ میں نے دانستہ اپنا چمڑے کا پرس دائیں طرف رکھ لیا تھا تاکہ اس کے اور میرے بیچ فاصلہ قائم رہے۔ اس سے گفتگو کے دوران میں میری توجہ کا مرکز اس کا چہرہ تھا۔ میں اس کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے مجھے اپنا نام بھی غلط ہی بتایا تھا' سو میں نے یاد رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

ٹرام رکنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا پھر وہ ٹرام کے رکتے رکتے اتر کر لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو

گیا۔ میرا تعاقب کرنے والے عموماً مجھے اس موڑ تک چھوڑ کر غائب ہوتے تھے جہاں سے میری کوٹھی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن اس روز ایسا نہیں ہوا۔

اپنی کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے اس نوجوان کے خیال کو میں نے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ میری توجہ اب ژیان اور مشتبہ سادھو کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔ اس نوجوان سے زیادہ ان دونوں کا غائب ہو جانا میرے نزدیک زیادہ اہم تھا۔ اتنے دن بعد تو مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تھی مگر نتیجہ صفر ہی نکلا۔ میں اسی لئے کچھ دل برداشتہ سی تھی۔ اسی کے ساتھ مشتبہ سادھو اور ژیان کا تعلق بھی میرے لئے ناقابل فہم تھا۔ بیک وقت بہت سے سوالات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ ژیان مجھے کسی ایسی ہی جگہ ملے گا جہاں عموماً عام لوگوں کا گزر نہیں ہوتا۔ میں نے اسی سبب خاصے سوچ بچار کے بعد قدیم مندروں کا رخ کیا تھا' مگر ژیان کی تلاش مجھے مشتبہ سادھو تک پہنچا دے گی' یہ خبر نہیں تھی۔ مشتبہ سادھو کے بارے میں میرا خیال یہ تھا کہ وقتی طور پر کسی وجہ سے وہ روپوش ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ سادھو کے علاوہ ڈیسوزا نے بھی میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے میری کوٹھی کا رخ نہیں کیا تھا۔ ایک آدھ بار آتے جاتے وہ مجھے نظر بھی آیا تو میں نے سرد مہری ہی برقرار رکھی۔ خود وہ بھی کسی اجنبی کی طرح میرے قریب سے گزر گیا۔ ڈیسوزا کے سوا کسی اور پڑوسی سے میری رسم و راہ تھی بھی نہیں۔

میرے ملازمین بھی اب قدرے مطمئن تھے۔ وقتی طور پر مشتبہ سادھو نے جو ہنگامہ برپا کر دیا تھا' اب اس کے اثرات تقریباً زائل ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود اگر کسی دن واپسی میں مجھے دیر ہو جاتی تو شہزاد میری طرف سے فکرمند ہو جاتا۔ آج میں صبح کی نکلی شام کو لوٹی تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی میں نے ایک ہوٹل میں کھا لیا تھا ورنہ تو گھر ہی پر کھانا کھانے کو ترجیح دیتی تھی۔ کسی دن اگر میں صبح نکل جاتی تو دوپہر تک لوٹ آتی' دوبارہ جانا ہوتا تو کچھ دیر آرام کر کے چلتی پھر میں رات ہونے سے قبل واپس آ جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس شام بھی شہزاد کو میں نے اپنا منتظر پایا۔ مجھے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی اس کا احساس ہو گیا۔ میں اسی لئے سیدھی اپنے کمرے میں نہیں گئی۔ میں نے نشست گاہ میں اپنے لئے چائے منگوا لی۔ شیتل چائے لے کر آئی تو اس کے ساتھ شہزاد بھی تھا۔ چائے کے ساتھ پھل وغیرہ بھی تھے۔

"یہ سب لے جاؤ شیتل! میں اس وقت صرف چائے پیوں گی۔" میں نے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم بیٹھو!" پھر شیتل سے اس کے لئے بھی چائے لانے کو کہہ دیا۔

"بھالو میم!" کہہ کر شیتل بقیہ پلیٹیں ٹرے میں رکھ کے چلی گئی۔ اس دوران میں شہزاد سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"تم کیوں پریشان ہو؟" میں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"آج آپ دوپہر کو بھی نہیں آئیں نا اس لئے بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ جانے کیا بات ہو گئی۔" شہزاد جواب میں بولا۔ "وہ خبیث سادھو تو خیر جہنم کا ایندھن بن گیا ہو گا' مگر پھر بھی جب اس کا خیال آ جاتا ہے تو خوف سا آنے لگتا ہے۔"

"تو ابھی تک تم اس سادھو کو بھولے نہیں جس کی لاش اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو؟" میں اس کے بھول پن پر مسکرا دی۔ وہ اسی غلط فہمی کا شکار تھا کہ سادھو قتل ہو چکا ہے۔

"ایک تو یہ کہ لاش کا سر غائب تھا۔ کیا خبر وہ کوئی اور ہی ہو؟" شہزاد نے اپنے شک کا اظہار کر دیا کیونکہ سادھو کا کٹا ہوا سر میرے سوا کسی اور نے نہیں دیکھا تھا۔ شہزاد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "پھر یہ کہ وہ لاش بھی پراسرار طور پر غائب ہو گئی۔"

"ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ کسی اور سادھو کی لاش ہو۔" میں نے مصلحتاً یہ بات کہہ دی کہ مجھے حقیقت کا علم تھا۔ "مگر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ تم آخر ان لعنتی سادھوؤں سے اس قدر ڈرتے کیوں ہو؟"

آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ ان میں سے اکثر سفلی علوم بھی جانتے ہیں۔" شہزاد نے اپنی دانست میں مجھے خطرے سے آگاہ کیا۔ اسی وقت شیتل اس کے لئے چائے لے آئی۔ شیتل کی آمد پر اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ وہ چلی گئی تو شہزاد مجھے سفلی علوم کے بارے میں بتانے لگا۔

"سنو' نہ میں سفلی سے ڈرتی ہوں نہ سفلوں سے اور تمہیں بھی میں یہی مشورہ دوں گی۔ چائے پیو۔" میں نے یہ کہتے ہوئے میز پر رکھا ہوا اپنا پرس ایک طرف ہٹایا۔ شہزاد نے چائے کی پیالی میز سے اٹھا لی۔ اسی وقت میری نگاہ ایک لفافے پر پڑی۔ لفافے کا رنگ گلابی تھا۔ میں نے ایسا کوئی لفافہ اپنے پرس میں نہیں رکھا تھا۔ غیرارادی طور پر میرا ہاتھ پرس کی طرف بڑھا' مگر مجھے دوسرے ہی لمحے وہاں شہزاد کی موجودگی کا خیال آ گیا۔ مجھے اس کے سامنے اپنے پرس سے وہ لفافہ نکال کر نہیں دیکھنا چاہئے تھا۔ میں نے اسی لئے پرس اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میری آنکھوں میں اس وقت بنگالی ہندو نوجوان کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ دھرم تلے تک اس نے میرے ساتھ سفر کیا تھا۔ یہ حرکت اسی کی ہو سکتی تھی۔ وقتی طور پر میں نے اپنے تجسس کو دبا لیا اور جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔ اب میں جلد از جلد اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ لفافہ دیکھنا چاہتی تھی۔ چائے کا کپ خالی کرتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "شہزاد! تم چائے پیو' میں ذرا لباس تبدیل کر کے تازہ دم ہو جاؤں۔" پھر میں وہاں نہیں رکی۔

اپنے کمرے میں آتے ہی میں نے دروازہ اندر سے بند کر کے بتی جلا دی۔ میری خواب گاہ میں بھی مسہری کے قریب دو آرام دہ کرسیاں پڑی تھیں۔ میں ان میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر میں نے اپنے پرس کی بیرونی جیب سے گلابی لفافہ نکالنے میں دیر نہیں کی۔ لفافہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کے اندر رکھا ہوا پرچہ نکال لیا۔ اب میں اس پرچے پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہی تھی۔ اردو میں لکھا ہوا وہ خط میرے ہی نام تھا۔

"معلبہ جی! آپ یقیناً مجھے نہیں جانتیں اور نہ میں آپ سے اپنا تعارف کراؤں گا۔ خود میں بھی آپ سے واقف نہیں ہوں۔ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئی ہیں' مجھے نہیں معلوم۔ اس کے باوجود مجھے اتنی خبر ضرور ہے کہ آپ کوئی اہم شخصیت ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اعلیٰ انگریز حکام آپ کی نقل و حرکت پر نظر نہ رکھتے۔ میں آپ کو صرف یہ اطلاع

دینا چاہتا ہوں کہ اپنے گردوپیش سے غافل نہ رہیں۔ انگریز حکومت کے پالتو کتے آپ کے پیچھے لگ چکے ہیں۔ ممکن ہے آپ نے خود بھی یہ بات محسوس کر لی ہو۔ مجھے بس اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر ان پالتو کتوں میں سے کسی نے آپ پر اپنے دانت تیز کرنا چاہے تو اس کے دانت توڑ دیئے جائیں گے۔ یہ خط میں اپنے ایک ہندو بنگالی دوست کے توسط سے آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرا یہ خط آپ تک پہنچا دے گا۔ فی الحال مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ میں آپ سے دور ہی رہوں۔ فقط والسلام۔"

آپ کا ایک خیرخواہ

اس خط کی عبارت کو میں نے کئی بار توجہ سے پڑھا اور ممکنہ نتائج اخذ کرنے لگی۔ خط اردو میں لکھا گیا تھا اور لکھنے والا کوئی مسلمان معلومات ہوتا تھا جس نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا' مگر اسے میرا نام معلوم تھا۔ خط کی عبارت اسے جذباتی اور پُرجوش ظاہر کر رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا' انگریز حکمرانوں سے خوش نہیں تھا۔ کچھ روز سے جو لوگ میری سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے' ان کا تعلق اعلیٰ انگریز حکام سے تھا جنہیں "پالتو کتے" لکھا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ انگریز حکومت کے کارندے تھے۔ اس سے قطع نظر وہ لوگ میرے "اجنبی خیرخواہ" کی نظر میں بھی آ چکے تھے جو مجھے کوئی اہم شخصیت سمجھ رہا تھا۔ اپنی دانست میں میری نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا سبب وہ یہی سمجھا تھا' مگر خود اسے میری حفاظت یا مجھ سے کیا دلچسپی تھی؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

معاً مجھے ڈیسوزا کا خیال آیا۔ اس نے مجھے واضح الفاظ میں دھمکی دی تھی۔ کم از کم اس کے بارے میں ایک بات تو میں جان ہی چکی تھی کہ وہ اچھے کردار کا مالک نہیں تھا ورنہ مجھے نائٹ کلب چلنے کی دعوت نہ دیتا۔ میں نے اس کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ یہ سارا چکر وہ بھی چلا سکتا تھا۔ وہ بہرحال حکمرانوں ہی کی نسل سے تھا۔ میں نے اس نکتے پر جتنا بھی غور کیا' مجھے اس کے پیچھے ڈیسوزا ہی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ مجھے وہ جس راہ پر لگانے کا آرزومند تھا' میرے علم میں آ چکی تھی۔ ایک ہی دن میں اس کا چہرہ بے نقاب ہو گیا تھا۔ خود اس کا تعلق بھی حکومت کے کسی خفیہ ادارے سے ممکن تھا۔ میں نے اس پر بھی غور کیا۔ پولیس انسپکٹر سبود مکرجی کو میں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا' وہ بھی مجھے یاد آیا۔ میری کوٹھی میں کسی لاش کی اطلاع دینے والا بھی ڈیسوزا ہی تھا۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد میں نے طویل سانس لیا اور وہ خط پھاڑ دیا جو میرے کسی نادیدہ خیرخواہ نے لکھا تھا۔ یہ معاملہ میرے نزدیک کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا۔

میرا مسئلہ نہ تو ڈیسوزا تھا' نہ وہ مشتبہ سادھو کہ جس کا نام تک ابھی مجھے معلوم نہیں تھا۔ مجھے تو اپنے دشمن ژیان پر قابو پانا تھا جسے میں اسی شہر میں دیکھ چکی تھی میرے نزدیک فی الحال باقی تمام باتیں ضمنی تھیں۔ ژیان اگر ایک بار مجھ سے بچ کر نکل گیا تھا تو یہ ضروری نہیں تھا کہ دوبارہ بھی میری گرفت سے نکل جاتا۔ میں نے آئندہ روز سے پھر اس کی تلاش کا فیصلہ کیا اور مطمئن ہو گئی۔

اسی رات میں نے پُراسرار سرگوشیاں سنیں اور مجھ پر ایک نئی حقیقت منکشف ہوئی۔ نیک روح عظیم مہین کی آشنا آواز میری سماعت میں گونج رہی تھی۔ "اے معبلہ! تو اسے تلاش کر کے اپنا وقت

برباد نہ کر کہ جو اس شہر میں نہیں۔ تجھے جو تاکید کی گئی تھی' اس پر عمل کر۔ کیا تجھ سے تاریخ پڑھنے کو نہیں کہا گیا تھا کہ تیری آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھ سکیں۔ علم حاصل کر کہ یہی تیرے کام آئے گا اور تیری سپر بنے گا۔ خیر و شر کی اس جنگ میں کہ جو شروع ہو چکی ہے' ابھی تیرے پاس مہلت ہے اور تو اس مہلت کو غنیمت جان۔ وہ تیرا دشمن ژیان نہیں تھا کہ تو نے جسے ژیان سمجھ لیا۔ بدی کے ہرکارے شمبھو نے تجھے ایک بار پھر فریب نظر کا شکار کر لیا تھا کہ تو اس کی طرف سے غافل ہو جائے۔ وہ جسے تو نے ژیان جانا اسی جٹا دھاری سادھو شمبھو کا ایک چیلا تھا اور سن کہ تجھ سے یقیناً غلطی ہو گئی۔ تو نے جس طرح پہاڑوں پر ایک عرصے اپنے اصل نام کو راز رکھا' سو یہاں بھی ایسا ہی کرتی۔ پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں میں آنے کے بعد تیرے لئے پہلے سے کہیں زیادہ خطرہ ہے۔ سو اب اس دنیا کو جان کہ علم کا مطلب جاننا ہی تو ہے۔ تجھ سے کہا گیا تھا کہ اب تجھے آئندہ کے ساتھ گزشتہ کی تعلیم بھی دی جاتی رہے گی۔ تو بند آنکھوں سے دیکھ کہ اس خطہ زمین پر بسنے والوں کو کس طرح غلام بنا لیا گیا۔ وہ جنہیں آزاد پیدا کیا گیا تھا' کس طرح انہوں نے خود اپنے ہی پیروں میں زنجیریں ڈال لیں۔ تجھے آنکھوں سے سب کچھ نظر تو آ رہا ہے نا' تو سن تو رہی ہے!؟"

"ہاں میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں اور سن بھی رہی ہوں۔" میرے ہونٹ جیسے خود بخود حرکت کرنے لگے۔

"سو بس آج کے لئے اتنا ہی کافی جان اور مان کہ تو اس سے بے خبر تھی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی سرگوشیاں معدوم ہو گئیں۔

"یہ تو اپنوں کے ساتھ اپنوں ہی نے بڑا ظلم کیا۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑائی اور آنکھیں کھول دیں۔ میری آنکھوں نے بڑے عبرت ناک مناظر دیکھے تھے۔

اس رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی اور میں عظیم مہین کی سرگوشیوں پر غور کرتی رہی۔ اب مجھے اس مشتبہ سادھو کا نام بھی معلوم ہو چکا تھا کہ جسے عظیم مہین نے بدی کا ہرکارا کہا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ تصدیق بھی ہو گئی تھی کہ شمبھو نے مجھے فریب نظری میں مبتلا کیا تھا۔ مجھے میری اس غلطی کا احساس بھی دلایا جا چکا تھا جو مجھ سے نادانستگی ہی میں سرزد ہوئی تھی۔ میری یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی تھی کہ میرا دشمن ژیان اسی شہر میں ہو گا پھر مجھے یہاں کیوں بھیجا گیا؟ اس کی وجہ یقیناً کچھ اور ہی تھی جس سے مجھے ابھی آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے عظیم مہین کی سرگوشیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے آئندہ اقدامات کے بارے میں چند اہم فیصلے کئے۔ ان فیصلوں کا تعلق میرے موجودہ رویے میں تبدیلی سے بھی تھا۔ کچھ باتیں اب کھل کر سامنے آ گئی تھیں اور میرے حق میں یہ بہتر ہی ہوا تھا۔

میں نے دوسرے دن صبح ناشتہ کرنے کے بعد شہزاد کو اپنے ساتھ لیا اور کالج اسٹریٹ روانہ ہو گئی۔ شہزاد نے اس وقت حیرت کا اظہار کیا جب میں ایک بڑے بک اسٹال میں داخل ہوئی۔ پہلے سے اسے میں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہاں سے میں نے خاصی کتابیں خریدیں جن میں تاریخ کی کتابوں کے علاوہ معلومات عامہ کی بھی کتابیں تھیں۔

"آپ اتنی ساری کتابوں کا کیا کریں گی؟" شہزاد نے آخر پوچھ ہی لیا۔ اس وقت دکان دار کتابوں کا بل بنانے میں مصروف تھا۔

"کتابیں کس لئے ہوتی ہیں؟" میں مسکرا کر بولی۔ میری آواز دھیمی ہی تھی۔

"ظاہر ہے پڑھنے کے لئے ہوتی ہیں' مگر میرا خیال آپ کے بارے میں یہ تھا کہ.........."

"خاصی پڑھی لکھی ہوں۔" میں نے اس کی بات پوری کر دی۔ "تم یہی کہنا چاہتے تھے نا؟"

"جی۔" اس نے اعتراف کیا۔

"دیکھو' تم بھی ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہو۔ اس بات کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ نصابی علم ناکافی ہوتا ہے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ شروع سے میں اسی طرح سوچتی آئی ہوں۔ اگر میرا یہ انداز فکر نہ ہوتا تو میں کبھی مختلف زبانوں کا علم حاصل نہ کرتی۔"

اسی وقت دکاندار نے کتابوں کا بل میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے پرس کھول کر بل ادا کر دیا۔

"ہم دونوں کتابوں کا ایک ایک بنڈل اٹھائیں گے۔" میں نے شہزاد سے کہا۔ "میں نے اسی لئے دو بنڈل بندھوائے ہیں۔"

"میں دونوں بنڈل اٹھا لوں گا' آپ فکر نہ کریں۔" شہزاد بولا۔ وہ بہرحال میرا ملازم تھا اور اسے یہی کہنا بھی چاہئے تھا' مگر میں نے انکار کر دیا۔

"اول تو دونوں بنڈل اٹھانا تمہارے لئے ممکن نہیں اور ممکن ہوتا بھی تو میں تمہیں ایسا نہ کرنے دیتی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم کوئی ٹیکسی رکواؤ۔"

ہماری گفتگو دکاندار بھی سن رہا تھا' وہ بول اٹھا۔ "میرے آدمی ٹیکسی میں دونوں بنڈل رکھ دیں گے' میڈم!"

میں نے دکاندار کی پیشکش قبول کر لی۔ اسٹال مین روڈ پر تھا۔ شہزاد دکان سے نکل کر ٹیکسی کے انتظار میں باہر کھڑا ہو گیا۔ اسی عرصے میں ایک سیلزمین نے کتابوں کے دونوں بنڈل کاؤنٹر پر لا کے رکھ دیئے۔ دکاندار مجھ سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے اس کے چہرے سے لگایا۔ میں نے اس سے جو کتابیں خریدی تھیں' خاصی مہنگی تھیں۔ اس کے علاوہ دکاندار نے غالباً یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ مجھے کس طرح کی اور کن مضامین کی کتابوں سے دلچسپی ہے۔ ان کتابوں میں مضامین کے اعتبار سے تقریباً تین طرح کی کتابیں تھیں' تاریخ قدیم و جدید' جغرافیہ اور معلومات عامہ۔ زیادہ کتابیں انگریزی میں تھیں۔ دکاندار مجھے شاید کوئی ریسرچ اسکالر سمجھ رہا تھا حالانکہ میری عمر ان کتابوں کو پڑھنے کی نہیں تھی۔ ابتدا میں دکاندار نے اسی لئے کتابوں کے انتخاب پر قدرے حیرت کا اظہار بھی کیا تھا۔ وہ بنگالی تھا اور میں اس سے بنگلہ زبان ہی میں بات بھی کر رہی تھی' مگر اس کے اظہار حیرت پر دانستہ مجھے فراٹے سے انگریزی بولنا پڑی۔ پھر اس نے کسی کتاب کے بارے میں دوبارہ تصدیق نہیں چاہی کہ مجھے وہی کتاب چاہئے۔ بنگال والے' حکمرانوں کی زبان بہت اچھی طرح بولتے اور سمجھتے تھے' خصوصاً تعلیم یافتہ افراد۔ اپنی زبان کے علاوہ اگر وہ کسی زبان سے متاثر ہوتے تھے تو وہ انگریزی ہی تھی۔

"میڈم! آپ کے سبجیکٹ کی ایک کتاب میرے پاس ختم ہو گئی ہے۔" دکاندار مجھ سے انگریزی ہی میں مخاطب ہوا۔ "اگر آپ پھر کبھی ادھر تشریف لائیں تو میں وہ کتاب منگوا کر رکھ لوں۔ کتاب نام "مغل ایمپائر اینڈ اولڈ سٹریز آف انڈیا" ہے۔"

"رکھ لیجئے گا' منگوا کر۔" میں نے مختصر سا جواب دیا کیونکہ اس وقت میرا ذہن ایک اور مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔

میں نے چند ہی لمحے پہلے دکان سے باہر کھڑے شہزاد کی طرف مڑ کر دیکھا تھا۔ مجھے اس سے کچھ فاصلے پر ایک "پالتو کتا" نظر آ گیا تھا۔ فرق صرف لباس کا تھا۔ آج اس کے سر پر ترکی ٹوپی اور جسم پر شیروانی نہیں تھی' مگر چہرہ وہی تھا۔ اس وقت وہ پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ یقیناً اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ میں اسے نہیں پہچان سکوں گی۔ یہ وہی تھا جو گزشتہ تقریباً سارا دن میرے پیچھے لگا رہا تھا اور پھر شام کو غائب ہو گیا تھا۔ جو شخص دن بھر نظر میں رہے اس کا چہرہ بھلا کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ اجنبی اور مشتبہ ہو۔ اب میں قدرے ترچھی ہو کر اس طرح کھڑی تھی کہ کنکھیوں سے شہزاد اور اس شخص کو دیکھ سکوں جسے میری نگرانی پر مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت میں چونکی جب وہ بے پروائی سے چلتا ہوا شہزاد کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے شہزاد سے کچھ کہا تھا۔ جواب میں شہزاد بھی کچھ بولا تھا۔ پھر وہ شخص آگے بڑھ گیا۔ اسی کے ذرا دیر بعد شہزاد نے ایک ٹیکسی روک لی۔

"آپ کتابوں کے بنڈل ٹیکسی میں رکھوایئے۔" میں نے دکاندار سے کہا اور پھر دکان سے باہر آ گئی۔ میری نظریں مشتبہ شخص کی تلاش میں تھیں۔ وہ کچھ ہی فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہیں پیادہ رو (فٹ پاتھ) سے لگی ایک کار کھڑی تھی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شہزاد کے قریب پہنچ کر میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تم کتابیں لے کر کوٹھی پہنچو' میں ابھی آتی ہوں۔" پھر میں نے پرس کھول کر ایک نوٹ اسے تھما دیا۔

"میرے پاس پیسے تھے۔" شہزاد بولا۔

"رکھ لو' حساب بعد میں دیتے رہنا۔"

"آپ کتنی دیر تک لوٹ آئیں گی؟"

اس وقت مجھے شہزاد کا یہ سوال گراں تو ہوا مگر مسکرا کر ٹال گئی۔ "میری زیادہ فکر نہ کیا کرو۔" میں نے کہا۔

اتنے میں دکاندار کے دو آدمی بنڈل اٹھا لائے اور ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر دونوں بنڈل اندر رکھ دیئے۔ شہزاد ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس زمانے میں کلکتہ جیسے بڑے شہر میں بھی ٹیکسیاں کم ہی تھیں۔ ٹیکسیوں میں سفر کرنے کی "عیاشی" سرمایہ داروں ہی کا وطیرہ تھا۔ شہزاد کو اسی لئے ٹیکسی کے انتظار میں اتنی دیر لگی تھی۔ سڑک پر خاصا ٹریفک تھا اور پیادہ رو پر بھی کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو میں بظاہر بے پروائی سے چلتی ہوئی خود اس طرف بڑھنے لگی جہاں وہ مشتبہ شخص کار کے قریب کھڑا تھا۔ میں دانستہ وہاں رک گئی تھی اور شہزاد کو تنہا کوٹھی بھیج دیا تھا۔ گزشتہ رات کو میں نے

جو فیصلے کئے تھے' انہی میں سے ایک فیصلے پر عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔

مشتبہ شخص کی عمر چالیس اور پینتالیس برس کے قریب تھی' چہرے سے ذہانت کے ساتھ عیاری کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ رنگ قدرے صاف تھا اور وہ بنگالی نہیں لگتا تھا۔ اس کی صحت البتہ قابل رشک نہیں تھیں وہ دبلا پتلا تھا' چہرہ لمبوترا اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر چونکا اور پھر تیزی سے مڑ کر سڑک پر چلنے والے ٹریفک کی طرف دیکھنے لگا۔ اب میری جانب اس کی پشت تھی۔ مجھ سے لاتعلقی کے اظہار کی خاطر اس نے اپنی دانست میں یہ ہنر آزمایا تھا۔ اسے گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ لاتعلقی اسے مہنگی پڑے گی۔ میں اس کے عقب میں پہنچ کر رک گئی اور پھر دھیرے سے بولی۔ "آج تم نے اپنے سر پر ترکی ٹوپی نہیں لگائی اور نہ شیروانی پہنی۔ تم شیروانی پہن کر بہت اچھے لگتے ہو۔" یہ الفاظ میں نے دانستہ انگریزی زبان میں ادا کیے تھے۔ اپنے چہرے سے وہ مجھے پڑھا لکھا ہی لگا تھا۔ پھر یہ کہ وہ انگریز حکومت کا ہی کارندہ تھا۔ وہ اپنے کسی بھی محکمے میں ایسے ملازم نہیں رکھ سکتے تھے جو ان کی زبان نہ جانتا ہو۔

میری آواز سن کر وہ اچھل پڑا اور مڑ کے بولا۔ "جی' آ.......... آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" جواباً وہ انگریزی ہی بولا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"نہیں' تمہارے باپ سے میں نے یہ بات کہی تھی۔" میری آواز میں سختی آ گئی۔

"کک.......... کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ بھی غصہ دکھا کے مجھے رعب میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔

"ابھی بتاتی ہوں۔" اتنا کہتے ہی میں نے ایک تھپڑ اس کے منہ پر جما دیا اور پھر چیخ اٹھی۔ اب میں زور زور سے بنگالی میں اسے بُرا بھلا کہتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ اسی کے ساتھ میں اس کی پٹائی بھی کرتی جا رہی تھی۔ میرے مخاطب پیادہ رو (فٹ پاتھ) پر چلنے والے تھے۔

میری توقع کے مطابق چند ہی لمحوں میں وہاں بھیڑ لگ گئی۔ صنف نازک ہونے کا میں نے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ چیخ چلا کر میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ اس شخص نے مجھے عورت سمجھ کے کوئی نازیبا حرکت کی تھی پھر میں تو پیچھے ہٹ گئی اور راہ گیروں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ قریب ہی سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار میں جو ادھیڑ عمر آدمی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا' وہ آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار تھے۔ معلوم نہیں اچانک اسے کیا سوجھی کہ کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ میں اس وقت تک بھیڑ سے نکل آئی تھی۔ میں تیز قدمی سے آگے بڑھ گئی۔

"مار شالا کو.......... مار شالا کو.........." یہ آوازیں مجھے اپنے عقب سے سنائی دے رہی تھیں۔

کچھ ہی دور چل کر مجھے ایک ہاتھ رکشا خالی نظر آ گیا۔ اس وقت میں موقعہ واردات سے دور نکل جانا چاہتی تھی' میں نے اسی لئے اس ناپسندیدہ سواری میں بیٹھنا بھی قبول کر لیا۔ چترنجن ایونیو کے چوراہے کے ایک جانب کا علاقہ کالج اسٹریٹ کہلاتا تھا۔ چترنجن ایونیو ہی پر کلکتہ میڈیکل کالج تھا۔ اسی کالج سے ملحق ایک بڑا ہسپتال تھا جسے عرف عام میں "میڈیکل" بھی کہا جاتا تھا۔ مقامی زبان میں اسے مُیا کالج بھی کہتے

تھے۔ میرا رکشا اب اسی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

کلکتے میں اتنے دن گزار کر میں نے ایک خاص بات محسوس کی تھی۔ کوئی جیب تراش ہو یا اٹھائی گیرا' اکا دکا کوئی بدمعاش ہو یا مخرب اخلاق کوئی حرکت کرنے والا' اگر وہ رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا تو خود عوام اس کی اچھی خاصی "دھنائی" کر دیتے تھے۔ پولیس کا نمبر بہت بعد میں آتا تھا۔ راہ گیر بس کسی کو پٹتا ہوا دیکھ لیں' پھر وہ اس "کار خیر" میں ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جو بھی آتا وہ پٹنے والے کو مارتا ہوا آتا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ ایک دوسرے سے یہ بھی پوچھتے۔ "کی ہولو؟" یعنی کیا ہوا؟ اور اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ ہوتا۔ لوگ اگر پولیس کو ادھر آتا دیکھتے تو عموماً اپنی اپنی راہ ہو لیتے۔ یوں جیسے اس واقعے سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو پھر پٹنے والے کو زخمی حالت میں پولیس اٹھا کر لے جاتی اور ظاہر ہے کہ مال بناتی۔ کوئی بے گناہ بھی اگر پھنس جاتا تو کچھ دے دلا کر ہی اس کی جان چھوٹتی۔ میرے اندازے کے مطابق اس مشتبہ شخص کا تعلق بھی پولیس ہی کے ایک شعبے سے تھا۔ عرف عام میں انہیں "سادہ لباس والے" کہا جاتا ہے' یعنی سی آئی ڈی والے۔ میں نے گویا عوام کے ہاتھوں خود ایک پولیس والے کی پٹائی کرا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں وہاں رکی نہیں تھی۔

میں نے جان بوجھ کر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا تھا اور اس کے رد عمل سے بھی واقف تھی۔

کوٹھی پہنچ کر میں نے شہزاد کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ عارضی طور پر اس نے کتابوں کے بنڈل میرے ہی کمرے میں رکھوا دیئے تھے۔

"سنو!" میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔ "اس کمرے کے برابر والا کمرہ خالی پڑا رہتا ہے۔ میرے اور اس کمرے کے درمیان اِدھر ایک دروازہ بھی ہے۔" میں نے بائیں جانب ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں دراصل اس کمرے کو اپنی ذاتی لائبریری بنانا چاہتی ہوں۔ فی الحال تم دو الماریاں اور خرید لو جو اسی کمرے میں رہیں گی۔ آبنوسی لکڑی کی بنی ہوئی اچھی الماریاں دیکھنا' خانے اس میں زیادہ ہوں۔ جو کتابیں میں خرید رہی ہوں' انہیں ان الماریوں میں رکھتے جاؤ' اس عرصے میں تمہیں برابر والے کمرے میں کتابیں رکھنے کے لئے ریک بنوانے ہیں۔ ہر سبجیکٹ کی کتابیں الگ ہونا چاہئیں۔ تم اگر ضروری سمجھو تو اس سلسلے میں اپنی مدد کے لئے کوئی اور ملازم بھی رکھ سکتے ہو۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی خاتون! میں ولیم سے کام لے لوں گا۔ ویسے بھی دن بھر مجھے کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں کتابوں کو آپ کی توقع کے مطابق الگ الگ ترتیب سے رکھ لوں گا۔ اس کے علاوہ آپ کہیں گی تو ایک رجسٹر بھی بنا لوں گا جس میں کتابوں کا اندراج ہوتا رہے گا۔ رجسٹر کی نمبرنگ کتابوں کے پشتے پر بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کسی بھی وقت رجسٹر دیکھ کر کوئی بھی کتاب نمبر سے تلاش کر سکتی ہیں۔" شہزاد نے مجھے ایک اور راہ سجھائی۔

"یہ اور بھی اچھا ہے' اس سے مجھے بہت آسانی ہو جائے گی۔" میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا' پھر پوچھا۔ "تمہارے خیال میں فرنیچر وغیرہ کی تیاری میں کتنے دن لگ جائیں گے؟ کتابوں کے لئے ریک بنوانے میں تو خاصا وقت لگ جائے گا۔"

"اس سے بچنے کی ایک اور صورت بھی ممکن ہے خاتون! اس سے کتابیں اور زیادہ محفوظ رہ سکیں گی۔ کبھی ضرورت پیش آئی تو لائبریری روم کو کسی اور کمرے میں بھی باآسانی شفٹ کیا جا سکتا ہے۔" شہزاد کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ اس کے چہرے سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔

"وہ کیا صورت ہے؟" میں نے سوال کیا' پھر بولی۔ "تم بیٹھ جاؤ نا' کھڑے کیوں ہو۔ یہ کرسی اٹھا لو یہاں سے۔" میں نے قریب ہی پڑی دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ شہزاد کرسی اٹھا کر مجھ سے کچھ فاصلے پر سامنے بیٹھ گیا تو میں نے کہا۔ "ہاں اب کہو!"

"ریک بنوانے کی بجائے الماریاں ہی خرید لی جائیں۔" شہزاد نے اپنی تجویز پیش کی۔ "بہو بازار میں اچھا فرنیچر مل جاتا ہے۔ دو الماریاں خریدنے کو تو آپ کہہ ہی رہی ہیں۔ دو کی جگہ مزید الماریاں خریدی جا سکتی ہیں۔ اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ خود آپ میرے ساتھ ...." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا' پھر جلدی سے بولا۔ "آپ کا وہاں جانا کچھ مناسب نہیں' میں خود ہی لے آؤں گا۔"

"کیوں مناسب نہیں؟" میں نے پوچھا۔ "اچھا ہے خود میں بھی وہ بازار دیکھ لوں گی۔ میں کبھی پہلے ادھر گئی بھی نہیں۔"

"دراصل وہ .... وہ علاقہ بدنام ہے۔" شہزاد نے کچھ جھجکتے ہوئے بتایا۔

"کس لئے بدنام ہے؟ بتاؤ نا' میں نے تو آج پہلی بار اس بازار کا نام سنا ہے۔ یہ شہر ہی اتنا بڑا ہے کہ ابھی بہت سے علاقے میں نہیں دیکھ سکی۔"

"بات یہ ہے خاتون کہ نیچے تو وہاں فرنیچر والوں کی دکانیں ہیں اور اور .... اوپر گانے بجانے والیاں رہتی ہیں۔ میری مراد .... طوائفوں سے ہے۔ اس بازار کا نام اسی لئے بہو بازار پڑ گیا ہے۔" شہزاد نے بتا ہی دیا۔

"تو کیا دن کے وقت بھی وہ عورتیں گاتی بجاتی ہیں اور اگر گاتی بجاتی بھی ہیں تو ہمیں ان سے کیا لینا' گانا بجانا کون سی بری بات ہے؟"

"آپ سمجھ نہیں رہیں' ان میں سے اکثر گانے والیاں .... گانے کی آڑ میں........" وہ پھر چپ ہو گیا۔

پھر میرے مزید اصرار پر شہزاد نے نظریں نیچے کئے ہوئے وہ بات کہہ ہی دی جسے کہتے ہوئے شاید خجالت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا' میرے لئے انتہائی حیران کن تھا۔ عورت ذات کی اتنی تذلیل تو پہاڑی بستیوں میں بھی نہیں کی جاتی تھی۔ طوائف کا مطلب اب اچھی طرح میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ میرے خیال میں وہ عورتیں قابل رحم تھیں۔ میں نے اپنے اسی خیال کا اظہار شہزاد سے بھی کر دیا۔

"ممکن ہے خاتون! آپ کا خیال درست ہو' مگر جہاں تک میرے علم میں ہے اعلیٰ درجے کی ان طوائفوں نے اسے اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ وہ مردوں کو لوٹ لیتی ہیں۔ بہت سے گھرانے ان عورتوں کے چکر میں تباہ ہو چکے ہیں۔" شہزاد اب بغیر جھجکے بات کر رہا تھا۔ میں نے خود ہی ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ وہ کھل کے بات کر سکے۔ پہلے بھی ایک مرتبہ ایسا ہو چکا تھا جب ڈیسوزا نے مجھے نائٹ کلب لے جانے کی

دعوت دی تھی۔ اس وقت بھی اسٹرپ ٹیز ڈانس کے بارے میں مجھے بتاتے ہوئے شہزاد کی کچھ یہی کیفیت تھی۔ تقریباً ایک ہی سی نوعیت کا یہ دوسرا موقع تھا۔ پھر یہ کہ کچھ جاننے کی جستجو میں میری طرف سے بھی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی اس لئے شہزاد بے جھجک بولنے پر آمادہ ہو گیا تھا' مگر اس کی نظریں نیچی ہی تھیں۔ اب وہ بتا رہا تھا۔ "یہ عورتیں تو پھر بھی ڈیرے دارنیاں اور مہذب کہلاتی ہیں' ان سے بھی گئی گزری موجود ہیں۔ اپرچیت پور روڈ سے ہاتھی بگان جاتے ہوئے راستے میں ایک علاقے کا نام سونا گاچھی ہے۔ یہ پیشہ ور طوائفوں کا علاقہ ہے جن کی گزر بسر صرف جسم فروشی پر ہوتی ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے شہزاد کہ میں اس شہر میں نئی ہوں۔ یہاں کے بارے میں مجھے یقیناً بہت سی باتیں نہیں معلوم۔" میں نرمی سے بولی۔ "مجھے یہ احساس بھی ہے کہ بعض موضوعات ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر کوئی عورت کسی مرد سے کھل کر گفتگو نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود میرا مزاج ذرا مختلف ہے۔ ممکن ہے' تمہیں بھی اب تک اس کا پتا چل گیا ہو۔ اس لئے میری طرف سے تمہیں پوری آزادی ہے کہ مجھ سے ہر بات کھل کے کر سکتے ہو۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ تمہاری حیثیت میرے دست راست کی ہے۔ تم سے جو بھی پوچھا جائے بلا جھجک اس کا جواب دو' سمجھ گئے؟"

"جی خاتون!" یہ کہتے ہوئے بھی اس کی نظریں نیچی ہی تھیں۔

"ادھر دیکھو .... نظر اٹھا کر .... ہاں اس طرح۔" میں نے اس کی مزید حوصلہ افزائی کی۔

"اس طرح یہ ہو گا کہ میں لاعلمی کا شکار نہیں رہوں گی اور اب سنو کہ میں تمہارے ساتھ بہو بازار ضرور چلوں گی' مگر آج نہیں کل۔ یوں بھی تمہاری اطلاع کے مطابق دن میں وہاں گانے بجانے اور رقص و موسیقی کی محفلیں نہیں جمتیں۔ ایک تم اور میں ہی کیا دن کے وقت تو دوسرے لوگ بھی وہاں فرنیچر خریدنے جاتے ہی ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہاں دکانیں ہی نہ ہوتیں۔" شہزاد نے میری بات کی تائید کی تو میں نے مزید کہا۔ "یہاں دھرم تلے میں بھی تو اچھے بک اسٹال ہوں گے۔ میں نے شاید کہیں دیکھے بھی تھے۔"

"ویلز لی اسٹریٹ اور ولنگٹن اسکوائر سے کچھ آگے دیکھے ہوں گے' آپ نے!" شہزاد بولا۔ "ولنگٹن اسکوائر کے بعد ہی اسلامیہ کالج ہے' اسی سے ملحق مسلم انسٹیٹیوٹ ہے' پھر ایک مسجد اور قدیم مدرسہ عالیہ ہے۔ کالج ہی کے قریب کئی بڑے بک اسٹال ہیں' مگر آپ کو وہاں اردو' فارسی اور عربی ہی کی کتابیں زیادہ ملیں گی۔"

"تو کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "ضروری تو نہیں کہ انگریزی زبان ہی کی کتابیں خریدی جائیں۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر آرام کروں گی' پھر آج ادھر بھی چلیں گے' ٹھیک ہے نا۔ اس وقت تک میں وہ کتابیں دیکھتی ہوں جو ابھی خرید کر لائی ہوں۔ تم جاؤ اور شیتل سے میرے لئے کافی بھجوا دو۔"

"میں دوں آپ کو ایک بنڈل اٹھا کے۔" شہزاد نے الماری کے قریب رکھی ہوئی میز کی طرف دیکھا۔ اسی پر دونوں بڑے بنڈل رکھے تھے۔ پھر وہ اٹھا۔

"ٹھہرو!" میں نے اٹھتے ہوئے شہزاد کو مخاطب کیا۔ "تم شاید میری طرف سے کچھ غلط فہمیوں کا شکار

ہو۔"

"جی خاتون! میں .... کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی؟"

"نہیں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تم غالباً مجھے کوئی بہت ہی نازک سی لڑکی سمجھتے ہو۔ میں تمہاری یہی غلط فہمی فی الحال دور کرنا چاہتی ہوں۔" میں یہ کہتی ہوئی میز تک پہنچ گئی اور ایک بنڈل کو اٹھا کر دوسرے بنڈل پر رکھ دیا۔ "یہ دیکھو۔" میں نے جھک کر دونوں بنڈل اٹھا لئے' پھر انہیں صرف اپنے سیدھے ہاتھ پر رکھ کر اٹھایا اور شہزاد سے بولی۔ "اب میں یہ دونوں بنڈل واپس میز پر رکھے دے رہی ہوں۔ تم انہیں اس طرح اٹھا کے دکھاؤ۔"

"مم .... میں نے تو خاتون .... ایک ہی بنڈل مشکل سے اٹھایا تھا' دو .... دو بنڈل شا........... شاید میں دونوں ہاتھوں سے بھی نہ اٹھا سکوں گا' مگر آپ کا حکم ہے تو..........."

"بس رہنے دو۔" مجھے ہنسی آ گئی۔ میں اس عرصے میں وہ دونوں بنڈل میز پر رکھ چکی تھی۔ "مجھے تمہارا امتحان لینا مقصود نہیں تھا۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ تم مجھے کمزور نہ سمجھو' اب تم جاؤ۔"

شہزاد کچھ خجل خجل سا میرے کمرے سے چلا گیا۔ میں ایک بنڈل اٹھا کر لے آئی اور اسے مسہری پر رکھ کے کھولنے لگی۔ پھر میں دوسرا بنڈل بھی اٹھا لائی۔ تینوں طرح کی کتابوں کو چھانٹ کر میں نے الگ کیا اور انہیں میز پر سجا دیا۔ ان میں سے ایک کتاب "اولڈ ہسٹری آف انڈیا" اٹھا کر میں کرسی پر آ بیٹھی۔ کتاب کے مطالعے ہی کے دوران میں شیتل' کافی دے گئی۔ مسہری کے سرہانے رکھی تپائی اس نے میرے کہنے پر کرسی کے برابر ڈال دی اور اس پر کافی کا مگ رکھنے کے بعد چلی گئی۔ دوپہر تک میں اس کتاب کو پڑھ چکی تھی اور اس کا ایک ایک لفظ جیسے میرے ذہن پر نقش ہو چکا تھا۔ پہلی بار کوئی کتاب پڑھ کر مجھے بڑی خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ وہ کتاب تین سو چوراسی صفحات کی تھی جسے میں بڑی روانی سے پڑھ گئی تھی۔

☆======☆======☆

بنگال میں گرمی بہت ہوتی ہے۔ میں اسی لئے دوپہر کے وقت باہر نکلنے سے گریز کرتی تھی۔ کوئی مجبوری ہو تو الگ بات ہے۔ رفتہ رفتہ میرا جسم اس موسم کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ دھوپ ذرا ڈھل گئی تو میں' شہزاد کو ساتھ لئے کوٹھی سے نکلی۔ صبح کالج اسٹریٹ میں جو ہنگامہ خود میں نے برپا کیا تھا' وہ میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ میں اسی سبب چوکنا تھی۔ کوٹھی کے گیٹ سے باہر قدم رکھتے ہی کچھ ہی فاصلے پر مجھے دو مشتبہ افراد نظر آ گئے۔ میں کچھ اور آگے بڑھی تو چورنگی روڈ پر پہنچنے کے لئے بائیں جانب مڑنا پڑا۔ دونوں مشتبہ افراد میرے تعاقب میں تھے۔ بائیں جانب مڑتے ہی مجھے وہ "زخمی بلبل" نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا تھا۔ اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ ہونے کی وجہ سے میں وہ الفاظ نہیں سن سکی تھی۔ مجھے جس ردعمل کی توقع تھی' وہ شاید ظاہر ہونے والا تھا۔ مجھے خیر اپنی تو کوئی پرواہ نہیں تھی مگر شہزاد کا ضرور خیال تھا۔

"شہزاد! تم ایسا کرو کہ واپس کوٹھی چلے جاؤ۔" میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔ "میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔" میری آواز دھیمی سی تھی۔

"مگر خاتون! ولنگٹن اسکوائر یہاں سے..........."

"اچھا ایسا کرو کہ یہ میرا پرس بھی لیتے جاؤ۔" میں بول اٹھی۔ "دراصل اس وقت ادھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ میں کچھ دیر تنہا ٹہلنا چاہتی ہوں۔ کتابیں کل صبح خرید لیں گے یا پھر میں لوٹ آؤں تو چلیں گے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا پرس اسے تھما دیا۔

میرے حکم کی تعمیل میں شہزاد حیران حیران سا واپسی کے لئے مڑ گیا۔ اس غریب کو خبر ہی نہیں تھی کہ کیا معاملہ درپیش ہے۔ پرس کا خیال بس مجھے اچانک ہی آ گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ پرس میں خاصی رقم تھی' دوسرے اس وقت پرس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ان "پالتو کتوں" کو دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ آج صبح بھی شہزاد کو میں نے یہ علم نہیں ہونے دیا تھا کہ میرا کیا ارادہ ہے۔ اسے میں ان معاملات سے الگ ہی رکھنا چاہتی تھی۔

صبح جس سادہ لباس والے کی پٹائی ہوئی تھی' اس کے سر پر پٹی بندھی تھی اور چہرہ سوجا ہوا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس نے بڑی کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھا تھا' پھر میری طرف پشت کر لی تھی۔ میرے نزدیک وہ انتقامی کارروائی کے لئے ہی اپنے ساتھ چار مزید افراد کو لایا تھا۔ ان چاروں کا تعلق بھی اسی کے محکمے سے ممکن تھا۔ وہ علاقہ جہاں میری کوٹھی تھی' چورنگی روڈ کی بھیڑ بھاڑ سے الگ اور نسبتاً پرسکون تھا۔ بڑی بڑی ان کوٹھیوں میں رہنے بسنے والے قدرے مختلف لوگ تھے۔ انہیں اس سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی کہ ان کی کوٹھیوں کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ یا برابر والی کوٹھی میں رہنے والے کیوں چیخ چلا رہے ہیں۔ مجھے خود اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ شمبھو نے جب اپنے قتل کا سوانگ رچایا تھا تو میرے ملازمین کی چیخ پکار کے باوجود کسی نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ آج صبح میں نے بھرے بازار میں جو ترکیب آزمائی تھی' وہ یہاں اس علاقے میں آزمانا' ممکن نہیں تھا۔ یہاں میرا چیخنا چلانا بے سود ہی ثابت ہوتا۔ کوئی بھی اپنی کوٹھی سے باہر نہ آتا۔ میں نے اسی لئے شہزاد کو واپس بھیج دیا تھا کہ وہ متوقع ہنگامے کی صورت میں محفوظ رہے۔

میں دانستہ چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھتی رہی۔ زخمی شخص کے ساتھی مجھے تنہا پا کر تیزی سے میری طرف لپکے۔ اس دوران میں جو دو افراد میرے پیچھے تھے' وہ بھی قریب آ گئے۔ سامنے سے آنے والوں کے علاوہ میں اپنے عقب سے بھی غافل نہیں تھی۔ زخمی شخص دور ہی کھڑا رہا۔ میں انہیں خود ہی قریب آنے کا موقع دے رہی تھی۔ ان میں سے ایک مجھے کہنی مارتا ہوا آگے نکل گیا۔ دوسرے نے ذرا اور ہمت کی' مگر وہ ناشائستہ حرکت اسے مہنگی پڑی۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ مجھ سے جھگڑا مول لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

"کہاں چلے؟" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے جھٹکا دیا۔

پھر وہ جیسے ہی نیچے جھکا' میرا دایاں گھٹنا اس کے پیٹ پر پڑا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ دونوں

ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کے بیٹھتا چلا گیا۔ اس سے پہلے ہی میں نے گریبان چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب کہنی مارنے والا میری زد پر تھا۔ اسے میں نے جبڑا سہلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنے ساتھی کی مدد کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہی اس کی آنکھوں میں ستارے ناچ گئے ہوں گے۔ بقیہ دو افراد گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے‘ مگر میں نے انہیں بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے جست بھری اور ایک کے سینے پر اپنے نقش قدم ثبت کر دیئے۔ اسی کے ساتھ نیچے گرتے ہی ایک دم اچھل کے کھڑی ہو گئی۔ چوتھا شخص جو اب تک میرے ”دست شفقت“ سے بچا ہوا تھا‘ اسے بھی میں نے محروم نہ رہنے دیا۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرتے ہوئے چیخا۔ میں نے تیزی سے گھوم کر اپنے پہلے ”شکار“ کو دیکھا۔ یہ وہی تھا کہ جس کی آج صبح پٹائی ہوئی تھی۔ اس عرصے میں وہ غائب ہو چکا تھا۔ اس میں شاید مزید پٹنے کی سکت نہیں ہو گی۔

ان چاروں میں سے تین تو زمین پر پڑے تھے اور وہ جس کے جبڑے پر میرا گھونسا پڑا تھا‘ مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف و اذیت کے آثار تھے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ کر شاید یہی غنیمت سمجھا ہو گا کہ فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور اطمینان کے ساتھ واپسی کے لئے مڑ گئی۔ میرے خیال میں آج ان کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد جب میں واپس اپنی کوٹھی پہنچی تو شہزاد مجھے دیکھتے ہی حیرت سے بولا۔ ”آپ تو بہت جلدی واپس آ گئیں؟“

”ہاں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں بھی جلدی میں شام کی چائے پینا بھول گئی اور تم نے بھی یاد نہیں دلایا۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی میں برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ ”کچھ دور جا کے مجھے یاد آیا کہ چائے تو پی ہی نہیں۔“

”ابھی چائے لے کر آئی میم!“ شیتل یہ سنتے ہی کچن کی طرف دوڑ گئی۔

”میں معذرت خواہ ہوں خاتون!“ شہزاد نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”آپ جیسے ہی اپنے کمرے سے نکلیں‘ میں سمجھا کہ فوراً چلنا ہے۔“

”خیر چھوڑو‘ میرا پرس کہاں ہے؟“ میں بولی۔ ”چائے تو رحیم بنا ہی رہا ہو گا۔“

”پرس میں نے آپ کے کمرے میں لا کے رکھ دیا تھا‘ لے آؤں؟“ شہزاد نے کہا۔

”ہاں لے آؤ‘ چائے پی کر اب خرید ہی لیتے ہیں کتابیں۔ کل صبح ہو بازار بھی تو جانا ہے۔ لائبریری کے لئے الماریاں بھی تو خریدنا ہیں نا! اب ٹہلنے کا موڈ نہیں رہا۔ یہ ولیم کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہا؟“ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے شہزاد سے پوچھا۔

”رحیم نے بھیجا ہے‘ اسے کچھ سودا لینے۔“ شہزاد نے بتایا اور پھر میرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کوٹھی واپس آ کر چائے پینے کا مقصد محض یہ تھا کہ اس دوران میں جتنے بھی ”زخمی بلبل“ ہیں‘ کسی طرح اڑ جائیں۔ اس عبرت ناک واقعے کے بعد مجھے امید تھی کہ اب ان میں سے کوئی بھی میرے

قریب آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ یہی میرا مقصد بھی تھا۔

چائے پی کر جب میں ایک بار پھر شہزاد کے ساتھ کوٹھی سے نکلی تو دور دور تک میدان صاف تھا۔ مجھے کوئی بھی مشتبہ چہرہ نظر نہیں آیا۔

”خاتون! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟“ شہزاد میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

”برا بھلا ماننے کی فکر نہ کرو‘ جو بھی پوچھنا ہے پوچھ لو۔“

”آپ خود ہی کوئی پروگرام بناتی ہیں اور پھر خود ہی اچانک اسے بدل دیتی ہیں۔ کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟“

”ہاں اس کی وجہ ہے‘ بچپن سے میری یہی عادت ہے۔ تم اسے میرا مزاج بھی کہہ سکتے ہو۔“ میں نے بات بنا دی۔ ”رفتہ رفتہ تم میرے اس مخصوص مزاج کے عادی ہو جاؤ گے۔ ابھی تمہیں میرے ساتھ رہتے ہوئے زیادہ دن بھی تو نہیں ہوئے نا!“ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

”ویسے اب تو آپ مجھے کوٹھی واپس نہیں بھیج دیں گی؟“ شہزاد نے بھی مسکرا کر سوال کیا۔

”کچھ خبر نہیں کہ صبح کی طرح اس وقت بھی کتابیں لاد کر تمہیں تنہا کوٹھی لوٹنا پڑے!“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس سے مجھے کم از کم ایک بات کا یقین تو ہو ہی گیا۔“ وہ طویل سانس لے کر بولا۔

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ اس وقت کتابیں ضرور خریدیں گی۔“ وہ بھی یہ کہتے ہوئے ہنس دیا۔

”ارے‘ تم تو ہنستے بھی ہو۔“ میں دانستہ اسے خود سے بے تکلفی کا موقع دے رہی تھی۔

”جی ہاں خاتون! میں ہنسنا بھی جانتا ہوں۔ یہ تو وقت اور حالات ہوتے ہیں جو آدمی کو.........“

”اداس بلبل بنا دیتے ہیں۔“ میں بول اٹھی اور پھر خود ہی زور سے ہنس پڑی۔ شہزاد بھی میری ہنسی کا ساتھ دینے لگا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنی خوش مزاج بھی ہیں۔“ شہزاد بولا‘ پھر پوچھنے لگا۔ ”کیا پیدل ہی چلنے کا ارادہ ہے؟“

”حرج بھی کیا ہے؟ ویسے بھی اب دھوپ میں اتنی تیزی نہیں رہی۔ راستے میں کہیں رک کر ڈاب پئیں گے اور پھر چل دیں گے۔ ولنگٹن اسکوائر کون سا دور ہے‘ یہاں سے۔ تمہیں تو معلوم ہے‘ ہاتھ رکشا میں بیٹھنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ادھر سے واپسی میں دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے کہ میں تمہیں ہاتھ رکشا میں کتابوں کے ساتھ کوٹھی کے لئے روانہ کر دوں اور خود وہاں سے ٹہلتی ہوئی واپس آؤں۔“

شہزاد سے گفتگو کرتے ہوئے بھی میں اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ سادہ لباس والے‘ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکے تھے۔ چورنگی روڈ سے ہم ویلزلی اسٹریٹ کی طرف مڑ گئے جو ولنگٹن اسکوائر پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہیں میں نے اور شہزاد نے ڈاب (کچے ناریل کا پانی) پیا اور آگے بڑھ گئے۔ اسکوائر سے ذرا آگے دائیں جانب اسلامیہ کالج کا لان نظر آ رہا تھا۔ کالج کے قریب مجھے کئی بڑے بک

اسٹال دکھائی دیئے۔ میں' شہزاد کو ساتھ لئے ایک بک اسٹال میں داخل ہو گئی۔ دکان میں ایک باریش شخص نے مجھے دیکھتے ہی بُرا سا منہ بنایا۔ اس کا سبب یقیناً میرے جسم پر موجود لباس ہی ہو سکتا تھا۔ اس شخص کی داڑھی کے آدھے بال تقریباً سفید تھے۔ وہ اپنے سامنے ایک چوکی رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے وہاں ایک باریش نوجوان بھی نظر آیا جس کے سر پر ٹوپی تھی۔ گاہکوں کو بٹھانے کے لئے مونڈھے پڑے تھے۔ میں انہی مونڈھوں کی طرف بڑھنے لگی۔ میرے پیچھے شہزاد تھا۔

"اے شہاب الدین!" ادھیڑ عمر باریش نے نوجوان کو مخاطب کیا۔ "ذرا تُو پوچھ ان میم صاحبہ سے انہیں کیا چاہیئے؟" پھر خود ہی بولا۔ "ویسے یہاں ان کے مطلب کی کوئی کتاب نہیں ملے گی' ذرا ٹال جلدی سے۔" آخری الفاظ اس نے ذرا دھیمی آواز میں کہے تھے۔

اسے شاید یہ غلط فہمی تھی کہ مجھے انگریزی کے سوا کوئی اور زبان نہیں آتی ہو گی۔ میں ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔

"مولانا! میں جلدی ٹلنے والی شے نہیں ہوں۔" میں نے براہ راست ادھیڑ عمر شخص کو مخاطب کیا۔

وہ چوکی پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا' میری آواز سنتے ہی ایک دم اچھل پڑا اور ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔

"آپ .... آپ نے مجھ سے کچھ فرمایا؟" ادھیڑ عمر شخص کی آواز سے خوف کا اظہار ہونے لگا۔

"جی" میں نے اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "مجھے کچھ تاریخی کتب چاہئیں اور سنئے' ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ نہ میرا تعلق حکمراں قوم سے ہے اور نہ میں ان کی کاسہ لیس ہوں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو خود ہی کتابیں نکال لائیں' شہاب الدین کو شاید اتنا علم نہ ہو۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔" ادھیڑ عمر شخص فوراً اٹھ کر کھڑا ہوا۔ "معاف کیجئے گا' میں نے آپ کو غلط سمجھا۔"

"کوئی بات نہیں' غلط فہمی ہو جاتی ہے۔" میں یہ کہہ کر شہزاد سے مخاطب ہوئی۔ "تمہارا کیا خیال ہے' فارسی اور عربی کی کتابیں بھی دیکھ لیں؟"

"جیسی آپ کی مرضی' مجھے تو نہ فارسی آتی ہے اور عربی تو قرآن شریف کے سوا بالکل نہیں پڑھی۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"سنو بیٹے! وہ سیڑھی ادھر اٹھا لاؤ۔" ادھیڑ عمر شخص نے نوجوان کو مخاطب کیا۔ اسی اثنا میں دو افراد اور دکان میں داخل ہوئے۔

میں نے ان دونوں پر اُچٹتی سی نظر ڈالی۔ ان میں سے ایک تو کرتہ پاجامہ پہنے ہوئے تھا مگر دوسرے شخص کا حلیہ قطعی مختلف تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک اٹھی۔ ادھیڑ عمر شخص اپنے نوجوان مددگار کو کتابیں اتار اتار کر دیتا جا رہا تھا' مگر میری تمام تر توجہ اب اس عجیب حلیئے والے نووارد کی طرف تھی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں لگتی تھی' نوجوان ہی ہو گا۔ میرے اندازے کے مطابق پچیس برس یا اس سے بھی ایک آدھ سال کم۔ اس کے جسم پر سفید دھوتی اور پیروں میں کھڑاؤں تھے' سر گھٹا ہوا تھا مگر چوٹی خاصی موٹی تھی۔ چوٹی کو گرہ دے کر اس نے پیچھے کی طرف ڈال رکھا تھا۔

یہ بھی حکومت کے پالتو کتوں میں سے کوئی ہو سکتا ہے' میں نے سوچا اور چوکنا ہو گئی۔ کرتے پاجامے والا تو دکاندار کو مصروف دیکھ کر چلا گیا' مگر مشتبہ حلیئے والا بڑے اطمینان سے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ اس شخص نے ایک مرتبہ بھی میری طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا تھا۔ ادھیڑ عمر دکان دار نے شاید ابھی اس بہروپئے کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو میرے لئے کتابیں تلاش کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے غالباً میرے وہ الفاظ بھی سن لئے تھے جو میں نے شہزاد سے کہے تھے کہ فارسی اور عربی کی کتابیں بھی دیکھی لی جائیں۔

مجھے عجیب سی الجھن ہو رہی تھی۔ وہ "دھوتی بند" اس طرح سکون سے جم کر بیٹھ گیا تھا جیسے یہیں آرام سے بیٹھنے کے لئے آیا ہو۔ دکاندار جیسے ہی پلٹا اور کتابیں اٹھائے میری طرف بڑھا' مجھے مزید حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔

"السلام علیکم مولانا!" مشتبہ شخص نے دکاندار کو مخاطب کیا۔

"نمستے پنڈت جی!" دکاندار جواب میں بولا۔ "آپ کب آئے؟"

"ابھی کچھ ہی دیر پہلے۔ آپ ذرا مصروف تھے اس لئے مخاطب نہیں کیا۔" وہ جسے دکاندار نے پنڈت جی کہا تھا' دھیمے لہجے میں بولا۔

دکاندار نے میرے سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا دیا اور کہنے لگا۔ "آپ یہ کتابیں ملاحظہ فرمائیں' میں ذرا پنڈت جی سے پوچھ لوں' انہیں کون سی کتاب چاہیئے۔"

"نہیں مولانا! پہلے آپ ان محترمہ کو کتابیں دکھا لیں' پھر میں عرض کروں گا۔ ویسے بھی یہ مجھ سے پہلے یہاں موجود تھیں۔ ان کا حق.........."

"ٹھیک ہے۔" دکاندار نے اثبات میں سر ہلایا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔

تو یہ دکاندار اس بہروپئے سے واقف ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا' پھر دکاندار سے بولی۔ "مجھے کتابیں دیکھنے میں دیر لگے گی اس لئے آپ پنڈت جی سے جو پوچھنے والے تھے' پوچھ لیں۔" یہ کہتے ہی میں نے سامنے رکھی ہوئی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھالی اور ورق گردانی کرنے لگی۔

"بہتر ہے۔" دکاندار میرے سامنے سے اٹھ کر "پنڈت جی" کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

اس شخص نے دکاندار سے عربی کی ایک کتاب مانگی۔

"شہاب الدین!" دکاندار نے ہانک لگائی۔ "وہ کتاب لے آ جو میں نے تجھ سے الگ بندھوا کے رکھوا دی تھی۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔"

بظاہر تو میں کتابیں دیکھ رہی تھی مگر میرے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ مجھے اس وقت ایک بار پھر حیرانی ہوئی جب مشتبہ شخص کتاب کی قیمت ادا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شخص اپنے حلیئے سے کوئی متعصب قسم کا ہندو لگتا تھا' مگر عربی زبان کی ایک کتاب خرید کر لے گیا تھا۔ دکاندار سے اس کی واقفیت نے میرے اس خیال کو رد کر دیا تھا کہ وہ کوئی سادہ لباس والا حکومت ہی کا کارندہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دکاندار اس سے اتنی شناسائی کا اظہار نہ کرتا پھر وہ کون تھا؟ اس کے کھڑاؤں کی آواز بھی معدوم ہو چکی تھی۔ اسی

الجھن کے نتیجے میں یکے بعد دیگرے کئی کتابوں کے نام پڑھ کر میں نے انہیں ایک طرف رکھ دیا۔ پھر میں دکاندار سے مخاطب ہو گئی۔ "آپ ایسا کریں مولانا کہ یہ ساری کتابیں بندھوا دیں' سبھی کام کی لگتی ہیں۔"

"جی!" دکاندار نے حیرت کا اظہار کیا۔

"کیوں' کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"مم .... میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ آپ کا حکم ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے! میں تو محض اس لئے دریافت کر رہا تھا کہ ابھی تو آپ نے صرف چند کتابیں ملاحظہ کی ہیں' پھر یہ کہ ان کی قیمت .... میرا عرض کرنا یہ تھا کہ ان میں سے کچھ کتابیں خاصی مہنگی ہیں۔"

"اگر مہنگی ہیں تو ہوا کریں۔ آپ سے میں نے یہ تو نہیں کہا کہ مجھے کم قیمت کتابیں چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "آپ بل بنایئے .... جلدی کریں۔"

"جی بجا ارشاد فرمایا۔" دکاندار بولا اور پھر اپنے مددگار نوجوان کو آواز دی۔ "شہاب الدین! ذرا قلم دوات ادھر ہی اٹھا لاؤ اور رسید بک بھی۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "دراصل ایک ہی عہد حکومت پر میں نے آپ کے انتخاب کی خاطر دو دو تین تین کتابیں نکال دی تھیں۔ آپ فرمائیں تو سب کتابوں کی رسید بنا دوں۔ حکم دیں تو جو کتابیں ایسی ہیں' ان میں سے بہتر کتاب خود منتخب کر لوں؟"

اب یہ عقدہ کھلا کہ دکاندار کیوں اظہار حیرت کر رہا تھا۔ دراصل عجیب حلئے والے شخص کی وجہ سے میں ان کتابوں کو ٹھیک سے دیکھ ہی نہیں سکی تھی۔ دکاندار شریف اور ایماندار معلوم ہوتا تھا ورنہ وہ یہ پیشکش کبھی نہ کرتا کہ خود میرے لئے بہتر کتاب منتخب کر دے۔ اس پر میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے یہ اجازت دے دی کہ جو کتابیں ایک ہی عہد حکومت پر ہیں' ان میں سے ایک کتاب وہ خود ہی انتخاب کر لے۔ اس نے جلدی جلدی کتابیں چھانٹیں اور انہیں ایک طرف رکھتا گیا۔ اس دوران میں شہاب الدین قلم دوات اور رسید بک ایک طرف رکھ گیا تھا۔

"مولانا ایک بات بتائیں گے؟" دکاندار جب رسید بنا چکا تو میں نے اس سے کہا۔

"جی فرمایئے!" وہ کتابوں کی رسید میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

میں نے رسید پر نظر ڈال کر اپنا پرس کھولا اور ان کتابوں کی قیمت ادا کر دی' پھر سوال کیا۔ "وہ پنڈت جی کون تھے جو آپ سے عربی کی ایک کتاب خرید کر لے گئے تھے؟ وہی جنہوں نے آپ کو سلام کیا تھا اور آپ نے جواب میں نمستے کہا تھا؟"

"ارے وہ' پنڈت گوری شنکر تھے۔ ہمیشہ میرے ہی یہاں سے کتابیں خریدتے ہیں۔" دکاندار نے بتایا پھر وہ اپنے مددگار نوجوان کو آواز دے کر کتابیں باندھنے کے لئے کہنے لگا۔ دکاندار کا جواب میرے لئے ناکافی تھا۔ میرا مقصد محض اس شخص کا نام دریافت کرنا نہیں تھا' نہ یہ کہ وہ دکاندار کا کوئی مستقل گاہک ہے۔ مجھے تو کچھ اور ہی کرید تھی۔ ایک ہندو پنڈت کو بھلا عربی کی کسی کتاب سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ شہزاد اس دوران میں قطعی خاموش بیٹھا رہا تھا' مگر جب اس پنڈت نے مولانا کو سلام کیا تھا تو میں نے اسے بھی چونکتے دیکھا تھا۔

شہاب الدین تو کتابوں کے بنڈل باندھنے لگا اور دکاندار میرے استفسار پر اس پنڈت کے بارے میں بتانے لگا۔

وہ مشتبہ پنڈت گوری شنکر' راما کرشنا انسٹیٹیوٹ آف لینگویج کا ایک ہندو اسکالر تھا۔ یہاں طلبہ کو لینگویج ڈپلومہ دیا جاتا تھا۔ اس ادارے میں چودہ زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان میں اردو' ہندی' سنسکرت' انگریزی' بنگلہ' فارسی' عربی' فرنچ' لیٹن وغیرہ سبھی زبانیں شامل تھیں۔ یہاں ہر زبان کے بڑے بڑے اسکالر پڑھاتے تھے۔ یہ انسٹیٹیوٹ غیر متعصب ہندوؤں نے قائم کیا تھا۔ اس کے نگران کا درجہ وائس چانسلر کے مساوی تھا۔ وائس چانسلر سے لے کر عام ہندو اسکالر تک یہاں ایک ہی مخصوص لباس میں رہتے تھے۔

"مگر مولانا! پنڈت جی کی عمر تو زیادہ نہیں لگتی تھی۔" میں بول اٹھی۔

"دس سال سے تو میں پنڈت جی کو اسی طرح دیکھ رہا ہوں' پچاس کے پیٹے میں ہوں گے۔" دکاندار نے گویا انکشاف کیا۔

"حیرت ہے!" شہزاد بھی اس انکشاف پر حیران رہ گیا۔

میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا جو زبان پر بھی آ گیا۔ "اس انسٹیٹیوٹ کے اخراجات کون برداشت کرتا ہے مولانا!"

"اس کے اخراجات برداشت کرنے والوں میں غیر متعصب سرمایہ دار ہندو پیش پیش رہتے ہیں۔" دکاندار نے جواب دیا۔

"میں نہیں مان سکتا مولانا!" شہزاد پُرجوش آواز میں بولا۔ "ہندو اور غیر متعصب ناممکن! .... یہ سب ڈھونگ ہے۔ غیر متعصب کہلوا کر یہ لوگ ہندومت کا پرچار کرتے ہیں۔ معاف کیجئے گا مولانا! آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟"

دکاندار اس سوال پر ذرا سا چونکا' پھر کہنے لگا۔ "میں خیر ہوں تو بنارس کا رہنے والا' مگر اس شہر میں رہتے کوئی بیس سال سے اوپر ہو گئے ہیں۔"

"اور وہ پنڈت گوری شنکر بھی شاید وہیں کے ہوں گے!" شہزاد کے لہجے میں تلخی تھی۔

"لیکن آپ .... آپ نے کیسے پہچان لیا؟" دکاندار' شہزاد کے لہجے کی تلخی کو شاید پی گیا اور پوچھا۔

"ان کی اور آپ کی بولی سے' نہایت افسوس کا مقام ہے مولانا کہ آپ سلام کے جواب میں نمستے کہتے ہیں۔"

"کیوں' نمستے کہنے یا نمسکار میں کیا برائی ہے؟" دکاندار بھی بحث کرنے لگا۔ "مجھے اب آپ اس قدر جاہل بھی نہ سمجھیں۔ نمستے کا مطلب آداب اور تسلیم ہی ہے۔ نمسکار سنسکرت سے ہندی میں آیا ہے جس کے معنی سلام علیک کے بھی ہیں۔ کہیں تو لغت نکال کے دکھاؤں؟ ایک ہندو پنڈت اگر مجھے السلام علیکم کہہ رہا ہے' جواب میں اگر میں بھی نمستے یا نمسکار کہہ دیتا ہوں تو کون سا گناہ ہو گیا؟"

"مولانا! آپ دہلی گئے ہیں کبھی؟" شہزاد نے سوال کیا۔

"جی نہیں۔" دکاندار نے ناگواری سے جواب دیا۔

"وہاں کے مسلمانوں کی حالت دیکھیں تو آپ کو پتا چلے کہ نمستے اور السلام علیکم میں کیا فرق ہے؟ آپ نے تو ہوش سنبھالتے ہی صبحِ بنارس دیکھی ہو گی نا! کاش کبھی شامِ اودھ بھی دیکھ لیتے۔ یا کبھی کسی سے دلی کے اجڑنے اور بسنے کا ماجرا ہی سن لیا ہوتا۔ کبھی لال قلعے کی فصیلوں کے نوحے سنے ہوتے کبھی.........."

"شہزاد!" میں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا پھر میں دکاندار سے مخاطب ہوئی۔ "مولانا آپ خیال نہ کیجئے گا' ان کا تعلق دلی سے ہے اور اس میں یقیناً آپ کا کوئی قصور نہیں کہ آپ وہاں نہیں گئے۔"

"دلی سے تعلق ہو کہ مغلیہ خاندان سے ہمیں کیا لینا دینا؟ ہم تو دو پیسے کمانے یہاں آئے ہیں' اللہ تعالیٰ رزق حلال دے رہا ہے' ہمارے لئے یہی کافی ہے۔" دکاندار میری مداخلت پر کچھ نرم پڑ گیا اور با آواز بلند بولا۔ "ابے او شہاب الدین! تجھ سے ابھی تین بنڈل نہیں بندھے!"

"بندھ گئے جی مولانا! بس آخری بنڈل باندھ رہا ہوں' سُتلی کم پڑ گئی تھی۔" شہاب الدین نے اپنی صفائی پیش کی۔

"آپ یہ تینوں بنڈل اٹھا کے کیسے لے جائیں گی؟" دکاندار نے مجھ سے پوچھا۔ "ان بھائی دلی والے میں تو اتنا دم لگتا نہیں۔"

اس سے پہلے کہ شہزاد اور اس دکاندار میں دوبارہ ٹھن جاتی' میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ "میں اٹھا لوں گی تینوں بنڈل۔"

"آپ اٹھائیں گی۔" دکاندار نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرے سر پر اچانک سینگ نکل آئے ہوں یا اسے میری ذہنی صحت پر شبہ ہو۔

"باہر تک ہی تو لے جانے ہیں بنڈل۔ وہاں سے کوئی ہاتھ رکشا کر لیں گے۔"

"آپ نہیں اٹھائیں گی کوئی بنڈل! ایک بنڈل میں اٹھاؤں گا' ایک شہاب الدین اور ایک.........."

دکاندار نے دانستہ شاید اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں ایک بنڈل میں اٹھا لوں گا۔" شہزاد خود ہی بول اٹھا۔ دکاندار کا اشارہ بھی اسی کی طرف تھا۔ شہزاد غصے اور جذبات کی رو میں بہہ کر وقتی طور پر جیسے کہیں بہت دور نکل گیا تھا اور اب غالباً اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

دکاندار بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ اس نے سب سے بھاری بنڈل شہزاد کو تھما دیا۔ پھر جب شہزاد بنڈل اٹھا کے چلا تو خود بھی ایک بنڈل اٹھا کے اس کے پیچھے چل دیا۔ اس کا مددگار نوجوان پیچھے تھا اور میں سب سے آخر میں۔

"ہو تیری ناجک کمریا سو بل کھائے۔" دکاندار گنگناتا ہوا شہزاد کے پیچھے چل رہا تھا۔

"مولانا! آپ کی آواز بڑی رسیلی ہے۔" میں نے دکاندار پر فقرہ چست کیا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ وہ شہزاد کو چڑانے سے باز آ جائے۔ نتیجتاً دکاندار کی بولتی بند ہو گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ دکاندار کی اس حرکت پر شہزاد کا خون کھول رہا ہو گا۔ اس نے شاید شہزاد کی حیثیت سمجھ لی تھی۔

ہاتھ رکشا فوراً ہی مل گیا' مگر میں اس میں نہیں بیٹھی۔ شہزاد کتابوں کے تینوں بنڈل رکشا میں رکھوا کر خود بھی اس میں بیٹھ گیا۔

"تم چلو' میں آتی ہوں ابھی۔" میں نے شہزاد سے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر رکشا روانہ ہو گیا۔

"پھر کبھی تشریف ضرور لائیے گا۔" عقب سے مجھے دکاندار کی آواز سنائی دی۔ "میں آپ کے لئے اور کتابیں نکال کر رکھوں گا۔" میں نے مڑ کر دیکھا تو دکاندار ابھی تک باہر ہی کھڑا تھا۔

"ضرور آؤں گی۔" میں بولی۔ "مگر مولانا! آپ سے تعارف تو ہوا ہی نہیں۔"

"خادم کو مولوی برکت علی کہتے ہیں۔" دکاندار نے اپنا تعارف کرایا۔

"ایک شرط پر آؤں گی' ناجک کمریا والا گیت سنانا پڑے گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

دکاندار نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "اب کیا دھرا ہے پھٹے بانس میں' کبھی تھی آواز اپنی بھی۔"

"ہر شخص کو اپنی آواز کے بارے میں تقریباً یہی غلط فہمی ہوتی ہے خیر.......... آپ جغرافیہ اور معلومات عامہ پر بھی کچھ کتابیں منگوا کر رکھ لیجئے گا' میں بشرط فرصت کسی دن آ کے لے جاؤں گی۔" پھر میں وہاں مزید نہیں رکی اور ولنگٹن اسکوائر کی طرف پیدل ہی چل دی۔

میں چوکنا انداز میں اردگرد کا جائزہ لیتی ہوئی چل رہی تھی مگر مجھے کوئی مشتبہ شخص اپنے قریب و دور نظر نہیں آیا۔

ولنگٹن اسکوائر سے میں ٹرام میں بیٹھ گئی۔ سڑک عبور کرنے سے بچنے کی خاطر میں ٹرام ڈپو سے پہلے ہی اتر گئی' پھر پیدل ہی چوراہے سے اپنی کوٹھی کے لئے چل دی۔ شام ہو چکی تھی اور چورنگی روڈ کی پیدل رو (فٹ پاتھ) پر خاصا ہجوم تھا۔ ایک دراز قد شخص تیز قدمی سے میرے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ اس نے بغل میں کپڑے کا ایک تھیلا دبا رکھا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کچھ اور سامان تھا' کیا؟ یہ میں نہیں دیکھ سکی۔ معلوم نہیں کیسے اس کی بغل سے کپڑے کا تھیلا پھسل گیا اور اسے شاید احساس بھی نہیں ہوا اور وہ آگے بڑھ گیا۔ میرے ساتھ ساتھ ہی ایک اور شخص چل رہا تھا۔ اس نے لپک کر وہ تھیلا اٹھا لیا اور چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا میں نے سوچا' تھیلا اٹھانے والے کو پکڑ لوں۔ صورت ہی سے وہ کوئی مفلوک الحال معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے اس دراز قد شخص پر افسوس ہو رہا تھا جو نہ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اسے تھیلے کا خیال آئے گا تو سر پیٹے گا' کیا خبر تھیلے میں اس کی کوئی قیمتی شے ہو' جس نے تھیلا اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تھا' اس پر مجھے غصہ آ رہا تھا۔ ابھی تک وہ میری نظر میں تھا۔

"بے ایمان کہیں کا۔" میں بربڑائی۔ وہ اب سڑک عبور کر کے ٹرام ڈپو تک پہنچنے کے لئے زیبرا کراسنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں، تھیلا اٹھانے والے تک پہنچتی، اسے کئی آدمیوں نے گھیر لیا۔ میں ان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

"اے شالا لوگ! ہم نے تم کو تھیلا اٹھاتے دیکھ لیا ہے۔" اس شخص کو گھیرنے والوں میں سے ایک بولا اور اس کے ہاتھ سے تھیلا جھپٹ لیا۔

"بابا! دیکھو تو تھیلے میں کیا ہے؟" ایک اور آدمی نے کہا۔

میں ان لوگوں سے کچھ ہی فاصلے پر لاتعلق سی بنی کھڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ انہی میں سے ایک شخص نے تھیلا اٹھانے والے کا بازو تھام رکھا تھا کہ وہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ کپڑے کے تھیلے سے ایک آدمی نے زیورات برآمد کر لئے۔ پھر وہ سبھی دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگے۔ تھیلا اٹھانے والے کی پہلے حالت خراب تھی، سونے کے زیورات پر نظر پڑتے ہی وہ جیسے شیر ہو گیا۔

"یہ میرا تھیلا ہے .... تم لوگ بھرے بازار میں مجھے لوٹ رہے ہو۔ میں ابھی پولیس کو بلا لوں گا۔"

"آہستہ بولو شالا لوگ!" ان میں سے ایک نے تھیلا اٹھانے والے کو ڈانٹا، پھر کہنے لگا۔ "آدھا آدھا کر لو۔"

"پولیس آ گیا تو نہ تم کو کچھ ملے گا، نہ ہم کو۔ تھیلا تم نے ہمارے سامنے اٹھایا ہے، ہم پولیس کو بیان دے گا۔" کسی دوسرے نے کہا۔

"اور چلو، اور۔" پہلا آدمی بولا جس نے تھیلا جھپٹ لیا تھا۔ "اور چل کے بات کرے، گا، شور کرنے کا ضرورت نہیں، یہ پکڑو تھیلا۔"

وہ پانچ آدمی تھے جنہوں نے تھیلا اٹھانے والے کو گھیر لیا تھا۔ زیورات دیکھ کر شاید ان سبھی کی نیت خراب ہو گئی تھی حالانکہ وہ تھیلا ان میں سے کسی کا نہیں تھا۔ میں نے سوچا، دیکھوں تو سہی کہ یہ لوگ اس جھگڑے کو کس طرح نمٹاتے ہیں۔ سو میں بھی خاموشی سے ان کے پیچھے ہو لی۔ وہ پانچوں، تھیلا اٹھانے والے کو گھیرے ہوئے ٹرام ڈپو سے ذرا آگے درختوں کے اس جھنڈ میں لے گئے جہاں ایک رات شمبھو مجھے اپنے پیچھے لگا کر لے آیا تھا۔ وہ لوگ، تھیلا اٹھانے والے کو لے کر زیادہ اندر نہیں گئے، مجھے ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

تھیلا اٹھانے والے کے پاس اس وقت صرف بیس روپے تھے اور ان پانچوں کا مطالبہ کم سے کم سو روپے تھا۔

"میں تم لوگوں کو صرف تیس روپے اور دے سکتا ہوں، وہ بھی کولوٹولہ چل کر، زیورات میرے پاس ہی رہیں گے۔" یہ آواز تھیلا اٹھانے والے کی تھی۔

"در ملائی نہیں چلے گا۔" دوسری آواز ابھری۔ "سو روپیا سے کم نئیں ہو گا۔ ہم پانچ لوگ ہے، بابا! دس دس روپیا سے کیا کام چلے گا؟"

کچھ دیر مزید بحث مباحثے کے بعد انہوں نے بیس روپے، تھیلا اٹھانے والے سے پیشگی وصول کر لئے۔ پھر ان میں سے ایک بقیہ رقم وصول کرنے کولوٹولہ جانے پر آمادہ ہو گیا۔ بقیہ چاروں نے اس کا وہیں انتظار کرنے کو کہا۔

ان لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے میں نے تھیلا اٹھانے والے کے بارے میں صرف اتنا سمجھا تھا کہ وہ کلکتہ شہر میں نووارد تھا۔ کولوٹولہ اسٹریٹ میں وہ اپنے کسی دوست کے یہاں ٹھہرا تھا۔ مجھے دراز قد شخص پر ملال ہوا کہ جس کا مال وہ سب مل کر کھا گئے تھے۔ میں ان سب پر لعنت پڑھ کر وہاں سے آگے بڑھنے والی تھی کہ سامنے سے ایک دراز قد شخص لپکتا ہوا آیا۔ مجھے کچھ شبہ سا ہوا کہ شاید یہ وہی ہے جس کا تھیلا گرا تھا کیونکہ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ جب وہ درختوں کے جھنڈ میں داخل ہونے لگا تو اس کی پشت پر میری نظر پڑی اور میں چونک اٹھی، میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔

"یہ آخر چکر کیا ہے؟" میں نے سوچا اور پھر قہقہوں کی صورت میں مجھے اس کا جواب مل گیا۔

"مرغی تو نہیں پھنسی، ہاں مرغا پھنس گیا۔" کسی نے زور سے ہنس کر کہا۔ "یہ لو استاد بیس روپے، بقیہ تیس روپے وصول کرنے پرفلو مرغے کے ساتھ گیا ہے۔"

"ابے لونڈو! تم بالکل گھامڑ ہو۔ وہ مرغی تو ابھی مجھے ادھر آتے ہوئے دکھائی دی تھی۔" یہ آواز اسی دراز قد شخص کی معلوم ہو رہی تھی۔

"نہیں استاد!"

"ابے ہاں .... خود میں نے اسے اپنے آنکھوں سے دیکھا ہے۔ گھبٹ لاتے اسے اندر اور کر لیتے ذبح، پرس دیکھا تھا، اس کے ہاتھ میں؟ ابے وہی چھین لیا ہوتا۔"

"تو اب اسے گھسیٹ لائیں استاد!"

"ابھی تو کیا وہ ذبح ہونے کے لئے کھڑی ہو گی وہاں؟ کھسک لی ہو گی۔"

یہ سب کچھ سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ تو ان نوسربازوں نے مجھے پھانسنے کے لئے وہ جال بچھایا تھا جس میں کوئی اور پھنس گیا تھا۔ یقیناً وہ زیورات نقلی ہوں گے۔ مجھے جس شخص پر رحم آیا تھا، وہی ان سب کا سرغنہ نکلا تھا۔ ممکن ہے کہ میں اس دراز قد شخص کے وہاں آنے سے پہلے آگے بڑھ گئی ہوتی تو اسے مظلوم ہی سمجھتی رہتی۔ وہ لوگ اپنی بول چال سے بنگالی نہیں لگتے تھے، ہاں وہ شخص ضرور بنگالی تھا جو تھیلا اٹھانے والے کے ساتھ گیا تھا۔

"پھر بھی استاد! دیکھ لینے میں کیا حرج ہے، کیا خبر ہتھے چڑھ ہی جائے؟" کوئی بولا۔

"دیکھو بے، تم میں سے کوئی باہر نہیں نکلے گا، جب تک پرفلو لوٹ کر نہ آ جائے۔ مرغی کو میں خود گھیر کے لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کڑکڑائے گی تو بہت، مگر ڈرنا مت۔ زیادہ چپڑ چپڑ کرے گی تو سالی کا پیٹ پھاڑ کر یہیں ڈال جائیں گے۔ یا تو وہ ٹرام ڈپو کی طرف گئی ہو گی یا پھر ابھی اگلے اسٹاپ تک پہنچی ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پرس میں تگڑا مال ہے۔ میں ولنگٹن اسکوائر سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا، مگر حرام زادی نے پرس چھیننے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کسی چوکنا ہرنی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی چل رہی تھی۔ میں آیا ابھی۔ اگر مل گئی تو گھسیٹ لاؤں گا۔"

ان الفاظ نے میرے پیروں میں جیسے زنجیر ڈال دی تھی۔ اپنے لئے میں نے اس سے گھٹیا زبان کبھی نہیں سنی تھی۔

چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ درختوں کے جھنڈ سے وہی دراز قد شخص باہر آیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا' پھر ٹھٹک کے رک گیا۔

"استاد!" معاً میں نے اسے مخاطب کیا۔ "مرغی حاضر ہے' کر لو ذبح .... تمہارے اندازے کا واقعی جواب نہیں۔ اس پرس میں واقعی تگڑا مال ہے۔ شاباش' ہمت کرو اور آگے بڑھ کر مجھ سے یہ پرس چھین لو۔" میں نے اس کی طرف پرس بڑھایا۔

وہ مجھے ناقابل یقین سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی اُلوؤں جیسی آنکھوں سے شیطنت جھلک رہی تھی۔

"ابے حرام زادے! میں تجھے پرس چھیننے کا موقع دے رہی ہوں اور تُو اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ بڑا ہی بزدل ہے بے تُو!"

"کون ہے تُو؟" وہ پہلی بار بولا۔ اس کی آواز کسی سانپ کی پھنکار سے مشابہہ تھی۔ "کیوں مرنا چاہتی ہے میرے ہاتھ سے؟"

"تُو مرغے کی طرح کیوں کڑکڑائے جا رہا ہے؟ ہمت ہے تو آگے بڑھ نا' گھسیٹ کے لے جا' مجھے درختوں کے جھنڈ میں۔ وہاں تو تیرے چار چار مددگار موجود ہیں' میں اکیلی ہوں' پھر بھی ڈر لگ رہا ہے تجھے۔" میری پوری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اسے غصہ آ جائے۔

"اچھا تو پھر تجھے پچھاڑنا ہی پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔ چوڑے پھل کا وہ گراری دار چاقو اس نے مجھے دہشت زدہ کرنے کے لئے آہستہ آہستہ کھولنا شروع کیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"اب تُو آگے بھی بڑھے گا کہ وہیں کھڑا ہوا کسی بندر کی طرح بھبکیاں دیتا رہے گا۔" میں اسے چڑانے کے لئے مسکرائی۔

معلوم نہیں' اچانک اسے کیا سوجھی کہ اس نے چاقو بند کر کے دوبارہ اپنے کرتے کی جیب میں ڈال لیا اور ہنس کر بولا۔ "میں تجھے پہچان گیا' بول تُو بمبئ ہی سے یہاں آئی ہے نا؟ تیرا نام رانی ہے' بمبئ کی رانی .... اور میں کلکتے کا راجا ہوں۔ کہاں ٹھہری ہے؟"

"کیوں' کیا ہوا؟ تُو جو اتنی شیخی بگھار رہا تھا' کیا ہوئی؟" میں حیران ہو کر بولی۔

"اپنوں پر کون ہاتھ اٹھاتا ہے رے پگلی! میں نے تیرا نام ہی نام سنا تھا' آج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ تُو واقعی بڑی دلیر ہے۔ ورنہ تیری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو اب تک اپنے پیروں پر کھڑی نظر نہ آتی۔ معاف کر دے مجھے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے پھر چاقو نکالا اور آگے بڑھ کر اسے میرے قدموں میں ڈال دیا اور کہنے لگا۔ "آج تک میں نے کسی کے قدموں میں اپنا چاقو نہیں ڈالا' اس سے زیادہ میں تجھے عزت نہیں دے سکتا۔ تُو چاہے تو کلکتے میں میری میزبانی قبول کر لے' چاہے میرے

چاقو کو ٹھوکر مار کے دور پھینک دے۔ میں بُرا نہیں مانوں گا۔ دھرم تلے کا یہ پورا علاقہ میرے پاس ہے۔" پھر اس نے درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھ کر زور سے آواز لگائی۔ "ابے لونڈو! باہر آ جاؤ۔ دیکھو کون آیا ہے؟"

دراز قد شخص کی آواز سن کر اس کے چاروں گرگے باہر نکل آئے۔

"استاد! یہ تو وہی ہے۔" ان میں سے ایک حیرت سے بولا۔

"ابے یہ استادوں کی بھی استاد ہے۔ دیکھ نہیں رہا کہ تیرے استاد کا چاقو اس کے قدموں میں پڑا ہے۔ کبھی نام سنا ہے بمبئ کی رانی کا' یہ وہی ہے۔"

صورت حال اچانک اس طرح بدل جائے گی' میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ جرائم پیشہ شخص مجھے اپنی ہی کوئی ہم پیشہ سمجھ بیٹھا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس کی یہ غلط فہمی دور کروں یا نہ کروں؟ پھر میں نے کچھ سوچتے ہوئے جھک کر اس کا چاقو اٹھا لیا۔

"لو استاد! اپنا چاقو جیب میں رکھ لو۔ میں اب چلوں گی۔"

"یہ تو بتا دو رانی کہ ٹھہری کہاں ہو؟" استاد نے چاقو لیتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں اب میرے لئے احترام تھا۔

"تمہارے ہی علاقے میں ٹھہری ہوں۔ فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"کوئی لمبا ہاتھ مارنا ہو اور لونڈے چاہئیں تو بتا دینا۔" پھر وہ مجھے اپنا پتا سمجھانے لگا۔

وہ راجا استاد کہلاتا تھا اور دھرم تلے ہی کے ایک علاقے چاندنی چوک میں اس کی سکونت تھی۔ ہندوستان ہی کے ایک صوبے کے شہر رامپور سے وہ یہاں آ بسا تھا۔ ذرا ہی دیر میں اس نے مجھ سے اپنا مکمل تعارف کرا دیا۔

"اگر ضرورت پڑی کبھی تو بتا دوں گی۔" میں نے مصلحتاً کہہ دیا۔ میں اب وہاں مزید رکنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے شہزاد کا خیال آ رہا تھا جو یقیناً میری طرف سے فکرمند ہو گا۔ اس کے علاوہ مولوی برکت علی سے اس کی نوک جھونک بھی یاد آ رہی تھی۔

"رانی! تم نے میری دوستی قبول کر کے میرا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔" راجا استاد بولا۔ "میں تمہارا ممنون ہوں اور ایک بار پھر تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے استاد! معافی تلافی کی ضرورت نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم سے بس ایک آخری بات اور کہنا تھی کہ بمبئ واپس جانے سے پہلے ایک بار مل کے ضرور جانا۔ میں صبح گیارہ بجے سے پہلے اڈے سے نہیں نکلتا۔ ویسے بھی تمہیں تو خبر ہے' دھندے کا وقت شام سے پہلے شروع نہیں ہوتا۔" راجا استاد عاجزی سے بولا۔

"استاد! میں نے تمہارا اتنا وقت برباد کیا' اس پر شرمندہ ہوں۔ یہ تمہارے دھندے کا وقت تھا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے پرس کھولا اور اس میں سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر دینے لگی۔ "اگر تم نے یہ رقم قبول نہیں کی استاد تو میں سمجھوں گی تمہیں میری دوستی منظور نہیں۔"

"رانی! تم دو سو جوتے میرے سر پر مار لو' مگر مجھے اتنا ذلیل نہ کرو۔ خدا کی قسم' میں اس میں سے ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ تم اگر اپنا ٹھکانہ بتا دیتیں تو میں خود روز تمہارا حصہ تمہیں پہنچا دیا کرتا۔ میرے لئے تو یہ بڑی عزت کی بات ہے کہ تم اس علاقے میں ٹھہری ہو۔"

مجبوراً میں نے دونوں نوٹ پرس میں واپس رکھ لئے اور پھر وہاں سے چل دی۔ میں واپسی میں یہ سوچ رہی تھی کہ ان لوگوں کی دنیا بھی عجیب ہے۔ کہیں تو یہ ایک ایک پیسے کے لئے جان لینے اور جان دینے پر تیار ہو جاتے ہیں اور کہیں ایک پیسہ بھی نہ لینے کی خاطر قسم کھانے لگتے ہیں۔

میں کوٹھی واپس پہنچی تو اندر قدم رکھتے ہی میری نظر اپنے نیپالی محافظ نریندرا کے چہرے پر پڑی۔

"کیا بات ہے نریندرا! تم اتنے ڈرے ڈرے سے کیوں ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میم! .... وہ پھر .... پھر ادھر آیا تھا۔ شہزاد بابو اس سے بات کیا تھا۔ میں تو گیٹ نہیں کھولا میم!" نریندرا نے جواب دیا۔

"کون آیا تھا؟" میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں وہی شیطان صفت سادھو شمبھو دوبارہ تو میری کوٹھی کے پھیرے نہیں لگانے لگا۔

جواباً نریندرا نے سادھو کا حلیہ بیان کر دیا۔ میرے ملازمین اس سے ڈرنے لگے تھے' یہ بات پہلے سے میرے علم میں تھی۔

"تم فکر نہ کرو۔" میں نے نریندرا کو تسلی دی۔ "اب میں آ گئی ہوں' وہ کمینہ سادھو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"جی میم! ہم جانتا ہے' وہ آپ سے ڈرتا ہے اور بھاگ جاتا ہے۔" نریندرا کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ میرے تمام ملازمین میں نریندرا ہی شمبھو سے زیادہ خوفزدہ رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہی شمبھو کی شیطانی قوتوں کا سب سے پہلے شکار ہوا تھا۔

میں اندر پہنچی تو نریندرا کی طرح سبھی کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ولیم بار بار اپنے سینے پر کراس بنا رہا تھا۔ شیتل کی بڑی بڑی حسین آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ رحیم منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ شہزاد کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ وہ سبھی صحن میں جمع تھے۔ کسی خطرے کے وقت عموماً جس طرح لوگ یک جا ہو جاتے ہیں' اس وقت کچھ ایسا ہی سماں تھا۔

سب سے پہلے میں نے رحیم کو مخاطب کیا کیونکہ اس وقت اسے باورچی خانے میں ہونا چاہئے تھا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو' کیا آج کھانا نہیں پکے گا؟"

"میم! میں ردبلا کا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔" رحیم نے جواب میں کہا۔

"جاؤ' کھانا پکاؤ۔ مجھے نریندرا سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ خبیث سادھو پھر ادھر آیا تھا۔" میں یہ کہتی ہوئی برآمدے میں پڑی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہے' میم! اب آپ آ گئی ہیں تو کیا ڈرنا؟" رحیم نے شاید یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی۔

پھر رحیم' شیتل اور ولیم بھی میرے کہنے پر روزانہ کے کام کاج میں لگ گئے۔ شہزاد سے میں نے

کرسی لا کر وہیں بیٹھ جانے کو کہا۔ برآمدے ہی میں ایک طرف ڈائننگ ٹیبل کے گرد کئی کرسیاں پڑی تھیں۔ شہزاد انہی میں سے ایک کرسی اٹھا لایا۔

"ہاں اب بتاؤ' کیا قصہ ہے؟" میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"خاتون! میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ وہ کمینہ تو ابھی زندہ ہے۔ وہ کسی اور ہی سادھو کی لاش ہو گی جو یہاں سے غائب ہو گئی تھی۔"

"اچھا پھر' اگر وہ زندہ بھی ہے تو کیا ہوا؟ تم تعلیم یافتہ ہو کر بھی اتنے توہم پرست کیوں ہو؟ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی۔"

"یہ سب توہم ہی کا کارخانہ ہے خاتون! .... کیا کیا جائے' دن کو دن اور رات کو رات تو کہنا ہی پڑتا ہے۔"

"تو بتاؤ تو سہی کہ آخر ہوا کیا؟ میں نے تمہیں کتابوں کے پیکٹ لے کر کوٹھی بھیجا تھا' اس کے بعد بتاؤ کہ کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میں ہاتھ رکشا میں یہاں پہنچا تو وہ پہلے سے موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا کہ دیوی مائی کو کہاں چھوڑ آیا بچہ؟ ہم تو درشن کو آئے تھے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا خاتون! مجھے اس سے خوف محسوس ہوا۔ میں نے نریندرا کو گیٹ کھولنے کے لئے کہا' مگر اس نے پہلے ہی سادھو کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اس نے گیٹ نہیں کھولا۔ ہاتھ رکشا والے کی مدد سے میں نے کتابوں کے پیکٹ اتارے۔ وہ بھی سادھو سے خوفزدہ لگتا تھا اور بار بار مجھ سے کرائے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے کرایہ دے دیا تو پھر وہ ایک لمحے بھی نہیں رکا۔ سادھو اس وقت چمٹا بجا بجا کر ہمارے گیٹ کے سامنے ناچ رہا تھا۔" شہزاد نے بتایا۔

"پھر تم نے کیا کیا؟ وہ لعنتی سادھو خود ہی چلا گیا یا تم نے اس سے چلے جانے کو کہا؟" میں نے دریافت کیا۔

"میری تو خیر اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اس سے جانے کو کہتا۔ وہ خود ہی مجھ سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ دیوی مائی سے کہنا بچہ! درشن کو نہ ترسائیں۔"

"تم نے اس سے پوچھا نہیں' کون دیوی مائی؟"

"خاتون! وہ آپ ہی کو تو دیوی مائی کہتا ہے۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "جب وہ چلا گیا تو نریندرا نے گیٹ کھولا۔"

"رحیم اور ولیم بھی ہوں گے اندر؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں خاتون! مگر کوئی بھی باہر نہیں نکلا اور یہ اچھا ہی ہوا۔" شہزاد بولا۔ "گیٹ کھل جاتا تو معلوم نہیں' وہ کیا کرتا؟"

"تم سب کو وہ کچا چبا جاتا اور بھلا کیا کرتا۔" شہزاد کی بات پر مجھے غصہ آ گیا۔ "اگر یہ سب لوگ اتنے ہی بزدل ہیں تو.........." میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ بہرحال غریب لوگ تھے۔ انہیں نوکری سے نکال کر دوسرے ملازمین رکھنا' ان پر ظلم ہوتا۔ اس کے باوجود نریندرا نے گیٹ نہ کھول کر اپنی جان تو بچا

لی تھی اور شہزاد کو خطرے میں چھوڑ دیا تھا۔ یہی بات ولیم اور رحیم کے لئے بھی کہی جا سکتی تھی۔ میری دانست میں یہ ان تینوں کی خودغرضی تھی۔ ان سب کو ملازم رکھنے والا شہزاد ہی تھا۔ اگر وہ کسی خطرے میں گھرا ہوا تھا تو دیگر ملازمین کا اس کے ساتھ یہ سلوک خودغرضانہ تھا۔ شہزاد بذات خود اس قدر شریف النفس واقع ہوا تھا کہ اس نے دوسروں کے اس خودغرضانہ سلوک کی خود ہی ایک تاویل پیش کر دی تھی۔ مجھے اسی لئے غصہ آ گیا تھا۔ میں نے شہزاد سے کہا۔ "بلاؤ ان سب کو' زیندرا' ولیم اور رحیم تینوں کو بلاؤ۔"

"خاتون! .... آپ .... آپ اس وقت کچھ غصے میں لگتی ہیں۔" شہزاد میری تیوریوں پر بل دیکھ کر کہنے لگا۔

"تم سے میں نے جو کہا ہے' وہ کرو۔ میں اس وقت کچھ اور سننا نہیں چاہتی۔"

شہزاد مجبوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ ذرا ہی دیر کے بعد تینوں میرے سامنے کھڑے تھے۔ مجھے سب سے زیادہ غصہ زیندرا پر تھا جس نے شہزاد کے کہنے پر بھی گیٹ نہیں کھولا تھا۔

"بولو زیندرا! تمہیں کس نے یہاں ملازم رکھا تھا؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ میرے لہجے میں سختی ہی تھی۔

"شہزاد بابو نے میم!"

"تم سے انہوں نے گیٹ کھولنے کو کہا تھا تو کیوں نہیں کھولا؟ آج تم نے ان کے لئے گیٹ نہیں کھولا' کل تم میرے ساتھ بھی ایسا ہی کر سکتے ہو۔"

"وہ .... وہ میم .... باہر سا.......... سادھو تھا۔" زیندرا ہکلانے لگا۔

"شہزاد کی جگہ تم باہر ہوتے اور تمہارے لئے گیٹ نہ کھولا جاتا پھر؟ کس قدر شرم کی بات ہے .... اوّل تو گیٹ کھولنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ خطرے کے وقت اپنی اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔ بولو جواب دو۔ خطرے کے وقت تمہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہئے' ساتھ دینا چاہئے یا اس طرح کی حماقت کا مظاہرہ کرنا چاہئے؟" میرے لہجے کی سختی اب بھی برقرار تھی۔

"گلتی (غلطی) ہو گیا میم! اب ہم کبھی ایسا نہیں کرے گا۔" زیندرا نے اعتراف کر لیا۔

"نیپالی گورکھے تو بہت بہادر ہوتے ہیں۔ تم ایک سادھو سے ڈر گئے' چلو جاؤ گیٹ پر۔"

"جی میم!" زیندرا سر جھکا کر چلا گیا۔

"ہاں رحیم! اب تم بتاؤ .... تم کون سا وظیفہ پڑھ کر بلا کو ٹال رہے تھے؟" میں نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"رد بلا کا یہ وظیفہ میرے نانا مرحوم نے بتایا تھا۔ دراصل میم.........."

"تمہیں معلوم تھا کہ شہزاد باہر ہے اور زیندرا نے اس کے لئے گیٹ نہیں کھولا؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"میم! مجھے شیتل نے آ کر یہ بات بتائی تھی کہ وہی سادھو پھر آ گیا ہے۔ بس اسی وقت سے میں نے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا کہ وہ شہزاد میاں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ اسی وظیفے کے زور سے تو وہ چپ چاپ چلا گیا۔" رحیم نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بکواس کرتے ہو تم۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "اپنی غلطی پر نادم ہونے کی بجائے اِدھر اُدھر کی کیوں ہانک رہے ہو؟ کیا تم زیندرا کو گیٹ کھولنے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے؟ یا خود جا کر گیٹ نہیں کھول سکتے تھے؟ وظیفے کی آڑ میں اپنی بزدلی پر پردہ کیوں ڈال رہے ہو؟"

رحیم کے کس بل بھی نکل گئے۔ اس نے بھی زیندرا کی طرح اپنی غلطی مان لی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ولیم سے جواب طلبی کرتی' وہ بھی راہ راست پر آ گیا۔

"اب جاؤ تم لوگ! آئندہ یہ خودغرضی میں برداشت نہیں کروں گی۔" پھر میں نے شہزاد سے کہا۔ "کتابوں کے پیکٹ کیا میرے کمرے میں رکھوا دیئے ہیں؟"

"جی خاتون!" شہزاد نے جواب دیا۔

"سنو! کل صبح تم ولیم کو ساتھ لے کر فرنیچر.......... میرا مطلب ہے الماریاں خریدنے چلے جانا۔ میں یہیں کوٹھی میں رہوں گی۔ وہ کمینہ سادھو میری غیر موجودگی میں پھر یہاں آ گیا تو ناحق یہ لوگ اس سے ڈریں گے' ٹھیک ہے نا!" میں نے شہزاد کو بتایا' پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے کتابوں کے وہ تینوں پیکٹ کھول لئے جو آج ہی خریدے گئے تھے۔ اردو' فارسی اور عربی کی کتابیں میں نے الگ الگ چھانٹ کر رکھ دیں۔ پھر میں عربی زبان کی ایک ضخیم مجلد کتاب اٹھا لائی اور اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اس کتاب کے چند صفحات پڑھ کر ہی مجھے دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ یہ عرب کی تاریخ تھی۔ میں پڑھ رہی تھی۔ "پورے عرب کا مذہبی مرکز کعبہ تھا جس کی بنیاد (قرآنی روایات کے مطابق) ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے ڈالی تھی۔ یہ ایک قدیم عمارت ہے جو دنیا کے خالق' اللہ کے نزدیک متبرک ہے۔ ابتدائے اسلام سے تقریباً بارہ نسل قبل ایک شخص فہر (قریش) نے کعبے کی خدمت و حفاظت کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اس کے وارثوں نے اس عمارت کے اردگرد شہر مکہ بسایا۔ وہ لوگ بہ حیثیت تجار بھی مشہور ہوئے۔ مکے میں واحد حکومتی ادارہ مجلس یا "مالا" تھی۔ یہ مختلف قبیلوں کے سرداروں اور سربرآوردہ لوگوں کی جماعت تھی۔ یہ مجلس صرف مشورہ و مباحثے کی تھی۔ اس کے اپنے کوئی انتظامی اختیارات نہ تھے۔ ہر قبیلہ بالفعل آزاد تھا اور اس کا اپنا طریقہ کار تھا۔ "مالا" کے مؤثر فیصلے وہی تھے جو مکمل اتفاق رائے پر مبنی ہوں۔ مکے سے چار دن کی مسافت پر طائف کا شہر خاصی بلندی پر ہے جو کہ لبنان سے ملتا جلتا شام کی زمین کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ثقیف قبیلے کے لوگ رہتے تھے لیکن یہاں مکے کے دولت مندوں کی جائیدادیں بھی تھیں۔"

میں نے اسی کتاب میں آگے جا کر یہ بھی پڑھا۔ "قرآن کہتا ہے کہ تم میں اچھے وہی ہیں جن کو اللہ کا قرب حاصل ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اللہ کسی قبیلے کا دیوتا نہیں بلکہ سارے جہان کا مالک

ہے۔ انہوں نے کفار عرب سے کہا کہ جن دیوتاؤں کو تم اللہ کی بیٹیاں سمجھ کر پوجتے ہو' ان کا کوئی وجود نہیں۔ اللہ کی عبادت براہ راست کرنا چاہئے۔ قرآن کہتا ہے' تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور پھر یہ کہ جب میرا بندہ میری عبادت کرتا ہے تو میں اس کے قریب ہوتا ہوں۔ وہ نیا دین جسے اسلام کہتے ہیں' اس کا طریقہ غیر مصالحت پسندانہ توحید ہے۔ سب مسلمان برابر ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اسلام کسی قسم کی رہبانیت اور مقرر کردہ ملائی کو نہیں مانتا۔"

مجھے وہ کتاب اتنی دلچسپ معلوم ہوئی کہ پڑھتی ہی چلی گئی۔ مختلف قبائل کا ذکر' دیوی دیوتاؤں کے قصے' یہ سب کچھ مجھے ان پہاڑی بستیوں سے بہت مماثل ماحول لگا جہاں سے میں آئی تھی۔ اسی کے ساتھ مجھ پر نئی نئی حقیقتیں بھی منکشف ہوئیں۔ دیوی' دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں' اسے میری روح نے قبول کر لیا .... اب مجھ پر یہ اسرار کھل رہے تھے کہ ان پہاڑی بستیوں کے رسم و رواج سے میری روح کیوں ہم آہنگ نہیں تھی۔ میرے وجود میں اس معاشرے سے بغاوت کا عنصر کیوں موجود تھا۔ اب مجھے بخوبی یہ اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ عظیم مہین کی نیک روح نے مجھے تاریخ کے مطالعے کا درس کیوں دیا تھا۔

اس بات کا مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ شیتل میرے کمرے میں داخل ہوئی تو میں چونک اٹھی۔ میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے کتاب رکھ دی۔ "ہاں شیتل! کہو کیا بات ہے؟"

"میم! کھانا یہیں لے آؤں کہ باہر چل کر کھائیں گی؟" شیتل نے مجھ سے پوچھا۔

"تم سب نے کھانا کھا لیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں میم! ابھی کسی نے نہیں کھایا۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ کھا لیں گی میم تو ہم کھائیں گے نا۔"

"پاگل ہو' بس تم لوگ .... اگر ایسا ہی تھا تو پہلے سے آ کر کہہ دیا ہوتا۔ مجھے تو یاد ہی نہیں تھا کہ کھانا بھی ابھی باقی ہے۔ چلو تم' میں آتی ہوں۔" شیتل کمرے سے نکل گئی تو میں اٹھی۔ کتاب میں نشانی لگا کر اسے میں نے اپنی مسہری کے سرہانے رکھ دیا۔

میں باہر آئی تو رحیم میز پر کھانا لگا رہا تھا۔ شیتل اس کی مدد کر رہی تھی۔

"آج ہم سب ساتھ کھانا کھائیں گے۔ نریندر کو بھی بلوا لو کہ اندر سے گیٹ بند کر کے آ جائے۔" میں نے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میم! آ .... آپ کے ساتھ؟" شیتل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کیوں' کیا ہوا؟ میں بھی تو تمہاری ہی طرح ہوں۔ تم لوگ اتنی دیر سے میرے انتظار میں بھوکے بیٹھے ہو کہ میں کب اپنے کمرے سے نکلوں اور کب تم لوگ بھی کھانا کھاؤ۔ تو پھر ساتھ کھانے میں کیا حرج ہے؟"

"میم! .... کیا مم .... میں بھی آپ کے برابر .... نن .... نہیں میم! ایسا نہ کریں۔" ولیم کہنے لگا۔

"بکو مت' ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔" پھر میں نے رحیم کو بھی ساتھ ہی کھانے کو کہا۔

پھر سبھی نے منع کیا' مگر میں نہیں مانی۔ میرے دائیں جانب شیتل بیٹھی تھی' بائیں طرف شہزاد' سامنے رحیم' ولیم اور نریندر تھے۔

کھانا کھا کے میں نے کوٹھی کے صحن ہی میں چہل قدمی کی اور پھر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ کچھ دیر تاریخ عرب کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے میں نے بند کر کے میز پر رکھ دیا۔ مجھے شمبھو کا خیال آ گیا تھا۔ ایک عرصے غائب رہنے کے بعد وہ پھر میری کوٹھی کے چکر کاٹنے لگا تھا۔ میں اسی کے سبب پر غور کرنے لگتی تھی۔ ایسے میں مطالعہ فضول ہی ثابت ہوتا۔ کیا مقصد ہو سکتا ہے اس کا؟ بار بار میرے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا تھا۔

یہ تو میں سمجھ چکی تھی کہ شمبھو میرا سامنا نہیں کر سکتا۔ ایسے مواقع پر عموماً وہ راہ فرار اختیار کر لیتا تھا۔ مجھے کئی بار اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ تو کیا وہ میرے ملازمین کو خوفزدہ کر کے یہاں سے بھگا دینا چاہتا ہے؟ یا پھر کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر مجھے اپنی طرف متوجہ رکھنے کا آرزومند ہے؟ پہلے خیال سے میرا ذہن متفق نہ ہو سکا۔ ملازمین کو خوفزدہ کر کے اسے کیا ملتا؟ میں اسی نتیجے پر پہنچی کہ وہ مجھے الجھائے رکھنا چاہتا ہے۔ میرے نزدیک اس کا یہی تدارک ممکن تھا کہ میں نہ الجھوں۔ مجھے جو مہلت ملی ہے' اس سے فائدہ اٹھا کر مطالعہ جاری رکھوں۔ مسئلہ صرف کتابوں کے حصول کا تھا تو یہ کام شہزاد سے بھی لیا جا سکتا تھا۔ خاصی کتابیں اب تک میں خرید چکی تھی' پھر بھی یہ ناکافی تھیں۔ مضامین طے شدہ تھے' معلومات عامہ' جغرافیہ اور تاریخ قدیم و جدید۔ ان میں زبان کی بھی کوئی قید نہیں تھی۔ اچھی کتابیں کسی بھی زبان میں ملتیں' میرے لئے کارآمد تھیں۔ شمبھو سے نمٹنے کی صورت یہی تھی کہ فی الحال میں اپنی کوٹھی سے باہر قدم نہ رکھوں۔ اس سے مجھے دہرا فائدہ ہوتا۔ ایک تو یہ کہ میرے اندازے کے مطابق شمبھو پھر میری کوٹھی کا رخ نہ کرتا' دوم میں مطالعہ بھی جاری رکھ سکتی۔ پہلے بھی چند روز جب میں اپنی کوٹھی سے نہیں نکلی تھی تو شمبھو غائب ہو گیا تھا۔ میں اس عرصے میں اپنی ذاتی لائبریری ترتیب دے سکتی تھی۔

پھر تقریباً دو ہفتے میں اپنی کوٹھی ہی میں رہی اور میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ شمبھو پھر ادھر نہیں آیا۔ اس عرصے میں میرے ذاتی کتب خانے کے لئے الماریاں بھی آ گئیں اور برابر والا کمرہ اس کے لئے مخصوص ہو گیا۔ شہزاد روزانہ کتابیں خریدنے جاتا اور میرے مطلوبہ مضامین کی کتابیں لاتا رہتا۔ اپنی مدد کے لئے وہ ولیم کو بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ مزید ایک ہفتہ ان کتابوں کی تریب میں صرف ہو گیا۔ شب و روز مطالعہ جاری تھا۔ ہموار میدانوں کی اس دنیا کے بہت سے راز اب مجھ پر کھلتے جا رہے تھے۔ اسی دوران میں مجھے مذاہب عالم کے بارے میں جاننے کی جستجو ہوئی۔ سو اپنے مضامین مطالعہ میں ایک اور مضمون کا میں نے اضاقفہ کر دیا۔ ہندومت' بدھ مت' جین مت' یہودیت' عیسائیت' اسلام اور دیگر مذاہب کی کتب بھی خریدی جانے لگیں۔ اسی کے ساتھ سحر و افسوں سے متعلق کتابیں بھی میرے زیر مطالعہ رہیں۔ کتابوں کی اپنی الگ ایک دنیا ہوتی ہے۔ میں اس دنیا کی سیر کر رہی تھی۔ مجھے اس میں مزید ایک مہینہ لگ گیا۔ اب مجھے اپنی کوٹھی سے باہر قدم رکھے پورے دو ماہ ہو چکے تھے۔ میرے مطالعے کی

رفتار بے حد تیز تھی۔ میں اوسطاً ایک روز میں تقریباً ایک ہزار صفحات پڑھ لیتی تھی۔ شاید اس تیز رفتاری کا سبب بھی میرے اندر پوشیدہ پُراسرار قوتیں ہی تھیں پھر یہ کہ میں جو بھی پڑھتی‘ مجھے یاد رہتا۔ بظاہر حالات پُرسکون ہی تھے۔ عظیم مہین کی نیک روح کی سرگوشیاں بھی میں نے اس عرصے میں نہیں سنیں اور نہ کوئی خلاف توقع واقعہ پیش آیا۔

☆======☆======☆

ان دو ماہ کے بعد ہی میں نے اپنے معمولات میں تبدیلی کی۔ مطالعے کے ساتھ ہی اب میں نے سیر و تفریح کا بھی فیصلہ کیا۔ اس کی ابتدا میں نے ہفتے میں ایک دن سے کی۔ اتوار کے دن چھٹی ہوتی تھی۔ سو میں نے بھی یہی دن سیر و تفریح کے لئے منتخب کیا۔

کلکتے میں تفریح گاہوں کی کمی نہیں تھی۔ دو ماہ کے بعد جو پہلا اتوار پڑا‘ اس سے پہلے ہی میں شہزاد کو ضروری ہدایات دے چکی تھی۔ اسے میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اسے میں نے بتا دیا تھا کہ اتوار کے دن گویا پکنک پر جائیں گے‘ صبح سے شام تک کے لئے۔ دوپہر کا کھانا اسے ساتھ لے کر چلنا تھا۔

اتوار کی صبح شہزاد نے مجھ سے پوچھا۔ ”خاتون! کدھر چلنا ہے؟“

”آج بوٹینکل گارڈن چلتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہتر ہے خاتون!“ شہزاد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر ایک ایئر بیگ میں وہ کھانے وغیرہ کا سامان رکھنے لگا۔ میں برآمدے میں پڑی آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ لباس میں پہلے ہی تبدیل کر چکی تھی۔

گزشتہ تجربات کی روشنی میں شہزاد کے ساتھ میں اپنی کوٹھی سے باہر قدم رکھتے ہوئے خاصی محتاط اور چوکنا تھی۔ مجھے کوئی بھی غیر متوقع واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ بوٹینکل گارڈن جانے کے لئے مجھے گارڈن ریچ روڈ پہنچنا تھا۔ گارڈن ریچ روڈ دھرم تلے کے ٹرام ڈپو سے خاصی آگے تھی۔ دھرم تلے سے دائیں جانب جا کر ایک سڑک سے گاڈن ریچ روڈ کے لئے مڑنا پڑتا تھا۔ یہیں آؤٹرم گھاٹ تھا جہاں سے بوٹینکل گارڈن کے لئے کرائے پر کشتیاں ملتی تھیں۔ یہ گھاٹ دریائے ہگلی کے کنارے واقع تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بوٹینکل گارڈن تھا۔ کشتیوں والے‘ مسافروں سے واجبی کرایہ لے کر انہیں دوسرے کنارے اتار دیتے تھے۔ اپنی کوٹھی سے میں‘ آؤٹرم گھاٹ تک شہزاد کے ساتھ پیدل ہی گئی حالانکہ فاصلہ خاصا تھا۔ میں پورے دو ماہ باہر نہیں نکلی تھی اس لئے پیدل چلنے ہی کو ترجیح دی تھی۔

”تم تھکے تو نہیں شہزاد!“ میں نے گھاٹ پر پہنچ کر شہزاد سے پوچھا۔ وہاں خاصی بھیڑ نظر آ رہی تھی۔

”نہیں خاتون!“ اس نے جواب دیا۔ ”تفریح مقصود ہے تو پھر تھکن کیسی۔ مجھے تو آپ کے ساتھ اتنے دن بعد باہر نکل کر خاصا لطف آ رہا ہے۔“

کچھ ہی دیر کے بعد دوسرے مسافروں کے ساتھ ہم بھی ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ میں نے مسافروں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ میں اپنے اردگرد سے پوری طرح واقف رہنا چاہتی تھی۔ وہ ایک نوجوان ہی تھا جس نے مجھے چونک اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا چہرہ احرس سے مشابہ

تھا۔ خیال کا سفر‘ دنیا کے ہر سفر سے تیز ہوتا ہے۔ سو میں ہموار میدانوں کی اس دنیا سے ایک ہی لمحے میں وادی سبز پہنچ گئی۔ مجھے احرس یاد آنے لگا جسے میں اپنی جگہ وادی سبز میں چھوڑ آئی تھی۔ احرس سے مجھے جو قلبی تعلق تھا‘ میرے دل میں اپنے بچپن کے اس ساتھی کے لئے جو جذبات تھے‘ وہ جیسے انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے۔ احرس سے مشابہ وہ نوجوان ذرا ہی فاصلے پر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ کشتی چل چکی تھی۔ وہ نوجوان میری طرف متوجہ نہیں تھا‘ مگر میں اسی کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ کشتی چلتی رہی اور میرے خیالوں کا سفر جاری رہا۔

دریا کے دوسرے گھاٹ پر پہنچ کر کشتی رکی تب بھی میں اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

”سارے مسافر اتر چکے ہیں خاتون! اٹھیں۔“ شہزاد نے مجھے مخاطب کیا تو جیسے میں پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں میں واپس آ گئی۔

احرس سے مشابہ نوجوان‘ دوسرے مسافروں کے ساتھ بوٹینکل گارڈن کا رخ کر چکا تھا۔ میں نے اس کی تلاش میں دور دور تک نظریں دوڑائیں مگر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ اس سے پہلے بھی میں تنہا ایک بار یہاں آ چکی تھی۔ مجھے یہ تفریح گاہ بہت پسند آئی تھی۔

گارڈن میں داخل ہو کر میں‘ شہزاد کے ساتھ اس برگد کی طرف بڑھی جو ایک عجوبہ ہی تھا۔ برگد کا پیڑ خاصے بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ بظاہر اس کے متعدد تنے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی شاخیں جگہ جگہ زمین میں پیوست ہو گئی تھیں۔ وہ شاخیں اتنی موٹی تھیں کہ پیڑ کا تنا ہی لگتی تھیں۔ درخت کا اصل تنا کون سا ہے‘ اس سوال کا جواب دینے والے کے لئے حکومت کے محکمہ زراعت کی طرف سے ایک بڑا انعام مقرر تھا۔ میں جب پہلی مرتبہ یہاں آئی تھی تو خاصی دیر تک اصل تنے کی تلاش میں چکراتی رہی تھی۔ وہیں حکومت کی جانب سے ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ بورڈ پر اس درخت کے بارے میں اصل تنے کی تلاش اور انعام کی رقم لکھی ہوئی تھی۔ مجھے انعام سے تو خیر کوئی دلچسپی نہیں تھی‘ ہاں درخت کے اصل تنے کی تلاش کا معاملہ مجھے ضرور دلچسپ لگا تھا۔ اب تک کوئی شخص اصل تنے کی تلاش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ یہ عبارت بھی مجھے بورڈ پر لکھی نظر آئی تھی۔ اس روز میں نے سوچا تھا کہ پھر کسی دن آ کے اس معمے کو حل کروں گی۔ تفریح کی غرض سے بوٹینکل گارڈن آنے کا سبب برگد کا وہ درخت بھی تھا۔

”شہزاد! تم پہلے کبھی یہاں آئے ہو؟“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں خاتون!“ وہ بولا۔ ”تلاش معاش نے کبھی اتنی مہلت ہی نہیں دی۔“

یہ سن کر میں‘ شہزاد کو برگد کے بارے میں بتانے لگی۔ وہ بڑی دلچسپی سے میری بات سن رہا تھا۔ میں آخر میں بولی۔ ”آج ہم دونوں مل کر اس برگد کا اصل تنا ڈھونڈیں گے۔ بولو‘ تیار ہو؟“ میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

”قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اب تک جو کچھ آپ نے بتایا ہے‘ اسے سن کر ناکامی کے اعتراف ہی میں عافیت لگتی ہے۔ جب آج تک کوئی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تو بھلا میں کیسے یہ دعویٰ کر سکتا ہوں؟“ شہزاد نے جواب میں مسکرا کر کہا۔

"تم نے تو پہلے ہی ہتھیار ڈال دیئے۔" میں ہنس پڑی، پھر بولی۔ "کوشش کرتے ہیں، اگر کامیاب ہو گئے تو انعام تمہارا۔"

چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے گارڈن میں خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ یہ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ خوبصورت تالابوں میں کنول تیر رہے تھے۔ انہی تالابوں کے قریب گھاس کے قطعات تھے جن کے اطراف کیاریوں میں رنگ برنگے خوشبودار پودے لگے تھے۔ یہاں مختلف ٹولیوں میں لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ برگد کی طرف بڑھتے ہوئے میری نگاہیں انہی لوگوں میں ایک چہرے کو تلاش کر رہی تھیں۔ یہ اسی نوجوان کا چہرہ تھا جو مجھے کشتی میں نظر آیا تھا۔ مجھے وہ نظر نہیں آ سکا۔ پھر دوپہر کو جب میں کھانا کھانے کے لئے ایک تالاب کے قریب گھاس پر بیٹھی تو اچانک ہی وہ مجھے نظر آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر وہ تنہا اور اداس سا بیٹھا تھا، اپنے خیالوں میں گم۔ وہاں سبھی اس نوجوان کے سوا خوش اور اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ میں بھی اب تک ہنستی ہی رہی تھی۔ آج بھی مجھے برگد کا اصل تنا تلاش کرنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی شہزاد اسی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

"خاتون! اگر یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو حکومت اس پر انعام مقرر نہ کرتی۔" شہزاد ایئر بیگ سے کھانے کے برتن اور تھرماس نکالتے ہوئے بولا۔

"ہوں۔" میں چونک کر بولی کیونکہ میرا دھیان اس نوجوان کی طرف تھا۔ "تمہارا خیال درست ہے۔ تم کھانا نکالو، میں ابھی آئی۔"

"کہاں جا رہی ہیں؟" شہزاد نے مجھے اٹھتے ہوئے دیکھ کر دریافت کیا۔

"کہیں نہیں، بس یہیں تالاب میں تیرتے ہوئے کنول دیکھوں گی۔" میں یہ کہہ کر اس طرف بڑھ گئی جہاں وہ نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔

میں اس نوجوان کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس نے بس ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر لاتعلق ہو گیا۔ میں ذرا آگے جا کر پھر پلٹی۔ نوجوان کے قریب پہنچ کر میں دانستہ لڑکھڑائی۔ مقصد اسے اپنی طرف متوجہ کرنا ہی تھا اور مجھے اس میں کامیابی ہوئی۔

"ارے!" اس کے منہ سے بے ساختہ کلمہ حیرت نکلا اور پھر اس نے گویا اپنی دانست میں مجھے زمین پر گرنے سے بچا لیا۔

"مینی مینی تھینکس!" میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"آر یو اے برٹش؟" اس نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا کہ کیا میں برطانیہ سے تعلق رکھتی ہوں؟

"اوہ نو!" میں نے جواب دیا پھر اردو میں بولی۔ "میرا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔"

"مگر وہاں کے لوگ تو سانولے ہوتے ہیں، آپ کا رنگ تو بہت گورا ہے۔" وہ بھی اردو بولنے لگا۔

"آپ شاید اکیلے ہیں، ہمارے ساتھ آ جائیں۔" میں نے کہا اور پھر اسے کھانے کی دعوت دی۔ اس پر اس نے میرے ساتھی کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے اسے بتایا۔ "ہاں، میرا سیکرٹری بھی ساتھ

ہے۔"

"کھانا تو خیر آپ لوگ کھائیے، ہاں یہ ممکن ہے کہ میں آپ کو کمپنی دوں۔" وہ کہنے لگا۔ "عموماً میں دوپہر کو کھانا نہیں کھاتا۔ آپ مجھے ون ٹائم میلر سمجھ لیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں اسے ساتھ لئے شہزاد کے پاس آ گئی اور بولی۔ "یہ میرے پرسنل سیکرٹری مسٹر شہزاد ہیں۔"

"گلیڈ ٹو میٹ یو!" اس نے شہزاد سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ "مجھے محی الدین کہتے ہیں۔"

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" جواباً شہزاد نے بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"اور آپ کا اسم گرامی خاتون!" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس کے لہجے سے شائستگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"معبلہ!" میں نے بتایا اور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

کھانا کھانے کے دوران میں اس سے میں تفصیلی تعارف حاصل کر چکی تھی۔ میرے اصرار پر اس نے چند لقمے لے لئے تھے۔

"محی کے معنی معلوم ہیں آپ کو؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"حیرت ہے محترمہ کہ میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے خود اپنے نام کے معنی معلوم نہیں۔" محی الدین نے اعتراف کیا۔

"عموماً لوگوں کو اپنے نام کے معنی معلوم نہیں ہوتے۔" میں نرمی سے بولی۔ "یہ کچھ آپ ہی پر موقوف نہیں۔ کچھ لوگ تو اپنے بچوں کے ایسے نام بھی رکھ دیتے ہیں کہ جن کے کوئی معنی نہیں ہوتے، مگر آپ کے ساتھ ایسا نہیں۔ محی کا مطلب زندہ کرنے والا ہے، سو محی الدین کا مطلب ہوا، دین کو زندہ کرنے والا۔ معلوم ہوتا ہے، آپ کے والدین خاصے مذہبی رجحان کے حامل ہیں، کیا میرا اندازہ درست ہے؟"

"دراصل میرا نام، والد کے ایک دوست نے رکھا تھا۔ مجھے بڑا ہونے کے بعد یہی معلوم ہوا۔ ممکن ہے کہ وہ مذہبی رہے ہوں۔ جہاں تک میرے گھرانے کا تعلق ہے تو اسے مذہبی گھرانہ نہیں کہا جا سکتا۔ میرے والد ایک بڑے زمیندار ہیں، پڑھے لکھے بھی ہیں، مگر میرے اور ان کے درمیان نظریاتی اختلافات ہیں۔ وہ انگریز حکمرانوں کے مداح ہیں۔ ان کا طرز حیات بھی اسی کا عکاس ہے۔ وہ مجھے مزید تعلیم کے حصول کی خاطر برطانیہ بھیجنا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔"

"اور یہاں اس شہر میں آ بسے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات پوری کر دی۔

"بس یوں سمجھ لیں کہ ایک چکر ہے۔ میرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔" وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "شہروں شہروں سکون کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ یہ شہر کچھ اچھا لگا اور یہاں سکونت اختیار کر لی، مگر میرا خیال یہ ہے محترمہ کہ سکون یہاں بھی نہیں۔ ممکن ہے کچھ روز کے بعد یہاں سے بھی کہیں اور چلا جاؤں۔"

"آپ کے گھر والوں کو علم ہے کہ آپ کہاں ہیں' ان دنوں؟" میں نے معلوم کیا۔

"جی!" اس نے جواب دیا۔ "امی کو میں خط لکھتا رہتا ہوں۔ وہ میرے اخراجات کا خیال رکھتی ہیں۔ آپ مجھے اپنی ماں کا لاڈلا بیٹا کہہ سکتی ہیں کیونکہ میں اپنی دو بہنوں اور چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔"

"کتنے دن سے آپ گھر واپس نہیں گئے؟" میں نے آگے بات بڑھائی۔ میں اس کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔

"گھر!" وہ تلخ سے انداز میں ہنسا۔ "وہ گھر میرا نہیں' میرے والد کا گھر ہے۔ میرا اپنا گھر کوئی نہیں۔ شاید آئندہ بھی گھر نہ بنا سکوں۔ بہرحال اپنے والد کے گھر گئے ہوئے مجھے تقریباً ایک سال ہو گیا۔ والدہ ہر خط میں لکھواتی رہتی ہیں' گھر کب آؤ گے؟ اور میں ان کے اس سوال کو ہمیشہ ٹال جاتا ہوں۔"

پھر شام تک محی الدین ہمارے ساتھ ہی رہا۔ اس کا قرب مجھے احرس کی یاد دلاتا رہا۔ مزاجاً وہ مجھے احرس سے مختلف ہی لگا۔ ہنسنا جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے بارے میں یہ اندازہ بھی میں نے لگایا کہ اپنے گھر نہ لوٹنے کا سبب صرف باپ سے نظریاتی اختلاف نہیں۔ اس اداسی اور بے سکونی کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ شاید اس کے پیچھے کسی کی بے وفائی یا بچھڑ جانے کا غم بھی تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ پر خاصا کھل گیا تھا اور میرے نزدیک اتنا بھی کافی تھا۔ میں نے اسے اپنی کوٹھی کا پتہ سمجھا دیا تھا۔ اس نے آئندہ روز شام کو آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اپنے بارے میں اسے میں نے وہی کہانی سنائی تھی جو ایک مرتبہ پولیس انسپکٹر سبود مکرجی کو سنا چکی تھی۔ اسی کہانی سے میرے ملازمین بھی واقف تھے' یعنی یہ کہ میرا تعلق حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے ہے۔ اس پر محی الدین نے مجھ سے حیدر آباد دکن کے متعلق کچھ گفتگو بھی کرنا چاہی تھی جسے مصلحتاً میں ٹال گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے اس مسلمان آزاد ریاست کے تاریخی پس منظر اور موجودہ حالات سے زیادہ آگہی نہیں تھی۔ میری معلومات واجبی سی تھیں۔ آج سے پہلے مجھے یہ علم بھی نہیں تھا کہ حیدر آباد دکن کے باشندے عموماً گورے نہیں ہوتے۔ محی الدین ہی نے مجھ سے یہ بات پہلی مرتبہ کہی تھی۔ میں نے گفتگو ہی کے دوران میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جس ریاست سے اپنا تعلق ظاہر کیا ہے' آج رات ہی اس کی تاریخ کا مطالعہ شروع کر دوں گی۔ میرے ذاتی کتب خانے میں تاریخ کی ایک ایسی کتاب موجود تھی جو جنوبی ہند کے تاریخی پس منظر سے متعلق تھی۔ ابھی تک میں اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ نہیں کر سکی تھی۔

دھرم تلے تک محی الدین ہمارے ساتھ آیا اور پھر رخصت ہو گیا۔

"محی الدین مجھے عشق کا مارا لگتا ہے خاتون!" کوٹھی کی طرف پیدل جاتے ہوئے شہزاد نے اظہار خیال کیا۔

"اس کے بارے میں خود میرا تجزیہ بھی تقریباً یہی ہے۔" میں تائید میں بولی۔ "مگر تم شاید یہ بھول گئے کہ اپنے باپ سے بھی اسے نظریاتی اختلاف ہے۔"

"وہ تو خیر الگ بات ہے خاتون! کوئی بھی باضمیر اور وطن پرست شخص' انگریزوں کی حاکمیت کو دل

سے قبول نہیں کر سکتا۔ میں تو دراصل اس کی زندگی کے کسی ذاتی المیے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ بات کرتے کرتے اچانک اس کا کھو جانا' ٹھنڈی آہیں بھرنا اور کسی طرف دیکھے چلے جانا' یہ ساری علامات اس کے عاشق صادق ہونے کی دلیل ہیں۔ آپ کی صحبت میں رہ کر میں بھی کچھ کچھ سیکھتا جا رہا ہوں۔"

"کچھ کچھ؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم تو بہت کچھ سیکھ گئے ہو۔ لگتا ہے کتابیں پڑھنے کا چسکا تمہیں بھی لگ گیا ہے؟"

"وہ تو خیر ہے ہی خاتون! فرصت کے اوقات میں اور کروں بھی کیا۔ مگر میری نظر میں زندگی بھی ایک کتاب کی مانند ہے۔ اس سے بھی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے یا اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خود زندگی بھی آدمی کو بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔"

"تم تو اچھا خاصا بولنے لگے ہو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم بھی اندر سے اتنے گہرے ہو۔ میرے لئے دوسری خوشی کی بات یہ ہے شہزاد کہ تم اب مجھ سے بلاجھجک گفتگو کرنے لگے ہو۔" میں مسکرائی۔ "اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے تم سے یہ پوچھ رہی ہوں کہ کیا تم نے بھی کبھی کسی سے عشق کیا ہے؟"

"جی ہاں خاتون! عشق کیا ہے' میں نے اور اب بھی کرتا ہوں' مگر صاف گوئی سے ایک بات کہہ دوں' مجھے کس سے عشق ہے؟ اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔"

"وہ کیوں بھئی!" میں نے کہا۔ "کیا تم مجھے اپنا رازدار نہیں بنا سکتے؟"

"اپنے دکھ اور اپنے خواب' اپنے ہی ہوتے ہیں خاتون! میں اسی لئے کسی کو اپنا رازدار یا غمخوار بنانے کا قائل نہیں۔ آپ برا نہ مانیئے گا۔"

"تم کہتے ہو تو نہیں مانتی برا۔" میں دھیرے سے ہنس کر بولی۔ "ورنہ یہ بات برا ماننے کی تھی ضرور۔"

ابھی میں' شہزاد سے اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ سامنے سے آنے والے ایک دراز قد شخص پر میری نگاہ پڑی۔ اس وقت اگر شہزاد میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں یقیناً اس دراز قد شخص سے نظر بچا کے نکل جانے کی کوشش نہ کرتی۔ وہ راجا استاد تھا۔ میں اسے پہچان چکی تھی۔ چورنگی روڈ کی پیادہ رو پر خاصا ہجوم تھا' سو میں نے اس کی آڑ میں شہزاد کے ساتھ آگے بڑھ جانا چاہا' مگر راجا استاد کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی۔ اس نے مجھے نکل کے نہ جانے دیا۔ وہ میرے قریب آ کر ساتھ ساتھ چلنے لگا' پھر دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ "رانی' تم ابھی تک کلکتے میں ہو' میں تو سمجھا تھا کہ بمبئی واپس چلی گئیں۔"

شہزاد نے بھی راجا استاد کو میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یقیناً دیکھ لیا تھا۔ وہ میری بائیں جانب چل رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق شہزاد نے وہ الفاظ بھی سن لئے تھے جو راجا استاد نے دھیمی آواز میں مجھ سے کہے تھے۔ راجا استاد کی بجائے میں اس وقت شہزاد کی طرف متوجہ تھی۔ شہزاد کے چہرے پر مجھے حیرت کے آثار نظر آئے تھے۔ شہزاد کو راجا استاد شاید کوئی راہ گیر ہی سمجھا تھا۔

موجودہ نازک صورت حال میں میرے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا' سو میں نے وہی راستہ اپنایا۔

"کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا محترم!" میں نے یہ کہتے ہوئے راجا استاد کی طرف رخ کیا اور معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے آنکھ سے خفیف سا اشارہ کر دیا۔ راجا استاد ایک گھاگ آدمی تھا۔ وہ میری آنکھ کے خفیف سے اشارے کو بھی یقیناً سمجھ گیا۔

دوسرا واضح اشارہ شہزاد سے میرا مخاطب ہونا تھا۔ "کیا یہ محترم' تمہارے کوئی جاننے والے ہیں؟" اس طرح میں نے راجا استاد کو یہ باور کرا دیا کہ اکیلی نہیں ہوں' کوئی اور بھی میرے ساتھ ہے' ایسا شخص کہ جس پر میں اپنی شخصیت ظاہر نہیں کر سکتی۔

"معاف کیجئے گا خاتون! مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ میں آپ کو اپنی ایک شناسا سمجھ بیٹھا تھا۔" راجا استاد مجھ سے معذرت کر کے بھیڑ میں گم ہو گیا۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ شہزاد بولا۔ "خاتون! کچھ لوگ اس طرح اجنبیوں' خصوصاً خواتین سے تعارف حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ شخص جو کوئی بھی رہا ہو' اپنی صورت اور حلئے سے شریف آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔"

"ہو گا' لعنت بھیجو اس پر۔" میں بولی۔ "کیا خبر وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو' رہا یہ کہ وہ کوئی بدمعاش تھا تو ہوا کرے' ہمیں کیا لینا' اگر اس کے بارے میں تمہارا قیاس درست ہوتا کہ اس بہانے وہ مجھ سے تعارف حاصل کر رہا تھا تو میں اس سے متفق نہیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو وہ چپکنے کی کوشش کرتا۔"

"ممکن ہے خاتون کہ میرا اندازہ غلط ہو۔" شہزاد نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

اس دن گھر آتے ہی کپڑے بدل کر میں نے برابر والے کمرے کا رخ کیا۔ مطلوبہ کتاب تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ وہ رجسٹر تھا جو شہزاد نے اس دوران میں بنا لیا تھا۔ سبجیکٹ وائز اس رجسٹر میں وہ تمام کتابوں کا اندراج کرتا رہا تھا۔ ہر کتاب کے پشتے پر اس نے نمبرنگ بھی کر دی تھی۔ نمبرنگ کے مطابق ہی کتابیں الماریوں میں رکھی تھیں۔

میں ایک عرصے کے بعد کوٹھی سے نکلی تھی اور مجھے شمبھو کی طرف سے خدشہ تھا کہ میری غیر موجودگی میں کہیں وہ ادھر نہ آیا ہو۔ اگر وہ لعنتی سادھو آیا ہوتا تو مجھے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی اطلاع مل گئی ہوتی۔ خود میں نے دانستہ اپنے ملازمین سے اس کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

شہزاد نے میرے ہی ایما پر کتب خانے میں چند کرسیاں اور ایک میز بھی ڈلوا دی تھی۔ انہی میں ایک آرام کرسی بھی تھی۔ میں اسی آرام کرسی پر نیم دراز جنوبی ہند سے متعلق اس تاریخی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی کہ مجھے شمبھو کا خیال آ گیا تھا۔

"جے دیوی مائی!" اچانک ہی شمبھو کی آشنا آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میں اچھل پڑی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اسی کمرے میں موجود ہو۔

"سامنے آ بزدل! چھپا ہوا کیوں ہے؟" میں نے حقارت سے کہا۔

"اس میں ایک بھید ہے دیوی! میں اپنی آرادھنا اور تپسیا (عبادت و ریاضت) چھوڑ کر تیرے چرنوں میں نہیں آ سکتا پھر بڑے مہاراج کا بھی یہی آدیش (حکم) ہے کہ میں اپنے کرتویہ (فرض) کا پالن کروں۔"

جواب میں مجھے شمبھو کی آواز سنائی دی۔

"شمبھو! شاید تجھے نہیں معلوم کہ تُو کسی چیونٹی کی طرح مسلا جا سکتا ہے۔ تیرا کیا فرض ہے اور تُو کس طرح اسے نبھا رہا ہے' میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

شمبھو کے کریہہ قہقہے سے کمرہ گونج اٹھا پھر اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ "دیوی! تُو بس اس پر اترا گئی کہ میرا نام جان لیا۔ اگر بڑے مہاراج کی تُش کرتی (رضامندی) ہوتی تو میں اب تک برہا (جدائی) کا کشٹ (تکلیف) نہ بھوگ رہا ہوتا' پرنتو تیرے میرے ملن کے بیچ کیول تھوڑے دن اور ہیں۔ ترنت (جلد) ہی تجھے بڑے مہاراج کی سیوا میں اپس تھت (حاضر) ہونا ہے۔ سنگھرش (تصادم) میں کچھ نہیں رکھا دیوی! ملن کی بات کر۔ بڑے مہاراج بڑے ہی انترگیانی (باطنی علم رکھنے والا) ہیں۔ انہی کے کہے پر میں تجھے یہ سوچنا (اطلاع) دے رہا ہوں۔ بول دیوی کہ تجھے یہ انگی کار (منظور) ہے؟"

"شمبھو! تُو اسی چوہے کی بات کر رہا ہے کہ جسے میرا خاکہ بنا کر دے رہا تھا۔" میں نے بدستور اپنے لہجے سے اظہار حقارت کیا۔ "سن اے لعنتی سادھو! نہ تجھ میں اتنا دم ہے نہ تیرے بڑے مہاراج میں کہ تُو یا وہ مجھ سے ٹکر لے سکے۔" میں دیدہ و دانستہ یہ سب کچھ کہہ رہی تھی تاکہ شمبھو یا بڑا مہاراج جو کھیل کھیل رہا تھا' کھل کر سامنے آ جائے۔ "اپنے بڑے مہاراج تک میرا یہ پیغام ضرور پہنچا دیجو کہ میں اسے اپنے پیر کی جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتی۔"

ابھی میرے الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ کمرے میں بھاری اور گرجدار آواز گونجی۔ "لوٹ آ شمبھو!" یہ آواز میرے لئے قطعی اجنبی تھی۔

جواب میں مجھے شمبھو کی مردہ سی آواز سنائی دی۔ "شما (معاف) کر دیں بڑے مہاراج کہ سیوک کو پرتیاگت (واپس) ہونے میں سمے لگ گیا' پر بڑے مہاراج کا آدیش' سیوک نے پہنچا دیا۔"

شمبھو کی آواز دور ہوتے ہوتے قطعی معدوم ہو گئی۔ پھر چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ کمرہ دھویں سے بھر گیا۔ مجھے اس دھویں میں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ گھبرا کر میں نے چیخنا چاہا' مگر میری آواز حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ ذرا ہی دیر میں دھواں قدرے چھٹ گیا تو کچھ فاصلے پر مجھے ایک کیم شحیم شخص کا ہیولا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ گول سا تھا اور ماتھے پر صندل سے ترشول بنا ہوا تھا۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا اور بڑی بڑی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ پنڈت گوری شنکر سے اس کا حلیہ زیادہ مختلف نہیں تھا' سر پر موٹی چوٹی' جسم پر سفید دھوتی اور پیروں میں کھڑاؤں تھے۔ اس کی نظریں میرے ہی چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ معاً اس کے موٹے موٹے ہونٹ ہلے اور میں نے اس کی بھاری آواز سنی۔

"اے معبلہ!" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "تُو نے میری توہین کی! شمبھو تو لپاڑیا ہے' پر تجھے کیا ہو گیا تھا؟ شمبھو کو تو اس کی سزا ملے گی ہی کہ اس نے حد سے تجاوز کیا' مگر سزا سے تُو بھی نہیں بچ سکے گی۔ میں نے اس کے ذریعے تجھ تک اپنا صرف یہ پیغام بھیجا تھا کہ جلد ہی تجھے اپنے پاس بلا لوں گا۔ وہ کمینہ بیچ میں اپنا منتر بھنانے لگا اور تُو اپنے آپ میں نہ رہی۔ سزا کے طور پر صبح ہونے تک تُو اسی حال میں رہے گی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی کمرے میں پھر دھواں سا چھا گیا۔ میں نے دوبارہ پہلے جیسی کیفیت محسوس

کی۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔

جب کچھ دیر کے بعد دھواں چھٹا تو ہیولا غائب ہو چکا تھا۔ مجھے اپنا جسم قطعی شل محسوس ہوا۔ میں نے اٹھنا چاہا مگر کرسی سے نہ اٹھ سکی اور نہ ہی اپنے جسم کو خفیف سی حرکت دے سکی۔ کتاب اسی طرح میرے ہاتھ میں تھی اور میں کسی مجسمے کی طرح آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ میں اپنی پلکیں جھپکنے پر بھی قادر نہیں تھی۔ میں صرف سوچ سکتی تھی' احاطہ نظر میں جو اشیاء تھیں' انہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ قریب و دور کی آوازیں بھی مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ میں سمجھ چکی تھی کہ ابھی مجھے جس شخص کا ہیولا نظر آیا تھا' وہ کون ہو سکتا ہے۔ اس کی گفتگو سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ "بڑے مہاراج" کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس نے مجھے میرا نام لے کر مخاطب کیا تھا' یہ بات بھی میرے لئے باعث تشویش ہی تھی۔ مجھے اس حد تک اپنے مقصد میں ضرور کامیابی ہو گئی تھی کہ شمبھو کے "بڑے مہاراج" کو دیکھ لیا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ وہ کم از کم میرے نام سے واقف ہے۔ وہ مجھے کیوں اپنے پاس بلانا چاہتا تھا؟ اس نے کیوں مجھے یہ پیغام بھیجا تھا؟ یہ سوال میرے ذہن میں ابھرے ضرور' مگر میں کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی۔ سوچنے کے سوا میرے بس میں اور تھا بھی کیا۔ بڑے مہاراج نے بطور سزا مجھے جسم کو حرکت دینے سے محروم کر دیا تھا۔

پلکیں نہ جھپکانے کے سبب میری دونوں آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ میری ملازمہ شیتل کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کمرے کا بیرونی دروازہ میرے احاطہ نظر میں تھا۔

"میم! چائے یا کافی پئیں تو لا دوں؟" شیتل نے مجھے مخاطب کیا۔ پھر شاید اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی۔ "ارے میم! .... آپ .... آپ تو رو رہی ہیں!" اس کی آواز سے حیرت اور دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھ کر میرے قریب آ گئی۔ "کک .... کیا ہوا میم .... کچھ تو بولیں۔"

میں اپنی کوشش کے باوجود کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میری آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی کو شیتل آنسو سمجھی تھی۔

"شہزاد بابو .... شہزاد بابو!" شیتل چیختی ہوئی کمرے سے نکلی۔ "معلوم نہیں میم کو کیا ہو گیا؟"

ذرا ہی دیر بعد شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ شیتل بھی تھی۔ وہ دونوں ہی میرے قریب آ گئے۔

"کیا ہوا؟ .... آپ کو کیا ہوا خاتون!" میں نے شہزاد کی گھبرائی ہوئی آواز سنی۔

اس وقت مجھے اپنی بے بسی پر واقعی رونا آ گیا۔ میں کسی کے بھی سوال کا جواب دینے سے قاصر تھی۔

"شاید .... شاید انہیں سکتہ ہو گیا ہے۔ یہ .... یہ ایک بیماری ہے شیتل! جس میں آدمی کی حس و حرکت جاتی رہتی ہے اور .... اور مریض کسی مردے کی طرح معلوم ہوتا ہے۔" شہزاد نے اپنی دانست میں میرے مرض کی تشخیص کر لی اور شیتل کو سمجھانے لگا۔ پھر وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "مگر سکتہ تو کسی صدمے .... شدید صدمے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ خا .... خاتون کو کیا صدمہ

لگا ہے؟ ابھی گھنٹے بھر پہلے تو یہ ٹھیک تھیں۔"

"نہیں .... نہیں شہزاد بابو! .... میری میم کو کک .... کچھ نہیں ہو سکتا .... کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر شیتل رونے لگی۔ یہ مجھ سے اس کے قلبی لگاؤ کا ثبوت تھا۔ بڑے مہاراج نے مجھے سزا دے کر میرے ہی ملازمین کی نظر میں تماشا بنا دیا تھا۔ اس پر مجھے انتہائی غصہ آنے لگا۔

"رونا بند کرو شیتل! .... مجھے کچھ سوچنے دو۔ تم جاؤ یہاں سے۔" شہزاد نے شیتل کو مخاطب کیا۔

"نہیں شہزاد بابو! میم .... میں اپنی میم کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" شیتل نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔

شیتل کے رونے دھونے اور چیخنے چلانے کی آوازیں دوسرے ملازمین نے بھی سن لی تھیں۔ رحیم' ولیم اور نریندرا بھی ذرا ہی دیر بعد کمرے میں آ گئے۔ وہ سبھی میری حالت پر تشویش کا اظہار کرنے لگے۔

"میرا خیال ہے شہزاد میاں کہ کسی ڈاکٹر کو بلوا لیں۔" رحیم نے مشورہ دیا۔ "میرا بھی یہی اندازہ ہے کہ میم کو سکتہ ہو گیا ہے۔"

میرے ملازمین کی تشویش اپنی جگہ لاکھ درست سہی مگر میں دل ہی دل میں اس پر کڑھ رہی تھی۔

شہزاد نے رحیم کے مشورے سے اتفاق کیا۔ دوسرے ملازمین بھی یہی کہنے لگے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب مجھے مزید تماشہ بننا پڑے گا۔

پھر ولیم نے ایک اور تجویز پیش کر دی۔ "ایسا بھی ہو سکتا ہے' شہزاد بابو کہ ہم میم کو میڈیکل لے جائیں۔ کیا خبر اِدھر کوئی اچھا ڈاکٹر ملے کہ نہیں؟"

"مگر وہاں تک کیسے لے جائیں گے؟ تمہاری تجویز اس اعتبار سے بہتر ہے کہ ہسپتال میں ہر طرح کی طبی امداد ملنا ممکن ہے۔" شہزاد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"یہ کوئی مسئلہ نہیں شہزاد میاں!" رحیم نے کہا۔ "کہیں سے فون کر کے ہسپتال کی گاڑی منگوا لیتے ہیں' اس میں میم کو لے جائیں گے۔ ڈیسوزا صاحب کی کوٹھی میں فون موجود ہے۔ وہاں سے فون کیا جا سکتا ہے۔ وہ لاکھ انگریز سہی مگر ایسے موقع پر........."

"نہیں رحیم!" شہزاد نے انکار کر دیا۔ "تم بھول رہے ہو کہ پولیس کو ہماری کوٹھی میں کسی لاش کی اطلاع اسی نے دی تھی۔ فون کہیں اور سے کرنا پڑے گا۔"

"کیا خبر برابر والی کوٹھی میں بھی فون ہو۔" ولیم بولا۔

ابھی وہ سب اسی بحث و مباحثے میں مصروف تھے کہ عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ کی خوشبو مجھے اپنے اردگرد منڈلاتی محسوس ہوئی۔ اسی کے ساتھ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے نزدیک خجیرہ کی آمد بلا سبب نہیں ہو سکتی تھی پھر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ اچانک میرے جسم کو جھٹکا سا لگا اور میرا جسم جیسے کسی آہنی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ شر کے اوپر خیر غالب آ چکا تھا۔

میں نے ہاتھ سے کتاب اپنی گود میں رکھ کر جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں اور اپنی آنکھوں سے پانی

صاف کرنے لگی۔ مجھے اچانک خود ہی حرکت کرتے دیکھ کے اب میرے ملازمین کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھے جا رہے تھے۔ خیرہ کی خوشبو رخصت ہو چکی تھی۔

"کیا بات ہے، تم سب لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟" میں سب کچھ جان کر قطعی انجان بن گئی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پھر وہ مجھے خود میری ہی حالت کے بارے میں بتانے لگے۔ شہزاد نے پہل کی تھی، اس کے بعد سب باری باری بولنے لگے تھے۔

"حد کر دی تم لوگوں نے!" میں زور سے ہنس پڑی۔ "ارے یہ بیماری تو مجھے بچپن سے ہے۔ تم لوگ جسے میری آنکھوں سے بہتے آنسو بتا رہے ہو، وہ پانی تھا۔"

"پانی!" شہزاد نے اظہار حیرت کیا۔

"ہاں پانی بھئی!......... تم ذرا بغیر پلکیں جھپکائے آدھے گھنٹے بیٹھ کر دیکھو، تمہاری آنکھوں سے بھی پانی بہنے لگے گا۔"

"یہ تو آپ صحیح کہہ رہی ہیں خاتون!......... لیکن ہماری فکرمندی بھی اپنی جگہ درست ہی تھی۔ ہم تو آپ کو ہسپتال لے جانے کا بندوبست کر رہے تھے۔"

"ایسا کبھی نہ کرنا۔ ایک مرتبہ ایسی ہی حالت میں ایک ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا تھا اور میں مرتے مرتے بچی تھی۔ میں خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہوں۔ آج تک کوئی ڈاکٹر میری اس بیماری کو نہیں سمجھ پایا۔ میں بہت علاج کرا چکی ہوں، نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ خود مجھے بھی ایسی حالت میں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ میں کہاں اور کس حالت میں ہوں۔ مجھے بس یوں لگتا ہے جیسے گہری نیند میں ہوں اور پھر حواس واپس آتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ ابھی گہری نیند سے اٹھی ہوں۔"

"اس بیماری کا علاج ہو جائے گا میم!" رحیم بول اٹھا۔ "میں ناخدا مسجد کے پیش امام صاحب سے آپ کو ایسا تعویذ........."

"بس معاف کرو مجھے۔" میں ہنس کر بولی۔ "میں پہلے بھی کئی بار تمہاری زبان سے ناخدا مسجد کے پیش امام کا ذکر سن چکی ہوں۔ تم نے ہر مرض کی دوا اس بے چارے پیش امام کو بنا رکھا ہے، چاہے وہ خود کتنے ہی امراض میں مبتلا کیوں نہ ہو؟"

"خاتون! آپ کبھی کم از کم مجھ سے تو اپنی اس عجیب و غریب بیماری کا ذکر کر دیتیں۔ خدا نخواستہ آپ کو ہوش نہ آ گیا ہوتا تو زندگی خطرے میں پڑ گئی ہوتی۔ ہم تو آپ کو ہسپتال لے جاتے یا پھر یہیں کسی ڈاکٹر کو بلوا کر........."

"میری موت کا سامان کر دیتے۔" میں شہزاد کی بات کاٹ کر بولی۔ "ڈاکٹر کوئی نہ کوئی انجکشن ٹھوک دیتا اور تمہاری خاتون دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو جاتی۔"

"میم! اب آپ ایسی باتیں تو نہ کریں۔" شیتل کے لہجے میں میرے لئے محبت ہی محبت تھی۔

"اچھا اب تم لوگ یہاں سے ٹلو گے بھی یا اسی طرح میرا گھیراؤ کئے رہو گے۔ اب میں بالکل ٹھیک

ہوں۔ اسی بات پر عمدہ سی چائے پلوا دو۔" میں نے آخری الفاظ رحیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہے۔ "کھانا آج میں دیر سے کھاؤں گی اور سن لو، اگر تم میں سے کسی نے میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تو بس اسی کی شامت آ جائے گی۔" میں دانستہ ان سے بڑے خوشگوار لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"ابھی لیں۔" رحیم نے چٹکی بجائی۔ "آپ کو عمدہ چائے پلواتا ہوں۔" یہ کہتے ہی رحیم دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر شہزاد کے سوا سبھی یکے بعد دیگرے کمرے سے نکل گئے۔

"اب آپ بھی ارشاد فرما ہی دیں ظل الٰہی کہ کس لئے میرے سر پر مسلط ہیں اور یہاں سے تشریف لے جانے کا کیا لیں گے؟" میں شہزاد سے مخاطب ہوئی۔

"مجھ غلام کو آپ کیوں ظل الٰہی بنا رہی ہیں؟ اگر میری موجودگی بار خاطر ہے تو چلا جاتا ہوں۔"

"دراصل اس وقت اسٹڈی کا موڈ تھا۔ تم کہو، کوئی خاص بات کہنا ہے؟" میں سنجیدہ ہو گئی۔

"مجھے بس اتنا کہنا تھا خاتون کہ دست راست کہنے کے باوجود آپ مجھ سے بہت سی باتیں نہیں کرتیں۔" شہزاد کہنے لگا۔ "ممکن ہے، اس کی وجہ مجھ پر اعتماد کی کمی ہو۔ یہ حق مجھے نہیں کہ آپ سے کہہ سکوں، مجھ پر بھروسہ کر لیں۔ میں کیا اور میری اوقات کیا؟ پھر بھی یہ درخواست ضرور کروں گا کہ ایسی باتیں مجھ سے راز نہ رکھیں جن کا تعلق آپ کی سلامتی اور تحفظ سے ہے۔" وہ اپنے لہجے سے سنجیدہ معلوم ہو رہا تھا۔

"تم بھی کمال کرتے ہو۔ مجھے کیا خبر تھی کہ جب بیماری کا حملہ ہو گا تو شیتل اس کمرے میں آن ٹپکے گی۔ پھر یہ کہ جب سے میں اس شہر میں آئی ہوں، ایسا پہلی بار ہوا ہے۔ تمہیں اپنی اس بیماری کے بارے میں بتا کر ناحق فکرمند کرتی۔ سنو! کبھی کبھی کچھ چیزوں کا علم نہ ہونا بھی سودمند ثابت ہوتا ہے۔ اس معاملے میں زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ گئے کہ مزید سمجھانے کی ضرورت ہے؟ میرے سامنے یہ درخواست ورخواست جیسے الفاظ استعمال نہ کیا کرو۔ میں تمہیں اپنا ملازم نہیں، دوست سمجھتی ہوں۔ ہاں دوسروں کے سامنے اس کا اظہار نہیں کرتی۔ مثلاً جیسے آج ہی محی الدین سے تمہارا تعارف کراتے ہوئے میں نے تمہیں اپنا پرسنل سیکرٹری بتایا۔ تم خود بھی اس کا سبب اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ اگر میں لوگوں کو یہ بتانے لگوں کہ تم میرے دوست ہو تو وہ مجھ پر انگلیاں اٹھانے لگیں گے اور تمہیں بھی بدنام ہونا پڑے گا۔ دنیا اور دنیا والوں کو سمجھتے ہو نا، تم!"

"جی خاتون!" اس نے کہا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا، پھر کمرے سے چلا گیا۔

شہزاد کی آنکھوں میں روز اول ہی سے میں نے اپنے لئے پسندیدگی دیکھی تھی۔ اسی پسندیدگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اسے خود ہی قریب آنے کا موقع دیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی کہ جب میں کلکتہ آنے کے بعد موسیٰ سیٹھ کے مسافرخانے میں ٹھہری تھی پھر وقت اور حالات کی گردش نے اسے میری ملازمت قبول کرنے کی راہ سجھائی تھی۔ وہ بہرحال نوجوان تھا۔ اس کے سینے میں بھی دل تھا اور اس دل میں کسی کی چاہت پیدا ہو سکتی تھی۔ چاہے جانے کا حق کسی سے بھی نہیں چھینا جا سکتا۔ چاہت اور خواہش پر کوئی قید لگانا، ممکن نہیں۔ میں نے آدمی کے اس بنیادی حق کو ہمیشہ تسلیم کیا۔ سو شہزاد کے متعلق

بھی میرا ذہن صاف تھا۔ میرے نزدیک یہ کوئی ضروری نہیں کہ چاہت دو طرفہ ہو۔ چاہت یکطرفہ بھی ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ جسے چاہا جائے وہ بے خبر رہے۔ میں نے آج بوٹینکل گارڈن سے لوٹتے ہوئے شہزاد سے بلا سبب یہ سوال نہیں کیا تھا کہ تم نے بھی کبھی کسی سے عشق کیا ہے؟ میں اس سے یہ سوال کر کے جاننا چاہتی تھی کہ آئندہ وہ میرے لئے مسئلہ تو نہیں بن جائے گا۔ اس میں ظرف بھی ہے یا نہیں۔ سو شہزاد نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو چپکے چپکے خود اپنی ہی آگ میں جل جاتے ہیں۔ شہزاد میرے نزدیک ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ میں نے اس وقت اسے دوستی کا درجہ دے کر بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ یوں گویا میں نے اس کے پُرخلوص جذبات محبت کو بے توقیر بھی نہیں کیا تھا اور ان کی حدود بھی مقرر کر دی تھیں۔

اپنے ملازمین سے میں نے مطالعے کا تو محض بہانہ کیا تھا۔ میں دراصل اس وقت پیش آنے والے واقعے پر غور کرنا چاہتی تھی۔ اب مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لعنتی سادھو اپنے طور پر کمینگی دکھا رہا تھا' بڑے مہاراج کی مرضی اس میں شامل نہیں تھی۔ دوم یہ کہ شمبھو صرف ایک درمیانی کڑی تھا۔ میرا اصل مقابلہ بڑے مہاراج سے تھا۔ وہ تو پہلے ہی سے میرے متعلق بہت کچھ جانتا تھا یا پھر اس دوران میں جان گیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے میرے نام سے مخاطب نہ کرتا۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میرا نام کوئی راز نہیں۔ کلکتے میں مجھے اسی نام سے جانا پہچانا جا رہا تھا۔ شمبھو جب میری کوٹھی تک پہنچ سکتا تھا تو یہ معلوم کرنا کون سا مشکل تھا کہ اس کوٹھی میں کون رہتا ہے! پھر بڑے مہاراج کو میرا نام معلوم ہو گیا تھا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ خود پُراسرار طور پر میری کوٹھی کے اس کمرے میں پہنچ گیا تھا جہاں میں موجود تھی اور پھر اسی طرح غائب بھی ہو گیا تھا۔ بڑے مہاراج کی پُراسرار شیطانی قوتوں کے زیر اثر آ کر میں مفلوج ہو گئی تھی' مگر اس کا یہ دعویٰ باطل ثابت ہو گیا تھا کہ صبح تک میری یہی حالت رہے گی۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ چاہے بھی تو مجھے اپنی شیطانی قوتوں کا شکار نہیں بنا سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وقتی طور پر وہ مجھ پہ غلبہ پا لے۔ اس نتیجے تک پہنچ کر میری کچھ ڈھارس بندھی۔ ذرا ہی دیر کے بعد میرا ذہن پُرسکون ہو گیا اور میں دوبارہ مطالعہ کرنے لگی۔

☆======☆======☆

دوسرے روز شام کو حسب وعدہ محی الدین وقت مقررہ پر میری کوٹھی پہنچ گیا۔ میں اسی کی منتظر تھی۔ وہ آیا تو مجھے یوں لگا جیسے احرس آ گیا ہو۔ آدمی بھی خود کو کیسے کیسے فریب دیتا ہے۔ دانستہ دھوکہ کھانا بھی شاید آدمی کی سرشت میں داخل ہے۔ خواب دیکھنا اور خوابوں میں زندہ رہنا بھی غالباً اس کی مجبوری ہے۔ یہی مجبوری میری بھی تھی۔ میں ان پہاڑی بستیوں سے اتر کر ہموار میدانوں کی اس دنیا میں تو آ گئی تھی' مگر احرس اور نضار کو نہیں بھول سکتی تھی۔ میں انہیں بھلاتی بھی کیسے کہ وہ دونوں تو جیسے میرے ہی وجود کا ایک حصہ تھے۔ محی الدین کی طرف پیش قدمی اسی کا شاخسانہ تھی۔ وہ اس وقت میرے ساتھ نشست گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس روز میں نے بہترین لباس زیب تن کیا تھا۔

"کوٹھی تلاش کرنے میں زیادہ دشواری تو نہیں ہوئی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں' کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ نے پتہ اس طرح سمجھایا تھا کہ میں سیدھا ادھر ہی آ گیا۔ ویسے اس علاقے میں رہنے والے لوگ مجھے کچھ عجیب سے لگے۔ یہاں کسی کو کسی سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ آپ کی کوٹھی کے قریب شاید دائیں جانب دو کوٹھیاں چھوڑ کر کوئی انگریز رہتا ہے۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر کہیں جانے والا تھا۔ مجھے کوئی اور نظر نہیں آیا تو اسی سے مجبوراً آپ کے بارے میں پوچھ لیا۔ منہ بگاڑ کر کہنے لگا۔ "آئی ڈونٹ نو!"

"جھوٹا ہے وہ!" میں بے ساختہ بولی۔ "وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور ایک مرتبہ اسی نشست گاہ میں آ بھی چکا ہے۔"

اس پر محی الدین نے کوئی اظہار حیرت نہیں کیا اور کہنے لگا۔ "یہ قوم تو کسی مطلب کے بغیر اپنے باپ کو نہیں پہچانتی۔ آپ نے شاید اسے لفٹ نہیں دی ہو گی۔"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات تھی۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈیسوزا نام ہے اس کا!" میں نے بتایا۔

"ویسے ایک بات عرض کروں آپ سے! انگریزوں نے جو ہمیں اپنا غلام بنا رکھا ہے' اس میں ان کی عیاریوں سے زیادہ ہماری کوتاہیوں اور خودغرضیوں کو دخل ہے۔ آپ میرے اس خیال سے متفق ہیں نا! چند افراد نے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر پوری ہندوستانی قوم کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا۔"

محی الدین ڈھکے چھپے لفظوں میں جو بات کہنا چاہتا تھا' میں اسے بخوبی سمجھ رہی تھی۔ گزشتہ رات اور آج دن بھر مختلف تاریخی کتب کا مطالعہ کر کے میں حقیقت تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے اپنا تعلق حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے ظاہر کیا تھا۔ محی الدین نے جو کچھ کہا' اس سلسلے میں سرزمین دکن کے نظام کو بھی مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ سو گویا میں اپنی صفائی میں خود ہی بول اٹھی۔ "میرا اختلاف بھی ہمیشہ اپنے خاندان سے اسی مسئلے پر رہا۔ میرے اجداد اگر اپنی ریاست بچانے کی خاطر انگریزوں سے مل نہ گئے ہوتے تو پھر ٹیپو سلطان شہید جنوبی ہند میں تنہا نہ رہ جاتا۔"

اس پر محی الدین نے مجھے حیرت سے دیکھا' پھر کہنے لگا۔ "معاف کیجئے گا محترمہ! مجھے آپ سے اس صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔"

"تاریخی حقائق بدلے نہیں جا سکتے محی الدین!" میں نے دانستہ قدرے بے تکلفی کا اظہار کیا' پھر بولی۔ "میرا خیال ہے کہ میں ابھی عمر کی اس منزل میں نہیں پہنچی کہ مجھے محترمہ کہا جا سکے۔" یہ کہہ کر میں مسکرائی۔

"دراصل احتراماً میں آپ کو محترمہ کہہ رہا تھا' اس سے میری مراد کچھ اور نہیں تھی۔ اگر آپ کو اس لفظ پر اعتراض ہے تو میں پرنسس کہہ سکتا ہوں۔"

"صرف معلبہ بھی تو کہا جا سکتا ہے۔" میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ "پرنسس کہلوانا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ابھی میں نے جو کچھ کہا' اسی کی روشنی میں میرے لئے یہ بات کوئی قابل فخر نہیں کہ میرا

تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔"

"ٹھیک ہے معبلہ! اگر آپ یہی چاہتی ہیں تو ایسا ہی سہی۔" اس نے یہ کہتے ہوئے طویل سانس لیا۔

"یہ بات تو میرے نزدیک ضمنی سی ہے کہ نظریاتی اختلاف کے سبب آپ نے اپنا گھر چھوڑا' اس کے علاوہ بھی تو کوئی اصل سبب ہو گا۔" میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "محی الدین! آپ جو اتنے لمبے لمبے سانس لیتے ہیں اور گفتگو کرتے کرتے کہیں کھو سے جاتے ہیں' اس کی وجہ بتائیں؟"

جواب میں محی الدین کچھ دیر تک خاموش رہا اور میں اس کے بولنے کی منتظر رہی۔ اسی عرصے میں شیتل خشک میوہ' پھل' چائے وغیرہ درمیانی میز پر رکھ کے چلی گئی۔ نشست گاہ میں آنے سے پہلے ہی میں اس سے یہ کہہ آئی تھی کہ چائے وغیرہ لے آنا۔

چائے پینے کے دوران میں پھر میں نے وہی گفتگو چھیڑ دی تو محی الدین بولا۔ "یہ معاملہ میرے لئے ذرا جذباتی اور ذاتی سا ہے۔ آپ اگر مجھے مزید اداس نہیں دیکھنا چاہتیں تو میرے زخموں کو نہ کریدیں۔ میں اپنے زخموں کی نمائش کا قائل نہیں ہوں معبلہ!"

"اس سے یہ تو پتہ چل ہی گیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا' کچھ زخم آپ کے دل پر ضرور لگے ہیں۔" میں بولی۔

"ہاں معبلہ!" اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "زخم تو لگے ہیں مگر میں انہیں .... اب میں .... میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔"

"لیکن یہ لگتا تو نہیں محی الدین کہ آپ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ نے کل اپنے بارے میں یہی بتایا تھا نا کہ تنہا رہتے ہیں۔ سو تنہائی کسی کو کچھ بھی نہیں بھولنے دیتی۔ آپ یہ کوشش کریں کہ کم سے کم تنہا رہیں۔"

"بھیڑ میں بھی تو آدمی تنہا رہتا ہے!"

"ہاں کل میں نے آپ کو بھیڑ میں تنہا ہی دیکھا تھا مگر تنہا نہ رہنے سے میری مراد کچھ اور تھی۔ شاید آپ نے کسی کو اپنا دوست بھی نہیں بنایا!"

"دوست.........!" اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری۔ "کیا اس زمانے میں کوئی کسی کا دوست بھی ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" میں نے برجستہ کہا۔ "دراصل دوستی اور دشمنی کا تعلق آدمی کے اپنے احساس سے ہے۔"

"لیکن میرا نقطہ نظر یہ ہے معبلہ کہ واقعات و تجربات دوستی یا دشمنی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ میں ایک دوست ہی کا تو زخم خوردہ ہوں۔"

وہ کچھ کھلنے لگا تو میں نے اسے مزید ترغیب دینے کے لئے کہا۔ "ضروری نہیں محی الدین کہ ہر شخص دوستی کے پردے میں دغا کرے۔"

"ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو' مگر مجھے دوستی پر اعتماد نہیں رہا۔"

"دوستی پر اعتماد نہ کرنا الگ بات ہے اور کسی دوست پر بھروسہ نہ کرنا مختلف بات ہے۔ کوئی دوست بے وفا نکل سکتا ہے' لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دوستی ہی کو صرف اس ایک شخص کی وجہ سے مسترد کر دیا جائے۔"

"آپ کسی بھی موضوع پر اچھی بحث کر سکتی ہیں۔" وہ پہلی مرتبہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "لگتا ہے آپ اپنے زمانہ طالب علمی میں اچھی ڈیبیٹر رہی ہیں۔ دکن میں تعلیمی معیار کیسا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"زمانہ طالب علمی کا تعلق نصابی علم سے ہوتا ہے اور میں محض نصابی علم کو علم نہیں مانتی۔ آدمی تو ساری زندگی علم کا طالب ہی رہتا ہے۔ دکن میں صورت حال یہاں سے قدرے بہتر ہے۔" میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا اور اس کی وجہ ظاہر تھی۔ نہ تو میرا تعلق دکن سے تھا اور نہ میں نے نصابی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس موضوع پر مزید گفتگو سے گریز کی خاطر میں نے کہا۔ "محی الدین! آپ شاید اس طرح اصل موضوع گفتگو بدلنا چاہتے ہیں۔"

"اب آپ سمجھ ہی گئی ہیں تو اس موضوع کو بدل جانے دیں۔" وہ پھر مسکرایا اور کہنے لگا۔ "کل آپ نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ میرا غریب خانہ بھی دیکھنے چلیں گی۔ تو کیا خیال ہے چلیں؟ چائے تو پی ہی چکے ہیں' کھانا میرے ساتھ کھا لیجئے گا۔"

"کیا کوئی باورچی وغیرہ رکھا ہوا ہے؟ .... مگر آپ نے تو بتایا تھا کہ تنہا رہتے ہیں' خود کھانا پکاتے ہیں کیا؟"

"اب میں اتنا بھی امیر نہیں کہ آپ کی طرح ملازمین رکھ سکوں۔ نہ مجھے خود کھانا پکانا آتا ہے۔ ہوٹلوں پر گزارہ ہے۔ ہوٹل تو خیر وہاں پارک اسٹریٹ میں بھی ہیں مگر عموماً میں رات کو ادھر دھرم تلے ہی کی طرف نکل آتا ہوں۔ یہاں کھانا بھی اچھا مل جاتا ہے اور اخراجات بھی کم آتے ہیں۔ واپسی میں یہیں کسی مناسب ہوٹل میں کھانا کھا لیں گے۔ دراصل اب آپ سے کیا چھپانا' ابی سے دانستہ میں کبھی زیادہ رقم کا مطالبہ نہیں کرتا۔ جتنے میں باآسانی گزر بسر ہو جاتی ہے' کر لیتا ہوں۔ اخراجات کو کبھی حد سے بڑھنے نہیں دیتا۔" اس نے بتایا۔

"یہ تو خیر اچھی بات ہے۔ آدمی کو اپنی چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانا چاہئیں۔ ویسے گھر ہونے کے باوجود یہ کچھ اچھا نہیں لگے گا کہ ہم ہوٹل میں کھانا کھائیں' مگر آپ کی خاطر یہ بھی سہی۔" میں مسکرا کر بولی۔

محی الدین کی سکونت رپن اسٹریٹ میں تھی۔ رپن اسٹریٹ اور فری اسکول اسٹریٹ' یہ دونوں ہی پارک اسٹریٹ کی ذیلی آبادیاں تھیں۔ یہاں مسلمانوں اور عیسائیوں کی مشترکہ سکونت تھی۔ پارک اسٹریٹ' پارک سرکس سے ملحق تھی۔ یہاں ایک بڑا پارک تھا جس کے اطراف مسلمان گھرانے آباد تھے۔ پارک سرکس کا شمار خاصی گھنی آبادیوں میں تھا۔ پارک سرکس اور دھرم تلے کے درمیان اپر اور لوئر

سرکلر روڈ تھے۔

میں اس شام محی الدین کے ساتھ اس کے گھر گئی۔ وہ چھوٹا سا گھر صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کی حیثیت نشست گاہ کی تھی اور دوسرا کمرہ اس کی خواب گاہ تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کا گھر اتنا صاف ستھرا ہو گا۔ عموماً جو لوگ بیچلر لائف گزارتے ہیں' اس معاملے میں بے پرواہ ہوتے ہیں' مگر محی الدین ان میں سے نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنی نشست گاہ میں بٹھایا۔ میں خاصی دیر تک اس کے ساتھ رہی۔ پھر ہم دونوں دھرم تلے لوٹ آئے۔ وہاں ہم نے ایک ہوٹل میں ساتھ کھانا کھایا اور پھر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

مجھے اپنے معمولات میں تبدیلی خوشگوار محسوس ہوئی تھی۔ آئندہ چند روز کی ملاقات میں مجھے محی الدین کے بارے میں تقریباً تمام ہی باتوں کا علم ہو گیا۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک صوبے بہار سے تھا۔ بہار ہی کا ایک شہر چھپرا اس کا مولد تھا۔ اس علاقے میں ایک زبان بھوجپوری بولی جاتی تھی۔ میں نے محی الدین سے گفتگو کے دوران میں ایک اور خاص بات محسوس کی کہ صوبہ بہار سے اپنے تعلق پر وہ کچھ فخر سا کرتا تھا۔ میں نے اس سے جب پہلی مرتبہ بھوجپوری بولی تو وہ حیران رہ گیا اور اس پر خوشی کا اظہار بھی کیا کہ مجھے بھوجپوری آتی ہے۔ ایک ہفتے میں پانچ بار میری اور اس کی ملاقات ہوئی۔ دو دفعہ وہ خود میری کوٹھی آیا اور تین بار میں خود رپن اسٹریٹ گئی۔ اتوار کو وہ بھی ہمارے ساتھ پکنک منانے چلے گا' یہ میں نے اس سے پہلے ہی طے کر لیا تھا۔

اتوار کے دن صبح ہی وہ میری کوٹھی پہنچ گیا۔ یہی اس سے طے بھی ہوا تھا۔ شہزاد میرے ایما پر تمام تیاری کر چکا تھا۔ محی الدین کے آتے ہی ہم روانہ ہو گئے۔ کلکتے کی ایک عمدہ نواحی آبادی ٹالی گنج سے پہلے بالی گنج پڑتا تھا۔ ہمیں وہیں جانا تھا۔ بالی گنج جانے کے لئے ہم ٹرام ڈپو پیدل پہنچے اور وہاں سے ایک ٹرام میں بیٹھ گئے۔

بالی گنج میں اعلیٰ درجے کے ہندوؤں کی سکونت تھی۔ بنگال کے بڑے بڑے سیاست دانوں کی کوٹھیاں بھی وہیں تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں بوٹنگ کلب بھی تھے۔ یہیں ایک خوبصورت تفریحی مقام لیک کہلاتا تھا۔ ہماری منزل وہی تھی۔

لیک پہنچ کر ہم کچھ دیر گھومتے پھرتے رہے اور پھر جھیل کے قریب سبزہ زار پر بیٹھ گئے۔ اسی جھیل میں ٹاپو پر ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ ٹاپو تک پہنچنے کے لئے ایک پُل تھا جو ہلتا رہتا تھا۔ مقامی لوگ اسے لچلچیا پُل کہتے تھے۔ شہزاد کی حالت اس پُل پر چلتے ہوئے قابل دید تھی۔ وہ بار بار محی الدین کا بازو تھام لیتا تھا۔ پہلے کی نسبت محی الدین کی اداسی خاصی کم ہو گئی تھی اور اس میں میری کوشش کو بڑا دخل تھا۔ میں بات بے بات اسے ہنسانے کی کوشش کرتی۔ بھوجپوری لوک گیت اسے خاصے یاد تھے' آواز بھی اچھی تھی۔ میری فرمائش پر اس نے دو ایک گیت سنائے بھی تھے۔ اس وقت بھی جب ہم سبزہ زار پر آ کے بیٹھے تو میں نے اس سے یہی فرمائش کر دی۔

وہ میرے اصرار پر کچھ شرمیلے سے انداز میں ایک بھوجپوری لوک گیت سنانے لگا۔ "کنوے کنوے

ہم تو بھاگیں اور چھپائیں جنا........ کنوے کنوے ہم تو........." گیت ختم ہوا تو شہزاد اس کی آواز اور ترنم کی تعریف کرنے لگا۔ تمام دن بہت خوشگوار گزرا لیکن جب میں کوٹھی پہنچی تو بدمزہ ہو گئی۔

زرینہ را نے ایک بند لفافہ مجھے تھما دیا۔ لفافے کا رنگ دیکھتے ہی میں چونک اٹھی۔ وہ گلابی رنگ کا لفافہ تھا جس پر اردو میں میرا نام لکھا ہوا تھا۔

"کون دے گیا تھا یہ لفافہ؟" میں نے زرینہ را سے پوچھا۔

"ایک لڑکا تھا میم!" زرینہ را نے جواب دیا۔

شہزاد اس عرصے میں اندر جا چکا تھا۔ میں نے وہ لفافہ اپنے پرس میں رکھ لیا اور آگے بڑھ گئی۔ اپنی خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کر کے لباس تبدیل کئے بغیر ہی میں نے وہ لفافہ کھول لیا۔ لفافے میں موجود خط پر نگاہ ڈالتے ہی میں سمجھ گئی کہ مجھے خط لکھنے والا کون ہو سکتا ہے! میرا قیاس درست ہی ثابت ہوا تھا۔ مجھے وہ خط لکھنے والا میرا "پُراسرار خیرخواہ" ہی تھا۔ خاصے طویل عرصے کے بعد مجھے اس کا یہ دوسرا خط ملا تھا۔ میں اس عرصے میں اسے تقریباً بھول ہی گئی تھی۔ اپنے پہلے خط میں اس نے مجھے خبر دی تھی کہ اعلیٰ انگریز حکام مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ جب سے میں نے اپنی نگرانی کرنے والوں کی پٹائی شروع کر دی' یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ دوسرا خط خاصا مختصر تھا جیسے جلدی میں لکھا گیا ہو۔ عبارت اردو ہی میں تھی' لکھا تھا۔

"معبلہ جی! جس شخص نے آپ کو اپنا نام محی الدین بتایا ہے اور آج کل آپ کے ساتھ نظر آ رہا ہے' اس سے چوکنا اور محتاط رہیں۔ نہ وہ مسلمان ہے اور نہ اس کا اصل نام محی الدین ہے۔ وہ بھی انگریز حکام کے پالتو کتوں میں سے ایک ہے۔ کوشش کروں گا کہ آپ سے کبھی خود مل سکوں۔ والسلام!

آپ کا خیرخواہ

خط پڑھ کر میرا سر گھوم گیا۔ "تو محی الدین بھی........." میں بڑبڑائی۔

میرا دل یہ بات ماننے پر راضی نہیں ہو رہا تھا کہ محی الدین کا تعلق سی آئی ڈی سے ہو سکتا ہے۔ خط میں واضح طور پر یہی اشارہ کیا گیا تھا۔

"مگر آخر میرا یہ خیرخواہ کون ہے؟" سوچتے سوچتے میں ایک بار پھر بڑبڑانے لگی۔

اب میں ایک اور ہی نہج پر سوچ رہی تھی۔ شاید اس کا سبب میرے خوابوں کی شکست تھا۔ میرے تو وہم و گمان میں یہ بات نہیں تھی کہ محی الدین فراڈ ہو گا۔ اس کے چہرے سے احرس کی مماثلت نے غالباً مجھے کسی قسم کے شک و شبہے میں مبتلا نہیں ہونے دیا تھا۔

کافی دیر غور و خوض کے باوجود میں تذبذب کا شکار رہی۔ کبھی اپنے پُراسرار خیرخواہ کی اطلاع مجھے درست معلوم ہوتی اور کبھی میں خود اسی پر شک کرنے لگتی۔ آخر اسے میری خیرخواہی کی کیا ضرورت تھی؟ پھر یہ کہ اسے کس طرح معلوم ہو گیا' محی الدین کا تعلق انگریز حکام سے ہے؟

محی الدین مجھ سے خود نہیں ملا تھا بلکہ میں نے ہی اس کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ یہ بات بھی محی

الدین کے حق میں جاتی تھی۔ اس کے باوجود میرے دل میں شک بیٹھ گیا۔ آئندہ روز مجھے محی الدین سے ملنے خود اس کے گھر جانا تھا۔ وقت ملاقات شام کا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور اس معاملے کو آئندہ روز پر ٹال دیا۔ خط کو میں نے سنبھال کر الماری میں رکھ دیا اور کپڑے بدلنے لگی۔

جب سے محی الدین ملا تھا' میری توجہ کسی اور طرف نہیں ہوئی تھی۔ بڑے مہاراج نے مجھے کیا دھمکی دی تھی' اسے بھی میں نے اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اس دوران میں مطالعے اور محی الدین سے ملاقات کے سوا کسی اور طرف میرا دھان نہیں گیا۔ ہاں اس عرصے میں مجھے اپنے دشمن ژیان کا ضرور خیال آیا۔ وجہ یہ ممکن تھی کہ محی الدین کو دیکھ کے مجھے میرا ماضی یاد آ جاتا تھا۔ ژیان بھی میرے ماضی کا ایک ایسا ہی زخم تھا کہ جو اب بھی ہرا تھا۔ پُراسرار سرگوشیوں کے ذریعے یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ ژیان اس شہر میں نہیں تھا۔ اسی کے بعد سے میں نے ژیان کی تلاش ترک کر دی تھی' مگر ایک سوال میرے ذہن میں رہ گیا تھا۔ یہ درست تھا کہ شمبھو نے مجھے فریب نظر میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ ژیان نہیں تھا جسے میں ژیان سمجھی' مگر فریب دینے کے لئے میرے دشمن کا چہرہ ہی کیوں دکھایا گیا؟ میں اس سوال کا کوئی جواب تلاش نہ کر سکی تھی۔

آئندہ روز شام کو میں وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی محی الدین کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے حسب معمول مجھے دیکھ کر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا لیکن اسے میں نے چونکتے ضرور دیکھا تھا۔ "آج آپ کچھ جلدی آگئیں معبلہ!" اس نے مجھے اندر داخل ہونے کے لئے راستہ دیا۔

"ہاں۔" کوشش کے باوجود میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ دراصل مجھے اس پر کچھ دکھ سا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید محی الدین وہ نہیں جو میں سمجھ رہی تھی۔ آج میرا زاویہ نظر اور سوچنے کا انداز قطعی مختلف تھا۔ نشست گاہ میں داخل ہوتے ہی میں نے ہر شے کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے' سنجیدہ سی نظر آ رہی ہیں آپ؟" محی الدین میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ میرے برابر ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"نہیں تو!" میں بالجبر مسکرائی اور پھر جو کچھ سوچ کر آئی تھی اسے مدنظر رکھتے ہوئے گفتگو شروع کر دی۔ "چھپرا سے آپ کی امی کا کوئی خط آیا؟"

"امی کا خط .... ہاں یاد آیا' پرسوں ہی ان کا خط ملا تھا۔" وہ پہلے خلاف توقع چونکا اور پھر روانی سے بولنے لگا۔ "ہر خط میں بس ایک ہی بات لکھواتی رہتی ہیں کہ گھر لوٹ آؤں۔ مگر آپ کو اس وقت امی کے خط کا خیال کیسے آگیا معبلہ!"

"آپ سے تعلق خاطر کی وجہ سے۔" میں نے جواب دیا۔ "ظاہر ہے کہ وہ آپ کی امی ہیں تو مجھے بھی ان کا خیال ہونا چاہئے۔ میرا تو خیال ہے محی الدین کہ آپ کچھ دن کے لئے چھپرا چلے ہی جائیں اور کچھ نہیں تو امی ہی خوش ہو جائیں گی۔ کیا آپ کو ان کی یاد نہیں آتی؟"

"کیوں نہیں آتی یاد۔ ظاہر ہے کہ وہ میری ماں ہیں' ان کے خط تو میں کئی کئی بار پڑھتا ہوں۔ بس یہی تو اب ان سے اب رابطہ رہ گیا ہے۔" محی الدین کے الفاظ کچھ تھے اور لہجہ کچھ' اس کا لہجہ سپاٹ سا

اور جذبات سے عاری تھا۔ ایک ایسا لاڈلا بیٹا جو اپنی ماں سے دور ہو' اپنی ماں کا ذکر کرتے ہوئے اتنا غیر جذباتی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اس وقت یہ بات شاید یوں بھی محسوس کر لی کہ محی الدین کے الفاظ اور لہجے پر پوری توجہ دے رہی تھی۔

"اگر آپ کئی کئی بار خط پڑھتے ہیں تو ظاہر ہے انہیں احتیاط سے سنبھال کر بھی رکھتے ہوں گے؟" میں بولی۔

"جی!" وہ پھر چونکا اور جلدی سے بولا۔ "جج .... جی ہاں' کیوں نہیں۔"

"میں دراصل یہ اس لئے کہہ رہی تھی محی الدین کہ میری والدہ کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب میں نے ہوش نہیں سنبھالا تھا۔ مجھے خبر ہی نہیں کہ ماں کی محبت کیا ہوتی ہے' میں تمہاری امی کا خط پڑھ کر اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ اولاد کے لئے ایک ماں کیا جذبات رکھتی ہے۔"

"یہ سن کر بہت دکھ ہوا معبلہ کہ جب آپ چھوٹی ہی تھیں تو آپ کی والدہ وفات پا گئیں۔ دراصل جن بچوں کی مائیں بچپن ہی میں..........."

"آپ اپنی امی کا کوئی خط تو لے کر آئیں۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ اصل بات گول کر جانا چاہتا ہے۔

"دیکھتا ہوں' شاید مل جائے۔" یہ کہتے ہوئے وہ کچھ فکرمند سا نظر آنے لگا۔

"ابھی تو آپ نے میری اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ خط احتیاط سے سنبھال کے رکھتے ہیں؟" میں اسے گھیرے جا رہی تھی۔

"ہاں وہ .... وہ تو خیر ہے لیکن..........." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا' پھر بولا۔ "اندر بیڈ روم میں جا کے دیکھتا ہوں' شاید الماری میں رکھا ہو۔ بات یہ ہے معبلہ کہ جس چیز کو جتنا زیادہ احتیاط سے سنبھال کے رکھو' وقت پر وہی چیز نہیں ملتی' پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کوئی بھی خط مل جائے' لے آئیں۔" میں نے اسے ڈھیل دی۔ میری دانست میں اب وہ پوری طرح گِھر چکا تھا۔ میں نے اس کے لئے کوئی راہِ مفر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے مجھے اپنی جو کہانی سنائی تھی' اگر سچی تھی تو کوئی نہ کوئی خط ضرور ہونا چاہئے تھا۔ اسے شاید یہ توقع نہیں رہی ہو گی کہ میں خط پڑھنے کو کہہ دوں گی ورنہ شاید وہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔ کچھ نہیں تو یہی کہہ سکتا تھا کہ خط محفوظ نہیں رکھتا۔

میں جہاں کرسی پر بیٹھی تھی' اسی کے عقب میں قدرے بلندی پر ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ یہ کھڑکی اندرونی اور بیرونی کمرے کے درمیان تھی۔ محی الدین جیسے ہی اٹھ کر اندر گیا' میں آہستگی کے ساتھ اٹھ کے کھڑکی سے اندر جھانکنے لگی۔ محی الدین مجھے اب تک اندرونی کمرے میں نہیں لے گیا تھا۔ میں جب بھی آتی' وہ مجھے نشست گاہ ہی میں بٹھا لیتا۔ خود میں نے وہ کمرہ دیکھنے کو نہیں کہا تھا۔ ابھی میں اس سے اتنی بے تکلف نہیں ہوئی تھی۔ خود اسے بھی میں اپنی خواب گاہ میں نہیں لے گئی تھی۔ ہموار میدانوں کی اس دنیا کے طور طریق اب پوری طرح میری سمجھ میں آ گئے تھے۔ میں کھڑکی سے پہلی بار ہی محی الدین کی خواب گاہ کا نظارہ کر رہی تھی۔

محی الدین کی پشت میری طرف تھی اور وہ کمرے کے درمیان میں کھڑا شاید کچھ سوچ رہا تھا۔ سامنے ہی ایک مسہری نظر آ رہی تھی جس کی دائیں جانب الماری رکھی تھی۔ ذرا دیر کمرے کے وسط میں کھڑا رہنے کے بعد وہ آگے بڑھا۔ پھر میں نے اسے مسہری کے سرہانے رکھا تکیہ اٹھاتے دیکھا۔ تکیہ اٹھا کر اس نے جو چیز اٹھائی اسے دیکھ کے میں اچھل پڑی۔ وہ ایک پستول تھا جو محی الدین نے اپنے کرتے کی جیب میں رکھ لیا تھا پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ پلٹنے والا ہے' میں فوراً ہی نیچے جھک گئی۔

محی الدین جب اندرونی کمرے سے نکل کر آیا تو میں اس وقت تک دوبارہ پہلے کی طرح کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اب مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ میرے پُراسرار خیرخواہ نے بالکل درست خبر دی تھی۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی کہ محی الدین نے اپنی مفروضہ ماں کا خط تلاش نہیں کیا تھا۔ اس نے یقیناً کسی خطرے کی بو سونگھ لی تھی اسی لئے پستول جیب میں رکھ کے نشست گاہ میں واپس آ گیا تھا۔ اگر اس کا تعلق سی آئی ڈی سے تھا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ اطلاع مل گئی ہو گی کہ میں دو چار کے بس میں آنے والی نہیں ہوں۔

"کوئی خط ملا محی الدین؟" میں نے اس سے پُراشتیاق آواز میں پوچھا۔ وہ اب میرے برابر والی کرسی پر بیٹھنے کی بجائے سامنے ایک کرسی پر آ بیٹھا تھا۔

"نہیں معبلہ!" اس نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔ "بہت تلاش کیا مگر کوئی خط نہیں مل سکا۔ معلوم نہیں خطوط کا وہ بنڈل میں نے کہاں رکھ دیا۔ دراصل جو خط بھی آتا ہے' میں بقیہ خطوط کے ساتھ اسے باندھ کے رکھ دیتا ہوں۔"

میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ وہ میرے برابر بیٹھنے کی بجائے سامنے کیوں بیٹھا ہے' اس طرح اسے اپنے کُرتے کی جیب سے کسی بھی موقع پر پستول نکال کے مجھے نشانے پر لینے میں آسانی ہوتی۔ میں اسی لئے اب پوری طرح چوکنی تھی۔

"چلو خیر کوئی بات نہیں' پھر کبھی دیکھ لوں گی۔" میں نے پُرسکون آواز میں کہا۔

میری اس بات پر وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

"اپنی والدہ کی کوئی تصویر تو ہو گی ہی تمہارے پاس!" میں نے پھر دانہ پھینکا۔ اب میں نے اسے "آپ" کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اس تکلف کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

"نہیں۔" اس نے فوراً انکار کر دیا۔ "ہماری خواتین تصویر کھنچوانے سے گریز کرتی ہیں۔"

"اور ظاہر ہے اپنے والد سے تمہیں ویسے بھی نظریاتی اختلاف ہے۔ تم انگریزوں کے دشمن ہو اور وہ دوست ہیں اس لئے ان کی تصویر تمہارے پاس ہونے کا سوال ہی نہیں۔" میری آواز میں چبھن تھی۔ "ویسے تمہارے پاس کوئی اور ثبوت ہے اس بات کا کہ تم نے مجھے اپنی جو کہانی سنائی تھی' وہ سچ ہے؟"

"ان فضول باتوں سے مطلب کیا ہے آپ کا؟" اس کے لہجے میں ایک دم سختی آ گئی۔

"مطلب بھی بتا دوں گی' مگر اپنا ہاتھ کُرتے کے پہلو والی جیب سے الگ رکھو جس میں تم اندر سے پستول رکھ کر لائے ہو۔"

میری بات سنتے ہی وہ اچانک اچھل کر کھڑا ہو گیا مگر اس کے باوجود میں نے اسے جیب سے پستول نکالنے کا موقع نہیں دیا۔ میں جیسے اڑتی ہوئی سی اس پر جا پڑی تھی۔ اس کے پیچھے کرسی تھی' وہ کرسی سے ٹکراتا ہوا نیچے گرا۔

"تم ابھی میرے سامنے دودھ پیتے بچے ہو' انگریزوں کے پالتو کتے!" میں غرائی اور پھر اس کے سینے پر کہنی ماری۔

وہ بلبلا کر چیخا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔ موقع دیکھتے ہی میں نے اس کے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا۔ پھر میں نے اچھل کر کھڑے ہونے میں دیر نہیں کی تھی' پستول کی نال کا رخ اب اس کی طرف تھا۔

"اٹھ کے کھڑے ہو جاؤ .... جلدی ورنہ میں تمہیں گولی بھی مار سکتی ہوں۔"

"نن .... نہیں۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر خوفزدہ آواز میں بولا' پھر اٹھنے لگا۔

میں جس کرسی پر پہلے بیٹھی تھی' دوبارہ اسی پر بیٹھ گئی اور اسے مخاطب کیا۔ "ہاں اب فرفر سارا سبق سنا دو۔" وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔

"کک .... کیسا سبق؟ میں .... میں سمجھا نہیں۔" وہ ہکلایا۔

"سب سمجھتے ہو تم' زیادہ معصوم جان بننے کی کوشش نہ کرو ورنہ میں تمہیں پیروں پر کھڑے رہنے کے قابل نہیں چھوڑوں گی۔ تمہاری دونوں ٹانگیں توڑ دوں گی۔" میرے لہجے میں غراہٹ تھی۔ "بتاؤ تمہارا اصل نام کیا ہے؟"

"پر .... پرکاش۔" اس نے گھبرا کر بتا دیا۔

"تو ہندو بچہ ہے تُو!" میری آواز میں حقارت تھی۔ "اور مجھے اپنا نام تُو نے محی الدین بتایا تھا .... دین کو زندہ کرنے والا۔"

"مم .... مجھے اس نام کے معنی معلوم نہیں تھے ورنہ ہر .... ہرگز یہ نام نہ رکھتا' کوئی .... کوئی اور نام بتا دیتا آپ کو۔"

"نام میں کچھ نہیں رکھا احمق کے پٹھے! کیا تُو صرف اپنا اتنا ہی قصور سمجھ رہا ہے؟"

پھر اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ خفیہ پولیس کا ایک انسپکٹر ہے۔ اپنے افسران کے حکم پر وہ مجھ سے تعلقات استوار کر رہا تھا تاکہ میرے بارے میں تفصیلی رپورٹ انہیں دیتا رہے۔ اسے میرے متعلق تمام مطلوبہ معلومات حاصل کرنا تھیں کہ میں کہاں سے اور کیوں ہندوستان آئی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ کہ آئندہ میرے کیا ارادے ہیں۔

"مگر میں نے تو خود تجھ سے تعارف حاصل کیا تھا؟" میں بول اٹھی۔

"اگر آپ ایسا نہ کرتیں تو میں خود کوئی راہ نکالتا' مجھ سے کہا گیا تھا کہ موجودہ میک اپ میں آپ خود ہی میری طرف متوجہ ہوں گی۔" اس نے بتایا۔

"کیا؟" مجھے کرنٹ سا لگا۔ اسی کے ساتھ مجھے جزیل یاد آ گیا' وہی جزیل کہ جسے میرا دشمن ژیان

اپنے بھیس میں قربانی کا بکرا بننے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔

"جی ہاں' یہ میرا اصل چہرہ نہیں' میرے چہرے پر میک اپ ہے۔" وہ بولا۔ اس کا یہ انکشاف میرے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔

"اپنا اصل چہرہ دکھا۔" میں غصے میں چیخی۔

پھر میرے حکم پر اس نے اپنے چہرے سے ویسا ہی ماسک الگ کر دیا جیسا میں جزیل کے چہرے پر دیکھ چکی تھی۔ اس کا چہرہ خاصا بھدا تھا۔

"تیرے پاس یہ ماسک کہاں سے آیا؟" میں نے درشت لہجے میں دریافت کیا۔

"یہ مجھے میرے افسران نے فراہم کیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"کون ہیں تیرے افسران؟ مجھے صرف اپنے اس افسر کا نام بتا کہ جس نے تجھے یہ ماسک دیا تھا۔"

میرے اس سوال کا جواب اس نے فوراً نہیں دیا۔ وہ خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو وہ عاجزانہ آواز میں کہنے لگا۔ "مجھ سے یہ نہ پوچھئے .... میں پہلے ہی آپ کو بہت کچھ بتا چکا ہوں۔ میری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"اور زندگی جو خطرے میں پڑی ہوئی ہے' اس کی تجھے کوئی پرواہ نہیں۔" میں بولی۔ "نوکری چلی گئی تو اور بھی مل سکتی ہے مگر زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔" یہ کہتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پستول میں نے اپنے پرس میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے گولی چلا کر نہیں ماروں گی۔ تیرے لئے میرے ہاتھ.........."

ابھی میرا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھ پر تیزی سے جھپٹا۔ میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھی اس لئے اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ وہ اپنے ہی زور میں سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر چیخ اٹھا۔ پیچھے سے میری لات اس کی کمر پہ پڑی اور وہ دہرا ہو گیا۔

"پستول پرس میں رکھتے ہی اپنی فطری کمینگی پر اتر آیا تُو! تُو نے میری پوری بات تو سن لی ہوتی کہ تیرے لئے میرے ہاتھ ہی کافی ہیں۔"

وہ پلٹا تو اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا' یہ دیوار سے سر ٹکرانے کا نتیجہ تھا۔

"پھر ایک بار کوشش کر کے دیکھ لے' کیا خبر اب کے تجھے کامیابی حاصل ہو جائے۔"

چوٹ کھا کر شاید اس کی عقل خبط ہو گئی تھی' وہ میرے چڑانے پر دوبارہ مجھ پر جھپٹا اور زمین چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے ایک طرف ہو کر اس کی ٹانگوں میں اپنی ایک ٹانگ پھنسا دی تھی۔ اس کے بعد میں نے رعایت نہیں کی اور اسے ٹھوکروں پہ رکھ لیا۔ اس کے چہرے کی کھال کئی جگہ سے پھٹ گئی۔ پٹتے پٹتے وہ نڈھال سا ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگا' مگر میں نے اس پر رحم نہیں کھایا۔ میری ایک بھرپور ٹھوکر اس کی دائیں پسلی پر پڑی اور وہ پوری قوت سے چیخ اٹھا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ چیخ چکا تھا۔

اچانک بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور کسی نے چیخ کر کہا۔ "اندر کیا ہو رہا ہے؟ .... دروازہ کھولو .... بھائی محی الدین .... اے بھائی محی الدین!"

اس پر میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ اس کی چیخیں پڑوسیوں کو متوجہ کر سکتی ہیں۔ دھرم تلے کا یہ وہ علاقہ نہیں تھا کہ جہاں کسی پڑوسی کو دوسرے پڑوس کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ میں نے چند ہی لمحے میں ایک فیصلہ کر لیا اور تیزی سے چھوٹا سا صحن عبور کر کے بیرونی دروازے تک پہنچی۔

دروازہ کھولتے ہی میری نگاہ دو افراد پر پڑی۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر اور دوسرا نوجوان تھا۔ وہ دونوں مجھے سامنے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتے میں خود ہی بول اٹھی۔ "میں محی الدین کی ایک عزیزہ ہوں۔ آج.........."

"جی ہاں' ہم نے بھائی محی الدین کے پاس آپ کو آتے جاتے دیکھا ہے۔" نوجوان میری بات کاٹ کر بولا۔

میرا مسئلہ اور آسان ہو گیا' میں نے کہا۔ "آج میں آئی تو گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا' میں سمجھی کہ محی الدین کہیں سے ابھی لوٹ کے آئے ہوں گے اور انہیں دروازہ بند کرنا یاد نہیں رہا ہو گا۔ جیسے ہی میں اندر پہنچی کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اسی کے ساتھ یوں لگا جیسے دروازہ اندر سے بند کیا گیا ہو۔ میں پلٹ کر صحن میں آنے والی تھی کہ ایک اجنبی شخص سامنے سے آ گیا۔ اس نے مجھے دھکا دے کر اندر نشست گاہ میں گرا دیا۔ پھر اس نے مجھ پر دست درازی کرنا چاہی مگر میں بچ گئی۔ اسی کشمکش میں اس کا سر دیوار سے ٹکرا گیا اور وہ لہرا کر گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے موقع مل گیا کہ اس کی اچھی طرح پٹائی کر دوں۔ وہ مجھے کوئی چور لگتا ہے جو کسی طرح دروازہ کھول کر اندر گھسا تھا کہ اتنے میں یہاں میں آ گئی اور وہ چھپ گیا۔ پھر مجھے دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی' میں نے مار مار کے اس کا کچومر نکال دیا ہے۔ محی الدین معلوم نہیں کب لوٹیں' آپ لوگ اسے پولیس کے حوالے کر دیں۔ آیئے میں دکھاؤں آپ کو' وہ اندر زخمی پڑا ہے۔"

میری من گھڑت کہانی پر انہوں نے فوراً یقین کر لیا اور پھر ذرا ہی دیر میں چیخ چیخ کر دوسرے محلے داروں کو بھی بلا لیا۔ اس سی آئی ڈی انسپکٹر پرکاش کو واقعی میں نے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ فوری طور پر اٹھ کر کھڑا ہو سکے۔ میں جب محلے والوں کے ساتھ نشست گاہ میں پہنچی تو وہ زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ پرکاش کے چہرے پر ماسک نہیں تھا اس لئے وہ اب سبھی کے لئے اجنبی تھا۔ نتیجتاً وہ اسے کوئی چور ہی سمجھے اور میری تعریفیں کرنے لگے کہ ایک عورت ہو کر میں نے جواں مردی کا مظاہرہ کیا۔ پرکاش لہولہان ہے' محلے والوں نے یہ بھی نہیں دیکھا اور بقیہ کسر پوری کرنے لگے۔ میں پھر وہاں نہیں رکی کیونکہ ایک شخص کو میں نے یہ کہتے سن لیا تھا' وہ پولیس کو فون کرنے جا رہا ہے۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ میں نے ایک پولیس والے ہی کو پھنسوا دیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ پولیس کو جب پرکاش کی حقیقت کا علم ہو گا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا' مگر اس وقت بہرحال میری گلوخلاصی ہو گئی تھی۔ صورت حال کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند ہی لمحوں میں سوچی ہوئی وہ کہانی میرے کام آ گئی تھی۔

رپن اسٹریٹ سے اپنی کوٹھی کی طرف لوٹتے ہوئے مجھے یہ خیال اور ملال ضرور تھا کہ پرکاش سے

اس افسر کا نام نہ پوچھ سکی جس نے اسے ماسک فراہم کیا تھا۔ میں خود ہی اس میک اپ میں پرکاش کی طرف متوجہ ہو جاؤں گی' میرے نزدیک یہ بات بڑی معنی خیز تھی۔ اس کی کڑیاں بہت دور تک ملتی تھیں۔ اس کے علاوہ میں یہ سوچ بھی رہی تھی کہ خفیہ پولیس والوں نے میری نگرانی اور میرے متعلق مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے لئے نیا طریقہ اپنایا تھا۔ میری یہ غلط فہمی اب دور ہو چکی تھی کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ چکے ہیں۔ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے بہت سے سوال تشنہ جواب تھے۔ پہلے میں نے اسے محض ڈیسوزا کی انتقامی کارروائی سمجھ کے نظرانداز کر دیا تھا' مگر اب یہ معاملہ ایک اور ہی رخ اختیار کرتا جا رہا تھا۔

☆======☆======☆

اس واقعے کے تیسرے روز دوپہر کے بعد جب میں اپنی خواب گاہ سے نکلی تو شیتل کو ادھر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں گلابی لفافہ تھا۔

"یہ لفافہ تمہیں نریندرا نے دیا ہو گا؟" میں اس کے قریب پہنچتے ہوئے بولی۔

"جی میم!" یہ کہتے ہوئے شیتل نے مجھے وہ لفافہ دے دیا۔

"تم ایسا کرنا کہ کچھ دیر کے بعد میرے لئے چائے لے آنا' فوراً نہیں۔" میں یہ کہہ کر خواب گاہ کی طرف پلٹی۔

میں اب اس لفافے کو پہچان گئی تھی۔ میرا پُراسرار خیرخواہ شاید دانستہ گلابی رنگ کے لفافے استعمال کرتا تھا۔ اپنی خواب گاہ میں آ کر میں نے وہ بند لفافہ کھول لیا۔ خط میں اس نے صرف چند جملے لکھے تھے۔

"معبلہ جی! انسپکٹر پرکاش "چترنجن" میں داخل ہے اور اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ سے تعارف ہو جائے۔ مجھے یقین ہے' آپ ملاقات سے گریز نہیں کریں گی۔ کچھ ایسی مشکلات درپیش ہیں کہ میں خود آپ کی کوٹھی نہیں پہنچ سکتا۔ ملاقات کے لئے آپ ہی کو زحمت کرنا پڑے گی۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ دھرم تلے ہی کے علاقے میں ایڈن گارڈن ہے جسے مقامی لوگ "لیڈی باغیچہ" کہتے ہیں' وہاں تشریف لے آئیں۔ شام پانچ بجے سے چھ بجے کے درمیان آپ کو وہاں میرا وہی ہندو بنگالی دوست ملے گا جس کے ذریعے میں نے پہلا خط بھجوایا تھا۔ ممکن ہے' آپ اس کا چہرہ بھول چکی ہوں۔ سو وہ خود ہی آپ کے قریب سے گزرتے ہوئے "خیرخواہ" کہے گا۔ آپ کوئی جواب نہ دیں اور اس کے پیچھے پیچھے چل دیں۔ آپ کو گویا اس کا تعاقب کرنا ہے۔ اس طرح آپ مجھ تک پہنچ جائیں گی۔ اگر ملاقات مقصود نہ ہو تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میرا دوست وقت مقررہ تک آپ کا انتظار کر کے واپس آ جائے گا۔ یوں مجھے علم ہو جائے گا کہ ابھی میں آپ کی نظر میں قابل اعتماد نہیں۔ نقط والسلام۔ آپ کا ایک خیرخواہ۔"

وہ خط پڑھ کر میرے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ پارک سرکس میں "چترنجن میڈیکل

کالج" تھا۔ اسی سے ملحق ہسپتال کو عرف عام میں "چترنجن" کہتے تھے۔ انسپکٹر پرکاش نے زبان نہ کھول کر خود اپنی شامت کو آواز دی تھی۔ اس پر مجھے یوں بھی کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا کہ بڑی صفائی سے مجھے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ وہ یقیناً اردو پڑھا لکھا تھا اور یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ بہت سے ہندو گھرانوں میں اردو' فارسی اور عربی پڑھانے کا رواج مغلوں کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ یہ ان کی معاشی ضرورت بھی تھی کیونکہ ان کے حکمران مسلمان تھے۔ انگریزوں کے زمانے تک بھی یہ فضا زیادہ بدلی نہیں تھی۔ ہندوؤں کی ایک برادری جو کائست کہلاتی تھی' اس کے افراد بطور خاص بہت اچھی اردو' فارسی وغیرہ جانتے تھے۔ انسپکٹر پرکاش بھی مجھے کائست ہی لگتا تھا۔ زبان بھی کسی کو دھوکہ دینے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہے۔ خفیہ پولیس کے افسران نے غالباً انہی تمام خوبیوں کے مدنظر پرکاش کا انتخاب کیا تھا۔ وہ بس ایک معاملے میں دھوکہ کھا گیا تھا۔ اگر وہ یہ خیال رکھتا کہ اس نے مجھے اپنی جو کہانی سنائی تھی' اس کا کوئی ثبوت بھی ہونا چاہئے تو مار نہ کھاتا۔ کہیں نہ کہیں ذہین افراد سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی غلطی پرکاش کو لے ڈوبی تھی۔ اس سے دوسری غلطی یہ ہوئی تھی کہ مجھے کمزور سمجھا تھا ورنہ پستول جب میں نے پرس میں رکھا تھا تو وہ مجھ سے بھڑنے کی حماقت نہ کرتا۔ میرا پُراسرار خیرخواہ' پرکاش کی طرف سے پوری طرح باخبر تھا' تبھی اس نے مجھے یہ اطلاع دی تھی کہ پرکاش اب تک ہسپتال میں داخل ہے۔ اب وہ مجھ سے ملاقات کا متمنی تھا۔ میں تو خود ہی پہلے سے یہ سوچ رہی تھی کہ اس سے رابطے کی کیا صورت ہو؟ وہ تو مجھ سے واقف تھا مگر میں قطعی بے خبر تھی' وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے' اس سے اب رابطے کی ایک صورت نکل آئی تھی اور میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ پانچ اور چھ بجے کے درمیان مجھے ایڈن گارڈن پہنچنا تھا۔ میں اس کے محل وقوع سے واقف تھی۔ وہاں جا بھی چکی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات تھی کہ جب میں کلکتہ شہر خصوصاً دھرم تلے کے ایک ایک حصے کی سیر کر رہی تھی۔ اس وقت تک میں نے کوٹھی نہیں خریدی تھی۔ ایڈن گارڈن ہی کے عقب میں اسٹیڈیم تھا۔ یہیں ایک بار میں نے فٹ بال کا سنسنی خیز میچ دیکھا تھا۔ فٹ بال کی حیثیت بنگال کے قومی کھیل کی تھی۔ اس زمانے میں فٹ بال کی تین ٹیمیں بہت مشہور تھیں' محمڈن اسپورٹس' موہن بگان اور ویسٹ بنگال۔ میں نے جو میچ دیکھا' وہ محمڈن اسپورٹس اور موہن بگان کے درمیان تھا۔ ہندو تماشائی واضح طور پر موہن بگان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور مسلمان' محمڈن اسپورٹس کے حق میں چیخ رہے تھے۔ محمڈن اسپورٹس کی ٹیم کا کپتان ایک نوجوان' عباس مرزا تھا۔ وہ جب بال لے کر گول کی طرف بڑھتا تو "بک اپ مرزا' بک اپ" کی آوازوں سے سارا اسٹیڈیم گونجنے لگتا۔ اسی میچ کے دوران میں مجھے اس کھلاڑی کے متعلق لوگوں کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ صوبہ یو پی کے ایک شہر لکھنؤ کا تھا۔ وہ سنسنی خیز میچ محمڈن اسپورٹس نے جیت لیا۔ بعد میں مسلسل پانچ سال تک لیگ چیمپئن شپ اور کلکتہ شیلڈ' محمڈن اسپورٹس ہی کے پاس رہی اور یہ ریکارڈ کوئی نہیں توڑ سکا۔ اس عرصے میں ٹیم کا کپتان وہی نوجوان عباس مرزا تھا۔ اس وقت تک ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات نہیں مل سکی تھی۔

اس ذکر سے قطع نظر ایڈن گارڈن کے سبب میرا دھیان اسٹیڈیم کی طرف گیا اور پھر مجھے فٹ بال کا وہ سنسنی خیز میچ یاد آ گیا۔ میں نے اٹھ کر جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور اسی وقت کمرے کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔ شیتل چائے لے آئی تھی۔ چائے پی کر اپنی کوٹھی سے نکلتے ہوئے مجھے مزید آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ اب بھی وقت مقررہ پر ایڈن گارڈن پہنچنے کے لئے میرے پاس نصف گھنٹہ تھا۔ میں پیدل ہی ادھر چل دی کہ وہاں قبل از وقت نہ پہنچ جاؤں۔

کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت میں نے شہزاد کو یہ ہدایت دے دی تھی کہ مجھے واپسی میں دیر ہو جائے تو رات کے کھانے میں تاخیر کی ضرورت نہیں۔ اس نے پوچھا بھی کہ میرا قصد کدھر کا ہے تو میں ٹال گئی۔ میں اسے کیا بتاتی کہ خود مجھے علم نہیں تھا' کہاں جانا ہے۔

"آپ شاید محی الدین سے ملنے رپن اسٹریٹ جا رہی ہیں' وہ کئی دن سے ادھر آیا بھی تو نہیں۔" شہزاد نے اپنی دانست میں قیاس آرائی کی۔

"اب وہ کبھی آئے گا بھی نہیں۔" میں نے اسے مسکرا کر جواب دیا۔ "اگر آئے بھی تو دھکے دے کر باہر نکلوا دینا' اندر سے وہ بہت گھٹیا ثابت ہوا۔" بطور احتیاط میں نے شہزاد سے یہ بات کہہ دی کہ کہیں آئندہ کبھی میری غیر موجودگی میں پھر کوئی "ڈرامہ" نہ ہو۔

اس وقت شہزاد کے چہرے پر مجھے بڑا اطمینان نظر آیا تھا۔ شاید میرے ان الفاظ سے اس کے جذبہ رقابت کو تسکین ملی تھی۔

"آپ نے اچھا کیا' مجھے بتا دیا۔" شہزاد بولا اور پھر میں کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

آرام سے چہل قدمی کرتی ہوئی میں ایڈن گاڈرن پہنچ گئی۔ اس ہندو بنگالی نوجوان کا چہرہ میرے ذہن میں محفوظ تھا جس نے ایک مرتبہ ہاوڑہ برج سے دھرم تلے تک ٹرام میں میرے ساتھ سفر کیا تھا اور اسے میں خفیہ پولیس کا کوئی آدمی سمجھی تھی۔ اس وقت میری نظریں اسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ پھر وہ مجھے نظر آ ہی گیا۔ آج اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا مگر اسے میں نے چہرے سے پہچان لیا۔ اپنے لباس سے وہ غریب طبقے کا کوئی فرد معلوم ہو رہا تھا۔ لباس سے یہ پہچاننا مشکل تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان' وہ میلی سی ایک پینٹ اور پھٹی ہوئی قمیض پہنے ہوئے تھا۔

میری اور اس کی نظریں لمحے بھر کو ملیں۔ میں مسکرا دی۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ پھر بھی شاید میرے اطمینان کی خاطر وہ دھیمی آواز میں "خیرخواہ" کہتا ہوا قریب سے گزر گیا اور میں اس کے پیچھے ہو لی۔

ٹراموں کے ساتھ ساتھ پورے شہر میں بسوں کا جال بھی پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت تک بعض جگہوں کے لئے کسی سبب ٹرام لائن نہیں بچھائی جا سکی تھی تو وہاں آمدورفت کے لئے سرکاری بسیں تھیں۔ یہ گویا متبادل بندوبست تھا۔ دھرم تلے ہی میں ٹرام ڈپو کے بعد بس کا اڈہ تھا۔ سرکاری بسوں کے علاوہ یہاں سے پرائیویٹ بسیں بھی چلتی تھیں' مگر پرائیویٹ بسوں کی تعداد کم ہی تھی۔ میں اس ہندو بنگالی نوجوان کا تعاقب کرتی ہوئی اس بس کے اڈے تک پہنچ گئی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس طرح بڑھا چلا جا رہا تھا جیسے مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو۔

وہ ایک پرائیویٹ بس میں سوار ہو گیا۔ چند ہی مسافر ابھی اس بس میں بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ بس کی روانگی میں شاید ابھی دیر تھی۔ اس کے آگے جو بس کھڑی تھی' وہ البتہ تقریباً بھر چکی تھی۔ سیٹوں کے علاوہ لوگ اس بس میں کھڑے ہوئے بھی تھے۔ وہ بس چلی دیتی تو پیچھے والی بس کا نمبر آتا۔ طویل سفر اختیار کرنے والے یا آرام سے سیٹ پر بیٹھنے والے عموماً فوراً روانہ ہونے والی بس میں سوار نہیں ہوتے۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ یا تو طویل سفر درپیش ہے یا پھر میرا راہبر مجھے اطمینان و آرام کے ساتھ میری منزل تک پہنچانا چاہتا ہے۔ بہرحال میں اس بس میں چڑھ گئی۔ وہ بس کی اگلی سیٹوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے والی سیٹ بھی ابھی خالی تھی جس پر تین افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ میں کھڑکی کے قریب اسی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

آگے کھڑی ہوئی بس چل دی تو ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا اور اس نے بس کو آگے بڑھا کے کھڑا کر دیا۔ اب کنڈیکٹر بھی بس میں آ چکا تھا۔ اگلی بس کے روانہ ہوتے ہی سیٹیں تیزی سے بھرنے لگیں اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد کنڈیکٹر نے مسافروں سے ٹکٹ کے پیسے لینا شروع کر دیئے۔

"ٹمیا برج ایک ٹا۔" میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان کی آواز سنی۔ اس "کائیاں بالک" نے صرف اپنا ٹکٹ لیا تھا۔

میں زیر لب مسکرائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ مجھے اپنی منزل کا علم ہو چکا تھا۔ میں اس سے پہلے کبھی کلکتے کی اس مشہور نواحی بستی میں نہیں گئی تھی۔ ہاں اس کے بارے میں سنا اور پڑھا ضرور تھا۔ ایک تاریخی کتاب میں بھی اس بستی کا ذکر میں نے پڑھا تھا۔ اس ذکر کا سبب نواب واجد علی شاہ تھا۔ سرزمین اودھ کا یہ نواب' شاعر بھی تھا اور کہیں میں نے اس کا ایک مشہور زمانہ شعر بھی پڑھا تھا۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

خود یہ شعر بھی تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ انگریزوں نے جب اودھ پر قبضہ کیا اور نواب واجد علی شاہ کو لکھنؤ سے ہجرت پر مجبور کر دیا تو اس نے یہ شعر لکھا۔

انگریزوں نے نواب واجد علی شاہ کو لکھنؤ سے لا کر کلکتے کی اسی نواحی بستی میں رکھا تھا۔ اس زمانے میں یہاں خاک اڑتی تھی۔ نواب کی آمد کے بعد ہی یہاں آبادی ہوئی۔ ابتدا میں یہاں نواب کے مصاحبین اور متعلقین ہی رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کی آبادی بڑھتی گئی۔ یوپی سے آنے والے یہاں بستے گئے۔ ٹمیا برج اس قلعہ نما (مٹی کی فصیلوں والی) عمارت کا نام تھا جس میں نواب واجد علی شاہ کی سکونت تھی۔ یہاں اب مسلمانوں کی گنجان آبادی تھی جو چھوٹے چھوٹے علاقوں پر مشتمل تھی۔ ٹمیا برج کی یہ بستی خاصے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں غریب' اوسط اور اپر مڈل کلاس' سبھی طبقوں کے لوگ آباد تھے۔ گارڈن ریچ روڈ' ٹمیا برج تک جاتی تھی جس کی ایک جانب دریائے ہگلی تھا۔

جب تک بس نہ چلی میں 'مٹیابرج کے بارے میں سوچتی رہی۔ میرے راہبر نے مٹیابرج کا ٹکٹ لیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اپنے پُراسرار خیرخواہ سے میری ملاقات وہیں متوقع تھی۔ دھرم تلے سے مٹیابرج کا خاصا فاصلہ تھا۔ میں اسی لئے اطمینان سے بیٹھی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتی رہی۔

مٹیابرج جاتے ہوئے دائیں جانب میں نے کلکتہ ریڈیو اسٹیشن کی عمارت دیکھی۔ اسی سڑک پر "فورٹ ولیم" تھا جہاں فورٹ ولیم کالج تھا۔ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں فورٹ ولیم کالج کی بڑی خدمات ہیں۔ میرامن دہلوی جنہوں نے اردو زبان کے لئے فارسی زبان کے مشہور قصے لکھے اسی کالج سے متعلق تھے۔ میرامن کا "باغ و بہار" فارسی کے "قصہ چہار درویش" ہی کا گویا "آزاد ترجمہ" ہے۔

بس چلتی رہی اور اسی کے ساتھ میرے خیالوں کا سفر بھی جاری رہا۔ یہ سفر اس وقت ختم ہوا جب بس، مٹیا برج کے داخلی دروازے "آئرن گیٹ" سے گزری۔ میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اب میری نگاہ اپنے راہبر پر تھی بس اپنے اڈے پر پہنچ کر رک گئی تو وہ اپنی سیٹ سے اٹھا۔ وہ ابھی تک اجنبی بنا ہوا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بس سے اتری۔ اب گنبد والی ایک عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بعد میں مجھے اس عمارت کے متعلق علم ہوا۔ یہ عمارت بڑی امام بارگاہ کہلاتی تھی۔ یہ نواب واجد علی شاہ کی یادگاروں میں سے ایک تھی۔ اس میں ایک پتھر رکھا تھا جس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قدموں کا نشان (قدم علیؑ) بتایا جاتا ہے۔ اسی امام بارگاہ کے عقب میں ایک پرانا باغ تھا اور اسی باغ کے اطراف قدیم آبادی تھی جہاں کبھی نواب کے مصاحبین رہتے تھے۔ میں اپنے راہبر کا تعاقب کرتی ہوئی اسی آبادی میں داخل ہو گئی۔

وہ قدیم طرز کی ایک عمارت تھی جس کے دروازے پر رک کر میرے راہبر نے دستک دی۔ میں اس سے ابھی کچھ فاصلے پر تھی۔ اس ظالم نے اب تک مڑ کر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ جس کی رہنمائی کرتا ہوا وہ یہاں تک آیا ہے' ساتھ ہے بھی یا نہیں۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور وہ اندر چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے یہ دیکھ لیا تھا کہ دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ میں تیز قدمی سے کھلے دروازے تک پہنچ گئی۔ وہاں مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ دروازے میں داخل ہونے سے پہلے لمحہ بھر کو میں جھجکی اور پھر قدم بڑھا دیئے۔ اندر روشنی تھی۔ اس دباری سے گزر کر میں آگے بڑھی ہی تھی کہ عقب سے کنڈی لگائے جانے کی آواز سنی۔ یقیناً کسی نے اندر سے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو اپنے پیچھے مجھے وہی نوجوان نظر آیا جس کا تعاقب کرتی ہوئی وہاں تک آئی تھی۔ اس نوجوان کے لئے دروازہ کھولنے والا شاید اندر چلا گیا تھا اور وہ نوجوان وہیں رکا رہا تھا۔ دروازے کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہونا اس کے لئے کون سا مشکل تھا' میں رک گئی تھی۔

پہلی بار مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آشنائی کی چمک لہرائی اور وہ مجھ سے بنگلہ زبان میں مخاطب ہوا۔ "آپنی بھالو تو؟" یعنی میں ٹھیک تو ہوں؟

"بھالو۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آشن۔" وہ بولا' یعنی آیئے اور پھر مجھے ساتھ لئے ایک کمرے میں آ گیا۔ وہاں مونڈھے پڑے

تھے۔ "آپنی بوشن' امی چولم۔" یعنی آپ بیٹھئے میں چلتا ہوں۔

"تارپور کونور کم کاج تاچولبے؟" میں نے اس سے معنی خیز لہجے میں سوال کیا' یعنی پھر کیسے کام چلے گا؟

"آپنی اے کھن تھاکل۔" اس نے جواب دیا' یعنی آپ یہاں رکئے۔ پھر بتانے لگا کہ میرا پُراسرار خیرخواہ آنے ہی والا ہے۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ کمرے سے نکل گیا۔ بظاہر وہ عمارت ویران سی معلوم ہو رہی تھی جیسے وہاں کوئی نہ رہتا ہو۔ میں اکیلی اس کمرے میں بیٹھی یہ سوچ رہی تھی کہ آخر اتنی رازداری اور پُراسراریت کی کیا ضرورت تھی؟ اس طرح میرا خیرخواہ مجھے کیا تاثر دینا چاہتا ہے؟ کیا یہ کہ وہ کوئی عجیب اور پُراسرار شخصیت ہے؟ اور یہ کہ اس طرح میں اس سے مرعوب ہو جاؤں گی؟ مجموعی طور پر اس کا مجھ پر کوئی اچھا اثر مرتب نہیں ہوا' اس کے باوجود کہ میں اس شخص پہ اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کر چکی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اس سے ملاقات کے لئے وہاں آتی ہی نہیں۔ کہیں یہ بھی کوئی فریب ہی تو نہیں؟

ابھی میں انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ چونک اٹھی۔ کسی کے بھاری قدموں کی چاپ میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔ چند ہی لمحے بعد میں نے ایک وجیہہ نوجوان کو اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ ململ کا کرتہ اور پاجامہ زیب تن کئے ہوئے تھا۔ جسم متناسب اور رنگ کھلتا ہوا تھا' بالائی لب پر خوبصورتی سے ترشی ہوئی مونچھیں تھیں اور اس کا چہرہ کتابی تھا' آنکھیں بڑی بڑی خمار آلود سی تھیں۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کا تفصیلی جائزہ لے لیا۔

"معاف کیجئے گا معلبہ جی کہ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔" اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی شائستہ لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "میرا نام ارشاد حسین ہے۔ تفصیلی تعارف ابھی ہو جائے گا۔ میں نے ہی آپ کو ایک خیرخواہ کی حیثیت سے خطوط لکھے تھے اور خطرات سے آگاہ کیا تھا۔ آپ شاید کچھ کبیدہ خاطر لگتی ہیں؟" وہ میرے سامنے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"میں آپ کی ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے خطرات سے آگاہ کیا۔" میں نے جواب میں اسی کی طرح فصیح و بلیغ اردو میں جواب دیا۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے اس ملاقات کو اس قدر پُراسرار کیوں بنا دیا؟" جو بات میرے دل میں تھی' وہ زبان پر آ گئی۔ "اس طرح آپ نے پہلی ملاقات میں مجھ پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ میری صاف گوئی کو معاف کیجئے گا کیونکہ اس شہر میں آ کر میں کئی بار فریب کھا چکی ہوں۔ آپ میرے ساتھ مخلص ہیں' میں اس پر کیسے یقین کر لوں؟"

"آپ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ سب کچھ سوچنے اور کہنے میں حق بجانب ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ مومن کبھی ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے عقائد کیا ہیں اور نہ میں انہیں زیر بحث لانا چاہتا ہوں۔ عرض کرنا محض یہ ہے کہ جہاں تک میرے علم میں ہے' آپ کو بھی کبھی ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکا۔" وہ بلا جھجک بولے جا رہا تھا

اور میں اس کی بات پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ "آپ کے ذہن میں میری طرف سے جو شکوک و شبہات پیدا ہوئے ان کا سبب صرف یہ ہے کہ آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ اسی طرح میں بھی آپ کے متعلق محض چند باتوں سے باخبر ہوں۔ میں آپ سے اپنا نام تو عرض کر ہی چکا ہوں' بقیہ تعارف بھی کرائے دیتا ہوں۔ اس کے بعد شاید آپ میری طرف سے مطمئن ہو جائیں پھر انسپکٹر پرکاش کی طرح آپ کو مجھ سے کسی تحریری ثبوت کے طلب کرنے کی ضرورت غالباً پیش نہیں آئے گی۔ اس پر بھی اگر آپ مجھ پر بھروسہ نہ کریں تو میں شکایت نہیں کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ "اسے ملاحظہ کیجئے!"

میں نے اس سے وہ کارڈ لے لیا۔ کارڈ کی ایک جانب اس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ تصویر کے اوپر اور کارڈ کے کچھ حصے پر ربڑ کی مہر لگی تھی اور کسی نے اس پر انگریزی میں اپنے دستخط کئے تھے۔ نام کے خانے میں ارشاد حسین اور عہدے کے خانے میں سب انسپکٹر لکھا تھا۔ کارڈ کے اوپری حصے پر سینٹرل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ (سی آئی ڈی) جلی حروف میں چھپا ہوا تھا۔ کارڈ پر اس کے گھر کا پتہ بھی درج تھا۔ پتے کے مطابق اس کی سکونت مٹیا برج ہی کے ایک علاقے بج کل میں تھی۔ وہ کارڈ دیکھ کر لمحے بھر کو میں چکرا سی گئی۔

"تو آپ کا تعلق بھی پرکاش کی طرح خفیہ پولیس سے ہے؟" میں نے اسے کارڈ واپس کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔" اس نے اعتراف کیا۔ "یہ کارڈ دیکھ کر آپ کے ذہن میں موجود بہت سے سوالات کا جواب مل گیا ہو گا۔ مجھے بطور وضاحت صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر میرے دل میں کوئی کھوٹ ہوتا تو ہرگز یہ کارڈ آپ کو نہ دکھاتا۔ دوم یہ کہ میں نے دانستہ حکومت کے اس محکمے میں ملازمت حاصل کی ہے' اس کے باوجود میں' انگریز کا پالتو کتا نہیں ہوں۔ اس کے ثبوت بھی آئندہ آپ کو مل جائیں گے۔ فی الحال میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کو میری طرف سے اطمینان ہوا یا نہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ آپ آنے والے وقت پر چھوڑ دیجئے۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ "فی الوقت میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ یہ کارڈ دکھا کر آپ نے بڑی حد تک مجھے اپنے اعتماد میں لے لیا ہے۔ اس سے آپ کا مقصد کیا ہے' میں نہیں جانتی۔ ملاقات میں رازداری برتنے کی وجہ بھی اب میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ آپ مجھ سے مل کر اپنے افسران یا دوسرے اہل محکمہ کو اپنی طرف سے شکوک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔ اب میں یہ جاننا چاہوں گی کہ آپ کو میری ذات سے کیوں اور کس لئے دلچسپی ہے؟ آپ کی خیر خواہی کی وجہ کیا ہے؟ جبکہ آپ سے میری کوئی شناسائی بھی نہیں۔"

"جہاں تک مجھے یاد ہے' اپنے پہلے خط میں اس کی وجہ میں نے عرض کر دی تھی۔" وہ بولا۔ "اعلیٰ انگریز حکام کا آپ کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا' یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کوئی اہم شخصیت ہیں اور شاید مستقبل میں ان کے لئے کوئی خطرہ بن سکتی ہیں۔ آپ نے شاید وہ مقولہ سنا ہو کہ دشمن کا دشمن' دوست ثابت ہوتا ہے۔ انگریز حکمراں میری نظر میں آپ کے دوست نہیں ہو سکتے ورنہ وہ آپ کے متعلق

تشویش میں مبتلا نہ ہوتے۔ اسی خیال کے تحت میں نے آپ کو خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ پھر جب میرے علم میں یہ بات آئی کہ انسپکٹر پرکاش آپ کی ٹوہ میں ہے تو میرے آدمیوں نے یہ سراغ لگا لیا کہ وہ کیا کھیل' کھیل رہا ہے۔ مجھے اس پر مزید حیرت ہوئی کہ خود آپ دانستہ اس کے دام میں آ گئیں اور........."

"ذرا ٹھہریئے!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیا اس کی وجہ آپ کے علم میں نہیں آ سکی کہ ایسا کیوں ہوا؟ بقول آپ کے میں خود اس کے دام میں کیوں پھنس گئی؟"

"جی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "خود اپنی کوششوں سے اور اپنے آدمیوں کے ذریعے مجھے اتنا ہی علم ہو سکا کہ انسپکٹر پرکاش' میک اپ کے ذریعے اپنا اصل چہرہ چھپا کے آپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے' اس نے خود کو مسلمان ظاہر کیا ہے اور اپنا نام محی الدین بتایا ہے۔ میں کیونکہ خود اسی محکمے سے وابستہ ہوں اس لئے یہ علم بھی ہو گیا۔ محکمہ جاتی طور پر آپ کے معاملے میں انتہائی رازداری سے کام لیا جا رہا ہے اس لئے مجھے بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ پھر میں یہ معمہ حل کرنے میں بھی مصروف تھا کہ آپ خود انسپکٹر پرکاش کی طرف کیوں راغب ہوئیں؟ میرے آدمی آپ کی نگرانی کرتے رہے۔ مجھے ایک ہفتے کے دوران میں جو رپورٹس ملیں' ان سے اندازہ ہوا کہ پانی' سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ پرکاش آپ کو فریب دینے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ سو بڑی عجلت میں آپ کو میں نے ایک مختصر سا خط لکھ دیا اور دوسرے ہی روز اس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا۔ پہلے جو افراد آپ کی نگرانی پر مامور کئے گئے تھے' ان میں سے ہمارے محکمے کا ایک اے ایس آئی درگا پرشاد بھی تھا۔ یہ وہی تھا کہ ایک روز کالج اسٹریٹ میں آپ نے پبلک کے ہاتھوں جس کی درگت بنوا دی تھی۔ وہ فطرتاً بڑا کمینہ اور کینہ پرور ہے۔ اس نے اسے ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ ذاتی سطح پر محکمے میں اس کے جو دوست تھے' انہیں اس نے ساتھ لیا اور آپ کو ایک شام گھیر لیا۔ اس واقعے کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ اس وقت کہ جب اے ایس آئی درگا پرشاد کو معطل کر دیا گیا اور محکمے کے جن افراد نے ذاتی سطح پر اس کا ساتھ دیا تھا' ان سے جواب طلب کر لیا گیا۔ اسی کے بعد سے آپ کی نگرانی اٹھا لی گئی۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اب آپ کو کوئی خطرہ نہیں پھر جب تفصیلات کا علم ہوا کہ آپ نے کس طرح ان چاروں افراد کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا جنہوں نے آپ پر حملہ کیا تھا تو میرے دل کو مزید تقویت ہوئی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کیوں آپ نے خود کو اپنی کوٹھی تک محدود کر لیا۔ شاید دو مہینے تک آپ اپنی کوٹھی سے نکلی ہی نہیں۔ انسپکٹر پرکاش کوٹھی سے آپ کے نکلنے کا منتظر تھا۔ میں یہ دیکھنا اور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کس طرح آپ سے تعارف حاصل کرتا ہے اور کیسے اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ آپ کے بارے میں میرا قیاس یہ تھا کہ اس کے فریب میں نہیں آئیں گی۔"

"اور آپ کو میں نے مایوس کیا۔" میں پہلی بار مسکرائی۔ مجھے اب یقین ہو چلا تھا کہ ارشاد حسین ایک وطن پرست نوجوان ہے ورنہ وہ میری خاطر اتنا فکرمند نہ ہوتا۔ جو باتیں اس کے لئے معمہ تھیں' میں نے اس پر ظاہر نہیں کیں کہ اس طرح میری اصل شخصیت کا راز اس پر کھل جاتا۔ میں اسے احرس کے بارے میں کس طرح کچھ بتا سکتی تھی' نہ میں اسے یہ بتانے کی پوزیشن میں تھی کہ دو ماہ تک کیوں کوٹھی سے نہیں نکلی۔

میری بات کا جواب دیتے ہوئے ارشاد حسین کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ "میری اس مایوسی کو خود آپ ہی نے دور بھی تو کر دیا۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ خط لکھنے کے دوسرے ہی روز پرکاش جیسے دلیر اور ذہین شخص کا آپ کے ہاتھوں یہ حشر ہو گا۔ وہ تو کئی بار مجرموں .... میری مراد پیشہ ور مجرموں سے ہے .... ان کے نرغے سے بھی بچ کر نکل آیا تھا وہ۔ آپ کے اس کارنامے ہی نے آخرکار مجھے مجبور کر دیا کہ کھل کے سامنے آ جاؤں۔ اس سے پہلے میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ کیا تھا۔ آپ سے میری اس ملاقات میں ان کی مرضی بھی شامل ہے۔"

"آپ اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی کچھ بتائیں گے کہ وہ کون لوگ ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔ "میرے نزدیک ابھی اس کی نوبت نہیں آئی۔ اب آپ کچھ مجھے بھی تو پوچھنے دیں نا! ورنہ تو یہ ملاقات رائیگاں ہی جائے گی۔"

"آپ اپنے ساتھیوں کے متعلق کچھ بتاتے ہوئے کس لئے راز داری برت رہے ہیں؟"

"ایک عہد مانع ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے عہد شکنی پر مجبور نہیں کریں گی۔" اس نے جواب دیا۔

تقریباً ایسی ہی صورت حال سے خود میں بھی دوچار ہو چکی تھی۔ بعض اوقات آدمی کسی پر مکمل بھروسہ کرنے کے باوجود بھی اسے کوئی بات بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ کچھ معاملات میں انتہائی قربت کے باوجود احرس سے رازداری برتنا پڑی تھی۔ اس کے علاوہ نضار کو بھی میں نے پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں کی طرف آنے کی اصل وجہ نہیں بتائی تھی۔ کچھ باتیں یقیناً ایسی ہوتی ہیں جو آدمی کی اپنی ذات ہی تک محدود ہوتی ہیں۔ میں نے اسی لئے ارشاد حسین پر اس سلسلے میں مزید دباؤ نہیں ڈالا اور اس سے بولی۔ "آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں مجھ سے؟"

"ویسے تو سوالوں کا ایک سلسلہ ہے لیکن فی الحال چند باتوں کا جواب تو دے ہی دیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "یہ بھی میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہے' آپ مجھے شک کی نظر سے نہیں دیکھ رہیں۔ تو عرض کروں؟" اس نے اپنی خمار آلود آنکھیں جیب سے رومال نکال کے صاف کیں۔

"اگر آپ کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے میں بھی عہد شکنی کی مرتکب نہ ہوئی تو جواب ضرور دوں گی۔" میں معنی خیز لہجے میں بولی۔

وہ میری بات پر دھیرے سے ہنس کر کہنے لگا۔ "آپ نے خود میرے ہی الفاظ بڑی خوبصورتی سے مجھے لوٹا دیئے' خیر.......... کوئی سوال کرنے سے پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ اب تک اپنے ذرائع سے مجھے آپ کے متعلق کیا کیا معلوم ہو چکا ہے؟"

"ضرور بتایئے تاکہ میری معلومات میں بھی اضافہ ہو۔" میں نے اس پر فقرہ چست کیا۔ فقرے بازی کی یہ عادت احرس ہی کی دین تھی۔

"آپ تو خاصی زندہ دل بھی ہیں۔" وہ پھر ہنسا۔

"جی ارشاد ہو۔" میں نے اس کے نام کی رعایت سے فائدہ اٹھایا۔

"عرض کرتا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ نے اپنے بارے میں اب تک یہی ظاہر کیا ہے کہ آپ کا تعلق حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے ہے۔ معاف کیجئے گا' مجھے اس پر شک ہے۔ میرا پہلا سوال یہی ہے کہ اس افواہ میں کہاں تک صداقت ہے؟"

"آپ نے جب خود ہی اسے افواہ قرار دے دیا ہے تو پھر صداقت کی تلاش کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ کبھی کبھی کوئی افواہ درست بھی ثابت ہو جاتی ہے۔" اس نے برجستہ کہا۔

"تو پھر اس افواہ کو فی الحال درست ہی جانئے۔"

"فی الحال سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا آئندہ اس افواہ میں کسی تبدیلی کا امکان ہے؟"

"آپ کے اس سوال کا جواب دینے میں عہد شکنی کا خطرہ ہے' اس لئے معذرت!"

"گڈ۔" وہ مسکرایا۔ "سوال واپس' دوسرا سوال یہ کہ آپ کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟"

"کبھی کبھی ریس کھیل لیتی ہوں۔ مزید سوال؟"

"سوال ابھی تشنہ جواب ہے۔ ریس کھیل کر ہرگز اتنی آمدنی نہیں ہو سکتی کہ کوئی فرد پانچ افراد کو ملازم رکھ سکے۔ دوم یہ کہ اس عرصے میں آپ کو کبھی ریس کورس کا رخ کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ سوم یہ کہ.........."

"اب کے ادھر کا رخ کروں گی تو آپ کو بھی ساتھ لے لوں گی۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔

ابھی ارشاد حسین کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہی بنگالی ہندو نوجوان دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا جو مجھے لے کر وہاں آیا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا' اسے سن کر میرے بھی ہوش اڑ گئے۔ ارشاد حسین ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

☆======☆======☆

اس بنگالی ہندو نوجوان نے اطلاع دی تھی کہ میں جس عمارت میں تھی اسے پولیس نے گھیر لیا ہے۔ اچانک ارشاد حسین نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "آپ میرے ساتھ آیئے۔" پھر وہ اپنے دوست یا ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں' اسلحہ یہاں سے کل ہی ہٹا دیا گیا تھا۔ ہمارے بعد تم بھی یہاں سے نکل جانا' علی احمد سے کہنا یہیں رہے۔"

اس کے بعد ارشاد حسین میرا ہاتھ تھامے اسی کمرے سے ملحق برابر والے کمرے میں آ گیا اور اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک الماری رکھی تھی۔ وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔ لکڑی کی وہ قد آدم الماری غالباً خالی تھی۔ ارشاد حسین اسی لئے الماری کو باآسانی اس کی جگہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اس کی حرکات و سکنات کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ الماری کے ہٹتے ہی مجھے ایک دروازہ نظر آ گیا جو اندر کی طرف کھلتا تھا۔ ارشاد حسین نے میری طرف مڑ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور دروازہ کھول لیا۔ دروازے کے باہر نیم تاریکی سی نظر آ رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر دروازے تک

پہنچ گئی۔ ارشاد حسین نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ اس عمارت سے نکلنے کا ایک خفیہ راستہ تھا۔ کسی ایسے ہی آڑے وقت پر اسے استعمال کیا جاتا ہو گا۔ گزشتہ روز تک اس عمارت میں اسلحہ بھی تھا' یہ اطلاع بھی میرے لئے معنی خیز تھی مگر یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ ارشاد حسین نے باہر نکلتے ہی دروازہ بھیڑ دیا تھا۔

"ذرا چوکنا رہئے گا' ادھر بھی پالتو کتے ہو سکتے ہیں۔" ارشاد حسین نے سرگوشی کی۔

پیڑوں کا وہ ایک جھنڈ تھا جہاں میں ارشاد حسین کے ساتھ کھڑی تھی۔ عمارت سے نکل کر ہم اسی جھنڈ میں پہنچے تھے۔ یہ اس عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ ارشاد حسین مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھا اور پھر چند ہی قدم چل کر رک گیا۔ وہ کوئی باغ معلوم ہوتا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے اس کے قریب پہنچ کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

"وہ ادھر بھی موجود ہیں۔" اس نے بتایا۔ ارشاد حسین کے لہجے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے بھی کچھ آگے بڑھ کر درختوں کے درمیان سے جھانکا' کچھ ہی فاصلے پر دو مسلح باوردی پولیس والے مجھے کھڑے دکھائی دیئے۔ وہ دونوں اسی جھنڈ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عمارت کے عقبی حصے کو بھی انہوں نے نظرانداز نہیں کیا تھا۔ انہیں شاید اس عمارت کے خفیہ عقبی دروازے کا علم نہیں تھا ورنہ جھنڈ میں گھس کر دروازے تک پہنچ گئے ہوتے۔ یہ محض احتیاطی تدبیر لگتی تھی کہ کوئی شخص عقبی سمت سے فرار نہ ہو سکے۔

سورج اب ڈوب چکا تھا اور دھیرے دھیرے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں' ارشاد حسین کے ساتھ نہ ہوتی تو وہ شاید فکرمند نہ ہوتا۔ اس کا تعلق تو خود خفیہ پولیس سے تھا۔ اس کے پاس محکمے سے جاری کردہ شناختی کارڈ بھی تھا۔ پھر اسے پولیس والوں سے کیا خوف ہوتا؟

وہ کوئی پرانا اور متروک باغ معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہاں ان دونوں پولیس والوں کے سوا کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ جگہ جگہ کوڑا کرکٹ اور جھاڑ جھنکار بھی دکھائی دے رہا تھا۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ اس جھنڈ سے نکل کر پولیس والوں کی نظروں میں آئے بغیر کسی طرف جانا ناممکن تھا۔ وہیں چھپے رہ کر تاریکی پھیلنے کا انتظار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پولیس اس عمارت میں داخل ہو کر جلد ہی عقبی خفیہ دروازے کا سراغ لگا لیتی پھر ہم ہر دو طرف سے گھر کے رہ جاتے۔ میرے ذہن نے جلد ہی صورت حال کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا۔ اب صرف ایک ہی راستہ تھا اور میں اسی پر عمل کرنے والی تھی۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" ارشاد حسین کی سرسراتی ہوئی سی آواز میں نے سنی۔

"دیکھتے جائیں' آپ کو میں نے اس مشکل میں پھنسایا ہے تو اس سے نکالنا بھی میری ہی ذمے داری ہے۔" میں نے جھک کر دوسرا پتھر اٹھا لیا۔ ایک پتھر میں پہلے ہی اٹھا چکی تھی۔

"آپ .... آپ اس کی ذمے دار نہیں ہیں۔ خطرے کی بو پرسوں ہی ہم نے سونگھ لی تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی .... ارے ارے!"

پھر ارشاد حسین "ارے ارے" ہی کرتا رہ گیا اور مجھے جو کچھ کرنا تھا کر گزری۔ مجھے اپنے نشانے پر بھروسہ تھا۔ چند لمحوں کے فرق سے میرے پھینکے ہوئے پتھر یکے بعد دیگرے ان دونوں پولیس والوں کی کنپٹیوں پر پڑے اور وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گئے۔

"کمال ہے!" ارشاد حسین کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"نکل چلیں اب یہاں سے۔" میں بولی۔

ذرا ہی دیر بعد ہم اس پرانے باغ سے نکل کر مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے نہ جانے کدھر نکل آئے۔

"یہ کون سا علاقہ ہے؟" میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میری حیرت کا سبب چیتے کا ایک بچہ تھا جو ایک دکان کے سامنے لوہے کی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔

"ہم چڑی ماروں کے محلے سے گزر رہے ہیں۔" ارشاد حسین نے جواب دیا۔ اس کی آواز دھیمی تھی اور جواب بھی میری طرف دیکھ کر نہیں دیا تھا۔ وہ اس طرح میرے ساتھ چل رہا تھا جیسے کوئی راہ گیر ہو۔ میں اس احتیاط کا سبب سمجھ رہی تھی۔

پھر ارشاد حسین نے مجھے اس علاقے کے بارے میں مزید بتایا کہ نواب واجد علی شاہ کے زمانے ہی سے وہاں چڑی ماروں کی آبادی تھی۔ وہاں ہندوستان کے مختلف حصوں کے لوگ آباد تھے۔ یہ لوگ معمولی پرندوں سے لے کر ہر طرح کے جانور' یہاں تک کہ درندوں کے بچے بھی پالتے اور فروخت کرتے تھے۔ اس کے بعد نہ ارشاد حسین کچھ بولا نہ میں نے اس سے کچھ دریافت کیا۔ میری اور اس کی گفتگو ادھوری ہی رہ گئی تھی اس لئے وہ مجھے اپنے ایک اور ٹھکانے پر لے آیا۔

وہ علاقہ دھان کھیتی کہلاتا تھا۔ مدرسہ اسلامیہ کے عقب میں ایک گلی کے اندر وہ چھوٹا سا مکان تھا۔ اس مکان میں میرے اور ارشاد حسین کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ مکان کا مقفل دروازہ اشاد حسین نے میرے ہی سامنے کھولا تھا۔ اس مکان میں دو کمرے اور ایک صحن تھا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے آیا اور لالٹین جلا کر ایک طرف رکھ دی۔

"یہ جگہ قطعی محفوظ ہے' آپ اطمینان سے بیٹھیں۔ میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔" ارشاد حسین بولا۔ "باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

"تکلف کی کیا ضرورت ہے' بیٹھئے آپ۔" میں نے کہا۔

"مہمان داری کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور میں بہرحال خود کو بداخلاق کہلوانا نہیں چاہتا۔" اس کی خوش مزاجی لوٹ آئی تھی۔

وہ چلا گیا اور کچھ دیر بعد دو پیالیوں میں چائے بنا کر لے آیا۔ میں جس کمرے میں تھی' وہ نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہاں کرسیوں اور مونڈھوں کے علاوہ ایک طرف دیوار سے لگا چھوٹا سا تخت بھی بچھا ہوا تھا جس پر چاندنی بچھی تھی اور دیوار سے دو گاؤ تکیے لگے ہوئے رکھے تھے۔

"معلوم نہیں' چائے کیسی بنی ہو گی! آپ کو پسند بھی آئے گی یا نہیں!" وہ میرے مقابل ایک کرسی

پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ مجھے وہ چائے کی پیالی دے چکا تھا۔

میں نے چائے کی چسکی لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ خاصے گھر گرہست قسم کے مرد لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کھانا وغیرہ بھی پکا لیتے ہوں گے۔"

"خیر اب اتنا بھی گھر گرہست نہیں ہوں۔" وہ ہنس دیا' پھر بولا۔ "ہاں تو ہماری گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ آپ کا ذریعہ معاش ریس کھیلنا ہے۔"

"اور آپ نے اس پر یقین نہیں کیا تھا اس لئے کہ آپ کے ساتھیوں نے مجھے ریس کورس میں نہیں دیکھا اور یہ کہ ریس کھیل کر اتنی آمدنی نہیں ہو سکتی کہ میں پُر آسائش زندگی گزار سکوں۔ اس پر میں نے کسی روز آپ کو ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی اور پھر اس سے پہلے کہ آپ میری دعوت قبول یا رد کرتے' پولیس چھاپہ پڑ گیا تھا۔ یہ ارشاد فرمایئے کہ اسلحہ کا کیا چکر ہے؟ کیا آپ اور آپ کے ساتھی' انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"یہ تو آپ ایک بار پھر میرا ہی انٹرویو لینے لگیں۔" وہ مسکرایا۔

"اگر کوئی عذر مانع ہو تو مجھے جواب نہیں چاہئے۔" میں نے اسے رعایت دی۔

"یہ باتیں وقت آنے پر خود آپ کے علم میں آجائیں گی۔"

"اور ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے نا!"

"آ بھی سکتا ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "اس کا انحصار آپ کی رضامندی پر ہے۔"

"کیسی رضامندی؟"

"انگریزوں کے خلاف آپ ہمارا ساتھ دے سکتی ہیں یا نہیں؟"

"میں اگر آپ کے سوال کا جواب رضامندی کی صورت میں بھی دوں تو شاید اس سے آپ لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" میں بولی۔

"یہ آپ نے کس طرح سمجھ لیا؟"

"ہر فرد اپنے بارے میں بہتر طور پر جان سکتا ہے۔ مجھے اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں۔"

"مگر مجھے اور میرے ساتھیوں کو یقین ہے کہ آپ ہمارے لئے بہت کار آمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس کا براہ راست تجربہ خود مجھے کچھ دیر پہلے ہو چکا ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور اس طرح پھنس گیا ہوتا تو اتنی آسانی سے نہ بچ نکلتا۔"

"تو آپ لوگ مجھے پھنسوانا چاہتے ہیں!" میں نے ہنس کر کہا۔ پھر اسی وقت مجھے ایک خیال آیا۔ ارشاد حسین کا تعلق خفیہ پولیس کے محکمے سے تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بھی میرے لئے کار آمد ہو سکتا تھا۔ یہی سوچ کر اپنی بات کے جواب سے پہلے میں پھر بول اٹھی۔ "میک اپ کرنا تو آتا ہو گا آپ کو؟ میری مراد بھیس بدلنے سے ہے۔"

"جی ہاں' میں نے اس کی تربیت لی ہے۔"

"مجھے سکھا سکتے ہیں آپ؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"اس میں وقت لگے گا خاصا' مگر آپ کیوں سیکھنا چاہتی ہیں؟"

"آپ کے محکمے کی کرم فرمائیوں سے بچنے کے لئے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اگر رضامندی کا اظہار کر دیتیں تو شاید میں بھی آپ کو یہی مشورہ دیتا' مگر اس وقت جب مجھے اپنے سوالوں کے جواب مل جاتے۔"

"ان سوالوں کو اب صبر ہی کر لیں تو بہتر ہے کیونکہ میں فی الحال جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"پھر تو آپ کی رضامندی بھی ہمارے لئے بے معنی ہے۔" اس کا لہجہ بجھ سا گیا۔

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم کسی کو بھی اس وقت تک اپنا ساتھی نہیں بناتے جب تک اس کے متعلق ہمیں سب کچھ معلوم نہ ہو۔"

"پھر تو مجبوری ہے۔ ہرچند کہ میرا اور آپ کا دشمن ایک ہے' مگر ہم ایک نہیں ہو سکتے۔" میں نے کہا۔ "بہرحال میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے خطرات سے آگاہ کیا۔ اب میں اجازت چاہوں گی۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آخر آپ اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے اتنی رازداری سے کیوں کام لے رہی ہیں؟"

"اس لئے کہ مجھے خود بھی اپنے متعلق علم نہیں کہ میں کون ہوں۔ یہ بات پہلے میں نے اس لئے نہیں بتائی کہ شاید آپ میری بات کا یقین نہ کرتے۔"

"آپ بہت عجیب سی بات کہہ رہی ہیں' عجیب اور ناقابل یقین۔ میری صاف گوئی کو معاف کر دیجئے گا۔"

"آپ کے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن حقیقت وہی ہے جو میں عرض کر چکی ہوں۔"

"میں آپ کی بات سے صرف یہی نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں کہ کسی سبب اپنے متعلق کچھ بتانے سے گریز کر رہی ہیں۔"

"اگر اسی طرح آپ مطمئن ہو سکتے ہیں تو پھر یہی سہی۔"

"مجھے اعتراف ہے کہ آپ کی شخصیت نے مجھے متاثر کیا ہے۔ ذاتی سطح پر اگر میں آپ کے کسی کام آسکا تو مجھے خوشی ہو گی۔ مثلاً آپ نے میک اپ سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے تو میں اس خواہش کا احترام کر سکتا ہوں' مگر اس کے لئے آپ کو خود ہی زحمت کرنا پڑے گی۔"

"یعنی .... کیا مجھے یہاں آنا پڑے گا؟"

"نہیں۔" وہ جواب میں بولا۔ "یہاں کیوں کہ میرا گھر بھی ہے اس لئے یہ مناسب نہیں رہے گا۔"

"پھر........... پھر کہاں؟"

"معلوم نہیں' آپ نے وہ علاقہ دیکھا بھی ہو گا یا نہیں؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا' پھر خود ہی ذرا توقف کے بعد بولا۔ "یہ ہو سکتا ہے' انیل چودھری وہاں تک ایک مرتبہ آپ کی رہنمائی کر دے۔ انیل چودھری وہی میرا بنگالی ہندو دوست ہے جس کے تعاقب میں آپ یہاں تک پہنچی تھیں۔"

"تو پھر کب آپ سے ملاقات ہو سکے گی؟" میں نے دریافت کیا۔

میرا سوال سن کر کچھ دیر وہ خاموش رہا' پھر بتایا۔ "پرسوں شام پانچ اور چھ کے درمیان انیل چودھری آپ کو آج ہی کی طرح ایڈن گارڈن میں مل جائے گا۔"

"اور مجھے اس کا تعاقب کرنا ہو گا۔"

"جی ہاں۔"

"کہاں تک؟"

"فی الحال یہ نہ پوچھیں اس لئے کہ ابھی اس سلسلے میں کچھ سوچا نہیں۔"

"میں سمجھی کہ شاید ابھی تک آپ نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا۔"

"ایسا نہیں۔" وہ خاصی دیر کے بعد مسکرایا۔ "اگر بھروسہ نہ ہوتا تو ملنے کا وعدہ ہی کیوں کرتا۔"

اس وقت تک میں چائے پی چکی تھی۔ "اب میں چلوں؟" میں نے چائے کا کپ دوسری قریبی کرسی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے لئے غالباً یہ علاقہ نیا ہے اس لئے بس اسٹاپ تک میرا تعاقب کرنا ہو گا۔"

"منظور ہے۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں آپ نے کچھ تو منظور کیا۔" وہ آہستہ سے ہنسا اور میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

☆======☆======☆

مٹیا برج سے دھرم تلے واپس آتے ہوئے میں' ارشاد حسین ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کا کھرا پن مجھے پسند آیا تھا۔ اس نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی تھی جو اس کے دل میں تھا' وہی زبان پر تھا۔ کم از کم میں نے یہی محسوس کیا تھا۔

ارشاد حسین سے گفتگو کرتے ہوئے میرے ذہن میں کچھ نئی باتیں آئی تھیں۔ مجھ سے جو بنیادی غلطی ہو گئی تھی' میک اپ کے ذریعے میری دانست میں اس کا ازالہ ممکن تھا۔ اپنے چہرے کی تبدیلی کے بعد میں ایک نئے نام سے اس شہر میں بود و باش اختیار کر سکتی تھی۔ نیک روح عظیم مہیمن کی کاہن۔ خیر! مجھے اس شہر تک لے کر آئی تھی تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی۔ میں اسی لئے فوری طور پر کلکتے سے کہیں اور جانے کے حق میں نہیں تھی' اگر جاتی بھی تو کہاں اور کیوں؟ میرا دشمن ثریان ہندوستان کے کس شہر میں تھا؟ اگر مجھے اس سوال کا جواب مل جاتا تو وہ شہر چھوڑنے کا کوئی جواز بھی تھا۔ اس سے قطع نظر میں' بڑے مہاراج کو بھی نہیں بھولی تھی۔ وہ کون تھا اور مجھے کیوں چند روز بعد اپنے پاس بلانا چاہتا تھا؟ اس کا کیا مقصد تھا؟ یہ سوالات ابھی تک تشنہ جواب تھے۔ اسی کے ساتھ بڑے مہاراج کے ایک چیلے شمبھو کو بھی میں سبق دینا چاہتی تھی۔ جس نے خاصے عرصے تک مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا رکھا تھا۔ یہ

موقع مجھے اسی شہر میں رہ کر مل سکتا تھا۔

کوٹھی سے روانگی کے وقت میں بطور احتیاط یہ کہہ گئی تھی کہ واپسی میں مجھے دیر بھی ہو سکتی ہے۔ میں جب واپس پہنچی تو اسی لئے شہزاد فکرمند نہیں تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے اور میری ہدایت کے مطابق تمام ملازمین کھانا کھا چکے تھے البتہ شہزاد نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میں لباس تبدیل کر کے اپنے کمرے سے باہر آ رہی تھی۔ شہزاد' رحیم سے اپنے لئے کھانا لگانے کو بھی کہہ رہا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے شہزاد سے کہا۔ "تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

"مجھے اس وقت بھوک نہیں تھی خاتون!" شہزاد نظریں چرا کر بولا۔

"اور اب لگ آئی؟" میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"اب بھی کوئی خاص بھوک تو خیر نہیں لگ رہی لیکن آپ .... آپ کھا رہی ہیں تو میں بھی کھا لیتا ہوں۔ رحیم کو فرصت مل جائے گی۔"

شہزاد کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں کھانا کھاتے ہوئے سوچنے لگی کہ اگر میں نے ایک نئے نام سے ازسرنو اس شہر میں سکونت اختیار کی تو میرے یہ ملازمین کہاں جائیں گے؟ خصوصاً شیتل اور شہزاد کی طرف سے میں زیادہ فکرمند تھی۔ وہ دونوں ہی مجھ سے محبت کرتے تھے پھر مجھے نفار اور احرس کا خیال آیا۔ ایک خاص مقصد کے حصول کی خاطر جب میں نے ان دونوں کی جدائی کو برداشت کر لیا تھا تو پھر شہزاد اور شیتل کے بچھڑ جانے کا کیا غم۔ فرق اگر تھا تو صرف ان کی حیثیتوں اور حالات کا تھا۔

اس رات کو میں سونے کے لئے بستر پر لیٹی تو مستقبل کے سوچ بچار نے میری نیند اڑا دی۔ نئے سرے سے اس شہر میں زندگی بسر کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ مستقل سکونت کے لئے پھر سے کوئی جگہ تلاش کرنا پڑتی۔ اس کوٹھی سے کہیں اور سامان کی منتقلی بھی ایک مسئلہ تھا۔ تمام سامان میں سب سے زیادہ عزیز مجھے میری کتابیں تھیں جو میں نے بڑی مشکل سے جمع کی تھیں۔ کتابوں سے مجھے اب محبت سی ہو گئی تھی۔ یہی کتابیں تو تھیں جنہوں نے مجھ پر زندگی کے نئے راز کھولے تھے' مجھے آگہی کی نئی دنیاؤں کا سفر کرایا تھا۔ میرے پاس اتنی رقم بہرحال تھی کہ میں اپنی سکونت کے لئے کوئی اور کوٹھی یا مکان خرید لیتی' مگر اس کے لئے شہزاد کو اعتماد میں لینا ضروری تھا کیونکہ یہ کوٹھی بھی تو بیچنا ہی تھی۔ دیر تک میں انہی خیالات میں کھوئی رہی اور پھر آئندہ روز کے لئے کچھ فیصلے کر کے میں سو گئی۔

☆======☆======☆

معلوم نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ مجھے اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہوا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں اپنی خواب گاہ میں ہلکا نیلا بلب جلا کر سوئی تھی' مگر اس وقت اندھیرا تھا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ میں نے اٹھنا چاہا تو میرے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ اسی کے ساتھ میرے اندر اندھیرے میں دیکھنے کی قوت بیدار ہو گئی اور میں چونک اٹھی۔ وہ میری خواب گاہ نہیں ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی

جس کے اندر میں ایک چارپائی سے بندھی پڑی تھی۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ دم گھٹنے کا احساس اب کم ہو چکا تھا لیکن میں چکرا کے رہ گئی تھی۔ میں اپنی خواب گاہ میں سوئی تھی تو پھر وہاں کیسے پہنچ گئی؟ مجھے اس جگہ کون اور کس طرح لایا؟ سوتے سوتے آخر میرا دم کیوں گھٹنے لگا تھا؟ اور یہ کہ میری آنکھ پہلے کیوں نہیں کھلی؟ کیا مجھے بے ہوش کر دیا تھا؟ میرے ذہن میں متعدد سوالات گردش کرنے لگے۔ میں اس کوٹھری کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی ایک دیوار میں چھوٹا سا روشندان بھی نظر آ رہا تھا جس سے کسی صورت باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ ایک تو وہ روشندان بہت چھوٹا تھا' پھر اس کے درمیان لوہے کی ایک سلاخ لگی ہوئی تھی۔

"جے دیوی مائی!" اچانک میری سماعت سے شمبھو کی آشنا آواز ٹکرائی۔ "تجھے میں نے جگایا ہے دیوی! ورنہ تُو سوتی ہی رہتی۔" اس وقت جانے کیوں وہ دقیق قسم کی ہندی بولنے سے گریز کر رہا تھا۔ کوٹھری میں میرے سوا کوئی نہیں تھا' مگر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شیطان صفت سادھو میرے سامنے ہی کھڑا مجھ سے بات کر رہا ہو۔ "دیوی! تیری خاطر بڑا کشٹ بھوگا ہے پرنتو جی نہیں ہارا۔ جیسے ہی میری سزا پوری ہو گئی' میں تجھے یہاں اٹھا لیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو تین روز کے بعد بڑے مہاراج تجھے اپنے چرنوں میں بلا لیتے اور پھر میں پیاسا کا پیاسا رہ جاتا۔ یہ میری سوبھاگیہ (خوش قسمتی) ہے کہ بڑے مہاراج بردوان گئے ہیں اور پرسوں لوٹیں گے۔ تب تک کے لئے تُو میری مہمان رہے گی۔ اس کے بعد میں یہ شہر ہی چھوڑ جاؤں گا' پر اکیلے نہیں' تُو بھی جوگن بنی میرے ساتھ ہو گی۔ یہاں رہا تو بڑے مہاراج مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میرا انتظار کر دیوی! میں بہت جلد تیرے پاس آ رہا ہوں۔ اپنے اس پریم پجاری کو پریم کی بھکشا (بھیک) ضرور دینا دیوی!" ان الفاظ کے ساتھ ہی شمبھو کی آواز معدوم ہو گئی۔

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ سارے جسم میں شعلے سے لپکنے لگے اور میں نے اپنے اندر بلا کی قوت محسوس کی۔ میرے وجود میں خوابیدہ ایک اور پُراسرار قوت بیدار ہو چکی تھی جس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا۔

پھر میں نے ایک ہی جھٹکے میں اپنے جسم سے لپٹی ہوئی مضبوط رسیاں توڑ دیں اور اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے کوٹھری کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ ایک روشن حصار میرے گرد قائم ہو گیا۔ مجھے اپنا وجود اس حصار میں گردش کرتا محسوس ہوا اور میں چکرا کر فرش پر گر پڑی۔ میرے وجود میں بھڑکتے ہوئے شعلے ایک دم سرد ہو گئے تھے۔ شمبھو یقیناً میری طرف سے غافل نہیں تھا ورنہ شاید میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتی۔

"تُو اپنے پجاری کو چھوڑ کر کہاں جا رہی تھی' دیوی مائی!" شمبھو کی آواز میں نے پھر سنی۔ میرے خیال کی تصدیق ہو گئی تھی۔ میرے گرد قائم ہونے والا روشن حصار اسی کی شیطانی قوتوں کا کمال معلوم ہوتا تھا۔

"کمینے! تُو شاید اس طرح یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے بے بس کر دے گا۔" میں پوری قوت سے چیخ اٹھی۔

جواب میں وہ زور سے ہنسا اور پھر چند ہی لمحے بعد کوٹھری کا دروازہ کھل گیا۔ شمبھو ایک لالٹین لئے

اندر داخل ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی سرخ سرخ آنکھوں کی جگہ انگارے سے دہکتے دکھائی دے رہے تھے۔

"ارے ارے! یہ تُو یہاں زمین پر کیوں پڑی ہے دیوی! اٹھ اور کھاٹ پر لیٹ جا ورنہ تیرا نازک جسم دکھ جائے گا۔" اس کے سیاہ بھدے اور موٹے ہونٹ ہلے پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے میرے اوپر نظر گاڑ دی۔

میرا جسم جیسے خود بخود فضا میں بلند ہوتا گیا اور پھر چارپائی پر آ رہا۔ روشن حصار اب بھی موجود تھا۔

"دیکھ شمبھو! تُو مجھے اپنے یہ کرتب دکھا کر ہرگز مرعوب نہیں کر سکتا۔" میں حقارت بھرے لہجے میں بولی۔

اس نے لالٹین فرش پر رکھ دی اور کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور میری طرف پلٹا۔

"دیوی!" اس نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "یہ تو بتا دے کہ تُو اپنے اس پجاری سے اتنی ناراض کیوں ہے؟ دیکھ لے کہ تیری خاطر میں تیری ہی زبان میں بات کر رہا ہوں۔"

اس کی تیز نظریں مجھے اپنے جسم میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھ آیا۔ میں نے خاص طور پر ایک بات محسوس کی کہ وہ روشن حصار سے دور ہی دور رہنا چاہتا تھا۔ جب وہ کوٹھری میں داخل ہوا تھا' اس وقت بھی حصار سے دور ہی رک گیا تھا۔ اپنے اس خیال کی تصدیق کے لئے میں نے اس سے کہا۔ "قریب آنے سے کیوں ڈر رہا ہے؟"

"اس لئے دیوی کہ اس حصار میں تجھے میں نے ہی قید کیا ہے۔ نہ تُو اس سے باہر آ سکتی ہے نہ میں اس میں داخل ہو سکتا ہوں۔ اگر میں نے یہ غلطی کی تو جل جاؤں گا۔ سو میں جل گیا تو پھر تجھے کون جلائے گا۔ مجھے خبر ہے کہ تُو میری صورت ہی سے جلتی ہے' جانے کیوں؟"

شمبھو سے یہ سن کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ حصار کی موجودگی میں وہ میرے قریب نہیں آ سکتا۔ میں اگر مجبور تھی تو وہ بھی پوری طرح مختار نہیں تھا کہ اپنی من مانی کر سکتا۔ وہ مجھ سے کیا چاہتا تھا' اس کی غیر شائستہ اور نازیبا حرکتوں سے میں پہلے ہی جان چکی تھی۔

"میں اگر چاہوں دیوی! تو یہ حصار تنگ ہوتے ہوتے تیرے شریر (جسم) کو چھو لے' پر میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ پلک جھپکتے تیرا یہ سندر بدن جل کر راکھ بن جائے گا۔ سو دیوی' ایسا کر کہ راضی ہو جا' یہ تیرے ہی فائدے کی بات ہے ورنہ ایک بار تُو بڑے مہاراج کے ہتھے چڑھ گئی تو جیون بھر تجھے انہی کی داسی بن کر رہنا پڑے گا۔ تُو اپنا آپ بھول جائے گی۔ تجھے یاد ہی نہیں رہے گا کہ تُو کون تھی۔"

جسم شل ہونے کے باوجود میرے پانچوں حواس کام کر رہے تھے۔ میں بولنے پر بھی قادر تھی اور سن بھی رہی تھی۔ اس کے علاوہ میرا ذہن بھی پوری طرح کام کر رہا تھا۔ میرے حصول کی خاطر یقیناً شمبھو' بڑے مہاراج سے بغاوت پر آمادہ ہو گیا تھا میں اس سے فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مرد چاہے کتنا ہی عیار کیوں نہ ہو' عورت اگر چاہے تو اسے شیشے میں اتار سکتی ہے۔ مجھے شمبھو اور اپنی مجبوری کا احساس ہو گیا تھا۔ شمبھو کی مجبوری یہ تھی کہ وہ میری آمادگی کے بغیر قریب نہیں آ سکتا تھا۔ میری آمادگی کے بعد ہی وہ حصار ختم کرتا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ اس حصار میں قید ہونے کے بعد میرے اندر

چھپی ہوئی حیرت انگیز پُراسرار قوتیں وقتی طور پر کار آمد نہیں رہی تھیں۔ وہ حصار میرے گرد اسی غرض سے کھینچا بھی گیا تھا۔ میرے خیال میں درمیانی کڑی ہونے کے باوجود شمبھو بہت کچھ جانتا تھا۔ اگر میں اسے کسی طرح شیشے میں اتار کر اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتی تو مجھے بہت سے سوالوں کے جواب مل سکتے تھے۔ ان تمام سوالوں میں سب سے اہم سوال ژیان کے بارے میں تھا۔ مجھے فریب نظر میں مبتلا کرنے کے لئے آخر اس نے میرے دشمن ہی کا چہرہ کیوں دکھایا تھا؟ شمبھو یقیناً اس سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ مجھے راہ پر لانے کے لئے اب وہ دھمکیوں پر اتر آیا تھا لیکن میں پُریقین تھی کہ وہ ان دھمکیوں پر ہرگز عمل نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود میں نے مصلحتاً اپنا رویہ بدل دیا۔

"شمبھو! کیا تو واقعی میرا پجاری ہے؟" میں نے اسے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔ اب میرا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

اس نے چونک کر یوں میری طرف دیکھا جیسے جو کچھ سنا ہے اس پر یقین نہ ہو۔

"بول نا شمبھو! آخر چپ کیوں ہے؟" میرے لہجے میں مٹھاس تھی۔

"ہاں .... ہاں دیوی! میں .... میں تجھے چاہتا ہوں۔ اتنا کہ .... کہ اپنے گرو کی بھی میں نے پرواہ نہیں کی۔" اس کے موٹے سیاہ ہونٹ جیسے خود بخود ہلنے لگے۔

"پھر تو مجھے جلا ڈالنے کی دھمکیاں کیوں دے رہا تھا؟ کیا یہی تیری چاہت ہے؟"

"میں اور کہتا بھی کیا دیوی کہ تو کسی طرح پگھل ہی نہیں رہی تھی اور .... اور اب بھی مجھے وشواس (یقین) نہیں کہ تُو بدل گئی ہے۔"

"تو پھر تجھے کس طرح میری بات کا یقین آئے گا؟ بول۔"

میری بات سن کر وہ کچھ دیر چپ رہا۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا پھر میں نے اسے شیطانی انداز میں مسکراتے دیکھا۔ اس نے غالباً کوئی راہ نکال ہی لی تھی۔

"سن دیوی!" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "بظاہر تجھے یہ صرف ایک ہی حصار دکھائی دے رہا ہے پرنتو ایسا نہیں ہے۔"

بے اختیار میری نگاہ چمکیلے حصار پر جم گئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو ایک ہی حصار میں مجھے کئی رنگ نظر آئے' سرخ' سبز اور سیاہ۔

"یہ تین حصار ہیں۔ سرخ حصار تجھے باہر نہیں نکلنے دے گا۔ تُو نے اگر یہ کوشش کی بھی تو خود ہی اپنی موت کو دعوت دے گی۔" وہ بتانے لگا۔ "اور سیاہ حصار تیرے اندر موجود پُراسرار قوتوں کو بیدار نہیں ہونے دے گا اور یہ جو تُو سبز حصار دیکھ رہی ہے' اس نے تیرے جسم کو شل بنا رکھا ہے۔ سو میں اسے اٹھا سکتا ہوں۔"

"مگر اس سے مجھے کیا فائدہ شمبھو؟ میں تو پھر بھی تیرے کھینچے ہوئے دو حصاروں کی قید میں رہوں گی۔"

"اس حصار کو اٹھا کر مجھے تیرے سچ اور جھوٹ کا اندازہ ہو جائے گا۔" اس کے ہونٹوں پر اب بھی

شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جس کی وجہ سمجھنے سے میں قاصر تھی۔

"وہ کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا' دیکھتی رہ دیوی!" یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ حصار کی طرف کئے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا جو میری سمجھ میں نہ آ سکا۔

چند ہی لمحے بعد مجھے اپنے جسم سے کوئی بوجھ سا ہٹتا محسوس ہوا۔ سبز حصار غائب ہو چکا تھا۔

"ہاں میری دیوی!" شمبھو نے سسکاری سی بھری۔ "بول تو کیا کہہ رہی تھی؟"

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ٹوٹی ہوئی رسیاں میرے اردگرد پڑی تھیں۔ اب میں اپنے جسم کو حرکت دینے پر قادر تھی۔

"پہلے میں تجھ سے کچھ سوالات کرنا چاہتی ہوں۔" میں سنبھل کر بولی۔ "یہ بتا کہ تُو مجھے یہاں کس طرح اٹھا کے لے آیا؟ کیا تُو نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا؟"

"بس تجھے یہی پوچھنا ہے دیوی!" وہ ہنس دیا۔ "ظاہری بات ہے کہ اگر بے ہوش نہ کرتا تو تیری آنکھ نہ کھل جاتی!"

"یہ کون سا علاقہ ہے؟" میں فی الحال دانستہ ایسے سوال کر رہی تھی کہ اسے جواب دینے میں اعتراض نہ ہو۔

"یہ کالی گھاٹ ہے اور یہاں تُو پہلے بھی آ چکی ہے' ان دنوں جب تُو مندروں کے چکر کاٹ رہی تھی' پر یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ مجھے یہ بتا کہ تُو راضی بھی ہے یا نہیں؟" یہ کہتے ہوئے اس نے بڑی ندیدی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

جواب میں شرما کر میں نے نظریں جھکا لیں۔ اسے فریب دینے کا صرف یہی ایک راستہ تھا۔ میرے قریب آنے کے لئے اسے بقیہ دونوں حصار بھی اٹھانا پڑتے اور پھر میرا مقصد پورا ہو جاتا۔ وہ میرے مقابلے کا اہل نہیں' اس کا تجربہ مجھے کئی بار ہو چکا تھا۔ ورنہ راہِ فرار اختیار نہ کرتا لیکن اس مرتبہ میں اسے یہ موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

"میں سمجھ گیا دیوی! سمجھ گیا۔" وہ خوشی سے تقریباً چیخ اٹھا۔

"تو پھر بقیہ دونوں حصار بھی اٹھا لے شمبھو تاکہ .... تیرے میرے بیچ کوئی دیوار نہ رہے۔" میں نے اس کی طرف مدہوش کن نظروں سے دیکھا۔

"اٹھا لوں گا' ابھی اٹھا لوں گا دیوی!" وہ جلدی سے بولا۔ "مگر پہلے مجھے یقین تو کر لینے دے کہ جو بات تیری زبان پر ہے' دل میں بھی ہے۔"

"دلوں کا بھید کس نے جانا ہے شمبھو جو تُو جان لے گا اس لئے جو میں کہہ رہی ہوں' اس پر یقین کر لے۔" میں نے کہا' پھر اسے مزید مطمئن کرنے کے لئے کہنے لگی۔ "دراصل مجھے اب اندازہ ہو چکا ہے کہ تیری شکتی (طاقت) مجھ سے زیادہ ہے۔ میں نے اسی لئے تیری داسی (کنیز) بن کر بقیہ جیون بتانے کا فیصلہ کیا ہے.........."

"نہیں، تُو میری داسی نہیں دیوی ہے اور میں تیرا پجاری ہوں۔ میں جیون بھر تیری پوجا کروں گا۔"

اگر زندہ بچ گیا' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ شمبھو سے یہ سب کچھ کہتے ہوئے مجھے اپنے دل پر بڑا جبر کرنا پڑ رہا تھا' مگر کیا کرتی۔ اسے دھوکہ تو دینا ہی تھا۔ ایک مرتبہ میں اس کی قید سے آزاد ہو جاتی تو پھر وہ مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

"اچھا تو پھر پہلے درشن کرا دے۔" وہ لہک کر بولا۔ "تاکہ مجھے تیری باتوں پر یقین آ جائے۔"

"درشن!" میں چکرا گئی۔ "کیا .... کیا میں تجھے نظر نہیں آ رہی؟"

"دیوی! یہ دیکھنا بھی کوئی دیکھنا ہے۔" پھر شمبھو نے جو کچھ کہا' وہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ انتہائی صبر تحمل کے باوجود مجھے غصہ آ گیا۔

"حرام زادے! ذلیل .... کتے!" میں اس پر برس پڑی۔ "تیری یہ مجال کہ مجھ سے اتنی کمینگی کا اظہار کرے۔"

"کھل گئی نا آخر تیری چال۔" وہ زور سے ہنس پڑا۔ "دیوی! کیا تُو شمبھو کو اتنا ہی اُلو سمجھ رہی تھی کہ تیرے چلتر میں آ جائے گا۔"

میں خون کا گھونٹ پی کے رہ گئی۔ وہ اتنا ہی بڑا کمینہ اور شیطان تھا کہ میں اسے فریب دینے میں ناکام رہی۔

"سن اے دیوی! جس طرح میں تجھے تیری کوٹھی سے یہاں اٹھا لایا ہوں اور مجھے ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکا' اسی طرح تجھے اس شہر سے نکال کر لے جاؤں گا۔ پھر دیکھوں گا کہ تُو کب تک اپنی ضد پر قائم رہتی ہے۔ شاید تجھے ابھی شمبھو کی شکتی کا پوری طرح گیان نہیں ہوا۔ بڑے مہاراج کو چھوڑ کر کوئی بھی اس شہر میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" وہ دیر تک لاف زنی کرتا رہا پھر اس نے میری بے بسی سے فائدہ اٹھا کر ایسی نازیبا حرکتیں شروع کر دیں جن کے لئے اس کا میرے قریب آنا ضروری نہیں تھا۔

"دیوی .... میری دیوی!" وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دونوں کان بھی۔ کانوں پر میں نے ہاتھ رکھ لئے تھے کہ اس کی منحوس آواز سنائی نہ دے۔ وہ منظر اتنا ہی شرم ناک اور گھناؤنا تھا۔ پہلے بھی اس نے ایک بار ایسی ہی گھٹیا حرکت کی تھی اور طیش کے مارے میرے جسم میں بجلیاں سی گردش کرنے لگی تھیں۔ پھر اس سے پہلے کہ میری آنکھوں سے موت کی روشنی نکل کر اسے زندہ جلا ڈالتی' وہ فرار ہو گیا لیکن اس وقت وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

معاً میرے جسم کو جھٹکا سا لگا اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے دونوں ہاتھ بھی اس جھٹکے کی وجہ سے کانوں کے اوپر نہیں رہے تھے۔

"دے .... دے دی .... دیوی! .... دیکھ .... دیکھ تو سہی!" وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

میں نے اس مرتبہ بھی آنکھیں بند کر لینا چاہیں مگر ناکام رہی۔ اس شیطان صفت سادھو نے بے

...ائی کا وہ آخری نظارہ دیکھنے پر مجھے مجبور کر دیا تھا۔ کوئی آدمی اتنا گھٹیا اور پست ذہن کا بھی ہو سکتا ہے' میرے لئے یہ پہلا تجربہ تھا۔ آدمی کے بجائے وہ مجھے اس وقت جانور معلوم ہوا۔ وہ صرف چند ہی اذیت ناک لمحے تھے جنہوں نے میرے احساس کو شدید مجروح کیا تھا۔ میں کسی بت کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر ایک ہی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ کوٹھری میں کچھ دیر شمبھو کے حیوانی سانس گونجتے رہے اور پھر دوبارہ میرے جسم کو جھٹکا لگا۔ میں نڈھال سی ہو کر چارپائی پر گر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ اب تینوں حصار میرے گرد محیط تھے۔

"میں اب جا رہا ہوں دیوی! کل صبح آؤں گا۔" وہ اب اپنے پھولے ہوئے سانسوں پر قابو پا چکا تھا۔ "اور کل رات تُو اس شہر میں نہیں ہو گی۔"

"رک جا شمبھو!" میں ایک دم بول اٹھی۔

"اب کیوں روکتی ہے دیوی! اب کیا فائدہ؟"

"میں تجھ سے صلح کرنا چاہتی ہوں۔" میں اپنے دل پر انتہائی جبر کر کے بولی۔

"صلح .... تُو اور اتنی جلدی مجھ سے صلح پر راضی ہو گئی.........." وہ ہنسنے لگا' شیطانی ہنسی۔

"اب تیرا کوئی چلتر نہیں چلے گا۔"

"تُو میری بات تو سن لے' ماننا نہ ماننا تیرے اختیار میں ہے۔" مصلحت وقت کے تحت میں نے اپنے لہجے میں حتی الامکان نرمی پیدا کی۔

"میں سن رہا ہوں دیوی! بول کیا کہنا ہے؟"

"تجھ سے چند سوال کرنا چاہتی ہوں میں۔ تُو نے اگر ان کے صحیح جواب دے دیئے تو پھر .... پھر میں.........." دانستہ میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پھر تُو راضی ہو جائے گی' یہی کہنا چاہتی ہے نا؟"

میں نے کچھ کہے بغیر اقرار میں سر ہلانا چاہا مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا' سو میں نے پلکیں اقرار میں جھکا دیں۔

"تیرے ہر سوال کا جواب دینے پر آمادہ ہوں میں لیکن میری شرط بھی وہی ہے' پہلے تجھے درشن کرانے ہوں گے .... اس کا کچھ بھی بیت چکا ہے۔ اس سے ضرورت نہیں' کل صبح ممکن ہے۔ جس طرح ابھی کچھ دیر پہلے میں نے سبز حصار ہٹا لیا تھا' سو کل صبح بھی ایسا ہو سکتا ہے' پر تیرے سوالوں کے جواب درشن کر لینے ہی پر دوں گا۔"

اس کی "حرامزدگی" اپنی جگہ برقرار تھی۔ میں نے اس مرتبہ بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا اور خاموش رہی ورنہ جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ اس کمینے کو زندہ ہی جلا ڈالوں۔ "درشن" کی وضاحت وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔

"سوچ لے دیوی! ساری رات پڑی ہے۔ صبح تجھے وعدہ خلافی کی سزا بھی دینی ہے۔"

"میں نے کیا وعدہ خلافی کی ہے؟" کوشش کے باوجود میں چپ نہ رہ سکی

"یہی دیوی کہ تُو نے میری داسی بن کر جیون بتانے کا فیصلہ کیا تھا' پھر ذرا ہی دیر بعد وعدہ خلاف پر اتر آئی اور مجھے گالیاں بکنے لگی۔"

"مگر یہ کیوں بھول رہا ہے کہ تُو بھی تو کمینگی پر اتر آیا تھا۔"

"تُو جسے کمینگی کہہ رہی ہے دیوی! میں اسی کو سچا پیار سمجھتا ہوں۔"

"مگر ضروری تو نہیں کہ جو تُو سمجھے وہی میں بھی سمجھوں۔"

"تن کے بنا من کچھ نہیں ہوتا دیوی! تُو ایک بار تن کی پکار سن تو سہی' تیرے من میں ٹھنڈک پڑ جائے گی۔ تیری بیاکل آتما (بے چین روح) شانت (پُرسکون) ہو جائے گی۔ پھر یہی شمبھو کہ تُو جسے کمینہ اور ذلیل کہتی ہے' تجھے اچھا لگے گا' پر ابھی یہ باتیں تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی' گیا جی چل کر سمجھ جائے گی۔"

"گیا جی؟" میں حیرت سے بولی۔

"ہاں گیا جی! وہ ایک تیرتھ استھان (زیارت گاہ) ہے۔ میں تجھے یہاں سے وہیں لے جاؤں گا اور وہاں مجھے بڑے مہاراج کا کوئی کھٹکا نہیں ہو گا۔" اس نے جواب دیا۔ "تُو جوگن بن کے رہے گی' میری جوگن اور میں تیرا جوگی۔"

"کیا تُو سمجھتا ہے کہ بڑے مہاراج کو یہ خبر نہیں ہو گی کہ تُو مجھے یہاں سے لے اڑا ہے؟"

"خبر ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی' تُو ان چکروں میں نہ پڑ۔ یہ میرا اور بڑے مہاراج کا معاملہ ہے۔ وہ میرے پتا سمان (باپ کی طرح) ہیں۔ جب انہیں یہ معلوم ہو گا کہ میں نے تجھے اپنی جوگن بنا لیا ہے اور تُو اب ان کے قابل نہیں رہی تو وہ مجھے شما (معاف) بھی کر سکتے ہیں۔" وہ بولا اور پھر لالٹین اٹھا کر چل دیا۔ کوٹھری کے دروازے تک پہنچ کر وہ رکا اور مڑ کر کہنے لگا۔ "میرے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ تیری زبان بند کر دوں' پر اس کی ضرورت نہیں۔ یہ بات تجھے اس لئے بتا رہا ہوں کہ چیخ چلا کر تُو میری نیند خراب نہ کرے۔ یہاں دور دور تک کوئی دوسری کٹیا نہیں۔ تُو اگر گلا پھاڑ پھاڑ کے بھی چیخے گی تو یہاں کوئی نہیں آئے گا' سو شانت ہی رہے دیوی تو بہتر ہے' آگے تیری مرضی۔"

دروازہ وہ کھلا ہی چھوڑ گیا۔ روشن حصار کی وجہ سے اس کوٹھری میں اتنی روشنی ضرور تھی کہ لالٹین روشن کیے بغیر ہی سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔

لعنتی شمبھو چلا گیا تو میں دیر تک اپنی بے بسی پر غور کرتی رہی۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ صبح جب شہزاد اور میرے دوسرے ملازمین مجھے خواب گاہ میں نہیں پائیں گے تو ان پر کیا گزرے گی۔ اسی سوچ بچار کے ساتھ بار بار مجھے شمبھو کی یہ دھمکی بھی یاد آ رہی تھی کہ کل صبح وہ مجھے وعدہ خلافی کی سزا بھی دے گا۔ یہ سزا کس نوعیت کی ہو گی' میرے لئے سمجھنا مشکل تھا۔ معلوم نہیں کب میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔

دوسرے روز صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے شمبھو کو چارپائی کے قریب کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں جانے کیا پڑھ رہا تھا۔ روشن حصار اب بھی میرے گرد قائم تھا۔ میں نے

[اٹھ]نے کی کوشش کی مگر میرا جسم بدستور شل تھا۔ اٹھنا تو اٹھنا میں کروٹ بھی نہ لے سکی۔

شمبھو کے کاندھے پر حسب معمول جھولی پڑی تھی البتہ چمٹا ہاتھ میں نہیں تھا۔ گزشتہ رات بھی اس کے پاس چمٹا نظر نہیں آیا تھا۔ سحر و افسوں کے بارے میں اب مجھے بہت کچھ معلوم تھا۔ میرے اندازے کے مطابق شمبھو اس وقت کسی منتر کا جاپ کر رہا تھا۔ مسلمان جس طرح مختلف وظائف پڑھتے ہندو اسی طرح منتروں کا جاپ کرتے ہیں۔ فرق صرف مثبت اور منفی کا ہے۔ وظائف خود کو یا کسی شخص کو فائدہ پہنچانے کے لئے بھی پڑھے جاتے ہیں جنہیں رحمانی وظائف کہا جاتا ہے' اس کے علاوہ دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے یا انہیں نقصان پہنچانے کے لئے بھی مختلف عمل ہیں۔ اس کا انحصار عامل کی نیت اور تصور خیر و شر پر ہے کہ وہ کون سی راہ اختیار کرتا ہے۔ سفلی علوم کا تعلق انہی منتروں سے ہے' جن کے ذریعے کسی پر جادو کیا جائے۔ منتر' سحر' جادو یا افسوں کو کہتے ہیں۔ منتر پڑھنے والا اگر خلوت میں نہ ہو تو اپنے ذہن کی یکسوئی کے لئے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ منتر ان مخصوص الفاظ کے مجموعے کو کہا جاتا ہے جن کے ذریعے کسی کا دل موہنے' اسے قابو میں کرنے یا کسی کو کوئی نقصان پہنچانے کی خاطر پڑھ کر پھونکے جائیں۔ جاپ' وظیفے کو کہتے ہیں۔ منتر کے دوران میں جو الفاظ ادا کئے جاتے ہیں' بلند یا دھیمی آواز میں انہیں انچھر' یعنی جادو کے بول کہا جاتا ہے۔ جنتر کے معنی تعویذ کے ہیں' مگر جنتر منتر اصطلاحاً جھاڑ پھونک کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہندو اپنی عبادت کے دوران میں جو کچھ پڑھتے ہیں' وہ منتر نہیں' اشلوک کہلاتے ہیں۔ اشلوک کسی نظم' شعر' بیت یا دوہے کو کہتے ہیں جس میں خالق حقیقی کی حمد و ثنا کی جائے۔ شمبھو کو اس وقت آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے دیکھ کر یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ بدی کا وہ ہرکارہ یقیناً کوئی منتر ہی پڑھ رہا تھا۔ یہ منتر وہ کس غرض سے پڑھ رہا تھا' مجھ پر ابھی یہ نہیں کھلا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ شمبھو کا مقصد نیک نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک وہ مجسم شر تھا' بدی تھا اور مجھے حیرت اس پر تھی کہ شر کے خلاف خیر کی قوتیں اب تک میرے اندر بیدار نہیں ہوئی تھیں۔ شاید یہ میری آزمائش کا وقت تھا۔ میں اسی لئے زیادہ خوفزدہ اور ہراساں نہیں تھی کہ مجھے خیر کی قوتوں پر مکمل یقین اور بھروسہ تھا۔ مجھے اب تک جو تجربات ہوئے تھے' ان کا نچوڑ یہی تھا۔ وقتی طور پر شر کا غلبہ تو ہو گیا مگر آخری فتح خیر ہی کی ہوئی اور آخری فتح ہی تو اصل فتح ہے .... اسی یقین نے مجھے اس وقت بھی مایوس نہ ہونے دیا جب میں' شمبھو کے مقابلے میں قطعی بے بس تھی۔ اس نے مجھے اپنی شیطانی قوتوں کے حصار میں لے رکھا تھا اور اب کسی نئے حربے کی تیاری کر رہا تھا۔

میری نگاہیں اسی کے منحوس چہرے پر جمی ہوئی تھیں کہ میں نے اسے آنکھیں کھولتے دیکھا پھر اس نے اپنے کاندھے پر پڑی ہوئی جھولی میں ہاتھ ڈال دیا۔

جھولی سے میں نے شمبھو کو مٹی کا ایک پتلا نکالتے دیکھا۔ پھر مجھے اس کے ہاتھ میں بڑی سی ایک سوئی نظر آئی۔ اس نے تین مرتبہ حصار کی طرف پھونک ماری اور مٹی کے اس پتلے پر ہاتھ پھیرا۔ اسی کے ساتھ میرے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی۔ حیرت انگیز طور پر میرا جسم اب بے حس یا شل نہیں رہا تھا۔ کسی عورت سے مشابہ مٹی کے اس پتلے کے جس حصے پر شمبھو ہاتھ

پھیرتا مجھے اپنے جسم کے اس حصے پر اس کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوتا۔ میرے لئے یہ بڑا انوکھا اور حیران کن تجربہ تھا۔ شمبھو اپنی شیطانی حرکات میں مصروف تھا اور میرا چہرہ شاید شرم سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ پتلے کے ایک مخصوص حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے شیطانی انداز میں مسکرا کر میری طرف دیکھا پھر اس نے کچھ پڑھ کر پتلے پر بھی تین مرتبہ پھونکیں ماریں اور میری جانب دیکھ کر زور سے ہنس پڑا۔ اس نے جو منتر پڑھا تھا غالباً اپنی تکمیل کا آخری مرحلہ طے کر چکا تھا۔

"دیوی!" اس نے اچانک مجھے مخاطب کیا۔ "میں نے منتر کا جاپ کر کے تیری آتما (روح) کے دو حصے کر دیئے ہیں۔ تیری آتما کا آدھا حصہ اس پتلے میں بند ہے' سو جو آدھا محسوس کرے گا' وہی دوسرے آدھے حصے کو محسوس ہو گا۔"

"جھوٹ بولتا ہے تُو!" میں خوفزدہ سی ہو کر چیخ اٹھی۔ "روح کو دو حصوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔" اس لعنتی کی باتیں واقعی گھبرا دینے والی تھیں۔

"تو پھر ابھی کس لئے لجا رہی تھی دیوی! بول کیا تُو نے میرے ہاتھ کا لمس اپنے بدن پر محسوس نہیں کیا؟ .... تُو اگر مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہے تو پھر تجھے یہی تجربہ کراتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر پتلے سے کھیلنے لگا۔

"بس کر کمینے' بس کر!" پتلے کے ساتھ اس نے ایک ایسی ہی حرکت کی تھی کہ میں خود پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

"تُو جب تک میرے منتر کی سچائی کا اعتراف نہیں کر لے گی دیوی! میں تیرے ساتھ یہی کھیل کھیلتا رہوں گا۔" وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا اور کہنے لگا۔ "ابھی تو ابتدا ہے' یہ سوئی دیکھ رہی ہے' میں اس سے تیرے بدن کو چھیدوں گا اور تُو چیخے گی۔ یاد کر دیوی کہ کل رات میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تجھے تیری وعدہ خلافی کی سزا دوں گا پھر بھلا تُو سزا سے کیسے بچ سکتی ہے۔ اس سمے تیری موت اور زندگی میرے ہاتھ میں ہے۔ میں چاہوں تو تیری دونوں ٹانگیں پکڑ کر تجھے چیر دوں' پر میں ایسا نہیں کروں گا۔ اس لئے دیوی کہ میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔ ایک پریمی اپنی پریمیکا پر یہ اتیاچار کیسے کر سکتا ہے۔ سن دیوی! تیرا شمبھو مردار خور نہیں ورنہ تو جب تجھے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر لایا تھا' اسی سمے تیری چاہت کا قرض اتار دیتا پرنتو میں ایسے ملن کو ملن نہیں جانتا۔ تن اور من ایک ہو تو ملن ہوتا ہے ورنہ پاپ ہے۔ سو جب تک تیری آتما مجھے سویکار نہیں کر لے گی' میں تجھے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

"تیری یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہو گی شمبھو! تُو یہی حسرت لئے ایک دن اپنے ہی گناہوں کی آگ میں جل مرے گا۔" میں نے نفرت و حقارت سے کہا۔

"شمبھو کو جھکانا آتا ہے دیوی! تُو خود میرے چرنوں پر جھکے گی اور ملن کو کہے گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا اور میں تیرے اقرار کے انتظار پر راضی ہوں۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تُو کب تک نہیں جھکتی۔ کب تک اپنے تن اور آتما کو سزائیں جھیلنے پر آمادہ رکھتی ہے۔ سو آج' کل رات کی وعدہ خلافی کے جرم میں سزا بھگت تیری چیخیں سن کر مجھے خوشی ہو گی دیوی!" یہ کہتے ہی شمبھو

نے نرم مٹی کے پتلے کو اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ سوئی اب اس کے سیدھے ہاتھ میں تھی۔

میں نے اسے پتلے کے ایک بازو میں سوئی کی نوک اتارتے دیکھا اور اپنے بائیں بازو میں مجھے شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے دونوں ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ میں چیخ کر اسے خود پر ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

"اچھا تو پھر یہ لے!" شمبھو نے باری باری پتلے کے ہونٹوں کو نشانہ بنایا۔

میرے منہ سے سسکی نکل گئی اور وہ ہنس پڑا پھر اس نے پتلے کے جسم کو سوئی سے جگہ جگہ چھیدنا شروع کر دیا اور میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔

"چیخ دیوی چیخ!" وہ چیخا اور پتلے کے سینے میں تقریباً آدھی سوئی اتار دی۔

میرے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ اب اس نے پتلے کی رانوں اور جسم کے نچلے حصے کو تختہ مشق بنا رکھا تھا۔ میں تڑپتی رہی' چیختی رہی اور اس کے قہقہے کوٹھری میں گونجتے رہے۔ اسی دوران میں وہ مجھ سے بار بار اقرار محبت کرنے کے لئے کہا رہا۔

"نہیں .... نہیں .... نہیں میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں۔" شدید اذیت سہنے کے باوجود میرا جواب یہی تھا۔

"اور میں تیری نفرت کو ایک روز محبت میں بدل دوں گا۔" وہ کہتا اور مجھ پر مزید ظلم کرنے لگا۔ اس کے ظلم کا ذریعہ وہی مٹی کا نرم پتلا تھا۔

وہ میرے صبر اور حوصلے کا امتحان لے رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اتنی اذیت برداشت نہیں کی تھی۔ چیختے چیختے میں نڈھال ہونے لگی۔ قریب تھا کہ میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی کہ جیسے میرے سارے وجود میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ میں نے عظیم مہین کی کاہنہ نجیرہ کی خوشبو کوٹھری میں محسوس کر لی تھی۔

شمبھو مٹی کے جس پتلے کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا جیسے کسی نادیدہ وجود نے اس سے چھین لیا۔

"کون ہے تُو؟" شمبھو چیخ اٹھا۔

مٹی کا وہ پتلا فضا میں بلند ہوا اور پھر کوٹھری کے کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ شمبھو پتلے کو دیکھتا رہ گیا۔ میرے گرد شمبھو نے جو حصار کھینچے تھے' وہ غائب ہو گئے۔ اسی کے ساتھ تیز کڑک سی سنائی دی جیسے کہیں بجلی گری ہو۔ شمبھو پورے قد سے زمین پر آ رہا۔ وہ کوٹھری کے فرش پر پڑا ہوا اس طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جیسے اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا ہو۔ گہرے پانی میں ڈوبنے سے پہلے جس طرح کوئی ہاتھ پاؤں مارتا ہے' وہی حالت اس وقت شمبھو کی تھی۔ انہی لمحات میں نجیرہ کی خوشبو کو میں نے خود سے انتہائی قریب محسوی کیا۔

شمبھو نے شیطانی عمل کے ذریعے مجھے جس شدید اذیت میں مبتلا کیا تھا' اس کی وجہ سے میرا جسم جیسے پھوڑا بنا ہوا تھا۔ نجیرہ کی خوشبو قریب آئی تو میں نے اپنے جسم میں عجیب سی ٹھنڈک اور راحت

محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے بدن سے ساری تکلیف کھینچ رہا ہے۔ میں چند ہی لمحوں میں خود کو پہلے جیسا محسوس کرنے لگی۔

پھر ادھر میں اٹھ کر بیٹھی اور خبیرہ کی خوشبو کا لمس معدوم ہوا' ادھر شمبھو اچھل کر کوٹھری کے دروازے کی طرف بھاگا۔ میں نے اس پر جست لگائی لیکن اس وقت تک وہ کوٹھری سے نکل چکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

"رک جا شمبھو!" میں چیخی۔ میں نے اسے برابر والی کوٹھری کے درواے سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔

موت جس کے تعاقب میں ہو' وہ بھلا کہاں رکتا ہے۔ اس نے بھاگتے بھاگتے ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی وحشت برس رہی تھی۔ وہ کوٹھریاں دریا کے کنارے بنی ہوئی تھیں اور وہاں سے کالی گھاٹ کی آبادی کچھ دور تھی۔ کوٹھری سے باہر آتے ہی میری پہلی نظر اسی طرف اٹھی تھی۔ دور ہی سے کالی مائی کے قدیم مندر کا اونچا کلس دکھائی دے رہا تھا۔ شمبھو اسی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے پیر زمین پر نہ ٹک رہے ہوں۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ دریا کے کنارے نرم ریت پر دوڑتے ہوئے مجھے دشواری پیش آ رہی تھی۔ شمبھو کو شاید ریت پر دوڑنے کی مشق تھی۔

کیا یہ کمینہ بچ کر نکل جائے گا؟ میں نے دوڑتے ہوئے بڑے دکھ سے سوچا اور اسی کے ساتھ میرے سارے جسم میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ شمبھو ابھی تک میری نگاہ کی دسترس میں تھا۔ پھر معلوم نہیں دوڑتے دوڑتے اچانک شمبھو کو کیا سوجھی کہ اس نے تیزی کے ساتھ اپنا رخ بدلا۔ آبادی کی بجائے اب اس نے دریا کی سمت زقند بھری۔ ادھر بجلیوں کی گردش میری دونوں آنکھوں میں مرکوز ہوئی اور ادھر شمبھو نے "جے درگا مائی" کا نعرہ بلند کیا اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ میری آنکھوں سے موت کی روشنی نکل کر پانی کی سطح پر ٹھیک اس جگہ پڑی جہاں شمبھو ڈوبا تھا۔ میں نے دریا کے پانی کو کھولتے دیکھا اور پھر میری آنکھوں سے نکلنے والی روشنی دوبارہ میری آنکھوں میں سما گئی۔ بھاگتے ہوئے اب میں اس جگہ تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے دریا کی سطح پر نگاہیں جما دیں۔ پانی کی سطح دور دور تک مجھے پُرسکون دکھائی دی۔ میرے وجود میں گردش کرتی ہوئی بجلیاں اب تھم چکی تھیں۔ شمبھو اس طرح غائب ہو چکا تھا جیسے اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ زندہ بچ گیا تھا۔ میں دریائے ہگلی کے کنارے کھڑی ہوئی یہ سوچ رہی تھی کہ اس شیطان کو یقیناً کسی طرح خطرے کی خبر ہو جاتی ہے ورنہ یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ عین وقت پر غائب ہو جائے۔ زعیم جیسا ساحر جب موت کی روشنی سے نہیں بچ سکا تھا' اس کی پُراسرار بلائیں جب سوکھی لکڑی کی طرح جل گئی تھیں تو شمبھو کس شمار قطار میں تھا' وہ صرف اس لئے زندہ بچ گیا تھا کہ خطرے سے پہلے ہی اس نے دونوں مرتبہ راہ فرار اختیار کر لی تھی۔ مجھے اس کے فرار ہو جانے پر دکھ تھا لیکن اس دکھ کا مداوا فی الحال ناممکن تھا۔ میں یہی سوچ کر بوجھل قدموں سے آبادی کی طرف بڑھ گئی جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔

اس وقت صبح کے سات بجے ہوں گے جب میں کالی گھاٹ کے ٹرام ڈپو تک پہنچی۔ وہاں سے مجھے

دھرم تلے کے لئے ٹرام مل گئی۔ میں شب خوابی کے لباس میں تھی' مگر میرے پاس چھوٹا پاکٹ پرس موجود تھا۔ ٹرام کنڈیکٹر میری طرف آیا تو میں نے گاؤن کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پرس نکال کر ٹکٹ لے لیا۔ اگر مجھے چھوٹا پاکٹ پرس رکھنے کی عادت نہ ہوتی تو کالی گھاٹ سے لوٹتے ہوئے یقیناً پریشانی ہوتی۔ میرے پیروں میں چپل یا سینڈل بھی نہیں تھے' مگر اس طرف اب تک کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ صبح ہی صبح کا وقت تھا اس لئے ٹرام میں زیادہ رش نہیں تھا۔ میں بہرحال کسی دشواری کے بغیر دھرم تلے پہنچ گئی۔ میں اس دوران بہت کچھ سوچ چکی تھی۔ جس پر مجھے کوٹھی پہنچ کر عمل کرنا تھا۔

رات کو دیر تک جاگنے کے سبب عموماً میں آٹھ نو بجے تک سو کر اٹھتی تھی۔ میں خود ہی اٹھ کر اپنی خواب گاہ سے باہر آتی تھی۔ میرا کوئی ملازم مجھے نہیں اٹھاتا تھا۔ نیپالی گورکھا زیندرا صبح چھ بجے ہی اٹھ جاتا تھا۔ رحیم' شیتل اور ولیم کے اٹھنے کا وقت بھی یہی تھا البتہ شہزاد سات بجے تک بیدار ہوتا تھا۔ میرے اٹھنے سے پہلے ہی ملازمین ناشتہ کر لیتے تھے۔

میں سوا آٹھ بجے کے قریب اپنی کوٹھی کے پھاٹک پر دستک دے رہی تھی۔ زیندرا نے پھاٹک کھولنے سے پہلے باہر جھانک کر دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

اس نے جلدی سے پھاٹک کھولتے ہوئے ہکلا کر کہا۔ "میم! آپ.......... آپ باہر کیسے چلا گیا؟"

زیندرا کا یہ سوال مجھے کھلا تو سہی مگر میں کوئی جواب دیئے بغیر مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ راہداری سے گزر کر میں سیدھی صحن میں پہنچی اور باتھ روم کا رخ کرتے ہوئے شیتل کو آواز دی جو رحیم کے ساتھ کچن میں برتن دھو رہی تھی۔

"شیتل! میرے کمرے سے تولیا اور چپل لے آ!" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"اچھا میم!" جواب میں شیتل کی آواز سنائی دی۔

میں اس وقت اپنے پیر دھو رہی تھی جو ریت میں لت پت ہو رہے تھے۔ شہزاد اس وقت شاید اپنے کمرے میں تھا اور ولیم حسب معمول ناشتہ کر کے سودا سلف لینے گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق زیندرا کے سوا غالباً کسی نے یہ بات محسوس نہیں کی تھی کہ میں اپنی خواب گاہ سے نکلنے کی بجائے باہر سے آئی ہوں۔

غسل کر کے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس دوران میں شیتل کمرے کی صفائی کر چکی تھی۔ میں نے تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ مجھے وہاں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ ہر شے اپنی جگہ پر موجود تھی۔ صحن میں قدم رکھتے ہی میں نے عقبی دروازہ بھی دیکھ لیا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میرے لئے یہ ایک معمہ ہی تھا کہ شمبھو کس طرح رات کو مجھے وہاں سے اٹھا لے گیا؟ اس کا کوٹھی کے اندر داخل ہونا تو کسی حد تک میری سمجھ میں آ سکتا تھا' مگر بند دروازوں کے اندر سے کسی کو لے کر نکل جانا بعید از قیاس تھا۔ میرے خیال میں وہ اس کے لئے عقبی دروازہ ہی استعمال کر سکتا تھا لیکن وہ بھی مجھے بند ملا تھا۔

میں آرام کرسی پر نیم دراز ابھی اسی گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھی کہ خواب گاہ کے دروازے

پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"آ جاؤ!" میں بلند آواز میں بولی۔

آنے والا شہزاد تھا۔ پہلی ہی نظر میں اس کے چہرے پر میں نے الجھن کے آثار دیکھ لئے۔

"آؤ شہزاد! بیٹھو۔" میں نے سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں تم ہی کو بلوانے والی تھی، مگر پہلے یہ بتاؤ تم الجھے ہوئے سے کیوں ہو؟"

"خاتون! آج صبح جب میں صحن میں پہنچا تو عقبی دروازے کی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔" شہزاد نے بتایا۔

"ہوں!" میں نے طویل سانس لیا۔ میری ایک الجھن ختم ہو گئی تھی۔ "تو پھر؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"میں سمجھا کہ شاید رات کو سونے سے پہلے نریندرا نے عقبی دروازہ چیک نہیں کیا ہو گا' سو میں نے کسی سے کچھ کہے بغیر کنڈی ڈال دی۔ ابھی کچھ دیر پہلے نریندرا نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ کہیں باہر سے آئی ہیں۔ اس وقت میں اپنے کمرے میں لباس تبدیل کر رہا تھا۔" یہ کہہ کر شہزاد سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ نہیں سکی۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے دانستہ انجان بن کر کہا۔

"مم .... میں .... دراصل.........." وہ گڑبڑا گیا۔ "دراصل عقبی دروازہ کھلا دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی اور .... اور معاف کیجئے گا' میں نے آپ کی خواب گاہ کا دروازہ کھول کر دیکھا تو .... تو آپ وہاں .... میرا مطلب ہے کہ یہاں نہیں تھیں۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ظاہر .... ظاہر ہے خاتون کہ .... کہ میں آپ کی طرف سے فکرمند ہو گیا' مگر .... مگر میں نے کسی کو کچھ بتایا نہیں کہ خواہ مخواہ .... اور وہ شیتل تو ذرا سی دیر میں شور مچا دیتی ہے۔ لباس تبدیل کر کے میں آپ ہی کی تلاش میں جانے والا تھا کہ .... کہ مجھے آپ کی آواز سنائی دی اور.........."

"اور تمہاری جان میں جان آئی' ہے نا؟"

"جج .... جی ہاں خاتون!"

شہزاد کے بیان کی روشنی مجھے ایک "کہانی" ترتیب دیتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں پُرسکون آواز میں بولی۔ "تم لوگ آخر ذرا ذرا سی باتوں پر اس قدر کیوں گھبرا جاتے ہو؟ آج صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ سحر خیزی کے لئے میرا جی چاہا تو میں اٹھ گئی۔ تم سب لوگ سو رہے تھے' میں نے سوچا تمہاری نیند کیوں خراب کروں' اس لئے عقبی دروازہ کھول کر نکل گئی۔ لوٹ کر آئی تو عقبی دروازہ اندر سے بند تھا اس لئے پھاٹک پر دستک دینا پڑی۔ اتنی سی بات تھی جس کا

نے فسانہ بنالیا۔"

"بات یہ ہے خاتون کہ گزشتہ دنوں اس سادھو کی وجہ سے جو غیر معمولی واقعات پیش آتے رہے ہیں انہی کی بنا پر فکر ہو جاتی ہے۔" شہزاد نے صفائی پیش کی۔

"لعنت بھیجو' اس سادھو پر اور جو کہہ رہی ہوں وہ غور سے سنو۔ میں یہ کوٹھی تمہارے نام کر رہی ہوں۔"

"جج .... جی!" شہزاد حیران رہ گیا۔ "مگر کیوں خاتون!"

"تمہارے سوال کا جواب بھی دے دوں گی لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ دھرم تلے کے علاوہ کہیں اور تم کوئی اتنا بڑا مکان خرید سکتے ہو جہاں اس کوٹھی کا تمام فرنیچر اور کتابوں کی الماریاں باآسانی رکھی جا سکیں؟" میں نے دریافت کیا۔

میری بات سن کر شہزاد کچھ دیر خاموش رہا' پھر بولا۔ "جی ہاں' ممکن ہے۔ پارک سرکس کے علاقے میں میرے کچھ عزیز بھی رہتے ہیں اور دوست بھی' وہاں کوئی مکان آسانی سے مل سکتا ہے۔ وہ علاقہ دھرم تلے کی طرح زیادہ مہنگا بھی نہیں لیکن خاتون.........."

"کوئی سوال نہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "میں جو کہہ رہی ہوں' سنتے جاؤ۔"

"جی بہتر ہے۔" اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "فرمایئے!"

"تمہیں یہ کوٹھی فروخت کر کے پارک سرکس کے علاقے میں جلد از جلد کوئی مکان خریدنا ہے۔ اس کے بعد یہاں سے وہاں شفٹ ہو جانا ہے' سمجھ گئے؟ میں آج شام تک چلی جاؤں گی' مگر اس سے پہلے تمہیں میرے ساتھ کورٹ چلنا ہے تاکہ اس کوٹھی کے مالکانہ حقوق تمہارے نام ہو سکیں۔ پارک سرکس میں بھی تم جو نیا مکان خریدو گے' اپنے ہی نام سے خریدنا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!" میں نے اس کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"سمجھ رہا ہوں خاتون! لیکن آپ یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہیں؟ یہاں کیا پریشانی ہے؟ اور آپ .... آپ شام کو کہاں جا رہی ہیں؟"

"تمہارے آخری سوال کا جواب تو فی الحال میں نہیں دے سکتی البتہ پہلے دو سوالوں کے جواب دے سکتی ہوں۔" میں نے یہ کہہ کر طویل سانس لی' پھر کہا۔ "میرا خیال ہے شہزاد کہ اتنا اندازہ تو تم نے بھی لگا ہی لیا ہو گا کہ کچھ لوگ بلا سبب مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ انہی میں وہ لعنتی سادھو بھی ہے۔ یہاں کی سکونت ترک کرنے کی اصل وجہ یہی ہے' مگر تم اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کرو گے۔ یہ تمام باتیں صرف میرے اور تمہارے درمیان رہنا چاہئیں۔ یہاں تم نے جن لوگوں کو ملازم رکھا تھا' ان کے بارے میں بھی تمہی کو فیصلہ کرنا ہے۔ میں صرف شیتل کی سفارش ضرور کروں گی کہ اسے جواب نہ دینا' باقی تمہاری مرضی۔ اس کے علاوہ تمہیں یہ کوٹھی بیچ کر اور نیا مکان خریدنے کے سلسلے میں حتیٰ الامکان رازداری سے کام لینا ہے۔ کوشش کرنا کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کوٹھی بیچنے کے بعد تم نے کہاں نیا

مکان خریدا ہے۔ اس سلسلے میں تم ملازمین کو بھی زبان بند رکھنے کی تاکید کر سکتے ہو کہ وہ کسی اجنبی کو کچھ نہ بتائیں۔ یہاں سے شفٹنگ کی وجہ ملازمین سے تم وہی بیان کر سکتے ہو جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔"

"اس کی ایک اور بہتر صورت بھی ہو سکتی ہے خاتون! میں آپ کی پوری بات سمجھ گیا ہوں خاتون!" اس کی آواز میں دبا دبا سا جوش تھا۔ "مجھے خوشی یہ ہے کہ آپ مجھ پر اتنا اعتماد کرتی ہیں اور انشاء اللہ کبھی میں اس اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ جلدبازی میں یہ کوٹھی بیچنے سے اس کی مناسب رقم نہیں ملے گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلے کرائے پر پارک سرکس ہی کے علاقے میں کوئی مکان لے لیا جائے اور یہاں سے سارا سامان وہاں شفٹ کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہمیں کوٹھی بیچنے کی اتنی جلدی نہیں ہوگی اور نہ وہاں نیا مکان خریدنے میں زیادہ دشواری ہوگی۔ آپ بھی نیا مکان دیکھ کر اطمینان.........."

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں بول اٹھی۔ "تمہارا اطمینان میرے لئے کافی ہے پھر یہ کہ میں چند روز کے لئے یہ شہر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ جب یہاں نہیں ہوں گی' سب کچھ تمہی کو کرنا ہے۔"

"لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کوٹھی بیچنے کے بعد نیا مکان کہاں خریدا گیا ہے؟ آپ کب تک لوٹ آئیں گی؟"

"میری واپسی جلدی بھی ہو سکتی ہے اور اس میں دیر بھی لگ سکتی ہے۔ رہا یہ کہ مجھے نئے مکان کے بارے میں کس طرح معلوم ہوگا تو یہ کوئی مسئلہ نہیں۔"

"لیکن خاتون کس طرح؟ میں سمجھ نہیں سکا۔"

"سمجھ جاؤ گے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "فی الحال تم جاؤ اور مجھے لباس تبدیل کرنے دو' میں آتی ہوں ابھی۔"

پھر شہزاد اٹھ کر چلا گیا اور میں لباس تبدیل کرنے لگی۔

اس روز دوپہر سے کچھ پہلے ہی ہم دونوں کوٹھی واپس آ گئے۔ ضروری قانونی کارروائی پوری ہو چکی تھی۔ کورٹ سے لوٹ کر میں' شہزاد کے ساتھ پارک سرکس چلی گئی تھی۔ وہاں اس کے کئی عزیزوں کی سکونت تھی۔ شہزاد نے ان سے میری ملاقات کرا دی۔ اس کے علاوہ اپنے ایک قریبی دوست آفتاب سے بھی ملوا دیا۔ وہ جمعے کا دن تھا اس لئے آفتاب گھر ہی پر تھا۔ جمعے کے روز وہ چھٹی کرتا تھا۔ شہزاد پہلے بھی مجھ سے اس کا تذکرہ کر چکا تھا۔ آفتاب کنگ اسٹریٹ میں چشمے کی ایک دکان پر ملازم تھا۔ اتوار کو ہرچند بازار بند ہوتا تھا مگر چشمے والا فٹ پاتھ پر پتھارا لگا لیتا تھا۔ اس کے بدلے وہ دونوں سیلز مینوں کو باری باری دوسرے دنوں میں چھٹی دے دیتا تھا۔ شہزاد کا اور اپنا یہ مسئلہ میں نے اس طرح حل کر لیا تھا۔ شہزاد نے کہا تھا کہ نئی سکونت کے بارے میں زیادہ افراد کو بتانے کی بجائے' وہ صرف آفتاب کو آگاہ کر دے گا۔ آفتاب سے مل کر وہاں تک پہنچ سکتی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کے میں نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر شہزاد کو اپنے کمرے میں بلوا لیا۔

"تم احتیاطاً یہ رقم اپنے پاس رکھ لو۔ کیا خبر میری غیر موجودگی میں تمہیں کیا ضرورت پڑ جائے۔" میں نے اپنے بڑے پرس سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

"مگر.......... مگر خاتون! یہ .... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ میں اتنے پیسوں کا کیا کروں گا؟" وہ بولا۔

"رکھ لو' زیادہ نہیں صرف دس ہزار ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر مجھے واپسی میں دیر ہو گئی تو ملازمین کی تنخواہ تم کہاں سے دو گے؟"

"لیکن گزشتہ ہفتے ہی تو سب کو تنخواہ دی ہے .... پھر یہ کہ میرے پاس بھی خاصے پیسے ہیں جن کا آپ نے کبھی حساب نہیں لیا۔" اس نے نوٹوں کی گڈی لے لی۔

"کتنے ہوں گے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"تین چار ہزار تو ہوں گے ہی۔" اس نے بتایا۔

"تو وہ بھی اپنے پاس رکھو' ابھی تو پورا مہینہ پڑا ہے۔ تنخواہوں کے علاوہ گھر کے خرچ کے لئے بھی تو تمہارے پاس کچھ ہونا چاہئے نا!"

"مگر آپ حساب تو لے لیں' میں حساب کی کاپی لے کر آتا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر اٹھنے لگا۔

"بیٹھ جاؤ' تم نے فارسی کی ایک مثل شاید نہیں سنی۔ حساب دوستاں در دل۔ یعنی دوستوں کا حساب دل میں ہوتا ہے۔ اب تم ٹہل جاؤ اور میرے لئے شیتل سے عمدہ سی کافی بھجوا دو۔ مجھے ابھی سامان سفر بھی باندھنا ہے۔"

"آپ بتائیں گی نہیں ورنہ میں ایک بات ضرور پوچھتا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یعنی یہ کہ میں اس شہر سے کہاں جا رہی ہوں اور کب تک لوٹ کر آؤں گی' یہی پوچھنا چاہتے ہو تم؟"

"جی .... جی ہاں!" وہ خوش ہو گیا۔

"بالکل نہیں بتاؤں گی' ہاں نہ بتانے کی وجہ ضرور بیان کر سکتی ہوں۔"

"چلیں یہی سہی۔"

"اس کی وجہ یہ ہے اے میرے دست راست کہ خود مجھے بھی نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے۔" یہ کہتے ہی میں ہنس پڑی۔

"آپ سے باتوں میں کوئی نہیں جیت سکتا خاتون!" وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے اور استعمال کی دوسری اشیاء رکھیں' پھر ایک ایئر بیگ کے اندر بقیہ سامان رکھا۔ الماری کی سیف کھول کر وہ سونا بھی میں نے نکال لیا جو بچ رہا تھا اور جسے میں وادی سبز سے لے کر آئی تھی۔ سیف میں نوٹوں کی جو گڈیاں ضروری اخراجات کے بعد بچ گئی تھیں' انہیں بھی سونے کے ساتھ ہی نکال کر میں نے سوٹ کیس کے نچلے حصے میں رکھ دیا۔ اس کے علاوہ میرے بڑے اور چھوٹے پرس میں بھی خاصی رقم تھی۔ اس وقت میرے وہی احساسات تھے جو وادی سبز سے روانگی کے وقت تھے۔ مجھے اپنے فیصلے کے مطابق اب ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ بہت

سی باتیں ابھی خود میرے ذہن میں واضح نہیں تھیں۔ ان کا انحصار آئندہ پیش آنے والے واقعات پر تھا۔ اپنے آئندہ اقدامات کے متعلق میرے ذہن میں جو دھندلا سا خاکہ تھا' میں اسی پر عمل کر رہی تھی۔ شیتل اس عرصے میں مجھے کافی کا مگ دے گئی تھی۔ کافی میں پی چکی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ایر بیگ کندھے سے لٹکائے اور سوٹ کیس دائیں ہاتھ میں اٹھائے میں اپنی خواب گاہ سے نکل آئی۔

شہزاد غالباً میرے تمام ملازمین کو بتا چکا تھا کہ میں کچھ عرصے کے لئے کہیں جا رہی ہوں اس لئے وہ سبھی صحن میں مجھے اپنے منتظر ملے۔ ان میں شہزاد بھی تھا۔ ولیم نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لینا چاہا تو میں نے کہا۔ "رہنے دو' تم ایسا کرو کہ ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن تک کے لئے ایک ٹیکسی لے آؤ۔"

ولیم اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا اور میں آگے بڑھ کر برآمدے میں بچھی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ سوٹ کیس میں نے کرسی کے پاس ہی رکھ لیا' پھر کاندھے سے ایر بیگ بھی اتار دیا۔ اس وقت عجیب سوگواری کا سا سماں تھا۔ شہزاد بھی چپ چپ سا تھا۔

"تم لوگ آخر اس طرح منہ لٹکائے کیوں کھڑے ہو؟" میں ہنس کر بولی۔ "مجھے تو تم لوگوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے سسرال وداع ہو کر جا رہی ہوں۔"

"یہ بات نہیں میم!" شیتل بولی۔

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کچھ پھوٹو تو سہی منہ سے' جبھی تو معلوم ہو گا مجھے۔"

"ہم نے شہزاد میاں سے پوچھا تھا کہ میم کب واپس آئیں گی تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔" رحیم بول اٹھا' لہجہ شکایتی سا تھا۔

"شہزاد کو خود کچھ خبر ہوتی تو تمہارے سوال کا جواب ملتا نا۔"

"تو پھر میم آپ ہی بتا دیں۔"

"دیکھو' بات یہ ہے کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے بتایا۔ "ابھی مجھے خود اندازہ نہیں کہ کب تک واپس آ سکوں گی۔ شہزاد کو میں نے تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ میری غیر موجودگی میں تمہیں شہزاد کے کہنے پر چلنا ہے۔ ضروری گھریلو اخراجات اور تنخواہ جس طرح تمہیں پہلے ملتی تھی' ملتی رہے گی۔ پہلے بھی شہزاد ہی پر یہ ذمے داری تھی اور آئندہ بھی ایسا ہو گا۔ مجھے امید ہے شہزاد سے تمہیں اس معاملے میں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ کچھ اور مجھ سے کہنا سننا ہو تو بتا دو۔"

"اور تو کچھ نہیں میم! بس جلدی لوٹ آنا۔" یہ شیتل تھی۔

"ٹھیک ہے' میں کوشش کروں گی۔" میں نے اسے دلاسہ دیا اور وہ خوش نظر آنے لگی۔

ذرا دیر کے بعد ولیم ٹیکسی لے آیا۔ اس مرتبہ میں نے اسے سوٹ کیس اٹھانے سے نہیں روکا۔ ایر بیگ شہزاد نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

شہزاد کے سوا یہ بات کسی کے علم میں نہیں تھی کہ میری واپسی اب کبھی اس کوٹھی میں نہیں ہو

گی۔ سوٹ کیس اور ایر بیگ میں نے ٹیکسی کی پچھلی نشست ہی پر رکھوا لیا اور پھر خود بھی پیچھے ہی بیٹھ گئی۔ ٹیکسی چلنے سے پہلے میں نے گیٹ پر کھڑے ہوئے اپنے تمام ملازمین کو دیکھا اور رخصتی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ اس وقت میں یہ سوچ رہی تھی کہ دوبارہ پھر کبھی یہ چہرے دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں؟ زندگی کی بھیڑ میں اکثر چہرے اسی طرح تو گم ہو جاتے ہیں۔

جواب میں ان سب نے بھی ہاتھ ہلائے اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

چورنگی سے گزر کر میری ٹیکسی لوئر چی پور روڈ پر پہنچی ہو گی کہ میں نے ایک اور ٹیکسی کو اپنے تعاقب میں دیکھا۔ میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ ٹرام ڈپو کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر پہلی بار اس ٹیکسی پر پڑی تھی۔ میں سمجھی تھی کہ چورنگی کے بعد وہ کسی طرف مڑ جائے گی' مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ مسلسل میری ٹیکسی کے پیچھے لگی ہوئی تھی اور درمیانی فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ یا تو تعاقب کرنے والا اناڑی تھا یا پھر اسے یہ پرواہ نہیں تھی کہ مجھے تعاقب کئے جانے کا علم ہو جائے گا۔

ڈلہوزی اسکوائر والے چوراہے تک آتے آتے میں نے ٹیکسی والے کو مخاطب کیا۔ "ٹیکسی ایک طرف روک لو۔"

"پن میم شاب او تو ہم کو بولا میم ہاوڑہ اسٹیشن............"

"ادھر بھی چلیں گے' پہلے تم کچھ دیر یہاں ٹیکسی روکو۔" میں نے الفاظ دانستہ بنگلہ زبان میں ادا کئے تھے کیونکہ ٹیکسی والا مجھے بنگالی ہی معلوم ہوا تھا۔

"بھالو' میم بھالو!" وہ خوش ہو کر بولا اور ٹیکسی سڑک کے کنارے روک لی۔

پیچھے آنے والی ٹیکسی اس وقت تک بالکل قریب آ چکی تھی۔ میں جیسے ہی مڑی اس ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر ایک دراز قد شخص کو اترتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں اسے پہچان گئی۔ وہ راجہ استاد تھا۔ مجھے اس وقت راجہ استاد کی مداخلت گراں تو گزری مگر اپنی ناگواری ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے خواہ مخواہ میری راہ کھوٹی کی تھی۔ ہر چند کہ میرا ارادہ ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن جانے کا نہیں تھا بلکہ میں راستے ہی میں رک جاتی' مگر یہ بات میرے گمان میں بھی نہیں تھی کہ اس سے پہلے ہی راجہ استاد سے مڈبھیڑ ہو جائے گی۔ اپنے ملازم ولیم سے میں نے اسٹیشن کے لئے ٹیکسی اس وجہ سے منگوائی تھی کہ یہ ظاہر ہو سکے واقعی میں کلکتے سے کہیں اور جا رہی ہوں۔ دھرم تلے سے ہاوڑہ اسٹیشن جانے کے لئے ٹیکسی اس جگہ سے ضرور گزرتی جہاں مجھے حقیقتاً جانا تھا۔ میں وہاں ٹیکسی رکوا کر اتر جاتی۔ میری منزل دراصل موسیٰ سیٹھ کا مسافر خانہ تھی۔ یہیں چند روز گزار کر میں آئندہ کے لئے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا چاہتی تھی۔ جب تک میں میک اپ کرنا نہ سیکھ جاتی' میری کہیں مستقل سکونت لاحاصل ہی تھی۔ یہ وہی مسافر خانہ تھا کہ جہاں تک خجیرہ نے میری رہنمائی کی تھی اور جہاں میری ملاقات شہزاد سے ہوئی تھی۔ کلکتہ شہر میں اپنی زندگی کا از سر نو آغاز میں اسی جگہ سے کرنا چاہتی تھی۔

اپنی کوٹھی سے روانگی کے بعد میں پوری طرح چوکنا تھی۔ میں اپنے اردگرد سے قطعی غافل نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جلد ہی مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہو گیا تھا۔ حکمرانوں کے کسی پالتو کتے کو میں اپنے

پیچھے لگائے موسیٰ سیٹھ کے مسافرخانے تک لے جانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اپنی ٹیکسی اسی لئے رکوائی تھی کہ تعاقب کرنے والی ٹیکسی آگے نکل جائے یا اگر وہ بھی کچھ فاصلے پر رک جائے تو میں تعاقب کرنے والے سے نمٹ سکوں۔ "پالتو کتوں" کے ساتھ میں اب کسی رعایت کی روادار نہیں تھی لیکن راجہ استاد کے چہرے پر نظر پڑی تو میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ اب اپنی ٹیکسی سے اتر کر قریب آ چکا تھا۔ اخلاقاً میں بھی اپنی ٹیکسی سے اتر گئی۔

"یہ عیاشیاں ہو رہی ہیں استاد!" میں نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا۔ "ٹیکسیوں میں گھوما جا رہا ہے آج کل۔"

"بس رہنے دو رانی! تم بڑی بے وفا ہو' چپکے سے نکلی جا رہی تھیں۔ وہ تو میری نظر پڑ گئی اور ٹیکسی کر کے بھاگ اٹھا تمہارے پیچھے ورنہ تو تم ہاوڑہ پہنچ کر ہی دم لیتیں۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا استاد کہ میں چپکے سے نکلی جا رہی تھی اور یہ کہ ہاوڑے جا رہی تھی۔"

"اب اتنا اندھا بھی نہیں ہوں میں' ٹیکسی میں سوٹ کیس رکھ کر ظاہر ہے کہ تم کہیں گھومنے پھرنے تو جا نہیں رہی ہو گی۔ بس تم سے اتنی سی درخواست کی تھی کہ دیکھو رانی! بمبئی جانے سے پہلے ایک بار ضرور مل لینا' مگر تم ہم جیسے چھوٹے آدمیوں کو کہاں گھاس ڈالتی ہو؟ اتنے دن کلکتے میں رہیں اور راجہ کو ذرا بھی خدمت کا موقع نہیں دیا۔ اس سے تو میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم چاہتی ہو' میں اگر کبھی بمبئی آؤں تو تم سے ملنے کی کوشش نہ کروں۔" راجہ استاد بالکل بچوں کی طرح مجھ سے روٹھ رہا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے کہا۔ "تم بھی کمال ہو استاد! خود ہی جانے کیا کیا فرض کر لیتے ہو۔ ارے تم اگر بمبئی آؤ گے تو رانی کے اڈے ہی پر ٹھہرو گے۔ تم نے یہ کیا بات کہی' مگر اس لئے نہیں ملی کہ بمبئی آؤ تو یہاں نہ ٹھہرو۔ وہ بمبئی ہے بمبئی' کلکتہ نہیں۔ تم وہاں آ کر کہیں اور ٹھہر کے تو دیکھو' دوسرے ہی دن اٹھوا لوں گی تمہیں۔" میں نے یہ سب کچھ راجہ استاد کی خوشنودی کے لئے کہا تھا۔ پہلی ملاقات میں وہ مجھے بمبئی کی کوئی بڑی جرائم پیشہ عورت سمجھا تھا جس کا نام رانی تھا۔ میں اس وقت وہی کردار نبھا رہی تھی۔

"مجھے تو تم اٹھوا لینے کے دعوے کر رہی ہو اور خود ایک دن میرے یہاں نہیں ٹھہریں۔ یہ کیا خوب رہی بھئی!" وہ منہ بنا کر کہنے لگا۔

"کوئی جگہ ہے تمہارے پاس مجھے ٹھہرانے کے لئے؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں ہے' تم کہہ کر تو دیکھتیں۔"

"تو اب کہہ رہی ہوں' کیا فرق پڑ گیا۔ ابھی تو مجھے خاصے دن تمہارے شہر میں گزارنے ہیں۔"

"اور یہ سامان .... کیا تم واقعی ہاوڑہ اسٹیشن نہیں جا رہیں؟"

"نہیں استاد! میں تو کچھ روز کے لئے موسیٰ سیٹھ کے مسافرخانے میں رہنے جا رہی تھی۔" میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کیونکہ اب اپنا ارادہ بدل چکی تھی۔ میں موسیٰ سیٹھ کے مسافرخانے میں ٹھہرتی چند روز راجہ استاد کی مہمان بن کے رہتی' بات ایک ہی تھی۔

"رانی تم اور مسافرخانہ؟ حیرت ہو رہی ہے یہ سن کر۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "لگتا ہے' وہ کام جس کے لئے تم یہاں آئی تھیں لیکن ...."

"لیکن یہ کہ دوسرا کام ابھی باقی ہے۔" میں نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"سمجھ گیا میں' چند روز تم شاید روپوش رہنا چاہتی ہو۔" اس نے سرگوشی کی۔

"استاد! تم تو واقعی اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہو۔"

"بس اب گھومت بہت زیادہ اور میری ٹیکسی میں آ جاؤ' میں تمہارا سوٹ کیس........."

"ایسا کرو استاد کہ اپنی ٹیکسی والے کو فارغ کر کے تم بھی اسی ٹیکسی میں آ جاؤ' خواہ مخواہ سامان اٹھانا پڑے گا۔ میں دراصل تمہاری طرف اس لئے نہیں آئی کہ کہیں تم بھی میرے ساتھ تھمبو نہ ہو جاؤ۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"راجہ استاد پر ہاتھ ڈالنے والا ابھی اس کلکتے میں تو پیدا ہوا نہیں۔ دھرم تلہ میرا علاقہ ہے میرا' کسی مائی کے لعل میں دم نہیں کہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔"

"اچھا اب جاؤ بھی نا!"

"جانے کی ضرورت کیا ہے۔" راجہ استاد نے یہ کہہ کر پیچھے کھڑی ٹیکسی والے کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ وہ ٹیکسی والا قریب آ گیا تو استاد نے کہا۔ "جا بے تُو!"

"ٹھیک ہے استاد!" یہ کہہ کر ٹیکسی والا واپس اپنی ٹیکسی کی طرف چلا گیا۔ وہ یقیناً راجہ استاد کو جانتا تھا۔

"اور استاد! اس کا کرایہ؟" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

"راجہ استاد سے کرایہ لے گا تو دھرم تلے میں گھس سکے گا .... جاننے والا ہے۔" یہ کہہ کر راجہ استاد میری ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

میں بھی پچھلی نشست پر بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے ٹیکسی والے سے مخاطب ہوئی۔ "چلو!"

"کدھر جائے میم؟"

"ہاوڑہ اسٹیشن اور کہاں۔"

"ارے ارے!" راجہ استاد نے مڑ کر کہا۔ "یہ تم کہاں چل رہی ہو؟ مجھ سے تو تم نے ...."

"چھری کے نیچے ذرا دم تو لو استاد!" میں ہنس کر بولی۔ "یہ تو تمہارا شہر ہے' پھر کیوں اتنا ڈر رہے ہو۔"

"لو اور سنو!" وہ بھی ہنس پڑا۔ "میں ڈروں گا' میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ تم نے میرے ساتھ چلنے کو کہا اور جا رہی ہو ہاوڑے۔"

"شام کا وقت ہے استاد' تھوڑی سی تفریح ہی سہی۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہارے دھندے کا وقت ہے اسی لئے تو تمہاری طرف........."

"تم سے زیادہ نہیں ہے دھندا۔ تم بھلا کب آؤ گی کلکتے۔ دھندا تو روز ہی ہوتا رہتا ہے۔ دھندا

کرنے کو لونڈے بہت ہیں۔ میں تو بس اس لئے لونڈوں کا ساتھ دیتا رہتا ہوں کہ ہاتھ پیر چلتے رہیں۔ لونڈے کہتے رہتے ہیں' استاد عیش کرو' تمہارا حصہ پہنچ جایا کرے گا۔" وہ بے دھڑک بول رہا تھا۔

"ہاں استاد! تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں' ٹھہراؤ گے کہاں مجھے؟"

"ارے وہیں چاندنی میں اور کہاں' خاصی جگہ ہے میرے پاس۔ تین کمرے ہیں میرے پاس۔ خالی پڑا رہتا ہے' کسی آنے جانے والے کے لئے۔ خالی کمرے میں تم رہ لینا یا پھر جہاں کہو۔ وہاں بندوبست کر دوں۔" راجہ استاد نے فراخ دلی سے پیشکش کی۔

"ایک کمرے میں ظاہر ہے کہ تم رہتے ہو گے۔" میں سوچتے ہوئے بولی۔ "ایک میں' میں رہوں گی' بقیہ جو ایک کمرہ ہے اس میں کون رہتا ہے؟"

"شاگرد ہے ایک میرا ہمایوں' میری ہی جگہ سمجھو اسے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بچپن سے پالا ہے میں نے اسے۔ چودہ سال کی عمر سے میرے پاس ہے۔"

"صرف وہی ہے یا کوئی اور بھی ہے؟" میں پوری طرح پہلے مطمئن ہو جانا چاہتی تھی اس لئے سیدھی راجہ استاد کے ٹھکانے پر نہیں گئی تھی۔

"چل کر دیکھ لینا خود' تم تو بالکل پولیس والوں کی طرح پوچھ گچھ کر رہی ہو۔ ایک لونڈیا بھی ہے مگر اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ ہمایوں اسے یو پی سے بھگا کر لایا تھا' اپنے ہی شہر رامپور سے۔ وہی کھانا پکاتی ہے۔" استاد نے بلا جھجک بتا دیا۔ "کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے' جبھی سے ساتھ ہے۔"

پھر راجہ استاد سے میں نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔ ہری سین روڈ سے ٹیکسی ہاوڑہ برج کی طرف مڑی تھی کہ میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔ "اب پھر واپس دھرم تلے کی طرف موڑ لینا' چاندنی چوک جانا ہے۔"

اس زمانے میں اوّل تو ٹیکسیوں میں کم ہی لوگ سفر کرتے تھے' پھر اس طرح ٹیکسی میں گھومنے کا بھی رواج نہیں تھا۔ خال خال ہی کسی ٹیکسی والے کو ایسا کوئی مسافر ملتا تھا جو بے مقصد ٹیکسی کو اِدھر اُدھر لے کر گھومتا پھرے۔ ٹیکسیاں میٹر سے چلتی تھیں۔ دھرم تلے سے ہاوڑہ برج تک خاصے پیسے بنتے تھے اور اتنے ہی تقریباً واپسی میں بن جاتے مگر مجھے پرواہ نہیں تھی۔ اصل مسئلہ میرے اطمینان کا تھا۔ برج کی طرف ٹیکسی لے جانے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ میرا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ راجہ استاد سے گفتگو کرتے ہوئے بھی میں اس طرف سے چوکنا تھی۔ ہاوڑہ کی طرف جاتے ہوئے اور واپسی میں بھی کوئی مشتبہ کار یا ٹیکسی مجھے اپنے تعاقب میں نظر نہیں آئی۔ میں نے بہرحال اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا تھا کہ پولیس کا خفیہ محکمہ میری دوبارہ نگرانی کرا سکتا ہے۔ پرکاش کے علاوہ بھی کوئی اور سادہ لباس والا کسی بھیس میں میری اطراف موجود رہ سکتا ہے۔ انسپکٹر کو میرے ہاتھوں پٹے ہوئے صرف چار دن گزرے تھے۔ اس عرصے میں خفیہ پولیس والے میرے گرد جال ڈالنے کے لئے کوئی نئی حکمت عملی بھی اختیار کر سکتے تھے۔ مجھے اگر اس طرف سے کچھ اطمینان تھا تو

یہ کہ روز ہی ارشاد حسین سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ مجھے اس سے ضرور آگاہ کرتا۔

چاندنی چوک پہنچ کر ٹیکسی ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ میں نے پہلے ہی سے کرائے کے نوٹ ہاتھ میں لے لئے تھے کہ راجہ استاد کرایہ ادا نہ کر سکے یا ٹیکسی والے کو کرائے کے بغیر ٹلا دے۔ ادھر راجہ استاد نے ٹیکسی رکوائی' ادھر میں نے پیچھے سے نوٹ ٹیکسی والے کو تھما دیئے۔ راجہ استاد نے حجت کی کہ کرایہ وہ ادا کرے گا' مگر میں نہیں مانی۔

"ابھی سے میزبانی شروع کر دی استاد!" میں نے ہنس کر کہا۔ "گھر تو چلنے دو۔" میں ایر بیگ کاندھے سے لٹکائے اور سوٹ کیس اٹھائے ٹیکسی سے اتر آئی۔

"لاؤ یہ مجھے دو۔" راجہ استاد نے سوٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے سوٹ کیس اس کے حوالے کر دیا۔

آگے بڑھ کر میں نے میٹر دیکھا اور بقیہ پیسے لے کر اپنے پرس میں رکھ لئے۔ میں اب گویا خود بخود راجہ کی رانی بن چکی تھی۔ کلکتے میں میری نئی زندگی کا یہ نقطہ آغاز ہی تھا' اگر کوئی فرق یا کمی تھی تو یہ کہ میرے جسم پر مغربی لباس تھا اور چہرہ بھی بدلا ہوا نہیں تھا۔

استاد کے ساتھ اس بلڈنگ میں داخل ہوتے وقت میں نے سوچا کہ اپنا نیا نام رانی ہی رکھوں گی۔ نام کے انتخاب کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ نام ہندوؤں اور مسلمانوں' دونوں ہی میں مشترک تھا۔ نام سے یہ پتا لگانا دشوار ہی تھا کہ یہ نام رکھنے والی ہندو ہے یا مسلمان۔

اس بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور ہی کے تین کشادہ کمرے استاد کے تصرف میں تھے۔ نیچے اور جو کمرے تھے وہ بطور گودام بازار کے دکان داروں نے لے رکھے تھے۔ اوپری تین منزلوں میں دوسرے افراد کی سکونت تھی۔ چلتے چلتے راجہ استاد نے خود ہی مجھے یہ باتیں بغیر پوچھے بتا دی تھیں۔

"بس یوں سمجھو رانی کہ نیچے کا پورا حصہ میرے ہی پاس ہے۔ یہاں میری مرضی کے بغیر پرندہ پَر نہیں مار سکتا۔"

"مگر استاد! ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ یہاں گودام........."

"وہ تو خیر ہیں اور دکاندار مجھے اس کا کرایہ بھی دیتے ہیں مگر........."

"تو کیا یہ بلڈنگ تمہاری ہے؟"

"نہیں بھئی......... کرائے سے میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" وہ اب مجھے ساتھ لئے لمبی سی راہداری سے گزر کر ایک بند دروازے کی سامنے رک گیا تھا۔ "مال محفوظ رہے' چوری نہ ہو' اس کا کرایہ' اب سمجھیں!" اس نے ہنستے ہوئے بتایا اور "کرائے" کا مطلب میری سمجھ میں آ گیا۔

اس بلڈنگ میں اوپری منزلوں تک جانے کا راستہ الگ تھا۔ راجہ استاد مجھے ساتھ لئے جس دروازے سے اندر داخل ہوا تھا' وہ الگ ہی تھا۔ بلڈنگ کی بیرونی سمت اور راہداری میں بھی بند دروازے میں نے دیکھے تھے جو گوداموں ہی کے ہو سکتے تھے۔ راجہ استاد کی سکونت بلڈنگ کے اندرونی حصے میں

تھی۔

دروازے پر ایک ہی مرتبہ دستک کے بعد دوسری جانب قدموں کی چاپ گونجی اور پھر ایک آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں ری' دروازہ کھول۔" استاد بلند آواز میں بولا۔

فوراً ہی دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک نوجوان و حسین لڑکی تھی جو عمر میں دو تین سال ہی بڑی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔

"آ رانی!" استاد میرا سوٹ کیس اٹھائے اندر داخل ہو گیا۔

"آج اتنی جلدی کیسے آ گئے پاپا؟" لڑکی دروازہ بند کر کے پیچھے آتے ہوئے راجہ استاد سے ہوئی۔

اس لڑکی کے منہ سے راجہ استاد کے لئے "پاپا" سن کر میں چونکی کیونکہ یہ وہی لڑکی معلوم تھی جس کے متعلق راجہ استاد مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

"ہاں بیٹا! آج دھندا نہیں کیا۔" راجہ استاد ایک کمرے میں داخل ہو کر بولا۔ "یہ مل گئی تم کا نام رانی ہے اور یہ بمبئی سے آئی ہیں۔ تیرے پاپا کی بھی استاد ہیں یہ۔ ہمارے گھر مہمان رہیں راجہ استاد نے کمرے کی ایک دیوار کے قریب سوٹ کیس رکھ دیا۔

میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرہ کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ ایک طرف مونڈھے پڑے تھے ان میں سے ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی فرش پر موٹا سا گدا بچھا تھا۔ گدے پر سفید چاندنی دیوار سے لگے ہوئے دو گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ایک طرف لکڑی کی کئی الماریاں اور دوسرا سامان رکھا کمرے کے دو دروازے تھے' ایک سے ہم داخل ہوئے تھے دوسرا گھر کی اندرونی سمت کھلتا تھا۔

لڑکی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر میری طرف دیکھا اور سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب کر راجہ استاد سے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ لڑکی پھر بول اٹھی۔ وہ راجہ استاد ہی سے مخاطب تھی۔ "ہمایوں بھی جلدی آ جائے گا آج؟"

"وہ مجھے ملا نہیں' دھندا کر کے ہی لوٹے گا' جلدی کیوں آنے لگا؟" راجہ استاد نے جواب بولا۔ "تو ایسا کر کہ دائیں بازو والا کمرہ ان کے لئے صاف کر دے۔"

"ٹھیک ہے پاپا!" لڑکی اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے چلی گئی۔

"استاد! تمہارے شاگرد کی پسند اچھی ہے۔ لونڈیا زوردار ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے آواز میں راجہ استاد سے کہا۔

"اپنا لونڈا بھی لاکھوں میں ایک ہے۔ لونڈیا راضی نہیں ہوتی ورنہ تو میں اب تک دونوں کی بھی کر دیتا۔" استاد نے بتایا۔

"تیار کیوں نہیں ہوتی شادی پر؟"

"ہندو ہے سالی اور مسلمان ہونے پر تیار نہیں ہوتی۔ اس کا اصل نام شانتی ہے۔ بس

یہاں مشہور کر رکھا ہے کہ مسلمان ہے۔"

"یہ تو تمہارے لونڈے کا قصور ہوا استاد!" میں مسکرائی۔

"ایک آدھ دفعہ اسی بات پر ہمایوں نے پیٹ پاٹ دیا تھا اسے۔ پھر میں نے ہی زبردستی سے منع کر دیا۔ ہمایوں تو اسے گھر سے نکال رہا تھا کہ مسلمان نہیں ہوتی تو دفع ہو جا۔ مجھے ہی بیچ میں بولنا پڑا۔ پاؤں پکڑ لئے تھے شانتی نے میرے' مجھے پاپا کہتی ہے' میں کیا کرتا۔ نہ ہمایوں کو چھوڑنے پر آمادہ ہے نہ اپنا مذہب۔" پھر استاد نے ہنستے ہوئے کسی شاعر کا ایک مصرع پڑھا۔

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

"مگر یہ صیاد کون ہے استاد؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔ مجھے ہمایوں اور شانتی کے قصہ عشق میں لطف محسوس ہو رہا تھا۔

"دونوں ہی سسرے باغباں ہیں اور دونوں ہی صیاد۔" راجہ استاد یہ کہہ کر زور سے ہنسا۔ "میں نے تو زندگی میں کبھی یہ ٹنٹا ہی نہیں پالا۔"

"کیوں استاد! کیا شادی نہیں کی؟"

"چھوڑو بھی لاحول پڑھو' کیا میں تمہیں صورت سے اتنا ہی بے وقوف نظر آتا ہوں؟"

"خیر اس میں عقل مندی کی بھی کوئی بات نہیں۔" میں بولی۔ "ویسے کسی سے عشق وشق تو کیا ہی ہوگا استاد!"

"لو اب تم نے بے وقوفی سے بھی ایک قدم آگے بڑھا دیا۔ شادی کرنے کو میں حماقت اور عشق کو پاگل پن سمجھتا ہوں۔"

"تو پھر اپنے لونڈے کی شادی کیوں کرا رہے تھے؟"

"اس لئے کہ وہ صرف حماقت کی حد تک رہے' پگلا نہ ہو جائے۔"

راجہ استاد سے میں انہی خوش گپیوں میں مصروف رہی اور شانتی نے میرے لئے کمرہ صاف کر دیا۔ راجہ استاد نے اس مرتبہ بھی مجھے سوٹ کیس نہیں اٹھانے دیا۔

اس کمرے میں بغلی گلی کی طرف ایک کھڑکی کھلتی تھی جس سے بڑی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ میں نے شانتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کھڑکی کھول کر تم نے اچھا کیا۔" میری تعریف پر وہ مسکرائی پھر پوچھنے لگی۔ "رات کو کھانے میں کیا کھائیں گی؟ جو آپ کہیں سو پکا لوں۔"

"گوشت کھا لیتی ہو تم؟" میں نے دانستہ اس سے یہ سوال کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جو کٹر قسم کے ہندو ہوتے ہیں' گوشت نہیں کھاتے۔

میرا سوال سن کر وہ چونکی' پھر کہنے لگی۔ "گوشت کیوں نہیں کھاؤں گی جی' ہمایوں بھی تو کھاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر گوشت ہی پکا لو' استاد تمہارے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔"

"مارے گئے۔" استاد نے نعرہ لگایا۔ "ارے یہ سبزیاں اور دالیں بہت اچھی پکاتی ہے، گوشت نہیں۔ گوشت کا تو "ریڑا" لگا دیتی ہے۔" پھر اس نے شانتی سے کہا۔ "ایسا کر ماش کی دال پکا لے، دو تو اچھی بنا لیتی ہے۔ چٹنی، اچار، پاپڑ، رائتہ وغیرہ تو ہو گا ہی ساتھ، مزہ آ جائے گا۔"

شانتی چلی گئی تو میں نے سوٹ کیس کھول کر اپنا سلیپنگ گاؤن نکال لیا اور پھر روزانہ استعمال کی دوسری اشیاء بھی نکالنے لگی۔ اس کمرے میں بھی راجہ استاد کے کمرے ہی کی طرح فرشی نشست تھی۔ ایک طرف دو تین مونڈھے بھی پڑے تھے۔ یہ کمرہ بھی کشادہ، صاف ستھرا اور ہوادار تھا۔ گزشتہ رات کیونکہ سخت تکلیف و اذیت میں گزری تھی اس لئے آج رات میرا ارادہ صرف آرام کرنے کا تھا۔ کمرے میں کھونٹیاں بھی تھیں۔ میں نے اپنا گاؤن، تولیا اور دوسرے کپڑے کھونٹیوں پر ٹانگ دیئے۔

"معلوم نہیں رانی! تمہیں اس فقیر کا یہ ڈیرہ پسند بھی آیا ہو گا یا نہیں؟" راجہ استاد بول اٹھا۔ "تم ٹھہریں بمبئی کی رانی!"

"تم بھی تو کلکتے کے راجہ ہو استاد!"

"تمہارا سکہ تو سارے بمبئی پر چلتا ہے، میرے پاس تو لے دے کے صرف یہی علاقہ ہے۔ میرا تمہارا کیا مقابلہ؟"

"ہر جگہ، ہر ماحول میں رہ لیتی ہوں میں۔ آسمان سے نہیں اتری، اسی زمین کی مخلوق ہوں۔ موتی سیٹھ کے مسافر خانے سے تو لاکھ درجے اچھا ہے یہ گھر استاد! تمہیں تو معلوم ہے کہ میں وہاں جا رہی تھی۔ خیر چھوڑو، یہ تکلف کی باتیں۔ یہ بتاؤ استاد تمہاری یہ لونڈیا کافی بنا لیتی ہے؟"

"نہیں رانی! ہاں چائے اعلیٰ نسل کی بناتی ہے، کہو تو پلواؤں؟"

"تم بھی پیو گے؟"

"تم کہتی ہو تو میں بھی پی لوں گا۔" پھر اس نے شانتی کو آواز دے کر بلایا اور دو کپ چائے بنانے کو کہہ دیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے مجھ سے پوچھا۔ "دوسرا ہاتھ کب دکھاؤ گی؟"

میں اس کا اشارہ سمجھ گئی اور ہنس کر بولی۔ "یہ سب کاروباری راز ہیں، بتائے نہیں جاتے۔"

"نہ بتاؤ، میں تو بس اس لئے پوچھ رہا تھا کہ کب تک روپوشی کا ارادہ ہے؟"

"بس کل شام تک کے لئے۔"

"کیا؟" راجہ استاد چونک کر کہنے لگا۔ "تو کیا کل تم چلی جاؤ گی؟"

"یہ تو نہیں کہا، میں نے۔ بس آتی جاتی رہوں گی، کل کے بعد۔ ڈیرا تمہارے ہی یہاں رہے گا، جب تک کام نہ ہو جائے یا تم مجھ سے اکتا نہ جاؤ۔"

"اکتانے کی خوب کہی تم نے۔ ارے یہ تمہارا گھر ہے جب تک جی چاہے رہو۔" راجہ استاد نے کہا، پھر ذرا توقف سے بولا۔ "ایک بات سچ سچ بتاؤ رانی، تمہیں ان بندروں کا لباس پہنتے ہوئے الجھن نہیں ہوتی؟ مجھے تو ہمایوں کو دیکھ کر دحشت ہوتی ہے۔ سڑی گرمی میں ظالم گلے میں پھندا لگائے پھرتا ہے۔ میں کچھ بولتا ہوں تو کہتا ہے استاد! زمانہ بدل گیا ہے اور بندے کو زمانے کے ساتھ چلنا چاہئے۔ اس طرح کوئی

شک بھی نہیں کرتا کہ بندہ کیا دھندا کرتا ہے۔ شاید تم بھی اسی لئے بندروں کے لباس کو پسند کرتی ہو!"

"پسند اور ضرورت میں فرق ہوتا ہے استاد!" میں سمجھ گئی کہ وہ انگریزوں کو بندر کہہ رہا ہے۔ "میرا دل تو خود یہ چاہتا ہے کہ طرح طرح کے لباس پہنوں، مگر ایک تو یہ کہ میرے پاس ایسے لباس ہیں نہیں، بمبئی میں ایسے لباس اونچے ہوٹلوں میں اور اچھی جگہوں پر چلتے بھی نہیں، دوسرے وہی بات ہے جو تمہارا لونڈا کہتا ہے۔ ویسے میں دوسرا ہاتھ دکھانے سے پہلے یہ سوچ ضرور رہی تھی کہ حلیہ بدل لوں۔ تم مل گئے ہو تو اب مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہو گی۔ میرے لئے دو چار اچھی ساڑھیاں لا دینا، مگر ایک شرط ہے استاد! پیسے لینا پڑیں گے تمہیں۔" میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

میری بات سن کر اس نے بڑا جاندار قہقہہ لگایا اور میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"تو راجہ استاد کو ساڑھیاں خریدنے کے لئے پیسے خرچ کرنے پڑیں گے، لعنت ہے راجہ استاد پر۔"

میں دراصل اس سے بات کرتے کرتے یہ بھول جاتی تھی کہ وہ ایک جرائم پیشہ شخص ہے اور دھرم تلے جیسے علاقے میں اس کی "دادا گیری" چلتی تھی۔ جس طرح پولیس کے حلقے بٹے ہوتے ہیں، اسی طرح بڑے شہروں میں غنڈوں کے علاقے بھی اس زمانے میں بٹے ہوتے تھے۔ ایک غنڈا دوسرے کے علاقے میں واردات نہیں کرتا تھا۔ غنڈوں کی الگ اپنی "حکومت" تھی اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ پورا تعاون کرتے تھے۔ کلکتے کی زیر زمین دنیا کے بارے میں راجہ استاد سے مجھے ان دنوں بہت کچھ معلوم ہوا، مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ اس وقت تو میں محتاط ہو گئی تھی کہ میرے کسی طرز عمل یا گفتگو سے راجہ استاد کو مجھ پر شک نہ ہو جائے۔ ابتدا میں اسے میں کوئی معمولی نوسرباز، چور یا اچکا ہی سمجھی تھی، مگر وہ اس سے آگے کی شے تھا اور رفتہ رفتہ مجھ پر کھلتا جا رہا تھا۔ ہاں اس کے کھرے پن نے مجھے ضرور متاثر کیا تھا۔ جو اس کے دل میں تھا، زبان پر تھا۔

"استاد! میں تو صرف اس لئے پیسے دینے کو کہہ رہی تھی کہ میری وجہ سے تمہارے دھندے پر فرق نہ پڑے۔ ظاہر ہے تمہارا کوئی لونڈا مال اٹھائے گا تو میری وجہ سے اس کا حصہ بھی مارا جائے گا۔ بولو، ٹھیک کہہ رہی ہوں میں؟" میں نے بات بنائی۔

"ہرگز ٹھیک نہیں کہہ رہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔ "ارے اللہ کی نیک بندی، ہم تمہیں تمہارا حصہ دیں گے یا الٹا تم سے اپنا حصہ لیں گے؟"

"بغیر کچھ کئے دھرے میں ایک پائی بھی نہیں لوں گی استاد! یہ اچھی طرح سمجھ لو۔ میں اپنا شکار خود کرتی ہوں، یہ میرا اصول ہے۔ اگر تم نے اس معاملے میں گڑبڑ پھیلائی تو میں یہاں سے ریس لگا جاؤں گی۔ ساڑھیوں کی حد تک چلو تمہاری بات مان لیتی ہوں۔"

میری بات ختم ہوئی تھی کہ شانتی ایک ٹرے میں رس گلے، رس ملائی اور چائے لے کر آ گئی اور میرے سامنے رکھنے لگی کیونکہ اب میں آرام سے گدے پر بیٹھی تھی۔ راجہ استاد بھی میرے سامنے ہی آ بیٹھا تھا۔

"یہ کیا بدذوقی ہے استاد!" میں بے تکلفی سے بولی۔ "رس گلے کھا کر منہ اتنا میٹھا ہو جائے گا کہ

چائے پھیکی لگے گی۔ میں تو صرف چائے پیوں گی۔"

"کھا کر تو دیکھیں جی!" شانتی نے مجھ سے کہا۔ "سرکار کی دکان کے ہیں' رات کو ہمایوں لے کر آیا تھا۔"

"چورنگی پر کلکتے کی سب سے مشہور دکان ہے یہ۔ سارے بنگال میں اس کے رس گلے مشہور ہیں۔" استاد نے بھی شانتی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"چاہے سارے ہندوستان میں مشہور ہوں مگر اس وقت ہرگز نہیں کھاؤں گی' پھر کبھی سہی۔"

"میں تو کھاؤں گا بھئی!" استاد نے پلیٹ میں سے پورا ایک رس گلہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔

"تم بھی آ جاؤ نا!" میں نے شانتی سے کہا۔

"میں ہمایوں کے ساتھ کھاؤں گی' آپ کھائیں۔"

"ہمایوں کے بغیر نوالہ نہیں توڑتی یہ!" راجہ استاد بول اٹھا۔

"پتی ورتا (شوہر پرست) معلوم ہوتی ہے شاید!" میں نے فقرہ لگایا اور شانتی کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔

بڑی بھرپور لڑکی تھی وہ۔ دھانی ساڑھی میں تو اور غضب ڈھا رہی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کا کاجل جیسے باتیں کر رہا تھا۔ رنگ سانولا مگر چہرہ بلا کا پرکشش تھا۔ میں نے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھا تو کہیں کوئی کمی نظر نہیں آئی' قد مناسب اور جسم متناسب تھا۔

"تو جا کام کر جب ضرورت ہو گی بلا لوں گا۔" اس نے اس سے کہا اور وہ اپنی جھانجر بجاتی ہوئی چلی گئی۔ پھر استاد نے مجھ سے پوچھا۔ "تمہیں کب چاہئیں ساڑھیاں؟"

"کل دوپہر تک لا دینا' شام کو جانا ہے مجھے۔ چار ساڑھے چار بجے تک نکل جاؤں گی۔" میں نے بتایا۔

"اور واپسی؟"

"کچھ پتا نہیں' ویسے تم لوگ کب تک سو جاتے ہو؟" میں نے معلوم کیا۔

"گیارہ بارہ بج ہی جاتے ہیں۔" راجہ استاد نے جواب دیا۔ "دس بجے تک تو ہمایوں ہی لوٹتا ہے۔ کہیں یار دوستوں میں اگر چسکا لگانے بیٹھ جائے تو گیارہ بھی بج جاتے ہیں اور اس روز مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسا' پھر خود ہی بتانے لگا۔ "شانتی جھاڑ کے چیتھڑے کی طرح اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ خوب لڑتے ہیں دونوں' کبھی کبھار مار پیٹ کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔"

"اور تمہیں مزہ آتا ہے استاد!" میں چائے کا گھونٹ لے کر بولی۔

"اس لئے مزہ آتا ہے کہ لونڈا میری تو سنتا نہیں۔ لاکھ کہہ لوں کہ ابے شرافت کے ساتھ گھر میں بوتل لا کے پی پلا لیا کر مگر ہاں ہوں کر کے ٹال جاتا ہے۔ شانتی جب سرزائی لگاتی ہے تو سالے کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اس نے باہر بھی کچھ لونڈیاں پال رکھی ہیں اور میں نے یہ بات شانتی کو بتا دی ہے۔"

"معاف کرنا استاد! یہ بہت بری بات ہے۔ تمہیں ان دونوں میں پھوٹ نہیں ڈلوانا چاہئے۔"

"پھوٹ نہیں ڈلواؤں گا تو لڑیں گے کیسے اور نہیں لڑیں گے تو مجھے مزہ کیسے آئے گا۔" راجہ استاد نے ہنس کر کہا' پھر بولا۔ "اچھا تم آرام کر لو کچھ دیر' میں تمہارے لئے ساڑھیاں لے کر آتا ہوں۔" اس نے چائے کا آخری گھونٹ لیا۔

"ہو سکے تو ایک برقع بھی پکڑ لانا۔"

"برقع .... کیا کہہ رہی ہو تم!"

"کیوں' برقع بھی تو کسی آڑے وقت پر کام آ سکتا ہے استاد!"

"گھر میں ہے نا برقع! شانتی اور تمہارے جسم میں زیادہ فرق نہیں ہو گا۔ ہمایوں اسے برقع اڑھا کر ہی گھمانے پھرانے لے جاتا ہے۔ اس نے تو برقعوں کی لائن لگا دی تھی شروع میں۔ مگر شانتی بہت چلتی ہے برقع پہننے سے' کہتی ہے میرا سانس گھٹتا ہے برقع میں۔ طرح طرح کے قدیم و جدید برقع ہیں۔ مجھے ان میں ٹوپی دار برقع سب سے زیادہ پسند ہے۔" یہ کہہ کر استاد زور سے ہنس پڑا۔ "شانتی کی تو میں نے چڑ بنا لی ہے۔ ادھر میں نے اس کے سامنے ٹوپی دار برقع کا نام لیا' ادھر وہ بھنبھنانے لگی۔ مجھ پر تو خیر اس کا بس نہیں چلتا البتہ ہمایوں کی کم بختی آ جاتی ہے۔"

پھر راجہ استاد اٹھ کر چلا گیا اور میں کمرے سے نکل کر گھر کا جائزہ لینے لگی۔ گھر کا عقبی دروازہ بھی موجود تھا' مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا۔

تینوں کمروں کے درمیان خاصی جگہ تھی۔ وہیں دائیں جانب باتھ روم وغیرہ تھا۔ میں جس کمرے میں تھی اسی کے مقابل ہمایوں اور شانتی کا کمرہ تھا۔ اسی کے برابر کچن تھا۔ شانتی اس وقت کچن کے سامنے پیڑھی بچھائے دال چن رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے سینی زمین پر رکھی اور بولی۔ "میں آپ کے لئے مونڈھا لاتی ہوں۔" وہ اٹھی اور بائیں جانب راجہ استاد کے کمرے سے ایک مونڈھا اٹھا لائی۔ "اس پر بیٹھیں۔" وہ پھر پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

اگر میں اسکرٹ پہنے ہوئے نہ ہوتی تو قریب پڑی دوسری پیڑھی پر بیٹھ جاتی۔ اندر کمرے میں بھی مجھے گدے پر بیٹھتے ہوئے قدرے دشواری ہوئی تھی۔ سو میں آرام سے مونڈھے پر بیٹھ گئی اور اسے مخاطب کیا۔ "شانتی! تمہیں اپنے.........."

"میرا نام صبیحہ ہے جی!" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

"تم کہتی ہو تو صبیحہ سہی' مگر مجھے شانتی زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

"لگتا ہے بابا نے آپ کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"اپنا جان کر۔" میں نے کہا۔ "میرا نام رانی ہے شانتی! تم مجھے اپنی بہن .... چھوٹی بہن سمجھ سکتی ہو۔"

"بہن!" وہ دال چنتے چنتے رک کر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی اور پھر میں نے اس کی حسین آنکھوں میں نمی سی تیرتے دیکھی۔

"کیوں' کیا تمہاری کوئی چھوٹی بہن بھی ہے؟"

"تھی مگر بچپن میں مر گئی۔" اس نے بھرائی ہوئی سی آواز میں جواب دیا۔ "چیچک نکلی تھی اسے' بس جھٹ پٹ ہو گئی۔" پھر اس نے طویل سانس لی۔ "میں اسے گڑیا رانی کہتی تھی۔ مجھ سے سات آٹھ سال چھوٹی تھی وہ۔ بڑا چاؤ تھا مجھے بہن کا' پانچ بھائی ہیں میرے۔ دو بڑے' تین چھوٹے' گڑیا رانی سب سے چھوٹی تھی۔ پانچ ہی سال کی تو ہوئی تھی وہ کہ .... کہ چلی گئی۔" شانتی کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔

نادانستگی میں' میں نے اس کے زخموں کو کرید دیا تھا' مجھے اس پر دکھ ہوا۔ کچھ دیر بعد جب اس نے اپنی ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھ لئے تو میں بولی۔ "میرا نام بھی تو رانی ہے۔" میری آواز میں نرمی تھی۔ "تم مجھے گڑیا رانی کہہ لیا کرو!"

اس پر وہ خلاف توقع ایک دم ہنس پڑی۔ "اتنی بڑی گڑیا رانی!"

میں خفیف سی ہو کر رہ گئی' مگر اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا اور اس کی ہنسی کا ساتھ دینے لگی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد راجہ استاد لوٹ آیا۔ وہ میرے لئے پانچ ساڑھیاں لے کر آیا تھا جن میں سے ایک بنارسی بھی تھی۔ شانتی اس دوران میں کھانا پکا چکی تھی۔ استاد نے اسے گویا خوشخبری سنائی۔ "ہمایوں بھی مل گیا تھا' اس سے آج میں نے جلدی آنے کو کہہ دیا ہے۔"

شانتی کھل اٹھی اور پھر اس نے منہ ہاتھ دھو کر بناؤ سنگھار شروع کر دیا۔ میں ایک ساڑھی لے کر اس کے کمرے میں گھس گئی کیونکہ مجھے ساڑھی باندھنا نہیں آتی تھی۔ جب وہ "سات سنگھار" سے فارغ ہو گئی تو میں نے اس سے کہا۔ "اب تم مجھے ساڑھی باندھنا سکھا دو۔" وہ اب مجھ سے خاصی بے تکلف ہو چکی تھی۔

"ارے' تمہیں ساڑھی باندھنا بھی نہیں آتا!" اس نے دیدے مٹکائے۔

"اگر آتا تو تم سے کیوں سیکھتی؟"

"اچھا ادھر دو ساڑھی' میں بتاتی ہوں۔" اس نے میرے ہاتھ سے ساڑھی لے لی۔

اسے میں نے دو تین مرتبہ ساڑھی باندھتے اور کھولتے دیکھا۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ استاد اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے اس کی ایک جھلک دیکھی' وہ نوٹ گن رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی اور دروازہ بند کرنے کے بعد بغلی گلی میں کھلنے والی کھڑکی بھی بھیڑ دی۔ ساڑھی کے رنگ سے میچ کرتا ہوا ایک بلاؤز بھی میں' شانتی سے لے کر آئی تھی۔ پھر جب میں ساڑھی باندھ کر کمرے سے نکلی تو شانتی نے تیزی سے آگے بڑھ کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور پھر پیار کر لیا۔

"ارے یہ کیا لپٹا چپٹی ہو رہی ہے' بیچ بجار میں!" راجہ استاد اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے ہنس کر کہنے لگا۔

"تم میرے ساتھ آؤ۔" شانتی مجھے اپنے کمرے میں گھسیٹ کر لے گئی۔

"کیا آفت ہے' ہاتھ تو چھوڑو میرا۔"

"آفت تو میں تمہیں بتاؤں گی اب' ادھر بیٹھو مونڈھے پر۔"

پھر شانتی نے اپنی ہی طرح میرا بھی سنگھار کر دیا۔ جب اس نے مجھے آئینہ دکھایا تو میں اپنا ہی چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میں عموماً اپنے بال کھلے رکھتی تھی۔ اس نے جُوڑا باندھ دیا تھا اور چہرے پر بھی خاصی محنت کی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ نضار یا احرس بھی مجھے اس حال میں دیکھ لیں تو نہ پہچان سکیں۔

"کہاں کھو گئیں رانی جی کیا کوئی یاد آنے لگا؟" معلوم نہیں کیسے اس لڑکی نے میرے دل کا چور پکڑ لیا۔

"بالکل غلط!" میں صاف مکر گئی۔

"اچھا اب چلو' پاپا کے کمرے میں چلتے ہیں۔ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں؟" شانتی بولی اور اسی وقت دور سے دروازے پر دستک سنائی دی۔ "ہمایوں آ گیا شاید!"

"کھولتا ہوں یار!" باہر سے استاد کی آواز آئی۔

میں' شانتی کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ ہمایوں کو دیکھنے کا خود میرے دل میں بڑا تجسس تھا کیونکہ اتنی دیر سے اس کے تذکرے سن رہی تھی۔ میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ آنے والا وہی ہو گا۔ راجہ استاد نے اسے شاید میری وجہ سے جلدی گھر بلا لیا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک وجیہہ نوجوان کو میں نے استاد کے ساتھ آتے دیکھا۔ اس کا رنگ گورا اور قد پورا تھا۔ وہ پینٹ اور بش کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بال گھنگریالے تھے اور ایک لٹ ماتھے پر جھوم رہی تھی۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی' پیروں میں سیاہ چمکدار بوٹ تھے اور ہاتھ میں انگریزی شراب کی ایک بوتل۔ وہ کسی بھی طرح راجہ استاد سے میل نہیں کھاتا تھا۔

"رانی! یہ ہے میرا لونڈا ہمایوں.........." راجہ استاد نے اس سے میرا تعارف کرایا۔

ہمایوں مبہوت سا مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ استاد کی آواز پر چونک اٹھا۔

"ابے! دیدے پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھے جا رہا ہے' یہی ہے بمبئی کی رانی جس کا میں نے تجھ سے ذکر کیا تھا۔" راجہ استاد نے اس کی پشت پر ایک دھپ رسید کر دی۔

"معاف کرنا استاد! یہ .... یہ کوئی اور .... تم نے تو بتایا تھا کہ.........."

"بتایا ہو گا بے' لعنت پڑھ۔"

"یہ میں آپ کے لئے لایا تھا۔" ہمایوں نے شراب کی بوتل میری طرف بڑھائی۔ "اسکاچ ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر شکریہ ادا کیا' پھر بولی۔ "میں شراب نہیں پیتی' مگر تم محبت سے لائے ہو تو قبول کر لی۔" اس کے بعد میں نے شانتی کی طرف مڑ کر کہا۔ "تم تو پی لیتی ہو' نا!" اس نے سر ہلا دیا۔ "تو پھر میری طرف سے بطور تحفہ تمہارے اور ہمایوں کے لئے۔"

"یہ سخت ناانصافی ہے رانی!" راجہ استاد بولا۔ "اس میں میرا بھی حصہ ہو گا بلکہ .... تم نہیں پیو گی تو تمہارا حصہ بھی میرا۔"

"استاد اکیلے ادھا ڈکارنے کے چکر میں ہیں۔" ہمایوں پہلی بار ہنسا۔ "دیکھ لے تُو!" وہ شانتی سے

مخاطب تھا۔

"میرے پاپا ہرگز ایسے نہیں ہیں۔ وہ تو اپنا پوا بھی ہم دونوں کو دے دیں گے اور رانی تو ہے ہی میری بہن۔"

"لوٹ لو' تم دونوں مل کے مجھے اور اے لونڈیا! تو نے رانی پہ بھی ہاتھ صاف کر دیا.......... اچھا کیا کھڑے کا ٹکٹ لیا ہے سب نے؟ چل بھئی رانی ادھر کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ ساڑھی باندھ کر تو تم پہچان میں نہیں آ رہیں؟"

"پکایا کیا ہے آج تو نے؟" ہمایوں نے شانتی سے پوچھا۔

"پاپا نے کہا ارد کی دال پکا لوں"

"لعنت!"

"اے پاپا پر یا ارد کی دال پر؟"

"دونوں پر!" میں نے گرہ لگائی اور ہنس پڑی۔ راجہ استاد بھی قہقہے لگانے لگا۔

"اسکاچ کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔" ہمایوں نے منہ بنایا۔

"تو جا کر کباب شباب پکڑ لا' روکا کس نے ہے؟" راجہ استاد بولا۔ "میں نے تو کہا تھا اس سے گوشت پکا لے مگر.........."

"دیکھو پاپا' جھوٹ نہیں چلے گا۔" شانتی بات کاٹ کر بولی پھر میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "تجھے اگر میری بات پر وشواس نہیں تو رانی سے پوچھ لے۔"

"چپ ہو جا' اس سے پوچھ لے .... اس سے پوچھ لے۔" ہمایوں نے شانتی کو ڈانٹ دیا۔

"میں آتا ہوں ابھی کباب لے کر۔"

"اور سنو ہمایوں! استاد کی باتوں میں نہ آنا' انہوں نے کباب شباب دونوں کے لئے کہا تھا' تم صرف کباب لانا۔"

ہمایوں نے آگے بڑھتے ہوئے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں' راجہ استاد کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئی۔

"استاد! تم خود ہی اپنے لونڈے کو غلط ترغیب دیتے ہو اور پھر شکایت کرتے ہو۔ شباب تو اس کے لئے یہاں پہلے سے آنکھیں بچھائے کھڑا تھا۔" میں یہ کہتے ہوئے ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔

"ہے بڑا حرامی یہ۔" راجہ استاد نے مجھ سے کہا۔ "بھلا بتاؤ' تمہی کو تکنے لگ گیا تھا' بس ایک دفعہ خون لگ جائے منہ سے تو پھر آدمی اپنا پرایا نہیں دیکھتا۔ تم برا نہ ماننا!"

"نہیں استاد! میں اتنی پیدل نہیں ہوں۔"

راجہ استاد کے گھر کا ماحول بہت کھرا اور سچا تھا۔ خود کو بھی میں نے اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک جرائم پیشہ عورت کا کردار اچھی طرح ادا کر سکوں۔ یہ ماحول میرے لئے نیا ہونے کے باوجود دلچسپ اور پرلطف تھا۔ یہاں کوئی منافقت تھی نہ کوئی کھوٹ۔

اس رات ہم سب نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے ہمایوں نے بوتل بھی کھول لی تھی۔ شراب کی بو مجھے ناگوار تو محسوس ہوئی مگر اس پر میں نے اعتراض نہیں کیا۔ اس بہانے میں نے اپنے لئے الگ پلیٹ میں کھانا نکال لیا تھا۔ وہ تینوں' یعنی راجہ استاد' ہمایوں اور شانتی ایک ہی بڑی پلیٹ میں کھا رہے تھے۔ دوسری بڑی پلیٹ میں انہوں نے کباب نکال لئے تھے۔ دال واقعی مزیدار پکی تھی۔ مرد اور عورت کے پکے ہوئے کھانے میں جو فرق ہوتا ہے' وہ نمایاں تھا۔ وہ لوگ دال کم اور کباب زیادہ کھا رہے تھے' اس کے ساتھ شراب کی چسکیاں بھی لگاتے جا رہے تھے۔ جب بھی ہمایوں نئے پیگ بناتا' راجہ استاد اپنی جیب سے ماچس نکال کر گلاس کے قریب رکھ دیتا اور کہتا' دیکھ بے لونڈے بے ایمانی نہیں چلے گی۔ جو لوگ ناپ تول میں بے ایمانی کرتے ہیں' انہیں بڑا گناہ ملتا ہے۔

"تمہیں تو وہم ہو گیا ہے استاد! جتنی میرے گلاس میں ہے' اتنی ہی تمہارے گلاس میں ڈالی ہے۔" ہمایوں جھنجلا کر کہتا۔

"تو پھر بدل لے گلاس۔" راجہ استاد' ہمایوں کا گلاس اٹھا لیتا۔

"مجھ پر بھروسہ نہیں تو شانتی کو بوتل دیئے دیتا ہوں۔"

"تیری یہ چال بھی جانتا ہوں میں' تو نے شانتی کو پہلے ہی سے سانٹ رکھا ہے' دو چار بوندیں یہ تیرے گلاس میں ضرور زیادہ ڈالے گی۔"

شراب چاہے کم ہو یا زیادہ شرابی اسی طرح ایک ایک بوند پر ایک دوسرے سے حجت کرتے ہیں۔ یہ تماشا پہلی بار میں نے راجہ استاد ہی کے گھر میں دیکھا۔ بہرحال وہ تینوں پیتے رہے' میں نے شانتی کی آنکھوں میں گلابی ڈورے دیکھے۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آنے لگی تھی۔ اس کی حالت کچھ ایسی تھی ۔

یوں گرا جاتا ہے مستی میں کوئی
کہ اٹھا لے کوئی ساغر کی طرح

اور یہ "ساغر" اٹھانے والا وہاں موجود تھا۔ بوتل میں تھوڑی سی شراب رہ گئی تو ہمایوں بولا۔

"استاد! یہ کل کے لئے رکھ لوں؟ تمہارا حصہ تو پورا ہو گیا نا!"

راجہ استاد ترنم سے ایک شعر پڑھنے لگا ۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

بہ مجبوری جو شراب بچ گئی تھی' وہ بھی ہمایوں نے اپنے اور استاد کے گلاس میں انڈیل لی۔ شانتی اس پر کنمنائی تو ہمایوں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "بس کر' اپنے پیروں پر چل کے کمرے تک جانا ہے کہ میری گود میں جائے گی؟"

کھانا کبھی کا ختم ہو چکا تھا اور اب صرف دور ساغر چل رہا تھا۔ پھر بھی میں ان لوگوں کی خوشنودی کی خاطر وہاں سے اٹھی نہیں۔ یہ محفل راجہ استاد کے کمرے میں جمی ہوئی تھی۔ شرابیوں کی اکثریت میں

ظرف نہیں ہوتا۔ وہ پیتے کم چھلکتے زیادہ ہیں' مگر راجہ استاد اور ہمایوں شاید اہل ظرف میں سے تھے۔ انہیں میں نے بہکتے ہوئے نہیں دیکھا البتہ شانتی کے قدم اس وقت اِدھر اُدھر ضرور بہک رہے تھے۔ جب ہمایوں اس کا بازو تھامے کمرے کی طرف لے جا رہا تھا وہ کسی بیل کی طرح ہمایوں سے لپٹی جا رہی تھی۔

"برداشت نہیں تو اتنا ڈکوس کیوں لیتی ہے؟" ہمایوں اسے سنبھال کر لے جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اچھا استاد' میں بھی چلتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میری نظر برتنوں پر پڑی جو اسی طرح پڑے تھے۔ میں برتن سمیٹنے لگی کہ انہیں باورچی خانے میں رکھ آؤں کیونکہ پینے کے بعد شانتی کے لئے چلنا ہی محال ہو رہا تھا تو برتن کیا اٹھاتی۔

ابھی میں نے دو ایک پلیٹیں ہی اٹھائی تھیں کہ استاد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "یہ کیا کر رہی ہو تم! ہمایوں آ کر اٹھائے گا برتن۔"

"شانتی آنے دے گی جب نا' تم اس کی حالت نہیں دیکھ رہے تھے استاد!"

"آئے گا کیسے نہیں؟" یہ کہہ کر استاد نے ہانک لگائی۔ "ہمایوں .... ابے او ہمایوں! وہیں چپک گیا کیا؟"

"ابھی آیا استاد! ذرا اسے لٹا دوں۔" جواب میں ہمایوں کی آواز سنائی دی۔

پھر میں وہاں مزید نہیں رکی۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے ساڑھی اتارنے کے بعد میں نے سلیپنگ گاؤن پہن لیا اور پھر گدے پر لیٹ گئی۔

ہر چند کہ وہاں میرے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا' پھر بھی میں نے احتیاطاً دروازہ بند ہی رہنے دیا۔ کھانا کھا کے عموماً میں ٹہلتی تھی' رات کو' مگر آج مجھے یہ موقع نہیں ملا تھا پھر یہ کہ کھانا کچھ زیادہ بھی کھا لیا تھا۔ لائٹ میں پہلے ہی آف کر چکی تھی۔ کچھ دیر تو میں نے کوشش کی کہ ٹہلے بغیر ہی نیند آ جائے' پھر اٹھ کر کمرے ہی میں ٹہلنے لگی۔ گدا تقریباً آدھے کمرے میں بچھا ہوا تھا اس لئے میں نے سوچا' کمرے کے باہر خاصی جگہ ہے' وہاں ٹہل لیتی ہوں زیادہ سے زیادہ چپل نہیں پہنتی تاکہ کسی کی آنکھ نہ کھلے۔ یہی سوچ کر میں نے دھیرے سے کنڈی کھولی اور پھر دروازے کے پٹ کھولنے لگی۔ اس وقت جھانجر کی چھن کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی' پھر چوڑیوں کی چھن چھن سنائی دی اور مجھے شانتی کا خیال آیا۔ اس وقت کمرے سے نکلنا بری بات ہے۔ میں نے سوچا اور ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔ یہ آوازیں سامنے والے کمرے ہی کی طرف سے آ رہی تھیں۔ میں اب اتنی بچی بھی نہیں تھی کہ ان آوازوں کا مطلب نہ سمجھ پاتی۔ ہمایوں کے کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی' مگر دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ پھر یہ آوازیں معدوم ہو گئیں اور ذرا ہی دیر بعد ہمایوں کو میں نے کمرے سے نکلتے دیکھا۔ میں دروازے کی آڑ میں ہو گئی۔ ہمایوں باتھ روم کی طرف گیا تھا۔ میں سوچنے لگی' چلو اب یہ لوگ سو جائیں گے' میں باہر ٹہل لوں گی۔ میں اسی وجہ سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔ جلد ہی مجھے باہر ہمایوں کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اسی کے ساتھ میں نے راجہ استاد کی تیز سرگوشی سنی۔ "اب ادھر آ جا۔"

ہمایوں کو میں نے تیزی سے استاد کے کمرے میں جاتے دیکھا۔ پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ چودہ سال

کی عمر کے ہمایوں' راجہ استاد کے پاس کیوں تھا اور یہ بھی کہ استاد کو شادی کی ضرورت کیوں پیش نہیں آئی تھی۔ اس وقت تک میں نے زندگی کے اتنے رنگ' اتنے مثبت اور منفی رخ نہیں دیکھے تھے۔ اس لئے مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ میرے لئے اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ راجہ استاد کا لہجہ ہمایوں کا ذکر کرتے ہوئے روایتی عاشقوں جیسا کیوں ہو جاتا ہے۔ فارسی شاعر شیخ سعدی نے ایک خوبصورت ہندو لڑکے کے رخسار پر تل دیکھ کر یوں ہی تو سمرقند و بخارا بخش دینے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ یہ ایک اور ہی جہان تھا جس کے متعلق مجھے بہت بعد میں علم ہوا۔ اس وقت تو میں' استاد کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتی ہوئی دروازے میں کنڈی ڈال کر بستر پر آ لیٹی تھی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح ہم سبھی نے دیر سے ناشتہ کیا۔ شانتی مجھ سے کچھ جھینپ رہی سی تھی۔ شاید رات کو نشہ ہو جانے کے سبب' استاد اور ہمایوں کا رویہ حسب معمول تھا۔ بس اتنا ضرور ہوا کہ ایک مرتبہ راجہ استاد نے گزشتہ روز ہی کی طرح ہمایوں کو ضرور ڈانٹا۔ "ابے تجھے اتنا خیال بھی نہیں کہ یہ تیری کھال میں بھس بھر سکتی ہے۔ دیکھ رہا ہے نظر بچا بچا کے۔ رانی نام ہے اس کا رانی۔ تُو نے شاید اس کے قصے نہیں سنے۔ اس کی ظاہر عمر پہ نہ جا' یہ عمر چور ہے۔ کم سے کم بھی چوالیس پینتالیس کی ہو گی۔ بیس سال سے تو میں اس کے قصے سن رہا ہوں۔ بیسیوں کو تو مٹی کے نیچے سلا چکی ہے' تُو کس کھیت کی مولی ہے سالے! میری وجہ سے تجھے طرح دے رہی ہے اور تُو ہے کہ چمار کی طرح اینٹھے جا رہا ہے۔"

اس کے بعد ہمایوں نے مجھے نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ وہ کچھ خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ جو کچھ راجہ استاد نے کہا تھا' میں نے اس کی تردید ضروری نہیں سمجھی۔

"چھوڑو استاد! بچہ ہے ابھی۔ آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا۔" میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ فضا پہلے ہی کی طرح خوشگوار ہو گئی۔ اس میں میری کوشش کو زیادہ دخل تھا۔ شانتی نے حلوہ پوری اور آلو کی بڑی مزیدار بھجیا بنائی تھی۔ میں نے ڈٹ کے ناشتہ کیا اور شانتی کی تعریف کرنے میں بھی بخل سے کام نہ لیا۔

راجہ استاد اور ہمایوں ناشتہ کر کے گھر سے نکل گئے۔ میں اور شانتی گھر میں رہ گئے۔ ابھی تک میں سلیپنگ گاؤن ہی پہنے ہوئے تھی۔

"تم صرف ساڑھی ہی باندھتی ہو شانتی' یا تمہارے پاس دوسرے کپڑے بھی ہیں؟" میں نے شانتی سے پوچھا۔ وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی اور میں اس کے ساتھ باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھی۔

"ساڑھی تو بس گھر میں باندھتی ہوں۔" اس نے چولھے پر ہانڈی چڑھاتے ہوئے میری بات کا جواب دیا۔ "ہمایوں کہیں باہر گھمانے لے جاتا ہے تو قمیض شلوار اور آڑا پاجامہ ہی پہنواتا ہے۔ اس اُڑے پجامے سے تو میری جان جلتی ہے اور پاپا کو دیکھو ہر عید' بقرعید پہ گھر میں بھی یہی کم بختی مارا آڑا پاجامہ پہننے کو کہتے ہیں۔ ہمایوں کو تو بس موقع ملنا چاہئے' فوراً پاپا کی ہاں میں ہاں ملانے لگتا ہے۔ سکون تو

بس ساڑھی میں ملتا ہے۔"

"اپنی اپنی عادت کی بات ہے۔ تم نے دراصل بچپن سے ساڑھی باندھی ہے اس لئے وہی اچھی لگتی ہے۔ اچھا سنو' آج تم میری ایک فرمائش پوری کرو گی؟"

"بولو!"

"تم روٹی ہنڈیا کر لو' پھر نہا دھو کے بنارسی ساڑھی باندھ لینا۔"

"وہ تو نہیں ہے میرے پاس۔"

"میں دوں گی تمہیں۔"

"وہی جو کل تمہارے لئے پاپا لائے تھے؟"

"ہاں وہی' پسند ہے نا تمہیں؟"

"نہیں' میں وہ ساڑھی نہیں لوں گی۔"

"کیوں؟"

"بہت مہنگی ہے وہ اور .... اور پھر وہ تمہارے لئے لائے تھے پاپا۔ میری ماتا جی کہتی تھیں کہ کسی کو کوئی تحفہ دے کر واپس نہیں لیتے۔"

"تمہاری ماتا جی ٹھیک کہتی ہوں گی مگر وہ ساڑھی تم نے تو مجھے نہیں دی۔"

"پاپا نے تو دی ہے نا' پاپا اور میں کوئی الگ الگ ہیں کیا؟"

"اور میں بھی تو تمہاری چھوٹی بہن ہوں؟"

"ارے ہاں خوب یاد آیا' تم چھوٹی کب ہو مجھ سے' صبح ہی تو پاپا تو بتا رہے تھے کہ تمہاری عمر.........."

"خیر اس بات کو چھوڑو' بہن تو بنایا ہے نا تم نے مجھے۔ بولو نہیں بنایا؟"

"وہ تو بنایا ہے' مگر اب میں تمہیں دیدی (باجی) کہوں گی ہاں!"

"تو پھر جب میں تمہاری دیدی ہوئی تو تم سے الگ کیسے ہو گئی؟"

میری بات پر وہ لاجواب سی ہو گئی' پھر کہنے لگی۔ "ہمایوں مارے گا۔"

"وہ کس خوشی میں؟"

"کہتا ہے' تجھے مارنے میں مزہ آتا ہے۔ بہانہ مل جائے اسے پھر مارے بغیر نہیں چھوڑتا۔ ساڑھی ہی کو بہانہ بنا لے گا' اس کا کیا ہے۔"

"اچھا یہ میرا وعدہ کہ تمہیں اس بہانے نہیں مارے گا وہ۔"

شانتی ان لڑکیوں میں سے تھی جو ہر حال میں اپنے مرد سے نبھا کر لیتی ہیں۔ سیدھی بھی بہت تھی' زیادہ چھل فریب اسے نہیں آتے تھے اور ہمایوں کو کسی دیوتا کی طرح پوجتی تھی۔ ہمایوں کے لئے وہ اس سے زیادہ اور کیا قربانی دیتی کہ شادی بیاہ کے بغیر گھر میں پڑی تھی۔ مجھے اس سے یہ سن کر بھی سخت حیرت ہوئی کہ خود اسے بھی ہمایوں سے پٹ کر مزہ آتا تھا۔ وہ کھانا پکا کر نہا آئی تو میں نے بنارسی ساڑھی بندھوا

ی دی۔ اس کا ایک شلوار سوٹ میں نے لے لیا تھا۔ راجہ استاد اور ہمایوں کھانے کے وقت لوٹ کر آئے تو ہم دونوں ہی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"بول میں کیسی لگ رہی ہوں تجھے؟" شانتی نے ساڑھی کا پلہ درست کرتے ہوئے ہمایوں سے پوچھا۔

"چمریا لگ رہی ہے اور کیا لگے گی!" ہمایوں نے اسے چڑایا۔

"مگر کیوں ری لونڈیا' یہ ساڑھی تیرے پاس.........."

"میں نے دی ہے' ہم دونوں جوڑا بدل بہنیں بن گئی ہیں۔" میں استاد کی بات کاٹ کر بول اٹھی۔

"لو اور سنو' آج تک دوپٹا بدل بہنیں تھیں' یہ جوڑا بدل بہنیں بن گئیں۔" راجہ استاد اپنی عادت کے مطابق زور سے ہنسا پھر مجھ سے کہنے لگا۔ "کمال ہے رانی تم پر تو ہر کپڑا سجنے لگتا ہے۔"

"میری دیدی جو ہیں اس لئے پاپا!" شانتی فخریہ لہجے میں بولی۔

"تُو نے خوب رشتے داری جوڑی رانی سے!" راجہ استاد نے کہا۔ "اچھا چل کھانا نکال کے لا۔"

شانتی اٹھلاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ میں' راجہ استاد کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئی۔ ہمایوں بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ ہرچند کہ مجھے کوئی خاص بھوک نہیں تھی مگر ان لوگوں کا ساتھ دینے بیٹھ گئی۔ راجہ استاد نے غلط نہیں کہا تھا کہ شانتی کو گوشت پکانا نہیں آتا۔ اس نے واقعی گوشت کا "ریڑا" لگا دیا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھا کے میں نے کچھ دیر آرام کیا۔ شلوار سوٹ پہن کر مجھے عجیب سا تو لگا مگر بیٹھنے اٹھنے میں بہت آرام محسوس ہوا۔ ہاں دوپٹہ مجھ سے نہیں سنبھالا گیا۔ اسے میں نے ایک طرف ڈال دیا تھا۔ تین بجے کے قریب میں اپنے کمرے سے نکلی تو شانتی کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ راجہ استاد بھی اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ میں تولیہ لے کر غسل خانے میں گھس گئی۔ نہا کر میں نے ساڑھی باندھی اور پھر دروازہ کھول کر سامنے والے کمرے کی طرف دیکھا۔ دروازہ اب بھی بند ہی تھا۔ باہر نکلی تو راجہ استاد جاگ چکا تھا۔ اس نے مجھے آواز دے لی۔ میں اس کے کمرے میں پہنچی تو پوچھنے لگا۔ "چائے پیو گی؟"

"پیوں گی مگر وہ لیلیٰ مجنوں تو جاگ جائیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہمایوں کے کمرے کا دروازہ بند ہے۔"

"کیا؟" استاد چونک اٹھا۔ "ان حرامیوں کو دن میں بھی چین نہیں' اب یہ نئی کہانی شروع کر دی انہوں نے۔" استاد یہ کہتے ہوئے اٹھا۔

"چھوڑو نا استاد! بچے ہیں۔ ویسے بھی شانتی نے پہلی بار شاید بنارسی ساڑھی باندھی ہے۔"

"ایسی تیسی بنارسی ساڑھی کی' حد کر دی سالوں نے بے غیرتی کی۔ نہ کسی آئے کو دیکھیں نہ گئے کو۔"

وہ تو خیریت گزری کہ راجہ استاد میرے کہنے سننے سے ٹھنڈا پڑ گیا اور کچھ ہی دیر کے بعد ہمایوں کے کمرے کا دروازہ بھی کھل گیا ورنہ کیا خبر کیا فساد برپا ہوتا۔ مجھے شانتی سے صرف اتنا کام تھا کہ گزشتہ روز

کی طرح وہ مجھے بنا سنوار دے۔ مقصد محض حلیہ بدلنا تھا ورنہ مجھے بناؤ سنگھار کی کوئی ایسی خواہش نہ تھی۔

"چائے بناؤں پاپا!" باہر سے شانتی کی آواز آئی۔

"آج بڑی جلدی اٹھ گئی پاپا کی بٹیا!" راجہ استاد جیسے جل بھن کر بولا۔

میں نے باہر نظر ڈالی تو بنارسی ساڑھی کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ شانتی چور چور سی کوئی جواب دیئے بنا باورچی خانے میں گھس گئی۔

"وہ مردود بھی اٹھا یا نہیں؟" راجہ استاد پھر گلا پھاڑ کے چیخا۔

استاد کی گرج سن کر ہمایوں بھیگی بلی بنا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ "ابھی دو منٹ میں تیار ہو تا ہوں استاد!" وہ یقیناً اس وقت استاد کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے استاد کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا کر غصہ ٹھنڈا کیا۔ اسی دوران میں شانتی چائے لے کر گئی۔

"یہ ساڑھی بدل لے' اشتہار بنی پھر رہی ہے بے غیرتی کا۔" راجہ استاد بولے بغیر نہیں چوکا۔ "اس حرامی سے تو میں رات کو نمٹوں گا۔" استاد کا اشارہ ہمایوں کی طرف تھا۔

راجہ استاد اس گھر کا بڑا تھا اور اپنا بڑا پن برقرار رکھنا بھی جانتا تھا۔ ہمایوں اس کا مزاج آشنا تھا اس لئے کپڑے بدل کر اور استاد کا سامنا کئے بغیر باہر ہی سے یہ ہانک لگا کر چلا گیا کہ دھندے پر جا رہا ہوں۔ شانتی نے بھی تعمیل حکم میں ساڑھی بدل لی تھی۔ وہ چائے کے خالی کپ اٹھانے آئی تھی۔

"تم دھندے پر جاؤ استاد! میں بھی اب چلوں گی۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میری واپسی کی فکر نہ کرنا' دیر سویر ہو سکتی ہے۔"

"بس ذرا یہ خیال رکھنا' ہاتھ اوچھا نہ پڑے۔" استاد مسکرا کر بولا۔ "ویسے تو تم مجھ سے زیادہ سمجھدار ہو' میرے کہنے کا برا نہ ماننا۔"

میں بھی مسکراتی ہوئی استاد کے کمرے سے نکل آئی۔ شانتی باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھی۔ میں اسے وہاں سے اٹھا لائی' اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"اب تمہی بتاؤ دیدی اس میں میرا کیا قصور ہے' پاپا خواہ مخواہ مجھے بھی ڈانٹ دیتے ہیں' ہاں نہیں تو!"

شانتی اس وقت مجھے چھوٹی سی کوئی بچی معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ "تم فکر نہ کرو' میں تمہارے پاپا کو ڈانٹ دوں گی بس!"

"اس میں پاپا بیچارے کا کیا قصور ہے' ہمایوں کو ڈانٹیں نا!"

"اسے ڈانٹنے کے لئے تمہارے پاپا کافی ہیں۔ تم جلدی سے میرا جوڑا باندھ دو' مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔" یہ کہہ کر میں مونڈھے پر بیٹھ گئی۔

شانتی نے مجھے گزشتہ روز کی طرح جلد ہی تیار کر دیا' پھر کہنے لگی۔ "دیدی! ٹھہرو میں تمہارے لئے

ایک خاص چیز لاتی ہوں۔ پچھلی عید پر ہمایوں میرے لئے لایا تھا۔"

"نہیں رہنے دو' میں نہیں لوں گی۔" میں نے انکار کر دیا۔

"دے کب رہی ہوں' قنوج کا اصلی روح گلاب ہے' بس تھوڑا سا لگا لو مہک جاؤ گی دیدی!"

وہ کہیں سے ایک شیشی نکال لائی اور پھر خود اپنے ہاتھوں سے روح گلاب لگانے لگی۔ سارا کمرہ گلابوں کی خوشبو سے مہک گیا۔

"واقعی لاجواب چیز ہے۔" میں نے تعریف کی اور کھڑی ہو گئی۔

راجہ استاد اس وقت نہا کر نکل رہا تھا جب میں اپنا پرس تھامے باہر آئی۔ "آج کلکتے والوں کی خیر نہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

میں رخصتی انداز میں اس کی طرف ہاتھ ہلاتی اور مسکراتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

بلڈنگ سے نکلتے ہوئے میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ چاندنی چوک سے ایڈن گارڈن کا فاصلہ خاصا تھا۔ مجبوراً مجھے ہاتھ رکشا میں بیٹھنا پڑا کہ اس کے سوا وہاں کوئی اور سواری نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک تو یہ کہ مجھے پانچ بجے ایڈن گارڈن پہنچنا تھا' دوسرے میں کسی اور جھنجٹ میں بھی پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ میں پہلی بار اس شہر میں حلیہ بدل کے نکلی تھی اور پوری طرح چوکنا تھی۔ آدمی کے لباس اور بالوں کی بناوٹ سے شخصیت پر اتنا اثر پڑ جاتا ہے' یہ اندازہ مجھے پہلی ہی مرتبہ ہوا تھا۔ رکشا والے نے مجھے پانچ منٹ قبل ہی میری منزل تک پہنچا دیا۔ کرایہ ادا کر کے میں گارڈن کی طرف چلنے لگی۔ میں سوچ رہی تھی کہ آج ارشاد حسین کے ہندو بنگالی دوست انیل چودھری کو بھی مجھے پہچاننے میں دشواری ہو گی۔ خود اس کا بھی کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ وہ کس بھیس میں ہوتا۔ میں اس لئے کچھ فکرمند سی تھی۔ ارشاد حسین نے پانچ سے چھ بجے شام تک کا وقت دیا تھا کہ انیل چودھری' ایڈن گارڈن میں ملے گا۔ اسی کا تعاقب کرتے ہوئے مجھے اس جگہ تک پہنچنا تھا جہاں ارشاد حسین سے میری ملاقات ہونا تھی۔ اس نے ملاقات کی جگہ نہیں بتائی تھی ورنہ میں خود وہاں تک پہنچ جاتی۔ حسب توقع ٹھیک پانچ بجے انیل چودھری مجھے گارڈن میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ آج وہ انگریزوں کا کوئی پٹھو معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے سر پر ہیٹ اور ہاتھ میں پائپ تھا۔ میری نظر کیونکہ داخلے کے دروازے ہی پر لگی ہوئی تھی اور میں اس سے پہلے وہاں پہنچ گئی تھی اس لئے اسے پہچاننے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

ایک مرتبہ انیل چودھری انگریزوں کے سے انداز میں گردن ٹیڑھی کئے میرے قریب سے گزر گیا اور میں نے بھی اسے دانستہ نہیں ٹوکا۔ میں اپنے بدلے ہوئے حلئے کا امتحان لے رہی تھی اور اس امتحان میں مجھے کامیابی ہوئی تھی۔ کچھ دور جا کر وہ پلٹا تو میں اجنبیوں کی طرح اس کی طرف بڑھی اور پھر جب وہ قریب آیا تو آہستہ سے "خیرخواہ" کہا۔ پہلے بھی شناختی الفاظ یہی تھے' مگر آج یہ الفاظ میں نے ادا کئے تھے۔ وہ تقریباً اچھل پڑا اور شاید گھبراہٹ میں پائپ کا اتنی زور سے کش لیا کہ کھانسنے لگا۔ میں اگر خود پر قابو نہ رکھتی تو میری ہنسی چھوٹ جاتی۔ انیل چودھری نے جس طرح دو مرتبہ مجھے غچہ دیا تھا' میں نے آج اس کی کسر پوری کر دی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ "بے نکیل اونٹ" کدھر کا رخ کرے گا اس لئے

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی ایک عمر میں ہوا معلوم

اردو' ہندی' عربی' فارسی' انگریزی اور دنیا کی دوسری زبانوں کے شعر و ادب سے مجھے بہت بعد میں دلچسپی پیدا ہوئی اور تقریباً تمام ہی زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا لیکن اب جبکہ اپنی پُراسرار سرگزشت رقم کر رہی ہوں مجھے ان باتوں کا بھی تھوڑا بہت علم ہے جو اس وقت معلوم نہیں تھیں۔ سو اسی سبب کبھی کبھار یادوں کے نہاں خانے سے موقع محل کے مطابق کوئی شعر شعور کی سطح پر آ جاتا ہے۔ وہ بات جو دفتر کے دفتر لکھ کر نہ کہی جا سکے صرف ایک شعر کے دو مصرعوں میں بیان کر دی جاتی ہے۔ سمندر کو کوزے میں بند کرنا اسی کو تو کہتے ہیں۔ شاعری بڑے سلیقے سے جگر خوں کرنے کا نام ہے۔ زندگی اپنے پورے جمال و جلال کے ساتھ شاعری میں اپنا ظہور کرتی ہے۔ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں اور اس کا لفظوں میں اظہار نہیں کر پاتے' شاعر جب لفظوں کی مالا میں اسے پرو دیتا ہے تو ہمیں لگتا ہے' یہی تو ہمارے دل میں تھا اور شاعری کا یہی کمال ہے۔ شاعر ہمارے احساس کو زبان عطا کر دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی میں جتنا پھیلاؤ' کرختگی اور کھردرا پن ہے جوں کا توں صرف شاعری میں بیان کرنا' ممکن نہیں' یہ اظہار کی ایک سمت قصہ گوئی بھی ہے اور میں نے بھی اپنی آپ بیتی بیان کرنے کے لئے اس کو ذریعہ بنایا ہے۔ میرے بیان میں یقیناً لطافت کے ساتھ ساتھ کثافت بھی ہے۔ یہ کثافت بھی زندگی ہی کا حصہ ہے جس سے اجتناب ناممکن ہے۔ اگر یہ کثافت کسی کی طبع نازک پر گراں ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے اب تک وہی سب کچھ بیان کیا ہے جو مجھ پر گزر چکا ہے اور وہی آئندہ بیان کروں گی۔ زندگی کبھی یک رخی نہیں ہوتی۔ وہ جو اسرار و فسوں پر یقین نہیں رکھتے اور حقیقت نگاری کا دعویٰ کرتے ہیں' کیا ان میں اتنی ہمت ہے کہ الہامی کتابوں کو بھی جھٹلا دیں؟ اس کے لئے صرف ایک ہی مثال کافی ہے۔ کیا فرعون مصر کے ساحروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رسیاں پھینک کر انہیں سانپ نہیں بنا دیا تھا؟ اور کیا حضرت موسیٰ کا عصا اژدھا بن کر ان سانپوں کو نہیں نگل گیا تھا؟ ہے یوں کہ آدمی اسرار کائنات جاننے کے لئے ایک پردہ اٹھاتا ہے تو ستر پردے اسے اور اپنی آنکھوں کے آگے پڑے نظر آتے ہیں۔ آدمی قدرت سے پیکار میں مصروف ہے اور خود قدرت ہی نے اسے یہ حوصلہ عطا کیا ہے۔ اشیاء کا ظاہر ہی سب کچھ نہیں' باطن میں جھانکنے والی آنکھ چاہئے' جسم حقیقت ہے' ایک ٹھوس حقیقت۔ مگر جسم کو جو شے حرکت میں رکھتی ہے یعنی روح' اس کا انکار جہل کے سوا کچھ اور نہیں۔

اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے یہ وضاحت میں نے بہ وجوہ کی۔ زندگی میں میرا سابقہ ایسے لوگوں سے بھی پڑا جنھوں نے پُراسرار اور ناقابل تردید سچائیوں کو طلسماتی داستانوں اور خوابوں کی دنیا کا نام دیا۔ ان کے نزدیک ماورائیت انسانی شعور کے ارتقا کی نفی تھی۔ وہ صرف ظاہر ہی کو سب کچھ جانتے اور مانتے تھے۔ کنویں کے ان مینڈکوں کا ذکر بھی میری سرگزشت میں آگے چل کر آئے گا' فی الحال تو آپ میرے ساتھ ساتھ جوڑا سانکھو چلئے۔ جی ہاں جوڑا سانکھو کہ جہاں عظیم بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور پیدا ہوا تھا۔ جوڑا سانکھو کسی علاقے کا نہیں' تین منزلہ سرخ رنگ کی ایک عمارت کا نام ہے۔ چیت پور روڈ' ہری سین

روڈ کے چوراہے تک لوئر چیت پور روڈ کہلاتی ہے' چوراہے کے بعد اسی کو اپر چیت پور روڈ کہا جاتا ہے۔ اسی سڑک پر ہری سین روڈ کے چوراہے سے تقریباً نصف میل پر ہاتھی بگان کی طرف جاتے ہوئے دائیں جانب ایک راستہ ہے۔ اسی راستے پر وہ تین منزلہ عمارت واقع تھی۔ عمارت کی تعمیر میں سرخ چمکدار سیمنٹ استعمال ہوا تھا۔ یہی رابندر ناتھ ٹیگور کا گھر "جوڑا سانکھو" تھا اور میں' انیل چودھری کا تعاقب کرتی ہوئی اسی کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ انیل چودھری مجھے ہاتھی بگان لے جا رہا ہے۔ ٹیگور کے گھر سے تین عمارتیں چھوڑ کر وہ مکان تھا کہ جس کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے انیل چودھری واپسی کے لئے مڑ گیا۔ میں اس سے چند ہی قدم پیچھے تھی۔ میں سمجھ گئی کہ انیل چودھری کا کام ختم ہو چکا ہے اور بلا جھجک اس کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی جس کی طرف انیل چودھری نے اشارہ کیا تھا۔

"نمستے معبلہ جی!" ایک نسوانی آواز سن کر میں چونک اٹھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے ساڑھی میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر عورت نظر آئی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مجھے بڑی شفیق سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ میں نے بھی جواباً اسی کی طرح ہاتھ جوڑ دیئے۔

"آپ اندر چلیں' میں دروازہ بند کر کے آتی ہوں۔" اس عورت نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

میں نے آگے قدم بڑھا دیئے اور اپنے عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ صحن میں ہینڈ پمپ لگا تھا۔ بائیں جانب وہ کمرہ تھا جس کے دروازے پر مجھے ارشاد حسین کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ خود اسی نے مجھے مخاطب کیا۔ "آیئے' ادھر تشریف لے آیئے۔"

اس کمرے میں بھی راجہ استاد کے گھر کی طرح فرشی نشست ہی تھی۔ میں' ارشاد حسین کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ساڑھی کی وجہ مجھے بیٹھنے میں کوئی قباحت نہیں ہوئی تھی۔

"آج تو ماشاء اللہ آپ پہچاننے میں نہیں آ رہیں' کیا ابھی سے حلیہ بدلنے کی مشق شروع کر دی؟" ارشاد حسین مسکرا کر بولا۔

میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہی ادھیڑ عمر عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے ارشاد حسین سے پوچھا۔ "کیا پیو گے؟ ٹھنڈا یا گرم؟"

"جو چاہیں پلا دیں ماں جی! ہاں ان سے پوچھ لیں۔" ارشاد حسین نے میری طرف اشارہ کیا۔

"تکلف کی کوئی ضرورت نہیں' میں گھر سے چائے پی کر ہی چلی تھی۔" میں بول اٹھی۔

"ابھی رہنے دیں ماں جی' ضرورت ہوئی تو کہہ دوں گا۔" ارشاد حسین نے اس عورت سے کہا۔ وہ چلی گئی تو ارشاد حسین میری طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ لہجے میں بولا۔ "ظاہر ہے کہ آپ گھر ہی سے آ رہی ہیں۔"

میں اس کے ان الفاظ پر چونکی۔ "ہاں ہاں' کیوں؟ کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کون سے گھر سے آ رہی ہیں؟" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں کہاں رہتی ہوں؟" میں نے گول مول جواب دیا۔

"لیکن اس وقت آپ وہاں سے نہیں آ رہیں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" میں اسے اپنے نئے ٹھکانے سے آگاہ کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ذریعے میری نگرانی بھی کراتا رہا ہے۔ ممکن ہے' وہ اب بھی میری نگرانی کرا رہا ہو۔ پہلے بھی مجھے احساس نہیں ہو سکا کہ خفیہ والوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی میری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اب بھی ایسا ممکن تھا اس لئے سوال کرتے ہی میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تو آپ نے ابھی تک اپنے ساتھیوں کو میرے پیچھے لگا رکھا ہے۔"

"آپ شاید کچھ غلط سمجھ رہی ہیں' ایسا نہیں ہے۔"

"تو پھر صحیح کیا ہے' وہ بتا دیں۔" میری آواز میں قدرے تلخی سی آ گئی۔

"آپ نے شاید ابھی مجھ پر بھروسہ نہیں کیا۔ خیر.......... آج ہی صبح یہ بات میرے علم میں آئی تھی کہ آپ اپنی کوٹھی میں نہیں ہیں۔ میں آپ سے یہ عرض کر ہی چکا ہوں کہ میرا تعلق سی آئی ڈی سے ہے اور یہی محکمہ آپ کے خلاف تحقیقات کر رہا ہے۔ مجھے محکمے کی نئی حکمت عملی کے بارے میں معلوم ہوا تو چوکنا ہو گیا۔ نئی حکمت عملی یہ تھی کہ آپ کو چھیڑے بغیر پولیس کے ذریعے' میری مراد باوردی پولیس سے ہے' آپ کے دست راست شہزاد نامی نوجوان کو کسی جھوٹے کیس میں پھانس لیا جائے۔ پولیس کے لئے ایسے "کارنامے" انجام دینا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا' یہ شاید آپ بھی جانتی ہوں گی۔ سو آج گیارہ بجے صبح پولیس نے چوری کے ایک کیس میں آپ کی کوٹھی سے شہزاد کو گرفتار کر لیا جو شخص چوری کے الزام میں پہلے ہی سے پولیس کی تحویل میں تھا' اسی کی نشاندہی پر بظاہر یہ گرفتاری عمل میں آئی تھی۔"

میں تصویر حیرت بنی ارشاد حسین کی بات سن رہی تھی۔ میری قوت گویائی جیسے کسی نے سلب کر لی تھی۔

"اسی گرفتاری کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ آپ گزشتہ روز شام سے اپنی کوٹھی میں نہیں ہیں۔ اب آپ کا یہ شک دور ہوا یا نہیں کہ میں اپنے ساتھیوں سے آپ کی نگرانی کرا رہا ہوں؟" ارشاد حسین یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"مگر.......... مگر وہ.......... وہ شہزاد.........." میں بول اٹھی۔ "وہ.......... کیا وہ ابھی تک.........."

"جی ہاں' وہ ابھی تک پولیس کی حراست میں ہے۔ اسے پولیس ہیڈ آفس میں رکھا گیا ہے' مگر آج شام چار بجے تک کی اطلاعات کے مطابق اس پر تشدد کر کے ضروری معلومات حاصل کرنے والا انسپکٹر پرکاش ہے۔"

انسپکٹر پرکاش کا نام سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ خفیہ پولیس کا یہ وہی بہروپیا تھا جس نے مجھے محی الدین بن کر فریب دیا تھا۔

"لیکن وہ کمینہ تو ہسپتال میں زیر علاج تھا؟"

"وہ مردود چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ آج ہی اس نے ڈیوٹی جوائن کی تھی۔ میری اطلاع کے مطابق اس نے خود ہی اعلیٰ حکام سے یہ درخواست کی تھی کہ مجھے ڈیوٹی جوائن کرنے دی جائے اور جس کیس پر میں کام کر رہا تھا' کسی اور کے سپرد نہ کریں۔ آج صبح اسے میں نے خود بیساکھیوں کی مدد سے چلتے دیکھا تھا۔ جہاں تک میرا قیاس ہے' یہ سارا چکر پرکاش ہی کے شیطانی ذہن کا نتیجہ ہے۔ اس کے پیچھے آپ سے انتقام لینے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔"

میری حالت اس وقت کسی ایسے پرندے کی طرح تھی جسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو اور وہ پنجرے سے نکلنے کے لئے پر پھڑپھڑا رہا ہو۔

"تو وہ حرام زادہ میرا انتقام شہزاد سے لے رہا ہے۔" میرے ہونٹ جیسے خود بخود ہلے۔ میری آنکھوں میں شہزاد کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ مجھے اس کا انتہائی دکھ تھا کہ میری وجہ سے شہزاد کو ظلم سہنا پڑ رہا تھا۔

"ارشاد! آپ میرے ایک سوال کا جواب دے سکتے ہیں؟" میں نے اس عرصے میں جو کچھ سوچا تھا' اس کی روشنی میں پوچھا۔

ارشاد حسین بہت غور سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا' دھیرے سے بولا۔ "آپ سوال تو کریں۔"

"نہیں' میں سوال کرنے سے پہلے جواب کی یقین دہانی چاہتی ہوں۔ یہ میں بخوبی جانتی ہوں کہ آپ میرے سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ میرے سوال کا تعلق آپ کے ساتھیوں یا خود آپ کی ذات سے نہیں ہے اور نہ جواب دینے سے آپ کسی عہد شکنی کے مرتکب ہوں گے۔ میں یہ ساری باتیں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ سوال سنے بغیر آپ سے جواب دینے کا عہد لے رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ضبط و تحمل کی کوشش کے باوجود میرا سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔

"ایک منٹ رکیے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ابھی حاضر ہوا۔" یہ کہتے ہی وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ اس نے گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "پہلے پانی پی لیجئے آپ۔"

میں نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

"آپ شدید غصے میں معلوم ہوتی ہیں اور غصہ عقل کا دشمن ہوتا ہے۔" وہ مجھ سے خالی گلاس لیتے ہوئے بولا۔ میں پانی پی چکی تھی۔ "اب فرمائیے' کیا پوچھنا ہے۔"

"مجھے انسپکٹر پرکاش کے گھر کا پتا چاہئے۔ میں آپ سے اس کے گھر کا پتا ہی پوچھنا چاہتی تھی۔"

"مگر معلمہ جی! یہ تو مسئلے کا کوئی حل نہ ہوا۔" وہ شاید میری بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔"

"پتا میں آپ کو بتائے دیتا ہوں بلکہ زبانی بھی سمجھا دوں گا لیکن ابھی آپ نے پوری بات نہیں

سی۔ ممکن ہے آپ جن خطوط پر سوچ رہی ہیں' اس میں' میں بھی آپ کے کسی کام آسکوں۔ میرے اندازے کے مطابق آپ نے شاید کچھ عرصے کے لئے روپوشی کا فیصلہ کیا ہے۔ غالباً اسی لئے آپ مجھ سے میک اپ کی تربیت بھی لینا چاہتی ہیں۔ چونکئے مت! میرے اندازے یقین کی حد تک درست ہوتے ہیں۔ ان اندازوں کی بنیاد شہزاد کا وہ بیان ہے جو اس نے دیا ہے۔ بیان کی تصدیق بھی ہو چکی ہے۔"

"کیا بیان دیا ہے اس نے؟" میں نے دریافت کیا۔ اب میں خاصی حد تک خود پر قابو پا چکی تھی۔

"یہی کہ آپ نے کلکتے سے کسی نامعلوم شہر کے لئے روانہ ہونے سے قبل خود ہی کوٹھی اس کے نام کر دی تھی۔ آپ نے کس لئے کوٹھی اس کے نام کی؟ آپ کہاں گئی ہیں اور کب تک کلکتے لوٹ کر آئیں گی؟ تشدد کے باوجود ان سوالوں کے جواب شام چار بجے تک اس نے نہیں دیئے تھے۔ اس کے بعد کا مجھے علم نہیں کیونکہ آپ سے ملنے یہاں پہنچنا تھا۔"

میں اس عرصے میں ارشاد حسین کو ایک خاص حد تک اعتماد میں لینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے اسی لئے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ اعلیٰ انگریز حکام کس لئے میرے سلسلے میں فکرمند ہیں یا میرے متعلق تحقیقات کر رہے ہیں لیکن میں بہرحال اس سے تنگ آ چکی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی' میرا ارادہ واقعی روپوشی کا تھا اور اسی پر میں نے عمل بھی کیا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ وہ کوٹھی بیچ کر کہیں اور مکان خرید لوں۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ خفیہ پولیس والے زیادہ دن تک خاموش نہیں بیٹھیں گے جیساکہ ثابت بھی ہو گیا۔ میں نے اسی لئے گزشتہ روز فوری طور پر روپوشی کا فیصلہ کر لیا۔ شہزاد ایک تعلیم یافتہ ایماندار نوجوان ہے۔ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا کہ میں اسے جو ہدایات دوں گی' ان پر ایمانداری کے ساتھ عمل کرے گا۔ میں نے اسی سبب کوٹھی اس کے نام کر دی۔" پھر میں نے ارشاد حسین کو وہ ساری باتیں بتا دیں جن کا تعلق پارک سرکس کے علاقے میں نئے مکان کی خریداری سے تھا۔ اس کے بعد میں نے ارشاد حسین سے مزید کہا۔ "ممکن ہے کہ شہزاد' پولیس کا اور زیادہ تشدد برداشت نہ کر سکے اور وہ ساری باتیں بھی بتا دے جو ابھی میں نے آپ سے بیان کی ہیں۔ اس کے سوا وہ اور کچھ نہیں جانتا۔ اگر اس نے کچھ مزید بتایا بھی تو ایک شعبدہ باز سادھو کے بارے میں بتائے گا جو بلا سبب میری غیرموجودگی میں میرے ملازمین کو ہراساں کرتا رہتا تھا۔ شہزاد یا میرے کسی بھی ملازم کو یہ معلوم نہیں ہو سکا یا یوں کہیں کہ میں نے معلوم نہیں ہونے دیا کہ انگریز کے پالتو کتے میرے تعاقب میں ہیں۔" میں نے دانستہ سرسری انداز میں شمبھو کا ذکر بھی کر دیا اس لئے کہ شہزاد تشدد کے سبب اگر یہ باتیں بھی بیان کر دے تو ارشاد حسین کی نظر میں میرا اعتماد بحال رہے۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اب کہہ رہی تھی۔ "مکان کی منتقلی کی وجہ میں نے شہزاد سے یہی بیان کی تھی کہ اس طرح شعبدہ باز سادھو سے نجات مل جائے گی۔ میں نے اس سے یہی کہا تھا کہ چند روز کے لئے کلکتہ چھوڑ کر ایک ضروری کام سے کسی اور شہر جا رہی ہوں۔ اس نے پوچھا بھی تھا کہ کہاں جا رہی ہوں اور کب واپسی ہو گی؟ میں نے اسے ان سوالوں کے جواب نہیں دیئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ انتہائی تشدد کے باوجود کچھ نہیں بتا سکے گا۔ ممکن ہے مجھے آپ سے ملنا نہ ہوتا تو میں واقعی کچھ روز کے لئے ہی سہی یہ شہر چھوڑ دیتی۔" آخری الفاظ میں

نے محض اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے کہے حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی تھی جو ارشاد حسین سے بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

"مجھے خوشی ہوئی معبلہ کہ آپ نے ایک بات کے سوا مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔"

"وہ کیا؟" میں چونک کر بولی۔

"یہی کہ آپ کل سے اب تک کہاں رہیں؟" اس نے مسکرا کر کہا۔ "مگر میں آپ سے یہ سوال نہیں کروں گا۔ کلکتے میں سینکڑوں چھوٹے بڑے ہوٹل ہیں' آپ کہیں بھی ٹھہر سکتی ہیں۔ فی الحال میرے نزدیک اصل مسئلہ آپ کے دست راست اس بے گناہ نوجوان کی رہائی کا ہے جو ناحق پولیس کے تشدد کا شکار بنا ہوا ہے۔ اسی کے بعد دوسرے مسائل پر آپ سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ میرا اندازہ درست ہے نا معبلہ جی!" ارشاد حسین نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

"شہزاد کی رہائی میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ اسے کل یا پرسوں تک رہا کر دیا جائے گا۔" میں پُریقین لہجے میں بولی۔

"اور پولیس نے اس پر جو کیس بنایا ہے؟" ارشاد حسین مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"جس طرح جھوٹے کیس بنائے جاتے ہیں اسی طرح ختم بھی کئے جا سکتے ہیں۔" میں نے ارشاد حسین کو اپنے یقین کی وجہ نہیں بتائی۔

"بہرحال آپ کہہ رہی ہیں تو یقین کرنا پڑے گا۔ پہلے بھی آپ کئی مرتبہ حیران کر چکی ہیں۔ کسی سے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ آپ جیسی کوئی عورت بیک وقت چار تربیت یافتہ لڑاکا مردوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر سکتی ہے تو ہرگز یقین نہ کرے بہرحال کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے' یہ اور بتا دیں کہ کیا آپ اپنی روپوشی کو بھی کوئی مسئلہ..........."

"نہیں' یہ میرے لئے مسئلہ ہے۔" میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔ "میں اسی لئے آئی بھی تھی آپ کے پاس' پھر اور ہی بات چھڑ گئی۔"

"ہاں میں ایک اہم بات آپ کو بتانا بھول ہی گیا۔ آپ کو تلاش کرنے کے احکام بھی جاری کر دیئے گئے ہیں۔" ارشاد حسین نے بتایا۔

"کیا میری گرفتاری کے لئے؟"

"جی نہیں' صرف تلاش کے لئے کہ آپ کہاں ہیں۔ محکمے کے جو لوگ بحیثیت معبلہ آپ کی نگرانی کرتے رہے ہیں' انہیں قریبی شہروں مثلاً آسن سول' بردوان وغیرہ روانگی کے احکام مل گئے ہیں۔ پُرلطف بات اس میں یہ ہے کہ آپ یہیں کلکتے میں موجود ہیں۔ دراصل شہزاد کے بیان نے مس گائیڈ کیا ہے انہیں۔ آپ کے کسی ملازم نے بھی شہزاد کے اس بیان کی تصدیق کی ہے۔ اس سے آپ نے ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن ہی کے لئے ٹیکسی منگوائی تھی۔ حکام کو اسی لئے یقین آ گیا ہے کہ آپ کلکتے میں نہیں ہیں۔ اس کے باوجود میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ اگر آپ روپوش ہی رہنے کا فیصلہ کر چکی ہیں تو چاہے جہاں بھی رہیں' لباس اور حلیئے سے قطع نظر میک اپ ہی میں رہیں۔"

"مگر ارشاد! آپ تو جانتے ہیں مجھے یہ فن نہیں آتا اور میں یہی آپ سے سیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اس کے لئے میرے ذہن میں ایک تدبیر تھی مگر آپ کی رضامندی کے بغیر میں نے کوئی قدم اٹھانا نامناسب سمجھا۔ بُرا نہ مانئے گا' دراصل آپ کی اور میری ملاقاتیں موجودہ حالات میں انتہائی خطرناک ہیں۔ میرا اس طرح چوری چھپے آپ سے ملنا خدانخواستہ دشمنوں کی نظر میں آگیا تو ان مقاصد کو سخت دھچکا پہنچنے کا احتمال ہے جن کے حصول کی خاطر میں اور میرے ساتھی سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ میں یہ پہلے بھی غالباً عرض کر چکا ہوں کہ ذاتی سطح پر مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور اس کی وجہ بھی محض یہ ہے' آپ کے خلاف جو لوگ سرگرم ہیں انہیں میں بھی اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے ارشاد! لیکن آپ وہ تدبیر تو بتائیں جس کے لئے میری رضامندی ضروری سمجھی۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ جیسی ذہین خاتون کو میک اپ کی مکمل تربیت دینے کے لئے صرف ایک ہفتہ بہت ہے۔ میں یہ ایک ہفتہ آپ کے نام کرنے کو تیار ہوں' مگر اس کے لئے آپ کو پورے ایک ہفتے تک میرے ساتھ قیام کرنا پڑے گا۔ میں دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لوں گا۔"

"کیا آپ کے گھر مٹیا برج میں؟"

"جی نہیں۔"

"تو کیا پھر اس گھر میں رہنا پڑے گا؟"

"یہاں بھی نہیں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کہیں اور' کسی ایسی جگہ جہاں ارشاد حسین کی حیثیت سے مجھے کوئی بھی نہ جانتا ہو۔"

"کیا اسی شہر میں؟"

"جی' اس لئے فی الوقت یہی شہر آپ کے لئے زیادہ محفوظ ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" میں نے اپنا رضامندی کا اظہار کر دیا۔ پھر میں نے اچانک اس سے انسپکٹر پرکاش کا پتا پوچھ لیا اور فوراً ہی دوسری باتیں کرنے لگی۔ پرکاش کا پورا پتا میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ پھر باتوں ہی باتوں میں' میں نے ایک سوال اور کر دیا۔ "یہ آپ کی خفیہ پولیس کا دفتر کہاں ہے؟"

"کیوں' کیا آپ وہاں مجھ سے ملاقات کرنے آئیں گی؟" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"بس پتا بتائیں آپ' ہر بات پر سوال نہ کریں۔"

"جہاں آپ کی کوٹھی ہے' اسی کے قریب ہے۔ اب فرمایئے۔"

"کیا؟ میری کوٹھی کے قریب؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی کوٹھی سے زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ کی کوٹھی کے بعد چورنگی روڈ ہی پر بائیں جانب لارڈ سنہا روڈ ہے۔ چورنگی روڈ سے ایک سڑک تو آپ کی کوٹھی کے لئے جاتی ہے' اس کے بعد ذرا آگے لارڈ سنہا روڈ ہے۔ اسی پر کافی اندر جا کے سی آئی ڈی آفس ہے۔" ارشاد حسین مجھے محل وقوع سمجھانے لگا۔

"گئی ہوں میں اس روڈ پر بھی ایک بار' سمجھ گئی۔"

"اب ایک بات اور سمجھ لیں۔ یہ ساڑھی پہن کر آپ یہاں سے نہیں جائیں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"دوسری ساڑھی آپ کو مل جائے گی' سوتی اور سادہ سی ساڑھی جیسی آپ نے ماں جی کو باندھے دیکھا ہو گا۔ دوم یہ کہ آپ کے چہرے کا میک اپ بھی ہو گا۔ جو ماسک میں آپ کو پہناؤں' اسے اتاریئے گا مت۔ اور وگ بھی پہنے رہئے گا تاکہ آئندہ آپ سے ملاقات ہو تو میں آپ کو پہچان سکوں۔"

"یعنی .... یعنی آپ .... آپ اسی وقت میرا چہرہ بدل دیں گے؟" میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

"جی حضور! یہ ضروری ہے۔ چلیں پہلے یہی سہی۔" پھر اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔ "ماں جی!"

وہ ادھیڑ عمر عورت جس نے اس گھر میں گھستے ہی ہاتھ جوڑ کر مجھ سے "نمستے" کہا تھا' آواز دیتے ہی کمرے کے اندر آ گئی۔ وہ شاید صحن ہی میں ہو گی۔

"ماں جی! آپ انہیں اپنے ساتھ لے جایئے۔ اپنی کوئی استعمال شدہ ساڑھی انہیں پہننے کو دے دیجئے۔ ممکن ہو تو کوئی سی پہنی ہوئی چپل بھی انہیں دے دیں اور یہ سینڈل اتروا لیں۔ پرس.........." وہ کچھ کہتے کہتے رکا' پھر بولا۔ "یہ بھی خاصا قیمتی لگتا ہے۔" وہ تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔

"اپنا پرس دے دوں گی میں۔" ماں جی نے ارشاد حسین کی یہ مشکل بھی آسان کر دی۔

"معبلہ! آپ اپنا منہ بھی اچھی طرح دھو لیجئے گا۔ ماں جی کے ساتھ چلی جایئے۔"

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نئے تجربے نے باقی تمام باتیں میرے ذہن سے محو کر دی تھیں۔ ماں جی مجھے اپنے ساتھ لے گئیں اور پھر مطلوبہ اشیاء ایک ایک کر کے میرے حوالے کر دیں اور میں باتھ روم میں گھس گئی۔ کچھ دیر کے بعد میں باتھ روم سے نکل آئی۔ میرا حلیہ اب بدلا ہوا تھا۔ ماں جی صحن میں موجود تھیں۔ میرے پیروں میں اب کلکتہ چپل تھے۔ اپنے پرس کا سامان میں پہلے ہی ماں جی کے دیئے ہوئے پرس میں منتقل کر چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ماں جی بھی مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اپنی ساڑھی میں باتھ روم ہی میں چھوڑ آئی تھی۔

میں' ماں جی کے قریب سے گزری تو انہوں نے زور سے اوپر کی طرف سانس کھینچا' پھر کہنے لگیں۔ "بیٹا آپ کو یہ خوشبو نہیں لگانا چاہئے تھی۔ ٹھہریں' میں کوئی بلاؤز بھی دیکھتی ہوں۔ شاید اس بلاؤز میں بھی یہ خوشبو بسی ہوئی ہے۔"

ماں جی تجربہ کار اور جہاں دیدہ معلوم ہوتی تھیں۔ شاید انہیں ایسے معاملات کا یہ پہلا تجربہ نہیں تھا۔ وہ سامنے والے کمرے میں گھس گئیں اور پھر اس ساڑھی سے ملتا ہوا معمولی کپڑے کا ایک بلاؤز بھی لے آئیں۔ باتھ روم میں جا کر میں نے بلاؤز بھی بدل لیا جو کچھ ڈھیلا تھا۔ ماں جی نے ایک سیفٹی پن بھی لا کر دے دی جو میں نے بلاؤز کے نچلے حصے میں ایک طرف لگا لی اور ساڑھی کا پلہ اس پر ڈھک لیا تاکہ سیفٹی پن نظر نہ آئے۔

"اب ٹھیک ماں جی!" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! بھگوان آپ کی رکھشا (حفاظت) کرے۔" انہوں نے مجھے دعا دی۔

میں ان کا شکریہ ادا کر کے اس کمرے میں پہنچی جہاں ارشاد حسین کو چھوڑ گئی تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ ارشاد حسین غائب تھا اور اس کی جگہ کوئی دھوتی بند شخص بیٹھا تھا۔ مجھے وہ شخص ماں جی کا شوہر معلوم ہو رہا تھا۔

میں پلٹنے ہی والی تھی کہ وہ شخص اپنی منحنی سی آواز میں بول اٹھا۔ "آیئے شریمتی جی' پدھاریئے!" اس نے مجھ سے بیٹھنے کو کہا تھا۔

"مگر......... مگر وہ .... وہ ارشاد .... ارشاد حسین صاحب کہاں گئے؟"

"انہیں پولیس پکڑ لے گئی شریمتی جی اور اب آپ کی باری ہے۔"

"کون ہو تم؟" میرے تیور بدل گئے۔

"آپ کا خادم ارشاد حسین' کہئے کیسی رہی؟"

"حیرت ہے ارشاد!" میں نے اس کی آواز پہچان کر طویل سانس لیا۔ "آواز بھی بدل لی آپ نے' حد کر دی' میں تو ڈر ہی گئی تھی۔"

"اور مجھے آپ کے منہ سے "ڈر ہی گئی تھی" سن کر حیرت ہو رہی ہے' بیٹھئے!" میں اس کے قریب بیٹھ گئی تو وہ مزید بولا۔ "میں نے جو گٹ اپ کیا ہے' اسے ذہن میں رکھئے گا' آپ سے میری آئندہ ملاقات اسی گٹ اپ میں ہو گی۔"

اسی وقت میری نظر پہلی مرتبہ اس کے قریب رکھے ہوئے چھوٹے سے ایک بکس پر پڑی۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہی تو وہ جادو کا پٹارا ہے جو آپ کو بھی میرا ہی ہم عمر بنا دے گا' میری مراد اس عمر سے ہے جو مجھے دیکھ کر آپ کو محسوس ہو رہی ہے۔"

"آپ .... آپ مجھے بڑھیا بنا دیں گے؟"

"بڑھیا نہیں ادھیڑ عمر اور آپ کا نام........."

"رانی ٹھیک رہے گا۔" میں جلدی سے بول اٹھی۔

"چلئے آپ کا نام یہی رکھ دیتے ہیں شریمتی رانی دیوی۔"

"یہ آپ نے میرے ساتھ دیوی کیوں لگا دیا؟" میں اپنے ماضی کی پرچھائیں محسوس کر کے چونکی۔

"دیوی پر کیا اعتراض ہے آپ کو؟ دیوی صرف دیوتا کی تانیث نہیں۔ اس کے اور بہت سے مطلب ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں معلبہ جی کہ خدا نخواستہ میں آپ کو سچ مچ ہندو بنائے دے رہا ہوں۔ یہ تو ایک وقتی ضرورت ہے۔ دیوی کا ایک مطلب رانی بھی ہے' کنیا اور کنواری کو بھی دیوی کہتے ہیں۔ اسی طرح کنیا' دوشیزہ اور دلہن دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ درگا' کالکا' بھوانی یہ سب ایک ہی دیوی کے نام ہیں۔ درگا پوجا کے بارے میں شاید آپ نے سنا بھی ہو۔ یہی درگا یہاں بنگال میں کالی مائی کہلاتی ہے۔

اسے قہر و غضب کی دیوی سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان بھر میں اس کے مختلف نام ہیں۔ اسی کو صرف دیبی یا دیوی بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ ہندو اسی کے قہر و غضب سے بچنے کے لئے اس کی پوجا کرتے ہیں۔ لفظ دیوی یا کنیا معصوم عورت کے لئے بھی مستعمل ہے۔ یہ ساری باتیں میں آپ کو اس لئے بھی بتا رہا ہوں کہ آپ ایک ہندو عورت کا کردار صحیح طرح ادا کر سکیں۔"

ارشاد حسین نے مجھے جو باتیں بتائی تھیں' تقریباً سبھی میرے علم میں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہندی زبان سے بھی واقف تھی' دوم مذاہب عالم کا مطالعہ کرتے ہوئے ہندو مذہب بھی میرے زیر مطالعہ رہا تھا۔ میں اس کے باوجود بڑے صبر و تحمل کے ساتھ ارشاد حسین کی باتیں سنتی رہی۔ لفظ دیوی سے اختلاف کی وجہ وہ نہیں تھی جو ارشاد حسین سمجھ رہا تھا اس پر میری حقیقت نہ کھلے' میں نے اسی لئے کہہ دیا۔ "ٹھیک ہے شریمان ارشاد جی' مجھے شبد (لفظ) دیوی سے کوئی بھن نتا (اختلاف) نہیں۔"

"شریمتی رانی دیوی! سیوک (خادم) کو رام پرشاد اگروال کہتے ہیں۔" وہ شوخی سے بولا۔ "اور آپ اس سیوک کی دھرم پتنی (بیوی) ہیں۔"

"ارے ارے' یہ آپ ہنسی ہی ہنسی میں مجھے اپنی بیوی کیوں بنائے لے رہے ہیں۔" میں ہنس پڑی۔

"اس کارن (سبب) رانی دیوی کہ رام پرشاد اگروال اپنی پتنی کے ساتھ ہی ایک ہفتے کہیں نواس (قیام) کرے گا۔"

"یہ نواس کب ابھی لاشی (متوقع) ہے؟"

"ترنت (جلد) ہی۔ کیول (صرف) دیوی کی انومتی (اجازت) چاہیئے۔"

"اچھا ارشاد' آپ اب میک اپ کر دیں جلدی سے۔ ہاں یہ بتایئے پرسوں آپ سے کب اور کہاں ملاقات ہو گی؟"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں پرسوں سے ایک ہفتے کی چھٹی لوں؟"

"ظاہر ہے کہ آج تو آپ دفتر سے آ ہی چکے ہیں' کل ہی چھٹی لے سکتے ہیں۔" میں نے بات بنائی اور اس آڑ میں اصل بات گول کر گئی۔

""ہاں' یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "ایسا کریں پھر......... کہ پرسوں دوپہر دو اور تین بجے کے دوران ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن پہنچ جایئے۔ میں آپ کو اسی لباس اور حلیئے میں مین گیٹ کے باہر بستر بند اور ایک بکس لئے ملوں گا۔ آپ کو میرے قریب آ کر یہ ظاہر کرنا ہے جیسے وقتی طور پر بھیڑ بھاڑ میں آپ مجھ سے بچھڑ گئی تھیں پھر ہم میاں بیوی کی حیثیت سے امرتلہ اسٹریٹ کی ایک دھرم شالا (مسافرخانہ) میں ٹھہریں گے۔ اوّل تو آپ کو وہاں کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی' پھر بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ رام پرشاد اگروال اور اس کی بیوی رانی دیوی' دہلی کے رہنے والے ہیں۔ رام پرشاد اگروال ذات کا بنیا ہے اور اکثر کلکتے آتا رہتا ہے' کاروباری سلسلے میں۔ دھرم شالا والے اسے جانتے پہچانتے ہیں۔ رام پرشاد اگروال پہلی بار اپنی بیوی کو بھی کلکتہ شہر گھمانے لایا ہے۔ دہلی میں یہ دونوں

میاں بیوی' پہاڑی دھیرج کے علاقے میں رہتے ہیں۔ پہاڑی دھیرج کے علاقے میں اوسط درجے کے ہندو رہتے ہیں۔ یہاں جاٹ برادری کے لوگ زیادہ آباد ہیں۔ باڑہ ہندوراؤ کی طرف جاتے ہوئے پہاڑی دھیرج کا علاقہ راستے میں پڑتا ہے اور ہاں یہ دونوں میاں بیوی بے اولاد ہیں۔ بتایئے اتنی ساری باتیں آپ کو یاد رہیں گی؟" یہ کہہ کر ارشاد حسین سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں اس کی ایک ایک بات پوری توجہ سے سن رہی تھی اور ذہن پر نقش کرتی جا رہی تھی' سو فوراً یہ سبق سنانا شروع کر دیا۔ "رام پرشاد اگروال اور اس کی بیوی رانی دیوی' دہلی کے رہنے والے ہیں۔ رام پرشاد اگروال ذات کا بنیا..........."

"کمال ہے آپ تو معبلہ جی! لفظ بہ لفظ وہی سب کچھ بیان..........."

"معاف کیجئے بلکہ شما کیجئے شریمان رام پرشاد اگروال جی میرا شبھ سنگیا (نام) رانی دیوی ہے۔"

"تو پھر آپ کو رانی دیوی بنا ہی دیا جائے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے پہلو میں رکھا ہوا بکس کھول لیا۔

ارشاد حسین کو میرا میک اپ کرنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا پھر اس نے ایک آئینہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے "ارے" نکل گیا۔ میں خود اپنا ہی چہرہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وگ بھی کمال کی تھی۔ اس میں اکا دکا بال سفید بھی نظر آ رہا تھا۔

"اب اگر آپ کے لئے ممکن ہو تو ایسی ہی سادہ ساڑھیاں کہیں سے خرید لیجئے گا۔ آپ بھی اپنے ساتھ کوئی سوٹ کیس یا بکس وغیرہ لا سکتی ہیں جس میں کپڑے اور دوسرا ضروری سامان رکھ لیں۔ اس بات کا خیال رکھئے گا کہ سوٹ کیس یا بکس قیمتی نہ ہو' آپ اسے باآسانی اٹھا سکیں اور اس کے اندر کوئی ایسی شے نہ ہو جو آپ کی موجودہ شخصیت کی نفی کرتی ہو یا جس کی وجہ سے بحیثیت معبلہ آپ کی شناخت ہو سکے۔"

"کوئی اور سبق باقی رہ گیا ہے یا پرسوں تک کے لئے میری چھٹی؟" دراصل اب مجھے جلد از جلد چاندنی چوک پہنچنے کی جلدی تھی۔

پھر ارشاد حسین نے مجھے مزید نہیں روکا۔ ہاں ماں جی کو بلا کر میرا "دیدار" ضرور کرا دیا۔ انہوں نے میرا جائزہ لے کر اظہار اطمینان ہی کیا تھا۔ اس کے بعد وہی مجھے گھر کے دروازے تک بھی چھوڑنے آئی تھیں۔

☆======☆======☆

میں اب گویا غیر اہم سی ایک ادھیڑ عمر ہندو عورت تھی۔ کسی نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اس پر مجھے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ شخصیت کی اس تبدیلی کے بعد اب مجھے ایک اہم معرکہ درپیش تھا اور میرے پاس اس کے لئے زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ راستے بھر اسی پر غور کرتی ہوئی میں ٹرام کے دوسرے درجے میں بیٹھ کر دھرم تلے واپس پہنچ گئی۔ کلائی کی گھڑی بھی کھول کر میں نے پہلے ہی اپنے پرس میں ڈال لی تھی اس لئے وقت کے بارے میں صرف اندازہ ہی کر سکتی تھی۔ رات کے نو سے تو زیادہ

ہی ہوں گے' میں نے سوچا اور آہستہ قدمی کے ساتھ پیدل ہی چاندنی چوک کی طرف چل دی۔

راجہ استاد کو میرے اندازے کے مطابق اس وقت تک واپس آ جانا چاہئے تھا کیونکہ بازار بند ہو چکا تھا۔ اس کے دھندے کا اصل وقت شام چار بجے سے تقریباً نو بجے رات تک تھا' کوئی ہنگامی مسئلہ ہو تو بات دوسری ہے۔ ہمایوں اس لئے گھنٹے بھر بعد آتا تھا کہ اس کے اوپر راجہ استاد نے کچھ اور ذمے داریاں بھی ڈال رکھی تھیں۔

چاندنی چوک پہنچ کے اور راجہ استاد والی بلڈنگ میں داخل ہو کر گھر کے دروازے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے مختلف خیالات میرے ذہن میں گرش کر رہے تھے۔ انہی میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر میں ارشاد حسین کی طرح آواز بدل کر بولنے پر بھی قادر ہوتی تو اس وقت اور بھی مزہ آتا۔ راجہ استاد جیسا گھاگ بھی "چکر گھنی" بن کے رہ جاتا۔

گھر کے دروازے پر رک کر میں نے دانستہ زور سے دستک دی۔ مقصد راجہ استاد کو ہڑبڑانا ہی تھا۔ حسب توقع اندر سے راجہ استاد کی گرج سنائی دی۔ "ابے کون بیہودہ ہے؟" مگر میں "بیہودگی" سے باز نہ آئی۔ "تُو ٹھہر! میں دیکھتا ہوں۔" اس نے غالبًا شانتی کو دروازہ کھولنے سے روکا تھا۔ "اس کی تو..........." راجہ استاد گالیاں بکتا ہوا شاید دروازے کی طرف دوڑا کیونکہ اس کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔

میں اس عرصے میں راجہ استاد کو مزید تنگ کرنے کی تدبیر سوچ چکی تھی۔ وہ تو لوگوں کو فریب دینے میں طاق تھا ہی' موقع سے فائدہ اٹھا کر آج میں اسے چکر دینا چاہتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو چہرے پر انتہائی غصے کے آثار تھے اور ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔

"آ.......... آ.......... آ..........!" میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں گونگی ہوں۔

"پھاڑ دوں پیٹ تیرا حرام زادی! کیوں دروازہ پیٹے جا رہی تھی بول۔" راجہ استاد کے گلے کی نسیں چیخنے کے سبب پھول گئیں۔

میں نے پھر منہ سے بے معنی آوازیں نکالیں اور ہاتھ سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ "او.......... او!" اس مرتبہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے گردن پر ہاتھ پھیر کر یہ ظاہر کیا جیسے بلڈنگ کے باہر کسی کو قتل کر دیا گیا ہو۔

راجہ استاد میرا اشارہ سمجھ کے اچھل پڑا۔ "قتل.......... ابے کیا کوئی قتل ہو گیا؟"

"ہو ہو" کرتے ہوئے میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ راجہ استاد دروازہ اسی طرح کھلا چھوڑ کر چاقو ہاتھ میں تھامے باہر کی طرف بھاگا۔

"کیا ہوا بابا؟.......... کیا ہو گیا؟" اندر سے شانتی کی آواز آئی۔

میرے لئے یہ موقع غنیمت تھا۔ میں تیزی سے گھر میں داخل ہوئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ راجہ استاد بلڈنگ کے باہر کوئی لاش نہ دیکھ کر فوراً ہی قہر مجسم بنا ہوا پلٹے گا۔ شانتی کو میں کیا تنگ کرتی' وہ غریب تو ویسے ہی بھولی بھالی تھی۔ سو میں لپکتی ہوئی اندر پہنچی۔ وہ

باورچی خانے میں شاید راجہ استاد کے لئے سالن گرم کر رہی تھی۔ میں نے اسے آواز دی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔

"تم آگئیں دیدی!" اس کی آواز سے خوشی جھلک رہی تھی۔

اس وقت تک میں' شانتی کے قریب پہنچ چکی تھی

اس نے میرے قدموں کی چاپ سن کے مڑ کر دیکھا اور اچھل پڑی۔ "ہائے دیا! تم .... تم کون ہو؟"

"ارے رانی ہوں' تمہاری دیدی اور کون ہوتی! بھیس بدلا ہوا ہے میں نے۔ استاد کو ڈرانے کے لئے پگلی! سمجھا کرو۔"

"پر پاپا کہاں گئے؟" اس کی آواز میں اب بھی بے یقینی سی تھی۔

"باہر دوڑا دیا ہے تمہارے پاپا کو' دیکھنا کیسا مزہ آتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں استاد کے سامنے گونگی بن گئی تھی تاکہ وہ مجھے آواز سے نہ پہچان لیں۔" میں جلدی جلدی بول رہی تھی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا ہے' فوراً نہیں کھولنا .... بلکہ میں کھولوں گی دروازہ اور استاد کو سارے گھر میں دوڑاؤں گی۔ تم مت ڈرنا۔"

"پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔" وہ بھی ہنس پڑی۔ "دیدی! ایسے ہماؤں کو بھی دوڑانا۔" اسے اب یقین آ چکا تھا کہ میں "رانی" ہی ہوں۔

عین اسی لمحے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔

"پاپا لوٹ آئے شاید۔"

"ہاں چلو' چل کے دیکھتے ہیں۔ سنو' میں تم سے جو کہوں' وہ استاد سے کہتی رہنا۔" یہ کہہ کر میں اس کا ہاتھ تھامے دروازے کی طرف دوڑی۔

راجہ استاد اتنی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا جیسے دروازہ نہ کھولا گیا تو وہ اسے توڑ دے گا۔

"شانتی .... اے شانتی! دروازہ کھول .... ابے کھول دروازہ۔" غصے میں راجہ استاد کو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ شانتی صرف گھر کی حد تک شانتی اور باہر صبیحہ ہے۔ "میں توڑ دوں گا دروازہ۔"

میں نے شانتی کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے وہی الفاظ زور سے دہرا دیئے جو میں نے اسے سرگوشی میں بتائے تھے۔ "پاپا! میں نے دروازہ کھولا تو یہ گونگی میری گردن پر چھری پھیر دے گی' ورنہ اسے رانی دیدی کا سوٹ کیس اٹھا کر بھاگ جانے دیں۔ آپ بلڈنگ کے باہر چلے جائیں پاپا .... چلے جائیں۔"

"اس نے تیری گردن پر چھری رکھ دی ہے؟" راجہ استاد نے پوچھا۔ "اور رانی کا سوٹ کیس بھی اس کے پاس ہے؟"

میں نے اسے اقرار میں جواب دینے کا اشارہ کیا۔ "ہاں پاپا .... یہ مجھے مار ڈالے گی۔"

"تُو فکر نہ کر' میں جا رہا ہوں۔ جب یہ سوٹ کیس لے کر بھاگ جائے گی اور میں خود اسے جاتے

ہوئے دیکھ لوں گا تو واپس آ جاؤں گا۔" راجہ استاد کی آواز میں اب سکون تھا۔ "اس سے کہہ دے یا اشارے سے سمجھا دے کہ میں جا رہا ہوں' یہ تیرے گلے سے چھری ہٹا لے۔"

میرے ایما پر شانتی جواب میں بولی۔ "اچھا پاپا! .... آپ جائیں۔"

میں سمجھ گئی تھی کہ راجہ استاد کیا داؤ کھیل رہا ہے' چوروں کو بھی کبھی مور لگے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے خود اپنے ہی گھر میں "چوری" کر کے فرار ہو جانے دیتا۔ وہ بھی اس کا سوٹ کیس لے کر جو اس کی مہمان تھی۔ میں نے چند ہی لمحے بعد اس کے قدموں کی دور ہوتی آواز سنی۔

"تم ایسا کرو شانتی کہ جلدی سے میرا سوٹ کیس اٹھا لاؤ یہاں۔" میں نے سرگوشی کی۔ "تاکہ جب میں دروازہ کھولوں تو استاد کو یقین آ جائے' واقعی کوئی چور گھر میں گھس آیا ہے۔"

"مگر پاپا تو باہر جا رہے ہیں؟" وہ دھیمی آواز میں بھول پن سے بولی۔

"کہیں نہیں جائیں گے پاپا! ابھی پنجوں کے بل چلتے ہوئے پھر پہنچ جائیں گے دروازے تک۔ تم جاؤ نا' جلدی کرو۔"

شانتی چلی گئی تو میں نے دروازہ سے کان لگا دیئے اور میرا قیاس درست ہی ثابت ہوا۔ راجہ استاد دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شانتی سوٹ کیس اٹھا لائی۔

"اب تم اندر جاؤ۔" میں نے اسے سرگوشی میں سمجھایا۔

"اور سنو' بھانڈا نہ پھوڑ دینا۔ میں جھوٹ موٹ راجہ استاد سے لڑوں گی بھی' تم چیخنا چلانا مت۔"

شانتی اقرار میں سر ہلا کے اندر چلی گئی۔ آج میں' راجہ استاد سے پہلی ملاقات کا "قرض" چکانا چاہتی تھی۔ اسی کے ساتھ اسے یہ بھی پختہ یقین ہو جاتا کہ میں واقعی "بمبئی کی رانی" ہوں' اس نے میرے بارے میں صحیح قیاس کیا ہے۔ اس یقین سے میں آئندہ فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

راجہ استاد شاید سانس روکے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ باہر اب ذرا سی بھی آہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ دروازہ کھلتے ہی مجھ پر جھپٹے گا اور یہ بھی علم تھا کہ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو ہے۔ میں اسی لئے دروازہ کھولتے ہوئے پوری طرح چوکنا اور محتاط تھی۔ یہ کھیل دلچسپ ہونے کے ساتھ بہرحال خطرناک بھی تھا۔

ادھر میں نے دروازہ کھولا' ادھر راجہ استاد تیزی سے اندر گھسا۔ وہ شاید دروازہ کے باہر دیوار سے چپکا کھڑا تھا اور دروازہ کھولے جانے ہی کا منتظر تھا۔ وہ اسی لئے پہلی نظر میں مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں اس کا توڑ پہلے ہی سوچ چکی تھی۔ جیسے ہی وہ گھسا' میں نے سوٹ کیس آگے کر دیا۔ سوٹ کیس سے ٹکرا کر وہ لڑکھڑایا اور میرے لئے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ میں پلٹ کر اندر بھاگی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو راجہ استاد گرتے گرتے سنبھلا اور پھر کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کی طرح میری طرف آیا۔ میں بھلا کہاں اس کے ہتھے چڑھنے والی تھی' لپک کر اسی کے کمرے میں گھس گئی۔ دانستہ میں نے ایسا کیا تھا کیونکہ اس کے کمرے کے دو دروازے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں دو اتنی بڑی کھڑکیاں بھی تھیں کہ میں ان سے گزر سکتی تھی۔ ہلکے پھلکے جسم کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جست بھرنے میں آسانی رہتی ہے۔

راجہ استاد ایک دروازے سے کمرے میں داخل ہوا تو میں دوسرے دروازے سے نکل گئی۔ وہ کمروں کے درمیان موجود جگہ تک میرے پیچھے دوڑا تو میں ایک کھڑکی کے ذریعے اندر کمرے میں کود گئی۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا گونگی بندریا!" راجہ استاد جیسے پھٹے بانس کی طرح دھاڑا۔ "تجھے پچھاڑے بغیر نہیں چھوڑوں گا کتیا!" وہ ایک بار پھر کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے کا انتخاب میں نے دروازوں اور کھڑکیوں ہی کی وجہ سے کیا تھا۔

"او' او.........." میں نے منہ سے آواز نکال کر اسے چڑایا اور جان بوجھ کر موقع دیا کہ وہ مجھ پر چھلانگ لگا دے۔ استاد نے ایسا ہی کیا اور چوٹ کھا گیا۔ میں جیسے اس کے اوپر سے اڑتی ہوئی کمرے کی دوسری کھڑکی سے باہر جا گری۔ اسی کے ساتھ اچھل کر کھڑے ہوتے ہی میں نے ایک مرتبہ پھر "او' او" کی آواز نکالی۔

"تیری تو.......... او' او.......... میں.........." راجہ استاد نے ناقابل تحریر الفاظ ادا کئے۔ پھر شاید اسے اپنی حماقت کا احساس ہو ہی گیا۔ اس نے کمرے کا وہ دروازہ جو باہر کی طرف سے کھلتا تھا' اندر سے بند کر دیا' اسی کے ساتھ دونوں کھڑکیاں بھی لگا دیں اور پہلو والے دروازے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ کمرے کا یہ دروازہ' گھر کے کھلے ہوئے دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس طرح گویا راجہ استاد نے اپنی دانست میں میری راہ فرار مسدود کر دی تھی۔ اب وہ میرے پیچھے بھاگنے کے بجائے خون خوار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں اس سے صرف چند گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ "اب دیکھتا ہوں گونگی حرامزادی کہ تُو کیسے بچ کر نکلتی ہے؟" استاد جیسے غرایا۔

میرے لئے یہ بہت آسان تھا کہ عقبی دروازہ کھول کر "سنٹ" (فرار) ہو جاتی۔ جہاں میں کھڑی تھی وہاں سے عقبی دروازہ دور نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے ایسا نہیں کیا۔ شانتی اپنے کمرے میں گھسی ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ اس نے بھیڑ رکھا تھا۔ میں نے دوڑتے بھاگتے ہوئے بھی دروازے میں خفیف سی جھری دیکھ لی تھی۔ اس جھری سے شانتی یقیناً سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ استاد اب نپے تلے قدم رکھتا ہوا اور مجھ پر نظر جمائے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اچانک اچھل کر اس کمرے کی طرف بھاگی جو گویا میری واحد پناہ گاہ رہ گیا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں استاد نے مجھے ٹھہرایا تھا پھر تو استاد کے پیروں میں جیسے پر لگ گئے۔

"پھنس گئی نا چوہیا چوہے دان میں۔" استاد کمرے کے دروازے پر چاقو ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

میں پیچھے ہٹتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ راجہ استاد نے یقیناً میری تیزی و طراری کا اندازہ کر لیا تھا۔ اسی سبب اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا کہ کہیں میں اسے غوطہ دے کر باہر نہ نکل جاؤں۔

"مجھے شوق تو نہیں ہے' مگر تیری خاطر آج یہ گناہ بھی کر لوں گا' تجھے پچھاڑ کر.........." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر دانت پیستے ہوئے چاقو والے ہاتھ کو گھٹیا انداز میں حرکت دی۔ "اس کے بعد تجھے اسی چاقو سے ذبح کر دوں گا۔"

راجہ استاد میرے لئے جو غلیظ زبان استعمال کر رہا تھا' اسے مزید سننا اب میرے لئے از راہ تفنن

طبع بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے اسی لئے "او' او" کی آوازیں نکال کر استاد کو طیش میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ مجھ پر حملہ کرے۔ اسی کے ساتھ اپنے جسم کو جھکا کر میں اس طرح اِدھر اُدھر حرکت کرنے لگی جیسے بھاگ نکلنے کی کوشش میں ہوں۔ توقع کے مطابق استاد سنک گیا۔ وہ بھی میری ہی طرح ذرا سا جھکا اور دونوں ہاتھ اِدھر اُدھر پھیلائے تیزی سے مجھ پر جھپٹا۔

میں ایک دم سیدھی ہو کر اچھلی اور چاقو والے ہاتھ کے پنجے پر بھرپور ٹھوکر ماری۔ نیم دائرے کی صورت میں میری ٹانگ اس طرح گھومی تھی کہ چاقو نیچے گرنے کی بجائے استاد کے ہاتھ سے چھوٹ کر اوپر جائے۔ استاد کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور میں نے چاقو کو فضا ہی میں لپک لیا۔

اب میں' استاد کے سامنے چاقو تھامے کھڑی تھی اور وہ مجھے آنکھیں پھاڑے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی بصارت پر یقین نہ ہو۔

کھیل ختم ہو چکا تھا اس لئے میں ایک قدم پیچھے ہٹی اور چاقو بند کر کے راجہ استاد کے قدموں میں پھینک دیا۔

"آج تک میں نے کسی کے قدموں میں چاقو نہیں ڈالا' اس سے زیادہ میں تمہیں عزت نہیں دے سکتی۔ تم چاہو تو کلکتے میں مجھے اپنا مہمان بنائے رکھو' چاہو تو چاقو کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دو۔ میں بُرا نہیں مانوں گی۔" یہ تقریباً وہی الفاظ تھے جو راجہ استاد نے پہلی ملاقات میں مجھ سے کہے تھے۔

"را.......... رانی! تت.......... تم۔" استاد حیرت کے مارے ہکلا کر رہ گیا۔ اس نے یقیناً میری آواز پہچان لی تھی۔

"جی ہاں استاد!" میں مسکرائی۔

"لعنت بھیجو استاد! بھنگی بنا کر استاد کہہ رہی ہو' میں کہاں کا استاد۔" اس کی آواز میں دکھ بھی تھا اور اظہار ندامت بھی۔ "اور مجھ کمینے کو دیکھو کہ بمبئی کی رانی کو پچھاڑنے کا دعویٰ کر رہا تھا' توبہ توبہ۔" وہ اس طرح اپنے دونوں رخساروں پر تھپڑ مارنے لگا جیسے کوئی گناہ عظیم کر دیا ہو۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ "بس کرو استاد! یہ کیا بچپنا چھانٹ رہے ہو؟"

"ارے میں تمہیں گندی گندی گالیاں بک رہا تھا اور تم الٹا مجھے روک رہی ہو۔ ڈوب مرنا چاہئے مجھے کہیں جا کر چلو بھر پانی میں۔ حد کر دی میں نے حرامزدگی کی۔"

"تو اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں استاد! تمہیں کیا الہام آ رہا تھا کہ میں رانی ہوں؟ فضول باتیں کئے جا رہے ہو۔" میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ "تمہاری جگہ اگر میں ہوتی اور اس طرح کوئی اجنبی میرے گھر میں گھس کر چوری کی کوشش کرتا تو.........."

اسی وقت دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور میری بات ادھوری ہی رہ گئی۔ راجہ استاد جھک کر اپنا چاقو اٹھانے لگا اور میں نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ میں یہ سمجھی تھی کہ شاید دروازہ بند ہونے کی وجہ سے شانتی کچھ گھبرا گئی ہو گی' مگر وہ شانتی نہیں تھی۔ میرے سینے کی طرف ایک ریوالور کی نال اٹھی ہوئی تھی اور ہمایوں مجھے بڑی غضبناک نظروں سے گھور رہا تھا اس کے پیچھے کچھ ہی فاصلے پر شانتی کھڑی تھی

جس کے ہونٹوں پر بڑی شریر مسکراہٹ تھی۔ یقیناً اسی نے ہمایوں کو اُلو بنایا تھا۔

"اگر تُو نے بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔" ہمایوں نے سخت لہجے میں مجھ سے کہا۔

"ابے چپ بے لونڈے! بڑا آیا گولی مارنے والا۔ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔ تُو اور بمبئی کی رانی کو گولی مارے گا۔" استاد مجھے پیچھے ہٹا کر سامنے آ گیا۔

شانتی شاید بہت دیر سے اپنی ہنسی ضبط کر رہی تھی۔ ہمایوں کو "نمونہ بنتے" دیکھ کر وہ کھلکھلا اٹھی۔

"پہلے بتایا نہیں اور اب دانت پھاڑ رہی ہے' ذلیل کہیں کی۔" ہمایوں گویا کھمبا نوچنے لگا۔ پھر اس نے ریوالور جیب میں رکھ کر شانتی کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "دوں گا ابھی الٹا ہاتھ منہ پر۔"

"مجھ پر کیوں بگڑ رہا ہے' دیدی ہی نے کہا تھا۔ کسی کو بتانا مت۔ اس میں میرا کیا قصور ہے' ہاں؟"

"ارے او شانتی کی بچی! تجھے پہلے سے خبر تھی کہ یہ رانی ہے اور تُو اپنے پاپا کو دوڑاتی رہی ناحق' تُو بھی پوری آفت کی پڑیا ہوتی جا رہی ہے' ہیں۔" استاد بولا۔ "حد ہو گئی آج تو' یہاں ساری دنیا کو اُلو بناتے پھرتے ہیں اور آج خود ہی اُلو بن گئے۔"

"وہ بھی اپنی ہی بٹیا کی سازش کے سبب۔" میں نے گرہ لگائی۔

"ارے اپنوں کی سازش کے سبب تو دلی لٹ گئی ورنہ بندر کیوں حکومت کر رہے ہوتے ہم پر۔"

"افسوس صد افسوس استاد کہ اس وقت یہاں جنرل بخت خاں نہ ہوا ورنہ تمہیں عظیم محب وطن جان کر اپنے گلے کا ہار بنا لیتا۔" یہ کہہ کر میں ہنس پڑی۔

استاد نے بھی بڑا تگڑا قہقہہ لگایا اور شانتی تو جیسے "کھلکھلانے" کے لئے بے چین سی تھی۔ ہمایوں بھی "قوقو' قوقو" کرنے لگا۔

اس تفریح میں خاصا وقت گزر گیا تھا اور اب رات کے دس بج رہے تھے۔ راجہ استاد سے ابھی کام کی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔ پھر خود اسی نے مجھے یہ موقع دے دیا' کہنے لگا۔ "اب یہ بہروپ ختم کر کے میرے کمرے میں آ جاؤ' کھانا لگواتا ہوں میں۔"

"یہ بہروپ ختم نہیں ہو گا استاد!"

"وہ کیوں؟"

"بتا دوں گی' پہلے کھانا کھا لو۔"

"لیکن رانی! تمہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا میں نے' تم اس وقت چھپن چھری بنی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا بھی شاید کہ آج کلکتے والوں کی خیر نہیں' پھر تم یہ........"

"آج تو کلکتے والوں نے میری خیریت پوچھ لی استاد! بڑی مشکل سے جان بچا کر یہاں تک پہنچی ہوں۔"

"کیوں' کیا ہو گیا؟" استاد ایک دم فکرمند ہو گیا۔ ہمایوں اور شانتی اس وقت تک وہاں سے جا چکے تھے۔

"بتا دوں گی نا' تم اپنے کمرے میں چلو' کھانا کھا کر بات ہو گی۔"

"تم نے الجھن میں ڈال دیا مجھے۔" وہ یہ کہتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور اسی وقت مجھے اپنے سوٹ کیس کا خیال آ گیا جو بیرونی دروازے کے پاس پڑا تھا۔ میں وہ سوٹ کیس اٹھا لائی اور بھاگ دوڑ میں چپلیں جو پیروں سے اتر گئی تھیں' وہ بھی تلاش کر لائی۔ گھر کا دروازہ تو شاید ہمایوں یا شانتی نے اندر سے بند کر دیا تھا مگر افراتفری میں میرے سوٹ کیس کا کسی کو خیال نہیں آیا تھا۔

میں اب تک پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں ایک ہی نتیجے تک پہنچی تھی کہ اعلیٰ انگریز حکام کسی سبب براہ راست مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کر رہے ہیں۔ وہ سب کیا ہو سکتا ہے' یہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ پہلے انہوں نے میری نگرانی شروع کرائی۔ جب یہ بات میرے علم میں آ گئی اور میں نے جارحانہ رویہ اختیار کیا تو انہوں نے گویا پسپائی اختیار کر لی' یعنی نگرانی ختم کرا دی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ جن لوگوں نے ذاتی سطح پر مجھے نقصان پہنچانا چاہا' ان سے جواب طلب کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں سی آئی ڈی کے ایک اے ایس آئی کو معطل بھی کر دیا گیا پھر انہوں نے دوسرا طریقہ کار اختیار کیا۔ سی آئی ڈی ہی کا ایک انسپکٹر پرکاش خود کو مسلمان ظاہر کر کے میرے قریب آ گیا۔ بھانڈا پھوٹ جانے کے بعد انسپکٹر پرکاش میرے ہاتھوں مار کھا کے مرتے مرتے بچا۔ اس کے باوجود میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اسی ضمن میں تازہ ترین واقعہ شہزاد کی گرفتاری تھی۔ ارشاد حسین سے مجھے معلوم ہوا کہ نئی حکمت عملی کیا ہے۔ یہ نئی حکمت عملی مجھے چھیڑے بغیر شہزاد کو کسی کیس میں پھانسنا تھی۔ بات اب بھی وہی تھی کہ اعلیٰ حکام کسی نامعلوم وجہ سے مجھے چھیڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ارشاد حسین سے اسی لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ شہزاد کی رہائی میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرا کوئی بھی جارحانہ اقدام میرے حریفوں کو ایک بار پھر پسپائی پر مجبور کر دے گا اور میں اس جارحانہ اقدام کا تعین کر چکی تھی۔ میں ابھی اپنا حالیہ محفوظ ٹھکانہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس وقت تک میں' راجہ استاد کے گھر میں رہنے کا فیصلہ کر چکی تھی جب تک کسی نئے مستقل ٹھکانے کا بندوبست نہ ہو جاتا۔ اسی غرض سے میرے نزدیک راجہ استاد کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ میں نے اب اپنے طرز عمل' گفتگو کے مخصوص انداز اور رکھ رکھاؤ سے راجہ استاد کو پختہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ مجھے جو کچھ سمجھ رہا ہے' حقیقت ہے۔ بلا سبب ہی میں نے یہ شوشہ نہیں چھوڑا تھا کہ آج بڑی مشکل سے جان بچا کر آئی ہوں۔

اس رات کھانا کھانے کے بعد ہمایوں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ راجہ استاد کے کمرے ہی میں دسترخوان بچھا تھا۔ شانتی برتن وغیرہ اٹھا رہی تھی۔ میں اسی سبب راجہ استاد کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ وہ مضطرب سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے لئے یہ اطلاع غیر متوقع ہی رہی ہو گی کہ بمبئی کی رانی کو بھی جان کے لالے پڑ سکتے ہیں۔

"ہاں اب کہو رانی! کیا ہوا؟" بیٹھتے ہی اس نے سوال کیا۔ "کیا ہاتھ اوچھا پڑ گیا؟"

"بس یہی سمجھ لو استاد! مگر میرا نام بھی رانی ہے' میں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ آج ہی رات بدلہ چکا دوں گی۔"

"کیا؟" حسب توقع استاد چونک اٹھا۔ "اس وقت جاؤ گی؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں' اور ممکن ہے کل رات بھی جانا پڑے۔" میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کہا' پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "یا تو رانی کسی پر ہاتھ ڈالتی نہیں اور ہاتھ ڈال دیتی ہے تو پھر چھوڑتی نہیں۔ تم بتاؤ استاد کہ کسی کار کا بندوبست ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ کار ڈرائیو کرنے والا کوئی بااعتماد اور نڈر بھی چاہئے۔"

"کار تو نہیں' ہاں ٹیکسی گھیرنا ممکن ہے۔ رہا ڈرائیور تو اپنے لونڈے ہمایوں کو ڈرائیونگ آتی ہے۔"

"پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔" میں نے اظہار مسرت کیا۔

"کب اور کہاں جانا ہے؟"

"تمہارے پہلے سوال کا جواب دے سکتی ہوں' دوسرے کا نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی گیارہ بجنے والے ہیں' گھنٹے بھر بعد روانہ ہونا ہے۔"

"تو پھر میں پکڑ لاؤں کوئی ٹیکسی؟"

"ہاں جاؤ اور اپنا چاقو تو مجھے دے دو .... مگر اس کے سوا کوئی اور چاقو نہیں ہے؟ گراری والا چاقو کو کھولتے ہوئے آواز بہت ہوتی ہے۔"

"کھٹکے سے کھلنے والا چاقو بھی ہے میرے پاس' وہ دے دوں گا۔ ہمایوں کے پاس ریوالور بھی ہے' تم دیکھ ہی چکی ہو۔"

"نہیں' گولی نہیں چلانی۔"

"پھر بھی ہمایوں ریوالور ساتھ لے جائے گا' ضرورت پڑ سکتی ہے۔" پھر استاد نے کمرے سے نکل کر ہانک لگائی۔ "ہمایوں! ابے کیا ابھی سے سونے کا بہانہ کر رہا ہے؟"

"نہیں استاد! جاگ رہا ہوں' آیا۔" جواب میں ہمایوں کی آواز آئی پھر چند ہی لمحے بعد وہ باہر نکل آیا۔

میں نے دیکھا وہ اپنے جسم کے نچلے حصے پر صرف گمچھا باندھے ہوئے تھا۔ بنگال میں گرمی بہت پڑتی ہے اس لئے لوگ رات کو سوتے وقت عموماً گمچھا باندھتے ہیں۔ گمچھا باریک سے جھرجھرے کپڑے کا ہوتا ہے اور صرف گھٹنوں تک جسم کے نچلے حصے کو ڈھکتا ہے۔

"کپڑے بدل کر تیار ہو جا' تجھے رانی کے ساتھ جانا ہے۔ میں سواری کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں' ریوالور ساتھ رکھ لیو۔" راجہ استاد تو یہ کہہ کر بیرونی دروازے کی طرف جیسے بتی بھر گیا اور ہمایوں وہیں حیران حیران سا کھڑا رہ گیا۔

"ہمایوں!" میں نے اسے آواز دی' پھر پوچھا۔ "شانتی بھی جاگ رہی ہے' یا سو گئی؟"

"جاگ رہی ہے' بھیجوں؟"

"ہاں بھیج دو۔"

مجھے دراصل یہ خیال آیا تھا کہ بھاگتے ہوئے میرے پیروں سے کلکتہ چپل اتر گئے تھے۔ اس وقت

چپل پہن کر جانا قطعی مناسب نہیں تھا۔ شانتی سے میں کوئی ایسے پرانے سینڈل لینا چاہتی تھی جو میری شخصیت اور حلئے سے میل کھا سکیں۔ شانتی نے میری یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ شانتی کا پیر مجھ سے قدرے چھوٹا تھا لیکن کام چل گیا۔ اس دوران میں ہمایوں بھی کپڑے پہن کر میرے کمرے میں آ گیا۔

"کیا استاد بھی ساتھ چل رہے ہیں؟ کوئی لمبا چکر ہے؟" ہمایوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"نہیں' صرف تمہی ساتھ چلو گے۔ استاد نے ریوالور لے جانے کو تم سے کہہ دیا اس لئے میں کچھ نہیں بولی ورنہ اس کی ضرورت نہیں۔ ریوالور چاہے ساتھ لے چلو مگر گولی نہیں چلاؤ گے۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا' مجھے صرف ٹیکسی میں لے جانا اور لانا ہے۔ تم ٹیکسی ہی میں بیٹھے رہو گے اور انجن اسٹارٹ رکھو گے۔ جیسے ہی میں واپس ٹیکسی میں آ کر بیٹھوں تمہیں ٹیکسی دوڑا دینی ہے۔ سمجھ گئے یا مزید کچھ سمجھنا ہے؟" میں نے ہمایوں کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"لیکن چلنا کدھر ہے؟" یہ سوال کرتے ہوئے ہمایوں کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔

"ساتھ چلو گے تو خود ہی دیکھ لو گے۔"

پھر ہمایوں نے کچھ نہیں پوچھا۔ راجہ استاد کو واپسی میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ وہ کامیاب ہی لوٹا

"لے بھئی لونڈے! یہ ٹیکسی کی چابی پکڑ۔" راجہ استاد نے ہمایوں کو مخاطب کیا' پھر مجھ سے بولا۔ "واپسی کے بارے میں تو شاید ابھی تم کچھ نہیں بتا سکو گی۔"

"ہاں استاد' کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"صبح ہونے سے پہلے تو خیر لوٹ آؤ گی نا؟" استاد ہنسا۔

"اتنی دور بہرحال نہیں جانا کہ واپسی میں صبح ہو جائے۔"

"چلو غنیمت ہے ورنہ تو میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا' کہیں دھوتی کے ساتھ لنگوٹی بھی نہ چلی جائے۔"

"اچھا تو استاد! ہمایوں تمہاری لنگوٹی ہے۔" میں خود ہی اپنی بات پر ہنس پڑی۔ اس براہ راست چوٹ کے سبب ہمایوں کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا' مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔

کچھ ہی دیر میں ہمایوں کے ساتھ گھر سے نکل کر میں ٹیکسی کی طرف بڑھی۔ راجہ استاد نے اس دوران میں مجھے کھٹکے دار چاقو لا کر دے دیا تھا۔

میں جب ہمایوں کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی تو وہ انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "اب تو بتا دو رانی! کدھر چلوں؟"

ہمایوں نے کچھ ایسی مظلوم سی آواز میں یہ سوال کیا کہ مجھے ہنسی آ گئی پھر میں نے اسے بتا ہی دیا۔ "بہو بازار۔"

راستے میں ہمایوں نے کئی بار باتوں باتوں میں مجھے کریدنا چاہا کہ معاملہ کیا ہے' مگر میں نے اسے ہوا نہ لگنے دی۔

مچھوا بازار میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ آبادی تھی۔ پھلوں کی بڑی مارکیٹ بھی یہیں ڈلہوزی اسکوائر میں واقع جنرل پوسٹ آفس کے بعد شہر کا سب سے بڑا پوسٹ آفس آبادی کے ... میں تھا۔ اس کے ساتھ آس پاس صرف ہندو آباد تھے۔ میں نے ٹیکسی پوسٹ آفس کے پاس ہی ... کیونکہ وہ گلی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی جہاں مجھے جانا تھا۔ ٹیکسی کا اگلا دروازہ بھی کھلا رکھنے ... کہہ کر میں تیزی سے اس گلی کی طرف چل دی جو میری منزل تھی۔ چلتے ہوئے میں نے کھٹکے دار ... ہاتھ رکھا جو میری ساڑھی میں کمر کے قریب اڑسا ہوا تھا۔

گلی میں داخل ہو کر میں نے دائیں جانب والے مکان گننا شروع کر دیئے اور پھر آٹھویں مکان ... سامنے رک گئی۔ گلی میں سناٹا تھا کیونکہ نصف شب گزر چکی تھی۔ اچانک میں نے اسی مکان کا دروازہ زور سے پیٹنا شروع کیا' اسی کے ساتھ پوری قوت سے چیخنے لگی۔ "بچاؤ .... بچاؤ' بھگوان کے لئے مجھے بچاؤ۔" میں مسلسل چیختے ہوئے یہی الفاظ دہراتی رہی۔ میری چیخ پکار کی وجہ سے پہلا دروازہ ... جسے میں پیٹے جا رہی تھی۔ ادھر دروازہ کھلا' ادھر میں زمین پر گر کے تڑپنے لگی۔ "بچاؤ' بچاؤ" میں چیخ رہی تھی۔ اردگرد کے کئی اور مکانوں کے دروازے بھی کھل گئے اور لوگ گلی میں نکل آئے۔ ... ہی طرف لپک رہے تھے۔

چند ہی لمحے بعد ایک سرد اور بے رحم آواز میری سماعت میں زہر سا گھول گئی۔ "معبلہ! تمہیں ... کی ضرورت نہیں' اسی طرح پڑی رہو ورنہ ...." فقرہ ادھورا چھوڑ دیا گیا جسے پورا کرنے کی ضرو... بھی نہیں تھی۔ ایک ریوالور کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اس پر مجھے شدید حیرت تھی کہ انسپکٹر پرکاش نے مجھے میک اپ کے باوجود کس طرح پہچان لیا ... مجھے ریوالور کی زد پر لینے والا وہی تھا۔ میں اسے شکار کرنے آئی تھی اور اس نے مجھی کو بے بس کر ... میں نے اسی کے گھر کا دروازہ پیٹا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر میرے قریب آئے ... اس کے سینے میں چاقو اتار دوں گی۔ توقع کے مطابق وہ بیساکھیوں کے سہارے ہی چلتا ہوا میرے پا... اور پھر اچانک ریوالور نکال لیا تھا۔

لمحہ حیرت گزرتے ہی مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ اس کے سوا کوئی اور امکان ... تھا کہ عیار انسپکٹر پرکاش نے مجھے میری آواز سے پہچان لیا ہو گا۔ میں بہرحال ابھی اپنی آواز بدلنے ... نہیں تھی۔ ابھی گلی کے دوسرے لوگ قریب نہیں پہنچے تھے اور مجھے ان کے قریب آنے سے پہلے ... کر گزرنا تھا۔

ہرچند کہ میرا وہ اقدام خطرناک تھا' اندازے کی ذرا سی بھی غلطی میری جان لے سکتی تھی مگر ... اور چارہ کار بھی نہیں تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے تیزی سے کروٹ لی اور چیختے ہوئے انسپکٹر پرکاش کی بیساکھی گھسیٹ لی۔ اسی لمحے فائر کی آواز گلی میں گونج اٹھی۔ گرتے گرتے اس نے مجھ پر گولی چلا دی ... میں لڑھک کر اس جگہ سے نہ ہٹ جاتی تو یقیناً گولی میرے سینے میں اتر گئی ہوتی۔ انسپکٹر پرکاش نے ... گرتے حیرت انگیز طور پر خود کو سنبھال لیا تھا۔ کیوں کہ اس کی سیدھی بغل میں دوسری بیساکھی ...

فائر ہونے کی وجہ سے گلی والے دوڑ کر اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔ ریوالور اب تک ... کے ہاتھ میں تھا اور یہ خطرناک بات تھی وہ مجھ پر دوبارہ بھی فائر کر سکتا تھا۔ وہ ابھی سنبھل کر کھڑا ہی تھا کہ میں نے اچھل کر اپنی دائیں ٹانگ سے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو نشانہ بنایا۔ میری نپی تلی ... اس کی کلائی پر پڑی تھی۔ ضرب کی شدت کے سبب پرکاش چیخ اٹھا اور اسی کے ساتھ ریوالور ہاتھ ... چھوٹ گیا۔ مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ میں نے ساڑھی میں اڑسا ہوا چاقو کھینچا اور زقند بھر کے پرکاش ... پہنچ گئی۔ دوسرے ہی لمحے کھٹکے دار چاقو کھل چکا تھا۔

"نہیں .... نہیں۔" انسپکٹر پرکاش خوفزدہ آواز میں چیخا۔ غیرارادی طور پر اس نے اپنے دونوں ... اٹھا دیئے تھے جس کی وجہ سے دوسری بیساکھی بھی اس کے بغل سے نکل گئی تھی اور وہ اپنے جسم کا ... برقرار نہ رکھ سکا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں پہلے ہی مضروب تھیں اور ایک ٹانگ پر پلاستر چڑھا ہوا

پھر میں نے دیر نہیں کی۔ ادھر وہ زمین پر گرا' ادھر میں اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی ... پر چاقو کی تیز دھار پھیرنے میں مجھے بس چند لمحے لگے ہوں گے۔ اس کے بعد میں اچھل کر کھڑی ہو ... کٹی ہوئی گردن سے بلند ہوتا خون کا فوارہ میری ساڑھی کو داغدار نہ کر دے۔

آدھی سے زیادہ گردن کٹ گئی تھی جس سے "خرر .... خرر" کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ... ذبح کئے ہوئے کسی جانور کی طرح ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

"خون .... خون .... خون ہو گیا .... خون۔" گلی میں ایک تیز آواز گونجی۔ پرکاش کا یہ ... پڑوسی ہی ہو سکتا تھا جس نے اپنے گھر سے چھپ کر پرکاش کو قتل ہوتے دیکھا ہو گا۔

اب میرا وہاں ایک لمحے بھی رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے چاقو بند کیا اور اسے پہلو میں ... کر اسی طرف بھاگ اٹھی جدھر سے گلی میں داخل ہوئی تھی۔

"پکڑو .... پکڑو .... وہ بھاگی جا رہی ہے۔" وہی پہلی مردانہ آواز پھر بلند ہوئی۔

پھر ہر طرف "پکڑو پکڑو" کا شور بلند ہونے لگا۔ یہ صورت حال میرے لئے غیر متوقع ہونے کے ... تشویشناک بہرحال نہیں تھی کیوں کہ وہ لوگ صرف شور مچا رہے تھے۔ کوئی بھی اپنے گھر سے نکل کر میرے پیچھے آنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ میں دوڑتی ہوئی اس گلی سے نکلی اور جلد ہی پوسٹ آفس کے ... اس جگہ پہنچ گئی جہاں ٹیکسی میں ہمایوں کو چھوڑ گئی تھی۔

ٹیکسی کا دروازہ مجھے کھلا ہوا ہی ملا تھا۔ ہمایوں نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے ... ٹیکسی میں بیٹھ کر جیسے ہی میں نے دروازہ بند کیا ہمایوں نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ جس کا انجن بند نہیں ... گیا تھا۔

"تیزی کے ساتھ جلد از جلد یہاں سے نکل چلو۔" میں نے ہمایوں کو مخاطب کیا۔

ہمایوں نے تعمیل حکم میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے بڑی تیزی سے ٹیکسی موڑی اور واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

"میں تو گولی چلنے کی آواز سن کر گھبرا گیا تھا۔" ہمایوں بولا۔ "مجھے معلوم تھا کہ آپ کے پاس چاقو ہے۔ ظاہر ہے کہ فائر کرنے والا کوئی اور ہی ہو گا جو آپ کا دوست نہیں ہو سکتا۔ کیا میرا خیال درست ہے؟"

"ہاں۔" میں نے تصدیق کی۔ "وہ دوست نہیں دشمن ہی تھا اور اس نے میرے ہی اوپر گولی چلائی تھی۔"

"پھر........... آپ بچ کس طرح .... کیسے بچ گئیں؟" ہمایوں حیران سا ہو کر بولا۔

"مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کام تو ہو گیا نا؟" ہمایوں نے پوچھا۔

"ہاں ہو گیا۔" یہ کہہ کر میں نے طویل سانس لیا۔

پھر ہمایوں نے کوئی سوال نہیں کیا اور میں بھی کچھ نہیں بولی۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ انگریز کے قتل کا کیا ردعمل ہو گا؟ اس کا قتل جن حالات میں ہوا تھا اس سے انگریز حکام کے لئے یہ نتیجہ مشکل نہ ہوتا کہ اس کے قتل میں میرا ہی ہاتھ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھ جاتے کہ میں کلکتے ہی میں موجود ہوں۔ انسپکٹر پرکاش کے قتل کے بعد میرے چہرے پر موجود میک اپ یقیناً خطرناک ثابت ہوتا اگر کسی کو قریب سے مجھے دیکھنے کا موقع مل جاتا' مجھے ایک ہی شخص نے قریب سے دیکھا تھا جو اب دنیا میں نہیں تھا۔ کوئی اور میرے نزدیک نہیں آ سکا تھا۔ تفتیش کی صورت میں اس گلی کے لوگ اتنا ہی بتا پاتے کہ پرکاش کو قتل کرنے والی کوئی عورت تھی جو ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ میں اس لئے فکر مند نہیں تھی۔

ہمایوں کے ساتھ میں واپس چاندنی چوک پہنچی تو راجہ استاد جاگ رہا تھا۔ میں نے کمر میں اڑسا کھٹکے دار چاقو نکال کر راجہ استاد کی طرف بڑھایا تو مجھے چاقو پر لگے ہوئے خون کا خیال آ گیا۔ "استاد! تمہارے چاقو پر خون لگ گیا ہے' دھو لینا۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر راجہ استاد چونکا اور کھٹکا دبا کر چاقو کو کھول لیا' چاقو کا پھل واقعی خون آلود تھا۔ ہمایوں ابھی تک وہیں تھا۔ راجہ استاد نے چاقو اسے دے کر کہا۔ "لے اسے دھو لا۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا کسی کو اگلے جہان کی سیر کرا دی ہے رانی!؟"

راجہ استاد کے سامنے یہ اعتراف کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' سو میں بولی۔ "ہاں استاد! ... تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آدھی گردن کٹنے کے بعد وہ زندہ نہیں بچا ہو گا۔ لوگ شور مچانے لگے ... گردن الگ ہی کر دیتی۔" میرا انداز گفتگو معمول کے مطابق تھا۔ جیسے یہ واقعی میرے لئے کسی ... کا حال نہ ہو۔

"تو کیا جاگ ہو گئی تھی۔" راجہ استاد نے پُر تجسس لہجے میں سوال کیا۔

"جگایا تو میں نے ہی تھا' ساری گلی والوں کو چیخ چیخ کر۔" میں نے ہنس کر کہا۔ پھر بغیر ... مقتول کون تھا اور اسے میں نے کیوں قتل کر دیا' راجہ استاد سے تمام واقعہ من و عن بیان کر دیا۔

بھی باہر سے چاقو دھو کر میرے قریب آ بیٹھا تھا۔ اس نے بھی یہ پورا واقعہ سنا۔

"رانی! واقعی تم بڑی جیوٹ ہو۔" استاد نے میری تعریف کی۔ "اس طرح دشمن کو گھر سے نکال کر مارنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ جبکہ اس کے پاس ریوالور بھی تھا اور اس نے تمہیں تمہاری آواز سے پہچان بھی لیا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر تو بڑے بڑے مردوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔"

اسی وقت شانتی پہلے والے کمرے سے نکل آئی۔ وہ بھی شاید ہمایوں کی واپسی کے انتظار میں سو نہیں سکی تھی۔ وہ چائے کے لئے پوچھنے آئی تھی۔

"ہاں بنا لو۔" میں بول اٹھی۔ اس وقت مجھے واقعی چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ ساحلی شہروں کی آب و ہوا کچھ ایسی ہوتی ہے کہ لوگ چائے پینے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ مجھے بھی یہ عادت پڑ گئی تھی۔ شانتی' استاد کے کمرے سے چلی گئی تو میں نے کہا۔ "استاد! تقریباً ایک ہفتے کے لئے مجھے بردوان جانا ہے۔"

"کیوں؟" استاد نے چونک کر دریافت کیا۔

"پرسوں دوپہر کو جاؤں گی اور ہفتے بھر بعد پھر تمہارے پاس لوٹ آؤں گی۔" میں نے بتایا۔

"اگر چاہو تو اپنے لونڈے ہمایوں کو بھی تمہارے ساتھ کر دوں؟ ممکن ہے ضرورت پڑ جائے۔ جیسے آج ضرورت پڑ گئی۔" راجہ استاد نے پیشکش کی۔

"نہیں استاد!" میں نے انکار کر دیا۔ "میں اکیلی ہی جاؤں گی۔"

"تمہاری جیسی مرضی۔" استاد یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

مجھے یہ ایک ہفتہ ارشاد حسین کے ساتھ امرتلہ اسٹریٹ کی ایک دھرم شالہ میں گزارنا تھا۔ مگر یہ بات استاد کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔ چائے پینے کے دوران میں استاد سے میں نے کہا۔ "اس وقت جیسی ساڑھی میں پہنے ہوئے ہوں' مجھے ایسی ہی سادہ سوتی ساڑھیاں چاہئیں۔ چار چھ کافی ہیں۔"

"کل مل جائیں گی۔" استاد نے جواب دیا۔

چائے پی کر میں' استاد کے کمرے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ساڑھی اتار کر میں نے نائٹ گاؤن پہن لیا۔ اپنے چہرے پر چڑھے ہوئے ماسک اور وگ کی وجہ سے مجھے الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر ارشاد حسین کی ہدایت کے مطابق نہ میں نے ماسک چہرے سے الگ کیا' نہ وگ اتاری۔ مجھے پرسوں دوپہر اسی میک اپ میں ارشاد حسین سے ملنا تھا۔ کمرے کی بتی بجھا کر میں بستر پر لیٹ تو گئی لیکن جلد نیند نہیں آئی۔

دوسرے دن میں دیر سے سو کر اٹھی۔ میک اپ برقرار رکھنے کی وجہ سے میں صرف دانت ہی مانجھ سکی۔ نہ میں نہا سکی' نہ منہ ہی دھویا۔ جب تک میں اس کی اہل نہیں ہو جاتی کہ میک اپ ختم کر کے دوبارہ خود میک اپ کر سکتی مجھے بہرحال یہ الجھن برداشت کرنا تھی۔ ارشاد حسین نے شاید اسی لئے ماسک اور وگ نہ اتارنے کی ہدایت کی تھی۔

راجہ استاد نے میرے انتظار میں اب تک ناشتہ نہیں کیا تھا۔ البتہ ہمایوں ناشتہ کر کے جا چکا تھا۔

اسے ٹیکسی واپس کرنا تھی۔ میں نے استاد کے ساتھ اس کے کمرے ہی میں ناشتہ کیا۔ استاد میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "رانی! یہ تم کب تک اپنے اچھے بھلے چہرے کی ریڑ لگائے رکھو گی؟ جوان جہان ہو کر بڑھیا بنتے ہوئے کیا تمہیں اچھا لگتا ہے؟"

"قطعی اچھا نہیں لگتا استاد!" میں مسکرا کر بولی۔ "بردوان سے لوٹ کر آنے کے بعد شاید بہروپ کی ضرورت نہ پڑے۔ ممکن ہے پھر کسی اور ہی بھیس میں تم سے ملاقات ہو۔"

"اب تو مجھے یہ شک ہونے لگا ہے رانی کہ وہ پہلا چہرہ بھی اصلی تھا یا نہیں۔" یہ کہہ کر استاد ہنس پڑا۔

"چہروں میں کیا رکھا ہے استاد! چہرے تو بدلتے رہتے ہیں' دل نہیں بدلنا چاہئے۔"

"یہ تو خیر تم ٹھیک کہتی ہو رانی!" استاد سنجیدہ نظر آنے لگا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا میں چلتا ہوں' تمہارے لئے ساڑھیاں بھی تو خریدنا ہیں۔"

اسی کے ساتھ مجھے بلاؤزوں کا خیال آیا۔ "کوئی ایسا درزی بھی ہے استاد جو کل تک چار چھ بلاؤز سی دے؟"

"ارے سیئے گا کیسے نہیں' مگر ناپ........"

"میں ناپ کے لئے ایک بلاؤز لائے دیتی ہوں اور سنو استاد! بلاؤز کا کپڑا بھی معمولی ہونا چاہئے' کل صبح اس وقت تک سی کر دے دے۔ میں آئی ابھی۔"

"پھر میں نے شانتی کا ایک بلاؤز استاد کو لا کر دے دیا۔

"کوئی معمولی سا سوٹ کیس بھی لیتے آنا استاد! خیال رکھنا سوٹ کیس عمدہ یا قیمتی نہ ہو۔" میں نے استاد سے ایک اور فرمائش کر دی۔

"غیر معمولی عورت ہو کر آج کل معمولی چیزوں پر بہت زور دے رہی ہو رانی!" راجہ استاد ہنس کر بولا۔

"یہ وقت وقت کی بات ہے استاد!" میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔ "کبھی ناؤ گاڑی پر' کبھی گاڑی ناؤ پر۔"

راجہ استاد چلا گیا۔ وہ سارا دن میں نے گھر ہی میں گزارا۔ راجہ استاد ساڑھیاں اور سوٹ کیس لے کر آیا تھا۔ کپڑا خرید کر اس نے بلاؤز سینے کے لئے دے دیئے تھے۔

اگلے روز صبح دس بجے تک بلاؤز بھی سل کر آ گئے۔ میں نے ایک بلاؤز پہن کر دیکھا تو فٹ تھا۔ استاد جو ساڑھیاں لے کر آیا تھا انہی میں سے ایک ساڑھی میں نے باندھ لی' بقیہ ساڑھیاں سوٹ کیس میں رکھ دیں۔ ضرورت کا دوسرا سامان میں پہلے ہی سوٹ کیس میں رکھ چکی تھی۔ میں نے نیا سوٹ کیس اس لئے منگوایا تھا کہ میرا سوٹ کیس قیمتی تھا۔ جو میرے معمولی لباس اور حیثیت سے لگا نہ کھاتا۔ کسی بھی چیز کو میں نے نظرانداز نہیں کیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر تقریباً سوا ایک بجے میں ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھائے راجہ استاد کے گھر سے نکل آئی۔ مجھے دو اور تین بجے کے دوران میں ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن پہنچنا تھا۔

ارشاد حسین کو وہیں مین گیٹ کے باہر مجھ سے ملنا تھا۔ ہاوڑہ پہنچنے کے لئے میں نے ٹیکسی کرنے سے گریز کیا۔ میں پیدل چلتی ہوئی چورنگی تک پہنچی اور اس ٹرام میں بیٹھ گئی جو ہاوڑے جا رہی تھی۔ ادھیڑ عمر عورتوں کی طرف کوئی نظر اٹھا کے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا' سو مجھ پر بھی کسی نے توجہ نہیں دی اور میں ہاوڑہ پہنچ گئی۔

ٹرام سے اتر کر میں ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھی۔ اس وقت دوپہر کے ڈھائی بجنے والے تھے۔ میں وقت پر پہنچ گئی تھی۔ اسٹیشن کے باہر خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ شاید اسی وقت کوئی ٹرین آئی تھی۔ مجھے اسی لئے مین گیٹ تک پہنچنے میں کچھ دشواری آئی تھی۔ جلد ہی مجھے ارشاد حسین اس میک اپ میں نظر آ گیا جو میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ بظاہر کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ جیسے کسی کی تلاش میں ہو۔ میں اس اداکاری کا مقصد سمجھ گئی۔ وہ مجھے اس سلسلے میں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر مجھے یہ ظاہر کرنا تھا کہ جیسے بھیڑ بھاڑ میں اس سے بچھڑ گئی تھی۔ اسی وقت ارشاد حسین کی نظر میری طرف اٹھی اور وہ مجھ سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "ہے رانی! تم کدھر نکل گئی تھیں؟"

"جاتی کہاں پتی دیو! تمہارے ہی پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "پیچھے سے ریلا آیا اور میں اس سے بچنے کے لئے ایک اور (طرف) ہو گئی۔ اسی سمے تم میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔"

ارشاد حسین نے ایک ہاتھ میں بستر بند اور دوسرے میں بکس لیا اور کہنے لگا۔ "اچھا آؤ' چلو کہیں پھر نہ بلٹ جائیں۔"

ایک وکٹوریہ والا (گھوڑا گاڑی والا) ہمیں دیکھ کر قریب آ گیا۔ ارشاد حسین نے اس سے کرایہ طے کیا اور پھر سامان رکھ کر ہم دونوں وکٹوریہ میں بیٹھ گئے۔ ارشاد حسین نے وکٹوریہ والے سے امرتلہ اسٹریٹ پر چلنے کو کہا تھا۔

"یہ ہاوڑہ برج ہے جو تمہیں سامنے نظر آ رہا ہے۔" ارشاد حسین نے پُل کی طرف اشارہ کیا۔

"ہے بھگوان' یہ تو بہت بڑا ہے۔" میں نے بھی ایسی اداکاری کی جیسے پہلی بار ہاوڑہ برج دیکھا ہو۔

"اور اترج (حیرت) کی بات یہ ہے کہ اس کے نیچے کوئی ستون نہیں ہے۔" اس نے مزید بتایا۔

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔" میرے لہجے میں بے یقینی تھی۔ "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے' گر نہ پڑے گا پُل کسی سہارے کے بنا۔"

"یہی تو کمال دکھایا ہے پُل بنانے والے نے۔ تمہیں کسی روز لا کر دکھاؤں گا نیچے سے' پھر مانو گی۔"

ہم دونوں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہری سین روڈ سے امرتلہ اسٹریٹ کے لئے مڑ گئے۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ آبادی تھی۔ امرتلہ اسٹریٹ ایک جانب ہری سین روڈ سے اور دوسری طرف کنگ اسٹریٹ سے مل جاتی تھی۔ ایک راستہ لوئر چیت پور روڈ سے بھی امرتلہ اسٹریٹ کے لئے آتا تھا۔ ہری سین روڈ سے دائیں جانب مڑنے کے کچھ ہی دیر بعد بائیں جانب ایک بڑی سی عمارت کے سامنے ارشاد حسین نے وکٹوریہ رکوا لی تھی۔ یہی دھرم شالہ تھی۔ میں نیچے اتر آئی۔ ارشاد حسین نے

سامان اتار کر وکٹوریہ والے کو کرایہ ادا کیا اور پھر جھک کر بستر بند اٹھانے لگا۔ میں اپنے ساتھ جو سوٹ کیس لائی تھی' اسے اٹھا کر ارشاد حسن کے پیچھے چلنے لگی۔ بستر بند کے ساتھ ہی ارشاد حسین نے دوسرے ہاتھ سے بکس اٹھا لیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم ایک بیٹھک میں پہنچے۔ بائیں جانب بڑا سا چبوترا بنا ہوا تھا۔ جس پر سفید چادر بچھی تھی۔ وہیں لکڑی کی ایک ڈیسک کے عقب میں مینڈک جیسا ایک دھوتی بند پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر موٹی سی چوٹی اور کان جنیئو سے بندھا ہوا تھا۔ ماتھے پر صندل سے ترشول بنا تھا۔

"جے رام جی کی پنڈت جی!" ارشاد حسین نے بستر بند اور بکس نیچے رکھ کر دھوتی بند کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"جے رام جی کی!" دھوتی بند نے بھی جواباً کہا' پھر بولا۔ "بہت دنوں بعد پدھارے اگروال جی! یہ شریمتی جی کون ہیں؟"

"میری دھرم پتنی رانی دیوی ہیں۔" ارشاد حسین نے بتایا' پھر وہ میری طرف مڑا۔ "پنڈت جی کو پرنام کرو رانی!"

میں نے بھی ہاتھ جوڑ کر ارشاد حسین کی طرح پنڈت جی کو پرنام کیا۔ جواب میں پنڈت نے مجھے دعا دی۔ "سہاگ بنا رہے۔"

"انہیں پہلی بار ساتھ لے کر آیا ہوں کہ کلکتہ شہر گھما دوں۔" ارشاد حسین بولا۔

پنڈت کے سامنے ڈیسک پر ایک موٹا سا رجسٹر رکھا تھا۔ وہ رجسٹر کھول کر ضروری اندراجات کرنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ارشاد حسین کو بحیثیت رام پرشاد اگروال پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے دہلی کا پتا البتہ ضرور پوچھ کر لکھا۔ بائیں جانب دیوار پر کیلوں سے چابیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ پنڈت نے ایک چابی اتار کر ارشاد حسین کو تھما دی اور بولا۔ "نیچے کوئی کمرہ خالی نہیں۔ اس کارن آپ کو اوپر کی منزل پر رہنا ہوگا۔ پرنتو کمرہ ہوادار ہے' پچھلی کھڑکی کھول لو تو بڑی ہوا آتی ہے۔"

"دھنیہ واد (شکریہ) پنڈت جی!" ارشاد حسین نے کہا اور جھک کر سامان اٹھانے لگا۔

کچھ فاصلہ طے کرتے ہی سامنے اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ میں سوٹ کیس اٹھائے ارشاد حسین کے پیچھے چلنے لگی۔ اس عمارت میں عجیب سی غیر فطری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اوپر پہنچ کر دائیں جانب ترتیب سے دروازے نظر آ رہے تھے۔ اکثر دروازوں میں تالے پڑے تھے۔ مجھے ساتھ لئے ارشاد حسین ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ اس نے تالے میں چابی گھمائی اور پھر کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا۔ چوکور سادہ کمرہ خاصا کشادہ تھا' مگر وہاں سامان نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ فرش پر بھی کچھ بچھا ہوا نہیں تھا۔ وہاں گرد کی تہہ ضرور نظر آ رہی تھی۔ ارشاد حسین نے بستر بند کھول کر کھجور کی ایک جھاڑو نکال لی اور مجھ سے بولا۔ "تم ذرا باہر چلی جاؤ رانی! کمرے کی صفائی کر لوں پہلے' پھر بستر بچھاؤں گا۔"

"یہ کام پتنی کا ہوتا ہے' پتی کا نہیں۔" میں نے آگے بڑھ کر جھاڑو اس کے ہاتھ سے لے لی۔ "کسی نے تمہیں جھاڑو دیتے دیکھ لیا تو شک کرے گا میں تمہاری پتنی نہیں۔"

میری بات میں وزن تھا۔ اس لئے ارشاد حسین اس پر راضی ہو گیا اور کہنے لگا۔ "اچھا تم کمرے کی

صفائی کر کے بستر بچھاؤ' میں آتا ہوں ابھی صراحی اور بالٹی لے کر۔"

ارشاد حسین کمرے سے نکل گیا تو میں جھاڑو دینے لگی۔ پھر جھاڑو دے کر فرش پر بستر بچھا دیا۔ ارشاد حسین کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک صراحی' بالٹی اور پلاسٹک کا ڈونگا تھا۔ کمرے کے باہر کچھ فاصلے پر کنواں تھا۔ ارشاد حسین وہاں سے بالٹی اور صراحی بھر لایا۔ ڈول اور رسی کنویں کے پاس ہی موجود تھے۔ ٹین کا بکس کھول کر اس نے مٹی کے تیل سے جلنے والا ایک چولھا' چائے کے کپ اور دوسرے برتن نکال کر دیوار کے سہارے رکھ دیئے۔ ایک موٹی سی موم بتی اور ماچس بھی اس نے بکس میں سے نکال لی تھی۔

دھرم شالہ میں بجلی نہیں تھی۔ ہوا کے لئے ارشاد حسین نے عقبی کھڑکی کھول دی۔ پھر وہ تیل کا چولھا جلا کر بھگونے میں چائے کے لئے پانی رکھتے ہوئے بولا۔ "کھانا تو کھا لیا ہوگا نا' یا بندوبست کروں؟ .... نیبو کی چائے تو پی لیں گی؟"

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے جی!" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ "ریل میں ساتھ ہی تو کھانا کھایا تھا' بھول گئے کیا اور یہ بھی یاد نہیں رہا کہ نیبو کی چائے تو میں بڑے شوق سے پیتی ہوں۔"

"لو یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ ہم نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا تھا مگر میں یہ نہیں بھولا کہ تم میری دھرم پتنی رانی دیوی ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔

"جی پتی دیو! خوب پہچانا آپ نے۔" میں بولی اور پھر اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کے بعد میں ارشاد حسین کے بالکل قریب آ بیٹھی اور دھیمی آواز میں کہا۔ "ارشاد! اب میں اس ماسک اور وگ کو ایک لمحے بھی برداشت نہیں کر سکتی' پہلے آپ ان سے میری جان چھڑا دیں۔ پرسوں سے میں نے منہ تک نہیں دھویا۔"

اس نے میری ٹھوڑی سے نیچے ہاتھ ڈال کر ماسک اتار لیا اور پھر اسی سے منسلک وگ بھی الگ کر دی۔ میرے چہرے پر ٹھنڈی ہوا لگی تو مجھے عجیب سی فرحت کا احساس ہوا۔

"چاہیں تو ڈونگے میں پانی لے کر یہیں کمرے کے کسی کونے میں منہ بھی دھو لیں۔"

میں نے فوراً ارشاد حسین کے مشورے پر عمل کیا۔ اس عرصے میں وہ چائے بنا چکا تھا۔ دو پیالیوں میں چائے نکال کر لے آیا۔ منہ دھو کر میں بستر پر آ بیٹھی تھی۔ میرے سامنے چائے کی پیالی رکھ کر وہ بھی سامنے بیٹھ گیا۔

"جی حضور!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا اور چائے کی چسکی لے کر کہا۔ "آخر آپ نے اس کافر بچے کو انجام تک پہنچا ہی دیا۔"

"میں نے .... کیسے؟" میں جان بوجھ کر انجان بن کر بولی۔

"معبلہ! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں کس کا ذکر کر رہا ہوں۔" ارشاد حسین سنجیدگی سے بولا۔ "انسپکٹر پرکاش کے سفاکانہ قتل نے سارے محکمے میں کھلبلی مچا دی ہے۔ گواہوں کے بیانات کے مطابق اسے قتل کرنے والی ایک عورت ہی تھی اور اس سلسلے میں آپ ہی پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ

آپ اسی لئے اس کا پتہ پوچھ رہی تھیں۔"

"کیا آپ کا خیال بھی یہی ہے کہ انسپکٹر پرکاش کو میں نے قتل کیا ہے؟"

"آپ کے سوا اسے گھر سے نکال کر قتل کرنے کی ہمت کس میں ہو سکتی ہے۔ بہرحال اب تفتیش کا رخ بدل گیا ہے۔ اعلیٰ انگریز حکام اب اس امکان پر غور کر رہے ہیں کہ آپ کلکتے ہی میں روپوش ہیں۔ اردگرد کے شہروں میں آپ کی تلاش کے احکام واپس لے لئے گئے ہیں۔"

"اور شہزاد کیا ابھی تک پولیس کی حراست میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کل شام اسے رہا کر دیا گیا ہے۔" ارشاد حسین نے بتایا۔ "آپ کا یہ کہنا حیرت انگیز طور پر درست ثابت ہوا کہ اسے رہا کر دیا جائے گا۔"

ارشاد حسین سے شہزاد کی رہائی کے بارے میں سن کر مجھے اطمینان ہوا۔ میرا یہ قیاس قطعی صحیح نکلا تھا کہ میری طرف سے کوئی جارحانہ اقدام انگریز حکام کو پسپا ہونے پر مجبور کر دے گا۔

"ویسے تو یہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں لیکن پہلے آپ یہ ماسک پہننا اور وگ لگانا سیکھ لیجئے' کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ رانی دیوی کی حیثیت سے آپ کو یہاں اسی میک اپ میں رہنا پڑے گا۔" ارشاد حسین نے چائے کا لمبا گھونٹ لیتے ہوئے کہا اور پھر بکس کھول کر اس میں سے ایک صندوقچی نکال لی۔

میں نے جلدی جلدی چائے کی پیالی خالی کی۔ اس عرصے میں ارشاد حسین صندوقچی کھول کر چھوٹا سا ایک آئینہ نکال چکا تھا۔ پھر وہ مجھے ماسک پہننے اور وگ لگانے کی تربیت دینے لگا۔ کچھ ہی دیر میں ارشاد حسین کی مدد کے بغیر میں خود ماسک پہننے اور اتارنے لگی۔ اسی کے ساتھ مجھے وگ لگانا اور اتارنا بھی آ گیا۔

"ویری گڈ!" ارشاد حسین نے میری تعریف کی۔ "آپ کے اندر سیکھنے کی بڑی صلاحیت موجود ہے۔ اتنی جلدی اور اس قدر صفائی کے ساتھ میں نے آج تک کسی کو ماسک پہنتے اور اتارتے نہیں دیکھا۔ لگتا ہے کہ آپ دو تین دن ہی میں پوری طرح ٹرینڈ ہو جائیں گی۔ ایک ہفتے کی تربیت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

پھر ارشاد حسین مجھے میک اپ کے متعلق چند بنیادی باتیں بتانے لگا۔ ان میں جلد کی رنگت کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔

"اپنے چہرے پر میک اپ کرتے ہوئے عموماً لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں اور چہرے کی رنگت میں فرق نہیں ہونا چاہئے۔" ارشاد حسین بتا رہا تھا۔

میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سن کر ذہن نشین کرتی رہی۔ اس کے بعد وہ ماسک کے بغیر چہرے کو تبدیل کرنے کی عملی تربیت دینے لگا۔ ستواں ناک کے اندر مخصوص ساخت کے اسپرنگ ڈال کر اسے کس طرح چوڑا یا چپٹا بنایا جا سکتا ہے' رخساروں کو پھلانا' پچکانا یا کوئی اور شکل دینا کس طرح ممکن ہے' دانتوں پر خول چڑھا کر دہانے کو کیسے بدلا جاتا ہے وغیرہ۔ اس نے مجھے مختلف قسم کے لوشن اور کیمیکلز بھی دکھائے اور ان کی عملی کارکردگی کا بھی مظاہرہ کیا۔ میں بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ یہ سب کچھ سمجھتی

اور سیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ کمرے میں اندھیرا پھیلنے لگا۔ ارشاد حسین نے میک اپ کا سامان سمیٹ کر صندوقچی میں رکھنا شروع کر دیا۔

"اب ہم باہر چلیں گے اور رات کا کھانا کھا کے ہی لوٹیں گے اس لئے آپ رانی دیوی بن جایئے۔" ارشاد حسین نے مجھ سے کہا۔

میں نے احتیاط کے ساتھ قریب رکھا ہوا ماسک اٹھا کر پہن لیا اور وگ بھی سر پر جما لی' پھر ارشاد حسین سے تصدیق چاہی۔ "ٹھیک؟"

"بالکل ٹھیک۔" اس نے میرے چہرے پر تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد جواب دیا۔

شام کے چھ بج رہے تھے جب ہم دھرم شالہ سے نکلے۔ امرتلہ اسٹریٹ سے نکل کر ہری سین روڈ پر آ گئے اور پھر چہل قدمی کے انداز میں پیادہ رو (فٹ پاتھ) پر چلتے ہوئے چوراہے کی طرف بڑھنے لگے۔ کچھ دور چل کر ایک ہوٹل نظر آ گیا۔ اوسط درجے کے اس ہوٹل میں ہم نے کھانا کھا لیا۔ ارشاد حسین نے بتایا تھا کہ رات کو دھرم شالہ کے دروازے جلد بند ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ وہاں ٹھہرتے ہیں' رات کے آٹھ بجے تک انہیں دھرم شالہ میں واپس آنا پڑتا ہے۔ نوواردوں کے لئے البتہ وقت کی کوئی قید نہیں تھی۔ ہمیں اسی لئے رات کا کھانا جلد کھانا پڑا۔ دھرم شالہ کی طرف لوٹتے ہوئے ارشاد حسین نے ایک دکان سے چھوٹا سا لیمپ بھی خرید لیا اور اس میں تیل بھی ڈلوا لیا۔

دودھ والے کی ایک دکان پر میری نظر پڑی تو میں نے کہا۔ "اگر کوئی برتن ساتھ ہوتا تو دودھ بھی لے لیتے چائے کے لئے۔"

"اس کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے' ٹھہرو۔" ارشاد حسین بولا اور قریبی جنرل اسٹور سے شیشے کا ایک گلاس خرید کر اس میں دودھ لے لیا۔

مجھے یہ سب کچھ عجیب عجیب اور نیا نیا سا لگ رہا تھا' مگر زندگی کا ایک رخ یہ بھی تھا۔ حکم دے کر کام کرانے اور خود ہاتھ سے کام کرنے میں جو فرق ہے' مجھ پر ظاہر ہو رہا تھا۔

آٹھ بجے سے آدھے گھنٹے پہلے ہی دھرم شالہ میں واپس آ گئے۔ عورت ہونے کے باوجود میں نے کبھی اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں پکایا تھا۔ کھانا تو کھانا مجھے تو چائے بنانی بھی نہیں آتی تھی۔ اس روز مجھے جانے کیا سوجھی کہ ارشاد حسین چائے بنانے لگا تو میں بھی قریب جا بیٹھی۔

"مجھے بھی چائے بنانا سکھا دیں ارشاد!" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"کیا؟" وہ چونک کر بولا۔ "آپ کو چائے بنانا نہیں آتی؟"

"کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

"پھر تو آپ واقعی کسی ریاست کی شہزادی ہی لگتی ہیں!" ارشاد حسین مسکرایا۔ پھر چائے بنانے کی عملی تربیت دینے لگا۔ اسی دوران میں اس نے کہا۔ "ویسے یہ طے نہیں ہوا تھا کہ میں میک اپ کے علاوہ چائے وغیرہ بنانا بھی سکھاؤں گا۔"

"آپ ہی کا فائدہ ہے۔" میں ہنس کر بولی۔ "سیکھ گئی تو آپ کا ہاتھ بٹا دیا کروں گی۔"

"یہ تو ہے۔" وہ بھی دھیرے سے ہنسا۔ "بس آخر میں حسب ضرورت دودھ ملا دیتے ہیں' اس طرح .... لیجئے چائے تیار ہو گئی۔" اس نے چائے کی ایک پیالی اٹھا کر مجھے تھما دی۔

"اب میں بنا لوں گی۔" میں نے کہا۔

"مجھے یقین ہے۔" وہ مسکرایا اور اپنی چائے کی پیالی اٹھا کر بستر پر آ بیٹھا۔

دروازہ بند تھا اس لئے میں نے میک اپ ختم کر دیا۔ چائے پینے کے بعد میں نے ارشاد حسین سے میک اپ کی صندوقچی نکالنے کو کہا۔

"کیا ارادے ہیں؟" وہ بولا۔

"ذرا اپنی ناک چوڑی کر کے دیکھوں گی۔"

"کیوں اچھی بھلی ستواں ناک پر ظلم کر رہی ہیں' خیر آپ جانیں' ناک آپ کی ہے۔" وہ ہنستا ہوا اٹھا اور بکس سے صندوقچی نکال کر میرے سامنے لا کے رکھ دی۔

"جو کچھ آپ سے سیکھ رہی ہوں' ساتھ ساتھ اس کا تجربہ بھی تو کر کے دیکھتی جاؤں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے صندوقچی کھول لی۔ میں نے اس میں سے ناک کے نتھنوں میں پھنسانے والے اسپرنگ نکال لئے' اسی کے ساتھ آئینہ بھی ہاتھ میں لے لیا۔ ایک اسپرنگ کو زور سے چٹکی میں دبا کر میں نے ناک کے دائیں نتھنے میں رکھ لیا۔ میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ نتھنے کی کھال اتنی ہی زور سے کھنچی تھی۔ تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے بائیں نتھنے میں بھی میں نے دوسری اسپرنگ رکھ لی۔ اس مرتبہ میں پہلے ہی سے ذہنی طور پر تکلیف برداشت کرنے کے لئے آمادہ تھی' اسی سبب منہ سے کراہ نہیں نکلی۔ پھر جب میں نے آئینے میں نگاہ ڈالی تو حیران رہ گئی۔ میری ناک حیرت انگیز طور پر پھولی ہوئی اور چپٹی سی نظر آنے لگی تھی۔ جس کی وجہ سے چہرے کی ساخت بھی بدل کر رہ گئی تھی۔

"اب ذرا یہ خول بھی دانتوں پر چڑھا لیں۔" ارشاد حسین نے صندوقچی سے خول اٹھا کر مجھے تھما دیا۔ جو بتیسی کی طرح تھا۔

میں نے اس سے وہ خول لے کر اوپری دانتوں پر چڑھا لیا تو میرا دہانہ بھی غیر معمولی طور پر پھیل گیا۔ دیر تک میں اپنے چہرے کو طرح طرح سے بدل کر دیکھتی رہی۔ ایک نیا دلچسپ مشغلہ گویا میرے ہاتھ آ گیا تھا۔ اس عرصے میں ارشاد حسین نے موم بتی بجھا کر لیمپ جلا دیا تھا۔

سونے سے پہلے ارشاد حسین نے اپنے چہرے سے بھی ماسک اتار دیا اور ایک چادر اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ بستر پر سو جائیں' میں ادھر چادر بچھا کر سو جاؤں گا۔"

"بستر تو خاصا بڑا ہے' یہیں سو جائیں نا۔ اگر ایسا ہی ہے تو درمیان میں تکیہ رکھ لیں۔" میں نے کہا۔

"آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا؟"

"کمال ہے' ارے اعتراض ہوتا تو کہتی ہی کیوں؟"

"میں سمجھا کہ شاید اخلاقاً کہہ رہی ہوں۔"

"جی نہیں' اخلاقاً بھی کسی اجنبی مرد کو اپنے ساتھ ایک بستر پر سلانے کی پیشکش نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اس پر بھروسہ نہ ہو۔"

"مجھ پر بھروسہ کرنے میں کہیں آپ نے جلدی تو نہیں کی معبلہ!" وہ چادر رکھتے ہوئے بولا۔

"اگر جلدی بھی کی ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیوں کہ مجھے خود پر بھی پورا بھروسہ ہے۔" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

پھر ارشاد حسین کچھ نہیں بولا۔ اس نے اٹھ کر لیمپ کی لو دھیمی کر دی اور میرے اور اپنے درمیان ایک تکیہ رکھ کر اسی بستر پر لیٹ گیا۔

اگلے چار دن کے اندر میں نے ارشاد حسین سے میک اپ کی مکمل تربیت حاصل کر لی۔ زیادہ وقت میں نے دھرم شالہ کے کمرے ہی میں ارشاد حسین کے ساتھ گزارا تھا۔ اس کا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا کہ میں قبل از وقت تربیت حاصل کر لوں گی۔ ابھی ارشاد حسین کی چھٹی ختم ہونے میں مزید دو روز باقی تھے۔ میں اس عرصے میں ارشاد حسین سے آواز بدل کر بولنا سیکھتی رہی۔ اسے جو کچھ آتا تھا' مجھے سکھانے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ آواز بدل کر بولنا بھی مجھے بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔ ایک ہفتے کے دوران میں ارشاد حسین مجھ سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے اپنے ماضی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ جس روز ہم دھرم شالہ سے رخصت ہونے والے تھے' اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

"کاش آپ نے مجھے اپنا سمجھا ہوتا۔"

"تو میں نے غیر کب سمجھا ہے آپ کو؟" میں بولی۔

"ابھی تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ ہیں کون؟" اس نے کہا۔

"ارشاد!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ممکن ہے آپ میری بات کا یقین نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں خود بھی اسی جستجو میں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔"

میری بات سن کر اس نے گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیا' پھر کہنے لگا۔ "مجھے اعتراف ہے معبلہ کہ زندگی میں پہلی بار میں نے آپ سے شکست کھائی ہے۔ میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ ایک ہفتے آپ کے قریب رہ کر سب کچھ معلوم کر لوں گا' مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ میں آپ کو نہیں سمجھ سکا۔ آپ کی شخصیت کسی ایسے گنبد بے در کی طرح ہے کہ جس میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس کے باوجود میری نیک تمنائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ اگر میں آئندہ بھی آپ کے کسی کام آ سکا تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"کیا آپ سے رابطے کی کوئی صورت ممکن ہے ارشاد!" میں نے دریافت کیا۔

"ممکن تو ہے لیکن میں یہی چاہوں گا معبلہ کہ سوائے ناگزیر حالات کے ہم ایک دوسرے سے نہ ملیں۔ یہ ہم دونوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔ ویسے بھی ایک نئی شخصیت اپنانے کے بعد آپ اس شہر کی بھیڑ میں گم ہو جائیں گی۔ جی تو چاہتا ہے' خبر رہے کہ آپ کہاں اور کس حال میں ہیں لیکن مجھے نہیں معلوم آپ ایسا پسند بھی کریں گی یا نہیں۔"

"ارشاد! آپ مجھے سمجھ سکے ہوں یا نہ سمجھ سکے ہوں لیکن میں آپ کو اس حد تک ضرور سمجھ چکی ہوں کہ آپ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ رابطے کی اگر کوئی صورت ممکن ہو تو میں اپنی نئی شخصیت کو بھی آپ سے راز رکھنا ضروری نہیں سمجھوں گی۔ اب تک آپ ہی میرے کام آتے رہے ہیں۔ آپ کا خلوص مجھ پر قرض ہے۔ اگر قدرت نے مجھے زندگی میں کبھی یہ قرض اتارنے کا موقع دیا تو اس موقع کو رائیگاں نہیں جانے دوں گی۔"

"آپ کے بارے میں جہاں تک میرا اندازہ ہے' نئی شخصیت اپنانے میں آپ کو ایک ہفتے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ آج اتوار ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آئندہ اتوار کو کہیں ہماری ملاقات ہو سکے؟" ارشاد حسین نے سوال کیا۔

"بالکل ممکن ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر کس وقت اور کہاں؟"

"اگلے اتوار کو ماں جی کے گھر شام چار اور پانچ بجے کے درمیان۔ وہ گھر آپ کے ذہن میں ہے نا؟"

"یاد ہے مجھے' میں پہنچ جاؤں گی۔ ممکن ہے میک اپ میں ماں جی مجھے نہ پہچان سکیں۔ اس لئے شناختی الفاظ کے طور پر.........."

"آپ خیر خواہ کہہ دیجئے گا' وہ سمجھ جائیں گی۔ یوں بھی آپ کے سوا اس روز کوئی مجھ سے ملنے وہاں نہیں پہنچے گا۔" ارشاد حسین نے کہا۔ "اچھا تو پھر اب چلنے کی تیاری کر لیں۔ سامان باندھا ہی جا چکا ہے۔ اتنے میں آپ میک اپ کر لیں۔ میں گھوڑا گاڑی لے کر آتا ہوں۔"

ارشاد حسین چلا گیا تو میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے جلدی جلدی میک اپ کرنے لگی۔

میں ایک ہفتے قبل شام چار بجے کے قریب ارشاد حسین کے ساتھ امرتلہ اسٹریٹ کی اس دھرم شالہ میں پہنچی تھی' تقریباً ہفتے بھر بعد اسی وقت وہاں سے نکل رہی تھی گھوڑا گاڑی ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن کے لئے ہی کی گئی تھی۔ گویا رام پرشاد اگروال اپنی بیوی کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق ہم دونوں ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر مسافروں کی بھیڑ میں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ میرا سوٹ کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ میک اپ کی صندوقچی بھی اب اسی میں تھی۔ کچھ دیر کے بعد میں اس طرح اسٹیشن کی عمارت سے باہر آئی جیسے ابھی ابھی کسی ٹرین کے ذریعے وہاں پہنچی ہوں۔

اپنے حلیئے' لباس اور چہرے پر موجود میک اپ کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ٹرام ڈپو کا رخ کیا اور دھرم تلے جانے والی ایک ٹرام میں بیٹھ گئی۔ مجھے اب واپس راجہ استاد کے گھر پہنچنا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ راجہ استاد بے چینی سے میرا منتظر ہو گا۔ اس سے میں نے اتوار کی شام تک ہی واپس آنے کو کہا تھا۔

ٹرام سے میں دھرم تلے کی چورنگی پر ہی اتر گئی اور پھر پیدل چاندنی چوک کی طرف چل دی۔

ابھی میں اس بلڈنگ سے دور ہی تھی جس کے نچلے حصے میں راجہ استاد کی سکونت تھی کہ مجھے دھڑا دھڑ دکانیں بند ہوتی دکھائی دیں۔ ہر طرف بھاگ دوڑ سی مچی ہوئی تھی اور کچھ فاصلے پر دھماکے سنائی

دے رہے تھے۔ مجھے کسی انجانے خطرے کا احساس ہو گیا مگر میں رکی نہیں۔

اچانک ایک شخص مخالف سمت سے بھاگتا ہوا آیا اور مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"آگے نہ جانا۔" وہ شخص چیخا۔ "بوتل چل رہی ہے۔ شنکر دادا کے آدمیوں نے سارے علاقے کو گھیر لیا ہے۔ آج وہ راجہ استاد کو نہیں چھوڑے گا۔"

وہ شخص تو یہ کہتا ہوا بھاگ گیا اور میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ شنکر دادا بھی کوئی گروہ بند بدمعاش تھا اور وہ اپنے گرگوں کو لے کر راجہ استاد پر چڑھ دوڑا تھا۔ جھگڑے کی وجہ کیا تھی' اس سے قطع نظر میرے لئے اتنا ہی جان لینا کافی تھا کہ میرا ایک بہی خواہ اس وقت مشکل میں گرفتار تھا۔ پھر تو جیسے میرے پیروں میں پر لگ گئے۔ میں تقریباً دوڑتی ہوئی چوک تک پہنچ گئی۔ جہاں ہر طرف شیشہ ہی شیشہ بکھرا ہوا تھا۔ ہنگامہ شاید ختم ہو چکا تھا۔

میں نے چوک میں پندرہ بیس افراد کے درمیان ایک لمبے تڑنگے شخص کو کھڑے دیکھا۔ ان میں سے کئی لہولہان نظر آ رہے تھے۔

"راجہ استاد!" اچانک لمبا تڑنگا شخص پوری قوت سے چیخا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو اپنے چوہوں کے ساتھ بل میں گھس جائے گا' مگر میرا نام بھی شنکر دادا ہے' تیرا جینا حرام کر دوں گا۔ لونڈیا کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اگر تو نے کل اس وقت تک دس ہزار روپے میرے اڈے پر نہ بھجوائے تو نہ اس لونڈیا کی عزت و آبرو بچے گی' نہ یہ زندہ بچے گی۔ کل میں اس کی لاش اسی چوک میں پھنکوا دوں گا۔"

میں سمجھ گئی کہ راجہ استاد کو للکارنے والا وہ لمبا تڑنگا شخص شنکر دادا ہی تھا۔ اس کے اردگرد جو لوگ کھڑے تھے' ان کی وجہ سے مجھے فوری طور پر شانتی نظر نہ آ سکی تھی۔ جس کا نازک سا ہاتھ شنکر دادا کی مضبوط گرفت میں تھا اور وہ کسی سہمی ہوئی فاختہ کی طرح کانپ رہی تھی۔ چوک میں مجھے ایک طرف تین جیپیں بھی کھڑی دکھائی دے گئیں۔ وہ غنڈے شاید انہی جیپوں میں بھر کے آئے تھے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ شنکر دادا نے شانتی کو کس طرح قابو میں کر لیا؟ یا وہ شنکر دادا کے ہتھے کیسے چڑھ گئی لیکن یہ امر واقعہ تھا کہ شنکر دادا' کسی بھی طرح راجہ استاد کو زیر کرنے کے بعد میرے سامنے شانتی کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔ شنکر دادا نے چیخ کر جو کچھ کہا تھا' اس سے ظاہر تھا کہ راجہ استاد وہیں موجود تھا اور وہ پسپا ہو کر اپنے گھر میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ راجہ استاد تنہا نہیں تھا۔ گھر کے اندر پناہ لینے والوں میں راجہ استاد کے وہ ساتھی بھی شامل تھے جنہوں نے شاید شنکر دادا کا مقابلہ کیا تھا۔

میرے لئے یہ بات انتہائی حیران کن تھی کہ سب کچھ سننے کے باوجود راجہ استاد خاموش تھا۔ اس کی غیرت نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ شنکر دادا دن دیہاڑے اس لڑکی کو اٹھا کر لے جا رہا تھا جو اسے پاپا کہتی تھی۔ یہی وہ بھولی سی لڑکی تھی جس نے مجھے اپنی بہن بنایا تھا اور مجھے دیدی کہہ کر پکارتی تھی۔ میں اب اس جگہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی جہاں شنکر دادا اور اس کے ساتھی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مجھے ہاکیاں نظر آ رہی تھیں' کچھ کے پاس لاٹھیاں بھی تھیں۔ ان کے پاس چاقو اور آتشیں اسلحہ بھی ہو سکتا تھا مگر بظاہر نظر نہیں آ رہا تھا۔

"چل بے جگا! لونڈیا کو جیپ میں ڈال لے۔" شنکر دادا کی بھاری آواز ایک بار پھر گونجی۔ اس نے شاید اپنے کسی ساتھی کو مخاطب کیا تھا۔

میں اچانک تیزی سے آگے بڑھی۔ اب میرے لئے ایک لمحہ بھی ضائع کرنا ممکن نہیں تھا۔

"رک جا شنکر دادا!" میں چیخ کر بولی۔ "جھگڑا تیرا اور راجہ استاد کا ہے۔ اس لڑکی سے جھگڑے کا کوئی تعلق نہیں جسے تُو اٹھا کر لے جا رہا ہے۔ کسی مجبور لڑکی کی بے بسی سے فائدہ اٹھانا بزدلی ہے' مردانگی نہیں۔ چھوڑ دے اسے۔" میں ان لوگوں سے کچھ ہی فاصلے پر جا کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ چھپکلی کدھر سے نکل آئی رے جگا!" شنکر دادا حقارت آمیز انداز میں ہنسا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اگر تیری عمر نہ بیت گئی ہوتی تو تجھے بھی جیپ میں ڈال کر لے چلتا۔ چل اپنا رستہ لے ورنہ چیر کے پھینک دوں گا ابھی۔"

"تُو اور مجھے چیرے گا۔" میں نے جان کر اسے طیش دلایا۔ "دم ہے تیرے اندر مجھ سے لڑنے کا؟؟"

خلاف توقع وہ غصے میں آنے کے بجائے زور سے ہنس پڑا' پھر کہنے لگا۔ "یہ دن بھی دیکھنا رہ گیا تھا شنکر دادا کو کہ ایک مرگھلی عورت اسے لڑنے کے لئے للکارے۔ بڑا ہی بُرا زمانہ آ گیا ہے۔ اب او جگا! آگے بڑھ کر دو چار ہاتھ جڑ دے تاکہ اس کے دماغ کے کیڑے جھڑ جائیں۔"

اتنا سنتے ہی شنکر دادا کے قریب کھڑا ہوا گٹھیلے جسم کا ایک پستہ قد شخص ہاکی ہاتھ میں لئے آگے بڑھا۔ یہی جگا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بائیں رخسار پر زخم کا لمبا سا نشان واضح نظر آ رہا تھا۔ جو شاید کسی جھگڑے کی یادگار تھا۔ سیاہ رو جگا کے قریب آنے سے پہلے میں نے سوٹ کیس دائیں جانب اچھال دیا۔ اسی طرف وہ تین منزلہ بلڈنگ تھی جس میں راجہ استاد رہتا تھا۔ سوٹ کیس بلڈنگ کے گیٹ ہی کے پاس جا کے گرا۔ یہی میرا بھی اندازہ تھا۔ میں نے ایک نظر ادھر دیکھ کر جگا پر نگاہ جما دی۔ جو اب خاصا قریب آ چکا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھی اور جگا کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ جسے وہ مخصوص انداز میں گردش دے رہا تھا۔

"دادا! اس کے ٹخنے جھاڑ دوں؟" جگا نے پلٹ کر ہانک لگائی۔

"اب جو کرنا ہے جلدی کر' دیر ہو رہی ہے۔" شنکر دادا کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"اچھا تو پھر لو دادا! سالی زندگی بھر اپنے پیروں سے چلنے کو محتاج ہو جائے گی۔" یہ کہتے ہی اس نے تیزی سے ہاکی گھمائی اور میرے پیروں پر وار کیا۔

میں نے اچھل کر اس کا وار خالی دیا۔ میری یہ پھرتی یقیناً اس کے لئے حیرت انگیز تھی۔ لمحے بھر کو مجھے اس کے چہرے پر حیرانی نظر آئی۔ پھر اس نے دوبارہ ہاکی بلند کی' مگر اس سے پہلے ہی چیخ اٹھا۔ میں نے اچھل کر اس کے سینے پر لات ماری تھی۔ اس کے ساتھ میرا دایاں ہاتھ گھوم گیا۔ میری کھڑی ہتھیلی اس کے سر پر پڑی تھی۔ وہ لہرا کر زمین پر گرا اور میں نے جھپٹ کر ہاکی اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ یہ سب کچھ بڑی تیزی کے ساتھ چند ہی لمحوں میں ہو گیا تھا۔ وہ سبھی تصویر حیرت بنے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"شنکر دادا! تیرا یہ شیر تو گیدڑ نکلا۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "مجھے ہاتھ لگائے بغیر ہی یہ غش کھا

گیا۔ اب اگر تُو مرد ہے تو خود سامنے آ۔"

"لے پکڑ اس لونڈیا کو۔" شنکر دادا نے شانتی کا ہاتھ اپنے ایک ساتھی کو تھما دیا اور کسی درندے کی طرح غرایا۔ "میں دیکھتا ہوں اسے' یہ کتنی بڑی غنڈی ہے۔"

"تم رک جاؤ دادا! اسے ہم بھگت لیں گے۔" کوئی بولا۔

"نہیں' اس نے مجھے مردانگی کا طعنہ دیا ہے' میں ہی اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا دباؤں گا۔" شنکر دادا نے اپنے ساتھی کو ڈانٹ دیا۔ پھر وہ خالی ہاتھ میری طرف بڑھنے لگا۔

"شنکر دادا اپنے کسی ساتھی سے ہاکی یا لاٹھی لے لے' ورنہ مجھے بھی تجھ سے خالی ہاتھ لڑنا پڑے گا۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"تیرے لئے میرے یہ دونوں ہاتھ ہی کافی ہیں۔" وہ دانت پیس کر بولا۔

"پاگل ہے تُو!" یہ کہہ کر میں اس طرح ہنس پڑی کہ جیسے کسی بچے کی بات پر ہنسی آ جاتی ہے۔ مقصد اسے غصہ دلانا ہی تھا۔ پھر میں نے اسے مزید تپانے کی خاطر اپنے ہاتھ سے ہاکی ایک طرف پھینک دی اور بولی۔ "تُو خالی ہاتھ ہے تو پھر میں بھی ہاکی پاس رکھ کے کیا کروں گی؟ تیرے لئے تو میرے یہ دونوں پیر ہی کافی ہیں۔"

"عورت!" وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔ "تُو پہلی عورت ہو گی جو میرے ہاتھوں سے قتل ہو گی۔" یہ کہتے ہی وہ کسی اندھے بھینسے کی طرح دونوں بازو پھیلائے میری طرف لپکا۔

میں اپنی جگہ سے نہیں ہلی اور جیسے ہی وہ میرے قریب آیا تیزی کے ساتھ ایک طرف ہو کر اس کی ٹانگوں میں ٹانگ پھنسا دی۔ وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل نیچے گرا۔ اسی وقت میری ٹھوکر اس کے سر پر پڑی اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ پلٹا کھا کر اٹھنے لگا تو میں نے اچھل کر اس کے دائیں شانے پر لات ماری۔ وہ دوبارہ ڈھے گیا۔ اپنا بھاری بھرکم جسم سنبھالنے میں اسے دشواری پیش آ رہی تھی۔

معاً میں نے اپنی بائیں طرف ایک سایہ سا لہراتے دیکھا اور تیزی سے جھک گئی۔ شنکر دادا کے ساتھیوں میں سے کسی نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر مجھ پر لاٹھی سے حملہ کیا تھا۔ اگر بروقت مجھے خطرے کا احساس نہ ہو جاتا اور میں جھک نہ جاتی تو میرے سر کے ٹکڑے اڑ گئے ہوتے۔ یہ حملہ میرے لئے خلاف توقع ہی تھا۔ لاٹھی والے نے دوبارہ لاٹھی گھمائی' مگر میں جست بھر کے آگے نکل گئی۔ لاٹھی پوری قوت سے زمین پر پڑی۔ اسی وقت شنکر دادا اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اسے نظرانداز کرتی ہوئی پلٹ کر لاٹھی والے کی طرف جھپٹی۔ عین اسی لمحے میری نگاہ اس ہاکی پر پڑی جو نے میں جگا سے چھینی تھی۔ میں نے ہاکی اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ لاٹھی والا میری طرف پلٹا ہی تھا کہ میں نے اس کے دائیں شانے کی ہڈی پر ہاکی سے بھرپور ضرب لگائی۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ چیختا ہوا پیچھے ہٹا۔ میں جیسے اڑتی ہوئی اس تک پہنچ گئی اور اس مرتبہ ہاکی پوری قوت کے ساتھ اس کی پنڈلیوں پر پڑی۔

وہ چیخ کر ڈھیر ہو گیا۔ شنکر دادا کے ساتھیوں میں سے یہ دوسرا شخص تھا جو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

"اب کوئی اس کے اور میرے درمیان نہیں آئے گا۔" شنکر دادا اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر زور سے چیخا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے سر سے خون بہتا ہوا پیشانی تک رہا تھا۔ یہ اس ضرب کا نتیجہ تھا جو میں نے اس کے سر پر لگائی تھی۔

"شنکر دادا! اگر مقابلہ صرف تیرے اور میرے ہی درمیان ہے تو پھر اس کی ایک شرط ہے۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"سنے بغیر مجھے تیری ہر شرط منظور ہے رانی!"

"رانی!" کئی حیرت زدہ آوازیں بیک وقت بلند ہوئیں۔

"ہاں یہ بمبئی کی رانی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔" شنکر دادا نے تصدیق کی۔ "وہ خبر غلط نہیں تھی کہ ان دنوں بمبئی کی رانی' راجہ استاد کی مہمان ہے۔ اس کے رانی ہونے کا اور کیا ثبوت چاہتے ہو۔ دیکھ لیا تم نے اپنی آنکھوں سے کہ اس نے جگا اور وشنو جیسے جوانوں کو لمبا لمبا لٹا دیا' لیکن میں اس سے ہار نہیں مانوں گا۔ یہ توہین ہے میری۔"

"دادا! اگر یہ واقعی بمبئی کی رانی ہے تو تم الگ ہٹ جاؤ۔ ہم سب مل کر اسے گرا لیں گے۔" شنکر دادا کے کسی ساتھی نے مشورہ دیا۔

"بھول ہے تمہاری! اگر تم اسے جانتے ہوتے تو ہرگز ایسی احمقانہ بات نہ کرتے۔" شنکر دادا نے جواب دیا۔ "مجھے اکیلے ہی اس سے لڑنے دو۔"

"دادا! جب ہم سب مل کر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو پھر تم کیوں لڑ رہے ہو اس سے؟" شنکر دادا کے کسی اور ساتھی نے سوال کیا۔

"صرف اس لئے کہ مجھے یہ فخر حاصل ہو جائے کہ میں نے بمبئی کی رانی سے دو دو ہاتھ کئے ہیں۔" شنکر دادا صاف گوئی سے بولا۔

"شنکر دادا!" میں بول اٹھی۔ "اگر تُو مجھے پہچان ہی گیا ہے تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے؟ میں تجھ سے لڑنا نہیں چاہتی۔"

"تو پھر کیا چاہتی ہے؟" وہ مجھے گھورتا ہوا بولا۔ میرے اور اس کے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ تھا۔

"لڑکی کو چھوڑ دے!"

"لیکن میرا نقصان کون بھرے گا؟"

"مجھے نہیں معلوم شنکر دادا کہ تیرے اور راجہ استاد کے درمیان کس بات پر جھگڑا ہے۔ پھر بھی اگر تجھے نقصان ہوا ہے تو میں بھروں گی نقصان۔"

شنکر دادا مجھے غیر یقینی سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ "میں بتاتا ہوں تجھے جھگڑے کی وجہ اور فیصلہ تجھ پر چھوڑتا ہوں۔ میرے آدمیوں نے ایک مارواڑی سیٹھ کو پانچ ہزار روپے میں ہمایوں کے ہاتھ تھا۔ سیٹھ کے پاس دس ہزار روپے کی رقم تھی۔ بعد میں ہمایوں نے پانچ ہزار روپے ادا نہیں کئے۔ بلکہ جرمانہ اب مجھے دوگنی رقم' یعنی دس ہزار روپے چاہئیں۔ تُو بھی دھندا کرتی ہے' بتا کیا میرا مطالبہ ناجائز ہے؟"

شنکر دادا کے لہجے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں نے اسی لئے فوراً فیصلہ سنا دیا۔ "تجھے صرف پانچ ہزار روپے مل سکتے ہیں' جرمانہ نہیں ملے گا۔ تُو نے راجہ استاد کے علاقے میں داخل ہو کر جو ہنگامہ کیا ہے' اس کے بعد تجھے جرمانے کے مطالبے کا حق نہیں۔ اگر تجھے میرا فیصلہ منظور ہے تو میں اسی وقت رقم ادا کر سکتی ہوں۔"

"اسی وقت؟" شنکر دادا حیران سا ہو کر بولا۔ "اس کی حیرانی کا سبب مجھے معلوم تھا۔ پانچ ہزار روپے کی رقم اس زمانے میں خاصی بڑی سمجھی جاتی تھی۔

"ہاں اسی وقت۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے سوٹ کیس میں دس ہزار روپے موجود تھے۔ میں جب راجہ استاد کے گھر سے گئی تھی تو احتیاطاً اپنے ساتھ رقم رکھ کر لے گئی تھی۔ سونا میں نے اسی سوٹ کیس میں رہنے دیا تھا جو وہاں چھوڑ گئی تھی۔

"تو پھر مجھے تیرا فیصلہ منظور ہے۔" شنکر دادا مان گیا۔

میرا سوٹ کیس ابھی تک اسی جگہ پڑا تھا جہاں میں نے پھینکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ سوٹ کیس میں پانچ پانچ ہزار روپے کی دو گڈیاں تھیں۔ ایک گڈی نکال کر میں نے شنکر دادا کی طرف اچھال دی۔ اس نے گڈی لپک لی۔

"لڑکی چھوڑ دو۔" شنکر دادا کی آواز بلند ہوئی۔

خوف کی زیادتی کے سبب شاید شانتی کی قوت گویائی سلب ہو کے رہ گئی تھی۔ اسے چھوڑ دیا گیا تو وہ لرزتے قدموں سے بلڈنگ کی طرف بڑھ گئی۔ اسی وقت شنکر دادا میری طرف آیا اور اس نے نوٹوں کی گڈی میرے قدموں میں ڈال دی۔

میں نے سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھائیں تو وہ بولا۔ "رانی! میری طرف سے دوستی کا یہ نذرانہ قبول کر لے۔"

"مگر کیوں؟ یہ تو تیرے مطالبے کی رقم ہے جو میں نے راجہ استاد کی طرف سے ادا کی ہے۔" میں بولی۔

"وہ رقم تو تُو نے دے دی اور میں نے لے لی' بات ختم ہو گئی۔" شنکر دادا نے کہا۔ "تُو بمبئی سے چل کر یہاں اتنی دور آئی ہے تو کیا ہماری کمائی میں تیرا کوئی حصہ نہیں؟ تُو صرف راجہ استاد کی نہیں' ہماری بھی مہمان ہے' پورے کلکتے کی مہمان ہے۔" وہ جذباتی ہو گیا۔

مجبوراً مجھے دوستی کا نذرانہ قبول کرنا پڑا' اسی کے ساتھ یہ وعدہ بھی کہ میں چاہے ایک ہی بار سہی اس کے اڈے پر ضرور آؤں گی۔

"میں نے سنا ہے رانی کہ تیرا اصل چہرہ آج تک کسی نے نہیں دیکھا اور جو تیرے اصل چہرے کی جھلک دیکھ لیتا ہے وہ زندہ نہیں بچتا۔ کیا یہ بات سچ ہے؟" شنکر دادا نے اس بھولپن سے سوال کیا کہ مجھے

اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گئی۔

"تُو نے ٹھیک ہی سنا ہے شنکر دادا!" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

پھر شنکر دادا نے جھک کر میرے پیروں کو ہاتھ لگایا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس عرصے میں شنکر دادا کے آدمی اپنے بے ہوش ساتھیوں کو اٹھا کر ایک جیپ میں ڈال چکے تھے۔ کچھ ہی دیر میں شنکر دادا اور اس کے آدمی جیپوں میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر بروقت وہاں نہ پہنچ جاتی تو نہ جانے شانتی پر کیا گزرتی۔

شنکر دادا اور اس کے آدمیوں کے جاتے ہی جیسے بھرے بازار کا سناٹا جاگ اٹھا۔ جو لوگ کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے' باہر نکلنے لگے۔ فلیٹوں اور گھروں کے بند دروازے اور کھڑکیاں بھی دھڑا دھڑ کھلنے لگیں۔ میں اپنا سوٹ کیس اٹھائے تیز قدمی کے ساتھ راجہ استاد کی بلڈنگ میں داخل ہو گئی۔

گھر کا دروازہ مجھے بند ملا۔ میں نے دستک دی تو جواب میں کچھ دیر بعد ایک اجنبی مردانہ آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

"میں رانی ہوں' دروازہ کھولو۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔

فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک اجنبی نوجوان تھا جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"راجہ استاد کہاں ہے؟" میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے اجنبی نوجوان سے معلوم کیا۔

"اپنے کمرے میں ہیں اور انہیں ابھی ابھی ہوش آیا ہے۔" اجنبی نوجوان نے جواب دیا۔

میں نے یہ سن کر ٹھنڈا سانس بھرا۔ اب میں سمجھ گئی تھی کہ شنکر دادا کی للکار کا جواب' راجہ استاد نے کیوں نہیں دیا تھا' وہ ہوش میں ہوتا تو کوئی جواب دیتا۔ اس نوجوان کے ساتھ میں' راجہ استاد کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہاں مجھے دس بارہ افراد نظر آئے جو تقریباً سبھی زخمی تھے۔ کسی کے لاٹھی لگی تھی تو کوئی ہاکی کھا کے زخمی ہوا تھا۔ کسی کے جسم میں ٹوٹی ہوئی بوتل کا شیشہ گھس گیا تھا اور کوئی چاقو کھا کر زخمی ہوا تھا۔ ان کے علاوہ راجہ استاد اور ہمایوں کو سب سے زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔ وہ دونوں کمرے کے درمیان بستر پر پڑے تھے۔ وہیں ایک طرف کونے میں سہمی ہوئی شانتی کھڑی تھی۔ ان لوگوں نے خود ہی اپنی مرہم پٹی کر لی تھی۔

اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا' میں نے وہاں موجود افراد کو مخاطب کیا۔ "کیا یہاں قریب ہی کوئی ڈاکٹر نہیں ہے؟"

"ہے۔" ایک شخص نے جواب دیا۔ "مگر کیا شنکر دادا اور اس کے آدمی چلے گئے؟"

"ہاں۔" میں نے بتایا' پھر اسی شخص سے کہا۔ "ڈاکٹر کو بلا لاؤ جلدی سے۔ اگر اس کے ساتھ کمپاؤنڈر بھی آ سکے تو اچھا ہے۔ بتا دینا کہ جھگڑے میں چوٹیں آئی ہیں۔ ممکن ہے ٹانکے بھی لگانے پڑیں۔ ڈاکٹر سے کہنا' ضروری سامان ساتھ لے کر چلے۔ جلدی جاؤ۔"

"اے چودھری .... ڈاکٹر چودھری کو بلا کر لے آ۔" راجہ استاد نحیف سی آواز میں بولا۔

نام لینا۔"

وہ شخص تیزی کے ساتھ باہر کی طرف لپک گیا۔ اسی وقت ہمایوں نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ اب تک شاید وہ بے ہوش تھا۔ شانتی لپک کر اس کے قریب پہنچ گئی۔

"تُو .... تُو .... تجھے اس .... اس .... شنکر دادا نے کیسے چھوڑ دیا؟" ہمایوں کراہتے ہوئے رک رک کر بولا۔

"دیدی نے .... مجھے دیدی نے اس سے چھڑایا ہے۔" شانتی نے میری طرف اشارہ کیا۔

"رانی! تم .... تم کب آئیں؟" راجہ استاد نے پہلی بار مجھے مخاطب کیا۔ میرے چہرے پر جو میک اپ تھا' اس میں وہ مجھے دیکھ چکا تھا۔ میں اسی میک اپ میں راجہ استاد سے ایک ہفتے قبل رخصت ہوئی تھی۔ راجہ استاد نے اسی لئے میک اپ کے باوجود مجھے پہچان لیا تھا۔

"استاد! میں اس وقت یہاں پہنچی جب کھیل ختم ہو چکا تھا۔" میں نے کہا۔ "کاش میں کچھ دیر پہلے آ گئی ہوتی' پھر شاید یہ نوبت نہ آتی۔ اس کے باوجود مجھے خوشی ہے کہ میں نے شانتی کو بچا لیا۔ شنکر دادا تمہیں دھمکیاں دے کر شانتی کو اغوا کر کے لے جانے والا تھا کہ اسی وقت میں پہنچ گئی۔" یہ کہتے ہوئے میں راجہ استاد کے قریب آ بیٹھی۔

"پھر........... پھر تم نے کس طرح شانتی کو اس سے چھڑا لیا؟" راجہ استاد نے بے چینی سے پوچھا۔

"حیرت ہے استاد کہ تم یہ سوال کر رہے ہو! تمہیں معلوم ہے کہ میرا نام رانی ہے۔"

"مگر شنکر اور اس کے آدمی خاصی تعداد میں تھے رانی! تم اکیلی کس طرح ان پر..........."

"میں بتاتی ہوں بابا!" شانتی بول اٹھی اور پھر اس نے پورا واقعہ بیان کر دیا۔

"تو وہ کافر بچہ بھی تمہارا مرید بن گیا۔" راجہ استاد تلخ سے انداز میں ہنسا۔ "لیکن میں اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔ جس طرح اس نے میرے علاقے میں آ کر ہنگامہ کیا ہے' میں بھی ٹالی گنج جا کر اس کے اڈے کے اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے راجہ استاد کا لہجہ پُرجوش ہو گیا۔ "وہ تو بس اچانک آ کے ٹوٹ پڑا ابھی تو لونڈوں کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ خبر لگ جاتی اور لونڈے یہاں پہنچ جاتے تو نہ شنکر یہاں سے بچ کر نکل پاتا' نہ اس کا کوئی آدمی اپنے پیروں پر چل کر یہاں سے جا سکتا۔ آس پاس جن لونڈوں کو اطلاع ہو گئی بس وہی جمع ہو گئے۔"

اس وقت راجہ استاد کا پارا چڑھا ہوا تھا۔ میں اسی لئے کچھ نہ بولی' ہاں شانتی کے بارے میں ضرور پوچھ لیا کہ وہ کس طرح شنکر دادا کے ہتھے چڑھ گئی؟

جب جھگڑا شروع ہوا تو شانتی گھر ہی میں تھی۔ راجہ استاد اور ہمایوں دونوں ہی نے اسے تاکید کی تھی کہ کسی بھی صورت گھر سے باہر نہ آئے۔ پھر وہ دونوں باہر چلے گئے تھے۔ جب مورچہ جم گیا اور راجہ استاد کو پسپائی اختیار کرنا پڑی تو ایک موقع پر ہمایوں چاقو کھا کر گرا۔ گرتے ہوئے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور یہی غضب ہو گیا وہ گھر کا دروازہ کھول کر باہر بھاگی اور شنکر دادا کے آدمیوں نے اسے دبوچ لیا۔ راجہ استاد کے سر پر بھی لاٹھی پڑی اور وہ چیختا ہوا پیچھے بھاگا۔ راجہ استاد کے گرتے ہی اس کے آدمی اسے

اٹھا کر گھر میں لے آئے اور بند ہو کر بیٹھ گئے۔ ہمایوں کو بھی وہ اندر گھسیٹ لائے تھے۔ یوں شانتی باہر ہی رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر چودھری کا مطب اور گھر چاندنی چوک ہی میں تھا۔ اپنے دو کمپاؤنڈروں کے ساتھ اسے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ڈاکٹر چودھری نے سب سے پہلے راجہ استاد اور ہمایوں کے زخم دیکھے۔ ہمایوں کے پہلو میں چاقو لگا تھا۔ کئی ٹانکے آئے اور اس کی مرہم پٹی کر دی گئی۔ پہلو کے علاوہ سر اور شانے پر بھی چوٹیں آئی تھیں جن پر دوا لگا دی گئی۔ تقریباً یہی حال راجہ استاد کا تھا۔ چاقو سے اس کے بائیں بازو پر گہرا زخم لگا تھا۔ ایک پیر پر بھی ہاکی پڑی تھی جو سوجا ہوا تھا۔ سر بھی لاٹھی کی ضرب سے پھٹ گیا تھا۔ اس کے سر اور بازو کے زخموں پر ٹانکے لگا دیئے گئے۔ سیدھے پیر پر بھی بینڈیج کر دی گئی۔ راجہ استاد اور ہمایوں کے بعد دوسروں کی باری آئی' مگر ان میں کوئی زیادہ زخمی نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگ بوتل کے شیشے لگنے سے زخمی ہوئے تھے۔ ایک شخص کی پنڈلی سے شیشے کا ٹکڑا بھی نکالا گیا اور دوا بھر کے پٹی باندھ دی گئی۔ اس پوری کارروائی میں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران راجہ استاد کے گروہ والے آتے جاتے رہے۔ جسے خبر ملی' وہ راجہ استاد کی عیادت کو دوڑ لیا۔ رات کے نو بجے تک یہ ہنگامہ ختم ہوا۔

☆======☆======☆

میں نے اپنے کمرے میں آ کر میک اپ ختم کیا اور منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لئے۔ راجہ استاد کے آدمی جا چکے تھے۔ راجہ استاد اور ہمایوں کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دودھ اور ڈبل روٹی دے کر شانتی نے مجھ سے کھانے کا پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ہنگامے کی وجہ سے ہانڈی پکانے کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ اب وہ میرے لئے کھانا پکانا چاہتی تھی۔ خود اس نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دوپہر کو ماش کی دال پکائی تھی جو تھوڑی سی بچی ہوئی ہے۔

"بس پھر ٹھیک ہے' صرف روٹی ڈال لو' اچار وغیرہ نکال لینا' کام چل جائے گا۔ اس وقت کہاں سالن پکاتی پھرو گی۔" میں نے کہہ دیا اور شانتی مان گئی۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے اور شانتی نے ساتھ کھانا کھایا اور پھر میں اٹھ کر راجہ استاد کے کمرے میں آ گئی۔ شانتی سے میں نے چائے کے لئے کہہ دیا تھا۔

"ہمایوں! تُو یہیں سوئے گا میرے پاس کہ اپنے کمرے میں جائے گا؟" راجہ استاد نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے استاد کہ آپ دونوں اسی کمرے میں رہیں اور شانتی بھی یہیں سو جائے۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "آپ دونوں ہی کو تیماردار کی ضرورت ہے۔"

"اور مجبوری یہ ہے کہ تیماردار صرف ایک ہے۔" راجہ استاد آہستہ سے ہنسا۔

"نہیں خیر تیمارداری تو میں بھی کر سکتی ہوں' مگر تم اس پر آمادہ نہیں ہو گے۔" میں بولی۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔" راجہ استاد نے سر ہلایا۔ "تم بہرحال میری مہمان ہو۔"

"یہ بتاؤ استاد کہ جھگڑا کس بات پر تھا؟ شنکر دادا بلا سبب تو نہیں چڑھ دوڑا ہو گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ سب کچھ اس لونڈھیار کا نتیجہ ہے۔" راجہ استاد نے منہ بنا کر ہمایوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے میں لاکھ سمجھاتا رہتا ہوں کہ دیکھ بدمعاشی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ مگر اس کی کھوپڑی ہی میں نہیں بیٹھتی۔ جس مارواڑی سیٹھ پر شنکر دادا کے آدمی اپنے علاقے میں ہاتھ صاف نہیں کر سکے' اسے انہوں نے ہمایوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ کیوں کہ وہ ہمارے علاقے میں نکل آیا تھا۔ اوّل تو اسے یہ اندھا سودا کرنا ہی نہیں چاہئے تھا' اگر سودا کر ہی لیا تھا تو زبان کا پاس رکھتا۔ مارواڑی سیٹھ کے پاس کل سات ہزار روپے کی رقم تھی۔ جس میں سے پانچ ہزار روپے اس نے ہمارے علاقے میں پہنچ کر ایک دکاندار کو ادا کر دیئے۔ اس طرح ہمایوں کے پلے صرف دو ہزار پڑے۔ بس یہ پسر گیا۔ شنکر کے آدمیوں سے اس نے کہہ دیا کہ ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ مجھے اس وقت پتا چلا جب بات بگڑ چکی تھی۔ دیکھ رانی! دھندا تُو بھی کرتی ہے' تجھے بھی معلوم ہو گا کہ دھندے میں نفع نقصان تو لگا ہی رہتا ہے۔ اسے چاہئے تھا کہ تین ہزار کی ڈز برداشت کر لیتا اور زبان سے نہ پھرتا۔"

"مگر استاد! شنکر کے آدمیوں نے بھی تو جھوٹ بولا تھا کہ سیٹھ کے پاس دس ہزار روپے ہیں۔" ہمایوں بول اٹھا۔

"ابے تو تجھ سے کس نے کہا تھا کہ سیٹھ کو پانچ ہزار میں خرید ہی لیتا۔ دھتا بتا دیتا' غلطی تو تیری ہے۔" راجہ استاد بگڑ کر بولا۔ "تجھے اتنی دفعہ سمجھایا ہے' دنیا بھر سے ہیرا پھیری چل جاتی ہے' اپنوں سے نہیں۔ بدمعاش اگر دوسرے بدمعاش کو ہاتھ دکھا جائے گا تو کبھی نہیں پنپ سکتا۔ اس دھندے میں زبان سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ جس بدمعاش کی کوئی زبان نہیں وہ بدمعاش نہیں' کچھ آیا تیری سمجھ میں کہ نہیں؟"

"سمجھ گیا استاد! آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں ہو گی۔" ہمایوں نے غلطی کا اعتراف کر کے اپنی جان چھڑالی۔

"ایک بات کہوں استاد!" میں موقع غنیمت جان کر بولی۔

"ہاں کہو۔"

"جب تمہیں خود اس بات کا احساس ہے کہ غلطی ہمایوں کی ہے تو پھر بات بڑھانے سے کیا فائدہ؟"

"کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"ٹالی گنج جا کر ہنگامہ کرنے سے کیا حاصل ہو گا تمہیں؟" میں نے وضاحت کی۔ "رات گئی' بات گئی' خاک ڈالو۔"

"تو کیا میں اس کافر بچے سے اپنی توہین کا بدلہ نہ لوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے رانی! جب تک میں اسے اس کے علاقے میں گھس کر نہیں ماروں گا جس طرح وہ مجھے یہاں مار کے گیا ہے' میرے دل کو چین نہیں آئے گا۔ اس ہاتھ دے' اس ہاتھ لے۔" راجہ استاد اپنی ضد پر اڑ گیا۔

"بات ختم ہونے کی کوئی اور صورت نہیں استاد!" میں نے پوچھا۔

"ہاں' ہے ایک صورت' مگر وہ ہرگز اس پر آمادہ نہیں ہو گا' میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تم بتاؤ تو سہی!" میں نے مصالحت کی ایک راہ نکلتے دیکھ کر کہا۔

"وہ یہاں آ کر بھرے بازار میں مجھ سے معافی مانگ کر اپنا چاقو میرے قدموں میں ڈال دے۔ میں اسے معاف کر دوں گا۔"

"تم نے بڑی کڑی شرط لگائی ہے استاد! اس کے باوجود میں کوشش کروں گی کہ وہ تمہاری شرط مان لے اور تمہارے درمیان صلح ہو جائے۔" میں بولی۔

"تو کیا تم اس کے اڈے پر جاؤ گی؟" راجہ استاد نے حیرت سے کہا۔

"ہاں' میں نے ایک مرتبہ وہاں جانے کا اس سے وعدہ بھی کر لیا ہے' اسی بہانے سہی۔ کل صبح تم اپنے کسی آدمی کو میرے ساتھ کر دینا' میں ٹالی گنج جاؤں گی۔"

"دیکھ رانی! ایسا نہ ہو کہ تمہاری بات بھی جائے اور جھگڑا وہیں رہے۔"

اس عرصے میں شانتی میرے لئے لائے بنا کر لے آئی تھی۔

میں چائے پی کر استاد کے پاس سے اٹھنے والی تھی کہ اس نے معلوم کیا۔ "ہاں یہ تو میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں۔ تمہارا کام ہو گیا' تم بردوان ہی گئی تھیں نا؟"

"ہاں' کام ہو گیا۔" میں نے اس کے اطمینان کی خاطر کہہ دیا۔ راجہ استاد سے میں' بنگال ہی کے ایک شہر بردوان جانے کا بہانہ کر کے ایک ہفتے غائب رہی تھی۔ مجھے کیوں کہ ابھی راجہ استاد کے گھر میں مزید رہنا تھا اس لئے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "کام کا ایک حصہ مکمل ہو گیا ہے' مگر دوسرا باقی ہے۔ مجھے اس کے لئے ابھی چند روز اور اسی شہر میں رہنا پڑے گا۔ مکمل کامیابی کے بعد ہی میں بمبئی لوٹوں گی۔"

"اچھا ہے' اس طرح کچھ مزید دن تمہاری میزبانی کا موقع مل جائے گا۔" راجہ استاد خوش ہو گیا۔

دوسرے روز ناشتہ کرنے کے بعد اپنے چہرے پر میں نے ایک نیا میک اپ کیا۔ اس میک اپ میں بھی میرا چہرہ زیادہ قابل توجہ نہیں تھا۔ مگر پہلے کی طرح میں ادھیڑ عمر یا عمر رسیدہ نہیں لگتی تھی۔ میری عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ میں' راجہ استاد کی وجہ سے جس معاملے میں ملوث ہو چکی تھی اسے بہرحال انجام تک پہنچانا تھا۔ اس کے لئے میں نے ایک تجویز سوچ لی تھی۔ وقت مقررہ پر استاد کا ایک آدمی آ گیا۔ اسے میرے ساتھ ٹالی گنج تک جانا تھا۔

ٹالی گنج کلکتے کی ایک نواحی بستی تھی جس کے بعد کوئی آبادی نہیں تھی۔ یہ اپر کلاس اور اپر مڈل کلاس ہندوؤں کا علاقہ تھا۔ دھرم تلے سے وہاں کے لئے ٹرام ملتی تھی لیکن راجہ استاد نے میری حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک کار اور ڈرائیور کا بندوبست کر دیا۔ میں نے منع بھی کیا مگر وہ نہیں مانا اور کہنے لگا۔ "تم دشمن کے اڈے پر جا رہی ہو رانی! تمہیں اسی طرح وہاں جانا چاہئے' یہ کیوں بھولتی ہو کہ تم میری مہمان ہو۔"

چلتے ہوئے میں نے راجہ استاد سے ایک چاقو لے کر اپنے ہینڈ پرس میں رکھ لیا۔ راجہ استاد نے اس کی وجہ بھی معلوم کی مگر میں مسکرا کر ٹال گئی۔

ٹالی گنج میں شنکر دادا کو جب میری آمد کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے اڈے پر عجیب طرح میرا استقبال کیا۔ اس کے ساتھی دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ میں جیسے جیسے قدم آگے بڑھاتی گئی وہ اپنے ہتھیار میرے قدموں میں ڈالتے گئے۔ آخر میں شنکر دادا نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر شنکر دادا اور اس کے تمام ساتھیوں نے جھک کر میرے پیر چھوئے۔ اس کے بعد شنکر دادا نے ایک ریوالور' ایک چاقو اور چاندی کے دو ہزار روپے ایک تھال میں رکھ کر مجھے نذر کئے۔ میں حیران حیران سی اپنی یہ عزت و توقیر دیکھ رہی تھی۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ ٹالی گنج میں میرا اتنا زبردست استقبال ہو گا۔ شنکر دادا نے مجھے واقعی بڑی عزت دی تھی۔ کسی کے قدموں میں چاقو پھینک دینے کا مطلب میرے نزدیک یہ تھا کہ چاقو پھینکنے والے نے دوسرے کی برتری تسلیم کر لی ہے' مگر بعد میں میرے علم میں یہ بات آئی کہ اس کا مطلب محض یہی نہیں تھا۔ دوسرے کی برتری تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا مطلب اپنا خون بھی معاف کر دینا تھا۔ یعنی جس کے قدموں میں چاقو پھینکا گیا ہو' وہ اگر چاہے تو اپنی برتری تسلیم کرنے والے کو قتل بھی کر سکتا ہے۔ قتل کرنے کا یہ حق ہر ایک کو نہیں دیا جاتا۔ راجہ استاد اور شنکر دادا دونوں ہی ایسا کر چکے تھے۔ گویا وہ دونوں ہی میری اطاعت کا عملی اظہار کر کے مجھے خود پر برتر مان چکے تھے۔

وہ ایک کوٹھی کا خاصا بڑا حصہ تھا جس کے بڑے کمرے میں یہ "تقریب" منعقد ہو رہی تھی۔ راجہ استاد کی نسبت شنکر دادا زیادہ خوش حال معلوم ہوتا تھا۔ شنکر دادا کے دیئے ہوئے دو ہزار روپے' چاقو اور ریوالور میں نے اس شخص کے سپرد کر دیئے جو میرے ساتھ آیا تھا۔ میں یہ نذر قبول کرنے پر مجبور تھی۔

اچانک ہی میں نے اپنا ہینڈ پرس کھول کر وہ چاقو نکال لیا جو ساتھ لے کر چلی تھی۔ شنکر دادا میرے قریب ہی دوسری آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس پر وہ چونک اٹھا۔ پھر جیسے ہی میں نے کرسی سے اٹھ کر چاقو اس کے قدموں میں ڈالنا چاہا' وہ تیزی سے جھکا اور چاقو لپک لیا۔

"یہ .... یہ تم کیا کر رہی ہو رانی! .... ایسا تو آج تک نہیں ہوا۔" شنکر دادا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "بولو کیا چاہتی ہو تم؟ کیا شنکر دادا اپنی گردن کاٹ کر تمہارے قدموں میں ڈال دے؟ بتاؤ رانی! تم مجھ پر یہ ظلم کیوں کر رہی تھیں؟ میں نے اور میرے ساتھیوں نے خود کو تمہاری غلامی میں دے دیا اور غلام ہمیشہ غلام ہی رہتے ہیں' آقا نہیں بنتے۔ جو کچھ ہو چکا نہیں بدلا جا سکتا۔ کیا تمہیں ہماری غلامی قبول نہیں؟ کیا ہماری جاں نثاری پر بھروسہ نہیں؟ بولو رانی' بولو۔" شنکر دادا کی آواز بھرا گئی۔

"بات صرف اتنی ہے شنکر دادا کہ تم نے مجھے کل اور آج جو عزت دی میں اس پر تہہ دل سے تمہاری ممنون ہوں' مگر میرا بھی ایک اصول ہے۔ میں کسی کو بھی اپنا غلام نہیں دوست بناتی ہوں اور دوستی برابر کی سطح پر ہوتی ہے۔ دوستی میں اونچ نیچ نہیں ہوتی۔ تم نے اپنا چاقو میرے قدموں میں پھینک دیا۔ سو دوستی کا تقاضا یہی تھا کہ میں بھی ایسا ہی کرتی۔ بولو شنکر دادا! کیا تمہیں رانی کی دوستی منظور نہیں؟" میں پرجوش آواز میں بولی۔

"کیوں نہیں رانی! یہ تو میرے لئے قابل فخر بات ہے، لیکن اونچ نیچ تو دنیا کی ریت ہے۔ آدمی کو چھوٹا بڑا بھگوان بناتا ہے۔ اس نے تمہیں بڑا بنایا ہے تو تمہاری بڑائی ماننا ہی پڑے گی۔ تم اسے جو چاہے

نام دے لو‘ یہ بھی تمہاری بڑائی ہے۔ یہ لو۔“ شنکر نے چاقو میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے چاقو اس سے لے کر اپنے پرس میں رکھ لیا اور کہا۔ ”تمہیں میرے ساتھ چاندنی چوک چلنا ہے‘ اسی وقت۔“

”میں تم سے اس کی وجہ نہیں پوچھوں گا رانی!“ وہ پُرسکون آواز میں بولا۔ ”میں تم سے کوئی سوال کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔“

”مگر میں تمہیں اس کی وجہ بتا دوں گی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

پھر شنکر دادا میرے ساتھ کار میں آ بیٹھا۔ اس کے اشارے پر ایک جیپ میں چار افراد سوار ہو کر کار کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں نے راستے میں جب اپنا مقصد بیان کیا تو چند لمحوں کو شنکر دادا کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ پھر وہ بھاری آواز میں بولا۔ ”رانی! ہر چند کہ بڑی ذلت کی بات ہے مگر تمہاری خاطر مجھے یہ ذلت بھی قبول ہے۔“

میں جواب میں خاموش ہی رہی۔ اس کے بعد چاندنی چوک پہنچ کر وہی ہوا جو راجہ استاد چاہتا تھا۔ میرے ایما پر راجہ استاد نے شنکر دادا کو گلے سے لگا لیا‘ پھر اسے اپنے ساتھ گھر میں لے آیا۔ شنکر دادا کے چاروں ساتھیوں کو بھی اندر بلا لیا گیا تھا۔

”شنکر دادا! تُو پہلی مرتبہ دوست بن کر میرے گھر آیا ہے۔“ یہ کہہ کر راجہ استاد نے پانچ ہزار روپے اس کے قدموں میں ڈال دیئے۔ ”دوستی کی یہ نذر قبول کر لے۔“

جھگڑا پانچ ہزار روپے کی ادائیگی ہی پر تھا۔ راجہ استاد نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ وجہ نزاع ختم کر دی تھی۔ شنکر دادا کو نذر قبول کرنا پڑی۔ یوں میں ان دونوں گروہ بند غنڈوں کے درمیان مصالحت کرانے میں کامیاب ہو گئی۔

کچھ دیر کے بعد شنکر دادا اپنے آدمیوں کے ساتھ رخصت ہو گیا تو میں نے راجہ استاد سے کہا۔ ”تم نے اسے پانچ ہزار روپے ادا کر کے بہت اچھا کیا استاد! اس طرح شنکر دادا کے دل میں جو پھانس اٹکی ہوئی تھی‘ وہ یقیناً نکل گئی ہو گی۔“

”لیکن وہ تمہارے ساتھ یہاں آنے پر آمادہ کیسے ہو گیا؟“

”اگر اس کی جگہ تم ہوتے استاد اور میں تم سے ساتھ چلنے کو کہتی تو کیا تم انکار کر دیتے؟؟“

”کسی اور کے لئے تو خیر نہیں کہتا‘ مگر شاید .... شاید تم سے انکار کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہوتا۔“ راجہ استاد نے اعتراف کیا۔

اس معاملے سے نمٹنے کے بعد اگلے دو روز میں نے طرح طرح کے لباسوں کی خریداری پر صرف کئے۔ میک اپ کا بھی مزید کچھ سامان خریدا۔ اب میرے پاس ہر وہ لباس موجود تھا کہ میں کوئی بھی شخصیت اپنا سکتی تھی۔ اس کے لئے مجھے راجہ استاد کے درزی سے بھی کچھ کپڑے سلوانا پڑے۔ اس نے سارے کام چھوڑ کر پہلے میرے کپڑے سیئے۔

شنزاد کے بارے میں مجھے پورا یقین تھا کہ اس نے رہا ہونے کے بعد میری ہدایات پر عمل کیا ہو گا۔

میں اب اس سے رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کر لیا تھا۔ شنزاد کو رہائی ملے تقریباً دس گیارہ دن ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں شنزاد کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ وہ کرائے پر کوئی مکان حاصل کر کے کوٹھی سے وہاں منتقل ہو جاتا۔ کوٹھی کو بعد میں بھی فروخت کیا جا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں ایک شام پارک سرکس پہنچ گئی۔ شنزاد کے بارے میں مجھے اس کے دوست آفتاب سے ضروری معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ شنزاد مجھے اس کا گھر دکھا چکا تھا اور ملوا بھی چکا تھا۔ میں اس وقت ایک مسلمان عورت کے میک اپ میں تھی اور برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ میں آفتاب کے گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی کنگ اسٹریٹ سے نہیں لوٹا جہاں چشمے کی ایک دکان پر سیلزمین تھا۔ آفتاب کی ماں اور دو بہنوں نے مجھے گھر میں بلا لیا۔ وہ متجسس تھیں کہ میں آفتاب کو کیسے جانتی ہوں اور میرا اس سے کیا تعلق ہے۔ میں نے انہیں اپنا نام رانی ہی بتایا تھا۔

”آپ آئی کہاں سے ہیں؟“ آفتاب کی بڑی بہن نے مجھ سے پوچھا۔

”کولوٹولہ سے۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ دراصل ذہنی طور پر میں پہلے سے کسی ایسی صورت حال کے لئے تیار نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اپنے ذہن میں کوئی ایسی کہانی ترتیب دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ تینوں خواتین میری طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ مجھے اس میں زیادہ دیر نہیں لگی اور میں روانی سے بولنے لگی۔ ”دراصل آفتاب بھائی ہمارے گھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ میرے بھائی جان سے ان کی دوستی ہے۔ اپنے گھر کا پتا بھی آفتاب بھائی نے ایک روز خود ہی بتایا تھا جو آج کام آ گیا۔ میری امی ضعیف ہیں اور ابا جی کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجبوراً اسی لئے مجھے خود گھر سے نکلنا پڑا۔ کل دوپہر کو بھائی جان‘ آفتاب بھائی کے ساتھ گئے تھے اور اب تک نہیں لوٹے۔ آفتاب بھائی سے میں ان کے بارے میں معلوم کرنے آئی ہوں۔ آفتاب بھائی جس دکان پر کام کرتے ہیں مجھے اس کا پتہ معلوم نہیں تھا ورنہ وہاں چلی جاتی۔“

میری بات سن کر ان تینوں خواتین کے چہروں سے اطمینان کا اظہار ہونے لگا۔ یوں بھی اگر کوئی لڑکی کسی نوجوان کو بھائی کہہ دے تو لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں۔

”تو آفتاب تمہیں جانتا ہے؟“ آفتاب کی ماں نے طویل سانس لیا۔

”جی۔“ میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

”عموماً وہ بعد مغرب ہی آتا ہے۔ تم بیٹھو‘ اذان ہونے والی ہے‘ میں ذرا وضو کر لوں۔“ یہ کہہ کر آفتاب کی ماں اٹھ کھڑی ہوئی۔

آفتاب کی چھوٹی بہن میرے لئے چائے بنانے چلی گئی اور بڑی مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ اس پر حیرت کا اظہار کر رہی تھی کہ آفتاب نے کبھی اپنے کسی ایسے بے تکلف دوست کا تذکرہ نہیں کیا کہ جو کولوٹولے میں رہتا تھا اور جس کے گھر اس کا آنا جانا تھا۔ مجھے اگر یہ اندازہ ہوتا کہ آفتاب ابھی گھر نہیں لوٹا ہو گا تو کچھ دیر سے آتی۔

پھر مغرب کی اذان بھی ہو گئی اور میرے لئے چائے بھی آ گئی۔ چائے پینے کے بعد میں نے کپ

رکھا ہی تھا کہ آفتاب گھر میں داخل ہوا۔ مجھے اپنی بہنوں کے ساتھ گھر کے برآمدے میں بیٹھے دیکھ کر وہ کچھ ٹھٹکا اور پھر مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالتا ہوا اندرونی کمرے کی طرف بڑھا۔ ظاہر ہے میں اس کے لئے اجنبی ہی تھی۔

"آفتاب بھائی!" معاً میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

"آپ......... آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

"آپ مجھے نہیں پہچانیں گے کیوں کہ میں کبھی بے پردہ آپ کے سامنے نہیں آئی۔" میں نے بات بنائی۔ "مجھے دراصل شہزاد بھائی کے بارے میں پوچھنا تھا کہ وہ کہاں ہیں' سمجھ گئے نا آپ؟" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ "وہ جنہوں نے معبلہ خاتون کو آپ سے ملوایا تھا۔"

شہزاد کا اور اپنا نام لے کر میں نے آفتاب پر صورت حال واضح کر دی تھی کہ میری آمد کا مقصد کیا ہے۔ وہ چونکا' پھر کہنے لگا۔ "آپ کو شہزاد سے ملنا ہے؟"

"جی ہاں۔" میں جلدی سے بولی اور فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہو گی آفتاب بھائی! اگر آپ مجھے شہزاد بھائی جان تک پہنچا دیں۔"

"اس میں مہربانی کی کیا بات ہے؟ شہزاد تو تقریباً روز یہ مجھ سے پوچھتا رہتا ہے کہ اس سے کوئی ملنے نہیں آیا۔ دو گلی چھوڑ کر ہی اس نے مکان کرائے پر لیا ہے' چلئے۔"

آفتاب کی بہنیں حیران حیران سی دیکھتی رہ گئیں اور وہ مجھے ساتھ لئے گھر سے نکل آیا۔ حیرانی کا سبب وہ کہانی ہی تھی جو میں نے انہیں سنائی تھی۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گی' کیا نہیں۔ اس وقت تو میں' شہزاد تک جلد از جلد پہنچنا چاہتی تھی۔

"آپ مجھے کیسے پہچانتی ہیں؟" گھر سے کچھ دور نکل آنے کے بعد آفتاب نے میرے ساتھ چلتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

ہر چند کہ میں آواز بدل کر نہیں بول رہی تھی مگر وہ مجھے میری آواز سے نہیں پہچان سکا تھا۔ یوں بھی میں اس سے ایک ہی مرتبہ ملی تھی۔ مجھے اس سے کسی ایسے ہی سوال کی توقع تھی۔ اس لئے فوراً ہی جواب میں بول اٹھی۔ "معبلہ خاتون سے مجھے آپ کا حلیہ اور گھر کا پتا معلوم ہوا تھا۔" میری آواز بھی بلند نہیں تھی۔ راستے میں پردہ نشین خاتون کی مردوں سے گفتگو اس زمانے میں معیوب سمجھی جاتی تھی۔ مجھے اس کا احساس تھا' اس لئے آہستہ بول رہی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "معبلہ خاتون ہی نے مجھے شہزاد کے پاس بھیجا ہے۔"

"شہزاد نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ خود آئیں گی۔ خود کیوں نہیں آئیں وہ؟" آفتاب نے پوچھا۔

"مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا خبر خود بھی وہ کسی روز آئیں۔"

میرے جواب کے بعد آفتاب نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ مکان دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی کے آخری سرے پر تھا جس کے دروازے پر رک کر آفتاب نے دستک دی۔

ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا نیپالی گورکھا نریندرا تھا۔ میرا چہرہ اور پورا جسم

برقع میں چھپا ہوا تھا۔ نریندرا نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"شہزاد صاحب گھر موجود ہیں؟" آفتاب نے نریندرا سے دریافت کیا۔

"موجود ہے' کیا بولے ہم؟"

"کہنا آفتاب ایک مہمان کو لے کر آیا ہے جنہیں معبلہ خاتون نے بھیجا ہے۔"

"میم نے بھیجا ہے۔" نریندرا کھل اٹھا۔ "میم کس کو بھیجا؟"

"انہیں۔" آفتاب نے میری طرف اشارہ کیا۔

"آپ کو میم بھیجا تو آپ اندر آ جاؤ۔" نریندرا دروازے سے ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر وہ آفتاب سے مخاطب ہوا۔ "آپ رکو' ہم شہزاد بابو کو بولتا ابی کہ آپتاب آیا۔"

"اس کی ضرورت نہیں' میں چلتا ہوں۔" آفتاب نے کہا۔ "میں تو بس ان محترمہ کو یہاں تک پہنچانے آیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑ گیا۔ نریندرا نے اسے نہیں روکا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ نریندرا وہاں سے چلا گیا۔

مجھے زیادہ دیر تک شہزاد کی آمد کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ جب نشست گاہ کے دروازے سے داخل ہو کر میری طرف بڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ فکرمند سا تھا۔

"جی محترمہ!" شہزاد نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ میرے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو معبلہ خاتون نے میرے پاس بھیجا ہے' فرمائیے!"

"کیا یہ ممکن ہے جناب کہ میری اور آپ کی گفتگو کے دوران میں کوئی اور شخص مداخلت نہ کرے یا یہاں نہ آئے؟" میں آواز بدل کر بولی۔

"اگر کوئی ایسی بات ہے محترمہ تو آپ میرے ساتھ اندر چلئے۔ کوئی اعتراض تو نہیں آپ کو میرے کمرے میں چلنے پر؟"

"جی نہیں۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب تک میرا جسم برقع میں ہی چھپا ہوا تھا۔

شہزاد مجھے گھر کے اندر ایک کمرے میں لے آیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اس کمرے میں بیڈ کے علاوہ دو تین کرسیاں بھی ایک طرف پڑی تھیں۔ میں نے ایک کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے برقع اتار دیا۔ اسی کے ساتھ اپنے چہرے پر چڑھا ہوا ماسک بھی الگ کر دیا۔ شہزاد کی طرف ابھی میری پشت تھی۔ وہ مجھ سے چند قدم پیچھے تھا۔

پھر جیسے ہی میں کرسی پر بیٹھی اور شہزاد قریب آیا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ پلکیں جھپکانا تک بھول گیا تھا۔

"اس قدر حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

"آ......... آپ......... خا......... خاتون آپ!" وہ ہکلایا اور پھر قریبی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "مم مگر......... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

ماسک اب تک میرے ہاتھ میں تھا۔ پرس کھول کر میں نے احتیاط کے ساتھ ماسک پرس میں رکھ دیا

اور بولی۔ "مجھے دیکھ کر اتنے حیرت زدہ کیوں ہو تم؟"

"اس لئے خاتون کہ .... کہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا' آپ یوں اچانک آ جائیں گی۔" لگتا تھا کہ وہ اب خاصی حد تک اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔

"اگر میرا اس طرح اچانک آنا تمہیں اچھا نہیں لگا تو چلی جاتی ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ .... میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا خاتون!" وہ سنبھل کر بولا' پھر پوچھنے لگا۔ "سامان کیا کسی ہوٹل یا مسافر خانے میں ہے؟ کب لوٹیں آپ کلکتے سے؟"

"یہ سب تو خیر تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال میں جو کچھ پوچھوں اس کا جواب دو۔ کوٹھی کا سودا ہو گیا؟"

"ایک بروکر سے بات چل رہی ہے' دو تین دن اور لگ جائیں گے۔" شہزاد نے بتایا۔ "دیر اس لئے ہو رہی ہے کہ میں اس سے کم قیمت لینے پر تیار نہیں' جتنے میں کوٹھی خریدی تھی۔"

"اس سے کتنے کم مل رہے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"دس گیارہ ہزار کم لینے پر آمادہ ہو جاتا تو اب تک سودا ہو گیا ہوتا۔ آخر میں بروکر کے ذریعے جس پارٹی سے بات ہوئی ہے' وہ بھی پانچ ہزار کم دے رہی تھی۔ میں نے منع کر دیا۔ اس پر پارٹی نے کسی فیصلے تک پہنچنے کے لئے دو روز کی مہلت مانگ لی۔ اس نے وعدہ لیا ہے کہ دو روز سے پہلے میں کوٹھی کسی کو نہ بیچوں۔"

"پانچ دس ہزار کے لئے مزید تاخیر کی ضرورت نہیں' بیچ دو کوٹھی۔" میں نے گویا فیصلہ سنا دیا' پھر سوال کیا۔ "یہاں کوئی مکان دیکھا؟"

"جی ہاں۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "دو مکان دیکھے ہیں۔ ایک دو منزلہ ہے' تین کمرے نیچے اور دو اوپر۔ دوسرا مکان چار کمروں کا ہے۔ دونوں کی قیمت میں دس ہزار کا فرق ہے۔"

"ان میں سے تمہیں کون سا بہتر معلوم ہوتا ہے؟"

"دو منزلہ زیادہ اچھا ہے۔ خاصی بڑی چھت بھی ہے۔ مگر یہ بات راز نہیں رہ سکے گی کہ آپ نے کوٹھی بیچ کر یہاں مکان خرید لیا ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں چونک کر بولی۔

"میں نے محسوس کیا ہے کہ کچھ لوگ سائے کی طرح میرے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں وہ میرے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ میرے علاوہ ولیم بھی گھر سے سودا سلف لینے کی خاطر نکلتا ہے۔ اس نے بھی مجھے یہی بتایا ہے کہ کچھ لوگ اس کا تعاقب کرتے ہیں۔"

"تمہارے خیال میں وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟" میں نے صرف یہ جاننے کے لئے سوال کیا کہ شہزاد کس نتیجے پر پہنچا ہے ورنہ تو مجھے بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

"وہ خفیہ پولیس والے ہی ہو سکتے ہیں خاتون؟ یہ سوچنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔" پھر شہزاد نے مجھے اپنی گرفتاری' پوچھ گچھ اور رہائی کے بارے میں بتایا۔ "مجھے جب رہا کیا گیا تھا تو خاص طور پر تاکید کی گئی تھی کہ آپ جیسے ہی مجھ سے ملیں میں قریبی تھانے میں اس کی اطلاع دوں۔"

"مجھے انتہائی دکھ ہے شہزاد کہ میری وجہ سے تمہیں پولیس کا تشدد برداشت کرنا پڑا۔"

"حیرت تو مجھے اس بات پر ہے خاتون کہ ایک چوری کے سلسلے میں اور ایک چور کی نشاندہی پر میری گرفتاری ہوئی لیکن مجھ سے پوچھ گچھ آپ کے متعلق کی گئی۔ پھر خود ہی مجھے رہا کر دیا گیا۔ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا اور پھر کس لئے فوراً ہی رہائی مل گئی' میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"کیا تم سے یہ سوال بھی کیا گیا تھا کہ میں نے کوٹھی تمہارے نام کیوں کر دی؟"

"یہ بھی پوچھا گیا تھا۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا اور میری بات پر یقین نہیں کیا گیا تھا۔ وہ شخص جو مجھ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا' اس جواب کے بعد اس نے مجھ پر تشدد شروع کر دیا تھا۔ جس کے سبب میں ہوش گنوا بیٹھا تھا۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو وہ جا چکا تھا۔"

"یعنی تم نے تشدد کے باوجود میرے آئندہ اقدامات کے بارے میں پولیس کو کچھ نہیں بتایا کہ میں کوٹھی بیچ کر تمہارے ذریعے کہیں اور مکان خریدنا چاہتی ہوں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں خاتون! آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے رازداری سے کام لیا اور زبان نہیں کھولی۔"

شہزاد اور میرے ملازمین کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا مطلب یہی تھا کہ خفیہ پولیس والے پُریقین تھے کہ میں اپنے ملازمین سے رابطہ ضرور قائم کروں گی۔ اسی کے ساتھ میرے لئے یہ سمجھنا بھی دشوار نہیں تھا کہ میں اس وقت جس مکان میں موجود تھی وہ بھی خفیہ والوں کی نگرانی میں تھا۔ یوں گویا میں ایک برقع پوش عورت کی حیثیت سے ان کی نظر میں آ چکی تھی۔ ایسی صورت میں وہ مجھ پر شبہ کرنے میں حق بجانب ہوتے۔ مجھے اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل بہرحال تلاش کرنا تھا کہ خفیہ پولیس والے میرا پیچھا نہ کر سکیں۔ انہیں اپنے پیچھے لگا کر راجہ استاد کے ٹھکانے تک لے جانا میرے لئے کسی بھی طرح مناسب نہیں ہوتا۔ اگر مجھے ذرا سا بھی یہ شبہ ہوتا کہ خفیہ پولیس والے میرے ملازمین کی نگرانی کر رہے ہیں تو ابھی ادھر کا رخ نہ کرتی۔

مجھے اپنے ملازمین میں صرف شہزاد اور شیتل سے دلچسپی تھی کیوں کہ وہ دونوں ہی مجھ سے محبت کرتے تھے۔ میں انہیں چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لئے میں نے جو کچھ سوچا تھا اسی پر عمل درآمد کی خاطر شہزاد کو ہدایات دینے آئی تھی۔ خفیہ پولیس والوں کی نظر میں آئے بغیر یہاں سے ملنا بعد کی بات تھی' اس کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آتا۔ میں نے اسی لئے شہزاد کو مخاطب کیا۔ "میری باتیں توجہ سے سنو۔ آئندہ تمہیں انہی پر عمل کرنا ہے۔ تمہیں خیر یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ میرے متعلق کسی کو یہ نہیں بتانا کہ میں تم سے ملی تھی۔" میں نے تائید طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ظاہر ہے خاتون!" شہزاد فوراً ہی بولا۔

"اگر تم سے یہ پوچھا گیا کہ وہ برقع پوش عورت کون تھی جو تم سے ملنے آئی تھی تو کیا جواب دو گے؟"

"تو کیا یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے؟" شہزاد نے حیرت سے کہا۔

"کیوں نہیں پوچھا جا سکتا؟ تمہیں اس کا یہ جواب دینا ہے کہ وہ شیتل تھی۔"

"شیتل .... مگر وہ تو برقع نہیں اوڑھتی۔"

"برقع اوڑھنے پر کوئی پابندی تو نہیں۔ برقع اوڑھنے کا یہ جواز پیش کیا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان ہو گئی ہے۔ تم اس سلسلے میں شیتل کو اعتماد میں لے سکتے ہو تاکہ اس سے پوچھ گچھ کی جائے تو تمہارے بیان کی تصدیق ہو جائے۔ تم اس کا کوئی بھی اسلامی نام رکھ سکتے ہو۔ مثلاً فاطمہ' زبیدہ یا کوئی بھی۔"

"بہتر ہے۔" شہزاد نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اب یہ سنو کہ تمہیں آئندہ کیا کرنا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اب اس علاقے میں مکان نہیں خریدنا کیوں کہ یہ علاقہ خفیہ پولیس والوں کی نظر میں آ چکا ہے۔ مکان کس علاقے میں خریدا جائے اس کا فیصلہ بعد میں خود کروں گی۔ فی الحال تمہیں جلد از جلد بروکر اور اس پارٹی سے مل کر کوٹھی کا سودا کرنا ہے۔ یہ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ اس سلسلے میں پانچ دس ہزار روپے کی فکر نہیں کرنا ہے۔ اس کے بعد ولیم' زریندرا اور رحیم کو ایک ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ دے کر جواب دے دینا ہے۔ کوٹھی فروخت کرکے تم پارک سرکس کی سکونت ترک کر دو گے۔ شیتل کو ساتھ لے کر تم یہاں سے موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے میں منتقل ہو جاؤ گے۔"

"لیکن خاتون! اس مکان کا پیشگی کرایہ ادا کیا جا چکا ہے۔ تین ماہ کا کرایہ ایڈوانس کے علاوہ مزید ایک ماہ کا کرایہ پیشگی دیا گیا ہے۔ اس کا کیا ہو گا؟" شہزاد نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ مکان چھوڑنے یا خالی کرنے کی صورت میں تین ماہ کا ایڈوانس تو تمہیں واپس مل جائے گا' رہا ایک مہینے کا کرایہ تو ابھی مکان خالی کرنے کی ضرورت نہیں۔ فرنیچر اور دوسرا تمام سامان یہیں پڑا رہنے دو اور مکان میں تالا ڈال دو۔ جب ہم کوئی مکان خرید لیں گے تو یہاں سے سامان وہاں منتقل ہو جائے گا۔ جو مکان کرائے پر لیا جائے' اس میں رہنا تو ضروری نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔"

"جی۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"میرے اندازے کے مطابق کوٹھی فروخت کرنے کے بعد شیتل کے ساتھ موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے میں منتقلی کے لئے تمہیں دو دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ جب تم اور شیتل مسافر خانے میں پہنچ جاؤ گے تو میں تم سے وہیں کسی بھی دن مل لوں گی۔"

"خاتون! آئندہ آپ کا کیا ارادہ ہے؟" شہزاد نے سوال کیا۔

"کس سلسلے میں؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ .... کہ آپ .... کیا آپ کو میری ضرورت رہے گی؟" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں .... یہ نہیں چاہتا خاتون کہ .... کہ خواہ مخواہ آپ پر بوجھ بنا رہوں۔"

"تم یہ کیا فضول باتیں کرنے لگے' کیا اپنے بوجھ ہوتے ہیں؟ تمہیں میں نے اپنا دوست سمجھا ہے ملازم نہیں اور یہ بات تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ تم نے اس طرح کی بات کرکے میرے دل کو ٹھیس پہنچائی ہے' آئندہ کبھی ایسی بات نہ کرنا۔"

اس پر شہزاد معذرت کرنے لگا۔

"اچھا یہ بتاؤ اس مکان کا کوئی عقبی دروازہ بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں' ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" میں بولی اور پرس کھول کر چھوٹا سا آئینہ اور ماسک نکال لیا۔ شہزاد میرے چہرے کو تبدیل ہوتے حیرت سے دیکھتا رہا۔ آئینے پر آخری تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"یہ برقع لے جاؤ اور شیتل سے کہو کہ وہ ٹرام ڈپو تک جا کر واپس گھر آ جائے۔ اسے برقع اوڑھ کر گھر سے نکلنا ہے اور راستے میں کہیں نقاب نہیں ہٹانا۔ اسے مکان کے بیرونی دروازے سے باہر نکالنے کے بعد تم مجھے عقبی دروازے سے نکال دو گے۔"

"خاتون! میں سمجھ نہیں سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟" شہزاد کے چہرے پر الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

"ضروری نہیں' ہر بات آدمی کی سمجھ میں آ جائے' پھر بھی کوشش کیا کرو۔" میں مسکرا کر بولی۔ "اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ خفیہ پولیس والے تم پر اور دوسرے ملازمین پر نظر رکھنے کے لئے اس مکان کی نگرانی بھی کرتے ہوں گے۔ میں انہیں اپنے پیچھے لگانا نہیں چاہتی۔ اس کا حل یہ ہے کہ وہ میرے دھوکے میں شیتل کا تعاقب کرتے ہوئے گھوم پھر کر یہیں واپس آ جائیں اور میں اس سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل جاؤں۔ اب سمجھ گئے؟"

"جی .... جی سمجھ گیا۔" شہزاد نے جلدی سے کہا۔ "میں نے اس پر پہلے غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ مکان کی نگرانی بھی کرتے ہوں گے۔" پھر وہ کہنے لگا۔ "تو اب جا رہی ہیں؟"

"ہاں' مجھے تم سے جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکی ہوں۔"

"کیا آپ بھی موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے میں ٹھہری ہوئی ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم میری فکر نہ کرو' میں جہاں بھی ہوں محفوظ ہوں۔" "اب تم جاؤ' یہ برقع اٹھا لو۔"

پھر شہزاد برقع لے کر کمرے سے نکل گیا۔ ذرا دیر کے بعد وہ کمرے میں واپس آیا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمام ملازمین کو سمجھا دینا' پوچھ گچھ کی صورت میں وہ یہی بتائیں کہ یہاں کوئی اجنبی عورت نہیں آئی تھی اور یہ بھی کہ شیتل ہی برقع اوڑھ کر دو ایک مرتبہ گھر سے نکلی تھی۔" میں نے شہزاد کے ساتھ چلتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

شہزاد مجھے اس کمرے سے لے کر نکلا اور پھر صحن عبور کرکے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ صحن میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں تیزی سے بڑھ کر عقبی دروازے تک پہنچی اور کنڈی کھول کر باہر آ گئی۔ میں اب ایک پتلی سی گلی میں تھی۔ میرے باہر نکلتے ہی شہزاد نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ میں دائیں جانب چل دی اور گلی سے نکل آئی۔ میں اب اس سڑک پر

نکل آئی تھی جو نیم دائرے کی صورت میں گھومتی ہوئی پارک سرکس ٹرام ڈپو کی طرف جاتی تھی۔ تیز قدمی سے ٹرام ڈپو کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے وہ باریش فقیر نظر آ گیا جو میرے پیچھے پیچھے لپکا آ رہا تھا۔ میں کھٹک گئی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ خفیہ پولیس والوں نے اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا کہ وہ جس مکان کی نگرانی کر رہے ہیں' اس کے مکین عقبی دروازے سے بھی آ جا سکتے ہیں۔ عقبی گلی سے نکلتے ہوئے میں نے اس باریش فقیر کو دیکھا تھا۔ مجھے اسی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ تیزی سے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ گلی سے باہر آنے کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا تو میں مطمئن ہو گئی تھی۔ اب وہ دوبارہ نظر آیا تو مجھے اس پر شبہ ہو گیا۔ عقبی گلی کے قریب ہی ایک درخت سڑک کے کنارے موجود تھا۔ یقیناً وہ میری نظروں سے چھپنے کی خاطر اسی کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ جب میں کچھ آگے نکل گئی تو وہ پیڑ کی آڑ سے باہر آ کے میرے پیچھے چل دیا۔ اس کے سوا اور کوئی ممکن نہیں تھا۔ میں اسی لئے چوکنا ہو گئی۔

اگر میرا یہ اندازہ درست تھا کہ وہ باریش فقیر خفیہ والا تھا تو اس مکان کی نگرانی کرنے والوں کی تعداد چار سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ دو بیرونی دروازے پر نظر رکھ سکتے تھے اور بقیہ دو عقبی گلی کی دونوں سمتوں پر متعین ہو سکتے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے میں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ سڑک پر لوگوں کی خاصی آمدورفت تھی۔ اچانک آگے بڑھتے بڑھتے میں ایک دم پلٹی۔ باریش فقیر مجھ سے چند قدم ہی کے پیچھے تھا۔ مجھے خلاف توقع پلٹتے دیکھ کر وہ کچھ سٹپٹا گیا۔ میں سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ فقیر کچھ سمجھ پاتا' میں اس سے ٹکرا گئی۔ اسی کے ساتھ میں چیخ اٹھی اور اس کی نقلی داڑھی نوچ لی۔

راہگیروں کے لئے اتنا ہی جان لینا کافی تھا کہ وہ شخص کوئی بہروپیا تھا اور اس کی نقلی داڑھی میرے ہاتھ میں تھی۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ کوئی خفیہ پولیس والا ہی تھا۔

"مار شالا کو۔" کوئی زور سے چیخا اور اسی کے ساتھ اس شخص کی کم بختی آ گئی۔

لوگوں کو ان کا "فرض" انجام دیتے دیکھ کر میں خاموشی کے ساتھ بھیڑ سے نکل آئی۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ میں نے عام آدمیوں کے ہاتھوں ایک پولیس والے کو پٹوا دیا تھا۔ چند قدم چل کر ہی مجھے ایک ہاتھ رکشا نظر آ گیا جو خالی تھا۔ میں اس میں بیٹھ گئی۔

"اپر سرکلر روڈ۔" میں نے رکشے والے سے کہا اور وہ سر ہلا کر چل دیا۔ براہ راست دھرم تلے جانے سے میں نے دانستہ گریز کیا تھا۔ دھرم تلے کا رخ کرنے سے پہلے میں یقین کر لینا چاہتی تھی کہ کوئی "پالتو کتا" تو میرے پیچھے دم ہلاتا ہوا تو نہیں آ رہا۔

میرا یہ اندیشہ درست ثابت نہیں ہوا کہ کوئی خفیہ پولیس والا میرے تعاقب میں آ سکتا ہے۔ اپر سرکلر روڈ سے میں نے چاندنی چوک کے لئے ایک ٹیکسی کر لی۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے باوجود میں پوری طرح چوکنا تھی' مگر کوئی خلاف توقع صورت حال پیش نہیں آئی۔

انسپکٹر پرکاش کے قتل کو خاصے دن گزر چکے تھے۔ اس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے مجبوراً سامنے آنا پڑا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ میں ابھی کلکتے ہی میں موجود ہوں' مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ خفیہ پولیس والوں کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میں نے راجہ استاد جیسے کسی گرگا

بند غنڈے کے یہاں پناہ لی ہو گی۔

اگلے روز تک راجہ استاد اور ہمایوں بھی اس قابل ہو گئے کہ گھر سے نکل سکیں۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں ساتھ نکلے تھے اور پھر شام چھ بجے کے قریب لوٹے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں انتہائی خوش ہیں۔ ہمایوں کے شانے سے ایک ایئر بیگ لٹکا ہوا تھا۔ اس ایئر بیگ پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھی۔ بالکل ویسا ہی ایک قیمتی ایئر بیگ میرے پاس بھی تھا جو میں اپنی کوٹھی سے ساتھ لے کر چلی تھی۔ یہ مماثلت محض ایک اتفاق بھی ہو سکتی تھی لیکن میرا دل اسے محض اتفاق تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ہمایوں کے ہاتھ میں ولایتی شراب کی ایک بوتل بھی نظر آ رہی تھی۔ راجہ استاد' ہمایوں کو ساتھ لئے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ میں کمرے کے باہر باورچی خانے کے سامنے شانتی کے ساتھ پیڑھی پر بیٹھی تھی۔

"رانی!" راجہ استاد نے مجھے آواز دی۔ اس کی آواز سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

"آئی استاد!" میں نے جواب میں ہانک لگائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ چند ہی لمحے بعد میں راجہ استاد کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

"تیرے قدموں کی برکت سے آج اتنا بڑا ہاتھ مارا ہے میں نے رانی کہ ساری اگلی پچھلی کسر پوری ہو گئی۔" راجہ استاد چہکا۔ پھر اس نے ہمایوں کو مخاطب کیا۔ "ہاں بھئی لونڈے! ذرا دیدار تو کرا واقعی سوا لاکھ ہیں۔ دیکھ بھئی' میں پہلے ہی کہے دے رہا ہوں کہ اس میں سے آدھا حصہ اپنی رانی کا ہو گا۔"

میری نگاہ اس ایئر بیگ پر جمی ہوئی تھی جو ان دونوں کے درمیان رکھا تھا۔ ہمایوں نے ایئر بیگ کی زپ کھول کر بڑے نوٹوں کی گڈیاں نکالنا شروع کر دیں۔ اب مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ وہی ایئر بیگ ہے جیسا میرے پاس موجود تھا۔ دھرم تلے کے ایک بڑے جنرل اسٹور سے کافی عرصے پہلے میں نے بالکل ایک سے دو قیمتی ایئر بیگ خریدے تھے۔ یہ انہی میں سے ایک معلوم ہوتا تھا۔ اتنی بڑی رقم اور وہ ایئر بیگ۔ میرا ذہن کڑیاں جوڑنے میں مصروف تھا۔ کوٹھی کے دیگر سامان کے ساتھ وہ ایئر بیگ بھی شہزاد کے تصرف میں ہونا چاہئے تھا۔ پھر یہ ہمایوں کے پاس کہاں سے آ گیا؟ میرا ذہن اسی سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا۔ ہمایوں ایئر بیگ خالی کر چکا تھا۔ راجہ استاد نوٹوں کی گڈیاں گننے لگا۔ دس دس ہزار کی وہ چھ گڈیاں تھیں۔ جو استاد نے میری طرف سرکا دیں اور چھ گڈیاں اپنے سامنے رکھ لیں۔ ایک گڈی چھوٹی تھی جو غالباً پانچ ہزار کی تھی۔ استاد نے وہ الگ رکھ دی۔

"یہ پانچ ہزار روپے پرفلو اور اس کے ساتھیوں میں بانٹ دینا۔" راجہ استاد نے ہمایوں سے کہا۔ "بہرحال خبر تو انہوں نے ہی دی تھی کہ سرکار اسٹیٹ ایجنسی سے پارٹی رقم لے کر نکل رہی ہے' کیا خیال ہے ہمایوں' کافی ہے نا اتنی رقم؟"

"کافی کیا استاد! خاصی رقم ہے۔ ان چاروں کو ایک ایک ہزار سے زیادہ پڑ جائیں گے اور کیا چاہئے؟" ہمایوں بولا۔

"جو نوجوان' سرکار اسٹیٹ ایجنسی سے اس ایئر بیگ میں یہ رقم لے کر نکلا تھا' اس کا حلیہ بتاؤں

استاد!" میں بول اٹھی۔ پھر میں نے اندھیرے میں تیر چلا ہی دیا اور شہزاد کا حلیہ بیان کر دیا۔ میرے اندازے کے مطابق راجہ استاد کے ہاتھوں لٹنے والا شہزاد ہی ہو سکتا تھا۔

حلیہ سن کر راجہ استاد چونک اٹھا اور کہنے لگا۔ "تو .... تو کیا تم .... تم بھی رانی وہیں کہیں قریب ہی موجود تھیں؟ مگر تم .... تمہیں تو میں یہاں گھر میں چھوڑ گیا تھا۔"

راجہ استاد کی بات سے تصدیق ہو گئی کہ میرا اندازہ سو فیصد صحیح تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے شہزاد کی طرف سے فکر ہو گئی کہ کہیں رقم چھینتے ہوئے راجہ استاد یا استاد کے کسی آدمی نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا اسے۔

"میں تو خیر گھر ہی میں تھی استاد! مگر یہ بتاؤ کہ اس نوجوان کو تم نے یا تمہارے بندوں نے مارا پیٹا تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس بے ہوش کر کے چھوڑ دیا تھا۔ ممکن ہے سر پر تھوڑی بہت چوٹ آئی ہو لیکن رانی! تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہو؟ تم اسے کیسے جانتی ہو؟" راجہ استاد حیران ہو کر بولا۔

"میں اسے اس لئے جانتی ہوں استاد کہ وہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

"اپنا آدمی .... یعنی تمہارا آدمی اور اتنا بودا!" راجہ استاد کے لہجے میں بے یقینی سی تھیں

"استاد! میں عموماً ایسے ہی لوگوں سے کام لیتی ہوں جو جرائم پیشہ نہ ہوں اور ان پر شک نہ کیا جا سکے۔" پھر میں نے بات بنائی۔ "میں نے گزشتہ ہفتے یہیں دھرم تلے کے علاقے میں موجود ایک خالی کوٹھی کے جعلی کاغذات اس نوجوان شہزاد کے حوالے کئے تھے۔ ان کاغذات کے مطابق کوٹھی کی مالکہ نے وہ کوٹھی اس نوجوان کے نام کر دی تھی۔ میرے ہی ایما پر اس نوجوان نے سرکار اسٹیٹ ایجنسی کے ذریعے ایک پارٹی سے سوا لاکھ روپے میں کوٹھی کا سودا کیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آخر میں میری ساری محنت پر تم ہاتھ صاف کر جاؤ گے۔" یہ کہتے ہوئے میں ہنس پڑی۔ "ویسے مجھے اس واقعے سے ایک سبق ضرور مل گیا استاد کہ شکار کھیلتے ہوئے شکاری کو چارے سے زیادہ دور نہیں رہنا چاہئے۔ ورنہ شکار پر کوئی دوسرا ہاتھ بھی صاف کر سکتا ہے۔"

"اچھا تو تم یوں چپکے چپکے لاکھوں کے ہاتھ مار رہی ہو رانی! اور ہمیں ہوا بھی لگنے نہیں دے رہی۔ یہ تو واقعی کمال ہو گیا۔ تمہارے ہی بندے پر ہاتھ دکھا دیا میں نے۔" راجہ استاد بھی ہنس دیا' پھر بولا۔ "ویسے تم ہو قسمت والی کہ تمہارا مال گھوم پھر کر تمہارے ہی پاس آ گیا۔" یہ کہہ کر راجہ استاد' ہمایوں سے مخاطب ہوا۔ "چل بھئی لونڈے! سارے نوٹ بھر دے بیگ میں اور حوالے کر دے رانی کے۔ بڑے ہاتھ بڑے ہی لوگ مارتے ہیں۔ ابھی اپنے دن پھرنے کی باری نہیں آئی۔"

"میرا مطلب یہ نہیں استاد! یہ رقم تم نے اپنی محنت سے حاصل کی ہے اور اس پر اب میرا نہیں تمہارا حق ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا تم راجہ استاد کو اتنا ہی ذلیل سمجھتی ہو رانی کہ وہ اپنی مہمان کی رقم ہضم کر جائے۔ لعنت ہے ایسی محنت اور ایسی کمائی پر۔"

پھر مجھے راجہ استاد کی بات ماننا ہی پڑی۔ اس نے قسم کھا لی تھی کہ وہ رقم اس پر حرام ہے۔ بڑی مشکل سے وہ اس پر آمادہ ہوا تھا کہ اپنے آدمیوں میں ان کی حوصلہ افزائی کے لئے دو ہزار روپے تقسیم کر دے۔ جب وہ اس پر راضی ہو گیا تو میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ "استاد! تم اس میں سے مجھے آدھی رقم دے رہے تھے نا؟"

"ہاں دے رہا تھا مگر اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ مال میرا نہیں تمہارا ہے۔"

"تو جب تم اپنے مال میں سے آدھا مجھے دے سکتے ہو تو کیا میں یہ حق نہیں رکھتی؟" میں بولی۔

"دیکھو رانی! میں اب تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔ دو ہزار روپے تمہاری ضد پر میں نے لونڈوں میں بانٹنے کے لئے قبول کئے ہیں' تم نے زیادہ تنگ کیا تو وہ بھی واپس کر دوں گا۔ یہ کہاں کی شرافت ہے کہ گھر بلائے مہمان کو لوٹ لیا جائے۔"

"لٹنے والا خود ہی لٹنا چاہے تو؟" میں مسکرائی۔

"تو لوٹنے والے کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہئے۔" راجہ استاد نے گردن کو جھٹکا دے کر کہا۔ پھر بولا۔ "اچھا یہ موضوع ختم .... ہاں ایک بات بتاؤ رانی کہ تمہیں یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ میں نے تمہارے ہی بندے پر ہاتھ صاف کیا ہے؟"

"یہ ایئر بیگ دیکھ کر ہی میں کھٹک گئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "اس نوجوان کو یہ ایئر بیگ میں نے ہی دیا تھا۔ ایسا ہی ایک دوسرا ایئر بیگ میں اپنے ساتھ لے کر یہاں آئی تھی۔ دونوں ایئر بیگ میں نے ایک ساتھ ہی خریدے تھے۔"

"مجھے اسی لئے یہ ایئر بیگ کچھ دیکھا بھالا سا لگ رہا تھا استاد!" ہمایوں بھی بولا۔ "اب اس کی وجہ سمجھ میں آئی۔"

"تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے ہمایوں! مگر پہلے یہ بتاؤ کہ اس نوجوان نے تمہیں تو نہیں دیکھا؟"

"ممکن ہے اس کی نظر بے ہوش ہونے سے پہلے مجھ پر بھی پڑ گئی ہو۔ کیوں کہ میں اور استاد ساتھ ہی تھے۔" ہمایوں نے بتایا۔

"تم بتاؤ تو سہی کہ کام کیا ہے؟" راجہ استاد بول اٹھا۔

"مجھے اس نوجوان تک ایک پیغام بھیجنا ہے۔"

"زبانی پیغام ہے یا تحریری؟" استاد نے پوچھا۔

"تحریری ہی مناسب رہے گا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"پتا بتا دو اور لکھ بھی دو پیغام پہنچ جائے گا۔" راجہ استاد نے اطمینان دلایا۔ "میں کسی بھی آدمی کو بھیج دوں گا۔"

"ٹھیک ہے' میں ابھی پیغام اور پتا لکھ کر لائی۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں نے ایک پرچے پر مختصر عبارت لکھی۔ "شہزاد! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ میں اس سلسلے میں تمہیں قصوروار نہیں سمجھتی۔

جو ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ اور وہی کرو' میں نے تمہیں جس کی ہدایت دی ہے۔ تم سمجھ ہی گئے ہوگے میں کون ہوں۔ یہ پرچہ پڑھ کر پھاڑ دینا۔" عبارت لکھ کر میں نے وہ پرچہ ایک لفافے میں بند کیا۔ لفافے پر میں نے پتا لکھنے کے بجائے لکیروں سے ایک نقشہ بنا دیا۔ جس کی مدد سے مطلوبہ مکان تک پہنچنا ممکن تھا۔ نقشے کے اوپر میں نے شہزاد کا نام لکھ دیا تھا۔

وہ لفافہ بند کر کے میں' استاد کے کمرے میں آ گئی اور اسے لفافہ تھما دیا۔

"استاد! پارک سرکس ٹرام ڈپو سے یہ مکان زیادہ دور نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اگر چاہو تو میں زبانی بھی اس آدمی کو یہ پتا سمجھا سکتی ہوں جسے پیغام لے کر بھیجنا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔ تم نے بالکل مکمل نقشہ بنایا ہے۔ اس کی مدد سے کوئی اجنبی شخص بھی مطلوبہ مکان تک پہنچ سکتا ہے۔" استاد بولا اور پھر خود لفافہ لے کر گھر سے چلا گیا۔ ہمایوں کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نوٹوں سے بھرا ہوا ایئر بیگ اٹھا کر واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

نوٹوں کی گڈیاں میں نے ایئر بیگ سے نکال کر اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیں۔ اسی سوٹ کیس میں مزید رقم اور وہ سونا بھی تھا جو میرے پاس بچ گیا تھا۔ یہ سونا میں وادی سبز سے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی جو یہاں میرے کام آیا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق شہزاد کو آئندہ روز تک موسیٰ سیٹھ کے مسافرخانے پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اہم اور وقت طلب کام اس کے لئے کوٹھی فروخت کرنا تھا۔ یہ کام وہ انجام دے چکا تھا۔ ولیم' نریندرا اور رحیم کو ایک مہینے کی پیشگی تنخواہیں دے کر ملازمت سے جواب دے دینا کون سا مشکل تھا کہ اس میں وقت لگتا۔ کوٹھی کا سودا کرنے کے بعد رقم کا چھین لیا جانا' شہزاد کے لئے ضرور ایک مسئلہ بن سکتا تھا۔ ردعمل میں وہ کوئی غلط قدم بھی اٹھا سکتا تھا جس کا میں نے تدارک کر دیا تھا۔ ممکن ہے شرمندگی سے بچنے کی خاطر وہ راہ فرار کو ترجیح دیتا لیکن اب میرا پیغام ملنے کے بعد کوئی ایسا فیصلہ کرنا بعید از امکان تھا۔

اسی روز رات کو ساڑھے آٹھ بجے تک مجھے راجہ استاد کے ذریعے یہ اطلاع مل گئی کہ میرا پیغام شہزاد کو پہنچا دیا گیا ہے۔ میں مطمئن ہو گئی۔ اسی رات میں نے کھانا کھانے کے بعد راجہ استاد سے دھرم تلے کے علاقے میں کوٹھی خریدنے کے متعلق بات کی۔ اس سے اپنا نیا ٹھکانہ چھپانے کی ضرورت میں نے محسوس نہیں کی۔

"کیوں' کیا کلکتہ بہت پسند آ گیا رانی!" راجہ استاد ہنس کر بولا۔ "کیا یہیں مستقل ڈیرا ڈالنے کا ارادہ ہے؟"

"تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے استاد تو نہیں ڈالتی ڈیرہ۔"

"ارے میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو گی رانی! دو ایک بروکر ہیں اپنے جاننے والے' کہو تو کل ہی بات کر لوں۔"

"دراصل کچھ عرصے کے لئے میں بمبئی سے دور رہنا چاہتی ہوں۔" میں نے بات بنائی۔

"تو یہاں رہو' کس نے روکا ہے۔ یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو استاد! مگر یہاں رہ کر میں اپنی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتی۔"

"اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا' تم بہتر سمجھ سکتی ہو۔" راجہ استاد بولا۔ "چاہو تو کل صبح میرے ساتھ تم بھی چلو۔"

"چلوں گی۔" میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔

دوسرے روز صبح میں نے اپنے چہرے پر ایسا میک اپ کیا جسے آئندہ طویل عرصے تک برقرار رکھا جا سکے۔ دراصل ذہنی طور پر کسی بوڑھے چہرے کو مستقل طور پر اپنے وجود کا حصہ بنائے رکھنے کے لئے میں آمادہ نہیں تھی۔ میں نے اپنے چہرے پر ایک ایسا ماسک منتخب کیا تھا جس سے میری عمر بیس بائیس سال سے زیادہ معلوم نہ ہو۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی خیال رکھا تھا کہ نہ تو میں غیر معمولی طور پر اپنے اصل چہرے کی طرح انتہائی حسین و پرکشش نظر آؤں' نہ اتنی بدصورت کہ کوئی میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہ کرے' موجودہ میک اپ میں مجھے نوجوان اور قبول صورت ہی کہا جا سکتا تھا۔ مجھے کیوں کہ دھرم تلے جیسے علاقے میں ایک کوٹھی خریدنا تھی تو اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے لباس بھی زیب تن کیا تھا۔ راجہ استاد نے مجھے نئے میک اپ میں دیکھا تو ہنس کر کہنے لگا۔ "تم روز ایک نیا چہرہ بدل لیتی ہو رانی! مجھے تو اب یہ دھڑکا لگ گیا ہے کہیں تمہارا اصل چہرہ ہی نہ بھول جاؤں۔ تم آخر کسی ایک چہرے پر ٹکو گی بھی یا نہیں؟ اچھے خاصے پھول سے چہرے کو ناحق چھپا رکھا ہے تم نے۔"

"کوٹھی خرید لینے دو ایک بار۔" میں بھی ہنس کر بولی۔ "پھر روز روز چہرہ بدلنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

پھر ناشتہ کرنے کے بعد راجہ استاد کے ساتھ میں گھر سے نکل آئی۔ دوپہر تک میں واپس آئی۔ راجہ استاد نے کئی بروکروں سے میری ملاقات کرائی تھی۔ ان میں سرکار اسٹیٹ ایجنسی والا بھی تھا۔ وہ بولا کہ اگر آپ کل صبح آ گئی ہوتیں تو ایک بہترین کوٹھی کا سودا کرا دیتا۔ میں نے کوٹھی کا محل وقوع پوچھا تو وہ خود میری ہی کوٹھی تھی۔ بہرحال میں نے کئی کوٹھیاں دیکھیں جن میں سے دو مجھے پسند آئیں۔ ایک کوٹھی کا قبضہ فوری طور پر ملنا ممکن نہیں تھا۔ کوٹھی کے مالکان دو ہفتے بعد قبضہ دیتے۔ اس کا سودا ایک لاکھ دس ہزار تک میں ہو سکتا تھا۔ یہ کوٹھی کم و بیش میری پہلی کوٹھی کی طرح تھی اور قیمت بھی زیادہ نہیں تھی لیکن میرے لئے دو ہفتے انتظار ممکن نہیں تھا۔ دوسری کوٹھی جو مجھے پسند آئی پہلی سے قدرے بڑی اور قیمت میں بھی زیادہ تھی۔ اس میں ڈرائنگ اور ڈائننگ کے علاوہ چھ کمرے تھے۔ یہ کوٹھی مین چورنگی روڈ پر ایک فائیو اسٹار ہوٹل پرنس گرانڈ سے ذرا آگے تھی۔ میں پہلے کبھی ہوٹل پرنس گرانڈ کے قریب نہیں گئی تھی۔ اس روز میں اس کے دروازے کے سامنے سے گزری تو ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کا سبب وہ بڑا سا بورڈ تھا جو دروازے پر لگا ہوا تھا۔ اس بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ "ڈوگس اینڈ انڈینز ناٹ الاوڈ" یعنی اس ہوٹل میں کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ کتوں کے ساتھ ہندوستانیوں کا ذکر انگریز ذہنیت کی عکاسی کرتا تھا۔ میں بُرا سا منہ بنا کر آگے بڑھ گئی۔ ہرچند کہ میرا تعلق ہندوستان سے نہیں

تھا۔ پھر بھی مجھے یہ الفاظ گراں گزرے تھے۔ میرے نزدیک انگریزوں نے اس طرح ہندوستانیوں کی توہین کی تھی۔ معلوم نہیں اس ملک کے باشندے کیسے تھے جو یہ کھلی توہین برداشت کر رہے تھے۔ غلامی شاید آدمی کی غیرت کو میٹھی نیند سلا دیتی ہے۔

دوسری کوٹھی کا قبضہ فوری طور پر مل سکتا تھا۔ اس کے محل وقوع اور مکانیت کو دیکھتے ہوئے ڈیڑھ لاکھ روپے زیادہ نہیں تھے۔ کوٹھی کی حدود ہی میں چھوٹا سا لان بھی تھا۔ مجھے یہ کوٹھی پسند آئی اور اسی شام اس کا سودا کر لیا۔ اگلے روز صبح قانونی کارروائی بھی پوری ہو گئی اور مجھے کوٹھی کا قبضہ مل گیا۔ میں نے رقم کی ادائیگی کر دی تھی۔ کوٹھی کے لئے نیا فرنیچر بھی اسی روز خرید لیا گیا۔ اس سلسلے میں راجہ استاد اور اس کے آدمیوں نے میری مدد کی۔ پوری کوٹھی کی صفائی کے بعد اس میں فرنیچر لگا دیا گیا۔

شانتی کو بھی میں اپنی نئی کوٹھی دکھانے ساتھ لے گئی۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگی۔ "دیدی! تم اکیلی اتنی بڑی کوٹھی میں رہو گی؟"

"اگر تمہیں میری تنہائی کا خیال ہے تو تم بھی میرے ہی پاس آ کر رہنے لگو۔" میں مسکرا کر بولی۔

راجہ استاد اور ہمایوں بھی ساتھ ہی تھے۔ شانتی نے کہا۔ "میں تمہارے پاس آ گئی دیدی تو بابا اور ہمایوں کا کون خیال رکھے گا؟"

"بس رہنے دے، جانتا ہوں میں تجھے اچھی طرح۔ زیادہ لاڈ نہ جتا۔" ہمایوں منہ بنا کر بولا۔

"تُو نے اگر اب مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو سمجھ لے دیدی کے پاس آ جاؤں گی ہاں۔" شانتی نے گویا دھمکی دی۔

"اور تیری دیدی تجھے سمجھا بجھا کر پھر پٹنے کے لئے میرے پاس چھوڑ جائے گی۔" یہ کہہ کر ہمایوں زور سے ہنس پڑا، پھر بولا۔ "ویسے یہ اچھا ہوا کلکتے میں تیرا میکا ہو گیا۔"

"اور اب یہ تجھے میکے جانے کی دھمکی بھی دے سکتی ہے اس لئے دب کے رہنا پڑے گا اور میکا بھی بہت تگڑا ہے اس کا۔" راجہ استاد بھی بول اٹھا۔

میرا سامان بھی راجہ استاد کے گھر سے نئی کوٹھی میں آ چکا تھا۔ پرانی کوٹھی کا فرنیچر اور دوسرا ساز و سامان یہاں ابھی منتقل کرنا میرے نزدیک خطرے سے خالی نہیں تھا کیوں کہ پارک سرکس کے جس مکان میں سامان تھا، وہ مکان خفیہ پولیس والوں کی نظر میں تھا۔ میں نے اسی لئے نیا فرنیچر خرید لیا تھا۔

اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بجنے والے تھے جب میں نے راجہ استاد، ہمایوں اور شانتی کو رخصت کیا۔ وہ تینوں چلے گئے تو میں اپنے اگلے اقدام کی تیاری کرنے لگی، میں نے ایک ایئر بیگ میں میک اپ بکس رکھا اور پھر کوٹھی کو مقفل کر کے وہاں سے چل دی۔

موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے تک پہنچنے کے لئے میں نے ایک ٹیکسی کر لی۔ وہاں پہنچ کر میں نے یہ ظاہر کیا کہ کلکتے ہی کے ایک قریبی شہر جیسور سے آئی ہوں۔ مسافر خانے میں مجھے ایک کمرہ حاصل کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ شہزاد اور شیتل وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ خفیہ پولیس والوں کی ان پر نظر ہو گی۔ ایسی صورت میں مجھے محتاط رہنا تھا۔ یہی وجہ تھی

کہ اس رات ان دونوں کو تلاش کر لینے کے باوجود میں ان سے نہیں ملی۔ وہ دونوں بہن بھائی کی حیثیت سے ایک کمرے میں ٹھہرے تھے۔ شہزاد نے شیتل کا نام فاطمہ ظاہر کیا تھا۔ میں نے اسی رات ان دونوں کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔

وہ رات میں نے خاموشی سے گزار دی۔ دوسرے دن صبح بھی میں، شہزاد اور شیتل سے نہیں ملی۔ پہلے میں ان خفیہ پولیس والوں کا سراغ لگانا چاہتی تھی جو میرے اندازے کے مطابق ان دونوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس کے لئے مجھے شہزاد پر نظر رکھنا تھی۔ میرے چہرے پر کیوں کہ میک اپ تھا اس لئے بہرحال یہ اندیشہ نہیں تھا کہ شہزاد مجھے پہچان لے گا۔ شہزاد پر نظر رکھنے کی خاطر ہی میں صبح جلدی اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ مجھے جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ مجھ سے بھی پہلے ایک شخص شہزاد کے کمرے کے اطراف منڈلا رہا تھا۔ اس شخص کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ اسے میں نے کہاں دیکھا تھا۔ شہزاد کا کمرہ جس قطار میں تھا اسی میں کونے والا کمرہ اس شخص کا تھا۔ کچھ دیر بعد شہزاد کے کمرے کا دروازہ کھلا پھر شہزاد کو میں نے باہر نکلتے دیکھا۔ شہزاد مسافر خانے سے باہر جانے لگا اور وہ مشتبہ شخص کچھ فاصلے سے شہزاد کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ اسی وقت کونے والے کمرے کا دروازہ کھول کر ایک اور آدمی باہر آیا۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ اب وہ دوسرا آدمی شہزاد کے کمرے کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس کا سبب شہزاد کے کمرے میں شیتل کی موجودگی ہی ہو سکتی تھی۔ گویا وہ دو افراد تھے جو شہزاد اور شیتل کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

جب شہزاد واپس آیا تو مجھے اس کے ہاتھ میں ناشتے کا سامان دکھائی دیا۔ اس کے تعاقب میں جانے والا بھی لوٹ آیا تھا۔ شہزاد اپنے کمرے میں چلا گیا تو دونوں مشتبہ افراد میں سے ایک تو وہیں منڈلاتا رہا، دوسرا مسافر خانے کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ شاید ناشتہ کرنے گیا تھا۔ پھر جب وہ کچھ دیر بعد لوٹ آیا تو پہلا شخص چلا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک لمحے کو بھی شہزاد کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہتے۔ میں نے سوچا۔ ان دونوں کی نظر میں آئے بغیر شہزاد اور شیتل سے کس طرح ملا جائے؟ میں اسی سوال پر غور کرتی رہی پھر وہاں سے ہٹ گئی۔ اب مجھے بھی بھوک لگ رہی تھی کیوں کہ میں نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔

وہ سارا دن سوچ بچار میں گزر گیا اور آخر میں نے اس مسئلے کا ایک حل نکال ہی لیا۔

نصف شب کے قریب جب مسافر خانے میں قدرے سناٹا چھا گیا تو میں اپنے کمرے سے نکلی۔ کمروں کے باہر برآمدوں میں بھی لوگ بستر بچھائے سو رہے تھے۔ میں آہستہ قدمی کے ساتھ شہزاد کے کمرے تک پہنچ گئی۔ اس کے کمرے میں تاریکی نظر آ رہی تھی۔ شہزاد اور شیتل شاید سو چکے تھے۔ میں نے برآمدے میں بستر بچھا کر سونے والوں پر نظر ڈالی تو چونک اٹھی۔ شہزاد کے دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر دونوں مشتبہ افراد میں سے ایک مجھے نظر آ گیا۔ بظاہر وہ سوتا ہوا ہی لگ رہا تھا لیکن یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل تھا۔ اس شخص کی وہاں موجودگی نے میرے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔ مجھے شدید جھنجلاہٹ محسوس ہوئی اور جی چاہا کہ نگرانی کرنے والے کی گردن دبا دوں۔ اس کی وہاں موجودگی میں

شہزاد کے کمرے کے دروازے پر دستک دینا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ میں ٹہلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ معاً میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ مجھے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آ گئی تھی۔ میں ایک لمبا چکر کاٹ کر ان کمروں کے عقب میں پہنچ گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔ کمروں کی عقبی کھڑکیاں گنتی ہوئی ایک کھڑکی کے سامنے رک گئی۔ اکثر کھڑکیاں بند ہی تھیں۔ میں جس کھڑکی کے سامنے رکی' وہ کھڑکی بھی بند تھی۔

چند لمحے وہاں رک کر میں نے سن گن لی اور پھر آگے بڑھ کر کھڑکی پر دھیرے سے دستک دی۔ کافی دیر کے بعد مجھے اپنی کوشش میں کامیابی ہوئی۔ مجھے اندر سے شیتل کی گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ”شہزاد بابو .... اے شہزاد بابو! اٹھو .... ادھر .... ادھر کوئی ہے' کھڑکی کی طرف۔“

”ارے وہم ہو گا تیرا' سو جا۔“ شہزاد کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ”اس وقت کون ہو سکتا ہے۔“

عین اسی وقت میں نے پھر دستک دی اور شیتل زور سے بولی۔ ”سنا شہزاد بابو!“

”ہاں میں دیکھتا ہوں۔ تو ڈر مت۔“ شہزاد کی آواز سنائی دی۔ پھر اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ ”معلوم نہیں ماچس کہاں گئی' موم بتی تو مل گئی۔“ کھڑکی کھولنے سے پہلے وہ کمرے میں روشنی کرنا چاہتا تھا اور شاید گھبراہٹ میں اسے ماچس نہیں مل رہی تھی۔

ہر چند کہ کمرے میں روشنی کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں تھا۔ مگر میں شہزاد کو ایسا کرنے سے کیسے روکتی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ان دونوں کی آوازیں کھڑکی بند ہونے کے باوجود مجھے سنائی دے رہی ہیں تو وہ بھی میری آواز سن سکتے ہیں۔ یہی سوچ کر میں نے کھڑکی کے قریب ہو کر شہزاد کو دھیمی آواز میں پکارا۔

”یہ .... یہ تو میم کی آواز ہے۔“ اندر سے شیتل کی لرزتی ہوئی آواز آئی۔

”ہاں میں ہی ہوں۔“ میں پھر بولی۔ ”موم بتی نہ جلاؤ اور کھڑکی کھول دو۔“

”ابھی کھولتا ہوں خاتون!“ شہزاد کی پُرجوش آواز ابھری۔

ذرا ہی دیر میں کھڑکی کھل گئی۔ کھڑکی اتنی چھوٹی تھی کہ بمشکل اس سے باہر نکلا جا سکتا تھا۔ میں نے کھڑکی کا جائزہ لے کر شہزاد کو دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔ ”تم ایسا کرو کہ پہلے کھڑکی کے راستے شیتل کو باہر نکالو۔“

”ہم دروازہ کھول کر کیوں نہ باہر آ جائیں' آپ ادھر آ جایئے۔“ شہزاد نے کہا۔

میں نے شہزاد کو نگرانی کرنے والوں کے بارے میں بتایا جن سے یقیناً وہ لاعلم تھا۔

”مگر یہ کھڑکی تو بہت چھوٹی ہے خاتون! ہمارے ساتھ جو سامان ہے' اس سے کس طرح باہر نکلے گا؟“ شہزاد بولا۔

”سامان کو جہنم میں جھونکو۔“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

”لیکن جو رقم میرے پاس بچی ہے' وہ بھی تو بکسے میں ہے۔“

”تو رقم نکال لو' میں نے رقم نکالنے کو کب منع کیا ہے۔“

اس کے بعد زیادہ دیر نہیں لگی۔ شہزاد نے شیتل کو سہارا دے کر کھڑکی پر چڑھا دیا اور میں نے اسے باہر کھینچ لیا۔ کھڑکی زمین سے کچھ بلند تھی۔ اس لئے شیتل کے جسم کا سارا بوجھ مجھے برداشت کرنا پڑا۔ اسے میں نے سیدھا کھڑا کر دیا۔ اب میں دوبارہ کھڑکی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ شہزاد کھڑکی پر چڑھ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دیا اور پھر شیتل کی طرح وہ بھی باہر آ گیا۔ میں ان دونوں کو ساتھ لئے اپنے کمرے میں آ گئی۔

میرے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی میں جیسے ہی مڑی شیتل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”یہ .... یہ میم .... میم تو نہیں۔“ وہ ہکلائی۔

”بے وقوف! میں تمہاری میم ہوں۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”چلو جلدی سے ادھر بیٹھ جاؤ۔ تمہارا چہرہ بھی اپنی ہی طرح بدلے دیتی ہوں۔“

پھر میں نے شیتل اور شہزاد کے چہروں پر میک اپ کرنے میں دیر نہیں کی۔ شیتل بار بار دستی آئینے میں اپنا بدلا ہوا چہرہ دیکھ کر حیران و پریشان ہو رہی تھی۔

”تم دونوں کے پاس کوئی سامان نہیں اس لئے چوکیدار تمہیں نہیں روکے گا۔ البتہ مجھے روانگی لکھوانا پڑے گی۔ تم یہیں رکو' میں روانگی لکھوا کر آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر میں دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ مسافروں کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ اسی لئے کسی بھی وقت مسافرخانے میں آمد یا روانگی کا اندراج کرایا جا سکتا تھا۔ مسافرخانے کا دفتر دن رات کھلا رہتا تھا۔ مجھے روانگی لکھانے اور واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میرے پاس ایک ایئر بیگ تھا جس میں میک اپ بکس پہلے ہی میں رکھ چکی تھی۔ بستر اور چارپائی میں نے واجبی معاوضے پر مسافرخانے سے لے لئے تھے۔ مسافرخانے کا ایک آدمی یہ سارا سامان وصول کرنے آیا تھا۔ میں نے اسی لئے شہزاد اور شیتل کو مسافرخانے سے نکل کر اپنا انتظار کرنے کو کہہ دیا۔ ان دونوں کے جاتے ہی میں نے ایئر بیگ اٹھا کر شانے پر ڈال لیا۔ مسافرخانے کا آدمی آ گیا تو اس نے بستر چیک کیا کہ کوئی چیز کم تو نہیں۔ پھر کمرے کا تالا اور چابی لے کر گتے کا ایک ٹکڑا مجھے تھما دیا۔ یہ گویا میرا ”کلیرنس پاس“ تھا۔ جو مجھے مسافرخانے کے پھاٹک پر کھڑے ہوئے چوکیدار کے حوالے کرنے کے بعد باہر نکلنا تھا۔ گتے کا وہ ٹکڑا ہاتھ میں لئے میں کمرے سے نکل آئی۔ پھاٹک پر پہنچ کر چوکیدار کو میں نے ”پاس“ دیا اور مسافرخانے سے باہر آ گئی۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا جب میں شہزاد اور شیتل کے ہمراہ ایک ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی دھرم تلے جا رہی تھی۔ میں بہرحال اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ اتنی سخت نگرانی کے باوجود مسافرخانے سے ان دونوں کو نکال لانا خفیہ پولیس والوں کے لئے شکست ہی کے مترادف تھا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ آئندہ روز جب خفیہ والوں کو یہ معلوم ہو گا کہ ”دونوں پنچھی“ اڑ گئے ہیں تو ان کی بوکھلاہٹ قابل دید ہو گی۔

احتیاطاً میں نے ٹیکسی اپنی کوٹھی سے کچھ پہلے ہی چھوڑ دی۔ کرایہ ادا کر کے میں' شہزاد اور شیتل

کے ساتھ پیدل ہی کوٹھی کی طرف بڑھ گئی۔

راستے میں ان دونوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا' مگر شیتل نے پوچھ ہی لیا۔ "ہم کہاں چل رہے ہیں میم؟"

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

پھر جب میں کچھ ہی دیر بعد کوٹھی کا پھاٹک کھول کر اندر داخل ہوئی تو شہزاد بھی اظہار حیرت کئے بغیر نہ رہ سکا۔ "خاتون! یہ .... یہ کوٹھی کس کی ہے؟"

"ہوتی کس کی' تمہاری ہے۔" میں نے بتایا۔

میرے جواب پر وہ چونک اٹھا اور بولا۔ "یہ تو پہلی کوٹھی سے بھی بڑی معلوم ہوتی ہے۔"

"معلوم نہیں ہوتی' واقعی بڑی ہے۔" لان کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے کہا۔ "پچھلی کوٹھی میں تو لان بھی نہیں تھا اور نہ سرونٹ کوارٹرز تھے۔" میں نے لان کے عقب میں بنے ہوئے کوارٹرز کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے علاوہ یہاں ٹیلی فون بھی ہے۔" میں اب برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر عمارت کے صدر دروازے تک پہنچ چکی تھی۔

صدر دروازے کا قفل کھول کر میں نے اندر قدم رکھا اور راہداری میں لگے ہوئے بلب کو روشن کر دیا۔

شہزاد اور شیتل دونوں ہی کو وہ کوٹھی بہت پسند آئی۔ وہ گھوم پھر کر میرے ساتھ اس کمرے میں آ گئے تھے جو میں نے بطور خواب گاہ منتخب کیا تھا۔

"خاتون! آپ نے تو نیا فرنیچر بھی خرید لیا۔" شہزاد بولا۔ "پچھلی کوٹھی کے فرنیچر کا کیا ہو گا جو پارک سرکس میں پڑا ہے؟"

"ہونا کیا ہے' اسے بیچ دینا' یا مناسب سمجھو تو یہاں لے آنا۔ خاصی بڑی کوٹھی ہے' جگہ کم نہیں پڑے گی۔ مگر فی الحال تمہیں ادھر کا رخ نہیں کرنا۔" میں نے کہا۔

"میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں خاتون کہ میری نااہلی کی وجہ سے آپ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ گیا۔" شہزاد نے اظہار پشیمانی کیا۔ "اگر مجھے آپ کا پیغام نہ مل گیا ہوتا تو .... تو شاید وہ .... وہ میری زندگی کی آخری رات ہوتی' میں .... میں خودکشی کر لیتا۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"پاگل ہو تم! انسانی زندگی سے زیادہ قیمتی کوئی اور شے نہیں۔"

"لیکن خاتون! آپ کو اس حادثے کا علم کیسے ہو گیا؟" شہزاد نے پوچھا۔

"جس وقت تم سے ایئر بیگ چھینا گیا' میں زیادہ دور نہیں تھی۔" میں نے بات بنائی۔ "مجھے کسی ایسے ہی واقعے کا اندیشہ تھا اس لئے جب تم سرکار اسٹیٹ ایجنسی سے رقم لے کر نکلے تو میں تمہارے پیچھے پیچھے تھی۔ ایک دراز قد شخص ہی نے تمہارے سر پر ضرب لگائی تھی نا؟"

"جی .... جی ہاں۔" شہزاد نے تصدیق کی۔ "وہ دو تھے اور میں ان کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ میرے سر پر ضرب لگانے والا دراز قد ہی تھا۔"

"ادھر دیکھو' وہی ایئر بیگ تھا تمہارے پاس جس میں تم رقم لے کر اسٹیٹ ایجنسی سے نکلے تھے؟" میں نے کچھ فاصلے پر موجود الماری کے قریب رکھے ہوئے ایئر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ شہزاد کی نگاہ میری انگلی کے ساتھ ادھر اٹھی۔

"ارے یہ تو وہی .... وہی ایئر بیگ ہے! مگر یہ .... یہ آپ کے پاس کیسے آ گیا؟" شہزاد نے حیران ہو کر کہا۔

"تم سے یہ بیگ ان دونوں نے چھینا اور پھر ان سے میں نے چھین لیا۔"

"یااللہ تیرا شکر ہے۔" شہزاد نے طویل سانس لیا۔ "ورنہ تو زندگی بھر میرا ضمیر مجھ پر ملامت کرتا رہتا۔"

"خود ہی سوچو کہ اگر وہ رقم مجھے نہ مل گئی ہوتی تو میں یہ کوٹھی کیسے خریدتی؟" میں بولی۔ "خیر یہ بتاؤ کہ جب میں پارک سرکس سے چلی آئی تو کیا ہوا؟ خفیہ پولیس والوں نے تم سے کچھ پوچھ گچھ تو نہیں کی؟"

"جی نہیں۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "شیتل ٹرام ڈپو تک جا کر لوٹ آئی تھی۔"

"تمہارا پیچھا کیا تھا کسی نے؟" میں نے شیتل سے دریافت کیا۔ اس سے میں بنگلہ زبان میں بات کر رہی تھی۔

"معلوم نہیں میم! میں نے غور نہیں کیا۔ میں تو شہزاد بابو کے کہنے پر سیدھی ٹرام ڈپو تک گئی اور پھر گھر واپس آ گئی۔ نہ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا نہ نقاب اٹھائی۔" شیتل نے بتایا۔

"تمہیں معلوم ہے شیتل کہ ہمارے پیچھے ایک منحوس سادھو لگ گیا تھا۔ اسی کمینے سے جان چھڑانے کے لئے میں نے وہ کوٹھی بیچ دی۔ اس سادھو کے علاوہ معلوم نہیں کیوں کچھ اور لوگ بھی میرے دشمن ہو گئے ہیں جنہیں میں نہیں جانتی۔ انہی کی وجہ سے یہاں کی پولیس بھی میرے خلاف ہو گئی ہے۔ شہزاد کو اسی وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا' مگر شاید انہیں کوئی ثبوت نہیں مل سکا' سو انہوں نے شہزاد کو رہا کر دیا۔ اس سادھو' پولیس اور اپنے انجانے دشمنوں سے بچنے کے لئے میرے پاس یہی ایک راستہ تھا کہ ایک نئی شخصیت اپنا لیتی اور میں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اور شہزاد مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میں نے اسی لئے نئی شخصیت اپنانے کے باوجود تمہیں نہیں چھوڑا۔ پھر بھی میں اس سلسلے میں تم دونوں پر کوئی جبر کرنا نہیں چاہتی۔ سو میں پہلے تمہی سے پوچھتی ہوں شیتل! کیا تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟ اس کے لئے تمہیں بھی اپنے ماضی کو بھولنا پڑے گا۔ تم شیتل نہیں فاطمہ کہلاؤ گی۔" میں نے یہ کہہ کر سوالیہ نظروں سے شیتل کو دیکھا۔

"تمہاری خاطر مجھے سب کچھ قبول ہے میم!" شیتل نے بلاجھجک جواب دیا۔ "تم کہو تو میں سچ مچ مسلمان ہو جاؤں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے' صرف نام اور چہرہ بدلنا کافی ہے۔ تمہارے چہرے پر میں نے جو جھلی چڑھائی ہے' اسے اتارنا اور پھر چڑھانا تمہیں سکھا دوں گی۔ مجھے معلوم ہے' شروع شروع میں تمہیں اس

سے الجھن ہو گی' پھر عادت ہو جائے گی۔ تمہیں بہرحال یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ تنہائی ہی میں جھلی اتارو' کوئی بھی تمہیں جھلی اتارتے یا پہنتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ ادھر آؤ' میں تمہیں بتاتی ہوں۔"

میرے کہنے پر شیتل اٹھ کر اپنی کرسی سے میرے قریب آ گئی۔ میں نے اس کے چہرے سے ماسک اتار لیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ خود ماسک اتارنے اور پہننے کے قابل ہو گئی۔ پھر میں نے شہزاد کو بھی اسی کی تربیت دی۔ وہ کیوں کہ شیتل کو ایسا کرتے ہوئے توجہ سے دیکھتا رہا تھا اس لئے اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔

"اب ہم اپنے اپنے نقلی چہرے اتارے لیتے ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا اور اپنے چہرے سے ماسک اتار لیا۔ شہزاد اور شیتل نے بھی میری تقلید کی۔

"خاتون! میں نے سنا ہی سنا تھا کہ چہرے بدلے بھی جاسکتے ہیں' آج عملاً اس کا تجربہ ہو گیا۔" شہزاد بولا۔ "میرے لئے یہ تجربہ بہت سنسنی خیز ہے۔"

"خیر اب یہ سنو کہ چہرہ بدلنے کے ساتھ ساتھ تمہارا نام بھی بدلنا ضروری ہے۔ شاہد کیسا نام رہے گا؟" میں نے شہزاد سے پوچھا۔

"بہت اچھا رہے گا۔" شہزاد خوش ہو کر بولا۔ پھر خوشی کی وجہ بھی بتا دی۔ "میری والدہ بھی میرا یہی نام رکھنا چاہتی تھیں بلکہ وہ تو گھر میں مجھے شاہد ہی کہتی ہیں۔"

"چلو یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ تم شاہد اور شیتل کا نام فاطمہ۔ میرا نیا نام بھی سن لو' رانی!" میں نے بتایا۔ "کیسا لگا؟"

"آپ رانی لگتی بھی تو ہیں میم!" شیتل بول اٹھی۔

"اب یہ میم نہیں چلے گا' بھول جاؤ اسے۔" میں نے شیتل کو ٹوکا۔

"پھر میں آپ کو کیا کہوں میم!"

"پھر وہی میم' کچھ بھی کہہ لو' میم نہیں کہو گی۔" میں نے شیتل کو تاکید کی۔

شیتل سوچ میں پڑ گئی' پھر کہنے لگی۔ "تو پھر میں آپ کو مالکن کہوں گی' ٹھیک ہے نا؟"

"عموماً مسلمانوں میں یہ لفظ رائج نہیں۔" شہزاد نے اعتراض کیا۔ "تمہارا نام فاطمہ رکھا گیا ہے اس لئے خاتون کو بیگم صاحبہ کہو تو بہتر ہے۔"

"بیگم صاحبہ!" شیتل نے دہرایا۔

"اور شہزاد کو بھی تم شاہد بابو نہیں' شاہد صاحب کہنا۔" میں بولی۔

"شاہد صاحب اور بیگم صاحبہ .... اب ٹھیک!"

"بالکل ٹھیک!" میں نے کہا۔ "فی الحال تم دونوں جس کمرے میں چاہو سو جاؤ' کل طے کریں گے کہ کس کا کون سا کمرہ ہو گا۔"

"مزید ملازمین کی بھی ضرورت ہو گی خاتون!" شہزاد بولا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اس سلسلے میں پہلے ہی میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔

وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے تو میں لائٹ آف کر کے سو گئی۔ دوسرے دن میں دیر تک سوتی رہی۔ میری آنکھ خود نہیں کھلی تھی' مجھے شیتل نے جگایا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے آنکھیں کھول کر انگڑائی لی۔ شیتل کے چہرے پر ماسک نظر آ رہا تھا۔

"کوئی راجہ استاد آپ سے ملنے آیا ہے بیگم صاحبہ!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے شیتل کچھ شرما سی گئی۔ اس کے منہ سے "بیگم صاحبہ" مجھے بہت اچھا لگا تھا۔

آج میں خود راجہ استاد سے ملنے کے لئے جانے والی تھی۔ یہ اچھا ہوا تھا کہ وہ خود ہی آ گیا تھا۔

"اسے بٹھا دیا نا؟" میں نے شیتل سے معلوم کیا۔

"جی بیگم صاحبہ! ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

"کچھ ناشتے وغیرہ کا بندوبست کیا؟" میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں' وہ شاہد با.......... شاہد صاحب ضروری سامان لے آئے تھے' میں نے ناشتہ بنا لیا ہے۔ پہلے ناشتہ کریں گی کہ اس آدمی سے ملیں گی؟"

"ناشتہ ابھی نہیں۔" میں بولی۔ "منہ دھو کر میں ڈرائنگ روم میں جا رہی ہوں' تم دو چائے بنا کر لے آنا۔"

کمرے سے نکل کر میں باتھ روم کی طرف گئی تو شہزاد کے چہرے پر بھی مجھے ماسک نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے قریب آ کر بولا۔ "خاتون! جو شخص اس وقت آپ کا انتظار کر رہا ہے' یہی .... اسی نے میرے سر پر ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کیا تھا۔" اس کی آواز شدت جذبات سے مرتعش تھی۔

"وہم ہو گا تمہارا! وہ ایسا آدمی نہیں' میں اسے ایک مدت سے جانتی ہوں۔ پھر یہ کہ جس شخص نے تمہیں ضرب لگا کر بے ہوش کیا اور بعد میں جس سے میں نے ایئر بیگ چھینا وہ یہ شخص ہرگز نہیں تھا۔ تم نے تو اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ میری تو اس سے معرکہ آرائی ہوئی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے خلاف توقع صورت حال کو بگڑنے سے بچا لیا۔

"پھر واقعی میرا وہم ہی ہو گا۔" شہزاد نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

میں باتھ روم میں گھس گئی۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر میں نے میک اپ کیا اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔

"ارے تم کہاں تھیں رانی! کل میں آیا تو تالا پڑا ہوا تھا۔ صبح کے بعد شام کو دیکھا تو بھی تالا ہی ملا۔" راجہ استاد نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"ایک ضروری کام سے گئی تھی۔" میں نے بات کو ٹال دیا۔ "کیا کوئی کام تھا مجھ سے؟"

"کام تو خیر کوئی نہیں تھا' محض تمہاری خیریت معلوم کرنا تھی۔ شانتی تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔"

"شانتی کو میری طرف سے بہت بہت پیار .... مگر میری طرف سے پیار تمہیں نہیں' ہمایوں کو کرنا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں بھی تو اس کا پاپا ہوں' کیا باپ بیٹیوں کو پیار نہیں کرتے۔"

"مگر جوان بیٹیوں کو نہیں۔ اس کے لئے بیٹیوں کے شوہروں کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں۔"
میری بات سن کر راجہ استاد زور سے ہنس پڑا' پھر شیتل اور شہزاد کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"یہ دونوں میرے پرانے بااعتماد گھریلو ملازمین ہیں۔" میں نے بتایا۔

"تو کیا انہیں تم بمبئی سے اپنے ساتھ لائی تھیں؟ پہلے تو تم نے ان کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔"

اسی وقت شیتل چائے لے کر آ گئی اور راجہ استاد مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شیتل چلی گئی تو
نے راجہ استاد کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "استاد! میں آج خود تم سے ملنے آ رہی تھی' کام
ایک .... مجھے تین چار کام کے بندے چاہئیں' ایسے کہ جو وقت پڑنے پر ہاتھ بھی دکھا سکیں .....
اس کے علاوہ یہ کہ ان پر اعتماد بھی کیا جا سکے۔ بظاہر ان کی مختلف حیثیتیں ہوں گی لیکن درحقیقت
میرے محافظ ہوں گے۔"

"کیا تمہیں کسی کی طرف سے خطرہ ہے رانی!" راجہ استاد کے لہجے میں تشویش تھی۔

"فی الحال تو کوئی خطرہ نہیں لیکن تم تو جانتے ہو استاد کہ ہم لوگ جس دھندے میں ہیں اس
کسی بھی وقت کوئی بھی خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ میں اسی لئے اپنے گرد ایک مضبوط حفاظتی حصار چا
ہوں۔"

"کتنے بندے بتائے تم نے تین یا چار؟"

"ایک تو سمجھو کہ مالی ہو گیا' دوسرا کوٹھی کا چوکیدار' تیسرا باورچی۔ باورچی کو کھانا پکانا آنا چاہئے
ان تین افراد کے علاوہ ایک آدمی سودا سلف لانے کو بھی چاہئے۔ ان چاروں کی ظاہری حیثیت یہی ہو
لیکن دراصل چاروں افراد کا اصل کام کوٹھی اور میری حفاظت کرنا ہو گا۔ اس کے لئے انہیں باقاعدہ تن
ملے گی۔"

"تنخواہ کی کوئی ضرورت نہیں۔" راجہ استاد بول اٹھا۔

"تو پھر مجھے ملازمین کی بھی ضرورت نہیں۔"

"تم سمجھو تو رانی! وہ میرے آدمی ہوں گے جو تمہاری حفاظت کریں گے۔"

"اور جب دن رات یہیں میری خدمت میں رہیں گے تو کھائیں گے کیا پتھر؟"

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"ہرگز نہیں۔" میں بولی اور پھر استاد کو میں نے راضی کر ہی لیا کہ جن آدمیوں کو وہ بھیجے گا
میرے تنخواہ دار ملازمین ہوں گے۔ ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہو گی۔ راجہ
استاد نے آئندہ روز صبح تک آدمی فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور چلا گیا۔

☆======☆======☆

گزشتہ تجربات کی بنا پر میں نے اپنے ذاتی ملازمین کی حیثیت سے ایسے افراد کو رکھنے کا فیصلہ کیا
جو خلاف توقع صورت حال کا مقابلہ کر سکیں اور گھبرا نہ جائیں۔

اس روز اتوار تھا اور شام چار پانچ بجے کے درمیان مجھے ارشاد حسین سے ملنا تھا۔ اس کا یہ اندا

ثابت نہیں ہوا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر میں نئی شخصیت اپنا کر کہیں مستقل سکونت کا بندوبست کر لوں
ارشاد حسین سے مل کر میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ خفیہ پولیس کا محکمہ میرے سلسلے میں کیا کر
رہا ہے۔

دوپہر کا کھانا کھا کے میں نے حسب معمول کچھ دیر آرام کیا اور پھر تین بجے کوٹھی سے نکل گئی۔
ترم تلے ہی کے علاقے میں دوبارہ مستقل سکونت اختیار کر لینا میرے لئے ہر اعتبار سے مناسب رہا تھا۔
سب سے بڑا اطمینان تو راجہ استاد کی وجہ سے تھا کیوں کہ اس علاقے میں اسی کا سکہ چلتا تھا۔ اس کی
وجہ سے مجھے کسی کی طرف سے بدمعاشی کا خطرہ نہیں تھا۔ میں اس علاقے میں ہر طرح سے محفوظ تھی۔
اس کے علاوہ قلب شہر ہونے کے سبب اس علاقے میں ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔

ٹرام سے مطلوبہ اسٹاپ پر اتر کر میں نے سڑک عبور کی اور پھر اپر چیت پور روڈ کی اس ذیلی آبادی
میں داخل ہو گئی جہاں بنگال کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا گھر جوڑا سانکھو تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد میں
اس گھر کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ ذرا آگے بڑھ کر میں اس مکان کے بند دروازے کے سامنے رک
گئی۔ جہاں ایک مرتبہ پہلے بھی آ چکی تھی۔ میں نے اس مکان کے دروازے پر دستک دی ہی تھی کہ
سامنے سے ایک جیپ تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور میرے قریب آ کر رک گئی۔

"خطرہ .... خطرہ........." میرے اندر جیسے کوئی چیخ اٹھا' مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ جیپ سے
اترنے والے مسلح باوردی پولیس والے مجھے اپنے نرغے میں لے چکے تھے۔

"جیپ میں بیٹھ جاؤ۔" ایک متوسط عمر کے پولیس افسر نے اپنے ریوالور کی نال سے جیپ کی طرف
اشارہ کیا۔

"لیکن .... لیکن میرا قصور جناب!" میں نے نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔

"قصور تمہیں پولیس ہیڈ کوارٹر آفس چل کر معلوم ہو گا۔" پولیس افسر نے سخت آواز میں جواب
دیا۔

مجبوراً مجھے جیپ میں بیٹھنا پڑا اور بیٹھتے ہی میں چونک اٹھی۔ میرے ہی سامنے والی سیٹ پر ایک
ادھیڑ عمر عورت بیٹھی تھی جس کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ وہی عورت تھی کہ جس نے پچھلی
مرتبہ اس مکان میں میرا استقبال کیا تھا۔ ارشاد حسین نے اسے "ماں جی" کہا تھا۔ اس عورت کی گرفتاری
کا مطلب سمجھنا میرے لئے دشوار ثابت نہ ہوا۔ میرے علم میں یہ تو تھا ہی کہ ارشاد حسین کا تعلق کسی
ایسی زیر زمین تنظیم سے ہے جو انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کرنے والی ہے۔ انگریز حکمرانوں کو
نجانے کس طرح اس تنظیم کے ارادوں کا علم ہو گیا تھا اور وہ تنظیم کی راہ پر لگ گئے تھے۔ اس کا عملی تجربہ
مجھے ارشاد حسین سے پہلی ملاقات میں بھی ہو چکا تھا۔ مٹیا برج کے جس مکان میں اس سے میری ملاقات
ہوئی تھی' اسے پولیس نے گھیر لیا تھا۔ وہاں ایک روز پہلے تک اسلحہ بھی موجود تھا۔ اس وقت تو ارشاد
حسین بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ مجھے مکان کے ایک خفیہ دروازے کے ذریعے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا
تھا۔ ایسی ہی کوئی کہانی یہاں بھی معلوم ہوتی تھی' مگر اس مرتبہ میں پولیس کے ہتھے چڑھ گئی تھیں اگر وہ

ادھیڑ عمر عورت جیپ میں موجود نہ ہوتی تو شاید میں اتنے درست اندازے قائم کرنے میں کا ہوتی۔

چار مسلح پولیس والے جیپ کے پچھلے حصے میں مجھے اور اس ادھیڑ عمر عورت کو نرغے میں لئے تھے۔ پولیس افسر اپنے ایک ماتحت کے ساتھ جیپ کی اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ پولیس افسر کے آ ہی جیپ چل دی تھی۔

جیپ نے ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ دھماکے سے فضا گونج اٹھی۔ پھر پے در پے ہونے لگے اور جیپ رک گئی۔ اگلی جانب سے وہ دائیں کو جھک گئی تھی۔

"پوزیشن لے کر جوابی فائرنگ کرو۔" پولیس افسر چیخا۔

میں سمجھ گئی کہ جیپ کا اگلا ایک ٹائر برسٹ ہو چکا ہے۔ جیپ کے ایک طرف جھک جانے کی یہی ہو سکتی تھی۔ اپنے افسر کا حکم سنتے ہی چاروں مسلح پولیس والے جیپ سے کود گئے اور انہوں نے میں ہو کر سامنے فائرنگ شروع کر دی۔ دو پولیس والے ایک طرف اور دو دوسری جانب گھٹنوں کے بیٹھ کر فائرنگ میں مصروف تھے۔ پولیس افسر اپنے ماتحت اور جیپ کے ڈرائیور کو ساتھ لئے بائیں ایک تپلی سی گلی میں گھس گیا تھا اور وہاں سے فائرنگ کر رہا تھا۔

میرے قیاس کے مطابق پولیس جیپ پر فائرنگ کرنے والے تنظیم ہی کے ارکان ہو سکتے تھے کوئی دو منزلہ مکان تھا جس کی طرف سے جیپ پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ فائر کرنے والوں کو جیپ ادھیڑ عمر عورت اور میری موجودگی کا بھی یقیناً خیال تھا۔ وہ اسی لئے بہت محتاط انداز میں فائرنگ کر تھے۔

جیپ میں ادھیڑ عمر عورت اور میرے سوا کوئی پولیس والا نہیں تھا۔

"تم سیٹوں کے درمیان لیٹ جاؤ۔" اچانک ادھیڑ عمر عورت نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں اگلی سی جا رہی ہوں۔ جیپ کا ڈرائیور شاید جلدی میں جیپ کی چابی لگی چھوڑ گیا ہے۔ میں جیپ اسٹارٹ ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ اپنی سیٹ سے اٹھی۔

"لیکن جیپ کا ایک ٹائر شاید برسٹ ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "جیپ الٹ جائے گی۔"

"تم اس کی پرواہ نہ کرو۔ جیپ کو صرف اتنی دور تک گھسیٹنا ہے کہ چاروں پولیس والے اس کی میں نہ رہیں۔"

"جیپ کو ریورس گیئر میں بھی تو چلایا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ چاروں خود بخود کچلنے سے بچنے لئے اچھل کر اِدھر اُدھر ہو جائیں گے۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"یہ بھی ممکن ہے بلکہ یہی بہتر ہے۔" اس نے میری تائید کی۔

اسی وقت مجھے اپنے ہینڈ پرس میں بھرے ہوئے ریوالور کی موجودگی کا خیال آگیا۔ پولیس افسر کی حماقت ہی تھی کہ اس نے میری تلاشی ضروری نہیں سمجھی تھی۔

"ٹھہرو!" میں نے ادھیڑ عمر عورت کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

"اب کیا ہوا؟" وہ حیرت سے بولی۔

کوئی جواب دینے کے بجائے میں نے پرس کھول کر ریوالور نکال لیا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو شنکر دادا بطور تحفہ دیا تھا۔ میں احتیاطاً اسے پرس میں رکھ لائی تھی۔

چاروں پولیس والے ہم دونوں کی طرف سے قطعی غافل ہو کر جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔ میں نے اطمینان کے ساتھ ان میں سے ایک کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ پھر دوسرا فائر کرنے میں صرف ایک لمحے کی دیر ہوئی۔ یکے بعد دیگرے دو چیخیں فضا میں گونجیں اور فائرنگ کی گونج میں معدوم ہو گئیں۔ بقیہ دو پولیس والوں نے اپنے ساتھیوں کو گر کر تڑپتے دیکھا۔ اسی وقت سامنے سے آنے والی ایک گولی' ایک پولیس والے کو چاٹ گئی۔ وہ چیخ بھی نہ سکا کیوں کہ گولی اس کے سر پر لگی تھی۔ زندہ بچ جانے والے پولیس والے نے میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنی رائفل میری طرف سیدھی کی ہی تھی کہ میرے ریوالور نے ایک اور شعلہ اگلا۔ اسی کے ساتھ میں تیزی سے جھک گئی۔ میں نے پولیس والے کو گرتے گرتے فائر کرتے دیکھ لیا تھا۔ ادھیڑ عمر عورت میرے عقب ہی میں تھی۔ وہ یقیناً صورت حال کی نزاکت کا احساس نہ کر سکی۔ یہی اس کے حق میں خطرناک ثابت ہوا۔ پولیس والے کی چلائی ہوئی گولی نے اس عورت کے سینے میں جگہ بنا لی۔ وہ چیخ کر اوندھے منہ مجھ پر گرنے لگی۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔ میں اگر اچھل کر ایک طرف نہ ہو جاتی تو میرے کپڑے خون سے تر بہ تر ہو جاتے۔

مجھے اس ادھیڑ عمر عورت کی موت پر افسوس ہو رہا تھا کہ میں اسے بچا نہ سکی۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ میرے ہاتھوں تین پولیس والے مارے جا چکے ہیں۔ مجھے وہاں زیادہ دیر نہیں رکنا تھا۔ فائرنگ میں اب پہلی جیسی شدت نہیں رہی تھی۔ پولیس کے خلاف جو لوگ فائرنگ کر رہے تھے ان کا پلہ واضح طور پر بھاری معلوم ہو رہا تھا۔

میں ابھی جیپ سے اترنے ہی والی تھی کہ عقبی سمت سے ایک شخص جھکا ہوا بھاگتا دکھائی دیا۔ وہ جیپ ہی کی سمت دوڑ رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی دیکھا۔ اس کے جسم پر وردی نہیں تھی۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ جو کوئی بھی ہو' دشمن بہرحال نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے ریوالور پرس میں نہیں رکھا۔ آنے والا میرے لئے اجنبی ہی تھا۔

"ماں جی!" وہ جیپ کے قریب آتے ہوئے سرسراتی سی آواز میں بولا۔

میں چونک اٹھی۔ اس کی آواز سے میں نے اسے پہچان لیا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "ارشاد حسین!" اس کے چہرے پر میک اپ تھا۔

"معبلہ!" اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔ "شکر ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ مگر ماں جی کو کیا ہوا..." وہ اب جیپ کے قریب آکر اندر دیکھ رہا تھا۔

"کام آگئیں۔" میں نے دکھ بھری آواز میں جواب دیا۔

"آپ میرے ساتھ آئیں معبلہ! میرے ساتھی بقیہ پولیس والوں کو سنبھال لیں گے۔" ارشاد

حسین نے مجھ سے کہا۔

"اور ماں جی کی لاش؟"

"اسے بھی لے جائیں گے' آپ مطمئن رہیں۔ ممکن ہے پولیس کی مزید نفری یہاں پہنچ جا
ہمیں اس سے پہلے ہی اس علاقے سے دور نکل جانا چاہئے۔"

پھر میں نے جیپ سے اترنے میں دیر نہیں کی۔ فائرنگ اب بھی جاری تھی۔ میں نے اپنا ریوا
پرس میں رکھ لیا۔ ارشاد حسین جدھر سے بھاگتا ہوا آیا تھا' ہم اسی طرف دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ ا
گلی کے اختتام تک پہنچنے سے پہلے کچھ اور مسلح افراد آتے دکھائی دیئے۔ وہ لوگ قریب پہنچے تو معلوم ہ
کہ ارشاد حسن کے ساتھی ہی تھے۔

"ماں جی ماری گئیں۔" ارشاد حسین نے انہیں رک کر بتایا۔ "ان کی لاش جیپ سے اٹھا کر
جاؤ' پھر یہاں رکنے کی ضرورت نہیں۔"

ارشاد حسین کی بات سن کر وہ لوگ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ اس گلی کے تمام دروازے بند تھ
مجھے کوئی کھڑکی تک کھلی نظر نہیں آئی۔ ارشاد حسین نے بھی اب اپنا ریوالور پینٹ کی جیپ میں رکھ لیا تھا
اس گلی سے نکل کر وہ ایک سڑک پر نکل آیا اور پھر سامنے والی ایک گلی میں گھس گیا۔ وہ سڑک بھی
سنسان ہی نظر آئی تھی۔ کیوں کہ وہاں تک بھی گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گلی میں البتہ اِد
اُدھر دو چار افراد کے گروہ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ وہ فائرنگ کی آوازوں ہی پر تبصرہ کر رہے تھے۔ گ
عبور کر کے ہم اپر چیت پور روڈ پر نکل آئے۔ یہاں سب کچھ حسب معمول تھا۔ ارشاد حسین مجھے اپ
ساتھ لئے ٹرام کے اسٹاپ پر آ گیا۔

ٹرام آ کر رکی تو میں' ارشاد حسین کے ساتھ اس میں بیٹھ گئی۔ وہ ٹرام دھرم تلے جا رہی تھ
خلاف توقع ارشاد حسین نے دھرم تلے ہی کے دو ٹکٹ لئے۔ مجھے اب تک یہ معلوم نہیں تھا کہ ارشا
حسین کہاں جا رہا ہے۔ اس نے دھرم تلے کے دو ٹکٹ لئے تو مجھے خیال آیا اسے اپنے ساتھ کوٹھی
کیوں نہ لے چلوں۔

دھرم تلے پہنچ کر ارشاد حسین نے مجھ سے کہا۔ "شام کا وقت ہے' وکٹوریہ میموریل کی طرف
ہیں' وہاں سبزہ زار پر کسی ایسی جگہ بیٹھ کر بات..........."

"آپ میرے ساتھ چلیں ارشاد!" میں بول اٹھی۔

"مگر کہاں؟"

"جہاں ہم دونوں ہی محفوظ ہوں گے اور اطمینان سے بات کر سکیں گے۔ اس سے ایک مقصد
بھی پورا ہو جائے گا۔ آپ میری نئی کوٹھی بھی دیکھ لیں گے۔"

"نئی کوٹھی؟" وہ چونک کر بولا۔ "کیا آپ نے نئی کوٹھی بھی دھرم تلے ہی میں خریدی ہے؟ آپ
خیال تو پارک سرکس کے علاقے میں کوئی مکان خریدنے کا تھا۔"

"بہ وجوہ ارادہ بدلنا پڑا۔" میں نے اس کے ساتھ سڑک عبور کرتے ہوئے بتایا۔

"ٹھیک ہے' چلئے۔" اس نے آمادگی ظاہر کر دی۔

ارشاد حسین کو ساتھ لئے میں اپنی کوٹھی میں آ گئی۔ شیتل کو آواز دے کر میں نے چائے کے لئے کہا اور ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔

"یہ کوٹھی تو آپ کی پہلی کوٹھی سے زیادہ بڑی اور قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ اب اگر لوگوں کو آپ کے ذریعہ آمدنی کے بارے میں تشویش ہو تو کیا غلط ہے؟" وہ مسکرایا۔

"بیٹھئے' اپنے ذریعہ آمدنی کے بارے میں آپ کو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ آپ کو تو میں نے ریس کورس ساتھ چلنے کی دعوت بھی دی تھی۔" میں بھی مسکرا دی۔

"اب تو کسی دن آپ کے ساتھ ریس کورس جانا ہی پڑے گا۔"

"ضرور۔" میں ہنس کر بولی۔

"میں معذرت خواہ ہوں کہ آج آپ کو پھر میری وجہ سے سخت زحمت اٹھانا پڑی اور آپ کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ شاید وہ چاروں پولیس والے آپ ہی کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے جن کی لاشیں جیپ کے قریب پڑی تھیں۔" ارشاد حسن نے کہا۔

"ان میں سے صرف تین میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔" یہ کہہ کر میں نے ارشاد حسین کو جیپ میں پیش آنے والے واقعے سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کر دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ماں جی کا آخری وقت آ ہی گیا تھا۔ ورنہ وہ اس طرح نہ ماری جاتیں۔" ارشاد حسین نے ٹھنڈا سانس بھرا' پھر بتانے لگا۔ "معبلہ! وہ بڑی عظیم عورت تھیں۔ انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں اپنے شوہر اور دو بیٹوں کی وہ پہلے ہی قربانی دے چکی تھیں' آج خود بھی قربان ہو گئیں۔ اب ان کے خاندان کا صرف ایک فرد باقی بچا ہے' چھوٹی بیٹی ارملا۔ اس کی عمر آپ ہی جیسی ہو گی۔ سوچتا ہوں کہ اسے ماں کے مرنے کی خبر ہو گی تو کیا حال ہو گا اس کا۔ جب ارملا کے باپ کو غداری کے الزام میں پھانسی دی گئی تھی تو وہ صرف پانچ سال کی تھی۔ چار سال پہلے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے جنوبی ہند میں اس کے دو نوجوان بھائی مارے جا چکے ہیں۔ کیسا ستم ہے معبلہ کہ ماں جی کو گولی مارنے والا ایک ہندوستانی ہی تھا' ایک ایسا شخص جسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کسے گولی مار رہا ہے۔"

"اس نے تو میرا نشانہ لیا تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں ماں جی عقب میں تھیں۔ میں اگر تیزی سے جھک نہ جاتی تو ماں جی کو گولی نہ لگتی۔" یہ کہتے ہوئے مجھے ماں جی کی نوجوان بیٹی ارملا کا خیال آیا اور میں نے ارشاد حسین سے پوچھا۔ "کیا ارملا بھی ماں جی کے ساتھ اسی گھر میں رہتی تھی؟"

"نہیں وہ آسام میں ہے۔" ارشاد حسین نے بتایا۔ "آسام میں وہ گوریلا وار کی تربیت حاصل کر رہی ہے۔ اسے وہاں گئے تقریباً ایک سال ہوا ہے۔"

"یہ اچانک ہوا کیا ارشاد! پولیس نے وہاں کیسے چھاپا مار دیا؟" میں نے سوال کیا۔

"اچانک کچھ بھی نہیں ہوتا معبلہ!" ارشاد حسین عجیب سے لہجے میں بولا۔ "ہمیں اچانک اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسباب سے بے خبر ہوتے ہیں۔ جسے ہم حادثہ کہتے ہیں' وہ اچانک یا ایک دم نہیں

ہوتا بلکہ وقت برسوں اس کی پرورش کرتا ہے۔ مجھے اس واقعے کا علم اس وقت ہوا جب کسی بھی طرح آپ کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ چند روز سے ہمارے کچھ ایسے ساتھی' ماں جی کے گھر میں چھپے ہوئے تھے جو پولیس کی نظر میں آ چکے تھے۔ آج جب یہ معلوم ہوا کہ پولیس چھاپا مارنے والی ہے تو انہیں وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ اس کے باوجود پولیس نے چھاپا مارا۔ چھاپے کی ناکامی پر انہوں نے جھنجلا کر بغیر سبب اور کسی ثبوت کے بغیر ماں جی کو حراست میں لے لیا۔ معلوم نہیں کیسے ان کے دماغ میں یہ بات آ گئی کہ ممکن ہے' ماں جی کا کوئی اور ساتھی بھی ان کے ہتھے چڑھ جائے۔ ماں جی کو حراست میں لینے کے بعد بھی وہ اسی لئے وہاں سے گئے نہیں۔ وہ ماں جی کے گھر کسی کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ یہ صورت حال میرے لئے انتہائی تشویش ناک تھی۔ کیونکہ کہ مجھے معلوم تھا کہ آپ آنے والی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ آپ میک اپ میں ہوں گی۔ ایسی صورت میں آپ کو پہچاننا بھی دشوار تھا۔ جب تک کہ آپ ماں جی کے دروازے پر دستک نہ دیں۔ ادھر پولیس کے وہاں رک جانے سے ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ ہم نے ایک اور مکان میں مورچہ بنا لیا۔ پولیس جیپ کو اسی راستے سے گزرنا تھا۔ ہم ہر قیمت پر ماں جی کو پولیس کی حراست سے چھڑا لینا چاہتے تھے' مگر افسوس کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔" اپنی بات ختم کرتے ہوئے ارشاد حسین نے ایک مرتبہ پھر ٹھنڈا سانس لیا۔ یقیناً اسے ماں جی کی موت کا بہت دکھ ہوا تھا۔ ماں جی کے متعلق اس نے جو تفصیلات بیان کی تھیں' انہیں سن کر مجھے خود ماں جی سے ایک قلبی لگاؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ عورت لازماً قابل تعظیم تھی کہ جس نے وطن عزیز کو بدیسی حکمرانوں کی غلامی سے آزاد کرانے کی خاطر اپنے پیاروں کو قربان کر دیا تھا اور پھر خود بھی اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا تھا۔

کچھ دیر تک نشست گاہ میں بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ اسی دوران میں شیتل چائے رکھ کر چلی گئی۔

جب شیتل نشست گاہ سے نکل گئی تو ارشاد حسین نے دھیمی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "معلبہ! تو آپ کی وہ ملازمہ نہیں' خفیہ پولیس والے جس کی نگرانی کر رہے تھے؟ کل رات جو اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ خفیہ والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر موسیٰ سیٹھ کے مسافرخانے سے فرار ہو گئی تھی؟"

"ہاں یہ وہی تھی۔" میں نے ارشاد حسن سے رازداری ضروری نہیں سمجھی۔ "مگر یہ اور اس کا ساتھی خود وہاں سے فرار نہیں ہوئے تھے۔"

"پھر؟" ارشاد حسین نے سوال کیا۔

"دونوں کو میں نے وہاں سے فرار کرایا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر کیوں معلبہ جی! ان لوگوں کی وجہ سے تو آپ پہچانی جا سکتی ہیں۔" ارشاد حسین نے دانست میں مجھے خطرے کا احساس دلایا۔

"ارشاد! اگر آپ نے اس لڑکی کو پہلے بھی دیکھا ہوتا تو آپ ہرگز ایسا نہ کہتے۔" میں بولی۔

"وہ کیوں معلبہ جی!" ارشاد حسین نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

"میں نے دونوں کے چہرے بدل دیئے ہیں' اس لڑکی کا چہرہ اور نام بھی اور دوسرے بندے کا بھی۔"

"پھر بھی میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کو یہ خطرہ مول لینے کی ضرورت کیا تھی؟"

"زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی مل جاتے ہیں ارشاد کہ جنہیں چھوڑا نہیں جا سکتا۔ وہ عادت بن جاتے ہیں۔"

"آپ کے سینے میں اتنا گداز دل بھی ہے معلبہ! مجھے اس پر حیرت ہے۔ بھلا آپ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے چار جیتے جاگتے انسانوں کو موت کی نیند سلا چکی ہیں۔"

"کیا آپ کے خیال میں وہ لوگ زندہ تھے ارشاد؟" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہم ایسی باتیں کرتے ہوئے عموماً ایک بات نظرانداز کر جاتے ہیں معلبہ! معاش آدمی کی بہت بڑی مجبوری ہے اور ہر شخص قربانی دینے کا اہل نہیں ہوتا۔"

"انگریز حاکموں نے شاید اسی مجبوری کو خرید لیا ہے۔ غربت و افلاس کے مارے ہوئے لوگ خود بکنا چاہتے ہیں' مگر ارشاد! ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟"

"اس وقت تک معلبہ کہ جب تک سوئے ہوئے ضمیر بیدار نہیں ہو جاتے۔ اس کے لئے ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے۔"

"یہ بتائیں ارشاد! کیا آپ کا محکمہ اب تک میری تلاش سے دستبردار نہیں ہوا؟ کچھ معلوم ہوا کہ وہ کس لئے میری تلاش میں ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ کی تلاش جاری ہے۔" ارشاد حسین نے بتایا۔ "اس تلاش کا سبب اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ پہلے ہی کی طرح اب بھی اس سلسلے میں انتہائی رازداری برتی جا رہی ہے۔ ہاں اتنا ضرور پتا چل گیا ہے کہ چند اعلیٰ انگریز حکام بطور خاص آپ کے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

اسی وقت میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا اور میں نے اسی کے زیر اثر ارشاد حسین سے پوچھا۔ "ارشاد! کیا آپ ان انگریز حکام میں سے کسی کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟"

"ایسا شاید اس لئے مشکل ہو گا معلبہ کہ یقینی طور پر کسی کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" ارشاد حسین نے جواب دیا۔ "محض شک کی بنا پر کسی کا نام نہیں لیا جا سکتا۔"

"پھر بھی ایک شخص کے بارے میں یقینی طور پر یہ کہنا ممکن ہے ارشاد کہ وہ حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔"

"وہ کون معلبہ!"

"تمہارے محکمے کا سربراہ۔" میں نے کہا۔

"آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو معلبہ کہ اسے بھی اوپر سے ہدایات ملتی ہیں۔"

"تو اس کا مطلب ہوا کہ وہ ہدایات دینے والوں سے واقف ہے۔"

"ہاں اس حد تک آپ کا خیال درست ہے۔"

"یعنی آپ کے محکمے کا سربراہ ان اعلیٰ انگریز حکام کی نشاندہی کرنے کا اہل ہے جن کے ایما پر آپ کا محکمہ میرے متعلق ضروری معلومات حاصل کر رہا ہے۔"

"اگر یہ معلوم بھی ہو جائے معبلہ کہ پس پردہ آپ کے بارے میں کون سے اعلیٰ انگریز حکام دلچسپی لے رہے ہیں تو اس سے کیا حاصل ہو گا؟"

"حیرت ہے ارشاد کہ آپ اتنی سامنے کی بات نہیں سمجھے۔" میں بولی۔ "ان حکام کا علم ہو جائے تو سارا معمہ حل ہو سکتا ہے۔"

"مگر کس طرح؟ یہی تو میں سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"جب پس پردہ چہرے بے نقاب ہو جائیں گے تو پھر یہ معلوم کرنا بھی آسان ہو جائے گا کہ میرے خلاف تحقیقات کا مقصد کیا ہے؟"

"تو کیا آپ واقعی آگاہ نہیں معبلہ کہ آپ کے خلاف کس لئے اعلیٰ سطح پر تشویش پائی جاتی ہے؟"

"کمال ہے ارشاد! اگر مجھے یہی علم ہوتا تو پھر رونا کس بات کا تھا' میں تو خود قطعی بے خبر ہوں۔"

"اگر آپ کے جواب کو صحیح مان لیا جائے معبلہ! تو واقعی یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ خود صاحبِ معاملہ کو کچھ معلوم نہیں۔"

"حقیقت یہی ہے ارشاد! میں اسی لئے اس معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ میرے نزدیک اب اس کی ایک ہی صورت ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آپ کے محکمے کے سربراہ کو اس پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ پس پردہ چہروں کو بے نقاب کر دے۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ممکن نہ ہوتا ارشاد تو میں یہ بات ہی زبان پر نہ لاتی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے طویل سانس لی۔ "آپ سے میں اس سلسلے میں صرف اتنا تعاون چاہتی ہوں ارشاد کہ اپنے محکمے کے سربراہ کی نشاندہی کر دیں۔"

ارشاد حسین میری بات سن کر چونک اٹھا' پھر کہنے لگا۔ "معبلہ! آپ شاید کوئی خطرناک قدم اٹھانا چاہتی ہیں۔ میں بہرحال آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ ایسا نہ کریں۔"

"آپ نے کس طرح یہ سمجھ لیا کہ میرا ارادہ کوئی خطرناک قدم اٹھانے کا ہے؟"

"آپ کی باتوں سے اتنا اندازہ تو خیر لگایا ہی جا سکتا ہے۔ شاید آپ کا ارادہ میرے محکمے کے سربراہ کو اغوا کرنا ہے تاکہ اس سے ان اعلیٰ حکام کے بارے میں معلوم کر سکیں۔ جن کے ایما پر آپ کے خلاف تحقیقات ہو رہی ہے۔"

"تو اس میں خطرناک قدم کون سا ہے' میں یہ نہیں سمجھ سکی۔"

"کیا آپ کے نزدیک خفیہ پولیس کے سربراہ کو اغوا کرنا خطرناک قدم نہیں؟" ارشاد حسین نے حیرت سے کہا۔

"میں تو اسے کوئی خطرناک قدم نہیں سمجھتی۔"

"ارے یہاں سے لے کر دہلی تک کھلبلی مچ جائے گی' آپ اسے خطرناک قدم نہیں کہہ رہیں۔"

"تو مچ جائے کھلبلی' اس سے مجھ پر کیا فرق پڑتا ہے؟"

"آپ دراصل سمجھ نہیں رہیں کہ ایک اعلیٰ انگریز افسر کے اغوا کا مطلب کیا ہے۔ یہ کتنا سنگین جرم ہے اور اس کے کتنے بھیانک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟"

"کیا ہو گا' مجھے بتایئے نا' کیا بگاڑ لیں گے وہ میرا؟"

"آپ کا تو شاید کچھ نہ بگڑے' مگر سینکڑوں بے گناہ لوگ حراست میں لے لئے جائیں گے اور جو مشتبہ افراد زیر حراست ہیں ان پر تشدد کی انتہا کر دی جائے گی۔ آپ کو شاید ہی علم نہیں کہ جو مشتبہ افراد زیر حراست ہیں ان میں ہمارے ساتھی بھی ہیں۔ ان پر زندگی تنگ کر دی جائے گی۔"

"آپ کے ساتھیوں کو قید سے رہائی مل جائے پھر؟" میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔

"رہائی.......... مگر کیسے؟" ارشاد حسین بدستور حیران ہو کر بولا۔

"تو پھر سنئے' آپ کے محکمے کے سربراہ کو اغوا کر لیا جاتا ہے' اس کے بعد انگریز حکمرانوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ آپ کے ساتھیوں کو رہا کر دیں تو کیا ایسا ممکن نہیں؟ کیا حکمراں اپنے ایک اعلیٰ افسر کی زندگی بچانے کے لئے ہمارا مطالبہ تسلیم نہیں کر لیں گے؟"

"لیکن اس طرح تو اغوا کی ذمے داری ہمارے ساتھیوں کو قبول کرنا پڑے گی۔"

"تو کیا ہوا' کیا آپ کے ساتھی یہ ذمے داری قبول نہیں کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ معاملہ ایسا ہے معبلہ کہ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کئے بغیر آپ کو کوئی جواب نہیں دے سکتا لیکن ذاتی طور پر آپ سے متفق ہوں۔"

"خیر یہ بات تو بعد کی ہے کہ آپ کے ساتھی اس اغوا کی ذمے داری قبول کر کے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ فی الحال تو آپ میرے سوال کا جواب دیں کہ اپنے سربراہ کی نشاندہی کر سکتے ہیں یا نہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"انکار کا میرے پاس جو جواز تھا اسے آپ نے رد کر دیا' پھر بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے آپ نے اس عیار شخص کو دیکھا ہو یا آپ سے اس کی ملاقات کا امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ آپ کی پہلی کوٹھی کے قریب ہی رہتا ہے' ڈیسوزا نام ہے اس کا۔"

ڈیسوزا کا نام سن کر میں تقریباً اچھل پڑی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ڈیسوزا خفیہ پولیس کا سربراہ ہو گا۔ اس کی اصل شخصیت ظاہر ہونے کے بعد میں جیسے ماضی میں کھو گئی۔ وہ مجھ سے دوستی کرنا چاہتا تھا اور اس کا مقصد مجھ پر آج واضح ہوا تھا۔ پولیس کو میرے پیچھے لگانا اس کی انتقامی کارروائی نہیں تھی۔ بلکہ اس طرح وہ میرے بارے میں یہ معلوم کرنے کا خواہشمند تھا کہ میں کون ہوں۔ مجھ سے تعلقات بڑھانا اس کا ذاتی مسئلہ بہرحال نہیں تھا۔ کیوں کہ اب میں جان چکی تھی' اس کی ڈوری اوپر سے ہلائی جا رہی تھی۔ میں اپنے مزاج کے مطابق اس کے فریب میں نہیں آئی اور اسے دھتکار دیا تو

اس نے دوسرے ذرائع سے میرے متعلق تحقیقات جاری رکھیں۔ اب مجھ پر روز روشن کی طرح سب کچھ ظاہر ہو چکا تھا۔ میں اپنی لاعلمی کے سبب جسے ڈیسوزا کا ذاتی فعل سمجھی تھی وہ اس کا ذاتی فعل نہیں تھا۔

"آپ کہاں کھو گئیں معبلہ!" مجھے خاموش دیکھ کر ارشاد حسین نے ٹوکا۔

میں چونک کر بولی۔ "ارشاد! آپ نے آج اپنے محکمے کے سربراہ کا نام بتا کر میری بہت سی الجھنیں ختم کر دیں۔" پھر میں' ارشاد حسین کو بتانے لگی کہ ڈیسوزا نے کس طرح میرے قریب آنے کی کوشش کی تھی اور میں نے کس طرح اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ اسی ضمن میں ریس کورس اور اسٹرپ ٹیز ڈانس کا ذکر بھی آیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ سے قریب ہو کر کچھ معلوم کرنے کی کوشش خود میرے محکمے کے سربراہ کی تھی۔ اس سے بھی معاملے کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بہرحال کوئی معمولی بات نہیں کہ محکمے کا سربراہ بذات خود کسی معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔" ارشاد حسین نے اظہار خیال کیا' پھر پوچھا۔ "اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"وہی جو پہلے تھا۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں اسے اغوا کر کے زبان کھولنے پر مجبور کر دوں گی۔"

"کیا کہیں کل آپ سے ملاقات ممکن ہے؟ میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے آپ کو جواب دینا چاہتا ہوں کہ وہ اغوا کی ذمے داری قبول کریں گے یا نہیں!"

"آپ کل بھی یہیں آ جایئے۔ وقت بتا دیں تاکہ میں کوٹھی ہی پر رہوں۔" میں نے کہا۔

"ہرچند کہ آپ سے میرا جلدی جلدی ملنا' خصوصاً خود آپ کی کوٹھی پر مناسب نہیں ہے لیکن اب میں آپ کو کسی اور جگہ بلا کر مزید آزمائش میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ میری وجہ سے آج ہی آپ کو زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرنا پڑا ہے۔ میں کل رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان یہیں آ جاؤں گا۔ کل بھی کیوں کہ میرے چہرے پر ایک نیا میک اپ ہو گا اس لئے بطور شناخت بتا دوں' اپنا نام میں ہردیال سنگھ بتاؤں گا۔"

"ہردیال سنگھ۔" میں نے وہ نام دہرایا۔ "ٹھیک ہے' مجھے یاد رہے گا۔ چائے اور منگاؤں؟"

"نہیں' اب میں اجازت چاہوں گا۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اسے کوٹھی کے بیرونی دروازے تک چھوڑنے گئی اور واپس آ کر شیتل سے کھانا لگانے کو کہا۔

☆======☆======☆

اگلے روز وقت مقررہ پر راجہ استاد اپنے ساتھ چار افراد کو لے کر آ گیا۔ وہ چاروں ہی مسلمان تھے۔

"عبدل' غنی' رحمت اور یہ میرا شیر قاسم!" راجہ استاد نے ان چاروں کا مجھ سے تعارف کرایا۔

"غنی کھانا بھی اچھا پکا لیتا ہے اور عبدل تمہارے لان میں لگے ہوئے پودوں کی بخوبی نگہداشت کر سکتا ہے۔ قاسم کے لئے میں چوکیدار رکھنے کی سفارش کروں گا۔ اس کا نشانہ بڑا سچا ہے۔ رہا رحمت تو اس سے اوپر کا کام لیا جا سکتا ہے۔"

"تم نے کمال کر دیا استاد!" میں ہنس کر بولی۔ "اتنی جلدی اتنے اچھے دانے چھانٹ لائے۔"

"اور میں نے انہیں تمہارے بارے میں بھی بتا دیا ہے کہ تم کون ہو' تاکہ یہ اونچا اڑنے کی کوشش نہ کریں۔" راجہ استاد نے بتایا۔

"یہ تم نے اچھا کیا' ویسے جو اونچا اڑنے کی کوشش کرتا ہے' مجھے اس کے پر کاٹنا بھی آتے ہیں۔ تم کہو تو ان کا امتحان لے لوں؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ میں خود بھی یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ راجہ استاد کے فراہم کردہ آدمیوں میں کتنا دم خم ہے۔

"بخوشی' تم فری میں تو ان سے کام لے نہیں رہیں' مال خرچ کر رہی ہو آخر۔ تمہیں ان کا امتحان لینا چاہئے۔ تم نہ کہتیں تو میں اس کے لئے کہتا۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔" میں کھڑی ہو گئی اور پھر انہیں کوٹھی کے لان میں لے آئی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ شہزاد بھی ادھر آ نکلے گا۔ وہ مجھے اس وقت نظر آیا جب میں راجہ استاد سے چاقو لے کر کھول چکی تھی۔ "تم میں سے کون میرے ہاتھ سے یہ چاقو چھین سکتا ہے؟" میں نے ان چاروں کو مخاطب کیا۔

"رانی! تمہارے ہاتھ سے تو راجہ استاد چاقو نہیں چھین سکتا' پھر ان لونڈوں کی کیا مجال ہے؟" راجہ استاد بول اٹھا۔

"تم انہیں کوشش تو کرنے دو استاد!" میں نے کہا۔ "تم جسے اپنا شیر کہہ رہے تھے' اسے آگے کرو پہلے۔"

"چل بھئی قاسم! چڑھ جا بیٹا سولی پر۔" استاد نے ہنس کر ان چاروں میں سے ایک کا بازو پکڑ کر اسے آگے دھکیل دیا۔

میں ایک ہاتھ میں چاقو تھامے جھک کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی تھوڑا سا جھک کر میری طرف بڑھا۔ پھر اس نے مجھے ڈاج دینے کے لئے ایک طرف جھکائی دی اور دوسرے ہی لمحے مجھ پر جست لگا دی۔ میں دانستہ اس جگہ سے نہیں ہٹی۔ میرے دائیں ہاتھ کی کلائی کو قاسم نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب وہ میرے اوپر تھا اور میں گھاس پر پڑی۔ اس نے میری کلائی پر سارا زور لگا دیا' مگر اسے جھکا نہ سکا اور نہ میرے ہاتھ سے چاقو چھین سکا۔

"اب سنبھلو قاسم! میری باری ہے۔" یہ کہتے ہی میں نے اپنے جسم کو مخصوص انداز میں سمیٹا۔ اسی کے ساتھ قاسم کی گردن میری دونوں ٹانگوں کی گرفت میں آ گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ میرے اوپر سے اچھل کر دور جا گرا اور میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "کھڑے ہو جاؤ۔" میں نے اسے حکم دیا۔ "یہ لو چاقو۔" میں نے چاقو اس کی طرف اچھال دیا اور بولی۔ "اب میں تم سے چاقو چھین کر دکھاتی ہوں۔"

چاقو لپکنے کے بعد وہ بالکل میری ہی طرح جھک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کی دائیں کلائی پر کھڑی ہتھیلی ماری۔ ہرچند کہ میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ زیادہ چوٹ نہ لگے' پھر بھی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی' اسی کے ساتھ چاقو چھوٹ کر نیچے گرنے لگا جسے تیزی سے جھک کر میں نے لپک لیا۔

"اب ایسا کرو کہ تم چاروں مل کر مجھ سے یہ چاقو چھینو۔"

میرا حکم سنتے ہی وہ چاروں مجھ پر جھپٹ پڑے میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلی اور ان کے اوپر سے جیسے اڑتی ہوئی دور جا کھڑی ہوئی۔

"ادھر۔" میں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

وہ پھر پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ اس مرتبہ میں نے ان میں سے ایک کو ٹانگ اڑا کر گرا دیا' دوسرا اپنا جبڑا سہلاتا ہوا بیٹھ گیا' تیسرا آگے بڑا تو اسے پشت پر لاد کر دور پھینک دیا اور چوتھے کے سینے پر میری فلائنگ کک پڑی تو وہ چیخ کر لمبا ہو گیا۔

"اٹھو۔" میں نے انہیں للکارا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو دور گھاس میں پھینک دیا۔ "چاقو اٹھانے کی کوشش کرو' میں تمہیں ایسا کرنے سے روکوں گی۔"

وہ چاروں نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ ان چاروں کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ چاقو جب ان سے چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی۔ ایک مرتبہ پھر ان چاروں کو زمین چاٹنا پڑی۔ ان میں سے کوئی بھی چاقو نہیں اٹھا سکا تھا۔

"کھڑے ہو جاؤ۔" انہیں پھر میرا حکم ملا۔ "جہاں چاقو پڑا ہے' اس جگہ کو گھیر کر کوشش کرو کہ میں چاقو نہ اٹھا سکوں۔"

وہ سب کراہتے لنگڑاتے اس جگہ پہنچ گئے۔ چاروں ہی گویا میری راہ میں دیوار بنے کھڑے تھے۔ میں نے انہیں دم لینے کا موقع دیا' پھر جست بھر کے قریب پہنچ گئی۔ اس مرتبہ قاسم نے ہمت کی اور مجھ پر جھپٹ پڑا مگر یہ کوشش اسے مہنگی پڑی۔ میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اس کی پنڈلی پر ٹھوکر ماری تھی اور وہ اوندھے منہ زمین پر آ رہا تھا۔ ادھر تو قاسم گرا اور ادھر عبدل اور غنی کے شانوں پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ پہلے چیختے ہوئے بیٹھ گئے اور پھر لڑھک گئے۔ اب صرف رحمت میرے سامنے تھا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر خلاف توقع اچھل کر میری ٹھوڑی پر اپنے سر کی ٹکر مارنا چاہی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ پھر میرا گھونسہ اس کے سینے پر پڑا اور وہ الٹ گیا۔ قریب ہی چاقو پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔

"لو استاد! کھیل ختم۔" میں نے چاقو راجہ استاد کی طرف اچھال دیا۔

راجہ استاد نے چاقو لپک کر مجھ سے پوچھا۔ "فیل یا پاس؟" اس دوران میں وہ چاروں اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔

"چل جائیں گے بس۔" میں نے جواب دیا۔ پھر دور کھڑے اور تصویر حیرت بنے ہوئے شہزاد کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ شہزاد قریب آ گیا تو میں نے ان چاروں سے اس کا تعارف کرایا۔ "یہ شاہد صاحب ہیں میرے مینیجر! تم سب کو گھریلو ذمے داریوں کے سلسلے میں انہی کے احکام کی پابندی کرنا ہے۔"

جواب میں انہوں سر ہلائے تو شہزاد سے نام بہ نام انہیں متعارف کرا دیا' پھر بولی۔ "ان کے علاوہ فاطمہ بھی ہے جو میری خاص ملازمہ ہے۔ اسے بھی تم دیکھ لو گے۔"

پھر میں نے شہزاد سے کہا کہ ان چاروں کے رہنے کا بندوبست سرونٹ کوارٹرز میں کر دے۔ اس

سے پہلے میں نے ان کی مناسب تنخواہ بھی مقرر کر دی تھی۔ جو مساوی ہی تھی۔ شہزاد انہیں سرونٹ کوارٹرز دکھانے لے گیا تو میں' راجہ استاد کو ساتھ لئے ایک بار پھر نشست گاہ میں آ گئی۔

"ہاں استاد! ناشتہ کر کے آئے ہو کہ بنواؤں؟" میں راجہ استاد سے مخاطب ہوئی۔

"کر کے آیا ہوں' صرف چائے پلوا دو۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

میں نے شیتل کو آواز دی اور چائے لانے کو کہا۔

"ابھی یہ بچے ہیں' تمہاری جھنک کیسے جھیل سکتے ہیں' پھر بھی میں نے چاروں کو مسلح کر دیا ہے۔ چاروں کے پاس ریوالور موجود ہیں۔" راجہ استاد نے بتایا۔

"میں نے ان سے بھڑتے ہوئے یہ بات محسوس کر لی تھی۔ بہرحال انہیں میں یہ ہدایت کر دوں گی کہ میری اجازت کے بغیر گولی نہ چلائیں۔ جب تک اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔ بلاوجہ مار دھاڑ مجھے پسند نہیں۔ ہاں استاد! تم سے ایک بات اور کرنا تھی۔ کوئی ایسی جگہ ہے تمہارے پاس جہاں کسی کو اغوا کر کے رکھا جا سکے؟"

"کسی مرد کو یا عورت کو؟" راجہ استاد نے معلوم کیا۔

"مرد یا عورت سے کیا فرق پڑتا ہے استاد؟" میں ہنس کر بولی۔

"پڑتا ہے فرق رانی! عورت کے لئے کم اور مرد کے لئے زیادہ جگہ درکار ہوتی ہے۔"

"وہ کیسے اور کس لئے استاد!"

"جسے اغوا کیا جاتا ہے' ضرورت پڑنے پر اسے ٹھوکنا پیٹنا بھی پڑتا ہے۔ ایسے میں عورت تو خیر عموماً دھونس میں آ جاتی ہے۔ جب کہ مرد ہاتھ پاؤں ضرور مارتا ہے۔ تو اس کے لئے جگہ ذرا کشادہ چاہئے۔ میں اسی لئے تو پوچھ رہا تھا۔"

راجہ استاد کی اپنی منطق تھی۔ جو میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ پھر بھی میں نے اس سے بحث نہیں کی اور بتا دیا۔ "ایک مرد کو اغوا کرنا ہے۔"

"جگہ کا بندوبست ہو جائے گا۔ یہ بتاؤ کہ اغوا کرانے کے لئے بندے بھی چاہئیں تمہیں؟"

"کیوں' کیا ان چاروں سے کام نہیں چل جائے گا؟"

"چل تو سکتا ہے' اگر تم بھی ان کے ساتھ رہو۔" راجہ استاد نے جواب دیا۔ "کوئی تجربہ کار بندہ ان کے ساتھ ضرور ہونا چاہئے جو رہنمائی کر سکے۔"

"تو پھر استاد! تم سے زیادہ تجربہ کار کون ہو گا۔ میں دانستہ اس معاملے سے دور رہنا چاہتی ہوں۔"

"تم کہتی ہو تو پھر کس طرح انکار کر سکتا ہوں' ہے کون؟"

"وہ بھی بتا دوں گی مگر پہلے یہ سن لو استاد کہ دن رات اس کی نگرانی کرنا ہو گی۔"

"پھر تو سالے کو اپنے گھر ہی رکھنا پڑے گا۔"

"نہیں استاد! یہ بڑے خطرے کی بات ہے۔ وہاں شانتی بھی ہو گی۔ میں یہ نہیں چاہتی' اسے معلوم ہو کہ جہاں وہ اغوا ہونے کے بعد رہا تھا' وہاں کوئی لڑکی بھی تھی۔ دوسری اہم بات یہ کہ تمہیں یا تمہارے

کسی بھی آدمی کو اپنا چہرہ چھپائے بغیر اس کے سامنے نہیں آنا ورنہ بعد میں یہ بے احتیاطی تمہارے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہو گی۔"

"خطرناک تو اس وقت ثابت ہو گی جب وہ زندہ بچ کر جائے گا۔" راجہ استاد پُرجوش آواز میں بولا۔

"زندہ بچ کر تو جانا ہے اسے' میں اسی لئے تو احتیاط برتنے کو کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا خیر تو یہ بتاؤ وہ ہے کون اور رہتا کہاں ہے؟"

"وہ ایک اعلیٰ انگریز افسر ہے اور دھرم تلے ہی میں رہتا ہے۔" میں نے بتا دیا۔

"اعلیٰ انگریز افسر۔" راجہ استاد نے حیرت سے کہا۔ "معاملہ کچھ ٹیڑھا لگتا ہے' کس محکمے کا افسر ہے؟"

"خفیہ پولیس کے محکمے کا سربراہ ہے وہ۔" میں نے جواب دیا۔ راجہ استاد کو میں اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتی تھی تاکہ اس کی ہمت نہ پڑے تو میں کوئی اور راستہ تلاش کروں۔ اگر میں اس کے ساتھ مخلص نہ ہوتی تو یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ معمولی قسم کے غنڈے بدمعاش تو صرف پولیس کا نام سن کر ہی کان پکڑنے لگتے ہیں۔ یہ معاملہ تو اس سے بھی ایک قدم آگے خفیہ پولیس کا تھا' وہ بھی اس کے سربراہ کے اغوا کرنے کا۔

مجھ سے حقیقت کا علم ہونے کے بعد راجہ استاد کچھ دیر جیسے سناٹے میں رہ گیا۔

"اچھی طرح سوچ لو استاد!" میں اسے خاموش دیکھ کر بول اٹھی۔ "اگر یہ معاملہ تمہارے بس کا نہیں تو ہاتھ نہ ڈالو' میں برا نہیں مانوں گی۔"

"کیا فضول باتیں کر رہی ہو رانی! راجہ استاد کو آخر تم نے سمجھا کیا ہے۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا کہ ان چاروں کو ساتھ نہ رکھوں۔ میرے ساتھ ایک تو ہمایوں کو ہونا چاہئے' دوسرے اگر تم کہو تو شنکر دادا کو بھی تمہارا نام لے کر بلوا لوں۔ اپنے ساتھ وہ جگا کو بھی لیتا آئے گا۔ ہم چاروں کافی رہیں گے۔"

"تو پھر شنکر دادا کو بھی اعتماد میں لینا پڑے گا۔ اگر شنکر دادا ہی کو ساتھ لینا ہے استاد! تو میرا مشورہ یہ ہے کہ جگہ کا معاملہ بھی اسی پر چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔۔ ایسا کیوں نہ کرو کہ آج شام تم اسے ساتھ لے کر میرے پاس آ جاؤ' میں خود اس سے بات کر لوں گی۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"یہ اور بھی اچھا رہے گا رانی!" راجہ استاد نے میری تائید کی۔

پھر راجہ استاد چائے پی کر شام کو شنکر دادا کے ساتھ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر میں' ڈیسوزا کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ قدموں کی آہٹ سن کر چونک اٹھی۔ آواز دروازے کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے اس طرف نگاہ اٹھائی تو شہزاد دروازے میں کھڑا ہوا دکھائی دیا۔

"خاتون! کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں؟" اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"حاضر ہو کر پوچھ رہے ہو کہ حاضر ہو جاؤں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آ جاؤ۔"

"یہ آپ نے کس طرح کے لوگوں کو ملازم رکھ لیا ہے؟" وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے

کہنے لگا۔

"کیوں' کیا ہوا' کیا ان کے سر پر سینگ نکلے ہوئے ہیں؟"

"سینگ تو خیر نہیں نکلے لیکن وہ۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ سب صورت ہی سے جرائم پیشہ معلوم ہوتے ہیں۔"

"کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں سے جرائم پیشہ افراد ہی بہتر طور پر نمٹ سکتے ہیں؟ کیا تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ کسی ایسے شخص سے بھڑ سکو جو مسلح ہو؟"

"میرے لئے یہ ممکن ہو یا نہ ہو لیکن آپ کے لئے یقیناً ممکن ہے خاتون!" شہزاد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "مجھے تو آپ نے حیران کر دیا۔ آپ کی اس صلاحیت کا مجھے پہلے علم نہیں تھا۔"

"ارے وہ تو محض ایک نمائشی مقابلہ تھا۔" میں نے یہ کہہ کر بات کو ٹالنا چاہا' پھر بولی۔ "یہ لوگ کیسے بھی سہی نگران پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ وقت پڑنے پر یہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے اور نہ ہی کسی شعبدہ باز قسم کے سادھو سے ڈریں گے۔ میں نے اسی لئے انہیں ملازم رکھا ہے۔ تم بھی ان پر بھروسہ کر سکتے ہو۔"

"آپ کا حکم ہے خاتون! تو بھروسہ کرنا ہی پڑے گا۔" شہزاد نے طویل سانس لے کر گویا ہتھیار ڈال دیئے۔

"اب یہ لوگ آ گئے ہیں تو تم باقاعدہ کوٹھی کا چارج سنبھال لو۔ ان سے کام لینا تمہارا کام ہے۔ مہینے بھر کا سودا سلف وغیرہ بھی خرید لاؤ۔ پیسے ہیں تمہارے پاس؟"

"ابھی تو ہیں' جب ختم ہو جائیں گے تو لے لوں گا آپ سے۔ حساب تو لے لیں' آپ نے مجھے۔۔۔۔۔۔۔"

"حساب دوستاں در دل۔" میں مسکرا کر بولی۔ یعنی دوستوں کا حساب دل میں ہوتا ہے۔ "اب تم جاؤ اور میرے لئے ایک اعلیٰ نسل کی چائے بنوا کر بھیج دو۔"

"اعلیٰ نسل کی چائے خوب کہا آپ نے۔" شہزاد بھی مسکرا دیا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ پھر اس نے چلتے چلتے پوچھا۔ "پارک سرکس والے مکان میں جو فرنیچر پڑا ہے' اس کے لئے تو خیر آپ نے بیچنے کو کہہ دیا مگر کتابوں کی الماریاں تو ظاہر ہے آپ یہاں منگوانا چاہیں گی' وہ کب اور کیسے یہاں لائی جائیں؟"

"ویسے تو خیر مجھے اس کی کوئی خاص جلدی نہیں لیکن ایک حل ہے اس کا' تم دو ایک روز بعد اپنے دوست آفتاب کو ساتھ لے کر مالک مکان کے پاس چلے جانا۔ مالک مکان کو بتا دینا کہ اس مہینے کے بعد تم گھر خالی کر رہے ہو' گھر کی چابیاں اسے تمہارے دوست کے ذریعے مل جائیں گی۔ تین مہینے کا ایڈوانس وہ آفتاب کو واپس کر دے۔ اسی کے سامنے تم گھر کی چابیاں آفتاب کے حوالے کر دینا۔ جہاں تک میرا خیال ہے خفیہ پولیس والے اب اس مکان کی نگرانی نہیں کر رہے ہوں گے۔ اگر اب بھی نگرانی جاری ہو گی تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں تمہیں میں ادھر نہیں بھیجوں گی۔ میں نے تمہارے دوست آفتاب کا گھر دیکھا ہے۔ وقتی طور پر وہاں کتابوں کی الماریاں رکھی جا سکتی ہیں۔ اپنے دوست سے تمہیں یہ کہنا ہے کہ وہ کتابوں کی الماریاں اس مکان سے اٹھوا کر اپنے گھر لے آئے۔ وہاں جو فرنیچر ہے' اسے

فروخت کرنے کی ذمے داری بھی تم اسی پر ڈال سکتے ہو۔ کیا یہ ممکن ہے؟"

"فرنیچر فروخت کرنا کوئی مسئلہ نہیں خاتون! یہ ایک دن کا کام ہے۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "بو بازار ہی میں ایسے کچھ دکاندار بھی ہیں جو پرانے فرنیچر کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو ساتھ لے جاکر فرنیچر دکھا دیا جائے گا۔ پھر وہ اس کے پیسے لگا کر خود وہاں سے سودا ہونے کے بعد فرنیچر اٹھا لے جائیں گے۔ کتابوں کی الماریوں کے بارے میں بھی ان سے بات کی جا سکتی ہے کہ یہاں پہنچا دیں۔ ویسے آفتاب بھی منع نہیں کرے گا۔"

"نہیں۔" میں نے انکار کر دیا۔ "کتابوں کی الماریاں فی الحال آفتاب ہی کے گھر رکھوا دو۔ وہاں سے کسی دن اٹھوا کر یہاں لے آنا' یہ زیادہ مناسب ہے۔ یہاں کسی بھی کمرے کو تم لائبریری روم بنا سکتے ہو' خاصی جگہ ہے اور ہاں سنو۔ میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ تم اور فاطمہ سرونٹ کوارٹرز میں نہیں' یہیں کوٹھی میں رہو گے۔ کیوں کہ مجھے کسی بھی وقت تم دونوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"بہتر ہے خاتون!" شہزاد نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اب اجازت ہے؟"

"ہاں جاؤ' چائے بھجوانا مت بھولنا۔"

پھر شہزاد چلا گیا اور جلد ہی میرے لئے شیتل سے چائے بنوا کر بھیج دی۔

اسی شام چار بجے کے قریب مجھے شنکر دادا اور استاد کے آنے کی اطلاع ملی۔ اس وقت میں سو کر اٹھی تھی۔ میں نے دانستہ اپنے چہرے پر ماسک پہننا ضروری نہیں سمجھا۔ ان لوگوں سے بھلا مجھے اپنا اصل چہرہ چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر باتھ روم سے نکلی اور نشست گاہ کی طرف جانے لگی تو شہزاد نے مجھے ٹوکا۔

"اپنوں سے چہرہ نہیں چھپاتے۔" میں نے مسکرا کر کہا اور پھر ڈرائنگ روم کی طرف چلی دی۔

شنکر دادا مجھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر آگے بڑھ کر میرے پیر چھوئے۔

"کیوں گناہگار کرتے ہو مجھے شنکر دادا! بیٹھو۔" میں آگے بڑھ کر راجہ استاد کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ تو میرے لئے عزت کی بات ہے رانی کہ تم مجھے اپنے پیر چھونے دیتی ہو۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں استاد! تم نے شنکر دادا سے بات کر لی؟" میں نے راجہ استاد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"نہیں رانی!" راجہ استاد نے جواب دیا۔ "میں نے سوچا کہ جب تمہارے پاس چلنا ہی ہے تو پھر تمہی بات کر لو تو بہتر ہے۔ ہاں میں نے اتنا ضرور بتا دیا ہے کہ رانی مجھ سے اور تم سے کوئی بہت اہم کام لینا چاہتی ہے۔"

"بتا دیتے تو اچھا تھا' خیر۔" میں نے یہ کہہ کر شنکر دادا کو مخاطب کیا۔ "کوئی خاص یا اہم کام تو اسے نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ صرف ایک شخص کو اغوا کرنا ہے' ہاں وہ شخص ضرور اہم ہے جسے اغوا کیا جانا ہے۔

راجہ استاد کی تجویز اسی لئے یہ تھی کہ تمہیں اور تمہارے نمبر دو جگا کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔ راجہ استاد کے ساتھ ہمایوں ہو گا۔ میرے خیال میں ایک آدمی کو اغوا کرنے کے لئے چار افراد کافی رہیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے شنکر دادا!"

"میں تو سمجھتا ہوں رانی! چار بھی زیادہ ہیں۔ راجہ استاد اور ہمایوں کی بھی ضرورت نہیں' میں اور جگا اسے اٹھا لائیں گے۔" شنکر دادا بولا۔

"اغوا کرنے کے بعد تمہی اسے اپنے پاس رکھو گے شنکر دادا! میں نہیں چاہتی کہ وہ دھرم تلے ہی کے علاقے میں رہے' کیوں کہ اسے یہیں سے اغوا کرنا ہے اور ہاں پہلے یہ سن لو کہ وہ ہے کون۔ تم شاید اسے آسان شکار سمجھ رہے ہو۔ میرے خیال میں راجہ استاد اور ہمایوں کو بھی اپنے ساتھ رکھو۔" مجھے معلوم تھا کہ جسے اغوا کیا جانا تھا' اس کے بارے میں جان کر راجہ استاد کی طرح کچھ دیر کو شنکر دادا بھی بڑبڑائے گا۔ وہ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں کسی اعلیٰ انگریز افسر کو تو کیا معمولی انگریز کارندے پر ہاتھ ڈالنے کا تصور محال تھا۔ پھر یہی ہوا۔ شنکر دادا' ڈیسوزا کے بارے میں سن کر ایک دم سٹپٹا گیا اور عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"لیکن .... لیکن رانی! حکومت سے ٹکر .... تم حکومت سے ٹکر کیوں لینا چاہتی ہو؟ پہلے .... پہلے کبھی تمہارے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں سنی!" شنکر دادا رک رک کر بولا۔

"ہم لوگ قانون شکن ہیں اور حکومت خود کو قانون کی محافظ کہتی ہے۔ پھر ٹکراؤ تو ہو گیا نا۔ کیا تم اس سے ڈر رہے ہو شنکر دادا؟"

"ڈرنے کی تو اس میں کوئی بات نہیں۔ قتل' اغوا' لوٹ مار' ڈکیتی اور فریب دہی یہی تو اپنا دھندا ہے .... ہاں کسی انگریز پر اب تک ہاتھ نہیں ڈالا تھا' سو اب یہ بھی سہی۔" شنکر دادا نے آمادگی ظاہر کر دی۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو تو اب تک لوٹتا رہا تھا' مگر ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا جو سارے ہندوستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔ اس کے جرائم کی ایک حد مقرر تھی اور اس حد میں انگریز حکمران نہیں آتے تھے۔

راجہ استاد ہی کی طرح میں نے شنکر دادا کو بھی یہ تاکید کر دی کہ وہ اور اس کے آدمی چہرہ چھپائے بغیر ڈیسوزا کے سامنے نہ آئیں۔

"اس کوٹھی کی نشاندہی کون کرے گا رانی جہاں وہ رہتا ہے؟" شنکر دادا نے پوچھا۔

"ابھی میرا ایک آدمی تمہارے اور راجہ استاد کے ساتھ جا کر وہ کوٹھی دکھا دے گا۔ میں تمہیں اس کا نام بتا ہی چکی ہوں۔ میرا خیال ہے چہرہ کرانے کی ضرورت نہیں۔ کہو تو میں اس کے دفتر کا پتا بھی بتا دوں۔ دفتر' یعنی سی آئی ڈی آفس اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں۔"

"بتا دو تو زیادہ اچھا ہے۔" راجہ استاد نے کہا۔ "ممکن ہے' کوٹھی کے بجائے اسے راستے سے اغوا کرنا زیادہ آسان رہے۔"

میں نے سی آئی ڈی آفس کا پتا بھی بتا دیا' پھر پوچھا۔ "کب تک کام ہو جانے کی توقع ہے؟"

"آج ہی رات یا زیادہ سے زیادہ کل رات لگ سکتی ہے۔ کیوں شنکر دادا!" راجہ استاد مجھے جواب دے کر شنکر دادا سے مخاطب ہوا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو استاد! اس سے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

پھر جب ان لوگوں نے چائے پی لی تو میں نے شہزاد کو ساتھ کر دیا۔ شہزاد سے میں نے کہا تھا کہ ان دونوں کو ڈیسوزا کی کوٹھی دکھا کر واپس آ جائے۔ شہزاد جب تک واپس نہ آ گیا میں کچھ مضطرب سی رہی۔ بظاہر مجھے اس اضطراب کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شہزاد لوٹا تو کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔

"کیا ہوا تمہیں؟" میں نے اس کی گھبراہٹ کی وجہ دریافت کی۔

"جب میں وہاں سے واپس آ رہا تھا خاتون تو .... تو مجھے راستے میں وہی منحوس سادھو مل گیا اور اس نے اچانک میرا راستہ روک لیا۔" شہزاد نے بتایا۔

"کیا؟" میں اچھل پڑی۔ "تمہیں یقین ہے کہ وہی سادھو تھا؟"

"جی ہاں' اس نے مجھے اپنا نام بھی بتایا تھا آج' شمبھو نام ہے اس خبیث کا۔"

"اس نے کہا کیا تھا تم سے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"پہلے تو اس حرامزادے نے "جے دیوی مائی" کا نعرہ لگا کر مجھے ڈرا دیا' پھر میرے سامنے آ کر کہنے لگا دیوی مائی سے کہنا وہ ہم سے نہیں چھپ سکتی۔ میرا نام شمبھو ہے اور شمبھو اپنی دیوی کے درشن کرنے ترنت (جلد) آئے گا۔ پھر وہ چمٹا بجاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔"

حالانکہ وقتی طور پر شمبھو کا خلاف توقع ذکر سن کر میں بھی ذہنی طور پر کچھ پریشان سی ہو گئی تھی مگر شہزاد کو یہ احساس نہیں ہونے دیا۔

"بکواس کرتا ہے وہ' اگر ایسا ہی ہوتا تو وہ اب تک یہاں پہنچ جاتا۔ جو گرجتے ہیں' برستے نہیں۔ اسے بھلا کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ میں کہاں ہوں؟"

"تو پھر اس نے مجھے میک اپ کے باوجود کیسے پہچان لیا؟"

شہزاد کے اس سوال نے مجھے چکرا دیا۔ شمبھو جیسے شیطانی قوتیں رکھنے والے کے لئے کسی کو میک اپ کے باوجود پہچان لینا کون سا دشوار تھا۔

"ضروری تو نہیں کہ اس نے تمہیں پہچان لیا ہو۔ یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے شہزاد کو سمجھایا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اول تو وہ یہاں تک پہنچ نہیں سکتا' اگر پہنچ بھی گیا تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پہلے بھی تو وہ میرا سامنا کرنے سے بھاگتا رہا ہے اور تمہیں بھی یہ بات معلوم ہے۔"

میرے سمجھانے بجھانے کا شہزاد پر بس اتنا اثر ہوا کہ اس نے مزید کچھ نہیں کہا' مگر اس کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار بدستور ہوتا رہا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر شہزاد کو ڈیسوزا کی کوٹھی دکھانے نہ بھیجتی تو اچھا تھا۔ پھر نہ راستے میں اسے شمبھو ملتا نہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا۔

شام کا وقت تھا۔ میں نے رحمت سے لان میں گارڈن چیئرز ڈالنے کو کہا اور پھر خود بھی عمارت سے نکل کر کھلی فضا میں آ گئی۔ عبدل لان میں موجود تھا۔ وہ لان کے کنارے کنارے لگے ہوئے پودوں کی

تراش خراش میں مصروف تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر پھاٹک کے پاس میں نے قاسم کو مستعد و چوکنا پایا۔ لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے میں سوچنے لگی کہ اتنے عرصے خاموشی کے بعد ایک مرتبہ پھر شیطانی قوتیں میرے خلاف متحرک ہو چکی ہیں۔ میں اب تک بڑے مہاراج کی یہ بات بھی نہیں بھولی تھی کہ مجھے بہت جلد اپنے پاس بلا لے گا۔ اس نے اب تک مجھے نہیں چھیڑا تھا۔ رہا شمبھو تو اس کا معاملہ میرے نزدیک قدرے مختلف تھا۔ وہ ذاتی طور پر میرے حصول کا متمنی تھا۔

اس دوران میں رحمت نے لان میں میز اور کرسیاں لا کر ڈال دی تھیں۔ میں ٹہلتی ہوئی ایک کرسی پر آ کے بیٹھی ہی تھی کہ میری سماعت سے شمبھو کی آشنا منحوس آواز ٹکرائی۔ "جے دیوی مائی!" اس نے حسب معمول نعرہ لگایا اور پھر اچانک مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر ظاہر ہو گیا وہ چمٹا بجاتے ہوئے محو رقص تھا۔

میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری رگوں میں لہو سنسنانے لگا اور آنکھوں میں وہ منظر گھومنے لگا جب وہ مجھے بے بس کر کے اذیتیں دے رہا تھا۔

"بیٹھی رہ دیوی! درشن کی پیاسی آنکھوں کو درشن کرنے دے۔" وہ رقص کرتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

"ارے او عبدل!" قاسم کی تیز آواز سنائی دی۔ "یہ سالا سادھو کدھر سے اندر گھس آیا؟"

"معلوم نہیں یار! میں تو گوڈائی کر رہا تھا۔ پھاٹک ہی سے اندر آیا ہو گا اور کدھر سے آتا؟" عبدل جواب میں بولا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"پھاٹک سے نہیں آیا' کہیں اور سے دیوار پھاند کر اندر کودا ہے۔ نکالتا ہوں ابھی حرامزادے کو باہر۔" قاسم نے کہا اور پھر تیز تیز قدم چلتا ہوا لان میں آ گیا۔

"دیوی! تیرے میرے بیچ نوکر آئیں گے تو پچھتائیں گے۔ انہیں روک دے۔" شمبھو مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ تیرا میرا معاملہ ہے' ان سے کیا مطلب؟"

شمبھو غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ قاسم یا عبدل اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ انہیں مداخلت کرنے کی وجہ سے شمبھو کوئی نقصان پہنچا دیتا۔ یہی سوچ کر میں نے بلند آواز میں قاسم سے کہا۔ "اسے میں نے بلایا ہے۔ تم پھاٹک پر جاؤ۔"

قاسم اب قریب آ چکا تھا' میری یہ بات سن کر کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! مگر یہ آیا کدھر سے؟"

"ابے او گھامڑ کی اولاد!" شمبھو بول اٹھا۔ "کیا تو دیوی کے پجاریوں کو دیوی کے پاس آنے جانے سے روک سکتا ہے؟ یہ دیکھ میں چلا گیا۔"

شمبھو اچانک نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ قاسم کی آنکھیں حیرت سے پھیلی رہ گئیں۔ وہ بالکل بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑا تھا۔

"اور یہ دیکھ' میں پھر آ گیا۔" شمبھو دوبارہ ظاہر ہو گیا۔

"بب .... بھو .... بھوت۔" قاسم چیخ اٹھا۔

اس پر شمبھو نے زوردار قہقہہ لگایا اور پھر "جے دیوی مائی" کا نعرہ مار کر چمٹا بجاتے ہوئے میرے چاروں طرف رقص کرنے لگا۔

"شمبھو!" اچانک میں اس پر برس پڑی۔ "تُو پھر اپنی کمینگی پر اتر آیا' چلا جا یہاں سے۔"

"ابھی تو ٹھیک سے درشن بھی نہیں کئے دیوی! تُو نے چہرہ تو چھپا رکھا ہے' ایک بار درشن کرا دے چلا جاؤں گا۔"

مجھے جانے کیا سوجھی کہ چہرے سے ماسک اتار دیا اور چیخی۔ "لے دیکھ۔" پھر میں نے اس کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

"بھگوان تیرا بھلا کرے دیوی! اب تیرا شمبھو رات کو آئے گا' اس سمے جب تیرے پاس کوئی نہیں ہو گا۔ جے دیوی مائی!" وہ نعرہ لگاتے ہی غائب ہو گیا۔

قاسم اب تک کسی مجسمے کی طرح چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ ایسی ہی حالت عبدل کی تھی جو کھرپی ہاتھ میں لئے آنکھیں پھاڑے اس طرف دیکھے جا رہا تھا جہاں چند لمحے پہلے شمبھو موجود تھا۔ دونوں ہی کی حالت قابل دید تھی۔ انہوں نے شاید اپنی ساری زندگی میں ایسا حیران کن منظر نہیں دیکھا ہو گا۔

میرے ہاتھ میں چہرے سے اتارا ہوا ماسک تھا اور یہ بھی یقیناً ان دونوں کے لئے حیرت انگیز بات ہی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گئی اور ماسک کو میز پر رکھ دیا۔

"قاسم! یہاں کیوں کھڑے ہو؟ میں نے تم کو پھاٹک پر جا کر کھڑے ہونے کو کہا تھا۔"

"جج .... جی بے .... بیگم صاحبہ!" وہ ہکلایا۔ "م .... مگر وہ کون تھا؟"

"میرا ایک پجاری۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ جیسے یہ کوئی خلاف معمول بات نہ ہو۔ "کیا تم نے نہیں سنا' وہ مجھے دیوی کہہ رہا تھا اور میرا درشن کرنے آیا تھا۔"

"آ .... آپ دیوی .... دیوی .... ہیں! مگر راجہ استاد نے تو بتایا تھا کہ .... آپ بمبئی کی رانی ہیں۔" قاسم لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں میں بمبئی کی رانی بھی ہوں اور دیوی بھی۔ میرا پورا نام رانی دیوی ہے۔ اور دیوی کے پجاری بھی ہوتے ہیں۔ یہی نہیں' میرے اور بہت سے پجاری ہیں۔ جنہیں تم آتے جاتے دیکھو گے' مگر ان کی ضرورت نہیں' نہ کسی سے اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی باتیں کسی پر ظاہر نہیں کی جاتیں ورنہ معلوم ہے' کیا ہوتا ہے؟ آدمی کو سوتے سوتے اچانک ایسا لگتا ہے جیسے کوئی نادیدہ وجود اس کا گلا گھونٹ رہا ہے اور پھر صبح وہ مردہ حالت میں پایا جاتا ہے۔"

"نن .... نہیں!" قاسم خوفزدہ ہو کر گھگھیایا۔ "میں .... میں کسی سے نہیں کہوں گا۔"

اسی وقت مجھے ایک اور خیال آیا۔ اس طرح ہر وقت گھر میں شیتل' شہزاد یا میرے چہرے پر ماسک چڑھائے رکھنے کی ضرورت نہ رہتی۔

"اور سنو قاسم! آج تم نے میرا اصل چہرہ تو دیکھ لیا۔ اس کوٹھی میں دو اور چہرے ایسے ہیں جو تم

نے نہیں دیکھے' وہ بھی دیکھ لو اور یاد رکھو' یہ ذکر بھی تمہیں کسی سے نہیں کرنا۔ آؤ میرے ساتھ۔" میں کھڑی ہو گئی' پھر اندر جاتے ہوئے عبدل کو بھی ساتھ لے لیا۔

اندر رحمت اور غنی بھی موجود تھے۔ چاروں نئے ملازمین کی موجودگی میں شہزاد اور شیتل کے چہروں سے میں نے ماسک اتروا دیئے۔

"یہ لوگ اب اپنے ہیں' ان سے چہرے چھپانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اجنبیوں کے سامنے ماسک کے بغیر نہیں آنا۔" میں نے شیتل اور شہزاد کو تاکید کی۔ "یہ آزادی صرف اس عمارت کی حدود تک ہے' وہ بھی اس صورت میں جب کہ کوئی اجنبی عمارت میں موجود نہ ہو۔"

قاسم وغیرہ چلے گئے تو شہزاد نے کہا۔ "خاتون! یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ ہر وقت ماسک پہنے رہنے سے نجات مل گئی۔"

جواباً میں مسکرا دی۔ وہ اندر تھا اور اسے خبر نہیں تھی کہ مجھے کس لئے ماسک اتارنا پڑا تھا۔ اسے کوٹھی میں شمبھو کی آمد کا پتا چل جاتا تو اس وقت خوش نظر نہ آ رہا ہوتا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ شمبھو نے رات کو آنے کے لئے کہا تھا' کیا واقعی وہ آئے گا؟ اسی سوچ بچار میں کھانے کا وقت ہو گیا اور میں نے کھانا کھا لیا' پھر لان میں چہل قدمی کے لئے آ گئی۔ اب رات کے آٹھ بجنے والے تھے اور مجھے ارشاد حسین کی آمد کا انتظار تھا۔ اس نے آٹھ اور نو بجے کے درمیان آنے کو کہا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد مجھے پھاٹک کی طرف سے قاسم کی آواز سنائی دی۔ وہ پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر کسی سے پوچھ رہا تھا۔ "کس سے ملنا ہے سردار جی!"

"رانی جی سے!" جواب میں' میں نے ارشاد حسین کی آواز سنی۔ "میرا نام ہردیال سنگھ ہے جی' ان کو بولو' جا کر۔"

"آپ یہیں ٹھہرو سردار جی! میں پوچھتا ہوں۔" قاسم یہ کہہ کر مڑا۔

"آنے دو سردار جی کو!" میں نے بلند آواز میں قاسم سے کہا۔

"آئیں سردار جی!" میری اجازت ملنے کے بعد قاسم ذیلی دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔

سر پر پگڑی باندھے اور چہرہ گھنی داڑھی مونچھوں کے پیچھے چھپائے ارشاد حسین اندر داخل ہوا۔ لان میں ابھی تک کرسیاں پڑی تھیں۔ میں نے اسے وہیں بٹھا لیا۔ اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی کوٹھی میں اب تو اور نئے چہرے نظر آ رہے ہیں؟"

"ہاں' میں نے چار نئے ملازم اور رکھ لئے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "چوکیدار' مالی' باورچی اور اوپر کے کام کے لئے مزید ایک ملازم۔"

"دو ملازم پہلے ہی آپ کے پاس تھے' گویا اب چھ ملازم ہو گئے۔ ملازمین کی خاصی عادی معلوم ہوتی ہیں آپ۔ کبھی کبھی تو آپ کے عادات و اطوار دیکھ کر واقعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی ریاست کی شہزادی ہیں۔ ہاں یہ چہرے پر آج میک اپ نظر نہیں آ رہا' کیا بات ہے؟"

"چہرہ تو اجنبیوں سے چھپایا جاتا ہے۔ آپ میرے لئے کون سے اجنبی ہیں۔" میں بولی۔

"ایک خوشخبری سنا دوں آپ کو۔ ماں جی زندہ بچ گئی ہیں۔ انہیں بروقت طبی امداد مل گئی تھی۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ان کی حالت ٹھیک نہیں لیکن جو ڈاکٹر ان کا علاج کر رہے ہیں' کہتے ہیں ماں جی کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ گولی ان کے سینے سے نکال لی گئی تھی۔"

"یہ سن کر واقعی بے حد خوشی ہوئی ارشاد!" میں نے اظہار مسرت کیا۔

"کل آپ نے جو کارنامہ انجام دیا' اس پر میرے تمام ساتھی بہت خوش ہیں اور مزید جو کارنامے انجام دینے والی ہیں اس پر بھی سبھی پوری طرح متفق ہیں۔ میرے توسط سے انہوں نے یہ پیشکش کی ہے کہ ڈیسوزا کے اغوا میں وہ آپ کی ہر ممکن مدد کرنے پر آمادہ ہیں۔ اسے اغوا کرنے کے بعد اگر جگہ چاہئے تو یہ بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔ ڈیسوزا کے اغوا کی ذمے داری قبول کرنے سے بھی انہیں انکار نہیں۔ البتہ ان کی یہ خواہش ضرور ہے کہ عملاً وہ بھی ڈیسوزا کے اغوا میں شریک رہیں۔"

"اب تو یہ ممکن نہیں رہا ارشاد! اغوا کے سلسلے میں جو تیاریاں ضروری تھیں' وہ میں کر چکی ہوں۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ سے کبھی کبھی بات بگڑ بھی جاتی ہے۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' میں تو اپنے ساتھیوں کے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ ویسے آپ نے بڑی تیزی دکھائی۔"

"آج رات یا پھر کل رات تک ڈیسوزا میرے قبضے میں ہو گا' اس سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔" میں نے بتایا۔ "باقی آپ جانیں کہ حکومت سے کب اور کس طرح آپ کو اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کرنا ہے۔ ہاں مجھے ایک بات پوچھنا تھی' آپ سے۔ کیا پارک سرکس والے مکان کی نگرانی اب تک کی جا رہی ہے؟"

"جی ہاں۔" ارشاد حسین نے جواب دیا۔ "محکمے والوں کا خیال ہے' آپ کے دونوں ملازمین وہاں ضرور آئیں گے۔ اس لئے کہ مکان میں خاصا قیمتی ساز و سامان موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ انہوں نے مالک مکان سے بھی رابطہ قائم کر لیا ہے۔ مالک مکان کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ جب بھی آپ کے ملازمین اس سے ملیں' وہ انہیں کسی بھی بہانے روک کر قریبی تھانے میں یہ اطلاع دے دے۔ کیوں' کیا آپ وہاں سے اپنا فرنیچر وغیرہ نکالنا چاہتی ہیں؟"

"فرنیچر سے تو مجھے خیر کوئی زیادہ دلچسپی نہیں' ہاں کتابوں کا ضرور خیال ہے جو کئی الماریوں میں محفوظ ہیں۔ بہرحال اگر خفیہ پولیس والے وہاں دام بچھائے بیٹھے ہیں تو فی الحال کتابوں کو بھی صبر کرنا پڑے گا۔ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اب میں محتاط رہوں گی۔"

اس وقت ارشاد حسین زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ اسے کوئی کام تھا۔ میں نے بھی اسے نہیں روکا۔ وہ چلا گیا تو میں اٹھ کر اندر آ گئی۔

معلوم نہیں اس رات مجھے کیوں کچھ بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید اس کی وجہ یہ

ہو کہ شمبھو نے اس رات آنے کو کہا تھا' مگر پہلے تو کبھی مجھے اس سے خوف یا بے چینی محسوس نہیں ہوئی۔ پھر آج کیا خاص بات ہے؟ میں سوچتی رہی' مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کوٹھی سے نکل کر کہیں چلی جاؤں' یہ رات اپنی کوٹھی میں گزارنے کے بجائے کہیں اور گزاروں لیکن کہاں اور کیوں؟ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک بار یہ بھی خیال آیا کہ راجہ استاد کے گھر چلوں' پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کیا خبر آج رات راجہ استاد اور ہمایوں' شنکر دادا کے ساتھ مل کر ڈیسوزا کو اغوا کرنے گئے ہوں یا جانے والے ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور لباس تبدیل کر کے سونے کے لئے بستر پر لیٹ گئی۔

طبیعت میں اضطراب اس قدر تھا کہ میں لیٹے لیٹے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ ساری کوٹھی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عرصہ دراز سے مجھے عظیم اور نیک روح مہین کی پُراسرار سرگوشیاں بھی سنائی نہیں دی تھیں۔ مہین کی طرف سے مجھے کوئی نئی ہدایات نہیں ملی تھیں۔ میں نے مہین ہی کی سرگوشیوں کے نتیجے میں نئی شخصیت اپنائی تھی۔ مہین ہی نے میری اس غلطی کی نشاندہی کی تھی کہ مجھے پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں میں آنے کے بعد اپنے اصل نام اور شخصیت کی پردہ پوشی کرنا چاہئے تھی۔ سو میں نے اب اسی پردہ پوشی کی خاطر کلکتے میں ازسرنو ایک نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس طرح خفیہ پولیس کے محکمے کو تو میں دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئی تھی مگر شمبھو نے میرا سراغ لگا لیا تھا۔ اس نے مجھے اغوا کر کے لے جانے کے بعد جس طرح ذہنی اور جسمانی اذیت دی تھی' وہ جیسے میری روح پر قرض تھی۔ آج شام اسے اپنی کوٹھی میں دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا تھا لیکن میں اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکی تھی۔ ایک تو مجھے قاسم کی مداخلت نے اتنی مہلت نہیں دی' دوم شمبھو کچھ ہی دیر رک کر خلاف توقع فوراً غائب ہو گیا۔

میں جب ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی تو دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اب میں سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے ذہن میں غنودگی طاری ہوتی جا رہی تھی کہ اچانک مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں ہلکا نیلا بلب جل رہا تھا لیکن اس وقت بلب کی روشنی ماند پڑ گئی تھی۔ کمرے کے اندر دھواں بھرا ہوا تھا۔ پھر چند ہی لمحوں میں دھواں چھٹ گیا۔ میں نے بڑے مہاراج کو ظاہر ہوتے دیکھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا' اس کے ساتھ شمبھو بھی نظر آ رہا تھا۔

میں نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا لیکن اپنے جسم کو خفیف سی حرکت بھی نہ دے سکی۔ میرے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ پہلے بھی جب بڑے مہاراج کو میں نے دیکھا تھا تو ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ پہلی کوٹھی کے دوران قیام کی بات تھی۔ اس وقت پہلی مرتبہ بڑے مہاراج سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

"شمبھو! اسے اب تک ہم نے بہت ڈھیل دے دی۔" اچانک بڑے مہاراج کی آواز کمرے میں گونجی۔ میں سمجھ چکی تھی کہ اس وقت میں بڑے مہاراج کی پُراسرار شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہوں۔ وہ اب شمبھو سے کہہ رہا تھا۔ "اب سمے آ گیا ہے کہ اسے اور ڈھیل نہ دی جائے۔ باندھ لے اسے اور ساتھ لے چل .... اور سن' تُو نے ہم سے اس کے وشے (بارے) میں جو پرارتھنا کی تھی' سو ہم نے سویکار کر لی' پرنتو یہ ایک ہی رات اسی دشا (حالت) میں تیرے پاس رہے گی۔ یہ تیری اس محنت کا پھل

ہے کہ تُو نے اس کا کھوج نکال لیا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی شمبھو میری طرف بڑھا۔

میں نے دیکھا کہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر شمبھو آ کے رک گیا اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کے ہونٹ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ اسی کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کو کسی نادیدہ شے سے باندھا جا رہا ہو۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹانا چاہیں تاکہ وہ مجھ پر جو عمل کر رہا ہے نہ کر سکے لیکن ایک انجانی کشش میری اور اس کی نظروں کے درمیان موجود تھی۔ میں نظریں نہ ہٹا سکی۔ میرا جسم ایک نادیدہ گرفت میں آ گیا اور پھر میں نے شمبھو کو ہاتھ سے اشارہ کرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا جسم فضا میں بلند ہونے لگا۔ "باندھ لے اسے" کا مطلب اب میری سمجھ میں آیا تھا۔

معاً شمبھو ایک جھٹکے سے مڑا۔ اس جھٹکے کا اثر میں نے اپنے جسم پر بھی محسوس کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم رسی سے بندھا ہو اور کسی نے رسی کو جھٹکا دے کر کھینچا ہو۔ بڑے مہاراج نے میرے جسم کو ہوا میں تیرتے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر عجیب سی شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اچانک اس نے دونوں ہاتھ بلند کئے اور کمرے میں ایک بار پھر دھواں بھر گیا۔ اس مرتبہ دھواں جلد نہیں چھٹا۔ مجھے ہر طرف دھویں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اس عالم میں مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ اب میرے لئے اس دھویں میں سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ میرے ذہن پر اب اندھیرے کی چادر پھیلتی جا رہی تھی اور میں تیز ہواؤں کا شور سن رہی تھی۔

ان تیز ہواؤں کا شور بڑھتے بڑھتے جیسے میری سماعت کا حصہ بن گیا۔ ہوش و حواس کھونے سے پہلے مجھے اتنا احساس ضرور تھا کہ میں اغوا کی جا رہی ہوں اور اغوا کرنے والے بڑے مہاراج اور شمبھو ہیں۔ وہ دونوں ہی حیرت انگیز پُراسرار شیطانی قوتوں کے مالک تھے۔ انہوں نے مجھے قطعی بے بس کر دیا تھا۔ اس غیر معمولی پُراسرار تجربے سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ پہلے شمبھو نے میرے اغوا کی خاطر کیا تدبیر آزمائی ہو گی۔ میں نے خود اپنے جسم کو فضا میں بلند ہوتے دیکھا تھا' پھر میرا جسم فضا میں تیرنے لگا تھا۔ زیادہ دیر تک میں اپنے حواس بحال نہ رکھ سکی اور بے ہوش ہو گئی۔

☆======☆======☆

معلوم نہیں کب تک مجھ پر غفلت طاری رہی۔ کچھ دیر تک تو مجھے یاد ہی نہ آ سکا کہ میں کہاں اور کن حالات سے دوچار ہوں۔ اب مجھے ہوش آ چکا تھا۔ میرے اطراف اندھیرا تھا لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں جہاں بھی ہوں' تنہا نہیں ہوں۔ وہاں کوئی اور بھی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے یاد آتا گیا کہ مجھ پر کیا گزری تھی۔ اس احساس نے میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی اور میں نے سوچا' کیا اب بھی میرے اعصاب شل ہیں؟ کیا میں اب بھی جسم کو حرکت نہیں دے سکتی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا' مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ اسی وقت مجھے قریب ہی کسی کے قدموں کی مدھم سی چاپ سنائی دی۔

"معبلہ!" کسی نے دھیمی آواز میں مجھے پکارا۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی جو میری سماعت

میں نہیں' ذہن میں گونجی تھی۔ یہ آواز میرے لئے قطعی اجنبی تھی۔ یہی آواز میں نے پھر سنی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم بول نہیں سکتیں' نہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتی ہو۔ اس کے باوجود میری بات کا جواب دینا تمہارے لئے ممکن ہے۔ تمہارے ذہن میں جو خیال آئے گا' اسے میں بھی جان لوں گی۔ تم میری آواز سن رہی ہو نا؟"

میں نے سوچا' ہاں میں سن رہی ہوں' مگر یہ عورت ہے کون؟ اسے میرا نام کیسے معلوم ہو گیا؟

"تم مجھے اپنی ایک ہمدرد سمجھ سکتی ہو۔" اس نے میرے ذہن میں ابھرنے والے خیال کو پڑھ کر جواب دیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے بولے بغیر اپنی ہمدرد سے سوال کیا۔

"یہ کالی گھاٹ کے قدیم مندر کا تہہ خانہ ہے۔" جواب ملا۔

"بڑے مہاراج اور شمبھو اس وقت کہاں ہیں؟" میں نے اپنے ذہن میں سوچا۔

"شمبھو اس وقت درگا مائی کی پوجا کر رہا ہے اور وہ پوجا کر کے تمہارے پاس آئے گا۔ رہے بڑے مہاراج تو وہ اپنے آشرم میں جا چکے ہیں' سونے کے لئے۔" جواب دیا گیا۔ "بڑے مہاراج اب صبح ہونے سے پہلے اپنے آشرم سے باہر نہیں آئیں گے۔ یہاں سے تمہارے فرار ہونے کے لئے یہ موقع اچھا ہے۔"

"مگر تم تو جانتی ہو کہ میں اپنی مرضی سے ہل بھی نہیں سکتی' پھر کس طرح فرار ہونا ممکن ہے؟" میں نے سوچا۔

"اتنا گیان مجھے بھی ہے کہ میں تمہیں کھول دوں' پر اس سے پہلے میں تم سے ایک وچن (عہد) لینا چاہتی ہوں۔ بولو کیا تم کچھ بھی جانے بغیر وچن دینے پر آمادہ ہو؟"

یہ سودا مہنگا نہیں' میں سوچنے لگی۔ اسی کے ساتھ مجھے اس تکلیف و اذیت کا خیال آیا جو شمبھو کی قید میں پہلے اٹھانا پڑی تھی۔

"میں سمجھ گئی کہ تم راضی ہو۔" اس اجنبی عورت کی آواز میرے دماغ میں گونجی۔ "میں تم سے صرف یہ وچن لینا چاہتی ہوں کہ جب تم کھول دی جاؤ تو شمبھو کو ختم کئے بغیر یہاں سے فرار نہ ہو۔ بولو کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟" اس نے دریافت کیا۔

اس عورت کی بات سن کر مجھے خیال آیا کہ اگر میرے اندر سوئی ہوئی پُراسرار قوتیں بیدار ہو جائیں تو شمبھو کو قتل کرنا مشکل نہیں ہو گا۔

"اس بات کو بھول جاؤ معبلہ! اس مندر کی حدود میں تمہاری کوئی پُراسرار قوت نہیں جاگ سکے گی۔" اس عورت نے بتایا۔

"پھر تو صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔" میرے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ شمبھو تمہارے وار سے نہیں بچ سکے گا۔" اس نے میرے

ذہن میں ابھرنے والے خیال کو پڑھ لیا۔ ”وہ آنے ہی والا ہو گا اس لئے میں تمہیں کھول کر جا رہی ہوں۔ جب تم اسے ٹھکانے لگا دو گی تو میں تمہیں یہاں سے خاموشی کے ساتھ نکال دوں گی۔“

اندھیرے کی وجہ سے مجھے اس عورت کا صرف ہیولا ہی نظر آ رہا تھا۔ کچھ اور دیکھنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوا کہ وہ عورت جو کوئی بھی تھی‘ شمبھو کی دشمن تھی۔ اس دشمنی کا سبب کیا تھا‘ کیا نہیں‘ مجھے یہ جاننے کا کوئی خاص تجسس نہیں تھا۔ میرے لئے یہ بھی جاننا کافی تھا کہ وہ شمبھو کو میرے ہاتھوں ختم کرانے کے لئے میری مدد کر رہی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے ہلکی سی بڑبڑاہٹ سنائی دینے لگی جیسے وہ اجنبی عورت منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی ہو۔ اسی کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے جسم سے نادیدہ گرفت دھیرے دھیرے ختم ہونے لگی ہے۔

ادھیر میرا جسم نادیدہ آہنی گرفت سے آزاد ہوا‘ ادھر اچانک تہہ خانے میں اجالا ہو گیا۔ میری نظر سامنے کی طرف اٹھی تو سیڑھیاں نظر آئیں۔ روشنی ادھر ہی سے آ رہی تھی۔

”وہ آ گیا معبلہ! تمہیں یہی ظاہر کرنا ہے کہ تم ابھی بندھی ہوئی ہو‘ آزاد نہیں ہوئی۔“ میرے ذہن میں اس عورت کے الفاظ گونجے۔ ”تم نے ایسا نہ کیا تو وہ تمہارے قریب نہیں آئے گا۔“

زمین پر بچھے ہوئے بستر پر میں جس طرح پڑی تھی‘ ویسے ہی بے حس و حرکت پڑی رہی۔ میری نگاہیں تہہ خانے میں اترنے والی سیڑھیوں پر تھیں۔

ذرا ہی دیر کے بعد شمبھو کو میں نے سیڑھیوں سے اتر کر تہہ خانے میں قدم رکھتے دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مجھے لیمپ نظر آ رہا تھا۔ مجھ سے پہلے اس کی نظر اجنبی عورت پر پڑی اور وہ چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میری نظر بھی اس عورت پر پڑی۔ اس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ اس کے جسم پر ہلکی سی سفید ساڑھی تھی۔ سانولی رنگت کے باوجود اس کا چہرہ بے حد پرکشش تھا۔ متناسب جسم یقیناً حسین کہا جا سکتا تھا۔

”تو یہاں کیا کر رہی ہے چمپا! تجھے تو اس سمے بڑے مہاراج کی سیوا (خدمت) میں ہونا چاہئے تھا۔“ شمبھو چونک کر اس عورت سے بولا جسے اس نے چمپا کہا تھا۔

”بڑے مہاراج سو گئے تو میں یہ سوچ کر ادھر آ گئی کہ تو پوجا کر رہا ہے‘ ایسے میں کہیں تیری یہ چڑیا نہ اڑ جائے۔“ یہ کہہ کر چمپا سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔

”اب تو آ ہی گئی ہے تو پھر ٹھہر جا اور تماشا دیکھ۔ رہا چڑیا کے اڑنے کا سوال تو اس کے پر میں نے پہلے ہی باندھ دیئے تھے۔“

”مجھے یہاں قدم رکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے پر بندھے ہوئے ہیں۔“ چمپا سیڑھیوں کے پاس رک کر بولی۔ ”میں جانے ہی والی تھی کہ تو آ گیا۔ تو عیش کر‘ مجھے یہ تماشا نہیں دیکھنا۔ بڑے مہاراج نے پہلے ہی مجھے بہت تھکا دیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مسکرائی۔

”کبھی مجھے بھی تھکانے کا موقع دے دیا کر۔“ شمبھو بے حیائی سے ہنسا۔ ”جب سے تو بڑے مہاراج کے آشرم میں گئی ہے‘ مجھے تو ترسا ہی دیا تو نے۔“

”اب تو نہیں ترسنا پڑے گا تجھے‘ یہ جو آ گئی ہے۔“ چمپا نے میری طرف اشارہ کیا۔

”کس نے کہہ دیا تجھ سے‘ کیول آج ہی رات یہ میرے پاس ہے‘ کل سے یہ بھی بڑے مہاراج کے آشرم میں چلی جائے گی۔ ایک رات میں کیا کیا ارمان نکالے جا سکتے ہیں۔“

پھر چمپا وہاں رکی نہیں اور چلی گئی۔ شمبھو نے دیوار کے ایک طاق میں لیمپ رکھ دیا اور میرے قریب آ کھڑا ہوا۔

”مجبوری ہے دیوی کہ میں تجھے کھول کر کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ بڑے مہاراج نے بھی یہی حکم دیا ہے کہ تجھے اسی دشا (حالت) میں رکھا جائے ورنہ من تو یہی کرتا ہے کہ تجھے کھول دوں اور دیکھوں‘ تیرا شریر (جسم) بھی کچھ بولتا ہے یا نہیں۔“ شمبھو نے مجھے مخاطب کیا۔ پھر وہ بڑے اطمینان سے میرے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ”کتنی سندر ہے تو!“ وہ بولا اور پھر اس کا ایک ہاتھ میرے جسم کی طرف بڑھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی نازیبا حرکت کرتا‘ میں ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دوسرے ہی لمحے میرے دانت اس کی کلائی میں اتر چکے تھے۔

شمبھو چیخ اٹھا اور اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے سر کے بال پکڑ لئے۔ میں نے اپنے دانت اس کی کلائی کے گوشت سے نکال لئے تاکہ سر اوپر اٹھا سکوں۔

”تجھے کس نے کھول دیا کتیا!“ وہ غرایا۔ پھر اس کی آواز سے گھبراہٹ کا اظہار ہونے لگا۔ ”پر .... پر یہ مجھے کیا .... مجھے کیا ہو رہا ہے؟“ اب تک میرے سر کے بال اس کی گرفت میں تھے‘ مگر گرفت اب ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ یقیناً اپنے دانتوں کے ذریعے میں نے جو زہر اس کے خون میں داخل کیا تھا‘ وہ اپنا اثر دکھا رہا تھا۔

”تو مر رہا ہے شمبھو! مر رہا ہے۔“ میں زور سے ہنس دی۔ ”تو صرف چند لمحوں کا مہمان ہے۔“

”نہیں۔“ وہ چیخ اٹھا اور میرے سر کے بال چھوڑ دیئے۔ اس کے جسم کی رنگت زہر کے سبب دھیرے دھیرے نیلی پڑتی جا رہی تھی۔

میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ شمبھو اب بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ پھر میں نے اسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے دیکھا۔ اس کے منہ سے نیلے نیلے جھاگ نکل رہے تھے۔ ادھر شمبھو کا جسم ساکت ہوا‘ ادھر میں سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ ہر چند کہ چمپا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا‘ جب میں شمبھو کو ٹھکانے لگا دوں گی تو وہ مجھے خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکال دے گی‘ مگر میں اس کے انتظار میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیا خبر وہ کب آتی۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی۔ نیچے تہہ خانے میں ہونے والی روشنی وہاں برائے نام آ رہی

تھی۔ وہاں نیم تاریکی ہونے کے باوجود میں نے یہ محسوس کر لیا بظاہر وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بائیں جانب چند سیڑھیاں دکھائی دے رہی تھیں' مگر ان کے اختتام پر سپاٹ دیوار سی تھی۔ میں چکرا کر رہ گئی۔

چند لمحے توقف کے بعد وہاں سے نکلنے کی جدوجہد میں ایک بار پھر میں نے انہی سیڑھیوں کی طرف بڑھنا شروع کیا جن کے آخر میں دیوار تھی۔ عین اسی لمحے سیڑھیوں کے اوپر دیوار میں خلا نمودار ہوا۔ اسی خلا سے روشنی بھی اندر آئی۔ خلا میں مجھے چمپا کا چہرہ نظر آیا۔ یقیناً مجھ پر اس کی نظر بھی پڑ چکی تھی۔

”کیا تُو نے اسے نرگ (جہنم) میں بھیج دیا؟“ چمپا نے مجھے مخاطب کیا۔

”ہاں۔“ میں جلدی سے بولی۔ ”اور مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔“

”اپنی دائیں اَور (طرف) دیکھ .... کچھ نظر آ رہا ہے؟“ وہ بولی۔ ”سیڑھیاں دکھائی دے رہی ہیں؟“

میں نے چمپا کے کہنے پر ادھر دیکھا کچھ ہی فاصلے پر سیڑھیاں نظر آئیں جو اندر اترتی چلی گئی تھیں۔

”ہاں ادھر بھی سیڑھیاں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر اتر جا اندر کہ وہی تیرا استھان (مقام) ہے۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”اب بھی مطلب نہیں سمجھی۔“ وہ خلاف توقع زور سے ہنس دی' پھر کہنے لگی۔ ”سن! جب تُو سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچے گی تو سامنے ہی تجھے ایک سرنگ نظر آئے گی جس میں روشنی ہو گی۔ اس سرنگ سے گزر کر تو اپنے استھان تک پہنچ جائے گی' بڑے مہاراج کے آشرم تک' وہی تیرا استھان ہے۔“

”مگر تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ .... کہ مجھے یہاں سے خاموشی کے ساتھ نکال دوں گی؟“ میری آواز میں احتجاج اور غصہ تھا۔

”نکالتی تو جب کہ تُو خود وہاں سے نکل نہ آتی۔“ اس کے لہجے سے عیاری عیاں تھی۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو نے مجھے دھوکا دیا ہے۔“ میں سخت آواز میں بولی۔

”نہیں' اسے دھوکا دینا نہیں کام نکالنا کہتے ہیں۔ شمبھو بھی کیسا نادان تھا کہ یہاں کی ریت بھول گیا۔ بھلا کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ کوئی اَن چھوئی ناز بڑے مہاراج سے پہلے کسی اور کو چھونے دی جائے۔ شمبھو کو اسی کی سزا ملی۔“

”تو تیری ہی طرح تیرا بڑا مہاراج بھی..........“ پھر جو کچھ میں کہنا چاہتی تھی نہ کہہ سکی .... میری قوت گویائی جیسے سلب ہو گئی تھی۔

”تیری زبان باندھ دی ہے میں نے کہ تُو بڑے مہاراج کی شان میں گستاخی نہ کر سکے۔ جس

طرح میں نے تیری زبان باندھی ہے' تیرے پورے شریر (جسم) کو باندھ سکتی ہوں' پر میں چاہتی ہوں کہ تُو خود اپنے پیروں پر چل کر بڑے مہاراج کے آشرم میں داخل ہو۔“

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ اس عیار عورت نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں بڑے مہاراج کی مرضی شامل ہے۔ چمپا بھی شیطانی قوتوں کی مالک تھی' مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ میرے لئے اگر کوئی باعث اطمینان بات تھی تو صرف یہ کہ میں نے شمبھو کو ٹھکانے لگا دیا تھا جو مجھ سے اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل چاہتا تھا لیکن چمپا نے بڑے مہاراج کے بارے میں جو کچھ کہا تھا' وہ بھی میرے نزدیک تشویش ناک ہی تھا۔ چمپا کے الفاظ سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ بڑا مہاراج بھی ہوس کار تھا۔ تو کیا اس نے مجھے اسی لئے اغوا کیا ہے؟ میں سوچنے لگی۔

”بہتر یہی ہے کہ تُو خود سیڑھیاں اتر کر اندر چلی جا ورنہ میں تجھے اس پر مجبور بھی کر سکتی ہوں۔“ چمپا ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

میں دل ہی دل میں اس عیار عورت کو برا بھلا کہنے لگی پھر اچانک ایک فیصلہ کر کے انتہائی تیزی سے ان سیڑھیوں کی طرف لپکی جن کے اوپر خلا میں چمپا کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ میری زبان ضرور باندھ دی گئی تھی مگر بقیہ جسم ابھی آزاد تھا۔ میں اسی سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

ابھی اوپر چڑھنے کے لئے میں نے پہلی ہی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ میرے جسم کو زبردست جھٹکا لگا اگر میں خود کو سنبھال نہ لیتی تو اس جھٹکے کی وجہ سے پیچھے جا گرتی۔

چمپا نے میری بے بسی پر زوردار قہقہہ لگایا' پھر کہنے لگی۔ ”کیوں خود کو تھکا رہی ہے' تُو یہاں سے نہیں نکل سکتی۔ جا' واپس چلی جا' اتر جا اندر۔ مجھے زبردستی پر مجبور نہ کر۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں .... نہیں مان رہی .... اچھا تو پھر یہ لے۔“

معاً مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم میں آگ سی لگی گئی ہو۔ میں تڑپ کر پلٹی تو دائیں جانب موجود سیڑھیوں کی جانب سے سرد ہوا کا جھونکا سا آتا محسوس ہوا۔ میں ادھر لپکی اور پھر سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ اسی کے ساتھ میرے جسم میں بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی۔ چمپا نے کی پُراسرار شیطانی عمل کے ذریعے مجھے واقعی تہہ خانے میں اترنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہی سامنے ایک سرنگ دکھائی دی۔ ٹھنڈک ادھر ہی سے محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جیسے ہی سرنگ کے اندر قدم رکھا جسم کی آگ بجھ گئی۔ میں آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔

”نہیں' اب تجھے پلٹنا نہیں ہے۔“ میرے دماغ میں چمپا کی آواز گونجی۔

میں چمپا کی تاکید کے باوجود اپنے ارادے سے باز نہ آئی اور پلٹ کر بھاگی۔ سرنگ سے باہر آتے ہی مجھے گرمی لگی جسے میں برداشت کر گئی۔ اب میں ایک بار پھر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر جا رہی تھی۔ لمحہ لمحہ جسم کی حدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا مگر میں نے پرواہ نہیں کی۔ اوپر پہنچی تو وہ خلا غائب تھا جہاں کچھ دیر پہلے مجھے چمپا کا سانولا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اب گرمی میرے لئے

ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی دہکتے ہوئے تنور میں ہوں۔

جلد ہی میری قوت مدافعت دم توڑ گئی اور میں تیزی کے ساتھ پلٹی۔ ٹھنڈک جیسے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں پھر مجھے سرنگ ہی میں واپس پہنچنے کے بعد سکون ملا۔ چمپا مجھے بتا چکی تھی کہ اس سرنگ کو عبور کر کے میں بڑے مہاراج کے آشرم میں پہنچ جاؤں گی واپسی ممکن نہیں تھی اسی لئے مجبوراً مجھے آگے بڑھنا پڑا۔

سرنگ سے نکل کر میں نے ایک بڑے سے کمرے میں قدم رکھا تو یوں لگا' خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں آ گئی ہوں۔ وہاں آنکھوں کو ٹھنڈک بخشنے والی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی کا مخرج نہ معلوم کہاں تھا' فرش پر دبیز قالین بچھے تھے اور فضا میں خوشبو تیر رہی تھی۔ نوجوان و حسین لڑکیاں باریک ریشمی لبادوں میں ملبوس اِدھر اُدھر دراز و نیم دراز تھیں۔ ان ہی کے درمیان میں نے بڑے مہاراج کو دیکھا۔ اس کے جسم پر بھی اس وقت دھوتی کی بجائے ایک ڈھیلا ڈھالا ریشمی لبادہ نظر آ رہا تھا۔ رنگ و خوشبو کی اس دنیا میں ایک میں ہی اجنبی تھی۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ ان میں سے کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ معاً میں نے چمپا کو اس کمرے کے ایک دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے جسم پر بھی اب مجھے ایک ریشمی لبادہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے ریشمی لبادے کا رنگ سرخ تھا جبکہ وہاں موجود دوسری لڑکیاں سبز رنگ کے لبادے زیب تن کئے ہوئے تھیں۔ بڑے مہاراج کے جسم پر پیلے رنگ کا لبادہ تھا۔ چمپا کے ہونٹوں پر مجھے عجیب سی شیطانی مسکراہٹ نظر آئی۔ میں اس کی وجہ نہ جان سکی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے اس کمرے کے ایک دروازے سے باہر لے آئی۔

"تم تھکی ہوئی ہو اس لئے آج رات آرام کرو' کل رات تمہیں بنا سجا کر بڑے مہاراج کی سبھا (محفل) میں لے جاؤں گی۔" چمپا کے لہجے میں نرمی اور یگانگت تھی۔

وہ مجھے اپنے ساتھ ایک راہداری میں لے آئی۔ اس راہداری میں دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کمروں کے دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ بائیں جانب ایک کمرے کے دروازے پر رک کر چمپا نے میری طرف دیکھا اور پھر دروازہ کھول دیا۔

کمرے کے اندر ایک لیمپ روشن تھا۔ چمپا میرا ہاتھ تھامے اندر داخل ہو گئی۔ اس کشادہ کمرے میں دائیں جانب ایک مسہری پر بستر بچھا ہوا تھا۔

"جاؤ آرام کرو۔" چمپا نے مسہری کی طرف اشارہ کیا پھر کہنے لگی۔ "تمہاری زبان میں نے کھول دی ہے' اب تم بول سکتی ہو۔"

"مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" زبان کا قفل کھلتے ہی میں نے پہلا سوال کیا۔

"درگا مائی کی داسی بنانے۔" اس نے جواب دیا پھر خود ہی بتایا۔ "اور جو درگا مائی کی داسیاں بن جاتی ہیں' ان پر صرف بڑے مہاراج کا ادھیکار (حق) ہوتا ہے۔ تم نے بڑے مہاراج کی سیوا (خدمت) کرنی ہے' جنہیں ابھی تم نے دیکھا تھا' وہ سب درگا مائی کی داسیاں ہی تھیں۔"

"داسی بننے کے لئے کیا کرنا پڑتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے' تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ اس کی پہلی شرط کنواری ہونا ہے جیسے کہ تم کنواری ہو۔ دوسری شرط بڑے مہاراج کی پسند ہے۔ بڑے مہاراج کی پسند کے بغیر کسی کو بھی داسی نہیں بنایا جاتا۔ بڑے مہاراج جب کسی داسی کو سویکار (قبول) کر لیتے تو اسے ایسی شکتی (طاقت) مل جاتی ہے کہ پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنے آگے نہیں جھکا سکتی۔ تم نے میری شکتی دیکھ ہی لی۔ میں بھی بڑے مہاراج کی پرانی داسیوں میں سے ایک ہوں۔"

چمپا جو کچھ کہہ رہی تھی' مجھے اس سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ دراصل میں اسے باتوں میں لگا کر اپنی طرف سے غافل کرنا چاہتی تھی۔

"نہیں معبلہ!" وہ ایک دم اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ "شمبھو کی طرح تم میرے جسم میں اپنا زہر نہیں اتار سکتیں.......... سنو معبلہ! میری دشمنی تمہیں مہنگی پڑے گی۔"

معلوم نہیں اس نے کس طرح میرے ذہن میں پیدا ہونے والے خیال کو پڑھ لیا تھا اور چوکنا ہو گئی تھی۔

"لیکن میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" میں صاف مکر گئی۔ "تمہیں یقیناً میری طرف سے غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"بے وقوف لڑکی!" اس کا لہجہ بدل گیا۔ "تُو سمجھتی ہے کہ مجھے دھوکا دے سکتی ہے.......... جھوٹ بولتی ہے' مجھ سے۔ تیرا علاج اب یہی ہے کہ میں تجھے یہاں باندھ کر ڈال جاؤں۔" یہ کہتے ہی اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اس کے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔

اس کے ساتھ میں نے اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس کئے۔ پھر جیسے کسی نے مجھے دھکا دے کر مسہری پر گرا دیا۔ میں نے صرف یہ دیکھا تھا کہ چمپا نے ہوا میں اپنا ہاتھ لہرایا تھا۔ اس کے بعد چمپا کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ میرے احاطہ نظر میں تھا۔ دروازے کو وہ کھلا ہی چھوڑ گئی تھی۔ دروازہ بند کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی' بستر سے اٹھنا تو درکنار میں تو اب اپنے جسم کو حرکت دینے سے بھی قاصر تھی۔ میں سوچنے لگی کہ اگر میرے ذہن میں شمبھو کی طرح چمپا کو بھی ٹھکانے لگانے کا خیال نہ آیا ہوتا تو شاید وہ میرا یہ حشر نہ کرتی۔ چمپا کی اطلاع کے مطابق آئندہ رات مجھے بڑے مہاراج کے سامنے سجا بنا کر پیش کیا جانا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں کل تک محفوظ تھی یا میرے پاس آئندہ رات تک کی مہلت تھی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس عیار عورت نے مجھے ایک بار پھر دھوکا دیا ہے۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ میں مطمئن ہو کر سو جاؤں' مگر اس کے باوجود میرے اضطراب نے مجھے سونے نہ دیا۔ میں اپنی طرف سے غافل نہ ہو سکی۔

زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی اور چونک اٹھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا میرے ہی کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دانستہ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر پلکوں کے درمیان جھری رہنے دی۔ آنکھیں بند کرنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ اس کے باوجود میں اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ قدموں کی چاپ قریب آتی گئی۔ میری نظریں دروازے ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں کچھ ہی دیر میں کمرے کے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا اور اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ بڑے مہاراج کی آمد کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس کی نظریں میرے ہی جسم پر جمی ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی بڑے مہاراج کے جسم پر پیلا لبادہ تھا۔ وہ آہستہ قدمی سے چلتا ہوا مسہری کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"تُو ابھی سوئی نہیں' جاگ رہی ہے۔" معاً اس نے مجھے مخاطب کیا۔

معلوم نہیں اس نے کس طرح یہ جان لیا تھا کہ میں جاگ رہی ہوں حالانکہ بظاہر میری آنکھیں بند ہی تھیں۔

"جواب دے میری بات کا کہ تیری زبان سے گرفت ہٹا لی گئی ہے اور آنکھیں بھی کھول دے۔" وہ پھر بولا۔

اب مزید آنکھیں بند کئے رکھنا فضول ہی تھا۔ میں نے اسی لئے آنکھیں کھول دیں اور پھر بڑے مہاراج سے کہا۔ "مجھ سے تو چمپا نے کہا تھا کہ مجھے آئندہ رات تمہارے سامنے پیش کیا جائے گا پھر تم آج ہی رات اور خود ہی کیوں میرے پاس چلے آئے؟"

"مجھے تم سے کچھ ضروری اور نہایت اہم بات کرنا تھی معبلہ!" اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا پھر اس سے پہلے کہ میں پوچھتی' وہ اہم بات کیا ہے' وہ خود ہی بول اٹھا۔ "میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں معبلہ! مگر اس سے پہلے تمہیں یہ بتا دوں کہ مجھے معلوم ہے' تم پہاڑوں سے اتر کر یہاں کیوں آئی ہو!" یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہ میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ "میں چاہوں تو زبردستی بھی تمہیں اپنی آغوش کی زینت بنا سکتا ہوں معبلہ! مگر کسی لڑکی کے ساتھ میں نے آج تک ایسا نہیں کیا۔ میں مکمل خود سپردگی کا قائل ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم خود اپنی مرضی سے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دو۔ اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ معبلہ! تو میں تمہارے دشمن ثریان کو تمہارے قدموں میں لا کر ڈال دوں گا۔ بولو معبلہ! کیا تمہیں یہ سودا منظور ہے؟"

بڑے مہاراج کی زبان سے اپنے دشمن کا ذکر سن کر میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر بڑے مہاراج نے مزید کہا۔ "مجھے یہ بھی خبر ہے معبلہ کہ تم کوئی معمولی لڑکی نہیں ہو۔ میں زبردستی تمہارے جسم کو تو فتح کر سکتا ہوں مگر تمہاری روح کو نہیں۔ میں اسی لئے تم سے سودا کرنے آیا ہوں۔ یہ سودا تمہارے اور میرے دونوں کے لئے سودمند ہے۔ اپنے دشمن سے انتقام لے کر تمہارے سینے میں بھڑکتا ہوا الاؤ سرد ہو جائے گا اور تمہیں پا کر مجھے بھی میری منزل مل جائے گی۔ یہ سودا قبول کرنے کی صورت میں اپنی وفاداری کے اظہار کی خاطر تمہیں

خود کو اپنی مرضی سے میرے حوالے کرنا پڑے گا۔ اس طرح مجھے یقین آ جائے گا کہ تم میرے ساتھ دھوکا نہیں کرو گی۔"

"یعنی تم ثریان کو میرے قدموں میں اسی وقت لا کر ڈالو گے کہ جب میں تمہاری ہوس کی بھینٹ چڑھ جاؤں۔ مطلب یہ کہ تم پہلے اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتے ہو؟" میں نے بڑے مہاراج سے وضاحت چاہی کیونکہ میری دانست میں اس کے الفاظ مبہم تھے۔

میرے سوال پر اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ ناچنے لگی۔ "ظاہری بات ہے ورنہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم بعد میں اپنے وعدے پر پھرو گی نہیں۔ ویسے یہ تمہاری زیادتی ہے معبلہ کہ تم میرے عشق کو ہوس کا نام دے رہی ہو۔"

"عشق میں کیا جسمانی تعلق ضروری ہے؟" میں چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بغیر ملن کے عشق کیسا' ملن تو عشق کی انتہا ہے۔"

"تو پھر تمہارا یہ ناپاک خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔" میں نے نفرت و حقارت کے ساتھ کہا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر تم اپنے انتقام کی آگ میں جیون بھر اسی طرح سلگتی تڑپتی رہو گی۔ تم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گی۔ اپنے دشمن کو تم کبھی تلاش نہیں کر پاؤ گی۔ تمہارا جیون اسی طرح میری قید میں گزر جائے گا۔ میں تمہیں کل تک سوچنے کی مہلت دے سکتا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے سوچ لو معبلہ! یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ مڑا۔ "کل بھی اگر تمہارا جواب انکار میں ہوا تو مجھے مجبوراً دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اگر تم زبردستی ہی چاہتی ہو تو یہی سہی۔"

"لیکن ابھی تو تم کچھ اور کہہ رہے تھے کہ تم نے آج تک کسی لڑکی کے ساتھ زبردستی نہیں کی۔"

"تمہارا معاملہ اور لڑکیوں سے مختلف ہے معبلہ! کبھی کبھی کسی معاملے میں آدمی کو اپنے اصول بھی توڑنے پڑتے ہیں۔ اگر تمہارے حصول کی خاطر مجھے اپنا کوئی اصول بھی توڑنا پڑا تو اس پر مجھے دکھ نہیں ہو گا لیکن ذمے دار تم خود ہو گی' میں نہیں۔ تم نے اس وقت میرے اظہار عشق کے جواب میں جس نفرت و حقارت کا اظہار کیا ہے' اس کی سزا بہرحال آج ہی رات تمہیں بھگتنا پڑے نہ۔ جانتی ہو میں نے شمبھو کو تمہارے ہاتھوں کیوں مروا دیا؟ صرف اس لئے معبلہ کہ شمبھو نے تمہارے ملن کی تمنا کی تھی۔ آئندہ ایک بات کا خیال رکھنا معبلہ کہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے تمہاری زبان پر ایسے الفاظ نہیں آنا چاہئیں جن کی وجہ سے تمہیں سزا بھگتنا پڑے۔" پھر وہ رکا نہیں اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

بڑے مہاراج کی اس وقت آمد نے مجھے شدید الجھن میں مبتلا کر دیا۔ میرے لئے یہ بات انتہائی حیران کن تھی کہ اسے معلوم تھا' میں پہاڑوں سے اتر کر آئی ہوں اور یہ کہ اس کا سبب کیا ہے۔ وہ ثریان سے بھی واقف تھا اور اس بات سے بھی کہ میں ثریان سے انتقام لینا چاہتی ہوں۔

پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں میں آنے کے بعد میں نے اب تک کسی سے بھی ثریان کا ذکر نہیں کیا تھا پھر بڑے مہاراج کو اس سے میری دشمنی کا علم کیسے ہو گیا تھا؟ یہی سوچتے ہوئے ماضی کا ایک اور واقعہ یاد آیا۔ شمبھو نے ایک مرتبہ مجھے میرے دشمن کا چہرہ دکھا کر ہی فریب میں مبتلا کیا تھا۔ یہ بھی بلا سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ شمبھو اور بڑے مہاراج دونوں ہی یقیناً ثریان سے واقف تھے اور شاید یہ بھی کہ میں ثریان کی تلاش میں ہوں۔ شمبھو تو اب میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا البتہ بڑا مہاراج زندہ تھا۔ معلوم نہیں کیوں بار بار میرے ذہن میں یہ خیال ابھرتا تھا کہ بڑے مہاراج کا مقصد محض میرا حصول ہی نہیں' کچھ اور بھی ہے۔ میرا جسمانی حصول ضمنی بات تھی۔ بظاہر میرے ذہن میں یہ خیال آنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

میں ابھی انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ چونک اٹھی۔ چمپا نامعلوم کب میرے کمرے میں داخل ہو کر مسہری کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اگر مجھے مخاطب نہ کرتی تو شاید ابھی اپنے خیالوں ہی میں کھوئی رہتی۔ وہ سخت آواز میں مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "گستاخ لڑکی! کیا تُو مہاراج سے بات کرتے ہوئے یہ بھول گئی تھی کہ کس سے مخاطب ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ چمپا جس غرض سے آئی ہے' وہ ضرور پوری کرے گی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک سوئی اور مٹی کا بنا ہوا پتلا دیکھ لیا تھا۔ شمبھو نے بھی ایک مرتبہ مجھے یہی سزا دی تھی۔ وہ تکلیف و اذیت ابھی تک میں بھولی نہیں تھی۔ بڑا مہاراج بھی مجھے سزا دینے کو کہہ کر گیا تھا۔ یقیناً مجھے سزا دینے ہی آئی تھی۔ میں اگر اس کے ساتھ نرم رویہ بھی رکھتی تو وہ اپنے ارادے سے باز نہ آتی۔ میں نے اسی لئے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیصلہ کیا۔

"سن اے حرافہ!" میں نے چمپا کو مخاطب کیا۔ "نہ میں تجھ سے ڈرتی ہوں نہ اس بوڑھے گدھ سے جسے تُو بڑا مہاراج کہتی ہے۔"

"چپ ہو جا۔" وہ گلا پھاڑ کر چیخی۔ "ورنہ میں .... تیری زبان باندھ دوں گی۔" لا غصے میں آ گئی تھی۔

"تیرے بس میں اور ہے بھی کیا۔ اگر تُو اتنی ہی بہادر ہے تو میرے جسم کو کھول کر دیکھ، میں تجھے بتاؤں کہ کون کتنا طاقتور ہے۔ تیری ٹانگیں چیر کے رکھ دوں۔"

"تُو اگر اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ میں تیرے چڑھائے میں آ کر تجھے کھول دوں گی تو یہ بھول ہے۔ میں تو تجھے اسی طرح باندھ کر ماروں گی۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگی۔ وہ کسی شیطانی عمل میں مصروف تھی اور میں ذہنی طور پر خود کو تکلیف و اذیت برداشت کرنے پر آمادہ کر رہی تھی۔

چمپا نے کوئی عمل پڑھ کر تین مرتبہ میری طرف پھونکیں ماریں' اس کے بعد اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لمبی سوئی پتلے کے دائیں بازو میں اتار دی۔

کوشش ضبط کے باوجود میرے منہ سے ہلکی سی سسکی نکل گئی پھر وہ سوئی سے پتلے کو

جگہ جگہ سے گودنے لگی۔ میں بس چند ہی لمحے اپنی بے اختیار چیخوں پر قابو رکھ سکی تھی کیونکہ اب اس نے پتلے کے ذریعے میرے چہرے کو نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔

"میں چاہوں تو تیری دونوں آنکھوں میں یہ سوئیاں اتار کر تجھے اندھا کر دوں' مگر بڑے مہاراج نے صرف تکلیف و اذیت پہنچانے کی اجازت دی ہے سو میں ایسا نہیں کر رہی۔ تیرے ہاتھ پیر توڑنا بھی میرے اختیار میں ہے' یہ دیکھ۔" اس نے پتلے کا ایک ہاتھ پکڑ کر مروڑا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرا بازو شانے سے ٹوٹ کر الگ ہو جائے گا۔ میرے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں پھر اس نے پتلے کا بازو چھوڑ کر ایک ٹانگ پر زور ڈالنا شروع کر دیا۔ گھٹنے کے پاس میری ایک ٹانگ مڑنے لگی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں ایک بار پھر چیخنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں زیادہ دیر تک وہ تکلیف و اذیت برداشت نہیں کر سکوں گی اور میرے حواس جواب دے جائیں گے۔

چمپا بدستور میرے جسم کو چھیدے جا رہی تھی۔ میں چیخ چیخ کر نڈھال ہونے لگی تھی کہ مجھے کمرے میں خجیرہ کی مانوس خوشبو محسوس ہوئی۔ میں جیسے جی اٹھی۔

معلوم نہیں کہ چمپا کو ایک دم کیا ہوا' وہ چیخ کر بھاگی۔ دوسرے ہی لمحے اسے میں نے منہ کے بل گرتے دیکھا۔

"بڑے مہاراج .... بڑے مہاراج! میری سہایتا (مدد) کریں۔" گرتے گرتے وہ چیخی۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ چمپا کا جسم گرتے گرتے ایک دم فضا میں بلند ہوا' اس کے بعد تیرتا ہوا کمرے کے دروازے سے نکل گیا۔

خجیرہ کی خوشبو کا لمس اب مجھے خود سے قریب تر محسوس ہو رہا تھا۔ میرا جسم نادیدہ ذہنی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میرے جسم کی ساری دکھن ختم ہو گئی۔

"اے معبلہ! میرے پیچھے چلی آ۔" میں نے خجیرہ کی آواز سنی۔

میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خجیرہ کی خوشبو اب میری رہنمائی کر رہی تھی۔ مجھے خبر نہیں کہ میں کن راستوں سے گزرتی ہوئی کالی گھاٹ کے اس قدیم مندر سے باہر آئی۔

"اب اپنی آنکھیں بند کر لے اے معبلہ کہ میں تجھے وہاں پہنچا دوں کہ جہاں سے تجھے یہاں لایا گیا تھا۔" خجیرہ کی آواز مجھے پھر سنائی دی۔

میں نے خجیرہ کے کہنے پر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اپنا جسم فضا میں بلند ہوتا محسوس ہوا' مگر میں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ خجیرہ نے آنکھیں بند کرنے کی تاکید بلا سبب نہیں کی ہو گی' اسی خیال سے میں نے اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں پھر مجھے تیز ہواؤں کا شور سنائی دیا اور یوں لگا جیسے میرا جسم فضا میں انتہائی تیزی کے ساتھ تیر رہا ہو۔ ایسا ہی مجھے اس وقت معلوم ہوا تھا جب بڑے مہاراج اور شمبھو کے ساتھ میں اپنی کوٹھی سے کالی گھاٹ کے مندر پہنچی تھی اور ہوش کھو بیٹھی تھی۔ اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا اور میرے ہوش و حواس برقرار رہے۔

ہواؤں کا شور آہستہ آہستہ تھمنے لگا اور پھر چند ہی لمحے بعد نخیرہ نے مجھے مخاطب کیا۔ "ا
آنکھیں کھول سکتی ہے اے معبلہ!"

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو خود کو اپنی خواہ گاہ میں پایا۔ میں اپنے بستر پر دراز
دوسرے ہی لمحے نخیرہ کی خوشبو غائب ہو گئی اور خلاف توقع میں نے اپنی مسہری کے اردگرد
حصار قائم ہوتے دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئی۔ یہ دودھیا حصار یقیناً عظیم مہین کی طرف سے
حفاظت کے لئے کھینچا گیا ہے' میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا۔ مجھے علم تھا کہ چند ہی لمحوں
وہ حصار نادیدہ ہو جائے گا۔ پھر ایسا ہی ہوا۔

وہ حفاظتی حصار میرے لئے نیا نہیں تھا۔ پہلے بھی ایک مرتبہ ایسا ہو چکا تھا۔ یہ ان دنوں
بات تھی کہ جب میں پہاڑوں پر تھی اور ساحر زعیم مجھ پر پے در پے ساحرانہ حملے کر رہا تھا۔
حملوں سے بچاؤ کے لئے وہ حفاظتی حصار اس وقت میرے اردگرد قائم ہو گیا تھا جب میں سونے
لئے لیٹتی تھی حصار کی موجودگی میں ساحر زعیم کا کوئی بھی سحر کارگر نہیں ہوتا تھا۔ حصار کا خود
میرے گرد قائم ہو جانا کئی باتوں کی نشاندہی کرتا تھ۔ پہلی بات تو یہ کہ عظیم مہین کی نیک
میری طرف سے غافل نہیں تھی۔ اس کا ثبوت نخیرہ کی آمد تھا۔ متعدد بار پہلے بھی نخیرہ
میری مدد کے لئے آ چکی تھی' مگر وہ آتی اسی وقت تھی جب کوئی اور چارہ کار نہ رہتا یا میری جا
نہ بن جائے۔ دوسری بات حفاظتی حصار کے قائم ہونے سے یہ معلوم ہوئی کہ مجھے اپنے دشمنو
طرف سے خطرہ لاحق تھا۔

مجھے اس رات جو بھی تکلیف و اذیت اٹھانا پڑی ہو' میں بہرحال اس پر خوش تھی کہ
ایک دشمن کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ شمبھو نے ذہنی اور جسمانی طور پر مجھے، بہت دکھ پہنچائے تھے۔

☆======☆======☆

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

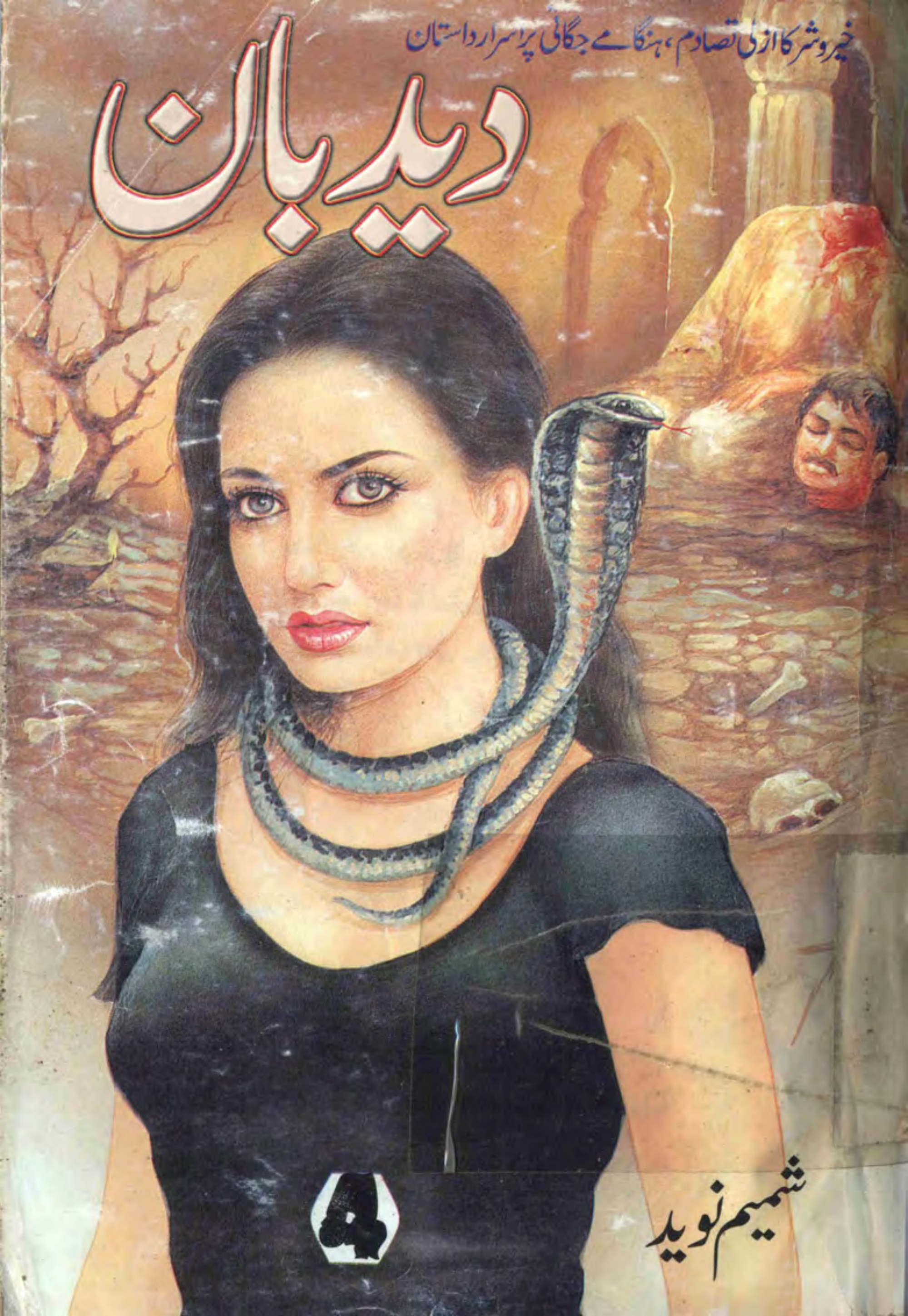
خیر و شر کا ازلی تصادم، ہنگامے جگاتی پراسرار داستان
دیدبان
شمیم نوید

ہر قسم کے ناول، ماہنامہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران ڈائجسٹ
0301-7283296
[illegible] لائبریری

وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی۔ پُراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں۔ اس کی آنکھوں میں موت کی کڑکتی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر تھی نہ موت کی۔ وہ سانپ سے زیادہ زہریلی تھی۔ وہ اپنے دشمن کی کٹی ہوئی گردن دیکھنا چاہتی تھی۔
پُراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں۔

پُراسرار قوتوں کی مالک ایک دوشیزہ کی ہنگاموں سے بھرپور داستان عجیب

رات کا ابھی کچھ حصہ باقی تھا۔ میں نے اسی لئے سوچا کہ کچھ دیر کو سو جاؤں۔ ابھی میں نے آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ مجھے گھٹن سی محسوس ہوئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو اس کی وجہ معلوم ہو گئی۔ میرے کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ چند لمحے بعد ہی جب دھواں چھٹا تو مجھے دو چہرے نظر آئے۔ ان میں سے ایک چہرہ بڑے مہاراج کا تھا اور دوسرا آشنا چہرہ چمپا کا تھا۔ وہ دونوں تمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"معبلہ! کیا تُو یہ سمجھ رہی تھی کہ تیرے پاس جو شکتی (طاقت) ہے اس کے بل پر چمپا کو بے بس کر کے فرار ہونے کے بعد دوبارہ میرے ہتھے نہیں چڑھے گی۔" بڑے مہاراج نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "دیکھ لے کہ میں کتنی جلدی تجھ تک پہنچ گیا؟ چمپا کو میں اس لئے اپنے ساتھ لایا ہوں کہ یہ تجھے باندھ کر میرے سامنے اپنے ساتھ لے چلے۔ اب دکھا اپنی شکتی۔"

میں لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس پر بڑے مہاراج کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار دیکھے۔

"حیران ہو رہا ہے مجھے اٹھتے دیکھ کر۔" میں دھیرے سے ہنسی۔ "میں تو خود جان بوجھ کر پہلے تیرے اور شمبھو کے ساتھ گئی تھی تاکہ شمبھو کو قتل کر دوں۔ تُو نہ جانے کس گمان میں رہا اور اب بھی ہے۔ تیری حیثیت میرے نزدیک کسی چوہے سے زیادہ نہیں اور یہ جو چنڈال تیرے ساتھ ہے' اسے تو میں جب چاہوں کسی چیونٹی کی طرح مسل دوں۔"

میری بات سن کر چمپا جیسے آپے سے باہر ہو گئی۔ وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح میری طرف جھپٹی' مگر مسہری کے قریب پہنچتے ہی اس کے منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔ یوں لگا جیسے اسے بجلی کا زبردست جھٹکا لگا ہو۔ وہ دور جا گری تھی اور خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"چمپا! تجھے کیا ہوا چمپا؟" بڑے مہاراج کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

اسی وقت میں زور سے ہنس پڑی' پھر بڑے مہاراج سے مخاطب ہوئی۔ "اگر تجھے یہ دیکھنا ہے کہ چمپا کو کیا ہو گیا ہے تو پھر تو بھی میرے قریب آ کر دیکھ۔"

"تیرے قریب نہ آ کر بھی میں تجھے باندھ کر اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔" بڑے مہاراج نے یہ کہتے ہی شیطانی عمل پڑھنا شروع کر دیا۔

مجھ پر اس عمل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ چمپا ابھی تک فرش پر پڑی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے جسم کو حرکت دینے یا چلنے پھرنے کے باوجود حفاظتی حصار قائم رہے گا۔ میں یہی سوچ کر اٹھی اور مسہری سے اتر کر بڑے مہاراج کی طرف بڑھی۔ اسی وقت بڑے مہاراج نے میری طرف پھونک ماری۔ اسی کے ساتھ فضا میں چنگاریاں سی اڑیں اور بڑے مہاراج کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں پھر اس سے پہلے کہ میں اس کے قریب پہنچتی' اس نے تیزی سے جھک کر چمپا کو اپنے بازوؤں پر اٹھایا اور "جے درگا مائی" کا نعرہ مارا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چمپا کو ساتھ لئے میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

اسی وقت میرے کمرے کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں خاتون! شہزاد آپ .... آپ خیریت سے تو ہیں؟"

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور پھر تیزی سے پیچھے ہٹ گئی تا کہ شہزاد نادیدہ حصار کی زد میں نہ آ جائے۔ شہزاد کے علاوہ دروازے پر قاسم اور میرے دوسرے ملازمین بھی نظر آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مجھے ریوالور نظر آ گئے تھے۔ قاسم کی تیز نظریں میری خواب گاہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟ تم لوگ کیوں آئے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"شاہد صاحب نے مجھے آ کر بتایا تھا بیگم صاحبہ کہ آپ کے کمرے سے انہیں تیز چیخ کی آواز سنائی دی ہے۔" شہزاد کی بجائے قاسم نے میرے سوال کا جواب دیا۔ شہزاد کو وہ اس کے فرضی نام سے ہی جانتا تھا۔ قاسم اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "انہوں نے بتایا تھا کہ چیخ کسی عورت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ آپ کے کمرے سے کسی اور عورت کی چیخ کیسے آ سکتی ہے۔ پھر میں نے احتیاطاً عبدل اور غنی کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔" یہ کہہ کر قاسم خاموش ہو گیا۔

"میری آنکھ تو چیخ کی آواز ہی سے کھلی تھی خاتون!" شہزاد بول اٹھا۔ "مگر مجھے وہ چیخ آپ کی معلوم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے قاسم سے یہ بات کہی بھی تھی لیکن اس کی دلیل بھی مضبوط تھی کہ آپ کی خواب گاہ میں اور کون ہو سکتا ہے۔"

"خواہ مخواہ تم نے سب کو جگا ڈالا۔" میں شہزاد سے بولی۔ "خیر اب تم لوگ جاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔ لگتا ہے شاہد صاحب نے خواب میں چیخ سنی ہو گی جسے وہ حقیقت سمجھے۔"

"اب تو واقعی ایسا ہی لگ رہا ہے خاتون!" شہزاد نے دھیرے سے کہا' پھر ناوقت جگانے پر مجھ سے معذرت کرنے لگا۔

"کوئی بات نہیں۔" میں مسکرا دی۔ "ظاہر ہے کہ تم نے جان بوجھ کر تو کسی کو تنگ نہیں کیا نا' اس میں معذرت کی کیا بات ہے؟"

پھر وہ سب چلے گئے اور میں نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ شہزاد نے یقیناً چمپا کی تیز چیخ سنی ہو گی مگر ظاہر ہے میں اس کا اقرار کیسے کر لیتی۔

میں بستر پر آ کر لیٹ گئی تو مجھے حفاظتی حصار کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اگر میرے گرد حفاظتی نادیدہ حصار قائم نہ ہوتا تو شاید ایک بار پھر بڑا مہاراج مجھے اغوا کر کے لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ مجھے حفاظتی حصار ہی نے بچا لیا تھا۔ مسہری سے اٹھ کر بڑے مہاراج کی طرف میں اسی خیال سے بڑھی تھی کہ چمپا کی طرح وہ بھی حفاظتی حصار کی زد میں آ جائے لیکن اس سے پہلے ہی وہ چمپا کو لے کر فرار ہو گیا تھا۔ اس نے شاید اندازہ کر لیا تھا کہ اس وقت کوئی شیطانی عمل کارگر نہیں ہو گا اور غالباً وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا' میرا اس کے قریب پہنچ جانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ خطرے کے اسی احساس نے میرے اندازے کے مطابق اسے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

رات کا بڑا حصہ جاگ کر گزارنے اور ناقابل برداشت تکلیف و اذیت اٹھانے کی وجہ سے میں خاصی تھک گئی تھی اس لئے جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔

معلوم نہیں میں کب تک سوتی رہتی کہ کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی اور پھر اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"راجہ استاد اور شنکر دادا آئے ہیں بیگم صاحبہ!" شیتل نے مجھے بتایا۔ اس وقت شیتل کے چہرے پر مجھے ماسک نظر آ رہا تھا۔ "ان دونوں کو میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' ان سے کہہ دو کہ میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں زیادہ دیر نہیں سو سکی تھی۔ اس وقت صبح کے سوا پانچ بج رہے تھے جب میں سونے لیٹی تھی۔ شیتل مڑ ہی رہی تھی کہ میں نے اس سے کہا۔ "ان دونوں کو چائے دے دینا۔"

"جی بیگم صاحبہ!" شیتل بولی اور پھر چلی گئی۔

میں نے الماری سے سرخ پھولدار ساڑھی نکالی اور پھر اپنی خواب گاہ سے باہر آ گئی۔ کسلمندی دور کرنے کے لئے میں نے غسل کیا اور ساڑھی باندھ کر غسل خانے سے نکل آئی۔ راجہ استاد اور شنکر دادا کے سپرد میں نے ایک اہم کام کیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دونوں شاید خفیہ پولیس کے سربراہ ڈیسوزا کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس وقت نہ آئے ہوتے۔ میں نے شنکر دادا سے کہا تھا کہ ڈیسوزا کو اغوا کرنے کے بعد وہ اپنے ہی پاس رکھے۔ ایسی صورت میں مجھے شنکر دادا کے ساتھ ٹالی گنج جانا پڑتا۔ یہی سوچ کر میں اپنے کمرے میں آ کر میک اپ کرنے لگی۔ میک اپ کرنے میں مجھے آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ میرے سر پر اب سنہرے بالوں کی وگ تھی۔ چہرے سے اب میں

تیس سال سے کسی طرح کم معلوم نہیں ہوتی تھی۔ میں اب ایک قبول صورت ہندو عورت معلوم ہو رہی تھی۔ ماتھے پر بھی میں نے بڑی سی بندیا لگالی تھی۔ اپنے پرس میں ریوالور کے علاوہ میں نے ایک چاقو بھی ڈال لیا تھا۔ آئینے پر آخری تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد میں کمرے سے نکلی تو شہزاد مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے شاید یہ خیال آگیا ہو گا کہ میری خواب گاہ سے بھلا اور کون نکل سکتا ہے۔

"خاتون! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔" وہ میرے قریب آکر دھیرے سے بولا۔

"میں آپ کو پہچانی نہیں مسٹر!" میں نے دانستہ آواز بدل کر اسے مخاطب کیا۔ "شاید ہم پہلی بار ایک دوسرے کو مل رہے ہیں۔"

وہ پھر چونک اٹھا اور حیرت سے میری صورت دیکھنے لگا۔

"پہچانی تو نہیں گئی میری آواز؟" میں نے اس سے اپنی اصل آواز میں سوال کیا۔

"حیرت انگیز خاتون! واقعی حیرت انگیز۔" شہزاد نے کہا۔ "مجھے بھی آواز بدل کر آپ نے چکرا دیا۔"

"ویری گڈ!" میں نے اطمینان سے سر ہلایا اور نشست گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے ناشتہ بھجوا دینا ڈرائنگ روم ہی میں۔"

"بہتر ہے خاتون!" شہزاد نے جواب دیا اور کچن کی طرف چلا گیا۔

میں نشست گاہ میں داخل ہوئی تو شنکر دادا نے کرسی سے اٹھ کر حسب معمول میرے پیر چھوئے۔ اس کے لئے میرا بدلا ہوا چہرہ بے معنی تھا۔ وہ بار بار بدلے ہوئے چہرے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔

"معاف کرنا تم لوگوں کو میرا انتظار کرنا پڑا۔" میں ان دونوں کے مقابل ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ میرے اور ان کے درمیان سینٹرل ٹیبل تھی۔

"مبارک ہو رانی! کام ہو گیا۔ بس شنکر دادا کا شاگرد خرچ ہوتے ہوتے بچ گیا۔" راجہ استاد نے مجھے ڈیسوزا کے اغوا کی خوشخبری سنائی۔

"کیسے؟ جگا ہی کے بارے میں کہہ رہے ہو استاد!" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں رانی جی!" اس مرتبہ شنکر دادا نے میری بات کا جواب دیا۔ "دراصل ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے تکیے کے نیچے بھرا ہوا ریوالور رکھ کے سوتا ہو گا۔ اس نے بس اچانک ریوالور نکال کر گولی چلا دی۔ بچتے بچتے بھی جگا کے گولی لگ ہی گئی۔ لمبی سی نال کا وہ عجیب سا ریوالور تھا۔ اس سے گولی چلنے کی آواز بھی نہیں ہوئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے وہ ریوالور چھین لیا تھا ورنہ دوسری گولی ہمایوں کا سینہ چھید دیتی۔ بعد میں دیکھا تو ریوالور کی نال پر ایک اور نال چڑھی نظر آئی۔"

شنکر دادا' ڈیسوزا سے زیادہ اس کے عجیب و غریب ریوالور کی تفصیل بیان کر رہا تھا۔ اس زمانے میں لوگ سائیلنسر سے کم ہی واقف تھے۔ خال خال ہی کسی بڑے انگریز افسر کے پاس ایسا ریوالور ہوتا تھا جس کی نال پر سائیلنسر چڑھایا جا سکے۔ اس وقت مجھے بھی اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لئے شنکر دادا

اور راجہ استاد سے ڈیسوزا کے اغوا کی مزید تفصیلات معلوم کرتی رہی۔ ڈیسوزا کا اتنی آسانی سے اغوا کر لیا جانا' اس کی نشاندہی کر رہا تھا کہ اعلیٰ انگریز حکام خود کو اس وقت تک قطعی محفوظ تصور کرتے تھے۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ کوئی غلام اپنے آقاؤں کو اغوا کرنے کا تصور بھی کر سکتا ہے۔ یہی غلط فہمی ڈیسوزا کے اغوا میں معاون ثابت ہوئی تھی۔ ڈیسوزا کی حفاظت کا کوئی خاص بندوبست نہیں تھا۔ شنکر دادا وغیرہ نے ڈیسوزا کی کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے اس کے ملازمین کو باندھ کر ڈال دیا تھا۔ اس کے بعد وہ ڈیسوزا کی خواب گاہ میں پہنچے تھے۔ ڈیسوزا شاید چوکنا سونے کا عادی تھا اسی لئے جیسے ہی یہ لوگ اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئے وہ جاگ اٹھا۔ اگر ڈیسوزا کے مقابل معمولی چور اچکے قسم کے لوگ ہوتے تو اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے' مگر وہ لوگ تو گھاگ تھے۔ ادھر ڈیسوزا نے جگا کو گولی کا نشانہ بنایا' ادھر شنکر دادا نے اس کی کنپٹی پر اپنے ریوالور کی نال رکھ دی اور پھر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ اس کے بعد وہ ڈیسوزا کو باندھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ڈیسوزا کے منہ میں انہوں نے کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا اور آنکھوں پر بھی سیاہ پٹی باندھ دی تھی۔ پھر وہ ڈیسوزا کو جیپ میں ڈال کر ٹالی گنج لے گئے تھے۔ ڈیسوزا کی چلائی ہوئی گولی سے جگا کے بائیں شانے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ گولی شانے کی ہڈی توڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ یہ بہرحال کوئی تشویشناک بات نہیں تھی۔

"لگتا ہے راجہ استاد کہ تم اور شنکر دادا ابھی تک سوئے نہیں ہو۔" وہ ڈیسوزا کے اغوا کی پوری روداد بیان کر چکے تو میں نے کہا۔ میرا انداز تصدیق طلب سا تھا۔

"نہیں' ایسی بات نہیں۔" راجہ استاد نے جواب دیا۔ "چند گھنٹے تو خیر ہم سو ہی لئے ہیں۔"

"اور چند ہی گھنٹے میں بھی سوئی ہوں۔" میرے منہ سے بے اختیار سچی بات نکل گئی۔

"کیوں' تم کیوں نہیں سو سکیں؟" راجہ استاد نے سوال کیا۔

اب مجھے خیال آیا کہ یہ بات زبان پر نہیں لانا چاہئے تھی پھر بھی میں نے بات بنا دی۔ "تھا ایک ایسا ہی چکر کہ جس کی وجہ سے رات کا بڑا حصہ مجھے کوٹھی سے باہر گزارنا پڑا۔"

اسی وقت شیتل میرے لئے ناشتہ لے آئی راجہ استاد اور شنکر دادا ناشتہ کر کے آئے تھے اس لئے میرے اصرار کے باوجود صرف دوبارہ چائے پینے پر آمادہ ہوئے۔

شیتل ان دونوں کے لئے چائے لینے چلی گئی تو راجہ استاد نے مسکراتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔ "رانی! یہ دیوی والا کیا چکر ہے؟"

راجہ استاد کے اس سوال پر میں چونک اٹھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ قاسم یا عبدل دونوں میں سے کوئی پیٹ کا ہلکا تھا۔

"میں یہ تم سے اس لئے پوچھ رہا ہوں رانی کہ مجھے قاسم کی بات کا بالکل یقین نہیں آیا حالانکہ اس نے قسم بھی کھائی تھی اور عبدل سے بھی اپنی بات کی تصدیق کرائی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان دونوں نے کوئی خواب دیکھ لیا ہو گا۔" مجھے چپ دیکھ کر راجہ استاد مزید بولا پھر شنکر دادا سے کہنے لگا۔ "بھلا یہ بھی

کوئی عقل میں آنے والی بات ہے کہ ایک شخص دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جائے' غائب ہو کر پھر آ جائے اور دوبارہ غائب ہو جائے۔ وہ دونوں بتا رہے تھے کہ غائب ہو جانے والا کوئی سادھو تھا جو دیوی کے درشن کرنے آیا تھا۔"

"اگر وہ کوئی سادھو سنت تھا تو یہ ممکن ہے استاد!" شنکر دادا نے خلاف توقع جواب دیا۔ "بہت سے سادھو سنتوں کو بھگوان نے یہ شکتی دی ہے۔ میں نے بنارس کے ایک رشی مہاراج کے بارے میں تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ ہوا میں تیر سکتے ہیں۔"

"یہ بات ہے تو اپنے پیر فقیر بھی کسی سے کم نہیں۔" راجہ استاد کے اندر چھپا ہوا مسلمان بول اٹھا۔ "اجمیر والے خواجہ رحمتہ اللہ نے تو اپنے وضو کے لوٹے میں سارے آنا ساگر کا پانی بھر لیا تھا۔ ایک مرتبہ اجمیر کے راجہ نے خواجہ رحمتہ اللہ کے اوپر ایک پاگل ہاتھی چھوڑ دیا۔ خواجہ رحمتہ اللہ نے جو اسے ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھنے سے روکا تو وہ پاگل ہاتھی پتھر کا بن گیا اور آج تک اسی جگہ پتھر بنا کھڑا ہے۔"

"خیر یہ تو میں نے بھی سنا ہے۔" شنکر دادا نے تائید کی پھر کہنے لگا۔ "مگر یہاں کون سا ایسا رشی منی آ گیا؟"

راجہ استاد نے قاسم سے جو کچھ سنا تھا بیان کر دیا اور آخر میں کہا۔ "حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ سادھو خود کو رانی کا پجاری بتا رہا تھا۔"

"اچھا استاد! یہ فضول باتیں چھوڑو۔" میں نے بات کو ٹالنا چاہا اسی وقت شیتل دو پیالیوں میں چائے لے آئی۔ "لو چائے بھی آ گئی' چائے پی لو پھر چلتے ہیں۔"

"میرا چلنا ضروری ہے کیا؟" راجہ استاد بولا۔

"ہاں۔" یہ کہہ کر میں' شیتل کے وہاں سے جانے کا انتظار کرنے لگی۔ شیتل نشست گاہ سے نکل گئی تو میں بولی۔ "دراصل جس انگریز افسر کو اغوا کرایا گیا ہے' اس کی زبان بھی کھلوانا ہے۔ کیا خبر تمہارا کوئی آزمودہ نسخہ کام آ جائے۔ یہ مجھے بہرحال معلوم ہے کہ وہ آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔"

"معلوم کیا کرنا ہے اس سے؟ یہ بھی تو پتا چلے۔" راجہ استاد نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"وہیں چل کر بتا دوں گی۔" میں نے جواب دیا اور پھر جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگی پھر مجھے ایک بات کا اور خیال آ گیا۔ میں نے راجہ استاد اور شنکر دادا کو یہ تاکید کر دی کہ ڈیسوزا کے سامنے ان دونوں میں سے کوئی مجھے رانی نہیں کہے گا۔

"ظاہر سی بات ہے رانی جی کہ جب تم نے ہمیں اس شخص کے سامنے چہرہ چھپائے رکھنے کی تاکید کر دی تھی تو ہم تمہارا نام کس طرح زبان پر لا سکتے ہیں۔" شنکر دادا بولا۔

شنکر دادا اپنی جیپ ساتھ لایا تھا۔ اسی جیپ میں ہم دھرم تلے سے ٹالی گنج روانہ ہو گئے۔ شنکر دادا ہی جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔

یہ وہ کوٹھی نہیں تھی جہاں پہلے بھی میں ایک بار آ چکی تھی۔ ڈیسوزا کو اغوا کر کے شنکر دادا نے ایک ایسی کوٹھی میں رکھا تھا کہ جس کے اردگرد دور دور تک کوئی اور کوٹھی نہیں تھی۔ ٹالی گنج یوں بھی

کلکتے کی ایک ایسی نواحی بستی تھی کہ جس کے بعد کوئی اور آبادی نہیں تھی۔ ڈیسوزا کو رکھنے کے لئے اس آبادی کا بھی آخری سرا منتخب کیا گیا تھا۔ اس کوٹھی میں داخل ہوتے ہی میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ وہاں قدم قدم پر' کوٹھی کے چپے چپے پر نگرانی ممکن نہیں تھی۔ وہ کوٹھی دو منزلہ تھی۔ ڈیسوزا کو انہوں نے کوٹھی کی اوپری منزل کے ایک ایسے کمرے میں رکھا تھا جو تقریباً وسط میں تھا۔ اس کمرے کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے مسلح افراد پہرا دے رہے تھے۔ مجھے یہ تمام انتظام پسند آیا اور میں نے اس طرح کے بندوبست پر شنکر دادا کی تعریف بھی کی۔ اگر کوئی شخص کسی بھی طرح اس کوٹھی میں داخل بھی ہو جاتا تو مسلح افراد کی موجودگی میں اس کمرے تک نہ پہنچ سکتا جہاں ڈیسوزا کو رکھا گیا تھا۔

کمرے کے دروازے پر بھی دو مسلح بندے موجود تھے۔ شنکر دادا کے اشارے پر ان میں سے ایک نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ راجہ استاد اور شنکر دادا اس سے پہلے ہی اپنے چہروں پر ڈھاٹے باندھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں میں نے جتنے بھی مسلح افراد اب تک دیکھے تھے' سبھی کے چہرے چھپے ہوئے تھے حالانکہ وہاں ڈیسوزا کی نظر پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ محض احتیاطی تدبیر تھی۔ ان لوگوں کے درمیان اب صرف میں ہی ایسی تھی کہ جس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ میرے چہرے پر میک اپ تھا اس لئے میں نے چہرہ چھپانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ راجہ استاد اور شنکر دادا کے ساتھ میں اس کمرے میں داخل ہوئی تو مسلح افراد نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

اس کمرے میں ایک مسہری کے علاوہ میز کرسیاں بھی موجود تھیں۔ ڈیسوزا کو نہ مسہری پر ڈالا گیا تھا نہ کسی کرسی سے باندھا گیا تھا۔ وہ کمرے کے فرش پر رسیوں سے جکڑا ہوا پڑا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گزشتہ رات کو اسے جس حالت میں یہاں ڈالا گیا تھا اب تک وہ اسی حالت میں تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا اور آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں اس کوٹھی میں داخل ہوتے وقت اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل مرتب کر چکی تھی جس سے شنکر دادا اور راجہ استاد کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔

"ارے' یہ کیا کیا تم لوگ' ہم تم کو یہ تو نہیں بولا تھا۔ تم کو معلوم کہ یہ کتنا بڑا آدمی ہوتا' کھولو اس کو۔" میں آواز بدل کر سخت لہجے میں بولی۔

شنکر دادا اور راجہ استاد آگے بڑھے۔ انہوں نے ڈیسوزا کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا اور آنکھوں پر بندھی ہوئی سیاہ پٹی بھی کھول دی۔ ڈیسوزا نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا پھر اس کے ہاتھ پیر بھی رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دیئے گئے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار نظر آ رہے تھے۔

"گلیڈ تو میٹ یو مسٹر ڈیسوزا!" میں نے اس کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ "مائی نیم از راج کماری سیتا!" میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا پھر بدلی ہوئی آواز ہی میں اس سے بولی۔ "میں نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ میں لندن میں تھی۔ مجھے ہندوستان آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اس لئے ٹھیک طرح ہندوستانی نہیں بول سکتی۔" میں اس سے انگریزی زبان ہی میں گفتگو کر رہی تھی۔ پھر میں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے اس

طرف بڑھ گئی جہاں کرسیاں پڑی تھیں جن کے درمیان چھوٹی سی ایک میز پڑی تھی۔ "آئی ایم ویری ویری سوری مسٹر ڈیسوزا!" میں نے اس سے معذرت کی۔ "میں نے ان لوگوں سے ہرگز یہ نہیں کہا تھا کہ آپ کو اس طرح زبردستی اٹھا لائیں کیونکہ میں ان لوگوں کی زبان ٹھیک طرح سے نہ بول سکتی ہوں' نہ سمجھ سکتی ہوں اس لئے یہ کچھ غلط سمجھے۔ بہرحال اس کے لئے ایک بار پھر معذرت۔ میں نے ان سے صرف اتنا کہا تھا کہ مسٹر ڈیسوزا کو لے آؤ' کل صبح میں ان سے مل کر کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ آج صبح مجھے ان لوگوں نے بتایا کہ یہ رات ہی کو میرے حکم کی تعمیل کر چکے ہیں اور آپ کو میری اس کوٹھی میں رکھا ہے۔ یقین کریں مسٹر ڈیسوزا کہ مجھے یہاں آنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان لوگوں نے آپ کو اس حالت میں باندھ رکھا ہو گا .... پلیز سٹ ڈاؤن۔" میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ جب وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو میں بیٹھی۔ "میرا خیال ہے مسٹر ڈیسوزا آپ فریش ہونا چاہیں گے۔ اتنے میں آپ کے لئے ناشتہ منگواتی ہوں۔ مجھے آپ سے جو گفتگو کرنا ہے وہ بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔"

ڈیسوزا کے چہرے سے اب بھی شدید الجھن کا اظہار ہو رہا تھا اور یہی میں چاہتی بھی تھی۔ وہ بہرحال باتھ روم جا کر فریش ہونے پر رضامند ہو گیا۔ اس کمرے سے کچھ ہی دور باتھ روم تھا۔ شنکر استاد نے وہاں تک اس کی رہنمائی کر دی۔ میں بھی کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ ہرچند کہ کمرے کے باہر ہر طرف مسلح افراد موجود تھے' اس کے باوجود میں' ڈیسوزا کو اپنی نظروں میں رکھنا چاہتی تھی۔ شنکر دادا نے اپنے ایک آدمی کو ڈیسوزا کے لئے ناشتہ لینے بھیج دیا تھا۔

باتھ روم میں ڈیسوزا نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اب اس کے چہرے پر برستی ہوئی وحشت خاصی حد تک کم ہو گئی تھی میں اسے ساتھ لئے ایک بار پھر کمرے میں آ گئی۔

"جی راج کماری!" ڈیسوزا نے پہلی مرتبہ مجھے مخاطب کیا۔ "کہئے' آپ مجھ سے کیا گفتگو کرنا چاہتی ہیں؟"

"بس تھوڑی دیر اور انتظار کر لیں مسٹر ڈیسوزا! مجھے اس پر سخت شرمندگی ہے مسٹر ڈیسوزا کہ میرے آدمیوں نے آپ کو ناشتہ بھی نہیں کرایا۔"

"آپ ناشتے کے لئے کہہ رہی ہیں راج کماری! آپ کے آدمیوں کا رویہ تو ایسا تھا جیسے یہ مجھے یہاں قتل کرنے کے لئے لائے ہوں۔" ڈیسوزا کی آواز میں پہلی بار زندگی کی تھوڑی سی جھلک نظر آئی۔

"ایکس ٹریم لی سوری مسٹر ڈیسوزا!" میں مجسم انکسار بنی ہوئی تھی۔

"نیور مائنڈ۔" ڈیسوزا نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

"ناشتہ آ جائے مسٹر ڈیسوزا اور آپ ناشتہ کر لیں تو پھر گفتگو شروع ہو گی۔ آپ یقیناً تھک گئے ہوں گے مسٹر ڈیسوزا! اگر آپ چاہیں تو آپ ناشتہ آنے تک ادھر بیڈ پر لیٹ کر آرام کر لیں۔" میں نے کچھ ہی فاصلے پر پڑی ہوئی مسہری کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ نو!" ڈیسوزا نے انکار کر دیا۔ "اب میں اتنا تھکا ہوا بھی نہیں ہوں۔"

شنکر دادا کے آدمی جلد ہی ناشتہ لے آئے اور ڈیسوزا کے سامنے لگا دیا۔ اس نے ناشتے کے لئے مجھ

سے اخلاقاً پوچھا۔ میں نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چائے پی لوں گی مسٹر ڈیسوزا! میں ناشتہ کر چکا ہوں' آپ ناشتہ کیجئے۔" میرے معذرت کر لینے پر ڈیسوزا اطمینان سے ناشتہ کرنے لگا۔ اب اس کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلک رہا تھا۔

راجہ استاد اور شنکر دادا بھی ابھی تک کمرے میں تھے۔ میں محسوس کر چکی تھی کہ وہ دونوں ہی مستعد چوکنا تھے۔ ڈیسوزا ناشتہ کر چکا تو میں نے کیتلی سے اس کی پیالی میں چائے انڈیلی۔ ڈیسوزا نے میرا شکریہ ادا کر کے چائے کی پیالی اٹھا لی۔ اپنی پیالی میں چائے انڈیل کر میں نے ڈیسوزا کو مخاطب کیا۔ "میرا خیال ہے مسٹر ڈیسوزا کہ اب گفتگو شروع کی جا سکتی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ میں ابھی تک آواز بدل کر ہی بول رہی تھی۔

"وائی ناٹ۔" ڈیسوزا نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے خوش دلی سے جواب دیا۔

"آکسفورڈ میں میری ایک کلاس فیلو تھی۔ میری ہی طرح اس کا تعلق بھی ہندوستان کی ایک ریاست سے تھا۔ کچھ دن پہلے اس سے میری ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ آپ کا محکمہ معلوم نہیں کیوں اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ وہ اسی وجہ سے چھپی چھپی پھر رہی ہے۔ آپ سے مجھے اس کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔" میں نے بات شروع کی۔

"آپ کی اس کلاس فیلو کا کیا نام ہے راج کماری؟" ڈیسوزا نے سوال کیا۔

"نام بھی بتا دوں گی مسٹر ڈیسوزا! مگر پہلے آپ یہ وعدہ کیجئے کہ مجھ سے کچھ چھپائیں گے نہیں۔" میں بولی۔ "چلئے یہی بتا دیجئے' کیا آپ کا محکمہ کسی ریاست کی شہزادی کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہے؟ اگر اس کا جواب ہاں میں ہے تو میں وجہ جاننا چاہوں گی۔"

ڈیسوزا کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں پھر اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے مجھ سے پوچھا۔ "راج کماری! اپنی اس کلاس فیلو سے آپ کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟"

"میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دوں گی مسٹر ڈیسوزا! مجھے معلوم ہے کہ آپ کا محکمہ اس کی تلاش میں ہے۔"

"آپ اس کا نام تو بتا دیں راج کماری!"

"میرا خیال ہے مسٹر ڈیسوزا کہ آپ اس کا نام سمجھ چکے ہیں۔ آپ کا محکمہ بیک وقت کئی ایسی لڑکیوں کے بارے میں تفتیش نہیں کر سکتا جن کا تعلق کسی ریاست کے حکمران خاندان سے ہو۔ کیا اتنا کہنے کے باوجود بھی نام بتانے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟" میں اپنی بات پوری کر کے ڈیسوزا کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

"راج کماری! آپ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔" وہ بولا۔ "آپ نام بتا دیتیں تو بہتر تھا۔"

"اس میں الجھن کی تو کوئی بات نہیں مسٹر ڈیسوزا! آپ اصرار ہی کر رہے ہیں تو بتا دیتی ہوں' اس کا نام معبلہ ہے اور تعلق حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے ہے۔"

"کیا آپ کو پورا یقین ہے راج کماری کہ واقعی اس کا تعلق حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے

ہے؟"

"کیوں' اس میں یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے مسٹر ڈیسوزا!"

"یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں راج کماری کہ ہماری حکومت' ریاست حیدر آباد دکن سے اس کی تصدیق کر چکی ہے۔"

"پھر وہاں سے کیا معلوم ہوا؟" میں نے اپنے اضطراب و تجسس پر قابو پاتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہی جواب ملا کہ معبلہ نامی کسی لڑکی کا کوئی تعلق حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے نہیں۔" ڈیسوزا نے بتایا۔ "ایسی صورت میں اس کا کردار ہماری نظر میں مزید مشتبہ ہو جاتا ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کہاں سے ہندوستان آئی' اس کے علاوہ یہ کہ اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی جو وہ شاہانہ زندگی بسر کر رہی ہے؟"

"سوال تو یہی ہے مسٹر ڈیسوزا کہ آپ یہ سب کچھ کیوں جاننا چاہتے ہیں؟ میری مراد آپ کے محکمے سے ہے جس کے آپ سربراہ ہیں۔ ہندوستان بھر میں نہ جانے کتنے ایسے افراد ہوں گے مسٹر ڈیسوزا' جو شاہانہ زندگی گزار رہے ہیں اور یہ کسی کو نہیں معلوم کس کے پاس دولت کہاں سے آئی' تو کیا آپ کا محکمہ ان سب کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہے' یا تحقیقات کرنا اس کا فرض ہے؟ بات کچھ اور ہے مسٹر ڈیسوزا! جو آپ مجھے بتانے سے شاید گریز کر رہے ہیں۔"

"مگر راج کماری! آپ اس معاملے میں کیوں دلچسپی لے رہی ہیں؟"

"سیدھی سی بات ہے مسٹر ڈیسوزا کہ معبلہ میری دوست ہے اور میں نے اس سے وعدہ کیا ہے' حقیقت کا سراغ لگا کر اسے بتاؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے راج کماری کہ آپ جانتی ہیں' معبلہ کہاں ہے۔ کیا آپ ہمیں اس کا پتا بتا سکتی ہیں؟ اس کے ساتھ یہ بھی راج کماری کہ اس کے متعلق آپ اور کیا کیا جانتی ہیں؟ آپ میری بات کا یقین کریں راج کماری کہ اس نے آپ کو اپنے بارے میں یہ غلط بتایا ہے' اس کا تعلق حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے ہے۔ یقیناً وہ کوئی بہت بڑی فراڈ ہے۔ آپ اسے کیسے اور کب سے جانتی ہیں؟" ڈیسوزا مجھے ایسی متوقع نظروں سے دیکھنے لگا جیسے میں اس کے سوالوں کا جواب دے ہی دوں گی۔

ڈیسوزا سے اتنی دیر گفتگو کے بعد مجھے اب تک صرف ایک ہی کام کی بات معلوم ہوئی تھی کہ انگریز حکمرانوں نے میرے متعلق ریاست حیدر آباد دکن سے رابطہ قائم کیا تھا۔ حکومت کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اس ایک بات کے سوا ڈیسوزا سے کچھ اور معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ تو خود مجھ ہی سے معلومات حاصل کرنے کے درپے تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے ڈیسوزا کو مخاطب کیا۔ "مجھے معبلہ کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے مسٹر ڈیسوزا' وہ سب کچھ آپ کو بتا دوں گی لیکن پہلے آپ میرے اس سوال کا جواب دے دیں کہ آپ کا محکمہ یا آپ کی حکومت معبلہ کے متعلق کیوں چھان بین کر رہی ہے؟"

"کیا آپ یقین کریں گی راج کماری کہ مجھے خود بھی اس کا علم نہیں۔" ڈیسوزا نے جواب دیا اور

میں اس کے لہجے سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "مرکزی حکومت سے مجھے معبلہ کے بارے میں یہ احکام ملے ہیں کہ تحقیقات کے بعد جلد از جلد اس کے متعلق رپورٹ بھیجی جائے۔"

"یعنی حکومت کے اعلیٰ حکام معبلہ کے بارے میں چھان بین کرا رہے ہیں؟" میں تصدیق طلب لہجے میں بولی۔

"کہہ سکتی ہیں آپ۔"

"کیا وہ ماسک بھی مرکزی حکومت نے فراہم کیا تھا جو معبلہ کو فریب دینے کے لئے آپ کے ایک انسپکٹر پرکاش نے استعمال کیا تھا؟"

میرے اس سوال پر ڈیسوزا چونک اٹھا پھر پوچھا۔ "آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی راج کماری!"

"ظاہر سی بات ہے مسٹر ڈیسوزا کہ مجھے اس کے متعلق معبلہ ہی نے بتایا ہو گا۔" میں نے بلاجھجک جواب دیا پھر اسے یاد دہانی کرائی۔ "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا مسٹر ڈیسوزا!"

"جی ہاں راج کماری' وہ ماسک ہمیں مرکزی حکومت ہی نے فراہم کیا تھا۔" ڈیسوزا نے طویل سانس لے کر کہا۔

"مسٹر ڈیسوزا' بس آخری سوال' کیا آپ مرکزی حکومت کے ان اعلیٰ حکام کے نام بتا سکتے ہیں جن کے ایما پر معبلہ کے خلاف تحقیقات کی جا رہی ہے؟"

"آپ کو یہ جان کر کیا حاصل ہو گا راج کماری؟"

"ظاہر ہے کہ جب آپ کو معلوم نہیں' معبلہ کے متعلق کیوں چھان بین ہو رہی ہے تو ان اعلیٰ انگریز حکام کو یہ ضرور خبر ہو گی جن کے حکم پر ایسا ہو رہا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے راج کماری کہ میں آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔"

"لیکن کیوں مسٹر ڈیسوزا!" میرا لہجہ بدل گیا۔ "کیا آپ کو احساس نہیں کہ آپ کس پوزیشن میں ہیں؟"

"میں .... میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں راج کماری!" ڈیسوزا کے چہرے سے فکرمندی جھلکنے لگی۔

"آپ اتنے بھولے تو نہیں لگتے مسٹر ڈیسوزا کہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکیں۔ آپ کو میرے سوال کا جواب دینا پڑے گا۔"

"اور جواب نہ دوں تو راج کماری!" خلاف توقع اس کا لہجہ جارحانہ ہو گیا۔ "آپ شاید یہ بھول رہی ہیں کہ اس وقت ایک اعلیٰ انگریز افسر سے مخاطب ہیں اور ایک معمولی انگریز بھی ہندوستان کی کسی راج کماری سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے' سمجھیں آپ!"

"ایکس کیوزمی مسٹر ڈیسوزا! میں واقعی آپ کی حیثیت بھول گئی تھی۔" یہ کہتے ہی میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔

یہ خلاف توقع حرکت میرے اب تک کے رویے کے برعکس اور اچانک تھی اس لئے ڈیسوزا چند لمحے جیسے صورت حال کو سمجھ ہی نہ سکا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا' پھر ایک دم چیخ اٹھا۔ "تم نے ایک اعلیٰ انگریز افسر پر ہاتھ اٹھایا ہے اور تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔"

"لیکن مسٹر ڈیسوزا! آپ کو تو ابھی میرے بارے میں یہ تک معلوم نہیں کہ میرا تعلق ہندوستان کی کس ریاست سے ہے۔ پہلے تو آپ کو اپنے محکمے کے ذریعے یہی سراغ لگانا پڑے گا کہ ہندوستان کی اتنی ساری چھوٹی بڑی ریاستوں میں سے میں کس ریاست سے تعلق رکھتی ہوں۔ اس کے بعد ہی آپ میرے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" میرا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔ "پہلے میرا ارادہ یہ تھا کہ کسی انگریز سے شادی کروں گی لیکن آپ کو دیکھ کر مجھے اپنا یہ ارادہ بدلنا پڑے گا مسٹر ڈیسوزا! اگر سارے انگریز آپ ہی کی طرح احمق ہوتے ہیں تو میں کسی انگریز کو ہرگز اپنا شوہر بنانا پسند نہیں کروں گی۔ ہاں مسٹر ڈیسوزا! ابھی تک آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔" وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"میں نے صرف ایک ہی سوال تو کیا ہے مسٹر ڈیسوزا کہ مرکزی حکومت کے کن حکام کی مرضی یا ایما پر آپ کا محکمہ معلبہ کے خلاف تحقیقات کر رہا ہے؟ لیکن یقین کیجئے مسٹر ڈیسوزا کہ اگر آپ نے اس سوال کا جواب نہیں دیا تو آپ یہاں سے نہیں جا سکیں گے۔"

"تم یہ جاننے کے باوجود مجھے دھمکی دے رہی ہو کہ میں کون ہوں؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"تم اپنے حق میں یہ اچھا نہیں کر رہیں۔"

"میں اپنے حق میں اچھا کر رہی ہوں یا برا' یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے' مسٹر ڈیسوزا! آپ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے چند لمحے توقف کیا پھر بولی۔ "میرے اندازے کے مطابق مسٹر ڈیسوزا! آپ کو ہندوستان آئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ یقیناً آپ یہاں کی روایات سے واقف ہوں گے۔ پھر بھی میں آپ کو بتا دوں کہ اگر کسی شخص کے سر پر جوتے مارے جائیں تو اسے انتہائی بے عزتی سمجھا جاتا ہے۔ کسی شخص کی اس سے بڑی توہین کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ جانتے ہو نا آپ؟"

"مجھے یہ بتانے سے مطلب کیا ہے تمہارا؟" ڈیسوزا اب بھی برف خانے کے چمار کی طرح اکڑا ہوا تھا۔

"مطلب یہ کہ تمہاری بے عزتی کے لئے میں تمہارے سر پر جوتے لگواؤں گی' وہ بھی ان تمام افراد کی موجودگی میں جنہیں تم اپنا غلام سمجھتے ہو۔ ذرا خود ہی سوچو غلاموں کے سامنے آقاؤں کی نسل کا کوئی شخص جوتے کھاتا ہوا اچھا معلوم ہو گا؟" میں بھی اب "آپ" سے "تم" پر اتر آئی۔ "اس لئے بہتر یہی ہے کہ بے عزتی سے بچنے کے لئے میرے سوال کا جواب دے دو۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ ایک دم غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی وقت میں نے راجہ استاد اور شنکر دادا کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ڈیسوزا کو جکڑ لیا۔ جسمانی طور پر ڈیسوزا زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ راجہ استاد نے اس کے دونوں بازوؤں کو مخصوص انداز میں پیچھے کر کے اس

طرح گرفت میں لے لیا تھا کہ وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے بھی قاصر ہو گیا تھا۔ ڈیسوزا کو سنبھالنے کے لئے صرف راجہ استاد کافی تھا۔ میں نے اسی لئے شنکر دادا کو الگ ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور بولی۔ "اپنا سب لوگ کو باہر برآمدے میں جمع کرو۔ سب اس کو ایک ایک جوتا لگائے گا۔" انگریزی کی بجائے اب میں ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہی تھی۔ میں اپنے متعلق ڈیسوزا سے جو کچھ کہہ چکی تھی' مجھے اس کا احساس تھا' یعنی اردو مجھے ٹھیک طرح بولنا نہیں آتی۔

"جو حکم راج کماری!" شنکر دادا یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"اے!" میں نے راجہ استاد کو مخاطب کیا۔ "تم اسے لے کر باہر چلے گا۔" یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چل بے بندر!" راجہ استاد نے ڈیسوزا کو آگے بڑھانے کے لئے دھکا دیا۔

"پلیز راج کماری! ایسا نہ کرو۔" ڈیسوزا کے سارے کس بل نکل گئے اور وہ گھگیانے لگا۔

"تو پھر مرکزی اعلیٰ حکام کے نام بتا دو' جوتے نہیں لگواؤں گی۔"

"یہ .... یہ ناممکن ہے۔ میں .... حکومت سے غداری نہیں کر سکتا۔"

"جوتے تو پھر لگیں گے نا اور اس بے عزتی کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہو گا جسے پولیس والوں کی زبان میں تھرڈ ڈگری کہا جاتا ہے۔"

"تم .... تم ایسا نہیں کر سکتیں۔"

"اور مجھے ایسا کرنے سے کوئی روک بھی نہیں سکتا۔" اب میں دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں آ چکی تھی۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ راجہ استاد بھی ڈیسوزا کو پیچھے سے جکڑے ہوئے برآمدے میں آ چکا تھا۔ وہاں شنکر دادا کے آدمی جمع ہو چکے تھے۔ میں نے ان لوگوں کو مخاطب کیا۔ "تم سب اپنی اپنی باری پر اس بندر کے سر پر جوتا لگائے گا اور اس کے منہ پر تھوکے گا بھی۔ سر پر جوتا مارے گا' منہ پر تھوکے گا بھی اور پیچھے ہٹ جائے گا۔"

"نہیں۔" ڈیسوزا چیخ اٹھا۔ میں نے اس کے لئے جو اضافی سزا تجویز کی تھی' یہ اسی کا ردعمل تھا۔

میں' ڈیسوزا کے احتجاج کو سنا ان سنا کر گئی اور شنکر دادا' کو اشارہ کیا۔ وہ اپنے پیر سے جوتا اتارنے لگا۔

"راج کماری پلیز!" ڈیسوزا نے پھر میری دہائی دی۔

"شٹ اپ باسٹرڈ!" میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا۔

اس وقت تک شنکر دادا ہاتھ میں جوتا سنبھالے ڈیسوزا کے قریب پہنچ چکا تھا پھر جیسے ہی شنکر دادا کا ہاتھ جوتا مارنے کے لئے اٹھا' ڈیسوزا چیخا۔ "ایگری .... آئی ایم ایگری۔"

میں نے شنکر دادا کو جوتا مارنے سے روک دیا اور ڈیسوزا کو دوبارہ کمرے میں لے چلنے کو کہا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی راضی ہو جائے گا۔ تشدد کرنے سے زیادہ بے عزتی کا حربہ کارگر رہا تھا۔ راجہ استاد اسے کمرے میں لے آیا۔ شنکر دادا بھی اپنا جوتا پہن کر کمرے میں آ گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ

دوبارہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ میرے کہنے پر راجہ استاد نے ڈیسوزا کو چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر رنگ بدلا اور نرمی سے ڈیسوزا کو مخاطب کیا۔ "سوری مسٹر ڈیسوزا کہ آپ کو زحمت اٹھانا پڑی۔ اگر آپ پہلے ہی میرے سوال کا جواب دینے پر آمادہ ہو جاتے تو میں انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ نہ کرتی۔ آیئے' یہاں کرسی پر تشریف رکھئے۔"

ڈیسوزا نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ کرسی پر بیٹھنے کی بجائے میری طرف جھپٹا۔ میں اگر چاہتی تو بچ سکتی تھی' مگر ایسا نہیں کیا۔ میں دراصل یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کیا کرتا ہے۔ یقیناً وہ مجھے عام سی لڑکیوں کی طرح کمزور سمجھا تھا۔ اس نے مجھے پیچھے سے اپنے لمبے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا اور پھر تیزی کے ساتھ دیوار کے قریب گھسیٹ لے گیا۔ راجہ استاد اور شنکر دادا اب اس کے سامنے تھے۔ ڈیسوزا نے بھی میرے دونوں بازوؤں کو مخصوص انداز میں موڑ کر جکڑ لیا تھا۔ اس نے میرے بازوؤں پر زور ڈالتے ہوئے مجھے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "راج کماری! اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ یہ ایک ریوالور میرے حوالے کر کے کمرے سے نکل جائیں۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تمہارے دونوں بازو توڑ دوں گا؟"

"پلیز مسٹر ڈیسوزا!" میں نے اداکاری کی۔ "مجھے چھوڑ دیجئے' میں آپ کو یہاں سے نکل جانے دوں گی۔"

راجہ استاد اور شنکر دادا مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ڈیسوزا میرے عقب میں تھا اور اس لئے وہ مجھے آنکھ کا اشارہ کرتے نہ دیکھ سکا۔ شنکر دادا اور راجہ استاد کے چہروں سے اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ یقیناً یہ سمجھ چکے تھے کہ میں ڈیسوزا کو کھلا رہی ہوں۔

"نہیں' میں تمہیں ہرگز نہیں چھوڑوں گا' تم میرے ساتھ ساتھ بطور یرغمال چلو گی۔" ڈیسوزا نے میری بات کا جواب دیا۔ میرے بازوؤں پر اس نے دباؤ اور بڑھا دیا تھا۔ پھر اس نے براہ راست راجہ استاد اور شنکر دادا سے کہا۔ "ام ٹمارا راج کماری کا دونوں ہاٹ توڑ دے گا۔ اگر ٹم اس کو بچانا مانگٹا تو ام کو ریوالور دو۔"

"پگلوٹ ہے بے!" راجہ استاد نے اس طرح کہا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"کیا بولا .... کیا بولا ٹم؟" ڈیسوزا حیران سا ہو کر بولا پھر وہ مجھ سے انگریزی میں مخاطب ہوا۔ "تم کیوں ہنس رہی ہو راج کماری؟"

"وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مجھ سے پہلے ہی تنگ ہے' اچھا ہے کہ تم میرے دونوں ہاتھ توڑ دو۔" میں نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"اس پر کہ لوگ کتنی جلدی آنکھیں پھیر لیتے ہیں' ابھی تم دیکھنا ڈیسوزا کہ جب میں تمہاری گرفت سے نکل جاؤں گی اور تمہیں ماروں گی تو یہ پھر میری وفاداری کا دم بھریں گے۔" پھر میں نے اسے اپنی پشت پر لاد کر سامنے پٹخ ہی دیا۔

پختہ فرش پر گرتے ہی ڈیسوزا کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

"کیا ہوا مسٹر ڈیسوزا! زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" میں اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھی۔

ڈیسوزا کہنیوں کے بل فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے لات مار کے اسے پھر گرا دیا۔ وہ فرش پر پڑا ہوا لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میرا ہینڈ پرس میز پر رکھا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر پرس اٹھایا اور اس میں سے چاقو نکال کر کھول لیا۔

"بہت دیر ہو گئی سفید کتے!" میں چاقو ہاتھ میں تھامے اس کی طرف بڑھتے ہوئے نفرت و حقارت سے بولی۔ "تُو بھونکنے پر آمادہ ہے یا تیری کھال اتار لوں؟" میں نے جھک کر چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ "بول .... جواب دے؟"

ڈیسوزا کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں پھر وہ ہکلایا۔ "پلیز راج کماری .... یہ چاقو .... ہٹا لو .... تم .... تم جو بھی پوچھو گی' میں .... میں بتا دوں گا۔"

"اٹھ کر کھڑا ہو جا۔" میں نے چاقو اس کی گردن سے ہٹا لیا۔ پھر میں نے اسے کرسی پر بیٹھ جانے کا حکم دیا اور چاقو بند کر کے پرس میں رکھ دیا۔ اسے ذہنی دھچکا پہنچانے کی خاطر ایک بار پھر میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "سوری مسٹر ڈیسوزا! آپ کی شان میں گستاخی پر میں سخت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے۔"

وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا' پھر بولا۔ "راج کماری! مجھے اعتراف ہے کہ میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔"

"یہ کوشش بھی نہ کیجئے گا مسٹر ڈیسوزا! میں آج تک خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکی۔ اب آپ اپنا قیمتی وقت مزید ضائع نہ کریں اور ان اعلیٰ انگریز حکام کے نام بتا ہی دیں جن کے حکم پر آپ معبلہ کے خلاف تحقیقات کر رہے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھئے گا مسٹر ڈیسوزا کہ جھوٹ بولنے پر غلط نام بتانے کی صورت میں آپ کو کسی جانور کی طرح پچھاڑ کر ذبح بھی کیا جا سکتا ہے۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ پھر بدل گیا تھا۔

"لیکن راج کماری! میں آپ کو کس طرح یقین دلا سکتا ہوں کہ غلط نام نہیں بتائے؟"

"یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا مسٹر ڈیسوزا! پہلے آپ نام تو بتایئے۔"

پھر ڈیسوزا نے مرکزی حکومت کے دو اعلیٰ حکام کے نام بتا ہی دیئے۔ ان دونوں کا تعلق براہ راست وائسرائے' یعنی حکومت ہند کے سربراہ سے تھا۔ وہ دونوں صرف وائسرائے ہی کو جواب دہ تھے۔ ان میں سے ایک کا نام ولیم رائٹ اور دوسرے کا رابرٹ ہیم تھا۔

"بہت بہت شکریہ مسٹر ڈیسوزا!" میں خوش اخلاقی سے بولی۔ "اب آپ اس وقت تک میرے مہمان رہیں گے جب تک ان ناموں کی تصدیق نہیں ہو جاتی۔"

"یہ ظلم ہے راج کماری!" ڈیسوزا نے شدید احتجاج کیا۔ "میں نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا

پھر بھی آپ مجھے رہا نہیں کر رہیں۔"

"ناموں کی تصدیق تو ہو جانے دیں' مسٹر ڈیسوزا! کیا خبر آپ نے مجھے یونہی بہلانے کی خاطر دو نام لے دیئے ہوں؟ مرکز میں ولیم اور رابرٹ نامی حکام سرے ہی سے نہ ہوئے تو میں آپ کا کیا بگاڑ لوں گی؟ آپ کو تو میں رہا کر چکی ہوں گی۔"

"جس طرح آپ مجھے ایک مرتبہ اغوا کر چکی ہیں راج کماری! اسی طرح دوبارہ بھی تو اغوا کرا سکتی ہیں۔" ڈیسوزا نے بحث کی۔

"میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں مسٹر ڈیسوزا کہ آپ کی ان باتوں میں آ جاؤں۔ دوبارہ آپ کو اغوا کرا لینا ہنسی کھیل نہیں ہو گا۔ ایک بات ذہن میں رکھئے گا کہ میں نے آپ کے لئے لفظ مہمان استعمال کیا ہے۔ اس کی لاج رکھئے گا ورنہ دوسری صورت میں میزبان جوتا بھی اٹھائے سکتے ہیں جو ظاہر ہے کوئی اچھی بات نہیں ہو گی۔ ایک غلام اپنے آقا پر جوتا اٹھاتے ہوئے اچھا نہیں لگے گا۔ مجھے امید ہے مسٹر ڈیسوزا کہ آپ حدود سے تجاوز نہیں کریں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ آپ کے بتائے ہوئے ناموں کی تصدیق ہوتے ہی آپ کو رہائی مل جائے گی۔" بظاہر میرا لہجہ نرم اور مہذب ہی تھا لیکن لہجے کی چبھن بہت کچھ ظاہر کر رہی تھی۔ "بولیں مسٹر ڈیسوزا! مہمان بن کے رہنا چاہتے ہیں یا قیدی؟"

ڈیسوزا کا چہرہ بجھ سا گیا۔ شاید اسے یہ توقع تھی کہ مطلوبہ نام بتانے کے بعد اس کی جان چھوٹ جائے گی' مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

"کسی اعلیٰ انگریز افسر کو اغوا کرانے اور حبس بے جا میں رکھنے کا مطلب آپ جانتی ہیں راج کماری!" وہ آخری حربے کے طور پر بولا۔

"ہاں معلوم ہے مجھے' یہ بہت بڑا جرم ہے لیکن تم لوگوں نے جو پورے ہندوستان کو حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے' کیا یہ جرم نہیں؟" میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"ہم تو یہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت سنبھالنے پر مجبور ہوئے ہیں' راج کماری! یہ بات ساری دنیا جانتی ہے۔ اگر ہم حکومت نہ سنبھالتے تو یہاں کے لوگ آپس میں لڑ لڑ کر مر جاتے۔" ڈیسوزا نے عیاری سے جواب دیا۔

"اور انہیں ایک دوسرے کا دشمن کس نے بنایا' آپس میں لڑایا کس نے؟"

"وہ تو خود ہی لڑ رہے تھے۔ ہم تو ان کی درخواست پر مدد کر رہے تھے۔"

"اور اس بہانے ان کے علاقے ہڑپ کر رہے تھے یہ بھی تو سچ ہے مسٹر ڈیسوزا!"

"اس بحث سے اب کوئی فائدہ نہیں راج کماری! جو ہونا تھا وہ ہو چکا' اب تو اس ملک کے حاکم ہم ہیں اور ہم نے بڑی مشکل سے یہ ملک حاصل کیا ہے۔"

"اور مشکل ہی سے اسے چھوڑیں گے لیکن یاد رکھیں مسٹر ڈیسوزا! ایک نہ ایک دن آپ کو یہ ملک چھوڑ کر جانا پڑے گا کیونکہ کچھ سرفروش آپ کے خلاف سرگرم ہو چکے ہیں۔ آپ بھی اس سے شاید بخوبی آگاہ ہیں۔" میں دانستہ یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ "جلد ہی انگریز غاصبوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز

ہو جائے گا۔"

ڈیسوزا میری توقع کے مطابق چونک کر بولا۔ "تو کیا آپ .... آپ بھی راج کماری! حکومت کے ان باغیوں سے ملی ہوئی ہیں؟"

"باغی نہیں' سرفروش کہو۔ ملنا کیسا مسٹر ڈیسوزا! آپ مجھے بھی انہی سرفروشوں میں سے ایک سمجھ سکتے ہیں۔" میں جان بوجھ کر اسے غلط راہ پر لگا رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ کہ ڈیسوزا مجھے بھی اسی زیر زمین خفیہ تنظیم کی رکن سمجھ لے جو انگریزوں کے خلاف کام کر رہی تھی۔ رہا ہونے کے بعد یقیناً ڈیسوزا کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کے اغوا کی ذمے داری کن لوگوں نے قبول کی تھی۔ ایسی صورت میں اس کا دھیان ہرگز میری طرف سے نہ جاتا کہ میں نے اسے اغوا کرایا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی سوچتا کہ زیر زمین تنظیم کی ایک رکن راج کماری ذاتی طور پر معبلہ' یعنی مجھ سے ہمدردی رکھتی تھی۔

ڈیسوزا پر مجھے جو کچھ ظاہر کرنا تھا' وہ میں ظاہر کر چکی تھی۔ ایسی صورت میں ڈیسوزا یہی سمجھتا کہ وہ زیر زمین کسی خفیہ تنظیم کی قید میں ہے۔ میرا مقصد بھی اسے یہی باور کرانا تھا اور اپنے اندازے کے مطابق میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ ردعمل جاننے کے لئے میں نے ڈیسوزا کے چہرے کا جائزہ لیا تو وہ مجھے مزید بدحواس دکھائی دیا۔

میں نے اپنی بات میں مزید وزن پیدا کرنے اور اپنی طرف سے ڈیسوزا کی توجہ ہٹانے کی خاطر کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔ "مسٹر ڈیسوزا! جب بہت سی باتیں سامنے آ ہی گئی ہیں تو پھر میں آپ کو یہ بتا دینے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتی کہ دراصل آپ کو کس لئے اغوا کیا گیا ہے' کیا آپ اس کی وجہ بتا سکتے ہیں؟"

ڈیسوزا کے چہرے سے الجھن ظاہر ہونے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا۔ "اب تک تو میں اس کی وجہ یہی سمجھ سکا ہوں راج کماری کہ آپ مجھ سے ان مرکزی اعلیٰ حکام کے نام معلوم کرنا چاہتی تھیں جنہوں نے مجھے معبلہ کے بارے میں چھان بین کا حکم دیا تھا۔"

"اور یہاں مزید مہمان رکھنے کی وجہ غالباً آپ کے بتائے ہوئے ناموں کی تصدیق ہی سمجھ رہے ہوں گے؟" میں مسکرائی۔

"جی ہاں' راج کماری! آپ نے یہی مجھ سے کہا بھی ہے۔"

"اور تم نے یقین کر لیا؟ کیا تمہاری کھوپڑی میں نام کو گودا نہیں مائی ڈیر ڈیسوزا! آدمی کا کچھ اپنا اندازہ' اپنا قیاس بھی تو ہوتا ہے۔ مجھے حیرت ہے ڈیسوزا کہ تمہیں کس بے وقوف نے خفیہ پولیس جیسے محکمے کا سربراہ بنا دیا۔ تم تو نرے پیدل ہو۔ ابھی میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا تعلق ایک انگریز دشمن تنظیم سے ہے' اس کے باوجود تم کچھ نہیں سمجھے۔" میرا لہجہ پھر بدل گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اس کا مذاق اڑا رہی ہوں۔

"مجھے تسلیم ہے راج کماری کہ میں آپ کے سامنے طفلِ مکتب ہوں۔" ڈیسوزا نروس نظر آنے لگا۔ "اب .... اب مجھے معبلہ والا معاملہ زیادہ اہم معلوم نہیں ہو رہا۔"

"اب تم صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو۔ نہ تمہیں معبلہ کے معاملے کی وجہ سے اغوا کیا گیا ہے' نہ یہاں مزید اس وجہ سے رکھا جارہا ہے کہ تمہارے بتائے ہوئے ناموں کی تصدیق ہو سکے۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ مسٹر ڈیسوزا کہ ہم اپنے ان تمام ساتھیوں کو رہائی دلانا چاہتے ہیں جنہیں ہندوستان بھر کی جیلوں میں شبہے کی بنیاد پر قید رکھا گیا ہے۔ حکومت جب ہمارے ان ساتھیوں کو رہا کر دے گی تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ اب سمجھ گئے تم اپنے اغوا کا مقصد۔"

"اور .... اور راج کماری! اگر حکومت نے تمہارا مطالبہ تسلیم نہیں کیا پھر؟" یہ سوال کرتے ہوئے ڈیسوزا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"تو پھر بہ مجبوری ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔ تمہی بتاؤ اس کے سوا ہمارے پاس اور کیا راستہ ہو گا؟ پھر ہم تم سے بھی کسی بڑے افسر یا وزیر کو اغوا کرنے کی کوشش کریں گے لیکن میرا خیال ہے ڈیسوزا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ حکومت ہمارا مطالبہ تسلیم کر لے گی تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک آخری سوال راج کماری!" ڈیسوزا مجھے اٹھتے دیکھ کر جلدی سے بولا۔ "اس کے بعد میں آپ سے کچھ بھی نہیں پوچھوں گا۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"ہاں پوچھو۔" میں آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔

"میں نے آپ کا چہرہ دیکھ لیا ہے راج کماری! کیا اس کے باوجود آپ مجھے رہا کر دیں گی؟"

"تم بہت بے وقوف ہو ڈیسوزا! یہ کہہ کر میں زور سے ہنس پڑی پھر بولی۔ "جب میرے معمولی آدمی تک تم سے اپنے چہرے چھپائے ہوئے ہیں تو کیا میں تمہیں اپنے چہرے کا دیدار کرا دیتی؟ ڈیسوزا مائی ڈیئر! تمہاری کھوپڑی میں اتنی عقل تو ہونا ہی چاہئے تھی۔ میرا اصل چہرہ تو آج تک میرے ساتھی نہیں دیکھ سکے پھر تم کیسے دیکھ سکتے ہو۔ نہ یہ چہرہ میرا اصل چہرہ ہے جو تم دیکھ رہے ہو' نہ یہ آواز میری اصل آواز ہے جو تم سن رہے ہو۔ آخر میں تمہیں یہ بھی بتا ہی دوں ڈیسوزا کہ راج کماری سیتا بھی میرا فرضی نام ہے۔ سنو ڈیسوزا! ناموں میں کچھ نہیں رکھا' ہم تو روح سفر ہیں' کل کسی اور نام سے آ جائیں گے اس لئے ہمیں ہمارے ناموں سے نہیں' جذبوں سے پہچاننے کی کوشش کرو......... اور کوئی سوال؟"

ڈیسوزا کا سر جھک گیا۔ یہی اس کا جواب تھا پھر اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور میں اس کمرے سے نکل آئی۔ راجہ استاد اور شنکر دادا میرے پیچھے تھے۔

"مجھے اور راجہ استاد کو شنکر دادا نے دھرم تلے تک پہنچانے کے لئے اپنا ایک آدمی ساتھ کر دیا جو جیپ ڈرائیو کرنا جانتا تھا۔ شنکر دادا وہیں رک گیا تھا۔

راستے میں راجہ استاد مجھ سے بولا۔ "رانی! یہ تو کوئی بہت ہی لمبا چکر معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ کیسے استاد؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمہاری اور اس بندر کی گفتگو سے تو یہی پتا چل رہا ہے۔" راجہ استاد نے جواب دیا۔ "تھوڑی

بہت انگریزی مجھے بھی آتی ہے' مڈل تک پڑھا ہوں۔"

"استاد! تم تو چھپے رستم نکلے' مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم انگریزی بھی جانتے ہو گے۔"

"خیر یہ تو چھوڑو رانی! مگر ایک بات میرے پلے نہیں پڑی .... بلکہ یوں سمجھو کہ کئی باتیں۔"

"فرماؤ باری باری۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔ "کیا خبر وہ باتیں خود میرے پلے بھی نہ پڑی ہوں۔"

"اب ایسی اندھی بھی نہیں لگ رہی' اتنے دن میں تمہیں تھوڑا بہت تو میں سمجھ ہی چکا ہوں۔ بڑی پہنچی ہوئی ہو تم۔"

"کہاں؟" میں نے برجستہ پوچھا۔

اس پر راجہ استاد بھی ہنسنے لگا پھر بولا۔ "یہی بات تو میں نہیں سمجھا رانی کہ یہ معبلہ کون ہے جس کے پیچھے خفیہ پولیس پڑی ہوئی ہے۔ دوسرے یہ تنظیم کا کیا چکر ہے جو حکومت کے خلاف کام کر رہی ہے؟ پھر اس تمام چکر میں مال پانی کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا' یہ بھی میرے لئے حیرت کی بات ہے۔"

"بعض کام اللہ واسطے بھی تو کر دیئے جاتے ہیں استاد!" میں ہنسی۔

"تم کتنی بڑی اللہ والی ہو' معلوم ہے مجھے۔ اندر خانے تم نے کوئی نہ کوئی کھانچا ضرور فٹ کیا ہو گا۔"

"ظاہر سی بات ہے استاد!" میں نے دانستہ ایک ناکردہ جرم کا اقرار کر لیا تاکہ راجہ استاد مطمئن ہو جائے۔ دھرم تلہ قریب آنے والا تھا کہ معاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور اسی کے زیر اثر میں نے راجہ استاد سے کہا۔ "استاد! چند روز کے لئے تم ہمایوں اور شانتی کو لے کر میری کوٹھی میں آ جاؤ۔"

"وہ کس خوشی میں بھئی؟" راجہ استاد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم دھرم تلے میں رہتے ہو' نا استاد! اور سبھی کو خبر ہے کہ یہ تمہارا علاقہ ہے' پولیس کو بھی علم ہو گا۔" میں بولی۔

"ہاں کیوں نہیں' پولیس کو باقاعدہ بھتا جاتا ہے۔" راجہ استاد کے لہجے میں احساس تفاخر تھا یوں جیسے پولیس کو بھتا دینا کوئی فخر کی بات ہو۔

"دھرم تلہ تمہارا علاقہ ہے اور یہاں جو جرائم ہوتے ہیں تمہاری ہی مرضی سے ہوتے ہیں' پولیس بھی یہ بات جانتی ہے۔ ڈیسوزا کو بھی اسی علاقے سے اغوا کیا گیا ہے۔ تو کیا پولیس اس معاملے میں تم پر شبہ نہیں کرے گی؟"

"تو کیا کرے' کیا فرق پڑتا ہے۔" راجہ استاد بے پرواہی سے بولا۔

"تم میری بات نہیں سمجھ رہے استاد! اس سے فرق یہ پڑے گا کہ پولیس' میری مراد علاقے کی پولیس سے ہے' اپنے بڑے افسران کی خوشنودی حاصل کرنے اور کارکردگی دکھانے کے لئے سب سے پہلے جسے گرفتار کرے گی' وہ تم ہو گے' تم اور ہمایوں! اب آیا تمہاری سمجھ میں۔"

"تو کیا وہ سالے نمک حرامی پر آمادہ ہو جائیں گے؟ برسوں ہو گئے انہیں مال کھلاتے ہوئے۔"

"یہ معاملہ ہی ایسا ہے استاد کہ وہ اپنی نوکریاں بچانے کے لئے کسی کا لحاظ نہیں کریں گے۔"

بڑی مشکل سے راجہ استاد کی سمجھ میں میری بات آئی۔ میں نے اسے اپنی کوٹھی پر اتار دیا اور خود اسی جیپ میں چاندنی چوک کے لئے روانہ ہو گئی۔ میرے خیال میں اس وقت تک راجہ استاد کا اپنے گھر جانا خطرناک تھا جب تک معاملات کوئی رخ اختیار نہ کر لیتے' واضح رخ۔ پولیس کی تفتیش کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے کسی جرم کی تفتیش کا آغاز وہ علاقے کے معروف غنڈوں پر ہاتھ ڈال کر ہی کرتی ہے' اس جرم میں چاہے وہ غنڈے ملوث ہوں نہ ہوں۔

چاندنی چوک پہنچ کر میں نے جیپ کو رخصت نہیں کیا اور ڈرائیور سے انتظار کرنے کے لئے کہہ کر بلڈنگ میں داخل ہو گئی۔ اس وقت دوپہر کے ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دستک دی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اندر سے مجھے شانتی کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟" اس کی آواز مجھے واضح طور پر بھرائی ہوئی سی لگی تھی۔

"دروازہ کھولو شانتی! میں ہوں۔" میں نے جواب میں دھیرے سے کہا۔

"دیدی!" شانتی کی تیز آواز آئی۔ میری توقع کے مطابق اس نے آواز پہچان لی تھی۔

دروازہ فوراً ہی کھل گیا' مگر مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اس کی آنکھیں بھیگی سی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ میرے آنے سے پہلے روتی رہی تھی۔

"ہمایوں کہاں ہے؟" یہ کہتے ہوئے میں گھر میں داخل ہو گئی۔

"تم .... تم دیدی .... دیدی ہو .... نا؟" اس کی آواز میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں' میں تمہاری دیدی ہوں۔ اس وقت میرا چہرہ بدلا ہوا ہے۔" میں بولی۔ شانتی کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ مجھے پہلے بھی میک اپ میں بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔ "شانتی! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ ہمایوں کہاں ہے؟"

"دیدی اسے پولیس پکڑ کے لے گئی اور .... اور پولیس .... پاپا کو بھی پوچھ رہی تھی۔ وہ .... وہ کہہ گئے ہیں دیدی کہ .... کہ جیسے ہی پاپا آئیں' میں انہیں تھانے بھیج دوں۔ اب .... اب کیا ہوگا دیدی؟ وہ .... وہ میرے ہمایوں کو تو چھوڑ دیں گے؟" شانتی نے رک رک کر بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔

"یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے شانتی!" میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"پاپا کو گھر سے نکلے ذرا ہی دیر ہوئی تھی دیدی کہ پولیس آ گئی۔ معلوم نہیں پاپا کہاں ہوں گے؟"

"تم گھبراؤ مت! تمہارے پاپا خیریت سے ہیں اور ہمایوں کو بھی جلد ہی پولیس چھوڑ دے گی۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"مگر کہاں دیدی؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اپنے پاپا کے پاس اور کہاں' وہ میری کوٹھی پر ہیں۔ میں تم ہی کو لینے آئی تھی۔ جیسی ہو بس ویسی

ہی چلی چلو۔"

میرے کہنے پر شانتی فوراً میرے ساتھ ہو لی اور گھر کے دروازے پر تالا ڈال دیا۔ میرے خیال میں اس کا وہاں تنہا رہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ میں اسے ساتھ لئے باہر آ گئی۔ روانگی سے پہلے وہ برقع اوڑھنا نہیں بھولی تھی کیونکہ اہل محلہ اسے مسلمان سمجھتے تھے۔

میں نے اسے جیپ میں سوار کرایا اور پھر خود بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"چلو!" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "ہمیں کوٹھی پر اتار کر تم واپس ٹالی گنج چلے جانا۔"

ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلا کر جیپ اسٹارٹ کر دی۔ میں سوچنے لگی کہ آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ہمایوں کی طرف سے مجھے یہ خطرہ بہرحال نہیں تھا کہ وہ پولیس کے سامنے زبان کھول دے گا' نہ پولیس سے یہ توقع تھی کہ وہ ڈیسوزا جیسے اعلیٰ انگریز افسر کے اغوا کا شبہ ہمایوں پر کرے گی۔ ہمایوں بہرحال پولیس کی نظر میں ایک معمولی درجے کا غنڈا تھا۔ شبہ نہ کئے جانے کی صورت میں یہ امکان بھی نہیں تھا کہ پولیس سختی کے ساتھ اس سے پوچھ گچھ کرتی۔ پولیس ہمایوں سے بہت پوچھتی تو بس یہ کہ وہ گزشتہ رات کہاں تھا؟ ہمایوں کے پاس اس کا سیدھا سا جواب یہ تھا کہ اپنے گھر میں تھا۔ اس سے زیادہ پوچھ گچھ کی مجھے توقع نہیں تھی۔

شنکر دادا کا آدمی مجھے اور شانتی کو کوٹھی کے گیٹ پر اتار کر چلا گیا۔ قاسم نے مجھے دیکھتے ہی پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول دیا اور میں' شانتی کو ساتھ لئے اندر داخل ہو گئی۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ راجہ استاد ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ میں وہیں پہنچ گئی۔ شانتی نے برقع اتار کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں راجہ استاد سے کچھ کہتی یا وہ مجھ سے ہمایوں کے بارے میں پوچھتا' شانتی روتی ہوئی راجہ استاد کی طرف لپکی۔

"کیا ہوا .... ارے کیا ہو گیا تجھے؟" راجہ استاد گھبرا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "تو رو کیوں رہی ہے؟"

شانتی' راجہ استاد سے لپٹ کر اسے روتے ہوئے بتانے لگی کہ ہمایوں کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔

"بیٹھ .... بیٹھ جا! گھبرا مت' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" راجہ استاد اس کی پشت تھپک کر تسلی دینے لگا۔

اس لمحے مجھے شانتی اور ہمایوں کی محبت پر رشک سا محسوس ہوا۔ ان دونوں کے درمیان مذہباً یا قانوناً کوئی رشتہ نہیں تھا' پھر بھی وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ شانتی کا رویہ کسی شوہر پرست بیوی کا سا تھا حالانکہ نہ تو ہمایوں اس کا شوہر تھا نہ ہم مذہب۔ مگر شاید اس کے سوا بھی کوئی اور مضبوط رشتہ ہوتا ہے' محبت کا رشتہ۔ اس رشتے سے مضبوط اور گہرا کوئی اور رشتہ نہیں ہوتا۔ راجہ استاد کے کہنے پر شانتی نے خود کو سنبھال لیا اور آنسو پونچھتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے ماں باپ اور عزیز رشتے داروں کو چھوڑ کر ہمایوں کے ساتھ رامپور سے بھاگ آئی تھی۔ اب ہمایوں ہی تو اس کی کل کائنات تھا۔ بھری دنیا میں ہمایوں کے سوا اس کا اور تھا بھی کون۔ تو پھر وہ ہمایوں کی گرفتاری پر بدحواس کیوں نہ ہو جاتی۔ مجھے

وہ وقت یاد آیا جب احرس میدان جنگ میں زخمی ہو گیا تھا اور میں تڑپ اٹھی تھی۔ میری حالت بپھری ہوئی کسی شیرنی کی سی ہو گئی تھی۔ شاید ہر عورت اپنے مرد کو مصیبت میں دیکھ کر اسی طرح بے چین ہو جاتی ہے۔

"تم ٹھیک کہتی تھیں رانی!" راجہ استاد نے کچھ دیر بعد مجھے مخاطب کیا۔ "پولیس نمک حرامی پر اتر ہی آئی۔"

"لیکن استاد! فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہمایوں کو جلد ہی چھوڑ دیا جائے گا۔" میں نے راجہ استاد کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو رانی!"

"اس طرح کہ بہت جلد حکومت کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ڈیسوزا کو کن لوگوں نے اغوا کیا ہے۔"

"کیا؟" راجہ استاد چونک کر بولا۔ "حکومت کو یہ کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ ڈیسوزا کو ہم.........."

"تمہارا ذکر اس میں کہاں سے آ گیا استاد!" میں بول اٹھی۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ راجہ استاد شانتی کے سامنے یہ راز افشا کر دے۔ "ڈیسوزا کو تو ایک ایسی خفیہ تنظیم نے اغوا کیا ہے جو انگریزوں کے خلاف ہے۔ اچھا ٹھہرو، میں ابھی آئی۔" یہ کہہ کر میں نے شانتی کو مخاطب کیا۔ "آؤ میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔"

"میرا کمرہ دیدی!" شانتی حیرت سے بولی۔

"ہاں اور کیا، فی الحال تم میرے ہی پاس رہو گی جب تک ہمایوں چھوٹ کر نہ آ جائے اور تمہارے پاپا بھی یہیں رہیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہمایوں کب تک چھوٹ کر آ جائے گا دیدی؟" اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ اسے تو بس ایک ہی رٹ لگی ہوئی تھی۔

"کہا نا کہ جلد آ جائے گا، گھبرا کیوں رہی ہو۔"

پھر شانتی کچھ نہ بولی اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ کوٹھی میں ڈرائنگ اور ڈائننگ کے علاوہ چھ کمرے تھے۔ ان میں سے تین ہی اس وقت زیر استعمال تھے۔ دو کمرے شیتل اور شہزاد کے استعمال میں تھے اور ایک میرے تصرف میں تھا۔ تین کمرے بالکل خالی پڑے تھے حالانکہ ان میں تمام ضروری فرنیچر موجود تھا۔ کسی بھی کمرے کو بطور خواب گاہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میں جب اندر پہنچی تو شیتل اور شہزاد کو بھی آواز دے کر بلا لیا۔ شانتی سے میں نے ان دونوں کا تعارف کرا دیا۔

"آمنے سامنے دونوں کمروں میں شانتی اور راجہ استاد رہیں گے۔" میں نے شہزاد کو بتایا اور پھر شانتی کو ساتھ لئے اس کمرے میں داخل ہو گئی جس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ "تم اس کمرے میں رہو گی شانتی!" میں نے اسے بتایا۔

شانتی حیرت سے کمرے کے نئے فرنیچر اور دیگر ساز و سامان کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔

"میں.......... دیدی! میں یہاں.......... یہاں رہوں گی؟ اتنے بڑے اور اچھے کمرے میں؟"

"کیوں، کیا ہوا؟ میں بھی تو رہتی ہوں یہاں۔"

"اور دیدی، کوئی چیز خراب ہو گئی تو؟" اس نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

"پگلی! یہ سب چیزیں خراب ہی کرنے کے لئے ہیں۔" میں نے اس کے پھول سے رخسار پر ہلکی سی تھپکی دی، پھر بولی۔ "تم یہاں آرام کرو، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو فاطمہ کو آواز دے لینا۔" پھر میں وہاں رکے بغیر باہر نکل آئی اور شیتل سے چائے کے لئے کہہ کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"تمہاری بات اس وقت سمجھا نہیں تھا میں۔" راجہ استاد مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ "راستے میں بھی تم سے میں تنظیم کے متعلق پوچھ رہا تھا مگر تم گول کر گئیں۔"

"سنو استاد!" میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر بولی۔ "ڈیسوزا کو اغوا تو خیر ہم نے کیا ہے مگر اغوا کی ذمے داری ایک خفیہ زیر زمین تنظیم قبول کر لے گی۔"

"وہ کس خوشی میں؟ تنظیم کیوں یہ الزام اپنے سر لینے لگی؟"

"تمہاری انگریزی دانی مجھے بس واجبی سی لگتی ہے استاد! تم نے اگر ڈیسوزا کے اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو پوری طرح سمجھ لی ہوتی تو ہرگز یہ سوال نہ کرتے۔"

"تو اب سمجھا دو۔"

پھر میں نے راجہ استاد کو ساری بات سمجھا دی، مگر صرف اس حد تک جہاں تک سمجھانا ضروری تھا۔

"اب میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ تم نے مال بنانے کے لئے کس جگہ کھانچا فٹ کیا ہے۔" راجہ استاد معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"اگر تم سمجھ گئے ہو تو مجھے بھی سمجھا دو استاد! اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔" میں بھی مسکرائی۔

"اچھا تو سنو، راجہ استاد نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ بات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ تم نے ڈیسوزا کو اس لئے اغوا کرایا ہے کہ خفیہ تنظیم والوں سے مال توڑ سکو۔ اس طرح وہ لوگ حکومت پر دباؤ ڈال کر اپنے آدمیوں کو رہا کرا لیں گے۔ بولو، ہے نا یہی بات۔" راجہ استاد نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تمہارا بھی جواب نہیں استاد! بڑی دور کی کوڑی لاتے ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ راجہ استاد بہرحال ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور مجھے بھی اپنی ہی طرح سمجھتا تھا اس لئے وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھا۔ اس کے خیال میں اگر ڈیسوزا کو اغوا کرا کے مجھے کوئی مالی فائدہ نہ ہوتا تو میں کیوں اسے اغوا کراتی۔ جرائم کی دنیا میں بھی عموماً آدمی کے ہر عمل کو دولت کے ترازو ہی میں تول کر دیکھا جاتا ہے۔ کچھ بھی سہی راجہ استاد کو بہرحال یقین آ گیا کہ ہمایوں جلد رہا ہو جائے گا۔ میں اسے یہی یقین دلانا چاہتی بھی تھی۔

☆======☆======☆

مجھے اب ارشاد حسین سے ملاقات کی فکر تھی۔ اسی کے ذریعے ان دونوں ناموں کی تصدیق ہو سکتی تھی جو ڈیسوزا سے معلوم ہوئے تھے۔ اس نے تو میری کوٹھی دیکھی تھی مگر مجھے اس کے گھر کا علم نہیں

تھا۔ میں مٹیا برج گئی بھی تھی تو اس سے میری ملاقات دوسری جگہ ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تو تھا کہ مٹیا برج کے ایک علاقے بتی کل میں اس کی سکونت ہے لیکن گھر کا پتا نہ ہونے کی صورت میں اسے میں کہاں تلاش کرتی پھرتی۔ ارشاد حسین سے رابطے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ اس کے دفتر میں پیغام پہنچا دیا جاتا کہ وہ مجھ سے فوری طور پر مل لے' مگر میرے نزدیک یہ ایک خطرناک قدم ہوتا۔ ڈیسوزا کو اغوا کیا جا چکا ہے' ارشاد حسین کو اب تک پتا چل گیا ہوگا۔ ایسی صورت میں ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ خود مجھ سے رابطہ قائم کرتا۔ پھر بھی یقینی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ ارشاد حسین کو یہ معلوم کرنے کا تجسس بھی ہو سکتا تھا کہ ڈیسوزا نے زبان کھولی یا نہیں؟ اور اگر زبان کھول دی تو کیا بتایا؟ فی الحال میرے پاس اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں تھی کہ ارشاد حسین کا انتظار کرتی۔ اس سے ملاقات کر کے میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ تنظیم ڈیسوزا کے اغوا کے ذمے داری کب اور کس طرح قبول کرنے کا اعلان کرے گی؟ اسی کے ساتھ یہ کہ اپنے ارکان کی رہائی کا مطالبہ تنظیم کب کرے گی؟ اگر تنظیم کا معاملہ درمیان میں نہ آگیا ہوتا تو ڈیسوزا کے اغوا کا مقصد حاصل ہو چکا تھا' صرف ان ناموں کی تصدیق باقی تھی جو اس نے بتائے تھے۔

اسی شام جب میں ڈائننگ روم میں بیٹھی شانتی اور راجہ استاد کے ساتھ چائے پی رہی تھی تو رحمت نے آکر اطلاع دی۔ "کوئی رام پرشاد اگروال آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ قاسم نے اسے گیٹ پر روک رکھا ہے۔ اس کے لئے کیا حکم ہے؟"

ارشاد حسین اسی نام سے میرے ساتھ امرتلہ اسٹریٹ کی دھرم شالہ میں ایک ہفتے ٹھہرا تھا۔ میں اسی لئے اس فرضی نام کے باوجود اسے پہچان گئی۔

"اگروال جی کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور ان سے کہو کہ میں ابھی آتی ہوں۔" میں نے رحمت سے کہا۔

میرا حکم سن کر رحمت چلا گیا تو راجہ استاد بولا۔ "رانی! حالانکہ تمہیں کلکتے آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر لگتا ہے جیسے سارا شہر تمہیں جانتا ہو۔ تم نے اس شہر میں بہت جلد اپنی جڑیں گہری کر لی ہیں۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک ہوا میں ہاتھ پاؤں چلا رہا ہوتا۔"

"یہ سب تمہاری ہی دعاؤں کا نتیجہ ہے استاد!" میں جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔

"ارے میں کیا اور مجھ گنہگار کی دعائیں کیا' یہ سب کچھ تمہاری خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ہے۔" راجہ استاد نے کہا پھر دھیمی آواز میں میری طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔ "ویسے رانی! تنظیم میں کیا ہندو مسلمان سبھی شامل ہیں؟"

"اس وقت تمہیں تنظیم کا خیال کیسے آگیا استاد!" میں چونک کر بولی انداز ے لگانے میں واقعی راجہ استاد کا جواب نہیں تھا۔

"بس یوں ہی خیال آگیا۔" وہ مسکرایا پھر خود ہی کہنے لگا۔ "ظاہر بات ہے کہ ان دنوں تم سے اور کون ملنے آسکتا ہے۔"

میں جواب میں کچھ کہے بغیر چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور شیتل سے کہا کہ ڈرائنگ روم میں چائے پہنچا دے۔ اس وقت میرے چہرے پر میک اپ نہیں تھا' نہ اس کی ضرورت تھی البتہ میں نے اپنے کمرے میں جا کر لباس ضرور تبدیل کیا کیونکہ میں نائٹ گاؤن پہنے ہوئی تھی۔

میں نشست گاہ میں پہنچی تو شیتل چائے دے کر لوٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ارشاد حسین نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔ "جے رام جی کی دیوی!"

"نمستے!" میں بھی جواباً ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ شیتل اس وقت تک دروازے سے نکل چکی تھی۔ میں نے اسی لئے ارشاد حسین سے کہا۔ "اب آپ کو کھل کر جو چاہے بات کر سکتے ہیں' یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

"معبلہ! آپ نے واقعی کمال کر دیا۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"ایک بات بتایئے ارشاد کہ اگر کبھی مجھے آپ سے رابطہ قائم کرنا ہو تو اس کی کیا صورت ہوگی؟ باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ مثلاً آج ہی میں آپ سے ملنا چاہ رہی تھی مگر آپ سے کس طرح رابطہ قائم کیا جائے' یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس سے قطع نظر مجھے یقین سا تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔"

"اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا پھر بھی فوری طور پر ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔ اس میں کم از کم صبح سے شام تک کا وقت لگ سکتا ہے اور بعض اوقات زیادہ بھی۔ یہیں دھرم تلے میں چورنگی کے قریب ایک پنواڑی ہے۔ شام کو روزانہ پانچ بجے سے رات نو بجے تک خود میں یا میرا کوئی آدمی اس سے ضرور ملتا ہے۔ اس کے ذریعے تحریری پیغام مجھ تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ میں جب یہاں سے جاؤں گا تو آپ کے کسی ملازم کو ساتھ لے لوں گا اور اسے پنواڑی کی دکان دکھا دوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چار یا ساڑھے چار بجے آپ اسے پیغام پہنچائیں اور وہ پیغام مجھے پانچ بجے ہی مل جائے۔ اسی کے ساتھ ایسا بھی ہے کہ شام پانچ بجے کے بعد آپ پیغام پہنچائیں تو وہ مجھے اگلے روز ہی پانچ بجے کے بعد ملے۔" ارشاد حسین نے رابطے کی صورت بتائی۔

"یہ بھی غنیمت ہے۔" میں نے اظہار اطمینان کیا۔ "اس سے پہلے تو رابطے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ خیر یہ مسئلہ تو حل ہو گیا' اب آپ یہ بتایئے کہ حکومت سے اپنے ارکان کی رہائی کا مطالبہ آپ کی تنظیم کب اور کیسے کرے گی؟ یہ میں اس لئے بھی پوچھ رہی ہوں کہ اس شہر کی فرض شناس پولیس نے بے گناہ افراد کو گرفتار کرنا شروع کر دیا ہے۔" میرے لہجے میں طنز تھا۔

"حیرت ہے معبلہ کہ آپ اس قدر باخبر رہتی ہیں۔ پولیس نے واقعی آج صبح سے اب تک تقریباً سو سے زیادہ افراد کو گرفتار کیا ہے جن میں بڑی تعداد دھرم تلے کے علاقے سے گرفتار کی گئی ہے۔ شاید آپ کے علم میں ہو کہ جس طرح پولیس نے پورے شہر کو انتظامی اعتبار سے تقسیم کر رکھا ہے' اسی طرح گروہ بند غنڈوں نے بھی شہر کو آپس میں بانٹ رکھا ہے۔ ہر علاقے کا ایک سرغنہ ہے۔ ان میں سے صرف چار علاقوں کے سرغنہ ابھی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ سکے جن میں ایک............"

"کا تعلق اسی علاقے' یعنی دھرم تلے سے ہے۔" میں نے ارشاد حسین کی بات پوری کر دی۔

ارشاد حسین نے اس پر اظہار حیرت کیا۔ "کمال ہے معبلہ! مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنی چوکنا اور باخبر رہتی ہیں۔"

میں نے ارشاد حسین کو مزید حیران کرنے کے لئے یہ بھی کہہ دیا۔ "میں تو اس علاقے کے سرغنہ کا نام بھی بتا سکتی ہوں اور اس کا شجرہ بھی کہ اس کا تعلق ہندوستان کے کس علاقے سے ہے' یہ بھی کہ وہ کلکتے میں کہاں رہتا ہے۔ آپ اگر کہیں تو بتا دوں اور یہ بھی کہ اس کے دست راست ہمایوں کو پولیس گرفتار کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔"

"معبلہ! جب آپ اس کے دست راست کا نام بتا سکتی ہیں جو خود میرے علم میں بھی نہیں تھا تو یقیناً اس کا نام بھی بتا سکتی ہیں۔" ارشاد حسین نے میرے دعوے کو کسی ثبوت کے بغیر ہی تسلیم کر لیا پھر کہنے لگا۔ "پولیس کی اس لاحاصل بھاگ دوڑ کا ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہمارے محکمے سے متعلق تمام افراد کو بھی الرٹ کر دیا گیا ہے۔ انہیں فوری طور پر سارے شہر میں پھیل جانے کا حکم ملا ہے۔ ڈیسوزا کی جگہ ڈپٹی ڈائریکٹر نے لے لی ہے اور وہ بھی ایک انگریز ہی ہے۔ اس نے چارج سنبھالتے ہی سارے محکمے کو چوبیس گھنٹے کی مہلت دی ہے کہ اس عرصے میں ہر قیمت پر ڈیسوزا کا سراغ لگایا جائے۔ ڈیسوزا کے ملازمین کا بیان یہ ہے کہ اغوا کرنے والوں کی تعداد چار تھی اور وہ اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ ڈیسوزا کی خواب گاہ میں خون کے دھبے بھی ملے ہیں جن سے یہی اندازہ لگایا گیا ہے کہ شاید ڈیسوزا کو اغوا کرنے سے پہلے زخمی بھی کیا گیا ہے۔ ڈیسوزا کی خواب گاہ سے ایک سروس ریوالور بھی غائب ہے جسے وہ ہمیشہ اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا۔ صحیح صورت حال کیا ہے' یہ تو آپ ہی بتا سکتی ہیں۔" اپنی بات ختم کر کے ارشاد حسین میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ڈیسوزا زخمی نہیں ہوا بلکہ اس نے اغوا کرنے والوں میں سے ایک پر گولی چلا کر اسے زخمی کر دیا تھا۔" میں نے بتایا اور پھر مختصراً ڈیسوزا کے اغوا کا واقعہ بیان کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے خیال رکھا تھا کہ ارشاد حسین یہ اندازہ نہ لگا سکے' اغوا کی واردات میں خود میں بھی شریک تھی یا نہیں۔ مگر اس کے باوجود ارشاد حسین نے درست قیاس کیا۔

"معلوم ہوتا ہے معبلہ کہ یہ کام آپ نے اپنے چند بااعتماد افراد سے لیا ہے جن پر آپ کو پورا بھروسہ تھا کہ وہ ناکام نہیں ہوں گے۔ بہرحال اب یہ بتائیے کہ آپ ڈیسوزا کی زبان کھلوانے میں بھی کامیاب ہوئیں یا نہیں؟ میرے اندازے کے مطابق آپ کو اب تک اس سے پوچھ گچھ شروع کر لینا چاہئے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے ارشاد! یقیناً آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو چکی ہوں۔"

"زندہ باد!" ارشاد حسین بے ساختہ بول اٹھا۔ "آپ تو واقعی حیرت انگیز خاتون ہیں۔"

"اور آپ کو یہ سن کر مزید حیرت ہو گی ارشاد کہ اس کے لئے ڈیسوزا پر تشدد کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔"

"وہ کیسے معبلہ! یہ تو واقعی حیران کن بات ہے۔"

"اس لئے کہ میں نے تشدد کی بجائے ایک نفسیاتی حربہ آزمایا۔" پھر میں نے ارشاد حسین کو تفصیل کے ساتھ بتا دیا کہ ڈیسوزا کس طرح تشدد کے بغیر زبان کھولنے پر آمادہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے مرکزی حکومت کے ان دونوں اعلیٰ انگریز حکام کے نام بھی بتا دیئے جو ڈیسوزا سے معلوم ہوئے تھے۔ اس کے بعد میں نے ارشاد حسین سے ان ناموں کی تصدیق چاہی۔

"ڈیسوزا نے جھوٹ نہیں بولا معبلہ!" ارشاد حسین نے طویل سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "ولیم وائٹ اور رابرٹ ہیم دونوں ہی مرکزی حکومت کے دو ستونوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا تعلق اگر سرفروش تنظیم سے نہ ہوتا تو شاید میں بھی ان دونوں کے ناموں سے بے خبر ہوتا۔ دراصل تنظیم کو مرکز اور صوبوں میں متعین اہم انگریز افسران کی طرف سے باخبر رہنا پڑتا ہے۔ ان میں سے رابرٹ ہیم تو ملٹری انٹیلی جنس کا سربراہ ہے اور ولیم وائٹ سیکرٹ سروس کا چیف ہے اور یہ بھی غلط نہیں کہ دونوں حکام صرف وائسرائے کو جوابدہ ہیں۔ مجھے اس پر شدید حیرت ہے معبلہ کہ اتنی اعلیٰ سطح پر آپ کے متعلق تشویش پائی جاتی ہے' آخر اس کا کوئی تو سبب ہو گا!"

"یہی خیال میرا بھی ہے ارشاد! اور میں اسی سبب کی تلاش میں ہوں۔" میں بولی۔

"لیکن معبلہ! یہ جاننے کے باوجود بھی کہ مرکزی حکومت کے دو اعلیٰ حکام کے ایما پر آپ کے متعلق تحقیقات ہو رہی ہے' آپ اندھیرے میں ہیں۔ ان حکام کے نام معلوم کر کے بھی تو آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ میرے خیال میں آپ کی تمام تگ و دو بے سود ہی رہی۔"

"ارشاد! آپ کے خیال میں کیا مجھے پہلے سے یہ اندازہ نہیں ہو گا اور میں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا ہو گا۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا معبلہ کہ موجودہ صورت حال میں کیا قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔" ارشاد حسین نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

"اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے ارشاد! سیدھی سی بات ہے کہ جن دو اعلیٰ انگریز حکام کے حکم پر میرے بارے میں چھان بین کی جا رہی ہے' کم از کم وہ اس کی وجہ ضرور جانتے ہوں گے' ہے نا یہی بات؟"

"بالکل' انہیں یقیناً معلوم ہو گا۔" ارشاد حسین نے جواب دیا۔

"تو پھر انہی تک پہنچنا ہو گا اور ارشاد! یہ بات پہلے ہی سے میرے ذہن میں تھی۔" جو کچھ میرے ذہن میں تھا' میں نے کہہ دیا۔

"معبلہ! کہیں آپ ولیم اور رابرٹ کو بھی تو صوبہ بنگال کی خفیہ پولیس کے سربراہ ڈیسوزا کی طرح نہیں سمجھ رہیں کہ ان پر باآسانی ہاتھ ڈال سکیں گی۔ پھر آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ وہ دونوں کلکتے میں نہیں دہلی میں ہیں؟"

"معلوم ہے مجھے۔" میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ "لیکن دہلی بھی تو ہندوستان ہی میں ہے اور

وہاں بھی جانا ممکن ہے۔"

"تو کیا آپ وہاں جائیں گی معلبہ!" ارشاد حسین نے پوچھا۔

"جانا تو پڑے گا ارشاد! ورنہ یہ معمہ کیسے حل ہو گا؟ رہا ان دونوں سے ضروری معلومات حاصل کرنے کا سوال تو اس کے لئے صرف یہی ایک راستہ نہیں جو ڈیسوزا کے سلسلے میں رو بہ عمل لایا گیا ہے۔ آپ تو خود ایک ایسے محکمے سے تعلق رکھتے ہیں جو معلومات حاصل کرنے کے متعدد طریقوں سے واقف ہے۔ ہاں ارشاد' آپ نے میرے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں کہ آپ کی تنظیم حکومت سے کب اور کس طرح اپنے ارکان کی رہائی کا مطالبہ کرے گی؟"

"کل صبح تک حکومت کو ہمارے مطالبے کا علم ہو جائے گا۔ اس کا بندوبست کیا جا چکا ہے۔ تمام اہم اور قابل ذکر اخبارات میں کل سرفروش تنظیم کی جانب سے جاری کردہ ایک بیان شائع ہو جائے گا۔ اس بیان میں تنظیم ڈیسوزا کے اغوا کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے ہندوستان کی مختلف جیلوں میں قید اپنے ارکان کے ناموں کی ایک فہرست بھی شائع کرے گی۔ اسی کے ساتھ حکومت سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ تنظیم کے تمام ارکان کو تین دن کے اندر اندر غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے ورنہ ڈیسوزا کو قتل کر دیا جائے گا۔"

"آپ کی تنظیم کے کتنے ارکان جیلوں میں ہیں جن کے نام فہرست میں دیئے گئے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"پچپن۔" ارشاد حسین نے بتایا۔

"آپ کا کیا خیال ہے ارشاد! حکومت اپنے ایک انگریز افسر کو بچانے کے لئے پچپن باغیوں کو رہا کر دے گی؟ کیا یہ سودا اسے مہنگا نہیں پڑے گا؟"

"سودا تو یقیناً مہنگا ہے معلبہ! مگر حکومت یہ سودا کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔" ارشاد حسین نے جواب دیا۔ "معلبہ! شاید آپ کو علم نہیں کہ انگریزوں کے نزدیک ہندوستانیوں کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں' انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہندوستان اب کروٹ بدل رہا ہے۔ اب ہر گھر میں باغی پیدا ہوں گے۔ وہ آخر کتنے باغیوں کو جیلوں میں ڈالیں گے۔ پھر پچپن باغی کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ آپ تو صرف پچپن افراد کی بات کر رہی ہیں' میرے نزدیک تو ایک ہزار سے زیادہ ہندوستانی بھی ایک انگریز کی زندگی کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ میں اسی لئے پُریقین ہوں معلبہ کہ ہمارا مطالبہ حکومت کسی صورت رد نہیں کرے گی۔"

"جب آپ کی تنظیم ڈیسوزا کے اغوا کی ذمے داری قبول کر لے گی تو پھر پولیس نے آج جن سو سے زیادہ افراد کو مختلف علاقوں سے گرفتار کیا ہے' انہیں رہا کر دیا جائے گا؟"

"امکان تو یہی ہے معلبہ! پھر ان لوگوں کو حراست میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔" ارشاد حسین نے کہا پھر بولا۔ "تنظیم کو اپنے ارکان کی رہائی کا موقع فراہم کرنے پر ہمارے سب ساتھی اور تنظیم کے بڑے آپ کے بے حد ممنون ہیں معلبہ! آپ نے یقیناً تنظیم کے لئے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے

لئے ذاتی طور پر میں بھی آپ کا شکرگزار ہوں۔"

"ارشاد! شاید ہمارے درمیان جو تعلقات قائم ہو چکے ہیں' وہ اس طرح کے تکلفات کی اجازت نہیں دیتے۔"

"ممکن ہے میں ایک بات بھول جاؤں معلبہ! وہ پہلے کہہ دوں۔ آپ جب بھی دہلی جانا چاہیں مجھے ضرور بتا دیجئے گا۔ وہاں ہماری تنظیم کے ارکان آپ سے ہر ممکن تعاون کریں گے۔"

"تو کیا وہاں بھی آپ کی تنظیم قائم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں معلبہ! ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں سرفروش تنظیم کی شاخیں اب تک قائم ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اب یہ کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ چھوٹے شہروں اور بڑے قصبوں میں بھی شاخیں قائم کی جائیں۔ ممکن ہے معلبہ کہ جب آزادی کا سورج طلوع ہو' ہم نہ ہوں' مگر ہمیں مرتے وقت یہ سکون و اطمینان ضرور ہو گا' ہماری زندگی رائیگاں نہیں گئی۔ ضروری نہیں کہ پیڑ لگانے والا خود بھی اس کی چھاؤں میں بیٹھے۔" ارشاد حسین کی آواز میں جوش و جذبہ تھا' ایسا جذبہ جسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

"آپ کے خیالات یقیناً قابل ستائش ہیں ارشاد!" میں نے اس کی حوصلہ افزائی میں بخل سے کام نہیں لیا' پھر اس سے پوچھا۔ "دہلی میں آپ کی تنظیم کے ارکان سے رابطے کی صورت کیا ہو گی؟"

"جب آپ دہلی جانے کا ارادہ کر لیں گی معلبہ! تو اس سلسلے میں بھی معلومات فراہم کر دی جائیں گی۔ فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت اور بے سود ہو گا کیونکہ کوڈ ورڈز بدلتے رہتے ہیں۔"

"میں سمجھتی ہوں ارشاد کہ مجھے شاید جلد ہی دہلی جانا پڑے گا۔" میں بولی۔

"اگر وہاں رہنے سہنے کے بندوبست کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے گا۔"

"میرا خیال ہے' یہ ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" یہ کہتے ہوئے مجھے شہزاد کا خیال آ گیا تھا۔ وہ دہلی ہی کا تھا اور وہاں اس کا گھر بھی تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ کہیں اور قیام کا بندوبست کرا سکتا تھا۔ یہی میں نے ارشاد حسین کو بھی بتا دیا۔ "میرا ایک ملازم جسے میں اپنا دست راست سمجھتی ہوں' اسے ساتھ لے جاؤں گی۔ وہ دہلی کا باشندہ ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی پریشانی نہیں ہو گی پھر بھی آپ کی تنظیم کے ارکان سے رابطہ قائم رکھنا میرے حق میں بہتر ہی ہو گا۔ اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں' پیشگی شکریہ!"

"شکریہ نامنظور' اس لئے کہ ابھی آپ خود ہی کہہ چکی ہیں کہ ہمارے درمیان تکلف کے تعلقات نہیں ہیں۔"

"اچھا تو پھر شکریہ واپس۔" میں ہنس پڑی اور ارشاد حسین بھی میرا ساتھ دینے لگا۔

اس کے بعد مزید کچھ دیر بیٹھ کر ارشاد حسین اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اسے نہیں روکا کیونکہ اسے آئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اس پر یوں بھی دہری ذمے داریاں تھیں ایک ذمے داری تو خفیہ پولیس کے محکمے سے وابستہ ہونے کے سبب' دوسری ذمے داری سرفروش تنظیم کے رکن کی حیثیت سے۔ میں نے

اس کے ساتھ رحمت کو بھیج دیا تھا تاکہ وہ پنواڑی کی دکان دیکھ آئے۔

اندر پہنچ کر میں نے راجہ استاد اور شانتی کو یہ خوشخبری سنا دی کہ آئندہ روز ہمایوں کو رہائی مل جائے گی۔

"پھر تو کل ہم اپنے گھر چلیں گے ناپاپا!" شانتی خوش ہو کر بولی۔

"تو کیا تم اسے اپنا گھر نہیں سمجھتیں؟" میں نے اسے گھور کر کہا۔

"کک .... کیوں .... نہیں دیدی!" وہ غریب سٹپٹا گئی۔

"بات دراصل یہ ہے رانی کہ گھر تو گھر والے سے ہوتا ہے اور اس کا گھر والا کل گھر آ جائے گا۔" راجہ استاد نے مداخلت کی۔

"ہاں' اس پر ایک بات یاد آ گئی استاد! ممکن ہے کہ کچھ عرصے کے لئے مجھے کلکتے سے باہر جانا پڑے میری غیر موجودگی میں تمہی لوگوں کو کوٹھی میں رہنا پڑے گا۔"

"تو کیا اتنے دن کے لئے جاؤ گی؟ زیادہ سے زیادہ ہفتے دس دن کو جاؤ گی جیسے پہلے گئی تھیں۔ میں چکر لگا جایا کروں گا۔"

"نہیں استاد! ہفتے دس دن کی بات نہیں' زیادہ دن لگ سکتے ہیں۔"

"پھر بھی کتنے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی ابھی' ہاں اندازہ یہی ہے کہ واپسی میں ایک مہینے سے تو زیادہ ہی لگ جائے گا۔"

"پھر تو خیر سوچا جا سکتا ہے۔" راجہ استاد نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ویسے ابھی تو تم جا نہیں سکتیں جب تک کہ اس بندر کا چکر چل رہا ہے۔"

"ہاں' وہ چکر نمٹا کر ہی جاؤں گی لیکن اسے نمٹنے میں بھی تین دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔"

"اللہ مالک ہے' دیکھا جائے گا۔ راجہ استاد تمہارے حکم سے باہر کب ہے۔"

شہزاد کو اگر اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ نہ ہوتا تو میں راجہ استاد سے یہ بات نہ کرتی۔ شہزاد کی غیر موجودگی میں شیتل کے لئے تمام ذمے داریاں سنبھالنا دشوار تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ پڑھی لکھی نہیں تھی دوسرے بہت سیدھی تھی۔ بقیہ تمام ملازمین نئے تھے۔ ان پر بھی ابھی میں بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے علاوہ میرے سامنے ایک اور مسئلہ بھی تھا جو پہلے بھی ایک مرتبہ درپیش آ چکا تھا۔ اخراجات کے سلسلے میں مجھ سے احتیاط نہیں ہو سکی تھی۔ نئی کوٹھی اور اس کے لئے نیا فرنیچر خریدنے میں خاصی بڑی رقم خرچ ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ملازمین کی تنخواہیں اور دیگر اخراجات کی مد میں بھی رقم خرچ ہوئی تھی۔ دہلی روانگی سے پہلے مجھے رقم کی ضرورت تھی۔ پہلے یہ مسئلہ جس طرح حل ہو گیا تھا' مجھے توقع تھی کہ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہو گا۔ بات صرف اتنی ہی تو تھی کہ وقت سے پہلے مجھے کسی بات کا علم ہو جائے اور ایسا میرے ساتھ بارہا ہو چکا تھا۔ مجھے آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں قبل از وقت معلوم ہو جاتا تھا۔ اس رات میں اسی مسئلے پر غور کرتی ہوئی سونے کے لئے بستر پر لیٹ گئی۔ سونے سے

پہلے میں نے اپنی مسہری کے اردگرد دودھیا حفاظتی حصار قائم ہوتے دیکھ لیا تھا جو چند ہی لمحوں کے بعد میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں اب بے فکر ہو کر سو سکتی تھی۔

☆======☆======☆

میری آنکھوں میں نیند نے جال بننا شروع کئے ہی تھے کہ طویل عرصے کے بعد عظیم نیک روح مہین کی پُراسرار سرگوشیاں میری سماعت میں گونجنے لگیں۔ "اے معلبہ! سن کہ تُو نے صحیح سمت سفر کا فیصلہ کیا ہے۔ اس شہر میں تُو نے جسے تلاش کرنا شروع کیا تھا' وہ بھی اسی شہر میں ہے کہ تُو جس کی طرف جا رہی ہے۔ وہی بدی کا ہرکارہ ژیان جس نے تیری روح پر بڑے گہرے زخم لگائے ہیں' وہاں موجود ہے۔ وہاں پہنچ کر بھی تُو آزمائشوں سے گزرے گی' مگر گھبرانا مت! بدی کی قوتیں تیرا کچھ نہ بگاڑ پائیں گی اور سن کہ خرچ میں میانہ روی اختیار کیا کر' انہیں نہ بھلا کہ جو ضرورت مند ہیں' ضرورت مندوں کا خیال رکھے گی تو تیرے مال میں برکت ہو گی اور تو جان لے کہ تیرے مال میں ضرورت مندوں کا حصہ بھی ہے۔ اس بات کو گرہ میں باندھ لے' تجھے مال میں تنگی نہیں رہے گی۔ نیک روحیں تجھ پر اپنی رحمت کا سایہ بلند کئے رہیں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی سرگوشیاں معدوم ہو گئیں۔

سرگوشیوں کے ذریعے یہ جان کر میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی کہ میرا دشمن ژیان دہلی میں موجود ہے۔ اسی سے انتقام لینے کی خاطر تو میں پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں کی طرف آئی تھی۔ طویل عرصے کے بعد آخرکار اس کا سراغ مل ہی گیا تھا اور اس سلسلے میں بھی عظیم مہین ہی نے میری رہنمائی کی تھی۔ میرے لئے یہ اتنی بڑی خوشخبری تھی کہ نیند آنکھوں سے غائب ہو گئی اور میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک کر میں دوبارہ مسہری پر لیٹنے والی تھی کہ کہیں دور سے مجھے ایک دبی دبی سی سسکی سنائی دی' پھر یوں لگا جیسے سسکی گھٹ گئی ہو۔ میرے اعصاب تن گئے۔ سسکی نسوانی ہی تھی اور عمارت کے اندر ہی سے سنائی دی تھی۔ میرے علاوہ کوٹھی میں صرف دو ہی خواتین اور تھیں' ایک شانتی دوسری شیتل۔ یہ سسکی ان دونوں ہی میں سے کسی کی ہو سکتی تھی۔ میں دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھی اور پھر آہستگی کے ساتھ ذرا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

پہلے میں نے شانتی کے کمرے کا رخ کیا۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور اندر خاموشی تھی۔ شانتی کی طرف سے مطمئن ہو کر میں پنجوں کے بل چلتی ہوئی شیتل کے کمرے کی طرف بڑھی۔ شیتل کے کمرے کا دروازہ بھی مجھے بظاہر بند ہی نظر آیا۔ کمرے کے اندر بھی اندھیرا ہی تھا۔ چند لمحے میں دروازے کے سامنے سانس روکے کھڑی رہی تو اندر ہلکی ہلکی آہٹیں سنائی دینے لگیں اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ذرا ہی دیر کے بعد ایک مردانہ سرگوشی ابھری۔ "دیکھ فاطمہ! جو ہونا تھا سو ہو گیا جب عورت اور مرد ملتے ہیں تو یہی ہوتا ہے۔ تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ یہ گناہ ہے۔ دیکھ اب میں تیرے منہ سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں' زور زور سے سسکیاں نہ بھرنا۔ اگر کوئی جاگ گیا تو غضب ہو جائے گا۔ تُو اگر واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے فاطمہ تو تجھے میری جان کی قسم اب نہ رو' خدا کے لئے چپ ہو جا۔ جس طرح تُو نے مجھے کوٹھی کا صدر دروازہ کھول کر اندر بلایا تھا' اسی طرح خاموشی کے ساتھ چلا جانے دے تاکہ کسی کو

کچھ پتا نہ چلے۔"

اس مردانہ سرگوشی کو شناخت کرنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ یہ قاسم کی سرگوشی تھی۔ اس نے اب یقیناً شیتل کے منہ سے اپنا ہاتھ ہٹا دیا تھا جسے وہ فاطمہ کے نام سے مخاطب کر رہا تھا۔ میں نے شیتل کا یہی فرضی نام رکھا تھا۔ گھر کے سارے ملازمین اسے فاطمہ ہی کہتے تھے۔

کچھ دیر شیتل کے لمبے لمبے سانسوں کی آواز سنائی دیتی رہی' پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"مگر تم تو ہم کو بولا تھا قاسم کہ ہم سے شادی بنائے گا۔"

"تو میں نے اس سے کب انکار کیا ہے؟" جواب میں قاسم کی آواز ابھری۔

ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ قاسم' شیتل کو پیار کا دھوکا دے کر اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کر چکا تھا۔ شیتل اسی وجہ سے اندیشوں کا شکار ہو گئی تھی۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اس معاملے میں تالی صرف ایک ہاتھ سے نہیں بجی۔ شیتل بھی کسی نہ کسی حد تک اس میں شریک تھی۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ قاسم کو میری کوٹھی میں آئے ابھی گنتی کے چند روز ہوئے تھے اور اس نے بڑی صفائی سے شیتل پر کام دکھا دیا تھا بلاشبہ قاسم میں مردانہ وجاہت بھی تھی اور صنف مخالف کے لئے کشش بھی تھی لیکن اس کی یہ تیزگامی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ شیتل کا شاید یہ پہلا تجربہ تھا اور یقیناً وہ اس معاملے میں اناڑی تھی ورنہ اتنی جلدی ہتھیار نہ ڈال دیتی۔ اس معاملے میں اگر کسی حد تک شیتل بھی ملوث نہ ہوتی اور قاسم نے قطعی طور پر زبردستی سے کام لیا ہوتا تو میں اسی وقت فیصلہ کر دیتی۔ اس وقت میں نے یہی مناسب سمجھا کہ بات کو پی جاؤں اور صبح کوئی مناسب فیصلہ کروں۔ شیتل نے اگر قاسم کو یہ موقع نہ دیا ہوتا تو وہ ہرگز اپنا دست ہوس شیتل کی طرف نہ بڑھا پاتا۔ یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ شیتل ہی نے قاسم کے لئے دروازہ کھولا تھا ورنہ وہ اندر نہ آتا۔ یہی سوچ کر میں خاموشی کے ساتھ پنجوں کے بل چلتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں آ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

اپنی خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کرتے ہی میں نے محسوس کر لیا کہ وہاں میرے سوا بھی کوئی اور موجود ہے۔ پھر میری نظر اپنی مسہری کی طرف اٹھی تو میں نے چمپا کو اپنے بستر پر نیم دراز پایا۔ وہ بڑے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ چمپا کا اس طرح میری خواب گاہ میں پہنچ جانا میرے لئے حیران کن نہیں تھا۔

"معلبہ!" چمپا نے مجھے مخاطب کیا۔ "برا نہ ماننا کہ میں بے تکلفی کے ساتھ تمہارے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ کہو تو اٹھ جاؤں؟"

"وہ تو خیر تمہیں اٹھنا ہی پڑے گا۔" میں آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ بتاؤ کہ تم آئی کیوں ہو؟"

"میں تمہارے لئے بڑے مہاراج کا ایک سندیسہ لے کر آئی ہوں۔" وہ میرے بستر سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "بڑے مہاراج تم سے صلح کرنا چاہتے ہیں۔ صلح کی شرط وہی ہے جو وہ خود تم سے بیان کر چکے

ہیں۔ تمہیں ان کی داسی بننا پڑے گا اور داسی بننے کا مطلب تم اچھی طرح جان ہی چکی ہو۔" چمپا نے اپنے ریشمی لبادے کو سمیٹا اور بستر سے اتر گئی۔ آج رات بھی وہ سرخ لبادہ زیب تن کئے ہوئے تھی۔

"تمہارے بڑے مہاراج کو تو میں خود اپنا داس (خدمت گار) بنانا چاہتی ہوں۔ وہ نیچ مجھے کیا اپنی داسی بنائے گا۔" میں نفرت و حقارت سے بولی۔ میں نے واضح طور پر یہ بات محسوس کر لی تھی کہ آج چمپا میرے قریب آنے سے گریز کر رہی تھی۔

"بڑے مہاراج کے وشے (متعلق) میں ایسے شبد زبان پر نہ لاؤ معلبہ کہ جن پر تمہیں بعد میں پچھتاوا ہو۔" چمپا چند قدم مزید پیچھے ہٹ گئی۔

"بکواس نہ کر۔" مجھے غصہ آ گیا۔ "اور دفع ہو جا یہاں سے' میں اس چوہے سے نہیں ڈرتی جسے تُو بڑا مہاراج کہتی ہے۔"

"سوچ لو معلبہ! اس میں تمہارا گھاٹا ہی گھاٹا ہے ورنہ بڑے مہاراج کی داسی بننے میں بڑا لابھ (فائدہ) ہے۔"

معلوم نہیں اس وقت میرے ذہن میں کیوں یہ بات آ گئی کہ چمپا کی اس وقت آمد کا مقصد محض وہی نہیں جو اس نے ظاہر کیا ہے' بات کچھ اور ہے۔ میرے خیال میں وہ بلاوجہ بات کو طول دے رہی تھی' مگر کس لئے؟ یہ بات فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آ سکی۔

"بڑے مہاراج سے بگاڑ نہ کرو معلبہ!" چمپا مجھے خاموش دیکھ کر پھر بولی۔ اب اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

اسی وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آنکھوں کے راستے نادیدہ لہریں میرے دماغ میں اترتی جا رہی ہوں۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ اسی کے ساتھ چمپا اور میری آنکھوں کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ میرے اندر سے جیسے کسی نے کہا مجھے اس عیار عورت کو اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ ابھی تک مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے دماغ کو کوئی کرید رہا ہے۔ مجھے گزشتہ رات کا واقعہ یاد آیا کہ جب شیطانی قوتوں کی مالک چمپا نے میرے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات پڑھ لئے تھے۔ کہیں وہ اس وقت بھی تو اسی لئے نہیں آئی؟ میرے ذہن میں خطرے کا احساس جاگ اٹھا۔ میرے ذہن میں ایسی بہت سی باتیں تھیں جن کا چمپا کے علم میں آ جانا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ موجودہ صورت حال میں اس کا میری خواب گاہ سے جلد از جلد چلا جانا میرے حق میں بہتر تھا۔

"معلبہ! تمہیں صحیح نتیجے تک پہنچنے میں دیر ہو گئی۔" چمپا بول اٹھی۔ "تمہارا ذہن پڑھ کر مجھے ایک ایک بات معلوم ہو چکی ہے جو تمہارے کسی دشمن کے علم میں نہیں آنا چاہئے۔ کہو تو بتا دوں کہ خفیہ پولیس کے سربراہ کو تم نے اغوا کرانے کے بعد کہاں رکھا ہے؟" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسنے لگی۔

میں نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر اسی لمحے اس پر چھلانگ لگا دی۔ میں جیسے اڑتی ہوئی اس تک پہنچی تھی مگر یقیناً وہ میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھی۔ میں نے اسے غائب ہوتے دیکھ لیا۔ وہ خبیث تو چلی گئی مگر مجھے بے چین کر گئی۔ ڈیسوزا اب یقیناً اس جگہ محفوظ نہیں تھا جہاں اسے رکھا گیا تھا۔

مجھے اس وقت کیا کرنا چاہئے؟ بار بار یہی ایک سوال میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ پھر مجھے اس مسئلے کا ایک ہی حل نظر آیا۔ میں تیزی کے ساتھ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر نکلی اور اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں راجہ استاد کو ٹھہرایا گیا تھا۔ اسی وقت میں نے حفاظتی حصار کو نمایاں ہونے کے بعد غائب ہوتے دیکھا۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

راجہ استاد بہت چوکنا سوتا تھا اس لئے دوسری ہی دستک پر اس نے یہ جاننے کے بعد کہ دستک دینے والی میں ہوں' دروازہ کھول دیا۔

"کیا ہوا رانی! تم اتنی بدحواس کیوں نظر آ رہی ہو؟" راجہ استاد میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"بات ہی کچھ ایسی ہے استاد!" میں نے جلدی سے کہا۔ "ڈیسوزا کو جہاں رکھا گیا ہے' اب وہ وہاں محفوظ نہیں رہا۔ اسے فوری طور پر اس کوٹھی سے کہیں اور ہٹانا ہے۔"

"لیکن رانی! اچانک تمہیں یہ خیال کیسے آگیا؟"

"استاد! اس چکر میں نہ پڑو۔ میں اس وقت تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ یہ بتاؤ' کہ اس وقت کسی طرح ٹالی گنج پہنچ کر شنکر دادا کو یہ پیغام پہنچانا' ممکن ہے کہ ڈیسوزا کو فوراً اس کوٹھی سے نکال کر کہیں اور منتقل کر دیا جائے؟"

"ممکن کیوں نہیں رانی! میں چلا جاتا ہوں ٹالی گنج۔"

"مگر جاؤ گے کیسے استاد! رات کا ایک بجنے والا ہے۔"

راجہ استاد آہستہ سے ہنس دیا پھر کہنے لگا۔ "چندا! میرا نام راجہ استاد ہے اور یہ میرا علاقہ ہے۔ کسی بھی وقت اور کہیں کے لئے بھی میں سواری کا بندوبست کر سکتا ہوں۔"

"لیکن پولیس بھی تو تمہاری تلاش میں ہے استاد! رات کو گشت پر موجود پولیس والے بھی تو تمہیں پہچان سکتے ہیں۔ کل صبح تک تو تمہیں پولیس سے چھپنا ہی پڑے گا نا!؟"

"ہاں' یہ ایک فضول کا روڑا ضرور ہے لیکن تم فکر نہ کرو' میں پولیس کے ہتھے نہیں چڑھوں گا۔" راجہ استاد کے لہجے میں خوداعتمادی تھی۔

اسی لمحے اس مسئلے کا حل بھی میں نکال لیا۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا' میں بولی۔ "میرے ساتھ چلو استاد!"

"مگر کہاں؟"

"میرے کمرے میں' پولیس والوں کے فرشتے بھی تمہیں نہیں پہچان سکیں گے۔"

"لیکن چندا کیسے؟ کچھ بتاؤ بھی تو۔" وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا استاد' جب تم خود اپنا چہرہ نہیں پہچان سکو گے۔"

پھر میں راجہ استاد کو اپنے کمرے میں لا کر انتہائی تیزی سے اس کے چہرے پر میک اپ کرنے لگی۔ میں نے اس کے چہرے پر اس کی جلد سے مناسبت رکھتا ہوا ماسک چڑھا دیا تھا۔ "اب پہچانو کون ہے یہ

آدمی؟" میں نے راجہ استاد کے ہاتھ میں آئینہ دیتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی واقعی' یہ تو تم نے میرا چہرہ ہی بدل دیا۔ کم سے کم بھی پندرہ سال عمر گھٹا دی تم نے۔" راجہ استاد آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر ہنسنے لگا۔ "جوان نظر آ رہا ہوں' میرا مطلب ہے دیکھنے میں بھی۔ ویسے تو خیر میں جوان ہوں ہی .... تمہارے اس ہنر کا کوئی جواب نہیں رانی!"

"کس کس ہنر کی داد دو گے استاد! ابھی تم نے میرے ہنر دیکھے ہی کہاں ہیں؟" میں بھی ہنس دی۔

"یہ بتاؤ کتنے بجے تک لوٹ آؤ گے؟"

"بس یوں سمجھو یہ گیا وہ آیا۔" راجہ استاد نے چٹکی بجائی۔ "حد سے حد بھی تین بجے تک واپس آ جاؤں گا۔"

جس انداز میں راجہ استاد نے چٹکی بجائی تھی' اسے دیکھ کر مجھے بھی شرارت سوجھ گئی۔ میں نے بھی اسی کی طرح چٹکی بجائی اور بولی۔ "بس کتے کی چال جانا' بلی کی چال آنا!"

"کیا .... یہ کیا کہا تم نے؟ میں کیا کوئی جانور ہوں۔"

"مثال دے رہی ہوں استاد! تمہیں جانور کب بنا رہی ہوں۔ وہ جو مثلاً کہتے ہیں نا! جیسے وہ چیتے کی طرح زقند لگا کر اپنے شکار پر جھپٹا۔"

"تو یہ سسرے میری قسمت میں کتے بلی ہی رہ گئے ہیں؟"

"جیسا موقع ویسا جانور۔" یہ کہتے ہوئے میں خود بھی ہنس پڑی پھر بولی۔ "اچھا اب یہ آئینہ تو ہاتھ سے رکھ دو ٹوٹ جائے گا۔"

"لو بھئی رکھ دیا' تم نے جان ہی آفت میں کر دی۔"

میں نے جلدی جلدی میک اپ کا سامان سمیٹا اور استاد سے کہا۔ "اوّل تو تمہاری واپسی تک میری آنکھ نہیں لگے گی' پھر بھی سو جاؤں تو جگا لینا .... اب آؤ.........." میں نے استاد کا ہاتھ تھاما اور کمرے سے نکل آئی۔ معلوم نہیں کیوں کبھی کبھی میرے اندر رگ شرارت پھڑک اٹھتی تھی۔ میرا یہ مزاج ایک ایسے شخص کی دین تھا جو مجھ سے ہزاروں میل دور تھا اور مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس سے کب ملاقات ہو گی۔ احرس کو میں بھولتی بھی کیسے کہ وہ تو خود میرے ہی وجود کا حصہ تھا اور یہی معاملہ نضار کے ساتھ تھا۔ جب سے مجھے عظیم مہین کی سرگوشیاں سنائی دی تھیں اور اپنے دشمن ثریان کے بارے میں معلوم ہوا تھا' بار بار میرا دھیان اونچے پہاڑوں کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے احرس اور نضار یاد آ رہے تھے کہ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ اس وقت بھی میں جیسے غائب تھی۔ مجھے عمارت کے صدر دروازے سے لوٹ آنا تھا' مگر میں بے دھیانی میں راجہ استاد کے ساتھ پھاٹک تک پہنچ گئی۔

قاسم مجھے پھاٹک کے قریب مستعد چوکنا کھڑا دکھائی دیا اور میں سوچنے لگی کہ کسی ایک شخص کے لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے پہرا دے سکے؟ آدمی' آدمی ہی تو ہوتا ہے پتھر نہیں کہ دن رات ڈیوٹی دیتا رہے اور اسے آرام کی ضرورت نہ ہو۔ وہ صرف ایک ہی وقت ڈیوٹی دے سکتا ہے' دن کے وقت یا رات کو۔ جو لوگ دن اور رات کے لئے صرف ایک پہریدار رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں' شاید

اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ یہی غلطی خود مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ اس وقت قاسم پہرا دینے کے لئے نہیں' کسی اور وجہ سے جاگ رہا تھا۔ یہ بات مجھ سے زیادہ بھلا اور کون جانتا۔

میرے ساتھ قاسم نے ایک اجنبی چہرہ دیکھا تو چونک اٹھا۔ یہ بات راجہ استاد نے بھی شاید محسوس کر لی۔ وہ قاسم سے مخاطب ہوا۔ "ابے او چڑیا کے اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہا ہے؟ یہ ہم ہیں' راجہ استاد' ذیلی دروازہ کھول دے۔"

"جج .... جی استاد!" قاسم بوکھلا کر آگے بڑھا اور پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول دیا۔

راجہ استاد میری طرف الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر باہر چلا گیا اور قاسم نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں وہاں تک آ ہی گئی تھی تو سوچا' قاسم کی کلاس لے ہی لوں۔ یوں بھی مجھے راجہ استاد کے انتظار میں جاگنا ہی تھا۔

"آؤ قاسم! ادھر لان میں بیٹھتے ہیں۔" میں قاسم سے مخاطب ہوئی۔

"جی .... جی بیگم صاحبہ؟" وہ حیران سا ہو کر بولا۔

"کیوں' کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی؟ .... آؤ نا!" میں نے دانستہ اٹھلا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا میں' فاطمہ سے کم خوبصورت ہوں؟"

"یہ .... یہ آپ کیا .... کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"ارے چھوڑو بھی بیگم صاحبہ بیگم صاحبہ' رانی کہو' رانی۔" میں نے اس کا ہاتھ کھینچا۔ "اس عمر میں دل تو سب کا ہی مچلتا ہے قاسم! چاہے بیگم ہو یا نوکرانی۔" قاسم میرے ساتھ کسی معمول کی طرح کھنچا چلا آیا۔ میں نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"فاطمہ کی طرح میں بھی تو نوجوان اور کنواری ہوں تو پھر قاسم! تم نے مجھے پانے کی تمنا کیوں نہیں کی؟"

"مم .... مگر آپ .... آپ تو بیگم .... بیگم صاحبہ ہیں۔" وہ ہکلانے لگا۔

میں نے پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ "میں تو رانی ہوں تمہاری اور تم .... تم میرے راجہ ہو قاسم!"

کسی نوجوان و حسین دوشیزہ کی طرف سے کسی مرد کے لئے اتنی ترغیب بہت ہوتی ہے' خواہ وہ دوشیزہ سماجی حیثیت میں مرد سے کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو۔ سو قاسم کو بھی بہکنے میں دیر نہیں لگی۔ "رانی!" اس کے ہونٹ کانپے۔ یقیناً وہ دل ہی دل میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا ہو گا کہ ایک ہی رات میں اس نے دو معرکے سر کر لئے تھے۔

وہ میری طرف جھکا تو میں نے اسے مزید اپنی جانب جھکنے سے روکنے کے لئے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ "لیکن قاسم! کیا تم میری خاطر فاطمہ کو بھلا دو گے؟ تم تو اس سے شادی کرنے کا وعدہ بھی کر چکے ہو۔"

"یہ سب تو کہنا پڑتا ہے رانی! .... ورنہ وہ .... وہ راضی کیسے ہوتی؟"

"تو کیا تم اس سے شادی نہیں کرو گے قاسم! وہ تو تمہیں اپنا سب کچھ سونپ چکی ہے۔" میں خود اس کی زبان سے یہ اعتراف کرانا چاہتی تھی اس لئے بولی۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں نا؟"

"ہاں۔" اس نے اعتراف کر لیا۔ "لیکن میں ہرگز اس سے شادی نہیں کروں گا رانی!"

"اگر میں تمہیں اپنا راجہ نہ بناتی پھر بھی تم اسے نہ اپناتے؟"

"ضرورت ہی کیا ہے شادی کی؟ اس طرح اگر آدمی ہر لڑکی سے شادی کرنے لگے تو جی لیا۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "اگر میں ایسا کرتا تو اب تک خرچ ہو گیا ہوتا کبھی کا۔"

"کیا تمہاری زندگی میں فاطمہ سے پہلے اور بھی لڑکیاں آئی ہیں؟" میں نے سوال کیا۔ اس سے میں سب کچھ قبلوا لینا چاہتی تھی۔

"مرد کی زندگی میں تو آتی ہی ہیں لڑکیاں۔ سب اس قابل نہیں ہوتیں کہ ان سے شادی کر لی جائے۔"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟"

"تم .... تم تو ہیرا ہو۔"

"اور فاطمہ؟"

"کہاں تم کہاں فاطمہ؟' کہاں زمین کہاں آسمان' کہاں ہیرا کہاں پتھر۔" اس کی آواز شدت جذبات سے مرتعش ہو رہی تھی۔

میں اب اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ وہ فاطمہ کے عشق میں سچا نہیں' اس نے فاطمہ کو بے وقوف بنا کر اپنے سفلی جذبات کی تسکین کی ہے۔

"اب زیادہ نہ تڑپاؤ رانی! قریب آ جاؤ۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹا دیا۔ میرا ہاتھ تھام کر اس نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔

میں خاصی دیر اس سے کھیل چکی تھی۔ جو کچھ اس سے پوچھنا تھا' پوچھ لیا تھا اس لئے اسے مزید ڈھیل دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ جیسے ہی وہ مجھے اپنی طرف کھینچ کر مجھ پر جھکا' میں نے اس کی ٹھوڑی پر بائیں ہاتھ سے ضرب لگائی کیونکہ میرا سیدھا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا۔ دانستہ میں نے ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا کہ کہیں ٹھوڑی کی ہڈی چٹخ نہ جائے۔ اس پر بھی قاسم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی ٹھوڑی تھام لی۔

"سنو قاسم!" میں نے اسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "تم نے فاطمہ کو دھوکا دے کر لوٹ لیا ہے اس لئے تمہیں اس سے شادی کرنا پڑے گی۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں تمہاری کھال گرا دوں گی۔ جواب دو' فاطمہ سے شادی کرو گے؟"

"لے .... لیکن مم .... میں تو شادی .... شادی شدہ ہوں اور .... اور میرے دو .... دو بچے بھی ہیں۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"اس پر تمہارے یہ الجھن ہیں .... مجھے معلوم ہے مسلمان مرد ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے ہیں۔ صبح فاطمہ سے تمہارا نکاح پڑھوا دیا جائے گا۔"

"قصور تو میرا ہے بیگم .... بیگم صاحبہ! پھر.......... پھر میرے بیوی بچوں کو سزا کیوں دے رہی ہیں؟ مجھ سے ان کا ہی خرچہ پورا نہیں ہوتا تو پھر میں فاطمہ کا بوجھ کیسے اٹھاؤں گا؟"

"فاطمہ کے اخراجات کی ذمے داری تم پر نہیں' مجھ پر ہوگی' سمجھے اور رہے گی بھی وہ میرے ہی پاس اسی کوٹھی میں۔ بس تمہیں اتنی رعایت دے سکتی ہوں کہ شادی کے بعد اگر تم چاہو اور فاطمہ بھی اس پر راضی ہو تو اسے تم اپنے کوارٹر میں رکھ سکتے ہو۔"

میرے یہ کہنے کے بعد قاسم کے پاس فاطمہ یا شیتل سے شادی نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ اس کا سر جھک گیا اور میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب میں شیتل سے بات کرنا چاہتی تھی۔ قاسم کے بارے میں اسے سب کچھ بتانا ضروری تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کی محبت کے فریب میں آ گئی ہے جو پہلے ہی سے شادی شدہ ہے۔ قاسم کو اپنانے کی صورت میں اسے اپنے مذہب کو بھی چھوڑنا پڑتا۔ وہ اگر یہ قربانی دینے پر آمادہ تھی تو میں قاسم کو اس سے شادی پر مجبور کرتی ورنہ نہیں۔

شیتل اس وقت تک سو چکی تھی جب میں نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی کیونکہ مجھے کافی دیر بعد دستک کے جواب میں اس کی آواز سنائی دی تھی' نیند میں ڈوبی ہوئی آواز' اس نے میری آواز سن کر پہلے لائٹ آن کی' پھر دروازہ کھول دیا۔

"آپ .... آپ بیگم صاحبہ!" وہ مجھے دیکھ کر حیرت سے بولی۔

میں کچھ کہے بغیر اس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ شیتل کی بڑی بڑی آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل' کچھ کھلے سے گیسو' اڑی اڑی سی رنگت اور جگہ جگہ سے شکن آلود ساڑھی گزرے ہوئے وقت کی کہانی بیان کر رہے تھے۔ وہ میرے قریب مسہری پر آ بیٹھی۔

"شیتل! کیا تم واقعی قاسم سے محبت کرتی ہو؟" میں نے براہ راست سوال کیا۔

کئی دفعہ ٹوکنے اور سوال دہرانے کے بعد شیتل نے اقرار میں سر ہلایا۔

"مگر وہ تم سے محبت نہیں کرتا اور یہ بھی سن لو کہ وہ بیوی بچوں والا ہے۔ اس نے تمہارا قرب حاصل کرنے کے لئے تم سے شادی کا جھوٹا وعدہ کیا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور تم اپنا سب کچھ ہار گئیں۔ اس کے باوجود کہ اسے تم سے محبت نہیں اور وہ شادی شدہ بھی ہے' اس کو تم سے شادی پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ مجھے جواب دو شیتل کہ کیا تم ایسی صورت میں اس کی دوسری بیوی بن کر رہنے پر راضی ہو؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ بھی سوچ لینا کہ تمہیں اس سے شادی کرنے کے لئے اپنا مذہب بھی چھوڑنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر میں اس کے متغیر چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ اپنے محبوب کی حقیقت جان کر شاید اس کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔ اسی کے نتیجے میں اس کی پلکیں بوجھل ہو گئی تھیں۔

"پتنی کا دھرم تو اس کا پتی ہوتا ہے۔" بڑی مشکل سے شیتل کی زبان پر یہ الفاظ آ سکے اور پھر وہ

دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

شیتل کے الفاظ کا مطلب واضح تھا۔ وہ ہر حال میں قاسم کو اپنانے پر آمادہ تھی اور شاید اب یہ اس کی مجبوری بھی تھی۔ قاسم کے سوا وہ اب کسی اور کی بنتی بھی کس طرح' عورت کے پاس کسی مرد کو دینے کے لئے جو سب سے قیمتی متاع ہوتی ہے' وہ شیتل نے قاسم پر لٹا دی تھی۔

میں نے اسے تسلی دے کر چپ کرایا اور پھر کہا۔ "کل صبح قاسم سے تمہارا نکاح ہو جائے گا' مگر اس سے پہلے تمہیں مسلمان بننا پڑے گا' ٹھیک ہے نا؟"

اس نے زبان سے کچھ کہے بغیر اقرار میں سر ہلا دیا۔

"اور سنو' قاسم سے شادی کے بعد بھی تم میرے ہی پاس رہو گی۔ تمہارے اخراجات کی ذمے داری مجھ پر ہوگی۔ میں یہ بات قاسم سے بھی کہہ چکی ہوں۔"

اظہار ممنونیت میں شیتل نے اٹھ کر میرے دونوں پیر پکڑ لئے اور پھر انہیں چومنے لگی۔

"ارے ارے پگلی' یہ کیا کر رہی ہو؟" میں نے اس سے اپنے پیر چھڑا لئے اور شانوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ "پگلی! تمہاری جگہ میرے قدموں میں نہیں' دل میں ہے۔" پھر میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور وہ دوبارہ سسک اٹھی۔ میں اسے سینے سے لگائے رہی کہ اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔

اس کے دل پر جو غبار جم گیا تھا' وہ شاید آنسوؤں سے دھل گیا۔ وہ مجھے کھلی کھلی سی نظر آنے لگی۔

"اب تم آرام کرو' میں چلتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں اس کے کمرے سے باہر آ گئی۔

شیتل کے کمرے سے میں اپنی خواب گاہ میں پہنچی تو ڈھائی بج رہے تھے۔ اتنی دیر وقت گزاری کے باوجود راجہ استاد کی واپسی میں اب بھی تقریباً آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے سوچا' کچھ دیر کو لیٹ ہی جاؤں مگر خلاف توقع ذہن پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور اس کی وجہ مجھے کچھ ہی دیر میں معلوم ہو گئی۔ میری آنکھیں بند ہونے کے باوجود ایک منظر دیکھ رہی تھیں۔ ایسا ہی ایک منظر کافی عرصے پہلے بھی ایک رات بند آنکھوں سے میں نے دیکھا تھا۔ وہ ریس کورس کا میدان تھا۔ کسی کو مالدار اور کسی کو کنگال کرنے کے لئے گھوڑے پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔ ایک بار گھوڑے دوڑ کر دوسری اور پھر تیسری بار دوڑے۔ یوں مجھے تین ریسوں کے نتائج کا علم ہو گیا پھر اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ جو گھوڑے جیتے تھے ان ہی کے جیتنے کی توقع بھی تھی۔ تینوں ریسوں میں کوئی بھی گھوڑا خلاف توقع نہیں جیتا تھا۔ میں اسی لئے پہلے کی طرح کسی ایک ہی گھوڑے پر داؤ لگا کر لمبی رقم نہیں جیت سکتی تھی جیسا کہ پہلے ہوا تھا۔ مجھے ایک کے دس ملے تھے۔ میں نے دس ہزار کی رقم ایک گھوڑی پر لگائی تھی اور مجھے پورے ایک لاکھ کی رقم ملی تھی۔

پھر وہ منظر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں میرا دل خوشی کے سبب تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میرے اندر خوابیدہ پراسرار قوتوں نے میرا ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ تینوں ریسوں میں جو گھوڑے جیتے تھے' ان کے نام میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لئے تھے۔

راجہ استاد مجھے واپسی کے لئے جو وقت دے کر گیا تھا' اس سے دس منٹ پہلے لوٹ آیا۔ وہ کامیاب لوٹا تھا۔ اسی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شنکر دادا بھی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا۔ پولیس نے اس کی گرفتاری کے لئے اس وقت چھاپہ مارا تھا جب وہ اپنے اڈے پر نہیں' میرے ساتھ تھا۔ جگا بھی نہیں پکڑا جا سکتا تھا کیونکہ نہ وہ اپنے گھر پر پولیس کو ملا تھا نہ اڈے پر۔ جگا کی حالت کے پیش نظر شنکر دادا نے اس ڈاکٹر ہی کے یہاں جگا کے رہنے کا بندوبست کر دیا تھا جو اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا تھا ورنہ وہ پکڑا جاتا تو پولیس کو جواب دینا محال ہو جاتا کہ اسے گولی کب اور کہاں لگی؟ ڈیسوزا کو اس کوٹھی سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا تھا جہاں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ شنکر دادا نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ ڈیسوزا اس کوٹھی میں محفوظ نہیں تھا۔

راجہ استاد کے چہرے سے میک اپ ختم کر کے میں نے اسے اپنے کمرے سے رخصت کر دیا اور سونے لیٹ گئی۔ گزشتہ رات کی طرح آج رات کا بڑا حصہ بھی جاگتے ہی گزرا تھا۔ حفاظتی دودھیا حصار میں نے پھر اپنے اردگرد قائم ہوتے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ یہ حفاظتی حصار اسی لئے تھا کہ بے خبری میں کوئی بھی شیطانی قوت مجھ پر غالب نہ آ سکے۔ جب مجھے اس حصار کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ مجھ سے جدا ہو جاتا۔ مجھے آج ہی رات اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

دوسرے دن میں گیارہ بجے تک سوتی رہی اور کسی نے مجھے جگایا بھی نہیں۔ اٹھتے ہی میں نے حفاظتی حصار کو نمایاں ہو کر غائب ہوتے دیکھا۔ اپنے کمرے سے نکل کر میں نے شہزاد سے اس روز کے اخبارات لانے کو کہا۔ پھر میں باتھ روم میں گھس گئی۔ جب میں ڈائننگ روم میں ناشتہ کر رہی تھی تو شانتی آ گئی۔ اسی کے پیچھے پیچھے راجہ استاد بھی تھا۔ شانتی کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اسی کو راجہ استاد کے ساتھ بازار بھیج کر شیتل کے لئے شادی کا سرخ جوڑا خریدوا لوں۔

وہ دونوں میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے تو میں نے مسکراتے ہوئے شانتی کو مخاطب کیا۔ ''معلوم نہیں شانتی! تم تو نہ جانے کب شادی کا سرخ جوڑا پہنو گی لیکن میں فاطمہ کو آج ہی شادی کا جوڑا پہنانا چاہتی ہوں۔ تم ایسا کرو کہ راجہ استاد کے ساتھ جا کر اس کے لئے جوڑا خرید لاؤ۔''

''مگر دیدی! سلا سلایا جوڑا تو ملنا مشکل ہے' کہو تو سرخ بنارسی کامدار ساڑھی خرید لاؤں۔ کل بھی میں نے فاطمہ کو ساڑھی باندھے دیکھا تھا اور آج بھی وہ ساڑھی ہی باندھے ہوئے ہے۔ شاید وہ بھی میری ہی طرح ہمیشہ ساڑھی ہی باندھتی ہے۔'' شانتی بولی۔

''ٹھیک ہے' بنارسی ساڑھی ہی لے آؤ۔'' پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ جب شیتل' قاسم سے شادی کرنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑ سکتی تھی تو پھر شانتی کو اس پر کیا اعتراض تھا؟ جانے کیوں اس وقت میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ جس طرح شیتل مسلمان ہو رہی تھی اسی طرح شانتی بھی مسلمان ہو کر ہمیشہ کے لئے ہمایوں کی ہو جائے۔ اسی خواہش کے پیش نظر میں نے شانتی سے کہا۔ ''شانتی! تمہیں شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ فاطمہ بھی تمہاری طرح ہندو ہے اور اس کا ہونے والا شوہر مسلمان ہے جسے وہ

چاہتی ہے۔ معلوم ہے تمہیں کہ وہ اپنے محبوب کو اپنانے کی خاطر مسلمان ہو رہی ہے۔ کل رات جب میں نے اس سے یہ بات کی کہ اسے اپنے محبوب کو اپنانے کے لئے اپنا مذہب چھوڑنا پڑے گا تو اس نے مجھے جواب دیا۔ پتنی کا دھرم تو اس کا پتی ہوتا ہے۔ جس طرح رازداری کی خاطر تمہارا نام صبیحہ رکھ دیا ہے اسی طرح اسے میں نے فاطمہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا اصل نام شیتل ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں شانتی کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا' ایک جا رہا تھا۔ کبھی کبھی آدمی کو اپنی زندگی کا کوئی اہم فیصلہ کرنے کے لئے کسی ترغیب' کسی مثال کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے اسی لئے شانتی کے سامنے ایک مثال پیش کر دی تھی تاکہ اسے فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ شانتی پر مزید نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لئے میں نے شیتل کو آواز دے کر بلا لیا اور پوچھا۔ ''تمہارا اصل نام کیا ہے؟'' میں نے محسوس کیا کہ وہ جواب دیتے ہوئے جھجک رہی ہے تو اس سے کہا۔ ''یہ اپنے ہی لوگ ہیں' ان سے کوئی پردہ نہیں' جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔''

''اب .... اب بیگم صاحبہ' میں وہ نام بھول جانا چاہتی ہوں' ہمیشہ کے لئے۔'' وہ نظریں جھکا کر بولی۔

''مگر کیوں؟'' میں نے دانستہ اس سے یہ سوال کیا۔ ''آخر اس کی کوئی تو وجہ ہو گی؟''

''وجہ آپ جانتی ہیں بیگم صاحبہ! پیار میں اپنا کچھ نہیں' سب کچھ پرایا ہوتا ہے' جان' ایمان' دھرم سب کچھ۔''

''تمہارا نام شیتل ہے نا' تم ہندو ہو اور اپنے پیار کی خاطر اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہونے والی ہو' یہ سچ ہے کیا؟ تمہارے نزدیک پتی ہی پتنی کا دھرم ہوتا ہے؟'' میں نے ایک ہی مرتبہ وہ ساری باتیں کہہ دیں جن کا اس سے اقرار کرانا مقصود تھا۔

''جی .... جی بیگم صاحبہ! یہ سب کچھ سچ ہے .... اور پیار سب سے بڑا سچ ہے۔''

''تمہارے اسی سچ کو حقیقت بنانے کے لئے' خراج عقیدت پیش کرنے کی خاطر اپنی طرف سے ایک تحفہ خریدنے میں ان دونوں کو بازار بھیج رہی ہوں۔''

شیتل نے میرا شکریہ ادا کیا اور پھر میرے لئے چائے لینے چلی گئی۔

''پیار میں جو سب کچھ تج دیں' وہ لوگ قابل احترام ہوتے ہیں' تمہارا کیا خیال ہے شانتی؟'' میں نے جان بوجھ کر اس سے سوال کیا۔

شانتی جانے کہاں کھوئی ہوئی تھی' میرے متوجہ کرنے پر وہ اس طرح چونکی جیسے سوتے سوتے جاگ اٹھی ہو۔ ''جی .... جی ہاں دیدی!'' شانتی کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ ریس کورس بھی جانا ہے۔ میں نے اسی لئے راجہ استاد کو مخاطب کیا۔ ''ایسا ہے استاد کہ بازار بعد میں چلے جانا' پہلے میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں چلنا ہے؟'' راجہ استاد نے دریافت کیا۔

''ریس کورس۔'' میں نے بتایا۔

"وہ کس لئے رانی!"

"ریس کھیلنے اور کس لئے۔"

"رانی! تم ریس بھی کھیلتی ہو؟ میں تو عرصہ ہوا ریس کھیلنا چھوڑ چکا ہوں۔ ہزاروں گنوا چکا ہوں گر آج تک کچھ حاصل نہیں ہوا۔"

"میرے ساتھ چلو گے تو کبھی نہیں ہارو گے استاد!" میں نے کہا۔ اسی وقت شہزاد اخبار لے کر آیا اور شیتل بھی چائے لے آئی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اخبار پر نظریں دوڑانا شروع کیں۔ جلد ہی مجھے وہ خبر مل گئی جسے تلاش کر رہی تھی۔ تنظیم کا یہ وہی بیان تھا جس کے متعلق ارشاد حسین نے مجھے بتایا تھا۔ اخبار پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ایک کالم پر میری نظر پڑ گئی۔ وہ کالم ریس کے متعلق ہی تھا۔ اس میں گزشتہ روز ہونے والی ریسوں کے نتائج دیئے گئے تھے' اسی کے ساتھ آج اور کل ہونے والی ریسوں کی تفصیل تھی۔ میں ان گھوڑوں کے ناموں پر نظر دوڑانے لگی جو آج اور کل مختلف ریسوں میں دوڑنے والے تھے۔ ونر' گولڈ اور کنگ ان گھوڑوں کے نام تھے جنہیں میں نے مستقبل میں جھانک کر جیتتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان میں کسی گھوڑے کا نام آج ہونے والی ریسوں میں درج نہیں تھا۔ آئندہ ہونے والی تین ریسوں میں مجھے ان کے نام نظر آئے اور میں نے طویل سانس لیا۔

"استاد! ریس کھیلنے کل چلیں گے' آج تم بازار ہی چلے جاؤ۔" میں نے اپنا ارادہ راجہ استاد پر ظاہر کر دیا۔

"جیسا تم کہو' میں تو بس تمہاری خاطر چلا چلوں گا ورنہ تو تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ ریس کی کمائی مجھے کبھی راس نہیں آئی۔"

"اور ہاں سنو' ممکن ہے ہمایوں کو آج ہی رہائی مل جائے۔ وہ رہا ہو کر آئے گا تو گھر کے دروازے پر تالا نظر آئے گا۔ تم اپنے کسی بندے کی ڈیوٹی وہاں لگا آنا کہ جیسے ہی ہمایوں وہاں پہنچے' اسے یہاں بھیج دے سمجھ گئے نا اور یہ لو ...." میں نے قریب ہی میز پر رکھا ہوا اپنا ہینڈ پرس اٹھا کر کھولا اور اس میں سے کئی بڑے نوٹ نکال کر استاد کو تھما دیئے۔ "استاد! یہ رکھ لو اپنے پاس' ہاں ایک ساڑھی میری طرف سے شانتی کو بھی دلا دینا۔ جیسی بھی اسے پسند ہو دلانا ضرور۔ پیسوں کی پرواہ بالکل نہ کرنا اور شانتی' تم سنو ساڑھیاں اچھی خریدنا۔"

"جی دیدی! .... مگر مجھے .... مجھے کیوں ساڑھی دلوا رہی ہیں؟ میرے پاس تو بہت سی ساڑھیاں ہیں۔"

"وہ تو تمہیں ہمایوں نے دلوائی ہوں گی' ایک ساڑھی دیدی کی طرف سے بھی سہی۔"

راجہ استاد' شانتی کے ساتھ اٹھنے ہی والا تھا کہ رحمت نے آ کر بتایا کہ شنکر دادا کا کوئی آدمی آیا ہے۔ رحمت نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا تھا۔ شنکر دادا کا نام سن کر قاسم نے اسے اندر آنے دیا تھا۔

"یہ شنکر دادا نے آدمی کیوں بھیجا ہے؟" راجہ استاد دھیرے سے بولا۔ "کہیں کوئی چکر تو نہیں ہو گیا؟"

معاملہ کسی فوری ضرورت کا مستحق بھی ہو سکتا تھا اسی لئے میں آدھا کپ چائے پی کر ہی اٹھ گئی۔ میں نے راجہ استاد سے کہا۔ "چلو چل کر دیکھ لیتے ہیں' کیا بات ہے؟"

راجہ استاد بھی اٹھ کھڑا ہوا پھر ہم دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ آنے والا شنکر دادا کا وہی آدمی تھا جس نے گزشتہ روز مجھے جیپ میں کوٹھی پر چھوڑا تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھا۔

"بیٹھو بیٹھو۔" میں نے بیٹھے رہنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا اور آگے بڑھتے ہوئے اس سے آنے کی وجہ معلوم کی۔

"دادا نے کہلوایا ہے کہ آپ نے جو اطلاع رات کو بھجوائی تھی' صحیح نکلی۔ جس کوٹھی میں انگریز کو رکھا گیا تھا' صبح ساڑھے نو بجے پولیس نے اس پر چھاپہ مار دیا مگر کوٹھی خالی تھی' وہاں کوئی نہیں تھا۔ پولیس تلاشی لے کر چلی گئی۔ کرائے کے لئے خالی ہے' کا بورڈ ہم نے رات ہی کو لگا دیا تھا۔"

"وہ کوٹھی ہے کس کی؟" میں بیچ میں بول اٹھی۔

"ایک سیاسی لیڈر کی ہے۔ دادا کو اس کی سرپرستی حاصل ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

ظاہر ہے کہ ایک گروہ بند غنڈے کو سیاسی لیڈر کی سرپرستی حاصل نہیں ہو گی تو کسے ہو گی؟ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ پھر پوچھا۔ "کچھ اور کہلوایا ہے شنکر دادا نے؟"

"جی ہاں۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "دادا نے معلوم کرایا ہے کہ انگریز کو جہاں رکھا گیا ہے' وہیں رہنے دیا جائے یا وہاں سے بھی کہیں اور منتقل کر دیا جائے؟"

میں نے بھی ڈیسوزا کا نام لینے سے گریز کیا اور بولی۔ "شنکر دادا سے کہنا کہ انگریز کو دوبارہ اسی کوٹھی میں منتقل کرنا ہے جس پر چھاپہ پڑ چکا ہے۔ موجودہ حالات میں اس سے محفوظ کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی۔ کیوں استاد؟" میں نے راجہ استاد کی طرف تصدیق طلب نظروں سے دیکھا۔

"بالکل ٹھیک سوچا ہے تم نے۔" راجہ استاد نے میری تائید کر دی۔ "جواب ہی نہیں اس کا' پولیس کا اب ادھر دھیان ہی نہیں جائے گا۔"

"تو پھر مجھے اجازت ہے؟" اس شخص نے کہا۔

"ٹھہرو' چائے پی کر جانا۔ میں تمہارے لئے چائے منگواتی ہوں۔"

"شکریہ دیوی جی! دراصل دادا نے مجھے فوراً واپس آنے کو کہا تھا۔" اس نے معذرت کر لی۔

"اگر ایسی کوئی مجبوری ہے تو میں تمہیں نہیں روکوں گی۔"

وہ شخص اٹھ کر چلا گیا تو میں بھی راجہ استاد کے ساتھ وہاں سے اٹھ آئی۔

راجہ استاد خریداری کے لئے شانتی کو ساتھ لے کر جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔ "استاد! واپسی میں کچھ ہار پھول اور چھوارے بھی لیتے آنا۔"

راجہ استاد' شانتی کو لے کر چلا گیا تو میں شیتل سے چائے کے لئے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

کچھ ہی دیر کے بعد جب میں آرام کرسی پر نیم دراز چائے کی چسکیاں لے رہی تھی تو مجھے ارشاد

حسین کا خیال آگیا۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے پہلی ملاقات میں مجھ سے میرے ذریعہ آمدنی کے متعلق پوچھا تھا۔ میں نے اسے یہی جواب دیا تھا کہ ریس کھیلتی ہوں۔ میرے اس جواب پر ارشاد حسین کو یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے شاید یہ کہا تھا کہ ریس کھیلنا کسی شخص کا ذریعہ آمدنی نہیں ہو سکتا۔ اب موقع تھا کہ میں اپنے دعوے کا عملی ثبوت دے سکتی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے ارشاد حسین کے لئے چند لفظی پیغام لکھا۔ "مل لیجئے' منتظر ہوں' خیرخواہ۔" پیغام لکھ کر میں نے ایک لفافے میں بند کیا اور اس پر ارشاد حسین کا نام لکھ دیا۔ دانستہ میں نے پیغام انتہائی مختصر لکھا تھا جس سے پیغام بھیجنے والے کی صنف کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ پھر میں نے رحمت کو بلا کر لفافہ اس کے حوالے کر دیا۔

"یہ لفافہ تمہیں اسی پنواڑی کو دینا ہے جس کی دکان ان صاحب نے دکھائی تھی جن کے ساتھ کل میں نے بھیجا تھا۔"

"بہتر ہے بیگم صاحبہ!" یہ کہہ کر رحمت چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹہ اور گزرا ہو گا کہ مجھے ہمایوں کے آنے کی اطلاع ملی۔ راجہ استاد ابھی نمک بازار سے نہیں لوٹا تھا۔ ہمایوں کو میں نے اپنے کمرے ہی میں بلوا لیا۔

"استاد اور شانتی کہاں ہیں؟" اس نے آتے ہی معلوم کیا۔

"ذرا میں نے انہیں کام سے بھیجا ہے' آ جائیں گے' تم بیٹھو۔"

"شانتی کو بھی؟" ہمایوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں اسے بھی۔" میں نے جواب دیا۔ "دراصل آج میری کوٹھی میں شادی کی ایک تقریب ہے۔ وہ دونوں اسی سلسلے میں خریداری کرنے گئے ہیں۔ خیر تم سناؤ' حوالات میں کیسی گزری؟ پولیس والوں نے تمہیں مارا پیٹا تو نہیں؟"

"ایک عرصے سے مال کھا رہے ہیں تو پھر مارتے پیٹتے کیسے۔ ہر مہینے میں ہی تو تھانے بھتہ پہنچاتا ہوں۔ وہ سالے تو الٹی معافیاں مانگ رہے تھے کہ یار ہمایوں! برا نہ ماننا' خانہ پری کے لئے تمہیں گرفتار کرنا پڑا ہے۔ وہی اغوا کی کہانی سنا رہے تھے۔" ہمایوں نے بتایا۔

"تم سے کچھ پوچھ گچھ نہیں کی؟" میں نے سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔ آج جب مجھے رہا کیا اس وقت بھی معذرت کر رہے تھے' کہہ رہے تھے' ہمیں تو پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہ کام حکومت کے باغیوں کا ہے' تم لوگ بھلا ایسے کام کیوں کرنے لگے۔ رہا ہو کر چاندنی چوک پہنچا تو استاد کا زبانی پیغام اپنے ایک آدمی سے ملا کہ استاد اور شانتی آپ کی کوٹھی پر ہیں' سو ادھر چلا آیا۔"

پھر میں نے ہمایوں کو بتایا کہ مجھے کل ہی اس کی اور استاد کی گرفتاری کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اسی لئے استاد کو اپنے پاس روک لیا۔ "پھر جب میں تمہیں لینے پہنچی تو شانتی گھر میں اکیلی ملی۔ پولیس تمہیں گرفتار کر کے لے جا چکی تھی۔ اسی سے مجھے تمہاری گرفتاری کا علم ہوا اور میں اسے اپنے ساتھ یہاں لے آئی۔"

"آپ نے یہ بہت اچھا کیا ورنہ تو وہ پاگل رو رو کر آدھی ہو جاتی۔" ہمایوں نے لفظ پاگل میں اپنی ساری محبت سمو دی تھی۔

"ناشتہ تو کر لیا تم نے یا منگواؤں؟"

"پولیس والوں نے خاصا تگڑا ناشتہ کرا دیا تھا۔" ہمایوں نے بتایا۔

"ظاہر ہے کہ انہیں تم سے آئندہ بھی بھتا وصول کرنا ہے۔" میں ہنس کر بولی۔ "تمہاری باتوں سے تو یوں لگ رہا ہے کہ تمہاری حیثیت تھانے میں کسی مہمان کی سی تھی۔" پھر میں نے موضوع گفتگو بدل دیا اور پوچھا۔ "تم شانتی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"وہ شادی پر راضی بھی تو ہو۔ میں تو اس سے کہہ کہہ کر تھک گیا۔ وہی ایک رٹ لگائے رہتی ہے کہ اپنا دھرم نہیں چھوڑوں گی۔ کبھی کبھی تو اس بات پر پٹ بھی جاتی ہے مجھ سے۔ مگر اپنی ضد نہیں چھوڑتی۔ پیار سے بھی اسے سمجھا کر دیکھ لیا اور مار پیٹ کر بھی۔ وہ اگر اسی طرح ساتھ رہنا چاہتی ہے تو رہے' مجبوری ہے۔"

"تمہاری مجبوری یا اس کی؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی مجبوری ہیں۔ نہ وہ مجھے چھوڑ سکتی ہے' نہ میں اسے۔"

"ویسے تمہیں وہ چاہتی بہت ہے۔ تمہارے لئے اس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔"

راجہ استاد اور شانتی کی واپسی تک ہمایوں میرے ہی پاس رہا۔ میں اس سے شانتی ہی کی باتیں کرتی رہی۔ ان دونوں کی محبت واقعی مثالی تھی۔ راجہ استاد کو معلوم ہوا کہ ہمایوں میرے کمرے میں ہے تو وہ شانتی کو ساتھ لئے وہیں آ گیا۔

"لے بھئی لونڈے آج تیری قسمت بھی پلٹ ہی گئی۔" راجہ استاد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی باآواز بلند کہا۔ اس نے ہمایوں کو مخاطب کیا تھا۔

"کیا ہو گیا استاد! بہت خوش نظر آ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ارے ہمایوں جسے برسوں میں رام نہیں کر سکا' تم نے ایک ہی دن میں اسے موم کی طرح پگھلا دیا۔ میں تو اسی وقت سمجھ گیا تھا جب تم شیتل کو بلا کر شانتی کے سامنے اس کا بیان دلوا رہی تھیں۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے' مجھ سے تو جب اس نے.........." راجہ استاد نے شانتی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کہا کہ بابا! میں بھی سرخ پھولوں والی بنارسی ساڑھی خریدوں گی تو چکرا کے رہ گیا۔ یک نہ شد دو شد۔ اب اسے بھی کلمہ پڑھوانا پڑے گا۔"

میں نے شانتی کی طرف دیکھا' وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی اور چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ رہی تھی۔ پھر اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ ایک دم بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ شاید وہ ہمایوں کا سامنا کرتے ہوئے اس وقت شرما رہی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ بیوی کی حیثیت سے جس کے ساتھ رہتے ہوئے اسے کئی برس ہو چکے تھے' اسی سے شرما رہی تھی۔ وہ مجھے اس وقت بہت اچھی لگی۔

ہمایوں کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھا ہو۔ اچانک جب کوئی خلاف

توقع بات ہو جائے تو آدمی آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے پر بھی مشکل ہی سے یقین کرتا ہے۔ کچھ دیر گم صم رہ کر اس نے راجہ استاد کو مخاطب کیا۔ "آخر ہوا کیا استاد!"

"ابے یہ پوچھ کہ کیا نہیں ہوا۔" راجہ استاد چہکا۔ "سب کچھ تو بتا چکا اب کیا پوچھ رہا ہے۔ آج تجھے دولہا بنانے کا ارمان پورا ہو جائے گا کیوں کہ دلہنیا راضی ہو گئی ہے۔"

"استاد! ہمایوں کی شادی بھی یہیں میری کوٹھی میں ہو گی۔" میں نے کہا۔

"اپنی جان پر کیوں ڈبل خرچہ بڑا رہی ہو رانی! لمبی ٹھک جائے گی تمہیں۔"

"تم فکر نہ کرو، شانتی یہیں رہے گی اور تم ہمایوں کی بارات لے کر آؤ گے، ہمایوں اور قاسم کی بارات۔"

"کیا مطلب، یہ قاسم سسرا بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا؟" استاد نے حیرت سے پوچھا۔

"قاسم کی شادی شیتل سے ہو رہی ہے۔" میں نے بتا دیا۔

"مگر تمہیں یہ بھی معلوم ہے رانی کہ وہ حرام زادہ بیوی بچوں والا ہے؟"

"معلوم ہے مجھے، لوگ دوسری شادی بھی تو کر لیتے ہیں نا۔"

"تو کیا وہی صورت حرام رہ گیا تھا؟ کوئی اور کنوارا لونڈا مل جاتا، لونڈوں کی کون سی کمی ہے۔"

"شیتل کو وہی پسند ہے۔" میں نے بات مختصر کر دی، پھر بولی۔ "اب یہ بتاؤ کہ بارات میں کتنے آدمی ہوں گے؟"

"تم تو واقعی لڑکی والی بن رہی ہو؟" راجہ استاد ہنسا۔ "سوچ لو، شہر بھر کے لچے لفنگے ہوں گے، بارات میں۔"

"ہوا کریں۔" میں بھی ہنس دی۔ "جیسا دولہا ویسے باراتی اور شنکر دادا کو نہ بھولنا۔"

"میرا خیال ہے ایک سو آدمیوں کی دعوت کا انتظام کر لو، کافی رہے گا۔" راجہ استاد نے باراتیوں کی تعداد بتائی۔ "شام کو چھ بجے تک بارات آ جائے گی۔"

"باراتیں کہو استاد! قاسم بھی تو آخر تمہارا ہی شاگرد ہے۔"

"یہ سالا کباب میں ہڈی خوب اٹکا۔"

پھر راجہ استاد، ہمایوں اور قاسم کو اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ میں نے شہزاد کو بلایا اور دعوت کا بندوبست کرنے کے لئے کہا۔ جو کام پہلے چھوٹے پیمانے پر ہونے والا تھا، اب ہمایوں شانتی کی شادی کے سبب باقاعدہ ایک تقریب کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ بہرحال مجھے اس پر بہت خوشی تھی۔

شہزاد نے غنی، عبدل اور رحمت کو اپنے ساتھ لگا کر شام تک سارا بندوبست کر لیا۔ کوٹھی کے لان میں شامیانہ لگ چکا تھا اور لان ہی کے ایک گوشے میں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں بذات خود تمام تیاریوں میں نگرانی کر رہی تھی۔ شام ہی کو پانچ بجے کے قریب میں نے شہزاد کو کسی مولوی صاحب کا بندوبست کرنے کو بھی کہا۔ وہ کرسیاں لگوا رہا تھا۔ اس نے یہ کام رحمت کے سپرد کیا اور مولوی صاحب کو بلانے چلا گیا۔ غنی اس باورچی کے ساتھ لگا ہوا تھا جو کھانا پکوا رہا تھا۔ عبدل اندر کوٹھی میں تھا۔

اس وقت تک دونوں دلہنیں شانتی اور شیتل نہا دھو کر لباس تبدیل کر چکی تھیں۔ ان دونوں کو خاص طور پر بنا سنوار کر ایک الگ کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ ان کا سنگھار خود میں نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔ میک اپ کی تربیت آخر کس دن کام آتی۔ وہ دونوں شادی کی سرخ بنارسی ساڑھیاں پہن کر بہت بھولی اور خوبصورت لگ رہی تھیں۔ میرے ایما پر قاسم کے کوارٹر کو بھی صاف ستھرا کر دیا گیا۔ کم از کم آج رات شیتل کو قاسم کے کوارٹر ہی میں گزارنا تھی۔ میں نے کوارٹر میں ہی شیتل کے کمرے کا سارا نیا فرنیچر بھی پہنچوا دیا تھا۔ خود میں نے بھی قاسم کے کوارٹر کو جا کر دیکھا۔ وہ سرونٹ کوارٹر ہی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اسے دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا۔ مسہری کے گرد بھی پھولوں کی چادریں لٹکی ہوئی تھیں۔ اس پر میں نے اطمینان کا اظہار کیا اور باہر نکل آئی۔

کچھ ہی دیر میں شہزاد، مولوی صاحب کو ساتھ لے کر آ گیا۔ میں نے مولوی صاحب کو بتایا کہ دو ہندو لڑکیوں کو انہیں مسلمان بنانا ہے۔

"سبحان اللہ!" مولوی صاحب نے اس پر خوشی کا اظہار کیا، پھر پوچھا۔ "وہ لڑکیاں بہ رضا و رغبت اسلام قبول کر رہی ہیں؟"

"جی ہاں مولوی صاحب!" میں نے جواب دیا۔ "مسلمان ہونے کے لئے انہیں مجبور نہیں کیا گیا۔ آپ خود چل کر ان سے تصدیق کر لیں۔"

"چلئے۔" مولوی صاحب بولے۔

میں، مولوی صاحب کو اپنے ساتھ کوٹھی کے اس کمرے میں لے آئی جہاں شیتل اور شانتی دلہن بنی بیٹھی تھیں۔

مولوی صاحب ان دونوں کے قریب جا کر بیٹھ گئے، پھر ان دونوں ہی سے باری باری میرے بیان کی تصدیق کی۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے ان دونوں کو کلمہ طیبہ پڑھوایا اور پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اب شیتل، فاطمہ اور شانتی ہمیشہ کے لئے صبیحہ بن چکی تھی۔ مولوی صاحب کو میں نے روک لیا کہ ان دونوں کا نکاح پڑھا کر جائیں۔ عصر کی نماز انہوں نے لان ہی میں کپڑا بچھا کر پڑھ لی۔

وقت مقررہ پر راجہ استاد باراتیں لے کر آ گیا۔ میرے ملازمین نے باراتیوں کے گلوں میں ہار ڈالے۔ ہمایوں اور قاسم کے سروں پر سہرے بندھے ہوئے تھے۔ مغرب میں ابھی خاصا وقت تھا اس لئے نکاح پڑھوا دیا گیا۔ دلہنوں کی طرف سے میں نے اور دولہوں کی جانب سے راجہ استاد نے سرپرستی قبول کی تھی۔

شنکر دادا بھی بارات میں شامل تھا۔ اس نے مجھے اور راجہ استاد کو مبارک باد دی، پھر دلہنوں کو اپنی طرف سے ایک ایک ہزار روپیہ دیا۔ یہ وہی شانتی یا صبیحہ تھی جسے وہ ایک روز چاندنی چوک سے اغوا کر کے لے جانے والا تھا۔ میں نے اسی دوران میں آئندہ روز صبح نو بجے شنکر دادا سے اپنی کوٹھی پر پہنچنے کے لئے کہہ دیا۔ اس سے میں نے زیادہ سے زیادہ رقم ساتھ لانے کو بھی کہا تھا۔ راجہ استاد سے میں پہلے ہی یہ کہہ چکی تھی پھر موقع دیکھ کر میں نے شنکر دادا سے پوچھ لیا۔ "تمہارا مہمان تو خیریت سے ہے نا؟" میرا

اشارہ ڈیسوزا کی طرف تھا۔

"جی ہاں۔" شنکر دادا نے جواب دیا۔ "آپ کے حکم پر اسے وہیں پہنچا دیا گیا ہے جہاں پہلے رکھا گیا تھا۔"

پھر دونوں دلہنوں کو رخصت کرنے اور کھانا کھلانے میں رات کے کوئی نو بج گئے۔ فاطمہ اور صبیحہ کو بطور جہیز میں نے پانچ پانچ ہزار روپے دیئے تھے۔ رخصتی کے وقت وہ دونوں ہی مجھ سے گلے مل کے اس طرح روئی تھیں جیسے واقعی اپنے میکے سے جا رہی ہوں۔ اس وقت کچھ فضا ہی ایسی بن گئی تھی کہ میری آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے۔ ان دونوں کو میں رخصت کر ہی رہی تھی کہ رحمت نے آ کر سرگوشی کی۔ "کوئی سردار ہردیال سنگھ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو انہیں لان میں دوسرے مہمانوں کے ساتھ بٹھا آیا ہوں۔" رحمت نے بتایا۔

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دو' کہنا میں ابھی آتی ہوں۔" میں سمجھ گئی تھی کہ آنے والا ارشاد حسین ہے۔ اسے یقیناً میرا پیغام مل گیا تھا۔

میری بات سن کر "بہتر ہے" کہتا ہوا رحمت تیزی سے باہر نکل گیا۔ صبیحہ کو تو راجہ استاد' چاندنی چوک لے گیا اور فاطمہ کوٹھی ہی میں قاسم کے کوارٹر میں پہنچا دی گئی۔ شہزاد کو ضروری ہدایات دے کر میں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ شہزاد کو بہرحال شامیانے' کرسیاں وغیرہ واپس بھجوانا تھیں اور وہ کراکری بھی جو کرائے پر لائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ لان کی صفائی بھی کرانا تھی۔ میں نے اسے اسی سلسلے میں ہدایات دی تھیں۔

میں ڈرائنگ روم میں پہنچی تو ارشاد حسین کو مخاطب کیا۔ "معاف کیجئے گا' آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔" پھر میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"چلئے کر دیا معاف۔" ارشاد حسین خوش مزاجی سے بولا' پھر کہنے لگا۔ "آج سے پہلے میں نے اتنی بڑی تعداد میں جرائم پیشہ افراد کو کسی ایک جگہ اکٹھے نہیں دیکھا تھا۔ کیا آپ نے جرائم پیشہ افراد سے رشتے داری جوڑ لی ہے معبلہ!" ارشاد حسین بہرحال خفیہ پولیس میں تھا' وہ ان لوگوں سے واقف رہا ہو گا۔

"سچ تو خیر یہی ہے ارشاد! جو آپ نے کہا ہے۔ میں نے آج اپنی ایک منہ بولی بہن اور ایک ملازمہ کی شادی دو جرائم پیشہ افراد ہی سے کی ہے۔ ان میں سے ایک راجہ استاد کا دست راست ہمایوں اور دوسرا بھی اسی کا ایک شاگرد قاسم ہے۔"

"یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب آپ سماجی خدمات بھی انجام دینے لگی ہیں۔" ارشاد حسین مسکرایا۔

"اور مذہبی خدمات بھی۔ میں نے آج دو ہندو لڑکیوں کو کلمہ پڑھوا کر مسلمان کیا ہے۔"

"بھئی سبحان اللہ' اب یقیناً آپ کا قصد حج بیت اللہ کا ہو گا۔"

"ابھی تو خیر ریس کورس جانے کا قصد ہے۔ یاد ہے' ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ

میرا ذریعہ معاش کیا ہے؟"

"ہاں یاد ہے۔ کیا آپ نے مجھے اسی لئے بلایا ہے کہ اس راز سربستہ سے پردہ اٹھا دیں؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"پردہ تو خیر کل ریس کورس ہی میں اٹھے گا۔ فی الحال تو میں نے آپ کو صرف یہ اطلاع بہم پہنچانے کے لئے بلایا ہے کہ کل میرے ساتھ ریس کورس تشریف لے چلیں۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ پوچھنا تھی کہ آپ کی سرفروش تنظیم کی مالی صورت حال کیسی ہے؟"

"کیوں' کیا آپ کا دریائے سخاوت جوش مار رہا ہے؟"

"اس کے لئے میرے دریائے سخاوت کو جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ آپ سے میں نے جو سوال کیا ہے' اس کا جواب دیجئے۔" میں بولی۔

"تنظیم کی مالی حیثیت بس ٹھیک ہی ہے لیکن اسے اطمینان بخش یا بہتر نہیں کہا جا سکتا۔" وہ سنجیدگی سے بتانے لگا' پھر پوچھا۔ "مگر آپ کو یہ خیال کیسے آگیا؟"

"دراصل میرے پاس جو رقم جمع تھی' وہ اب نئی کوٹھی خریدنے اور دیگر اخراجات میں تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ رقم کے حصول کی خاطر مجبوراً کل مجھے ریس کھیلنے جانا پڑے گا۔ مجھے خیال آیا کہ اس موقع سے آپ بھی کیوں نہ فائدہ اٹھائیں۔"

"یہ ممکن نہیں معبلہ! اس لئے کہ میرے نزدیک یہ مال جائز نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تنظیم کے بڑے بھی اسے پسند نہیں کریں گے۔ پھر یہ بھی تو ضروری نہیں کہ ریس کھیل کر کوئی قابل ذکر رقم جیت ہی لی جائے۔ ریس بھی ایک طرح کا جوا ہے اور جوئے میں ہار جیت دونوں ہی ہوتی ہیں۔ تنظیم کے اخراجات عطیات کے مرہون منت ہیں۔ اگر آپ تنظیم کی مالی امداد کے لئے کوئی عطیہ دینا چاہتی ہیں تو وہ ضرور قابل قبول ہو سکتا ہے۔" ارشاد حسین صاف گوئی سے بولا۔

"مگر تنظیم کو میں نے بھی کوئی رقم بطور عطیہ دی تو وہ ریس ہی کی کمائی سے دوں گی۔ تو کیا وہ مال تنظیم کے لئے جائز ہو جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی ذمے دار آپ ہوں گی۔ تنظیم کا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ رقم عطیہ دینے والے نے کہاں سے اور کس طرح حاصل کی۔" اس نے جواب دیا۔

"ارشاد! کیا خود آپ بھی ذاتی طور پر تنظیم کو بطور عطیہ کچھ رقم دے سکتے ہیں؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں' دے سکتے ہیں' کیا مطلب؟ میں تو اپنی پوری آبائی جائیداد تنظیم کو بطور عطیہ دے چکا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"اور بقول آپ کے تنظیم کو اس سے کوئی تعلق نہیں کہ عطیے میں دی جانے والی رقم کس طرح حاصل کی گئی ہے تو پھر ذاتی طور پر آپ ریس کھیلئے اور جو رقم جیت جائیں' وہ بطور عطیہ تنظیم کو دے دیجئے۔" میں نے ایک راہ نکال ہی لی۔

"مال حرام حاصل کرنے کا گناہ تو بہرحال ہو گا' خواہ میں وہ رقم اپنے پاس رکھوں' یا کسی کو دے دوں۔ میں نے تو گناہ کما ہی لیا نا۔ مال حرام اگر کارِ خیر میں بھی لگا دیا جائے تو اس سے حرام مال کمانے کا گناہ کم یا ختم نہیں ہو سکتا پھر بھلا میں کیوں یہ گناہ کماؤں؟"

"اگر آپ کی بات مان بھی لی جائے ارشاد! تو کیا آپ کے اس گناہ سے تنظیم کو فائدہ نہیں ہو گا؟ اس بات کو یوں سمجھئے کہ کسی کو قتل کرنا گناہ ہے نا۔ مگر آپ یہ گناہ کرتے ہیں' خواہ تنظیم کو بچانے ہی کے لئے سہی۔ کیا آپ کا گناہ تنظیم کے لئے سودمند نہیں ہوتا؟ مجھے بتایئے۔ اس وقت کسی شخص کو قتل کرنا آپ کے لئے کیسے جائز ہو جاتا ہے؟"

"آپ نے تو میری اچھی خاصی ذہنی ورزش کرا دی۔" ارشاد حسین ہنس کر بولا۔ "یہ آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں کہ نیک اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر راستے کی رکاوٹیں ہٹانا پڑتی ہیں اور یہ بھی یقیناً آپ کے علم میں ہو گا کہ ہر ذی روح کو اپنی زندگی بچانے کی حق حاصل ہے۔ اگر میں اپنی جان بچاتے ہوئے کسی شخص کو قتل کر دوں یا وہ میرے ہاتھوں قتل ہو جائے تو قانوناً اور مذہباً میں مجرم یا گنہگار نہیں کہلاؤں گا۔ جوا کھیلنا بالکل الگ معاملہ ہے' سمجھیں آپ!"

میں بھی اپنے دل میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس موقع سے تنظیم کو کسی نہ کسی طرح ضرور فائدہ پہنچاؤں گی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ آئندہ یہ موقع کب آتا۔ غیر ملکی غاصبوں کے خلاف جدوجہد کرنے والے ان سرفروشوں سے مجھے بھی ہمدردی ہو چکی تھی۔ میں نے اسی لئے ایک اور راہ نکال لی۔

"ارشاد!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "کل تک کے لئے کیا کچھ رقم آپ مجھے ادھار دے سکتے ہیں؟"

"کتنی رقم؟" اس نے دریافت کیا۔

"زیادہ سے زیادہ جتنی رقم بھی کل صبح نو بجے تک فراہم کر سکیں۔" میں نے کہا۔ "کل شام ہونے سے پہلے یہ رقم میں واپس کر دوں گی۔"

"میں شاید کل تک پانچ ہزار روپے سے زیادہ کا بندوبست نہ کر پاؤں۔" ارشاد حسین بولا' پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ "اور اگر آپ یہ رقم ریس میں ہار گئیں؟"

"ارشاد! کچھ لوگ صرف جیتنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں' ہارنے کے لئے نہیں۔ ایسے لوگوں میں آپ میرا شمار بھی کر سکتے ہیں۔ پھر بھی بقول آپ کے میں ہار بھی گئی تو اس کی ذمے داری مجھ پر ہو گی' آپ پر نہیں۔ آپ کی رقم بہرحال واپس مل جائے گی۔" ارشاد حسین شاید اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ میں اس کی رقم سے ریس کھیلنا چاہتی ہوں۔

"تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے کل کی چھٹی لینا ہی پڑے گی۔" ارشاد حسین نے طویل سانس لیا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلتا ہوں اس لئے کہ رقم کا بندوبست بھی کرنا ہے۔"

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح نو بجے ہی تینوں افراد میری کوٹھی میں پہنچ گئے۔ ارشاد حسین' رام پرشاد اگروال

کے میک اپ میں تھا۔ اس کے علاوہ آنے والوں میں راجہ استاد اور شنکر دادا تھے۔ میں پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ ان تینوں ہی کو رحمت نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا تھا۔ ان میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ اس کے سوا بھی میں نے کسی کو بلایا ہے۔ راجہ استاد اور ارشاد حسین کو معلوم تھا کہ میں نے کسی کو بلایا ہے۔ راجہ استاد اور ارشاد حسین کو معلوم تھا کہ انہیں میرے ساتھ کہاں چلنا ہے البتہ شنکر دادا بے خبر تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں پہنچی تو حسب معمول اس نے اٹھ کر میرے پیر چھوئے' میرے چہرے پر میک اپ تھا' مگر ان تینوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

میں نے لباس تبدیل کرنے سے پہلے اپنے پاس بچ جانے والی رقم کا جائزہ لے لیا تھا۔ سونے کے علاوہ میرے پاس صرف سولہ ہزار روپے باقی بچے تھے جو میں نے اپنے پرس میں رکھ لئے تھے۔ میرے خیال میں یہ رقم ریس کھیلنے کے لئے کافی تھی۔

"یہ رام پرشاد اگروال جی ہیں' میرے عزیز دوست۔" میں نے راجہ استاد اور شنکر دادا سے ارشاد حسین کا تعارف کرایا' پھر بولی۔ "اور اگروال جی! یہ شنکر دادا اور راجہ استاد ہیں۔ انہیں آپ میرے دوست بھی سمجھ سکتے ہیں اور عزیز بھی۔ کیوں کہ استاد ہی کے ایک چہیتے شاگرد ہمایوں سے میں نے اپنی منہ بولی بہن کی شادی کی ہے۔" پھر میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

ان لوگوں نے آپس میں ہاتھ ملائے۔ پھر ارشاد حسین مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شریمتی رانی جی! آپ نے آج کے سماچار پتر (اخبار) دیکھے؟"

"میں نہیں دیکھ سکی اگروال جی! کوئی خاص خبر ہے کیا؟"

"جی ہاں' ان دنوں تو ایک ہی خبر زوروں پر ہے۔ انگریز سرکار نے سرفروش تنظیم کا مطالبہ سویکار (منظور) کر لیا ہے۔" ارشاد حسین نے بتایا۔

"حیرت ہے کہ حکومت سرفروش تنظیم کے زیر حراست ارکان کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گئی!"

پھر میں نے ارشاد حسین کو چمڑے کا ایک بیگ کھولتے دیکھا۔ اس نے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "شریمتی جی! سیوک نے جو روپے آپ سے ادھار لئے تھے' سو حاضر ہیں۔ بہت بہت دھنیہ واد۔ انہیں گن لیں' پورے پانچ ہزار ہیں۔"

میں نے نوٹوں کی گڈی لے لی' مگر نوٹ گنے نہیں۔ ارشاد حسین نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ وہ رقم میرے حوالے کر دی تھی جو میں نے اس سے منگوائی تھی۔ اس موقع سے شنکر دادا نے بھی فائدہ اٹھایا۔ ریگزین کا ایک تھیلا مجھے اس کے ہاتھ میں بھی نظر آیا تھا۔ اس نے تھیلے سے دو گڈیاں نکالیں' ایک بڑی تھی دوسری چھوٹی۔

"دیوی جی! پندرہ ہزار جو میں نے آپ سے لئے تھے' رکھ لیجئے۔" اس نے دونوں گڈیاں میری طرف بڑھائیں۔

"بات یہ ہے کہ آپ لوگ ایک دوسرے سے اصل بات چھپا رہے ہیں۔" میں ہنس کر بولی۔

"اگروال جی نے مجھ سے کوئی رقم ادھار نہیں لی تھی بلکہ میں نے ہی خود ان سے یہ رقم منگوائی تھی۔ یہ

ان کی شرافت ہے کہ ادھار کی رقم لوٹانے کا بہانہ کر کے انہوں نے یہ روپے مجھے دیئے ہیں۔ شنکر دادا! بات دراصل یہ ہے کہ میں آج ریس کھیلنے جارہی تھی' سو یہ سوچا کہ آپ لوگوں کو بھی ساتھ لے لوں۔ اگروال جی ریس کھیلنے کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اس کا توڑ میں نے یہ کیا کہ ان کے پانچ ہزار تمہیں یا راجہ استاد کو دے دوں گی کہ ان کی طرف سے داؤ پر لگا دو۔ اپنی رقم اپنے ہی پاس رکھو شنکر دادا!" یہ کہہ کر میں راجہ استاد سے مخاطب ہوئی۔ ""ہاں استاد! تم کتنا مال لے کر چل رہے ہو؟"

"میرے پاس تو ہارنے کے لئے اس وقت صرف چھ ہزار ہی تھے' سو لے آیا۔" راجہ استاد نے ہنس کر جواب دیا۔

"استاد! اتنا پختہ یقین ہے تمہیں اپنے ہارنے کا؟" میں بھی ہنسی۔

"مجھے تو آج تک یاد نہیں کہ کبھی ریس میں جیت کر آیا ہوں اسی لئے تو ریس کھیلنا چھوڑ دی۔ تمہاری خاطر اور ایک دفعہ اور ہار جاؤں گا تو کون سی قیامت آجائے گی؟"

"اچھا یہ اگروالی جی کے پانچ ہزار بھی تم اپنے پاس رکھ لو۔ ان کا جو حصہ بنے وہ الگ رکھنا۔" میں نے ارشاد حسین والی نوٹوں کی گڈی راجہ استاد کو تھما دی۔ اس سے ارشاد حسین پر یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ میں اس کی رقم سے ریس نہیں کھیلوں گی پھر میں اٹھ کھڑی ہوئی اور شنکر دادا سے پوچھا۔ "جیپ لے کر آئے ہو؟"

"جی دیوی جی۔" شنکر دادا نے جواب دیا۔

میں کوٹھی کے صدر دروازے سے باہر ہی نکلی تھی کہ فاطمہ اور قاسم کو آتے دیکھا۔ وہ دونوں ہی خوش نظر آرہے تھے۔ فاطمہ آگے بڑھ کر میرے پیر چھونے کے لئے جھکی تو میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھکنے سے روک دیا۔ "اب تم مسلمان ہو چکی ہو اور مسلمان خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتے۔" میں نے فاطمہ کو سمجھایا۔ ہرچند کہ میں خود بھی اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئی تھی مگر مذہب اسلام کا میں نے تفصیل اور گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ مجھے اسی لئے ایک ایک بات کی خبر تھی کیونکہ مجھے عربی زبان بھی آتی تھی اس لئے قرآن شریف بھی پڑھ چکی تھی۔ اسلام کے ساتھ ہی میں نے دیگر مذاہب کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ فاطمہ کو سمجھا کر میں نے قاسم کو مخاطب کیا۔ "تم فاطمہ کو اپنے مذہب کی باتیں بتایا کرو اور ہاں تین دن کے لئے تمہاری اور فاطمہ کی چھٹی ہے۔ خوب گھومو پھرو۔ میں شہزاد سے کہہ دوں گی کہ گیٹ پر اس وقت تک کے لئے کسی اور کی ڈیوٹی لگا دے۔"

"شکریہ بیگم صاحبہ!" قاسم بولا۔ "دراصل میں اس وقت بھی فاطمہ کو گھمانے ہی لے جا رہا تھا۔ آپ سے اجازت لینے کے لئے ہی ہم دونوں حاضر ہوئے تھے۔"

"جاؤ عیش کرو' پیسے تو ہیں نا تم لوگوں کے پاس؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں' کل آپ نے پانچ ہزار روپے دیئے تو تھے۔"

"وہ تو بطور جہیز دیئے تھے۔" یہ کہہ کر میں نے ہینڈ پرس کھول کر پانچ سو روپے نکالے اور فاطمہ کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ "یہ گھومنے پھرنے اور چھوٹی موٹی خریداری کے لئے ہیں۔" پھر میں آگے بڑھ

گئی۔ ارشاد حسین' راجہ استاد اور شنکر دادا میرے پیچھے پیچھے تھے۔

"قاسم سسرے کے تو عیش ہو گئے۔ سسرال بڑی تگڑی ملی ہے سالے کو۔" راجہ استاد یہ کہہ کر زور سے ہنس پڑا۔

شنکر دادا پھاٹک کھلوا کر جیپ اندر ہی لے آیا تھا۔ ہم سبھی جیپ میں سوار ہو گئے۔ شنکر دادا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور میں اس کے برابر آگے بیٹھی تھی۔ راجہ استاد اور ارشاد حسین پچھلی سیٹ پر تھے۔ ریس کورس' بیل گھیا سے کچھ پہلے ہی تھا' شنکر دادا نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔

ہم ریس کورس پہنچے تو پہلی ریس شروع ہو چکی تھی' مگر اس میں وہ تینوں گھوڑے نہیں دوڑ رہے تھے جن پر مجھے رقم لگانا تھی۔ جیپ ایک طرف کھڑی کر کے ہم اس طرف بڑھنے لگے جہاں ٹوکن خریدنے کے لئے کیبن بنے ہوئے تھے۔ ارشاد حسین' راجہ استاد اور شنکر دادا کو میں اس لئے ریس کھلانے ساتھ لائی تھی کہ وہ تینوں ہی مختلف مواقع پر میری مدد کر چکے تھے۔ اس طرح کچھ نہ کچھ تو ان کے احسانوں کا بدلہ اتر ہی جاتا۔

اس ریس کے بعد ونر اگلی ریس میں دوڑنے والا تھا۔ میں نے اس گھوڑے پر پندرہ ہزار روپے لگا دیئے۔ اس کا ایک اور تین کا بھاؤ چل رہا تھا' یعنی اگر وہ ریس جیت جاتا تو مجھے تگنی رقم ملتی' پینتالیس ہزار روپے۔ مجھے اتنی بڑی رقم ایک ہی گھوڑے پر لگاتے دیکھ کر راجہ استاد نے پوچھا۔ "کیا اسی گھوڑے پر ساری رقم لگا دوں؟"

"ہاں استاد! لگا دو۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اور اگروال جی کے پانچ ہزار بھی؟"

راجہ استاد نے ساری رقم ونر پر لگا دی اور اس کی دیکھی دیکھا شنکر دادا نے بھی اپنے پندرہ ہزار داؤ پر لگا دیئے۔

"چڑھ جا بیٹا سولی پر' رام بھلی کرے گا۔" راجہ استاد نے شنکر دادا پر فقرہ چست کیا' پھر میری طرف دیکھ کر ایک شعر کا مصرعہ پڑھا۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

میں مسکرا کر رہ گئی۔ شنکر دادا نے مڑی خرید لی اور سب کو ایک ایک پڑیا تھما دی۔ مڑی کھاتے ہوئے ہم وہاں سے اس طرف چل دیئے جہاں دوسری ریس شروع ہونے والی تھی۔ پہلی ریس ختم ہو چکی تھی۔ لوگ ریلنگ سے لگے ان گھوڑوں کو دیکھ رہے تھے جو اس ریس میں دوڑنے والے تھے۔ ان کے جاکی انہیں اسٹارٹنگ پوائنٹ کی طرف لے جا رہے تھے۔

راجہ استاد ریلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔ "اس گھوڑے کے دیدار تو کر لو جس پر مال لڑایا ہے۔" مجموعی طور پر ہم چاروں افراد کی خاصی بڑی رقم اس گھوڑے پر لگی ہوئی تھی۔ اکتالیس ہزار روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔

ہجوم خاصا تھا' پھر بھی کھڑے ہونے کی جگہ مل ہی گئی۔ ہرچند کہ چہرے پر میک اپ کی وجہ سے میری عمر پچیس سال کے قریب معلوم ہو رہی تھی اور خوبصورتی بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ مجھے قبول

صورت ہی کہا جا سکتا تھا البتہ جسم متناسب ہونے کی وجہ سے پُرکشش ہی تھا۔ میں نے ذرا دیر بعد ہی یہ محسوس کر لیا کہ ایک نوجوان مجھ سے لگ کر کھڑا ہوا ہے۔ میری دائیں جانب شنکر دادا تھا۔ درمیان میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں مزید دائیں جانب سرک سکتی۔ چند لمحے میں کچھ نہیں بولی، مگر جب اس نے دست درازی شروع کر دی تو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔

"کیا بات ہے میری جان!" میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔ آواز میں نے دانستہ دھیمی ہی رکھی تھی۔ "کہو تو ساتھ چلوں؟"

وہ بھی ایک ڈھیٹ ہڈی ہی تھا، میری بات کو سنی ان سنی کر گیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

چند لمحے سکون سے گزرے ہوں گے کہ اس کا ہاتھ پھر جسم سے مس ہوا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔

"تیرا کیا کھو گیا ہے جو ٹٹول کر ڈھونڈ رہا ہے؟" میں نے سخت لہجے میں اس سے کہا اور پھر کلائی کو جھٹکا دیا۔

اس نوجوان کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔

"ابھی تیرے دودھ کے دانت ٹوٹے نہیں اور تُو عورتوں پر ہاتھ ڈالنے لگا۔" میں نے اس کی کلائی ایک جھٹکے سے چھوڑ دی اور پھر شانے پر لات جمائی تو وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

سب کچھ چند ہی لمحوں میں اور بڑی تیزی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ شنکر دادا، راجہ استاد اور ارشاد حسین کو اس وقت حقیقت کا علم ہوا جب وہ نوجوان میری لات کھا کر دور تک لڑھکتا چلا گیا تھا۔

کلکتہ شہر کی روایت کے مطابق "مار شالا کو" کی کئی آوازیں ابھریں، مگر جب تک لوگ اس "کار خیر" میں حصہ لیتے گھڑسوار پولیس والے اپنے گھوڑے دوڑاتے وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے اس نوجوان کو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ راجہ استاد اور شنکر دادا اس کے بعد میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

عورت ہونا بھی مردوں کے معاشرے میں ایک عذاب ہے۔ کچھ مرد، جوان ہوتے ہی بے لگام ہونے لگتے ہیں اور ہر عورت کو اپنی جاگیر سمجھ لیتے ہیں۔ عموماً شریف عورتیں اس طرح کی بے ہودہ حرکتوں کو تماشا نہ بننے کی وجہ سے نظرانداز کر جاتی ہیں۔ اس سے ایسے مردوں کا حوصلہ اور بڑھ جاتا ہے۔ مجھ جیسی کوئی عورت تو ان سے برسوں میں کہیں ٹکراتی ہو گی جو خود ایسے دل پھینک مردوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دے۔

پھر ریس شروع ہو گئی۔ اسی کے ساتھ لوگ بری طرح چیخنے لگے۔ ریس کا انجام مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا۔ ارشاد حسین اور شنکر دادا دونوں ہی میری طرح "اناڑی" لگتے تھے البتہ راجہ استاد پوری طرح ریس کا حصہ بنا ہوا تھا۔ "ونر، ونر........" وہ چیختے جا رہا تھا۔ ہم لوگ وننگ پوائنٹ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ آگے آگے اس وقت تک کوئی اور گھوڑا تھا لیکن وننگ پوائنٹ تک آتے آتے ونر نے ایک طویل جست بھری اور آگے نکل گیا۔ جن لوگوں نے ونر پر رقم لگائی تھی، انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ایک

بوڑھے کو میں نے ناچتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ڈیل ڈول خاصا تھا اور ناچتے ہوئے وہ بہت مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"ونر زندہ باد!" راجہ استاد نے بھی زبردست نعرہ لگایا۔

"استاد! کیا اس بوڑھے کی طرح تمہارا بھی ناچنے کا ارادہ ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آج پہلی بار بار کسی ریس میں جیتا ہوں، خوش تو ہو لینے دو۔" وہ بولا۔

پھر ہم نے کاؤنٹر پر جا کر اپنے اپنے حصے کی رقم وصول کی۔ شنکر دادا کو اور مجھے پینتالیس، پینتالیس ہزار روپے ملے۔ اسی طرح راجہ استاد کو چھ ہزار کے تگنے اٹھارہ ہزار ملے۔ اسی نے ارشاد حسین کے پانچ ہزار بھی داؤ پر لگائے تھے جو پندرہ ہزار ہو چکے تھے۔

"یہ پندرہ ہزار اگروال جی کے حوالے کر دوں؟" راجہ استاد نے نوٹ گننے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

"کیوں، کیا ابھی سے واپس چلنے کا ارادہ ہے؟" میں نے ہنس کر سوال کیا۔ "ابھی تو میں نے ریس کھیلنا شروع کی ہے۔"

"لو اتنا تگڑا مال کاٹ کر ابھی تمہارا دل نہیں بھرا، کیا جو کمایا ہے گنوانے کا ارادہ ہے؟"

"اتنے سے پیسوں کو تم تگڑا مال کہہ رہے ہو استاد! یہ تو سمجھو ابھی ابتدا ہے۔"

اگلی ریس میں کنگ دوڑ رہا تھا۔ میں نے جتنی رقم جیتی تھی سب اس پر لگا دی۔ کنگ لوگوں کا فیورٹ تھا اس لئے اس کا بھاؤ ڈبل کا تھا یعنی مجھے نوے ہزار ہی ملتے۔ میرے کہنے پر راجہ استاد نے اپنے اٹھارہ ہزار اور ارشاد حسین کے پندرہ ہزار داؤ پر لگا دیئے۔ شنکر دادا بھی پیچھے نہیں رہا تھا۔

ٹوکن لے کر ہم ہٹ آئے اور میں نے راجہ استاد سے کہا۔ "آؤ استاد! ڈاب پیتے ہیں۔" سامنے ہی ایک لڑکا مجھے ڈاب لئے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔

"ارے ریس شروع ہونے والی ہے اور تمہیں ڈاب پینے کی لگی ہے، بعد میں دیکھا جائے گا۔" راجہ استاد ریس کا پرانا دھنی معلوم ہوتا تھا۔

"کیا دیکھنا ہے ریس، کنگ ہی جیتے گا۔" میں بولی۔

"یہاں اتنی بڑی رقم داؤ پر لگی ہوئی ہے اور تمہیں کوئی فکر ہی نہیں، کمال ہے تم سے بھی۔"

"تو کیا تمہارے ریس دیکھنے سے کچھ فرق پڑ جائے گا، کیوں بھئی اگروال جی! آپ کیوں چپ چپ ہیں؟ بولئے نا۔"

"جی!" ارشاد حسین مسکرایا۔ "مجھے تو ڈاب پینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے بھی اس وقت ڈاب والے کے پاس کوئی نہیں، سبھی ریس دیکھنے دوڑ رہے ہیں۔"

راجہ استاد تڑپ ہی کے تو رہ گیا کیونکہ شنکر دادا بھی میری ہاں میں ہاں ملانے لگا تھا۔ مجبوراً اسے بھی اکثریت کا فیصلہ ماننا پڑا۔ ڈاب پیتے ہوئے راجہ استاد کو ستانے کے لئے میں نے دانستہ دیر لگائی اور اسی عرصے میں ریس شروع ہو گئی۔ جب ہم ریلنگ کی طرف بڑھے تو کہیں بھی کھڑے ہونے کی جگہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود راجہ استاد ایک جگہ گھسنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میں، شنکر دادا اور ارشاد حسین کے

ساتھ دور کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ مضطرب تو خیر شنکر دادا بھی لگ رہا تھا کیونکہ اس ریس میں اس کی بھی بڑی رقم داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ ہوتا یہ ہے کہ جواری جتنی رقم بھی جوئے میں جیت لیتا ہے' اسے اپنی ہی سمجھتا ہے۔ اگر وہ ہار جائے تو اپنی اصل رقم سے زیادہ دکھ اسے جیتی ہوئی رقم گنوانے کا ہوتا ہے۔ شنکر دادا باتیں تو مجھ سے کر رہا تھا مگر اس کی نظریں وننگ پوائنٹ ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

آخرکار اس ریس کا فیصلہ بھی ہو گیا اور یوں میرے پندرہ ہزار گویا دوسری ہی ریس میں نوے ہزار ہو گئے۔ اب آخری ریس رہ گئی تھی۔ اس میں گولڈ کو دوڑنا تھا۔ گولڈ کے علاوہ اس ریس کی ایک اور کشش لوگوں کے لئے یہ تھی کہ اس میں گزشتہ تین ریسوں میں جیتنے والے گھوڑے بھی دوڑ رہے تھے۔ پہلی ریس میں ایک گھوڑی کوئن دوڑی تھی جو بقیہ گھوڑوں کو خاصا پیچھے چھوڑ کر وننگ پوائنٹ تک پہنچی تھی۔ اس کے بعد ونر اور کنگ یکے بعد دیگرے دو ریسوں میں پہلے نمبر پر آئے تھے۔ ہر طرف انہی تینوں کا چرچا تھا۔ ہر شخص انہی پر داؤ لگا رہا تھا۔ ارشاد حسین کے پانچ ہزار تیس ہزار بن چکے تھے۔

"میں تو بھئی ونر پر مال لگاؤں گا۔" راجہ استاد لہرا کر بولا۔ اس کے چھ ہزار' چھتیس ہزار ہو گئے تھے۔

"سارا مال لگاؤ گے نا استاد؟" میں نے تفریح لینے کی خاطر پوچھ لیا۔

"ہاں سارا مال۔" راجہ استاد خاصی ترنگ میں دکھائی دے رہا تھا۔

"اور تمہارے کیا ارادے ہیں شنکر دادا؟" میں شنکر دادا کی طرف مڑی۔

"ویسے تو میرے خیال میں کنگ پر رقم لگانا چاہئے مگر دیوی جی جس گھوڑے پر کھیلیں گی اسی پر میں بھی کھیلوں گا۔" شنکر دادا نے جواب دیا۔

اب ہم کیبنوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے راجہ استاد سے کہا۔ "ذرا معلوم تو کرو استاد! گولڈ کا کیا بھاؤ چل رہا ہے؟"

"گولڈ!" راجہ استاد نے برا سا منہ بنایا۔ "یہ بھی کیا کسی گھوڑے کا نام ہے؟"

"ہاں گھوڑے ہی کا نام ہے' گدھے کا نہیں۔ تم پوچھو تو سہی۔"

میرے کہنے پر راجہ استاد کچھ دیر بعد منہ لٹکائے واپس آیا اور بتانے لگا۔ "معلوم ہے تمہارے گولڈ کے کیبن پر مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ ارے پہلی دفعہ یہ گھوڑا ریس میں دوڑ رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے راجہ استاد کی آواز میں فریاد سی تھی۔ "معلوم ہے تمہیں ایک اور دس کا بھاؤ ہے اس کا۔ تمہارے گولڈ کو کوئی گھاس نہیں ڈال رہا۔"

"لیکن استاد! یہ سوچ لو کہ سونا پھر سونا ہوتا ہے۔" میں مسکرا کر بولی۔ "ویسے تمہاری مرضی ہے' کھیلو نہ کھیلو۔ میں تو اسی پر اپنے نوے ہزار لگاؤں گی تاکہ نو لاکھ ملیں۔"

ارشاد حسین جو اب تک اس معاملے میں کچھ نہیں بولا تھا' وہ بھی چپ نہ رہا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "شریمتی جی! میرا وچار (خیال) یہ ہے کہ اتنا بڑا رسک نہ لیں۔ اگر آپ کو کھیلنا ہی ضرور ہے تو دس بیس ہزار لگا دیں گولڈ پر۔ اگر آپ نے دس ہزار بھی لگا دیئے اس گھوڑے پر اور اتفاق سے وہ جیت گیا' پھر

بھی ایک لاکھ ملیں گے۔ یہ رقم بھی کوئی تھوڑی نہیں ہوتی۔ مانو گھوڑا ہار گیا تو صرف دس ہزار ہی جائیں گے' اسی ہزار تو پھر بھی بچ رہیں گے' آپ کے پاس۔"

"یہ نہ بھولئے اگروال جی کہ اس میں سے پندرہ ہزار روپے وہ بھی شامل ہیں جن سے میں نے ریس کھلنا شروع کی تھی۔ یوں کہئے کہ اس طرح میں پینسٹھ ہزار جیت میں رہوں گی۔"

"چلیں یوں ہی سمجھ لیں۔" ارشاد حسین بولا۔

"بات دراصل یہ ہے اگروال جی کہ میں روز روز ریس کھیلنے نہیں آتی۔ جب پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے' تبھی ادھر کا رخ کرتی ہوں' نو لاکھ جیت گئی تو بہت دنوں کے لئے مجھے اخراجات کی طرف سے بے فکری ہو جائے گی اس لئے مجھے داؤ لگانے ہی دیں تو بہتر ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

"اس بات کو آپ یوں بھی تو کہہ سکتی ہیں یا دوسرے الفاظ میں فرض کر سکتی ہیں کہ اگر بھگوان نہ کرے گولڈ ہار گیا تو آپ کی جیتی ہوئی رقم بھی جائے گی اور اصل رقم بھی۔"

موقع دیکھ کر راجہ استاد نے بھی ارشاد حسین کی بات سے اتفاق کیا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ میں چھ ہزار لگاتا ہوں۔ اسی رقم سے میں نے کھیلنا بھی شروع کیا تھا' پانچ ہزار اگروال جی کی رقم میں سے کھیلے دیتا ہوں۔ تم اور شنکر دادا پندرہ پندرہ ہزار لگا لو' بس ہو گیا فیصلہ۔"

"استاد! ابھی میں نے کہا تھا کہ تم کھیلو نہ کھیلو' کوئی زبردستی نہیں۔ میری طرف سے کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ چاہو تو تم ونر پر داؤ لگا لو' مگر میں گولڈ ہی پر جتنی رقم لگانا چاہتی ہوں' لگاؤں گی۔ اسی کے ساتھ اگروال جی والی رقم بھی اسی گھوڑے پر لگے گی۔" میرے لہجے میں سنجیدگی آ گئی۔

"ارے رانی' تم بھی حد کرتی ہو۔ یہ رقم تم سے زیادہ تو نہیں۔ زیادہ سے زیادہ خالی جیب ہی تو لوٹنا پڑے گا تو کیا ہوا' ایسا پہلے بھی مسلسل ہوتا رہا ہے' آج بھی سہی۔"

پھر وہی ہوا جو میں چاہتی تھی۔ ہم چاروں کی تمام رقم گولڈ پر لگ گئی۔ اتنی بڑی رقم داؤ پر لگانے والے وہاں شاید دو ایک ہی ہوں گے۔

کچھ دیر کے بعد جب اس ریس کا فیصلہ ہو گیا تو راجہ استاد پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ چھتیس ہزار لگا کر وہ تین لاکھ ساٹھ ہزار جیت چکا تھا۔ میرے اور شنکر دادا کے پاس نو نو لاکھ روپے تھے۔ ارشاد حسین کے تیس ہزار' تین لاکھ بن چکے تھے۔ عالم وارفتگی میں راجہ استاد نے میرا ہاتھ چوم لیا۔

"مبارک ہو استاد کہ تم اب لکھ پتی بن گئے ہو۔" میں نے راجہ استاد سے کہا۔

"ارے تم جگ جگ جیو میری رانی! مجھے کیا خبر تھی کہ تم اتنی پہنچی ہوئی ہو۔" راجہ استاد چہکا' پھر پوچھا۔ "اگروال جی کے تین لاکھ دے دوں انہیں؟"

"نہیں۔" ارشاد حسین مجھ سے پہلے بول اٹھا۔ "صرف پانچ ہزار دے دیں' باقی رقم شریمتی رانی کے حوالے کر دیں۔"

"ابھی تم ہی رکھو استاد! یہاں سے سب کوٹھی ہی تو چل رہے ہیں' حساب کتاب وہاں ہو جائے گا۔" میں بولی۔

پھر ہم سب جیپ میں بیٹھ کر دھرم تلے روانہ ہو گئے۔ شنکر دادا نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کے چہرے پر بھی عجب بہار سی تھی۔ شاید اس نے بھی اپنی ساری زندگی میں اتنی بڑی رقم کبھی حاصل نہیں کی ہو گی۔ راجہ استاد کے لئے بھی تین لاکھ ساٹھ ہزار کم نہیں تھے۔ یکمشت اس نے بھی کبھی اتنی دولت نہیں کمائی ہو گی۔

کوٹھی پہنچ کر ہم سب نے چائے پی۔ پھر شنکر دادا نے نو لاکھ روپے میرے قدموں میں رکھ دیئے اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "دیوی جی! یہ لکشمی آپ ہی کی وجہ سے مجھے ملی ہے ورنہ میرے یہ بھاگ کہاں۔ اس لئے اپنا حصہ لے لیں ورنہ میں اس لکشمی کو سوئیکار نہیں کروں گا۔"

"میرا حصہ تمہاری محبت ہے شنکر دادا!" یہ کہہ کر رقم کا تھیلا اٹھا کر میں نے اس کی طرف بڑھا دیا۔ "رکھ لیں اسے .... اپنی محبت کا قرض سمجھ لیں اسے۔"

شنکر دادا نے بڑی مشکل سے وہ رقم قبول کی' پھر میرے پیر چھو کر رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد راجہ استاد نے بھی پہلو بدلا اور اسے بھی میں نے جانے دیا۔ جانے سے پہلے ارشاد حسین والے تین لاکھ روپے وہ مجھے دے گیا تھا۔ راجہ استاد چلا گیا تو ارشاد حسین نے مسکرا کر کہا۔ "شریمتی جی نے اپنے اس سیوک کو کیوں روک رکھا ہے؟"

میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ "سیوک کو بھوجن کے بنا جانے کی آگیا نہیں دی جا سکتی۔"

"شریمتی جی کے آدیش کا پالن ہو گا۔"

"اب آپ شریمان رام پرشاد اگروال سے جناب ارشاد حسین بن جایئے .... اور پہلے یہ لیجئے اپنے پانچ ہزار واپس جو میں نے آپ سے ادھار لئے تھے۔" میں نے ان تین لاکھ روپوں میں سے پانچ ہزار گن کر ارشاد حسین کو دے دیئے جو ابھی الگ ہی میز پر رکھے تھے۔ "اب یہ رہے دو لاکھ پچانوے ہزار روپے۔ یہ میں اپنی طرف سے .... بلکہ ٹھہریئے۔" میں نے اپنا ہینڈ پرس کھولا جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس میں سے پانچ ہزار نکال کر میں نے میز پر رکھ دیئے' پھر بولی۔ "اب یہ پورے تین لاکھ ہو گئے۔ میں یہ تین لاکھ روپے آپ کی تنظیم کے لئے دے رہی ہوں۔ آپ چاہیں اپنی طرف سے تنظیم کو یہ رقم بطور عطیہ دے دیجئے کیونکہ حقیقتاً تو یہ آپ ہی کی رقم ہے' اگر اس پر کوئی اعتراض ہے تو یہ رقم تنظیم کے لئے عطیے کے طور پر میری طرف سے قبول فرمالیجئے۔"

"رقم تو آپ ہی کی طرف سے تنظیم کو بطور عطیہ دی جائے گی معبلہ! میرے خیال میں جو رقم چار جگہ بٹ گئی ہے' یعنی چوبیس لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم' یہ دراصل آپ ہی نے ریس میں جیتی ہے۔ ہم لوگوں کو تو بس آپ یوں ہی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔" ارشاد حسین نے کہا۔ "راجہ استاد اور شنکر دادا نے تو خیر کہہ سکتے ہیں' تھوڑا بہت حصہ بھی لیا مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر یہ تین لاکھ میرے کہاں سے ہو گئے؟ انہیں میں آپ ہی کا سمجھتا ہوں۔" پھر ارشاد حسین نے وہ تین لاکھ روپے اپنے چمڑے کے بیگ میں رکھ لئے۔ اسی کے ساتھ اپنے پانچ ہزار بھی۔

"یعنی بقول آپ کے سارا مال حرام میرے نام۔" یہ کہہ کر میں ہنس پڑی پھر ارشاد حسین سے

پوچھا۔ "اب تو آپ کو میری آمدنی کا ذریعہ معلوم ہو گیا؟ پہلی ملاقات میں آپ سے میں نے یہ بات کہی تھی تو یقین نہیں کر رہے تھے۔ اب آگیا یقین؟"

"آنکھ دیکھے کو کون جھٹلا سکتا ہے لیکن مجھے حیرت ضرور ہے اس پر' عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔"

"ماورائے عقل بھی تو بہت کچھ ہے ارشاد! کیا آپ کا یقین نہیں اس پر؟ مثلاً یہ ساری دنیا' یہ کائنات۔ کیا آدمی نے سب کچھ جان لیا ہے کہ یہ سب کیا ہے؟"

"یہ تو خیر آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں معبلہ! ہماری پرواز عقل ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتی' مگر یہ معاملہ ذرا مختلف ہے۔ یہ تو دو اور دو چار کی طرح ہے۔ کیا آپ مجھے اس بات کا جواب دے سکتی ہیں کہ جو گھوڑا پہلی مرتبہ کسی ریس میں شرکت کر رہا تھا' راجہ استاد اور میرے اختلاف کرنے کے باوجود آپ نے اسی کو کیوں ترجیح دی' کیوں بضد رہیں کہ اسی پر داؤ لگایا جائے؟ آخر آپ کیوں پُریقین تھیں کہ وہی گھوڑا ریس جیتے گا؟ اس کی کوئی تو وجہ ہو گی نا۔ اس میں بھلا ماورائے عقل کی کیا بات ہے؟"

حقیقت یہ تھی کہ ارشاد حسین نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ میرے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"اگر میں آپ سے کہوں ارشاد کہ مجھے ایک روز پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ آج کون کون سے گھوڑے جیتیں گے تو کیا آپ میری بات پر یقین کر لیں گے؟" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں۔" وہ بولا۔ "مگر اسی کے ساتھ آپ کو اپنی معلومات کا ذریعہ بھی بتانا پڑے گا۔"

"مثلاً میں کہوں کہ جب میری آنکھیں گزشتہ رات بند تھیں تو مجھے یکے بعد دیگرے یہی تینوں گھوڑے ریس جیتتے ہوئے نظر آئے' یعنی اس بات کو یوں سمجھیں کہ جو کچھ آج ریس کورس میں ہوا' وہ مجھے خود بخود پہلے سے معلوم ہو گیا تھا تو ظاہر ہے آپ کو میری بات پر یقین نہیں آئے گا۔"

"ظاہر سی بات ہے کہ یہ خلاف عقل بات ہے۔"

"تو پھر آپ اس واقعے کو ماورائے عقل ہی مان لیں۔ اس کا عملی تجربہ آپ کو ہو ہی چکا ہے۔" میں بولی۔

"آپ اگر بضد ہیں تو مانے لیتا ہوں ورنہ تو اسے اتفاق بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"یعنی تین مرتبہ اتفاق سے وہی گھوڑے جیتے جن پر میں نے رقم لگائی تھی؟"

"جی ہاں' یہ ایک اتفاقی امر بھی ہو سکتا ہے۔ خیر معبلہ! اس بحث کو چھوڑیں' آپ سے ایک ضروری بات یہ کہنا تھی کہ کل تک اس کی تصدیق ہو جائے گی کہ حکومت نے اپنے اعلان کے مطابق ہمارے ارکان کو رہا کر دیا ہے یا نہیں۔ ویسے لگتا یہی ہے کہ حکومت نے آج جو اعلان کیا ہے اس پر عمل کرے گی۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے ڈیسوزا کو چھوڑنا پڑے گا۔ میں کل شام پانچ بجے تک حتمی طور پر آپ کو اس سلسلے میں جواب دے دوں گا۔"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک ایک چھناکا سا ہوا۔ دوسرے ہی لمحے میرے

اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ میں نے بڑے مہاراج کی دست رات چمپا کو ظاہر ہوتے دیکھا۔ اس نے ظاہر ہوتے ہی تیزی سے جھک کر میز پر رکھا ہوا میرا ہینڈ پرس اٹھالیا۔

"معبلہ! بڑے مہاراج کا آدیش ہے کہ تجھے کنگال کر دیا جائے' سو آج سے اس کی میں نے ابتدا کر دی۔ تجھے اب کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہیں' مگر میں نے اسے ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس پر وہ زور سے ہنسی۔ "چالاک ہو گئی ہے' نظریں نہیں ملا رہی۔ مگر چمپا کے پاس ابھی تجھے نیچا دکھانے کے لئے بہت سے چمتکار موجود ہیں۔ تُو نے خفیہ پولیس کے سربراہ کو اغوا کرا کے جس کوٹھی میں رکھا تھا' وہاں سے اسے راتوں رات غائب کرا دیا۔ کل جب تُو انگریز سرکار کے باغیوں کی مانگ پوری ہونے پر اسے چھوڑ دے گی تو اس کو یہ جانکاری کرا دی جائے گی کہ اغوا کرنے والی تُو تھی۔"

معلوم نہیں ارشاد حسین کو کیا سوجھی یا اس کے ذہن میں کیا خیال آیا کہ اچانک وہ کرسی سے اٹھ کر چمپا پر جھپٹ پڑا۔ اسے شاید یہ خبر نہیں تھا کہ چمپا کس قیامت کا نام ہے۔ ارشاد حسین کے جسم کو چمپا کے قریب پہنچتے ہی اتنا زبردست جھٹکا لگا تھا کہ جیسے اس نے بجلی کا ننگا تار چھو لیا ہو۔ وہ دور جا گرا تھا اور میں نے اس کی بھیانک چیخ سنی تھی' شاید آخری چیخ۔ اسی لمحے چمپا غائب ہو گئی اور میں کرسی سے اٹھ کر ارشاد حسین کے بے حس و حرکت جسم کی طرف لپکی۔

☆======☆======☆

ارشاد حسین کے قریب پہنچتے ہی میں نے محسوس کیا کہ اس کا جسم ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے اس کی نبض دیکھی تو وہ بھی بہت دھیمی تھی۔ اسی وقت میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ یقیناً میرے ملازمین نے ارشاد حسین کی چیخ سن لی تھی۔

میری پہلی نظر شہزاد پر پڑی۔ وہی پہلے دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔ اس کے پیچھے رحمت تھا۔

"جلدی سے کسی ڈاکٹر کو لے کر آؤ' جلدی۔" میں نے تیز آواز میں شہزاد سے کہا' پھر رحمت سے بولی۔ "ادھر آؤ۔"

شہزاد جس طرح دوڑتا ہوا آیا تھا' اسی طرح واپس چلا گیا۔ میں' ارشاد حسین کی ٹھنڈی ہتھیلیوں کو تیزی سے رگڑ کر اس کے جسم کو حرارت پہنچا رہی تھی۔ رحمت کو میں نے اسی طرح پیر کے دونوں تلوے رگڑنے کو کہا۔ ارشاد حسین ابھی زندہ تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ اگر اسے فوری طور پر طبی امداد مل جاتی تو اس کی زندگی بچائی جا سکتی تھی۔

جو کچھ بھی ہوا اتنا اچانک اور قطعی غیر متوقع طور پر ہوا تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ ارشاد حسین مجھے یہ بتا رہا تھا کہ اگر انگریز حکومت نے سرفروش تنظیم کے مطالبے پر اس کے ارکان کو رہا کر دیا تو پھر خفیہ پولیس کے سربراہ ڈیسوزا کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس ضمن میں ارشاد حسین نے مجھے کل شام پانچ بجے تک حتمی جواب دینے کو کہا تھا۔ اسی کے بعد بڑے مہاراج کی دست راست چمپا نمودار ہو گئی

تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ دن کے وقت آئی تھی۔ اس وقت میرے گرد حفاظتی حصار بھی قائم نہیں تھا لیکن چمپا نے مجھ پر حملہ نہیں کیا تھا۔ اس نے میرا ہینڈ پرس اٹھالیا تھا جس میں نو لاکھ روپے کی رقم موجود تھی' پھر وہ خود ہی بتانے لگی تھی کہ بڑے مہاراج نے مجھے کنگال کرنے کا حکم دیا ہے۔ چمپا نے مجھ سے نظریں ملا کر میرا ذہن پڑھنے کی بھی کوشش کی تھی' مگر میں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کے بعد چمپا نے ڈیسوزا کا ذکر کیا تھا کہ وہ اسے بتا دے گی' اغوا میں میرا ہاتھ تھا۔ ارشاد حسین اسی موقع پر چمپا کی طرف جھپٹا تھا جس کے نتیجے میں چیخ کر ڈھیر ہو گیا تھا اور اب اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ چمپا اسی وقت غائب ہو گئی تھی۔

یہ صورت حال میرے لئے تشویش ناک تھی۔ میرے پاس جو تھوڑا بہت سونا تھا اس کے علاوہ صرف سولہ ہزار روپے باقی بچے تھے جو میں ریس کھیلنے کے لئے لے گئی تھی۔ آئندہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے میرے پاس جو سونا تھا اسے بیچنے کے سوا کوئی اور صورت نہیں رہی تھی۔ اس فکر سے قطع نظر اس وقت مجھے ارشاد حسین کی طرف سے زیادہ فکر تھی۔ وہ غریب لاعلمی میں چمپا کی پُراسرار شیطانی قوت کا شکار ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر کی آمد تک ارشاد حسین کے جسم میں تھوڑی بہت حرارت پیدا ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور فوری طور پر انجکشن لگایا۔

"انہیں ہوا کیا ڈاکٹر صاحب!" میں نے پوچھا۔ "کوئی فکر کی بات تو نہیں ہے؟"

"کرنٹ لگا ہے انہیں' فکر کی کوئی بات نہیں' تھوڑی دیر میں ہوش آ جائے گا۔ اپنے آدمی کو میرے ساتھ بھیج دیں' میں دوا دے دوں گا۔ خالی پیٹ دوا نہ دیں اور انہیں اچھی خوراک پھل وغیرہ دیں جس سے جسم میں طاقت آئے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کے لئے بھی میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ شہزاد کے پاس گھریلو اخراجات کے لئے پیسے ہوتے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ ڈاکٹر کی فیس ادا کر کے دوا لے آئے۔ ڈاکٹر اس وقت تک نشست گاہ سے باہر نکل چکا تھا۔ شہزاد نے میری بات سن کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا' پھر اس کے چہرے سے فکرمندی جھلکنے لگی۔ وہ بڑبڑایا۔ "معلوم نہیں' میرا پرس کہاں گیا؟"

"معاً مجھے ارشاد حسین کے بیگ کا خیال آیا جو اس کرسی پر رکھا تھا جہاں شہزاد بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے چمڑے کے بیگ کی چین کھول کر اس میں سے پانچ ہزار روپے نکال لئے جو الگ ہی رکھے تھے۔ اس میں سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر میں نے شہزاد کو دے دیا۔ ہرچند کہ وہ میرے روپے نہیں تھے مگر ان حالات میں اور ممکن بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر نشست گاہ کے باہر کھڑا ہوا شہزاد کا منتظر تھا۔ مجھ سے نوٹ لیتے ہی شہزاد لپک کر نشست گاہ سے نکل گیا۔

جب تک شہزاد دوا لے کر آیا ارشاد حسین کو ہوش آ چکا تھا۔ میں اسے سہارا دیئے ہوئے کوٹھی کے اندر ایک کمرے میں لے آئی اور مسہری پر لٹا دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت کمزوری محسوس کر رہا ہو۔ اسے دوا پلانا تھی اس لئے میں نے رحمت سے اس کے لئے وہیں کھانا لانے کو کہہ دیا۔ اس کے، چمڑے کا

بیگ میں نے سرہانے ہی رکھ دیا تھا۔

رحمت کھانا لینے چلا گیا تو میں نے ارشاد حسین کو مخاطب کیا۔ "اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

"ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نے جسم کی تمام طاقت کھینچ لی ہے۔" ارشاد حسین نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔

"کھانا کھا کے پھل کھالیں گے اور پھر دوا پی لیں گے تو حالت بہت ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ فی الحال بولنے سے بھی آپ کو زحمت ہو رہی ہے' اس لئے خاموش ہی رہیں۔" میں بولی۔

ارشاد حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر جب اس نے کھانا کھا لیا تو میں اسے پھل کاٹ کاٹ کر کھلانے لگی۔ وہ مجھے ممنون نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

کھانا اور پھل کھانے کے بعد اس نے دوا کی ایک خوراک بھی پی لی تو کچھ بہتر نظر آنے لگا۔ میری سماعت میں چمپا کے یہ الفاظ گونج رہے تھے کہ تجھے کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا جائے گا۔ عام حالات میں اگر شہزاد کا پرس نہ ملتا تو میں اس پر دھیان بھی نہ دیتی' مگر اس وقت مجھے یہ بات خلاف معمول معلوم ہوئی اور میں نے اسے بلا کر پرس کے بارے میں پوچھا۔

"خاتون! مجھے خود حیرت ہے کہ میرا پرس کہاں چلا گیا۔" اس نے بتایا۔ "جہاں جہاں پرس رکھنے کا امکان تھا' میں دیکھ چکا ہوں لیکن کہیں نہیں ملا۔ دو ڈھائی ہزار روپے تھے اس میں۔"

"میں ابھی آئی۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آپ آرام کیجئے۔" پھر میں شہزاد سے مخاطب ہوئی۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

میں' شہزاد کو ساتھ لئے اپنی خواب گاہ میں پہنچی تو خیال آیا کہ الماری کی چابی بھی اسی گچھے میں تھی جو میرے ہینڈ پرس کے اندر تھا۔

"کیا بات ہے خاتون! آپ کچھ فکرمند سی لگ رہی ہیں؟" شہزاد مجھ سے مخاطب ہوا۔

اصل واقعہ گول کر کے میں نے شہزاد کو بتایا۔ "جب میں یہاں سے گئی تھی تو ہینڈ پرس میرے پاس تھا۔ اس میں خاصی رقم بھی تھی اور چابیوں کا گچھا بھی۔ معلوم نہیں' پرس کہاں مجھ سے چھوٹ گیا۔ معلوم نہیں یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔"

"لیکن خاتون! جب آپ واپس آئی تھیں تو میں نے پرس آپ کے پاس دیکھا تھا۔" شہزاد بولا۔ "واپس آنے کے بعد آپ ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھی تھیں یا پھر اس کمرے میں وہاں سے اٹھ کر گئی تھیں جہاں اگروال جی کو لٹایا ہے۔ میں دونوں جگہ جا کر دیکھتا ہوں۔"

"تم شاید بھول رہے ہو کہ جب ڈاکٹر کو فیس دینا تھی تو میرے پاس پرس نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے تمہیں اگروال جی کا پرس کھول کر اس میں سے سو روپے دیئے تھے۔ میں ڈرائنگ روم میں پہلے ہی دیکھ چکی ہوں۔ وہاں پرس نہیں ہے۔ یہ تمہارا وہم معلوم ہوتا ہے کہ جب میں واپس آئی تھی تو پرس میرے ہاتھ میں تھا۔ اگر میں کہیں پرس بھول کر یا گرا کے نہ آئی ہوتی تو ڈرائنگ روم سے کہاں جاتا

........بہرحال خاک ڈالو اس پر۔ چابیوں کی ڈپلی کیٹ بھی تو تھیں نا' وہ کہاں ہیں؟"

"میرے علم میں تو نہیں خاتون!" شہزاد نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ فرنیچر میری غیر موجودگی میں خریدا گیا تھا۔ میں تو بعد میں آیا تھا۔ آپ ہی نے ڈپلی کیٹ کہیں رکھی ہوں گی۔"

ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود مجھے کچھ یاد نہ آ سکا کہ میں نے ڈپلی کیٹ کہاں رکھی تھیں' میں جھنجلا گئی۔ خبیث چمپا نے مجھے ایک نئے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ شہزاد کو میں اپنے ساتھ اس لئے لائی تھی کہ اپنی الماری کھول کر اس کے اندر موجود سیف میں سے سونے کے بچے ہوئے ٹکڑے نکال کر اسے دے دوں کہ بیچ آئے۔ الماری اور سیف کی چابیاں نہ ہونے کی وجہ سے میں جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو گئی تھی۔ مجھے چمپا پر شدید غصہ آنے لگا' اتنا کہ میرے جسم میں شعلے سے لپکنے لگے۔

اپنی یہ کیفیت میرے لئے نئی نہیں تھی۔ پہلے بھی میں اس کیفیت سے گزر چکی تھی۔ ایک بار پہاڑوں پر مجھے اور نصار کو قیدخانے میں موٹے موٹے رسوں سے باندھ دیا گیا تھا تو میرے جسم میں اسی طرح شعلے لپکنے لگے تھے۔ اسی کے ساتھ میرے جسم میں حیرت انگیز غیر معمولی طاقت پیدا ہو گئی تھی پھر میں نے ان موٹے موٹے رسوں کو کچے دھاگوں کی طرح توڑ دیا تھا۔ میرے اندر خوابیدہ یہی پُراسرار قوت اس وقت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ محسوس کرتے ہی میں تیزی سے الماری کی طرف بڑھی۔ شہزاد وہیں موجود تھا۔

میں نے الماری کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے جھٹکا دیا۔ پُرشور آواز کے ساتھ تالا ٹوٹ گیا اور میں نے الماری کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ درمیانی خانے میں بائیں جانب تجوری تھی۔ میں نے اس کے ہینڈل کو بھی گھمایا تو بڑی آسانی سے گھوم گیا۔

"یہ .... خاتون .... آپ یہ کیا .... کیا کر رہی ہیں؟" شہزاد لپک کر قریب آ گیا اور اس کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔ "ارے .... یہ .... یہ سیف .... یہ کس طرح کھل گیا؟ .... چابی .... چابی کے بغیر ہی .... کمال ہے۔"

شہزاد کی بات پر میں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ اسی لمحے میرے وجود میں شعلے لپکنا بند ہو گئے اور مجھے ٹھنڈک کا سا احساس ہوا۔

سیف سے میں نے سونے کے ٹکڑے نکال لئے۔ الماری ہی میں ایک اور ہینڈ پرس رکھا تھا' وہ بھی میں نے نکال لیا۔

سونا زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی میرے اندازے کے مطابق اس کی قیمت دس ہزار روپے سے کم نہیں تھی۔ کسی آڑے وقت کے لئے میں نے یہ تھوڑا سا سونا بچا کر رکھ لیا تھا جو آج کام آ گیا تھا۔ میں نے سونے کے وہ ٹکڑے ایک بڑے سے رومال میں باندھ کر شہزاد کے حوالے کر دیئے۔

"تم ایسا کرو کہ یہ سونا بیچ کر جو رقم بنے لے آؤ۔ واپسی میں کسی قفل ساز کو ساتھ لیتے آنا تاکہ وہ الماری اور سیف کی چابیاں بنا دے۔" میں نے شہزاد سے کہا۔

"مگر خاتون! آپ نے الماری اور سیف کے تالے کس طرح کھول لئے؟" وہ پوچھنے لگا۔

"تالے کمزور تھے اس لئے کھل گئے۔" میں نے بات بنائی اور پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ "تم جاؤ۔"

"خیر اتنے کمزور بھی نہیں ہو سکتے۔" شہزاد کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ "حیرت ہے!"

میں نے جواباً کچھ نہ کہا اور دروازے سے باہر آ گئی۔ شہزاد پیچھے پیچھے تھا۔ میں اس کمرے میں جانے سے پہلے جہاں ارشاد حسین تھا' کچن کی طرف گئی اور غنی سے کہا کہ میرے لئے ارشاد والے کمرے ہی میں کھانا بھجوا دے۔ اب مجھے کچھ کچھ بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔

ارشاد حسین کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی ہے۔ میں دبے پاؤں باہر آ گئی کہ اچھا ہے وہ کچھ دیر سو لے۔ کھانا میں نے ڈائننگ روم میں منگوا لیا۔

کھانا کھانے کے بعد چائے پی کر میں اپنے کمرے میں آ گئی اور بستر پر آرام کرنے لیٹ گئی۔ اب مجھے شہزاد کی واپسی کا انتظار تھا۔ معلوم نہیں مجھے کیوں کچھ بے چینی سی تھی۔

خلاف توقع شہزاد کو لوٹنے میں خاصی دیر ہو گئی تو مجھے فکر ہونے لگی۔ اسے گئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہو رہے تھے۔ وہ دو بجے کے قریب گیا تھا اور اب چار بج رہے تھے۔ میری بے چینی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ شہزاد کو کہاں تلاش کراؤں؟ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ ارشاد حسین بھی اب سو کر اٹھ چکا ہو گا۔

عالم اضطراب میں بستر سے اٹھ کر اب میں نے ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ پھر ٹہلتے ہوئے ہی میں اپنی خواب گاہ سے نکل کر ارشاد والے کمرے میں پہنچ گئی۔ ارشاد حسین کو ابھی مجھے یہ بھی بتانا تھا کہ میں نے اس کے بیگ میں سے سو روپے کا نوٹ نکالا ہے۔ پانچ ہزار روپے کی وہ گڈی میں نے اس کے بیگ ہی میں واپس رکھ دی تھی جس سے سو کا نوٹ نکالا تھا۔ میں وہاں پہنچی تو ارشاد حسین جاگ چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھنے لگا۔

"لیٹے رہیں آپ' لیٹے رہیں۔" میں بولی۔

وہ نیم دراز ہو گیا اور مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا لی' پھر کہنے لگا۔ "معاف کیجئے گا معلّہ! میری وجہ سے آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔"

"ارے نہیں ارشاد! اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔" میں مسہری کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "آپ بتایئے اب کیسی طبیعت ہے؟"

"پہلے سے بہت بہتر ہوں۔" اس نے بتایا۔

"میں آپ کے لئے چائے منگواتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے رحمت کو آواز دی۔ وہ آ گیا تو میں نے اسے دو کپ چائے لانے کو کہا۔ وہ چلا گیا تو میں نے ارشاد حسین کو سو کے نوٹ کے متعلق بتا کر کہا۔ "ابھی شہزاد بازار سے لوٹ آئے گا تو میں آپ کو سو روپے واپس کر دوں گی۔"

"آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں معلّہ! میرا تو خیال یہ ہے کہ فی الحال آپ تنظیم کو بطور عطیہ تین لاکھ روپے نہ دیں۔ جب آپ کے پاس کچھ سہولت ہو جائے تو پھر دیکھا جائے گا۔ یہ رقم آپ اپنے پاس

رکھ لیں۔ مجھے آپ کے اخراجات کا اندازہ ہے۔" یہ کہہ کر ارشاد حسین دائیں جانب مڑا۔ چمڑے کا بیگ جس میں رقم تھی' وہیں اس کے سرہانے رکھا تھا۔ "یہاں سے وہ.......... وہ میرا بیگ کہاں گیا؟" وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میرا ماتھا ٹھنکا کیونکہ جب میں کمرے سے گئی تھی تو بیگ کو مسہری کے سرہانے ہی رکھا دیکھا تھا پھر ارشاد حسین مسہری سے اتر آیا اور بیگ سارے کمرے میں تلاش کیا' مگر نہیں ملا۔ میں نے غنی' عبدل' رحمت اور سبھی کو بلا لیا۔ ان میں سے کوئی میری غیر موجودگی میں وہاں نہیں آیا تھا۔

"تم لوگ جاؤ۔" میں نے تینوں ملازمین سے کہا۔ عبدل تو ویسے بھی باہر ہی تھا۔ ارشاد حسین ابھی تک بیگ تلاش کر رہا تھا۔ وہ مسہری کو ایک طرف سرکا کر سرہانے زمین کو دیکھ رہا تھا کہ وہاں بیگ نہ گر گیا ہو۔ معمولی رقم تو تھی نہیں کہ جسے نظرانداز کر دیا جاتا۔ لاکھوں کا معاملہ تھا۔ رحمت یا غنی پر شبہ کرنا فضول تھا۔ ان سے کسی ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی۔ بالآخر میرا ذہن ایک نتیجے پر پہنچ ہی گیا۔ یہ اسی خبیث چمپا کی ذلیل حرکت ہو سکتی تھی تاکہ میں' ارشاد حسین سے مالی مدد حاصل نہ کر سکوں۔ یہی سوچ کر میں نے ارشاد حسین کو مخاطب کیا۔ "فضول ہے ارشاد! اب آپ کا بیگ نہیں ملے گا۔"

"مگر وہ یہاں سے جا کہاں سکتا ہے؟" اس نے مسہری کو سرکا کر دوبارہ دیوار سے لگا دیا۔

"جہاں میرا پرس چلا گیا۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "آپ پر یہ مصیبت میری وجہ سے آئی ہے۔"

میری بات پر ارشاد حسین نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کے ذہن سے چمپا شاید نکل ہی گئی تھی۔

"تو کیا آپ کا ہینڈ پرس بھی نہیں مل رہا؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

ارشاد حسین کے اس سوال پر مجھے شدید حیرت ہوئی۔ چمپا نے اسی کے سامنے تو میرا پرس میز سے اٹھایا تھا۔

"ارشاد! کیا واقعی آپ کو نہیں معلوم کہ میرا پرس کہاں گیا؟" یہ پوچھتے ہوئے میں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

"جی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ نے مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔ آپ کے پرس میں تو بہت بڑی رقم تھی' نو لاکھ روپے میں سے صرف پانچ ہزار ہی تو آپ نے نکال کر مجھے دیئے تھے۔ آخری بار میں نے آپ کے پرس کو ڈرائنگ روم میں سینٹرل ٹیبل پر رکھے دیکھا تھا جہاں ہم بیٹھے تھے۔"

"پھر کیا ہوا تھا؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے دریافت کیا۔ میرا ذہن تیزی سے ایک نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"پھر.......... پھر شاید اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میں غالباً بے ہوش ہو گیا تھا۔"

"کیسے بے ہوش ہو گئے تھے؟" میری نظریں اب تک اس کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"کیا ہو گیا تھا مجھے؟" وہ اپنی پیشانی رگڑنے لگا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "یاد نہیں آ

.... رہا۔" وہ بڑبڑایا۔ "معلوم نہیں کیا ہوا گیا تھا مجھے؟ میں .... شاید کرسی پر بیٹھے بیٹھے نیچے گر گیا تھا اور پھر جب .... جب مجھے ہوش آیا تھا تو .... تو آپ مجھے سہارا دے کر اس کمرے میں لے آئی تھیں۔"

میں سمجھ چکی تھی کہ ارشاد حسین کو نہ چمپا کی آمد یاد تھی' نہ یہ کہ اس نے میز سے میرا پرس اٹھا کر کیا کہا تھا اور نہ یہ خبر تھی کہ وہ کیوں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

"ارشاد! اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دیں۔ میں ہی آپ کو یہ بتانا بھول گئی تھی کہ میرا پرس کھو گیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کے لئے ہی آپ کے بیگ سے سو روپے کا نوٹ نکالا تھا۔" یہ کہتے ہی مجھے یاد آیا کہ جب ارشاد حسین کو معلوم تھا کہ میرے پاس نو لاکھ روپے موجود ہیں تو پھر وہ تنظیم کے لئے میرا عطیہ کیوں واپس کر رہا تھا؟ یہی سوال میری زبان پر بھی آ گیا۔

"میں نے کہا تھا یہ؟" وہ حیرت سے بولا۔ "مجھے تو یاد نہیں۔"

"پھر آپ اپنا بیگ کیوں تلاش کر رہے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"شاید آپ .... آپ ہی نے مجھ سے بیگ مانگا تھا یا .... یا پھر خود ہی مجھے بیگ کا خیال آ گیا تھا۔"

یقیناً اس وقت ارشاد حسین کی ذہنی حالت درست نہیں تھی۔ میرے نزدیک اس کا سبب وہی حادثہ تھا جو اسے پیش آیا تھا۔ چمپا اسے بالکل یاد نہیں تھی' اس سے مجھے ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ میں اس کے سوالات سے بچ گئی تھی۔ وہ اگر مجھ سے چمپا کے بارے میں پوچھتا تو میں اسے کیا بتاتی۔ یہ سب کچھ چمپا ہی کی پُراسرار شیطانی قوتوں کی کارستانی معلوم ہوتی تھی کہ ارشاد حسین کو وہ واقعہ تک یاد نہیں تھا جس میں اس کی جان جاتے جاتے بچی تھی۔

"اب میری طبیعت ٹھیک ہے اور میں جانا چاہتا ہوں۔" ارشاد حسین کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔

وہی خود کو ٹھیک سمجھ رہا تھا لیکن میرے خیال میں ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے کہا۔ "ارشاد! آپ کچھ دیر اور آرام کر لیجئے پھر چلے جایئے گا۔"

اسی وقت رحمت ایک ٹرے میں دو کپ چائے لے کر آ گیا۔ "آپ کہتی ہیں تو مزید کچھ دیر رک جاتا ہوں۔" ارشاد حسین نے یہ کہتے ہوئے ٹرے سے ایک کپ اٹھا لیا۔

پھر رحمت نے مجھے چائے دی اور چلا گیا۔ ابھی میں نے چائے کا پہلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا شہزاد؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہو اور لوٹنے میں دیر کیسے ہو گئی؟"

"مم .... میں بہت دور سے پیدل چلتا ہوا آ رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"وہ کیوں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"خاتون! میں جیسے ہی سونا بیچ کر صرافہ بازار سے نکلا' مجھے محسوس ہوا کچھ غنڈے میرے پیچھے لگ

گئے ہیں۔ میرے پاس ساڑھے نو ہزار روپے تھے۔ انہوں نے شاید مجھے سونا بیچتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ ان کے ہتھے نہ چڑھوں۔ بہرحال میں ان سے کسی طرح بچ بچا کر ٹرام کے اسٹاپ تک پہنچ گیا۔ یہی شاید میری غلطی تھی۔ میں اگر وہاں سے کوئی ٹیکسی کر لیتا تو شاید وہ حادثہ پیش نہ آتا۔ میں اسٹاپ پر ٹرام کے انتظار میں کھڑا تھا کہ میرے بالکل قریب سے تیزی کے ساتھ ایک نوجوان گزرا۔ اسی وقت سامنے سے ایک چینی لڑکی آ کر مجھ سے ٹکرا گئی۔ وہ الٹا مجھ ہی کو قصوروار ٹھہرانے لگی۔ اس چینی لڑکی اور میرے گرد بھیڑ لگ گئی۔ وہ لڑکی ٹوٹی پھوٹی اردو اور بنگلہ زبان میں لوگوں کو بتانے لگی کہ میں نے اسے چھیڑا ہے۔ میں اسے خوش قسمتی سمجھا کہ بھیڑ ہی میں سے دو نوجوان میری حمایت کرنے لگے۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ خود وہ چینی لڑکی مجھ سے آ کر ٹکرائی تھی۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ میں نے بھی لوگوں کو قسمیں کھا کھا کر اپنی بات کا یقین دلایا تب کہیں جا کے اس آفت سے نجات ملی۔ میری حمایت کرنے والے دونوں نوجوان دائیں بائیں کھڑے تھے۔ وہ لڑکی چلی گئی اور بھیڑ بھی چھٹ گئی تو میں نے ان دونوں نوجوانوں کا شکریہ ادا کیا پھر وہ دونوں بھی اپنی راہ ہو لئے۔ معاً مجھے محسوس ہوا کہ میری جیب ہلکی ہو چکی ہے۔" اپنی روداد بیان کرتے ہوئے شہزاد نے قمیض کی کٹی ہوئی جیب دکھائی۔ "سارے پیسے اسی جیب میں تھے' وہ بھی جو ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کے بعد میرے پاس بچے تھے' میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا اس لئے بہ مجبوری مجھے پیدل ہی آنا پڑا۔"

میں چکرا کے رہ گئی۔ بظاہر اس معاملے میں کوئی پُراسرار شیطانی قوت ملوث نظر نہیں آتی تھی۔ کلکتے جیسے بڑے شہر میں ایسے واقعات روزانہ کا معمول تھے۔ اس کے باوجود پے در پے جو واقعات پیش آ رہے تھے اور چمپا نے مجھے کنگال کرنے کی جو دھمکی دی تھی' اسے مدنظر رکھتے ہوئے شہزاد کی جیب کٹ جانا مجھے غیر معمولی واقعہ ہی لگ رہا تھا۔ شہزاد کسی مجرم کی طرح میرے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں نے اس کی دل جوئی کے لئے کہا۔ "کوئی بات نہیں' جو ہونا تھا ہو گیا۔ تمہیں ملول ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے تو خوشی یہ ہے کہ رقم کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اگر تمہاری جیب نہ کٹتی اور غنڈے تم سے رقم کے حصول کی خاطر بھڑ گئے ہوتے تو شاید تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا۔ بہرحال آئندہ کے لئے ایک بات ذہن میں رکھ لو کہ کبھی سفر کے دوران میں کسی ایک ہی جیب کے اندر سارے پیسے نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ اگر تمہارے پاس پیسے نہیں تھے تو کوئی رکشا یا ٹیکسی کر کے آ گئے ہوتے' پیدل آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"لیکن خاتون! یہاں .... یہاں بھی تو پیسے نہیں تھے۔ آپ نے خود میرے سامنے اگروال جی کے بیگ سے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا تھا پھر .... میرا پرس پہلے ہی نہیں مل رہا تھا .... ایسی صورت میں کرایہ کہاں سے دیتا؟" شہزاد نے جواب دیا۔

"تو کیا آپ کا پرس بھی غائب ہو چکا ہے؟" ارشاد حسین نے حیران سا ہو کر شہزاد سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ آخر ہو کیا رہا ہے؟" ارشاد حسین مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آپ کا ہینڈ پرس کھو گیا' میرا بیگ

غائب ہو گیا اور اب یہ بتا رہے ہیں کہ ان کا پرس بھی..........."

"مجھے اپنے پرس کی گمشدگی کے بارے میں یہ پہلے ہی بتا چکے تھے۔" میں بول اٹھی۔

"اگروال جی کا بیگ کب اور کیسے غائب ہو گیا؟" شہزاد نے چونک کر پوچھا۔

میں نے مختصراً اس کے سوال کا جواب دے دیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے مگر ان دونوں کو کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ ارشاد حسین کے بیگ کی گمشدگی پر شہزاد نے رحمت اور غنی کے متعلق دبی دبی زبان میں اپنے شبہے کا اظہار کیا۔

"نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "وہ دونوں ایسا نہیں کر سکتے۔"

"لیکن خاتون! اس کمرے سے بیگ کہاں جا سکتا ہے؟" شہزاد بولا۔

"اپنے پرس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے' وہ کہاں چلا گیا؟" میں نے کہا۔

"وہ تو ممکن ہے' کہیں رکھا ہوا مل جائے۔ بعض اوقات جو چیز بہت احتیاط سے کہیں سنبھال کر رکھ دی جاتی ہے' فوراً نہیں ملتی۔"

"فضول باتیں کر رہے ہو تم۔ پرس کوئی ایسی چیز نہیں جسے اس قدر احتیاط سے کہیں رکھ دیا جائے۔ وہ تمہاری جیب ہی میں ہوتا تھا کیونکہ تمہیں اس کی ضرورت پڑتی ہی رہتی تھی۔"

شہزاد لاجواب ہو گیا۔ میں سوچنے لگی کہ فوری طور پر رقم کا حصول کہاں سے ممکن ہے؟ میرے ذہن میں راجہ استاد کا نام آیا۔ اس سے کچھ رقم وقتی طور پر ادھار لی جا سکتی تھی۔ وہ بھی آج ریس میں تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے جیتا تھا۔ میں اگر اس سے ایک لاکھ روپے بھی ادھار مانگ لیتی تو وہ انکار نہ کرتا' مگر یہ وقت اس کے دھندے کا تھا۔ وہ رات کو نو بجے سے پہلے کبھی گھر نہیں لوٹتا تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ رات کو نو اور دس بجے کے درمیان اس کے گھر جاؤں گی۔

چائے پینے کے کچھ دیر بعد ارشاد حسین نے پھر جانے کے لئے کہا اور میں نے اسے نہیں روکا۔ اس نے آئندہ روز شام پانچ بجے کے بعد آنے کو کہا تھا۔

اسی روز رات کو کھانا کھانے کے بعد ساڑھے آٹھ بجے میں اپنی کوٹھی سے نکلی اور چہل قدمی کے انداز میں پیدل ہی چاندنی چوک روانہ ہو گئی۔ راجہ استاد کے گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ جیت کی خوشی میں اس دن وہ دھندے ہی پر نہیں گیا تھا۔

مجھے دیکھ کر شانتی کھل اٹھی جو اب صبیحہ بن چکی تھی۔ واقعی وہ کوئی نئی نویلی دلہن معلوم ہو رہی تھی۔ ہمایوں گھر پر نہیں تھا۔ راجہ استاد نے اسے اپنی نیابت کرنے کے لئے دھندے پر بھیج دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کروں۔ راجہ استاد سے مجھے ادھار مانگتے ہوئے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ راجہ استاد کو معلوم تھا' خود میرے پاس لاکھوں روپے موجود ہیں۔ ایسی صورت میں آخر مجھے اس سے پیسے لینے کی کیا ضرورت تھی۔

"اور سناؤ رانی! اب کس دن ریس کورس چل رہی ہو؟" راجہ استاد چہکنے لگا۔

"کچھ خبر نہیں استاد کہ پھر کب چلنا پڑے۔" میں نے یہ کہہ کر ٹھنڈا سانس بھرا۔

"کیا بات ہے رانی! یہ چہرہ کیوں اترا ہوا ہے تمہارا؟ آج تو تمہیں گارڈن گارڈن نظر آنا چاہئے۔ لاکھوں کا ہاتھ مارا ہے تم نے۔"

"کچھ ایسی ہی بات ہے استاد!" میرا لہجہ مضمحل ہی تھا۔

"بتاؤ تو سہی' ممکن ہے میں کوئی بہتر مشورہ دے سکوں۔" راجہ استاد بضد ہو گیا۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک تدبیر آ گئی اور میں نے کہا۔ "ایک لمبا سودا کیا تھا استاد جس میں لمبا ہی نقصان ہو گیا۔ جس پارٹی سے سودا ہوا تھا' کل اسے دس لاکھ روپے ادا کرنے ہیں اور میرے پاس صرف نو لاکھ روپے ہیں۔ آج اگر ریس میں لمبی رقم نہ جیت گئی ہوتی تو بات خراب ہو جاتی۔ اب صرف اتنا ہے کہ ایک لاکھ کم دوں گی تو صرف شرمندگی ہو گی۔" میں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ راجہ استاد سے ایک لاکھ روپے ادھار لینے کا جواز پیدا کر دیا۔ میں نے اس طرح بات کی کہ راجہ استاد خود ہی مجھے ایک لاکھ روپے ادھار دینے کی پیشکش کر دے۔

میری توقع رائیگاں نہیں گئی۔ راجہ استاد فوراً ہی کہنے لگا۔ "رانی! تمہیں شرمندگی اٹھانے کی کیا ضرورت ہے' مجھ سے ایک لاکھ لے لو' جب ہوں دے دینا۔"

"لینے کو تو لے لوں استاد! مگر فی الحال کوئی وعدہ نہیں کر سکتی کہ کب یہ رقم واپس کر سکوں گی' یہ سوچ لو تم۔"

"سوچ تو وہ جسے واپسی کی فکر ہو۔ تم اگر کوئی وعدہ نہیں کر سکتیں تو میں ضرور یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ کبھی تم سے میں رقم کی واپسی کا تقاضا نہیں کروں گا۔" پھر وہ اٹھا اور سامنے دیوار میں بنی ایک الماری کھولنے لگا۔

اس زمانے میں یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ کسی کو اتنی بڑی رقم کوئی ادھار دے دے۔ راجہ استاد نے دس دس ہزار روپے کے نوٹوں کی دس گڈیاں لا کر میرے سامنے رکھ دیں۔ میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ اگر آج راجہ استاد کو اپنے ساتھ ریس کورس نہ لے گئی ہوتی تو شاید اس سے میں دس پانچ ہزار روپے ہی ادھار لے سکتی۔ میں نے راجہ استاد کا شکریہ ادا کیا اور پھر چائے پینے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ بطور احتیاط اپنی کوٹھی کی طرف واپس جانے کے لئے میں بہ مجبوری ایک ہاتھ رکشے میں بیٹھ گئی۔ عام حالات میں مجھے ہاتھ رکشے میں بیٹھتے ہوئے بہت دکھ ہوتا تھا کیونکہ اسے ایک آدمی کھینچتا تھا۔ آدمی کی یہ ذلت مجھے گوارا نہیں تھی۔ اپنی کوٹھی تک پہنچنے سے کچھ پہلے ہی میں اچھل پڑی۔ میری کوٹھی کے سامنے ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔ کوٹھی سے دھوئیں کے بادل اور شعلے اٹھ کر جیسے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ کیا ہوا؟ میری کوٹھی میں آگ کیسے لگ گئی؟ میں نے سوچا اس وقت تک رکشا ہجوم کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میرے ہینڈ پرس میں کچھ کھلے پیسے پڑے تھے جو میں نے رکشا والے کو دیئے اور اتر گئی۔ ہجوم اتنا تھا کہ میرے لئے لوگوں کے درمیان سے گزر کر آگے جانا ممکن نہیں تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی' کیا کروں کہ آگ بجھانے والی گاڑیاں وہاں پہنچ گئیں۔ کسی نے یقیناً ان لوگوں کو آگ لگنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اطلاع دینے والے میرے پڑوسی بھی ہو سکتے تھے تاکہ میری کوٹھی میں لگی ہوئی آگ ان کی

کوٹھیوں تک نہ پہنچ جائے۔ کبھی کبھی لوگ خود کسی آفت سے بچنے کے لئے بھی دوسروں کی مدد کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

آگ بجھانے والی گاڑیوں کو دیکھ کر مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ میری کوٹھی کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ دونوں گاڑیاں اندر داخل ہو گئیں' مگر لوگ باہر ہی کھڑے رہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں بھی گیٹ سے اندر پہنچ گئی۔ لوگوں کے اِدھر اُدھر ہو جانے سے مجھے آگے بڑھنے کا راستہ مل گیا تھا۔ کوٹھی کے لان میں مجھے اپنے ملازمین نظر آئے۔ وہ بڑی بے بسی کے عالم میں کوٹھی سے دھواں اور شعلے اٹھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ان میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ میں تیز قدمی کے ساتھ ان کے قریب پہنچ گئی۔

مجھے دیکھ کر شہزاد میری طرف لپکا اور قریب آ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ”خاتون! یہ .... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”ہوا کیا؟ یہ بتاؤ۔“ میں نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔

”آپ چلی گئیں تو کچھ ہی دیر بعد قاسم اور فاطمہ آ گئے۔ ہم سب لوگ کھانا کھا کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ہمیں ایک اجنبی نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ ہم سے کہہ رہی تھی' بھاگ جاؤ' بھاگ جاؤ تم لوگ' اس کوٹھی میں آگ لگنے والی ہے۔ ہم سبھی خوفزدہ ہو گئے خاتون! وہ نسوانی آواز ہر طرف سے آ رہی تھی' مگر جس کی یہ آواز تھی وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ خوفزدہ ہونے کے باوجود ہم کوٹھی سے نہیں نکلے۔ پھر چند ہی لمحے بعد ہم نے صحن میں ایک عورت کو دیکھا۔ وہ سرخ لبادے میں ملبوس تھی۔ معلوم نہیں وہ کدھر سے کوٹھی میں گھس آئی تھی!“ شہزاد اس خوبصورت عورت کا مزید حلیہ بیان کرنے لگا۔ وہ حلیہ سو فیصد چمپا کا تھا۔ شہزاد حلیہ بیان کرنے کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا۔ ”سرخ لبادے والی عورت نے ہم سے پھر بھاگ جانے کو کہا۔ اسی کی آواز ہم نے پہلے سنی تھی۔ اب وہ کہہ رہی تھی' تم لوگوں سے میری کوئی دشمنی نہیں اس لئے میں تمہیں جان بچانے کا موقع دے رہی ہوں ورنہ مارے جاؤ گے۔ میری دشمنی معبلہ سے ہے' تم سے نہیں۔ بھاگ جاؤ۔ ہم لوگ برآمدے میں کھڑے اس پُراسرار عورت کو دیکھ رہے تھے پھر وہ اچانک ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اسے اس طرح غائب ہوتے دیکھ کر فاطمہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ سخت خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس نے قاسم کا بازو تھام لیا اور کوارٹر میں چلنے کو کہا۔ اسی وقت میں نے آپ کی خواب گاہ سے شعلے اٹھتے دیکھے اور پھر آگ تیزی سے پھیلنے لگی۔ اس پُراسرار عورت نے جو پیشگوئی کی تھی' وہی ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ہم بھاگ اٹھے۔ بھاگتے ہوئے ہم عمارت سے نکلے اور گیٹ کھول کر ”آگ' آگ“ چیخنے لگے۔ رستہ چلتے لوگ جمع تو ہو گئے مگر کسی نے ہماری مدد نہیں کی۔ خود ہماری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ آگ کو کیسے بجھائیں پھر ہم یہاں لان میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر ہی میں آگ نے ساری کوٹھی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ معلوم نہیں کس نے فائر بریگیڈ والوں کو فون کر دیا اور ہم نے ان کی گاڑیوں کو اندر آتے دیکھا۔ اس کے بعد آپ آ گئیں۔“ شہزاد تفصیل کے ساتھ ساری بات بتانے کے بعد پوچھنے لگا۔ ”وہ .... وہ پُراسرار عورت کون

ہے خاتون! اور اس سے آپ کی کیا دشمنی ہے؟“

شہزاد سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ مجھ سے ایسے احمقانہ سوالات کرے گا اور یہ بھی نہیں سوچے گا کہ وہاں اس کے علاوہ میرے دوسرے ملازمین بھی موجود تھے۔ میرے ملازمین میں صرف شہزاد اور فاطمہ ہی کو میرا اصل نام معلوم تھا۔ باقی ملازمین نئے تھے اور وہ مجھے بمبئی کی ایک جرائم پیشہ عورت رانی کے نام سے جانتے پہچانتے تھے۔ پیش آنے والے واقعے نے شاید شہزاد کو بدحواس کر دیا تھا اس نے اسی لئے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔

”یہ تم کیا فضول اور بے سر و پا باتیں کر رہے ہو شاہد!“ میرے لہجے میں سختی تھی۔ میں نے دانستہ شہزاد کو اس کے فرضی نام سے مخاطب کیا تھا۔ ”مجھے کیا خبر کہ وہ عورت کون ہے؟“

”م .... مگر خاتون' وہ .... وہ تو کہہ رہی تھی کہ اس کی دشمنی ہے آپ سے۔“ شہزاد رک رک کر بولا۔ ”ابھی تک وہ میرا اشارہ نہیں سمجھ سکا تھا۔

”تم شاید ہوش میں نہیں ہو شاہد! تمہی نے ابھی بتایا ہے کہ اس عورت نے کسی معبلہ نامی عورت سے اپنی دشمنی کا اظہار کیا تھا تو پھر میرا کیا تعلق اس دشمنی سے؟ میرا نام تو معبلہ نہیں۔ میں تو بمبئی کی رانی ہوں۔ اس عورت کو شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

”ج .... جی جی ہاں خاتون!“ شہزاد کو شاید اب اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ ”اسے .... اس عورت کو غلط فہمی ہوئی ہے ٹھیک .... آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔“

یہ غنیمت ہوا کہ اس موقع پر فاطمہ کچھ نہیں بولی ورنہ بات اور بگڑ جاتی۔ وہ تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے کوٹھی کو جلتے دیکھے جا رہی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے کی سخت جدوجہد کے بعد آگ بجھانے والا عملہ آگ پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکا۔ دو گاڑیاں اور اس عملے کی مدد کو آ گئی تھیں۔ وہ لوگ نصف شب کے قریب میری کوٹھی سے رخصت ہوئے۔ کوٹھی کے اندر موجود شاید تمام ساز و سامان جل کر خاک ہو چکا تھا۔ وہ اب ایک بھیانک کھنڈر معلوم ہو رہی تھی۔ تمام دروازے بھی جل چکے تھے۔ میں دور ہی سے اس کا جائزہ لے کر پلٹنے والی تھی کہ میری سماعت سے ایک کریہہ قہقہہ ٹکرایا اور پھر میں نے خبیث چمپا کی آواز سنی۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ”دیکھ لے معبلہ کہ میں نے تیرے آشیانے کو آگ لگا دی۔ اب تُو وہاں رات گزار کہ جہاں تیرے نوکر رہتے ہیں۔ تیری یہی اوقات ہے۔“

”سامنے کیوں نہیں آتی حرامزادی!“ میں غصے میں چیخ اٹھی۔ ”سامنے آ تاکہ میں تیری دونوں ٹانگیں چیر دوں۔“

وہ مکروہ انداز سے ہنسنے لگی۔

”چپ ہو جا اے خارش زدہ کتیا!“ میں غصے سے کھول اٹھی۔

جواب میں چمپا کا زہریلا قہقہہ پھر سنائی دیا اور پھر یہ آواز دور ہوتے ہوتے قطعی ختم ہو گئی۔ میں کوٹھی کے جلے ہوئے صدر دروازے سے لوٹ آئی۔ لان میں میرے ملازمین اب تک کھڑے ہوئے

تھے۔ میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "تم لوگ کوارٹرز میں جا کر سو جاؤ۔ شاہد! تم بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ کسی کوارٹر میں چلے جاؤ۔"

"اور آپ خاتون!" شہزاد نے مجھ سے سوال کیا۔

"میں صبح آ جاؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔ "پھر دیکھا جائے گا کہ کیا کیا جائے۔" مجھے چمپا کے الفاظ یاد تھے کہ میں بھی اپنے نوکروں کے ساتھ رات گزاروں گی۔ میں اسی لئے اب وہاں رات گزارنا نہیں چاہتی تھی حالانکہ پہلے میرا ارادہ یہی تھا پھر کچھ سوچ کر کہ میں نے اپنا ہینڈ پرس کھولا اور اس میں سے دس ہزار روپے کی ایک گڈی نکال کر شہزاد کی طرف بڑھا دی۔ "یہ دس ہزار روپے ہیں۔ انہیں احتیاط سے اپنے پاس رکھو اور جو ضروری اخراجات ہوں' کروں۔"

"لیکن آپ کہاں جا رہی ہیں خاتون! .... میں آپ کے لئے کوئی کوارٹر صاف.........."

"نہیں۔" میں نے شہزاد کی بات کاٹ دی۔ "میں کل صبح آ جاؤں گی۔ تم میری فکر نہ کرو۔ گیٹ بند کر لو قاسم!" میں جانے کے لئے مڑ گئی۔

"جی بیگم صاحبہ!" قاسم نے کہا اور میرے پیچھے چل دیا۔

جب میں کوٹھی کے گیٹ سے باہر آ گئی تو قاسم نے میری ہدایت کے مطابق گیٹ اندر سے بند کر لیا۔

☆======☆======☆

باہر آتے ہی پہلا خیال مجھے یہی آیا کہ عارضی طور پر دوبارہ راجہ استاد کے گھر ہی میں سکونت اختیار کر لوں۔ پھر میں نے سوچا کہ بار بار ایک ہی شخص کو ہر معاملے میں زحمت دینا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں کسی ہوٹل میں رہنے لگوں۔ اس شہر میں اچھے اور درمیانے درجے کے ہوٹلوں کی کوئی کمی تو نہیں تھی۔ دھرم تلے کے علاقے ہی میں کئی اچھے ہوٹل تھے۔ میں اس وقت تک ہوٹل میں رہ سکتی تھی جب تک میری کوٹھی دوبارہ قابل سکونت نہ ہو جاتی۔ ابھی تو یہ بھی طے نہیں تھا کہ مجھے کتنے دن اور کلکتے میں گزارنا تھے۔ کیوں کہ میں اپنی سمت سفر کا تعین کر چکی تھی۔ عظیم مہین نے بھی اس سمت سفر کے درست ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔ مجھے تو اب کلکتے سے دہلی جانا تھا جہاں میرا دشمن ژیان موجود تھا۔ اسی کے ساتھ اب میں بڑے مہاراج اور چمپا سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اب نیک روح عظیم مہین کی یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی کہ ژیان تو صرف میرے راستے کا ایک پتھر تھا اور مجھے تو پہاڑوں سے ٹکرانا تھا۔ اگر ژیان سے انتقام لینا مقصود نہ ہوتا تو شاید میں ابھی کلکتے سے دہلی جانے کا قصد نہ کرتی اور پہلے شیطانی قوتوں کے مالک بڑے مہاراج سے نمٹنے کی کوشش کرتی جس نے مجھے ذلت و رسوائی سے ہمکنار کر رکھا تھا۔ اس کا ایک گرگا شمبھو میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا تو اب چمپا میرے لئے عذاب جاں بن گئی تھی۔ میرے حق میں چمپا' شمبھو سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو رہی تھی۔ وہ شمبھو سے کہیں زیادہ شیطانی قوتوں کی مالک تھی۔ مجھے اچھی طرح اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔

اس رات میں' راجہ استاد کے گھر جانے کی بجائے دھرم تلے ہی کے ایک عمدہ ہوٹل میں پہنچ گئی۔

میرے پاس کیونکہ کوئی سامان نہیں تھا اس لئے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے مجھے کچھ مشتبہ سی نظروں سے دیکھا۔ اس نے مجھ سے بظاہر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور پھر ضروری اندراج کے لئے پہلا سوال کیا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں؟"

"بمبئی سے۔" میں نے فوراً جواب دیا' پھر اس کی مشتبہ نظروں کو دیکھ کر وضاحت کی۔ "میرا سامان ہاوڑہ اسٹیشن پر گم ہو گیا ہے۔"

"افسوس ہوا محترمہ یہ سن کر۔" کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے اظہار افسوس کیا' پھر پوچھا۔ "آپ اس وقت ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن ہی سے آ رہی ہیں؟"

اس وقت مجھے اس سوال کی اصل نوعیت کا اندازہ نہیں تھا' نہ یہ معلوم تھا کہ اس طرح وہ شخص میرا امتحان لے رہا ہے۔ میں نے اسی لئے جواب میں کہہ دیا۔ "جی ہاں' وہیں سے آ رہی ہوں۔" وہ شخص معنی خیز انداز میں میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

"اس طرح آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟" میں ناگوار لہجے میں بولی۔

"محترمہ! میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ جھوٹ کیوں بول رہی ہیں؟" اس نے کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں برہم ہو گئی۔ "مجھے آپ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہی تو مجھے حیرت ہے۔ آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ رات کے وقت ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن سے کوئی ٹرین چلتی ہے' نہ کوئی ٹرین آتی ہے۔ پھر آپ اس وقت وہاں سے کیسے آ رہی ہیں؟ آخر جھوٹ بولنے کی کوئی تو وجہ ہو گی۔" وہ معنی خیز لہجے میں کہنے لگا۔

مجھے اس روز پہلی مرتبہ یہ عجیب بات معلوم ہوئی کہ رات کو ہاوڑہ اسٹیشن بند رہتا ہے۔ غالباً یہ ہندوستان کا واحد ریلوے اسٹیشن تھا جہاں نہ رات کو کوئی ٹرین آتی تھی نہ وہاں سے کہیں کے لئے ٹرین روانہ ہوتی تھی۔ اس شخص نے بڑی چالاکی سے میرا جھوٹ پکڑ لیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے پاس کوئی سامان نہ ہونے کے سبب وہ پہلے ہی میری طرف سے مشتبہ ہو گیا تھا۔

"آپ نے جو کچھ بتایا ہے مجھے بھی معلوم ہے۔" میں نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا' پھر بات بنائی۔ "اپنے سامان کی تلاش میں مجھے وہاں دیر ہو گئی تھی۔" یہ کہتے ہوئے میں فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے اس ہوٹل میں اب نہیں ٹھہرنا اسی لئے سخت لہجے میں بولی۔ "معاف کیجئے گا' اب میں آپ کے ہوٹل میں ٹھہرنا نہیں چاہتی۔ اس شہر میں اور بہت سے ہوٹل موجود ہیں۔" میں جانے کے لئے مڑی۔

"رک جایئے محترمہ! آپ اس طرح نہیں جا سکتیں۔" وہ بلند اور سخت آواز میں بولا۔

میں رک کر اس کی طرف پلٹی اور جواباً سخت آواز میں کہا۔ "کیوں نہیں جا سکتی' آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے؟"

"پولیس کی طرف سے ہمیں سخت ہدایات ہیں کہ کسی بھی مشتبہ شخصیت کو پولیس کی آمد سے قبل نہ جانے دیں۔ پہلے مجھے قریبی پولیس تھانے کو مطلع کرنے دیجئے۔ پولیس یہاں آ جائے تو آپ اسے

مطمئن کر کے کہیں بھی جا سکتی ہیں۔ پھر آپ جانیں اور پولیس جانے۔ آپ کو شاید خبر نہیں کہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز انگریز افسر اغوا کیا جا چکا ہے۔"

"تو آپ کے خیال میں اسے میں نے اغوا کیا ہے یا اغوا کرایا ہے؟" میں اس شخص کو گھورنے لگی جو خواہ مخواہ میری راہ میں روڑے اٹکا رہا تھا۔

"محترمہ! یہ معلوم کرنا میرا نہیں پولیس کا کام ہے۔" یہ کہہ کر اس نے قریب رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھینچ لیا۔

"میں جا رہی ہوں' دکھاؤ مجھے روک کر۔" میں نے سختی سے کہا اور شاید یہی میری غلطی تھی۔ مجھے اس سے کچھ کہے بغیر خاموشی اور تیزی کے ساتھ نکل جانا چاہئے تھا۔

اس نے کاؤنٹر سے منسلک کوئی بٹن دبا دیا۔ اسی کے ساتھ ہر طرف جیسے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں پھر اس سے پہلے کہ میں وہاں سے فرار ہوتی' بیک وقت کئی باتیں ہوئیں۔ کاؤنٹر پر موجود شخص نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف تان لیا۔ اسی کے ساتھ چاروں طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور کچھ فاصلے پر بائیں جانب موجود ہوٹل کا صدر دروازہ بند کر دیا گیا۔ دروازے پر موجود مسلح محافظ نے بھی اپنی گن کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ پھر ہوٹل کے ملازمین نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔

اچانک صورت حال اتنی سنگین اور خطرناک نوعیت اختیار کر جائے گی' یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ بیک وقت دو آتشیں ہتھیاروں کا رخ میری طرف تھا۔ اس کے علاوہ راہ فرار بھی مسدود کر دی گئی تھی اور ہوٹل کے بیرے مجھے اپنے نرغے میں لئے ہوئے تھے۔ میرے ذہن سے یہ بات قطعی نکل ہی گئی تھی کہ ان دنوں شہر کے چپے چپے پر سادہ لباس پولیس والے متعین تھے۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ ڈیسوزا کا اغوا ہی تھا۔ ارشاد حسین مجھے یہ سب کچھ بتا چکا تھا۔ ایسے حالات میں خفیہ پولیس والوں کی نظر بڑے بڑے ہوٹلوں پر ضرور ہوتی ہے۔ میں نے ہوٹل کا رخ کر کے یقیناً غلطی کی تھی' مگر اب اس کا تدارک ممکن نہیں تھا۔

"محترمہ! آپ شاید مجھے اس ہوٹل کا کوئی معمولی ملازم سمجھ رہی تھیں۔" کاؤنٹر والے نے مجھے مخاطب کیا۔ "تو آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرا تعلق خفیہ پولیس کے محکمے سے ہے۔" یہ کہہ کر وہ فون پر نمبر ملانے لگا نمبر ملاتے ہی وہ پھر میری طرف گھوم کر دیکھنے لگا اور بولا۔ "آپ کا تعلق بھی مجھے سرفروش تنظیم سے معلوم ہوتا ہے۔" پھر شاید دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا اور وہ شخص کہنے لگا۔

"میں اے ایس آئی کشور بول رہا ہوں .... ٹھیک ہے' ریسیور سر کو دے دو .... یس سر!" پھر وہ اپنے کسی افسر کو بتانے لگا کہ کس ہوٹل سے بول رہا ہے اور اس نے کیا "کارنامہ" انجام دیا ہے۔ "ٹھیک ہے سر! آپ وین بھیج دیجئے' میں اسے ساتھ لے کر آ رہا ہوں .... جی سر! تلاشی لے لوں گا .... اس کے پاس صرف ایک ہینڈ پرس ہے .... جی ہاں سر! مجھے اندازہ ہے کہ اس کے پرس میں ریوالور بھی ہو سکتا ہے .... بہتر ہے سر! میں چوکنا رہوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا اور

کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آیا۔

اے ایس آئی کشور کے ریوالور کی نال اب بھی میری طرف ہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ کشور نے خفیہ پولیس کے دفتر سے کوئی وین منگوائی ہے جس میں وہ مجھے اپنے ساتھ وہاں لے جانا چاہتا ہے۔ یقیناً یہ اچھا نہ ہوتا۔ کشور کمبخت نے خواہ مخواہ اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے سرفروش تنظیم سے میرا تعلق جوڑ دیا تھا۔ وین آنے والی تھی اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ خفیہ پولیس کا دفتر وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وین کو اس ہوٹل تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہ لگتا۔ اس کا مطلب تھا میرے پاس تھوڑا وقت تھا۔ اگر میں خفیہ پولیس والوں کے ہتھے چڑھ جاتی تو پھر مجھے باآسانی نجات ملنا مشکل ہو جاتا۔ میں اگر اس کمینی چمپا کی بات سے چڑ کر اپنی کوٹھی سے نہ نکلتی تو شاید اس مصیبت کا شکار نہ ہوتی۔

ابھی میں نے کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچا ہی تھا کہ اے ایس آئی کشور نے تیزی کے ساتھ جھپٹ کر میرے ہاتھ سے ہینڈ پرس چھین لیا۔

"میرا .... میرا پرس واپس دو۔" میں اس کی طرف بڑھی تو اس نے ریوالور آگے کر دیا۔

"اگر اب ایک بھی قدم آگے بڑھایا تو گولی مار دوں گا۔" وہ کسی درندے کی طرح غرایا۔ اس کے ایک ہاتھ میں میرا ہینڈ پرس تھا اور دوسرے میں ریوالور جو میری طرف اٹھا ہوا تھا۔

یہ اس کی بدقسمتی تھی یا میری خوش نصیبی کہ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے جھپٹ کر اس کے ریوالور والے ہاتھ کی کلائی پر کھڑی ہتھیلی ماری۔ اس کی انگلی شاید ٹریگر پر تھی اسی لئے گولی چل گئی۔ میں چشم زدن میں بائیں طرف ہو گئی تھی اور اسی کے ساتھ اپنا پرس اس کے بائیں ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ بیک وقت کئی باتیں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ کشور کی کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا' مگر اس سے پہلے گولی چل چکی تھی۔ اس گولی نے ہوٹل کے ایک ویٹر کے سینے میں جگہ بنا لی تھی۔ ویٹر چیخ کر ڈھیر ہو گیا تھا۔ بیرونی دروازہ بند تھا اور وہاں بندوق لئے چوکیدار بھی موجود تھا اس لئے مجبوراً جست بھرتی ہوئی میں ہوٹل کے اندرونی دروازے میں گھس گئی۔

اس ہوٹل کا کوئی عقبی دروازہ بھی ہو گا' میں نے بھاگتے ہوئے سوچا۔ میں بھاگتی ہوئی ایک دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ وہ ایک ہال تھا اور سامنے ہی اسٹیج نظر آ رہا تھا جس پر ایک نیم عریاں غیر ملکی رقاصہ گویا اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنے چہرے سے ماسک اور وگ اتاری پھر دونوں چیزیں میں نے اپنے ہینڈ پرس میں رکھ لیں۔ ہال میں نیم تاریکی تھی اس لئے شاید کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ روشنیوں کے دائرے رقاصہ کے جسم پر حرکت کر رہے تھے اور وہ موسیقی کی دھن پر تھرک رہی تھی۔

میں آگے بڑھ کر ایک میز پر بیٹھ گئی۔ نیم تاریکی میں فوری طور پر میں یہ نہ دیکھ سکی تھی کہ وہاں پہلے ہی سے ایک جوڑا "وہ ہم میں اور ہم ان میں سمائے جاتے ہیں" کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ مجھے ان کی وہاں موجودگی کا احساس اس وقت ہوا جب ان دونوں کے منہ سے حیرت زدہ سی آوازیں نکلیں اور وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ لڑکی اپنا بے ترتیب لباس درست کرنے لگی تھی۔

"ہو آر یو؟" ایک مردانہ احتجاجی آواز بلند ہوئی پھر انگریزی ہی میں کہا گیا۔ "بغیر اجازت آپ اس میز پر کیسے بیٹھ گئیں؟"

"سوری نو ڈسٹرب یو۔" میں نے معذرت کی اور اسی وقت اسٹیج کا پردہ گر گیا۔ ہال میں تیز روشنی ہو چکی تھی۔ میری نظر اس نوجوان پر پڑی جو پچیس سال سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اپنے چہرے سے وہ ہندوستانی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر بہترین لباس تھا۔ وہ جے پوری کوٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھا اور گلے میں سونے کی زنجیر پڑی تھی۔ بائیں کان میں سونے کی چھوٹی سی بالی دکھائی دے رہی تھی جس میں موتی پڑا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس نوجوان کا سرسری جائزہ لے لیا تھا۔ میری دوسری نظر لڑکی پر پڑی تھی۔ وہ بیس برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس کے جسم پر بھی بہترین لباس تھا۔ رنگت سانولی' نقوش تیکھے اور چہرہ پرکشش تھا۔ اس نوجوان کی نظروں میں اپنے لئے پسندیدگی کو میں نے ابتدائی چند لمحات میں محسوس کر لیا تھا۔ اس کا سبب یقیناً میرا چہرہ ہی تھا کہ جس پر اب ماسک نہیں تھا۔

ہال میں تمام ہی میزیں بھری ہوئی تھیں۔ نوجوان نے مجھے مخاطب کیا۔ "آپ کی تعریف؟"

"رانی۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کس اسٹیٹ کی؟" اس نے سوال کیا۔

"یہ میرا صرف نام ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"میرا نام پرنس جگدیش ہے اور میرا تعلق جے پور اسٹیٹ سے ہے۔" نوجوان نے اپنا تعارف کرا کر لڑکی کی طرف مڑا۔ "اور یہ میری پرنسس سوشیلا ہیں۔ ہم دونوں ہنی مون منانے جے پور سے کلکتے آئے ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی رانی!" نوجوان نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

"گلیڈ ٹو میٹ یو پرنس!" میں نے گرم جوشی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا۔ جواباً اس نے بھی میرا ہاتھ دبایا۔ پھر میں نے پرنسس سوشیلا سے ہاتھ ملایا مگر اس نے گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی۔ اسے یقیناً وہاں میری موجودگی اچھی نہیں لگی تھی۔ شاید اس نے اپنے شوہر کی آنکھوں میں میرے لئے پسندیدگی کی تحریر بھی پڑھ لی تھی۔ نادانستہ طور پر ہی سہی میں اس نوبیاہتا جوڑے کے درمیان کباب میں ہڈی بن گئی تھی۔ میں نے ان کی میز پر شراب کی بوتل اور گلاس بھی رکھے دیکھ لئے تھے۔ دونوں گلاسوں میں سے صرف تھوڑی تھوڑی شراب ہی پی گئی تھی۔ بوتل بھی زیادہ خالی نہیں تھی۔ شراب کے علاوہ مختلف پلیٹوں میں کاجو' کباب وغیرہ بھی رکھے تھے۔

"میں آپ کے لئے بھی گلاس منگواتا ہوں۔" نوجوان پرنس نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"شکریہ! میں پیتی نہیں ہوں۔" میں نے نرم آواز میں انکار کر دیا۔

"تو پھر کچھ کھائیے۔" وہ بضد ہوا۔

"ہاں یہ ممکن ہے۔" میں نے کہا اور ایک پلیٹ میں کباب نکال لیا۔

"پیو سوشیلا!" اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔

"کمرے میں چلیں۔" سوشیلا نے اپنا گلاس اٹھا لیا۔ "وہیں پئیں گے۔ بوتل لئے چلتے ہیں۔" اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دونوں اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" پرنس حیرت سے بولا۔ "یہ آؤٹ آف ایٹی کیٹ ہے پھر ابھی تو لاسٹ آئٹم باقی ہے۔ اسٹرپ ٹیز ڈانس بھی تو ابھی دیکھنا ہے نا!"

اسٹرپ ٹیز ڈانس کے متعلق سن کر میں چونک اٹھی۔ اس نوجوان کی موجودگی میں اسٹرپ ٹیز ڈانس دیکھنا یقیناً میرے لئے باعث خجالت ہی ہوتا۔ رہی سوشیلا تو وہ اس کی بیوی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بے لباسی کا یہ مظاہرہ دیکھ سکتا تھا میں ابھی اٹھنے کے لئے سوچ ہی رہی تھی کہ ہال کے دروازے پر مجھے اے ایس آئی کشور نظر آیا۔ اس کے ساتھ دوسرے سادہ لباس والے بھی تھے۔ میں اس طرح بیٹھی تھی کہ ہال کا دروازہ میرے احاطہ نظر میں تھا۔ کشور کے گلے میں پٹی پڑی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ پٹی کے اندر پڑا ہوا تھا۔

کشور اپنے ساتھیوں کو لے کر ہال میں داخل ہوا اور میزوں کے درمیان چکرانے لگا۔ اس کی نظریں خاص طور پر خواتین کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ میری میز کے قریب سے بھی مجھے اور پرنسس سوشیلا کو دیکھتا ہوا گزرا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے دیکھ کر قدرے ٹھٹکا تھا کیونکہ میرے جسم پر لباس وہی تھا۔ میرے ہینڈ پرس پر اس کی نگاہ غالباً نہیں پڑ سکی تھی کیونکہ اسے ہال کے دروازے پر دیکھتے ہی میں نے پرس اپنے پیروں پر رکھ لیا تھا اور ذرا آگے سرک کر بیٹھ گئی تھی۔ صرف لباس کی مماثلت کے سبب وہ مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا کیونکہ ہلکے سبز رنگ کی ساڑھیاں اور خواتین بھی زیب تن کئے ہوئے تھیں۔ وہ آگے بڑھ گیا تو میری جان میں جان آئی۔ دو میزیں چھوڑ کر ایک میز پر ایک اور عورت سبز ساڑھی میں نظر آ رہی تھی' مگر وہ ادھیڑ عمر تھی۔ ہوٹل میں یقیناً مجھ ہی کو تلاش کیا جا رہا تھا کیونکہ انہوں نے مجھے ہوٹل کے اندر جاتے ہی دیکھا تھا۔ میرا قیاس یہ تھا کہ ان لوگوں نے بیرونی اور عقبی دروازے اسی وقت بند کرا دیئے ہوں گے تاکہ کوئی بھی ہوٹل سے باہر نہ جا سکے۔ اس وقت ہوٹل سے میرا نکلنا ممکن نہیں تھا۔

پرنس جگدیش نے مجھے میرے غیر معمولی خداداد حسن ہی کی وجہ سے اپنی میز پر بیٹھے رہنے دیا تھا۔ میرے چہرے پر اگر ماسک ہوتا تو ظاہراً میں ایک قبول صورت عورت ہی نظر آتی۔ ایسی صورت میں وہ یقیناً اپنی حسین و نوجوان بیوی کے وہاں ہوتے میری موجودگی قبول نہ کرتا اور مجھے اپنی میز سے اٹھا دیتا۔ اگر میں تنہا کسی میز پر بیٹھی ہوتی تو بھی کشور کو شک ہوتا لیکن ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ مجھے بیٹھے دیکھ کر کسی قسم کے شک کا سوال نہیں تھا۔ یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا۔

"ابھی تک اسٹرپ ٹیز شروع ہو جانا چاہئے تھا۔" پرنس جگدیش نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھ کر کہا۔ اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

میں اس تاخیر کا سبب سمجھ رہی تھی۔ جب تک کشور سارے ہال کا جائزہ لے کر وہاں سے چلا نہ جاتا' ڈانس شروع نہیں ہو سکتا تھا مگر ظاہر ہے کہ میں پرنس جگدیش کو یہ نہیں بتا سکتی تھی۔ میرے لئے

یہ صورت حال مناسب نہیں تھی۔ نہ میں وہاں بیٹھ کر ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ اسٹرپ ٹیز ڈانس دیکھ سکتی تھی' نہ ہوٹل سے نکل سکتی تھی۔

کچھ دیر اور گزری' کشور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہال سے نکل گیا۔ اسی وقت ہال کی روشنیاں بجھ گئیں اور اعلان کیا گیا کہ اسٹرپ ٹیز ڈانس شروع ہونے والا ہے۔ پرنس جگدیش نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ میری نشست اس کی دائیں جانب تھی' سوشیلا اس کی بائیں طرف بیٹھی تھی۔

"آئی ایم کمنگ جسٹ ناؤ۔" یہ کہتے ہی میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں رانی! ڈانس شروع ہونے والا ہے۔" پرنس جگدیش نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"باتھ روم۔" جواب دے کر اس سے میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"او کے۔" وہ چہکا۔ "مگر جلد لوٹ آیئے گا۔"

مجھے علم نہیں تھا کہ باتھ روم کدھر ہیں' میں نے اسی لئے ایک ویٹریس سے یہ سوال کیا۔

"کم آن ودھ می میڈم!" ویٹریس نے خوش اخلاقی سے جواب دیا اور رہنمائی کے لئے میرے ساتھ چلنے لگی۔

"ہوٹل کا عقبی دروازہ کدھر ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں اس سے پوچھا۔

"مگر میڈم! ابھی تو آپ باتھ روم جانے کے لئے کہہ رہی تھیں۔" ویٹریس قدرے حیرت سے بولی۔

میں نے پرس کھول کر سو روپے کا نوٹ نکالا اور ویٹریس کو دیتے ہوئے کہا۔ "پلیز' عقبی دروازے تک میری رہنمائی کرو۔"

ویٹریس نے حیرت سے نوٹ کو دیکھا۔ شاید اسے اتنی بڑی ٹپ کبھی نہیں ملی تھی۔ پھر وہ پُرمسرت آواز میں کہنے لگی۔ "میرے ساتھ آیئے میڈم!" وہ ہال کے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر اس وقت عقبی دروازہ بند بھی ہوا تو کچھ دیر کے بعد یقیناً کھول دیا جائے گا۔ پھر میں وہاں سے نکل جاؤں گی۔

توقع کے مطابق دور ہی سے عقبی دروازہ بند نظر آ گیا۔ وہاں دو مسلح چوکیدار کھڑے تھے۔ اس پر ویٹریس نے اظہار حیرت کیا۔

"واپس چلو۔" میں نے ویٹریس سے کہا۔ اس غریب کو کیا خبر تھی کہ یہ سارا بندوبست میرے ہی لئے کیا گیا ہے تاکہ میں فرار نہ ہو سکوں۔

ویٹریس کے ساتھ میں پھر ہال میں لوٹ آئی۔ اگر کوئی اور میز خالی ہوتی تو میں وہاں بیٹھ جاتی' مگر ایسا نہیں تھا۔ مجھے اسی لئے مجبوراً پرنس جگدیش کی میز کا رخ کرنا پڑا۔ ہال میں موجود لوگ پورے انہماک سے اسٹرپ ٹیز ڈانس دیکھ رہے تھے۔ میری نظر بھی اسٹیج کی طرف اٹھی۔ روشنیوں کے دائرے ایک دراز

قد غیر ملکی رقاصہ کے جسم کی حرکت کے ساتھ ساتھ اِدھر سے اُدھر گردش کر رہے تھے۔ رقاصہ کے جسم پر اب صرف دو کپڑے نظر آ رہے تھے' ایک بالائی حصے پر' دوسرا جسم کے زیریں حصے پر۔ ہیجان خیز موسیقی کی لَے پر وہ اپنے نرم و نازک جسم کو یوں حرکت دے رہی تھی کہ جیسے کوئی شعلہ سا لپک رہا ہو۔

ایک بار پھر میں نے ان دونوں میاں بیوی کو ڈسٹرب کر دیا۔ سوشیلا نے میری موجودگی محسوس کرتے ہی اپنی بانہیں پرنس کی گردن سے نکالنا چاہیں' مگر پرنس نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ سوشیلا نے سرگوشی کی۔ "ارے' وہ پھر آ گئی ہے چھوڑو مجھے۔" پرنس نے شاید مجھے نہیں دیکھا تھا۔

"سوری!" میں نے معذرت کی۔

"اوہ تو مائی ڈیر!" پرنس کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ میں اب اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہیں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سوشیلا نے اپنی خجالت مٹانے کے لئے سامنے رکھا ہوا گلاس اٹھا لیا اور پھر اسے ایک ہی سانس میں خالی کر گئی۔

پرنس نے اپنا گلاس بھی اٹھا کر خالی کیا اور پھر دونوں گلاسوں میں شراب انڈیلنے لگا۔ میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ پرنس نے سوشیلا کے گلاس میں زیادہ شراب انڈیلی تھی' پھر اس میں جلدی سے سوڈا ملا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے گلاس میں سوڈا ڈالنے لگا۔

"پیو۔" پرنس جگدیش نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے سوشیلا سے کہا' پھر مجھ سے کہنے لگا۔ "ذرا اپنی کرسی تھوڑی سی ترچھی کر لیں تاکہ ڈانس بھی دیکھتی رہیں۔"

"سوری! مجھے ڈانس دیکھنے کی کوئی ایسی خاص خواہش نہیں۔" میں بولی۔

"آپ دیکھئے تو سہی' انجوائے کریں گی' پلیز رانی!" وہ بضد ہو گیا۔

مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ کرسی ترچھی کرنے کی وجہ سے میرا جسم اب پرنس کے جسم سے مس ہو رہا تھا۔ میں اس لئے کچھ سمٹ گئی۔ معاً موسیقی کا ایک چھناکا ہوا اور اسی کے ساتھ پرنس کے منہ سے سسکی سی نکل گئی۔ رقاصہ کے جسم کا بالائی حصہ اب لباس کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ یقیناً اس کا جسم بہت متناسب اور خوبصورت تھا جیسے سارنگی کے سارے تار کھنچے ہوں۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔

"ہاؤ بیوٹی فل!" پرنس بے اختیار بولا۔

اسی لمحے میں نے اس کی انگلیوں کی لرزش اپنے جسم پر محسوس کی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

کچھ دیر وہ صبر کئے بیٹھا رہا یا پھر اپنی نوجوان بیوی کے لمس کو محسوس کرتا رہا۔

"کیا کر رہے ہو' وہ دیکھ لے گی۔" میں نے سوشیلا کی سرگوشی سنی۔

"تو دیکھنے دو' ہم یہاں پوجا کرنے نہیں آئے۔" پرنس کی جوابی سرگوشی ابھری۔ پھر پرنس نے شراب کا گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

میرے لئے اب وہاں بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا' مگر اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کی بے حجابی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اب میری موجودگی کی پرواہ بھی نہیں کر رہے تھے۔ شراب کا گلاس خالی ہو گیا تو پرنس نے سوشیلا کا گلاس پھر شراب سے بھر دیا۔ اس مرتبہ پرنس نے برائے نام سوڈا ہی

اس کے گلاس میں ملایا تھا۔ یہ ایسا کیوں کر رہا ہے‘ میں نے سوچا تو ضرور مگر اس سوال کا جواب میرے ذہن میں نہ آ سکا۔ پرنس کی انگلیاں دوبارہ میرے جسم پر رینگنے لگی تھیں۔ مجبوراً مجھے پھر اس کے ہاتھوں کی آوارگی روکنے کی خاطر سختی سے کام لینا پڑا۔ اس مرتبہ میں نے پرنس کی طرف جھک کر سخت آواز میں سرگوشی بھی کی تھی۔ ”میں یہ حرکتیں پسند نہیں کرتی۔“

پرنسس سوشیلا نے ایک مرتبہ پھر کمرے میں چلنے کو کہا۔

”اوہ نو‘ ڈانس کا کلائمکس ابھی باقی ہے۔“ پرنس بولا۔ ”مگر تم اپنا گلاس تو خالی کرو۔“

سوشیلا نے شراب کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف دیکھا‘ پھر ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ”کیا سوڈا .... سوڈا نہیں ملایا؟“

”ملایا ہے‘ کباب کھا لو‘ تھوڑا سا۔“

پھر وہ لمحہ بھی آ گیا کہ سارے ہال میں سسکیاں گونج اٹھیں۔ میں نے اس حیا سوز منظر کو بس ایک نظر دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں پھر اسی وقت آنکھیں کھولیں جب پردہ گر چکا تھا اور ہال میں روشنی ہو گئی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مردوں کا وہ ڈانس دیکھنا تو میری سمجھ میں آتا تھا مگر عورتیں کیا دیکھنے آتی تھیں‘ میں سمجھ نہ سکی۔

”چلو جلدی سے اپنا گلاس خالی کرو‘ پھر اٹھیں گے۔“ پرنس نے سوشیلا سے کہا۔

میں نے سوشیلا کی آنکھیں سرخ دیکھیں۔ ”اچھا۔“ پھر اس نے گلاس اٹھا کر خالی کیا اور مزید شراب پینے کے لئے کہنے لگی۔

”اچھا بس ایک گلاس اور پی لو‘ اس سے زیادہ نہیں۔“ پرنس اس کے گلاس میں شراب ڈالنے لگا۔

”نائیں .... پوری بوتل .... پی .... پیوں گی .... مجھ .... مجھ کو نشہ .... نائیں ہوتا..........“

”پی لینا‘ مگر یہ تو پیو۔“ پرنس نے گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس مرتبہ پرنس نے ذرا سا سوڈا بھی نہیں ملایا تھا۔

”میرا خیال ہے پرنس کہ انہیں خاصا نشہ ہو گیا ہے‘ اب اور نہ پینے دیں۔“ میں بول اٹھی۔

”یو .... شاٹ آپ!“ سوشیلا ہاتھ اٹھا کر زور سے بولی۔

”پلیز رانی! آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔ یہ اس وقت ہوش میں نہیں ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ شاید اب تک ہوٹل کی تلاشی لی جا چکی ہو اور دروازے کھول دیئے گئے ہوں۔

سوشیلا کو واقعی نشہ ہی ہو چکا تھا ورنہ وہ چند گھونٹوں میں گلاس خالی نہ کر دیتی۔ اب وہ مزید شراب کے لئے ضد کر رہی تھی۔

”اب نہیں .... بالکل نہیں۔“ پرنس نے انکار کر دیا۔

سوشیلا کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور وہ بیٹھے بیٹھے کرسی پر جھومنے لگی‘ اس کے باوجود مزید

شراب کی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ پرنس نے ایک ہاتھ سے اسے سنبھالا اور اشارے سے ویٹر کو بلا کر بل لانے کے لئے کہا۔ لوگ اب اٹھ اٹھ کر جانے لگے تھے۔ مجھے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ میں نے سوچا۔ ظاہر ہے کہ یہاں موجود تمام ہی افراد اس ہوٹل میں نہیں ٹھہرے ہوں گے۔ ان میں اکثریت باہر کے لوگوں کی ہو گی اور ان کے لئے دروازہ ضرور کھولا جائے گا۔

”آپ کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا پرنس اب مجھے اجازت دیجئے۔“ میں نے پرنس جگدیش کو مخاطب کیا۔

”بس ذرا تھوڑی دیر رک جایئے پلیز!“ وہ عاجزی سے بولا۔

”کوئی خاص بات؟“

”ویٹر بل لے آئے۔“ پرنس نے جواب دیا۔ ”سوشیلا شاید سہارے کے بغیر کمرے تک نہ جا سکیں۔ ممکن ہے کہ میں اکیلا انہیں نہ لے جا سکوں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر آپ کو تھوڑی سی زحمت برداشت کرنا پڑے گی۔ اس کے لئے میں پہلے ہی سے معذرت خواہ ہوں۔“

میں چونک اٹھی‘ اب میری سمجھ میں آ چکا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو اتنی شراب کیوں پلائی تھی۔ میں دل ہی دل میں پرنس جگدیش کی حماقت پر ہنسی۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ کمرے میں اس بہانے کیوں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی نیت یقیناً مجھ پر خراب ہو چکی تھی۔ خود پرنس کی بیوی بھی کم حسین نہیں تھی لیکن شاید مرد کی ہوس کسی ایک پر کبھی قناعت نہیں کرتی۔ پرنس جگدیش لازماً اس سے بے خبر تھا کہ میں دو چار دس کے قابو میں آنے والی نہیں ہوں۔ میں چاہتی تو اس کی عیارانہ التجا کو ٹھکرا کر وہاں سے چلی آتی مگر اسے سبق دینے کی خاطر رک گئی۔ معلوم نہیں مرد ہر عورت کو موم کی گڑیا کیوں سمجھتا ہے کہ جب اور جدھر چاہے گا موڑ لے گا۔

پھر ویٹر بل لے آیا۔ پرنس جگدیش نے بل ادا کیا۔ اس وقت تک سوشیلا خبر سے بے خبری کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

”اے آنکھیں کھولو سوشیلا!“ پرنس نے اسے جھنجھوڑا‘ پھر پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے۔

”کاؤن ہائے؟“ سوشیلا نے جھرجھری لے کر آنکھیں کھول دیں۔

”کھڑی ہو جاؤ‘ کمرے میں چلنا ہے۔“ پرنس نے اسے سہارا دے کر کرسی سے اٹھایا‘ پھر مجھ سے بولا۔ ”پلیز رانی! آپ ادھر سے پرنسس کو سنبھال لیں۔“

”میں ہی سنبھالے لیتی ہوں‘ آپ چھوڑ دیں انہیں پرنس!“ یہ کہتے ہی میں نے جھک کر سوشیلا کو اپنے دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا۔

”ارے ارے‘ یہ آپ کیا .... کیا کر رہی ہیں؟“ پرنس جلدی سے بولا۔ ”لل .... لوگ دیکھ رہے ہیں۔ ہم تماشا بن جائیں گے۔“

”کبھی کبھی تماشا بھی بننا پڑتا ہے۔“ میں اس کی بات کو سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ گئی۔

لوگ واقعی مجھے حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ سوشیلا معلوم نہیں کیا بڑبڑا رہی تھی۔ مجبوراً

پرنس جگدیش کو میری رہنمائی کرنا ہی پڑی۔ دراصل اس طرح پرنس پر میں یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اس کا سابقہ کسی معمولی عورت سے نہیں پڑا‘ مگر کچھ لوگ سمجھ کر بھی تو کچھ نہیں سمجھتے۔ پرنس جگدیش بھی شاید ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔

پرنس جگدیش نے پورا ایک سوٹ بک کرایا تھا جس میں دو بیڈ رومز کے علاوہ ایک ڈرائنگ روم بھی تھا۔ اس کا سوٹ پہلی ہی منزل پر تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں‘ سوشیلا کو اٹھائے اس کے پیچھے اندر گئی۔ جیسے ہی میں نے قدم آگے بڑھائے اس نے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے یہی توقع بھی تھی۔

"ادھر........... ادھر ہے بیڈ روم۔" پرنس نے بائیں جانب کے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے بیڈ روم میں داخل ہو کر سوشیلا کو مسہری پر لٹا دیا۔ اس عرصے میں پرنس جگدیش بیڈ روم کا دروازہ بھی اندر سے بند کر چکا تھا۔

"اتنی رات گئے آپ کہاں جائیں گی رانی! یہیں سو جائیں۔" پرنس نے مجھے مخاطب کیا۔

"مگر یہاں تو ایک ہی مسہری ہے۔" میں دانستہ بولی۔ "اور اس پر پرنسس سو رہی ہیں۔"

"دوسرا بیڈ روم بھی تو ہے نا‘ وہاں ہم دونوں سو جائیں گے۔" وہ ڈھٹائی سے کہنے لگا۔ وہ یہ کہتے ہوئے اپنے الفاظ کا ردعمل میرے چہرے پر تلاش کر رہا تھا۔

اس پر بھی انجان بنی رہی اور کہا۔ "کیا آپ یہاں پرنسس کے پاس نہیں سوئیں گے پرنس!؟"

"جب آپ موجود ہیں تو مجھے یہاں سونے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ "گوشت موجود ہو تو دال روٹی کون کھاتا ہے؟"

"تو پھر دوسرے بیڈ روم میں چلئے۔" میں مسکرا دی۔

اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ پہلے شاید اس نے یہ سوچ کر دروازہ بند کیا تھا کہ میں نہ مانوں تو وہ زبردستی کر سکے‘ مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اطمینان سے چلتی ہوئی بیڈ روم سے باہر آ گئی۔ میں دوسرے بیڈ روم کی طرف قدم بڑھانے کی بجائے دروازے کی طرف بڑھی تو جھپٹ کر اس نے میرا راستہ روک لیا۔ مجھے یہی توقع بھی تھی پھر وہ اپنی اصلیت پر اتر آیا اور کہنے لگا۔ "وعدہ خلافی نہیں چلے گی رانی! پرنس کے جال میں پھنسی ہوئی چڑیا اتنی آسانی سے نہیں نکل سکتی۔"

"میں تمہیں چڑیا نظر آ رہی ہوں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم نے مجھ سے دوسرے بیڈ روم میں چلنے کا وعدہ کیا ہے۔ سیدھی طرح چلی چلو ورنہ میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

"اتنی طاقت ہے تمہارے اندر‘ میں تو تمہارا ہاتھ بھی پکڑ لوں تو نہ چھڑا سکو۔" یہ کہتے ہی میں نے اس کے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "اگر مرد ہو تم تو مجھ سے اپنے ہاتھ کی کلائی چھڑا کر دکھا دو۔ یقین کرو کہ اگر تم نے کلائی چھڑا لی تو میں تمہارے ساتھ بیڈ روم میں چلنے سے ہرگز

انکار نہیں کروں گی۔"

وہ کلائی چھڑانے کے لئے زور لگانے لگا اور اس کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"دونوں ہاتھوں سے زور لگاؤ شاباش!" میں ہنس کر بولی۔

وہ دوسرے ہاتھ سے بھی زور آزمائی کرنے لگا۔ میں نے اپنے ہاتھ کی گرفت تھوڑی سی سخت کر دی تو اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی پھر چند ہی لمحے بعد وہ فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے چہرے سے تکلیف و اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں اس کی حالت پر ہنسنے لگی۔

"تمہاری مردانگی کو کیا ہوا پرنس! حیرت ہے کہ تم ایک عورت سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکتے‘ کیسے مرد ہو تم؟ میں چاہوں تو تمہارا ہاتھ توڑ سکتی ہوں‘ کہو تو توڑ کر دکھاؤں؟"

"نن .... نہیں۔" وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور وہ آہستہ آہستہ اپنے دوسرے ہاتھ سے کلائی سہلاتے ہوئے کراہنے لگا۔

"تم اپنی بیوی کے ساتھ ہنی مون منانے یہاں آئے ہو پرنس! اور تمہاری بیوی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ نوجوان بھی ہے پھر تم کیوں اِدھر اُدھر منہ مارنے کی کوشش کر رہے ہو؟ اب تم اپنی بیوی کے پاس جا کر سو جاؤ‘ پہلے میرا ارادہ جانے کا تھا لیکن تمہاری دعوت پر رک رہی ہوں۔ میں اکیلی برابر والے بیڈ روم میں سوؤں گی۔" میں نے واقعی ہوٹل ہی میں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"ٹھی .... ٹھیک ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر تیز تیز چلتا ہوا بائیں جانب والے دروازے میں داخل ہو گیا۔

اسی بیڈم روم کے بالکل سامنے دائیں جانب دوسرے بیڈ روم کا دروازہ تھا۔ میں اس میں گھس گئی اور اندر سے چٹخنی لگا لی۔ بس اچانک ہی میرا ارادہ بدل گیا تھا۔ اس کا سبب میرا ہینڈ پرس بھی تھا۔ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اے ایس آئی کشور‘ ہوٹل سے باہر نکلنے والوں کو چیک کر رہا ہو۔ ہینڈ پرس سے وہ مجھے پہچان سکتا تھا۔ وہ ہینڈ پرس خاصا قیمتی تھا۔ لومڑی کی کھال سے بنا ہوا ایسا ہینڈ پرس عام طور پر خواتین کے پاس نہیں ہوتا۔ کشور اس پرس کو بھول نہیں سکتا تھا۔ میں اس امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے وہاں رک گئی تھی۔

لائٹ بجھا کر میں مسہری پر لیٹ گئی۔ پھر نیند نے جلد ہی میری آنکھوں میں جال بننا شروع کر دیا۔

دستک کی زوردار آواز ہی سے میری آنکھ کھلی تھی۔ چند لمحے میں سمجھ ہی نہ سکی‘ کہاں ہوں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں گہری نیند سے اٹھی تھی۔

"دروازہ کھولو۔" ایک سخت آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور دوبارہ دروازہ دھڑدھڑایا جانے لگا۔

"پولیس .... دروازہ کھولو ورنہ توڑ دیا جائے گا۔"

انتقامی کارروائی‘ میں نے سوچا یقیناً پرنس جگدیش ہی نے پولیس کو بلایا تھا۔ وہ مجھ پر کوئی بھی الزام

لگا سکتا تھا کیونکہ میں اس کے سوٹ میں تھی۔ میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر کھڑکی پر پڑی تھی۔ کمرے میں روشنی کے بغیر میں تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھی اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہ ایک نیم تاریک سی گلی تھی۔ کھڑکی سے کچھ ہی فاصلے پر مجھے نکاسی کا پائپ نظر آیا۔ اگر میں اس پائپ تک پہنچ جاتی تو پھر اس کے سہارے میرے لئے گلی میں اترنا مشکل نہ ہوتا۔ ایسا کرنا کم از کم میرے لئے خطرناک نہیں تھا۔ کھڑکی کے نیچے چھوٹی سی گگر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے سینڈل اتار کر ایک ہاتھ میں لے لئے۔ اسی ہاتھ میں ہینڈ پرس بھی تھا پھر میں بڑے اطمینان کے ساتھ کھڑکی پر چڑھ گئی اور ایک پیر نیچے لٹکا دیا۔ دروازے پر اب بھی تیز دستک سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گگر پر پاؤں جما دیا اور پھر دونوں پیر اس گگر پر جمانے میں مجھے چند ہی لمحے لگے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ میں پائپ کی طرف کھسکنے لگی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ جلد ہی میں پائپ تک پہنچ گئی۔ پائپ کے ذریعے مجھے نیچے گلی میں اترتے ہوئے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے سینڈل پہن لئے۔

گلی میں پہنچ کر میں نے ایک نظر اوپر دیکھا۔ کچھ دیر تک پہلے میں جس بیڈ روم میں تھی وہاں اب تک اندھیرا ہی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی پولیس والوں نے دروازہ توڑنے کی دھمکی پر عمل نہیں کیا تھا یا عمل کر رہے تھے۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اس گلی سے ایک سڑک پر نکل آئی۔ یہ نیو مارکیٹ کا عقبی حصہ تھا۔ چاندنی چوک یہاں سے خاصی دور تھا لیکن مجھے پیدل ہی چلنا پڑا۔ آس پاس کوئی سواری نظر نہیں آ رہی تھی۔ معلوم نہیں کدھر سے رات کی گشت پر پہرا دینے والا ایک پولیس والا ادھر نکل آیا۔ وہ اقامتی علاقہ نہیں تھا اور دکانیں بند پڑی تھیں۔ ویسے بھی اس وقت رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ اس وقت اس علاقے میں کسی اکیلی عورت کا مل جانا اس پولیس والے کے لئے حیران کُن ہی رہا ہو گا۔

”اے ٹھہرو!“ پولیس والے نے دور ہی سے ہانک لگائی۔

یہ کم بخت اس وقت کہاں آمرا۔ میں نے سوچا اور رک گئی۔

”کہاں سے آ رہی ہو تم اور کدھر جا رہی ہو اس وقت؟“ پولیس والے نے رعب دار آواز میں قریب آ کر سوال کیا۔

”کیوں‘ کیا رات کے وقت کہیں جانا جرم ہے؟“ مجھے اس کے رعب گانٹھنے پر غصہ آ گیا۔

”زبان چلاتی ہے؟“ وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ”چل تھانے‘ وہاں چل کر تجھے بتاؤں گا کہ کیا جرم ہے کیا نہیں۔“

”زبان سنبھال کر بات کرو۔“ میں بھی برہم ہو کر بولی۔ ”کیوں چلوں میں تمہارے ساتھ تھانے‘ کیا جرم کیا ہے میں نے؟“

شاید آس پاس اور پولیس والے بھی موجود تھے۔ جنہیں بلانے کے لئے اس نے جیب سے سیٹی نکال کر بجانا چاہی‘ مگر اس کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ میرا الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا تھا اور سیٹی دور جا گری تھی۔ دوسرے ہی لمحے میرا جچا تلا ہاتھ اس کی کنپٹی پڑا اور وہ چیخے بغیر لہراتا ہوا زمین پر آ رہا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔ پھر میں نے سڑک عبور کر کے سامنے نظر آنے والی ایک

نیم تاریک گلی کے اندر گھسنے میں دیر نہیں کی۔ گلیوں گلیوں‘ میں جائے واردات سے خاصی دور نکل آئی۔ اب میرے لئے یہی ممکن تھا کہ رات کا بقیہ حصہ راجہ استاد کے گھر گزارتی۔ میں دھرم تلے ہی کے علاقے میں تھی لیکن گلیوں گلیوں آگے بڑھنے کی وجہ سے خاصی دیر لگ گئی۔ میں کھلی سڑک پر چلنے سے اس لئے گریز کر رہی تھی کہ کہیں پھر کوئی پولیس والا نہ مل جائے۔

کوئی پون گھنٹے بعد تقریباً سوا تین بجے مَیں راجہ استاد کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ میں اگر اپنی کوٹھی سے سیدھی ادھر ہی آ گئی ہوتی تو یقیناً اتنا خوار نہ ہونا پڑتا۔

دستک کا جواب فوری طور پر نہیں ملا۔ راجہ استاد یقیناً گہری نیند سو رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد راجہ استاد کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ابے ہمایوں! .... او ہمایوں! .... ابے جا کے دیکھ اس وقت کون آ مرا .... سالے رات کو بھی چین سے نہیں سونے دیتے۔ ابے سنا کہ نہیں یا اپنی بیوی کے کلیجے ہی میں گھسا ہوا ہے۔“

”دیکھتا ہوں استاد! .... ابھی دیکھتا ہوں۔“ جواب میں ہمایوں کی بھرائی ہوئی غنودہ سی آواز آئی۔

اس پر مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی کہ مجبوراً ان لوگوں کی نیند خراب کرنا پڑی۔ راجہ استاد کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ میں اس وقت آ سکتی ہوں۔ ذرا دیر بعد قدموں کی چاپ ابھری اور ہمایوں نے مجھ سے پوچھا‘ کون ہے؟ میں نے جواب میں اپنا نام رانی بتایا تو اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

”ارے آپ؟“ ہمایوں حیرت سے بولا۔

”ہاں۔“ میں اندر داخل ہو گئی اور ہمایوں نے دروازہ بند کر لیا۔ ”معاف کرنا کہ میری وجہ سے تمہاری نیند خراب ہوئی۔“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے معذرت کی۔

”ارے نہیں‘ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ تو گھر ہے آپ کا اور اپنے گھر آدمی کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔“

”یہ تو رانی کی آواز لگ رہی ہے۔“ راجہ استاد چہکا اور پھر میں نے اس کے کمرے کی بتی جلتے دیکھی۔

”تم جا کر سو جاؤ۔“ میں نے ہمایوں سے کہا۔ ”میں راجہ استاد کے کمرے میں جا رہی ہوں۔“

”چائے پینا ہو تو صبیحہ کو جگا دوں؟“ ہمایوں نے دریافت کیا۔

”نہیں اسے سونے دو‘ جگانے کی ضرورت نہیں۔“ میں بولی اور پھر راجہ استاد کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

”آؤ آؤ‘ معاف کرنا میں سمجھا پتا نہیں کون ہے۔ تمہارا تو خیال ہی نہیں آیا۔ ادھر بیٹھو۔“ وہ ایک طرف سرک گیا۔

”معافی تو مجھے مانگنا چاہئے۔ اچھے خاصے سو رہے تھے‘ ناحق جگا دیا۔“ میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ”دراصل ہوا یہ کہ کوٹھی میں آگ لگ گئی اور..........“

"کیا؟" راجہ استاد درمیان میں بول اٹھا۔ "کوٹھی میں آگ لگ گئی؟" اس کے لہجے میں شدید حیرت تھی جیسے میری بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"ہاں استاد!" میں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "میں جب یہاں سے واپس کوٹھی پہنچی تو وہاں آگ لگی ہوئی تھی۔" پھر میں بقیہ تفصیل بتانے لگی، مگر یہ نہیں بتایا کہ آگ لگنے سے پہلے میرے ملازمین نے چمپا کی آواز بھی سنی تھی اور پھر اسے دیکھا بھی تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ "سب کچھ جل گیا اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں وہاں میں کس طرح رات گزار سکتی تھی؟"

"یہ تو بہت برا ہوا رانی!" راجہ استاد نے اظہار افسوس کیا۔ "بالکل نیا فرنیچر تھا، ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا آگ لگی کیسے؟"

"کچھ پتا نہیں چلا .... بہرحال چھوڑو، جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو ازسرنو کوٹھی پر رنگ و روغن کرانا پڑے گا اور فرنیچر بھی خریدنا ہو گا۔"

"میرا جہاں تک خیال ہے، تم دس بجے سے پہلے ہی یہاں سے چلی گئی تھیں، پھر آنے میں اتنی دیر کیسے ہو گئی؟ زیادہ سے زیادہ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک آ سکتی تھیں۔"

"دراصل غلطی مجھ ہی سے ہو گئی۔ میں نے سوچا، تمہیں زحمت نہ دوں اور کسی ہوٹل میں رہ لوں۔" پھر اسے میں نے اب تک پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر دیا اور آخر میں بولی۔ "مگر ہوا وہی، مجھے یہیں آنا پڑا۔ آدمی جو کچھ سوچتا ہے، وہ عموماً ہوتا نہیں۔"

"لگتا ہے رانی، آج کل تمہارا ستارہ گردش میں ہے۔ تمہیں دس لاکھ روپے کے ایک سودے میں ڈز لگ گئی اور اب کوٹھی جل گئی۔" راجہ استاد افسردگی سے بولا۔

"خیر ستارہ تو گردش میں نہیں ہے اس لئے کہ کل ہی میں ریس میں نو لاکھ جیتی ہوں۔ اگر میرا ستارہ گردش میں ہوتا تو ہار گئی ہوتی۔"

اس کے بعد راجہ استاد نے اسی کمرے میں میرے سونے کا بندوبست کر دیا جہاں میں پہلے بھی رہ چکی تھی۔

دوسرے دن تقریباً دوپہر تک میں سوتی رہی اور مجھے کسی نے نہیں جگایا۔ سو کر اٹھی تو دن کا ایک بج چکا تھا۔ صبیحہ نے میرے لئے چائے بنا دی۔ چائے پی کر میں نہانے گھس گئی اور پھر راجہ استاد کے کمرے میں پہنچ گئی، وہ بولا۔ "میں نے صبیحہ سے منع کر دیا تھا رانی کہ تمہیں سونے دے جگائے نہیں۔ جب تک تمہاری کوٹھی کی مرمت نہ ہو جائے تم یہیں رہو۔"

میں نے راجہ استاد کی پیشکش قبول کر لی پھر مجھے خیال آیا کہ میرا دہلی جانا بھی تو ضروری ہے۔ کوٹھی کی مرمت ہونے تک میرا وہاں، یعنی کلکتے میں رکنا ضروری نہیں تھا۔ شہزاد کو میں اپنے ساتھ دہلی لے جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ایسی صورت میں راجہ استاد ہی سے یہ کام لیا جا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے راجہ استاد سے کہا۔ "استاد! تم سے ایک کام ہے۔"

"بولو۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا استاد کہ مجھے کچھ عرصے کے لئے کلکتے سے باہر جانا ہے۔ پہلے میرا ارادہ یہ تھا کہ میری غیر موجودگی میں تم، ہمایوں اور صبیحہ کوٹھی میں رہیں لیکن اب کوٹھی اس قابل نہیں رہی۔ اب تمہیں ایسا کرنا پڑے گا استاد کہ پہلے تو کوٹھی کی صفائی کراؤ، پھر رنگ روغن اور ضروری مرمت، اس کے بعد فرنیچر وغیرہ خرید کر وہاں ڈلواؤ۔ جب یہ سارے کام ہو جائیں تو تم لوگ کوٹھی میں جا کر رہنے لگو۔ کیا اندازہ ہے استاد! کتنا خرچہ آ جائے گا اس میں؟"

"پہلے بھی میں نے ہی کوٹھی کے لئے فرنیچر وغیرہ خریدا تھا۔ تقریباً بیس ہزار لگ گئے تھے۔ اب رنگ روغن اور مرمت بھی کرانا ہے تو میرا خیال ہے، سارا کام پچیس اور تیس ہزار کے درمیان بہت آرام سے ہو جائے گا۔ بہرحال تم فکر نہ کرو، سب کام ہو جائے گا۔ تمہیں جب اور جہاں جانا ہے، اطمینان سے جاؤ۔" راجہ استاد نے ساری ذمے داری قبول کر لی۔

میں نے ہینڈ پرس کھول کر دس دس ہزار کی تین گڈیاں نکالیں اور راجہ استاد کے سامنے رکھ کر بولی۔ "تو پھر یہ تیس ہزار اپنے پاس رکھ لو استاد!"

"نہیں۔" اس نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ "تمہیں باہر جانا ہے اور وہاں پیسوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے اس لئے یہ رقم اپنے پاس ہی رکھو۔ جو خرچہ ہو گا میں اپنے پاس سے کر دوں گا، پھر جب سہولت دیکھو واپس کر دینا۔" اس نے نوٹوں کی گڈیاں اٹھا کر میری طرف بڑھائیں۔

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ چمپا میرے پیچھے لگی ہوئی ہے اور رقم میرے پاس محفوظ نہیں۔ شاید یہی سوچ کر میں نے دس ہزار روپے شہزاد کے حوالے کر دیئے تھے۔

"یوں کرو استاد کہ فی الحال یہ مناسب نہیں کہ میں اتنی بڑی رقم اپنے ساتھ ساتھ لئے پھروں، تم یہ رقم اپنے پاس رکھ لو۔ جب مجھے ضرورت ہو گی، تم سے لے لوں گی۔"

راجہ استاد نے بھی میری بات پر اتفاق کیا۔ میں نے اس کے پاس اسّی ہزار روپے رکھوا دیئے جو خود اُسی سے قرض لئے تھے۔ وہ گڈی جس میں سے سو روپے بطور ٹپ ہوٹل کی ویٹریس کو دیئے تھے میں نے اپنے پاس ہی رکھ لی۔ اتنی تھوڑی رقم اپنے پاس رکھنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ راجہ استاد نے نوٹوں کی گڈیاں اپنی الماری میں رکھ دیں۔

"ارے ہاں، ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔" راجہ استاد نے کہا۔ "آج تمہیں ایک پارٹی کو دس لاکھ روپے بھی تو دینا تھے۔"

"اب نہیں دیئے جا سکتے۔" میں نے ٹھنڈا سانس لے کر جواب دیا۔

"وہ کیوں؟" راجہ استاد نے پوچھا۔

"اس لئے استاد کہ کوٹھی کے ساتھ ہی نو لاکھ روپے کے نوٹ بھی جل گئے۔" میں نے بات بنا دی۔ "تم سے جو ایک لاکھ روپے قرض لے گئی، بس وہ بچ گئے۔ ایک لاکھ میں سے دس ہزار میں نے اپنے مینجر کو دے دیئے، دس ہزار میرے پاس ہیں اور اسّی ہزار تمہارے پاس ابھی رکھوائے ہیں۔ اس رقم کے سوا اب میرے پاس کچھ نہیں بچا۔"

"رانی! کیا خبر کہ تم نے جس الماری میں رقم رکھی ہو' نوٹ اس کے اندر ہونے کی وجہ سے نہ جلے ہوں۔ چل کر ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" راجہ استاد کے لہجے میں امید کی جھلک تھی۔

"رات ہی کو دیکھ چکی ہوں میں۔" اصل بات پر پردہ ڈالنے کی خاطر میں نے کہا۔ کیوں کہ وہ رقم تو مجھ سے منحوس چمپا چھین کر لے گئی تھی۔ راجہ استاد کو میں چمپا کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔

"پھر تو دیوالہ ہی نکل گیا نا! یہ تو تم نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا۔ اب کیا ہو گا رانی! تمہاری تو بات خراب ہو جائے گی۔" راجہ استاد فکرمند نظر آنے لگا۔

"اب جو بھی ہو' دیکھا جائے گا' تم کیوں فکر کرتے ہو استاد! اس پارٹی سے بھی یہ بات چھپی نہیں رہے گی کہ میری کوٹھی میں آگ لگ گئی ہے۔" پھر میں نے استاد کو مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔ "دس لاکھ کی حیثیت کیا ہے' جب چاہوں گی ایک ہی دن میں ریس کھیل کر جیت لوں گی۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" استاد کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ "اگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ نہ دیکھا ہوتا تو شاید اس بات پر یقین نہ کرتا' پھر تو کوئی ایسی فکر کی بات نہیں۔"

"اور کیا' یہی تو میں تمہیں سمجھا رہی تھی۔"

اسی وقت صبیحہ کمرے میں آ گئی اور مجھے مخاطب کیا۔ "دیدی! ناشتہ کرو گی کہ کھانا لاؤں؟"

"ایک بات تو یہ سنو صبیحہ کہ اب تم مجھے دیدی نہیں باجی کہا کرو۔ دوسرے یہ کہ اب کھانے ہی کا وقت ہو گیا' کھانا لے آؤ۔" میں بولی' پھر معلوم کیا۔ "پکایا کیا ہے؟"

"آپ کو دی .... ہاں باجی! ماش کی دال اچھی لگتی تھی نا' وہی پکائی ہے۔ ساتھ میں پاپڑ بھی تل لئے ہیں۔" صبیحہ نے بتایا۔

"بس تو پھر لے آؤ جلدی سے۔"

"میں بھی رانی کے ساتھ ہی کھا لوں گا۔" راجہ استاد نے کہا۔

"تم دونوں میاں بیوی بھی آ جاؤ نا' سب ساتھ ہی کھا لیں گے۔" میں بولی۔

"کہتی ہوں' ان سے۔" صبیحہ نے جواب دیا۔ "روٹیاں تو ڈال لی ہیں مَیں نے۔"

"یہ ان' کون ہے بھئی؟" مَیں نے ہنس کر پوچھا۔

"جب سے اس نے ہمایوں کے ساتھ دو بول پڑھوائے ہیں ہمایوں "ان" ہو گیا ہے۔ میں نے بھی پوچھا تھا تو کہنے لگی کہ پتی کا نام نہیں لیتے۔ جب تک ہمایوں سے شادی نہیں ہوئی تھی' خوب پڑپڑ اس کا نام لیتی تھی۔" صبیحہ کی بجائے راجہ استاد نے ہنستے ہوئے میرے سوال کا جواب دیا۔ صبیحہ شرما کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

پھر ہم سب نے ساتھ کھانا کھایا اور میں وہاں سے کوٹھی کے لئے چل دی۔ کھانے کے دوران ہی میں راجہ استاد نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ روز صبح سے وہ کوٹھی پر کام شروع کرا دے گا۔ میں نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ آج ہی شام کو پانچ بجے تک ارشاد حسین کو بھی آنا تھا۔ میں اسی لئے کوٹھی میں رہنا چاہتی تھی۔ ارشاد حسین کو آ کر یہ بتانا تھا کہ سرفروش تنظیم کے گرفتار شدہ ارکان رہا کر دیئے گئے

یا نہیں' اسی کے بعد ڈیسوزا کو آزاد کرنے کے متعلق سوچا جا سکتا تھا۔

☆======☆======☆

میں کوٹھی پہنچی تو میرے سبھی ملازمین فکرمند تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ان سے صبح آنے کے لئے کہہ گئی تھی اور اب دوپہر ہو چکی تھی۔ کھانے کا بندوبست ان لوگوں نے سرونٹ کوارٹرز ہی میں کر لیا تھا لیکن اب تک کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میرے لئے سب سے زیادہ فکرمند شہزاد اور فاطمہ تھے۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے ان کے چہروں پر بہار آ گئی۔ میں نے لان میں ایک گھنے اور سایہ دار درخت کے نیچے کرسیاں اور ایک میز ڈلوا لی۔ سرونٹ کوارٹرز میں کرسیاں زیادہ اچھی نہیں تھیں مگر وقتی طور پر ان سے کام چلایا جا سکتا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو بتا دیا تھا کہ کھانا کھا کر آئی ہوں' وہ کھا لیں۔ شہزاد سے میں نے کہا تھا کہ تم کھانا کھا کے میرے پاس لان میں آ جانا۔ اسی سے میں نے چائے بھیجنے کے لئے بھی کہہ دیا تھا کیونکہ راجہ استاد کے گھر سے چائے پی کر نہیں آئی تھیں صبیحہ نے چائے کو پوچھا بھی تھا مگر میں نے منع کر دیا تھا۔ مجھے بھی احساس تھا کہ شہزاد اور فاطمہ میری طرف سے فکرمند ہوں گے۔ میں اسی لئے جلد کوٹھی پہنچنا چاہتی تھی۔

جلد ہی رحمت میرے لئے چائے لے کر آ گیا۔

"کیا تم نے اتنی جلدی کھانا کھا لیا؟" میں نے رحمت سے پوچھا۔

"نہیں بیگم صاحبہ! اب کھاؤں گا۔ پہلے آپ کو چائے دینے آ گیا۔" رحمت بولا۔

"اتنی جلدی کے لئے نہیں کہا تھا میں نے۔" میں نے چائے کا کپ میز سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

رحمت چلا گیا تو مَیں بڑے مہاراج اور چمپا کے بارے میں سوچنے لگی۔ انہوں نے مجھے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اگر مجھے دہلی نہ جانا ہوتا تو پہلے ان ہی سے نمٹتی۔ میں' شہزاد کے آنے تک ان ہی کے متعلق سوچتی رہی۔ شہزاد اب تک کھڑا ہی تھا۔ میں نے اس سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

"خاتون! کوٹھی کی صفائی شروع کرا دوں؟" شہزاد نے سامنے والی ایک کرسی سنبھال لی۔

"میں نے اس کا بندوبست کر دیا ہے' کل سے کام شروع ہو جائے گا۔ راجہ استاد کو تو جانتے ہو نا تم! ان ہی کی نگرانی میں کل صبح سے پہلے کوٹھی کی صفائی ہو گی' اس کے بعد جو ضروری مرمت ہے کرائی جائے گی' پھر رنگ روغن ہو گا .... اور ہاں' تم خیال نہ کرنا کہ مَیں نے یہ کام تمہارے سپرد کیوں نہیں کیا۔ تمہیں دراصل میرے ساتھ چلنا ہے' دو ایک دن بعد اور کوٹھی کا کام لمبا ہے' اس میں دیر لگ سکتی ہے۔ مَیں اس وقت تک انتظار نہیں کر سکتی۔"

"کیا کلکتے سے کہیں اور جانا ہے؟" شہزاد نے دریافت کیا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "دہلی چلنا ہے۔"

"دہلی؟" وہ کھِل اٹھا۔ "پھر .... پھر تو مَیں طویل عرصے کے بعد اپنے والدین سے بھی مل لوں گا۔"

"تمہیں اسی لئے تو ساتھ لئے چل رہی ہوں کہ مَیں اس شہر میں اجنبیت محسوس نہ کروں۔"

"کب چلنا ہے خاتون!"

"دو ایک دن لگیں گے ابھی' بتا دوں گی تمہیں۔ بہرحال تم تیاری کر لو پوری۔"

"کپڑے وغیرہ بھی خریدنے ہیں۔" وہ بولا۔ "میرا بھی تو سارا سامان کوٹھی میں جل گیا۔ اس ایک جوڑے کے سوا جو پہنے ہوں' کوئی جوڑا پہننے کو نہیں۔"

ایسا ہی خود میرے ساتھ بھی تھا۔ میں جو ساڑھی باندھے ہوئے تھی بس وہی میرے پاس تھی۔ خریداری مجھے بھی کرنا تھی۔ میں اسی لئے شہزاد کو اپنے ساتھ لے کر کوٹھی سے نکل گئی۔ پہلے میں نے دو سوٹ کیس خریدے اور پھر ساڑھیاں' جوتے وغیرہ لئے۔ شہزاد کو بھی خریداری کرائی کیونکہ اسے بھی میرے ہی ساتھ دہلی چلنا تھا۔ اس وقت تین بج چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ راجہ استاد شام کو چار بجے سے پہلے دھندے پر نہیں جاتا۔ مجھے ساڑھیوں کے بلاؤز سلوانا تھے اور شہزاد کے کپڑے بھی سلنے کو دینا تھے۔ پہلے بھی ایک مرتبہ راجہ استاد کے درزی نے فوری طور پر میرے لئے بلاؤز سی کر دیئے تھے۔ میں اسی لئے چاندنی چوک پہنچ گئی۔ شہزاد کو میں نے راجہ استاد کے ساتھ ناپ کے لئے بھیج دیا' ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ بھی درزی کی دکان دیکھ لے۔ بلاؤز کے ناپ کی خاطر میں نے وہ بلاؤز اتار کر بھیج دیا جو پہنے ہوئے تھی۔ وقتی طور پر صبیحہ کا ایک بلاؤز میں نے پہن لیا تھا۔ اس کا بلاؤز تھوڑا سا چھوٹا تھا اور میں ہلکے سبز رنگ کی جو ساڑھی باندھے ہوئے تھی' اس سے رنگ بھی مختلف تھا' مگر کچھ دیر کو' وہ بھی گھر میں پہنا جا سکتا تھا۔ شہزاد سے میں نے کہہ دیا تھا کہ ناپ دے کر بلاؤز واپس لیتا آئے۔

اس مسئلے سے نمٹ کر جب میں' شہزاد کے ساتھ واپس کوٹھی پہنچی تو چار بج رہے تھے۔ دونوں سوٹ کیس مَیں نے راجہ استاد کے گھر ہی چھوڑ دیئے تھے۔ میرے بلاؤز اور شہزاد کے کپڑے آئندہ روز شام تک سی کر دینے کا درزی نے وعدہ کر لیا تھا۔ اس سے پہلے کپڑے سل کر ملنا ممکن بھی نہیں تھے۔ شہزاد نے بتایا تھا کہ درزی نے اپنے سارے کاریگروں کو اسی کام پر لگا دیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں جو کام تھا' رکوا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس درزی کو راجہ استاد کے علاقے ہی میں رہنا تھا اس لئے پہلے اسی کا کام کرنا تھا۔ کپڑا اور ساڑھیاں خریدنے کے ساتھ ساتھ مَیں نے میک اپ کا سامان بھی خرید لیا تھا۔ یہ سامان بھی لکڑی کی ایک خوبصورت صندوقچی میں رکھ کر اپنے دونوں سوٹ کیسوں کے ساتھ ہی مَیں نے راجہ استاد کے گھر چھوڑ دیا تھا۔ شہزاد کو میں نے بتا دیا تھا کہ گزشتہ رات بھی وہیں سوئی تھی اور آج رات بھی وہیں سونے کا ارادہ تھا۔ شہزاد بہت خوش خوش نظر آ رہا تھا کیونکہ طویل عرصے کے بعد اسے میرے ساتھ دہلی جانے کا موقع مل رہا تھا۔

کوئی آدھا پون گھنٹہ اور گزرا ہو گا کہ ارشاد حسین آ گیا۔ مَیں ابھی تک لان ہی میں تھی اور مجھے ارشاد حسین کی آمد ہی کا انتظار تھا۔ وہ اس وقت سردار ہردیال سنگھ بنا ہوا تھا۔ کوٹھی کی حدود میں قدم رکھتے ہی اس کی نظریں میں نے جلی ہوئی عمارت پر مرتکز دیکھیں پھر وہ میری طرف بڑھ آیا۔

"آیئے سردار جی! تشریف رکھئے۔ کیسے ہیں آپ؟" مَیں نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا۔ اسے سردار جی کہنے کی ایک وجہ رحمت بھی تھا جو جگ اور گلاس لے کر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے پانی لانے کو کہا تھا۔

ارشاد حسین میرے مقابل بیٹھ گیا تو رحمت نے جگ اور دو گلاس میز پر رکھ دیئے۔ مَیں نے اس سے چائے لانے کو بھی کہہ دیا۔

رحمت چلا گیا تو ارشاد حسین نے عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کیا ہوا؟"

"کل آپ کے جانے کے بعد رات کو تقریباً ساڑھے نو دس بجے کے درمیان کوٹھی میں اچانک آگ لگ گئی تھی۔" میں نے بتایا۔

"کوئی زخمی تو نہیں ہوا' آپ کہاں تھیں؟"

"میں ذرا گئی ہوئی تھی' لوٹ کر آئی تو کوٹھی کو جلتے دیکھا۔ زخمی کوئی نہیں ہوا۔ کوٹھی میں آگ لگتے ہی سارے ملازمین باہر نکل آئے تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"کسی نے آگ بجھانے کی کوشش نہیں کی اور آگ کیسے لگ گئی؟"

"یہ تو نہیں معلوم کہ آگ کیسے لگی' ہاں یہ خبر ہے' آگ اتنی تیزی سے پھیلی تھی کہ بجھانا ان کے بس میں نہیں تھا۔" پھر میں نے فائر بریگیڈ کی آمد اور بقیہ واقعات سے مختصراً اسے آگاہ کیا۔

"آپ کا پرس گم ہو جانا جس میں لاکھوں روپے تھے اور پھر اچانک کل ہی آپ کی کوٹھی میں آگ بھڑک اٹھنا مجھے ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ معبلہ! ایسا لگتا ہے کہ کوئی آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔" ارشاد حسین نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

ارشاد حسین کا تعلق بہرحال خفیہ پولیس کے محکمے سے تھا۔ اس نے درست ہی اندازہ لگایا تھا' مگر میں بولی۔ "مجھے بھلا کون نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ کسی کو کیا فائدہ مجھے نقصان پہنچانے سے .... ممکن ہے' یہ محض اتفاقات ہوں۔"

"یہ تو خیر آپ ہی بہتر جان سکتی ہیں' کون آپ کا ایسا دشمن ہو سکتا ہے۔ میرے ذہن میں تو جو بات آئی تھی' کہہ دی۔"

"ہاں ارشاد! وہ بتائیں کہ آپ نے جن ارکان کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا' حکومت نے انہیں چھوڑ دیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہماری تنظیم کے دو ارکان کے سوا بقیہ تمام ارکان کو رہا کیا جا چکا ہے۔ یہ دونوں افراد دہلی میں گرفتار کیے گئے تھے۔ انہیں ایک انگریز کو قتل کرنے کے شبہے میں دہلی پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ نہ ان دونوں نے اعتراف جرم کیا' نہ ان پر قتل کا الزام ثابت ہو سکا' اس کے باوجود وہ جیل میں ہیں۔ آج کے اخبارات میں حکومت کی طرف سے یہ بیان شائع ہوا ہے کہ حکومت ان دونوں کو ڈیسوزا کی رہائی کے بعد چھوڑے گی۔" ارشاد حسین نے تفصیل بیان کی۔

"رہائی کا مطالبہ کرنے کے بعد حکومت کو ان دونوں کی بابت معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک حکومت دشمن زیرِ زمین خفیہ تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایسی صورت میں حکومت کا انہیں رہا نہ کرنا خطرناک بات ہے۔ میرا خیال یہ ہے ارشاد کہ ڈیسوزا کی رہائی کے بعد حکومت اپنے وعدے سے پھر

سکتی ہے۔ اس طرح ان دونوں ہی کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ حکومت ان پر غداری کا الزام لگا کر پھانسی بھی دے سکتی ہے۔ بہرحال ان حالات میں آپ کی تنظیم نے کیا فیصلہ کیا؟"

"آپ نے جو کچھ کہا ہے معبلہ! تقریباً میں بھی تنظیم کے اجلاس میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ تنظیم کی مجلس عاملہ کے بیشتر افراد نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ ہم اپنے رہا نہ کئے جانے والے افراد کی قربانی نہیں دے سکتے۔"

ارشاد حسین کی بات ابھی جاری تھی کہ رحمت چائے لے کر آ گیا۔ ارشاد حسین اسے قریب آتے دیکھ کر ہی خاموش ہو گیا تھا۔

رحمت چائے دے کر چلا گیا تو میں نے پوچھا۔ "پھر کیا فیصلہ ہوا؟"

"یہی کہ ابھی ڈیسوزا کو رہا نہ کیا جائے۔" ارشاد حسین نے مجھے اپنی تنظیم کے فیصلے سے آگاہ کیا' پھر کہنے لگا۔ "کل کے اخبارات میں تنظیم کی طرف سے ایک اور سخت بیان شائع ہو گا۔ اس بیان میں حکومت سے دونوں اراکین کی رہائی کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ واضح الفاظ میں حکومت کو یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ ڈیسوزا کی رہائی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تنظیم کے بقیہ دونوں ارکان کو چھوڑ نہ دیا جائے۔ اس کے لئے حکومت کو صرف ایک دن کی مہلت دی گئی ہے' یعنی اگر آئندہ روز کے اخبارات میں دونوں ارکان کی رہائی کا اعلان نہ کیا گیا اور واقعتاً بھی اس پر عمل نہ ہوا تو ڈیسوزا کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ ٹھیک رہے گا نا؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ جہاں حکومت نے تنظیم کے اتنے اراکین کو رہا کر دیا ہے' وہ بقیہ دونوں ارکان کو بھی چھوڑ ہی دے گی۔ انگریز حکومت دیدہ و دانستہ ہرگز اپنے ایک بڑے انگریز افسر کو موت کے منہ میں نہیں دھکیلے گی۔ آپ کی تنظیم نے موجودہ حالات میں نہایت درست فیصلہ کیا ہے۔" میں نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا' پھر بولی۔ "یہ معاملہ کسی طرح نمٹ جائے تو پھر میں دہلی جانے کا فیصلہ کروں۔"

"کیا اس کے فوراً بعد ہی آپ دہلی چلی جائیں گی معبلہ!" ارشاد حسین نے پوچھا۔

"ہاں اب تک تو یہی ارادہ ہے۔" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"اور یہ جو آپ کی کوٹھی اس حال میں پڑی ہے' اس کا کیا ہو گا؟ کیا یہ آپ کی واپسی تک اسی طرح پڑی رہے گی؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کا بندوبست میں نے کر دیا ہے۔ میری غیر موجودگی میں ضروری مرمت اور رنگ روغن ہو جائے گا۔"

"پھر ایسا ہے معبلہ کہ اب میں پرسوں شام ساڑھے چار اور پانچ بجے کے درمیان آؤں گا جیسے آج آیا ہوں۔ اس وقت تک صورت حال واضح ہو جائے گی۔ پرسوں ہی میں آپ کو یہ بھی بتا دوں گا کہ دہلی میں تنظیم کے ارکان سے رابطے کی صورت کیا ہو۔ اس کے بعد آپ دہلی روانہ ہو سکتی ہیں۔" ارشاد حسین بولا۔

"اچھا ہے' اس طرح مجھے تیاری کے لئے دو دن کی مہلت اور مل جائے گی۔" میں نے اپنے

اطمینان کا اظہار کیا۔

"تنظیم کی جانب سے آپ کو ایک علامتی نشان بھی جاری کر دیا جائے گا۔ اس کا مطلب ہو گا کہ تنظیم کے ارکان آپ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔"

"علامتی نشان' اس سے کیا مراد ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"نکل اسٹیل کی بنی ہوئی ایک انگوٹھی علامتی نشان کے طور پر آپ کو دی جائے گی جس پر انگریزی حرف "ایس" کھدا ہو گا۔ اس انگوٹھی کو آپ اپنی کسی انگلی میں ڈال لیجئے گا۔"

"ہر وقت تو وہ انگوٹھی پہنے رہنا ضروری نہیں ہو گا؟"

"جی نہیں' ہر وقت ضروری نہیں لیکن جب آپ تنظیم کے ارکان سے رابطہ قائم کریں اور ان سے ملاقات ہو تو انگوٹھی پہنے ہوں۔ اس کے علاوہ کوڈ ورڈز' یعنی شناختی الفاظ پرسوں ہی میں آپ کو بتا سکوں گا۔" ارشاد حسین نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ میز پر رکھتے ہوئے مجھ سے رخصت کی اجازت چاہی۔

"ٹھیک ہے ارشاد! پرسوں شام کو میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

پھر ارشاد حسین اٹھ کھڑا ہوا اور میں اسے گیٹ تک چھوڑ کر لوٹ آئی۔ میں کوٹھی میں صرف ارشاد حسین کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ مزید وہاں رکنا میرے لئے ضروری نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے راجہ استاد کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ روانگی سے قبل میں نے شہزاد کو بلایا اور اسے تاکید کی' کسی ملازم سے یہ ذکر نہ کرے کہ وہ میرے ساتھ دہلی جا رہا ہے یا میرا ارادہ کلکتے سے باہر کہیں جانے کا ہے۔

"کل میں کسی بھی وقت ادھر آ جاؤں گی۔" میں نے کہا۔ "وقت کوئی مقرر نہیں۔ ہاں تم کل درزی سے کپڑے ضرور لے آنا' کوشش کرنا کہ وہ پیسے لے لے سلائی کے۔ ویسے وہ انکار ضرور کرے گا۔ میرے بلاؤز راجہ استاد کے گھر پہنچا دینا۔ میں اگر نہ ملوں تو صبیحہ کو دے جانا۔ تم بھی چاہو تو اپنے لئے کوئی سوٹ کیس خرید لو تاکہ اس میں اپنے کپڑے اور زیر استعمال دوسری اشیاء رکھ سکو۔ اس عرصے میں اگر کوئی خاص بات ہو تو تم جانتے ہی ہو کہ میں کہاں ملوں گی۔"

"جی ہاں معلوم ہے خاتون!" شہزاد جواباً بولا۔ "کل شام کو میں کپڑے درزی سے لے لوں گا۔"

شہزاد سے باتیں کرتی ہوئی میں گیٹ تک آ گئی تھی۔ اس سے رخصت ہو کر میں گیٹ سے نکل آئی۔ میرے چہرے پر ماسک موجود تھا۔ شام کا وقت تھا اور دھوپ ڈھل چکی تھی۔ سارا شہر ہی شام کے وقت جیسے اسی علاقے میں امنڈ پڑتا تھا۔ پیادہ رو (فٹ پاتھ) پر خاصی بھیڑ تھی۔ پھر بھی میں پیدل ہی چاندنی چوک کی طرف جا رہی تھی۔ راجہ استاد کے گھر پہنچنے کی مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں اسی لئے بھیڑ بھاڑ سے بچتی ہوئی سبک خرامی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کچھ ہی دیر کے بعد میں کسی خطرے سے دوچار ہو جاؤں گی۔ وہ خطرہ خفیہ پولیس کے اے ایس آئی کشور کی صورت میں اچانک ہی میرے سامنے آ گیا تھا۔ یہ وہی تھا کہ جس سے گزشتہ رات میرا ٹاکرہ ہو چکا تھا۔ وہ میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ میرے چہرے پر وہی ماسک تھا جو

میں کل رات پہنے ہوئی تھی اور جسم پر بھی ہلکے سبز رنگ کی ساڑھی تھی۔ میں نے اس سے کترا کر نکل جانا چاہا' مگر اس نے میرا راستہ روک لیا۔ اس کا دایاں ہاتھ اب بھی پٹی کے سہارے گلے میں پڑا ہوا تھا۔

"کل رات کو تو تم مجھے جُل دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئیں لیکن اس وقت میں تمہیں فرار نہیں ہونے دوں گا۔" وہ مجھے گھور کر بولا۔

"تم ہو کون؟ میں تمہیں نہیں جانتی۔" مَیں نے رکھائی سے کہا۔

اس نے کوئی جواب دیئے بغیر ایک دم میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے لئے کشور نے اپنا بایاں ہاتھ استعمال کیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا لی اور چیخ اٹھی۔ "چھیڑتا ہے مجھے بھرے بازار میں لفنگے کہیں کے۔" پھر میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ جڑ دیا۔ اس سے جان چھڑانے کی تدبیر فوری طور پر میری سمجھ میں آئی تھی۔ میں صنف نازک ہونے کا فائدہ اٹھا سکتی تھیں یہ آزمودہ تدبیر تھی۔

ہمارے گرد لوگوں کی بھیڑ لگنے میں دیر نہیں لگی مگر اس سے پہلے کہ کوئی کشور پر ہاتھ اٹھاتا' اس نے بلند آواز میں کہا۔ "میرا تعلق پولیس سے ہے' یہ عورت ایک مفرور مجرمہ ہے۔"

"جھوٹ بولتا ہے یہ۔" میں بھی زور سے چیخی۔

لوگ بہرحال تذبذب میں پڑ گئے اور کسی طرف سے بھی "مار شالا کو" کی متوقع صدا بلند نہ ہو سکی۔ یہ صورت حال میرے لئے تشویشناک تھی۔ کشور نے پولیس سے اپنا تعلق ظاہر کر کے میری تدبیر کو ناکام بنا دیا تھا۔

میرے نزدیک اب مزید وقت ضائع کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ پھر خود کشور ہی نے مجھے براہ راست قدم اٹھانے کا موقع دے دیا۔ اس نے دوبارہ میری کلائی پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ میری کلائی پکڑ سکتا' میں نے اس کا پنجا گرفت میں لے کر جھٹکا دیا۔ "چٹ" کی آواز کے ساتھ ہی کشور کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے میرا دایاں پاؤں حرکت میں آ گیا۔ اس کی پیشانی پر ٹھوکر پڑی اور وہ چیخ کر لمبا لمبا ہو گیا۔ پیشانی کی کھال پھٹنے سے خون بہنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہو گئے لوگ سراسیمہ ہو کر چھٹنے لگے۔ میں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ کسی نے بھی مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ کشور میرے متعلق لوگوں کو یہ بتا چکا تھا کہ میں ایک مفرور مجرمہ ہوں۔ اے ایس آئی کشور بے ہوش ہو چکا تھا اور میں یہ موقع ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ گزشتہ رات میں نے کشور کی دائیں کلائی توڑ دی تھی اور آج بائیں ہاتھ کا پنجا چٹخا دیا تھا۔ کچھ دن کے لئے یقیناً وہ بالکل بے کار ہو کر رہ گیا تھا۔ سارا فساد میرے لباس اور میرے چہرے پر موجود میک اپ کی وجہ سے تھا۔ نہ میں لباس تبدیل کر سکی تھی نہ میک اپ۔ میری اسی مجبوری نے مجھے اس وقت مشکل میں ڈال دیا تھا۔ میک اپ کا سامان تو میں خرید چکی تھی مگر ایک تو مجھے اتنی مہلت نہیں ملی تھی' دوسرے یہ بھی تھا کہ میں نے خود بھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ کشور مجھ سے ٹکرا جائے گا۔ اب وہ میک اپ میرے لئے محفوظ نہیں تھا۔ میں نے ماسک اپنے چہرے سے اتار دیا اور وگ بھی۔

جائے واردات سے حتی الامکان تیزی کے ساتھ میں دور نکل آئی۔ اب میں چاندنی چوک کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی پھر میں نے راجہ استاد کے گھر پہنچ کر ہی سکون کا سانس لیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو خلاف توقع دیر تک دروازہ نہیں کھلا۔ اس کے بعد جب دروازہ کھلا تو میں صبیحہ پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ذورے تیر رہے تھے' سر کے گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور ساڑھی شکن آلود تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ میری آمد سے قبل کسی اور ہی عالم میں تھی' ایک ایسا عالم کہ جس کے بعد کوئی عالم نہیں ہوتا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی۔ پہلا خیال مجھے یہی آیا کہ شاید ہمایوں آج دھندے پر نہیں گیا۔ میں نے خلاف معمول صبیحہ کو بھی چونکتے دیکھا تھا۔

"آ .... آپ باجی!" صبیحہ سہمی ہوئی سی حیرت زدہ آواز میں بولی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"ہاں میں۔" میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر .... پھر وہ .... وہ کون ہے؟ وہ .... وہ بھی تو آپ ہی ہیں۔" صبیحہ رک رک کر کہنے لگی۔ معلوم نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی اور کیا کہنا چاہتی تھی۔

"کون .... تم کس کی بات کر رہی ہو؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ صبیحہ نے اندر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"مم .... میں آپ .... آپ ہی کی بات کر رہی ہوں۔ آپ تو گھنٹے بھر سے گھر میں ہیں' پھر باہر .... باہر کیسے چلی گئیں؟"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو صبیحہ! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ بتاؤ' کیا ہمایوں بھی گھر میں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"نن .... نہیں تو باجی! .... وہ تو چار .... چار بجے ہی چلے گئے تھے۔" صبیحہ نے جواب دیا۔

صبیحہ کا جواب سن کر میں چونک اٹھی۔ اگر ہمایوں گھر میں نہیں تھا تو پھر صبیحہ اس حالت میں کیوں تھی؟ یہ معمہ میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ میں اس کمرے کی طرف مڑنے لگی جہاں میرا سامان رکھا تھا تو صبیحہ نے عجیب سے انداز میں میرا بازو تھام لیا۔ "کیا بات ہے؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ میرے ہی کمرے میں آرام کرنے کو کہہ رہی تھیں نا!" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔

"یہ کب کہا تھا میں نے تم سے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا اور پھر اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔

وہ مجھے اپنے ساتھ لئے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کمرے میں ایک ہی مسہری تھی جس پر ہمایوں اور صبیحہ سوتے تھے۔ شکن شدہ بستر کی چادر سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے وہاں کوئی لیٹا تھا۔ صبیحہ نے نظریں جھکائے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "ابھی آپ یہیں .... یہیں تو لیٹی تھیں اور

"......... اور آپ نے مجھے .... مجھے بھی اپنے ہی پاس لٹایا تھا .... اس .... اس کے بعد.........."

صبیحہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تو میں نے سوال کیا۔ "اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"مم .... مجھے شرم .... شرم آ رہی ہے بتاتے ہوئے۔" وہ واقعی شرما گئی۔ پھر جانے اسے کیا ہوا کہ وہ میرے سینے سے آ لگی۔ اب وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔

مجھے کسی گڑبڑ کا اندازہ ہو گیا تھا مگر اس کی نوعیت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے صبیحہ کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟"

وہ مجھ سے الگ ہونے کی بجائے اور لپٹ گئی۔ اس کے لمس میں گرم جوشی اور خود سپردگی سی تھی۔

"تمہیں آخر کیا ہو گیا ہے صبیحہ! کچھ بتاؤ نا؟" میں نے خود اسے شانوں سے پکڑ کر الگ کیا۔

"کچھ باتیں کہنے .... کہنے کی نہیں ہوتیں۔ آپ .... آپ ہی تو یہ .... یہ کہہ رہی تھیں۔" اس کی نظریں اب تک جھکی ہوئی تھیں۔

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کر مسہری پر بٹھا دیا اور پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ صبیحہ نے ایک بار پھر ایسی حرکت کی کہ میں چکرا کے رہ گئی۔ وہ میری گود میں لیٹ گئی تھی اور آنکھیں بند کر کے لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔ اس کی حالت کسی ایسی عورت کی سی تھی جو قرب کی آرزو میں اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے لگتی ہے' مگر میں تو خود اسی کی طرح ایک عورت تھی۔ پھر یہ کیا قصہ تھا؟ صبیحہ کو کیا ہو گیا تھا؟ اس کی حالت کچھ ایسی تھی ؎

یوں گرا جاتا ہے مستی میں کوئی
کہ اٹھا لے کوئی ساغر کی طرح

"صبیحہ!" میں نے اسے آواز دی۔

"ہوں۔" اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے ابھری' آنکھیں اب بھی بند ہی تھیں پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ "مجھے .... مجھے سمیٹ لیں ورنہ میں .... میں بکھر جاؤں گی۔"

"اٹھ کر بیٹھ جاؤ صبیحہ!" میری آواز میں سختی آ گئی۔ میں اسے اس کیفیت سے نکالنا چاہتی تھی۔ اس کی یہی صورت تھی کہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آتی۔ اسی کے بعد مجھے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ میری آمد سے قبل اسے کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

میری سخت آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر مجھے شدید حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔

"اٹھو اور اپنی حالت درست کرو۔" میرے لہجے کی سختی برقرار تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی جن میں ملال' اداسی اور شکوہ سبھی کچھ تھا۔

"اگر .... اگر اسی .... اسی طرح ٹھکرانا تھا رانی تو .... تو پھر تم مجھے ایسی .... ایسی

دنیا میں کیوں لے گئی تھیں کہ جہاں میں .... میں سب کچھ بھول گئی۔ یہ .... یہ بھی کہ .... کہ میری دیدی ہو .... تم نے کیوں .... کیوں کہا تھا مجھ سے کہ مجھے چاہتی ہو اور .... اور میں تمہیں اپنی دیدی نہ سمجھوں؟ بولو!" صبیحہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ "پھر .... پھر جب میں نے تمہاری بات مان لی اور خود کو .... تمہارے سپرد کر دیا اور تمہارے کہنے پر سب کچھ بھلا دیا تو .... تو اب .... اب یہ بے رخی کیسی؟ .... تم نے مجھ سے کیوں کہا تھا کہ میں تمہیں رانی نہ کہوں' اپنا راجہ کہوں؟ .... تم اس کے بعد راجہ بن گئیں اور .... اور مجھے اپنی رانی بنا لیا پھر .... دروازے پر دستک ہوئی تو میں تمہیں یہیں چھوڑ کر دیکھنے چلی گئی کہ کون آیا ہے .... نہ جانے تم کس طرح میرے کمرے سے نکل کر گھر کے باہر چلی گئیں اور تمہاری آواز سن کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ اب .... اب تم انجان بن رہی ہو' کیوں؟ .... آخر کیوں؟"

صبیحہ سے یہ سب کچھ سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ یقیناً وہ کسی زبردست فریب کا شکار ہوئی تھی' مگر اسے یہ فریب دینے والا تھا کون؟ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی' حیران کن ہونے کے باوجود جھوٹ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ مجھ سے "تم" کہتی اور ایسی باتیں کرتی جو کر چکی تھی۔ مجھ سے پہلے یقیناً کوئی اس کی خواب گاہ میں تھا جس نے اسے کیف و بے خودی اور لذت و سرشاری کی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ صبیحہ کا کہنا تھا کہ وہ میں ہی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ کسی نے رانی بن کر اسے فریب دیا تھا۔ اسے یہ فریب دینے والی میرے نزدیک صرف ایک ہی ہستی ہو سکتی تھی۔ مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا' اگر واقعی ایسا ہی تھا تو یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ شیطانی قوتوں کی مالک چھپا نے یہ نیا کھیل کھیل کر مجھے ایک نئے ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں اس سلسلے میں صبیحہ کو کچھ بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ میں اسے بھلا چھپا کے بارے میں کیا بتاتی؟ اگر بتا بھی دیتی تو وہ میری بات پر کیسے یقین کر لیتی؟ آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے کو آخر کون جھٹلا سکتا ہے؟ پھر وہ تو دیکھنے اور سننے کی حد سے بھی آگے کی بات تھی۔ میری نظر میں صبیحہ قطعی بے قصور تھی۔

"اب چپ کیوں ہو؟ بولو .... میری بات کا جواب دو۔" صبیحہ نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اسے خود سے قریب کر لیا اور اس کے آنسو اپنی ساڑھی کے پلو سے پونچھنے لگی۔ "غلطی میری ہے' تمہاری نہیں۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

وہ سسک اٹھی اور میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اب تو تم .... تم مجھے نہیں ڈانٹو گی؟ اسی طرح پیار کرو گی نا جیسے .... جیسے کچھ دیر پہلے کر رہی تھیں؟ .... بولو .... کرو گی نا پیار؟ .... تمہیں مجھ سے محبت ہے نا؟ .... تم ہمایوں سے بھی زیادہ مجھے چاہتی ہو نا؟"

"ہاں .... ہاں صبیحہ! میں .... میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" یہ الفاظ ادا کرنے سے پہلے

مجھے ان کی وحشت خیزی کا علم نہیں تھا۔

صبیحہ نے میرے لب و رخسار پر بوسوں کی بارش کر دی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی گرم جوشی کا جواب دینے لگی۔ میں نے اپنے حواس پر پہلی مرتبہ ایک نشہ سا طاری ہوتے محسوس کیا۔ میرے اندر جمی ہوئی برف جیسے پگھلنے لگی۔ میرے وجود کی گہرائی میں ایک تلاطم سا برپا ہو گیا۔ میں جیسے اپنے بس میں نہیں رہی۔ خوشبو کے دائرے میرے اندر پھیلنے اور سمٹنے لگے۔ یہی وہ لمحے تھے کہ جب میرے وجود سے ایک سرگوشی سی ابھری' معبلہ! ہوش میں آ' اپنی دشمن کے سحر کا شکار نہ ہو۔ یہ سرگوشی خود میری اپنی ہی سرگوشی تھی۔ مجھے خود اپنی ہی آواز سنائی دی تھی۔

"تو مجھ پر سحر کر دیا گیا ہے۔" میں بڑبڑائی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اٹھ کر کھڑے ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔ میں یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ میری ہی طرح صبیحہ بھی سحر کا شکار ہے۔ میں نے اسے خود سے الگ کر دیا تھا۔ میرے وجود میں جو ایک نشہ سا تیر رہا تھا' میں اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے بے ترتیب لباس کو درست کر لیا۔

اسی وقت میری سماعت سے چمپا کا زہریلا قہقہہ ٹکرایا' پھر میں نے اس کی آواز سنی۔ "معبلہ! تو آج میرے سحر سے بچ گئی' مگر کب تک بچے گی؟ میں اب جا رہی ہوں لیکن جلد ہی پھر لوٹ کر آؤں گی۔ تو مجھے یہیں اسی گھر میں دیکھے گی۔ معبلہ! تو دیکھے گی کہ میں تجھے کس طرح ذلیل و رسوا کرتی ہوں .... تجھے خود اپنے وجود سے گھن آنے لگے گی۔"

چمپا مجھے نظر نہیں آئی تھی' میں نے صرف اس کی آواز سنی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میرے وہاں آنے کے باوجود وہاں سے گئی نہیں تھی۔ اس نے صبیحہ کو اپنے سحر میں لے رکھا تھا پھر اسے مجھ پر بھی قابو حاصل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں' صبیحہ کے ساتھ جس حالت میں تھی' اس کا تصور بھی میرے لئے سوہان روح تھا۔

میرے وجود کی گہرائی میں جو تلاطم برپا ہوا تھا اس کی تپش مجھے اب تک جھلسا رہی تھی۔ صبیحہ کسی کھلی کتاب کی طرح مسہری پر پڑی تھی' اس کے تنفس کی رفتار ابھی تک معمول پر نہیں آ سکی تھی۔ چمپا کے وہاں سے جاتے ہی چند لمحوں کے بعد میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ یوں جیسے سوتے سوتے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی ہو۔ اسے بھی شاید اپنی حالت کا اندازہ ہو گیا پھر وہ جلدی جلدی جیسے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹنے لگی .... جب وہ مسہری سے اٹھی تو اس کی نظروں میں عجیب سا حجاب تھا۔

"میں نہانے جا رہی ہوں صبیحہ!" یہ کہہ کر میں اس کے کمرے سے نکل آئی۔

دیر تک میرے جسم پر ٹھنڈا پانی پڑتا رہا تو میری حالت اعتدال پر آئی۔ میں نے نہا کر ایک نئی ساڑھی باندھ لی تھی۔ صبیحہ کی حالت بھی یقیناً مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ میں نے اسے بھی نہانے کا مشورہ دیا جسے اس نے فوراً قبول کر لیا۔ صبیحہ تو غسل خانے میں گھس گئی اور میں' چمپا کے بارے میں سوچنے لگی۔ اب سے پہلے پہاڑوں پر جو میرے اوپر ساحرانہ حملے ہوئے تھے' ان کی نوعیت تازہ ترین حملے سے قطعی مختلف تھی۔ یہ تو معاملہ ہی دوسرا تھا جس کا تعلق میرے وجود کے فطری تقاضوں سے تھا۔ اب سے

پہلے کبھی میں نے انہیں یوں محسوس نہیں کیا تھا' اس طرح کبھی ایسے جذبوں کی گرفت میں نہیں آئی تھی' یوں کبھی بے بس نہیں ہوئی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے وہ الفاظ بھی میری سماعت میں گونج رہے تھے جو چمپا نے جاتے جاتے کہے تھے۔ اس نے مجھے ذلیل و رسوا کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میں قطعی بے خبر تھی کہ وہ اپنے الفاظ کو کس طرح عملی جامہ پہنانے والی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اتنا یقین ضرور تھا کہ چمپا کا کوئی سحر مجھ پر کارگر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

صبیحہ نہا کر آ گئی تو میں نے اس سے چائے کے لئے کہا اور باورچی خانے کے سامنے مونڈھا ڈال کر بیٹھ گئی۔ یہ مونڈھا میں' راجہ استاد کے کمرے سے اٹھا کر لائی تھی۔ صبیحہ غسل کر کے کچھ اور نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ وہ مجھ سے نظریں ملاتے ہوئے گریز کر رہی ہے۔ شاید اس کا سبب وہی بے حجابانہ لمحات تھے جو اس نے چمپا اور میرے ساتھ گزارے تھے۔ اب وہ باورچی خانے میں میرے لئے چائے بنا رہی تھی۔ اس کی حالت کسی ایسی نئی نویلی دلہن کی سی تھی جو اپنے دولہا کے ساتھ پہلی رات گزارنے کے بعد شرمائی شرمائی سی رہتی ہے۔ بلاشبہ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی نے اسے اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ اس کے جمال کی دوشیزگی کچھ اور نکھر آئی تھی جب وہ میرے لئے چائے بنا کر لائی تو اس کی چشم خمار سرور میں محسوس کی' بدن کی مینا اور لبوں کے ساغر اسے کوئی چلتا پھرتا میخانہ ظاہر کر رہے تھے۔ اب سے پہلے کبھی میں نے اسے ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سرخ و سفید رنگت جیسے لباس سے باہر چھلکی پڑ رہی تھی۔ ہمایوں یقیناً خوش نصیب تھا کہ اسے صبیحہ جیسی محبوبہ مل گئی تھی۔

مجھے چائے دے کر صبیحہ رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ اس عرصے میں صبیحہ اور میرے درمیان صرف چند جملوں ہی کا تبادلہ ہوا۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ شرما رہی تھی۔

اس روز راجہ استاد اور ہمایوں خلاف معمول جلد ہی گھر لوٹ آئے۔ ہم سب نے ساتھ کھانا کھایا۔

پھر چائے پیتے ہوئے مجھے راجہ استاد نے بتایا۔ "میں نے ایک ٹھیکیدار سے بات کر لی ہے رانی! کل سے وہ تمہاری کوٹھی پر کام شروع کر دے گا۔ کل صبح نو بجے وہ اپنے آدمیوں کو لے کر میرے پاس پہنچ جائے گا' چاہو تو تم بھی ساتھ چلنا۔"

ہمایوں بھی راجہ استاد کے کمرے ہی میں ہمارے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ میں نے جلد ہی یہ بات محسوس کر لی کہ وہ بار بار چور نظروں سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ شاید کوئی عورت کسی مرد کی نظروں کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتی۔ سو میں نے بھی اس کی نظریں پہچان لیں۔ پہلی بار جب اس نے مجھے دیکھا تھا تو نظروں میں یہی طلب تھی۔ پھر جب اسے میرے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ میں' بمبئی کی رانی ہوں تو پھر اس کی نظریں بدل گئی تھیں۔ میرے لئے ہمایوں کی نظروں سے عزت و احترام جھلکنے لگا تھا۔ معلوم نہیں اتنے دن کے بعد آج اسے کیا ہو گیا تھا' میں اس پر حیرت زدہ تھی پھر اس نے براہ راست میری طرف دیکھتے ہوئے تعریف بھی کر دی۔ "گلابی ساڑھی میں آپ خود بھی گلاب کی کلی لگ رہی ہیں۔"

"ابے لونڈے! ابھی دو دن تیری شادی کو نہیں ہوئے کہ سالی پر بھی دل مچلنے لگا۔" راجہ استاد ہنس کر بولا۔ صبیحہ مجھے دیدی کہتی تھی اسی رشتے سے راجہ استاد نے مجھے ہمایوں کی سالی بنا دیا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ خیال رکھا کر کہ تیری سالی کوئی معمولی عورت نہیں، بمبئی کی رانی ہے۔"

بات ہنسی میں ٹل گئی لیکن ہمایوں کے دیکھنے کا انداز نہیں بدلا۔ چائے پینے کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ہمایوں اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

اس گھر میں مجھے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا اس لئے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنا مَیں نے چھوڑ دیا تھا۔ اس رات بھی سونے سے پہلے مَیں نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا اور مَیں سو گئی۔

معلوم نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مجھے معاً کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی۔ اسی کے ساتھ میری سماعت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ نہ جانے کیوں خود بخود میرے اندر خوابیدہ پُراسرار قوت بیدار ہو گئی تھی۔ اسی کے ساتھ میں چونک اٹھی۔ مَیں نے ہمایوں کی آواز سنی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مگر رانی! یہاں تو صبیحہ بھی ہے۔ تمہارے کمرے میں چلتے ہیں۔"

"میں اپنے کمرے میں چلتی ہوں، تم آ جاؤ۔" مَیں نے خود اپنی ہی آواز سنی تو چونک اٹھی۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ شیطانی قوتوں کی مالک چمپا، ہمایوں کو دھوکہ دے کر میرے کمرے میں بھیج رہی تھی۔ وہ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ مَیں ابھی تک گہری نیند سو رہی ہوں۔ چند لمحے بعد ہی مجھے اپنے ذہن پر نیند کا غلبہ محسوس ہوا۔ مَیں اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہی تھیں یقیناً چمپا مجھے اپنے سحر میں لے کر بے بس کرنا چاہتی تھی۔

"میں .... میں نہیں سوؤں گی .... مجھے نہیں سونا چاہئے۔" مَیں بڑبڑائی۔ اپنے آپ سے لڑنے کی کوشش کے باوجود میرا ذہن غنودہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی پلکیں بھاری محسوس ہو رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا کہ مَیں اپنی آنکھیں بند کر لوں، مگر مَیں نے ایسا نہیں کیا۔

مَیں اگر اٹھ کر بیٹھ جاؤں تو شاید نیند نہ آئے۔ مَیں نے یہ سوچ کر اٹھنا چاہا، مگر تھوڑی سی اٹھ کر ہی دوبارہ لیٹ گئی۔ اسی وقت مجھے ایک ہیولا اپنے کمرے کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ آنے والا دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ ہمایوں ہی ہو سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ میرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"رانی!" آنے والے کی سرگوشی ابھری۔ یہ آواز ہمایوں ہی کی تھی۔ وہ میرے قریب لیٹ گیا تھا۔ میں چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف کروٹ لے کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے بولا۔ "تم بھی ادھر کروٹ لے لو نا!" اس نے خود ہی مجھے کروٹ دلا دی۔ اب اس کے گرم سانسوں کی تپش مَیں اپنے لب و رخسار پر محسوس کر رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ "یقین کرو میری جان! اگر تم خود میرے کمرے میں نہ آ گئی ہوتیں تو مَیں تمہارے قرب کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔" اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

کوشش کے باوجود ذہن پر نیند غالب تھی۔ مَیں جیسے آدھی جاگ رہی تھی آدھی سو رہی تھی۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ہمایوں کی آواز خواب میں سن رہی ہوں۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھوں کا لمس میرے اندر سوئی ہوئی عورت کو بیدار کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ مَیں نے بمشکل اس کا ہاتھ جھٹکنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اپنی دانست میں پوری قوت سے چیخ اٹھی۔ "نن .... ناہیں .... نہیں!" مَیں اس کا ہاتھ اپنے جسم کے ایک مخصوص حصے سے جھٹکنے میں کامیاب ہو گئی۔ پوری قوت صرف کرنے کے باوجود میرے منہ سے بس دھیمی سی آواز نکل سکی تھی۔

"یہ کیا رانی! تم نے تو مجھے خود ہی اپنے کمرے میں بلایا تھا۔" ہمایوں کی آواز میں حیرت تھی۔

"جا .... جاؤ .... چا .... چلے جاؤ یہاں سے۔" میں نے پھر گویا چیخ کر کہنا چاہا۔ اس مرتبہ بھی میری آواز دھیمی ہی تھی۔

"نہیں، مَیں نہیں جاؤں گا۔" اس نے یہ کہتے ہوئے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور مجھے خود سے قریب کرنے لگا۔

اسی وقت اچانک کمرے میں روشنی ہو گئی۔ اسی کے ساتھ میرے اعصاب پر چھناکا سا ہوا۔ میری نظر راجہ استاد اور صبیحہ پر پڑی تھی۔ معلوم نہیں وہ دونوں کب دبے پاؤں کمرے میں آ گئے تھے۔

"دیکھ لیں بابا! مَیں آپ سے غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔" صبیحہ، راجہ استاد سے مخاطب تھی۔ "یہ مجھے چھوڑ کر یہاں عیش کر رہا ہے، رانی کے ساتھ۔"

"ہمایوں!" راجہ استاد کی سخت آواز آئی۔ "شرم کر کہ اب یہ تیری داشتہ نہیں بیوی ہے۔"

راجہ استاد کی آواز سنتے ہی ہمایوں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ صبیحہ کو کیا سوجھی کہ اس نے جھپٹ کر ہمایوں کا گریبان پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتی ہوئی وہاں سے لے گئی۔ ساتھ ہی وہ اسے بُرا بھلا بھی کہتی جا رہی تھی۔ "تجھے شرم نہیں آتی آوارہ کہیں کے۔ کیا مَیں تیرے لئے کافی نہیں؟ .... میری موجودگی میں .... اس گھر میں موجود ہوتے تیری یہ ہمت کیسے ہوئی؟"

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا رانی!" راجہ استاد مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ وہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ تمہاری آنکھیں لاکھ بند سہی مگر میں جانتا ہوں کہ تم جاگ رہی ہو اور مجھے یہ بھی معلوم ہے، اگر تم اس کی حوصلہ افزائی نہ کرتیں تو ہرگز وہ تمہارے کمرے میں نہ آتا۔ صبیحہ نے مجھے بتایا ہے کہ تم خود پہلے اس کے کمرے میں گئی تھیں۔ اس وقت صبیحہ کی آنکھ کھل گئی تھی جب تم اور ہمایوں باتیں کر رہے تھے۔ تم نے جب پہل کی تھی تو ہمایوں نے کہا تھا، یہاں تو صبیحہ بھی ہے۔ پھر تم اس سے یہ کہہ کر چلی آئی تھیں کہ مَیں اپنے کمرے میں چلتی ہوں، تم آ جاؤ۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کے باوجود صبیحہ نے تمہیں تمہاری آواز سے پہچان لیا تھا۔ مَیں جا رہا ہوں رانی! مَیں سمجھ چکا ہوں کہ اس وقت تم دانستہ سوتی بنی ہوئی ہو۔ اس لئے شاید کہ کل صبح میرے استفسار پر تم یہ کہہ سکو، تمہیں کچھ خبر نہیں، تم تو گہری نیند سو رہی تھیں۔"

حقیقت بھی یہی تھی کہ میں اس وقت انتہائی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ راجہ استاد سے نظریں ملا سکتی۔ چمپا نے واقعی اپنی دھمکی کے مطابق مجھے ذلیل و رسوا کر دیا

تھا۔ مَیں خود اپنی ہی نظر میں گر گئی تھی۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ کمرے کی بتی بجھ گئی ہو۔ پھر مجھے دور ہوتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ مَیں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو راجہ استاد میرے کمرے سے نکل کر جا رہا تھا۔ اسے مَیں نے اس کے دراز قد سے پہچانا تھا۔ مَیں نے سکون کا سانس لیا اور سوچنے لگی کہ کل صبح ان لوگوں کا سامنا کیسے کر سکوں گی؟ چمپا نے مجھے ان سبھی کی نظر سے گرا دیا تھا۔ مَیں سمجھ رہی تھی کہ شاید ذلت و رسوائی ختم ہو گئی' مگر ایسا نہیں تھا۔ اس رات کے بطن میں ابھی میرے لئے اور بہت کچھ تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مَیں نے صحن کی طرف سے سرگوشیاں سنیں پھر پہلے ہی کی طرح دوبارہ میری سماعت کا دائرہ خود بخود وسیع ہوتا گیا۔ اب میں وہ سرگوشیاں واضح طور پر سن رہی تھی۔

"رانی! یہ .... یہ تم کیا کر رہی ہو رانی!" یہ راجہ استاد کی احتجاجی آواز تھی۔ "مجھے .... مجھے یہ شوق نہیں ہے۔"

"میں جانتی ہوں استاد!" یہ خود میری اپنی آواز تھی۔ "میں آج رات تمہارا یہی کفر تو توڑنا چاہتی ہوں۔"

اب میں چمپا کا خطرناک کھیل اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ ہمایوں کے کمرے میں بھی وہی گئی تھی اور پھر اسے فریب دے کر میرے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ اب وہ راجہ استاد کے کمرے میں تھی۔ وہ مجھے اس طرح راجہ استاد' ہمایوں اور صبیحہ سبھی کی نظر سے گرانا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ مجھے ایک بدکردار جنس زدہ عورت ہی سمجھتے۔

"میرے راجہ!" مجھے پھر اپنی ہی آواز سنائی دی۔

"میری رانی' میری زندگی!" جواب میں راجہ استاد کی جذبات سے مرتعش آواز ابھری۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ چمپا نے اسے اپنی شیطانی قوتوں کا اسیر کر لیا تھا۔ راجہ استاد نے یقیناً ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ چمپا جیسی پُراسرار قوتوں کی مالک عورت کے سامنے بھلا راجہ کی حیثیت بھی کیا تھی۔ راجہ استاد کی کانپتی ہوئی آواز پھر آنے لگی۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا میری رانی کہ .... کہ تُو مجھ پر اتنی مہربان بھی ہو سکتی ہے۔ تجھے پا کر میں .... میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔"

پھر مجھے ان دونوں کے تیز تیز سانس لینے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ چمپا نے شاید راجہ استاد کا کفر توڑ دیا تھا۔ اب شاید وہ دونوں ان لمحات سے گزر رہے تھے کہ جب کچھ کہنے یا سننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ذرا ہی دیر گزری ہو گی کہ میں نے ہمایوں کی بلند اور تیز آواز سنی۔ "استاد! کیا اب تمہیں شرم نہیں آ رہی؟"

"آ جا' تُو بھی آ جا ہمایوں! استاد سے آخر تیرا کیا پردہ؟" چمپا میری آواز میں بولی۔

"یہ تو کیا کہہ رہی ہے رانی! یہ کس طرح ہو سکتا ہے' میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ تُو میرے سامنے ہمایوں کا پہلو گرم کرے؟" راجہ استاد کی آواز میں احتجاج تھا۔

"راجہ استاد! مَیں صرف تمہاری ہی ملکیت تو نہیں' ہمایوں بھی تو مجھ پر مرتا ہے۔ اگر یہ بھی اپنی آرزو پوری کر لے تو کیا حرج ہے؟"

"لیکن یہ شادی شدہ ہے رانی!"

"مجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں۔" چمپا آہستہ سے ہنسی۔ "آ ہمایوں! استاد سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

"رانی .... میری جان!" ہمایوں کی آواز آئی۔

چمپا' راجہ استاد کو سیراب کر کے اب ہمایوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا رہی تھی۔ مَیں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ اب راجہ استاد' چمپا یا ہمایوں کسی کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ زندگی بھر شاید میں نے اتنی ذلت کبھی محسوس نہ کی ہو۔ چمپا نے مجھے ایک فاحشہ بنا دیا تھا' بے عزت کر دیا تھا۔ اس گھر کا کوئی فرد ایسا نہیں بچا تھا جس سے اس لعنتی عورت نے جسمانی تعلق استوار نہ کیا ہو۔ نہ اس نے صبیحہ کو چھوڑا تھا' نہ ہمایوں اور راجہ استاد کو بخشا تھا۔

اچانک مجھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی تو میں چونک اٹھی۔ میری نظر دروازے کی طرف اٹھی تو ایک ہیولا نظر آیا۔ وہ ہیولا صبیحہ کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔ پنجوں کے بل چلتی ہوئی وہ میرے بستر کے قریب آئی اور پھر میرے قریب لیٹ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"رانی!" وہ جیسے میرے کان کے پاس منہ لا کر گنگنائی۔

"ہوں' کیا بات ہے؟ .... تم ابھی تک کیسے جاگ رہی ہو؟ .... جاؤ .... سو جاؤ جا کر۔" میں نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے کہا۔

مجھے یاد آیا کہ جب چمپا نے ہمایوں کو بہکا کر میرے کمرے میں بھیجا تھا تو صبیحہ' راجہ استاد کو ساتھ لے کر میرے کمرے میں آ گئی تھی۔ پھر ہمایوں کو مجبوراً میرے کمرے سے نکلنا پڑا تھا۔ مجھ سے جذبہ رقابت کے باوجود صبیحہ اب کس طرح میرے پاس آ گئی تھی' یہ بات میرے لئے حیران کن ہی تھی۔ میں نے جب اس سلسلے میں صبیحہ سے سوال کیا تو مجھے مزید حیرانی ہوئی۔

"کیا .... کیا ہمایوں تمہارے پاس بھی آیا تھا رانی!" صبیحہ کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

مَیں نے اسے پورا واقعہ یاد دلایا' مگر اسے کچھ بھی یاد نہ تھا۔ اس سے مَیں نے یہی قیاس کیا کہ صبیحہ اس وقت چمپا کے سحر کا شکار تھی جب راجہ استاد کو ساتھ لے کر میرے کمرے میں آئی تھی۔ بات کو ٹالنے کی غرض سے مَیں نے صبیحہ سے کہہ دیا۔ "شاید مَیں نے کوئی خواب دیکھا ہو گا جسے حقیقت سمجھ رہی ہوں۔"

"ہاں' ایسا ہی ہو گا رانی! کیونکہ رات کو سونے کے بعد ابھی کچھ دیر پہلے ہی میری آنکھ کھلی تھی۔"

"مگر تم میرے پاس کیوں آ گئیں؟"

جواب میں صبیحہ نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کے جوان جسم کا قرب مجھے شام کی طرح پھر بہکنے پر آمادہ کرنے لگا' مگر میں نے خود پر قابو پا لیا۔

"تم .... تم چلی جاؤ صبیحہ!" میں نے بمشکل کہا۔ "ہمایوں تمہیں جب اپنے کمرے میں نہیں پائے گا تو یہ .... یہ اچھا نہیں ہو گا۔" مَیں نے اپنے گلے سے اس کی بانہیں نکال دیں۔

صبیحہ کو سمجھا بجھا کر میں نے واپس جانے پر آمادہ کر ہی لیا۔ وہ چلی گئی تو میں سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے اپنے ذہن کو پُرسکون کرنے میں بڑی دشواری ہوئی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لی تھی کہ جو کچھ ہوا ہے' اس میں بہرحال میرا کوئی قصور نہیں۔ صبح جو ہو گا' دیکھا جائے گا۔

دوسرے دن صبح میں دیر سے سو کر اٹھی۔ میری آنکھ خود نہیں کھلی تھی۔ میں نے اپنے سانسوں سے کسی اور کے سانسوں کو الجھتے محسوس کیا تھا اور پھر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ اپنے اوپر میں نے راجہ استاد کو جھکے دیکھا تھا اور میں گھبرا کر اٹھ کے بیٹھ گئی تھی۔

"گھبراؤ مت میری جان! صبیحہ ابھی سو رہی ہے اور ہمایوں جاگ گیا تو اس سے کیا پردہ؟" راجہ استاد نے مجھ سے کبھی ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ مجھے اسی لئے رنج سا ہوا۔ گزشتہ رات خبیث چمپا نے اس گھر میں جو شرمناک کھیل کھیلا تھا' یہ اسی کا ردعمل تھا۔ یقیناً اس میں راجہ استاد کا کوئی قصور نہیں تھا۔

"رانی! تم شاید یقین نہ کرو کہ میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت تم ہی ہو۔ بچپن ہی سے میں غلط راہ پر لگ گیا تھا۔ کل رات پہلی مرتبہ مجھے فطری اور غیر فطری فرق معلوم ہوا۔ میں تمہارا احسان مند ہوں رانی کہ مجھے تم نے اپنے قرب پر مجبور کیا' مگر.......... مگر مجھے تم سے ایک شکایت بھی ہے۔ تمہیں ہمایوں کو اپنے قریب نہیں آنے دینا چاہئے تھا۔ رانی! کیا.......... کیا یہ ممکن نہیں کہ تم صرف اور صرف میری ہی رہو؟ ہمایوں تو یوں بھی شادی شدہ ہے۔"

میں نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ راجہ استاد کی بات سنی۔ چمپا کے نئے ساحرانہ حربے نے مجھے سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں راجہ استاد سے کہوں تو کیا کہوں؟ وہ بھلا کس طرح میری اس بات پر یقین کر لیتا کہ گزشتہ رات اس کا پہلو گرم کرنے والی میں نہیں' کوئی اور تھی۔ یہی سوچ کر میں اس سے کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے نکل آئی۔ پھر جب تک میں ضروریات سے فارغ ہو کر تیار ہوئی تو ہمایوں اور صبیحہ بھی جاگ چکے تھے۔ ہمایوں میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔ اس پر مجھے بڑی خجالت سی محسوس ہوئی تھی' مگر دل ہی دل میں کڑھنے کے سوا میرے بس میں اور تھا بھی کیا۔ شرمندگی سے بچنے کے لئے میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ اسی فیصلے کے نتیجے میں ناشتہ کرتے ہی میں نے پہلے اپنے چہرے پر ایک نیا میک اپ کیا اور پھر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ اسی عرصے میں ہمایوں میرے کمرے میں آ گیا۔

"ارے یہ کیا کیا تم نے رانی!" وہ میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ "اچھا خاصا حسین چہرہ چھپا لیا تم نے.......... اور یہ تم سامان کیوں سمیٹ رہی ہو؟" وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے مخاطب تھا حالانکہ پہلے کبھی اس نے یہ ہمت نہیں کی تھی۔

"میں یہاں سے جا رہی ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"کہاں.......... تمہاری تو کوٹھی میں آگ لگی گئی تھی' کہاں رہو گی؟" وہ بولا۔

"سرونٹ کوارٹرز میں۔ وہ جلنے سے محفوظ رہ گئے ہیں۔"

"لیکن کیوں؟ یہاں آخر تمہیں کیا تکلیف ہے؟" وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ اس کا جسم اب

میرے جسم سے مس ہو رہا تھا۔ میں یہ محسوس کر کے الگ ہٹ گئی تو اس نے اچانک میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے خود سے قریب کر لیا اور کہا۔ "صبیحہ اور استاد اپنے اپنے کمروں میں ہیں۔"

میں تڑپ کر اس کی بانہوں کے حصار سے نکل گئی کیونکہ وہ میرے اوپر جھکنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ میں اس لئے رعایت کر رہی تھی کہ میرے نزدیک راجہ استاد کی طرح وہ بھی بے قصور ہی تھا۔ یہ سارا فساد تو چمپا کا بویا ہوا تھا ورنہ ہمایوں کی اتنی جرأت ہرگز نہ ہوتی۔

"کہیں ایسا تو نہیں رانی کہ تم استاد کے بہکائے میں آ گئی ہو۔ استاد شاید یہ چاہتے ہیں کہ میں تمہیں ان کے لئے چھوڑ دوں' بولو یہی بات ہے نا؟" ہمایوں نے دریافت کیا۔

میں نے سوچا کہ کم سے کم اس بہانے ہمایوں سے تو جان چھڑائی ہی جا سکتی ہے یہی سوچ کر میں نے کہہ دیا۔ "ہاں ہمایوں! مجھے اپنے استاد ہی کے لئے رہنے دو۔ رات کو جو کچھ ہوا' اچھا نہیں ہوا۔ مجھے صبیحہ کے حق پر ڈاکا نہیں ڈالنا چاہئے تھا۔ تم.......... تم ہمایوں شادی شدہ ہو اور مجھ سے زیاہ حق تم پر صبیحہ کا ہے۔"

"تم.......... تم کہو رانی تو.......... تو میں تمہاری خاطر صبیحہ کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔"

"نہیں' وہ جس نے تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا تم.......... تم ہمایوں اس کے ساتھ ہرگز بے وفائی نہیں کرو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

"لیکن رانی! یہ.......... یہ مجھ پر ظلم ہے۔ میں.......... میں تمہارے بغیر.........."

"بکو مت!" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

اسی وقت دور سے راجہ استاد کی آواز سنائی دی۔ وہ ہمایوں کو بلا رہا تھا۔ ہمایوں چلا گیا تو میں نے سوٹ کیس بند کر دیا۔ میں اس میں کپڑے رکھ چکی تھی جو اتارے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں سوٹ کیس اٹھائے میں راجہ استاد کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"ارے' یہ تم اپنے سوٹ کیس کہاں لے جا رہی ہو؟" راجہ استاد نے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا۔

"اپنی کوٹھی۔" میں نے جواب دیا۔ "اب میں وہیں کسی سرونٹ کوارٹر میں رہوں گی۔"

"یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" راجہ استاد نے انکار میں سر ہلایا۔ "تم یہیں رہو گی اسی گھر میں' میرے پاس۔"

میں' راجہ استاد کے انکار کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس کے منہ سے خون لگ چکا تھا' مگر اب میں وہاں کسی بھی قیمت پر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس گھر میں اب میں محفوظ نہیں تھی۔ وہاں دو دو افراد ایسے موجود تھے جو میری عزت و آبرو کے درپے ہو سکتے تھے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور راجہ استاد نے ہمایوں کو آواز دے کر دیکھنے کو کہا۔ آنے والا وہ ٹھیکیدار تھا جس سے راجہ استاد نے گزشتہ روز میری کوٹھی کی مرمت اور رنگ روغن کی بات طے کی تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور راجہ استاد سے کہا۔ "تم ان لوگوں کو کوٹھی لے کر پہنچو' میں چلتی ہوں۔" یہ کہتے ہی میں دروازے کی طرف بڑھی۔

"مگر اپنا سامان تو یہیں چھوڑ جاؤ رانی! تمہیں رات کو یہیں سونا ہے۔" راجہ استاد زور دے کر بولا۔

"نہیں استاد!" میں نے جواب دیا اور مزید کچھ کہے سنے بغیر تیزی کے ساتھ کمرے کے دروازے سے نکل آئی۔ میں وہاں رہ کر کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ میرے پاس کیونکہ دو سوٹ کیس بھی تھے اس لئے میں نے اپنی کوٹھی تک پہنچنے کے لئے ایک رکشا کر لیا۔

کوٹھی پہنچ کر میں نے شہزاد سے کہا کہ میرے لئے کوئی کوارٹر صاف کرا دے۔ شہزاد کے علاوہ میرے دیگر ملازمین کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی کہ میں اب ان ہی کے ساتھ رہوں گی۔ اس پر سب سے زیادہ خوشی کا اظہار فاطمہ نے کیا۔ سرونٹ کوارٹرز میں سب سے بہتر حالت اسی کے کوارٹر کی تھی کیونکہ کوٹھی میں جو کمرہ اس کی زیر استعمال تھا' اس کا تمام نیا فرنیچر کوارٹر میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یوں وہ فرنیچر جلنے سے بچ گیا تھا۔ مَیں نے اپنے سوٹ کیس شہزاد کے حوالے کر دیئے تھے اور گزشتہ روز کی طرح لان میں پیڑ کے نیچے سائے میں کرسیاں ڈلوا کر بیٹھ گئی تھی۔ میری ہدایت پر شہزاد ایک کوارٹر کی صفائی کرانے چلا گیا تھا۔ اپنی کوٹھی میں آنے کے بعد میں نے چہرے سے نیا ماسک اور سنہری وگ اتار دی تھی۔ میرے خیال میں اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

مجھے لان میں بیٹھے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے فاطمہ کو ادھر آتے دیکھا۔ قریب آ کر وہ میرے قدموں میں گھاس پر بیٹھ گئی۔

"ارے' تم یہاں زمین پر کیوں بیٹھ گئیں' کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" میں نے فاطمہ کو مخاطب کیا۔

"نہیں بیگم صاحبہ! میری جگہ آپ کے قدموں میں ہے۔ مجھے یہیں بیٹھا رہنے دیں۔" فاطمہ جواب میں بولی' پھر التجا آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ "آپ سے ایک درخواست کرنا تھی۔"

"ہاں ہاں' بولو کیا بات ہے؟"

"بیگم صاحبہ! آپ میرے کوارٹر میں رہ لیں۔ میں' قاسم کے ساتھ اس کوارٹر میں چلی جاؤں گی جو صاف کیا جا رہا ہے۔"

پھر میں نے لاکھ منع کیا مگر فاطمہ مجھ سے اپنی بات منوا کر ہی مانی۔ اسی وقت راجہ استاد' ٹھیکیدار اور مزدوروں کو لے کر آ گیا۔ وہ ان لوگوں کو جلی ہوئی حویلی میں لے گیا اور انہیں وہاں چھوڑ کر کچھ دیر بعد میرے پاس آ گیا۔ مَیں نے اس سے کہا۔ "استاد! اگر کہو تو اپنے ملازمین کو بھی مزدوروں کے ساتھ لگا دوں' کام جلدی ہو جائے گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں رانی! ٹھیکیدار کا کہنا ہے کہ صفائی میں دو روز سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ جب اسے پیسے دینا ہی ہیں تو پھر اپنے آدمیوں کو لگانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم جانو۔" میں بولی۔

"آخر تم نے میری بات نہیں مانی نا!" راجہ استاد کے لہجے میں شکایت تھی۔ "سامان لے ہی آئیں وہاں سے .... خیر! تمہارا یہاں آ جانا بھی ایک طرح سے ٹھیک ہی ہے۔ وہاں ہمایوں بھی ہوتا۔ اب اگر کہو تو میں رات کو تمہارے پاس یہیں آ جاؤں؟ .... ظاہر ہے کہ تم یہاں کسی الگ ہی کوارٹر میں سو

گی۔ رات کو میں ایسے وقت آؤں گا کہ سب سو چکے ہوں تاکہ کسی کو میرے آنے کی خبر نہ ہو اور پھر صبح ہونے سے ذرا پہلے چپ چاپ چلا جاؤں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی کہ کون آیا' کون گیا۔" راجہ استاد نے خود ہی سارا منصوبہ بنا لیا تاکہ اسے میرا قرب میسر آ سکے۔

"نہیں استاد! تم رات کو نہیں آؤ گے۔" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کیوں تڑپا رہی ہو میری جان! اب رستہ دکھا ہی دیا ہے تو پھر ترساؤ مت۔"

مارے غصے کے میرا خون کھول رہا تھا۔ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ راجہ استاد' چمپا کے فریب کا شکار ہوا ہے تو میں شاید خود پر قابو نہ رکھ پاتی۔

"بولو نا' چپ کیوں ہو؟" راجہ استاد مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔

"استاد! اب اس سلسلے میں' مَیں ایک لفظ سننا نہیں چاہتی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں سختی آ گئی۔

"تمہیں آج صبح سے آخر ہو کیا گیا ہے رانی؟ کہیں اس لونڈے ہمایوں نے تو تمہیں کوئی پٹی نہیں پڑھا دی؟"

میرے جی میں آیا' کہہ دوں کہ تم پر اور ہمایوں پر لعنت بھیجتی ہوں' مگر میں نے اپنے غصے کو ضبط کر لیا۔ اس کی بجائے میں نے نرم آواز میں راجہ استاد کو سمجھایا۔ "جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ استاد! مجھے خود نہیں معلوم کہ رات کو میں کس طرح اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی' نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا؟ اب میں وہ سب کچھ دہرانا نہیں چاہتی۔"

"لیکن میں اس راحت کو کیسے بھول جاؤں رانی جو مجھے تمہارے قرب سے پہلی مرتبہ .... زندگی میں پہلی مرتبہ حاصل ہوئی تھی۔"

"سمجھ لو استاد کہ وہ ایک حسین خواب تھا اور خواب دوبارہ نظر نہیں آتے۔ ایک ہی خواب آدمی دوبارہ نہیں دیکھ سکتا۔"

راجہ استاد نے کچھ کہنے سے پہلے اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چاقو نکال کر کھولنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اگر وہ حسین خواب مجھے پھر کبھی نظر نہیں آ سکتا تو رانی! یہ چاقو اٹھا کر میرے دل میں اتار دو۔ نہ دل ہو گا نہ اس میں تمہارے قرب کی آرزو ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کُرتے کے بٹن کھولنے لگا۔

میری قوت برداشت اب جواب دیتی جا رہی تھی۔ راجہ استاد کا انداز بالکل روایتی عاشقوں جیسا تھا۔ ممکن ہے کہ ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا کہ اسی وقت میری نظر شہزاد پر پڑی۔ وہ کوارٹروں کی طرف سے آ رہا تھا۔ میں جلدی سے بولی۔ "استاد! میرا مینجر ادھر ہی آ رہا ہے' چاقو اٹھا کر جیب میں رکھ لو۔" میں نے دائیں جانب اشارہ کیا۔ "مجھے رسوا نہ کرو۔"

راجہ استاد نے شہزاد کو آتے دیکھا تو چاقو اٹھا کر بند کیا اور پھر اسے جیب میں ڈال کر کُرتے کے بٹن لگانے لگا۔ شاید میرے آخری الفاظ کا اس پر اثر ہوا تھا۔ اسی عرصے میں شہزاد قریب آ گیا اور مجھ سے کہا۔

"وہ فاطمہ کہہ رہی ہے کہ آپ اس کے کوارٹر میں رہیں گی۔ میں نے جس کوارٹر کی صفائی کرائی تھی' فاطمہ اس میں اپنا سامان لے جا رہی ہے۔"

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے دانستہ شہزاد کو وہاں روک لیا تاکہ راجہ استاد مجھ سے اظہار عشق کر کے میرے خون کو مزید نہ کھولا سکے۔ شہزاد ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو میں اسے بتانے لگی کہ فاطمہ نے خود مجھ سے اپنے کوارٹر میں رہنے کی درخواست کی تھی۔

راجہ استاد ایک جہاں دیدہ آدمی تھا۔ اس نے بھی شاید یہ بات محسوس کر لی کہ میں نے شہزاد کو جان بوجھ کر وہاں روکا ہے تاکہ وہ مجھ سے تنہائی میں بات نہ کر سکے۔

"تو پھر میں چلتا ہوں رانی!" راجہ استاد مجھ سے بولا۔ "رات کو آؤں گا' ٹھیک ہے نا!" آخری الفاظ اس نے معنی خیز انداز میں ادا کئے تھے۔ پھر وہ شہزاد سے مخاطب ہوا۔ "مینجر صاحب! آپ ذرا مجھے وہ کوارٹر دکھا دیں جہاں.........."

"اس کی ضرورت نہیں استاد!" میں درمیان میں بول اٹھی۔ "آخر مقصد تو کام سے ہے نا' تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں وہ کام رات کو وہیں آ کر کر دوں گی۔"

راجہ استاد نے مجھے غیر یقینی سی نظروں سے دیکھا پھر بولا۔ "کیا سچ رانی! میرا کام ہو جائے گا نا؟" شہزاد کی موجودگی میں وہ اس سے زیادہ کچھ اور پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ ابھی میں اسے ٹالنے کے لئے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کوٹھی کی طرف سے چیخ پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر کئی مزدور بھاگ کر چیختے ہوئے باہر آتے دکھائی دیئے۔ میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کیا ہوا؟ یہ لوگ چیخ کیوں رہے ہیں؟ تم جا کر دیکھو شہزاد!" میں نے شہزاد سے کہا۔

میرے کہنے پر شہزاد لپکتا ہوا ان مزدوروں کے پاس پہنچا جو کوٹھی سے چیختے ہوئے نکلے تھے۔

"آؤ استاد! خود چل کر دیکھتے ہیں' کیا بات ہے؟"

"ہاں چلو!" راجہ استاد میرے ساتھ ہو لیا۔

ٹھیکیدار کو بھی میں نے بھاگ کر کوٹھی سے نکلتے دیکھا۔ وہ سیدھا ہماری ہی طرف دوڑتا آ رہا تھا۔ قریب آ کر پھولے ہوئے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے راجہ استاد کو مخاطب کیا۔ "سانپ.......... وہاں اندر سانپ ہیں اور.......... اور ایک سانپ نے.......... میرے ایک مزدور کو ڈس بھی لیا ہے۔"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ حرکت چمپا کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ میری کوٹھی دوبارہ سکونت کے قابل ہو سکے۔

"تو اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے ٹھیکیدار!.......... چلو میں چل کر دیکھتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ.......... آپ وہاں نہ جائیں بیگم صاحبہ!" ٹھیکیدار خوفزدہ آواز میں بولا۔ "کہیں آپ.......... آپ کو بھی کوئی سانپ نہ ڈس لے۔"

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

وہ سب مزدور بھی اب ٹھیکیدار کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے جو اندر سے بھاگتے ہوئے نکلے تھے۔ ٹھیکیدار نے ان سے پوچھا۔ "ارے کیا پریم کو وہیں اندر چھوڑ آئے؟"

پھر ٹھیکیدار سے معلوم ہوا' پریم اس مزدور کا نام تھا جسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس کے بعد ٹھیکیدار کے ساتھ بمشکل صرف دو مزدور کوٹھی کے اندر چلنے پر آمادہ ہوئے۔ مزدوروں کی ہمت مجھے ساتھ چلتے دیکھ کر بھی بڑھ گئی تھی۔ میں آگے آگے تھی' راجہ استاد میرے پیچھے' پھر ٹھیکیدار اور مزدور تھے۔ شہزاد باہر ہی رہ گیا تھا۔

جیسے ہی اندر داخل ہوئی ایک مزدور کو لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آتے دیکھا۔ یہی پریم تھا۔ دونوں مزدوروں نے اسے سنبھال لیا۔

"جلدی سے اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔" ٹھیکیدار نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ روپے کا ایک نوٹ ایک مزدور کو تھما دیا۔

دونوں مزدور اپنے ساتھی کو لے کر چلے گئے۔ اسی وقت کوٹھی کے اندر سے تیز پھنکار سنائی دی۔ راجہ استاد اور ٹھیکیدار کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ پھر میری نظر سانپوں کے ایک جوڑے پر پڑی۔ وہ جوڑا تیزی سے رینگتا ہوا میری ہی طرف آ رہا تھا۔ میرے قدم نہیں رکے۔ ان سانپوں کو چمپا ہی وہاں لا کر چھوڑ سکتی تھی۔

"رانی! رک جاؤ۔" راجہ استاد خوفزدہ آواز میں چیخا۔

"میری فکر نہ کرو استاد!" میں نے بغیر مڑے جواب دیا۔ دونوں سانپ اس وقت تک میرے قریب پہنچ چکے تھے۔

پھر وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں سانپ میرے گلے کے ہار بن چکے تھے۔

"یہی دونوں تھے یا ان کے علاوہ اور بھی سانپ تھے؟" میں نے مڑ کر ٹھیکیدار سے سوال کیا۔

راجہ استاد اور ٹھیکیدار دونوں ہی خوفزدہ نظروں سے تصویر حیرت بنے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے انہیں اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو ٹھیکیدار نے اٹک اٹک کر بتایا کہ مزید دو سانپوں کو حویلی میں دیکھا گیا تھا۔

"وہ بھی یہیں کہیں ہوں گے' میں دیکھتی ہوں۔" یہ کہتے ہی میں آگے بڑھی۔

"مم.......... میں تو باہر.......... باہر جا رہا ہوں استاد!" عقب سے ٹھیکیدار کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"استاد! تم بھی چاہو تو باہر چلے جاؤ' میں ابھی بقیہ دونوں سانپوں کو پکڑ کر آتی ہوں۔" میں نے مڑ کر کہا۔

"مگر میں.......... میں تمہیں اس خطرے میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا رانی!" راجہ استاد بلند آواز میں بولا حالانکہ اس کی آواز لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

اس پر مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے کہا۔ "دیکھ نہیں رہے استاد! خطرہ تو خود میرے گلے کا ہار بنا ہوا ہے۔"

"رانی! انہیں .... انہیں اپنی گردن سے نکال کر پھینک دو ورنہ یہ کسی بھی لمحے تمہیں ڈس لیں گے۔" راجہ استاد چیخا۔

"اگر انہیں ڈسنا ہوتا استاد تو کبھی کا ڈس چکے ہوتے۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھی۔

اسی لمحے ایک کمرے کے دروازے سے تیزی کے ساتھ دو سانپ نکل کر میری طرف لپکے۔ میں نے جھک کر ان دونوں کو پکڑ لیا اور پھر اپنے دونوں بازوؤں سے لپیٹ کر واپسی کے لئے مڑ گئی۔ راجہ استاد مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

راجہ استاد کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "استاد! اس وقت ہم دونوں کے سوا کوٹھی میں اور کوئی نہیں ہے۔ کیا خیال ہے؟ رات کو میں آ کر کیا کروں گی' رات کا کام ابھی کیوں نہ کر لیں۔"

"مم .... مگر اس .... وقت یہ سانپ بھی تو ہیں .... پہلے .... پہلے تم انہیں تو بھگاؤ۔"

"یہ ہیں تو کیا ہوا؟ میں بھی تو ان سے نہیں ڈر رہی۔ پھر یہ کہ انہیں یہاں چھوڑ دیا تو مزدور کیسے کام کریں گے؟ وہ تو انہیں دیکھتے ہی بھاگ جائیں گے۔" میں اب راجہ استاد کے قریب پہنچ چکی تھی۔

"سنو استاد! سارے سانپ زہریلے نہیں ہوتے۔ یہ بھی مجھے زہریلے نہیں لگتے۔"

مجھے قریب آتے دیکھ کر راجہ استاد پیچھے ہٹنے لگا۔ میں ہنس پڑی۔

"حیرت ہے رانی کہ تم ہنس رہی ہو .... ارے یہ بڑا موذی جانور ہوتا ہے۔ اس کے لئے تو یہ حکم آیا ہے کہ اسے دیکھتے ہی مار دو۔ تم نے انہیں بازوؤں اور گلے سے لپیٹ رکھا ہے۔ اپنے آپ کو کیوں خطرے میں ڈال رہی ہو۔ خدا کے لئے مان جاؤ رانی!" راجہ استاد الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔

"قریب تو آ نہیں رہے استاد! اس پر عشق کا دعویٰ ہے تمہیں۔" میں ہنستی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔

پھر میں اور راجہ استاد آگے پیچھے حویلی سے باہر آ گئے۔ لان میں چند مزدور اور ٹھیکیدار بھی موجود تھا۔ انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

"اب تم لوگ جا کر کام شروع کرو۔" میں نے مزدوروں اور ٹھیکیدار کو مخاطب کیا۔ "میں سارے سانپوں کو پکڑ کر لے آئی ہوں۔"

"مگر .... مگر یہ .... یہ لوگ یہاں کام کرنے سے منع کر رہے ہیں۔" ٹھیکیدار سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیوں' اب کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم ایسا کرو استاد کہ اگر یہ لوگ کام کرنے پر راضی نہیں تو ان کو چھٹی کر دو' دوسرے مزدور لے آؤ۔" راجہ استاد نے تجویز پیش کی۔

"ہاں یہ ممکن ہے۔" ٹھیکیدار نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "میں کل صبح دوسرے مزدور لے کر آ جاؤں گا۔"

اس کے بعد ٹھیکیدار ان مزدوروں کو ساتھ لے کر چلا گیا اور میں آگے بڑھ کر نیچے اسی کرسی پر آ بیٹھی جہاں پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ ذرا سی دیر میں میرے سارے ملازمین آ گئے۔ انہوں نے شاید اپنی ساری زندگی میں ایسا منظر نہیں دیکھا ہو گا۔ میں اپنے جسم سے لپٹے ہوئے سانپوں سے کھیل رہی تھی۔ راجہ استاد بھی میرے ملازمین کے ساتھ کھڑا تھا۔

"خاتون! موت سے نہ کھیلیں۔" شہزاد نے مجھے مخاطب کیا۔

"اگر تم لوگ ان سانپوں سے اتنا ہی ڈر رہے ہو تو میں انہیں مارے دیتی ہوں۔" میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔

"ہاں' ہاں مار دیں بیگم صاحبہ! مار دیں۔" فاطمہ بھی بول اٹھی۔

"بڑے بے رحم ہو تم لوگ بھی' کیسے خوبصورت ہیں یہ اور تم انہیں مارنے کو کہہ رہے ہو۔ اچھا ایسا کرو' تھوڑا سا دودھ کسی برتن میں لے آؤ' مارنا ہی ہے انہیں تو کم سے کم دودھ تو پلا دوں' کیا خبر بھوکے ہوں۔"

رحمت جا کر ایک کٹورے میں دودھ لے آیا۔ وہ میرے قریب آ کر میز پر دودھ سے بھرا کٹورا رکھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس نے میز سے کچھ فاصلے پر رک کر زمین پر کٹورا رکھ دیا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے خود کرسی سے کٹورا اٹھا کر اس میں سے ایک گھونٹ دودھ پی لیا' پھر کٹورا میز پر رکھ دیا۔ سب لوگ دور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ کرسی پر دوبارہ بیٹھنے کے بعد میں نے سانپوں کو اپنے جسم سے ایک ایک کر کے الگ کیا اور میز پر رکھے کٹورے کے قریب چھوڑ دیا۔

میرا جوٹھا دودھ پیتے ہی چاروں سانپ بل کھانے لگے اور پھر بے حس و حرکت ہو گئے۔

"جاؤ انہیں اٹھا کر پھینک آؤ' یہ مر چکے ہیں۔" میں نے اپنے ملازمین کو مخاطب کیا۔

ان سبھی کے لئے یقیناً وہ منظر حیران کن ہی تھا۔ راجہ استاد کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ رحمت کہیں سے کوئی آدھ جلا لکڑی کا تختہ اٹھا کر لے آیا اور لکڑی کے دوسرے ٹکڑے کی مدد سے مردہ سانپوں کو تختے پر ڈالنے لگا۔

"یہ دودھ بھی زہریلا ہو چکا ہے' اسے بھی پھینک دینا اور کٹورا اچھی طرح مانجھ کر استعمال میں لانا۔" میں نے عبدل کو مخاطب کیا۔

عبدل نے ڈرتے ڈرتے دودھ کا کٹورا اٹھا لیا اور پھر دودھ ایک طرف کیاری میں ڈال دیا۔

"تم لوگ جاؤ' اپنا اپنا کام کرو۔" میں نے ملازمین سے کہا۔

"آپ چاہیں خاتون! تو اپنے کوارٹر میں جا کر آرام کر سکتی ہیں۔ آپ کے دونوں سوٹ کیس بھی وہیں پہنچا دیئے گئے ہیں۔" شہزاد مجھ سے بولا۔

"تو پھر رات کو کتنے بجے تک آؤ گی رانی!" راجہ استاد نے مجھ سے دریافت کیا۔ "رات کا کھانا

ساتھ ہی کیوں نہ کھالیں۔"

راجہ استاد ابھی تک اپنی ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ مجھے اس کی بات ناگوار تو ہوئی مگر ٹال گئی اور بولی۔ "ٹھیک ہے' دیکھا جائے گا۔"

"نہیں' پکا وعدہ کرو۔ میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک تم آ نہیں جاؤ گی۔"

جی میں آیا' کہہ دوں' نہیں آؤں گی اور تھا بھی ایسا ہی۔ میرا ارادہ ہرگز رات کو اس کے گھر جانے کا نہیں تھا لیکن شہزاد کے سامنے وہ مزید بحث نہ کرے' یہ سوچ کر رات کو آنے کا وعدہ کر ہی لیا البتہ کھانے کے لئے منع کر دیا تاکہ میرے انتظار میں وہ بھوکا نہ رہے۔ بہرحال راجہ استاد مطمئن ہو کر چلا گیا اور میں لان سے اٹھ کر شہزاد کے ساتھ اس کوارٹر کی طرف چل دی جو پہلے قاسم اور فاطمہ کے لئے مخصوص تھا۔ شہزاد سے معلوم ہوا کہ برابر والے کوارٹر میں عارضی طور پر اس نے سکونت اختیار کر لی تھی۔

اس روز دوپہر کا کھانا کھا کر میں اسی کوارٹر میں سو گئی۔ رات کو میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لئے خوب گہری نیند سوئی۔ جب میں اٹھی تو کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور لباس تبدیل کرنے کے بعد باہر لان میں ٹہلنے نکل آئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد شہزاد کو میں نے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ میرے قریب آیا تو اس کے چہرے سے میں نے اندازہ لگایا کہ کچھ شرمندہ سا ہے۔ میں اس کی وجہ نہ سمجھ سکی۔

شہزاد سر جھکائے میرے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "کچھ کہنا ہے مجھ سے؟"

"جج .... جی نہیں .... جی ہاں۔" وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔

"کیا بات ہے' تم اتنے نروس کیوں ہو؟"

"وہ نن .... نہیں تو' ایسی .... ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

صاف پتا چل رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو وہ مجھ سے چھپا رہا ہے۔ میں رک کر اس کی طرف مڑی۔ "ادھر دیکھو' میری طرف اور اب بتاؤ کہ تم کیا چھپا رہے ہو مجھ سے؟"

"آپ .... آپ سے بھلا میں کیا چھپاؤں گا خاتون! آپ کو تو خود .... خود ہی سب کچھ معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے' صاف بات کرو۔"

"وہی جو .... جو ہوا۔" وہ نظریں جھکا کر بولا۔ "دراصل میں .... میں جذبات میں بہہ کر یہ بھول ہی گیا تھا کہ آپ میری اس جسارت پر خفا بھی ہو سکتی ہیں .... آپ کو جب مَیں نے اپنے کوارٹر میں دیکھا اور آپ خود .... خود ہی میرے انتہائی قریب آ گئیں تو .... تو مَیں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور مجھ سے وہ حرکت سرزد ہو گئی جس پر اب تک پشیمان ہوں۔"

مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ کیا چکر ہو سکتا ہے اور یہ چکر کون چلا سکتا ہے۔ میں نے اسی لئے اس واقعے سے اپنی لاتعلق ظاہر کرنے کی غرض سے کہا۔ "تم کس حرکت کا ذکر کر رہے ہو اور یہ واقعہ کس وقت کا ہے؟"

شہزاد نے میری بات سن کر حیرت سے میری طرف دیکھا' پھر کہنے لگا۔ "اب سے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے پہلے کی بات ہے کہ جب آپ میرے کوارٹر میں آئی تھیں اور پھر............" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

ظاہر ہے کہ مَیں اس کے کوارٹر میں نہیں گئی تھی' مگر یہ ضرور سمجھ چکی تھی کہ میری جگہ چمپا اس کے پاس گئی ہو گی۔ یہی سوچ کر میں نے بات بنائی۔ "مجھے دراصل نیند میں چلنے کی عادت ہے۔ تم کہہ رہے ہو تو یقیناً میں تمہارے کوارٹر میں آئی ہوں گی۔ ڈرو مت! مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا تھا جس پر تم اتنے شرمندہ ہو؟"

"کیا .... کیا واقعی آپ کو کچھ .... کچھ بھی یاد نہیں؟" شہزاد حیرت سے بولا۔

"میں نے بتایا نا تمہیں کہ نیند کی حالت میں مجھے کچھ پتا نہیں چلتا کہ میں کہاں جا رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں' تم سے اسی لئے تو پوچھ رہی ہوں کہ مجھے بتاؤ کیا کیا تھا میں نے؟"

شہزاد کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ پھر اس نے بتایا۔ "کچھ دیر کو میری بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ پھر جب آنکھ کھلی تو میں نے آپ کو آتے دیکھا۔ آپ قریب آ کر میرے پاس لیٹ .... گئیں .... اور .... اور میری طرف کروٹ لے کر اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ اس کے بعد .... میں .... میں بھی خود پر قابو نہ پا سکا .... مگر .... مگر خاتون! ان خود فراموشی کے لمحات میں بھی .... میں نے حد سے تجاوز نہیں کیا حالانکہ آپ .... آپ تمام حدود پھلانگ جانا چاہتی تھیں۔ اس پر بھی میں نے اپنی خواہشوں کو بے لگام نہیں ہونے دیا۔ آپ نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے آپ خفا ہو کر ایک دم بستر سے اٹھیں اور کوارٹر سے نکل گئیں۔"

شہزاد نے جو کچھ بیان کیا تھا' میرے لئے یقیناً قابل شرم تھا۔ خبیث چمپا اب مجھے میرے ایک اور ہمدرد کی نظر میں ذلیل و رسوا کرنے کے درپے تھی۔ شہزاد اگر فطرتاً نیک اور شریف نہ ہوتا تو چمپا نے اس کے لئے جو جال بچھایا تھا' اس میں پھنس جاتا' جیسا راجہ استاد اور ہمایوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ وہ دونوں اپنی دانست میں وصل سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ لعنتی چمپا نے اب یہی حربہ شہزاد کے معاملے میں آزمایا تھا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ کار بھی تو نہیں تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے شہزاد سے سارا واقعہ سن کر میں دل پر جبر کر کے ہنس پڑی اور بولی۔ "اچھا ہوا کہ وہ تم تھے ورنہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس سنہری موقع سے فائدہ ضرور اٹھاتا۔ بہرحال میں تمہاری ممنون ہوں کہ تم نے حدود سے تجاوز نہیں کیا۔"

"لیکن خاتون' یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔" شہزاد کے لہجے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہاں ہے تو' مگر کیا کیا جا سکتا ہے؟" میں بولی۔

"کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیوں نہ کریں؟" شہزاد نے تجویز پیش کی۔

"تمہارے خیال میں کیا میں نے ایسا نہیں کیا ہو گا؟ جب بھی مَیں نے اپنے اس مرض کا علاج کرایا اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ پھر مایوس ہو کر مَیں نے علاج کا خیال ہی چھوڑ دیا۔"

ہر چند کہ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی ذمے دار میں نہیں تھی نہ میرا اس سے کوئی تعلق تھا' اس کے باوجود مجھے شہزاد سے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس قدر سیدھا تھا کہ اس نے میرے بہانے کو سچ سمجھ لیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کہیں چمپا' شہزاد کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر مجھے اس کی نظر میں نہ گرا دے' اس بدکار عورت سے یہ بعید نہیں تھا۔ شہزاد آخر کب تک کھلی ترغیب گناہ کو ٹھکرا سکتا تھا؟ وہ کب تک جذبے کے چڑھے ہوئے دریا پر اپنی فطری شرافت کا بند باندھ سکتا تھا؟

"خاتون! اس کی ایک صورت ہے کہ آپ اپنے کوارٹر سے نکل کر نیند کی حالت میں کہیں نہ جا سکیں۔" چند لمحے بعد شہزاد نے مجھے مخاطب کیا۔

"وہ کیا؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا حالانکہ وہ جو کچھ بھی کہتا بے سود ہی ہوتا۔

"جب آپ دن یا رات کے وقت سو جائیں تو باہر سے دروازہ بند کر دیا جائے تاکہ نیند میں اٹھ کر..........."

"فضول ہے۔" میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "یہ بھی کر کے دیکھا جا چکا ہے۔ ایسا کرنا اور بھی خطرناک ہے۔ دروازہ بند ہونے کی صورت میں مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور میں دیواروں سے سر ٹکرانے لگتی ہوں۔ ایک مرتبہ اس طرح میں شدید زخمی بھی ہو چکی ہوں۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے نے ایسا کرنے کو منع کر دیا تھا۔"

"پھر تو واقعی مجبوری ہے۔" شہزاد کے لہجے میں اداسی تھی۔ پھر وہ اس طرح چونک اٹھا جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔ "ارے یہ بات تو میرے ذہن ہی سے نکل گئی تھی' درزی سے کپڑے بھی تو جا کر لانے تھے آج شام........ میں چلتا ہوں خاتون!"

اس کے بعد شہزاد تو چلا گیا اور میں لان میں ایک طرف پڑی ہوئی میز کرسیوں کی طرف بڑھ گئی۔ رحمت نے آ کر مجھ سے چائے کو پوچھا۔ میں نے کہہ دیا' لے آؤ۔

ابھی سے مجھے رات کی فکر ہو رہی تھی۔ چمپا نے گزشتہ رات جو ذلت آمیز کھیل کھیلا تھا' آج بھی اسے دہرا سکتی تھی۔ حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ اپنی کوٹھی کے سوا کہیں اور میں رات بھی نہیں گزار سکتی تھی۔ یہ کوشش مجھے مہنگی پڑ چکی تھی۔ ڈیسوزا کے اغوا کی وجہ سے خفیہ پولیس والے ہوٹلوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ اب تو ان کے علم میں یہ بات بھی آ چکی تھی کہ ایک اجنبی عورت جس پر سرفروش تنظیم سے تعلق کا شبہ ہے' کسی ہوٹل میں قیام کی کوشش کر رہی ہے۔ اگر وہ عورت واقعی بے گناہ ہوتی تو پکڑ لئے جانے کے باوجود فرار نہ ہو جاتی۔ ایسی صورت میں کسی ہوٹل میں میرا عارضی قیام کسی نئی افتاد کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ راجہ استاد کے گھر کو بھی کمینی چمپا نے اب میرے لئے محفوظ نہیں رہنے دیا تھا۔ مجھے چمپا کے وہ الفاظ بھی یاد تھے جو اس نے میری کوٹھی میں آگ لگا دینے کے بعد مجھ سے کہے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے میں نے کسی ہوٹل میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر بہ مجبوری راجہ استاد کے گھر جا پہنچی تھی۔ چمپا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے تیرے آشیانے کو آگ لگا دی۔ اب تُو وہاں رات گزار جہاں تیرے نوکر رہتے ہیں۔ تیری یہی اوقات ہے۔ لعنتی چمپا کے الفاظ کو غلط

ثابت کرنے کی خاطر ہی میں اپنی کوٹھی سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ گھوم پھر کر میں دوبارہ اپنی کوٹھی میں آ گئی تھی۔ میں اب وہیں رات گزارنے پر مجبور ہو گئی تھی جس کے لئے چمپا نے کہا تھا۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی تھی' مگر یہاں بھی اس نے میرے لئے سامان رسوائی بہم کر دیا تھا۔ نیند میں چلنے کا بہانہ آخر کب تک میری ڈھال بن سکتا تھا' رحمت مجھے چائے دے کر جا چکا تھا اور میں چائے پیتے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہی تھی۔

ان ہی خیالوں میں رات ہو گئی۔ لان میں اب اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف چل دی۔ راستے میں مجھے قاسم مل گیا۔ خلاف توقع وہ مجھے دیکھ کر رک گیا اور پھر دبے قدموں رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔ "اور تو سب کچھ ٹھیک ہے' مگر مجھے فاطمہ سے ڈر لگتا ہے۔ ایسا کیوں نہ کروں کہ رات کو خود میں ہی آپ کے کوارٹر میں آ جاؤں۔ آپ دروازہ کھلا رکھئے گا۔"

"کیا بکتے ہو؟" مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ "یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ ہیں!"

"آپ .... آپ ہی نے تو ابھی کچھ دیر پہلے میرے پاس آ کر کہا تھا کہ .... کہ مجھے چاہتی ہیں اور .... مجھ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہیں۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"تم اندھے ہو گیا؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں لان میں بیٹھی تھی؟ کیا تمہارے کان بجنے لگے ہیں۔؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"خود ہی تو آپ نے کہا تھا کہ میری وجہ سے لان میں بیٹھتی ہیں تاکہ میں نظر آتا رہوں' اب .... اب ناراض ہو رہی ہیں۔" قاسم کے لہجے میں شکایت تھی۔

"تم اتنے ہی خوبصورت ہو ناکہ میں تمہیں گیٹ کے قریب کھڑا ہوا دیکھنے کے لئے لان میں بیٹھوں گی۔ بڑی غلط فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں۔ جاؤ اپنا کام کرو اور آئندہ مجھ سے اس طرح کی کوئی بات کی تو بری طرح پیش آؤں گی۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"جی .... جی بہتر ہے بیگم صاحبہ!" قاسم بولا اور پھر سر جھکائے ہوئے اپنے کوارٹر کی طرف بڑھ گیا۔

چمپا نے تو میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہی قاسم کے پاس گئی تھی اور میری طرف سے اظہار عشق کر دیا تھا۔ وہ بدبخت اگر مجھ پر کوئی اور ساحرانہ حربہ استعمال کرتی تو شاید میں اس کا توڑ بھی کر لیتی' یہ تو عجیب ہی معاملہ تھا۔ میں تو اس کے سامنے قطعی بے بس ہو کے رہ گئی تھی۔ وہ میری عزت و آبرو خاک میں ملا رہی تھی اور میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

☆======☆======☆

اس رات کھانا کھا کے جب میں لان میں ٹہل رہی تھی تو اچانک کچھ فاصلے پر ایک ہیولے کو نمودار ہوتے دیکھا۔ ہیولا ذرا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔

"کمینی .... ذلیل .... بدکردار.........." میں اسے پہچانتے ہی چیخ اٹھی۔ "اپنی گھٹیا حرکتیں بند کر دے۔" وہ چمپا ہی تھی۔

"مجھے بڑے مہاراج نے خود ان گھٹیا حرکتوں کی اجازت دی ہے معبلہ! ورنہ تو میں بڑے مہاراج کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ تمہیں ذلیل کرنے کے ساتھ ساتھ اس طرح مجھے عیش کرنے کا موقع بھی مل رہا ہے۔ آج شہزاد کی باری ہے' پھر میں ایک ایک کر کے تمہارے تمام نوکروں کو خراب کر دوں گی' یہاں تک کہ وہ تمہاری خاطر ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیں گے۔ تمہیں ابھی اس ذلت و رسوائی کا اندازہ نہیں جو تمہارا مقدر بننے والی ہے۔ سنو معبلہ! اس سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم بڑے مہاراج کی داسی بننے پر آمادہ ہو جاؤ۔ میں اس وقت تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ بڑے مہاراج نے کہلوایا ہے کہ وہ تم سے دشمنی ختم کرنے پر تیار ہیں' اگر تم بھی ان سے دوستی پر راضی ہو۔ یقین کرو' بڑے مہاراج سے دوستی کر کے تم فائدے میں رہو گی .... بولو کیا جواب ہے تمہارا؟" چمپا نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"وہ کتا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" میں غصے کے عالم میں چیخ اٹھی۔ "میں اس کی منحوس صورت پر تھوکنے تک کی روادار نہیں۔"

"اپنی زبان کو لگام دے معبلہ! اگر بڑے مہاراج کا خیال نہ ہوتا تو میں تجھے ابھی جلا کر خاک میں ملا دیتی۔ معلوم نہیں انہوں نے تجھے کیوں اتنی ڈھیل دے رکھی ہے' پھر بھی میں تجھے اتنی سزا تو دے ہی سکتی ہوں کہ جس پر بڑے مہاراج بھی مجھ سے خفا نہ ہوں اور تُو بھی تڑپ کر رہ جائے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی چمپا غائب ہو گئی۔

میں سخت الجھن کا شکار ہو گئی کہ نہ معلوم لعنتی چمپا کیا نیا فتنہ برپا کرنے والی ہے۔ ابھی میں لان ہی میں تھی کہ کوارٹروں کی طرف سے میں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور اچھل پڑی۔ میرے لئے یہ بات خلاف توقع ہی تھی۔ میں کوارٹروں کی طرف لپکی کہ حقیقت حال معلوم کر سکوں۔ اس وقت میرے ذہن میں دور دور تک چمپا کا خیال نہیں تھا۔ میں کوارٹروں کے نزدیک پہنچی ہی تھی کہ پھر ایک فائر ہوا۔ فوراً ہی جوابی فائر سنائی دیا اور پھر فضا پے در پے دھماکوں سے گونجنے لگی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے دو افراد ایک دوسرے پر فائر کر رہے ہوں۔

"عبدل!" معاً قاسم کی بلند آواز ایک طرف سے آئی۔ "میں نے تجھے دیکھ لیا ہے کہ تُو کہاں چھپا ہوا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" میں بھی زور سے چیخی۔ "کون گولیاں چلا رہا ہے؟"

جواب میں عبدل ایک کوارٹر کی آڑ سے نکل کر بھاگتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

"بیگم صاحبہ! پہلے قاسم نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔" عبدل مجھ سے مخاطب ہوا۔ "مجبوراً مجھے بھی گولی چلانا پڑی۔"

"مگر کیوں؟" میں ابھی یہی کہہ پائی تھی کہ وحشت زدہ قاسم بھی دوڑتا ہوا وہاں آگیا۔ اسے دیکھتے ہی عبدل میری آڑ میں ہو گیا تھا۔ قاسم کے ہاتھ میں بھی مجھے ریوالور نظر آ رہا تھا۔

"آپ سامنے سے ہٹ جائیں بیگم صاحبہ!" قاسم بولا۔

"ریوالور جیب میں رکھ لو قاسم!" میری آواز میں حکم تھا۔ اسی وقت میرے دیگر ملازمین بھی وہاں آ گئے۔ قاسم نے میرے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی تھی۔ میں نے مڑ کر عبدل کو بھی یہی حکم دیا تھا۔

"ہاں' اب یہ بتاؤ کہ تم دونوں آپس میں کیوں لڑ رہے تھے؟" میں نے ان دونوں سے دریافت کیا۔

"بیگم صاحبہ! میں غنی کے کوارٹر میں تھا کہ قاسم نے آتے ہی مجھ پر ریوالور تان لیا۔ اگر بروقت میں نے اسے ریوالور نکالتے نہ دیکھ لیا ہوتا تو بے موت مارا جاتا۔ میں اچھل کر بھاگا تو اس نے مجھ پر فائر کر دیا۔ اس وقت تک میں بھی اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اس پر فائر کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اچانک اسے کیا ہو گیا تھا؟" عبدل نے بتایا۔

"یہ جھوٹا ہے بیگم صاحبہ!" قاسم نے تردید کی۔ "اسے سب کچھ معلوم ہے۔"

"اگر یہ جھوٹ بول رہا ہے تو تم بتاؤ سچ کیا ہے؟" میں نے قاسم سے کہا۔

"سچ یہ ہے بیگم صاحبہ کہ میں' رحمت کے کوارٹر میں اس سے مل کر جب واپس اپنے کوارٹر پہنچا تو مجھے شک ہوا جیسے فاطمہ اندر اکیلی نہ ہو۔ میں دبے قدموں اندر داخل ہوا تو کمرے میں فاطمہ اور عبدل کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا۔ دونوں ہی لباس کی قید سے آزاد تھے۔ یہ دیکھ کر ظاہر ہے میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکال کر عبدل پر گولی چلائی تو فاطمہ سامنے آ گئی۔ میری چلائی ہوئی گولی فاطمہ کے سینے میں پیوست ہو گئی تو اس کے سینے سے خون ابلتے دیکھ کر چند لمحوں کو جیسے میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اسی سے فائدہ اٹھا کر عبدل وہاں سے فرار ہو کر بھاگنے لگا تو میں چونک اٹھا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا اور اسے غنی کے کوارٹر میں گھستے دیکھا۔ باقی باتیں تو یہ خود بتا ہی چکا ہے۔" قاسم یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

قاسم کا بیان سن کر میں اور تو سب کچھ بھول گئی' بس اتنا یاد رہا کہ قاسم نے فاطمہ کو گولی مار دی ہے۔

"یہ کیا کر دیا تُو نے ظالم! .... یہ کیا کر دیا؟" میری آواز بھرا گئی۔

پھر میں تقریباً دوڑتی ہوئی قاسم کے کوارٹر تک پہنچی تھی۔ ملازمین بھی میرے ساتھ ہی تھے۔ کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ چھوٹا سا صحن عبور کر کے میں کمرے میں پہنچ گئی۔ کمرے میں روشنی تھی۔ سامنے ہی مسہری پر مجھے فاطمہ کی لاش نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ قاسم نے جو کچھ بتایا تھا' اس کے برعکس فاطمہ ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچی تو دیکھا' مسہری پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ گولی اس کے سینے ہی میں لگی تھی۔ اس کا چہرہ حیرت انگیز طور پر پُرسکون معلوم ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہی ہو۔ وہ مر چکی تھی۔ یہ وہ لڑکی تھی جو مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔ اسے مردہ حالت میں دیکھ کر میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ اسی وقت میری سماعت میں چمپا کے کہے ہوئے الفاظ گونج اٹھے۔ "میں تجھے اتنی سزا تو دے سکتی ہوں کہ جس پر بڑے مہاراج بھی مجھ سے خفا نہ ہوں اور تُو بھی تڑپ کر رہ جائے۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ میں

واقعی تڑپ کے رہ گئی تھی۔ چمپا ہی نے یقیناً قاسم کو فریبِ نظر میں مبتلا کر کے اتنا طیش دلا دیا تھا کہ وہ فاطمہ کو قتل کر دے۔

ہر چند کہ فاطمہ کے قتل کا ذمے دار قاسم نہیں تھا' اس کی ذمے داری چمپا پر تھی' اس کے باوجود قتل کے لئے چمپا نے اسی کو آلہ کار بنایا تھا۔ میں اسی سبب اس پر برس پڑی۔ "تم نے تو بتایا تھا کہ فاطمہ کو عبدل کے ساتھ بے لباس دیکھا تھا' پھر اس کے جسم پر ساڑھی کیسے نظر آ رہی ہے؟"

"اس پر مجھے .... مجھے خود حیرت ہے۔ جب میں یہاں سے گیا تھا تو .... تو فاطمہ کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا اور عبدل بھی بے لباسی کی حالت ہی میں یہاں سے بھاگا تھا۔"

"اور جب تم نے عبدل کو غنی کے کوارٹر میں دیکھ کر اس پر گولی چلائی تو اس وقت بھی کیا وہ بے لباس ہی تھا؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "تم تو اس کا تعاقب کرتے ہوئے ہی غنی کے کوارٹر میں پہنچے تھے' پھر اسے لباس پہننے کی مہلت کس طرح مل گئی؟"

"مم .... میں نے عبدل کو لباس چھوڑ کر بھاگتے ہی دیکھا تھا پھر .... پھر نہ معلوم کیسے اور کب اس نے کپڑے پہن لئے' مجھے نہیں معلوم؟"

"تم بتاؤ غنی کہ عبدل تمہارے کوارٹر میں کتنی دیر سے تھا؟" میں غنی کی طرف مڑی۔

"عبدل میرے پاس آدھے گھنٹے سے تھا کہ اچانک ہم دونوں ہی نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ پھر ہم دونوں حقیقت حال جاننے کی خاطر اٹھنے ہی والے تھے کہ قاسم وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ چہرے سے انتہائی غصے میں معلوم ہوتا تھا۔" پھر غنی نے وہی کچھ بتایا جو عبدل پہلے ہی بیان کر چکا تھا۔

"یہ .... یہ جھوٹ ہے؟" قاسم بول اٹھا۔ "عبدل میرے کوارٹر میں تھا۔ غنی جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے فاطمہ کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا تھا۔"

"اگر غنی جھوٹا ہے تو یہ بتاؤ کہ فاطمہ اور عبدل کے جسم پر لباس کہاں سے آ گیا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے .... مجھے نہیں معلوم۔" قاسم نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ "میں .... میں تو خود اس پر حیران ہوں۔"

"تمہارا حیران ہونا میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ اپنے بیان کی روشنی میں تم جھوٹے ثابت ہو چکے ہو۔ تمہارے بیان کی گواہی دینے والا کوئی نہیں جبکہ غنی' عبدل کے بیان کی تصدیق کر چکا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم نے فاطمہ کو جان بوجھ کر قتل کیا اور قتل کے جواز کی خاطر عبدل اور مقتولہ فاطمہ پر قابلِ اعتراض حالت میں ہونے کا الزام لگا دیا۔"

"مگر .... مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دونوں کو دیکھا تھا اور ...."

"تم سچ کہہ رہے ہو' تمہارے پاس کیا ثبوت ہے اس کا؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ثبوت .... ثبوت تو کو .... کوئی نہیں ہے بیگم صاحبہ!"

"لیکن عبدل کے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ثبوت موجود ہے۔ غنی کا بیان ہے کہ

عبدل آدھے گھنٹے سے اس کے کوارٹر میں تھا۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ہی شخص دو جگہ موجود ہو؟" یہ کہتے ہی اچانک مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اسی کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ بہرحال وہ شہر کا ایک مصروف علاقہ تھا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں باہر تک گئی ہوں گی۔ تفتیش کی خاطر وہاں پولیس بھی آ سکتی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے ان سب کو مخاطب کیا۔ "تم سب لوگ اس کوارٹر سے باہر نکل جاؤ اور کوارٹر میں باہر سے تالا ڈال دو' جلدی کرو۔"

"لیکن خاتون! یہاں .... فاطمہ .... فاطمہ کی لاش بھی تو ہے۔ کیا اسے اسی حالت میں چھوڑ دیں گی؟" شہزاد مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہاں۔" میں نے جلدی سے جواب دیا' پھر انہیں دوسرا حکم دیا۔ "اپنے ریوالور بھی یہیں چھوڑ دو۔"

شہزاد کے سوا ان سبھی کے پاس ریوالور موجود تھے۔ میرے حکم پر انہوں نے اپنی جیبوں سے ریوالور نکالے اور اسی کمرے میں ایک چھوٹی سی میز پر رکھ دیئے۔ میرے کہنے پر شہزاد نے میز پر ایک چادر ڈال دی جس سے ریوالور چھپ گئے۔

"سنو' ممکن ہے پولیس ادھر کا رخ کرے۔" میں ان سب کے ساتھ کوارٹر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "پولیس کی پوچھ گچھ کے جواب میں کسی کو یہ نہیں بتانا کہ کوٹھی کے اندر فائرنگ ہوئی تھی' نہ فاطمہ کے قتل کی بابت کچھ بتانا ہے۔"

میری بے چینی بے سبب ثابت نہیں ہوئی۔ ذرا ہی دیر بعد پولیس آ گئی اور فائرنگ کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگی۔ میری ہدایت کے مطابق کسی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔

"مگر لوگوں کا کہنا تو یہی ہے کہ فائرنگ کی آوازیں اسی کوٹھی سے آئی تھیں۔" ایک سب انسپکٹر بولا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ "کیا آپ لوگوں میں سے کسی نے گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن وہ آوازیں دور کی تھیں۔"

"ممکن ہے' لوگوں نے اندازہ لگانے میں غلطی کی ہو۔" سب انسپکٹر نے کہا' پھر اپنے ساتھ آنے والے دونوں سپاہیوں کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔

پولیس والے چلے گئے تو میں نے قاسم اور عبدل سے کوٹھی کے عقبی حصے میں قبر کھودنے کے لئے کہا۔ کوٹھی کی صفائی کے لئے ٹھیکیدار اپنے ساتھ پھاوڑے اور کدال بھی لایا تھا۔ وہاں سے قبر کی کھدائی کے لئے ضروری سامان لے لیا گیا۔ میں نے رحمت اور غنی کو بھی قاسم اور عبدل کی مدد کے لئے حکم دیا اور وہ سب کوٹھی کے عقبی حصے میں چلے گئے۔ میرے پاس صرف شہزاد رہ گیا۔ میں اس کے ساتھ لان میں تھی۔ وہ کہنے لگا۔ "خاتون! وہ .... وہ فاطمہ مسلمان ہو چکی تھی۔ ایسی صورت میں لاش کو غسل دینا اور کفن پہنانا بھی ضروری ہے۔"

"مگر میں نے تو یہ پڑھا ہے کہ جو بے گناہ قتل کر دیا جاتا ہے اس کا شمار شہیدوں میں ہوتا ہے اور شہیدوں کو نہلانا یا کفن دینا ضروری نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ فاطمہ کو اسی حالت میں

دفن کر دیا جائے۔ اس سے قطع نظر یہ کہ اسے نہلائے گا کون؟ پھر اس وقت کفن کا بندوبست کہاں سے ہو گا؟"

"جہاں تک لاش کو غسل دینے کا تعلق ہے تو یہ کام قاسم انجام دے سکتا ہے کیونکہ وہ فاطمہ کا شوہر ہے۔ ہاں کفن ملنا اس وقت مشکل ہو جائے گا۔ جہاں تک آپ کا یہ کہنا ہے کہ بے گناہ مارے جانے والوں کا شمار شہیدوں میں ہوتا ہے تو مَیں اس سلسلے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا۔"

قبر کھودنے اور فاطمہ کو دفن کرنے میں ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ مَیں اپنے کوارٹر میں آ گئی۔ تمام ملازمین اپنے اپنے کوارٹروں میں سونے کے لئے جا چکے تھے۔ میں بستر پر سونے کو لیٹ تو گئی مگر مجھے نیند نہیں آ سکی۔ مجھے لعنتی چمپا کی یہ دھمکی یاد آ رہی تھی کہ آج رات وہ شہزاد کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائے گی۔ برابر والا کوارٹر اسی کا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب ہر طرف سناٹا چھیل گیا تو میں تجسس سے مجبور ہو کر اٹھی اور اپنے کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ ہر کوارٹر کی عقبی سمت میں ایک کھڑکی تھی۔ مَیں نے سوچا کہ وہیں جا کر اندر سے آنے والی آوازیں سننے کی کوشش کروں گی۔ سو میں دبے پاؤں شہزاد کے کوارٹر کی عقبی کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ کھڑکی اندر سے بند نہیں کی گئی تھی، تھوڑی سی جھری دونوں پٹوں کے درمیان نظر آ رہی تھی۔ میں جیسے ہی وہاں پہنچی، چونک اٹھی۔ اندر سے مجھے اپنی ہی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"شہزاد میری جان! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں نیند میں نہیں ہوں۔ اگر مَیں نیند میں ہوتی تو تم سے باتیں کیسے کرتی۔" چمپا میری آواز میں شہزاد سے مخاطب تھی۔

"لیکن خاتون! آپ .... آپ نے تو کہا تھا کہ نیند .... آپ کو نیند میں چلنے کی عادت ہے .... ارے یہ .... یہ نہ کریں۔ حد .... حد سے تجاوز کرنا کسی .... کسی طرح مناسب نہیں۔" چمپا نے یقیناً کوئی ایسی ہی گھٹیا اور نازیبا حرکت کی ہو گی کہ شہزاد احتجاج کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"میں .... میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" چمپا کی جذبات سے بوجھل آواز ابھری۔

"محبت تو مَیں .... مَیں بھی تم سے کرتا ہوں معبلہ! مگر .... مگر محبت کا مطلب یہ .... یہ تو نہیں جو .... جو تم چاہتی ہو۔" اب شہزاد کی آواز بھی جذبات سے مرتعش تھی۔

"تم بس یونہی لیٹے رہو، تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"معبلہ! .... یہ غلط ہے .... یہ گناہ ہے۔" شہزاد کی کانپتی ہوئی سی آواز آئی مگر اب اس کی آواز میں شدت یا احتجاج برائے نام ہی تھا۔

"محبت کرنا کوئی گناہ نہیں اور .... اور پیا ملن محبت کی آخری منزل ہے۔"

اسی کے فوراً بعد شہزاد کی سسکاری سی سنائی دی۔ چمپا نے شاید اسے زیر کر لیا تھا۔

"معبلہ .... میری جان، میری زندگی!" شہزاد کی آواز کیف و نشاط میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ پوری طرح چمپا کے قرب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر ان دونوں کی سرگوشیاں، سسکاریوں میں ڈوب گئیں۔ مجھے اب ان کے تیز تیز سانسوں کی آوازیں سنائی دے رہی

تھیں۔ چمپا اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ میں، شہزاد کے سامنے نظر اٹھا کر بات کر سکتی۔ میں دبے قدموں وہاں سے اپنے کوارٹر میں لوٹ آئی۔ معلوم نہیں، شہزاد نے چمپا سے یہ پوچھا تھا یا نہیں کہ کوارٹر کا دروازہ بند ہونے کے باوجود وہ اندر کیسے آ گئی تھی؟ بہرحال یہ سوال شہزاد کے ذہن میں ابھرا ضرور ہو گا۔

دیر تک مَیں یہ سوچتی رہی کہ پہلے تو مَیں نے شہزاد سے نیند میں چلنے کا بہانہ کر دیا تھا مگر اب اس کا سامنا کیسے کروں گی؟ چمپا کی اس کمینگی پر میرا خون کھول رہا تھا، مگر مَیں بے بس تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح اس گھٹیا حرکت سے باز رکھوں۔ ان ہی خیالوں میں جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

یہ بھی اسی رات کا ذکر ہے کہ مَیں نے اپنے جسم پر کسی کا بوجھ محسوس کیا تو میری آنکھ کھل گئی۔ کوارٹر میں اندھیرا تھا اور مجھے کسی کے تیز سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ مَیں اس شخص کو اپنے اوپر سے اچھال کر دور پھینک دیتی، کمرے میں ایک دم روشنی ہو گئی۔

"قاسم!" مَیں نے شہزاد کی تیز آواز سنی۔ "تیری یہ ہمت۔"

اتنا سنتے ہی قاسم میرے اوپر سے اچھل کر اپنے بے ترتیب لباس کو سنبھالتا ہوا بستر ہی پر دور جا گرا۔ مَیں نے اپنی حالت دیکھی تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ میرا لباس بھی بے ترتیب ہی تھا۔ مَیں ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ قاسم نے یقیناً اس وقت جب مَیں گہری نیند میں تھی تو مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی خاطر یہ سب کیا تھا اور جب وہ ایسا کرنے والا تھا تو میری آنکھ کھل گئی تھی۔ اسی کے ساتھ شہزاد بھی وہاں آ گیا تھا۔ مَیں نے جلدی سے اپنی ساڑھی درست کی اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

شہزاد یقیناً یہی سمجھا تھا کہ جو کچھ ہونے والا تھا، اس میں میری مرضی و خواہش بھی شامل تھی۔ وہ اسی لئے نظریں جھکا کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "خاتون! مجھے افسوس ہے کہ مَیں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی۔ اگر اتفاق سے میری آنکھ نہ کھل گئی ہوتی اور مَیں نے آپ کو قاسم کے لئے کوارٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہوتا تو مجھے آپ کا اصل چہرہ کبھی دکھائی نہ دیتا۔ آپ اتنی ہرجائی ہوں گی مجھے .... مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔" یہ کہتے ہی وہ جانے کے لئے مڑتے ہوئے بولا۔ "مجھے معاف کر دیجئے گا کہ مَیں نے لمحات عیش میں مداخلت کی۔"

"رک جاؤ۔" مَیں تیز آواز میں بولی۔

"اب رکنے سے کیا فائدہ خاتون!" اس نے مڑ کر کہا۔ "سب کچھ تو مَیں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ مَیں صرف آپ کو یہ احساس دلانے آیا تھا کہ مجھے بے خبر نہ سمجھیں۔"

میری حالت اس وقت کسی ایسے چور کی سی تھی جو عین موقع پر چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ اس کے باوجود میں نے ہمت سے کام لیا اور شہزاد ہی کے سامنے قاسم سے سخت آواز میں پوچھا۔ "تم یہاں میرے کوارٹر میں کیسے آئے؟" قاسم اب مسہری سے اتر کر نیچے کھڑا ہو گیا تھا۔

خلاف توقع قاسم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اب زیادہ اس کے سامنے پاک دامن بننے کی

کوشش مت کرو۔ شام کو بھی تم نے مجھ سے اظہار عشق کیا تھا اور پھر مکر گئی تھیں اور اب خود مجھ سے اپنے کوارٹر میں آنے کے لئے کہہ کر معصوم بن رہی ہو۔ تمہارے ہی کہنے پر تو مَیں نے فاطمہ کو راستے سے ہٹایا تھا۔"

"قاسم!" مَیں چیخ اٹھی۔ "یہ تُو کیا بکواس کر رہا ہے؟"

"یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔ تم نے اسی لئے تو فاطمہ کو خاموشی سے دفن کرا دیا ورنہ اس کے قتل میں مجھے پولیس کے حوالے بھی کر سکتی تھیں لیکن پھر مَیں پکڑا جاتا تو اپنی ہوس کی آگ کس سے بجھاتیں، کسے رات کو اپنے کوارٹر میں بلاتیں؟"

مارے غصے کے میرا خون کھول اٹھا اور مَیں اس پر جھپٹ پڑی۔ معلوم نہیں قاسم کے جسم میں اتنی قوت کہاں سے آ گئی کہ اس نے میری دونوں کلائیاں پکڑ لیں اور پھر غراتے ہوئے شہزاد سے بولا۔ "تم جاؤ شاہد صاحب! مجھے اس سے نمٹنے دو۔ مجھے معلوم ہے تم چلے جاؤ گے تو یہ نخرے نہیں دکھائے گی اور سیدھی ہو جائے گی۔" اسی کے ساتھ قاسم نے مجھے دھکیل کر مسہری پر گرا دیا اور مجھ سے درشت لہجے میں مخاطب ہوا۔ "اسی طرح پڑی رہ، اگر بستر سے اٹھی تو ٹانگیں چیر دوں گا تیری۔"

"قاسم!" شہزاد چیخا اور پھر جارحانہ انداز میں آگے بڑھا۔

قاسم اپنی جگہ تن کر کھڑا رہا۔ جیسے ہی شہزاد نے اس پر ہاتھ اٹھایا، اس نے الٹا ہاتھ شہزاد کے جبڑے پر مارا۔ مَیں نے حیرت سے دیکھا کہ شہزاد اچھل کر کسی مردہ چھپکلی کی طرح دور جا گرا۔ اسی وقت مَیں نے اپنی جگہ سے حرکت کی لیکن قاسم نے پلٹ کر مجھے پھر بستر پر گرا دیا اور بولا۔ "اب میں تیرے اس حمایتی کے سامنے پامال کروں گا۔" اسی کے ساتھ وہ مسہری پر چڑھ آیا۔ مجھے اس کے جسم میں غیر معمولی قوت کا احساس ہو چکا تھا اس کے باوجود ایک بار پھر مَیں اس سے بھڑ گئی۔

اس نے مجھے پھر اٹھا کر دور پھینک دیا۔ پھر وہ مجھے بے لباس کرنے کی غرض سے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ خود کو اس سے بچانے کی کوشش میں میرے جسم پر موجود لباس تار تار ہو گیا۔ اسی دوران ایک مرتبہ مجھے یہ موقع مل گیا کہ اس کی گرفت سے نکل کر مسہری سے چھلانگ لگا دی۔ وہ بھی میرے پیچھے لپکا اور چند ہی لمحے بعد مجھے دبوچ لیا۔ اس عرصے میں شہزاد اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے دوبارہ قاسم پر حملہ کر دیا۔ اس وقت تک قاسم مجھے اپنی گود میں اٹھا چکا تھا۔ شہزاد کے گھونسے کھا کر جیسے قاسم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جواب میں اس نے شہزاد کی پنڈلی پر ٹھوکر ماری اور شہزاد چیختا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ مَیں قاسم کی فولادی گرفت میں تھی۔

اب میں اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ قاسم کے جسم میں اتنی غیر معمولی قوت کیسے پیدا ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً اس وقت چمپا کے سحر میں تھا۔ قاسم جو کچھ کہہ رہا تھا اور کر رہا تھا ہر چند کہ اس کا خود ذمے دار نہیں تھا پھر بھی مجھے تو کسی نہ کسی طرح اپنی عزت و آبرو تو اس سے بچانا تھی۔ اب تک کئی ایسے مواقع مجھے ملے تھے کہ میں، قاسم کو موت کی نیند سلا دیتی، مگر مَیں نے اس سے گریز کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ مَیں اسے قصوروار نہیں سمجھ رہی تھی۔

قاسم نے مسہری کے قریب آ کر مجھے بستر پر اچھال دیا اور پھر خود بھی چڑھ آیا۔ اس نے مجھے اٹھنے کی مہلت نہیں دی تھی اور مجھ پر چھا گیا تھا۔ اب وہ لمحات آ چکے تھے کہ اگر میں آخری قدم نہ اٹھاتی تو قاسم مجھے بے آبرو کر دیتا۔ مَیں پوری طرح اس کی گرفت میں تھی۔ مجبوراً مَیں نے اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی میں اپنے زہریلے دانت گاڑ دیئے۔

"کاٹتی ہے کتیا!" وہ چیخ کر بولا۔ "مگر مَیں تجھے اس کے باوجود......" اس نے گالی بکی اور اسی کے ساتھ دوسرے ہاتھ سے میرے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ میرے بالوں کو جھٹکا دیتا، مَیں نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ میں اپنا کام کر چکی تھی۔ میں نے اپنا زہر اس کے جسم میں اتار دیا تھا۔ اس نے صرف ایک جھٹکا دے کر میرے سر کے بال چھوڑ دیئے اور دوبارہ مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مَیں اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے مچلنے لگی تاکہ وہ زہر کے اثر کرنے سے پہلے کہیں اپنی ناپاک کوشش میں کامیاب نہ ہو جائے ورنہ تو مَیں کہیں کی نہ رہتی۔

"تڑپ، کتنا تڑپے گی اور کب تک بچے گی؟" وہ مجھے بے بس کر کے وحشیانہ انداز میں ہنسا۔ پھر اگلے ہی لمحے مَیں نے اپنے جسم پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوتے محسوس کی۔ اسی کے ساتھ وہ بڑبڑایا۔ "یہ .... یہ میرے دل .... دل کو کیا ہو رہا .... ہے؟"

"تو کتے کی موت مر رہا ہے قاسم!" مَیں نے اسے اپنے اوپر سے ایک طرف دھکیل دیا اور اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔

"نن .... نہیں۔" وہ چیخا اور یہی اس کے آخری الفاظ تھے۔

مَیں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے گھسیٹا اور مسہری سے نیچے پھینک دیا۔ قاسم کا جسم نیلا پڑنے لگا اور چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ اسی لمحے میری نظر شہزاد پر پڑی اور مجھے اپنے جسم پر موجود تار تار لباس کا خیال آیا۔ مسہری کے قریب ہی میرا ایک سوٹ کیس رکھا تھا اسی میں وہ بلاؤز بھی رکھے تھے جو شہزاد سلوا کر لایا تھا۔ مَیں نے جلدی سے سوٹ کیس کھول کر ایک بلاؤز اور ساڑھی نکال لی۔ کمرے میں کیونکہ شہزاد بھی موجود تھا اس لئے کمرے کے باہر جا کر مَیں نے پھٹا ہوا بلاؤز اتار کر نیا بلاؤز پہنا اور پھر ساڑھی باندھ لی۔ مَیں دوبارہ کمرے میں پہنچی تو شہزاد کو دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے دیکھا۔

"یہ .... یہ اسے کیا ہو گیا خاتون؟" شہزاد نے قاسم کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے منہ سے تو جھاگ نکل رہے ہیں؟"

"یہ مر چکا ہے۔" مَیں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"م .... مر چکا ہے؟" شہزاد ہکلایا۔

"ہاں اور اب اس کی لاش بھی زمین میں دبانا پڑے گی۔"

"مگر .... مگر یہ کیسے .... کیسے مر گیا؟"

"جیسے سب ایک روز مر جاتے ہیں۔ اس کا وقت آ گیا تھا اس لئے مر گیا۔" میرا لہجہ اب بھی پُرسکون ہی تھا۔ "غنی، عبدل اور رحمت کو بلا لاؤ جا کر۔ فاطمہ کی قبر کے برابر اسے بھی دفن کرنا پڑے گا،

یہ اگر حد سے گزرنے کی کوشش نہ کرتا تو شاید نہ مارا جاتا۔"

شہزاد خوفزدہ نظروں سے قاسم کی لاش کو اکڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے دوبارہ اسے ملازمین کو بلا کر لانے کا حکم دیا تو وہ کمرے سے نکل گیا۔ وہ چلا گیا تو میں نے باہر صحن سے پھٹا ہوا بلاؤز اور تار تار ساڑھی اٹھا کر مسہری کے نیچے ڈال دی۔

اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ جب میرے ملازمین قاسم کے لئے قبر کھود رہے تھے۔ اس جھنجٹ سے نجات پانے میں صبح کے پانچ بج گئے تھے۔ میں نے اپنے ملازمین کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ قاسم کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ میری بات کی تصدیق قاسم کے منہ سے نکلتے ہوئے جھاگ نے بھی کر دی تھی البتہ وہ لوگ اس پر حیران تھے کہ رات کے وقت قاسم میرے کوارٹر میں کس لئے آیا تھا۔ میں نے ان سے یہ بات نہیں چھپائی کہ قاسم کے ارادے نیک نہیں تھے اور اس نے مجھ پر دست درازی کی کوشش کی تھی جس کی گواہی شہزاد نے بھی دے دی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ قاسم نے کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب میں نے دریافت حال کے لئے دروازہ کھولا تو وہ اندر گھس آیا۔ میرے دروازے پر دستک دینے کی آواز ہی سے شہزاد کی آنکھ کھل گئی تھی اور پھر وہ بھی میرے کوارٹر میں آ گیا تھا۔ شہزاد نے میری غلط بیانی کی تردید نہیں کی۔ پھر میں نے بتایا کہ نامعلوم کدھر سے ایک سانپ نکل آیا اور قاسم کو ڈس لیا۔ دن کے وقت سبھی نے کوٹھی میں سانپوں کو دیکھا تھا اس لئے میری بات کا یقین کر لیا۔

چند گھنٹوں کے اندر میرے دو ملازمین موت کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔ قاسم سے زیادہ مجھے فاطمہ کی موت کا رنج تھا۔ وہ لڑکی مجھے بہرحال بہت عزیز تھی۔

رات کا بڑا حصہ جاگتے گزرا تھا اس لئے میں دوپہر تک سوتی ہی رہی۔ یہ رات مجھ پر پچھلی رات سے بھی زیادہ بھاری گزری تھی۔ جاگنے کے بعد معلوم ہوا کہ راجہ استاد دو مرتبہ چکر کاٹ کر جا چکا ہے۔ اب اس نے رات کو آنے کے لئے کہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ گزشتہ رات کی وعدہ خلافی پر مجھ سے شکوہ کرنے آیا ہو گا۔ نہا دھو کر میں ناشتہ کر چکی تھی اور لان میں آ بیٹھی تھی۔ وہیں میں نے شہزاد کو بلوا لیا تھا۔

"ٹھیکیدار نئے مزدوروں کو لے کر نہیں آیا؟" میں نے شہزاد سے معلوم کیا۔

"نہیں خاتون! وہ تو نہیں آیا اور شاید اب آئے بھی نہیں۔ کل وہ بہت خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔" شہزاد نے بتایا۔

شہزاد کی نظروں میں آج میں پہلے کی نسبت خاصی بے باکی محسوس کر رہی تھی۔ جو عورت کسی مرد کی خلوت آباد کر چکی ہو' اس کے لئے مرد کی نظریں اسی طرح بے باک ہو جاتی ہیں۔ میں نے اسی لئے نہیں ٹوکا۔ اسے کیا خبر تھی کہ رات کو اس کے پہلو میں میرے بجائے کوئی اور عورت تھی۔

"سنیں خاتون! رات کو ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" شہزاد اچانک اس طرح بولا جیسے اسے ابھی یہ بات یاد آئی ہو۔ وہ اب بھی مجھے ادب ہی سے مخاطب کر رہا تھا۔ رات کے ذکر پر میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تو اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اندر سے اپنے کوارٹر کا دروازہ بند

کر کے سویا تھا' پھر جب آنکھ کھلی تو آپ میرے پاس موجود تھیں۔ اس کے بعد آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ کچھ ایسی فضا ہو گئی جو مجھے کچھ یاد ہی نہ رہا۔ یہ تو بتا دیں اب کہ آپ کس طرح اندر آ گئی تھیں؟"

اب تک میں گزشتہ رات کے ذکر سے بچ رہی تھی مگر آخرکار کسی نہ کسی بہانے پر یہ ذکر چھڑ ہی گیا تھا۔ میں اسے کس طرح بتاتی کہ رات کو اس کے کوارٹر میں آنے والی چمپا تھی اور یہ کہ چمپا جیسی شیطانی قوتیں رکھنے والی عورت کے لئے بند دروازے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میں نے بات کو ٹالنے کے لئے ایک اور ہی بات شروع کر دی۔ "دہلی چلنے کے لئے تمام تیاریاں تو کر لی ہیں نا تم نے؟" میں نے اس طرح یہ سوال کیا تھا جیسے اس نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا ہو۔

"تیاریاں کیا کرنا ہیں' کپڑے سل ہی آئے ہیں' ایک سوٹ کیس بھی خرید لیا ہے۔" اس نے جواب دیا اور پھر کہنے لگا۔ "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ جب سے میں سو کر اٹھا ہوں اسی الجھن میں گرفتار ہوں۔"

مجھے آخر اس سے مجبوراً کہنا ہی پڑا۔ "گزشتہ رات جو کچھ بھی ہوا' اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میں نہیں جانتی' کیا ہوا تھا اور نہ میں اس پر گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا آپ اب بھی یہی کہیں گی خاتون کہ نیند میں تھیں؟" شہزاد کے لہجے میں چبھن سی تھی۔ "حالانکہ رات کو آپ خود کہہ رہی تھیں کہ........."

"چپ ہو جاؤ۔" میں بول اٹھی۔ میری آواز میں سختی کے ساتھ تلخی بھی گھلی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے خاتون! میں چپ ہوا جاتا ہوں' کچھ نہیں کہتا......... مگر......... مگر میں بھی انسان ہوں کوئی کھلونا نہیں کہ جب تک آپ کا جی چاہے مجھ سے کھیلیں اور......... جب چاہیں مجھ سے محبت کا دعویٰ کرنے کے باوجود کسی اور کو اپنے پاس بلا لیں۔" شہزاد کا لہجہ ایک دم بدل سا گیا۔ "اگر میں سب ملازمین کو یہ بتا دوں کہ رات کو جب میں آپ کے کوارٹر میں پہنچا تو آپ قاسم کے ساتھ کس حال میں تھیں' تو کیا عزت رہ جائے گی آپ کی' آپ نے یہ ہرجائی پن کیوں کیا؟ ایسا تو وہ عورتیں بھی نہیں کرتیں جنہیں داشتہ بنا کر رکھا جاتا ہے۔ معاف کیجئے گا' آپ کی یہ حرکت تو کسی گھٹیا درجے کی طوائف جیسی تھی۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ اتنے پست کردار کی مالک........."

شہزاد کا جملہ پورا نہیں ہو سکا' میرا ہاتھ اتنی زور سے اس کے رخسار پر پڑا تھا کہ منہ پھر گیا تھا۔

"شرم نہیں آتی تمہیں میرے سامنے یہ بکواس کرتے ہوئے۔" غصے کی زیادتی کے سبب میں چیخ اٹھی۔

"تمہیں بھی تو شرم نہیں آئی تھی معبلہ! میرے سوا کسی اور کا پہلو گرماتے ہوئے۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈھٹائی سے بولا۔ "جب میں پہنچ گیا تو بھانڈا پھوٹ جانے کی وجہ سے تم نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ اگر اب تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو تمہیں پچھتانا پڑے گا۔" شہزاد کا لہجہ قطعی بدلا ہوا تھا۔

"کیا کر لو گے تم میرا؟ بولو۔" میں طیش کے عالم میں چیخ کر بولی۔

"تمہارے ہتھکڑیاں لگوا دوں گا۔ میں پولیس کو خبر کر دوں گا کہ تم نے اپنے دو ملازمین کو قتل کر کے اپنی کوٹھی کے عقبی حصے میں ان کی لاشیں دفنا دی ہیں۔" اس نے دھمکی دی۔

اسی وقت جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ یہ الفاظ شہزاد کی زبان پر ہرگز نہیں آ سکتے تھے۔ وہ قاسم ہی کی طرح یقیناً چمپا کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا۔ چمپا ہی اس سے یہ سب کچھ کہلوا رہی تھی۔ یہ سوچ کر میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا لیکن اسی کے ساتھ میں اپنی مدافعت کے بارے میں سوچنے لگی۔ اگر واقعی چمپا نے شہزاد کے ذریعے پولیس کو لاشوں کے متعلق بتا دیا تو کیا ہو گا؟ اس طرح تو میں ایک نئی مشکل میں پھنس جاتی۔

"تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" میں ایک دم نرم پڑ گئی کہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

"یہ کہ تم صرف اور صرف میری وفادار بن کے رہو' میرے سوا کسی اور کا پہلو نہ گرماؤ۔"

مَیں نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو قابو میں رکھا اور بولی۔ "تم جو چاہتے ہو وہی ہو گا۔"

"تو پھر اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔" وہ میری طرف دیکھ کر بے حیائی سے مسکرایا۔

"مگر کہاں؟"

"میرے کوارٹر میں اور کہاں' رات کے حسین لمحات کی یاد میں پھر تازہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں' اس وقت نہیں۔"

"کیوں نہیں' تم میری محبوبہ ہو اور خود ابھی کہہ چکی ہو کہ وہی ہو گا جو مَیں چاہوں گا۔ تمہیں اسی وقت میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔ ورنہ مَیں تمہیں گود میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔" اس کے تیور جارحانہ ہو گئے۔

کیا گزشتہ رات والی کہانی پھر دہرائی جانے والی ہے؟ مَیں نے دکھی دل سے سوچا۔ کیا شہزاد بھی قاسم کی طرح میرے ساتھ زبردستی کر کے اپنی موت کو دعوت دینا چاہتا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو یہ بہت برا ہو رہا تھا کیونکہ میں' شہزاد کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ بات بگڑ جاتی اور حالات میرے قابو سے باہر ہو جاتے' میں نے وقتی طور پر اس مسئلے کا ایک حل سوچ ہی لیا۔ میں ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا نپا تلا مکا شہزاد کی بائیں کنپٹی پر پڑا۔ وہ آواز نکالے بغیر تیورا کر کرسی سے نیچے جا گرا۔

میں نے رحمت کو آواز دے کر بلایا۔ وہ لپکتا ہوا قریب آ گیا تو میں نے اس سے کہا۔ "بیٹھے بیٹھے نہ معلوم کیا ہوا کہ شاہد بے ہوش ہو گیا۔ اسے اس کے کوارٹر تک پہنچانا ہے۔ تم عبدل کو بھی بلا لاؤ' جاؤ جلدی سے۔"

"کیوں جھوٹ بول رہی ہو۔ میں خود دور کھڑا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ تم نے ابھی میری آنکھوں کے سامنے ان کی کنپٹی پر گھونسہ مارا تھا۔" رحمت بے ادبی سے بولا۔

"رحمت!" مجھے اس کے لہجے اور بے ادبانہ طرزِ تخاطب پر غصہ آ گیا۔

"چیخو مت' میں جانتا ہوں کہ تم قاسم کی طرح شاہد صاحب کو بھی کوئی بہانہ بنا کر قتل کر دینا چاہتی

ہو۔ مگر یاد رکھو' اب ہم کوئی نئی قبر نہیں کھودیں گے اور سب کچھ پولیس کو جا کر بتا دیں گے۔ تم ہمیں اپنا زرخرید غلام نہ سمجھو۔" وہ اور بھی گستاخی پر اتر آیا۔

میں چکرا کے رہ گئی۔ میرے نزدیک یہ سب کچھ بلاوجہ نہیں تھا۔ شہزاد کے بعد چمپا نے اب رحمت کو اپنے سحر میں لے لیا تھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ میں اسے بھی شہزاد کی طرح لمبا لمبا لٹا دیتی۔

"بولو' تم نے اسے مکا مار کر کیوں بے ہوش کیا؟" رحمت کا انداز جواب طلبی کا سا تھا۔

"بتاتی ہوں۔" یہ کہتے ہی مَیں اس پر اچانک جھپٹ پڑی۔ نتیجتاً رحمت بھی بے ہوش ہو کر گھاس پر گر پڑا۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کروں تو کیا کروں کہ ایک طرف سے عبدل اور غنی کو آتے دیکھا۔ وہ تیز قدمی سے چلتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے' انداز ایسا تھا جیسے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہوں۔ میں کھٹک گئی کیونکہ اس وقت چمپا یکے بعد دیگرے مجھ پر وار کئے جا رہی تھی۔

"بیگم صاحبہ! میرے کوارٹر میں سانپ نکل آیا ہے۔" عبدل آگے بڑھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس کی نظر ابھی تک شاید بے ہوش رحمت اور شہزاد پر نہیں پڑی تھی۔

عبدل جس لہجے میں ادب کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوا تھا' اسے محسوس کر کے میری جان میں جان آئی۔ مَیں نے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ چمپا کے سحر سے آزاد ہے۔

"آپ بیگم صاحبہ! سانپ پکڑ لیتی ہیں' میں نے اسی لئے عبدل کو مشورہ دیا کہ آپ کو چل کر بلا لاتے ہیں۔ یہ وہی سانپ معلوم ہوتا ہے جس نے رات کو قاسم .... ارے یہ .... یہ رحمت اور شاہد صاحب کو کیا ہو گیا؟ .... دونوں ہی بے ہوش لگتے ہیں۔" غنی نے کہا۔

"ہاں یہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "لیکن پہلے عبدل کے کوارٹر میں چلتے ہیں۔ بعد میں تم دونوں رحمت اور شاہد کو یہاں سے اٹھا کر ان کے کوارٹروں میں پہنچا دینا۔"

"جی بہتر ہے بیگم صاحبہ!" عبدل سعادت مندی سے بولا۔

غنی اور عبدل کے ساتھ میں کوارٹروں کی طرف چل دی۔ کچھ ہی دیر بعد جب میں عبدل کے کوارٹر میں داخل ہوئی تو اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے اور کنڈی لگائے جانے کی آواز سن کر چونک اٹھی۔ مَیں تیزی سے مڑی تو میرے ذہن کو دوسرا جھٹکا لگا۔ عبدل اور غنی کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آ رہے تھے اور ان کے ہونٹوں پر بڑی خبیث مسکراہٹ تھیں

"یہ کیا حرکت ہے؟" مَیں نے انہیں ڈانٹا۔

"ہم نے سوچا کہ جب سبھی کو تم اپنے حُسن کی خیرات بانٹ رہی ہو تو بہتی گنگا میں ہمارے ہاتھ دھو لینے سے کون سا فرق پڑ جائے گا' میری پیاری بیگم جان!" عبدل بے غیرتی سے ہنسا۔

"اس لئے اے میری گلہری' اب تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ سیدھی طرح کمرے میں چلی چلو' ہم بھی تو آخر مرد ہیں اور سینے میں دل رکھتے ہیں۔ ہمیں سب معلوم ہے کہ رات کو تم شاہد کے کوارٹر میں

کیوں گئی تھیں اور قاسم کو کس لئے اپنے کوارٹر میں بلایا تھا۔" اس مرتبہ غنی ہنس کر بولا۔ "اب ہم سے یہ نہ پوچھنا کہ تمہیں کس لئے گھیر کر یہاں لائے ہیں۔"

لعنتی چمپا ان بے قصور لوگوں کو اپنا آلہ کار بنا کر مجھے مصیبت میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔ مجھے وہ دونوں کوارٹر میں سانپ نکل آنے کے بہانے وہاں لے آئے تھے۔

"چلو اندر۔" عبدل نے مجھے حکم دیا۔

"یار! یہ اس طرح قابو میں نہیں آئے گی۔" غنی کہنے لگا۔ "تو اسے گود میں اٹھا لے' میں ریوالور لئے پیچھے پیچھے چلتا ہوں۔"

"ہاں' یہ ٹھیک رہے گا۔" عبدل نے اتفاق کیا اور اپنا ریوالور جیب میں رکھ کر میری طرف بڑھا۔

"اگر تُو مرنا نہیں چاہتا عبدل تو رک جا۔" مَیں اس کی طرف دیکھ کر تیز آواز میں بولی۔

"ہم تو پہلے ہی تم پر مر چکے ہیں میری جان! اب اور کیا کرنا ہے۔"

ادھر عبدل کے الفاظ ختم ہوئے' ادھر مَیں نے اس پر چھلانگ لگا دی' مجھے معلوم تھا کہ غنی چمپا کے سحر میں گرفتار ہے اس لئے مجھ پر گولی نہیں چلا سکے گا۔ یہ مجھے یقین تھا کہ چمپا میری ہلاکت نہیں چاہتی ورنہ تو وہ کسی کو بھی اپنا آلہ کار بنا کر اب تک مجھے ختم کر چکی ہوتی۔

عبدل پہلے ہی سے چوکنا تھا' اس کے باوجود میری گرفت میں آ گیا۔ انتہائی قدم اٹھانے سے مَیں نے گریز کیا اور اس کی کنپٹی پر بھی ضرب لگائی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ مَیں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اب میرے مقابل صرف غنی رہ گیا تھا۔ اس اعتماد یقین کے سبب کہ غنی مجھ پر گولی نہیں چلائے گا' مَیں ریوالور پر نظر جمائے اس کی طرف بڑھنے لگی۔

"رک جاؤ' ورنہ مَیں تمہیں گولی مار دوں گا۔" غنی نے مجھے دھمکی دی۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" میری آواز میں خود اعتمادی تھی۔

غنی کے چہرے سے اچانک بدحواسی جھلکنے لگی اور پھر وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑانے لگا۔

"یہ .... یہ مَیں کیا .... کیا کر رہا ہوں .... مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں ——— میں نے بیگم صاحبہ پر ریوالور کیوں تان رکھا ہے؟ .... کیوں .... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے ——— بالکل نہیں۔"

میں اب غنی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر مَیں نے اس سے ریوالور چھین لیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعی کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ لعنتی چمپا نے غنی کو اپنے سحر سے آزاد کر دیا ہے۔ مَیں نے ریوالور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "اسے اپنی جیب میں رکھ لو۔"

"ج .... جی بیگم صاحبہ!" وہ ہکلایا اور پھر مجھ سے ریوالور لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"اسے اٹھواؤ!" میں نے بے ہوش عبدل کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے کیا .... کیا ہو گیا بیگم صاحبہ!" اس نے حیرت سے پوچھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کچھ دیر پہلے کے واقعات اس کے ذہن سے محو ہو چکے تھے۔

"معلوم نہیں کیا ہوا' میں جب یہاں پہنچی تو یہ بے ہوش اور تم یہاں ریوالور ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔" مَیں نے بات بنا دی۔

"لیکن میں .... میں تو اپنے کوارٹر میں رات کے کھانے کی تیاری کر رہا تھا' پھر یہاں .... یہاں کیسے آ گیا؟"

"مجھے نہیں معلوم' آؤ عبدل کو اٹھواؤ۔" مَیں نے جواب دیا۔

میرے حکم کی تعمیل میں غنی نے دیر نہیں کی۔ مَیں نے غنی کی مدد سے عبدل کو اٹھا کر اندر کمرے میں چارپائی پر ڈال دیا اور پھر کمرے سے نکل آئی۔ غنی بھی باہر آ گیا تو مَیں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد میں' غنی کو ساتھ لئے لان میں پہنچی اور تقریباً اچھل پڑی۔ رحمت وہاں سے غائب تھا حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے مَیں اسے بے ہوشی کی حالت میں وہیں پڑے ہوئے چھوڑ کر گئی تھی۔ شہزاد البتہ ابھی تک وہیں بے ہوش پڑا تھا۔ رحمت کہاں جا سکتا ہے؟ میں نے سوچا اور پھر میری سماعت میں اس کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے پولیس کو سب کچھ بتانے کی دھمکی دی تھی۔ دراصل یہ دھمکی اس نے نہیں' چمپا نے اس کے ذریعے مجھے دی تھی۔ چمپا کے لئے اسے ہوش میں لانا کون سا مشکل تھا۔ وہ رحمت کو ہوش میں لا کر اسے پولیس کو یہ اطلاع دینے بھیج سکتی تھی کہ میری کوٹھی کے عقبی حصے میں دو لاشیں دفن کی گئی ہیں ظاہر ہے کہ فاطمہ اور قاسم کی لاشیں برآمد ہونے کی صورت میں میرے لئے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ آخر میں پولیس کو ان لاشوں کے بارے میں کیا بتاتی۔ کچھ سوچتے ہوئے میں نے پہلے شہزاد کے بے ہوش جسم کو وہاں سے اٹھوا کر اس کے کوارٹر میں پہنچا دیا اور کمرے کا دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا۔ پھر میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا چار بج رہے تھے۔ غنی سے میں نے اس کے کوارٹر میں جانے کو کہا اور تیزی سے اپنے کوارٹر کی طرف بڑھی۔ اپنے چہرے پر مَیں نے ایک نیا میک اپ کیا اور دونوں سوٹ کیس اٹھا کر باہر آ گئی۔ مَیں اس وقت کوٹھی سے راہ فرار اختیار کر سکتی تھی لیکن مجھے ارشاد حسین کا انتظار تھا۔ اس نے آج شام ساڑھے چار بجے سے پانچ بجے تک آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مَیں اس کی آمد سے پہلے نہیں جا سکتی تھی۔

میں اب لان میں آ کر بیٹھ چکی تھی۔ کسی بھی غیر متوقع صورت حال کے لئے مَیں پوری طرح تیار' مستعد اور چوکنا تھی۔ گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے لان میں بیٹھے ابھی چند منٹ ہوئے تھے کہ ارشاد حسین کو ذیلی دروازے سے اندر آتے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اس کے چہرے پر اس وقت رام پرشاد اگروال کا میک اپ تھا اور وہ دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ مَیں ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب میں اپنی کوٹھی میں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ ارشاد حسین سے کہیں اور بھی گفتگو کی جا سکتی تھی۔

ارشاد حسین تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا تو میں جلدی سے بولی۔ "ارشاد! یہاں خطرہ ہے' ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

اس نے یقیناً میری آواز پہچان لی تھی۔ وہ میری بات سن کر پوچھنے لگا۔ "کیا ہوا معلبہ! کیسا خطرہ؟"

"میں سب کچھ بتا دوں گی' پہلے یہاں سے نکل چلو۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہی وہ مڑا اور پھر ایک دم چونک کر بولا۔ "پولیس۔"

میں نے بھی پولیس کو پھاٹک کے ذیلی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ پولیس پارٹی پانچ افراد پر مشتمل تھی۔ ان ہی کے ساتھ مجھے رحمت بھی نظر آ گیا تھا۔ مجھے جس بات کا ڈر تھا وہ سامنے آ گئی تھی۔ اگر مجھے ارشاد حسین کا انتظار نہ ہوتا تو میرے پاس اتنا وقت یقیناً تھا کہ وہاں پولیس کی آمد سے پہلے فرار ہو جاتی۔ موجودہ صورت حال سے نمٹنے کے لئے میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مَیں نے کچھ سوچتے ہوئے ارشاد حسین کو مخاطب کیا۔ "سنئے ارشاد! آپ رام پرشاد اگروال تو ہیں ہی' مگر میں آپ کی مسز ہوں' یعنی مسز اگروال۔ ہم دونوں یہاں مس رانی کی دعوت پر ان سے ملنے آئے تھے اور اب انہیں موجود نہ پا کر واپس جا رہے ہیں۔"

"بالکل صحیح ہے۔" ارشاد حسین نے میری بات سے اتفاق کیا۔ "تو پھر آیئے' چلتے ہیں۔"

"چلو۔" ایک سوٹ کیس مَیں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر پولیس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہم دونوں ہی گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔

"اے! تم لوگ ٹھہرو۔" ایک دراز قد پولیس والے نے ہاتھ سے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنی وردی سے انسپکٹر لگ رہا تھا۔ ہم رک گئے تو پولیس انسپکٹر قریب آ کر ہم سے بولا۔ "کون ہو تم لوگ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس کی نظریں میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

جواب میں ارشاد حسین نے وہی کہانی سنا دی جو مَیں نے اسے بتائی تھی۔

"تم لوگ مس رانی کو کیسے جانتے ہو؟" پولیس انسپکٹر نے گھور کر مجھ سے سوال کیا۔

"انسپکٹر صاحب!" رحمت بول اٹھا۔ "یہ شخص پہلے بھی کوٹھی میں آتا رہا ہے' مگر .... مگر یہ .... یہ عورت پہلی مرتبہ نظر آئی ہے .... وہ .... وہ جی رانی بھیس بدلنے میں بڑی ماہر ہے' کہیں یہی عورت تو رانی نہیں ہے؟" رحمت میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اپنے شک کا اظہار کرنے لگا۔

"کیا بکتے ہو؟" میں دانستہ آواز بدل کر بولی تاکہ رحمت کا شبہ دور ہو جائے۔ "میں مسز اگروال ہوں۔"

میری بدلی ہوئی آواز سن کر رحمت نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ "نہیں جی' یہ عورت رانی نہیں ہے۔" اسی وقت اس کی نظر میرے ہاتھ میں موجود سوٹ کیس پر پڑی اور اس نے چونک کر کہا۔ "لیکن جناب! یہ .... یہ سوٹ کیس رانی ہی کا ہے۔"

"ہوں۔" پولیس انسپکٹر نے ہنکارا بھرا۔ "اگر یہ سوٹ کیس بقول اس ملازم کے مس رانی کا ہے تو تمہارے پاس کیسے ہے؟"

"اور .... اور جناب! یہ دوسرا سوٹ کیس بھی رانی کا ہے جو اگروال کے پاس ہے۔" رحمت پھر بولا۔

"یہ دونوں ہمارے سوٹ کیس ہیں۔ یہ غلط کہتا ہے۔" ارشاد حسین نے کہا۔

"تم دونوں کسی سفر پر نکلے تھے یا یہاں ملنے آئے تھے؟ .... جھوٹ بولتے ہو۔" پولیس انسپکٹر کی آواز میں چبھن تھی۔ پھر وہ مزید کچھ سنے بغیر اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "ان دونوں کو حراست میں لے لو۔ لاشیں برآمد ہو جائیں تو پھر ان دونوں سے نمٹیں گے .... مگر پہلے رانی کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔" یہ کہہ کر پولیس انسپکٹر رحمت کی طرف مڑا۔ "رانی کے کوارٹر تک ہماری رہنمائی کرو .... جلدی کرو' اس کی گرفتاری کے بعد لاشیں بھی برآمد کرنا ہیں۔"

پھر پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کو تو ہمارے پاس چھوڑ گیا اور بقیہ دو سپاہیوں کو اپنے ساتھ کوارٹر کی طرف لے گیا۔ رحمت ان کے آگے آگے تھا۔ میرے ایما پر ارشاد حسین نے پولیس انسپکٹر کو جو کہانی سنائی تھی' کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ خود رحمت نے یہ تصدیق کر دی تھی کہ ارشاد حسین میرے ملاقاتیوں میں سے تھا۔ ممکن ہے' پولیس انسپکٹر اس کے بعد ہم دونوں کو جانے دیتا مگر سوٹ کیسوں نے کام بگاڑ دیا تھا۔

جو دو سپاہی ہماری نگرانی کر رہے تھے' مسلح تھے۔ مگر ان کی بندوقیں شانوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ ان دونوں پر قابو پا کر وہاں سے فرار ہو جانا مشکل نہیں تھا' مگر اس کے لئے ارشاد حسین کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ یہی سوچ کر مَیں نے دھیمی آواز میں ارشاد حسین کو مخاطب کیا۔ "اگر دو روپے پاس ہوں تو ایک ایک روپیہ بانٹنا پڑتا ہے۔" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

میری بات پر ارشاد حسین چونک اٹھا اور میری طرف دیکھا۔ وہ شاید میری بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

"تم دونوں یہ کیا کھسر پھسر کر رہے ہو۔" ایک پولیس والے نے ہمیں ڈانٹ پلائی۔

اسی وقت مَیں نے دونوں سپاہیوں میں سے ایک پر چھلانگ لگا دی۔ ارشاد حسین نے بھی میری تقلید کی تھی۔ خلاف توقع اپنی یہ کوشش مجھے بہت مہنگی پڑی۔ جس سپاہی پر میں نے جست لگائی تھی' اس کی لات پوری قوت سے میرے پیٹ کے نچلے حصے پر پڑی تھی اور میں چیختی ہوئی اچھل کر دور جا گری تھی۔ عین اسی لمحے چمپا کا زہریلا قہقہہ میری سماعت سے ٹکرایا' پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "معبلہ! جب میں یہاں موجود ہوں تو کس طرح تجھے یہاں سے فرار ہو جانے دوں گی۔"

اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر کھڑی ہوتی' سپاہی اپنے شانے سے بندوق اتار کر اس کی نال میرے سینے پر رکھ چکا تھا۔ ارشاد حسین کا حشر بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوا۔ دوسرے سپاہی نے اسے ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسرے سپاہی نے اپنی بندوق کی نال ارشاد حسین کی پشت پر رکھ دی تھی۔

حیرت انگیز طور پر فرار کا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ چمپا اگر درمیان میں نہ آ گئی ہوتی تو یقیناً میری کوشش کامیاب رہتی۔ میں نے بے دلی کے ساتھ سوچا۔ میں اب خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے لئے مجبور تھی۔

ارشاد حسین اور میں نے فرار ہونے کی کوشش کر کے پولیس کی نظر میں خود کو مزید مشتبہ بنا لیا تھا۔ میرے تو وہم و گمان میں یہ بات نہیں تھی کہ صرف دو پولیس والوں سے نمٹنا مسئلہ بن جائے گا۔ پھر یہ کہ میں تنہا بھی نہیں تھی۔ میرے ساتھ ارشاد حسین بھی تھا جو نہ صرف خفیہ پولیس کا تربیت یافتہ تھا بلکہ ایک زیر زمین خفیہ تنظیم سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ عام حالات میں پولیس والوں سے ایسی مستعدی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی لیکن شاید ارشاد حسین قطعی بے خبر تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میری طرح اس نے بھی چمپا کی آواز سن لی ہو۔

میں ابھی تک گھاس پر پڑی ہوئی تھی اور میرے سینے پر بندوق کی نال تھی۔ معاً میں نے پولیس والے کی نظروں میں ایک نئی بات محسوس کی۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت ناچنے لگی تھی۔ بندوق کی نال اب دھیرے دھیرے اِدھر سے اُدھر حرکت کرنے لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ سپاہی' چمپا کے سحر کے زیر اثر ہی یہ نازیبا حرکت کر رہا تھا۔

میرا خون کھول اٹھا۔ اسی کے ساتھ اچانک شدید غصے کے سبب میرے جسم میں بجلیاں دوڑنے لگیں۔ پولیس والا میری کیفیت سے بے خبر اپنی فحش حرکت میں مصروف تھا۔ کافی عرصے کے بعد میرے وجود میں خوابیدہ ایک ایسی پُراسرار خطرناک قوت بیدار ہو رہی تھی جو کسی کو بھی جلا کر خاک کر سکتی تھی۔ چند ہی لمحے بعد بجلیوں کی گردش میری دونوں آنکھوں میں مرکوز ہو گئی۔ اسی کے ساتھ میری آنکھوں سے تیز روشنی' موت کی روشنی نکل اور پولیس والے کے جسم پر محیط ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا جسم کسی سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح بھڑک اٹھا۔ میں نے دوسرے پولیس والے کی طرف نگاہ اٹھائی جو ارشاد حسین کی پشت پر بندوق کی نال رکھے کھڑا تھا۔ اس کا جسم بھی لو دے اٹھا۔ ان دونوں پولیس والوں کے جسموں کو راکھ بننے میں صرف چند لمحے لگے تھے۔ میرے جسم میں گردش کرتی ہوئی بجلیاں تھم گئیں۔ موت کی روشنی میری آنکھوں میں سما کر معدوم ہو چکی تھی۔

ارشاد حسین کے لئے وہ نظارہ اتنا حیرت انگیز اور غالباً ناقابل یقین تھا کہ وہ مبہوت سا ان راکھ کے ڈھیروں کو دیکھے جا رہا تھا جو دو پولیس والوں کو زندہ جل جانے سے نمودار ہو گئے تھے۔ اس جگہ کی گھاس بھی جل گئی تھی۔ پولیس انسپکٹر اور جو دو سپاہی میری تلاش میں سرونٹ کوارٹرز کی طرف گئے تھے۔ اب تک نہیں لوٹے تھے۔ یہ موقع فرار کے لئے بہت غنیمت تھا' سو میں نے دیر نہیں کی اور تیزی سے آگے بڑھ کر کچھ فاصلے پر رکھے ہوئے سوٹ کیس اٹھا لئے۔

"چلئے ارشاد! جلدی کیجئے۔" میرے مخاطب کرنے پر ارشاد حسین اس طرح چونک اٹھا جیسے سوتے سے ابھی ابھی جاگا ہو۔

اس نے میرے ہاتھ سے ایک سوٹ کیس لے لیا اور میرے ساتھ تیز قدم سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ ہم ابھی گیٹ تک پہنچے تھے کہ عقب سے پولیس انسپکٹر نے للکارا۔ "ٹھہر جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"بھاگو۔" یہ کہتے ہی میں نے جست بھری اور گیٹ سے نکل گئی۔

ارشاد حسین بھی مجھ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ گیٹ سے نکلتے ہی ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ مَیں نے

ہاتھ اٹھا کر اسے روک لیا اور اس کے رکتے ہی دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ ارشاد حسین میرے قریب آ بیٹھا تھا۔ ٹیکسی والے نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

"تلی گنج چلو۔" میں نے جلدی سے کہہ دیا۔ اس وقت یہی جگہ میرے ذہن میں آئی تھی۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو پولیس انسپکٹر میری کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا ہوا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ حیران تھا کہ ہم اتنی جلدی کہاں اور کیسے غائب ہو گئے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا' اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ پولیس والا جو زندہ جل کر مر گیا' اگر نازیبا حرکت نہ کرتا تو شاید مجھے شدید غصہ نہ آتا اور پھر میرے اندر خوابیدہ خطرناک پُراسرار قوت بیدار نہ ہوتی۔ بہرحال اس مرتبہ لعنتی چمپا میرا راستہ روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

لاشعوری طور پر میرے منہ سے تلی گنج کا نام اس لئے نکل گیا تھا کہ اب مجھے شنکر دادا کے یہاں ہی امان مل سکتی تھی۔ راجہ استاد کا گھر اب میرے لئے جائے امان نہیں رہا تھا۔ ارشاد حسین سے اب تک مجھے گفتگو کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ آیا انگریز حکومت نے سرفروش تنظیم کے بقیہ دو ارکان کو رہا کیا یا نہیں۔ ڈیسوزا کی رہائی کا دار و مدار بھی اسی پر تھا۔ میں اسی پر اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں فیصلہ کر سکتی تھی۔ ظاہر ہے' ٹیکسی میں یہ گفتگو ممکن نہیں تھی۔ ارشاد حسین نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ میں' تلی گنج کیوں چل رہی ہوں۔ یقیناً وہ سفر کے دوران احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ عموماً لوگ ٹیکسی میں سفر کرتے ہوئے ڈرائیور کو بھول جاتے ہیں اور اسے بھی ٹیکسی کا کوئی حصہ سمجھ لیتے ہیں' مگر وہ ارشاد حسین تھا۔ اس سے کسی ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ شنکر دادا کے اڈے کا مجھے علم تھا۔ میں ایک مرتبہ وہاں آ چکی تھی۔ راستہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ ٹیکسی کو میں نے پہلے رکوا لیا اور کرایہ ادا کر کے اتر گئی۔

"معبلہ! آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟" ارشاد حسین نے پہلی بار مجھ سے سوال کیا۔

"اس لئے کہ میں اس علاقے میں پوری طرح محفوظ ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں ہم اطمینان سے بیٹھ کر جو گفتگو چاہیں گے کر سکیں گے۔"

"لیکن کہاں' کیا یہاں کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے؟" ارشاد حسین نے پوچھا۔

"ہم وہیں چل رہے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "آپ شنکر دادا سے مل چکے ہیں اور یہ علاقہ اسی کا ہے۔"

"اچھا!" ارشاد حسین نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس کے چہرے سے فکرمندی کے آثار معدوم ہو گئے تھے۔

میں کچھ ہی دیر میں ارشاد حسین کو ساتھ لئے اس کوٹھی تک پہنچ گئی جس کا بڑا حصہ شنکر دادا کے تصرف میں تھا۔ کوٹھی کے گیٹ ہی پر ایک مسلح نوجوان نے ہمیں روک لیا۔

"شنکر دادا کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔" میں نے اس نوجوان سے کہا۔

"وہ اس وقت نہیں ہیں۔" نوجوان نے بتایا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟ دادا سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟"

"میں صرف تمہارے پہلے سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔ میرا نام رانی ہے۔ دادا جہاں بھی ہوں انہیں فوراً بلاؤ۔" میرے لہجے میں اب حکم شامل تھا۔

"کیا بمبئی کی رانی؟" نوجوان چونک کر بولا۔

"ہاں' جلدی کرو۔"

"مگر آپ یہاں کب تک کھڑی رہیں گی' میں آپ کو اندر بٹھائے دیتا ہوں' پھر دادا کو خبر بھجواتا ہوں کہ آپ تشریف لائی ہیں۔" نوجوان مؤدب ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں بولی اور پھر اس نوجوان کی رہنمائی میں اندر داخل ہو گئی۔ ارشاد حسین میرے ساتھ ساتھ تھا۔

اس نوجوان نے ہمیں ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا اور پوچھا۔ "کیا پینا پسند کریں گے' ٹھنڈا یا گرم؟"

"ہمارے لئے چائے بھجوا دو۔" میں نے بے تکلفی سے کہہ دیا۔ ظاہر ہے شنکر دادا کا اڈا میرے گھر ہی کی طرح تھا۔

نوجوان چلا گیا تو ارشاد حسین مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب یہ بتایئے معبلہ کہ وہ .... وہ روشنی کیسی تھی جو آپ کی آنکھوں سے نکلی تھی اور .... اور جس نے دو پولیس والوں کو زندہ جلا دیا؟"

"روشنی .... کیسی روشنی؟ .... مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔ میں تو خود حیران ہوں کہ وہ پولیس والے کس طرح جل کر راکھ ہو گئے؟" میں قطعی انجان بن گئی۔

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ سارا منظر دیکھا تھا' آپ اس حیرت انگیز واقعے سے لاتعلقی کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ مجھے کچھ بتانا گوارا نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پُراسرار قوتوں کی مالک ہیں۔ یہ احساس مجھے ریس کورس میں بھی ہوا تھا۔ جب جیتنے والے گھوڑوں کا علم آپ کو پہلے سے ہو گیا تھا۔"

"ارشاد! اگر ایسا ہوتا اور میں بقول آپ کے واقعی پُراسرار قوتوں کی مالک ہوتی تو اب تک یہ سراغ نہ لگالیتی کہ اعلیٰ انگریز حکام میری طرف سے کیوں تشویش میں مبتلا ہیں۔"

"یہ مجھے کچھ نہیں معلوم' میں تو صرف دو باتیں کر رہا ہوں جو میرے مشاہدے میں آ چکی ہیں۔" ارشاد حسین اپنی بات پر اڑا رہا۔

"خیر یہ بتائیں' حکومت نے آپ کا مطالبہ تسلیم کر کے تنظیم کے ارکان کو رہا کیا یا نہیں؟" میں نے موضوع گفتگو بدل دیا۔ میں نے ایسا سوال کیا تھا کہ ارشاد حسین کو جواب دینا ہی پڑے۔

"ایک نئی ہی صورت حال سامنے آئی ہے اور افسوس ناک بھی۔ مگر ابھی اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ آج کے اخبارات میں وزارت داخلہ کے ایک ترجمان کی طرف سے بیان شائع ہوا ہے۔ اس بیان میں کہا گیا ہے کہ مذکورہ دونوں اراکین نے پوچھ گچھ کے دوران خودکشی کر لی تھی' حکومت اسی سبب تنظیم کا مطالبہ پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حکومت کے گزشتہ بیان کو درست مانا جائے یا آج

کے بیان کو تسلیم کیا جائے؟ بیان میں گزشتہ بیان کے متعلق یہ وضاحت کی گئی ہے کہ پہلے اس لئے یہ بات چھپائی گئی تھی کہ کہیں مشتعل ہو کر تنظیم ڈیسوزا کو قتل نہ کر دے۔ اب مجبوراً یہ بات ظاہر کی جا رہی ہے۔ اسی کے ساتھ حکومت نے اپنی صفائی میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ جب ایک سو کے قریب افراد کو رہا کیا جا سکتا ہے تو دو افراد کو بھی رہا کرنا حکومت کے لئے کون سا مشکل تھا۔ بیان میں تنظیم سے اپیل کی گئی ہے کہ ڈیسوزا کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر رہا کر دیا جائے۔" ارشاد حسین نے تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دیا۔

میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے ایک شخص چائے لے آیا۔ وہ چلا گیا تو میں بولی۔ "پھر اب آپ کی تنظیم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"تنظیم کے ارکان کی اکثریت کا کہنا ہے کہ ان کے ساتھیوں نے خودکشی نہیں کی بلکہ ان کی زبان کھلوانے کے لئے انہیں تشدد کا نشانہ بنا کر مار دیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انتقامی کارروائی کے طور پر ڈیسوزا کو بھی قتل کر دیا جائے۔ اس کے لئے تنظیم کے مقامی سربراہ نے مرکزی سربراہ سے اجازت لینے کے لئے رابطہ قائم کیا ہے۔ کل تک اس کا جواب آ جائے گا۔ اگر مرکزی سربراہ نے ہمارے اراکین کے فیصلے کی توثیق کر دی تو ڈیسوزا کو قتل کرنا پڑے گا ورنہ رہا کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ کل تک یہ تصدیق بھی ہو جائے گی کہ واقعی مذکورہ اراکین مر چکے ہیں یا زندہ ہیں اور حکومت غلط بیانی سے تو کام نہیں لے رہی۔" ارشاد حسین نے مجھے اپنی تنظیم کے فیصلے سے آگاہ کیا۔

میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "تو گویا کل تک کے لئے مزید معاملہ ٹل گیا۔ یعنی میں اب فوری طور پر دہلی نہیں جا سکتی۔"

"ہاں یہ تو ہے' مگر میں آپ کے لئے علامتی نشان لے آیا ہوں۔" ارشاد حسین نے یہ کہہ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نکل اسٹیل کی وہ انگوٹھی نکال لی جس کا ذکر کیا تھا۔ انگوٹھی میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ آپ اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیں۔ کوڈ ورڈز یہ ہیں' ہم انگریز کے غلام ہیں' جوابی الفاظ یہ ہیں کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی شیر کی ایک دن کی زندگی سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ شناخت کے لئے پہلا جملہ آپ ادا کریں گی۔ جواب میں دوسرا جملہ سنائی دے تو آپ سمجھ لیں کہ صحیح آدمی سے مل رہی ہیں۔ آپ کی انگلی میں انگوٹھی بھی ہونا چاہئے۔ دہلی پہنچ کر آپ وہاں کی جامع مسجد کے پیش امام سے ملیں گی اور ان سے کہیں گی کہ آپ کو غداروں سے ملنا ہے۔ پیش امام آپ کو وقت بتا دیں گے اور مقام بھی کہ غداروں سے کہاں ملاقات ممکن ہے۔ آپ کو یہ سب باتیں یاد تو رہیں گی نا' یا میں پھر کوڈ ورڈز دہراؤں؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے چائے کا کپ واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بطور شناختی الفاظ ایسے لفظوں کا انتخاب کیوں کیا گیا جو مثبت نہیں منفی ہیں۔ کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟ کیونکہ شناختی الفاظ مثبت بھی تو ہو سکتے تھے جو طبیعت پر گراں نہ ہوتے؟"

"بات یہ ہے معبلہ کہ عموماً بطور شناخت ایسی تنظیمیں پُرجوش اور ایسے الفاظ ہی استعمال کرتی ہیں

جن سے ان کے اصل مقصد پر روشنی پڑتی ہو۔ شناختی الفاظ رازداری کے لئے ہوتے ہیں' عموماً لوگ اسے نظرانداز کر جاتے ہیں کہ کسی طرح اصل مقاصد کی طرف اشارہ نہ ہو۔ ہم اسی لئے شناخت کی خاطر قطعی برعکس الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہر تین ماہ بعد یہ الفاظ تبدیل کر دیئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ لے لیتے ہیں۔ بہرحال اپنا اپنا طریقہ کار ہے۔ ہم اسی کو محفوظ جانتے ہیں۔"

"ہاں' آپ سے ایک بات اور معلوم کرنا تھی۔ کیا دہلی میں قیام کا مسئلہ بھی آپ کی تنظیم حل کر سکتی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ سے ہر طرح کا تعاون کیا جائے گا۔ اس انگوٹھی کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ہماری تنظیم کے لئے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔"

"لیکن واقعتاً تو ایسا نہیں۔" میں ہنس کر بولی۔ "میں نے آپ کی تنظیم کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔"

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں معبلہ! تنظیم کے زیر حراست افراد کی رہائی کیا کوئی معمولی واقعہ ہے؟"

"خیر' ڈیسوزا کا اغوا تو میرا ذاتی معاملہ تھا' یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ بس اتنا ضرور ہوا کہ مَیں نے تنظیم کو اس سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیا اور اس نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔"

"ہاں' یہ تو بتایئے معبلہ کہ پولیس کس سلسلے میں آپ کی کوٹھی تک پہنچ گئی اور یہ کہ آپ نے وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ پولیس کو لے کر آنے والا میرا ہی ایک ملازم تھا؟"

"جی ہاں' مجھے اس پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ وہ اس طرح آپ کا ذکر کر رہا تھا جیسے آپ کی طرف سے سخت برگشتہ ہو۔"

"ہوا یہ کہ کل شام میرے ایک ملازم قاسم نے اپنی بیوی کو شبہے میں مبتلا ہو کر گولی مار دی' وہی جس کے ساتھ میں نے اپنی ملازمہ فاطمہ کی شادی کی تھی' پولیس کے چکر سے بچنے کے لئے میں نے اپنی کوٹھی کے عقب میں مقتولہ کی لاش دفن کرا دی۔ پھر گزشتہ رات احساس جرم سے مغلوب ہو کر قاسم نے خودکشی کر لی۔" اس موقع پر دانستہ میں اصل واقعہ گول کر گئی۔ "قاسم کی لاش کو بھی میں نے فاطمہ کی قبر کے برابر دفنا دیا۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے میرے ملازمین کے دماغ میں یہ خناس سما گیا کہ ان دونوں کی موت میں میرا ہاتھ ہے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ایسا نہیں' مگر انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ سو انہی میں سے ایک رحمت جب کوٹھی سے غائب ہو گیا تو میں کھٹک گئی۔ ظاہر ہے کہ میرے ملازمین کی نشاندہی پر پولیس قبریں کھود کر لاشیں برآمد کر سکتی تھی۔ ایسی صورت میں میرے پاس اپنے دفاع میں کہنے کو کچھ بھی نہ ہوتا۔ پھر خود میرے ملازمین مجھ پر الزام لگاتے۔ ان حالات میں فرار کے سوا مجھے کوئی اور راہ نظر نہ آئی۔ سو میں نے جلدی جلدی میک اپ کیا اور اپنا سامان سوٹ کیسوں میں رکھ کر باہر آ گئی۔ یہ آپ کے آنے کا وقت تھا۔ آپ سے میری ملاقات ڈیسوزا کے معاملے میں انتہائی ضروری تھی۔ اگر میں اس وقت آپ کا انتظار نہ کرتی تو رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ مجھے اسی لئے خطرے کے باوجود کوٹھی

میں رکنا پڑا۔"

"معبلہ! آپ نے واقعی بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔" ارشاد حسین نے میری تعریف کی۔ "مجھ سے ملنے کی خاطر آپ خطرے میں گھر گئیں۔"

"خطرات تو خیر میرے لئے قدم قدم پر ہیں۔ ہاں' میری وجہ سے آپ کو ضرور زحمت اٹھانا پڑی۔"

"یہ بھی تو کہیں معبلہ کہ خطرے سے مجھے نکال کر لانے والی بھی تو آپ ہی ہیں۔" وہ مسکرایا۔ "اب تو تسلیم کر لیں کہ آپ پُراسرار قوتوں کی مالک ہیں۔"

"خیال ہے آپ کا ورنہ یہ حقیقت نہیں۔" میں بھی اپنی بات پر اڑی رہی۔

اسی وقت میں نے بھاری قدموں کی چاپ سنی۔ دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی تو شنکر دادا کو آتے دیکھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور میرے پیر چھو کر کہنے لگا۔ "رانی دیوی! معاف کیجئے گا کہ آپ کو اتنا انتظار کرنا پڑا۔ دراصل میں ادھر گیا تھا۔" اس نے معنی خیز لہجہ اختیار کیا۔ "بھوک ہڑتال ہو گئی تھی وہاں۔" وہ یہ کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ارشاد حسین کو بھی سلام کیا۔

"شنکر دادا! یہ اگروال جی ہیں۔ ان سے تو ملے ہیں پہلے بھی آپ۔" میں بولی۔

"جی دیوی جی!"

"تو ان سے کوئی پردہ نہیں' یہ بھی اپنے ہی آدمی ہیں۔ کھل کر بات کریں۔ کیا ڈیسوزا نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا؟"

میرے سوال پر ارشاد حسین چونک اٹھا۔ میں نے اب تک اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ ڈیسوزا کو اغوا کرنے کے بعد تالی گنج میں رکھا گیا ہے۔

"جی ہاں۔" شنکر دادا نے بتایا۔ "کل سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ ضد کر رہا تھا کہ اسے راجکماری' یعنی آپ سے ملوایا جائے۔ میں پہنچا' اب تو وہی آپ کا داؤ آزمایا اور جوتا اتار لیا۔ میں بولا' کھانا کھا سیدھی طرح ورنہ جوتی مار مار کر چندیا کے سارے بال جھاڑ دوں گا۔ بس جوتا' ہاتھ میں لیتے ہی کھانا کھانے پر آمادہ ہو گیا۔ وہاں سے میں لوٹ ہی رہا تھا کہ راستے میں آپ کی آمد کا پیغام مل گیا۔ اسے کب تک اور قید میں رکھنا ہے دیوی!"

"کل تک طے ہو جائے گا دادا! اِدھر یا اُدھر۔"

"یعنی؟" شنکر دادا نے وضاحت چاہی۔

"یا تو کل اسے قتل کر دیا جائے گا یا پھر رہائی مل جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"قتل کی صورت میں اس کی لاش کا کیا کرنا ہو گا؟" شنکر دادا نے پوچھا۔

"کون سی اس سے ہماری رشتے داری ہے' کہیں بھی پھینک دی جائے گی لاش۔ ویسے اس کے لئے ایک جگہ زیادہ مناسب ہے۔" میں نے مسکرا کر ارشاد حسین کی طرف دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ "وہ کیوں کہ خفیہ پولیس کا سربراہ ہے اس لئے سی آئی ڈی آفس کے سامنے اس کی لاش پھینکی جائے تو انگریز حکومت کے منہ پر جوتا مارنے کے مترادف ہو گا۔ کیوں اگروال جی! آپ کا اس سلسلے

میں کیا خیال ہے؟"

"بات تو آپ نے بڑی مناسب کی ہے' پر اس کی لاش یہاں سے دھرم تلے لے جانا بہرحال خطرناک ہو گا۔" ارشاد حسین نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"جب اسے دھرم تلے سے اغوا کر کے لایا جا سکتا ہے تو وہاں لاش پہنچانا کون سا دشوار ہے' کیوں شنکر دادا؟"

"بالکل دیوی جی! میں تو خود یہ نہیں چاہتا کہ اس کی لاش میرے علاقے سے برآمد ہو۔ پولیس ویسے ہی یہاں چھاپہ مار چکی ہے۔" شنکر دادا بولا۔

"کیا؟" ارشاد حسین چونک کر کہنے لگا۔ "کیا پولیس نے یہاں چھاپہ بھی مارا تھا؟ میرے علم میں یہ بات نہیں آئی۔"

"اور لطیفہ یہ ہے کہ جس کوٹھی پر پولیس نے چھاپہ مارا اور ناکام لوٹ گئی' ڈیسوزا پہلے بھی اسی کوٹھی میں تھا اور اب بھی وہیں ہے۔ صرف اس وقت چند گھنٹے کو اسے وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا تھا جب پولیس چھاپہ مارنے آئی تھی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ کس طرح پتا چلا کہ پولیس وہاں چھاپہ مارنے والی ہے؟" ارشاد حسین نے سوال کیا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی شنکر دادا بول اٹھا۔ "جس رات کی صبح ہوتے ہی چھاپہ پڑنا تھا' رانی دیوی نے اسی رات پیغام بھجوا دیا تھا کہ ڈیسوزا کو اس کوٹھی سے کہیں اور منتقل کر دیا جائے اور پھر دیوی ہی کے حکم پر چھاپے کے بعد دوبارہ اسے وہیں پہنچا دیا گیا۔"

اس موقع پر ارشاد حسین نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں مسکرا کر بولی۔ "اگروال جی! ہر طرف سے چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ کیا خبر دشمن کب کون سی چال چل جائے۔" پھر میں نے بات ٹالنے کی غرض سے شنکر دادا کو مخاطب کیا۔ "دادا! کیا دو تین دن میرے یہاں رہنے کا بندوبست ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں دیوی جی!" وہ خوش ہو گیا۔ "میرے لئے تو یہ بڑا سوبھاگیہ (خوش نصیبی) ہے کہ آپ کی سیوا کا موقع مل رہا ہے۔"

"تو پھر اگروال جی! کل آپ یہیں آ جائیں۔ کس وقت تک آئیں گے؟" میں نے ارشاد حسین سے معلوم کیا۔

"شام پانچ اور چھ بجے کے درمیان آ جاؤں گا۔ تو پھر اجازت؟"

"ٹھیک ہے' میں کل شام آپ کا انتظار کروں گی۔ ہاں رابطے کی کوئی صورت اور بتا دیجئے' ممکن ہے کوئی ایسی صورت پیش آ جائے جیسی کہ آج پیش آئی۔ کم از کم میں آپ سے رابطہ تو قائم کر سکوں یا آپ ہی کسی سبب نہ آ سکیں۔ ممکنات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"آپ کے ذہن میں ٹیا برج والا وہ مکان ہے جہاں پہلی ملاقات ہوئی تھی؟"

"جی ہاں' اچھی طرح۔"

"وہاں کوئی نہ کوئی ہر وقت ضرور ہوتا ہے۔ اگر خدانخواستہ کبھی وقت مقررہ پر میں نہ پہنچ سکوں یا آپ بہ مجبوری اس جگہ کو چھوڑ دیں جہاں ملاقات طے تھی تو پھر ٹیا برج کے اسی مکان پر پہنچ جائیں۔ وہاں جو بھی ہو گا جلد سے جلد مجھ تک آپ کا پیغام پہنچا دے گا۔" ارشاد حسین نے رابطے کی صورت بتائی۔

"اگر مجھے پہلے سے یہ بات معلوم ہوتی تو آج ہرگز آپ کا انتظار نہ کرتی۔"

پھر ارشاد حسین چلا گیا۔ اس کے بعد شنکر دادا نے مجھے ایک کمرہ اسی کوٹھی میں دکھایا جو بطور خواب گاہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی کے باہر باتھ روم وغیرہ بھی تھا۔ کمرے میں تمام ضروری اشیاء موجود تھیں۔ میں نے وہاں قیام کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ میرے دونوں سوٹ کیس شنکر دادا نے وہیں منگوا لئے۔

"کیا خیال ہے دادا! ڈیسوزا سے مل لوں میں؟"

"جیسی دیوی کی مرضی۔"

"تم یا تمہارا کوئی آدمی چہرہ چھپائے بغیر تو اب تک اس کے سامنے نہیں آیا نا؟" میں شنکر دادا کو "آپ" اور "تم" دونوں ہی طرح مخاطب کر لیتی تھی' اس کا انحصار میرے موڈ پہ تھا۔

"نہیں دیوی جی! آپ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے ہو سکتی تھی۔"

"میں ذرا میک اپ کر لوں' پھر چلتے ہیں۔ تم بیٹھو دادا! .... تمہیں کوئی ضروری کام تو نہیں اس وقت؟"

"کیسا ضروری کام دیوی جی! آپ کی سیوا سے بڑھ کر اور کیا ضروری کام ہو سکتا ہے۔ میرے لئے؟" یہ کہہ کر وہ وہیں موجود کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

میں اپنے چہرے سے وہ میک اپ احتیاطاً اس لئے بھی ختم کرنا چاہتی تھی کہ اس میں پولیس مجھے دیکھ چکی تھی۔ اپنے چہرے پر نیا میک اپ کر کے میں نے باتھ روم میں جا کر ساڑھی بھی بدل لی۔ مجھے اس میں آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

فی الحال مجھے کوئی اور خاص کام نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے وقت گزاری کی خاطر ڈیسوزا سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید اس سے کوئی اور کام کی بات معلوم ہو جائے۔ روانگی سے قبل میں نے شنکر دادا سے کہا۔ "گزشتہ ہفتے بھر کے انگریزی اخبار مل سکتے ہیں دادا!"

"ہاں' کوئی مجھے بتا تو رہا تھا کہ ڈیسوزا کے اغوا کا واقعہ اخباروں میں بھی چھپا ہے۔ ٹالی گنج میں کئی بک اسٹال ہیں' معلوم کراتا ہوں۔ میں آیا ابھی۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ شنکر دادا جیسے شخص کے لئے کسی بک اسٹال والے سے گزشتہ تاریخوں کے اخبار حاصل کرنا میرے نزدیک کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

شنکر دادا لوٹ کر کمرے آ گیا اور مجھے بتایا کہ اخبار لینے اپنے ایک آدمی کو بھیج دیا ہے۔ اخبارات کے لئے مزید کچھ دیر انتظار کرنا پڑا لیکن شنکر دادا کا آدمی ناکام نہیں لوٹا۔ پھر میں اس کوٹھی سے نکل کر شنکر دادا کے ساتھ اس کی جیپ میں بیٹھ گئی۔ جیپ وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس کے ساتھ اگلی نشست ہی پر بیٹھی تھی۔ شنکر دادا میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ غیر ضروری سوالات نہیں کرتا تھا۔ اس نے

مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ مجھے اخبارات کس لئے چاہئیں۔

جلد ہی شنکر دادا کی جیپ آبادی کی اس آخری کوٹھی تک پہنچ گئی جہاں ڈیسوزا کو رکھا گیا تھا۔ کمپاؤنڈ میں جیپ رکی تو میں اتر گئی۔ میرے ہاتھ میں پرس کے علاوہ انگریزی اخبارات بھی تھے۔ ڈیسوزا اوپری منزل کے اسی کمرے میں تھا جہاں پہلے بھی میں اس سے مل چکی تھی۔ شنکر دادا کے مسلح آدمیوں کو میں نے نیچے سے اوپر تک مستعد و چوکنا ہی دیکھا۔ اسی کے ایک آدمی نے کمرے کا مقفل دروازہ کھول دیا۔ شنکر دادا نے ایک بڑے رومال کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی پھیل چکی تھی۔ ساری کوٹھی روشن تھی' مگر ڈیسوزا کے کمرے میں خلاف توقع مجھے اندھیرا ہی نظر آیا۔ معلوم نہیں کیوں اس نے روشنی نہیں کی تھی۔

دروازہ کھلتے ہی تیزی کے ساتھ کوئی میرے قریب سے گزرا۔ میں کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ میرے پیچھے شنکر دادا تھا۔ اس نے بھاگنے والے کو چھاپ لیا۔ وہ ڈیسوزا ہی ہو سکتا تھا۔ شاید اس نے اسی لئے کمرے میں اندھیرا کر رکھا تھا کہ جیسے ہی دروازہ کھولا جائے' وہ نکل بھاگے۔

"فضول ہے مسٹر ڈیسوزا! تم یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے۔" میں آواز بدل کر بولی۔

اسی وقت شنکر دادا کے ایک آدمی نے کمرے میں داخل ہو کر روشنی کر دی۔

"چھوڑ دو اسے۔" میں نے شنکر دادا سے کہا جو ڈیسوزا کو زمین پر گرا کر اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا۔

شنکر دادا میرا حکم سن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا آدمی بھی اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ شنکر دادا کا اشارہ پا کر وہ کمرے سے نکل گیا اور دروازہ باہر سے بند کر لیا۔ اس دوران ڈیسوزا فرش سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور مجھے بڑی مظلوم نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کم آن مسٹر ڈیسوزا!" میں نے ایک طرف پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس سے آواز بدل کر انگریزی میں بات کر رہی تھی۔ "مجھے یقین ہے کہ تم نے میری آواز پہچان لی ہو گی۔ میں یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

میری بات سن کر ڈیسوزا بوجھل قدموں سے کرسیوں کی طرف بڑھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"تم یہاں سے فرار ہونے کا خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔" میں آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ "اس کوٹھی کے چپے چپے پر مسلح افراد موجود ہیں۔ تم اگر اس کمرے سے نکلنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو تمہارے لئے کوٹھی سے نکلنا محال ہو جاتا۔"

"پھر بھی مجھے کوشش تو کرنا ہی چاہئے تھی نا! آخر تم کب تک مجھے قید رکھو گی؟" وہ ایک کرسی پر ڈھیر سا ہو گیا۔ "کیا حکومت نے تمہارے زیر حراست اراکین کو اب تک رہا نہیں کیا؟"

"میرا خیال ہے ڈیسوزا کہ پہلے تم گزشتہ چند روز کے یہ اخبارات پڑھ لو۔ تمام صورت حال خود بخود تم پر واضح ہو جائے گی۔ میں یہ اخبارات تمہارے ہی لئے لے کر آئی ہوں۔"

مجھ سے اخبارات لے کر وہ جلدی جلدی ان پر نظریں دوڑانے لگا' پھر ایک خبر پڑھ کر بولا۔ "یہ

.... یہ دیکھو' حکومت نے تم لوگوں کا مطالبہ مان لیا نا؟"

"مجھے معلوم ہے' تم اگلے روز کا اخبار تو دیکھو۔" میں نے کہا۔ "اور جو خبر دیکھی ہے' پوری پڑھو۔"

پوری خبر پڑھ کر اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ پھر اس نے بقیہ دو دن کے اخباروں میں متعلقہ خبریں پڑھ لیں اور اخبارات میز پر رکھ دیئے۔

"حکومت نے تمام صورت حال واضح کر دی ہے۔ جن دو ارکان کو رہا نہیں کیا گیا' وہ خودکشی کر چکے ہیں۔ پھر اب مجھے تم لوگوں نے کیوں قید کر رکھا ہے؟"

"ایمانداری سے بتاؤ ڈیسوزا! ان دونوں نے خودکشی کی ہو گی یا ان پر اتنا تشدد کیا گیا ہو گا کہ وہ زندہ نہ رہ سکے؟"

"زبان کھلوانے کے لئے تشدد تو کرنا ہی پڑتا ہے' یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو راجکماری! تمہارا یہ اندازہ درست ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں تشدد کے سبب مارے گئے ہوں گے لیکن ظاہر ہے کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔ حکومت تمہارا مطالبہ پورا کرنے سے قاصر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی صورت میں مجھے رہائی مل جانا چاہئے۔"

"اس کے لئے تمہیں کل رات تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"کل تک تنظیم یہ فیصلہ کر لے گی کہ تمہیں رہا کر دیا جائے یا........." میں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"یا......... یا پھر کیا ہو گا؟" ڈیسوزا نے گھبرا کر سوال کیا۔

"ابھی یہ سوال نہ کرو تو بہتر ہے۔ کل رات تمہیں خود ہی اس سوال کا جواب مل جائے گا۔"

"نہیں' مجھے اسی وقت جواب دو راجکماری! پلیز......... میں کل رات تک انتظار نہیں کر سکتا۔"

"تمہارے لئے یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہو گی۔ بہتر یہی ہے کہ ضد نہ کرو۔"

"صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔" وہ چیخ اٹھا۔

"فرض کرو ایسا ہی ہے تو' یہ جان کر تمہیں کیا فائدہ؟"

"تمہیں معلوم ہے راجکماری کہ میں تم سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟ میں دراصل تمہاری تنظیم کو مستقل طور پر ایک ایسا فائدہ پہنچانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس سے تنظیم کو آئندہ کے لئے ایسا تحفظ حاصل ہو جاتا کہ اسے حکومت کوئی نقصان نہ پہنچا سکتی' مگر اب......... اب شاید یہ گفتگو لاحاصل ہے۔"

"ابھی تو کل رات تک کا وقت ہے' تم بتاؤ تو سہی کہ کیا سوچا تھا؟ ممکن ہے تنظیم تمہارے بارے میں جو فیصلہ کرے' وہ تمہارے حق میں ثابت ہو۔"

"کیا......... کیا اب بھی ایسا امکان باقی ہے راجکماری!" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم کہو جو کہنا چاہتے ہو۔"

"میں جس عہدے پر ہوں وہاں رہ کر تمہاری تنظیم کو فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔ تنظیم کے خلاف حکومت جو قدم بھی اٹھانا چاہے گی' میں اس سے تم لوگوں کو قبل از وقت آگاہ کر سکتا ہوں۔" اس نے یہ کہہ کر بڑی پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھا۔

مجھے اس کی حماقت آمیز بات پر بہت ہنسی آئی۔ جب آدمی کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے تو کسی روزن کی تلاش میں وہ ایسی ہی بچگانہ باتیں سوچنے لگتا ہے۔ پھر بھی میں نے اس سے یہی کہا۔

"یہ تو بڑی ہی خوشی کی بات ہے مسٹر ڈیسوزا کہ تم تنظیم کی خاطر اپنی قوم سے غداری کرنے پر آمادہ ہو۔"

میری بات سن کر اس کے چہرے پر رونق نظر آنے لگی۔ وہ بولا۔ "تو پھر راجکماری! تم فوراً اپنی تنظیم کے ذمے دار افسران سے بات کرو۔ یہ سنہری موقع پھر نہیں ملے گا۔"

"ٹھیک ہے' کل تمہیں اس کا جواب مل جائے گا۔ بطور ثبوت کہ تم واقعی تنظیم کے وفادار ہو' کیا ایسی کوئی اطلاع فراہم کر سکتے ہو جس سے تنظیم کو فائدہ پہنچ سکے؟ مثلاً یہ کہ حکومت کا آئندہ کیا ارادہ ہے؟ تنظیم کے کون سے ارکان حکومت کی نظر میں مشتبہ ہیں جنہیں گرفتار کیا جانے والا ہے؟ اپنے محکمے کے سربراہ کی حیثیت سے کچھ تو معلوم ہو گا تمہیں؟"

اس کے چہرے سے معلوم ہونے لگا کہ وہ سوچ میں پڑ گیا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"میرے ڈپٹی ڈائریکٹر جم نے مجھ سے اس شبہے کا اظہار کیا تھا کہ حکومت کے حساس اداروں میں بھی شاید تنظیم کے ارکان گھس گئے ہیں' جن میں میرا محکمہ سرفہرست ہے۔ اس نے پچھلے دنوں مجھے چند افراد کی فہرست دی تھی جن پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ تنظیم کے لئے کام کر سکتے ہیں۔ میں ابھی تک ان لوگوں کے خلاف تفتیش کے احکام جاری نہیں کر سکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ واقعی ان میں سے کوئی تمہاری تنظیم کا رکن ہے یا نہیں۔ یہ تو تم ہی بہتر جان سکتی ہو۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں ان کے نام بتا سکتا ہوں۔ اس طرح وہ لوگ آئندہ کے لئے چوکنا ہو سکتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ جو افراد ان میں سے تنظیم کے رکن ہوئے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔ تو پھر میں ان لوگوں کے نام بتاؤں؟"

"ہاں بتاؤ۔" میری یہ توقع پوری ہو ہی گئی تھی کہ ڈیسوزا سے کوئی اور کام کی بات معلوم ہو سکتی ہے۔

جواب میں ڈیسوزا نے چار نام گنوائے اور میں ایک نام سن کر بمشکل خود پر قابو پا سکی۔ وہ نام سب انسپکٹر ارشاد حسین کا تھا۔ میں نے وہ چاروں نام اپنے ذہن میں محفوظ کر لئے۔ ڈیسوزا نام بتا کر کہنے لگا۔

"ان میں سے تم جس کے بارے میں یہ چاہو کہ تفتیش نہ ہو' مجھے بتا سکتی ہو۔"

ڈیسوزا کے ان الفاظ کا مقصد میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ اس طرح یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جو نام اس نے بتائے ہیں' ان میں سے کس کا تعلق تنظیم سے ہے؟

"ان میں سے تو کسی کا تعلق بھی ہماری تنظیم سے نہیں۔ ہاں ایک شخص کا نام میں تمہیں ضرور بتا سکتی ہوں جو ہماری تنظیم کا باقاعدہ رکن تھا اور تمہارے محکمے میں انسپکٹر تھا۔ یہ نام بھی میں اس لئے بتا رہی ہوں کہ اب وہ شخص اس دنیا میں نہیں ہے۔ اسے قتل کیا جا چکا ہے۔ میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ اسے

تنظیم ہی کی ایک رکن نے قتل کیا اس لئے کہ وہ تنظیم کے کچھ اصولوں سے انحراف کرنے لگا تھا۔ تمہیں یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ اس کا نام انسپکٹر پرکاش تھا۔"

"انسپکٹر پرکاش۔" ڈیسوزا حیرت سے یوں بولا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔ "وہ .... وہ پرکاش تمہاری تنظیم کا رکن تھا اور .... اور تنظیم ہی نے اسے قتل کرا دیا؟"

"جی ہاں مسٹر ڈیسوزا! اگر اس سے کچھ حماقتیں سرزد نہ ہوتیں تو وہ بڑے کام کا آدمی تھا۔ اپنے افسران کی نظر میں اس نے بڑا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اس پر کسی کو بھی شک نہیں ہو سکتا تھا۔ بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" میں بولی۔

"تمہارا خیال بالکل درست ہے راجکماری! وہ تو ہماری گڈ بکس میں تھا۔ اس پر تو حکومت دشمن سرگرمیوں میں شریک ہونے کا شبہہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر پرکاش کے بارے میں تو ہم نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اسے معبلہ نے قتل کیا ہو گا۔ ہم نے اسی لئے فوری طور پر اس کے زیر حراست ملازم کو رہا کر دیا تھا۔ اب تم یہ بتا رہی ہو کہ تنظیم کی ایک رکن نے اسے قتل کیا تھا۔ میرے لئے یہ بات بھی حیران کن ہے۔" ڈیسوزا نے کہا۔

"ایک بات بتاؤ۔" میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ "تم لوگوں نے معبلہ کے ساتھ رعایت کیوں کی براہ راست اس پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا؟"

"مرکزی حکومت کے اعلیٰ حکام کی طرف سے ہمیں یہ حکم دیا گیا تھا۔" ڈیسوزا نے بتایا۔ یہی میرا بھی اندازہ تھا جس کی تصدیق آج ہو گئی تھی۔

"یعنی جب بھی اس کی طرف سے کوئی جارحانہ قدم اٹھایا جائے تمہارا محکمہ پسپائی اختیار کر لے؟" میں نے مزید وضاحت چاہی۔

"ہاں' مجھے خود بھی اس پر حیرت تھی' لیکن حکم کی تعمیل تو کرنا ہی تھی۔ معبلہ کی نگرانی اس طرح کرائے جانے کا حکم تھا کہ خود اسے بھی علم نہ ہو۔ دوسری صورت میں نگرانی اٹھانے لینے کا حکم تھا۔ ایک مرتبہ ایک اے ایس آئی درگا پرشاد' معبلہ کی نظر میں آ گیا۔ معبلہ نے اس کی بھرے بازار میں پٹائی کر دی تھی۔" پھر ڈیسوزا مجھے وہی سب کچھ بتانے لگا جو ارشاد حسین کے ذریعے پہلے ہی میرے علم میں آ چکا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔ "اس واقعے کے بعد معبلہ کی نگرانی وقتی طور پر ختم کر دی گئی۔"

معاً مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا جب پہلی مرتبہ ڈیسوزا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ ڈیسوزا نے دانستہ شمبھو کو فرار ہونے کا موقع دیا تھا جو میری گرفت سے نکل کر اس کی کوٹھی میں جا گھسا تھا۔ اس وقت ڈیسوزا نے مجھے اپنی باتوں میں الجھا لیا تھا۔

"مسٹر ڈیسوزا! کیا آپ کسی سادھو شمبھو کو بھی جانتے ہیں؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔

میرے اس سوال پر ڈیسوزا چونک اٹھا' پھر کہنے لگا۔ "تم .... تم اسے کس طرح جانتی ہو؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"یہ .... یہ اسی معبلہ کا چکر تھا۔" آخرکار وہ چند لمحے بعد بولا۔ "مرکزی حکومت کے اعلیٰ حکام

ہی کی طرف سے مجھے یہ ہدایت ملی تھی کہ قدیم کالی گھاٹ مندر کے بڑے پجاری مہاراج چندر موہن کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ وہ بڑے مہاراج کے نام سے مشہور ہے۔ اسی نے مجھے یہ پیغام بھیجا تھا کہ شمبھو اس کا چیلا ہے۔ ایک مرتبہ کے سوا کبھی مجھے بڑے مہاراج یا شمبھو کے تعاون کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ معبلہ سے بچ کر ایک مرتبہ شمبھو میری کوٹھی میں آگھسا تھا۔ اس کے پیچھے معبلہ.........." پھر ڈیسوزا نے اعتراف کر لیا کہ اس نے دانستہ شمبھو کو اپنی کوٹھی کے عقبی دروازے سے فرار ہونے کا موقع فراہم کیا تھا۔

میرے لئے یہ ایک حیرت انگیز خبر تھی کہ بڑے مہاراج کے بارے میں اسے مرکزی حکومت کی طرف سے تعاون کی ہدایت ملی تھی۔ پہلی مرتبہ ہی مجھے بڑے مہاراج کا نام معلوم ہوا تھا۔ اعلیٰ انگریز حکام اور مہاراج چندر موہن کے درمیان کیا تعلق تھا؟ یہ سوال میرے لئے کسی معمے سے کم نہیں تھا۔ ڈیسوزا سے مجھے غیر متوقع طور پر ایک اور اہم بات معلوم ہو گئی تھی۔ میری اس سے ملاقات رائیگاں نہیں گئی تھی۔ بڑے مہاراج کو یہ معلوم ہونا کہ میں پہاڑوں سے اتر کر یوں آئی ہوں اور پھر مرکزی اعلیٰ حکام سے اس کا تعلق میرے لئے معنی خیز تھا۔

ڈیسوزا سے مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ مزید کوئی نئی بات معلوم ہونے کا امکان نہیں۔ میرا اب وہاں رہنا فضول ہی تھا۔ میں اسی لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جا رہی ہو راجکماری! .... کیا میں امید رکھوں کہ میں نے جو پیشکش کی ہے، تنظیم میرے متعلق کوئی فیصلہ کرتے وقت اسے مدنظر رکھے گی؟" اس کی آنکھوں میں جیسے امیدوں کے چراغ روشن تھے۔

"ہاں مسٹر ڈیسوزا! میری پوری کوشش یہی ہو گی کہ تمہاری پیشکش قبول کر لی جائے۔ ذاتی طور پر میں تمہاری پیشکش سے متفق ہوں۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔

"بہت بہت شکریہ راجکماری! میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ اب تم کل کس وقت آؤ گی؟"

"تقریباً اسی وقت۔" میں نے جواب دیا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے شنکر دادا کو اشارہ کیا۔

شنکر دادا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھلوایا اور میں اس کے ساتھ باہر آ گئی۔ اخبارات دانستہ میں اندر ہی چھوڑ آئی تھی تاکہ ڈیسوزا کے لئے وقت گزاری کا سامان فراہم رہے۔

☆======☆======☆

شنکر دادا کے ساتھ لوٹتے ہوئے میرا ذہن خاصا الجھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ بڑے مہاراج کے بارے میں حاصل ہونے والی نئی معلومات تھی۔ اب میرا یہ خیال مزید پختہ ہو گیا تھا کہ بڑے مہاراج کا مقصد محض میرے جسم کا حصول ہی نہیں تھا۔ معاملہ کچھ اور ہی معلوم ہو رہا تھا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں بار بار شہزاد کا خیال بھی آ رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کیا موجودہ حالات میں اسے اپنے ساتھ دہلی لے جانا میرے لئے ممکن ہو گا؟ یوں بھی میں فی الحال اپنی کوٹھی کا رخ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بات بھی میرے مدنظر

تھی کہ چمپا کو اب ضرورت نہیں تھی، شہزاد اس کے سحر میں رہتا۔ جب اسے ہوش آئے گا تو کیا وہ میری طرف سے فکرمند نہ ہو گا؟ وہ بہرحال مجھے چاہتا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ مجھے ایک خدشہ اور بھی تھا کہ لعنتی چمپا یہاں بھی میرے لئے مشکلات پیدا نہ کر دے؟ گزشتہ دو راتوں کے دوران میں اس نے مجھے ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اب میرے لئے لے دے کر شنکر دادا کا ہی ایک ٹھکانا رہ گیا تھا جہاں میں خود کو محفوظ سمجھ سکتی تھی۔

اپنے اڈے پر واپس پہنچنے کے بعد شنکر دادا نے میرے لئے پرتکلف کھانے کا بندوبست کیا۔

"دادا! کیا تم بھی اسی کوٹھی میں رہتے ہو؟" کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"نہیں رانی دیوی!" اس نے جواب دیا۔ "یہ صرف میرے دھندے کی جگہ ہے، گھر یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ہے لیکن اگر آپ کا حکم ہو تو میں یہاں بھی رہ سکتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ شنکر دادا کا وہاں رات کو نہ رہنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔ "رات کو کون ہوتا ہے یہاں؟"

"دو بجے تک تو خیر میں ہی رہتا ہوں۔" شنکر دادا نے بتایا۔ "چھوٹا سا ایک جوئے کا اڈہ کھول رکھا ہے یہاں جو دو بجے تک چلتا ہے۔ اس کے بعد میں تو گھر چلا جاتا ہوں۔ میرے کچھ بندے یہاں رہتے ہیں۔ آپ کو رات کے وقت کسی چیز کی ضرورت ہو تو مہیا کی جا سکتی ہے۔ میں آپ کے کمرے کے باہر کسی کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔"

"رات کو کیا ضرورت ہو گی، رہنے دو۔ میں اپنے پاس رات کے وقت کسی کی موجودگی پسند نہیں کرتی۔" میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کہہ دیا۔ چمپا کا خیال میرے ذہن میں تھا۔ وہ کمینی میرے قریب موجود کسی بھی شخص کو اپنے سحر میں لے کر کوئی نیا مسئلہ کھڑا کر سکتی تھی۔ میرے آس پاس کوئی بھی نہ ہوتا تو مناسب تھا۔ چمپا ہی کے خیال سے میں نے مزید کہا۔ "ہاں دادا! ایک بات اپنے آدمیوں کو اور بتا دیجئے گا کہ رات کو میں کسی بھی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتی۔"

"آپ بالکل اطمینان رکھیں دیوی! آپ کے آرام میں کوئی بھی دخل اندازی نہیں کرے گا۔" شنکر دادا نے یقین دلایا۔ "اب مجھے اجازت ہے؟"

"ہاں تم جاؤ دادا!" میں بولی۔

شنکر دادا چلا گیا تو میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں کسی بھی ممکنہ خطرے کا پہلے ہی تدارک کر لینا چاہتی تھی۔ اس وقت رات کے صرف ساڑھے آٹھ ہی بجے تھے۔ اتنی جلدی سونا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ یوں بھی میں دوپہر تک سوتی رہی تھی۔ پھر بھی میں آرام کی غرض سے بستر پر لیٹ گئی۔ کمرے کی بتی میں نے ابھی جلی ہی رہنے دی تھی کیونکہ اتنی جلدی سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ مجھے ابھی زیادہ دیر لیٹے نہیں ہوئی تھی کہ اچانک مسہری سے کچھ فاصلے پر میں نے چمپا کو ظاہر ہوتے دیکھا۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ میری طرف دیکھ کر زور سے ہنسی، پھر کہنے لگی۔ "معبلہ! میں تجھے یہ خوشخبری سنانے آئی ہوں

کہ پولیس تیری تلاش میں ہے۔ پولیس نے تیری کوٹھی کا عقبی حصہ کھود کر دونوں لاشیں برآمد کر لی ہیں۔ تیرے ملازمین نے پولیس کے سامنے بیان دیا ہے کہ تُو نے ہی ان دونوں کو قتل کیا ہے۔ انہوں نے پولیس کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ تُو بمبئی کی مشہور جرائم پیشہ عورت رانی ہے۔ پولیس نے تجھ پر قتل کا مقدمہ بنانے کے ساتھ ساتھ دو سپاہیوں کے اغوا کا بھی مقدمہ قائم کیا ہے' انہی دو سپاہیوں کے اغوا کا مقدمہ جنہیں تُو زندہ جلا چکی ہے۔"

"اے میری ذلیل اور گھٹیا دشمن! آخر تُو یہاں بھی آ مری۔" میں نے حقارت سے دیکھا۔

"تو کیا تُو یہاں خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی؟" وہ دھیرے سے ہنسی۔ "کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔ میرا نام چمپا ہے اور یہ فیصلہ کر چکی ہوں کہ تجھے ذلیل و رسوا کرتی رہوں گی۔ اس قدر ذلیل کہ تجھے خود اپنے وجود سے گھن آنے لگے۔ بول آج کے تیرے لئے عذاب بنا دوں؟ شنکر دادا کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ اچھا خاصا صحت مند اور تندرست آدمی ہے' کیسا رہے گا تیرے لئے؟ آج رات میں تجھے ایک نیا ہی تماشا دکھاؤں گی۔"

"چمپا! اپنی ذلیل حرکتوں سے باز آ جا ورنہ میں تیرا بہت بُرا حشر کروں گی۔" میں غصے میں بل کھا کے رہ گئی۔

"تُو ایک روز اسی حسرت میں مر جائے گی۔" وہ ہنس دی۔ "ویسے کیا کہتی ہے' اگر پولیس کو آگاہ کر دیا جائے کہ تُو کہاں چھپی ہوئی ہے تو کیسا رہے؟ اور سن' پولیس کو یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ تیری یہ لمبی زلفیں نقلی ہیں اور اگر انہیں کھینچ کر دیکھا جائے تو یہ ہاتھ میں آ سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ تیرے چہرے پر کھوٹا "ماسک" چڑھا ہوا ہے۔"

"یہ بھی سوچا احمق عورت کہ پھر رانی کی حیثیت سے میری شناخت کون کرے گا؟" میں نے اس پر طنز کیا۔

"کیا تُو اسے مشکل سمجھتی ہے؟ تیرا وہ چہڑو شہزاد یہ بیان دے گا کہ تُو ہی رانی ہے اور تُو ہی معبلہ ہے۔ اگر شیتل زندہ ہوتی تو وہ بھی یہ تصدیق کر سکتی تھی' وہی شیتل کہ تُو نے جس کا دھرم بھرشٹ کر کے اس کا نام فاطمہ رکھ دیا تھا۔"

مجھے معلوم تھا کہ چمپا میرے بارے میں جو فیصلہ کر چکی ہے' وہی کرے گی۔ میں اگر کچھ کہوں گی تو اس سے کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ میں یہی سوچ کر بولی۔ "تجھ سے جو ہو سکے کر لے' میں تیرے کسی گھٹیا وار سے نہیں ڈرتی' دفع ہو جا یہاں سے۔"

"اب یہاں تجھے ڈھونڈتی ہوئی آئی ہوں تو میرا اتنی جلدی دفع ہونا ممکن نہیں۔ میں اگر چلی گئی تو تیری نیند حرام کون کرے گا' تُو ذلیل و رسوا کیسے ہو گی؟"

پھر چمپا اچانک ہی غائب ہو گئی۔ مجھے جس بات کا خدشہ تھا' سامنے آ گئی تھی۔ اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ میرے لئے سب سے بڑا خطرہ وہاں پولیس کی آمد تھی۔ میں واقعی اب وہاں محفوظ نہیں رہی تھی۔ مجھے خطرہ یہ بھی تھا کہ کہیں چمپا' ڈیسوزا کا سراغ نہ لگا لے۔ ایسی صورت میں میرا وہاں رہنا

انتہائی خطرناک تھا۔ اگر میں یہاں نہ رہوں تو چمپا بھی یہاں سے چلی جائے گی۔ میں نے سوچا پھر آج رات کہاں گزاری جائے؟ ہمایوں اور راجہ استاد کی نظروں میں تو چمپا مجھے ذلیل کر ہی چکی تھی' مزید کیا ذلیل کرتی۔ بس اتنا تھا کہ میں خود کو ان کی دست درازیوں سے کس طرح بچاتی؟ یہ ایک ایسا سوال تھا کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ سو میں نے راجہ استاد کے گھر جانے کا خیال بھی اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ میں کہیں بھی جاؤں لیکن ٹالی گنج میں نہیں رہنا چاہئے تاکہ چمپا یہاں سے چلی جائے۔ میں سوچنے لگی۔ میرے یہ سوچنے کی وجہ ڈیسوزا تھا۔ چمپا کو اس کی بھنک نہیں لگنا چاہئے تھی۔ مجھے یہ بھی خبر تھی کہ وہ ذہن پڑھ لینے پر بھی قادر تھی۔ اگر وہ شنکر دادا کو اپنے سحر میں لے کر میرے خلاف استعمال کرتی تو عین ممکن تھا کہ اس کا ذہن بھی پڑھ لیتی۔ پھر اسے معلوم ہو جاتا کہ ڈیسوزا کو کہاں رکھا گیا ہے اور یہ بہت خطرناک ہوتا۔ شنکر دادا کو چمپا سے دور رکھنے کی یہی صورت تھی کہ میں وہاں سے چلی جاتی۔

سوچتے سوچتے رات گزارنے کا ایک ٹھکانا میرے ذہن میں آ ہی گیا۔ وہاں میں پہلے بھی رہ چکی تھی۔ یہ فیصلہ کرتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنے دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ میں سیدھی گیٹ کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ کوٹھی کے گیٹ پر شنکر دادا کا جو آدمی موجود تھا' میں اس کے قریب جا کر رک گئی اور اسے مخاطب کیا۔ "سنو' دادا سے کہہ دینا کہ میں چلی گئی اور اب کل شام کو پانچ بجے آؤں گی۔"

"اگر آپ کا حکم ہو تو دادا کو بلا لاؤں؟" وہ شخص بولا۔ "دادا کوٹھی ہی میں موجود ہیں۔"

"نہیں۔" میں نے انکار کر دیا۔ "تم بس انہیں میرا پیغام پہنچا دینا۔" میں یہ کہہ کر گیٹ سے باہر آ گئی۔

سوٹ کیسوں کے ساتھ ٹرام میں سفر کرنا' مناسب نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے ایک ٹیکسی کر لیں

"لوئر چیت پور روڈ چلو۔" میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی کہا۔

ٹیکسی چل دی۔ میں نے ٹالی گنج میں رات نہ گزارنے کا فیصلہ کر کے ایک طرف تو شنکر دادا کی نظر میں خود کو ذلیل ہونے سے بچا لیا تھا' دوسری جانب چمپا کو ڈیسوزا کا سراغ لگانے سے روک دیا تھا۔ میں نے وہ رات موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لعنتی چمپا مجھ پر کوئی گھٹیا وار کرتی تو میرے لئے وہاں سبھی اجنبی ہوتے۔ کسی کے سامنے مجھے شرمندگی نہ ہوتی۔ چمپا نے مجھ پر اپنے ارادے ظاہر کر کے اچھا ہی کیا تھا۔ اگر وہ مجھ پر غفلت میں کوئی وار کرتی تو اس سے بچنا میرے لئے مشکل ہو جاتا۔ خودستائی کے جذبے نے اسے شاید ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ مجھ پر اتنی سی بات ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اسے برتری حاصل ہے۔ ٹیکسی فاصلے طے کرتی رہی اور میں اپنے خیالوں میں کھوئی رہی۔ میں چونکی اس وقت جب ٹیکسی اچانک رک گئی۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سامنے ہی انگریزی الفاظ میں "دھرم تلہ پولیس اسٹیشن" لکھا ہوا تھا۔ ٹیکسی' تھانے کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو چکی تھی۔

خطرہ! خطرہ! میرے ذہن نے گردان کی۔

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟" میں نے سخت لہجے میں ٹیکسی والے کو مخاطب کیا۔

"جہاں کے لئے آپ نے کہا تھا جی' وہیں لے کر آیا ہوں۔" ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔

اسی وقت میری نگاہ سامنے سے آتے ہوئے پولیس انسپکٹر پر پڑی اور میں اچھل پڑی۔ اس کے ساتھ کئی پولیس والے بھی تھے۔ یہ وہی پولیس انسپکٹر تھا جسے رحمت اپنے ساتھ لے کر میری کوٹھی پہنچا تھا۔ وہ سیدھا ٹیکسی کے سامنے آ کے رک گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "رانی دیوی! نیچے اتر آؤ۔"

"میرا نام رانی نہیں' راحیلہ ہے۔" میں تیزی سے بولی۔

"تم کوئی بھی روپ اپنالو' بچ نہیں سکتیں۔ مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ تم بھیس بدلے ہوئے ہو۔" یہ کہتے ہی اس نے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ پھر اس کی نظر میرے قریب ہی رکھے ہوئے سوٹ کیسوں پر پڑی۔ "اب یہ نہ کہنا کہ دونوں سوٹ کیس تمہارے نہیں ہیں' یہی سوٹ کیس تمہارے پاس اس وقت دیکھے گئے تھے جب تم مسز اگروال بنی ہوئی تھیں۔ اترو .... اترو ورنہ خود باہر گھسیٹ لوں گا۔"

میرے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ مجھے وہاں لا کر پھنسانے والی چمپا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو یقیناً اپنے سحر میں لے لیا تھا اور دوسری جانب اس پولیس انسپکٹر کو میرے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ ٹیکسی رکتے ہی وہ اس طرح تھانے سے باہر آ گیا تھا جیسے میرا ہی منتظر رہا ہو۔

مجبوراً مجھے ٹیکسی سے اترنا ہی پڑا۔ اسی وقت پولیس انسپکٹر نے سپاہیوں کی طرف مڑ کر کہا۔ "دونوں سوٹ کیس مال خانے میں جمع کرا دو۔"

دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر ٹیکسی سے سوٹ کیس اتار لئے۔

"اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔" پولیس انسپکٹر نے ٹیکسی والے کو مخاطب کیا۔

"جی .... جی صاحب جی!" ٹیکسی ڈرائیور حیران سا ہو کر بولا اور انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔

"ٹھہرو' تم غریب آدمی لگتے ہو' کرایہ لیتے جاؤ۔" میں نے اپنا ہینڈ پرس کھولا۔

"بڑی سخی بن رہی ہو' اسے ادھر لاؤ' یہ بھی مال خانے میں جمع ہو گا۔" پولیس انسپکٹر نے میرے ہاتھ سے پرس جھپٹ لیا۔

"یہ ظلم ہے۔" میں چیخ اٹھی۔

"ہو گا۔" پولیس انسپکٹر بولا۔ پھر ٹیکسی ڈرائیور کی طرف مڑا۔ "ابے تُو ابھی تک یہیں کھڑا ہے' کیا تجھے بھی حوالات کی ہوا کھانا ہے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے جلدی سے اپنی ٹیکسی ریورس میں لے کر موڑی اور رفوچکر ہو گیا۔

"اسے اندر لے کر آؤ' اس کا نام تو آج تک بہت سنا ہے' مگر درشن نہیں کئے' ہم بھی دیکھیں کہ بمبئی میں جس کے نام کا ڈنکا بجا ہوا ہے' وہ ہے کیسی؟" پولیس انسپکٹر یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

سپاہیوں نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا اور پھر ایک سپاہی نے سخت لہجے میں مجھ سے اندر چلنے کو کہا۔ خلاف توقع یہ صورت حال یقیناً میرے لئے پریشان کن تھی۔ پولیس انسپکٹر کے ذہن میں یہ بات بیٹھ

چکی تھی کہ میں بمبئی کی رانی ہوں۔ یا تو چمپا نے اسے یہ باور کرایا تھا یا پھر میرے ملازمین رحمت' عبدل اور غنی نے میرے متعلق بیان دیا تھا۔ ان تینوں کو راجہ استاد نے میرے متعلق یہی بتایا تھا۔ وہ میک اپ کے بغیر بھی میرا اصل چہرہ دیکھ چکے تھے' یہ بات میرے لئے اور بھی تشویش ناک تھی۔ میرے چہرے سے موجودہ میک اپ ختم ہونے کے بعد وہ تینوں ہی مجھے بحیثیت رانی شناخت کر لیتے۔ میں یہی سب کچھ سوچتی ہوئی سپاہیوں کے ساتھ تھانے کی عمارت میں داخل ہو گئی۔

"اس کی تلاشی لے کر اسے حوالات میں بند کر دو۔" پولیس انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "اس کی نقاب کشائی تھوڑی دیر کے بعد ہو گی۔"

کسی عورت کے لئے یہ بات قابل شرم ہی کہی جا سکتی ہے کہ مرد اس کی تلاشی لیں' مگر مجھے یہ ستم بھی برداشت کرنا پڑا۔ خیریت یہ ہوئی کہ تلاشی لیتے ہوئے سپاہیوں نے کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی۔ شاید اس کی وجہ وہاں پولیس انسپکٹر کی موجودگی تھی ورنہ تو پولیس والے عموماً اتنے شریف نہیں ہوتے۔ ایسے خوبصورت مواقع سے تو وہ پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

تلاشی لینے کے بعد مجھے تنگ و تاریک حوالات میں بند کر دیا گیا۔ وہاں اتنی سڑاند آ رہی تھی کہ مجھے متلی ہونے لگی۔ کافی دن سے شاید وہاں کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ میرے چہرے سے فوری طور پر میک اپ شاید اس لئے ختم نہیں کیا گیا تھا کہ پولیس انسپکٹر میری شناخت کی خاطر رحمت وغیرہ کو بلوانے والا تھا۔

تقریباً پون گھنٹے بعد مجھے حوالات سے نکالا گیا۔ پولیس والے مجھے ایک کمرے میں لے آئے۔ میرا قیاس درست ہی ثابت ہوا تھا۔ وہاں پہلے ہی میرے تمام ملازمین موجود تھے۔ ان میں شہزاد بھی تھا۔ جس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ سبھی دیوار سے لگے ایک طرف کھڑے تھے۔ سامنے ہی ایک گندی سی میز کے پیچھے کرسی پر پولیس انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی تھانے میں آئی تھی۔

پولیس انسپکٹر نے اچانک میرے سر سے نقلی بالوں کی وگ اتار لی اور فخریہ انداز میں ہنسا' پھر مجھ سے بولا۔ "اب چہرے سے تم خود ہی ماسک اتار دو۔"

میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ پولیس انسپکٹر کی بات مان لیتی۔ سو میں نے ماسک بھی اتار دیا۔

"یہی ہے .... یہی ہے جناب!" اچانک کئی آوازیں بیک وقت ابھریں۔ "یہی بمبئی کی رانی ہے۔"

میں نے یہ بات خاص طور سے محسوس کی تھی کہ ان آوازوں میں شہزاد کی آواز شامل نہیں تھی۔

"ارے!" پولیس انسپکٹر نے چونک کر کہا۔ "ایسے حسین چہرے کو چھپائے پھرتی ہے۔ چہرے سے تو بالکل جوان لگتی ہے۔ تیرا نام تو میں پچھلے دس سال سے سن رہا ہوں۔"

"صاحب جی! کچھ عورتیں عمرچور ہوتی ہیں۔ چہرے سے ان کی عمر پتا نہیں لگتی۔" ایک سپاہی بول اٹھا۔

"لگتا یہی ہے۔" پولیس انسپکٹر نے سر ہلایا اور میرے ہاتھ سے ماسک لے کر میز پر اچھال دیا' پھر دوبارہ میری طرف مڑا۔ "ہاں بھئی رانی! اب یہ بتا کہ بغیر خاطر مدارات کے زبان کھول دے گی کہ تیری خاطر کرنا پڑے گی؟" پھر شاید اسے میرے ملازمین کا خیال آ گیا اور ان سے مخاطب ہوا۔ "تم لوگ جا سکتے ہو' مگر کوئی بھی کوٹھی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ سمجھے یا نہیں؟" پولیس انسپکٹر نے انہیں گھور کر دیکھا۔

"سمجھ گئے جناب۔" وہ ہم آواز ہو کر بولے۔ اس مرتبہ بھی شہزاد کچھ نہیں بولا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے شہزاد کی خاموشی بھانپ لی۔ "تُو کیوں کچھ نہیں بولتا؟ ہیں!؟" اس نے شہزاد کو ڈانٹ پلائی جو میری طرف بڑی مظلوم نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب! آپ نے جو حکم دیا ہے' وہی ہو گا۔" شہزاد فوراً بول اٹھا۔

پھر ان سب کو جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ چلے گئے تو پولیس انسپکٹر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"دیکھ رانی! مردوں کی زبان کھلوانا مشکل ہوتا ہے' عورتیں تو ذرا سی دیر میں فر فر سبق سنانے لگتی ہیں۔ یہ بتا پہلے کہ وہ دونوں سپاہی کہاں ہیں جنہیں میں تیرے پاس چھوڑ گیا تھا؟ وہ اسی وقت سے غائب ہیں۔"

"تم نے خود مجھے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ تم ہی بتاؤ' کیا وہ میرے ساتھ تھے؟" میں نے کہا۔

"تو پھر وہ کہاں گئے؟" وہ میرے قریب آ کر غرایا۔

"مجھے کیا معلوم .... وہ دونوں تو مجھے لان میں چھوڑ کر تمہارے پاس کوارٹروں کی طرف چلے گئے تھے۔" میں نے بات بنائی۔

"اور اپنی بندوقیں وہیں لان میں پھینک گئے تھے؟" پولیس انسپکٹر کی آواز میں چبھن تھی۔

میں نے اس نکتے پر غور ہی نہیں کیا تھا اس لئے بولی۔ "مجھے اس سلسلے میں کچھ خبر نہیں۔ جب وہ کوارٹروں کی طرف جا رہے تھے تو بندوقیں ان کے پاس تھیں۔"

"اور وہ تیرا بھگوڑا ساتھی کہاں گیا جسے تُو اپنا شوہر بتا رہی تھی؟" پولیس انسپکٹر نے ارشاد حسین کے بارے میں دریافت کیا۔ "کہہ دے' وہ بھی جادو سے غائب ہو گیا۔"

"میرے ساتھ تو کوئی بھی نہیں تھا۔" میں فوراً مکر گئی۔

پولیس انسپکٹر کے ہاتھ میں ایک رول تھا' اس نے رول سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تُو کیوں یہ چاہتی ہے کہ میں.........." وہ فحش زبان پر اتر آیا۔ "یہ سوچ لے کہ اس وقت تھانے میں آٹھ سپاہی موجود ہیں اور نواں میں ہوں' تیرا حشر بگڑ جائے گا۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے گی' صبح تک۔"

غصے کے مارے میرا خون کھولنے لگا۔ میں چیخ اٹھی۔ "بکواس بند کر' ورنہ اتنے جوتے لگاؤں گی کہ تیرے سر پر ایک بال نہیں رہے گا۔ ذرا کوئی مجھے ہاتھ تو لگا کر دیکھے۔"

جواب میں اس نے پھر ایک ناقابل بیان جملہ ادا کیا اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "پچھاڑ لو اسے یہیں۔"

وہ صرف دو سپاہی تھے جو مجھے حوالات سے نکال کر وہاں لائے تھے۔ اپنے افسر کا حکم سن کر وہ

دونوں میری طرف جھپٹے اور یہ کوشش انہیں بہت مہنگی پڑی۔ ان میں سے ایک کے پیٹ پر میری لات پڑی تھی اور دوسرا اپنا جبڑا پکڑ کر چیخ اٹھا تھا۔ پھر میں نے انسپکٹر کے ہولسٹر سے اس کا ریوالور نکال لیا۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو انسپکٹر۔" میں نے اس کی طرف ریوالور تان لیا۔ "ورنہ میں گولی مارنے میں دیر نہیں کروں گی۔"

پولیس انسپکٹر نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ یقیناً اس کا ریوالور لوڈ ہی تھا ورنہ وہ میرا حکم نہ مانتا۔

"اب تم دونوں بھی ہاتھ اٹھا کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" میں نے کمرے میں موجود دونوں سپاہیوں کو حکم دیا۔

ان دونوں نے بھی تعمیل حکم میں دیر نہیں کی تھی۔

"انسپکٹر! میرے دونوں سوٹ کیس اور پرس منگواؤ' انہی میں سے ایک سپاہی کو بھیج دو اور بتا دو۔ انہوں نے تھانے میں موجود دوسرے سپاہیوں سے کچھ کہا تو میں تمہیں بھون دوں گی .... جلدی کرو۔"

مجبوراً پولیس انسپکٹر کو میرا یہ حکم بھی ماننا پڑا۔ اس نے ایک سپاہی کو میرا سوٹ کیس لینے بھیج دیا اور اسے تاکید کر دی تھی کہ کسی کو کچھ نہ بتائے۔ میرے پرس کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ وہیں اس کی میز کی دراز میں موجود ہے۔ میرے کہنے پر اس نے دراز سے پرس نکال کر میز پر رکھ دیا اور دور ہٹ گیا۔ میں نے پرس میز سے اٹھا کر کھولا تو اس میں سے تمام رقم غائب تھی۔

"روپے کہاں ہیں؟" میں نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

"میری جیب .... جیب میں ہیں۔ اگر .... اگر تم ہاتھ نیچے کرنے کی اجازت دے دو تو نکال کر.........."

"نکالو۔" مَیں بول اٹھی۔ اس نے اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے اور میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے الٹے ہاتھ سے نوٹ لے لئے اور بولی۔ "تم تو اسے بھی مال خانے میں جمع کرا رہے تھے' پھر نیت کیوں خراب ہو گئی' رقم دیکھ کر؟ معلوم ہوتا ہے حرام کھانے کی تمہیں کچھ زیادہ ہی عادت پڑ گئی ہے۔"

جواب میں انسپکٹر نے کچھ نہیں کہا اور سر جھکا لیا۔ ذرا دیر بعد جو پولیس والا میرا سوٹ کیس لینے گیا تھا' لوٹ آیا۔ دونوں ہاتھوں میں اس نے سوٹ کیس اٹھا رکھے تھے۔

"سنو انسپکٹر! تم یہ دونوں سوٹ کیس اٹھا کر میرے ساتھ چلو گے۔"

"مگر کہاں؟" اس نے سوال کیا۔

"جہنم میں .... تمہارے اندر اتنی بھی عقل نہیں کہ ظاہر ہے' میں یہاں سے پیدل نہیں جاؤں گی۔"

"اگر تم کسی ٹیکسی میں کہیں جانا چاہتی ہو تو .... تو میں یہیں تھانے میں ٹیکسی منگوائے دیتا

ہوں۔" پولیس انسپکٹر نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے، منگواؤ ٹیکسی۔" میں نے اس کی تجویز مان لی۔

پولیس انسپکٹر نے ایک سپاہی کو ٹیکسی لینے بھیجتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "کہاں کے لئے ٹیکسی منگواؤں؟"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو انسپکٹر! ٹیکسی منگواؤ۔ یہ ضروری نہیں کہ پہلے سے بتا دیا جائے کہ کہاں جانا ہے۔ ویسے بھی ٹیکسی ڈرائیور کی یہ مجال نہیں کہ کسی پولیس والے سے غیر ضروری سوالات کی ہمت کر سکے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

پولیس انسپکٹر نے پھر دیر نہیں کی اور سپاہی کو ٹیکسی لینے بھیج دیا۔ سارے کام میری مرضی کے مطابق ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ چمپا مجھے وہاں پھنسا کر غائب ہو گئی تھی۔ یقیناً وہ یہی سمجھی ہو گی کہ اب میں، پولیس کی گرفت سے بچ کر نہیں نکل سکوں گی۔ بصورت دیگر وہ وہیں رہتی۔

سپاہی کو ٹیکسی لے کر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ایک سوٹ کیس میں نے اٹھا لیا اور دوسرا میرے حکم پر پولیس انسپکٹر کو اٹھانا پڑا۔

"تم آگے آگے چلو گے۔" میں نے انسپکٹر کو مخاطب کیا۔

پھر پولیس انسپکٹر سوٹ کیس اٹھائے ہوئے کمرے سے نکلا۔ میں اس کی آڑ میں تھی تاکہ کسی کو میرے ہاتھ میں ریوالور نظر نہ آئے۔ ریوالور پر میں نے ساڑھی کا پلو ڈال دیا تھا۔

باہر آنے کے بعد پولیس انسپکٹر نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر سوٹ کیس اندر رکھ دیا تو میں نے ٹیکسی سے دور کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔ میں اسے ابھی اپنے نشانے ہی پر رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد تیزی کے ساتھ میں نے اپنے ہاتھ میں موجود سوٹ کیس بھی ٹیکسی میں رکھا اور اندر بیٹھ گئی۔

"اپر سرکلر روڈ چلو۔" میں نے دانستہ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی اصل منزل سے آگاہ نہیں کیا کہ اگر میری آواز پولیس انسپکٹر بھی سن لے تو کوئی فرق نہ پڑے۔

وہ پولیس انسپکٹر کچھ زیادہ ہی بزدل ثابت ہوا تھا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ پھر بھی میں پوری طرح چوکنا تھی۔ جب تک ٹیکسی تھانے کی حدود سے باہر نہیں آ گئی میری نظریں پولیس انسپکٹر ہی پر جمی رہیں۔ وہ بالکل بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑا رہا تھا۔ اس سے مجھے یہ خطرہ نہیں تھا کہ وہ میرا تعاقب کرے گا۔

تھانے سے کچھ دور نکل آنے کے بعد ٹیکسی والے سے میں نے لوئر چیت پور روڈ چلنے کو کہا اور اس نے رستہ بدل دیا۔ اس دفعہ سفر کرتے ہوئے میں ایک لمحے کو بھی غافل نہیں ہوئی تھی۔ راستے پر میری نظر تھی۔ ٹیکسی ٹھیک راستے پر جا رہی تھی۔

مسافر خانے پہنچ کر مجھے ایک کمرہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں کچھ ہی دیر کے بعد کمرے کا دروازہ بند کر کے سونے کے لئے بستر پر لیٹ گئی۔ شام سے اب تک میں غیر معمولی حالات کا

شکار رہی تھی۔ میرے اعصاب تنے رہے تھے۔ اب مجھے قدرے سکون محسوس ہوا تو میری آنکھوں میں نیند اپنا جال بننے لگی۔ پھر جلد ہی میں سو گئی۔

معاً میں نے اپنے جسم کو کسی کی گرفت میں محسوس کیا تو میری آنکھ کھل گئی۔ معلوم نہیں، کتنی رات گزر گئی تھی اور میں کتنی دیر تک سوتی رہی تھی۔ سونے سے پہلے میں نے کمرے میں موجود لیمپ کی لو دھیمی کر دی تھی۔ اس وقت بھی کمرے میں نیم تاریکی ہی تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی میں نے مضبوط جسم کے ایک آدمی کو اپنے ساتھ ہی بستر پر لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ وہی مجھے لپٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ دروازہ اندر سے بند ہونے کے باوجود وہ شخص میرے کمرے میں کیسے آ گیا تھا۔

میں نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے میں دیر نہیں کی اور پھر اٹھ کر بیٹھتے ہی سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "کون ہو تم .... میرے کمرے میں کیسے داخل ہوئے؟"

"خود ہی مجھے لے کر آئی ہو اور خود ہی پوچھ رہی ہو، بنو مت۔ میں اپنے پیسے وصول کئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میرے پانچ روپے حرام کے نہیں ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور زبردستی گھسیٹ کر مجھے اپنے پاس لٹا لیا۔

تو اس لعنتی چمپا نے مجھے ایک پیشہ ور عورت بنا دیا ہے، میں نے سوچا۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت اس کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے لئے بند کمرے میں داخل ہو کر دروازہ کھولنا کون سا مشکل تھا۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے باہر سوئے ہوئے کسی مسافر سے جسم فروشی کا سودا کیا ہو گا اور پھر اسے میرے کمرے میں چھوڑ کر غائب ہو گئی ہو گی۔

وہ شخص دست درازی کرنے لگا تو میں نے دھکا دے کر اٹھنا چاہا، مگر اس مرتبہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نے میرے جسم کو جکڑ لیا تھا۔ اس کے جسم میں مجھے غیر معمولی قوت محسوس ہوئی۔ یقیناً وہ چمپا کے سحر میں تھا۔ قاسم کے معاملے میں بھی ایک مرتبہ ایسا ہی ہو چکا تھا۔ مجھے مجبوراً قاسم کے دست ہوس سے بچنے کے لئے اسے موت کے گھاٹ اتارنا پڑا تھا۔ میں نے سوچا، کیا چمپا اس بے گناہ شخص کو بھی میرے ہاتھوں قتل کرانا چاہتی ہے؟ مگر کیوں؟ اس سے وہ کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتی تھی؟ وہ کمینی عورت میری طرف سے صرف چند گھنٹے بے خبر رہی تھی اور پھر مجھ تک پہنچ گئی تھی۔

میری نظر میں وہ شخص قطعی بے قصور تھا جو اس وقت میرے ساتھ زبردستی کر رہا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر اسی خیال کے سبب اس کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے سے میں گریز کر رہی تھی لیکن کب تک؟ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا کیونکہ میں محسوس کر چکی تھی، وہ مجھے بے لباس کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ کسی حد تک وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ میں خود کو اس سے نہیں چھڑا سکی تھی۔

میں انتہائی قدم اٹھانے ہی والی تھی کہ خلاف توقع اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور کئی افراد اندر داخل ہو گئے۔ انہی میں سے ایک نے لپک کر لیمپ کی لو بڑھا دی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے والے

ایک باریش شخص کو میں نے پہچان لیا۔ وہ مسافرخانے کا نگران تھا۔ بقیہ افراد میرے لئے اجنبی تھے۔

"دیکھ لیا جناب! میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔" ایک آدمی نے مسافرخانے کے نگران کو مخاطب کیا۔ "اب تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

جو شخص مجھ سے دست درازی کر رہا تھا' اس کی گرفت میرے جسم پر ڈھیلی پڑ گئی۔ میں اسے دھکا دے کر الگ ہو گئی اور جلدی جلدی اپنا بے ترتیب لباس درست کرنے لگی۔ اسی وقت کمرے میں موجود ایک اور شخص بول اٹھا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے کہ اب رنڈیوں نے بھی مسافرخانے میں آنا شروع کر دیا ہے۔"

اس شخص کی بات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں تقریباً چیخ اٹھی۔ "بکواس بند کرو' یہ شخص خود میرے کمرے میں گھس آیا تھا اور میرے ساتھ زبردستی کر رہا تھا۔ میں اس کی زبردستی سے بچنے کی کوشش........."

"جھوٹ مت بولو۔" مسافرخانے کے نگران نے میری بات کاٹ دی۔ "تم نے اس سے اپنے جسم کا سودا کیا تھا' پانچ روپے میں۔ پھر اسے خود اپنے ساتھ کمرے میں لے کر آ گئی تھیں۔ کیوں صاحب' آپ بولیں نا! آپ نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تھا۔"

وہی شخص پھر بول اٹھا جس نے پہلے نگران کو مخاطب کیا تھا۔ "میں برابر ہی سو رہا تھا کہ اس عورت کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ یہ عورت میرے برابر سونے والے کو جگا کر اس سے سودا کر رہی تھی۔ کافی دیر پیسوں پر حجت ہوتی رہی۔ پھر پانچ روپے میں معاملہ طے ہو گیا' ساری رات کے لئے۔ اس کے بعد میں نے عورت اور مرد کو اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں نے سوچا کہ اس جھگڑے میں نہ پڑوں۔ پھر جب خاموش رہنے پر میرا ضمیر مجھ پر ملامت کرنے لگا تو میں اٹھ کر نگران صاحب کے پاس پہنچ گیا اور انہیں ساری بات بتا دی۔"

وہ شخص جو میرے بستر پر دراز تھا اس عرصے میں اٹھ کر سر جھکائے نگران کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ نگران اس سے بولا۔ "کیوں جناب! آپ بتائیں' کیا بات تھی؟"

"میں .... میں سخت شرمندہ ہوں کہ .... کہ مجھ پر شیطان سوار ہو گیا تھا۔" اس شخص نے اعتراف کر لیا۔ اس کے چہرے سے ندامت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس عورت کی باتوں میں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے کہ تم اس کے کمرے میں گھس کر زبردستی کر رہے تھے؟" ایک اور شخص نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"جی .... جی ہاں۔" اس مونچھوں والے نے جواب دیا۔ "اس نے مجھ سے پہلے ہی پانچ روپے وصول کر لئے تھے۔"

"یہ عورت پکی پیشہ ور لگتی ہے' اسے پولیس کے حوالے کر دیں۔" ایک شخص نے نگران کو مشورہ دیا۔

"چلو بی بی' نکلو یہاں سے' تم جیسی عورتوں کا یہاں کیا کام؟" نگران نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

مجبوراً مجھے اپنے سوٹ کیس اٹھا کر کمرے سے باہر آنا پڑا۔ باہر نکلتے ہی مجھے اپنے ہینڈ پرس کا خیال آیا اور لپک کر پھر اندر کمرے میں گئی۔ پرس غائب تھا۔ پھر میں نے سارا کمرہ چھان مارا مگر پرس نہیں ملا۔ اس عرصے میں نگران بار بار مجھے کمرے سے نکلنے کی تاکید کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ اپنا پرس ڈھونڈ رہی ہوں۔

وہ لوگ بہرحال کمرے سے میرے نکلنے کے منتظر رہے۔ پرس گم ہونے کی صورت میں میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہیں رہی تھی۔ معاً مجھے چمپا کا خیال آیا اور پھر میں کمرے سے نکل آئی۔ پرس کی تلاش فضول ہی تھی۔ یہ حرکت بھی اسی کمینی چمپا کی ہو سکتی ہے' یہ سوچتے ہوئے میں نے طویل سانس لیا۔

مسافرخانے کے نگران نے مجھ پر اتنا رحم کیا کہ مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ البتہ اسی وقت مسافرخانے سے ضرور نکال دیا۔

اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے جب میں مسافرخانے سے نکل کر بے یار و مددگار سڑک پر کھڑی ہوئی تھی۔ میرے سامنے اب پھر یہی سوال تھا کہ کہاں جاؤں؟ ٹالی گنج جانے کا تو فی الحال سوال ہی نہیں تھا۔ وہاں سے تو میں خود بھاگی تھی۔ پھر یہ کہ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ مجھے کسی ایسی جگہ جانا تھا جہاں جا کر ٹیکسی کا کرایہ بھی دلوا سکتی۔ ایسی دو ہی جگہیں تھیں' شنکر دادا کا اڈا یا پھر راجہ استاد کا گھر۔ مجبوراً مجھے راجہ استاد کے گھر جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

مجھے کوئی ٹیکسی تو نہیں مل سکی' ہاں رکشا مل گیا۔ کلکتے میں اس زمانے تک زیادہ ٹیکسیاں بھی نہیں تھیں۔ یوں بھی رات کے وقت ٹیکسیوں کا حصول ذرا مشکل ہوتا تھا۔ اپنے مزاج کے خلاف رکشے میں بیٹھ کر میں چاندنی چوک پہنچ گئی۔

"تم ٹھہرو' میں ابھی پیسے لے کر آتی ہوں۔" میں' رکشا والے سے یہ کہہ کر اتر گئی اور سوٹ کیس اٹھائے بلڈنگ میں گھس گئی۔

دروازہ فوراً ہی نہیں کھلا۔ میں منتظر رہی۔ پھر ہمایوں نے آ کر دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر چونک اٹھا۔ "رانی! تم؟"

"ہاں میں۔" میں نے جواب دیا اور پھر رکشا والے کو اندر سے پیسے لا کر دینے کو کہا۔

ہمایوں لپکتا ہوا اندر گیا اور پیسے لے آیا۔ پھر اس نے خود ہی کہا۔ "میں دے آتا ہوں' تم اندر چلو۔"

میں اندر پہنچی تو معلوم ہوا راجہ استاد بھی جاگ چکا تھا۔ اس نے مجھے آواز دے کر اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"اس وقت کہاں سے آ رہی ہو؟" راجہ استاد کے لہجے میں تشویش تھی۔

میں سوٹ کیس ایک طرف رکھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور طویل سانس لے کر بولی۔ "کچھ نہ

پوچھو استاد! آج کل ستارے گردش میں ہیں۔"

"ستارے گردش میں ہوں تمہارے دشمنوں کے۔" اس نے پُرخلوص لہجے میں کہا' پھر بولا۔ "ویسے تم تھیں کہاں .... مجھے تو غنی وغیرہ کچھ اور ہی بتا رہے تھے۔ ان کی باتوں پر مجھے یقین سا نہیں آیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب چکر کیا ہے؟"

"تم کب گئے تھے وہاں؟" مَیں نے پوچھا۔

"صبح تو خیر گیا ہی تھا' رات کو بھی کوئی نو بجے کے قریب وہاں پہنچا تھا۔" راجہ استاد نے بتایا۔

"تو پھر.......... غنی وغیرہ کیا کہہ رہے تھے تم سے؟"

"وہ بتا رہے تھے کہ شام کو پولیس نے تمہاری کوٹھی پر چھاپہ مارا تھا۔"

"میں سو جاؤں استاد! دروازہ بند کر دیا ہے میں نے۔" باہر سے ہمایوں کی آواز آئی۔

"ہاں سو جاؤ اور سنو' صبیحہ کو جگا کر ذرا دو کپ چائے بنوا دو۔"

"رہنے دیں استاد! ایسی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہو رہی چائے کی۔"

"مجھے تو ہو رہی ہے۔ بنوا لے بھئی چائے۔" راجہ استاد نے بلند آواز میں کہا۔

"اچھا استاد! ابھی جگاتا ہوں صبیحہ کو۔" ہمایوں نے جواب دیا۔

"ان لوگوں نے یہ نہیں بتایا استاد کہ پولیس نے چھاپہ کیوں مارا تھا؟"

"شاید رحمت بتا رہا تھا کہ کسی نے پولیس سے مخبری کر دی تھی۔ تمہاری کوٹھی کے عقبی حصے سے پولیس نے فاطمہ اور قاسم کی لاشیں بھی برآمد کرلی ہیں۔" راجہ استاد نے بتایا۔ میں سمجھ گئی کہ ان لوگوں نے راجہ استاد کو حقیقت سے بے خبر ہی رکھا تھا۔ "رانی! یہ سب قصہ کیا ہے؟ فاطمہ کو قاسم نے کیوں قتل کر دیا؟ پھر.......... پھر وہ خود بھی مارا گیا؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔" راجہ استاد کے چہرے پر فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "وہ لوگ بتا رہے تھے کہ قاسم کی لاش تمہارے کوارٹر سے ملی تھی۔ قاسم تمہارے کوارٹر میں کیسے پہنچ گیا؟ ظاہر ہے' اسے تم نے تو نہیں بلایا ہو گا۔"

"میں سو رہی تھی کہ اچانک قاسم کی ہلکی سی چیخ سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ معلوم نہیں وہ کس لئے میرے کوارٹر میں آیا تھا۔ مَیں نے اسے زمین پر گر کر تڑپتے دیکھا اور اسی وقت ایک سانپ پر میری نظر پڑی جو کمرے سے نکل رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ قاسم کو سانپ نے کاٹا ہے۔ پھر میں نے ملازمین کو بلوا لیا۔ پولیس کے جھنجھٹ سے بچنے کی خاطر میں نے قاسم کی لاش کو بھی فاطمہ کے برابر ہی دفنانے کو کہہ دیا۔" میں نے بات بنا دی۔

"لیکن پولیس سے مخبری کس نے کی؟ یہ سوچنے والی بات ہے۔" راجہ استاد نے کہا۔

"ظاہر ہے استاد کہ جو لوگ اس سے واقف تھے انہی میں سے کوئی مخبر ہو گا۔" میں بولی۔

"یہ تو نمک حرامی ہے۔" راجہ استاد کو غصہ آ گیا۔

"اب جو بھی کہہ لو' جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔"

"میں ان تینوں کی کھال کھینچ لوں گا۔" راجہ استاد کا اشارہ غنی' عبدل اور رحمت کی طرف تھا۔ پھر

کچھ سوچ کر بولا۔ "وہ تمہارا مینجر شہزاد تو ایسا نہیں ہے نا؟"

مجھے علم تھا کہ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سب کچھ چمپا کا کیا دھرا تھا اس لئے راجہ استاد کو سمجھایا۔ "جو ہوا' بھول جاؤ استاد! کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی اب میں دو ایک دن میں کلکتے سے جانے والی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم غنی' عبدل اور رحمت کی چھٹی کر دو۔ جب میں دوبارہ کلکتے لوٹوں گی تو پھر دیکھا جائے گا اور ہاں وہ تمہارا ٹھیکیدار' مزدوروں کو لے کر نہیں پہنچا؟"

"سلام باجی!" اسی وقت صبیحہ چائے لے کر آ گئی۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دے کر ناوقت جگائے جانے پر معذرت کی۔

"ارے نہیں باجی! آپ کی خدمت کر کے تو خوشی ہوتی ہے۔" اس نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی' پھر دوسری پیالی راجہ استاد کو تھما کر چلی گئی۔

"ٹھیک ہے رانی! میں کل ہی ان تینوں کی چھٹی کر دیتا ہوں۔ تو پھر کیا تمہارا مینجر ہی کوٹھی میں رہے گا؟"

"ممکن ہے' میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔" مَیں نے جواب دیا۔ "تم ایسا کرنا استاد کہ اگر وہ ٹھیکیدار جسے تم لے کر آئے تھے' کام نہیں کرا سکتا تو کسی دوسرے سے بات کر لینا۔ میری غیرموجودگی میں کوٹھی تمہارے ہی قبضے میں رہے گی۔"

"ارے جس کی ناک پر پیسہ مارا جائے گا وہ کام کرے گا۔ میں پوچھ لوں گا اس ٹھیکیدار سے۔ وہ نہیں کوئی اور سہی۔" راجہ استاد نے چائے کا گھونٹ لیا۔

"ہاں استاد! یہ بھی ممکن ہے کہ پولیس میرے ملازمین کو فی الحال وہیں رہنے پر مجبور کرے۔ ایسی صورت میں جو بھی تم مناسب جانو' وہ کرنا۔"

"تم فکر نہ کرو رانی! میں سب دیکھ لوں گا۔ تمہارا ارادہ ہے کب جانے کا؟"

"ابھی کچھ طے نہیں استاد! ہاں یہ معلوم ہے زیادہ دن نہیں ہیں۔"

"کل رات تم وعدہ کر کے نہیں آئیں رانی!" راجہ استاد کا لہجہ شکایتی تھا۔ آخر اس نے وہ موضوع چھیڑ ہی دیا تھا جو میرے لئے ناگوار تھا۔

"شاید میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا استاد کہ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔"

"کاش میں بھول سکتا رانی!" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"اگر تم نہیں بھول سکتے استاد! تو میرا تمہارے گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔"

"ایسا ہے رانی! تو .... تو پھر.......... پھر اب میں تم سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ اداس سا ہو گیا۔

چائے پینے کے بعد راجہ استاد کے کمرے سے اٹھ کر میں اسی کمرے میں آ گئی جہاں پہلے بھی رہ چکی تھی۔ اپنے ساتھ ہی مَیں دونوں سوٹ کیس بھی اٹھا لائی تھی۔ میں نے بطور احتیاط کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ مجھے راجہ استاد ہی کی طرف سے نہیں' ہمایوں سے بھی خطرہ تھا۔

خلاف توقع اس رات کا بقیہ حصہ پرسکون ہی گزرا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ چمپا مجھے پہلے ہی ان لوگوں کی نظر میں ذلیل و رسوا کر چکی تھی۔

صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد ہمایوں کے ذریعے میں نے شہزاد کو وہاں بلوا لیا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ اپنا سوٹ کیس بھی ساتھ لایا تھا۔

"آپ .... آپ خاتون! تھانے سے کس طرح بچ کر نکل آئیں؟" شہزاد نے مجھ سے پوچھا۔

اس وقت راجہ استاد اور ہمایوں بھی میرے کمرے میں تھے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی راجہ استاد بول اٹھا۔ "کیا' یہ تھانے کا کیا قصہ ہے رانی؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ کیونکہ رات کو میں نے اس سلسلے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

"ارے کچھ نہیں استاد!" میں ہنس کر بولی۔ "تمہیں تو معلوم ہی ہے' پولیس کا اور ہم لوگوں کا تو پرانا ساتھ ہے۔ پولیس تو تھی ہی میری تلاش میں .... وہی فاطمہ اور قاسم والے معاملے میں۔ کل دھرم تلے میں ٹرام ڈپو کے قریب مڈبھیڑ ہو گئی اور یوں میں تھانے پہنچ گئی۔ بس اتنی سی بات تھی۔"

"مگر پھر پولیس نے تمہیں چھوڑ کیسے دیا؟" راجہ استاد نے دریافت کیا۔

"چھوڑا کب تھا۔" میں ہنسی' پھر مختصراً تھانے سے فرار کی روداد بیان کر دی۔ موسیٰ سیٹھ کے مسافرخانے کا ذکر درمیان سے میں گول کر گئی تھی اور یہی بتایا تھا کہ پولیس حراست سے نکل کر میں سیدھی راجہ استاد کے گھر آ گئی تھی۔"

"تو پھر وہ رکشا والا بڑا حرامی نکلا۔" ہمایوں بولا۔ "جھوٹ بول کر وہ مجھ سے زیادہ کرایہ لے گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ لوئر چیت پور روڈ سے سواری لایا ہوں۔"

یہ بات میرے ذہن سے نکل ہی گئی تھی کہ رات کو کرایہ ہمایوں سے دلوایا تھا۔ میں نے اسی لئے بات بنائی۔ "تھانے سے فرار ہو کر دراصل وقتی طور پر میں دور ہی نکل گئی تھی۔ پھر کچھ دیر اِدھر اُدھر گھوم کر اِدھر پلٹی تھی کہ پولیس میری تلاش سے مایوس ہو جائے۔ رکشا والے نے غلط نہیں کہا تھا' میں لوئر چیت پور روڈ سے ہی اس کے رکشے میں بیٹھی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔ "اب تم یہیں رہو گے' جب تک ہم کلکتے سے روانہ نہیں ہو جاتے۔"

"لیکن پولیس انسپکٹر نے تو کہا تھا کہ..........."

"لعنت پڑھو اس پر۔"

دوپہر کے بعد اس روز میں نے اپنے چہرے پر ایک نیا میک اپ کیا۔ اسی وقت راجہ استاد سے میں نے مزید پانچ ہزار روپے لے لئے۔ کیونکہ وہ اور ہمایوں دھندے پر جانے والے تھے۔ شہزاد سے میں نے اپنے لئے ایک ہینڈ پرس خرید کر منگوا لیا۔ راجہ استاد کو میں نے بتا دیا تھا کہ میرا ارادہ ٹالی گنج جانے کا ہے اور یہ کہ میں رات کو لوٹ آؤں گی۔ ساڑھے تین بجے میں' ہمایوں اور راجہ استاد ایک ساتھ گھر سے نکلے۔ شہزاد کو میں نے راجہ استاد کے گھر ہی پر چھوڑ دیا تھا۔

پانچ بجنے میں ابھی خاصی دیر تھی اور مجھے پانچ بجے تک ٹالی گنج پہنچنا تھا۔ اس لئے ٹیکسی نہیں کی۔

دھرم تلہ ٹرام ڈپو سے میں ٹالی گنج جانے والی ٹرام میں بیٹھ گئی۔ راجہ استاد اور ہمایوں پہلے ہی مجھ سے رخصت ہو چکے تھے۔

وقت سے کچھ پہلے ہی میں' شنکر دادا کے اڈے پر پہنچ گئی۔ مجھے نئے میک اپ کی وجہ سے پھر کوٹھی کے گیٹ پر روکا گیا۔ مگر تعارف کرانے کے بعد شنکر دادا تک پہنچا دیا گیا۔ وہ اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں تھا۔

"کل کیا ہو گیا تھا رانی دیوی کہ آپ اچانک چلی گئیں؟" شنکر دادا نے معلوم کیا۔

"بس ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا دادا! کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا' پھر بولی۔ "وہ اگروال جی آتے ہوں گے' گیٹ پر کہلوا دو۔"

"کہہ چکا ہوں' وہ آئیں گے تو انہیں بھی یہیں بھیج دیا جائے گا۔ چائے پئیں گی دیوی!؟"

"منگوا لو۔" میں نے بے تکلفی سے کہہ دیا۔

پھر ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ ارشاد حسین بھی آ گیا۔ شنکر دادا نے اس کے لئے بھی چائے منگوا لی۔

"معاف کرنا دادا! مجھے اگروال جی سے تنہائی میں کچھ بات کرنا ہے۔" میں نے شنکر دادا سے اس وقت کہا جب وہ چائے کا آخری گھونٹ لے رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں دیوی جی!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "جب میری ضرورت ہو تو بلوا لیجئے گا۔ کمرے کے باہر میرا آدمی موجود ہے' میں کوٹھی ہی میں ہوں۔"

شنکر دادا کے جاتے ہی میں نے دھیمی آواز میں ارشاد حسین کو مخاطب کیا۔ "ڈیسوزا کی قسمت کا کیا فیصلہ ہوا؟"

"خس کم جہاں پاک۔" ارشاد حسین نے طویل سانس لیتے ہوئے بتایا۔ "تنظیم کے سربراہ نے مقامی شاخ کے سربراہ کا فیصلہ بحال رکھا۔"

"یعنی ڈیسوزا کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے .... یہ قصہ بھی آخر ختم ہو ہی گیا۔" میں بولی۔

"عموماً مقامی شاخوں کے نگران یا سربراہ جو فیصلے کرتے ہیں انہی کو بحال رکھا جاتا ہے۔ مجھے اندازہ تھا معبلہ کہ یہی ہو گا۔"

"کل آپ جب چلے گئے تو میں' ڈیسوزا سے جا کر ملی تھی۔" میں نے کہا اور پھر اسے ڈیسوزا سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ شمبھو اور بڑے مہاراج کا ذکر دانستہ میں نے نہیں کیا تھا' باقی ساری باتیں بتا دی تھیں۔

"تو آخرکار انہیں مجھ پر شک ہو ہی گیا۔ مجھے بھی کچھ کچھ اندازہ تھا کہ اب زیادہ دن سرکاری ملازمت کا طوق میرے گلے میں نہیں رہ سکے گا۔ ویسے آپ نے اس سے یہ معلوم کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے' ورنہ میں دھوکے میں مارا جاتا۔" ارشاد حسین نے اظہار ممنونیت کیا۔

"ارشاد! آپ یہ کیسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہیں؟ یہ بھی کوئی احسان کی بات ہے۔ ویسے ارادہ

کیا ہے' کیا ملازمت چھوڑ دیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اتنا آسان نہیں معبلہ! جس شخص پر شبہ ہو جائے اور وہ فوری طور پر ملازمت چھوڑ دے' خصوصاً ایسے کسی حساس محکمے سے' تو اس سے شبہ مزید پختہ ہو جاتا ہے۔" ارشاد حسین نے جواب دیا۔

"دو باتوں میں سے فی الحال ایک پر عمل کرنا پڑے گا۔ یا تو میں روپوش ہو جاؤں یا پھر کچھ عرصے کے لئے تنظیم کی سرگرمیوں سے قطعی علیحدگی اختیار کر لوں۔ ڈیسوزا کے بعد ظاہر ہے کہ اب جم ہی محکمے کا سربراہ بنے گا اور اسی نے مشتبہ افراد کی فہرست ڈیسوزا کو پیش کی تھی۔ ایسی صورت میں وہ مکمل اختیارات ملتے ہی محکمے میں موجود مشتبہ افراد کے بارے میں فوری طور پر کوئی قدم اٹھائے گا۔ میں اس سلسلے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔ خیر یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں' فی الحال تو یہ بتایئے کہ کیا آپ واقعی ڈیسوزا کو قتل کرانے کے بعد اس کی لاش سی آئی ڈی آفس کے سامنے پھنکوانے کا ارادہ رکھتی ہیں جیساکہ آپ کل کہہ رہی تھیں؟" ارشاد حسین نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ویسے تو خیر اس کی لاش کہیں بھی پھنکوائی جا سکتی ہے لیکن حکومت پر تنظیم کی دھاک اسی صورت میں بیٹھے گی۔" میں نے کہا۔

جو آپ بہتر سمجھیں۔ میں تو خطرے کے خیال سے کہہ رہا تھا۔"

"خطرہ تو اسے اتنے دن یہاں رکھنے میں بھی تھا۔ اس کی موت کے بعد تو خطرہ ٹل جائے گا۔"

"مجھے حیرت تو اس بات پر ہے معبلہ کہ آپ کے ایما پر شنکر دادا نے اتنا بڑا خطرہ کیسے مول لے لیا؟ شنکر دادا جیسے جرائم پیشہ افراد کے جرائم کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ ایسے معاملات میں تو وہ ہاتھ ہی نہیں ڈالتے جن میں کوئی مالی منفعت نہ ہو۔ اس پر بھی میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ لوگ آپ کا اتنا احترام کرتے ہیں۔"

میں نے ارشاد حسین کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "ڈیسوزا کی موت کا منظر دیکھنا ہے ارشاد؟"

میری بات سن کر وہ چونکا۔ "کیا آپ مجھے بھی وہاں ساتھ لے جانا چاہتی ہیں؟"

"کیا حرج ہے؟ چلتے ہیں۔" میں کچھ سوچتے ہوئے مسکرائی۔

"آپ کہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے کہا۔ پھر میں نے شنکر دادا کو بلوا لیا۔ وہ آ گیا تو میں اس سے بولی۔ "دادا! ادھر چلنا ہے۔"

وہ میرا اشارہ سمجھ گیا۔ "کیا اگروال جی بھی چلیں گے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا رہا دیوی! اسے چھوڑنا ہے؟" شنکر دادا نے بھی اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں۔" میں نے بتایا۔ "ختم کرنا ہے اسے۔ آج رات اس کی لاش بھی سی آئی ڈی آفس کے سامنے پھنکوانی ہے۔"

"دیوی! اسے آپ اپنے ہاتھ سے ختم کریں گی یا میں قتل کروں؟" شنکر دادا نے معلوم کیا۔

"تم فکر نہ کرو دادا! وہ اس طرح مر جائے گا کہ خود اسے بھی خبر نہیں ہو گی۔" میں کچھ سوچتے ہوئے بولی' پھر پوچھا۔ "ولایتی شراب مل جائے گی؟"

"کیوں نہیں' کہیں تو منگواؤں؟"

"ہاں منگوا ہی لو۔" یہ کہتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئی۔

شنکر دادا چلا گیا تو ارشاد حسین بولا۔ "معبلہ! شراب کا کیا کرنا ہے؟"

"ڈیسوزا کو پلانی ہے۔" میں مسکرائی۔

"اچھا تو آپ اسی لئے کہہ رہی تھیں کہ اپنے مرنے کی خود اسے بھی خبر نہیں ہو گی۔ نشے میں آدمی............"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے ارشاد حسین کی بات کاٹ دی۔

"پھر کیا بات ہے؟" ارشاد حسین کے لہجے میں تجسس تھا۔

"ابھی دیکھ لیں گے آپ۔" میں بولی اور پھر ارشاد حسین نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

شنکر دادا انگریزی شراب کا ایک پینٹ (نصف بوتل) لے کر ہی لوٹا۔ میں نے ایک جگ میں پانی اور دو گلاس منگوانے کو کہا۔ اس نے آواز دے کر اپنے آدمی کو بلا لیا اور میرا حکم دہرا دیا۔

پانی سے بھرا جگ اور گلاس آ گئے تو میں شنکر دادا سے بولی۔ "تم تو پیتے ہو نا دادا؟"

"جی دیوی! پی لیتا ہوں۔" شنکر دادا نے جواب دیا۔

میں نے پینٹ اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولا اور ایک گلاس میں تھوڑی سی شراب انڈیل کر پانی ملا دیا' پھر دوسرے گلاس میں اپنے لئے پانی جگ سے پلٹا اور شنکر دادا سے کہا۔ "پیو دادا! میں پانی پی کر تمہارا ساتھ دوں گی۔" میں نے پانی کا گلاس اٹھا لیا۔

شنکر دادا اور ارشاد حسین دونوں ہی کے چہروں پر حیرت تھی۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکے ہوں گے کہ آخر چلتے چلتے رک کر مجھے اچانک شنکر دادا کو شراب پلانے کی کیا سوجھ گئی۔ بہرحال مجھ سے کچھ پوچھے بغیر شنکر دادا نے اپنا گلاس اٹھا لیا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ پانی کے دو ایک گھونٹ لے لئے۔

جب وہ گلاس خالی کر چکا تو میں نے کہا۔ "ایک پیگ اور چلے گا شنکر دادا؟" میں نے یہ اس لئے کہا تھا کہ نشہ کرنے والے کم سے کم دو پیگ ضرور پیتے ہیں۔ ایک پیگ میں تو انہیں ہلکا سا سرور ہی آتا ہے۔ یہ اندازہ مجھے راجہ استاد کے گھر ہوا تھا۔ ہمایوں اور استاد دونوں ہی مے نوش تھے۔

شاید موقع محل کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے شنکر دادا نے دوسرا پیگ فی الحال پینے سے انکار کر دیا' وہ بولا۔ "بس رانی دیوی! ابھی تو شام ہوئی ہے' پینے کے لئے بہت وقت پڑا ہے اور ابھی ہمیں ڈیسوزا کے معاملے کو بھی نمٹانا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے کہا کیوں کہ میرا مقصد حل ہو چکا تھا۔ "ایسا کرتی ہوں کہ بوتل سے جتنی شراب نکلی ہے اتنا پانی ملا دیتی ہوں۔" یہ کہتے ہی میں وہ گلاس اٹھایا جس سے پانی پی چکی تھی۔ گلاس میں ابھی خاصا پانی تھا۔ میں نے اپنا جوٹھا پانی شراب کی بوتل میں ڈال کر دوبارہ اس کا ڈھکنا بند کر دیا۔ تھوڑی

سی شراب نکل کر پانی ملا دینے سے شراب کے رنگ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا۔ ڈھکنا بند کر کے بوتل میں نے شنکر دادا کو تھما دی۔ "اسے اپنے پاس رکھ لو دادا!" پھر میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "چلیں' اب چلتے ہیں۔"

ارشاد حسین اور شنکر دادا کے ساتھ اٹھ کر میں باہر آ گئی۔ کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں شنکر دادا کی جیپ کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ شنکر دادا نے اپنے کسی آدمی کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ وہ خود ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شراب کا ادھا اس نے سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں جیپ اس کوٹھی تک پہنچ گئی جہاں ڈیسوزا کو رکھا گیا تھا۔ جیپ سے اتر کر ہم اوپر پہنچ گئے۔ میرے کہنے پر شنکر دادا نے شراب کا پینٹ ساتھ لے لیا تھا۔ آج ڈیسوزا کے کمرے میں تاریکی نہیں تھی۔ شنکر دادا کیوں کہ میک اپ میں نہیں تھا اس لئے اپنا چہرہ چھپانے کے لئے منہ پر رومال باندھنے لگا تو میں بول اٹھی۔ "اب اس کی کوئی ضرورت نہیں دادا! ڈیسوزا اگر آپ کا چہرہ دیکھ بھی لے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اسے اب کون سا زندہ رہنا ہے کہ اس سے چہرہ چھپایا جائے۔" شنکر دادا نے رومال چہرے سے ہٹا دیا۔ اس عرصے میں ڈیسوزا کے کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ ڈیسوزا مجھے سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھا نظر آ گیا تھا۔

"ہیلو مسٹر ڈیسوزا!" میں نے آواز بدل کر اسے مخاطب کیا۔

آواز سن کر وہ چونک اٹھا۔ "راجکماری!" اس نے میری بدلی ہوئی آواز سے مجھے پہچان لیا تھا۔ "تم روز اپنا چہرہ بدل لیتی ہو؟"

"ہاں۔" میں اس کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ارشاد حسین میرے ساتھ ساتھ تھا۔ شنکر دادا قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ وہاں چار کرسیاں ایک میز کے گرد پڑی تھیں' جن میں سے ایک کرسی پر ڈیسوزا بیٹھا تھا۔ میں نے شنکر دادا کو اشارہ کیا۔ "دادا! آپ بھی یہاں آ کر بیٹھ جائیں' کھڑے کھڑے تھک جائیں گے۔"

پھر میں' ارشاد حسین اور شنکر دادا' بقیہ تینوں خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شراب کی بوتل شنکر دادا نے اپنی گود میں رکھ لی تھی۔ ڈیسوزا سوالیہ نظروں سے ارشاد حسین اور شنکر دادا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب سے اسے اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا اس نے میرے ہی چہرے کو بے نقاب دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے علاوہ بھی دو افراد اپنے چہرے چھپائے بغیر اس کے سامنے آئے تھے۔ وہ شاید اسی لئے حیران سا معلوم ہو رہا تھا۔

"مسٹر ڈیسوزا! یہ شنکر دادا ہیں۔ یہ علاقہ انہی کا ہے۔" میں نے اس سے شنکر دادا کا تعارف کرایا اور اس نے شنکر دادا کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"کون سا علاقہ ہے؟" ڈیسوزا نے شنکر دادا سے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

"ٹالی گنج۔" میں نے بتایا۔ میرے نزدیک ڈیسوزا سے اب کچھ بھی چھپانا بے سود تھا۔ "یہاں شنکر دادا کا سکہ چلتا ہے۔ تمہیں اغوا کر کے لانے والوں میں سے ایک یہ بھی تھے۔"

"تو .... تو ان کا تعلق سرفروش تنظیم سے ہے؟" ڈیسوزا نے پُراضطراب لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "شنکر دادا نے تمہیں میرے کہنے پر اغوا کیا تھا۔ وہ شخص ان کا نمبر دو تھا جو تمہاری گولی سے زخمی ہو گیا تھا۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں' وہ زندہ بچ گیا ہے۔ سرفروش تنظیم کے رکن تو یہ ہیں۔" میں نے ارشاد حسین کی طرف اشارہ کیا' پھر بولی۔ "مگر تم انہیں پہچان نہیں سکو گے کیونکہ یہ بھی میری طرح میک اپ میں ہیں۔"

"تو کیا بغیر میک اپ کے پہچان لیتا؟" ڈیسوزا چونک کر بولا۔

"ہاں مسٹر ڈیسوزا!" میں نے اطمینان سے کہا۔ "کیونکہ ان کا تعلق تمہارے ہی محکمے سے ہے۔"

"میرے محکمے سے۔" ڈیسوزا کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

"ہاں' اور بغیر میک اپ کے تو تم مجھے بھی پہچان لو گے؟" میں ہنس کر بولی۔

"تو .... تو کیا تمہارا .... تمہارا تعلق بھی میرے ہی محکمے سے ہے؟"

"نہیں مسٹر ڈیسوزا!" میں اپنی اصل آواز میں بولی۔ "میں وہ ہوں جسے تم اسٹرپ ٹیز ڈانس دکھانا چاہتے تھے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے چہرے سے ماسک اتار دیا۔

"معبلہ!" وہ اچھل پڑا۔ "تم .... تم یہاں؟"

"اور یہ سب انسپکٹر ارشاد حسین ہیں۔" میں نے بتایا۔ پھر ارشاد حسین سے کہا۔ "ارشاد! آپ بھی مسٹر ڈیسوزا کو اپنا چہرہ دکھا ہی دیں۔"

ارشاد حسین نے الجھی ہوئی سی نظروں سے میری طرف دیکھا' مگر ماسک اتار ہی دیا۔ ڈیسوزا کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"تمہیں معلوم ہے مسٹر ڈیسوزا کہ تم سے کوئی بھی بات کیوں نہیں چھپائی جا رہی ہے؟" میں نے ڈیسوزا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"کک .... کیوں .... کیوں معبلہ!" وہ ہکلایا۔

"اس لئے مسٹر ڈیسوزا کہ سرفروش تنظیم نے تمہاری پیشکش قبول کر لی ہے۔ تنظیم تمہیں اپنا دوست بنانا چاہتی ہے اور دوستوں سے کوئی بات چھپائی نہیں جاتی۔"

"تو معبلہ! تو کیا تم .... تمہارا تعلق بھی اسی تنظیم سے ہے؟"

"نہیں مسٹر ڈیسوزا! تنظیم سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں تم مجھے تنظیم کے ہمدردوں میں ضرور شمار کر سکتے ہو۔ میں بھی تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں' اس امید پر کہ تمہیں میرے بارے میں مرکزی حکومت سے جو احکام ملیں گے مجھے تم اس سے آگاہ کرتے رہو گے۔ بولو مسٹر ڈیسوزا! کیا یہ ممکن ہے؟"

"کیوں ممکن نہیں معبلہ!" ڈیسوزا جلدی سے بولا۔ "میں تنظیم کا اور تمہارا وفادار رہوں گا۔ مجھے خوشی ہے کہ تنظیم نے میری پیشکش قبول کر لی۔ ظاہر ہے معبلہ کہ اب تو مجھے رہائی مل جائے گی۔" اس نے متوقع نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں مسٹر ڈیسوزا! تمہیں رہائی مل جائے گی آج۔" یہ کہہ کر میں نے شنکر دادا کو مخاطب کیا۔ "ذرا

ایک جگ میں پانی اور گلاس منگوا لو دادا اور بوتل مجھے دے دو۔"

شنکر دادا نے شراب کی بوتل مجھے تھما دی۔ اسی وقت ڈیسوزا نے بتایا کہ پانی کا جگ اور گلاس کمرے ہی میں موجود ہیں۔ اس کے بتانے پر شنکر دادا مسہری کے سرہانے رکھا ہوا جگ اور گلاس اٹھا لایا۔ اس وقت تک بوتل مَیں نے میز پر رکھ دی تھی۔

"تم سے دوستی اور تعاون کی خوشی میں تمہارے لئے مَیں یہ تحفہ لائی ہوں۔" مَیں نے ڈیسوزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈیسوزا اس پر میرا شکریہ ادا کرنے لگا اور بولا۔ "مگر معبلہ! کیا میں اکیلا ہی پیوں گا؟"

"سوری مسٹر ڈیسوزا! میں ڈرنک نہیں کرتی ورنہ تمہارا ساتھ ضرور دیتی۔" میں نے معذرت کرلی۔ "ہاں تمہارے لئے پیگ ضرور بنا سکتی ہوں۔"

اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا۔ اخلاقاً اس نے شنکر دادا اور ارشاد حسین کو بھی ساتھ پینے کے لئے مدعو کیا۔

"یہ دونوں بھی نہیں پیتے۔" میں فوراً بول اٹھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں شنکر دادا اس کے ساتھ پینے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ پھر میں نے بوتل کا ڈھکنا کھول کر گلاس میں شراب انڈیلی اور جگ سے اس میں پانی ملا دیا۔ اس کے بعد گلاس اٹھا کر ڈیسوزا کی طرف بڑھا دیا۔

"اس نوازش کے لئے میں تمہارا ممنون ہوں معبلہ!" ڈیسوزا نے میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ اپنے ہونٹوں تک گلاس لے جاتے ہوئے اچانک وہ رک گیا اور بڑبڑانے لگا۔ "مگر کیوں .... کیا .... شراب زہر آلود ہے؟ .... یہ .... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ .... لیکن تم .... تم کون ہو؟ میرے سامنے کیوں نہیں آتیں؟ .... اچھا .... میں نہیں پیتا۔" اس نے گلاس میز پر رکھ دیا اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔

"کیا ہوا مسٹر ڈیسوزا!" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"معبلہ! تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔"

"یہی کہ تنظیم نے تمہاری پیشکش قبول کرلی ہے؟ تم یہی کہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ میں سمجھ چکی تھی کہ کھیل شروع ہو چکا ہے۔ چمپا یقیناً مجھے تلاش کرتی ہوئی وہاں پہنچ چکی تھی اور اسی نے ڈیسوزا کو شراب پینے سے روک دیا تھا لیکن اب مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔ چمپا بہت دیر میں وہاں پہنچی تھی۔

"ہاں معبلہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تنظیم کے سربراہ نے میری موت کا حکم جاری کر دیا ہے۔ تم .... تم جو شراب مجھے پلا رہی ہو' وہ زہر آلود ہے۔ یہ .... یہ زہر آلود شراب پلا کر تم مجھے قتل کر دینا چاہتی ہو۔ بولو' کیا ایسا ہی نہیں ہے؟"

"مسٹر ڈیسوزا! اگر تم حقیقت جان ہی گئے ہو تو تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہئے کہ میں نے تمہاری موت کو آسان بنا دیا ہے۔"

"مگر میں .... میں مرنا نہیں چاہتا .... میں ہرگز یہ شراب نہیں پیوں گا۔" یہ کہتے ہی ڈیسوزا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم لوگ مجھے قتل نہیں کر سکتے .... نہیں۔"

چمپا کو اس جگہ کا علم ہو چکا تھا اور وہ کسی بھی لمحے کوئی نئی مصیبت کھڑی کر سکتی تھی۔ ڈیسوزا کو جلد از جلد ٹھکانے لگایا جانا ضروری تھا۔ یہی سوچ کر میں نے شنکر دادا کو اشارہ کیا۔ میرا اشارہ پاتے ہی شنکر دادا' ڈیسوزا کی طرف جھپٹا۔ اسی کے ساتھ میں بھی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈیسوزا کی پھرتی قابل دید تھی۔ شنکر دادا اسے اپنی گرفت میں نہیں لے سکا تھا۔ ڈیسوزا اسے کمرے میں نچاتا پھر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ چمپا کے سحر میں تھا۔ چمپا وہاں موجود تھی۔ چمپا کی وہاں موجودگی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ ڈیسوزا کے متعلق ابھی پولیس کو مطلع نہیں کر سکی تھی۔ وہ اگر وہاں سے غائب ہو جاتی تو یہ خطرہ پیدا ہو جاتا۔

شنکر دادا کے ہاتھ میں اب چاقو نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے شدید غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ شنکر دادا کے ماتھے پر لگنے والی چوٹ تھی۔ ڈیسوزا کو پکڑنے کے چکر میں اس کا سر کمرے کی ایک دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ اسے یہ تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ ڈیسوزا کو قتل کرنا ہے۔ اس لئے چاقو نکال لینا بہرحال خلاف مصلحت نہیں تھا۔

"میں اسے ختم کئے دیتا ہوں۔" ارشاد حسین نے مجھے مخاطب کیا اور دوسرے ہی لمحے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

"نہیں۔" میں نے اسے روک دیا۔ "ممکن ہے گولی چلنے کی آواز سے قریبی کوٹھیوں کے رہنے والے اس طرف متوجہ ہو جائیں یا ان میں سے کوئی پولیس کو فون کر دے کہ اس کوٹھی میں گولی چلنے کی آواز سنی گئی ہے۔ ریوالور جیب میں رکھ لیں۔"

"پھر .... پھر کیا کریں گی آپ؟ وہ تو ہاتھ ہی نہیں آ رہا .... چھلاوہ بنا ہوا ہے۔" ارشاد حسین نے کہا۔

"میں کوشش کرتی ہوں۔" یہ کہتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھلی۔

مخالف سمت سے شنکر دادا' ڈیسوزا کو گھیر رہا تھا۔ ادھر سے میں نے اس پر جست بھری۔ حیرت انگیز طور پر ڈیسوزا ہم دونوں ہی کے درمیان سے نکل گیا۔ میں مسہری پر جا کے گری لیکن اٹھنے میں دیر نہیں کی۔ ڈیسوزا اب کمرے کے دروازے سے پشت لگائے چوکنا انداز میں ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

معلوم نہیں شنکر دادا کو کیا سوجھی کہ اس نے اپنے چاقو کو نوک کی طرف سے پکڑا اور پھر ڈیسوزا کا نشانہ لیا۔ ڈیسوزا تیزی سے فرش پر بیٹھ گیا۔ چاقو کا پھل دروازے میں گڑ گیا۔ ڈیسوزا اٹھا اور اس نے چاقو پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو آ جانا میرے نزدیک خطرناک تھا۔ ایسی صورت میں کسی کا اس کے قریب جانا اب آسان نہیں رہا تھا لیکن وہ بھی شنکر دادا تھا۔ ڈیسوزا کے ہاتھ میں چاقو ہونے کے باوجود وہ اس کے سامنے پہنچ کر مخصوص انداز میں جھک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اچانک میں نے ڈیسوزا کو بھی جھکتے دیکھا۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے شنکر دادا پر حملہ کرنے والا

ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر ایسے میں شنکر دادا نے ڈیسوزا سے چاقو چھیننا چاہا تو اسے ہرگز کامیابی نہیں ہو گی۔ ایسی صورت میں شنکر دادا کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ شنکر دادا اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ اس کے مقابلے میں ڈیسوزا نہیں چھپا تھی' پُراسرار شیطانی قوتوں کی مالک چھپا۔ شنکر دادا اسے کسی صورت میں زیر نہیں کر سکتا تھا۔ اسی خیال کے ساتھ میں ایک دم چیخ اٹھی۔ "شنکر دادا! پیچھے ہٹ جاؤ۔"

شنکر دادا چونک کر مڑا اور میری طرف دیکھا۔ عین اسی لمحے ڈیسوزا نے اس پر چھلانگ لگا دی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے طویل جست بھری۔ ادھر ڈیسوزا نے شنکر دادا کے سینے میں چاقو اتارنے کے لئے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا' ادھر میں نے شنکر دادا کو دھکا دے کر گرا دیا۔ میرے لئے اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن نہیں تھی کہ شنکر دادا کو ڈیسوزا کے قاتلانہ حملے سے بچا سکتی۔ ڈیسوزا اپنے زور میں آگے کی طرف جھکا اور میں نے اچھل کر اس کے گھٹنے پر ٹھوکر ماری۔ وہ چیختا ہوا اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔ چاقو اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ پھر میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے دانت اس کی بائیں کلائی میں گڑ گئے تھے۔ اس نے پہلو بدل کر دائیں ہاتھ میں موجود چاقو سے میری گردن پر وار کرنا چاہا مگر میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور اچھل کے کھڑی ہو گئی۔ مجھے علم تھا کہ وہ اب صرف چند لمحوں کا مہمان ہے۔ میں نے اپنا زہر اس کے جسم میں اتار دیا تھا۔

اس عرصے میں شنکر دادا بھی اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ میری نظر ڈیسوزا پر جمی ہوئی تھی۔ اس نے کہنیوں کے بل زمین سے اٹھنے کی کوشش کی' مگر اس کا جسم کانپنے لگا اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ گرتے ہی اس کا جسم تڑپا اور پھر ایک دم ساکت ہو گیا۔ یقیناً وہ سفر آخرت پر روانہ ہو چکا تھا۔ تیز اثر زہر نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔

"یہ .... یہ اسے کیا ہوا رانی دیوی!" شنکر دادا نے مجھ سے پوچھا۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔

"ختم ہو گیا۔" میں نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

"مگر کیسے؟" شنکر دادا کی آواز میں حیرت تھی۔ یقیناً وہ کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔

ڈیسوزا کی موت کے بعد اب وہاں چھپا کے موجود رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور یہ خطرناک بات تھی۔ میں نے اسی لئے شنکر دادا کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "دادا! یہاں کسی بھی لمحے پولیس پہنچ سکتی ہے۔ اس لئے جس قدر جلد ممکن ہو ڈیسوزا کی لاش یہاں سے ہٹوا دو۔ موجودہ حالات میں یہ ضروری نہیں کہ لاش کو سی آئی ڈی آفس کے سامنے ہی پھینکا جائے۔ اس علاقے کے سوا کہیں بھی لاش پھنکوا دو' جلد کرو۔"

"یہاں سے قریبی آبادی بالی گنج ہی ہے دیوی! لاش وہیں پھنکوا دیتے ہیں' لیک کے قریب۔" شنکر دادا نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"ٹھیک ہے' مگر دیر نہ کرو۔" میں فوراً آمادہ ہو گئی۔ کیونکہ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

پھر سب کچھ بہت تیزی سے ہوا۔ ڈیسوزا کی لاش کو ایک بڑی سی چادر میں باندھ کر شنکر دادا کے آدمی وہاں سے لے گئے۔ اس دوران ارشاد حسین اور خود میں نے اپنے اپنے چہروں پر ماسک چڑھا لئے

چند منٹ کے اندر اندر کوٹھی بالکل خالی کر دی گئی۔ زہریلی شراب میں نے باتھ روم میں جا کر بہا دی تھی اور خالی بوتل بھی وہاں نہیں چھوڑی تھی۔ خالی بوتل میں نے شنکر دادا کے ایک آدمی کو یہ کہہ کر دی تھی کہ باہر جا کر پھینک دے۔ جس کمرے میں ڈیسوزا کو رکھا گیا تھا وہاں بھی کوئی ایسی شے نہیں چھوڑی گئی جو مشتبہ قرار دی جا سکتی۔ شنکر دادا کی جیپ اس کے آدمی' ڈیسوزا کی لاش ٹھکانے لگانے کے لئے لے گئے تھے۔ اس لئے ہم تینوں' یعنی میں' ارشاد حسین اور شنکر دادا پیدل ہی وہاں سے اڈے کی طرف چل دیئے۔ کوٹھی سے روانہ ہونے کے بعد ابھی ہم کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ پولیس کی دو جیپوں کو تیزی کے ساتھ مخالف سمت سے آتے دیکھا۔ ہم تینوں تیزی کے ساتھ بائیں جانب کی ایک گلی میں گھس گئے۔ چند ہی لمحوں کے بعد دونوں جیپیں آندھی طوفان کی طرح گلی کے سامنے سے گزر گئیں۔ ان کا رخ اسی کوٹھی کی طرف تھا جہاں سے ہم آ رہے تھے۔ ہم دوبارہ اس گلی سے باہر نکل آئے اور کوٹھی کی طرف دیکھا۔ دونوں جیپیں اسی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھیں۔ اب یہ تصدیق ہو گئی تھی کہ پولیس اسی کوٹھی پر چھاپہ مارنے آئی تھی۔ ہم پھر شنکر دادا کے اڈے کی طرف چل دیئے۔

☆======☆======☆

مجھے اس کوٹھی پر پولیس کے چھاپہ مارنے کی خبر کیسے ہو گئی' مجھ سے شنکر دادا نے تو خیر یہ سوال نہیں کیا مگر ارشاد حسین خاموش نہ رہ سکا۔ اس کی زبان پر یہ سوال آ ہی گیا۔

"بس' مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا اور کوئی بات نہیں۔" میں نے ارشاد حسین کے سوال کا جواب دیا۔

"آپ کو متوقع واقعے کا علم پہلے سے کس طرح ہو جاتا ہے؟" ارشاد حسین نے پوچھا' پھر وہ اپنے ساتھ چلتے ہوئے شنکر دادا سے مخاطب ہوا۔ "کیوں شنکر دادا! یہ دوسرا موقع ہے نا کہ انہوں نے قبل از وقت بتا دیا کہ پولیس چھاپہ مارنے والی ہے؟"

"جی ہاں۔" شنکر دادا نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اسے محض اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے یا آپ اسے میری چھٹی حس کہہ لیں۔" میں بولی۔

"لیکن اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔" ارشاد حسین نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کی موت کا جو سبب بیان کیا جائے گا وہ میں ضرور بتا سکتی ہوں۔" میں مسکرائی۔

"وہ کس طرح؟" ارشاد حسین نے چونک کر دریافت کیا۔

"کیوں اور کس طرح کا جواب تو میں نہیں دے سکتی مگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہی ہو گی کہ اس کی موت کسی خطرناک زہر کی وجہ سے ہوئی۔"

"زہر کی وجہ سے؟ .... مگر ایسا تو نہیں ہوا۔ اس نے تو شراب پینے تک سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ شراب قطعی زہریلی نہیں تھی۔ اسی بوتل میں سے تو شنکر دادا بھی شراب پی چکے تھے۔ معلوم نہیں

کیوں وہ شراب پیتے پیتے ایک دم رک کر بڑبڑانے لگا تھا اور پھر اس نے شراب کو زہر آلود بتا کر پینے سے انکار کر دیا تھا۔ ہاں ایک بات ضرور حیران کن ہے کہ تنظیم کے فیصلے کا علم اسے کیسے ہو گیا؟" ارشاد حسین کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

"یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے میری بات پر یقین نہ کیا ہو اور بھلا کیا ہو سکتا ہے۔" میں بولی۔

"مگر اس کے رویے میں اچانک تبدیلی آنا حیرت انگیز تھا۔"

میں اور ارشاد حسین، شنکر دادا کے اڈے تک ڈیسوزا ہی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ شنکر دادا نے اپنی عادت کے مطابق ہماری گفتگو میں مداخلت نہیں کی تھی۔ ہم پھر اسی کمرے میں آ بیٹھے تھے جہاں سے اٹھ کر گئے تھے۔ شنکر دادا نے چائے منگوا لی تھی۔ چائے پینے کے دوران ہی مجھے یہ خیال آیا کہ میں بہرحال راجہ استاد کے گھر میں محفوظ نہیں ہوں اور اب تو وہاں شہزاد بھی تھا۔ راجہ استاد، ہمایوں اور شہزاد تینوں ہی کو چمپا اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے صبیحہ کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ یہ تمام ہی افراد ایک جگہ موجود تھے۔ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ چمپا آج رات بھی حسب معمول مجھے ذلت و رسوائی سے دوچار کرنے کے لئے کوئی نیا حربہ آزماتی۔ میرے نزدیک اس سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی۔ میں کسی ایسی جگہ رات گزارتی جہاں میرے سوا کوئی اور نہ ہوتا۔ شنکر دادا بھی میرے لئے ٹالی گنج میں کسی ایسے خالی مکان کا بندوبست کر سکتا تھا۔ خود وہی کوٹھی اب خالی تھی جہاں ڈیسوزا کو رکھا گیا تھا۔ مگر میں نے شنکر دادا پر ارشاد حسین کو ترجیح دی۔ مجھے ٹمیا برج کے علاقے دھان کھیتی کا وہ مکان یاد تھا جہاں پہلی مرتبہ ارشاد حسین سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ بڑی امام بارگاہ والے گھر پر پولیس چھاپے کے بعد ارشاد حسین مجھے وہاں لے گیا تھا۔ میرے اور ارشاد حسین کے سوا اس مکان میں کوئی اور نہیں تھا۔ دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرنے کے بعد چائے پیتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں اب چلوں گی شنکر دادا!" میں نے کہا۔ "ممکن ہے کہ کچھ عرصے کے لئے مجھے کلکتے سے باہر جانا پڑے، سو ظاہر ہے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔"

"دیوی! آپ نے کل بھی خدمت کا موقع نہیں دیا تھا اور چلی گئی تھیں، آج رات تو........."

"پھر کبھی سہی دادا!" میں نے اس کی بات کاٹ دی، پھر ارشاد حسین کی طرف مڑ کر بولی۔ "چلئے۔" وہ بھی میرے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

مجھے اور ارشاد حسین کو چھوڑنے کے لئے شنکر دادا باہر تک آیا۔ رخصت کرنے سے قبل اس نے میرے پیر چھوئے، اسی وقت شنکر دادا کی جیپ کوٹھی کے گیٹ پر آ کے رکی۔ اسی جیپ میں شنکر دادا کے آدمی، ڈیسوزا کی لاش بالی گنج لے گئے تھے۔ وہاں سے چلتے وقت مجھے یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ وہ لوگ لاش کو ٹھکانے لگا آئے تھے۔

جیپ آنے کے بعد شنکر دادا نے کہا تھا کہ ہم جہاں کہیں وہ ہمیں پہنچوا دے گا۔ مگر میں نے انکار کر دیا تھا۔

شنکر دادا سے رخصت ہو کر میں اور ارشاد حسین پیدل ہی ٹرام ڈپو کی طرف بڑھنے لگے۔

"یہ بتائیے ارشاد حسین کہ دھان کھیتی کا وہ دو کمروں والا مکان اب بھی خالی ہے۔ جہاں پہلی بار آپ نے مجھے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں، مگر اس وقت آپ کو اس مکان کا خیال کیسے آ گیا؟ .... اور ہاں اب آپ کا ارادہ کیا ہے؟ میں چاہتا تھا کہ کچھ دیر خلوت میں آپ سے گفتگو ہو سکتی۔"

"ارادہ تو خیر آپ کے ساتھ ہی جانے کا تھا۔ مگر اب ارادہ بدلنا پڑے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"آج رات میں کسی ایسی جگہ گزارنا چاہتی ہوں جہاں میرے سوا اور کوئی نہ ہو۔ دھان کھیتی والے مکان کا خیال مجھے اس لئے آیا تھا، مگر آپ کہتے ہیں کہ........."

"تو کیا ہوا، آپ کے لئے ٹمیا برج ہی میں دوسرے مکان کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے۔ آپ چلیں..."

"اگر یہ ممکن ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں، مگر پہلے آپ کو میرے ساتھ چاندنی چوک تک چلنا ہوگا، وہاں سے ٹمیا برج چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" ارشاد حسین راضی ہو گیا۔ "اس طرح مجھے آپ سے خلوت میں گفتگو کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔"

پھر ہم ٹرام میں بیٹھ کر دھرم تلے پہنچے۔ میں یہاں اس لئے آئی تھی کہ شہزاد کو مطلع کر سکوں اور راجہ استاد بھی میری طرف سے فکرمند نہ ہو۔

اس وقت رات کے آٹھ بجنے والے تھے جب میں، راجہ استاد کے گھر پہنچی۔ ہمایوں اور راجہ استاد ابھی دھندے سے نہیں لوٹے تھے۔ صبیحہ نے مجھے بہت روکا کہ کھانا کھا کر جاؤں مگر میں نہیں رکی۔ شہزاد کو میں نے بتا دیا تھا کہ آئندہ روز صبح دس گیارہ بجے تک آ جاؤں گی۔ ارشاد حسین کو وہ رام داس کروال کے میک اپ میں پہلے بھی میرے پاس آتے جاتے دیکھ چکا تھا۔

چاندنی چوک سے ہم دھرم تلہ میدان میں اس بس کے اڈے تک پہنچ گئے جہاں سے ٹمیا برج کے لئے پرائیویٹ بسیں ملتی تھیں۔ ارشاد حسین ہی سے پہلی مرتبہ ملنے کے لئے میں ٹمیا برج جا چکی تھی۔ ایک بس روانہ ہونے والی تھی اور اس میں ایک سیٹ بھی ابھی خالی تھی۔ ارشاد حسین نے اسی میں چڑھنے کو کہا۔

"لیکن سیٹ تو ایک ہی خالی نظر آ رہی ہے، آپ کیسے جائیں گے؟" میں چڑھنے سے پہلے بولی۔

"میں کھڑے ہو کر بھی سفر کر سکتا ہوں، آپ چڑھئے۔ دوسری بس دیر میں چلے گی، بالکل خالی ہے۔" ارشاد حسین نے جواب دیا۔

مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی اور پھر اس نے میری خاطر ٹمیا برج تک کھڑے ہو کر سفر کیا۔

ٹمیا برج میں بتی کل کا علاقہ اپر مڈل کلاس آبادی پر مشتمل تھا۔ ارشاد حسین کی سکونت بھی اسی علاقے میں تھی۔ وہ مجھے وہیں ایک چھوٹے سے مکان میں لے آیا۔ وہاں میں نے دو نوجوانوں کو دیکھا۔

ان میں سے ایک کو میں پہچانتی تھی۔ وہ انیل چودھری تھا۔ یہ وہی ہندو نوجوان تھا جس کا تعاقب کرتی ہوئی میں پہلی بار مٹیا برج آئی تھی۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ بھی سرفروش تنظیم کا رکن ہے مگر میں نے ارشاد حسین سے تصدیق ضروری نہیں سمجھی تھی۔

"تم دونوں آج رات بڑی امام بارگاہ والے مکان میں چلے جاؤ۔" ارشاد حسین نے ان سے کہا۔ "مگر چودھری! تم ذرا ٹھہرو' میرے گھر سے کھانا لے آؤ۔" پھر مجھے ارشاد حسین نے بتایا۔ "میرا گھر بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

وہاں سے ارشاد حسین کا گھر قریب ہونا میرے نزدیک کوئی مناسب بات نہیں تھی۔ جب وہ دونوں نوجوان وہاں سے چلے گئے تو میں نے ارشاد حسین سے کہا۔ "کیا اس مکان کے علاوہ کہیں اور آج رات گزارنے کا بندوبست نہیں ہو سکتا؟"

"یوں تو غریب خانہ بھی حاضر ہے' مگر آپ نے شرط ہی ایسی لگا دی ہے کہ میں یہ درخواست نہیں کر سکتا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ویسے کیا یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ تنہا کیوں رہنا چاہتی ہیں' کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟"

مجھے توقع تھی کہ ارشاد حسین یہ سوال ضرور کرے گا۔ ذہنی طور پر میں اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھی۔ اس لئے جواب میں فوراً ہی بول اٹھی۔ "خطرات ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کوئی بھی خطرے میں پڑ جائے۔ اسی سبب تو میں اس مکان میں رہنے سے گریز کر رہی ہوں کیونکہ آپ کا گھر یہاں سے قریب ہے۔ میں آپ سے جتنی دور بھی رہوں' بہتر ہے۔"

"یہ آپ کا وہم بھی تو ہو سکتا ہے معبلہ!" ارشاد حسین نے مجھے سمجھانا چاہا۔ "پھر بھی اگر آپ یہاں مطمئن نہیں تو اسی دھان کھیتی والے مکان میں بندوبست ہو سکتا ہے۔ وہاں جو لوگ ہیں وہ ایک رات کے لئے اس گھر میں بھی آ سکتے ہیں۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ بہرحال میں آپ کو یہ زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔"

"معبلہ! آپ بھی کمال کرتی ہیں' بھلا اس میں معذرت کی کیا بات ہے۔ آپ کھانا کھا لیجئے' پھر وہاں چلتے ہیں۔" ارشاد حسین بولا۔

انیل چودھری کو ارشاد حسین کے گھر سے کھانا لے کر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ارشاد حسین نے اسے روک لیا تھا۔

ارشاد حسین نے بھی میرے ہی ساتھ کھانا کھایا۔ پانی پینے کے لئے گلاس ایک ہی تھا۔ میں نے اس لئے پانی نہیں پیا۔ ارشاد حسین نے اس بات کو محسوس کر لیا اور مجھ سے پانی پینے کو کہا۔

"آپ پی لیجئے پہلے' پھر میں پی لوں گی۔" میں نے جواب دیا۔ احتیاطاً میں چاہتی تھی کہ ارشاد حسین وہ گلاس استعمال نہ کرے جس میں پانی میں پی چکی ہوں۔

"معبلہ! کبھی کبھی آپ بڑی عجیب سی باتیں کرتی ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں۔" اس نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مثلاً ابھی تک میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ جب ہم لوگ ڈیسوزا کو ملنے جا رہے تھے

تو آپ نے شراب کیوں منگوائی تھی؟ پھر اس میں سے شنکر دادا کو ایک پیگ پلا کر شراب میں پانی کیوں ملا دیا تھا؟"

ارشاد حسین نے مجھ سے جو سوال کیا تھا اس کا سیدھا جواب یہ تھا کہ میں شراب میں اپنا جوٹھا پانی ملا کر اسے زہر آلود بنانا چاہتی تھی۔ کچھ باتیں بظاہر بے مقصد معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقتاً بے مقصد نہیں ہوتیں۔ ارشاد حسین پانی پی چکا تو میں نے جگ سے اپنے لئے گلاس میں پانی انڈیلا۔ میں نے پانی پی لیا تو انیل چودھری چائے لے کر آ گیا۔ ارشاد حسین نے مجھ سے جو سوال کیا تھا' موقع غنیمت جان کر اسے گول کر گئی۔ انیل چودھری بھی وہیں تھا۔

"چودھری' ابھی تم یہیں رہو۔" ارشاد حسین نے انیل چودھری کو مخاطب کیا۔ "ہم لوگ دھان کھیتی والے ٹھکانے پر جا رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ آسن سول سے جو مہمان آئے ہیں انہیں وہیں ٹھہرایا گیا ہے۔ انہیں میں یہاں بھیج دوں گا۔ وہ ایک رات یہاں اس گھر میں رہ لیں گے۔ جب وہ یہاں آ جائیں تو تم کھانے کے برتن میرے گھر پہنچاتے ہوئے بڑی امام بارگاہ والے مکان میں چلے جانا۔ بس ایک رات کی بات ہے' کل سے پھر جہاں بھی جو رہ رہا ہے وہیں رہے گا۔ تم چاہو تو یہاں بھی رہ سکتے ہو۔"

جواب میں انیل چودھری نے سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے' میں یہیں پڑ رہوں گا۔ ایک رات کی ایسی کوئی بات نہیں۔"

میں چائے پیتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ارشاد حسین مجھے اپنے ساتھ لئے اس مکان سے نکل آیا۔ اس کے چہرے پر میک اپ تھا اس لئے آج وہ میرے ساتھ اجنبیوں کی طرح نہیں چل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں دھان کھیتی پہنچ گئے۔ ارشاد حسین نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے پوچھا گیا۔ "کون ہے؟" آواز نسوانی تھی۔

"دشمن۔" ارشاد حسین نے جواب دیا۔

"دشمنوں کے لئے ہم اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتے ہیں۔" کسی عورت کے ان الفاظ کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

ارشاد حسین مجھے ساتھ لئے اندر داخل ہو گیا۔ اندر اجالا تھا۔ ساڑھی میں ملبوس ایک نوجوان خوبصورت عورت ہاتھ میں لالٹین لئے کھڑی تھی۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی لڑکی نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ارشاد حسین نے اب اپنے چہرے سے ماسک اتار دیا تھا۔ صحن عبور کر کے سامنے نظر آنے والے دو کمروں میں سے ارشاد حسین نے ایک کمرے کا رخ کیا۔ روشنی دونوں ہی کمروں میں نظر آ رہی تھی۔ لڑکی ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

مکان میں اس لڑکی سمیت پانچ افراد تھے۔ ارشاد حسین نے ان سے زحمت کے لئے معذرت کی اور پھر انہیں بتی کل والے مکان میں بھیج دیا۔ ان لوگوں میں سے ایک نے وہ گھر دیکھا تھا۔ وہ لوگ چلے گئے تو میں نے ارشاد حسین سے کہا۔ "مجھے یہاں ساتھ لا کر آپ ناحق مشکل میں پڑ گئے۔"

"اب اس مشکل کا ایک ہی حل ہے کہ آپ سے میں جو کچھ پوچھوں صحیح صحیح بتا دیں۔" وہ ہنس کر

بولا۔

"اگر واقعی ایسا ہی ہے ارشاد! تو پھر آپ صبر کریں۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "اس لئے آپ کو اپنے کسی سوال کا جواب صحیح نہیں ملے گا۔"

"اور صبر نہ آئے پھر؟"

"تو جھوٹ پر گزارا کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ میں جواب میں سچ نہیں بولوں گی۔ ویسے معلوم ہو کہ آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میرے ذہن میں ایک نہیں متعدد سوالات ہیں۔ پہلا سوال تو یہی ہے کہ آپ کی آنکھوں سے نکلنے والی وہ تیز روشنی کیسی تھی جس نے دو پولیس والوں کو زندہ جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا؟ میں نے اس روشنی کو آپ ہی کی آنکھوں میں واپس جاتے اور معدوم ہوتے دیکھا تھا۔" یہ کہہ کر ارشاد حسین میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ "میں اس سوال کا جواب کیسے دے سکتی ہوں۔ نہ میں نے اپنی آنکھوں سے روشنی نکلتے محسوس کی نہ اسے دوبارہ اپنی آنکھوں میں معدوم ہوتے دیکھا۔ جو بات میرے تجربے میں نہیں آئی اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ دوسرا سوال۔"

"آپ کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جھوٹ بول رہی ہیں۔ ویسے بھی آپ جھوٹ پر گزارا کرنے کو کہہ چکی ہیں۔ اچھا یوں کیجئے کہ آپ جس سوال کا جواب نہ دینا چاہیں انکار کر دیں کہ جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس طرح آپ بھی بلا سبب جھوٹ بولنے سے بچ جائیں گی اور مجھے بھی کوئی الجھن نہیں ہو گی۔ ٹھیک ہے؟"

"منظور۔" میں نے اس کی تجویز قبول کر لی۔ "سوال کیجئے۔"

"آپ نے یہ جھوٹ ہی بولا ہے نا کہ اپنی آنکھوں سے نکلنے والی تیز روشنی کے بارے میں آپ کو معلوم نہیں؟" ارشاد حسین نے بڑی ذہانت سے پہلا سوال کیا۔

"جواب نہیں دیا جا سکتا۔" میں مسکرا کر بولی۔ "اگلا سوال۔"

"ریس میں جیتنے والے گھوڑوں کے بارے میں آپ کو کس طرح پہلے سے علم ہو گیا تھا؟"

"آپ کے اس سوال کا جواب بھی دینا ممکن نہیں۔"

"اس سوال کا جواب صرف "ہاں" یا "نہیں" میں دیجئے کہ آپ کو کچھ پُراسرار قوتیں حاصل ہیں۔" اس نے مجھے پھر گھیرا۔

"جواب دینے کے لئے الفاظ کی پابندی قبول نہیں۔" میں نے کہا۔ "ویسے اس سوال کو جانے دیجئے۔ کچھ اور پوچھئے۔"

"اب کیا خاک پوچھوں۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "آپ تو کچھ بتا ہی نہیں رہیں۔"

"کیا خبر بھولے سے کسی جواب کا چانس مل ہی جائے آپ کو۔" میں بھی ہنسی۔

"یعنی آپ نے طے کر لیا ہے کہ کسی سوال کا جواب نہیں دیں گی۔"

"ایسا نہیں ہے، مایوس نہ ہوں۔" میں دراصل اس طرح یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ میرے متعلق ارشاد حسین اب تک کیا کیا جان چکا ہے۔

"لاحاصل ہے۔ مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔" وہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔ "میں سمجھ چکا ہوں کہ آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں اس لئے اپنے متعلق کچھ بھی بتانا نہیں چاہتیں۔"

"یہ داؤ بھی نہیں چلے گا۔" میں زور سے ہنس پڑی۔ "میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ آپ پر بھروسہ کرتی ہوں، بے وقوف بننے پر ہرگز آمادہ نہیں۔"

"اچھا یہ بتانے میں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ دہلی کب جا رہی ہیں؟"

"شکر ہے ارشاد کہ آپ نے کوئی ایسا سوال تو کیا جس کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ ارادہ تو کل ہی روانگی کا ہے۔ کیونکہ ڈیسوزا کا قصہ نمٹ چکا ہے۔"

"ہاں یہ تو بتا ہی دیں معبلہ کہ ڈیسوزا اچانک کیسے مر گیا؟ میں نے آپ کو اس کی کلائی میں دانت گڑاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں اٹھ سکا۔"

ارشاد حسین سے میں یہ سن کر چونک اٹھی۔ اس سے پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس نے مجھے ڈیسوزا کے جسم میں زہر اتارتے دیکھ لیا ہو گا۔ میں نے سوچا، اس بات کا تعلق میرے اندر موجود پُراسرار قوتوں سے نہیں۔ یہ میری ذات کا ایک ایسا راز تھا جس سے اگر میں ارشاد حسین کو آگاہ کر بھی دیتی تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس طرح ارشاد حسین کو اس کے کئی سوالوں کا جواب مل سکتا ہے۔ یوں وہ میری طرف سے مایوس بھی نہ ہوتا کہ میں اسے کچھ بتانا ہی نہیں چاہتی۔

"ڈیسوزا کی موت ایک خطرناک اور تیز اثر زہر سے ہوئی تھی اور وہ زہر میں نے ہی اس کے جسم میں داخل کیا تھا۔" میں نے پُرسکون آواز میں بتایا۔

"مگر کب اور کیسے؟" ارشاد حسین حیرت سے بولا۔

"سنیں ارشاد! میں آج آپ کو اپنے وجود کے ایک راز سے آگاہ کر رہی ہوں۔ اس کے بعد آپ کو اپنے کئی سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے طویل سانس لیا۔ "دراصل بچپن ہی سے میری حفاظت کی خاطر مجھے زہر کھانے کا عادی بنا دیا گیا تھا تاکہ کوئی میری زندگی سے نہ کھیل سکے۔ مجھے اگر زہر دے دیا جائے تو میں اس کے اثر سے محفوظ رہوں۔ میرے اندر اتنا زہر ہے ارشاد کہ کوئی جاندار میرا جوٹھا پانی پی کر بھی زندہ نہیں بچ سکتا۔ یہاں تک میرا جوٹھا دودھ یا پانی اگر کوئی زہریلا سانپ بھی پی لے تو زندہ نہ بچے۔"

میری بات سن کر ارشاد حسین نے مجھے ناقابلِ یقین سی نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

"آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا نا! میں اسی لئے یہ بات بتانے سے گریز کر رہی تھی۔"

"ایسی بات نہیں معبلہ!" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "میں دراصل ایک اور بات پر غور کر رہا تھا وہ کہ یہ واقعی آپ کوئی اہم شخصیت ہیں۔"

"آپ نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"جن لوگوں کا تعلق برسراقتدار طبقے سے ہوتا ہے' عموماً وہی اپنی اولاد کے تحفظ کی خاطر طریقے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے دشمنوں کی طرف سے خطرہ لاحق رہتا ہے۔ یقینی طور بلاخوف تردید اب یہ بات کی جا سکتی ہے کہ آپ کا تعلق بھی کسی ریاست کے برسراقتدار طبقے سے ہو ہے۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے آپ کو اہم شخصیت قرار دیا ہے۔ ان حالات میں انگریز حکو آپ کی طرف سے متجسس ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ریاست یا علاقہ کہاں ہے لیکن اتنا اندازہ ضرور کر سکتا ہوں' وہ ریاست کہیں شمال میں ہوگی۔" ارشاد حسین نے اپنی بات وضاحت کردی۔ اس کے اندازے حیرت انگیز طور پر درست تھے۔

"شمال ہی میں کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ بات آپ کی گوری رنگت اور چہرے کے خد و خال دیکھ کر کہی ہے میں نے۔ آپ کا تعلق جنوبی ہندوستان یا بنگال و حیدر آباد دکن سے ہوتا تو رنگ اتنا اجلا اور نکھرا نہ ہوتا۔ بہرحال میں آپ ممنون ہوں معبلہ کہ کم از کم اپنی شخصیت سے ایک پردہ تو اٹھا ہی دیا۔"

"اور اسی کو بنیاد بنا کر آپ نے خیالوں کے گھوڑے دوڑانا شروع کر دیئے۔" میں نے ہنس کر کہا

"لیکن آپ زبان سے اس بات کا اعتراف کریں نہ کریں' دل سے ضرور یہ تسلیم کریں کہ ان خیالی گھوڑوں کی سمت سفر کتنی درست ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔

"میں آپ کے خیال کی تائید یا تردید نہیں کروں گی۔" میں مسکرائی۔

"اب اس کی کوئی ایسی خاص ضرورت بھی نہیں رہی۔" وہ بھی مسکرایا۔ "میرے اندازے غلط نہیں ہو سکتے۔"

اس کے بعد ارشاد حسین میرے پاس مزید کچھ دیر بیٹھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دروازے تک اس کے ساتھ جا کر اندر سے کنڈی ڈال دی۔ مجھے توقع تھی کہ چمپا مجھے آج رات تنگ نہیں کر سکے گی۔ اس مکان میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ صدر دروازہ اندر سے بند کر کے آئی تو میں نے اس کمرے کا دروازہ بھی بند کر لیا جو سونے کے لئے منتخب کیا تھا۔ اس کمرے کے فرش پر برابر برابر دو بستر بچھے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے میں جلتے ہوئے لیمپ کی لو دھیمی کر دی اور ایک بستر پر دراز ہوگئی۔ سونے سے پہلے میں نے اپنے گرد چمکیلا دودھیا حصار محیط ہوتے دیکھا جو چند لمحے بعد نادیدہ ہوگیا۔ یہ دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ عظیم اور نیک روح مہمن کی جانب سے آج رات میرے تحفظ کا بندوبست کیا جانا بلاسبب نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا آج رات بڑے مہاراج کی طرف سے مجھ پر کوئی وار کیا جانے والا ہے' میں نے سوچا۔ اگر ایسا تھا بھی تو مجھے دودھیا حصار کی موجودگی میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چمپا یا بڑے مہاراج کا میرے قریب آنا ممکن نہیں تھا۔ اسی اطمینان کے سبب جلد ہی میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ پھر جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میرے ذہن میں کسی انجانے خطرے کا خیال موجود تھا۔ دوم یہ کہ وہ جگہ میرے لئے بہرحال

تھی۔ میں اسی لئے چوکنا سوئی تھی۔ شاید یہی سبب رہا ہو گا کہ کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے باہر صحن میں کچھ لوگ چل پھر رہے ہیں۔ میں ان کے بھاری قدموں کی آواز سن رہی تھی گھر کا صدر دروازہ تو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا۔ پھر یہ لوگ اندر کیسے آ گئے؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ میں ابھی تک بستر سے اٹھی نہیں تھی۔ کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ؟ میں نے سوچا۔

"دیکھو' ان میں سے کوئی فرار نہ ہونے پائے۔ وہ پانچوں انہی دونوں کمروں میں ہو سکتے ہیں۔" ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ جو سرگوشی کی حد تک دھیمی تھی۔

پانچوں .... میں سوچنے لگی اور پھر مجھے یاد آ گیا کہ میرے وہاں آنے سے پہلے لڑکی سمیت پانچ ہی افراد اس مکان میں تھے۔ اسی ایک جملے نے اس مکان میں داخل ہونے والوں کا تشخص بھی کر دیا تھا۔ ان کا تعلق پولیس ہی سے ہو سکتا تھا۔ گویا پولیس نے ان پانچوں کو گرفتار کرنے کے لئے اس مکان پر چھاپہ مارا تھا۔ خلاف توقع اگر میں وہاں نہ آگئی ہوتی تو اس وقت وہ پانچوں اسی مکان میں ہوتے۔ اسی کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ وہ پانچوں تو خیر بچ گئے تھے مگر میں بری طرح پھنس چکی ہوں۔ میں اس مکان میں اپنی موجودگی کا کیا جواز پیش کرتی؟ پولیس والوں سے میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ مجھے ارشاد حسین نے وہاں ٹھہرایا ہے۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ جن لوگوں کو پولیس نے گرفتار کرنے کی غرض سے چھاپا مارا تھا ان کا تعلق حکومت کے خلاف ایک زیر زمین تنظیم سے تھا۔ ایسی صورت میں پولیس مجھے بھی تنظیم سے متعلق سمجھ سکتی تھی۔

اچانک میں اچھل پڑی اور فوری طور پر میری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ اس بند کمرے کے اندر پولیس والے کیسے داخل ہو گئے۔

"سر! لڑکی تو اس کمرے میں موجود ہے۔ مگر کوئی اور نہیں ہے۔" ایک پولیس والے نے دائیں جانب مڑ کر بلند آواز میں کہا۔

پھر جب میری نگاہ بھی دائیں جانب اٹھی تو یہ راز کھلا کہ اس کمرے اور برابر والے کمرے کے درمیان ایک دروازہ اور تھا۔ وہ دونوں مسلح پولیس والے جو مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے' یقیناً اس دروازے سے اندر آئے تھے۔ سونے سے پہلے اگر میں اس کمرے کا جائزہ لے لیتی تو وہ دروازہ میری نظر میں آ گیا ہوتا۔

ایک پولیس والے نے طاق میں رکھے ہوئے لیمپ کی لو اونچی کر دی۔ نیم تاریک کمرہ پوری طرح روشن ہو گیا۔ اسی وقت پہلو کے دروازے سے ایک پولیس انسپکٹر چار سپاہیوں کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

"فکر نہ کرو' یہ لڑکی سب کچھ بتا دے گی کہ اس کے چاروں ساتھی کہاں ہیں؟" پولیس انسپکٹر یہ کہتا ہوا آگے بڑھ آیا۔ "مگر تم نے ابھی تک اسے حراست میں کیوں نہیں لیا؟"

"سر! آپ کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔" اس کمرے میں پہلے داخل ہونے والے ایک سپاہی نے جواب دیا۔

میں ابھی تک بستر پر اسی طرح لیٹی ہوئی تھی جیسے سو رہی ہوں۔ انہیں دیکھنے کے لئے پلکوں کے درمیان میں نے تھوڑی سی جھری رہنے دی تھی۔

"اے لڑکی! اٹھ کر کھڑی ہو جا۔" پولیس انسپکٹر نے بلند آواز میں مجھ سے کہا۔

میں نے جان بوجھ کر کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے پولیس والوں کے قریب آنے کا انتظار تھا۔

"یہ فریب دے رہی ہے ورنہ اب تک اسے جاگ جانا چاہئے۔" پولیس انسپکٹر بولا۔ "گھسیٹ کر کھڑا کر دو اسے۔" اس کی آواز میں حکم بھی تھا اور غصہ بھی۔

ایک پولیس والا اپنے افسر کے حکم پر تیزی سے میرے بستر کی طرف بڑھا اور قریب آتے ہی چیختا ہوا اچھل کر کسی مردہ چھپکلی کی طرح دور جا گرا۔

"ارے' یہ کیا ہوا؟" پولیس انسپکٹر کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔ "دیکھو اسے۔"

بقیہ پولیس والے اپنے ساتھی کی طرف لپکے' پھر ان میں سے ایک نے بتایا۔ "سر! یہ تو بے ہوش ہو گیا ہے۔"

"بے ہوش ہو گیا مگر کیسے؟" پولیس انسپکٹر سپاہیوں کی طرف مڑا۔

"معلوم نہیں سر! آپ خود ہی دیکھ لیں۔" جواب ملا۔

"اچھا خیر اسے چھوڑو اور اس لڑکی کو اٹھاؤ۔" انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

"انسپکٹر! ان بے چارے سپاہیوں کو کیوں تنگ کرتے ہو۔" میں اچانک بول اٹھی۔ "میں خود ہی اٹھی جاتی ہوں۔" میں اس دوران یہ سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے' اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے دانستہ انسپکٹر کو غصہ دلانے کے لئے کہا۔ "ویسے انسپکٹر! تم اتنے حرام خور کیوں ہو؟ تمہارے پیروں میں کیا مہندی لگی ہے جو تم سپاہیوں سے مجھے اٹھانے کے لئے کہہ رہے تھے؟" میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا بکتی ہے' جانتی ہے میرا نام کیا ہے؟" انسپکٹر آگ بگولا ہو گیا۔

"ہاں معلوم ہے' تمہارا نام شاید گھامڑ خاں ہے۔ دیکھا' میں نے تمہیں کیسا پہچانا۔"

"اب اگر تُو نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو گولی مار دوں گا تجھے۔ ذرا تھانے چل پھر بتاؤں گا تجھے۔" اس نے ریوالور میری طرف سیدھا کر کے دھمکی دی۔

"تم اور مجھے تھانے لے جاؤ گے۔" یہ کہہ کر میں اس طرح طنزیہ انداز میں ہنسی جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ "تم تو کیا تمہارا باپ بھی مجھے تھانے نہیں لے جا سکتا۔ تم ہو کس کھیت کی مولی؟"

"بتاؤں تجھے .... یہیں بتا دوں کہ میں کون ہوں۔" اس کے چہرے پر مجھے خباثت کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ "میں تجھے ابھی بتاتا ہوں' ابھی۔" یہ کہتے ہی اس نے سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ "تم لوگ برابر والے کمرے میں چلو' میں آتا ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی چیخیں سنو گے تم' مگر کمرے میں آنے کی ضرورت نہیں' جاؤ۔"

پولیس انسپکٹر نے ریوالور اپنے ہولسٹر میں رکھ لیا اور پھر مجھے گھورتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔

"سیدھی ہو جاؤ۔" میرے اوپر رعب ڈالنے کی خاطر وہ کسی درندے کی طرح غرایا۔ میں بدستور اپنی جگہ کھڑی مسکراتی رہی۔

پھر وہ اتنے قریب آ ہی گیا کہ نادیدہ دودھیا حصار کی زد میں آ کر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو سپاہی کا ہو چکا تھا۔ اس کا جسم یوں اچھل کر دور جا پڑا جیسے بجلی کا شدید جھٹکا لگا ہو۔ وہ بھی چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا سر!" برابر والے کمرے سے کسی سپاہی کی خوفزدہ سی آواز آئی۔

"تمہارے سر کو مرگی کا دورہ پڑ گیا ہے اور اسے جوتا سنگھانے کی ضرورت ہے۔" جواب میں نے دیا۔

"چلو اندر چل کے دیکھتے ہیں۔" اور ایک آواز سنائی دی۔ یہ کوئی دوسرا سپاہی تھا۔

"لیکن سر نے کمرے میں آنے کو منع کیا تھا۔" پہلے سپاہی کی آواز پھر ابھری۔

"ابے یار! وہ تو لڑکی کی چیخیں سن کر آنے سے منع کیا تھا۔ یہ تو خود سر کی چیخ تھی' معلوم نہیں کیا گزری ہے ان پر۔"

"کہیں سر بھی بے ہوش تو نہیں ہو گئے۔ ہمیں چل کر دیکھنا چاہئے۔"

دوسرے سپاہیوں نے بھی تائید کی اور پھر چند ہی لمحے بعد وہ سب کمرے میں آ گئے۔

"ارے واقعی .... سر تو ادھر بے ہوش پڑے ہیں۔" ایک سپاہی نے اس طرح اشارہ کیا جہاں پولیس انسپکٹر کمرے کے فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔

سپاہی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اب مزید وقت ضائع کرنا میرے نزدیک فضول تھا۔ میں اسی لئے تیزی سے آگے بڑھ کر سپاہیوں کے قریب پہنچ گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے پانچ چیخیں کمرے میں گونجیں اور سپاہیوں کے جسم اچھل کر دور جا گرے۔ اب اس کمرے میں چھ سپاہی اور ایک پولیس انسپکٹر بے ہوش پڑا تھا۔ انہیں بے ہوش چھوڑ کر میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ صحن میں صبح کا جھٹپٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت صبح کے پونے چھ بج رہے تھے۔ باہر آ کر میں نے احتیاطاً دونوں کمروں کی کنڈیاں لگا دیں' پھر مکان کے صدر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ صدر دروازہ مجھے صحیح سلامت ملا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ پولیس والے صحن کی بائیں دیوار پھاند کر گھر میں کودے تھے۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ مکان کی بائیں طرف تنگ سی ایک گلی تھی۔ میرے اس خیال کی تصدیق صدر دروازے سے بھی ہو گئی۔ اس کی کنڈی اب بھی اندر سے بند تھی۔ چوروں کی طرح دیوار پھاند کر پولیس والے شاید اس لئے گھر میں داخل ہوئے تھے کہ پانچوں افراد کو سوتے میں چھاپ لیں۔

مکان کا صدر دروازہ کھول کر میں باہر آ گئی۔ دروازہ میں نے آہستہ سے بھیڑ دیا۔ ارشاد حسین کے ساتھ ہی کل سے یہاں آتے ہوئے راستے کو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھا تھا۔ موجودہ حالات میں ارشاد حسین کو پولیس کی طرف سے چوکنا کرنا ضروری تھا۔ اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ

جب پولیس والوں کو ہوش آتا تو وہ آسن سول سے کلکتے آنے والے پانچوں افراد کی تلاش میں کہیں اور چھاپہ نہ مارتے۔

عظیم میمن کی طرف سے میرے گرد قائم کیا جانے والا حصار پولیس کے خلاف ایک مؤثر ہتھیار ثابت ہوا تھا۔ میرے گرد حفاظتی حصار قائم نہ ہوتا تو میں یقیناً پولیس کے ہتھے چڑھ جاتی۔ پھر پولیس مجھے انگریز حکومت کے خلاف سرگرم عمل زیر زمین تنظیم کا رکن ہی سمجھتی۔ اب میں سمجھ چکی تھی کہ اس حفاظتی حصار کا مقصد مجھے بڑے مہاراج یا چمپا کے کسی ممکنہ خطرے سے بچانا نہیں تھا۔ میں گلی کو عبور کر کے ایک سڑک پر آ گئی تو معاً حفاظتی دودھیا حصار ظاہر ہو کر ایک دم غائب ہو گیا۔ اب غالباً اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

صبح ہو چکی تھی اور سڑک پر اکا دکا راہ گیر اور سواری نظر آنے لگی تھی۔ کئی راتوں کے بعد یہ پہلی رات تھی کہ جب میں تقریباً صبح ہونے تک سکون سے سوتی رہی تھی اور لعنتی چمپا نے مجھے تنگ نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں اس مکان میں بالکل اکیلی تھی۔

بتی گل والے مکان تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو میری آواز پہچان کر انیل چودھری نے مجھے اندر بلا لیا۔

دروازہ دوبارہ بند کرتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا ہوا' آپ وہاں سے کیوں آ گئیں؟" اس کے لہجے میں حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تم جا کر ارشاد حسین کو بلاؤ۔" میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کر دیا۔

"وہ تو میں ابھی انہیں بلائے لاتا ہوں۔ مگر بتائیں تو سہی' کیا بات ہے؟"

میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں پولیس کے اس مکان پر چھاپہ مارنے کے متعلق بتا دیا۔ ظاہر ہے کہ حفاظتی حصار کا ذکر میں گول کر گئی تھی۔

"آپ نے اس پولیس انسپکٹر اور چھ پولیس والوں کو تن تنہا بے ہوش کر دیا۔" انیل چودھری حیرت سے بولا۔

"ظاہر ہے' ایسا نہ ہوتا تو میں اس وقت پولیس کی حراست میں ہوتی۔"

انیل چودھری سوچ میں پڑ گیا' پھر کہنے لگا۔ "ان حالات میں تو یہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہی۔ پہلے یہ لوگ اسی مکان میں تھے۔ انہیں یہاں محفوظ نہ جان کر ہی دھان کھیتی والے مکان میں رکھا گیا تھا۔ اب ایک ہی محفوظ ٹھکانہ ہے۔ میں ان لوگوں کو بڑی امام بارگاہ والے مکان میں بھیجے دیتا ہوں۔"

ابھی تک انیل چودھری صدر دروازے کے قریب ہی کھڑا ہوا مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے وہیں ٹھہرنے کے لئے کہہ کر لپکتا ہوا وہ اندر چلا گیا۔

اس کے بعد لڑکی سمیت پانچوں افراد کو انیل چودھری نے وہاں بڑی امام بارگاہ والے مکان کی طرف بھیجنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگائے تھے۔ پھر اس مکان کے دروازے پر تالا ڈال کر وہ مجھے ساتھ لئے وہاں سے چل دیا تھا۔

چند گلیوں کے بعد ہی وہ ایک دو منزلہ مکان تھا جس کے دروازے پر انیل چودھری نے دستک دی۔ کسی نے کھڑکی کھول کر اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ وہ کوئی باریش آدمی تھی۔ چند لمحے بعد سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولنے والا باریش آدمی ہی تھا۔ وہ اپنے لباس سے کوئی ملازم لگتا تھا۔

"صاحب ابھی سو رہے ہیں' کہو تو جگا دوں؟" اس اجنبی شخص نے انیل چودھری کو مخاطب کیا۔ وہ شاید انیل چودھری کو پہچانتا تھا۔

"ہاں بابا! جگا دو اور نیچے والی بیٹھک کھول دو۔" انیل چودھری نے جواب دیا۔

"اچھا ابھی کھولتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ آدمی پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔

زینے کے برابر ہی ایک اور بڑا سا مضبوط دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ذرا ہی دیر کے بعد باریش آدمی نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔ اوپری منزل سے نچلی منزل کے لئے یقیناً کوئی زینہ تھا۔ باریش ملازم اسی لئے غالباً اوپر گیا تھا۔

انیل چودھری مجھے ساتھ لئے اندر داخل ہو گیا۔ باریش ملازم نے دروازہ اندر سے بند کر کے دائیں جانب کے ایک کمرے تک ہماری رہنمائی کی اور چلا گیا۔ کمرے میں فرشی نشست تھی۔ موٹا سا ایک گدا فرش پر بچھا ہوا تھا۔ جس پر سفید چادر تھی۔ گاؤ تکیے بھی دیوار کے سہارے لگے نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف تین چار مونڈھے اور چھوٹی سی میز بھی پڑی تھی۔ میں آگے بڑھ کر انہی میں سے ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ انیل چودھری نیچے گدے پر جوتے اتار کر جا بیٹھا تھا۔

"آپ بھی یہیں آرام سے بیٹھ جائیں۔" انیل چودھری نے ایک گاؤ تکیے کا سہارا لیتے ہوئے مجھ سے بھی کہا۔

"تم آرام سے وہاں بیٹھو' میں یہیں ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

ارشاد حسین کو آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ میرے ہی قریب ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اسے بھی مختصراً میں نے پولیس چھاپے کی روداد سنا دی۔

"پھر تو ان لوگوں کو وہاں بھی نہیں رہنا چاہئے۔" ارشاد حسین فکرمند لہجے میں بولا۔

"میں نے انہیں وہاں سے ہٹا دیا ہے۔" انیل چودھری نے بتایا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا چودھری!" ارشاد حسین نے اس کی تعریف کی۔ "انہیں تم نے بڑی امام بارگاہ والے مکان میں بھیجا ہو گا۔" لہجہ تصدیق طلب تھا۔

"جی ہاں' فی الحال مجھے وہی جگہ محفوظ معلوم ہوئی تھی۔ یہاں کے مکان میں تالا ڈال دیا ہے میں نے۔ یہ چابی رکھ لیں۔" انیل چودھری نے جیب سے چابی نکالی۔

"چابی ابھی اپنے پاس ہی رکھو اور سنو۔ تم حاجی صاحب کے پاس چلے جاؤ۔ ممکن ہے' پولیس ان سے کرایہ داروں کے بارے میں پوچھ گچھ کرے۔ حاجی صاحب سے کہنا کہ اگر ان تک پولیس پہنچ جائے تو وہ کہہ دیں' گزشتہ ہفتے بھر سے مکان خالی تھا۔ پہلے جس کرایہ دار کے پاس مکان تھا' وہ ایک ہفتے پہلے مکان خالی کر کے جا چکا ہے اور ابھی کوئی نیا کرایہ دار نہیں ملا۔ سمجھ گئے نا پوری بات؟" ارشاد حسین نے

اپنی بات ختم کرتے ہوئے سوال کیا۔
"سمجھ گیا' اچھی طرح۔" انیل چودھری کھڑا ہو گیا۔
انیل چودھری چلا گیا تو ارشاد حسین مجھ سے مخاطب ہوا۔ "معبلہ! اب آپ کا یہ میک اپ تو بیکار ہو گیا۔ اس میں آپ کو یہاں کی پولیس دیکھ چکی ہے۔ میرے خیال سے پہلے یہ بہتر ہے کہ آپ کے چہرے پر نیا میک اپ کر دیا جائے۔ باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔" ارشاد حسین اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
اسی کمرے کی ایک الماری کھول کر ارشاد حسین نے ایک میک اپ بکس نکالا اور مجھ سے نیچے گدے پر بیٹھ جانے کو کہا۔ میں بیٹھ گئی تو اس نے میرے چہرے سے پہلا میک اپ ختم کیا اور نیا میک اپ کرنے لگا۔ اسی دوران میں باریش ملازم ایک ٹرے میں چائے لے آیا۔
"چائے واپس لے جاؤ اور ناشتہ تیار کرو۔" ارشاد حسین اپنے ملازم کی طرف دیکھے بغیر بولا۔
ملازم چائے واپس لے گیا۔ پھر ارشاد حسین نے میرا میک اپ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں نے آئینہ دیکھا تو ہنس پڑی۔ "ارے' یہ آپ نے مجھے کیا بنا دیا؟" میرے چہرے پر کسی پچاس سالہ عورت کا میک اپ تھا۔ سر پر جو وگ تھی اس میں سفید بال زیادہ نظر آ رہے تھے۔
"یہ ضروری تھا معبلہ!" ارشاد حسین سنجیدگی سے بولا۔ "انہیں کسی نوجوان عورت کی تلاش ہو گی۔ بوڑھی یا ادھیڑ عمر عورت کی طرف وہ توجہ نہیں کریں گے۔"
"مجھے اب یہاں رہنا ہی کتنی دیر ہے۔ بسیں چل گئی ہوں گی اب تک۔ آپ نے ناشتے کو کہہ دیا ہے' ناشتہ کر کے چلی جاؤں گی۔"
"ہاں' میں ایک بات تو آپ سے پوچھنا بھول ہی گیا۔ کوئی پولیس والا زخمی تو نہیں ہوا آپ کے ہاتھوں؟"
"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ان میں سے کسی کو کوئی چوٹ نہیں آئی۔"
"حیرت ہے کہ اس کے باوجود آپ نے انہیں بے ہوش کر دیا۔ آپ بھی کمال کرتی ہیں معبلہ! کاش آپ ہماری تنظیم کے ساتھ ہوتیں۔"
اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتی' ارشاد حسین کا باریش ملازم ناشتہ لے کر آ گیا۔ ناشتہ کر کے میں نے ارشاد حسین سے رخصت کی اجازت چاہی۔
"اب تو کچھ خبر نہیں معبلہ کہ آپ سے کب ملاقات ہو گی' ہے نا؟"
"ہاں' میں کوشش کروں گی کہ آج ہی کسی ٹرین سے دہلی روانہ ہو جاؤں۔"
پھر ارشاد حسین نے بھی اپنے چہرے پر ریڈی میڈ میک اپ کیا اور مجھے چھوڑنے ساتھ چل دیا۔ میں ایک بس میں بیٹھ کر دھرم تلے کے لئے روانہ ہو گئی۔ اس وقت صبح کے پونے آٹھ بج رہے تھے۔ بس کے اڈے پر میں نے کئی پولیس والوں کو مختلف بسوں میں جھانکتے دیکھا تھا۔ ان میں سے دو پولیس والے وہی تھے جنہیں میں دھان کھیتی والے مکان میں بے ہوش کر کے چھوڑ آئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ نیا برج میں میری تلاش شروع ہو گئی تھی۔ بس' اڈے سے روانہ ہوئی تو آئرن گیٹ پر اسے ایک پولیس پارٹی نے روک لیا۔ اس پولیس پارٹی کا انچارج وہی پولیس انسپکٹر تھا جس نے دھان کھیتی والے مکان پر چھاپہ مارا تھا۔ دو پولیس والوں کے ساتھ وہ بس میں چڑھا اور سفر کرنے والی ایک ایک عورت کو گھور کر دیکھنے لگا۔ نوجوان عورتوں پر اس کی خاص نظر تھی۔ میرے پاس سے تو وہ بس ایک سرسری نظر ڈالتا ہوا گزر گیا تھا۔ ارشاد حسین نے غلط نہیں کہا تھا کہ پولیس کو کسی نوجوان عورت کی تلاش ہو گی۔
دھرم تلے پہنچ کر میں' چاندنی چوک کی طرف چل دی۔ میں چاندنی چوک میں راجہ استاد کے گھر پہنچی تو وہاں ایک اور ہی ہنگامہ میرا منتظر تھا۔ شہزاد کو میں نے گھر کے صحن میں بندھے ہوئے پڑا دیکھا۔ ہمایوں شدید غصے میں تھا۔ راجہ استاد اسے سمجھا رہا تھا کہ ابھی وہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھائے' پہلے مجھے ساری بات بتا دے۔ وہ سبھی صحن میں جمع تھے۔
"کیا ہو گیا استاد؟" میں نے راجہ استاد کو مخاطب کیا اور قریب ہی کھڑی صبیحہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔
"یہ پوچھو رانی! کیا نہیں ہوا؟ ہمایوں کو میں نے بڑی مشکل سے روکا ہے کہ تمہارے آدمی کو قتل نہ کرے' جب تک تم نہ آ جاؤ۔ ہوا یہ کہ رات کو صبیحہ بیت الخلا جانے کے لئے اپنے کمرے سے نکلی تو تمہارا آدمی اسے زبردستی اپنے کمرے میں گھسیٹ لے گیا' منہ پر ہاتھ رکھ کے اور پھر جب وہ صبیحہ کے ساتھ منہ کالا کر رہا تھا تو صبیحہ کو چیخنے کا موقع مل گیا۔ میری آنکھ بھی صبیحہ کی چیخ سن کر کھل گئی اور ہمایوں بھی جاگ گیا۔ ہمایوں تو اسی وقت صبیحہ اور تمہارے آدمی دونوں کو ختم کئے دے رہا تھا' مگر میں نے روک دیا۔ تمہارے آدمی نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ مگر میں نے اور ہمایوں نے اسے قابو کر لیا اور باندھ کر صحن میں ڈال دیا۔ اس کے بعد صبیحہ نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ میں نے ہمایوں کو سمجھایا کہ جو کچھ ہوا اس میں صبیحہ کا کوئی قصور نہیں' وہ بے قصور ہے۔ ہمایوں' صبیحہ کی جان بخشی پر تو آمادہ ہو گیا۔ مگر تمہارے آدمی کو قتل کرنے کی ضد پر اڑ گیا۔ یہ صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے کا واقعہ ہے۔ رانی! اب تمہی کوئی فیصلہ کرو کہ کیا ہونا چاہئے؟ ویسے یہ حقیقت ہے کہ صبیحہ کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔" راجہ استاد ساری بات بتا کر چپ ہو گیا۔
یہ سب کچھ سن کر میں سناٹے میں رہ گئی۔ شہزاد سے مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ایسی کسی گری ہوئی حرکت کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ یقیناً یہ ذلیل حرکت لعنتی چمپا کی تھی۔ چمپا ہی نے شہزاد کو اپنے سحر میں لے رکھا ہو گا' مگر میں یہ بات راجہ استاد اور ہمایوں کو کس طرح سمجھاتی' میں اسی لئے چکرا کے رہ گئی۔
اس حرکت سے چمپا کا مقصد مجھے پریشانی میں مبتلا کرنے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے دیکھا' شہزاد کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ وہ میری طرف بڑی رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر کار میں نے ہمایوں کو مخاطب کیا۔ "اسے کھول دو ہمایوں!"
"کھول دیا تو یہ بھاگ جائے گا۔ پہلے ہی بڑی مشکل سے اسے باندھا ہے۔" ہمایوں بولا۔
"نہیں بھاگے گا۔" میں زور دے کر بولی۔ "اس سے بھی تو معلوم کیا جائے کہ اس نے ایسی ذلیل

حرکت کیوں کی؟"

"رانی کہتی ہے تو اسے کھول دے ہمایوں!" راجہ استاد نے بھی میری تائید کی۔

ہمایوں قہر آلود نظروں سے شہزاد کو دیکھتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ میرے نزدیک ہمایوں کا غصہ بے جا نہیں تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ شہزاد نے اس کی بیوی کو اسی کے گھر میں بے آبرو کر دیا تھا۔ ہاتھ پیر کھلتے ہی شہزاد نے اپنے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا اور غیر متوقع طور پر ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"تُو مجھے قتل کرے گا؟" شہزاد نے ہمایوں کو گھور کر دیکھا۔ "تیری بیوی کس گنتی شمار میں ہے' مَیں نے تو اسے نہیں چھوڑا۔" شہزاد نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اسی نے تو مجھ سے کہا تھا کہ میں تیری بیوی سے اپنا پہلو گرم کروں اس لئے تُو اور یہ..........." اس نے راجہ استاد کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ "تم دونوں اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکے ہو۔ میری محبوبہ کی عزت تم لوٹ لو تو کوئی بات نہیں اور میں اگر تمہاری بیوی.........."

میری قوت برداشت جواب دے گئی اور میرا الٹا ہاتھ شہزاد کے منہ پر پڑا۔

"تُو بھی اپنے ان عاشقوں کی حمایت لے رہی ہے۔ میں سمجھ گیا' تُو ان دونوں پر ریجھ گئی ہے۔" شہزاد میری طرف دیکھ کر چیخا۔

میں سمجھ گئی تھی کہ شہزاد اس وقت اپنے ہوش میں نہیں۔ وہ چمپا کے سحر میں گرفتار ہے۔ مجھے اس کے باوجود اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ شہزاد نے میرے بارے میں جو کچھ کہا تھا' اس سے مجھے بڑی ذلت محسوس ہو رہی تھی۔

"اب تُو میری خوشامد بھی کرے گی تو مَیں تجھ پر نہیں تھوکوں گا۔" شہزاد ایک مرتبہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تُو رہ اپنے ان عاشقوں کے پاس اور ان کے پہلو گرم کر' میں جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں میں کہ مجھے کون مائی کا لال جانے سے روکتا ہے۔"

ادھر شہزاد کی بات ختم ہوئی' ادھر ہمایوں اس پر جھپٹ پڑا' مگر اسے یہ سودا بہت مہنگا پڑا تھا۔ شہزاد نے اسے اٹھا کر کسی بچے کی طرح دور پھینک دیا تھا۔ پھر راجہ استاد نے آگے بڑھ کر شہزاد کے منہ پر گھونسا مارنا چاہا' مگر شہزاد نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ شہزاد کو اپنے بچاؤ کے لئے مزید کچھ نہیں کرنا پڑا۔ راجہ استاد کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے راجہ استاد کو تکلیف میں دیکھ کر شہزاد کے دائیں شانے پر کھڑی ہتھیلی ماری۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ شہزاد نے چیخ کر راجہ استاد کی کلائی چھوڑ دی۔ راجہ استاد جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اب میں شہزاد کے مقابل تھی۔

"تُو نے میری داشتہ ہو کر مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔" شہزاد میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کسی درندے کی طرح غرایا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ کرتا' میرا نپا تلا ہاتھ اس کی کنپٹی پر پڑا اور وہ لہرا کر زمین پر آ رہا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسے بے ہوش کر دیتی۔ لعنتی چمپا کے سحر سے اسے اسی طرح نکالا جا سکتا تھا۔ ہمایوں اس وقت تک سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے بھاگ کر کمرے میں جاتے دیکھا۔ جب وہ کمرے سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ مَیں سمجھی کہ وہ شاید شہزاد کو گولی مارنا چاہتا ہے' مگر اس وقت حیران رہ گئی جب میں نے ریوالور کی نال اپنی طرف اٹھی دیکھی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا رانی کہ تُو نے اپنا ایک اور عاشق بھی پال رکھا ہے۔ ادھر تُو مجھے اور استاد کو اُلو بنا رہی تھی' ادھر اس کے ساتھ عیش کر رہی تھی۔ رنڈی تجھ سے لاکھ درجے بہتر ہو گی کہ وہ پیسے لے کر تیری طرح کمینگی پر تو نہیں اترتی۔ تُو نے اپنے عاشق سے میری بیوی کو بے آبرو کرایا۔ اصل قصوروار تُو ہے۔ پہلے میں تجھے گولی ماروں گا' پھر تیرے عاشق کو قتل کروں گا۔ اب میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ تُو کتنی بڑی حرامزادی ہے۔"

ہمایوں کے الفاظ میری سماعت میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر گئے۔ شہزاد کے بعد اب کمینی چمپا نے ہمایوں کو اپنے سحر میں لے لیا تھا اور مجھے ذلیل کر رہی تھی۔ میں نے اسی لئے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے راجہ استاد کو مخاطب کیا۔ "استاد! تم دیکھ رہے ہو کہ ہمایوں حد سے گزر رہا ہے۔"

"اب تو ہر بات سے پردہ اٹھ گیا ہے رانی!" خلاف توقع راجہ استاد کے لہجے سے بھی اجنبیت کا اظہار ہونے لگا۔ "جو جیسا بوتا ہے' ویسا کاٹتا ہے۔ تُو نے اپنے آدمی کو اس گھر میں بلا کر ہمایوں کی بیوی کو بے آبرو کرایا' تجھے اس کی سزا تو بھگتنا ہی پڑے گی۔ میں اس سلسلے میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

تو گویا راجہ استاد بھی چمپا کے سحر میں ہے۔ میں نے سوچا اور دوسرے ہی لمحے جست بھر کے ہمایوں کی کلائی تھام لی۔ ایک ہی جھٹکے میں اس کے ہاتھ سے ریوالور نیچے گر گیا۔ پھر میں نے اسے مہلت نہیں دی۔ میں نے اس کی کنپٹی بھی "سہلا" دی تھی۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لے رانی! ورنہ پھونک دوں گا تجھے۔" اپنی پشت پر مجھے ریوالور کی نال کا دباؤ محسوس ہوا۔ مجھے یہ حکم دینے والا راجہ استاد تھا۔

چمپا مجھے ہر طرف سے زچ کرنے پر لگی ہوئی تھی۔ پہلے شہزاد' پھر ہمایوں اور اب اس نے راجہ استاد کو اپنے سحر میں لے لیا تھا۔ ریوالور نیچے گرتے ہی راجہ استاد نے اٹھا لیا تھا۔ اس وقت میرے لئے یہ ممکن تھا کہ ٹھوکر مار کے ریوالور دور پھینک دیتی لیکن راجہ استاد کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا اسی لئے اسے ریوالور اٹھا لینے دیا تھا۔ راجہ استاد' چمپا کے زیر اثر مجھے کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے اس کے کہنے پر دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

"رانی! یہ بمبئی نہیں کلکتہ ہے اور یہاں کا راجہ میں ہوں۔ تیری یہ مجال کہ تُو نے میرے ہی سامنے ہمایوں کو ڈھیر کر دیا۔" وہ غرایا۔

"میری بات تو سنو استاد!" مَیں نے آہستہ سے مڑنے کی کوشش کی۔

"مڑنے کی ضرورت نہیں۔" راجہ استاد چیخ اٹھا۔ "میں تیرے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا رانی!"

میں مڑتے مڑتے رک گئی۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ کچھ بھی سہی' چمپا مجھے ہلاک نہیں ہونے

دے گی۔ بڑے مہاراج کی اجازت کے بغیر وہ ہرگز یہ قدم نہیں اٹھا سکتی تھی اور بڑے مہاراج کے بارے میں مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ابھی میری موت نہیں چاہتا۔ اسی خیال کے تحت ہر خطرے کو پس پشت ڈال کر میں تیزی سے مڑی اور راجہ استاد کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔

"راجہ استاد! اب تم اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے کمرے میں چلو۔" میں نے اسے حکم دیا۔ میری آواز میں سختی تھی۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے رانی!" معاً راجہ استاد کا لہجہ بدل گیا۔ بالکل یوں لگا جیسے سوتے سوتے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی ہو۔

میرے اندازے کے مطابق راجہ استاد اب چمپا کے سحر سے آزاد ہو گیا تھا۔ میں نے ریوالور اپنے ہینڈ پرس میں رکھ لیا۔ دوبارہ اسے ریوالور دے کر میں کوئی خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں تھی۔ میں نے راجہ استاد کو مخاطب کیا۔ "ان دونوں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو استاد!"

راجہ استاد نے قریب ہی کھڑی ہوئی صبیحہ سے ایک گلاس پانی لانے کو کہا۔ صبیحہ پانی لے آئی تو راجہ استاد ہمایوں اور شہزاد کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں ہمایوں اور شہزاد کو ہوش آ گیا۔ وہ دونوں زمین سے اٹھ کر خالی خالی سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"اب کیسے ہو تم؟" میں نے شہزاد سے کہا۔

"آپ .... آپ کب آئیں خاتون!" شہزاد نے حیران سا ہو کر سوال کیا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں ابھی یہاں سے چلنا ہے۔" میں شہزاد سے بولی اور پھر راجہ استاد کی طرف دیکھا۔ "استاد ایک لاکھ روپے میں سے پندرہ ہزار تو میں تم سے لے چکی ہوں' بقیہ رقم مجھے دے دو۔"

"لیکن تم جا کہاں رہی ہو؟"

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا استاد کہ کچھ عرصے کے لئے مجھے کلکتے سے باہر جانا ہے۔"

"تو کیا آج اور ابھی جانا ہے تمہیں؟"

"ہاں استاد! اسی وقت جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں رقم لے کر آتا ہوں' تم اپنے کمرے میں چلو۔"

"آؤ۔" میں' شہزاد کو ساتھ لئے اس کمرے میں آ گئی جہاں میرے دونوں سوٹ کیس رکھے تھے۔ کمرے میں آ کر میں نے شہزاد سے پوچھا۔ "رات کو کیا ہوا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں خاتون!" شہزاد نے جواب دیا۔

"پھر تم صحن میں بندھے کیوں پڑے تھے؟" میرے لہجے میں چبھن تھی۔

"میں .... میں بندھا پڑا تھا؟ .... کب؟" شہزاد حیرت سے کہنے لگا۔

اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ میرے چہرے پر جو میک اپ تھا' وہ مجھے گراں گزر رہا تھا۔ میں نے اس

لئے وہ میک اپ ختم کر دیا۔ اس کی اب کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میک اپ ختم کر کے میں نے باتھ روم میں جا کر منہ دھویا۔ باہر نکلی تو ہمایوں صحن میں کھڑا تھا۔ میں نے اس سے گفتگو کی تو پتا چلا کہ کچھ دیر پہلے تک پیش آنے والے واقعات اس کے ذہن سے بھی حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ صحن سے میں کمرے میں آئی تو راجہ استاد رقم لے آیا تھا' وہ رقم میں نے سوٹ کیس میں رکھ دی۔ وہ پورے پچاسی ہزار روپے تھے۔ میرے پاس اس کے علاوہ مزید پانچ ہزار روپے پرس میں بھی موجود تھے۔ راجہ استاد سے بھی میں نے اشاروں کنایوں میں گزرے ہوئے واقعے کے متعلق پوچھا' مگر وہ بھی قطعی انجان بن گیا۔

"رات کو .... رات کو کیا ہوا تھا؟" وہ حیران ہو کر کہنے لگا۔ "مجھ سے صبیحہ نے کچھ بھی نہیں کہا.......... میں بلاتا ہوں ابھی اسے۔" پھر راجہ استاد' صبیحہ کو آواز دینے لگا۔

میں نے دانستہ اسے ایسا کرنے سے نہیں روکا۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اسے بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔

صبیحہ آ گئی اور بولیں "ہاں پاپا! کیا بات ہے؟"

"رات کو کیا تمہاری آنکھ کھلی تھی؟" راجہ استاد نے صبیحہ سے پوچھا۔

"رات کو نہیں بلکہ صبح کے وقت' صبح ہی صبح' دن نکلنے سے پہلے۔" میں نے وضاحت کی۔

"نہیں تو .... میں تو آٹھ بجے جاگی تھی۔ اس وقت تک دن نکل آیا تھا۔ کیوں' کیا بات ہو گئی؟"

"کچھ نہیں' بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔" میں بولی۔ "تم جاؤ اور میرے لئے اچھی سی چائے بنا لاؤ۔"

"ابھی لائی۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میں نے سوچا کہ وہاں سے مجھے اسٹیشن تک ہی تو جانا ہے اس لئے چہرے پر کسی نئے میک اپ کی ضرورت نہیں۔ اب یہ جان کر میرے دل کو اطمینان ہو چکا تھا کہ وقتی طور پر چمپا نے سبھی کو ایک فریب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ شرمناک واقعہ سرے سے رونما ہی نہیں ہوا تھا' یعنی شہزاد نے صبیحہ کو بے آبرو نہیں کیا تھا۔ اس فریب کی آڑ میں لعنتی چمپا مجھے احساس ذلت کا شکار کرنا چاہتی تھی اور اس میں وہ کامیاب رہی تھی۔ چمپا کی طرف سے ایک اندیشہ مجھے یہ بھی تھا کہ کہیں وہ میرے ساتھ ساتھ دہلی نہ چلے۔ البتہ میں یہ سوچ کر کسی قدر مطمئن تھی کہ وہ بڑے مہاراج کو چھوڑ کر میرا تعاقب نہیں کر سکتی۔ چمپا جیسی شیطانی قوتوں کی مالک کے لئے یہ معلوم کر لینا کوئی مشکل نہیں تھا کہ میں' کلکتے سے کہاں جا رہی ہوں۔

جب میں چائے پی رہی تھی تو ہمایوں' صبیحہ اور راجہ استاد سبھی اسی کمرے میں میرے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان سبھی کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں کچھ عرصے کے لئے کلکتے سے باہر جا رہی ہوں۔ راجہ استاد نے مجھے یقین دلایا کہ وہ جلد ہی میری کوٹھی پر کام شروع کرا دے گا۔

"استاد! کوٹھی سکونت کے قابل ہو جائے تو میری طرف سے اجازت ہے کہ تم چاہو تو وہاں رہ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"ارے رانی! کیوں ہماری عادتیں بگاڑتی ہو۔ ہم یہیں ٹھیک ہیں۔" راجہ استاد آہستہ سے ہنسا۔

"کب تک لوٹ آؤ گی باجی!" صبیحہ نے مجھے مخاطب کیا۔

"کچھ خبر نہیں صبیحہ! جلدی بھی آ سکتی ہوں' دیر بھی لگ سکتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ تیاری مکمل ہی تھی اور اب میں چائے بھی پی چکی تھی اس لئے ہمایوں سے ٹیکسی لانے کو کہہ دیا۔

ہمایوں ٹیکسی لینے چلا گیا۔ کلکتہ چھوڑتے ہوئے میرے احساسات عجیب سے تھے۔ میرے وہی احساسات تقریباً اس وقت تھے جب میں وادی سبز سے چلی تھی۔ ہرچند کہ وہ شہر میرا وطن نہیں تھا مگر مجھے محسوس کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا جیسے میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور جانے والی ہوں۔ کچھ شہروں کی اپنی ہی ایک الگ کشش ہوتی ہے کہ آدمی کچھ دن وہاں رہ لے تو جیسے وہیں کا ہو جاتا ہے۔ کلکتہ شہر بھی ایسے ہی شہروں میں سے تھا۔ اس کی خوشبو بڑی دور اور بڑی دیر تک آدمی کا پیچھا کرتی ہے۔ اس شہر کے متعلق میرا تو یہی تجربہ تھا۔

ٹیکسی آ گئی تو راجہ استاد نے بھی اسٹیشن تک ساتھ چلنے کو کہا لیکن میں نے منع کر دیا۔

"اچھا تو پھر میرے کمرے میں چل کر ایک بات سن لو۔" راجہ استاد کے لہجے میں التجا سی تھی۔

میرا ماتھا ٹھنکا لیکن مجھے اس کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اندر سے دروازہ بند کر لیا تو میں چونکی۔ "یہ کیا استاد!"

جواب میں راجہ استاد نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور بولا۔ "بس ایک بار میرے سینے سے لگ جاؤ رانی! میں اور کچھ نہیں چاہتا' اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ کیا خبر کہ اب ہم دوبارہ کب مل سکیں۔ میں تمہیں یہ بتانے اپنے ساتھ لایا ہوں کہ تم .... تم رانی' میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت ہو۔ تمہارے بعد کوئی بھی تمہاری جگہ نہیں لے سکے گا۔ راجہ استاد صرف اور صرف تمہاری امانت ہے .... اب گلے لگ بھی جاؤ رانی! زیادہ نہ تڑپاؤ۔"

"نہیں۔" میں نے سخت لہجے میں انکار کر دیا۔

"تم .... تم رانی! اتنی سنگ دل کیوں ہو؟ کیا .... کیا تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا؟" راجہ استاد کی آواز بھرا گئی۔

"بالکل نہیں' میں تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں جو ہوا اسے بھول جاؤ۔" یہ کہتے ہی میں دروازے کی طرف مڑی۔

"کاش .... کاش میں تمہیں بھول سکتا رانی!" اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ چمپا نے اسے میرے قرب کا فریب دے کر واقعی بڑا ظلم کیا تھا۔ اس کی حالت قابل رحم تھی' مگر یہ معاملہ ہی ایسا تھا کہ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

پھر میں' راجہ استاد کے کمرے میں نہیں رکی اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر آ گئی۔ اس گھر میں صرف صبیحہ ایسی تھی کہ جس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کو میں نہ جھٹک سکی۔ اسے میں نے گلے سے لگایا۔ قریب ہی ہمایوں کھڑا تھا۔ اس نے سرگوشی کی۔ "استاد سے تو گلے مل آئیں' کیا مجھے یونہی تڑپتا چھوڑ جا

گی؟"

میں ایسی بن گئی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ شہزاد نے اپنا اور میرے دونوں سوٹ کیس کمرے سے نکال کر صحن میں رکھ دیئے تھے۔ دو سوٹ کیس اس نے اٹھا لئے تو باقی بچ جانے والا ایک سوٹ کیس اٹھانے کے لئے میں جھکی' مگر ہمایوں نے مجھ سے وہ سوٹ کیس لے لیا۔ ایسا کرتے ہوئے ہمایوں نے ایک ایسی حرکت کی تھی کہ میرا خون کھول اٹھا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو قابو میں رکھا تھا ورنہ چلتے چلتے بدمزگی پیدا ہو جاتی۔ یہ سب اسی لعنتی چمپا کی ذلیل اور گھٹیا حرکتوں کا نتیجہ تھا ورنہ نہ تو ہمایوں دست درازی کی ہمت کرتا اور نہ راجہ استاد مجھے اپنے سینے سے لگانے کو کہتا۔ وہ دونوں ہی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میں ان کی زینت آغوش بن چکی ہوں۔ جو عورت کسی مرد کی زینت آغوش بن چکی ہو' اسے سینے سے لگانے کی آرزو کرنا یا دست درازی کرنا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ میں نے یہی سوچ کر ان دونوں کو معاف کر دیا تھا۔

میں گھر سے باہر آ گئی۔ راجہ استاد اور ہمایوں دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ تینوں سوٹ کیس ٹیکسی کی ڈگی میں رکھ دیئے گئے تو میں پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ شہزاد نے بھی میری تقلید کی تھی۔ وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر آ بیٹھا تھا۔

"اچھا خدا حافظ!" میں نے راجہ استاد اور ہمایوں کی طرف دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ٹیکسی والے کو چلنے کو کہا۔

ان دونوں کے ہاتھ بھی اٹھے اور فضا میں لہرائے۔ اسی وقت ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ بڑے انتظار کے بعد یہ دن آیا تھا کہ میں کلکتے سے دہلی کے لئے روانہ ہونے والی تھی۔ بظاہر کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ میرے پروگرام میں کوئی رکاوٹ پڑنے کا خطرہ ہوتا' اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ بے چینی کی وجہ پر میں نے بہت غور کیا مگر کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے اس خیال ہی کو ذہن سے جھٹک دیا۔

ٹیکسی کو چاندنی چوک سے روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک مجھے محسوس ہوا' ڈرائیور کی برابر والی نشست خالی نہیں ہے۔ وہاں کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے آگے کی طرف جھک کر دیکھا تو ایک دم اچھل پڑی۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر چمپا بیٹھی تھی اور اس کے ہونٹوں پر بڑی شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"مجھے اپنے ساتھ دیکھ کر حیران ہو رہی ہے معبلہ!" چمپا مڑے بغیر دھیرے سے ہنس کر کہنے لگی۔

"تو .... تو کمینی!" اسے دیکھ کر میں شدید غصے میں آ گئی۔

"ہاں میں' مگر کمینی میں نہیں تو ہے جو بڑے مہاراج کی انومتی (اجازت) کے بغیر ہی خاموشی کے ساتھ اس شہر سے فرار ہونے والی تھی۔ وہ تو بس مجھے اچانک تیرا دھیان آ گیا کہ دیکھوں تو کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔" چمپا نے کہا۔

اسی وقت میری نگاہ ٹیکسی کے باہر پڑی اور میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ ٹیکسی نہ جانے کب اپنا راستہ

بدل چکی تھی۔

"اے۔" مَیں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ "یہ تم کہاں جا رہے ہو؟ ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن چلو۔"

"اسے میں ریلوے اسٹیشن کے بجائے پولیس اسٹیشن چلنے پر بھی مجبور کر سکتی تھی' مگر تُو خوفزدہ نہ ہو معبلہ! میں ایسا نہیں کروں گی۔"

چمپا کی بات کو نظرانداز کر کے میں نے ایک بار پھر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ "ٹیکسی روکو......والا ٹیکسی۔"

"یہ تیرا حکم نہیں مانے گا معبلہ!" چمپا بولی۔ "یہاں سے یہ وہیں چلے گا جہاں میں نے چلنے کو کہا ہے۔ کہو تو میں اسی سے کہلوا دوں کہ یہ کہاں جا رہا ہے۔" پھر چمپا نے ٹیکسی والے کو مخاطب کیا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"کالی گھاٹ۔" ٹیکسی ڈرائیور نے فوراً جواب دیا۔ "وہیں کے لئے تو ٹیکسی کی ہے آپ نے۔"

یہ سن کر میں سناٹے میں رہ گئی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ چمپا مجھے گھیر کر بڑے مہاراج کے پاس لے جا رہی تھی۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنا پرس کھول کر ریوالور نکال لیا۔ اسی کے ساتھ میں نے چمپا کو اگلی سیٹ سے غائب ہوتے دیکھا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو میں نے ہمایوں سے چھینا تھا۔ میں نے آگے جھک کر ریوالور کی نال ڈرائیور کے سر پر رکھ دی اور سخت لہجے میں اس سے ٹیکسی روکنے کو کہا۔

"اگر تم نے ٹیکسی نہ روکی تو میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گی۔"

وہ اس طرح سکون و اطمینان سے ٹیکسی چلاتا رہا جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔

"خاتون! یہ .... یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" .... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" شہزاد یہ صورت حال دیکھ کر بول اٹھا۔

"تم چپ بیٹھو۔" میں نے شہزاد کو ڈانٹ دیا اور ایک بار پھر ڈرائیور کے سر پر ریوالور کی نالی کا دباؤ ڈالتے ہوئے ٹیکسی روکنے کا حکم دیا۔

"وہ تمہاری بات سن ہی نہیں رہا' الو کی دم فاختہ!" چمپا کی آواز سنائی دی۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ضرور ہو گئی تھی مگر ٹیکسی ہی میں موجود تھی۔ اب وہ مجھے چڑانے کے لئے زور سے ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی واقعی میرا خون کھولا رہی تھی۔

"ریوالور نکالتے ہی تُو رفو چکر کیوں ہو گئی حرامزادی؟" میں نے اسے گالی دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

"اس لئے کہ تُو عقل سے پیدل ہے۔ تیرا کوئی بھروسہ نہیں کب بلا سوچے سمجھے کیا کر بیٹھے۔ ویسے میں ہوں تیرے ساتھ ہی۔"

میں اس قدر غصے میں تھی کہ نتیجے کی پرواہ کیئے بغیر ریوالور کا دستہ پوری قوت سے ڈرائیور کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر چمپا کے سحر سے آزاد ہو جاتا۔ میں

اس پر غور نہیں کیا تھا ٹیکسی بے قابو ہو کر کسی حادثے کا شکار بھی ہو سکتی تھی۔ جب ڈرائیور ہی بے ہوش ہو جاتا تو ظاہر ہے ٹیکسی کو کون سنبھالتا۔ یہ خیال مجھے اس وقت آیا جب وقت گزر چکا تھا۔ ٹیکسی ایک بار سڑک پر اِدھر سے اُدھر لہرائی اور آگے پیچھے چلتی ہوئی کاروں کے بریک چیخ اٹھے لیکن چند لمحے بعد ہی ٹیکسی دوبارہ سیدھی ہو کر یکساں رفتار سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ ڈرائیور کے برابر والا دروازہ میں نے اچانک کھلتے دیکھا تھا اور پھر یوں لگا تھا جیسے ڈرائیور کے بے ہوش جسم کو کسی نے اٹھا کر ٹیکسی سے باہر پھینک دیا ہو۔ اس کے بعد دروازہ پھر خود بخود بند ہو گیا تھا۔

اب ٹیکسی بغیر ڈرائیور کے سڑک پر تیزی سے دوڑی جا رہی تھی۔ اچانک ایک کار' ٹیکسی کو اوور ٹیک کر کے قریب سے نکلی۔ دو افراد اس کار میں سفر کر رہے تھے۔ میں نے ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتے دیکھیں۔ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کچھ کہتے ہوئے ٹیکسی کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ یقیناً ان کے لئے یہ امر انتہائی حیران کن ہی رہا ہو گا کہ ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی نہیں تھا' اس کے باوجود ٹیکسی سڑک پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ مجھے اس پر یوں حیرت نہیں تھی کہ مجھے معلوم تھا' ٹیکسی میں چمپا موجود ہے۔ ظاہر ہے اس کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ ٹیکسی کو قابو میں رکھتی۔

کچھ ہی فاصلے پر ایک سگنل کی سرخ بتی نظر آ رہی تھی۔ مجبوراً اس چوراہے پر ٹیکسی کو رکنا ہی پڑا۔ ٹیکسی سے آگے دو کاریں تھیں۔ پیچھے اور دائیں بائیں بھی ٹریفک کا ہجوم تھا۔ ٹیکسی رکتے ہی میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھولنا چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اتر جاؤں لیکن زور لگانے کے باوجود دروازہ نہیں کھلا۔

اسی وقت ٹیکسی میں چمپا کا زہریلا قہقہہ گونج اٹھا۔ پھر وہ مجھ سے بولی۔ "معبلہ! تُو بھاگ نہیں سکے گی۔ دروازہ نہیں کھلے گا تجھ سے۔ تُو یہ کیوں بھول گئی کہ میں بھی اس وقت تیری ہم سفر ہوں۔ اتنے عرصے کے بعد تو قابو میں آئی ہے تُو! میں بھلا تجھے کس طرح فرار ہو جانے دوں گی۔"

دائیں بائیں جو گاڑیاں کھڑی تھیں' ان میں سوار لوگ حیرت بھری نظروں سے ٹیکسی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر بھی ان میں سے کوئی حقیقت حال دریافت کرنے کے لئے اپنی گاڑی سے نہیں اترا۔ اسی اثنا میں ہری بتی جل گئی۔ ہماری ٹیکسی کے آگے جو کاریں کھڑی تھیں' وہ آگے بڑھ گئیں تو ٹیکسی بھی ان کے پیچھے چل دی۔ چمپا مجھے دن دیہاڑے اغوا کر کے لے جا رہی تھی اور اسے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ٹیکسی میں چیخ و پکار شروع ہو جائے تو یقیناً لوگ ادھر متوجہ ہو جائیں گے۔ پھر شاید وہ کسی طرح ٹیکسی کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں۔

"بچاؤ .... بچاؤ۔" میں نے اچانک چیخنا شروع کر دیا اور پھر شہزاد سے بھی کہا۔ "تم بھی چیخو۔"

"مگر کیوں خاتون؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا احمق آدمی کہ ٹیکسی بغیر ڈرائیور کے سڑک پر دوڑ رہی ہے اور کسی بھی لمحے حادثے کا شکار ہو سکتی ہے۔" میں جھنجلا کر بولی۔

"ارے ہاں' یہ تو ہے۔" شہزاد آگے کی طرف جھک کر ڈری ڈری سی آواز میں بولا۔

"تو پھر چیخو .... مدد کے لئے چیخو۔" میں نے شہزاد سے کہا اور دوبارہ "بچاؤ بچاؤ۔" چیخنے لگی۔

"مم .... میری آ.......... آواز.........." شہزاد کو میں نے گلا مسلتے دیکھا۔

اسی لمحے پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ پوری قوت سے گلا پھاڑنے کے باوجود میری آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ پھر یہ آواز بھی چمپا کے قہقہے میں دب گئی۔ میں نے چیخنا بند کر دیا تو چمپا طنزیہ لہجے میں بولی۔ "کیوں' کیا تھک گئی؟ چیخ نا! میں بھی تو دیکھوں تجھے کون بچاتا ہے .... اور ہاں تیری پُراسرار قوتیں کیا ہوئیں؟ .... تُو بالکل کسی چوہیا کی طرح میرے جال میں پھنس گئی ہے' اب نکل نہیں سکتی۔"

"اس کے باوجود نہ تُو میرا کچھ بگاڑ سکتی ہے' نہ وہ تیرا بڑا مہاراج کہ جس کے اشاروں پر تو ناچ رہی ہے۔"

"یہ تو تجھے بڑے مہاراج کے پاس چل کر پتا چلے گا کہ تجھے کہاں کہاں سے بگاڑا جائے گا۔ میں نے بڑے مہاراج کو مشورہ دیا ہے کہ وہ تیری مرضی اور آمادگی کو بھول جائیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے تجھے حاصل کر لیا تو پھر تیرا سارا غرور خاک میں مل جائے گا۔ پھر تُو خود ہی کسی بولائی ہوئی کتیا کی طرح ان کے پیچھے دم ہلاتی پھرے گی۔"

"چپ ہو جا ذلیل عورت!" میں چیخ اٹھی۔ پھر جو میرے منہ میں آیا کہنے لگی۔ میں چمپا اور بڑے مہاراج دنوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

"بڑی گستاخ ہو رہی ہے' میں تیری بولتی ہی بند کئے دیتی ہوں۔" چمپا کی غصیلی آواز سنائی دی۔

دوسرے ہی لمحے مجھے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

دوبارہ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو بڑے مہاراج کے اسی عشرت کدے میں دیکھا جہاں سے ایک مرتبہ فرار ہو چکی تھی۔ میرے جسم پر گلابی رنگ کا باریک سا ایک لبادہ تھا جس سے میرے جسم کی رعنائیاں چھلکی پڑ رہی تھیں۔ وہ لبادہ لباس کے نام پر ایک تہمت ہی تھا۔ میرے علاوہ اس بڑے کمرے میں کہ جس کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا' بڑے مہاراج کی اور داسیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے جسموں پر بھی رنگ برنگے باریک لبادے ہی تھے۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی' مگر مجھے وہاں چمپا کہیں بھی نظر نہیں آئی اور نہ ہی بڑا مہاراج دکھائی دیا۔ میں سمجھ چکی تھی کہ بے ہوشی کے دوران ہی میں میرا لباس تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس باریک گلابی لبادے کی وجہ سے مجھے اٹھ کر کھڑے ہوتے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ میں قالین پر دراز تھی اور میرے سرہانے گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ پھر میں نے ان خوبصورت اور نازک و متناسب جسموں والی داسیوں کو آپس میں شرمناک حرکتیں کرتے دیکھا تو اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ منظر میرے لئے ناقابل دید ہی تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد معاً مجھے یوں لگا کہ کوئی میرے پاس بھی دراز ہو چکا ہے اور مجھ سے دست درازیاں کر رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور پھر

جس چہرے پر میری نظر پڑی اسے دیکھ کر میرا لہو سنسنا گیا۔ وہ چمپا تھی اور اس کے جسم پر بھی مجھے باریک گلابی لبادہ نظر آ رہا تھا۔

"معبلہ! واقعی تُو بے انتہا حسین ہے۔" چمپا نے میرے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ "بڑے مہاراج بلا سبب ہی تیرے دیوانے نہیں ہیں۔ میں نے آج پہلی بار تجھے قریب سے دیکھا ہے۔"

"بکواس نہ کر اور دور ہٹ جا۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ یہی ہاتھ چمپا کی بجائے کسی مرد کا ہوتا تو میرے غصے میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

"یہ بکواس نہیں ہے ظالم! تیرے جسم سے تو روشنی سی پھوٹ رہی ہے۔" وہ سسکاری سی بھر کے مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے اس کی گرفت سے نکلنا چاہا مگر ممکن نہ ہوا۔ اس نے مجھے یوں جکڑ لیا تھا جیسے کوئی بڑی سی جونک میرے جسم سے چمٹ گئی ہو۔

"تُو خواہ مخواہ کوشش کر کے خود کو تھکا رہی ہے' یہ چمپا کی گرفت ہے جس سے نکلنا تیرے لئے کسی طرح ممکن نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور مجھے اپنی غلطی کا فوراً ہی احساس ہو گیا۔ مجھے اس سے نظریں نہیں ملانا چاہئیں' یہ خیال آتے ہی میں نے اپنی نظریں اس کی طرف سے ہٹانا چاہیں لیکن ناکام رہی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کو کوئی ٹٹول رہا ہو۔

معاً میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چمپا کو ختم کر سکتی تھی۔

"نہیں معبلہ! تُو ایسا نہیں کر سکتی۔" اس نے مجھے حکم دیا۔ "تُو میرے جسم میں اپنا زہر نہیں اتارے گی۔" وہ اب تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئی تھی۔

معلوم نہیں کیسے میری قوت ارادی کمزور پڑنے لگی۔ شاید یہ چمپا کے حکم ہی کا اثر تھا۔ میں خواہش کے باوجود اپنے ارادے پر عمل کرنے سے قاصر تھی۔ پھر جیسے میں خود اپنے ذہن سے لڑنے لگی۔ نہیں' میں اس عورت کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ یہ میری دشمن ہے' دشمن ہے۔

آخرکار میں نے اپنے ذہن کو مغلوب کر ہی لیا اور عین اسی لمحے جب چمپا کے شانے میں میرے دانت اترنے والے تھے' وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بھی میں اٹھ کر اس کی طرف جھپٹی۔ دوسرے ہی لمحے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ خلاف توقع اس کے کمرے میں موجود داسیاں میرے گرد جمع ہو گئیں اور میرے جسم کو چومنے لگیں۔

میں نے اپنے جسم میں ایک عجیب سا نشہ تیرتے محسوس کیا۔ شاید انہوں نے مجھے اپنے سحر میں لے لیا تھا۔ میرا جسم ٹوٹنے لگا اور میں قالین پر لیٹ گئی۔ ان کے بوسوں کا لمس میرے انگ انگ میں شعلے سے بھڑکانے لگا تھا۔ پھر انہی میں سے کوئی کہیں سے ایک صراحی اٹھا لائی۔ اسی صراحی سے ایک پیالے میں ٹھنڈا اور میٹھا مشروب انڈیل کر ایک داسی نے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ مجھے اس سے بڑی فرحت محسوس

ہوئی۔ چند ہی لمحے بعد مجھے ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے نظر آنے لگے۔ رگ و پے میں دوڑتا ہوا نشہ اور سوا ہو چکا تھا۔ میں جیسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی۔ مجھ پر عجیب سی بے خودی طاری ہوتی گئی۔ یہ لذت و سرشاری کی دنیا تھی اور یہاں میں تنہا نہیں تھیں وہ داسیاں بھی میرے ساتھ تھیں۔ ان کے لمس کی حرارتوں کو میں اپنی روح میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔ پھر معلوم نہیں، کب اور کیسے میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ یہ سب کچھ غلط ہو رہا ہے۔ مجھے گناہ کی دلدل میں گھسیٹا جا رہا ہے۔

"نہیں۔" میں ایک دم چیخ اٹھی اور پھر ان داسیوں کو دھکے دے کر دور ہٹانے لگی جو میرا جزو بدن بنی ہوئی تھیں۔

وہ سبھی سہم کر پیچھے ہٹ گئیں اور میں اپنے جسم پر موجود بے ترتیب لبادے کو درست کرنے لگی۔ شعلے اب بھی میرے سارے وجود میں بھڑک رہے تھے۔ یہ ایک ایسی آگ، لذت آمیز آگ تھی جس سے میں سرسری طور پر صرف ایک مرتبہ آگاہ ہوئی تھی۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب انہی داسیوں کی طرح صبیحہ کے قرب نے میرے وجود میں شعلے بھڑکا دیئے تھے، مگر اب اس سے کئی سو گنا زیادہ میں ان شعلوں کی حرارت محسوس کر رہی تھی۔ میں پگھل جانا چاہتی تھی کہ اچانک جیسے مجھے ہوش آ گیا تھا اور میرے اندر کی آگ اندر ہی رہ گئی تھی۔ یہ بڑے نازک اور صبر آزما لمحے تھے۔ خود فراموشی کی سرحدوں تک پہنچ کر یوں لوٹ آنا بڑے حوصلے، بڑی ہمت کا کام تھا لیکن میں ان لمحوں کے ہاتھوں پسپائی اختیار کرتے کرتے عالم ہوش میں واپس آ گئی تھی۔

داسیاں دور کھڑی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے بے ترتیب لبادے درست نہیں کئے تھے۔ مجھے ان کی طرف دیکھتے ہوئے حیا محسوس ہوئی تو آنکھیں بند کر لیں اور پھر میرے ذہن پر غنودگی چھا گئی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ بیدار رہوں مگر کچھ ہی دیر میں مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔ شاید یہ اس مشروب کا اثر تھا جو مجھے پلایا گیا تھا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں اندھیرے میں تھی۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں شاید کسی نرم اور آرام دہ بستر پر دراز تھی۔ مجھے اپنے سر کے نیچے تکیہ بھی لگا محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تک مجھے یاد ہی نہ آ سکا کہ میں کہاں ہوں۔ میں اپنے ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی کہ کن حالات سے دوچار ہوں؟ پھر آہستہ آہستہ یادوں کے دریچے کھلتے گئے۔ میں، شہزاد کے ساتھ ایک ٹیکسی میں ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن جا رہی تھی کہ راستے میں اچانک چمپا ٹیکسی کے اندر ظاہر ہو گئی اور پھر .... مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ تو اس وقت میں، بڑے مہاراج کی قید میں ہوں۔ میں نے سوچا۔ اسی لمحے مجھے اپنے قریب تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دی اور پھر میرے لئے اچانک وہ اندھیرے روشن ہو گئے۔ میرے وجود میں اندھیرے کے اندر دیکھ لینے کی پُراسرار قوت بیدار ہو چکی تھی۔ خود سے کچھ ہی فاصلے پر بچھے ہوئے ایک اور بستر پر مجھے شہزاد نظر آیا۔ وہ تیز تیز سانس لیتے ہوئے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہیں بستروں کے سرہانے مجھے تین سوٹ کیس رکھے دکھائی دیئے جن میں سے دو میرے اور ایک شہزاد کا تھا۔ انہی کے قریب میری ساڑھی، پیٹی کوٹ، بلاؤز وغیرہ پڑے تھے۔ میرے جسم پر ابھی تک باریک گلابی لبادہ تھا۔

میں دھیرے سے اٹھی اور لباس تبدیل کرنے لگی۔ باریک گلابی لبادہ میں نے ایک طرف ڈال لیا۔

"کک .... کون .... کون ہے؟" شہزاد نے خوفزدہ سی آواز میں پوچھا۔ اس نے شاید میرے لباس کی سرسراہٹ سن لی تھی۔

"میں ہوں، ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے بلاؤز پہنتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ .... آپ کہاں چلی گئی تھیں خاتون؟" اس نے دریافت کیا۔

"لیکن پہلے میں یہاں تھی ہی کب؟" میں بولی۔

"نہیں، آپ .... آپ تو بہت دیر سے میرے پاس تھیں .... میرے ہی بستر پر۔"

"کیا بکتے ہو؟" مجھے غصہ آ گیا اور اسی غصے میں ہاتھ سے ساڑھی کا پلو چھوٹ گیا۔

"یہ آپ چند مخصوص لمحات کے علاوہ اتنی اجنبی کیوں بن جاتی ہیں خاتون!" اس کے لہجے سے قدرے خفگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "یوں لگتا ہے جیسے آپ نے مجھے کھلونا سمجھ لیا ہے کہ جب تک جی چاہا اس سے کھیلا اور جب چاہا دور پھینک دیا۔"

"کیوں خواہ مخواہ بکواس کر رہے ہو تم؟"

"یہ بکواس ہے، کیا ابھی کچھ دیر پہلے تک آپ .... آپ مجھے اپنی وفاؤں کا یقین نہیں دلا رہی تھیں؟ کیا .... کیا میرے گلے کا ہار نہیں بنی ہوئی تھیں؟" وہ بولا۔ "بولیں خاتون!"

کیا شہزاد اس وقت چمپا کے سحر میں گرفتار ہو کر یہ سب کچھ کہہ رہا ہے؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ پھر خود ہی مَیں نے اپنے اس خیال کی تردید کر دی۔ اگر ایسا ہوتا تو شہزاد ادب سے بات نہ کرتا۔ اس کا انداز گفتگو غیر مہذب ہوتا۔ اس کے باوجود میں اتنا ضرور سمجھ گئی تھی کہ کچھ دیر پہلے تک چمپا اس کے پاس تھی۔ چمپا نے اسے حسب معمول یہی فریب دیا ہو گا کہ وہ نہیں، میں اس کے پہلو میں ہوں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں اس کا گلہ کرنا بے جا نہیں تھا مگر میں بھی کیا کرتی۔ میں اسے خود سے بے حجابی کا موقع تو نہیں دے سکتی تھی۔

میں اب ساڑھی باندھ چکی تھی۔ اپنے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے نرم اور پُرسکون آواز میں شہزاد کو مخاطب کیا۔ "تمہیں کب ہوش آیا؟"

"حیرت ہے خاتون کہ آپ مجھ سے یہ سوال کر رہی ہیں۔ آپ ہی تو مجھے ہوش میں لائی تھیں اور پھر ...." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور پھر کیا ہوا؟" مَیں نے پوچھ لیا۔

"پھر .... پھر آپ نے مجھے ہوش میں نہیں رہنے دیا۔ اس کے بعد آپ اچانک نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ یہاں اس وقت بھی اندھیرا ہی تھا اور اب بھی اندھیرا ہے۔ پھر آپ اچانک ہی لوٹ آئیں .... میں یہاں اکیلا پڑا رہا۔ میں نے آپ کو کئی مرتبہ پکارا بھی مگر جواب نہیں ملا۔ اس سے میں یہی سمجھا کہ آپ یہاں نہیں ہیں۔"

شہزاد نے اپنی بات کی ابتدا میں جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ یقیناً میرے لئے قابل شرم و

ندامت تھی۔ لعنتی چمپا میرا روپ دھار کر مجھے ذلیل و رسوا کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس طرح وہ اپنی ہوس کی تسکین بھی کر رہی تھی۔ میں اب اپنے بستر پر آ کے بیٹھ چکی تھی۔

چند ہی لمحے بعد ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی بھاری پتھر اپنی جگہ سے ہٹا ہو۔ اسی کے ساتھ روشنی سی ہو گئی۔ میں نے روشنی کی طرف نظر اٹھائی تو سامنے دیوار میں ایک در دکھائی دیا۔ اسی کے بعد سیڑھیاں نظر آئیں اور کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ کوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہا تھا۔

سیڑھیاں اتر کر آنے والے دو مکروہ صورت سیاہ فام افراد تھے۔ ان میں سے ایک دو تھالیاں اٹھائے ہوئے تھا۔ دوسرے شخص کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور مٹی ہی کے دو پیالے تھے، بغل میں چمڑے کا کوڑا دبا ہوا تھا۔ ان کے سر گھٹے ہوئے تھے اور لمبی چوٹیاں گردنوں پر پڑی تھیں، ماتھوں پر قشقے تھے، پیروں میں کھڑاؤں۔ سیڑھیوں کی طرف سے اتنا اجالا آ رہا تھا کہ ان دونوں کو بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ دونوں میرے اور شہزاد کے لئے کھانا لے کر آئے تھے۔ انہوں نے ہمارے سامنے ایک ایک تھالی رکھ دی۔ دونوں بستروں کے درمیان جو خالی جگہ تھی وہاں صراحی اور پیالے رکھنے کے بعد وہ سیڑھیوں کے قریب جا کر خاموش کھڑے ہو گئے۔

مَیں نے صبح جلدی ناشتہ کیا تھا اس لئے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ آلو کے ساگ کی بھجیا، دہی، پاپڑ، اچار وغیرہ چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں رکھے تھے، ان کے ساتھ گرم گرم پوریاں تھیں۔ کھانا خوش ذائقہ تھا، میں نے سیر ہو کر کھایا۔ سیڑھیوں کی طرف سے آنے والی روشنی دن کی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ غالباً دوپہر کا کھانا تھا۔ جب ہم دونوں کھانا کھا چکے تو ایک شخص نے سامنے سے تھالیاں اٹھا لیں۔ پانی کی صراحی اور پیالے وہیں چھوڑ دیئے گئے تھے۔

وہ شخص تھالیاں لے کر مڑا ہی تھا کہ میں جیسے اڑتی ہوئی اس تک پہنچ گئی۔ میں نے پیچھے سے اس کی گردن پر جچا تلا ہاتھ مارا تھا اور وہ اوندھے منہ زمین پر آ رہا تھا۔ اس کے منہ سے چیخ بھی نہیں نکل سکی تھی۔ اس کا ساتھی شاید کسی ایسی صورت حال کے لئے پہلے ہی سے مستعد و چوکنا تھا۔ چمڑے کا ہنٹر میری پشت پر پڑا تو میں تکلیف کی شدت سے دہری ہو گئی۔ پھر اس نے مجھے سنبھلنے نہیں دیا تھا۔ میں چیختی رہی اور وہ میرے جسم پر کوڑے برساتا رہا۔

میں نے اس دوران کئی مرتبہ یہ کوشش کی کہ کوڑا پکڑ لوں لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ وہ شخص بہت چالاک تھا، میری ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ میرے جسم پر جہاں بھی کوڑا پڑتا، آگ سی لگ جاتی۔ میری چیخوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مجھ پر اس وقت تک کوڑے برساتا رہا جب تک میں اپنے پیروں پر کھڑی رہی۔ میرے جسم پر موجود ساڑھی چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ شہزاد مجھے پٹتے دیکھتا رہا تھا۔ اس نے مجھے بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جب میں نڈھال ہو کر زمین پر گر گئی تو اس شخص نے دو ایک کوڑے اور مارے، شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ میں اٹھنے کے قابل ہوں یا نہیں۔ میں فرش پر پڑی ہوئی سسکتی رہی تو اس نے ہاتھ روک دیا۔ پھر اس نے جھک کر اپنے بے ہوش ساتھی کو کاندھے پر لاد لیا۔ اس سے پہلے وہ دونوں تھالیاں اور برتن

سمیٹ چکا تھا۔ اپنے ساتھی کو وہ کاندھے پر ڈالے ہوئے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ بظاہر وہ اتنا طاقتور نہیں لگتا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد پھر ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ اندھیرے میں دیکھنے کی پُراسرار قوت پہلی بار گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔ دوبارہ میرے اندر یہ قوت بیدار نہیں ہوئی۔

میرے لئے اب یہ سمجھ لینا کوئی دشوار نہیں تھا کہ مجھے اور شہزاد کو کسی تہہ خانے میں قید کیا گیا تھا اور اس تہہ خانے میں داخل ہونے کا راستہ وہی تھا جس سے وہ دونوں سیاہ فام اندر آئے تھے۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی سمجھ گئی کہ یہ راستہ کسی خفیہ میکنزم کے ذریعے کھلتا تھا۔

فرش سے اٹھنے کی طاقت اب میرے اندر نہیں رہی تھی۔ میرا پورا جسم لہولہان ہو چکا تھا۔ سیاہ فام شخص نے بڑی بے دردی سے میرے جسم پر کوڑے برسائے تھے۔ میں اس جگہ سے اٹھ کر فرش پر بچھے ہوئے بستر تک پہنچنا چاہتی تھی۔ میں نے اسی لئے دھیمی آواز میں کراہتے ہوئے شہزاد کو پکارا تاکہ وہ مجھے سہارا دے کر اٹھا سکے۔

"خاتون! کہاں ہیں آپ؟.......... اندھیرے میں مجھے .... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔" شہزاد کی ڈری ڈری سی آواز ابھری۔

مجھے زد و کوب ہوتے دیکھ کر شہزاد کچھ زیادہ ہی خوفزدہ معلوم ہوتا تھا۔ میں یہ محسوس کر کے خود ہی اندازے کے مطابق بستر کی طرف گھسٹنے لگی۔ میری قوت برداشت اب جواب دیتی جا رہی تھی اور سر چکرانے لگا تھا، آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرے کی دبیز چادر پھیل رہی تھی۔ بستر کی طرف گھسٹتے ہوئے جانے کب میرے جسم کی توانائی جواب دے گئی۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ پھر معلوم نہیں کب تک میں ہوش و حواس سے بیگانہ رہی۔

ہوش آنے پر میں نے خود کو اجالے میں دیکھا۔ وہ چھوٹا سا حوض تھا، میرا جسم جس کے خوشبودار محلول میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے اسی حوض کی ایک دیوار کے سہارے بٹھایا گیا تھا۔ گردن تک میرا جسم حوض کے اندر تھا، صرف میرا چہرہ اس محلول سے باہر تھا۔ حوض کے کنارے خوبصورت داسیاں باریک لبادے زیب تن کئے نیم دراز تھیں۔ حوض کے سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک اونچی سی کرسی پر بڑا مہاراج چندر موہن بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر وہی مخصوص لباس تھا جو اس کی پہچان تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم پر داسیوں جیسا باریک لبادہ تھا جو محلول کی وجہ سے میرے جسم ہی کا حصہ بن گیا تھا۔ خلاف توقع اس وقت مجھے بالکل تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر دیکھا تو زخم کا ایک نشان بھی نظر نہ آیا۔

"اسے حوض سے باہر نکال لو۔ یہ ہوش میں آ چکی ہے۔ دیوتاؤں کے مقدس حوض میں غسل کرنے کے بعد اس کا حسین جسم اب قطعی بے داغ ہو چکا ہے۔" بڑے مہاراج کی بلند اور بھاری آواز گونجی۔ وہ غالباً داسیوں سے مخاطب تھا۔

میں یہ سمجھی تھی کہ وہاں صرف وہی داسیاں تھیں جو حوض کے کنارے نیم دراز تھیں، مگر ایسا

نہیں تھا۔ کچھ داسیاں‘ بڑے مہاراج کی اونچی کرسی کے پیچھے بھی موجود تھیں۔ وہ وہاں سے نکل کر حوض کے قریب آ گئیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بڑی سی ریشمی چادر اور دوسری کے ہاتھ میں ایک باریک گلابی لبادہ تھا۔ دو داسیاں حوض کی طرف جھکیں اور انہوں نے میری دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے حوض سے باہر کھینچ لیا۔ جس داسی کے ہاتھ میں ریشمی چادر تھی‘ اس نے میرے بھیگے ہوئے جسم پر چادر ڈال دی اور پھر بھیگا ہوا لبادہ میرے شانوں سے پھسل کر قدموں میں آ گرا۔ داسی نے میرے جسم کو چادر سے خشک کیا‘ پھر دوسری داسی نے مجھے خشک لبادہ پہنا دیا۔ اسی وقت پہلی مرتبہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں کسی سہارے کے بغیر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ میرے اعصاب شل تھے۔

"اسے یہاں لا کر بٹھا دو۔" بڑے مہاراج نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے داسیوں کو حکم دیا۔

میں نے داسیوں کے چہروں پر حیرت کے آثار دیکھے۔ پھر مجھے ایک داسی کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ دوسری داسی سے مخاطب تھی۔ "ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ بڑے مہاراج نے اپنی کرسی پر تو چمپا دیوی کو بھی کبھی نہیں بٹھایا۔ پھر یہ کون ہے جسے اتنی عزت دی جا رہی ہے۔"

میرے قدم بمشکل اٹھ رہے تھے‘ بالکل اس طرح جیسے کسی بچے کو سہارا دے کر چلایا جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ داسیاں مجھے سہارا نہ دیئے ہوتیں تو میں ایک قدم نہ اٹھا سکتی اور پہلا قدم اٹھاتے ہی گر پڑتی۔ داسیوں نے مجھے سنبھال کر بڑے مہاراج کی کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کرسی کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"آج تُو وہ منظر دیکھے گی اے معبلہ! جو کبھی تُو نے اونچے پہاڑوں کے درمیان رہتے ہوئے دیکھا ہو گا۔" بڑے مہاراج نے مجھے مخاطب کیا‘ پھر بلند آواز میں بولا۔ "اس ظالم داس کو حاضر کیا جائے جس نے ہماری معبلہ کے پھول سے جسم کو زخموں سے سجا دیا۔"

ذرا ہی دیر کے بعد چار قوی ہیکل شخص اسی سیاہ فام شخص کو لے کر ایک طرف سے آتے دکھائی دیئے جس نے مجھ پر کوڑے برسائے تھے۔ اس کا جسم بھاری زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ بھاری زنجیروں کی وجہ سے سیاہ فام شخص آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی کے پیچھے مجھے بھاری تن و توش کا ایک شخص اپنے ہاتھ میں چوڑے پھل والی تلوار لئے نظر آیا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر دو افراد ایک بڑی سی انگیٹھی اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ انگیٹھی کے دونوں جانب لکڑی کے دستے لگے ہوئے تھے جنہیں وہ دونوں پکڑے چل رہے تھے۔

میں اس سے بخوبی اندازہ کر سکتی تھی کہ وہاں کیا ہونے والا ہے۔ اگر ایسا ہی تھا جیسا کہ میں نے سوچا تھا تو اس پر مجھے حیرت تھی۔ بڑے مہاراج کو پہاڑی بستیوں کی اس ہولناک سزا کے بارے میں کیسے معلوم تھا؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

کرسی سے کچھ ہی فاصلے پر وہ قافلہ رک گیا۔

"اے میرے داس!" بڑے مہاراج کی آواز گونجی۔ "تُو نے میری اجازت کے بغیر پھول سے ایک جسم پر کوڑے برسائے۔ بول‘ تُو نے ایسا کیوں کیا؟"

"اے بڑے مہاراج! اس لڑکی نے تیرے ہی ایک داس پر اتنا خطرناک حملہ کیا کہ اس کے وار سے

تیرے داس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ سورگ باش ہو گیا۔ یہ لڑکی قیدی تھی اور کسی قیدی کو حق نہیں کہ تیرے کسی داس پر ہاتھ اٹھائے‘ سو میں نے اسے سزا دی۔" پابہ زنجیر سیاہ فام جواب میں بولا۔

"لیکن اسے سزا دینے سے پہلے تُو نے ہماری انومتی (اجازت) کیوں نہیں لی؟"

"تیرے داس کو اس پر غصہ آ گیا تھا‘ سو چھما چاہتا ہے۔" سیاہ فام نے معافی کی درخواست کی۔

"تُو نے ایسا پاپ کیا ہے کہ تجھے معاف نہیں کیا جا سکتا۔" بڑے مہاراج کی آواز میں سختی آ گئی۔ "تجھے اس کی سزا ملے گی۔"

"دیا کریں بڑے مہاراج! .... دیا کریں۔" سیاہ فام شخص گڑگڑانے لگا۔

"نہیں‘ ہم تجھے سزائے موت کا حکم سناتے ہیں جس پر اسی سمے عمل ہو گا۔" بڑے مہاراج نے حکم سنایا۔

میری نگاہ دور رکھی ہوئی انگیٹھی پر پڑی جس پر لوہے کا توا رکھا تھا۔ توا دھیرے دھیرے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

"معبلہ!" بڑے مہاراج نے میری طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔ "بالکل اسی طرح یہاں تیرے دشمن ژیان کا سر قلم کر کے اس کی کٹی ہوئی گردن پر بھی دہکتا ہوا توا رکھا جا سکتا ہے‘ اگر تُو میری داسی بننا قبول کر لے۔ تُو کہاں اس کے پیچھے پیچھے بھاگی جا رہی ہے؟ میں اسے جب چاہوں یہاں بلوا سکتا ہوں۔ بول‘ تجھے منظور ہے؟ تیرے جواب کی خاطر میں تیری زبان کھول دیتا ہوں‘ جواب دے۔"

معاً مجھے یوں لگا جیسے میں بول سکتی ہوں۔ میرا جواب سننے کی خاطر بڑا مہاراج ابھی تک میری طرف جھکا ہوا تھا۔

"نہیں چندر موہن!" میں نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا۔ "تیری یہ ناپاک خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔ میں اپنا شکار خود کرنے کی قائل ہوں۔"

وہ میری بات سن کر چونکا۔ "تو تجھے میرا نام بھی معلوم ہو گیا‘ بہت خوب۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "لگتا ہے کہ مجھے چمپا نے جو مشورہ دیا ہے‘ وہ ماننا ہی پڑے گا۔"

چمپا یہ مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ اس نے بڑے مہاراج کو کیا مشورہ دیا ہے۔ اسی لئے میرا خون کھول اٹھا۔ چمپا کے الفاظ میری سماعت میں گونج رہے تھے۔ "میں نے بڑے مہاراج کو مشورہ دیا ہے کہ وہ تیری مرضی اور آمادگی کو بھول جائیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے تجھے فتح کر لیا تو پھر تیرا سارا غرور خاک میں مل جائے گا۔ پھر تُو خود ہی کسی بولائی ہوئی کتیا کی طرح ان کے پیچھے دم ہلاتی پھرے گی۔" بڑے مہاراج کا اشارہ اسی مشورے کی طرف تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ زبردستی مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی دھمکی دے رہا تھا۔

اس عرصے میں انگیٹھی پر رکھا ہوا توا بالکل سرخ ہو چکا تھا۔

"معبلہ! اب ایک اور تماشا دیکھ۔ یہ تماشا میں تجھے اس لئے دکھا رہا ہوں کہ میری بات پر یقین کر لے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ تماشا دیکھ کر تیری روح میں کرچیاں سی اتر جائیں گی لیکن اسی کے ساتھ تو یہ

بھی جان لے گی' میرے دھیان کی ڈور کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ میں اونچے اونچے پہاڑوں پر بھی کمند پھینک سکتا ہوں۔" وہ یہ کہتے ہوئے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدانے لگا۔ پھر اس نے پلٹ کر میری آنکھوں پر پھونک ماری۔

پھونک مارنے سے میری پلکیں لمحہ بھر کو جھپک گئیں۔ اس کے بعد جیسے ہی میری نظر سامنے کھڑے ہوئے پا بہ زنجیر شخص پر پڑی' میں چیخ اٹھی۔ "نضار!"

نضار نے میری طرف نگاہ اٹھائیں وہ مجھے رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سزا پر عمل کیا جائے۔" میرے اعصاب پر دوسرا چھناکا ہوا۔ یہ آواز سو فیصد میرے دشمن ژیان کی آواز تھی۔ وہ میری کرسی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔

"نہیں۔" میں پوری قوت سے چیخی۔

بھاری تن و توش والے جلاد کا ہاتھ بلند ہوا۔ چوڑے پھل والی تلوار نضار کی گردن کے پچھلے حصے پر پڑی اور اس کا سر کٹ کر نیچے گرا۔ کٹی ہوئی گردن سے خون کا فوارہ بلند ہوا اور اسی وقت گردن پر دہکتا ہوا لوہے کا توا رکھ دیا گیا۔ "رقص بسمل" شروع ہو گیا۔ نضار کا کٹا ہوا سر زمین پر اچھل رہا تھا اور میری نگاہ اسی پر جمی ہوئی تھی کہ ایک بار پھر میری پلکیں جھپک گئیں۔ میری آنکھوں پر پھونک ماری گئی تھی۔

منظر ایک بار پھر بدل چکا تھا۔ کٹا ہوا سر سیاہ فام شخص کا تھا' نضار کا نہیں۔ کچھ دیر کے لئے بڑے مہاراج نے مجھے اپنی شیطانی قوتوں کے اثر میں لے کر فریب نظر اور فریب سماعت کا شکار بنا دیا تھا۔ اس طرح مجھ پر وہ شاید یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ بڑے مہاراج کا ایک چیلا شمبھو جب مجھے فریب نظر میں مبتلا کر کے ژیان کا چہرہ دکھا سکتا تھا تو پھر وہ تو بڑا مہاراج تھا' بڑا شیطان۔

وہ صرف چند ہی لمحے تھے جب میں نے وہ ہولناک منظر دیکھا تھا' مگر انہی چند لمحوں میں جیسے میری روح میں نشتر اتر گئے تھے۔ بڑے مہاراج نے غلط نہیں کہا تھا۔

پھر جب "رقص بسمل" تھم گیا تو سیاہ فام شخص کا سربریدہ جسم گر پڑا۔

"اب تو دیکھ معبلہ کہ صرف تجھے ہی جسموں کو سوکھی لکڑیوں کی طرح جلانا نہیں آتا۔" یہ کہتے ہی بڑے مہاراج نے "جے درگا مائی" کا نعرہ بلند کیا' پھر جانے کیا بڑبڑانے لگا۔ وہ الفاظ میرے لئے ناقابل فہم ہی تھے۔

چند لمحوں بعد بڑے مہاراج کی آنکھوں سے تیز روشنی خارج ہونے لگی۔ وہ روشنی جیسے ہی سیاہ فام شخص کے جسم اور قریب موجود گردن پر پڑی' آگ لگ گئی۔ سیاہ فام شخص کا جسم واقعی کسی سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح جلنے لگا تھا۔ تیز روشنی دوبارہ بڑے مہاراج کی آنکھوں میں سما کر معدوم ہو گئی۔

"جے ہو .... بڑے مہاراج کی جے ہو۔" وہاں موجود سارے لوگ زور زور سے چیخنے لگے۔ ان میں داسیوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

سیاہ فام شخص کا جسم راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ اسی کے ساتھ لوہے کی وہ زنجیریں بھی پگھل گئی تھیں جن میں اسے جکڑا گیا تھا۔

"میری برتری مان لے معبلہ! میں تجھے اپنی شکتی بھی دے دوں گا۔" وہ میری طرف مڑ کر کہنے لگا۔

میرے جی میں آئی کہ کہہ دوں' میں تجھ پر اور تیری شکتی پر تھوکتی ہوں' مگر خاموش رہی۔ اس سے کچھ بھی حاصل نہیں تھا۔ میں پہلے بھی ایک مرتبہ اس کی قید میں رہ چکی تھی۔ میں نے اسے برا بھلا کہا تھا تو مجھے اس کی سخت سزا بھگتنا پڑی تھی۔

"تو زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی' مگر مجھے معلوم ہے تیرے دل میں کیا ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کر دھیرے سے ہنسا۔ "میرے سارے جیون میں تو پہلی عورت ہو گی معبلہ کہ جو اپنی مرضی سے میری آغوش کی زینت نہیں بنے گی۔ یقین کر کہ میں نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا۔ میں تو سدا سے خود محبوب بنتا رہا ہوں۔ کبھی مجھے خود پہل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی' پرنتو لگتا ہے کہ تیرے معاملے میں مجھے اپنا یہ اصول توڑنا پڑے گا۔ پھر بھی میں آخری کوشش ضرور کروں گا۔ کیا خبر میرا بھگوان میری سن ہی لے اور تیرا پتھر دل پگھل جائے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور میرے جسم کو کرسی سے اٹھا لیا۔ "پھول سا بدن ہے تیرا۔" اس کی آواز جیسے نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ مجھے اپنے بازوؤں پر اٹھائے ایک طرف بڑھنے لگا۔ مختلف پُرپیچ راہداریوں سے گزرتا ہوا وہ مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ کمرہ بڑا اور کشادہ تھا۔ ایک جانب دیوار سے لگی اونچی مسہری پر سفید بے داغ چادر بچھی تھی اور سرہانے تکیہ رکھا تھا۔ مسہری خاصی بڑی تھی۔ اس نے مجھے مسہری پر لٹا دیا۔

"چمپا!" اس نے آواز دی۔

دوسرے ہی لمحے چمپا وہاں ظاہر ہو گئی۔ "جی بڑے مہاراج!" وہ جھک کر بولی۔

"میرا وچار یہ ہے کہ تیرے مشورے پر عمل کرنے سے پہلے آخری کوشش کر لی جائے۔" بڑے مہاراج نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"یہ وہ پتھر ہے مہاراج کہ اس میں جونک نہیں لگے گی۔ ساری داسیاں مل کر اسے راہ پر نہیں لا سکیں جب کہ یہ پوتر جل بھی پی چکی تھی۔ پتا نہیں' اس کے پاس کیا ایسی شکتی ہے کہ راہ پر آتے آتے یہ ایک دم پلٹ جاتی ہے۔"

"اس کی آگ ابھی اسی کے اندر ہے چمپا! ایک بار جب یہ آگ باہر نکل گئی' اسے نکاسی کا رستہ مل گیا تو پھر شاید یہ کبھی نہ پلٹے۔ میں نے اسی کارن تو تیری بات مان لی ہے اور آج اس پر آمادہ ہو گیا ہوں کہ اپنا ایک اصول توڑ دوں۔" بڑے مہاراج نے کہا۔ "پھر بھی کیا خبر یہ راضی ہو ہی جائے' لا اسے پہلے پوتر جل لا کے پلا۔" پھر وہ مسہری پر پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔

بڑے مہاراج نے جو کچھ کہا تھا' اسے سن کر میری روح تک لرز گئی تھی۔ میری عزت و آبرو خطرے میں پڑنے والی تھی۔ چمپا غائب ہونے کے بعد جب دوبارہ ظاہر ہوئی تو اس کے ہاتھ میں مجھے ایک خوبصورت صراحی اور پیالہ نظر آیا۔ ایسی ہی صراحی میں پہلے بھی دیکھ چکی تھیں داسیوں نے مجھے ایسی ہی ایک صراحی سے ٹھنڈا میٹھا مشروب پلایا تھا جس کو پی کر مجھ پر بے خودی سی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ مشروب نہیں پیوں گی۔

"پیالے میں پوتر جل انڈیل کر دے چمپا! میں اسے اپنے ہاتھ سے پلاؤں گا۔" بڑے مہاراج نے چمپا کو حکم دیا۔

چمپا نے حکم کی تعمیل میں صراحی سے پیالے میں مشروب انڈیلا اور پھر پیالہ بڑے مہاراج کو تھما دیا۔ بڑے مہاراج نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مجھے اٹھایا اور وہ پیالہ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے سختی سے دونوں ہونٹ بھینچ لئے۔

"کیا ہوا' کیوں نہیں پی رہی؟ ارے پگلی یہ پوتر جل ہے' پی کر تو دیکھ۔" بڑے مہاراج نے نرمی سے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے انکار میں سر ہلا دیا' پھر بولی۔ "ایک شرط پر پیوں گی کہ ایک گھونٹ میں اس پیالے سے پیوں گی ایک تم۔"

"اور تُو سمجھتی ہے کہ اس کے بعد میرا دیہانت ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔ "ارے یہ پوتر جل ہے' تیرے اندر جو زہر بھرا ہے' اس پر اثر نہیں کرے گا۔ اچھا تُو ایک گھونٹ پی کر پیالہ مجھے دے دے' میں تجھے پی کر دکھاؤں گا۔"

میں چکرا کر رہ گئی کہ وہ کیسا مشروب تھا جس پر میرے زہر کا اثر بھی نہیں ہو سکتا تھا؟ دوسرا خیال مجھے یہ آیا کہ بڑے مہاراج کو یہ بھی معلوم ہے' میں زہریلی ہوں۔ چمپا بھی مجھ سے اس کا اظہار کر چکی تھی۔ میں تذبذب کا شکار ہو گئی کہ وہ مشروب پیوں یا نہ پیوں؟

"جب میں نے تیری شرط مان لی تو پھر کیوں نہیں پی رہی؟" وہ مجھ سے بولا۔

میں نے سوچا' کم از کم یہ دیکھنا تو چاہئے کہ بڑے مہاراج کے دعوے میں کہاں تک صداقت ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا' میرا جوٹھا پانی یا دودھ پی کر آج تک کوئی جاندار زندہ نہیں بچ سکا تھا' یہاں تک کہ خطرناک زہریلے سانپ بھی زندہ نہیں رہے تھے۔

"لاؤ' پلاؤ۔" میں نے بڑے مہاراج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے میری اور اس کی نظریں مل گئیں اور میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔ چمپا سے نظر ملاتے ہوئے میں چوکنا اور محتاط رہتی تھی' مگر بڑے مہاراج کے سلسلے میں مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ یہ میرے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔

اس نے میری طرف سے نظریں ہٹائے بغیر پیالہ میرے منہ سے لگا دیا اور پھر مشروب پینے کے لئے کہا۔

"پی جا' سارا جل پی جا۔" مجھے بڑے مہاراج کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی سنائی دی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں سارا مشروب پی گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا ذہن اس کے قابو میں ہے۔ وہ مجھے جو حکم دے گا' میں اس کی تعمیل کروں گی۔

"تُو میری ہے نا معبلہ!"

"ہاں میں تمہاری ہوں بڑے مہارج!" میرے ہونٹ جیسے خود بخود حرکت کرنے لگے۔

"میں تجھے جو بھی حکم دوں گا تُو مانے گی' مانے گی نا' تُو میری داسی ہے۔"

"تم جو حکم دو گے' میں مانوں گی۔ میں تمہاری داسی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میرے رگ و پے میں نشہ سا تیرنے لگا۔

اس نے میری طرف سے نظریں ہٹائے بغیر چمپا سے کہا۔ "یہ پیالہ لے لے اور تُو چلی جا۔ اب تیری ضرورت نہیں رہی۔"

"مجھے یہیں رہنے دیں مہاراج! میں .... میں بھی اس کا غرور خاک میں ملتے دیکھوں گی۔"

"اچھا تو پھر دیکھ۔" بڑے مہارج نے اسے وہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "معبلہ! میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دے۔"

میرے دونوں ہاتھ جیسے خود بخود اٹھے اور وہ مجھ پر جھک گیا۔ میری بانہیں اس کے گلے کا ہار بن چکی تھیں۔ سب کچھ دیکھنے' سننے اور سمجھنے کے باوجود کہ کیا ہونے والا ہے' میں بڑے مہاراج کا حکم ماننے پر مجبور تھی۔

☆======☆======☆

اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اپنے قابو میں نہیں ہوں۔ ہر طرف جیسے رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے' گلابی رنگ' دنیا شاید اس سے پہلے کبھی اتنی حسین' اتنی رنگین نہیں تھی۔ کیف و سرمستی میرے انگ انگ سے ابل رہی تھی۔ کوئی سیال آگ تھی جو میرے وجود کی گہرائیوں سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ میں جیسے تمام کی تمام خوشبو کے ایک دائرے میں سمٹ گئی تھی۔ خوشبو کا یہ دائرہ کبھی پھیلتا کبھی سمٹتا' گلاب کی پنکھڑیاں کھلتیں اور بند ہو جاتیں' طلب و خواہش کی تتلیاں ان پر منڈلانے لگتیں۔ پھر میں نے خوابوں کے دھنک رنگ میں آسمان پر ایک آشنا چہرہ ابھرتے دیکھا۔ اس چہرے کے خد و خال دہرے تھے۔ وہ دو چہرہ وجود مجھ پر چھا گیا۔ وہ نصار بھی تھا اور احرس بھی اور یہ تجربہ میرے لئے بہت عجیب تھا۔ پل پل وہ دو چہرہ وجود مجھے سمیٹ رہا تھا۔ بے خودی و نشاط کے ان لمحوں میں وہ دونوں ہی میری طلب بن گئے تھے۔

"احرس!" میں نے ان میں سے ایک کو پکارا۔

"ہوں۔" اس کی آشنا آواز ابھری۔

"نصار!" میرے لبوں نے پھر حرکت کی۔

"معبلہ' میری جان' میری زندگی!" نصار کی آشنا آواز سنائی دی۔ "آؤ معبلہ! ہم دونوں کہیں دور' بہت دور نکل چلیں۔"

میں اس دو چہرہ وجود کے ساتھ خوابوں اور خواہشوں کے جزیرے میں نکل آئی۔ سفر شوق جاری تھا کہ اس آشنا مسافر نے سرکش چٹانوں کو فتح کر لیا۔ میری جیت' ہار جانے ہی میں تھی' سو میں ہار گئی۔ سرکش چٹانوں کی تسخیر کے بعد منزل شوق کے اس مسافر کا رخ اب نشیب کی طرف تھا۔ نشیب میں ایک کشتی جذبات کے بلاخیز طوفان میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ لہروں کے دوش پر کبھی وہ کشتی اوپر اٹھتی' کبھی

نیچے ہو جاتی۔ مسافر نے کشتی پر سوار ہو کر اسے طوفان سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچانے کے لئے پتوار اٹھا لئے۔ طوفان کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ کف در دہن لہروں کا شور ابھرا' مگر مسافر نے ہمت نہیں ہاری۔ کشتی اس کے قابو میں تھی۔ پتوار اٹھائے ہوئے وہ سنبھلا۔ وہ اب سفر شروع کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا کہ عین اسی لمحے زبردست دھماکہ ہوا جیسے کہیں بجلی گری ہو۔ مسافر کے ہاتھوں سے پتوار چھوٹ گئے اور پھر سارا طلسم ٹوٹ گیا۔

میں نے در و دیوار کو ہلتے دیکھا۔ نہ وہاں نضار تھا نہ احرس۔ مجھے اپنے قریب صرف بڑا مہاراج چندر موہن نظر آیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ وہ اپنے بے ترتیب لباس کو سمیٹتا ہوا تیزی سے اٹھا اور مسہری سے اتر گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ معاً میرے گرد دودھیا حصار قائم ہو گیا اور اسی کے ساتھ میرے اعصاب کسی نادیدہ گرفت سے آزاد ہو گئے۔ میں ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی اور اپنے قدموں پر پڑا ہوا باریک گلابی لبادہ اٹھا لیا۔ ستر پوشی کے لئے مجھے وہ لبادہ ناکافی معلوم ہوا تو میں نے مسہری پر بچھی ہوئی چادر گھسیٹ کر اپنے جسم سے لپیٹ لی۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ کچھ دیر پہلے تک میں بڑے مہاراج کے سحر میں گرفتار تھی۔

در و دیوار کی لرزش اب ختم ہو چکی تھی۔ میں' بڑے مہاراج کے دست ہوس سے بال بال بچ گئی تھی۔ اس نے مجھے شکار کرنے کے لئے فریب نظر اور فریب سماعت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے لئے بڑے مہاراج نے احرس اور نضار کے قرب کا فریب دیا تھا۔ یہ ایسا حسین فریب تھا کہ شاید میں اس سے نہ بچ سکتی' مگر بروقت میری مدد کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مدد عظیم مہیمن ہی کی طرف سے تھی۔ طلسم ٹوٹنے کے بعد چمپا مجھے اس کمرے میں دکھائی نہیں دی تھی۔ غالباً وہ پہلے ہی راہِ فرار اختیار کر چکی تھی۔

جیسے ہی میں نے اس کمرے سے قدم باہر رکھا' مجھے راہداری میں دو داس نظر آئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں چوڑے پھل والی تلواریں اور ترشول تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف جھپٹے۔ حالانکہ دودھیا حصار پہلے ہی قائم ہو چکا تھا۔ وہ جیسے ہی میرے قریب پہنچے' وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ دونوں ہی چیخ مار کے دور جا گرے اور پھر اٹھ نہ سکے۔ اسی وقت مجھے مانوس خوشبو اپنے قریب محسوس ہوئی اور میں چونک اٹھی۔ عظیم مہیمن کی کاہنہ خجیرہ وہاں پہنچ چکی تھی۔ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ بدی کے خلاف نیکی کی قوتیں متحرک ہو چکی تھیں۔ مجھے علم تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ خجیرہ ایک مرتبہ پہلے بھی مجھے وہاں سے نکال کر لے جا چکی تھی۔

خجیرہ کی خوشبو کا تعاقب کرتے ہوئے میں مختلف راستوں اور راہداریوں سے گزرتی رہی۔ میں نے اسی دوران میں ایک جگہ ملبہ دیکھا۔ کچھ ہی حصہ منہدم ہونے سے رہ گیا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ یہ اس عمارت کا وہی حصہ تھا جو بڑے مہاراج کی عیاشی کے لئے مخصوص تھا۔ ملبے میں مجھے کئی داسیوں کے جسم دبے نظر آئے۔ غالباً اسی حصے کے انہدام کی وجہ سے وہ دھماکہ ہوا تھا جو میں نے کچھ دیر پہلے سنا تھا۔ اس موقع پر مجھے لعنتی ساحر زعیم کے پہاڑ کی تباہی یاد آ گئی۔ اسے تباہ کرنے والی خجیرہ ہی تھی اور یقیناً بڑے مہاراج کے اس عشرت کدے کو بھی خجیرہ ہی نے نیست و نابود کیا تھا۔

بلند چبوترے پر رکھا ہوا وہ ایک بڑا سا بت تھا جسے میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ میں نے ہلکی سی گڑگڑاہٹ بھی سنی تھی۔ خجیرہ کی خوشبو ہی مجھے وہاں تک لے کر آئی تھی۔ بت اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو نیچے اترنے کے لئے سیڑھیاں نظر آئیں۔ خجیرہ کی خوشبو مجھے اسی طرف محسوس ہوئی۔ میں اس سے لاعلم ہی تھی کہ وہ بت کس طرح اپنی جگہ سے حرکت کرنے لگا تھا۔ جس چبوترے پر وہ بت رکھا تھا اس کے گرد دائرے کی صورت میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ سیڑھیاں کسی بھی طرف سے اس بت تک پہنچنے کے لئے بنائی گئی ہوں گی۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ بت اپنی جگہ سے حرکت کرنے لگا تھا۔ بت کے ہٹنے سے جو خلا نمودار ہوا اسی پر سیڑھیاں نظر آئی تھیں۔ میں ان سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔ میں نے نیچے اترتے ہی اس جگہ کو پہچان لیا۔ یہ وہی تہہ خانہ تھا جہاں مجھے اور شہزاد کو قید کیا گیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ مجھے خجیرہ وہاں کیوں لائی تھی۔

"خاتون!" شہزاد کی خوفزدہ سی آواز مجھے سنائی دی۔ "آپ .... آپ مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر کہاں .... کہاں چلی گئی تھیں؟"

میں' شہزاد کے سوال کو نظرانداز کرتی ہوئی تیزی سے اپنے سوٹ کیسوں کی طرف بڑھی۔ میں نے ایک سوٹ کیس کھول کر ساڑھی' بلاؤز وغیرہ نکالا۔ لباس زیب تن کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ گلابی لبادہ اور وہ چادر میں نے وہیں چھوڑ دی جو اپنے جسم سے لپیٹے ہوئے تھی۔ پھر میں نے دو سوٹ کیس اٹھا لئے اور شہزاد کو مخاطب کیا۔ "جلدی چلو۔"

اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر تیسرا سوٹ کیس اٹھا لیا اور میرے پیچھے چلنے لگا۔ خجیرہ کی خوشبو ابھی رخصت نہیں ہوئی تھی۔ وہ میری رہنمائی کر رہی تھی۔ میں اس تہہ خانے سے باہر آ گئی اور پھر چبوترے سے اترنے کے لئے پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی بت نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔

"وہ .... وہ خاتون! .... بت ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔" شہزاد کی ڈری ڈری سی آواز عقب سے آئی۔ اس وقت شاید وہ اسی بت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کرنے دو تعاقب۔" میں نے بغیر مڑے کہا اور تیزی سے آگے قدم بڑھانے لگی۔

وہاں سے میں مندر کے ایک ایسے حصے میں نکل آئی جو شاید یاتریوں کے لئے مخصوص تھا۔ دائیں جانب کچھ فاصلے پر درگا مائی کے قدیم مندر کی عمارت نظر آ رہی تھی اور بائیں طرف بڑا سا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ عقبی سمت حجرے بنے ہوئے تھے جن میں سے بیشتر آباد تھے۔ وہاں لوگ آ جا رہے تھے' مگر کسی نے بھی میری یا شہزاد کی طرف توجہ نہیں دی۔ میں تیز قدمی کے ساتھ مندر کی حدود سے باہر نکل آئی۔ خجیرہ کی خوشبو اب رخصت ہو چکی تھی۔

کچھ دور پیدل چل کر میں ایک سڑک پر نکل آئی اور مجھے ایک خالی ٹیکسی دکھائی دے گئی۔ اس وقت شام کے چار بجنے والے تھے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ شام کو ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن سے دہلی کے لئے کوئی ٹرین مل سکتی تھی یا نہیں۔ مگر میں نے ریلوے اسٹیشن ہی چلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سوچا کہ اگر کوئی ٹرین مل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ دیکھا جائے گا۔ ایک رات کسی ہوٹل میں بھی گزاری جا سکتی تھی۔ مجھے اتنا بہرحال

معلوم تھا کہ رات کے وقت ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن سے نہ کوئی ٹرین روانہ ہوتی ہے نہ آتی ہے۔ یہ ریلوے اسٹیشن غالباً سارے ہندوستان میں اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے منفرد تھا۔ میں نے ٹیکسی کو ہاتھ اٹھا روک لیا۔

"ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

ڈرائیور نے اقرار میں سر ہلا دیا اور تینوں سوٹ کیس ڈکی میں رکھ لئے۔ میں اور شہزاد ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ذرا ہی دیر بعد ٹیکسی کالی گھاٹ سے ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گئی۔ شہزاد کچھ سہما سہما تھا۔ مجھے اس کا سبب معلوم تھا۔ گزشتہ چند گھنٹوں کے غیر معمولی واقعات نے یقیناً اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے شہزاد! تم چپ چپ سے کیوں ہو؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"نن .... نہیں تو خاتون! میں .... میں ٹھیک ہوں۔" اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

"کیا تمہیں میرے ساتھ اپنے وطن چلنے کی خوشی نہیں؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"خوشی .... خوشی کیوں نہیں خاتون! مم .... میں تو بہت .... بہت خوش ہوں۔"

"تمہیں دیکھ کر ہر شخص یہی سمجھے گا کہ تم واقعی بہت خوش ہو۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔ اس سے میرا مقصد یہی تھا کہ وہ نارمل ہو جائے۔

ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن پہنچنے تک شہزاد کا خوف بڑی حد تک دور ہو چکا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ دہلی جانے والی ایک ٹرین آدھے گھنٹے بعد روانہ ہو گی۔ یہ جان کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ میں نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ خرید لئے۔ سیٹ کے ساتھ برتھ بھی تھی۔ جس کے لئے مجھے کچھ پیسے الگ سے ادا کرنا پڑے تھے۔

ٹرین میں خاصا رش تھا مگر صرف تھرڈ کلاس کی حد تک۔ فرسٹ کلاس کے آرام دہ ڈبے تقریباً خالی پڑے تھے۔ ہم ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ اس میں متوسط عمر کا ایک انگریز اور ایک نوجوان عورت بھی پہلے سے پہلے بیٹھے تھے۔ نوجوان عورت بھی سفید فام تھی اور اس انگریز کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ رنگت میری بھی گوری ہی تھی مگر میرے جسم پر ساڑھی تھی جس کی وجہ سے میں ہندوستانی لگ رہی تھی۔ پھر یہ کہ میرے ساتھ شہزاد بھی تھا جو سو فیصد ہندوستانی تھا۔ مجھے اور شہزاد دونوں کو شاید اس غیر ملکی جوڑے نے ہندوستانی سمجھ کر بُرا سامنہ بنایا۔ اپنے غلاموں کو فرسٹ کلاس میں سفر کرتے دیکھ کر غالباً انہیں ناگواری محسوس ہوئی تھی۔

حالانکہ پورا ڈبہ ہی خالی پڑا تھا لیکن میں دانستہ انہی دونوں کے سامنے والی نشست پر بیٹھی۔ ان دونوں کا منہ اور بھی بن گیا مگر ظاہر ہے' میں کیوں پرواہ کرتی۔ ٹرین کی روانگی میں کچھ دیر تھی کہ اسی ڈبے میں ایک اور ادھیڑ عمر شخص سوار ہوا۔ اس کے سر پر مخصوص وضع کی پگڑی اور گلے میں موتیوں کی مالائیں پڑی تھیں۔ وہ بند گلے کا جے پوری کوٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سیدھے کان کی لو چھدی ہوئی تھی۔ جس میں سونے کی بالی پڑی تھی۔ دو نوکر بھی اس کے ساتھ تھے جو سامان رکھنے لگے۔ اپنے طرز لباس اور وضع قطع سے وہ ادھیڑ عمر شخص کسی دیسی ریاست کے برسراقتدار خاندان کا فرد معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے ملازمین اسے "راجہ صاحب" کہہ رہے تھے۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر اور نوجوان انگریز عورت پر ڈالی' پھر کھڑکی کے قریب سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"تم اپنے ڈبے میں جاؤ۔" اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنے نوکروں کو حکم دیا اور اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سگار نکال لیا۔

اس کے دونوں نوکر ڈبے سے اتر گئے۔ غالباً وہ تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ سگار سلگا کر کش لیتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر ہم دونوں عورتوں پر باری باری نگاہ ڈالی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا چاہتا ہوں حیرت کی بات یہ تھی کہ اس دوران اس نے ایک بار بھی شہزاد یا انگریز مرد کی طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔ پھر اس کی نظر مجھی پر جم گئی۔ شاید اس نے نظربازی کے لئے میرا انتخاب کر لیا تھا۔ یوں براہ راست کسی عورت کو دیکھے جانا غیر شائستہ حرکت ہے' مگر شاید کچھ لوگ خود کو ہر قید سے آزاد تصور کرتے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے لگتا تھا۔

ٹرین تین مرتبہ وقفے وقفے سے سیٹی دے کر اپنے طویل سفر پر روانہ ہو گئی۔

مجھے اس ادھیڑ عمر شخص کے اس طرح دیکھے جانے پر الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے شہزاد سے گفتگو کرنے لگی۔

"تمہارے شہر میں تاریخی اور قابل دید مقامات تو خاصے ہوں گے نا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں خاتون!" شہزاد نے اقرار میں سر ہلایا۔ "قطب مینار ہے' لال قلعہ ہے' جامع مسجد ہے' اس کے علاوہ بزرگان دین کے مقبرے ہیں۔ آپ کو شاید علم ہو خاتون کہ دلی بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ کہلاتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے شہزاد کے لہجے میں فخر سا تھا۔

"تم مجھے یہ سارے مقامات دکھانا۔"

"کیوں نہیں خاتون! ضرور دکھاؤں گا۔"

"تم شاید پہلی دفعہ دہلی جا رہی ہو؟" اچانک ادھیڑ عمر شخص نے کسی تعارف کے بغیر مجھے مخاطب کیا۔ انداز تصدیق طلب ہی تھا۔

میں ایسی لاتعلق بن گئی جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔" اس مرتبہ ادھیڑ عمر کی آواز قدرے بلند تھی۔ "جواب نہ دینا بے ادبی ہے۔"

"ادب اور اخلاق سے تمہارا کیا تعلق؟" میرے لہجے میں ناگواری تھی۔ "تمہارا اس سے کیا تعلق کہ میں پہلی مرتبہ دہلی جا رہی ہوں یا آخری مرتبہ' تم کون ہو یہ پوچھنے والے؟"

"لڑکی!" وہ شخص تقریباً چیخ اٹھا۔ "مت بھولو کہ تم راجہ سکھ دیو آف بڑودا اسٹیٹ سے مخاطب ہو۔" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

"مجھے کچھ بھولنے یا یاد رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ تم کون ہو' نہ مجھے یہ جاننے کا شوق ہے۔" میں اس کے غصے کی پرواہ کئے بغیر بولی۔

اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے غرا کر کہا۔ "تم دہلی ہی چل رہی ہو نا؟ وہاں چل کر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں؟"

"دھمکی دے رہے ہو؟" مجھے بھی غصہ آ گیا۔

"یہ دھمکی نہیں، حقیقت ہے۔ ورنہ تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ معافی مانگ لو۔" اس کے لہجے میں تکبر تھا۔

"اور اگر میں معافی نہ مانگوں تو، کیا بگاڑ لو گے تم میرا؟"

"تم یہ سوال مجھ سے کر رہی ہو۔ راجہ سکھ دیو آف بڑودا اسٹیٹ سے۔ کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہی ہو تم۔ رحم آ رہا ہے مجھے تم پر۔"

"اچھا اب اپنی چونچ بند رکھو، میں بکواس سننے کی عادی نہیں ہوں۔ تم جیسے چڑ قناطی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

یہ سنتے ہی وہ آپے سے باہر ہو گیا اور شدید غصے کے عالم میں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم .... تم میری توہین کر رہی ہو، تمہیں اس کی سزا معلوم ہے؟"

"آرام سے بیٹھو، زیادہ تیس مار خاں بننے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

ہم سفر انگریز غالباً تھوڑی بہت اردو بھی جانتا تھا۔ اس نے پہلی بار مداخلت کی، مگر اس سے پہلے وہ اپنا تعارف کرانا نہیں بھولا تھا۔ اس نے اپنا نام فلپ بتایا تھا۔ راجہ سکھ دیو کو اس نے ہزہائی نیس ہی کہا تھا۔ فلپ کے سمجھانے بجھانے پر راجہ سکھ دیو دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا، مگر ابھی تک وہ اسی طرح گھور رہا تھا جیسے پھاڑ کھائے گا۔ میں نے اب قطعی برعکس رویہ اختیار کر لیا تھا۔ اسے جلانے کے لئے میں مسکرائے جا رہی تھی۔

"شہزاد! تم نے کبھی کوئی برف خانے کا چمار دیکھا ہے؟" میں نے راجہ سکھ دیو کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں سوال کیا تاکہ وہ سن لے۔

"کیا .... کیا کہا تُو نے؟" راجہ سکھ دیو دھاڑا۔ وہ اب تے پر اتر آیا تھا۔

"جو سنا تُو نے۔" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"پلیز .... پلیز ہزہائی نیس!" انگریز اپنی سیٹ سے اٹھ کر ہم دونوں کے درمیان آ گیا۔ کیونکہ راجہ سکھ دیو اٹھ کر میری طرف جھپٹ پڑا تھا۔

"اس سے کہہ دو کہ یہ خاموش بیٹھے ورنہ میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گی۔" راجہ سکھ دیو نے انگریزی جھاڑی۔

"اور مسٹر فلپ! اس بوڑھے گدھ کو بھی آپ بتا دیں کہ اگر اب اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پھوڑ دوں گی۔" میں بھی روانی سے انگریزی بولی۔

راجہ سکھ دیو ایک بار پھر ہتھے سے اکھڑنے لگا۔ فلپ نے مجھ سے درخواست کی کہ میں خاموش رہوں۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے راجہ سکھ دیو کو ٹھنڈا کیا۔ ہمارے درمیان دوبارہ جھگڑا نہ ہو جائے اس

لئے فلپ نے ایک تجویز پیش کی۔ اس پورے ڈبے میں ہم ہی پانچ مسافر تھے جو ایک ہی جگہ بیٹھے تھے۔ فلپ کی تجویز یہ تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی کسی اور سیٹ پر جا کے بیٹھ جائے۔ تجویز مناسب ہی تھی۔

"میں ہرگز اپنی سیٹ نہیں چھوڑوں گا۔" راجہ سکھ دیو سخت لہجے میں بولا۔ "اس عورت سے کہو کہ یہ یہاں سے اپنا منہ کالا کر جائے۔"

"یہ ڈبا اس کے باپ کی جاگیر نہیں مسٹر فلپ! اس گدھ سے کہیں کہ کسی اور ٹھونٹ پر جا کر بیٹھ جائے۔" میں بول اٹھی۔

"پھر زبان چلانے لگی تُو!" راجہ سکھ دیو گرجا۔

"تُو نے بھی تو دوبارہ بکواس شروع کر دی۔ دفع کیوں نہیں ہو جاتا یہاں سے؟" میں اس سے بھی زیادہ چیخ کر بولی۔

"اس وقت اگر میری دو نالی میرے پاس ہوتی تو میں تجھے گولی مار دیتا!" وہ براہ راست مجھی سے مخاطب تھا۔

"گنجے کو اسی لئے ناخن نہیں ملتے کہ کہیں وہ کھجا کھجا کے نہ مرجائے۔" میں نے اس پر فقرہ چست کیا۔ "تُو مجھے کیا گولی مارے گا، کبھی کسی طوطے نے بھی توپ چلائی ہے۔"

جھگڑا پھر بڑھنے لگا تو فلپ نے ہم دونوں ہی سے خاموش رہنے کی درخواست کی اور دوبارہ اپنی تجویز دہرائی۔

"یہاں میرا سامان رکھا ہے اور میرے ملازمین اس ڈبے میں نہیں کہ دوسری جگہ سامان اٹھا کر رکھا جا سکے۔" راجہ سکھ دیو نے عذر پیش کیا۔

میرے جی میں آیا کہ کہہ دوں، کیا تیرے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں؟ خود سامان نہیں اٹھا سکتا؟ مگر مجھے فلپ کا خیال آ گیا جو اس جھگڑے کو کسی طرح نمٹانا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے، اب جس اسٹیشن پر ٹرین رکے، آپ اپنے نوکروں کو بلا کر کہیں اور سامان رکھوا لیں۔" فلپ نے گویا اپنی دانست میں مسئلہ حل کر دیا۔

اس پر راجہ سکھ دیو منہ بنا کر کہنے لگا۔ "لیکن مسٹر فلپ! تم اس عورت سے کیوں نہیں کہتے کہ یہ............"

"پلیز ہزہائی نیس!" فلپ درمیان میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "آپ ان کے لئے کچھ کہیں گے تو وہ آپ کے لئے بولیں گی۔ پلیز آپ لوگ ایک دوسرے سے بات ہی نہ کریں۔"

"مجھے کیا پڑی ہے، اس خبیث عورت کے تذکرے کی۔"

"اور مجھے بھی اس لعنتی بڈھے کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے بھی جواباً کہہ دیا۔

"تُو مجھے لعنتی کہہ رہی ہے ذلیل عورت!"

"اور تُو مجھے خبیث کہہ رہا ہے کمینے!"

"پلیز .... پلیز ...." فلپ دہائیاں دینے لگا۔

"خاتون! خدا کے لئے آپ ہی چپ ہو جائیں۔ بکنے دیں اسے جو بکتا ہے۔" شہزاد پہلی مرتبہ بولا۔

"لو' اب ایک اور حرام زادہ بکواس کرنے لگا۔" راجہ سکھ دیو نے شہزاد کو بھی نہیں بخشا۔

شہزاد جو مجھے خاموش رہنے کی تاکید کر رہا تھا' گالی کھا کر ایسا بے مزہ ہوا کہ چپ نہ رہ سکا۔ "اپنی زبان کو لگام دیں راجہ صاحب! آپ کو مجھے گالی دینے کا کوئی حق نہیں۔"

"ابے تو بتائے گا مجھے کہ میں کیا حق رکھتا ہوں' کیا نہیں۔ اتنے جوتے ماروں گا کہ چاند پر ایک بال نظر نہیں آئے گا۔"

راجہ سکھ دیو محض اس بنا پر شہزاد کی بے عزتی کر رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ تھا۔ مجھے اسی لئے بولنا پڑا۔ "تم کچھ نہ بولو شہزاد! تم نے اس بھنگی کو راجہ صاحب کہہ دیا تو یہ اور بانس پر چڑھ گیا۔ یہ تو جوتے کا یار ہے' جوتا کاری کرتے رہو تو خوش رہتا ہے۔" میں نے یہ کہہ کر شہزاد کا بدلہ لے لیا۔

"مسٹر فلپ! اب میں اس سے زیادہ اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ اب آپ کو درمیان میں آنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی ہمیشہ کے لئے میں اس عورت کی زبان بند کئے دیتا ہوں۔ اس کے لئے میرے یہ دونوں ہاتھ ہی کافی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے راجہ سکھ دیو ایک مرتبہ پھر اپنی سیٹ پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہرگز نہیں ہز ہائی نیس! میں آپ کو قانون کو ہاتھ میں نہیں لینے دوں گا۔" فلپ نے انکار میں سر ہلایا۔

"میرا راستہ چھوڑ دو مسٹر فلپ!" راجہ سکھ دیو ضد کرنے لگا۔

"ہز ہائی نیس! کیا آپ ایک عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے اچھے لگیں گے؟" فلپ اسے سمجھانے لگا۔

میں دانستہ خاموش رہی۔ اگر راجہ سکھ دیو بھی چپ رہتا تو بات کبھی کی ختم ہو جاتی۔ مزید بات بڑھانے سے بدمزگی کے سوا کیا حاصل ہوتا۔ اس کے باوجود میں راجہ سکھ دیو کی برتری تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

"عورت سمجھ کر ہی تو میں نے اب تک اسے ڈھیل دے رکھی تھی' مگر یہ باز ہی نہیں آ رہی کسی طرح۔" راجہ سکھ دیو کچھ نرم پڑ گیا۔

"آپ بیٹھیں تو سہی ہز ہائی نیس!" فلپ نے کہا۔ "بات تو بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہے۔"

راجہ سکھ دیو' فلپ کی بات مان ہی گیا۔ "تم کہتے ہو تو بیٹھ جاتا ہوں ورنہ تو اس وقت دل کچھ اور ہی کہہ رہا ہے۔" راجہ سکھ دیو بولا۔ فلپ اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

مجھے پھر شرارت سوجھ گئی اور میں نے مسکراتے ہوئے راجہ سکھ دیو کو بڑے ادب سے مخاطب کیا۔

"میں بتاؤں راجہ صاحب کہ اس وقت آپ کا دل کیا کہہ رہا ہے۔"

"چپ رہو تم! میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتا۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"اب ایسا بھی کیا راجہ صاحب! میں نے تو سنا ہے کہ راجہ لوگ بڑے دل پھینک ہوتے ہیں۔ کیا

میں آپ کو اچھی نہیں لگ رہی؟ ایمان داری سے بتائیں۔" میں اسے گھنے لگی۔

"تم اگر بدزبانی نہ کرو تو خیر اتنی بری بھی نہیں ہو۔ اگر تم شادی شدہ نہیں تو میں تمہیں اپنے محل میں رکھ سکتا ہوں۔" میرے ذرا سی ڈھیل دینے پر وہ کچھ زیادہ ہی پھیل گیا۔

میں نے اس سے تفریح لینے کی خاطر کہا۔ "شادی شدہ ہونے سے کیا فرق پڑ جاتا ہے' راجہ صاحب!"

"دراصل مجھے سیکنڈ ہینڈ عورتیں پسند نہیں ہیں۔" اس نے بے حجابی سے کہہ دیا۔ یہ کہتے ہوئے اسے اتنا لحاظ بھی نہیں آیا کہ اس وقت ایک عورت سے ہمکلام ہے۔ پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم نے بتایا نہیں' شادی شدہ ہو یا کنواری ہو؟"

"میں نے ابھی شادی نہیں کی۔" میں نے بتایا۔

"اچھی بات ہے یہ۔" اس نے اطمینان سے سر ہلایا' پھر بولا۔ "ایک بات اور تمہیں پہلے سے بتا دوں کہ کچھ عورتیں شادی شدہ تو خیر نہیں ہوتیں' مگر کنواری بھی نہیں ہوتیں۔ سمجھ رہی ہو نا! میرا مطلب ہے کہ وہ شادی سے پہلے ہی اپنا کنوار پن کھو دیتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو میں ایک رات بھی اپنے محل میں برداشت نہیں کرتا اور پہلی ہی رات محل سے نکال دیتا ہوں' مگر سزا دے کر۔" وہ بڑی ڈھٹائی سے ہر بات صاف صاف بتا رہا تھا۔ یہ سب کچھ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ذرا بھی جھجک نہیں تھی۔

"ایسی عورت کو آپ کیا سزا دیتے ہیں راجہ صاحب؟" میں نے معلوم کیا۔

"ہمارے محلوں میں یہ سزا ایک رسم کی طرح ہے۔ اس رسم کو کواہن کنی کہا جاتا ہے۔ ایسی عورت جو خود کو کنواری بتا کر محل میں داخل ہو جائے اور اسے برتنے کے بعد جھوٹ کھل جائے تو اس کا سر مونڈ کر محل سے باہر ہانک دیا جاتا ہے۔ اسی کو کواہن کنی کی رسم کہتے ہیں۔" راجہ سکھ دیو نے بڑی بے غیرتی کے ساتھ وضاحت کی' پھر مجھ سے پوچھا۔ "تم تو کنواری ہی ہو گی نا! میرا مطلب ہے' کسی مرد نے تو ابھی تک تمہیں ہاتھ نہیں لگایا؟" وہ اس طرح پوچھ گچھ کر رہا تھا جیسے مجھے خریدنے کا ارادہ ہو۔

میں اس کے سوال کو نظرانداز کر گئی اور بولی۔ "کیا آپ مجھے اپنی بیوی بنائیں گے اور باقاعدہ شادی کریں گے؟"

"نہیں۔" اس نے انکار کر دیا۔ "بیوی ہے ہمارے محل میں۔ ہمارے دھرم میں ایک بیوی سے زیادہ رکھنے کی اجازت نہیں۔ ہاں' داسیاں جتنی چاہے رکھ سکتے ہیں۔"

"کتنی داسیاں ہیں آپ کے محل میں؟" میں نے دریافت کیا۔

"سو سے اوپر ہی ہوں گی' کبھی گن کر نہیں دیکھا۔"

"ان سے بچے بھی ہوتے ہوں گے؟"

"ہاں ہوتے ہیں' مگر انہیں راجکماروں کے برابر درجہ نہیں ملتا۔ جائیداد میں بھی ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اور نہ وہ یہ ادھیکار رکھتے ہیں کہ راج سنگھاسن پر بیٹھ سکیں۔" وہ بڑے اطمینان سے بتانے لگا۔

"ہاں' یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے کہ ہم کسی داسی کی خدمت سے خوش ہو کر اسے یا اس سے پیدا ہونے

والی اولاد کو جو چاہے بخش دیں۔ کئی داسیوں کو ہم نے الگ گھر لے کر بھی دے رکھے ہیں۔ ہر مہینے پابندی سے انہیں گھر خرچ پہنچ جاتا ہے۔ دیش کے سبھی بڑے بڑے شہروں میں ہماری داسیاں بڑے عیش و آرام کا جیون بیتا رہی ہیں۔ تم اگر ہماری داسی بن جاؤ تو ہم تمہیں بھی یہ سہولت دے سکتے ہیں۔ تم جس شہر میں رہنا چاہو رہ سکتی ہو' خرچہ تمہیں ملتا رہے گا۔ بولو' کیا کہتی ہو؟"

"آپ کی عمر کتنی ہو گی راجہ صاحب!" میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی زیادہ نہیں' ساٹھ سال ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہو گا ساٹھا پاٹھا ہوتا ہے۔ مجھے تم جوانوں سے کم نہیں پاؤ گی۔"

"راجہ صاحب! کوئی بیٹی بھی ہے آپ کی؟ کسی داسی یا بیوی سے؟"

"تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟ .... بہرحال' بیوی سے ایک بیٹی تھی۔ اس کا وواہ کئے بھی برسوں بیت گئے۔ بھگوان کی دیا سے وہ چھ بچوں کی ماں ہے۔ اس کے علاوہ داسیوں سے بھی لڑکیاں ہوں گی جن کی صحیح تعداد مجھے معلوم نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں عمر میں آپ کی بیٹی سے بھی بہت چھوٹی ہوں؟"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ مرد' مرد ہوتا ہے' خواہ کسی عمر کا ہو۔ مرد کا جوڑ کسی بھی عمر کی عورت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ تم کو اس وشے (بارے) میں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سے بھی کم عمر کی داسیاں ہمارے محل میں ہیں۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک چودہ سال کی لڑکی پسند آ گئی تھی۔ مہینہ بھر ہوا' اسے ہم نے اپنی داسی بنا لیا۔"

"اپنی ان ذلیل اور گھٹیا حرکتوں پر کبھی تمہیں شرم نہیں آتی؟ کہاں تم ساٹھ سال کے اور کہاں چودہ سال کی ایک لڑکی؟" میرا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

"تم پھر فضول باتیں کرنے لگی ہو۔ تم حسین ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تمہاری ہر بات برداشت کر لیں۔" راجہ سکھ دیو قدرے برہم ہو کر بولا۔

"میرا بس چلے تو تم جیسے مردوں کو گولی مار دوں۔" میری آواز میں مزید نفرت و حقارت پیدا ہو گئی۔

"کیا......... ابھی تو' تُو راجہ صاحب.......... راجہ صاحب کہہ رہی تھی' پھر کمین پن پر اتر آئی۔"

"کمینہ تُو ہے' میں نہیں۔"

پھر اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتی' فلپ نے مجھے مخاطب کیا۔ "پلیز مس! دوبارہ جھگڑا کھڑا نہ کریں۔ گاڑی اب کسی اسٹیشن پر رکنے والی ہے' راجہ صاحب کہیں اور جا کر بیٹھ رہیں گے۔ پھر یہ جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر فلپ نے مجھ سے خاموش رہنے کی درخواست کی۔

"میرا خیال ہے مسٹر فلپ آپ بھی تھوڑی بہت یہاں بولی جانے والی زبان سمجھتے ہیں۔ آپ نے اس بوڑھے گدھ کی باتیں سنیں۔ کتنے فخر کے ساتھ یہ ذلیل آدمی اپنے سیاہ کارنامے بیان کر رہا تھا۔ مجھے بھی یہ حرام کاری کی ترغیب دے رہا تھا۔ آپ نے اس کی ہمت دیکھی؟"

"چھوڑیں مس! یہ نواب' راجہ وغیرہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔" فلپ نے مجھے سمجھایا۔ "میں انہیں

اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک ریاست کے نواب کو تو میری وائف مارگریٹ پسند آ گئی تھی۔" اس نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا۔ "نواب نے مجھ سے کہا کہ میں مارگریٹ کو طلاق دے دوں تا کہ وہ مارگریٹ سے شادی کر لے۔ میں اس پر تیار نہیں ہوا تو نواب نے اپنے آدمیوں سے مارگریٹ کو اغوا کر لیا اور زبردستی اسے بے آبرو کر دیا۔ ہم لوگ کبھی قانون کو ہاتھ میں نہیں لیتے۔ مارگریٹ کو نواب کے محل سے برآمد کر لیا گیا۔ میں نے نواب پر کیس کر دیا۔ ہرجانے کے طور پر نواب کو دس لاکھ روپے ادا کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ اپنی جائیداد کا آدھا حصہ دینا پڑا۔ جو کچھ بھی ہوا اس میں مارگریٹ کا کوئی قصور نہیں تھا اس لئے مارگریٹ اب بھی میری بیوی ہے۔"

وہ انگریز فلپ بھی یقیناً اپنے ہم قوموں کی طرح بے غیرت ہی تھا کہ اپنی بیوی کی عزت و آبرو کے بدلے اس نے ایک بڑی رقم قبول کر لی تھی' اسی کے ساتھ جائیداد بھی۔

"عجب بیڈ ٹیسٹ تھا اس نواب کا کہ اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ عورت کو پسند کیا۔" راجہ سکھ دیو آہستہ سے ہنس کر کہنے لگا۔

فلپ کو اس پر غصہ آ گیا۔ "راجہ صاحب! آپ میری اور میری بیوی کی توہین کر رہے ہیں۔"

"چھوڑ یار! میں بھی تمہارے ملک جا چکا ہوں اور مجھے سب معلوم ہے کہ انگریز کتنے غیرت مند ہوتے ہیں۔ تم لوگ تو عیاشی کی خاطر اپنی بیویوں کو بھی ایک دوسرے سے بدل لیتے ہو۔"

پھر راجہ سکھ دیو اور فلپ کے درمیان گرماگرمی شروع ہو گئی۔ راجہ سکھ دیو انگریز قوم کے بارے میں نئے نئے حیرت انگیز انکشافات کر رہا تھا۔ یہ انکشافات میرے لئے بھی حیران کن تھے۔ ایک دوسرے سے بیویاں بدل لینا بھی میرے لئے کم حیران کن بات نہیں تھی۔

فلپ اور راجہ سکھ دیو کے درمیان صلح کرانے والی مارگریٹ تھی۔ اسی دوران میں ٹرین آسن سول ریلوے اسٹیشن پر رک چکی تھی۔

"خوبصورت عورتوں کی درخواست میں کبھی نہیں ٹھکراتا اس لئے تمہارے شوہر کو معاف کئے دیتا ہوں۔" راجہ سکھ دیو نے مسکرا کر کہا۔

"بہت بہت شکریہ ہز ہائی نیس!" مارگریٹ ادب سے بولی۔ پھر اس نے اپنے شوہر فلپ کو خاموش رہنے کے لئے کہا۔

چند ہی لمحے بعد راجہ سکھ دیو کے دونوں ہٹے کٹے ملازمین ڈبے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے راجہ سکھ دیو سے پوچھا۔ "کوئی حکم راجہ صاحب!"

"ہاں۔" راجہ سکھ دیو نے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "اس عورت اور اس کے ساتھی کو سامان سمیت اٹھا کر ڈبے سے باہر پھینک دو۔"

ان دونوں نے حیرت سے پہلے راجہ سکھ دیو اور پھر مجھے دیکھا۔ راجہ سکھ دیو نے سخت لہجے میں اپنا حکم دہرایا۔ دونوں ملازمین تیزی سے میری طرف بڑھے۔

"شہزادے! تم درمیان میں مداخلت نہیں کرو گے۔" میں نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ

دونوں قریب آ چکے تھے۔

اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا' میں نے ایک کے جبڑے پر گھونسا جڑ دیا اور دوسرے کے پیٹ پر لات ماری۔ وہ دونوں ہی ایک ساتھ چیخ اٹھے۔

فلپ اور مارگریٹ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ وہ دونوں ہی گھبرا کر کھڑے ہو گئے تو میں ان سے پُرسکون آواز میں بولی۔ "مسٹر فلپ! آپ نہ گھبرائیں' میں ابھی ان دونوں مٹی کے شیروں کو بھگائے دیتی ہوں' پھر ان کے ان داتا سے نمٹوں گی۔" میرا اشارہ راجہ سکھ دیو کی طرف تھا۔

راجہ سکھ دیو نے اپنے آدمیوں کو پسپا ہوتے دیکھ کر جوش دلایا۔ "ابے حرامزادو! میں نے تمہیں اسی دن کے لئے کھلا کھلا کر سانڈ بنایا تھا۔ پل پڑو اس پر۔ تم سے ایک لونڈیا نہیں سنبھالی جا رہی۔"

نتیجتاً اس کے دونوں آدمی بھینسوں کی طرح بھنا کر مجھ پر جھپٹے۔ ایک کو میں نے ٹانگ مار کر گرا دیا اور دوسرے کے سینے پر سر کی ٹکر ماری تو وہ الٹ گیا۔ اسی وقت ٹرین کی پہلی سیٹی سنائی دی جسے میں نے ٹانگ مار کر گرایا تھا وہ اٹھنے لگا تو اس کے ماتھے پر میرے پیر کی ٹھوکر پڑی۔ دانستہ میں نے آہستہ ضرب لگائی تھی۔ پھر بھی اس کے ماتھے کی کھال پھٹ گئی۔

اس شخص نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر ہاتھ کو دیکھا تو خوفزدہ سی آواز میں چیخ اٹھا۔ "خو.......... خون.........."

ٹرین نے دوسری سیٹی دی۔ اسی کے ساتھ راجہ سکھ دیو گرجا۔ "دفع ہو جاؤ تم دونوں۔ ٹرین چلنے والی ہے۔ اس کمینی عورت سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔"

یہ سنتے ہی وہ دونوں اس طرح سر پر پیر رکھ کر بھاگے جیسے موت ان کا تعاقب کر رہی ہو۔ ذرا ہی دیر کے بعد ٹرین کی تیسری سیٹی ہوئی' پھر ٹرین چل دی۔ ملازمین کا اپنے مالک کے ساتھ فرسٹ کلاس میں سفر کرنا خلاف ادب تھا۔ راجہ سکھ دیو نے اسی لئے ان دونوں کو وہاں سے بھگا دیا تھا۔ میں ابھی تک اپنی سیٹ پر نہیں بیٹھی تھی۔

"تیرے حمایتی تو چلے گئے' اب بتا' تیرا کیا حشر بناؤں؟" میں نے راجہ سکھ دیو کو مخاطب کیا۔ فلپ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے اس سے کہا۔ "مسٹر فلپ! اب آپ اسے میرے ہاتھوں سے پٹنے سے نہیں بچائیں گے۔ یہ جو برف خانے کے چمار کی طرح اینٹھ رہا ہے' ابھی اس کی ساری اینٹھ نکالے دیتی ہوں۔"

فلپ پہلے ہی راجہ سکھ دیو سے تپا بیٹھا تھا' کہنے لگا۔ "نہیں مس! میں کچھ نہیں بولوں گا۔"

"کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہی ہے تُو؟" راجہ سکھ دیو غراتا ہوا اپنی سیٹ سے اٹھا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا یہ تو۔" یہ کہتے ہی میں نے اپنی جگہ سے جست بھری۔ راجہ سکھ دیو کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے کر میں نے موڑنا شروع کیا۔ اس کے دونوں ہاتھ مڑنے کی وجہ سے اسے خود بھی مڑنا پڑا تھا۔ اس کا منہ اب دوسری طرف تھا اور میں اس کی پشت پر تھی۔ جیسے ہی میں نے اس کے دونوں بازوؤں پر دباؤ ڈالا' وہ چیخنے لگا۔

"چھوڑ دے.......... چھوڑ دے مجھے۔" وہ چیخ رہا تھا۔

"ایک شرط پر چھوڑوں گی تجھے کہ تُو خود اپنا سامان اٹھا کر یہاں سے کہیں اور لے جائے گا۔ بول' منظور ہے تجھے؟ اگر منظور نہیں تو ئیں تیرے دونوں بازو توڑ دوں گی۔" میں نے کہتے ہی ذرا سا دباؤ ڈالا۔ اس کے منہ سے پھر چیخیں نکلنے لگیں۔ اپنی بات میں نے پھر دہرائی۔

"تُو جو چاہے کر مگر میں خود اپنا سامان نہیں اٹھاؤں گا۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ میں نے بازو سے دباؤ کم کر دیا تھا۔

"تیرے تو باپ کو بھی اٹھانا پڑے گا سامان' تُو ہے کس کھیت کی مولی؟" میں نے بازوؤں پر پہلے سے کہیں زیادہ دباؤ ڈالا۔

تکلیف و اذیت نے اسے دوبارہ چیخنے پر مجبور کر دیا۔ پھر آخرکار اس نے ہتھیار ڈال ہی دیئے۔ وہ میرے حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ جیسے ہی میں نے ہاتھ چھوڑے' وہ تیزی سے پلٹا اور دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچ لی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اب وہ مجھ سے بھڑنے کی کوشش کرے گا۔ چند لمحے ہی میری گردن اس کے ہاتھوں کی گرفت میں رہ سکی اور پھر وہ "اوغ" کی آواز اپنے منہ سے نکال کر دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے ہوئے بیٹھ گیا۔ میرا گھونسا اس کے پیٹ پر ہی پڑا تھا۔ پھر وہ بیٹھا بھی نہ رہ سکا۔ میں نے ٹھوکر مار کر اسے گرا دیا۔ اب وہ چاروں خانے چت پڑا تھا۔ میں اس کے سینے پر پیر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"بول' سامان اٹھائے گا یا اور ماروں تجھے؟"

"اٹھاؤں.......... اٹھاؤں گا۔"

"تو پھر کھڑا ہو جا اٹھ کر۔" میں نے اس کے سینے سے پیر ہٹا کر سر پر دھیرے سے ٹھوکر ماری۔

"مم.......... میں اٹھ رہا ہوں' مارو.......... مارو مت۔" وہ کہنیوں پر زور دے کر اٹھنے لگا۔

اس کے بعد وہی ہوا جو میں نے چاہا۔ راجہ سکھ دیو نے بڑی مشکل سے اپنا بھاری سوٹ کیس اٹھایا اور ڈبے کے آخری سرے پر جا کر رکا۔ ٹین کا ایک بکس' ایئر بیگ اور ایک ٹوکری بھی اسے اٹھا کے لے جانا پڑی۔ شاید اپنی پوری زندگی میں اتنا بوجھ اس نے کبھی نہیں اٹھایا ہو۔ ٹین کے بکس کو تو وہ کنڈے میں ہاتھ ڈال کر گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔ اس وقت میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے لیکن مجھے اس پر رحم نہیں آیا۔ اپنے اعمال کے پیش نظر وہ قابل رحم بھی نہیں تھا۔ اس ساٹھ سالہ بوڑھے کو جب چودہ سالہ لڑکی کو خراب کرتے ہوئے رحم نہیں آیا تھا تو پھر اس پر رحم کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اپنا سامان وہاں سے اٹھا لے گیا تو میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"حیرت انگیز مس!" فلپ نے مجھے مخاطب کیا۔ "اگر میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو ہرگز اس پر یقین نہ کرتا۔ آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔"

"وہ اگر حد سے زیادہ کمینگی پر نہ اترتا تو میں اسے معاف کر دیتی۔ بعض لوگ واقعی جوتے کے یار ہوتے ہیں۔" پھر میں نے موضوع گفتگو بدل دیا اور بولی۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"دہلی۔" فلپ نے جواب دیا۔ "میں سرکاری ملازم ہوں اور میرا تبادلہ کلکتے سے دہلی ہو گیا ہے۔"

"کس محکمے میں ہیں آپ؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"پہلے تو انفارمیشن منسٹری میں تھا' اب میرا تبادلہ ہوم منسٹری میں ہو گیا ہے۔" فلپ نے بتایا۔

میں یہ سن کر چونک اٹھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس' سیکرٹ سروس اور سیکورٹی کے دیگر محکمے وزارت داخلہ کے تحت ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کام کا آدمی تھا۔

"کس عہدے پر ہیں آپ؟" میں نے معلوم کیا۔

"ایڈیشنل سیکرٹری ڈپوٹ کیا گیا ہے مجھے۔" اس نے جواب دے کر مجھ سے پوچھا۔ "آپ سے ابھی تک تعارف نہیں ہوا۔ میرا نام تو آپ جان ہی چکی ہیں اور میری وائف کا نام بھی آپ کو معلوم ہو گیا ہے۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام رانی ہے۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اب میں کسی کو اپنا اصل نام بتانے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مسکرا کر مزید کہا۔ "مگر اس راجہ کی طرح میرا تعلق کسی اسٹیٹ سے نہیں۔ میں صرف نام کی رانی ہوں۔"

"سمجھ گیا' سمجھ گیا مس رانی!" وہ بھی مسکرایا اور میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس سے مصافحہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔ "آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی مس رانی!" اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ "آپ جیسی بہادر عورت میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی ہے۔"

"شکریہ مسٹر فلپ!" میں نے بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا' پھر شہزاد سے بھی اس کا تعارف کرایا۔ "یہ میرے دوست ہیں مسٹر شہزاد۔"

فلپ نے شہزاد سے بھی مصافحہ کیا۔ مارگریٹ نے بھی مجھ سے اور شہزاد سے ہاتھ ملایا۔

"آپ کس لئے دہلی جا رہی ہیں؟" فلپ نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ میرے دوست دہلی ہی کے رہنے والے ہیں۔" میں نے شہزاد کی طرف اشارہ کیا۔ "انہی کی دعوت پر میں گھومنے پھرنے دہلی جا رہی ہوں!"

"نئی دہلی کی طرف کبھی گھومنے آئیں تو مجھ سے ضرور ملئے گا مس رانی!" فلپ نے دعوت دی۔ "میں اپنی کوٹھی اور دفتر کا پتا آپ کو لکھ کر دے دیتا ہوں۔"

"ضرور آؤں گی آپ سے ملنے۔" میں نے وعدہ کر لیا۔ فلپ سے ملاقات میرے حق میں سودمند ہی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے واضح طور پر یہ بات محسوس کر لی تھی کہ جب شہزاد اور میں ڈبے میں داخل ہوئے تھے اس وقت سے اب تک فلپ اور مارگریٹ کے رویے میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ ابتدا میں اس انگریز جوڑے نے ہمیں دیکھ کر منہ بنا لیا تھا۔

فلپ نے اس کے بعد اپنے لیٹر پیڈ پر دہلی میں اپنی کوٹھی اور دفتر کے پتے لکھ کر مجھے دے دیئے تھے۔ میں نے اس پر فلپ کا شکریہ ادا کیا تھا۔

☆======☆======☆

آسن سول کے بعد ٹرین بردوان اسٹیشن پر رکی۔ وہاں راجہ سکھ دیو نے پھر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس نے ریلوے پولیس کو ڈبے میں بلا لیا۔

"اس عورت اور اس کے ساتھی نے مجھ سے بدتمیزی کی ہے۔" راجہ سکھ دیو نے پولیس انسپکٹر سے میری شکایت کی۔

"کیا بدتمیزی کی ہے سر! کچھ..........."

"سر نہیں' ہمیں راجہ صاحب کہو۔" راجہ سکھ دیو نے پولیس انسپکٹر کی بات کاٹ کر کہا۔ "ہم راجہ سکھ دیو آف بڑودا اسٹیٹ ہیں۔"

پولیس انسپکٹر مرعوب نظر آنے لگا۔ راجہ سکھ دیو کے ملازمین بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی تصدیق کی۔

"اس عورت نے نہ صرف ہماری توہین کی ہے بلکہ ہمارے ملازمین کو بھی مارا ہے۔ خود تم دیکھ لو کہ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔" راجہ سکھ دیو نے اس ملازم کی طرف اشارہ کیا جس کے ماتھے پر چوٹ آئی تھی۔ اس نے یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ میں نے اسے بھی مارا ہے۔ یوں شاید اس کی سبکی ہوتی۔

راجہ سکھ دیو کے دونوں ہی ملازم خاصے صحت مند اور گٹھے ہوئے جسموں کے مالک تھے۔ پولیس انسپکٹر نے حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں' جی انسپکٹر صاحب! اس عورت نے ہم دونوں کو مارا ہے۔" وہ دونوں بیک آواز میں بولے۔

"آپ دونوں کو مارا ہے انہوں نے؟" پولیس انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں جناب! ہم دونوں کو ایک ساتھ مارا ہے۔"

"ایک ساتھ سے کیا مطلب ہے تم لوگوں کا؟" پولیس انسپکٹر نے وضاحت چاہی۔

"میں بتاتی ہوں انسپکٹر!" میں بول اٹھی۔ "یہ جو راجہ صاحب ہیں' مجھے اپنی داسی بنانے کی پیشکش کر رہے تھے۔ میں نے ان کی پیشکش ٹھکرا دی تو یہ مجھ پر برہم ہو گئے۔ پھر جب آسن سول ریلوے اسٹیشن آیا اور یہ دونوں میرے ڈبے میں آئے تو..........." پھر میں نے بتا دیا کہ راجہ سکھ دیو نے ان سے کیا کہا تھا' اس کے بعد بولی۔ "یہ دونوں اپنے مالک کا حکم سن کر میری طرف جارحانہ انداز میں بڑھ رہے تھے کہ ایک کا پیر دھوتی میں الجھ گیا اور وہ خود گر کر زخمی ہو گیا۔ مسٹر فلپ نے مجھے بڑی مشکل سے بچایا۔ اگر اسی وقت ٹرین کی سیٹی نہ ہو جاتی تو یہ دونوں مجھے مسٹر فلپ کی مداخلت کے باوجود شاید ڈبے سے اٹھا کر باہر پھینک دیتے۔"

میں نے جو بیان دیا' وہ ناقابل یقین تھا' مگر راجہ سکھ دیو کے ملازموں کے بیان پر پولیس انسپکٹر اظہار حیرت ہی کر سکتا تھا۔ میں ابھی مزید کچھ کہنے والی تھی کہ راجہ سکھ دیو چیخ اٹھا۔ "یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس نے تو مجھے بھی .... میرا مطلب ہے' میری بھی توہین کی ہے۔" شاید وہ رو میں یہ کہنے والا تھا کہ

اس نے تو مجھے بھی مارا ہے' مگر بات بدل گیا تھا۔ اسے غالباً وہاں اپنے ملازمین کی موجودگی کا خیال آ گیا تھا وہ آخر کیا سوچتے کہ ان کے راجہ صاحب کی بھی پٹائی ہوئی ہے۔

"انسپکٹر!" فلپ نے پولیس انسپکٹر کو مخاطب کیا۔

"یس سر!" پولیس انسپکٹر ایک دم سے مؤدب نظر آنے لگا۔ یہ گوری چمڑی ہی کا کمال تھا۔

"مس رانی نے جو کچھ کہا ہے' میں اس کی گواہی دیتا ہوں۔" فلپ نے میرے بیان کی تصدیق کر دی' حالانکہ میرا پورا بیان سچ نہیں تھا۔ ہاں' بیان کے بڑے حصے کو سچ ضرور قرار دیا جا سکتا تھا۔

ایک ہندوستانی راجہ کے مقابلے میں پولیس انسپکٹر کے لئے حکمران قوم کے ایک فرد کی گواہی کہیں زیادہ معتبر تھی۔ وہ راجہ سکھ دیو کی طرف مڑ کر بولا۔ "راجہ صاحب! میں معافی چاہتا ہوں کہ مسٹر فلپ کی گواہی کے بعد اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتے کارروائی؟" راجہ سکھ دیو' پولیس انسپکٹر پر برس پڑا۔ "میرا نام راجہ سکھ دیو ہے۔ میں تمہاری پیٹی اتروا دوں گا' آنے دو دہلی۔"

"تم بے فکر رہو' یہ تمہارے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔" فلپ نے پولیس انسپکٹر کو تسلی دی۔ "میں بھی دہلی تک چل رہا ہوں۔ تم سپاہیوں کو لے کر جاؤ۔"

اس وقت تک ٹرین ایک مرتبہ سیٹی دے چکی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے فلپ کا شکریہ ادا کیا اور پھر سپاہیوں کو ساتھ لئے ڈبے سے اتر گیا۔

"میرا سامان اٹھاؤ اور کسی دوسرے ڈبے میں چلو۔" راجہ سکھ دیو نے اپنے ملازموں کو حکم دیا۔

"مم .... مگر ٹرین .... ٹرین تو سیٹی دے چکی ہے راجہ صاحب!" ایک ملازم ڈرتے ڈرتے بولا۔ اسی وقت دوسری سیٹی ہو گئی۔

"دفع ہو جاؤ' اگلے اسٹیشن پر یہاں سے سامان اٹھا کر لے جانا' میں کسی دوسرے ڈبے میں بیٹھ جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ڈبے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"خس کم جہاں پاک۔" میں نے چلتے چلتے اس پر فقرہ چست کیا۔

وہ رکا اور مڑ کر قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا' پھر کسی درندے کی طرح غرایا۔ "دیکھ لوں گا تجھے۔"

"ابے جا' کیوں تیری موت ڈنڈ پیل رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے مجھے ہنسی آ گئی۔

"بتاؤں ابھی۔" اس نے بندر کی طرح بھبکی دی۔

"اتنے جوتے لگاؤں گی تیری چاند پر کہ اولاد تک گنجی پیدا ہو گی۔"

جواب میں راجہ سکھ دیو کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ٹرین نے تیسری سیٹی دی اور وہ لپک کر ڈبے سے اتر گیا۔ اس کے ملازم پہلے ہی ڈبے سے اتر چکے تھے۔ تیسری سیٹی کے بعد ہی ٹرین دھیرے دھیرے رینگنے لگی تھی۔ راجہ سکھ دیو نے یقیناً ایسے وقت ڈبے سے اتر کر حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ اترتے اترتے مارے غصے کے اس نے ڈبے کا دروازہ بہت زور سے بند کیا تھا۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ راجہ سکھ دیو کی التجا

آمیز بلند آواز آئی۔ "بھگوان کے لئے دروازہ کھول دو' ورنہ میں گر جاؤں گا۔"

میں سمجھ گئی کہ راجہ سکھ دیو کو اتنی مہلت نہیں مل سکی ہو گی کہ وہ فرسٹ کلاس کے کسی ڈبے میں سوار ہو جاتا۔ نتیجتاً وہ پھر ہمارے ڈبے کی طرف پلٹ آیا تھا' مگر ٹرین کا بھاری دروازہ اس سے نہیں کھل سکا تھا۔ مجبوراً اسے پائدان پر لٹکنا پڑا تھا۔ وہ اسی لئے اندر سے دروازہ کھولنے کے لئے گڑگڑا رہا تھا۔

ٹرین کی رفتار دھیرے دھیرے تیز ہوتی جا رہی تھی۔

فلپ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ "مسٹر فلپ! کچھ دیر اس خود سر کو ڈنڈا پکڑ کر لٹکا رہنے دیں۔"

"لیکن وہ گر بھی سکتا ہے مس رانی!" فلپ نے خطرے کا اظہار کیا۔ راجہ سکھ دیو اب بھی دروازہ کھولنے کے لئے مسلسل چیختا جا رہا تھا۔

"وہ اتنا غیرت مند نہیں ہے۔ ایسے ظالموں کو جلد موت نہیں آتی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی آپ کہتے ہیں تو میں دروازہ کھولے دیتی ہوں۔"

میں ڈبے کے دروازے تک پہنچی اور دروازہ کھول دیا۔ راجہ سکھ دیو زیادہ اوپر نہیں چڑھ سکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کے ساتھ ڈنڈے کو جکڑے ہوئے تھا۔

"دروازہ کھل گیا' اوپر آ جاؤ۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"نن .... نہیں' مم .... میں نے ڈنڈا چھوڑا تو .... تو گر جاؤں گا۔" اس کی خوفزدہ آواز سنائی دی۔

میں نے دیکھا کہ شدید خوف کے سبب اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "میرا ہاتھ پکڑ لو' تم نہیں گرو گے۔"

"تم .... تم زنجیر کھینچ دو' ٹرین رک جائے گی تو میں اوپر چڑھ جاؤں گا۔"

"بلاوجہ زنجیر کھینچنا جرم ہے' میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"تم .... تم چاہتی ہو کہ .... کہ میں ٹرین سے گر کر مر جاؤں۔"

"اگر میں یہی چاہتی تو اب تک تمہیں دھکا دے چکی ہوتی۔ ہمت کرو بے وقوف آدمی! ایک ہاتھ سے ڈنڈا پکڑے رہو اور دوسرا ہاتھ مجھے تھما دو۔"

"تم میرا ہاتھ تو نہیں چھوڑ دو گی؟"

"نہیں چھوڑوں گی' یقین کرو۔"

پھر راجہ سکھ دیو نے ڈرتے ڈرتے اپنا ایک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے مزید جھک کر خود اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسی کے ساتھ میرے جسم کو جھٹکا لگا۔ اس احمق نے اپنے جسم کا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا اور اوپر چڑھنے کے لئے دوسرے ہاتھ سے ڈنڈا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے فوراً سنبھل کر دوسرے ہاتھ سے دروازہ پکڑ لیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو راجہ سکھ دیو تو ٹرین سے گر کر مرتا ہی' مگر مجھے بھی ساتھ لے مرتا۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو یقیناً اب تک موت کے منہ میں پہنچ چکا ہوتا۔ فلپ کو دروازہ کھولنے

سے روک کر میں نے گویا اس کی جان بچالی تھی۔

راجہ سکھ دیو خود اوپر چڑھنے کی قطعی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اس کے بھاری جسم کو زور لگا کر اوپر کھینچنا پڑ رہا تھا۔ ایسے میں اگر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتا تو وہ زندہ نہ بچتا۔ میں زور لگا کر دھیرے دھیرے اسے اوپر کھینچنے لگی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر تمام تر ذمے داری مجھ پر ڈال دی تھی۔

جب میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی تو راجہ سکھ دیو اکڑوں بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور بولی۔ "چلو' اندر چل کر سیٹ پر بیٹھنا!" پھر میں نے دروازہ بند کر دیا۔ راجہ سکھ دیو کے جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ اس کا جسم اب تک کانپ رہا تھا۔ موت کے خوف نے شاید اس کی یہ حالت بنا دی تھی۔ میں اسے سہارا دیئے وہاں تک لے آئی جہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی سیٹ پر اسے بٹھا دیا۔ شہزاد سرک کر کھڑکی کے قریب ہو گیا تو میں راجہ سکھ دیو کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

میں نے مختصراً اسے بتا دیا کہ میں کس آزمائش میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اس دوران میں راجہ سکھ دیو اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔

"خاتون! آپ کو یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہئے تھا۔" شہزاد بولا۔

"تو کیا میں ہاتھ تھام کر چھوڑ دیتی' انسانی زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے۔"

"آپ اپنی مدد کے لئے ہمیں آواز دے لیتیں مس رانی!" فلپ نے بھی کہا۔

"مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی مسٹر فلپ!"

اسی وقت راجہ سکھ دیو بول اٹھا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ "تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا سی گئی۔ "تم .... تم یقیناً ایک عظیم عورت ہو۔ دشمنی کے باوجود تم نے........."

"دشمنی اپنی جگہ ہے۔" میں مسکرا کر بولی۔ "اور انسانیت اپنی جگہ۔"

"نہیں' مم .... میں اب تمہیں اپنا دشمن نہیں سمجھتا۔ غلطی میری ہی تھی' مجھے اس کا احساس ہے' میں یہ بھول گیا تھا کہ ہر عورت کو خریدا نہیں جا سکتا۔ میں تم سے معافی مانگتا ہوں' مجھے معاف کر دو دیوی!" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"ارے نہیں راجہ صاحب!" میں نے اس کی پشت پر تھپکی دی۔ "میں نے بھی غصے اور جھنجلاہٹ میں آپ کی عمر اور بزرگی کا خیال نہیں کیا۔ مجھے بھی معاف کر دیں۔"

"واقعی تم بہت اعلیٰ ظرف لڑکی ہو رانی!" راجہ سکھ دیو نے پہلی مرتبہ میرا نام لیا۔

"میرا خیال ہے مس رانی کہ اگلے اسٹیشن پر راجہ صاحب کا سامان یہیں اٹھوا لیتے ہیں۔" فلپ نے حالات سازگار دیکھ کر تجویز پیش کی۔ "یہ الگ بیٹھے کچھ اچھے نہیں لگیں گے۔"

"اگلے اسٹیشن کا انتظار کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے' میں ابھی ان کا سامان یہاں اٹھا لاتی ہوں

اٹھو شہزاد!" میں کھڑی ہو گئی۔

"ارے ارے' تم کیسے اٹھاؤ گی سامان' بہت بھاری ہے بکس وغیرہ۔" راجہ سکھ دیو بول اٹھا۔

"آپ بھی تو یہاں سے سامان اٹھا کر لے گئے تھے۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گئی۔ شہزاد میرے پیچھے پیچھے تھا۔ راجہ سکھ دیو بھی اٹھ کر ہمارے ساتھ چلنے لگا۔

میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ سب سے بھاری ٹین کا بکس ہے۔ پہلے میں نے اسی کو اٹھایا۔ سوٹ کیس شہزاد نے اٹھا لیا۔ ایئر بیگ اور ٹوکری اٹھانے میں راجہ سکھ دیو نے تکلف نہیں کیا۔ یوں ایک ہی پھیرے میں سب سامان آ گیا۔ راجہ سکھ دیو کھڑکی کے قریب اپنی سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے ہمارے ہی ساتھ آ بیٹھا۔

"رانی! مجھے خوشی ہو گی' اگر تم دہلی میں مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخش دو۔" راجہ سکھ دیو نے پیشکش کی۔ "تم میری کوٹھی میں رہنا' کوٹھی قرول باغ میں ہے۔ ایک کار اور ڈرائیور تمہارے ڈسپوزل پر رہے گا۔ تم جب اور جہاں چاہو' آ جا سکو گی۔"

"راجہ صاحب! اس نوازش اور پیشکش کا بہت بہت شکریہ! میں دراصل اپنے ان دوست کی دعوت پر دہلی جا رہی ہوں اور انہی کی مہمان ہوں۔" میں نے شہزاد کی طرف اشارہ کیا۔ "ظاہر ہے کہ یہ مجھے اپنے ہی گھر ٹھہرائیں گے۔ اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو یقیناً مجھے آپ کی کوٹھی میں قیام کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔"

"تو آپ انہی کے گھر ٹھہریں گی۔ یہ رہتے کہاں ہیں؟ ان کی کوٹھی کہاں ہے؟" فلپ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"میں غریب آدمی ہوں جناب!" شہزاد بول اٹھا۔ "میری کوئی کوٹھی نہیں' ایک ٹوٹا پھوٹا گھر ضرور ہے' جامع مسجد کے قریب چتلی قبر پر۔"

"تو پھر تم ہی رانی کو ہماری کوٹھی پر ٹھہرنے کی اجازت دے دو۔" راجہ سکھ دیو نے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"یہ تو رانی صاحبہ کی عزت افزائی ہے جناب کہ انہوں نے مجھے میزبانی کا شرف عطا کیا ہے۔ میں تو کیا چاہوں گا کہ یہ میرے ہی غریب خانے پر قیام فرمائیں لیکن یہ اگر آپ کی کوٹھی میں رہنا چاہیں تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔" شہزاد نے جواب دیا۔

"فی الحال تو میں انہی کے گھر ٹھہروں گی۔ ہاں' یہ ممکن ہے راجہ صاحب کہ چند روز وہاں رہ کر آپ کے یہاں بھی دو ایک دن کو آ جاؤں۔" میں نے کہا۔ کیونکہ مجھے راجہ سکھ دیو کی دل آزاری بھی منظور نہیں تھی۔ پھر مجھے یہ بھی خیال تھا کہ دہلی میں کیا خبر کیسے حالات پیش آئیں۔ ایک ٹھکانے کے بجائے دو ٹھکانے ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔

راجہ سکھ دیو نے میری بات مان لی اور پھر فلپ کی طرح اس نے بھی مجھے ایک کاغذ پر اپنی کوٹھی کا پتا لکھ کر دے دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے شہزاد کے گھر کا پتا بھی اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔ اگلے

اسٹیشن پر گاڑی رکتے ہی راجہ سکھ دیو کے ملازم ڈبے میں آ گئے۔ انہوں نے اپنے مالک کو ہمارے ساتھ بیٹھے دیکھا تو ان کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔ اسی وقت ڈائننگ کار کا ایک باوردی بیرا بھی آ گیا۔ اس سے سبھی کے لئے کھانا لانے کو کہہ دیا' اسی کے ساتھ چائے کا آرڈر بھی دے دیا۔

"اب ہمیں کہیں نہیں جانا' ہم اسی ڈبے میں سفر کریں گے۔ تم لوگ جاؤ۔" راجہ سکھ دیو نے اپنے ملازمین سے کہا۔

"جی بہتر ہے راجہ صاحب!" وہ دونوں بیک۔ آواز بولے اور پھر اس تبدیلی کی وجہ پوچھے بغیر چلے گئے۔ ملازمین کو یہ حق دیتا بھی کون ہے کہ انہیں کچھ بتایا جائے یا وہ کچھ پوچھ سکیں۔ پھر کچھ دیر کے بعد کھانا کھا کے ہم نے چائے پی۔ مجھے رات کا کھانا کھا کر ٹہلنے کی عادت تھی' سو اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"کھانا کھایا ہے اور مجھے ٹہلنے کی عادت ہے.. ڈبا خالی پڑا ہے' ٹہل لیتی ہوں۔" میں نے بتایا۔

راجہ سکھ دیو اور فلپ کو بھی یہی عادت تھی۔ وہ دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔ شہزاد اور مارگریٹ، دونوں ہی اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہے تھے۔ خالی ڈبے کے کئی چکر کاٹ کر ہم تینوں واپس اپنی سیٹوں پر آ بیٹھے۔ اب رات کے دس بجنے والے تھے۔ ذرا ہی دیر کے بعد ہم نے اپنی اپنی برتھوں پر سونے کا فیصلہ کیا۔ بڑا بلب بجھا کر ہلکا بلب جلا دیا گیا۔

میں خاصی تھکی ہوئی تھی اس لئے جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔

معلوم نہیں' وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ کسی کے تیز اور گرم گرم سانس محسوس کر کے میری آنکھ کھل گئیں میں نے خود کو شہزاد کی بانہوں کے حصار میں پایا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے دانستہ بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"آپ ہی نے تو مجھے بلایا ہے کہ اکیلے نیند نہیں آ رہی' سو میں آ گیا۔' اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں اس کی بات سن کر چونک اٹھی اور ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوند گیا۔ کیا خبیث چمپا نے اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے؟ ظاہر ہے شہزاد کو جگا کر میری برتھ پر اور کون بھیج سکتا تھا۔ میں اس کی آغوش میں کسمسائی اور سخت لہجے میں سرگوشی کی۔ "چھوڑ دو مجھے۔"

"مان جائیں نا! سب سو رہے ہیں۔" اس نے خمار آلود سی آواز میں کہا۔ میرے جسم پر اس کی گرفت اور سخت ہو گئی تھی۔

"ہوش میں آؤ شہزاد!" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"پھر........... پھر بلایا ہی کیوں تھا........... کیا صرف تڑپانے کو؟"

میں زور لگا کر اس کی بانہوں کا حصار توڑنے میں کامیاب ہو گئی' پھر اسے دھکا دے دیا۔ وہ برتھ سے نیچے گرتے گرتے بچا۔ میری کوشش بہرحال رائیگاں نہیں گئی۔ میں اس کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی' وہ اٹھا۔

"ٹھیک ہے' اب آپ بلائیں گی بھی تو نہیں آؤں گا۔" اس نے برتھ سے اترتے ہوئے کہا۔

"ہاں' نہ آنا۔" میں نے کہہ دیا۔

پھر میں دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی' مگر نیند نہ آ سکی۔ جو واقعہ پیش آیا تھا اس نے میرے ذہن کو بُری طرح الجھا دیا تھا۔ چمپا میرے تعاقب میں تھی۔ اس سے بڑا خطرہ میرے لئے کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈبے میں اس کی موجودگی ثابت ہو چکی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اتنی شریف نہیں تھی کہ محض شہزاد کو میرے پاس بھیج کر خاموش ہو جاتی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب اس کا اگلا قدم کیا ہو سکتا ہے؟ چند ہی لمحوں بعد مجھے اپنے اس سوال کا جواب مل گیا۔

"میرے راجہ! مجھے اپنی داسی بنا لو۔" مجھے خود اپنی آواز سنائی دی۔ یہ آواز دائیں جانب کچھ فاصلے سے آ رہی تھی۔

"آہستہ بولو میری رانی! کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔" راجہ سکھ دیو کی سرگوشی ابھری۔

"جاگتا ہے تو جاگ جائے' میں نہیں ڈرتی۔ میں سب کو بتا دوں گی کہ میں تمہاری داسی بن چکی ہوں۔" یہ میری ہی آواز تھی' مگر مجھے خبر تھی کہ میری آواز میں چمپا بول رہی ہے۔

چمپا نے اپنا شیطانی اور گھناؤنا کھیل شروع کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی شہزاد بھی نہیں سویا ہو گا اور وہ بھی یہ سب کچھ سن رہا ہو گا۔ میں دم سادھے اپنی برتھ پر پڑی رہی۔ میرے لئے چمپا کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ چمپا اس طرح مجھ کو ذلیل و رسوا کر رہی تھی۔ وہ راجہ سکھ دیو کو اٹھا کر ڈبے کے کسی اور حصے میں لے گئی۔

اچانک میری سماعت سے شہزاد کی تیز اور سخت آواز ٹکرائی۔ "تم نے مجھے تو میری برتھ پر واپس بھیج دیا اور یہاں راجہ کے ساتھ منہ کالا کر رہی ہو۔" شہزاد اپنی دانست میں مجھی سے مخاطب تھا۔ چمپا نے مجھے ذلیل و رسوا کرنے کی راہ نکال ہی لی تھی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" چمپا کی آواز ابھری۔ "یہ نہ بھول کہ تُو میرا نوکر ہے۔"

"مگر میں تمہارا عاشق ہوں۔" شہزاد بھی ترکی بہ ترکی بولا۔ "تم میری آغوش کی زینت بن چکی ہو۔"

"اسے بکواس کرنے دو راجہ! یہ ہمیں یہیں کھڑا دیکھتا رہے اور جلتا رہے' مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

"مم........... مگر وہ........... وہ انگریز کہیں نہ جاگ جائے۔" راجہ سکھ دیو اپنی آواز سے خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔

"جاگنے دو' جب میں تمہاری ہوں تو تمہیں کسی کا کیا ڈر؟" چمپا تیز آواز میں بول رہی تھی۔ وہ شاید یہی چاہتی تھی کہ فلپ بھی جاگ جائے اور یہ حیا سوز تماشا دیکھ لے۔ معاً میں نے مارگریٹ کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "فلپ! یہ آوازیں کیسی ہیں؟ کیا تم جاگ رہے ہو؟"

"ہاں' جاگ رہا ہوں اور ان تینوں کی آوازیں سن رہا ہوں۔ رانی اس راجہ سے پھنس گئی ہے اور رانی کے دوست نے ان دونوں کو موقع پر پکڑ لیا ہے' اسی پر جھگڑا ہو رہا ہے' مگر ہمیں اس جھگڑے میں

پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم سو جاؤ۔" فلپ نے مارگریٹ کو سمجھایا۔ اس نے جو کچھ کہا اسے سن کر مجھے بہت ذلت محسوس ہوئی۔

"لیکن اس ہنگامے میں مجھے کس طرح نیند آئے گی؟" مارگریٹ کی آواز سنائی دی۔

"ابھی کچھ دیر میں یہ ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔"

فلپ اور مارگریٹ سامنے والی برتھوں ہی پر تھے۔ میں نے سوچا' کم از کم ان کی نظروں میں ذلیل ہونے سے تو بچ سکتی ہوں۔ یہی سوچ کر میں نے فلپ کو آواز دی۔

"اب وہ تمہیں بلا رہی ہے۔" مارگریٹ نے فلپ کو مخاطب کیا۔

"پھر تو جانا ہی پڑے گا کہ کیا بات ہے؟" فلپ کی آواز آئی۔

"میں یہاں ہوں مسٹر فلپ!" میں نے برتھ سے اٹھتے ہوئے اس سے کہا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے مس رانی! میں تمہارے ہی پاس آ رہا ہوں۔" فلپ نے جواب دیا۔

پھر میں نے حیرت سے فلپ کو اتر کر اسی طرف جاتے دیکھا جہاں چمپا' راجہ سکھ دیو اور شہزاد موجود تھے۔ میں نے اسے کئی آوازیں دیں' مگر وہ نہیں رکا۔ میرے لئے یہ سمجھ لینا دشوار نہیں تھا کہ فلپ اس وقت چمپا کے سحر میں گرفتار ہے۔ مجبوراً میں پھر برتھ پر لیٹ گئی۔ چمپا کے سحر کا توڑ میرے لئے ناممکن تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد میں نے دوبارہ چمپا کی تیز آواز سنی۔ وہ فلپ سے کہہ رہی تھی۔ "مسٹر فلپ! آپ کا تعلق تو ایک ایسے ملک سے ہے جہاں عورت کو مرد کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ آپ ہی بتایئے' اگر میں راجہ صاحب سے تعلقات استوار کر رہی ہوں تو اسے روکنے کا کیا حق حاصل ہے' اسے یہاں سے ہٹ جانا چاہئے یا نہیں؟"

"یہ عورت میری ہے اور میرے ساتھ تعلقات ہیں اس کے۔" شہزاد کی احتجاجی آواز ابھری۔

"جھوٹ بول رہا ہے یہ۔" راجہ سکھ دیو کی غصیلی آواز سنائی دی۔ "میں دعوے سے کہتا ہوں کہ مجھ سے پہلے رانی کے جسم کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔"

"اگر آپ ٹھیک بھی کہہ رہے ہیں تو رانی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی اور کو اپنا لے۔ یہ آپ کی بیوی تو نہیں ہے؟" فلپ نے گویا فیصلہ سنا دیا۔ "آیئے' آپ میرے ساتھ آ جایئے۔"

"چھوڑ دیں میرا ہاتھ مسٹر فلپ! جو عورت میرا پہلو گرم کر چکی ہے' میں اسے ہرگز کسی دوسرے کے ساتھ رنگ رلیاں نہیں منانے دوں گا۔" شہزاد غصے میں چیخ اٹھا۔

"یہ بکواس کر رہا ہے مسٹر فلپ!" چمپا بھی پوری قوت سے چیخی۔ "راجہ صاحب خود اس کے دعوے کی تردید کر چکے ہیں۔"

"میں تجھے دیکھ لوں گا بے غیرت عورت! تجھے چلنا تو میرے ہی ساتھ ہے نا!"

"رانی! تجھ جیسے بھک منگے کے ساتھ نہیں جائے گی۔ یہ اب میری داسی بن چکی ہے' میری کوٹھی بس رہے گی' اور جو عورت میری داسی بن جاتی ہے' اس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ایسے شخص کی آنکھیں نکلوا لیتا ہوں۔ بول رانی! تُو کس کے ساتھ جائے گی؟" راجہ سکھ دیو کی تیز

آواز آئی۔ اب اسے کسی کے جاگنے کا خطرہ نہیں رہا تھا۔

"اپنے راجہ کے ساتھ جاؤں گی۔" چمپا خمار آلود آواز میں بولی۔

"سن لیا تُو نے۔ اب یہاں سے دفع ہو جا اور ہمارے مزے میں خلل نہ ڈال۔" راجہ سکھ دیو نے غصے میں کہا۔

"آ جائیں مسٹر! یہ بُری بات ہے۔" فلپ' شہزاد کو سمجھا کر شاید اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے ان کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو قریب آتی جا رہی تھیں۔

"ان دونوں کا خیال اپنے ذہن سے نکال کر آپ سو جایئے مسٹر شہزاد!" فلپ نے شہزاد کو مشورہ دیا۔ وہ اب اپنی برتھ پر چڑھ رہا تھا۔

چمپا کا مقصد حل ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا تھا۔ میں سونے کی کوشش کرنے لگی۔ میرے نزدیک اب اس کا ایک ہی حل تھا کہ میں بقیہ سفر کسی ایسے ڈبے میں کرتی جہاں میرے اور شہزاد کے سوا کوئی اور مسافر نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ صورت بھی تھی کہ میں' شہزاد کو بھی اسی ڈبے میں چھوڑ جاتی اور تنہا سفر کرتی۔

نیند نے ایک مرتبہ پھر میری آنکھ میں جال بننا شروع کر دیئے۔ ایک فیصلے تک پہنچنے کے بعد بڑی حد تک میرا ذہن سکون مطمئن ہو چکا تھا۔ مجھے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ بقیہ رات اب سکون سے گزر جائے گی' مگر جلد ہی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ چمپا نے ایک نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ میری آنکھ مارگریٹ کی تیز اور بلند آواز سے کھلی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر مجھے اور فلپ کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ اسی کے ساتھ راجہ سکھ دیو اور شہزاد کی تیز آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ آوازیں ڈبے کے ایک گوشے سے آ رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو تمام برتھیں خالی تھیں۔

"تم ٹھیک کہہ رہے تھے لڑکے!" میں نے راجہ سکھ دیو کی آواز سنی۔ "یہ عورت کسی رنڈی سے بھی بدتر ہے' گندی نالی ہے یہ۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہ میرا پہلو گرم کرتے ہوئے مجھے اپنی وفا کا یقین دلا رہی تھی اور اب اس انگریز کو پھانس کر اس کے ساتھ عیش اڑا رہی ہے۔" راجہ سکھ دیو غالباً شہزاد سے مخاطب تھا۔

میں اپنی برتھ سے اتر آئی تاکہ خود وہاں پہنچ کر اس ڈرامے کا ڈراپ سین کر سکوں۔

"مارگریٹ! تم جاؤ یہاں سے' ان لوگوں سے میں بھگت لوں گا۔" فلپ کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے فلپ! میں جا رہی ہوں لیکن اب تم بھی مجھے دہلی پہنچ کر ولیم کے ساتھ تعلقات رکھنے سے منع نہیں کرو گے۔" مارگریٹ کی آواز ابھری۔

ولیم' میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ یہ نام سنا ہوا تھا۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ یہ نام مجھے ڈیسوزا سے معلوم ہوا تھا۔ اس کا پورا نام ولیم رائٹ تھا اور وہ سیکرٹ سروس کا چیف تھا۔ میں ولیم رائٹ اور ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ رابرٹ ہیم ہی کی خاطر تو دہلی جا رہی تھی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ مارگریٹ کا آشنا ولیم رائٹ کا کوئی ہم نام بھی تو ہو سکتا تھا۔

"اب تم دونوں بھی یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ عورت تم دونوں میں سے کسی کی بھی پابند نہیں، نہ تمہاری بیوی ہے۔ یہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے اور یہ اس کا قانونی حق ہے۔" فلپ کی آواز آئی۔

"چھوڑ دو ڈیئر فلپ! انہیں جلنے دو۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" یہ چمپا کی آواز تھی۔

"میں تمہاری ٹانگیں چیر سکتا ہوں، میرا نام راجہ سکھ دیو ہے۔ جو عورت ایک بار مجھ سے مل لے پھر وہ کسی دوسرے مرد کی آغوش نہیں گرما سکتی۔ یہ میری توہین ہے۔"

"بے چارا بوڑھا۔" چمپا کے لہجے میں طنز تھا۔ "اس میں دم ہے اتنا کہ کسی نوجوان عورت کو اپنا پابند بنا کر رکھ سکے۔ چمپا، راجہ سکھ دیو کا مذاق اڑانے کے لئے ایسی گھٹیا زبان استعمال کرنے لگی جو ناقابل تحریر ہے۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس ندیدے پر مجھے ترس آگیا تو یہ کچھ زیادہ ہی اترانے لگا۔"

یہ سن کر راجہ سکھ آپے سے باہر ہو گیا اور چمپا کو گالیاں دینے لگا۔ جواب میں چمپا بھی اسے گالیاں بکنے لگی۔

"تیری پول کھول دی تو اب کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہا ہے۔ پھوٹ لے یہاں سے۔" چمپا یہ کہہ کر ہنس پڑی۔

اسی وقت سامنے سے میں نے مارگریٹ کو آتے دیکھا۔ موقع دیکھ کر اس بے حیا عورت نے اپنے آشنا سے ملنے کے لئے شوہر سے سودے بازی کر لی تھی۔ چند لمحے بعد مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مارگریٹ اس طرح میرے قریب سے گزر گئی جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی جلد ہی اس جگہ پہنچ گئی جہاں سے سب کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اب میری آنکھوں کے سامنے ایک شرمناک منظر تھا۔ سامنے ہی نیچے والی ایک برتھ پر فلپ اور چمپا بے غیرتی کی حدوں کو چھوتے نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں کو وہاں شہزاد اور راجہ سکھ دیو کی موجودگی کا خیال بھی نہیں تھا۔ وہ منظر میرے لئے ایسا ہی تھا کہ میں نے ادھر سے نگاہ پھیر لی۔ فلپ اور چمپا دونوں ہی مجھے جانور معلوم ہو رہے تھے۔

میں نے شہزاد اور راجہ سکھ دیو کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ دونوں بھی اس منظر کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ وہ اب خفا ہونے کے بجائے غالباً اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ باری باری میں نے ان دونوں کو مخاطب کیا، مگر انہوں نے جیسے میری آواز سنی ہی نہیں۔ پھر میری آنکھوں نے ایک اور قابل شرم منظر دیکھا۔ چمپا نے شہزاد کو آواز دے کر اپنے قریب بلا لیا تھا۔ شہزاد کسی سحرزدہ شخص کی طرح بڑھتا چلا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا، اسے دیکھ کر وہاں نہ رک سکی۔ ایسا ہی کھیل چمپا ایک بار ہمایوں اور راجہ استاد کے ساتھ بھی کھیل چکی تھی۔

اب اس ڈبے میں کوئی فرد ایسا نہیں تھا جس کی نظر میں میری عزت برقرار رہ گئی ہو۔ میں نے وہ رات انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزاری۔ میں یہ سمجھی تھی کہ صبح ہو گی تو کم از کم راجہ سکھ دیو مجھ سے ضرور ناراض ہو گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ لعنتی چمپا نے رات ہی کو انہیں ہموار کر لیا تھا۔ میرے قرب کی خاطر ان

تینوں مردوں کے درمیان گویا اتحاد ہو گیا تھا۔ اس کا عملی اظہار بھی ہو گیا۔ ابتدا راجہ سکھ دیو نے کی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ "رانی! تم رات کو ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ عورت پر کسی ایک ہی مرد کا حق نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے پہلے اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ گزشتہ رات کے تجربے کی روشنی میں اب مجھے فلپ اور شہزاد سے تمہارے قرب پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہمارے تو دھرم میں بھی اس کی مثال موجود ہے کہ ایک ہی عورت کئی مردوں کی بن کر رہ سکتی ہے۔ اب مجھے پتا لگا کہ ہمارے دھرم میں یہ مثال کیوں دی گئی ہے۔" پھر وہ شہزاد اور فلپ سے مخاطب ہوا۔ "کیوں بھئی، تم دونوں کو تو اس پر کوئی اعتراض نہیں؟"

"بالکل نہیں راجہ صاحب!" فلپ اور شہزاد یک زبان ہو گئے۔

میں نے حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اب ہمارے درمیان کون سا پردہ رہ گیا ہے جو اعتراض والی بات ہو، رانی پر ہم تینوں کا برابر حق ہے۔"

"اوہ یس .... شیور شیور۔" فلپ نے بھی شہزاد کی ہاں میں ہاں ملائی۔

فلپ کے قریب ہی مارگریٹ بیٹھی تھی۔ وہ ایک دم اپنے شوہر پر برس پڑی۔ "اب میں بھی ولیم کو اپنی کوٹھی میں بلا کر اس سے ملا کروں گی اور تم اس پر اعتراض نہیں کرو گے۔" مارگریٹ کی خفگی میں بھی سودے بازی تھی۔ "بولو فلپ! کیا تم اسے برداشت کر لو گے؟"

"میں تو اسے انجوائے کروں گا مائی ڈیئر!" فلپ بے غیرتی سے ہنس دیا۔ "اس طرح تو مجھے رانی کو بھی اپنی کوٹھی میں بلانے کا موقع مل جائے گا۔"

اب تک میں قطعی خاموش رہی تھی۔ ان تینوں کی باتوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں ان کی جاگیر ہوں۔

"تم بھی تو کچھ بولو میری رانی!" معاً راجہ سکھ دیو نے میری پشت پر ہاتھ پھیرا۔

اب تک بڑے صبر و سکون کے ساتھ میں ان تینوں کی بکواس سنتی رہی تھی لیکن پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے مڑ کر بڑی سختی کے ساتھ راجہ سکھ دیو کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولی۔ "اب اگر تم نے میرے جسم کو ہاتھ لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

"ارے ظالم! تم نے تو صبح ہوتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔" راجہ سکھ دیو لچر انداز میں کہنے لگا۔

"رانی کی یہ عادت ہے راجہ صاحب!" شہزاد بول اٹھا۔ "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ صبح ہوتے ہی یہ اس طرح اجنبی بن جاتی ہے جیسے رات کو اس کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہیں۔"

یہ جاننے کے باوجود کہ شہزاد جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کا قصور نہیں، وہ چمپا کے سحر میں ہے، مجھے غصہ آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میرا الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ "اب اگر بکواس کی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی، سمجھ گئے۔" شہزاد تھپڑ کھا کر اپنا گال سہلانے لگا۔ اسی عرصے میں راجہ سکھ دیو نے میری ران پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی مصیبت بھی آ گئی۔ اسے بھی میں نے اپنا رخسار سہلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ میری ایک طرف بیٹھا اور شہزاد دوسری جانب۔

"یہ ظلم ہے رانی! اپنے عاشقوں کے ساتھ تمہیں یہ سلوک نہیں کرنا چاہئے۔" فلپ نے مجھ سے

کہا۔

"کیا تمہاری کھال بھی کھجا رہی ہے۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"میں کوئی ہندوستانی نہیں ہوں رانی کہ تم مجھے اپنے رعب میں لے لوگی۔ اگر تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں ہاتھ توڑنا بھی جانتا ہوں۔" فلپ کے تیور بدل گئے۔ "تم ایک غلام قوم کے فرد ہو، تمہیں اپنے آقاؤں سے گفتگو کرنے کا سلیقہ آنا چاہئے۔ تم مجھے جسمانی تسکین پہنچا چکی ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہاری بدتمیزی برداشت کرلوں۔"

"تُو آقا ہوگا کسی اور کا، میں تیری صورت پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔" میں نے نفرت و حقارت کا اظہار کیا۔

فلپ غصے میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان امنڈ پڑا۔ میں بھی کھڑی ہوگئی۔ عین اسی لمحے مجھے پیچھے سے شہزاد نے گھسیٹ لیا۔ راجہ سکھ دیو بھی پیچھے نہیں رہا تھا۔ ان دونوں نے مجھے تقریباً جکڑ لیا تھا۔ مجھے فوراً ہی ان کے جسموں میں غیر معمولی قوت کا احساس ہوگیا۔

"اسے اٹھا کر وہیں لے چلو۔" فلپ نے شہزاد اور راجہ سکھ دیو کو مخاطب کیا۔ "اس کے ساتھ رات والی کہانی دہرائی جائے گی تو دماغ درست ہوگا۔"

مجھے حیرت نہیں ہوئی کہ شہزاد نے فلپ کے کہنے پر فوراً عمل کیا۔ اس نے مجھے کسی گڑیا کی طرح اپنی گود میں اٹھا لیا تھا۔ میں مچلنے لگی، مگر اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی۔ شہزاد کے پیچھے پیچھے فلپ اور راجہ سکھ دیو بھی تھے۔ وہ تینوں مجھے ڈبے کے اسی گوشے میں لے آئے جہاں رات کو چمپا کے ساتھ رنگ رلیاں منائی تھیں۔ شہزاد نے مجھے بڑی بے رحمی کے ساتھ برتھ پر ڈال دیا۔

"اٹھ کر بھاگی تو تیری گردن دبا دوں گا۔" شہزاد نے مجھے دھمکی دی۔

پھر وہ تینوں مجھے بے بس کرنے کے لئے مجھ سے الجھ پڑے کیونکہ میں نے برتھ سے فوراً اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

"اسی طرح خاموش پڑی رہ۔" راجہ سکھ دیو نے میری ساڑھی پکڑ کر کھینچ لی۔

میں نے ساڑھی پکڑی تو فلپ نے دوسری جگہ سے میری ساڑھی کھول دی۔ اسی چھینا جھپٹی میں ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹ گئی۔ میرے ایک ملازم قاسم نے بھی اسی طرح چمپا کے سحر کا شکار ہو کر میرے ساتھ زبردستی کی تھی اور میں نے اپنا زہر اس کے جسم میں اتار دیا تھا۔ میں ان تینوں کی دست درازیوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی، کیا مجھے اس وقت بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا؟ اس وقت حالات مختلف تھے اور قاسم تنہا تھا۔ اگر اب میں ایسا کرتی تو یہ میرے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ان تینوں کی مشترکہ کوششوں کے باوجود میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی، مگر اب ساڑھی میرے جسم پر نہیں تھی۔ میرے جسم پر اب بلاؤز اور پیٹی کوٹ رہ گیا تھا۔ پھر مجھے امید کی ایک کرن نظر آ ہی گئی۔ ٹرین کی رفتار اب کم ہونے لگی تھی۔ شاید کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔ ڈبے سے باہر کا منظر بدل چکا تھا۔ آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شاید ان تینوں کو بھی اس کا احساس ہوگیا۔

"ٹرین شاید رکنے والی ہے۔ یہ چیخنے لگی تو کیا ہوگا؟" راجہ سکھ دیو مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"تم بھی نرے اناڑی ہو راجہ صاحب!" شہزاد نے فوراً کہا۔ "چیخے گی کیسے، میں اس کا منہ دبائے لیتا ہوں۔ تم دونوں اسے دبوچ کر بیٹھ جاؤ۔"

"گڈ!" فلپ نے اس تجویز کی تائید میں سر ہلایا۔ "گاڑی جب یہاں سے چل دے گی تو پھر اس سے بھگت لیں گے۔" یہ کہتے ہی فلپ نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے برتھ پر گرا لیا۔

"ایسے مچل رہی ہے جیسے کنواری کنیا ہو اور کسی نے اسے.........." راجہ سکھ دیو گھٹیا زبان استعمال کرنے لگا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ سر کی طرف اٹھا کر اپنی گرفت میں لے لئے تھے۔ "اپنے یاروں سے دھینگا مشتی کر رہی ہے، شرم کر۔"

اسی عرصے میں فلپ نے میری کمر چھوڑ کر دونوں ٹانگیں مضبوطی سے پکڑ لیں۔ شہزاد کا ہاتھ میرے منہ پر جم گیا۔ ان تینوں نے مجھے قطعی بے بس کر دیا تھا۔

"یہ موقع اچھا ہے۔" راجہ سکھ دیو، شہزاد سے مخاطب ہوا۔ اس نے جو مشورہ دیا، اسے سن کر میرا خون کھول اٹھا۔

"ابھی نہیں۔" فلپ بول اٹھا۔ "جب یہ اسٹیشن گزر جائے گا تو ایسا کرنا بہتر رہے گا۔"

ٹرین اس وقت تک رک چکی تھی۔ چند لمحے بعد میں نے ٹرین کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ شاید کوئی نیا مسافر اس ڈبے میں چڑھا تھا، مگر میرا اندازہ غلط تھا۔ یہ بات کچھ دیر بعد ہی معلوم ہوگئی کہ وہ ٹی ٹی آئی تھا جو ٹکٹ چیک کرنے ڈبے میں سوار ہوا تھا۔

"ٹکٹ پلیز!" میں نے ٹی ٹی آئی کی آواز سنی۔ وہ غالباً مارگریٹ سے مخاطب تھا۔

"یہ کمبخت ٹی ٹی آئی کہاں سے آ مرا، یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ ادھر بھی آ سکتا ہے۔" راجہ سکھ دیو نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ "یہاں تو اس کی پھٹی ہوئی ساڑھی بھی پڑی ہے۔"

"فکر کی کوئی بات نہیں۔" فلپ کے عیارانہ ذہن نے فوراً ہی ایک راہ نکال لی۔ ممکن ہے یہ راہ چمپا ہی نے اسے سجھائی ہو۔

پھر فلپ کے مشورے کے مطابق ہی میرے منہ پر ساڑھی کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا باندھ دیا گیا۔ اسی طرح بہت تیزی کے ساتھ انہوں نے میرے ہاتھ پیر بھی باندھ دیئے۔ اس کے بعد وہ الگ ہٹ گئے۔ اسی وقت قدموں کی چاپ ابھری اور ٹی ٹی آئی وہاں آ گیا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

فلپ نے اس کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی جیب سے ٹکٹ نکال کر دکھایا۔ "یہ لو۔"

ٹی ٹی آئی نے ٹکٹ لے کر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ "سر! یہ عورت کون ہے؟"

"میری بیوی ہے۔" شہزاد فوراً بول اٹھا۔ "کبھی کبھی اس پر پاگل پن کے دورے پڑ جاتے ہیں اور یہ اپنے جسم پر موجود لباس پھاڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ اس وقت یہ دیکھیں، اس نے اپنی ساڑھی پھاڑ ڈالی۔ ادھر پڑی ہے۔ اب بھی یہ ڈبے سے کودنے والی تھی کہ میں نے اسے پکڑ لیا۔ یہ ہرگز میرے قابو میں نہ آتی، اگر یہ لوگ میری مدد نہ کرتے۔ انہی کی مدد سے بمشکل میں نے اس کے ہاتھ پیر باندھے ہیں۔ میں

ابھی آپ کو چل کر ٹکٹ دکھاتا ہوں' میرے ساتھ چلئے۔ ٹکٹ میری بیوی کے پرس میں ہیں۔"

"مگر آپ لوگوں کا سامان تو وہاں رکھا ہے' پھر یہاں کیسے آ گئے؟" ٹی ٹی آئی کے لہجے سے شک کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہم اسی کے پیچھے بھاگتے ہوئے یہاں آئے تھے کہ یہ کہیں کسی کھڑکی سے نہ کود جائے۔" شہزاد نے جواب دیا۔

"مسٹر ٹی ٹی آئی!" فلپ نے اسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "اپنے کام سے کام رکھو' زیادہ عقلمند بننے کی ضرورت نہیں۔"

فلپ کی ڈانٹ کھا کر ٹی ٹی آئی جلدی سے "یس سر' یس سر" کرنے لگا۔ پھر اس کی اتنی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ بقیہ افراد کے ٹکٹ چیک کر سکتا۔ اسے شاید اپنی نوکری خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ وہ الٹے پیروں وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔

ذرا ہی دیر بعد ٹرین وہاں سے چل دی۔ وہ غالباً کوئی بڑا اسٹیشن نہیں تھا۔ ٹرین وہاں زیادہ دیر نہیں رکی تھی۔

"اُلو کا پٹھا!" راجہ سکھ دیو زور سے ہنسا۔ "مسٹر فلپ کی ایک ڈانٹ کھا کر ہی کتے کی دم کی طرح سیدھا ہو گیا۔"

"چلو اب اسے بھی سیدھا کرتے ہیں۔ اب تو یہ بالکل قابو میں ہے۔" شہزاد بھی ہنسنے لگا۔

"پیر کھولنا پڑیں گے اس کے۔ کہیں پھر پیر کھلتے ہی نہ اٹھ کر بھاگنا شروع کر دے۔" راجہ سکھ دیو نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

اس پر فلپ نے بھی ہنس کر ایسی گھٹیا بات کی کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "........... پھر تو کوئی پاگل عورت بھی اٹھ کر نہیں بھاگتی۔" یہ فلپ کے آخری الفاظ تھے۔

وہ تینوں اب اٹھ کر میرے قریب آ چکے تھے۔ اچانک میں نے اپنے جسم میں شدید گرمی محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود میں شعلے سے لپکنے لگے ہوں۔ یقیناً میرے اندر خوابیدہ ایک پُراسرار قوت انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ جب میں اس کیفیت سے گزرتی تھی تو میرے جسم میں بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی تھی۔ مجھے پہلے بھی اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔

فلپ اس وقت میرے بندھے ہوئے دونوں پیر کھول رہا تھا کہ میں نے ایک ہی جھٹکے میں مضبوطی سے بندھے ہوئے اپنے ہاتھ آزاد کر لئے' پھر پیروں کو جھٹکا دیا تھا۔ فلپ اچھل کر برتھ سے نیچے جا گرا اور اسی کے ساتھ میرے پیر بھی کھل گئے۔ شہزاد اور راجہ سکھ دیو نے مجھے جکڑنا چاہا لیکن ان کا حشر بھی مختلف نہ ہوا۔ وہ دونوں بھی اِدھر اُدھر جا پڑے۔ میں نے اپنے منہ پر بندھا ہوا کپڑا بھی گھسیٹ لیا اور اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تمہیں ابھی بتاتی ہوں کمینو!" میں ان پر جھپٹ پڑی۔ وہ تینوں اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے یہ احساس تھا کہ میرے جسم میں اس وقت غیر معمولی قوت موجود ہے۔ میں نے اگر ذرا سی بھی

بے احتیاطی سے کام لیا تو ان میں سے کوئی نہ کوئی میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ میں اس عرصے میں یہ سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ پہلے میرے ہاتھ فلپ آیا اور اسی پر مجھے زیادہ غصہ بھی تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھا لیا' کچھ اور اٹھایا تو اس کے دونوں پیر ہوا میں جھولنے لگے تھے۔ گلا گھٹنے کے سبب اس کی دونوں آنکھیں باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔ میں اسے صرف ایک ہاتھ سے اٹھائے ہوئے تھی۔

"اب یہ بتا سفید بندر کہ پاگل عورت اٹھ کر بھاگتی ہے یا نہیں؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اسی وقت راجہ سکھ دیو اور شہزاد اٹھ کر میری طرف جھپٹے۔ میں ان دونوں کی طرف سے غافل نہیں تھی۔ دونوں کے ایک ایک لات پڑی تو دور جا گرے۔ راجہ سکھ دیو کا سر سیٹ کے آہنی پائے سے ٹکرا گیا تھا۔ اسے میں نے بے سدھ ہو کر ڈبے کے فرش پر پھیلتے دیکھا۔ وہ شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔ ہاں' شہزاد پھر اٹھنے والا تھا۔ میں نے اس کے بعد زیادہ دیر نہیں لگائی۔ میرا نپا تلا ہاتھ فلپ کی کنپٹی پر پڑا۔ ہاتھ میں نے دانستہ ہلکا ہی رکھا تھا کہ کہیں وہ بے ہوش ہونے کی بجائے سفر آخرت پر روانہ نہ ہو جائے۔ بے ہوش فلپ کو ایک طرف ڈال کر میں' شہزاد کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اب کچھ سہما سہما سا نظر آ رہا تھا۔ اس نے لاکھ اِدھر اُدھر بچنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے دبوچ ہی لیا۔

"خاخا........... خاتون! یہ .... یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ خوفزدہ سی آواز میں بولا۔ اس کا مجھے اتنی دیر بعد "خاتون" کہنا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ چمپا نے اسے اپنے سحر سے آزاد کر دیا ہے لیکن اب میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ چمپا دوبارہ بھی اسے اپنے سحر میں لے سکتی تھی۔

میں نے شہزاد کے لہجے کی حیرت اور بات کو نظرانداز کرتے ہوئے اسے بھی ہوش و حواس سے غافل کر دیا۔ راجہ سکھ دیو پہلے ہی بے ہوش پڑا تھا۔ ان تینوں کو وہیں اس حال میں چھوڑ کر میں تیزی کے ساتھ اپنی سیٹ تک پہنچی۔ مارگریٹ سامنے ہی سیٹ پر بیٹھی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سیٹ کے نیچے سے اپنا ایک سوٹ کیس گھسیٹ لیا۔ سوٹ کیس کو سیٹ پر رکھ کر کھولتے ہی میری نظر میک اپ بکس پر پڑی۔ ہاں' یہ بھی ممکن ہے۔ میں نے سوچا' مگر جو کچھ سوچا تھا' اس پر فوراً عمل کرنا ضروری نہیں تھا۔ سوٹ کیس سے میں نے صرف ایک ساڑھی نکال لی اور اسے دوبارہ بند کر دیا۔

"مس رانی! وہ .... وہ فلپ کہاں ہے؟" مارگریٹ نے ڈری ڈری سی آواز میں مجھ سے سوال کیا۔

میرا جی چاہا کہہ دوں' جہنم میں۔ مگر جواب یہی دیا۔ "فلپ اور وہ دونوں ادھر ہی بیٹھے ہیں۔" میں نے دائیں جانب اشارہ کیا۔ پھر میں جلدی جلدی ساڑھی باندھنے لگی۔

ساڑھی باندھ کر میں نے اپنے دونوں سوٹ کیس ایک طرف رکھ دیئے۔ شہزاد کے سوٹ کیس کو میں نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس کے بعد میں باتھ روم میں گھس گئی کیونکہ اب تک منہ بھی نہیں دھو سکی۔ باتھ روم سے نکل کر میں پھر اپنی سیٹ پر آ بیٹھی تو مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے اپنا ہینڈ پرس کھول کر اس میں سے ایک ٹکٹ نکالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ذرا دیر بعد جب میں بے ہوش شہزاد کی جیب میں ٹکٹ رکھ رہی تھی تو کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔ میں تیزی سے مڑی تو راجہ سکھ دیو کو کراہتے اور

آنکھیں جھپکتے دیکھا۔ اسے ہوش آ چکا تھا' مگر وہ ابھی لیٹا ہی ہوا تھا۔ ان تینوں میں سے فی الحال کسی کا ہوش میں آنا بہتر نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے راجہ سکھ دیو کی کنپٹی "سہلانے" میں دیر نہیں کی۔ وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنے جسم میں لپکتے ہوئے شعلوں کو سرد محسوس کیا۔ میرے وجود میں موجود پُراسرار قوت خوابیدہ ہو چکی تھی۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

پھر اگلا ریلوے اسٹیشن آنے تک میں نے ان تینوں کے پاس ہی رہنے کا فیصلہ کیا کہ اگر کسی کو ہوش آ جائے تو دوبارہ اسے جہان غفلت میں پہنچا سکوں۔ مجھے وہاں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے کسی کے قدموں کی چاپ قریب آتے سنی۔ آنے والی مارگریٹ ہی ہو سکتی تھی۔ اس نے آتے ہی ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"کیا ہوا انہیں؟ .... تم نے کیا کر دیا میرے شوہر کو؟" وہ فلپ کے بے ہوش جسم کی طرف لپکی۔ قریب پہنچ اس نے فلپ کے سینے پر ہاتھ رکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "یہ کیسے بے ہوش ہو گیا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "میں جب یہاں سے گئی تھی تو یہ تینوں ہوش میں تھے' لوٹ کر آئی تو یہ فرش پر بے ہوش پڑے تھے۔"

"جھوٹ بولتی ہو تم!" وہ چیخی۔ "انہیں تم نے بے ہوش کیا ہے۔" مارگریٹ کے رویے میں غیر معمولی تبدیلی کو میں نے فوراً محسوس کر لیا۔ یہ تبدیلی بلا سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد مارگریٹ نے جو کچھ کہا' اسے سن کر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "میں ابھی زنجیر کھینچ کر ٹرین رکواتی ہوں۔" وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

مارگریٹ اگر زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوا لیتی تو میرے لئے یقیناً مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ سب اسی کی سنتے اور اسی کی بات پر اعتبار کرتے کیونکہ وہ بہرحال حکمران قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ ٹرین جب کسی اسٹیشن پر رکتی تو بھی وہ میرے لئے مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔ ان مشکلات سے بچنے کا صرف ایک ہی حل تھا جس پر میں نے فوری طور پر عمل کیا۔ میں نے پیچھے سے مارگریٹ پر چھلانگ لگا دی۔ وہ چیختی ہوئی فرش پر گری اور پھر اٹھ نہ سکی۔ میں نے اس کی کنپٹی بھی "سہلا" دی تھی۔ اب اس ڈبے میں میرے سوا کوئی ہوش میں نہیں تھا۔ معلوم نہیں کتنی دیر بعد کوئی دوسرا اسٹیشن آتا اور ٹرین رکتی۔ میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے متعلق سوچا۔ میں ان چاروں کو وہیں بے ہوش چھوڑ کر زیادہ دیر کے لئے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتی تھی' اسی لئے اپنے سوٹ کیس سے میک اپ بکس نکال کر دوبارہ وہیں آ گئی۔ اب میں اپنے چہرے پر میک اپ کر رہی تھی۔ میک اپ کرنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لے کر میں نے میک اپ بکس بند کر دیا اور اسے سوٹ کیس میں رکھ آئی۔ اب وہ چاروں ہوش میں بھی آ جاتے تو مجھے نہ پہچان سکتے۔ اس کے باوجود میں نے کوئی خطرہ مول نہیں لیا اور وہیں موجود رہی۔

تقریباً آدھا گھنٹہ اور گزرا ہو گا کہ کھڑکی سے باہر کسی آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ کوئی چھوٹا

اسٹیشن تھا جہاں ٹرین نہیں رکی حالانکہ میں پوری طرح ٹرین سے اترنے کے لئے تیار تھی۔ میں اب اس ڈبے سے اتر کر کسی ایسے ڈبے میں سوار ہونا چاہتی تھی جہاں میرے سوا کوئی اور مسافر نہ ہو۔ چمپا کے اوچھے ہتھکنڈوں سے بچنے کی اس کے سوا اب کوئی اور راہ نہیں تھی۔ اسی غرض سے میں نے اپنے چہرے پر میک اپ بھی کیا تھا کہ اگر راجہ سکھ دیو وغیرہ مجھے تلاش کریں تو کامیاب نہ ہوں۔

اس کے بعد مجھے مزید پون گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ اس عرصے میں ان چاروں کو ہوش نہیں آیا تھا۔ ٹرین رکتے ہی میں اپنے دونوں سوٹ کیس اٹھائے اتر گئی۔ وقتی طور پر میں نے اپنا ہینڈ پرس ایک سوٹ کیس میں رکھ دیا تھا۔ تھوڑی سی تلاش و جستجو کرنے سے مجھے فرسٹ کلاس کا ایک ڈبا بالکل خالی مل گیا۔ ٹرین چلنے ہی والی تھی۔ باہر سے مجھے اس ڈبے میں کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میں اسی لئے تیزی سے اس ڈبے کا دروازہ کھول کر سوار ہو گئی۔ اسی وقت ٹرین نے تیسری سیٹی دی اور آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

میں نے اندر جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ بائیں جانب باتھ روم کا دروازہ کھلا اور میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر آنے والا ایک خوبصورت نوجوان تھا جس کے جسم پر بہترین سوٹ نظر آ رہا تھا۔ تیکھے نقوش اور گوری رنگت والا وہ نوجوان مغربی لباس میں کوئی انگریز ہی معلوم ہو رہا تھا' مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی باشندہ ہی تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ حیرت زدہ سا ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

اس کے قریب سے گزر کر میں آگے بڑھنے لگی تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "محترمہ! آپ نے شاید اس ڈبے میں سوار ہونے سے پہلے باہر لگا ہوا کارڈ نہیں دیکھا۔"

میں رک گئی اور اس کی طرف مڑ کر بولی۔ "کیسا کارڈ؟"

"ریزرویشن کارڈ۔" اس نے نرمی سے جواب دیا۔ "ریزروڈ فار نواب زادہ احمد لوط خان۔"

"تو .... یہ پورا ڈبا آپ کے لئے .... میرا مطلب ہے کہ آپ نے اپنے لئے ریزرو کرایا ہے؟" میں نے گڑبڑا کر پوچھا۔

"جی ہاں' مگر خیر' اب کیا ہو سکتا ہے' ٹرین چل چکی ہے۔"

"معاف کیجئے گا' میری نظر ریزرویشن کارڈ پر نہیں پڑ سکی' میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گی۔"

"اگلا اسٹیشن میرے اندازے کے مطابق ڈھائی گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گا۔" اس نے ڈبے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ دونوں سوٹ کیس اٹھائے اٹھائے تھک جائیں گی اس لئے اندر تشریف لے چلئے۔ جو کچھ ہوا ہے' نادانستگی میں ہوا ہے' اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں' آیئے۔" وہ آگے بڑھا۔

میں مزید کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ وہ ڈبا نسبتاً چھوٹا تھا۔ جس خطرے سے میں بچنا چاہتی تھی' وہ بدستور نواب زادہ احمد لوط خان کی شکل میں میرے سامنے موجود تھا۔ میرے قریب کسی مرد کی موجودگی چمپا کے لئے بہت کارگر ثابت ہو سکتی تھی۔ چمپا کے لئے ایسی صورت میں مجھے کسی آزمائش میں ڈالنا بہت آسان تھا۔ میں اسی وجہ سے پوری طرح چوکنا اور محتاط تھی۔ اپنے چہرے پر میں نے کسی بوڑھی

عورت کا میک اپ نہیں کیا تھا۔ اس سے مجھے کوفت سی ہوتی تھی۔ میک اپ کے باوجود میرا چہرہ پُرکشش اور جوان ہی تھا' مگر اس قدر نہیں جتنا میک اپ کے بغیر ہوتا۔ اپنے سوٹ کیس اٹھائے ہوئے میں اس کے ساتھ ڈبے کے اندر پہنچی۔

"آپ جہاں فرمائیں' میں وہاں بیٹھ جاؤں۔" میں بولی' وہ ڈبا بہرحال اس کی تحویل میں تھا۔

"اب آپ آ ہی گئی ہیں تو ساتھ ہی بیٹھیے۔" وہ مقابل والی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

میں "شکریہ" کہہ کر سیٹ پر بیٹھ گئی اور اپنی ساڑھی کا پلو درست کرنے لگی۔ سوٹ کیس میں نے قریب ہی فرش پر رکھ دیئے۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے چونک کر دریافت کیا۔

"آنچل تو ڈھلکا ہوا ہی اچھا لگتا ہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہی تھا۔

"تو کھیل شروع ہو گیا۔" میں نے بڑے دکھ سے سوچا۔ لعنتی چمپا مجھے کہیں چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

"سنو!" وہ بے تکلفی بولا۔ "تم جیسی لڑکیوں کو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں جو شکار کی تلاش میں مسلسل سفر کرتی رہتی ہیں۔ تمہارا جسم متناسب اور خوبصورت ہے' مگر چہرہ مجھے پسند نہیں آیا۔ پھر بھی پچاس روپے دے سکتا ہوں لیکن اس کے لئے دو شرطیں تمہیں ماننا پڑیں گی۔ ایک شرط تو یہ کہ تم علی گڑھ تک میرے ساتھ ہی سفر کرو گی۔ اگر تمہارے پاس وہاں تک کا ٹکٹ نہیں بھی ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ پورا ڈبا ریزرو ہے اور اس میں میرے ساتھ کوئی بھی ٹکٹ کے بغیر سفر کر سکتا ہے۔ علی گڑھ تک تم اس پر کوئی اعتراض نہیں کرو گی کہ میں کتنی بار تمہارے قرب کی آرزو کرتا ہوں۔ دوسری شرط یہ کہ تم اپنا اصل چہرہ مجھ سے نہیں چھپاؤ گی۔ تمہیں اپنے چہرے پر موجود میک اپ ختم کرنا پڑے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ تمہارے جسم ہی کی طرح تمہارا چہرہ بھی حسین ہو گا۔ اور سنو! مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں نے تمہیں غلط سمجھا ہے اور یہ کہ تم کوئی پیشہ ور لڑکی نہیں ہو۔ اس طرح تمہارا بھاؤ نہیں بڑھ سکے گا۔ میں پچاس روپے سے زیادہ آگے نہیں بڑھوں گا۔ زیادہ پیسے تمہیں ایک ہی صورت میں مل سکتے ہیں کہ تم مجھے زیادہ سے زیادہ خوش کر سکو۔ بولو' منظور ہیں میری شرائط؟"

اس نوجوان نواب زادے سے یہ سب کچھ سن کر میں سناٹے میں رہ گئی۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ چمپا نے یہاں بھی میری عزت و آبرو کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

"چپ کیوں ہو؟ بولو نا!" اس نے مجھے خاموش دیکھ کر ٹوکا۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے باوجود بھی کہ وہ نوجوان' چمپا کے سحر میں گرفتار ہے' میں نے آخری کوشش سے گریز نہیں کیا۔ میں جواب میں بولی۔ "ہرچند کہ آپ پہلے ہی یہ کہہ چکے ہیں' اگر میں نے کہا' پیشہ ور نہیں ہوں تو آپ کو یقین نہیں آئے گا' پھر بھی میں اسی پر اصرار کروں گی۔ میرے پاس اپنی بات کے

سلسلے میں ناقابل تردید ثبوت بھی موجود ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ایک سوٹ کیس ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا اور اسے سیٹ پر رکھ کر کھولنے لگی۔

"رک جاؤ۔" میں نے اس کی سخت آواز سنی۔ اس نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا تھا۔ ریوالور کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ "تم کس لئے یہ سوٹ کیس کھول رہی ہو؟ کیا اس میں کوئی پستول وغیرہ ہے جو تم نکالنا چاہتی ہو؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ اپنا ریوالور جیب میں رکھ لیں۔ میں تو آپ کو وہ ثبوت دکھا رہی تھی جو آپ کے خیال کی..........."

"زبانی بیان کرو' کیا ثبوت ہے وہ؟" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"جو لڑکی پیشہ ور ہو اور پچاس' سو روپے کے لئے اپنا جسم بیچتی ہو' اس کے پاس ہزاروں روپے نہیں ہو سکتے۔ آپ یہ بات تسلیم کرتے ہیں؟"

"اس سے مطلب کیا ہے تمہارا؟ کیا تم یہ ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ تمہارے سوٹ کیس میں ہزاروں روپے موجود ہیں؟"

"جی ہاں' میرے پاس ہزاروں روپے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی موجودگی میں مجھے وہ سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں؟"

"تمہارے پاس اور ہزاروں روپے۔" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ "ہاں' میں تسلیم کر سکتا ہوں کہ تمہارے پاس ہزاروں روپے کی ایک چیز ضرور ہے۔ ممکن ہے اس سے تم نے ہزاروں کمائے ہوں اب تک اور ہزاروں مزید کماؤ' لیکن ظاہر ہے' تمہارے اخراجات بھی ہوں گے؟ تم یہ رقم جمع کر کے محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔"

"اور اگر آپ کو یہ رقم دکھا دوں؟"

"کیوں ایسا دعویٰ کر رہی ہو جسے ثابت نہ کر سکو؟"

"آپ مجھے اپنا دعویٰ سچ کر دکھانے کا موقع تو دیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے' اگر تمہارے پاس اتنی رقم نکل آئی تو تمہیں مجبور نہیں کروں گا کہ اپنے جسم کا سودا کرو۔ سوٹ کیس ادھر کر لو تاکہ میں دیکھ سکوں' تم کچھ اور تو نہیں نکال رہیں۔"

میں نے سوٹ کیس کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں اب تک ریوالور موجود تھا۔ میں نے سوٹ کیس کھول لیا اور کپڑوں کے نیچے رکھی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں تلاش کرنے لگی۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیوں' کیا ہوا؟ رقم دکھاؤ نا؟" اس کی آواز میں چبھن تھی۔

"شاید دوسرے سوٹ کیس میں رقم رکھ دی ہے میں نے!"

"وہ بھی کھول کر دیکھ لو' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

پھر میں نے دوسرا سوٹ کیس بھی دیکھ لیا مگر نوٹوں کی گڈیاں غائب تھیں۔ اس کے بعد میں نے

ایک ایک کپڑا جھاڑ کر دیکھ لیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یقیناً چمپا کام دکھا چکی تھی۔ معاً مجھے یاد آیا کہ میرے پرس میں بھی تو کئی ہزار روپے تھے۔ پانچ ہزار روپے میں سے صرف ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا تھا اور دہلی تک کے لئے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ لئے تھے۔

"کیوں' بھول گئیں چھوکری؟" اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

"نہیں' دو چار ہزار تو میرے پرس میں بھی پڑے ہوں گے' دکھاتی ہوں ابھی۔" میں نے سوٹ کیس میں کپڑے واپس رکھتے ہوئے کہا۔

"چلو یہ بھی منظور ہے۔ تم ایک ہزار روپے ہی دکھا دو' تم جیسی لڑکیاں دس بیس روپے سے زیادہ ساتھ لے کر نہیں چلتیں جان من! زیادہ سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔"

سوٹ کیس میں سے پورے پچاسی ہزار روپے غائب ہو جانے کے بعد ایک موہوم سی امید کے تحت میں نے ہینڈ پرس کھولا۔ اس میں صرف پندرہ روپے پڑے تھے۔

"گن کر دیکھ لو' بیس روپے سے زیادہ ہرگز نہیں ہوں گے۔" اس نے مجھ پر طنز کیا۔

"اگر نہیں بھی ہیں تو پھر' تم کون ہوتے ہو میرے ساتھ زبردستی کرنے والے؟" میرا لہجہ بدل گیا۔

"میں کون ہوتا ہوں .... بہت خوب۔ آنے دو اگلا اسٹیشن' بتا دوں گا کہ میں کون ہوں۔ یہ پورا ڈبا میرے نام ریزرو ہے اور تم چوری کی نیت سے اس وقت یہاں داخل ہوئیں جب میں باتھ روم میں تھا۔ کیا سمجھیں؟ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا اور سنو گی' اس کے علاوہ مزید کیا کروں گا۔ پچاس روپے بھی نہیں دوں گا اور اگلا اسٹیشن آنے تک تمہارے ساتھ عیش بھی کروں گا۔ تم کوئی فراڈ لڑکی ہو' یہ ثابت کرنے کے لئے تمہارے چہرے پر موجود میک اپ کافی ہے جو میں تمہیں نہیں اتارنے دوں گا۔"

"اس سے کیا مل جائے گا تمہیں؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"وہی' جو کسی مرد کو عورت سے ملتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "کیوں خواہ مخواہ بات بڑھا رہی ہو' مان جاؤ' فائدے میں رہو گی۔ تمہیں تو دھندا کرنا ہی ہے' پھر مجھ میں کیا بُرائی ہے؟ ضد کرو گی تو نقصان اٹھاؤ گی۔ ہاں' یہ بھی مت بھولو کہ میں زبردستی بھی اپنی مرضی پوری کر سکتا ہوں۔ اس صورت میں تمہیں پیسے بھی نہیں ملیں گے۔ چلتی ہوئی ٹرین میں اگر تم چیخی چلائیں بھی تو کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔" اس نے مجھے واضح الفاظ میں دھمکی دی۔

"اوّل تو مَیں وہ نہیں جو تم مجھے سمجھ رہے ہو' فرض کرو ایسا ہے بھی تو ضروری نہیں کہ تم زبردستی مجھ سے سودا کرو۔"

وہ میری بات نظرانداز کر کے بولا۔ "ہاں' میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ اپنی آسودگی کے بعد میں تمہیں گولی مار کر تمہاری لاش ڈبے سے باہر بھی پھینک سکتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے اختیارات بتا رہا ہوں کہ میرے لئے کیا کیا ممکن ہے۔ تم اپنا دعویٰ ثابت نہیں کر سکیں اس لئے اپنی شکست قبول کر لو۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔"

میرا ذہن بے حد الجھ گیا تھا۔ چمپا اب تک مجھے لاکھوں روپے سے محروم کر چکی تھی۔ اس وقت بھی اس لعنتی عورت نے مجھے ایک بڑی رقم سے محروم کر دیا تھا۔ میں ایک نئے شہر میں قدم رکھنے والی تھی۔ مجھے رقم کی ضرورت تھی اور چمپا نے مجھے بالکل کنگال کر دیا تھا۔ ایک طرف تو میرا ذہن اس وجہ سے پریشانی کا شکار تھا' دوسری جانب نواب زادہ احمد لوط خان میری جان کو آ گیا تھا۔ فلپ وغیرہ سے جان چھوٹی تھی تو یہ گلے پڑ گیا تھا۔ کاش میں اس ڈبے میں سوار ہونے سے پہلے اچھی طرح سے جائزہ لے لیتی کہ وہاں کوئی پہلے سے موجود ہے یا نہیں' یا پھر مجھے ڈبے کے باہر لگا ہوا کارڈ نظر آ جاتا جس پر لکھا تھا کہ وہ ڈبا نواب زادے کے لئے مخصوص ہے۔ مجھے وہ کارڈ کیوں نظر نہ آ سکا؟ یا عین وقت پر نواب زادہ باتھ روم میں کیوں چلا گیا؟ ان دونوں سوالوں کا جواب ایک ہی تھا کہ چمپا ہی نے یہ سارا چکر چلا کر مجھے وہاں پھنسایا ہو گا۔ موجودہ حالات میں اب میرے لئے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ اس نواب زادے سے بھڑ جاتی۔ اس کے بعد مجھے کیا کرنا تھا' میں یہ بھی سوچ چکی تھی۔ مجھے بہرطور صورت حال سے کسی نہ کسی طرح تو نمٹنا ہی تھا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ اپنے پیروں پر کھڑے رہ سکو تو اپنے ذہن سے میرے حصول کا خیال نکال دو۔ تم اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور یہ کھلونا اپنی جیب میں رکھ لو' میں اس سے نہیں ڈرتی۔" میں نے پہلی بار سخت لہجے میں اسے دھمکی دی۔

خلاف توقع اس نے ریوالور اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور کہنے لگا۔ "تم نہیں مان رہیں تو مجھے زبردستی کرنا ہی پڑے گی۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں زیر کرنے سے پہلے ہی قتل کر دوں۔ میں نے اسی لئے ریوالور جیب میں رکھ لیا ہے کہ کہیں بھول چوک میں گولی نہ چل جائے۔" یہ کہتے ہی وہ جارحانہ انداز میں اٹھ کر میری طرف بڑھا۔ اس کے دونوں بازو اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ مجھے گھیر کر گرفت میں لینا چاہتا ہے۔

میں نے جھپٹ کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا اور جھٹکا دیا۔ وہ منہ کے بل نیچے گرتے گرتے حیرت انگیز طور پر سنبھل گیا۔ اسی وقت میری کھڑی ہتھیلی اس کے بائیں شانے پر پڑی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ کنپٹی پر مخصوص ضرب وہ برداشت نہ کر سکا اور لہرا کے سیٹوں کے درمیان گر گیا۔

اب مجھے اس ڈبے سے بھی فرار ہونا تھا' مگر یہ اس وقت تک ناممکن تھا کہ ٹرین کسی اسٹیشن پر رک نہ جاتی۔ راجہ سکھ دیو کی طرح نواب زادہ احمد لوط خان کے ملازمین بھی اسی ٹرین کے کسی اور ڈبے میں ہو سکتے ہیں' میں نے اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا۔ نواب زادے کے ملازمین بھی ٹرین کے کسی اسٹیشن پر رکنے کے بعد اس کے ڈبے میں آ سکتے تھے۔ مجھے ان کی آمد سے قبل ہی وہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنے چہرے پر نیا میک اپ بھی کرنا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے سوٹ کیس سے میک اپ نکالا اور اطمینان کے ساتھ پہلا میک اپ ختم کر کے چہرے پر نیا میک اپ کرنے لگی۔

میک اپ سے فارغ ہو کر میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔

لیکن یہ غیر اخلاقی حرکت ہے' میرے اندر سے ایک آواز ابھری۔

"کیا نواب زادہ میرے ساتھ کوئی شریفانہ سلوک کرنے والا تھا؟" میں آپ ہی آپ بڑبڑائی۔

"وہ اور بات تھی۔ وہ اس کا قصور تھا' مگر تمہیں یہ جرم نہیں کرنا چاہئے۔" اندر سے جواب ملا۔

کچھ دیر تک میں اپنے آپ سے الجھتی رہی' پھر کسی نہ کسی ضرورت وقت اور مصلحت کے تحت خود کو مطمئن کر ہی لیا۔ اس کے بعد میں نے نواب زادے کے سامان کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ کچھ رقم اس کے ایک سوٹ کیس میں ملی اور کچھ اس کے پرس میں موجود تھی۔ وہ سولہ ہزار چند سو روپے تھے۔ دس ہزار روپے میں نے ایک سوٹ میں رکھ دیئے اور بقیہ رقم اپنے ہینڈ پرس میں ڈال لی۔ فی الحال میرے لئے یہ رقم بھی کم نہیں تھی۔ اب مجھے ٹرین رکنے کا انتظار تھا۔

شاید سگنل نہ ملنے کے سبب ٹرین کسی اسٹیشن پر رکنے کے بجائے ایک کھلی جگہ پر رک گئی۔ میرے لئے یہ خلاف توقع ہی تھا لیکن میں نے اس ڈبے سے اترنے میں دیر نہیں کی۔ میرے دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس تھے۔ کچھ اور لوگ بھی یہ معلوم کرنے ڈبوں سے اتر آئے تھے کہ ٹرین کیوں رک گئی ہے۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال یہ آیا کہ فرسٹ کلاس کے کسی خالی ڈبے کی بجائے اگر تم سیکنڈ کلاس یا تھرڈ کلاس کے کسی ڈبے میں بیٹھ جاؤ تو بھی کوئی حرج نہیں۔ بڑی تعداد میں لوگ ڈبے کے اندر موجود ہوں گے تو کوئی ایک شخص یا دو چار افراد دوسرے لوگوں کی وہاں موجودگی کے سبب میری عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کر سکتے۔

پھر میں تیز قدمی سے ایک سمت بڑھی کیونکہ ٹرین وہاں سے کسی بھی وقت چل سکتی تھی۔ تھرڈ کلاس کے کئی ڈبوں میں' میں نے قسمت آزمائی کی۔ دو ڈبوں کے تو دروازے ہی نہیں کھل سکے۔ دروازوں کے ساتھ لوگوں نے سامان کا انبار لگا رکھا تھا۔ بقیہ ڈبوں میں لوگ اس بری طرح بھرے ہوئے تھے کہ کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ مجبوراً میں نے سیکنڈ کلاس کے ڈبوں کا رخ کیا۔ مجھے کسی ایسے ڈبے کی تلاش تھی کہ جہاں خاصے لوگ بھی ہوں اور بیٹھنے کو بھی جگہ مل جائے۔

میری تلاش ابھی جاری ہی تھی کہ ٹرین نے سیٹی دے دی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر اپنے اپنے ڈبوں میں چڑھنے لگے میں کچھ سٹپٹا گئی۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر مجھے سیکنڈ کلاس کا ایک ڈبا نظر آیا۔ میں یہ دیکھے بغیر کہ اس ڈبے میں کتنے افراد ہیں' کتنے نہیں' جلدی سے اس کی طرف لپکی۔ میں اس ڈبے میں سوار ہو رہی تھی کہ ٹرین کی دوسری سیٹی سنائی دی۔ میں نے ایک سوٹ کیس کو پائیدان سے ٹکا کر پیروں سے سہارا دیا اور ایک ہاتھ سے ڈبے کا دروازہ کھول لیا' پھر ایک سوٹ کیس اوپر رکھ کر دوسرا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ دونوں ہاتھ بھرے ہونے کی وجہ سے مجھے ڈبے میں چڑھتے ہوئے پریشانی تو ہوئی مگر اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ ٹرین اس وقت تک تیسری سیٹی دے چکی تھی۔

سیکنڈ کلاس کے اس ڈبے میں دس بارہ سے زیادہ مسافر نہیں تھے۔ بیشتر سیٹیں خالی تھیں۔ میں ایک خالی سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اس ڈبے میں سوار مسافروں نے مجھے حیرت سے دیکھا کیوں کہ وہ کوئی اسٹیشن نہیں تھا جہاں سے کوئی مسافر سوار ہوتا۔ مسافروں میں دو خواتین بھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک

عورت ادھیڑ عمر تھی' دوسری جوان۔ وہ دونوں ہی اپنے لباس سے ہندو معلوم ہو رہی تھیں۔ میں اطمینان سے بیٹھ گئی۔ میں کسی ایسے ہی ڈبے کی تلاش میں تھی۔ کسی مسافر سے میں نے کوئی بات نہیں کی۔ ٹرین چل چکی تھی۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ربڑ کی ایک گیند میرے آ کر لگی۔ گیند کے پیچھے پیچھے ایک آٹھ نو سالہ بچی بھاگتی ہوئی آئی۔

"آنٹی! میری گیند۔" بچی میرے قریب آ کر بولی۔

گیند میری گود میں پڑی تھی' میں نے اٹھا کر بچی کو دے دی تو ایک اور شخص اس بچی کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے بچی کو پکارا۔ "بے بی! ادھر آؤ۔" پھر وہ شخص میرے قریب آ کر کہنے لگا۔ "چھما کیجئے گا شریمتی جی! یہ کچھ زیادہ ہی شریر ہے۔" وہ شخص درمیانی عمر کا تھا۔ پینٹ شرٹ اس کے جسم پر تھی۔ میں جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ بچی بول اٹھی۔ "واہ پتا جی! خود تاک کر آنٹی کے گیند ماری ہے اور میرا نام لگا رہے ہیں۔"

بچی کی بات پر میں چونکی اور اس شخص کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اگر اسی شخص نے گیند پھینک کر ماری تھی تو یقیناً بڑی جسارت کا ثبوت دیا تھا کیونکہ گیند میرے جسم کے ایک نازک حصے پر آ کے لگی تھی۔ بچی کی بات ختم ہوتے ہی اس شخص نے مجھ سے کہا۔ "یہ جھوٹ بول رہی ہے شریمتی جی! آپ اس کی بات پر وشواس نہ کر لیجئے گا۔"

"میں ابھی جا کر ماں کو بتاتی ہوں کہ آپ نے آنٹی کے گیند ماری ہے۔" لڑکی بھاگی۔

"ارے ارے' اے بے بی کی بچی! اپنی ماں سے کچھ نہ کہنا' رکو۔" وہ شخص زور سے بولا۔

لڑکی رک گئی اور کہنے لگی۔ "پھر آئس کریم کھلائیں گے نا!"

"ہاں کھلاؤں گا۔ اچھا تم کھیلو ادھر جا کر میں آتا ہوں ابھی۔" اس شخص نے بچی سے کہا۔

بچی چلی گئی۔ اس نے اپنے باپ کی نازیبا حرکت کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ میرے خیال میں اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

"شریمتی جی! آپ ڈبے کے اس حصے میں بالکل اکیلی کیوں بیٹھی ہیں؟ ادھر آ جائیں نا ہمارے ساتھ۔" اس شخص نے پیشکش کی۔

"جی نہیں' شکریہ! میں یہیں ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"گیند زور سے تو نہیں لگی تھی؟" وہ پھر بولا۔

"ظاہر ہے آپ نے جتنی زور سے گیند پھینکی تھی اتنی ہی زور سے لگی ہو گی۔"

"ارے آپ نے تو بچی کی بات کو سچ ہی جان لیا .... خیر کہاں جا رہی ہیں؟" یہ کہتے ہوئے وہ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "مجھے ونود کمار شرما کہتے ہیں' آپ کا شبھ نام؟"

"میرا خیال ہے کہ ابھی میں نے آپ کے پہلے ہی سوال کا جواب نہیں دیا۔" میری آواز میں چبھن تھی۔

"تو دے دیجئے جواب۔" وہ میرے لہجے کو نظرانداز کر گیا۔ "آپ شاید پہلے کسی اور ڈبے میں سفر کر رہی ہوں گی ورنہ تو ظاہر ہے' جہاں ٹرین رکی تھی' وہاں تو آبادی نہیں تھی۔"

"ان تمام باتوں سے آپ کا مطلب کیا ہے آخر؟ آپ کو اس سے کیا غرض کہ میں کہاں سے ڈبے میں چڑھی ہوں اور کہاں جا رہی ہوں؟" میرے لہجے میں بے رخی تھی۔

"سنگی ساتھیوں سے اگر پریچے (تعارف) ہو جائے تو اچھا ہی ہوتا ہے شریمتی جی!"

"مجھے آپ سے کسی پریچے کی ضرورت نہیں۔" میری آواز میں سختی آ گئی۔ "آپ یہاں سے تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

"اگر مجھ سے آپ کا پورا پریچے ہو جاتا تو ہرگز ایسا نہ کہتیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"کیوں' کیا آپ ہندوستان کے وائسرائے لگے ہوئے ہیں؟"

"جی شریمتی! آپ کی اطلاع کے لئے یہ سیوک وائسرائے ہاؤس ہی میں ہوتا ہے۔" اس نے فخر سے گردن ٹیڑھی کر لی۔

"معاف کیجئے گا' یہ جاننے کے باوجود بھی مجھ پر آپ کا کوئی رعب نہیں پڑا۔" میری بے رخی بدستور برقرار تھی۔ "شاید اسی غرور میں آ کر آپ عورتوں پر نشانے لگاتے ہیں۔"

"ارے شریمتی جی! ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تو بس آپ سے پریچے حاصل کرنے کے لئے............"

"تو آپ نے تسلیم کر ہی لیا کہ وہ ذلیل حرکت آپ ہی نے کی تھی۔" میں اس کی بات کاٹ کر غصے میں بولی۔ "معلوم ہے آپ کو گیند کہاں آ کر لگی تھی۔"

غیر ارادی طور پر میرے منہ سے جو الفاظ نکل گئے تھے' ان سے ونود کمار شرما کو مزید بے شرمی کا موقع مل گیا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ "بتا دیں نا آپ ہی' کہاں لگی تھی گیند؟"

"بتا دوں؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ہاں بتا دیں۔ یہاں ہمارے سوا اور ہے بھی کون' کوئی نہیں سن پائے گا۔"

"بتاتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھی اور پھر قریب جا کر منہ پر طمانچہ جڑ دیا۔

"یہ چانٹا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔" وہ اپنا رخسار سہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری آنکھوں میں اس نے اپنی آنکھیں ڈال دی تھیں۔ پھر وہ جھٹکے سے مڑا اور چلا گیا۔

اس ڈبے میں بھی بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اس لئے یہی سوچا کہ میرا اس ڈبے میں سفر کرنا بھی مناسب نہیں ہے' اب جو بھی اسٹیشن آیا' اتر کر کسی اور ڈبے میں چلی جاؤں گی۔ میں خود سمجھ رہی تھی کہ یہ سب چمپا ہی کی کمینگی ہے کہ وہ مجھے کہیں سکون سے نہیں بیٹھنے دے رہی۔ میرے لئے ہر جگہ کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ صبح سے مجھے اتنی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی کہ میں ناشتہ ہی کر لیتی۔ مجھے اب بھوک سی محسوس ہونے لگی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی۔ اس دوران دوبارہ ونود کمار شرما نے مجھے چھیڑنے

کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ غالباً سمجھ چکا تھا' میں کوئی آسان شکار نہیں ہوں۔ گاڑی رکنے سے پہلے ہی میں اترنے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ ونود کمار شرما اور اس کی فیملی کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ میں نے اتنا بہرحال دیکھ لیا تھا کہ ونود کمار شرما کونے والی سیٹ پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ کچھ اور پھیل کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے کچھ سمٹتے ہوئے بچ کر نکل جانا چاہا' مگر جیسے ہی میں قریب پہنچی' اچانک اور خلاف توقع اس نے ایک ٹانگ آگے بڑھا دی۔ میرے دونوں ہاتھوں میں کیونکہ سوٹ کیس تھے اس لئے کوشش کے باوجود سنبھل نہ سکی اور ٹانگ سے الجھ کر منہ کے بل گری۔ گرتے گرتے میں نے اپنے ہاتھ سے دانستہ سوٹ کیس چھوڑ دیئے تھے تاکہ ہاتھ آگے بڑھا کر چہرے پر چوٹ کھانے سے بچ سکوں۔

ونود کمار شرما اپنی حرکت پر شرمندہ ہونے کی بجائے الٹا مجھی پر برس پڑا۔ "دیکھ کر نہیں چلا جاتا کیا اندھی ہو؟"

میں تو پہلے ہی کھولی ہوئی تھی' اس کی سینہ زوری پر اور بھی غصہ آ گیا۔ میں نے اٹھتے ہی اس کے منہ پر چانٹا مارنا چاہا۔ وہ یقیناً پہلے ہی سے کسی ایسی صورت حال کے لئے چوکنا بیٹھا تھا۔ اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ خلاف توقع گرفت اتنی سخت تھی کہ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"مردوں پر ہاتھ اٹھاتی ہے۔" وہ غرایا۔ "توڑ دوں تیری کلائی۔"

اسی وقت معلوم نہیں اس کی بیوی کو کیا سوجھی کہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر مجھ پر جھپٹ پڑی اور چیخ کر بولی۔ "تم اسے چھوڑ دو' میں بتاتی ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے میرے سر پر موجود وگ ایک جھٹکے سے کھینچ لی۔ وگ کے ساتھ ہی چہرے پر چڑھا ہوا ماسک بھی منسلک تھا' وہ بھی اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

"ارے' یہ تو کوئی بہت بڑی فراڈ معلوم ہوتی ہے' پولیس کو خبر کرنا چاہئے۔" ونود کمار شرما چیخا۔ اس نے اب تک میری کلائی تھام رکھی تھی۔

"پولیس کے حوالے کرو اسے' پولیس کے حوالے۔" کئی اور مسافر چیخ اٹھے۔

میرے لئے یہ صورت حال انتہائی خطرناک تھی۔ مجھے نواب زادہ احمد لوط خان' فلپ' راجہ سکھ دیو وغیرہ کا بھی خیال تھا۔ اس دوران انہیں ہوش آ سکتا تھا۔ وہ بھی میرے لئے کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر سکتے تھے۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر فوری طور پر وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرے ہی لمحے میرا گھٹنا ونود کمار شرما کے پیٹ پر پڑا اور اس نے چیختے ہوئے میری کلائی چھوڑ دی۔ میں نے پلٹ کر تیزی کے ساتھ اپنے دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور ڈبے کے دروازے کی طرف بھاگی۔

"وہ بھاگی جا رہی ہے .... پکڑو .... پکڑو............" مجھے اپنے عقب میں لوگوں کا شور سنائی دیا' مگر میں رکی نہیں۔

اس ڈبے سے اتر کر میں تیز قدمی کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ پھر مجھے فرسٹ کلاس کا جو پہلا ڈبا نظر آیا' اس میں چڑھ گئی۔

جیسے ہی میں اس ڈبے کے اندر پہنچی' چونک اٹھی۔ یہ وہی ڈبا تھا میں جس سے بھاگی تھی۔

”ارے خاتون! آپ کہاں چلی گئی تھیں؟“ شہزاد مجھے دیکھتے ہی ایک دم بول اٹھا۔

”کم آن مس رانی!“ فلپ نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے راجہ سکھ دیو کو بھی وہیں بیٹھے دیکھا۔ اس نے بھی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ بظاہر وہ سبھی اس وقت نارمل نظر آ رہے تھے۔ میں طویل سانس لے کر سوٹ کیس سیٹ کے نیچے رکھنے لگی۔ اسی وقت ڈائننگ کار کا بیرا آ گیا۔

معلوم ہوا اس وقت تک ایک میں نے ہی کیا' کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ بیرے کو آرڈر دے دیا گیا۔

”رات کو ایسی آنکھ لگی' اتنی گہری نیند آئی مس رانی کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آنکھ کھلی۔“ فلپ نے مجھ سے کہا۔ ”یہ سب لوگ بھی ابھی کچھ دیر پہلے جاگے ہیں۔ جاگتے ہی آپ کا خیال آیا۔ دیکھا تو آپ اپنی برتھ پر نہیں تھیں۔ اس پر سبھی کو حیرت ہوئی۔ پھر ٹرین کے رکتے ہی آپ آ گئیں۔“

فلپ کی بات سن کر میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ آج صبح جو واقعات پیش آئے تھے اور جن کی وجہ سے میں فرار ہونے پر مجبور ہو گئی تھی' چمپا نے کسی مصلحت کے تحت ان واقعات کو فلپ وغیرہ کے ذہنوں سے محو کر دیا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ابھی کچھ دیر پہلے سو کر اٹھے ہیں۔ انہیں یاد نہیں تھا کہ انہوں نے اجتماعی طور پر میری بے حرمتی کرنا چاہی تھی۔ اب میں یہ سوچ رہی تھی کہ رات کے واقعات بھی ان کے ذہن میں محفوظ ہیں یا نہیں؟ لیکن میں نے دانستہ اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ مارگریٹ خاموش بیٹھی مجھے گھورے جا رہی تھی۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ رات کو چمپا نے جو کھیل کھیلا تھا' وہ مارگریٹ اور دوسرے لوگوں کے ذہن سے محو نہیں ہو سکا۔ میں نے مارگریٹ کے خیال میں اس کے شوہر کو اس سے چھین لیا تھا۔ یہ اسی کا ردعمل معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے شوہر اور چمپا کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا تھا۔

میں نے اب تک شہزاد یا فلپ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس پر راجہ سکھ دیو بھی بول ہی اٹھا۔ ”تم نے بتایا نہیں رانی! کہاں چلی گئی تھیں؟“

”صبح جب میں جاگی تو آپ لوگ قطعی غافل سو رہے تھے۔ میں نے کوشش بھی کی جگانے کی لیکن کوئی نہیں جاگا۔ مجھے تنہا کوفت ہونے لگی۔ پھر جب ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میں ایک اور ڈبے میں چلی گئی کہ جب آپ لوگ اٹھ جائیں گے تو یہاں آ جاؤں گی۔“ میں نے انہی کی سنائی ہوئی کہانی کو مدنظر رکھتے ہوئے بات بنا دی۔

وہ لوگ میرے بیان سے مطمئن نظر آنے لگے۔ ذرا دیر بعد بیرا ناشتہ لے آیا۔ اس وقت دن کے پونے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا اور پھر چائے پی جو کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی لیکن اس وقت غنیمت ہی معلوم ہوئی۔ ٹرین کی پہلی سیٹی ہوئی تھی کہ میں نے چند سپاہیوں کے ساتھ نواب زادہ احمد لوط خان کو ڈبے کی کھڑکی سے اندر جھانکتے دیکھا۔ اس کے پاس جتنی رقم تھی' میں نے اڑا لی تھی۔ شاید اسی لئے اس نے پولیس کو مطلع کر دیا تھا اور اب غالباً پولیس والوں کے ساتھ مجھے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

میرے چہرے پر اس وقت میک اپ تھا جب میں اس سے ملی تھی' اس لئے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اب سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔

میری ایک جانب راجہ سکھ دیو اور دوسری طرف شہزاد بیٹھا ہوا تھا' سامنے والی سیٹ پر فلپ اور مارگریٹ تھے۔

اس ٹرین کو اگلے روز صبح دس بجے دہلی پہنچنا تھا۔ ابھی ایک رات اور درمیان میں تھی۔ میں اسی لئے کچھ فکرمند سی تھی کہ نہ جانے چمپا اب کیا نیا گل کھلائے۔ وہ تمام دن سکون سے گزر گیا اور کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب میں حسب معمول ڈبے میں ٹہل رہی تھی تو مجھے راجہ سکھ دیو کی آواز سنائی دی۔ ”مسٹر فلپ! میری یہ تجویز ہے کہ آج رات کے پروگرام میں مارگریٹ کو بھی شامل کریں۔“

”اس سے کیا مطلب ہے آپ کا راجہ صاحب!“ فلپ قدرے تیز آواز میں بولا۔ میں آگے بڑھتے بڑھتے چونک کر رک گئی اور ان دونوں کی باتیں سننے لگی۔

”مطلب صاف ہے۔ جس طرح میں نے اور شہزاد نے رانی کے معاملے میں تمہیں حصے دار بنا لیا ہے اسی طرح ہم دونوں مارگریٹ کے............“

”شٹ اپ۔“ فلپ چیخ اٹھا۔ ”میری بیوی کوئی طوائف نہیں ہے۔“

”لیکن رانی بھی تو کوئی بازاری لڑکی نہیں۔“ راجہ سکھ دیو نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ خود اپنی مرضی سے میرے پاس آئی تھی' میں نے اسے مجبور نہیں کیا تھا۔“ فلپ نے جواب دیا۔

”مگر پہلے وہ میرے پاس آئی تھی۔ اس پر صرف میرا حق تھا۔ اس نے خود مجھ سے میری داسی بننے کے لئے کہا تھا۔“

”کہا ہو گا' مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

اسی وقت خلاف توقع مارگریٹ کی آواز ابھری۔ ”فلپ! اصولی طور پر راجہ صاحب غلط نہیں کہہ رہے۔ تمہیں ان کی تجویز سے اختلاف نہیں کرنا چاہئے۔“

”یہ تم کیا بکواس کر رہی ہو؟“ فلپ اپنی بیوی پر برس پڑا۔ ”تم ایک انگریز کی بیوی ہو کر کسی ہندوستانی غلام............“

”میں نے ہندوستانی مردوں کی بڑی تعریفیں سنی ہیں۔“ مارگریٹ نے اپنے شوہر کی بات کاٹ دی۔

”تو تم اس بڈھے............“

”نہیں' یہاں ایک جوان بھی موجود ہے۔“ مارگریٹ کا اشارہ شہزاد کی طرف تھا۔ ”جب تم میری موجودگی میں کسی دوسری عورت کو اپنے قریب بلا سکتے ہو تو مجھے بھی کسی دوسرے مرد کے پاس جانے............“

”میں تمہیں گولی مار دوں گا مارگریٹ!“ فلپ دھاڑا۔

"تم ہرگز ایسا نہیں کرو گے فلپ! مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں کوئی ہندوستانی نہیں کہ جسے گولی مار کے تم پھانسی کے پھندے سے بچ جاؤ گے۔"

معلوم نہیں چمپا کیا نیا کھیل کھیلنے والی تھی' میں سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ مجھے ان لوگوں کی نظر میں ذلیل و رسوا تو کر ہی چکی تھی' اب نہ جانے اور کیا چاہتی تھی۔

"یہ رانی کہاں گئی؟" راجہ سکھ دیو کی آواز سنائی دی۔ معلوم نہیں اسے میرا خیال کیوں آ گیا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا جیسے وہ اٹھ کر میری طرف آ رہا ہو۔

فلپ اور مارگریٹ اب تک آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ راجہ سکھ دیو کے قدموں کی چاپ سن کر میں واپس ہونے لگی۔

"رانی!" عقب سے ذرا ہی دیر بعد مجھے راجہ سکھ دیو کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔

میں رک گئی اور مڑ کر بولی۔ "کیا بات ہے' کیوں مجھے آواز دے رہے ہو؟"

"فلپ اور مارگریٹ آپس میں لڑ رہے ہیں۔" اس نے قریب آ کر کہا۔ "شہزاد بھی وہیں ہے۔ اس موقع سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ آؤ ادھر چلتے ہیں' وہاں زیادہ روشنی نہیں ہے۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے کچھ سوچ کر اس سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا اور وہ مجھے لے کر ڈبے کے ایک نیم تاریک گوشے میں آ گیا۔ اب اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"میں یہاں ہوں' میرے راجہ!" معاً مجھے اپنی ہی آواز ایک اوپری برتھ سے سنائی دی۔ ظاہر ہے وہ چمپا ہی ہو سکتی تھی۔

راجہ سکھ دیو جیسے کھنچا ہوا اس طرف چلا گیا۔ اس نے مجھے قطعی نظرانداز کر دیا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس وقت چمپا کی مداخلت نے میری مشکل آسان کر دی تھیں میں وہاں سے لوٹ ہی رہی تھی کہ اچانک راجہ سکھ دیو کی گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ "بچاؤ.......... بچاؤ.........."

چند ہی لمحے بعد راجہ سکھ دیو کی چیخ سن کر فلپ اور شہزاد اسی طرف بھاگتے ہوئے آئے۔ وہ میرے قریب ہی سے گزرے تھے' مگر انہوں نے مجھے قطعی نظرانداز کر دیا تھا۔ میں حیران تھی کہ آخر راجہ سکھ دیو کو ہوا کیا کہ وہ اچانک چیخنے لگا؟ یہ سوچ کر میں بھی پلٹ رہی تھی کہ مارگریٹ کو بھی لپکتے ہوئے ادھر آتے دیکھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے کے باوجود جیسے مجھ سے بالکل بے خبر تھی۔ پھر میں نے اسے آگے نکل جانے دیا۔ میں اطمینان سے چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ راجہ سکھ دیو زور سے چیخا۔ میں بھی دوڑتی ہوئی وہاں تک پہنچ گئی اور پھر میری آنکھوں نے نیم تاریکی میں ایک ہولناک منظر دیکھا۔ چمپا میری شکل میں راجہ سکھ دیو کے اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ فلپ' شہزاد اور مارگریٹ تینوں ہی جیسے بت بنے ہوئے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ راجہ سکھ دیو کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ چمپا نے ایک بار پھر خنجر کو حرکت دی۔ اس مرتبہ چمپا نے تیز دھار خنجر راجہ سکھ دیو کے گلے پر پھیر دیا تھا۔ راجہ سکھ دیو کی کٹی ہوئی گردن سے خون کا فوارہ بلند ہوا۔ چمپا اچھل کر ایک طرف ہو گئی ورنہ اس کا لباس خون آلود ہو جاتا۔

"مرڈر.......... مرڈر۔" اچانک فلپ چابی بھرے ہوئے کھلونے کی طرح ایک ہی لفظ بار بار دہرانے لگا۔

"قتل.......... قتل.........." شہزاد بھی چیخنے لگا۔

اسی لمحے میں نے چمپا کو اوپری برتھ سے کودتے اور پھر اپنے قریب آ کر نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔ خون آلود خنجر وہ اوپر برتھ ہی پر پھینک آئی تھی۔ راجہ سکھ دیو کا جسم زور سے تڑپا اور پھر برتھ سے نیچے آ گرا۔ نیچے گرنے کے چند لمحے بعد ہی اس کا جسم ساکت ہو چکا تھا۔

میں اب سمجھ چکی تھی کہ آج رات چمپا نے کیا خطرناک کھیل کھیلا ہے۔ تین افراد اس کے چشم دید گواہ تھے کہ میں نے راجہ سکھ دیو کو قتل کیا ہے۔ چمپا نے مجھے سکھ دیو کے قتل میں پھنسا دیا تھا اور غائب ہو گئی تھی۔ قتل کے چشم دید تین گواہوں میں سے دو کا تعلق حکمران قوم سے تھا۔ میرا ذہن اس وقت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے چمپا کے پھیلائے ہوئے جال سے بہرحال نکلنا تھا۔ اس کے لئے کوئی راہ سوچ ہی رہی تھی کہ فلپ نے کھڑی ہوئی مارگریٹ کو مخاطب کیا۔ "مارگریٹ! زنجیر کھینچ لو۔"

"زنجیر۔" مارگریٹ حیرت سے بولی۔ پھر اچانک اس کی نگاہ میری طرف اٹھی۔ اس نے میری طرف انگلی اٹھائی اور ہکلائی۔ "یہ.......... فلپ! یہ یہاں.........."

فلپ نے بھی میری طرف دیکھا اور چونک کر کہا۔ "تم نے.......... یہ.......... مس رانی! اچھا نہیں کیا۔"

"خاتون! آپ.......... آپ نے یہ کیا کر دیا؟" شہزاد نے بھی بھرائی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا.......... کچھ نہیں کیا میں نے۔"

"لیکن ہم سب نے اپنی آنکھوں سے تمہیں قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" فلپ بول اٹھا۔ پھر اس نے دوبارہ مارگریٹ سے زنجیر کھینچنے کے لئے کہا۔

مارگریٹ لرزتی ہوئی لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف بڑھی۔ اسی لمحے میرا گھونسا اس کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ لہرا کر گری اور میں نے پلٹ کر فلپ کو بھی ہوش کی دنیا سے غافل کر دیا۔ اس کے بعد شہزاد کا ہاتھ تھام کر میں اسے وہاں سے روشنی میں لے آئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"اب.......... اب کیا ہو گا خاتون!.......... پولیس آپ کو راجہ سکھ دیو کے قتل میں گرفتار کر لے گی۔" شہزاد روہانسا سا ہو کر کہنے لگا۔

"راجہ سکھ دیو کو میں نے قتل نہیں کیا۔" میں نے شہزاد کو پُرسکون آواز میں سمجھایا۔

"مم.......... مگر خاتون آپ.......... آپ کو تو خود میں نے بھی.........."

"وہ سب کچھ فریب نظر تھا۔" میں مسکرا کر بولی۔ "تمہیں سادھو شمبھو کی بغیر سر کی لاش یاد ہے ناں؟"

"ہاں لیکن اس سے راجہ سکھ دیو کے قتل کا کیا تعلق؟" شہزاد نے حیرت سے پوچھا۔

"ہے تعلق۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "بہرحال' تم فکر نہ کرو' پھر میں اسے سمجھانے لگی کہ کیا

کرنا ہے۔"

ذرا ہی دیر بعد میں' شہزاد کے چہرے پر میک اپ کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر میک اپ کر۔ جب میں جلدی جلدی اپنے چہرے پر میک اپ کر رہی تھی تو ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی اور میں چونک اٹھی۔ میک اپ کرنے سے پہلے ٹرین کا کہیں رکنا میرے حق میں خطرناک ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ چمپا۔ میرے لئے جو جال بچھایا تھا' اس میں مجھے پوری طرح پھانسنے کے لئے مزید اقدامات سے گریز نہ کرتی۔ ان میں پہلا قدم پولیس کا وہاں پہنچنا تھا۔ میں یہ سوچ کر کہ ٹرین کسی بھی وقت رک سکتی تھی' تیزی کے ساتھ اپنے چہرے پر ایک ماسک چڑھا کر وگ پہننے لگی اور پھر جلدی سے میک اپ بکس بند کر کے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔

ٹرین کی رفتار دھیمی ہو کر ایک بار پھر تیز ہو چکی تھی۔ وہ شاید کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا جہاں سے گزرتے ہوئے ٹرین آہستہ ہو گئی تھی۔ وہاں ٹرین کو رکنا نہیں تھا۔

مجھے وہاں سے فرار ہونا ہی تھا اس لئے جلدی جلدی راجہ سکھ دیو' فلپ اور مارگریٹ کے سامان کی تلاشی لینے لگی۔

"خاتون! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" شہزاد نے سوال کیا۔

"خاموشی سے دیکھتے رہو' بولو مت۔"

کہتے ہیں کہ جب آدمی ایک مرتبہ کوئی جرم کر لیتا ہے تو دوبارہ وہی جرم کرتے ہوئے نہیں ہچکچاتا۔ نواب زادہ احمد لوط خان کے سولہ ہزار چند سو روپے میں چرا ہی چکی تھی مگر یہ رقم میرے نزدیک خاصی کم تھی۔ کیا خبر مجھے کب تک دہلی میں رہنا پڑتا' اس دوران اخراجات کا قبل از وقت اندازہ لگانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے مزید رقم کے حصول کے بارے میں سوچا تھا۔ فلپ کے پاس سے تو تقریباً سات ہزار روپے ملے البتہ راجہ سکھ دیو کے سامان سے بڑی رقم ہاتھ آئی۔ اندازہ یہی تھا کہ پچاس ہزار روپے سے کم نہیں ہوں گے۔ یہ نوٹ گن کر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے حاصل شدہ تمام رقم اپنے ایک سوٹ کیس میں رکھ لی۔ شہزاد حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لئے لازماً یہ ایک ناقابل یقین سی بات رہی ہو گی۔ مجھ سے اسے ہرگز یہ توقع نہیں ہو گی کہ میں چوری بھی کر سکتی ہوں۔

"تمہیں معلوم ہے شہزاد کہ میں' راجہ استاد سے کتنی رقم لے کر چلی تھی؟" میں نے شہزاد سے دریافت کیا۔

• "شاید وہ پچاسی ہزار روپے تھے خاتون!" اس نے جواب دیا۔ "مگر .... یہ .... یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"اس لئے کہ تمہیں بتا سکوں' وہ ساری رقم راستے میں چوری ہو چکی ہے۔"

"کیا .... وہ ساری رقم چوری ہو گئی؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں اور میں نے وہی بدلہ اتارا ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر .... پھر تو ٹھیک ہے۔" شہزاد کا انداز ایسا تھا جیسے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے یہ

کہہ رہا ہو۔

شہزاد نے تو خیر یہ بات کہہ دی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ بہرحال' اب میرے پاس پھر اتنی رقم جمع ہو چکی تھی کہ میں طویل عرصے تک اخراجات کی طرف سے بے فکر ہو کر دہلی میں رہ سکتی تھی۔ میرے پاس اب اندازاً ستر ہزار روپے سے زیادہ رقم تھی جو اس زمانے میں خاصی بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔

"دیکھو' اب جہاں بھی گاڑی رکے ہمیں فوراً اس ڈبے سے اتر جانا ہے۔" میں نے شہزاد کو ہدایت کی۔ "اور یہاں جو کچھ ہوا ہے' وہ سب کچھ بھول جانا ہے۔"

"بہتر ہے خاتون!" شہزاد نے اقرار میں سر ہلایا۔

ٹرین کے کسی اسٹیشن پر رکنے سے پہلے ہی ہم اپنے سوٹ کیس اٹھا کر دروازے پر آ گئے۔ اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی مزید گیارہ گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ مجھے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ چمپا میرے لئے کلکتے سے دہلی تک کے سفر کو اس قدر عذاب ناک بنا دے گی۔

☆======☆======☆

معلوم نہیں وہ کون سا اسٹیشن تھا جہاں چند منٹ کے لئے ٹرین رک گئی تھی۔ میرے لئے یہ چند منٹ بھی کافی تھے۔ میں ٹرین کے رکتے ہی اس ڈبے سے اتر گئی۔ شہزاد نے بھی میری تقلید کی تھی۔ اس اسٹیشن پر اترنے اور وہاں سے چڑھنے والوں کی تعداد برائے نام ہی تھی۔ اس ڈبے سے اتر کر میں سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں چڑھ گئی۔ اس ڈبے میں مجھے چھ سات مسافر نظر آ گئے تھے۔ میں نے فرسٹ کلاس کا کوئی بالکل خالی ڈبا تلاش کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

میں اور شہزاد بقیہ مسافروں سے ہٹ کر اس ڈبے کے ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھ گئے۔ تینوں سوٹ کیس ہم نے سیٹوں کے نیچے اس طرح سرکا کر رکھ دیئے تھے کہ کسی کی نظران پر نہ پڑ سکے۔ کلکتے میں ایک مرتبہ مجھے سوٹ کیسوں ہی کی وجہ سے پہچان لیا گیا تھا۔ میں نے اسی لئے یہ احتیاط برتی تھی۔

ٹرین کو اسٹیشن سے روانہ ہوئے ابھی بمشکل نصف گھنٹہ ہوا تھا کہ اچانک اس کی رفتار کم ہونے' پھر وہ رک گئی۔

"یہ ٹرین کیوں رک گئی خاتون!" شہزاد کے لہجے میں فکرمندی تھیں

"ممکن ہے' کسی نے زنجیر کھینچ لی ہو۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"اور .... اور خاتون! زنجیر کھینچنے والا وہ .... وہ شخص فلپ بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اسے اب ہوش آیا ہو۔ وہ تو مارگریٹ سے پہلے بھی زنجیر کھینچنے کو کہہ رہا تھا۔"

"کون فلپ اور کون مارگریٹ؟ میں نے تو اس سے پہلے کبھی یہ نام نہیں سنے۔" میں نے دانستہ اظہار حیرت کیا' پھر شہزاد کو نرمی سے سمجھایا۔ "میں شاید تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اس ڈبے میں جو کچھ ہوا' تمہیں بھول جانا ہے۔ تم سے جو بات کہی جائے اسے ذہن میں محفوظ رکھا کرو۔ اس ہدات پر عمل نہ کرنے کی صورت میں ہم کسی انجانے خطرے سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں۔"

"آئندہ آپ کو اس سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہو گی خاتون!" شہزاد نے یقین دلایا۔

ٹرین اس جگہ تقریباً پندرہ منٹ کھڑی رہی' مگر وہاں رکنے کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کسی مسافر نے ٹرین سے اترنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کوئی گھنٹے بھر کے بعد ایک ریلوے اسٹیشن آیا۔ وہ کوئی بڑا اسٹیشن معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہی ٹرین رکی' میں باہر پلیٹ فارم پر نظر ڈالتے ہی چونک اٹھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پلیٹ فارم پر سپاہی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اسی وقت پلیٹ فارم پر لگے لاؤڈ اسپیکر پر ایک بھاری آواز ابھری۔ "ٹرین کے مسافروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس اسٹیشن پر اس وقت تک اترنے کی کوشش نہ کرے جب تک اس کی اجازت نہ دے دی جائے۔ اسی کے ساتھ ان لوگوں سے بھی گزارش ہے جو اس اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہونے والے تھے' ابھی وہ ٹرین سے دور رہیں اور ٹرین پر سوار ہونے کی کوشش نہ کریں۔ جب انہیں ٹرین میں سوار ہونے کی اجازت مل جائے گی تو اعلان کر دیا جائے گا۔" یہی اعلان تین مرتبہ دہرایا گیا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

یہ اعلان مجھے راجہ سکھ دیو کے قتل ہی کا شاخسانہ معلوم ہوتا تھا۔ میرا ذہن کڑیاں جوڑنے میں مصروف ہو گیا۔ میں واقعات کو ترتیب دینے لگی' ان متوقع واقعات کو جو میری غیر موجودگی میں پیش آ سکتے تھے۔ فلپ نے ہوش میں آنے کے بعد زنجیر کھینچ کر ٹرین کو رکوا لیا ہو گا۔ ٹرین کے ساتھ جو ریلوے پولیس سفر کر رہی تھی' اسے قتل سے آگاہ کیا گیا ہو گا۔ فلپ نے پولیس کو یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ راجہ سکھ دیو کو قتل کرنے والی میں ہوں۔ شہزاد کے بارے میں اس نے یہی کہا ہو گا کہ وہ میرا ساتھی تھا۔ قتل کر کے میں اسی ٹرین کے کسی اور ڈبے میں سوار ہو سکتی ہوں' پولیس باآسانی یہ اندازہ قائم کر سکتی تھی۔ پھر پولیس نے وائرلیس کے ذریعے اس اسٹیشن کو قتل کی واردات سے مطلع کر دیا ہو گا۔ قتل ہونے والا بہرحال کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ قاتلہ' یعنی میری نشاندہی فلپ اور مارگریٹ دونوں ہی کر سکتے تھے۔ پولیس کے ہمراہ اب وہ ہر ڈبے میں مجھے تلاش کرتے۔ میں نے اپنے چہرے پر میک اپ کر کے پہلے ہی اس کا تدارک کر لیا تھا۔

معاً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ فلپ مجھے اور شہزاد کو تلاش کرتے ہوئے کسی نوجوان ہندوستانی جوڑے پر خصوصی توجہ دے گا۔

"تم ایسا کرو شہزاد کہ کہیں اور جا کے بیٹھ جاؤ۔" میں نے اچانک شہزاد کو مخاطب کیا۔

"وہ کیوں خاتون؟" اس نے چونک کر معلوم کیا۔

میں نے مختصراً اسے وجہ بتا دی۔ وہ میرے برابر ہی بیٹھا ہوا تھا' فوراً اٹھ گیا۔ ڈبا تقریباً خالی ہی تھا۔ شہزاد مجھ سے کافی فاصلے پر جا کے الگ تھلگ بیٹھ گیا۔ میں اب مزید مطمئن ہو گئی۔ میں نے شک کیے جانے کے خفیف سے امکان کو بھی ختم کر دیا تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد اس ڈبے کی تلاشی کا نمبر آیا۔ فلپ ہی پولیس والوں کے ساتھ تھا۔ اس نے ڈبے کے باہر ہی مسافروں کا جائزہ لینے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ وہ پولیس والوں کے ساتھ ڈبے میں آ

گیا تھا۔ اس وقت چہرے پر میک اپ ہونے کے باوجود میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ جب میں نے فلپ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کے ساتھ چار پولیس والے اور ایک انسپکٹر تھا۔ درشت سے خدوخال والا انسپکٹر میرے سامنے آ کر رک گیا۔

"محترمہ! آپ اس ٹرین میں کہاں سے سوار ہوئی ہیں؟" پولیس انسپکٹر نے مجھ سے سوال کیا۔

مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ اس طرح باقاعدہ پوچھ گچھ بھی ہو گی۔ میں تو صرف یہ سمجھی تھی کہ فلپ جب مجھے نہیں پہچان سکے گا تو پولیس والوں کے ساتھ آگے بڑھ جائے گا' پھر بھی خلاف توقع صورت حال کے باوجود میں نے آواز بدل کر جواب دیا۔ "کلکتے سے۔"

"کہاں جا رہی ہیں؟" پولیس انسپکٹر نے فوراً ہی دوسرا سوال کر دیا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ نوجوان عورتوں سے خاص طور پر پوچھ گچھ کی جا رہی ہو گی۔ میں نے جواب میں کہا۔ "دہلی۔" میری آواز اب بھی بدلی ہوئی تھی۔

پولیس انسپکٹر نے چونک کر فلپ کی طرف دیکھا' انداز معنی خیز ہی تھا۔ فلپ بول اٹھا۔ "ٹھیک ہے' وہ بھی کلکتے سے ٹرین میں بیٹھی تھی اور دہلی ہی جا رہی تھی' مگر یہ وہ نہیں ہے۔"

"بہتر ہے سر!" پولیس انسپکٹر نے سر ہلایا۔ صورت سے وہ کوئی کھاگ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے فلپ سے مزید کہا۔ "پھر بھی سر! پوچھ گچھ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اب فرسٹ کلاس کے کسی ڈبے میں سفر کرنے کی بجائے سیکنڈ کلاس یا تھرڈ کلاس کے کسی ڈبے میں بیٹھ گئی ہو۔"

"ہاں' یہ ہو سکتا ہے۔" فلپ تائید میں بولا۔

"محترمہ! آپ اپنا ٹکٹ دکھائیں گی؟" پولیس انسپکٹر ایک بار پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

ٹکٹ دکھانے کا مطالبہ میرے لئے قطعی غیر متوقع تھا۔ میں اسے ٹکٹ دکھا دیتی تو وہ شک میں مبتلا ہو جاتا۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر میں سیکنڈ کلاس میں کیوں سفر کر رہی ہوں؟ مجھ سے وہ یہ سوال کر سکتا تھا لیکن ٹکٹ نہ دکھانے کی صورت میں بھی اسے شک ہو جاتا۔ پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس طرح میں ٹکٹ دکھانے سے بچ سکتی تھی۔

"میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے انسپکٹر!" میں نے پُرسکون آواز میں بتایا۔ "میں جب ہاوڑہ اسٹیشن پہنچی تو مجھے اتنا وقت نہیں مل سکا کہ ٹکٹ لے سکتی۔"

"تو آپ بغیر ٹکٹ سفر کر رہی ہیں۔"

"کوئی ٹی ٹی آئی آ جاتا تو میں اب تک ٹکٹ بنوا چکی ہوتی۔"

"انسپکٹر! تم وقت ضائع کر رہے ہو۔" فلپ منہ بنا کر بولا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔"

"یس سر!" پولیس انسپکٹر نے فوراً ہی آگے قدم بڑھا دیئے۔ "چلیے سر! اس ڈبے میں کوئی اور مسافر خاتون نہیں۔"

"تم باتھ روم چیک کرنا بھول رہے ہو انسپکٹر!" فلپ نے واپسی کے لئے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ابھی چیک کئے لیتے ہیں سر!" پولیس انسپکٹر نے جواب دیا۔

وہ لوگ کسی امکان کو بھی نظرانداز نہیں کر رہے تھے۔ میں سمجھ گئی تھی کہ خواتین کو بطور خاص چیک کیا جا رہا تھا۔ جب فلپ سپاہیوں کے ساتھ اس ڈبے سے اتر کر چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ گولی میرے کان کے قریب سے گزر گئی تھی۔ کلکتے سے دہلی تک سفر کرنے کے ذکر پر پولیس انسپکٹر پہلے ہی چونک اٹھا تھا' اگر میں اسے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ دکھا دیتی تو وہ اور بھی شک میں پڑ جاتا۔ میں سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کی کوئی وجہ بیان نہ کر پاتی۔ پھر یہ کہ میں آواز بدل کر بولنے پر قادر نہ ہوتی تو بھی پکڑی جاتی۔ پوچھ گچھ کے وقت فلپ مجھے میری آواز سے پہچان لیتا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ میں مشکلات میں پھنس جاتی۔

ٹرین تقریباً دو گھنٹے تک اس اسٹیشن پر رکی رہی۔ اس عرصے میں میری جان گویا سولی پر لٹکی رہی۔ اس اسٹیشن سے کم ہی مسافر سوار ہوئے اور دو چار ہی اترے' وہ بھی اجازت ملنے کے بعد۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میری تلاش میں ناکام ہو کر پولیس نے یہی قیاس کیا ہو گا' میں پچھلے اسٹیشن ہی پر اتر گئی ہوں۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج چکے تھے کہ جب ٹرین اس اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ چند منٹ کے بعد شہزاد پھر آ کر میرے برابر بیٹھ گیا۔

"تم سے بھی پولیس والوں نے کچھ پوچھ گچھ کی تھی؟" میں نے معلوم کیا۔

"جی نہیں۔" اس نے بتایا' پھر کہنے لگا۔ "اچھا ہوا خاتون! کسی طرح بلا ٹلی' ورنہ تو میرا دم خشک ہو رہا تھا۔ آپ نے اگر دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے میرے اور اپنے چہرے پر میک اپ نہ کیا ہوتا تو اس وقت پھنس گئے ہوتے۔"

"پھنس تو اب بھی جاتے چندا!" میں آہستہ سے ہنسی' پھر اسے پولیس انسپکٹر کی پوچھ گچھ کے بارے میں مختصراً بتا دیا۔

"مگر.......... مگر خاتون! وہ .... وہ فلپ آپ کی آواز سن کر.........."

"میری اصل آواز سنتا تو پہچانتا نا!" میں آواز بدل کر بولی۔

"آپ بھی کمال خاتون ہیں! اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ہرگز نہ بچ پاتا۔" شہزاد نے میری تعریف کی' پھر بولا۔ "لیکن کبھی کبھی آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ مثلاً اب تک یہی نہیں سمجھ سکا کہ راجہ سکھ دیو اور فلپ کو آپ نے اپنے قریب آنے کا موقع کیوں دیا؟ جواب میں اب یہ نہ کہہ دیجئے گا کہ کون راجہ سکھ دیو اور کون فلپ۔"

"وہ تو میں ضرور کہوں گی اس لئے کہ واقعی میں نہیں جانتی' تم کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو؟" میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا کہ شہزاد کو گزشتہ رات کے ذکر ہی سے روک دیتی۔ ظاہر ہے' میں اسے کس طرح یہ بتا سکتی تھی کہ وہ میں نہیں چمپا تھی' جس نے بے حیائی کی تمام حدود توڑ دی تھیں۔

"میں تو صرف یہ بات اس لئے کہہ رہا تھا کہ مجھے اس سے تکلیف ہوئی تھی۔ آپ اس موضوع پر

گفتگو سے گریز کر رہی ہیں تو میں بھی چپ ہوا جاتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے شہزاد کہ اب ہمیں سو جانا چاہئے۔ تم ایسا کرو' وہ سامنے والی سیٹ پر جا کے جاؤ۔"

"لیکن آپ .... آپ یہاں ہوں گی تو .... تو مجھے وہاں اکیلے نیند کیسے آئے گی؟" اس لہجہ معنی خیز تھا۔ میری شکل میں چمپا کے ساتھ قرب کی تمام منزلیں طے کر کے بھی وہ ابھی شرماتا تھا۔

"کیوں' تم کوئی بچے تو ہو نہیں کہ تمہیں لوری سنے بغیر نیند نہ آئے۔"

"کیا آج نظر کرم کا ارادہ نہیں خاتون!"

"جاؤ' جا کر سو جاؤ' فضول باتیں نہ کرو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔" میں نے اسے محبت سے ڈانٹ دیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس سلسلے میں قصوروار نہیں تھا۔

"اتنے قریب ہو کر بھی آپ دور رہنا چاہتی ہیں۔" شہزاد کی آواز میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔

"ہاں' میں تم سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں' جاؤ۔"

"ٹھیک ہے خاتون' چلا جاتا ہوں' مجھے معلوم ہے' میری حیثیت کسی کھلونے سے زیادہ نہیں۔" وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اسے نہیں روکا' نہ جواب میں کچھ کہا۔ وہ سامنے والی سیٹ پر جا کے لیٹ گیا اور اظہار خفگی کی خاطر دوسری طرف کروٹ لے لی۔

میں بھی سیٹ پر دراز ہو گئی۔ اس ڈبے میں اور لوگوں کی موجودگی کے باوجود میں اور شہزاد الگ تھلگ ہونے کے سبب ایک طرح سے اکیلے ہی تھے۔ مجھے چمپا کی طرف سے اب بھی خطرہ تھا کہ وہ کوئی نیا ڈرامہ برپا نہ کر دے۔ مجھے اسی وجہ سے فوری طور پر نیند نہیں آئی' مگر میرا خدشہ غلط ہی نکلا۔ رات کا بقیہ حصہ سکون سے گزر گیا۔ مجھے نہیں معلوم' کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔

صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب کھڑکی سے دھوپ میرے چہرے پر پڑنے لگی۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ شہزاد مجھ سے پہلے جاگ چکا تھا اور سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں انگڑائی لے کر اٹھ گئی۔ باتھ روم میں جا کر میں نے چہرے سے ماسک اتارا اور سر سے وگ بھی الگ کر کے ہاتھ منہ دھویا' پھر دوبارہ میک اپ کر کے باہر آئی تو ٹرین کسی اسٹیشن پر رکنے والی تھی۔ کلکتے سے چلے آج تیسرا دن تھا۔ جغرافیہ کے مطالعے سے مجھے یہ تو علم تھا کہ ہندوستان خاصا بڑا ملک ہے مگر اس کا عملی تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ اس اسٹیشن پر ٹرین رکی تو میں' شہزاد کو لئے پہلی مرتبہ ٹرین سے کسی پلیٹ فارم پر اتری۔ سامنے ہی گرم گرم پوریاں چھوٹی سی کڑھائی میں تلی جا رہی تھیں۔ پوری والے کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔

"پوریاں خرید لو' ڈبے میں بیٹھ کر کھائیں گے۔" میں نے شہزاد سے کہا اور اپنا ہینڈ پرس کھول کر دس روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ نوٹ میں نے شہزاد کو تھما دیا۔

شہزاد ہجوم میں گھس گیا اور میں چہل قدمی کرنے لگی۔ قریب ہی ایک بک اسٹال تھا۔ میں اخبارات

کی سرخیاں دیکھنے لگی۔ ایک اخبار کے پہلے صفحے پر ایک سرخی دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ یہ سرخی راجہ سکھ دیو کے قتل سے متعلق تھی۔ "ٹرین میں سفر کرتے ہوئے بڑودا اسٹیٹ کے راجہ کو قتل کر دیا گیا' پُراسرار قاتل فرار" ذیلی سرخی تھی۔ "راجہ سکھ دیو کو قتل کرنے والی رانی نامی ایک عورت تھی' آلہ قتل برآمد' وجہ قتل معلوم نہ ہو سکی۔" اخبارات پر سرسری نظر ڈال کر میں وہاں رکی نہیں اور واپس اپنے ڈبے کی طرف چل دی۔ ڈائننگ کار کے ایک بیرے کو میں نے ڈبے سے اترتے دیکھا تو دو کپ چائے لانے کا آرڈر دے دیا۔

کچھ ہی دیر میں شہزاد گرم گرم پوریاں لے آیا۔ آلو کی بھجیا اور پوریاں مزے کی لگیں۔ ٹرین کی تیسری سیٹی سے پہلے بیرا چائے دے گیا۔ اس وقت تک ہم پوریاں کھا چکے تھے۔ ہم چائے پی رہے تھے کہ ٹرین چل دی۔ اسی وقت مجھے یہ خیال آیا کہ شہزاد خاصے عرصے کلکتے میں رہنے کے بعد اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ ظاہر ہے اس کے گھر والوں کو توقع ہو گی کہ وہ کچھ کما کر لائے گا۔ حالانکہ میں پابندی کے ساتھ اسے تنخواہ دیتی رہی تھی مگر ضروری نہیں تھا' اس نے کوئی بڑی رقم بچا لی ہو۔ پھر بھی میں نے اس سلسلے میں پوچھ ہی لیا۔

"یہ خیال آپ کو کیسے آ گیا خاتون؟" وہ چونک کر بولا۔

"اسے چھوڑو اور میں نے جو پوچھا ہے' وہ بتاؤ۔"

"کچھ رقم جمع کر لی تھی میں نے۔" شہزاد نے بتایا۔ "کھانے پینے اور رہنے سہنے کا تو ظاہر ہے کوئی خرچ نہیں تھا۔ پوری تنخواہ ہی تقریباً بچ رہی تھی' لیکن.........." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"بولو نا! چپ کیوں ہو گئے؟" میں نے سوال کیا۔

"جس روز میرا پرس غائب ہو گیا تھا جس میں گھریلو اخراجات کے لئے رقم میرے پاس رہتی تھی تو میں نے اپنی جمع شدہ رقم سے یہ نقصان پورا کرنا چاہا۔ جب اس غرض سے میں نے اپنا ٹرنک کھولا تو میری جمع شدہ رقم بھی غائب تھی۔" شہزاد نے جواب دیا۔

"لیکن تم نے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

"کیا ذکر کرتا خاتون! آپ ویسے ہی اس وقت پریشان تھیں۔"

"اندازاً کتنی رقم جمع کر لی ہو گی تم نے؟" میں نے معلوم کیا۔

"یہی کوئی آٹھ نو ہزار روپے ہوں گے خاتون!"

میں نے اس سے مزید کچھ کہے بغیر اپنا ایک سوٹ کیس سیٹ کے نیچے سے نکالا اور اسے کھول لیا۔ چوری کی رقم موجود تھی۔ میں نے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی کھینچ کر نوٹ گنے۔ وہ پورے دس ہزار روپے تھے۔ سوٹ کیس بند کر کے دوبارہ میں نے سیٹ کے نیچے سرکا دیا۔

"لو شہزاد! یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔" میں نے نوٹوں کی گڈی اس کی طرف بڑھا دی۔

شہزاد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں' پھر چند لمحے بعد وہ کہنے لگا۔ "یہ .... یہ اتنی بڑی رقم آپ .... آپ مجھے کیوں دے رہی ہیں خاتون!"

"یہ تم میری طرف سے اپنی خدمات کا انعام سمجھ کر قبول کر لو۔ لے لو۔"

"لیکن تنخواہ تو مجھے ہر ماہ پابندی سے ملتی رہی ہے۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ میں یہ رقم تمہیں بطور تنخواہ دے رہی ہوں۔"

پھر خاصے اصرار کے بعد شہزاد نے وہ رقم لے ہی لی اور اسے اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔

بقیہ سفر میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ ٹرین ڈھائی گھنٹے لیٹ یعنی ساڑھے بارہ بجے دہلی پہنچی۔

ٹرین کے رکتے ہی ایک اعلان سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "ایک ضروری اعلان سنئے۔ اس ٹرین سے اترنے والی خواتین ابھی گیٹ کا رخ نہ کریں۔ جن عورتوں کے ساتھ مرد بھی ہیں' وہ بھی اتر کر ایک طرف کھڑے ہو جائیں۔" یہ اعلان تین مرتبہ کیا گیا۔

"اس اعلان کا کیا مطلب ہو سکتا ہے خاتون!" شہزاد نے اپنے ہاتھوں میں دو سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اسی عورت کی تلاش جس کے لئے راستے میں گاڑی کی تلاشی لی گئی تھی۔ سنو' تم ایسا کرو' اکیلے باہر نکل جاؤ۔ باہر پہنچ کر میرا انتظار کرنا۔ میرے ساتھ تمہارا رہنا مناسب نہیں۔"

"ٹھیک ہے خاتون! پھر میں چلتا ہوں۔ جو مرد حضرات اکیلے ہیں انہیں باہر جانے سے نہیں روکا جا رہا۔" شہزاد بولا۔

شہزاد اور میں ساتھ ساتھ ڈبے سے اترے' پھر وہ میری ہدایت پر دو سوٹ کیس اٹھائے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا تو ایک قلی اس کی طرف لپکا۔ اس نے رک کر قلی کو دونوں سوٹ کیس تھما دیئے۔ وہ سوٹ کیس میں نے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا جس میں رقم تھی۔ جن عورتوں کے ساتھ مرد اور بچے تھے یا تنہا تھیں' وہ پلیٹ فارم کے ایک حصے میں جمع ہو گئی تھیں۔ میں بھی انہی میں شامل ہو گئی۔ معاً اپنے قریب ہی سے ایک آشنا آواز سن کر میں چونک اٹھی۔ یہ ونود کمار شرما کی آواز تھی۔ وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ "میں جا کر بات کرتا ہوں کہ سرکاری ملازم ہوں' مجھے نہ روکا جائے۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو۔"

پھر میں نے ونود کمار شرما کو گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ اسے شاید سرکاری ملازم ہونے پر کچھ زیادہ ہی غرور معلوم ہوتا تھا۔ ایک بینچ پر مجھے تھوڑی سی جگہ نظر آئی تو وہاں بیٹھ گئی۔ میرے برابر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ ایسی عورتیں کم ہی نظر آ رہی تھیں جو اکیلی ہوں۔ تقریباً سبھی مردوں کے ساتھ تھیں۔ زیادہ تر عورتیں خاموش نہیں تھیں۔

"اے بہن! مجھے تو لگے ہے کہ اسی عورت کی تلاش ہو رہی ہے' جو ہمارے ڈبے میں آ گئی تھی۔" پچھلی بینچ سے ایک عورت کی آواز ابھری۔ "میرے بیٹے ونود سے چلتے چلتے اٹکنے لگی تھی وہ۔ میری بہو نے جو اس کی چٹیا پکڑ کے کھینچی تو نقلی بال ہاتھ میں آ گئے۔"

"ارے نہیں۔" جواب میں دوسری عورت کی آواز آئی' لہجے سے بے یقینی ظاہر ہو رہی تھی۔

"تو میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں۔ بھیس بدلے ہوئے تھی وہ .... بھاگ گئی' ورنہ تو ونود اسے

پولیس کے حوالے کر دیتا۔"

میں نے مڑ کر اس ادھیڑ عمر عورت کو دیکھا جو میرے پیچھے ہی دوسری بینچ پر بیٹھی تھی۔ اس کا چہرا میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ جہاں ونود کمار شرما کی بیوی بیٹھی تھی' وہیں سکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں اسے بھی میں نے بیٹھے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ ونود کی ماں ہی تھی۔ میں اسی طرح لاتعلق بیٹھی رہی جیسے اس عورت کو کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔

کچھ دیر کے بعد یہ اعلان ہوا کہ جن عورتوں کے ساتھ مرد بھی ہیں' وہ گیٹ پر پہنچ جائیں۔ اس عرصے میں ونود کمار شرما واپس آ چکا تھا۔ اسے باہر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی جس پر اس کا منہ بنا ہوا تھا۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے وہ غالباً اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ دوسرے غلاموں سے اس کا درجہ بلند ہے۔ یہ غلط فہمی اب دور ہو گئی تھی۔ دوسرا اعلان ہوتے ہی وہ اپنی بیوی' ماں اور بیٹی کو ساتھ لئے گیٹ کی طرف چلا گیا۔ اب وہاں مجھ سمیت صرف چار عورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ان میں دو عورتیں بوڑھی تھیں۔ انہی عورتوں میں سے ایک کے ساتھ اس کی نوجوان بیٹی تھی۔ پھر یہ اعلان بھی ہو ہی گیا کہ جو عورتیں اکیلی ہیں' ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں' وہ بھی اب گیٹ کی طرف جا سکتی ہیں۔ پلیٹ فارم اب تقریباً سُونا ہو چکا تھا۔

تینوں عورتیں اٹھیں تو میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چل دی۔ گیٹ کے قریب پہنچتے پہنچتے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے وہاں ٹکٹ چیکر کے ساتھ فلپ اور مارگریٹ کو بھی دیکھ لیا تھا۔ ان دونوں کو دو کرسیاں فراہم کر دی گئی تھیں۔ وہ انہی کرسیوں پر آرام سے بیٹھے تھے۔ انہی کے قریب پولیس والے بھی کھڑے تھے۔ ایک تنہا بوڑھی عورت میرے آگے آگے تھی۔ ٹکٹ چیکر نے اس کا ٹکٹ دیکھ کر اسے جانے دیا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے پہلے ہی اپنا ٹکٹ نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"آپ نے ٹکٹ بنوا لیا تھا مس!" معاً فلپ نے مجھے مخاطب کیا۔ اسے یقیناً میرا چہرہ یاد رہ گیا تھا۔

میں نے زبان سے کچھ کہے بغیر اقرار میں سر ہلا دیا اور پھر اپنا ٹکٹ' ٹکٹ چیک کرنے والے کی طرف بڑھایا۔ ٹکٹ چیکر نے فلپ کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "سر! کلکتہ ٹو ڈلی' فرسٹ کلاس!" غالباً فلپ نے ٹکٹ چیکر کو پہلے ہی یہ بتا دیا تھا کہ جو نوجوان عورت کلکتے سے دہلی تک فرسٹ کلاس کا ٹکٹ دکھائے اسے روک لیا جائے۔

"فرسٹ کلاس؟" فلپ نے چونک کر کہا۔ "لیکن یہ تو سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہی تھیں اور انہوں نے ٹکٹ نہیں لیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ان کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ کہاں سے آگیا؟ ابھی میں نے ان سے یہی پوچھا بھی تھا۔"

"آپ ادھر آ جایئے۔" پولیس انسپکٹر نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ سپاہیوں کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ "بقیہ عورتوں کو ٹکٹ چیک کرانے دیں۔"

مجبوراً مجھے گیٹ سے باہر نکلنے کی بجائے دائیں جانب ہونا پڑا جہاں فلپ اور پولیس والے کھڑے تھے۔ اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ فلپ کی نظریں میرے ہینڈ پرس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس عرصے میں

بقیہ دو عورتیں بھی گیٹ سے نکل گئیں۔ ٹکٹ چیکر سے فلپ نے میرا ٹکٹ لے لیا تھا۔

"کیا حکم ہے سر! اسے اریسٹ کر لیا جائے؟" پولیس انسپکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فلپ سے پوچھا۔

"نہیں' مگر یہ مشتبہ ضرور ہے۔" فلپ نے جواب دیا۔ "یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ جب اس کے پاس ٹکٹ موجود تھا تو یہ جھوٹ کیوں بول رہی تھی؟ پھر فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہونے کے باوجود اس نے سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سفر کیوں کیا؟"

"پھر ایسا ہے سر کہ اگر آپ حکم دیں تو ہم اسے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں لے چلیں' وہیں ضروری پوچھ گچھ کر لی جائے گی۔" پولیس انسپکٹر نے تجویز پیش کی۔

اس پر فلپ نے رضامندی ظاہر کر دی اور اپنی بیوی مارگریٹ سے مخاطب ہوا۔ "چلو ڈارلنگ! جہاں اتنی دیر ہوئی ہے' کچھ دیر اور سہی۔"

"مگر فلپ! یہ تو وہ لڑکی نہیں ہے۔" مارگریٹ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہے مجھے۔ مگر اس نے جھوٹ کیوں بولا؟ رات کو میں نے اسے سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں دیکھا تھا۔ پولیس انسپکٹر جو میرے ساتھ تھا' اس نے ٹکٹ مانگا تو یہ بولی کہ جلدی میں ٹکٹ نہیں لے سکی' کوئی ٹی ٹی آئی نہیں آیا ورنہ ٹکٹ بنوا لیتی۔ اب اس کے پاس سے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ملا ہے۔ یہ ٹکٹ کلکتہ ہی سے خریدا گیا ہے۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔" یہ کہتے ہوئے فلپ نے ایک قلی کو اشارہ کیا۔ قلی قریب آ گیا تو فلپ نے اس سے اپنا سامان اٹھانے کو کہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ مارگریٹ اس کے ساتھ تھی۔

مجھے گرفتار نہ کرنے کے باوجود پولیس والوں نے اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ یہ بھی ایک طرح سے گرفتاری ہی تھی۔ مجھے قطعی یہ اندازہ نہیں تھا کہ دہلی پہنچ کر کوئی ایسی صورت حال بھی پیش آ سکتی ہے ورنہ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ بنوا لینا کون سا مشکل تھا۔ ٹی ٹی آئی نہ سہی' کسی بھی ریلوے اسٹیشن پر اتر کر کلکتے سے دہلی تک کا ٹکٹ بنوایا جا سکتا تھا۔ فلپ کو اگر رات والی بات یاد نہ رہتی یا میرا چہرہ وہ بھول گیا ہوتا تو بھی بات نہ بگڑتی۔ جب میں گیٹ پر پہنچی تو شہزاد کو اپنا منتظر دیکھ لیا۔ مجھے روک لئے جانے پر یقیناً وہ فکرمند ہو گا۔ میں نے سوچا' مگر اس کی فکرمندی سے زیادہ اس وقت مجھے اپنا خیال تھا۔ ذرا سی بات نے مجھے فلپ کی نظر میں مشتبہ بنا دیا تھا۔

جلد ہی پولیس والے مجھے لے کر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں آ گئے۔ فلپ کو دیکھتے ہی اسٹیشن ماسٹر اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور فلپ کو مخاطب کیا۔ "سر! کیا یہ وہی عورت ہے جس کے متعلق وائرلیس پر خبر دی گئی تھی؟"

"بیٹھو تم' ابھی کچھ نہیں معلوم یہ وہ ہے یا نہیں۔" فلپ جواب میں بولا۔ "یہ دیکھنا پڑے گا کہ کہیں اس کے چہرے پر میک اپ تو نہیں ہے۔"

فلپ کی بات سن کر میرے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی۔ خطرہ' خطرہ' میرے ذہن میں یہی ایک لفظ بار بار گردش کرنے لگا۔ کچھ پولیس والے میرے پیچھے کھڑے تھے' کچھ دائیں بائیں۔ فلپ اور

مارگریٹ کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں نے کنکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر میرے پیچھے پولیس والے کھڑے نہ ہوتے تو میں ایک ہی جست میں دروازے تک پہنچ سکتی تھی۔ میں نے اس چھوٹے سے کمرے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ سامنے ہی ایک کھلی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ کھڑکی خاصی بڑی تھی اور اس پر چڑھ کر دوسری طرف کودنا' ممکن تھا' مگر وہ کھڑکی ایسی جگہ تھی کہ اس تک پہنچنا دشوار تھا۔ کھڑکی اس کرسی کے اوپر تھی جس پر اسٹیشن ماسٹر بیٹھا تھا۔ اس کھڑکی کے اور میرے درمیان میز بھی حائل تھی۔ میز پر چڑھ کر ہی کھڑکی تک پہنچا جا سکتا تھا جو اتنے افراد کی موجودگی میں قابل عمل نہیں تھا۔ بائیں جانب دروازے کے قریب ہی ٹوائلٹ کا دروازہ تھا اور وہی مجھے امید کی ایک کرن نظر آیا۔

پھر اس سے پہلے کہ پوچھ گچھ شروع ہوتی' میں بدلی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے ٹوائلٹ جانا ہے۔"

میری بدلی ہوئی آواز سن کر فلپ کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے تھے۔ پولیس انسپکٹر نے سوالیہ نظروں سے فلپ کی طرف دیکھا۔

"ٹوائلٹ میں کوئی کھڑکی تو نہیں جس سے یہ فرار ہو جائے؟" فلپ نے یہ سوال اسٹیشن ماسٹر سے کیا تھا۔

"نو سر! ایک روشن دان ضرور ہے وہ چھوٹا بھی ہے اور اونچائی پر ہے۔" اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' تم ٹوائلٹ ہو آؤ۔" فلپ میری طرف دیکھ کر بولا۔

میرے پیچھے جو پولیس والے کھڑے تھے' وہ مجھے راستہ دینے کے لئے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ میں ٹوائلٹ کی طرف بڑھی اور پھر اچانک مڑ کر دروازے کی طرف طویل جست بھری۔ میں ایک ہی جست میں دروازے سے باہر نکل آئی تھی اور پھر فوراً پلٹ کر باہر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے اندر سے چیخ پکار سنائی دینے لگی۔ اسی کے ساتھ دروازہ پیٹا جانے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی دروازے کی طرف متوجہ ہوتا' میں وہاں رکے بغیر انتہائی تیز قدمی کے ساتھ اس طرف لپکی جہاں شہزاد کو کھڑا چھوڑ آئی تھی۔ کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد شہزاد مجھے نظر آ گیا۔ وہ میری تلاش میں غالبًا اسی طرف آ رہا تھا۔

"جلدی چلو۔" میں نے شہزاد سے کہا اور وہ میرے ساتھ ہو لیا۔

☆======☆======☆

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

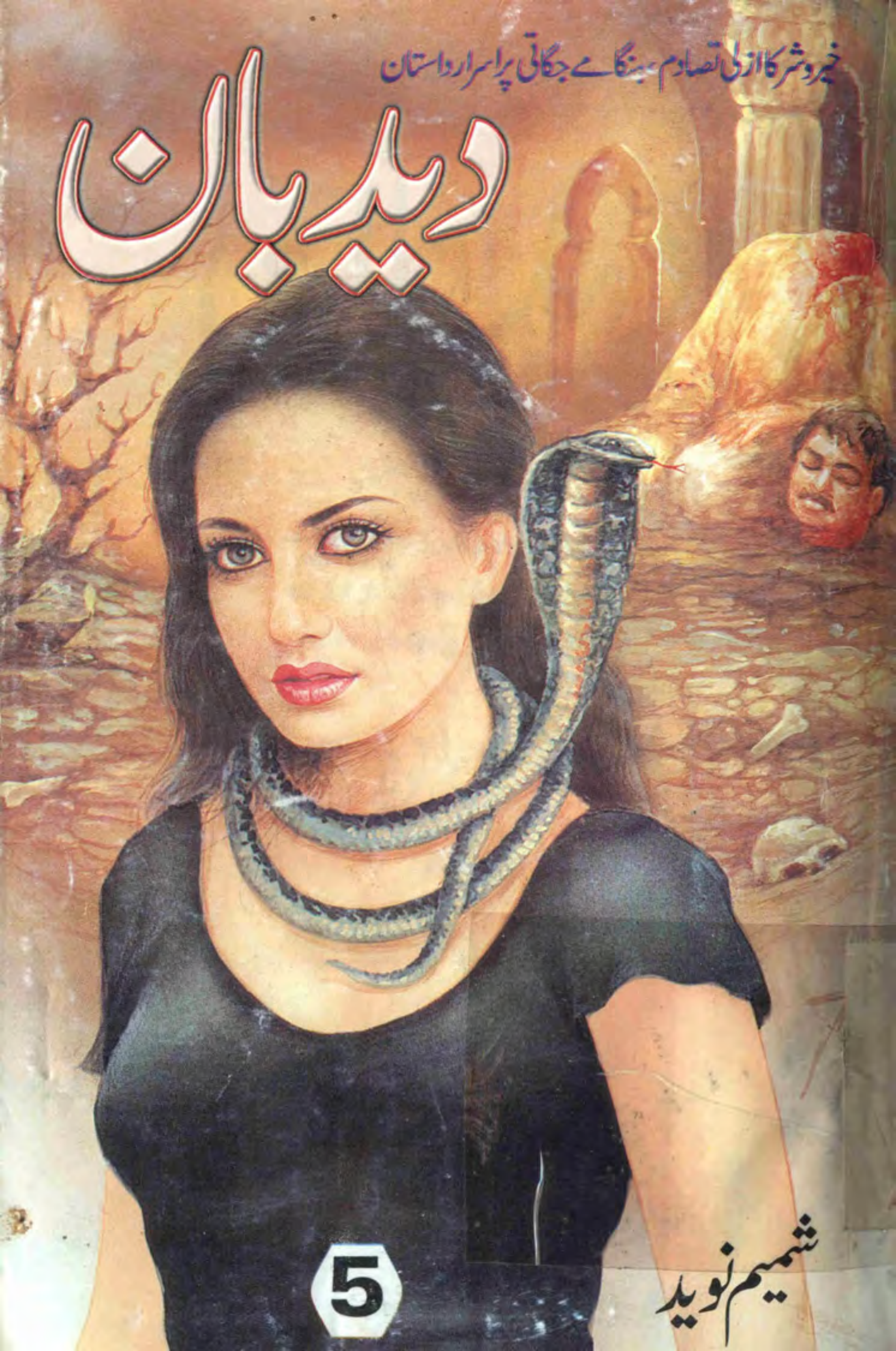
خیر و شر کا ازلی تصادم ۔ ہنگامے جگاتی پراسرار داستان
دیدبان
5
شمیم نوید

وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی۔ پُراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں۔ اس کی آنکھوں میں موت کی کڑکتی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر تھی نہ موت کی۔ وہ سانپ سے زیادہ زہریلی تھی۔ وہ اپنے دشمن کی کٹی ہوئی گردن دیکھنا چاہتی تھی۔ پُراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں۔

پُراسرار قوتوں کی مالک ایک دوشیزہ کی ہنگاموں سے بھرپور داستانِ عجیب

اسٹیشن کی عمارت سے باہر آتے آتے میں نے اپنے سر سے وگ اور چہرے سے ماسک اتار لیا تھا۔ جن پولیس والوں کو میں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں بند کر آئی تھی' وہ اب مجھے نہیں پہچان سکتے تھے۔ اس امکان کو بہرحال نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر کے بند دروازے کو کسی بھی لمحے کوئی کھول سکتا تھا یا کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے پولیس والے کود کر باہر آنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ سامنے ہی کچھ دور ایک تانگا کھڑا تھا' اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسیاں بھی موجود تھیں' مگر اب میں ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں لپک کر تانگے میں بیٹھ گئی۔ شہزاد نے بھی میری تقلید کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"چنگی قبر چلو۔" شہزاد نے تانگے والے سے کہا۔ شہزاد سے دونوں سوٹ کیس لے کر اس نے اگلی سیٹ پر رکھ لئے تھے۔ میں نے بھی اپنا سوٹ کیس اس کی طرف بڑھا دیا۔

تانگے والا جب مجھ سے سوٹ کیس لے کر اگلی سیٹ پر رکھ رہا تھا تو معاً میری نگاہ سامنے سے بھاگ کر آنے والے پولیس والوں پر پڑی۔ وہ بھاگتے ہوئے اسٹیشن کی عمارت سے نکلے تھے اور اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہے تھے۔ انہی میں مجھے پولیس انسپکٹر بھی دکھائی دیا۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کا دروازہ یقیناً باہر سے کسی نے کھول دیا تھا۔ میں نے ان پولیس والوں کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی تھے جنہیں میں کمرے میں بند کر آئی تھی۔ جیسے ہی تانگا آگے بڑھا' ایک پولیس والے نے اپنے انسپکٹر سے کچھ کہا۔ جواب میں انسپکٹر بھی منہ بنا کر کچھ بولا۔ وہ لوگ اتنے قریب تھے کہ مجھے تانگے میں بیٹھے دیکھ سکتے تھے۔ مجھ پر کسی قسم کا شک نہ کرنے کی وجہ تو خیر چہرے کی تبدیلی ہی تھی۔ اگر میں نے اپنے چہرے سے ماسک نہ اتار لیا ہوتا تو وہ مجھے لازماً پہچان لیتے۔ دوسرے میں تنہا فرار ہوئی تھی اور اس وقت شہزاد بھی میرے ساتھ تھا۔

تانگا جب فوارہ چوک سے آگے بڑھنے لگا تو میں نے دھیمی آواز میں شہزاد سے کہا۔ "اب تم بھی

کوئی موقع دیکھ کر اپنے چہرے سے ماسک اتار لو۔"

"مگر کیا یہاں بھرے بازار میں؟" شہزاد نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی۔

"پھر کیا میک اپ ہی میں اپنے گھر چلنے کا ارادہ ہے؟"

"تو کیا کیا جائے؟" وہ کچھ نروس سا ہو گیا۔

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ کچھ دور چل کر جب تانگا' جامع مسجد جانے والی سڑک پر پہنچا تو دائیں جانب چھوٹا سا ایک پارک نظر آیا۔ پارک میں دور ہی سے کسی انگریز کا مجسمہ لگا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ "یہ جگہ ٹھیک ہے' تم پارک میں جا کر ماسک اتار لو' میں تانگا کو رکواتی ہوں۔" میں نے شہزاد کو دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔

شہزاد نے بھی میری تجویز سے اتفاق کیا۔

"ذرا تانگا روکنا۔" میں نے تانگے والے سے بلند آواز میں کہا۔ "انہیں ذرا پیشاب لگ رہا ہے۔"

"اچھا جی!" تانگے والے نے سڑک کے کنارے تانگا روک لیا۔

شہزاد جلدی سے اترا اور سڑک عبور کر کے پارک میں گھس گیا۔ جب ذرا دیر میں وہ لوٹا تو اس کے چہرے پر ماسک نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے آ کر تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگا پھر چل پڑا۔ مچھلی دالان سے گزر کر تانگا اردو بازار میں داخل ہوا اور پھر بائیں ہاتھ کو بازار مٹیا محل کی طرف مڑ گیا۔ جامع مسجد اب ہمارے عقب میں تھی۔ میں کیونکہ پیچھے بیٹھی تھی اس لئے جامع مسجد کا ایک دروازہ مجھے اب بھی نظر آ رہا تھا۔ شہزاد مجھے راستوں اور علاقوں کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔

وہ بڑا گنجان علاقہ تھا جہاں تانگا رکا تھا۔ دائیں طرف اتنی تنگ گلی تھی کہ تانگا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں ہی تانگے سے اتر گئے۔ میں نے تانگے والے سے کرایہ پوچھا۔ اس نے کرایہ بتایا تو شہزاد حجت کرنے لگا۔ "تم آٹھ آنے زیادہ مانگ رہے ہو۔ بھائی' ہم یہیں کے رہنے والے ہیں' کہیں باہر سے نہیں آئے۔"

"چھوڑو بھی۔" میں نے پرس کھول کر مطلوبہ کرایہ ادا کر دیا۔

"اسی طرح تو یہ لوگ پردیسیوں کو لوٹتے ہیں۔" شہزاد نے بڑبڑاتے ہوئے سوٹ کیس تانگے سے اتار لئے۔ پھر وہ دو سوٹ کیس اٹھا کر مجھ سے بولا۔ "آیئے خاتون!"

"کتنی دور پیدل چلنا پڑے گا؟" میں نے تیسرا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ تانگے والا تانگا موڑ کر لے جا رہا تھا۔

"زیادہ دور نہیں خاتون! اس زحمت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔" وہ دائیں جانب گلی میں مڑتے ہوئے بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں' گلی ہی اس قدر تنگ ہے کہ تانگا یہاں نہیں آ سکتا۔" میں اس کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔ پھر بائیں جانب میری نگاہ اٹھی تو میں نے شہزاد سے پوچھا۔ "یہ کیا کسی کا مزار ہے؟"

"جی ہاں' یہ چٹلی صاحب کا مزار ہے۔ انہی بزرگ کے نام سے یہ علاقہ مشہور ہے۔" شہزاد نے بتایا۔

وہی گلی آگے جا کر مزید دائیں جانب مڑ گئی۔ بائیں جانب پنواڑی کی ایک دکان پر کچھ نوجوان کھڑے تھے۔ انہی میں سے ایک "بھائی جان' بھائی جان" کہتا ہوا شہزاد کی طرف لپکا۔ شہزاد کے رکتے ہی میں بھی رک گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شہزاد سے دونوں سوٹ کیس لے لئے۔ پھر میری طرف دیکھ کر کچھ ٹھٹکا۔

"لایئے خاتون! یہ مجھے دے دیجئے!" میں نے شہزاد کے کہنے پر اسے اپنا سوٹ کیس تھما دیا تو وہ مجھ سے بولا۔ "یہ میرا چھوٹا بھائی فرہاد ہے اور فرہاد یہ........"

"میرا نام رانی ہے۔" میں جلدی سے بول اٹھی کہ کہیں شہزاد میرا اصل نام اپنے بھائی کو نہ بتا دے۔ میں شہزاد کو یہ بتانا بھول گئی تھی کہ وہ اپنے گھر والوں پر میرا اصل نام ظاہر نہ کرے۔

فرہاد نے مجھے سلام کیا۔ وہ شہزاد سے دو تین سال چھوٹا اور میرا ہم عمر لگتا تھا۔

"بھائی جان! آپ نے اپنی آمد کی اطلاع ہی نہیں دی ورنہ ہم لوگ اسٹیشن پہنچ جاتے۔" فرہاد نے کہا۔

"بس اچانک ہی آنے کا پروگرام بن گیا۔" شہزاد نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

جہاں شہزاد رکا وہ قدیم طرز تعمیر کا دو منزلہ مکان تھا۔ سامنے ہی بڑا سا محرابی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اسی میں چھوٹا سا ذیلی دروازہ بھی تھا۔ شہزاد نے اسی دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

"چلی آیئے خاتون!" شہزاد نے میری طرف مڑ کر کہا۔

میں فرہاد کے ساتھ ذیلی دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ اندر نیم تاریکی سی تھی اور سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ شہزاد نے وہ دروازہ آگے بڑھ کر کھولا تو دروازے کی دوسری جانب بڑا سا صحن دکھائی دینے لگا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ شہزاد اور اس کے بھائی فرہاد کے ساتھ میں گھر میں پہنچ گئی۔ صحن کے دائیں اور بائیں قطار میں کئی پیڑ لگے ہوئے تھے۔ انہی کے ساتھ کیاریاں بھی بنی ہوئی تھیں جن میں رنگ برنگے خوشبودار پھول لگے تھے۔ کہیں کہیں بیلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ صحن کا یہ حصہ کچا اور درمیانی حصہ پختہ تھا۔ دائیں جانب ہی ایک زینہ اوپر منزل پر جانے کے لئے تھا۔ اسی کے ساتھ ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ بائیں جانب بھی اسی کے مقابل دوسرا کمرہ بنا ہوا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا دالان دکھائی دے رہا تھا' وہاں پلنگ بچھا تھا۔ پلنگ پر کوئی ادھیڑ عمر عورت اپنے سامنے بڑا سا پاندان رکھے پان لگا رہی تھی۔ معاً بائیں جانب والے کمرے کے دروازے سے سفید آڑا پاجامہ اور سرخ قمیض پہنے' بڑی سی موٹی چوٹی کمر پر ڈالے' سر پر ململ کا دوپٹا سنبھالتی ہوئی ایک خوبصورت نوجوان لڑکی باہر آئی۔

"ارے بھائی جان!" وہ خوشی سے تقریباً چیخ اٹھی۔

بوٹے سے قد اور گداز جسم والی اس لڑکی کا رنگ گورا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اس کی عمر سولہ

سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔

"میری گڑیا!" شہزاد نے بھی جواباً بلند آواز میں کہا۔

لڑکی بھاگتی ہوئی شہزاد سے آ کر لپٹ گئی۔ اسی وقت ادھیڑ عمر عورت زور سے بولی۔ "اری او سنبل! کون آیا ہے؟"

"اماں! بھائی جان ہیں۔" لڑکی خلاف توقع زور سے بولی۔

"خالہ جان!......... اری کون سی خالہ جان آئی ہیں؟" عورت نے پھر ہانک لگائی۔ وہ شاید کم سنتی تھی۔

"خالہ جان نہیں' بھائی جان اماں!" لڑکی نے چیخ کر تصحیح کی۔

"اچھا فرہاد آیا ہے۔ ٹھیک ہے' کھانا مانگنے تو دے دینا اور سن' اپنے ابا کے لئے کھانا باندھ کر فرہاد سے دکان پر بھجوا دینا۔ اذان ہونے والی ہو گی ظہر کی' میں وضو کر لوں۔" یہ کہہ کر عورت پلنگ سے اترنے لگی۔ "لوٹے میں پانی لا کے دے دے' وضو کے لئے۔"

اس دوران میں شہزاد اور فرہاد کے ہمراہ دالان تک پہنچ چکی تھی۔ شہزاد نے مجھ سے کہا۔ "یہ میری اماں ہیں' ذرا اونچا سنتی ہیں اور دکھائی بھی کم دیتا ہے۔"

"ارے' یہ تو شہزاد کی سی آواز ہے' کہیں میرے کان تو نہیں بج رہے۔" شہزاد کی ماں چونک کر بولی۔

"اماں! تمہارے کان نہیں بج رہے' یہ میں ہی ہوں۔" شہزاد آگے بڑھ کر اپنی ماں کے قریب پہنچ گیا۔ سوٹ کیس اس نے ہاتھ سے رکھ دیا تھا۔

"شہزاد! ارے تو کب آیا؟" عورت نے شہزاد کو اپنے گلے سے لگا لیا' پھر پیشانی چومنے لگی۔

"ابھی آیا ہوں اماں!" شہزاد نے جواب دیا۔

"یہ کیا فرہاد کھڑا ہے؟" عورت نے فرہاد کی طرف غور سے دیکھا۔

"ہاں اماں!" فرہاد فوراً بولا اور دونوں سوٹ کیس جو اٹھائے ہوئے تھے' زمین پر رکھ دیئے۔

"کھڑا کیا ہے' جلدی سے بھاگ کر دکان پر جا اور اپنے ابا کو بلا لا۔ کہنا شہزاد کلکتے سے آ گیا ہے۔"

"جاتا ہوں اماں!" فرہاد جانے کے لئے مڑ گیا۔

"اور اماں! یہ رانی صاحبہ ہیں۔" شہزاد نے اپنی ماں سے میرا تعارف کرایا۔ "میں انہی کے یہاں کلکتے میں نوکر ہوں۔ یہ دلی گھومنے آئی ہیں پہلی بار۔"

میں نے عورت کو سلام کیا تو اس نے مجھے دعا دی۔ "جیتی رہو' اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بنگالن ہو گی تم؟" آخر میں عورت نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

"جی نہیں' میں بنگالی نہیں ہوں' ہاں بنگالی آتی ضرور ہے مجھے۔" میں نے بتایا۔

"ہاں' بول چال سے واقعی تم بنگالن نہیں لگتیں۔" پھر عورت کو خیال آ گیا کہ میں اب تک کھڑی ہوئی ہوں۔ "ارے تم بیٹھو نا!" اس نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔

"شکریہ!" یہ کہہ کر میں پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شہزاد کی ماں بھی میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ وہ بیٹے کے آنے کی خوشی میں شاید وضو کرنا بھی بھول گئی تھیں۔

"اور یہ سنبل ہے جسے میں بچپن سے گڑیا کہتا آیا ہوں' میری چھوٹی بہن۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ سب سے بڑی بہن کی شادی ہو چکی ہے۔ ان کی سسرال علی گڑھ میں ہے۔"

"تم تینوں بہن بھائیوں میں سے ابھی کسی کی شادی نہیں ہوئی؟" میں نے دریافت کیا۔

"شہزاد کی منگنی کر دی ہے میں نے۔" شہزاد کے بجائے اس کی ماں بول اٹھی۔ "میرٹھ میں میری چھوٹی بہن بیاہی ہے' اسی کی بیٹی سے منگنی کی ہے۔ اب اس سنبل کے لئے کوئی ڈھنگ کا لڑکا مل جائے تو دونوں بہن بھائی کو ایک ساتھ نمٹا دوں۔ ارے ہاں' میں نے تم سے پان کو تو پوچھا ہی نہیں۔ پان لگاؤں تمہارے لئے؟"

"جی نہیں شکریہ! میں پان نہیں کھاتی۔" میں بولی۔

اپنی شادی کا ذکر سنتے ہی سنبل کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی اور وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

شہزاد اپنی ماں کی بائیں جانب پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو مخاطب کیا۔ "اماں! چچا امجد واپس پلکھوے چلے گئے ہیں کہ ابھی تک اوپر والا کمرہ گھرا ہوا ہے؟" بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پلکھوا دہلی کے قریب ایک گاؤں کا نام تھا۔

"ارے وہ کم بختی کا مارا کہاں جائے گا؟" شہزاد کی ماں نے جواب دیا۔ "یہاں مفت کی روٹی جو توڑنے کو مل رہی ہے۔ اب تو اسی نے اوپر کی منزل گھیر رکھی ہے۔ گلی والے زینے سے اب تو اپنے یار دوستوں کو بھی اوپر چڑھا لے جاتا ہے۔ آدھی رات تک دند مچتا رہتا ہے اوپر' تیرے ابا نے تو کانوں میں تیل ڈال رکھا ہے۔"

"میں تو خیر اس لئے پوچھ رہا تھا کہ اگر اوپری کمرے خالی ہوتے تو ان میں سے کسی کمرے کو رانی صاحبہ........"

"اوپر کا خیال چھوڑ دے' انہیں نیچے ادھر والا کمرہ دے دیں گے۔" شہزاد کی ماں نے صحن میں دائیں جانب بنے ہوئے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"مگر اماں! اس میں تو کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔" شہزاد بولا۔

"تیرے ابا نے صفائی کرا دی تھی اس کی' پچھلے مہینے لکھنؤ سے ان کے دوست الن میاں آئے تھے' انہیں وہیں ٹھہرایا تھا انہوں نے۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔" شہزاد نے اطمینان سے سر ہلایا' پھر بولا۔ "یہ گڑیا کہاں چلی گئی؟ اس کمرے کو صاف ہی کر دیتی۔" اس کے بعد وہ اپنی بہن کو آواز دینے لگا۔

"آئی بھائی جان!" جواب میں سنبل کی آواز آئی' پھر وہ خود بھی آ گئی۔

شہزاد نے اس سے صحن والے مذکورہ کمرے کی صفائی کے لئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی جان! میں اس کمرے کی صفائی کئے دیتی ہوں مگر آپ نے انہیں یہاں کہاں

بٹھا رکھا ہے۔" سنبل کا اشارہ میری طرف تھا۔ "ادھر تخت ہی پر بٹھا دیا ہوتا' یہ کیا سوچ رہی ہوں گی اپنے دل میں۔"

"ارے ہاں' ماں کی باتوں میں مجھے یہ دھیان ہی نہیں رہا۔" شہزاد نے کہا' پھر مجھ سے بولا۔ "آیئے خاتون! ادھر چل کر آرام سے بیٹھئے' آئیں اماں! آپ بھی وہیں آ جائیں۔"

دالان کے ایک سرے پر بڑا سا تخت بچھا تھا۔ تخت پر سفید چاندنی تھی اور دیوار سے لگے گاؤ تکئے رکھے تھے۔ شہزاد مجھے پلنگ سے اٹھا کر وہاں لے آیا۔ اس کی ماں صحن میں وضو کرنے لگ گئی تھی۔ دالان کے بعد ہی بڑا سا کمرہ تھا۔ میں نے تخت کی طرف آتے ہوئے سرسری سی نظر اندر کمرے میں ڈالی تھی۔ میں اب آرام سے ایک گاؤ تکئے پر کہنی ٹیک کر بیٹھ گئی تھی۔ آج تک کبھی یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ میں' شہزاد سے اس کے خاندانی حالات معلوم کرتی۔ اب یہاں آ ہی گئی تھی تو میں نے وقت گزاری کی خاطر یہ ذکر چھیڑ دیا۔ مجھے اب تک گفتگو میں "چچا امجد" کا ذکر عجیب سا لگا تھا۔ پہلا سوال میں نے شہزاد سے اسی سلسلے میں کیا۔

"میرے سگے چچا ہیں وہ۔" شہزاد بتانے لگا۔ "نوجوانی سے غلط صحبت میں پڑ گئے تھے۔ شادی انہوں نے کی نہیں۔ دہلی سے کچھ ہی دور ایک گاؤں ہے پلکھوا' وہاں میرے تایا رہتے ہیں۔ چچا امجد انہی کے پاس رہتے تھے' پہلے کبھی کبھار ہی دہلی آتے تھے۔ میں نے سوچا' میرے پیچھے واپس گاؤں چلے گئے ہوں گے مگر اماں بتا رہی ہیں کہ وہ یہیں ٹک گئے ہیں۔ ان کی بری عادتوں کے سبب اماں انہیں پسند نہیں کرتی ہیں۔ بس یہ ہے سارا قصہ' کام کاج کچھ کرتے نہیں۔"

"پھر ان کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گاؤں میں رہتے ہیں تو تایا خرچہ اٹھاتے ہیں' یہاں آ جاتے ہیں تو ابا کو ان کی ذمے داری اٹھانا پڑتی ہے۔ کبھی جوئے میں لمبی رقم جیت جاتے ہیں تو کچھ دن ابا کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں چھپاؤں گا خاتون کہ جوئے کی لت کے ساتھ چچا امجد کو شراب کا چسکا بھی لگا ہوا ہے۔ ہاتھ چھوٹ بھی بہت ہیں۔ محلے والے اسی لئے ان سے ڈرتے ہیں۔ اب ان کے بارے میں ایک نئی خبر اماں نے یہ سنائی ہے کہ اپنے یار دوستوں کو بھی گھر میں لانے لگے ہیں۔ یہ بہرحال میرے نزدیک اچھی بات نہیں کیوں کہ ان کے سارے یار دوست بھی انہی کی طرح ہیں۔ معلوم نہیں ابا ان سے کچھ کیوں نہیں کہتے!"

شہزاد کے چچا امجد کے متعلق تفصیل سے جان کر میں نے دریافت کیا۔ "تمہارے والد کیا کام کرتے ہیں؟"

"چھوٹی سی سنار کی دکان ہے۔ گھر کا خرچ اسی سے چلتا ہے۔ ابا کے لگے بندھے پرانے گاہک ہیں جنہیں ابا ہی کا کام پسند ہے۔" شہزاد نے بتایا۔ "مجھے اور فرہاد کو بھی ابا سنار ہی بنانا چاہتے تھے کہ یہ ہمارا آبائی پیشہ ہے' مگر میں نے پڑھنے کی ضد کی۔ ہاں' فرہاد کو ابا نے ضرور ایک اچھا کاریگر بنا دیا تھا لیکن وہ بھی ابا کو غوطے ہی دیتا رہتا ہے۔ جم کر کبھی دکان پر نہیں بیٹھتا۔ دیکھ لیں آج بھی گھر کے باہر دوستوں کے

ساتھ پنواڑی کی دکان پر کھڑا ہوا تھا۔ پڑھنے میں اس کا جی ہی نہیں لگا۔ چھٹی کلاس میں فیل ہونے کے بعد پھر اسکول کا رخ ہی نہیں کیا۔ میں جب تک کلکتے نہیں گیا تھا' کہتا تھا' بھائی جان نے پڑھ کر کیا کر لیا۔"

ابھی شہزاد سے میری گفتگو جاری ہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر شخص آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی' سر پر ٹوپی اور کندھے پر بڑا سا خانے دار رومال پڑا تھا۔ تنگ مہری کا پاجامہ' کرتہ اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ شہزاد اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔

شہزاد نے اس شخص سے میرا تعارف کرایا۔ وہ اس کا باپ تھا۔ جب ہم سب بیٹھ گئے تو وہ شخص بولا۔ "شہزاد بیٹے! تمہیں کم از کم اپنے آنے کی اطلاع تو دے دینا ہی چاہئے تھی۔"

"مجھے تو خود پہلے سے خبر نہیں تھی ابا جی!" شہزاد نے کہا۔ "رانی صاحبہ نے چلنے سے دو ایک روز پہلے ہی بتایا تھا کہ دہلی گھومنے چلنا ہے۔"

"تو یہ سیر و تفریح کی غرض سے دلی آئی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "کلکتے میں آپ کیا کیا کاروبار ہے؟"

"اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی' شہزاد نے بات بنا دی۔ "ابا جی! کلکتے میں ان کی کئی بلڈنگیں اور کوٹھیاں ہیں۔ ان کا کرایہ ہی اتنا آ جاتا ہے کہ مزید کسی کاروبار کی ضرورت نہیں۔ کئی آدمی کرایہ وصول کرنے پر ہیں۔ میں ان سب کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ خود رانی صاحبہ جس کوٹھی میں رہتی ہیں' وہیں ان کے دوسرے ملازمین کے ساتھ میں بھی رہتا ہوں۔"

"شہزاد میرے منیجر ہیں اور سارا حساب کتاب یہی رکھتے ہیں۔" میں نے بھی گویا گرہ میں گرہ لگا دی۔ شہزاد نے اس وقت بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ ورنہ تو اس کے باپ نے مجھ سے جو سوال کیا تھا' اسے سن کر میں چکرا سی گئی تھی۔

شہزاد کا باپ ارشد علی اپنے چھوٹے بیٹے فرہاد کو اپنی جگہ دکان پر بٹھا آیا تھا۔ وہ اسی لئے اپنا کھانا بندھوا کر لے گیا تھا کہ فرہاد کو کھانا کھانے کے لئے بھیج دے۔ اس دوران میں سنبل میرے لئے صحن والا کمرہ صاف کر چکی تھی۔ صحن ہی میں کمرے سے لگا ہوا غسل خانہ تھا۔ طویل سفر کی وجہ سے میرا اور شہزاد کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ پہلے میں نے نہا کر کپڑے تبدیل کئے' پھر شہزاد نہانے کے لئے گھس گیا۔ اس عرصے میں فرہاد دکان سے آ چکا تھا۔ سنبل باورچی خانے میں گرم گرم روٹیاں ڈال رہی تھی۔

"چھوٹے بھائی جان!" سنبل نے فرہاد کو آواز دی۔ "ارے یہ بڑے بھائی جان نہا کر نکلے یا نہیں' گرم گرم روٹیاں ڈال رہی ہوں' کھا لیتے تو اچھا تھا۔"

"ابھی نہیں نکلے۔" فرہاد نے جواب دیا۔ "جب تک وہ آتے ہیں' میں تخت پر دسترخوان بچھا کر پانی وغیرہ رکھتا ہوں۔"

پھر شہزاد نہا کر نکل آیا۔ سنبل نے لاکھ کہا کہ وہ بعد میں کھانا کھا لے گی لیکن میں نہیں مانی۔ اس نے روٹیاں ڈال لیں تو سب نے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ شہزاد کا گھر اور اس کے گھر والے مجھے اپنے سے لگے۔ ان کا تعلق متوسط طبقے سے ضرور تھا مگر دل بڑا تھا اور اس دل میں جگہ بھی بہت تھی۔ کھانا کھا

کر چائے پینے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرہ تازہ گلابوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ سنبل نے میرے سرہانے والی طاق میں گلدان رکھ دیا تھا۔ کمرہ ہوادار اور صاف ستھرا تھا۔ پلنگ پر بے داغ بستر بچھا ہوا تھا۔ میں بستر پر آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گئی۔ پلنگ کے قریب ہی چھوٹی سی ایک گول میز اور دو آرام کرسیاں بھی رکھی تھیں۔ میں نے کمرے کا ایک نظر جائزہ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ کلکتے سے دہلی تک کے سفر نے مجھے خاصا تھکا دیا تھا' اب میں سونا چاہتی تھی۔ سرفروش تنظیم کے ارکان سے رابطہ قائم کرنے کے معاملے کو میں نے اگلے روز پر چھوڑ دیا تھا۔ چتلی قبر سے جامع مسجد زیادہ دور نہیں تھی۔ تنظیم سے رابطے کی خاطر مجھے جامع مسجد کے پیش امام سے ملنا تھا۔

میں اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ مغرب کے وقت تک بے خبر پڑی سوتی رہی۔ مغرب کی اذان کے وقت سنبل نے مجھے آ کر جگایا اور کمرے کا بلب جلا دیا۔

"چائے پئیں تو بنا دوں؟" سنبل نے دریافت کیا۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ میں سو کر اٹھتی ہوں تو چائے پیتی ہوں؟" میں اٹھ کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔

"بھائی جان نے۔" وہ بھول پن سے بولی۔

"اچھا تو پھر بنا لاؤ' میں اتنے میں منہ دھو لیتی ہوں۔" میں کھڑی ہو گئی' سنبل چائے بنانے چلی گئی۔

میں غسل خانے سے منہ دھو کر نکلی تو صحن میں ایک اجنبی شخص کو دیکھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"ارے ساوتری! تم اور یہاں۔" وہ شخص چونک کر کہنے لگا۔

میں نے اس شخص کی آنکھوں میں لال لال ڈورے تیرتے ہوئے دیکھے۔ وہ قدرے بھاری جسم کا مالک تھا' کلین شیو تھا' مگر چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ وہ پینتالیس اور پچاس سال کے درمیان معلوم ہوتا تھا۔ معلوم نہیں وہ مجھے کیوں ساوتری کہہ رہا تھا۔

"محترم! میرا نام ساوتری نہیں' رانی ہے۔" میں جواب میں بولی۔

"بکواس نہ کرو۔" وہ بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں مَیں نے اس لئے یہاں کا پتا نہیں بتایا کہ.........."

"محترم! آپ کو یقیناً غلط فہمی ہو گئی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ابے غلط فہمی کی بچی! بھابی سے تو تُو نے کوئی انٹ شنٹ بات نہیں کر دی؟ چل' جلدی سے اوپر چل اور مجھے بتا کہ یہاں تک کیوں آئی ہے۔" اس نے میری کلائی پکڑ لی۔

میں نے جھٹکا دے کر کلائی اس کے ہاتھ سے چھڑا لی اور سخت لہجے میں کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے کون ہیں آپ؟"

"اچھا تو اب تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر رہی ہو۔" اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔

میں تیزی کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سنبل کے متعلق تو مجھے معلوم تھا' باورچی

خانے میں میرے لئے چائے بنا رہی تھی اور شہزاد کی ماں کو میں نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے دالان میں نماز پڑھتے دیکھ لیا تھا' مگر شہزاد کہاں چلا گیا تھا اور یہ اجنبی شخص کون تھا جو زبردستی مجھے ساوتری بنانے پر تلا ہوا تھا؟ میں یہی سوچتی ہوئی کمرے میں گئی۔

میں نے سوچا کہ سنبل چائے بنا کر لے آئے گی تو اس سے شہزاد کے بارے میں پوچھوں گی اور اس اجنبی شخص کے متعلق بھی کہ وہ کون بلا ہے' جس بے تکلفی سے وہ شخص مجھے مخاطب کر رہا تھا' اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ خطرہ بھی تھا کہ وہ کہیں کمرے ہی میں نہ آ جائے' مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر سنبل کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔

کچھ دیر کے بعد سنبل کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے پہلا سوال اس سے اجنبی شخص کے متعلق کیا۔

"ارے وہ۔" وہ مسکرائی۔ "آپ سے انہوں نے کچھ کہا تو نہیں؟ کبھی کبھی نشے میں وہ بڑی بے تکی بات کرنے لگتے ہیں۔"

"لیکن تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ ہیں کون؟"

"اپنے چچا امجد ہیں' اور کون ہوتے۔ آپ ان کی کسی بات کا بُرا نہ مانئے گا۔"

میں نے طویل سانس لیا۔ "تو یہ ہیں تمہارے چچا امجد۔" میں بولی۔ "ہیں ابھی کہ چلے گئے؟"

"اپنے حجرے میں مجھے یہ حکم دے کر چلے گئے ہیں کہ کھانا پہنچا دوں۔ اپنے کمرے کو وہ حجرہ ہی کہتے ہیں۔"

"تو تم اوپر آتی جاتی ہو' وہاں تو سنا ہے کہ ان کے یار دوست بھی آتے ہیں؟"

"رات کو عشاء کے بعد میرے اوپر جانے پر پابندی ہے اور یہ پابندی خود چچا امجد نے لگائی ہوئی ہے۔ عشاء سے پہلے پہلے وہ اوپر اکیلے ہی ہوتے ہیں۔" سنبل نے بتایا۔

"اور یہ تمہارے بھائی جان کہاں ہیں؟"

"بڑے بھائی جان .... وہ ان کے کوئی دوست آئے تھے' ان کے ساتھ گئے ہیں۔ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ آپ کو نہ اٹھاؤں' سونے دوں۔ مغرب کی اذان ہوئی تو میں نے سوچا' آپ کو اٹھا ہی دوں۔ بھائی جان کہہ رہے تھے کہ سات آٹھ بجے تک لوٹ آئیں گے۔" سنبل نے بتایا۔ "چائے پئیں آپ' ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"تمہارے ابا جی کب آتے ہیں دکان بند کر کے؟" میں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"عشاء کے بعد ہی آتے ہیں وہ بھی۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' اچھا تم جاؤ' چچا امجد کے حجرے میں ابھی تمہیں کھانا بھی پہنچانا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہانڈی تو خیر پک گئی' مگر ابھی روٹیاں ڈالنا باقی ہیں۔ روٹیاں ڈال لوں تبھی تو چچا کے حجرے میں کھانا پہنچاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑ گئی۔

سنبل چلی گئی تو میں سوچنے لگی۔ یہ ساوتری کون ہے؟ کہیں وہ میری کوئی ہم شکل تو نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شہزاد کا چچا امجد مجھے ساوتری کیوں کہتا؟ اس کی سرخ آنکھوں اور منہ سے آتی ہوئی بدبو کے سبب میں سمجھ گئی تھی کہ وہ پئے ہوئے ہے' مگر اسی کے ساتھ مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ نشے میں نہیں تھا۔ یقیناً ابھی اس نے دو ایک پیگ ہی لگائے تھے۔ عادی شرابیوں کا ایک دو پیگ سے کچھ نہیں بگڑتا' بس تھوڑا سا سرور ہوتا ہے۔ وہ زیادہ نشے میں ہوتا تو سوچا جا سکتا تھا کہ اِدھر اُدھر کی اڑا رہا ہوگا۔ جس اعتماد کے ساتھ اس نے میری کلائی پکڑی تھی' وہ بلاوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی آٹھ بجنے میں خاصی دیر تھی' میں نے سوچا کہ تھوڑا گھر سے نکل کر گھومنا چاہئے۔ اردگرد کا علاقہ تو کم از کم دیکھ ہی لوں۔ اسی خیال کے تحت میں نے لباس تبدیل کیا اور کمرے سے نکل آئی۔ باورچی خانہ صحن ہی میں تھا۔ میں وہاں پہنچ گئی۔

"سنبل! میں ذرا باہر گھومنے جا رہی ہوں' ابھی آ جاؤں گی۔" میں نے سنبل سے کہا جو روٹیاں پکا رہی تھی۔

"آپ اکیلی جائیں گی؟" وہ حیرت سے بولی۔

"کیوں' کیا ہوا؟ میرا خیال ہے کہ اب میں خاصی بڑی ہو چکی ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم فکر نہ کرو' میں جلدی آ جاؤں گی۔"

"کہیں بھائی جان آ کر ناراض نہ ہوں کہ میں نے تنہا آپ کو گھر سے کیوں جانے دیا۔"

اسی وقت باورچی خانے کے باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں سنبل کو سمجھا بجھا کر باہر آئی تو فرہاد کو دیکھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "آپ کہیں جا رہی ہیں؟"

"ہاں' بس یونہی ذرا گھومنے جا رہی تھی۔" میں نے بتایا۔

"اس وقت تو چاندنی چوک میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ کہیں تو میں چلوں آپ کے ساتھ؟" وہ ذرا جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں چلو' اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' میں کپڑے بدل کر ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ صحن میں میرے کمرے کے مقابل والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد فرہاد کے ساتھ میں گھر سے نکلی۔ گلی سے باہر آتے ہی فرہاد نے ایک خالی سائیکل رکشا کو روکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ میں فوراً بول اٹھی۔ "نہیں' پیدل گھومیں گے۔"

"تھک جائیں گی آپ۔ ویسے بھی خاصا طویل سفر کر کے آئی ہیں۔" فرہاد بولا۔ رکشا والا رک چکا تھا' فرہاد نے اس سے جانے کو کہہ دیا' پھر مجھ سے پوچھا۔ "چاندنی چوک ہی چلیں؟"

"پہلے ذرا جامع مسجد تک چلتے ہیں۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ کیونکہ مجھے بہرحال کل صبح وہاں جانا ہی تھا۔

"جامع مسجد تو یہاں سے قریب ہی ہے' راستے میں پڑے گی۔" اس نے بتایا اور میرے ساتھ ساتھ

چلنے لگا۔

وہ یقیناً مسلمانوں کا علاقہ تھا۔ اپنے سوا مجھے وہاں کوئی بھی عورت برقع کے بغیر نظر نہیں آئی۔ بازار مٹیا محل سے ہو کر ہم جامع مسجد کے ایک ذیلی دروازے کے سامنے جا پہنچے۔ ادھر بھی اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے فرہاد کو مخاطب کیا۔ "چلو' ذرا مسجد کے صدر دروازے کی طرف چلتے ہیں۔"

"آیئے۔" فرہاد دائیں جانب مڑتے ہوئے بولا۔

میں نے تاریخ میں ہندوستان کے اس عظیم الشان مغل تاجدار شاہ جہاں کے متعلق پڑھا تھا جس نے یہ تاریخی مسجد تعمیر کرائی تھی۔ دہلی کا لال قلعہ اور آگرے کا تاج محل بھی اس مغل بادشاہ کی یادگار ہیں۔ میں خاصی دیر تک مسجد کے سامنے کھڑی رہی۔ میرے صفحہ ذہن پر تاریخ کے واقعات ابھر رہے تھے۔ میں اس وقت صدر دروازے کے سامنے سیڑھیوں کے نیچے کھڑی تھی۔ یہ وہ سیڑھیاں تھیں جن سے ایک مرد خدا اپنا کٹا ہوا سر ہاتھ میں لئے اترا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے حکم پر اس کا سر قلم کر دیا گیا تھا۔ یہ درویش سرمدؒ تھے۔ اسی مسجد کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک اور تاریخی واقعہ تازہ ہو گیا۔ اس کا تعلق بھی اورنگ زیب عالمگیر ہی سے تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک روز اورنگ زیب مسجد میں نماز پڑھنے آیا تو اس نے دیکھا' ایک فقیر کعبے کی طرف پیر کئے لیٹا تھا۔ اورنگ زیب نے کئی بار اسے ایسا کرنے سے منع کیا' مگر وہ باز نہ آیا۔ اس پر اورنگ زیب کو غصہ آ گیا۔ اس نے تلوار نکال کر فقیر کے دونوں پیر کاٹ دیئے۔ پھر خود اورنگ زیب اور مسجد میں موجود دوسرے لوگوں نے ایک ناقابل یقین اور حیرت انگیز پُراسرار منظر دیکھا۔ فقیر کے کٹے ہوئے دونوں پیر دوبارہ اس کے جسم سے اس طرح جڑ گئے جیسے کٹے ہی نہیں تھے۔ اورنگ زیب نے دوبارہ فقیر کے پیروں پر تلوار کا وار کیا اور پیر کٹ کر الگ جا گرے۔ لوگوں نے پھر وہی حیران کن منظر دیکھا کہ پیر خود بخود اپنی جگہ سے حرکت کرتے ہوئے فقیر کے جسم تک پہنچ گئے۔ دوبارہ پیر جڑنے کے بعد اورنگ زیب نے تیسری مرتبہ بھی پیر کاٹ دیئے اور چیخ کر بولا۔ "قسم ہے مجھے خدا کی' اگر سو مرتبہ بھی تیرے پیر کٹ کر اس طرح تیرے جسم سے جڑتے رہے اور تُو نے کعبے کی طرف سے اپنے پیر نہ ہٹائے تو میں اسی طرح بار بار تیرے پیر کاٹتا رہوں گا۔"

یہ سن کر فقیر نے کہا۔ "تُو بڑا ضدی ہے۔ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان مداخلت سے بھی باز نہیں آیا۔ لے میں ہی اٹھ کر چلا جاتا ہوں۔" فقیر کے پیر تیسری مرتبہ بھی جڑ چکے تھے۔ وہ اٹھا اور پھر چند قدم چل کر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں جیسے زمانہ حال سے ماضی میں پہنچ گئی تھی۔ معاً مجھے فرہاد نے مخاطب کیا۔ "چاندنی چوک نہیں چلیں گی؟"

"ہاں چلو۔" میں چونک کر بولی۔

فرہاد مجھے وہاں سے چاندنی چوک لے گیا۔ چاندنی چوک پر واقعی بڑی رونق تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں دھرم تلے میں چورنگی روڈ پر گھوم رہی ہوں۔ ہم تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تک گھر واپس ہوئے۔ شہزاد

اور اس کا باپ ارشد علی دونوں ہی گھر آ چکے تھے۔ انہوں نے میرے انتظار میں اب تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ شہزاد اپنے بھائی سے پوچھنے لگا کہ وہ مجھے کہاں گھمانے لے گیا تھا' فرہاد بتانے لگا۔ اس عرصے میں سنبل تخت پر کھانا لگانے لگی۔

گھر کا صحن اتنا بڑا تھا کہ مجھے کھانا کھا کر ٹہلنے کے لئے کہیں باہر نہیں جانا پڑا۔ شہزاد بھی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں نے اس سے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "یہ ساوتری کون ہے' تم جانتے ہو؟"

"نہیں خاتون!" اس نے جواب دیا۔ "میں پہلی مرتبہ یہ نام سن رہا ہوں۔"

میں نے شہزاد کے چچا امجد کے عجیب رویے سے شہزاد کو آگاہ کر دیا۔ پورا واقعہ بیان کر کے میں نے اس سے کہا۔ "ساوتری نام کی عورت سے تمہارے چچا کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔"

"جی ہاں خاتون! آپ نے جو کچھ بتایا ہے' اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ پھر بھی چچا کو آپ کے ساتھ یہ حرکت نہیں کرنا چاہئے تھی۔ میں اس سلسلے میں ان سے پوچھوں گا ضرور۔ اس وقت تو خیر کچھ کہنا سننا بیکار رہے گا کیونکہ وہ اپنی ٹنکی فل کر چکے ہوں گے' صبح ان سے بات کروں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ساوتری نامی عورت سے مل کر خود ہی ان کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

"آپ کا حکم ہے تو خیر کچھ نہیں کہتا۔ پھر بھی انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔" شہزاد کہنے لگا۔ "بہرحال' میں ذاتی طور پر آپ سے چچا امجد کے نازیبا رویے کی معافی چاہتا ہوں۔"

"تم بھی خوب ہو' ارے اس کے لئے تمہیں معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کل آپ کا کیا پروگرام ہے' کہیں گھومنے چلیں گی؟"

"تو کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ میں یہاں گھومنے پھرنے کے لئے آئی ہوں۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔ "ویسے وقت ملا تو گھوم پھر بھی لوں گی۔"

"رات کو اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رکھیں گی یا بند؟" شہزاد کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"دروازہ تو خیر کھلا ہی رہے گا مگر تم اسے اپنے لئے بند ہی سمجھنا۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہاں تمہارے والدین کے علاوہ جوان بھائی بہن بھی ہیں۔ یہ کلکتہ نہیں ہے اور نہ میری کوٹھی ہے' سمجھ گئے نا؟"

"جی ہاں خاتون' سمجھ گیا۔" اس کی آواز بجھی ہوئی سی تھی۔

کچھ دیر کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ دوپہر سے شام تک سونے کے باوجود ابھی سفر کی تھکن اتری نہیں تھی۔ میں نے اسی لئے جلد سونے کا فیصلہ کیا تھا۔ یوں بھی شہزاد کے گھر والے جلد سونے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ شہزاد سونے کے لئے جا چکا تھا۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے بستر پر دراز ہونے سے پہلے میں نے لباس تبدیل کیا اور بتی بجھا دی۔ احتیاطاً میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ ٹرین میں چمپا کی گھٹیا حرکتوں کو میں بھولی نہیں تھی۔

ابھی میرے ذہن میں غنودگی چھائی ہی تھی کہ مجھے چیخ و پکار اور ہنگامے کی سی آوازیں سنائی د

اور میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے آوازوں کی سمت سے اندازہ لگایا کہ آوازیں اوپری منزل سے آ رہی تھیں۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر صحن میں نکل آئی۔ صحن میں مدھم نیلے بلب کی ٹھنڈی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اوپری منزل پر اتنی چیخ و پکار اور ہنگامے کے باوجود شہزاد کے گھر والے بڑے سکون و اطمینان سے سو رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی مجھے صحن میں نظر نہیں آیا تھا۔

"امجد! آج ہم تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم نے آج تجھے پتے لگاتے ہوئے پکڑ لیا ہے۔" ایک بلند اور بھاری آواز سنائی دی۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے گراری دار چاقو کھولا ہو۔ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرے اندازے کے مطابق شہزاد کے چچا امجد کی زندگی خطرے میں تھی۔

ہرچند کہ اس شخص کا رویہ میرے لئے نامناسب اور ناقابل فہم تھا' پھر بھی وہ شہزاد کا چچا اور اس کا گھر کا فرد تھا جہاں میں ٹھہری ہوئی تھی۔ جھگڑے کی وجہ سمجھنا بھی میرے لئے دشوار نہیں تھا۔ اوپری منزل پر جوا ہو رہا تھا جس میں جواریوں نے امجد کو بے ایمانی کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ وہ شاید کافی دن سے امجد کے ہاتھوں لٹتے آ رہے تھے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ امجد کو قتل ہی کر دیتے۔ اگر وہ قتل نہ بھی کرتے تو شدید زخمی تو کر ہی دیتے۔ میں اسی خیال کے تحت تیزی سے اوپری منزل تک جانے والے زینے پر چڑھ گئی۔

اوپر پہنچتے ہی مجھے بائیں جانب کچھ فاصلے پر ایک کمرے کے کھلے دروازے سے روشنی باہر تک آتے دکھائی دی۔ ہنگامہ وہیں برپا تھا' میں اس طرف لپکی۔

اس کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک دراز قد شخص کو لمبے پھل کا گراری دار چاقو فضا میں بلند کرتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ تین اور فرد بھی چاقو کھولے کھڑے تھے۔ امجد کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی کے قریب تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ امجد نے دونوں ہاتھ اس طرح اٹھا رکھے تھے جیسے چاقو کے متوقع وار سے بچنا چاہتا ہو۔ خوف کی زیادتی نے شاید اس کی قوت گویائی سلب کر دی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ دراز قد شخص جھک کر امجد پر چاقو کا وار کرتا' میں سخت آواز میں بولی۔ "ٹھہرو۔"

دراز قد شخص کا ہاتھ رک گیا اور اس نے مڑ کر مجھے بڑی غضب ناک نظروں سے دیکھا۔ بقیہ تین افراد بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ سبھی دھوتی بند تھے۔

"کون ہے تُو؟" دراز قد شخص کسی درندے کی طرح غرایا۔

"تمہاری موت۔" میں نے بھی کرخت آواز میں جواب دیا۔

خلاف توقع دراز قد شخص نے اپنے ایک ساتھ کو مخاطب کیا۔ "کیا خیال ہے جانکی! امجد کو ختم کر کے اس لونڈیا کو اٹھا کر لے چلتے ہیں۔"

"اٹھا کر لے جانے کا ٹنٹا مول لینے کی کیا ضرورت ہے شیامو استاد! اسے یہیں گرا لیں گے۔" دوسرا

شخص جواب میں بولا۔

اب ان چاروں کی توجہ امجد سے ہٹ کر میری طرف ہو گئی تھی اور میں یہی چاہتی بھی تھی۔ اس طرح فوری طور پر امجد کی موت کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ ان چاروں کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے اور میں خالی ہاتھ تھی۔ پھر بھی مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔

"تو پھر اسی لونڈیا کو گھیر کر گراؤ۔" دراز قد شخص نے میری طرف قدم بڑھایا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

اچانک ہی میں نے اچھل کر اس کے سینے پر اپنے نقشِ قدم ثبت کر دیئے اور وہ ریت سے بھری بوری کی طرح چیختا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے چاقو چھیننے میں دیر نہیں کی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے سرہانے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں نے چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔

"ذرا بھی اپنی جگہ سے ہلے تو چاقو تمہاری گردن میں اتار دوں گی۔" میں نے دراز قد شخص کو دھمکی دی' پھر اس کے ساتھیوں سے مخاطب ہوئی جو چند ہی قدم کے فاصلے پر تصویرِ حیرت بنے مجھے ناقابلِ یقین سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ "تم لوگ اپنے اپنے چاقو نیچے پھینک دو ورنہ تمہارے استاد کو میں ذبح کر دوں گی۔"

ان تینوں نے فوراً تعمیل حکم کی اور چاقو پھینک دیئے۔ میں نے امجد کو لپک کر چاقو اٹھاتے دیکھا۔

"سالے کافرو! اب میں تم میں سے کسی ایک کو بھی زندہ بچ کر جانے نہیں دوں گا۔" امجد زور سے بولا۔ مَیں نے اس کے ہاتھوں میں دو کھلے چاقو دیکھ لئے تھے۔

"نہیں۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم ان میں سے کسی کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔" میں نے یہ کہہ کر دراز قد شخص کو مخاطب کیا۔ "اے! تم اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

"ساوتری! تُو اس معاملے میں نہ بول' ابھی مجھے ان لوگوں سے وہ رقم بھی نکلوانا ہے جو انہوں نے زبردستی مجھ سے چھین لی ہے۔" امجد مجھ سے مخاطب ہوا۔

امجد نے اس وقت بھی مجھے ساوتری ہی کہا تھا مگر یہ موقع اس کی غلط فہمی دور کرنے کا نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے صرف مطلب کی بات کرنا ضرور سمجھا اور دراز قد شخص سے کہا۔ "کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے ان سے رقم چھینی ہے؟"

دراز قد شخص شیامو اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ میری بات سن کر بولا۔ "ہاں ہم نے اس سے رقم چھینی ہے' مگر یہ رقم ہماری ہے جو اس نے پتے لگا کر جیت لی تھی۔ ہم رقم نہیں دیں گے۔"

"دے گا تو تیرا باپ بھی سالے! پیسے نکال ورنہ تیرا پیٹ پھاڑ دوں گا۔" امجد دانت پیس کر بولا۔ وہ کمرے کے دروازے پر اس طرح چاقو ہاتھوں میں لئے کھڑا تھا کہ ان چاروں میں سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ پانسا اب پلٹ چکا تھا۔ امجد اس سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا' وہ چاروں خالی ہاتھ تھے۔

"مردوں کی طرح بات کر امجد! تجھے بھی اسی دلی میں رہنا ہے اور ہمیں بھی۔ رقم کا فیصلہ ابھی ہو

جاتا ہے۔ ایک چاقو میری طرف اچھال دے' مرد بن۔ جو جیت جائے رقم اس کی۔ اس لونڈیا سے دھوکے میں چوٹ کھا گیا میں' ورنہ تو اسے چیونٹی کی طرح مسل دیتا۔" شیامو نے تجویز پیش کی۔

"منظور ہے مجھے۔" امجد نے یہ کہتے ہوئے اچانک ایک چاقو شیامو کی طرف اچھال دیا۔

شامیو نے چاقو لپک لیا' مگر اسی وقت میں اپنی جگہ سے بجلی کی طرح حرکت کر کے ان دونوں کے درمیان آ گئی۔

"تُو نے ابھی دعویٰ کیا تھا کہ دھوکے میں چوٹ کھا گیا ورنہ مجھے مسل دیتا۔ امجد کے بجائے میں لڑوں گی تجھ سے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"ساوتری! تُو ہٹ جا درمیان سے' چاقو چلانا تجھ جیسی عورتوں کا کام نہیں۔" امجد مجھ سے بولا۔

"نہیں' یہ کام تم جیسے مردوں کا نہیں امجد! کیا تم ابھی کچھ دیر پہلے کا منظر بھول گئے جب فرش پر بے بس پڑے تھے؟"

"ان چاروں نے اس وقت اچانک مجھ پر حملہ کر کے مجھے گرا لیا تھا' مگر اب برابر کا مقابلہ ہو گا۔ تُو الگ کھڑی ہو کر تماشا دیکھ کہ میں اس کی آنتیں کس طرح باہر کرتا ہوں۔"

"جب میں یہاں آئی تھی تو ان چاروں کے ہاتھوں میں چاقو تھے اور میں خالی ہاتھ تھی۔ پھر بھی یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ میں ان سے کمزور ہوتی تو یہ تمہاری طرح مجھے بھی گرا لیتے۔ مجھے اس شخص سے لڑنے دو جس نے مجھ کو کسی چیونٹی کی طرح مسلنے کا دعویٰ کیا ہے۔"

"تو پھر سنبھل اے لونڈیا!" یہ کہتے ہی شیامو مجھ پر جھپٹ پڑا۔

میں اس پر وار کرنے کی بجائے عین اس لمحے اچھل کر الگ ہو گئی جب وہ میرے قریب پہنچا۔ اسی کے ساتھ میں نے اس کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگ پھنسا دی۔ اس نے سنبھلنے کی لاکھ کوشش کی مگر گر ہی پڑا۔ میں نے دوسری بار اچھلتے ہی اس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی پر بھرپور ٹھوکر ماری۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی۔ اس کے باوجود شیامو نے اٹھ کر کھڑے ہونے میں دیر نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ خوف تھا کہ کہیں میں اسے چاقو نہ مار دوں۔

اس نے چاقو لپکتے ہی مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں پہلے ہی سے چوکنا تھی۔ اس لئے اسے ایک بار پھر زمین چاٹنا پڑی۔ لیٹے لیٹے ہی اچانک اس نے پلٹ کر چاقو مجھ پر کھینچ مارا۔ چاقو کا پھل سامنے دیوار کے قریب رکھی لکڑی کی الماری کے دروازے میں پیوست ہو گیا۔ میں بہت تیزی کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئی تھی' ورنہ الماری کے دروازے کے بجائے چاقو کا پھل میرے سینے میں پیوست ہو جاتا۔ اس نے بڑا خطرناک وار کیا تھا۔

"یہ بہت اچھا ہوا استاد شیامو!" میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "اب ہم دونوں ہی خالی ہاتھ ہیں۔ مَیں نے تمہیں ایک سنہری موقع دیا تھا جو تم نے کھو دیا۔ اب پٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ہاں شاباش' ہمت نہ ہارو' اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" میرا لہجہ ایسا ہی تھا جیسے کسی بچے سے مخاطب ہوں۔

وہ کھڑا ہوتے ہی دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے اپنی ایک ٹانگ آگے بڑھا دی تو خلاف

توقع میری ٹانگ پکڑ لی۔ اب میں ایک ٹانگ پر کھڑی تھی۔ مجھے بے بس دیکھ کر وہ زور سے ہنسا' مگر دوسرے ہی لمحے میں نے پلٹ کر دوسری ٹانگ اس کے سر کے پچھلے حصے پر ماری اور وہ چیخ کر زمین پر آ رہا۔ مَیں نے اچھل کر کھڑے ہونے میں دیر نہیں لگائی۔

"اب جب تک میں نہیں چاہوں گی تم اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکتے شیامو استاد!" یہ کہتے ہوئے میں جیسے اڑتی ہوئی اس تک پہنچ گئی۔

پھر میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ جیسے ہی اٹھنے کی کوشش کرتا میں ٹھوکر مار کر اسے گرا دیتی۔ کچھ ہی دیر میں وہ زمین پر چت پڑا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے شیامو استاد کہ تم شکست کھا چکے ہو۔ تم اپنی شکست قبول کرو نہ کرو' مگر میں تمہارے ماتھے پر شکست کا ٹیکا ضرور لگاؤں گی تاکہ تم زندگی بھر یہ بات یاد رکھ سکو کہ ایک معمولی سی لونڈیا نے تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دیا تھا۔"

پھر میں نے انتہائی تیزی سے جو کچھ کیا' اسے فوری طور پر شاید کوئی نہ سمجھ سکا۔ میں نے اپنے پیر میں موجود سینڈل کی ایڑی اس کی پیشانی کے درمیان رکھی اور پھر کسی لٹو کی طرح گھوم گئی۔ میں نے پیر ہٹایا تو اس کا ماتھا لہولہان ہو چکا تھا۔

"سنو! تمہارا استاد شیامو شاید خود اٹھ کر اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں رہا۔" میں نے اس کے ساتھیوں کو مخاطب کیا جو آنکھیں پھاڑے مجھی کو دیکھ رہے تھے۔ "تم لوگوں کو اسے یہاں سے اٹھا کر لے جانے کی زحمت کرنا پڑے گی اور ہاں' اگر تمہارے دل میں کوئی ارمان ہو تو تم بھی آ جاؤ۔ میں تم تینوں کو ایک ساتھ سنبھال سکتی ہوں۔ بولو' بنتے ہو مرد؟ ہاں تمہیں اتنی رعایت دے دوں گی کہ جب تم ہار مان لو گے تو ہاتھ نہیں اٹھاؤں گی۔"

"ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے دیوی!" وہ تینوں بیک زبان بولے۔ پھر انہوں نے بغیر لڑے ہی اپنی شکست مان لی۔

"رقم کس کے پاس ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیوں کہ شیامو استاد کی شرط کے مطابق میں رقم جیت چکی ہوں۔"

"پیسے دے دے جانکی!" شیامو استاد نے کراہتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کیا۔

جب جانکی نے روپے نکال کر دیئے تو مجھے یہ حیرت ہوئی کہ وہ ڈیڑھ دو سو روپے سے زیادہ نہیں تھے۔ میں اظہار حیرت کئے بغیر نہ رہ سکی۔ "تم لوگ اتنے سے روپوں کے لئے ایک دوسرے کا خون بہانے پر آمادہ ہو گئے تھے؟ حیرت ہے!" میں نے وہ نوٹ امجد کی طرف بڑھا دیئے۔

امجد نے مجھ سے وہ نوٹ لے کر اپنی قمیض کی جیب میں ٹھونس لئے۔ پھر اسے جانے کیا خیال آیا کہ دس دس روپے کے دو نوٹ نکال کر مجھے دینے لگا۔

"یہ تُو رکھ لے ساوتری! تُو نے بڑی محنت کی ہے' ان لوگوں سے یہ رقم نکلوانے کے لئے۔" امجد مجھ سے بولا۔

شیامو استاد کے تینوں ساتھی اس عرصے میں اسے سہارا دے کر اٹھا چکے تھے۔

"کیوں حاتم کی قبر پر لات مار رہے ہو' مجھے یہ بیس روپے دے کر۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"اچھا چل' پانچ روپے اور لے لے' اس سے زیادہ نہیں دوں گا۔" اس نے پانچ روپے کا ایک نوٹ جیب سے اور نکال لیا۔

"ان لوگوں کو تو چلا جانے دو۔" میں بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے' میں زینے کا دروازہ اندر سے لگا کر آتا ہوں ابھی۔" اس نے نوٹ دوبارہ جیب میں رکھ لئے' پھر ان لوگوں سے کہا۔ "جلدی چلو اور اب آئندہ ادھر نہ آنا۔"

کسی نے کچھ نہ کہا۔ وہ زخمی شیامو کو سہارا دیئے کمرے سے نکل گئے۔ امجد ان کے پیچھے گیا تھا۔ کمرے کے فرش پر موٹا سا گدا اور اس پر میلی سی چاندنی بچھی تھی۔ میں اسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ ہی فاصلے پر دیوار سے لگا شراب کا ایک ادھا رکھا تھا جس میں تھوڑی سی شراب بچی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک گلاس بھی موجود تھا۔

میں جس غرض سے اوپر آئی تھی وہ پوری ہو چکی تھی' اب میرا وہاں رکنا لاحاصل تھا۔ مگر میں امجد کی واپسی کے بعد ہی اب وہاں سے نیچے جانا چاہتی تھی۔ اگر میں اس کی آمد سے پہلے ہی چلی جاتی تو یہ امکان تھا کہ وہ خود نیچے میرے کمرے میں آ جاتا۔ پھر میں نے ذرا ہی دیر کے بعد کسی کے قریب آتے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ امجد ہی ہو سکتا تھا۔

امجد آ گیا تو میں نے اس سے کہا۔ "اب میں چلتی ہوں۔"

"مگر کچھ بتا تو سہی ظالم کہ تُو نے یہ کیا چکر چلایا ہے؟" میں تو سمجھ رہا تھا کہ تُو بھابی سے مل ملا کر چلی گئی ہو گی' مگر تُو تو یہیں ٹک گئی۔" وہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"اب تم نے یہ بات خود ہی چھیڑ دی ہے تو پھر بتا ہی دو چچا امجد کہ یہ ساوتری کون ہے؟"

"اے مجھے چچا مت کہہ۔" اس نے ڈانٹ دیا۔ "رشتوں کا احترام کرنا چاہئے۔"

وہ مجھے بدستور ساوتری سمجھنے پر مصر تھا اور ساوتری کے بارے میں کچھ بتانے پر بھی تیار نہیں تھا' الٹا مجھی سے پوچھے جا رہا تھا کہ میں وہاں کیسے آ گئی؟ میں بس اتنا ہی سمجھ سکی کہ ساوتری اور اس کے درمیان کچھ ایسے بے تکلفانہ تعلقات ہیں جو وہ میرے منہ سے لفظ چچا سننے کا روادار نہیں۔ میں نے سوچا' اس وقت اس کے ساتھ مغز ماری فضول ہے' پھر کبھی یہ معمہ حل کروں گی۔ اس کے بعد میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس کے روکنے پر بھی نہیں رکی۔

نیچے آ کر اپنے کمرے کی بتی جلائے بغیر میں اندازے سے پلنگ کی طرف بڑھی۔ میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ شہزاد کے گھر والے بھی خوب ہیں' اوپری منزل پر اتنی چیخ و پکار ہوتی رہی' اتنا ہنگامہ ہوا مگر کوئی نہیں جاگا۔

پلنگ کے قریب پہنچ کر میں بستر پر جیسے ہی دراز ہوئی تو ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرے سوا بھی وہاں کوئی اور موجود ہے۔ لپک کر میں نے لائٹ کا سوئچ آن کر دیا۔ دوسرے

ہی لمحے کمرہ روشن ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میری آنکھوں نے ایسا ہی بھیانک اور دل ہلا دینے والا منظر دیکھا۔

میرے بستر پر شہزاد کی نوجوان بہن سنبل کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا نیم برہنہ جسم جگہ جگہ سے اس طرح ادھڑا ہوا تھا جیسے اسے کسی درندے نے بھنبھوڑا ہو۔ آدھی کٹی ہوئی گردن سے اب تک خون بہہ رہا تھا۔ اسے قتل ہوئے شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔

معاً میری سماعت سے ایک تیز مردانہ چیخ ٹکرائی' پھر میں نے شہزاد کے چیخنے کی آوازیں سنیں۔

"بچاؤ .... بچاؤ۔" وہ بری طرح چیخے جا رہا تھا۔

کیا اب وہی خونی درندہ شہزاد کو قتل کرنے والا تھا جس نے سنبل کو قتل کیا ہے؟ یہ خیال آتے ہی میرے سارے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

☆======☆======☆

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے موجودہ صورت حال میں کیا قدم اٹھانا چاہئے کہ ایک بار پھر شہزاد کی تیز چیخیں میری سماعت سے ٹکرائیں۔ میں نے سوچا' شہزاد یقیناً شدید خطرے میں ہے' مجھے اس کی مدد کرنا چاہئے۔ مجھے معلوم تھا کہ شہزاد صحن ہی میں میرے کمرے کے مقابل والے کمرے میں سو رہا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی فرہاد بھی اسی کمرے میں تھا۔ سنبل اپنے والدین کے ساتھ دالان والے بڑے کمرے میں سوئی تھی جس کی لاش مجھے اپنے کمرے میں نظر آئی تھی۔ میں لپک کر اپنے کمرے سے نکلی تو مجھے باہر خلاف معمول سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ شہزاد کی چیخیں سن کر حیرت انگیز طور پر کوئی بھی گھر کا فرد نہیں جاگا تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ صحن عبور کیا اور پھر شہزاد کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

شہزاد کے کمرے میں تاریکی تھی۔ میں نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا کسی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔" میں نے شہزاد کے چھوٹے بھائی فرہاد کی سرگوشی سنی۔

میرے لئے فرہاد کے یہ الفاظ حیران کن تھے۔ اس کے الفاظ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میرا ہی منتظر تھا۔

ابھی میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کی سرگوشی پھر ابھری۔ "چلو بیٹھک میں چلتے ہیں' یہاں بھائی جان کی آنکھ کھل سکتی ہے۔"

"چھوڑو مجھے۔" میری آواز میں احتجاج تھا' پھر بھی میں زور سے نہیں بولی تھی۔

اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور میں تڑپ کر الگ ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔

"میرے پیچھے آئیو۔" فرہاد یہ کہہ کر دروازے سے نکل گیا۔ پھر اس نے مڑ کر مجھے دوبارہ مخاطب کیا۔ "اب آؤ نا' بھائی جان جاگ گئے تو غضب ہو جائے گا۔"

اب میری سمجھ میں آتا جا رہا تھا کہ یہ سارا چکر کیا ہے۔ چمپا ہی نے یقیناً مجھے فریبِ سماعت میں مبتلا

کر کے وہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔ اگر شہزاد واقعی چیخا ہوتا تو اسی کمرے میں موجود اس کا چھوٹا بھائی فرہاد اس سے بے خبر نہ ہوتا۔ چمپا ہی میری طرف سے فرہاد کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کر چکی تھی۔ اب تو مجھے یہ بھی شک ہو رہا تھا کہ سنبل کی لاش واقعی میرے کمرے میں تھی۔ چمپا مجھے فریب نظر میں بھی مبتلا کر سکتی تھی۔ ایسا کرنا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ ایک مرتبہ کلکتے میں ایسا ہی ایک خوفناک تماشا مجھے شمبھو بھی دکھا چکا تھا۔ شمبھو نے خود اپنے قتل کا ڈھونگ رچایا تھا۔ شمبھو کی سربریدہ لاش میری کوٹھی کے صحن میں دکھائی دی تھی اور اس کا کٹا ہوا سر میری خواب گاہ میں تھا۔ چمپا' شمبھو سے بھی زیادہ پراسرار شیطانی قوتوں کی مالک تھی۔ میں اسی سبب یہ سب کچھ سوچنے میں حق بجانب تھی۔ اب میرا وہاں رکنا لاحاصل ہی تھا۔ یہ سوچ کر میں کمرے سے نکلی۔

کمرے کے باہر فرہاد میرا منتظر تھا۔ میں جیسے ہی باہر آئی' اس نے میرا بازو تھام لیا۔ "بیٹھک ادھر ہے۔" اس نے میرے بازو پر دباؤ ڈالتے ہوئے ایک طرف چلنے کو کہا۔

"جاؤ' اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔" میں فرہاد سے دھیمی آواز میں بولی۔ "تمہیں یقیناً میرے متعلق غلط فہمی ہو گئی ہے۔" میں نے اس سے اپنا بازو چھڑانا چاہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ "تم نے خود ہی مجھ سے جاگتے رہنے کو کہا اور پھر وعدے کے مطابق آ بھی گئیں تو اب........."

"بازو چھوڑو میرا۔" میری آواز میں سختی آ گئی۔

"وہ تو نہیں چھوڑوں گا میں' تمہیں میرے ساتھ بیٹھک میں چلنا پڑے گا۔" اچانک اس کا لہجہ بدل گیا۔

میں نے اس کے لہجے سے خطرے کی بو محسوس کر لی۔ چمپا کے سحر میں گرفتار ہو کر ہی وہ اس لہجے میں بات کر سکتا تھا۔

"اور اگر میں نہ جاؤں تمہارے ساتھ تو؟" میں نے جھٹکا دے کر اپنا بازو اس سے چھڑا لیا۔

"تو پھر......... پھر میں تمہیں زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا۔" یہ کہتے ہی اس نے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ مجھے اٹھا لیا۔

"چھوڑ دو مجھے ورنہ میں شور مچا دوں گی۔" میں نے اسے دھمکی دی۔

جواب میں وہ دھیرے سے ہنسا اور پھر تیز قدمی سے بائیں جانب بڑھا۔ میں اس کی گرفت سے نکلنے کو مچلنے لگی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ شور مچانے کی دھمکی پر ظاہر ہے میں عمل نہیں کر سکتی تھی۔ اس میں میری ہی رسوائی تھی۔ یہ بات شاید فرہاد نے بھی محسوس کر لی تھی۔ وہ غالباً اسی لئے میری بات سن کر ہنس دیا تھا۔

بیٹھک میں آ کر اس نے مجھے اتار دیا اور پھر فوراً ہی اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے چاہا تھا کہ تیزی کے ساتھ کھلے دروازے سے باہر نکل جاؤں' مگر فرہاد اس سے پہلے ہی اندر سے کنڈی بند کر چکا تھا۔ بیٹھک میں اندھیرا تھا۔ میں اسی سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف رینگ گئی۔

"کہاں ہو تم؟" چند لمحے بعد اس نے مجھے پکارا۔

میں خاموش رہی لیکن یہ خاموشی میرے کام نہ آ سکی۔ فرہاد نے بیٹھک کا بلب جلا دیا تھا۔ میں نے اسے دروازے کے قریب کھڑا ہوا دیکھا۔ میں اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک مونڈھے کے پاس کھڑی تھی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔

"رک جاؤ فرہاد! تم شاید ہوش میں نہیں ہو۔"

"تمہیں دیکھ کر کون ہوش میں رہ سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں بازاری پن تھا۔

پھر اس کے اور میرے درمیان اچھل کود شروع ہو گئی۔ وہ مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ایک بار اس کی گرفت میں آ گئی تو پھر نکلنا مشکل ہو گا۔ اسے چک پھیریاں دیتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں اس صورت حال سے بچنے کی ایک تدبیر آ گئی۔ اب اس تدبیر پر عمل کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ یہ تدبیر پہلے بھی ایسے مواقع پر کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اس وقت میں دروازے کے نسبتاً قریب اور وہ قدرے دور تھا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ دروازہ کھول کر باہر نکل جاؤں' پھر اپنی تدبیر پر عمل کرنے کی بجائے میں نے دروازے کی کنڈی کھول دی مگر فرہاد نے مجھے دروازہ کھول کر باہر نکلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ تیزی سے مجھ پر جھپٹا اور میں اس سے بچنے کی خاطر ایک طرف جست بھرنے کے لئے مجبور ہو گئی۔ دروازے کی طرف مڑ کر اس نے پہلے میری راہ فرار مسدود کر دینا چاہی۔ یہی وہ لمحات تھے کہ جب مجھے اپنی تدبیر پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔

میں نے فرہاد پر چھلانگ لگا دی پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا' میرے ہاتھ کی ضرب اس کی کنپٹی پر پڑی۔ وہ اندر سے کمرے کی کنڈی نہیں لگا سکا تھا۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا۔ فرہاد کا جسم لہرا کر زمین پر آ رہا۔

اسی وقت خاصی دور سے مجھے کسی کی مردانہ آواز سنائی دی۔ "ارے یہ بیٹھک کی بتی کس نے جلی چھوڑ دی ہے؟" انداز خود کلامی کا سا تھا۔

پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ادھر ہی آ رہا ہو۔ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اس شخص کی آواز کو میں نے پہچان لیا تھا جو اب بیٹھک کی طرف آ رہا تھا۔ وہ شہزاد کا باپ ارشد علی تھا۔ وہ کسی ضرورت سے اٹھا تھا' بظاہر یہی لگتا تھا مگر میں سمجھ چکی تھی کہ اسے بیدار کرنے والی چمپا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اس کی سازش سمجھ چکی تھی۔ وہ مجھے شہزاد کے گھر والوں کی نظر میں یقیناً ذلیل و رسوا کرنا چاہتی تھی۔ اس صورت حال نے مجھے سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ میرے پاس وقت بہت تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اس ذلت و رسوائی سے کس طرح بچا جائے؟ پھر میرے ذہن میں ایک تدبیر آ ہی گئی۔ میں نے سوچا کہ ارشد علی کو بھی بے ہوش کر دیا جائے تاکہ وہ مجھے وہاں نہ دیکھ سکے۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ میں بیٹھک کا بلب بجھا دیتی اور پھر جیسے ہی ارشد علی اندر قدم رکھتا اسے چھاپ لیتی۔ اپنی اس تدبیر پر عمل کرنے کی غرض سے میں نے فرہاد کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر

دروازے کے سامنے سے ہٹایا اور پھر فوراً اٹھ کر بیٹھک کا بلب بجھا دیا۔ پھر میں سانس روک کر دیوار سے لگ کے کھڑی ہو گئی کیوں کہ قدموں کی چاپ اب دروازے کے باہر تک آ چکی تھی۔

معاً مجھے حیرت زدہ سی آواز سنائی دی اور پھر دوسرے ہی لمحے خلافِ توقع ارشد علی زور زور سے چیخنے لگا۔ "چور .... چور .... چور۔" پھر وہ اپنے دونوں جوان بیٹوں کو آوازیں دینے لگا۔ "فرہاد! شہزاد! جلدی آؤ' بیٹھک میں کوئی چور چھپا ہوا ہے۔" ....

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بتی بجھانے کا یہ ردعمل ہو گا۔ میں جس بات سے بچنا چاہتی تھی وہی میرے سامنے آ گئی تھی۔ خلاف توقع بتی بجھنے کے بعد ارشد علی نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھنے کی بجائے چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ میں چکرا کر رہ گئی کہ اب کروں تو کیا کروں۔

"کیا ہوا ابا جی! .... کیا ہوا؟" باہر سے مجھے شہزاد کی آواز سنائی دی۔ یقیناً اپنے باپ کی چیخ پکار سن کر وہ صحن میں آ گیا تھا۔

"میں پیشاب کرنے اٹھا تھا کہ بیٹھک کی بتی جلتے دیکھی۔" ارشد علی بتانے لگا۔ "میں سمجھا کہ کسی نے بتی جلی چھوڑ دی ہو گی' بجھا دیتا ہوں' مگر جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچا بیٹھک کی بتی بجھ گئی۔ ظاہر ہے کوئی اندر موجود ہے جس نے ...."

"کیا ہوا بھائی صاحب؟" ایک اور تیز آواز سنائی دی۔ یہ آواز شہزاد کے چچا امجد کی تھی وہ بھی یقیناً اپنے بڑے بھائی کی چیخ پکار سن کر اوپر سے اتر آیا تھا۔ شہزاد نے اسے بھی بتا دیا کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔

"آپ دونوں پیچھے ہٹ جائیں' میں دیکھتا ہوں۔" امجد کی آواز ابھری۔

"ٹھہریں چچا' میں اپنے کمرے سے ٹارچ لے کر آتا ہوں۔" شہزاد جلدی سے بولا۔

"ارے یہ چاقو تو جیب میں رکھ لے' یہ تُو نے کیوں نکال لیا؟" ارشد علی غالباً امجد سے مخاطب تھا۔

"اس لئے بھائی صاحب کہ اس کے پاس بھی کوئی ہتھیار ہو سکتا ہے۔ آپ بھی اپنی لاٹھی لے آئیں' میں یہاں کھڑا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' میں لاٹھی لے کر آتا ہوں۔" ارشد علی نے اپنے بھائی کی تجویز مان لی۔

میں نے سوچا' یہی موقع ہے۔ پھر اس موقع سے میں نے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ دوسرے ہی لمحے میں تیزی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس سے پہلے کہ امجد کچھ سمجھ پاتا' میں نے اس کے ہاتھ میں چاقو کی پرواہ کئے بغیر جھپٹ کر اس کی کنپٹی پر گھونسا مارا۔ دوسرے ہی لمحے وہ لہرا کر گرا اور میں اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔ کسی بھی لمحے شہزاد یا ارشد علی وہاں پہنچ سکتے تھے۔

اپنے کمرے کی لائٹ میں جلی ہی چھوڑ گئی تھی۔ کسی نے اب تک اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بے اختیار میری نظر اپنے بستر پر پڑی۔ سنبل کی ادھڑی ہوئی لاش ابھی تک وہاں موجود تھی۔ یہ دیکھ کر میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور میں نے سوچا' کیا یہ فریب نظر نہیں ہے؟ کیا واقعی سنبل کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟ میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ سنبل کی لاش اب مجھے اپنے کمرے میں نہیں ملے گی۔ اپنے حواس پر قابو پانے میں مجھے چند لمحے لگے۔ میں اتنے کمزور دل کی بہرحال نہیں تھی کہ

ایک لاش کے ساتھ اس کمرے میں نہ رہ سکتی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ تیزی سے مڑ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اگر وہاں کوئی آ جاتا تو میرے لئے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ باہر سے شہزاد اور ارشد علی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ غیر فطری سی بات ہوتی کہ اتنی چیخ پکار کے باوجود میں اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتی اور یہی ظاہر کرتی رہتی کہ سو رہی ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے کمرے کی بتی بجھائی اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

صحن میں کچھ ہی فاصلے پر مجھے ارشد علی اور شہزاد نظر آئے۔ وہ دونوں امجد کے قریب بیٹھے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ارشد علی اپنے بھائی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ان دونوں کے قریب پہنچ گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"معلوم نہیں' یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" ارشد علی میری بات کے جواب میں بول اٹھا۔ "ابھی میں اسے ٹھیک ٹھاک یہاں کھڑا چھوڑ گیا تھا' لوٹ کر آیا تو یہ بے ہوش پڑا تھا۔"

پھر شہزاد نے مجھے مختصراً اس واقعے سے آگاہ کیا جس کا مرکزی کردار خود میں ہی تھی۔

"کہیں وہ چور ابھی تک بیٹھک ہی میں نہ ہو۔" میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"نہیں۔" ارشد علی بولا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ امجد کو بے ہوش کر کے بھاگ گیا ہے۔"

"پھر بھی' آپ نے بیٹھک کا جائزہ لیا؟" میں نے بیٹھک کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔

"وہ شاید بیٹھک کا بیرونی دروازہ کھول کر نکل گیا ہو گا۔" شہزاد نے کہا۔

"اگر اسے بیرونی دروازے ہی سے فرار ہونا تھا تو پھر اندر گھر میں کیوں آیا؟" میں بولی۔ "اس کے گھر میں آنے کا ثبوت چچا امجد کی بے ہوشی ہے۔ لگتا ہے' اسی نے چچا امجد پر حملہ کیا تھا۔" میں نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ بیٹھک کا بیرونی دروازہ ان لوگوں کو اندر سے بند ہی ملتا۔

"لیکن وہ گھر میں آنے کے بعد کہاں غائب ہو سکتا ہے؟" ارشد علی خودکلامی کے سے انداز میں بولا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ابھی تک گھر میں کہیں چھپا ہو۔"

اسی وقت بیٹھک میں سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی اور شہزاد اچھل پڑا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا کٹورا تھا' اس سے پانی چھلک کر نیچے گر گیا تھا۔

"ابا جی! آپ .... آپ نے کچھ .... کچھ سنا؟" شہزاد گھبرا کر کہنے لگا۔

میں نے ارشد علی کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھیں تو بول اٹھی۔ "آپ فکر نہ کریں' میں ابھی دیکھتی ہوں اندر جا کر۔"

"یہ .... یہ .... آپ .... آپ لاٹھی لے لیں۔" ارشد علی نے اپنے ہاتھ میں موجود لاٹھی میری طرف بڑھائی۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں یہ کہتے ہی تیزی سے بیٹھک کے کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گئی۔

"یا اللہ رحم کر۔" عقب سے مجھے ارشد علی کی خوفزدہ آواز سنائی دی۔

بیٹھک میں داخل ہوتے ہی میں نے بتی جلا دی۔ سامنے ہی فرش پر مجھے فرہاد کراہتا ہوا نظر آیا۔ وہ شاید ہوش میں آ رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ گئی۔

"فرہاد! .... فرہاد!" میں نے اس کا سر اٹھاتے ہوئے اسے آوازیں دیں اور رخسار تھپتھپائے۔

"آنکھیں کھولو فرہاد!"

اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ "آ .... آپ؟" اس کے ہونٹ ہلے۔

"اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرو۔" میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔

"مم .... میں یہاں .... یہاں کیسے آ گیا؟" وہ بڑبڑانے لگا۔

"یہ تو تمھی بتاؤ گے۔" میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تو اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔" اس نے کہا۔

میں سمجھ گئی کہ اسے کچھ بھی یاد نہیں کہ چمپا کے سحر میں گرفتار ہونے کے بعد اس نے مجھ پر دست درازی کی تھی۔

"آؤ چلو' باہر چلیں۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

وہ میرے ساتھ بیٹھک سے باہر آ گیا۔ اسے میرے ساتھ باہر آتے دیکھ کر ارشد علی اور شہزاد' دونوں ہی حیرت زدہ نظر آنے لگے۔

"تم .... تم وہاں بیٹھک میں کیا کر رہے تھے؟" ارشد علی نے فرہاد سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ .... کچھ نہیں معلوم ابا جی! میں تو اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا آنکھ کھلی تو بیٹھک میں تھا اور .... اور رانی صاحبہ مجھے آوازیں دے رہی تھیں۔" فرہاد نے حیران سا ہو کر بتایا۔ اسی وقت امجد کراہنے لگا اور پھر اسے ہوش آ گیا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے قریب ہی پڑا ہوا اپنا چاقو اٹھا کر بند کیا اور جیب میں ڈال لیا۔

"کیا وہ بھاگ گئی؟" امجد نے پوچھا۔

"کون؟" ارشد علی نے چونک کر دریافت کیا۔

"وہ نیلا پٹی کوٹ پہنے ہوئے تھی اور اس نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔" امجد بتانے لگا۔ "بیٹھک سے نکلتے ہی اس نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ اس کے ہاتھ میں شاید لوہے کی کوئی بھاری چیز تھی جو میرے سر پر ماری تھی۔"

"کیا .... کیا کہہ رہے ہیں چچا!" شہزاد حیرت سے بولا۔ "کیا وہ کوئی عورت تھی؟"

"ہاں بیٹے! مجھے یقین ہے' وہ عورت ہی تھی اور اسے میں نے بیٹھک ہی سے نکلتے دیکھا تھا۔" امجد نے یقین دلایا۔

"تو اب عورتیں بھی چوریاں کرنے لگیں۔" ارشد علی بول اٹھا۔

"کیا خبر بھائی صاحب! وہ کس ارادے سے گھر میں آئی؟" امجد بولا۔

"لیکن وہ گھر میں داخل کیسے ہوئی اور پھر فرار کیسے ہو گئی؟" شہزاد نے کہا۔ "ہمیں بہرحال اچھی طرح گھر کی تلاشی لے لینا چاہئے۔"

امجد نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا' پھر کہا۔ "سارے گھر کی پہلے بتیاں جلا دو۔"

"اپنا کمرہ میں خود دیکھے لیتی ہوں۔" میں جلدی سے بولی۔ "میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میرے کمرے میں داخل ہو۔ پھر میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ میرا دل اس خیال سے تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا کہ اگر کسی نے میرے کمرے میں سنبل کی لاش دیکھ لی تو کیا ہو گا؟ اس کے علاوہ ایک اور اندیشہ بھی میرے ذہن میں سر ابھار رہا تھا۔

میں ایک بار پھر اپنے کمرے میں آ گئی اور آتے ہی اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ جس خدشے نے میرے ذہن میں سر ابھارا تھا' کچھ ہی دیر بعد سامنے آ گیا۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلنے والی تھی کہ کسی نے دستک دی اور پھر شہزاد کی گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولئے خاتون!"

میں جلدی سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی کہ کہیں شہزاد اندر نہ آ جائے۔ اس سے پہلے میں کمرے کی بتی بجھانا نہیں بھولی تھی۔

"کیا بات ہے' تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"وہ سنبل .... وہ غائب ہے۔" اس نے بتایا۔

"غائب ہے۔" میں نے اظہار حیرت کیا۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"امی اور ابا جی کے ساتھ ہی وہ دالان والے کمرے میں سوتی تھی۔ وہاں .... وہ وہاں نہیں ہے۔ امی بھی جاگ گئی ہیں۔ سارا گھر دیکھ لیا' وہ کہیں بھی نہیں ہے۔"

"چلو' میں چل کر دیکھتی ہوں۔" میں اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "گھر کا صدر دروازہ دیکھا' کھلا ہوا تو نہیں؟"

"وہ .... صدر دروازہ تو ابھی نہیں دیکھا لیکن وہ .... سنبل اتنی رات گئے کہیں نہیں جا سکتی۔" شہزاد نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

شہزاد کے ساتھ میں دالان والے کمرے میں پہنچی تو اس کی ماں کو روتے ہوئے دیکھا۔

"تم رو رو کر اور ہاتھ پیر پھلا دو۔" ارشد علی اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"شہزاد! تم صدر دروازہ دیکھ کر آؤ۔" میں نے شہزاد سے کہا۔

امجد مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اوپری منزل کی تلاشی لینے گیا ہے۔ "شہزاد ابھی لوٹ کر نہیں آیا تھا کہ ایک تیز چیخ سن کر میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔

"یہ .... یہ تو چچا امجد کی چیخ معلوم ہوتی ہے۔" فرہاد کمرے سے باہر کی طرف دوڑا۔

میں بھی فرہاد کے پیچھے بھاگی۔ صحن میں پہنچتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرے کمرے میں روشنی تھی۔ پھر میں نے وہاں امجد کو چیختے ہوئے نکلتے دیکھا۔

"خون .... خون .... سنبل کو کسی نے قتل کر دیا۔" امجد علی چیختے جا رہا تھا۔ اس نے یقیناً میرے کمرے میں سنبل کی لاش دیکھ لی تھی۔

پھر ذرا ہی دیر میں گھر کے سارے افراد وہاں جمع ہو گئے۔ وہ سبھی سنبل کی ادھڑی ہوئی لاش دیکھ کر جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ شہزاد کی ماں کو سکتہ ہو گیا تھا۔ جوان بیٹی کی لاش دیکھ کر وہ اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر سنبل کی لاش پر چادر ڈال دی۔ کسی کو اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ مجھ سے کوئی سوال کر سکتا۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کیا کروں۔

میں سوچ رہی تھی کہ ابھی کچھ دیر کے بعد پولیس یہاں آئے گی اور پوچھ گچھ شروع کر دے گی۔ میں ہی اس گھر میں اجنبی تھی اور سنبل کی لاش میرے ہی کمرے میں پائی گئی تھی۔ ان حالات میں پولیس پہلا شبہ مجھ پر کرتی۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود نہ جانے کیوں اب تک میرا دل یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ سنبل واقعی قتل ہو چکی ہے۔

"میری گڑیا .... میری گڑیا!" شہزاد روتے ہوئے دیوار سے سر ٹکرانے لگا۔

میں نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔ "کیا کر رہے ہو تم! ہوش میں آؤ۔"

"کیسے ہوش میں آؤں خاتون!" وہ رونے لگا۔ "میری گڑیا کسی نے توڑ دی .... توڑ دی۔"

گھر کے تمام افراد میرے ہی کمرے میں جمع تھے۔ معلوم نہیں اچانک امجد کو کیا ہوا کہ اس نے سختی سے میرا بازو پکڑ لیا اور پھر چیخ اٹھا۔ "بول ساوتری! یہ سب کیا ہے؟ جب سے تُو نے اس گھر میں قدم رکھا ہے' یہ مصیبتیں نازل ہوئی ہیں .... میں نے تجھے تیری ساڑھی کے رنگ سے پہچان لیا ہے .... تُو نے ہی بھیڑئیے سے نکل کر مجھ پر حملہ کیا تھا۔"

امجد کی یہ حرکت میرے لئے خلاف توقع تھی۔ وہ اس وقت بھی مجھے ساوتری ہی سمجھ رہا تھا۔

"میرا بازو چھوڑ دو۔" میں نے سخت لہجے میں اس سے کہا۔

"نہیں' تجھے بتانا پڑے گا کہ تُو یہاں کیوں آئی ہے؟" امجد آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

"امجد!" ارشد علی بول اٹھا۔ "اس وقت ہمارے دل ویسے ہی ٹوٹے ہوئے ہیں' تُو نے یہ کیا بکواس شروع کر دی ہے؟"

"آپ اسے نہیں جانتے بھائی صاحب .... یہ طوائف ہے اور اس کا نام ساوتری ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ سنبل کی لاش اس کے کمرے میں پائی گئی ہے۔ یقیناً اسی نے سنبل کو قتل کیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہتے ہی وہ مجھے زبردستی کمرے سے باہر لے آیا۔

ارشد علی' شہزاد اور فرہاد بھی کمرے سے باہر آ گئے تھے۔

"چچا! کیا آپ کا دماغ چل گیا ہے؟" شہزاد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ "آپ ایک شریف خاتون کو طوائف کہہ رہے ہیں' شرم آنا چاہئے آپ کو۔ یہ اس گھر میں میرے ساتھ آئی ہیں اور ہماری [illegible]ہیں۔"

"تو اسے لے کر تُو آیا ہے۔" امجد نے خون خوار نظروں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ "تجھے کوٹھوں پر جانے کا شوق کب سے ہو گیا؟"

"امجد! کیوں فضول بکواس کر رہا ہے؟" ارشد علی نے مداخلت کی۔ "یہ میرا خون ہے اور تیری طرح آوارہ نہیں۔"

"بھائی صاحب! میں لاکھ بُرا سہی' مگر کوٹھے پر بیٹھنے والی کسی طوائف کو اس کی طرح اپنے گھر نہیں لا سکتا۔" امجد اب تک میرے بازو کو سختی سے پکڑے ہوئے تھا۔

مجھ پر اب ساوتری کی حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ وہ یقیناً کوئی میری ہم شکل تھی جس سے امجد کی ملاقات بازار حُسن میں ہوئی تھی۔ اس کی برہمی اور لہجے سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ لعنتی چمپا' امجد کو بھی فریب نظر میں مبتلا کر سکتی ہے۔

"ان کا بازو چھوڑ دو امجد! یہ میرا حکم ہے۔" ارشد علی سخت لہجے میں امجد سے مخاطب ہوا۔

"ٹھیک ہے بھائی صاحب! آپ کہتے ہیں تو چھوڑ دیتا ہوں' مگر پولیس اسے ہرگز نہیں چھوڑے گی۔" امجد نے میرا بازو چھوڑ دیا۔

"پولیس۔" ارشد علی چونک اٹھا۔

"ہاں پولیس بھائی صاحب! یہ قتل کا کیس ہے اور پولیس کو اس سے مطلع کرنا بہت ضروری ہے۔ پولیس کے سامنے آپ مجھے صحیح بیان دینے سے نہ روکئے گا۔ میں پولیس کو اس کی حقیقت سے ضرور آگاہ کروں گا۔" امجد اپنے آخری الفاظ پر زور دے کر بولا۔

ارشد علی کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا' پھر اس نے خودکلامی کے سے انداز میں کہا۔ "پولیس تو ویسے ہی مسلمانوں کی دشمن ہو رہی ہے۔ وہ سارے گھر کو باندھ کر لے جائے گی۔ اسے تو موقع ملنا چاہئے۔"

"ابا جی! پولیس کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" شہزاد بول اٹھا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ پولیس ہم سب کو گرفتار کر لے گی۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ سنبل کو قتل کس نے کیا؟" امجد بولا۔ "پولیس نہیں آئی تو یہ کیسے پتا چلے گا؟"

"اب پتا کرنے نہ کرنے سے فرق بھی کیا پڑ جائے گا جسے جانا تھا وہ .... وہ تو چلی ہی گئی۔" ارشد علی کی آواز بھرا گئی۔

"مجھے یقین ہے بھائی صاحب کہ اسی عورت نے سنبل کو قتل کیا ہے۔" امجد نے مجھے قہرآلود نظروں سے دیکھا۔

"خاتون! اس عرصے میں آپ کئی مرتبہ اس کمرے میں آئی گئی تھیں۔ کیا آپ نے سنبل کی لاش نہیں دیکھی؟" شہزاد نے مجھ سے دریافت کیا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ مجھے اس سوال کی پہلے ہی سے توقع تھی۔

"سنبل کی لاش دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے اسے کسی درندے نے بھنبھوڑا ہو۔" فرہاد پہلی مرتبہ لا۔ اس کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔

"کیا خیال ہے' ابا جی! سنبل کی لاش اس کمرے سے اٹھا کر ہم باہر کیوں نہ لے آئیں؟" شہزاد نے پنے باپ سے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" امجد کے لہجے میں سختی تھی۔ "پولیس کی آمد سے پہلے کوئی بھی لاش کو ہاتھ نہیں ائے گا۔"

"لیکن ہم طے کر چکے ہیں کہ پولیس کو نہیں بلانا۔" ارشد علی جھنجلا کر کہنے لگا۔ "تم آخر پولیس کو انے پر کیوں ضد کر رہے ہو' کیا تم ہم سب کو پھنسوانا چاہتے ہو؟"

"حیرت ہے بھائی صاحب! ایک بے گناہ بچی کو سفاکی سے قتل کر دیا گیا اور آپ کو اپنی پڑی ہے۔ کیا پ نہیں چاہتے کہ یہ عورت پکڑی جائے جس نے سنبل کو قتل کیا ہے؟"

"یہ آخر میری بچی کو کیوں قتل کرنے لگیں؟ ان کی اس معصوم سے کیا دشمنی تھی؟ تم .... تم بد! ہمارے دکھے ہوئے دل کو اور نہ دکھاؤ تو اچھا ہے۔" ارشد علی روہانسا ہو گیا۔

"اگر اس نے قتل نہیں کیا تو پھر لاش اس کے کمرے میں کیسے پہنچ گئی؟ اس سے پوچھیں نا۔"

"چچا! یہ پہلے ہی بتا چکی ہیں کہ انہوں نے لاش نہیں دیکھی تھی۔ لاش کا انکشاف تو آپ نے کیا ہ۔ آپ ان کے کمرے میں کیوں گئے تھے؟" شہزاد بولا۔

"اس لئے کہ مجھے اس پر شک تھا۔" امجد نے جواب دیا۔ "اور میرا شک درست ثابت ہوا۔"

"آؤ تم لوگ' اسے اٹھا کر باہر لاتے ہیں۔" ارشد علی نے شہزاد اور فرہاد کو مخاطب کیا۔

"آپ پولیس کو قتل کی اطلاع نہ دے کر اچھا نہیں کر رہے بھائی صاحب!" امجد پھر بولا۔

"تم خاموش ہی رہو تو زیادہ اچھا ہے بلکہ بہتر یہ ہے' تم اوپر اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔" یہ کہتے ئے ارشد علی کمرے کی طرف بڑھا۔

ارشد علی کے ساتھ شہزاد اور فرہاد دونوں ہی تھے۔ میں اور امجد باہر صحن ہی میں رہ گئے۔

"ساوتری!" امجد مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میرا نام بھی امجد علی ہے' میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں "

"بکواس نہ کرو زیادہ' تم اگر شہزاد کے چچا نہ ہوتے تو میں تمہیں بدتمیزی کا مزہ چکھا چکی ہوتی اب ۔" میں حقارت سے بولی۔ "تم سے میں اتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط ا ہو گئی ہے مگر تمہاری سمجھ ہی میں نہیں آ رہی میری بات۔"

اسی وقت ارشد علی اور شہزاد کمرے سے چارپائی اٹھائے ہوئے باہر نکلے۔ جیسے ہی میری نظر چارپائی ی' میں اچھل پڑی۔ سنبل کی لاش پر میں نے جو چادر ڈالی تھی' اب اس کے نیچے کچھ بھی نہیں تھا' ا غائب ہو چکی تھی۔ پھر ان لوگوں نے چارپائی نیچے رکھی تو ان کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ی نظریں چارپائی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ جیسے پتھر کے ہو گئے تھے' ان سبھی کی آنکھیں حیرت سے

پھیلی ہوئی تھیں۔

میں نے آگے بڑھ کر چادر ہٹائی تو بستر بالکل بے داغ تھا۔ معاً میرے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندگیا اور میں دالان والے کمرے کی طرف دوڑی۔

میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا' دالان میں سنبل اپنے بستر پر بے خبر سوئی ہوئی تھی۔

"سنبل........ سنبل!" میں نے اسے پکارا۔

"جی!" اس نے آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

"اٹھو........ اٹھو سنبل!" میں جلدی سے بولی۔

"کیا ہوا' یہ سارے گھر میں روشنی کیوں ہو رہی ہے؟" اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "اماں اور ابا جی کہاں گئے؟"

"وہ سب باہر موجود ہیں۔" میں نے بتایا۔

"مگر کیوں؟" اس نے پریشان سی آواز میں سوال کیا۔

"تم باہر چلو تو سہی۔"

سنبل اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے ساتھ صحن میں آ گئی۔

"سنبل میری بچی!" ارشد علی چیخ اٹھا اور پھر بیٹی کو گلے سے لگالیا۔

شہزاد کی ماں اب تک سکتے کے عالم میں کمرے کے اندر بیٹھی تھی۔ ارشد علی اسے آوازیں دینے لگا۔ فرہاد اپنی ماں کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آیا اور پھر چند ہی لمحے بعد اس کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ وہ سکتہ ٹوٹتے ہی اپنی بیٹی کو گلے سے لگا لگا کر رونے لگی تھی۔ وہ سنبل کو گلے سے لگاتی' پھر اس کا چہرہ غور سے دیکھتی اور دوبارہ سینے سے چمٹالیتی۔

سنبل بھی سب کو روتے دیکھ کر کچھ نہ سمجھنے کے باوجود رونے لگی تھی۔

"ارے وہ ساوتری کہاں غائب ہو گئی؟" امجد اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا حالانکہ میں کچھ ہی فاصلے پر اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

امجد کی بات سن کر میں چونکی۔ اس نے ساوتری کے بارے میں سوال کرتے ہوئے میرے چہرے پر بھی نظر ڈالی تھی مگر مجھے بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ اپنے لئے میں نے اس کی آنکھوں میں اجنبیت سی محسوس کی تھی۔ اب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ چمپا نے یقیناً اسے بھی فریبِ نظر میں مبتلا کر دیا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے تک چمپا نے مجھے ذہنی عذاب میں مبتلا رکھا تھا۔ یہ وقت میں نے کس طرح گزارا مجھے ہی خبر ہے۔

میری چارپائی دوبارہ اٹھوا کر کمرے میں ڈال دی گئی۔ جو حیرت انگیز واقعہ پیش آیا تھا' وہ میرے گھر کے سبھی افراد کے لئے کسی معمے سے کم نہیں تھا۔ پہلے فرہاد کو بیٹھک میں بے ہوش پایا گیا' پھر ... نے امجد پر حملہ کر کے اسے بے ہوش کر دیا' اس کے بعد سنبل غائب ہو گئی اور یہ انکشاف ہوا کہ ... قتل کر دیا گیا ہے۔ یکے بعد دیگرے یہ سارے واقعات ہی انتہائی حیران کن تھے۔ شہزاد میرے کمرے

تھا۔ میں نے چائے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ فرہاد باورچی خانے میں چائے بنانے کے لئے گیا تھا۔ سنبل اپنے والدین کے ساتھ دالان والے کمرے میں سونے چلی گئی تھی۔ اسے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ گھر میں چور گھس آئے تھے جو جاگ جانے کی وجہ سے بھاگ گئے۔ اصل واقعے سے اسے بے خبر ہی رکھا گیا تھا تاکہ وہ خوفزدہ نہ ہو جائے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس عرصے میں وہ گہری نیند سوتی رہی تھی اور اسی وقت جاگی تھی جب میں نے اسے آوازیں دی تھیں۔ امجد سونے کے لئے اوپری منزل پر چلا گیا تھا۔ وہ اس بات پر سب سے زیادہ حیران تھا کہ اچانک ساوتری کہاں غائب ہو گئی۔

"خاتون!" شہزاد نے مجھے مخاطب کیا۔ "سمجھ میں نہیں آیا' یہ سب کیا چکر تھا؟........ اسی طرح کے واقعات تو وہاں کلکتے میں بھی پیش آتے رہے ہیں۔"

"ہاں۔" میں طویل سانس لے کر بولی۔ "تمہیں یاد ہوگا ایک مرتبہ سادھو شمبھو کی لاش بھی تو اسی طرح غائب ہو گئی تھی۔"

"لیکن خاتون! وہ تو شیطانی قوتوں کا مالک تھا' سنبل ایسا کس طرح........"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "دراصل یہ سارا کھیل نظربندی کا ہے۔"

"نظربندی؟"

"ہاں اسے نظربندی ہی کہتے ہیں' یعنی جو حقیقتاً نہ ہو' وہ نظر آنے لگے۔" میں نے شہزاد کو سمجھایا۔

"کمال ہے خاتون! مگر ہماری نظربندی کس نے کی تھی اور کس لئے؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

"وہ جو ہمیں ذہنی عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہوگا۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"کون ہو سکتا ہے وہ؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے"

"حیرت تو اس پر ہے کہ چچا امجد کے سر سے بھی ساوتری کا بھوت اتر گیا۔"

"یہ بھی نظربندی کا چکر تھا کہ میں انہیں اپنی کوئی شناسا معلوم ہوئی۔" میں نے بتایا۔

"لاش غائب ہوتے ہی آپ دالان والے کمرے کی طرف کیوں دوڑنے لگی تھیں خاتون! آپ کو کس طرح یہ معلوم ہوا کہ سنبل کمرے میں سو رہی ہے؟"

"وہ میرا محض اندازہ تھا جو درست نکلا۔"

اسی وقت فرہاد چائے بنا کر لے آیا۔ ٹرے میں صرف دو پیالیاں تھیں۔

"تم چائے نہیں پیو گے کیا؟ اپنے لئے چائے نہیں بنائی تم نے؟" میں نے فرہاد سے کہا۔

"جی نہیں' میں اب سوؤں گا۔ چینی دیکھ لیں ٹھیک ہے ورنہ اور لا دوں۔" اس نے ایک پیالی اٹھا کر مجھے دے دی۔

میں نے ہلکا سا گھونٹ لے کر بتایا۔ "ٹھیک ہے' شکریہ۔ معاف کرنا تمہیں میری وجہ سے چائے

بنانے کی زحمت اٹھانا پڑی۔"

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے' مہمانوں کی خدمت کر کے تو خوشی ہوتی ہے۔"

"لیکن میں مہمان نہیں' خود کو اس گھر کا فرد سمجھتی ہوں۔"

"مہربانی ہے آپ کی۔"

"اچھا تم جاؤ فرہاد!" شہزاد بولا۔ "خالی کپ میں رکھ دوں گا' باورچی خانے میں۔"

فرہاد چلا گیا۔ اس کے رویے میں مجھے کوئی بات خلاف معمول معلوم نہیں ہوئی تھی۔ وہ یقیناً سب کچھ بھول چکا تھا اور میرے حق میں یہ اچھا ہی تھا۔ چائے پی کر شہزاد نے انگڑائی لی۔

"اگر اجازت ہو تو میں بھی جاؤں خاتون!" اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ چاہتا ہو میں اجازت نہ دوں۔

"ہاں جاؤ۔" میں نے مسکرا کر کہہ دیا۔

"میں سمجھا تھا کہ آپ مجھے روک لیں گی۔" اس کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔

"تمہیں کچھ سمجھایا تھا میں نے کہ اس گھر میں تمہارے جوان بھائی بہن بھی موجود ہیں۔"

"میں تو خیر اسی وقت سمجھ گیا تھا خاتون! مگر یہ ظالم دل نہیں سمجھتا۔" اس کی آواز خمار آلود سی تھی۔

مجھے کسی خطرے کی بو سی محسوس ہونے لگی تو کسی قدر سختی کے ساتھ شہزاد سے جانے کے لئے کہا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ پھر وہ رکا نہیں اور خالی چائے کی پیالیاں ٹرے میں رکھ کر کمرے سے نکل گیا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ میں کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔

لائٹ آف کر کے میں بستر پر لیٹ گئی' پھر معلوم نہیں کب چمپا کے بارے میں سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ رات کا بقیہ حصہ پرسکون ہی گزرا۔

☆======☆======☆

صبح میں نو بجے کے قریب اٹھی۔ کسی نے بھی مجھے جگایا نہیں تھا۔ نہا دھو کر میں نے لباس تبدیل کیا۔ اس وقت تک سنبل میرے لئے ناشتہ بنا چکی تھی۔ میری وجہ سے شہزاد نے بھی ناشتہ نہیں کیا تھا۔ وہ میرے ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ وہیں ہم دونوں نے ناشتہ کیا۔

"میں کچھ دیر کے لئے ذرا جاؤں گی۔" میں نے شہزاد کو بتایا۔

"کہاں تک جانا ہے؟" اس نے معلوم کیا۔

"زیادہ دور نہیں بس جلد ہی لوٹ آؤں گی۔" میں نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ کہاں جا رہی ہوں۔

"آپ فرمائیں تو میں چلوں آپ کے ساتھ؟"

"نہیں' مجھے تنہا ہی جانا ہے۔"

"لیکن خاتون! یہ شہر تو آپ کے لئے اجنبی ہے۔"

"اتنا اجنبی بھی نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔" میں نے اپنا ہینڈ پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ساڑھیوں کے سوا میرے پاس پہننے کو کوئی اور لباس نہیں۔ یہ سوچ کر میں نے شہزاد سے کہا۔

"تمہاری نظر میں کوئی ایسا درزی ہے جو خواتین کے اچھے کپڑے سیتا ہو؟"

"درزی تو خیر اس علاقے میں بھی ہیں مگر کناٹ پلیس میں اچھے ٹیلر ہیں۔ آپ جیسے کپڑے چاہیں گی' وہ سی دیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ابھی کچھ دیر میں آتی ہوں' تم گھر ہی پر رہو' واپس آ کر تمہارے ساتھ کناٹ پلیس چلوں گی۔"

"ٹھیک ہے' خاتون! میں یہیں رہ کر آپ کی واپسی کا انتظار کروں گا۔"

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ گزشتہ روز میں گھر سے جامع مسجد تک کا راستہ فرہاد کے ساتھ دیکھ ہی چکی تھی' مجھے اسی لئے وہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مٹیا محل کے سامنے والے دروازے ہی سے میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئی۔ کچھ فاصلے پر بائیں جانب برآمدے میں مجھے بہت سے بچے قرآن شریف پڑھتے دکھائی دیئے۔ میرے قدم اس طرف اٹھ گئے۔ ایک باریش بوڑھا اپنے سامنے ایک چوکی رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک بچہ بیٹھا تھا جسے وہ بوڑھا سبق دے رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا جناب! مجھے پیش امام صاحب سے ملنا ہے۔" قریب پہنچ کر میں نے اس بوڑھے کو مخاطب کیا۔

"ادھر سیدھی چلی جاؤ' چوتھا حجرہ امام صاحب ہی کا ہے۔" بوڑھے نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں' بوڑھے کے بتائے ہوئے حجرے کی طرف بڑھی اور جب وہاں پہنچی تو دروازہ کھلا ہوا ہی دیکھا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا' پیش امام کہیں گیا ہو گا اس لئے حجرے کے سامنے ہی برآمدے میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ مجھے بیٹھے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تو الجھن محسوس ہونے لگی۔ اب تک پیش امام نہیں آیا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر وہی بوڑھا بچوں کو سبق دینے میں مصروف تھا۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا بھی تھا اور پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا' میں اٹھنے ہی والی تھی کہ پھر کسی وقت آ جاؤں کہ قرآن شریف پڑھانے والے بوڑھے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

"تم اندر بیٹھ جاتیں' یہاں باہر کیوں بیٹھ گئیں؟" بوڑھا میرے قریب آ کر بولا۔

"آپ کو معلوم ہے' پیش امام صاحب گئے کہاں ہیں اور کب تک لوٹیں گے؟" میں نے بوڑھے کی بات کو نظرانداز کر کے پوچھا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"وہ تو کہیں نہیں گئے' تمہارے سامنے ہی کھڑے ہیں۔"

"آپ .... آپ ہی پیش امام ہیں؟" میں حیرت سے بولی۔

"ہاں .... دراصل یہ وقت بچوں کو سبق دینے کا تھا۔ میں نے اسی لئے تمہیں ادھر بھیج دیا تھا۔

آؤ' اندر حجرے میں آ جاؤ۔" بوڑھا آگے بڑھا۔

مجھے اس بوڑھے کی یہ حرکت کچھ اچھی نہیں لگی تھی' پھر بھی میں اس کے پیچھے پیچھے حجرے میں داخل ہوئی۔ وہ پہلے ہی مجھے بتا سکتا تھا کہ میں کچھ دیر انتظار کر لوں' بچوں کو سبق دے کر ابھی آتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ خود ہی پیش امام ہے۔

"بیٹھو۔" وہ حجرے میں بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ کر مجھ سے بولا۔

میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہی مطلب کی بات کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ "مجھے غداروں سے ملنا ہے۔"

میری بات سن کر بوڑھا چونک اٹھا اور اس نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ارشاد حسین کی ہدایت کے مطابق میں اس کی دی ہوئی انگوٹھی پہننا بھول گئی تھی۔ بوڑھے نے میری بات کے جواب میں کہا۔ "میں سمجھا نہیں کہ تم کن غداروں کی بات کر رہی ہو اور میرا ان سے کیا تعلق؟"

"معاف کیجئے گا' مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔" میں اپنا ہینڈ پرس کھولتے ہوئے بولی۔

بوڑھا ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "لڑکی! فوراً میرے حجرے سے نکل جاؤ۔"

"آپ میری بات تو سنئے۔" میں نے پرس میں انگوٹھی تلاش کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں سننا' تم چلی جاؤ یہاں سے۔" بوڑھا اور زیادہ برہم ہو گیا۔

جلدی اور گھبراہٹ میں مجھے فوری طور پر انگوٹھی نہیں مل سکی۔ معلوم نہیں' پرس کی کون سی جیب میں سنبھال کر رکھ دی تھی۔ مجبوراً مجھے وہاں سے اٹھنا ہی پڑا۔ میں حجرے سے باہر آ گئی۔ میری ذرا سی غلطی نے کام بگاڑ دیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے ٹھیک طرح یہ بات یاد نہیں تھی' پیش امام سے بھی انگوٹھی پہن کر ملنا تھا۔ میں یہ سمجھی تھی کہ تنظیم کے ارکان سے ملاقات کے وقت انگوٹھی پہننا ضروری ہو گا۔ بہرحال اب تو غلطی ہو ہی چکی تھی۔ بوڑھا شخص ایک بار پھر بچوں کے درمیان پہنچ چکا تھا۔

مسجد کے صحن میں آ کر میں ایک بار پھر انگوٹھی تلاش کرنے لگی۔ اس مرتبہ مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ انگوٹھی مل گئی تھی۔ بوڑھا میری طرف سے شبہے میں مبتلا ہو چکا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ دوبارہ اسی وقت اس سے ملنا مناسب ہو گا یا نہیں۔ بوڑھے نے مجھے جس طرح اپنے حجرے سے نکالا تھا' اس سے مجھے اپنی ہتک بھی محسوس ہوئی تھی۔ میں اسی لئے اس پر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اس نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ اسی خیال نے مجھے اسی وقت بوڑھے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ میں نے دیکھا' بوڑھے نے بچوں کی چھٹی کر دی۔ پھر وہ اٹھ کر اپنے حجرے کی طرف جانے لگا۔

میں تیز قدمی کے ساتھ برآمدے میں پہنچی اور پیچھے سے اسے آواز دی۔ "پیش امام صاحب! ذرا سنئے۔"

بوڑھے نے رک کر قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا اور چیخ اٹھا۔ "میں کہہ چکا ہوں' تم سے

لنا نہیں چاہتا۔ پھر تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو؟"

میں لپک کر اس تک جا پہنچی اور جلدی سے بولی۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی تھی کہ انگوٹھی پہننا بھول گئی تھی۔ یہ دیکھئے۔" میں نے انگوٹھی اس کے سامنے کر دی جو ابھی پہنی نہیں تھی۔ انگوٹھی پر نظر پڑتے ہی بوڑھے کے چہرے کا تاثر ایک دم بدل گیا۔ اس نے نرم آواز میں مجھ سے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے ایک بار پھر حجرے میں پہنچ گئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" وہ بدستور نرم آواز میں بولا۔ "اتنی اہم بات تمہیں بھولنا نہیں چاہئے تھی۔ میں ہرگز اس پر معذرت نہیں کروں گا کہ تمہارے ساتھ سختی سے پیش آیا کیوں کہ غلطی تمہاری ہی تھی۔ آئندہ تمہیں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے ورنہ تمہاری زندگی خطرے میں بھی پڑ سکتی ہے۔"

"شکریہ محترم! میں آئندہ احتیاط برتوں گی۔ امید ہے کہ آپ اب مطمئن ہونے کے بعد میرے سوال کا جواب دے دیں گے۔" میں نے بات کو درگزر کرنے کی غرض سے کہہ دیا۔

"تم نے کیا سوال کیا تھا؟" بوڑھے نے میرے چہرے پر نظر جما دی۔

"میں نے یہ عرض کیا تھا کہ مجھے غداروں سے ملنا ہے۔" میں پُرسکون آواز میں بولی۔

"کل شام ہمایوں کے مقبرے میں عصر کے وقت۔ ہمایوں کے مزار کے داخلی دروازے پر سیڑھیوں کے نیچے۔ سمجھ گئیں؟ وقت اور مقام یاد رکھنا۔"

میں نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے روکا نہیں تھا۔ میں نے حجرے سے برآمدے میں اور پھر صحن مسجد سے گزر کر مسجد کے بائیں جانب والے دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ یہ دروازہ مینا محل ہی کی طرف تھا۔ تھوڑی بہت ذلت تو اٹھانا پڑی تھی مگر میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

مسجد سے واپس گھر تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔

"آپ تو کہہ رہی تھیں جلدی لوٹ آئیں گی؟" شہزاد میرے ساتھ ساتھ کمرے کی طرف چلتے ہوئے بولا۔

"ہاں' خلاف توقع کچھ دیر ہو گئی۔ ذرا چائے کو کہہ دو' پھر چائے پی کر چلتے ہیں۔"

"میں ابھی آیا' چائے کے لئے کہہ کر۔" وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

شہزاد لوٹ کر آیا تو میں نے اس سے کہا۔ "تمہارے شہر میں بہت سے تاریخی مقامات ہیں' کیا خیال ہے کہیں چلیں آج؟"

"مگر خاتون! آپ تو کناٹ پلیس چلنے کو کہہ رہی تھیں۔"

"پہلے وہیں چلیں گے' اس کے بعد کہیں اور۔ ہاں' وہاں کپڑے وغیرہ کی دکانیں بھی ہیں نا؟"

"ایک سے ایک عمدہ' بس ذرا وہاں کپڑا مہنگا ملتا ہے۔" اس نے بتایا۔

"اس کی فکر نہ کرو' کپڑا اچھا ہونا چاہئے۔ موسم کچھ بدلنے لگا ہے' میرا خیال ہے' تم بھی اپنے لئے سوٹ وغیرہ کا کپڑا دیکھ لینا۔"

"میں کیا کروں گا خاتون! آپ اپنے لئے کپڑا خرید لیں۔ ہاں' کناٹ پلیس سے کہاں چلنا ہے؟ اگر

وہاں نہ جانا ہوتا تو پہلے میں آپ کو لال قلعے لے جاتا۔ سب سے زیادہ قریب وہی تاریخ جگہ ہے۔" شہزاد نے کہا۔

"غلط کہہ رہے ہو تم۔" میں مسکرا کر بولی۔ "یہاں سے قریب ترین تاریخی مقام وہ ہے جو میں کل ہی دیکھ چکی ہوں۔ کیا تم جامع مسجد کو تاریخی عمارت نہیں سمجھتے؟"

"کیوں نہیں خاتون! اس کی تاریخی اہمیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے؟"

"کناٹ پیلس سے ہم اس جگہ چلیں گے جہاں آخری مغلیہ تاج دار بہادر شاہ ظفر نے اپنی گرفتاری سے پہلے پناہ لی تھی۔" میں نے تاریخ کے تناظر میں بات کی۔

"ہمایوں کے مقبرے۔" شہزاد فوراً سمجھ گیا۔ "یہ ٹھیک ہے' وہیں سے نظام الدین اولیاءؒ کے مزار مبارک پر چلیں گے جو وہاں سے بہت قریب ہے۔"

"دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا' کیوں کہ میرا اصل مقصد تفریح نہیں بلکہ ہمایوں کا مقبرہ دیکھنا تھا تاکہ آئندہ روز اکیلی وہاں پہنچ سکتی۔

سنبل چائے لے کر آ گئی اور چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "آپ کیا کھائیں گی؟ جو کہیں پکا لوں' چھوٹے بھائی جان سودا لینے جا رہے ہیں۔"

"اے لڑکی! مجھ سے تکلف بالکل نہیں چلے گا۔ تم جو پکا لو گی کھا لوں گی۔" میں بے تکلفی سے بولی اور چائے کی پیالی اس سے لے لی۔

"سنبل کوفتے بہت اچھے پکاتی ہے خاتون!" شہزاد بول اٹھا۔

"لگتا ہے' بھائی جان کا دل کوفتے کھانے کو چاہ رہا ہے۔" سنبل نے ہنس کر کہا۔

"اچھا چلو' یہی سمجھ لو۔" شہزاد بھی ہنس دیا۔

"پھر ٹھیک ہے' میں کوفتوں کے لئے قیمہ منگوا لیتی ہوں۔" وہ مڑ کر جانے لگی۔

"سنو تو!" میں نے اسے روک لیا۔ "ممکن ہے' دوپہر کا کھانا ہم دونوں کہیں باہر ہی کھا لیں۔"

"تو پھر کوفتے پکانے کا کیا فائدہ ہوا؟"

"کوفتے رات کو پکا لینا' اس وقت دال وال پکا لو۔" شہزاد بولا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" وہ خوش ہو گئی۔

چائے پی کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ جامع مسجد سے میرے ایما پر کناٹ پیلس تک کے لئے شہزاد نے ٹیکسی کر لی۔ روانگی سے قبل میں نے سوٹ کیس کھول کر خاصی رقم اپنے پرس میں رکھ لی تھی۔ میں دراصل ہر طرح کے کپڑے بنوانا چاہتی تھی۔ کلکتے میں میری کوٹھی کے ساتھ ساتھ سارے کپڑے وغیرہ بھی جل گئے تھے' ورنہ تو میرے پاس ہر طرح کا لباس موجود تھا۔ کسی بھی وقت مجھے کیسے ہی لباس کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ دہلی میں آئندہ کیا حالات پیش آتے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ میں بدستور شہزاد ہی کے گھر میں رہتی۔ میں اسی سبب پہلے ہی سے تمام تیاریاں کر لینا چاہتی تھی۔ ویسے بھی مجھے رات کو سوتے وقت سلیپنگ گاؤن پہننے کی عادت تھی' بہ مجبوری میں ساڑھی پہن کر

سوتی تھی۔ کلکتے سے چلتے وقت جلد بازی کے سبب میں صرف ساڑھیاں ہی خرید سکی تھی۔ دوسرے لباس سلوانے کا وقت ہی نہیں تھا۔

کناٹ پیلس خاصا خوبصورت اور بڑا علاقہ تھا۔ وہاں مجھے انگریز مرد اور عورتیں بھی خریداری کرتے دکھائی دیئے۔ شہزاد مجھے کپڑے کی ایک بڑی سی دکان میں لے کر داخل ہو گیا۔ میں نے وہاں سے خاصا کپڑا خریدا۔ ایک خوبصورت کامدار ساڑھی اتروا کر دیکھتے ہوئے میں نے شہزاد سے پوچھا۔ "کیسی ہے؟"

"بہت اچھی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"سنبل یہ ساڑھی پہن کر کتنی پیاری لگے گی۔" میں بولی۔

"سنبل .... وہ ساڑھی نہیں پہن سکتی۔"

"کیوں' کیا ہوا' وہ کیوں نہیں پہن سکتی؟"

"ہمارے یہاں لڑکیاں شادی سے پہلے ساڑھی نہیں باندھتیں۔" اس نے بتایا۔

"تو کیا ہوا' شادی کے بعد باندھ لے گی۔ اپنی خوشی کی خاطر ویسے میں ایک بار اسے یہ ساڑھی بندھوا کر ضرور دیکھوں گی۔" پھر میں نے اسی ساڑھی سے میچ کرتا ہوا بلاؤز کا کپڑا بھی خرید لیا اور پیٹی کوٹ کے لئے بھی۔ اس کے علاوہ ایک شلوار سوٹ اور غرارہ سوٹ کے لئے بھی کپڑا لے لیا۔ انہی کے ساتھ بھاری کامدار دوپٹے بھی تھے۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں خاتون! اباجی ناراض ہوں گے۔" شہزاد بولا کیوں کہ میں نے اسے بتا دیا تھا' وہ کپڑے سنبل کے لئے خرید رہی ہوں۔ "یہ بہت مہنگے کپڑے ہیں۔"

"تو ہوا کریں' سنبل سے زیادہ تو نہیں ہیں نا اور پھر یہ کہ اس معاملے میں تم کیوں مداخلت کر رہے ہو۔ یہ میرا اور سنبل کا معاملہ ہے۔ وہ تمہاری بہن ہے تو کیا میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں؟ فضول باتیں مت کرو۔" میں نے اسے محبت سے ڈانٹ دیا اور پھر وہ کچھ نہیں بولا۔

کپڑا اتنا تھا کہ تنہا شہزاد کے بس کا نہیں تھا کہ اٹھا لیتا' مجھے بھی اس کی مدد کرنا پڑی۔ سنبل کے لئے میں نے جو کپڑے خریدے تھے' وہ الگ ایک پیکٹ میں بندھوا لئے تھے۔ کپڑوں کی رقم ادا کر کے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دکان صرف خواتین کے کپڑوں کے لئے مخصوص تھی اس سبب شہزاد کی خاطر سوٹ کا کپڑا بھی میں نے نہیں خریدا تھا۔

دکان سے باہر آتے ہی میں نے شہزاد سے کہا۔ "اب کسی اچھے سے درزی کی دکان پر چلو۔"

"خاتون! یہاں دو طرح کے درزی ہیں۔ کچھ درزی صرف مغربی لباس سیتے ہیں اور کچھ مشرقی۔ پہلے کدھر چلنا ہے؟"

"کہیں بھی چلو۔" میں نے جواب دیا۔

شہزاد مجھے ساتھ لئے درزی کی ایک دکان میں داخل ہوا۔ وہاں مجھے کوئی ہندوستانی نظر نہیں آیا۔ دکان میں قدم رکھتے ہی میں ٹھٹک گئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں فلپ کی بیوی مارگریٹ سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہ دکان سے نکل رہی تھی۔ وہ بھی میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر رک

گئی تھی۔ یہ وہی تھی جو کلکتے سے دہلی آتے ہوئے ٹرین میں میری ہم سفر تھی۔ میں کسی ایسی صورت حال کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی۔ یقیناً مارگریٹ نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں اسے دیکھ کر اس لئے کچھ بوکھلا سی گئی تھی کہ اس کی نظر میں مَیں ایک مفرور قاتلہ تھی حالانکہ راجہ سکھ دیو کو میں نے نہیں چمپا نے مجھے قتل کے الزام میں پھنسوانے کے لئے قتل کیا تھا۔ میں رک گئی تھی مگر شہزاد آگے بڑھ گیا تھا۔

"تم .... تم مس رانی ہو؟" مارگریٹ میری طرف انگلی اٹھا کر خوفزدہ سی آواز میں بولی۔ اس نے مجھے انگریزی میں مخاطب کیا۔

میں اب بڑی حد تک اپنے حواس پر قابو پا چکی تھی اس لئے آواز بدل کر اس سے کہا۔ "آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے' میرا نام ساوتری ہے۔"

میری بدلی ہوئی آواز سن کر وہ چونکی' پھر کہنے لگی۔ "حیرت ہے' تمہارا چہرہ بالکل مس رانی سے ملتا ہوا ہے' ہاں آواز ضرور مختلف ہے۔"

"کون مس رانی؟" میں نے بلاجھجک پوچھ لیا۔

"وہ .... وہ بڑی خطرناک عورت ہے۔ اس نے ٹرین میں ایک راجہ کو قتل کر دیا تھا۔" مارگریٹ کے لہجے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر وہ "سوری تو ڈسٹرب یو۔" کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ بدلی ہوئی آواز میں بولنا اس وقت میرے کام آ گیا تھا ورنہ تو میں پھنس ہی گئی تھی۔ یہ بھی غنیمت ہوا تھا کہ اس کی نظر شہزاد پر نہیں پڑی تھی اگر وہ شہزاد کو میرے ساتھ دیکھ لیتی تو شاید اس کا شبہ یقین میں بدل جاتا۔

پھر وہاں میں نے زیادہ دیر نہیں لگائی اور ناپ دے کر دکان سے نکل آئی۔ قریب ہی ایک اور درزی کے یہاں میں نے قمیض شلوار وغیرہ کے لئے ناپ دیا اور پھر شہزاد کو ساتھ لئے آگے بڑھتے ہوئے اسے مارگریٹ کے بارے میں بتایا۔

"پھر تو خاتون' یہاں سے فوراً نکل چلیں۔" وہ ڈر گیا۔

"اب تو وہ جا بھی چکی ہے' کہیں کی کہیں پہنچی ہو گی اب تک .... اچھا اب کسی کپڑے کی دکان پر چلو جہاں مردانہ کپڑے........"

"کبھی پھر دیکھا جائے گا' اس وقت رہنے دیں۔" شہزاد بدستور خوفزدہ آواز میں بولا۔ "ٹیکسی روکوں؟"

میں نے اسے خوفزدہ دیکھ کر کہہ دیا۔ "اچھا روک لو۔"

کچھ ہی دیر کے بعد ہم دونوں ہمایوں کے مقبرے کی طرف جا رہے تھے۔ کناٹ پلیس کی حدود سے نکلتے ہی شہزاد کے چہرے سے فکرمندی کے آثار خاصے کم ہو گئے تھے۔

ہمایوں کے مقبرے پہنچ کر میں' شہزاد کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ "یہ تم اتنی جلدی کیوں گھبرا جاتے ہو؟"

"دراصل مجھے اس وقت وہ .... وہ راجہ سکھ دیو یاد آ گیا تھا جسے آپ نے ٹرین میں قتل کر دیا

تھا۔" یہ کہتے ہوئے شہزاد کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "ٹرین میں بھی تمہیں بتایا تھا کہ میں نے راجہ سکھ دیو کو قتل نہیں کیا' مگر تم اب تک مجھی کو قاتلہ سمجھ رہے ہو۔ کیا کل رات کا واقعہ بھول گئے؟ کل بھی تو تمہارے چچا امجد مجھ پر سنبل کے قتل کا الزام لگا رہے تھے۔" میرے لہجے میں چبھن تھی۔

"معاف .... معاف کیجئے گا خاتون! میں .... میں بھول ہی گیا تھا کہ وہ .... وہ فریب نظر تھا۔ آپ نے راجہ سکھ دیو کو قتل نہیں کیا۔" شہزاد نے معذرت کر لی۔

وہ روہانسا سا ہو گیا تھا اس لئے میں نے موضوع گفتگو بدل دیا اور تاریخ پر بات کرنے لگی۔ "تمہیں معلوم ہے ناکہ یہ مقبرہ ہمایوں کی بیوی نے تعمیر کرایا تھا؟"

"جی .... جی ہاں خاتون!" اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

"تقریباً یہی طرز تعمیر تاج محل کا ہے۔" میں نے اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے یہی پڑھا تھا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں خاتون!" شہزاد نے سر ہلا کر میری تائید کی۔ "میں نے تاج محل بھی دیکھا ہے۔"

اب ہم ہمایوں کے مزار تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ میں نے وہ تمام محل وقوع اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اس جگہ کھڑی تھی جہاں عصر کے وقت تنظیم کے کسی رکن سے میری ملاقات ہونا تھی۔ ہمایوں کے مزار تک پہنچنے کے لئے داخلی دروازہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر ہم مزار کے احاطے میں داخل ہو سکتے تھے۔ شہزاد کی تقلید کرتے ہوئے میں نے بھی جوتے اتار دیئے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہو گئی۔

یہ اس مغل تاجدار کا مزار تھا کہ جس کے باپ نے اس کی خاطر خدا کے حضور اپنی جان کا نذرانہ دے کر تاریخ عالم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔ دنیا جسے مغل اعظم اکبر کے نام سے جانتی ہے' یہ اسی کے باپ ہمایوں کا مزار تھا۔ میں' ہمایوں کے مزار کے سامنے دیر تک کھڑی رہی اور میری چشم تصور ماضی کے اوراق پلٹتی رہی۔ یوں تو اس مٹی کے ڈھیر میں اب کیا رکھا تھا مگر اس کے پیچھے ایک عہد کی تاریخ تھی۔ مجھے وہ سقہ بھی یاد آیا جس نے ہمایوں کی جان بچائی تھی ورنہ تاریخ کچھ اور ہوتی۔ یہی وہ جگہ تھی کہ جہاں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے سامنے اس کے بیٹوں کے کٹے ہوئے سر ایک ظالم انگریز نے پیش کئے تھے۔ جو لوگ اپنے اجداد کی روش چھوڑ دیتے ہیں' تاریخ انہیں ایسے ہی ہولناک تماشے دکھاتی ہے۔ شہزاد فاتحہ پڑھنے کے بعد میرے قریب خاموش کھڑا تھا۔ اس نے میری محویت دیکھ کر مجھے مخاطب نہیں کیا تھا۔ آخری مغل فرماں رواں کے بعد سے اب تک ہندوستان پر انگریز غاصبوں ہی کا قبضہ تھا جس کے خلاف کچھ سر پھرے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے ان سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔

پھر خود ہی میں پلٹی تو شہزاد بھی میرے پیچھے پیچھے چل دیا۔ دائیں بائیں جو دالان بنے ہوئے تھے' ان

میں بھی مغلوں کے عہد زوال کے بہت سے کردار آخری نیند سو رہے تھے۔ میں ان پر ایک نظر ڈالتی ہوئی باہر آگئی۔ میرا دل کچھ بھاری بھاری سا ہو گیا تھا۔ شاید اس کا سبب مسلمانوں کا عہد ماضی تھا۔

"کیا بات ہے خاتون! آپ کچھ خاموش خاموش سی ہیں؟" باہر آکر شہزاد مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہاں۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "معلوم نہیں شہزاد کہ غلامی کی یہ طویل اور سیاہ رات کب ختم ہو گی۔"

"آپ کو اس وقت یہ خیال کیسے آگیا؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"کیا تم بھول گئے شہزاد کہ یہی تو وہ جگہ ہے جہاں مغلوں کے اقتدار کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہوا تھا۔"

"اچھا تو آپ اس وجہ سے ملول نظر آ رہی ہیں۔" وہ اس طرح بولا جیسے ذہن سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔

پھر ہم دونوں دیر تک وہاں چہل قدم کرتے رہے۔ وہاں آنے والوں کی تعداد کم ہی تھی۔ ہمارے علاوہ چند ہی لوگ ہوں گے۔ ان میں بھی آدھے کے قریب غیر ملکی تھے۔ وہاں سے ہم پیدل ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے لئے چل دیئے جو زیادہ دور نہیں تھی۔ وہاں مجھے میلہ سا لگا نظر آیا۔ اب دوپہر کے دو بج رہے تھے اور مجھے بھوک سی محسوس ہونے لگی۔ ایک ٹھیلے پر دیگ رکھے بریانی والا کھڑا تھا۔ ٹھیلے کے گرد اس طرح بھیڑ لگی ہوئی تھی جیسے مفت بریانی بانٹی جا رہی ہو۔

"چلو شہزاد! ہم بھی بریانی کھاتے ہیں۔" میں بولی۔

"اتنی بھیڑ میں اور کھڑے ہو کر کھائیں گی۔" اس نے حیرت سے کہا۔ "اور پھر وہاں سارے مرد ہی مرد کھڑے کھا رہے ہیں۔"

"تو کیا ہوا' تم آؤ۔" میں نے شہزاد کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"یہ پہلا موقع ہو گا خاتون کہ میں اس طرح ٹھیلے پر کھڑے ہو کر بریانی کھاؤں گا۔ دراصل ہمارے یہاں اس طرح ٹھیلے پر کھانے کو غیر مہذب سمجھا جاتا ہے۔"

"سمجھا جاتا ہو گا۔" میں ہنس کر بولی۔ "بھوک کی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے۔"

میں اس کا ہاتھ تھامے بھیڑ میں گھسنے لگی تو اس نے کہا۔ "آپ یہیں کھڑی ہو جائیں' میں آپ کے لئے بھی پلیٹ لے آتا ہوں۔"

میں رک گئی اور وہ بھیڑ میں گھس گیا۔

"پہلوان! ذرا مڑ کر تو دیکھو کیا غضب کی چیز کھڑی ہے پیچھے۔" میں نے ایک شخص کی آواز سنی جو میرے آگے ہی کھڑا ہوا اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔ اسے اور اس کے ساتھی کو ایک نظر دیکھ کر ہی میں سمجھ گئی' وہ دونوں کشتی لڑتے ہوں گے۔ دونوں کے کان ٹوٹے ہوئے تھے اور جسم گٹھیلے تھے۔

اپنے ساتھی کے کہنے پر دوسرے پہلوان نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "واقعی تُو ٹھیک کہتا ہے۔ لگتا ہے اللہ میاں نے فرصت میں بنایا ہے اسے۔ ابے کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے'

حسن تو کافروں کے حصے میں آگیا ہے۔"

میں ان دونوں کے تبصرے کو طرح دے گئی۔ خواہ مخواہ ان کے منہ لگنا فضول تھا۔ وہ اس طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہے تھے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں نگل جائیں گے۔ میں نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ ان کی گفتگو سے پتا چلا تھا کہ وہ مجھے ہندو سمجھے تھے۔ اس کا سبب میرے جسم پر موجود لباس ہی ہو سکتا تھا۔

وہ دونوں بھی بریانی کھا رہے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی اپنی پلیٹیں صاف کیں' پھر ان میں سے ایک بولا۔ "پہلوان! معلوم ہوتا ہے اکیلی ہے۔"

"دکیلی بھی ہوتی تو ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا؟" دوسرا ہنس کر کہنے لگا۔

"پھر کیا ارادہ ہے پہلوان!"

میرے کان کھڑے ہو گئے کہ کہیں وہ دونوں میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کریں۔

"ابے کافر عورتیں مسلمانوں پر حلال ہیں۔" پہلے شخص نے جواب دیا۔ "تُو یہ پلیٹیں رکھ کر آ اور ایک گلاس پانی لے آ' پھر قسمت آزمائی کرتے ہیں۔"

یہ سن کر میں نے بھیڑ میں شہزاد کو تلاش کیا۔ وہ اس وقت تک بریانی والے تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں احتیاط کے پیش نظر ان دونوں سے چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ان میں سے ایک اب ٹھیلے پر پلیٹیں رکھنے اور ٹنکی سے پانی لینے آگے بڑھ چکا تھا۔ دوسرے نے مجھے پیچھے ہٹتے دیکھا تو مزید آگے بڑھ آیا۔ وہ شاید مجھے اپنی نظروں میں رکھنا چاہتا تھا۔ میں کسی بھی قسم کے جھگڑے سے گریز کرنا چاہتی تھی لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ ان کی بدتمیزی برداشت کر لیتی۔ وہ دونوں مجھے اپنی گفتگو سے پست ذہن ہی معلوم ہوتے تھے۔ میں بہرحال ان کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھی۔

وہ جو پانی لینے گیا تھا' جلد ہی لوٹ آیا۔ پانی سے بھرا ہوا گلاس اس نے اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ پانی پی کر دوسرے شخص نے قریب ہی موجود ایک آدمی کو گلاس تھما دیا۔ "لو' پانی پی کر گلاس ٹھیلے پر رکھ دینا' ہم چلے۔"

"شکریہ پہلوان!" وہ آدمی جواباً بولا۔

مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ دونوں براہ راست مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کریں گے مگر انہوں نے کیا یہی۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر بلا جھجک میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"ہمارے ساتھ چلو۔" اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر مجھے گویا دھمکایا۔

"چلنا کہاں ہے؟" میں نے بظاہر پُرسکون آواز میں سوال کیا۔

"تُو آگے تو بڑھ' یہ بھی بتا دیں گے۔"

"نہیں' پہلے بتاؤ۔"

"بس یہیں ہمایوں کے مقبرے تک چلیں گے' وہاں کوئی نہ کوئی جگہ مل جائے گی۔" اس نے بتا ہی دیا۔

"اور کسی نے دیکھ لیا تو' پکڑے گئے پھر؟" میں انہیں گھس رہی تھی۔

"کسی کی مجال ہے جو پہلوان پر ہاتھ ڈال سکے۔" دوسرا بولا۔ "سالے کی کھال میں بھس بھر دیں گے ہم۔"

"ایسا لگتا تو نہیں' کسی مرد سے لڑنا تو دور کی بات ہے تم لوگ تو کسی عورت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔"

"کیا بکتی ہے بے؟" وہ شخص ایک دم گرم ہو گیا جو میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

"میں ٹھیک فرما رہی ہوں۔" یہ کہتے ہی مَیں نے جھٹکا دے کر اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "تم دونوں مل کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" میں اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

دونوں کو غصہ آ گیا اور غصے میں عقل تو خبط ہو ہی جاتی ہے۔ وہ ایک ساتھ مجھ پر جھپٹ پڑے۔ میں نے ان میں سے ایک کے پیٹ پر لات ماری اور دوسرے کے جبڑے پر میرا گھونسا پڑا۔ میں نے دانستہ شدید ضربیں لگائی تھیں۔ اسی کے نتیجے میں ایک تو پیٹ پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا اور دوسرا دونوں ہاتھوں سے جبڑا سہلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

"شاباش میرے شیرو! پھر کوشش کرو۔" مَیں نے ان دونوں کو چڑایا۔

وہاں موجود لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے دونوں پہلوانوں کو میرے ہاتھوں پٹتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے حلقہ سا بنا لیا تھا جیسے کوئی دلچسپ تماشا دیکھ رہے ہوں۔

پھر میرے للکارنے پر ان میں سے ایک جو پیٹ پکڑے زمین پر بیٹھ گیا تھا' ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"کمینی! تجھے ابھی بتاتا ہوں مَیں۔" وہ مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھتا ہوا چیخا۔

"کمینی ہو گی تیری ماں۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تُو نے میری ماں کو کمینی کہا ہے' اب میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ابھی تیری آنتیں باہر نکال دوں گا۔" وہ آپے باہر ہو گیا اور پھر اس نے اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔ کھٹکے دار چاقو کا لمبا پھل فوراً ہی دستے سے باہر آ گیا تھا۔

دوسرا پہلوان بھی اس وقت تک سنبھل چکا تھا۔ اس نے بھی اپنے ساتھی کی تقلید میں جیب سے چاقو نکال کر کھول لیا۔ لوگ پیچھے ہٹ گئے کیوں کہ وہ تماشا اب خطرناک حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہاں موجود افراد میں سے کسی نے ان دونوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی' نہ مجھے ان سے بچانے کے لئے کوئی قدم اٹھایا تھا۔ ہاں' انہیں اپنی اپنی فکر ضرور تھی کہ کہیں جھگڑے میں ان کے چوٹ پھینٹ نہ آ جائے۔ وہ اسی لئے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ وہ غالباً یہی سوچ رہے ہوں گے کہ ابھی کچھ دیر میں میری لاش وہاں پڑی تڑپ رہی ہو گی۔ میری نظر ان دونوں ہی پر جمی ہوئی تھی۔ پھر ایک نے دوسرے کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا۔ میں چونک اٹھی۔ اب وہ دونوں میرے دائیں بائیں ہو کر قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ اب بیک وقت ان دونوں پر نظر رکھنا میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ پھر بھی میں گھبرائی نہیں۔

اچانک ان دونوں نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کر دیا اور عین اسی لمحے میں اپنی جگہ سے اچھلی۔ اپنے عقب میں مجھے یکے بعد دیگرے دو چیخیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ دونوں اپنے اپنے پیٹ پکڑے زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے پیٹ میں چاقو اتار دیئے تھے۔ ان کے کپڑے انہی کے خون سے تربتر ہو رہے تھے۔

پھر مجھے ایک طرف سے شہزاد کی آواز سنائی دی۔ "خاتون!"

میں نے اس طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ لوگوں کے درمیان سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب وہاں مزید رکنا کسی خطرے کو دعوت دینے کے مترادف تھا کیوں کہ ممکن تھا وہاں آس پاس پولیس بھی ہوتی اور میں پولیس کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ہرچند کہ جو کچھ ہوا تھا' اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا مگر پولیس والے بے قصوروں ہی کو زیادہ رگیدتے ہیں۔ یہ سوچ کر میں تیزی کے ساتھ اس طرف بڑھی جدھر شہزاد کو دیکھا تھا۔ لوگ مجھے اس طرف بڑھتے دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ مجھے شہزاد تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

"یار! بڑی جیوٹ عورت تھی' ذرا بھی نہیں گھبرائی۔" کسی نے تبصرہ کیا۔

"چلو' یہاں سے نکل چلیں۔" میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"جج .... جی ہاں خاتون!" شہزاد بدحواس سا دکھائی دے رہا تھا۔

ہم دونوں تیزی سے اس طرف بڑھ گئے جہاں کچھ فاصلے پر تانگے' یکے اور قریب ہی ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے شہزاد کو مسکرا کر مخاطب کیا۔ "تم تو بریانی لینے گئے تھے' اس کا کیا ہوا؟"

"میرا نمبر آنے ہی والا تھا کہ ایک دم بھگی مچ گئی۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اچانک ہوا کیا۔ پھر میں نے کچھ ہی دور لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ آپ مجھے کہیں نظر نہیں آئیں تو میں اسی ہجوم کی طرف بڑھ آیا۔" شہزاد بتانے لگا۔ پھر اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ اسے شاید یہ خیال آ گیا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور بھی ہماری باتیں سن رہا ہے۔ "میں نے دور ہی سے آپ کو مجمع کے درمیان دیکھ لیا' مگر کوشش کے باوجود لوگوں کے درمیان سے آپ تک نہیں پہنچ سکا۔ میں نے ان دونوں کو بھی دیکھ لیا تھا جو چاقو ہاتھوں میں لئے آپ کی طرف بڑھ رہے تھے پھر.........."

"کھیل ختم ہو گیا۔" میں دھیرے سے ہنس کر بولی۔

"خاتون! آپ بھی کمال شے ہیں۔ آپ کو ذرا بھی ڈر نہیں لگا؟"

"اگر ڈر جاتی تو ان دونوں کی بجائے میں زمین پر گر کر تڑپ رہی ہوتی۔"

"آخر ہوا کیا تھا؟" اس نے دریافت کیا۔

میں نے دھیمی آواز میں مختصراً اسے بتا دیا' پھر بولی۔ "خیر خاک ڈالو ان پر۔ ایسے لوگوں کی یہی سزا ہے۔" اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ کھانا اب تک نہیں کھایا اور گھر پر کھانے کے لئے منع کر آئے تھے۔ اسی خیال سے میں نے کہا۔ "ایسا کرو کہ کسی اچھے ہوٹل چلو' گھر کھانا کھا کے جائیں گے۔"

"اب تو گھر ہی چل رہے ہیں' وہیں کھا لیں گے نا!"

"نہیں۔" میں نے انکار کر دیا۔ "خواہ مخواہ سنبل کو پریشانی ہو گی۔"

پھر ہم نے جامع مسجد کے علاقے ہی میں ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کھانا لذیذ اور عمدہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دہلی والے کھانے بہت لذیذ بناتے تھے۔

"چائے اب گھر چل کر پی لیں گے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ کھانے کا بل میں پہلے ہی ادا کر چکی تھی۔

شہزاد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میز پر رکھا ہوا پیکٹ اس نے اٹھا لیا تھا جس میں سنبل کے لئے کپڑا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے سنبل سے چائے بنا کر لانے کو کہا۔ پھر جب وہ چائے لے آئی تو میں نے میز پر رکھا ہوا بنڈل کھولتے ہوئے اس سے کہا۔ "ذرا بیٹھو۔"

"جی بہتر ہے۔" وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھ گئی اور سوالیہ نظروں سے پیکٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے پہلے ساڑھی نکال کر اسے دکھائی۔

"کیسی ہے یہ ساڑھی؟" میں نے ساڑھی اس کی طرف بڑھا دی۔

"بہت ہی پیاری ہے' اپنے لئے خریدی ہے نا آپ نے؟"

"سنو سنبل! اگر میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن بنا لوں تو کوئی اعتراض تو نہیں کرو گی؟" میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیوں اعتراض ہوتا؟"

"تو پھر آج سے تم مجھے باجی کہو گی' کہو باجی۔"

"باجی!" اس کے خوبصورت ہونٹ ہلے۔

"تو اسی خوشی میں یہ ساڑھی تمہاری .... اور یہ شرارہ سوٹ اور شلوار سوٹ بھی میں نے تمہارے ہی لئے خریدا ہے۔" میں نے بقیہ کپڑا بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔ "کیسے ہیں سوٹ؟"

سنبل کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے اور بڑی نظر آنے لگیں۔ پھر وہ بولی۔ "مگر......! ...... مگر باجی یہ .... یہ تو بہت مہنگا کپڑا معلوم ہوتا ہے؟"

"تو کیا ہوا اور ہاں سنو' تمہارے بھائی جان نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارے گھر میں لڑکیاں شادی سے پہلے ساڑھی نہیں باندھتیں لیکن میری ایک خواہش ہے کہ تمہیں بس ایک بار ساڑھی باندھے ہوئے دیکھ لوں۔ بولو میری خواہش پوری کرو گی؟"

"لیکن مجھے .... باجی! مجھے تو ساڑھی باندھنا آتا ہی نہیں' کبھی باندھی ہی نہیں۔"

"وہ تمہیں میں سکھا دوں گی۔ اب تم آج ہی بلاؤز اور پیٹی کوٹ کسی اچھے درزی کو سلنے کے لئے دے دو۔"

"گھر میں مشین موجود ہے' میں خود سی لوں گی لیکن ایک بات آپ بھی میری مان لیں۔"

"بولو۔"

"آپ یہ کپڑے میری بجائے امی کو دے دیں کہ میرے لئے لائی ہیں۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" شہزاد بھی اپنی بہن کی تائید میں بول اٹھا۔

"منظور ہے' چائے پی لوں تو چلتے ہیں۔" میں راضی ہو گئی۔

چائے پینے کے بعد شہزاد اور سنبل کے ساتھ میں دالان میں پہنچی جہاں شہزاد کی ماں حسب معمول پلنگ پر بیٹھی پان لگا کر کلے میں رکھ رہی تھی' میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "ارے رانی بیٹا! تم ہو؟" وہ بولی۔

"جی۔" میں نے بلند آواز میں کہا کیوں کہ مجھے علم تھا' وہ اونچا سنتی ہے۔ کپڑے میری گود میں رکھے تھے۔

"اماں! رانی صاحبہ نے اپنی گڑیا کو چھوٹی بہن بنا لیا ہے۔" شہزاد نے اپنی ماں کی دوسری طرف بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"یہ تو خوشی کی بات ہے۔" بڑی بی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بہن بنانے ہی کی خوشی میں سنبل کے لئے میں یہ کپڑے خرید کر لائی ہوں۔" میں نے کپڑے اٹھا کر بڑی بی کے سامنے رکھ دیئے۔

وہ کپڑے اٹھا اٹھا کر آنکھ کے قریب لے جانے لگی اور چٹکی میں لے کر بھی دیکھے۔ "یہ تو بہت مہنگے کپڑے لگ رہے ہیں مجھے۔"

"ہاں اماں!" سنبل نے تصدیق کی' پھر کپڑوں کی تفصیل بتائی۔

"اچھا تو یہ ساڑھی ہے' مگر.........."

"شادی کے بعد باندھ لے گی۔" میں فوراً بول اٹھی۔

"یہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن رانی بٹی! تم ہم پر اتنا بوجھ کیوں چڑھا رہی ہو؟ ہم غریب لوگ آخر یہ بوجھ کیسے اتاریں گے۔"

"سنبل کو میں نے اس لئے تو بہن نہیں بنایا کہ آپ اسے بوجھ سمجھیں' کیا آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں سمجھتیں؟"

"وہ تو خیر تم ہو' اللہ تمہیں خوش رکھے۔" اس نے دعا دی۔ پھر کپڑے سنبل کو دیتے ہوئے کہا۔ "اپنے جہیز کے لئے رکھ دے' مہنگے کپڑے ہیں۔"

سنبل نے شرما کر کپڑے لے لئے۔ اسی وقت بکرے کی آواز سن کر میں چونک اٹھی۔ سامنے نظر اٹھا کر دیکھا تو شہزاد کا باپ ارشد علی نظر آیا۔ وہ بکرے کی رسی تھامے ہوئے دالان ہی کی طرف آ رہا تھا۔ دور ہی سے اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ "شہزاد کی ماں! صدقے کے لئے بکرا لے آیا ہوں میں۔"

"چلو یہ اچھا ہوا کہ تمہارے ابا بھی آ گئے' انہیں بھی کپڑے دکھا دو۔" شہزاد کی ماں نے سنبل سے کہا۔

معلوم ہوا کہ رات کے واقعے میں سنبل کی جان بچ جانے کی وجہ سے ارشد علی' بکرا خرید کر لایا تھا کہ صدقہ دے سکے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے لائے ہوئے کپڑوں کی اتنی تشہیر ہو گی۔ اسی سبب مجھے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ بہرحال میرے تحفے کو قبول کر لیا گیا۔

"شام کو میں مغرب سے پہلے دکان بند کر کے آ جاؤں گا تاکہ قربانی کر سکوں۔ فرہاد کو دکان پر بٹھا کر آیا ہوں' وہ کلس رہا ہو گا۔ جا کر اسے بھیجتا ہوں۔ لے بیٹا! بکرا باندھ دے۔" ارشد علی نے بکرے کی رسی سنبل کو تھما دی اور چلا گیا۔

☆======☆======☆

میں پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر مجھے یوں بھی آرام کرنے کی عادت تھی۔ کپڑے بدل کر میں بستر پر لیٹ گئی۔ گزشتہ رات جو واقعہ پیش آیا تھا' اسے مدنظر رکھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ آج کی رات بھی مشکل ہے' خیریت سے گزرے۔ لعنتی چمپا ابھی تک مجھے اس گھر میں ذلیل و رسوا نہیں کر سکی تھی۔ اس سے کسی بھی گری سے گری ہوئی حرکت کی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ چمپا کے ممکنہ حملے سے کس طرح بچنا ممکن ہے؟ یہ میں کلکتے ہی میں ارشاد حسین سے پوچھ چکی تھی کہ اس کی تنظیم دہلی میں میرے لئے سکونت کا بندوبست بھی کر سکتی ہے یا نہیں۔ ارشاد حسین نے اقرار میں جواب دیا تھا۔ شہزاد کا گھرانا شریف لوگوں کا تھا۔ میرے نزدیک یہ اچھا نہیں تھا کہ میری وجہ سے وہ لوگ کسی مشکل میں گرفتار ہو جاتے یا میں ان کی نظر میں بے عزت ہو جاتی۔ کافی دیر غور و خوض کرنے کے بعد مجھے اس کا ایک ہی حل نظر آیا۔ مجھے شہزاد کے گھر میں اپنی سکونت ترک کر دینی چاہئے تھی۔ تنظیم کے ارکان سے مجھے آئندہ روز ملنا تھا۔ ان سے ملاقات ہونے ہی پر سکونت کا بندوبست کرنے کے لئے کہا جا سکتا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ کل ہی یہ بندوبست کر دیتے۔ اس میں ایک سے زیادہ دن لگ سکتے تھے۔ اگر وہ فوری طور پر بھی یہ مسئلہ حل کر دیتے پھر بھی مجھے ایک رات تو اس گھر میں گزارنا ہی تھی لیکن گزشتہ رات کے ہولناک تجربے کے بعد میں ایک رات کا بھی رسک لینے پر آمادہ نہیں تھی۔ دہلی کا شمار بھی ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔ جب سے انگریزوں نے اسے دارالحکومت بنایا تھا' اس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ وہاں اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے کلکتے میں بھی تنگ آ کر ہوٹل کا رخ کیا تھا مگر ڈیسوزا کے اغوا کی وجہ سے خفیہ پولیس والے ہوٹلوں کی نگرانی کر رہے تھے اسی وجہ سے میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ اس مسئلے کا مجھے ایک اور حل بھی نظر آیا' مگر وہ بھی دیر طلب تھا۔ اس طرح نہ مجھے تنظیم کا سہارا لینا پڑتا اور نہ شہزاد کے گھر میں رہنے پر مجبور ہوتی۔ عارضی طور پر میں کوئی مکان کرائے پر لے سکتی تھی۔ اس سلسلے میں شہزاد میری مدد کر سکتا تھا۔ مکان تلاش کرنے اور کرائے پر حاصل کرنے میں وقت لگ سکتا تھا اور میرے پاس ایک رات کا وقت بھی نہیں تھا۔ ان حالات میں مکان کرائے پر ملنے یا سکونت کے لئے کوئی اور بندوبست ہونے تک میرا کسی ہوٹل میں قیام بہتر تھا۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے بعد مجھے کچھ اطمینان ہو گیا اور میری آنکھ لگ گئی۔

مغرب کی اذان کے وقت سنبل ہی نے مجھے آ کر جگایا۔ "اذان ہونے والی ہے باجی! اٹھیں نہیں؟" وہ بڑی محبت سے بولی۔ وہ میرے کہنے کے مطابق مجھے باجی کہنے لگی تھی۔

میں انگڑائی لے کر اٹھ گئی تو وہ لپک کر گئی اور میرے لئے چائے لے آئی جو شاید وہ پہلے ہی بنا لائی

"بڑا خیال رکھتی ہو تم میرا۔" میں نے چائے لیتے ہوئے کہا۔

"حد کرتی ہیں آپ بھی باجی! ذرا سی چائے بنا کر دے دی تو کیا ہو گیا۔ ابھی تو آپ کی خدمت کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"اور میں یہ موقع تمہیں دوں گی بھی نہیں۔" میں مسکرا کر بولی۔

"وہ کیوں' کیا کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے؟"

"میں آج جا رہی ہوں' اپنے ایک عزیز کے یہاں' وہیں رہوں گی۔" میں نے جانے کے لئے راہ ہموار کی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہمیں اپنا عزیز نہیں سمجھتیں۔"

"یہ بات نہیں ہے پاگل لڑکی!" میں نے ہنس کر کہا۔ "آج ان سے ملاقات ہو گئی تھی' یوں ہی راہ۔ وہ بضد ہو گئے کہ ان کے یہاں رہوں۔ بہرحال میں آتی جاتی رہوں گی۔ تمہارے بھائی جان کہاں ہیں؟" میں نے شہزاد کے بارے میں دریافت کیا۔

"اپنے کمرے میں ہیں' ابھی آئے ہیں۔ یتیم خانے میں صدقے کا گوشت دے کر۔" اس نے بتایا۔

"انہیں میرے پاس بھیج دو۔"

اقرار میں سر ہلا کر وہ چلی گئی۔ جب کچھ دیر بعد شہزاد کمرے میں آیا تو بیٹھتے ہی کہنے لگا۔ "یہ سنبل کیا کہہ رہی ہے؟ آپ نے پہلے تو اپنے کسی عزیز کا ذکر نہیں کیا جو دہلی میں رہتے ہوں۔"

"اگر کوئی عزیز یہاں ہوتا تو ذکر کرتی نا؟" میں ہنس دی۔

"پھر وہ سنبل سے آپ نے.........."

"تو اور اس غریب سے کیا کہتی؟" پھر میں سنجیدہ ہو گئی۔ "بات دراصل یہ ہے شہزاد کہ تمہارے گھر میں میرا رہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔"

"وہ کیوں خاتون!" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا گزشتہ رات کا واقعہ بھول گئے؟.......... میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم لوگ کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔ میں اگر یہاں مزید ایک رات بھی رہی تو نہ صرف میرے لئے بلکہ تم لوگوں کے لئے بھی یہ اچھا نہیں ہو گا۔ میری وجہ سے کوئی بھی نئی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔"

"لیکن.......... آپ یہاں نہیں رہیں گی تو.......... تو پھر کہاں رہیں گی؟" شہزاد پریشان سا ہو گیا۔

"یہ میں سوچ چکی ہوں۔ فی الحال میں یہاں سے کسی ہوٹل جاؤں گی' مگر تم اپنے گھر والوں سے کہو گے جو میں نے سنبل کو بتایا ہے۔"

"فی الحال سے آپ کی مراد کیا ہے خاتون!" اس نے وضاحت چاہی۔

"تم یہیں کسی قریبی محلے میں کرائے پر کوئی مکان تلاش کر لو' اس کے بعد تمہی کو ملازمین کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے اچانک مجھے کلکتے کے تلخ تجربات یاد آ گئے۔ موجود صورت

حال میں یہی بہتر تھا کہ میں اکیلی رہتی۔ ملازمین کے ساتھ رہنے کی صورت میں لعنتی چمپا میرے لئے مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کہا۔ "ابھی ملازمین رہنے دو............ کوئی ایسی بوڑھی یا ادھیڑ عمر عورت مل سکتی ہے جو میرے ساتھ رہنے پر تیار ہو جائے؟"

"ہاں کیوں نہیں مل سکتی' تلاش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

مجھے خیال آیا کہ اگر میں مرد ملازمین کی بجائے دو تین ضرورت مند عورتوں کو ملازم رکھ لوں تو لعنتی چمپا کو کسی گھٹیا حرکت کا موقع نہ ملے گا۔ میں نے اپنے اسی خیال کا اظہار شہزاد سے کر دیا۔ "عورتیں دیکھو' ایسی عورتیں جو میرے ساتھ رہ سکیں۔"

"ٹھیک ہے خاتون! میں پہلے مکان تلاش کرتا ہوں' پھر عورتیں بھی ڈھونڈ لوں گا۔"

"یہاں اچھے ہوٹل تو نئی دہلی ہی کے علاقے میں ہوں گے؟"

"جی ہاں' مگر ان میں قیام ذرا مہنگا پڑے گا۔"

"کوئی پرواہ نہیں۔ بس اب تم چلنے کی تیاری کر لو۔"

"وہ سنبل نے بڑی محبت سے آپ کے لئے کوفتے پکائے ہیں' کیا کھانا کھا کر نہیں جائیں گی؟"

"ہاں' یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ وہ خواہ نخواہ خیال کرے گی۔ بھوک تو اس وقت بالکل نہیں مگر خیر سنبل کی خاطر کھا لوں گی' دو چار نوالے۔ ہاں تم اس سے کہہ دو' جلدی سے روٹیاں ڈال دے۔ اسے بھی میرے ساتھ ہی کھانا کھانا ہے۔"

شہزاد اٹھ کر چلا گیا اور میں کمرے سے نکل کر باتھ روم میں گھس گئی۔ اس روز شہزاد کا باپ اور علی بھی گھر ہی پر موجود تھا۔ میں ہاتھ منہ دھو کر اپنے کمرے میں آ گئی اور دروازہ اندر سے بند کر کے لباس تبدیل کیا۔ اِدھر اُدھر کمرے میں جو میرے کپڑے وغیرہ پڑے ہوئے تھے وہ میں نے اٹھا کر ایک سوٹ کیس کے اندر رکھ دیئے' پھر دروازہ کھول دیا۔

کچھ دیر بعد ہی پھر شہزاد میرے کمرے میں آ گیا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اخلاقاً آپ ابا جی اماں سے بھی کہہ دیتیں کہ جا رہی ہیں تو بہتر ہوتا۔"

"چلو' کہے دیتی ہوں۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اور ہاں تم نے سنبل سے کہہ دیا کہ میں اس ساتھ کھانا کھاؤں گی؟"

"جی ہاں' کہہ دیا ہے۔ وہ آپ کی اچانک روانگی پر کچھ اداس اداس سی ہے۔"

"میں نے اس سے کہہ تو دیا تھا کہ آتی جاتی رہوں گی' پھر خواہ مخواہ اداس ہو رہی ہے۔ پگلی پوری۔" پھر میں ہنس کر بولی۔ "ظاہر ہے تمہاری بہن ہے۔"

"اور آپ کی بھی۔" شہزاد بول اٹھا۔ "آپ اسے اپنی بہن بنا چکی ہیں۔"

"ہاں اس نے تو خیر مجھے انکار نہیں' مگر اس پر اثر تمہارا ہی ہے۔" میں کمرے سے نکل آئی۔

دالان میں دونوں بوڑھے بڑھیا بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان دونوں کو سلام کیا اور بڑی بی کے پلنگ پر بیٹھ گئی' پھر شہزاد کو اشارہ کیا۔

"اماں! رانی صاحبہ آج جا رہی ہیں۔" شہزاد نے میرے اشارے پر اپنی ماں کو مخاطب کیا۔

"کہاں جا رہی ہیں بھئی! کل ہی تو آئی ہیں۔" بڑھیا حیران ہو کر کہنے لگی۔

"ان کے ایک عزیز رہتے ہیں نئی دہلی میں' انہی کے یہاں رہیں گی یہ۔"

"ہاں بھیا! یہ ہم غریبوں کے یہاں کیوں رہنے لگیں۔"

"یہ بات نہیں ہے اماں!" میں بول اٹھی۔ "میرا ارادہ تو یہیں رہنے کا تھا مگر........." پھر میں نے وہی کہانی سنا دی جو سنبل کو سنا چکی تھی۔

"اگر وہ لوگ مجبور کر رہے ہیں تو ظاہر ہے' پہلا حق انہی کا ہے۔ عزیز ہیں تمہارے۔" وہ مان ہی گئی۔

"فرہاد!" شہزاد نے اپنے چھوٹے بھائی کو صحن میں دیکھ کر آواز دی۔ وہ قریب آ گیا تو تخت پر دسترخوان بچھانے اور پانی رکھنے کو کہا۔

ذرا ہی دیر بعد میں شہزاد کے سب گھر والوں کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ کوفتے واقعی اتنے اچھے پکے تھے کہ بھوک نہ ہونے کے باوجود میں نے پوری دو روٹیاں کھا لیں۔

سنبل خالی برتن اٹھا کر باورچی خانے کی طرف لے جا رہی تھی تو میں اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کہنے لگی۔ "تم پیٹی کوٹ اور بلاؤز سی کر رکھنا' کسی روز میں آؤں............"

"باجی! وہ تو میں نے سی بھی لئے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

"ارے کب؟"

"آج دوپہر کے بعد ہی اور کب۔"

"حیرت ہے' اب اگر کبھی مجھے کوئی ارجنٹ کپڑا سلوانا ہوا تو تمہی سے سلواؤں گی۔ اچھا تو پھر ایسا کرو کہ ساڑھی' بلاؤز اور پیٹی کوٹ لے کر جلدی سے میرے کمرے میں آ جاؤ۔ تمہیں ساڑھی باندھنا سکھا ہی دوں۔ اس بہانے میری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی کہ تمہیں ساڑھی باندھے ہوئے دیکھ لوں۔"

"لیکن باجی! اس وقت تو ابا جی گھر میں ہیں۔" وہ باورچی خانے کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔

"تو کیا ہو گا' وہ میرے کمرے میں نہیں آئیں گے۔ بے فکر رہو۔"

"اچھا آپ اپنے کمرے میں چلیں' میں آتی ہوں ابھی۔"

میں صحن عبور کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ شہزاد آیا تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد چلیں گے' رکنے کی وجہ بھی بتا دی وہ بولا۔ "ٹھیک ہے' مجھے بلا لیجئے گا۔"

شہزاد چلا گیا تو کچھ ہی دیر میں سنبل ساڑھی وغیرہ لے کر آ گئی۔ میرے سامنے بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہنتے ہوئے وہ شرمانے لگی تو میں نے کہا۔ "میں پیٹھ موڑے لیتی ہوں۔" پھر میں نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس سے پہلے سنبل خود ہی کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر چکی تھی۔

"اب ادھر منہ کر لیجئے۔" کچھ دیر کے بعد سنبل مجھ سے مخاطب ہوئی۔

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے اپنے جسم کا اوپری حصہ

چھپانے کی خاطر ساڑھی کو چادر کی طرح لپیٹ لیا تھا۔

"ادھر دو ساڑھی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پگلی! یہ ساڑھی ہے چادر نہیں۔"

اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی اور پھر نظریں جھکائے جھکائے ہی ساڑھی اتار کر مجھے دیتے ہی میری طرف سے منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

"بہت خوب' اس طرح تو واقعی میں تمہیں ساڑھی باندھنا سکھا سکتی ہوں۔ ارے ادھر منہ کروں" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ "ہاتھ نیچے کرو' میں باجی ہوں تمہاری۔"

پھر بڑی مشکل سے اس نے دھیرے دھیرے اپنے دونوں ہاتھ نیچے کر لئے مگر نظریں نہیں اٹھائیں۔

"ادھر دیکھو!" میں اس سے بولی اور پھر ساڑھی باندھنے لگی۔

وہ مجھے ساڑھی باندھتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ایک بار ساڑھی باندھ کر میں نے کھول دی اور پھر خود اس سے باندھنے کو کہا۔ دو ایک مرتبہ کوشش کر کے وہ آخر ساڑھی باندھنا سیکھ ہی گئی۔ میری توقع کے مطابق ساڑھی میں اس کے حسن کو واقعی چار چاند لگ گئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی' پھر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی تھی۔ میں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"آپ اپنے وعدے کے مطابق ملنے آتی رہیں گی نا باجی!" اس کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

"کیوں نہیں' ضرور آؤں گی۔" میں نے یقین دلایا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے' دہلی میں رہوں اور تم سے ملنے نہ آؤں۔"

پھر دوبارہ مجھے اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہونا پڑا۔ اس نے دوبارہ کپڑے پہن لئے تھے جو اتارے تھے۔

"اچھا اب دروازہ کھول دو اور اپنے بڑے بھائی جان کو بھیج دو۔"

وہ دروازہ کھول کر چلی گئی۔ میرے دونوں سوٹ کیس تیار تھے۔ شہزاد آ گیا تو میں نے اس سے چلنے کو کہا اور ایک سوٹ کیس خود اٹھا لیا۔

"یہ بھی مجھے دے دیجئے۔" اس نے ایک سوٹ کیس اٹھا کر دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں' ایک سوٹ کیس میں اٹھا کر چلوں گی۔" میں نے دوسرا سوٹ کیس اسے دینے سے انکار کر دیا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں خاتون تو یہ کچھ اچھا نہیں لگے گا۔"

"رہنے دو بس۔" میں یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

باہر صحن میں شہزاد کے سبھی گھر والے موجود تھے۔ میں شہزاد کی ماں اور سنبل سے گلے ملی۔ اسی عرصے میں فرہاد نے میرا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ پھر میں نے ارشد علی کو سلام کیا اور جانے کے لئے مڑی۔ فرہاد ہمیں چھوڑنے کے لئے جامع مسجد تک ساتھ آیا۔ ہم وہاں تک پیدل ہی گئے تھے کیوں کہ ٹیکسی وہیں سے

مل سکتی تھی۔

خالی ٹیکسی کے انتظار میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ شہزاد ہی نے آگے بڑھ کر ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی تھی۔ ڈکی میں دونوں سوٹ کیس رکھوا دیئے گئے' پھر ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

"اماں سے کہہ دینا فرہاد کہ واپسی میں مجھے دیر ہو سکتی ہے' میں اپنے ایک دوست کے گھر ہو کر آؤں گا۔" شہزاد نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا۔

"بہتر ہے بھائی جان! کہہ دوں گا۔" فرہاد نے جواب دیا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "خدا حافظ!"

"خدا حافظ!" میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ اسی کے ساتھ ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

نئی دہلی میں ٹیکسی اس فائیو اسٹار ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوئی جس کے لئے شہزاد نے ٹیکسی والے سے کہا تھا۔ ٹیکسی ہوٹل کے دروازے پر رکی تو سامنے ہی کھڑے ہوئے چوکیدار نے جلدی سے آگے بڑھ کر ہمارے لئے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔

"سامان بھی ساتھ ہے۔" شہزاد نے باوردی چوکیدار سے کہا۔

"یس سر!" چوکیدار نے پلٹ کر شیشے کے دروازے کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے کسی کو آنے کا اشارہ کیا۔

میں اس عرصے میں کرایہ ادا کر چکی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے نیچے اتر کر ڈکی کھولی اور یکے بعد دیگرے دونوں سوٹ کیس ڈکی سے نکال کر نیچے رکھ دیئے۔ ہوٹل کا ایک باوردی پورٹر لپکتا ہوا آیا اور سوٹ کیس اٹھا کر ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ اندر استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے ایک سنگل روم کے لئے کہا۔ اس نے ضروری کوائف معلوم کئے اور میرا نام رجسٹر میں لکھتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگا۔ "کتنی دلچسپ بات ہے مس کہ آپ ہی کی ایک ہم نام اسی فلور پر پہلے سے ٹھہری ہوئی ہیں۔ وہ بمبئی سے آئی ہیں۔"

یہ سن کر میں تقریباً اچھل پڑی۔ "بمبئی کی رانی' کہیں یہ وہی جرائم پیشہ عورت رانی تو نہیں جو راجہ استاد مجھے سمجھ بیٹھا تھا؟"

"آپ کا روم نمبر ایک سو پندرہ ہے اور وہ مس رانی ایک سو گیارہ نمبر کے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہیں۔" کاؤنٹر مین نے خود ہی بتا دیا۔ "ہے نا دلچسپ بات۔"

"ہاں واقعی۔" میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر میں نے بطور ایڈوانس مطلوبہ رقم ادا کی اور پورٹر کی رہنمائی میں زینے کی طرف بڑھنے لگی۔ شہزاد میرے ساتھ تھا۔

"کیا ہوا خاتون! آپ کچھ فکرمند سی دکھائی دے رہی ہیں۔" شہزاد میرے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں تو۔" میں زبردستی مسکرائی۔ "خیال ہے تمہارا۔" ظاہر ہے' میرے ذہن میں جن خدشات نے سر ابھارا تھا' میں ان کا اظہار شہزاد سے نہیں کر سکتی تھی۔

ایک سو پندرہ نمبر کمرے کے سامنے پہنچ کر میں نے تالا کھولا اور اندر داخل ہو گئی یہ کمرہ پہلی ہی منزل پر تھا۔ اصل میں تو یہ ہوٹل کا صرف پندرہ نمبر کمرہ تھا مگر فائیو اسٹار ہوٹلوں والے ہر فلور کی گنتی

ایک سو زیادہ سے شروع کرتے ہیں۔ دوسرے فلور پر جو کمرے تھے ان کے نمبر دو سو ایک سے شروع ہوتے تھے۔ ہر فلور کے ساتھ سو کا اضافہ ہو جاتا تھا' تین سو ایک' چار سو ایک وغیرہ۔ پورٹر نے سوٹ کیس رکھ دیئے تو میں نے اسے ٹپ دے کر رخصت کیا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

کمرہ آرام دہ تھا۔ ایک طرف بیڈ پڑا ہوا تھا اور کچھ ہی فاصلے پر تین چار کرسیاں اور ایک چھوٹی میز رکھی ہوئی تھی۔ نیچے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ وارڈ روب اور لکڑی کی ایک الماری بھی کمرے میں گھستے ہی بائیں جانب تھی۔ الماری کے نچلے حصے میں جوتے رکھنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ اسی کے سامنے دائیں جانب باتھ روم کا دروازہ تھا۔ میں نے اٹھ کر اس کا بھی جائزہ لیا۔ ہلکے رنگ کے نیلے ٹائلز فرش اور دیواروں پر کچھ اوپر تک لگے ہوئے تھے۔ باتھ ٹب اور شاور بھی تھا اور اسی کے اوپر دیوار پر بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔ باتھ روم صاف ستھرا تھا۔ دروازہ بند کر کے میں شہزاد کے مقابل کرسی پر آ بیٹھی۔

"کمرہ نمبر تو ظاہر ہے تمہیں یاد رہے گا' کل دوپہر سے ذرا پہلے آ جانا' ساتھ ہی ہوٹل کے ڈائننگ روم میں کھانا کھائیں گے۔" میں نے شہزاد سے کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب میں جاؤں؟" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"تمہاری مرضی ہے' چاہو تو بیٹھو۔" میں بولی۔ میرا ذہن اس وقت الجھا ہوا سا تھا اور اس کی وجہ وہی میری ہم نام تھی۔

"یہ تو میرا گھر نہیں ہے خاتون اور نہ یہاں میرے جوان بھائی بہن ہیں۔" اس کے لہجے کی معنی خیزی برقرار تھی۔

"تو پھر؟" میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"آپ اتنی سنگ دل کیوں ہیں؟"

"فضول باتیں نہ کرو۔"

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا' پھر بولا۔ "کل میرا انتظار نہ کیجئے گا' ممکن ہے میں نہ آ سکوں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ چمپا نے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر میرے حق میں اچھا نہیں کیا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں اسے حقیقت سے آگاہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اگر میں اسے یہ بتاتی بھی کہ اس کا پہلو گرمانے والی میں نہیں کوئی اور عورت تھی تو وہ کبھی میری بات پر یقین نہ کرتا۔

"بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ کل تم کیوں نہیں آؤ گے؟" میرے لہجے میں سختی تھی۔

"مجھے جانے دیں خاتون! اور میرے ضبط کا مزید امتحان نہ لیں۔ میں .... میں پہلے بھی آپ سے کہہ چکا ہوں کہ .... کہ میں انسان ہوں' کھلونا نہیں۔"

"میں کہتی ہوں بیٹھ جاؤ۔" میں پہلے سے بھی سخت آواز میں بولی۔

اس مرتبہ وہ بیٹھ گیا اور منہ پھیر کر اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا' پھر کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے خاتون کہ یہاں دہلی میں آپ کو میری کوئی ضرورت نہیں۔"

"کیا مطلب ہے اس سے تمہارا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میرے اوپر آپ کے بہت احسانات ہیں جو میں کوشش بھی کروں تو نہیں اتار سکتا۔" اس کی آواز اب تک بھرائی ہوئی تھی۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ .... کہ جب آپ کلکتے واپس جائیں گی اور آپ کو میری ضرورت ہو گی تو .... تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ دہلی آ کر مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی؟ آج ہی میں نے تمہارے سپرد ایک کام کیا ہے۔"

"وہ میں کر دوں گا۔ اس کے علاوہ بھی جس کام کے لئے کہیں گی' انکار نہیں کروں گا کیوں کہ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو' ان سب باتوں سے مقصد کیا ہے تمہارا؟"

"آپ کی غلامی سے عارضی طور پر آزادی۔" وہ نظر جھکا کر بولا۔ "نہ میں آپ کے قریب رہوں گا' نہ آپ کو پانے کی تمنا دل میں کروٹیں لے گی۔"

"آزادی نہیں مل سکتی' نہ عارضی طور پر نہ مستقل۔ آئندہ تمہاری زبان پر یہ بات نہیں آنا چاہئے' سمجھ گئے؟" میں نے کہا۔ "اور ادھر نظریں اٹھا کر بات کرو' تمہیں ہر حال میں کل دوپہر کو آنا پڑے گا' میں انکار نہیں سنوں گی۔"

"تو آپ مجھے اپنی مرضی سے نہ جینے دیں گی' نہ زندگی سے مایوس ہونے دیں گی۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں اسی طرح تڑپتا رہوں' قربت کے باوجود ہجر برداشت کروں۔"

"ہاں' میں جو چاہتی ہوں' تمہیں وہی کرنا پڑے گا اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ یہاں دہلی آنے کے باوجود تم بدستور میرے دست راست ہو۔ تمہیں پابندی کے ساتھ جس طرح پہلے تمہاری خدمات کا صلہ ملتا رہا ہے آئندہ بھی ملتا رہے گا۔"

"اگر یہ آپ کا حکم ہے تو مجبوری ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"یہ حکم نہیں' دوستانہ درخواست ہے۔" میں مسکرا دی کیوں کہ اس نے بہت دیر بعد مجھ سے نظریں ملا کر بات کی تھی۔

"لیکن درخواست میں کوئی جبر نہیں ہوتا' یہ آپ بھی جانتی ہوں گی خاتون!"

"کچھ لوگوں سے اسی طرح درخواست کی جاتی ہے اور میرا خیال ہے کہ تم بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل ہو۔"

"ٹھیک ہے' میں کل آپ کے حکم کے مطابق آ جاؤں گا۔"

"درخواست کے مطابق۔" میں نے گویا تصحیح کی۔

"ایک ہی بات ہے۔ آپ کی درخواست میرے لئے حکم ہی کا درجہ رکھتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے اجازت ہے؟"

"اجازت کھڑے ہو کر نہیں لی جاتی' بہرحال جاؤ۔ کل اس طرح سڑا ہوا منہ لے کر مت آنا۔ تم ہنستے مسکراتے اچھے لگتے ہو۔"

وہ چلا گیا تو میں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور لباس تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ دوپہر کو کچھ دیر سونے کے باوجود گزشتہ رات کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لئے میں جلد ہی سو جانا چاہتی تھی۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے میں نے کمرے میں ہلکا نیلا بلب جلا دیا تھا۔

مجھے ابھی بستر پر لیٹے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں چونک اٹھی۔ میں نے سوچا' شہزاد تو ابھی گیا ہے' پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟ میں یہی سوچتی ہوئی اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی ایک اجنبی شخص مجھے دھکا دیتا ہوا زبردستی کمرے میں آ گیا۔ اس کے سر پر ہیٹ تھا اور جسم پر سوٹ۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے حیرت انگیز تیزی سے مڑ کر اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں جب تک سنبھلتی وہ اپنی جیب سے چھوٹا سا خطرناک کھولنا نکال چکا تھا۔

"تمہارا کھیل ختم ہو چکا رانی!" وہ جیسے کسی وحشی درندے کی طرح غرایا۔ "ہیرے میرے حوالے کر دو۔"

"تم شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر اس کمرے میں گھس آئے ہو۔" میں نے پُرسکون آواز میں کہا۔ "تمہیں جس کی تلاش ہے' میں وہ نہیں ہوں۔"

"کیا تم وکٹر کو کوئی بچہ سمجھ رہی ہو کہ تمہارے چہرے پر موجود میک اپ اور بدلی ہوئی آواز سے دھوکا کھا جائے گا۔ سیدھی طرح ہیرے میرے حوالے کر دو ورنہ میرے پاس دوسرا راستہ بھی ہے۔ میں تمہیں گولی مار کر تمہارے کمرے سے ہیرے برآمد کر کے لے جاؤں گا۔ مت بھولو رانی کہ یہ بمبئی نہیں دہلی ہے اور یہاں میرا حکم چلتا ہے۔"

"مائی ڈیئر وکٹر! اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ میرے چہرے پر میک اپ نہیں تو پھر تمہیں میری بات کا یقین آ جائے گا؟" میری آواز اب بھی پُرسکون تھی۔

"میرے ریوالور کی نال تمہاری طرف اٹھی ہوئی ہے جو کسی بھی لمحے میری انگلی کی خفیف سی حرکت پر تمہیں موت کی نیند سلا سکتی ہے۔ اس کے باوجود تم انتہائی پُرسکون دکھائی دے رہی ہو۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ میں صحیح کمرے میں آیا ہوں؟ تم اگر رانی نہ ہوتیں کوئی اور معمولی عورت ہوتیں تو موت کو خود سے اس قدر قریب دیکھ کر اب تک اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ پاتیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنی عادت کے مطابق مجھے باتوں میں لگا کر بچنے کی کوئی تدبیر سوچ رہی ہو مگر میں اس کا موقع نہیں دوں گا۔" یہ کہتے ہی اس نے خطرناک انداز میں اپنے ریوالور کو حرکت دی اور غرایا۔ "میں صرف تین تک گنوں گا اور پھر تمہیں گولی مار دوں گا۔" پھر اس نے گنتی شروع کی۔ "ایک.........."

"ٹھہرو۔" میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "میں تمہیں ایک بات اور بتانا چاہتی ہوں' پھر تم جو چاہو کرنا۔ اسی فلور پر کمرہ نمبر ایک سو گیارہ میں میری ایک ہم نام بھی موجود ہے' جو واقعی بمبئی سے آئی ہے اور یہاں مجھ سے پہلے ٹھہری ہوئی ہے۔ میں تو یہاں آج ہی کچھ دیر پہلے آئی ہوں اور میرا تعلق بمبئی سے نہیں کلکتے سے ہے۔ تم اگر کاؤنٹر پر یہ بھی معلوم کر لیتے تو تمہیں دھوکا نہ ہوتا کہ بمبئی سے آنے والی رانی کے

کمرے کا نمبر کیا ہے۔ جہاں تک تمہاری یہ دلیل ہے کہ میں رانی کی بجائے' میری مراد بمبئی والی رانی ہے' کوئی اور ہوتی تو خوفزدہ ہو جاتی۔ ضروری نہیں کہ ہر عورت بزدل ہی ہو۔ میں آخری بار تم سے کہہ رہی ہوں کہ ریوالور جیب میں رکھ لو ورنہ نتائج کی ذمہ داری تم پر ہو گی۔"

اس کے چہرے سے تذبذب کا اظہار ہونے لگا۔ میری بات نے یقیناً اس پر اثر کیا تھا۔

"تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو' اگر تم واقعی رانی ہو' تمہاری بات جھوٹ نکلی تو وقتی طور پر ہی مجھ سے بچ جاؤ گی۔ پھر میں تمہارا بہت بُرا حشر کروں گا۔ تم دہلی سے زندہ واپس نہیں جا سکو گی۔" کچھ دیر کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کی نظریں اب تک میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تمہیں دوبارہ اس کمرے میں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ویسے میں تمہارے بارے میں اتنا ضرور جان چکی ہوں کہ تم زیادہ ذہین بہرحال نہیں ہو' ورنہ پوری یقین دہانی کے بغیر اس کمرے میں قدم نہیں رکھتے۔" میں بولی۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور جانے کے لئے مڑتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں اس کمرے سے نکل نہ جاؤں تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گی۔ تم اگر بمبئی کی رانی نہیں بھی ہو تو تمہیں گولی مارتے ہوئے میں ذرا بھی نہیں جھجکوں گا۔" یہ کہتے ہی اس نے پوری طرح مڑ کر تیزی کے ساتھ دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

میں نے اس کی ہدایت کے کے مطابق اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ بلا سبب میں اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ طویل عرصے سے میں جس عورت کا کردار ادا کر رہی تھی' وہ دہلی میں ٹکرا جائے گی۔ چند ہی لمحے بعد میں اپنی جگہ سے آگے بڑھی۔ اب میں دروازہ بند کر کے سو جانا چاہتی تھی۔ پھر جیسے ہی میں دروازے کے قریب پہنچی' اچھل پڑی۔ میں نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔ یہ آواز یادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ جواب میں پھر گولی چلی اور میں نے کسی کو اپنے کمرے کے سامنے سے بھاگتے محسوس کیا۔ اس وقت دروازہ کھول کر باہر دیکھنا خطرناک تھا۔ تجسّس کے باوجود میں نے یہ کوشش نہیں کی۔ دوسرے فائر کے بعد پھر کوئی اور فائر نہیں ہوا تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازے کی چٹخنی لگا دی اور پھر بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ یہ ہیروں کی چوری وغیرہ کا چکر تھا جس میں بمبئی کی رانی ملوث تھی۔ وکٹر شاید اس سے وہ ہیرے چھین لینا چاہتا تھا۔

ہو گا کچھ' جہنم میں جائے۔ میں نے سوچا اور سونے کی کوشش کرنے لگی کہ اچانک سرہانے تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے ذرا سا اٹھ کر ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ریسیور اٹھا کر میں نے کہا۔ "ہیلو!"

"تمہیں اس نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟" دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"تم بمبئی کی رانی بول رہی ہو؟" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"پہلے میرے سوال کا جواب دو۔" اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔

"نہیں۔ اسے میں نے یقین دلا دیا تھا کہ وہ غلط کمرے میں آ گیا ہے۔" میں نے بتا دیا۔

"سنو' میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم میرے کمرے میں آنا پسند کرو گی یا میں تمہارے کمرے میں آ جاؤں؟"

"لیکن تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تم کون ہو؟"

"تمہارا اندازہ قطعی درست ہے۔ میں وہی ہوں جو تم سمجھ رہی ہو اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں میرے کمرے کا نمبر بھی معلوم ہے۔"

"اگر میں تم سے ملنا پسند نہ کروں تو؟" میں بولی۔

جواب میں اس کی ہنسی سنائی دی' پھر اس نے کہا۔ "یہ تمہارے بس میں نہیں۔ تم نہ بھی چاہو تو تمہیں مجھ سے ملنا پڑے گا۔"

"کوئی زبردستی ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لو' ویسے تمہارے ہی فائدے کی بات تھی۔ اگر مجھے زبردستی کرنا پڑی تو تم فائدے سے محروم ہو جاؤ گی۔"

میں بلاوجہ اس جرائم پیشہ عورت سے جھگڑا مول لینا نہیں چاہتی تھی اس لئے بولی۔ "ٹھیک ہے' تم آ جاؤ' میں انتظار کر رہی ہوں' مگر یہ نہ سمجھ لینا کہ تم سے میں ڈر گئی ہوں۔"

"مجھے کیا سمجھنا چاہئے کیا نہیں' یہ میں تم سے بہتر جانتی ہوں۔" انہی الفاظ کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں بستر سے اٹھی اور کم پاور کا نیلا بلب بجھا کر دوسرا بلب جلا دیا۔ ذرا ہی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ آنے والے دو افراد تھے۔ ان میں ایک عورت تھی' دوسرا مرد۔ عورت کو بلاشبہ خوبصورت کہا جا سکتا تھا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی' جسم متناسب اور چہرے کے نقوش تیکھے تھے' رنگ گورا تھا۔ وہ پینٹ اور شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ساتھ جو مرد تھا' پچاس سال سے کم کا نہیں لگتا تھا۔ وہ سرمئی سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھا۔ اس کے جبڑے بھاری اور چہرے پر کرختگی تھی' ہونٹ پتلے' آنکھیں چھوٹی۔ مجموعی طور پر وہ کوئی سخت گیر شخص معلوم ہوتا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظریں مجھ سے ملی تھیں تو میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی تھی۔ دروازہ اندر سے اسی نے بند کیا تھا۔ عورت کا قد مجھ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ میں سمجھی تھی کہ وہ اکیلی آئے گی' مگر اپنے ساتھ ایک مرد کو بھی لگا لائی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر بڑی بے تکلفی کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گئی' مگر مرد اس کی کرسی کے قریب کھڑا ہی رہا۔

اخلاقاً میں نے مرد سے کہا۔ "آپ بھی بیٹھ.........."

"نہیں۔" میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ عورت بول اٹھی۔ "رانی کے سامنے بیٹھنے کی جرأت اس میں نہیں ہے' نہ اسے یہ اجازت ہے۔ بہتر یہ ہے لڑکی کہ تم بھی کھڑے ہو کر ہی بات کرو۔" عورت کے لہجے میں غرور تھا۔

"ہرگز نہیں۔" مجھے اس کی بدتمیزی پر غصہ آ گیا۔ "میں تمہاری زرخرید نہیں ہوں کہ تمہارے

سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنی بدتمیز عورت ہو تو ہرگز تمہیں اپنے کمرے میں آنے کی اجازت نہ دیتی۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھی اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرے اور اس کے درمیان اب صرف میز تھی۔

میرے بیٹھتے ہی وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "تیری یہ ہمت۔" وہ چیخ اٹھی۔ پھر اس نے تیزی سے جھپٹ کر میرے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے اور جھٹکا دے کر غرائی۔ "کھڑی ہو جا۔" میں کھڑی تو ہو گئی' مگر میرا کھڑا ہونا اسے بہت مہنگا پڑا۔ میں نے اس کے پہلو پر زوردار ضرب لگائی تھی اور اس نے چیخ کر میرے بال چھوڑ دیئے تھے۔

"اپنے ہاتھ اٹھا لے لڑکی! ورنہ پھونک دوں گا۔" مجھے مرد کی کرخت آواز سنائی دی۔

میں نے اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھا۔ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے اچھل کر اس کی کلائی پر ٹھوکر ماری۔ اسی کے ساتھ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فضا میں اچھلا۔ میں نے لپک کر اسے گرنے سے پہلے کیچ کر لیا۔ پھر میں نے تیزی سے پیچھے ہٹ کر ان دونوں کو نشانے پر رکھ لیا۔

ضرب کھا کر عورت دہری ہو گئی تھی۔ اس دوران وہ سنبھل کر پھر سیدھی کھڑی ہو چکی تھی۔ اب وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" عورت مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"رانی .... اگر تم چاہو تو مجھے بمبئی کی رانی بھی کہہ سکتی ہو۔" میں ہنس دی۔ "کیوں کہ تم جیسی چوہیا بمبئی کی رانی نہیں ہو سکتی۔"

"لڑکی! تم نے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا ہے کہ میرے سامنے بیٹھ سکو۔ ریوالور ڈیوڈ کو واپس کر دو' میں تم سے صلح کرنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے کام کی معلوم ہوتی ہو۔"

میں نے ریوالور کی گولیاں نکال کر ایک طرف پھینک دیں اور پھر ریوالور ڈیوڈ کی طرف اچھال دیا۔ ڈیوڈ نے ریوالور لپک کر جیب میں رکھ لیا۔ میں آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ عورت نے بھی بیٹھنے میں دیر نہیں کی تھی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی پھرتیلی اور بہادر ثابت ہو گی۔ میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا پھر بولی۔ "یہ ہیروں کا کیا چکر ہے؟"

میرا سوال سن کر وہ چونک اٹھی' پھر طویل سانس لے کر کہا۔ "تو تمہیں بھی معلوم ہو گیا؟"

"ہاں' وکٹر مجھ سے ہیروں ہی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میرے چہرے پر میک اپ ہے اور میں آواز بدل کر بول رہی ہوں۔"

"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا' پھر بتانے لگی۔ "ان ہیروں کا تعلق ایک ہندوستانی ریاست سے ہے۔ جس ریاست کے نواب کے وہ ہیرے ہیں اس کی ایک کوٹھی یہاں دہلی میں بھی ہے۔ عیاش نواب اپنے خاندانی ہیرے بیچنے کے لئے یہاں ساتھ لایا تھا۔ میں ان ہیروں کو حاصل کرنا چاہتی تھی جن کی مالیت بیس

لاکھ سے زیادہ ہے۔ میرا طریقہ کار ذرا مختلف ہے۔ میں عموماً اپنے شکار پر براہ راست ہاتھ ڈالنے سے گر کرتی ہوں۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ میں اپنے ساتھ صرف چند افراد کو رکھتی ہوں۔ میں نے ا سبب وکٹر کو اپنے ایک آدمی کے ذریعے ہیروں کے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم کر دیں۔ پھر جب وکٹر ہیرے چرانے میں کامیاب ہو گیا تو میں نے اس سے ہیرے چھین لئے۔ وہ دہلی کا ایک بڑا گروہ ب بد معاش ہے۔ اب وہ مجھ سے دوبارہ ہیرے حاصل کرنا چاہتا ہے۔" اس نے تفصیل کے ساتھ مجھے س کچھ بتا دیا۔

"پھر تم یہاں سے فرار کیوں نہیں ہو جاتیں؟ ہیرے تو تمہارے قبضے میں آ ہی چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ ہیرے اصلی نہیں ہیں۔" اس نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب، پھر اصلی ہیرے کہاں ہیں؟" میں چونک کر بولی۔

"قیاس یہی ہے کہ نواب نے اصلی ہیرے چوری کے خطرے کی وجہ سے اپنی کوٹھی میں نہی رکھے ہوں گے۔"

"کیا خبر کہ نواب اصلی ہیرے اپنے ساتھ ہی نہ لے کے آیا ہو۔" میں نے قیاس آرائی کی۔

"نہیں، یہ تصدیق ہو چکی ہے کہ وہ ہیرے ساتھ ہی لے کر آیا تھا۔ امکان ہے کہ نواب نے د آنے کے بعد اصلی ہیرے اپنے کسی قریبی دوست کے پاس رکھوا دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں میرے دو آد ضروری معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ پتا چلا ہے کہ دہلی میں نواب کی دو رکھیل بھی ہیں۔ ممکن ہے نوا نے ان میں سے کسی کو ہیرے دے دیئے ہوں۔ بہرحال .... نواب کے دوستوں کی فہرست بھی طو ہے۔ ضروری معلومات حاصل کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔"

"تو پھر تم نقلی ہیرے وکٹر کے حوالے کیوں نہیں کر دیتیں؟ اس طرح وکٹر سے تو تمہاری جا چھوٹ ہی جائے گی۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔

"صرف وقتی طور پر۔" وہ مسکرائی۔ "پھر جب وکٹر کو حقیقت کا علم ہو گا تو وہ یہی سمجھے گا کہ نے اصلی ہیرے غائب کر کے نقلی ہیرے اس کے حوالے کر دیئے ہیں۔"

"تم اپنے اصلی نام سے اس ہوٹل میں کیوں ٹھہری ہو؟ اس طرح تو تمہارا دشمن با آسانی تمہ تلاش کر سکتا ہے۔"

"میں اگر فرضی نام سے بھی کسی ہوٹل میں ٹھہری ہوتی تو وکٹر مجھے تلاش کر ہی لیتا۔" اس جواب دیا۔

"لیکن چہرے کی تبدیلی کے بعد تو تلاش کرنا آسان نہ ہو گا؟"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب میک اپ سے تھا۔" میں نے بتایا۔

"مجھے معلوم تو ہے کہ میک اپ کے ذریعے چہرہ تبدیل کیا جا سکتا ہے، مگر یہ فن مجھے نہیں آتا۔

ں ایسے کسی آدمی سے واقف ہوں جو اس فن میں طاق ہو۔" اس نے صاف گوئی سے اعتراف کر لیا۔ ر میرے لئے یہ ممکن ہوتا تو یقیناً ایسا ہی کرتی۔ پھر شاید مجھے وکٹر کی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہوتا۔"

"تمہارا یہ مسئلہ میں حل کر سکتی ہوں۔" میں مسکرائی۔

"نہیں۔" اسے جیسے میری بات پر یقین نہیں آیا۔

"سنو، آج ہی رات بمبئی کی رانی یہ ہوٹل چھوڑ کر چلی جائے گی اور پھر چہرے کی تبدیلی کے بعد نام ل کر دوبارہ اسی ہوٹل میں کوئی کمرہ حاصل کر کے رہنے لگے گی۔"

"کیا .... کیا ایسا ممکن ہے؟" اس کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔

"بالکل ممکن ہے۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم کس لئے مجھ سے ملنے آئی یں؟"

"میں تمہیں بطور چارہ استعمال کرنا چاہتی تھی۔"

"یعنی؟"

"میں تمہیں رقم کا لالچ دے کر یا زبردستی ڈرا دھمکا کر کمرہ بدلنے پر مجبور کرتی کہ تم یہ رات میرے رے میں گزارو اور میں یہاں رہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ کس لئے؟"

"اس طرح میں، وکٹر کو ٹھکانے لگانا چاہتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خاموش نہیں بیٹھے گا اور آج ت کسی بھی وقت مجھ پر دوبارہ حملہ کرے گا۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ جب وہ میرے کمرے پر یلغار کرتا تو اسے پیچھے سے بھون کر رکھ دیتی۔ اس وقت بھی میں اپنے کمرے میں نہیں، ڈیوڈ کے کمرے میں تھی۔ ارے کمرے میں اسے داخل ہوتے اور پھر کچھ دیر بعد نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہاں سے وہ میرے رے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میں نے اس پر گولی چلا دی۔ وہ یقیناً بلٹ پروف پہنے ہوئے تھا اس لئے بچ یا ورنہ میرا نشانہ بہت سچا ہے۔ اگر بلٹ پروف جیکٹ اس کے جسم پر نہ ہوتی تو میری چلائی ہوئی گولی کے دل میں اتر چکی ہوتی۔ سر پر بھی وہ اسی لئے ہر وقت ہیٹ پہنے رہتا ہے کہ ہیٹ بھی بلٹ پروف ہے۔"

"لیکن تم اس کے چہرے پر گولی مارتیں تو یقیناً وہ نہ بچ پاتا۔" میں بولی۔ "جواب میں اس نے بھی لی چلائی ہو گی کیوں کہ میں نے دو گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔"

"ہاں، اس نے بھی ایک جوابی فائر کیا تھا۔"

"حیرت ہے کہ ہوٹل کی انتظامیہ نے گولی چلنے کے باوجود کسی قسم کی تفتیش نہیں کی۔" میں نے ا۔

"بھاگ دوڑ تو کی تھی ان لوگوں نے۔" اس نے بتایا۔ "مگر جن کمروں میں نیلے بلب جل رہے ے، ان کے مسافروں کو انہوں نے جگا کر پوچھ گچھ نہیں کی۔ تمہارے کمرے میں بھی شاید نیلا بلب جل ا ہو گا۔ شاید اسی وجہ سے تمہیں نہیں جگایا گیا۔"

"مگر دروازہ اندر سے بند ہونے کی صورت میں ان لوگوں کو کس طرح معلوم ہو سکتا ہے، کہ
میں کون سا بلب جل رہا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"بہت آسان ہے۔ راہداری کی لائٹ بند کر کے باآسانی یہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے
ہی کیا تھا کیوں کہ جب میں ڈیوڈ کے کمرے سے اپنے کمرے میں جا رہی تھی تو لوگ راہداری میں م
تھے اور وہاں لائٹ نہیں تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔"

میں سمجھ گئی کہ باہر اندھیرا ہونے کی صورت میں دروازے کے نچلے حصے کی جھری سے نکلتی
روشنی کو دیکھ کر ہوٹل والوں کے لئے یہ جاننا مشکل نہیں رہا ہو گا کہ کس کمرے میں نیلا بلب جل
ہے۔ مجھ سے غالباً اسی لئے پوچھ گچھ نہیں کی گئی تھی۔

وہ ایک جرائم پیشہ عورت تھی، اس کے باوجود میں شاید اس سے ایک تعلق کے سبب اس کی
کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر میک اپ کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اس کے بو
اپنے ساتھی کو لے کر چلی گئی۔ اس نے میری تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رانی کی حیثیت سے
ہوٹل چھوڑ رہی تھی۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ رانی نے ساڑھے دس اور گیارہ بجے
سے تنہا ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ڈیوڈ بدستور اپنے کمرے میں رہتا۔ رانی نے اس کے ہوٹل چھوڑنے یا چ
کی تبدیلی ضروری نہیں سمجھی تھی۔ موجودہ صورت حال میں میرے لئے صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ میں
نہیں سو سکی تھی۔

وعدے کے مطابق رانی ٹھیک ساڑھے دس بجے میرے کمرے میں پہنچ گئی۔ میں اس کی آمد
پہلے میک اپ بکس نکال چکی تھی۔

"بڑھیا بنو گی یا جوان؟" میں نے رانی سے مسکرا کر پوچھا اور میک اپ بکس کھولنے لگی۔

"جو چاہے بنا دو، اب تو تمہارے قابو میں ہوں۔" اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"تم بدصورت بڑھیا اچھی نہیں لگو گی اس لئے تمہیں مزید خوبصورت اور جوان بنائے دیتی
اور ہاں تم پینٹ شرٹ نہیں پہنو گی۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے ایک طرح سے یہ بھی تمہاری پہچان ہی معلوم ہوتی ہے۔ تم کوئی ساڑھی
لینا۔" میں نے مشورہ دیا۔

"مگر پینٹ شرٹ کے سوا تو میرے پاس کوئی اور لباس ہے ہی نہیں۔ ساڑھی میں نے کبھی با
ہی نہیں، نہ باندھنا آتی ہے۔"

"چلو تمہاری خاطر ایک ساڑھی کی قربانی ہی سہی۔" میں ہنس پڑی۔ "مگر صرف کل تک کے
ادھار دوں گی۔ کل تم بازار سے دو ایک ساڑھیاں خرید لینا۔"

"بلاؤز اور پیٹی کوٹ؟"

"وہ سلنے کو دے دینا، ارجنٹ۔ جب تمہارے بلاؤز اور پیٹی کوٹ سل کر آ جائیں تو میرے وا

"پھر میں اس کے چہرے پر طبع آزمائی کرنے لگی جس میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی کیوں کہ میں نے
استعمال کیا تھا جس سے سنہرے بالوں کی ایک وگ بھی منسلک تھی۔ اس میک اپ کے بعد رانی کی
شمارہ بیس سال سے زیادہ نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آخری تنقیدی نظر ڈال کر میں نے
آئینہ تھما دیا۔

"حیرت انگیز!" وہ خوشی سے تقریباً چیخ اٹھی۔ "تم تو جادوگرنی ہو۔"

میں اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا سوٹ کیس کھول کر ایک ساڑھی، بلاؤز اور پیٹی کوٹ نکال کر اسے دے
"باتھ روم میں جاؤ اور پیٹی کوٹ، بلاؤز پہن کر باہر آ جاؤ۔ ساڑھی میں باندھنا سکھا دوں گی۔" میں

رانی پیٹی کوٹ اور بلاؤز لے کر باتھ روم میں گھس گئی اور نکلی تو پیٹی کوٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے
میں نے پیازی رنگ کی ساڑھی باندھ دی۔ اسی روز یہ دوسرا موقع تھا کہ میں کسی کو ساڑھی باندھنا
رہی تھی۔ بلاؤز کچھ تنگ تھا، مگر وقتی طور پر کام چل سکتا تھا۔ دو چار مرتبہ کی کوشش میں اس نے
ی باندھنا سیکھ لیا۔

"یہ تو بڑا جھنجھٹ ہے۔ اسے باندھ کر تو ضرورت پڑنے پر ٹھیک طرح سے ہاتھ پیر بھی نہیں
ے جا سکتے۔" وہ آخری مرتبہ ساڑھی باندھتے ہوئے بولی۔

"خیال ہے تمہارا، تم نے مجھے نہیں دیکھا، کس طرح ہاتھ پیر چلا کر تمہیں اور ڈیوڈ کو بے بس کر دیا

"تمہیں عادت ہو گی۔"

"تمہیں بھی عادت ہو جائے گی۔"

"اس میں ایک اور مسئلہ بھی ہے۔ بلٹ پروف جیکٹ نہیں پہنی جا سکتی جو شرٹ کے نیچے پہننا بہت
ا ہوتا ہے۔"

"تو کیا اس وقت بھی تم بلٹ پروف جیکٹ پہنے ہوئے تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، یہ رہی۔" اس نے جیکٹ اٹھا کر مجھے دکھائی۔

پہلی بار میں نے بلٹ پروف جیکٹ دیکھی اور اس سے بولی۔ "تمہارے پاس اور کوئی جیکٹ ایسی
"

"ہاں، ایک اور ہے۔ کیوں؟"

"تو پھر بطور تحفہ یہ مجھے دے دو، ساڑھی تمہاری۔" میں مسکرائی۔

"لے لو، پھر بھی ساڑھی کل واپس کر دوں گی۔ جیکٹ کو ساڑھی کا کرایہ سمجھ لو۔" یہ کہہ کر وہ
لی۔

"تمہیں معلوم ہے رانی! تم بہت دور دور تک مشہور ہو۔ میں نے کلکتے میں تمہارا نام سنا تھا۔" میں
سے بتایا۔

"ہاں، مجھے خبر ہے، میں بہت بدنام ہوں۔" وہ بدستور ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ "میں کلکتے بھی جا چکی ہوں۔"

"اب جاؤ گی تو تمہیں اپنے بارے میں ایک نئی بات معلوم ہوگی۔"

"وہ کیا بھئی؟" اس نے میری بات میں دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

پھر میں نے اسے بتا ہی دیا کہ کلکتے میں اس کا کردار ادا کر چکی ہوں اور یہ کردار ادا کرنے میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔

"لیکن تم رانی نہیں ہو تو پھر کون ہو؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"یہ ایک ایسی راز کی بات ہے جو صرف چند لوگوں کو معلوم ہے۔"

"کیا ان چند لوگوں میں مَیں شامل نہیں ہو سکتی؟"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں نے اگر تمہیں اپنا نام بتا بھی دیا تو اپنے بارے میں اور نہیں بتا سکوں گی۔"

"اتنی رازداری کی وجہ؟"

"اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خود میں بھی اپنے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔"

"تم بہت عجیب اور پُراسرار ہو۔ بہرحال تم سے دوستی کر کے مجھے خوشی ہوئی۔ تمہارے متعلق اندازہ تو خیر میں بھی لگا چکی ہوں کہ تم یقیناً بہت پہنچی ہوئی ہو۔"

"اچھا، اب تم مجھ سے یہ ماسک اتارنا اور پہننا بھی سیکھ لو کہ میری محتاج نہ رہو۔" پھر میں احتیاط کے ساتھ ماسک اور وگ اتارنا اور پہننا سکھانے لگی۔

"میں نے آج تک کسی کو اپنا استاد تسلیم نہیں کیا، مگر تمہیں اپنی استاد مانے لیتی ہوں۔"

"نہ بھی مانتیں تو میں تمہارا کیا بگاڑ لیتی۔" میں ہنسی اور وہ بھی میرا ساتھ دینے لگی۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ "تم جس کمرے میں ٹھہرو، مجھے کل صبح بتا دینا۔"

"میں تمہیں آج ہی فون کر کے بتا دوں گی۔ میری کوشش ہوگی کہ اسی فلور پر کوئی روم مل جائے کیوں کہ ڈیوڈ بھی اسی فلور پر ہے اور تم بھی یہیں ہو۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

رانی چلی گئی تو میں نے دروازہ بند کرنے کے بعد بلٹ پروف جیکٹ سنبھال کر اپنے ایک بریف کیس میں رکھ دی۔ رانی سے دوستی میرے لئے سودمند ہی ثابت ہوئی تھی۔ میرے وہم و گمان میں آج سے پہلے یہ بات نہیں تھی کہ کلکتے میں طویل عرصے مَیں نے جس جرائم پیشہ عورت کا کردار ادا کیا وہ کبھی میری دوست بھی بن جائے گی۔

نیلا بلب جلا کر میں سونے کے لئے لیٹ گئی۔ مجھے اب رانی کے فون ہی کا انتظار تھا۔ اس نے کر کے کمرہ نمبر بتانے کو کہا تھا۔ وہ فون کرتی تو دوبارہ میری آنکھ کھل جاتی اسی لئے میں سونے سے گریز کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد رانی کا فون آ گیا۔ اس نے میرے برابر والا کمرہ ہی بک کرا لیا تھا۔ کمرہ نمبر ایک سو سولہ تھا اور نیا فرضی نام کنول۔

☆======☆======☆

معلوم نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ جب سوتے سوتے پے در پے کئی دھماکوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ پھر فائرنگ کا سلسلہ کچھ دیر جاری رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دو جانب سے فائرنگ کی جا رہی ہو۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ ذرا توقف کے بعد میں اٹھی اور ٹیلی فون کا ریسیور تھام کر آپریٹر سے کمرہ نمبر ایک سو سولہ سے رابطہ قائم کرنے کو کہا۔

دوسری جانب مسلسل گھنٹی بجتی رہی، مگر کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ رانی یقیناً اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ وہ کہاں جا سکتی ہے؟ میں نے سوچا۔ پھر میرے ذہن میں یہ اندیشے پیدا ہونے لگے کہ کہیں رانی کو فائرنگ میں کوئی نقصان تو نہیں پہنچ گیا؟ اگر وہ زخمی ہو جاتی تو ظاہر ہے، اسے ہسپتال بھیج دیا جاتا۔ یہ تو طے تھا کہ جو فائرنگ ہوئی تھی اس کا تعلق رانی اور وکٹر ہی سے تھا۔ رانی مجھے بتا چکی تھی کہ وکٹر آج رات ضرور دوبارہ حملہ کرے گا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ جب رانی اپنا کمرہ چھوڑ چکی تھی اور اس کی شخصیت بھی بدل گئی تھی تو پھر وکٹر نے اسے کس طرح تلاش کرا لیا؟ کمرے میں رانی کی غیر موجودگی ہی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ حالیہ ہنگامے میں ملوث رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے راہداری میں غیر معمولی نقل و حرکت سنائی دینے لگی جیسے بہت سے لوگ آ جا رہے ہوں۔ میں بستر سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے واپس جا کر ریسیور اٹھا لیا۔

"تم جاگ رہی ہو؟" یہ رانی کی آواز تھی۔

"ہاں، مگر تم کہاں تھیں؟ میں نے کچھ دیر پہلے تمہیں فون کیا تھا۔"

"میں کمرے میں نہیں تھی۔" اس نے بتایا۔

"وکٹر ہی تھا وہ؟" میں نے تفصیل سے دانستہ گریز کیا۔

"ہاں۔" اس نے مختصراً جواب دیا، پھر بولی۔ "باہر آ جاؤ، پھر بات کریں گے۔"

"کیا ہے باہر؟ لگ رہا ہے بہت سے لوگ جمع ہوں۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ باہر پولیس آ چکی ہے۔"

"اچھا میں آ رہی ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

میں اپنے کمرے کے دروازے سے نکلی تو راہداری میں بہت سے لوگوں کو دیکھا۔ ان میں وہاں قیام کرنے والے بھی تھے، ہوٹل سے متعلق افراد بھی اور پولیس والے بھی۔ کمرہ نمبر ایک سو گیارہ کے مقابل کا کمرہ تھا زیادہ لوگ اسی کے سامنے جمع تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس کے سامنے دو پولیس والے مستعد کھڑے تھے اور لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔

میں اس طرف متوجہ تھی کہ کمرہ نمبر ایک سو سولہ کا دروازہ کھلا اور رانی ساڑھی سنبھالتی ہوئی باہر آتی دکھائی دی۔ وہ میرے قریب ہی آ کر کھڑی ہو گئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "ہیلو رانی!"

"کیسی ہو کنول؟" میں نے اسے فرضی نام سے پکارا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ مسکرائی۔ "آؤ اس طرف چلتے ہیں۔" اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

میں اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ وہاں آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے تجسس کے سبب اس کے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "ہاں اب بتاؤ' کیا ہوا تھا؟"

"توقع کے مطابق وکٹر ہی نے حملہ کیا تھا۔" رانی بتانے لگی۔ "وہ شاید نیچے یہ معلوم کر چکا تھا کہ میں ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہوں۔ اس کا اندازہ میں نے اس طرح لگایا کہ وکٹر نے کمرہ نمبر ایک سو گیارہ کا رخ نہیں کیا تھا۔ میں اسی کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس نے ڈیوڈ کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ ڈیوڈ نے دروازہ نہیں کھولا تو اس کے آدمیوں نے دروازے پر گولیاں برسا دیں۔ وکٹر اس مرتبہ اکیلا نہیں تھا' اس کے کئی آدمی تھے۔ میں اپنے دروازے کی جھری سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وکٹر یقیناً ڈیوڈ سے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہو گا اور اسی لئے..........."

"تمہیں بھی تو پہلے سے اندازہ ہو گا کہ وکٹر' ڈیوڈ تک بھی پہنچ سکتا ہے!" میں بول اٹھی۔ "تم اس کے چہرے پر بھی مجھ سے میک اپ کرا سکتی تھی!"

"اگر میں ایسا کرتی تو پھر ڈیوڈ کو چارے کے طور پر کیسے استعمال کر سکتی! بہرحال مجھے افسوس ہے کہ وہ مارا گیا۔"

"کیا ڈیوڈ کو تم نے بتا دیا تھا کہ اسی ہوٹل کے اس فلور پر تمہارا کمرہ نمبر کیا ہے اور کس نئے نام سے ٹھہری ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"تم مجھے پاگل سمجھتی ہو گیا؟"

"کیوں' اس میں بھلا پاگل سمجھنے کی کیا بات ہے؟"

"دیکھو' آدمی بہرحال آدمی ہوتا ہے۔ اپنی جان بچانے کے لئے وہ دوسرے کی جان داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کرتا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب وکٹر کو پتا چلے گا' میں ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہوں تو وہ ڈیوڈ کی زبان کھلوانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ یہ جاننے کے باوجود بھی اس اگر ڈیوڈ کو اپنا نیا کمرہ نمبر اور نیا فرضی نام بتا دیتی تو یہ میرا پاگل پن ہی ہوتا۔"

"خیر!........... تو یہ بتا رہی تھیں کہ وکٹر کو ڈیوڈ کے کمرے کا دروازہ کھلوانے کی کوشش کرتے ہوئے تم دیکھ رہی تھیں۔ پھر؟" میں نے بقیہ تفصیل جاننا چاہی۔

"یہ دیکھ کر میں نے اس پر فائر کھول دیا۔ اس وقت تک اس کے آدمی' ڈیوڈ کے کمرے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو چکے تھے۔ پیچھے سے ان پر فائر ہوا تو انہوں نے بھی جوابی فائرنگ کی۔ ڈیوڈ کے کمرے میں گھس کر وہ مجھ پر فائر کر رہے تھے۔ زخمی وکٹر کو انہوں نے کمرے کے اندر گھسیٹ لیا تھا۔ میں نے گولی کھا کر اسے گرتے دیکھا تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کی دائیں پنڈلی میں لگی تھی اور میں نے اسے گرانے کے لیے پنڈلی ہی کا نشانہ لیا تھا۔ وہ کچھ اس طرح اپنے آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا کہ اس کی گردن یا چہرے کا نشانہ نہیں لے سکی تھی۔ بہرحال مجھے یہ رنج ہے کہ وکٹر کو قتل نہیں کر سکی۔ پھر میں نے ڈیوڈ کی چیخ سنی۔ اندازہ ہے کہ انہوں نے ڈیوڈ سے میرے متعلق پوچھا ہو گا اور کچھ معلوم نہ ہونے

پر اسے گولی مار دی ہو گی۔ اس کے بعد وہ رکے نہیں تھے اور فائرنگ کرتے ہوئے بھاگ گئے تھے۔ میں نے انہیں ڈیوڈ کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر ہی اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ زیادہ تعداد میں ہونے کا فائدہ اٹھا کر کہیں بھرا مار کر میرے کمرے میں نہ آ گھسیں۔"

"پھر تو انہوں نے یقیناً یہ دیکھ لیا ہو گا کہ ان پر کس کمرے سے فائرنگ کی گئی ہے؟" میں بولی۔

"ظاہر ہے' ہر کمرے کے دروازے پر پیتل کے نمبر موجود ہیں۔ تم جس خطرے کی طرف اشارہ کر رہی ہو' میں اس کے متعلق پہلے ہی سوچ چکی ہوں۔ پولیس چلی جائے تو میں کمرہ تبدیل کر لوں گی۔ میں اس سلسلے میں ہوٹل کے مینجر سے بات کر چکی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں دوسری منزل پر کمرے بک کرائے لیتے ہیں۔ موجودہ حالات میں تمہارا بھی یہاں رہنا مجھے مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ کیا کہتی ہو؟" اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں بھی اگر نام اور چہرہ تبدیل کر لوں تو کیسا رہے؟ کیوں کہ وکٹر مجھے دیکھ چکا ہے۔ پھر یہ کمرہ تبدیل کرنے کے باوجود نام تو بہرحال مجھے یہی لکھانا پڑے گا۔"

پھر میرے اور رانی کے درمیان یہی طے ہوا کہ ہم دونوں ہی اپنے اپنے کمرے چھوڑ کر دوسری منزل پر کمرے بک کرا لیں گے۔ اس وقت ہوٹل میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اپنے کمرے میں آ کر چہرے پر ماسک چڑھا لیا اور وگ بھی لگا لی۔ پھر میں بہت تیزی کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور سوٹ کیس اٹھائے سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔ اس وقت کاؤنٹر پر کوئی موجود نہیں تھا۔ میں اسی لئے سامنے پڑے ہوئے صوفوں پر بیٹھ گئی۔

ذرا ہی دیر کے بعد اوپر سے پولیس والے ڈیوڈ کی لاش لے کر اترے اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ لاش ایک اسٹریچر پر تھی۔ ضروری خانہ پری شاید وہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ کاؤنٹر اب خالی نہیں تھا۔ میں اپنے سوٹ کیس وہیں چھوڑ کر کاؤنٹر پر پہنچی۔

میں نے اپنا نیا نام ساوتری بتایا اور دوسری منزل پر کمرہ نمبر دو سو دو مجھے مل گیا۔ میں نے خود ہی دوسری منزل پر کمرہ لینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں ابھی کاؤنٹر سے ہٹی نہیں تھی کہ کنول' یعنی رانی وہاں آ گئی۔

"پلیز! کسی پورٹر کا بندوبست کر دیجئے جو میرا سامان کمرے تک پہنچا دے۔" میں نے کاؤنٹر مین کو دانستہ مخاطب کیا تاکہ رانی میری آواز سن کر مجھے پہچان لے پھر میں نے رانی کو اپنا کمرہ نمبر بتانے کی خاطر چابی کی طرف دیکھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "دو سو دو۔"

"جی ہاں' آپ کے کمرے کا نمبر یہی ہے مس ساوتری! آپ تشریف رکھئے' میں ابھی پورٹر کو بلاتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کوئی بٹن دبایا اور پھر رانی سے مخاطب ہوا۔ "جی؟"

"میں نے کمرہ تبدیل کرنے کے لئے آپ کے مینجر صاحب سے بات کر لی ہے۔" رانی کہنے لگی۔ "میں فرسٹ فلور پر روم نمبر ایک سو سولہ..........."

"جی' وہ مجھے بتا چکے ہیں۔ جسٹ اے منٹ۔" اس نے اپنے سامنے رکھا ہوا رجسٹر کھول لیا۔

میں سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ رانی کو مجھے جو بتانا تھا' بتا چکی تھی۔ پورٹر آ گیا تو اسے کاؤنٹر مین نے میرے پاس بھیج دیا۔ میں اس کے ساتھ دوسری منزل پر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے ٹپ دے کر رخصت کرنے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور بستر کی طرف چل دی۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ میں نے جلدی میں لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا اس لئے بستر پر لیٹنے سے پہلے لباس تبدیل کرنا ضروری نہیں تھا۔ آج کی رات بھی خلاف توقع سکون سے نہیں گزری تھی۔ دہلی میں یہ میری دوسری ہنگامہ خیز رات تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ رانی کچھ ہی دیر کے بعد مجھ سے رابطہ قائم کر کے اپنا نیا کمرہ نمبر ضرور بتائے گی اور اس کے لئے مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ فون کرنے کی بجائے خود ہی چلی آئی تھی۔

"ایک بار پھر میں تمہاری پڑوسی بن چکی ہوں مس رانی عرف سادتری!" وہ کمرے میں داخل ہو کر ہنستے ہوئے بتانے لگی۔ "میرے کمرے کا نمبر اب دو سو تین ہے۔"

میں نے دروازہ بند کرنا چاہا تو اس نے روک دیا۔ میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کھلا رہنے دو کیوں کہ میں کافی کا آرڈر دے کر آئی ہوں' خواہ مخواہ تمہیں اٹھ کر ویٹر کے لئے دروازہ کھولنا پڑے گا۔" اس نے دروازہ بند نہ کرنے کی وجہ بتائی اور پھر آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اپنا کمرہ نمبر بتانے کا شکریہ۔" وہ مسکرائی۔ "میں اس لئے چلی آئی تھی کہ کچھ دیر تم سے گپ لڑا لوں' پھر سوؤں گی۔"

"اچھا کیا۔" میں نے اخلاقاً کہہ دیا ورنہ تو میرا ارادہ سونے کا تھا۔

"تم کلکتے سے کب آئیں؟" اس نے سوال کیا۔

"کل آئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر کل سے اب تک' میرا مطلب ہے کہ اس ہوٹل میں آنے سے پہلے کہاں رہیں؟"

"پرانی دلی میں ایک جگہ۔" میں نے بتا دیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"وہاں کلکتے میں کیا کرتی تھیں؟"

"اگر میں اس سوال کا جواب دے دوں تو تم اگلا سوال یہ کرو گی کہ میں یہاں دہلی کیوں آئی ہوں؟"

"چلو یہی سہی' دونوں سوالوں کا جواب ایک ساتھ ہی دے دو۔" وہ مسکرائی۔

"میں دونوں سوالوں میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دوں گی۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ ان دونوں باتوں کا تعلق میری ذات کے اسرار سے ہے۔"

"اچھا یہی بتا دو کہ تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟ تم بنگال کی تو نہیں لگتیں۔"

اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے بلند آواز میں کہا۔ "دروازہ کھلا ہوا ہے' آ جاؤ۔"

آنے والا توقع کے مطابق ویٹر ہی تھا۔ وہ ایک ٹرے میں کافی کے مگ رکھ گیا۔

"برتن صبح لے جانا .... ہاں بل چاہو تو ابھی لے جا سکتے ہو۔" میں نے ویٹر سے کہا اور پھر اپنا پرس اٹھا کر کافی کی مطلوبہ قیمت ادا کر دی۔ ویٹر نے بل بنوا کر لانے کو کہا تھا' مگر میں نے منع کر دیا اور وہ چلا گیا۔

"ہاں' تو میں نے تم سے یہ پوچھا تھا کہ تمہارا تعلق..........."

"تمہیں میرے متعلق کچھ جاننے کی اتنی دلچسپی کیوں ہے؟" میں اس کی بات کاٹ کر بولی اور کافی کا مگ اٹھا لیا۔

"میں دراصل یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں اپنا شریک کار یا یوں کہہ لو کہ بزنس پارٹنر بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔" اس نے صاف گوئی سے بتا دیا۔

"رانی! اگر تمہارے دل میں ایسی کوئی بات ہے تو تمہیں مایوسی ہو گی۔"

"کیوں' کیا تم بالکل تنہا کام کرنے کی عادی ہو؟" اس نے کافی کا مگ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو' میں تمہاری ہم پیشہ نہیں ہوں۔"

"تمہاری اس بات پر مجھے یقین نہیں آ رہا' وجہ تم سمجھ سکتی ہو۔ تم بہرحال کوئی معمولی عورت نہیں ہو۔"

"ہاں تمہاری دوسری بات کسی حد تک درست ہو سکتی ہے لیکن اس کا سبب میرا جرائم پیشہ ہونا نہیں۔"

"تم مجھے یہ بھی بتا چکی ہو کہ کلکتے میں بمبئی کی رانی بھی بن چکی ہو۔ اگر تم میری ہم پیشہ نہیں تو تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ خود میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے اپنی اصل شخصیت پر پردہ ڈالنے کے لئے کسی نام کی ضرورت تھی۔ پھر ایک جرائم پیشہ شخص نے خود ہی مجھے بمبئی کی رانی سمجھ لیا اور میں نے انکار نہیں کیا۔ اسے تم میری مجبوری یا میرے حالات کا تقاضا بھی سمجھ سکتی ہو۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔"

"قطعی نہیں۔" میں نے واضح طور پر انکار کر دیا۔

"اگر مجھے کسی سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت پیش آئے تو کیا میری مدد کرو گی؟"

"اس کا تعلق مدد کی نوعیت سے ہے۔ میں تمہاری کسی بھی مجرمانہ سرگرمی میں تمہاری مدد نہیں کروں گی۔"

"اگر میں ہیروں کے سلسلے میں تمہاری مدد چاہوں اور آدھے ہیرے' یعنی تقریباً دس لاکھ روپے کے ہیرے تمہیں دینے کی پیشکش کروں تو کیا تم میری پیشکش قبول کر لو گی؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ابھی واضح طور پر تمہیں بتا چکی ہوں کہ تمہاری کسی بھی مجرمانہ سرگرمی کا حصہ نہیں بنوں گی۔ ایسی صورت میں تمہاری پیشکش کیسے قبول کر سکتی ہوں۔"

"پھر تو میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ تمہیں میری دوستی منظور نہیں۔" اس کے لہجے سے مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"دوستی سے اس بات کا کوئی تعلق نہیں۔ دوستی بے غرض بھی تو ہوتی ہے۔ بولو' کیا نہیں ہوتی؟"

"مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"تو اب ہو جائے گا۔" میں نے مسکرا کر کہا اور کافی کے گھونٹ لینے لگی۔

"تمہارا ارادہ کب تک دہلی میں رہنے کا ہے؟" اس نے معلوم کیا۔

"فی الحال کوئی اندازہ نہیں۔ ہاں تمہیں یہ ضرور بتا سکتی ہوں کہ اس ہوٹل میں زیادہ دن نہیں رہوں گی۔"

"تو پھر.......... کیا کسی اور ہوٹل میں چلی جاؤ گی؟"

"ہوٹل میں نہیں' گھر میں۔ کرائے پر کسی گھر کی تلاش میں ہوں۔"

"پھر تو تم شاید طویل عرصے دہلی میں قیام کا ارادہ رکھتی ہو۔"

"میں نے تمہیں بتایا نا کہ ابھی مجھے کچھ نہیں معلوم' یہاں مجھے زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں اور کم عرصہ بھی۔"

"یہاں سے واپس کلکتے ہی جاؤ گی؟"

"کوئی ضروری نہیں کہ وہیں جاؤں۔ اس کا جواب مجھے خود آنے والا وقت دے گا۔ وقت اور حالات کی گرد مجھے کہاں کہاں لئے پھرے' کچھ خبر نہیں۔"

"تمہارا لہجہ بتا رہا ہے کہ تم اندر سے بہت دکھی ہو۔" رانی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی اور پھر کافی کا آخری گھونٹ لے کر مگ ٹرے میں رکھ دیا۔

"ممکن ہے تمہارا اندازہ درست ہو' میرا خیال ہے کہ تم ہیروں کے حصول کے بعد شاید دہلی میں نہیں رکو گی۔" میں نے موضوع گفتگو دانستہ بدل دیا۔

"ہاں' پھر میں بمبئی لوٹ جاؤں گی۔" اس نے جواب دیا۔ "اچھا اب تم سوؤ' کل ملاقات ہو گی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چلتے چلتے ایک بار پھر اپنی پیشکش دہرائی۔

"مجھے افسوس ہے رانی کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تمہارے اور میرے راستے الگ الگ ہیں۔"

"اتنی بڑی پیشکش اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کو نہیں کی۔ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ تم اتنی بڑی رقم کو نظرانداز کر رہی ہو۔ اگر چاہو تو ٹھنڈے دل سے میری پیشکش پر غور کر لینا' میں کل تک تمہارے آخری جواب کا انتظار کر سکتی ہوں۔" اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"تمہاری مرضی لیکن کل بھی میرا جواب یہی ہو گا۔"

"یہ کل دیکھیں گے۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔

رانی چلی گئی تو میں دروازہ بند کرنے کے بعد پلٹی اور نیلا بلب جلا کر زیادہ پاور کا بلب بجھا دیا۔ بستر پر

لیٹنے کے بعد مجھے سونے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

دوسرے دن صبح میں سو کر اٹھی تو ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ مجھے شہزاد کا خیال آیا۔ اسے میں نے آج دوپہر بلایا تھا۔ جلدی جلدی نہا دھو کر میں تیار ہوئی اور میک اپ کر کے نیچے پہنچ گئی۔ میں بروقت نیچے آ گئی تھی ورنہ شہزاد بلا سبب پریشان ہوتا۔ وہ اس وقت ہوٹل کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ دوپہر کا سوا ایک بج چکا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ ایک بجے کے بعد ہی آئے گا۔ اگر میں کچھ دیر اور سو کر نہ اٹھتی تو مسئلہ ہو جاتا۔ ظاہر ہے شہزاد کو نہ تو میرے کمرہ بدلنے کا علم تھا نہ بدلی ہوئی شخصیت کا۔ وہ تو پہلی منزل پر اسی کمرے کے دروازے پر دستک دیتا جہاں گزشتہ روز مجھے چھوڑ گیا تھا۔ میں نہ ملتی تو کاؤنٹر پر میرے بارے میں معلوم کرتا۔ اسے یہی بتایا جاتا کہ میں ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہوں۔

میں اس کے قریب پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس میک اپ میں شاید وہ مجھے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کے چونک اٹھنے کی وجہ یہی ممکن تھی۔

"آؤ شہزاد! ڈائننگ ہال میں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"آ.......... آپ خاتون!" اس نے یقیناً مجھے میری آواز سے پہچان لیا تھا۔

"میرا نام ساوتری ہے۔" میں دھیرے سے بولی۔

"جی.......... جی ہاں.......... میں جانتا ہوں آپ کو۔"

پھر میں اسے ساتھ لئے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں آ گئی۔ کھانے کے لئے آرڈر دے کر میں نے پوچھا۔ "کوئی مکان دیکھا تم نے؟"

"جی ہاں خاتون!"

"خاتون نہیں' ساوتری!" میں نے اسے ٹوکا۔

"جی' ساوتری جی۔" وہ گڑبڑا کر بولا' پھر اپنے اوپر قابو پا کر بتایا۔ "ابا جی کے ایک دوست ہیں' ان کا مکان خالی ہے۔ وہ کرائے پر مکان اٹھانا نہیں چاہتے تھے' مگر میں نے کہا تو راضی ہو گئے۔ میں انہیں چچا کہتا ہوں۔ انہوں نے صرف ایک شرط رکھی ہے کہ کرایہ نہیں لیں گے۔"

"مکان ہے کہاں؟" میں نے معلوم کیا۔

"ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ کوچہ چیلان کہلاتا ہے۔"

"تم نے ان سے کہا کیا کہ کس لئے مکان چاہئے؟"

"میں نے انہیں آپ کے بارے میں وہی سب کچھ بتایا ہے جو اپنے گھر والوں کو بتایا تھا۔ وجہ یہ کہ کبھی وہ ابا جی سے یہ ذکر چھیڑ بیٹھیں تو.........."

"لیکن تمہارے گھر والوں کو تو میں نے کچھ اور بتایا ہے کہ اپنے ایک عزیز کے یہاں رہنے جا رہی ہوں۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ تم اپنے گھر والوں سے کہہ سکتے ہو بعد میں کہ میرا مزاج ایسا ہے' میں

الگ تھلگ ہی رہنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں کم ہی کسی کا احسان لیتی ہوں۔ بہرحال کوئی بھی بات بنائی جا سکتی ہے کہ میں دو ایک روز اپنے عزیز کے یہاں رہ کر کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئی۔ ہاں یہ بتاؤ' اس مکان میں کوئی اور تو نہیں رہتا؟ میرا مطلب یہ کہ مکان دو منزلہ تو نہیں کہ اوپری منزل پر خود مالک مکان یا کوئی اور رہتا ہو؟"

"جی ہاں' مکان دو منزلہ ہی ہے مگر اوپری منزل کے لئے الگ زینہ بھی ہے۔ وہاں چچا حمید اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ رہتے ہیں۔" شہزاد نے بتایا۔

"مختصر سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"چچا حمید ہیں اور ان کا بیٹا مجید۔ حال ہی میں مجید کی شادی ہوئی ہے' میری غیر موجودگی میں۔ اس وقت میں کلکتے میں تھا۔ چچی کا انتقال ہو چکا ہے۔"

میں اس پر کچھ کھٹکی کہ اس مکان کے اوپری حصے میں کچھ لوگ رہتے تھے۔ مالک مکان کے بیٹے کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا' اس کا مطلب تھا کہ وہ نوجوان تھا۔ کسی نوجوان کا میرے قریب ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ایسی صورت میں چمپا اس نوجوان کو میرے خلاف استعمال کر سکتی تھی۔ میں اسی پر غور کر رہی تھی کہ ویٹر کھانا لا کر میز پر لگانے لگا۔

"آپ کس سوچ میں پڑ گئیں خاتون!" ویٹر چلا گیا تو شہزاد نے مجھ سے دریافت کیا۔ اس نے شاید میرے چہرے سے اندازہ کر لیا تھا کہ میں کس سوچ میں ہوں۔

"تمہیں میں نے بتایا تھا کہ تمہارے یہاں کیوں رہنا نہیں چاہتی۔" میں نے سالن کی ڈش اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم نکالو سالن۔"

"جی۔" اس نے دوسری ڈش اٹھا لی' پھر بولا۔ "آپ نے شاید یہ کہا تھا کہ آپ کی موجودگی سے گھر کے دوسرے افراد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"یہی صورت وہاں ہو سکتی ہے۔ تم کوئی ایسا مکان دیکھو جہاں نیچے یا اوپر کوئی اور نہ رہتا ہو بالکل الگ ہو وہ مکان۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"پھر ٹھیک ہے' میں چچا حمید کو منع کر دوں گا۔" وہ بولا۔

اس کے بعد ہم نے کھانا کھا کے چائے پی۔ ابھی ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ مجھے ایک جانب سے رانی آتی دکھائی دی۔ میں سمجھی' وہ بھی کھانا کھانے آئی ہو گی۔

"ہیلو ساوتری!" وہ قریب آ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"ہائے کنول! کم آن۔" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی تو میں نے اس سے شہزاد کا تعارف کرایا۔ "مائی بوائے فرینڈ' مسٹر شہزاد۔"

"گلیڈ ٹو میٹ یو۔" اس نے شہزاد کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ "مائی نیم از کنول۔"
شہزاد نے بھی اخلاقاً اس سے ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے اس سے کھانے کے لئے پوچھا۔

"کھانا کھا چکی ہوں۔ میں تمہارے پیچھے ہی ایک میز پر بیٹھی تھی۔ میرے ساتھ بھی ایک بوائے فرینڈ ہے' کہو تو اسے بھی اسی میز پر بلا لوں؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

"وائے ناٹ!" میں نے مڑ کر اس طرف دیکھا جدھر رانی نے اشارہ کیا تھا۔ اس میز پر ایک وجیہہ نوجوان بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ نوجوان بھی رانی کے انہی ساتھیوں میں سے ہو گا جو اس کے ساتھ بمبئی سے دہلی آئے تھے۔ اپنے ساتھیوں سے یقیناً رانی نے رابطہ قائم کر کے اپنی نئی شخصیت کے بارے میں بتا دیا ہو گا۔

رانی نے اشارے سے اس نوجوان کو بلا لیا' پھر کہنے لگی۔ "ہم نے کھانا تو کھا لیا ہے' ہاں چائے نہیں پی جو تمہارے ساتھ پی لیں گے۔"

میں نے ویٹر کو بلا کر مزید دو چائے لانے کو کہا۔ اس نوجوان کا نام رانی نے جہانگیر بتایا۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ جہانگیر مجھے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تقریباً یہی حال شہزاد کا تھا۔ وہ کنول کو چور نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ ان دونوں ہی کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی پسندیدگی یا چاہت اس میک اپ کے لئے تھی جو میرے اور رانی کے چہروں پر تھا۔ اس وقت مجھے یہ بات بڑی عجیب سی محسوس ہوئی کہ ان دونوں ہی نے ایسے چہرے پسند کئے تھے جن کا کوئی حقیقی وجود نہیں تھا۔

رانی بہت تیز تھی۔ اس نے یہ بات فوراً ہی محسوس کر لی اور کہنے لگی۔ "ساوتری! کیوں نہ ہمارے بوائے فرینڈز اپنی جگہ تبدیل کر لیں۔" پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جہانگیر سے بولی۔ "تم اپنی نائس کے پاس آ کر بیٹھ جاؤ' میں وہاں اپنے بی لوڈ کے قریب بیٹھ جاتی ہوں۔"

جہانگیر قدرے بوکھلایا' مگر رانی نے اپنی بات پر اصرار کیا تو اسے اٹھنا ہی پڑا۔ مجھے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔ شہزاد پر بھی مجھے غصہ آیا تھا کہ اسے مجھ سے عشق کا دعویٰ تھا اور دوسری حسین لڑکی دیکھتے ہی فوراً بدل گیا تھا۔ پھر چائے آ گئی۔ میں نے دیکھا' رانی' شہزاد سے سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد شہزاد بھی دھیمی آواز میں رانی سے باتیں کرنے لگا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں وہاں اکیلے ہوں۔ رانی مجھ سے بولی۔ "ہم کمرے میں جا رہے ہیں۔ تمہارے بوائے فرینڈ کو میں ایک گھنٹے کے بعد واپس کر دوں گی۔ اس وقت تک میرا بوائے فرینڈ تمہارے ساتھ رہے گا۔ ٹھیک ہے نا!" یہ کہتے ہی وہ شہزاد کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈائننگ ہال کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

"میں زیادہ بے تکلفی پسند نہیں کرتی مسٹر جہانگیر!" میں نے کہا۔

"یو آر ویری بیوٹی فل مس ساوتری! آئی لو یو۔" جہانگیر میری طرف دیکھ کر خواب ناک سی آواز میں بولا۔

جہانگیر کی نظریں میری نظروں سے ملیں تو اچانک میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دوسرے ہی لمحے میرے سارے جسم میں ایک تیز نشہ سا تیرنے لگا۔ ہر طرف مجھے رنگ ہی رنگ نظر آنے لگے۔ اسی لمحے مجھ سے نظریں ملائے ہوئے جہانگیر نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"آئی آلسو لَو یو مائی ڈارلنگ!" میرے ہونٹ جیسے خود بخود ہلنے لگے۔ مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔

پھر میں چونک اٹھی اور میری آنکھوں نے نضار کو اپنے قریب بیٹھے دیکھا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"میری معبلہ!"

"نضار!" میرے ہونٹ لرزے۔

اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ میں نے کب ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور کب نضار کا ہاتھ تھامے وہاں سے اٹھ کر دوسری منزل پر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرتے ہی نضار نے مجھے خود سے قریب کر لیا تھا۔ خود فراموشی کے وہ لمحات میری روح کو سرشار کر رہے تھے کہ اچانک نہ جانے کیسے وہ سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ ایک آشنا خوشبو کو میں نے اپنے بہت قریب محسوس کیا۔ وہ خوشبو عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ کی تھی۔ پھر میں نے بستر پر خود کو جہانگیر کے ساتھ اس حالت میں دیکھا کہ مجھے خود شرم سی محسوس ہونے لگی۔

میں ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے میرے جسم کی اطراف حفاظتی حصار قائم ہو گیا۔ وہ دودھیا حصار چند لمحے قائم رہ کر معدوم ہو گیا۔ یقیناً میں کسی خطرے سے دوچار ہونے والی تھی اسی لئے میرے گرد وہ حفاظتی حصار قائم ہوا تھا۔ میں پلنگ کے پاس پڑے ہوئے اپنے کپڑے اٹھانے لگی۔

معاً میری سماعت سے ایک آشنا خبیث قہقہہ ٹکرایا اور پھر میں نے لعنتی چمپا کی آواز سنی۔ "معبلہ! تجھے بہت جلدی ہوش آ گیا' مگر آج تُو بچ نہیں سکتی۔" پھر وہ ظاہر ہو گئی۔

میں نے چمپا کو مسہری کے قریب کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس کے جسم پر مجھے صرف ایک گلابی باریک لبادہ نظر آ رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے دیکھا اس کا ہاتھ حیرت انگیز طور پر جسامت اختیار کرنے لگا' مگر میرے جسم تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے جھٹکا سا لگا۔ اسی کے ساتھ چمپا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کا ہاتھ دوبارہ اپنی اصل حالت میں آ چکا تھا۔ جہانگیر جس حالت میں میرے بیڈ پر پڑا تھا اسی طرح پڑا رہا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے چمپا کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

چمپا منہ ہی منہ میں کچھ بدبدانے لگی اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف اٹھائے۔ اس کی دونوں ہتھیلیوں سے میں نے شعلے لپکتے دیکھے۔ ان شعلوں کو میں نے اپنے جسم سے کچھ فاصلے پر محیط ہوتے دیکھا۔ چند ہی لمحے بعد مجھے انتہائی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا' میرا جسم اسی حالت میں جم جائے گا۔ چمپا کا شیطانی قہقہہ پھر میری سماعت سے ٹکرایا۔ پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں چاہوں تو اسی طرح اس سرد جہنم میں تجھے دفن کر دوں مگر بڑے مہاراج ابھی تجھے زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔"

میرا جسم کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ سردی جیسے میری ہڈیوں میں اتری جا رہی تھی۔

"ابھی تُو دیکھے گی کہ تیرے جسم کے گرد جو یہ حصار قائم ہے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ سن' آج

مجھے بڑے مہاراج سے یہ اجازت مل گئی ہے کہ تیرے غرور کو خاک میں ملانے کے لئے میں کسی بھی نوجوان کو استعمال کر سکتی ہوں۔ اگر مجھے یہ اجازت انہوں نے پہلے دے دی ہوتی تو اب تک میری منتظر آنکھیں تجھے پامال ہوتے دیکھ چکی ہوتیں۔"

چمپا کے الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ میں نے اپنے اردگرد چنگاریاں سی اڑتے دیکھیں۔

"دیکھ رہی ہے تُو معبلہ! حفاظتی حصار کس طرح ٹوٹ رہا ہے۔ اب تیرا بچنا محال ہے۔" چمپا ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو مخصوص انداز میں گردش دی۔

وہ شعلے جو میرے جسم سے کچھ فاصلے پر قائم تھے' سمٹ کر چمپا کی دونوں ہتھیلیوں میں سما گئے۔ اسی کے ساتھ چمپا غائب ہو گئی۔

جہانگیر عین اسی لمحے اچھل کر بستر سے اٹھا اور اس نے مجھے دبوچ لیا۔ اس کے جسم میں مجھے بے پناہ طاقت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مجھے اٹھائے ہوئے بستر پر لے آیا اور پھر مجھ پر چھا گیا۔ میں کوشش کے باوجود اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکی۔

چمپا کا زہریلا قہقہہ مجھے سنائی دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "تیرا سانچے میں ڈھلا ہوا جسم بے حد حسین ہے۔ مجھے تیرے جسم سے حسد ہے اسی لئے اسے پامال ہوتے دیکھ کر مجھے لذت محسوس ہو رہی ہے۔" چمپا اس کمرے میں موجود تھی' مگر مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔

اب سے پہلے چمپا نے جتنے بھی نوجوانوں کو میرے خلاف استعمال کیا تھا انہوں نے مجھے جسمانی اذیت میں مبتلا نہیں کیا تھا' مگر اس مرتبہ ایسا نہیں تھا۔ میں نے اب تک انتہائی قدم اٹھانے سے گریز کیا تھا لیکن اب یہ سب کچھ میری قوت برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ نوجوان قطعی بے قصور ہے اور جو کچھ میرے ساتھ کر رہا ہے یا کرنا چاہتا ہے' اس کی ذمے دار چمپا ہے لیکن میرے صبر کا پیمانہ آخر کب تک نہ چھلکتا۔ میں نے اس کے بازو میں اپنے دانت گاڑ ہی دیئے۔ اس کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔ پھر وہ مجھے دھکا دے کر الگ ہٹ گیا اور خوں خوار نظروں سے دیکھنے لگا۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ اچانک اس کی گرفت میرے جسم پر ڈھیلی پڑ گئی۔ اسی کے ساتھ میری بھرپور لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ اچھل کر بستر سے نیچے جا گرا۔ اس کے بعد اسے اٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کے جسم میں جو زہر اتارا تھا' وہ کام کر چکا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

خلاف توقع اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو میں اچھل پڑی۔ میں نے تیزی کے ساتھ جہانگیر کے مردہ جسم کو گھسیٹ کر مسہری کے نیچے ڈال دیا۔ چند لمحے بعد پھر دستک ہوئی تو میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھولتے ہی میری نظر رانی اور شہزاد پر پڑی۔ رانی اندر داخل ہو کر ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

"ارے یہ تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے؟" شہزاد کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا؟" میں نے دروازہ بند کر کے پلٹتے ہوئے رانی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جہانگیر نے تو تمہارا حلیہ ہی بگاڑ دیا؟"

"بتا بھی نا کہ ہوا کیا ہے؟" میں کچھ جھنجلا سی گئی۔

"آئینہ دیکھ لو' خود پتا چل جائے گا۔" وہ زور سے ہنسی۔ "اور یہ جہانگیر کیا باتھ روم میں جا کر چھپ گیا ہے؟"

"وہ چلا گیا؟" میں نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔ "ابھی چند منٹ پہلے گیا ہے۔"

"مگر میرے پاس تو نہیں آیا۔" وہ حیرت سے بولی۔ "میں تو اسے تم سے واپس لینے آئی تھی۔"

میں کچھ کہے بغیر تیزی سے باتھ روم میں گھس گئی اور پھر جیسے ہی میری نگاہ آئینے پر پڑی میرے م سے حیرت زدہ سی آواز نکل گئی۔ میرے چہرے پر چڑھا ہوا ماسک پھٹ گیا تھا۔ وگ بھی ایک طرف ہٹ گئی تھی۔ وگ کے کھنچنے کی وجہ سے ماتھے کی دائیں جانب ماسک بھی جلد سے اٹھا اور کھنچا ہوا دکھا دے رہا تھا۔ یہ تمام علامات جہانگیر کی درندگی کا نتیجہ تھیں۔

شہزاد اور رانی دونوں ہی اس سے واقف تھے کہ میرے چہرے پر میک اپ ہے۔ میں نے اسی لئے پھٹا ہوا ماسک اور وگ علیحدہ کیا اور باتھ روم سے باہر آ گئی۔ وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے بغیر میک اپ کے دیکھ کر کسی نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

"تم بھی جا کر باتھ روم میں منہ دھو آؤ۔" میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"شہزاد چونک کر بولا۔ "مم .... میں؟ .... جی اچھا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر باتھ رد میں چلا گیا۔

"یہ تمہارے اعتماد کا بندہ لگتا ہے۔ تم شاید اسی لئے میک اپ کے بغیر بھی اس کے سامنے گئیں۔" رانی نے مجھ سے کہا۔

"ہاں۔" میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

اچانک وہ اچھل پڑی۔ "ارے' یہ تمہاری مسہری کے نیچے سے کون نکل رہا ہے؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو میری بھی یہی کیفیت ہوئی۔ معلوم نہیں کیسے جہانگیر کے مردہ جسم کا ایک ہاتھ باہر آ گیا تھا۔ جب تک میں اپنے حواس پر قابو پاتی رانی اٹھ کر وہاں تک پہنچ چکی تھی اور اس نے لاش کا ہاتھ کھینچ کر اسے باہر نکال لیا تھا۔

"یہ .... یہ تو مر چکا ہے۔" رانی کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔ وہ جھکی ہوئی لاش کے بگڑے ہوئے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "اسے زہر دیا گیا ہے' مگر کیوں؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟ .... میرے ایک بہترین آدمی کو تم نے زہر دے کر کیوں مار ڈالا؟" رانی کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

میں حیران تھی کہ لاش خود بخود کس طرح مسہری کے نیچے سے باہر آ گئی؟

"خاموش کیوں ہو' بتاؤ نا!" خلاف توقع رانی کے لہجے میں سختی آ گئی۔

چمپا' میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یقیناً یہ حرکت اسی لعنتی عورت کی ہو سکتی تھی۔ اسی کے سا

مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ اس کمرے میں ایک لاش موجود تھی اور چمپا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھے کسی بھی مصیبت میں پھنسا سکتی تھی' مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ چمپا نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹا جا رہا تھا۔

"دروازہ کھولو .... پولیس۔" باہر سے آواز آئی۔

میں نے رانی کو بھی چونکتے دیکھا۔ وہ بہرحال ایک جرائم پیشہ عورت تھی۔ پولیس کی آمد اس کے لئے خطرناک ہی ثابت ہو سکتی تھی' خاص طور پر ایسی صورت میں کہ وہاں ایک لاش بھی موجود تھی۔ اسی وقت شہزاد باتھ روم سے نکل آیا۔ اس کی وہاں موجودگی نے مجھے مزید الجھن میں گرفتار کر دیا تھا۔ میرے اور رانی کے ساتھ وہ بھی قتل کے اس کیس میں پھنس سکتا تھا۔ اچانک میں نے رانی کو کمرے کی کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے ہٹاتے دیکھا پھر اس نے کھڑکی کھول لی۔

"سنو!" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "فرار کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ تم بھی میرے پیچھے آ جاؤ۔"

"مگر یہ؟" میں نے شہزاد کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے جہنم میں جھونکو' اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔" یہ کہتے ہی وہ کھڑکی پر چڑھ گئی۔

دروازہ اب بھی پیٹا جا رہا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بہت مضبوط تھا۔ پولیس والے اسے توڑنے کی کوشش بھی کرتے تو اس میں انہیں خاصا وقت لگ جاتا۔ میں کرسی سے اٹھی اور لپک کر کھڑکی تک پہنچی۔ رانی ایک پائپ کے سہارے تیزی سے نیچے اتر رہی تھی۔ اس کی تیزی حیرت انگیز تھی۔ نیچے مجھے گھاس کا ایک میدان نظر آ رہا تھا۔ ہوٹل کا یہ عقبی حصہ تھا۔ میدان ہی میں ایک طرف نیٹ بندھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ کوئی پلے گراؤنڈ تھا۔ میں نے لپک کر اپنے دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور پھر انہیں کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اس وقت تک رانی نیچے پہنچ چکی تھی۔ میں نے شہزاد کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اب تک اس کی نظر جہانگیر کی لاش پر نہیں پڑی تھی۔

"شہزاد! ہمیں یہاں سے ہر قیمت پر فرار ہونا ہے۔" وہ قریب آ گیا تو میں نے اس سے کہا۔ "کیا تم یہ جو پائپ نظر آ رہا ہے' اس کے سہارے نیچے اتر سکتے ہو؟"

"مم .... مگر خاتون' وہ پائپ تو کھڑکی سے خاصا ہٹ کر اور نیچے ہے۔ میں وہاں تک کیسے پہنچوں گا؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم' میں نے تم سے جو پوچھا ہے' اس کا جواب دو۔" میں تیزی سے بولی۔

"دروازہ کھول دو ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے۔" باہر سے بلند آواز میں دھمکی دی گئی۔ "تمہیں صرف دو منٹ کا وقت دیا جاتا ہے۔ پھر دروازہ توڑ دیا جائے۔"

"مم .... میں پائپ کے سہارے نیچے نہیں اتر سکتا۔" شہزاد نے کہہ ہی دیا۔

"تو پھر میری بات غور سے سنو۔" ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ "تم یہاں ساوتری سے ملنے آئے تھے جس سے تمہاری ملاقات آج ہی صبح ہوئی تھی۔ تم باتھ روم گئے تو تم نے دروازہ پر دستک سنی۔ پھر تمہیں محسوس ہوا جیسے کسی کے لئے دروازہ کھولا گیا ہو اور اندر سے بند کر لیا گیا ہو۔ تم جب باتھ روم سے

نکلے تو ساوتری نے تمہاری کنپٹی پر گھونسا مار کر بے ہوش کر دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا' تمہیں کچھ نہیں معلوم' ٹھیک ہے نا؟"

"ج .... جی ہاں' مگر آپ .... آپ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہیں؟" وہ گھبرا گیا۔

"ادھر دیکھو۔" میں نے شہزاد کی توجہ لاش کی طرف دلائی۔ جہانگیر کی لاش پر نظر پڑتے ہی شہزاد کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"اب تم سمجھ گئے کہ میں تمہیں وہ سبق کیوں پڑھا رہی تھی۔ یاد رکھنا بے ہوش ہونے سے پہلے اس کمرے میں تم نے کوئی لاش نہیں دیکھی تھی۔" یہ کہتے ہی میرا دایاں ہاتھ تیزی سے اٹھ کر شہزاد کی کنپٹی پر پڑا اور دوسرے ہی لمحے وہ لہرا کر گرا۔

میں نے شہزاد کے بے ہوش جسم کو اٹھا کر باتھ روم کے سامنے ڈال دیا اور کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف لپکی' پھر رک گئی۔ پولیس والے کچھ کہہ رہے تھے۔

"دو منٹ پورے ہو چکے ہیں' اب ہم دروازہ توڑ رہے ہیں۔" باہر سے آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی دروازے پر ضربیں پڑنے لگیں۔

میں نے کمرے پر آخری نظر ڈالی اور اپنا ہینڈ پرس میز سے اٹھالیا۔ ہینڈ پرس کو میں نے کمر کے پاس ساڑھی میں اڑس لیا۔ کھڑکی پر چڑھ کر میں نے نیچے دیکھا۔ رانی وہاں نہیں تھی البتہ میرے دونوں سوٹ کیس اب بھی گھاس پر پڑے ہوئے تھے۔ کھڑکی پر چڑھ کر باہر میں نے کگر پر پیر جمائے اور اوپر سے آنے والے پائپ تک پہنچ گئی۔ پھر پائپ کے ذریعے میں نے نیچے اترنے میں دیر نہیں کی۔ نیچے اترتے ہی میں نے دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور تیز قدمی کے ساتھ اس سڑک کی طرف چل دی جو وہاں سے نظر آرہی تھی۔

سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر میں نے کسی خالی ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ دیر بعد ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔

"یہاں کے کسی بڑے ہوٹل میں چلو۔" میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور سے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے عقبی آئینہ درست کرتے ہوئے میرے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ میں نے کچھ ہی دیر میں محسوس کر لیا کہ ٹیکسی ڈرائیور اسی علاقے کے چکر لگائے جا رہا ہے۔ اس مرتبہ وہ پھر اسی سڑک پر آ گیا تھا جہاں سے میں اس کی ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ پھر وہ ایک چکر کاٹ کر اس ہوٹل کے بیرونی دروازے کے سامنے ٹیکسی روکنے لگا جہاں سے میں فرار ہو گئی تھی۔ مجھے اس پر غصہ بہت آیا مگر پی گئی۔ وہ دہلی میں مجھے اجنبی جان کر پاگل بنا رہا تھا۔

"اس ہوٹل میں نہیں' کسی اور ایسے ہی بڑے ہوٹل چلو۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے جی!" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بار پھر عقبی آئینے کے ذریعے میرے چہرے پر نظر ڈالی۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ دوسرا فائیو اسٹار ہوٹل پہلے ہوٹل سے کتنے فاصلے پر تھا مگر ٹیکسی والے نے وہاں تک مجھے خاصی دیر میں پہنچایا۔ میں سوٹ کیس لے کر نیچے اتر گئی تو دربان اور ایک پورٹر میری طرف لپکے۔ وہ دونوں قریب آ گئے تو میں بولی۔ "میرا سامان لے کر اندر چلو' میں کرایہ ادا کر کے ابھی آتی ہوں۔"

پورٹر نے میرے سوٹ کیس اٹھائے اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ دربان بھی اسی کے ساتھ پلٹ گیا تھا۔

"تم نے میرا اتنا وقت ضائع کیا' تمہیں اس کی کیا سزا دی جائے؟ میں ٹیکسی ڈرائیور کی طرف جھک کر کہنے لگی۔

"جی!" اس نے چونک کر کہا۔

"جی کے بچے! تم مجھے اجنبی سمجھ کر پہلے اسی ہوٹل کے اردگرد مختلف سڑکوں پر گھومتے رہے جہاں مجھے پہلے لے کر گئے تھے اور یہاں تک پہنچنے میں بھی یقیناً تم نے طویل راستہ اختیار کیا۔"

"آپ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں جی! کرایہ دے دیجئے ورنہ.........."

"ورنہ تو کیا کرلے گا؟" مجھے اس کی بدتمیزی پر مزید غصہ آ گیا اور پھر میرا ہاتھ اٹھ ہی گیا۔ اس کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور پھر وہ سر نہ اٹھا سکا۔

میں پلٹ کر ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بدتمیزی نہ کرتا تو شاید میں اسے کچھ پیسے دے دیتی۔

اس ہوٹل میں مجھے تیسری منزل پر ایک کمرہ مل گیا۔ میرے کمرے کا نمبر تین سو بیس تھا۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام میں نے عالیہ لکھوایا تھا۔

میں اب کوئی ایسا نام استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی جو پہلے رکھ چکی تھی یا کسی کے علم میں تھا۔ میں نے اپنی آمد بنگال کے ایک شہر بردوان سے لکھائی تھی اور دہلی آنے کا سبب سیر و تفریح ظاہر کیا تھا۔ پانچ بجے سے پہلے ہی عصر کا وقت ہو جاتا تھا اور مجھے عصر کے وقت ہمایوں کے مقبرے پہنچنا تھا اس لئے میں ہوٹل میں نہیں رکی۔

جیسے ہی میں نیچے آئی' ایک ٹیکسی آکر رکی اور اس سے مسافر اتر کر ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ یوں مجھے فوراً ہی خالی ٹیکسی مل گئی۔ میں جس ٹیکسی میں وہاں تک آئی تھی' اس کا ڈرائیور ابھی تک بے ہوش تھا۔ دور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کے سو گیا ہو۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

غیر معمولی واقعات پیش آنے کے باوجود میں بروقت ہمایوں کے مقبرے پہنچ گئی۔ مقبرے کی حدود میں داخل ہوتے ہی میں نے ارشاد حسین کی دی ہوئی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی تھی۔ وہ انگوٹھی میرے ہینڈ پرس ہی میں پڑی ہوئی تھی۔ دہلی کی جامع مسجد کے پیش امام سے انگوٹھی پہنے بغیر ملنے کا انجام میں دیکھ چکی تھی۔ میں کچھ ہی دیر میں مقررہ جگہ پہنچ گئی۔ اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے وہاں آئے

زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ میری سماعت سے کھڑاؤں کی آواز ٹکرائی جو لحہ بہ لحہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر میں نے ایک دھوتی بند شخص کو دیکھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک سفید دھوتی تھی‘ سر پر چھوٹے چھوٹے بال اور ان کے درمیان موٹی سی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ چوٹی میں گرہ لگی ہوئی تھی۔ اس کا جسم بھاری‘ رنگ گورا اور چہرے کے نقوش موٹے موٹے سے تھے‘ کان میں جنیئو بندھا تھا۔ جسم کے اوپری حصے کو بھی اس نے دھوتی ہی سے ڈھک رکھا تھا۔ پیشانی پر بڑا سا ترشول سیندور سے بنا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر حلیئے اور جسامت کے سبب میری آنکھوں میں بڑے مہاراج چندر موہن کا چہرہ گھوم گیا۔

"اوم ہری ہر۔" اس نے میرے قریب آ کر نعرہ مارا۔

اسی وقت کہیں دور سے "اللہ اکبر" کی آواز سنائی دی۔ عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ میں کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جس پر سرفروش تنظیم کے رکن ہونے کا یقین کر سکوں‘ عصر کا وقت ہو چکا تھا‘ وہاں اس دھوتی بند کے سوا کوئی اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اب آلتی پالتی مار کے ہمایوں کے مزار کا دروازہ تھا اندر جانے کے لئے‘ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔ میری مشکل یہ تھی کہ خود مجھے تنظیم کے رکن سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ پہلے شناختی الفاظ مجھی کو کہنا تھے۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا اور میری الجھن میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ تنظیم کا کوئی رکن وہاں کیوں نہیں پہنچا۔ یہ سوچتے ہوئے میری نگاہ پھر اس دھوتی بند کی طرف اٹھی۔ یوں لگ تھا جیسے وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا ہو۔

جب قدرے اندھیرا پھیلنے لگا تو تین چار آوارہ گرد سے لڑکوں کا ایک گروہ وہاں آیا اور کچھ دور بیٹھ کر تاش کھیلنے لگا۔

"دو پیسے کی بیگم باہر۔" ایک لڑکے کی آواز سنائی دی۔

وہ مانگ پتا کھیل رہے تھے۔ ظاہر ہے ان جواری لڑکوں میں تنظیم کے کسی رکن کے ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے ان کی طرف سے نگاہ پھیر لی۔ اسی وقت میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر دھوتی بند اب تک وہاں کیوں بیٹھا ہوا تھا؟ مجھے علم تھا کہ تنظیم کے ارکان میں ہندو اور مسلمان سبھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتی تھی کہ اپنی شخصیت پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ کوئی بھی بھیس بھر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اس دھوتی بندھ پر تنظیم کے رکن ہونے کا شبہ ہوا۔ اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا‘ خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ مقررہ وقت پر صرف وہی مقررہ پہنچا تھا۔ میں یہی سوچتی ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے واضح الفاظ شناختی الفاظ کہے۔ "ہم انگریز کے غلام ہیں۔"

"گیدڑ کی سو سالہ زندگی شیر کی ایک دن کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔" دھوتی بند نے جوابی شناختی الفاظ ادا کئے۔ اس کی نظر میری انگلی میں موجود انگوٹھی پر جمی ہوئی تھی۔

شناختی الفاظ ادا کرتے وقت مجھے یہ امید نہیں تھی کہ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہو گا۔ میں نے محض ایک چانس لیا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ جوابی شناختی الفاظ سن کر میں تقریباً اچھل پڑی۔ میری سماعت

اس وقت ارشاد حسین کے کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے تھے کہ جواب میں دوسرا جملہ سنائی دے تو آپ سمجھ لیں‘ صحیح آدمی سے مل رہی ہیں۔ صحیح آدمی دھوتی بند ہو گا‘ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں نہیں تھی۔ شناختی الفاظ ادا کرنے کے بعد دھوتی بند اب اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہی لگتی تھی۔

"تم نے شناختی الفاظ ادا کرنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی معبلہ!" دھوتی بند نے مجھے میرے اصل نام سے مخاطب کیا تو میں چکرا گئی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہنے لگا۔ "تم مقررہ وقت پر مقررہ جگہ پہنچ گئی تھیں اور میرے سوا یہاں کوئی اور نہیں تھا‘ پھر تمہیں رابطہ کرنے میں کیوں جھجک ہوئی؟"

"مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ ہی میرے مطلوبہ آدمی ہوں گے۔" میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا پھر فوراً ہی سوال کیا۔ "آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"کلکتہ شاخ کے سربراہ کی جانب سے ہمیں تمہارے متعلق تفصیلی رپورٹ مل چکی ہے۔ اس وقت مجھے تم سے مل کر بے انتہا خوشی ہو رہی ہے معبلہ!" اس کے لہجے میں قطعی رسمی پن یا بناوٹ نہیں تھی۔ "میرا نام عادل ہے اور میں ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں جنہیں تنظیم کے مطالبے پر رہا کیا گیا ہے۔"

"تم.......... تم مسلمان ہو؟" میں حیرت سے بولی۔

"یہ حلیہ اس لئے بنا رکھا ہے کہ مجھے دوبارہ گرفتار نہ کر لیا جائے۔ جان بچانے کے لئے میری نظر میں ایسا کرنا جائز ہے۔ ویسے عام طور پر لوگ اب مجھے پنڈت بال مکند کہتے ہیں۔ تم بھی مجھے پنڈت جی کہہ سکتی ہو‘ میں برا نہیں مانوں گا۔" وہ دھیرے سے ہنسا پھر اس نے بتایا۔ "تم اگر چاہو معبلہ! تو میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ میری ہی طرح کچھ اور لوگ بھی تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ تنظیم کے مطالبے پر رہائی پانے والوں میں سے بارہ ارکان کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ وہ تمہارے منتظر ہوں گے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ کوشش کروں گا معبلہ کو اپنے ساتھ لیتا آؤں۔ تم تک میں نے ان لوگوں کا پیغام پہنچا دیا ہے اب ملنا نہ ملنا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ ویسے ہم یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ تم ہم سے کس طرح کی مدد لینا چاہتی ہو؟"

"مدد لینے کا معاملہ تو بعد کا ہے۔ فی الحال تو آپ مجھے یہ بتایئے کہ جامع مسجد کے پیش امام صاحب کے علاوہ آپ لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کی اور کیا صورت ممکن ہے؟"

"کئی ایسی جگہیں اور مقامات ہیں جہاں شناختی الفاظ ادا کرنے کی صورت میں تمہاری رہنمائی کی جا سکتی ہے۔ وہ مقامات تمہیں بتا دیئے جائیں گے۔" عادل نے جواب دیا۔

میں کچھ دیر سوچتی رہی کہ عادل کے ساتھ جاؤں یا نہیں‘ مجھے کام تو کوئی تھا نہیں‘ ہاں شہزاد کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ پولیس نے اسے چھوڑا ہو گا کہ نہیں۔

"ٹھیک ہے‘ میں آپ کے ساتھ چلنے پر راضی ہوں۔ کہاں چلنا ہے؟" میں نے کہا۔

"شکریہ معبلہ! تمہیں پہاڑ گنج تک چلنا ہو گا۔" عادل نے بتایا۔

"یہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نئی دہلی ہی میں لگتا ہے۔" اس نے نیچے چلنے کے لئے زینے کی طرف قدم بڑھائے۔ "ہاں، اگر تم مجھے پنڈت جی ہی کہو تو زیادہ بہتر ہے۔"

"اور آپ مجھے عالیہ کہیں تو مناسب ہے۔" میں بھی جواب میں بولی۔

"تو کسی سبب تم بھی نام کے معاملے میں رازداری برتنا چاہتی ہو۔ ٹھیک ہے، اب میں تمہیں عالیہ ہی کہوں گا۔"

ہمایوں کے مقبرے سے نکل کر عادل نے پہاڑ گنج کے لئے ایک تانگہ کر لیا۔ عادل میرے ساتھ تانگے کی پچھلی سیٹ ہی پر بیٹھا تھا۔

"پنڈت جی! اگر دیوی جی کو آگے بھیج دیں تو اچھا ہے، تانگا الار ہو رہا ہے۔" تانگے والے نے عادل کو مخاطب کیا۔

عادل قدرے بھاری تن و توش کا مالک تھا۔ تانگے میں سوار ہوتے ہی یہ بات میں نے بھی محسوس کر لی تھی کہ تانگہ پچھلی طرف سے بہت نیچے ہو گیا ہے۔ تانگے والے نے اسی کے تدارک کی خاطر مجھے اگلی سیٹ پر بٹھانے کی تجویز پیش کی تھی تاکہ تانگے کا توازن برقرار رہے۔

"تم آگے جا کر بیٹھ جاؤ۔" عادل نے مجھ سے کہا۔

میں تانگے سے اتر گئی۔ تانگے کا پچھلا حصہ تھوڑا سا اوپر ہو گیا۔ پھر جب میں اگلی سیٹ پر چڑھ کے بیٹھ گئی تو تانگے کا توازن بالکل درست ہو گیا۔ اس کے بعد تانگہ چل دیا۔ زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا جب میں تانگے پر سوار ہوئی تھی۔ پہلی مرتبہ دہلی پہنچتے ہی ریلوے اسٹیشن سے چتلی قبر تک تانگے میں سواری کی تھی اور پھر آج بیٹھی تھی۔

عادل کے ساتھ جب میں پہاڑ گنج پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ اس نے ایک جگہ تانگہ چھوڑ دیا اور مجھے ساتھ لے کر پیدل ہی چل پڑا۔ خاصی دیر پیدل سفر کرنے کے بعد ایک بڑے سے گھر کے آہنی گیٹ پر رک گیا۔ اب تک وہ جن راستوں سے گزر کر وہاں تک پہنچا تھا ان پر تانگہ بھی باآسانی آ سکتا تھا مگر شاید تانگے کو اس گھر تک لانا نہیں چاہتا تھا۔ پھاٹک کی ایک جانب کوئی بٹن لگا ہوا تھا۔ عادل نے اس پر انگلی رکھ دی۔ میں سمجھی کہیں دور سے گھنٹی کی آواز سنائی دے گی مگر، ایسا نہیں ہوا۔

"کیا آپ کو لارڈ کلائیو سے ملنا ہے؟" پھاٹک کی دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"نہیں، سراج الدولہ کو پھانسی پر چڑھانا ہے اسے باہر بھیج دو۔"

میں سمجھ گئی کہ وہ بھی شناختی الفاظ ہی تھے جو گیٹ کھلوانے کے لئے ادا کئے گئے تھے۔ عادل کے جواب دیتے ہی گیٹ کا ذیلی دروازہ کھل گیا تھا۔ عادل مجھے لئے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ سامنے ہی دائیں بائیں لان نظر آ رہا تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی چھوٹا سا ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی۔

"پنڈت جی! آپ نے واپسی میں بہت دیر لگا دی۔" متوسط عمر کی ایک عورت، عادل سے مخاطب ہوئی۔ وہ شلوار سوٹ پہنے ہوئے تھی اور سر پر دوپٹا تھا۔ آواز سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ گیٹ کھلنے سے پہلے اسی کی آواز سنائی دی تھی۔ اسے خوبصورت نہیں تو قبول صورت بہرحال کہا جا سکتا تھا۔ اسی نے

اندر سے گیٹ کا ذیلی دروازہ بند کیا تھا۔

"ہاں دلاری! کچھ دیر ہو گئی، ان کی وجہ سے۔" عادل نے میری طرف اشارہ کیا۔

"تو یہی معبلہ دیوی ہیں، ہم سب کی اپکاری (محسن)۔" دلاری بولی۔ لباس سے وہ مسلمان لگتی تھی اور نام سے ہندو۔ معلوم نہیں، دراصل وہ کیا تھی۔

"تم ٹھیک سمجھیں، یہی وہ عظیم ہستی ہیں۔" عادل نے پُرخلوص آواز میں جواب دیا پھر پوچھا۔ "اللہ کے نیک بندے کہاں ہیں؟"

"سبھی اندر میٹنگ روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" دلاری نے بتایا اور پھر وہیں رک گئی۔

سامنے ہی عمارت نظر آ رہی تھی۔ ایک برآمدے کی چند سیڑھیاں چڑھ کر عادل ایک بڑے سے دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازے کی دائیں جانب بھی ایک بٹن لگا ہوا تھا۔ اس نے بٹن دبا دیا۔ چند لمحے بعد ہی اندر سے ایک بھاری مردانہ آواز ابھری۔ "کیا صبح ہو چکی ہے؟"

"نہیں، کچھ بارش کے آثار لگتے ہیں۔" عادل نے جواب میں کہا۔

یہ دونوں بے جوڑ جملے بھی شناختی ہی لگتے تھے اس لئے کہ پھر دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

"رام رام پنڈت جی!" دروازہ کھولنے والے نے عادل کو مخاطب کیا۔ اس شخص کے چہرے پر داڑھی تھی اور شیروانی پہنے ہوئے تھا۔

"السلام علیکم مولانا!" عادل ہنس کر بولا۔

اس شخص نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا اور وہیں رک گیا۔ دہرے شناختی الفاظ کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی طرح گیٹ سے اندر بھی آ جائے اور گیٹ پر موجود دلاری کو دھوکا دے دے تو عمارت کے صدر دروازے سے اندر داخل نہ ہو سکے۔

اندر سے وہ مکان خاصا بڑا تھا۔ مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا عادل مجھے لے کر ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوا جہاں ایک لمبی سی میز کی دونوں جانب کرسیوں پر کچھ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے عادل کے ساتھ کمرے کے دروازے سے اندر آتے دیکھ کر وہ سب کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے مجھے تعظیم دی تھی۔

میز کے ایک سرے پر بڑی سی آرام دہ کرسی رکھی تھی۔ عادل نے وہاں تک میری رہنمائی کی۔

"آپ حضرات تشریف رکھئے۔" میں نے انہیں مخاطب کیا۔

"ہم سب اپنی محسنہ کو دہلی میں خوش آمدید کہتے ہیں۔" ایک دراز قد شخص نے اپنے ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ سبھی اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

"شکریہ کہ آپ لوگوں نے مجھے اتنی عزت دی۔" میں بولی۔

"آپ ہیں ہی قابل عزت۔" کسی اور نے کہا۔ "ہم آپ کے تہہ دل سے ممنون ہیں کہ آپ کی وجہ سے ہمیں رہائی ملی۔"

میں نے دیکھا کہ عادل بھی اب انہی لوگوں کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"معلیہ! ہم خود کو بے انتہا خوش قسمت تصور کریں گے' اگر آپ کے کسی کام آ سکیں۔ ہماری کلکتہ شاخ نے ہمیں ہدایت دی ہے کہ آپ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا جائے۔ آپ سے ملاقات کی آرزو کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ جان کر بھی خوشی ہو گی کہ آپ ہم سے کیا کام لینا چاہتی ہیں یا کس نوعیت کا تعاون درکار ہے؟"

"فی الحال تو مجھے دو اعلیٰ انگریز حکام کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ وہ دونوں کہاں رہتے ہیں' مطلب' ان کی سکونت کہاں ہے؟ دفاتر کس جگہ ہیں' ان کے معمولات کیا ہیں؟ ان کی دوستی کس سے ہے؟ اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے بعد وہ کہاں کہاں جاتے ہیں اور کن کن لوگوں سے عموماً ملتے ہیں؟ ان کے متعلق جو بات بھی معلوم ہو سکے' معلوم کر لی جائے۔ مثلاً جہاں وہ رہتے ہیں ان کے علاوہ کتنے افراد کا وہاں قیام ہے؟ نوکروں وغیرہ کی تعداد کتنی ہے؟ ان کے مکمل حلیے اور مخصوص عادتیں کیا کیا ہیں؟ یہ تمام معلومات نہایت خاموشی اور رازداری کے ساتھ حاصل کی جائیں کیوں کہ یہ دونوں ہی افراد انتہائی چالاک اور خطرناک ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب آپ لوگ ان دونوں اعلیٰ انگریز حکام کے نام اور عہدے جاننا چاہیں گے تو سنئے' ان میں سے پہلے شخص کا نام ولیم رائٹ ہے۔ یہ شخص سیکرٹ سروس کا سربراہ ہے۔ دوسرے شخص کا نام رابرٹ ہیم ہے۔ یہ ملٹری انٹیلی جنس کا سربراہ ہے۔ یہ دونوں ہی افراد بہت بااثر ہیں اور صرف وائسرائے کو جواب دہ ہیں۔ کیا آپ لوگ ان دونوں سے واقف ہیں؟" میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے سوال کیا۔

انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"جب آپ ان دونوں اعلیٰ انگریز حکام کو جانتے ہی نہیں تو ان کے بارے میں معلومات کیسے حاصل کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر نہیں جانتے تو اب جان جائیں گے۔" دراز قد شخص نے جواب دیا۔ "کچھ عرصے قبل ہمارے شہر کی تنظیم کے نگران اعلیٰ نے تنظیم کا ایک نیا شعبہ قائم کیا تھا جو براہ راست نگران اعلیٰ کی رہنمائی میں کام کرتا ہے۔ اس شعبے کی یہ ذمے داری ہے کہ تنظیم کے خلاف اٹھائے جانے والے حکومتی اقدامات کا سراغ لگائے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس شعبے کا سالار یقیناً ان دونوں اہم افراد سے واقف ہو گا۔ یہ بندوبست کیا جا سکتا ہے کہ متعلقہ شعبے کے سالار سے آپ کی ملاقات کرا دی جائے۔ آپ نے جن دو افراد کے نام لئے ہیں ان کے متعلق تنظیم کا یہ شعبہ لازماً ضروری معلومات فراہم کر سکتا ہے۔"

"سالار سے ملاقات کب اور کہاں ممکن ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ تو سالار سے پوچھ کر ہی بتایا جا سکتا ہے۔"

"کب تک آپ سالار سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں؟"

"آج رات تک ایسا ممکن ہے۔"

"مجھے اس سلسلے میں کب اور کیسے علم ہو گا؟"

"آپ جہاں ٹھہری ہوئی ہیں' وہاں خبر کر دی جائے گی۔ آپ کا قیام کہاں ہے؟"

میں نے اس ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتا دیا جہاں اب ٹھہری تھی۔

"تو پھر کل دوپہر ایک اور دو بجے کے درمیان آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔"

"میں انتظار کروں گی۔ اچھا اب اجازت؟"

"چائے پی کر جایئے گا۔" عادل بول اٹھا۔ "میں جا کر مولوی رگھوویر سے کہتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ لوگوں سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔" میں نے ان لوگوں سے کہا۔ "اب مجھے یقیناً یہ احساس نہیں ہو گا کہ میں دہلی میں اکیلی ہوں۔"

کچھ دیر بعد چائے آ گئی۔ ٹرے میں چائے لانے والا وہی شخص تھا جس نے عمارت کا صدر دروازہ کھولا تھا اور جسے میں حلیے سے مسلمان سمجھی تھی۔ اس کا نام رگھوویر تھا۔ چائے پی کر عادل مجھے گیٹ تک چھوڑنے آیا۔ واپسی میں راستہ میں نے ذہن میں رکھا اور ایک سڑک کے کنارے پہنچ کر کسی ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔

پہاڑ گنج سے ٹیکسی کر کے میں اپنے ہوٹل پہنچ گئی۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک بار پھر شہزاد کا خیال آیا۔ کچھ دیر میں سوچتی رہی۔ پھر مجھے شہزاد کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ایک امکان نظر آ ہی گیا۔ میرے کمرے میں فون موجود تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر آپریٹر سے اس ہوٹل کو فون ملانے کے لئے کہا جہاں پہلے ٹھہری تھی۔ وہاں سے فون مل گیا تو اس ہوٹل کی آپریٹر سے میں نے کہا۔ "کمرہ نمبر دو سو تین میں مس کنول سے ملا دیجئے۔"

"انتظار کیجئے۔" آپریٹر بولی۔ "میں ریسیور کان سے لگائے رہی۔ کچھ دیر کے بعد آپریٹر کی آواز پھر سنائی دی۔ "بات کیجئے۔"

"ہیلو!"

"ہیلو' کون؟ .... کیا تم سا.......... میرا مطلب ہے کہ رانی بول رہی ہو؟" دوسری طرف سے ساوتری کہتے کہتے رانی کو شاید یہ خیال آ گیا ہو گا کہ بہ حیثیت ساوتری' میں ایک مفرور مجرمہ بن چکی ہوں اور یہ کہ ہمارے درمیان فون پر ہونے والی گفتگو کوئی تیسرا فرد بھی سن سکتا ہے۔ رانی نے اسی لئے احتیاط سے کام لیا تھا۔ یقیناً وہ میری آواز پہچان گئی تھی۔

"میرا نام عالیہ ہے۔" میں نے بھی احتیاط سے کام لیا۔ "ہاں میں مس رانی کو جانتی ضرور ہوں جن سے کل تمہاری ملاقات روم نمبر ایک سو پندرہ میں ہوئی تھی۔ میں.........."

"اچھا اچھا' میں سمجھ گئی کہ تم عالیہ ہی بول رہی ہو۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "تم سے آج شام ہی تو ملاقات ہوئی تھی۔ خیر' جلدی سے یہ بتاؤ کہ کہاں مل سکتی ہو؟ اپنے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتا دو۔"

"وہ تو میں بتا دوں گی لیکن میرے ایک سوال کا جواب دے دو۔ آج شام جو تمہارے پڑوس میں شادی ہوئی تھی' تو کیا بارات رخصت ہو گئی؟ اور یہ کہ دولہا والے' دلہن کو ساتھ لے گئے کہ چھوڑ دیا؟"

میں نے ٹیلی فون پر گفتگو کی وجہ سے اشاروں کنایوں میں بات کی۔ مجھے توقع تھی کہ رانی میرے اشارے سمجھ جائے گی۔

"ہاں' بارات رخصت ہو گئی۔ وہ دلہن کو بھی لے گئے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ دلہن کو دولہا کے ظلم و ستم سے بچالوں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ میری اس کوشش کی وجہ تم سے تعلق ہونے کے علاوہ یہ بھی تھی کہ میرے خیال میں دلہن قطعی بے گناہ ہے۔"

"کیا تم دولہا والوں کے گھر گئی تھیں؟" میری مراد تھانے سے تھی۔

"نہیں' میں خود نہیں گئی' اپنے چھوٹے بھائی کو وہاں بھیجا تھا۔ میرا بھائی وہاں پہنچا تو دیکھا دلہن کی پٹائی ہو رہی تھی کہ وہ اپنے آشنا کے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دے۔ دلہن نے اس سلسلے میں جو بیان دیا تھا' دولہا والے اس پر یقین نہیں کر رہے تھے اور دلہن سے کہہ رہے تھے' ہم تمہاری زبان کھلوا کر چھوڑیں گے۔"

مجھے یہ جان کر بے حد ملال ہوا کہ میری وجہ سے پولیس شہزاد پر تشدد کر رہی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ شہزاد کو پولیس کے ظلم و ستم سے کس طرح بچایا جائے؟ یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ میری خاطر پولیس کے تشدد کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ کلکتے میں خفیہ پولیس کے انسپکٹر پرکاش نے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ایک جھوٹے کیس میں پھنسایا تھا۔ مجھے یقین تو یہی تھا کہ شہزاد میرے متعلق پولیس کو کچھ نہیں بتائے گا لیکن یہ اندیشہ بھی ساتھ ساتھ تھا' پولیس کا تشدد برداشت کر لینا اس کے بس میں نہیں۔

"ہیلو عالیہ! تم خاموش کیوں ہو گئیں؟ میں تم سے فوری طور پر ملنا چاہتی ہوں' مجھے اپنا پتا بتاؤ۔ ممکن ہے' ہم دونوں مل کر کوئی راہ نکال سکیں۔"

میں نے سوچا' یہ ممکن تو ہے' تو پھر کیوں نہ رانی کو یہاں بلا لیا جائے۔ اسی خیال سے میں نے رانی کو اپنے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتا دیا۔

"تمہارا ہوٹل میرے ہوٹل سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ میں آدھے گھنٹے کے اندر اندر پہنچ رہی ہوں' کہیں جانا مت۔"

"ٹھیک ہے' آ جاؤ' میں کمرے ہی میں رہوں گی' کہیں نہیں جاؤں گی۔" میں نے یقین دہانی کرائی۔

"میں آ رہی ہوں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی دوسری جانب سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

☆======☆======☆

شہزاد کے بارے میں رانی سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا' اس کی وجہ سے میرے اضطراب میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی حالت اضطراب نے مجھے بیٹھنے نہ دیا اور میں اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ مجھے بڑی بے چینی سے رانی کا انتظار تھا۔

حسب وعدہ رانی شاید آ گئی تھی کیوں کہ مجھے اپنے کمرے کے دروازے پر دستک سنائی دے رہی

تھی۔ رانی کے فون کو آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔

میں دروازہ کھولنے کے لئے بڑھی ہی تھی کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پہلے میں نے فون اٹینڈ کیا اور ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا۔

"سنو' میں تمہیں ایک بات بتانا بھول ہی گئی۔" دوسری جانب سے رانی کی آشنا آواز سن کر میں حیران رہ گئی۔ رانی مجھ سے فون پر بات کر رہی تھی تو پھر دروازے پر دستک دینے والا کون تھا۔ رانی ذرا توقف سے پھر بولی۔ "وہ بات یہ تھی کہ تمہارے آدمی نے پولیس کے تشدد سے تنگ آ کر زبان کھول دی۔ ابھی ابھی میرے ایک آدمی نے فون پر مجھے خبر دی ہے کہ پولیس' ہوٹل کی تیسری منزل تک پہنچ چکی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس اس وقت تمہارے کمرے پر دستک دینے والی ہو گی یا پھر دے رہی ہو گی۔ شہزاد نے تمہارے بارے میں باقی ساری باتیں تو پولیس کو بتا دیں' مگر ظاہر ہے' یہ نہیں بتا سکا کہ تم فرار ہو کر کہاں گئی ہو۔ یہ میں نے فون پر تم سے معلوم کر کے پولیس کو بتا دیا۔ پہلے میرا ارادہ تو یہی تھا کہ جہانگیر کے قتل کا انتقام خود ہی تم سے لیتی لیکن پھر مصلحت کے تحت ارادہ بدل دیا۔ ہاں' تمہیں ایک بات اور بتا دوں' میں وہ ہوٹل کچھ دیر پہلے چھوڑ چکی ہوں۔ اگر تم نے پولیس کو میرے متعلق بتا بھی دیا تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا مائی ڈیئر معبلہ! اب تمہیں یقین آ گیا کہ تمہارے آدمی شہزاد نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارا نام معبلہ ہے نا!" اس کے بعد رانی کا زہریلا قہقہہ سنائی دیا اور پھر لائن بے جان ہو گئی۔

فون پر رانی سے گفتگو کے دوران بھی مجھے دروازے پر مسلسل دستک سنائی دیتی رہی تھی۔ ان میں اب اضافہ ہو چکا تھا۔ رانی کو اپنے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتا کر میں نے یقیناً سخت غلطی کی تھی۔ معلوم نہیں کیوں میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ وہ بہرحال ایک جرائم پیشہ عورت ہے۔

دروازہ اب بُری طرح دھڑ دھڑایا جا رہا تھا اور دروازہ توڑ دینے کی دھمکی دی جا رہی تھی۔

میں نے دھمکی کو نظرانداز کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ کر کمرے کی کھڑکی کھولی اور اس سے نیچے جھانکنے لگی۔ نیچے بھی مجھے مسلح پولیس والے نظر آئے۔ پولیس نے یہ بندوبست غالباً میرے گزشتہ فرار کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا تھا۔ فرار کی یہ راہ بھی مسدود تھی۔ میں بُری طرح گِھر چکی تھی۔ میرا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ شہزاد' پولیس کا تشدد برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اس کا واضح ثبوت مجھے رانی کی زبانی اپنا نام سن کر مل گیا تھا۔ شہزاد کے سوا میرا اصل نام پولیس کو بھلا کون بتا سکتا تھا۔

معاً کمرے میں چمپا کا بھیانک قہقہہ گونجا تو میں اچھل پڑی۔ وہ میری نظروں سے اوجھل تھی' مگر مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "معبلہ! تُو اگر دروازہ نہیں کھول رہی' دروازہ کھولنے سے ڈر رہی ہے تو میں کھولے دیتی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی میں نے چند ہی لمحے بعد دروازہ کھلتے دیکھا۔

مسلح پولیس والے کمرے میں گھس آئے۔ ان کی رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

ان پولیس والوں کا اس طرح میرے کمرے میں داخل ہونا قطعی غیر قانونی تھا' مگر وہ انگریزوں کا دور حکومت تھا۔ قانون نافذ کرنے والے تمام ہی ادارے حکومت کے آلہ کار تھے۔ لوگوں کو اپنا غلام

ہمنائے رکھنے کے لئے حکومت نے پولیس کو وسیع تر اختیارات دے رکھے تھے۔ عوام کے بنیادی حقوق تقریباً سلب تھے۔ اس کے باوجود میں نے پولیس کی آمد پر کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے چہرے پر اب میک اپ نہیں تھا۔ میک اپ کے بغیر ساوتری کی حیثیت سے مجھے کوئی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس کے لئے مجھے ساوتری ثابت کرنا مشکل ہو جاتا۔ ان پولیس والوں میں ایک اپنی وردی سے مجھے پولیس انسپکٹر معلوم ہو رہا تھا۔ اسی نے سپاہیوں کو میری گرفتاری کا حکم دیا۔

"لیکن مجھے کس جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے؟" میں نے احتجاج کیا۔ "اور میری گرفتاری کا وارنٹ کہاں ہے؟ آپ وارنٹ کے بغیر مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔"

"زیادہ قانون پڑھانے کی ضرورت نہیں۔" پولیس انسپکٹر سخت لہجے میں بولا۔ "تمہیں ہم ایک نوجوان کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کر رہے ہیں۔ رہا وارنٹ کا معاملہ تو ہمارے پاس یہ اختیارات ہیں کہ ہم شبہے میں کسی کو بھی گرفتار کر لیں۔ سیدھی طرح ہتھکڑیاں پہن لو ورنہ..........." اس نے دھمکی دینے کے انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ تین سپاہی تھے اور ایک پولیس انسپکٹر اور ان تینوں ہی کا رخ دروازے سے مخالفت سمت یعنی میری طرف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان دو سیاہ پوشوں کو دروازے سے اندر داخل ہوتے نہ دیکھ سکے جو دبے پاؤں پولیس انسپکٹر کے پیچھے آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان دونوں ہی کے ہاتھوں میں مجھے ریوالور نظر آ رہے تھے۔یہ منظر دیکھ کر میں نے خود کو بمشکل چونک اٹھنے سے روکا تھا۔ ان دونوں کے چہرے بھی سیاہ نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے پولیس انسپکٹر کی گدی پر ریوالور کی نال رکھ دی۔

"ریوالور پھینک دو انسپکٹر! اور اپنے سپاہیوں کو بھی حکم دو کہ اپنی رائفلیں زمین پر ڈال دیں۔" سیاہ پوش نے پولیس انسپکٹر کو سخت لہجے میں حکم دیا۔ "ریوالور پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لو ورنہ مارے جاؤ گے۔" پھر سیاہ پوش نے پلٹ کر اپنے ساتھی کو کچھ اشارہ کیا۔

سیاہ پوش کے ساتھی نے لپک کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اسی وقت پولیس انسپکٹر نے اپنا ریوالور پھینکتے ہوئے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "ہتھیار ڈال دو۔"

سپاہیوں نے اپنے افسر کے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ پولیس انسپکٹر نے بھی اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لئے تھے۔ پھر سیاہ پوش کے کہنے پر اس کے ساتھی نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لبادے سے ریشمی ڈوری کا ایک لچھ نکالا اور ان چاروں پولیس والوں کو انتہائی تیزی کے ساتھ باندھ کر فرش پر ڈال دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کام میں مہارت رکھتا ہو۔ سپاہیوں کی تینوں رائفلیں' پولیس انسپکٹر کا ریوالور' کارتوس اور گولیاں جمع کر کے بڑے سے ایک سیاہ کپڑے میں لپیٹ دیئے گئے۔ میں سمجھ گئی کہ پولیس سے چھینا ہوا اسلحہ وہ ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اسی کے ساتھ میرے لئے یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ سیاہ پوش کون ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو میں اس کی آواز سے پہچان بھی گئی تھی حالانکہ اس نے آواز بدل کر بولنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اس پر بہرحال حیرت تھی کہ وہ بروقت میری مدد کرنے کس طرح پہنچ گئے۔

میرے خیال میں ان پولیس والوں کو صرف باندھنا ہی کافی نہیں تھا۔ میں نے اسی خیال کے پیش

نظر تیزی کے ساتھ باری باری ان چاروں کی کنپٹیاں "سہلا" دیں' پھر پلٹ کر پہلے سیاہ پوش سے بولی۔ "پنڈت جی! اب چاہیں تو اپنی ریشمی ڈوری بھی کھول لیں' یہ کچھ نہیں کہیں گے۔"

سیاہ پوش چونک کر دھیرے سے ہنسا' پھر کہنے لگا۔ "تو تم نے بدلی ہوئی آواز کے باوجود مجھے پہچان لیا۔"

اس سیاہ پوش کا اصل نام عادل اور فرضی نام پنڈت بال مکند تھا۔ وہی مجھے آج شام ہمایوں کے مقبرے پر ملا تھا اور اپنے ساتھ تنظیم کے دیگر ساتھیوں سے ملوانے کے لئے پہاڑ گنج کی ایک بڑی سی عمارت میں لے گیا تھا۔

"ہاں' میں تمہیں پہچان گئی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اور شاید تمہارے ساتھ مولوی رگھوویر ہیں۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا جو نشانے پر بیٹھا۔

"تمہارا یہ اندازہ بھی حیرت انگیز طور پر درست ہے۔" عادل نے تصدیق کی' پھر خود ہی بتانے لگا۔ "پہاڑ گنج سے تمہاری واپسی کے بعد ہمارے شہر کے نگران نے ہم سے رابطہ قائم کیا۔ ہم نے تمہارے متعلق بتایا تو حکم ملا کہ فوری طور پر تمہاری حفاظت و نگرانی کا بندوبست کیا جائے۔ یہ ذمے داری میں نے قبول کر لی اور مولوی رگھوویر کے ساتھ یہاں اسی فلور پر ایک کمرہ حاصل کر لیا۔ ہم نے دانستہ تمہارے کمرے کے سامنے والا کمرہ لیا تھا جو خالی تھا' تاکہ ہم تمہارے کمرے پر نظر رکھ سکیں۔ میرا خیال ہے مناسب ہے کہ ہم بقیہ باتیں اسی کمرے میں چل کے کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ تم یہاں سے اپنا سامان سمیٹ لو اور کمرے کو مقفل کر دو۔"

"مگر میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں فوری طور پر اس ہوٹل کو چھوڑ دینا چاہئے۔" میں بولی۔

"یہ بھی ممکن ہے۔" عادل نے جواب میں کہا' پھر تجویز پیش کی۔ "تم چاہو تو ہمارے ساتھ چلو' ہم تمہاری سکونت کا بندوبست کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے عادل کی تجویز منظور کر لی۔

پھر میں نے اور ان لوگوں نے ہوٹل کے واجبات ادا کر کے وہاں سے روانہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ چاروں پولیس والوں کو میں اپنے کمرے ہی میں بندھا چھوڑ آئی۔ تنظیم کے ارکان کی بروقت مدد کے سبب میں قتل کے الزام میں پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بال بال بچ گئی تھی۔ اس طرح چمپا کا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا جو یقیناً میرے کمرے کا دروازہ کھول کر اور مسلح پولیس والوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر غائب ہو گئی تھی' ورنہ پولیس سے نجات حاصل کرنا اس قدر آسان نہ ہوتا۔ اسی طرح بمبئی کی رانی بھی مجھے پھنسوانے میں ناکام رہی تھی جو مجھ سے اپنے نوجوان ساتھی جہانگیر کے قتل کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اسی نے پولیس کو میرے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتایا تھا۔ اس جرائم پیشہ عورت سے نمٹنا میرے لئے اتنا ضروری نہیں تھا جتنا شہزاد کو پولیس کے چنگل سے رہائی دلانا تھا۔ پولیس نے اسے ایک ایسی جگہ سے بے ہوشی کی حالت میں پکڑا تھا جہاں ایک شخص کی لاش موجود تھی۔ پولیس اصل قاتل کی تلاش میں ناکام ہو کر شہزاد پر بھی قتل کا الزام عائد کر سکتی تھی۔ مجھے یہ علم بھی نہیں تھا کہ شہزاد نے پولیس کو کیا

بیان دیا ہے۔ رانی کے ذریعے البتہ مجھے اتنا ضرور پتا چل گیا تھا کہ شہزاد نے زبان کھول دی ہے۔ اس کا ثبوت رانی کو میرا اصل نام معلوم ہو جانا تھا جس سے صرف شہزاد واقف تھا۔

عادل اور رگھودیر کے ساتھ میں اسی عمارت میں آگئی جہاں آج شام آ چکی تھی۔ انہوں نے مجھے اس عمارت کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔ کمرے میں تمام ضروری سامان موجود تھا۔ بڑی سی مسہری کے قریب ہی چند آرام دہ کرسیاں اور ایک میز پڑی تھی۔ لکڑی کی ایک الماری کے قریب عادل اور رگھودیر نے میرے دونوں سوٹ کیس رکھ دیئے تھے۔ ہم لوگ کرسیوں پر آ بیٹھے تو عادل نے مجھ سے سوال کیا۔

"معبلہ! پولیس تمہارے پیچھے کیسے لگ گئی؟"

مجھے یہی توقع تھی کہ عادل اس سلسلے میں مجھ سے ضرور سوال کرے گا۔ میں نے اسی لئے سکون و اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ "میں اس سے پہلے جس ہوٹل میں ٹھہری تھی' وہاں ایک جرائم پیشہ عورت ٹکرا گئی تھی۔" پھر میں نے مختصراً رانی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ اسی نام سے ہوٹل میں میرا قیام تھا۔ جو واقعہ آج دوپہر کو پیش آیا تھا' وہ بھی میں نے اختصار کے ساتھ بیان کر دیا' صرف یہ بات چھپا گئی کہ جہانگیر میرے اندر موجود زہر کے سبب ہلاک ہوا تھا۔ "میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا۔ اسے ایک حادثاتی موت ہی کہا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس وقت اپنے اوپر دست درازی کے سبب شدید غصہ آ گیا تھا۔ اسی غصے میں اس کی گردن پر میرے ہاتھ کا دباؤ بڑھتا گیا۔ پھر جب میں نے اسے چھوڑا تو دم گھٹنے کی وجہ سے وہ مر چکا تھا۔" اس کے بعد میں نے رانی اور شہزاد کی آمد کے متعلق بتایا اور وہاں سے فرار کی روداد بیان کر دی۔

"سوال یہ ہے معبلہ کہ پولیس کو اس نوجوان کے قتل ہونے کا علم کیسے ہوا؟" عادل نے پوچھا۔

حالانکہ مجھے علم تھا' یہ چمپا کی حرکت تھی مگر میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ عادل کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔ ظاہر ہے' عادل کو میں چمپا کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے میں ایک بار پھر شہزاد کی طرف سے فکرمند ہو گئی جو پولیس کی حراست میں تھا۔ اسی وقت عادل نے مجھ سے شہزاد کے بارے میں پوچھ لیا۔

میں نے اسے شہزاد کے متعلق بتا دیا تو وہ بولا۔ "پھر تو وہ بے چارہ ناحق پھنس گیا۔" عادل کے لہجے سے اظہار تاسف ہو رہا تھا۔

"کیا یہ ممکن ہے' کسی طرح معلوم ہو جائے کہ شہزاد نے پولیس کو کیا بیان دیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

اس مرتبہ میری بات کا جواب رگھودیر نے دیا جو خاصا حوصلہ افزا تھا۔ "جیسا کہ میرا اندازہ ہے' پولیس نے ابھی تک پکی ایف آئی آر درج نہیں کی ہو گی۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اس بے گناہ نوجوان کو بچایا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم کیا جانا ممکن ہے کہ اس نے پولیس کو کیا بیان دیا ہے' معبلہ! تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں' ہم اس معاملے کو سنبھال لیں گے۔ یہ معاملہ جس تھانے کی حدود میں آتا ہے' وہاں تک ہماری رسائی ہے۔"

پھر رگھودیر فوری طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چلا گیا تو میں نے عادل کو مخاطب کیا۔ "عادل! میں چاہتی وں کہ تم لوگ میرے قیام کا بندوبست کسی ایسی جگہ کرو جہاں میرے سوا کوئی اور نہ ہو۔ ممکن ہو تو وہاں سی ادھیڑ عمر ملازمہ کا انتظام کر دو۔" یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں چمپا کا خیال تھا۔

"اس کی کوئی خاص وجہ؟" عادل نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میرے کچھ نامعلوم دشمن ایسے ہیں جن کی وجہ سے تم لوگوں کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے اور ظاہر ہے' میں یہ نہیں چاہتی۔" میں نے جواب دیا۔

"نامعلوم دشمن .... اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم بھی ان کے متعلق اندھیرے میں ہو۔" عادل بلا۔

"ہاں' وہ کہیں بھی اور کسی بھی وقت مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔" میں نے بتایا۔

"پھر تو تمہاری حفاظت و نگرانی کے لئے یہی بہتر ہے کہ تم ہمارے ہی درمیان رہو۔"

"نہیں۔" میں نے انکار کر دیا۔ "یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں۔"

عادل کچھ دیر سوچ میں گم رہا' پھر کہنے لگا۔ "تمہیں یاد ہو گا کہ تنظیم کے مطالبے پر جن دو ارکان کو لومت نے رہا نہیں کیا اور وہ تشدد کے سبب شہید ہو گئے' انہی میں سے ایک کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ ں کی بیوہ کے عزیزوں اور رشتے داروں کے علاوہ تنظیم بھی اس کی مالی مدد کرتی ہے۔ اس کے پاس رہنے ں صورت میں تمہیں کسی ملازمہ کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ پھر بھی تم اگر وہاں نہ رہنا چاہو تو کرائے ے کسی مکان کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔"

"اس عورت سے میرے بارے میں تم کیا کہو گے کہ میں کون ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ تم دہلی میں ہماری مہمان ہو اور کیا کہنا ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گئی۔ عادل کی تجویز بری نہیں تھی۔ اس طرح میں گھریلو کام کاج کے لئے کسی زمہ کو رکھنے کے جھنجٹ سے بھی بچ سکتی تھی لیکن مسئلہ اسی لعنتی چمپا کا تھا۔ میری وجہ سے اس غریب ہ یا اس کے معصوم یتیم بچوں کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو یہ اچھا نہ ہوتا۔

"کس سوچ میں پڑ گئیں معبلہ!" عادل نے مجھے ٹوکا۔

"نہیں' بات تو پھر بھی وہیں کی وہیں رہی۔" میں بولی۔ پھر جو کچھ میرے دل میں تھا' کہہ دیا۔

"اگر کسی ایسے خطرے کا اندیشہ ہے تو پھر تمہارا فیصلہ درست ہے' تمہیں وہاں نہیں رہنا چاہئے۔" ل نے کہا۔ "آج کی رات تم یہاں گزار لو' کل کرائے کے کسی مکان کا تمہارے لئے بندوبست کر دیا ئے گا۔ میرا خیال ہے کہ ملازمہ کے ساتھ ساتھ تمہیں موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی محافظ کی ا ضرورت ہے جو.........."

"نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کسی مرد کو میں اپنے ساتھ نہیں رکھوں گی' خواہ وہ نظ ہی کیوں نہ ہو۔"

"پہلے میری بات تو سن لی ہوتی۔" وہ مسکرایا۔ "ہماری تنظیم میں خواتین بھی شامل ہیں اور بہت دلیر

خواتین۔ انہی میں سے کسی کو گھریلو ملازمہ کی حیثیت سے تمہارے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ وہ گھر کا کام بھی کرے گی اور اسی کے ساتھ تمہاری حفاظت کی ذمہ داری بھی اس پر ہو گی۔ کیا تمہیں اس پر بھی اعتراض ہے؟"

"ٹھیک ہے' مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔"

پھر وہ اٹھ کر کھانے کے لئے کہنے چلا گیا۔ لوٹا تو اس کے ساتھ دلاری بھی تھی جو ایک ٹرے اٹھا ہوئے تھی۔ اس نے میز پر ٹرے رکھ دی۔ عادل نے بھی میرے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ جب ہم کھانا کھا چائے پی رہے تھے تو رگھوویر بھی آ گیا۔

"کیا رہا؟" میں نے اس کے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

"میرا اندازہ درست نکلا۔ پولیس نے ابھی ایف آئی آر درج نہیں کی تھی۔ تمہارے آدمی کو ر لیا گیا ہے۔ اب اس کیس سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ پولیس اب یہ ظاہر کرے گی کہ ہوٹل کمرے میں اسے صرف لاش ملی تھی۔" رگھوویر نے بتایا۔

"یہ بھی معلوم ہوا کہ پولیس وہاں پہنچی کیسے؟" عادل نے پوچھا۔

"پولیس کو ٹیلی فون پر کسی گمنام عورت نے جہانگیر کے قتل کی اطلاع دی تھی۔" رگھوویر نے شہزاد کے اس بیان سے آگاہ کیا جو اس نے پولیس کے سامنے دیا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ گمنام عورت چ ہو سکتی تھی۔

پھر میرے استفسار پر رگھوویر نے مجھے شہزاد کے اس بیان سے آگاہ کیا جو اس نے پولیس کے دیا تھا۔ بیان بالکل وہی تھا جو میں نے اسے بتایا تھا۔ پولیس کے سامنے میرا نام اس نے ایک اور سلسلے لیا تھا۔ اس سے سوال کیا گیا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے؟ اس نے جواب دیا تھا کہ وہ کلکتے میں ایک دولت خاتون معبلہ کا ملازم ہے اور چند روز کی چھٹی لے کر اپنے گھر والوں سے ملنے دہلی آیا ہے۔ اس نہیں بتایا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ دہلی آئی ہوں۔ اتنی سی بات تھی جس کی آڑ لے کر جرائ عورت رانی نے مجھے ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو صحیح نشانے تھا۔ اسے علم تھا کہ میں کلکتے سے آئی ہوں اور شہزاد نے بھی کلکتے ہی کا حوالہ دیا تھا۔ سو اس نے سے کڑی جوڑ لی تھی۔ مجرمانہ ذہن رکھنے والی کسی عورت کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ تنظیم ارکان سے میری ملاقات سودمند ہی ثابت ہوئی تھی ورنہ شہزاد کی گرفتاری سے میرے ذہن پر ایک بو رہتا۔ میں نے اس پر رگھوویر کا شکریہ ادا کیا' پھر جواباً رگھوویر کے کچھ کہنے سے پہلے عادل سے دریافت

"تمہارے شہر کی تنظیم کے نگران اعلیٰ نے تنظیم کے خلاف اٹھائے جانے والے حکومتی اقدامات کا لگانے کی خاطر جو نیا شعبہ قائم کیا ہے' کیا اس کے سالار سے رابطہ قائم ہوا؟"

"سالار تک آج رات تفصیلی پیغام پہنچ جائے گا' کل صبح تک یقینی طور پر جواب مل جائے تمہاری ملاقات سالار سے کب اور کہاں ممکن ہے۔" عادل نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا' پھر معلوم کیا۔ "کیا تم دونوں بھی اسی عمار

رہتے ہو؟"

"نہیں۔" عادل نے بتایا۔ "یہاں صرف دلاری اور دو مسلح محافظ ہی عموماً رہتے ہیں لیکن آج رات ہم دونوں بھی یہیں رہیں گے اور اس کی وجہ تمہاری حفاظت و نگرانی ہے۔ اپنے نگران اعلیٰ کے حکم کی تعمیل بہرحال ہمارے لئے ضروری ہے۔"

"تم لوگوں کو ناحق میری وجہ سے پریشانی اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

"حیرت ہے معبلہ کہ تم اسے ناحق کہہ رہی ہو۔ ہمارے اوپر تو تمہارا حق ہے۔ تمہاری ہی بدولت تو ہم آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں ورنہ ہمارے لئے درِ زنداں کھلنا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ ہمیں تو بے انتہا خوشی ہو گی اگر تمہارے کسی کام آ سکیں۔" عادل نے اپنے پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا۔

مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد وہ دونوں میرے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس وقت رات کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ اس کمرے کے باہر بائیں جانب راہداری کے اختتام پر باتھ روم وغیرہ تھے جو عادل نے مجھے جانے سے پہلے دکھا دیئے تھے۔ راہداری میں میری ہی وجہ سے ایک بلب بھی جلتا چھوڑ دیا گیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ میرے کمرے کے دائیں اور بائیں موجود کمروں میں ہیں اور میں رات کو کسی بھی وقت کوئی ضرورت پڑنے پر انہیں طلب کر سکتی ہوں۔ خود انہوں نے بھی میری طرف سے چوکنا رہنے کو کہا تھا۔ تمام انتظامات ایسے تھے کہ وہاں کوئی پرندہ پَر نہیں مار سکتا تھا۔ عمارت کے صدر دروازے اور پھاٹک پر مسلح محافظ موجود تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں میری حفاظت کا پورا بندوبست کیا تھا مگر وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ مجھے جو خطرہ درپیش تھا' اس کا تدارک ان تمام انتظامات سے ممکن نہیں تھا۔

وہ دونوں چلے گئے تو میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور زیادہ پاور کا بلب بجھا کر نیلا ہلکا بلب جلا دیا۔ بستر پر دراز ہونے سے پہلے میں نے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر بستر پر سونے کے لئے لیٹ گئی۔ میں جس غرض سے دہلی آئی تھی' ابھی تک اس سلسلے میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس بات کو بھی فراموش نہیں کیا تھا کہ میرا دشمن ژیان بھی اسی شہر میں تھا۔ عظیم مہین ہی نے مجھے اس سے آگاہ کیا تھا۔ ژیان کی تلاش کا آغاز اس شہر میں کس طرح کیا جائے' ابھی میں یہ بھی نہیں سوچ سکی تھی۔ لعنتی چمپا نے ابھی مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ وہ مجھے کہیں سکون سے رہنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس رات بھی سونے سے پہلے میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہو رہے تھے۔ میں سوچنے لگی کہ مجھے عادل کے ساتھ اس عمارت میں نہیں آنا چاہئے تھا۔ وجہ یہ کہ چمپا سے کسی بھی قسم کی کوئی گھٹیا حرکت متوقع تھی۔ اسی سوچ بچار میں نامعلوم کب میری آنکھ لگ گئی۔

خلاف توقع وہ رات سکون سے گزر گئی۔ اس کا سبب یہی ممکن تھا کہ چمپا میری طرف سے مطمئن ہو گی۔ اپنی دانست میں اس نے مجھے پولیس کے چکر میں پھنسا دیا تھا۔ اسے یہ توقع نہیں ہو گی کہ میں اس کے پھیلائے ہوئے جال سے کس طرح بچ نکلوں گی۔

میں اپنے کمرے میں عادل اور رگھوویر کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی کہ وہی دراز قد شخص آ گیا جس

سے گزشتہ روز اسی عمارت کے ہال کمرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا نام سمیع اللہ تھا۔ عادل مجھے بتا چکا تھا کہ تنظیم کے مطلوبہ سالار سے رابطہ قائم کرنے کی ذمے داری اسی کے سپرد کی گئی تھی۔ سمیع اللہ کو شاید وہاں میری موجودگی کا علم دلاری سے ہو گیا تھا۔ اس نے اسی لئے مجھے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ رگھو ویر کے برابر والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"سالار اکبر آج رات دس بجے اسی عمارت کے کانفرنس روم میں آپ سے ملاقات کریں گے۔" سمیع اللہ نے مجھے مخاطب کیا۔

"سمیع اللہ! تمہیں آج ہی معبلہ کے لئے کرائے کے کسی مکان کا بندوبست کرنا ہے۔" عادل نے سمیع اللہ سے کہا۔

"معبلہ یہاں بھی تو قیام کر سکتی ہیں۔" سمیع اللہ بولا۔

"کسی سبب معبلہ اسے مناسب نہیں سمجھتیں۔" عادل نے جواب دیا۔ "اگر اسی علاقے میں مکان مل جائے تو زیادہ بہتر ہے۔"

"وہ مکان قطعی علیحدہ ہونا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ وہاں کسی اور کا قیام نہ ہو۔" میں نے وضاحت ضروری سمجھی۔

"ایک مکان میری نظر میں ہے۔" سمیع اللہ نے بتایا۔ "ہے تو وہ اسی علاقے میں' مگر خاصا بڑا ہے۔ چار پانچ کمرے ہیں اس میں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں بول اٹھی۔

"فرق بس کرائے میں پڑے گا۔ چھوٹا مکان مل جاتا تو آپ کو کرایہ کم ادا کرنا پڑتا۔"

"کرائے کی فکر نہ کریں' آپ بات کر لیں۔" میں نے کہہ دیا۔

سمیع اللہ چائے پی کر چلا گیا۔ دو گلیاں چھوڑ کر اسی علاقے میں وہ مکان تھا۔ مالک مکان سمیع اللہ کا کوئی شناسا تھا۔ سمیع اللہ ایک ہی گھنٹے بعد لوٹ آیا۔ مکان کی چابی اس کے پاس تھی۔ عادل نے دلاری اور ایک محافظ کو مکان کی صفائی کے لئے بھیج دیا۔ اسی عمارت کے ایک کمرے سے ضروری فرنیچر بھی وہاں بھجوا دیا گیا جس میں مسہری' الماری اور میز کرسیاں وغیرہ تھیں۔ دلاری کو بھی میرے ساتھ اسی مکان میں رہنا تھا اس لئے وہ بھی اپنا سامان وہیں لے گئی تھی۔

مکان کی صفائی ہو گئی اور وہاں سامان سیٹ کر دیا گیا تو میں بھی سمیع اللہ اور عادل کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ مکان خاصا کشادہ تھا۔ درمیان میں بڑا سا صحن بھی تھا۔ دلاری نے میری خواب گاہ کے برابر والا کمرہ اپنے رہنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ میں نے اس کا کمرہ بھی دیکھا اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ مکان میری توقع کے مطابق تھا۔ اس پر میں نے سمیع اللہ سے اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ شہزاد سے بھی میں نے مکان کا بندوبست کرنے کو کہا تھا' مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ شہزاد کو اس سلسلے میں بتانا ضروری تھا تاکہ وہ کسی سے بات نہ کر لے۔ اس کے علاوہ سنبل سے کیا ہوا وعدہ بھی مجھے یاد تھا کہ ملنے آتی رہوں گی۔ کناٹ پیلس میں جو کپڑے میں نے دو درزیوں کو سلنے کے لئے دیئے تھے' وہ بھی لینا تھے۔

ان میں مشرقی اور مغربی دونوں ہی طرح کے لباس تھے۔ پہلے میں نے شہزاد کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تاکہ واپسی میں کناٹ پیلس سے کپڑے لیتی ہوئی پہاڑ گنج آ جاؤں۔

جب میں چلنے لگی تو دلاری نے مجھ سے پوچھا۔ "معبلہ! دوپہر کو کھانے میں کیا کھائیں گی؟ میں ہر طرح کا گوشت بھی پکا لیتی ہوں۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر پہلے باورچی خانے کے لئے سودا سلف بھی تو چاہئے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا ہینڈ پرس کھولا اور اس میں سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر دلاری کی طرف بڑھا دیئے۔ "کچن کے لئے تمہیں جو ضروری سامان لانا ہو' لے آنا۔ مزید پیسوں کی ضرورت پڑے تو وہ بھی............"

"مگر اس کی کوئی ضرورت نہیں معبلہ!" دلاری بول اٹھی۔ "ضرورت کا ہر سامان وہاں کچن میں موجود ہے۔ کھانا میں وہیں پکا لیا کروں گی۔" دلاری نے اس عمارت کے باورچی خانے کا ذکر کیا جہاں میں نے گزشتہ رات گزاری تھی۔

"تم بار بار صبح و شام وہاں کہاں آتی جاتی پھرو گی۔ پھر یہ کہ کھانے کے علاوہ چائے وغیرہ کی ضرورت بھی پڑے گی۔ یہیں کھانے پکانے کا بندوبست کر لو تو زیادہ بہتر ہے۔" میں بولی۔

میرے اصرار پر دلاری کو میری بات ماننا ہی پڑی۔

"دوپہر کو میرے کھانے کی فکر نہ کرنا' میں کھا کر آؤں گی۔ رات کو جو چاہے پکا لینا۔" میں نے کہا اور آگے قدم بڑھا دیئے۔

"کب تک واپس آ جاؤ گی؟" عادل نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دریافت کیا۔

"شام سے پہلے ہی واپسی ہو جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

پھر میں اس مکان سے باہر آ گئی۔ سمیع اللہ عادل اور دلاری کو میں وہیں چھوڑ آئی تھی۔ وہاں سے قریبی سڑک تک پہنچتے ہوئے میں نے راستے کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھا تھا۔ ابھی صبح کے گیارہ ہی بجے تھے اور مجھے شہزاد کے گھر پہنچنے کی کوئی ایسی زیادہ جلدی نہیں تھی۔ میں نے اسی سبب ٹیکسی کی بجائے جامع مسجد کے لئے ایک تانگہ کر لیا۔ میرے علاوہ تانگے والا کوئی اور سواری نہ بٹھائے اس کے لئے میں زیادہ پیسے دینے پر آمادہ ہو گئی تھی۔

جامع مسجد سے چتلی قبر کا راستہ میرا دیکھا بھالا تھا' پھر یہ کہ فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ میں اسی لئے تانگے سے اتر کر پیدل اس طرف روانہ ہو گئی۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ کسی مسلمان گھرانے کی عورت کا بے پردہ گھر سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی وہ ساڑھی باندھتی تھیں۔ کسی ایسی عورت کو ہندو ہی سمجھا جا سکتا تھا اور وہ پورا علاقہ مسلمانوں کا تھا۔ وہاں کسی ہندو عورت کی آمد حیران کن ہی تھی' مگر اب میں ان نظروں کی عادی ہو چکی تھی۔ میں اسی سبب کسی طرف دھیان دیئے بغیر آگے بڑھتی رہی۔

میں' شہزاد کی گلی میں داخل ہوئی ہی تھی کہ اسے گھر سے نکلتے دیکھا۔ مجھے آتا دیکھنے کے بعد وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

کچھ ہی دیر بعد شہزاد کے ساتھ میں اس کے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ سنبل مجھے دیکھ کر کھل

اٹھی۔ میں، شہزاد کی ماں سے بھی ملی۔
"آیئے خاتون! ادھر بیٹھک میں چلتے ہیں۔" شہزاد مجھ سے بولا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ تنہائی م
مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔
"چلو۔" میں اس کے ساتھ چل دی۔ شہزاد نے سنبل سے چائے بنانے کو کہا تو میں بھی بول اٹھی
"دوپہر کا کھانا کھا کر ہی جاؤں گی۔"
"مجھے معلوم ہوتا کہ آپ آنے والی ہیں تو کوئی اچھی سی چیز پکا لیتی۔" سنبل بولی۔
"فرہاد آتا ہوگا ابھی دکان سے' اس سے مچھلیاں منگوا لو۔" شہزاد نے مشورہ دیا۔
"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" سنبل خوش ہو گئی۔
"خواہ مخواہ تکلف کر رہے ہو تم لوگ' جو گھر میں پکا تھا کھا لیتی۔" میں نے کہا پھر شہزاد کے سا
نشست گاہ کی طرف بڑھنے لگی اور دھیمی آواز میں شہزاد سے معلوم کیا۔ "پولیس والوں نے تمہیں مارا
تو نہیں تھا؟" یہ میں نے اس لئے پوچھا تھا کہ رانی نے مجھے یہی بتایا تھا۔
"خیر' مارا تو نہیں' ہاں ڈرایا دھمکایا بہت تھا۔" نشست گاہ کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے جوا
دیا' پھر کہنے لگا۔ "معلوم نہیں وہ اللہ کا کون سا بندہ تھا جس نے پولیس سے کل رات مجھے نجات دلائ
میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ کوئی شیروانی پوش تھا جو
سے ملا تک نہیں .... بیٹھئے خاتون!"
میں آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ شہزاد بھی میرے برابر والی کرسی پر آ بیٹھا تو میں نے
سے پوچھا۔ "یہ بتاؤ' تمہیں کب ہوش آیا اور پھر کیا ہوا؟"
"وہ تو خیر میں بتا ہی دوں گا خاتون! مگر وہ .... وہ رانی کا ساتھی جہانگیر اسے .... اسے
نے قتل کر دیا تھا؟ اور .... اور اس کے جسم پر لباس بھی نہیں تھا۔"
جہانگیر کی بے لباسی شہزاد کے لئے کیوں باعث تشویش تھی' یہ سمجھنا میرے لئے زیادہ مشکل
تھا۔ میں اسی لئے مسکرا کر بولی۔ "تم غلط سمجھ رہے ہو۔ نہ وہ بے لباس تھا اور نہ اسے کسی نے قتل
تھا۔ تم نے جو کچھ دیکھا' وہ فریب نظر تھا۔" میری بات سن کر شہزاد چونک اٹھا اور چہرے سے حیر
اظہار ہونے لگا۔ میں نے اپنے دروغ مصلحت آمیز کو سچ ظاہر کرنے کی غرض سے کہا۔ "کیا تم اسی گھ
پیش آنے والا واقعہ بھول گئے؟" میرا اشارہ سنبل کی طرف تھا جس کی لاش گھر کے سبھی افراد نے د
تھی۔
"تو وہ .... وہ بھی نظر بندی تھی۔" شہزاد حیرت سے بولا۔
"اگر اسے واقعی قتل کر دیا گیا ہوتا تو پولیس تمہیں اتنی آسانی سے رہا نہ کر دیتی۔" میں نے
اور دلیل دی۔
"ہاں' یہ بات بھی ہے۔" اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "مگر وہ شیروانی پوش تھا کون؟"
"اسے میں نے ہی تمہیں رہائی دلانے کے لئے بھیجا تھا۔" میں نے اسے بتا ہی دیا۔

پھر میرے استفسار پر شہزاد نے بتایا کہ اسے جب ہوش آیا تو جہانگیر کی لاش ایک اسٹریچر پر اٹھا کر
لی کے کمرے سے لے جائی جا رہی تھی۔ ہوش میں آتے ہی پولیس نے اسے حراست میں لے لیا تھا۔
زاد نے کمرے کا ٹوٹا ہوا دروازہ دیکھا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ پولیس دروازہ توڑ کر اندر داخل
ئی تھی۔ شہزاد نے پولیس کو وہی بیان دیا تھا جو میں نے اسے بتایا تھا۔ تھانے پہنچنے کے بعد جب اسے
انگیر کی لاش کا چہرہ دکھایا گیا تھا تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ جہانگیر کو نہیں جانتا۔ اس کے بعد لاش
و پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھیج دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد شہزاد نے مجھ سے عجیب
ے لہجے میں دریافت کیا۔ "تو کیا خاتون! وہ ہسپتال جا کر زندہ ہو گیا ہو گا؟"
"ممکن ہے ایسا ہی ہو یا اس کی لاش ہی غائب ہو گئی ہو' کیا کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں تو وہاں
ی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔
"آپ کل سے اب تک کہاں رہیں؟ مجھے آپ کی طرف سے بہت فکر تھی۔"
"ظاہر ہے' تم میری فکر نہیں کرو گے تو کون کرے گا .... بہرحال میں نے اپنی مستقل سکونت
ابندوبست کر لیا ہے۔ تمہیں اب اس سلسلے میں تگ و دو کی ضرورت نہیں۔"
"کب اور کہاں خاتون!" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"پہاڑ گنج میں ایک مکان میں نے آج ہی کرائے پر حاصل کر لیا ہے اور ملازمہ کا بھی انتظام ہو گیا
ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ آج ہی لے جا کر وہ مکان میں دکھا دوں گی۔"
"حیرت ہے خاتون کہ آپ نے اس شہر میں اجنبی ہونے کے باوجود یہ سب کچھ کس طرح اتنی
دی کر لیا۔"
"کل کچھ اپنے پرانے شناسا افراد سے میری ملاقات ہو گئی۔ انہی کے تعاون سے یہ سب کچھ ہوا
ہے اور انہی میں سے ایک نے تمہیں رہائی دلائی تھی۔" میں نے تنظیم کے ارکان کو اپنا پرانا شناسا ظاہر کر
کے بات بنا دی کیونکہ شہزاد کی موجودگی میں بھی وہ لوگ میرے پاس آ جا سکتے تھے۔
"چلیں یہ بہت اچھا ہوا۔" شہزاد نے اطمینان کا اظہار کیا۔
میں نے شہزاد کو چھیڑنے کی خاطر دانستہ رانی کا ذکر چھیڑ دیا تو اس کے چہرے سے شرمندگی کا اظہار
نے لگا۔
"معلوم نہیں خاتون کہ مجھے اس وقت کیا ہو گیا تھا .... ویسے وہ بڑی گندی اور بے حیا عورت
ہے۔"
میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ سنبل چائے لے کر آ گئی۔ چائے کی پیالی مجھے دیتے ہوئے اس نے
ہا۔ "فرہاد بھائی سے میں نے مچھلیاں منگوائی ہیں' تلی ہوئی کھائیں گی یا سالن ...."
"تلی ہوئی ٹھیک رہیں گی۔" مجھ سے پہلے ہی شہزاد بول اٹھا۔
"ٹھیک ہے' تل لیتی ہوں۔" یہ کہہ کر سنبل چلی گئی۔
پھر دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد شہزاد کو میں نے اپنے ساتھ لیا اور کناٹ پلیس پہنچ گئی۔ کپڑے سل

چکے تھے۔ دونوں درزیوں سے کپڑے لے کر وہیں سے میں نے ایک سوٹ کیس بھی اور خرید لیا۔ کپڑ اس سوٹ کیس میں رکھ دیئے۔ نیا سوٹ کیس میں نے اس لئے خریدا تھا کہ دونوں سوٹ کیس تقریباً بھر ہوئے تھے۔ اس کے بعد میں نے وہاں سے ٹیکسی کی اور پہاڑ گنج کے لئے روانہ ہو گئی۔

ٹیکسی کو کرائے پر حاصل کئے ہوئے اس مکان تک لے جانا' ممکن تھا کیوں کہ گلی خاصی چوڑ تھی۔ میں اسی لئے وہاں تک ٹیکسی لے گئی۔

شہزاد کو مکان بہت پسند آیا۔ دلاری سے بھی بحیثیت ملازمہ میں نے شہزاد کا تعارف کرا دیا۔ پھر شہزاد کو اپنی خواب گاہ میں لے آئی۔ میرے ساتھ شام کی چائے پی کے اور آئندہ روز آنے کے لئے کر وہ رخصت ہو گیا۔ وہ چلا گیا تو میں کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گئی کیوں کہ آج دوپہر کو کھانے کے بعد مجھے آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

☆======☆======☆

یہ اسی روز کا ذکر ہے کہ بعد مغرب دلاری جب مجھ سے کھانے کے لئے پوچھنے آئی تو اس چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے دلاری' تم کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی ہو؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"بات ہی ایسی ہے معبلہ جی!" اس نے جواب دیا۔ "رگھوویر اور سمیع اللہ پکڑے گئے ہیں۔"

"کب اور کیسے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"آج ہی شام پانچ بجے کی بات ہے۔ ان کے پاس سے ہتھیار بھی برآمد کر لئے گئے ہیں۔" دلا بتانے لگی۔ "آج ہی رات ان دونوں کو یہاں سے کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا جائے گا۔ تنظیم نگران اعلیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان دونوں کو اس سے پہلے ہی چھڑا لیا جائے۔ عشاء کے بعد یہاں سے کا ایک دستہ روانہ ہو گا۔ اس دستے کی رہنمائی سالار اکبر کو کرنا ہے۔"

"سمیع اللہ اور رگھوویر کو فی الحال جہاں رکھا گیا ہے' ظاہر ہے اس سلسلے میں معلومات حاصل گئی ہوں گی۔" میرا انداز تصدیق طلب تھا۔

"جی ہاں۔" دلاری نے بتایا۔

مجھے بھی آج رات دس بجے سالار اکبر سے ملنا تھا' مگر موجودہ ہنگامی حالات میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ دلاری سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ تنظیم کے جن ارکان کو اس مہم میں حصہ لینا تھا وہ اسی عما میں جمع ہوں گے جہاں میں نے گزشتہ رات گزاری تھی۔ ہرچند کہ براہ راست اس معاملے میں میرا تعلق نہیں تھا لیکن مجھے یہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا' کہ لاتعلق بنی رہوں۔ یوں بھی میں گرفتار ہ والے ان دونوں ارکان سے واقف تھی۔ ان میں سے رگھوویر نے شہزاد کو رہائی دلوانے میں میری تھی اور سمیع اللہ نے مجھے کرائے پر مکان دلوایا تھا۔ میرے نزدیک تنظیم ایک نیک مقصد کے لئے جد کر رہی تھی۔ تنظیم کے ارکان میرے دوست اور بہی خواہ تھے۔ مجھے اس موقع پر ان کا ساتھ دینا تھا۔ میں اسی لئے کھانا کھاتے ہی روانگی کی تیاری کرنے لگی۔ میں نے سیاہ رنگ کی ایک پینٹ اور

ب تن کر لی۔ یہ جوڑا میں نے اسی غرض سے بنوایا تھا کہ کسی ایسے ہی موقع پر کام آ سکے۔ بطور احتیاط ں نے شرٹ کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ بھی پہن لی تھی۔ یہ وہی بلٹ پروف جیکٹ تھی جو رانی نے مجھے نفے میں دی تھی۔

میں جب تیار ہو کر چلنے لگی تو دلاری نے مجھ سے معلوم کیا۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں معبلہ جی!" ں کے لہجے میں حیرت سی تھی۔

"وہیں جا رہی ہوں جہاں سب جمع ہو رہے ہیں۔ میں بھی اس مہم میں ان لوگوں کے ساتھ شرکت رنا چاہتی ہوں۔"

"مگر معبلہ جی! میرا خیال ہے کہ سالار اکبر آپ کو اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"کیوں' اس میں اجازت نہ دینے کی کیا بات ہے؟"

"آپ بہرحال ہماری مہمان ہیں۔ آپ کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔"

"میری زندگی تم لوگوں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ تم فکر نہ کرو' میں سالار اکبر سے بات کر لوں ی۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری درخواست رد نہیں کریں گے۔" میں پریقین لہجے میں بولی۔

پھر دلاری نے صرف اتنا کہا۔ "بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔"

میں اس مکان سے نکل آئی اور دو گلیاں عبور کر کے مطلوبہ عمارت کے پھاٹک تک پہنچ گئی۔ شناختی اظ ادا کرنے پر گیٹ کھل گیا اور میں اندر داخل ہو گئی۔ اس عمارت کے کانفرنس روم میں تنظیم کے ت ارکان جمع تھے۔ ان میں عادل بھی تھا۔ میری توقع کے مطابق ان سبھی کے جسموں پر سیاہ لباس نظر آ ہے تھے۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر عادل میرے قریب آ گیا اور بولا۔ "تم .... تم یہاں کیوں آ گئیں بلہ!"

"میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے' سالار اکبر تمہیں ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔" عادل نے ا۔

"وہ کہاں ہیں؟ تم مجھے ان سے ملواؤ۔" میں بولی۔

"وہ بس آنے ہی والے ہوں گے۔ میں تمہیں ان سے ملوا تو دوں گا مگر..........."

"اگر مگر کچھ نہیں۔" میں بول اٹھی۔ "میں ان سے خود بات کر لوں گی۔"

میں سمجھ رہی تھی کہ سالار اکبر کوئی عمر رسیدہ یا ادھیڑ عمر شخص ہو گا لیکن جب میری اس سے قات ہوئی تو حیران رہ گئی۔ اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ نوجوان اور صحت مند تھا۔ ل ہی نے اس سے میرا تعارف کرایا تھا۔

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" سالار اکبر نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ "مگر افسوس کہ اس وقت پ سے تفصیلی ملاقات نہیں ہو سکے گی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اس وقت میرا مقصد یہ تھا بھی نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کا پیام مل گیا تھا مجھے۔" وہ بولا۔ "مگر شاید آج رات ملاقات نہ ہو سکے۔ ملاقات کب ممکن ہے' اس سلسلے میں آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔ میری یہی کوشش ہوگی کہ جلد سے جلد تفصیلی ملاقات ہو سکے۔ اچھا' اب میں اجازت چاہوں گا۔"

سالار اکبر آگے بڑھنے والا تھا کہ میں بول اٹھی۔ "ذرا سنئے۔" پھر میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں' لیکن یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ ہماری مہمان ہیں' دوسرے یہ کہ مہم بہت خطرناک ہے۔ ہمیں آپ کی حفاظت کے احکام ملے ہیں' دیدہ و دانستہ ہم آپ کی زندگی کو کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔" سالار اکبر نے نرمی کے ساتھ انکار کر دیا۔ "میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

دلاری اور عادل سے گفتگو کر کے مجھے پہلے ہی یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ سالار اکبر آسانی سے میری بات نہیں مانے گا۔ میں نے اسی لئے ایک اور حربہ آزمایا۔ میں نے کہا۔ "تو پھر اس سے میں یہی نتیجہ اخذ کر سکتی ہوں کہ آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے خاتون! آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ اگر تنظیم کو آپ پر بھروسہ نہ ہوتا تو آپ ہماری مہمان ہی نہ ہوتیں۔ میرے انکار کا مقصد تو محض یہ ہے کہ خدا نخواستہ آپ کی زندگی خطرے میں نہ پڑ جائے۔" سالار اکبر نے مجھے سمجھانا چاہا۔

آدمی اگر خود ہی کوئی بات سمجھنا نہ چاہے تو بھلا اسے کون سمجھا سکتا ہے۔ وہ موقع زیادہ بحث و مباحثے کا نہیں تھا۔ ان لوگوں کے پاس وقت بھی کم تھا اس لئے آخرکار سالار اکبر کو میری بات ماننا ہی پڑی۔ مجھے بھی ایک سیاہ نقاب دے دی گئی' اسی کے ساتھ ایک ریوالور اور اس کی گولیاں بھی دی گئیں۔ اس کے بعد سالار اکبر نے مختصراً مہم کے بارے میں سب کو حکمت عملی سے آگاہ کیا۔ مجھ سمیت اب اس مہم میں شریک ہونے والے افراد کی تعداد نو ہو چکی تھی۔ ہم سب کو ایک بند' سیاہ وین میں انٹیلی جنس کے ہیڈ آفس تک سفر کرنا تھا جو پرانے قلعے کے قریب ایک قدیم عمارت میں واقع تھا۔ سالار اکبر' ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھا تھا اور مجھ سمیت بقیہ سات افراد اندر' وین میں تھے۔ وین کے پچھلے حصے ہی میں کینوس کے دو تھیلے بھی رکھے تھے جن میں دستی بم تھے۔

رات نو بجے کے قریب وین وہاں سے روانہ ہوئی اور پھر مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ میرے لئے اس طرح کی کسی مہم میں شرکت کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس کے باوجود میں فکرمند نہیں تھی۔ زندگی اور موت کا کھیل میرے لئے کوئی نیا نہیں تھا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا یہی کھیل کھیلتی آئی تھی۔ وین تیز رفتاری سے سفر کرتی رہی اور پھر ایک جگہ رک گئی۔ وین کو جہاں روکا گیا تھا' وہاں ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وین کا پچھلا دروازہ آہستگی سے کھولا گیا اور تمام افراد ایک ایک کر کے دبے پاؤں نیچے اتر گئے۔

منصوبے کے مطابق تمام افراد کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ تعداد کیوں کہ نو تھی اس لئے پانچ

افراد ایک طرف ہو گئے اور چار دوسری طرف۔ پانچ افراد کے گروہ کو مطلوبہ عمارت پر سامنے کے رخ سے حملہ کرنا تھا۔ بقیہ چار افراد کی ٹکڑی کو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عمارت کی عقبی سمت سے دیوار پھاند کے اندر داخل ہونا تھا۔ اطلاع کے مطابق اس عمارت میں موجود محافظوں کی تعداد بارہ تھی جن میں سے آٹھ سامنے کی طرف اور چار عقبی سمت متعین تھے۔

وین جہاں رکی تھی' وہاں سے خاصے فاصلے پر شمال میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہمیں اسی طرف جانا تھا۔ عادل اس گروہ میں شامل تھا جسے عمارت کے اندر داخل ہونا تھا۔ میں بھی اسی کے گروپ میں تھی۔ بقیہ دو ساتھیوں میں سے ایک اس عمارت کے اندرونی نقشے سے واقف تھا۔ اسی کو ہماری رہنمائی کرنا تھا۔

دور سے نظر آنے والی روشنی انٹیلی جنس کے ہیڈ آفس ہی کی تھی۔ ہم دو حصوں میں بٹ کر اس طرف روانہ ہوئے۔ کینوس کا ایک تھیلا جس میں دستی بم تھے' عادل کی پشت سے لٹکا ہوا تھا۔ ویسا ہی دوسرا تھیلا سالار اکبر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

عمارت کی عقبی سمت میں نسبتاً روشنی کم تھی۔ اس کے باوجود ہم احتیاط سے آگے بڑھتے رہے۔ عمارت کی چاردیواری جب تھوڑے فاصلے پر رہ گئی تو ہم زمین پر لیٹ کر سینے کے بل آگے بڑھنے لگے۔ ذرا ہی دیر کے بعد ہم رینگتے ہوئے دیوار کے بالکل نیچے پہنچ گئے۔ سالار اکبر کی ہدایت کے مطابق اب ہمیں سامنے کی طرف سے عمارت پر حملہ ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ ہم سب دم سادھے بے حس و حرکت دیوار سے لگے ہوئے لیٹے تھے۔ ہمیں وہاں اس حالت میں لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک پے در پے دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ حملہ کر دیا گیا تھا۔ عمارت سے جوابی فائرنگ بھی شروع ہو گئی۔ پھر نسبتاً ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ عمارت پر دستی بم پھینکا گیا تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ہمیں عمارت کے اندر داخل ہو جانا ہے اور اس بات کی علامت بھی کہ ہمارے ساتھیوں نے محافظوں کو پوری طرح الجھا لیا ہے۔

ہم چاروں اٹھ کھڑے ہوئے۔ چاردیواری پر چڑھ کر ہمیں اندر کودنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اطلاع کے مطابق جو چار محافظ عمارت کی عقبی سمت متعین تھے' ہمیں ان سے نبرد آزما نہیں ہونا پڑا۔ ہمیں یہی توقع تھی کہ عمارت پر حملے کی صورت میں وہ چاروں محافظ بھی اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے وہاں سے ہٹ جائیں گے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ سالار اکبر کا قیاس صد فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ اس عمارت کا مضبوط عقبی دروازہ بند تھا۔ عادل نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک دستی بم نکال لیا اور پھر ہمیں ادھر اُدھر' دور ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں بعد زبردست دھماکے سے عقبی دروازہ اڑ گیا۔ دستی بم دروازے پر پھینکتے ہی عادل تیزی سے پیچھے ہٹ کر زمین پر لیٹ گیا تھا۔ اس دھماکے کے ساتھ ہمارے لئے خطرہ بڑھ گیا تھا۔ عمارت کے عقبی حصے میں اس زبردست دھماکے کی وجہ سے محافظ یقیناً اس طرف متوجہ ہو جاتے۔ اسی خطرے کے پیش نظر عادل نے مجھے اور ایک ساتھی کو وہیں چھوڑا اور خود دوسرے ساتھی کے ہمراہ اڑے ہوئے دروازے سے پیدا ہونے والے خلا میں داخل ہو گیا۔ عادل جاتے جاتے ہم دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک دستی بم بھی تھما گیا تھا۔ کسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے ہم دونوں

ہی بہت چوکنا تھے۔

جس خطرے کا اندیشہ تھا' وہ چند ہی لمحوں بعد سامنے آ گیا۔ وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ہم پر جہنم کے دہانے کھول دیئے تھے۔ ہم دونوں نے بھی دیوار سے تقریباً چپک کر جوابی فائرنگ شروع کر دی اور یوں ہمارے درمیان باقاعدہ ٹھن گئی۔ یہ صورت حال ہمارے لئے خطرناک تھی۔

"تم یہیں ٹھہرو اور جوابی فائرنگ کرتے رہو' میں ان کے عقب میں پہنچ کر........"

"مگر کسی بھی وقت ہمیں یہاں سے فرار ہونا پڑا تو؟" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

"میں بس ابھی آتی ہوں۔" یہ کہتے ہی میں نے مخالف سمت فائر کیا اور پھر تیزی کے ساتھ دائیں جانب دوڑی۔

پنجوں کے بل دوڑتی ہوئی جلد ہی میں گھوم کر ان تینوں کے پیچھے پہنچ گئی جن سے فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ میں ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ پھر میں نے دیر نہیں کی۔ دستی بم کی سیفٹی پن اپنے دانتوں سے کھینچ کر میں نے بم ان کی طرف اچھال دیا اور تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ ان تینوں کے جسم فضا میں چیتھڑے ہو کر بکھر گئے۔ اسی کے ساتھ چاردیواری کا ایک حصہ بھی اڑ گیا تھا۔ میں واپسی کے لئے بھاگ رہی تھی کہ اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر دیکھا۔ کچھ ہی فاصلے پر میں نے ایک شخص کو گھٹنوں کے بل بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور رائفل کی نال میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ مجھی پر فائر کرنے والا تھا۔ بھاگتے ہوئے رک کر میں مڑی اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ریوالور نے آگ اگل دی۔ عین اسی لمحے میرے جسم کو دھکا لگا اور میں لڑکھڑا گئی۔ ہم دونوں نے بیک لمحہ ایک دوسرے پر گولیاں چلائی تھیں۔ اس نے میرے سینے کا نشانہ لیا تھا اور میں نے اس کے سر پر گولی چلائی تھی۔ سر پر گولی لگتے ہی وہ دوسری طرف الٹ گیا تھا۔ اس کے سر کے پرخچے اڑ گئے تھے مگر بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے میں بچ گئی تھی ورنہ میرا حشر بھی اس سے مختلف نہ ہوتا یا اگر اس نے میرے سینے کو نشانہ بنانے کی بجائے سر کو نشانہ بنایا ہوتا تو بھی میرا زندہ بچ جانا محال تھا۔ میرے ہاتھوں سفر آخرت پر روانہ ہونے والا وہ چوتھا وردی پوش تھا۔

جب میں پلٹ کر اپنے ساتھی تک پہنچی تو عادل کے ساتھ مزید تین افراد کو عمارت کے اندر سے باہر آتے دیکھا۔ یقیناً اس کے ساتھ وہ دونوں افراد بھی تھے جنہیں رہائی دلانا مقصود تھی۔

پھر ہمیں اس عمارت کی چاردیواری سے نکلنے میں دیر نہیں لگی۔ ہماری مہم کامیاب رہی تھی۔ عمارت سے باہر آتے ہی عادل نے اپنی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی تھی۔ فائرنگ اب بھی ہو رہی تھی مگر اس میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔

سیٹی بجنے کے کچھ ہی دیر بعد فائرنگ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی۔ ہم اس طرف واپس ہو رہے تھے جہاں سیاہ وین کو چھوڑ کر آئے تھے۔ واپسی کے اس سفر میں بھی ہم پوری طرح چوکنا اور محتاط تھے۔ ہمارا تعاقب کر کے ہم پر پیچھے سے حملہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی تھا کیونکہ دشمن پر ہم نے بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ وہ فوری طور پر سنبھلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس معرکے میں

چار محافظ تو میرے ہی ہاتھوں مارے گئے تھے۔ بارہ محافظوں میں سے کتنے اور کام آئے تھے یا زخمی ہوئے تھے' ابھی علم نہیں تھا۔ ہماری چار نفری پارٹی میں کسی کو ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی مگر دوسری پانچ رکنی پارٹی کے بارے میں ابھی ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس پر کیا گزری۔ وہ لوگ بھی وین تک پہنچ جاتے تبھی صورت حال واضح ہوتی۔

ہم وین تک پہنچ کر باہر ہی کھڑے ہو کے دوسری پارٹی کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ ان لوگوں کو بھی وین تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ تب معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک کے شانے میں گولی لگی تھی۔ گولی شانے کو زخمی کرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اخراج خون کو روکنے کے لئے اس شخص کے شانے پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ سالار اکبر سے معلوم ہوا کہ دو محافظ ان کی پارٹی کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ ان دونوں کے سینے اور سر پر گولیاں لگی تھیں اور انہیں گرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اندازہ تھا کہ چند محافظ زخمی بھی ہوئے تھے۔ یوں گویا بارہ محافظوں میں سے چھ مارے گئے تھے' یعنی ہمارے دشمن کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جس مقصد کی خاطر انٹیلی جنس ہیڈ آفس پر حملہ کیا گیا تھا وہ کامیاب رہا تھا۔ تنظیم نے دشمن کی قید سے اپنے دونوں ارکان کو رہا کرا لیا تھا۔

وین میں فرسٹ ایڈ بکس بھی موجود تھا۔ راستے ہی میں زخمی رکن کے شانے کی ڈریسنگ کر دی گئی۔

اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے جب وین پہاڑ گنج والی عمارت کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔

سالار اکبر نے اس مہم میں میری شرکت پر شکریہ ادا کیا۔ ہم سب اس وقت کانفرنس روم میں جمع تھے اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ ایک پارٹی' دوسری پارٹی کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کر رہی تھی۔ اسی دوران میں میرے ہاتھوں مارے جانے والے محافظوں کا ذکر بھی آیا۔ اس پر سالار اکبر بولا۔ "معبلہ نے یقیناً اس معرکے میں بے مثال جرأت و بہادری کا ثبوت دیا۔ ہم سبھی ان کے ممنون ہیں۔ عقبی سمت میں متوجہ ہو جانے والے محافظوں کو یہ اگر ٹھکانے نہ لگاتیں تو ممکن ہے صورت حال مختلف ہوتی۔ پھر شاید ہم لوگ اتنی آسانی کے ساتھ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہوتے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ستائشی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اصل کارنامہ میں نے نہیں' عادل نے انجام دیا ہے۔" میں بول اٹھی۔ "یہی تو عقبی دروازے کو بم سے اڑا کر عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے تھے اور قیدی ساتھیوں کو وہاں سے نکال کر لائے تھے۔ میں نے تو جو کچھ کیا' محض اپنی جان بچانے کے لئے کیا تھا۔"

"بالکل نہیں۔" عادل نے کہا۔ "اگر واپسی میں راستہ صاف نہ ملتا اور تم اس طرف آنے والے محافظوں کو پہلے ہی ہلاک نہ کر چکی ہوتیں تو بقول سالار اکبر' ہم بآسانی وہاں سے فرار نہ ہو پاتے۔ تمہارا فعل قطعی طور پر صرف اپنی جان بچانے کے لئے نہیں تھا۔"

"بہرحال جو کچھ بھی ہے' میں اس مہم کی کامیابی پر سالار اکبر اور تنظیم سے بقیہ ارکان کو مبارک باد

دیتی ہوں۔ دراصل اس مہم کی کامیابی کا سبب سالار اکبر کی بہترین منصوبہ بندی تھی۔ منصوبے پر عمل درآمد سے قطع نظر صحیح معنوں میں سالار اکبر کی مناسب پلاننگ نے آپ لوگوں کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔" میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"معبلہ! آپ نے اس نازک موقع پر ہمارا ساتھ دے کر ہمارے دلوں میں اپنے لئے مزید جگہ بنالی ہے۔ ہم لوگ اگر آپ کے کسی کام آسکے تو ہمیں بے حد خوشی ہو گی۔" سالار اکبر بولا۔

"فی الحال تو یہ بتا دیں کہ آپ سے تفصیلی ملاقات کب ممکن ہے؟" میں نے موقع غنیمت جان کر پوچھ لیا۔

"اس وقت تو خیر ملاقات ممکن نہیں کیوں کہ خاصی رات ہو چکی ہے۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ یہ کہ میں یہاں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتا۔ مجھے اپنے نگران اعلیٰ کو موجودہ مہم کی رپورٹ بھی پیش کرنا ہے۔ ایسی صورت میں کل ہی ملاقات ممکن ہے۔ یہ بتائیں کہ آپ صبح کتنے بجے تک سو کر اٹھ جاتی ہیں؟"

"اس کا انحصار رات کو سونے پر ہے۔" میں مسکرا کر بولی۔ "ویسے عموماً میں صبح سویرے ہی اٹھ جاتی ہوں۔"

"تو پھر کل صبح دس بجے کا وقت رکھ لیجئے۔ میں حاضر ہو جاؤں گا' یہیں اسی عمارت میں۔ آپ یہیں ٹھہری ہیں اس لئے یہی مناسب رہے گا۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی عادل نے سالار اکبر کو بتا دیا کہ اپنی سکونت کے لئے میں نے اسی علاقے میں کرائے پر ایک مکان لے لیا ہے۔

"آپ یہیں قیام کرتیں تو میرے خیال میں زیادہ مناسب تھا۔" سالار اکبر نے میری طرف نگاہ اٹھائی۔

"یہ زیادہ بہتر ہے کہ میں آپ لوگوں کے قریب بھی رہوں اور دور بھی۔ اس کا سبب میں' عادل سے بیان کر چکی ہوں۔"

پھر سالار اکبر رخصت ہو گیا اور میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ عادل مجھے گھر تک چھوڑنے آیا اور دروازے ہی سے لوٹ گیا۔ دلاری اس وقت تک میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اسے میں نے مہم کی کامیابی سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر بہار سی آگئی۔ میں اس کے بعد اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں نے پینٹ شرٹ اتار کر سلیپنگ گاؤن پہن لیا۔ کافی دن بعد رات کو سوتے وقت سلیپنگ گاؤن پہن کر مجھے سکون سا محسوس ہوا۔

ابھی مجھے بستر پر دراز ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ یوں لگا جیسے میرے کمرے کے سامنے سے کوئی دبے پاؤں گزرا ہو۔ میرے کمرے کے بعد جو کمرہ تھا اس میں دلاری تھی۔ جب میں اپنے کمرے میں داخل ہو رہی تھی تو دلاری برابر والے کمرے میں جا چکی تھی۔ دلاری جب اپنے کمرے میں ہے تو پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ قدموں کی چاپ اب دور ہوتے ہوتے معدوم ہو چکی تھی۔ تجسس کے

زیر اثر میں آہستگی کے ساتھ بستر سے اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ دانستہ میں نے دروازہ تھوڑا ہی سا کھولا تھا۔ باہر تاریکی تھی۔

معاً ایک مانوس سرگوشی سن کر میں چونک اٹھی۔ "تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا سلیم!" یہ نسوانی سرگوشی دلاری ہی کی تھی۔

"لیکن میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں جسے تمہارے بغیر قرار ہی نہیں آتا۔" یہ کسی مرد کی آواز تھی۔ "ایسا پہلی بار تو نہیں ہو رہا۔ اس عمارت میں بھی تو میں تم سے راتوں کو ملنے آتا تھا۔"

"آہستہ بولو۔" دلاری کی تیز سرگوشی ابھری۔ "وہاں کی بات اور تھی' تم فوراً واپس چلے جاؤ۔"

"اب میں آ ہی گیا ہوں تو اس طرح .... اس طرح کیسے واپس چلا جاؤں۔ آؤ .... آؤ میرے قریب آ جاؤ دلاری!"

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے سلیم! .... کیا تم سے چند روز صبر نہیں ہو سکتا؟" دلاری کے لہجے میں احتجاج تھا۔

اسی وقت میں نے قدموں کی چاپ سنی۔ شاید وہ شخص کمرے کا دروازہ بند کرنے آ رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ جلدی سے بھیڑ دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ شخص اگر میرے کمرے کی طرف نظر ڈالے تو اسے دروازہ کھلا نظر آئے۔ پھر مجھے کنڈی لگائے جانے کی آواز سنائی دی۔

میں نے جو کچھ سنا تھا' اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ رات کے اس پہر دلاری کے پاس آنے والا کون ہو سکتا تھا۔ مجھے اس معاملے سے لاتعلق ہی رہنا چاہئے' یہ سوچ کر میں نے آہستگی کے ساتھ اپنے کمرے کی چٹخنی لگا دی اور دوبارہ بستر پر آ کے لیٹ گئی۔ متوسط عمر کی وہ عورت دلاری بھی کسی کے عشق میں مبتلا ہو گی' یہ میرے لئے اطلاع ہی تھی۔ بظاہر اس عورت سے میرا کوئی قریبی تعلق نہیں تھا' پھر بھی مجھے اس کی یہ بے راہ روی کچھ اچھی نہیں لگی۔

"ہو گا' مجھے کیا؟" میں بڑبڑائی اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔

بظاہر بے چینی کا کوئی سبب نہیں تھا۔ ہاں' دلاری کے آشنا کا وہاں آنا ضرور خلاف معمول تھا۔ اس کے باوجود کوئی خطرے کی بات نہیں تھی کیوں کہ میرے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بے چینی کی جگہ رفتہ رفتہ غنودگی نے لے لی۔ میری پلکیں بوجھل ہوتے ہوئے بند ہو گئیں۔

میرے ذہن پر ابھی پوری طرح غنودگی کا غلبہ نہیں ہوا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے جسم کو جھنجھوڑ دیا ہو۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ عین اسی وقت میری نگاہ دروازے کی طرف اٹھی۔ چٹخنی خود بخود کھل رہی تھی۔ خطرہ' یہی ایک لفظ بار بار میرے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ میں نے بستر سے اٹھنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ میرے اعصاب تقریباً شل تھے۔ چند ہی لمحے بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک اجنبی شخص کو میں نے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ ہلکے نیلے بلب کی مدھم روشنی کے باوجود اس شخص کا چہرہ بڑی حد تک مجھے نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے لئے اجنبی ہی تھا۔ میں نے ایک بار پھر اٹھنے کی

کوشش کی۔ اپنے جسم کی پوری قوت صرف کرنے کے باوجود میں تھوڑی سی اٹھی تو ضرور لیکن دوبارہ بستر پر گر گئی۔ میرے جسم پر جیسے منوں بوجھ تھا جو مجھے اٹھنے سے روک رہا تھا۔ میں بستر پر گر کے لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

میں نے اسی دوران اس اجنبی شخص کو اپنی مسہری کی طرف بڑھتے دیکھا۔

"رک جاؤ۔" میں پوری قوت سے چیخ اٹھی۔ مجھے یہ جان کر قدرے اطمینان ہوا کہ میری قوتِ گویائی بحال تھی۔ میں نے اس شخص سے سوال کیا۔ "کون ہو تم؟"

"ارے معبلہ! تم نے مجھے نہیں پہچانا؟" ایک آشنا آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اسی کے ساتھ اسی اجنبی شخص کے چہرے کے خطوط بدلنے لگے۔

"احرس!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں میں تمہارا احرس ہوں۔" اس نے بدستور میری طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

یہ احرس نہیں ہے۔ کسی نے جیسے میرے وجود میں سرگوشی کی۔ احرس تو وادی سبز میں ہے۔ وہ یہاں کس طرح آ سکتا ہے۔

"تم .... تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم احرس نہیں ہو سکتے۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"تو پھر کیا تمہاری نظریں تمہیں دھوکا دے رہی ہیں؟ کیا تمہیں میرا چہرہ نظر نہیں آ رہا؟"

"یہ .... یہ فریب نظر ہے۔" میں نے زور دے کر بولی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ فریب نظر فریب سماعت کے دوران مجھے فریب دہی کا احساس ہو گیا تھا۔

اس وقت تک وہ اجنبی میری مسہری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میرا چہرہ غور سے دیکھو۔" وہ میرے اوپر جھکا۔ آواز احرس ہی کی تھی لیکن پُراسرار شیطانی قوتوں کے مالک میرے دشمنوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ میرے ساتھ فریب دہی کے ایسے کھیل پہلے بھی کھیلتے رہے تھے۔ اس شخص نے جس کا چہرہ قطعی احرس کا چہرہ نظر آ رہا تھا' میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور خواب ناک سی آواز میں بولا۔ "معبلہ! اب تو تم نے اپنے احرس کو پہچان لیا۔" پھر وہ میرے ہی قریب بستر پر دراز ہو گیا۔

یہ احساس ہونے کے باوجود کہ وہ احرس نہیں کوئی اجنبی ہے' میرے لہو کی گردش تیز ہونے لگی۔ شاید یہ بھی اسی سحر کا اثر تھا' میں اس وقت جس کے زیر اثر تھی۔ اگر یہ دھوکا بھی تھا تو بڑا حسین دھوکا تھا۔

"احرس!" میرے ہونٹوں سے سسکی سی ابھری۔

"معبلہ!" اس نے بھی میرے جذبات کا ساتھ دیا۔

"سلیم!" اچانک ایک آواز کا بھاری پتھر میری سماعت پر گرا۔ اسی کے ساتھ میرے اعصاب کی نادیدہ آہنی گرفت سے آزاد ہو گئے۔ وہ چہرہ جو میرے بہت قریب تھا' اس کے خدوخال بدل گئے۔ اب وہ چہرہ میرے لئے آشنا نہیں' قطعی اجنبی تھا۔

دلاری نے کمرے میں داخل ہوتے ہی شاید تیز بلب جلا دیا تھا۔ سوئچ دروازے کے قریب ہی تھا۔ تیز روشنی کے سبب ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی۔ میں بستر پر ایک اجنبی شخص کے ساتھ جس حالت میں تھی' اس سے مجھے سخت شرمندگی محسوس ہوئی۔

"سلیم!" دلاری نے ایک بار پھر اس اجنبی کو مخاطب کیا۔ "تم یہاں .... یہاں کس طرح آ گئے؟"

اس شخص کے چہرے سے حیرت اور کسی قدر گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ بولا۔ "مجھے .... مجھے خود .... خود حیرت ہے۔ مم .... میں تو تمہارے .... تمہارے پاس تھا۔ معلوم نہیں میں .... میں کیسے یہاں آ گیا؟" اس کے لہجے سے نمایاں طور پر واضح ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ "مم .... میں تو انہیں جانتا .... جانتا بھی نہیں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

اب میں نے بھی بڑی حد تک اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

"یہ سب کیا ہے دلاری!" میں ہمت کر کے بولی۔ "یہ صاحب کون ہیں؟" پھر مجھے یاد آیا کہ میرے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دلاری نے کیا منظر دیکھا تھا' وہ شرمناک منظر جس کا حصہ میں بھی تھی۔ اسی خجالت سے بچنے کی خاطر میں نے بات بنائی۔ "میری آنکھ تو ابھی تمہاری آواز سے کھلی ہے۔ میں تو گہری نیند سو رہی تھی۔ آنکھ کھلی تو .... تو ان صاحب کو یہاں اپنے قریب موجود پایا۔ حیرت ہے کہ یہ کب اور کیسے میرے کمرے میں آ گئے۔" یہ کہتے ہوئے میں بستر سے اتر کر قریب ہی پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف بڑھی۔ پھر میں نے اس اجنبی اور دلاری کو بھی کرسیوں پر آ کر بیٹھنے کے لئے کہا۔

وہ شخص جسے دلاری نے سلیم کے نام سے پکارا تھا' مجرموں کی طرح سر جھکائے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دلاری بھی آگے بڑھ کر ایک کرسی پر آ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر بھی شرمندگی کے آثار تھے۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ سب کچھ لعنتی چمپا کا کیا دھرا ہے۔ اس کے باوجود میں کم از کم دلاری کی نظر میں اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ آئندہ کے لئے بھی ایسی صورت حال پیدا کرنا میرا مقصد تھا کہ وہ اجنبی شخص سلیم' دلاری سے ملنے وہاں نہ آ سکے۔ نہ وہ آج رات آیا ہوتا نہ چمپا اسے آلہ کار بنا کر میرے خلاف استعمال کرتی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی' دلاری بول اٹھی۔ "معبلہ جی! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔" اس کے بعد دلاری مجھے سلیم کے بارے میں بتانے لگی' وہ جو مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔ سلیم اس کا محبوب تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "بھگوان کو ساکھی (گواہ) بنا کے میں نے سلیم کو اپنا پتی سوئیکار کر لیا ہے۔ ہر دھرم میں پتی اور پتنی کو ایک دوسرے پر ادھیکار ہوتا ہے۔ سو ہم نے بھی ایک دوسرے کا یہ ادھیکار مان لیا ہے۔ ہم اسے پاپ نہیں پُن جانتے ہیں۔ میرا من اور تن دونوں ہی سلیم کے ہیں۔ ہمارے اس ملاپ کو بیس برس ہو گئے ہیں۔ سماج نے ہمارے بیچ دھرم کی جو دیوار کھڑی کر دی تھی' ہم اس دیوار کو برسوں پہلے گرا چکے ہیں۔

سلیم بھی میری ہی طرح تنظیم کا ایک رکن ہے۔ ہم دونوں کا مقصد ایک ہے۔ ہم ایک ہیں۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے معبلہ جی کہ میں نے اپنے علاوہ سلیم کو کسی اور عورت کے ساتھ دیکھا ہو اور مجھے اس پر بڑی حیرانی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"لیکن جب یہ تم سے ملنے آئے تھے اور تمہارے ہی پاس تھے تو پھر میرے کمرے میں کس طرح آ گئے؟" میں نے سوال کیا۔

"معبلہ جی! مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اچانک میرے ذہن پر غنودگی چھا گئی تھی۔" دلاری بتانے لگی۔ "پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے سلیم کو نہیں دیکھا۔ میں اپنے کمرے سے سلیم کو تلاش کرنے باہر نکلی تو آپ کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھا۔ کھلے ہوئے دروازے ہی سے مجھے اندر کا منظر نظر آ گیا۔ سلیم کو میں نے آپ کے بستر پر دیکھا اور پھر کمرے میں گھستے ہی تیز بلب جلا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ کو معلوم ہی ہے۔" یہ کہہ کر دلاری نے سلیم کو مخاطب کیا۔ "اب تم بتاؤ سلیم کہ یہاں معبلہ جی کے کمرے میں کیوں آ گئے؟ تم مجھے وہیں سوتا ہوا کیوں چھوڑ آئے؟ تم تو میرے کمرے میں میرے پاس تھے۔"

"دلاری!" سلیم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "خدا گواہ ہے کہ مجھے کچھ خبر نہیں' میں کب اور کس طرح اس کمرے میں آ گیا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ .... یہ سوئی ہوئی ہیں اور نہ یہ معلوم تھا' تمہاری جگہ کوئی اور ہے۔ میں تو اس وقت چونکا جب تم نے مجھے آواز دی۔ پھر بھی لاعلمی اور بے خبری کے باوجود مجھ سے جو قصور ہوا' میں اس پر سخت شرمندہ ہوں۔" پھر وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ "خاتون! مجھے معاف کر دیجئے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

جو کچھ ہوا تھا یا ہونے والا تھا اس میں سلیم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اسے تو لعنتی چمپا نے اپنا آلہ کار بنایا تھا۔ وہی نہیں خود میں بھی فریب نظر اور فریب سماعت کا شکار ہو گئی تھی۔ اگر بروقت دلاری بیدار نہ ہو جاتی تو شاید چمپا کا وار کارگر ہو جاتا۔ دلاری کا بروقت بیدار ہو جانا اور میرے اعصاب کا ایک آہنی گرفت سے آزاد ہو جانا بھی بلا سبب نہیں ہو سکتا تھا ورنہ تو میں قطعی بے بس ہو چکی تھی۔ عین وقت پر صورت حال بدل جانا اس طرف اشارہ کر رہا تھا کہ شر کے مقابلے میں خیر کی قوتوں نے مجھے بچا لیا تھا۔

اب تک سلیم مجھے ملتجی نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد سلیم کی بجائے میں نے دلاری کو مخاطب کیا۔ "میرا خیال ہے دلاری کہ انہوں نے دانستہ مجھ پر دست درازی نہیں کی۔ کسی شدید غلط فہمی کے سبب ایسا ہوا ہے۔ میں اسی لئے انہیں قصوروار نہیں سمجھتی۔ بہرحال جو کچھ ہوا' اسے بھول جاؤ۔ ہاں' آئندہ کے لئے ضرور یہ سوچنا پڑے گا کہ ایسا نہ ہو اور اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔" یہ کہہ کر میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "وہ صورت یہ ہے کہ آئندہ یہ اس گھر میں قدم نہ رکھیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" دلاری فوراً بول اٹھی۔ "معبلہ جی! میں آپ کی آبھاری (شکرگزار) ہوں کہ اتنے بڑے واقعے کے باوجود آپ نے سلیم کو معاف کر دیا۔ آپ کے حکم کے انوسار (مطابق) سلیم اب یہاں نہیں آئے گا۔" یہ کہتے ہی اس نے تصدیق طلب نظروں سے سلیم کی طرف دیکھا جس کا سر جھکا ہوا تھا۔

سلیم نے دلاری کو اپنی طرف متوجہ پا کر سر اٹھایا اور پھر بھاری آواز میں بولا۔ "بہتر ہے' جب تک تم یہاں ہو' میں نہیں آؤں گا۔" اس کے بعد سلیم نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اچھا دلاری! اب تم جاؤ۔" میں یہ کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید شرمندگی کے احساس ہی کی وجہ سے میں نے اب تک براہ راست سلیم کو مخاطب نہیں کیا تھا۔

"آؤ سلیم! میں تمہیں چھوڑ آؤں۔" دلاری بھی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

سلیم نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں کی تھی۔ پھر جب وہ دلاری کے ساتھ کمرے کے دروازے تک پہنچا تھا تو جانے کیوں اس نے ایک بار میری طرف مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کا یوں مڑ کر دیکھنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگا تھا مگر میں برداشت کر گئی تھی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ یقیناً اس پر میرے حُسن کا جادو چل چکا ہے۔ عمر میں وہ مجھ سے دوگنا ہی ہو گا' مگر جس عورت کو مرد اپنی آغوش میں لے چکا ہو اس کی اور اپنی عمر کے فرق کو بھول جاتا ہے۔ پھر بھی میں یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ اب وہ نہیں آئے گا۔ میرے اس قدر قریب آ جانے والوں میں کم ہی مرد ایسے تھے جو زندہ بچ گئے ہوں۔

دلاری اور سلیم چلے گئے تو میں نے اٹھ کر تیز روشنی والا بلب بجھا دیا۔ اب کمرے میں صرف ہلکے نیلے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہرچند کہ سلیم کے جانے کے بعد گھر میں اب صرف دلاری ہی رہ جاتی' پھر بھی میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لینا ضروری سمجھا۔

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح جب میں نہا کر باتھ روم سے نکلی تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میری روح سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ ایسی تازگی و شادابی میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ شاید یہ اسی خواب کے سبب تھا جو رات کو مجھے نظر آیا تھا۔ دلاری نے ناشتہ لگایا تو وہ بھی مجھے نکھری نکھری سی دکھائی دی۔ اس کے دراز گیسو شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ بالوں کی ہلکی سی نمی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھی کچھ دیر پہلے نہائی تھی۔

ناشتے کے بعد سلیپنگ گاؤن اتار کر میں نے شلوار سوٹ پہن لیا۔ میں اپنے کمرے سے نکلی تو دلاری نے تعریف کی۔ "آپ اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں معبلہ جی!"

"سب تمہارا حُسن نظر ہے۔" میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "تم بھی آج بہت کھلی کھلی نظر آ رہی ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کل رات پیا جی کے درشن جو ہو گئے تھے۔" میں نے دانستہ پیا ملن کی بجائے صرف درشن پر اکتفا کیا تھا۔ پھر بھی دلاری کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔

"معبلہ جی! آپ سے ایک پرارتھنا ہے کہ میرے اور سلیم کے رشتے میں کسی کو کچھ نہ بتایئے گا۔" دلاری نے مجھ سے درخواست کی۔

"مطمئن رہو' میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گی۔ تمہارا راز' راز ہی رہے گا۔" میں نے وعدہ کر لیا۔

"دھنیہ واد۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرا شکریہ ادا کیا۔

اس وقت تک صبح کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ دس بجے تک مجھے تنظیم کی عمارت میں سالار اکبر سے ملاقات کرنا تھی۔ میں اسی لئے وہاں سے چل دی۔ دلاری کو میں نے بتا دیا تھا کہ کہاں جا رہی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میری غیر موجودگی میں اگر شہزاد آ جائے تو اسے بٹھا لے۔ اس بات کا امکان تھا کہ شہزاد صبح ہی آ جاتا۔ ویسے بھی دہلی میں اسے کوئی کام نہیں تھا۔

تنظیم کی عمارت تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں اندر پہنچی تو رگھوویر اور سمیع اللہ کو بھی وہیں دیکھا۔ گزشتہ رات کی مہم میں انہی دونوں کو رہا کرایا گیا تھا۔ عارضی طور پر شاید ان دونوں نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی' مگر میں نے اس ضمن میں ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ علیک سلیک کے بعد رگھوویر نے مجھے کانفرنس روم میں پہنچا دیا۔ اسے علم تھا کہ آج مجھے وہاں سالار اکبر سے ملنا ہے۔ میں تنہائی محسوس نہ کروں' شاید اس خیال سے رگھوویر وہیں رک گیا۔ ابھی دس نہیں بجے تھے۔

"انہوں نے قید کے دوران تم دونوں پر تشدد تو نہیں کیا؟" میں نے یوں ہی وقت گزاری کے خیال سے پوچھ لیا۔

"نہیں' ابھی ہم دونوں سے پوچھ گچھ شروع نہیں کی گئی تھی۔" رگھوویر نے جواب دیا۔ "پوچھ گچھ کرتے تو یقیناً تشدد کی نوبت بھی آتی۔"

"وہاں سے تم دونوں کو کہیں اور منتقل کرنے کے بعد غالباً پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کیا جاتا۔" میں نے خیال آرائی کی۔

"آپ کا خیال درست ہی معلوم ہوتا ہے۔" اس نے میری رائے سے اتفاق کیا۔

سالار اکبر کے آنے تک ہم دونوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے' وہ آ گیا تو رگھوویر میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

"جی معظمہ! اب بتایئے آپ مجھ سے کس سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتی تھیں؟" سالار اکبر نے مجھے مخاطب کیا۔

"مجھے دراصل دو اعلیٰ انگریز حکام کے متعلق ضروری معلومات درکار ہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تنظیم نے کوئی نیا شعبہ قائم کیا ہے جس کے سالار آپ ہیں۔ اس شعبے کا کام یہ ہے کہ تنظیم کے خلاف اٹھائے جانے والے حکومتی اقدامات پر نظر رکھے۔ تنظیم کے خلاف حکومت کی مختلف ایجنسیاں سرگرم عمل ہو سکتی ہیں جن میں پولیس' انٹیلی جنس وغیرہ شامل ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ سیکرٹ سروس یا ملٹری انٹیلی جنس بھی اس میں شامل ہیں یا نہیں' کیوں کہ بظاہر ان دونوں اداروں کی حدود کار ذرا مختلف ہیں۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ اب تک اس طرح کے شواہد نہیں ملے کہ پولیس یا انٹیلی جنس کے علاوہ بھی کوئی اور ایجنسی ہمارے خلاف حرکت میں آئی ہو۔" سالار اکبر نے بتایا۔

"تو پھر آپ ان دونوں کے اقدامات ہی پر نظر رکھتے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سیکرٹ سروس یا ملٹری انٹیلی جنس کے متعلق آپ کو کچھ علم نہیں ہو گا۔" میں بولی۔

"علم سے کیا مراد ہے آپ کی؟" سالار اکبر نے دریافت کیا۔

"مثلاً یہ کہ مذکورہ دونوں اداروں کے سربراہ کون ہیں؟"

"جی ہاں' ہمیں اس کا علم نہیں کیوں کہ یہ معلوم کرنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی لیکن یہ سب کچھ کیوں معلوم کر رہی ہیں' کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟"

"وجہ تو ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر کوئی وجہ نہ ہوتی تو میں یہ ذکر ہی نہ چھیڑتی۔"

"اگر وجہ معلوم ہو جائے تو شاید ہم بہتر طور پر کسی نتیجے تک پہنچ سکیں' مگر میں اس سلسلے میں وجہ بتانے پر اصرار نہیں کروں گا۔"

کچھ دیر میں سوچتی رہی کہ سالار اکبر کو وجہ بتائی جائے یا نہیں' یہ بات ارشاد حسین کے علم میں تھی۔ وہ بھی تنظیم ہی کا ایک رکن تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں نے کلکتے سے دہلی کا رخ کیوں کیا۔ جب ارشاد حسین کو اعتماد میں لیا جا سکتا تھا تو پھر سالار اکبر کو بھی وجہ بتائی جا سکتی تھی۔

"ڈیسوزا کے اغوا کا علم تو آپ کو ہو گا ہی؟ تنظیم کے ارکان کی رہائی کے علاوہ بھی اس کے اغوا کا اور مقصد تھا۔" میں نے بات شروع کی۔

"یہ تو مجھے معلوم ہے کہ اس کے اغوا میں آپ ہی کا ہاتھ تھا' مگر تنظیم کے ارکان کی رہائی کے علاوہ اس کے اغوا کا اور کیا مقصد تھا' اس سے میں بے خبر ہوں۔" سالار اکبر بولا۔

"بات دراصل یہ ہے سالار اکبر کہ طویل عرصے سے انٹیلی جنس والے میری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں اس سے لاعلم تھی کہ وجہ کیا ہے۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ پھر مختصراً میں نے سالار اکبر کو حالات سے آگاہ کر دیا۔ "کافی تلاش و جستجو کے بعد جب اس کا سبب معلوم نہ ہو سکا تو میں نے کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ آپ ہی کی تنظیم کے ایک رکن ارشاد حسین سے مجھے بنگال کے انٹیلی جنس کے سربراہ ڈیسوزا کا علم ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ ڈیسوزا کو ضرور علم ہو گا کہ اس کا محکمہ مجھ پر کیوں نظر رکھے ہوئے ہے۔ اسی غرض سے میں نے ڈیسوزا کو اغوا کرایا کہ اس سے نگرانی کی وجہ معلوم کی جا سکے۔ میں نے اس سے پہلے ارشاد حسین کو یہ مشورہ دیا تھا کہ تنظیم بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے زیر حراست ارکان کو رہا کرا لے۔ بہرحال' اس ضمن میں تفصیلات کا علم آپ کو ہو گا ہی؟ ڈیسوزا سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں جو کچھ معلوم ہوا' وہ حیران کن تھا اس لئے کہ خود اسے بھی اصل حقائق کا علم نہیں تھا۔ اس کی ڈور یہاں دارالحکومت کے دو اعلیٰ انگریز حکام کے ہاتھ میں تھی۔ ڈیسوزا انہی کے حکم پر میرے متعلق نگرانی کرا رہا تھا۔ یہ دونوں اعلیٰ حکام براہ راست وائسرائے کو جواب دہ ہیں۔ ان میں سے ایک سیکرٹ سروس کا سربراہ ولیم رائٹ ہے اور دوسرا ملٹری انٹیلی جنس کا چیف رابرٹ ہیم ہے۔ میں انہی دونوں کے بارے میں تفصیلی معلومات چاہتی ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟"

میری بات سن کر سالار اکبر کچھ دیر خاموش رہا' پھر کہنے لگا۔ "ان دونوں ایجنسیوں سے اب تک ہم کا واسطہ نہیں پڑا۔ اس کے باوجود دونوں محکموں کے سربراہوں کے متعلق ضروری معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں' مگر ظاہر ہے اس میں کچھ وقت لگے گا۔ آپ ان دونوں کے بارے میں کیا معلومات چاہتی

ہیں؟"

"ان دونوں کے اوقات کار' دفاتر کا محل وقوع' روزانہ کی مصروفیات' جائے سکونت وغیرہ' ہم کچھ معلوم کرنا ہے۔ ان کے حلقہ احباب میں کون لوگ ہیں' جہاں ان کا قیام ہے' وہاں اور کتنے افراد رہتے ہیں' حفاظتی انتظامات کی کیا صورت ہے وہاں؟" میں نے بتایا۔

"کہیں آپ ڈیسوزا کی طرح ان دونوں کو بھی تو اغوا کرانے کے بارے میں نہیں سوچ رہیں؟" سالار اکبر نے سوال کیا۔

"ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا۔ کیا خبر کیا صورت پیش آئے۔ ضروری نہیں کہ انہیں اغوا کرانا آسان ہو۔ میرا مقصد تو محض یہ معلوم کرنا ہے کہ حکومت کے اعلیٰ افسران میرے متعلق کیوں چھان بین کر رہے ہیں اور اس سے ان کا کیا مقصد ہے؟" میں نے کہا۔

"اس سے کم از کم آپ کی اہمیت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔" سالار اکبر معنی خیز لہجے میں بولا۔ "آپ حکومت وقت کی نظر میں بہت اہم ہیں' اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آج تک آپ کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی' نہ براہ راست آپ پر ہاتھ ڈالا گیا۔ اس کے برعکس جب بھی آپ کی طرف سے کوئی جارحانہ قدم اٹھایا گیا' حکومت نے پسپائی اختیار کر لی۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ بہرحال ہو گی جس کا اندازہ خود آپ ہی کو ہو سکتا ہے۔"

"میں اس سلسلے میں اب تک کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکی۔" میں نے بلاجھجک کہہ دیا۔ "میں تو خود اندھیرے میں ہوں۔"

"یہ بڑی عجیب سی اور حیران کن بات ہے۔" سالار اکبر نے کہا' پھر چند لمحے توقف کے بعد کہنے لگا۔ "ممکن ہے اس بات کا تعلق آپ کے ماضی سے ہو۔"

گفتگو اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جہاں سے میری شخصیت کے اسرار کی حدود شروع ہوتی تھیں۔ میں نے اسی لئے موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر کہا۔ "حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پس پردہ کیا ہے' میں بہرحال یہ چاہتی ہوں کہ جس قدر جلد ممکن ہو' ولیم اور رابرٹ کے متعلق ضروری معلومات حاصل کر لی جائیں۔"

سالار اکبر غالباً سمجھ گیا کہ میں اس سے جو کام لینا چاہتی ہوں اس کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو کرنا مجھے منظور نہیں۔ وہ اسی لئے پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "انشاء اللہ جلد ضروری معلومات حاصل کر لی جائیں گی' آپ اس سلسلے میں قطعی مطمئن رہیں۔"

"مجھے آپ لوگوں سے یہی توقع بھی ہے۔ اس تعاون کے لئے میں آپ کی ممنون ہوں۔" میں نے مسکرا کر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"یہ آپ کیا غیروں جیسی باتیں کر رہی ہیں معبلہ! آپ کو تو ہم اپنا سمجھتے ہیں۔ اظہار ممنونیت تو غیروں سے کیا جاتا ہے۔"

"یہ آپ لوگوں کی محبت ہے کہ مجھے اپنا سمجھتے ہیں۔" میں بولی۔

اسی وقت رگھوویر چائے کی ایک کیتلی اور دو پیالیاں لے کر آ گیا۔ اس نے پیالیاں ہم دونوں کے نے رکھ دیں اور ان میں کیتلی سے چائے انڈیلنے لگا۔

"آپ کو اس گھر میں کسی طرح کی کوئی پریشانی تو نہیں معبلہ!" سالار اکبر نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں' کوئی پریشانی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر وہاں کوئی مسئلہ ہو تو آپ جب چاہیں یہاں شفٹ ہو سکتی ہیں۔" سالار اکبر نے چائے کی پیالی تے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلانا ہی کافی سمجھا۔ چائے پینے کے بعد سالار اکبر رخصت ہو گیا۔ پھر میں بھی کھڑی ہوئی۔ میں عمارت سے نکل کر پھاٹک کی طرف بڑھ رہی تھی کہ خلاف توقع سلیم کو سامنے سے تے ہوئے دیکھا۔ میرے قریب آ کر وہ رکا اور مجھے سلام کیا' پھر عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے ۔ "اگر میں اس وقت خدا سے کچھ اور بھی مانگ لیتا تو میری دعا قبول ہو جاتی۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"ارے کک .... کچھ نہیں۔ آپ .... آپ تو برا مان گئیں۔ دراصل ابھی جب میں یہاں تو آپ کا خیال آ گیا اور میں نے سوچا' کاش! آپ سے ملاقات ہو جائے اور دیکھ لیجئے' آپ مل گئیں۔"

"مگر کیوں؟ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" میرا انداز جواب طلبی کا سا تھا۔

"بس معلوم نہیں کیوں آپ کو دیکھنے کے لئے دل چاہ رہا تھا۔ دل ہی تو ہے نا' یقین کریں کہ رات بھی بار بار آپ ہی کا دھیان آتا رہا۔"

"میرا خیال ہے آپ کو میرے بجائے دلاری کا دھیان آنا چاہئے تھا۔" میرا لہجہ سرد تھا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں' ہونا تو یہی چاہئے تھا۔" اس نے شاید میرے سرد لہجے کا کوئی اثر قبول نہیں ا۔ "مگر کیا کیا جائے' کوئی بھی شخص خود پر یہ پابندی عائد نہیں کر سکتا کہ کسی مخصوص ہستی ہی کا دھیان ے' اس کے سوا کسی اور کا دھیان نہ آ سکے۔" اس کے دیکھنے کے انداز اور لہجے میں بے باکی تھی۔

گزشتہ شب اس شخص نے مجھے جس حال میں دیکھا تھا' وہ میرے لئے باعث ندامت و شرمندگی ۔ میں اس وقت اسی لئے خجالت سی محسوس کر رہی تھی۔ مزید بات نہ بڑھانے اور گفتگو مختصر کرنے کے ل سے میں نے اس موضوع پر بحث سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب اجازت دیں' پھر ملاقات ہو ۔" آخری الفاظ میں نے یوں ہی اخلاقاً کہہ دیئے تھے۔

"کب ملاقات ہو گی؟" وہ جلدی سے بول اٹھا۔ "اپنے گھر آنے پر تو آپ نے پابندی لگا دی ہے۔"

میں اس سے جتنی جان چھڑا رہی تھی' وہ اتنا ہی "کمبل" ہو رہا تھا۔ مجبوراً مجھے سخت لہجے میں کہنا ا۔ "میں آپ سے ملاقات کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔"

"لیکن ابھی تو آپ آئندہ ملاقات کے لئے کہہ رہی تھیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"غلطی ہو گئی' معاف کر دیجئے' آئندہ بھولے سے بھی ایسی کوئی بات اخلاقاً بھی زبان پر نہیں لاؤں

گی۔" میں یہ کہہ کر آگے بڑھنے لگی۔

"ٹھہریے!" وہ مڑا۔ "آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔"

"جی ارشاد ہو۔" میں رک کر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مجھے شک ہے کہ گزشتہ رات دلاری کے آنے سے پہلے واقعی آپ سو رہی تھیں۔ میرا شا درست ہے نا کہ آپ اس وقت جاگ رہی تھیں؟"

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ حد سے تجاوز کرنے لگا۔ میں ای لئے تقریباً چیخ اٹھی۔ "کیا مطلب ہے اس بات سے آپ کا .... کیا آپ یہ بھول گئے کہ مجھ سے معافی مانگ چکے ہیں؟"

"آہستہ بولئے خاتون! کسی نے سن لیا تو ناحق بدنام ہو جائیں گی آپ .... بات صرف اتنی ہے کہ لاکھ بھلانے کی کوشش کے باوجود میں آپ کو نہیں بھول سکا۔ یقین کریں' اب تک رگ و پے ! نشہ سا دوڑ رہا ہے۔"

معاً میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ سلیم تنظیم کا رکن تھا۔ اس کے علم میں بھی یہ بات تھی میں تنظیم کی مہمان ہوں۔ اس کی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اتنے گھٹیا پن پر اتر آیا۔ یقیناً وہ ا وقت لعنتی چمپا کا آلہ کار بنا ہوا تھا۔ میں کچھ بھی کہتی' اس پر اثر نہ ہوتا۔ چمپا اس طرح مجھے ذہنی اذیہ میں مبتلا کرنا چاہتی ہے۔ میں نے سوچا اور اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ سلیم سے الجھ رسوائی کے سوا اور کیا ہاتھ آتا۔

"اگر دلاری کچھ دیر اور نہ آتی تو میں آپ کو خراج محبت ادا کر چکا ہوتا۔" مجھے خاموش دیکھ کر پھر بول اٹھا۔

"خراج محبت" سے اس کی کیا مراد تھی' یہ سوچ کر میرا خون کھول اٹھا۔ اپنے غصے پر حتی الامکا قابو پانے کے باوجود میرے لہجے میں سختی برقرار رہی۔ میں اس سے بولی۔ "گزشتہ رات جو کچھ ہوا' ار سب شدید غلط فہمی تھی۔ اسے بھول جایئے۔ خود آپ بھی اس غلط فہمی کا اعتراف کر چکے ہیں۔"

"غلط فہمی سہی مگر کتنی حسین تھی وہ غلط فہمی۔ میری خواہش ہے خاتون کہ یہ حسین غلط فہمی ! اور آپ کو بار بار ہو۔ اسی کا اعادہ کرنے میں آج رات بھی آؤں گا۔" اس نے بے باکی سے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" پھر ایک بار میں اپنے غصے پر قابو پاتے پاتے تقریباً چیخ اٹھی۔ "آپ میرے گھر قدم نہیں رکھیں گے' سمجھے! ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

"آپ پھر چیخنے لگیں خاتون!" وہ پُرسکون آواز میں بولا۔ "آپ کے اور میرے درمیان جو مع ہے' اسے دوسروں پر تو ظاہر نہ کریں۔ کیا فائدہ بدنامی سے۔ اگر بخوشی آپ نے اجازت نہ دی تو پھر مجھے آنا ہے۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

اسی وقت شاید میری بلند آواز سن کر سمیع اللہ تیز تیز قدموں سے اس طرف آتا دکھائی دیا۔ قریب آتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا ہوا معبلہ .... کیا آپ کسی بات پر چیخی تھیں؟"

"نہیں تو۔" میری بجائے سلیم بول اٹھا۔ "انہوں نے تو چیخ کر کوئی بات نہیں کی۔ یہ تو مجھے را

ے کھانے پر مدعو کر رہی تھیں۔"

"تو تم ان سے واقف ہو؟" سمیع اللہ نے پوچھا' اس کے لہجے میں قدرے حیرانی تھی۔

"ہاں' کل دلاری سے ملنے گیا تھا تو اس نے تعارف کرایا تھا۔" سلیم نے بتایا۔

میں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھ گئی۔ چلتے چلتے سلیم نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ رات کو وعدے کے مطابق ضرور آئے گا۔ میں اس پر خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی تھی۔ اس کے سوا میرے بس میں اور تھا بھی کیا۔

وہاں سے میں اپنے گھر پہنچی تو خاصی دیر کال بیل بجانے کے بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والی دلاری ہی تھی جس کا سانس پھولا ہوا تھا جیسے وہ دوڑتی ہوئی دروازہ کھولنے آئی ہو۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ لباس بھی جگہ جگہ سے شکن آلود اور بے ترتیب سا تھا۔

"کیا ہوا دلاری! تم اتنی گھبرائی ہوئی سی کیوں ہو؟" میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ .... وہ معبلہ جی! .... وہ سلیم آگیا تھا۔ آپ .... آپ گھر پر نہیں تھیں اس لئے میں .... میں نے اسے آنے دیا۔ اب .... اب کہے دیتی ہوں کہ .... کہ چلا جائے۔" دلاری اپنے بے قابو سانسوں کے درمیان کہنے لگی۔ "آپ کچھ .... کچھ خیال نہ کیجئے گا۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں اس کی بات سن کر الجھ گئی۔ "کیا گھر میں سلیم موجود ہے' تم یہ کہنا چاہتی ہو؟"

"ج .... جی ہاں' م .... مگر وہ ابھی چلا جائے گا .... چلا جائے گا وہ۔"

میں چکرا کر رہ گئی' کیوں کہ سلیم سے تو ابھی مل کر آ رہی تھی۔ وہ بھلا یہاں کس طرح ہو سکتا تھا؟ بہرحال میں اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "وہ کب آیا تھا؟"

"آدھا گھنٹہ ہوا ہے۔" دلاری نے بتایا۔ اب وہ اپنے سانسوں پر قابو پا چکی تھی۔

"اور آدھے گھنٹے سے وہ یہیں ہے؟"

"جی .... وہ بس ذرا ہی دیر بعد جانے والا تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ .... کہ کہیں اس کی موجودگی میں آپ نہ آ جائیں۔"

میرے لئے حیران کن بات یہ تھی کہ سلیم جب یہاں تھا تو پھر تنظیم کی عمارت میں اس سے میری ملاقات کیسے ہوئی؟ ایک ہی شخص بیک وقت دو جگہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں گھر کے اندر پہنچی تو صحن میں ایک طرف بنے ہوئے باتھ روم وغیرہ کی طرف سے شہزاد کو آتے دیکھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک اٹھی۔

"تم کب آئے شہزاد؟" وہ میرے قریب آگیا تو میں نے معلوم کیا۔

"حد ہو گئی آپ سے خاتون!" وہ آہستہ سے ہنس کر بولا۔ "آدھا گھنٹہ ہو گیا مجھے آئے ہوئے اور آپ اب پوچھ رہی ہیں کہ میں کب آیا۔"

"آدھا گھنٹہ؟" میں بڑبڑائی۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ دلاری نے بھی سلیم کے

بارے میں یہی بتایا تھا کہ وہ آدھے گھنٹے سے گھر میں ہے۔ میں نے مڑ کر دلاری کی طرف دیکھا اور بولی "تم نے مجھے شہزاد کے بارے میں نہیں بتایا کہ یہ بھی آئے ہوئے ہیں۔" دلاری حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ کہاں سے بتائیں' یہ تو خود ابھی آئی ہیں۔" دلاری کے کچھ کہنے سے پہلے شہزاد بول اٹھا۔

"شہزاد! تم میرے کمرے میں چل کر بیٹھو' میں ابھی آتی ہوں۔" میں نے کہا۔ پھر جب وہ میرے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو میں نے دلاری کو مخاطب کیا۔ "سلیم کہاں ہے؟"

"جب مم .... میں دروازہ کھولنے گئی تھی تو .... تو وہ باتھ روم کی طرف گیا تھا' م .... مگر ادھر سے........" دلاری گڑبڑا گئی اور اپنی بات پوری نہ کر سکی۔

"ادھر سے تم نے شہزاد کو آتے دیکھا' یہی نا!" میں اطمینان سے بولی۔ اب میں کچھ کچھ سمجھ رہی تھی کہ یہ سب کیا معمہ ہے۔ شہزاد سے گفتگو کے بعد اس کی مزید تصدیق ہو جاتی۔ "دلاری! میرا خیال ہے کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ سلیم یہاں نہیں آیا۔ میں تو خود ابھی اس سے مل کر آ رہی ہوں۔ تم چاہو تو اپنی تسلی کے لئے باتھ روم اور اپنے کمرے میں جا کر اسے دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں یہاں نہیں ملے گا۔ اسے کچھ دیر ہی پہلے میں نے تنظیم کی عمارت میں دیکھا تھا۔"

"اگر......... اگر وہ .... وہ سلیم نہیں تھا تو .... تو پھر کچھ .... دیر پہلے میرے .... میرے ساتھ کون تھا؟ .... نہیں معلمہ جی! یہ .... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اگر .... وہ سلیم نہ ہوتا تو .... تو میں بھلا اسے اپنا آپ کیسے سونپ دیتی؟ .... میں .... میں یہ پاپ کیسے کر سکتی ہوں؟" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے دلاری کی آواز بھرا گئی۔

"تم اسے تلاش تو کرو جا کے۔" میں بولی اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میں اپنے کمرے میں پہنچی ہی تھی کہ شہزاد نے تیزی کے ساتھ کرسی سے اٹھ کر مجھے خود سے قریب کر لیا۔

"ارے ارے' یہ کیا بیہودگی ہے؟" میں نے ایک ہی جھٹکے میں خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ "شرافت سے بیٹھو ادھر۔"

شہزاد لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ اچانک آپ کو کیا ہو جاتا ہے خاتون! ابھی کچھ دیر پہلے تک تو آپ مجھ پر بہت مہربان تھیں۔ آپ کی ملازمہ جانے کہاں سے آ مری۔"

"تم بیٹھو تو سہی۔" میں اس کی بات سن کر چونکتے ہوئے بولی۔

شہزاد کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی اور اطمینان سے کہا۔ "ہاں اب کہو' کب آئے تھے تم؟"

"پھر وہی .... کیا ہو گیا ہے آپ کو خاتون! .... آپ نے خود ہی تو میرے لئے دروازہ کھولا تھا اور پھر .... اب کیا بتاؤں .... میں تو خود حیران ہو رہا تھا کہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے .... ایک دم کس طرح مجھ پر اتنی مہربان ہو گئی ہیں۔" شہزاد الجھے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

"ہوں .... تو جب تم آئے' میں نے تمہارے لئے دروازہ کھولا اور تمہیں یہاں اپنے کمرے میں لے آئی۔ تم یہی کہہ رہے ہو؟"

"جی ہاں خاتون! یہی عرض کر رہا ہوں۔ پھر اچانک کال بیل بجنے لگی اور مجبوراً آپ کو دروازہ کھولنے کے لئے جانا پڑا۔"

"میں نے جب تمہارے لئے دروازہ کھولا تھا تو ساڑھی باندھے ہوئے تھی نا؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں .... جی ہاں' ساڑھی ہی باندھے ہوئے تھیں۔" اس نے پُریقین لہجے میں جواب دیا۔

"اور اب میں کیا پہنے ہوں؟" میں نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"ارے' یہ .... یہ کیسے ہو گیا؟ آپ تو ساڑھی باندھے ہوئے تھیں۔" شہزاد حیرت سے بولا۔ "یہ آپ نے شلوار سوٹ کب گھڑی کی گھڑی میں بدل لیا؟"

"اور میں جو ساڑھی باندھے ہوئے تھی' وہ سفید سوتی ساڑھی تھی' ہے نا؟" میں نے کہا کیوں کہ دلاری سفید سوتی ساڑھی ہی باندھے ہوئے تھی۔

"جی .... جی ہاں بالکل .... آپ ٹھیک .... ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" شہزاد جلدی سے بولا۔ "مگر .... مگر اتنی جلدی آپ نے لباس کیسے بدل لیا؟"

"خیر' اس ذکر کو چھوڑو' یہ بتاؤ سنبل کیسی ہے' مجھے یاد کرتی ہے؟" میں نے دانستہ موضوع گفتگو بدل دیا۔

بظاہر تو میں' شہزاد سے باتیں کرتی رہی' مگر میرا ذہن اس واقعے میں الجھا رہا جو کچھ دیر پہلے پیش آیا تھا۔ شہزاد نے جو کچھ بتایا تھا' میں نے اس کی روشنی میں ساری کڑیاں جوڑ لی تھیں۔ لعنتی چمپا نے گزشتہ رات میرے ساتھ جو کھیل کھیلا تھا' اس وقت اسی گھناؤنے کھیل کو شہزاد اور دلاری کے ساتھ دہرایا تھا۔ شہزاد کو دلاری کی بجائے میں نظر آئی تھی اور دلاری کو شہزاد' اپنا محبوب سلیم دکھائی دیا تھا۔ اس کھیل کا مقصد مجھے ذہنی انتشار اور پریشانی میں مبتلا کرنا ہی ہو سکتا تھا اور چمپا اپنے اس مقصد میں کامیاب تھی۔ اس کے علاوہ چمپا نے سلیم کو اپنا آلہ کار بنا کر مجھے مزید الجھن اور عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب اس گھر میں بھی میرا محفوظ رہنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ سلیم نے مجھے رات کو آنے کی دھمکی دی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ محض دھمکی نہیں تھی۔ لعنتی چمپا اسے یقیناً میرے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میرا ذہن اسی مسئلے میں الجھا ہوا تھا کہ لعنتی چمپا کے اس وار سے کس طرح بچا جائے؟ میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ الگ کرائے پر گھر لے کر ہر طرح سے محفوظ ہو گئی ہوں' مگر یہاں بھی مجھے چمپا چین سے نہیں رہنے دے رہی تھی۔ میری یہ احتیاط بھی رائیگاں گئی تھی کہ جہاں میں رہوں' وہاں کوئی مرد نہ ہو۔

معلوم نہیں میں کب شہزاد سے باتیں کرتے کرتے' چپ ہو گئی تھی۔ شہزاد نے اسی لئے مجھے مخاطب کیا۔ "خاتون! آپ کس سوچ میں کھوئی ہوئی ہیں؟ کیا بات ہے' کچھ فکرمند سی لگ رہی ہیں؟"

"نہیں تو۔" میں چونک کر بولی اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔

"نہیں' کچھ تو ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں۔" اس نے اصرار کیا۔ "بتائیں نا آپ' کیا بات ہے؟"

"کہہ تو دیا' کوئی بات نہیں۔"

"کوئی بات نہیں تو خفا خفا سی کیوں ہیں؟" شہزاد بولا۔ "میں اب اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ جب آپ کا دل چاہے خود ہی نواز دیجئے گا' خادم عرض مدعا نہیں کرے گا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں خاتون کہ اگر آپ میری وجہ سے پریشان ہیں تو اس پریشانی کو ذہن سے جھٹک دیں اور اسی خوشی میں چائے پلوا دیں۔"

"ارے ہاں' میں تم سے چائے کو پوچھنا تو بھول ہی گئی۔ میں آئی ابھی دلاری سے چائے کے لئے کہہ کر۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے جو کچھ کہا تھا' اسے میں نے دانستہ نظرانداز کر دیا۔

کمرے سے نکل کر میں نے دلاری کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو وہ مجھے کچن میں نظر آ گئی۔ شاید وہ دوپہر کے کھانے کا بندوبست کر رہی تھی۔ اس کے جسم پر وہی سوتی ساڑھی تھی جس کا ذکر میں نے شہزاد سے کیا تھا۔ میں کچن میں پہنچ گئی۔

"جی معبلہ جی!" مجھے اپنے قریب دیکھ کر دلاری میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"دو کپ چائے بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ۔" میں نے اس سے کہا۔

"جی بہتر ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے دلاری کے چہرے کا جائزہ لیا تو اس کی آنکھوں سے یوں لگا جیسے وہ روتی رہی ہو۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا دلاری! تمہاری آنکھیں کچھ روئی روئی سی لگ رہی ہیں؟"

پہلے تو وہ انکار کرتی رہی کہ ایسی کوئی بات نہیں' میں نے اصرار کیا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "معبلہ جی! بھگوان جانے کیوں ایسا جان پڑتا ہے' مانو کوئی بڑا پاپ ہو گیا ہے مجھ سے .... اگر وہ سلیم ہی تھا جسے میں نے اپنا آپ سونپ دیا تھا تو .... تو پھر وہ کہاں چلا گیا؟ بھگوان نہ کرے' کہیں وہ .... وہ آپ کو ملنے کے لئے آنے والا نوجوان تو نہیں تھا؟ اس نے بھی تو یہی کہا تھا آپ سے کہ وہ آدھے گھنٹے سے گھر میں تھا۔ کل رات بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ سلیم آپ کے کمرے میں چلا گیا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ آپ کی جگہ میں ہوں۔ یہ .... یہ سب کیا ہو رہا ہے معبلہ جی! میرے من پر ایک بوجھ سا ہے۔ اسی کے کارن آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کہ کہیں بھولے سے سلیم کی امانت میں خیانت تو نہیں ہو گئی۔"

"کچھ نہیں ہوا دلاری! کل رات اور آج کے واقعے کو بھلا دو۔" میں نے اسے دلاسا دیا' پھر سمجھایا۔ "ایک بات کا خیال رکھنا کہ اب سلیم سے تمہاری ملاقات ہو تو آج کے واقعے کا کوئی ذکر نہ کرنا۔"

"وہ کیوں معبلہ جی!" وہ بول اٹھی۔ "تو .... تو کیا میرا شک صحیح ہے کہ .... کہ وہ سلیم نہیں تھا؟"

"یہ بات نہیں ہے دلاری!" میں نے بات کو سنبھالا۔ "اس طرح آپس میں شکوک و شبہات پیدا

ہوتے ہیں۔ سمجھا کرتے ہیں بات کو۔ میں نے جو کہا ہے' اس کا خیال رکھنا۔ اچھا میں چلتی ہوں۔"

پھر میں وہاں مزید رکی نہیں۔ اس موضوع پر جتنی گفتگو کی جاتی' دلاری کے دل میں اور شک پیدا ہوتا۔ وہ تو پہلے ہی اندیشوں اور وسوسوں کا شکار ہو چکی تھی۔ بات مزید نہ بڑھے اس خیال سے میں نے دلاری کو یہ سمجھا دیا تھا کہ وہ آج کے واقعے کا ذکر سلیم سے نہ کرے۔ اگر وہ سلیم سے اس واقعے کی تصدیق کرتی تو ظاہر ہے سلیم انکار کر دیتا کہ آج دن کے وقت میرے گھر آیا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا صورت حال پیش آتی۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ ان دونوں کے دل میں کوئی گرہ پڑے۔ وہ دونوں بہرحال ایک عمر سے ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا تھے۔ یہ ساری غلط فہمیاں اور مسئلے تو لعنتی چمپا نے پیدا کئے تھے۔ میں یہی سب کچھ سوچتی ہوئی کمرے میں واپس آ گئی۔

"یہ تم کمرے کا اس طرح کیا جائزہ لے رہے ہو؟" میں نے شہزاد کو حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہ دیکھ رہا ہوں خاتون کہ جب آپ مجھے اپنے ساتھ لے کر گھر میں آئی تھیں تو وہ .... یہ کمرہ تو نہیں تھا۔" شہزاد نے میری بات کا جواب دیا۔

"بڑی جلدی خیال آ گیا تمہیں۔" میں نے آہستہ سے ہنس کر کہا۔

"جی ہاں خاتون! اس کمرے میں تو مسہری کی بجائے ایک پلنگ تھا۔" شہزاد مزید بولا۔ "آپ چلی گئیں تو مجھے اس بات کا خیال آیا۔"

"اب چھوڑو بھی یہ ذکر' میرے تو کان پک گئے ہیں۔" میں نے دانستہ اظہار بیزاری کیا۔

"حیرت ہے آپ اس بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہیں کہ کمرہ بدل گیا' آپ کا لباس بھی بدل گیا' یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"بدل گیا ہو گا' کوئی اور بات کرو۔ یہ بتاؤ آج رات کے لئے کسی ایسے مکان کا بندوبست ہو سکتا ہے جو بالکل خالی ہو۔" اس طرح میں نے بات کا موضوع بھی بدل دیا اور اپنے مطلب کی ایک بات بھی کہہ دی۔ اگر کسی خالی مکان کا بندوبست ہو جاتا تو کم از کم آج رات کا خطرہ تو ٹل ہی جاتا۔ میں نے بہرحال یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آج کی رات اس گھر میں نہیں گزارنا' خواہ مجھے وقتی طور پر کسی ہوٹل ہی میں کیوں نہ رہنا پڑے۔ شہزاد سے موضوع گفتگو بدلنے کے لئے یہ ذکر چھڑ گیا تھا۔ اس میں میرے ارادے کو زیادہ دخل نہیں تھا۔

"کیوں خاتون! آج ہی رات کے لئے کسی خالی مکان کی ضرورت کس لئے پڑ گئی؟" شہزاد میری بات سن کر بولا۔ "یہ مکان بھی تو ایک طرح سے خالی ہی ہے۔ آپ کے علاوہ شاید صرف ملازمہ ہی تو ہے یہاں۔ اگر قطعی تنہا رہنا مقصود ہے تو اسے بھیج دیں' آج رات کے لئے۔ کوئی گھر در تو ہو گا اس کا؟"

"تم سے میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو' اِدھر اُدھر کی نہ اڑاؤ۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"مکان تو بتایا تھا میں نے آپ کو .... اور ابھی میں چچا حمید کو منع بھی نہیں کر سکا' مگر خود آپ ہی نے اس مکان میں رہنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ اس مکان کی پوری نچلی منزل خالی تھی۔"

"اسی کوچہ چیلان والے مکان کی بات کر رہے ہو جس کا تم نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں وہی۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "آپ نے یہ کہہ کے منع کر دیا تھا کہ ایسا مکان چاہئے جس کی یا تو اوپر منزل ہی نہ ہو' اگر ہو تو وہاں کوئی رہتا نہ ہو۔"

"یاد آ گیا مجھے۔" اسی وقت مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں نے شہزاد سے کہا۔ "ٹھہرو ابھی اس موضوع پر بات کرتے ہیں۔"

چند ہی لمحے بعد دلاری چائے کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے شہزاد کو نمایاں طور پر چونکتے ہوئے دیکھا۔ اس کی نظر دلاری کی سوتی ساڑھی پر جمی ہوئی تھی۔ دلاری جیسے ہی چائے کی ٹرے رکھ کر کمرے سے نکلی' شہزاد پرجوش آواز میں بول اٹھا۔ "وہی .... بالکل وہی تھی۔"

"کون وہی تھی؟" میں نے دریافت کیا حالانکہ بڑی حد تک اس کی بات میری سمجھ میں آ چکی تھی' مگر میں اس پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"ساڑھی .... وہ ساڑھی جو .... جو آپ باندھے ہوئے تھیں۔"

"کہاں کی ہانک رہے ہو تم! میں وہ ساڑھی کیوں باندھے ہوتی' میں نے تو آج تک کبھی سوتی ساڑھی باندھی ہی نہیں۔"

"لیکن .... لیکن اس وقت جب میں آیا تھا تو آپ یہی ساڑھی........."

"یہ تمہارے ذہن پر آج ساڑھی کیوں سوار ہو گئی ہے .... چائے پیو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

شہزاد کے چہرے سے شدید الجھن کا اظہار ہونے لگا۔ میں اس الجھن کا سبب سمجھ رہی تھی مگر ظاہر ہے' اسے کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ میرے کہنے پر شہزاد نے ٹرے سے چائے کی پیالی اٹھا لی تھی۔

چائے پیتے ہوئے میں سوچنے لگی کہ اگر وقت بے وقت کے لئے کوچہ چیلان والا مکان بھی کرائے پر لے لیا جائے تو بہتر ہے۔ وہاں آج رات گزارنے کے علاوہ بھی کسی آڑے وقت پناہ لی جا سکتی تھی۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔ "تم اس مکان کی بات تو کر ہی چکے ہو' آج مالک مکان سے اس کی چابی لے لو۔"

"اور خاتون! یہ مکان' کیا اسے آپ چھوڑ رہی ہیں؟" شہزاد نے دریافت کیا۔

"نہیں' یہ بھی رہے گا۔" میں نے بتایا۔ "ضروری نہیں کہ میں روز ہی یہاں یا وہاں رہوں' کہیں بھی رہ لیا کروں گی۔"

میری بات سن کر شہزاد کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہونے لگا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "یہ ٹھیک رہے گا۔ وہاں کسی کی مداخلت کا خطرہ بھی نہیں ہو گا جس طرح آج یہاں........."

"فضول باتیں نہیں۔" میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بول اٹھی۔ "تم ایسا کرنا کہ آج ہی وہاں ضروری فرنیچر خرید کر ایک کمرے میں ڈلوا دینا۔ میں تمہیں اس کے لئے پیسے دے رہی ہوں۔" یہ کہہ کر

میں نے اپنا ہینڈ پرس میز سے اٹھایا اور اسے کھول کے کئی نوٹ اسے تھما دیئے۔ "مسہری کے لئے گدا' چادر وغیرہ بھی لے لینا۔ ایک چھوٹی سی میز اور دو تین کرسیاں بھی لینا ہوں گی کہ کوئی آ جائے تو بٹھایا جا سکے۔"

"کوئی الماری بھی لے لوں؟"

"ضرورت تو نہیں ہے' پھر بھی مناسب سمجھو تو خرید لو۔ ہاں' وہ تم نے شاید بتایا تھا کہ اوپری منزل کے لئے الگ زینہ ہے۔ تو کیا وہ زینہ نچلی منزل کے اس حصے میں ہے جہاں میں رہوں گی؟"

"اس زینے کا راستہ باہر سے بھی ہے اور اندرونی حصے سے بھی۔ میں نے دیکھا ہے وہ مکان' دونوں طرف دروازے ہیں۔ اگر آپ اپنی طرف والا دروازہ بند کر لیں گی تو پھر نچلی منزل بالکل الگ ہو جائے گی' اوپری منزل والوں سے آپ کا کوئی رابطہ نہیں رہے گا۔ وہ باہر والے دروازے سے اوپر آئیں گے جائیں گے۔" شہزاد نے وضاحت کی۔

"پھر تو نچلی منزل ایک طرح سے بالکل الگ ہی ہو گئی۔ تمہیں یہ بات پہلے بتانا چاہئے تھی۔ اگر مجھے پہلے اس بات کا علم ہوتا تو انکار ہی نہ کرتی' وہ مکان کرائے پر لینے سے .... خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اچھا ہوا جو تم نے مالک مکان سے منع نہیں کیا۔ سنو' آج رات کا کھانا میں تمہارے گھر کھاؤں گی۔ امید ہے کہ تم رات تک وہاں فرنیچر خرید کر پہنچوا دو گے۔"

"کیوں نہیں' آپ کے آنے سے پہلے ہی سارا کام مکمل ہو جائے گا' مطمئن رہیں۔ گھر کی صفائی وغیرہ بھی کرا دوں گا۔"

شہزاد سے بات کرنے کے بعد میرے ذہن سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ اب مجھے رات کی کوئی فکر نہیں رہی تھی۔ شہزاد کو میں نے ایک نئی ذمے داری سونپ دی تھی اس لئے وہ زیادہ دیر میرے پاس نہیں رکا۔ وہ چلا گیا تو میں حالات پر ازسرنو غور کرنے لگی۔ اسی غور و فکر کے دوران مجھے یہ بھی یاد آیا کہ میرا دشمن ژیان بھی اسی شہر میں موجود ہے۔ ابھی تک مجھے اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ اس کی تلاش کا آغاز کر سکتی۔ عظیم مہین کی نیک روح نے اس ضمن میں پُراسرار سرگوشیوں کے ذریعے میری رہنمائی کی تھی۔ ابھی تو میں یہ بھی نہیں سوچ سکی تھی کہ ژیان کی تلاش کہاں سے شروع کروں۔ اب تک تو لعنتی چمپا ہی میرے لئے عذاب جان بنی ہوئی تھی۔ وہ مجھے کہیں ٹک کر ہی نہیں بیٹھنے دے رہی تھی کہ میں کچھ سوچ سمجھ سکوں۔

اس روز شام تک کوئی اور قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ شام کی چائے پینے کے بعد میں نے اپنے ایک سوٹ کیس میں چند کپڑے اور ضروری چیزیں رکھ لیں۔ اپنا یہ سوٹ کیس میں کوچہ چیلان والے مکان میں رکھنا چاہتی تھی تاکہ بوقت ضرورت مجھے وہاں قیام کرنا پڑے تو کوئی دشواری نہ ہو۔ اسی غرض سے اپنا ایک سلیپنگ گاؤن بھی میں نے سوٹ کیس میں رکھ لیا تھا۔

عمدہ سا ایک شلوار سوٹ پہننے کے بعد ایک چادر میں نے اوڑھ لی اور آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اب میں کسی معزز تعلیم یافتہ گھرانے کی کوئی فرد معلوم ہو رہی تھی۔ یہ لباس میں نے اس علاقے کو مدنظر رکھتے

ہوئے زیب تن کیا تھا جہاں رہنے جا رہی تھی۔ ساڑھی باندھنے کی صورت میں بلاوجہ میں لوگوں کی نگا
کا مرکز بن جاتی۔

جب میں تیار ہو کر سوٹ کیس ہاتھ میں لئے اپنے کمرے سے باہر آئی تو دلاری کو آواز دی
مجھے باہر نظر نہیں آئی تھی۔ میرے آواز دینے پر وہ اپنے کمرے سے نکل آئی اور مجھے دیکھتے ہی حیراں
ہو کر کہنے لگی۔ "ارے معبلہ جی! آپ کہاں جا رہی ہیں؟ کیا کہیں دہلی سے باہر جانے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں' دہلی سے باہر تو خیر نہیں جا رہی لیکن آج رات اپنے ایک عزیز کے یہاں رہوں گی۔
کسی وقت لوٹ آؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر وہاں کل تک ہی رہنا ہے تو پھر یہ سوٹ کیس کیوں لے جا رہی ہیں؟" اس نے پوچھ لیا۔

"اس لئے کہ آئندہ بھی وہاں آنا جانا لگا رہے گا' چند جوڑے وہاں بھی رہیں تو اچھا ہے۔" میں
پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"کہیں کل رات پیش آنے والے واقعہ کی وجہ سے تو آپ نہیں جا رہیں؟" دلاری کے لہجے
احساس ندامت تھا۔ "بلاوجہ سلیم کی رات کو آمد نے آپ کو پریشان کر دیا۔ میں سختی کے ساتھ اسے
آنے سے منع کر چکی ہوں۔ اب وہ خاص طور پر رات کے وقت یہاں بالکل نہیں آئے گا۔"

میں اس بھولی عورت کی بات سن کر مسکرا دی۔ میرا جی چاہا اسے بتا دوں کہ سلیم آج رات
آئے گا' مگر بتانا لاحاصل ہی تھا۔ اس کی بجائے میں نے کہا۔ "نہیں دلاری! میرے یہاں سے جانے کی
کل رات کا واقعہ نہیں۔ وہ بات تو رات ہی کو ختم ہو گئی تھی جب سلیم نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی
میں نے اسے معاف بھی کر دیا تھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں' کبھی کبھی آدمی کو غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے۔

میری بات سن کر دلاری کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر وہ دھیمی آواز میں بو
"بھگوان کرے آج صبح مجھے غلط فہمی نہ ہوئی ہو۔"

دلاری کے ذہن میں اب تک وہی گرہ پڑی ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے سلیم کے دھ
میں شہزاد کے ساتھ قرب کے مراحل طے کئے تھے' مگر یہ بات اسے بتانا محال تھی۔ میں نے اسی لئے
کی طرح اسے پھر سمجھایا۔ "دلاری! صبح کے واقعے کو اپنے ذہن سے جھٹک دو' کچھ باتوں کو بھول جا
بہتر ہوتا ہے جس طرح میں نے گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے کو بالکل بھلا دیا۔ اس واقعے کو اگر
اپنے لئے سوہان روح بنا لوں تو کیا حاصل؟"

"شاید آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں معبلہ جی!" دلاری طویل سانس لے کر بولی۔

"اچھا تو دلاری! میں اب چلتی ہوں' کل ملاقات ہو گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے قریب ہی فرش
رکھا ہوا سوٹ کیس اٹھا لیا۔

ابھی میں نے جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ خلاف توقع کال بیل بجنے لگی۔ میں رک گئی
سوچا کہ اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے؟ میرے ذہن کے ایک گوشے میں جانے کیوں خطرے کی
بجنے لگی تھی۔ دلاری یہ دیکھنے گھر کے صدر دروازے کی طرف جا چکی تھی۔

کچھ ہی دیر کے بعد میں نے دلاری کے ساتھ سلیم کو گھر کے اندر آتے دیکھا تو چونک اٹھی۔ اس
ن سلیم کی آمد قطعی غیر متوقع تھی۔ دلاری کے چہرے پر مجھے ناگواری کے اثرات نظر آ رہے تھے۔

"ہمیں مدعو کر کے کہاں چل دیں خاتون!" سلیم نے بے تکلفی کے ساتھ مجھے مخاطب کیا' پھر کہنے
ل "اسے سمجھائیں' دلاری کو۔ اس کو یقین ہی نہیں آ رہا کہ میں یہاں آپ کی دعوت پر آیا ہوں۔"

"بالکل نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں نے آپ کو مدعو نہیں کیا۔ کل رات میں نے
پ سے کہا تھا کہ آئندہ یہاں تشریف نہ لائیں' پھر بھی آپ آ گئے۔"

"لیکن آج ہی صبح تو آپ نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "سمیع
ۃ بھی اس بات کا گواہ ہے۔"

"زبردستی مدعو نہیں ہوا جاتا' سمجھے آپ۔" میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ "آپ جا سکتے ہیں اور
ئندہ یہاں آنے کی زحمت نہ کریں' میں آپ سے ملنا پسند نہیں کرتی۔"

"یہ تو آپ سراسر وعدہ خلافی کر رہی ہیں۔ اگر میں کچھ دیر اور نہ آتا تو آپ نکل ہی گئی ہوتیں۔
علوم نہیں کیوں بار بار مجھے یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ اگر دیر سے آپ کے گھر پہنچا تو ملاقات نہیں ہو سکے گی
ر یہاں آ کر میرا اندیشہ درست ہی نکلا۔ میں اسی لئے رات کو آنے کی بجائے اسی وقت چلا آیا۔" اس
نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ "اب یہ سوٹ کیس اندر جا کے کمرے میں رکھ دیں۔ یہ بداخلاقی ہے
کہ کوئی آپ کے گھر آئے اور آپ اسے چھوڑ کر چل دیں۔"

میں نے ہونٹ بھینچ کے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی
ے وہ میری بے بسی سے لطف لے رہا ہو۔ دلاری' جو اب تک خاموش رہی تھی' اس موقع پر بول اٹھی۔
سلیم! تمہارا یہ کہنا غلط ثابت ہو چکا ہے کہ معبلہ جی نے تمہیں مدعو کیا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم
ہاں سے چلے جاؤ۔"

"اگر مجھے اسی طرح واپس جانا ہوتا دلاری تو آتا ہی کیوں۔ تم اس معاملے میں نہ بولو' یہ میرا اور
بلہ خاتون کا معاملہ ہے۔ انہیں تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔ ان کے دل میں کچھ ہوتا ہے' زبان پر کچھ۔
ہیں میں گزشتہ رات کی بات بتا دوں تو تم حیران رہ جاؤ گی۔" پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا اور کہنے لگا۔
اجازت ہے خاتون! دلاری کو حقیقت سے آگاہ کر دوں؟"

وہ پوری طرح شیطانیت پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ میں اسی سے بچنے کی خاطر گھر چھوڑ کر جا رہی تھی
ر وہی اس وقت خلاف توقع میری راہ کھوٹی کرنے آ گیا تھا۔ یقیناً یہ بھی چمپا کی شرارت معلوم ہوتی تھی
نہ تو وہ رات ہی کو آتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح جان چھڑاؤں؟ پھر میں نے
نہ جتنی دیر بھی یہاں موجود رہوں گی' وہ اسی طرح بکواس کرتا رہے گا۔ میں اسی خیال کے تحت کچھ کہے
بغ آگے بڑھنے لگی اور اسی لمحے سلیم نے میرا راستہ روک لیا۔

"اب آپ کی حقیقت کھل رہی ہے تو راہ فرار اختیار کر رہی ہیں۔ میں اس طرح آپ کو نہیں
نے دوں گا۔" وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ نے ایک عورت ہو کر دوسری عورت کے حق پر کل

رات ڈاکا ڈالنا چاہا اور آج رات کو بھی مجھے اسی لئے مدعو کیا۔ دلاری کو اس سے آگاہ ہونے دیں نا' یہ آپ کو پاک دامن سمجھ رہی ہے۔"

دلاری کا چہرہ متغیر نظر آنے لگا۔ اس نے شاید اپنے محبوب کے سفید جھوٹ کو سچ سمجھ لیا تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی اور میرا راستہ چھوڑ دو۔" یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس وقت چمپا کا آلہ کار بنا ہوا ہے' میں اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکی۔

"معبلہ جی کو جانے دو سلیم!" دلاری نے مداخلت کی۔ "جو بات بھی ہے تم مجھے بعد میں بتا دینا۔ مجھے یقین ہے تم مجھ سے غلط بیانی نہیں کرو گے۔"

"نہیں۔" سلیم تیز آواز میں بولا۔ "میں انہی کے سامنے اظہار حقیقت کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ بعد میں تمہارے سامنے خود کو معصوم اور بے گناہ ثابت نہ کر سکیں۔ میں اس وقت اسی لئے آیا تھا۔"

اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جاتا اور چمپا مجھے بے عزت و رسوا کرنے کی غرض سے کوئی حربہ آزماتی' میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔

"دلاری! یہ اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہے اور قطعی جھوٹ بول رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ سراسر مجھ پر بہتان لگا رہا ہے' تم اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا۔"

یہ سنتے ہی سلیم عجیب سے انداز میں زور سے ہنس پڑا۔ پھر اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ اس کے چہرے پر بھی میں نے تناؤ سا دیکھا تھا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز بھی بدلی ہوئی سی تھی۔ "معبلہ! تو تو بڑی پارسا ہے' یہ ابھی معلوم ہو جائے گا .... ادھر دیکھ میری آنکھوں میں' میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتا' کیا تو کل رات بیدار تھی؟ .... جو سچ ہے' وہ خود ہی تیری زبان پر آ جائے گا۔ دیکھ ادھر۔" اس کے لہجے میں حکم تھا۔

"نہیں معبلہ! اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالنا۔" کسی نے جیسے میرے اندر سے مجھے تاکید کی۔ "اگر تم نے ایسا کیا تو اس شخص کے ذریعے چمپا تمہیں اپنے سحر میں گرفتار کر لے گی۔ پھر وہی ہو گا جو وہ چاہے گی۔ تم بے بس ہو جاؤ گی۔" اسی کے ساتھ مجھے رانی کا ساتھی جہانگیر یاد آ گیا جس سے خود کو بچانے کی خاطر میں نے اسے قتل کر دیا تھا۔ چمپا نے مجھے اسی کے ذریعے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ اس سے نظر ملاتے ہی جیسے میں اپنے حواس میں نہیں رہی تھی۔

ذرا دیر پہلے میں نے جو فیصلہ کیا تھا' اس پر عمل کرنے کے لئے آہستگی سے سوٹ کیس فرش پر رکھ دیا۔ اسی کے فوراً بعد میرا جچا تلا ہاتھ سلیم کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ چکرا کر گرنے والا تھا کہ میں نے لپک کر اس کے جسم کو سنبھال لیا۔ وہ گر کر زخمی بھی ہو سکتا تھا۔

"یہ .... یہ آپ نے کیا کیا معبلہ جی! .... کیا کیا آپ نے؟" دلاری جیسے تڑپ اٹھی۔ اس کا تڑپنا فطری تھا۔ سلیم بہرحال اس کا محبوب تھا۔

"وہی جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔" میں نے سلیم کے بے ہوش جسم کو فرش پر ڈال کر سیدھے کھڑے ہو کر کہا' پھر اسے تسلی دی۔ "گھبراؤ مت' اسے تھوڑی دیر میں ہوش آ جائے گا۔"

"مم .... میں اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتی ہوں۔ میں ابھی .... ابھی پانی لے کر آئی۔" دلاری جانے کے لئے مڑی۔

"تم جو چاہو کرتی رہنا' میں جا رہی ہوں۔" یہ کہتے ہی میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☆======☆======☆

گھر سے باہر آ کر مجھے سڑک تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہاں سے میں نے جامع مسجد تک کے لئے ایک ٹیکسی کر لی۔ میں جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی۔

ٹیکسی کو میں جامع مسجد پر چھوڑنے کی بجائے تراہا بیرم خاں تک لے گئی کیوں کہ وہاں تک ٹیکسی بآسانی جا سکتی تھی۔ وہاں سے شہزاد کا گھر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ کرایہ ادا کر کے میں نے سڑک عبور کی اور دائیں جانب واقع چتلی قبر کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ چتلی صاحب کا مزار مبارک اس گلی کی بائیں جانب تھا' میں جس میں داخل ہوئی تھی۔

اب سورج غروب ہو چکا تھا اور مغرب کا وقت قریب تھا۔ میں دائیں ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھائے سکون واطمینان سے آگے بڑھتی رہی کیوں کہ مجھے زیادہ جلدی نہیں تھی۔

جلد ہی میں' شہزاد کے گھر تک پہنچ گئی اور دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر میں دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا شہزاد کا چھوٹا بھائی فرہاد تھا۔ جیسے ہی میری نظر اس کے چہرے پر پڑی' میں چونک اٹھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گھر کے اندر بھی مجھے شور شرابے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"کیا بات ہے فرہاد!" میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "یہ شور کیسا ہے اندر؟"

"آپ کو تو معلوم ہے' گھر کی اوپری منزل پر چچا امجد رہتے ہیں۔" فرہاد میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بتانے لگا۔ "اوپری منزل پر کچھ غنڈے گھس آئے ہیں جو چچا امجد کو مار پیٹ رہے ہیں۔ بھائی جان' چچا امجد کو بچانے اوپر گئے تھے تو غنڈوں نے انہیں بھی مار کے بھگا دیا۔ ان کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ سنبل پٹی باندھ رہی ہے۔ امی نے مجھے قسم دے کر اوپر جانے سے روک دیا ہے۔"

میں اس وقت تک صحن میں پہنچ چکی تھی۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر دالان میں شہزاد' اس کی ماں اور سنبل' تینوں نظر آ رہے تھے۔ سنبل پٹی باندھ کر گرہ لگا رہی تھی۔

"تم یہ سوٹ کیس پکڑو اور یہ میرا پرس بھی تھامو۔" میں نے فرہاد کی طرف سوٹ کیس بڑھایا اور اپنا ہینڈ پرس بھی دے دیا اور بولی۔ "میں آئی ابھی۔"

"ارے آپ .... آپ کہاں جا رہی ہیں؟" فرہاد نے مجھے زینے کی طرف لپکتے دیکھ کر کہا۔

"میری فکر نہ کرو۔" میں مڑے بغیر زور سے بولی اور پھر بھاگتی ہوئی زینے پر چڑھ گئی۔

سیڑھیاں عبور کر کے میں نے اوپری منزل کے دروازے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ ان لوگوں نے غالباً اس خیال سے کہ گھر کا مزید کوئی فرد مداخلت نہ کرے' شہزاد کو مار

کے بھگانے کے بعد اس طرف کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو دروازے کے اوپر دیوار زیادہ بلند نہیں تھی۔ ممکن ہے کسی اور کے لئے دروازے پر چڑھ کر اس دیوار تک پہنچنا' پھر دیوار پھاند دوسری طرف کودنا خطرناک یا ناممکن ہوتا' مگر میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں تو پہاڑوں باسی تھی' میری ایک عمر بلندیاں سر کرتے گزری تھی۔ سو میں نے دروازے پر چڑھنے میں دیر نہیں میں تیزی کے ساتھ اوپر چڑھ گئی۔

"خاتون .... خاتون! یہ کیا کر رہی ہیں' آپ گر جائیں گی۔" شہزاد کی تیز آواز مجھے سنائی دی۔

اس وقت تک میں دیوار تک پہنچ چکی تھی۔ دیوار کے اوپر چڑھنے کے بعد میں نے نیچے صحن پر شہزاد' فرہاد اور سنبل کو دیکھا۔ وہ سب منہ اٹھائے میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ اوپری منزل پر موجود شہزاد کے چچا امجد کے کمرے سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے سامان کی توڑ پھوڑ جاری ہو۔

"ہائے میں مرا۔" امجد کی تیز آواز آئی۔ یقیناً اسے اب تک زد و کوب کیا جا رہا تھا۔

مزید وقت ضائع کئے بغیر میں دیوار سے دوسری جانب کود گئی اور پھر امجد کے کمرے کی طرف دوڑی۔

جیسے ہی میں بھاگتی ہوئی کمرے کے دروازے کے اندر داخل ہوئی' ایک شخص چیخ اٹھا۔ "وہ آ شیامو استاد!"

"اگر یہ آ ہی گئی ہے تو پھر آج میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

میں ان تینوں ہی کو ایک نظر دیکھ کر پہچان گئی۔ دراز قد شخص کا نام شیامو تھا۔ جو شخص مجھے دیکھ ہی چیخا تھا وہ شیامو کا شاگرد جانکی تھا۔ تیسرے شخص کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔

چند روز قبل اسی جگہ ان ہندو غنڈوں سے میرا ٹاکرہ ہو چکا تھا۔ وہ تینوں ہی میرے ہاتھوں پٹے سب سے زیادہ شامیو استاد پٹا تھا۔ وہ اپنے پیروں پر چل کر نہیں جا سکا تھا۔ شاید وہ امجد سے اسی انتقام لینے آج آیا تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دیکھا تھا کہ جانکی تو امجد کو زد و کوب تھا اور شیامو اپنے ایک گرگے کے ساتھ سامان کی توڑ پھوڑ میں مصروف تھا۔ شیامو کے ہاتھ میں ہاکی وہ جارحانہ انداز میں ہاکی اٹھائے میری طرف لپکا۔ جانکی اور اس کے دوسرے گرگے نے اپنی اپنی میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال کے کھول لئے تھے۔ اس کے برعکس میرے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ امجد پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ اس کی شاید خاصی پٹائی ہو چکی تھی۔

ایک نہتی عورت کے مقابلے میں پر یوں تین مردوں کا آ جانا' بہادری نہیں بزدلی تھی۔

"شیامو استاد! آج بھی میں تجھے پیروں پر چل کر یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔" یہ کہتے اپنی جگہ سے اچھل کر دائیں جانب ہو گئی کیوں کہ شیامو نے مجھ پر وار کر دیا تھا۔ مجھ سے اگر چھوڑنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو ہاکی کی بھرپور ضرب میرے سر پر پڑی ہوتی۔

اس جگہ سے میرے ہٹ جانے کے سبب ہاکی پوری شدت کے ساتھ کمرے کے فرش پر عین اسی وقت میں نے اچھل کے شیامو کے پہلو پر زوردار لات ماری۔ ضرب اتنی کاری تھی کہ ا

منہ سے چیخ نکل گئی۔ میری دوسری لات شیامو کی دائیں کلائی پر پڑی۔ میری توقع کے مطابق ہاکی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور فرش پر پڑے ہوئے امجد کے پاس جا کے گری۔ شیامو کے ہاتھ سے ہاکی چھوٹتے ہی اس کے دونوں گرگے جھپٹ کر آگے آ گئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں چاقو تھا' اس کے باوجود اپنے چہروں سے وہ گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔

"ٹھہرو!" میں نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔ "تمہارا استاد یہاں سے اپنے پیروں پر چل کر نہیں جائے گا۔ تم دونوں ہی کو اسے یہاں سے اٹھا کر لے جانا ہے' اس لئے بہتر یہ ہے کہ تم مجھ سے اپنے ہاتھ پیر نہ تڑواؤ اور چاقو پھینک دو' اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ تم نے اگر چاقو پھینک دیئے تو میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

میری بات سن کر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے جیسے کوئی فیصلہ کرنا چاہتے ہوں۔ میرے کہنے پر وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئے تھے' یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ مجھ سے خوفزدہ ہیں۔

"چیر دو اس حرامزادی کو۔" شیامو استاد پیچھے سے چیخا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں کلائی تھامے ہوئے تھا۔ لگتا تھا کلائی کی ہڈی پر کچھ زیادہ ہی چوٹ آ گئی تھی۔

معاً وہ دونوں وحشیوں کی طرح چیخ کر مجھ پر جھپٹ پڑے۔ میں نے جست بھری اور پھر کسی پرندے کی طرح اڑتی ہوئی ان کے سروں کے اوپر سے عقب میں موجود شیامو استاد کے شانے پر کھڑی کہنی کی بھرپور ضرب لگائی۔ وہ چیختا ہوا زمین پر بیٹھ گیا تو میں تیزی سے پلٹی۔ شیامو کے دونوں گرگے اپنے ہی زور میں دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کے دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوتے' میں اس طرف لپکی جدھر فرش پہ ہاکی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے تیزی سے جھک کر ہاکی اٹھا لی۔ اسی وقت میری نگاہ قریب ہی فرش پر پڑے ہوئے امجد کی طرف اٹھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اسے شاید کسی عورت سے یہ توقع نہیں رہی ہو گی کہ وہ یوں مردانہ وار لڑ سکتی ہے' حالانکہ اس کے لئے کوئی ایسا منظر دیکھنے کا یہ دوسرا موقع تھا۔ اس وقت تک وہ دونوں مجھ پر حملہ کرنے کے لئے پلٹ چکے تھے۔ میرے ہاتھ میں ہاکی دیکھ کر وہ ٹھٹک کے رک گئے۔

"رک کیوں گئے حرامزادے کے چیلو!" میں نے انہیں للکارا۔ "آگے بڑھو نا' تم نے ایک بار مجھ پر حملہ کر کے اپنے لئے رحم کا خانہ بند کر لیا ہے۔ اب تم تینوں کو ہی خود میں باری باری اٹھا کے گھر سے باہر پھینک کر آؤں گی۔" یہ کہتے ہی میں آگے بڑھی۔

غالباً ان دونوں ہی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جب نہتی ہونے کے باوجود وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے تو ہاکی ہاتھ میں آ جانے کے بعد مجھ پر قابو پا لینا ناممکن ہے۔ اچانک ان دونوں نے اپنے چاقو پھینک دیئے۔ پھر جانکی گڑگڑایا۔ "ہمیں معاف کر دیں دیوی جی! ہم سے غلطی ہو گئی۔"

"ابے حرامیو! ایک ذرا سی لونڈیا سے ڈر گئے۔" شیامو استاد غصے کی وجہ سے چیخ اٹھا۔

"معاف کرنا استاد! ہمیں یہاں سے اپنے ہاتھ پیر سلامت لے جانے ہیں۔" جانکی منہ بنا کر بولا۔

جواب میں شیامو استاد ان دونوں کو گالیاں بکنے لگا۔ پھر میں نے اسے ایک دم اٹھ کر کھڑے ہوتے

دیکھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں اب کھلا ہوا چاقو نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اس نے اٹھنے سے پہلے اپنے کرتے جیب میں ہاتھ ڈال کے چاقو نکال لیا تھا۔ چاقو کو وہ دستے کی طرف سے نہیں بلکہ نوک کی طرف پکڑے ہوئے تھا۔ چاقو کی نوک اس نے چٹکی میں لے رکھی تھی۔

"پہلے میں نے سوچا تھا کہ تجھے بے آبرو کرنے کے بعد زخمی حالت میں یہاں تڑپتا ہوا چھوڑ جا گا لیکن اب .... اب میں تجھے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔" شیامو استاد غرایا۔

میں اس کا ارادہ بھانپ چکی تھی اسی لئے پوری طرح چوکنا کھڑی تھی۔ شیامو استاد کسی بھی لمحے پھینک کر مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ میری نظریں اس کے دائیں ہاتھ ہی پر جمع ہوئی تھیں۔ پھر ادھر اس کا چاقو پھینکنے کے لئے بلند ہوا' ادھر میں انتہائی تیزی کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئی۔ چاقو سرسراتا ہوا میرے سے گزرا اور کافی فاصلے پر موجود دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ شیامو نے پوری قوت سے چاقو پھینکا تھ شاید اس کا نشانہ بھی غلط نہیں تھا' پھر بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"یہ تو بہت برا ہوا شیامو استاد!" میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ہاکی اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔ "تمہارے لئے یہ تو ڈوب مرنے کا مقام ہے شیامو استاد کہ آج تمہیں ایک لڑکی کے ہاتھوں پٹنا پڑے گا۔ ایسا کرو کہ پھر دو ایک بار کوشش کر کے دیکھ لو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم حسرت دل ہی میں رہ جائے۔ وہ دیکھو' تمہارے اور میرے درمیان فرش پر دو چاقو اور پڑے ہیں۔ یہ چاقو ہیں جو تمہارے دونوں شاگردوں نے پھینکے ہیں۔ انہیں اٹھا لو' یقین کرو میں تمہیں نہیں روکوں گی

میری بات سن کر شیامو استاد مجھے ناقابل یقین سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اچانک وہ آگے مگر میں نے اسے چاقو اٹھاتے نہیں دیکھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر میرے قدموں میں جھک گیا میرے دونوں پیر پکڑ لئے تھے۔ میں' شیامو استاد کی اس حرکت پر حیران رہ گئی۔ آخرکار اس نے یوں قدموں میں جھک کر میری برتری تسلیم کر لی تھی۔ اس موقع پر مجھے راجا استاد یاد آ گیا تھا۔ اس نے اسی طرح میرے قدموں میں چاقو ڈال کر لڑے بغیر ہی اپنی شکست مان لی تھی۔

"مجھ سے بھول ہو گئی دیوی کہ میں تجھے نہیں پہچان سکا۔" شیامو استاد کے لہجے میں عاجز

"مجھ سے زیادہ عقل مند تو وہ دونوں رہے کہ جنہوں نے تجھے پہچان لیا۔"

"اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ استاد!" میں نے ہاکی پھینک کر اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ "یو انسان کا دوسرے انسان کے سامنے جھکنا اچھا نہیں لگتا۔"

"تم دونوں بھی دیوی کے چرن چھوؤ بے۔" شیامو استاد نے اپنے دونوں گرگوں کو لتاڑا۔

میں انکار ہی کرتی رہ گئی مگر وہ دونوں نہیں مانے۔ اس کے بعد میرے کچھ کہے بغیر ہی انہ امجد سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ بطور تاوان شیامو استاد نے امجد کو ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ میں سے اس نے آدھی رقم اسی وقت ادا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں سے جو دو سو روپے لو وہ بھی امجد کو واپس کر دیئے تھے۔ کمرے میں مرہم پٹی کا کچھ سامان ٹین کی ایک صندوقچی میں شیامو استاد نے خود اپنے ہاتھ سے امجد کی مرہم پٹی کی۔

"امجد! آج سے تم میرے بھائی ہو۔" شیامو استاد کے لہجے میں خلوص تھا۔ "میں ایک بار پھر تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

میں اس چکر میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ مجھے اوپر آئے ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے۔ میں چونکی اس وقت جب دروازے پر دستک دینے کی آوازیں آئیں۔ میں تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلی اور آگے بڑھ کر زینے کے دروازے کی کنڈی کھول دی۔ پھر میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی شہزاد کھڑا نظر آیا جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ "کیا وہ غنڈے بھاگ گئے خاتون؟"

"نہیں' ابھی تو نہیں بھاگے۔ کیوں' کیا ان سے تمہیں بھی کام ہے؟" مجھے شرارت سوجھی۔

"کک .... کیا وہ .... وہ ابھی موجود ہیں؟ شاید آپ .... آپ مجھے بنا رہی ہیں۔"

"تم تو پہلے ہی سے اچھے خاصے بنے بنائے ہو' تمہارے اندر مزید بنائے جانے کی گنجائش نہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو میرے ساتھ آؤ' ان غنڈوں کا دیدار کرائے دیتی ہوں۔ تم نے تو انہیں دیکھا تھا' پہچان لو گے۔" یہ کہتے ہی میں نے شہزاد کا ہاتھ تھام لیا۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا خاتون کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں!" شہزاد میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

شہزاد کو میں اپنے ساتھ امجد کے کمرے میں لے گئی تو وہ شیامو استاد وغیرہ کو دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ وہ تینوں کمرے کے بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ رہے تھے اور امجد اپنے بستر پر نیم دراز تھا۔

"یہی ہیں نا وہ غنڈے؟" میں نے شہزاد سے سوال کیا۔

"جج .... جی .... جی ہاں خاتون!" شہزاد نے ہکلا کر تصدیق کی۔

"میں نے ان کے ڈنک نکال دیئے ہیں اور اب یہ بے ضرر ہو چکے ہیں۔ یقین نہ آئے تو خود ان سے پوچھ کر دیکھ لو۔" میں مسکرا کر بولی۔ پھر میں نے شیامو استاد کو مخاطب کیا۔ "اب میں چل رہی ہوں استاد! اب تم جانو اور چچا امجد جانیں۔"

"ذرا ٹھہریں دیوی جی!" شیامو استاد اٹھ کر میرے قریب آیا۔ "چرن تو چھو لینے دیں جانے سے پہلے۔" پھر اس نے شہزاد سے بھی معافی مانگ لی۔

شہزاد حیرت سے ان تینوں کو باری باری میرے قدموں میں جھکتے دیکھتا رہا۔ پھر میں اس کے ساتھ کمرے سے نکل آئی اور بولی۔ "اب وہ کبھی یہاں آ کر جھگڑا نہیں کریں گے۔"

"حیرت ہے خاتون کہ آپ .... آپ نے ان سرکش غنڈوں کو کس طرح سیدھا کر دیا۔ آپ تو کمال کر دیتی ہیں۔" شہزاد نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ' تم نے میرا کام کر دیا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "مکان کی صفائی بھی ہو گئی ہے اور ایک کمرے میں فرنیچر بھی لگا دیا ہے۔ اس کمرے کے علاوہ دو کمرے اور ہیں۔ میں ان کے لئے فرنیچر نہیں لایا۔"

"ضرورت بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا اور زینے سے اترنے لگی۔ "ہاں' فرہاد وغیرہ کو یہ نہ بتانا کہ

غنڈے ابھی اوپر موجود ہیں۔"

شہزاد کے ساتھ میں نیچے آگئی تو اس کی ماں نے بلند آواز میں معلوم کیا۔ "ارے کیا ہوا شہزاد بڑ .... وہ موئے غنڈے بھاگے کہ نہیں ابھی؟"

"بھاگ گئے اماں!" شہزاد نے بھی بلند آواز میں بتایا اور ہاتھ سے بھی بھاگ جانے کا اشارہ کیا کیو کہ اس کی ماں اونچا سنتی تھی۔

"خدا کا شکر ہے کہ کم بختی مارے دفع ہوئے۔" بڑھیا نے کہا۔ پھر اسے میری فکر ہوئی۔ "ار رانی بٹیا کے تو چوٹ پھینٹ نہیں آئی؟"

"نہیں اماں!" شہزاد نے جواب دیا تو بڑھیا کے چہرے سے اطمینان جھانکنے لگا۔

"معلوم نہیں یہ امجد کس دن یہاں سے جائے گا۔ جب سے آیا ہے' ایک دن کو چین نصیب ن ہوا۔" بڑھیا اپنے دیور کو برا بھلا کہنے لگی۔

آتے ہی میں اوپر چلی گئی تھی اس لئے سنبل سے بھی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ میں نیچے آئی مجھ سے آ کے لپٹ گئی۔

"آپ نے یہ بہت اچھا کیا باجی کہ لوٹ آئیں یہاں۔ اب میں آپ کو جلدی نہیں جانے دوں ہاں۔" سنبل کہنے لگی۔ اسے یہ غلطی فہمی یقیناً میرے ساتھ سوٹ کیس دیکھ کر ہوئی تھی۔

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا پگلی کہ میں دوبارہ یہاں رہنے آگئی ہوں۔" میں ہنس کر بولی۔ "ا یہ سوٹ کیس تو آج ہی خریدا ہے' راستے سے۔ کچھ کپڑے اور دوسرا سامان بھی بازار سے خریدا سوٹ کیس میں رکھ لیا ہے۔ یہاں بھی رہوں گی آ کر مگر ابھی نہیں۔"

"ویسے تو باجی سے بڑی محبت ظاہر کر رہی ہے لیکن چائے تک کو ابھی نہیں پوچھا۔" شہزا اٹھا۔ "ہم بیٹھک میں جا رہے ہیں' چائے بنا کر لاؤ عمدہ سی۔"

"ابھی لائی .... اور ہاں باجی! کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی آپ کو۔"

"شرط یہ ہے کہ تمہیں بھی میرے ساتھ کھانا کھانا پڑے گا۔ یہ نہیں چلے گا کہ میں گرم روٹی جا رہی ہوں' آپ کھائیں۔" میں ہنسی۔

"دراصل بات یہ ہے خاتون کہ ہمارے یہاں پہلے مہمانوں اور مردوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے کے بعد عورتیں کھاتی ہیں۔" شہزاد بولا۔

"تاکہ مہمان اور مرد حضرات سالن سپوٹ جائیں تو بے چاری عورتیں چٹنی روٹی کھا کے گز لیں' ہے نا؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "ویسے جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میں خود کو مہمان نہیں' اس ایک فرد سمجھتی ہوں اس لئے میرے ساتھ پہلے اور بعد کا چکر نہیں چلے گا۔" اسی وقت میں نے والے کمرے سے فرہاد کو نکلتے دیکھا تو اس سے سوٹ کیس اور اپنے ہینڈ پرس کے بارے میں پوچھ وقت وہ صحن میں تھا جب میں نے سوٹ کیس اور ہینڈ پرس اس کے حوالے کیا تھا۔

"دونوں چیزیں میں نے کمرے میں رکھ دی ہیں' کہیں تو لا دوں؟" فرہاد کہنے لگا۔ "ویسے

آپ یہاں رہیں گی ہی نا!"

میں نے اس کی غلط فہمی بھی دور کر دی' پھر اس کو دونوں چیزیں لانے کو کہہ کر شہزاد کے ساتھ نشست گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ میں وہاں پہنچی تو فرہاد دونوں چیزیں دے گیا۔

کچھ دیر کے بعد جب میں چائے پی رہی تھی تو شہزاد سے بولی۔ "کیا خیال ہے' چائے پی کر چلیں' کوچہ چیلان کی طرف۔ ایک نظر مکان چل کر دیکھ لیا جائے۔"

"جیسا آپ کہیں۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "چاہے چائے پی کر چلیں یا پھر کھانا کھا کے ایک ساتھ ہی چلئے گا۔"

"ابھی تو کھانے میں دیر ہے۔ جب تک کھانا پکے گا' ہم وہاں سے ہو کر بھی آ جائیں گے۔" میں نے چائے کا گھونٹ لیا۔ "ہاں تم نے مالک مکان کو یہ بھی بتا دیا کہ نہیں' میں مستقلاً صرف اسی مکان میں نہیں رہوں گی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں ہفتے میں ایک آدھ رات ہی وہاں گزاروں۔"

"میں نے یہ بتایا تو نہیں لیکن آپ کہیں گی تو بتا دوں گا۔ ویسے یہ بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ آپ وہاں رہیں نہ رہیں انہیں کرایہ ملتا رہے گا۔"

"یہ میں اس لئے کہہ رہی تھی کہ کہیں وہ میری طرف سے تشویش میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ بہرحال' تم ضروری نہیں سمجھتے تو چھوڑو۔"

"ہاں کبھی بات نکلی یا انہوں نے مجھ سے پوچھا تو کہہ دوں گا کہ دہلی میں آپ کے کئی عزیز ہیں اور آپ ان کے یہاں بھی رہتی ہیں۔"

چائے پی کر میں شہزاد کے ساتھ مکان کے لئے کوچہ چیلان روانہ ہو گئی۔ اس سے میرا ایک مقصد راستہ ذہن نشین کرنا بھی تھا۔ مکان کی چابی شہزاد کے پاس ہی تھی۔

چتلی قبر سے کوچہ چیلان زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم ٹہلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ مکان قدیم طرز تعمیر کا تھا۔ تالا کھول کر ہم نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ کسی نے کنڈی ہلائی۔

"کون ہے بھائی!" شہزاد نے صحن کی بتی جلاتے ہوئے بلند آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں شہزاد بھائی' مجید!" باہر سے آواز آئی۔ "اجازت ہو تو اندر آ جاؤں؟"

"آ جاؤ۔" شہزاد نے جواب دیا' پھر مجھے بتایا۔ "مالک مکان چچا حمید کا بیٹا مجید ہے۔"

ذرا ہی دیر بعد ایک وجیہہ نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس نے مجھے سلام کیا' پھر کہنے لگا۔ "آپ کو مکان پسند آیا محترمہ!" وہ شہزاد کے چھوٹے بھائی فرہاد کی عمر کا لگتا تھا۔

"ابھی تو ہم لوگ آئے ہیں' دیکھوں گی اب .... ویسے ٹھیک ہی لگتا ہے۔" میں بولی۔

"شہزاد بھائی بتا رہے تھے کہ آپ اکیلی ہی یہاں رہیں گی۔ مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی۔" مجید نے ا۔ وہ مجھے کچھ باتونی سا لگ رہا تھا۔

"کیوں' اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

"اس لئے محترمہ کہ میں نے آج تک کسی خاتون کو اکیلے رہتے نہیں دیکھا۔ آپ مجھے بہت ہمت

والی لگتی ہیں۔" اس کا انداز بچگانہ سا تھا۔

اس کی بات سن کر میں ہنس دی' پھر شہزاد سے بولی۔ "یہیں کھڑے رہو گے کہ کمرے بھی دکھاؤ گے۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں' چلیں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

میں نے صرف وہی کمرہ دیکھنا ضروری سمجھا جو شہزاد نے بطور خواب گاہ میرے لئے منتخب کیا تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔" پھر میں باہر آ گئی۔ مجید بھی ہمارے ہی ساتھ ساتھ تھا۔ باہر آ کر میں نے باتھ روم وغیرہ کا بھی جائزہ لیا' پھر اس طرف بڑھ گئی جدھر اوپری منزل پر جانے کے لئے زینہ تھا۔

"خاتون! میں نے اس طرف سے کنڈی لگا دی ہے۔" شہزاد نے بتایا۔ "چچا حمید سے بھی میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ بھی دوسری طرف سے کنڈی لگا کر رکھیں' ٹھیک ہے نا!"

"ہاں بالکل۔" میں نے تائید کی۔ "اس طرح نہ کوئی اوپر سے نیچے آ سکے گا نہ یہاں سے کوئی اوپر۔ ادھر سے تالا ہی ڈال دیتے تو اور بھی اچھا تھا۔"

"آپ کہیں گی تو کل تالا بھی خرید کر ڈال دوں گا۔" شہزاد بولا۔

معلوم نہیں مجید کو یہ بات کیوں ناگوار ہوئی اور اس نے اپنی ناگواری کا اظہار بھی کر دیا۔ "معاف کیجئے گا محترمہ! آپ شاید ہم لوگوں کو کچھ غلط سمجھ رہی ہیں۔ اس طرح کے انتظامات وہاں کئے جاتے ہیں جہاں ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو۔ ہم شریف لوگ ہیں' آپ کے قیمتی ساز و سامان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھیں گے۔ آپ نے آخر ہمیں سمجھا کیا ہے؟ کیا آپ ہم لوگوں کو چور اچکا سمجھ رہی ہیں؟" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں تلخی بھی آ گئی اور سختی بھی۔

"ارے ارے' مجید! یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ یہ تو خیال کرو کہ خاتون ہماری مہمان ہیں۔" شہزاد اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے لگا۔

"مہمان ہوں گی آپ کی' ہماری تو یہ کرائے دار ہیں۔" وہ اور بھی اینٹھ گیا۔ "آپ بتا رہے تھے ابا کو یہ بہت مالدار خاتون ہیں۔ اگر یہ مالدار ہوں گی تو اپنے لئے یا آپ کے لئے۔ انہیں ہماری عزت نفس پر حملہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔" پھر اس نے آگے بڑھ کر زینے کے دروازے کی کنڈی کھول دی اور غصے میں بولا۔ "یہ کنڈی انہیں کھلی ہی رکھنا پڑے گی۔ کنڈی نہ ادھر سے لگے گی نہ دوسری طرف سے۔ اگر انہیں ہم پر بھروسہ نہیں اور ہمیں چور اچکا ہی سمجھ رہی ہیں تو اپنا رستہ لیں' کوئی اور مکان دیکھ لیں کرائے پر۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو مجید!" شہزاد کو بھی غصہ آ گیا۔ "زبان سنبھال کر بات کرو' برداشت کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ چچا حمید ہیں گھر میں؟ میں ابھی ان سے تمہاری بدتمیزی کی شکایت کرتا ہوں۔ تمہیں چھوٹے بڑے کا بھی کوئی لحاظ نہیں رہا۔"

شہزاد تو مجید پر اظہار خفگی کر رہا تھا لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ میں نے کوئی ایسی بات نہیں

کہی تھی کہ وہ نوجوان اس طرح آپے سے باہر ہو جاتا۔ یہ معاملہ بگاڑنے میں ایک اور ہی لعنتی ہستی کا ہاتھ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے کچھ کچھ خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔

شہزاد کے ناراض ہونے پر خلاف توقع مجید خاموش ہو گیا اور پھر صرف اتنا کہہ کر چلا گیا کہ وہ اپنے باپ کو نیچے بھیج رہا ہے۔

کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص اتر کر نیچے آیا۔ وہ شخص مجھے بڑی سی ایک گیند معلوم ہوا۔ اس کا قد بہت مختصر تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ ہر طرف سے گول ہی گول نظر آتا تھا۔ چہرہ گول' آنکھیں آلوؤں کی طرح گول گول' توند آگے کو نکلی ہوئی اور گول۔ شہزاد نے اس شخص کو سلام کیا' پھر اس سے میرا تعارف کرایا۔ "چچا! یہ رانی صاحبہ ہیں۔" پھر وہ میری طرف مڑا۔ "اور رانی صاحبہ! یہ میرے والد کے دوست چچا حمید ہیں۔"

"وہ تو خیر ہیں' مگر یہ چور اچکے والا کیا قصہ ہے؟" اس شخص حمید نے شہزاد سے پوچھا' پھر میری طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کے بعد وہ گویا تفصیل کے ساتھ میرا جائزہ لینے لگا۔

"مجید نے آپ سے یہ بات کہی ہو گی' اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر شہزاد' بوڑھے کو ساری بات بتانے لگا۔

جتنی دیر شہزاد اس بوڑھے کو اصل واقعہ بتاتا رہا' بوڑھے کی نظریں میرے جسم پر رینگتی رہیں۔ بوڑھے کی نظروں کی آوارگی مجھے گراں ہو رہی تھی' مگر میں کرتی بھی کیا۔ مجبوراً برداشت کرتی رہی حالانکہ یہ جی چاہ رہا تھا کہ اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دوں۔ بوڑھے نے شہزاد کے سر پر پٹی بندھے ہونے کی وجہ بھی پوچھی اور شہزاد اصل بات گول کر گیا۔

"یہ تو ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" بوڑھے نے آخر فیصلہ سنا دیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو شہزاد میاں! واقعی اس لڑکے کا دماغ چل گیا ہے۔" پھر وہ اپنے بیٹے کی طرف سے معذرت کرنے لگا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ "آپ کچھ خیال نہ کیجئے گا۔ دراصل جب سے اس کی بیوی گھر میں آئی ہے' بے سرا ہو گیا ہے۔ آپ چاہے کنڈی لگائیں چاہے تالا ڈال کے رکھیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جیسی کرایہ دار تو ہمارے لئے باعث عزت افزائی ہیں۔ آپ کو کوئی بھی ضرورت ہو' مجھے آدھی رات کو آواز دے لیں' فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔" مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی بوڑھا مسلسل نظربازی میں مصروف رہا۔ اسے شاید وہاں شہزاد کی موجودگی کا بھی خیال نہیں تھا۔

"شکریہ محترم!" میں نے اخلاقاً کہہ دیا۔

"ارے میں کہاں کا محترم ہو گیا' ابھی سے؟" بوڑھے نے ہنس کر کہا۔ "میری عمر کوئی زیادہ نہیں ہے۔ دراصل سولہ سال کا تھا تو اسی وقت گھر والوں نے پیروں میں بیڑی ڈال دی تھی' میری مراد شادی سے ہے۔ اسی سال یہ صاحبزادے تولد ہو گئے۔ مجید بیس سال کا ہے۔ تو یہاں میری عمر کا حساب لگا لیں' بیس اور سترہ' سینتیس ہوئے۔ تو بھلا یہ کوئی محترم کہلانے کی عمر ہے۔ ابھی تو یہ سمجھیں کہ جوانی ہے۔"

بوڑھا اس طرح اپنی عمر کا حساب بتا رہا تھا جیسے جوانی کا اشتہار دے رہا ہو۔

بات بگڑتے بگڑتے پھر بن گئی تھی۔ میں نے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ یہ میرا وہم ہی ہو گا کہ چچا اس معاملے میں ٹانگ اڑا رہی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بوڑھا بھی وہی بولی بولتا جو اس کا بیٹا بول کر گیا تھا۔ میں نے اس پر اطمینان کا سانس لیا۔

"اچھا اب چلو شہزاد!" میں بولی۔

"ارے آپ پہلی مرتبہ تشریف لائی ہیں' میں آپ کے لئے چائے بنوا کر لاتا ہوں۔" بوڑھا کہنے لگا۔

"نہیں چچا! رہنے دیں۔ ابھی ہم لوگ چائے پی کر ہی آئے ہیں۔ اب کھانا بھی کھانا ہے جا کر۔" شہزاد بول اٹھا۔

"تو کب سے آپ اس غریب خانے کو رونق بخش رہی ہیں؟" بوڑھے نے مجھے مخاطب کیا۔

"شہزاد نے نہیں بتایا آپ کو.......... میں آج رات یہیں سوؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں' میں چچا کو بتا نہیں سکا تھا۔" شہزاد نے مجھ سے کہا' پھر بوڑھے سے کہنے لگا۔ "اور ہاں چچا' ضروری نہیں کہ رانی صاحبہ روز ہی یہاں آ کر رہیں۔ ان کے کئی عزیز بھی اسی شہر میں ہیں۔ یہ وقتاً فوقتاً وہاں بھی رہیں گی۔ میں نے یہ بات اس لئے بتا دی چچا کہ آپ ان کی طرف سے فکرمند نہ رہیں۔"

"یہ بتا کر تم نے اچھا کیا شہزاد میاں! یہ نہ آتیں تو ان کی طرف سے فکر تو رہتی۔ ماشاء اللہ جوان جہان ہیں اور حسین بھی ہیں۔ تمہیں تو خبر ہے' زمانہ کتنا خراب ہے۔ پرسوں ہی کی بات ہے۔ شیر محمد کی بیٹی اکیلی گلی سے گزر رہی تھی' شابو کمبخت اس کے پیچھے لگ گیا۔ آج کل کے لونڈے ذرا سی کیا سونگھ لیتے ہیں کہ کسی چوہے کی طرح دم کے بل کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو قاضی جی کا' انہوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ تو شابو نے شیر محمد پر چاقو نکال لیا تھا۔ محلے میں کھلے عام جوئے کا اڈا چلاتا ہے اور پولیس کچھ نہیں کہتی۔" بوڑھا بولا۔

"مال کھلاتا ہو گا پولیس کو' پھر پولیس اس سے کچھ کیوں کہنے لگی۔" شہزاد نے برا سا منہ بنایا۔

"اور ہاں' وہ تمہارے چچا امجد کا کیا حال ہے؟ کچھ سدھرا کہ نہیں؟" بوڑھے نے شہزاد سے سوال کیا۔ جوئے کے ذکر پر اسے امجد یاد آ گیا تھا۔

"چچا امجد بھلا کہاں سدھرنے والے ہیں؟"

"ہاں میاں! جو ایک دفعہ بگڑ گیا' سو بگڑ گیا۔" بوڑھا طویل سانس لے کر بولا۔ "اس کی وجہ سے تمہارا باپ بے چارہ خواہ مخواہ فکرمند رہتا ہے۔ جب سے امجد آ کر یہاں مستقل طور پر بسا ہے' ارشد علی کو چین نہیں ملا۔"

بوڑھا باتیں بنائے جا رہا تھا۔ بات تو وہ شہزاد سے کر رہا تھا مگر نظریں مجھی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے شہزاد کو چلنے کے لئے ٹہوکا دیا۔

شہزاد چلنے کے لئے غالباً کہنے ہی والا تھا کہ بوڑھے نے ایک اور قصہ چھیڑ دیا جو مجھے سخت ناگوار گزرا۔ بوڑھے نے کہا۔ "شہزاد میاں! تم نے ایک خاص بات محسوس کی' رانی صاحبہ کی شکل و صورت

تمہاری مرحومہ چچی جان سے کتنی ملتی ہے۔"

"چچا! مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔" شہزاد نے انکار میں سر ہلایا۔ "جہاں تک مجھے یاد ہے' چچی سانولی تھیں۔"

"بس ذرا رنگ ہی تو اجلا ہے ان کا' باقی تو سب کچھ وہی ہے نا۔" بوڑھے نے پھر میرے سراپا کو اپنی نظروں سے تولا۔

"چچی کا تو جسم بھی بھاری تھا اور قد بھی تقریباً آپ کے برابر ہو گا۔"

"جب مجید پیدا نہیں ہوا تھا تو تمہاری چچی بھی انہی کی طرح دبلی پتلی تھیں۔ ہاں مرحومہ کا قد ان سے تھوڑا کم ضرور ہو گا' باقی تو کوئی فرق نہیں ہے نا۔"

"معلوم نہیں کیوں آپ کو ان میں چچی مرحومہ کی مماثلت نظر آ رہی ہے؟ چچی کی تو آنکھیں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں اور سر کے بال بھی جھڑ گئے تھے۔"

"یہ تو بعد کی بات ہے میاں! ورنہ تو جب تمہاری چچی بیاہ کر آئی تھیں' ان کے بال بھی رانی صاحبہ کی طرح کالی گھٹا لگتے تھے۔ بس آنکھیں ذرا ان کے مقابلے میں قدرے چھوٹی تھیں۔ خیر' تم کچھ بھی کہو' مجھے تو ان میں تمہاری چچی کی جھلک ہی نظر آتی ہے۔" بوڑھا اپنی بات پر اڑا رہا۔

شہزاد کی باتوں سے اس بوڑھے کی مرحومہ بیوی کا جو نقشہ میرے ذہن میں بنا وہ یہ تھا' پستہ قد' بھاری جسم' سر کے بال جھڑے ہوئے' آنکھیں چھوٹی' مجھ سے اس کا کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کا اعتراف خود بوڑھے نے بھی کیا تھا' پھر بھی وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم تھا۔ مجھے اپنی بیوی سے مشابہہ ظاہر کر کے شاید وہ اپنے سفلی جذبات کی تسکین کر رہا تھا۔ میں نے اس کی بکواس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر براہ راست اسے مخاطب کیا۔ "اچھا اب اجازت دیجئے.......... چلو شہزاد!"

"جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ گھڑی بھر بھی نظروں سے اوجھل نہ ہوں' مگر پھر سہی۔ یار زندہ صحبت باقی!"

پھر بوڑھا زینے سے اوپر چلا گیا تو میں نے شہزاد سے کہا۔ "کنڈی لگا دو۔"

شہزاد نے آگے بڑھ کر کنڈی ڈال دی' پھر میرے ساتھ گھر کے صدر دروازے سے نکل کر باہر آ گیا۔

میں واپسی میں شہزاد سے بولی۔ "یہ تمہارا چچا حمید بڑا ہی چیکو اور گھٹیا قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ بار بار مجھے اپنی مرحومہ بیوی سے ملائے جا رہا تھا اور تم نے اس خبیث کی نظریں دیکھی تھیں' یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے نظروں ہی نظروں میں نگل جائے گا۔ ذلیل بڈھا۔" میں نے اپنی بھڑاس نکال لی۔

"ہاں' برا تو مجھے بھی لگا تھا۔" شہزاد نے میرے خیال کی تائید کی۔ "پہلے تو کبھی چچا حمید کو ایسی کوئی حرکت کرتے نہیں دیکھا۔"

"آج تو دیکھ لیا؟ اوپر کچھ' اندر کچھ۔" میں منہ بنا کر بولی۔

اسی وقت میں نے سامنے سے ایک لمبے تڑنگے آدمی کو جھومتے جھامتے ہوئے آتے دیکھا۔ وہ گلی

کچھ پتلی تھی۔ میں اسی لئے شہزاد کی آڑ میں ہو گئی تاکہ وہ آدمی آسانی سے گزر جائے۔ وہ کچھ اور قریب آیا تو میں نے اس کی چڑھی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ اس کے چوڑے چکلے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ عمر چالیس کے قریب لگتی تھی۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا۔ وہ جب ذرا آگے بڑھ گیا تو شہزاد نے مجھے بتایا۔ "یہی وہ شابو بدمعاش ہے' چچا حمید جس کا ذکر کر رہے تھے۔"

"ہو گا' لعنت پڑھو۔" میں ناگواری سے بولی۔ "سارا شہر ہی ایسے لچے لفنگوں سے بھرا پڑا ہے لیکن یہ لوگ پھر بھی تمہارے چچا حمید جیسے لوگوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ یہ جیسے بھی ہیں' ظاہر تو ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تو ہے۔ یہ شرافت کا دعویٰ تو نہیں کرتے نا!"

"ٹھیک کہتی ہیں آپ۔" شہزاد نے میری بات سے اتفاق کیا۔

شہزاد کے ساتھ جب میں اس کے گھر پہنچی تو اوپری منزل سے اس کے باپ ارشد علی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا کہ ارشد علی کو اس کی بیوی نے آج پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا تھا۔ ارشد علی اسی پر اپنے چھوٹے بھائی امجد کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

"امی! آپ نے ابا کو کیوں بتا دیا سب کچھ؟ اچھی خاصی بات ختم ہو گئی تھی۔" شہزاد اپنی ماں سے بولا۔

"خاک ختم ہو گئی بات۔ ارے جب تک یہ امجد اس گھر میں ہے یہ ہنگامے ختم نہیں ہونے کے۔ میں اگر تیرے ابا کو نہ بتاتی اور انہیں کسی اور سے ہنگامے کا پتا چل جاتا' پھر محلے والے بہرے تو نہیں ہیں۔ کوئی نہ کوئی تو ان سے کہہ ہی دیتا' پھر وہ میرے لتے لیتے کہ میں نے انہیں کیوں یہ بات نہیں بتائی۔" بڑھیا نے ہاتھ نچا کر کہا۔

شہزاد نے خاموشی اختیار کر لی۔ سنبل کھانا پکا چکی تھی۔ شہزاد نے دالان کے تخت پر فرہاد سے چٹائی اور دسترخوان بچھوا دیا۔

"ابا نیچے آ جائیں تو کھانا نکال لینا۔" شہزاد نے اپنی بہن سنبل کو مخاطب کیا۔

شہزاد کا باپ جلد ہی نیچے اتر آیا۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا تو اس نے اخلاقاً مسکرا کر جواب دیا' پھر میری خیریت پوچھنے لگا۔ سنبل کھانا لانے چلی گئی۔ میں دالان ہی میں بیٹھ گئی تھی۔ شہزاد کی ماں پلنگ پر میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔

"کیا کہا امجد نے؟" بڑی بی نے پھر وہی ذکر چھیڑ دیا۔

"ہوش میں ہو تو کچھ کہے بھی۔ اس وقت بھی چڑھائے ہوئے ہے کمبخت' سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے کب بات کی جائے۔ صبح جب میں دکان پر جاتا ہوں تو پڑا سوتا رہا ہوتا ہے' آتا ہوں گھر تو ہوش میں نہیں ملتا۔ دن میں آؤ تو گھر سے غائب ہوتا ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"جس روز دکان کی چھٹی ہو' اس دن بات کرنا۔" بڑی بی نے مشورہ دیا۔

"ہاں اب یہی کرنا پڑے گا۔ سارے محلے میں کمبخت نے بدنام کر رکھا ہے۔ کس کس کی زبان بند کی جائے۔ اب تو لوگ کھلے عام کہنے لگے ہیں کہ ہمارے گھر میں جوا ہوتا ہے۔"

جب تک کھانا نہ لگ گیا' امجد کا قصہ ہی چھڑا رہا۔ سنبل کو میں نے اپنے پاس بٹھایا تھا۔

کھانا کھا کر چائے پینے کے بعد زیادہ دیر میں وہاں رکی نہیں۔ میرا سوٹ کیس نشست گاہ میں رکھا تھا۔ شہزاد نے اسے اٹھا لیا اور پھر میرے ساتھ ہو لیا۔ اب ایک بار پھر میں کوچہ چیلان کی طرف جا رہی تھی۔ شہزاد نے اب مکان کی چابی میرے حوالے کر دی تھی۔

کوچہ چیلان پہنچ کر میں نے کچھ سوچتے ہوئے شہزاد کو گھر کے دروازے ہی سے رخصت کرنا چاہا مگر وہ اندر داخل ہو کر بولا۔ "ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی' چلا جاؤں گا۔" پھر وہ میرے ساتھ ساتھ ہی کمرے میں چلا آیا۔ صدر دروازہ اس نے گھر میں گھستے ہی بند کر دیا تھا۔ سوٹ کیس اسی کے ہاتھ میں تھا جو اس نے مسہری کے قریب ہی دیوار سے لگا کر رکھ دیا۔ مسہری کے پاس جو چھوٹی سی میز پڑی تھی' اس پر پانی سے بھرا ہوا جگ اور شیشے کے دو گلاس رکھے تھے۔

سوٹ کیس کھول کر میں نے سلیپنگ گاؤن نکالا اور شہزاد سے بولی۔ "میں ابھی آتی ہوں کپڑے بدل کر۔ اب تو سونا ہی ہے۔" پھر کمرے سے نکل کر میں نے باتھ روم کا رخ کیا اور لباس تبدیل کر کے آ گئی۔ جو کپڑے اتارے تھے وہ میں نے کمرے میں واپس آ کر کھونٹی پر ٹانگ دیئے۔

"میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں خاتون کہ اپنی زبان سے عرض وصال نہیں کروں گا۔" شہزاد میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

مجھے اس کی صورت دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ پھر میں نے کہا۔

"کبھی کبھی تم مجھے چھوٹے بچے لگتے ہو۔ میں اسی لئے تمہیں دروازے ہی سے واپس کر رہی تھی کہ کہیں تم بچوں کی طرح نہ مچلنے لگو' مگر تم نہیں مانے۔ میرا خیال ہے جتنی دیر تم تنہائی میں میرے پاس رہو گے تمہارے ذہن پر بھی غبار چھایا رہے گا۔ بہتر یہ ہے تم جا کے آرام کرو اور مجھے بھی آرام کرنے دو۔"

حسب معمول اس کا چہرہ بجھ سا گیا اور پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "تو پھر میں چلتا ہوں' صبح آؤں گا۔"

"میں نے راستہ دیکھ لیا ہے' خود آ جاؤں گی صبح۔ تمہارے ساتھ ہی ناشتہ کروں گی۔ پھر پہاڑ گنج جاؤں گی۔" میں بھی کھڑی ہو گئی تاکہ وہ جائے تو اندر سے گھر کا دروازہ بند کر لوں۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ "کل زینے کے دروازے کے لئے ایک تالا خرید کر ضرور رکھ لینا۔"

"ہاں' یاد آیا خاتون!" وہ جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ "آپ نے جو مجھے روپے دیئے تھے' ان میں سے.........."

"رہنے دو' اپنے ہی پاس رکھو۔ آئندہ بھی کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے جس طرح اس وقت تالا خریدنا مجھے یاد آ گیا۔" میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔

شہزاد چلا گیا تو میں گھر کا صدر دروازہ اندر سے بند کر کے لوٹ آئی۔ اب میں اس گھر میں اکیلی تھی۔ اوپری منزل کا دروازہ بھی بند تھا۔ بظاہر اب مجھے کسی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ صحن کا بلب

میں نے اسی طرح جلا چھوڑ دیا اور کمرے میں آ گئی۔ میرے سوا گھر کے اندر کوئی اور تھا ہی نہیں اس لئے کمرے کا دروازہ بند کرنا میں نے ضروری نہیں سمجھا' ہاں بستر پر دراز ہونے سے پہلے کمرے کی بتی ضرور بجھا دی۔ کمرے میں ایک ہی بلب تھا اس لئے تاریکی پھیل گئی۔ صحن میں جو بلب جل رہا تھا اس کی تھوڑی بہت روشنی کمرے کے باہر موجود برآمدے تک ہی آ رہی تھی۔ چادر اوڑھ کر میں سونے کی کوشش کرنے لگی۔

ابھی میری آنکھ نہیں لگی تھی کہ معاً کمرے کے باہر کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سن کر میں چونک اٹھی۔ دروازہ اندر سے بند ہے تو پھر گھر میں کون آ سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ قدموں کی چاپ قریب آتی گئی' پھر ایک آشنا آواز آئی۔ "کیا سو گئیں رانی صاحبہ؟" یہ آواز اسی منحوس بوڑھے حمید کی تھی جو مالک مکان تھا۔

مجھے سخت حیرت ہوئی کہ زینے کا دروازہ بند ہونے کے باوجود وہ کدھر سے آ گیا؟ حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے میں اسی سبب تیزی سے اٹھی اور کمرے میں روشنی کر دی۔

"اچھا تو میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ تو آپ جاگ رہی ہیں۔ حاضر خدمت ہو سکتا ہوں خاتون!" بوڑھے کی آواز اور قریب آئی۔

"آیئے۔" میں دروازے کی طرف بڑھی۔ بوڑھے نے کمرے میں قدم رکھا تو میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "فرمایئے' کیسے زحمت کی آپ نے؟"

"میں دراصل سونے جا رہا تھا کہ آپ کا خیال آ گیا۔ میں نے سوچا' کہیں آپ کو کسی چیز کی ضرورت نہ ہو' پوچھ لوں۔ پھر میرے ذہن میں یہ آیا کہ آپ سو نہ گئی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کچھ اور آگے بڑھ آیا۔ "اگر اجازت ہو تو بیٹھ کر بات کر لوں؟" اس نے میرے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"جی تشریف رکھئے۔" میں اپنے سلیپنگ گاؤن کو درست کرتے ہوئے بولی۔ اس ندیدے اور خبیث بوڑھے کے سامنے مجھے صرف سلیپنگ گاؤن میں کوفت سی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور دانت نکال کر کہنے لگا۔ "خدا نظر بد سے بچائے' آپ اس لباس میں بالکل کوئی انگریز میم لگ رہی ہیں۔"

"آپ یہ بتا رہے تھے کہ کیسے زحمت کی؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"وہ تو میں عرض کر چکا ہوں خاتون!........ بہرحال' میں کہہ رہا تھا کہ نیچے صحن میں روشنی دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی آپ جاگ رہی ہیں۔ سوچا کہ زینے کے دروازے پر دستک دے کر دیکھ لیتا ہوں' اگر آپ نے دروازہ کھول دیا تو ٹھیک ورنہ لوٹ جاؤں گا۔ نیچے آ کر میں نے جیسے ہی اپنی طرف کی کنڈی کھولی تو دروازہ کھلا پایا۔ پھر میں........"

"کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "آپ کو دروازہ کھلا ہوا ملا؟" مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ شہزاد نے میرے سامنے ہی دروازے کی کنڈی لگائی تھی۔

"جی ہاں خاتون!........ لیکن آپ بھی بیٹھ جایئے نا........ میری وجہ سے ناحق آپ کو زحمت ہوئی۔"

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی' پھر بولی۔ "آپ کی بڑی عنایت کہ میری ضروریات کا خیال آیا۔" میرے لہجے میں چبھن تھی۔ "مگر معاف کیجئے' کسی کو جگا کر یہ نہیں پوچھا جاتا کہ وہ جاگ رہا ہے یا نہیں؟........ خیر' آج تو آپ نے یہ زحمت اٹھا لی کہ پوچھنے آ گئے' مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ آئندہ یہ زحمت نہ کیجئے گا۔ آپ کو میں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے تنہا رہنا زیادہ پسند ہے۔ میں اپنی تنہائی میں کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں دیتی۔"

"اس عمر میں اور تنہائی........ آپ نے بڑی عجیب بات کہی خاتون!........ یہ تو جوانی کی راتیں' مرادوں کے دن ہیں' کہیں چھوٹی سی عمر میں دل پر کوئی چوٹ تو نہیں کھا لی؟"

"جی نہیں۔" میں سختی سے بولی۔ "تنہا رہنا میری عادت ہے۔ مزید کچھ فرمانا ہے آپ کو؟" ان الفاظ سے میرا مقصد یہ تھا کہ اب میں اس کا زیادہ دیر بیٹھے رہنا پسند نہیں کر رہی۔ کنڈی کا کھل جانا میرے نزدیک خطرے کی علامت ہی تھا۔ ظاہر ہے کہ دروازے کی کنڈی خود بخود نہیں کھل سکتی تھی۔

"جی ہاں' عرض تو کرنا تھا۔ بس ذرا یہ سوچ رہا تھا' تمہید کیا ہو........ یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ میری عمر زیادہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اپنی بیوی مرحومہ کی وفات کے بعد سے میں بھی آپ ہی کی طرح تنہا ہوں۔ آپ ہی کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ میں بھی اکیلا ہوں اور آپ بھی تنہائی کا شکار ہیں تو پھر کیوں نہ ہم دونوں مل کر ایک دوسرے کا دکھ بانٹ لیں۔ ویسے بھی آپ میری مرحومہ بیوی کی ہم شکل ہیں اور عقد ثانی کرنا میرے نزدیک کوئی عیب کی بات نہیں۔"

"یعنی آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟" میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے اس خبیث بوڑھے کو گھور کے دیکھا۔

"جی ہاں خاتون! آپ ٹھیک ہی سمجھی ہیں۔ شہزاد میاں سے باتوں باتوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اپنے معاملات میں آپ خود مختار ہیں' آپ کا کوئی بزرگ نہیں۔ میں نے اسی لئے براہ راست خود آپ سے بات کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔"

صورت حال میرے لئے بڑی مضحکہ خیز تھی اور تکلیف دہ بھی۔ میں نے خطرے کی بو بھی سونگھ لی تھی اس لئے پرسکون اور محتاط لہجے میں اس خبیث بوڑھے سے کہا۔ "ابھی میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ اگر ایسا کوئی ارادہ ہوا تب بھی تو کسی کنوارے شخص سے شادی کرتی' آپ سے نہیں۔"

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ سے شادی کر کے ازدواجی زندگی کی وہ ساری راحتیں مل جائیں گی جو اپنی عمر کے کسی ناپختہ ذہن لونڈے سے ہرگز نہیں مل سکتیں۔ مجھے ازدواجی زندگی کا وسیع تجربہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک عورت کو کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے۔ مجھ سے شادی کرنے کے بعد آپ کو میرے الفاظ کی صداقت کا صحیح اندازہ ہو گا۔ میں اسی لئے آپ سے درخواست کروں گا کہ کسی کنوارے اور ازدواجی زندگی سے قطعی ناآشنا شخص پر مجھے ترجیح دیجئے۔ میں آپ کو ایسی راحتوں سے

متاثر کروں گا خاتون کہ جس کا تصور بھی شاید آپ نہ کر سکیں۔ بس یوں سمجھیں کہ نیا نو دن اور پرانا دن والا معاملہ ہے۔ بس اب آپ ہاں کر دیجئے۔" اس نے مجھے متوقع نظروں سے دیکھا۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسے کرسی سمیت اٹھاؤں اور کمرے سے باہر پھینک دوں۔ پھر بھی صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے صبر سے کام لیا۔

میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "ذرا اپنا دست مبارک ادھر لایئے۔"

"وہ کس لئے؟" میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

اب وہ اپنی جیب سے ہاتھ نکال چکا تھا اور مجھے اس کے ہاتھ میں سونے کی ایک انگوٹھی نظر آ رہی تھی۔ وہ میرے سوال کے جواب میں بولا۔ "آپ سے رشتہ الفت استوار ہونے کی خوشی میں یہ انگوٹھی خود اپنے ہاتھ سے آپ کو پہنانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ایجاب و قبول بھی ابھی ہو جائے گا۔ میں جس مسلک کا ماننے والا ہوں' اس میں گواہوں کی موجودگی ضروری نہیں۔ نکاح کے لئے مرد اور عورت کی باہمی رضامندی کافی ہے۔ نکاح میں خود پڑھا لوں گا' نکاح خواں کی ضرورت بھی نہیں۔"

برداشت کی حد اب گزر چکی تھی۔ میں اسی لئے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "تشریف لے جایئے یہاں سے آپ! ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

"خدا نہ کرے' آپ کیوں بری ہوتیں' آپ تو بہت اچھی ہیں۔ اچھی نہ ہوتیں تو میں آپ کو شادی کا پیغام کیوں دیتا۔ برے ہوں آپ کے دشمن۔" وہ بدستور بیٹھا رہا۔

"آپ جائیں یہاں سے اور مجھے سونے دیں۔"

"ارے آپ سونے کی بات کر رہی ہیں' حیرت ہے۔ یہ تو آپ کے نصیب جاگنے کا وقت ہے۔ زندگی کے ایسے حسین اور سنہری موقع سے فائدہ اٹھائیں خاتون!"

"میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے حسین موقع پر۔" میں نے برہم ہو کر کہا۔ "میرے صبر کا مزید امتحان لینے سے بہتر ہے' آپ چلے جائیں .... اٹھئے۔"

"لڑکی!" معاً اس کا لہجہ بدل گیا۔ مجھے بالکل ایسا لگا تھا جیسے کوئی سانپ پھنکارا ہو۔ "میری شرافت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ۔ یہ میرا گھر ہے اور میں تمہیں اسی وقت اپنے گھر سے نکال سکتا ہوں۔ مجھے سختی پر مجبور نہ کرو تو اچھا ہے۔ سیدھی طرح مجھ سے نکاح پڑھوا لو۔"

آخرکار وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ لعنتی چمپا نے مجھے اذیت میں مبتلا کرنے کے لئے اس خبیث بوڑھے کو اپنا آلہ کار بنا لیا تھا۔ بوڑھے کے بدلے ہوئے لہجے سے ساری حقیقت کھل گئی تھی۔ عام حالات میں یقیناً وہ بوڑھا مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کرتا۔ اس وقت بوڑھے سے کچھ کہنا سننا لاحاصل ہی تھا۔ وہ میری ایک بات نہ سنتا۔ میں عجب گومگو کی کیفیت کا شکار تھی کہ کروں تو کیا کروں؟ پھر مجھے وہی آزمودہ ترکیب سوجھی جو عموماً ایسے مواقع پر کامیاب ثابت ہو چکی تھی۔ بوڑھے کی کنپٹی پر بھرپور ضرب لگا کر اسے بے ہوش کرنے کی خاطر میں تیزی سے پلٹی' مگر میرا ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ بوڑھا بڑی سرعت کے

ساتھ جھک کر میرا وار بچا گیا تھا۔

اسی لمحے کمرے میں چمپا کا قہقہہ گونجا اور میں اچھل پڑی۔

"اس بڈھے سے تو وہ دلاری کا عاشق سلیم ہی اچھا تھا جسے تُو چھوڑ کر چلی آئی معلبہ!" چمپا کی آواز سنائی دی' مگر وہ مجھے نظر نہ آ سکی۔ "مگر تیری قسمت میں تو یہ بڈھا ہی لکھا تھا۔ تُو اسے بے ہوش کر کے نہیں بچ سکتی۔ میں بھی دیکھتی ہوں تُو کہاں تک اپنی تقدیر سے بھاگے گی۔"

چمپا کی آواز معدوم ہوتے ہی میں نے بوڑھے کو کرسی سے اٹھتے دیکھا۔ اس کے تیور مجھے خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔ لمحے بھر ہی میں مَیں نے ایک فیصلہ کیا اور دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میں ایک ہی جست میں دروازے سے باہر پہنچ گئی اور پھر تیزی سے پلٹ کر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ بوڑھا اندر بند ہو گیا اور ذرا ہی دیر بعد دروازہ پیٹنے لگا۔ دروازہ پیٹتے ہوئے وہ چیخ بھی رہا تھا۔ میری نگاہ دروازے کی کنڈی پر تھی۔ میں نے اس بات کو نظرانداز نہیں کیا تھا کہ لعنتی چمپا بھی وہاں موجود ہے۔ وہ کسی بھی لمحے دروازے کی کنڈی کھول سکتی تھی۔ پھر میرا اندیشہ درست ہی نکلا۔ کمرے کی کنڈی میں نے خودبخود کھلتے دیکھی۔ میں نے جھپٹ کر دوبارہ کنڈی لگانا چاہی' مگر اس وقت تک دروازہ کھل چکا تھا۔ بوڑھا کسی جنگلی بھینسے کی طرح میری طرف لپکا اور میں نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگ پھنسا دی۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرا اور اس کے سر کو میں نے برآمدے کے فرش سے ٹکراتے دیکھا۔ وہ چیخ اٹھا لیکن فوراً ہی حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا جس سے چہرہ بڑا بھیانک معلوم ہونے لگا تھا۔ وہ پھر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے اچھل کر اس کی توند پر لات ماری۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ لیا اور چیخنے لگا۔ میں نے دانستہ شدید ضرب لگائی تھی۔

اچانک میرے جسم کو دھکا لگا اور میں اس بوڑھے پر جا پڑی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے پیچھے سے دھکا دیا ہو۔ وہ بوڑھا اور میں دونوں ہی زمین پر گر گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اٹھتی بوڑھے نے مجھے اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔ میں اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے زور لگانے لگی۔ میں نے اپنی دونوں کہنیاں بوڑھے کے سینے میں گاڑ دی تھیں۔ بوڑھے کے جسم میں بلا کی شیطانی طاقت معلوم ہو رہی تھی حالانکہ وہ زخمی ہو چکا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور اب تک خون بہے جا رہا تھا۔ اچانک میں نے اس کے سینے سے کہنیاں ہٹا لیں اور پھر اپنا سر پوری قوت کے ساتھ اس کی ناک پر مارا۔ وہ ایک بار پھر زور سے چیخ اٹھا۔ اب اس کی ناک سے بھی خون بہنے لگا تھا۔ ناک پر ضرب پڑتے ہی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور تڑپ کر بوڑھے کی گرفت سے نکل گئی۔

میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود خبیث بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ایک وحشیانہ چیخ مار کے میری طرف جھپٹا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ میں اس سے بچنے کے لئے بھاگی' وہ مجھے پکڑنے کے لئے میرے پیچھے دوڑنے لگا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" معاً مجھے بوڑھے کے نوجوان بیٹے مجید کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید اپنے باپ کی چیخیں سن کر نیچے اتر آیا تھا۔

میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ زینے سے نیچے اتر کر صحن میں پہنچ چکا تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اپنے باپ کو میرے پیچھے بھاگتے دیکھ رہا تھا۔ معاً دروازہ دھڑدھڑانے کی آواز آئی۔ گھر کے صدر دروازے کو بُری طرح پیٹا جا رہا تھا۔ پھر یوں لگا جیسے کسی نے دروازے کی کنڈی کھول دی ہو۔ دس افراد بھرا مار کے اندر گھر میں گھس آئے۔

بوڑھا ہر طرف سے بے نیاز اب تک مجھے پکڑنے کی دھن میں میرے پیچھے دوڑے جا رہا تھا۔ میں داخل ہونے والوں کے آگے آگے لحیم شحیم شابو تھا۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی میں پہچان گئی تھی۔ بھی اس کا چہرہ بھولنے والا نہیں تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

"ابے او بڈھے!" شابو نے بھاری آواز میں حمید کو پکارا۔ "اپنے گھر میں تو یہ خرمستیاں کر نہیں ہے۔"

پھر شابو نے جھپٹ کر بوڑھے کو پکڑ لیا۔ بوڑھے نے اس کے پیٹ میں اتنی زور سے کہنی ماری بلبلا کر الگ ہٹ گیا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر باتھ روم کی طرف بھاگی جس کا دروازہ کھلا ہوا جیسے ہی میں قریب پہنچی' باتھ روم کا دروازہ پُرشور آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ گویا ابھی چمپا وہاں تھی۔ وہ یقیناً یہ چاہتی تھی کہ میں ابھی لوگوں کے سامنے ہی رہوں۔ میں پلٹی تو شابو کو پھر بوڑھے سے آزما پایا۔ بوڑھے نے شابو کو اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ شابو کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پھر معلوم نہیں موجود دیگر افراد کو کیا سوجھی کہ وہ سبھی بوڑھے پر پل پڑے۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ وہ سبھی بوڑھے میرے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر غالباً ان کی غیرت جاگ اٹھی تھی۔ آنکھوں کے سامنے بوڑھا مجھ پر مجرمانہ حملہ کر رہا تھا۔ وہ بھلا کس طرح یہ برداشت کر لیتے۔

کچھ دیر تو بوڑھا ہاتھ پاؤں چلاتا رہا' اس کے بعد لہرا کر زمین پر ایسا گرا کہ پھر اٹھ نہ سکا۔ مجھ دور کھڑا ہوا تھا' ادھر لپکا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" ایک شخص نے میرے متعلق مجید سے سوال کیا۔

"لڑکی آئی کہاں سے یہاں؟ نچلی منزل تو خالی پڑی تھی۔" دوسرا شخص بھی بولا۔

"آج ہی ہم نے اسے مکان کرائے پر دیا تھا۔" مجید نے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ نے مجھے بہکانا چاہا تھا۔ یہ آوارہ ہے۔ اس نے ابا سے پیسے لے لئے ہوں گے' پھر نخرا کر رہی ہو گی غصہ آگیا ہو گا جبھی تو وہ اسے پکڑنے بھاگ رہے تھے۔" مجید نے ایک اور ہی کہانی بنا دی۔

اسی دوران میں شابو اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں' مجید کے سفید جھوٹ کی کرتی شابو بول اٹھا۔ "پھر تو یہ اپنا مال ہوا۔" پھر وہ میری طرف بڑھا اور کلائی پکڑ لی۔ "ابے تو کہ شریفوں کے گھر میں گھس آئی۔ تیرا ٹھکانا تو اپنے اڈے پر ہے۔ چل میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹا۔

"ہاں شابو بھائی! تمہی لے جاؤ اسے اپنے ساتھ۔" مجید نے کہا اور دوسرے لوگ بھی اس کرنے لگے۔

شابو یہ سن کر اور شیر ہو گیا۔ میں اس سے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دی۔ "چپ چاپ چلی چل میرے ساتھ ورنہ اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

"ارے شابو! اسے کپڑے تو بدل لینے دو۔" کوئی بولا۔

"تم لوگ کہہ رہے ہو تو یہی سہی۔" شابو ہنس کر کہنے لگا' پھر مجھے مخاطب کیا۔ "چل بے جا کر بدل لے اور اپنا سامان بھی سمیٹ لے یہاں سے۔ اب تُو میرے اڈے پر رہے گی لیکن یہ سمجھ اچھی طرح کہ تجھے اس محلے میں دھندا نہیں کرنے دوں گا۔ تجھے میری پابند بن کر رہنا پڑے گا۔" اس میری کلائی چھوڑ دی۔ "جا' جلدی سے کپڑے بدل۔"

میں نے کمرے کی طرف نگاہ اٹھائی تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں ادھر بڑھ گئی۔ مجھ پر اس وقت آسمان کرا کھجور میں اٹکا والی مثل صادق آ رہی تھی۔ خبیث بوڑھے سے جان چھوٹی تھی تو اب شابو گلے پڑ تھا۔ مجھے اچھی طرح لوگوں کی نظر میں ذلیل و رسوا کرنے کے بعد لعنتی چمپا شاید اب وہاں سے جا چکی اس کا ثبوت کمرے کا کھلا ہوا دروازہ تھا جو پہلے بند تھا۔ شابو کا معاملہ خود اس کی ذات تک محدود لگتا اس میں چمپا کا ہاتھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ شابو سے بچنے کی ایک تدبیر تو یہ تھی کہ میں اس کمرے کا اندر سے بند کر کے بیٹھ جاتی۔ وہ بھلا کب تک انتظار کرتا۔ دروازہ خاصا مضبوط تھا۔ اسے توڑنا ن ہوتا۔ پھر مجید بھی غالباً ایسا نہ کرنے دیتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں' شابو کے ساتھ چلی جاتی استے میں اس سے پیچھا چھڑا کر فرار ہو جاتی۔ فرار ہو کر میں کہاں جاتی' اس کا فیصلہ بعد میں کیا جا سکتا

انہی باتوں پر غور کرتے ہوئے میں نے کمرے میں آ کر کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کپڑے اتار کے پہن سلیپنگ گاؤن میں نے سوٹ کیس کے اندر رکھ دیا۔

حالیہ واقعے کے بعد اب میرے لئے اس گھر میں رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اگر کمرے کا دروازہ بند کر کی طرح میں وہ رات وہاں گزار بھی لیتی تو صبح پھر یہی مسئلہ ہوتا۔ شابو مجھے گھر سے باآسانی نکل کر نہ دیتا۔ اب تو اسے محلے والوں کی تائید و حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ پھر وہ کس طرح مجھ سے ار ہو جاتا۔ ان حالات میں مجھے یہی بہتر معلوم ہوا کہ اسی وقت شابو سے نمٹ لیا جائے۔ یہی فیصلہ کر ل سوٹ کیس اٹھائے ہوئے باہر آ گئی۔ اپنا ہینڈ پرس بھی میں نے سوٹ کیس ہی میں رکھ لیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کی مدد سے مجید اپنے باپ کو اٹھوا کر اوپری منزل پر لے جا رہا تھا۔ بوڑھا تک بے ہوش تھا۔

شابو میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ "ابے! کپڑے بدل کر تو بڑی شریف لگ رہی ہے تُو۔" یہ کر وہ دھیرے سے ہنسا۔ میں اس کے قریب پہنچ گئی تو اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "لا یہ سوٹ کیس سے دے' مرد کے ہوتے عورت بوجھ اٹھاتے اچھی نہیں لگتی۔"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوٹ کیس اسے تھما دیا۔ اس طرح مجھے شابو سے نمٹنے میں آسانی

کچھ ہی دیر بعد شابو کے ساتھ میں اس گھر سے نکل رہی تھی۔ اس گلی سے نکل کے وہ مجھے ساتھ لئے ایک گلی میں داخل ہوا۔ ہم دونوں کے سوا اس وقت گلی میں کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ معاً شابو نے مجھے مخاطب کیا۔ "دیکھ' اگر تُو میرے ساتھ شرافت سے رہی اور وفادار ثابت ہوئی تو عیش کرا دوں گا تجھے۔ سمجھ گئی میری کبوتری!"

شابو کے الفاظ ابھی ختم ہی ہوئے تھے کہ کہ فیصلے کی گھڑی آ گئی۔ میرے مکے کی بھرپور ضرب کنپٹی پر پڑنے کے بعد یقیناً اس کے کئی طبق ایک ساتھ روشن ہو گئے تھے۔ اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس چھوٹ گیا اور وہ لہرا کے زمین پر آ رہا۔ میں نے لپک کر اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور پھر تیزی کے ساتھ اس گلی سے نکل آئی۔

وہاں سے شہزاد کا گھر زیادہ دور نہیں تھا اور میں اس کے گھر بھی رات گزار سکتی تھی لیکن لعنتی پر کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہاں وہ میرے لئے کوئی نیا ہنگامہ کھڑا کر سکتی تھی۔ جامع مسجد کے قریب قریب میں نے اوسط درجے کے کئی ہوٹل دیکھے تھے۔ میں نے شہزاد کے گھر جانے کی بجائے انہی ہوٹلوں میں سے کسی ہوٹل میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔

اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے جب میں ایک ہوٹل میں داخل ہوئی۔ کاؤنٹر پر ا باریش بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔

"مجھے آج رات بھر کے لئے ایک کمرہ چاہئے۔" میں نے بوڑھے کو مخاطب کیا۔

"آپ کا نام؟" بوڑھے نے ایک رجسٹر کھولتے ہوئے پوچھا۔

"زبیدہ۔" میں نے جواب دیا۔ فوری طور پر یہی نام میرے ذہن میں آیا تھا۔

"کہاں سے آئی ہیں؟" بوڑھا رجسٹر میں میرا نام لکھ کر بولا۔

"کلکتے سے۔"

"وہاں کا پتا لکھوایئے۔"

میں نے کلکتے میں اپنی کوٹھی کا پتا لکھوا دیا۔

"ایک ہی رات رہیں گی؟"

"ایسا کریں کہ ہفتے بھر کے لئے کمرہ بک کر لیں۔ اگر میں اس دوران میں کمرہ چھوڑ کر چلی حساب ہو جائے گا۔" میرا ارادہ بدل گیا تھا۔ وہ ہوٹل مجھے پُرسکون ہی لگا تھا۔

"تو پھر ایک ہفتے کا پیشگی کرایہ جمع کرا دیں۔" بوڑھے نے رقم بتائی۔

میں نے کاؤنٹر پر سوٹ کیس رکھ کر اس میں سے اپنا ہینڈ پرس نکالا اور مطلوبہ رقم ادا کر دی۔ بوڑھے نے ایک بیرے کو آواز دے کر بلایا اور کمرے کی چابی میرے حوالے کر دی۔ بیرا ساتھ ہو لیا۔ اس نے سوٹ کیس اٹھا لیا تھا۔ اندر ایک تنگ سی راہداری کی دونوں جانب کمروں دروازے نظر آ رہے تھے۔ میرا کمرہ نمبر آٹھ تھا۔ گتے کا ایک ٹکڑا چابی کے ساتھ دھاگے سے بندھا جس پر ہاتھ سے آٹھ کا ہندسہ لکھا تھا۔

بیرا بائیں جانب کے ایک کمرے کے سامنے رک گیا۔ کمرے کے دروازے پر ایک کاغذ چپکا ہوا تھا۔ کاغذ پر کمرہ نمبر لکھ دیا گیا تھا۔ میں نے کمرے کے دروازے پر پڑا ہوا تالا کھول لیا۔ کنڈی کھولنے کے بعد میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو بیرے نے بتایا' "سوئچ بائیں ہاتھ پر ہے۔ ٹھہریں آپ' میں بتی جلاتا ہوں۔"

میں پیچھے ہٹ گئی۔ بیرا آگے بڑھ کر اندر داخل ہوا اور کمرے میں روشنی ہو گئی۔ بلب کم پاور کا تھا۔

وہ کمرہ کیا' ایک کوٹھری سی تھی۔ اس میں ایک چارپائی پر دری اور چادر بچھی تھی۔ قریب ہی ایک مونڈھا پڑا تھا۔ سامنے طاق میں ٹوٹے ہوئے آئینے کا چھوٹا سا تکونا ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔ بیرے ہی سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ باتھ روم وغیرہ مشترکہ سب کمرے والوں کے لئے ہیں جو راہداری کے اختتام پر بنے ہوئے تھے۔ بیرے نے ایلومونیم کے ایک میلے سے جگ میں پانی لا کر چارپائی کے سرہانے رکھ دیا۔ جگ کے ساتھ گلاس بھی ایلومونیم ہی کا تھا۔

اب سے پہلے کبھی میں کسی ایسے ہوٹل میں نہیں ٹھہری تھی۔ بہرحال' بیرا چلا گیا تو میں دروازہ بند کرنے کے بعد بتی بجھا کے بستر پر لیٹ گئی۔ شہزاد کے ذریعے میں نے جو مکان کرائے پر حاصل کیا تھا' وہاں تو مجھے سکون نہیں مل سکا تھا لیکن ہوٹل کا یہ کمرہ اس کا نعم البدل بن گیا تھا۔ اس رات شاید چمپا اپنی دانست میں مجھے خاصا پریشان اور ذلیل و رسوا کر چکی تھی اس لئے رات کا بقیہ حصہ سکون ہی سے گزر گیا۔ سونے کے بعد صبح نو بجے ہی میری آنکھ کھلی تھی۔

کچھ دیر کے بعد جب میں باتھ روم سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی تو ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس کمرے سے باہر آنے والی عورت کے چہرے پر جیسے ہی میری نظر پڑی' میں ٹھٹک کر رک گئی۔ یہی حالت اس عورت کی ہوئی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جرائم پیشہ عورت کسی ایسے ہوٹل میں بھی ٹھہر سکتی ہے۔ وہ اس وقت میری ہی دی ہوئی ساڑھی باندھے ہوئے تھی لیکن چہرے پر ماسک نہیں تھا۔ میرے اور اس کے درمیان صرف چند فٹ کا فاصلہ تھا۔

معاً وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "ارے تم! رک کیوں گئیں؟ آؤ نا معلبہ! .... میرے کمرے میں چلو' وہاں چل کے بات کرتے ہیں۔"

"میرا نام معلبہ نہیں' زبیدہ ہے اور مَیں تمہیں نہیں جانتی۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

"ایسی بے رخی!" وہ آہستہ سے ہنسی۔ "ناموں میں کیا رکھا ہے۔ میں بھی یہاں بمبئی کی رانی نہیں' مراد آباد کی اندو ہوں۔ کیا ناراض ہو' مجھ سے؟"

وہ جرائم پیشہ عورت بہرحال میری دوست نہیں دشمن تھی اور پولیس کو میرے پیچھے لگا کر دشمنی کا ثبوت بھی دے چکی تھی۔ میں نے اسی لئے اس کی پیشکش قبول نہیں کی۔ اس عورت کی وجہ سے اب وہ ہوٹل بھی میرے لئے محفوظ نہیں رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اپنا سامان لے کر فوراً وہاں سے نکل جاؤں۔

"یہ مت بھولو معبلہ کہ پولیس اب بھی تمہاری تلاش میں ہے۔" رانی نے مجھے دھمکی دی۔ "میں تمہاری طرف ایک بار پھر دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتی ہوں اور تم دامن بچا رہی ہو۔ مجھے اپنے اس ساتھی سے یہ معلوم ہو چکا ہے جو تمہاری نگرانی کر رہا تھا کہ تمہیں پولیس کی گرفت سے نکالنے والے دو مسلح نقاب پوش تھے۔ یقیناً وہ تمہارے ہی ساتھی ہوں گے اور تم بھی میری طرح گروہ بند ہو۔ ابھی تک میرے میرے ہتھے نہیں چڑھ سکے۔ وکٹر الگ میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ میں تم سے صرف اتنا تعاون چاہتی ہوں اپنے کچھ آدمی وقتی طور پر مجھے دے دو۔ میں تمہیں اس کے لئے معقول معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔" اسی وقت ایک آدمی باتھ روم کی طرف سے آتا دکھائی دیا تو رانی چپ ہو گئی۔

"چلو۔" میں کچھ سوچتے ہوئے رانی کے ساتھ اس کے کمرے میں چلنے پر آمادہ ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں راہداری میں اس سے الجھ پڑنا خود میرے حق میں بھی مناسب نہیں تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑا کر اس ہوٹل کو چھوڑ دینا چاہتی تھی۔

اس کمرے کی حالت بھی تقریباً ویسی ہی تھی جیسا میرا کمرہ تھا۔ رانی نے میرے اندر داخل ہوتے ہی کنڈی بند کر دی تھی۔ میں مونڈھے پر اور وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"بات دراصل یہ ہے معبلہ کہ میں اپنے ساتھ بمبئی سے چار ساتھیوں کو دہلی لے کر آئی تھی۔ ان میں سے ڈیوڈ تو وکٹر کے ہاتھوں مارا گیا اور جہانگیر کو معلوم نہیں کیوں تم نے زہر دے کر قتل کر دیا۔ خیر .... یہ تلخ ذکر چھوڑو' مجھے کم از کم دو ہفتے کے لئے پانچ تجربہ کار مسلح آدمیوں کی ضرورت ہے۔ تجربہ کار کا مطلب سمجھانے کی غالباً ضرورت نہیں۔ بولو' تم اس کے لئے کتنا معاوضہ لو گی؟ .... معاوضہ اگر میرے لئے قابل قبول ہوا تو طے شدہ نصف رقم میں اسی وقت ادا کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

"رانی! تم میری طرف سے شدید غلط فہمی کا شکار ہو۔ میرا کوئی گروہ نہیں۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

"پھر وہ مسلح نقاب پوش کون تھے؟ اس کے علاوہ تم نے پولیس حراست سے اپنے آدمی کو کیسے نکالا؟"

"اگر میں تمہارے ان دونوں سوالوں کے جواب نہ دوں تو؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تو میں یہ سمجھوں گی کہ تم مجھ سے دوستی کرنے کی بجائے دشمنی برقرار رکھنا چاہتی ہو۔" اس نے بھی جواباً مجھے گھورا۔ "تمہیں شاید یہ علم نہیں کہ رانی سے دشمنی مول لینے کا کیا مطلب ہے؟ تمہیں میری دشمنی بہت مہنگی پڑے گی معبلہ! ہم دونوں ہم پیشہ ہیں اور ہم پیشہ افراد کو آپس میں نہیں لڑنا چاہئے۔"

معاً میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اسی کے پیش نظر میں بولی۔ "رانی! کیا تم مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دے سکتی ہو؟"

میری بات سن کر وہ مسکرائی اور پھر کہنے لگی۔ "معاف کرنا معبلہ! تمہارے چہرے اور لہجے سے ظاہر نہیں ہو رہا کہ تم واقعی سوچنے کے لئے وقت چاہتی ہو۔ تم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے فرار ہو جانے کے بارے میں سوچ رہی ہو۔"

"اگر میرا یہی مقصد ہوتا تو رانی تم سے سودا کر کے اور رقم وصول کرنے کے بعد بھی فرار ہو سکتی تھی۔" میں نے دلیل دی۔

"تم بھی جانتی ہو معبلہ کہ سودا ہونے اور رقم لینے کے بعد ایسا ممکن نہیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"تم اگر میری ہی زبان سے سننا چاہتی ہو تو سنو معبلہ کہ جرائم کی دنیا کے بھی کچھ اصول ہیں جن سے کوئی بھی جرائم پیشہ شخص انحراف نہیں کرتا' نہ میں ایسا کر سکتی ہوں نہ تم کہ کوئی سودا کر کے اپنی زبان سے پھر جاؤ۔ اب تو تمہیں یقین آ گیا کہ میں جرائم کی دنیا کے اصولوں سے پوری طرح واقف ہوں۔"

"تو تم مجھے سوچنے کا وقت نہیں دینا چاہتیں؟"

"اس میں سوچنے کی کوئی بات ہے ہی نہیں۔" اس نے کہا۔ "اِدھر یا اُدھر' دوستی یا دشمنی؟ تمہیں دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ بولو' کیا کہتی ہو؟"

میرے لئے اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور میں نے فوری طور پر اسی پر عمل کیا۔ میں نے ایک دم اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ بھی ایک ہی عیار عورت تھی۔ ذہنی طور پر یقیناً وہ کسی ایسی خطرناک صورت حال کے لئے پہلے سے تیار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اچھل کر انتہائی سرعت سے ایک طرف ہو گئی اور میں منہ کے بل چارپائی پر گری۔ جب تک میں اٹھی' وہ کھڑی ہو چکی تھی اور مجھے اس کے ہاتھ میں خطرناک کھلونا نظر آ رہا تھا۔

"اچھا ہوا معبلہ کہ تم نے خود ہی مجھ پر حملے میں پہل کر کے انتقام کی راہ ہموار کر دی۔" اس کی سرد آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "اگر میں تمہیں گولی مار دوں تو یہ ناانصافی نہیں ہو گی۔ تم بہرحال میرے ایک نوجوان ساتھی جہانگیر کو قتل کر چکی ہو۔ ٹھیک ہے نا! میں اگر تمہیں قتل کر دوں تو حساب برابر ہو جائے گا۔"

اسی وقت میری دائیں ٹانگ دائرے کی صورت میں گھوم گئی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ پھر جیسے میں اڑتی ہوئی اس تک پہنچ گئی اور اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے ہی ساتھ وہ بھی زمین پر گر پڑی۔ وہ نیچے تھی اور میں اوپر۔ میرے دائیں گھٹنے کی ضرب اس کی کنپٹی پر پڑی۔ اسی کے ساتھ اس کے دونوں ہاتھ' جو میری گردن کی طرف بڑھ رہے تھے' اِدھر اُدھر گر پڑے۔ میں تیزی سے اٹھی۔ اس کے کمرے سے نکلنے اور باہر سے کنڈی لگانے میں مَیں نے دیر نہیں کی تھی۔

اگلے چند منٹ کے اندر اندر میں وہ ہوٹل چھوڑ چکی تھی۔ اب میں ہوٹل سے نکل کر تیز قدمی کے ساتھ شہزاد کے گھر چتلی قبر جا رہی تھی۔

دروازہ شہزاد ہی نے کھولا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار دیکھے تو اندر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا' تم مجھے دیکھ کر اتنے حیران پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟"

"ابھی ذرا ہی دیر پہلے چچا حمید کا بیٹا مجید مجھ سے مل کر گیا ہے۔ وہ.........."

"وہ تمہیں بڑی دلچسپ کہانی سنا کر گیا ہو گا۔" میں اس کی بات کاٹ کر آہستہ سے ہنسی۔

میں اندر پہنچ کر سنبل سے ملی جو صحن میں ہی نل کے نیچے بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ سوٹ کیس مجھ سے شہزاد نے گھر میں داخل ہوتے ہی لے لیا تھا۔

"اب تو تمہیں کوئی شکایت نہیں، صبح شام ملاقات ہو رہی ہے۔" میں سنبل سے بولی۔ "اسی خوشی میں ناشتہ بنا دو میرے لئے۔"

"بس یہ دو تین برتن دھونے کو رہ گئے ہیں، ابھی بناتی ہوں آپ کے لئے ناشتہ۔" وہ مسکرائی۔

پھر میں، شہزاد کی ماں کو سلام کر کے نشست گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ شہزاد وہیں میرا منتظر تھا۔

نشست گاہ میں داخل ہوتے ہی میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔ "ہاں اب بتاؤ، اس خبیث بوڑھے خبیث بیٹا تم سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"پہلے تو آپ بتائیے خاتون کہ آپ نے رات کہاں گزاری؟ آپ چچا حمید کے مکان میں تو نہیں نہیں، کیا پہاڑ گنج چلی گئی تھیں؟" شہزاد نے دریافت کیا۔

"تم بھی کمال کرتے ہو، اگر وہاں چلی گئی ہوتی تو سوٹ کیس کیوں لئے پھرتی۔ یہ چھوڑو کہ میں کہاں تھی، وہ بتاؤ جو میں نے تم سے پوچھا ہے۔" میں بولی۔

"مجید کہہ رہا تھا کہ رات آپ نے اس کے باپ کو شدید زخمی کر دیا اور پھر فرار ہو گئیں۔"

"یہ نہیں بتایا کہ اس نے مجھے شابو کے حوالے کر دیا تھا؟"

"کیا؟" شہزاد حیرت سے بولا۔ "یہ شابو وہاں کیسے پہنچ گیا؟"

مختصراً میں نے شہزاد کو رات کا واقعہ بتا دیا، پھر یہ بھی کہ رات کہاں گزاری.. اس واقعے کا پس منظر کیا تھا یا اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا، ظاہر ہے یہ میں شہزاد کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اس نے اسی لئے سارا قصور حمید ہی کا سمجھا اور اسے برا بھلا کہنے لگا۔

"جہنم میں جھونکو اس بڈھے کو۔" میں نے کہا۔ "تم ایسا کرنا کہ کسی وقت وہاں سے فرنیچر اٹھا کر اپنے گھر لے آنا، کام آ جائے گا۔"

"وہ تو ظاہر ہے، میں فرنیچر تو وہاں نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں اسی لئے تم سے کہہ رہی تھی کہ کوئی ایسا مکان دیکھنا جہاں کوئی اور نہ رہتا ہو۔ بہرحال کوشش جاری رکھو، ممکن ہے کوئی الگ تھلگ مکان کرائے پر مل ہی جائے۔" میں بولی۔

"بہتر ہے خاتون!" شہزاد نے جواب دیا۔

پھر ناشتہ کرنے کے بعد میں، شہزاد کے گھر سے روانہ ہو گئی۔ اسی علاقے میں کیوں کہ رانی بھی موجود تھی اس لئے میں جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ بازار ٹمیا محل سے گزرتے ہوئے ایک خالی تانگہ مل گیا۔ میں اس میں پہاڑ گنج کے لئے بیٹھ گئی۔ شہزاد کو میں نے آئندہ روز آنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ وہ واپس چلا گیا۔

☆======☆======☆

تانگے میں بیٹھ کر پہاڑ گنج کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ دلاری کے عاشق سلیم سے کس طرح نمٹا جائے، لعنتی چمپا نے اسے اپنا آلہ کار بنا کر پہاڑ گنج میں میرا رہنا مشکل کر دیا تھا۔ میں نے تو اپنی دانست میں بہت احتیاط سے کام لیا تھا، کسی ایسی جگہ نہیں رہی تھی جہاں کوئی مرد ہو۔ پھر بھی سلیم میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا ضروری تھا ورنہ میں راتوں کو کب تک اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی۔ موجودہ حالات میں تو یہی ایک حل نظر آ رہا تھا کہ میں کسی اور علاقے میں کرائے پر مکان حاصل کر کے اس مکان کو چھوڑ دیتی، اس کے علاوہ دلاری سے بھی اپنا پیچھا چھڑا لیتی۔ اس سلسلے میں تنظیم کے ارکان میری مدد کر سکتے تھے۔

سفر اسی سوچ بچار میں کٹ گیا اور میں پہاڑ گنج پہنچ گئی۔ تانگے کو میں نے مین روڈ ہی پر چھوڑ دیا اور کرایہ ادا کر کے اتر گئی۔

میں گھر پہنچی تو دلاری نے مجھے پیغام دیا کہ تنظیم کی عمارت میں عادل میرا منتظر ہے۔ سوٹ کیس اپنے کمرے میں رکھ کر میں باہر آ رہی تھی تو مجھے سلیم کا خیال آ گیا۔ میں گزشتہ روز شام کو اسے بے ہوشی کی حالت میں دلاری کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد سلیم نے دلاری سے میرے متعلق زہر افشانی کی ہو گی۔ اسی خیال سے باہر آ کر میں نے دلاری کو بلایا جو کچن میں تھی۔ وہ آ گئی تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "سلیم تو خیریت سے ہے، کتنی دیر بعد اسے ہوش آ گیا تھا؟"

"جی ہاں معبلہ جی! وہ ٹھیک ہے۔" دلاری نے جواب دیا، پھر کہنے لگی۔ "ہوش میں آنے کے بعد وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ یہاں کب اور کیسے آ گیا؟ حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کے سامنے وہ جو باتیں کر رہا تھا، ان میں سے کوئی بات اسے یاد نہیں تھی۔ اسے تو یہ تک یاد نہیں تھا کہ کچھ دیر پہلے یہاں آپ موجود تھیں اور اس نے آپ کا راستہ روکا تھا۔"

"میں تم سے اس وقت کہہ رہی تھی نا کہ سلیم اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ اب یقین آیا تمہیں؟" میں نے دلاری سے کہا۔

"واقعی آپ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں معبلہ جی!" دلاری بولی۔ "لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی میری، ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟"

"کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں دلاری جو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں.......... اچھا میں، عادل سے مل کر آتی ہوں۔" میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

سلیم کے ذہن سے ہر بات کا محو ہو جانا یہی ظاہر کر رہا تھا کہ چمپا نے اس کے ذہن کو آزاد کر دیا تھا۔ اب وہ چمپا کے زیر اثر نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ چمپا پھر کسی بھی وقت اسے میرے خلاف استعمال کر سکتی تھی۔ میں یہی سوچتی ہوئی تنظیم کی عمارت تک پہنچ گئی۔

شناختی الفاظ کی ادائیگی کے بعد میرے لئے پھاٹک کھول دیا گیا تھا۔

"پنڈت جی کانفرنس روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" پھاٹک کھولنے والے مسلح محافظ نے مجھے

بتایا۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔

میں کانفرنس روم میں پہنچی تو وہاں عادل اکیلا نہیں تھا۔ رگھوویر اور سمیع اللہ بھی اس کے ساتھ تھے۔

”آؤ معبلہ!“ عادل نے خوش اخلاقی سے مجھے مخاطب کیا۔

”آ گئی‘ بولو۔“ میں اسی کے سامنے ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر بولی۔

”کیا بات ہے معبلہ! کیا تم اس مکان میں خود کو محفوظ نہیں سمجھ رہیں جو کرائے پر مکان لیا ہے؟“ عادل نے سوال کیا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر ایسی بات نہیں تو پھر تم نے کل رات وہاں کیوں نہیں گزاری؟ اس کے علاوہ تم سے ایک بات اور پوچھنا تھی‘ سلیم تمہارے گھر کے چکر کیوں لگا رہا ہے؟ پرسوں رات بھی اسے تمہارے گھر آتے جاتے دیکھا گیا تھا اور کل شام کو بھی۔“

عادل کی بات سن کر میں چونک اٹھی اور اس سے معلوم کیا۔ ”تمہیں اس کا کیسے پتا چلا؟“

”ان لوگوں سے پتا چلا جو تمہارے گھر کی نگرانی اور حفاظت پر مقرر کئے گئے ہیں۔“ عادل نے بتایا۔

”سلیم کی بجائے اگر کوئی اور اجنبی شخص ہوتا تو رات کے وقت اسے ہرگز تمہارے گھر میں داخل نہ ہونے دیا جاتا۔ ہاں‘ تم نے سلیم کی بابت میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”سلیم مجھ سے نہیں‘ دلاری سے ملنے آتا رہا ہے۔“

”لیکن کل تو اسے خود آپ نے ہی رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔“ سمیع اللہ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

”میں نے اسے مدعو نہیں کیا تھا بلکہ کل صبح آپ کے سامنے جھوٹ بول رہا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”وہ اس بہانے دلاری سے ملنا چاہتا تھا۔“

”کیا خیال ہے پنڈت جی‘ یہ عشق بازی کچھ زیادہ نہیں بڑھ گئی۔“ رگھوویر نے عادل کو مخاطب کیا جسے وہ لوگ پنڈت بال مکند کے فرضی نام سے پکارتے تھے۔

”ہاں مولوی رگھوویر! تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔“ عادل نے تائید کی۔

اسی وقت ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوند گیا۔ اس طرح با آسانی سلیم سے پیچھا چھڑایا جا سکتا تھا۔ اسی خیال کے تحت میں نے عادل سے کہا۔ ”خود مجھے بھی سلیم کا اپنے گھر آنا جانا بالکل پسند نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اسے وہاں آنے سے روک دیا جائے؟“

”کیوں نہیں ممکن۔“ عادل فوراً بولا۔ ”تنظیم کے نگران اعلیٰ کی طرف سے اس پر پابندی لگوائی جا سکتی ہے۔“

”میرا خیال ہے‘ بات اس حد تک آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ویسے تو خود میں بھی اسے اپنے گھر آنے سے منع کر چکی تھی‘ پرسوں رات ہی۔ پھر بھی وہ نہیں مانا اور کل شام آ گیا۔ ایسا کرو کہ جن لوگوں کی ذمے داری ہے‘ میرے گھر کی نگرانی اور حفاظت کریں‘ ان سے کہہ دو‘ وہ سلیم کو میرے گھر آنے سے روک دیں۔ اتنا کافی ہے۔“ میں نے یہ بات اس لئے کی تھی کہ اگر تنظیم کے نگران اعلیٰ کی طرف سے بھی سلیم پر پابندی عائد کر دی جاتی تو بھی وہ میرے گھر آنے سے نہ رکتا۔ چمپا کے زیر اثر آ کر وہ سب کچھ بھول جاتا۔

”تم کہتی ہو تو پھر ایسا ہی کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں بھی اپنے طور پر اسے منع کر دوں گا کہ وہ تمہارے گھر کا رخ نہ کرے تا کہ جب اسے روکا جائے تو روکنے والوں کے پاس اس کا جواز موجود ہو۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ تم اپنے گھر اس کا آنا‘ پسند نہیں کرتیں۔“ عادل نے کہا۔

شام کو میں‘ سالار اکبر سے ملی تو اس نے بتایا کہ سیکرٹ سروٹ والے بھی تنظیم کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ گزشتہ روز ہی سے سیکرٹ سروس کے سربراہ ولیم کی نگرانی شروع کرا دی گئی تھی۔ اسی نگرانی کے نتیجے میں معلوم ہوا تھا کہ گزشتہ رات ولیم اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں اپنے کسی مہمان سے ملا تھا۔ جب مجھے اس مہمان کا حلیہ پتا چلا تو میرے لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ ولیم کا مہمان میرا دشمن ژیان تھا۔ عظیم مہین کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ میں نے سالار اکبر کو بتا دیا کہ مجھے ولیم کے مہمان سے ایک دیرینہ قرض چکانا ہے۔ اس سلسلے میں سالار اکبر نے تنظیم کی جانب سے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ اسی کے ساتھ بتایا کہ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخل ہونا‘ ناممکن ہے۔ حفاظتی اقدامات بہت سخت تھے۔ رات کے وقت سرچ لائٹس سے بھی مسلح محافظ اردگرد کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ جلد بازی سے کام نہ لوں اور مزید معلومات حاصل ہونے دوں۔ میرا دشمن سات پہروں میں بیٹھا تھا مگر مجھے ہر حال میں اس تک پہنچنا تھا۔ میرے سارے زخم جیسے ہرے ہو گئے تھے۔ اسی روز رات کو میں‘ عادل کے ساتھ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا جائزہ لینے روانہ ہو گئی۔ ہم دونوں ایک کار میں تھے۔ کار اس عمارت کے سامنے سے گزری اور پھر عمارت کے عقب میں واقع سڑک پر پہنچی۔ عمارت کی چھت پر بھی میں نے مسلح محافظوں کو دیکھا۔ واقعی وہاں انتہائی سخت حفاظتی اقدامات تھے۔ میرے کہنے پر عادل دوبارہ اس عمارت کے سامنے سے گزرا۔ اسی وقت مجھے اپنے دشمن ژیان کی آواز سنائی دی کہ تُو میری تلاش میں یہاں تک تو پہنچ ہی گئی ہے تو میں تجھے اپنے پاس بلوا ہی لیتا ہوں۔ میں‘ چمپا کو بھیج رہا ہوں‘ وہ تجھے باندھ کر میرے پاس لے آئے گی۔ مجھے علم تھا کہ ژیان نے بھی کچھ شیطانی قوتیں حاصل کر لی تھیں۔ اچانک کار چلتے چلتے رک گئی جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا ہو۔ عادل نے اس پر اظہار حیرت کیا۔ عین اس لمحے میری سماعت سے چمپا کا زہریلا قہقہہ ٹکرایا۔ ژیان کے دعوے کے مطابق وہ مجھے باندھ کر لے جانے کے لئے آ پہنچی تھی۔

ابھی چند لمحے گزرے ہوں گے کہ مجھے کار کے اندر شدید گھٹن کا احساس ہوا۔ میرا سانس رکنے لگا۔ مجھے یوں لگا کہ کار میں بیٹھی رہی تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں نے تیزی کے ساتھ کار کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گئی۔ اسی وقت عادل کی بلند آواز آئی۔ ”معبلہ! کہاں جا رہی ہو؟“

کار سے اترتے ہی گھٹن کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ عادل کی آواز سنتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا۔ ا لمحے کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں حیران تھی کہ عادل مجھے وہاں کس طرح چھوڑ کر چلا گیا۔ اس مجھے یہ توقع نہیں تھیں ابھی تک میں اسی جگہ کھڑی تھی جہاں کار سے اتری تھی۔ اچانک میری سما سے نامانوس سحرانگیز موسیقی کی آواز ٹکرائی اور میں چونک اٹھی۔ ایسی ہی پرکشش موسیقی میں نے ایک مرتبہ بستی اشر کے نواح میں سنی تھی۔ میرے قدم جیسے خود بخود اس طرف اٹھنے لگے۔ کچھ ہی فاصلے پر عمارت نظر آ رہی تھی جس کے سامنے سے میں کار میں بیٹھ کر گزری تھی۔ میرے قدم اسی طرف اٹھ رہے تھے کیونکہ سحرانگیز موسیقی کی آواز ادھر ہی سے آ رہی تھی۔ مخالف سمت سے ایک بگھی بھی اسی عمارت ہی کی طرف بڑھتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس بگھی کے آگے آگے میں نے دو مسلح گھڑسواروں کو بھی دیکھا' پھر ادھر تو وہ بگھی عمارت کے سامنے آ کے رکی' ادھر میں وہاں پہنچی۔ بگھی کے رکتے ہی اس میں سے ایک دراز قد' خوبصورت عورت بہترین لباس زیب تن کئے اتری۔ اس عورت کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ چمپا تھی جو اپنے لباس سے کوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

معاً چمپا نے میری طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کی اور میری نظریں ملیں۔ میرے جسم کو جھٹکا سا لگا موسیقی کی آواز آنا بند ہو گئی۔

"آؤ معبلہ! میرے ساتھ آؤ۔" چمپا نے دوستانہ انداز میں میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کی نظریں اب تک میری نظروں سے ملی ہوئی تھیں۔

میں نے کچھ کہے بغیر غیرارادی طور پر اپنا ہاتھ چمپا کے ہاتھ میں دے دیا۔

"تم وہی کرو گی جو کہا جائے گا۔" میرے ذہن میں چمپا کی آواز گونجی۔ اس کے ہونٹ بے حرکت تھے لیکن آواز سنائی دے رہی تھی۔ "بولو معبلہ! میرا حکم مانو گی؟"

"ہاں' میں وہی کروں گی جو تم کہو گی۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ "میں تمہارا حکم مانوں گی۔"

"تو پھر میرے ساتھ ژیان کے پاس چلو' وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" چمپا نے کہا اور پھر میرا ہاتھ تھامے عمارت کے آہنی پھاٹک کی طرف بڑھنے لگی۔

چمپا نے میری طرف سے اپنی نظریں ہٹا لی تھیں لیکن میرے ذہن پر اب بھی ایک گرفت برقرار تھی۔ یہ گرفت پہلی مرتبہ اس وقت مجھے محسوس ہوئی تھی' چمپا کی نظروں سے جب میری نظریں ملی تھیں اور میرے جسم کو جھٹکا لگا تھا۔ میں گویا اب اپنے اختیار میں نہیں رہی تھی۔

مجھے ساتھ لئے چمپا آہنی پھاٹک تک پہنچی تو اِدھر سے اُدھر تک مسلح محافظوں کی ایڑیاں بج اٹھیں۔ چمپا کو سیلوٹ دینے کے بعد انہی میں سے دو محافظوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر آہنی پھاٹک کھول دیا۔ میں خواب کے سے عالم میں یہ سب کچھ دیکھتی ہوئی چمپا کے ساتھ پھاٹک سے گزر کر اندر داخل ہو گئی۔ میں نے عقب میں ذیلی پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنی لیکن خواہش کے باوجود مڑ کر نہ دیکھ سکی۔

نوں جانب سرسبز و شاداب وسیع لان تھے جن کے درمیان راستہ تھا۔ چمپا مجھے لئے اسی راستے پر آگے ہ رہی تھی۔ میرا ہاتھ اب تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ راستے کی دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے ے درخت لگے ہوئے تھے۔ میں نے ان درختوں کی اوٹ میں بھی مسلح محافظوں کی جھلک دیکھی۔

اس راستے کے اختتام پر سرخ پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں' چمپا کے ساتھ ان سیڑھیوں پر ھنے لگی۔ اوپر بڑا سا چبوترا تھا اور سامنے ہی دالان نظر آ رہا تھا۔ بظاہر وہاں کوئی دکھائی نہیں دے رہا ا۔ دالان کے بعد بڑے بڑے تین محرابی دروازے تھے جن میں سے درمیانی دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اچانک ہلکی ہلکی سحرانگیز پرکشش موسیقی پھر سنائی دینے لگی جو لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ چمپا لان عبور کر کے درمیانی دروازے کے سامنے پہنچی اور پھر غائب ہو گئی۔ اب میں وہاں اکیلی تھی۔ میں میانی دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ وہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کے فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے ے۔ سامنے بائیں جانب اوپر جانے کے لئے چوڑی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میرے قدم جیسے خود بخود ھنے لگے۔ اسی وقت عقب سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی' مگر میں اس سے بے پرواہ ہو کر آگے ھتی رہی۔ موسیقی کی آواز اسی سمت سے آ رہی تھی۔ میرے ہاتھوں مارے جانے والے ساحر زعیم نے ی مجھ پر قابو پانے کے لئے ایسی ہی سحرانگیز موسیقی کو ذریعہ بنایا تھا۔ وہ ساحروں کی بستی سارزوم کا رہنے لا تھا اور ژیان بھی کچھ عرصے وہاں رہا تھا۔ یقیناً یہ سحر اس نے وہیں سیکھا تھا۔ میں اب زینے کی تقریباً ف سیڑھیاں چڑھ چکی تھی۔ اس عمارت میں میرے داخلے کے لئے ژیان نے چمپا کو استعمال کیا تھا جسے نظ اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ اب میں عمارت کے اندر پہنچ چکی تھی اس لئے ژیان نے دوبارہ براہ است اپنے سحر میں گرفتار کر لیا تھا۔ اسے شاید اب چمپا کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں دائیں جانب مڑ ر زینے کی بقیہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ موسیقی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

ژیان اگر خود ہی نہ چاہتا تو یقیناً میں اس عمارت میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنی شیطانی توں کے ذریعے یہ معلوم کر لیا تھا کہ میں اس عمارت کے اردگرد منڈلا رہی ہوں اور اسی موقع سے فائدہ ھا کر اس نے مجھے قابو میں کر لیا تھا۔ اس کے لئے ژیان نے بڑے مہاراج کی دست راست چمپا سے بھی دلی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ بڑے مہاراج سے بھی میرے دشمن کی ساز باز تھی۔ مجھے یہ بھی علوم تھا' بنگال کے چیف انٹیلی جنس ڈیسوزا کو دارالحکومت سے یہ احکام بھی ملے تھے کہ بڑے مہاراج ندر موہن کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا جائے۔ چندر موہن کو انگریز حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور ں معاملہ ژیان کے ساتھ تھا۔ سو یوں چندر موہن' انگریز حکومت اور ژیان' تینوں ہی کا آپس میں تعلق اہر ہو چکا تھا۔ یہ تینوں ہی میرے خلاف تھے اور شاید یہی ان کے درمیان قدر مشترک تھی۔

سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بائیں جانب مجھے ایک راہداری نظر آئی۔ میں اس طرف مڑ گئی۔ راہداری ے شروع ہی میں دائیں طرف ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"آ چلی آ اے سردار اشم کی کنواری بیٹی! سرداروں کا سردار ژیان تیرا منتظر ہے۔ اس کی آغوش رے لئے کھلی ہوئی ہے۔" کھلے ہوئے دروازے سے میرے دشمن کی آواز آئی۔

سحر انگیز موسیقی اچانک رک گئی۔ اسی کے ساتھ مجھے یوں لگا جیسے میرا وجود کسی نادیدہ گرفت آزاد ہو گیا ہے۔

"اے ژیان! اے میرے بابا اور میری ماں کے قاتل! میں تیری موت بن کر آ رہی ہوں۔" م اٹھی اور پھر دوڑتی ہوئی کھلے دروازے میں داخل ہو گئی۔

اپنی بات کے جواب میں مجھے ژیان کا کریہہ اور بلند قہقہہ سنائی دیا تھا۔ اپنے دشمن کا قہقہہ میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔

جہاں میں داخل ہوئی تھی' وہ ایک بڑا سا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ کمرے کے درمیانی حصے کے س طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ژیان مجھے کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ ایک چمکیلا حصار اس اردگرد محیط تھا۔ وہ روشنی اسی حصار کی تھی۔

ژیان کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب میری عمر سات آٹھ سال تھی اور اب برسوں کے دیکھ رہی تھی۔ دس گیارہ سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کے چہرے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں تھی۔ وہی تنگ پیشانی' بھنوؤں کی جگہ دو باریک باریک سی لکیریں' حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی دو چ چھوٹی آنکھیں' رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں' چپٹی ناک مگر نتھنے پھولے ہوئے' پتلے سفاک ہو چوڑا دہانہ' دہانے کے نیچے ٹھوڑی پر لمبا سا زخم کا ایک نشان جو کسی جنگ کی یادگار تھا۔ میں اس چہر کیسے بھول جاتی۔ وہی چہرہ تو میری تمام تر نفرتوں کا مرکز تھا۔ اس پر ایک نظر ڈالتے ہی میں جیسے اپنے ہ و حواس میں نہ رہی۔ اپنے انجام کی پرواہ کئے بغیر میں تیزی سے اس کی طرف دوڑی۔ اس وقت م بھی بھول گئی تھی کہ اس کی اطراف حصار قائم ہے۔

میں دوڑتی ہوئی حصار سے ٹکرا گئی اور اچھل کر دور جا گری۔ میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

"میری آغوش میں آنے کی تجھے اتنی جلدی ہے اے معبلہ!" ژیان یہ کہہ کر زور سے ہنسا۔

"بزدل!" فرش سے اٹھتے ہوئے میں نے چیخ کر کہا۔

غصے کی زیادتی کے سبب میرے سارے جسم میں بجلیاں سی دوڑنے لگیں۔ پھر ان بجلیوں کا میری دونوں آنکھیں بن گئیں۔ عظیم مہیمن کی عطا کردہ پُراسرار قوتوں میں سے ایک حیرت انگیز ق میرے اندر بیدار ہو رہی تھی۔

توقع کے مطابق چند ہی لمحوں کے بعد میری آنکھوں سے زندہ جلا ڈالنے والی روشنی خارج ہو میری نظریں ژیان ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میری آنکھوں سے خارج ہونے والی روشنی' ژیان گرد محیط چمکیلے حصار سے ٹکرائی اور زبردست کڑاکا سنائی دیا۔ اسی کے ساتھ فضا میں تیز آواز کے چنگاریاں بکھرنے لگیں۔ میری آنکھوں سے نکلنے والی روشنی دوبارہ میری آنکھوں میں داخل ہو کر غائب گئی۔ بجلیوں کی گردش تھم گئی۔

میں نے ژیان کے گرد قائم حصار کو ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے ژیان کی چیخیں سنائی دیں پھر کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔

عین اسی لمحے میرے اندر ایک اور پُراسرار قوت جاگ اٹھی۔ کمرے میں گہری تاریکی ہونے کے باوجود مجھے سب کچھ روز روشن کی طرح نظر آ رہا تھا۔ میری نظر ژیان پر پڑی وہ کمرے کے عقبی دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جس کے باہر بھی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

"بچ کر کہاں بھاگ رہا ہے کمینے!" میں نے اپنے دشمن کو للکارا' پھر دوسرے ہی لمحے زقند بھری۔

اس کے بعد میرے اور ژیان کے درمیان چوہے اور بلی کا کھیل شروع ہو گیا۔ وہ ساری عمارت میں چکراتا پھر رہا تھا اور میں اس کے تعاقب میں تھی۔ آخرکار وہ ایک کمرے میں گھس ہی گیا۔ میں نے اس کمرے میں داخل ہوتے ہی تیزی کے ساتھ پلٹ کر اندر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"چوہے! اب تو کہاں بھاگ کر جائے گا؟" میں اس کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔

میں نے اسے کمرے میں موجود کھڑکی کھول کر اس پر چڑھتے دیکھا۔ میں چشم زدن میں جیسے اڑتی ہوئی وہاں تک پہنچ گئی' اس کے باوجود مجھے دیر ہو گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ یہ اس عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ عمارت کے عقب میں واقع میدان کو میں پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ ژیان اسی میدان میں کودا تھا۔ میدان میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا' مگر میں' ژیان کو اٹھ کر بھاگتے ہوئے واضح طور پر دیکھ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی پر چڑھ کر نیچے کودنے میں دیر نہیں کی۔ ژیان مجھے میدان کے سرے پر بھاگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس کی طرف دوڑی ہی تھی کہ اچانک عمارت کی چھت سے سرچ لائٹ کا دائرہ نیچے میدان میں حرکت کرنے لگا۔ میرے اور ژیان کے درمیان وہ متحرک روشن دائرہ حائل ہو گیا تھا۔ اگر میں بھاگتے بھاگتے ایک دم رک نہ جاتی تو یقیناً سرچ لائٹ کی زد میں آ جاتی۔ چھت پر موجود مسلح محافظ مجھے دیکھ لیتے اور پھر شاید وہ میرے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔ روشنی کی متحرک لکیر کو میں نے آہستہ آہستہ اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اس کی مخالف سمت چھلانگ لگا دی۔ ژیان کو بھول کر اب میں سرچ لائٹ سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرچ لائٹ کے ذریعے غالباً پورے میدان کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔

میں اِدھر سے اُدھر چھلانگیں لگا کر سرچ لائٹ سے بچتی رہی۔ چند ہی منٹ کی اس اچھل کود نے میرے اعصاب میں تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ پھر سرچ لائٹ بجھ گئی تو میدان میں ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ اس دوران میرے اندر اندھیرے میں دیکھنے کی پُراسرار قوت بھی ختم ہو چکی تھی۔

کچھ فاصلے پر مجھے اس سڑک کے کنارے لگے ہوئے کھمبوں کی روشنی دکھائی دے رہی تھی جہاں سے میں کار میں بیٹھ کر عادل کے ساتھ گزری تھی۔ عادل نے مجھے بتایا تھا کہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد سرچ لائٹ سے اطراف کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ سرچ لائٹ کے دوبارہ حرکت میں آنے سے پہلے مجھے اس میدان کی حدود سے نکل جانا چاہئے تھا۔ یہی سوچ کر میں تیزی کے ساتھ سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہونے کے سبب اب کوئی مجھے وہاں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخل ہو کر زندہ سلامت نکل آنے کی خوشی سے زیادہ مجھے اس بات کا رنج تھا کہ میرا دشمن بچ کر نکل گیا۔ ممکن ہے کہ سرچ لائٹ میری راہ میں حائل نہ ہو جاتی تو ژیان کو فرار کا موقع نہ ملتا۔ مگر اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ ابھی شاید میرے دشمن کا آخری وقت نہیں

آیا تھا۔

اس عمارت کے عقبی حصے میں جو سڑک تھی، تقریباً ویران تھی۔ اب تک مجھے وہاں سے کوئی گزرتی دکھائی نہیں دی تھی۔ میں وہاں پہنچ کر اپنی یادداشت کے سہارے ایک طرف بڑھنے لگی۔ دور پیدل چلنے کے بعد میں ایک ایسی سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکی جس پر ٹریفک رواں دوا[ں] میں سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کسی خالی ٹیکسی کا انتظار کرنے لگی۔ میرے سامنے سے زیادہ تر گزر رہی تھیں۔ اس علاقے میں قیام پذیر افراد کی اکثریت کے پاس شاید اپنی سواریاں تھیں۔ غالب[اً] لئے ٹیکسیاں وہاں کم ہی تھیں۔ مجھے وہاں ٹیکسی کا انتظار کرتے ہوئے بیزاری محسوس ہونے لگی۔ کھڑے ہوئے مجھے پندرہ منٹ سے زیادہ ہو چکے تھے۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے گزرنے والی کاروں کی ہیڈ لائٹس مجھ پر ہی پڑ رہی تھیں۔ میری گزرتے ہوئے ٹریفک ہی پر تھی۔ ایک ٹیکسی گزری بھی تھی تو وہ خالی نہیں تھی۔ اچانک ایک لمبی سی میرے قریب سے گزرتی ہوئی رفتار دھیمی کرتے کرتے کچھ دور آگے جا کر رک گئی۔ پھر میں نے ا[سے] ریورس میں تیزی سے اپنے قریب آتے دیکھا تو چونک اٹھی۔

"ہیلو رانی!" کار میں بیٹھے ہوئے شخص نے مجھے پکارا۔ پکارنے والے کا لہجہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ملکی ہے۔

جانے کیوں مجھے اس شخص کی آواز سنی ہوئی سی لگی۔ کار کے اندر اندھیرا تھا اس لئے میں اس چہرہ نہیں دیکھ سکی۔

"تم نے مجھے پہچانا مس رانی!" اس شخص نے پھر مجھے انگریزی میں مخاطب کیا۔ اسی کے ساتھ کے اندر لائٹ جلا دی۔

"فلپ!" بے اختیار اس کا نام میری زبان پر آ گیا۔ میں اسے پہچان گئی تھی۔ یہ وہی انگریز تھا جس نے کلکتے سے دہلی تک میرے ساتھ سفر کیا تھا۔

"اوہ یس!" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ "مگر مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے یقیناً میرے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثرات دیکھ لئے تھے۔ "آؤ کار میں بیٹھ جاؤ، تم جہاں کہو گی، میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ تم یہاں شاید کسی خالی ٹیکسی کی تلاش میں کھڑی ہو۔"

فلپ کے متعلق سفر کے دوران میں مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ وزارت داخلہ میں ایڈیشنل سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھا۔ ٹرین میں راجہ سکھ دیو کے قتل سے پہلے میں نے فلپ کی بابت یہی سوچا تھا کہ وہ کام کا آدمی ہے۔ اس نے مجھے نئی دہلی میں اپنی کوٹھی اور دفتر کا پتا بھی دیا تھا۔ ولیم نامی کسی شخص سے اس کی بیوی مارگریٹ کے تعلقات بھی تھے جس کے متعلق میرا قیاس یہ بھی تھا کہ وہ شخص سیکرٹ سروس کا سربراہ ولیم رائٹ بھی ہو سکتا ہے۔ چمپا نے مجھے فلپ کی نظروں میں ایک قاتلہ ثابت کر دیا تھا۔ راجہ سکھ دیو کے قتل میں ایک عینی شاہد فلپ بھی تھا۔ ان حالات میں ظاہر ہے اس سے ملنا میرے لئے خطرناک تھا۔ فلپ نے اس وقت مجھے گرفتار کرانے کی کوشش بھی کی تھی، مگر اب اس کا رویہ قطعی دوستانہ تھا۔

اسی وجہ سے شدید الجھن کا شکار ہو گئی تھی کہ اس کی دعوت قبول کروں یا نہ کروں۔

غالباً اس نے میرے چہرے سے تذبذب کا اندازہ کر لیا اور کہنے لگا۔ "گھبراؤ مت مس رانی! مجھے بوڑھے راجہ سے کوئی ہمدردی نہیں جو راستے میں تمہارے ہاتھوں مارا گیا، بھول جاؤ اس واقعے کو۔ تمہاری طرف جو دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہوں، اسے جھٹکو مت۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا، یقین کرو مجھ پر۔" فلپ کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ اس نے میرے لئے اپنی برابر والی نشست کا دروازہ کھول دیا تھا اور مجھ سے کار میں بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔

میں یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھ کر کار میں بیٹھ گئی کہ اگر اس نے وعدہ خلافی کی تو میرے لئے اسے ختم کر دینا مشکل نہیں ہو گا۔ کار میں بیٹھتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

"تھینک یو مس رانی کہ تم نے مجھ پر بھروسہ کیا۔" فلپ نے مجھ سے کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ "اگر تمہیں کہیں جانے کی جلدی نہ ہو تو کچھ دیر کہیں بیٹھتے ہیں۔"

"کہاں؟" میں نے سوال کیا۔

"ویسے تو میری کوٹھی بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں مگر وہاں مارگریٹ بھی ہو گی جو یقیناً تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر بھڑک اٹھے گی، اس لئے کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔" فلپ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔

فلپ نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا، پھر پوچھا۔ "کیا تم اپنے اسی دوست کے ساتھ ٹھہری ہو جو پرانی دہلی کے کسی علاقے میں رہتا ہے۔ مجھے اس علاقے کا نام یاد نہیں رہا، کیا نام تھا؟"

"کوچہ چیلان۔" میں نے دانستہ دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔ میں موجودہ حالات میں اسے شہزاد کے گھر کا پتا بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔

"شاید اس علاقے کا یہی نام بتایا تھا تم نے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کوچہ چیلان۔" اس نے محلے کا نام دہرایا۔ "اب میں یاد رکھوں گا۔"

یہ کیسی عجیب بات تھی کہ جو حکومت میرے متعلق چھان بین میں لگی ہوئی تھی اسی کا ایک اعلیٰ افسر اس وقت میرے ساتھ تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میں ایک قاتلہ ہوں، وہ مجھ سے رشتہ دوستی استوار کرنے کا آرزومند تھا۔ میرے نزدیک اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی۔ چمپا نے اسے میرے قرب کا جو دھوکا دیا تھا، فلپ یقیناً اسے بھول نہیں سکا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد فلپ کی کار ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنی کار جہاں پارک کی، وہیں ایک اور کار پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا۔

"کیا ہوا فلپ؟" میں نے کار سے اترنے کے لئے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں .... کوئی خاص بات نہیں۔" فلپ نے جواب دیا۔ "ایک شناسا کی کار بھی یہاں کھڑی ہے۔" اس نے قریب ہی کھڑی کار کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے چہرے سے قدرے فکرمندی

جھلک رہی تھی۔

"تو پھر کیا ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

"اگر اس سے تمہارے ساتھ ملاقات ہو گئی تو مارگریٹ کو بھی خبر ہو جائے گی لیکن ایک حل ہ اس کا.......... پھر مارگریٹ کو پتا نہیں چلے گا کہ میں تم سے ملا تھا۔ تم ایسا کرنا رانی کہ اگر کوئی مل جا اور اس سے میں تمہارا تعارف کراؤں تو اپنا نام رانی نہ بتانا۔ سمجھ گئیں نا!" فلپ نے ایک راستہ نکال لیا۔

"ٹھیک ہے' تم فکر نہ کرو۔ میں اپنا نام گریٹا بتا دوں گی۔" میرے جسم پر اس وقت پینٹ اور شر تھی۔ فلپ کا شناسا مجھے دیسی عیسائی سمجھ سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے یہ نام لیا تھا۔

"گڈ۔" فلپ کے چہرے سے اطمینان ظاہر ہونے لگا۔ "مارگریٹ کہہ رہی تھی کہ چند روز پ اسے تمہاری کوئی ہم شکل کناٹ پیلس میں ملی تھی۔ مارگریٹ نے اس سے بات بھی کی تھی مگر وہ کوئی ا نکلی۔ اچھا خیر' چلو اترو۔" فلپ نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔

میں نیچے اتر گئی۔ فلپ نے کار کو مقفل کیا اور میرے ساتھ ہوٹل کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔

فلپ کے ساتھ میں اندر ہوٹل کے ہال میں پہنچی تو وہاں تقریباً تمام ہی میزیں بھری ہوئی تھیں وہاں موجود لوگوں میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔

"ہیلو مسٹر فلپ!" ایک طرف سے بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

میں نے بھی فلپ کے ساتھ ادھر مڑ کر دیکھا۔ آواز دائیں سمت کی ایک میز سے آئی تھی۔ اس م پر ایک غیر ملکی جوڑا بیٹھا تھا۔ مرد کی شکل کسی بلڈاگ سے مشابہہ تھی۔ بھاری جبڑے' پھولی ہوئی ناک موٹے اور بھدے نقوش۔ البتہ لڑکی نازک سی اور خوبصورت تھی۔

"اوہ مسٹر ولیم!" فلپ ادھر بڑھتے ہوئے بولا۔ اس نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس شخص کا نام سن کر میں چونک اٹھی تھی۔

"کم آن مسٹر فلپ!" بلڈاگ سے مشابہہ شخص نے دعوت دی۔

فلپ نے اس شخص کی دعوت قبول کر لی۔ غالباً اس کی وجہ اردگرد کوئی میز خالی نہ ہونا تھا۔ پہلے و نے اپنے ساتھ موجود خوبصورت لڑکی کا تعارف کرایا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ انیس برس سے زیادہ نہیں لگ تھی۔ اس کا نام ایلزبتھ تھا۔ ایلزبتھ نے گرم جوشی کے ساتھ پہلے فلپ اور پھر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"اور یہ ہیں مس گریٹا' میری گرل فرینڈ۔" فلپ نے میرا نام بتایا۔ ولیم نے میری طرف مصا کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے خود ہی اپنا تعارف کرا دیا۔ "مجھے ولیم رائٹ کہتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ بلڈاگ سے مشابہہ شخص سیکرٹ سروس کا سربراہ ہی تھا۔ حیرت کے سبب میں اس سے ہاتھ ملانا بھی بھول گئی تھی۔ میر وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آج ہی ولیم رائٹ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ اس کا نام کلکتے سے د

آتے ہوئے دوران سفر پہلی بار میں نے مارگریٹ کی زبانی سنا تھا۔ مارگریٹ اور ولیم کے مراسم تھے۔ اس بات کی تصدیق فلپ کی تاکید سے بھی ہوتی تھی کہ میں اس شخص کو اپنا نام رانی نہ بتاؤں ورنہ مارگریٹ کو بھی فلپ سے میری ملاقات کا علم ہو جائے گا۔ ولیم سے مارگریٹ کے مراسم کی نوعیت کیا تھی' یہ بات بھی میرے علم میں تھی۔ مارگریٹ نے اپنے شوہر کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے مجھ سے تعلقات برقرار رکھے تو وہ بھی کھلے عام ولیم سے ملے گی۔ فلپ کیونکہ خود ایک بڑا افسر تھا اس لئے حلقہ احباب میں بڑے افسران کا ہونا ہی ممکن تھا۔

"مس گریٹا! آپ کو شاید مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی۔" ولیم نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کا ہاتھ اب تک میری طرف بڑھا ہوا تھا۔

"اوہ نو مسٹر ولیم!" میں چونک کر مسکرائی اور جلدی سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ پھر اس سے ملاقات پر خوشی کا اظہار بھی کیا۔

ہمارے آنے سے قبل وہ لوگ مے نوشی کر رہے تھے۔ میز پر شراب کی بوتل اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ فلپ نے تو مے نوشی کی دعوت قبول کر لی مگر ظاہر ہے میں نے معذرت کر کے اپنے لئے کافی کو کہہ دی۔ ولیم نے اس پر اظہار حیرت کیا اور پھر ویٹر کو بلا کر کافی لانے کا آرڈر دیا۔

ذرا ہی دیر بعد وہاں رقص کا راؤنڈ شروع ہوا اور جوڑے اپنی اپنی میزوں سے اٹھ کر ڈانسنگ فلور کی طرف جانے لگے۔ ولیم نے مجھے اپنے ساتھ رقص کی دعوت دی۔ میں نے یہ بتائے بغیر کہ مجھے رقص کرنا نہیں آتا' نرمی کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس پر ولیم معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "آئی سی گریٹا! شاید آپ دونوں تنہائی میں کچھ دیر باتیں کرنا چاہتے ہیں۔" پھر اس نے ایلزبتھ کا ہاتھ تھاما اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ولیم' ایلزبتھ کے ساتھ آگے بڑھ گیا تو فلپ نے مجھے مخاطب کیا۔ "مجھے جس بات کا خدشہ تھا' وہی ہوا۔ آج کی ملاقات تشنہ رہی۔ تمہارے پاس میرے دفتر کا پتا تو ہے نا! کل ساڑھے چار بجے سے پہلے آ جاؤ' پھر کہیں تنہا آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ پتا ہے نا تمہارے پاس؟"

"ہاں لکھا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر ضروری نہیں میں کل ہی آ جاؤں۔ یہ وعدہ رہا' کسی بھی دن میں آ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے' کل نہ سہی پھر کسی دن آ جانا لیکن جلدی آنا۔ میں تمہارا بے چینی سے انتظار کروں گا۔" فلپ نے اپنے گلاس سے شراب کا گھونٹ بھرنے کے بعد کہا پھر بولا۔ "ہاں' یہ بتاؤ اب تمہیں یہ تو یقین آ گیا کہ میں تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا؟"

"ہاں فلپ!" میں نے اقرار کیا' پھر ولیم کے متعلق مزید تصدیق کی خاطر پوچھا۔ "ولیم رائٹ بھی تمہاری طرح کسی بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہو گا؟"

"تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔ وہ سیکورٹی کے ایک ادارے کا سربراہ ہے' لیکن اس کا ادارہ میرے ہی محکمے کے تحت آتا ہے۔" فلپ نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرے ساتھ مخلص ہے اور مجھے ولیم رائٹ کے متعلق حقیقت سے آگاہ کرنے میں کوئی رازداری ضروری

نہیں سمجھتا۔ ہرچند کہ فلپ نے ولیم کے ادارے کا نام نہیں بتایا تھا مگر میرے لئے اتنا بھی کافی تھا۔

"یہ وہی تو نہیں جس کا ذکر تمہاری مسز نے سفر کے دوران کیا تھا؟" میں نے مسکرا کر سوال کیا۔

فلپ نے برا سا منہ بنایا پھر کہنے لگا۔ "ہاں یہ وہی ہے۔ میں اسی لئے اسے پسند نہیں کرتا۔"

"مجھے حیرت ہے' تمہارے مقابلے میں مارگریٹ اس جیسے کرخت شخص کو کیوں پسند کرتی ہے؟"

"کچھ عورتوں کو ایسے ہی رف اینڈ ٹف مرد پسند آتے ہیں۔ اب اسی ایلزبتھ کو دیکھ لو۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں بولی۔ "ولیم عمر میں بھی ایلزبتھ سے دگنا ہوگا۔"

اسی وقت اچانک موسیقی کا ایک چھناکا ہوا۔ اسی کے ساتھ ہال کی تمام بتیاں چند لمحوں کے لئے بجھ گئیں۔ فلپ نے جھک کر میرا ہاتھ چوم لیا اور پھر بتیاں دوبارہ جل گئیں۔ رقص کا راؤنڈ ختم ہو گیا تو ولیم اور ایلزبتھ میز پر آ کر بیٹھ گئے۔

"اچھا مسٹر ولیم! اب ہم چلیں گے۔" فلپ نے اپنے گلاس سے آخری گھونٹ لے کر کہا۔

"اب آپ سے کب ملاقات ہوگی مس گریٹا!" ولیم نے خلاف توقع براہ راست مجھ سے سوال کیا۔

"کسی بھی دن مسٹر فلپ کے ساتھ پھر کبھی ملاقات ہو جائے گی۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیا یہ ملاقات مسٹر فلپ کے بغیر ممکن نہیں؟" وہ بے حجابی سے بولا۔ شاید ان غیر ملکیوں کی تہذیب میں ایسی باتوں کو غیر شائستہ تصور نہیں کیا جاتا تھا۔

میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ ولیم مجھے خود بخود اپنے قریب آنے کا موقع دے رہا تھا۔ میری نظر میں وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ ان دو اعلیٰ انگریز حکام میں سے ایک تھا جن کے علم میں یہ بات تھی کہ انگریز حکومت میرے متعلق کیوں چھان بین کر رہی ہے۔

"کیوں نہیں مسٹر ولیم!" میں بول اٹھی۔ "مسٹر فلپ کے بغیر بھی آپ سے ملاقات ممکن ہے۔ کب اور کہاں؟"

"کل تو میں کچھ مصروف ہوں مس گریٹا! پرسوں رات آپ یہیں اسی ہوٹل میں رات کو نو بجے میرے ساتھ ڈنر کیجئے۔ اگر آپ تشریف لائیں تو اسے میں اپنی عزت افزائی سمجھوں گا۔"

"میں ضرور آؤں گی۔" میں نے وعدہ کر لیا۔

فلپ نے بھی فوراً ہی قرض اتار دیا تھا۔ اس نے بھی آئندہ روز ڈنر پر ایلزبتھ کو ایک اور فائیو سٹار ہوٹل میں مدعو کر دیا تھا۔ میری ہی طرح ایلزبتھ نے بھی فلپ کی دعوت قبول کر لی تھی۔

اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے مصافحہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوٹل سے باہر آتے ہی ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ اس وقت کوئی شخص اس سے اترا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی روکا تو فلپ بول اٹھا۔ "تمہیں میں چھوڑ دوں گا' ٹیکسی کی کیا ضرورت.........."

"نہیں' میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔" میں نے ٹیکسی کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"پھر میرے دفتر آؤ گی نا؟" فلپ نے چلتے چلتے کہا۔

"ہاں ہاں' کیوں نہیں۔" میں اس کی طرف مڑ کر بولی۔

فوری طور پر ٹیکسی مل جانے کی وجہ سے میں نے یہ موقع غنیمت سمجھا تھا کہ بلاشبہ اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے فلپ کے ساتھ مجھے پرانی دہلی نہ جانا پڑے۔ ایسی صورت میں وہاں سے پہاڑ گنج کا رخ کرنے کے علاوہ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ فلپ مجھ سے گھر دکھانے کو کہہ دیتا۔ یوں بھی کافی دیر ہو چکی تھی۔ میری طرف سے عادل کو تشویش ہو سکتی تھی۔ میں بے خبر تھی کہ اس پر کیا گزری تھی۔ کیونکہ مجھے اس سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی' وہ دانستہ مجھے وہاں چھوڑ کر چلا جائے گا۔

مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد تھا کہ ثریان کی آواز جب میں نے سنی تھی تو اچانک عادل کی کار خود بخود رک گئی تھی۔ عادل نے اس پر اظہار حیرت بھی کیا تھا۔ پھر جب میں کار سے اتر گئی تو کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی تھی۔ میرے لئے یہ سمجھنا کوئی زیادہ دشوار نہیں تھا کہ روکے بغیر کار جب خود بخود ہی رک سکتی تھی تو آگے بھی بڑھ سکتی تھی۔ ان حالات میں عادل کا میری طرف سے فکرمند ہونا بعید از قیاس نہیں تھا۔ جو کچھ بھی تھا بہرحال مجھے پہاڑ گنج پہنچ کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

☆======☆======☆

اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے جب میں ٹیکسی کے ذریعے پہاڑ گنج پہنچی۔ ٹیکسی میں نے سڑک ہی پر چھوڑ دی تھی۔ میں اپنے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی کہ مجھے دور ہی سے گھر کے سامنے عادل کی کار کھڑی نظر آ گئی۔ عادل شاید میری تلاش میں ناکام ہو کر گھر لوٹ آیا تھا اور اب وہاں میرا منتظر تھا۔ میں تیز قدمی کے ساتھ آگے بڑھ کر اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ گئی اور کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ دلاری نے کھولا تھا۔

"پنڈت جی بڑی دیر سے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں معبلہ جی۔" دلاری مجھے دیکھتے ہی بولی۔ اس کا اشارہ عادل کی طرف تھا جسے تنظیم کے ارکان پنڈت جی کہتے تھے۔

"ہاں' میں نے کار کھڑی دیکھ لی تھی۔" میں نے کہا اور اندر داخل ہو گئی۔

دلاری دروازہ بند کرنے لگی اور میں آگے بڑھ گئی۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے میں یہ سوچ رہی تھی کہ عادل سے کیا کہوں گی؟ ظاہر ہے' وہ مجھ سے یہ ضرور پوچھتا کہ میں کار سے اتر کر کہاں چلی گئی تھی؟ یہی سوچتی ہوئی میں اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ عادل سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"شکر ہے کہ تم آ تو گئیں معبلہ!" عادل نے میری طرف دیکھتے ہوئے طویل سانس لے کر کہا۔

"میں تو خیر کسی طرح آ ہی گئی لیکن تم کار لے کر کہاں رفو چکر ہو گئے تھے؟" میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"مجھے تو خود اس پُراسرار واقعے پر حیرت ہے۔" عادل بولا۔ "جیسے ہی تم کار سے اتریں' کار خود بخود تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ پھر میں نے لاکھ چاہا کہ کار کو روک لوں لیکن ایسا ممکن نہیں ہوا۔ فل بریک لگانے کے باوجود کار تیز رفتاری سے آگے بڑھتی رہی۔ اسی طرح جب کار خلاف توقع چلتے چلتے اچانک رک گئی تھی تو میں نے ایکسی لیٹر پر لاکھ دباؤ ڈالا تھا مگر کار آگے نہیں بڑھی تھی۔ میرے ساتھ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا خاصی دور جا کر کار آپ ہی آپ رک گئی تھی۔ میں واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی طرف

لوٹ کر آیا اور جس جگہ تم کار سے اتری تھیں' وہاں تمہیں تلاش کیا۔ تم وہاں مجھے نہیں ملیں۔ پھر تمہاری تلاش میں وہ سارا علاقہ میں نے چھان مارا۔ اس کے بعد بہ مجبوری پہاڑ گنج لوٹ آیا۔ تم اگر تھوڑی کچھ دیر نہ آتیں تو میں دوبارہ تمہاری تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ یہ بتاؤ' تم کار سے کیوں اتر گئی تھیں؟ میں نے تم سے پوچھا بھی تھا کہ کہاں جا رہی ہو؟"

"مگر اپنے سوال کا جواب سننے کے لئے وہاں رکے نہیں تھے۔" میں آہستہ سے ہنس کر بولی۔

"وہ تو میں تمہیں اس کی وجہ بتا ہی چکا ہوں لیکن تم نے وہیں رک کر میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟"

"مجھے یہ علم نہیں تھا کہ کار تمہارے قابو میں نہیں رہی تھی۔ ظاہر ہے مجھے یہ بات پتا بھی کیسے چلتی۔ میں کچھ اور ہی سمجھی۔ میں نے سوچا' تم شاید وہاں اپنے لئے کسی قسم کا خطرہ محسوس کر کے چلے گئے ہو اور ایسی صورت میں اب لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ کار خود بخود رک گئی ہے۔ میرا خیال تھا' خود تم نے کار کو روکا ہے کہ میں قریب سے اس عمارت کو دیکھ سکوں۔ میں اسی لئے کار سے اتری تھی لیکن جب تم تیزی سے کار آگے بڑھا لے گئے یا یوں کہو کہ کار خود بخود آگے بڑھ گئی تو مجھے بھی خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے کسی خالی ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائیں تاکہ واپس گھر آ سکوں۔ کوئی خالی ٹیکسی تو وہاں نہیں مل سکی البتہ میرے ایک انگریز شناسا نے مجھے وہاں کھڑے دیکھ کر اپنی کار روک لی۔ وہ کلکتے سے دہلی تک میرا ہم سفر رہ چکا تھا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔ فائیو اسٹار ہوٹل سے نکلتے ہی مجھے ٹیکسی مل گئی اس لئے میں نے اپنے شناسا کو یہاں تک آنے کی زحمت نہیں دی۔ ویسے بھی میں اسے اپنا گھر دکھانا نہیں چاہتی تھی۔" میں نے کسی نہ کسی طرح بات بنا ہی دی اور اصل واقعہ گول کر گئی۔

"پھر بھی تم نے واپسی میں خاصی دیر لگا دی۔" عادل نے کہا۔

"ہاں بس باتوں میں دیر ہو گئی۔" میں بولی۔ عادل زیادہ دیر لگنے کے بارے میں اس لئے کہہ رہا تھا کہا اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں اور پھر وہاں سے فرار ہونے میں جو وقت گزرا تھا' میں نے اس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا تھا۔

"خیر یہ بتاؤ معبلہ! تم نے اس عمارت کو دیکھ کر کیا اندازہ لگایا؟ اتنے سخت حفاظتی انتظامات کی موجودگی میں کیا وہاں داخل ہونا ممکن ہے؟" عادل نے پوچھا۔

"ہاں ممکن ہے۔" میں نے خلاف توقع جواب دیا۔ "وہاں داخل بھی ہوا جا سکتا ہے اور باحفاظت نکلنا بھی ممکن ہے۔"

"وہ کیسے؟" عادل حیران سا ہو کر کہنے لگا۔

"عمارت کے عقبی حصے سے۔" میں نے بتایا۔ "یہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔"

"جہاں تک میرے علم میں ہے عمارت کی عقبی دیوار بالکل سپاٹ ہے' اس پر کس طرح چڑھا جا سکتا ہے؟"

"کمند ڈال کر۔ شرط صرف یہ ہے کہ عمارت کی کوئی کھڑکی کھلی ہو۔ ایسا رات کے وقت ہی ممکن

ہے۔"

"اور سرچ لائٹس سے کس طرح بچا جائے گا؟"

"کم سے کم بھی دس منٹ کا وقفہ تو ہوتا ہے نا' یہ وقت سڑک سے عمارت کے درمیان واقع ونے سے میدان کو عبور کرنے کے بعد کمند ڈال کر اوپر چڑھنے کے لئے کافی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ں کے لئے حیرت انگیز تیزی اور مہارت کا ثبوت دینا پڑے گا۔" یہ سب کچھ میں نے اس عمارت سے ارے تجربے کی بنیاد پر کہا تھا۔

"حیرت ہے معبلہ کہ تم نے اس عمارت کا ایک ہی مرتبہ جائزہ لے کر اندر داخل ہونے کا راستہ ں ڈھونڈ لیا۔" عادل کا لہجہ ستائشی تھا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ عمارت کے حفاظتی اقدامات میں عقبی سمت کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی' را زور سامنے ہی کے رخ پر رکھا گیا ہے۔ چھت کے علاوہ اگر نیچے میدان میں بھی مسلح محافظ متعین تے تو پھر میری تجویز قابل عمل نہ ہوتی۔ بہرحال میں اس سلسلے میں سالار اکبر سے بات کروں گی۔"

مزید کچھ دیر اسی موضوع پر گفتگو کے بعد عادل نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ میں نے اس ران چائے کے لئے بھی پوچھا تھا مگر عادل نے انکار کر دیا تھا۔

عادل چلا گیا تو میں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے کپڑے تبدیل کئے اور پھر نیلا ہلکا بلب جلا کر سونے ے لئے بستر پر لیٹ گئی۔ میرے لئے یہ بات خوش آئند تھی کہ ژیان کا سراغ مل گیا تھا۔ اب اسی کو بام تک پہنچانا میری پہلی ترجیح تھی۔ پہاڑوں سے اتر کر میدانوں کا رخ کرنے کا بنیادی سبب بھی تو آخر ا تھا۔ سونے سے پہلے میں اسی سلسلے میں غور و فکر کرتی رہی۔

میری آنکھوں میں نیند نے اپنے جال بننا شروع کئے ہی تھے کہ میں چونک اٹھی۔ مجھے اپنی مسہری ے اردگرد نارنجی شعاعوں کا ایک حصار دکھائی دیا جو چند لمحے قائم رہ کر غائب ہو گیا۔ اس سے پہلے میں نے ئدد بار اپنے گرد دودھیا حفاظتی حصار محیط ہوتے دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حصار کا رنگ بدل گیا تھا۔ مار کا میرے گرد قائم ہونا اس طرف اشارہ کر رہا تھا کہ مجھے کوئی خطرہ درپیش ہے اور ظاہر ہے یہ خطرہ رے دشمنوں کی طرف ہی سے ممکن تھا۔ مجھے میرے دشمنوں کے شیطانی حملے سے بچانے کی خاطر یقیناً حفاظتی بندوبست عظیم مہین کی نیک روح نے ہی کیا تھا۔ میں نے حفاظتی حصار کی تبدیلی پر غور کیا تو ا کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ چمپا ایک مرتبہ میرے گرد قائم دودھیا حصار کو توڑ چکی تھی۔

خطرے کا احساس ہونے کے بعد اب میرے لئے سو جانا' ممکن نہیں رہا تھا۔ چمپا کی طرف سے میں ی ممکنہ شیطانی حملے کا انتظار کر رہی تھی۔ کافی دیر تک جب میرا انتظار بے سود رہا تو دوبارہ میری پلکیں رے بوجھل ہونے لگیں۔ نارنجی رنگ کی شعاعوں کے اس نئے حصار نے مجھے بڑی حد تک مطمئن کر تھا۔

میرے ذہن پر غنودگی چھائی ہوئی تھی کہ اچانک مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ میں نے گھبرا کر نہیں کھول دیں۔ مسہری سے کچھ ہی فاصلے پر مجھے لعنتی چمپا اپنے مخصوص ریشمی لبادے میں کھڑی نظر

آئی۔ اس کے دونوں ہاتھ میری طرف اٹھے ہوئے تھے اور ہونٹ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ وہ شیطانی عمل میں مصروف تھی۔ خطرے کا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔

معاً میں نے نارنجی شعاعوں کو چمپا کی طرف لپکتے دیکھا۔ جیسے ہی شعاعیں اس کے جسم سے ٹکرائیں وہ چیخ اٹھی۔ اس کے چیختے ہی میرا دم گھٹنا بند ہو گیا تھا۔ اس کا سبب شاید ادھورا رہ جانے والا شیطانی عمل تھا۔ نارنجی شعاعیں غائب ہو چکی تھیں لیکن چمپا اب تک بری طرح چیختے جا رہی تھی۔ پھر میں نے اسے زمین پر گر کے تڑپتے دیکھا۔ وہ اس طرح تڑپ رہی تھی جیسے شدید تکلیف و اذیت میں مبتلا ہو۔

"سہایتا .... سہایتا کریں بڑے مہاراج!" لعنتی چمپا اپنی مدد کے لئے بڑے مہاراج چندر موہن کو پکارنے لگی۔

اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ چمپا جس عذاب میں گرفتار ہو چکی تھی' اس سے بچنا خود اس کے بس میں نہیں تھا۔ میں اب مسہری پر اٹھ کر بیٹھ چکی تھی اور فرش پر گر کے تڑپتی ہوئی چمپا کی حالت کا جائزہ لے رہی تھی۔

ابھی چند لمحے گزرے ہوں گے کہ کمرے میں گاڑھا گاڑھا سا دھواں بھرنے لگا۔ اس کے ساتھ میں نے ٹھنڈک سی محسوس کی۔ دھویں کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا سا پھیل گیا تھا۔ چمپا کی چیخیں رک چکی تھیں۔ اندھیرے نے اس کے جسم کو بھی چھپا لیا تھا۔ میں اب اسے دیکھنے سے قاصر تھی۔

اب تک چمپا کے شیطانی حملوں سے کسی نہ کسی طرح میرا دفاع کیا جاتا رہا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اسے مجھ پر حملہ کرنے اور میرے قریب آنے کی سزا بھی ملی تھی۔

کمرے سے جب دھواں چھٹا اور چیزیں مجھے واضح نظر آنے لگیں تو چمپا کا جسم غائب ہو چکا تھا۔ ٹھنڈک کا احساس بھی اب نہیں رہا تھا۔

میں دوبارہ لیٹنے والی تھی کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اسی لمحے نارنجی شعاعوں کا دائرہ نمودار ہوا اور پھر میں نے اسے فضا میں بکھرتے دیکھا۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بلند آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں' دلاری ہوں معلبہ جی!" باہر سے آواز آئی۔ "دروازہ کھولئے۔"

میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تو دلاری کے ہاتھ میں مجھے ریوالور نظر آیا۔

"کیا ہوا دلاری!" میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ کے کمرے سے مجھے چیخوں کی آواز سنائی دی تھی معلبہ جی!" اس نے بتایا۔ "آپ ٹھیک ہیں' وہ .... وہ چیخیں کس کی تھیں؟"

"لیکن مجھے تو کسی کی چیخیں سنائی نہیں دیں۔" مصلحت کے تحت میں بولی۔ میں سمجھ چکی تھی یقیناً اس نے چمپا کی چیخیں سنی ہوں گی۔ "میں تو گہری نیند سو رہی تھی۔ تم نے دروازے پر دستک دی تو میری آنکھ کھلی۔"

"حیرت ہے کہ آپ سوتی رہیں اور آپ نے کچھ نہیں سنا۔" دلاری کے چہرے پر موجود تاثر

اس کے الفاظ کا ساتھ دے رہے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں' تم جا کر سو جاؤ۔" میں نے نرمی سے کہا۔

وہ حیران حیران سی واپس اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس بار میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ گھر میں دلاری کے سوا اور تھا بھی کون۔ میں نے دروازے کو صرف بھیڑ دیا تھا۔ سلیم نے شاید عادل کی طرف سے پیغام ملنے کے بعد میرے گھر کا رخ نہیں کیا تھا' یا وہ آیا بھی ہو گا تو گھر کی نگرانی و حفاظت پر مامور افراد نے اسے آگے نہیں بڑھنے دیا ہو گا۔ آج رات چمپا خود براہ راست مجھ پر حملہ کرنے والی تھی اس لئے سلیم کو آلہ کار نہیں بنایا ہو گا۔ بہرحال مجھے اب سلیم کی طرف سے خطرہ نہیں رہا تھا۔

اس رات کا بقیہ حصہ سکون سے گزر گیا۔ میں آرام سے سو گئی تھی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن جب میں ناشتہ کرنے کے بعد چائے پی رہی تھی تو سمیع اللہ کے ذریعے مجھے سالار اکبر کا پیغام ملا۔ پیغام کے مطابق سالار اکبر مجھ سے شام کو پانچ بجے ملنے کی بجائے دوپہر دو بجے میرے ہی گھر پر ملنے آ رہا تھا۔ اس تبدیلی وقت کی وجہ سے میں یہی سمجھی کہ شاید شام کو اسے کوئی مصروفیت ہو گی۔ سمیع اللہ پیغام دے کر چلا گیا۔

سمیع اللہ کو گئے زیادہ نہیں ہوئی تھی کہ شہزاد آ گیا۔ مجھے وہ کچھ فکر مند سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی۔

"چچا حمید کی حالت نازک ہے۔" اس نے بتایا۔ "ان کا بیٹا مجید رات کو گھر آیا تھا۔ اس نے ابا جی کو سب کچھ بتا دیا کہ میں نے آپ کو اس کا مکان کرائے پر دلایا تھا۔ ابا جی بھی چچا حمید کو دیکھنے گئے تھے۔ مجید اپنے باپ کی حالت دیکھ کر بہت بپھرا ہوا ہے۔ وہ اس کا ذمے دار آپ کو بتا رہا ہے۔ اس نے مجھ سے رات کو آپ کے بارے میں بھی معلوم کیا کہ آپ کہاں ہیں؟ ظاہر ہے' میں نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ رات کو وہ مجھے دھمکی دے کر گیا تھا کہ سیدھی طرح میں آپ کا پتا بتا دوں ورنہ وہ کوئی اور قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے گا۔ میں نے سوچا' یوں ہی دھمکی دے رہا ہو گا لیکن آج صبح شابو گھر آ گیا۔ اس نے بھی مجھ سے آپ کے بارے میں دریافت کیا۔ میرا خیال ہے اسے مجید ہی نے میرے پیچھے لگایا ہے۔ شابو مجھے دھمکی دے کر گیا ہے کہ اگر آج شام تک میں نے اسے آپ کا پتا نہیں بتایا تو وہ میرے ہاتھ پیر توڑ دے گا۔ اس کے علاوہ ابا جی مجھ سے الگ استفسار کر رہے ہیں کہ میں نے چچا حمید کا مکان آپ کو کس لئے کرائے پر دلا دیا؟ ان کے علم میں یہ تھا کہ آپ اپنے کسی عزیز کے گھر رہ رہی ہیں۔ معلوم نہیں چچا حمید نے ان سے آپ کے بارے میں کیا کیا باتیں کی ہیں۔ شاید وہ اسی لئے مجھ سے آپ کے متعلق طرح طرح کے سوالات کر رہے ہیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے وہ میرے اور آپ کے تعلقات کی طرف سے بھی شبہے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اب بتایئے خاتون کہ میں ان حالات میں کیا کروں؟"

"تم نے جو کچھ بتایا ہے' اس میں تشویشناک بات صرف شابو کے متعلق ہے۔" میں طویل سانس

لے کر بولی۔ ”اس غنڈے کا تمہارے پیچھے لگنا کسی طرح بھی مناسب نہیں‘ مگر تمہیں فکرمند ہونے
ضرورت نہیں۔ شام تک اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ پھر وہ تم سے کچھ نہیں کہے گا۔“

”خاتون! آپ .... آپ کیا کریں گی؟ وہ شابو بہت خطرناک غنڈہ ہے۔ کئی آدمیوں کو وہ چاقو
چکا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ .... آپ اس سے نہ بھڑیں۔ میں ایسا کرتا ہوں‘ اگر آپ اجاز
دیں تو .... تو چند روز کے لئے یہاں آ جاؤں‘ آپ کے پاس۔ بات پرانی ہو جائے گی تو
شابو..........“

”نہیں۔“ میں نے شہزاد کی بات کاٹ دی۔ ”تم یہاں میرے پاس آ کر نہیں رہو گے۔“

”اگر یہاں نہیں تو .... تو پھر میں کچھ دن کے لئے اپنے کسی دوست کے گھر رہ لیتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت ہی نہیں ہے نا!“ میں بولی۔ ”تم سے کہہ چکی ہوں نا میں کہ فکر نہ کرو‘ ش
تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

میرے سمجھانے بجھانے سے شہزاد کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا۔ میں نے اس کے لئے چائے م
لی۔

”شام کو میں چار اور پانچ بجے کے دوران تمہارے گھر پہنچ جاؤں گی۔“ میں نے شہزاد سے کہا۔ ”
مجھے گھر ہی پر ملنا۔“

”اگر خاتون! آپ کی آمد سے پہلے شابو آ گیا تو؟“

”وہ آ جائے تو تمہیں اس سے ملنے کے لئے گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے جواب د
”کہلوا دینا کہ تم گھر پر نہیں ہو۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا خاتون!“ شہزاد نے مطمئن انداز میں سر ہلایا‘ پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا
”ایسا کیوں نہ کروں خاتون کہ شام تک میں یہیں رہوں اور پھر شام کو یہاں سے آپ..........“

”تم آخر اتنا گھبرا کیوں رہے ہو؟“ میں بول اٹھی۔ ”تمہیں اگر شابو کی طرف سے اتنا ہی خطرہ ہے
پانچ بجے شام تک اپنے گھر پہنچ جانا‘ میں تمہیں وہیں ملوں گی‘ یہ تو ٹھیک ہے؟“

شہزاد نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ زبان سے تو اس نے یہ اقرار نہیں کیا تھا کہ شابو سے خوفزدہ ہے م
اس کے انداز و اطوار سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

”شام تک تمہارے یہاں رہنے پر بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا مگر کچھ دیر بعد میں گھر سے نک
والی ہوں‘ مجھے ایک جگہ کام سے جانا ہے۔“ میں نے بات بنائی تاکہ وہ کچھ اور نہ سوچے۔

”تو پھر میں چلوں؟“ اس نے ہاتھ سے چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں تم اب جاؤ۔“ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

جاتے ہوئے شہزاد کا انداز ایسا تھا جیسے چاہتا ہو میں اسے روک لوں۔ میں اسے روک بھی لیتی م
سالار اکبر مجھ سے ملنے آنے والا تھا۔ اس وقت شہزاد کی موجودگی مناسب نہ ہوتی۔ اس روز بھی دوپہ
کھانا کھا کر میں اپنی عادت کے مطابق آرام کرنے لیٹ گئی۔ دو بجنے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ میں

ے آرام کر سکتی تھی۔ دلاری کو میں نے سالار اکبر کی آمد سے آگاہ کر دیا تھا۔ دو بجے سے ذرا پہلے اٹھ کر
ں نے لباس تبدیل کیا کیونکہ لیٹنے کے لئے سلیپنگ گاؤن پہن لیا تھا۔

توقع کے مطابق ٹھیک دو بجے سالار اکبر آ گیا۔ دلاری اسے میرے کمرے میں لے آئی تھی۔ دلاری
مرے سے چلی گئی تو سالار اکبر نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
ولیم رائٹ اور رابرٹ ہیم کے دفتروں‘ نیز کوٹھیوں کے پتے حاصل کر لئے گئے ہیں جو اس لفافے میں
وجود ہیں۔ ان دونوں کے متعلق بقیہ ضروری معلومات ابھی حاصل کی جا رہی ہیں۔ دونوں ہی کے دفاتر
یسے ممنوعہ علاقوں میں ہیں جہاں کسی عام آدمی کا داخلہ ممکن نہیں ہے جب تک اس کے پاس متعلقہ حکام
ی طرف سے جاری کردہ خصوصی اجازت نامہ نہ ہو۔ دونوں کی سکونت البتہ ایسے کسی علاقے میں نہیں
ہے۔“

میں نے لفافہ کھول کر ایک کاغذ پر درج پتے پڑھے اور پھر کاغذ کو دوبارہ لفافے میں بند کر کے میز پر
کھ دیا۔ ان پتوں کی فراہمی پر میں نے سالار اکبر کا شکریہ ادا کیا۔

”کل رات کو جو لوگ ولیم کی نگرانی کر رہے تھے‘ ان سے مجھے ایک اور حیران کن اطلاع بھی ملی
ہے۔“ سالار اکبر بولا۔

پھر اس سے پہلے کہ سالار اکبر مزید کچھ کہتا‘ میں بول اٹھی۔ ”وہ حیران کن اطلاع غالباً میرے ہی
رے میں ہو گی کہ مجھے ولیم کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔“

”جی ہاں۔“ سالار اکبر نے تصدیق کی‘ پھر معلوم کیا۔ ”آپ اس تک کس طرح پہنچ گئیں؟ ولیم
یسے کسی شخص تک پہنچ جانا بہرحال کوئی آسان بات نہیں۔“

”ولیم سے میری ملاقات محض ایک اتفاق تھی۔“ میں نے جواب دیا‘ پھر سالار اکبر کو فلپ کے
رے میں بتایا۔ ”اسی نے ولیم رائٹ سے میری ملاقات کرائی تھی۔“

”بقول آپ کے‘ خود فلپ بھی وزارت داخلہ میں ایڈیشنل سیکرٹری ہے۔ پھر تو وہ بھی آپ کے لئے
ار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔“ سالار اکبر نے اظہار خیال کیا۔

”ممکن ہے‘ آپ کا خیال درست ہو۔ پھر بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سیکرٹ سروس
رحال الگ ایک ادارہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے تمام اقدامات سے وزارت داخلہ کو باخبر رکھتا ہو۔
ض معاملات انتہائی رازداری کے بھی تو حامل ہوتے ہیں۔“ میں بولی۔

”لیکن وزارت داخلہ کسی بھی معاملے میں سیکرٹ سروس سے استفسار کرنے کا حق رکھتی ہے۔ خیر
...... یہ الگ بحث ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ کل پنڈت جی کے ساتھ آپ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا جائزہ
لینے بھی گئی تھیں اور آپ کا خیال ہے‘ وہاں سے عقبی سمت سے داخل ہونا مشکل نہیں۔“

”جی ہاں‘ میں ایسا ہی سمجھتی ہوں۔“

”پھر بھی میں یہی مشورہ دوں گا معلبہ کہ یہ خطرہ مول نہ لیا جائے۔ اگر وہاں داخل ہوئے بغیر مقصد
پورا ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔“

"آپ ٹھیک کہتے ہیں' بلاضرورت خطرہ مول نہیں لینا چاہئے لیکن میرا خیال ہے کہ آخر کار یہ اٹھانا ہی پڑے گا۔ ولیم کے مہمان کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تسلی بخش حفاظتی انتظامات کے بغ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے باہر قدم نہیں رکھے گا۔"

"اس کا نام بھی معلوم ہو گیا ہے' ظاہر ہے تصدیق آپ ہی کر سکتی ہیں۔" پھر سالار اکبر نے مد دشمن کا نام بتایا۔

"جی ہاں اس کا نام ژیان ہے۔" میں نے تصدیق کر دی۔ سالار اکبر کا عملہ یقیناً بڑی جاں فشانی تیز رفتاری کا ثبوت دے رہا تھا۔ اتنے کم وقت میں ان لوگوں نے خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ سوچتے ہوئے میں نے سالار اکبر سے سوال کیا۔ "ژیان کے متعلق یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ اسٹ گیسٹ ہاؤس سے نکلتا بھی ہے یا نہیں' آپ کو کتنا وقت چاہئے؟"

"کم سے کم تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔ اگر اس سے پہلے معلومات حاصل ہو گئیں تو ظاہر آپ کو مطلع کر ہی دیا جائے گا۔" سالار اکبر نے واب دیا۔

"ٹھیک ہے' میں تین دن انتظار کئے لیتی ہوں' اسی کے بعد آخری قدم اٹھانے کے بارے میں ا فیصلہ کروں گی۔"

"آخری قدم سے آپ کی مراد اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخل ہونے سے ہے؟"

"جی' اس سلسلے میں مجھے آپ سے تعاون چاہئے ہو گا۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخلے کے۔ مجھے کم از کم دو مسلح ارکان کی ضرورت پڑے گی۔ ان میں سے ایک کا انتخاب میں کر چکی ہوں' دوسر رکن کے انتخاب کا فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں۔"

""آپ نے شاید پنڈت جی کا انتخاب کیا ہے۔ دوسرا رکن خود میں بھی ہو سکتا ہوں لیکن کیا صر دو افراد کافی ہوں گے معبلہ!"

"ابھی میں نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا لیکن بھیڑ جتنی کم ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ کم افراد ہوں تو تیز سے حرکت کی جا سکتی ہے۔"

"میں بھی اس پر غور کروں گا اور کوئی نئی بات ذہن میں آئی تو آپ کو بتاؤں گا۔ اب اجاز ہے؟"

"کل بھی اسی وقت دوپہر کو تشریف لائیں گے یا شام پانچ بجے؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے تو شام ہی کو آنے کا ارادہ ہے لیکن وقت تبدیل ہوا تو آپ کو آج ہی کی طرح مطلع ک دوں گا۔ ہاں آپ سے ایک بات اور دریافت کرنا تھی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے' آپ آئندہ بھی سے ملتی رہیں گی۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟"

"قطعی درست ہے۔ کل رات اسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ولیم سے میری ملاقات ہو گی جہاں ک اس کے ساتھ ولیم کی نگرانی کرنے والے آپ کے آدمیوں نے دیکھا تھا۔" میں نے بتا دیا۔

"ویسے تو آپ خود بھی بہت ذہین اور باشعور ہیں معبلہ! پھر بھی ان غیر ملکیوں کی طرف سے

محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" سالار اکبر کے لہجے میں خلوص تھا۔ "آپ نے اچھا کیا جو مجھے بتا دیا۔ اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دوں گا کہ ولیم کی نگرانی کرتے ہوئے آپ کا بطور خاص خیال رکھیں۔"

"شکریہ سالار اکبر! آپ کی ہدایت کے مطابق میں پوری طرح چوکنا اور محتاط رہوں گی۔" سالار اگر مجھے یہ تاکید نہ بھی کرتا تو میں ایسا ہی کرتی۔ پھر بھی میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ یہ ادا کر دیئے تھے۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میں اخلاقاً اسے رخصت کرنے گھر کے دروازے تک گئی۔

اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد میں نے مزید کچھ دیر آرام کیا اور پھر چار بجے کے قریب اٹھ چلی قبر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اسی عرصے میں دلاری میرے لئے چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اب وہ عادات سے بڑی حد تک واقف ہو گئی تھی۔ چائے پی کر میں نے گھر سے نکلنے میں دیر نہیں کی۔

مجھے پانچ بجے تک شہزاد کے گھر پہنچنا تھا اور اب سڑک تک پہنچتے پہنچتے سوا چار ہو گئے تھے اسی لئے نے ایک خالی ٹیکسی روک لی۔

پانچ بجے سے کچھ پہلے ہی میں' شہزاد کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ دروازہ کھولنے شہزاد کا چھوٹا بھائی فرہاد تھا۔

"تمہارے بھائی جان ہیں گھر پر؟" میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے فرہاد سے معلوم کیا۔

"جی نہیں' صبح کے گئے ہوئے ہیں ابھی تک نہیں لوٹے۔ امی بھی پریشان ہو رہی ہیں۔" فرہاد نے ۔ "ابھی کچھ دیر پہلے شابو بھی انہیں پوچھنے آیا تھا۔ معلوم نہیں اب ان غنڈوں نے ہمارے گھر کے چکر کیوں شروع کر دیئے ہیں۔ پہلے تو بھائی جان کا ایسے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"اب بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں فرہاد کے ساتھ ساتھ گھر کے اندر پہنچ گئی۔

سنبل اپنی ماں کے ساتھ دالان میں بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی حسب معمول کھل ا۔ میں بھی ان دونوں ماں بیٹی کے پاس دالان میں بیٹھ گئی۔

"اے بیٹی! شہزاد کے ابا بتا رہے تھے کہ تم نے حمید بھائی کا مکان کرائے پر لیا تھا۔ تم تو یہاں سے کی عزیز کے گھر رہنے کو کہہ کر گئی تھیں۔ پھر جب تمہارا یہ اپنا گھر موجود ہے رہنے کو تو کرائے پر لینے کی کیا ضرورت تھی۔ معاف کرنا بیٹی! یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ لگتا ہے تم ہمیں اپنا سمجھتیں۔" شہزاد کی ماں نے مجھے مخاطب کیا۔

"ارے نہیں خالہ! ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ لوگوں کو اپنا نہیں سمجھوں گی تو کسے سمجھوں گی؟ وہ تو میں نے بس یوں ہی وقت بے وقت کے لئے کرائے پر لینا چاہتا تھا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ جب عزیزوں کے یہاں رہ کر لوٹوں گی تو اسی مکان میں رہ لوں گی تاکہ آپ لوگوں کو میری وجہ سے زحمت ہو۔" میں نے جیسے تیسے بات بنا ہی دی۔

ممکن ہے' بڑی بی ابھی مزید میری جان نہ چھوڑتی کہ شہزاد آ گیا۔

"کیا آپ کو آئے ہوئے دیر ہو گئی؟" اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا۔ "مجھے ذرا اپنے ایک ست کے یہاں دیر ہو گئی۔"

"بس ابھی کچھ ہی دیر پہلے آئی ہوں۔" میں بولی۔

"کیوں رے' یہ تو بغیر کچھ کہے سنے کہاں دن دن بھر اڑا پھرتا ہے؟" شہزاد کی ماں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اس نے یہ خیال بھی نہیں کیا تھا کہ وہاں میں بھی موجود ہوں۔

"بس اماں! بتانا بھول گیا تھا کہ واپسی میں دیر ہو جائے گی معاف کر دیں۔" شہزاد نے بڑی ٹھنڈا کرنے کے لئے فوراً معافی مانگ لی۔

"کھانا بھی کھا لیا تھا کہیں دوپہر کو کہ ایسے ہی بھوکا پھر رہا ہے؟"

"کھا لیا تھا اماں!" شہزاد نے جواب دیا' پھر مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں اٹھ کھڑی ہوئی اور شہزاد مجھے لے کر نشست گاہ میں آ گیا۔

"ہاں خاتون! اب بتایئے آپ کا کیا ارادہ ہے؟" شہزاد نے سوال کیا۔

"تم نے شابو کا اڈہ دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں' مگر کیا وہاں چلیں گی؟" وہ کچھ گھبرا سا گیا۔

"کیوں' کیا حرج ہے وہاں چلنے میں اور کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ یہاں آ کر کوئی ہنگامہ کھڑا کرے' فرہاد مجھے بتا رہا تھا کہ وہ تمہیں پوچھنے ایک بار آ بھی چکا ہے۔"

شہزاد کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا تھا۔ "سمجھ میں نہیں آ رہا خاتون کہ میں کیا کروں' کیا نہ کروں؟"

"جب آدمی کی سمجھ میں خود کچھ نہ آ رہا ہو تو دوسرے کی سمجھ پر بھروسہ کر لینا چاہئے۔ چلو اٹھو مجھے شابو کے اڈے پر لے چلو۔" میں نے کہا۔

"سوچ لیجئے اب بھی خاتون! وہاں جانا میرے خیال میں ہرگز مناسب نہیں ہے۔ وہاں یوں بھی وہ اکیلا نہیں ہو گا' اس کے اور بھی چیلے چانٹے ہوں گے۔ یہاں تو وہ پھر بھی اکیلا آیا تھا۔"

"سوچ لیا بس' تم اٹھو میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں آئے۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی' مجبوراً شہزاد کو بھی میرا ساتھ دینا پڑا۔

شہزاد کے ساتھ میں نشست گاہ سے باہر نکلی ہی تھی کہ سنبل نے دیکھ لیا اور لپکتی ہوئی قریب آ کر مجھ سے بولی۔ "ارے باجی! کیا ابھی سے جا رہی ہیں؟ میں تو آپ کے لئے چائے بنانے جا رہی تھی۔"

"ابھی تھوڑی دیر بعد آ کر پیوں گی! تمہارے بھائی جان کے ساتھ ذرا ایک جگہ جانا ہے' وہاں سے ہو کر آتی ہوں۔"

"آیئے گا ضرور۔" اس نے محبت سے تاکید کی۔

میں اقرار میں سر ہلا کر شہزاد کے ساتھ گھر کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

گھر سے نکل کر ہم دونوں تراہا بیرم خاں تک ہی پہنچے تھے کہ میں نے شہزاد کو ٹھٹک کر رکتے دیکھا۔

"تم رک کیوں گئے' کیا ہوا؟" میں نے شہزاد کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ .... وہ خاتون! شابو' وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔" شہزاد ایک طرف دیکھ کر ہکلایا۔

میں نے شہزاد کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو مجھے بھی ایک جانب سے لحیم شحیم شابو نظر آ گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واقعی ہماری ہی طرف آ رہا تھا۔ لگتا تھا' اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔ شہزاد کے گھر سے ہم خاصی دور نکل آئی تھی۔ اب ہم بھرے بازار میں تھے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ شابو بھرے بازار میں الجھنے کی کوشش کرے گا۔ میں بھی اب رک چکی تھی۔

شابو اور قریب آ گیا تو میں نے شہزاد سے کہا۔ "تم ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور لو' یہ میرا پرس پکڑ لو۔" میں نے اپنا پرس اسے تھما دیا۔

میں نے شابو کے چہرے پر تناؤ سا دیکھا۔ اس کا چہرہ تنے ہوئے ککے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ وہ میرے بالکل سامنے آ کے رک گیا اور اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ پھر وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ "آخر اس نے تجھے اپنی جان بچانے کے لئے بلا ہی لیا تاکہ میں اس کے ہاتھ پیر نہ توڑ دوں۔" اس کا اشارہ شہزاد کی طرف تھا۔ پھر اچانک اس نے میرا دایاں بازو پکڑ لیا اور غرایا۔ "چل میرے ساتھ اڈے پر۔"

"کیوں' یہیں بھرے بازار میں فیصلہ ہو جائے تو کیا برا ہو؟" میں پُرسکون آواز میں بولی اور اسی کے ساتھ جھٹکا دے کر اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔

"تو شاید یہ سمجھ رہی ہے کہ یہاں بازار میں تجھے لوگ بچا لیں گے۔ سن' اگر میں تجھے یہاں چیر کے بھی ڈال دوں تو کسی کی مجال نہیں کہ ایک لفظ زبان سے نکال سکے۔ میرا نام شابو ہے شابو۔ یہ سارا علاقہ مجھے جانتا ہے۔ تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ چپ چاپ میرے ساتھ چلی چل ورنہ میں تجھے اٹھا کر بھی لے جا سکتا ہوں۔"

میرے اور شابو کے درمیان تکرار دیکھ کر لوگ جمع ہونے لگے تھے۔

"چلو بے' کام کرو اپنا۔" شابو نے لوگوں کو ڈانٹ دیا۔ "یہاں تمہاری اماں نہیں ناچ رہی جو تماشا دیکھنے رک گئے ہو۔"

ڈانٹ کھا کر لوگ چھٹنے لگے تھے کہ میں نے انہیں بلند آواز میں مخاطب کیا۔ "ٹھہر جاؤ! اس گیدڑ کی بھبکی میں آنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی یہ تم سب لوگوں کو ناچ کر اپنا تماشا دکھائے گا۔" یہ کہتے ہی میں تیزی سے پیچھے ہٹی اور پھر شابو کے پھولے ہوئے رخسار پر اتنی زور سے میرا الٹا ہاتھ پڑا کہ اس کا چہرہ دوسری طرف گھوم گیا۔

"تیری تو........" شابو مجھے گالی دیتا ہوا میری طرف جھپٹا۔

مجھ پر حملہ کرنے یا ضرب لگانے کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اپنی ایک ٹانگ پھنسا کر اسے گرا دیا تھا۔

"شاباش' اٹھ جا میرے مٹی کے شیرا!" میں نے اسے چڑایا۔

بھاری بھرکم جسم ہونے کے باوجود وہ اچھل کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ لوگوں نے اب ہمارے گرد حلقہ بنا لیا تھا۔ وہ میرے روکنے پر جاتے جاتے ٹھہر گئے تھے اور اب یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے تھے۔ یقیناً انہوں

نے آج سے پہلے ایک عورت کے ہاتھوں یوں کسی بدمعاش مرد کو پٹتے ہوئے نہ دیکھا ہو گا۔

شابو مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا شاید میرے اوپر چھلانگ لگانے والا تھا۔ میں پوری طرح چو تھیں جیسے ہی وہ اڑتا ہوا سا میری طرف آیا' میں نے اپنی دائیں ٹانگ آگے بڑھا دی۔ میرے پیر کی ضر اس کے جبڑے پر پڑی اور وہ چیختا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ ممکن ہے کہ وہ دوبارہ زمین چاٹ جاتا مگر اس نے خو کو سنبھال لیا۔ وہ گرتے گرتے بچ گیا۔

"اتنا کافی ہے شابو کہ ابھی اور ذلیل ہونے کی تمنا ہے؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"میں تجھے یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جانے دوں گا۔" وہ یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر مجھ پر جھپ پڑا۔

میں نے بائیں طرف ہٹ کر اس کے پہلو پر کہنی ماری اور اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ ضرب کھا کر دہرا ہو گیا۔ اسی لمحے لپک کر میں نے اس کی پنڈلی پر ٹھوکر ماری۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور پھر اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔

"شابو! میں تیرے اڈے پر چل کر تیرا انتظار کر رہی ہوں۔ جب تُو چلنے کے قابل ہو جائے تو وہاں آ جانا۔ میرا خیال ہے' بقیہ تماشا تیرے اڈے پر ہو تو زیادہ اچھا ہے' یہاں خواہ مخواہ لوگوں کا رستہ کھوٹا رہا ہے۔" میں یہ کہہ کر شہزاد کی طرف مڑی اور بولی۔ "چلو۔"

"خاتون! اب .... اب رہنے دیں' زیادہ بات نہ بڑھائیں۔" شہزاد خوفزدہ سا دکھائی دے ر تھا۔

"ڈرو مت' میں اس طرح بات بڑھا نہیں رہی بلکہ ختم کرنا چاہتی ہوں۔ تم چلو تو سہی میرے ساتھ۔" میں نے دھیمی آواز میں شہزاد سے کہا۔

"چلئے۔" شہزاد مردہ سی آواز میں بولا اور پھر میرے ساتھ چلنے لگا۔

لوگ مجھے دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے راستہ دے دیا تھا۔ وہ میرے ہی بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

"یہ ہے شیر کی بچی!" کوئی کہہ رہا تھا۔

"دیکھا نہیں' شابو جیسے بدمعاش کی مینگ نکال دی۔" دوسرا شخص بولا۔

"اور اب اس کے اڈے پر جا رہی ہے' اسے کہتے ہیں بہادری۔" کسی اور نے کہا۔

میں یہ سارے تبصرے سنتی ہوئی لوگوں کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھ گئی۔ شہزاد میرے ساتھ تھا۔ میرا ہینڈ پرس اب تک اس کے پاس تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے پرس لے لیا۔ شہزاد ایک مرتبہ پھر مجھ سے واپس چلنے کے لئے کہنے لگا تو میں نے اسے سمجھایا۔ "اگر بات یہیں ختم ہو گئی تو تمہارا دشمن ہو جائے گا۔ پھر موقع دیکھ کر وہ تمہیں کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا ہے جو ظاہر ہے' میں نہیں چاہتی۔"

"تو پھر خاتون! بات ختم کس طرح ہو گی؟ اس طرح تو بات اور بڑھتی جا رہی ہے۔ اڈے پر تو ا

ے اور ساتھی ہوں گے۔"

"تو کیا ہوا' یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ اس کے دل میں کوئی حسرت تو نہیں رہے گی۔ تم بس دیکھتے جاؤ۔ اگر زیادہ ڈر لگ رہا ہے تو مجھے اس کا اڈہ دکھا کر تم گھر واپس چلے جاؤ۔"

"یہ .... یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے خاتون کہ میں .... میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

شہزاد کی بات سن کر میں دل ہی دل میں ہنسی۔ اس کا میرے ساتھ ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا مگر میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں کچھ کہتی تو وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہوتا۔

میں' شہزاد کے ساتھ کوچہ چیلان میں شابو کے اڈے پر پہنچ گئی۔ اڈے کا بڑا سا محرابی پھاٹک بند تھا۔ پھاٹک ہی کے اندر ایک چھوٹا دروازہ اور بھی نظر آ رہا تھا۔

"دستک دو۔" میں نے شہزاد سے کہا۔

شہزاد نے میرے کہنے پر دستک دی تو ذیلی دروازہ کھول کر لمبے سے منہ والے ایک شخص نے باہر جھانک کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟" اس کے لہجے میں اکھڑپن تھا۔

"ہمیں شابو نے یہاں بھیجا ہے۔" شہزاد کے کچھ کہنے سے پہلے میں بول اٹھی۔

"تمہیں بھیجا ہے۔" لمبے منہ والا حیرت سے بولا۔ "مگر کس لئے؟"

"ہمیں کیا معلوم' ہم سے جو کہا گیا ہے اسی پر عمل کر رہے ہیں۔ تم ہمیں اندر آنے دو۔" میں نے کہا۔

"خود استاد شابو کہاں ہیں؟" وہ شخص مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئے؟"

"تم ادھر ہٹو۔" میں نے شہزاد کو ایک طرف کر دیا اور اپنا ہینڈ پرس بھی پکڑا دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ لمبے منہ والا کچھ سمجھ پاتا کہ میرا کیا ارادہ ہے' میں اسے دھکا دے کر اندر داخل ہو گئی۔

"ارے تُو ہاتھا پائی پر اتر آئی' بتاتا ہوں تجھے ابھی .... مجھے تو پہلے ہی تجھ پر شک ہو رہا تھا۔" یہ کہتے ہی لمبے منہ والے شخص نے اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔

"زیادہ بہادری نہ دکھا اور چاقو جیب میں رکھ لے۔ میں ہراجے بجے پر ہاتھ اٹھانا اپنی توہین سمجھتی ہوں۔"

"ابے' تُو آپے سے باہر ہی ہوئی جا رہی ہے۔" اس نے کھٹکے دار چاقو کھول لیا۔ "ابھی تیری آنتیں باہر کئے دیتا ہوں۔"

میں سمجھ گئی کہ وہ اس طرح نہیں مانے گا۔ میں نے اسی لئے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پر لات ماری۔ وہ چیخا اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ میں پھر اس پر جھپٹی۔ اس بار میرے ہاتھ کی ضرب اس کی کنپٹی پر پڑی اور وہ لہرا کے زمین پر آ رہا۔

"ابے ننھے! کیا ہو گیا' کیوں چیخ رہا ہے؟" اندر سے کسی کی بھاری آواز آئی۔

ننھے غالباً اسی لمبے منہ والے کا نام تھا جو ہوش و حواس کی دنیا سے غافل ہو چکا تھا۔ میں دہاری میں کھڑی تھی۔ شہزاد ابھی تک باہر ہی کھڑا تھا میں نے اسے آواز دی۔ "اندر آ جاؤ شہزاد! راستہ صاف ہو چکا ہے۔" یہ کہتے ہی میں پلٹی کیونکہ اپنے عقب میں مجھے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔

میری طرف آنے والا گٹھیلے جسم کا ایک شخص تھا۔ اس کا ایک کان ٹوٹا ہوا تھا اور کاندھے پر رومال پڑا تھا۔ اسی دوران میں شہزاد اندر آ گیا۔

"یہ ننھے کو کیا ہوا؟" نووارد نے میرے قریب آ کر حیرت سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا' بس ایک ہی ہاتھ میں غش کھا گیا۔ منع کیا تھا میں نے کہ زیادہ بہادری نہ دکھا' مگر مانا ہی نہیں۔ کہنے لگا' ابھی آنتیں باہر کر دوں گا۔" میرا لہجہ بالکل ایسا تھا جیسے اس شخص سے لمبے منہ والے کی شکایت مقصود ہو۔

"کیا مطلب؟ تُو نے مارا ہے ننھے کو؟" اس شخص نے چونک کر مجھے گھورا۔

"ہاں مَیں نے ہی مارا ہے۔" میں نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔ "اگر میں اسے نہ مارتی تو یہ مجھے چاقو مار دیتا۔ وہ دیکھ لو' ادھر چاقو پڑا ہے اس کا۔"

اس شخص نے دور پڑے ہوئے چاقو کی طرف حیرت سے دیکھا' پھر مجھ سے سخت لہجے میں بولا۔ "کون ہے تُو' یہاں کیوں آئی ہے؟"

"اماں پہلوان! تم یہ بازی چھوڑ کر کہاں پھوٹ لئے؟" اندر سے کوئی تیز آواز میں کہنے لگا۔ "پھر کہو گے میں نے پتے سرکا لئے۔"

ابھی نہ وہ شخص کچھ کہہ پایا تھا نہ میں اس کے سوال کا جواب دے پائی تھی کہ پھاٹک کے ذیلی دروازے سے شابو کسی طوفان کی طرح بپھرا ہوا اندر داخل ہوا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں لمبے پھل کا کھلا ہوا چاقو دیکھ لیا تھا۔ میں ایک دم اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

"ارے ارے استاد شابو! کیا ہو گیا؟" گٹھیلے جسم والے نے شابو کو مخاطب کیا۔

"تم ہٹ جاؤ ایک طرف پہلوان! مجھے اس لونڈیا کے ٹکڑے کرنے دو۔" شابو دانت پیستا ہوا آگے بڑھا۔

"مگر پتا تو چلے یار کہ بات کیا ہے' جھگڑا کس بات پر ہے؟" پہلوان نے پھر پوچھا۔

شابو اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر میری طرف جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک پہنچ کر چاقو سے وار کرتا' میں جھکائی دے کر تیزی سے ایک طرف ہو گئی۔ شابو اپنے ہی زور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسی وقت میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ شابو کی پشت میری طرف تھی۔ میں اس کی پشت پر سوار ہو گئی۔ اس نے جھک کر مجھے سامنے پٹخنا چاہا' مگر اس سے پہلے ہی میرے ہاتھ کی ضرب اس کی گردن کے پچھلے حصے پر پڑی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گرا۔ میں ابھی تک اس کی پشت پر سوار تھی۔ میں نے جھک کر اس کے دائیں شانے کے جوڑ پر کہنی ماری' پھر اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ شابو اوندھا پڑا تھا لیکن چاقو اب تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے ہاتھ پر میرے پیر کی ٹھوکر پڑی تو چاقو ہاتھ سے نکل کر پہلوان کے قریب گرا۔ اسی

دوران دائیں جانب بنے ہوئے ایک کمرے کے اندر سے دو آدمی اور نکل آئے تھے۔ وہ دونوں بھی تصویر حیرت بنے شابو کو میرے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہے۔ شاید انہیں اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اب تک نہ ان دونوں نے مداخلت کی تھی' نہ پہلوان درمیان میں کچھ بولا تھا۔ پھر بھی جب شابو کا چاقو پہلوان کے قریب جا کے گرا تو میں چوکنا ہو گئی۔ میرا اندازہ تھا کہ ان تینوں افراد کا تعلق شابو سے صرف جوئے کی حد تک تھا ورنہ وہ خاموش نہ رہتے۔ شابو کا گرگا صرف وہی معلوم ہوتا تھا جس نے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھولا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر پہلوان کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ اس نے چاقو نہیں اٹھایا۔

میں نے شابو کو کہنیوں کے بل اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا پھر وہ میری طرف پلٹا تو اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

"شابو! ابھی اور لڑنا ہے کہ مجھ سے صلح کرنے پر راضی ہو؟" میں نے دانستہ اسے نرمی سے مخاطب کیا۔

اس نے اپنی آستین سے خون صاف کیا پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "میں سمجھ گیا' تم کوئی بہت اونچی چیز ہوں میں تم سے صلح کرنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر گویا اس نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا تھا۔ وہ یقیناً یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ میں اس کے قابو میں آنے والی نہیں ہوں۔

میں اب یہ جھگڑا ختم کرنا چاہتی تھی اسی لئے صلح کی پیشکش کی تھی۔

"بھئی لڑکی! تم نے کمال کر دیا۔ آج تک ایسے پینترے نہیں دیکھے۔ جی خوش ہو گیا۔" پہلوان نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"واہ پہلوان! اپنا کچومر نکل گیا اور تم خوش ہو رہے ہو۔" شابو دھیرے سے ہنس کر بولا۔ اسی وقت اس کی نظر اپنے بے ہوش گرگے پر پڑی۔ "اسے کیا ہوا؟"

میں نے پہلوان کو جو کچھ بتایا تھا' وہی اس نے ہنستے ہوئے شابو کو بتا دیا۔

"یار! ذرا اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لاؤ تاکہ اپنی مہمان کی کچھ خاطر مدارات کر سکوں۔" شابو نے دونوں جواریوں میں اسے ایک کو مخاطب کیا۔

"ہاں استاد شابو! صلح کی خوشی میں ملائی کے لڈو منگوا لو۔" پہلوان نے مشورہ دیا۔

دونوں جواری' شابو کے گرگے ننھے کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ شابو مجھے اور شہزاد کو ساتھ لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھا۔ پہلوان ہمارے پیچھے پیچھے تھا۔

"دراصل اس حمید کے لونڈے نے مجھے مروا دیا۔" شابو نے مجھ سے کہا۔ "زبردستی مجھے پچیس روپے تھما گیا تھا۔" شابو اب ہمیں لئے اپنے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ وہاں زمین پر ایک میلا سا موٹا گدا بچھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے بیٹھنے کو کہا' پھر خود بھی بیٹھ گیا۔

"شابو! یہاں مرہم پٹی وغیرہ کے لئے کچھ ہے؟" میں نے اس کے ہونٹ سے خون رستے دیکھ کر معلوم کیا۔

"ہاں ادھر ٹین کی ایک صندوقچی پڑی ہے۔ ذرا اٹھانا پہلوان! وہ ادھر۔" شابو نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "بند چوٹیں زیادہ لگی ہیں۔ خون تو بس ہونٹ پھٹنے سے نکل آیا ہے۔"

"معاف کر دینا شابو! خواہ مخواہ بات بڑھ گئی اور تمہیں.........."

"ارے نہیں' اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں' غلطی میری ہی تھی۔" شابو بولا۔ "نہ میں تم سے دون کی لیتا' نہ میرا یہ حشر ہوتا۔"

اسی دوران میں پہلوان ٹین کی صندوقچی اٹھالایا۔ اس کے اندر ایک شیشی میں کوئی مرہم تھا جو شابو نے اپنے پھٹے ہوئے ہونٹ پر لگالیا۔ پھر ایک اور شیشی سے کوئی اور مرہم نکال کر اس نے اپنی پنڈلی متورم جبڑے اور جسم کے مضروب حصوں پر لگالیا۔ چوٹوں پر مرہم لگاتے ہوئے اس کے منہ سے کراہیں نکلتی رہی تھیں۔ واقعی اسے خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ اس کی جگہ اگر کوئی دوسرا کمزور شخص ہوتا تو اٹھ کر نہ بیٹھ سکتا۔

"وہ میں تمہارا نام بھول گیا۔" شابو نے اپنی کلائی پر مرہم لگانے کے بعد آستین نیچے سرکاتے ہوئے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"رانی!" میں نے بتایا۔ پھر اس سے پوچھا۔ "وہ تمہیں حمید کے بیٹے نے کس لئے روپے دیئے تھے؟"

"تمہارا یہی حشر بنانے کے لئے جو تم نے میرا بنایا ہے۔" شابو نے جواب دیا۔ "میں بھی اتنا بے وقوف ہوں جو یہ بھول گیا کہ تم مجھے اس رات بے ہوش کر کے فرار ہوئی تھیں۔ اسی سے مجھے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ہاتھیوں سے گنے نہیں کھانا چاہئیں۔"

شابو کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ اس کا گرگا' ننھے' کمرے کے دروازے میں نظر آیا۔

"ادھر آ!" شابو نے اسے بلایا۔ "بھاگ کر جا نجے کی دکان پر اس وقت گرم گرم جلیبیاں بن رہی ہوں گی' سیر بھر جلیبیاں لے آ۔"

ننھے مجھے حیرت سے دیکھتا ہوا پلٹ کر چلا گیا تو وہ دونوں افراد کمرے میں آ گئے جو وہاں میرے آنے سے پہلے برابر والے کمرے میں غالباً جوا کھیل رہے تھے۔

"کیا ارادے ہیں پہلوان! پھر جمے گی ابھی کہ رکھ دوں پتے؟" ان میں سے ایک نے پہلوان کو مخاطب کیا۔

"پھر کیوں نہیں جمے گی' بس ذرا جلیبیاں آ لینے دو۔ ابے ہاں' وہ تم دونوں نے میرے پتے تو نہیں سمیٹ لئے؟"

"اگر ایسا ہی ہے پہلوان تو دوبارہ پتے بانٹ لیں گے' نیت پر تو شک نہ کرو۔"

ان لوگوں کی نوک جھونک جاری رہی۔ شابو مجھ سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں؟ ظاہر ہے' میں اس کے سوالوں کے گول مول جواب دیتی رہی۔

تعلق میں نے بمبئی سے ظاہر کیا تھا۔ راجہ استاد کی طرح شابو کوئی بڑا گردہ بند قسم کا غنڈہ نہیں تھا جس نے بمبئی کی رانی کا نام سنا ہوتا۔ ہاں میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ بمبئی کے ذکر سے کچھ مرعوب سا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی ننھے جلیبیاں لے آیا۔ سب نے ایک ہی دونے میں جلیبیاں کھائیں۔ پہلوان نے کچھ زیادہ ہی لمبے لمبے ہاتھ مارے تھے۔

"اچھا شابو! میں اب چلتی ہوں ایک بار پھر میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو رانی! ارے یہ تو تمہاری بڑائی ہے کہ میرے ہاتھ پیر نہیں توڑے ورنہ تمہاری جگہ میں ہوتا تو ہرگز اتنی شرافت نہ دکھاتا۔" پھر وہ بھی اٹھنے لگا۔

"نہیں' تم بیٹھو' بلکہ آرام کرو۔ میں خود چلی جاؤں گی' تکلیف کی ضرورت نہیں۔" میں نے شہزاد کو چلنے کا اشارہ کیا جو میرے ہی ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"یار! تم بھی مجھے معاف کر دینا۔" شابو نے شہزاد سے کہا۔ "تمہیں میں نے خواہ مخواہ دھمکیاں دیں۔"

"ارے نہیں شابو! اس میں تمہاری غلطی نہیں' یہ تو اس مجید کمینے کی بدمعاشی ہے۔" شہزاد بولا۔

"تم کہو تو دو چار ہاتھ جڑ دوں اس کے۔" شابو کہنے لگا۔ وہ شہزاد ہی سے مخاطب تھا۔

"نہیں شابو!" میں نے منع کر دیا۔ "میں خود ابھی ادھر جا رہی ہوں' اسے سمجھا دوں گی۔"

اس کے بعد شہزاد کو ساتھ لئے میں' شابو کے اڈے سے باہر آ گئی۔ باہر آتے ہی شہزاد نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا واقعی چچا حمید کی طرف چلنے کا ارادہ ہے خاتون!"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس خبیث بڈھے سے مجھے یہ بھی تو پوچھنا ہے کہ تمہارے والد سے اس نے میرے بارے میں کیا کیا لگائی بجھائی کی ہے۔ پھر اس کے بیٹے کی خبر لینا ہے جس نے مجھے پٹوانے کے لئے شابو کو روپے دیئے تھے۔ تمہیں بھی تو وہ دھمکی دے کر گیا تھا۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے خاتون! مگر چچا حمید میرے ابا جی کے بچپن کے دوست ہیں۔ خواہ مخواہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

"کچھ نہیں ہو گا' تم چلو۔" میں بولی' پھر اس سے پوچھا۔ "وہ تم نے ان کے گھر سے سامان اٹھوا لیا؟"

"اس جھگڑے کی وجہ سے ابھی نہیں اٹھوا سکا۔" شہزاد نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جواب دیا۔

"خیر' اب اٹھوا لینا' سامان بہرحال وہاں چھوڑنا نہیں ہے۔"

وہاں سے وہ گھر زیادہ دور نہیں تھا جہاں میں پوری ایک رات بھی نہیں گزار سکی تھی جلد ہی ہم وہاں پہنچ گئے۔ نیچے کوئی کال بیل نہیں تھی اس لئے شہزاد نے بلند آواز میں "چچا حمید" کی ہانک لگائی۔ کچھ دیر بعد اوپر سے کسی نے جھانک کر دیکھا۔ وہ اسی بڈھے کا نوجوان بیٹا مجید تھا۔

"آیا ابھی۔" مجید نے جواب دیا۔

"وہ نیچے آ جائے تو اس سے میرے بارے میں کہنا کہ یہ چچا کو دیکھنے آئی ہیں۔" میں نے شہزاد سے کہا۔

"جی خاتون!" شہزاد حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"جو کہہ رہی ہوں' وہی کرنا۔" میں نے اسے تاکید کی۔

اتنے میں مجید دھم دھم کرتا ہوا زینے سے اترا اور مجھے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم کیوں آئی ہو یہاں؟"

"شہزاد! انہیں بتاؤ کہ میں کیوں آئی ہوں۔"

"یہ چچا حمید کی عیادت کرنے آئی ہیں۔" شہزاد بول اٹھا۔

"عیادت کرنے یا زخموں پر نمک چھڑکنے۔ میں انہیں ہرگز اپنے گھر میں نہیں گھسنے دوں گا۔" وہ اینٹھ گیا۔ "ان جیسی آوارہ عورتوں کا میرے گھر میں کیا کام۔"

مجھے اس کے یوں اینٹھنے اور اپنے متعلق ناشائستہ الفاظ سن کر غصہ تو بہت آیا مگر مصلحتاً نظرانداز کر گئی اور قدرے پُرسکون آواز میں اس سے بولی۔ "تمہی تو شہزاد سے میرا پتا معلوم کر رہے تھے' اب میں خود چل کر تمہارے گھر تک آ گئی ہوں تو اوپر اپنے والد کی عیادت کو بھی نہیں جانے دے رہے۔"

"میرا گھر ہے' میری مرضی' تم کون ہو مجھ سے جواب طلب کرنے والی؟ نہیں جانے دیتا میں تمہیں اوپر۔"

"خیر تم مجھے اوپر جانے سے تو نہیں روک سکتے۔"

"اچھا تو آگے قدم بڑھا کے دکھاؤ ذرا۔" وہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اچانک اسے ایک طرف دھکا دیا اور اچھل کر زینے پر چڑھ گئی۔ وہ گرتے گرتے سنبھلا اور میرے پیچھے بھاگا۔ میں اسے دانستہ چڑانے کے لئے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئی اور اس کی طرف مڑ کر بولی۔ "بس روک لیا مجھے؟"

شہزاد بھی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ میرے چڑانے پر مجید آپے سے باہر ہو کر چیخ اٹھا۔ "ابھی تیری ٹانگ پکڑ کر تجھے نیچے گھسیٹتا ہوں۔"

"کیوں ڈرا رہے ہو مجھے۔" میں ہنس پڑی اور پھر اس کے گھر میں داخل ہو گئی۔

سامنے ہی چھوٹی سی راہداری تھی۔ اسے عبور کر کے میں مختصر سے صحن میں پہنچ گئی۔ صحن کے با ایک کمرے کا دروازہ کھلا نظر آ رہا تھا۔ دائیں جانب بھی کچھ فاصلے پر ایک کمرہ تھا۔ میں صحن سے گزر کمرے میں داخل ہو رہی تھی کہ بائیں جانب سے ایک نسوانی آواز آئی۔ "کون ہیں آپ' کس سے ہے؟"

میں نے ادھر مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک نوخیز و نوجوان لڑکی تھی۔ اس کے جسم پر نئی دلہنوں جیسا لبا تھا۔ وہ مجید کی نوبیاہتا بیوی ہی ہو سکتی تھی۔ شہزاد سے مجھے معلوم ہی ہو چکا تھا کہ مجید کی شادی کو ا

زیادہ دن نہیں ہوئے۔ میں اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ پیچھے سے مجید لپکتا ہوا پہنچ گیا۔

مجید کو دیکھتے ہی میں جھپٹ کر اندر کمرے میں گھس گئی۔ سامنے دیوار کے قریب بچھے ہوئے پلنگ پر میں نے مجید کے باپ حمید کو لیٹے دیکھ لیا تھا۔ مجید بھی میرے پیچھے پیچھے ہی کمرے میں آ گیا اور سخت لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شرافت کے ساتھ نکل جا میرے گھر سے ورنہ تیرا بڑا برا حشر کروں گا۔"

"ارے مجھے تو یہ وہی حرافہ لگتی ہے۔" بوڑھا کراہتے ہوئے چیخا۔

"ہاں ابا! یہ وہی ہے' زبردستی گھر میں گھس آئی ہے۔" مجید نے بتایا اور میری طرف بڑھنے لگا۔

"تو کیا دیکھ رہا ہے' جلدی سے بھاگ کے جا اور شابو کو بلا لا۔ یہ تیرے بس میں نہیں آنے کی۔"

"بس میں کیسے نہیں آئے گی ابا! میں ابھی اسے چوہیا کی طرح پکڑے لیتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ میری طرف جھپٹا۔

میں دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ جیسے ہی میرے قریب آیا' میں تیزی سے اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ نتیجتاً وہ دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کا سر دیوار سے لگا تھا۔ وہ جھنجلا کر پلٹا اور دوبارہ مجھ پر لپکا۔ اس مرتبہ میں نے اڑی مار کر اسے گرا دیا۔

"تجھ سے کہہ رہا ہوں میں کہ جا کر شابو کو لے آ یہاں' مگر تُو مان ہی نہیں رہا۔" بوڑھا ایک بار پھر چیخ اٹھا۔

چند ہی لمحے بعد مجید اپنے بائیں ہاتھ سے داہنی کہنی سہلاتا ہوا اٹھا اور مجھے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔

"ابا کے حکم پر شابو کو بلانے جا رہا ہوں ورنہ تو میں ہی تیرے لئے کافی تھا۔"

"تجھے یہاں سے جانے کون دے گا اور تجھے اپنے اس بیمار باپ کا خیال نہیں؟ اسے میرے رحم و کرم پر چھوڑے جا رہا ہے' تیرے پیچھے اگر میں نے اس کا کچومر نکال دیا تو؟"

میری بات سن کر مجید کے چہرے سے تذبذب اور الجھن کا اظہار ہونے لگا۔ اسی وقت میں نے شہزاد کو کمرے میں آتے دیکھا۔ شاید اس گھر میں شہزاد کا پردہ نہیں تھا ورنہ وہ یوں اندر نہ آ گیا ہوتا۔ شہزاد پر نظر پڑتے ہی حمید پھر چیخ اٹھا۔ "شہزاد! یہ سارا عذاب میرے گھر میں تُو نے ہی بویا ہے۔ آنے دے اب کے ارشد علی کو' ابھی سے تیری شکایت کروں گا۔"

"لیکن چچا! یہ تو آپ کی عیادت کرنے آئی تھیں۔ مجید تو بلا سبب ان سے جھگڑنے لگا تھا۔" شہزاد نے میرا پڑھایا ہوا سبق دہرایا۔

"اس عورت سے میری کون سی رشتے داری ہے جو یہ میری عیادت کرنے آئی ہے؟ تم اسے لے کر ہی کیوں آئے ہو میرے گھر؟" بوڑھا ٹرایا۔

"میں لے کر آئی ہوں شہزاد کو' سمجھے بڑے میاں!" میں بول اٹھی۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے شہزاد کے والد سے میرے بارے میں کیا کیا کہا ہے؟"

"کیوں بتاؤں تمہیں' کیا کہا ہے۔ دھونس ہے کوئی تمہاری مجھ پر۔" بوڑھے نے منہ بنا کر جواب

دیا۔

"اپنی حرکتوں کے نتیجے میں زخمی پڑے ہو بستر پر' پھر بھی ٹرانے سے باز نہیں آ رہے۔ کیوں مہ ہاتھوں اپنی بے عزتی کرانا چاہتے ہو بڈھے!"

"اے' تُو میرے سامنے ابا کو دھمکیاں دے رہی ہے۔ تجھے بتاؤں ابھی۔" مجید نے کسی بندر طرح مجھے بھبکی دی۔

"تُو مجھے کیا بتائے گا' میں تجھے بتاتی ہوں۔" میں نے لپک کر اس کی کلائی پکڑ لی اور پھر ا مروڑنے میں بھی دیر نہیں کی' مگر زیادہ دباؤ نہیں ڈالا۔ وہ اتنے ہی میں چیخنے چلانے لگا تھا۔ کلائی مڑنے وجہ سے اس کی پشت میری طرف ہو گئی تھی۔ "بول' توڑ دوں تیرا ہاتھ؟ اتنی دیر سے بک بک کئے جا ہے۔"

"اسے چھوڑ دے .... چھوڑ دے اسے خدا کے لئے۔" بوڑھا چلایا۔ "اس کا ہاتھ ٹوٹ جا گا۔"

مجید بھی اپنی کلائی چھڑانے کے لئے زور لگا رہا تھا' مگر ظاہر ہے میری گرفت سے کلائی چھڑا لینا ا کے بس کی بات نہیں تھی۔

"میں ایک شرط پر اس کی کلائی چھوڑ سکتی ہوں کہ تم نے جو کچھ شہزاد کے والد سے میرے متعلق کہا ہے' سچ سچ بتا دو۔" میں نے بوڑھے سے کہا۔

"تُو اسے چھوڑ دے' مجھے تیری ہر شرط منظور ہے۔" بوڑھا میری بات مان گیا۔

میں نے ذرا سا جھٹکا دے کر مجید کی کلائی چھوڑ دی' پھر اس سے بولی۔ "مجھے اس غنڈے شابو سے پٹوانے کے لئے تُو نے اسے روپے دیئے تھے' بزدل کہیں کے۔"

مجید میری طرف مڑا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کی ساری اکڑ ذرا سی دیر میں نکل گئی تھی۔ پلنگ کے قریب ہی سرہانے ایک کرسی پڑی ہوئی تھی' میں اس پر بیٹھ گئی۔ بوڑھا مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"دیکھو بڑے میاں! میں تمہیں مزید تکلیف دینا نہیں چاہتی کیونکہ تم پہلے ہی سے زخمی ہو۔" میں نے نرمی کے ساتھ بوڑھے کو مخاطب کیا۔ "میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم نے شہزاد کے والد کو میری طرف سے جس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے' وہ ختم ہو جائے' چلو میں تم سے یہ بھی نہیں پوچھتی کہ تم نے ان سے کیا کہا ہے۔"

"لیکن یہ غلط فہمی دور کیسے ہو سکتی ہے' اس وقت؟" بوڑھا بولا۔ "ارشد علی یہاں ہوتا تو بات ہو جاتی۔"

"تو کیا ہوا' انہیں شہزاد بلا کر لے آئے گا یہاں۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"نن .... نہیں' میں خود ارشد علی سے کہہ دوں گا کہ .... کہ تمہارے بارے میں جو کچھ کہا تھا' وہ .... وہ قطعی جھوٹ تھا۔ اسے یہاں بلانے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم نے غلط فہمی دور کر دی ہے؟"

"میں جو کہہ رہا ہوں تم سے۔ میری بات پر یقین کر لو۔ میں تم سے جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا۔"

"چچا کی بات مان لیں خاتون!" شہزاد نے بھی بوڑھے کی سفارش کی۔

"تم کہتے ہو تو مانے لیتی ہوں۔" میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور شہزاد سے بولی۔ "تو پھر چلو۔"

اسی وقت نیچے سے کسی نے بوڑھے کو نام لے کر پکارا تو شہزاد بول اٹھا۔ "ارے یہ تو ابا جی کی آواز رہی ہے۔ وہ شاید مغرب کی نماز پڑھ کر ادھر ہی نکل آئے ہیں' چچا کو دیکھنے۔"

مجید کمرے سے نکل گیا۔ وہ شہزاد کے والد کی آواز سنتے ہی دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں نے ڑھے حمید کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار دیکھے۔ اس وقت شہزاد کے باپ کی آمد ہی سے شاید وہ گھبرا یا تھا۔ اس کی گھبراہٹ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ میرے متعلق اس نے ارشد علی سے خاصی بکواس کی ہے۔

کچھ ہی دیر کے بعد شہزاد کا باپ ارشد علی بھی اوپر آ گیا۔ اسے غالباً میری وہاں موجودگی کے بارے ں مجید نے بتانے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس کے چہرے سے یہی ظاہر تھا۔ میں نے اسے سلام کیا تو وہ ھے سلام کا جواب دے کر حیرت سے دیکھنے لگا۔ مجھ سے تو اس نے کچھ نہیں پوچھا البتہ شہزاد سے بولا۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں .... میں دراصل رانی صاحبہ کو یہاں لے کر آیا تھا۔" شہزاد نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

"کس لئے؟" ارشد علی نے سوال کیا۔

"میں نے ہی شہزاد سے کہا تھا۔" شہزاد کے بجائے میں بول اٹھی۔ "میں چچا میاں کی عیادت کرنا چاہتی تھی اسی لئے یہاں آئی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ غلط فہمیاں بھی دور کرنا تھیں۔"

"کیسی غلط فہمیاں؟ میں سمجھا نہیں۔"

"یہ تو چچا میاں ہی آپ کو بتائیں گے۔" میں نے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے بھئی حمید! تمہی بتا دو۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔" ارشد علی نے بوڑھے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بب .... بات کیا .... کیا ہوتی۔" بوڑھا ہکلانے لگا۔ "دراصل تم سے میں نے ان کے بارے میں جو کچھ کہا تھا' وہ .... وہ غلط تھا۔" بوڑھا یہ کہہ کر ارشد علی سے نظریں چرانے لگا۔

"چچا میاں نے بھولے سے جو غلط فہمی پیدا کر دی تھی' میں وہی دور کرانا چاہتی تھی۔ اب مجھے چچا میاں سے کوئی شکایت نہیں رہی۔" میں نے ارشد علی سے کہا' پھر بوڑھے سے بولی۔ "اچھا چچا میاں! آپ کا بہت بہت شکریہ' میں چلتی ہوں۔"

پھر نہ میں خود وہاں رکی نہ بوڑھے یا اس کے بیٹے نے مجھے روکا۔ شہزاد میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں بوڑھے کے گھر سے نیچے اتر آئی۔

"اب خاتون! آپ کھانا کھا کر ہی جائیں گی' کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔" شہزاد نے میرے ساتھ

ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تم یہ سمجھ رہے تھے کہ میں کھانا کھائے بغیر ہی ٹل جاؤں گی؟" میں ہنس کر بولی۔

"ویسے اس وقت ابا جی کا آنا بہت اچھا ہوا۔ چچا حمید کو آپ کی وہاں موجودگی کے سبب چپ ہونا پڑا۔"

"ہاں یہ اچھا ہی ہو ورنہ تمہارے والد خواہ مخواہ میری طرف سے غلط فہمی میں مبتلا رہتے۔" میں نے بھی شہزاد کی تائید کی۔

شہزاد کے ساتھ میں اس کے گھر پہنچی تو سنبل میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کہنے لگی۔ "آپ نے بڑی دیر لگا دی آنے میں' کباب ٹھنڈے ہو گئے۔"

"کیسے کباب؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل آج مسور کی اور دال چاول پکے تھے۔ بھائی صاحب کو بھیج کر میں نے اسی لئے کباب منگوائے تھے۔ یہاں جامع مسجد پر بڑے اچھے کباب بنتے ہیں۔" وہ بولی۔

"تو تم نے یہ بھی فرض کر لیا تھا کہ میں کھانا کر جاؤں گی۔"

"ظاہر ہے' کھانے کے وقت بھوکی کیسے جا سکتی ہیں۔ آپ بیٹھئے' میں کباب گرم کر کے لاتی ہوں ابھی۔" سنبل مجھے دالان میں اپنی ماں کے پاس بٹھا کر باورچی خانے کی طرف لپک گئی۔

شہزاد نے بھی میرے ہی ساتھ کھانا کھایا۔ سنبل اپنی ماں کے ساتھ پہلے ہی کھانا کھا چکی تھی' پھر میرے اصرار پر اس نے دو ایک لقمے لے ہی لئے۔ کھانا کھا کے جب میں چائے پی رہی تھی تو شہزاد کا باپ بھی کوچہ چیلان سے لوٹ آیا۔ جو بات اس کی بیوی نے مجھ سے کی تھی' وہی اس نے بھی چھیڑ دی' یعنی کہ میں نے چچا حمید کا مکان کرائے پر کیوں لیا تھا؟ جس طرح میں نے بات بنا کر شہزاد کی ماں کو مطمئن کیا تھا' ارشد علی کو بھی کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دیا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ تم جب تک دلی میں ہو' ہمارے ہی گھر رہو" ارشد علی پُرخلوص لہجے میں مجھ سے کہنے لگا۔ "ویسے تم رہ کہاں رہی ہو آج کل؟"

"وہیں اپنے عزیزوں کے پاس' پہاڑ گنج میں۔ میں تو بہت چاہتی ہوں کہ ان لوگوں پر بوجھ نہ بنوں مگر وہ کہیں اور رہنے ہی نہیں دیتے۔ میں نے اسی لئے چچا میاں والا مکان بھی پہلے سے کرائے لے لیا تھا مگر بات نہیں بنی۔ وجہ معلوم ہی ہے آپ کو۔"

"بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہے اور کوئی بات نہیں۔ اگر اس نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے تو میں اس کی طرف سے........"

"نہیں۔" میں نے ارشد علی کی بات کاٹ دی۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔"

ارشد علی سے بات کرنے کے دوران چائے ختم ہو چکی تھی۔ رات کا کھانا کھا کے یوں بھی میں ٹہلنے کی عادی تھی اس لئے چائے پیتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شہزاد بھی میرے ساتھ ساتھ ہی اٹھا تھا میں' سنبل سے مل کر شہزاد کے ساتھ گھر سے نکل آئی۔ اب میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ شہزاد کا

ے رویہ سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ اس کا دل ابھی میری طرف سے صاف ہو چکا تھا۔ جو غلط حمید نے پیدا کر دی تھی' دور ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ شابو کی طرف سے بھی اب شہزاد کو کوئی خطرہ ں رہا تھا۔

پہاڑ گنج کے لئے مجھے بازار مٹیا محل ہی سے ایک تانگہ مل گیا۔ میں نے شہزاد کو وہیں سے رخصت کر مجھے گھر پہنچنے کی کوئی ایسی زیادہ جلدی نہیں تھی اس لئے ٹیکسی کے ذریعے سفر کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ گزشتہ رات سے ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی' مگر اس پر غور کرنے یا کسی نتیجے تک نے کا ابھی تک مجھے موقع نہیں ملا تھا۔ اس وقت بھی تانگے میں تنہا سفر کرتے ہوئے پھر مجھے وہی بات یاد ی۔ رات کو چمپا نے اپنی مدد کے لئے بڑے مہاراج چندر موہن کو پکارا تھا۔ اس سے میرے ذہن میں بار یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ کیا چندر موہن بھی کلکتے سے دہلی پہنچ چکا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اسے نے کیوں پکارا تھا؟ یا پھر چندر موہن اتنی زبردست شیطانی قوتوں کا مالک ہے کہ کلکتے میں موجود رہتے بھی دہلی میں وہ اپنی دست راست کی مدد کر سکتا ہے؟ پُراسرار قوتوں کے سلسلے میں فاصلے کچھ اہمیت نہیں تے' اس کا عملی تجربہ خود مجھے بھی تھا۔ عظیم مہین کی نیک روح کا مسکن بلند پہاڑوں میں تھا' اس کے جود وہ میری طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ساحر زعیم نے بھی دور رہ کر کئی مرتبہ مجھ پر اپنی رانہ قوتیں آزمائی تھیں۔ تمام راستے ان باتوں پر غور کرنے کے باوجود بھی میں کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ ۔ چندر موہن کلکتے سے دہلی بھی آ سکتا تھا اور شاید کلکتے ہی میں رہ کر بھی اپنی داسی کی مدد کر سکتا تھا۔ نوں ہی باتیں قرین قیاس تھیں۔ بس اتنا تھا کہ چندر موہن یعنی بڑے مہاراج کی دہلی میں موجودگی سے رے لئے خطرہ مزید بڑھ جاتا۔ اس کی دست راست چمپا دہلی میں تھی' میرا دشمن ژیان بھی اسی شہر میں ا اور وہ بھی شیطانی قوتوں کا مالک تھا' ایسے میں اگر خود وہ بھی یہاں آ جاتا تو یہ امکان تھا کہ میں بیک ت کئی طرف سے خطرے میں گھر جاتی۔

تانگہ جب پہاڑ گنج کی حدود میں داخل ہوا تو میں چونکی اور پھر تانگے والے کی رہنمائی کرنے لگی کہ دھر چلنا ہے۔

وہ رات خلاف توقع سکون سے گزر گئی۔ میرے خیال میں اس کی وجہ گزشتہ شب پیش آنے والا اقعہ ہی ہو سکتا تھا۔ نارنجی رنگ کی شعاعوں نے چمپا کو شاید وقتی طور پر اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ یرے خلاف اپنی کوئی پُراسرار شیطانی قوت استعمال کر سکے۔ اس سے میں نے کچھ اطمینان سا محسوس کیا۔ عارضی اطمینان و سکون بھی میرے لئے بہت تھا۔ اس رات خاصے عرصے کے بعد میں گہری اور پُرسکون ند سوئی تھی۔

☆======☆======☆

دوپہر کو کھانے سے کچھ پہلے شہزاد مجھ سے ملنے آیا۔ شام کو کیونکہ سالار اکبر سے میری ملاقات متوقع تھی اس لئے شہزاد کو پہلے ہی میں نے رخصت کر دیا تھا۔

اسی روز شام کو چار بجے کے بعد مجھے سالار اکبر کا ایک تحریری پیغام سمیع اللہ کے ذریعے ملا۔ پیغام

کے مطابق صورت حال بدستور تھی' اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسی سبب سالار اکبر سے آج میری ملاقات ضروری نہیں تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ آئندہ روز شام کو مقررہ وقت پر ملنے آئے گا۔ وقت میں تبدیلی ہوئی تو مجھے آگاہ کر دیا جائے گا۔ ژیان کے سلسلے میں سالار اکبر نے مجھ سے تین روز کی مہلت طلب کی تھی۔ یہ بات گزشتہ دن کی تھی۔ یوں گویا اگلے روز تین دن پورے ہونے والے تھے۔ میں اپنے دشمن ژیان سے نمٹنے کے لئے بے چین تھی' مگر بقول سالار اکبر' جلدبازی سے گریز کرنا تھی۔ میں نے اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا کہ ژیان دہلی میں اپنے گرد حلقہ تنگ ہوتے دیکھ کر یہاں سے راہ فرار بھی اختیار کر سکتا تھا۔ تنظیم میرے ساتھ تعاون کر رہی تھی' اس سے کم از کم بہرحال تھا کہ ژیان کی نقل و حرکت پر براہ راست نہ سہی بالواسطہ میری نظر تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ دہلی سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔

رات کو نو بجے مجھے ولیم رائٹ سے ملنا تھا۔ اس نے مجھے ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ دلاری کو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ رات کا کھانا باہر کھاؤں گی۔ آٹھ بجے سے پہلے ہی میں جانے کے لئے لباس تبدیل کر کے تیار ہو گئی' پھر گھر سے نکلنے میں دیر نہیں کی۔

مطلوبہ فائیو اسٹار ہوٹل تک ٹیکسی کے ذریعے میں نو بجے سے کچھ پہلے پہنچ گئی۔ میرا خیال تھا کہ ولیم ابھی نہیں آیا ہو گا' مگر ایسا نہیں تھا۔ ہوٹل کے ہال میں وہ ایک میز پر موجود تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی جب میں نے اطراف کا جائزہ لیا تھا تو مجھے ولیم ایک میز پر نظر آ گیا تھا۔ ولیم کی نظریں ہال کے دروازے ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جیسے وہ میری ہی آمد کا منتظر ہو۔ میں سمجھی تھی کہ ولیم اپنی میز پر تنہا ہو گا' مگر اس کے ساتھ مجھے ایک اور انگریز نوجوان بیٹھا دکھائی دیا۔ ولیم کی میز کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ولیم نے اس انگریز نوجوان کو میری طرف متوجہ کر کے کچھ کہا ہو۔ ابھی میں اس کی میز تک پہنچی نہیں تھی کہ اچانک وہ انگریز نوجوان اٹھا اور پھر میرے قریب سے گزرتا ہوا ہال کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں دانستہ اسے نظرانداز کرتی ہوئی ولیم کی میز تک پہنچ گئی۔

ولیم مجھے قریب دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ "کم آن مس گریٹا! گڈ نائٹ۔" ولیم نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے میرا استقبال کیا۔

"گڈ نائٹ مسٹر ولیم!" میں بھی جواباً مسکرائی اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "میں شاید وقت سے کچھ پہلے ہی آ گئی۔"

"اور میں بھی۔" وہ دھیرے سے ہنسا' پھر کہنے لگا۔ "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بے چین تھے' ہے نا؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"شاید۔" میں اس سے انگریزی ہی میں بات کر رہی تھی۔

"آپ ڈرنک کیوں نہیں کرتیں مس گریٹا!" ولیم نے میز پر رکھا ہوا مینو اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ شاید اس گریز کا سبب شراب سے آنے والی بو ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تو آپ کی موجودگی میں مجھے بھی ڈرنک سے اجتناب کرنا چاہئے تاکہ آپ کو شراب کی بو ناگوار ہو۔" وہ بولا۔

"نہیں' میری وجہ سے آپ کیوں تکلف کریں۔ آپ چاہیں تو ڈرنک کر سکتے ہیں۔ میں برداشت کر لیتی ہوں۔ پرسوں جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی اس وقت بھی تو آپ اور مس الزبتھ ڈرنک ہی کر رہے تھے۔ کیا آپ نے میری ناگواری محسوس کی تھی؟"

"اس وقت تو خیر مجھے معلوم ہی نہیں تھا لیکن اب تو آپ بتا چکی ہیں۔ ایسی صورت میں میرا ڈرنک کرنا غیراخلاقی حرکت ہو گی۔"

"اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ آپ کے مہذب اور شائستہ مزاج ہونے کی دلیل ہے۔ بہرحال میری طرف سے آپ پر کوئی پابندی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے مجھے ایک اور خیال آ گیا اور میں بولی۔ "ضروری نہیں مسٹر ولیم کہ آدمی اپنے لئے جس چیز کو ناپسند کرے یا جس چیز کا اسے شوق نہ ہو' دوسروں کو بھی اس سے روک دے۔ مثلاً مجھے رقص سے بھی کوئی دلچسپی نہیں' نہ میں رقص سے ناواقف ہوں لیکن کسی کو رقص کرنے سے روکتی نہیں۔"

"کیا.......... کیا آپ کو رقص کرنا نہیں آتا؟" ولیم نے انتہائی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے لہجے سے بے یقینی ظاہر ہو رہی تھی پھر اس نے اپنی بے یقینی کا اظہار کر ہی دیا۔ "یہ کس طرح ہو سکتا ہے مس گریٹا! آپ شاید مذاق کر رہی ہیں۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔

"یہ مذاق نہیں حقیقت ہے مسٹر ولیم! کیا آپ بھول گئے کہ پرسوں رات بھی جب آپ نے مجھے رقص کی دعوت دی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"اس وقت تو میں انکار کی وجہ یہ سمجھا تھا کہ شاید آپ اور مسٹر فلپ کچھ دیر خلوت میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے انکار پر شاید میں نے ایسی ہی کوئی بات کہی بھی تھی۔"

"سوری مسٹر ولیم کہ آپ نے ایک ایسی عورت کو آج ڈنر پر مدعو کر لیا جو نہ تو ڈرنک کرتی ہے' نہ اسے رقص کرنا آتا ہے۔"

"اوہ نو!" وہ خوش مزاجی سے بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر مجھے بے انتہائی خوشی ہو رہی ہے۔" پھر اس نے میری طرف مینو بڑھا دیا۔ "آپ جو ڈنر میں لینا چاہیں' منتخب کر لیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے مینو لے لیا تو اس نے ایک ویٹر کو اشارے سے قریب بلا لیا۔ مینو پر ایک نظر ڈال کر میں نے ویٹر کو کھانے کا آرڈر دے دیا۔ ولیم پہلے ہی مینو دیکھ چکا تھا۔ اس نے بھی اپنا آرڈر بتا دیا اور ویٹر چلا گیا۔ کھانے کے ساتھ اس نے اپنے لئے شراب کا آرڈر نہیں دیا تھا۔

"آپ کا قیام کہاں ہے مس گریٹا!" ولیم نے دریافت کیا۔

اس سوال کے لئے ذہنی طور پر میں پہلے ہی سے تیار تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ولیم یہ سوال ضرور کرے گا۔ میں نے اسی لئے بلاجھجک جواب دیا۔ "میں پرانی دہلی میں اپنے ایک مسلمان بوائے فرینڈ کے

یہاں ٹھہری ہوئی ہوں۔"

"تو کیا آپ کہیں کسی اور شہر سے یہاں آئی ہیں؟" ولیم کے لہجے میں یہ پوچھتے ہوئے حیرت تھی۔

"جی ہیں مسٹر ولیم! میں اس شہر کی رہنے والی نہیں ہوں۔ میں یہاں کلکتے سے آئی ہوں۔" میں نے بتایا۔

"یہاں گھومنے پھرنے آئی ہوں گی۔" ولیم کا انداز تصدیق طلب تھا۔

"جی' اسی غرض سے آئی تھی۔"

"آپ کلکتے کی رہنے والی ہیں تو پھر مسٹر فلپ سے وہیں آپ ملی ہوں گی۔ مسٹر فلپ کی پوسٹنگ وہیں تھی۔" ولیم بولا۔

"جی مجھے معلوم ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

اسی وقت میری نگاہ سامنے سے آتے ہوئے ایک دراز قد شخص پر پڑی اور میں چونک اٹھی۔ وہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ خطرہ' میرے ذہن نے گردان کی۔ اس دراز قد شخص نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ میری ہی طرح وہ بھی میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی چونکا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے چہرے کے تاثرات سے ہوا تھا۔ میرے نزدیک اس شخص کی وہاں موجودگی خالی ازعلت نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ وہی تھا جس سے بمبئی کی رانی کی ٹھنی ہوئی تھی۔ اس کا نام وکٹر تھا۔ ایک مرتبہ یہی شخص' رانی کے دھوکے میں میرے ہوٹل کے کمرے میں گھس آیا تھا۔ رانی اور اس کے درمیان کسی نواب کے ہیروں پر جھگڑا تھا۔ میں نے بمشکل خود کو اس جھگڑنے میں پڑنے سے بچایا تھا۔ وکٹر مجھ پر بظاہر سرسری سی نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میرے ذہن سے اس وقت یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ سامنے بیٹھا ہوا شخص کوئی معمولی آدمی نہیں۔ وہ سیکرٹ سروس کا سربراہ تھا۔ اس کی نظر سے بھلا میرے چہرے کے تاثرات کس طرح چھپے رہ سکتے تھے۔ مجھے اس وقت ولیم کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا جب اس نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔

"سنئے مس گریٹا!" ولیم نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ "آپ اچانک کچھ فکرمند ہی کیوں نظر آنے لگی ہیں' کیا بات ہے؟

"کچھ .... کچھ بھی نہیں مسٹر ولیم!" میں زبردستی مسکرائی۔ "میں کیوں فکرمند ہوتی۔"

"ابھی ذرا دیر پہلے ایک دراز قد شخص ادھر سے گزرا تھا۔ اسی کو دیکھ کر آپ کے چہرے کا تاثر بدلا تھا۔ کیا آپ اس شخص کو جانتی ہیں مس گریٹا؟" ولیم نے پوچھا۔

"نہیں .... میں تو نہیں جانتی اسے۔" میں نے فوراً انکار کر دیا۔ ولیم کی قوت مشاہدہ یقیناً بہت تیز تھی۔

"مجھے بہرحال آپ کی آنکھوں میں اس شخص کے لئے شناسائی کی جھلک محسوس ہوئی تھی لیکن ممکن ہے' یہ میرا وہم ہو۔"

"چھوڑیں یہ ذکر مسٹر ولیم!" میں نے طویل سانس لے کر کہا' پھر موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر

ل۔ "اپنے بارے میں ابھی تک آپ نے کچھ نہیں بتایا مسٹر ولیم!"

"مثلاً آپ میرے متعلق کیا جاننا چاہتی ہیں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا' پھر کہنے لگا۔ "ویسے تو مسٹر پ نے بھی آپ کے پوچھنے پر کچھ نہ کچھ بتایا ہی ہو گا۔"

"نہیں' نہ میں نے کچھ پوچھا' نہ خود انہوں نے کچھ بتایا۔" میں صاف مکر گئی۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ی کہ وہ اپنے بارے میں مجھ سے سچ بولتا ہے یا نہیں۔

"اگر مسٹر فلپ سے آپ کو واقعی کچھ معلوم نہیں ہوا تو میں بتائے دیتا ہوں۔ میں ایک سرکاری لے میں ملازم ہوں' قیام یہیں نئی دہلی میں ہے۔" یہ کہتے ہوئے ولیم نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال ر ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ آپ اپنے پاس رکھ لیجئے۔"

میں نے وزیٹنگ کارڈ لے کر اس پر نظر ڈالی۔ کارڈ پر اس کا نام اور کوٹھی کا پتا درج تھا۔ اس کے اوہ کونے میں فون نمبر بھی چھپا ہوا تھا۔ یہی پتا مجھے سالار اکبر نے فراہم کیا تھا۔ کارڈ سے تصدیق ہو گئی ی کہ سالار اکبر کا فراہم کردہ پتا درست تھا۔ میں نے وزیٹنگ کارڈ اپنے پرس میں رکھ لیا۔

"اس میں آپ کے دفتر کا پتا نہیں ہے مسٹر ولیم!" میں نے پرس بند کرتے ہوئے کہا۔

"میری سرکاری ذمے داریاں کچھ اس نوعیت کی ہیں مس گریٹا کہ میں اپنے دفتری اوقات میں کسی است سے نہیں مل سکتا۔ میں نے اسی لئے وزیٹنگ کارڈ میں اپنے دفتر کا پتا دینا ضروری نہیں سمجھا۔" یم نے بلاجھجک وضاحت کر دی۔ ذہنی طور پر شاید کسی ایسی بات کا جواب دینے کے لئے پہلے ہی سے تیار ا۔ اس نے میرے سوالوں کے جواب بڑے محتاط انداز میں دیئے تھے جنہیں بہرحال غلط نہیں کہا جا سکتا ا۔ اس کے باوجود اپنی اصل شخصیت چھپانے میں کامیاب رہا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا مسٹر ولیم کہ دن کے وقت آپ سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتی۔ اگر پہلے سے ملاقات کا پروگرام طے ہو جائے تو دفتر سے چھٹی بھی کی جا سکتی ہے۔" وہ بولا۔

اسی وقت ویٹر کھانا لے کر آ گیا اور میز پر کھانا لگانے لگا۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ ویٹر کھانا لگا کر ا ہی تھا کہ میز کی دائیں جانب سے ساڑھی باندھے ہوئے ایک عورت گزری۔ میں ایک بار پھر چونک ی۔ غنیمت یہ ہوا تھا کہ اس عورت کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ وہ بمبئی کی رانی تھی۔ اس وقت رانی ے چہرے پر وہی ماسک چڑھا ہوا تھا جو خود میں نے اسے دیا تھا۔ اسی ماسک کی وجہ سے میں اسے پہچاننے ں کامیاب ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر ایک میز پر بیٹھ گئی جہاں پہلے ہی دو افراد موجود تھے۔ وہ دونوں رانی ے کے آدمی ہو سکتے تھے۔ ولیم کی میز سے رانی کی میز کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا' مگر رانی اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں اسی لئے مطمئن تھی۔ وہاں میں' وکٹر کو بھی دیکھ چکی تھی اور اب انی نظر آ گئی تھی۔ ایسا بلا سبب نہیں ہو سکتا تھا یقیناً وہاں کوئی خطرناک کھیل شروع ہونے والا تھا۔ بظاہر میں کھانا کھانے میں مصروف تھی مگر میرا ذہن انہی دونوں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ وکٹر تو مجھے وہاں دیکھ بھی کا تھا۔ اس کی طرف سے تو مجھے زیادہ خطرہ نہیں تھا البتہ رانی کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو یقیناً اچھا نہ ہوتا۔

میں یہ بھولی نہیں تھی کہ اس کا ایک ساتھی جہانگیر میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ وہ مجھے انتقام لینے کی دھمکی بھی دے چکی تھی اور ایک مرتبہ میرے پیچھے پولیس کو لگا بھی چکی تھی' پھر اس نے مجھ سے مصالحت کرنا چاہی تو میں اسے جامع مسجد کے قریب ایک ہوٹل میں بے ہوش کر کے فرار ہو گئی تھی۔

میں اب واضح طور پر اپنے لئے وہاں خطرہ محسوس کر چکی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ رانی اگر اپنی میز سے اٹھ کر ہال کے دروازے کی طرف بڑھتی تو لازماً مجھ پر اس کی نظر پڑ جاتی۔ غیر ارادی طور پر بار بار اسی لئے میری نگاہ رانی کی طرف اٹھ رہی تھی۔

"مس گریٹا!" اچانک ولیم نے مجھے مخاطب کیا۔ "آپ جب بھی مجھ سے ملنا چاہیں فون پر رابطہ قائم کر کے ملاقات کا وقت طے کر سکتی ہیں۔ آپ تو خیر خود کسی کے گھر ٹھہری ہوئی ہیں اس لئے میرا وہاں آنا تو مناسب نہیں لیکن آپ میرے گھر ضرور آ سکتی ہیں۔"

"جی .... جی ہاں مسٹر ولیم! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں بولی۔

"تو پھر مس گریٹا! آپ سے اگلی ملاقات گھر ہی پر ہونا چاہئے' ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں' اس طرح آپ کی مسز سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" میں نے اخلاقاً کہہ دیا۔

"مگر میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گا مس گریٹا کہ اتنی سی عمر میں میری مسز سے آپ کی ملاقات ہو جائے۔"

میں اس کی بات سن کر چونکی معلوم نہیں "اتنی سی عمر" سے اس کی کیا مراد تھی اور وہ اپنی مسز سے میری ملاقات کیوں نہیں چاہتا تھا؟ یہی سوال میری زبان پر بھی آ گیا۔

میرے سوال پر وہ مسکرایا' پھر کہنے لگا۔ "میری مسز سے ملاقات کے لئے آپ کو دوسری دنیا میں جانا پڑے گا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا اور آپ کی عمر ابھی وہاں جانے کی نہیں ہے۔"

"یہ جان کر افسوس ہوا مسٹر ولیم!" میں نے اظہار افسوس کیا کہ یہ بھی اخلاق کا تقاضا تھا۔

"پھر کب آ رہی ہیں گھر؟" اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کسی بھی دن فون کر کے آپ کو بتا دوں گی۔" میں نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

کھانا کھانے کے بعد جب میں' ولیم کے ساتھ کافی پی رہی تھی تو رانی کی میز سے اس کا ایک ساتھی اٹھا اور ہال کے دروازے کی طرف چلا گیا۔ شاید کسی کھیل کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں نے کسی خطرے کی بو محسوس کی۔ میں نے سوچا کہ مجھے کسی ممکنہ خطرے سے پہلے ہی اٹھ جانا چاہئے۔ اسی خیال کے تحت میں کافی کے لمبے لمبے گھونٹ لینے لگی۔

"کیا آپ کو جانے کی کچھ جلدی ہے مس گریٹا!" ولیم نے میری جلد بازی کو یقیناً محسوس کر لیا تھا۔

"نہیں کوئی ایسی خاص جلدی بھی نہیں ہے' مگر میں جہاں ٹھہری ہوں وہ لوگ جلد سو جاتے ہیں۔ میری کوشش اس لئے یہی ہوتی ہے کہ واپسی میں مجھے زیادہ دیر نہ ہو۔"

"پھر تو میں آپ کو نہیں روکوں گا۔" ولیم نے کہا۔ میری بات پر اسے شاید یقین آ گیا تھا۔ "میں بل منگواتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور بل لانے کو کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میں آپ کو اپنی کار میں چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں مسٹر ولیم! آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں۔ میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔"

"مجھے کوئی زحمت نہیں ہو گی مس گریٹا! بلکہ خوشی ہو گی۔"

"شکریہ مسٹر ولیم! لیکن میں اسے زحمت ہی سمجھتی ہوں۔" ابھی میری بات پوری ہی ہوئی تھی کہ اچانک ہال میں تاریکی چھا گئی۔ اسی کے ساتھ پے در پے دو دھماکے سنائی دیئے۔ یقیناً کسی نے گولیاں چلائی تھیں کئی چیخیں بھی فائروں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ ابھری تھیں۔ ان میں نسوانی آوازیں بھی شامل تھیں۔ غالباً کچھ عورتیں خوفزدہ ہو کر چیخ اٹھی تھیں۔ مجھے جس خطرناک کھیل کے شروع ہونے کا اندیشہ تھا وہ شروع ہو گیا تھا۔ میری نظر میں اس کے مرکزی کردار وکٹر اور رانی ہی تھے۔

"مس گریٹا!" معاً ولیم نے مجھے دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔ "جب تک لائٹ نہ آ جائے اپنی جگہ سے اٹھئے گا مت۔"

"مجھے اندازہ ہے مسٹر ولیم! میری فکر نہ کریں۔ میں اپنی سیٹ سے نہیں اٹھوں گی۔" میں نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا۔

لوگ چیخ چلا رہے تھے اور ہوٹل کی انتظامیہ کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ہال میں ایک ہنگامہ برپا تھا کہ اچانک ہر طرف روشنی ہو گئی۔

روشنی ہوتے ہی میری نظر رانی کی میز کی طرف اٹھیں رانی اپنے آدمی کے ساتھ وہاں سے غائب تھی۔ میز خالی پڑی تھی۔

"قتل .... قتل۔" معاً ایک جانب سے کوئی چیخا۔

"جلدی اٹھئے مس گریٹا!" ولیم تیزی سے بولا۔ "اگر یہاں پولیس آ گئی تو ہال کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ پھر آپ کو واپسی میں بہت دیر ہو جائے گی' یہاں پھنس کے رہ جائیں گی۔"

میں نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں کی۔ اسی وقت ویٹر ہماری میز کی طرف لپکا۔ یہ وہی تھا جس سے ولیم نے بل لانے کو کہا تھا۔ ولیم نے اسے کھڑے کھڑے بل ادا کیا اور پھر مجھے ساتھ لئے ہال کے دروازے کی طرف بڑھا۔ لوگوں کا ہجوم ہال کے دروازے ہی کے قریب تھا۔ میں لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

لاش دروازے کے قریب ہی پڑی تھی۔ بے اختیار میری نظر ادھر اٹھ گئی اور میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ لاش وکٹر کی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ آج رانی کو موقع مل گیا تھا اور اس نے اپنے حریف وکٹر کو راستے سے ہٹا دیا تھا۔ اس کے سینے میں شاید دل کے مقام پر گولی لگی تھی جس کے سبب فوری طور پر اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

ہال کے دروازے سے نکلتے ہی ولیم نے آہستہ آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "یہ تو اسی شخص کی لاش تھی مس گریٹا جسے دیکھ کر آپ چونک اٹھی تھیں۔"

"مجھے یاد نہیں مسٹر ولیم کہ میں کب چونک اٹھی تھی اور نہ یہ خبر ہے کہ قتل ہونے والا کون ہے۔" میں نے حتی الامکان اپنا لہجہ پُرسکون رکھا اور ولیم کے ساتھ چلتی رہی۔

ہوٹل سے باہر آ کر ولیم نے ایک بار پھر مجھے اپنی کار میں چھوڑنے کی پیشکش کی' مگر میں نے اسے ٹال دیا۔ اسٹینڈ پر مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی تھی۔ ولیم سے رخصت ہو کر میں اسٹینڈ کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ ٹیکسی کے قریب پہنچ کر میں نے پچھلا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔ "پہاڑ گنج چلو۔"

ٹیکسی کا انجن جاگ اٹھا' کچھ ہی دیر بعد ٹیکسی ہوٹل کے کمپاؤنڈ سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو عقب نما آئینہ درست کرتے دیکھا۔ ٹیکسی کے اندر اندھیرا تھا' مگر ڈرائیور اندر نہیں باہر غور سے کچھ دیکھ رہا تھا شاید ٹیکسی کے پیچھے آنے والی کسی گاڑی پر اس کی نظر تھی۔ میں نے بھی یوں ہی مڑ کر دیکھ لیا۔ نیلے رنگ کی ایک کار' ٹیکسی کے پیچھے آ رہی تھی۔ معاً مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ٹیکسی کے پچھلے حصے میں تنہا نہیں ہوں' میرے سوا وہاں کوئی اور بھی ہے۔ میں نے اندھیرے میں گھور کر پچھلے حصے کا جائزہ لیا۔ اسی وقت ٹیکسی ایک کھمبے کے قریب سے گزری۔ چند لمحے کو روشنی سی ہوئی اور پھر ٹیکسی میں اندھیرا ہو گیا۔ میں انہی چند لمحوں کے دوران اگلی اور پچھلی نشستوں کی درمیانی تنگ جگہ میں کسی کو سکڑے سمٹے بیٹھے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

"ڈرائیور! ٹیکسی روکو۔" بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔

اچانک سیٹوں کے درمیان چھپا ہوا وجود اچھل کر میرے برابر آ بیٹھا۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنے پہلو میں کوئی سخت سی چیز چبھتے محسوس ہوئی۔

"کچھ اور نہ سمجھنا معبلہ! تمہارے پہلو میں چبھنے والی ایک ریوالور کی نال ہے۔" ایک سرد نسوانی آواز سنائی دی۔

"رانی! تم؟" میں نے رانی کی آواز پہچان لی۔

"ہاں میں۔" وہ دھیرے سے ہنسی' پھر سخت آواز میں دھمکی دی۔ "چیخنے' چلانے یا چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں گولی مارنے میں دیر نہیں کروں گی۔"

"مگر تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟"

"جہاں لے جا رہی ہوں وہاں چل کر تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا' ایسی جلدی بھی کیا ہے؟"

"لیکن کس لئے مجھے اس طرح اغوا کر کے لے جا رہی ہو' مقصد کیا ہے تمہارا؟"

"مجھے تم سے اپنا کچھ پچھلا قرض چکانا ہے۔ تم شاید اس غلط فہمی کا شکار تھیں کہ میں نے ہوٹل ہال میں تمہیں دیکھا نہیں۔ بہرحال آج کی رات میرے لئے خوش قسمتی کی رات ہے۔ مجھے خبر نہیں تم کہ میں نے جس ہوٹل میں وکٹر کو قتل کرنے کا جال بچھایا ہے' وہیں تم بھی آ پھنسو گی۔"

"میڈم! ایک کار ہوٹل ہی سے ہماری ٹیکسی کا تعاقب کر رہی ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے رانی کو آگاہ کیا۔ وہ رانی ہی کا ساتھی ہو سکتا تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ ہمارے ہی تعاقب میں ہے؟" رانی نے دریافت کیا۔

"لگتا تو یہی ہے میڈم!" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"لگتا ہے' کیا مطلب؟" رانی کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "تمہیں اب تک تصدیق کر لینا چاہئے تھی کہ وہ ہماری ہی ٹیکسی کے پیچھے لگا ہوا ہے' جلدی اپنے شبہے کی تصدیق کرو۔"

"بہتر ہے میڈم!" ڈرائیور فوراً بولا۔

پھر جو پہلا موڑ آیا' ڈرائیور نے ٹیکسی ادھر موڑ لی۔ اس کے بعد ڈرائیور نے ٹیکسی کو کئی سڑکوں پر موڑا اور پھر سیدھا ایک سڑک پر چلنے لگا۔

"میڈم! وہ نیلی کار اب بھی ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔" ڈرائیور نے رانی کو بتایا۔

"میں بھی دیکھ چکی ہوں۔" رانی نے کہا۔ "اس کار میں اسی معبلہ کے ساتھی ہو سکتے ہیں۔" پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "کیوں معبلہ! تمہارے ہی آدمی ہیں وہ؟"

"میں تمہاری کسی بات کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔" میں نے دانستہ اسے جواب نہیں دیا۔ خود میں بھی ناواقف تھی کہ ٹیکسی کا تعاقب کون کر رہا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ رانی اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ اس کار میں میرے آدمی ٹیکسی کا تعاقب کر رہے ہیں تو یہ میرے ہی حق میں بہتر تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے' نہ جواب دو۔" رانی بولی' پھر اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "معلوم کرو کہ اس کار میں کتنے آدمی ہیں' اس کے لئے تم ایک دم ٹیکسی کی رفتار کم کر سکتے ہو یا پھر ٹیکسی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے اس کار کو آگے نکلنے کا موقع دے سکتے ہو۔"

"بظاہر تو کار میں صرف ایک ہی شخص معلوم ہوتا ہے میڈم!" ڈرائیور بولا۔ "وہی جو کار ڈرائیو کر رہا ہے۔ کار کے اندر تاریکی ہے اس لئے یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔"

"تم میری ہدایت پر عمل کرو' میں دیکھتی ہوں۔"

ذرا ہی دیر کے بعد ڈرائیور نے اچانک کار کی رفتار ایک دم کم کر کے بریک لگائے اور اسے سڑک کی ایک جانب روک لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ رانی کی تمام تر توجہ پیچھے آنے والی کار پر مرکوز ہے جو غالباً تیزی کے ساتھ قریب آ رہی تھی۔ میں دروازے سے لگی ہوئی بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا' مجھے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔ تیزی کے ساتھ میں نے دروازے کے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسی لمحے پیچھے سے آنے والی کار' ٹیکسی کے قریب آ گئی۔ اگر میں اس وقت دروازہ کھولنے کی غلطی کرتی تو یقیناً اس کار کے نیچے آ جاتی۔ میرا آگے بڑھا کا بڑھا رہ گیا۔ نیلی کار آگے نکل گئی۔ میری نگاہ کیونکہ دروازے ہی کی طرف تھی اور ٹیکسی ایک کھمبے کے قریب رکی کھڑی تھی۔ اس لئے میں نے نیلی کار ڈرائیو کرنے والے کو دیکھ لیا۔ میرے لئے یہ امر باعث حیرت تھا کہ اس کار کو ڈرائیو کرنے والا وہی انگریز تھا جسے میں نے ہوٹل میں ولیم کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا' کیا ولیم نے اس انگریز نوجوان کو میرے تعاقب پر مامور کیا تھا' مگر کیوں؟ میں اس وقت ایسی صورت حال سے دوچار تھی کہ اس معاملے پر

غور کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

"ٹیکسی کو تیزی کے ساتھ مخالف سمت لے چلو' جلدی کرو۔" نیلی کار کے آگے بڑھتے ہی رانی نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔

رانی کے ساتھی نے فوری طور پر نئی ہدایت پر عمل کیا۔ چند ہی لمحے بعد ٹیکسی پھر اسی سمت تیز رفتاری سے دوڑی جا رہی تھی جدھر سے آئی تھی۔ فرار ہونے کا جو موقع مجھے کچھ دیر پہلے ملا تھا' رائیگاں ہو چکا تھا۔ میرے پہلوے سے رانی نے اب تک ریوالور کی نال ہٹائی نہیں تھی۔ ٹیکسی اب پھر مختلف سڑکوں کے چکر کاٹ رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور اس طرح شاید متعاقب کار کو ڈاج دے رہا تھا۔

"میڈم! نیلی کار میں صرف ایک ہی شخص تھا۔" ڈرائیور نے رانی کو مخاطب کیا۔

"ہاں' میں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ شاید وہ کوئی انگریز نوجوان تھا۔" رانی بولی۔

"جی ہاں میڈم! وہ انگریز ہی تھا۔" ڈرائیور نے تصدیق کی۔

"لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ معبلہ کے ساتھیوں میں کوئی انگریز نہیں ہو سکتا۔" رانی کا لہجہ حتمی تھا۔ "یہ تو کوئی اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے .... ارے ہاں دیکھو' اب وہ کار تو تعاقب میں نہیں رہی؟ ویسے تو میرا اندازہ یہی ہے کہ تم اسے ڈاج دینے میں کامیاب رہے ہو۔"

"نہیں میڈم! دور تک اب اس کار کا پتا نہیں۔" ڈرائیور نے عقبی آئینے پر نظر جماتے ہوئے بتایا۔

"پھر ٹھیک ہے' اب سیدھے اودھر ہی چلو جدھر ہم پہلے جا رہے تھے۔" رانی نے ڈرائیور سے کہا پھر اچانک مجھ سے مخاطب ہو گئی۔ "ارے ہاں معبلہ! اچھا یاد آیا' ہوٹل کے ہال میں بھی تو تم کسی انگریز کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ٹیکسی کا تعاقب کرنے والا اسی کا کوئی ساتھی تو نہیں تھا؟"

"رانی! تم ناحق پھر مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کر رہی ہو۔" میں دانستہ سخت لہجے میں بولی۔ "میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتی۔"

"اس قدر ناراض ہو مجھ سے۔" یہ کہہ کر وہ تمسخرانہ انداز میں ہنس پڑی۔

میں کچھ نہیں بولی۔ ٹیکسی تیز رفتاری سے سفر طے کرتی رہی اور پھر آخر کار وہ اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ وہ شاید کوئی کوٹھی تھی جس کے آہنی پھاٹک کے سامنے رک کر ڈرائیور نے ہارن دیا تھا۔ کسی نے پھاٹک کھول دیا اور ٹیکسی اندر داخل ہو گئی۔ اسی کے ساتھ پھاٹک دوبارہ بند کر دیا گیا۔

کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں ٹیکسی رک گئی تو ڈرائیور نیچے اترا اور میں نے اسے بھی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالتے دیکھا۔ ریوالور کا رخ میری ہی طرف تھا۔

"معبلہ! دروازہ کھول کر نیچے اتر جاؤ۔" رانی نے مجھے مخاطب کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے ریوالور کی نال کا دباؤ بھی میرے پہلو پر بڑھا دیا تھا۔

میں گویا اب دو ریوالوروں کے نشانے پر تھی۔ کچھ کہے بغیر میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گئی۔ رانی کا ساتھی کچھ اور پیچھے ہٹ گیا۔ رانی شاید اسے میری طرف سے چوکنا رہنے کی تاکید کر گئی تھی۔ پھر رانی میری پشت سے ریوالور کی نال لگا کر کھڑی ہو گئی اور اس کے ساتھی نے تیزی سے آگے بڑھ

کر عمارت کے صدر دروازے کا قفل کھولا۔

"آگے بڑھو معبلہ!" رانی نے میری پشت پر ریوالور کی نال کا دباؤ ڈالا۔

میں جب تک عمارت کے صدر دروازے تک پہنچی' رانی کا ساتھی دروازہ کھول کر ایک طرف چوکنا انداز میں کھڑا ہو چکا تھا۔ رانی مجھے ساتھ لئے اندر داخل ہوئی تو اس کے ساتھی نے دروازہ بند کر دیا۔ غالباً اس عمارت میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو عمارت کے صدر دروازے میں قفل نہ ہوتا۔

رانی مجھے ایک کمرے میں لے آئی جو غالباً بطور نشست گاہ استعمال ہوتا تھا۔ وہاں مجھے ایک جانب تپائی پر فون رکھا ہوا بھی نظر آ رہا تھا۔ رانی نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود مجھ سے خاصے فاصلے پر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ریوالور کی نال اب بھی میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اپنے ساتھی کو اس نے رخصت کر دیا تھا۔

"معبلہ! اب تک تم یہ تو اندازہ لگا ہی چکی ہو گی کہ میں تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتی۔" رانی زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "حالانکہ میں تمہیں قتل بھی کر دوں تو میرے پاس اس کا جواز موجود ہے۔ تم نے بہرحال میرے ایک ساتھی کو قتل کیا ہے جس کے بدلے تمہیں قتل کیا جا سکتا ہے لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔ اگر میرا یہی ارادہ ہوتا تو تمہیں یہاں لے کر نہ آتی' راستے ہی میں ٹھکانے لگا دیتی۔" یہ کہہ کر وہ خاموشی کے ساتھ میرے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ جرائم پیشہ عورت آخر مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ اب اس کے چہرے پر ماسک نہیں تھا۔ ہوٹل کے ہال میں اندھیرا ہوتے ہی شاید اس نے اپنے چہرے سے ماسک الگ کر لیا تھا۔ رانی کے چہرے پر جو تاثرات تھے' ان سے بھی میرے لئے کوئی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

"تم اگر مجھ سے اپنے ساتھی کے قتل کا انتقام لینا نہیں چاہتیں تو پھر مجھے یہاں کیوں لے کر آئی ہو؟" میں نے آخر اس سے پوچھ ہی لیا۔

"یہ بتاؤ معبلہ کہ تمہارے ساتھی تمہیں رہا کرانے کے لئے زیادہ سے زیادہ کتنی رقم ادا کر سکتے ہیں؟" آخر وہ کھل ہی گئی۔

"تم غلط فہمی کا شکار ہو رانی!" میں نے کہا۔ "تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ میں بھی تمہاری ہی طرح کسی گروہ بند جرائم پیشہ عورت ہوں۔ اس سے پہلے بھی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ........."

"فضول باتیں مت کرو معبلہ!" اس نے مجھے سختی سے ڈانٹ دیا۔ "میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں' البتہ تمہیں یہ ضرور غلط فہمی معلوم ہوتی ہے کہ مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ سنو' تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ میں نے تم سے جو سوال کیا ہے' اس کا صحیح جواب دے دو اور مجھے تشدد پر مجبور نہ کرو۔"

"تم جو چاہے کرو مگر سچ وہی ہے جو میں نے کہا ہے۔ نہ میرا کوئی گروہ ہے' نہ ساتھی ہیں۔"

"بکواس کرتی ہو تم۔" وہ غصے میں چیخ کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ

مُردے بھی میرے سامنے زبان کھولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کو آ[illegible] دی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ عیار شخص نشست گاہ کے دروازے ہی پر کھڑا ہو گا۔

وہ تیزی سے اندر آ کر بولا۔ "یس میڈم!" اس کے ہاتھ میں اب بھی ریوالور موجود تھا۔

"اسے بتانا ہی پڑے گا کہ رانی جب کسی پر تشدد کرتی ہے تو تشدد سہنے والا کس طرح اپنی موت [illegible] دعائیں کرنے لگتا ہے' باندھ دو اسے۔" رانی نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔

رانی کا ساتھی نشست گاہ ہی میں موجود ایک الماری کی طرف بڑھا اور اسے کھولنے لگا۔ اسی [illegible] معاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رانی اپنے ریوالور کا رخ میری ہی طرف کئے ہوئے اس تپائی کی سمت [illegible] جس پر فون رکھا ہوا تھا۔ اب بھی رانی کے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔

"ہیلو!" رانی نے ریسیور اٹھا کر کہا' پھر دوسری جانب سے کچھ سنتی رہی' اس کے بعد بولی۔ "[illegible] مجھے یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی .... نہیں' کوئی خاص بات نہیں۔ تم خیریت سے پہنچ گئے' ٹھیک .... ہاں ہاں' کل .... کل بات ہو گی۔ او کے۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

رانی کے ساتھ ہوٹل کے ہال میں' میں نے دو افراد کو دیکھا تھا۔ شاید ان میں سے ایک تو یہی تھا [illegible] اس وقت بھی موجود تھا' دوسرا ساتھی کہیں اور ٹھہرا تھا۔ ممکن ہے' اس کا قیام کسی ہوٹل میں ہو اور ا[illegible] نے اپنے ہوٹل تک بخیریت پہنچ جانے کی اطلاع رانی کو دی ہو۔

فون سننے کے بعد رانی دوبارہ دور جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ احتیاط رہی ہو گی کہ ا[illegible] قریب پا کر میں اس پر چھلانگ نہ لگا دوں۔

اس عرصے میں رانی کا ساتھی الماری سے ریشم کی ڈوری کا ایک لچھا نکال چکا تھا۔ اب الماری [illegible] کرنے کے بعد وہ بڑے محتاط انداز میں کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ دیوار [illegible] ساتھ ساتھ چلنے کا سبب یہی ممکن تھا کہ وہ رانی اور میرے درمیان نہیں آنا چاہتا تھا ہو گا۔ ریوالور ا[illegible] اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

"اسے کرسی ہی سے باندھ دوں میڈم!" رانی کے ساتھ نے میرے قریب پہنچ کر معلوم کیا۔

"ہاں یہی مناسب رہے گا۔" رانی نے اسے اجازت دے دی۔

رانی کی اجازت پا کر اس کا ساتھی ریشمی ڈوری کا لچھا کھولنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے بھی وہ میرے ا[illegible] رانی کے درمیان نہیں آیا تھا تاکہ میں بدستور ریوالور کے نشانے پر رہوں۔

اب کچھ کر گزرنے کے لمحات بہت قریب آ چکے تھے۔ رانی کا ساتھی کرسی کے ایک سرے [illegible] ڈوری کا ایک حصہ باندھنے کے لئے ذرا سا جھکا۔ وہ کرسی کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ ڈ[illegible] باندھنے پر مرکوز معلوم ہوتی تھی۔ میں نے کنکھیوں سے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا جو ڈوری باند[illegible] میں مصروف تھے۔ اپنے جسم کو میں نے غیر محسوس انداز میں حرکت دی' خفیف سی حرکت تاکہ [illegible] خطرے کی بو نہ سونگھ لے۔ مجھے علم تھا' وہ کتنی خطرناک عورت ہے۔ خطرہ محسوس کرتے ہی وہ مجھے [illegible] مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ کرتی۔ معلوم نہیں اب تک اس کے ہاتھوں کتنے لوگ قتل ہو[illegible]

تھے۔ بمبئی سے کلکتے تک بلاوجہ ہی تو اس کی شہرت نہیں تھی۔

اپنے دونوں پیر میں نے سختی کے ساتھ زمین پر جما دیئے' پھر پیروں پر زور دے کر اچانک کرسی سمیت پوری قوت سے اپنے جسم کو پیچھے کی طرف دھکیلا۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا۔ رانی کا ساتھی چیختا ہوا کرسی کے نیچے دب گیا اور میں فضا میں قلابازی کھاتی ہوئی اس کے پیچھے جا کر گری۔ اسی لمحے کمرہ دھماکے سے گونج اٹھا۔ رانی نے فائر کر دیا تھا' مگر رانی کی گولی کا نشانہ بننے والا خود اسی کا ساتھی تھا جو تیزی سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولی اس کی گردن کو ایک طرف سے چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی۔ لمحے بھر کی بھی تاخیر کئے بغیر میں نے اس کے جسم کی آڑ لیتے ہوئے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ رانی کے ریوالور نے پھر شعلہ اگلا۔ اسی کے ساتھ میں ایک طرف لڑھکتی چلی گئی۔ رانی کی چلائی ہوئی دوسری گولی بھی اسی کے ساتھی کے جسم میں اتر گئی پھر اس سے پہلے کہ رانی تیسرا فائر کرتی' میں نے اس کے ہاتھ کا نشانہ لیا۔ دوسرے ہی لمحے رانی چیخ اٹھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود ریوالور چھوٹ کر دور جا گرا۔ میں نے صرف اس کے ریوالور کو نشانہ بنایا تھا لیکن اس کا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ رانی کے چہرے پر شدید تکلیف و اذیت کے آثار تھے۔ اس نے موت کے فرشتے کی طرح مجھے اپنے سامنے ریوالور لئے کھڑے ہوئے دیکھا تو چیخ اٹھی۔ "نن .... نہیں معبلہ! نہیں .... مجھے گولی نہ مارنا۔"

"رانی! میں تمہاری طرح کوئی سفاک جرائم پیشہ عورت نہیں ہوں۔ ڈرو مت' میں تمہیں قتل نہیں کروں گی۔" میں قدم قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

رانی مجھے پھٹی پھٹی سی خوفزدہ آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے شاید میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

"اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا تو یہ لو۔" میں نے ریوالور ایک طرف پھینک دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ غالباً اسے کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا کیا ارادہ ہے اسی لئے اس نے اپنی کنپٹی پر میرے مکے کی ضرب سے بچنا چاہا' مگر ناکام رہی۔ نتیجتاً وہ بے ہوش ہو گئی اور یہی میں چاہتی تھی۔

سب کچھ بہت تیزی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اب میں جلد از جلد وہاں سے فرار ہو جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میں کچھ سوچ سوچ کر رانی کے مردہ ساتھی کی طرف لپکی اور اسی وقت دروازے پر تیز دستک سنائی دی۔ اس عمارت کے چوکیدار نے یقیناً اندر ہونے والے فائروں کی آوازیں سن لی تھیں اور اب شاید وہی صدر دروازے پر زوردار دستک دے رہا تھا۔ اسے میں بھول ہی گئی تھی۔ دستک کو نظرانداز کر کے میں نے مردہ شخص کے کوٹ کی جیب سے ایک کی رِنگ نکال لیا جس میں دو چابیاں پڑی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چابیاں اسی ٹیکسی کی تھیں جس میں رانی مجھے وہاں تک لے کر آئی تھی۔

کی رِنگ ہاتھ میں لئے میں اپنا ہینڈ پرس کمرے کے فرش سے اٹھاتی ہوئی اس کمرے سے نکل آئی۔ اب میں تقریباً دوڑتی ہوئی صدر دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دروازے پر اب بھی دستک دی

جا رہی تھی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر چٹخنی کھولتے ہی میں تیزی سے ایک پٹ کی آڑ میں ہو گئی۔ چوکیدار فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور میں نے پیچھے سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ پھر اسے بھی ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانہ کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی تھی۔

اب راستہ صاف تھا۔ ٹیکسی کا دروازہ مقفل نہیں کیا گیا تھا۔ میں تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

پھر معلوم نہیں میں نے کیسے ٹیکسی کا انجن اسٹارٹ کیا اور کس طرح ٹیکسی کو ڈرائیو کرتی ہوئی سڑک پر لے آئی۔ خود میرے لئے بھی یہ ایک حیرت ناک تجربہ ہی تھا کیونکہ اس سے پہلے میں نے کبھی ڈرائیونگ نہیں کی تھی۔ معلوم نہیں کیسے اور کیوں میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ میں وہاں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر فرار ہو سکتی ہوں۔ اسی کے بعد مردہ شخص کے کوٹ کی جیب سے میں نے چابیاں نکالی تھیں۔ اس وقت میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں تھا کہ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔ یہ احساس تو مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد ہوا تھا۔ پھر میں مایوس ہو کر ٹیکسی سے اترنے والی تھی کہ مجھے ایک مانوس خوشبو کا جھونکا محسوس ہوا۔ یہ عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ کی مخصوص خوشبو تھی جو میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ اس کے بعد جیسے خودکارانہ طور پر میرے ہاتھ اور پاؤں حرکت کرنے لگے تھے۔ کوئی جیسے مجھے یہ تعلیم دے رہا تھا کہ ڈرائیونگ کس طرح کی جاتی ہے۔

کچھ ہی دیر میں خجیرہ کی خوشبو غائب ہو گئی تھی' مگر اب مجھے ڈرائیونگ کرنے میں کوئی دشواری نہیں آ رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ڈرائیونگ جانتی ہوں۔

وہ نئی دہلی کا علاقہ تھا اور پہاڑ گنج بھی نئی دہلی ہی کی حدود میں ہے۔ میرے لئے یہ بھی حیران کن بات ہی تھی کہ اس علاقے کے راستوں سے پوری طرح واقف نہ ہونے کے باوجود میں صحیح سمت میں سفر کرتی رہی اور پہاڑ گنج تک پہنچی گئی۔ اس میں بھی یقیناً نیکی کی قوتوں ہی کو دخل تھا جنہوں نے مجھے راستے سے بھٹکنے نہیں دیا تھا۔

ٹیکسی کو میں نے اپنے گھر سے خاصے فاصلے پر ایک سڑک کے کنارے کھڑا چھوڑ دیا اور پیدل ہی آگے بڑھ گئی۔

اس وقت نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی جب میں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر کال بیل کا بٹن دبا رہی تھی۔

دلاری نے دروازہ کھولنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ وہ شاید میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

"معبلہ جی! آج آپ کو بہت دیر ہو گئی؟" دلاری میرے لئے راستہ چھوڑتے ہوئے بولی۔

"ہاں دیر ہو گئی۔" میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے' یہ آپ کے کپڑوں پر تو خون لگا ہوا ہے۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ "کہیں آپ کو چوٹ تو نہیں آ گئی؟" وہ فکرمند نظر آنے لگی۔

میں نے بھی اس کے توجہ دلانے پر پہلی بار اپنے کپڑوں کو دیکھا۔ شرٹ اور پینٹ دونوں ہی پر خون

ے لگے ہوئے تھے۔ یہ رانی اور اس کے ساتھی کا خون ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے جب رانی پر چھلانگ
ی تو اس کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے کسی قدر مزاحمت بھی کی تھی۔ شاید اسی وقت خون
یا تھا۔ میں نے سوچا' اگر کوئی مجھے اس حالت میں فرار ہوتے دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟ میں ایک خطرے
ح کر دوسرے خطرے میں گھر جاتی۔

"مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی۔" میں نے دلاری کو تسلی دی۔ "یہ خون ایک زخمی شخص کا ہے جو
، کپڑوں پر لگ گیا ہے۔"

"آپ ایسا کریں معبلہ جی کہ مجھے کپڑے اتار کر دے دیں' میں دھو دیتی ہوں۔"

"تم کہاں تکلیف کرو گی' میں خود ابھی دھو لوں گی۔" میں' دلاری کے ساتھ ساتھ اپنے کمرے کے
رے تک پہنچ کر بولی۔

"نہیں معبلہ جی! آپ آرام کریں اور کپڑے مجھے دیں۔" دلاری نہیں مانی۔ "میں کھڑی ہوں
۔"

مجبوراً مجھے دلاری کی بات ماننا پڑی تھی۔ سلیپنگ گاؤن پہننے کے بعد کپڑے میں نے اسے دھونے کو
، دیئے تھے۔ جب میں نیلا بلب جلا کر بستر پر دراز ہوئی تو آج رات پیش آنے والے واقعات پر غور
نے لگی۔ رانی کے ساتھ معرکہ آرائی سے قطع نظر میں اس نوجوان کے بارے میں سوچنے لگی جس نے
ی کا تعاقب کیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق شاید اس انگریز نوجوان نے ولیم ہی کی ہدایت پر ایسا کیا
۔ میرے نزدیک اس کا ایک ہی سبب ممکن تھا۔ ولیم اس طرح میرے سچ یا جھوٹ کا اندازہ لگانا چاہتا ہو
۔ اس نے سوچا ہو گا کہ میں شاید گھر تک چھوڑنے کی پیشکش قبول نہیں کروں گی۔ ایسی صورت میں وہ
ریز نوجوان تعاقب کر کے پتا چلا لے گا کہ میں اس ہوٹل سے اٹھ کر کہاں گئی تھی۔ یعنی یہ کہ میں نے
ے اپنی جائے قیام کے بارے میں سچ بتایا تھا یا نہیں۔ ولیم جیسے اہم سرکاری عہدوں پر کام کرنے والوں
ے لئے اپنے ملاقاتیوں کی طرف سے پوری طرح چوکنا اور آگاہ رہنا کوئی بعید از قیاس بات بہرحال نہیں
ی۔

انہی باتوں پر غور کرتے ہوئے میری پلکوں پر نیند کا بوجھ بڑھنے لگا۔ اسی عالم میں اچانک میری
اعت سے بڑے مہاراج چند موہن کی آشنا آواز ٹکرائی تو میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ چندر
وہن کمرے میں نہیں تھا' لیکن اس کی آواز مجھے واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں وہ کہہ رہا تھا۔ "معبلہ!
تو نے میری داسی چمپا کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ جلد ہی تجھے اس کا ہمکتان بھگتنا پڑے گا۔ اس کا حسین جسم
ئی جگہ سے جل کر داغ دار ہو گیا ہے۔ میں اپنی شکتی سے ان داغوں کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تو
نے تو اسے جلا ہی ڈالا ہوتا اگر میں وقت پر اس کی سہایتا نہ کرتا۔ سن معبلہ! مجھ سے بیر مول نہ لے اور
اب بھی میرے آگے جھک جا ورنہ تو بہت پچھتائے گی۔ میں کتنا مہان ہوں اور میرے پاس کتنی شکتی ہے'
تجھے شاید ابھی اس کا گیان نہیں ہوا۔ چمپا کو میں نے تیرے خطرناک وار سے بچا لیا ہے۔ وہ ٹھیک ہو چکی
ہے' بس جسم پر داغ رہ گئے ہیں سو وہ بھی جلد ختم ہو جائیں گے۔ اپنی شکتی کا تھوڑا سا چمتکار تجھے ابھی

دکھاتا ہوں۔ تُو نے میری چہیتی داسی کو جلایا ہے‘ سو تُو بھی اب صبح تک جلتی رہے گی۔ تیرا تن بھی جلے گا‘ پر اسے میں داغ دار نہیں کروں گا کہ مجھے تیرا سندر تن بہت پیارا ہے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی بڑے مہاراج کی آواز آنا بند ہو گئی۔

اسی لمحے میں نے اچانک اپنے سینے میں آگ سی لگتی محسوس کی۔ پھر چند ہی لمحوں میں یہ آگ میرے سارے بدن میں پھیل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے جسم کو دہکتے ہوئے انگاروں پر ڈال دیا ہو۔ شدید اذیت کے سبب میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انتہائی برداشت کے باوجود میرے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ میں کوشش کر رہی تھی کہ کہیں میرے منہ سے چیخیں نہ نکلنے لگیں۔ میرے لئے اب بستر پر دراز رہنا مشکل ہو چکا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر بے قراری کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔

معاً بڑے مہاراج کے قہقہے سے کمرہ گونج اٹھا۔ وہ یقیناً میری حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر میں نے اس کی آواز ایک بار پھر سنی۔ ”معبلہ! دیکھ رہی ہے میری شکتی‘ کس طرح میں تجھے اندر ہی اندر جلا رہا ہوں۔ میں چاہوں تو اس آگ کو اور بھڑکا کر تجھے بھسم بھی کر سکتا ہوں‘ پرنتو ابھی تیرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ چمپا مجھ سے ضد کر رہی ہے کہ وہ تجھے اس حالت میں دیکھے گی۔ سو میں اسے تیرے پاس بھیج رہا ہوں تاکہ تجھے دیکھ کر اس کے من کو کچھ شانتی ملے۔“ بڑے مہاراج کی آواز معدوم ہو گئی۔

مجھے اب اپنے جسم پر سلیپنگ گاؤن بھی بار گزر رہا تھا۔ میں نے اسے اتار کر بستر پر پھینک دیا‘ مگر اندر کی آگ کم نہ ہوئی۔

اچانک ایک چھناکا سا ہوا اور چمپا ظاہر ہو گئی۔ میں نے اسے خود سے کچھ فاصلے پر کھڑے دیکھا۔ اس کے جسم پر بھی میری طرح صرف زیر جامہ تھا۔ اس کا سارا جسم مجھے داغ دار دکھائی دے رہا تھا۔ جسم پر جگہ جگہ سیاہ داغ نمایاں تھے۔ چہرہ بھی سیاہ داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس حالت میں وہ انتہائی کریہہ نظر آ رہی تھی۔

”معبلہ! کاش بڑے مہاراج تیرے جسم کو بھی اسی طرح داغ داغ کر دیتے۔“ چمپا کے ہونٹ ہلے۔ اس کے لہجے سے انتہائی نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

شدید تکلیف و اذیت کی وجہ سے میرے لئے بولنا مشکل ہو رہا تھا‘ پھر بھی میں چیخ ہی اٹھی۔ ”لعنتی عورت! جس طرح تیرا جسم داغ داغ ہے تیری روح بھی اسی طرح مکروہ ہے۔“

وہ میری بات سن کر زور سے ہنس پڑی۔ غصے کی زیادتی کے سبب میں اس پر جھپٹ پڑی۔ اسی لمحے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”میں یہاں ہوں معبلہ!“ مجھے عقب سے اس کی آواز سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر اس پر چھلانگ لگائی مگر درمیان میں موجود کرسی سے الجھ کر گر پڑی‘ پھر مجھ پر جنون سا طاری ہو گیا۔ میں اس پر چیختے چلاتے ہوئے جھپٹتی رہی اور وہ مجھے چڑانے کے لئے قہقہے لگاتی رہی۔ آخرکار میں تھک کر فرش پر گر گئی۔ اب میرے منہ سے نکلنے والی کراہوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔

”بس معبلہ! ہار گئی مجھ سے‘ پکڑ کے دکھا مجھے۔“ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

میں نے کراہتے ہوئے سر اٹھا کر اسے بڑی نفرت و حقارت سے دیکھا۔ انتہائی غصے کے سبب میرے اندر لگی ہوئی آگ اور بھی بھڑک اٹھی‘ مگر اسی کے ساتھ میں نے ایک تغیر بھی محسوس کیا۔ میرے سارے جسم میں بجلیاں سی گردش کرنے لگی تھیں۔ آگ اب جیسے انہی بجلیوں کی لپیٹ میں آ گئی تھیں یہ بجلیاں اس آگ کو میرے اندر سے سمیٹ رہی تھیں۔ میرا وجود جیسے تیز آندھیوں کی زد پر تھا۔ بجلیوں کی گردش میرے اندر کی آگ کو سمیٹتی ہوئی میری دونوں آنکھوں میں مرکوز ہونے لگی۔

”چمپا! واپس آ جا چمپا........ معبلہ کے اندر کی شکتی جاگ رہی ہے‘ وہ تجھے زندہ جلا دے گی۔“ اچانک بڑے مہاراج کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔

خود مجھے بھی اب تک اندازہ ہو چکا تھا کہ میرے اندر خوابیدہ ایک پُراسرار قوت بیدار ہو رہی ہے۔ پھر ادھر میں اچھل کر کھڑی ہوئی‘ ادھر چمپا غائب ہو گئی۔

ذرا ہی دیر میں بجلیوں کی گردش خود بخود تھم گئی۔ میری آنکھوں سے جلا ڈالنے والی روشنی خارج نہیں ہوئی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ روشنی کا ہدف میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ایسا ایک مرتبہ پہلے بھی کلکتے کے دوران قیام میں ہو چکا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر تھا جب شمبھو کی ذلیل شیطانی حرکتوں کے نتیجے میں میرے اندر یہی حیرت انگیز پُراسرار قوت بیدار ہوئی تھی اور شمبھو نے قاتل روشنی کا شکار ہونے سے پہلے ہی راہ فرار اختیار کر لی تھی۔ اس وقت بھی شمبو کے فرار ہو جانے پر بجلیاں اسی طرح تھم گئی تھیں۔ یہ میری ایسی ناقابل شکست قوت تھی کہ اس کا توڑ غالباً بڑے مہاراج کے پاس بھی نہیں تھا۔ اگر اس کے لئے کوئی تدارک ممکن ہوتا تو وہ ہرگز چمپا کو فرار کا مشورہ نہ دیتا۔ میری اسی قوت نے ساحر زعیم کو جلا کے خاک کر دیا تھا۔ اپنی اسی قوت کا مجھے آج ایک اور نیا تجربہ ہوا تھا۔ بجلیوں کی گردش تھمتے ہی میرے اندر بھڑکتی ہوئی آگ بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس سے بڑے مہاراج کا یہ دعویٰ باطل ثابت ہو گیا تھا کہ صبح ہونے تک میں اسی آگ میں جلتی رہوں گی۔

اس پُراسرار تجربے سے گزرنے کے بعد مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کی ساری طاقت کسی نے نچوڑ لی ہے۔ میں انتہائی کمزوری اور نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ بوجھل قدموں سے اپنے بستر کی طرف بڑھی اور پھر قریب پہنچ کر جیسے ڈھے گئی۔ میرے ذہن پر غفلت سی چھا رہی تھی۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں نے بمشکل سلیپنگ گاؤن پہنا تھا اور پھر غافل ہو گئی تھی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن میں دوپہر سے کچھ پہلے ہی بیدار ہو سکی۔ میں انگڑائی لے کر سرہانے تکیہ لگا کے نیم دراز ہو گئی۔ اب میرے جسم پر قطعی نقاہت طاری نہیں تھی‘ ہاں ذہن پر نیند کا غبار اب بھی تھا۔ رات کو میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھے بغیر دلاری کو آواز دی۔ دو تین بار بلند آواز میں پکارنے پر وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی تو میں نے اس سے چائے بنا کر لانے کو کہا۔

"رات کو آپ دیر سے سوئی تھیں معبلہ جی! میں نے اسی لئے آپ کو نہیں جگایا اور سونے دیا۔" دلاری بولی۔ "میں ابھی آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ اگر کہیں تو انڈا بھی ابال لاؤں۔"

"نہیں' انڈا رہنے دو صرف چائے بنا لاؤ۔" میں نے کہا۔

دلاری چلی گئی اور کچھ ہی دیر میں چائے بنا کے لے آئی۔ چائے کی پیالی مجھے دے کر وہ کھڑی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔

"بیٹھو دلاری!" میں اس سے مخاطب ہوئی۔ "کوئی بات ہے' کچھ کہنا ہے مجھ سے؟"

میرے کہنے پر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی' پھر جھجکتے ہوئے کہنے لگی۔ "معبلہ جی! رات کو میں سوئی ہی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے کسی عورت کے زور زور سے ہنسنے کی آواز سنائی دی رہی تھی' پھر ایسا لگا کہ کوئی کراہ رہا ہو۔ اسی طرح کی آوازیں بہت دیر تک آتی رہیں۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اٹھ کر دیکھوں' آوازیں کہاں سے آرہی ہیں مگر جانے کیا ہوا کہ میں اٹھ نہ سکی۔ مجھے اپنے اوپر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ یہی بوجھ مجھے اٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا معبلہ جی کہ پہلے بھی ایک رات آپ کے کمرے سے مجھے کسی عورت کی چیخیں سنائی دی تھیں' پھر جب میں نے آپ سے آکر پوچھا تو معلوم ہوا' آپ کو وہ چیخیں سنائی نہیں دی تھیں' آپ گہری نیند سو رہی تھیں۔ معبلہ جی! کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب کیا چکر ہے۔ آپ نے تو رات کو کسی عورت کے قہقہے نہیں سنے؟"

"نہیں دلاری!" میں اس کے سوا دلاری سے اور کہتی بھی کیا۔ "میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔ میں تو سو رہی تھی۔"

دلاری کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔

"تمہارا وہم ہو گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "کبھی کبھی حالت خواب میں بھی آدمی کو ایسا لگتا ہے جیسے وہ جاگ اٹھا ہو جبکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی۔ پھر وہ خواب ہی کو حقیقت سمجھ لیتا ہے۔"

دلاری نے شاید میری دل دہی کی خاطر اختلاف نہیں کیا اور مردہ سی آواز میں بولی۔ "ممکن ہے معبلہ جی آپ ہی ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

چائے پینے کے بعد نہا دھو کر میں تر و تازہ ہو گئی۔ گزری ہوئی رات کا اب کوئی اثر میرے جسم پر باقی نہیں تھا۔ کھانے کی بجائے میں نے ناشتے ہی پر اکتفا کیا۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ خلاف توقع سالار اکبر اس روز شام کو آنے کی بجائے قبل از وقت کوئی پیغام دیئے بغیر دوپہر دو بجے ہی آ گیا۔ چہرے سے وہ مجھے کچھ فکرمند سا نظر آرہا تھا۔

میرے استفسار پر سالار اکبر نے بتایا۔ "معلوم ہوا ہے کہ حکومت بڑے پیمانے پر تنظیم کے خلاف کوئی قدم اٹھانے والی ہے۔ اس سلسلے میں انتہائی رازداری سے کام لیا جا رہا ہے۔ ہمارے لئے جو افراد اطلاعات فراہم کرتے ہیں اور سیکورٹی کے مختلف اداروں سے وابستہ ہیں' انہیں بھی معلومات کے حصول میں دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ ملک گیر بنیاد پر حکومت تنظیم کی بیخ کنی کا کوئی بڑا منصوبہ بنا چکی ہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں میری مصروفیات بڑھ جائیں گی۔ ممکن ہے کہ مجھے

چند روز کے لئے دہلی سے باہر بھی جانا پڑے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے ہی کم از کم آپ کا معاملہ نمٹ جائے۔"

"ولیم کے مہمان ثریان کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہوئی؟" میں نے سالار اکبر سے دریافت کیا۔

"جی ہاں' آج صبح ہی صبح وہ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے نکل کر جمنا کے کنارے گیا تھا۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔ "اس سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ اس عمارت سے باہر بھی نکلتا ہے۔ رپورٹ یہ ہے کہ وہ ایک بگی میں بیٹھ کر اس عمارت سے نکلا تھا اور بگھی کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دو دو مسلح گھڑسوار تھے۔ گویا وہ آٹھ مسلح محافظوں کے پہرے میں عمارت سے باہر آیا تھا۔ موجودہ حالات کے پیش نظر کسی اور ایسے موقع کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہی صورت ممکن ہے کہ آپ کی تجویز پر عمل کیا جائے۔"

"پھر آج ہی رات کو اس عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کیوں نہ کریں؟" یہ کہتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" سالار اکبر نے میری رائے سے اتفاق کیا' پھر کہنے لگا۔ "میں یہ سوچ رہا تھا معبلہ کہ آزمودہ تدبیر پر کیوں نہ عمل کیا جائے۔" پھر اس نے خود ہی وضاحت کی۔ "اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پر سامنے سے ہمارے آدمی اچانک حملہ کر دیں۔ اس طرح وہاں متعین تمام تر محافظوں کی توجہ ادھر ہو جائے گی۔ اسی سے فائدہ اٹھا کر ہم عقبی سمت سے کمند ڈال کر اندر داخل ہو جائیں۔"

"نہیں سالار اکبر!" میں نے انکار کر دیا۔ "اس طرح عیار ثریان چوکنا ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں ایک امکان یہ بھی ہے کہ عقبی سمت کھلنے والی تمام کھڑکیاں بند کر دی جائیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو پھر ہم کمند ڈال کر عمارت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ اس سے قطع نظر سامنے کے رخ سے عمارت پر حملہ کرنے کی صورت میں جانی نقصان کا بھی اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے' عمارت پر حملے کی صورت میں جوابی کارروائی بھی ہو گی۔ اس کارروائی کے نتیجے میں یہ امکان نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑے۔"

"ہاں معبلہ! یہ امکان تو بہرحال ہے۔" سالار اکبر نے میرے اندیشے کی تائید میں کہا۔

"تو پھر میری ہی تجویز مناسب ہے۔" میں بولی۔ "دشمن کو ہوشیار ہونے کا موقع دیئے بغیر خاموشی کے ساتھ ہم اس عمارت میں داخل ہو جائیں۔ یہ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ میرے ساتھ صرف دو افراد ہوں گے۔ پنڈت جی کو اطلاع دینا پڑے گی۔ آپ تو خیر ساتھ ہوں گے ہی۔" پنڈت جی سے میری مراد عادل تھا۔ میں بھی اسے پنڈت جی ہی کہنے لگی تھی۔

"پنڈت جی کو اطلاع ہو جائے گی' آپ مطمئن رہیں۔ نصف شب سے کچھ پہلے روانگی ٹھیک رہے گی' کیا خیال ہے؟" سالار اکبر نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"جی ہاں' یہ وقت مناسب ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاں میں ایک بات آپ کو اور بتا دوں سالار کہ ثریان کو وہاں قتل نہیں کرنا۔"

"پھر؟" سالار اکبر نے دریافت کیا۔

"اسے اغوا کر کے اپنے ساتھ لانا ہے۔" میں نے بتایا۔ "اسے میں یہاں لانے کے بعد مخصوص طریقے سے قتل کروں گی۔"

"یہاں سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"اس گھر میں یا پھر تنظیم کی عمارت میں۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے اسے قتل کرنے کے لئے بہتر جگہ تنظیم کی عمارت ہی رہے گی کیونکہ وہاں لان بھی ہے۔"

"کیا اسے باہر لان میں قتل کریں گی؟" سالار اکبر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں' میں اسے جس طرح قتل کرنا چاہتی ہوں' اس کے لئے کھلی جگہ ہی چاہئے۔" سالار اکبر سے یہ کہتے ہوئے میری چشم تصور میں بڑا دل خوش کن منظر تھا۔ میں اپنے دشمن ژیان کی کٹی ہوئی گردن پر دہکتا ہوا لوہے کا توا رکھا دیکھ رہی تھی اور "رقص بسمل" جاری تھا۔ اسی منظر کے ساتھ مجھے اشیاء کی دستیابی کا خیال آ گیا۔ یہی سوچ کر میں نے سالار اکبر کو مخاطب کیا۔ "سالار! مجھے کچھ چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔" پھر میں نے وہ تمام اشیاء بتا دیں' ژیان کو قتل کرنے کے لئے جن کی ضرورت تھی۔

"بھاری زنجیریں' قینچی' تیز دھار تلوار' بڑے چمٹے' لوہے کا بڑا توا اور انگیٹھی۔" سالار اکبر نے حیرت سے ان تمام چیزوں کے نام لئے جو میں نے بتائی تھیں۔

اس کا تصدیق طلب لہجہ محسوس کر کے میں بولی۔ "جی ہاں' یہی چیزیں چاہئیں۔ دو ایسے افراد کی ضرورت بھی ہو گی جو تیزی اور مہارت کے ساتھ کٹی ہوئی گردن پر لوہے کا دہکتا ہوا توا رکھ سکیں۔ کٹی ہوئی گردن سے خون کا فوارہ زیادہ بلند نہیں ہونا چاہئے۔" میری آواز خمار آلود سی تھی۔ میں اس وقت جیسے ہموار میدانوں کی اِس دینا سے نکل کر بلند پہاڑوں کی دنیا میں پہنچ گئی تھی جہاں سینوں کے اندر دل نہیں' پتھر ہوتے ہیں۔

"معاف کیجئے گا معبلہ! اس طرح میں آپ کی بات کچھ سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ کیا چاہتی ہیں۔ اگر آپ مخصوص طریقے سے قتل کی وضاحت کر دیتیں تو بہتر تھا۔"

میں جیسے کوئی حسین خواب دیکھتے دیکھتے چونک اٹھی۔ میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ سالار اکبر کا تعلق پہاڑی بستیوں سے نہیں' ہموار میدانوں کی مہذب دنیا سے ہے۔ میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا تو معلوم ہوا' وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔

"بات یہ ہے سالار اکبر کہ اگر کسی شخص کی گردن کاٹ کر اخراج خون روک دیا جائے تو فوری طور پر اس کی جان نہیں نکلتی۔" یہ کہہ کر میں نے تفصیل کے ساتھ اسے سب کچھ بتا دیا کہ اپنے دشمن کو کس طرح قتل کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ میں جب طریقہ قتل کی وضاحت کر رہی تھی تو میری نگاہ سالار اکبر کے چہرے ہی پر تھی۔ اس کے چہرے سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے یقیناً قتل کے کسی ایسے درندگی آمیز طریقے کے متعلق تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ اپنی بات ختم کر کے میں نے اس سے پوچھا۔

"اب تو آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے سالار کہ میں کیا چاہتی ہوں۔"

"جی ہاں معبلہ! سمجھ گیا۔" وہ بولا۔ "مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی گردن کون کاٹے گا؟"

"گردن میں کاٹوں گی۔ بس ذرا یہ دیکھ لیجئے گا کہ تلوار کی دھار تیز ہو تاکہ ایک ہی وار میں گردن کٹ جائے۔"

"یہ بندوبست ہو جائے گا لیکن معبلہ! اگر اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں کوئی ایسی صورت حال پیش آ گئی کہ ہم اسے اپنے ساتھ اغوا کر کے نہ لا سکے تو کیا بہ مجبوری اسے وہیں بھی قتل کیا جا سکتا ہے؟ یا ایسی صورت میں کسی دوسرے موقع کے لئے اسے زندہ چھوڑ آئیں گے؟" سالار اکبر نے ایک اہم سوال کیا۔

"اس کا فیصلہ موقع پر ہی خود میں کروں گی۔ بہرحال آپ دونوں میں سے کوئی اسے قتل نہیں کرے گا۔" میں نے وضاحت کی۔

"ٹھیک ہے معبلہ! ہم اسے گھیرنے میں تو آپ کی مدد کریں گے مگر خود اس پر وار نہیں کریں گے۔ ہاں یہ بتائیں' آپ کے پاس ریوالور ہے؟"

"نہیں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "عموماً میں غیر مسلح ہی رہتی ہوں۔"

"لیکن اس موقع پر آپ کو غیر مسلح نہیں ہونا چاہئے معبلہ! خیر' اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ رات کو میں' پنڈت جی کے ساتھ گیارہ بجے تک یہیں آپ کے گھر پہنچ جاؤں گا۔ آپ نے جن چیزوں کے بارے میں بتایا ہے' وہ بھی رات تک مل جائیں گی۔ اب اجازت ہے' میں چلوں؟"

پھر سالار اکبر کو میں نے چائے پینے کے بعد ہی جانے دیا۔

طویل عرصے صبر کر کے آج میرے خوابوں کی تعبیر ملنے کا دن آ ہی گیا تھا۔ میں بہت خوش تھی۔ شام کو جب شہزاد مجھ سے ملنے آیا تو اس نے بھی یہ بات محسوس کر کے اپنی خوشی کا اظہار کیا' مگر وہ کسی اور ہی غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔

"خاتون! مجھے آپ کی خوشی کا سبب تو معلوم نہیں لیکن یہ پتا ہے کہ عموماً ایسے موقعوں پر آپ مہربان ہوتی ہیں۔" شہزاد خواب ناک سے لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"ارے ارے' آپ یہ اپنا اچھا خاصا موڈ کیوں خراب کر رہی ہیں؟ میں تو آپ کی خوشی میں اضافے کی بات کرنے والا تھا۔ ابھی تو میں نے اظہار مدعا بھی نہیں کیا۔"

میں نے اس روز پہلی بار یہ سوچا کہ شہزاد کو میری بات پر یقین آئے یا نہ آئے' اسے حقیقت سے آگاہ کر ہی دوں۔ اس طرح کم از کم میرے ضمیر کا بوجھ تو ختم ہو ہی سکتا تھا۔ چمپا نے اسے میری طرف سے ایک شدید اور قابل شرم غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس غلط فہمی نے خود مجھے اپنی نظر میں گرا دیا تھا۔

"شہزاد! میری بات غور سے سنو۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "میں آج تم سے بہت اہم بات کرنے والی ہوں۔"

"جی فرمایئے خاتون! میں پوری توجہ اور سنجیدگی سے آپ کی بات سن رہا ہوں۔" شہزاد واقعی سنجیدہ نظر آنے لگا۔

"تمہیں وہ سادھو شمبھو یاد ہے جو حیرت انگیز شیطانی قوتوں کا مالک تھا؟" میں نے تمہید باندھی۔

"جی ہاں خاتون! وہ کمینہ بھولنے والی شے کب ہے۔"

"اور تم پُراسرار شیطانی قوتوں پر بھی یقین رکھتے ہو۔ ان میں سے کچھ کا تمہیں عملی تجربہ بھی ہے۔ مثلاً تم نے شمبھو کی سربریدہ لاش دیکھی اور پھر وہ لاش پُراسرار طور پر غائب ہو گئی۔ اس کے دوسرے دن تمہیں وہ زندہ سلامت نظر آ گیا۔ شاید میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ شمبھو نے اپنی شیطانی قوتوں سے کام لے کر ہم سب کو فریب نظر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس سے تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا......... نا کہ کبھی کبھی آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا بھی غلط ہوتا ہے۔ بتاؤ ایسا ہے یا نہیں؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں خاتون! مگر میں سمجھا نہیں کہ آپ یہ سب باتیں اس وقت کیوں کر رہی ہیں؟" شہزاد کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

"سمجھ جاؤ گے ابھی۔" میں بولی۔ "پہلے وہ باتیں تو سمجھ لو جو میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں۔ فریب نظر میں مبتلا کرنے کو نظربندی بھی کہتے ہیں۔ یعنی وہ نظر آنے لگے جس کا حقیقت میں کوئی وجود نہ ہو۔ انہیں تم شیطانی علوم بھی کہہ سکتے ہو۔ یہ علوم جاننے والے ان کے ذریعے اپنے دشمنوں کو ہر طرح نقصان پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی سمجھ رہا ہوں خاتون! آپ کہیں۔" شہزاد نے اقرار میں گردن ہلائی۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ بدی کی کچھ قوتیں عرصہ دراز سے مجھے نقصان پہنچانے کے درپے ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"لیکن پہلے تو کبھی آپ نے یہ ذکر نہیں کیا۔"

"اس کو چھوڑو کہ ذکر کیا تھا پہلے یا نہیں' میں نے تم سے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ کلکتے میں میری کوٹھی کے اندر آگ لگ جانا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

"جی ہاں خاتون! مجھے یاد آ گیا' وہ جب کوٹھی میں آگ لگنے والی تھی تو سرخ لبادے میں ہمیں ایک عورت نظر آئی تھی۔ وہ کوئی پُراسرار عورت تھی جو ہم سے کہہ رہی تھی کہ تم لوگوں سے میری دشمنی نہیں اس لئے میں تمہیں جان بچانے کا موقع دے رہی ہوں ورنہ مارے جاؤ گے' میری دشمنی ان سے ہے' تم سے نہیں۔"

شہزاد نے یہ سب کچھ کہہ کر میری مشکل خود بخود آسان کر دی تھی۔ پھر میں نے اسے یاد دلایا۔ "اس کے بعد جب کوٹھی جل گئی تھی تو تم نے مجھ سے سرخ لبادے والی پُراسرار عورت کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے اور یہ کہ اس سے میری کیا دشمنی ہے' یاد آیا؟"

"یاد کیوں نہ ہوتا خاتون! لیکن اس وقت وہاں اور بھی ملازمین موجود تھے جو آپ کے اصل نام سے واقف نہیں تھے اور آپ ان سے رازداری برتنا چاہتی تھیں۔ ان کے سامنے شاید اسی لئے آپ نے میری بات کا جواب دینے سے گریز کیا تھا۔ پھر اس کے بعد کبھی اس موضوع پر آپ سے گفتگو ہی نہیں ہوئی۔"

"تو اب تم سمجھ گئے نا کہ کچھ شیطانی قوتیں میری دشمن ہیں جو ہر طرح سے مجھے نقصان پہنچانے پر تلی ہوئی ہیں۔" میں نے کہا' پھر اصل موضوع پر آ گئی۔ "سو پُراسرار شیطانی قوتوں کے مالک میرے انہی دشمنوں نے مجھے ذلیل و رسوا کرنے کی غرض سے ایک ایسا وار کیا جس کا زخم میرے سینے میں اب تک ہرا ہے۔ انہوں نے ایسا حربہ آزمایا کہ میں اندر ہی اندر تڑپتی سلگتی رہوں مگر زبان نہ کھول سکوں اور اگر میں زبان کھولوں بھی تو کسی کو میری بات پر یقین نہ آئے۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے خود بخود میرا لہجہ دکھ سے بھر گیا۔

غالباً شہزاد نے بھی میرے چہرے پر ابھرنے والے دکھ کی پرچھائیں دیکھ لی تھیں وہ اسی لئے اظہار ہمدردی کرنے لگا۔ "کم از کم آپ مجھے تو اپنے دکھ سے آگاہ کر ہی دیتیں خاتون!"

"معلوم ہے تمہیں شہزاد کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ تم شاید .... تم بھی میری بات پر یقین نہ کرتے۔ آج بھی اتنے عرصے کے بعد میں نے تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنے کی اس لئے ہمت کی ہے کہ اب تک خود تم بھی میرے ساتھ رہ کر متعدد پُراسرار واقعات کا مشاہدہ کر چکے ہو۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ میں اب یہ صورت حال مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ اب بھی چاہے تم میری باتوں پر یقین کرو یا نہ کرو مگر مجھے جو کچھ کہنا ہے' ضرور کہوں گی۔ تو سنو شہزاد! میرے اور تمہارے درمیان جو رشتہ خلوص پہلے استوار تھا' وہ آج بھی برقرار ہے۔ اس رشتے میں گناہ کا پیوند نہیں لگا۔ مجھے ذلت و رسوائی سے ہمکنار کرنے اور ذہنی اذیت دینے کی خاطر میرے دشمنوں نے تمہیں یہ حسین فریب دیا ہے کہ تم میرے ساتھ قرب کی تمام منزلیں طے کر چکے ہو اور یہ کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی حجاب نہیں رہا۔ تم نے اب تک قرب کے تمام مراحل اسی پُراسرار عورت کے ساتھ طے کئے ہیں جو تمہیں ایک مرتبہ کوٹھی میں آگ لگنے سے پہلے نظر آئی تھی' جس نے مجھ سے اپنی دشمنی کا اظہار کیا تھا۔ اسی لعنتی عورت نے تمہیں متعدد بار اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور یہ فریب دیا کہ تم اس کے ساتھ نہیں بلکہ میرے ساتھ ہو۔ کلکتے سے دہلی تک سفر کے دوران میں بھی وہ یہی گھناؤنا کھیل کھیلتی رہی۔ تم نے مقتول راجہ سکھ دیو اور اس انگریز ہم سفر فلپ کے ساتھ جسے داد عیش دیتے دیکھا تھا' وہ میں نہیں' وہی خبیث عورت تھی۔ یہ خوفناک کھیل وہ ایک عرصے سے میرے ساتھ کھیل رہی ہے۔ اس گھر میں بھی وہ تمہارے ساتھ یہی کھیل کھیل چکی ہے۔ ایک روز میں گھر میں نہیں تھی اور تم آ گئے تھے۔ گھر میں اس وقت میرے بجائے دلاری تھی۔ اس لعنتی عورت نے تمہیں اور دلاری دونوں کو فریب نظر میں مبتلا کر دیا۔ دلاری تمہیں اپنا محبوب سلیم سمجھی اور تم یہ سمجھے کہ وہ دلاری نہیں' میں ہوں۔ پھر جب میں آئی تو یہ طلسم ٹوٹ گیا تھا اور تم میرے جسم پر ساڑھی نہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ پھر وہی سوتی ساڑھی تمہیں دلاری باندھے ہوئے نظر آئی تھی۔" میں خاموش ہو گئی۔

"جی .... جی ہاں خاتون!" شہزاد کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ "تو وہ .... وہ دلاری تھی' آپ کی ملازمہ' جس کے ساتھ میں .... میں.........." شہزاد مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

"ہاں شہزاد! یہی حقیقت ہے۔ اس لعنتی عورت کا نام چمپا ہے جو تمہیں اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر مجھ سے قرب کا فریب دیتی آئی ہے۔ اسی نے راجہ سکھ دیو کو قتل کر کے مجھے پھنسوانے کی کوشش بھی کی

تھی۔ راجہ سکھ دیو کو میں نے نہیں، چمپا نے قتل کیا تھا مگر نظربندی کے سبب تمہیں، فلپ اور اس کی بیوی مارگریٹ کو نظر یہی آیا کہ چمپا نہیں، میں راجہ کو قتل کر رہی ہوں۔"

"یہ .... یہ تو خاتون! بڑی خطرناک بات ہے۔ آج سے پہلے تو مجھے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا۔ اس طرح تو وہ .... وہ پُراسرار عورت چمپا آپ کو کسی بھی جرم میں پھنسوا سکتی ہے، کوئی بھی ایسا جرم جو آپ نے نہ کیا ہو۔ یہ .... یہ تو آپ کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے اور .... اور نادانستگی میں خود میں بھی اس ظلم کا ذریعہ بنا رہا۔ آپ کے صبر اور حوصلے کو داد دینا پڑ رہی ہے خاتون کہ .... کہ آپ نے قطعی بے گناہ ہونے کے باوجود ایک عرصے تک میری گستاخیوں کو برداشت کیا۔ خاتون! مجھے معاف کر دیجئے، میں .... میں سخت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو ذہنی اذیت برداشت کرنا پڑی۔" شہزاد کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی۔ اس نے میری باتوں پر یقین کر لیا تھا۔

"تمہیں معافی مانگنے یا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم ایک فریب کا شکار ہوئے تھے اور مجھے اس کا علم تھا ورنہ میں خود یہ سب کچھ برداشت نہ کرتی۔ یقین کرو شہزاد کہ میں نے کبھی اس سلسلے میں تمہیں قصوروار نہیں سمجھا۔ مجھے تو خوشی یہ ہے کہ تمہیں میری باتوں پر یقین آ گیا۔" میں نے کہا۔

"کبھی کبھی اس شیطان صفت پُراسرار عورت چمپا کی حد سے بڑھی ہوئی بے حجابیاں دیکھ کر مجھے بھی شرم آنے لگتی تھی۔ اب .... اب یہ حقیقت کھلی کہ اس کا مقصد کیا تھا، توبہ توبہ، کتنا بڑا فریب کھایا ہے میں نے۔ افسوس کہ اسی فریب کے زیر اثر آپ جیسی نیک خاتون کے لئے میں نے کیا کیا سوچا، کیا کیا گمان کیا۔" شہزاد کے لہجے سے اظہار ندامت ہو رہا تھا۔

"جو بھی ہوا، اسے بھول جاؤ۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "اور ہاں ایک بات اپنے ذہن میں رکھو، میں یہ نہیں چاہتی کہ چمپا تمہاری بھی دشمن ہو جائے اور تمہیں کوئی نقصان پہنچا دے۔ اس سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ تم اس پر ہرگز یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تمہیں اس کی حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ وہ آئندہ بھی تمہیں فریب میں مبتلا کر سکتی ہے۔"

"لیکن خاتون! وہ اپنی شیطانی قوتوں کے ذریعے بھی تو یہ معلوم کر سکتی ہے کہ میں اس کی حقیقت سے آگاہ ہو چکا ہوں۔"

"ہاں اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے شہزاد کی بات سے اتفاق کیا۔ "وہ خواہ آگاہ ہو جائے تو ہونے دو لیکن تم خود اس کا اظہار نہیں کرو گے۔ وہ اگر اس بات سے آگاہ ہو گئی کہ اس کے فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے تو پھر وہ شاید آئندہ تمہیں اپنا آلہ کار نہیں بنائے گی اور یوں اس سے خود بخود تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔"

اس روز شہزاد کو اعتماد میں لے کر میں نے اپنے ضمیر کے بوجھ میں خاصی حد تک کمی محسوس کی۔ شہزاد چلا گیا تو میں سوچنے لگی، کاش راجہ استاد اور ہمایوں کو بھی کبھی میں یقین دلا سکوں کہ وہ بھی شہزاد کی طرح فریب کا شکار ہوئے ہیں۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد جب اپنی عادت کے مطابق میں گھر کے صحن میں ٹہل رہی تھی تو میرا

نکھوں میں اپنے دشمن ژیان کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ آج رات اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی تو برے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کے شعلے سرد پڑ جاتے ہیں۔ اس کے بعد بس بڑے مہاراج اور نتی چمپا سے حساب چکانا باقی رہ جاتا۔ ہموار میدانوں کی طرف سے آنے کے بعد ان دونوں نے میرے م و روح پر بڑے چرکے لگائے تھے۔ میں انہیں نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ابھی میری نصیت کے اسرار سے بھی پردہ نہیں اٹھا تھا۔ عظیم مہین کی پُراسرار سرگوشیوں کو بھلا میں کیسے بھول سکتی ی۔ میں اگر بلند پہاڑوں کی وحشیانہ معاشرت اور روایات کا حصہ نہیں تھی تو پھر کون تھی؟ اپنی تلاش کا سفر ابھی جاری تھا۔ عظیم مہین کی سرگوشیوں کے مطابق مجھ پر ابھی میری شخصیت کے بہت سے بھید ھلنا باقی تھے۔

دیر تک میں یہی سوچتی رہی کہ شاید اپنے دشمن ژیان پر غالب آ جاؤں اور اس رات کی کوکھ سے برے لئے ایک نیا سورج طلوع ہو۔ اسی دوران دل کے کسی گوشے میں یہ حسرت بھی جاگی، کاش میں پنے دشمن ژیان کا سر اسی میدان میں کاٹتی جہاں اس نے میرے باپ سردار اشم کا سر قلم کیا تھا لیکن اپنی ں آرزو کو میں نے تھپکیاں دے کر سلا دیا۔ یہ حسرت مجھے اپنی منزل سے بہت دور لے جا سکتی تھی۔ اید ایسا ممکن نہیں تھا۔ حسرت تو میری یہ بھی تھی کہ اپنی ماں کے جسم کی طرح ژیان کے جسم کو بھی ں کے پودے پر بٹھا دیتی اور پھر وہ پودا بڑھتے بڑھتے اس کے جسم کو چھیدتا ہوا کھوپڑی کی ہڈی توڑ کر باہر جاتا لیکن ایک ہی شخص کو دو مرتبہ کس طرح قتل کیا جا سکتا ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اپنے دشمن ، بار بار قتل کرتی، ہر مرتبہ ہولناک عذابوں میں گرفتار کر کے مارتی، اس کے جسم کو روندتی اور رگیدتی ہتی۔ پھر شاید میری بے چین روح کو قرار آ جاتا۔

☆======☆======☆

سالار اکبر نے اس رات عادل کو ساتھ لے کر گیارہ بجے تک پہنچ جانے کو کہا تھا۔ میں اس سے ریباً آدھے گھنٹے پہلے ہی پوری طرح تیار ہو گئی۔ احتیاطاً میں نے اپنی شرٹ کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ ی پہن لی تھی۔ تمام تر تیاری کرنے کے بعد بے چینی سے میں سالار اکبر کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔

وقت کو تو جس رفتار سے گزرنا تھا اسی سے گزرا، ہاں مجھے سست رفتاری کا احساس ضرور ہوا۔ الار اکبر اپنے وقت ہی پر آیا تھا اور اس کے ساتھ عادل بھی تھا۔ ان دونوں کے جسموں پر بھی میری رح سیاہ چست لباس تھا۔ عادل کے شانے سے کینوس کا ایک تھیلا بھی لٹک رہا تھا۔

"اس تھیلے میں کیا ہے پنڈت جی!" میں نے عادل سے پوچھا۔

"مت پوچھو، اس میں بڑے بڑے عجائبات ہیں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ایک عجوبہ ابھی مارے حوالے بھی کیا جائے گا جو سالار ہی کی ایجاد ہے۔" یہ کہہ کر عادل نے احتیاط کے ساتھ تھیلا انے سے اتارا۔ پھر اسے کھول کر ریوالور سے مشابہہ ایک ہتھیار نکال کے مجھے تھما دیا۔ "سالار اکبر نے ں کا نام سائلنٹ ڈیتھ، یعنی خاموش موت رکھا ہے۔ اس کا میکنزم تقریباً ریوالور کی طرح ہے، مگر اس کی اسے گولیاں نہیں، فولادی سوئیاں نکلتی ہیں۔ یہ سوئیاں ایک خطرناک تیز اثر زہر میں بجھی ہوئی ہیں۔

ادھر سوئی آدمی کے جسم میں پیوست ہوتی ہے' ادھر تیز اثر زہر خون میں شامل ہو کر اپنا کام دکھا دیتا ہے۔"

"واقعی پنڈت جی! یہ تو زبردست ایجاد ہے۔" میں نے سالار اکبر کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم دونوں کے پاس بھی ایسے ہی ہتھیار ہیں۔" سالار اکبر نے بتایا۔ "اس کی موجودگی میں ریوالور کی ضرورت نہیں۔ فولادی سوئی کی رینج اتنی ہی ہے جتنی ریوالور کی گولی کی ہوتی ہے۔ ریوالور میں چھ گولیاں ہوتی ہیں' اس میں چوبیس فولادی سوئیاں ہیں۔"

میں اس ہتھیار کا جائزہ لینے لگی۔ ٹریگر کی بجائے اسی جگہ ایک بٹن لگا ہوا تھا۔ میں نے تصدیق ضروری سمجھی۔ "فولادی سوئیاں اسی بٹن کو دبانے سے نکلتی ہوں گی؟"

"جی ہاں معبلہ!" سالار اکبر نے جواب دیا۔ "ریوالور کے مقابلے میں اس کی افادیت یہ ہے کہ اس کے چلنے سے دھماکہ نہیں ہوتا۔"

"شاید اسی لئے آپ نے اسے خاموش موت کا نام دیا ہے۔" میں بولی۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ میں نے اس کا فوراً ہی اظہار بھی کر دیا۔ "بے ہوشی کی دوا بھی خون میں شامل ہو کر ہی اپنا اثر کرتی ہے' خواہ وہ خوراک میں شامل ہونے کے بعد خون کا حصہ بنے اور آدمی بے ہوش ہو جائے یا براہ راست اسے خون میں شامل کر دیا جائے۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ فولادی سوئیوں کے ذریعے زہر کی بجائے بے ہوشی کی دوا بھی آدمی کے جسم میں داخل کی جا سکتی ہے' یعنی زہر سے مرنے کی بجائے آدمی اس دوا کی وجہ سے صرف بے ہوش ہو جائے۔" اپنی بات پوری کر کے میں سالار اکبر کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

سالار اکبر نے میری اس تجویز کی تعریف کی اور کہا۔ "یقیناً ایسا ممکن ہے معبلہ! میں یہ تجربہ ضرور کروں گا۔ آپ کا ذہن خاصا زرخیز معلوم ہوتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چل دینا چاہئے سالار!" عادل بولا اور تھیلا دوبارہ اپنے شانے سے لٹکا لیا۔

"ہاں چلو۔" سالار اکبر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

وہ دونوں میرے ہی کمرے میں بیٹھے تھے۔ ذرا ہی دیر کے بعد ہم گھر کے باہر کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ گئے۔ دلاری نے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ ڈرائیونگ سیٹ عادل نے سنبھال لی تھی۔ برابر والی اگلی سیٹ پر اس نے تھیلا رکھ دیا تھا۔ میں اور سالار اکبر پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔

پہاڑ گنج سے جب کار اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے لئے روانہ ہوئی تو میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔

عادل نے ایسا راستہ اختیار کیا تھا کہ ہمیں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے سامنے سے نہیں گزرنا پڑا تھا۔ ہم براہ راست گیسٹ ہاؤس کے عقب میں واقع سڑک تک پہنچ گئے تھے۔ کار کو عادل نے سڑک کے

نارے روک دیا۔ اس وقت سرچ لائٹس سے عمارت کے عقبی حصے کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ یہ میں پہلے ہی کھ چکی تھی کہ محافظ صرف اس چھوٹے سے میدان کا جائزہ لیتے تھے جو عمارت کے عقب میں تھا۔ سرچ ائٹس کے دائرے سڑک تک نہیں پہنچتے تھے۔

ہم تینوں آہستگی کے ساتھ کار سے اتر چکے تھے' لیکن میدان کی طرف بڑھنا شروع نہیں کیا تھا جسے بور کر کے ہم عمارت تک پہنچ سکتے تھے۔ آگے نہ بڑھنے کی وجہ روشنی اور متحرک لکیریں تھیں۔ ہمیں سرچ لائٹس کے بجھنے کا انتظار تھا۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد عمارت کے عقب میں تاریکی پھیل گئی تو ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ قدم آگے بڑھاتے ہوئے میری نظریں عمارت ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ عمارت کے اندر مکمل تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ عمارت کی کوئی بھی کھڑکی مجھے روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"سالار!" اچانک عادل کی مدھم آواز ابھری۔ "اس اندھیرے میں یہ کس طرح پتا چلے گا کہ کون کھڑکی کھلی ہوئی ہے؟"

"میرے پاس ٹارچ موجود ہے۔" سالار نے بھی آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"لیکن ٹارچ جلانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" میں بول اٹھی۔ "اوپر سے کوئی محافظ بھی ٹارچ کی شنی دیکھ کر ہماری طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔"

"یہ ضروری نہیں ہے معبلہ کہ سرچ لائٹس سے میدان کا جائزہ لینے کے بعد بھی محافظ نیچے جھانک دیکھتے رہیں۔ اگر ایسا ہو بھی تو بہرحال یہ خطرہ ہمیں مول لینا ہی پڑے گا۔"

سالار اکبر کی دلیل میں وزن تھا۔ محافظ بلا سبب اندھیرے میں جھانک کے کیا کرتے' اندھیرے میں یں نظر بھی کیا آتا میں اس لئے خاموش ہو گئی۔

میرے اندر اندھیرے میں دیکھنے کی قوت بھی موجود تھی۔ میں نے سوچا' اگر اس وقت میری یہ ت بیدار ہو جائے تو ٹارچ جلانے کا خطرہ مول نہیں لینا پڑے گا۔ اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ جب بھی ے کسی ایسی صورت حال کا سامنا تھا تو خود بخود یہ قوت بیدار ہو جاتی تھی اور اندھیرے میرے لئے روشن جاتے تھے۔

ہم اس عمارت تک پہنچے ہی تھے کہ بس اچانک ہی اندھیرے مجھ پر روشن ہو گئے۔ میری پہلی نظر ل پر پڑی جو تھیلے سے رسی کا ایک لچھا نکال کر کھول رہا تھا۔ اسی رسی کے ایک سرے پر لوہے کا آنکڑا رھا ہوا تھا۔ میں نے اوپر نگاہ اٹھائی اور تیزی کے ساتھ عمارت کی کھڑکیوں کا جائزہ لینے لگی۔ اسی وقت ے خیال آیا کہ کہیں اس دوران سالار اکبر ٹارچ نہ جلا لے۔ میں اسی لئے بولی۔ "سالار! ابھی آپ ٹارچ جلائیے گا۔"

"مگر کیوں معبلہ! ہمارے پاس وقت کم ہے۔ سرچ لائٹس کے دوبارہ حرکت میں آنے سے پہلے یں عمارت کے اندر داخل ہونا ہے۔" سالار اکبر نے کہا۔

"ذرا ٹھہریں۔" میں یہ کہہ کر چند قدم پیچھے ہٹی تاکہ واضح طور پر کھڑکیوں کا جائزہ لے سکوں۔

سالار اکبر کو میں یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اندھیرے کے باوجود میں جس طرف بھی نگاہ اٹھاتی ہوں' مجھے ہر شے واضح نظر آنے لگتی ہے۔

"آپ کیا دیکھ رہی ہیں معبلہ! وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔" سالار اکبر نے مجھے ایک مرتبہ پھر مخاطب کیا۔

مجھے جو دیکھنا تھا دیکھ چکی تھی۔ نامہرباں وقت شاید ابھی مجھے مزید آزمائشوں میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ عمارت کی ساری عقبی کھڑکیاں بند تھیں۔ میں نے کسی متبادل اقدام کے بارے میں پہلے سے کچھ سوچا ہی نہیں تھا اس لئے چکرا کر رہ گئی۔

"میں ٹارچ جلا رہا ہوں معبلہ!" میں نے ایک بار پھر سالار اکبر کی آواز سنی۔

"فضول ہے سالار!" ناامیدی کے ان لمحات میں بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے لیکن فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں جلدی سے بولی۔ "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری ہی کھڑکیاں بند ہیں' کوئی بھی کھڑکی کھلی ہوئی نہیں لگتی۔"

"یہ محض آپ کا اندازہ ہے معبلہ! یقینی طور پر تو اسی وقت کوئی بات کہی جا سکتی ہے جب ٹارچ جلا کر جائزہ لے لیا جائے۔"

"لے لیں جائزہ۔" میں نے بے دلی سے کہا۔ کھڑکیاں بند دیکھ کر جیسے میرے ذہن کی بھی ساری کھڑکیاں بند ہو گئی تھیں۔ میرا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

سالار اکبر نے ٹارچ جلائی اور پھر اس کا رخ عمارت کی طرف کر دیا۔ ٹارچ کا دائرہ دیوار کے ساتھ حرکت کرتا ہوا ایک بند کھڑکی پر پڑا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ میری نگاہ یہ جاننے کے باوجود اوپر اٹھی ہوئی تھی کہ تمام کھڑکیاں بند ہیں۔ روشن دائرے کی تیز حرکت کے ساتھ ساتھ میں بھی دیوار کا جائزہ لے رہی تھی۔ دیوار قریبی عمارت تک پہنچ کر ختم ہو گئی۔ اس عمارت کی دیوار کا رنگ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی دیوار سے مختلف تھا۔ میں نے قریبی عمارت کی چھت کی طرف دیکھا اور اسی لمحے میرے ذہن میں روشنی سی آ گئی۔ اس عمارت کی چھت اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی چھت سے ایک منزل بلند تھی۔

"واپس چلیں سالار!" میں نے پُرجوش لہجے میں سالار اکبر کو مخاطب کیا۔

"ہاں اب تو واپس ہی چلنا پڑے گا۔" سالار اکبر کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ اس نے شاید میری آواز کے جوش کو محسوس نہیں کیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہم سڑک تک پہنچ گئے۔ سالار اکبر کار کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میں بول اٹھی۔

"ٹھہریں سالار!"

اسی وقت اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی چھت پر موجود سرچ لائٹس حرکت میں آ گئیں۔

"معبلہ! آپ نے بروقت واپسی کا فیصلہ کیا۔" سالار اکبر نے کہا۔ "اگر ہمیں واپسی میں ذرا سی بھی تاخیر ہو جاتی تو محافظوں کی نظر میں آ گئے ہوتے لیکن اب آپ یہاں کیوں رکنا چاہتی ہیں' کیا دیکھ رہی ہیں؟" اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہم اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخل ہو سکتے ہیں۔" میری آواز اب بھی پُرجوش تھی۔

"وہ کس طرح معبلہ!" سالار اکبر حیرت سے بولا۔

"دائیں جانب وہ عمارت دیکھ رہے ہیں؟" میں نے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے قریب دوسری عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔" سالار اکبر نے اس طرف نگاہ اٹھائی۔

"ہم اس عمارت کی چھت پر چڑھ کر اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی چھت تک پہنچ سکتے ہیں۔" میں نے بتایا۔

"لیکن معبلہ! وہ عمارت تو اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی عمارت سے خاصی بلند ہے۔"

"تو کیا ہوا' ہم رسی کی مدد سے برابر والی چھت پر اتر سکتے ہیں۔"

"اور وہاں موجود مسلح محافظوں کو آپ بھول ہی گئیں؟"

"نہیں' بھولی نہیں ہوں۔ چھت پر اترنے سے پہلے ہی ہم انہیں موت کی نیند سلا دیں گے۔ انہیں زہر میں بجھی فولادی سوئیوں کے ذریعے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔"

"ہاں یہ ممکن تو ہے معبلہ!" سالار اکبر نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ "مگر انہیں اسی وقت نشانہ بنانا پڑے گا جب چھت پر روشنی ہو۔ ظاہر ہے کہ ہم اندھیرے میں ان کا نشانہ کس طرح لے سکتے ہیں۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب وہ سرچ لائٹس آن کریں۔"

میں سالار اکبر کو کیا بتاتی کہ محافظوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے چھت پر روشنی ہونا ضروری نہیں تھا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود محافظوں کو میں موت کی نیند سلا سکتی تھی لیکن ظاہر ہے میرے لئے اس بات کا اظہار سالار اکبر سے کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے اس کی بات سے اختلاف نہیں کیا۔

سرچ لائٹس کے ذریعے میدان کے صرف اس حصے کا جائزہ لیا جا رہا تھا جو اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے عقب میں تھا۔ اس میدان کا کچھ حصہ قریبی عمارت تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم سڑک پر آگے بڑھتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے۔

"میں تو آج کی مہم سے مایوس ہی ہو گیا تھا معبلہ! مگر تم نے ایک راہ نکال ہی لی۔" عادل خاصی دیر بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔

"پنڈت جی! میں نے ان کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا نا کہ یہ بڑے زرخیز ذہن کی مالک ہیں۔" سالار اکبر بھی بول اٹھا۔ "ہمارے ذہن میں یہ خیال آیا ہی نہیں تھا۔"

"یہ محض اتفاق ہے سالار!" میں نے کہا۔ "ورنہ تو حقیقت یہ ہے کہ مایوس تو میں بھی ہو گئی تھی۔"

اس وقت تک ہم عمارت کے عقب میں اس کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی کوئی سرکاری عمارت ہی معلوم ہوتی تھی جس میں شاید کسی محکمے کے دفاتر تھے۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی طرح اس عمارت کے اندر بھی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

"پنڈت جی! رسی مجھے دے دو' کمند میں ڈالوں گی۔" میں نے عادل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میرا خیال ہے معبلہ کہ پنڈت جی ہی کو یہ کام کرنے دو۔ انہیں کمند ڈالنے میں خاصی مہا حاصل ہے۔" سالار اکبر نے مجھ سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں بولی۔ "مگر انہیں صرف ایک موقع دیا جائے گا۔ اگر یہ ناکام رہے تو پھر کوشش کروں گی۔"

"منظور ہے۔" عادل بول اٹھا۔ "حالانکہ ضروری نہیں' پہلی ہی مرتبہ کامیابی ہو جائے۔"

عادل نے آنکڑے کی طرف سے رسی کو گھمایا پھر اسے چھت کی طرف اچھا دیا۔ آنکڑا عمارت چھت تک نہ پہنچا سکا اور دیوار سے ٹکرا کر نیچے آ رہا۔ بلندی خاصی تھی اور اندھیرا بھی تھا۔ ایسی صور میں عادل کی ناکامی تعجب خیز بہرحال نہیں تھی۔

"تم کامیاب نہیں ہوئے اس لئے اب میں کوشش کرتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے آگے ب کر آہنی آنکڑا اٹھالیا۔

اب تک میری اندھیرے میں دیکھنے کی قوت بیدار تھی۔ میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر چھت طرف دیکھا اور آنکڑے کو فضا میں گردش دینے لگی۔ میرے لئے یہ کھیل کوئی نیا نہیں تھا۔ بچپن ہی مجھے اس کھیل کا تجربہ تھا۔ میں اس عمارت سے بھی بلند پہاڑیوں اور چٹانوں پر کمندیں پھینکتی آئی تھی۔ مج عرصہ دراز کے بعد ایسا موقع ملا تھا اس لئے عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ آنکڑے کو فضا میں گرد دیتے دیتے میں نے رسی کو تھوڑی سی ڈھیل دی اور پھر پوری قوت سے اس عمارت کی چھت کی طرف اچھال دیا۔ میں پہلی ہی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ آنکڑا چھت کی منڈیر میں پھنس گیا تھا۔ رسی کھینچ کر میں نے اندازہ لگایا کہ آنکڑا نکلے گا تو نہیں۔

"زندہ باد!" سالار اکبر بے اختیار بولا۔ "اندھیرا ہونے کے باوجود پہلی ہی کوشش میں آپ کا کامیابی حیرت انگیز ہے معبلہ!"

"شکریہ سالار!" میں نے کہا۔ "اب اوپر بھی پہلے میں ہی چڑھتی ہوں۔"

"نہیں معبلہ! پہلے مجھے اوپر جانے دیں۔ چھت پر پہنچنے کے بعد میں رسی ہلا کر اشارہ دوں گا کہ کوئی خطرہ نہیں تو پھر آپ چڑھ جایئے گا۔ آپ کے بعد پنڈت جی اوپر آئیں گے۔" میں نے سالار اکبر کی بات مان لی اور پھر وہ رسی کے ذریعے اوپر چڑھنے لگا۔ اب میرے پاس صرف عادل رہ گیا تھا۔

"معبلہ! تمہیں تو رسی کے ذریعے چڑھنے میں کوئی پریشانی نہیں ہو گی؟" عادل نے مجھ سے پوچھا۔

عادل کے اس سوال پر میرا جی ہنسنے کو چاہا' مگر میں نے اپنی ہنسی ضبط کر لی اور بولی۔ "اگر پریشانی ہوئی بھی تو کیا کیا جا سکتا ہے' جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

میرے اندازے کے مطابق سالار اکبر نے چھت تک پہنچنے میں خاصا وقت لگایا تھا۔ میں اس سے چوتھائی وقت میں اوپر پہنچ سکتی تھی۔ اوپر پہنچنے کے بعد جب سالار اکبر نے رسی ہلائی تو میں آگے بڑھی۔ اسی وقت عادل نے کہا۔ "معبلہ! تم بے فکر ہو کر چڑھنا میں نیچے کھڑا ہوں۔"

کچھ کہے بغیر میں نے رسی تھام لی اور پھر دیوار پر قدم رکھتی ہوئی انتہائی تیزی کے ساتھ چھت پر پہنچ گئی۔

منڈیر سے میں آہستگی کے ساتھ چھت پر کودی تو سالار اکبر حیرت سے بولا۔ "کمال کر دیا آپ نے' میں نے ابھی چند ہی لمحے پہلے تو رسی ہلا کر اشارہ دیا تھا اور آپ اوپر بھی آ گئیں۔"

"میں اس لئے ذرا جلدی چڑھ آئی کہ آپ کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔"

سالار اکبر نے ایک بار پھر رسی ہلا کر عادل کو اوپر چڑھنے کا اشارہ دیا۔ عادل نے اوپر پہنچنے میں سالار اکبر سے بھی زیادہ دیر لگائی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ اس کے شانے سے بھاری تھیلا بھی لٹک رہا تھا۔ عادل نے بھی میرے تیزی سے اوپر چڑھنے پر اظہار حیرت کیا تھا۔

چھت کی منڈیر چار فٹ سے زیادہ بلند نہیں لگتی تھی۔ اب ہم بائیں جانب بڑھ آئے تھے جہاں سے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی چھت کو جھانک کر دیکھا جا سکتا تھا۔ اس عرصے میں سرچ لائٹس بجھ چکی تھیں۔ نیچے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی چھت پر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

"معلوم نہیں چھت پر کتنے محافظ ہوں؟" سالار اکبر دھیمی آواز میں بولا۔ "اس وقت تو اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔" اس کا انداز خودکلامی کا سا تھا۔

سالار اکبر جو معلوم کرنا چاہتا تھا' میں اس کا جواب دے سکتی تھی کیونکہ مجھے وہ چاروں محافظ واضح نظر آ رہے تھے۔ چھت پر دو سرچ لائٹس بھی رکھی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں سب کچھ دن کے اجالے کی طرح دیکھ رہی تھی۔ "خاموش موت" موجود تھی۔ میں نے اسے جیب سے نکال لیا۔ اگر ان چاروں محافظوں کو ٹھکانے لگائے بغیر اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخلہ ممکن ہوتا تو میں ہرگز ایسا نہ کرتی کیونکہ میرے نزدیک وہ بے گناہ تھے۔

وہ چاروں محافظ قریب قریب ہی بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کی پشت میری طرف تھی۔ پہلے میں نے اسی کا نشانہ لیا اور بٹن دبا دیا۔ اسی کے ساتھ تیز سنسناہٹ ابھری۔

"یہ .... یہ آپ کیا کر رہی ہیں معبلہ! کہیں آپ سے سائلنٹ ڈیتھ کا بٹن تو نہیں دب گیا؟" سالار اکبر مجھ سے مخاطب ہوا۔ یقیناً اس نے ہتھیار کی نال سے فولادی سوئی نکلنے کی تیز سنسناہٹ سن لی تھی۔

"ہاں' میں اسے چلا کر دیکھ رہی تھی تاکہ وقت پر دقت نہ ہو۔" میں نے اس طرح پرسکون آواز میں کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہوں یہ کہتے ہوئے میری نگاہ محافظوں ہی پر جمی ہوئی تھی۔ جس محافظ کو میں نے نشانہ بنایا تھا' وہ منہ کے بل مونڈھے سے نیچے گر پڑا تھا۔ بقیہ تینوں محافظ اسے پکڑ کر اٹھا رہے تھے۔ یقیناً وہ تینوں یہ نہیں سمجھ سکے ہوں گے کہ ان کے ساتھی کو اچانک کیا ہوا۔ وہ اس سے بھی بے خبر تھے کہ ایک اڑتی ہوئی موت ان کی طرف بھی آنے والی تھی وہ بھی شکار کئے جانے والے تھے۔ فولادی سوئی پر لگا ہوا زہر واقعی انتہائی تیز اثر تھا۔ مرنے والا چیخ بھی نہیں سکا تھا۔

"معبلہ! ذرا احتیاط سے۔" سالار اکبر نے مجھے تاکید کی۔ "اس کی نال کا رخ سامنے ہی رکھئے گا۔"

"میں تو بس یوں ہی اندازے سے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی چھت پر فولادی سوئیاں پھینک کر رہی ہوں' کیا خبر کوئی محافظ ان کی زد میں آ جائے۔" یہ کہتے ہی میں نے ایک اور محافظ کا نشانہ لے کر دبا دیا۔ فولادی سوئی اس محافظ کے پہلو میں پیوست ہو گئی تھی۔

"یہ خطرناک ہے معبلہ!" سالار اکبر پھر بول اٹھا۔ "ہمیں بھی چھت پر اترنا ہے' کوئی زہریلی ہمارے بھی چبھ سکتی ہے۔ آپ نے شاید پھر بٹن دبا دیا ہے۔"

پھر میں نے یکے بعد دیگرے بقیہ دونوں محافظوں کو بھی موت کی نیند سلا دیا۔ سالار اکبر کی با میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ "خاموش موت" کو اب میں نے پھر اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب کی ضرورت نہیں تھی۔

"معلوم نہیں وہ زہریلی سوئیاں چھت پر کہاں گری ہوں گی؟" سالار اکبر بڑبڑایا۔

"ارے کچھ نہیں ہو گا سالار! آپ مطمئن رہیں۔" میں نے کہا' پھر عادل سے مخاطب ہوئی۔ "تمہارے پاس ہے نا؟"

"ہاں' کیوں؟" عادل بولا۔

"مجھے دو' منڈیر میں آنکڑا پھنسا کر اس کو نیچے چھت پر بھی تو ڈالنا ہے۔"

"ابھی نہیں معبلہ! پہلے چھت پر موجود محافظوں کو ٹھکانے لگانا ضروری ہے۔ سرچ لائٹس ہونے دیجئے۔" سالار اکبر نے کہا۔

میں عجیب الجھن میں گرفتار ہو گئی۔ سالار اکبر کو میں یہ کیسے بتاتی کہ اب چھت پر سرچ لائٹس کرنے والا کوئی محافظ زندہ نہیں بچا تھا۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ جب سرچ لائٹس آن ہو جاتیں محافظوں کو نشانہ بنایا جاتا۔ میں خاموش ہو گئی اور سوچا' دیکھوں کب تک سالار اکبر سرچ لائٹس ہونے کا انتظار کرتا ہے۔

وقت گزرتا رہا مگر اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی چھت پر تاریکی چھائی رہی۔

"اس مرتبہ محافظوں نے بہت دیر لگا دی۔ اب تک انہیں سرچ لائٹس آن کر دینا چاہئے تھیں" سالار اکبر آخرکار بول ہی اٹھا۔

میں موقع دیکھ کر بولی۔ "لگتا ہے سالار کہ چھت پر موجود محافظ میری پھینکی ہوئی فولادی سوئ شکار ہو چکے ہیں۔"

"لیکن .... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے معبلہ!"

"اتفاقاً بھی تو بہت کچھ ہو جاتا ہے سالار!"

"میں کسی ایسے اتفاق پر یقین نہیں کر سکتا۔" سالار اکبر کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"آپ کی مرضی! اور کچھ دیر انتظار کر لیں لیکن مجھے یہی محسوس ہو رہا ہے کہ چھت پر موجو محافظ زندہ نہیں بچا ہے۔" میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ "اگر آپ اس اتفاق کو تسلیم کرنے پ نہیں ہیں تو نیچے چھت پر ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھ لیں۔"

"معبلہ! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ مجھے آپ سے کسی ایسے غیرذمے دارانہ مشورے کی توقع نہیں تھی۔ ٹارچ جلا کر نیچے دیکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ مسلح محافظ ہمیں بھون کے رکھ دیں گے۔ آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ چھت پر موجود محافظوں کے علاوہ بھی عمارت میں خاصے محافظ موجود ہیں۔ وہ اس عمارت کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے اور پھر ہمیں فرار کا موقع بھی نہیں مل سکے گا۔" سالار اکبر نے اپنی دانست میں گویا مجھے ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا۔

سالار اکبر کی وجہ سے بلا سبب وقت ضائع ہو رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اسے نیچے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی چھت پر اترنے کے لئے آمادہ کرنے کی غرض سے ایک اور تدبیر آزمائی۔ میں نے اس سے کہا۔ "سالار! آپ شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے یوں ہی چار مرتبہ سائلنٹ ڈیتھ کا بٹن دبا دیا تھا' یا بس یوں ہی فضا میں فولادی سوئیاں داغ دی تھیں۔ ایسا نہیں تھا بلکہ میں نے حتی الامکان طور پر محافظوں ہی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔"

"مگر کس طرح؟" اس نے بحث کی۔ "اندھیرے میں وہ آپ کو کیسے نظر آ گئے؟"

"دراصل میری آنکھیں بہت جلد اندھیرے سے مانوس ہو جاتی ہیں۔ قدرتی طور پر ایسا ہے۔ عام لوگوں کے مقابلے میں مجھے اندھیرے میں قدرے زیادہ نظر آتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ میں نے چار محافظوں کے ہیولے نیچے چھت پر دیکھے تھے' پھر انہی کو نشانہ بنایا تھا۔ انہی ہیولوں کو دیکھ کر میں نے جیب سے آپ کا فراہم کردہ ہتھیار نکالا تھا۔"

"کیا اب آپ کو محافظوں کے ہیولے نظر نہیں آ رہے؟" سالار اکبر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"نظر تو اب بھی آ رہے ہیں' مگر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے اور بے حرکت۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ حیرت انگیز بات کر رہی ہیں معبلہ!"

"بعض حیرت انگیز باتیں سچ بھی ہوتی ہیں سالار!" میں بولی۔

"معبلہ! اگر واقعی آپ کو ان محافظوں کے ہیولے نظر آئے تھے اور انہی کو آپ نے سائلنٹ ڈیتھ سے نشانہ بنایا ہے تو پھر سرچ لائٹ کون آن کرے گا۔ ہرچند کہ یہ ناقابل یقین سی بات لگتی ہے مگر تجربے سے کچھ اور ہی ظاہر ہو رہا ہے۔"

"سالار!" عادل نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا۔ "میرا خیال ہے کہ خطرہ مول لے ہی لیں معبلہ کو جب بے حرکت ہیولے نظر آ رہے ہیں تو ایسا بلاسبب نہیں ہو سکتا۔ آپ معبلہ کو ٹارچ دے دیں تاکہ یہ براہ راست اسی جگہ روشنی ڈالیں جہاں انہیں بے حرکت ہیولے دکھائی دے رہے ہیں۔ معبلہ کی بات اگر غلط ہوتی تو اب تک کم از کم دو مرتبہ سرچ لائٹس آن کی جا چکی ہوتیں۔"

پھر سالار اکبر مان ہی گیا اور ہم اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی چھت پر اتر کر ثریان کی خواب گاہ تک پہنچ گئے۔ میں نے خواب گاہ کی کھڑکی کا شیشہ کاٹنا شروع کر دیا۔

"دیکھو' کہیں شیشہ کٹ کر اندر نہ جا گرے۔" عادل نے اپنی دانست میں مجھے ممکنہ خطرے سے آگاہ کیا۔ اب وہ آگے بڑھ کر میرے قریب آ گیا تھا۔

"دوسرے ہاتھ سے میں نے شیشے کو پکڑ رکھا ہے، فکر نہ کرو۔"

کچھ ہی دیر کے بعد چوتھی طرف سے بھی میں شیشے کو کاٹنے میں کامیاب ہو گئی۔

"لو یہ قلم پکڑو۔" میں نے عادل کی طرف اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا۔ بائیں ہاتھ سے میں شیشہ پکڑے ہوئے تھی۔

عادل کو شیشہ کاٹنے کا قلم دے کر میں نے احتیاط کے ساتھ کٹا ہوا شیشے کا ٹکڑا کھڑکی کے فریم سے باہر نکال لیا۔ عادل اس وقت تھیلے میں قلم رکھ رہا تھا اس لئے میں نے خود جھک کر شیشے کا وہ ٹکڑا راہداری میں کمرے کی دیوار کے ساتھ لگا کے رکھ دیا۔

میرا دشمن ژیان یقیناً محو خواب تھا ورنہ میں اتنی آسانی کے ساتھ سب کچھ کرنے میں کامیاب نہ ہوتی۔ وہ مجھ پر اپنی شیطانی قوتیں ضرور آزماتا۔ اگر وہ اسی طرح سوتا رہتا اور میں اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تو پھر میرے لئے اس پر قابو پانا مشکل نہ ہوتا۔ میں اسے سوتے ہی میں بے ہوش کر سکتی تھی۔ بے ہوش کر کے ہی اسے وہاں سے اغوا کر کے لے جانا ممکن تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے کھڑکی کے اس خلا میں ہاتھ ڈالا جو شیشہ کاٹنے سے پیدا ہوا تھا۔ چٹخنی تک میرا ہاتھ پہنچ گیا جو اندر سے بند تھی۔ بہت آہستہ اور احتیاط کے ساتھ میں نے چٹخنی کو حرکت دی تاکہ کم سے کم آواز پیدا ہو۔ چٹخنی نیچے آ گئی تو میں نے آہستگی ہی سے کھڑکی کھول دی۔

کھڑکی کھلتے ہی میری نظر اندر پڑی اور میرے لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ کچھ ہی فاصلے پر بڑی سی مسہری نظر آ رہی تھی اور اس مسہری پر میرا دشمن ژیان محو خواب تھا، مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ ایک نوجوان انگریز لڑکی بھی ژیان کے ساتھ موجود تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف کروٹ لئے سو رہے تھے۔ لڑکی کی پشت میری طرف تھی۔ مسہری کے قریب ہی سرہانے کی طرف سے میں نے چھوٹی سی ایک میز بھی رکھی دیکھی۔ اس میز پر شراب کی بوتل اور دو خوب صورت جام موجود تھے۔ شراب کی بوتل آدھی سے زیادہ خالی تھی۔

سالار اکبر اور عادل میرے دائیں بائیں کھڑے تھے اور ظاہر ہے کمرے میں اندھیرا ہونے کے سبب انہوں نے اندر کا منظر نہیں دیکھا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا تھا ورنہ مجھے ان دونوں سے شرمندگی محسوس ہوتی۔ میں نے سالار اکبر کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ "میں اندر کمرے میں جا رہی ہوں۔ آپ دونوں یہیں باہر رہیں، جب میں بلاؤں تو آ جائیے گا۔"

پھر میں نے سالار اکبر کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ گئی، پھر میں آہستگی کے ساتھ نیچے اتری اور پنجوں کے بل چلتی ہوئی مسہری کی طرف بڑھنے لگی۔ جب میں مسہری کے قریب پہنچی تو انگریز لڑکی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ لڑکی کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ اسے میں نے سیکرٹ سروس کے سربراہ ولیم رائٹ کے ساتھ اس رات ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں دیکھا تھا جب فلپ نے پہلی بار ولیم رائٹ سے میرا تعارف کرایا تھا۔ اس لڑکی کا نام ایلزبتھ تھا۔ وہی لڑکی اس وقت میرے دشمن کے پہلو میں تھی۔ میرا دشمن، ولیم رائٹ ہی کا مہمان تھا۔ ولیم رائٹ سے اس کے

تعلق کا مجھے علم تھا بلکہ ولیم ہی کی نگرانی کے نتیجے میں ژیان کا سراغ ملا تھا۔ ایسی صورت میں ایلزبتھ کا میرے دشمن تک پہنچ جانا کوئی تعجب خیز امر نہیں تھا۔ ولیم رائٹ کے توسط سے ایلزبتھ، ژیان تک پہنچ سکتی تھی۔ ایلزبتھ جیسی لڑکیوں کے لئے مرد صرف مرد ہوتا ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، محبت اور وفاداری ان کا مسئلہ نہیں ہوتا۔

میرے لئے فی الوقت یہ مسئلہ تھا کہ ژیان اور ایلزبتھ اس طرح محو خواب تھے کہ صرف ژیان کو بے ہوش کر کے وہاں سے لے جانا ممکن نہیں تھا۔ ایلزبتھ، ژیان کی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھی۔ پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ پہلے ژیان ہی کو بے ہوش کیا جائے۔ اس کے لئے ظاہر ہے کہ میں نے سوئے ہوئے ژیان کی کنپٹی ہی پر ضرب لگائی تھی۔ اس کے بعد میں نے آہستگی کے ساتھ ایلزبتھ کا ہاتھ ژیان کی گردن سے نکالنا چاہا۔ ایلزبتھ سوتے میں بڑبڑانے لگی۔ میرا ہاتھ دوبارہ بلند ہوا اور اس کی کنپٹی پر ضرب پڑی، پھر میں نے ایلزبتھ کے جسم کو گھسیٹ کر ژیان سے الگ کر دیا۔ پائنتی کی طرف ایک چادر پڑی تھی۔ وہ میں نے ایلزبتھ کے جسم پر ڈال دی۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ میری موجودگی میں سالار اکبر اور عادل ایک عورت کو اس عالم میں دیکھیں۔ میں اب ان دونوں کو کمرے میں بلانا چاہتی تھی۔

"سالار اکبر! اب آپ ٹارچ روشن کر سکتے ہیں۔" میں نے بلا جھجک وہیں سے سالار اکبر کو مخاطب کیا۔

دوسرے ہی لمحے راہداری میں اجالا ہو گیا اور پھر ٹارچ کی روشنی کمرے میں در آئی۔

"آپ دونوں اندر آ جائیے، میں اپنا کام کر چکی ہوں۔"

"کیا؟" سالار اکبر کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

پھر یکے بعد دیگرے وہ دونوں کھڑکی کے راستے کمرے میں آ گئے۔ سالار اکبر نے ٹارچ کی روشنی میں مسہری کا جائزہ لیا۔ اسی کے ساتھ مجھے سالار کے چہرے پر فکرمندی سی نظر آئی۔

"مطمئن رہیں، میں ان دونوں کو بے ہوش کر چکی ہوں۔" میں بول اٹھی۔

"آپ .... آپ نے معبلہ! انہیں کمرے میں اندھیرا ہونے کے باوجود کیسے بے ہوش کر دیا؟" سالار اکبر نے حیرت سے سوال کیا۔

"میں آپ کو بتا تو چکی ہوں کہ مجھے عام لوگوں کے مقابلے میں اندھیرے کے باوجود خاصا نظر آتا ہے۔" میں نے جواب دیا، پھر عادل سے مخاطب ہوئی۔ "کمند ڈالنے والی رسی کے علاوہ تمہارے پاس اور بھی رسی ہے؟ اس کے ہاتھ پیر باندھنا ہیں۔"

"ہاں، میں اور بھی رسی تھیلے میں کسی ایسے ہی موقع کے لئے رکھ کر لایا تھا۔" عادل نے جواب دیا۔ پھر اس نے اپنے شانے سے تھیلا اتار کر مسہری پر رکھ دیا۔

سالار اکبر کی ٹارچ کا رخ تھیلے کی طرف ہو گیا تاکہ عادل کو رسی تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔ اس نے جیسے ہی تھیلے سے رسی نکالی میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"اس کے ہاتھ پیر میں باندھے دیتا ہوں۔" سالار اکبر نے مجھے کہا۔

"آپ باندھ لیجئے۔" میں نے کہہ دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔

سالار اکبر نے ژیان کو اوندھا کیا' پھر پہلے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے اور اس کے بعد دونوں ٹانگیں موڑ کر انہیں بھی مضبوطی سے باندھ دیا۔ ٹارچ اس نے عادل کو تھما دی تھی۔

"اب آپ پیچھے ہٹ جایئے سالار!" میں نے کہا۔

"مگر اسے یہاں سے اٹھا کر بھی تو لے جانا ہے۔" سالار اکبر بولا۔

"یہ میرا بوجھ ہے سالار اور اسے میں ہی اٹھاؤں گی۔"

"آپ .... معبلہ! آپ اسے اٹھائیں گی' کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یہ آپ سے نہیں اٹھے گا۔"

"آپ ادھر تو آئیں۔" میں آگے بڑھی اور پھر سالار اکبر کی غلط فہمی دور کر دی۔ میں نے ایک ہی جھٹکے میں ژیان کو اٹھا کر اپنی پشت پر لاد لیا تھا اور سالار اکبر "ارے ارے" ہی کرتا رہ گیا تھا۔ "اب آپ کو یقین آیا' میں اسی حالت میں اسے پشت پر لادے ہوئے تیزی سے دوڑ بھی سکتی ہوں۔ چلئے سالار!" میں نے کھڑکی کی طرف چلنے کی بجائے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اب کھڑکی پر چڑھ کر راہداری میں کودنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ہم دروازہ کھول کر بھی باہر نکل سکتے تھے۔

"ٹھہریئے تو معبلہ! یہ زیادتی ہے۔" سالار اکبر تیزی سے آگے بڑھ کر میرے قریب پہنچ گیا۔ "ہماری موجودگی میں اگر آپ ہی کو یہ بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے تو پھر ہم کس لئے آپ کے ساتھ آئے ہیں؟ لایئے' اسے مجھے دے دیجئے۔"

سالار اکبر نے اس قدر اصرار کیا کہ مجھے اس کی بات ماننا ہی پڑی۔ پھر میری پشت کا بوجھ سالار اکبر کی پشت پر منتقل ہو گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازے کی چٹخنی نیچے کی اور پھر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی اچانک چاروں طرف سے سائرن کی تیز آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر میں اچھل پڑی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دروازے کے ساتھ کوئی ایسا برقی نظام منسلک تھا جو دروازہ کھلتے ہی حرکت میں آ جائے اور ساری عمارت میں خطرے کے سائرن گونجنے لگیں۔ سونے سے قبل یقیناً ژیان نے اس نظام کو متحرک کر دیا ہو گا۔ خطرے کے وہ سائرن اس عمارت میں موجود مسلح محافظوں ہی کے لئے ہو سکتے تھے تاکہ وہ سائرن سن کر فوری طور پر عمارت کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

"بھاگیں سالار!" میں چیخ اٹھی' اسی کے ساتھ دوڑتی ہوئی میں دروازے سے نکل گئی۔

میرے پیچھے سالار اکبر اور عادل بھی بھاگے۔ اس راہداری سے نکل کر میں نے بھاگتے ہوئے دوسری راہداری کا رخ کیا۔ اسی وقت میری سماعت سے بہت دور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ٹکرائیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ مسلح محافظ یقیناً عمارت کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ میں نے "سائلنٹ ڈیتھ" جیب سے نکال لی۔

سیڑھیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک میں نے نیچے ہال میں روشنی ہوتے دیکھی۔ اسی کے ساتھ کوئی چیخا۔ "وہ رہے۔"

"فائر۔" دوسری تیز آواز بلند ہوئی۔

یقیناً ہمیں دیکھ لیا گیا تھا۔ کسی بھی لمحے اب ہم پر آگ برسائی جا سکتی تھی۔ مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ اپنے دشمن ژیان کی فکر تھی۔ میں اسے ہر حال میں اس عمارت سے زندہ نکال کر لے جانا چاہتی تھی کہ اپنے ہاتھ سے اس کا سر قلم کر کے اس کی گردن پر لوہے کا دہکتا ہوا توا رکھا دیکھ سکوں۔

ان سنسنی خیز لمحات کی سنگینی مجھ سے تقاضا طلب تھی کہ میں ان لوگوں کے لئے مجسم قہر بن جاؤں جو میری راہ میں موت کی دیوار بن کر حائل ہو گئے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی قدم اٹھاتی' فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ اسی کے ساتھ میں نے سالار اکبر کو چیخ کر گرتے دیکھا۔ سالار اکبر ہی کی پشت پر ژیان کا بے ہوش جسم تھا جو ایک طرف لڑھک گیا۔ عادل بھاگتے بھاگتے ایک دم اوندھا زمین پر لیٹ گیا۔

"لیٹ جاؤ معبلہ!" عادل نے مجھ سے چیخ کر کہا۔

اسی وقت پے در پے فائر ہونے لگے۔ کئی گولیاں میرے آس پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔ میں نے عادل کے مشورے پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔ میں بھی اب اسی کی طرح زمین پر اوندھی لیٹ گئی تھی۔ عادل کو میں نے سینے کے بل رینگتے ہوئے آگے بڑھتے دیکھا۔ وہ پلٹ کر زینے کی طرف جا رہا تھا اور فائرنگ بھی ادھر ہی سے کی جا رہی تھی۔

"معبلہ! تم سالار اکبر کو سنبھالو۔" عادل نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "انہیں شاید گولی لگی ہے۔"

"مگر تم کہاں جا رہے ہو؟" میں چیخ کر بولی کیونکہ مسلسل فائرنگ کی وجہ سے عادل کے الفاظ بھی مجھے بمشکل سنائی دیئے تھے۔ وہ بھی چیخ کر بولا تھا۔

جواب میں عادل نے یقیناً کچھ کہا تھا' مگر اس کے الفاظ دھماکوں کی آوازوں میں دب گئے اور میں کچھ نہ سن سکی۔ عادل اب آگے بڑھ چکا تھا۔ میں نے اسے زمین پر لیٹے لیٹے تھیلا کھول کر دستی بم نکالتے دیکھا اور اسی لمحے میں نے اپنے اندر بجلیاں سی گردش کرتے محسوس کیں۔ میرے وجود میں خوابیدہ حیرت انگیز قوت بیدار ہو رہی تھی۔ رقص اجل شروع ہونے والا تھا کہ زبردست دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ عادل کے پھینکے ہوئے دستی بم کا تھا۔ بیک وقت ہال سے کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ اس وقت تک بجلیوں کی گردش میری دونوں آنکھوں میں مرکوز ہو چکی تھی۔ دستی بم کا دھماکہ ہوتے ہی چند لمحوں کو فائرنگ رک ہی تھی کہ میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "سائلنٹ ڈیتھ" کی اب ضرورت نہیں رہی تھی۔ اسے میں نے جیب میں رکھ لیا۔

میں نے نیچے ہال پر نگاہ ڈالی جہاں افراتفری سی مچی ہوئی تھی۔ نصف سے زیادہ ہال مسلح محافظوں سے بھرا ہوا تھا۔ انہی کے درمیان میں نے کچھ لاشوں اور زخمیوں کو دیکھا جنہیں کچھ محافظ اٹھا کر ہال کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسی لمحے میری آنکھوں سے موت کی روشنی خارج ہونے لگی۔ اس قاتل روشنی کا ہدف محافظ ہی تھے۔ جیسے ہی ان پر روشنی پڑی' ان کے جسم سوکھی ہوئی لکڑیوں کی طرح جلنے لگے۔

چند ہی لمحوں کے اندر ان سب کو شعلوں نے نگل لیا۔ قاتل روشنی میری آنکھوں میں واپس آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی بجلیوں کی گردش تھم گئی۔

اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے اندر جتنے بھی محافظ تھے' شاید سبھی خطرے کا سائرن سن کر اندر آ گئے تھے اور جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے۔ سائرن بجنا اب خود بخود بند ہو چکا تھا۔ غالباً سائرن ایک محدود وقت تک بج کر خاموش ہو جاتا تھا۔ نیچے ہال میں اب بھی آگ لگی ہوئی تھی۔

عادل کی آواز سن کر میں چونک اٹھی۔ وہ حیرت زدہ آواز میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ''معبلہ! تمہاری آنکھوں سے نکلنے والی وہ .... وہ روشنی کیسی تھی جس نے سارے محافظوں کو زندہ جلا ڈالا؟ وہ کیسی .... کیسی روشنی تھی معبلہ!'' عادل نے یقیناً میری آنکھوں سے قاتل روشنی کو خارج ہوتے دیکھ لیا تھا۔

اب میرے لئے اس بات سے انکار کرنا مشکل تھا کہ میری آنکھوں سے موت کی وہ روشنی خارج نہیں ہوئی تھی۔ میں اسی لئے بولی۔ ''میں خود نہیں جانتی کہ میری آنکھوں سے وہ روشنی کیوں نکلتی ہے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم..........'' پھر میں نے فوری طور پر موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر عادل کی توجہ سالار اکبر کی طرف مبذول کرا دی۔ وہ اب بھی کچھ فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ عادل کا یہ خیال درست ہی معلوم ہوتا تھا کہ اسے گولی لگی ہے۔

میں اور عادل بیک وقت سالار اکبر کی طرف لپکے۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ وہ ہوش میں تھا۔ گولی اس کی پنڈلی میں لگی تھی وہ گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس کی ٹانگ خون میں تر ہو رہی تھی۔ عادل نے انتہائی سرعت کے ساتھ تھیلے سے ایک کپڑا نکال کر زخم پر کس کے باندھ دیا۔ اس سے خون کا اخراج بند ہو گیا۔ میں نے اس دوران میں بے ہوش ژیان کو اٹھا کر اپنی پشت پر لاد دیا۔ سالار اکبر کے لئے بھی میں نے عادل کو یہی مشورہ دیا۔

''نن .... نہیں۔'' سالار اکبر بولا۔ ''مجھے صرف سہارا دے کر لے چلو' میں چل سکتا ہوں۔''

''سالار! کسی اور بڑے خطرے میں گھرنے سے پہلے ہمیں جلد از جلد اس عمارت سے نکلنا ہے اس لئے مان جایئے۔'' میں نے کہا۔

پھر سالار اکبر کے منع کرنے کے باوجود عادل نے میرے مشورے پر عمل کیا۔ اب سالار اکبر اس کی پشت پر سوار تھا۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں جتنے بھی محافظ تھے' وہ میرے اندازے کے مطابق ہلاک ہو چکے تھے اس لئے اب ہم صدر دروازے سے بھی باہر نکل سکتے تھے۔ موجودہ صورت حال میں واپسی کا سفر یوں بھی عمارت کے عقبی حصے سے ممکن نہیں رہا تھا۔ میرے لئے تو خیر کوئی دشواری نہ ہوتی لیکن عادل شاید سالار اکبر کو اپنی پشت پر لاد کر پہلی منزل سے عمارت کے عقبی میدان میں نہ کود پاتا۔ میں نے اسی خیال کے تحت زینے کا رخ کیا۔ عادل میرے پیچھے پیچھے تھا۔ میں تیزی کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر نیچے ہال میں پہنچ گئی جس کے فرنیچر میں اب تک آگ لگی ہوئی تھی۔ ہال کا بڑا حصہ آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا لیکن شعلے ابھی اس کے دروازے تک نہیں پہنچے تھے۔ میں نیچے رک کر عادل کے اترنے کا انتظار کرنے لگی۔

''معبلہ! تمہاری تیز رفتاری کا ساتھ دینا میرے لئے ممکن نہیں اس لئے آہستہ چلو۔'' عادل نے پھولے ہوئے سانسوں پر قابو پا کر میرے قریب پہنچ کر کہا۔

ہم عمارت سے نکلے ہی تھے کہ میں نے چبوترے کے نیچے سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے کچھ افراد کو دیکھا۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔ وہ سبھی انگریز تھے۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے وہ عمارت کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو کہ عمارت کے اندر کیا ہوا ہے۔ یہ لوگ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے ملازمین ہی ہو سکتے تھے جو خطرے کا سائرن اور پھر دھماکوں کی آوازیں سن کر سرونٹ کوارٹرز سے نکل کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان ملازمین کا مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ خلاف توقع ان ملازمین کو وہاں دیکھ کر چند لمحے کو میں چکرا کر رہ گئی۔ عادل بھی میری طرح ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' انہی میں سے کسی ملازم نے چیخ کر انگریزی میں پوچھا۔ اس کے لہجے میں سختی تھی۔ میں نے اسے جیب سے ریوالور نکالتے بھی دیکھ لیا تھا۔

میں نے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں کی کہ وہ لوگ ہمارا راستہ روک سکتے تھے۔ میرا ایک ہاتھ تیزی سے اپنی پینٹ کی جیب میں رینگ گیا۔ انہیں راستے سے ہٹانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ''سائلنٹ ڈیتھ'' اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں ان کا نشانہ لے کر بٹن دباتی چلی گئی۔ وہ سب چند ہی لمحوں میں زندگی کی سرحد عبور کر گئے۔ میں نے ''خاموش موت'' کو پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

جب میں سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچی تو دو عورتوں سمیت چھ افراد کی لاشیں وہاں پڑی تھیں۔ اگر ان لوگوں نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی ہوتی تو ہرگز یوں نہ مارے جاتے۔ انہوں نے ہمیں چھیڑ کر خود ہی اپنی موت کو دعوت دی تھی۔

اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا آہنی پھاٹک ہمیں کھلا ہوا ہی ملا۔ وہاں ایک بھی محافظ موجود نہیں تھا۔ ہم تیزی کے ساتھ باہر نکل آئے۔

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھیں ہر طرف سناٹے کی حکمرانی تھیں سڑک سونی پڑی تھی۔ ہمیں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے عقب میں اس سڑک تک پہنچنا تھا جہاں اپنی کار چھوڑی تھی۔ کچھ فاصلہ طے کر کے عمارتوں کے درمیان موجود ایک پتلی اور لمبی گلی عبور کر کے ہم عقبی سڑک تک پہنچ گئے۔ وہ سارا علاقہ عادل کا دیکھا بھالا تھا اس لئے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں اگر تنہا ہوتی تو شاید میرے لئے عقبی سڑک تک پہنچنا آسان نہ ہوتا۔

کار تک پہنچنے کے لئے کچھ دور تک مزید پیدل چلنا پڑا۔

سالار اکبر کو عادل نے کار کی اگلی سیٹ پر بٹھا دیا تھا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ بے ہوش ژیان کو پچھلی سیٹ پر ڈال کر خود میں بھی اسی کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ کار جب وہاں سے روانہ ہوئی تو معلوم نہیں کیوں مجھے یقین سا نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہوں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ جب خلاف توقع آدمی سے کوئی کارنامہ سرزد ہو جائے تو کچھ دیر تک خود اسے اپنی کامیابی کا

یقین نہیں آتا۔ زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر کر آخرکار میں اپنے دشمن کو اغوا کر کے لئے آئی تھی تاکہ اپنے ہاتھوں سے قتل کرسکوں اور میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ بجھ جائے۔

☆======☆======☆

کار تیزی کے ساتھ فاصلہ طے کر رہی تھی کہ رات کو گشت کرنے والی ایک پولیس جیپ ہمارے پیچھے لگ گئی۔ اس نے تیزی کے ساتھ ہماری کار سے آگے نکل کر راستہ روک لیا تھا۔ مجبوراً عادل کو کار روکنا پڑی۔ پولیس جیپ میں پانچ باوردی سپاہی تھے۔ آگے بیٹھا ہوا ایک شخص جیپ سے اترا۔ وہ اپنی وردی سے انسپکٹر معلوم ہوتا تھا۔ دو مسلح پولیس والے بھی اس کے ساتھ ساتھ جیپ سے اتر کر کار کی طرف بڑھے۔ میں نے خطرہ محسوس کرتے ہی جیب سے "سائلنٹ ڈیتھ" نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ کار کے اندر اندھیرا تھا اور وہاں قریب ہی کوئی کھمبا بھی نہیں تھا کہ اس کی روشنی کار کے اندر آتی۔

پولیس انسپکٹر نے عادل کے قریب پہنچ کر سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔ "اس وقت تم کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

جواب میں عادل نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا نام لیا۔ "ہم لوگ اس ہوٹل سے آ رہے ہیں اور پہاڑ گنج جا رہے ہیں۔"

"نیچے اترو اور کار کی تلاشی دو۔" پولیس انسپکٹر نے حکم دیا۔

کار کی تلاشی کا واضح مطلب پولیس کے ہتھے چڑھ جانا ہی تھا۔ عادل کے تھیلے میں غیر قانونی اسلحہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ پچھلی نشست پر بے ہوش ژیان بھی بندھا پڑا تھا۔ عادل کو بھی حقیقت حال کا علم تھا۔ اس کے باوجود وہ پُرسکون آواز میں بولا۔ "ایک منٹ انسپکٹر صاحب! آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اطمینان کے ساتھ اپنے شانے سے تھیلا اتار کر سالار اکبر کے حوالے کیا اور کار کا دروازہ کھول کر اتر گیا۔ "انسپکٹر صاحب! ذرا ادھر آ کے میری ایک بات سن لیجئے۔" عادل نرمی کے ساتھ پولیس انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔

"کیا بات ہے؟" پولیس انسپکٹر کے لہجے کی سختی اب بھی برقرار تھی۔ پھر وہ سپاہیوں کو وہیں رکنے کے لئے کہہ کر عادل کے ساتھ ایک طرف چلا گیا۔

میری نگاہ پولیس انسپکٹر اور عادل ہی پر جمی ہوئی تھی۔ وہ دونوں کار سے اتنی دور تھے کہ ان کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں صرف ان کے ہونٹ ہلتے دیکھ رہی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے عادل کی کسی بات کے جواب میں سر ہلا کر انکار کیا۔ عادل نے پھر کچھ کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کے اپنا بٹوا نکالا۔ میں نے اسے بٹوے سے کچھ نوٹ نکال کر انسپکٹر کو دیتے دیکھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ معاملہ صرف رشوت پر ٹل گیا تھا۔ میں نے "سائلنٹ ڈیتھ" کو جیب میں رکھ لیا۔

پھر پولیس انسپکٹر نے جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے سپاہیوں کو ہاتھ سے چلنے کا اشارہ کیا۔ عادل کار کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد عادل نے سالار اکبر سے کہا۔ "حرامزادہ پچاس روپے لے مرا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔ پولیس جیپ اس سے پہلے ہی روانہ ہو چکی

تھی۔

"اچھا ہی ہوا کہ اس حرامزادے نے رشوت قبول کرلی ورنہ اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا۔" میں بول اٹھی۔

"آپ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں معبلہ!" سالار اکبر بولا۔ "اس کے انکار کی صورت میں مجبوراً یہی قدم اٹھانا پڑتا۔"

سالار اکبر بولا تو مجھے اس کے زخمی ہونے کا خیال آیا اور میں نے پوچھا۔ "اب تکلیف کیسی ہے؟"

"تکلیف تو خیر ہے مگر ظاہر ہے' برداشت کرنا پڑے گی۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔ پھر وہ بھی مجھ سے وہی بات پوچھنے لگا جو عادل نے دریافت کی تھی۔ "معبلہ! آپ کی آنکھوں سے نکلتی ہوئی وہ روشنی میں نے بھی دیکھی تھی۔ کیا تھا وہ؟ یہ تو بڑی حیرت انگیز بات ہے۔"

"اور اس سے بھی حیرت انگیز وہ منظر تھا سالار جو شاید آپ نہیں دیکھ سکے۔" عادل بھی بول اٹھا۔ "اس روشنی سے محافظوں کے جسموں میں اس طرح آگ لگ گئی تھی جیسے پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی ہو۔ اپنی ساری زندگی میں کوئی ایسا حیران کن اور ناقابل یقین منظر میں نے نہیں دیکھا۔"

ایک بار پھر وہی موضوع چھڑ گیا تھا جس سے میں گریز کرنا چاہتی تھی۔ اسی وقت اچانک میری سماعت سے ژیان کے کراہنے کی آواز ٹکرائی۔ اسے شاید ہوش آ رہا تھا۔ میں فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ راستے میں ژیان کا ہوش میں آ جانا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ میں یہ بھولی نہیں کہ وہ بھی پُراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ میرے لئے کوئی بھی مسئلہ پیدا کر سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے دوبارہ اس کی کنپٹی پر ضرب لگانے میں دیر نہیں کی تھی۔ اس دوران میں ژیان کے منہ سے صرف ایک کراہ ہی نکل سکی تھی اور وہ پھر ہوش و حواس کی دنیا سے غافل ہو چکا تھا۔

"سالار اکبر نے مڑ کر مجھ سے پوچھا۔ "کیا ہوا معبلہ!"

"اسے ہوش آ رہا تھا۔" میں نے بتایا۔ "اسی لئے دوبارہ بے ہوش کرنا پڑا۔"

ژیان کی وجہ سے دوبارہ سالار اکبر اور عادل کا دھیان بٹ گیا۔ میری آنکھوں سے نکلنے والی روشنی کے بارے میں پھر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ میں ان دونوں ہی پر کیا کسی پہ بھی یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ مجھے پُراسرار قوتیں حاصل ہیں۔ یہی پُراسرار قوتیں اب تک مجھے میرے دشمنوں سے بچاتی ہوئی آئی تھیں ورنہ تو شاید میں زندہ نہ بچتی۔ ژیان پر قابو پانے میں بھی انہی پُراسرار قوتوں نے میرا ساتھ دیا تھا۔

کار میں اب خاموشی چھا گئی تھی اور میں اپنے دشمن کے متعلق سوچنے لگی تھی۔ طویل جدوجہد کے بعد آخر وہ میرے قابو میں آ ہی گیا تھا۔ میں نے اپنے اسی طاقتور دشمن پر قابو پانے کی خاطر پہاڑوں میں متعدد جنگیں لڑی تھیں۔ ان جنگوں کا مقصد اقتدار کا حصول ہرگز نہیں تھا۔ اس سے اپنا حق حاصل کرنا تو محض ایک بہانہ تھا۔ وادی سبز پر میرا حق ہے' اس کا نہیں۔ اس طرح میں نے قبائل کی حمایت حاصل کر لی تھی اور وہ میرے شانہ بشانہ لڑے تھے۔ میرا اصل مقصد وادی سبز کی حکمران بننا نہیں بلکہ اس طرح

ژیان سے انتقام لینا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں عیش و آرام ترک کر کے اور اقتدار احرس کے سپرد کرنے کے بعد ہموار میدانوں کی اس دنیا کا رخ نہ کرتی۔ پھر شاید اپنی تلاش کا سفر بھی ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا۔ میں اگر پہاڑوں کی اس غیر مہذب اور وحشی دنیا کا حصہ نہیں تھی تو پھر کون تھی؟ یہ سوال شاید تشنہ جواب ہی رہ جاتا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ آدمی کو ہر سوال کا جواب مل ہی جائے۔ عظیم مہیمن نے پیش گوئی کی تھی کہ میں اپنی اصل کی طرف لوٹوں گی اور مجھ پر میری شخصیت کے سارے بھید کھل جائیں گے۔ یہ بھید ابھی کھلنا باقی تھے۔ ابھی تو مجھے اپنے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ انہی خیالوں میں سفر تمام ہو گیا' میں اس وقت چونکی جب کار تنظیم کی عمارت کے پھاٹک پر رکی۔

عادل کار سے اترا اور آگے بڑھ کر مخصوص انداز میں پھاٹک پر دستک دینے کے بعد شناختی الفاظ ادا کیے۔ پھاٹک کھول دیا گیا۔ عادل دوبارہ کار میں آ کر بیٹھ گیا اور اسے ڈرائیو کرتا ہوا اندر لے گیا۔ میں نے بائیں جانب والے لان میں کچھ لوگوں کو نقل و حرکت کرتے دیکھا۔ وہاں روشنی بھی تھی۔ کار کیونکہ تیزی سے آگے بڑھ کر عمارت تک پہنچ گئی تھی اس لئے میں یہ نہ دیکھ سکی کہ لان میں کیا ہو رہا تھا۔

کار کے رکتے ہی میں نے اتر کر ژیان کے جسم کو گھسیٹ کر اپنی پشت پر لاد لیا۔ عادل نے سہارا دے کر سالار اکبر کو کار سے اتارا۔

"میں صرف سہارا لے کر بھی چل سکتا ہوں۔" سالار اکبر نے کہا۔ "ویسے بھی یہاں جلدی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اسی وقت عمارت کا صدر دروازہ کھول کر رگھوویر اور سمیع اللہ باہر آ گئے۔

"ارے' یہ سالار کو کیا ہوا؟" سمیع اللہ نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا۔ "یہ تو زخمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں انہیں گولی لگی ہے۔" عادل نے بتایا۔

"کس جگہ لگی ہے گولی؟" اس مرتبہ رگھوویر کی فکر میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ٹانگ میں گولی لگی ہے۔" عادل آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "مگر زیادہ تشویش کی بات نہیں۔"

پھر رگھوویر نے مجھے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا اور لپک کر میرے قریب آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"لایئے' اسے میں اٹھائے لیتا ہوں۔"

میں نے لاکھ منع کیا مگر وہ نہیں مانا۔ اسی وقت سالار اکبر' رگھوویر سے بولا۔ "اسے تہہ خانے میں پہنچا دو کہ وہی سب سے محفوظ جگہ ہے۔ ہاتھ پیر اسی طرح بندھے رہنے دینا۔ تہہ خانے میں روشنی کی بھی ضرورت نہیں بلکہ کسی طرح اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دینا۔ تہہ خانے کا راستہ بند کرنے کے بعد وہاں دو مسلح افراد کو بھی متعین کر دو۔ اس قیدی کی سخت نگرانی اور حفاظت کی ضرورت ہے۔"

"بہتر ہے سالار!" رگھوویر اندر داخل ہونے کے بعد دائیں جانب ایک راہداری میں مڑ گیا۔

"سالار! یہ وہی ہے جسے قتل کرنے کے انتظامات ہو رہے ہیں؟" سمیع اللہ نے ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سالار اکبر سے دریافت کیا۔

"ہاں وہی ہے۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔

ذرا ہی دیر کے بعد ہم ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ نشست گاہ معلوم ہوتا تھا۔ سالار اکبر کو ایک آرام دہ کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ عادل کے کہنے پر وہیں موجود ایک الماری سے سمیع اللہ فرسٹ ایڈ باکس نکال کر لے آیا۔ پھر عادل زخم صاف کر کے ڈریسنگ کرنے لگا۔ میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"لگتا ہے کہ وہاں خاصی معرکہ آرائی ہوئی ہے۔" سمیع اللہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ وہ پیش آنے والے واقعات جاننا چاہتا تھا۔

ان واقعات کے بیان میں میری پُراسرار قوتوں کا ذکر پھر چھڑ جاتا اسی لئے میں نے بہت مختصر جواب دیا۔ "ظاہر ہے اس عمارت میں داخل ہو کر نکل آنا آسان نہیں تھا۔ اس عمارت کی حفاظت کے لئے خاصی بڑی تعداد میں مسلح محافظ متعین تھے۔ واپسی میں ان سے ٹھن گئی' مگر ہم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔"

غنیمت یہ ہوا کہ عادل درمیان میں کچھ نہیں بولا۔ وہ ڈریسنگ میں مصروف تھا۔ یوں بات اسی جملے پر ختم ہو گئی۔

اس وقت رات کے ڈھائی بجنے والے تھے۔ صبح ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی اور میں صبح ہونے سے پہلے ہی ژیان کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتی تھی۔ عادل اب ڈریسنگ کر چکا تھا۔ میں نے اس سے اپنے خیال کا اظہار کیا' پھر بولی۔ "مگر پہلے تم سالار اکبر کو کسی ایسے کمرے میں پہنچا دو جہاں یہ آرام سے سو سکیں۔"

"نہیں۔" سالار اکبر نے انکار میں سر ہلایا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے' میں بھی اس انوکھے طریقہ قتل کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں معبلہ!" پھر وہ عادل سے مخاطب ہوا۔ "مجھے بھی تم لوگ اپنے ساتھ باہر لے چلو۔"

سالار اکبر کی خواہش کو میں نے رد نہیں کیا۔ عادل مجھ سے بولا۔ "پہلے تم باہر چل کے انتظامات کا جائزہ تو لے لو۔"

"ہاں چلو!" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

عادل نے سالار اکبر کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اسی وقت رگھوویر کمرے میں داخل ہوا تو سالار اکبر نے اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"آپ کی ہدایت کے مطابق تمام بندوبست کر دیا گیا ہے۔" رگھوویر' سالار اکبر کی نظروں کا مطلب سمجھ کر بولا۔

پھر ہم سب عمارت سے نکل کر باہر لان میں آ گئے۔ لان کا منظر دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ لان کے بیچ ہی درمیان میں چھوٹا سا ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ تخت پر گدا اور گدے پر سفید چاندنی تھی۔ گاؤ تکیہ رکھا نظر آ رہا تھا۔ اسی گاؤ تکیے کی ایک جانب تلوار رکھی تھی۔ تخت کے قریب ایک طرف اسٹول پڑا

تھا۔ اسٹول پر مجھے قینچی اور ایک پلیٹ میں سفید پاؤڈر رکھا ہوا دکھائی دیا۔ اسٹول کے نیچے زمیں پر آہنی زنجیریں پڑی تھیں۔ تخت کے بالکل مقابل خاصے فاصلے پر بڑی سی انگیٹھی رکھی تھی جس پر بڑا لوہے کا توا بھی رکھا تھا۔ انگیٹھی کے قریب ہی زمین پر دو بڑے بڑے چمٹے پڑے تھے۔ لان میں ایک جانب میں نے گڑھا بھی کھدا ہوا دیکھا جو ژیان کی "آخری آرام گاہ" تھی۔ ظاہر ہے اسے انجام تک پہنچانے کے بعد اس کی لاش کو بھی تو ٹھکانے لگانا ہی تھی۔ سالار اکبر نے یہ تمام انتظامات میرے ہی بیان کی روشنی میں کرائے تھے۔ جب اس نے مجھ سے طریقہ قتل کی وضاحت چاہی تھی تو میں نے تفصیل کے ساتھ اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ تخت کی ایک جانب کچھ فاصلے پر چند کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ یہ کرسیاں یقیناً تنظیم کے ان ارکان کے لئے تھیں جو اس عمارت میں موجود تھے اور میرے دشمن کے قتل کا منظر دیکھنا چاہتے تھے۔ عادل نے سالار اکبر کو انہی کرسیوں میں سے ایک پر بٹھا دیا تھا۔ میں اب جائزہ لینے کے بعد سالار اکبر کے قریب دوسری کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ سب کچھ میری مرضی ہی کے مطابق تھا۔ اگر کوئی کسر تھی تو صرف جگہ کی تھی۔ وہ جگہ وادی سبز نہیں تھی جہاں ژیان کا سر کاٹا جانے والا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اپنے دشمن کو باندھ کر وادی سبز کے اسی میدان میں لے جاتی جہاں اس نے میرے بابا سردار اشم کو قتل کرایا تھا۔ آدمی کے اختیار میں بہت کچھ ہونے کے باوجود شاید کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے اختیار کا محض دھوکا ہے ورنہ تو قدم قدم پر مجبوریاں بے اختیار ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔

میں خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ سالار اکبر نے مجھے مخاطب کیا۔ "کوئی کمی تو نہیں رہ گئی معلبہ! "کمی۔" میں چونک کر بولی۔ "نہیں' کوئی کمی نہیں رہی۔ آپ نے ہر بات کا پورا خیال رکھا ہے۔ میں تو آپ کو ان تمام انتظامات پر داد دینے والی تھی۔ اب ایسا کیجئے کہ یہ زنجیریں لے کر کسی کو تہ خانے میں بھیج دیجئے۔ بے ہوشی کے دوران ہی میں اگر رسیاں کھول کر اسے زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے' بلکہ اب اسے یہیں اٹھوا لیں۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ژیان کو اب میں اپنی نظر کے سامنے رکھنا چاہتی تھی۔ "جب اسے ہوش آ جائے گا تو سزا پر عمل در آمد شروع کر دیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے' آپ کہتی ہیں تو اسے یہیں اٹھوائے لیتے ہیں۔" سالار اکبر نے کہا۔

وہاں لان میں چار پانچ افراد اور موجود تھے۔ رگھوویر ان میں سے دو افراد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہی دونوں نے زنجیریں اٹھالی تھیں۔

"انگیٹھی بھی جلانے کو کہہ دیں کیونکہ توا سرخ ہونے میں خاصی دیر لگے گی۔"

"جاؤ عادل' انگیٹھی جلوا دو۔" سالار اکبر نے عادل کی طرف مڑ کر کہا۔

عادل اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ذرا ہی دیر میں انگیٹھی بھی جلا دی گئی۔ میں کرسی سے اٹھ کر تخت تک پہنچی اور ایک طرف رکھی ہوئی تلوار اٹھا کر اس کی دھار دیکھنے لگی۔ اس تلوار سے مجھے ژیان کا سر قلم کرنا تھا۔ تلوار کی دھار دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ شاید اسے آج ہی تیز کیا گیا تھا۔ میں تلوار کو اسی جگہ رکھ کر لوٹ رہی تھی کہ رگھوویر وہاں ژیان کو اٹھوا کر لے آیا۔ ژیان ابھی تک بے ہوش تھا۔ اب اس کے بے ہوش جسم کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ میرے کہنے پر ژیان کو تخت کے سامنے ڈال دیا گیا۔ میں

سالار اکبر کے پاس آ بیٹھی۔ اب مجھے ژیان کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ اس کی زندگی کی مہلت اب بے ہوشی اور ہوش کے درمیان تھی جب تک وہ بے ہوش تھا اپنے بھیانک انجام سے بچا ہوا تھا۔

"کہیں وہ ہوش میں آنے کے بعد چیخنا چلانا شروع نہ کر دے۔" سالار اکبر نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشے کا اظہار کیا۔

"ہاں یہ ممکن تو ہے۔" عادل نے بھی سالار کی بات سے اتفاق کیا۔

"اور اس وقت رات کے سناٹے میں دور تک اس کی آواز جا سکتی ہے۔" سمیع اللہ بولا۔ "اپنے قتل کا سامان دیکھ کر ظاہر ہے وہ خاموش نہیں رہے گا۔"

وہ لوگ غلط نہیں کہہ رہے تھے' اس کا امکان بہرحال تھا لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ میرے نزدیک اصل مسئلہ ژیان کی پُراسرار شیطانی قوتیں تھیں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنے متوقع انجام سے بچنے کے لئے یقیناً ان شیطانی قوتوں کو ضرور بروئے کار لاتا۔ مجھے ساحر زعیم یاد آ گیا۔ عظیم مہین نے اس کی تمام شیطانی قوتیں سلب کر لی تھیں۔ وہ اپنی موت سے پہلے کسی بے ضرر چوہے کی طرح ہو گیا تھا اور میں نے اسے زندہ جلا دیا تھا۔ اگر عظیم مہین' ژیان کو بھی میرے ہاتھوں اس وقت قتل کرانے پر راضی تھا تو وہ ژیان کی شیطانی قوتوں کو بھی سلب کر سکتا تھا۔ اگر ایسا نہیں تو یہ ممکن تھا کہ ژیان کا کوئی شیطانی حربہ کامیاب نہ ہوتا۔ میں اگر چاہتی تو بے ہوشی کے دوران ہی میں اپنے دشمن کو سفر آخرت پر روانہ کر سکتی تھی لیکن اس طرح میرے دل کو قرار نہ آتا۔ یہ سب کچھ میں اپنے بے قرار دل کو قرار فراہم کرنے کے لئے ہی تو کر رہی تھی۔

"معلبہ! آپ کیوں خاموش ہیں؟" معاً سالار اکبر نے مجھے مخاطب کیا۔ "کیا آپ کو ہم لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں؟"

میں اپنے خیالوں میں اس قدر غرق تھی کہ بھول ہی گئی' کچھ دیر پہلے سالار اکبر نے کس خدشے کا ظہار کیا تھا۔ میں اسی لئے حیرت سے بولی۔ "کس سلسلے میں؟" سالار اکبر نے اپنی بات دہرائی۔

"ہاں ٹھیک ہے' آپ کا خدشہ غلط نہیں۔ اس کے منہ پر کپڑا بندھوا دیں۔" میں نے کہہ دیا۔

رگھوویر نے ایک شخص کو بھیج کر کپڑا منگوا لیا۔ پھر جب وہ ژیان کے منہ پر کپڑا باندھنے اس کے قریب پہنچا تو میری طرف مڑ کر بولا۔ "معلبہ! اسے ہوش آ چکا ہے۔"

"تو پھر جلدی کرو' اس کے منہ پر کپڑا باندھ دو۔" میری بجائے سالار اکبر بول اٹھا۔ میں تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کر ژیان کی طرف لپکی۔

"نو.......... نولسن می۔" ژیان چیخ اٹھا۔

یہ الفاظ میری سماعت پر بھاری پتھر کی طرح گرے تھے۔ یہ آواز ہرگز میرے دشمن ژیان کی آواز میں تھی۔ یہ آواز میری سنی ہوئی تھی لیکن فوری طور پر مجھے یاد نہیں آ سکا' کہاں سنی تھی۔ میں اب اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔

"مس گریٹا!" وہ یہ کہتا ہوا ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ وہ یقیناً میرا دشمن ژیان نہیں تھا۔ اب میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ مجھے مس گریٹا سمجھنے والا ایک ہی شخص ہو سکتا تھا۔

میری حالت اس وقت کسی ایسے تشنہ لب کی سی تھی جو انتہائی پیاسا ہو اور پانی اس کے ہونٹوں تک لا کر ہٹا لیا گیا ہو۔ میں نے شدید غصے کے عالم میں اس کے سر پر موجود بڑے بڑے بالوں کی وگ پکڑ کر کھینچ لی۔ وگ کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر چڑھا ہوا ماسک بھی میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میک اپ اتنا شاندار اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ ایک لمحے کو بھی مجھے گمان نہیں ہوا تھا کہ وہ ژیان نہیں ہے۔ ژیان کے میک اپ میں وہ سیکرٹ سروس کا سربراہ ولیم رائٹ تھا۔ میک اپ ختم ہوتے ہی رگھوویر کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکل گئی تھی۔ ولیم حیران حیران سا منہ اٹھائے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے وہاں کس طرح آ گیا۔

میرا غصہ اب تک برقرار تھا۔ میں اس کے پہلو میں لات مار کے چیخ اٹھی۔ "بول ژیان کہاں ہے' تُو نے اس کی جگہ کیوں لی؟" میں نے اس کے پہلو میں دوسری ضرب لگائی۔

دوسری ضرب پہلی سے شدید تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ چیخا اور پہلو کے بل گر پڑا۔ میں نے وگ اور اس سے منسلک ماسک کو ایک طرف پھینک دیا۔

عادل اور سمیع اللہ بھی دوڑتے ہوئے قریب آ گئے۔

"یہ .... یہ کون ہے؟" عادل نے حیرت سے پوچھا۔

"سیکرٹ سروس کا سربراہ ولیم رائٹ۔" میں نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا اور پھر جھک کر ولیم کے سر کے بال پکڑ کے اسے گھسیٹا۔

ولیم دوبارہ چیخنے لگا۔ سالار اکبر نے بلند آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "یہاں اسے زدوکوب نہ کریں' اندر لے چلیں۔"

مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ ولیم کو واقعی وہاں مارنا پیٹنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ دیئے۔

"اس کمینے بہروپئے کو اندر لے چلو۔" میں نے عادل کی طرف مڑ کر کہا۔

عادل اور سمیع اللہ نے ولیم کو اٹھایا تو سالار اکبر پھر بول اٹھا۔ "اسے وہیں تہ خانے میں لے چلو۔"

اب تک غصے کی وجہ سے میری بری حالت تھی۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ ژیان اپنی جگہ کسی اور کو پھنسا کر مجھے جل دے گیا تھا۔ پہلی مرتبہ وادی سبز میں ایسا ہوا تھا جب ژیان اپنے میک میں جذیل کو حویلی کے اندر چھوڑ کے فرار ہو گیا تھا اور اب مجھے اس کے میک اپ میں ولیم ملا تھا۔

سالار اکبر نے وہاں موجود افراد کو تمام سامان ہٹانے اور گڑھا پاٹ دینے کا حکم دیا۔ پھر وہ ایک شخص کے سہارے عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ عادل اور سمیع اللہ' ولیم کو ساتھ لے کر آگے جا چکے تھے۔ رگھوویر بھی انہی کے ساتھ تھا۔ میں بوجھل قدموں سے سالار اکبر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"معبلہ! میرا خیال ہے کہ اس نئی صورت حال پر پہلے غور کر لیا جائے' غصے میں کوئی قدم اٹھانا بہتر

نہیں رہے گا۔" سالار اکبر نے مجھ سے کہا۔

"اس حرامزادے کی وجہ سے سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔" میں اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے' محنت رائیگاں نہیں گئی۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بات سے سالار اکبر کا کیا مقصد تھا' غصے نے میری عقل خبط کر رکھی تھی۔

ذرا ہی دیر کے بعد سالار اکبر مجھے ساتھ لئے اسی نشست گاہ میں آ گیا جہاں سے ہم لوگ اٹھ کر گئے تھے۔ اس نے ایک شخص سے چائے بنا کر لانے کو بھی کہہ دیا تھا۔ نشست گاہ میں اب میرے اور سالار اکبر کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"معبلہ! آپ شاید ولیم کی اہمیت کو نظرانداز کر رہی ہیں۔" سالار اکبر نے مجھے مخاطب کیا۔

میں اب خاصی حد تک اپنے غصے پر قابو پا چکی تھی اس لئے سالار اکبر کی بات سن کر چونک اٹھی۔ میری سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

"آپ نے بنگال کے چیف انٹیلی جنس ڈیسوزا کو کس لئے اغوا کرایا تھا؟ یاد کریں اس سے آپ کو کیا معلوم ہوا تھا؟ کیا ولیم رائٹ انہی اہم اعلیٰ انگریز حکام میں سے ایک نہیں جن کے حکم پر آپ کے بارے میں چھان بین کی جا رہی ہے؟"

میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ ژیان کے سلسلے میں ناکامی کے دھچکے نے وقتی طور پر ہر خیال کو میرے ذہن سے محو کر دیا تھا۔ اب سالار اکبر نے میری توجہ اس طرف مبذول کرائی تو مجھے احساس ہوا کہ واقعی وہ مہم رائیگاں نہیں گئی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سالار!" میں نے سالار اکبر کی بات سے اتفاق کیا۔ "ولیم رائٹ سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"تنظیم کے خلاف حکومت کیا بڑا قدم اٹھانے والی ہے' اس سلسلے میں بھی ولیم کو علم ہو گا۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے معبلہ کہ ولیم رائٹ جیسا اہم سرکاری افسر ہمارے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اگر ہم اپنے طور پر اسے اغوا کرنے کا منصوبہ بناتے تو شاید کامیاب نہ ہوتے' یا ممکن ہے کہ ہم اتنا بڑا کوئی قدم اٹھانے کی ہمت ہی نہ کرتے۔" سالار اکبر نے کہا۔

"ژیان اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں نہیں تھا۔ اس کے متعلق بھی ولیم کو خبر ہو گی کہ کہاں ہے۔"

اسی وقت عادل' سمیع اللہ اور رگھوویر بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ سالار اکبر نے ان سے ولیم کے بارے میں دریافت کیا۔

"ہم نے اسے تہ خانے کے اس کمرے میں دو ستونوں کے درمیان باندھ دیا ہے جو اذیت دینے کے لئے مخصوص ہیں۔" عادل نے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ تہ خانے کے راستے پر بھی دو مسلح افراد کو متعین کر دیا ہے۔ کیا اس سے اسی وقت پوچھ گچھ شروع کرنا ہے؟"

"اس کا فیصلہ معبلہ کو کرنا ہے۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔ "اس وقت بھی اس کی زبان کھلوائی جا سکتی ہے اور اطمینان کے ساتھ کل صبح بھی۔ فی الحال تو میں نے چائے کے لئے کہا ہے' اس کے بعد ہی کچھ ہو گا۔ تم لوگ نے بھی چائے پینی ہے تو کہہ دو۔" رگھوویر مزید چائے کے لئے کہنے چلا گیا۔

"میرے لئے صبح تک انتظار کرنا' ممکن نہیں ہے۔" میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ "سب سے پہلے تو مجھے ژیان کے متعلق پوچھنا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ ابھی صبح ہونے میں خاصا وقت ہے' ژیان کو اغوا کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ باقی باتیں اس سے بعد میں بھی پوچھی جا سکتی ہیں۔"

"یہ جلدبازی ہو گی معبلہ!" سالار اکبر نے کہا۔ "اول تو وہ اتنی جلدی زبان نہیں کھولے گا' اگر ایسا ہو بھی گیا تو ایک ہی رات میں دوسری خطرناک مہم کی کامیابی ذرا مشکل ہی لگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ژیان جہاں ہو گا وہاں بھی سخت ترین حفاظتی اقدامات ہوں گے۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے متعلق تو ہمیں پہلے سے بہت کچھ معلوم تھا' پھر خود تم بھی اس کے گرد و نواح کا جائزہ لے چکی تھیں۔ کسی ایسی مہم کے لئے جگہ کا پہلے سے دیکھنا اور مناسب منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں آج رات اگر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ژیان کو کہاں رکھا گیا ہے تو یہ بھی کم نہیں۔"

سالار اکبر بردبار اور ذہین آدمی تھا۔ اب تک اس سے ملاقاتوں کے نتیجے میں مجھ پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ وہ ایک غیر جذباتی شخص ہے اور ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا قائل ہے۔ اس نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا' ان سے متفق ہونے کے باوجود جو پہلا خیال میرے ذہن میں آیا' میں نے اس کا اظہار کر دیا۔ "یہ کیا ضروری ہے سالار کہ آج رات پیش آنے والے واقعے کے بعد بھی ژیان اسی جگہ رہے جس کا علم ولیم کو ہے؟"

میری بات میں وزن تھا اس لئے سالار اکبر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کچھ دیر توقف کے بعد وہ کہنے لگا۔ "پہلے آپ ولیم کی زبان تو کھلوائیں' پھر سوچتے ہیں کیا قدم اٹھایا جائے۔"

اس کے بعد چائے آ گئی اور ہم سب چائے پینے لگے۔ میں اس دوران یہ سوچتی رہی کہ ولیم کی زبان کھلوانے کے لئے کیا طریقہ استعمال کرنا چاہئے۔ ڈیسوزا کو میں نے بہت جلد زبان کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جو حربہ میں نے اس پر آزمایا تھا' ولیم پر بھی کارگر ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے اسی حربے کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

چائے پیتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ رگھوویر اور عادل میرے ساتھ ہو لئے۔ سمیع اللہ وہیں سالار اکبر کے پاس رہ گیا تھا۔

"تم لوگ مجھے ولیم کے سامنے مس گریٹا ہی کہنا۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔ "میں اس پر اپنی شخصیت ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔"

ان دونوں ہی نے اقرار میں سر ہلا دیئے۔ پھر عادل نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ مس گریٹا کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اسے میرا ہی فرضی نام سمجھ لو۔ ولیم سے اپنا تعارف میں نے اسی نام سے کرایا تھا۔"

"تو ولیم سے تم پہلے بھی مل چکی ہو؟"

"ہاں' دو مرتبہ ملاقات ہو چکی ہے۔" میں نے بتایا۔

تہہ خانے میں اترنے کا راستہ ایک کمرے کے اندر تھا۔ اس کمرے کے دروازے پر دو مسلح افراد موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں آتے دیکھ کر راستہ دے دیا۔ بظاہر وہ کمرہ کوئی مطالعہ گاہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں طرف لکڑی کی قد آدم الماریوں میں کتابیں رکھی تھیں۔ رگھوویر نے آگے بڑھ کر دیوار سے لگی ہوئی ایک الماری کو ترچھا کیا تو ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی پتھر کی سل اپنی جگہ سے ہٹی ہو۔ اسی کے ساتھ بائیں جانب دیوار کے قریب ایک خلا نمودار ہو گیا۔ عادل کے ساتھ میں نے بھی ادھر قدم بڑھا دیئے۔ رگھوویر ہم دونوں کے پیچھے تھا۔ وہاں پہنچ کر تہہ خانے میں اترنے کی سیڑھیاں نظر آئیں۔ دائیں جانب کم پاور کا ایک بلب روشن تھا جس کی وجہ سے سیڑھیاں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک سپاٹ دیوار دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔

"آ جاؤ۔" عادل نے ان سیڑھیوں سے اترتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"مگر وہ دیوار؟" میں آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"وہ ہمیں راستہ دے دے گی' تم آؤ۔" عادل نے کہا اور تیزی سے اترتا ہوا آخری سیڑھی تک پہنچ گیا۔

ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ سپاٹ دیوار سامنے سے ہٹ گئی۔ میں بھی عادل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میرے پیچھے رگھوویر تھا۔ دیوار ہٹنے کے بعد اندر بھی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہم تینوں یکے بعد دیگرے ایک گول کمرے میں پہنچ گئے۔ اس کمرے سے نکلنے کا بظاہر کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عادل نے پلٹ کر کمرے کی دیوار کے ایک حصے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔ سپاٹ دیوار اپنی جگہ واپس آ گئی۔ اسی کے ساتھ سامنے ایک خلا نمودار ہوا۔ ہم اس خلا کو عبور کر کے ایک راہداری میں پہنچ گئے۔ ہمارے عقب میں گول کمرے کا خلا برابر ہو چکا تھا۔ راہداری میں بھی روشنی تھی اور دونوں جانب دو دروازے نظر آ رہے تھے۔ دونوں دروازوں میں بڑے بڑے قفل پڑے تھے۔ وہ تالے مجھے عام تالوں سے مختلف دکھائی دیئے تھے۔ رگھوویر نے دائیں جانب کے دروازے میں پڑے ہوئے گول تالے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے حصوں کو گھمانا شروع کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ اس تالے میں چابی کے لئے کوئی سوراخ نہیں تھا۔ نہ میں نے رگھوویر کے ہاتھ میں تالا کھولنے کے لئے کوئی چابی دیکھی تھی۔ وہ تالا' کڑے سے لے کر نیچے تک موٹی موٹی پلیٹوں پر مشتمل تھا جن پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ہندسے کھدے ہوئے تھے۔ رگھوویر انہی پلیٹوں کو یکے بعد دیگرے حرکت دے رہا تھا۔

"یہ نمبر لاک کہلاتا ہے جو مخصوص نمبروں کو ترتیب دینے ہی سے کھل سکتا ہے۔" رگھوویر نے اپنے قریب میری موجودگی محسوس کر کے بتایا۔ یہ کہتے ہوئے بھی وہ نمبر ملانے میں مصروف رہا تھا۔ "جس شخص کو نمبر معلوم نہ ہوں' اس تالے کو نہیں کھول سکتا۔" اس نے آخری پلیٹ کو گھمایا۔ پھر اس کا ہاتھ رکھتے ہی "کھٹ" کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔

اس کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہو گئے۔ اندر بھی روشنی تھی۔ بائیں جانب دو ستونوں کے درمیان مجھے ولیم رائٹ بندھا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے دونوں پیروں کو ممکنہ حد تک چیر کر ستونوں سے باندھا گیا تھا۔ یہی صورت دونوں ہاتھوں کے ساتھ تھی۔ ہاتھوں اور پیروں میں آہنی کڑے پڑے ہوئے تھے۔ اسی کے مقابل کچھ فاصلے پر دائیں جانب مجھے ایک الماری رکھی نظر آئی۔ الماری کے قریب ہی مختلف اشیاء ایک میز پر رکھی تھیں۔ میز کے قریب ہی دو کرسیاں بھی پڑی تھیں۔

دروازہ کھلتے ہی ولیم نے ہماری طرف دیکھا تھا' مگر کچھ بولا نہیں تھا۔

میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"مسٹر ولیم! تم نے سیکرٹ سروس کے سربراہ کی حیثیت سے یقیناً متعدد مجرموں کی زبان کھلوانے کے لئے ان پر تشدد کیا ہو گا۔" میں پُرسکون آواز میں اس سے مخاطب ہوئی۔ "مجھے بھی تمہاری زبان کھلوانا ہے' مگر اس کے لئے میں تم پر تشدد نہیں کروں گی۔ تم اگر میرے سوالوں کے جواب دینے پر آمادہ ہو تو میں تمہیں ان ستونوں سے بھی کھلوا سکتی ہوں۔ اس طرح بندھے بندھے تمہارے ہاتھ پیر اکڑ گئے ہوں گے۔ تمہیں آرام سے کرسی پر بٹھا دیا جائے گا۔ بولو مسٹر ولیم رائٹ! میری پیشکش تمہیں منظور ہے؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں اس سے انگریزی ہی میں بات کر رہی تھی۔

"منظور ہے۔" اس نے خلاف توقع جواب دیا۔ اس کے لہجے سے میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔

"مس گریٹا!" عادل پیچھے سے بولا۔ "اس طرح یہ دھوکا دے کے آزاد ہونے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ مسٹر ولیم اتنے احمق نہیں ہیں۔ انہیں اب تک اندازہ ہو جانا چاہئے کہ یہ یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے۔ تم انہیں کھول دو۔" میں نے کہا۔

پھر عادل اور رگھوویر نے میرے ایما پر ولیم کو ستونوں سے کھول دیا۔ ہاتھ پیر آزاد ہوتے ہی اس نے وہی کیا جو عادل نے کہا تھا۔ وہ رگھوویر اور عادل سے بھڑ گیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ حرب و ضرب کے فن میں خاصا طاق تھا اور ان دونوں کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل جائے۔ رگھوویر اور عادل اسے دروازے کی طرف بڑھنے سے روک رہے تھے۔

"تم دونوں الگ ہٹ جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ مسٹر ولیم کو عورتوں کے ہاتھوں پٹنے کا زیادہ شوق معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں ان کی اس خواہش کا احترام کرنا چاہئے۔" میں یہ کہتے ہوئے اس طرح کھڑی ہو گئی کہ اگر ولیم دروازے کی طرف لپکے تو اس کا راستہ روک سکوں۔ ویسے وہ دروازے سے نکل کر بھی فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ میں خود یہ دیکھ چکی تھی کہ واپسی کا راستہ بند ہو چکا تھا اور اس راستے کو کھولنے کا طریقہ یقیناً ولیم کو نہیں معلوم تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کے بس میں اتنا ہی تھا کہ کمرے سے نکل کر راہداری میں پہنچ جاتا جو ایک بند گلی کے مانند تھی یا پھر وہ کمرے سے باہر جا کے ہمیں اس کمرے میں بند کر سکتا تھا۔ ولیم کے لئے دونوں ہی صورتیں بے فائدہ تھیں۔ اس کے باوجود میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے کمرے سے نہیں نکلنے دوں گی۔

رگھوویر اور عادل اسے چھوڑ کر تیزی سے پیچھے ہٹ گئے تو اس نے میری توقع کے مطابق دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔

"ایسی بھی کیا جلدی مسٹر ولیم!" میں نے یہ کہتے ہوئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کی ٹانگوں میں اپنی ایک ٹانگ پھنسا دی۔

منہ کے بل گرتے گرتے اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر لئے اور خلاف توقع گرتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس نے مجھے قہرآلود نظروں سے گھورا' پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے جسم کو اس طرح حرکت دی جیسے مجھ پر چھلانگ لگانے والا ہو' مگر میں اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی رہی۔

"آؤ نا! تم پوز تو ایسا بنا رہے تھے جیسے مجھ پر چھلانگ لگانا چاہتے ہو' پھر کیا ہمت جواب دے گئی؟"

میرے الفاظ ختم ہوتے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگا ہی دی' مگر میرے جسم کو چھونے کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ میں تیزی کے ساتھ اس جگہ سے ہٹ گئی تھی۔ اس مرتبہ وہ جلدی نہیں اٹھ سکا۔ اس کے بائیں گھٹنے کو میں نے فرش سے ٹکراتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ گرتے ہی اسی لئے اس نے سیدھا ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنے کو پکڑ لیا تھا۔

"اب اٹھو بھی نا مسٹر ولیم! تم تو ذرا سی چوٹ کھا کر لیٹ گئے۔ ابھی تو تمہارے جسم پر نہ جانے ایسی کتنی چوٹیں لگیں گی۔ اپنے وعدے کے مطابق ابھی تک میں نے تم پر ہاتھ نہیں اٹھایا ہے۔ خود تمہی وعدہ خلافی کر رہے ہو۔" میرا انداز چڑانے والا تھا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے بائیں پیر کو جھٹکے دینے لگا۔

"کیا خیال ہے مسٹر ولیم! کچھ بے تکلفی میری طرف سے بھی ہو جائے۔ تمہیں وعدہ خلافی کی تھوڑی بہت تو سزا ملنا چاہئے۔ خیر سزا کو بھی چھوڑو' آؤ ہم دونوں ایک کھیل کھیلتے ہیں۔ جس جگہ ایک دفعہ چوٹ لگ جاتی ہے وہیں دوبارہ چوٹ لگ جائے تو بڑا مزہ آتا ہے۔ تمہیں شاید اس مزے کا تجربہ نہ ہو۔ اس کے لئے میری ایک تجویز ہے۔ میں تمہارے اسی گھٹنے پر ضرب لگانے کی کوشش کرتی ہوں' تم یہ کوشش کرو کہ میں ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکوں۔ جسم کے کسی اور حصے پر ضرب لگانا فاؤل ہے۔ ہاں' تمہیں میری طرف سے پوری اجازت ہے' مگر یہ سمجھ لو اس کوشش میں نتائج کی ذمے داری خود تم پر ہو گی' ٹھیک ہے؟"

میری بات کے جواب میں وہ مجھے صرف گھور کے رہ گیا۔

"تمہاری خاموشی کو میں رضامندی سمجھتے ہوئے کھیل شروع کر رہی ہوں مسٹر ولیم! اپنا زخمی گھٹنا مزید زخمی ہونے سے بچاؤ۔" میں نے یہ کہتے ہی اپنی جگہ سے جست بھری۔

ولیم تیزی سے پیچھے ہٹا مگر بچ نہیں سکا کیونکہ اس کے پیچھے دیوار تھی۔ میرے دائیں پیر کی ٹھوکر براہ

راست اس کے بائیں گھٹنے پر پڑی۔ میں نے دانستہ شدید ضرب لگائی تھی تاکہ کھیل زیادہ طوالت نہ اختیار کرے۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق ہی نکلا۔ اس کے منہ سے تیز چیخ نکلی اور پھر وہ فرش پر گر کے تڑپنے لگا۔ یقیناً اس کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی ورنہ وہ اس طرح نہ تڑپتا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس کے ماتھے کے بیچوں بیچ میں نے اپنے سینڈل کی ایڑی رکھی اور جسم کا سارا بوجھ ڈال کر تیزی سے گھوم گئی۔ ولیم کے منہ سے جگر خراش چیخیں بلند ہونے لگیں۔ میں نے اس کے ماتھے سے ایڑی ہٹائی تو خون بہنے لگا۔

"اسے اٹھا کر پھر باندھ دو۔" میں نے مڑ کر عادل اور رگھوویر کو مخاطب کیا۔

وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھ کر ولیم تک پہنچ گئے۔ ولیم کے اندر اب اتنی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ دوبارہ ان دونوں سے بھڑنے کی کوشش کرتا۔ ولیم کو گھسیٹتے ہوئے وہ پھر ستونوں کے درمیان لے آئے۔ میں ان کے قریب ہی موجود تھی۔ جب وہ ولیم کو باندھ رہے تھے تو ایک بار پھر ولیم مزاحمت کرنے لگا۔

"نہیں مسٹر ولیم! یہ بُری بات ہے۔" یہ کہتے ہی میں نے پھر اس کے بائیں گھٹنے کو نشانہ بنایا۔ اس مرتبہ میں نے زیادہ زور کی ٹھوکر نہیں ماری تھی۔ پھر بھی وہ چیخ اٹھا۔ رگھوویر اور عادل اسے دوبارہ ستونوں کے درمیان باندھنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

"ولیم! تمہارا تعلق حکمراں قوم سے ہے اور یہ دونوں جو تمہارے سامنے کھڑے ہیں یہ غلام قوم کے فرد ہیں۔ تم ان کے آقا ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم ہرگز یہ برداشت نہیں کرو گے کہ ایک غلام اپنے آقا کے سر پہ جوتے لگائے۔ بولو، میں غلط تو نہیں سمجھ رہی؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ماتھے سے بہنے والے خون کے سبب اس کا چہرہ لہولہان نظر آ رہا تھا۔

"کس بات کا مطلب پوچھنا چاہتے ہو؟ آقا اور غلام کا یا جوتے اور سر کا؟ نہ سمجھنے والی تو اس میں کوئی بات نہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ یا تو تم میرے سوالوں کے جواب دینے پر تیار ہو جاؤ، یا پھر اپنے غلاموں سے جوتے کھاؤ۔ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔" میں نے یہ کہہ کر عادل کو اشارہ کیا جو میرے قریب ہی کھڑا تھا۔

عادل جھک کر اپنے پیر سے جوتا اتارنے لگا۔

"ٹھہرو۔" ولیم بول اٹھا۔ "تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میرے سوالوں کے جواب دینے پر آمادہ ہو؟" میں بولی۔

"اس کا انحصار تمہارے سوالوں پر ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"بڑی ہمت ہے تمہاری۔" میں تضحیک آمیز انداز میں ہنسی۔ "ابھی شاید تمہارا دماغ درست نہیں ہوا۔ خیر، میرا پہلا سوال یہ ہے کہ ژیان کہاں ہے؟"

"اس سوال کا جواب مشروط ہے۔ پہلے تمہیں میرے دو سوالوں کے جواب دینا پڑیں گے۔" اس نے کہا۔

"ہرچند کہ اس وقت تم شرطیں لگانے کی پوزیشن میں نہیں ہو، اس کے باوجود میں تمہارے سوال ضرور سنوں گی۔ چلو پہلے تمھی سوال کر لو۔"

"میرا پہلا سوال یہ ہے کہ ژیان کو تم کیسے جانتی ہو اور اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" اس نے بلاجھجک مجھ سے سوال کر دیا۔

"اور تمہارا دوسرا سوال کیا ہے، وہ بھی بیان کر دو۔"

"دوسرا سوال یہ ہے کہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا، میں سیکرٹ سروس کا سربراہ ہوں؟"

"میں صرف تمہارے دوسرے سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔ مجھے یہ بات فلپ سے معلوم ہوئی تھی۔"

"مسٹر فلپ سے مجھے کسی ایسی غیر ذمے دارانہ حرکت کی توقع نہیں۔ تم جھوٹ بول رہی ہو، تمہاری معلومات کا ذریعہ کوئی اور ہے۔"

"خیال ہے تمہارا۔" میں دھیرے سے ہنسی۔ "ورنہ تو مسٹر فلپ مجھے تمہارے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتا چکے ہیں۔ کہو تو بتاؤں۔"

"بتاؤ۔" وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"بتا دوں گی مگر اس کی ایک شرط ہے کہ تم بھی مجھے میرے سوال کا جواب دے دو گے کہ ژیان کہاں ہے؟"

"مگر ابھی تم نے میرے پہلے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں کہ ژیان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"اس کا مطلب یہ ہے مسٹر ولیم کہ تم جوتے کھائے بغیر نہیں مانو گے؟" مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔

"میں نے ابھی تمہارے سوال کا جواب دینے سے انکار تو نہیں کیا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "تم میرے سوال کا جواب دے دو، میں تمہارے سوال کا جواب دے دوں گا۔"

"اور اگر میں تمہارے سوال کا جواب نہ دوں تو؟"

"تو پھر تمہیں بھی مجھ سے کچھ پوچھنے کا حق نہیں۔"

"جوتے لگاؤ اس کے سر پر، یہ اس طرح نہیں مانے گا۔" میں نے عادل سے کہا۔

عادل نے اپنے پیر سے ایک جوتا اتار کر ہاتھ میں لے لیا تو ولیم پھر کہنے لگا۔ "ٹھہرو.......... ٹھہرو مس گریٹا! اچھا اتنا ہی بتا دو کہ مسٹر فلپ نے تمہیں میرے بارے میں اور کیا بتایا تھا؟ اپنا پہلا سوال میں واپس لیتا ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق تمہارے اور ژیان کے درمیان کسی سبب دشمنی ہی ہو سکتی ہے۔ تم اسی لئے اسے اغوا کرنا چاہتی ہو گی۔ ظاہر ہے تم اس دشمنی کی وجہ بیان نہیں کرو گی۔"

وہ عیار شخص قطعی درست اندازہ لگا رہا تھا۔ میں نے اسی لئے اسے غلط راہ پر لگانے کے لئے کہا۔

"ژیان سے میری کوئی دشمنی نہیں، تم نے قطعی غلط اندازہ لگایا ہے۔"

"پھر تم نے اسے کیوں اغوا کرنا چاہا؟" اس نے دریافت کیا۔

"دولت کے حصول کی خاطر، ایک عورت سے میں نے ژیان کا پچاس ہزار میں سودا کیا تھا۔"

"اور اس عورت کا نام معبلہ ہے!" ولیم نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

میں دانستہ اس طرح اچھل پڑی جیسے کوئی خلاف توقع بات سن لی ہو' پھر بولی۔ "تم .... تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس لئے کہ ژیان کی دشمن صرف اور صرف معبلہ ہی ہو سکتی ہے' کوئی اور نہیں۔ میں پہلے یہ سوچ رہا تھا کہ خود تمہی معبلہ ہو اور تم نے مجھے اپنا نام غلط بتایا ہے۔ اب تمہی نے صورت حال واضح کر دی۔ تم کوئی گروہ بند جرائم پیشہ عورت ہو مس گریٹا! تم نے یہ بتا کر بہت اچھا کیا کہ معبلہ سے ژیان کا سودا کیا تھا۔ ژیان کے عوض تمہیں معبلہ سے جو بڑی رقم ملنے والی تھی' اگر میں وہ رقم ادا کر دوں تو کیا تم مجھ سے کوئی سوال کئے بغیر مجھے رہا کر سکتی ہو؟"

"تم گریٹا کے ہاتھوں میں بہت غلط پھنس گئے مسٹر ولیم رائٹ!" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا مس گریٹا! جو رقم تمہیں ژیان کے بدلے معبلہ سے ملتی' میں دینے پر آمادہ ہوں۔ تم اور کیا چاہتی ہو؟"

"تمہارے خیال میں مسٹر فلپ سے میں نے کس لئے دوستی کی ہو گی؟"

"کبھی وقت پڑنے پر قانون کا تحفظ حاصل کرنے کے لئے۔" ولیم نے جواب دیا۔ "بڑے بڑے جرائم پیشہ افراد مسٹر فلپ جیسے اعلیٰ حکام سے اسی لئے تعلقات قائم کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ تمہارے لئے مسٹر فلپ سے دوستی کرنا اس لئے آسان رہا ہو گا کہ تم بہرحال انتہائی حسین جسم کی مالک ہو۔"

"کیا میں' مارگریٹ سے بھی زیادہ حسین ہوں مسٹر ولیم رائٹ!" میری آواز میں چبھن تھی۔

"تو .... تو کیا تم مارگریٹ سے بھی واقف ہو؟"

"ہاں مسٹر ولیم! اور مجھے مارگریٹ اور تمہارے تعلقات کا بھی علم ہے۔ کچھ اور پوچھنا ہے تمہیں؟" میں طنزیہ آواز میں بولی۔ "مسٹر فلپ کو بھی اپنی بیوی سے تمہارے تعلقات کی خبر ہے۔ تم نے مسٹر فلپ سے میرے مراسم کے بارے میں جو اندازہ لگایا ہے' کسی حد تک درست ہے لیکن مسٹر فلپ سے تعلقات پیدا کرنے کی صرف یہی وجہ نہیں۔ مسٹر فلپ کے ذریعے میں تم تک پہنچنا چاہتی تھی اور مجھے بہرحال اپنے اس مقصد میں کامیابی ہو ہی گئی۔"

"تم مجھ تک پہنچنا چاہتی تھیں۔" وہ حیرت سے بولا' پھر سوال کیا۔ "مگر کیوں مس گریٹا؟"

"اس لئے مسٹر ولیم کہ معبلہ سے میں تمہارا سودا بھی کر چکی تھی۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میرا سودا؟" ولیم کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں مسٹر ولیم! تمہارا سودا اور یہ سودا بھی پچاس ہزار ہی میں ہوا تھا اس لئے ژیان کی بجائے تم میرے ہتھے چڑھ گئے تو بھی میں گھاٹے میں نہیں رہی۔"

"وہ .... معبلہ .... وہ مجھے کیوں اغوا کرنا چاہتی تھی؟" اس کا انداز خودکلامی کا سا تھا۔

"معبلہ مجھے کیسے جانتی ہے؟"

"اسی طرح مسٹر ولیم جس طرح تم معبلہ کو جانتے ہو۔" میں بولی۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ

معبلہ کا مقصد تمہیں اغوا کرانے سے کیا ہے۔"

"کیا مقصد ہے اس کا؟" ولیم نے بے اختیار مجھ سے پوچھا۔

"اب اتنی آسانی سے تو میں تمہیں سب کچھ نہیں بتا سکتی مسٹر ولیم! تم خود تو کچھ بھی بتانے کی تیار نہیں ہو۔ اچھا چلو یہی بتا دو کہ ژیان کو تم نے اپنا مہمان بنا کر اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں کیوں رکھا تھا؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"اگر میں تمہارے اس سوال کا جواب دے دوں تو کیا تم مجھے یہ بتا دو گی کہ معبلہ مجھے کس لئے اغوا کرانا چاہتی تھی؟"

"میں تمہارے سوال کا جواب دے دوں گی۔" میں نے کہا کیونکہ مجھے تو اسے یہ بتانا ہی تھا۔

"تو سنو مس گریٹا! ژیان میرا مہمان نہیں' میری ذمے داری تو محض اس کی حفاظت کرنا ہے کیونکہ اس نے حکومت سے سیاسی پناہ حاصل کی ہے۔ مجھ پر کیونکہ ژیان کی حفاظت کی ذمے داری ہے اس لئے تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں ہے۔ میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ ژیان نے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے سخت ترین حفاظتی انتظامات کے باوجود اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا۔ اسے اسی لئے وہاں سے ہٹا کر میں نے اس کی جگہ لے لی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا شبہہ درست ہے یا نہیں۔ اب جبکہ تم مجھے وہاں سے اغوا کرنے میں کامیاب ہو چکی ہو تو ژیان نے حفاظتی انتظامات پر جس بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا' وہ درست ثابت ہو چکی ہے۔ مس گریٹا! میں نے تمہارے سوال کا تفصیل کے ساتھ جواب دے دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم بھی مجھے مایوس نہیں کرو گی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے اغوا کرانے سے معبلہ کا مقصد کیا ہے؟" ولیم رائٹ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"یقیناً مسٹر ولیم! میں بھی وعدے کے مطابق تمہارے سوال کا جواب دوں گی۔ معبلہ نے مجھے بتایا تھا کہ ایک عرصے سے انگریز حکومت اس کے متعلق چھان بین کرا رہی ہے۔ معبلہ کو کسی ذریعے سے یہ پتا چلا ہے کہ یہ چھان بین تمہارے حکم پر کی جا رہی ہے۔" میں نے دانستہ صرف تمہارا نام لیا اور ملٹری انٹیلی جنس کے چیف رابرٹ ہیم کا نام گول کر گئی۔

"لیکن معبلہ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟" میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی ولیم بول اٹھا۔

"یہ اس نے مجھے نہیں بتایا۔" میں نے بتایا۔ "وہ تمہیں اغوا کرا کے تم سے یہی معلوم کرنا چاہتی ہے کہ اس کے متعلق تمہاری حکومت کیوں چھان بین کر رہی ہے؟ مجھے اسی سوال کا جواب معبلہ کو دینا ہے۔ سو یوں سمجھو مسٹر ولیم کہ یہ سوال پچاس ہزار روپے کا ہے۔ تمہاری زبان کھلوانے کی ذمے داری بھی معبلہ نے مجھی پر ڈالی ہے۔"

"اگر معبلہ کو تم اس سوال کا جواب فراہم نہ کرو مس گریٹا تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ تمہیں وہ پچاس ہزار روپے ادا نہ کرے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ پچاس ہزار روپے بھی معبلہ کی بجائے اگر میں تمہیں ادا کر دوں تو کیا تم مجھ سے یہ سودا کر سکتی ہو؟ اس طرح تمہیں مجموعی طور پر ایک لاکھ روپے کی رقم مل جائے گی جو ظاہر ہے' معمولی نہیں۔"

"تمہیں شاید یہ نہیں معلوم مسٹر ولیم کہ جرائم پیشہ افراد کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں اور اصولوں پر کسی سے اور کسی بھی قیمت پر سودے بازی نہیں کرتے۔ اس بات کو یوں سمجھو کہ ایک سے میں کسی آدمی کو قتل کرنے کا سودا بیس ہزار میں کرلیتی ہوں' جس آدمی کو قتل کیا جانا ہے وہ مجھے سے دگنی رقم دے کر بھی زندہ رہنا چاہے تو یہ ممکن نہیں' میں اسے ضرور قتل کروں گی۔ معبلہ سے تمہارا اور ژیان کا سودا کیا ہے' میں اس سودے سے انحراف کر کے اپنا اصول نہیں توڑ سکتی۔ ایک تو کیا تم اس سے دگنی چوگنی رقم بھی دینے پر آمادہ ہو جاؤ تو ایسا نہیں ہو گا۔" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"میں تمہیں نہ ژیان کے بارے میں کچھ بتاؤں اور نہ معبلہ کے سوال کا جواب دوں تو کیا تم ایک لاکھ روپے ڈوب نہیں جائیں گے؟ پھر تو تم مجھے قتل بھی کر دو گی تو تمہیں ایک پائی نہیں ملے گی مجھ سے سودا کرنے کی صورت میں ایک لاکھ ملیں گے۔" ولیم کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے سمجھا رہا ہو۔

"کسی بھی سودے میں نفع نقصان ہوتا ہی ہے مسٹر ولیم! اس سودے میں نقصان ہی سہی۔ ا بھی صرف اس صورت میں ہو گا جب کہ میں تمہاری زبان نہ کھلوا سکی۔"

"تمہیں میری زبان کھلوانے میں کامیابی نہیں ہو گی مس گریٹا! اس لئے بہتر یہی ہے کہ پیشکش پر غور کرلو۔"

"نہیں مسٹر ولیم! میں تمہاری پیشکش رد کرتی ہوں۔ میں تمہیں ایک منٹ کی مہلت دیتی ہوں کے بعد تم ٹھہرنے کو کہو گے بھی تو میں تمہاری بات نہیں مانوں گی۔ اس ایک منٹ میں تمہیں یہ سو کہ میرے سوالوں کے جواب دو گے یا اپنے غلاموں سے جوتے کھاؤ گے؟" یہ کہہ کر میں نے کا بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس وقت صبح کے پونے چار بجنے والے تھے۔

"ٹھہرو مس گریٹا!" ولیم بولا۔

"نہیں مسٹر ولیم! اب تمہیں جو کچھ کہنا ہے' ایک منٹ گزر جانے کے بعد کہنا۔" میں طرف دیکھے بغیر ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تم میری زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ اپنا بھی ایک لاکھ روپے کا نقصان کر مس گریٹا!"

"میں جانتی ہوں اور یہ نقصان اٹھانے پر آمادہ ہوں۔"

پھر ایک منٹ پورا ہو گیا۔ میں نے سوالیہ نظریں ولیم کی طرف اٹھائیں۔ جواب میں اس نے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔

"شروع ہو جاؤ' آقا اپنے غلاموں سے جوتے کھانا چاہتا ہے۔" میں نے عادل کو مخاطب کیا۔

عادل' جو اپنا جوتا پہن چکا تھا' اس نے دوبارہ جوتا اتار کر ہاتھ میں لے لیا اور آگے بڑھا۔

"تمہیں اس پر پچھتانا پڑے گا مس گریٹا!" ولیم کا لہجہ دھمکی دینے والا تھا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کون پچھتاتا ہے؟"

عادل نے ولیم کے سر پر جوتے برسانا شروع کر دیئے۔ ولیم اپنی یہ ذلت برداشت کر گیا۔ گویا

ملے میں میرا آزمودہ حربہ ناکام رہا تھا۔

"بس کرو۔" میں نے عادل سے کہا۔ "یہ ذلت کی پستیوں تک پہنچ چکا ہے جہاں آدمی کو اپنی عزت کا بھی کوئی احساس نہیں رہتا۔"

عادل نے جوتا پہن لیا اور پھر مجھ سے بولا۔ "مس گریٹا! آپ اب ہم دونوں کو مسٹر ولیم کی خاطر ارات کی اجازت دے دیں۔ کیا خبر ان کی سمجھ میں ہماری بات آ جائے۔"

میں سمجھ گئی کہ عادل' ولیم پر تشدد کر کے اس کی زبان کھلوانا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اجازت دے دی۔

عادل نے کمرے میں موجود الماری کھول کر ایک شیشی نکال لی۔ رگھوویر بھی اس کے پاس پہنچ گیا اس نے الماری میں سے ایک تیز دھار نشتر اٹھا لیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں وہ دونوں ولیم کے قریب پہنچ ے۔ عادل نے ایک سلائی کے سرے پر لپٹی ہوئی روئی کو بوتل میں ڈال کر بھگویا اور پھر بھیگی ہوئی روئی م کے ماتھے پر موجود زخم سے لگا دی۔ اسی کے ساتھ ولیم کی پے در پے چیخوں سے کمرہ گونجنے لگا۔ مجھے وشت جلنے کی بو محسوس ہوئی۔ چند لمحے توقف کے بعد عادل نے دوبارہ سلائی کو بوتل میں ڈالا۔

"نہیں' نہیں۔" ولیم بری طرح چیخنے لگا' مگر عادل تو جیسے بہرا ہو گیا۔ اس نے ولیم کی چیخوں کو نظرانداز کر دیا۔

عادل نے دوبارہ ولیم کی پیشانی کو سلائی سے نشانہ بنایا۔ پھر وہی سب کچھ ہوا جو پہلے ہوا تھا۔ سلائی پر ب روئی لپٹی ہوئی نہیں تھی۔ روئی بھی شاید جل گئی تھی۔

"اس کے ماتھے کی ہڈی نہ گلنا شروع ہو جائے۔" رگھوویر کو میں نے عادل سے کہتے سنا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم۔" عادل نے رگھوویر کی بات سے اتفاق کیا۔

"اس کے زخمی گھٹنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" رگھوویر بولا۔

"ہاں یہ مناسب ہے۔ ایسا کرو کہ اس کے جسم پر صرف زیر جامہ رہنے دو۔" عادل نے کہا۔

رگھوویر نے تیز نشتر کی مدد سے ولیم کے لباس کو چیر ڈالا۔ ذرا ہی دیر میں ولیم کے جسم پر صرف ایک بر رہ گیا۔ میں نے ولیم کے بائیں گھٹنے کو سوجا ہوا دیکھا۔ رگھوویر نے بڑی بے رحمی کے ساتھ اسی گھٹنے کو نشتر سے چھید دیا۔ ولیم کی مدھم ہوتی چیخیں پھر کمرے میں گونجنے لگیں۔ زخمی گھٹنے سے خون بہنے لگا تھا۔

"کیا خیال ہے مسٹر ولیم! تم اب بھی مس گریٹا کے سوالوں کے جواب دینے پر آمادہ ہو یا مزید خاطر کی جائے؟" عادل آگے بڑھا اور سلائی کو بوتل میں ڈالا۔

ولیم کوئی جواب دینے کی بجائے چیخے ہی چلا جا رہا تھا۔ میں نے عادل سے کہا۔ "مسٹر ولیم کو پوری طرح چیخ تو لینے دو تبھی تو وہ تمہاری کسی بات کا جواب دیں گے۔"

میرے کہنے پر عادل ذرا دیر کو رک گیا۔ پھر جب ولیم کی چیخیں کچھ دھیمی ہوئیں تو اس نے اپنا سوال دہرایا۔

ولیم کے چہرے پر شدید تکلیف و اذیت کے آثار تھے۔ اس نے عادل کے سوال کا کوائی جواب

نہیں دیا۔

"مس گریٹا! شاید مسٹر ولیم کو مزید خاطر مدارات کی ضرورت ہے۔" عادل مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہاں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں ان کی خاطر مدارات میں کمی نہیں کرنا چاہئے۔" یہ کہہ کر میں نے گویا عادل کو ولیم پر مزید تشدد کی اجازت دے دی۔

عادل نے ولیم کے زخمی گھٹنے پر سلائی رکھ دی اور میں نے وہاں سے ہلکا سا دھواں اٹھتے دیکھا۔ اس مرتبہ ولیم بڑے بھیانک انداز میں چیخا اور اس کی آواز پھٹ گئی۔ چند ہی لمحے بعد میں نے اس کا سر ایک طرف ڈھلکتے دیکھا۔ تکلیف کی شدت کے سبب وہ شاید بے ہوش ہو گیا۔ رگھوویر نے یہ دیکھنے کے لئے کہ واقعی ولیم بے ہوش ہو گیا ہے یا مزید اذیت سے بچنے کی خاطر بے ہوشی کا بہانہ کر رہا ہے' اس کے ایک بازو میں نشتر اتار دیا۔ ولیم کے جسم میں خفیف سی حرکت بھی نہ ہوئی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ واقعی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اس کے بازو سے بھی خون بہنے لگا تھا۔ پیشانی اور گھٹنے کے زخم سیاہ ہو گئے تھے۔

"یہ تو بہت سخت جان ثابت ہو رہا ہے۔" عادل نے مجھے مخاطب کیا پھر اس نے سلائی اور بوتل آگے بڑھ کر میز پر رکھ دیا۔

"ہاں لیکن اس کی زبان بہرحال کھلوانا ہے۔" میں بولی۔ "اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔"

"اسے ابھی کچھ دیر میں ہوش آ جائے گا۔" عادل یہ کہہ کر الماری کی طرف بڑھا۔

"اس پر اتنا تشدد کرو کہ یہ برداشت کرتا رہے اور بے ہوش نہ ہو۔" میں نے رگھوویر سے کہا۔

"اب یہی کوشش کریں گے۔" رگھوویر نے جواب دیا۔

الماری سے عادل ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر لے آیا اور اسے ولیم کی ناک سے لگا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ولیم کے جسم نے جھرجھری سی لی۔ عادل نے اس کی ناک کے آگے سے شیشی ہٹا لی۔ ولیم نے کئی چھینکیں لیں اور پھر آنکھیں کھولتے ہی زور زور سے کراہنے لگا۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے مخاطب کیا۔ "کیا حال ہے مسٹر ولیم! تم ٹھیک تو ہو؟"

اس نے کراہتے ہوئے میری طرف مظلوم سی نظروں سے دیکھا' پھر رک رک کر کہنے لگا۔ "مس گریٹا! تم مجھ پر.......... کیوں تشدد کر رہی ہو؟ مجھے.......... مجھے چھوڑ دو نا؟"

"میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اگر تم میرے سوالوں کے جواب دے دو تو تم پر تشدد نہیں کیا جائے گا۔"

"وہ.......... وہ تو میں.......... میں نہیں دے.......... دے سکتا۔" کراہنے کے باوجود اس کے لہجے میں عزم تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس کے منہ پر میرا الٹا ہاتھ پڑا۔ مجھے اس پر غصہ آ گیا تھا۔ ہاتھ اتنی زور سے پڑا تھا کہ اس کا منہ دوسری طرف پھر گیا تھا اور ایک طرف سے نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ اس کے منہ سے سسکی سی نکلی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسی دوران عادل الماری سے ایک اور شیشی نکال کر

لایا جس کے اوپر اسپرے لگا ہوا تھا۔

"مس گریٹا!" عادل نے مجھ سے کہا۔ "آپ ذرا پیچھے ہٹ جائیں۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے معلوم کیا۔ "اس سے کیا ہو گا؟"

"مسٹر ولیم کے جسم پر جہاں بھی یہ محلول لگے گا' وہاں انہیں شدید کھجلی محسوس ہو گی' ناقابل برداشت کھجلی۔" عادل مجھے بتانے لگا۔ "پھر ایک منٹ کے بعد اس جگہ اتنی تیز چبھن محسوس ہو گی جیسے وہاں سوئیاں چبھوئی جا رہی ہوں۔ تقریباً پانچ منٹ تک یہی کیفیت رہے گی۔ میرا خیال ہے مس گریٹا کہ اس کے بعد مسٹر ولیم اپنی ضد چھوڑ دیں گے۔"

یہ سنتے ہی ولیم زور زور سے چیخ کے عادل کو ایسا کرنے سے روکنے لگا' مگر عادل نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس نے وہ محلول ولیم کے سینے پر اسپرے کر ہی دیا۔ چند لمحے بعد ہی اس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا۔ ولیم کا جسم بری طرح اینٹھنے لگا۔ وہ بار بار اپنے دونوں بندھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکے دے رہا تھا۔ پھر ایک منٹ گزرتے ہی وہ اس طرح اچھل اچھل کر چیخنے لگا جیسے انتہائی تکلیف اور اذیت میں مبتلا ہو۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ چیختے چیختے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔

"مسٹر ولیم! تم چاہو تو تمہیں اس عذاب سے نجات مل سکتی ہے۔" عادل نے ولیم کو مخاطب کیا۔ "میں تمہارے متاثرہ جسم کے حصوں پر دوسری دوا چھڑک دوں گا جس سے یہ چبھن ختم ہو جائے گی ورنہ دوبارہ وقت پورا ہونے سے پہلے یہی دوا اسپرے کر دوں گا۔ پھر تم پہلے کی نسبت دگنی اذیت محسوس کرو گے۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

ولیم کو چیخنے سے مہلت ملتی تو عادل کی بات کا کوئی جواب بھی دیتا۔ نتیجتاً عادل نے وہی محلول دوبارہ اس کے جسم پر اسپرے کر دیا۔ اس مرتبہ عادل نے اس کے پیٹ پر بھی اسپرے کیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں ولیم کی حالت اور بگڑ گئی۔ میں سوچنے لگی کہ وہ کہیں پھر سے بے ہوش نہ ہو جائے' مگر ایسا نہیں ہوا۔

عادل وہ شیشی الماری میں رکھ آیا۔ وہ پلٹا تو مجھے اس کے ہاتھ میں ایک آہنی شکنجہ نظر آیا۔ اسی سے بجلی کا ایک لمبا تار اور پلگ بھی منسلک تھا۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا اور شکنجہ کھولا۔ وہ عام شکنجوں سے مختلف تھا۔ اس کے اندر تیز نوکدار کیلیں نظر آ رہی تھیں۔ عادل نے ان کیلوں کے درمیان ولیم کے ایک پیر کی انگلیاں کسنا شروع کر دیں۔ ولیم چیختے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے آہنی شکنجے کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اس کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ تکلیف اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ عادل کو میں نے شکنجہ مزید کسنے سے روک دیا۔ مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ ولیم ایک بار پھر بے ہوش نہ ہو جائے۔ عادل اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر شکنجے سے منسلک تار کو پکڑ کر قریبی دیوار کی طرف بڑھنے لگا جہاں مجھے سوئچ دکھائی دے رہا تھا۔ شکنجے کے نچلے حصے میں لکڑی لگی ہوئی تھی تاکہ کرنٹ فرش تک نہ پہنچے۔

سوئچ آن ہوتے ہی ولیم کے جسم کو جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ برقی رو اس کے جسم میں گردش کرنے لگی تھی۔ پھر چند لمحے بعد میں نے عادل کو سوئچ آف کرنے کا اشارہ کیا۔ ادھر عادل نے سوئچ آف کیا' ادھر ولیم کے جسم نے آخری جھٹکا لیا اور ساکت ہو گیا۔ مجھے جو اندیشہ تھا سامنے آ گیا۔ ولیم دوبارہ بے

ہوش ہو گیا تھا۔ شاید اس کے جسم میں اب مزید اذیت برداشت کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کی قوت ارادی حیرت انگیز تھی۔ اب تک انتہائی تشدد کے باوجود اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔ ہر حربہ اس پر ناکام ہو رہا تھا۔ عادل اسے ہوش میں لانے کے لئے دوا سنگھا رہا تھا۔

"آپ ذرا کچھ دیر کے لئے باہر چلی جائیں۔" رگھوویر نے مجھ سے کہا۔

"کیوں' کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ دیر اس کے پاس ہم دونوں کو چھوڑ دیں۔" رگھوویر نے جواب دیا۔

میں سمجھ گئی کہ رگھوویر تشدد کا کوئی ایسا نیا طریقہ آزمانا چاہتا تھا جس کا تعلق شاید ولیم کے نازک جسمانی اعضاء سے تھا۔ اس کے سوا مجھے وہاں سے ہٹانے کا کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اسی لئے مزید کوئی سوال کئے بغیر باہر آ گئی۔ اب میں راہداری میں تھی۔

ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ کمرے کے اندر سے ولیم کے گھگیانے کی آواز آئیں۔ "خدا کے لئے مجھے چھوڑ .... چھوڑ دو .... یہ تم .... تم کیا کر رہے ہو؟ .... ارے ارے۔"

رگھوویر اور عادل نے ولیم کو تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے ولیم کی تیز چیخوں سے لگایا۔ اس کی چیخوں میں اب ایک طرح کی تڑپ بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہ اس طرح چیخ رہا تھا جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو

"مس .... مس گریٹا کو بلاؤ' میں .... میں .... ان کے سوالوں .... کے جواب دینے پر .... راضی ہوں۔" چیخوں کے درمیان ولیم نے رک رک کر کہا۔

"تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ مس گریٹا تہہ خانے سے چلی گئی ہیں اور انہیں بلانے میں دیر لگے گی تو ایسا نہیں ہے۔ تمہیں زیادہ دیر ستانے کی مہلت نہیں ملے گی۔" رگھوویر کی آواز سنائی دی۔ "اگر تم نے دھوکا دیا تو ہم پھر تمہارے ساتھ یہی کھیل شروع کر دیں گے۔"

پھر کچھ دیر کے بعد مجھے عادل نے آواز دی اور میں کمرے میں پہنچ گئی۔ میرا اندازہ بھی یہی تھا کہ ولیم اس طرح دم لینا چاہتا ہے۔ رگھوویر کا اندازہ غلط نہیں لگتا تھا۔

"ہاں مسٹر ولیم!" میں نے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔ "اب کیوں کہ صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں اس لئے مجھے اپنے پہلے سوال کا جواب نہیں چاہئے' یعنی یہ کہ ژیان کہاں ہے' اس سوال کا جواب مجھے یوں بھی نہیں چاہئے کہ اب اتنا وقت نہیں رہا۔ ژیان جہاں بھی ہے' اسے اتنے کم وقت میں وہاں سے اغوا کرنا' ممکن نہیں۔ اس سے قطع نظر یہ بھی چھپا نہیں رہ سکے گا کہ تمہیں اغوا کر لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر ژیان اس جگہ ہرگز قیام نہیں کرے گا جو تمہارے علم میں ہے۔ اب تمہیں میرے اس سوال کا جواب دینا ہے کہ معبلہ کے متعلق چھان بین کیوں شروع کی گئی ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"پ .... پانی۔" کراہتے ہوئے اس نے پانی مانگا اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ تکلیف کی شدت سے اس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔

"پانی بھی مل جائے گا' مگر پہلے میرے سوال کا جواب دو۔" میں اسے گھور کر بولی۔

وہ میری بات کو نظرانداز کر کے "پانی' پانی" کی رٹ لگاتا رہا۔ "مم .... میرا حلق .... خشک ہو رہا ہے' میں پا .... پانی پیے بغیر .... بات نہیں کر سکتا۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے' پی لو پانی۔ اس طرح اور کتنی دیر تم وقت کو ٹال سکتے ہو' زبان تو تمہیں کھولنا ہی پڑے گی۔" میں نے کہا۔

کمرے میں پانی نہیں تھا۔ رگھوویر کو پانی لینے کے لئے تہہ خانے سے باہر جانا پڑا۔ جب تک وہ پانی لے کر لوٹا' ولیم کراہتا اور ہانپتا رہا۔ رگھوویر نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اس کے خشک ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ پورا گلاس پی گیا۔ رگھوویر نے گلاس اس کے ہونٹوں سے ہٹا لیا۔

"ہاں' اب میرے سوال کا جواب دینے پر آمادہ ہو یا میں تمہیں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر دوبارہ کمرے سے باہر چلی جاؤں؟" میں نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔

پھر ولیم نے جو جواب دیا اسے سن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس نے کہا تھا۔ "ہاں اب تم جا سکتی ہو۔"

"سفید کتے! میں .... میں تیری کھال ادھیڑ دوں گی۔" میں غصے میں چیخی۔

"میں کسی کتیا کے بھونکنے کا برا نہیں مانتا۔" وہ یہ کہہ کر ہذیانی انداز میں ہنسنے لگا۔ اس نے نفرت سے مجھ پر تھوکنے کی کوشش بھی کی تھی' مگر میں تیزی سے ایک طرف ہٹ گئی تھی۔ اسی کے ساتھ میری لات اس کے پیٹ پر پڑی تھی۔ "اوغ۔" وہ چیخا۔

پھر ولیم کو اپنی بدزبانی کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا' اس کا عملی مظاہرہ شروع کر دیا۔ میرے ہاتھ میں خنجر تھا اور میں' ولیم کے ایک ہاتھ کی کھال ادھیڑ رہی تھی۔ تہہ خانہ ولیم کی چیخوں سے گونج رہا تھا لیکن میرے ہاتھ نہیں رک رہے تھے۔ اس کے ایک بازو کو میں نے ادھیڑ کے رکھ دیا۔ پھر عادل نے ادھڑے ہوئے بازو پر نمک کا تیزاب لگانا شروع کیا تو ولیم اس اذیت کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا۔ وہ تیسری بار ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

"اس کے زخموں کی ڈریسنگ کر دینا۔" میں نے عادل کو مخاطب کیا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں مزید بولی۔ "اسے ابھی زندہ رکھنا ضروری ہے۔ جب تک یہ زبان نہ کھول دے اسے زندہ تو رکھنا ہے نا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت یہ مزید تشدد برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اسے ہوش میں تو لے آؤ لیکن سونے نہیں دینا۔ اس کے لئے یہاں کسی آدمی کی ڈیوٹی مقرر کر دو۔ جب دوبارہ اس سے پوچھ گچھ شروع کریں گے تو زخموں کو کھول دیں گے۔" اس کے بعد میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا' صبح کے ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دوپہر کو دو بجے کے بعد اسے پھر تختہ مشق بنائیں گے۔"

"اوپر سے فرسٹ ایڈ باکس لانا پڑے گا۔" عادل نے رگھوویر کی طرف دیکھا۔

"میں لے آتا ہوں۔" رگھوویر بولا۔

رگھوویر کے ساتھ ہی میں بھی تہہ خانے سے نکل آئی۔ میں اس وقت شدید قسم کی جھنجلاہٹ میں

مبتلا تھی۔ اس کی وجہ ولیم کی زبان کھلوانے میں ناکامی تھی۔ خلاف توقع وہ حیرت ناک قوت ارادی کا مالک ثابت ہوا تھا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اسی لئے جب میں گھر پہنچی تو دلاری سے کہا۔ "تمہیں زحمت تو ہو گی دلاری! میرے لئے ناشتہ بنا دو۔ ناشتہ کر کے میں سو جاؤں گی۔"

"اس میں زحمت کی کوئی بات نہیں معبلہ جی! یہ تو میرا کرتویہ (فرض) ہے۔" دلاری نے جماہی لی۔

"آپ کپڑے بدلیں، میں ابھی ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔"

اپنے کمرے میں آ کر میں نے سونے کے لئے لباس تبدیل کیا اور دلاری کے ناشتہ بنا کر لانے کا انتظار کرنے لگی۔ دلاری نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ ناشتہ کر کے میں سونے کے لئے لیٹ گئی اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔ فوری طور پر نیند آ جانے کا سبب تھکن بھی تھی۔

سوتے سوتے اچانک مجھے اپنے ذہن میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے اوپر مجھے ایک داغ داغ چہرہ جھکا دکھائی دیا اور میں اسے فوراً پہچان گئی۔ وہ چمپا کا کریہہ چہرہ تھا۔ آنکھیں کھلتے ہی میری نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائی تھیں۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن کو جھٹکا لگا تھا۔

"تو اپنی جگہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہے گی معبلہ!" چمپا کے ہونٹ ہلے۔

"ہاں" میں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کروں گی۔" میں خواب آلود سی آواز میں خود بخود بولی۔ میرے ارادے کو بولنے میں کوئی دخل نہیں تھا۔

اس کے بعد مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی میرے ذہن کو ٹٹول رہا ہو۔ میں پلک جھپکائے بغیر چمپا کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی اور میری نظروں کے درمیان کوئی ایسا تعلق قائم تھا کہ میں کسی اور طرف نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"اب تُو سو جائے گی گہری نیند۔" ذرا دیر بعد چمپا کے ہونٹوں کو پھر حرکت ہوئی۔ "سو جا معبلہ! سو جا.......... تجھے نیند آ رہی ہے .... تُو سو رہی ہے .... سو رہی ہے۔" یہی الفاظ سنتے سنتے میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور پھر جانے کب میں گہری نیند سو گئی

☆======☆======☆

معلوم نہیں میں کب تک اسی طرح سوتی رہتی کہ کسی نے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"معبلہ جی' معبلہ جی! اٹھئے .... جلدی اٹھئے۔" یہ دلاری کی آواز تھی۔

"سونے دو .... ابھی مجھے سونے دو۔" میں نے آنکھیں کھولے بغیر کروٹ بدل لی۔ دلاری کی آواز میں نے پہچان لی تھی۔

دلاری نے مجھے ایک مرتبہ پھر جھنجھوڑ ڈالا اور تیز آواز میں کہنے لگی۔ "یہ سونے کا وقت نہیں ہے معبلہ جی! بھگوان کے لئے اٹھ جایئے۔"

میں نے مجبوراً آنکھیں کھول ہی دیں۔ میرے ذہن پر اب تک نیند کا شدید غبار چھایا ہوا تھا لیکن دلاری کے وحشت زدہ چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ کوئی غیر معمولی بات ضرور ہے' اسی وقت میں نے دھماکوں کی آوازیں سنیں جو کہیں قریب ہی سے آ رہی تھیں۔

"یہ دھماکے کیسے ہیں؟" میں یہ کہتے ہی اچھل کر بیٹھ گئی۔

"تنظیم کے ارکان اور پولیس کے درمیان زبردست مقابلہ ہو رہا ہے۔ پولیس نے عمارت کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔" دلاری نے تیزی سے بتایا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" میں نے سوال کیا۔

"میں خود دیکھ کر آئی ہوں۔" دلاری نے جواب دیا۔ "ہمارے لئے بھی یہاں خطرہ ہو سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے معبلہ جی کہ ہم فوراً یہاں سے نکل چلیں۔ اپنا سامان سمیٹ کر میں نے اٹیچی میں رکھ لیا ہے' آپ بھی دیر نہ کریں۔"

دلاری سے یہ سن کر میری نیند بھاگ گئی۔ میں تیزی سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ منہ دھو کر لباس تبدیل کرنے اور سامان سمیٹ کر ایک سوٹ کیس کے اندر بھرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ میرے پاس تین سوٹ کیس تھے جن میں سے ایک میں نے دلاری کو تھما دیا۔ جب ہم گھر کے دروازے پر تالا لگا کے تیز قدمی سے وہ گلی عبور کر رہے تھے تو اس وقت تک فائرنگ کی آواز رکی نہیں تھی۔ ابھی تک منزل کا تعین نہیں ہوا تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے؟ یہی سوال میری زبان پر بھی آ گیا۔

"ٹھکانے تو بہت ہیں پر اس سے سب سے محفوظ جگہ قرول باغ کی کوٹھی ہے۔" دلاری نے بتایا۔

میں نے سوچا کسی ہوٹل کا رخ بھی کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اپنے اس خیال کا اظہار میں نے دلاری سے نہیں کیا۔ میرے نزدیک اس وقت وہ مجھے جہاں لے جا رہی تھی وہیں جانا بہتر ہے۔ فوری طور پر تنظیم سے رابطہ توڑنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ اس کی بڑی وجہ سیکرٹ سروس کا سربراہ ولیم رائٹ تھا۔ جس عمارت پر پولیس نے چھاپہ مارا تھا اور جہاں پولیس تنظیم کے ارکان کا مقابلہ جاری تھا' اسی عمارت کے تہہ خانے میں ولیم قید تھا۔ سالار اکبر کے علاوہ عادل اور تنظیم کے دیگر ارکان بھی ولیم کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اس عمارت میں ولیم کو چھوڑ کر فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ تنظیم سے فی الحال میرا رابطہ منقطع ہو جاتا تو مجھے ولیم کے متعلق پتا نہ چلتا کہ اسے اس عمارت سے نکال کر کسی دوسری محفوظ جگہ پہنچا دیا گیا یا نہیں۔ اس سے قطع نظر مجھے سالار اکبر کا بھی خیال تھا جو گزشتہ شب کے معرکے میں گولی لگنے سے زخمی ہو چکا تھا۔

دلاری کے ساتھ میں ایک سڑک پر نکل آئی اور جلد ہی ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔

قرول باغ کی اس کوٹھی سے پہلے ہی دلاری نے ٹیکسی والے کو رخصت کر دیا تھا۔ اب ہم پیدل ایک طرف بڑھ رہے تھے۔ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔

خاصی دور پیدل چلنے کے بعد دلاری ایک کوٹھی کے پھاٹک پر رک گئی۔ میں نے دائیں جانب کال بیل لگی دیکھ لی تھی مگر دلاری نے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اور مخصوص انداز میں دو مرتبہ پھاٹک پر دستک دی۔

"کون بدمعاش ہے؟" اندر سے بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

"ہم تمہارے دشمن ہیں اے عیار لوگو!" دلاری نے جواب دیا۔

"بھاگ جاؤ یہاں سے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھل گیا۔

میں سمجھ چکی تھی کہ یہ شناختی الفاظ تھے۔ دلاری کے ساتھ ذیلی دروازے سے میں اندر داخل ہو گئی۔ ہمارے اندر پہنچتے ہی ذیلی دروازہ پھر اندر سے بند کر لیا گیا تھا۔ دروازہ بند کرنے والا ایک مسلح شخص تھا۔ اس نے مڑتے ہی دلاری سے پوچھا۔ "دلاری! کیا یہ خبر صحیح ہے کہ پہاڑ گنج والے ٹھکانے پر پولیس سے ٹکراؤ ہو گیا ہے؟"

"ہاں رنجیت! ہم پہاڑ گنج ہی سے آ رہے ہیں۔" دلاری نے جواب دیا' پھر دریافت کیا۔ "تمہیں یہ خبر کب ملی؟"

"تقریباً آدھے گھنٹے پہلے۔" رنجیت نے بتایا۔ "جب سرفروشوں کا ایک دستہ یہاں سے پہاڑ گنج کے لئے روانہ کیا گیا۔ وہ لوگ اتنی تیزی سے نکلے کہ میں تفصیل معلوم نہ کر سکا۔ کوٹھی میں سالار گرچن سنگھ موجود ہیں' ان سے تفصیل معلوم ہو سکتی تھی مگر ظاہر ہے میں یہاں سے نہیں ہٹ سکتا تھا۔"

"مجھے بھی تفصیل معلوم نہیں کیونکہ میں نے دور سے جائزہ لیا تھا۔ میں بس اتنا ہی دیکھ سکی کہ پولیس اور ہمارے سرفروشوں کے درمیان مسلح تصادم جاری تھا۔" دلاری بولی۔ پھر دلاری نے رنجیت سے میرا تعارف کرایا۔ رنجت نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے تعظیم دی۔

"معبلہ جی کا نام ہی نام سنا تھا' آج دیکھ بھی لیا۔" رنجیت نے پُرخلوص لہجے میں کہا پھر براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آپ نے کچھ عرصے پہلے جن پر اپکار (احسان) کیا تھا' ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔" پھر اس نے بتایا کہ سرفروش تنظیم کے مطالبے پر جن ارکان کو رہائی ملی تھی' رنجیت بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں میرا شکریہ ادا کیا پھر کہنے لگا۔ "یہ میرا سوبھاگیہ (خوش قسمتی) ہے کہ آپ کے درشن ہو گئے۔"

"میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ میرے لئے ایسے الفاظ استعمال کریں۔" میں نے اظہار انکساری کیا۔

"یہ تو بس ہمارے ہی دل جانتے ہیں دیوی کہ آپ کتنی مہان ہیں۔"

"چلیں معبلہ جی! اندر چل کر سالار گرچن سنگھ جی سے معلوم کرتے ہیں کہ اب پہاڑ گنج والے ٹھکانے کی کیا صورتِ حال ہے؟" دلاری نے مجھے مخاطب کیا۔

"کیا انہیں معلوم ہو گا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں' فون پر سالار کا وہاں سے رابطہ قائم ہو گا۔" دلاری نے بتایا۔ "فون وہاں بھی ہے اور یہاں بھی۔"

"پھر تو فون ہی پر وہاں سے پولیس کے چھاپے کی اطلاع یہاں دی گئی ہو گی۔" میں' دلاری کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"جی معبلہ جی!" دلاری نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔

پھر دلاری کے ساتھ میں عمارت کے صدر دروازے پر پہنچ گئی۔ وہاں بھی کال بیل ہونے کے باوجود دلاری نے اسی مخصوص انداز میں دستک دی جو پھاٹک کھلوانے یا رنجیت کو متوجہ کرنے کے لئے میں نے

پہلے بھی سنی تھی۔ شناختی الفاظ کا تبادلہ ہوا بھی ہو جو پہلے الفاظ سے مختلف تھے۔ بہرحال دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک عورت تھی۔

ہم دونوں اندر داخل ہو گئے تو اس عورت کو دلاری نے مخاطب کیا۔ "رشیدہ! سالار گرچن سنگھ جی کہاں ہیں؟"

"وہ ڈرائنگ روم میں ہیں۔" اس عورت رشیدہ نے بتایا جس کی عمر تیس سال کے قریب لگتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ہمارا سامان یہیں رکھا ہے۔ ہمیں پہلے سالار سے ملنا ہے' واپس آ کر سامان اٹھالیں گے۔" دلاری نے اپنی اٹیچی اور میرا ایک سوٹ کیس ایک دیوار سے لگا کر رکھ دیا۔ میں نے بھی دلاری کی تقلید کی اور اپنے بقیہ دونوں سوٹ کیس بھی قریب ہی رکھ لئے۔

"آیئے معبلہ جی!" دلاری نے کہا اور میری رہنمائی کرنے لگی۔

ایک راہداری سے گزر کر دلاری دائیں جانب مڑی اور ایک کمرے کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ میں نے وہاں ایک سردار جی کو بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے دیکھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہی سالار گرچن سنگھ ہو گا۔ ذرا ہی دیر بعد میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی جب دلاری نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ وہ شخص ہمیں دیکھتے ہی ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔

"معبلہ جی! آپ تشریف رکھئے۔" سالار گرچن سنگھ نے تعارف کے بعد ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا پھر کہنے لگا۔ "معاف کیجئے گا معبلہ جی! اس وقت میں کچھ اضطراب کی حالت میں ہوں۔ دراصل مجھے ایک فون کا بے چینی سے انتظار.........." ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک طرف میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ ٹیلی فون کی طرف لپکا اور ریسیور اٹھاتے ہی بولا۔ "ہیلو! ہاں میں بول رہا ہوں .... کمک پہنچ گئی .... ٹھیک ہے سالار! اب پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنے کی کوشش کریں .... کیا .... پھر تو مجبوری ہے .... چھوڑ دیں اسے وہیں' ممکن ہے پولیس راستہ تلاش نہ کر سکے .... ہاں ہاں' میں سمجھ رہا ہوں .... جی ٹھیک .... بالکل ٹھیک ہے۔" پھر اس نے ریسیور رکھ کر طویل سانس لیا۔ اب اس کے چہرے سے کسی قدر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔ وہ میرے اور دلاری کے سامنے آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں تو اس سے پہلی مرتبہ ملی تھی اس لئے خاموش رہی البتہ دلاری بول اٹھی۔ "سالار جی! پہاڑ گنج کی کیا خبر ہے؟"

"ہمارے تازہ دم سرفروشوں کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا ہے اور اس نے پیچھے سے پولیس پر حملہ کر دیا ہے۔" سالار گرچن سنگھ بتانے لگا۔ "پولیس کی توجہ اب دو طرف بٹ گئی ہے۔ امید یہی ہے کہ ہمارے جو سرفروش عمارت کے اندر ہیں' وہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھائیں گے اور پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"کیا آپ کی بات فون پر سالار اکبر سے ہو رہی تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا سالار اکبر اپنے ساتھ ولیم رائٹ کو بھی نکال کر لا رہے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی نہیں' ولیم کو مجبوراً تہہ خانے ہی میں چھوڑنا پڑے گا۔ صورت حال کچھ ایسی ہی ہے۔ سالار اکبر کے ساتھ ایک لاش اور دو زخمی بھی ہیں۔ خود سالار اکبر بھی گزشتہ رات آپ کے ساتھ زخمی ہو چکے ہیں۔ ایسی صورت میں ولیم کو ساتھ لانا ممکن نہیں رہا' پھر یہ کہ پولیس نے اچانک چھاپہ مارا تھا۔ عمارت میں جو سرفروش موجود تھے انہیں پولیس سے بھڑ جانا پڑا۔ ان میں سے کسی کو تہہ خانے میں جانے کی مہلت نہیں مل سکی۔ ہاں' وہ سرفروش جو ولیم کے پاس تھا' اسے پولیس سے مقابلے کے لئے ضرور اوپر بلوا لیا گیا تھا۔" سالار گربچن سنگھ نے وضاحت کی۔

معلوم نہیں کیوں یہ سن کر میرا دل بجھ سا گیا۔ میرے خیال میں پولیس عمارت کے اندر داخل ہو کر تہہ خانے کا راستہ تلاش کر سکتی تھی۔

"سالار! پولیس کے اس چھاپے کے پیچھے کیا عوامل کارفرما ہو سکتے ہیں؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے سوال کیا۔

"فی الحال کچھ کہنا مشکل ہے لیکن اطلاعات کے مطابق حکومت بڑے پیمانے پر تنظیم کے خلاف قدم اٹھانے والی تھی' اس خلاف توقع چھاپے کو پہلا قدم سمجھا جا سکتا ہے۔"

سالار گربچن سنگھ کے اس جواب سے میں مطمئن نہ ہو سکی۔ اسی وقت معاً میرے ذہن میں سوتے سوتے اچانک جاگ اٹھنے کا واقعہ تازہ ہو گیا۔ یہ اہم واقعہ میرے ذہن سے بالکل محو ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پھر گہری نیند سو گئی تھی اور جب سے مجھے دلاری نے جگایا تھا' اب تک مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ کلکتے میں جب میں نے ڈیسوزا کو اغوا کیا تھا تو اس وقت بھی چمپا نے اسی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔ تب میں پوری طرح بیدار تھی اس لئے فوری طور پر اس کا توڑ کر لیا تھا' مگر اس مرتبہ ایسا نہیں تھا۔ چمپا نے اچانک مجھے سوتے سے جگا کر اپنے سحر میں لے لیا تھا اور پھر گہری نیند سلا دیا تھا۔ اس طرح یقیناً اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ولیم کو اس عمارت کے تہہ خانے میں قید کیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں پولیس باآسانی ولیم کو تلاش کر سکتی تھی۔ ولیم کو میری گرفت سے نکال لینا مجھے نقصان پہنچانے کے علاوہ بڑے مہاراج چندر موہن کی انگریز حکومت سے سازباز کا نتیجہ بھی تھا۔ اس کا علم مجھے کلکتے ہی میں ہو گیا تھا کہ بڑے مہاراج کو حکومت وقت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ دہلی سے ڈیسوزا کو یہ حکم ملا تھا کہ بڑے مہاراج کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا جائے۔ انگریز حکومت' چندر موہن یا مجھ سے ٹکراؤ کی صورت میں وہ تینوں' ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ یوں ولیم کی بازیابی کے سلسلے میں بڑے مہاراج کی داسی چمپا کا سرگرم ہو جانا سمجھ میں آتا تھا۔ میرا ذہن کڑیاں جوڑنے میں مصروف تھا۔ چمپا کو علم تھا کہ ژیان اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں مقیم ہے۔ چمپا خود مجھے اپنے سحر میں گرفتار کر کے ژیان کے پاس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے اندر چھوڑ گئی تھی۔ میرے فرار کے بعد ژیان اور چمپا دونوں ہی نے یہ اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں' ژیان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخل

ہونے کی کوشش ضرور کروں گی۔ ژیان نے اسی لئے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی سکونت ترک کر دی تھی اور اس کی جگہ ولیم رائٹ نے لے لی تھی۔ آج صبح چمپا کے علم میں جب یہ بات آئی ہو گی کہ ژیان کے میک اپ میں ولیم رائٹ کو سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے اغوا کر لیا گیا ہے تو لازماً اس نے مجھ ہی پر شک کیا ہو گا۔ اسی کے بعد وہ مجھ تک پہنچی تھی اور میرا ذہن پڑھ کر اس نے سب کچھ معلوم کر لیا تھا۔ تنظیم کی پہاڑ گنج والی عمارت پر پولیس کا اچانک چھاپہ اسی کا نتیجہ تھا۔

میں تو اپنے خیالوں میں کھوئی رہی اور دلاری' سالار گربچن سنگھ سے گفتگو کرتی رہی۔ میں یہ گفتگو جیسے سن کر بھی نہیں سن رہی تھی۔ اسی گفتگو کے دوران دلاری نے سالار گربچن سنگھ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ بطور احتیاط وہ مجھے پہاڑ گنج سے لے آئی ہے۔ سالار گربچن سنگھ نے اس پر دلاری کی دوراندیشی کو سراہا تھا۔

"آپ جب تک دہلی میں ہیں' یہیں قیام کیجئے۔" سالار گربچن سنگھ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"جی......... جی ہاں' میں سوچوں گی۔ فی الحال تو خیر میں یہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اگر آرام کرنا چاہیں تو دلاری اس کا بندوبست کرا دے گی۔"

"مجھے آرام سے زیادہ سالار اکبر اور دوسرے سرفروشوں کی فکر ہے۔" یہ کہتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ سالار گربچن سنگھ نے ایک لاش کا ذکر بھی کیا تھا۔ میں نے اسی لئے اس سے پوچھا۔ "شہید ہونے والے سرفروش کا نام معلوم ہوا؟"

"جی ہاں' وہ ہمارا بڑا سرگرم رکن تھا۔" سالار گربچن سنگھ نے جواب دیا۔

پھر سالار گربچن سنگھ نے جو نام بتایا اسے سن کر مجھے بہت ملال ہوا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "نہیں۔"

پولیس سے مقابلے کے دوران میں مارا جانے والا رگھو ویر تھا۔ آخری بار میں نے اسے اس وقت دیکھا تھا جب وہ تہہ خانے سے میرے ساتھ باہر آیا تھا۔ تب میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں آخری مرتبہ اسے دیکھ رہی ہوں۔ چند روزہ رفاقت میں اس سے میں خاصی مانوس ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں کچھ دیر صدمے کی حالت میں خاموش بیٹھی رہی۔

سالار گربچن سنگھ نے میری کیفیت کا شاید اندازہ لگا لیا اور بولا۔ "آپ کو اس خبر سے یقیناً دھچکا لگا ہے۔"

"جی۔" میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"رگھو ویر نے ایک عظیم مقصد کے حصول کی راہ میں اپنی جان قربان کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا۔" سالار گربچن سنگھ کی آواز پرجوش تھی۔

"سالار! کیا آپ کو یہ اطلاع بھی فون ہی پر ملے گی کہ آپ کے سرفروش' پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہو چکے ہیں؟" میں نے معلوم کیا۔

"نہیں' اس کے لئے فون کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" سالار گربچن سنگھ نے جواب دیا۔ "پہاڑ گنج والی عمارت سے فرار ہونے والے سرفروشوں کا ایک گروپ یہاں آئے گا اور دوسرا گروپ ایک اور محفوظ

ٹھکانے کا رخ کرے گا۔ جن لوگوں کو یہاں پہنچنا ہے ان سے تفصیلات کا علم ہو جائے گا۔"

میں نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ مجھے وہاں پہنچے اب آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔

"معاف کیجئے گا معبلہ جی! میں نے اب تک آپ سے چائے کو بھی نہیں پوچھا۔" معاً سالار گربچن سنگھ بولا پھر اس نے دلاری کو مخاطب کیا۔ "تم چائے کے لئے کچن میں کہہ آؤ' میں بھی پی لوں گا۔"

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے سالار!" میں نے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ مجھے بھی چائے پینا ہے۔ جاؤ دلاری!"

دلاری اٹھ کر چلی گئی۔ ابھی دلاری لوٹ کر نہیں آئی تھی کہ سالار اکبر' عادل اور سمیع اللہ وہاں پہنچ گئے۔ ان کے چہروں سے حزن و ملال کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کا سبب رگھوویر کی موت ہی ہو سکتی ہے۔ رگھوویر کی اچانک موت سے جب مجھے اتنا دکھ ہوا تھا تو مرنے والا انہیں دکھی کیوں نہیں کر جاتا۔ وہ تو ان کا پرانا وفادار ساتھی تھا۔

"معبلہ! آپ نے یہ اچھا کیا کہ یہاں آ گئیں۔" سالار اکبر مجھ سے مخاطب ہوا' پھر مجھے ولیم کے بارے میں بتانے لگا۔ "مجبوراً اسے وہاں چھوڑنا پڑا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں بول اٹھی اور سالار گربچن سنگھ کی طرف اشارہ کر کے مزید بولی۔ "سالار نے مجھے صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔"

"آپ مطمئن رہیں معبلہ! ہم آج رات ولیم کو اس عمارت کے تہہ خانے سے نکال کر یہاں لے آئیں گے۔" سالار اکبر نے مجھے دلاسہ دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں سالار!" میں نے کہا۔ "کیونکہ یہ کوشش لاحاصل ہو گی۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس نے اب تک اسے تہہ خانے سے نکال لیا ہو گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں معبلہ! پولیس تہہ خانے تک کس طرح پہنچ سکتی ہے؟" سالار اکبر نے اظہار حیرت کیا۔

"اس لئے سالار کہ پولیس نے ولیم کی بازیابی ہی کی غرض سے چھاپہ مارا تھا۔"

"پولیس کو یہ علم کیسے ہو سکتا ہے کہ ولیم کو اغوا کرنے کے بعد اس عمارت کے تہہ خانے میں رکھا گیا ہے؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم لیکن میرا قیاس یہی ہے۔ آپ کے پاس اگر ایسے ذرائع ہوں تو میرے قیاس کی تصدیق بھی ممکن ہے۔"

"ذرائع سے آپ کی کیا مراد ہے؟" سالار اکبر نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ ولیم کو شہر کے کسی بہترین ہسپتال لے جایا گیا ہو گا اور وہاں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا ہو گا۔ وجہ یہ کہ وہ انتہائی زخمی حالت میں تھا۔ اسی کے ساتھ وہاں سیکورٹی کے بھی سخت انتظامات ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ معلوم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔" سالار اکبر نے کہا۔ پھر شہر کے ایک ہسپتال کا نام لیا۔

"وہاں جدید ترین طبی سہولتیں موجود ہیں۔ اگر آپ کا قیاس درست ہے تو پھر ولیم کو وہیں لے جایا گیا ہو گا۔" یہ کہتے ہی سالار اکبر اپنی جگہ سے اٹھا اور فون پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ نمبر شاید مل گیا تھا' اسی لئے سالار اکبر کسی سے کہہ رہا تھا۔ "میں اکبر بول رہا ہوں' اکبر علی۔ مجھے ڈاکٹر شرما سے بات کرنا ہے .... جی وہ ابھی ابھی آئی سی یو کی طرف گئے ہیں؟ بہتر ہے .... آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟ محترم! آپ کو زحمت تو ہو گی میرا فون نمبر لکھ لیں اور ڈاکٹر شرما تک میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ پہلی فرصت میں فون پر مجھ سے بات کر لیں .... جی لکھئے۔" سالار اکبر نے فون نمبر بتایا پھر اس شخص کا شکریہ ادا کیا جو دوسری طرف سے بول رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ریسیور رکھ کر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اس دوران دلاری بھی چائے کے لئے کہہ کر واپس آ چکی تھی۔ اس نے سالار اکبر وغیرہ کو بھی آتے دیکھ لیا تھا اور ان کے لئے بھی چائے لانے کو کہہ آئی تھی۔ دلاری نے خود ہی یہ بات بتائی تھی۔

میں نے سالار اکبر کو مخاطب کیا۔ "آپ نے جس ہسپتال کا نام لیا تھا غالباً اسی کے کسی ڈاکٹر سے فون پر رابطہ قائم کرنا چاہا تھا۔"

"جی ہاں معبلہ! ایسے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو سرفروش تنظیم کے لئے اپنے دلوں میں نرم گوشے رکھتے ہیں اور دامے' درمے' سخنے ہر طرح ہمارے کام آتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ ہماری تنظیم کے باقاعدہ رکن نہ ہونے کے باوجود ہمارے لئے ایک سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر شرما بھی انہی لوگوں میں شامل ہے۔"

"پھر تو اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور آپ جو چاہیں اس سے معلوم کر سکتے ہیں۔" میں بولی۔

"بالکل' میں براہ راست اس سے ولیم رائٹ کے بارے میں دریافت کر سکتا ہوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ کا قیاس درست ہو اور ولیم کو اسی ہسپتال میں لے جایا گیا ہو۔ ڈاکٹر شرما کا شمار اس شہر کے اچھے ڈاکٹروں میں ہوتا ہے وہ ایک بہترین سرجن بھی ہے۔ میں نے اس کا وہ فون نمبر ملایا تھا جس پر براہ راست اس سے بات ہو سکتی تھی۔ بہرحال میرا پیغام ملتے ہی وہ فون کرے گا۔"

"سالار! آپ نے اس بات پر شاید غور نہیں کیا کہ اس عمارت سے ولیم کی بازیابی سے کچھ اور مسئلے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ فرض کیجئے میرا قیاس غلط ہے۔ پولیس نے ولیم کی بازیابی کے لئے اس عمارت پر چھاپہ نہیں مارا تھا' پھر بھی پولیس کے پاس چھاپہ مارنے کا کوئی تو جواز ہو گا۔ اس سے قطع نظر کہ پولیس سے مقابلے کے بعد اس عمارت میں موجود افراد فرار ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ وہ عمارت تنظیم ہی کے کسی اہم رکن کی ملکیت ہو گی۔ اس واقعے کے بعد کیا پولیس' تنظیم کے اس رکن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گی؟"

"اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں معبلہ جی!" اس مرتبہ میری بات کے جواب میں سالار گربچن سنگھ بول اٹھا۔ "ہم کسی ایسی صورت حال کے لئے پہلے ہی سے احتیاطی تدابیر کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ عمارت ایک ہندو بیوہ کی ملکیت ہے جس کا تنظیم سے کوئی تعلق نہیں۔ کافی عرصے قبل اس عمارت کو کرائے پر حاصل کیا گیا تھا۔ کرایہ نامہ ایک فرضی نام پر ہے پولیس جب اس ہندو بیوہ عورت سے

پوچھ گچھ کرے گی تو وہ پولیس کو صرف ایک فرضی نام ہی بتا سکے گی' اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ ایک صورت میں ظاہر ہے' ہمارے لئے کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"اور وہ تہہ خانہ' کیا وہ بھی عمارت میں پہلے سے موجود تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ تہہ خانہ خود ہم نے بنایا تھا۔ اس کا علم بھی اس عورت کو نہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر واقعی آپ لوگوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔" میں نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔

اسی دوران ایک شخص بڑی سی ٹرے میں چائے کے کپ رکھ کر لے آیا تھا۔

"معبلہ! مجھے پنڈت جی سے ولیم رائٹ کی قوت ارادی کے بارے میں جان کر بڑی حیرت ہوئی شاید ہی کوئی شخص اتنا تشدد برداشت کر سکے۔" سالار اکبر مجھ سے بولا۔

"ہاں سالار! خود میں بھی حیران ہوں کہ وہ شخص کس مٹی کا بنا ہوا تھا؟" میں نے یہ کہہ کر گویا شکست کا اعتراف کیا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سالار اکبر نے اپنی چائے کی پیالی سینٹرل ٹیبل پر رکھی اور اٹھ کر فون ریسیو کیا۔ "ہیلو! ہاں .... میں ہی بول رہا ہوں ڈاکٹر شرما۔" پھر سالار اکبر نے براہ راست ولیم رائٹ کے بارے میں پوچھا۔ دوسری جانب سے بات کرنے والا ڈاکٹر شرما ہی معلوم ہوتا تھا۔ "ہوں' حالت نازک ہے .... ٹھیک ہے .... بتاؤں گا پھر۔ ہاں یہ درست ہے کہ وہ اعلیٰ انگریز حکام ملا نے ہے .... جی .... نہیں .... اچھا۔" سالار اکبر نے مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد ریسیور رکھ دیا پھر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھتے ہی مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آپ کا قیاس حیرت انگیز طور پر درست ثابت ہوا معبلہ! ولیم ہسپتال میں ہے۔ اس کی حالت تشویش ناک ہے' مگر ڈاکٹر شرما کا کہنا ہے' اسے بچایا جا سکتا ہے۔ سب سے خطرناک زخم ماتھے پر ہے۔ ماتھے کی ہڈی متاثر ہے۔ بہرحال وہ زندہ بچے نہ بچے' اس کے قطع نظر پولیس کا تہہ خانے تک پہنچ جانا اور وہاں سے ولیم کو نکال کر لے آنا تعجب خیز بات ہے۔"

سالار اکبر غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ میں خود تہہ خانے میں جا چکی تھی۔ کسی ناواقف شخص کے لئے پہلے وہاں نہ گیا ہو' اس کے اندر داخل ہو جانا کچھ ناممکن سی بات تھی۔ سالار گربچن سنگھ نے بھی اس پر حیرت کا اظہار کیا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ ولیم کا میری گرفت سے بچ کر نکل جانا میرے انتہائی خطرناک تھا۔ میک اپ کے بغیر اب میرا باہر نکلنا کسی بھی وقت مجھے کسی خطرے سے دوچار کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کوٹھی میں میرا قیام بھی خالی از علت نہیں تھا۔ لعنتی چمپا وہاں میرے لئے کوئی ایسی صورت حال پیدا کر سکتی تھی جو میرے لئے ذلت و رسوائی کا سبب بن جاتی۔ اس سے تو پہاڑ گنج والے مکان میں میرا قیام بہتر تھا۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ پولیس کو اگر اس مکان پر بھی چھاپہ مارنا ہوتا تو بیک وقت وہاں بھی چھاپہ مار سکتی تھی۔ پولیس کے چھاپے کا مقصد محض ولیم کی بازیابی ہی تھا جس میں اسے کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے اس خیال کا اظہار سالار اکبر سے بھی کر دیا۔ بہرحال اس کوٹھی میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔

"اگر آپ الگ ہی رہنا چاہتی ہیں معبلہ! تو کرائے پر کسی مکان کا بندوبست تو اس علاقے میں بھی

سکتا ہے۔" سالار اکبر بولا۔ "میرا مقصد دراصل یہ ہے کہ آپ ہم لوگوں سے زیادہ دور نہ رہیں تاکہ آپ کی حفاظت و نگرانی ہمارے لئے آسان رہے۔"

"ایسا ممکن ہے تو مجھے اسی علاقے میں رہنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔" میں بولی۔ "دلاری میرے ساتھ ہی رہے گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے معبلہ! کل تک کرائے کے کسی مکان کا بندوبست ہو جائے گا پھر پہاڑ گنج والے مکان میں جو فرنیچر وغیرہ ہے' وہ بھی نئے مکان میں منتقل ہو جائے گا۔"

"کل تک!" غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔ دراصل میں ایک رات کے لئے بھی خطرہ مول لینے سے گریز کر رہی تھی۔

"کیوں' کیا ہوا معبلہ! ایک رات تو آپ یہاں گزار ہی سکتی ہیں۔" سالار اکبر کہنے لگا۔

"معبلہ جی! یہاں کوئی خطرہ نہیں' آپ ہر طرح محفوظ رہیں گی۔" سالار گربچن سنگھ نے بھی مجھے سمجھایا۔

صورت حال کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میرا مزید انکار ان لوگوں پر بے اعتمادی کا اظہار ہوتا۔ میں نے اسی لئے وقتی طور پر ان کی بات مان لی۔ ان لوگوں کے ساتھ میں ایک رات پہاڑ گنج والی عمارت میں بھی گزار چکی تھی۔ بہرحال میرے لئے اس کوٹھی میں ایک کمرے کا بندوبست ہو گیا تھا۔ نشست گاہ سے اٹھ کر میں' دلاری کے ساتھ اس کمرے میں آ گئی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے کے لئے میں بستر پر لیٹ گئی۔ اس سے پہلے میں نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند کرنا نہیں بھولی تھی۔ بستر پر لیٹنے کے بعد میں نئی صورت حال پر غور کرنے لگی۔ میرا دشمن ژیان ایک بار پھر میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اب مجھے دوبارہ اسے تلاش کرنا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میرے ذہن پر غنودگی چھانے لگی اور میں سو گئی۔

☆======☆======☆

آئیڈیل بک لائبریری

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

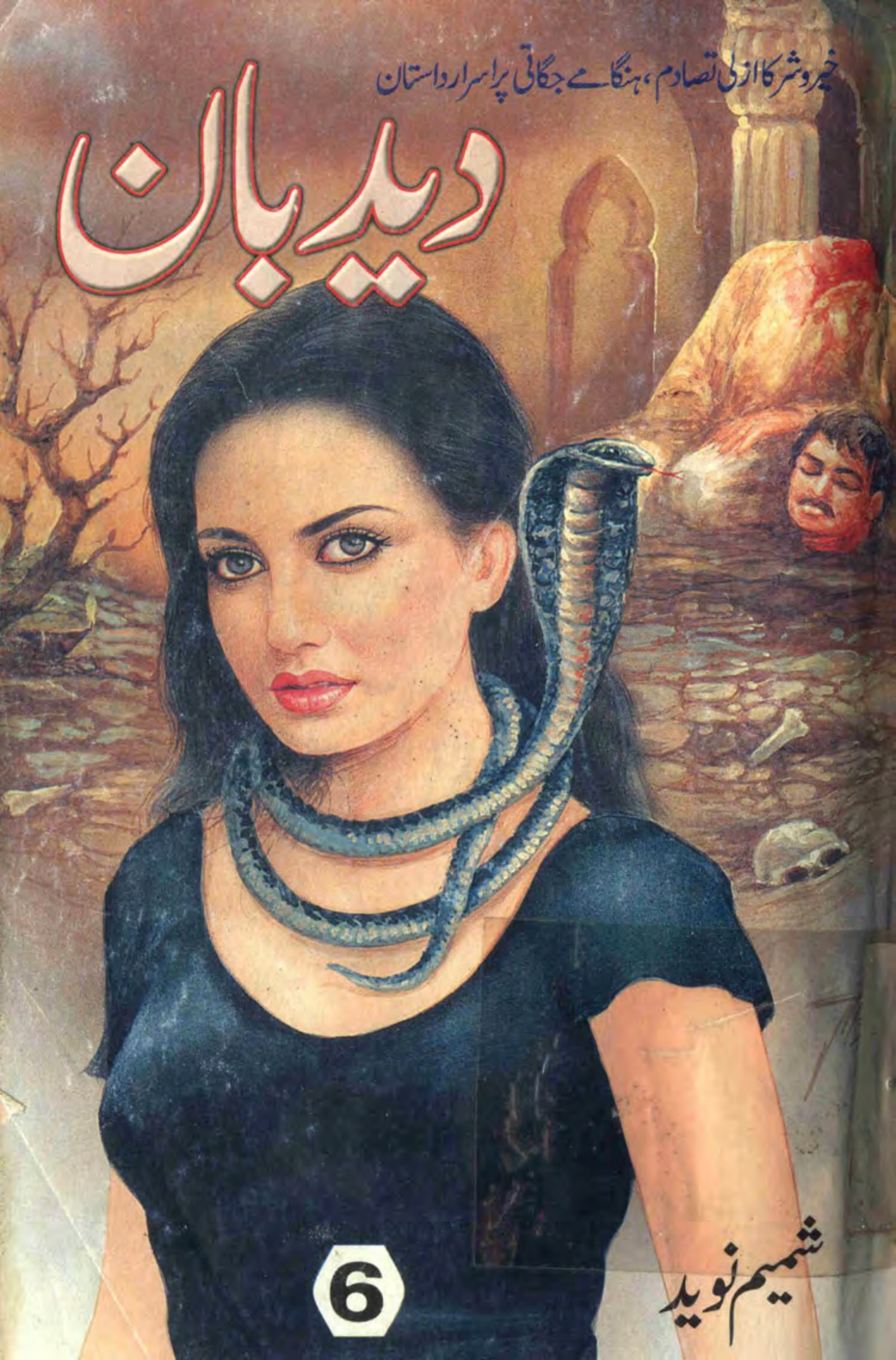
خیر و شر کا ازلی تصادم، ہنگامے جگاتی پراسرار داستان
دیدبان
6
شمیم نوید

وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی۔ پُراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں۔ اس کی آنکھوں میں موت کی کڑکتی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر تھی نہ موت کی۔ وہ سانپ سے زیادہ زہریلی تھی۔ وہ اپنے دشمن کی کٹی ہوئی گردن دیکھنا چاہتی تھی۔

پُراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں۔

پُراسرار قوتوں کی مالک ایک دوشیزہ کی ہنگاموں سے بھرپور داستانِ عجیب

شام کو جب میں سو کر اٹھی تو دلاری میرے لئے چائے لے آئی۔ سو کر اٹھتے ہی میں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے اٹھ کر لباس تبدیل کیا تو دلاری چائے کا خالی کپ لینے آ گئی۔ کچھ سوچتے ہوئے میں نے دلاری سے سالار اکبر کے بارے میں پوچھا۔

"وہ بھی اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں ہیں۔" دلاری نے بتایا۔

"مجھے وہاں پہنچا دو۔" میں نے کہا۔

"میں کپ کچن میں رکھ کے ابھی آتی ہوں معبلہ جی! پھر آپ کو سالار کے کمرے میں پہنچا دوں گی۔" دلاری بولی اور کپ اٹھا کر کمرے سے چلی گئی۔

دلاری لوٹ کر آئی تو مجھے ساتھ لے کر سالار اکبر کے کمرے تک پہنچ گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا' پھر بھی وہ بغیر اجازت اندر داخل نہیں ہوئی۔

"آیئے معبلہ! آیئے۔" سالار اکبر نے پُرخلوص آواز میں میرا استقبال کیا۔

"میں جاؤں معبلہ جی!" دلاری نے مجھ سے معلوم کیا۔

"ہاں جاؤ۔" میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کمرے تک آتے ہوئے راستے کو میں نے ذہن میں رکھا تھا۔

کمرے میں چند کرسیاں اور ان کے درمیان چھوٹی سی ایک میز بھی پڑی تھی۔ میں سالار اکبر کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ کے لئے اسی علاقے میں مکان کا بندوبست ہو گیا ہے' کل قبضہ مل جائے گا۔ مکان یہاں سے زیادہ دور نہیں' اگلی ہی گلی میں ہے۔ ضرورت سے کچھ بڑا ہے وہ مکان مگر مجبوری ہے اور کوئی مکان آس پاس خالی نہیں ہے۔" سالار اکبر نے بتایا۔

"یہ اچھا ہوا کہ اس کوٹھی کے قریب ہی مکان مل گیا۔" میں نے اطمینان کا اظہار کیا پھر وہ ذکر چھیڑ دیا جس کے لئے اس سے ملنے آئی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں معلبہ! ژیان کا سراغ لگانا ضروری ہے۔ میں اس سلسلے میں آج ہی ضروری ہدایات جاری کر دوں گا' آپ مطمئن رہیں۔" سالار اکبر نے مجھے یقین دلا دیا۔

"ژیان کا سراغ لگنے کے بعد پھر ایک مہم درپیش ہو گی۔" میں بولی۔

"ظاہر ہے' مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں اس مہم میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔"

"پہلے اس کا سراغ تو لگ جانے دیں' کیا خبر اس وقت تک آپ کی ٹانگ کا زخم ٹھیک ہو جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ ژیان کا سراغ لگنے میں اتنی دیر نہیں لگے گی۔" سالار اکبر سے رخصت کی اجازت چاہی۔

"چائے منگواؤں آپ کے لئے معلبہ!"

"شکریہ' ابھی پی کر آئی ہوں۔" میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں واپسی میں ایک راہداری سے گزر رہی تھی کہ اچانک ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے مجھے اندر گھسیٹ لیا۔ میں ذہنی طور پر اس غیر متوقع افتاد کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے اپنی مدافعت نہ کر سکی۔ مجھے کمرے میں گھسیٹتے ہی دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔ جیسے ہی میری نظر اس شخص کے چہرے پر پڑی جس نے مجھے کمرے میں گھسیٹ لیا تھا' میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ دلاری کا محبوب سلیم میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ سلیم کی وہاں موجودگی میرے لئے حیران کن ہی تھی۔ مجھے اس کے تیور اچھے معلوم نہیں ہو رہے تھے۔

"معلبہ! اب تم خود ہی بستر پر آ کر لیٹ جاؤ۔" اس نے کمرے میں موجود مسہری کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" میں غصے میں چیخ اٹھی۔

"اسے بدتمیزی نہیں دل کی لگی کہتے ہیں جان من!" اس کے لہجے میں گھٹیا پن تھا۔ "ذرا ادھر تو دیکھو' ان آنکھوں میں تمہیں اپنی ہی تصویر نظر آئے گی۔"

میں نے اس کی طرف قہر آلود نظریں اٹھائیں۔ معلوم نہیں اس وقت میرے ذہن سے کس طرح یہ بات محو ہو گئی تھی کہ لعنتی چمپا مجھ پر وار کرنے کے لئے سلیم کو اپنا آلہ کار بنا سکتی ہے۔ میری نظریں سلیم کی نظروں سے ملی ہی تھیں کہ مجھے اپنے ذہن پر ایک گرفت کا احساس ہوا۔

"اب تُو وہی کرے گی معلبہ جو تجھ سے سلیم کہے گا۔" معاً میرے ذہن میں چمپا کی آواز گونجی۔ یقیناً وہ سلیم کے ذریعے مجھے اپنے سحر میں لے چکی تھی۔ چمپا کی آواز اب بھی میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔

"معلبہ! آج تُو بہت دن بعد میرے قابو میں آئی ہے' میں تجھے خراب کئے بغیر نہیں چھوڑوں گی۔ میں خود بھی یہ تماشا دیکھنے آ رہی ہوں۔"

چمپا کی آواز معدوم ہو گئی تو سلیم نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے لئے مسہری کی طرف

بڑھنے لگا۔ میرے اندر ایک کشمکش جاری تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ مجھے آگے نہیں بڑھنا چاہئے' اس کے باوجود اپنے ارادے پر عمل کرنے سے قاصر تھی۔ میرا جسم میرے ارادوں کا پابند نہیں رہا تھا۔

سلیم نے مجھ سے لیٹ جانے کو کہا اور پھر اپنے حکم کی تعمیل ہوتے ہی خود بھی لیٹ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مجھے خود سے قریب کر چکا تھا۔

عین اسی لمحے چمپا مسہری کے قریب نمودار ہو گئی۔ اس نے مجھے ہنستے ہوئے مخاطب کیا۔ "تو نے دیکھ لیا معلبہ کہ میں نے تجھے کس طرح بے بس کر دیا۔ بول' اب تیری پُراسرار قوتیں کہاں گئیں' تجھے کون بچانے والا ہے؟"

کمرے میں چمپا کی آواز گونجنے کے باوجود سلیم نے اس مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ چمپا کی طرف اس کی پشت تھی۔ سلیم تو جیسے کسی اور ہی جہان میں پہنچا ہوا تھا۔ اس کی خواب ناک آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ "تم کتنی حسین ہو معلبہ! پرستش کی حد تک حسین۔" اس کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

نہیں' کوئی جیسے میرے اندر چیخ اٹھا۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنے جسم کی پوری قوت صرف کر کے سلیم کو پیچھے دھکا دے دیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر مجھ پر چھا گیا۔

اسی وقت اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی لیکن سلیم نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

"معلبہ! آنے والا جو بھی ہو' اسے یہ حسین منظر ضرور دیکھنا چاہئے۔" چمپا مجھ سے مخاطب ہوئی اور پھر آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ اسی کے ساتھ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یقیناً چمپا مجھے اس طرح ذلیل و رسوا کرنا چاہتی تھی۔

میں نے دروازے سے دلاری کو اندر آتے دیکھا۔ چند لمحوں کو کمرے کا منظر دیکھ کر اسے شاید سکتہ سا ہو گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر وہ گم صم سی تصویر حیرت بنی کھڑی تھی۔ اس کی نظریں مسہری کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ شاید پلکیں جھپکانا تک بھول گئی تھی۔

"سلیم!" دلاری اچانک پوری قوت سے چیخ اٹھی۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"جو تم دیکھ رہی ہو۔" سلیم نے ہیجان خیز آواز میں جواب دیا۔

"بے وفا۔" دلاری یہ کہتی ہوئی سلیم کی طرف جھپٹی۔

"سلیم ٹھیک کہہ رہا ہے دلاری!" معاً میں نے اپنی ہی آواز سنی حالانکہ میرے ہونٹ بے حرکت تھے۔ یقیناً لعنتی چمپا میری آواز میں دلاری سے مخاطب تھی۔

"معلبہ جی! آپ .... آپ بھی۔" دلاری مسہری کے قریب آ کر ٹھٹک گئی۔

"ہاں دلاری! میں بھی سلیم کو چاہتی ہوں۔" میری آواز میں چمپا پھر بولی۔

"نہیں' نہیں معلبہ جی!" دلاری نے بلند آواز میں کہا۔ "آپ .... آپ میری محبت پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتیں۔ یہ .... یہ میرا مرد ہے۔ آپ .... آپ اسے مجھ سے نہیں چھین سکتیں۔ یہ .... یہ سراسر ظلم ہے .... میں .... میں یہ ظلم برداشت نہیں کروں گی۔ ہرگز نہیں۔"

پھر میں نے دلاری کو سلیم پر جھپٹتے دیکھا۔ وہ سلیم سے الجھ پڑی تھی۔ اس نے سلیم کے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے تھے اور انہیں جھٹکے دے رہی تھی۔ سلیم نے دلاری سے اپنے سر کے بال چھڑانے کی خاطر اپنا ایک ہاتھ اٹھایا۔ پھر اس نے جھکی ہوئی دلاری کے پیٹ میں کہنی ماری۔ دلاری کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اسی کے ساتھ اس نے سلیم کے بال چھوڑ دیئے تھے۔

اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ کوئی دلاری کی چیخ سن کر اسی طرف بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کیونکہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں لحہ بہ لحہ قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ سلیم نے مجھے ایک بار پھر جکڑ لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی کی کوئی پرواہ نہ ہو۔

چند لمحے بعد ہی عادل دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ عادل کی کیفیت بھی کمرے میں قدم رکھتے ہی دلاری سے مختلف نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ عادل کچھ کہتا' دلاری بول اٹھی۔ "پنڈت جی! یہ دیکھو سلیم اور .... اور معبلہ جی .... دونوں.........." وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔

دلاری کے مخاطب کرنے پر عادل عالم حیرت سے نکل آیا تھا۔ وہ سلیم سے سخت لہجے میں مخاطب ہوا۔ "معبلہ کو چھوڑ دو سلیم! ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"جاؤ جاؤ کام کرو اپنا' تم کون ہو مجھے روکنے والے اور اسے' دلاری کو بھی یہاں سے اپنے ساتھ لے جاؤ۔" سلیم نے عادل سے کہا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے بس ایک نظر عادل پر ڈالی تھی۔

اسی لمحے اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرے اعصاب نادیدہ گرفت سے آزاد ہو گئے ہیں۔ میں مچل کر سلیم کی گرفت سے نکل گئی۔

"ارے ارے' یہ تجھے کیا ہو گیا؟ ابھی تو چپ چاپ پڑی ہوئی تھی۔" سلیم نے میری کلائی پکڑ کر مجھے گھسیٹ لیا۔ مجھے اس کے جسم میں غیر معمولی قوت محسوس ہوئی تھی۔

عادل نے ایک بار پھر سلیم کو گولی مارنے کی دھمکی دی' مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ میں دوبارہ اس کی گرفت سے نہ نکل جاؤں۔ میں نے اسے کی کنپٹی پر ضرب لگانا چاہی لیکن کامیاب نہ ہو سکی پھر میں نے عادل کو ریوالور جیب میں رکھتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سلیم پر ٹوٹ پڑا تھا۔

سلیم اور عادل ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔

اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ سلیم چکرا کر فرش پر گرا۔ عادل نے جھک کر اس کا گریبان پکڑا اور اسے اٹھا کے کھڑا کر دیا۔

"کیا ہوا پنڈت جی! تم .... تم میرا گریبان کیوں پکڑے کھڑے ہو؟" سلیم کے لہجے سے انتہائی حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"معصوم بن رہے ہو اب۔" عادل نے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر زوردار چانٹا مارا پھر دلاری

کی طرف پلٹ کر بولا۔ "اسے بتاؤ دلاری کہ یہ ابھی کچھ دیر پہلے کتنی ذلیل حرکت کر رہا تھا' اب بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"پر پنڈت جی! جتنا قصور اس کا ہے معبلہ جی کا بھی ہے۔" دلاری بولی۔ سلیم بہرحال اس کا محبوب تھا۔ وہ مجھ پر بھی الزام لگا کر گویا اپنے محبوب کی حمایت لے رہی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ چمپا میری ذلت و رسوائی کا پورا بندوبست کرنے کے بعد اب وہاں سے جا چکی ہے اور اس نے سلیم کو بھی اپنے سحر سے آزاد کر دیا ہے۔

"کیا بکتی ہو تم۔" عادل نے برہم ہو کر دلاری سے کہا۔ "تم کیسے معبلہ پر یہ الزام لگا سکتی ہو؟"

"معبلہ جی نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ بھی سلیم کو چاہتی ہیں۔" دلاری نے وہی بتایا جو چمپا کی زبانی سنا تھا۔

"جھوٹ بول رہی ہو تم۔" عادل سخت لہجے میں بولا۔ "میں نے تو معبلہ کو سلیم سے نبرد آزمائی کرتے دیکھا ہے۔"

"تو پھر پہلے معبلہ جی خاموش کیوں پڑی تھیں؟" دلاری نے بحث کی۔

"سلیم نے معبلہ کو جکڑ رکھا تھا۔" عادل نے جواب دیا۔

"یہ .... یہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو؟ آخر بات کیا ہے' مجھے بھی تو کچھ معلوم ہو۔ میرا گریبان تو چھوڑ دو پنڈت جی!" سلیم بول اٹھا۔

عادل نے سلیم کو غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کا گریبان چھوڑ دیا' پھر بولا۔ "تم نے معبلہ پر مجرمانہ حملہ کر کے اچھا نہیں کیا سلیم! تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی کیونکہ معبلہ اس شہر میں ہماری تنظیم کی مہمان ہیں۔ ان کی زندگی اور عزت و آبرو کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔"

"مجرمانہ حملہ!" سلیم حیرت سے کہنے لگا۔ "یہ .... یہ تم کیا کہہ رہے ہو پنڈت جی! میں .... میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"منہ پر جھوٹ بولتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہئے۔ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تم مجھے نہیں جھٹلا سکتے۔ تمہیں اسی وقت میرے ساتھ سالار اکبر کے پاس چلنا پڑے گا۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی تاکہ بتا سکوں سلیم اکیلا ہی قصوروار نہیں ہے۔" دلاری نے ایک بار پھر اپنے محبوب کی حمایت لی۔

"نہیں۔" عادل نے سختی سے انکار کر دیا۔ "تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گی۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آؤ معبلہ!"

میں بدستور اپنی جگہ کھڑی رہی۔ لعنتی چمپا نے میرے لئے ذلت و رسوائی کا جو جال پھیلایا تھا' میں اس میں بری طرح پھنس چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال سے کس طرح نمٹوں۔ عادل نے جو کچھ دیکھا تھا' ظاہر ہے سالار اکبر کو بھی بتاتا۔ یوں میری رسوائی میں اور اضافہ ہو جاتا۔ اس سے قطع نظر ایک تلخ حقیقت یہ بھی تھی کہ میرے نزدیک وہ شخص قطعی بے قصور تھا جس نے

میری عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنا چاہا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا چمپا کے سحر میں گرفتار ہو کر کیا تھا۔

"پنڈت جی!" آخرکار میں نے عادل کو مخاطب کیا۔ "اس بات کو یہیں ختم کر دو۔ سالار اکبر کے علم میں یہ سب کچھ آنا میرے لئے قابل شرم بات ہو گی۔"

"لیکن معبلہ! تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں جسے نظرانداز کر دیا جائے۔ زیادتی کرنے والے کو کس طرح معاف کیا جا سکتا ہے؟؟"

"اور میں اسے بھی اپنے ساتھ زیادتی ہی سمجھوں گی کہ یہ روح فرسا واقعہ مزید افراد کے علم میں آ کر میرے لئے باعث رسوائی بنے۔"

میری بات سن کر عادل نرم پڑ گیا اور بولا۔ "اگر یہ بات ہے معبلہ! تم ایسا سمجھ رہی ہو تو پھر میں اس بات کو یہیں ختم کئے دیتا ہوں لیکن سلیم کا وجود مجھے یہاں برداشت نہیں ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ سلیم کی طرف مڑا۔ "تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ' اپنے لئے تم اس کوٹھی کے سوا کہیں بھی بندوبست کر لو' یہاں اب تم قدم نہیں رکھو گے۔"

"مگر پنڈت جی! کیوں' آخر میں نے کیا کیا ہے؟" سلیم نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا کچھ دیر قبل جو کچھ ہوا تھا' وہ سب بھول چکا تھا۔

"اس بات کو اب نہ ہی دہرایا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔" عادل اس طرح بولا جیسے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ "میں تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں' اس پر عمل کرو۔"

"اور .... اور سالار گربچن سنگھ جی نے اس پر مجھ سے جواب طلب کر لیا تو میں کیا کہوں گا؟ انہی کے حکم پر تو میں یہاں.........."

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" عادل نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم یہاں سے اپنی روانگی کی تیاری کرو۔"

"تم گواہ رہنا دلاری کہ پنڈت جی کے کہنے پر میں یہاں سے جا رہا ہوں۔" سلیم نے دلاری کو مخاطب کیا۔

"مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اب تمہارا اصل روپ دیکھ چکی ہوں۔" دلاری کی آواز بھرا گئی اور پھر وہ تیزی کے ساتھ جانے کے لئے مڑی۔

"سنو دلاری! سنو تو۔" سلیم نے اسے پکارا۔

"میں کہہ چکی ہوں' تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔" دلاری بولی اور کمرے سے نکل گئی۔

پھر میں نے وہاں مزید رکنا مناسب نہیں سمجھا اور دروازے کی طرف بڑھی' عادل بھی میرے ساتھ اس کمرے سے نکل آیا۔ "آخر ہوا کیا تھا معبلہ!" عادل میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "تم سلیم کے کمرے میں کیسے پہنچ گئیں؟"

"میں کہاں گئی تھی اس کے کمرے میں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کوٹھی میں وہ بھی رہتا ہے۔ میں تو سالار اکبر سے مل کر اپنے کمرے کی طرف لوٹ رہی تھی۔ اس

راہداری سے جب میں گزر رہی تھی تو اچانک سلیم کے کمرے کا دروازہ کھلا اور پھر اس نے مجھے اندر گھسیٹ لیا۔"

"ظاہر ہے کہ دلاری اس وقت کمرے میں نہیں ہو گی۔"

"ہاں' وہ بعد میں آئی تھی۔" میں نے بتایا۔

"مجھے تو اس کی دیدہ دلیری پر حیرت ہو رہی ہے کہ اس نے تم پر دست درازی کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ لگانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہاں' دلاری کیوں چیخی تھی؟"

"اس نے مجھے سلیم کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے اس کے بال پکڑ لئے تھے۔ سلیم نے اپنے بال چھڑانے کے لئے دلاری کے پیٹ میں کہنی ماری تھی تو وہ چیخ اٹھی تھی۔"

"دلاری کی چیخ سن کر ہی میں اس طرف دوڑا تھا۔ اس کا چیخنا اچھا ہی ہوا لیکن اس کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ناحق وہ تمہیں بھی قصوروار ٹھہرا رہی تھی۔ ویسے تم اس راہداری میں غلط نکل آئی تھیں۔ سالار اکبر کے کمرے سے واپس اپنے کمرے تک پہنچنے کے لئے تمہارا ادھر سے گزرنا ضروری نہیں تھا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ اب میں اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔

"میں بتاتا ہوں تمہیں' میرے ساتھ آؤ۔"

پھر عادل نے مجھے وہ راستہ دکھایا جس سے دلاری' سالار اکبر کے کمرے تک لے گئی تھی۔ اس راستے میں واقعی وہ راہداری نہیں پڑتی تھی جس میں سلیم کا کمرہ تھا۔

"میں راستہ بھول گئی ہوں گی۔" میں نے بات بنائی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ چمپا ہی نے میری راہ کھوٹی کی ہو گی۔

"ہاں ایسا ہی ہوا ہو گا۔" عادل بولا۔ اب ہم دوبارہ اسی راہداری میں چل رہے تھے جہاں میرا کمرہ تھا۔

عادل مجھے میرے کمرے تک چھوڑ کر واپس چلا گیا تو کچھ ہی دیر کے بعد دلاری آ گئی۔ اس کی آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ روتی رہی ہو۔ ہرچند کہ عادل کے سامنے اس نے مجھ پر الزام تراشی کی تھی' پھر بھی مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میری نظر میں وہ بھی قصوروار نہیں تھی۔ دلاری ہی کیا کوئی بھی آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے کو حقیقت ہی سمجھے گا۔

"معبلہ جی!" دلاری نے مجھے بھاری آواز میں مخاطب کیا۔ "میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ آپ نے سلیم کو سزا سے بچا لیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ .... آپ بھی.........."

"ہاں ہاں' کہو۔ چپ کیوں ہو گئیں؟" میں بول اٹھی۔

"کیا .... معبلہ جی! آپ بھی اس سے پریم کرنے لگی ہیں؟" آخر اس نے جھجکتے ہوئے وہ بات کہہ ہی دی جو اس کے دل میں تھی۔

"تم بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو دلاری!" میں نے کہا۔ "تم نے جو کچھ دیکھا اور سنا' وہ سب کچھ

ایک دھوکا تھا۔ سلیم تمہی کو چاہتا ہے' اس کی چاہت میں کوئی کھوٹ نہیں۔"

"یہ .... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں معبلہ جی!" وہ حیران سی ہو کر بولی۔ "میں .... میں تو کچھ نہیں سمجھی۔"

"مجھے ایک بات کا جواب دو دلاری! جب سے تم میرے ساتھ ہو' کیا تمہیں کچھ عجیب اور پُراسرار باتیں محسوس نہیں ہوئیں؟ مثلاً ایک دفعہ شہزاد کو تم نے سلیم سمجھ لیا تھا؟"

"ہاں معبلہ جی! وہ گرہ آج تک میرے ذہن میں پڑی ہوئی ہے۔" دلاری نے اعتراف کیا۔

"میرے من پر آج تک اس واقعے کا بوجھ ہے کیونکہ شہزاد کو میں نے سلیم جان کر اپنا آپ اس .... اس کے حوالے کر دیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے دلاری کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔

"اسی طرح ایک رات جب سلیم تم سے ملنے آیا تھا تو میرے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ مجھے دلاری سمجھا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا نا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی .... جی ہاں معبلہ جی!"

"اور اب آج کا واقعہ یاد کرو۔ یہ بتاؤ کہ جب تم سلیم کے کمرے تک پہنچیں تو دروازہ کھلا تھا یا اندر سے بند تھا؟"

"دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر دیکھا تھا کہ شاید کھلا ہو۔ اس کے بعد میں نے دروازے پر دستک دی تھی۔"

"پھر دروازہ کھل گیا تھا اور دروازہ کھلتے ہی تم نے مجھے اور سلیم کو مسہری پر دیکھا تھا' ہے نا؟"

"ایسا ہی ہوا تھا معبلہ جی! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"کمرے میں میرے اور سلیم کے سوا تو اس وقت تمہیں کوئی اور نظر نہیں آیا؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں' آپ دونوں کے سوا کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔"

"اور دروازہ کھلتے ہی تم فوراً ہی کمرے میں داخل ہو گئی تھیں۔ یہ بتاؤ دلاری کہ جب سلیم مسہری پر تھا تو دروازہ کس نے کھولا تھا؟ اگر سلیم نے دروازہ کھولا ہوتا تو وہ تمہیں مسہری پر نظر نہ آتا۔ ظاہر ہے کہ وہ دروازہ کھولتے ہی پلک جھپکتے مسہری تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

"ہاں معبلہ جی! یہ .... یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پھر .... پھر دروازہ کھولنے والا کون تھا؟" دلاری کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

"اس سے یہی ثابت ہوتا ہے نا کہ کمرے میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا نادیدہ وجود بھی تھا۔"

"نادیدہ وجود!" دلاری بڑبڑائی۔

"ہاں دلاری! دروازہ کھولنے والا ایک نادیدہ وجود ہی تھا اور سلیم بھی اسی کے زیر اثر تھا پھر جب وہ اس نادیدہ وجود کے سحر سے آزاد ہو گیا تو سب کچھ بھول گیا۔ بولو دلاری! کیا سلیم کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے سے اپنی لاعلمی کا اظہار نہیں کر رہا تھا؟"

"ہاں وہ انکاری تو تھا۔"

"تم نے میری آواز میں جو الفاظ سنے تھے' وہ بھی میں نے ادا نہیں کیے تھے۔ اسی نادیدہ وجود نے میری آواز میں تمہیں دھوکا دیا تھا۔"

"پرنتو معبلہ جی! اس سے کسی نادیدنی وجود کو کیا لابھ ہو سکتا ہے؟"

"اس کے لئے یہ فائدہ بھی کم نہیں کہ مجھے تمہارے اور عادل کے سامنے ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔" میں اس طرح دلاری کو قائل کر کے اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہتی تھی۔ "دلاری! وہ کوئی آوارہ روح ہے' کسی خبیث عورت کی بھٹکی ہوئی روح جو میری دشمن ہو گئی ہے۔"

دلاری کے چہرے سے خوف کا اظہار ہونے لگا پھر وہ کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "میں نے .... معبلہ جی! ایک دفعہ بتایا تھا نا کہ مجھے آپ کے کمرے سے رات کے وقت کسی عورت کے زور زور سے ہنسنے کی آوازیں سنائی دی تھیں تو پھر وہی .... یہ وہی بدروح ہو گی .... میں .... میں آپ کو ایک جنتر بتاؤں گی معبلہ جی! اس کے جاپ سے وہ .... وہ بھاگ جائے گی۔ سدا کے لئے بھاگ جائے گی اور پھر کبھی آپ کو نہیں ستائے گی۔ سلیم کو بھی میں یہ جنتر بتا دوں گی تاکہ وہ .... وہ آوارہ روح اس پر قبضہ .... پھر کبھی قبضہ نہ کر سکے .... میرا من .... من گواہی دے رہا تھا کہ .... کہ میرا سلیم مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتا اور آپ .... آپ بھی معبلہ جی! اتنی نہیں گر سکتیں۔ مجھے پورا وشواس ہے جو کچھ ہوا' اسی روح کا اثر تھا۔"

مجھے خوشی تھی کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔ دلاری کو میری بے گناہی کا یقین آ گیا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر میرے پاس سے لوٹی تھی۔ وہ برابر والے کمرے ہی میں ٹھہری تھی۔

☆======☆======☆

دلاری تو میرے پاس سے چلی گئی مگر میں یہ سوچنے لگی کہ مجھے اس کوٹھی میں وہ رات گزارنا چاہئے یا نہیں؟ چمپا کو بھی شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس کوٹھی میں رات کو نہیں رکوں گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مجھ پر وار کرنے کے لئے رات کا انتظار نہیں کیا تھا غالباً آج وہ سلیم کو اپنا آلہ کار بنا کر میری آبرو پامال کرانے میں کامیاب ہو جاتی لیکن دلاری کی غیر متوقع آمد نے اس کا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ پھر بھی اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ اس نے میری رسوائی کا سامان تو بہرحال کر ہی دیا تھا۔

بات صرف ایک رات کی تھی اور یہ ایک رات میں کسی ہوٹل میں بھی گزار سکتی تھی۔ اس کوٹھی میں رات گزار کر میں مزید کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ لعنتی چمپا مجھے پھر کسی آزمائش میں ڈال سکتی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ ایک بار ناکام ہو کر وہ خاموش بیٹھ جاتی۔

ہرچند کہ ابھی ولیم کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ ہسپتال میں تھا' پھر بھی میں نے میک اپ کے بغیر کوٹھی سے نکلنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے ایک سوٹ کیس اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اس میں ضروری اشیاء رکھیں اور پھر اپنے چہرے پر میک اپ کرنے لگی۔ مجھے اسی دوران خیال آیا کہ روانگی سے قبل عادل کو ضرور اس سے آگاہ کر دینا چاہئے' میں جا رہی ہوں اور اب کل آؤں گی۔ یہی

سوچ کے میک اپ کرنے کے بعد میں نے دلاری کو آواز دے کر اپنے کمرے میں بلا لیا۔ میرا بدلا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"یوں حیرت سے کیا دیکھ رہی ہو؟ میں معبلہ ہی ہوں۔" میں بول اٹھی۔

"آپ کی آواز تو وہی ہے پر چہرہ........."

"میں نے میک اپ کر کے اپنا چہرہ بدل لیا ہے۔ سنو' تم ایسا کرو کہ پنڈت جی سے کہو' میں انہیں اپنے کمرے میں بلا رہی ہوں۔"

دلاری نے میری بات سن کر اقرار میں سر ہلایا اور پھر چلی گئی۔

کچھ ہی دیر میں عادل آ گیا۔ مجھے میک اپ میں دیکھ کر اس نے حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ دلاری نے غالباً اسے میک اپ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ بیڈ کے علاوہ کمرے میں چند کرسیاں اور ایک میز بھی تھی۔ میں بھی اس وقت ایک کرسی ہی پر بیٹھی تھی اور قریب ہی وہ سوٹ کیس رکھا تھا جو میں اپنے ساتھ لے جانے والی تھی۔ عادل میرے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ ولیم کے بچ کر نکل جانے کے بعد جس طرح بغیر میک اپ کے میرا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں رہا اسی طرح عادل کے لئے بھی یہ خطرہ پیدا ہو گیا۔ مجھے چاہئے کہ اسے بھی خطرے سے آگاہ کر دوں۔ اگر پہلے سے مجھے کسی ایسی صورت حال کا اندازہ ہوتا تو جیسے میں نے کلکتے میں شنکر دادا اور اس کے آدمیوں کو ڈیسوزا سے چہرے چھپانے کی تاکید کی تھی' یہاں بھی ویسا ہی کرتی۔ خود میں بھی ڈیسوزا کے سامنے میک اپ کے بغیر نہیں آئی تھی۔ معلومات کے حصول کے بعد ڈیسوزا کو تو خیر قتل کرنا پڑا تھا' اگر وہ میرا یا شنکر دادا وغیرہ کا چہرہ دیکھ بھی لیتا تو کوئی فرق نہ پڑتا لیکن ولیم نہ صرف میرا چہرہ دیکھ چکا تھا بلکہ اس نے رگھوویر اور عادل کے چہروں کو بھی دیکھ لیا تھا۔ رگھوویر تو اب ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکا تھا کیونکہ وہ اس دنیا ہی میں نہیں رہا تھا مگر عادل کے لئے یقیناً خطرہ تھا۔ جن لوگوں نے ولیم پر انتہائی تشدد کیا تھا اور اسے موت کی سرحد تک پہنچا دیا تھا' وہ بھلا ان کے چہرے کیسے بھول سکتا تھا۔

میں نے عادل سے پہلے یہی بات کی تو وہ بولا۔ "مجھے بھی خود اس کا اندازہ تھا' پھر سالار اکبر نے میری توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ اب تم بھی یہی کہہ رہی ہو۔ میں بہرحال اس سلسلے میں احتیاط برتوں گا۔ سالار اکبر نے تو ہمارے اس رکن کو بھی یہی تاکید کی ہے جو ہمارے بعد ولیم کے پاس موجود رہا تھا' وہی جس کی یہ ذمے داری تھی کہ ولیم کو سونے نہ دے۔ ہماری تنظیم میں میک اپ کے کئی ماہرین موجود ہیں۔ خود سالار اکبر کا شمار بھی انہی ماہرین میں ہوتا ہے۔ پھر بھی تمہارا شکریہ معبلہ کہ تم نے اس سلسلے میں یاد دہانی کرائی۔ ہاں یہ بتاؤ کہ اس وقت تم نے میک اپ کیوں کیا ہے' کیا تمہیں کہیں جانا ہے؟"

"ہاں میں جا رہی ہوں اور اب کل صبح ہی واپس آؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یہ حق تو نہیں پہنچتا کہ تم سے سوال کروں' کہاں اور کیوں جا رہی ہو' پھر بھی اس کی کوئی تو وجہ ہو گی؟ اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو بتا دو۔" عادل نرمی سے بولا۔

"وجہ وہی ہے جو شاید پہلے بھی میں بتا چکی ہوں۔ میرے کچھ نادیدہ دشمن ایسے ہیں جن سے تم

لوگوں کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے جو میں نہیں چاہتی۔"

"ہاں مجھے یاد ہے' تم نے اسی طرح کی کوئی بات پہلے بھی کہی تھی۔ تم شاید کسی ہوٹل میں یہ رات گزارو گی؟"

"ظاہر ہے' اس کے سوا اور کہاں جا سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے' تم اگر یہی مناسب سمجھتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" عادل نے کہا۔ "کھانا کھا کے چلی جاتیں تو زیادہ بہتر تھا۔ ویسے تمہاری مرضی ہے۔ میں اس لئے کہہ رہا تھا کہ کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔"

میں نے عادل کی بات مان لی اور کھانا کھانے کے لئے رک گئی۔ عادل کو بھی میں نے ساتھ ہی کھانا کھانے کے لئے کہا تو وہ کچھ دیر بعد آنے کو کہہ کر میرے پاس سے اٹھ گیا۔ واپسی میں اس نے زیادہ دیر نہیں کی تھی۔ اسی کے بعد دلاری ہم دونوں کے لئے کھانا لے آئی تھی۔ عادل ہی کھانے کے لئے کہہ آیا تھا۔

کھانا کھا کر چائے پینے کے بعد میں وہاں سے چل دی تھی۔ میں نے واپسی میں اس کوٹھی کے محل وقوع کو ذہن نشین کر لیا تھا تاکہ آئندہ روز جب وہاں لوٹ کر آؤں تو راستہ یاد رہے۔ مجھے اب دہلی کے کئی فائیو اسٹار ہوٹلوں کے نام معلوم تھے۔ میں نے انہی میں سے ایک ہوٹل میں قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک سڑک پر آ کر مجھے کسی خالی ٹیکسی کے لئے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں اس وقت شرٹ اور پینٹ زیب تن کئے ہوئے تھی۔ اپنے چہرے کے میک اپ اور لباس کی وجہ سے میں غیر ملکی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا میں نے دانستہ کیا تھا حکمراں کیونکہ غیر ملکی ہی تھے اس لئے مقامی لوگوں کا رویہ غیر ملکیوں کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ غیر ملکیوں کو ہر جگہ ایک طرح سے خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ لوگ احترام کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے دبتے بھی تھے۔ میں انگریزوں ہی کے لب و لہجے میں ان کی زبان بولنے پر قادر تھی اس لئے کوئی مجھ پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے غیر ملکی جان کر قدرے لمبا راستہ اختیار کیا' مگر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

مطلوبہ ہوٹل پہنچ کر مجھے پہلی منزل پر ایک کمرہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے وہاں اپنا نام ہیلن لکھایا تھا اور یہ ظاہر کیا تھا کہ کلکتے سے آئی ہوں۔

ابھی رات کے ساڑھے آٹھ ہی بجے تھے اور سونے کا وقت نہیں ہوا تھا پھر بھی میں نے لباس تبدیل کر لیا۔ میرے جسم پر اب شب خوابی کا لباس تھا۔ لباس تبدیل کر کے میں بستر پر آرام کرنے تو لیٹ ہی سکتی تھی کیونکہ نہ مجھے اب صبح ہونے سے پہلے کہیں جانا تھا اور نہ بحیثیت ہیلن کسی کو مجھ سے ملنے کے لئے آنا تھا۔

کمرے میں ہلکا نیلا بلب جلانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گئی۔ بطور احتیاط اپنے چہرے سے میں نے میک اپ نہیں اتارا تھا۔ ہوٹل میں رات گزارنے کا فیصلہ کر کے میں نے اپنی دانست میں لعنتی چمپا کے کسی ممکنہ وار سے خود کو بچا لیا تھا۔ مجھے ابھی بستر پر لیٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے میرے

جسم پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں اچھل کر بیٹھ گئی۔ ایسی حرکت ایک ہی ہستی سے متوقع تھی حالانکہ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسی ناشائستہ حرکت نہیں کی تھی۔ ہاتھ کا دباؤ اب ہٹ چکا تھا۔ اب میں پالتی مارے بستر پر بیٹھی ہوئی تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ معاً میرے جسم کے بالائی حصے پر کسی نے زور سے چٹکی بھرلی اور میرے منہ سے سسکی نکل گئی۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ کمرے میں میرے علاوہ کوئی نہ کوئی ضرور تھا۔

"سامنے کیوں نہیں آتی کمینی!" میں غصے میں چیخ اٹھی۔

جواب میں ایک آشنا ہنسی کی آواز سے کمرہ گونجنے لگا۔ وہ لعنتی چمپا ہی تھی جو مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "تُو مجھ سے کیا کیا چھپائے گی معبلہ! میں تو تجھے ہر حال میں دیکھ چکی ہوں، پھر پردہ کیسا؟"

"تُو بہت ذلیل اور گھٹیا عورت ہے۔" میں نے نفرت و حقارت کا اظہار کیا۔ وہ ابھی تک میری نظروں سے اوجھل تھی۔

"اور میں تجھے بھی تو ذلیل اور گھٹیا عورت ثابت کر چکی ہوں۔" وہ پھر ہنسی۔ "کیا ابھی تُو اپنی ذلت و رسوائی سے مطمئن نہیں ہوئی؟ تُو شاید اس گمان میں تھی کہ یہ رات سکون و آرام کے ساتھ گزار لے گی، اب تیری یہ غلط فہمی دور ہوئی کہ نہیں؟"

"بزدل، چھپی ہوئی کیوں ہے؟ سامنے آ پھر تجھے بتاؤں۔"

"تیری نظروں سے میں اس لئے چھپی ہوں کہ تُو پہلے کی طرح کمینگی پر نہ اتر آئے۔ تُو نے میرے حسین جسم کو جگہ جگہ سے جلا کر داغ دار کر دیا ہے۔ یقین کر کہ اگر بڑے مہاراج نے مجھے منع نہ کر دیا ہوتا تو اب تک میں تیرے جسم کو بھی داغ داغ کر چکی ہوتی۔ ہاں یہ بتا، میں تو تیری کمینگی کی وجہ سے تیرے سامنے نہیں آ رہی مگر تُو نے کس لئے اپنا چہرہ چھپا رکھا ہے؟ وہ تو بہت جلد تجھ تک پہنچنے والے ہیں۔"

"کیا بکواس کر رہی ہے حرافہ!" میں اس کی بات سن کر چونک اٹھی۔ اس لعنتی عورت نے یقیناً میرے لئے کوئی جال بچھا دیا تھا۔

"ڈر گئی؟" اس نے قہقہہ لگایا۔

پھر چند لمحے بعد ہی کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ چمپا کا قہقہہ معدوم ہو چکا تھا۔ یہ خاموشی اور سکون مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہو رہا تھا۔ پتا نہیں چمپا ابھی تک کمرے میں موجود تھی یا جا چکی تھی۔ چمپا نے جو کچھ کہا تھا، اس سے مجھ پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ وہاں میں محفوظ نہیں ہوں۔ اسی خیال کے تحت میں لباس تبدیل کرنے کے لئے اٹھی ہی تھی کہ بیڈ کے سرہانے ایک تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا میرے لئے خطرے کی گھنٹی بجنے کے مترادف تھا۔ بحیثیت ہیلن مجھے ٹیلی فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا اور ٹیلی فون ریسیو کرنے آگے بڑھی۔ اسی لمحے کسی نے پیچھے سے میری وگ کھینچ لی۔ وگ ہی سے ماسک بھی منسلک تھا، وہ بھی وگ کے ساتھ میرے چہرے سے اترنے لگا۔

"اب چہرہ چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے چمپا کی آواز سنی۔

"کمینی!" میں چیختے ہوئے پلٹی، مگر وہ تو پہلے ہی میری نظروں سے اوجھل تھی۔

سنہرے بالوں والی وگ اور ماسک کو میں نے دور فرش پر پڑے دیکھا اور میں اس کی طرف لپکی۔ وگ اٹھانے سے پہلے ہی میں منہ کے بل فرش پر آ رہی۔ پیچھے سے میری ٹانگ پکڑ کر کھینچنے والی چمپا ہی ہو سکتی تھی۔ فون کی گھنٹی ابھی تک بج رہی تھی۔ مگر فون سے زیادہ مجھے ماسک اور وگ کی فکر تھی۔ مجھے ابھی ان چیزوں کی ضرورت تھی۔ میں اسی میک اپ میں ہوٹل آئی تھی۔ ہیلن کی حیثیت سے یہ میک اپ میرے لئے ضروری تھا۔ میں دوبارہ اٹھ کر دونوں چیزوں کی طرف بڑھی۔ اسی لمحے میں نے دونوں چیزوں کو فرش سے اٹھتے دیکھا اور پھر ماسک ایک جھٹکے کے ساتھ وگ سے علیحدہ ہو گیا پھر اسے میں نے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر بکھرتے دیکھا۔ یہی حال وگ کا ہوا تھا۔

"میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ اب چہرہ نہ چھپا مگر نہیں مانی تُو، دیکھ لیا حشر؟" چمپا کی زہریلی آواز سنائی دی۔

ظاہر ہے جواب میں میرے منہ سے چمپا کے لئے برا بھلا ہی نکلا تھا۔ وہ ہنس کر مجھے چڑانے لگی۔ میں ٹیلی فون کی طرف تیزی سے بڑھی لیکن اچانک گھنٹی بجنا بند ہو گئی۔ معلوم نہیں مجھے فون کرنے والا کون تھا۔ اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر کہ چمپا ابھی کمرے میں موجود ہے یا نہیں میں نے وارڈ روب کھول کر پینٹ اور شرٹ اتار لی۔ اب میں جلد از جلد لباس تبدیل کر کے وہاں سے فرار ہو جانا چاہتی تھی میں نے پینٹ اور شرٹ کو بیڈ پر رکھ دیا۔ میں نے پینٹ پہننے کے لئے اٹھائی ہی تھی کہ اسے میرے ہاتھ سے چھین کر دور پھینک دیا گیا۔ اسی کے ساتھ شرٹ بھی دور جا گری۔

"کیوں ستا رہی ہے مجھے ذلیل عورت؟" میں نے نادیدہ چمپا کو مخاطب کیا۔ کیونکہ یہ اسی کی حرکت تھی۔ کمرے میں میرے اور اس کے سوا اور تھا بھی کون۔

"یقین کر معبلہ کہ تُو اس طرح بہت حسین لگ رہی ہے۔ تیرا کندن جیسا بدن جب انسپکٹر جیک دیکھے گا تو اس کے دل پر جانے کیا گزرے گی۔" چمپا کی آواز ابھری۔ "میں چاہتی ہوں وہ تجھے اسی حالت میں دیکھے۔ اسے اب تک آ جانا چاہئے تھا۔ شاید وہ تمہارے فرار کے راستے بند کر رہا ہو گا۔ تُو بہت بڑی فتنی ہے نا۔ کبھی قانون کے ہتھے نہیں چڑھتی، ہمیشہ جل دے کر نکل جاتی ہے۔ تُو سوچ رہی ہو گی کہ انسپکٹر جیک کون ہے؟ تو میں تجھے بتاتی ہوں کہ جیک ایک ذہین سی آئی ڈی انسپکٹر ہے۔ راجہ سکھ دیو کے قتل کی تفتیش جیک ہی کر رہا ہے، جسے تُو نے کلکتے سے دہلی آتے ہوئے ٹرین میں قتل کر دیا تھا۔"

"میں نے یا تو نے قتل کیا تھا اسے کمینی!" میں چیخ اٹھی۔

"ایک ہی بات ہے۔ میں اور تُو الگ الگ کب ہیں۔ تجھے شاید یہ نہیں معلوم کہ تیرے اور میرے درمیان ایک رشتہ بھی ہے۔ میں بڑے مہاراج کی داسی ہوں اور تُو داسی بننے والی ہے۔ تو پھر رشتہ ہو گیا نا۔ آج نہیں تو کل تجھے بڑے مہاراج کے آگے جھکنا ہی ہے۔"

"تُو مجھے باتوں میں الجھا کر شاید یہ چاہتی ہے کہ میں............"

"فرار نہ ہو جائے۔" وہ میری بات کاٹ کر بول اٹھی۔ "تُو ٹھیک سمجھی ہے۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تُو اسی حالت میں کمرے سے نکل جائے۔"

چمپا خاموش ہوئی ہی تھی کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور میں اچھل پڑی۔

"شاید وہ آ ہی گیا' میں دروازہ کھولے دیتی ہوں۔" چمپا کی آواز میری سماعت میں زہر انڈیل گئی۔

میں دور پڑے اپنے کپڑوں کی طرف دوڑی۔ چمپا یقیناً دروازے کی جانب گئی تھی اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کم از کم کپڑے تو پہن ہی سکتی تھی لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ ادھر میں نے پینٹ فرش سے اٹھائی' ادھر متوسط عمر کا ایک انگریز بہترین سوٹ میں ملبوس کمرے کے اندر آ گیا۔

"اوہ بیوٹی فل۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ بڑی بے حیائی سے میرے جسم کا جائزہ لے رہا تھا۔

میں نے تیزی کے ساتھ فرش سے سلیپنگ گاؤن اٹھا کر پہن لیا اور پھر پینٹ شرٹ اٹھا کر باتھ روم کی طرف بڑھی۔

"ڈونٹ موو مس!" اس نے تیزی کے ساتھ اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ "یور آر انڈر اریسٹ۔"

"ٹھیک ہے مسٹر جیک! مگر آپ مجھے باتھ روم میں جا کر کپڑے تو پہن لینے دیں۔" میں نے پُرسکون آواز میں کہا۔ "یہ میں آپ سے بعد میں پوچھوں گی کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کر رہے ہیں۔"

میں نے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے پھر وہ بولا۔ "آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہو گیا مس!"

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہے مسٹر جیک کہ آپ راجہ سکھ دیو کے قتل کی تفتیش کر رہے ہیں جس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مجھے جو کچھ چمپا سے اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا' بتا کر اسے متاثر کرنا چاہتی تھی۔ اپنے اس مقصد میں مجھے کامیابی ہوئی تھی۔

"مسٹر جیک! اپنا ریوالور جیب میں رکھ لیں اس لئے کہ میں کوئی مجرمہ نہیں ہوں اور مجھے باتھ روم جانے کی اجازت دے دیں۔" میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ مجھے اس لئے بھی اطمینان تھا کہ انسپکٹر جیک اکیلا ہی تھا۔ اس کے ساتھ کمرے میں کوئی اور داخل نہیں ہوا تھا۔ ایک شخص سے نمٹنا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے مس! آپ سے یہ میری پہلی ملاقات ہے۔" انسپکٹر جیک حیرت زدہ آواز میں بولا۔ "پھر آپ مجھے کس طرح جانتی ہیں؟"

"کیا اس بات کا جواب دینا فوراً ضروری ہے مسٹر جیک!" میری آواز میں چبھن تھی۔

"اوہ نو مس! آپ باتھ روم جا سکتی ہیں۔" اس نے چونک کر مجھے اجازت دے دی۔ ریوالور اس نے اب تک اپنی جیب میں نہیں رکھا تھا۔

باتھ روم کے قریب ہی کمرے کا دروازہ تھا۔ ادھر بڑھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ باتھ روم سے نکلتے ہی کمرے کے اندر جانے کی بجائے دروازے سے باہر بھی نکل سکتی تھی۔ باہر نکلتے ہی کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دینا بھی میرے لئے مشکل نہ ہوتا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس طرح فرار ہونے کی صورت میں مجھے اپنا سوٹ کیس وہیں چھوڑ دینا پڑتا۔ میں اس کے لئے ذہنی طور پر تیار تھی' مگر جب جیک کو میں نے اپنے پیچھے پیچھے آتے دیکھا تو یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے تو کھلا ہوا دروازہ بند کیا تھا پھر باتھ روم کے سامنے چوکنا انداز میں کھڑا ہو گیا تھا۔ چمپا نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ ایک ذہین سی آئی ڈی انسپکٹر ہے۔ صورت حال کے پیش نظر فرار کا جو راستہ مجھے نظر آیا تھا' جیک نے اسے مسدود کر دیا تھا۔ بہرحال میں باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ پینٹ شرٹ پہننے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ میں نے اس مختصر عرصے میں سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

لباس تبدیل کر کے سلیپنگ گاؤن کو میں نے کھونٹی پر ٹانگ دیا اور باتھ روم کا دروازہ کھول کر اس کی آڑ میں ہو گئی۔ میں باتھ روم سے باہر نہیں نکلی تھی۔

کچھ دیر تو جیک میرے باہر نکلنے کا انتظار کرتا رہا' پھر مجھے آواز دی۔ "باہر آ جایئے مس!" اس نے میری توقع کے مطابق باتھ روم میں قدم نہیں رکھا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے باتھ روم سے باہر نکالنے کے لئے آخرکار اسے اندر آنا ہی پڑتا۔ جیک نے پھر مجھے کئی مرتبہ پکارا لیکن میں حسب سابق اپنی جگہ دم سادھے کھڑی رہی۔

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا مس!" جیک کا انداز سمجھانے والا تھا۔ "آپ کو باہر آنا ہی پڑے گا۔"

میں پھر سنی ان سنی کر گئی۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ جیک جیسے ہی باتھ روم میں آئے گا اسے چھاپ لوں گی۔ اس نے بھی غالباً میرے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ اسی لئے باتھ روم میں داخل ہونے سے گریز کر رہا تھا۔ میں اس وقت جو پینٹ پہنے ہوئے تھی' اس کی جیب میں سالار اکبر کی ایجاد "خاموش موت" موجود تھی جسے میں واپس کرنا بھول گئی تھی۔ اس میں ابھی زہریلی فولادی سوئیاں موجود تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے اندر چوبیس زہر آلود سوئیاں تھیں جن میں سے دس فائر کی جا چکی تھیں۔ اس خطرناک ہتھیار سے اب بھی مزید چودہ افراد کی جان لی جا سکتی تھی۔ بلا سبب کسی کی جان لینا میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ جیک کو بھی میں صرف بے ہوش کر کے وہاں سے فرار ہو جانا چاہتی تھی۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا۔

پھر جیک کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔ مجھے باتھ روم میں تقریباً آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ وہ آخر کب تک میرے باہر نکلنے کا انتظار کرتا۔ اس نے محتاط انداز میں اندر قدم رکھا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ جیسے ہی اس نے دوسرا قدم اٹھایا' میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس کا رخ دروازے ہی کی طرف تھا اور اس طرح اسے چھاپ لینا ممکن نہیں تھا۔ اس نے یقیناً اندازہ لگا لیا تھا کہ میں دروازے کی آڑ میں چھپی کھڑی ہوں لیکن شاید اسے یہ خبر نہیں تھی' میں کوئی اور قدم بھی اٹھا سکتی ہوں جس کے لئے میرا

دروازے کی آڑ سے نکلنا ضروری نہیں تھا۔ جیک کا دوسرا قدم فرش پر پڑا ہی تھا کہ میں نے پوری قوت سے دروازے کو دھکا دیا جیک زور دار آواز کے ساتھ دروازے سے ٹکرایا۔ اسی کے ساتھ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ باتھ روم سے باہر جا کے گرا۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور پھر باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

جیک سامنے ہی فرش پر پڑھا تھا اور ریوالور اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے ریوالور پڑا ہوا دکھائی دیا۔ جیک کے ماتھے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے تیزی سے جھک کر اس کی کنپٹی پر مکا مارا۔ میری توقع کے مطابق وہ فوراً بے ہوش ہو گیا۔ میں ابھی اٹھ کر سیدھی کھڑی ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ پھر دروازے پر زور دار دستک سنائی دی جو میرے لئے قطعی خلاف توقع تھی۔ میں اسی لئے دستک سن کر چونک اٹھی تھی۔

اب کون آ سکتا ہے' میں نے سوچا۔ کیا انسپکٹر جیک تنہا نہیں تھا؟

"دروازہ کھولو۔" انگریزی میں کہا گیا' لہجہ غیر ملکی تھا۔

میں نے کوئی جواب دیئے بغیر جیک کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر باتھ روم میں ڈالا اور اس کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ فرش پر پڑا ہوا جیک کا ریوالور اٹھا کے میں نے اپنی پینٹ کی دوسری جیب میں رکھ لیا تھا اور اب "خاموش موت" میرے ہاتھ میں تھی۔ دروازے پر اب بس تیز دستک دی جا رہی تھی۔ اب میں آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر چکی تھی اور ایسا میں نے مجبوراً کیا تھا۔ میں سمجھ چکی تھی کہ جیک کے ساتھ یقیناً کچھ اور لوگ بھی تھے جنہیں وہ کمرے کے باہر چھوڑ آیا تھا۔ وہی لوگ جیک کی چیخ سن کر دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ہوٹل کی عقبی سمت میں بھی کمرے کی کھڑکی کے نیچے بھی مسلح افراد موجود ہوں گے۔ چمپا نے بھی اس سلسلے میں مبہم سا اشارہ کیا تھا۔ میں نے اسی سبب کمرے کی کھڑکی کھول کر عقبی سمت کا جائزہ لینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

دروازہ کھلنے کے بعد کتنے افراد کمرے میں داخل ہوتے' اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا' مگر اتنا یقین تھا کہ ان کی تعداد چودہ افراد سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی مجھے اس کی آڑ میں ہو جانا تھا اور میں نے ایسا ہی کا۔ وہ صرف تین افراد تھے جو تیزی کے ساتھ اندر آئے تھے اور وہ بھی تین ہی لمحے تھے کہ ان کے جسموں میں زہریلی سوئیاں اتر گئی تھیں۔ وہ یکے بعد دیگرے آواز نکالے بغیر فرش پر ڈھیر ہو گئے تھے اور میں نے فوراً کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ تینوں مرنے والے سادہ لباس میں تھے' ان میں سے صرف ایک انگریز تھا۔

پھر میں نے انتہائی تیزی کا ثبوت دیا۔ سلیپنگ گاؤن بھی میں نے باتھ روم میں نہیں چھوڑا تھا۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لئے میں نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر راہداری کا جائزہ لیا۔ مجھے صرف ایک ویٹر ٹرے اٹھائے ایک طرف جاتا دکھائی دیا۔ وہ کچھ آگے بڑھ گیا اور ایک کمرے کے سامنے جا کر رکا تو میں دروازے سے باہر آ گئی۔ دروازہ بند کر کے میں تیز قدمی کے ساتھ نیچے جانے والے زینے کی طرف بڑھی۔ سیڑھیاں اتر کر جب میں نیچے پہنچی تو کاؤنٹر کے مقابل دیوار سے لگے جو صوفے بچھے ہوئے تھے ان

پر نظر پڑتے ہی میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ صوفوں پر فلپ اور اس کی بیوی مارگریٹ' دونوں ہی مجھے بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی مارگریٹ چیخ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "فلپ! وہ .... وہ رانی۔"

کاؤنٹر کے سامنے ہی دو افراد اور کھڑے تھے۔ وہ دونوں بھی سادہ لباس میں تھے۔ انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا۔

"کیا بات ہے' کون لوگ ہو تم؟" میں آواز بدل کر بولی۔ حالانکہ میں اندازہ لگا چکی تھی کہ ان دونوں کا تعلق بھی سی آئی ڈی ہی سے ہو سکتا ہے۔

اسی دوران میں فلپ اور مارگریٹ بھی قریب آ چکے تھے۔ فلپ کی نظریں مجھ سے ملیں تو اس نے بڑی صفائی کے ساتھ آنکھ سے مجھے اشارہ کیا۔ پھر وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ "یہ تو مجھے رانی نہیں لگتی۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام گریٹا ہے۔" میں نے آواز بدل کر انگریزی میں جواب دیا۔

"اطلاعات کے مطابق رانی تو یہاں کسی کمرے میں ہیلن کے نام سے ٹھہری ہوئی ہے اور انسپکٹر جیک اپنے آدمیوں کے ساتھ اس کے کمرے میں گیا ہے۔ اگر یہ رانی ہوتی تو انسپکٹر جیک اسے کیسے نیچے آنے دیتا؟" فلپ نے گویا میرے حق میں ایک مضبوط دلیل دی۔ واضح طور پر وہ وہاں سے میرے فرار میں تعاون کر رہا تھا۔

"ہاں اس کی آواز تو قطعی بدلی ہوئی ہے۔ شاید رانی کی یہ وہی ہم شکل ہے جسے میں نے ایک بار کناٹ پیلس میں بھی دیکھا تھا۔" مارگریٹ نے میرے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"خواہ مخواہ انسپکٹر جیک نے ہمیں اتنی دیر سے یہاں رانی کی شناخت کے لئے بٹھا رکھا ہے۔" فلپ منہ بنا کر ان دونوں افراد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا جنہوں نے میرا راستہ روک رکھا تھا۔

"انسپکٹر جیک سے جا کر کہو اب ہم یہاں مزید انتظار نہیں کر سکتے۔"

"یس سر!" ان دونوں سادہ لباس والوں میں سے ایک نے جلدی سے کہا اور تیزی کے ساتھ زینے کی طرف بڑھا۔

"اسے جانے دو' یہ وہ نہیں ہے۔" فلپ دوسرے سادہ لباس والے سے بولا۔ اس کے لہجے میں حکم تھا۔

"یس سر!" دوسرا سادہ لباس والا یہ کہتے ہی میرا راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ "آپ جا سکتی ہیں مس!"

"تھینک یو سر!" میں نے فلپ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور پھر تیز قدمی سے ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

فلپ کی مداخلت کے سبب کسی نے مجھ سے یہ تک نہیں پوچھا تھا کہ میں ہوٹل میں کیوں آئی تھی اور کس لئے واپس جا رہی تھی۔ گولی بالکل میرے کان کے پاس سے نکل گئی تھی۔ اگر وہاں فلپ موجود نہ

ہوتا اور فرار ہونے میں میری مدد نہ کرتا تو میں پھنس ہی گئی ہوتی۔ فلپ اور مارگریٹ کی وہاں موجودگی کی وجہ بھی میرے علم میں آ چکی تھی۔ وہ دونوں راجہ سکھ دیو کے قتل کے عینی شاہد تھے۔ فلپ مجھ سے خود یہ کہہ چکا تھا کہ اسے راجہ سکھ دیو کے قتل سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن وہ ایک ذمے دار اعلیٰ افسر بھی تھا۔ شاید اسی لئے مجبوراً اسے میری شناخت کے لئے وہاں آنا پڑا تھا۔ غالباً مارگریٹ نے بھی اس پر یہاں آنے اور مجھے شناخت کرنے کے لئے دباؤ ڈالا ہوگا کیونکہ وہ مجھے اپنی رقیب سمجھتی تھی۔

ہوٹل سے باہر آتے ہی میں نے ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔ میرے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ فلپ نے میرے سامنے ایک سادہ لباس والے کو اوپر بھیجا تھا' میرے کمرے میں' اس کے اوپر پہنچتے ہی وہاں کیا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا' میں صرف اس کا اندازہ ہی لگا سکتی تھی۔ اس مرتبہ میرے ہاتھوں ایک انگریز بھی مارا گیا تھا۔ یہ جاننے کے بعد شاید فلپ کو بھی سخت ملال ہوتا کہ اس نے دانستہ مجھے کیوں فرار ہونے دیا۔ راجہ سکھ دیو کے قتل کی حد تک تو اس نے مجھے معاف کر دیا تھا کیونکہ راجہ بہرحال ایک ہندوستانی تھا لیکن اپنے کسی ہم قوم کا میرے ہاتھوں قتل ہونا غالباً برداشت نہ کر پاتا۔

مجھے وہاں کوئی خالی ٹیکسی نظر نہیں آئی تو میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ لمحہ بہ لمحہ میرے لئے خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں یہی ممکن تھا کہ میں پیدل ہی اس ہوٹل کی حدود سے دور نکل جاتی۔ میں نے آگے بڑھنے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک شخص تیزی کے ساتھ میرے قریب آیا۔ میں نے اس کے قدموں کی چاپ سے تیزی کا اندازہ لگایا تھا۔

"معبلہ! میرے پیچھے آؤ۔" وہ شخص یہ کہتا ہوا پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں چونک اٹھی کیونکہ اس کی آواز میرے لئے اجنبی نہیں تھی' ہاں اس کا چہرہ ضرور ناآشنا تھا۔ وہ یقیناً میک اپ میں تھا۔ تیز قدمی سے میں اس کے پیچھے چل دی۔ اس نے تقریباً دوڑتے ہوئے ایک کار کے پاس پہنچ کر اس کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی کار اسٹارٹ کر دی۔ اسی کے ساتھ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولنا بھی نہیں بھولا تھا۔

لپک کر میں کار کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر بیٹھ گئی۔ اپنا سوٹ کیس میں نے پچھلی سیٹ پر اچھال دیا تھا۔ جیسے ہی میں نے اپنی طرف کا دروازہ بند کیا' کار انتہائی تیزی کے ساتھ ہوٹل کی حدود سے نکل کر سڑک پر آ گئی اور فرانے بھرنے لگی۔

"پنڈت جی! تم یہاں کب اور کیسے پہنچ گئے؟" میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کیا جو عادل کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

"دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے۔" عادل نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

"لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں اس ہوٹل میں ہوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"سمیع اللہ نے فون کیا تھا۔ اسے میں نے ہی تمہارے تعاقب میں روانہ کیا تھا۔" عادل بتانے لگا۔ "اس نے فون پر زیادہ تفصیل تو نہیں بتائی صرف خطرے کا اشارہ کیا تھا۔ تفصیل مجھے یہاں آ کر معلوم

ہوئی۔ جس فلور پر تم نے کمرہ لیا تھا' سمیع اللہ نے بھی سامنے والی رو میں کمرہ حاصل کر لیا تھا تاکہ تمہارے کمرے پر نظر رکھ سکے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ سمیع اللہ نے تمہارے کمرے کے سامنے چند اجنبیوں کی غیر معمولی نقل و حرکت محسوس کی۔ ان میں سے دو انگریز تھے۔ سمیع اللہ نے تمہیں خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے فون کیا' مگر معلوم نہیں کیوں تم نے فون ریسیو نہیں کیا۔ وہ دوبارہ لوٹ کر پھر تمہارے کمرے کا جائزہ لینے لگا تو دیکھا ایک انگریز دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس کے ساتھی دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔ دستک دیتے ہی فوراً دروازہ کھل گیا تھا اور وہ انگریز تمہارے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تمہارے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا تھا۔ باہر جو اس انگریز کے تین ساتھی تھے' پھر دروازے کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ سمیع اللہ نے خطرے کی بو سونگھ لی اور مجھے فون کر دیا۔ میں جب یہاں پہنچا تو سمیع اللہ نے بتایا جو انگریز تمہارے کمرے میں گیا تھا اسے تقریباً اندر گئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہونے والا تھا۔ وہ ابھی تک باہر نہیں نکلا تھا۔ سمیع اللہ کے کمرے سے میں نے بھی تمہارے کمرے کے دروازے کا جائزہ لیا تو اس وقت باہر موجود تینوں افراد کچھ گھبرائے ہوئے سے دکھائی دیئے۔ ایک انگریز تمہارے کمرے کے دروازے پر زور زور سے دستک دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل گیا اور وہ تینوں بھی اندر چلے گئے۔ چند لمحے گزرے ہوں گے کہ پھر دروازہ بند ہو گیا۔ میں حیران تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا قدم اٹھانا چاہئے کہ ایک بار پھر دروازہ کھلا اور تم نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر راہداری کا جائزہ لیا اور پھر باہر آ گئیں۔ تمہارے چہرے پر میک اپ نہ دیکھ کر بھی مجھے حیرت ہوئی۔ تم نے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کیا پھر تیزی سے زینے کی طرف بڑھ گئیں۔ تمہارے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھ کر میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ تم کسی بھی وجہ سے وہ ہوٹل چھوڑ کر فرار ہو رہی ہو۔ یہ سوچ کر کہ تم کہاں جاؤ اور تمہارے ساتھ کیا صورت حال پیش آئے' میں نے بھی کمرے سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ سمیع اللہ کو میں نے یہ معلوم کرنے کے لئے وہیں چھوڑ دیا تھا کہ تمہارے فرار کے بعد کیا صورت حال پیش آئی۔ جو لوگ تمہارے کمرے میں داخل ہوئے تھے' ان پر کیا گزری۔ تم زینے سے اتر کر شاید نیچے تک ہی پہنچی ہو گی کہ میں' سمیع اللہ کے کمرے سے نکل آیا۔ مجھے ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید اس وقت تمہیں کوئی خالی ٹیکسی نہ مل سکے۔ جب میں زینے کی آخری سیڑھیوں پر تھا تو میں نے تمہاری آواز سنی۔ تم کسی کا شکریہ ادا کر رہی تھیں پھر تمہیں میں نے ہوٹل کے دروازے سے نکل کر باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ میں ہوٹل سے نکلا تو تمہیں حالت اضطراب میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے دیکھا۔ تمہارے اضطراب کا اندازہ تمہاری حرکات سے ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ تم جلد از جلد وہاں سے فرار ہونا چاہتی ہو۔ میرا قیاس درست ثابت ہوا تھا۔ وہاں کوئی خالی ٹیکسی نہیں تھی اور تمہیں کسی سواری کی ضرورت تھی۔ میں تمہارے قریب پہنچنے ہی والا تھا کہ تم نے شاید مایوس ہو کر پیدل ہی وہاں سے چلنے کا ارادہ کر کے قدم آگے بڑھایا۔ اسی وقت میں تمہارے قریب پہنچ گیا۔" عادل تفصیل کے ساتھ پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا پھر بولا۔ "اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ چلنا کدھر ہے اب؟"

عادل کے اس سوال نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ "ذرا سوچنے دو۔"

"سوچتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا' تم نے ایک ہوٹل سے راہ فرار اختیار کی ہے۔ اگر کسی وجہ سے تمہارے دیدہ یا نادیدہ دشمنوں کو تمہاری تلاش ہوئی تو وہ تمہیں پہلے دوسرے ہوٹلوں میں ڈھونڈیں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اس وقت کسی ہوٹل کا رخ نہ کرو۔" عادل نے حالات سے پوری طرح واقف نہ ہونے کے باوجود ایک ممکنہ خطرے کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس خطرے کا امکان سو فیصد تھا۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ کہاں جاؤں؟ مجھے رات گزارنے کے لئے کسی ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں میں اکیلی ہوتی یا کم از کم میرے اردگرد کوئی مرد نہ ہوتا جسے چمپا اپنا آلہ کار بنالیتی۔ اپنی دانست میں چمپا مجھے پھنسا کر چلی گئی تھی اور یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ پھر میری طرف پلٹتی' اس کے باوجود میں محتاط رہنا چاہتی تھی۔ اسی دوران مجھے پہاڑ گنج والے مکان کا خیال آیا۔ وہاں رات گزاری جا سکتی تھی لیکن اس کی چابی دلاری کے پاس تھی۔ شہزاد کے گھر بھی رات گزارنا میرے نزدیک خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہی سوچتے ہوئے شابو کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ میں اس کے اڈے پر بھی تو جا سکتی ہوں۔ میں نے سوچا لیکن وہاں تو شابو بھی ہو گا۔ تو کیا ہوا؟ میں اس سے کہہ سکتی ہوں کہ ایک رات وہ کہیں اور جا کے سو جائے۔ وہ میرا مطیع ہو چکا ہے' انکار نہیں کرے گا۔ میں خود سے سوال و جواب کرنے لگی۔

"معبلہ بہت گہری سوچ میں ڈوب گئیں کیا؟" عادل نے مجھے خاموش دیکھ کر ٹوکا۔

"آں ہاں۔" میں چونک کر بولی۔ "اگر پہاڑ گنج والے مکان کی چابی میرے پاس ہوتی تو وہاں جا سکتے تھے۔"

"چابی کیا دلاری کے پاس ہے؟" اس نے معلوم کیا۔

"ہاں!" میں نے کہا۔

"تو پہلے اس سے چابی لئے لیتے ہیں' یہ کون سا مسئلہ ہے۔ پھر میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا اور اگر کہو گی تو وہیں دلاری والے کمرے میں سو جاؤں گا۔"

"نہیں۔" میں فوراً بول اٹھی۔ "تم مجھے وہاں چھوڑ کر واپس آ جانا۔"

"چلو یہی سہی۔" وہ بولا۔ "اچھا تو پہلے اب قرول باغ چلتے ہیں۔"

"ہاں وہیں چلو۔" میں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ عادل سے گفتگو کے نتیجے میں مسئلے کا حل نکل ہی آیا تھا۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ ہوٹل میں تم پر کیا گزری؟ وہاں سے تمہیں کیوں فرار ہونا پڑا؟" عادل نے کار کو ایک سڑک پر موڑتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔

"قصہ دراصل یہ ہے پنڈت جی کہ کلکتے سے دہلی آتے ہوئے میں ٹرین کے جس ڈبے میں سفر کر رہی تھی.........." میں نے مختصراً راجہ سکھ دیو' فلپ اور مارگریٹ کے بارے میں بتایا۔ پھر کہنے لگی۔

"راجہ سکھ دیو بدنظر تھا۔ اس سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑے کا گواہ انگریز جوڑا بھی تھا۔ رات کو جب میں

سو گئی تو کسی نے راجہ کو قتل کر دیا۔ غالباً کسی اسٹیشن سے کوئی خطرناک لٹیرا ڈبے میں چڑھ گیا تھا۔ راجہ کو قتل کر کے وہ لٹیرا کسی اسٹیشن پر اتر گیا۔ راجہ کے پاس جو رقم تھی اور انگریز جوڑے کے پاس جتنے روپے تھے' وہ لٹیرا لے کر فرار ہو گیا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ میری رقم محفوظ رہی۔ مختصر یہ کہ انگریز جوڑے نے مجھے راجہ کا قاتل سمجھا۔ وہ مجھے گرفتار کرانے کے لئے زنجیر کھینچ کر ٹرین رکوانا چاہتے تھے۔ مجبوراً میں نے ان دونوں کو بے ہوش کر دیا اور اپنے ساتھی کو لے کر اگلے اسٹیشن پر دوسرے ڈبے میں جا بیٹھی۔ اس سے پہلے میں نے اپنا اور اپنے ساتھی کا میک اپ کر دیا تھا تاکہ وہ انگریز جوڑا ہمیں نہ پہچان سکے۔" میں درمیان سے چمپا کا ذکر بالکل گول کر گئی اور نہ دوسری بہت سی باتیں بیان کیں۔ "بہرحال مجھ کو راجہ سکھ دیو کا قاتل سمجھ لیا گیا۔ یہ سارا پس منظر میں نے اس لئے بیان کیا ہے کہ تم سمجھ سکو' سی آئی ڈی والوں کو میری تلاش کیوں تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہیں کس طرح پتا چلا کہ میں اس ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہری ہوں۔"

"ایک منٹ معبلہ!" عادل نے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ "تم نے اپنے ہم سفروں کو اپنا کیا نام بتایا تھا؟"

"ایک فرضی نام' رانی۔" میں نے جواب دیا۔

"اور یہاں ہوٹل میں کیا نام لکھایا تھا؟"

"وہ بھی فرضی نام ہی تھا' ہیلن۔"

"تو پھر سی آئی ڈی والوں کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ تم ہیلن کے فرضی نام سے اس ہوٹل میں مقیم ہو؟"

"مجھے خود اس پر حیرت ہے۔"

"اور تم نے اپنے چہرے سے میک اپ کیوں ختم کر دیا تھا؟"

"میں سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔ ظاہر ہے بحیثیت ہیلن مجھ سے ملنے کون آتا۔ میں نے سوچا تھا صبح اٹھ کر دوبارہ میک اپ کر لوں گی۔ کچھ ہی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے ذہن پر اس وقت تک غنودگی چھا گئی تھی۔ میں اسی وجہ سے یہ بھول گئی کہ میرے چہرے پر میک اپ نہیں۔ آنے والا ایک انگریز تھا جس نے اپنا نام انسپکٹر جیک بتایا اور اپنا تعلق سی آئی ڈی سے ظاہر کیا۔" چمپا کے ذکر کو گول کرنے کی خاطر بار بار مجھے دروغ مصلحت آمیز کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ "جیک نے مجھ سے کہا کہ وہ راجہ سکھ دیو کے قتل کی تفتیش کر رہا ہے۔ اسی قتل کے الزام میں اس نے مجھے گرفتار کرنے کو بھی کہا۔ میں نے اس سے باتھ روم کا بہانہ کیا۔ وہ ریوالور نکال چکا تھا۔ اس نے مجھے باتھ روم جانے کی اجازت دے دی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تاکہ میں باتھ روم سے نکل کر فرار نہ ہو جاؤں۔ میں یہ سمجھی کہ وہ اکیلا ہے اور اس پر قابو پانا کوئی مشکل نہیں ہو گا۔ میں اسے بے ہوش کر کے فرار ہو جانا چاہتی تھی۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ میں نے من و عن بیان کر دیا صرف آخری حصہ حذف کر گئی کہ فلپ نے مجھے دانستہ فرار کرایا تھا۔ اگر میں یہ بتا دیتی تو عادل ضرور پوچھتا کہ فلپ نے ایسا کیوں کیا؟ میں اس سوال کا اسے

جواب نہ دے پاتی۔ میں نے صرف وہاں تک واقعہ بیان کیا تھا' جب کمرے سے نکلی تھی۔

غنیمت ہوا کہ عادل کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ اس نے مجھے کسی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بھی سنا تھا۔ اس بھول میں میری کوشش کو بھی دخل تھا۔ واقعہ بیان کر کے میں خاموش نہیں ہوئی تھی۔ عادل کو میں نے دوسری باتوں میں الجھالیا تھا۔ ان باتوں میں "خاموش موت" کا ذکر بھی شامل تھا۔

"اگر میں "سائلنٹ ڈیتھ" واپس کرنا نہ بھول گئی ہوتی تو یقیناً ان تینوں کو اتنی آسانی سے ٹھکانے نہ لگا پاتی۔" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں کبھی کبھی کوئی بھول بھی بڑی سودمند ثابت ہوتی ہے۔" عادل بولا' پھر کہنے لگا۔ "موجودہ حالات میں تو تمہارا میک اپ کے بغیر باہر نکلنا اور بھر خطرناک ہو گیا ہے معبلہ!"

"کیا کیا جائے' خطرے تو میرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔

"ویسے مجھے یہ اعتراف کرنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے معبلہ کہ میں نے آج تک تم سے زیادہ دلیر اور بے خوف عورت نہیں دیکھی۔"

"رہنے بھی دو پنڈت جی! دلیر عورتیں میری طرح راہ فرار اختیار نہیں کرتیں۔"

"دلیری اور حماقت دو الگ الگ چیزیں ہیں معبلہ! حماقت کو دلیری نہیں کہتے۔ مثلاً یہ کہ آدمی تنہا ہونے کے باوجود دانستہ کسی مسلح شخص کے سامنے آ جائے تو یہ دلیری نہیں حماقت ہے' یا جہاں اسے گھیر لئے جانے کے امکانات ہوں اور موقع ہونے کے باوجود وہ فرار نہ ہو تو یہ حماقت ہی کہلائے گی۔"

اس وقت کار قرول باغ کی حدود میں داخل ہو چکی تھیں کچھ ہی دیر بعد عادل نے کوٹھی کے گیٹ پر کار روک دی۔

"تم کار ہی میں بیٹھی رہو' میں ابھی دلاری سے چابی لے کر آتا ہوں۔" عادل یہ کہہ کر کار سے اتر گیا۔

میں سوچنے لگی کہ اگر بروقت عادل میری مدد کو نہ پہنچ گیا ہوتا تو شاید مجھے اتنی آسانی کے ساتھ جائے واردات سے فرار ہونے کا موقع نہ ملتا۔ سرفروش تنظیم کے ارکان قدم قدم پر میرے لئے ڈھال بنے ہوئے تھے۔ جب میں نے کلکتے میں ڈیسوزا کے اغوا پر ارشاد حسین سے یہ پیشکش کی تھی کہ تنظیم بھی اس اغوا سے فائدہ اٹھا سکتی ہے تو میرے ذہن میں دور دور تک یہ بات نہیں تھی' مجھے اس طرح آئندہ کے لئے تنظیم کا تعاون حاصل ہو جائے گا۔ وہ لوگ وفاداری' احسان' خلوص' دوستی اور محبت و جاں نثاری کے مفہوم سے پوری طرح آشنا تھے۔ انہوں نے میرے کہے بغیر میری حفاظت و نگرانی کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ میں اس وقت تک انہی سوچوں میں گم رہی جب تک عادل چابی لے کر نہ آ گیا۔

عادل نے کار اسٹارٹ کی تو میں نے کہا۔ "تم لوگوں کو بلاوجہ میری خاطر اتنی زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ یہ سب کچھ بلاوجہ ہے؟"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ اس طرح ہم ایک قرض اتارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"کیسا قرض؟"

"وہ قرض جو تم نے مجھ جیسے دوسرے متعدد سرفروشوں کی زندگی بچا کر ہم پر چڑھا دیا ہے۔ اگر تم نے ہم پر یہ احسان نہ کیا ہوتا تو آج بھی نہ جانے کتنے سرفروش سلاخوں کے پیچھے ہی ہوتے اور ان میں سے ایک یہ تمہارا جعلی پنڈت بھی ہوتا۔ آئندہ ایسی دل دکھانے والی باتیں نہ کرنا۔"

"اگر اس سے تمہارا دل دکھتا ہے تو آئندہ نہیں کروں گی یہ باتیں۔"

"دل دکھنے کے علاوہ ایک طرح کی اجنبیت اور غیریت بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔" عادل نے شاید اپنے دل کی بات کہہ دی۔ "ہم تو تمہیں اپنا سمجھتے ہیں اور تم سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں اور اپنوں کے درمیان زحمت وغیرہ اٹھانے کا ذکر نہیں ہوتا۔ تمہارا تو ہم پر حق ہے معبلہ! اور حق اپنوں ہی کا ہوتا ہے۔"

ان لوگوں نے واقعی دہلی میں مجھے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی بڑھ کر میرے لئے پرخلوص تھے۔

پھر عادل مجھے پہاڑ گنج والے مکان میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ دروازہ بند کر کے سوٹ کیس اٹھائے ہوئے میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ سارا مکان جیسے خبیث قہقہوں سے گونج اٹھا۔ یوں لگتا تھا جیسے لعنتی چمپا آج کی رات مجھے چین سے نہیں گزرانے دے گی۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ آج رات لوٹ کر نہیں آئے گی۔

"تو گھوم پھر کے واپس یہاں آ ہی گئی تُو!" مجھے چمپا کی منحوس آواز سنائی دی۔

"ہاں' میں تیرے بچھائے ہوئے جال سے نکل آئی اے ذلیل عورت!" میں نے نفرت و حقارت سے جواب دیا۔

"جال سے نکل آئی یا اور جال میں پھنس گئی؟" وہ ہنسی۔ "تیری فرد جرم میں تین قتل اور لکھ دیئے گئے۔ ان قتل ہونے والوں میں حکمراں قوم کا ایک فرد بھی شامل ہے۔ کیا تُو اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ حکمراں تجھے معاف کر دیں گے؟ وہ سارے شہر میں تیری بو سونگھتے پھر رہے ہیں اور سن' وہ جس نے تجھے تیرے قرب کے لالچ میں فرار کرا دیا' اب اسے بھی اپنے ایک ہم قوم کے قتل پر دکھ ہو رہا ہے۔ اب وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ تجھے گرفتار کر لیا جائے۔ بڑے مہاراج کے حکم پر میں تجھے صرف اتنا بتانے آئی ہوں کہ وہ اب تک تجھ سے نرمی برت رہے ہیں ورنہ کیا قانون کے محافظ یہاں نہیں پہنچ سکتے؟ بول' کیا میں غلط کہہ رہی ہوں .... تو بڑے مہاراج نے کہلوایا ہے کہ تُو اس نرمی کو ہماری کمزوری نہ جان اور سیدھی ہو جا۔"

"ورنہ تُو اور تیرا بڑا مہاراج میرا کیا بگاڑ لے گا؟" میں آگے بڑھتی رہی۔

"تجھے ایک پل چین سے نہیں بیٹھنے دیا جائے گا۔" اس نے دھمکی دی۔ "اگر تُو نے اب بھی اپنی قوتوں پر اترانا نہ چھوڑا اور بڑے مہاراج کی داسی بننے پر آمادہ نہیں ہوئی تو تیرا بڑا برا حشر ہو گا۔ اب تو

تجھے پھانسی کے پھندے تک پہنچانا بھی بہت آسان ہو گیا ہے۔ بول' کیا اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈلوانا چاہتی ہے؟"

میں اب اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ اندر داخل ہو کر میں نے کمرے میں روشنی کر دی۔ مجھے علم تھا کہ چمپا میرے ساتھ ساتھ لگی ہوئی ہے حالانکہ وہ میری نظروں سے اوجھل تھی۔ اپنے کمرے میں چمپا کی موجوگی کا یقین کرتے ہوئے میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تو جو پیغام دینے آئی تھی' اگر دے چکی ہے تو یہاں سے دفع ہو جا۔ اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دے کہ میں تیری دھمکیوں سے ڈر جاؤں گی۔ مجھے دھمکیاں دے رہی ہے اور تو خود اتنی بزدل ہے کہ میرے سامنے آنے سے ڈرنے لگی ہے' ہمت ہے تجھ میں تو سامنے آ کے دکھا۔"

میری بات پر وہ زور سے ہنسی' پھر اس کی آواز آئی۔ "معلبہ! میں تیری عیاری اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ تو اس طرح یقیناً مجھے غصہ دلا کر یہ چاہتی ہے کہ میں ظاہر ہو جاؤں۔ تو سن کہ میں تجھ سے بڑی عیار ہوں اور تیرے فریب میں نہیں آؤں گی۔ اب میں جا رہی ہوں کہ بڑے مہاراج مجھے یاد کر رہے ہیں۔ یہ سمے ان کے جاپ کا ہے۔ وہ میرے جسم کے داغوں کو مٹانے کے لئے ہی جاپ کر رہے ہیں۔" اس کی آواز معدوم ہو گئی۔

"لعنتی عورت! اگر تیرے جسم کے داغ مٹ بھی گئے تو تیری روح کے داغ کیسے مٹیں گے۔" میں بولی' مگر میری بات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ چمپا شاید جا چکی تھی۔

میں نے سوٹ کیس کھول کر اس میں "خاموش موت" کو رکھا پھر مجھے اپنی دوسری جیب میں موجود انسپکٹر جیک کے ریوالور کا خیال آیا جسے میں نے ہوٹل کے کمرے سے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ ریوالور کو بھی میں نے سوٹ کیس کے اندر کپڑوں کی تہہ میں دبا دیا۔ سلیپنگ گاؤن اوپر ہی رکھا تھا' میں نے اسے اٹھا لیا اور لباس تبدیل کرنے لگی۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ بقیہ رات سکون و آرام سے گزر جائے گی چمپا کو اگر مجھ پر مزید کوئی وار کرنا ہوتا تو ابھی جاتی نہیں۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے بڑا بلب بجھا کر نیلا بلب جلا دیا اور بستر پر سونے کے لئے لیٹ گئی' مگر فوری طور پر نیند نہیں آئی۔ میں کچھ دیر پہلے تک گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگی۔ یوں تو میں نے چمپا کی دھمکیوں کو نظرانداز کر دیا تھا لیکن ایک حقیقت کو نظرانداز نہ کر سکی۔ جس طرح سی آئی ڈی والے' ہوٹل تک پہنچ گئے تھے اسی طرح چمپا اگر چاہتی تو وہ اس مکان تک بھی پہنچ سکتے تھے۔ یہ دھمکی نہیں حقیقت تھی۔ چمپا نے اسے میرے ساتھ بڑے مہاراج کی نرمی کہا تھا' مگر میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ شاید اس سے بڑے مہاراج کا کچھ اور ہی مقصد تھا۔ وہ غالباً یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں قانون کے ہتھے چڑھ جاؤں۔ مجھے زچ کر کے' اپنی قوت و طاقت کا احساس دلا کر اس کا مقصد شاید مجھے اپنے سامنے جھکانا اور اپنی بات منوانا تھا۔ میں بہت دیر تک یہی سب کچھ سوچتی رہی اور پھر رفتہ رفتہ میری پلکوں پر نیند کا بوجھ بڑھنے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مجھے نیند آ گئی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح اٹھ کر نہانے کے بعد میں نے ساڑھی باندھ لی۔ چائے پینے کو دل چاہا تو میں نے کچن کا رخ کیا۔ مجھے نہ چائے بنانی آتی تھی نہ کھانا پکانا۔ بچپن سے اب تک میں نے جس طرح کی زندگی گزاری تھی' اس میں ان چیزوں کو کوئی دخل نہیں تھا۔ کبھی مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ہاں میں نے یہ دیکھا ضرور تھا کہ چائے کیسے بناتے ہیں۔ اپنے اسی مشاہدے کی بنیاد پر میں نے کسی نہ کسی طرح چائے بنا ہی لی اور اس کوشش میں اپنا ہاتھ بھی جلا لیا۔ میں خود اپنے لئے چائے بنا کر عجیب سی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ چائے کا کپ اٹھا کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ پھر جیسے ہی میں نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا میری ساری خوشی پر پانی پھر گیا۔ چائے انتہائی بدذائقہ تھی۔ میں اسے کچن کی موری میں بہا آئی اور کپ دھو کر رکھ دیا۔ یہ میرے بس کا کام نہیں تھا۔ آئندہ کے لئے میں نے اس سے توبہ کر لی۔ اس کے بعد میں نے سوٹ کیس سے میک اپ باکس نکال لیا۔ میک اپ کے بغیر اب میں گھر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے لئے اب پہلے سے کہیں زیادہ خطرہ بڑھ چکا تھا۔ میں نے دانستہ معمولی سی ساڑھی باندھی تھی کیونکہ اپنے چہرے پر مجھے ایک ادھیڑ عمر ہندو عورت کا میک اپ کرنا تھا۔

میک اپ کر کے میں نے سلیپنگ گاؤن سوٹ کیس میں رکھ دیا' کچھ ہی دیر بعد میں وہاں سے روانگی کے لئے پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔ میں سوٹ کیس اٹھا کر کمرے سے نکلنے ہی والی تھی کہ کال بیل کی آواز سن کر چونک اٹھی۔ سوٹ کیس کمرے میں رکھ کر میں باہر آئی اور پھر گھر کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

دروازہ کھولتے ہی میری نظر شہزاد کے چہرے پر پڑی۔ اسے تو میں بھول ہی گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ پھر وہ بولا۔ "تم........... تم کیا نئی ملازمہ ہو؟"

مجھے شرارت سوجھی اور میں نے آواز بدل کر کہا۔ "کیسی ملازمہ جی! میں کیوں ہوتی کسی کی ملازمہ۔"

"پھر کون ہو تم؟"

"ہم شانتی ہیں جی' اور کون ہوتے۔"

"معلبہ خاتون کہاں ہیں؟"

"کون معلبہ خاتون؟ ہم کسی معلبہ کو نہیں جانتے۔ ہم تو کل ہی سے اس مکان میں آئے ہیں۔"

"اور وہ جو پہلے اس گھر میں رہتی تھیں' وہ کہاں گئیں؟"

"ہمیں نہیں معلوم جی کہ پہلے یہاں کون رہتا تھا۔"

"نہیں معلوم؟ تو پھر میں چلتا ہوں۔" شہزاد نے ٹھنڈا سانس بھرا اور پھر جانے کے لئے مڑا۔ اس کی صورت پر یتیمی سی برسنے لگی۔ مجھے ہنسی آ گئی اور اپنی اصل آواز میں اسے مخاطب کیا۔ "بالکل ہی عقل سے پیدل ہو تم!"

"جی' جی خاتون!" وہ تیزی سے پلٹا۔

"چلو آؤ اندر۔" میں ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ اندر آ گیا تو میں نے دروازہ بند کر کے اسے کہا۔

"کیا تم بھول گئے کہ میں چہرہ بھی بدل لیتی ہوں؟"

"لیکن اس وقت تو آپ نے آواز بھی بدل لی تھی۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

"یہ بھی تمہارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔"

"آپ نے تو خاتون مجھے چکرا ہی دیا تھا۔ یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ اگر ایک دفعہ آپ زندگی کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئیں یا گھر ہی بدل دیا تو میں آپ کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا؟"

"میں نے تو تمہارا گھر دیکھا ہے نا۔" میں اس سے باتیں کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔

"میں شام کو بھی آیا تھا تو یہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ آپ تو خیر کہیں چلی گئی ہوں گی مگر ملازمہ کہاں گئی، کیا اس کی چھٹی کر دی؟"

"اچھا ہوا کہ تم خود ہی آ گئے ورنہ مجھے خود تمہارے پاس آنا پڑتا۔ میں یہ گھر چھوڑ رہی ہوں۔" میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کیوں، کیا یہاں بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا؟"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"اب کہاں رہنے کا ارادہ ہے؟ کیا کوئی مکان دیکھ لیا ہے؟"

"مکان تو خیر ابھی نہیں دیکھا، ہاں علاقہ ضرور دیکھ لیا ہے۔ ویسے آج قرول باغ کے علاقے میں مکان کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"جب آپ نے ہی مکان ابھی نہیں دیکھا تو پھر مجھے کیسے دکھائیں گی؟"

"آج تو میں اس مکان میں منتقل ہو ہی جاؤں گی، ایسا ہے کہ شام کو تمہاری طرف آ جاؤں گی۔ میرے چہرے پر یہی میک اپ ہو گا اور نام یاد رکھنا، میرا نام شانتی ہے، کہیں بھول جاؤ۔ ہاں یہ بتاؤ، چائے بنا لیتے ہو تم؟" میں نے آخر میں اس سے سوال کیا۔

"جی ہاں خاتون! بنا لیتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"صبح سے میں نے چائے نہیں پی۔ خود کوشش کی تھی تو اتنی بدذائقہ چائے بنی، موری میں بہا دی۔"

میری بات سن کر وہ ہنس پڑا۔ "آپ نے بنائی تھی چائے، حیرت ہے۔ اچھا میں بنا کر لاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

پھر کچھ ہی دیر میں شہزاد چائے بنا لایا۔ چائے پیتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ دہلی آنے کے بعد اب تک میں نے شہزاد کو اس کی تنخواہ نہیں دی۔ "ٹھہرو!" میں نے شہزاد کو روکا۔ میرے سوٹ کیس میں اتنی رقم بہرحال تھی کہ اس کی تنخواہ ادا کر سکتی۔ میں نے سوٹ کیس میز پر رکھ کے کھولا اور اس کی سائیڈ پاکٹ سے نوٹ نکال لئے۔ نوٹ گن کر میں نے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"معاف کرنا، اس مہینے تمہاری تنخواہ کی ادائیگی میں دیر ہو گئی۔"

"ارے یہ آپ مجھے کس بات کی تنخواہ دے رہی ہیں، میں نے کیا ہی کیا ہے؟"

"فضول باتیں نہ کرو، رکھ لو۔" میں نے زبردستی اس کے ہاتھ میں نوٹ تھما دیئے۔

"خاتون! یہ تو آپ زیادتی کر رہی ہیں۔"

"میری خاطر یہ زیادتی برداشت کر لو۔" میں نے میز سے سوٹ کیس اٹھا لیا۔ "اگر تمہیں تنخواہ کی ضرورت نہیں تو تمہارے گھر والوں کو تو ہے۔"

"لائیں یہ سوٹ کیس مجھے دے دیں۔" اس نے مجھ سے سوٹ کیس لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس سے پہلے نوٹ وہ اپنی جیب میں رکھ چکا تھا۔

"نہیں، گھر سے نکلتے ہی تمہارے اور میرے راستے مختلف ہو جائیں گے اس لئے سوٹ کیس میرے ہی پاس رہنے دو۔ بلکہ تم ایسا کرو کہ مجھ سے پہلے ہی گھر سے نکل جاؤ۔"

"بہتر ہے خاتون!" شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کل شام میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

میں نے احتیاطاً شہزاد کو خود سے پہلے روانہ کر دیا تھا۔ وہ چلا گیا تو کچھ دیر بعد میں گھر سے نکل آئی۔ گھر کا دروازہ بند کر کے میں تالا لگا رہی تھی تو مجھے خلاف توقع کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا اور چوکنا انداز میں اچانک مڑ کر گلی کا جائزہ لیا۔ مجھے دور گلی کے نکڑ پر ایک شخص کی جھلک سی نظر آئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھ پر نظر پڑتے ہی ایک دم پیچھے ہٹ گیا ہو۔ کوئی نہ کوئی کھیل یقیناً شروع ہو چکا تھا۔ اسی وقت مجھے عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہوئی جیسے تیز ہوا کا شور، پھر میری سماعت کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ معلوم نہیں کیوں اس وقت میرے وجود میں خوابیدہ ایک پُراسرار قوت بیدار ہو گئی تھی اور ایسا بلاوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے آگے بڑھتے ہوئے قدم جیسے خود بخود رک گئے تھے۔ میں ابھی اپنے گھر کے دروازے ہی پر کھڑی تھی۔

اچانک میری سماعت سے شہزاد کی آواز ٹکرائی جو مجھ سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

"لیکن آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو اور تم سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے، اس کا جواب دو۔" ایک اجنبی درشت مردانہ آواز سنائی دی۔ "لو یہ دیکھو۔"

"تت .... تو آپ سی .... سی آئی ڈی میں ہیں۔" شہزاد کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ اجنبی نے اسے شاید رعب میں لینے کی خاطر اپنے محکمے سے جاری کردہ کارڈ دکھایا تھا۔

"اب تو سمجھ گئے کہ میں کون ہوں، ہاں اب یہ بتاؤ کہ تم کس سے ملنے گئے تھے؟"

شہزاد کو علم تھا کہ دہلی میں کسی پر میں نے اپنی اصل شخصیت ظاہر نہیں کی تھی، سوائے چند افراد کے، شہزاد کے گھر والوں تک کو میرا نام معلوم نہیں تھا۔ اس نے غالباً اسی وجہ سے صحیح جواب نہیں دیا۔ سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا۔ "میں اپنے ایک دوست جواد سے ملنے گیا تھا۔"

"جھوٹ مت بولو! تم کسی دوست سے نہیں ایک عورت سے ملنے گئے تھے۔" شہزاد کو ڈانٹ دیا گیا۔

"آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے جناب! میں کسی عورت سے نہیں ملا۔"

"تمہارا دوست گھر پر موجود ہے؟ اور کیا اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے تم مجھے اس سے ملوا سکتے ہو؟"

"جب میں اس سے مل کر آ رہا تھا تو وہ کہیں جانے والا تھا۔ اب وہ گھر پر نہیں ملے گا۔" شنزاد نے بات بنائی۔

"اس کے گھر والے تو ہوں گے۔" طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔ "وہ تو یہ تصدیق کر دیں گے کہ تم اسی سے ملنے آئے تھے؟"

"وہ اکیلا رہتا ہے۔" شنزاد نے بتایا۔

"بہت خوب' تمہارا دوست اکیلا رہتا ہے اور اب تک وہ کہیں جا چکا ہو گا۔ کہانیاں اچھی گھڑ لیتے ہو تم۔ اب تم سیدھی طرح میرے سوالوں کے جواب دینے پر آمادہ ہو کہ میں تمہاری زبان کھلوانے کے لئے تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں۔ بولو' کیا چاہتے ہو؟"

سی آئی ڈی والے میری بو سونگھتے ہوئے یہاں تک آ پہنچے تھے اور یہ بڑی خطرے کی بات تھی۔ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ شنزاد ان کی نظر میں آ گیا تھا۔ یقیناً انہوں نے شنزاد کو میرے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ میری نگرانی کر رہے تھے۔ جس شخص کی جھلک مجھے گلی کے نکڑ پر نظر آئی تھی اور جو مجھے دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا تھا' وہ بھی کوئی سی آئی ڈی والا ہی ہو سکتا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ سی آئی ڈی والے وہاں تک کیسے پہنچ گئے' فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ شنزاد کو میری مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے ابھی تک اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ سی آئی ڈی والے کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

میں نے آواز کی سمت کا اندازہ کیا اور پھر تیز قدمی سے اس طرف چل دی۔ مجھے یہ پرواہ نہیں تھی کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے یا نہیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب میں گلی کے نکڑ پر موجود سی آئی ڈی والے کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ تیز تیز چلتی ہوئی میں ایک سڑک پر نکل آئی اور پھر وہیں سڑک کے ایک کنارے مجھے شنزاد ایک کرخت اور سیاہ چہرے والے شخص کے ساتھ کھڑا نظر آ گیا۔ نتائج کی پرواہ کئے بغیر میں ان دونوں کی طرف تیزی سے بڑھی۔ شنزاد اس وقت پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھا اور لباس سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہی تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان' سی آئی ڈی والے نے ابھی تک اس کا نام نہیں پوچھا تھا اور نہ یہ کہ وہ کہاں رہتا ہے' میں البتہ کوئی ہندو عورت لگ رہی تھی۔

شنزاد کی نظر بھی میری طرف اٹھ گئی۔ اس نے مجھے قریب آتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اسے شاید میری آمد کی توقع نہیں تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ شنزاد کچھ کہتا' میں نے اسے مخاطب کیا۔ "ارے گوپال تم یہاں' سمجھی میں۔ تم اپنے دوست جواد سے ملنے یہاں آئے ہو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ادھر آتے رہتے ہو اور اپنی دیدی سے ملے بغیر ہی لوٹ جاتے ہو۔ تم شاید اب اپنے گھر پہاڑی دھیرج ہی جا رہے ہو۔ اچھا ہوا تم مل گئے

مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے سیاہ رو' سی آئی ڈی والے کو قطعی نظرانداز کر دیا تھا جس کے چہرے سے حیرت کے ساتھ ساتھ ایک نوع کی الجھن کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔

"اچھا شریمان جی' میں اب چلتا ہوں۔" شنزاد نے سیاہ رو شخص سے کہا۔ "پھر ملاقات ہو گی' مجھے دیدی کے ساتھ جانا ہے۔ اب تو آپ کو میری بات پر وشواس آ گیا ہو گا کہ میں اپنے دوست جواد ہی سے ملنے آیا تھا۔" آخری الفاظ اس نے دھیمی آواز میں اس شخص کی طرف جھک کر ادا کئے تھے۔

سیاہ رو شخص کے چہرے سے تذبذب کا اظہار ہونے لگا۔ اسی وقت میں بول اٹھی۔ "گوپال! یہ کون ہیں؟" میں نے دانستہ شنزاد سے یہ سوال کیا تھا۔

شنزاد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس سے پہلے ہی سیاہ رو شخص بول اٹھا۔ "شریمتی جی! میں بھی گوپال کا ایک متر ہوں۔ اچھا گوپال' تم جاؤ پھر ملیں گے۔"

سی آئی ڈی والے نے شنزاد کو جانے کی اجازت دے ہی دی۔ غالباً وہ میری غیر متوقع آمد سے کچھ بوکھلا گیا تھا۔ پھر میری زبانی شنزاد کے بیان کی تائید نے اسے شاید اور بھی چکرا دیا تھا۔ شنزاد کی جس بات کو وہ جھوٹ سمجھا تھا وہ میری مداخلت کی وجہ سے سچ ثابت ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا ہو گا کہ شنزاد نے جھوٹ بولا ہوتا تو اس کے کسی فرضی دوست کا نام مجھے کیسے معلوم ہو جاتا۔ اسی سبب اس نے شنزاد کی جان چھوڑ دی تھی۔ میری ایک پُراسرار قوت نے اس وقت نہ صرف شنزاد کو کسی مشکل میں گرفتار ہونے سے بچا لیا تھا بلکہ میری اصل شخصیت پر بھی پردہ پڑا رہ گیا تھا۔ یہ بعید نہیں تھا کہ شنزاد کی طرف سے مطمئن نہ ہو کر وہ سیاہ رو واقعی اس کی زبان کھلوانے کے لئے اپنے ساتھ لے جاتا۔ شنزاد کو اس کے بعد شاید زبان کھولنا ہی پڑتی اور پھر نہ جانے حالات کیا نیا رخ اختیار کرتے۔

شنزاد کو ساتھ لئے ہوئے میں ٹیکسی کے انتظار میں ذرا آگے بڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سیاہ رو شخص بھی اس طرح کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ میں نے اندازہ لگایا کہ سی آئی ڈی والوں کو کسی بھی ذریعے سے صرف اس مکان کے متعلق اطلاع ملی ہو گی' کہ وہاں میں ہوں۔ وہ غالباً اسی لئے مکان کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس مکان سے جو عورت بھی نکلتی وہ یہی سمجھتے میں ہوں' ورنہ تو نئے میک اپ میں مجھے پہچاننا ان کے لئے ناممکن ہی تھا۔ سیاہ رو شخص' شنزاد کو میرے گھر سے نکلتے دیکھ کر شاید اس کے پیچھے ہو لیا تھا اور اپنے ایک ساتھی کو میری نگرانی کے لئے چھوڑ آیا تھا۔ اسے وہاں بھیجا گیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے نتائج اخذ کرنے میں مصروف تھا۔ میں اسی دوران سیاہ رو شخص کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ معاً میں نے ایک دراز قد آدمی کو لپک کر سیاہ رو شخص کی طرف آتے دیکھا۔ وہ دراز قد آدمی ہرے رنگ کی قمیض پہنے ہوئے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اسی دراز قد آدمی کی جھلک مجھے گلی کے نکڑ پر نظر آئی تھی۔ سیاہ رو شخص کی طرف اس کا لپک کر آنا بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ بھی سی آئی ڈی والا ہے۔ اگر وہ میرا ہی تعاقب کرتا ہوا پہنچا تھا تو پھر اس نے اپنے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ قائم کر رکھا تھا کہ مجھے تعاقب کا علم نہ ہو۔

ابھی تک میری پُراسرار قوت بیدار تھی۔ میں نے اپنی سماعت ان دونوں پر مرکوز کر دی۔ وہ دونوں

اتنے فاصلے پر تھے کہ عام حالات میں ان کی آوازیں مجھ تک پہنچنا ممکن نہیں تھیں۔

"تم سے ابھی جو باتیں کر رہی تھی' وہ عورت تھی۔" دراز قد آدمی نے رازدارانہ لہجے میں سیاہ رو شخص سے کہا۔

"کون عورت؟" سیاہ رو شخص کی آواز میں قدرے جھنجلاہٹ تھی۔

"میں نے اسی عورت کو اس مکان سے نکلتے دیکھا تھا۔" دراز قد آدمی نے وضاحت کی۔

"پاگل ہو تم' ہمیں تو اس کے بارے بتایا گیا ہے کہ وہ نوجوان ہے اور یہ عورت ادھیڑ عمر ہے۔ تم خود ہی دیکھ لو۔ اسی لونڈے کے ساتھ کھڑی ہے جس کا تعاقب کرتا ہوا میں وہاں سے چلا تھا۔ نہ یہ نوجوان ہے اور نہ خوبصورت ہے۔ یہ وہ نہیں ہو سکتی منور خاں!"

"تم یہ کیوں بھول رہے ہو یار کہ وہ میک اپ بھی کر سکتی ہے۔"

"فضول باتیں نہ کرو' میرا تو خیال یہ ہے کہ مکان کے پتے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔" سیاہ رو شخص نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"پھر بھی ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے جگدیش!"

"تو گاڑی کھڑی ہے ادھر' یہ لو چابی اور لگے رہو اس کے ساتھ ساتھ۔ یہ بھی تمہیں پہلے سے بتائے دیتا ہوں کہ وہ دونوں یہاں سے پہاڑی دھیرج جائیں گے۔ اگر میری بات سچ نکلے تو اپنا سر پیٹ کر واپس آ جانا۔ میں اس لئے تمہارے ساتھ نہیں جا رہا کہ مجھے جھک مارنے کا کوئی شوق نہیں۔" سیاہ رو شخص نے اپنی جیب سے ایک چابی نکال کر دراز قد آدمی کو تھما دی۔ "میں تو آج بیکار ہی دفتر آ گیا۔ اچھی بھلی چھٹی لے رہا تھا۔ استری (بیوی) کی طبیعت الگ خراب چل رہی ہے۔ اسے وید کے پاس لے جانا تھا' وہ بھی نہیں لے جا سکا۔ میں چلا .... اور ہاں رپورٹ دیتے سمے یہ مت بھول جانا کہ دن بھر میں بھی تمہارے ساتھ ساتھ تھا۔"

پھر سیاہ رو شخص تو ایک تانگے میں بیٹھ کر چل دیا اور دراز قد آدمی سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک پرانی سی کار کی طرف بڑھ گیا۔ سیاہ رو شخص ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جو کسی مسئلے پر زیادہ سوچ بچار کے قائل نہیں ہوتے۔ اگر وہ ذرا سا بھی اپنے ذہن پر زور دیتا تو اس نتیجے تک با آسانی پہنچ جاتا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ اس نے شہزاد کو خود میرے گھر سے نکلتے دیکھا تھا' اسی طرح دراز قد آدمی کو بھی میں اسی مکان سے نکلتی دکھائی دی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میری اور شہزاد کی ملاقات آج ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس سیاہ رو شخص پر میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ شہزاد مجھے اتفاق سے مل گیا تھا۔ دراز قد آدمی کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ میرے اور سیاہ رو شخص کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔

ابھی میں اسی سوچ بچار میں تھی کہ ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ میں نے اسے روک لیا۔

"چلو بیٹھو گوپال!" میں نے شہزاد کو معنی خیز لہجے میں مخاطب کیا۔

"اچھا دیدی!" شہزاد سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہنے کے بعد ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

میں نے ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے اچٹتی سی ایک نظر اس کار پر ڈالی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پہ دراز قد سی آئی ڈی والا بیٹھا ہوا تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "پہاڑی دھیرج چلو۔"

"لیکن یہ تو جامع مسجد چلنے کو کہہ رہے ہیں جی۔" ٹیکسی والا مڑ کے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

یہ سن کر مجھے شہزاد پر غصہ تو آیا مگر پی گئی' پھر ٹیکسی ڈرائیور کی بجائے میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"بابو عبدالرحیم جی سے پھر کسی دن مل لیں گے' اس سے گھر ہی چلتے ہیں۔"

"جیسی آپ کی اچھا (مرضی) دیدی!" شہزاد سنبھل کر بولا۔ پھر ٹیکسی ڈرائیور سے پہاڑی دھیرج چلنے کو کہا۔

لاعلمی میں شہزاد سارا کھیل ہی بگاڑے دے رہا تھا۔ اس میں شہزاد کا بھی زیادہ قصور نہیں تھا۔ اسے بھلا کس طرح یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ میں کس لئے پہاڑی دھیرج جا رہی ہوں۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہو گئی۔ اس نے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ شہزاد نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی۔ "پہاڑی دھیرج کس لئے چل رہی ہیں؟"

"سیدھے بیٹھو۔" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "اور خاموش بھی رہو۔" میری آواز بھی دھیمی ہی تھی تاکہ ٹیکسی ڈرائیور کچھ نہ سن سکے۔

شہزاد ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں بھلا اسے کس طرح بتاتی کہ پہاڑی دھیرج کیوں جا رہی ہوں۔ اسے خبر ہی نہیں ایک بلا پیچھے لگی ہوئی تھی جس سے مجھے بہرحال جان چھڑانا تھی۔ اس بلا سے جان چھڑائے بغیر میں قرول باغ کا رخ نہیں کر سکتی تھی۔ شہزاد کو میں صرف اس لئے اپنے ساتھ لے جا رہی تھی کہ سیاہ رو شخص نے جو کچھ اپنے دراز قد ساتھی سے کہا تھا' اسے سچ ثابت کیا جا سکے۔ اس نے دراز قد آدمی سے کہا تھا کہ یہ بھی تمہیں پہلے سے بتائے دیتا ہوں' وہ دونوں یہاں سے پہاڑی دھیرج جائیں گے۔ اگر میری بات سچ نکلے تو اپنا سر پیٹ کر واپس آ جانا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ پہاڑی دھیرج پہنچ کر دراز قد سی آئی ڈی والا میرا پیچھا چھوڑ دیتا۔ میں اسی لئے ادھر جا رہی تھی۔ اپنی گاڑی ہو تو تعاقب کرنے والے کو جل دے کر نکلا جا سکتا ہے لیکن ٹیکسی میں یہ ممکن نہیں۔

پہاڑ گنج سے پہاڑی دھیرج کا علاقہ خاصا فاصلے پر تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں بہت دیر لگی' مگر میں نے اس دوران ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ دراز قد سی آئی ڈی والا میری ٹیکسی کے تعاقب میں ہو گا۔ میں مڑ کر دیکھتی تو اسے شبہ ہو سکتا تھا۔ میرے لئے یہ علاقہ بالکل نیا تھا۔ میں پہلے ادھر نہیں آئی تھی۔ میں نے اسی لئے شہزاد سے دھیمی آواز میں کہہ دیا تھا کہ وہی پہاڑی دھیرج کے علاقے میں کسی مناسب جگہ ٹیکسی رکوا لے۔ شہزاد نے اسی لئے وہاں پہنچ کر ایک سڑک کے کنارے ٹیکسی رکوا لی۔

ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ہی میں نے کرایہ ادا کیا اور پھر اترتے ہوئے یہ خیال رکھا کہ اگر تعاقب کرنے

والی کار اب بھی پیچھے لگی ہوئی ہے تو مجھے نظر آ جائے۔ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ اس کم بخت نے ابھی تک جان نہیں چھوڑی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر کار کو روک کر وہ بھی اتر رہا تھا۔ وہ شاید ہمیں گھر تک پہنچا کر ہی واپس جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ہماری ہی طرف آ رہا تھا۔

میں نے سڑک کے دائیں بائیں نظر ڈالی۔ دونوں طرف گھنی آبادی لگتی تھی۔ زیادہ تر گلیاں ہی تھیں۔ کوئی گلی چوڑی تھی اور کوئی خاصی تنگ۔

"چلو۔" میں بائیں جانب ایک تنگ سی گلی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے شہزاد سے مخاطب ہوئی۔

"اب تو مجھے سوٹ کیس دے دیجئے دیدی!" شہزاد نے مجھ سے کہا۔ اردگرد کوئی نہیں تھا' اس کے باوجود شہزاد احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اس کا سبب شاید میری ناراضگی کا خوف ہی تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے میں نے اسے سوٹ کیس تھما دیا۔ میرا ذہن یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ اس فرض شناس سی آئی ڈی والے سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے؟ یہ تو خیر ممکن ہی نہیں تھا کہ میں' شہزاد کو ساتھ لئے کسی گھر میں داخل ہو جاتی۔ گلی میں داخل ہوتے وقت بھی میں نے گوشہ چشم سے دراز قد آدمی کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ادھر ہی آتے دیکھ لیا تھا۔ شاید اسے یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں ہم کسی گلی میں گھس کر اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں اور اس طرح سارے کئے دھرے پر پانی نہ پھر جائے۔

میں نے دانستہ گلی میں داخل ہوتے ہی اپنی رفتار بہت دھیمی کر دی تھی۔ گلی میں کہیں کہیں کوئی اکا دکا بچہ اِدھر اُدھر کھیل رہا تھا۔ میں سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

اپنے عقب میں تیز قدموں کی چاپ سن کر میں تیزی کے ساتھ پلٹی دراز قدم آدمی مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ ایک دم بوکھلا گیا۔

"بات سنو منور خاں!" میں نے اسے نام لے کر مخاطب کیا اور پھر لپکتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے سیاہ رو ساتھی نے اسے اسی نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس کا نام میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

"جج .... جی!" وہ اور بھی زیادہ بدحواس ہو گیا۔

"تمہارے ساتھی جگدیش نے تم سے غلط نہیں کہا تھا' میں وہ نہیں ہوں جس کی نگرانی کا تمہیں حکم دیا گیا تھا۔" میں یہ کہتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ جگدیش کا نام میں نے اسی سے سنا تھا۔

"تت .... تم جگدیش کو اور .... مجھے کیسے جا......... جانتی ہو؟" وہ ہکلانے لگا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"ارے نہیں۔" میں نے ایک دم اس طرح سامنے دیکھا جیسے دراز قد آدمی کے پیچھے کوئی ہو۔ "سر پر نہ مارنا۔"

وہ اچھل کر مڑنے ہی والا تھا کہ میرا دایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ اس کی کنپٹی پر پڑنے والا میرا مکا اتنا ہی زوردار تھا کہ وہ اپنے منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر ہوش و حواس کی دنیا سے غافل ہو گیا۔ میں نے اس کے جسم کو سنبھال کر ایک طرف ڈال دیا۔ اس وقت تک شہزاد بھی پلٹ کر میرے

قریب آ چکا تھا۔

ایک کی رنگ اس کے ہاتھ میں تھا جو میں پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا تھا جسے میں نے جھک کر اٹھا لیا۔

"اوری اماں!" اچانک عقب سے کسی بچے کے چیخنے کی آواز آئی۔ "دانے وا کو مار ڈارو۔"

وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے بے ہوش ہو جانے والے کو مار ڈالا ہے۔ بچہ شاید یہ سمجھا تھا کہ دراز قد سی آئی ڈی والا منور خاں مر چکا ہے۔ وہ اب بھی چیخے جا رہا تھا۔

"بھاگو شہزاد!" میں نے کہا اور تقریباً دوڑتی ہوئی گلی سے نکلی۔ شہزاد نے بھی میری تقلید میں کوتاہی سے کام نہیں لیا تھا۔

سڑک پر لوگ بھی آ جا رہے تھے اس لئے میں نے بھاگنے کی بجائے ممکنہ حد تک تیز رفتاری سے چلنا شروع کر دیا۔

"خا .... خاتون! یہاں تو کوئی ٹیکسی بھی نظر نہیں آ رہی۔ اب .... اب کیا ہو گا؟ ہم .... ہم کہیں پکڑے نہ جائیں۔" شہزاد کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"بس چلے آؤ' جلدی کرو۔" میں سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ یہ وہی کار تھی جس میں دراز قد منور خاں نے پہاڑ گنج سے یہاں تک ہمارا تعاقب کیا تھا۔ کار کے اور میرے درمیان اب صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

ذرا ہی دیر میں ہم کار کے قریب پہنچ ہی گئے۔ پھر میں نے اس کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے میں زیادہ دیر نہیں کی اور شہزاد کے لئے ہاتھ بڑھ اکر اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ سوٹ کیس اس سے لے کر میں نے پچھلی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔ شہزاد نے جب تک اپنی طرف کا دروازہ بند کیا' میں کار اسٹارٹ کر چکی تھی۔ یہ میری زندگی میں دوسرا موقع تھا کہ میں ڈرائیونگ کر رہی تھی دونوں ہی مواقع پر مجھے موقعہ واردات سے فرار ہونے کے لئے ڈرائیونگ کرنا پڑی تھی۔

"یہاں سے جامع مسجد چلنا ہے اور تم میری رہنمائی کرو گے کیونکہ مجھے راستہ نہیں معلوم۔" میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"ٹھ .... ٹھیک ہے خاتون!" شہزاد ابھی تک نروس سا نظر آ رہا تھا۔ اسے غالباً اس طرح کے واقعات سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

"گھبراؤ مت! اب ہم وہاں سے خاصی دور نکل آئے ہیں۔ ہمیں اب کوئی نہیں پکڑے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"آپ .... آپ کو خاتون! ڈرائیونگ بھی آتی ہے؟" وہ حیرت سے بولا۔

"کمال ہے کہ تم مجھے ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھ کر بھی یہ سوال کر رہے ہو۔"

اس کے بعد شہزاد میری رہنمائی کرتا رہا اور میں ڈرائیونگ کرتی رہی۔ اسی دوران وہ پوچھنے لگا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی خاتون کہ آپ عین وقت پر اس سی آئی ڈی والے سے میری جان

چھڑانے کس طرح پہنچ گئیں اور آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے اس سے کیا کہا تھا' یعنی کیا بہانہ کیا تھا؟"

"تم تو کہہ رہے تھے کہ ایک بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی مگر یہ تو دو باتیں ہو گئیں۔" میں مسکرا کر بولی۔ "بہرحال تمہاری پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ مجھے قرول باغ پہنچنے کے لئے کسی سواری کی تلاش میں اسی سڑک تک آنا تھا۔ تمہیں وہاں خلاف توقع اس اجنبی شخص کے ساتھ کھڑے ہوئے میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ تم کچھ گھبرائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ جس گلی کی طرف تم دونوں کی پشت تھی' میں ذرا سا چکر کاٹ کر اس کے آخر تک پہنچ گئی اور پھر تمہارے درمیان ہونے والی باتیں سن لیں۔ اب تمہاری سمجھ میں آ گئیں دونوں باتیں؟"

"اور وہ کون تھا جسے آپ بے ہوش کر کے وہاں گلی میں چھوڑ آئی ہیں؟" دوبارہ سوال کرنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ میرے پہلے جواب سے مطمئن ہو چکا تھا۔

"یہ تیسری بات ہے جو تم نہیں سمجھے۔" میں دھیرے سے ہنسی' پھر سنجیدگی سے بولی۔ "تم جب میرے ساتھ ہو تو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھا کرو۔ کیا تم نے اس سیاہ رو سی آئی ڈی والے سے اس لمبو کو باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا؟ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ہم پہاڑ گنج میں سڑک کے کنارے کسی خالی ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔"

"نہیں خاتون! میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔"

"لیکن میں نے دیکھا تھا۔ سیاہ رو شخص ہی نے اس کار کی چابیاں لمبے کو دی تھیں تاکہ وہ کار میں ہمارا تعاقب کر سکے۔"

"تو .... تو یہ کار سی آئی ڈی والوں کی ہے؟" شہزاد نے چونک کر پوچھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ جان کر وہ ڈر گیا ہو کہ کار سی آئی ڈی والوں کی تھی۔

"جی جناب قبلہ محمد شہزاد صاحب!" میں نے ہنستے ہوئے تصدیق کی۔ "اسی کو شاید کہتے ہیں' جس کا جوتا اسی کی چاند۔"

"مجھے تو یہ حیرت ہو رہی ہے خاتون کہ کلکتے کی طرح یہاں بھی آپ کے ساتھ وہی چکر چل گیا۔ ایک طرف تو وہ پُراسرار عورت آپ کی دشمن بنی ہوئی ہے' دوسری جانب اب یہ کم بخت سی آئی ڈی والے بھی آپ کی جان کو آ گئے ہیں۔" شہزاد کے لہجے سے میرے لئے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا۔

"ابھی تو کچھ اور بھی دشمن جاں ہیں میرے جن کا تمہیں علم نہیں لیکن میں کسی سے نہیں ڈرتی۔" میں نے پُرسکون آواز میں کہا۔ "ہاں میں اپنی وجہ سے تمہیں کسی مشکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتی۔ موجودہ حالات کے پیش نظر تمہارے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ مجھ سے کم ہی ملو تو اچھا ہے' خصوصاً آج کے واقعے کے بعد۔ تم ان کی نظر میں آ چکے ہو۔ میں تو خیر ان کے ہتھے چڑھنے والی نہیں ہوں مگر وہ تمہیں ضرور تلاش کریں گے' خاص طور پر پہاڑ گنج اور پہاڑی دھیرج کے علاقوں میں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں ڈرا رہی ہوں لیکن بہتری یہی ہے' تم چند روز گھر سے نہ نکلو۔ میں جب ضروری سمجھوں گی تم سے خود رابطہ

قائم کر لوں گی۔"

"تو پھر کل شام آپ مجھے اپنا نیا گھر دکھانے کے لئے ساتھ نہیں لے جائیں گی؟"

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے' ظاہر ہے کہ میں نہیں آؤں گی۔ فی الحال تمہیں مجھ سے دور ہی رہنا ہے تاکہ آج پیش آنے والے واقعے کی طرح پھر کسی وقت میرے ساتھ تم بھی خطرے میں نہ گھر جاؤ۔ آئندہ کے لئے تم ایک اور بات اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھا لو۔ کسی بھی مرحلے پر' چاہے جیسے بھی حالات ہوں' پولیس' سی آئی ڈی والے یا کوئی اور اجنبی تم سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کرے تو تمہیں لاعلمی ہی کا اظہار کرنا ہے' یعنی یہ کہ تم مجھے نہیں جانتے۔ مجھ سے لاتعلقی کا اظہار ہی تمہارے تحفظ کا ضامن ہو سکتا ہے۔ ویسے تو خیر کسی ایسی صورت حال کے پیش آنے کا اندیشہ نہیں' پھر بھی بطور احتیاط میں تمہیں سمجھا رہی ہوں۔"

"آپ پوری طرح مطمئن رہیں خاتون! میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا۔" شہزاد نے مجھے یقین دلایا' پھر کہنے لگا۔ "ہاں ایک درخواست ضرور کروں گا' وہ بھی اس لئے کہ مجھے آپ کی طرف سے فکر رہے گی' جب بھی موقع ملے مجھ سے رابطہ ضرور قائم کر لیجئے گا۔ اس طرح مجھے آپ کی خیریت کا علم ہو جائے گا۔"

"اس میں درخواست کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تمہارے خلوص و محبت کا اندازہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میری خیریت نہ ملی تو تم فکرمند رہو گے۔ ہاں یہ بات اپنے ذہن میں ضرور رکھنا کہ میں آؤں گی اسی وقت جب حالات قدرے نارمل ہو جائیں گے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "ٹیکسی میں سرگوشی کرنے پر میں نے تمہیں جھڑک دیا تھا' اس کا خیال نہ کرنا۔"

"آپ بھی حد کرتی ہیں خاتون! میں تو بھول بھی گیا تھا۔"

"یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں ایسی باتیں یاد نہیں رہتیں۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔ پھر پوچھا۔ "سیدھے ہی چلنا ہے نا؟"

"جی ہاں۔" شہزاد نے جواب دیا۔

پھر اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہم جامع مسجد پہنچ گئے اور میں نے شہزاد کو کار سے اتار دیا۔ اپنا سوٹ کیس میں نے پچھلی نشست سے اٹھا کر آگے رکھ لیا تھا۔ اب میں یہ سوچ رہی تھی کہ اس کار کو کہاں چھوڑوں؟ وہاں میں نے شہزاد کو اتارا تھا اس لئے اس علاقے میں بھی کار چھوڑنا میرے نزدیک مناسب نہیں تھا۔ وہ کار سی آئی ڈی والوں کی تھی۔ انہیں اندازہ ہو جاتا کہ ہم کہیں آس پاس ہی گئے ہوں گے۔ پھر وہ اس علاقے کی نگرانی شروع کر دیتے۔ میرے لئے تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا مگر شہزاد کسی خطرے میں گھر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اس کار کو قرول باغ کی طرف لے جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں اسی ادھیڑبن میں دریا گنج کی طرف نکل آئی۔ آخرکار میں اس فیصلے پر پہنچ ہی گئی کہ اس کار کو کہیں دور لے جا کر چھوڑنا چاہئے تاکہ سی آئی ڈی والے کوئی اندازہ ہی قائم نہ کر سکیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میری چھٹی حس کسی خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ شاید اس خطرے کا تعلق اسی کار

سے تھا۔

کلکتے کی طرح مجھے ابھی دہلی میں زیادہ گھومنے پھرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اس لئے راستوں کا زیادہ علم نہیں تھا۔ میں دریاگنج سے سیدھی دہلی دروازے کی طرف نکل گئی اور پھر خونی دروازے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔

خطرے کا احساس اب پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے ایک عجیب سی بے چینی بھی محسوس ہونے لگی تھی جس کی وجہ سمجھنے سے میں قاصر تھی۔ ہاں میرا اب تک کا تجربہ یہی تھا کہ ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب کوئی خلاف توقع واقعہ پیش آنے والا ہو۔ میرا دھیان لعنتی چمپا کی طرف چلا گیا' مگر عموماً وہ رات کے وقت ہی مجھ پر وار کرتی تھی۔

پھر یہ بے چینی کیسی ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

سوچتے سوچتے بے دھیانی میں کار کی رفتار خود بخود کم ہو گئی تھی۔ ایکسی لیٹر پر میرے پاؤں کا دباؤ شاید کم ہو گیا تھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی کار تیز رفتاری کے ساتھ میری کار کے قریب سے گزری ہو۔ میں نے چونک کر ادھر نگاہ اٹھائی۔ میری کار کے قریب سے گزرنے والی کار کی رفتار آگے جا کر کم ہو گئی اور پھر اسے میں نے سڑک پر ترچھی ہو کر رکتے دیکھا۔

"خطرہ!!!" یہ ایک لفظ میرے ذہن میں کئی بار گونجا' مگر شاید خطرے کا تدارک کرنے میں مجھے دیر ہو چکی تھی۔ پھر بھی میں نے اتنا تو کیا ہی کہ اپنی کار کو روک کر خود کو ایک متوقع حادثے سے بچا لیا۔ میں اگر فوری طور پر ایسا نہ کرتی تو اگلی کار سے میری کار ٹکرا گئی ہوتی۔

ادھر میں نے اپنی کار روکی' ادھر میری راہ مسدود کر دینے والی کار سے دو افراد اترے۔ ان دونوں ہی کے ہاتھوں میں مجھے ریوالور نظر آ رہے تھے اور ان کے ریوالوروں کی نالیں میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ معلوم نہیں میرے وہ دشمن کون تھے۔ میرے لئے تو ان دونوں ہی کے چہرے اجنبی تھے۔

☆======☆======☆

اب میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں رہا کہ کچھ دیر سے میری چھٹی حس جس خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی' سامنے آ چکا ہے۔ وہ دونوں اجنبی تیز قدمی سے چلتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔

میں نے چند ہی لمحے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ کار کے اندر بیٹھے ہوئے اپنا دفاع نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے مجھے بہرحال کار سے اترنا ہی پڑے گا۔ ان لوگوں نے خود مجھے کار سے اترنے کے لئے کہہ کر گویا ایک سنہری موقع فراہم کر دیا تھا۔ میں نے اطمینان کے ساتھ کار کے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"کون ہو تم لوگ اور میرا راستہ کیوں روکا ہے؟" میں نے کار سے اترتے ہی سوال کیا۔

"اے عورت! زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کر۔" وہی شخص پھر بولا جس نے مجھے کار سے اترنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے طرز تخاطب سے میں سمجھ گئی کہ وہ بھی مجھے نہیں جانتا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ "بتا' یہ کار تیرے پاس کہاں سے آئی؟"

اجنبی شخص کے اس سوال نے میرے ذہن میں روشنی سی کر دی۔ انہوں نے مجھے نہیں' اس کار کو پہچان لیا تھا۔ یہ سیدھی سی بات تھی کہ اس کار کو پہچاننے والوں کا تعلق بھی یقیناً خفیہ پولیس کے محکمے ہی سے ہو سکتا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے نتائج اخذ کرنے لگا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس شخص نے پھر سخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔

"تو پھر جگدیش ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔" میں اس طرح بولی جیسے بے اختیار یہ بات میرے منہ سے نکل گئی ہو۔ میں نے محض تصدیق کی خاطر یہ جملہ ادا کیا تھا۔

"اے ایس آئی جگدیش کو تو کیسے جانتی ہے؟" اس شخص نے چونک کر پوچھا۔

"میں اس کی دیدی ہوں اور مجھے کار چلانے کا شوق ہے۔ جگدیش نے مجھے اپنے دفتر کی کار لے جانے سے منع کیا تھا۔ جگدیش کے ساتھ ہی اس کے دفتر کا ایک ساتھی منور خاں بھی تھا۔"

"وہ دونوں اب کہاں ہیں؟" اجنبی نے دریافت کیا۔ اس کے لہجے کی سختی اب ختم ہو چکی تھی۔ غالباً اس نے میرے جھوٹ کو سچ سمجھ لیا تھا۔

"گھر پہ ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ان سے میں نے گھنٹے بھر میں لوٹ آنے کو کہا تھا۔ تم لوگ بھی مجھے جگدیش کے دفتر والے لگتے ہو۔ میں تم سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ جگدیش کے دفتر میں اس کی شکایت نہ کرنا۔ غلطی اس کی نہیں میری ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ التجا آمیز تھا جیسے مجھے خود سے زیادہ جگدیش کی فکر ہو۔

"کچھ بھی ہو' اس نے غیر قانونی حرکت کی ہے۔" اجنبی شخص نے یہ کہتے ہوئے ریوالور واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے ساتھی نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ "ہم اس کی رپورٹ ضرور کریں گے' تم جا سکتی ہو۔" وہ شخص اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرا شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔

مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ وہ آفت اتنی جلدی اور اس قدر آسانی سے ٹل جائے گی۔ میری بیدار مغزی نے مجھے ایک خطرے سے بچا لیا تھا۔ اپنے ہی محکمے کے کسی فرد کی بہن کے ساتھ ظاہر ہے وہ دونوں کوئی بدتمیزی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ الگ بات کہ بعد میں جب انہیں حقائق کا علم ہوتا تو وہ اپنا سر پیٹ کے رہ جاتے۔

میں دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی۔ ان کی کار یو ٹرن لے کر واپس اسی راستے پر چلی گئی جدھر سے آئی تھی۔ مجھے اس میک اپ میں کئی سی آئی ڈی والے دیکھ چکے تھے۔ میں نے اسی لئے اس سے نجات حاصل کرنے میں دیر نہیں کی۔ وہ کار اب خاصی دور نکل چکی تھی۔ ذرا سی دیر بعد میں نے بھی واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

خونی دروازے سے ذرا پہلے میں نے اس کار کو سڑک کے کنارے کھڑا کیا اور سوٹ کیس لئے پیدل ہی آگے بڑھ گئی۔ اس کار میں مزید سفر کر کے میں اب کسی خطرے سے دوچار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے چہرے سے میک اپ ختم کر کے میں کسی حد تک مطمئن ہو چکی تھی۔ جن سی آئی ڈی والوں نے مجھے اس میک اپ میں دیکھا تھا' اب ان کے لئے میرا چہرہ اجنبی ہی ہوتا۔

کچھ دور پیدل چل کر میں سڑک کے کنارے کسی خالی ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔ ٹیکسی تو خیر نہیں ملی' ہاں ایک خالی تانگہ ضرور نظر آیا۔ مجھے دریاگنج سے کوئی نہ کوئی ٹیکسی یقیناً مل سکتی تھی۔ میں نے اسی لئے وہیں تک کے لئے تانگہ کر لیا۔ تانگے ہی میں قرول باغ تک جانے میں خاصی دیر لگ جاتی۔ میں اب جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہتی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ عادل' سالار اکبر وغیرہ میری طرف سے فکرمند ہو سکتے تھے۔ مجھے واپس میں پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی تھی۔ گزشتہ رات عادل سے میں نے آئندہ روز صبح آنے کے لئے کہا تھا اور اب گیارہ بج رہے تھے۔ تانگے والے نے مجھے دریاگنج پہنچا دیا۔ وہاں آ کر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ ایک خالی ٹیکسی ملنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر جب میں قرول باغ کے لئے روانہ ہوئی تو پے در پے تیزی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر غور کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

سی آئی ڈی والوں کا مجھ تک پہنچ جانا میرے لئے تعجب خیز نہیں تھا۔ چمپا خود مجھے پہاڑ گنج والے مکان میں دیکھ کر گئی تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیا جائے گا۔ صبح ہوتے ہی میں نے اس دھمکی کو حقیقت بنتے دیکھ لیا تھا۔ مجھے اس لئے فکر تھی کہ میں موجودہ صورت حال میں کہیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ میں آخر کتنے ٹھکانے بدلتی' اس سوچ بچار میں ٹیکسی قرول باغ تک پہنچ گئی۔ ٹیکسی والے ہی نے مجھے مخاطب کیا تھا کہ کدھر چلنا ہے تو میں چونک اٹھی تھی۔

میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کوٹھی وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ پیدل بھی میں بقیہ راستہ طے کر سکتی تھی۔

"بس یہیں سڑک کے کنارے روک لو۔" میں نے جواب دیا۔

کرایہ ادا کر کے میں سوٹ کیس سنبھالے ہوئے ٹیکسی سے اتر کر آگے بڑھ گئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچ کر مخصوص انداز میں دستک دینے کے بعد میں نے شناختی الفاظ ادا کئے۔ شناختی الفاظ کا جواب دیئے جاتے ہی پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوئی تو ایک شخص کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پھاٹک کی طرف آتے دیکھا۔ وہ دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ اس کا انداز خرام میرے لئے اجنبی نہیں تھا لیکن چہرہ ضرور اجنبی تھا۔

"نمستے دیوی جی!" میرے لئے ذیلی دروازہ کھولنے والے مسلح شخص نے مجھے دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ گزشتہ روز میں اس سے مل چکی تھی۔ اس کا نام رنجیت تھا۔

میں نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا' پھر اخلاقاً پوچھا۔ "تم ٹھیک تو ہو رنجیت!" میرے قدم آگے بڑھتے بڑھتے رک گئے تھے۔

"جی دیوی جی! آپ کی دیا (مہربانی) ہے۔" رنجیت بولا۔

اسی عرصے میں گیٹ کی طرف آنے والا قریب آ چکا تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا تو میں اسے پہچان

گئی۔ وہ عادل تھا' اس کے چہرے پر میک اپ تھا۔

"تم نے مجھے فکرمند ہی کر دیا تھا۔ معلبہ! میں تمہاری ہی تلاش میں نکل رہا تھا۔ چلو آؤ اور یہ سوٹ کیس مجھے دے دو۔" عادل نے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے سوٹ کیس لے لیا۔

"اور تم وہاں پہنچتے تو میں تمہیں وہاں نہ ملتی۔" میں اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔

"ارے!" اسے چلتے چلتے جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "یہ تم بغیر میک اپ کے کیسے چل دیں وہاں سے؟"

"وہاں سے تو میک اپ کر کے ہی چلی تھی' راستے میں ضرورتاً میک اپ ختم کرنا پڑا۔" میں نے جواب دیا۔

"کہیں پھر تو کوئی چکر نہیں چل گیا؟"

"چکر تو میری زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں' ان سے نجات کہاں؟" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"اندر چلو' پھر بتاتی ہوں۔"

گزشتہ روز جو کمرہ میرے استعمال میں تھا' عادل مجھے وہیں لے آیا اور بولا۔ "تم آرام سے اندر چل کے بیٹھو' میں آتا ہوں ابھی۔ سالار اکبر کو بتا آؤں کہ تم آ گئی ہو۔ وہ تمہاری طرف سے بہت فکرمند تھے۔ انہی کے ایما پر میں تمہیں دیکھنے جا رہا تھا۔ انہوں نے مجھے اس بات پر ڈانٹا بھی کہ اس مکان کی حفاظت کا بندوبست کیوں نہیں کیا گیا جہاں تمہیں رات گزارنا تھی۔"

"اچھا تم ہو کر آؤ۔" میں نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

عادل چلا گیا تو مجھے ناشتے کا خیال آیا۔ صبح سے اب تک مجھے ناشتہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ برابر والا کمرہ دلاری کا تھا۔ اپنے کمرے کے دروازے پر آ کر میں نے اسے آواز دی۔ اس وقت وہ شاید اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ سو میں پلٹ آئی اور آرام سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سوٹ کیس میں نے پہلے ہی دیوار کے سہارے رکھ دیا تھا۔ وہاں میرے دو سوٹ کیس اور بھی رکھے تھے جنہیں میں اپنے ساتھ نہیں لے گئی تھی کیونکہ مجھے ایک ہی رات باہر گزارنا تھی۔ ضروری سامان میں نے اس سوٹ کیس میں رکھ لیا تھا جو میرے ساتھ تھا۔

واپسی میں عادل نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس نے آتے ہی مجھے بتایا۔ "میں تمہارے لئے ناشتے کو بھی کہہ آیا ہوں۔ ناشتہ کہیں کر تو نہیں لیا؟" وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"نہیں' اتنی مہلت ہی نہیں ملی۔ ہاں ایک کپ چائے شہزاد سے بنوا کر ضرور پی تھی۔" میں بولی۔ شہزاد کو وہ جانتا تھا۔

"ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہیں دیر کیسے ہو گئی؟" عادل نے پوچھ ہی لیا۔

مختصراً اسے میں نے پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا۔ واقعہ بیان کرتے ہوئے ظاہر ہے کہ میں اپنی پُراسرار قوت کے بیدار ہو جانے کا ذکر گول کر گئی۔

"حیرت ہے۔" عادل پورا واقعہ سننے کے بعد بولا۔

"کس بات پر؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس پر کہ سی آئی ڈی والے ہر مرتبہ تمہارا سراغ کیسے لگا لیتے ہیں۔ کل رات بھی وہ ہوٹل میں تم تک پہنچ گئے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی اور ہی چکر ہو۔" اس نے کچھ معنی خیز سے لہجے میں کہا۔ "ہمارے درمیان رہ کر تو کوئی مخبری نہیں کر رہا۔ سالار اکبر نے بھی آج مجھ سے اس شبہے کا اظہار کیا تھا۔ پہاڑ گنج والی عمارت پر پولیس کا غیر متوقع چھاپہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہو سکتا ہے۔ یہ سوال بہرحال نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ پولیس کو کیسے علم ہوا' ولیم رائٹ کو اس عمارت میں رکھا گیا ہے؟ خاص طور پر اس عمارت کے اندر موجود تہہ خانے کے بارے میں تو تنظیم کے ارکان اور تمہارے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ان حالات میں سالار اکبر کا یہ شبہ درست ہی لگتا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی کالی بھیڑ موجود ہے۔"

"میں تمہاری بات سے قطعی متفق نہیں ہوں۔" میں نے اس کی بات سن کر انکار میں سر ہلایا کیونکہ مجھے حقیقت کا علم تھا' مگر اس سے عادل کو آگاہ نہیں کر سکتی تھی۔

"اس کی کوئی وجہ' تم اتنے یقین کے ساتھ یہ بات کس طرح کہہ سکتی ہو؟"

"حالات کا صحیح تناظر میں تجزیہ کرو تو یقیناً تم بھی اسی نتیجے پر پہنچو گے۔ مثلاً یہ بتاؤ' اس بات سے کون کون واقف تھا کہ گزشتہ رات میں کہاں گزاروں گی؟"

"تمہارے اور میرے علاوہ دلاری اور سالار اکبر اس سے واقف تھے۔" عادل نے جواب دیا۔

"سوچ لو اچھی طرح' کسی اور کو تو اس کا علم نہیں تھا۔"

"نہیں' سالار اکبر سے بھی میں نے آج صبح ہی یہ ذکر کیا تھا۔"

"کس وقت؟" میں نے معلوم کیا۔

"تقریباً نو بجے کے بعد۔" اس نے بتایا۔

"تو پھر سالار اکبر کا نام تو اس ضمن میں آتا ہی نہیں کیونکہ میں نو بجے تک گھر سے نکل چکی تھی۔ اس سے قطع نظر میرے نزدیک سالار اکبر کی شخصیت یوں بھی ہر قسم کے شک و شبہے سے بالاتر ہے۔ اب رہ جاتی ہوں میں۔ تو ظاہر ہے' خود مجھے کسی خطرے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ رہے تم' تو یہ خود اپنے اوپر شبہہ کرنے کے مترادف ہے۔ لے دے کر دلاری بچ جاتی ہے تو جہاں تک میرا اندازہ ہے' گزشتہ رات سے اب تک دلاری نے اس عمارت سے قدم باہر نہیں نکالا ہو گا۔ رنجیت سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اب یہ جواب دو کہ سی آئی ڈی والوں کو کس کالی بھیڑ نے یہ خبر دی' میں کہاں ہوں؟" میں نے اپنی بات ختم کر کے عادل کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"بظاہر تمہارا تجزیہ درست ہی معلوم ہوتا ہے لیکن میرا سوال اپنی جگہ برقرار ہے کہ سی آئی ڈی والوں کو تمہارے بارے میں کس طرح پتا چلا؟"

"یہ سوال بعد کا ہے۔ فی الحال تو ہم اس پر غور کر رہے ہیں کہ تنظیم کے ارکان میں سے تو کوئی کالی بھیڑ نہیں۔ اب کل رات کے واقعے پر غور کرو۔ کتنے لوگوں کو خبر تھی کہ میں یہاں سے کسی ہوٹل میں قیام کے لئے گئی ہوں اور وہ کون سا ہوٹل ہے؟" سوال کر کے میں خود ہی کہنے لگی۔ "بقول تمہارے'

سمیع اللہ نے اس ہوٹل تک میرا تعاقب کیا تھا اور پھر وہیں ایک کمرہ حاصل کر لیا تھا۔ سمیع اللہ نے تمہیں بھی اسی وقت فون پر اس ہوٹل کا نام بتایا ہو گا جب خطرہ محسوس کیا تھا۔ اس وقت تک انسپکٹر جیک میرے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ سمیع اللہ کے سوا کسی کو یہ معلوم نہیں تھا' میں کس ہوٹل کے کس کمرے میں ٹھہری ہوں۔ بولو' غلط کہہ رہی ہوں میں؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔" عادل نے تصدیق کی۔

"تو کیا تمہارے خیال میں سمیع اللہ میری مخبری کر سکتا ہے؟"

"ناممکن سی بات ہے۔ اس نے تو تنظیم کے لئے مجھ سے بھی زیادہ قربانیاں دی ہیں۔"

"تو اس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میرے متعلق سی آئی ڈی کو کسی اور ذریعے سے اطلاع ملی اور اس ذریعے کے بارے میں مجھے اچھی طرح علم ہے۔ ولیم رائٹ کی بازیابی میں بھی پولیس کا یہی ذریعہ تھا۔ اس خیال کو اپنے ذہن سے قطعی جھٹک دو کہ تم لوگوں کے درمیان رہ کر کوئی مخبری کر رہا ہے۔"

"لیکن معبلہ! وہ ایسا کون سا مصدقہ ذریعہ ہے جو پولیس اور سی آئی ڈی کو اتنی درست اطلاعات فراہم کر رہا ہے؟" یہ سوال کرتے ہوئے عادل کے لہجے میں انتہائی حیرت تھی۔

"میرے دیدہ و نادیدہ دشمن جو تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ طاقتور اور بااثر ہیں۔" میں نے پُریقین لہجے میں جواب دیا۔

"تمہارے دشمن' لیکن وہ ہیں کون؟ اور پھر انہیں تمہاری نقل و حرکت کا علم کیسے ہو جاتا ہے؟"

"یوں سمجھ لو کہ وہ سائے کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور میں چاہوں بھی تو خود کو ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتی۔ ولیم کے معاملے میں بھی ان کا مقصد محض مجھے زک پہنچانا تھا۔ تم لوگ تو صرف میری وجہ سے لپیٹ میں آ گئے۔" میں نے اسے بتایا۔

"یہ تو تم بڑی عجیب بات کر رہی ہو۔ میک اپ میں وہ تمہیں کیسے پہچان سکتے ہیں؟"

"اس کا عملی ثبوت کل رات اور آج صبح مل تو چکا ہے۔ میں گزشتہ رات بھی میک اپ میں تھی اور آج صبح بھی میک اپ کر کے ہی گھر سے نکلی تھی۔" میں بولی۔ "یہی تو وہ اصل وجہ ہے کہ میں تم لوگوں کے ساتھ رہنے سے گریز کرتی رہی ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم لوگ بھی کسی خطرے میں پڑ جاؤ۔"

"یہ تو بڑی عجیب اور ناقابلِ یقین سی بات ہے معبلہ کہ تم خود کو اپنے دشمنوں سے نہیں چھپا سکتیں۔" عادل کے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔

ممکن ہے' عادل کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہو لیکن کسی کے قدموں کی چاپ سن کر رک گیا۔ آنے والی دلاری تھی۔ وہ میرے لئے ناشتہ لے کر آئی تھی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے نمستے کہا' پھر درمیانی میز پر ناشتے کی ٹرے رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں ادھر ہی آ رہی تھی کہ رحمان بھائی راستے میں مل گئے۔ میں نے پوچھا' کس کے لئے اس طرف ناشتہ لے جا رہے ہو تو اس نے آپ کا نام لیا سو میں نے

اس سے ٹرے لے لی۔ معبلہ جی! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

دلاری کے معنی خیز لہجے کو محسوس کر کے اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ دلاری اور شہزاد کو میں اپنے ایک ایسے دشمن کے وجود سے آگاہ کر چکی تھی جو شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔ ان دونوں ہی کو میرے ساتھ رہ کر کسی حد تک اس کا تجربہ ہو چکا تھا اسی لئے میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی معنی خیز لہجے میں میری خیریت پوچھنے کا یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ مجھے اپنے دشمن کی طرف سے کوئی خطرہ تو پیش نہیں آیا۔ میں نے سوچا' اگر عادل کو بھی اسی طرح کی کوئی بات بتا دی جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

"ٹھیک ہوں میں۔" دلاری کی بات کا جواب دے کر میں نے اس سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئی تو میں دوبارہ اس سے مخاطب ہو گئی۔ "دلاری! کل میں نے تم سے اپنے کسی نادیدہ دشمن کا ذکر کیا تھا' تمہیں یاد ہے نا! اس کے علاوہ اتنے دن میرے ساتھ رہ کر بھی کچھ عجیب اور پُراسرار باتیں تمہارے علم میں آئی ہیں' ہے نا؟"

"جی ہاں معبلہ جی!" اس نے بلاجھجک تصدیق کر دی' پھر چونک کر بولی۔ "آپ سے کل میں نے ایک جنتر بتانے کو بھی کہا تھا۔ وہ ایک جگہ میں نے لکھ دیا ہے' دیکھ کر بتاؤں گی' کہیں میری اٹیچی ہی میں گیتا جی کے ساتھ رکھا ہو گا۔ اس کا جاپ کرنے سے.........."

"وہ تو خیر تم دے دینا مجھے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی کیونکہ مجھے جنتر منتر وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ "اس وقت تو تم سے محض ایک بات کی تصدیق کرانا تھی کہ کل جب تم سلیم کے کمرے کے دروازے تک پہنچی تھیں تو تمہیں دروازہ بند ملا تھا یا کھلا؟"

"دروازہ بند ملا تھا معبلہ جی! یہ بات میں کل بھی آپ کو بتا چکی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ "کمرے میں سلیم اور میرے سوا کوئی اور بھی تھا؟"

"نہیں' کمرے میں داخل ہوتے ہی آپ دونوں کو میں نے مسہری ہی پر دیکھا تھا۔" اس نے محتاط الفاظ میں جواب دیا تھا۔

"جب ہم دونوں میں سے کسی نے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا تو کھولنے والا کوئی نادیدہ وجود ہی تھا نا؟ کیونکہ دروازہ کھلتے ہی تم فوراً ہی کمرے میں داخل ہو گئی تھیں۔"

"آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں معبلہ جی! ایسا ہی ہوا تھا۔"

عین اسی لمحے میں نے کمرے میں چمپا کی موجودگی کو محسوس کر لیا اور چونک اٹھی۔ مجھے اس کے ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس وقت چمپا کی آمد میرے لئے قطعی خلاف توقع تھی۔ اس لعنتی وجود کی آمد کسی خطرے کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اس خیال سے میں کچھ فکرمند سی ہو گئی۔

"معبلہ!" معاً چمپا نے مجھے مخاطب کیا۔ "تو کس کس کو اپنی بے بسی اور پاک دامنی کے قصے سناتی

پھرے گی۔ یہ جو تیرے سامنے بیٹھا ہے' بڑا پکا مسلمان ہے۔ اسے تیری کسی بات پر یقین نہیں آئے گا۔ دلاری کی بات اور تھی۔ اچھا اگر تجھے میری بات کا وشواس نہیں تو اس سے بات کر کے دیکھ لے۔ ہاں سن' کہ اس وقت صرف تو ہی میری بات سن رہی ہے' گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

"تم اچانک کچھ فکرمند سی کیوں نظر آنے لگیں معبلہ؟" عادل نے مجھے مخاطب کیا۔

"نہیں تو۔" یہ کہتے ہی میں نے دلاری سے کہا۔ "تم جاؤ۔"

"ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے' ناشتہ تو کرتی رہیں۔" عادل بولا۔ "باتیں ہوتی رہیں گی۔"

"آں.......... ہاں۔" میں چونک اٹھی۔ دراصل چمپا کی آمد نے وقتی طور پر مجھے کچھ نروس سا کر دیا تھا۔ دلاری اٹھ کر چلی گئی تو میں نے کرسی آگے کھسکائی اور اسی وقت کرسی سمیت پیچھے جا پڑی۔

"ارے ارے' یہ تمہیں کیا ہوا؟" عادل تیزی سے اٹھ کر میری طرف لپکا۔

میں اٹھ ہی رہی تھی کہ عادل نے مجھے سہارا دیا اور پھر اسی لمحے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ لعنتی چمپا کی آمد کا مقصد میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ عادل نے مجھے گرفت میں لے لیا تھا۔ میں اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے جدوجہد کرنے لگی۔ عادل کو یقیناً چمپا نے اپنے سحر میں لے لیا تھا۔

اچانک چمپا میری آواز میں زور زور سے چیخنے لگی۔ "بچاؤ.......... بچاؤ۔"

ذرا ہی دیر میں دلاری گھبرائی ہوئی سی کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ میری نظریں دروازے ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"ارے ارے پنڈت جی! کیا تم پر بھی اس بدروح نے جادو کر دیا.......... چھوڑ دو معبلہ جی کو۔" دلاری تیز آواز میں بولی۔

"تو چلی جا یہاں سے۔" عادل کی آواز غیر فطری سی تھی۔

جدوجہد کے دوران میں مجھے اپنا دایاں ہاتھ گرفت سے آزاد کرانے کا موقع مل گیا۔ چمپا کے وار سے بچنے کی اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں تھی کہ میں' عادل کو ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانہ کر دیتی' مگر میرا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ میرے ہاتھ پر وہ نادیدہ گرفت چمپا کے ہاتھ ہی کی ہو سکتی تھی۔ پھر اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

"نہیں معبلہ! آج تو میرے شکار کو بے ہوش کر کے خود کو نہیں بچا سکے گی۔" چمپا کی زہریلی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے چمپا سے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے زور لگایا اور وہ میری بے بسی پر ہنسنے لگی۔ اپنی بے عزتی کے خیال سے میرے جسم میں شعلے سے لپکنے لگے۔ اسی کے ساتھ میرے اندر خوابیدہ بے پناہ پُراسرار طاقت بیدار ہو گئی۔ عادل خود ہی چیختا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے منہ سے صرف ایک ہی لفظ "آگ' آگ" بار بار نکل رہا تھا۔ چمپا کے ہاتھ کی نادیدہ گرفت بھی ختم ہو گئی۔

"شاید تیری شکتی جاگ اٹھی ہے۔ میں پھر آؤں گی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی چمپا کی آواز دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔

اسی دوران شعلے سرد پڑ چکے تھے اور عادل بھی چمپا کے سحر سے آزاد ہو کر کھوئی کھوئی سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چمپا اب جلد لوٹ کر نہیں آئے گی۔ میں واقف تھی کہ چمپا میرے اندر موجود پُراسرار قوتوں سے خوفزدہ ہے۔ خود اپنی زبان سے وہ اس کا اعتراف کر چکی تھی میں نے اسی لئے جھک کر کرسی اٹھائی اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔

"تم بھی بیٹھ جاؤ نا' کھڑے کیوں ہو؟" میں نے عادل کو مخاطب کیا پھر دلاری سے بولی۔ "تم میرے لئے تو ناشتہ لے آئیں' پنڈت جی کے لئے بھی تو چائے لاؤ۔"

"جج .... جی معبلہ جی!" دلاری نے حیرت سے کہا۔ "ابھی تو پنڈت جی آپ سے زبردستی کر........."

"چھوڑو یہ ذکر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "سلیم ہی کی طرح پنڈت جی کو بھی اب کچھ یاد نہیں ہو گا۔"

عادل اس وقت تک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ میری بات سن کر چونک اٹھا اور پوچھا۔ "کیا یاد نہیں ہو گا؟"

ابھی میں کچھ کہہ نہیں پائی تھی کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ چند ہی لمحے بعد چار مسلح افراد کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ تنظیم ہی کے ارکان تھے اور شاید دور سے دوڑتے ہوئے وہاں تک آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے دریافت کیا۔ "مدد کے لئے کون چیخا تھا؟ آواز اسی راہداری سے آئی تھی۔"

اس سے پہلے کہ دلاری بول اٹھتی' میں نے کہا۔ "یہاں تو کوئی نہیں چیخا۔ ہم نے تو کسی کی آواز نہیں سنی۔ کیوں پنڈت جی!"

عادل کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ چمپا کے سحر میں ہونے کے باوجود شاید اس نے بھی "بچاؤ' بچاؤ" کی آوازیں سنی تھیں۔

"حیرت ہے۔" وہی شخص پھر بولا' پھر بتانے لگا۔ "وہ کسی عورت کے چیخنے کی آواز تھی۔"

"بعض اوقات وہم بھی ہو جاتا ہے۔" میں نے بات کو ٹالنا چاہا۔

"لیکن وہم کسی ایک شخص کو ہو سکتا ہے' کئی افراد کو ایک ساتھ نہیں۔" وہ شخص بحث کرنے لگا۔ "کوٹھی میں اس وقت صرف تین عورتیں ہیں۔ دلاری' رشیدہ اور معبلہ جی۔ انہی تینوں میں سے وہ آواز کسی کی ہو سکتی تھی۔ رشیدہ کوٹھی کے اس حصے میں نہیں' کوٹھی کے صدر دروازے پر متعین ہے' ایسی صورت میں........."

"تم لوگ جاؤ۔" عادل اس شخص کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"بہتر ہے پنڈت جی!" وہ شخص بولا۔ "اگر کوئی خطرے کی بات نہیں تو ہم چلے جاتے ہیں۔"

وہ لوگ شاید عادل کا ادب کرتے تھے اسی لئے پھر مزید کچھ کہے بغیر واپس چلے گئے۔ دلاری نے بھی غالباً اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کسی مصلحت کے سبب ابھی کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کو چھپانا چاہتی

ہوں۔ وہ اسی لئے شاید گومگو کے عالم میں کھڑی رہی اور کچھ بولی نہیں۔

"تم سے میں نے پنڈت جی کے لئے چائے لانے کو کہا تھا دلاری!" میں نے دلاری سے کہا۔

"اچھا معبلہ جی! ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ چونک کر بولی اور پھر چلی گئی۔

دلاری کے جاتے ہی عادل بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "مجھے معاف کر دو معبلہ!" مجھے اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ "کس بات کی معافی مانگ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اسی زیادتی کی معافی مانگ رہا ہوں جو ابھی کچھ دیر پہلے میں نے تم سے کی تھی۔" عادل نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایسی ذلیل حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوئی۔" عادل کا اس طرح معافی مانگنا میرے لئے حیران کن ہی تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ چمپا کے سحر میں ہونے کے باوجود اسے سب کچھ یاد تھا۔

"میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔" مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا۔

"شرمندہ بعد میں ہو لینا' پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں ہوا کیا تھا؟"

"یہی تو خبر نہیں اور تمہارے چیخنے پر دلاری بھی کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی کہ میں .... میں .... اتنا گر بھی سکتا ہوں۔" عادل کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"سنو عادل! جو کچھ بھی ہوا' اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا اس لئے اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ لو۔ میں تمہیں ابھی یقین دلا دوں گی کہ تم بے قصور ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اس وقت کیا محسوس کیا؟"

"اس تلخ اور روح فرسا واقعے کو مجھ سے دہرانے کے لئے نہ کہو تو زیادہ بہتر ہے۔"

"نہیں' تم بتاؤ تو سہی مجھے۔ میں کسی وجہ سے پوچھ رہی ہوں۔"

"تمہیں جب میں سہارا دے کر اٹھا رہا تھا تو نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ .... کہ تمہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے پورا احساس تھا کہ میں غلط کر رہا ہوں' پھر بھی جیسے میرا خود اپنے جسم پر اختیار نہیں رہا تھا۔ پھر تم مدد کے لئے چیخ اٹھی تھیں اور اسی کے ساتھ میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کے بعد کمرے میں دلاری آ گئی تھی اور........." عادل نے من و عن واقعہ بیان کر دیا۔ اسے سب کچھ یاد تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ چمپا کسی کو پوری طرح اپنے سحر میں نہیں لے سکی تھی۔ میرے نزدیک اس کے دو اسباب ہو سکتے تھے۔ پہلا سبب تو عادل کی شرافت نفس تھی۔ غالباً فطری طور پر ان تمام لوگوں سے مضبوط کردار کا مالک تھا جنہیں چمپا اب تک میرے سلسلے میں آلہ کار بناتی رہی تھی۔ دوسرا بڑا سبب اس کی قوت ارادی تھی جس نے بے بس ہونے کے باوجود اسے یہ احساس دلائے رکھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے' غلط ہے۔ سلیم ہی کے سلسلے میں خود میرے ساتھ بھی پہلی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا۔ چمپا مجھے اپنے سحر میں لینے کے باوجود مکمل طور پر قابو میں نہیں کر سکی تھی۔ انہی باتوں پر غور کرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر ناشتے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"میں ذرا ناشتہ کر لوں' اس موضوع پر ابھی بات کرتے ہیں۔" میں نے عادل سے کہا۔ اس طرح

میں یہ سوچنے کے لئے مہلت چاہتی تھی کہ عادل کو کس طرح مطمئن کروں۔

"ٹھیک ہے، تم کرلو ناشتہ، مگر جب تک خود اپنی زبان سے یہ نہیں کہو گی کہ مجھے معاف کر دیا ہے، میرے دل کو سکون نہیں آئے گا۔"

"اگر تمہارے دل کو اسی طرح سکون مل سکتا ہے تو میں نے تمہیں معاف کیا، بس؟"

"تم بہت اعلیٰ ظرف ہو معبلہ!" عادل نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔ "کل تم نے سلیم کی دست درازی کی شکایت نہیں کرنے دی اور آج میری گھٹیا حرکت۔"

"ناشتہ کرنے دو گے مجھے کہ نہیں، میں کہہ چکی ہوں تم سے کہ قطعی بے قصور ہو، پھر بھی بولے چلے جا رہے ہو۔"

"اچھا اب نہیں بولوں گا۔" اس نے کسی سعادت مند بچے کی طرح گردن ہلائی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے شاید اس کی حالت پر ہنسی آ جاتی۔ میں بہرحال سر جھکائے ناشتہ کرتی رہی اور سوچتی رہی۔ اسی عرصے میں دلاری چائے لے کر آگئی۔ وہ میرے لئے بھی چائے لے کر آئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی ناشتہ کرتے ہوئے دلاری کو مخاطب کیا۔ "سنو دلاری! تم نے شاید اب تک اندازہ لگا لیا ہو گا کہ جو واقعہ کچھ دیر پہلے اس کمرے میں پیش آیا ہے، میں اس کی تشہیر نہیں چاہتی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس میں پنڈت جی کا کوئی قصور نہیں، نہ انہیں کچھ یاد ہے۔ تم کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کرنا۔"

"میں سمجھتی ہوں معبلہ جی! بھلا میں آپ کی اور پنڈت جی کی بدنامی کیوں چاہوں گی؟" دلاری بولی۔

عادل اس موقع پر کچھ کہنے والا تھا کہ میں نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ "تمہیں کسی صفائی کی ضرورت نہیں، دلاری جانتی ہے کہ تم بھی سلیم کی طرح سحر میں تھے۔ کیوں دلاری! ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل معبلہ جی! ورنہ تو نہ سلیم ایسا ہو سکتا ہے، نہ پنڈت جی اور نہ آپ۔"

"اچھا اب تم جاؤ۔ یہ برتن لیتی جاؤ، چائے کی پیالیاں خالی ہو جائیں گی تو میں تمہیں خود آواز دے کر بلا لوں گی۔" میں ناشتہ کر چکی تھی۔

دلاری اقرار میں سر ہلا کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ناشتے کی ٹرے وہ اٹھا کر لے گئی تھی۔

"تم نے دلاری سے یہ کیا کہا کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں؟" عادل نے دلاری کے کمرے سے جاتے ہی سوال کیا۔

"مصلحت کا تقاضا یہی تھا اور اس میں کچھ حقیقت بھی تھی، کم از کم سلیم کی حد تک۔ کل شام کا واقعہ یاد کرو، جب تم سلیم کا گریبان پکڑے کھڑے ہوئے تھے اور وہ اس کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ تم نے شاید یہ سمجھا ہو گا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن ایسا نہیں تھا، اسے واقعی کچھ بھی یاد نہیں تھا۔"

"مگر یہ .... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح تمہارے ساتھ ہوا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسے کچھ یاد نہیں رہا اور تمہیں یاد رہا۔"

"وہ تم کیا کہہ رہی تھیں کہ مجھے میرے بے قصور ہونے کا یقین دلا دو گی؟"

"پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم پُراسرار واقعات پر یقین رکھتے ہو؟"

"بالکل نہیں۔" عادل نے جواب دیا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ جو باتیں آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں یا وہ جنہیں نہیں جان پاتا، انہیں پُراسرار کہنے لگتا ہے۔"

"ممکن ہے کچھ لوگوں کے ساتھ ایسا بھی ہو یا بعض واقعات کے بارے میں تمہاری بات درست ہو۔ تمہیں شاید یاد ہو کہ کرسی الٹنے سے ذرا ہی دیر پہلے، دلاری سے کچھ گفتگو کر رہی تھی۔" پھر میں نے اسے گزشتہ روز کا واقعہ یاد دلاتے ہوئے کمرے کا دروازہ خود بخود کھلنے کا ذکر کیا اور اس سے پوچھا۔ "اسے تم کیا کہو گے؟"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کنڈی ٹھیک طرح بند نہ ہو جو دلاری کے ہاتھ کا دباؤ پڑنے سے کھل گئی ہو۔"

"لیکن ایسا نہیں تھا، سلیم نے خود میرے سامنے اندر سے دروازہ بند کیا تھا۔"

"پھر تو واقعی یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں۔ دروازہ خود بخود کس طرح کھل سکتا ہے؟"

"اگر تم کچھ دیر کو یہ فرض کر لو کہ کمرے میں اس وقت سلیم اور میرے علاوہ بھی کوئی موجود تھا تو یہ معمہ حل ہو سکتا ہے۔"

"لیکن مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔"

"یہ بات تمہارے وہاں پہنچنے سے پہلے کی ہے۔"

"تو کیا کمرے میں تمہارے اور سلیم کے علاوہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے کوئی اور بھی تھا؟" عادل نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں، ہم دونوں کے علاوہ کمرے میں ایک نادیدہ وجود بھی تھا۔ وہی نادیدہ وجود ابھی کچھ دیر پہلے اس کمرے میں بھی تھا۔ اسی نے میری کرسی الٹا دی تھی اور اگر تم یقین کرو تو اسی نادیدہ شیطانی قوتوں کے مالک وجود نے تمہیں بھی اپنے سحر میں لے لیا تھا۔"

عادل مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے اسے میری ذہنی صحت پر شبہ ہو، پھر کچھ دیر بعد وہ بولا۔ "معبلہ! کہیں تم نے یہ قصے بنگال میں تو نہیں سنے؟ بنگال سحر وافسوں کے لئے بہت مشہور ہے۔"

"مگر میں کوئی قصہ کہانی بیان نہیں کر رہی۔ سحر ایک حقیقت ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم خود ایک تجربے سے گزرنے کے باوجود اس کی حقیقت سے انکار کر رہے ہو۔"

"یہ ایک طرح کی ذہنی کیفیت بھی ہو سکتی ہے۔ تم تو پڑھی لکھی ہو، میری بات کو سمجھ سکتی ہو۔ انسان کے جسم میں مرکزی حیثیت اس کے دماغ کو حاصل ہے۔ آدمی کے تمام افعال دماغ ہی کے پابند ہوتے ہیں۔ فرض کرو کسی سبب دماغ اور جسم کے رابطے میں وقتی طور پر خلل واقع ہو جائے تو اس سے جسم کے افعال متاثر ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ خلل مستقل حیثیت اختیار کر لے تو فالج بھی ہو سکتا ہے۔ فالج کی

حالت میں یہی تو ہوتا ہے ناکہ آدمی اپنے مفلوج جسمانی اعضاء کو حرکت نہیں دے پاتا' یعنی اسے اپنے جسم پر اختیار نہیں رہتا یا اس کے اعضاء ارادے کے پابند نہیں رہتے۔ اس بحث سے قطع نظر میں تمہیں ایک بات اور بتا دوں۔ میں انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہوں' اس پر کسی بھی طرح کا سحر و افسوں اثر نہیں کر سکتا۔ جو لوگ ان باتوں پر یقین کر لیتے ہیں' معاف کرنا' میں انہیں باشعور نہیں سمجھتا۔" عادل کا لہجہ قطعی تھا۔

اس موقع پر میرا جی چاہا کہ اپنی آنکھوں سے نکلنے والی موت کی روشنی کا ذکر کروں۔ اس کا عینی گواہ تو خود عادل بھی تھا۔ اس نے زندہ انسانوں کو سوکھی لکڑیوں کی طرح جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیا اس کی نظر میں یہ کوئی پُراسرار واقعہ نہیں تھا؟ یہ بات میرے ذہن میں آئی تو ضرور مگر میں اسے زبان پر نہیں لائی۔ اس طرح میں خود کو کوئی ساحرہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی بجائے اسے قائل کرنے کے لئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ میں نے مطالعے کے دوران دنیا کے مختلف مذاہب کی تمام ہی قابل احترام کتب پڑھی تھیں۔ مجھے یہ اعتراض کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ان تمام کتابوں میں' جو مختلف مذاہب کی بنیاد تھیں۔ قرآن مجید کو میں نے سب سے افضل پایا۔ اس کتاب الٰہی کو میں نے پوری طرح سمجھ کر پڑھا اور اپنا دل اس کی طرف کھنچتے ہوئے محسوس کیا۔ قرآن مجید میں بھی سحر و افسوں کا ذکر تھا اور بہت سی پُراسرار باتوں کا بیان بھی۔ مجھے چمپا کا یہ کہنا یاد آگیا تھا کہ عادل پکا مسلمان ہے۔

"تم قرآن مجید پر تو یقین رکھتے ہو نا؟" میں نے تمہید باندھی۔

"بالکل' وہ مسلمان ہی نہیں جسے قرآن پر یقین نہ ہو۔" عادل نے فوراً جواب دیا۔

"تو پھر قرآن سے بھی تو سحر و افسوں کا وجود ثابت ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"کیا قرآن میں فرعون کے ان ساحروں کا ذکر نہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رسیاں ڈال کر ان رسیوں کو سانپوں میں تبدیل کر دیا تھا؟ وہ پورا واقعہ یاد کرو۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سانپوں کے آگے اپنا عصا پھینکا تھا جو ایک اژدھا بن گیا تھا اور ان سانپوں کو نگل گیا تھا۔" میں نے دلیل پیش کی۔

"لیکن قرآن نے سحر کو باطل قرار دیا ہے۔"

"پھر بھی سحر و افسوں کے وجود کا تو قرآن مجید سے پتا چلتا ہے۔" میں بولی۔ "کیا تم اس سے بھی انکار کرو گے کہ روز ازل سے خیر و شر کی قوتیں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں؟"

"اس سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن میں تمہاری ان تمام باتوں کا مقصد سمجھ نہیں سکا۔"

"نہ سمجھنے والی بات تو شاید اس میں کوئی نہیں۔ میں تم سے خیر و شر کی قوتوں کے وجود کا اقرار چاہتی تھی۔ میرا مقصد تمہیں محض یہ سمجھانا ہے کہ پُراسرار شیطانی قوتیں رکھنے والے کچھ لوگ میرے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ وہ مجھے زیر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرا دشمن ژیان بھی شیطانی قوتوں کا مالک ہے' ظاہر ہے وہ بھی میرے خلاف ہے۔ اسی کے ساتھ برسراقتدار غیر ملکیوں کو بھی میں اپنا دشمن ہی

تصور کرتی ہوں۔ میں یہ بھی سراغ لگا چکی ہوں کہ میرے خلاف تینوں دشمنوں کا اتحاد ہے۔ مجھے زک پہنچانے کی خاطر اسی اتحاد کے نتیجے میں ولیم رائٹ کو رہا کرا لیا گیا۔ اگر تم یقین کرو تو میں یہ بتاؤں کہ اس میں پُراسرار شیطانی قوتوں کا ہاتھ تھا ورنہ سرکاری ایجنسیاں کبھی یہ سراغ نہ لگا پاتیں کہ ولیم کو کہاں قید کیا گیا ہے۔" اپنی بات ختم کر کے میں نے عادل کے چہرے کا جائزہ لیا جس پر تذبذب کے سے آثار تھے۔

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا معبلہ کہ تم قطعی محفوظ نہیں ہو۔ وہ شیطانی قوتیں جن کا ذکر تم کر رہی ہو جب اور جہاں چاہیں تم تک پہنچ سکتی ہیں؟"

"یہ حقیقت ہے اور میں اس سے انکار نہیں کروں گی۔"

"تو پھر تمہاری پہاڑ گنج والی قیام گاہ بھی ان کے علم میں ہو گی۔"

"بالکل تھی۔"

"ایسا ہی تھا تو پولیس نے وہاں چھاپہ کیوں نہیں مارا؟" عادل نے سوال کیا۔

"سنو' اب تک متعدد بار سرکاری ایجنسیاں میرے خلاف حرکت میں آتی رہی ہیں' مگر میں انہیں پسپا ہو جانے پر مجبور کرتی آئی ہوں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ جوابی کارروائی کے طور پر انہیں بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اب تک حکومت براہ راست مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرتی رہی ہے۔ یہ میں اوپری سطح کی بات کر رہی ہوں۔ نچلی سطح پر پولیس یا کوئی اور حکومتی ادارہ مختلف جرائم کے سبب مجھ سے برسرپیکار رہا ہے۔ مثلاً راجہ سکھ دیو کا قتل یا اسی نوعیت کے دوسرے معاملات۔ ان معاملات کا اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں جس کا علم صرف اعلیٰ حکام کو ہے۔ انہی اعلیٰ حکام سے شیطانی قوتیں رکھنے والے افراد کا رابطہ ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مجھے گرفتار کرنے کے لئے چھاپہ نہیں مارا جا سکتا۔"

"اگر تمہارے بیان کو درست تسلیم کر لیا جائے معبلہ! تو پھر سی آئی ڈی انسپکٹر جیک کا تم تک پہنچنا کیا معنی رکھتا ہے؟"

"میں نے کہا نا کہ یہ معاملہ صرف راجہ سکھ دیو کے قتل تک محدود تھا۔ انسپکٹر جیک اسی قتل کی تفتیش کر رہا تھا۔ جیک کو میرے اندازے کے مطابق انہی شیطانی قوتوں نے میرے پیچھے لگایا تھا۔ ان شیطانی قوتوں کا مقصد میری گرفتاری نہیں بلکہ مجھے ذہنی طور پر پریشان کرنا ہے تاکہ میں ان کی برتری تسلیم کر لوں' ان کے سامنے جھک جاؤں۔ اسی کے ساتھ انہیں یہ بھی یقین ہے کہ میں آسانی کے ساتھ پولیس یا سی آئی ڈی کے ہتھے نہیں چڑھ سکتی۔ یہ کھیل بہت دن سے جاری ہے لیکن میں نے ابھی تک شکست قبول نہیں کی نہ آئندہ ایسا امکان ہے۔ خیر تم ان باتوں پر یقین کرو نہ کرو' یہ بہرحال حقیقت ہیں۔ ان تمام باتوں کے ذکر سے میرا مقصد محض یہ تھا' تم لوگ اس غلط خیال کو اپنے ذہنوں سے نکال دو کہ تمہارے درمیان حکومت کا کوئی مخبر موجود ہے' میری بات سمجھ رہے ہو نا؟" میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے عادل سے تصدیق چاہی۔

"تم نے جو تجزیہ کیا ہے' اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ خیر میں اس سلسلے میں سالار اکبر سے بات کروں گا۔ اگر تمہاری طرف سے یہ اجازت ہو کہ جو باتیں تم نے مجھے بتائی ہیں' وہ میں' سالار اکبر سے

بھی کہہ سکتا ہوں تو بات کرنے میں ذرا آسانی ہو جائے گی۔"

"صرف سالار اکبر کی حد تک میں تمہیں یہ اجازت دیتی ہوں۔" میں نے جواب دیا پھر مجھے ایک اور خیال آ گیا۔ میں نے کہا۔ "پہاڑ گنج والے مکان سے فی الحال فرنیچر میرے لئے حاصل کردہ نئے مکان میں منتقل نہ کرایا جائے تو بہتر ہے۔ وجہ یہ کہ وہ مکان سی آئی ڈی والوں کی نظر میں آ چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے' فرنیچر کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کوٹھی سے بھی ضروری فرنیچر اٹھوایا جا سکتا ہے۔"

"ہاں' ایک بات اور پوچھنا تھی۔ کیا دلاری کے سوا کسی اور خاتون کا بندوبست ہو سکتا ہے جو میرے ساتھ رہ سکے؟"

"بالکل ہو سکتا ہے۔ دلاری یہاں رشیدہ کی جگہ لے سکتی ہے اور رشیدہ تمہارے ساتھ نئے مکان میں رہ لے گی۔ تم شاید سلیم کی وجہ سے یہ تبدیلی چاہتی ہو؟"

"ہاں یہی بات ہے' تم ٹھیک سمجھے ہو۔ اس مکان کا قبضہ آج ملنے والا تھا' کیا ہوا؟"

"شام کو چابی مل جائے گی۔" عادل نے بتایا۔ "اب تم آرام کرو' میں چلتا ہوں۔ مجھے سالار اکبر سے بھی بات کرنا ہے۔" عادل اٹھ کھڑا ہوا۔

"سالار اکبر سے یہ بھی میری طرف سے پوچھ لینا کہ ثریان کے بارے میں کوئی سراغ ملا یا نہیں؟"

"پوچھ لوں گا' اب شام کو ملاقات ہو گی۔"

عادل چلا گیا' گویا مجھے شام تک اس کوٹھی میں رہنا تھا' اس کے بعد نئے مکان میں منتقل ہو جاتی۔ مجھے چمپا کی طرف سے کسی نئے حملے کا خطرہ تو نہیں تھا' پھر بھی چوکنا اور محتاط تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب دلاری میرے کمرے سے چائے کے خالی کپ اٹھا کر لے گئی تو میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور بستر پر دراز ہو گئی۔

☆======☆======☆

اس روز دوپہر کا کھانا میں نے نہیں کھایا اور شام کو تھوڑے سے ناشتے پر اکتفا کیا۔ ناشتہ کر کے میں چائے پی رہی تھی کہ عادل آ گیا۔ اس نے میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "اب تم جب چاہو نئے مکان میں جا سکتی ہو۔ وہاں فرنیچر پہنچ چکا ہے۔ رشیدہ نے کچن کے لئے ضروری اشیاء بھی پہنچا دی ہیں۔ وہ خود بھی وہیں ہے۔ اب صرف تمہارے یہ تینوں سوٹ کیس یہاں رہ گئے ہیں' وہ بھی اس وجہ سے کہ کمرے کا دروازہ بند تھا ورنہ انہیں بھی وہیں پہنچا دیا جاتا۔"

"چلو یہ قصہ تو ختم ہوا۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "رہے سوٹ کیس تو ساتھ چلے جائیں گے۔ تم تو وہاں تک ساتھ چلو گے ہی؟ دو سوٹ کیس میں اٹھا لوں گی' ایک تم۔ ہاں اس سے پہلے میں میک اپ کر لوں۔ ایک بات تم سے اور کہنا تھی۔ حالات کے پیش نظر جس طرح تم نے مستقل طور پر اپنا نام تبدیل کر لیا ہے اور سب لوگ تمہیں پنڈت جی کہتے ہیں اسی طرح میں اپنا کوئی نام رکھنا چاہتی ہوں تاکہ تم لوگ بھی مجھے اسی نام سے پکارو۔ تم بتاؤ' کیا نام رکھا جائے؟"

"ہندو نام رکھنا ہے یا مسلمان؟"

"ایسا کہ جس سے کسی خاص قومیت کا پتا نہ چلے۔"

وہ سوچنے لگا' پھر بولا۔ "رانی بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی یہ نام..........."

"نہیں کوئی اور۔" میں بول اٹھی کیونکہ یہ نام میں پہلے بھی رکھ چکی تھی۔ اس کے علاوہ راجہ سکھ دیو مرڈر کیس میں بھی میں اس نام سے پولیس کو مطلوب تھی۔

"پھر.......... کرن کیسے رہے گا؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ "اچھا نام ہے۔" میں یہ کہہ کر اٹھی اور سوٹ کیس سے میک اپ بکس نکالنے لگی۔

"تو پھر آج سے میں بھی تمہیں معبلہ کی بجائے کرن ہی کہوں گا۔ نام کی پسندیدگی کا شکریہ! ہاں میں نے سالار اکبر سے بات کی تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب سالار اکبر نے تمہاری تمام باتوں سے اتفاق کیا۔ انہوں نے تو مجھے ایک اور ایسی بات یاد دلائی جس کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں تمہاری آنکھوں سے نکلنے والی تیز روشنی سے سارے محافظ جل کر خاک ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ عام افراد کے مقابلے میں تمہاری قوت بصارت بھی حیرت انگیز ہے کہ تم اندھیرا ہونے کے باوجود دیکھ لیتی ہو۔ معلوم ہے تمہیں اس ضمن میں سالار اکبر کا کیا خیال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یقیناً نیکی کی قوتیں تمہاری مددگار ہیں ورنہ اب تک شیطانی قوتوں کا مقابلہ نہ کر پاتیں۔"

عادل سے یہ سن کر میں چونک اٹھی۔ سالار اکبر ذہین آدمی تھا۔ اس نے قطعی درست اندازہ قائم کیا تھا۔ میں نے سوچنے لگی کہ کہیں ان لوگوں کو میری شخصیت کے اسرار کا علم نہ ہو جائے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی اس لئے کہنے لگی۔ "یہ محض ایک اتفاق ہے کہ شیطانی قوتیں ابھی تک مجھے کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچا سکیں جس کی تلافی ممکن نہ ہو۔" پھر میں نے موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر اس سے سوال کیا۔ "تم نے سالار اکبر سے ثریان کے متعلق معلوم کیا؟"

"ہاں کرن!" عادل نے مجھے میرے نئے نام سے مخاطب کیا۔ "سالار نے اس سلسلے میں حکم جاری کر دیا ہے۔ انہیں توقع ہے کہ جلد ثریان کا سراغ لگا لیا جائے گا۔"

میں' عادل سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے چہرے پر میک اپ کرتی رہی۔ میک اپ سے فارغ ہو کر میں نے میک اپ بکس واپس سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ اس مرتبہ میں نے اپنے چہرے پر ایک نوجوان لڑکی ہی کا میک اپ کیا تھا تاکہ میرے بقیہ جسم سے چہرے کی مطابقت برقرار رہے۔ اس کے باوجود مجھے صرف قبول صورت ہی کہا جا سکتا تھا' خوبصورت نہیں۔ ایسا میں نے دانستہ کیا تھا کیونکہ خوبصورت اور پرکشش چہرے بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ یہ میرے حق میں بہتر نہیں تھا۔ میک اپ سے متعلق یہ نکتہ کلکتے کے دوران قیام میں ارشاد حسین نے مجھے تعلیم کیا تھا۔ میک اپ کی تربیت بھی میں نے اسی سے حاصل کی تھی۔

جب میں نے وہاں سے چلنے کے لئے اپنے دو سوٹ کیس اٹھائے تو عادل نے آگے بڑھ کر ایک سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے لیا' پھر تیسرا سوٹ کیس بھی اٹھا لیا۔ میں ایک سوٹ کیس اٹھائے اس کے

پیچھے ہوئی۔

اگلی ہی گلی میں وہ مکان تھا۔ کوٹھی سے نکل کر ہم بہت جلد وہاں پہنچ گئے۔ مکان کیا' وہ بھی چھوٹی سی ایک کوٹھی ہی تھی۔ نشست گاہ میں میز اور کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ رشیدہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اسی نے دروازہ بھی کھولا تھا اور میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا تھا۔ خواب گاہ میں بھی مسہری کے علاوہ ایک چوٹی گول میز اور تین کرسیاں موجود تھیں۔ سوٹ کیس وہاں رکھنے کے بعد ہم رشیدہ کے ساتھ کوٹھی کے دوسرے حصے دیکھنے کے لئے کمرے سے باہر آ گئے۔ میری خواب گاہ کے برابر والے کمرے میں رشیدہ نے اپنا سامان سیٹ کر لیا تھا۔ اپنی خواب گاہ میں مجھے لکڑی کی ایک الماری بھی ایک طرف رکھی نظر آئی تھی۔ پہاڑ گنج والے گھر میں میرے پاس الماری نہیں تھی۔

سالار اکبر کا کہنا درست ہی تھا۔ وہ کوٹھی میری ضرورت سے بہت بڑی تھی۔ عمارت کے باہر چھوٹا سا لان بھی تھا۔ لان کے کنارے پودے بھی لگے ہوئے تھے' مگر پانی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ کر مرجھا رہے تھے۔ لان کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے رشیدہ سے پودوں میں پانی ڈالنے کو بھی کہا تھا۔ لان کے بعد پھاٹک تھا۔ وہاں کال بیل میں دیکھ ہی چکی تھی۔

پوری کوٹھی کا جائزہ لینے کے بعد میں' عادل اور رشیدہ کے ساتھ دوبارہ اپنے کمرے کی طرف چل دی تو رشیدہ بولی۔ "معبلہ جی! اگر اجازت ہو تو میں کھانا پکانے باورچی خانے میں چلی جاؤں؟"

"ہاں جاؤ' مگر ایک بات کا آئندہ خیال رکھنا کہ اب میرا نام معبلہ نہیں کرن ہے۔" میں نے کہا۔

"چائے پینا ہو کرن جی تو بنا دوں؟" رشیدہ نے فوری طور پر میرے کہنے پر عمل کیا۔

"میں تو خیر ابھی پی کر آئی ہوں' پنڈت جی سے پوچھ لو' یہ کہیں تو ان کے لئے بنا لو۔"

"ہاں رشیدہ' میرے لئے بنا لاؤ۔" عادل نے بے تکلفی سے کہہ دیا۔

رشیدہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور میں' عادل کو ساتھ لئے کمرے میں آ گئی۔

"تم بیٹھو۔" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں ذرا الماری میں اپنے کپڑے وغیرہ رکھ دوں۔"

پھر میں نے الماری کھول کے اس کا جائزہ لیا اور تینوں سوٹ کیسوں سے کپڑے نکال کر الماری میں رکھنے لگی۔ الماری خاصی بڑی تھی۔ اس میں تینوں سوٹ کیسوں کے کپڑے اور بقیہ سامان آ گیا۔ خالی سوٹ کیس میں نے الماری کے پہلو ہی میں رکھ دیئے تھے۔ اس عرصے میں رشیدہ' عادل کو چائے دے گئی تھی۔

"سالار اکبر کے پیر کا زخم اب کیسا ہے؟" میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے عادل سے پوچھنے لگی۔

"پہلے سے بہت بہتر ہے۔" عادل نے بتایا۔

"تمہاری تنظیم کے ارکان اس گھر کی بھی نگرانی کریں گے؟" میں نے دریافت کیا۔

"نگران اعلیٰ کے حکم کی تعمیل تو کرنا ہی پڑے گی۔ انہی کا حکم ہے کہ تمہاری حفاظت و نگرانی کی جائے۔"

پھر میرے پاس مزید کچھ دیر بیٹھ کر عادل رخصت ہو گیا۔ وہ چلا گیا تو میں سوچنے لگی' کیا لعنتی چمپا کے اشارے پر یہاں بھی سی آئی ڈی والے پہنچ جائیں گے؟ پھر کیا مجھے یہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا؟ چمپا کی دسترس سے تو میں کہیں بھی محفوظ نہیں تھی' پھر میں کتنے ٹھکانے بدلتی؟ اور اس سے حاصل بھی کیا تھا؟ انٹیلی جنس والوں سے جان چھڑانے کے لئے میں نے جو طریقہ کلکتے میں اپنایا تھا' اسے اس شہر میں آزماتے ہوئے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی بڑی وجہ معاملے کی مختلف نوعیت تھی۔ یہاں سی آئی ڈی والوں کو راجہ سکھ دیو کے قتل کے سلسلے میں میری تلاش تھی۔ اسی تفتیش کے دوران میرے ہاتھوں تین افراد مزید مارے گئے تھے جن میں ایک انگریز بھی شامل تھا۔ یقینی طور پر کچھ اندازہ لگانا میرے لئے مشکل ہی تھا کہ سی آئی ڈی والے اپنے محکمے کے تین افراد کا صبر کر لیتے۔ ان میں ایک انگریز کے قتل نے معاملے کو اور بھی سنگین بنا دیا تھا۔ سی آئی ڈی والے فلپ اور مارگریٹ کی گواہی کے بعد ہی یہ ثابت کر سکتے تھے کہ میں ہی وہ مفرور مجرمہ رانی ہوں جس نے راجہ سکھ دیو کو قتل کیا تھا۔ فلپ کو تو خیر اب سے پہلے راجہ سکھ دیو کے قتل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن میرے ہاتھوں ایک انگریز کے قتل اور دوسرے کو شدید زخمی کرنے کے بعد صورت حال بدل بھی سکتی تھی۔ چمپا نے بھی اس طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ فلپ کی بیوی مارگریٹ بھی میرے لئے مسئلہ بن سکتی تھی۔ فلپ کی طرح بھلا وہ کیوں مجھے بچانے کی کوشش کرتی۔ مارگریٹ کو تو خبر تھی کہ اس کا شوہر فلپ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ سفر کے دوران تو وہ خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ چکی تھی۔ اس نے اپنی دانست میں میرے ساتھ فلپ کو قرب کے مراحل سے بھی گزرتے دیکھا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ میں نہیں چمپا تھی۔ یہ صورت حال میرے لئے کوئی اچھی نہیں تھی۔

ان تمام خطرات سے قطع نظر میرے لئے ترجیحی معاملہ ژیان کی تلاش اور اس سے انتقام لینا تھا۔ سالار اکبر نے کہا تو تھا کہ جلد ہی ژیان کا سراغ لگا لیا جائے گا لیکن میرے نزدیک یہ اس قدر آسان نہیں تھا کیونکہ میرا دشمن چوکنا ہو چکا تھا۔ میں ایک بار اس کا سراغ لگا کر اس تک پہنچ چکی تھی۔ وہ دوبارہ مشکل ہی سے مجھے یہ موقع دیتا۔

اس رات کھانا کھا کے لان میں ٹہلتے ہوئے بھی میں انہی تمام باتوں پر غور کرتی رہی۔ پھر جب میں سونے کے لئے اپنے کمرے میں جا رہی تھی تو کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ یہ بے چینی کسی غیر متوقع خطرے کی علامت تھی۔ خطرے کی نوعیت معلوم نہ ہو تو اس سے طبیعت الجھتی ہے۔ میں بھی الجھی ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ رشیدہ اس وقت تک اپنے کمرے میں سونے جا چکی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اسے پوری کوٹھی میں چکراتے دیکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ وہ سونے جا رہی ہے' اس سے قبل کوٹھی کا جائزہ لے رہی ہے۔ دلاری بھی میرے ساتھ رہی تھی لیکن اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ رشیدہ شاید اس سے زیادہ چوکنا اور محتاط رہنے کی عادی تھی۔

کسی متوقع خطرے کے پیش نظر ہی میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرایا تھا' اس کے علاوہ الماری سے "سائلنٹ ڈیتھ" اور انسپکٹر جیک سے چھینا ہوا ریوالور بھی نکال کر مسہری کے سرہانے رکھ لیا

تھا۔ "سائلنٹ ڈیتھ" میں ابھی گیارہ زہریلی سوئیاں اور باقی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اس خطرناک ہتھیار کو میں دوبارہ لوڈ کرا لوں گی اور سالار اکبر سے یہ ہتھیار مانگ لوں گی' اسی کے ساتھ اسے لوڈ کرنا بھی سیکھ لوں گی۔ یہ ہتھیار ریوالور سے کہیں زیادہ خطرناک اور کارآمد تھا۔ خطرے کے شدید احساس نے مجھے لائف جیکٹ بھی زیب تن کرنے پر مجبور کیا تھا۔ نہ معلوم کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے' رات پُرسکون نہیں گزرے گی۔ میرے جسم پر اب پینٹ اور شرٹ تھی۔

ایسے میں نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں بستر پر یوں ہی لیٹ گئی تھی اور کمرے میں نیلا بلب جلا دیا تھا۔ لائف جیکٹ پہن کر لیٹنے سے مجھے الجھن ہو رہی تھی' پھر بھی میں نے اسے اتارا نہیں۔ وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ اب رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ ہر طرف سناٹے کی حکمرانی تھی۔ میری بے چینی نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ میں اسی لئے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے میں اچانک اچھل پڑی۔ کہیں قریب ہی سے مجھے فائر کی آواز سنائی دی تھی۔

میں نے لپک کر مسہری کے سرہانے رکھے ہوئے دونوں ہتھیار اٹھا لئے۔

اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا دھماکہ ہوا۔ پھر ایک تسلسل کے ساتھ فائرنگ ہونے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دو گروہ ایک دوسرے پر آگ برسا رہے ہوں۔ میں فائرنگ کی سمت کا اندازہ لگا رہی تھی کہ رشیدہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی مجھے ریوالور نظر آ رہا تھا۔

"کرن جی! آپ یہیں ٹھہریں' میں چھت پر چڑھ کر دیکھتی ہوں کہ فائرنگ کدھر ہو رہی ہے۔" رشیدہ نے تیزی سے کہا اور ایک طرف دوڑ گئی۔

صحن میں سامنے کے رخ پر میں بھی وہ زینہ دیکھ چکی تھی جو چھت پر جانے کے لئے ہی تھا۔ رشیدہ اسی طرح دوڑتی ہوئی گئی تھی۔ اتنی دیر سے مجھے جس خطرے کا انتظار تھا' وہ سامنے آ گیا تھا۔ ابھی شاید رشیدہ سیڑھیاں عبور کر کے چھت پر نہیں پہنچی ہو گی کہ اچانک فائرنگ بند ہو گئی۔ نہ میں فائرنگ شروع ہونے کی وجہ سمجھ سکی تھی اور نہ اب فائرنگ رک جانے کا سبب میری سمجھ میں آیا۔ میں اسی جگہ حیران حیران سی کھڑی تھی کہ ایک نسوانی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ چیخنے کی آواز اسی طرف سے سنائی دی تھی جدھر میں نے رشیدہ کو بھاگ کر جاتے دیکھا تھا۔ صحن میں اندھیرا تھا۔ میں نے اس سمت نظریں اٹھا کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی جدھر سے چیخ سنائی دی تھی۔ مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے رشیدہ کو اس کا نام لے کر پکارا۔

"خطرہ۔" رشیدہ کی تیز آواز اسی جانب سے سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے پھر چیخ ابھری۔

میں تو پہلے ہی خطرے کی بو سونگھ چکی تھی' رشیدہ نے مزید اس کی تصدیق کر دی۔ میرے لئے یہ سمجھ لینا کوئی زیادہ مشکل نہیں تھا کہ رشیدہ خود بھی کسی خطرے میں گھر چکی تھی۔ اس کی چیخ اسی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ یقیناً کوئی زینے پر یا کہیں آس پاس موجود تھا اور شاید اسی نے رشیدہ کو بے بس کر دیا تھا۔ رشیدہ کو اپنا ریوالور استعمال کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتی تو مجھے فائر کی آواز ضرور

سنائی دیتی۔ اندھیرے کی وجہ سے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ہر طرف ایک ساتھ روشنی کی لکیریں حرکت کرنے لگیں۔ یہ روشنی طاقتور ٹارچوں کی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں متحرک روشنی سے بچ سکتی' روشن دائرے مجھ تک پہنچ گئے۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔

"رانی! تمہیں گھیرا جا چکا ہے۔" ایک سخت آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "ہتھیار پھینک دو ورنہ ہم اس عورت کو گولی مار دیں گے۔"

میرے لئے آواز پر گولی چلانا بہت آسان تھا۔ میں اس بولنے والے شخص کو نشانہ بنا سکتی تھی لیکن اس طرح محض میری وجہ سے رشیدہ کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ ذہنی طور پر میں کسی ایسی صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے پہلے سے تیار نہیں تھی۔ اگر صرف میری زندگی کو خطرہ درپیش ہوتا تو میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے نہ جھجکتی۔

"تم لوگوں کو یقیناً شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں آواز بدل کر بلند آواز میں بولی۔ "میرا نام رانی نہیں' کرن ہے۔"

"اس کا فیصلہ بعد میں ہو گا' پہلے تم اپنے ہاتھوں میں موجود ہتھیار نیچے ڈال دو۔" جواب میں کہا گیا۔ "یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ بیک وقت کئی ریوالور تمہاری طرف اٹھے ہوئے ہیں۔ تمہاری ذرا سی بھی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ صرف اس عورت کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی ہے بلکہ تمہارا جسم بھی گولیوں سے چھلنی ہو سکتا ہے۔ میں تین تک گنوں گا' اگر تم نے ہتھیار نہ ڈالے تو پہلے اس عورت کو جو ہمارے قابو میں ہے ٹھکانے لگایا جائے گا' پھر تمہارے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔ میں گنتی شروع کر رہا ہوں۔"

"ٹھہرو۔" میں پھر بول اٹھی۔ اب بھی میری آواز بدلی ہوئی تھی۔ "اس عورت کو چھوڑ دو' میں ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوں۔"

"نہیں' عورت کو ہتھیار ڈالنے سے پہلے نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

مجبوراً میں نے جھک کر دونوں ہتھیار زمین پر ڈال دیئے۔ مجھے ایسا صرف رشیدہ کی جان بچانے کے لئے کرنا پڑا تھا۔

"دونوں ہاتھ اٹھا کر اسی جگہ کھڑی رہو۔" مجھے حکم دیا گیا۔

ہتھیار تو میں ڈال ہی چکی تھی' سو ہاتھ اٹھانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ میں نے ان کا یہ مطالبہ بھی مان لیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے بھاری قدموں کی چاپ سنی۔ روشنی کے دائرے اب تک مجھ پر محیط تھے۔ ذرا ہی دیر میں کئی ریوالوروں کی نالیں میرے جسم سے آ لگیں۔ ایک سادہ لباس والے کو میں نے جھک کر ریوالور اور "خاموش موت" بھی اٹھاتے دیکھا۔ اس کے بعد دو ہاتھوں نے میرے جسم کو ٹٹولنا شروع کیا۔ وہ شخص میری تلاشی لے کر میرے پاس کسی اور ہتھیار کے نہ ہونے کا شاید یقین کرنا چاہتا تھا۔ کسی عورت کی اس طرح تلاشی لینا بیہودگی ہے لیکن انہیں یہ بتانے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ تلاشی لینے والے کمینے شخص نے یہ خیال بھی نہیں کیا تھا کہ اسے میرے جسم کے کن

حصوں تک اپنا ہاتھ نہیں لے جانا چاہئے اس پر میں خون کا گھونٹ پی کے رہ گئی۔ اس وقت کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔

"اب تو تم لوگوں کو یقین آگیا ہو گا کہ میں وہ نہیں جس کی تمہیں تلاش ہے۔" میں بول ہی اٹھی۔

"ہماری اطلاعات کے مطابق تم اس وقت میک اپ میں ہو۔" اسی شخص کی آواز ابھری جس نے مجھ سے ہتھیار پھینکنے کو کہا تھا۔

میں چونک اٹھی۔ ان لوگوں کو یہ اطلاع فراہم کرنے والی لعنتی چمپا ہی ہو سکتی تھی۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا تھا کہ چمپا مجھے گرفتار نہیں کرائے گی۔ میرے اندازے کے مطابق مجھے گرفتار کرنے والے سی آئی ڈی کے لوگ تھے۔ مجھے رانی کے نام سے مخاطب کرنا یہی ظاہر کر رہا تھا۔

"اسے اندر کمرے میں لے چلو۔" پہلی بار مجھے ایک آشنا سی آواز سنائی دی۔ لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ کوئی غیر ملکی ہے۔ الفاظ بھی انگریزی ہی میں ادا کئے گئے تھے۔ فوری طور پر مجھے یہ یاد نہ آسکا کہ وہ آواز میں نے پہلے کہاں سنی تھی لیکن آواز سنی ہوئی ضرور تھی۔

میں اپنے کمرے کے سامنے ہی کھڑی تھی اور اندر نیلا بلب جل رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے کمرے میں لے آئے اور نیلا بلب بجھا کر تیز روشنی والا بلب جلا دیا گیا۔ تیز روشنی ہوتے ہی میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر انسپکٹر جیک کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی جو مجھ سے ہوٹل میں پہلی ملاقات کا نتیجہ تھی۔ جیک کے علاوہ مزید چار افراد اور بھی تھے۔ انہی میں سے ایک رشیدہ کو جکڑے ہوئے تھا۔ سبھی سادہ لباس میں تھے۔

"میں اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ اسے پہچان سکوں۔" انسپکٹر جیک نے اپنے ایک ماتحت کو مخاطب کیا جو میرے پہلو سے اپنے ریوالور کی نال لگائے کھڑا تھا۔

"یس سر!" وہ شخص بولا اس شخص کے کہنے پر میں نے ہتھیار ڈالے تھے۔

پھر اس شخص نے میرے سر سے وگ اور چہرے سے ماسک اتارنے میں دیر نہیں کی۔

جیک کو میں نے چونکتے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "یہ وہی ہے' اسے ہتھکڑیاں پہنا دو۔"

"سر! اس عورت کے بارے میں کیا حکم ہے؟" جو شخص رشیدہ کو جکڑ کر اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھے ہوئے تھا' اس نے جیک سے پوچھا۔

"یہ عورت بھی اسی کی ساتھی ہو سکتی ہے' اسے بھی ساتھ لے چلو۔" جیک نے جواب دیا۔

"مسٹر جیک! اس عورت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ صرف میری ملازمہ ہے۔ اسے گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں بول اٹھی۔

"ناممکن۔" جیک نے انکار میں سر ہلایا۔ "اگر یہ صرف تمہاری ملازمہ ہوتی تو تم اس کی جان بچانے کے لئے ہرگز ہتھیار نہ ڈالتیں۔"

جیک سے مزید کچھ کہنا مجھے فضول ہی معلوم ہوا۔ میں اگر اکیلی ہوتی اور مجھے رشیدہ کی زندگی

خطرے میں پڑ جانے کا ڈر نہ ہوتا تو شاید اب تک ان لوگوں سے بھڑ گئی ہوتی۔ اس سے قطع نظر وہ لوگ بھی مجھے انتہائی چوکنا دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں غالباً پہلے سے بتا دیا تھا کہ میں کسی بھی لمحے ان کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہوں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ انہوں نے مجھے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ رشیدہ کے ساتھ بھی انہوں نے یہی کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے میرے اور رشیدہ کے کمروں کی تلاشی لی۔ تلاشی میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی کیونکہ سامان زیادہ نہیں تھا۔ انہیں شاید کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جسے ہمارے خلاف استعمال کر سکیں۔ اس ضمن میں انہیں ناکامی ہی ہو سکتی تھی کیونکہ ہتھیاروں کے سوا ہمارے پاس کوئی قابل اعتراض شے نہیں تھی۔ مجھے اس پر حیرت تھی کہ اب تک سالار اکبر یا عادل وغیرہ کیوں خاموش تھے؟ وہ لوگ اگلی ہی گلی کی تو ایک کوٹھی میں تھے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ فائرنگ کی آواز ان تک نہ پہنچی ہو۔ میں انہی خیالوں میں تھی کہ رشیدہ کو اور مجھے وہ لوگ اس کوٹھی سے باہر لے آئے۔

باہر آتے ہی کچھ فاصلے پر میں نے باوردی مسلح پولیس والوں کو دونوں جانب چوکنا کھڑے دیکھا۔ کوٹھی کے گیٹ ہی پر ایک بند سیاہ وین کھڑی تھی۔ رشیدہ کو اور مجھے اس وین کے پچھلے حصے میں بٹھا کر دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ دروازے کے اوپری حصے میں جالیاں تھیں اور باہر اتنی جگہ تھی کہ دو پولیس والے کھڑے ہو سکیں۔ دروازہ مقفل ہوتے ہی پولیس والے بھی چڑھ گئے۔ جالیوں میں سے وہ مجھے نظر آ رہے تھے۔ اس وقت مجھے تنظیم کے ان ارکان کا بھی خیال آ رہا تھا جو میری کوٹھی کی نگرانی پر مامور تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ کہیں انہی سے تو پولیس کا مقابلہ نہیں ہوا؟ انسپکٹر جیک نے شاید اسی موقع سے فائدہ اٹھایا تھا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر کوٹھی میں کسی طرح داخل ہو گیا تھا۔

میں نے اس اہم نکتے کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ ممکن ہے' سالار اکبر وغیرہ وہاں اپنی موجودگی ظاہر نہ کرنا چاہتے ہوں یا انہیں یہ خدشہ ہو' مقابلے کی صورت میں میری زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ یہ اسباب ہوں یا کچھ اور لیکن ان لوگوں کی خاموشی خلاف مصلحت بہرحال نہیں ہو سکتی تھی۔

ذرا ہی دیر کے بعد وین حرکت میں آ گئی۔ وین کے اندر اندھیرا نہیں تھا اور میں' رشیدہ کے چہرے پر موجود تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔ خلاف توقع اس کے چہرے سے کسی بھی قسم کی فکرمندی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ عورت مجھے نڈر معلوم ہو رہی تھی۔ یا تو اس کے لئے یہ خطرناک کھیل نیا نہیں تھا یا پھر ذہنی طور پر وہ اس کے لئے آمادہ رہتی ہو گی کہ کسی بھی وقت کوئی ایسی صورت حال پیش آ سکتی ہے۔

کوٹھی سے باہر آنے کے بعد اس وین کے آگے پیچھے بھی میں نے دو جیپیں کھڑی دیکھی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بھی وین کے ساتھ چل رہی تھیں۔

سفر ابھی جاری ہی تھا کہ فضا اچانک پے در پے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ یقیناً اس پولیس پارٹی پر حملہ کر دیا گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق حملہ کرنے والے تنظیم کے ارکان ہو سکتے تھے۔ جوابی فائرنگ بھی شروع ہو گئی لیکن سفر بدستور جاری رہا۔ کچھ ہی دیر کے بعد وین ایک دھماکے کے ساتھ ایک جانب جھک گئی۔ پھر وین کو رکنا ہی پڑا۔ وین کے ٹائر کو برسٹ کر دیا گیا تھا۔ فائر کر کے ٹائر کو غالباً اسی لئے برسٹ

کیا گیا تھا کہ وین رک جائے۔

اسی وقت میں نے لاؤڈ اسپیکر پر ایک تیز آواز سنی۔ "فائرنگ روک دو ورنہ ہم رانی اور اس کی ساتھی کو گولی مار دیں گے۔" یہی الفاظ بار بار دہرائے جاتے رہے۔

ذرا دیر اور ہوئی تھی کہ وین کا پچھلا دروازہ کھلا۔ "تم دونوں باہر آ جاؤ۔" کسی شخص نے ہم سے کہا۔

"نہیں، ہم اس وقت تک باہر نہیں آئیں گے جب تک فائرنگ نہیں رکے گی۔" میں نے سخت لہجے میں اترنے سے انکار کر دیا۔

"ان دونوں کو گھسیٹ کر وین سے اتار لو۔" اسی شخص نے دروازے کے باہر کھڑے ہوئے سپاہیوں کو حکم دیا۔ وہ شاید کسی جیپ سے اتر کر وہاں تک آیا تھا۔

دونوں مسلح سپاہی وین میں داخل ہو گئے اور عین اسی لمحے فائرنگ رک گئی۔ غالباً تنظیم کے ارکان پر ہمیں گولی مار دینے کی دھمکی اثر انداز ہو گئی تھی۔

"ہم خود اتر رہے ہیں۔" میں سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رشیدہ نے بھی میری تقلید کی تھی۔

دونوں مسلح سپاہی ہماری طرف بڑھتے بڑھتے رک گئے۔ پھر ان میں سے ایک پلٹ کر وین کے باہر کھڑے ہوئے شخص کو بتانے لگا۔ "سر! وہ اتر کر آ رہی ہیں۔"

ہم وین سے اتر آئے تو آگے کھڑی ہوئی جیپ کی پچھلی نشست پر ہمیں بٹھا دیا گیا۔ ایک مسلح سادہ لباس والا میری طرف، دوسرا رشیدہ کی جانب اس سے بالکل لگ کر بیٹھ گیا۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے علاوہ انسپکٹر جیک اور دوسرا سادہ لباس والا تھا۔ مجھ سے لگ کر جو شخص بیٹھا تھا، اس نے اپنے ریوالور کی نال میری کنپٹی پر رکھی دی تھی۔

جیک نے پلٹ کر ایک نظر مجھے دیکھا اور مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ شاید اس طرح مجھے کھلی جیپ میں لے جانے کی تجویز اسی کی تھی۔ اس سے جیک کا مقصد کیا تھا، میں سمجھ گئی تھی۔ اس طرح وہ حملہ آوروں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ انہوں نے اگر اب فائرنگ کی تو وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ اسی جیپ کے ونڈ اسکرین کے اوپر مجھے لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا بھی نظر آ رہا تھا۔ جیپ کی روانگی سے قبل جیک کے قریب بیٹھے ہوئے شخص نے ہاتھ میں مائک تھام لیا۔

"اگر تم لوگ اب بھی آس پاس موجود ہو تو پھر ایک مرتبہ سن لو، اگر دوبارہ تم نے فائر کھولا تو رانی کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔" اس شخص نے تین مرتبہ یہ الفاظ ادا کئے۔

"کافی ہے، چلو۔" میں نے انسپکٹر جیک کی آواز سنی۔

"یس سر!" یہ کہتے ہی ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔

"سر! یہ عورت تو کوئی بہت بڑی گروہ بند لگتی ہے۔" جیک کے قریب بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

"نو کومنٹس۔" جیک نے اس شخص کو تبصرے بازی سے روک دیا۔

اس عیار انگریز سی آئی ڈی انسپکٹر نے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ سرفروش تنظیم کے

ارکان بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ دھمکی ان کے لئے کارگر ثابت ہوئی تھی کہ اگر انہوں نے اب حملہ کیا تو مجھے ختم کر دیا جائے گا۔ اگر وہ کہیں قریب ہی موجود تھے تو انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا ہو گا کہ میرے اور موت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ جیپ پر حملہ کر کے میری زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے تھے۔ ان کے لئے اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ دور دور رہ کے جیپ کا تعاقب کرتے رہتے۔ وہ شاید ایسا ہی کر بھی رہے تھے۔ سفر جاری رہا۔ جس وین کا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا اسے وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ جیپ کے پیچھے ایک اور جیپ تھی۔ یہ وہی جیپ تھی جو پہلے وین کے پیچھے چل رہی تھی۔ ان دونوں جیپوں کے علاوہ پولیس کا ایک ٹرک بھی تھا جس میں باوردی مسلح پولیس والے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے گرفتار کرنے کے لئے سی آئی ڈی والوں نے پولیس کی خاصی نفری بھی اپنے ساتھ لے لی تھی۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ شاید سی آئی ڈی والوں کو پہلے ہی سے مزاحمت کئے جانے کا خدشہ تھا۔

رگھوویر اور سمیع اللہ کی رہائی کے لئے میں پہلے بھی ایک مرتبہ سی آئی ڈی ہیڈ آفس کا رخ کر چکی تھی۔ یہ دفتر بیرون شہر پرانے قلعے سے کچھ ہی پہلے تھا۔ اس وقت میں کسی کو رہا کرانے یہاں آئی تھی اور آج خود ہی گرفتار ہو کے یہاں پہنچی تھی۔ وقت اور حالات آدمی کے ساتھ کبھی کبھی بڑا سنگین مذاق کرتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔

اس عمارت کے حوالات کے دو الگ الگ کمروں میں رشیدہ کو اور مجھے بند کر دیا گیا۔ اس سے پہلے ہتھکڑیاں اتار لی گئی تھیں۔ حوالات کے آہنی دروازے کے باہر روشنی تھی اور باہر بھی۔ میں نے حوالات کا جائزہ لیا۔ ایک جانب دیوار سے لگا ہوا بستر فرش پر بچھا ہوا تھا۔ میلی سی دری اور ایک کمبل، تکیہ ندارد۔ میں اطمینان سے قدم اٹھاتی ہوئی بستر پر جا بیٹھی۔ حوالات تک آتے ہوئے میں نے قدم قدم پر مسلح محافظوں کو دیکھا تھا۔ وہاں سخت حفاظتی انتظامات تھے۔

ابھی مجھے بستر پر بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے حوالات کا دروازہ کھلتے دیکھا۔ دو مسلح محافظ اندر داخل ہوئے۔ یہ ان محافظوں سے الگ تھے جو دروازے کے باہر مستعد کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہمارے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟" میں نے نظر اٹھا کر پوچھا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔" محافظ نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "ہم جہاں بھی لے جائیں تمہیں چلنا پڑے گا۔"

"اور اگر میں چلنے سے انکار کر دوں پھر؟"

"تو پھر.......... پھر ہم زبردستی تمہیں یہاں سے گھسیٹتے ہوئے لے جائیں گے۔" اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا چلو۔" میں اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے پر اگر مزید دو مسلح محافظ موجود نہ ہوتے تو شاید میں ان دونوں سے بھڑ جاتی۔

میں حوالات کے کمرے سے نکل کر ان لوگوں کے کہنے پر دائیں جانب مڑی تو دوسرے کمرے

میں رشیدہ دروازے کے قریب کھڑی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اس کی وجہ مجھے حوالات سے نکال کر کہیں اور لے جانا ہی ہو سکتی تھی۔ اس راہداری میں بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مسلح محافظ مستعد و چوکنا کھڑے تھے۔ اس راہداری کے اختتام پر دائیں اور بائیں دونوں جانب چوڑی راہداریاں تھیں۔ مجھ سے بائیں جانب والی راہداری میں چلنے کو کہا گیا۔ دونوں محافظ میرے عقب میں تھے۔ وہاں بھی مجھے محافظ نظر آ رہے تھے۔ اس راہداری میں زیادہ نہیں چلنا پڑا۔ راہداری کے وسط میں دائیں جانب سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں جن کے اختتام پر ایک آہنی دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر دو محافظ کھڑے تھے۔ میں سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچی تو انہوں نے آہنی دروازہ کھول دیا۔

دروازہ عبور کر کے اندر پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں کس لئے وہاں لائی گئی ہوں۔ وہ سی آئی ڈی والوں کا ٹارچر سیل تھا۔ وہاں انسپکٹر جیک اپنے ایک ماتحت کے ساتھ پہلے سے موجود تھا۔ اس نے محافظوں کو ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔ "اسے اس میز پر لٹا کر چمڑے کے تسموں سے باندھ دو۔"

"مسٹر جیک! تم یہ سب کیا کر رہے ہو؟ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں' میرا نام رانی نہیں ہے۔" میں خاموش نہ رہ سکی۔

"لیکن تمہیں یہ تو تسلیم ہے کہ تم وہی ہو جس سے ایک مرتبہ اور بھی میری ملاقات ہو چکی ہے۔" اس کے لہجے میں چبھن تھی۔

ظاہر ہے اس کی بات سے انکار میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ اگر میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی تو پھر اس کا نام مجھے کیسے معلوم تھا۔

"اس وقت بھی میں نے تم سے یہی کہا تھا کہ میں کوئی مجرمہ نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا تو مجھے زخمی کر کے وہاں سے فرار کیوں ہو گئیں؟ اسی فرار کی کوشش میں تمہارے ہاتھوں تین افراد قتل بھی ہوئے۔ کیا تمہیں اس سے بھی انکار ہے؟"

"یہ مجھ پر الزام ہے۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور نہ میرا ارادہ تمہیں زخمی کرنے کا تھا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ بند کرنا چاہا تو تم اس سے ٹکرا کر زخمی ہو گئے۔ میں تمہیں وہاں بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم کن تین افراد کے قتل کی بات کر رہے ہو؟"

"تمہیں ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" انسپکٹر جیک کی آواز زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ پھر وہ محافظوں سے مخاطب ہوا۔ "باندھ دو اسے۔"

جو محافظ میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا اس نے اپنی رائفل کی نال میری کمر پر رکھ کر دباؤ ڈالا' پھر بولا۔ "چلو آگے بڑھو۔"

مجبوراً مجھے میز کی طرف قدم اٹھانے پڑے۔ وہ میز بطور خاص شاید ایذا رسانی ہی کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس کی لمبائی زیادہ اور چوڑائی کم تھی۔ اس سے چمڑے کی بیلٹیں منسلک تھیں۔ گن پوائنٹ پر انہوں نے مجھے میز پر لٹا دیا اور پھر میرے جسم کو بیلٹوں سے کسنے لگے۔ میرے دونوں پیروں کے ٹخنوں کو

انہوں نے دائیں بائیں بیلٹوں سے کس دیا اور ایسا ہی دونوں ہاتھوں کے ساتھ کیا۔ پیٹ پر بھی ایک بیلٹ بندھی ہوئی تھی اور گردن سے ذرا نیچے بھی۔ انہوں نے مجھے اس طرح کس کے باندھا تھا کہ میرے لئے اپنے جسم کو حرکت دینا بھی محال ہو گیا تھا۔ ابھی تک ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ مجھ پر تشدد کا مقصد کیا تھا؟ وہ آخر مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے تھے؟ رہا یہ اعتراف کرانا کہ میں ہی رانی ہوں تو اس کی بھی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی۔ فلپ اور مارگریٹ سے میری شناخت کرا کے بھی اس کی تصدیق ہو سکتی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں' انسپکٹر جیک کو مخاطب کرتی وہ خود ہی بول اٹھا۔ "تمہارے ہاتھوں جو تین افراد قتل ہوئے ہیں' ان کے جسموں میں زہریلی فولادی سوئیاں پائی گئی ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ان کی موت زہر ہی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ سوئیوں کے ذریعے زہر ان کے خون میں شامل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان کی فوری موت واقع ہوئی۔ آج تمہارے پاس سے جو دو ہتھیار برآمد ہوئے ہیں' ان میں سے ایک میرا سروس ریوالور ہے جو ہوٹل کے کمرے سے تم میری بے ہوشی کے بعد اڑا لے گئی تھیں۔ دوسرا وہ ہتھیار ہے جس کی نال سے گولیوں کی بجائے زہریلی فولادی سوئیاں نکلتی ہیں۔ میں اسے چلا کر دیکھ چکا ہوں۔ ایسی ہی سوئیاں قتل ہونے والے تینوں افراد کے جسموں میں پیوست تھیں۔ کل تک اس ہتھیار سے برآمد ہونے والی ایک فولادی سوئی کی تجزیاتی رپورٹ بھی آ جائے گی۔" یہ کہتے ہوئے جیک نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر "سائلنٹ ڈیتھ" نکال لیا۔ "یہی ہے نا وہ عجیب اور حیرت انگیز ہتھیار؟" وہ میرے بالکل قریب آ کھڑا ہوا۔ "ایسی ہی زہریلی سوئیوں کا شکار ہونے والوں کی لاشیں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے بھی ملی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں جو محافظ اور ملازمین مارے گئے' انہیں بھی تمہی نے قتل کیا تھا۔ یہ سوال میں بعد میں کروں گا کہ تم اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں کیوں داخل ہوئیں' پہلے اعتراف کر لو' اس واردات میں بھی تمہارا ہی ہاتھ تھا۔"

"کسی بھی واردات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔" میں نے صاف انکار کر دیا۔ اب میں خود پر تشدد کئے جانے کا سبب سمجھ چکی تھی۔

اس کے ہاتھ میں ابھی تک "سائلنٹ ڈیتھ" موجود تھا جس کا رخ اچانک میری طرف کر کے وہ غرایا۔ "مت بھولو کہ اس کی نال سے نکلنے والی زہریلی فولادی سوئی میں تمہارے حسین جسم میں بھی اتار سکتا ہوں۔ بولو' اعتراف کرتی ہو کہ اس کا بٹن دبا دوں؟"

"میرا خیال تھا مسٹر جیک کہ تم ذہین آدمی ہو گے لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ تم تو نہایت احمق آدمی ہو۔"

"کیا؟" میری بات سن کر وہ چیخ اٹھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں ڈر جاؤں گی۔ جو کھلونا دکھا کے تم مجھے خوفزدہ کرنا چاہتے ہو یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تمہارا یہ دعویٰ قطعی غلط ہے کہ اس میں زہریلی سوئیاں ہیں۔ اگر تم میرے ہاتھ کھول دو اور یہ کھلونا مجھے دے دو تو میں ثابت کر دوں کہ اس میں موجود سوئیاں قطعی زہریلی نہیں ہیں۔"

وہ طنزیہ انداز میں ہنسا پھر بولا۔ "معلوم ہوتا ہے تم مجھے واقعی بے وقوف ہی سمجھ رہی ہو۔"

"وہ تو خیر تم ہو۔" میں بول اٹھی۔

"شٹ اپ۔" وہ ایک بار پھر برہم ہو گیا۔ "تم اس لئے اپنا ہاتھ کھلوا کر یہ ہتھیار لینا چاہتی ہو کہ مجھے اور یہاں موجود تمام افراد کو موت کی نیند سلا دو۔"

"یہی تو غلط فہمی ہے تمہیں جو میں دور کرنا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے بقول تمہارے' جو افراد قتل ہوئے ہیں ان کے جسموں میں زہریلی سوئیاں پائی گئی ہوں اور ان کی موت کا سبب بھی زہر ہو مگر یہ وہ ہتھیار نہیں ہے۔ تمہیں اگر میری بات پر یقین نہیں تو اس کھلونے سے میرے جسم کے کسی حصے پر فائر کر کے دیکھ لو' مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ میں زندہ رہوں گی۔" میں بولی۔

انسپکٹر جیک مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ ہو۔

"سوچ کیا رہے ہو' کرو نا فائر۔" میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ "اس کے بعد لازماً تمہیں میری بے گناہی کا یقین آ جائے گا۔"

"سر! اس کی باتوں میں نہ آیئے گا۔" جیک کے ماتحت نے جلدی سے کہا۔ "ہو سکتا ہے سر! اس طرح یہ عورت خودکشی کرنا چاہتی ہو۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔" جیک نے اپنے ماتحت کو لتاڑ دیا۔ "دیدہ و دانستہ کوئی بھی موت کو دعوت نہیں دیتا۔"

"سر! اگر یہ کوئی خطرناک ہتھیار نہ ہوتا تو گرفتاری کے وقت اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔" جیک کے ماتحت نے ایک اور دلیل دی۔

"سنو! یہ عورت اگر مر بھی گئی تو مجھے افسوس نہیں ہو گا کیونکہ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سمیت اس کے ہاتھوں میرے کئی ہم وطن قتل ہو چکے ہیں۔" جیک نے کہا۔ "اگر یہ نہ مری اور زندہ رہی' جیسا کہ یہ دعویٰ کر رہی ہے تو کم از کم اتنا ضرور معلوم ہو جائے گا' اس پر جو شبہ کیا جا رہا ہے وہ درست نہیں۔"

میں نے فوراً اس کی تائید کر دی۔ "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو مسٹر جیک! تمہارا ماتحت تمہیں خواہ مخواہ غلط راہ پر لگا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے' تم اگر اس طرح خودکشی ہی کرنا چاہتی ہو تو یہی سہی۔" انسپکٹر جیک نے اس خطرناک ہتھیار کی نال میری طرف اٹھا کر بازو کا نشانہ لیا۔

جیک کے ہاتھ میں وہی ہتھیار تھا جس سے واقعی میں تیرہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکی تھی۔ قتل ہونے والوں میں صرف دو ہندوستانی تھے باقی گیارہ افراد انگریز تھے۔

"لیبارٹری رپورٹ کے مطابق فولادی سوئیوں پر اتنا خطرناک اور تیز اثر زہر ہے جو چند ہی لمحوں میں کسی جاندار کو ختم کر سکتا ہے۔ اب بھی وقت ہے تم سوچ لو' اپنا فیصلہ واپس لے لو۔" جیک کا انداز تخاطب ایسا تھا جیسے وہ مجھے آنے والے لمحات سے ڈرانا چاہتا ہو۔ "اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ فائر کئے بغیر میں تمہیں بے گناہ تسلیم کر لوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

"لیکن اس ہتھیار میں' جو تم نے میرے پاس سے برآمد کیا ہے زہریلی سوئیاں نہیں ہیں۔ تم وقت ضائع کر کے حماقت کا ثبوت دے رہے ہو بے وقوف!" میں نے دانستہ اسے غصہ دلایا۔ اسے غصہ دلانے سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ فائر کر دے۔ اس طرح اسے کم از کم یہ یقین تو آ جاتا کہ جو لوگ زہریلی سوئیوں سے مارے گئے ہیں ان کے قتل میں میرا ہاتھ نہیں۔ پھر اسے مجھ پر تشدد کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔ میرے اندر تو خود اتنا زہر تھا کہ فولادی سوئیوں کا زہر میرا کچھ نہ بگاڑ پاتا۔

میری توقع رائیگاں نہیں گئی۔ میں نے اسے اس کے ماتحت اور معمولی دیسی محافظوں کے سامنے بے وقوف کہہ دیا تھا۔ ایک مرتبہ تو وہ کسی طرح اپنی ذلت برداشت کر گیا تھا لیکن دوبارہ اس غصہ آ ہی گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ "اچھا تو پھر یہ لو۔" اس نے "خاموش موت" کا بٹن دبا دیا۔

دوسرے ہی لمحے میرے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ فولادی سوئی میرے بازو کے گوشت کو چیرتی ہوئی اس ٹیبل میں گڑ گئی تھی جس سے مجھے باندھا گیا تھا۔

فائر کرنے کے بعد انسپکٹر جیک نے اس ہتھیار کو پھر اپنی جیب میں رکھ لیا اور میرا جائزہ لینے لگا۔

جیک کی طرف دیکھ کر میں مسکرا دی۔ اس کے چہرے پر مجھے الجھن کے آثار نظر آ رہے تھے۔ مزید کچھ وقت گزر گیا تو میں نے جیک کو مخاطب کیا۔ "مسٹر جیک! تم نے اپنا اطمینان تو کر لیا اب میرے بازو سے یہ سوئی تو نکلوا دو' چبھ رہی ہے۔"

وہ سوئی اتنی لمبی تھی کہ اس کا کچھ حصہ اب بھی میرے بازو سے باہر نظر آ رہا تھا۔

"اس کے بازو سے سوئی نکال دو۔" جیک نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

جیک کا ماتحت وہیں موجود ایک الماری کھول کر پلاس نکال کر لے آیا۔ اس نے فولادی سوئی میرے بازو سے کھینچ لی۔

معاً مجھے لعنتی چمپا کی آواز سنائی دی۔ "تُو اپنا تماشا دکھا چکی معبلہ! اب میری باری ہے۔ میں تجھے تماشا دکھاؤں گی۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں' میری آواز صرف تُو ہی سن سکتی ہے تجھے جس مقصد کے لئے میں گرفتار کرا کے یہاں لائی ہوں' وہ تو ابھی پورا ہی نہیں ہوا۔ ویسے تُو ہے خوش قسمت' تیرے حصے میں ایک انگریز آیا ہے۔"

وہ ذلیل عورت جو کچھ کہہ رہی تھی' اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ میری عزت و آبرو سے کھیلنے کے لئے یقیناً وہ انسپکٹر جیک کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتی تھی۔ میرا خون کھول اٹھا' مگر زبان پر میں ایک لفظ نہیں لائی۔ میں اس وقت قطعی بے بس ہونے کے باوجود مایوس بہرحال نہیں تھی۔

"تم لوگ جا سکتے ہو۔" اچانک جیک کی آواز ابھری۔ وہ اپنے ماتحت اور دونوں محافظوں سے مخاطب تھا۔

"جی سر!" جیک کا ماتحت حیرت سے بولا۔

"کیا تم بہرے ہو یا انگریزی نہیں سمجھتے؟" جیک کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "باہر دروازے پر جو محافظ موجود ہیں' انہیں بھی یہاں سے ہٹا دو۔"

"بہتر ہے سر!" اس کے ماتحت نے کہا۔ اس کے لہجے کی حیرت اب تک برقرار تھی۔ وہ پلٹا۔

"اور سنو' تم اوپر راہداری میں موجود رہو۔ کسی کو نیچے نہیں آنے دینا۔" جیک نے مزید حکم دیا۔

جیک کا ماتحت "یس سر" کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ محافظ اس سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ ذرا ہی دیر میں وہاں میرے اور جیک کے سوا کوئی نہیں رہا۔ جیک نے کمرے کا جائزہ لیا' پھر میرے اور قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ مجھے اب کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ یہ غالباً چمپا کے سحر کا اثر تھا۔

پھر چند ہی لمحے بعد اس گھناؤنے کھیل کا پہلا مرحلہ شروع ہو گیا' چمپا نے جس کا اشارہ کیا تھا۔

میں غصے کی شدت سے چیخ اٹھی۔ "نہیں۔"

جواب میں میری سماعت سے چمپا کا کریہہ قہقہہ ٹکرایا پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "کیوں نہیں معبلہ! تُو آخر کب تک بچی بچی پھرے گی؟" وہ میری نظروں سے اب تک اوجھل تھی۔ میں غصے کے عالم میں اسے برا بھلا کہنے لگی۔ عین اسی لمحے میرے اردگرد نارنجی شعاعوں کا حصار قائم ہو گیا۔ جھکے ہوئے جیک کے جسم کو جھٹکا لگا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ دور جا گرا تھا۔

معاً میں نے جسم کے ان حصوں پر تپش محسوس کی جو چمڑے کی بیلٹوں سے بندھے ہوئے تھے۔ نارنجی شعاعوں کا حصار نادیدہ ہو چکا تھا۔

اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے بیلٹوں کی گرفت کم ہوتے محسوس کی تو اپنے دائیں ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ میرا ہاتھ گرفت سے آزاد ہو گیا۔ دوسرے ہاتھ اور اپنے بقیہ جسم کو آزاد کرانے میں پھر مجھے چند ہی لمحے لگے۔ میں میز سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چمڑے کی بیلٹوں کو میں نے ٹوٹا ہوا دیکھا۔ میری نگاہ جیک کی طرف اٹھی۔ وہ فرش پر ایک طرف بے ہوش پڑا تھا اور اس کا چہرہ جھلس کر سیاہ ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نارنجی شعاعوں کا حصار قائم ہوتے دیکھ کر چمپا وہاں نہیں رکی ہو گی۔

میں دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ جیک کے ماتحت اور مسلح محافظوں کو دروازے سے اندر آتے دیکھا۔ وہ غالباً جیک کی چیخ سن کر وہاں دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں۔ رائفلوں کی نالیں میری ہی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ سب مجھ سے کچھ فاصلے پر رک کر پوزیشن لے چکے تھے۔

"رک جاؤ ورنہ تمہیں بھون دیا جائے گا۔" جیک کے ماتحت نے بلند آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

معاً مجھے "سائلنٹ ڈیتھ" کا خیال آ گیا جو جیک کے کوٹ کی جیب میں تھا۔ میں محافظوں کی پرواہ کئے بغیر پلٹی اور پھر جیک کے قریب بیٹھ گئی۔ اب اس کا پورا جسم نادیدہ نارنجی شعاعوں کے حصار میں تھا۔ میں نے گوشت کے جلنے کی بو محسوس کی اور پھر اس کے کوٹ سے "خاموش موت" کو نکال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کھڑے ہوتے ہی میں نے جو ہولناک منظر دیکھا' اسے دیکھ کر لرز اٹھی۔ جیک کا جسم موم کی طرح پگھل کر فرش پہ بہنے لگا تھا۔ مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ حصار کے اندر آ کر جیک کا جسم اس طرح

پگھلنے لگے گا۔ خود میرے لئے بھی یہ تجربہ نیا تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی ایسا کوئی خدشہ ہوتا تو "سائلنٹ ڈیتھ" کو اسی کے پاس رہنے دیتی۔

کمرے میں موجود محافظوں اور جیک کے ماتحت نے بھی وہ دل دہلا دینے والا منظر دیکھا تھا اور ان سبھی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ انہیں جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ پھر جب میں ان کے قریب پہنچی تو وہ "آگ' آگ" چیختے ہوئے گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ "سائلنٹ ڈیتھ" اب تک میرے ہاتھ میں تھی۔

"فائر۔" اچانک جیک کا ماتحت کسی خودکار کھلونے کی طرح چیخ اٹھا۔

میں نے اس کے ریوالور کی نال سے شعلہ نکلتے دیکھا۔ مجھ سے ذرا ہی فاصلے پر چنگاریاں سی اڑیں اور معدوم ہو گئیں۔ اس کی چلائی ہوئی گولی نادیدہ حصار سے ٹکرائی تھی اور مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ پھر رائفلوں نے بھی آگ برسانا شروع کر دی تھی۔ چنگاریاں اڑتی رہیں مگر میرا کچھ نہ بگڑا۔

"ساحرہ۔" محافظوں میں سے کوئی چیخا۔ "یہ جادوگرنی ہے' بھاگو۔" وہ محافظ پلٹ کر دروازے کی طرف دوڑا۔

دو محافظ اور اپنے ساتھی کے پیچھے بھاگ لئے۔ کمرے میں اب صرف جیک کا ماتحت اور ایک مسلح محافظ رہ گیا تھا۔ ان دونوں ہی نے مجھ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ وہ کچھ زیادہ ہی بہادر بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے انہیں سزا دینے کی خاطر ان پر جھپٹ پڑی۔ نتیجتاً وہ دونوں ہی حصار کی زد میں آ گئے اور بری طرح چیخ اٹھے۔ میں فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی ورنہ ان کا حشر بھی جیک سے مختلف نہ ہوتا۔ وہ بے ہوش ہو کر فرش پر بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ان کے جسم بھی جھلس گئے تھے۔ میں اب اطمینان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی جو کھلا ہوا تھا۔ "سائلنٹ ڈیتھ" کو اب میں نے اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میرے نزدیک اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرے گرد جب تک حصار قائم تھا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر پہنچی تو راہداری سونی پڑی تھی۔ وہاں کوئی بھی محافظ نہیں تھا۔ ٹارچر سیل سے بھاگنے والے محافظوں نے یقیناً اوپر راہداری میں موجود محافظوں کو بھی خوفزدہ کر دیا تھا۔ شاید وہ اسی لئے فرار ہو گئے تھے۔ وہاں موجود دونوں محافظ حوالات کے اس کمرے کے باہر کھڑے تھے جس میں رشیدہ بند تھی۔

مجھے جن راستوں سے وہاں لایا گیا تھا' میرے علم میں تھے لیکن ابھی میں وہاں سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ رشیدہ کو میں بھولی نہیں تھی پھر میں اسے وہاں حوالات میں بند چھوڑ کر کس طرح چلی جاتی۔ اس راہداری سے گزر کر میں جلد ہی اس راہداری میں آ گئی جہاں حوالات تھے۔ وہاں صرف دو محافظ تھے' باقی غالباً خوفزدہ ہو کر بھاگ چکے تھے۔ ان دونوں نے مجھ پر نظر پڑتے ہی اپنی رائفلیں میری طرف تان لیں۔

"میں نہیں چاہتی کہ تم دونوں کو مجھ سے کوئی نقصان پہنچے۔" میں نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔ "تم اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو حوالات کا دروازہ کھول دو اور اندر جو عورت قید ہے' اسے

رہا کر دو۔ اس کمرے کے قفل کی چابی تمہی دونوں کے پاس ہو گی۔"

"ہرگز نہیں، ہم قیدی عورت کو رہا نہیں کریں گے۔" ایک محافظ نے جواب دیا۔ "اور تمہیں بھی پکڑ کر حوالات میں بند کر دیں گے۔"

میرے اور ان کے درمیان اب فاصلہ مزید کم ہو گیا تھا۔ میں اطمینان سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ دونوں شاید مجھے پکڑنے کی غرض سے خود بھی آگے بڑھے۔

"رک جاؤ' ورنہ مارے جاؤ گے۔" میں نے انہیں سمجھایا۔

"ہم کسی جادو وادو سے نہیں ڈرتے۔ تم ہمیں نہیں ڈرا سکتیں' ہمارا کچھ نہیں بگاڑ.........." آگے بڑھتا ہوا شخص اپنا جملہ پورا نہیں کر سکا۔ وہ حصار سے ٹکرا کر چیختا ہوا ایک طرف جا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل بھی چھوٹ گئی تھی۔

دوسرا محافظ جو ذرا پیچھے تھا' ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ اس نے مجھ پر فائر کر دیا۔ گولی حصار سے ٹکرائی اور چنگاریاں اڑیں۔ میں رک گئی۔

"تم نے دیکھ لیا کہ تمہاری چلائی ہوئی گولی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔" میں نے دوسرے محافظ سے کہا۔ "اپنے ساتھی کا حشر بھی تمہارے سامنے ہے' اس لئے میں جو حکم دوں اس پر عمل کرو۔ بولو' حوالات کی چابی تمہارے پاس ہے؟"

"نن .... نہیں۔" وہ دہشت زدہ سا ہو کر بولا اور اپنے بے ہوش ساتھی کی طرف انگلی اٹھا دی۔

اسی لمحے میری نظر حوالات کے دروازے کی طرف اٹھی۔ رشیدہ آہنی سلاخوں کے قریب کھڑی ہوئی سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"اگر چابی تمہارے بے ہوش ساتھی کی جیب میں ہے تو تم نکال کر حوالات کا قفل کھول دو۔" میں نے محافظ کو پھر مخاطب کیا۔

معلوم نہیں اس محافظ کو کیا سوجھی کہ وہ ایک دم وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگتے ہوئے اس نے کوشش کی تھی کہ میرے قریب سے نہ گزرے۔ محافظ کے قدموں کی چاپ دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی تو مجبوراً مجھے آگے بڑھنا پڑا۔ اس مرتبہ مجھے معلوم تھا کہ بے ہوش ہو جانے والے محافظ کا کیا حشر ہو گا لیکن مجبوری تھی۔ مجھے اس کی جیب سے حوالات کی چابی تو نکالنا ہی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ محافظ کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر میں کھڑی ہوئی تھی کہ اس کا جسم بھی پگھل کر بہنے لگا۔ رشیدہ یہ دلدوز منظر دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

"میں حوالات کا تالا کھول رہی ہوں' تم پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں رشیدہ سے بولی۔

رشیدہ خوفزدہ سی ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ ذرا ہی دیر بعد میں حوالات کا دروازہ کھول چکی تھی۔

"باہر آ جاؤ رشیدہ! مگر میرے قریب نہ آنا' تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے لیکن دور دور رہ کر۔ اپنے اور میرے درمیان تمہیں کم سے کم تین فٹ کا فاصلہ قائم رکھنا ہے۔" میں یہ کہہ کر واپسی کے لئے مڑ

گئی۔ اپنے عقب میں مجھے رشیدہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ رشیدہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ خوف کے سبب اس نے میرے اور اپنے درمیان تین فٹ سے زیادہ ہی فاصلہ رکھا تھا۔

رشیدہ کے ساتھ میں اس عمارت سے باہر آئی تو کمپاؤنڈ میں مسلح محافظوں کا ہجوم دیکھا۔

"ساحرہ! وہ دیکھو ساحرہ باہر آ گئی۔" کسی نے بلند آواز میں کہا۔

محافظوں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے اپنی رائفلیں میری طرف کر لی تھیں۔ کمپاؤنڈ ہی میں ایک جانب دو جیپیں کھڑی تھیں۔

"سنو' میں تم لوگوں کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتی۔ میرا راستہ چھوڑ دو۔" میں نے محافظوں کو مخاطب کیا۔

خلاف توقع وہ مجھے راستہ دینے کے لئے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ درمیان میں انہوں نے میرے گزرنے کے لئے تھوڑی سی جگہ چھوڑ دی تھی۔

"اور پیچھے ہٹو۔ تم اگر میرے قریب آئے تو تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ سے انہیں مزید پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ میں یہاں سے جاؤں گی کس طرح؟ وہاں سے پیدل قرول باغ جانا ممکن نہیں تھا۔

"ان جیپوں کی چابیاں کس کے پاس ہیں؟" میں نے رک کر محافظوں سے سوال کیا۔ "مجھے کسی بھی ایک جیپ کی چابیاں چاہئیں۔"

انہی محافظوں کے درمیان وہ دونوں ڈرائیور بھی موجود تھے جو ان جیپوں کو ڈرائیو کر کے وہاں تک لائے تھے۔ محافظوں کے درمیان سے ایک شخص آگے آیا اور اس نے دور ہی سے ایک کی رِنگ میری طرف اچھال دیا' وہ بولا۔ "یہ آگے کھڑی ہوئی جیپ کی چابی ہے۔"

میں نے کی رِنگ آگے بڑھ کر زمین سے اٹھا لیا اور پھر جیپ کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ محافظ وہاں سے دور ہٹ گئے۔

میں جیپ کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اچانک نارنجی شعاعوں کا حصار ظاہر ہوا اور پھر فضا میں بلند ہونے کے بعد ٹوٹ کر بکھر گیا۔ محافظ جانے کیا سمجھے کہ یہ منظر دیکھ کر چیختے ہوئے بھاگ اٹھے۔ اس حصار کی اب مجھے ضرورت نہیں رہی تھی اسی لئے میرے گرد قائم نہیں رہا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے رشیدہ کو مخاطب کیا۔ "آؤ آگے ہی میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔"

"مم .... مگر آپ .... آپ نے تو دور .... دور رہنے کو کہا تھا۔" رشیدہ کی آواز سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

میری بات سن کر رشیدہ ڈرتی اور جھجکتی ہوئی آگے بڑھی۔ وہ جیپ سے دور کھڑی ہوئی تھی۔ اس

وقت تک میں جیپ اسٹارٹ کر چکی تھی۔ رشیدہ میرے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھی تو میں نے جیپ کو گیٹ کی طرف موڑا جو کھلا ہوا نہیں تھا۔

میں نے گیٹ کے قریب جیپ کو روک کر رشیدہ سے پھاٹک کھولنے کو کہا۔ اس نے جیپ سے اتر کر پھاٹک کھول دیا اور پھر میرے قریب آ بیٹھی۔

"تمہیں یہاں سے قرول باغ تک کا راستہ تو معلوم ہو گا؟" میں نے رشیدہ سے معلوم کیا۔

"جج .... جی ہاں۔" اس نے چونک کر جواب دیا۔

"تو پھر میری رہنمائی کرنا۔" میں نے کہا' پھر اسے سمجھانے لگی۔ "خوفزدہ ہونے کی اب ضرورت نہیں۔" اسی کے ساتھ میں جیپ کو ڈرائیو کرتی ہوئی باہر سڑک پر آ گئی۔

"ادھر........ دائیں طرف چلیں۔" رشیدہ نے میری رہنمائی کی۔

میں نے جیپ کو دائیں جانب موڑ لیا اور پھر اس کی رفتار بڑھا دی۔ ابھی ہم اس سڑک پر زیادہ آگے نہیں بڑھے تھے کہ اچانک ایک چوراہے کی بائیں سمت والی سڑک سے یکے بعد دیگرے دو کاریں ہماری جیپ کے پیچھے لپکیں۔ جیپ کی رفتار کم کر کے میں نے اپنے تعاقب میں آنے والی کاروں کو دیکھا۔ ان دونوں کاروں میں تنظیم کے مسلح ارکان تھے۔ ایک کار کو سمیع اللہ اور دوسری کو عادل ڈرائیو کر رہا تھا۔ جیپ کو وہیں سڑک کے کنارے چھوڑ دیا گیا۔ میں' عادل والی کار میں بیٹھ گئی اور رشیدہ' سمیع اللہ والی کار میں۔ پھر ہمیں وہاں سے روانہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

"معلوم نہیں کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ لوگ تمہیں قیدی نہیں رکھ سکیں گے۔" عادل مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں اس کے قریب ہی ڈرائیونگ سیٹ کے برابر بیٹھی تھی۔ میری ہی وجہ سے کار کی پچھلی سیٹ پر پانچ افراد کو بیٹھنا پڑا تھا۔

"راستے میں تمہی لوگوں نے فائرنگ کی ہو گی جب وہ لوگ ہمیں گرفتار کر کے لے جا رہے تھے؟" میں نے عادل کی بات کو نظرانداز کر دیا تھا۔

"ہاں لیکن فائرنگ بیکار رہی۔"

"اس عیار انگریز نے چال ہی ایسی چلی تھی کہ مجبوراً تمہیں فائرنگ روکنا پڑی۔" میں بولی۔

"ہماری تعداد زیادہ ہوتی اور اسلحہ بھی وافر ہوتا تو اب تک ہم سی آئی ڈی ہیڈ آفس پر حملہ کر چکے ہوتے۔ جلدی میں ہم اپنے ساتھ دستی بم بھی نہیں لا سکے۔"

"پھر تم لوگ یہاں راستے میں کیوں کھڑے ہوئے تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہمیں یہ خدشہ تھا کہ تمہیں اور رشیدہ کو رات ہی میں کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم ایک بار پھر تم دونوں کو رہا کرانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے۔ پھر اگر ہم ناکام بھی رہتے تو کم از کم یہ تو پتا لگا ہی لیتے کہ تمہیں یہاں سے وہ کہاں لے گئے ہیں۔" عادل نے بتایا' پھر پوچھنے لگا۔ "اب تم بتاؤ کس طرح فرار ہونے میں کامیابی..........."

"اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔" میں نے عادل کی بات کاٹ دی۔

"چلو ٹھیک ہے۔" عادل بولا' پھر بتایا۔ "وہ دو ارکان جو تمہارے گھر کی نگرانی کر رہے تھے' فائرنگ کے تبادلے میں شدید زخمی ہو گئے ہیں۔"

"یہ بہت برا ہوا۔" میں نے اظہار تاسف کیا۔

"اگر ہم بروقت ان کی مدد کو نہ پہنچ جاتے تو وہ مارے ہی گئے ہوتے۔" عادل نے کہا۔

اس کے بعد راستے میں زیادہ تر خاموشی ہی رہی اور ہم قرول باغ پہنچ گئے۔

"ظاہر ہے کہ اب یہ گھر بھی پولیس اور سی آئی ڈی کی نظروں میں آ چکا ہے۔ تم یہاں رہنا پسند نہیں کرو گی۔" عادل کا لہجہ تصدیق طلب سا تھا۔

"ابھی میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچا نہیں۔" میں بولی۔ "لیکن یہ طے ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہوں گی۔"

"پھر' رات تو ابھی باقی ہے' کہاں رہو گی؟" عادل نے دریافت کیا۔

"فی الحال اسی گھر میں جہاں چھاپہ پڑا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "ایسا کرنا کہ تم باہر سے تالا ڈال دینا۔ اس سے یہی ظاہر ہو گا کہ اندر کوئی نہیں ہے' پھر صبح آ کر تم تالا کھول دینا۔"

"تم کہتی ہو تو ایسا ہی کر لیں گے البتہ کچھ دیر کے لئے ہمارے ساتھ چلی چلو۔ سالار اکبر تمہاری طرف سے بہت فکرمند تھے' یقیناً وہ بھی یہ جاننے کے لئے مضطرب ہوں گے کہ تمہیں کس طرح رہائی ملی۔ تمہارے آرام میں تو خلل پڑے گا لیکن اس طرح سالار اکبر..........."

"ٹھیک ہے' میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔" میں بول اٹھی۔

پھر عادل نے تنظیم کی کوٹھی کے پھاٹک ہی پر کار روکی۔ شناختی الفاظ کے بعد پھاٹک کھل گیا تو دونوں کاریں آگے پیچھے اندر داخل ہو گئیں۔

کار عمارت کے قریب جا کر رک گئی تو میں نے عادل سے کہا۔ "پہلے میں زخمی ہونے والے کارکنوں کی عیادت کروں گی۔"

"وہ تو یہاں نہیں ہیں۔" عادل نے بتایا۔ "انہیں فوری طور پر ہیڈ کوارٹر روانہ کر دیا تھا تاکہ انہیں ہر طرح کی طبی امداد مل سکے۔ ہیڈ کوارٹر میں چھوٹا سا آپریشن تھیٹر بھی ہے اور معالج بھی ہیں۔ ضرورت پڑنے پر تنظیم سے ہمدردی رکھنے والے کسی اچھے سرجن یا ڈاکٹر کی خدمات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔"

"ہیڈ کوارٹر' کیا یہاں تنظیم کا کوئی ہیڈ کوارٹر بھی ہے؟" میں حیرت سے بولی کیونکہ یہ میرے لئے نئی بات تھی۔

"ہاں' ہر شہر کی طرح اس شہر میں بھی تنظیم کا ایک ہیڈ کوارٹر ہے۔ وہیں شہر کے نگران اعلیٰ کا قیام بھی ہوتا ہے تاکہ اس سے کسی بھی وقت رابطہ قائم کر کے ضروری ہدایات حاصل کی جا سکیں۔" یہ کہہ کر عادل اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گیا۔ بقیہ افراد جو پچھلی نشست پر بیٹھے تھے پہلے ہی اتر چکے تھے۔

میں نے بھی کار سے اترنے میں دیر نہیں کی۔ سالار اکبر عمارت کی نشست گاہ میں ہمارا منتظر تھا۔ رشیدہ' سمیع اللہ اور عادل کے سوا بقیہ تمام افراد رخصت ہو گئے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی سالار اکبر بولا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہیں یہ لوگ چھڑا لائے۔"

"نہیں سالار! کرن یا رشیدہ کی رہائی میں ہماری کسی کوشش کو کوئی دخل نہیں۔" سمیع اللہ بول اٹھا۔

"سالار اس لئے ایسا سمجھ رہے ہیں کہ انہیں حقائق کا علم نہیں۔" عادل کہنے لگا۔

"تو پھر' حقائق کیا ہیں؟" سالار اکبر حیرت سے بولا۔

جواب میں عادل بتانے لگا کہ کس طرح تنظیم کے ارکان نے حملہ کیا اور پھر کیوں انہیں پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اس کے بعد سی آئی ڈی کے ہیڈ آفس تک تعاقب کا عادل نے ذکر کیا۔ آخر میں نے اس سے کہا۔ "خلاف معمول آج رات محافظوں کی خاصی بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ ایسی صورت میں ہیڈ آفس پر حملہ کرنا خودکشی ہی کے مترادف ہوتا۔ اس کے علاوہ ہم سے بنیادی غلطی ایک اور ہو گئی۔ دستی بم ہمارے پاس نہیں تھے۔ ناکافی اسلحہ اور کم افراد کے ساتھ پیش قدمی خود ہمارے حق میں نقصان دہ ہوتی۔ ہم نے اسی لئے حملے سے گریز کیا۔" پھر عادل نے بتایا کہ اس نے سی آئی ڈی ہیڈ آفس کے قریب ہی رکنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ اس کے بعد ایک جیپ میں ہماری آمد کا ذکر کیا۔

"حیرت انگیز۔" سالار اکبر بے اختیار بولا۔ "بڑی تعداد میں وہاں مسلح افراد موجود تھے' پھر بھی کرن کا وہاں سے زندہ سلامت نکل آنا کمال ہے۔"

"مسلح محافظوں نے تو خود ہمیں جانے کے لئے راستہ دیا تھا اور جیپ کی چابی بھی حوالے کی تھی۔" رشیدہ' جو اب تک چپ تھی' بول ہی اٹھی۔

"کیا مطلب ہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" سالار اکبر نے کہا۔ "مسلح محافظوں نے کس طرح اور کیوں راستہ دے دیا۔"

"کرن جی کے کہنے پر۔" رشیدہ نے جواب دیا۔ "انہوں نے عمارت کے کمپاؤنڈ میں موجود محافظوں سے کہا تھا کہ یہ انہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتیں اس لئے وہ راستہ چھوڑ دیں۔"

"پھر' پھر کیا انہوں نے کرن کی بات مان لی؟" یہ سوال کرتے ہوئے سالار اکبر کے چہرے پر انتہائی حیرت تھی۔ حیران تو عادل بھی تھا' مگر وہ خاموشی کے ساتھ رشیدہ کی بات سن رہا تھا۔ ہاں' میں نے سمیع اللہ کے چہرے پر زیادہ حیرت نہیں دیکھی۔ اسے یقیناً راستے ہی میں رشیدہ نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

"جی ہاں سالار! وہ سب تو کرن جی کو عمارت سے باہر آتے دیکھ کر ہی "ساحرہ' ساحرہ" چیخنے لگے تھے۔" رشیدہ نے بتایا۔

"ساحرہ! وہ کرن کو ساحرہ کہہ رہے تھے؟" عادل بھی اس بار خاموش نہ رہ سکا۔

"میرا خیال ہے رشیدہ کہ تم شروع سے بتاؤ کیا ہوا تھا؟" سالار اکبر نے کہا۔ "اس طرح شاید ہم کچھ نہیں سمجھ پائیں گے۔"

"انہوں نے مجھے اور کرن جی کو حوالات کے الگ الگ کمروں میں بند کر دیا تھا۔ حوالات کے باہر راہداریوں میں مجھے قدم قدم پر مسلح اور چوکنا محافظ دکھائی دیئے تھے۔" رشیدہ بتانے لگی۔ "میرے اور

کرن جی کے کمروں کے باہر بھی دو دو مسلح محافظ موجود تھے۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میں نے کرن جی کے کمرے کی طرف دو محافظوں کو جاتے دیکھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد جب وہ محافظ' کرن جی کو اپنے ساتھ لے گئے تو میں پریشان ہو گئی۔ میں اسی پریشانی کے عالم میں دیر تک کرن جی کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ میرے دل میں یہ اندیشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں کرن جی کو وہاں سے کسی دوسری جگہ تو منتقل نہیں کر دیا گیا' مگر ایسا نہیں تھا۔ مزید کچھ ہی دیر کے بعد مجھے حقیقت کا علم ہو گیا۔ مجھے چاروں طرف سے "ساحرہ' ساحرہ" کا شور سنائی دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ پھر ایک محافظ دوڑتا ہوا آیا اور میرے کمرے کے سامنے کھڑے ہوئے محافظوں کو بتانے لگا کہ جسے پوچھ گچھ کے لئے نیچے ٹارچر سیل میں لے جایا گیا تھا' وہ ساحرہ ہے اور اس پر گولیاں اثر نہیں کرتیں۔ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی گولیاں چنگاریاں بن کر غائب ہو جاتی ہیں۔ اسی محافظ نے ایک اور ہولناک واقعہ بیان کیا۔ ایسا ہی دہشت ناک منظر میں نے بعد میں خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا جو میں ابھی بیان کروں گی۔" پھر رشیدہ نے بیان کیا کہ اس کے کمرے کے سامنے موجود محافظوں کے سوا باقی محافظ وہاں سے فرار ہو گئے۔ اس کے بعد رشیدہ نے میری وہاں آمد کا ذکر کیا اور جو کچھ دیکھا تھا من و عن بیان کر دیا۔ اس دوران میں سالار اکبر اور عادل کچھ نہیں بولے اور حیرت زدہ سے رشیدہ کا بیان سنتے رہے۔ رشیدہ جیپ میں بیٹھ کر اس عمارت سے نکلنے کا واقعہ بیان کر کے چپ ہو گئی۔

کچھ دیر تک کمرے میں بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ سبھی خاموش تھے' پھر اس خاموشی کو سالار اکبر کی آواز ہی نے توڑا۔ "کرن! آپ کو ٹارچر سیل میں کیوں لے جایا گیا تھا؟"

"سارا قصہ اس سائلنٹ ڈیتھ کا تھا۔" میں نے جیب سے "سائلنٹ ڈیتھ" کو نکال کر میز پر رکھ دیا اور بتانے لگی کہ انسپکٹر جیک مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتا تھا دانستہ میں نے اپنے باندھے جانے کا ذکر نہیں کیا۔ میں ایسی باتوں سے گریز کر رہی تھی جن سے میری پُراسرار قوتوں کا اظہار ہو۔ صرف یہ بتا کر کہ جیک کو مجھ پر کیا شک تھا' میں خاموش ہو گئی۔ نہ تو میں نے جیک کی ہولناک موت کا ذکر کیا' نہ یہ کہ مجھ پر فائرنگ کی گئی تھی۔ یہ سب کچھ رشیدہ ایک محافظ کے حوالے سے پہلے ہی بتا چکی تھی۔ ٹارچر سیل میں جو کچھ ہوا تھا' رشیدہ کے کمرے کے سامنے متعین محافظوں سے ایک محافظ نے آ کے بیان کر دیا تھا۔ رشیدہ نے بھی وہ پورا واقعہ سنا تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا پنڈت جی کہ نیکی کی قوتیں کرن پر سایہ فگن ہیں جو ان کی حفاظت کرتی ہیں۔" سالار اکبر نے مرعوب کن آواز میں عادل کو مخاطب کیا۔

میری پُراسرار قوتیں موضوع بن گئی تھیں' میں نے اسی لئے بات کا رخ بدل دیا اور اچانک چائے پینے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" رشیدہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ "سبھی کے لئے چائے بنا لاؤں؟"

"ہاں۔" عادل نے جواب دیا تو رشیدہ کمرے سے چلی گئی۔ چند لمحے توقف کے بعد عادل پھر بولا۔ "سالار! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ سی آئی ڈی والوں کو کرن کے نئے ٹھکانے کا علم کس طرح ہو

گیا؟ کل شام ہی کو تو یہ وہاں منتقل ہوئی تھی۔" میری خواہش کے مطابق اب تنظیم کے تمام ارکان نے مجھے معبلہ کی بجائے کرن کہنا شروع کر دیا تھا۔

"میرا خیال ہے پنڈت جی کہ تمہیں کرن کی طرف سے پہلے ہی اس بات کا جواب مل چکا ہے۔" سالار اکبر نے کہا۔ "تمہی تو مجھے بتا رہے تھے کہ کرن کے کچھ دشمن ایسے بھی ہیں جو پُراسرار شیطانی قوتوں کے مالک ہیں اور یہ چاہیں بھی تو خود کو ان سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتیں۔ میرا خیال ہے انہی شیطانی قوتوں کے اشارے پر سی آئی ڈی والوں نے چھاپہ مارا تھا۔" سالار اکبر نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا اس لئے میں خاموش ہی رہی۔

"موجودہ صورت حال میں جب کہ وہ ٹھکانہ سی آئی ڈی والوں کے علم میں آ چکا ہے' کرن کا وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ تو کیا کرن کے لئے کوئی اور نیا ٹھکانہ تلاش کیا جائے؟"

عادل کے اس سوال پر سالار اکبر سوچ میں پڑ گیا پھر ذرا دیر بعد بولا۔ "مگر سوال یہ ہے پنڈت جی کہ یہی صورت کہیں اور قیام میں بھی پیش آ سکتی ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اب کرن کے لئے جس نئے گھر کا بندوبست کیا جائے گا' وہ سی آئی ڈی یا پولیس کی نظروں سے محفوظ رہے گا؟ کیا پُراسرار شیطانی قوتیں اس نئے ٹھکانے کا بھی سراغ نہیں لگا لیں گی؟"

"تو پھر کیا کیا جائے سالار!" یہ کہتے ہوئے عادل کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"موجودہ حالات میں اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔" میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "وہ یہ کہ کہیں کرائے پر مکان لے کر نہ رہا جائے۔"

"پھر' پھر آپ کہاں رہیں گی؟" سالار اکبر نے دریافت کیا۔

"ایک مکان چھوڑ کر دوسرا کرائے پر لینے سے یہ بہتر ہے سالار کہ میں کسی ہوٹل میں قیام کروں۔ ایک ہوٹل کا قیام ترک کر کے کسی دوسرے ہوٹل کا رخ کرنے میں بہرحال اس قدر پریشانی یا قباحت نہیں ہو گی۔ رہا آپ لوگوں سے رابطے کا مسئلہ تو میں خود ملتی رہوں گی۔" میں نے جو سوچا تھا کہہ دیا۔

"اس کے علاوہ ایک مسئلہ آپ کی حفاظت کا بھی تو ہے۔" سالار اکبر بولا۔

"اس مسئلے کا حل وہی ہے جس پر ہم پہلے بھی عمل کرتے رہے ہیں۔" اس مرتبہ سمیع اللہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ "ہم بھی اسی ہوٹل میں کوئی کمرہ حاصل کر کے کرن کے قریب رہ سکتے ہیں۔"

اسی عرصے میں رشیدہ چائے بنا کر لے آئی اور سب کو چائے کی پیالیاں دینے لگی۔ میں نے بھی ٹرے سے ایک پیالی اٹھا لی۔

پھر چائے پینے کے دوران سالار اکبر نے میری تجویز سے اتفاق کا اظہار کر دیا۔

"میں اپنے ایک سوٹ کیس میں ضروری سامان اور کچھ کپڑے رکھ کر لے جاؤں گی' بقیہ دو سوٹ کیس یہاں چھوڑے جا سکتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" عادل نے کہا۔

"تو پھر آج رات کیا آپ اسی گھر میں رہیں گی جس پر چھاپہ پڑ چکا ہے؟ میری تجویز یہ تھی کہ صبح

تک یہیں رہ لیں آپ۔" سالار اکبر بولا۔

"نہیں سالار! موجودہ حالات میں میرا یہاں ایک رات بھی قیام خطرناک ہے۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔" میں نے انکار کر دیا۔

"لیکن آپ وہاں بھی تو محفوظ نہیں ہیں کرن!"

"وہ یہ نہیں سوچ سکیں گے کہ انہوں نے جہاں سے مجھے گرفتار کیا تھا' میں پھر اسی جگہ کا رخ کروں گی۔"

میرے بعد عادل نے سالار اکبر کو بتایا۔ "کرن کا کہنا یہ ہے کہ صبح تک کے لئے باہر سے تالا ڈال دیا جائے۔"

سالار اکبر کو آخرکار رضامند ہونا ہی پڑا۔ میں نے "سائلنٹ ڈیتھ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سالار اکبر کو مخاطب کیا۔ "اس سے خاصے فائر ہو چکے ہیں۔ میری یہ خواہش ہے سالار کہ آپ مجھے اس میں زہریلی فولادی سوئیاں بھرنا سکھا دیں۔ اس کے علاوہ اگر ممکن ہو تو یہ ہتھیار مجھے دے دیں۔"

"فی الحال تو یہاں اس کا میگزین نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے سالار اکبر نے میز پر رکھے ہوئے "سائلنٹ ڈیتھ" کو اٹھا لیا اور پھر دائیں جانب لگے ہوئے ایک لیور کو باہر کھینچ لیا۔ میں نے اس جگہ ایک خانہ نمودار ہوتے دیکھا جس میں ہندسے نظر آ رہے تھے۔ "اس سے اب تک پندرہ فائر کئے جا چکے ہیں۔" سالار اکبر نے مجھے ہندسے دکھائے جو اس کے بیان کی تصدیق کر رہے تھے۔ "اس میں چوبیس سوئیاں تھیں۔ ابھی اس میں مزید نو سوئیاں باقی ہیں۔ اسے میں رکھ لیتا ہوں اور اپنا "سائلنٹ ڈیتھ" تمہیں دیئے دیتا ہوں۔" سالار اکبر نے یہ کہہ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ویسا ہی ہتھیار نکال کر مجھے دے دیا۔ "کرن! یہ میری طرف سے آپ تحفے میں قبول کر لیں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ سالار اکبر نے اس ہتھیار کے دستے پر دباؤ ڈال کر اسے کھول لیا اور میگزین باہر نکال کر مجھے دکھایا۔

"جب ساری سوئیاں فائر ہو جائیں تو آپ خالی میگزین اس طرح باہر نکال لیں اور نیا میگزین یوں لگا کر دستے کو پھر اپنی جگہ لے آئیں۔" اسی کے ساتھ "کھٹ" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ دستہ اپنی جگہ آ گیا۔ سالار اکبر نے مجھ سے کہا۔ "اب آپ کوشش کریں' میگزین نکال کر دوبارہ لگائیں۔"

سالار اکبر نے مجھے جو ہتھیار دیا تھا اسے میں نے اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا اور سالار اکبر سے وہ ہتھیار لے لیا جو میں نے ہی اسے دیا تھا۔ میگزین نکال کر دوبارہ لگانے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہوئی۔ میں نے بغور سالار اکبر کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

"حیرت ہے کرن کہ آپ کی پہلی کوشش کامیاب ہو گئی۔ آپ واقعی ذہین ہیں۔" سالار اکبر نے میری تعریف کی۔

میں اس وقت تک چائے پی چکی تھی اس لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلیں پنڈت جی!" میں نے عادل کو مخاطب کیا۔

"کل آپ جائیں تو مل کر جایئے گا۔" سالار اکبر مجھ سے بولا۔

"بہتر ہے سالار!" میں نے جواب دیا۔

عادل بھی چائے پی چکا تھا۔ میں اسے ساتھ لئے کچھ ہی دیر بعد اس کوٹھی سے باہر آ گئی۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔

"تم ذرا دیر سے آ کر مجھے جگانا۔ دوپہر بارہ ایک بجے کے درمیان آؤ تو زیادہ اچھا رہے گا۔" عادل کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے' مجھے بھی اپنی نیند پوری کرنا ہے۔ اس طرح میں بھی سو لوں گا۔"

سی آئی ڈی والے اسی طرح گھر کھلا چھوڑ گئے تھے۔ میں اندر داخل ہوئی۔ نشست گاہ میں تالا رکھا ہوا مل گیا۔ عادل نے تالا اٹھا لیا۔ اسے میں عمارت کے صدر دروازے پر چھوڑنے کے لئے آگے بڑھی ہی تھی کہ چونک اٹھی اور ٹھٹک کر رک گئی۔ اندر کی طرف مجھے ایک آہٹ سی سنائی دی تھی۔ مجھے رکتے دیکھ کر عادل بھی رک گیا تھا۔ اس نے شاید وہ آہٹ نہیں سنی تھی۔

"کیا ہوا کرن! تم رک کیوں گئیں؟" عادل نے سوال کیا۔

"ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی یہاں موجود ہے۔" میں نے عادل کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔

عادل کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو' میں اندر جا کر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں' میں دیکھتی ہوں۔" میں نے اسے روک دیا۔

"اچھا تو پھر دونوں چلتے ہیں۔" عادل میرے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔

پھر میں جدھر سے گزری لائٹ جلاتی چلی گئی۔ اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر خلاف معمول دروازہ بند دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ مجھے یاد تھا کہ کمرے کا دروازہ بھی سی آئی ڈی والے کھلا ہی چھوڑ گئے تھے۔ میری حیرت کی وجہ یہی تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے عادل کو ایک طرف ہٹا دیا اور پھر دروازہ کھول کر تیزی سے خود بھی ایک جانب ہٹ گئی۔ اندر اندھیرا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک پستہ قد کالا سا آدمی باہر نکلا۔ اس کے جسم پر صرف ایک نیکر تھا اور ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے سارے جسم پر تیل مل رکھا تھا۔

میں اور عادل دروازے کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ اس نے باہر آتے ہی دونوں طرف چونکا انداز میں دیکھا اور ٹھٹک گیا۔

"مجھے بھاگ جانے دو ورنہ میں تم دونوں کے پیٹ پھاڑ دوں گا۔" سیاہ فام شخص کھرکھراتی ہوئی سی آواز میں ہم سے مخاطب ہوا۔

اسے دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی چور تھا جو کھلا ہوا گیٹ اور عمارت کے دروازے کھلے ہوئے دیکھ کر اندر گھس آیا تھا۔

"تم کچھ چرائے بغیر خالی ہاتھ واپس جا رہے ہو' یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔" میں نے پرسکون آواز

میں سیاہ فام شخص سے کہا۔

"تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں نے جو دو بڑی بڑی گٹھریاں باندھی ہیں' انہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں؟ اس طرح تم شاید دھوکا دے کے کمرے میں بند کرنا چاہتی ہو۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ اگر میں تمہیں کمرے میں بند ہی کرنا چاہتی تو دروازہ کھولنے کی بجائے اسے باہر سے بند کر دیتی۔"

"پھر تم کیا چاہتی ہو؟" سیاہ فام شخص کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

"میں تمہیں کچھ رقم دینا چاہتی ہوں۔ ظاہر ہے کہ تم کوئی غریب ہی آدمی ہو ورنہ یوں اپنی جان خطرے میں ڈال کر گھروں میں نہ گھستے پھرتے۔"

"غریبوں کی بڑی ہمدرد بن رہی ہو' میں تم جیسی عیار عورتوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اس طرح دھوکا دے کر مجھے پکڑنے کا ارادہ رکھتی ہو۔" اس نے نفرت سے منہ بنایا۔

اس کی بدکلامی پر مجھے غصہ آ گیا حالانکہ میں نے اس سے جو کچھ کہا تھا' سچ تھا۔ میں واقعی اسے کچھ رقم دینا چاہتی تھی۔ اسے دھوکا دے کر پکڑنا میرا مقصد نہ تھا۔ اس نے میری نیت پر شبہ کیا تھا اس لئے میں سخت لہجے میں بولی۔ "تم شاید اپنے ہاتھ میں موجود کھلے ہوئے چاقو پر اترا رہے ہو' میں چاہوں تو......"

"چھوڑو کرن! اسے جانے دو۔" عادل بول اٹھا۔ "یہ کچھ چرا کے لے جا رہا ہوتا تو اسے روکتے بھی۔" پھر وہ سیاہ فام شخص سے مخاطب ہوا۔ "یہ ہمارے بس میں ہے کہ تمہیں پکڑ لیں' مگر ہم ایک چھوٹے چور کو بڑے چور کے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔ تم جاؤ۔" بڑے چور سے اس کی مراد پولیس والے تھے۔

"مجھے پتا ہے کہ تم دونوں میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر ڈر گئے ہو اسی لئے بھاگنے کا موقع دے رہے ہو۔" سیاہ فام شخص اور اینٹھ گیا۔ چوری اور سینہ زوری کا محاورہ اس پر صادق آ رہا تھا۔

"ابے جا بھی' غصہ آ گیا تو ابھی زمین چاٹتا نظر آئے گا۔" عادل کو بھی اس پر غصہ آ گیا۔

"کیا کہا؟" اس نے چاقو لہرا کر کسی بندر کی طرح عادل کو بھبکی دی۔ "ابھی آنتیں باہر کر دوں گا' عورت کے سامنے شیر نہ بن زیادہ۔"

اسی لمحے بجلی کی طرح کوند کر میں نے اس کے چاقو والے ہاتھ پر ٹھوکر ماری۔ دانستہ میں نے ہلکی ضرب لگائی تھی' پھر بھی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فضا میں رہا اور اسے میں نے جھپٹ کر لپک لیا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ دائیں ہاتھ کو اس نے بائیں ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا۔ میری نگاہ اس کے چمکتے ہوئے جسم سے پھسلتی ہوئی سیاہ نیکر پر پڑی اور میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ نیکر کچھ پھولا ہوا سا ہے۔ شاید وہ نیکر میں کچھ چھپا کر لے جا رہا تھا۔

"نیکر میں کیا چھپا کر لے جا رہا ہے تو؟" میں نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

میرے سوال پر وہ اچھل پڑا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ بولا۔ "کچھ نہیں...... نیکر میں تو

کچھ بھی نہیں۔ اندر میں جانگیا.......... ہاں جانگیا ہی پہنے ہوں۔"

"جھوٹ بول رہا ہے یہ۔" عادل کی نظریں بھی اس کے نیکر پر جم گئیں۔ "اس کے نیکر میں اندرونی سمت چور جیبیں ہوں گی۔ ابھی دیکھتا ہوں میں۔"

"آگے نہ بڑھنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" سیاہ فام شخص ہاتھ اٹھا کر عادل سے مخاطب ہوا۔

"اب تو تجھے دکھانا ہی پڑے گا کہ نیکر میں کیا ہے؟" عادل اس کی طرف جھپٹا۔

جسم پر تیل ملا ہونے کے سبب وہ عادل کے ہاتھوں سے کسی چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر بھاگا لیکن شاید اس نے وہاں میری موجودگی کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اسی کے نتیجے میں وہ منہ کے بل زمین پر رہا تھا۔ میں نے اڑنگا لگا کر اسے گرا دیا تھا۔ پھر عادل نے اسے اٹھنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔

"چھوڑ.......... چھوڑ دو مجھے' میں نوٹ.......... نوٹ دے رہا ہوں نکال کر۔"

اس کے نیکر کی چور جیبوں سے واقعی خاصے نوٹ برآمد ہوئے جو یقیناً الماری سے نکالے گئے تھے لیکن میرے پاس تو اس سے کہیں زیادہ رقم تھی۔

"باقی رقم کہاں ہے؟" میں نے چاقو کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

"وہ.......... پوٹلیوں.......... دونوں پوٹلیوں میں ہے۔" اس نے خوفزدہ آواز میں بتایا۔

عادل اس کے نیکر کی تلاشی لے چکا تھا۔ نیکر کے سوا اس کے جسم پر کوئی اور لباس تھا بھی نہیں کہ بقیہ رقم کسی دوسری جگہ چھپا لیتا۔ میں نے اسی لئے چاقو کی نوک اس کے سینے سے ہٹا لی۔ وہ بے چارہ تو آج رات غلط جگہ پھنس گیا تھا۔ چاقو بند کر کے میں نے اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنا چاقو لے لیا۔

"لو' یہ بھی رکھ لو۔" میں نے کچھ نوٹ بھی اس کی طرف بڑھائے۔

وہ مجھ سے نوٹ لینے کی بجائے میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا' پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میں یہ نوٹ نہیں لوں گا۔"

"کیوں نہیں لو گے؟" مجھے بھی اس کے انکار پر تعجب ہوا۔

"اس لئے کہ یہ میری محنت کی کمائی نہیں اور تم مجھ پر ترس کھا کر روپے دے رہی ہو۔ سنو! میں چور ضرور ہوں کوئی بھکاری نہیں۔ احسان ہی کرنا ہے تو مجھے جانے دو۔"

اس سیاہ فام چور کی بات سن کر میں چکرا گئی۔ عجیب چور تھا وہ بھی۔

"اسے چلا جانے دو کرن!" عادل مجھ سے بولا پھر اس نے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔

وہ چور دوڑتا ہوا نشست گاہ کے برابر والی راہداری میں سے صدر دروازے کی طرف چلا گیا جو کھلا ہوا تھا۔

"کمال ہے' اس نے رقم قبول نہیں کی۔" میں نے طویل سانس لیتے ہوئے عادل سے کہا۔

"وہ رقم قبول کر لیتا تو شاید اس کے پیشے پر حرف آ جاتا۔" عادل ہنس دیا۔ "ویسے تمہاری پھولے ہوئے نیکر پر خوب پڑی ورنہ تو وہ کام دکھا جاتا۔"

"کاش میری نظر نہ پڑی ہوتی۔"

"وہ کیوں؟"

"اس طرح کچھ دن تو وہ غریب سکون سے گزار لیتا۔"

"خیال ہے تمہارا' چند ہی روز میں وہ ساری رقم اڑا دیتا۔ حرام کا مال آدمی کے پاس زیادہ دن نہیں رکتا۔ اچھا اب سوؤ گی بھی کہ نہیں۔ اس چور نے خواہ مخواہ تمہاری نیند حرام کر دی۔ نہ وہ گھر میں گھستا نہ تمہیں یہاں آ کر سونے میں دیر ہوتی۔"

"اچھا چلو میں دروازہ بند کر دوں۔ گیٹ بھی تم باہر سے لگاتے جانا۔"

"لیکن دروازہ تو مجھے باہر سے بند کر کے جانا ہے۔"

"میں بھی احتیاطاً اندر سے بند کر لوں گی۔ تم کال بیل بجا دینا' میں جاگ جاؤں گی۔"

چور سے نبرد آزمائی کے دوران عادل نے تالا وہیں فرش پر پھینک دیا تھا جسے اس نے جھک کر اٹھا لیا۔ تالے ہی میں چابی بھی لگی ہوئی تھی پھر عادل کے ساتھ میں عمارت کے صدر دروازے تک گئی۔ وہ "خدا حافظ" کہہ کر باہر نکل گیا تو میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور لوٹ آئی۔

کمرے میں آ کر میں نے لائٹ جلائی تو دروازے کے قریب ہی فرش پر مجھے دو بڑی بڑی گٹھریاں دکھائی دیں۔ چور نے سارے کپڑے باندھ لئے تھے جو الماری میں رکھے تھے۔ اس کا یہ بیان بھی غلط ثابت نہیں ہوا تھا کہ بقیہ رقم گٹھریوں میں ہے۔ کپڑوں کو گٹھریوں میں باندھنے کے لئے اس نے میری ہی دو ساڑھیاں استعمال کی تھیں۔ میک اپ بکس کو کوئی فضول شے سمجھ کر اس نے الماری ہی میں چھوڑ دیا تھا البتہ باقی تمام چیزیں باندھ لی تھیں۔ ان میں میرا ہینڈ پرس بھی تھا۔ اس احمق چور میں اتنی عقل نہیں تھی کہ کپڑے اور دوسرا سامان سوٹ کیسوں ہی میں بھر لیتا جو الماری کی آڑ میں رکھے تھے۔ سوٹ کیس بھی الماری کی طرح کھلے پڑے تھے۔ اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ چور نے کسی توقع پر انہیں بھی کھول کر دیکھا ضرور تھا' مگر کپڑے وغیرہ ان میں رکھ کر لے جانے کا اسے خیال شاید نہیں آیا تھا۔

کپڑوں اور دوسرے سامان کو اس وقت میں نے دوبارہ الماری میں سنبھال کر نہیں رکھا اور یوں ہی چھوڑ دیا کیونکہ سارا سامان مجھے اب سوٹ کیسوں میں رکھنا تھا۔ میں نے صرف اپنا ہینڈ پرس اور نوٹ اٹھا کر الماری میں رکھ دیئے پھر مجھے لباس تبدیل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میرے جسم پر اب سلیپنگ گاؤن تھا۔ بستر پر دراز ہونے سے پہلے میں نے کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا اور نیلا بلب جلا دیا۔

تقریباً ساری ہی رات ہنگامے کی نذر ہو گئی تھی۔ مجھے اب تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بستر پر لیٹنے کے ذرا ہی دیر بعد میں بے خبر سو گئی۔

☆======☆======☆

آنکھ کھلی تو مجھے اپنی ذہنی کیفیت عجیب سی لگی۔ میں جیسے جاگ کر بھی نہیں جاگی تھی۔ میں بیدار بھی ہو چکی تھی اور حالت خواب میں بھی تھی۔ معلوم نہیں میں کہاں تھی' حیرت اس پر تھی کہ اپنے ذہن پر زور دینے کے باوجود مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ اتنا احساس مجھے ضرور تھا کہ میرا جسم کسی نرم و گداز

جگہ پر پڑا تھا۔ میری اطراف گہرا اندھیرا تھا۔ صرف میرا جسم رنگ برنگی روشنیوں کی زد میں تھا۔ یہ رنگ برنگی روشنیاں اوپر سے براہ راست میرے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ میرے جسم پر گلابی رنگ کا ایک باریک سا لبادہ تھا جس سے چھن چھن کر گویا وہ روشنیاں جیسے میرے جسم میں جذب ہو رہی تھیں۔ میں کہاں ہوں' بار بار یہی الفاظ میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

"خوش آمدید معبلہ!" اچانک اندھیرے میں ایک آشنا آواز ابھری۔ "چندر موہن تجھے اپنے دہلی کے آشرم میں دیکھ کر بہت خوش ہے۔"

"چندر موہن .... کون چند موہن؟" میں بڑبڑائی۔

"دھیرے دھیرے تجھے سب کچھ یاد آ جائے گا معبلہ!" وہی جانی پہچانی آواز پھر سنائی دی۔ "تجھے اس لئے ابھی کچھ یاد نہیں آ رہا کہ تجھ پر ایک عمل کیا جا رہا ہے تاکہ تیرا جسم پوتر (پاک) ہو جائے۔ اس عمل کے پورا ہونے پر تیری شکتی کچھ دن تک تیرے ہی شریر میں سوتی رہے گی اور پھر اسی وقت جاگے گی جب میں اسے جگاؤں گا۔ اس کے بعد تُو میرے لئے خطرناک نہیں رہے گی۔ تین پہر گزرنے کے بعد یہ عمل پورا ہو جائے گا۔ پھر تجھے ان روشنیوں سے رہائی مل جائے گی۔ تُو اس سے روشنیوں کی قیدی ہے۔"

"روشنیوں کی قیدی۔" میں پھر بڑبڑانے لگی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

پھر وہ آشنا آواز سنائی نہیں دی۔ مجھے نہیں معلوم کب تک میں اسی طرح رنگ برنگی متحرک روشنیوں کا ہدف بنی رہی۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ خاصا وقت گزر جانے کے بعد میرے ذہن پر غنودگی چھانے لگی تھی اور پھر شاید میں سو گئی تھی۔

دوبارہ میں جاگی تو ایک آرام دہ مسہری پر دراز تھی جس پر کسی خیمے کی طرح ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔

"کویتا' اے کویتا! دیکھ راجکماری جاگیں کہ نہیں۔" ایک نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"دیکھتی ہوں سیتا مائی!" جواب میں ایک اور نسوانی آواز ابھری۔

"اری بڑے مہاراج کا حکم ہے کہ راجکماری کو پوتر جل (پاک پانی) میں اشنان (غسل) بھی کرانا ہے۔" پہلی نسوانی آواز پھر آئی۔

میں نے کسی کے قدموں کی قریب ہوتی ہوئی آواز سنی۔ چند ہی لمحے بعد ریشمی پردہ ہٹا اور مجھے ایک نوجوان لڑکی کا چہرہ نظر آیا جو میرے لئے اجنبی تھا۔ وہ لڑکی سوتی ساڑھی باندھے ہوئی تھی۔

"نمستے راجکماری جی!" اس لڑکی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے جھکتے ہوئے کہا۔ "اٹھ جایئے آپ کے اشنان کا سمے ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی۔

میں نے اپنے جسم پر اس وقت قیمتی ریشمی لباس دیکھا۔ وہ لڑکی میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مجھے اٹھانے لگی۔

"کون ہو تم؟" میں نے اس نوجوان خوبصورت لڑکی سے پوچھا۔

"میں آپ کی داسی کویتا ہوں راجکماری!" اس نے جواب دیا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نوجوان لڑکی کویتا کا سہارا لئے بغیر میں اٹھ نہیں سکوں گی۔ معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ بہرحال میں اٹھ کر بیٹھ گئی تو کویتا نے مسہری کے قریب ہی رکھے ہوئے چپل مجھے پہنائے اور سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

"قدم بڑھائیں راجکماری!" کویتا مجھے سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھایا۔

"یہ رادھا کم بخت اس وقت کہاں جا کے مر گئی۔" مجھے کچھ ہی فاصلے پر ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی نظر آئی جو کسی رادھا کو پکار رہی تھی۔ وہ عورت لکڑی کی چھوٹی سی چوکی پر بیٹھی تھی۔

میں نے اس بڑے سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کا فرش سنگ مرمر کا تھا۔ وہ کمرہ قدیم سامان آرائش سے سجا ہوا تھا۔ کمرہ کسی راجکماری کی خواب گاہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔ اجالے سے پتا چل رہا تھا کہ یہ دن کا وقت ہے۔ میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی کویتا کے سہارے آگے بڑھتی رہی۔

ادھیڑ عمر عورت کی چیخ پکار کے جواب میں کہیں دور سے ایک آواز آئی۔ "ابھی آئی سیتا مائی!" یہ شاید رادھا کی آواز تھی۔

"اری جلدی آ' راجکماری جی جاگ گئی ہیں۔" ادھیڑ عمر عورت پھر زور سے چیخی۔ اسے کویتا اور رادھا دونوں ہی سیتا مائی کہہ رہی تھیں۔

کویتا کی عمر مجھے سولہ سترہ سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کا جسم گداز اور بھرا بھرا تھا۔ وہ مجھے سہارا دیئے ابھی کمرے کے محرابی دروازے تک نہیں پہنچی تھی کہ ایک اور نوجوان لڑکی بغلی دروازے سے اندر آ گئی۔ وہ نازک اندام سی تھی' مگر کویتا سے دو تین سال بڑی لگتی تھی۔

"نمستے راجکماری جی!" اس نئی لڑکی نے میرے قریب آ کر کہا اور پھر دوسری جانب سے میرا ایک ہاتھ اپنے شانے پر رکھ لیا۔

میں نے اپنے جسم کا کچھ بوجھ اس لڑکی پر بھی ڈال دیا۔

"راجکماری جی! یہ آپ کی داسی رادھا ہے۔" کویتا نے نئی لڑکی سے میرا تعارف کرایا۔

میں جواب میں کچھ نہیں بولی۔ وہ دونوں مجھے سہارا دیئے ہوئے ایک اور بڑے کمرے میں لے آئیں۔ وہاں داخل ہوتے ہی مجھے صندل کی خوشبو محسوس ہوئی۔ کمرے کے وسط میں ایک حوض دکھائی دیا جو سنگ سبز کا بنا ہوا تھا۔ اس میں اترنے کے لئے سیڑھیاں بھی تھیں۔ حوض کے قریب ہی سنگ مرمر کی کرسیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ کرسیاں ایسی تھیں کہ ان پر نیم دراز ہی ہوا جا سکتا تھا۔ کویتا اور رادھا نے مجھے انہی میں سے ایک کرسی پر نیم دراز کرا دیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟" میں بول اٹھی۔

"آپ کو پوتر جل میں اشنان کرنا ہے راجکماری جی!" کویتا نے بتایا۔

"تم دونوں جاؤ یہاں سے' میں خود نہا کر تمہیں آواز دے لوں گی۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے راجکماری جی! ہم دروازے کے باہر ہی کھڑے ہیں جب آپ اشنان کر لیں تو بلا لیجئے

گا۔" کویتا بولی۔

پھر وہ دونوں وہاں سے چلی گئیں۔ اس کے باوجود میں کچھ دیر تک اس کرسی سے نہ اٹھی اور کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ وہ ریشمی لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ اسے اتار کر میں حوض میں اتر گئی۔ پانی بہت شفاف اور خوشبودار تھا۔ میں اس میں نہاتی رہی۔ اسی کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے جسم کی ساری تھکن وہ پانی نچوڑ رہا ہے' جیسے میرے نیم شل اعصاب کسی نادیدہ گرفت سے آزاد ہونے لگے ہوں۔ میں نے اپنے وجود میں تازگی اور چستی سی محسوس کی۔

"راجکماری جی انومتی (اجازت) دیں تو داسی کویتا اندر آ کے بدن پونچھنے کو تولیہ دے جائے؟" باہر سے کویتا کی آواز آئی۔

"ہاں کرسی پر تولیہ رکھ کر چلی جاؤ۔" میں نے بلند آواز میں جواب دے کر خود کو پانی کے اندر چھپا لیا۔ صرف میرا چہرہ پانی سے باہر تھا۔

کویتا کو میں نے اندر آتے دیکھا۔ اس نے میری طرف نظر اٹھائے بغیر معذرت کی۔ "اس بھول پر چھما (معاف) کر دیجئے گا راجکماری جی!"

تولیہ کرسی پر رکھنے کے بعد کویتا کمرے میں رکی نہیں اور پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ ذرا ہی دیر میں حوض سے نکل کر میں نے تولیہ سے اپنا بھیگا بدن پونچھا اور کرسی پر رکھے ہوئے کپڑے پہن لئے۔ غسل کر کے میں اپنے اندر ایک تبدیلی سی محسوس کر رہی تھی۔ جیسے اب مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہ ہو۔

"آ جاؤ۔" میں نے ان دونوں کو اندر بلا لیا۔

"راجکماری جی! پوتر جل اشنان کرنے کے بعد اب آپ کو ہم دونوں کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" کویتا نے مجھ سے کہا۔ رادھا نے تولیہ کرسی سے اٹھا لیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو کویتا! اب میں سہارے کے بغیر چل سکتی ہوں۔" میں بولی۔

وہ دونوں آ پھر مجھے ایک اور کمرے میں لے آئیں۔ وہ کمرہ بھی بہترین و قدیم سامان آرائش کی منہ بولتی تصویر تھا۔ وہاں دیوار سے لگا ہوا ایک تخت بچھا تھا۔ تخت پر دبیز قالین تھا۔ دیوار سے لگے ہوئے گاؤ تکئے رکھے تھے۔ کویتا اور رادھا نے مجھے اس تخت پر لے جا کر بٹھا دیا۔ دائیں جانب میں نے ایک منقش تھالی میں چمکتی ہوئی خوبصورت صراحی دیکھی۔ صراحی کے ساتھ ہی دو گلاس بھی رکھے تھے۔ صراحی اور وہ دونوں گلاس چاندی کے معلوم ہوتے تھے۔

میں نے کویتا کو اس صراحی سے کوئی مشروب گلاس میں انڈیلتے دیکھا۔ گلاس اٹھا کر وہ میرے قریب آ گئی۔

کویتا نے وہ گلاس میری طرف بڑھایا تو میں نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ جیون رس ہے راجکماری جی!" کویتا نے جواب دیا۔ "اس سے آتما (روح) کو بڑی شانتی ملتی ہے۔"

"اچھا لاؤ۔" میں نے اس سے گلاس لے لیا۔

مشروب خوش ذائقہ ہونے کے باوجود ہلکی سی تلخی لئے ہوئے تھا' مگر یہ تلخی مجھے زیادہ ناگوار نہ ہوئی۔ ہاں مجھے ایسا ضرور لگا کہ وہ مشروب پہلے بھی کبھی پی چکی ہوں۔ گلاس خالی کر کے میں نے کویتا کو دے دیا۔ رادھا میرے بال سنوارنے لگی۔ ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے اپنے جسم میں نشہ سا تیرتا محسوس ہوا۔ ہر شے کا حسن مجھ پر عیاں ہونے لگا۔ کویتا بھی پہلے سے زیادہ حسین دکھائی دینے لگی۔ شاید یہ اس مشروب کا اثر تھا جو کچھ دیر پہلے میں نے پیا تھا۔ وہی مشروب پینے کو پھر میرا دل چاہا۔ رادھا میرے بال سنوار چکی تھی۔

"کویتا! مجھے اور جیون رس پلاؤ۔" میں نے خواب ناک سی آواز میں کہا۔

میں نے کویتا کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز سی مسکراہٹ دیکھی۔ وہ اٹھی اور گلاس میں صراحی سے مزید مشروب انڈیل کر لے آئی۔

"نہیں' اپنے ہاتھوں سے پلاؤ۔" اس نے میری طرف گلاس بڑھایا تو میں بولی۔

اس نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس مرتبہ مجھے تلخی بالکل محسوس نہ ہوئی۔ گھونٹ گھونٹ وہ مجھے پلاتی رہی اور میں پیتی رہی۔

"رادھا! راجکماری جی کی آنکھیں دیکھ رہی ہو' کیسی پیاری لگ رہی ہیں' کیسے لال لال ڈورے پڑے ہوئے ہیں؟ جی چاہتا ہے ان آنکھوں کو چوم لوں۔" کویتا نے آخری گھونٹ پلایا۔

"تو پھر چوم لو.......... اور مجھے بھی..........." میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے قریب کر لیا اور گاؤ تکئے کے سہارے نیم دراز ہو گئی۔

کیف و نشاط کے ان لمحات کا دائرہ جانے کتنا پھیل گیا تھا کہ نہ مجھے وقت گزرنے کا احساس تھا نہ یہ ہوش' میں کہاں اور کیوں ہوں؟ کویتا میرے قریب تھی۔ پھر جانے کب رادھا بھی نزدیک آ گئی۔ ہر طرف مجھے رنگ ہی رنگ نظر آ رہے تھے۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میرے ذہن پر دھند سی چھا گئی۔

بیداری کے باوجود خواب خواب سی کیفیت برقرار تھی۔ مجھے سہارا دے کر اٹھایا گیا تھا۔ سہارا دے کر اٹھانے والی رادھا ہی تھی۔ ایک برتن میں رادھا نے میرا منہ دھلایا اور کویتا نے گاؤ تکیہ میری کمر سے اس طرح لگا دیا کہ میں سہارے کے بغیر بیٹھ سکوں۔ پھر رادھا ایک تھالی میں گرم گرم پوریاں اور آلو کی بھجیا لے آئی۔ کویتا مجھے اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر پوریاں کھلانے لگی۔ جب میرا پیٹ بھر گیا تو اسی نے مجھے پانی بھی پلایا۔ پیٹ بھر گیا تو میرے ذہن پر ایک بار پھر غنودگی چھانے لگی۔

"آپ کو نیند آ رہی ہے راجکماری جی! سو جائیں۔" کویتا نے مجھے لٹا دیا اور سر کے نیچے تکیہ درست کرنے لگی۔

جانے کتنی دیر بعد میری آنکھ کھلی تو وہی دونوں مجھے پھر اسی کمرے میں سہارا دے کر لے آئیں جہاں خوشبودار پانی کا حوض تھا۔

غسل کر کے پہلے ہی کی طرح میرے جسم کی چستی اور توانائی لوٹ آئی۔ اس بار انہوں نے مجھے پہننے کے لئے ریشمی گلابی لبادہ دیا۔ اس باریک ریشمی لبادے میں نہ میرا جسم پوری طرح پوشیدہ تھا نہ بالکل ظاہر۔ چند لمحے کو مجھے یہ احساس ضرور ہوا کہ وہ لبادہ زیب تن نہیں کرنا چاہئے‘ مگر پھر میں جیسے یہ بات بھول ہی گئی۔ رادھا اور کویتا کے جسموں پر بھی اس وقت ویسے ہی لبادے تھے۔ وہ دونوں مجھے ساتھ لئے پھولوں بھرے ایک باغ میں لے آئیں۔ سارا باغ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

کویتا مجھے ایک کنج میں لے آئی اور رادھا سے کہنے لگی۔ ”جاؤ‘ جیون رس لے آؤ۔“

رادھا چلی گئی تو اس نے مجھے اپنے زانو پہ سر رکھ کے لٹا لیا۔ نرم نرم گھاس پر لیٹے ہوئے مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”راجکماری جی! آج بڑے مہاراج آپ کو درشن دیں گے۔“ کویتا نے میرے کھلے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”کون بڑے مہاراج؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جو ہمارے پالن ہار ہیں۔ ہم انہی کی داسیاں تو ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں بھی کیا انہی کی داسی ہوں؟“

”نہیں‘ آپ کا درجہ ہم سے بلند ہے۔ آپ تو راجکماری ہیں۔“

”میں کس راج کی راجکماری ہوں؟“ میں نے پھر سوال کیا۔

”وادی سبز کی راجکماری معبلہ!“ کویتا نے بتایا۔

”وادی سبز‘ وہ کہاں ہے؟“

”یہ تو بڑے مہاراج ہی کو خبر ہے۔“ کویتا نے جواب دیا۔ ”ہمیں تو بس اتنا معلوم ہے کہ ترنت (جلد) ہی بڑے مہاراج آپ کو اپنی پتنی بنالیں گے۔ پھر آپ راجکماری کی بجائے مہارانی کہلائیں گی۔ آپ کتنی بھاگوان ہیں راجکماری جی کہ بڑے مہاراج آپ کے پتی دیو (شوہر) بنیں گے۔“

”کسی کی پتنی بن جانے سے کیا ہوتا ہے کویتا؟“

”اس سے شریر کو بھی سکھ ملتا ہے راجکماری جی اور آتما کو بھی۔“

”تمہیں کیسے معلوم کویتا! کیا تم بھی کسی کی پتنی بن چکی ہو؟“

”پتنی تو نہیں پرنتو بڑے مہاراج کی داسی ضرور ہوں۔ بڑے مہاراج مجھے یہ سکھ دے چکے ہیں۔ وہ بڑے دیالو (رحم کرنے والے) ہیں‘ اپنی کسی داسی کو نراش (مایوس) نہیں کرتے۔ میں نے جب سے اپنے تن کی پکار سنی ہے انہی کی سیوا (خدمت) کر رہی ہوں۔ اب تو میرا تن اور من سبھی کچھ ان کا ہے۔“

کویتا کی باتیں میں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اس لئے دریافت کیا۔ ”جب شریر اور آتما کا سکھ ایک داسی کو بھی مل جاتا ہے تو پھر داسی اور مہارانی میں کیا فرق ہے؟“

”ادھیکار (حق) کا انتر (فرق) ہے راجکماری جی! ادھیکار ہی تو سب کچھ ہے۔ سارے سنسار (دنیا) میں ادھیکار ہی کی تو جنگ جاری ہے۔“

کویتا کی بات ختم ہوئی تھی کہ رادھا صراحی اور گلاس لے آئی۔

مشروب پینے کے کچھ ہی دیر بعد پہلے کی طرح میرے انگ انگ میں نشہ تیرنے لگا۔ میں بے خود ہونے لگی اور اس بے خودی میں وہ دونوں میری ہم سفر بن گئیں۔ مجھے اسی دوران میں یوں لگا جیسے ان دونوں کے علاوہ بھی وہاں کوئی اور موجود ہے۔ میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ شخص میرے لئے اجنبی نہیں تھا لیکن مجھے یاد نہ آسکا کہ میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا تھا۔

”راجکماری کو اٹھا کر ہمارے ایوان محبت میں لے آؤ۔“ اس شخص نے رادھا اور کویتا کو مخاطب کیا۔

”جی بڑے مہاراج!“ کویتا بولی۔

وہ شخص مڑا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رادھا اور کویتا نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور کنج سے نکل آئیں۔ اب وہ مجھے سنبھالتے ہوئے عمارت کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

اس کمرے کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور در و دیوار پر ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ گاؤ تکئے بھی رکھے تھے۔ کمرے میں ایک عجیب سی خوشبو چکرا رہی تھی۔ وہیں کئی جگہ میں نے صراحیاں اور گلاس بھی رکھے دیکھے۔ بظاہر کمرے میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان دونوں نے مجھے ایک گاؤ تکئے کے سہارے بٹھا دیا تھا‘ وہاں نیم تاریکی تھی۔

”اسے اور جیون رس پلاؤ۔“ کمرے کے ایک گوشے سے اسی شخص کی آواز ابھری جسے میں نے باغ میں دیکھا تھا۔

کویتا گلاس میں وہی مشروب بھر لائی اور میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ رادھا کمرے میں داخل ہونے کے بعد جانے کہاں چلی گئی تھی۔ وہ مجھے اب نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سارا مشروب پی لیا اور کویتا نے میرے ہونٹوں سے گلاس ہٹا لیا۔ اسی وقت میری سماعت سے رادھا کی آواز آئی۔ ”میرے دیوتا! میرے دیوتا.......... مجھے سمیٹ لو۔“

”نہیں‘ اب تو چلی جا رادھا! آج کی رات راجکماری معبلہ کی ہے۔“ مردانہ آشنا آواز ابھری۔

”تو پھر کچھ دیر کو راجکماری ہی کے پاس رہنے دیں۔“ رادھا کی آواز آئی۔

”اچھا جا‘ مگر دیر نہ کرنا۔“ اس شخص نے اجازت دے دی۔

جس سمت سے وہ آوازیں آ رہی تھیں‘ میری نگاہ ادھر ہی اٹھی ہوئی تھی۔ ایک ریشمی پردہ ہلا اور پھر رادھا آتی دکھائی دی۔ اس وقت کویتا میرے پاس تھی‘ پھر رادھا بھی قریب آ گئی۔

اچانک وہ دونوں چیخ کر مجھ سے الگ ہو گئیں۔ مجھے اپنے گرد نارنجی شعاعوں کا حصار قائم ہوتے نظر آیا تھا۔

”بھاگ جاؤ‘ تم دونوں یہاں سے بھاگ جاؤ۔“ گھبرائی ہوئی مردانہ آواز سنائی دی۔

رادھا اور کویتا کمرے کے دروازے کی طرف دوڑتی ہوئی چلی گئیں۔ اسی لمحے کمرے میں نامانوس الفاظ کی گونج سنائی دینے لگی۔

میں چونک اٹھی کیونکہ وہ آواز بڑے مہاراج چندر موہن کی تھی۔ یہاں میں کیسے آ گئی؟ میں نے سوچا۔ شاید میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی' مگر نہیں۔ وہ کوئی خواب نہیں لگتا تھا' جو کچھ گزر چکا تھا' مجھے کسی خواب ہی کی طرح یاد تھا۔ میری یادداشت واپس آ چکی تھی۔ میرا ذہن اب پوری طرح بیدار تھا البتہ کچھ بھاری پن ضرور تھا۔ اس کا سبب وہی مشروب ہو سکتا تھا جو مجھے پلایا گیا تھا۔ غالباً اس کا اثر ابھی پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔

نارنجی شعاعوں کا حصار اب نادیدہ ہو چکا تھا۔ میں اٹھنے ہی والی تھی کہ رک گئی۔ مجھے کوئی اس طرف آتا دکھائی دیا تھا۔ میرے نہ اٹھنے کی وجہ وہ باریک لبادہ ہی تھا جو ستر پوشی کے لئے ناکافی تھا۔ نیم تاریکی میں وہ ہیولا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ چندر موہن تھا جو اب تک ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدا رہا تھا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے اسے اپنے چاروں طرف زور زور سے پھونکیں مارتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ اس کے گرد بھی ایک نیلا حصار قائم ہو گیا۔

"میں نے تو تیری شکتی کو تیرے شریر میں سلا دیا تھا معبلہ! پھر یہ کیا ہوا؟" مخاطب تو وہ مجھ سے تھا مگر انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"تیرا کوئی بھی شیطانی حربہ مجھ پر کارگر نہیں ہو سکتا چندر موہن!" میں نفرت و حقارت سے بولی۔

"ایسا نہیں معبلہ! ورنہ اس سمے تُو میرے آشرم میں نہ ہوتی۔ ایک بات بتا' کیا تیرے میرے درمیان صلح نہیں ہو سکتی؟" وہ کہنے لگا۔

"نیکی اور بدی کے درمیان صلح ہو بھی کیسے سکتی ہے' تُو مجسم بدی ہے چندر موہن!" میں نے جواب دیا۔

"میں جیسا بھی ہوں معبلہ! تیرا ہوں اور تجھے اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ پہلے میں تجھے اپنی داسی بنانا چاہتا تھا' مگر اب ا:! یہ فیصلہ بدل دیا ہے۔"

"میں جانتی ہوں' تیری ہر تجویز کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہو گا لیکن تُو خود ہی مجھے تجویز مسترد کرنے کا حق دے چکا ہے' سو کہہ دے جو تیرے دل میں ہے۔"

"خیر سگالی اور تجھ سے پیار کے ناتے میں تیرے دشمن ژیان کو تیرے ہاتھوں قتل کرا سکتا ہوں' اسی طرح جیسے تُو چاہتی ہے۔" اس نے اپنی تجویز پیش کی۔ "میری یہ پیشکش کسی بھی پیشگی شرط کے بغیر ہے۔ میں ایسا محض اس لئے کر رہا ہوں کہ تجھے میری دوستی پر یقین آ جائے۔"

بڑے مہاراج چندر موہن کی اس پیشکش نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔

"میں اسے گرفتار کر کے یہیں' اسی آشرم میں لے آؤں گا۔ اس کے اندر جو تھوڑی بہت شکتی ہے میرے لئے اسے چھین لینا کوئی مشکل نہیں ہے۔" مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بول اٹھا۔ چندر موہن کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ میں جان گئی کہ وہ کیا کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔

"تُو بہت ہی بھولا ہے چندر موہن!" یہ کہہ کر میں ہنس دی۔

"اس سے کیا مطلب ہے تیرا؟" اس کی آواز میں پھر سختی آ گئی۔

"تُو میرے ہاتھوں کسی بھی بے گناہ شخص کو قتل کرا کے مجھے یہ فریب دینا چاہتا ہے کہ میں نے اپنے دشمن سے انتقام لے لیا۔ مجھے فریب نظر میں مبتلا کرنا تیرے لئے کون سی بڑی بات ہے۔ یہ کمال تو تیرے چیلے اور داسیاں بھی دکھا سکتے ہیں۔ شمبھو نے بھی ایک مرتبہ کلکتے میں میرے دشمن کا چہرہ مجھے دکھا دیا تھا۔ جب کہ ژیان اس شہر میں موجود ہی نہیں تھا۔ اپنی عیاری کا بھانڈا پھوٹ جانے پر تیرا چہرہ کیوں اتر گیا۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میری آواز میں چبھن شامل ہو گئی۔

"نہیں معبلہ! تُو غلط سمجھ رہی ہے' بات یہ نہیں ہے۔ مجھے تو اس پر دکھ ہو رہا ہے کہ تُو نے میری نیت پر شک کیا' میرے خلوص کو فریب سمجھا۔"

وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا' کبھی غصے سے بات کرتا' کبھی نرمی اختیار کر لیتا۔ پھر اسے میں نے اپنی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر کچھ پڑھتے دیکھا۔ اس کے ہونٹ تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ اس پر میں نے اسے مخاطب کیا۔ "چندر موہن! کیا کوئی نئی چال چل رہا ہے؟"

میرے سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور پڑھنے میں مصروف رہا۔ مجھے کسی ان دیکھے خطرے کا احساس ہوا تو اپنی نیم عریانی کو ذہن سے جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی طرف بڑھی۔ مجھے علم تھا کہ نادیدہ ہونے کے باوجود نارنجی شعاعوں کا حصار ابھی تک میرے گرد قائم تھا۔ اگر وہ حصار ٹوٹ جاتا تو فضا میں بلند ہو کر میں نے اسے ٹوٹ کے بکھرتے دیکھا ہوتا' پھر یہ کہ بڑے مہاراج نے بھی میرے قریب آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نارنجی شعاعوں کا یہ حصار کتنا خطرناک تھا' مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ انہی نارنجی شعاعوں نے چمپا کے جسم کو جگہ جگہ سے داغ دار بنا دیا تھا۔ ان کے درمیان آ کر انسانی جسم کو میں نے موم کی طرح پگھل کے بہتے ہوئے دیکھا تھا۔ بڑے مہاراج کی طرف بڑھنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ بھی ان شعاعوں کی زد میں آ جائے۔

مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں کی حرکت تیز ہو گئی۔ وہ اسی طرح دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے پیچھے ہٹنے لگا پھر اچانک ہی میرے اور اس کے درمیان کثیف دھواں حائل ہو گیا۔ وہ اب دھوئیں کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس دھوئیں نے میرے اعصاب پر عجیب اثر کیا۔ مجھے یوں لگا کہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکوں گی۔ میں اسی جگہ بیٹھ گئی۔

ذرا ہی دیر میں دھواں چھٹ گیا۔ میں نے بڑے مہاراج کو اسی کمرے میں کچھ فاصلے پر کھڑے دیکھا۔ اب اس کے ہاتھ اٹھے ہوئے نہیں تھے۔ شاید وہ اپنا شیطانی عمل پورا کر چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"اگر میں تیرے قریب نہیں آ سکتا معبلہ! تو تیرے لئے بھی مجھ تک پہنچ کے کوئی وار کرنا' ممکن نہیں رہا۔ اب تُو چل پھر تو سکے گی مگر بڑی مشکل سے' اس کے لئے تجھے اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کرنا پڑے گی۔ تجھے سہارا دینے اب کویتا اور رادھا بھی نہیں آئیں گی۔" چندر موہن مجھ سے مخاطب تھا۔ "ہاں' میں جہاں چاہوں تجھے لے جا سکتا ہوں۔ اس طرح میں نے تیرے یہاں سے فرار کا راستہ بھی بند کر

دیا ہے۔ اچھا اب تُو کہے تو میں تجھے تیری خواب گاہ میں پہنچا دوں۔" یہ کہتے ہی وہ پھر کچھ پڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس نے میری طرف اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا۔ "اٹھ .... اٹھ معبلہ!" یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ نیچے سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔

چندر موہن کے ہاتھ کی حرکت کے ساتھ ہی فرش سے میرا جسم بلند ہونے لگا۔

"بس!" اس نے ہاتھ روک لیا۔ "اب میرے پیچھے پیچھے چلی آ۔" وہ دروازے کی طرف مڑ کر قدم اٹھانے لگا۔

میرا جسم فضا میں تیرتا ہوا آگے بڑھا' مگر چندر موہن اور میرے درمیان مخصوص فاصلہ قائم رہا۔ اس کمرے سے نکل کر وہ ایک راہداری میں آ گیا جو آگے جا کے بائیں جانب مڑ گئی تھی۔ سامنے سے مجھے رادھا آتی دکھائی دی جو بڑے مہاراج پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کے رک گئی۔

"واپس جا .... واپس جا رادھا!" چندر موہن نے بلند آواز میں کہا۔

رادھا وہیں سے الٹے قدموں واپس ہو گئی۔ کچھ ہی دیر میں چندر موہن مجھے اسی کمرے میں لے آیا جہاں پہلی بار مجھے ہوش آیا تھا۔ اب میرا جسم فضا میں تیرتا ہوا کمرے کے وسط میں بچھی ہوئی مسہری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مسہری کے قریب پہنچ کر ریشمی پردوں سے گزر کر میرا جسم دھیرے دھیرے نیچے بستر پر دراز ہو گیا۔

"کویتا! راجکماری کو پہننے کے لئے کپڑے دے دو لیکن اب قریب نہ جانا۔ میں پردے اٹھائے دے رہا ہوں تاکہ یہ تمہاری نظر میں رہے۔" چندر موہن کی آواز آئی۔

اس کے بعد مسہری کے چاروں طرف پڑے ہوئے ریشمی پردے خود بخود اٹھ گئے۔

"کل سے درگا دیوی کا جاپ شروع ہو گا۔ سیتا کے ساتھ تم دونوں مل کر آج ہی جاپ استھان کی صفائی کر لینا۔ راجکماری کو وقت پر بھوجن کرا دینا' اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے کہ تم میں سے کسی کو بھی راجکماری کے قریب نہیں جانا۔" بڑے مہاراج نے ہدایات دیں۔

"پرنتو بڑے مہاراج! ہم راجکماری جی کو بھوجن کیسے کرائیں گے؟" کویتا نے معلوم کیا۔

"رسوئی (باورچی خانہ) سے کھانا لا کر چوکی پر پروس دینا۔ راجکماری خود مسہری سے اتر کے بھوجن کرنے چوکی تک پہنچ جائے گی۔ ہاں' کھانے کے ساتھ ہی جیون رس بھی رکھ دینا تاکہ راجکماری پینا چاہے تو پی لے۔ جیون رس پی کر وہ تمہیں پاس بلائے تو جانا نہیں۔"

چندر موہن اس کے بعد کمرے سے چلا گیا۔ کویتا مسہری کے قریب آئی تو پہلی بار اس کے گورے چہرے پر ہلکا سا سانولا پن دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے کپڑے نظر آ رہے تھے جو اس نے دور ہی سے مسہری پر پھینک دیئے۔ پھر بولی۔ "راجکماری جی! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

"مجھے' مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" میں کہنی کے بل اٹھنے لگی۔ مجھے انتہائی نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔

اٹھ کر کپڑے پہننے میں مجھے تھکن ہو گئی۔ اگر مجھے اپنی نیم عریانی کا خیال نہ ہوتا تو شاید میں کپڑے

نہ پہنتی۔ باریک گلابی لبادہ اٹھا کر میں نے مسہری سے نیچے پھینک دیا تھا۔ رادھا اور کویتا کے جسموں پر بھی اب لبادوں کی جگہ ساڑھیاں تھیں۔ کویتا وہ لبادہ اٹھا کر لے گئی۔ میں دوبارہ لیٹ گئی اور تیز تیز سانس لینے لگی۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ معلوم نہیں چندر موہن نے مجھے کس نئے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ کل سے وہ کوئی نیا جاپ شروع کرنے والا تھا۔ کیا خبر اس جاپ کا مجھ پر کیا اثر مرتب ہوتا۔

مجھے اس فکر کے ساتھ ساتھ کہ وہاں سے کس طرح راہ فرار اختیار کروں' سرفروش تنظیم کے ارکان کا بھی خیال آ رہا تھا۔ انہیں اب تک یقیناً پتا چل گیا ہو گا کہ میں پُراسرار طور پر کوٹھی سے غائب ہوں۔ ان کے لئے یہ امر حیرت انگیز ہی ہو گا کہ باہر سے تالا لگا ہونے کے باوجود میں کہاں اور کس طرح غائب ہو گئی۔

کمرے میں اب میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگی کیا چندر موہن کو یقین ہے کہ نقاہت کی وجہ سے مجھ میں اٹھنے کی ہمت نہیں ہو گی؟ یہ سوچ کر میں آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی' پھر مسہری سے اتر کے دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ اس کے لئے مجھے اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کرنا پڑی تھی۔

دروازے تک پہنچ کر میں ہانپنے لگی اور رک کے ستانے کو کھڑی ہو گئی اسی لمحے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو میں چونک اٹھی۔

آنے والی رادھا تھی۔ اس نے دور ہی رک کر مجھ سے پوچھا۔ "راجکماری جی! کہاں جا رہی ہیں؟"

"باتھ روم کدھر ہے؟" میں نے بہانہ کیا۔ اس پر میں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ فرار کے لئے راستہ تلاش کر رہی ہوں۔

"میرے پیچھے چلی آئیں۔" وہ میرا مقصد سمجھ گئی۔

میں نے سوچا' اس بہانے میں کمرے سے نکل کر باہر کا جائزہ تو لے ہی سکتی ہوں۔ میں اس کے پیچھے چلنے لگی۔ راہداری میں کچھ ہی فاصلے پر باتھ روم تھا۔

"اندر چلی جائیں۔" رادھا نے مجھ سے کہا۔

"تم جاؤ' میں خود واپس کمرے میں چلی جاؤں گی۔" میں رادھا سے بولی۔

رادھا نے اثبات میں سر ہلایا اور چل دی۔ میں باتھ روم میں جا گھسی۔ کچھ دیر بعد جب میں باہر نکلی تو راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ آگے جا کر وہ راہداری دائیں جانب مڑ گئی۔ میں ہمت کر کے چلتی رہی۔ وہ راہداری دائرے کی صورت تھی۔ گھوم پھر کے میں دوبارہ اسی کمرے کے سامنے پہنچ گئی جس سے نکلی تھی۔ اس دوران نہ مجھے وہ کمرہ نظر آیا جہاں حوض تھا' نہ کوئی اور راستہ دکھائی دیا۔ رادھا اور کویتا مجھے باغ میں بھی لے گئی تھیں لیکن وہاں تک پہنچنے کی راہ بھی میری نظروں سے اوجھل رہی۔ ادھیڑ عمر عورت سیتا اور رادھا' کوئی بھی راہداری کا چکر لگاتے ہوئے مجھے نہیں ملا تھا۔ معلوم نہیں' وہ کہاں چلی گئی تھیں۔ رادھا کو تو کچھ دیر پہلے میں نے خود دیکھا تھا مگر اب وہ بھی غائب ہو چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی جیسے وہاں میرے سوا کوئی نہ ہو۔

میں راہداری کا چکر لگا کے اتنا تھک گئی تھی کہ مسہری تک بڑی مشکل سے پہنچی اور پھر اس پر بے سدھ ہو کر گر پڑی۔ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ کمرے کا دروازہ کیوں بند نہیں کیا گیا تھا۔ اگر میرے لئے وہاں سے فرار ممکن ہوتا تو یقیناً دروازہ اس طرح کھلا نہ چھوڑا جاتا۔

جانے کتنی دیر مجھے اسی طرح پڑے ہو گئی تو سکوت ٹوٹا۔ رادھا اور کویتا ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ مسہری سے خاصے فاصلے پر جو چوکی پڑی تھی' وہ اس پر کھانا لگانے لگیں۔ پانی کا جگ' مخصوص وضع کی صراحی' گلاس وغیرہ انہوں نے سلیقے سے چوکی پر ایک جانب رکھ دیئے تھے۔

"راجکماری جی! کھانا لگا دیا ہے' کھا لیجئے۔" کویتا نے مجھے مخاطب کیا۔

بھوک تو مجھے لگ رہی تھی لیکن بستر سے اٹھ کر چوکی تک جانا دوبھر معلوم ہو رہا تھا۔ پھر بھی میں ہمت کر کے آہستہ آہستہ اٹھ ہی گئی۔

میں نے چوکی کی طرف بڑھنا شروع کیا تو وہ دونوں وہاں سے ہٹ گئیں۔

رات کا کھانا کھا کے ٹہلنا میری عادت میں شامل تھا۔ اس وقت بھی مجھے یہی ضرورت محسوس ہوئی لیکن جسمانی نقاہت کی وجہ سے ایسا نہ کر سکی۔ کھانا کھا کر میں نے جیون رس کی صراحی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ مشروب پی کر میں ایک اور ہی دنیا میں پہنچ جاتی تھی۔ اب تک نارنجی شعاعوں کا حصار ٹوٹ کر نہیں بکھرا تھا۔ شاید ابھی اسی کی ضرورت باقی تھی۔ اسی کی وجہ سے چندر موہن میرے قریب نہیں آ سکا تھا ورنہ تو اس نے رادھا کو یہی بتایا تھا کہ آج کی رات میرے لئے ہے۔

میں مسہری پر آ کر لیٹ گئی تو کویتا نے دریافت کیا۔ "راجکماری جی! اگر کہیں تو بڑی بتیاں بجھا کر چھوٹی بتی جلا دوں؟"

"ہاں چھوٹی بتی جلا دو' اب میں سوؤں گی۔" میں نے جواب دیا حالانکہ ابھی میرا ارادہ سونے کا نہیں تھا کمرے سے نکل کر میں ایک بار پھر وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرنا چاہتی تھی مگر کچھ دیر کے بعد' جب مجھے یقین ہو جاتا کہ جاگنے والے سو چکے ہوں گے۔

میری اجازت پا کر کویتا نے ہلکا نیلا بلب جلا دیا اور پھر رادھا کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ میرا جی چاہا کہ دبے پاؤں ان دونوں کا تعاقب کروں' یہ دیکھوں کہ وہ کہاں جاتی ہیں لیکن میری جو حالت تھی اس میں یہ ناممکن ہی تھا۔ جب تک میں دھیرے دھیرے چل کر دروازے تک پہنچی' وہ دونوں کہیں کی کہیں جا پہنچیں۔ ان دونوں کے قدموں کی چاپ دور ہوتے ہوتے اب معدوم ہو چکی تھی۔ انہیں گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے ایک آشنا زہریلی ہنسی کی آواز سنی۔

"چمپا!" بے اختیار میری زبان پر اس لعنتی عورت کا نام آ گیا جو اپنا داغ داغ چہرہ لئے میرے سامنے کھڑی تھی۔

"ہاں میں' کیا مجھے یہاں دیکھ کر تجھے حیرت ہو رہی ہے؟"

"نہیں بلکہ تیرا داغ داغ دار چہرہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔" میں نے اسے چڑانے کے خیال سے کہا۔

"تیرا کہنا تو یہ تھا کہ داغ مٹ جائیں گے مگر یہ تو ابھی تک موجود ہیں۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ یہ داغ تیز

چتا کے ساتھ ہی جلیں گے' اس سے پہلے ان کا ختم ہونا مشکل ہے۔"

"بددعا دے رہی ہے مجھے۔" اس کی آواز میں غصہ شامل ہو گیا۔ میری باتوں سے شاید وہ واقعی چڑ گئی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے چندر موہن آج کل تجھے منہ نہیں لگا رہا۔ تُو اسی لئے بولائی ہوئی کتیا کی طرح اِدھر اُدھر منہ مارتی پھر رہی ہے۔" میں نے اسے مزید تپایا۔

"اپنے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ رادھا اور کویتا مجھے ابھی بتا رہی تھیں کہ جیون رس پی کر تُو بھی بولا گئی تھی۔" اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا' پھر کہنے لگی۔ "میں تو یہاں بڑے مہاراج کی آگیا (اجازت) سے تیری بے بسی کا تماشا دیکھنے آئی تھی۔ دیکھ لے' بڑے مہاراج نے کس طرح تجھے چیونٹی کی طرح رینگنے پر مجبور کر دیا ہے' کہاں گئی تیری شکتی؟"

"تجھے اگر میری شکتی ہی دیکھنے کا ارمان ہے تو میرے قریب آ کے دیکھ' پھر تجھے خود ہی پتا چل جائے گا کہ کس میں کتنی شکتی ہے۔ تیری تو خیر حیثیت ہی کیا ہے' وہ تیرا گرو بھی میرے قریب آنے کی ہمت نہیں کر سکتا جسے تُو بڑے مہاراج کہتی ہے۔ اگر تجھ میں حوصلہ ہے تو آگے بڑھ۔" میں نے اسے غصہ دلانا چاہا۔

"مجھے تیرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے' میں تو دور رہ کر بھی تجھے ایسے عذاب میں مبتلا کر سکتی ہوں کہ تیرے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔"

"بکواس کرتی ہے تُو' تیرے لئے اتنی ہمت کر لینا بھی کافی ہے کہ تُو آج میرے سامنے ظاہر ہو گئی۔"

"اچھا تو پھر دیکھ۔" چمپا یہ کہہ کر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھنے لگی۔

چند ہی لمحے بعد اسے میں نے دایاں ہاتھ بلند کرتے دیکھا۔ دوسرے ہی پل مجھے اس کے ہاتھ میں مٹی سے بنا ہوا ایک پتلا اور سوئی دکھائی دی۔ سوئی لمبی اور موٹی تھی۔ ایسا ہی اذیت ناک کھیل ایک مرتبہ شمبھو نے بھی میرے ساتھ کھیلا تھا۔ مجھے ناقابل برداشت وہی اذیت یاد آ گئی۔

"میں اگر چاہوں تو تیرا دل چھید ڈالوں' تیری دونوں ٹانگیں چیر دوں' تیری شہ رگ میں یہ سوئی اتاروں لیکن بڑے مہاراج ابھی تجھے زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بڑی مشکل سے تجھے دکھ پہنچانے کی آگیا دی ہے۔" وہ بولی۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود پتلے کے ایک رخسار میں سوئی کی نوک اتار دی۔

مجھے اپنے دائیں رخسار میں تکلیف اور سوئی کی چبھن محسوس ہوئی اور میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

"میں بھی دیکھتی ہوں کہ تُو کب تک اذیت برداشت کرتی ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی اور پھر اس پتلے کے ذریعے میرے جسم کے مختلف حصوں کو نشانہ بنانے لگی۔ "کب تک اسی طرح ہونٹ بھینچے رہے گی........ چیخ۔" اس پر جنون سا سوار ہو گیا۔ سوئی چبھونے کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی۔

آخر میری قوت برداشت جواب دے ہی گئی۔ میں چیخنے لگی اور چمپا وحشیانہ انداز میں قہقہے لگاتی رہی۔

"بس کر چمپا!" اچانک کمرے میں بڑے مہاراج کی آواز گونجی' مگر وہ خود میری نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ "لوٹ آ .... اور یہ نہ بھول کہ کل صبح سے اسے جاپ منڈل میں بھی بٹھانا ہے۔ اسے سو جانے دے تاکہ یہ کچھ آرام کر لے۔"

"کیوں بڑے مہاراج! کیا اپنی چہیتی کی چیخیں سنی نہیں جا رہیں؟ اگر جاپ منڈل ہی میں اسے بٹھانا ہے تو پوتر جل میں اشنان (غسل) کرا دینا' ٹھیک ہو جائے گی۔"

"فضول باتیں نہ کر چمپا!" بڑے مہاراج کی آواز میں سختی آ گئی۔ "واپس آ جا۔"

"اس نے بھی تو میرا چہرہ بگاڑ دیا ہے بڑے مہاراج! مجھے جگہ جگہ سے جلا دیا ہے۔ کچھ تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو جانے دیتے اسے تڑپتے ہوئے دیکھ کر۔"

"نہیں' تجھ سے میں نے جو کہا ہے سو کر۔" بڑے مہاراج نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

"اچھا میں آ رہی ہوں۔" چمپا نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میرے سارے جسم کو اس ظالم عورت نے جگہ جگہ سے چھید ڈالا تھا۔ شدید تکلیف کے سبب میرے منہ سے دیر تک کراہیں نکلتی رہیں۔

"سن معلبہ!" اچانک ایک بار پھر کمرے میں بڑے مہاراج کی آواز گونجی۔ "چمپا تجھ سے انتقام لینے کے لئے پاگل ہوئی جا رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر میں تجھے اس لاذیت سے نجات مل جائے گی۔ میں تیرے پاس آ رہا ہوں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی بڑے مہاراج کو میں نے ظاہر ہوتے دیکھا۔

میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی تو دیکھا' اس کے ہاتھ میں وہی مٹی کا پتلا تھا۔ پتلے کی مٹی میں باریک باریک سوئیاں پیوست تھیں۔

"دیکھ رہی ہے معلبہ کہ چمپا کتنی دیوانی ہو رہی ہے' مجھے اس پر شک تھا کہ وہ میرے کہنے سے لوٹ تو آئی ہے پر تجھے ستانے سے باز نہیں آئے گی۔ میں نے اسی لئے اس پتلے کا سراغ لگایا۔ میں جب یہ ساری سوئیاں نکال دوں گا تو تیری تکلیف ختم ہو جائے گی۔" بڑے مہاراج نے مجھ سے کہا' پھر سوئیاں نکالنے لگا۔

"چندر موہن! کیا تیری منہ زور داسی تیرے قابو میں نہیں ہے؟" میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بھی تیری ہی طرح بہت دن تک میری چہیتی رہی ہے۔ میں اس کی یہ خوش فہمی ختم کرنا نہیں چاہتا کہ اب بھی وہ پہلے ہی کی طرح میری چہیتی ہے۔"

جیسے جیسے چندر موہن سوئیاں نکالتا جا رہا تھا میری تکلیف کم ہوتی جا رہی تھی پھر ساری سوئیاں نکل گئیں۔ اسی کے ساتھ میری تکلیف بالکل ختم ہو گئی۔

"تو کس جاپ کی تیاری کر رہا ہے چندر موہن!؟" میں نے موقع غنیمت جان کر پوچھ لیا۔

"چالیس دن کا جاپ ہے۔" وہ بتانے لگا۔ "روز تجھے اس کے لئے کئی گھنٹے تک جاپ منڈل میں بٹھاؤں گا۔ یہ درگا دیوی کا جاپ ہے۔"

"مگر اس سے ہو گا کیا؟" میں نے اسے کریدا۔

"جاپ مکمل ہوتے ہی تو میری مطیع ہو جائے گی اور میرا ہر آدیش (حکم) مانے گی۔"

"اور اگر تیرا جاپ پورا نہ ہو سکا تو؟" میں نے سوال کیا۔

"بھگوان نہ کرے کہ میرا جاپ ادھورا رہ جائے۔" وہ بول اٹھا۔ "ایسی بات منہ سے کیوں نکالتی ہے معلبہ! ابھی تو جاپ شروع بھی نہیں ہوا۔"

"پھر بھی معلوم تو ہو کہ جاپ پورا نہ ہونے سے کیا ہو جائے گا؟" میں کچھ پوچھنے پر بضد رہی۔

"تو مجھے اس کا پرائشچت (کفارہ) ادا کرنا پڑے گا۔"

"وہ کفارہ کیا ہو گا؟"

"سبھی کچھ جان لینا چاہتی ہے ابھی۔" وہ مسکرایا۔ "صبح تجھے کئی گھنٹے ایک ہی حالت میں بیٹھنا ہے اس لئے سو جا اب اور سن! تیرے من میں اگر یہ ہے کہ تو یہاں سے کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گی تو یہ ناممکن ہے۔ بلاسبب گھوم پھر کے اپنے آپ کو نہ تھکا۔" بڑے مہاراج کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

اس کے معنی خیز لہجے سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ میری نقل و حرکت سے بے خبر نہیں ہے۔ میں جواب میں کچھ نہیں بولی اور وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شدید اذیت سے نجات مل گئی تو سکون کے احساس نے میری پلکوں پر نیند کا بوجھ بڑھا دیا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اٹھ کر ایک بار پھر باہر کا جائزہ لوں گی کہ شاید فرار کی کوئی راہ نکل ہی آئے مگر اب مجھے یہ کوشش فضول معلوم ہو رہی تھی۔ چندر موہن مجھے اتنا بے وقوف نہیں لگتا تھا کہ میں باآسانی اس کے جال سے نکل جاتی۔ یہی سوچ کر میں سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆======☆======☆

صبح میری آنکھ کھلی تو کویتا نے مسہری کے قریب ایک لوٹے میں پانی لا کے رکھ دیا۔ اسی کے ساتھ ایک بڑی سی پرات بھی تھی۔

"راجکماری! آپ اس پرات میں منہ دھو لیں۔" کویتا نے مجھے مخاطب کیا۔

"پہلے میں باتھ روم جاؤں گی۔" میں بولی۔

"ٹھیک ہے' ہو آئیں' آ کر منہ ہاتھ دھو لیجئے گا۔"

"آج نہانا نہیں ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "منہ ہاتھ دھو کر آپ کپڑے اتار کے یہ نمن وس تر (زیر جامہ) پہن لیجئے گا۔" کویتا کے ہاتھ میں مجھے بالائی اور زیریں جسم کے مخصوص حصے چھپانے کے لئے دو مختصر سے کپڑے نظر آئے۔ وہ مزید کہنے لگی۔ "میں انہیں آپ کے بستر پر رکھ دوں گی۔" اسے شاید مسہری سے

میرے اٹھنے کا انتظار تھا۔

"لیکن کیوں، میں کپڑے اتار کے صرف زیر جامہ نہیں پہنوں گی۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "میرا جسم نمائش کے لئے نہیں ہے۔"

"بڑے مہاراج کا یہی آدیش (حکم) ہے راجکماری جی اور ان کے آدیش کا پالن کرنا ہمارا دھرم ہے۔" کویتا نے مجھے نرمی کے ساتھ سمجھانا چاہا۔

"تمہارا دھرم ہو گا، اس کا حکم ماننا میرا نہیں۔" میں یہ کہتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھی۔ میرے ذہن سے اس وقت یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ مجھے معذوری کی حد تک نقاہت میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں پھر بستر پر گر پڑی۔ مجھے سہارا لے کر یا آہستہ آہستہ اٹھنا چاہئے تھا۔

"کیا ہوا راجکماری جی! آپ ٹھیک تو ہیں؟" کویتا فکرمند سی ہو گئی۔

"کچھ نہیں، ٹھیک ہوں میں۔" یہ کہہ کر دوبارہ دھیرے دھیرے اٹھی۔ اب مجھے اپنی جسمانی حالت کا احساس ہو چکا تھا۔

باتھ روم سے لوٹ کر آنے کے بعد کچھ دیر سستا کر میں نے منہ دھویا اور پھر مسہری کے سرہانے رکھے ہوئے زیر جامے کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔

"اٹھا لو انہیں، میں نہیں پہنوں گی۔" میں نے غصے کے عالم میں کویتا سے کہا جو لوٹا اور پرات اٹھا رہی تھی۔

کویتا وہاں سے چلی گئی تو میں نے چمپا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ آتے ہی بولی۔ "ارے ابھی تک تُو جاپ کے لئے تیار نہیں ہوئی۔"

"مجھے جاپ واپ سے کوئی دلچسپی نہیں، دفع ہو جا یہاں سے۔" چمپا کو دیکھ کر میرا غصہ اور بڑھ گیا۔

"لگتا ہے کہ تُو رات کی تکلیف بھول گئی ہے۔ بڑے مہاراج آ کر تجھے اس اذیت سے نہ بچا لیتے تو رات بھر تُو تڑپتی ہی رہتی، اچھا اب نخرا چھوڑ اور جلدی سے نمن وس تر (زیر جامہ) پہن لے، مجھے بڑے مہاراج نے بھیجا ہے کہ تجھے جاپ منڈل میں لے آؤں۔" چمپا نے جھک کر فرش پر پڑے دونوں کپڑے اٹھا کے میری طرف پھینک دیئے۔

"جاپ منڈل میں بیٹھنے کے لئے تن پر کم سے کم کپڑے ہونا لازمی ہیں۔ اگر کپڑے بالکل نہ ہوں تو اور بھی اچھا ہے۔ بڑے مہاراج سے میں نے یہی کہا تھا کہ نمن وس تر کی بھی کوئی ضرورت نہیں، پر کہنے لگے تُو اس پر سوئی کرت (رضامند) نہیں ہو گی۔ مجھے خبر ہے کہ بڑے مہاراج تیرا بڑا آدر (لحاظ) کرتے ہیں۔"

بڑے مہاراج چندر موہن کو یقیناً یہ اندیشہ ہو گا کہ میں صرف زیر جامہ پہنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی اس نے اسی لئے چمپا کو بھیجا تھا کہ وہ مجھ پر سختی کر سکے۔

"اور تُو یہ کس سے اپنا تن چھپا رہی ہے، مجھ سے کہ بڑے مہاراج سے۔ ہم سے بھلا تیرا کیا چھپا گیا ہے۔" چمپا تضحیک آمیز انداز میں ہنسی۔

"تُو بڑی بے غیرت اور ذلیل عورت ہے۔" میں اسے بُرا بھلا کہنے لگی۔

"اس وقت تیری غیرت کہاں چلی گئی تھی جب جیون رس پی کر تُو رادھا اور کویتا کے ساتھ........." چمپا نے ناشائستہ الفاظ استعمال کئے، پھر دوبارہ زیر جامہ پہننے پر اصرار کرتے ہوئے بولی۔ "اگر تُو نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو رات ہی کی طرح پھر تجھے چیخنے چلانے پر مجبور کر دوں گی۔" اس نے دھمکی دی۔

میں جان گئی کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائے گی۔ اسے تو مجھ پر تشدد کرنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ پھر وہ یہ موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔ میں نے اسے زیر لب کچھ پڑھتے دیکھ لیا تھا۔ میں اسی لئے تیز آواز میں بول اٹھی۔ "باز آ جا کمینی! پہن رہی ہوں میں زیر جامہ۔"

"ڈر گئی ناسزا سے۔" وہ کریہہ انداز میں ہنس پڑی۔

پھر میں نے زیر جامہ پہن لیا۔ جو کپڑے اتارے تھے، وہ میں نے وہیں مسہری پر ڈال دیئے تھے۔

"مجھے تو ڈر ہے کہ تجھے اس حالت میں دیکھ کر بڑے مہاراج جاپ کا منتر پڑھنا ہی نہ بھول جائیں۔" وہ میرے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "اچھا چل، اب میرے پیچھے آ جا........." وہ مڑی۔

"مگر ابھی تو میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔" میری آواز میں احتجاج تھا۔

"بھول جا ناشتے کو اب، سورج ڈوبنے سے پہلے تجھے کچھ بھی کھانے پینے کو نہیں ملے گا۔ آج سے تُو ورت دھاری (روزہ دار) ہے۔ چالیس دن ورت رکھنا ہے تجھے، جب تک کہ درگا دیوی کا یہ جاپ (وظیفہ) پورا نہ ہو جائے۔" وہ مڑ کر بولی اور پھر دوبارہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

چندر موہن پورے چالیس دن تک زبردستی دن بھر مجھے بھوکا رکھنا چاہتا تھا، مگر میں مجبور تھی۔ زبردست مارے اور رونے نہ دے والی بات تھی۔

کمرے سے نکل کر چمپا راہداری میں آئی تو سامنے ہی راستہ دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ رات کو وہ راستہ وہاں نہیں تھا۔ مختصر سے اس راستے کے آخر میں چند سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان سیڑھیوں سے اتر کر کچھ ہی دور بڑا سا دروازہ نظر آیا۔ ادھر میں پہلی بار آئی تھی۔ دروازے کے اندر سے گھنٹا بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ چمپا اس وقت مجھ سے چند قدم آگے تھی۔ معاً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر میں ہمت کر کے چمپا پر جھپٹ پڑوں تو وہ نادیدہ نارنجی شعبوں کی زد میں آ جائے گی۔ اس طرح مجھے کم از کم اپنے ایک دشمن سے تو نجات مل ہی جاتی۔ اس کے لئے میرا چمپا کے قریب پہنچ جانا ہی کافی ہوتا۔

میں اپنے جسم کی ساری قوت صرف کر کے اس پر جھپٹی ہی تھی کہ اچانک بڑے مہاراج کی آواز سنائی دی۔ "بھاگ چمپا!"

میری اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود میں بھی اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ زمین پر گر کے میں بُری طرح ہانپنے لگی جیسے میلوں سے دوڑتی آئی ہوں۔ چمپا کا بے حس و حرکت جسم مجھ سے کچھ فاصلے پر دروازے کے بیچوں بیچ پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ہمت کی۔ چمپا یقیناً بے ہوش ہو چکی تھی۔ ایسی

حالت میں مجھے قریب آتے دیکھ کر وہ بھاگ بھی نہ پاتی۔ میں کہنیوں کے بل گھسٹتی ہوئی آگے بڑھی۔ اسی وقت میں نے دروازے میں بڑے مہاراج کو دیکھا اور میری ہمت جواب دے گئی۔ ظاہر ہے کہ بڑے مہاراج کی موجودگی میں چمپا کو نقصان پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ وہ چمپا کی طرف سے غافل نہیں رہا تھا۔

"معبلہ! یہ تُو نے کیا کر دیا؟" بڑے مہاراج نے مجھے مخاطب کیا۔ "کیوں اسے اپنی جان کا دشمن بنا رہی ہے؟ مجھے ڈر ہے کہ تیری وجہ سے یہ بھی شمبھو کی طرح ایک دن باغی نہ ہو جائے۔ کب تک یہ میرے آدیش کا پالن (تعمیل حکم) کرتے ہوئے تجھ سے انتقام نہیں لے گی۔"

"نہ یہ لعنتی عورت میری ہمدرد ہے نہ تُو میرا خیرخواہ ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں ہی کو میں اپنا دشمن سمجھتی ہوں اور دشمن کو ٹھکانے لگانا کوئی بری بات نہیں۔ اپنی جان بچانے کی خاطر دشمن کو مار دیا جائے تو میں اسے جائز سمجھتی ہوں۔" بڑے مہاراج کو باتوں میں لگا کر میں نے اب آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا' مگر وہ بھی ایک ہی عیار تھا۔ چونک کر اس نے مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔

"بڑا زہر بھرا ہے تیری نس نس میں۔" یہ کہتے ہی وہ جھکا اور چمپا کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھاتے ہی غائب ہو گیا۔

میں رکی نہیں اور آہستہ قدمی سے اس دروازے میں داخل ہو گئی جہاں ذرا ہی دیر پہلے بے ہوش چمپا بے خبر پڑی تھی۔

وہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کے آخر میں ایک بلند چبوترے پر ہندوؤں کی درگا دیوی کا بت رکھا ہوا تھا۔ چبوترے پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر چھت سے ایک بڑا گھنٹا لٹک رہا تھا۔ میں نے شاید اسی کے بجنے کی آواز سنی تھی۔ وہیں چبوترے کے سامنے ایک پختہ گڑھے میں آگ جل رہی تھی۔

مختلف مذاہب کا مطالعہ کرتے ہوئے میں ہندو مذہب کے متعلق بھی بہت کچھ پڑھ چکی تھی۔ مجھے اسی سبب درگاہ دیوی کے بارے میں بھی علم تھا۔ ہندوستان بھر میں یہ دیوی مختلف ناموں سے مشہور تھی۔ بنگال میں یہ کالی مائی کہلاتی تھی۔ کہیں اس کا نام کالکا اور کہیں اسی کو بھوانی کہا جاتا تھا۔ اس کے متعلق یہ روایت بھی تھی کہ یہ وشنو دیوتا کی بیوی ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک دنیا کا پہلا مرد' وشنو اور پہلی عورت درگا ہے جس طرح مسلمانوں کے عقائد کی رو سے آدمؑ و حواؑ ہیں۔ ہندو اسی دیوی کے نام سے ہر سال ایک تہوار بھی مناتے ہیں جو "درگا پوجا" کہلاتا ہے۔ اس دیوی کو ہندو قہر و غضب کی دیوی تصور کرتے ہیں۔ اس کے قہر سے بچنے کی خاطر نذر بھی دی جاتی ہے۔ بعض قدیم مندروں میں نذر گزارنے کے لئے قربان گاہیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ یہاں بکرے کو کھڑا کر کے اس طرح اس کا سر قلم کیا جاتا ہے کہ خون کے چھینٹے درگا دیوی کے بت پر پڑیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ متعصب ہندو زندہ انسانوں کی نذر بھی دیتے ہیں۔ انسانوں کو بھی جانوروں کی طرح درگا دیوی کے بت کے سامنے کھڑا کر کے کسی تیز دھار چھرے سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ گردن اس طرح کاٹی جاتی ہے کہ خون کی پھوار بت کے اوپر پڑے۔ اس کے لئے کٹی

ہوئی گردن سے ابلتے ہوئے خون کا رخ بت کی طرف کر دیا جاتا ہے۔ ہندو اپنی دیوی کے حضور دوسرے مذاہب کے لوگوں' خصوصاً مسلمانوں کی قربانی دیتے ہیں۔ اس روایت کو کچھ ہندو پنڈتوں نے ضعیف بھی قرار دیا ہے اور لکھا ہے' یہ غلط ہے۔ اس طرح جو لوگ ہندو مسلم اتحاد نہیں چاہتے' ان کو فائدہ پہنچتا ہے۔ مہذب دنیا میں بھی غیر مہذب پہاڑی بستیوں کے باشندوں کی طرح دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔ اس پوجا میں اگر وحشیانہ رسم و رواج کو بھی دخل تھا تو یہ کوئی ناقابل یقین بات نہیں تھی۔ ایک پہاڑی بستی تریال میں خود مجھے ناگ دیوتا پر قربان کیا جانے والا تھا۔ مجھ سے پہلے چھ معصوم بچے قربان کئے جا چکے تھے۔ میری قربانی ساتویں تھی۔ یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے جس کا میں تفصیلی ذکر پہلے کر چکی ہوں۔ دیوی دیوتا کو خوش کرنے کے لئے انسانی قربانی میرے مطالعے کے مطابق عہد قدیم سے جاری تھی۔

میں ابھی اس ہال کا جائزہ لے رہی تھی کہ اچانک گھنٹا بجنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک اٹھی اور مڑ کے دیکھا۔ چندر موہن گھنٹے کے نیچے کھڑا تھا۔ وہ چمپا کو یقیناً کسی محفوظ جگہ چھوڑ آیا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے کہا۔ "معبلہ! چبوترے کی ساتویں سیڑھی پر چڑھ کے اس طرح بیٹھ جا کہ تیرا منہ میری طرف رہے۔" پھر وہ اس پختہ گڑھے کے سامنے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا جس میں آگ جل رہی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولا۔ "جس طرح میں بیٹھا ہوں' تجھے اسی طرح آسن مار کے چبوترے کی ساتویں سیڑھی پر بیٹھنا ہے۔ جلدی کر پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"چندر موہن! تُو مجھے بتا چکا ہے کہ اس جاپ سے تیرا کیا مقصد ہے۔ تُو اس طرح مجھے اپنا مطیع و فرماں بردار بنانا چاہتا ہے تاکہ میں تیرے کسی بھی حکم کو ماننے سے انکار نہ کر سکوں۔ بول' تُو یہی چاہتا ہے نا؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر چبوترے کے نیچے کھڑی تھی۔

"ہاں میں یہی چاہتا ہوں لیکن تُو اس سے یہ بات کیوں دہرا رہی ہے؟"

"اس لئے چندر موہن کہ میں تیری مطیع بننا نہیں چاہتی۔"

"کیا مطلب ہے اس سے تیرا؟ تیرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہو گا تو وہی جو میں چاہوں گا۔" اس کی آواز میں سختی آ گئی۔

"اس وقت ہو گا نا جب میں تجھ سے تعاون کروں گی۔" میری آواز میں چبھن تھی۔ "میں کیوں تیرا ساتھ دوں اور کیوں تیرے کہنے پر عمل کروں۔"

میری بات سنتے ہی وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگا پھر وہ غرایا۔ "میرے کہنے پر عمل نہ کرنا بھی تیرے اختیار میں نہیں' کیا تجھے یہ خیال بھی نہیں کہ اس سمے تیرا جیون میرے اختیار میں ہے؟ میں درگا دیوی کے چرنوں (قدموں) میں تجھے قربان بھی کر سکتا ہوں اور تجھے کسی ایسے عذاب میں بھی مبتلا کرنا میرے بس میں ہے کہ تُو موت کی تمنا کرنے لگے اور تجھے موت نہ آئے۔ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ اور محسوس کر کہ تجھے موت کے گھاٹ اتار دینا میرے لئے کتنا آسان ہے۔"

میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تیزی سے کچھ پڑھ رہا ہے۔ وہ جو کچھ پڑھ رہا تھا' نہ پڑھ سکے' اس خیال سے میں حتی الامکان تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھی پھر میں اس کے قریب پہنچنے ہی والی تھی کہ وہ میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ وہ جو شیطانی عمل بھی کر رہا تھا' اس میں کوئی خلل نہیں چاہتا ہو گا اسی لئے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد کچھ فاصلے پر میں نے اسے پھر ظاہر ہوتے دیکھا۔ اب بھی اس کے ہاتھ میری ہی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

گزشتہ روز ہی کی طرح اس نے اپنے ہاتھوں کو نیچے سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اٹھ۔"

دوسرے ہی لمحے اپنے جسم کو میں نے فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ اس نے ہاتھوں کو اور اوپر کیا۔ میں اب چبوترے کے اوپر رکھے ہوئے بت کے قریب بلند ہو چکی تھی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو مخصوص انداز میں حرکت دینا شروع کی۔ اسی کے ساتھ میرا جسم فضا میں قلابازیاں کھانے لگا۔ اس کے بعد میں نے خود کو انتہائی تیزی کے ساتھ سر کے بل نیچے آتے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سر پوری قوت کے ساتھ زمین سے ٹکرا جائے گا۔ میں نے خوف کے سبب آنکھیں بند کر لیں۔ چندر موہن نے جو کچھ کہا تھا' اس کا عملی مظاہرہ کر رہا تھا۔ جس تیزی کے ساتھ میں سر کے بل زمین سے ٹکرانے والی تھی' اسی تیزی کے ساتھ میرا جسم اوپر اٹھنے لگا۔ میں چند ہی لمحوں میں ہال کی چھت تک پہنچ گئی۔ چندر موہن نے اسی طرح دو تین مرتبہ کیا اور پھر میرے جسم کو چبوترے کی ساتویں سیڑھی پر آہستگی سے رکھ دیا۔ میری دونوں ٹانگیں جیسے خود بخود مخصوص انداز میں مڑ کر اسی طرح ہو گئی تھیں جس طرح کچھ دیر پہلے چندر موہن نے مجھ سے بیٹھنے کو کہا تھا۔

"تُو نے دیکھ لیا میرا چمتکار (کرامت' کمال) کتنا آسان تھا میرے لئے تجھے قتل کر دینا؟ تیرا سر پوری طاقت کے ساتھ زمین سے ٹکراتا پھر تیرا بھیجا کھوپڑی سے نکل کر زمین پر بہنے لگتا۔ اسی کو شکتی کہتے ہیں معبلہ! تُو کہہ رہی تھی کہ میرے کہنے پر عمل نہیں کرے گی۔ بول' کیا تُو میری نافرمانی کر سکی؟"

"لیکن میں تو اب بھی چبوترے سے اتر سکتی ہوں' تُو مجھے کیسے روکے گا؟"

"یہ بھی ابھی بتا دیتا ہوں تجھے' تُو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکے گی۔" چندر موہن نے کہا اور پھر دوبارہ وہ کوئی عمل کرنے لگا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میں نے بین کی آواز سنی۔ اسی کے ساتھ سرسراہٹیں ابھریں۔ سانپوں کے چار جوڑوں کو میں نے تیزی سے چبوترے کی طرف بڑھتے دیکھا۔

"اب ناگ دیوتا کے یہ ہرکارے تیری چاروں اور (طرف) پہرا دیں گے۔" چندر موہن کے لہجے میں فخر تھا۔ "اب دیکھتا ہوں تُو کس طرح اپنی جگہ سے ہلتی ہے؟"

اسی لمحے میں نے خلاف توقع نارنجی شعاعوں کو نمودار ہو کر فضا میں بلند ہوتے اور ٹوٹ کر بکھرتے دیکھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ میرے خیال میں یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ میں ابھی خطرے میں تھی۔ حفاظتی حصار کو ابھی میرے گرد قائم رہنا چاہئے تھا مگر وہ حصار نہ مرضی سے قائم ہوا تھا اور نہ اسے توڑنے کا مجھے اختیار تھا۔ وہ تو خطرے کے وقت خود ہی نمودار ہو گیا تھا اور اب خود ہی ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ میرے

ذہن میں ایک اندیشہ یہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں چندر موہن کے شیطانی عمل کے نتیجے میں تو حصار نہیں ٹوٹ گیا؟ میں ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ سانپوں کے چار جوڑے سیڑھیوں پر چڑھ کر میرے قریب پہنچ گئے۔ معاً مجھے خیال آیا کہ اگر اس وقت میرے گرد حصار قائم ہوتا تو سانپ ہرگز قریب نہ آ پاتے۔ بڑے مہاراج نے جو دعویٰ کیا تھا کہ وہ سانپ میرے چاروں طرف پہرا دیں گے' غلط ثابت ہوا۔ اسے یقیناً یہ علم نہیں تھا کہ سانپ تو بچپن سے میرے گلے کا ہار بنتے آئے ہیں۔ ان سے بھلا میں کس طرح خوفزدہ ہو سکتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ سانپوں کا ایک جوڑا میرے گلے سے لپٹ گیا۔ دوسرے جوڑے نے میری کمر سے لپٹ کر اظہار عقیدت شروع کر دیا۔ بقیہ دو جوڑے میرے دائیں اور بائیں بازوؤں سے لپٹ گئے۔ اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن کو روشن کر گیا۔ ان سانپوں کی میرے پاس موجودگی میں بھی تو کوئی قریب آنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا' گویا وہ سانپوں کے جوڑے میرے لئے حصار کانعم البدل ثابت ہو سکتے تھے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکنیں اعتدال پر آ گئیں۔ آٹھ سانپ میرے جسم سے لپٹے ہوئے تھے اور میں اطمینان سے بیٹھی تھی۔ وہ سانپ میرے لئے عذاب کی بجائے ثواب بن گئے تھے۔

"چندر موہن! تیری چال تو خود تجھی پر الٹ گئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے بڑے مہاراج کو مخاطب کیا۔ "ناگ دیوتا کے یہ ہرکارے تو میرے مطیع بن گئے۔"

میں نے چندر موہن کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی دیکھیں۔ جو کچھ ہوا تھا' یقیناً اس کی توقع کے خلاف تھا ورنہ وہ اس قدر حیرت زدہ نہ ہوتا۔

"معبلہ! کہیں .... کہیں تیری شکتی تو نہیں جاگ اٹھی؟" اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہو۔ "پرنتو (لیکن) یہ .... یہ کیسے ہو سکتا ہے' میں نے تو تیری شکتی کو تیرے شریر میں گہری نیند سلا دیا تھا پھر .... پھر بھی معبلہ! تیرا وار کارگر رہا اور .... اور اب ناگ دیوتا کے ہرکارے بھی پہرا دینے کی بجائے تیری رکھشا (حفاظت) کر رہے ہیں۔ ہے درگا مائی! اپنے جاپ میں پڑ جانے والی اس ارچن (رکاوٹ) کو دور کر دے۔" چندر موہن نے دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا دیوی سے فریاد کی۔

"تُو بھی کیسا پاگل ہے چندر موہن کہ پتھر کی اس مورتی کے سامنے فریاد کر رہا ہے جو نہ کچھ سن سکتی ہے' نہ بول سکتی ہے۔"

"چپ ہو جا ناستک (لامذہب) دیوی کا اپمان (توہین) کرے گی تو جلا کے بھسم کر دوں گا۔" وہ چیخ اٹھا۔

اسی وقت مجھے ایک اور شرارت سوجھی' اس طرح وقتی طور پر چندر موہن ضرور بوکھلا جاتا۔ اسی کے ساتھ ایک امکان یہ بھی تھا کہ میرا وار کارگر ہو جاتا۔ میں نے اسی خیال کے تحت اپنے بائیں بازو سے لپٹے ہوئے ایک سانپ کو الگ کیا۔ ظاہر میں نے یہی کیا کہ سانپ سے کھیل رہی ہوں پھر اچانک میں نے سانپ کو چندر موہن کے اوپر پھینک دیا۔ وہ عیار شاید اتنی جلدی مرنے والا نہیں تھا۔ سانپ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحے بعد جب وہ ظاہر ہوا تو مجھے اس کی اطراف نیلے رنگ کا

حصار دکھائی دیا۔ اس کے چہرے سے شدید غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ سانپ زمین پر گرنے کے بعد ایک بار پھر چبوترے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"معبلہ! تُو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گی؟" وہ غصے سے چیخا۔

"تُو اپنا جاپ شروع تو کر' میں یہاں بیٹھی تو ہوں۔"

"میں نے جاپ شروع کر دیا اور تُو چبوترے سے اتر آئی تو؟"

"تو کیا ہو جائے گا؟" میں دانستہ جاپ کے عمل اور ردعمل کے متعلق اس کی زبان کھلوانا چاہتی تھی۔

"ایک بار اگر جاپ شروع کر دیا جائے تو اسے ہر حال میں پورا ہونا چاہئے ورنہ پرائشچت (کفارہ) کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔"

"کیا کفارہ ادا کرنا پڑے گا تجھے' کچھ معلوم تو ہو۔"

"دیوی کو خوش کرنے کے لئے بلیدان (قربانی) دینا ہو گا۔ کسی آدمی کو بلی چڑھانا ہو گا۔ اب سمجھی تُو؟ یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔" آخر وہ کھل ہی گیا۔

"بڑا ہی درندہ ہے تُو! آدمی کی قربانی دے گا۔" میں نے اسے اور چڑایا۔

"ہو سکتا ہے کہ مجھے تیرا ہی بلیدان کرنا پڑے۔" وہ دانت پیس کر بولا۔

"کیا تُو مجھ سے ڈر گیا ہے چندر موہن کہ اپنے گرد حصار کھینچ رہا ہے؟ میں تجھے اتنا بزدل نہیں سمجھتی تھی۔"

"میں تیری باتوں میں آ کر پری دھی (حصار) سے باہر نہیں نکلوں گا۔ میں جان رہا ہوں کہ تُو مجھے اس لئے پری دھی سے باہر لانا چاہتی ہے کہ پھر ناگ دیوتا کے کسی ہرکارے کو مجھ پر چھوڑ دے۔ تُو بڑی ونچک (عیار) ہے۔"

"اچھا تُو جاپ شروع نہیں کر رہا تو پھر میں چلتی ہوں۔" میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس دوران وہ سانپ دوبارہ میرے بائیں بازو سے آ کر لپٹ گیا تھا جو میں نے چندر موہن کے اوپر پھینکا تھا۔ میں سیڑھیاں اترنے لگی۔

"رک جا معبلہ!" وہ زور سے بولا۔

"تُو روک سکے تو مجھے روک لے۔" میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"دیکھ مجھے غصہ نہ دلا ورنہ تجھے پچھتانا پڑے گا۔" اس نے مجھے دھمکی دی۔

دھمکی کے باوجود مجھے اس کی آواز میں بے بسی معلوم ہو رہی تھی۔ میں اسی لئے نہیں رکی اور سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آ گئی۔

"نہیں مانے گی تُو' ٹھیک ہے کل سہی۔ آج ویسے بھی تُو نے بہت دیر لگا دی ہے۔" اس نے گویا ہتھیار ڈال دیئے۔

☆======☆======☆

اسی کے آشرم میں ہونے کے باوجود ایک طرح سے یہ میری جیت ہی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس کے گرد قائم حصار سے بہرحال میں بچ کر چلی تھی۔ ہال کے دروازے سے نکل کر میں اسی راستے سے واپس چل دی جس سے چمپا کے پیچھے چلتی ہوئی وہاں پہنچی تھی۔ اپنے کمرے کے سامنے پہنچ کر معاً میں نے مڑ کر دیکھا۔ راستہ غائب ہو چکا تھا۔ عقب میں سپاٹ دیوار نظر آ رہی تھی۔ کچھ سوچ کر میں پلٹی اور دیوار تک پہنچ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے دیوار کو چھونا چاہا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ دیوار واقعی موجود ہوتی تو میرا ہاتھ اس سے ضرور ٹکراتا۔ مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی کہ دیوار کا نظر آنا فریب نظر تھا۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ دیوار مجھے بدستور نظر آ رہی تھی اور میں اس کے اندر سے گزر سکتی تھی۔ میں دیوار سے گزر کر جیسے ہی ذرا آگے بڑھی اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ وہاں سیڑھیاں دیکھی تھیں۔ سیڑھیاں مجھے گھپ اندھیرے کی وجہ سے نظر نہیں آ سکی تھیں۔ میں اٹھی اور اندھیرے میں اندازے سے پیر آگے بڑھا کر سیڑھی پر رکھا اور مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ ذرا ہی دیر کے بعد میں دوبارہ اپنے کمرے کے سامنے موجود راہداری میں آ گئی۔ میں نے بہرحال ایک راستہ تو تلاش کر ہی لیا تھا۔ اندھیرے میں مزید آگے بڑھنے سے میں نے گریز کیا تھا۔ میرے خیال میں وہ اندھیرا بھی فریب نظر ہی تھا ورنہ اس ایک راستے کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہاں مزید راستے بھی تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ موقع ملتے ہی دوسرے راستے ضرور تلاش کر لوں گی۔ اس کے لئے دن کی بجائے رات کا وقت زیادہ مناسب تھا۔

میں نے کمرے میں قدم رکھا تو وہاں ادھیڑ عمر داسی سیتا' رادھا اور کویتا تینوں ہی موجود تھیں۔ میرے جسم سے سانپوں کو لپٹے ہوئے دیکھ کر وہ تینوں ہی اچھل پڑیں۔

"ہے پربھو! دیا کر۔" سیتا بے اختیار بول اٹھی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سر جھکا کر دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور بولی۔ "پرنام ناگ دیوتا!"

سیتا ہی کی تقلید رادھا اور کویتا نے بھی کی۔ اس کے بعد کویتا مرعوب سے لہجے میں کہنے لگی۔ "سیتا مائی! اپنی راجکماری جی تو مجھے ناگ دیوتا کی چہیتی لگتی ہیں۔"

"تُو ٹھیک ہی کہتی ہے کویتا!" سیتا نے تائید کی۔ "بھلا اپنے بڑے مہاراج کسی ایسی ویسی استر (عورت) سے تو وواہ (شادی) نہیں کر سکتے نا!"

میں ان کی باتوں کو سنی ان سنی کرتی ہوئی آگے بڑھ کر مسہری تک پہنچ گئی۔ میرے اتارے ہوئے کپڑے ابھی تک مسہری کے سرہانے رکھے تھے۔ ہاں انہیں تہہ ضرور کر دیا گیا تھا۔ سانپوں کو میں نے اپنے جسم سے جدا کر کے مسہری پر چھوڑ دیا اور کپڑے پہن لئے۔

"کویتا! آج چندر موہن نے جاپ شروع نہیں کیا' سو کچھ کھانے کو لے آ' مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"جی راجکماری جی! بڑے مہاراج ہمیں بتا چکے ہیں۔" کویتا نے بتایا۔

"کب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی آپ کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے۔" کویتا نے جواب دیا۔ "وہ سویم (خود) تو نہیں آئے تھے' پر ان کی آواز ہم نے سن لی تھی۔"

میرے لئے یہ اب نئی بات نہیں رہی تھی۔ چندر موہن ایسے بہت سے کرتب مجھے دکھا چکا تھا۔ پھر کویتا کمرے سے نکل کر چلی گئی۔ وہ سانپ جہاں میرے لئے حفاظت کا سبب تھے' وہیں الجھن کا باعث بھی تھے۔ وہ پھر میرے جسم کے مختلف حصوں سے لپٹ گئے تھے۔

ذرا ہی دیر میں کویتا ایک تھالی اٹھائے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسی دوران رادھا نے چوکی پر صراحی اور گلاس لا کے رکھ دیئے تھے' مگر یہ صراحی مٹی ہی کی تھی۔ جیون رس والی صراحی چاندی کی تھی۔ میں نے رادھا سے خود ہی وہ صراحی لانے کو منع کر دیا تھا۔

کھانا کھانے کے لئے چوکی پر بیٹھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر میرے جسم سے لپٹے ہوئے وہ سانپ کسی طرح چوکی کے گرد بیٹھ جائیں تو زیادہ بہتر ہو۔ اس طرح کوئی میرے نزدیک بھی نہ آتا اور میری حفاظت کا مقصد بھی پورا ہو جاتا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ میں چونک اٹھی۔ میں نے اپنے جسم سے لپٹے ہوئے سانپوں کو تیزی کے ساتھ چوکی سے اترتے ہوئے دیکھا۔ ایک ایک جوڑا چوکی کی چاروں سمت میں بیٹھ گیا۔ سبھی پھن کاڑھے بڑے چوکنا سے بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی کو قریب نہیں آنے دیں گے۔ اپنی خواہش کو یوں عملی جامہ پہنتے دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ سانپ میرا جسم چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ وہاں موجود تینوں داسیاں بھی سانپوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"دیکھا رادھا! ناگ دیوتا اپنی چہیتی کی کس طرح رکھشا (حفاظت) کر رہے ہیں۔" کویتا کی آواز ابھری۔

کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے مجھے سانپوں کا خیال آیا کہ وہ بھی بھوکے ہو سکتے ہیں۔ یہی سوچ کر میں نے کویتا سے ان سانپوں کے لئے کسی بڑے برتن میں دودھ لانے کو کہا۔ ان کے لئے دودھ آنے سے پہلے مجھے خود کھانا اچھا نہیں لگا۔ کویتا کھلے منہ کے ایک برتن میں دودھ لے آئی اور برتن چوکی کے قریب رکھ دیا تو ایک بار پھر مجھے شدید حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ تمام سانپوں نے ایک ساتھ دودھ نہیں پیا تھا۔ چار سانپ پہلے گئے اور دودھ پینے لگے۔ بقیہ چاروں سانپ بدستور چوکی کے گرد گویا پہرا دیتے رہے۔ جب چاروں دودھ پی کر لوٹ آئے تو بقیہ چار سانپ دودھ کے برتن کی طرف بڑھے۔ کھانا کھاتے ہوئے میں یہ دلچسپ تماشا دیکھتی رہی۔ ادھیڑ عمر داسی سیتا اس دوران میں کمرے سے چلی گئی۔ کھانا کھانے کے بعد میں چوکی سے اتری تو میرے اوپر چڑھنے کی بجائے سانپ میرے ساتھ ساتھ فرش پر رینگنے لگے۔ دو سانپ آگے' دو پیچھے اور دو دو دائیں بائیں رینگ رہے تھے۔ میں مسہری پر بیٹھی تو بھی وہ مجھ سے نہیں لپٹے بلکہ مسہری کی چاروں سمتوں کو انہوں نے گھیر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ سانپوں کے جسم سے لپٹے رہنے کے سبب مجھے جو الجھن پہلے محسوس ہو رہی تھی' وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھا کے عموماً میں آرام ضرور کرتی تھی۔ ابھی خیر دوپہر تو نہیں ہوئی مگر دوپہر ہونے میں زیادہ دیر بھی نہیں تھی۔ سامنے ہی دیوار پر بڑی خوبصورت دیوار گیر گھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس میں ساڑھے گیارہ بج رہے

تھے۔ گویا نہ یہ صبح کا وقت تھا' نہ دوپہر کا۔ پھر بھی میں آرام کرنے کے لئے لیٹ گئی۔ کویتا اور رادھا ابھی تک کمرے میں موجود تھیں۔ رادھا کھانے کے لئے برتن اٹھا رہی تھی۔ کویتا کو میں نے مسہری کی طرف بڑھتے دیکھا' مگر وہ قریب نہیں آئی اور دور ہی رک گئی۔ شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔

میرے استفسار پر کویتا پوچھنے لگی۔ "راجکماری جی! کیا اب ناگ دیوتا ہر سمے آپ کے ساتھ رہیں گے؟"

"ہاں' مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس لئے راجکماری کہ پھر تو یہ بڑے مہاراج کو بھی آپ کے پاس نہیں آنے دیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو بڑے مہاراج سے آپ کا ملن کیسے ہو گا؟"

"تُو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ چندر موہن اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جائے گا؟"

کویتا کچھ سہم سی گئی۔ اس کی وجہ شاید میرے لہجے کی سختی تھی۔ وہ ہکلانے لگی۔ "مم.......... میں تو بس پو.......... پوچھ رہی تھی راجکماری جی!"

"ایسی باتیں نہیں کرتے کویتا جن کا کوئی سر پیر نہ ہو۔" میں نے اس مرتبہ اسے نرمی سے مخاطب کیا۔

"تو کیا آپ بڑے مہاراج کی مہارانی نہیں بنیں گی؟" کویتا نے حیرت سے دریافت کیا۔

بڑے مہاراج کے سلسلے میں اب میں پہلے کی نسبت خاصی بے باک ہو چکی تھی اسی لئے بولی۔

"میں کیوں اس کی رانی بنتی' میں تو اس کی صورت پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

"معبلہ!" اچانک بڑے مہاراج کی آواز کمرے میں گونجی مگر وہ نظر نہیں آیا۔ "اپنی زبان کو لگام دے' تُو حد سے آگے بڑھ رہی ہے.........."

"میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی پھر تُو اتنا آپے سے باہر کیوں ہو رہا ہے؟ بتا' کیا میں نے اب تک تیری صورت پر تھوکا؟"

"ابھی میں خود آ کے تجھے بتاتا ہوں۔ تُو اس طرح باز نہیں آئے گی۔" بڑے مہاراج کی برہم آواز پھر سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ کمرے میں آ گیا اور میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تُو کویتا سے کیا بکواس کر رہی تھی؟" اب اس کے گرد نیلا حصار نہیں تھا۔

"وہ بکواس نہیں حقیقت تھی۔" میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اچھا۔" اس کی آواز میں چبھن تھی۔ "تجھے سزا دینا ہی پڑے گی۔" یہ کہتے ہی وہ کوئی عمل زیر لب پڑھنے لگا۔

میں نے جھک کر ایک سانپ اٹھا لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں سانپ کو اس کے اوپر پھینکتی' وہ کویتا کی آڑ میں ہو گیا۔

"بزدل' ایک داسی کا سہارا لے رہا ہے۔ اتنا ہی بہادر ہے تو سامنے آ۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور عمل پڑھنے میں مصروف رہا۔ میں نے کویتا سے کہا کہ وہ درمیان

سے ہٹ جائے' مگر بڑے مہاراج نے اس کے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اسے روک لیا۔ کویتا کے چہرے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں کچھ اور کہنے والی تھی کہ اچانک اپنی زبان اینٹھتے ہوئے محسوس کی۔ پھر میں جس طرح بیٹھی تھی' اسی طرح بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ میرا جسم کسی مجسّمے کی طرح بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ آنکھیں تک کھلی رہ گئی تھیں۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی' محسوس کر رہی تھی مگر بولنے اور اپنے جسم کو حرکت دینے سے قاصر تھی۔ بڑے مہاراج نے ایک مرتبہ کلکتے میں بھی میری یہی حالت بنا دی تھی۔ پھر عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ ہی نے مجھے اس عذاب سے نجات دلائی تھی۔

"اب اسی طرح پتھر بنی بیٹھی رہ کہ تیری یہی سزا ہے۔" بڑے مہاراج نے مجھ سے کہا۔ اب وہ کویتا کی آڑ سے نکل آیا تھا۔ "چلا نا' زبان اب۔ اب میں تھوک دوں تیرے منہ پر؟" پھر وہ کویتا سے مخاطب ہوا۔ "اس بدزبان کے قریب نہ جانا' اسے اسی طرح بیٹھے رہنے دینا۔"

"پر کب تک بڑے مہاراج؟" کویتا نے سوال کیا۔

"جب تک رات کے بھوجن کا سمے نہ ہو جائے۔" بڑے مہاراج نے جواب دیا۔ "اس وقت بھی یہ بدزبانی سے باز نہ آئی تو پھر اس کی یہی وشا (حالت) بنا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس بار وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔

چندر موہن کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ خواہ مخواہ اسے غصہ دلا دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو آرام سے لیٹی تو رہتی۔ ذرا ہی دیر میں میری آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ کویتا بے چاری شاید اس غلط فہمی کا شکار ہو گئی کہ میں رو رہی ہوں۔ وہ مجھے اپنی دانست میں سمجھانے لگی۔ "جو پتی بننے والا ہو یا پتی بن جائے دیوتا سمان ہوتا ہے راجکماری جی! اب رونے سے کیا فائدہ؟ چپ ہو جائیں۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر میرا من بھی بیاکل ہو رہا ہے۔"

ظاہر ہے' میں اسے کیا جواب دیتی۔ میری زبان پر تو بڑے مہاراج نے پہلے ہی تالا ڈال دیا تھا۔ کچھ دیر مجھے اپنی دانست میں سمجھا بجھا کر کویتا بھی کمرے سے چلی گئی۔ رادھا پہلے ہی برتن اٹھا کر جا چکی تھی۔ کمرے میں اب میں اکیلی تھی۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے چمپا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کا داغ داغ چہرہ جھلسا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ اور بھی بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اب کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کبھی وہ انتہائی حسن رہی ہو گی۔ میری نظریں کیونکہ سامنے کی طرف ہی اٹھی ہوئی تھیں اور اسی طرف دروازہ تھا اس لئے چمپا فوری طور پر مجھے نظر آ گئی تھی۔ اسی کے ساتھ میں نے اس کے ہاتھ میں مٹی کا پتلا اور سوئی بھی دیکھ لی تھی۔ وہ کس ارادے سے آئی تھی' یہ سمجھنا میرے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔

"تُو نے مجھ پر دھوکے سے وار کیا تھا' وہ بھی بزدلوں کی طرح پیچھے سے۔" پھر وہ مجھے گندی گندی گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگی۔ اس کے بعد مزید کمینگی اور گھٹیا پن پر اتر آئی اور کہنے لگی۔ "دیکھ میں تیرے کہاں سوئی اتارتی ہوں۔" اس نے پتلے پر سوئی کی نوک رکھ دی۔

مجھے سوئی کی چبھن محسوس ہوئی۔ اسی وقت چندر موہن اچانک نمودار ہو گیا اور اس نے چمپا کے

ہاتھ سے سوئی چھین لی اور سخت آواز میں بولا۔ "میں نے تجھ سے منع کیا تھا کہ تُو معبلہ کو نہیں چھیڑے گی' مگر نہیں مانی۔ تُو یہ کیوں بھول جاتی ہے چمپا کہ ادگیا (نافرمانی) کرے گی تو گھاٹے میں رہے گی۔ انتقام لینے کا مطلب یہ نہیں کہ تُو حد سے گزر جائے۔ کیا تُو شمبھو کو بھول گئی؟" چندر موہن کی آواز میں غصہ تھا۔

"چھمت (معاف) کر دیں بڑے مہاراج!" چمپا اس کے قدموں میں گر گئی۔

"میرے پیروں کو اپنی جیبھ (زبان) سے چاٹ پھر..........."

چندر موہن کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی چمپا اس کے پیر چاٹنے لگی۔ وہ منظر بڑا کریہہ تھا۔ اگر میرے لئے آنکیں بند کر لینا ممکن ہوتا تو میں ایسا ضرور کرتی۔ چمپا اس وقت مجھے کوئی کتیا معلوم ہو رہی تھی۔ پھر چندر موہن نے جھک کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میرے بڑے مہاراج! میرے دیوتا!" چمپا اس کے قدموں میں لوٹنے لگی۔

"اٹھ' یہ لے.........." بڑے مہاراج نے سوئی اس کی طرف بڑھا دی۔ "اپنی حسرت نکال لے' پر تجھے جو آدیش (حکم) دیا ہے' اس کا پالن کرنا۔"

چمپا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سوئی اس نے لے لی تھی۔ مٹی کا پتلا پہلے ہی سے اس کے پاس تھا۔

"بڑے مہاراج! میری ایک پرارتھنا (درخواست) مان لیں۔" چمپا کے لہجے میں التجا تھی۔ "معبلہ کی یہ وشا (حالت) ختم کر دیں۔ میں اس کی چیخیں سننا چاہتی ہوں۔"

"اسے میں نے سزا دی تھی لیکن تُو کہتی ہے تو تیری پرارتھنا سوئیکار (منظور) کر لیتا ہوں۔ اس کارن کہ تُو بھی اسے سزا ہی دے رہی ہے۔" بڑے مہاراج نے یہ کہہ کر کوئی عمل پڑھنا شروع کیا اور پھر دونوں ہاتھ میری طرف اٹھا کر انہیں مخصوص انداز میں ہلایا۔ اسی کے ساتھ میری کیفیت بدل گئی۔

میرے جسم کو جھٹکا سا لگا اور میں پلکیں جھپکانے لگی۔ سب سے پہلے میں نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور جو منظر پہلے دھندلایا ہوا سا تھا' واضح ہو گیا۔

"معبلہ! دیکھ لیا تُو نے اپنی بدزبانی کا نتیجہ؟" چندر موہن مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میں اگر صحیح سمے پر یہاں نہ آ جاتا تو چمپا جانے تیرا کیا حال کرتی۔ بول' اب کرے گی بدزبانی؟"

اچانک مجھے خیال آیا کہ سانپوں نے میری خواہش کے مطابق عمل کیا تھا اور میرے جسم سے لپٹنے کی بجائے اب مجھ سے دور رہ کے میری حفاظت کر رہے تھے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ میری خواہش پر چمپا یا چندر موہن پر حملہ کر دیں۔

دوسرے ہی لمحے میں نے سانپوں کی پھنکار سنی۔ چندر موہن تو چمپا سے ذرا پیچھے کھڑا تھا البتہ چمپا مجھے اذیت میں مبتلا کرنے کچھ آگے بڑھ آئی تھی۔

سانپوں کی پھنکار سنتے ہی چندر موہن کو میں نے چونکتے دیکھا' مگر چمپا مٹی کے پتلے کے ایک حصے میں سوئی اتار رہی تھی' وہ غافل رہی۔ اس نے آدھی سے زیادہ سوئی پتلے کی ایک ران میں اتار دی تھی اور پھر سوئی کو اِدھر اُدھر ہلانے لگی تھی۔ تکلیف کے سبب میں چیخ اٹھی اور اسی لمحے چندر موہن نظروں سے

اوجھل ہو گیا۔ اس نے یقیناً خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ اس وقت تک دو سانپ پھنکاریں مارتے ہوئے چمپا کے قریب پہنچ چکے تھے۔

چمپا میری چیخ سن کر زور سے ہنس پڑی تھی۔

”چمپا .... چمپا! سانپوں سے بچ۔“ کمرہ بڑے مہاراج کی تیز آواز سے گونج اٹھا۔ وہ خود بچ جانے کے بعد اب اپنی دست راست کو بچانا چاہتا تھا مگر دیر ہو چکی تھی۔

چمپا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دو سانپوں کو اپنے جسم پر تیزی کے ساتھ چڑھتے دیکھا اور چیخنے لگی۔ اس کے ہاتھ سے پتلا اور سوئی دونوں گر گئے تھے۔

”بڑے مہاراج! میری سہایتا (مدد) کریں۔“ چمپا گلا پھاڑ کر چیخی۔

”وہ بزدل تیری مدد کیا کرے گا‘ وہ تو خود یہاں سے ڈر کے بھاگا ہے۔“ میں یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔

دونوں سانپ چمپا کے گلے سے لپٹ گئے تھے اور چمپا کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ سانپوں کی گرفت شاید اس کی گردن پر سخت ہوتی جا رہی تھی کیونکہ اس کی چیخیں اب دم توڑ چکی تھیں۔ دونوں سانپ پھن کاڑھے اس کے چہرے پر لہرا رہے تھے پھر میں نے چمپا کی زبان باہر نکلتے دیکھی۔ اس کے قدم اب ڈگمگانے لگے تھے۔

”معبلہ!“ ایک بار پھر بڑے مہاراج کی آواز کمرے میں گونجی۔ ”اگر تیرے وار سے چمپا مر گئی تو بھگوان کی سوگند (قسم) میں تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اس وقت بڑے مہاراج چندر موہن کی دھمکی کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ میرا پلہ بھاری تھا۔ چندر موہن اگر میرا کچھ بگاڑ پاتا تو وہاں سے فرار ہی کیوں ہوتا۔ میں تو ایک عجیب سی لذت و سرشاری محسوس کر رہی تھی۔ وہ لعنتی عورت چمپا میرے سامنے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی جس نے مجھے ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ میری خواہش کے مطابق بڑے مہاراج اور چمپا پر سانپوں نے حملہ کر دیا تھا۔ چندر موہن تو چوکنا تھا اس لئے فرار ہو گیا مگر چمپا بے خبر تھی۔ وہ مجھے اذیت میں دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ دو سانپوں نے اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ میری خواہش کے مطابق سانپوں کا عمل کرنا اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ نیکی کی قوتیں میری مدد کر رہی تھیں ورنہ تو یہ ناممکن سی بات تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ چمپا کا سانس یقیناً سانپوں کی گرفت میں گھٹ رہا تھا اور کسی بھی لمحے وہ زمین پر گر سکتی تھی۔

میں اسی انتظار میں تھی کہ اچانک تیز سنسناہٹ سی ہوئی اور پھر کمرے میں بین بجنے کی مسحور کن آواز گونجنے لگی۔ چمپا کی گردن سے جو دو سانپ لپٹے ہوئے تھے وہ اپنے بل کھول کر تیزی کے ساتھ بین کی سحرانگیز آواز کی طرف لپکے۔ وہ آواز دروازے کی طرف سے آ رہی تھی۔ میری مسہری کی اطراف موجود سانپ بھی دروازے کی طرف لپکے۔ چمپا کا جسم زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس سے لاعلم تھی کہ وہ زندہ تھی یا مر چکی تھی۔ اس کا جسم قطعی بے حس و حرکت زمین پر پڑا تھا۔

مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ بڑے مہاراج چندر موہن کی پُراسرار شیطانی قوتوں نے

میری بساط الٹ دی تھی۔ اب میرے محافظ سانپ بھی کمرے سے جا چکے تھے۔ میرے گرد حفاظتی حصار بھی نہیں تھا۔ میں گویا بے سپر تھی۔ ایسے میں چندر موہن چاہتا تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ مجھے اگر کچھ اطمینان تھا تو یہ کہ چندر موہن اس وقت دفاعی جنگ میں مصروف تھا۔ وہ اپنی دست راست چمپا کی جان بچانے میں مصروف تھا۔

میں ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ کمرے میں اچانک گاڑھا گاڑھا دھواں بھر گیا۔ معلوم نہیں وہ کیسا دھواں تھا کہ میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے ہر شے گھومتی محسوس ہوئی۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ میں ہوش و حواس کھوتی جا رہی ہوں۔ میں بے سدھ ہو کر مسہری پر گر پڑی تھی۔

دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میری سماعت سے سانپوں کی پھنکار ٹکرائی۔ اسی کے ساتھ میں نے بڑے مہاراج کو اپنی مسہری سے اٹھ کر بھاگتے دیکھا۔ سانپ مسہری پر چڑھ آئے تھے۔ وہ شاید چندر موہن پر حملہ کرنے ہی والے تھے کہ چندر موہن بھاگ اٹھا تھا۔ عیار چندر موہن یقیناً بے ہوشی کے دوران مجھ پر مجرمانہ حملہ کرنے والا تھا۔ وہ شاید میرے ہوش میں آنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ جس وقت وہ میرے قریب آیا ہوگا‘ اس وقت سانپ موجود نہیں ہوں گے‘ میں یہ بھی سمجھ گئی۔

سانپوں کے پھر لوٹ آنے سے میری ہمت بڑھ گئی ورنہ تو بے ہوش ہونے سے پہلے میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ میرے وہ محافظ مجھے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ چندر موہن نے وقتی طور پر انہیں مسحور کر کے مجھ سے جدا کر دیا تھا‘ مگر یہ جدائی دائمی نہیں تھی۔ سانپ اب میرے جسم سے لپٹ کر گویا اظہار عقیدت کر رہے تھے۔

”اچھا اب تم مسہری سے نیچے اتر کر پہرا دو۔“ میرے منہ سے بس بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے۔ اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ میں دراصل کپڑے پہننا چاہتی تھی۔ میں ان کے سروں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ چند لمحے ہی بعد میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سانپ میرے حکم کی تعمیل میں مسہری سے اتر گئے۔ انہوں نے پہلے ہی کی طرح چاروں طرف سے میری مسہری کو گھیر لیا تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب میں انہیں زبانی بھی کوئی حکم دے سکتی تھی۔

پھر میں نے کپڑے پہننے میں دیر نہیں کی۔ اب میں یہ سوچ رہی تھی کہ میری دشمن جاں چمپا پر کیا گزری؟ وہ زندہ بھی تھی یا نہیں؟ مگر وہاں میرے سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ معلوم نہیں رادھا اور کویتا کہاں تھیں۔ ابھی تک میرا جسم معذوری کی حد تک نقاہت میں مبتلا تھا۔ مجھے اس عذاب سے نجات نہیں مل سکی تھی۔ چندر موہن نے یقیناً یہ عذاب مجھ پر اس لئے مسلط کیا تھا کہ میں اس کے آشرم سے فرار ہونے کی جدوجہد نہ کر سکوں۔

میں اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ نے مجھ چونکا دیا۔ کمرے میں داخل ہونے والی کویتا تھی۔

”آؤ کویتا!“ میں نے ایک خیال کے تحت اسے آواز دی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

مجھے اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آئے۔ اسی کے ساتھ وہ کچھ خوفزدہ بھی دکھائی دی۔

وہ مسہری کی طرف بڑھتے بڑھتے ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی نظریں سانپوں پر جمی ہوئی تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ سانپوں کی وہاں موجودگی سے خوفزدہ ہے۔ اسی خیال سے میں نے اسے تسلی دی۔ "ان سے نہ ڈرو کویتا! یہ تم پر حملہ نہیں کریں گے۔ تم اگر چاہو تو میرے قریب بھی آ سکتی ہو۔ یہ تمہارے راستے سے ہٹ جائیں گے۔" پھر میں سامنے موجود سانپوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ "کویتا کو راستہ دے دو کہ یہ میرے پاس آ سکے۔"

دونوں سانپ میرے حکم کی تعمیل میں دائیں بائیں ہٹ گئے۔

کویتا حیرت سے سانپوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "راجکماری! ناگ دیوتا کیا آپ کے آدیش (حکم) کو سمجھ لیتے ہیں۔"

تم نے دیکھا نہیں کہ انہوں نے میرے کہنے پر تمہارے لئے راستہ چھوڑ دیا۔"

"پرنتو (لیکن) میں آپ کے پاس نہیں آؤں گی۔ بڑے مہاراج نے اس سے منع کیا ہے۔" کویتا نے کہا۔ "انہوں نے تو یہ بھی کہا ہے کہ میں ناگ دیوتا کے ان ہرکاروں کی طرف سے بھی چوکنا رہوں' یہ کسی بھی پل حملہ کر سکتے ہیں۔ چمپا جی پر بھی تو انہوں نے ہی حملہ کر دیا تھا نا۔"

"تمہارا معاملہ چمپا سے مختلف ہے۔ چمپا پر انہوں نے اس لئے حملہ کیا تھا کہ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتی تھی اور تم۔ تم تو مجھ سے پیار کرتی ہو' ہے نا کویتا۔"

"جی .... راجکماری جی! بھگوان جانے کیوں میں آپ کو چاہنے لگی ہوں۔ اس سے بھی میں اسی کارن (سبب) ادھر آئی تھی کہ ایک نظر آپ کو دیکھ لوں میرا من بیاکل ہو رہا تھا' اسی سے جب میں نے آپ کی چیخ سنی تھی' مگر بڑے مہاراج نے ادھر آنے کو منع کر دیا تھا' سو میں پہلے نہیں آئی۔"

"چمپا کا کیا حال ہے؟" میں نے وہ سوال کر ہی دیا جس کے لئے اسے آواز دی تھی۔

"بہت برا حال ہے راجکماری جی!" کویتا نے بتایا۔ "چمپا جی کو بڑے مہاراج اپنی سوپن گرہ (خواب گاہ) میں لے گئے ہیں۔"

"ہوں۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "تو وہ کمینی زندہ بچ گئی۔"

"چمپا جی تو بڑی سدآتما (نیک سرشت) ہیں۔"

"وہ نیک نہیں' بڑی نابکار ہے۔ تم اسے نہیں جانتیں کویتا۔"

"آپ سے ان کی کیا شتروتا (دشمنی) ہے؟"

"تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی بھولی لڑکی۔" میں نے اسے ٹال دیا' پھر پوچھا۔ "کویتا! کیا یہاں چائے نہیں مل سکتی؟" یہ سوال میں نے اس لئے کیا تھا کہ جب سے وہاں آئی تھی' ایک مرتبہ بھی چا- پینے کو نہیں ملی تھی حالانکہ مجھے چائے پینے کی عادت تھی۔

"کیوں نہیں راجکماری جی! آپ نے پہلے کہا ہوتا۔"

"اچھا تو اب کہہ رہی ہوں۔ جاؤ میرے لئے اچھی سی چائے بنا کر لے آؤ۔"

کویتا چلی گئی اور پھر اسی وقت لوٹی جب چائے کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ شیشے کے گلاس ؛

مجھے چائے دیکھ کر عجیب سا لگا۔ وہاں شاید چائے کی پیالیاں نہیں تھیں۔ کویتا چائے کا گلاس میرے قریب آ کر مجھے دیتے ہوئے جھجکنے لگی۔

"آؤ نا! دیکھو تمہیں آتے دیکھ کر سانپ بھی راستے سے ہٹ گئے ہیں۔" میں نے کویتا کو نرمی سے مخاطب کیا۔

کویتا جھجکتے ہوئے میرے قریب آ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے چائے کا گلاس لے لیا' پھر اپنے قریب مسہری پر بٹھا لیا۔ اس کے چہرے سے حیرت جھلک رہی تھی۔ میں نے حیرت کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگی۔ "راجکماری جی! مجھ سے تو بڑے مہاراج نے کہا تھا کہ میں اگر آپ کے قریب گئی تو جل جاؤں گی۔" اس کے لہجے میں بڑا بھول پن تھا۔

"پھر تم میرے کہنے پر کیوں قریب آ گئیں۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"اس لئے کہ .... کہ مجھے وشواس (یقین) تھا' آپ .... آپ بھی راجکماری جی' مجھ سے پریم کرتی ہیں اور .... اور جس سے کوئی پریم کرتا ہے اسے کبھی نقصان نہیں پہنچاتا۔"

کویتا کی معصوم باتیں مجھ اچھی لگ رہی تھیں۔ مجھے یہ سوچ کر رنج سا ہونے لگا کہ وہ بھولی بھالی لڑکی ایک عیار اور شیطان صفت شخص چندر موہن کی ہوس کا نشانہ بنتی تھی۔ مجھ سے کویتا نے خود اس کا اعتراف کیا تھا۔ ایک خیال کے تحت میں نے اس سے دریافت کیا۔ "کویتا! تم میرے ساتھ چلو گی؟"

"کہاں راجکماری جی؟" اس نے حیران ہو کر معلوم کیا۔

"جہاں بھی میں لے جاؤں۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"مگر میں .... میں یہاں سے کس طرح جا سکتی ہوں راجکماری جی؟"

"کیوں نہیں جا سکتی؟"

"اس لئے راجکماری جی کہ میں بڑے مہاراج کو چھوڑ کے اپنا دھرم نشٹ نہیں کر سکتی۔ مجھے تو بڑے مہاراج ہی کے لئے پالا گیا ہے کہ میں جوان ہو کے ان کی سیوا کروں۔"

کویتا کی بات سن کر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کے ذہن میں بچپن ہی سے غلط تصورات بٹھا دیئے گئے تھے۔ میں اسے سمجھانے لگی۔ "کسی شخص کی غلامی کوئی مذہب نہیں سکھاتا۔ دھرم کے نام پر چندر موہن تمہیں عیاشی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اسے چھوڑ کر بھی تمہارا دھرم قائم رہے گا۔"

جیسے جیسے میں اسے اسی کے مذہب کی مثالیں دے کر سمجھاتی رہی' میری باتیں اس پر اثر کرتی رہیں۔

"آپ کی باتیں میرے من کو لگتی ہیں راجکماری جی!" کویتا نے کچھ دیر بعد اعتراف کر ہی لیا' پھر اپنے خوف کا اظہار کرنے لگی۔ "لیکن اگر بڑے مہاراج کو پتا لگ گیا کہ .... میں انہیں چھوڑ کر آپ کے ساتھ جانے پر راضی ہوں تو .... تو پھر .... پھر کیا ہوگا؟"

"اس نے میرا کیا بگاڑ لیا ہے جو تمہارا کچھ بگاڑ لے گا۔" میں نے بے خوفی کے ساتھ کہہ دیا۔

"آپ کی بات اور ہے راجکماری جی! آپ میں بڑے مہاراج سے ٹکرانے کی شکتی ہے پھر ....

پھر یہ کہ ہم اس آشرم سے نکلیں گے کیسے؟" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"کیوں' کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے؟"

"ہے کیوں نہیں' پر اس راستے پر........." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"ہاں' ہاں کہو' کیا ہے اس راستے میں؟" میں نے اسے خاموش دیکھ کر بولنے کی ترغیب دی۔

"آپ......... شاید راجکماری جی' وہاں سے نکل جائیں۔"

"اور تم؟ تم کیوں نہیں نکل سکتیں؟"

"اس لئے کہ میں آپ کی طرح ناگ دیوتا کی چہیتی نہیں ہوں۔"

"تم صاف صاف بات کرو۔ بالکل بلا جھجک بتاؤ جو بھی تمہارے دل میں ہے۔" میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کیوں کہ خلاف توقع امید کی ایک کرن اندھیرے میں مجھے نظر آ گئی تھی۔

"یہاں سے باہر نکلنے کے راستے پر ناگ دیوتا کا پہرا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک بار کسی داسی نے بڑے مہاراج کی آگیا (اجازت) کے بغیر یہاں سے فرار ہونا چاہا تھا تو ناگ دیوتا نے اسے ڈس لیا تھا۔ اسی سے اس داسی کے شریر کا سارا ماس (گوشت) پانی بن کر بہہ گیا تھا۔" کویتا کی آواز کانپ گئی۔ "دن کے سمے بڑے مہاراج کا خاص چیلا گوپال ترشول لئے پہرا دیتا ہے۔"

"تم میرے ساتھ ہو گی کویتا تو ناگ دیوتا تمہیں بھی نہیں روکے گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "گوپال کی پرواہ اس لئے نہیں کرو کہ ہم رات کے وقت فرار ہوں گے۔"

مزید کچھ دیر گفتگو کے بعد میں نے اس بھولی بھالی لڑکی کو شیشے میں اتار ہی لیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ رات کو بارہ بجے کے بعد وہ میرے پاس پہنچ جائے گی۔

"اب تم جاؤ کویتا! کہیں کوئی تمہیں میرے کمرے میں زیادہ دیر دیکھ کر کسی شک میں نہ پڑ جائے۔" میں نے کہا۔ اس وقت تک میں چائے پی چکی تھی۔ خالی گلاس میں نے اسے دے دیا۔

کویتا اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر چلتے چلتے اسے جانے کیا سوجھا کہ وہ جھکی اور مجھے چوم لیا۔ اس کے ابھرے ابھرے گداز ہونٹوں میں بڑی حرارت تھی۔ میرے سارے جسم میں برقی لہر سی دوڑ گئی۔ میرا جی چاہا کہ جواباً میں بھی اسے چوم لوں' مگر اس وقت تک وہ آگے بڑھ چکی تھی اور سانپ اپنی جگہ واپس آ چکے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے میری طرف پلٹ کر دیکھا' مسکرائی اور پھر باہر چلی گئی۔ عجیب لڑکی تھی وہ بھی' میں نے بھی اپنے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ محسوس کیا۔ اسی وقت مجھے اپنی ایک غلطی کا خیال آ گیا۔ ہرچند کہ کویتا نے میرے ساتھ فرار ہونے کا وعدہ کیا تھا' پھر بھی بطور احتیاط اس سے راہ فرار کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لینا چاہئے تھیں' مگر ظاہر ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کویتا جا چکی تھی اور یہ ضروری نہیں تھا کہ رات ہونے سے پہلے ایک بار پھر خلوت کا موقع مل جاتا۔

کویتا چلی گئی تو میں سونے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ مجھے اپنی حفاظت کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میری حفاظت کرنے والے سانپ کسی کو میرے قریب نہ آنے دیتے۔ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ میں سو گئی۔ جانے کتنی دیر تک سوئے رہنے کے بعد میری آنکھ بین بجنے کی آواز سے کھلی اور میں ایک د

اچھل کر بیٹھ گئی۔ فوراً ہی مجھے خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ اپنے محافظ سانپوں کو میں نے تیزی کے ساتھ کمرے کے دروازے سے باہر نکلتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ اچانک بند ہو گیا حالانکہ میں نے کسی کو دروازہ بند کرتے نہیں دیکھا تھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی' یہ کیا ہوا کہ بڑے مہاراج چندر موہن کے قہقہے سے کمرا گونج اٹھا۔ پھر وہ ظاہر ہو گیا۔ اسے میں نے مسہری کے قریب کھڑے دیکھا۔

"ناگ دیوتا کے ہرکارے اب اس کمرے میر داخل نہیں ہو سکتے مبعلہ! بہت دن صبر کر لیا میں نے۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔" بڑے مہاراج نے میری طرف اپنی ندیدی نظریں اٹھائیں۔

میں اس کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس سے نظر نہیں ملا رہی تھی تاکہ وہ مجھے اپنے سحر میں گرفتار نہ کر لے۔

"تو اس طرح نظریں جھکائے کیوں بیٹھی ہے' نظر اٹھا معبلہ" اس نے مجھے پھر مخاطب کیا۔ "ابھی سے شرما رہی ہے۔ شرمانے کے لمحے تو ابھی آئے بھی نہیں۔"

"اور کبھی آئیں گے بھی نہیں۔" میں نظر اٹھائے بغیر سخت لہجے میں بولی۔

"کیوں' کیا اب بھی تجھے کسی پر مان ہے۔ بول اب کون تجھے مجھ سے بچانے آئے گا؟" وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھا اور میرے قریب بیٹھتے ہی میری کلائی پکڑ لی۔

میں اس سے زور آزمائی کرنے لگی اور وہ ہنستا رہا۔ مجھے اس سے اپنی کلائی چھڑانے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ میری جسمانی نقاہت ہی تھی۔

"چندر موہن نے تیری کلائی پکڑی ہے' کسی اور نے نہیں۔"

"چھوڑ دے مجھے۔" میں غصے میں چیخ اٹھی۔

"چھوڑنے کے لیے تو نہیں پکڑا تجھے۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔

معاً میں نے اس کے جسم میں اپنا زہر اتارنے کے لئے منہ آگے بڑھایا ہی تھا کہ اس نے ایک ہاتھ سے میرے سر کے بال پکڑ لئے۔

"نہیں میری جان! میرے اوپر تیرا یہ وار نہیں چلے گا۔ مجھے معلوم ہے تیرا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ کیا تو بھول گئی کہ میرے ایک چیلے شمبھو کو بھی تو نے اسی طرح مارا تھا۔ میرے ہی آشرم کا تو واقعہ تھا وہ۔ تیرے اندر جو زہر بھرا ہے' اسے بھی میں ایک دن امرت بنا دوں گا۔ پھر تو جتنا چاہے میرے جسم میں دانت گاڑ لینا پر ابھی نہیں۔"

اسی لمحے میری نگاہ سامنے روشن دان کی طرف اٹھ گئی اور میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ اگر چندر موہن میرے سر کے بال پکڑ کر چہرہ ادھر نہ کر دیتا تو میں اپنے ان محافظوں کو نہ دیکھ پاتی جو روشن دان سے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

"میں تیرے منہ پر کپڑا باندھ دیتا ہوں۔" چندر موہن پرسکون آواز میں بولا۔ اب تک وہ اپنی طرف بڑھنے والے خطرے سے بے خبر تھا۔ پھر اس نے میرے سرہانے رکھے ہوئے تکئے کا غلاف اتار لیا۔

ایک ہاتھ سے وہ ابھی بھی میرے سر کے بال پکڑے ہوئے تھا۔

میرے منہ پر وہ غلاف باندھنے کے لئے اس نے جیسے ہی میرے سر کے بال چھوڑے' میں اٹھ کر بھاگی۔ اس نے پیچھے سے پھر میرے سر کے لمبے بال اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے لئے۔ مجھے اس وقت تک خود کو چندر موہن سے بچانا تھا جب تک روشن دان سے سانپ نیچے نہ اتر آتے۔ اس نے بال اپنی طرف کھینچے' میں پھر اس کے قریب پہنچ گئی۔

اسی وقت "دھپ" کی آواز ہوئی اور چندر موہن اچھل پڑا۔ اس نے آواز کی سمت پلٹ کر دیکھا۔ مجھے چھوڑ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"جے درگا مائی۔" چندر موہن نے اپنی طرف بڑھنے والے ایک سانپ کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر نعرہ مارا۔

دوسرے ہی لمحے کمرے میں بجلی کا ایک کوندا سا لپکا۔ میں نے سانپ کو تڑپ کر ساکت ہوتے اور پھر جلتے دیکھا۔ اس دوران میں دوسرا سانپ اوپر سے گرا۔ پھر تو یکے بعد دیگرے سانپوں نے جیسے یلغار کر دی۔ چندر موہن کے چہرے پر میں نے گھبراہٹ دیکھی۔

"مجھے چھمت (معاف) کر دینا ناگ دیوتا کہ تمہارا ایک ہرکارہ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اگر میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار ڈالتا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی چندر موہن کمرے سے غائب ہو گیا۔

میں ایک مرتبہ پھر اس ہوس کار کے مجرمانہ حملے سے بچ گئی تھی۔ گذشتہ روز سے یہ اس کی تیسری کوشش تھی۔ وہ اپنی تمام تر شیطانی قوتوں کے باوجود اب تک پوری طرح مجھ پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ معاً کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ سانپ اس وقت تک میری مسہری کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ان کی تعداد اب سات رہ گئی تھی ان میں سے کوئی نہ کوئی اپنے ساتھی سے بچھڑ گیا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے رنج ہوا۔ ایک بے زبان نے میری خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا تھا۔

میرے اور چندر موہن کے درمیان زور آزمائی کے سبب بستر کی چادر بے ترتیب ہو گئی تھی۔ میں نے اٹھ کر اسے درست کیا' پھر تکیے پر غلاف بھی چڑھا دیا۔

اب شام ہو چکی تھی اور کمرے میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا' مگر میں بتی جلانے نہیں اٹھی۔ کچھ دیر بعد ادھیڑ عمر داسی سیتا کمرے میں آئی اور بتی جلا کر چلی گئی۔

رات کو کھانے کے بعد بھی میں نے چائے طلب کی' پھر چائے پی کر چہل قدمی کی خاطر راہداری میں نکل آئی۔ سانپوں کو میں نے کمرے ہی میں رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ میں نے ان کے لئے دودھ منگوایا تھا۔ وہ اس وقت کھلے منہ کے ایک برتن میں دودھ پی رہے تھے۔ رادھا میرے کھانے کے برتن اٹھا کر چکی تھی۔ کمرے میں صرف کویتا تھی جو سانپوں کے دودھ پینے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ وہ برتن بھی اٹھا لے جا سکے۔ میں نے اسے آواز دے کر باہر بلا لیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں اس سے راہِ فرار کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"میں تو آپ کے ساتھ ہی ہوں راجکماری جی! پھر آپ راستہ کس لئے پوچھ رہی ہیں؟" کو

میرے سوال کے جواب میں کہنے لگی۔

"مجھے بھی معلوم ہو جائے تو اچھا ہے نا۔" میں نے کہا۔

"باغ میں سے ہو کر ہم عمارت کے صدر دروازے تک پہنچ سکتے ہیں۔" کویتا نے بتایا۔

"اور باغ کا راستہ کدھر ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ راہداری آگے جا کر دائیں جانب مڑ جاتی ہے۔ وہیں اشنان گرہ (غسل خانہ) ہے' وہی کمرا جس میں حوض ہے۔ آپ جا تو چکی ہیں ادھر۔ اشنان گرہ کے بالکل سامنے ہی باغ میں جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اِدھر اُدھر مڑے بغیر سیدھے چلیں تو عمارت کے صدر دروازے تک پہنچ جائیں گے جس پر ناگ دیوتا کا پہرا رہتا ہے۔" کویتا دھیمی آواز میں میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بتانے لگی۔

"چلو اشنان گرہ تک چل کر باغ میں جانے کا راستہ دیکھتے ہیں۔" میں نے اسی طرف آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ابھی کیا کرنا ہے ادھر جا کے؟"

میں اس لئے ادھر جانا چاہتی تھی کہ پہلے راہداری کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے باغ میں جانے کا وہ راستہ نظر نہیں آیا تھا' کویتا جس کا ذکر کر رہی تھی۔

"تم چلو تو سہی!" میں نے کویتا کی بات کا جواب دیا۔

وہ راضی ہو گئی۔ ذرا سی دیر میں ہم اس کمرے تک پہنچ گئے جسے کویتا نے اشنان گرہ کہا تھا۔ کمرے کے سامنے واقعی راستہ نظر آ رہا تھا۔ راہداری میں تو روشنی تھی مگر باغ کے اندر تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنے ساتھ کویتا کو لئے دائیں جانب موجود سیڑھیاں اتر کر باغ میں پہنچ گئی۔ باغ خوشبو سے مہک رہا تھا۔ رات کی رانی کے پھولوں کی خوشبو سب پر حاوی تھی۔ نقاہت کے باوجود میں دانستہ راستے کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنے کی غرض سے ادھر آئی تھی۔

"اب واپس چلئے راجکماری جی!" کویتا آگے بڑھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"چلتے ہیں' ابھی واپس چلتے ہیں۔ میں ایک نظر صدر دروازے کو تو دیکھ لوں۔"

"مگر اس اندھیرے میں کیا نظر آئے گا آپ کو؟"

"پھر جب ہم یہاں سے آدھی رات گزر جانے کے بعد چلیں گے تو کیا ہوگا؟" میں نے کویتا سے پوچھا۔

"میرے پاس چھوٹی سی ایک ٹارچ ہے' وہ لے آؤں گی۔" کویتا نے جواب دیا۔

میں مطمئن ہو گئی۔ "ٹھیک ہے' پھر واپس چلتے ہیں۔" میں بولی۔

مڑ کر میں نے واپسی کے لئے قدم اٹھائے ہی تھے کہ اچانک کسی نے مجھے دبوچ لیا۔

"تُو واپس جا کویتا! راجکماری کو میں اس کے کمرے تک پہنچا دوں گا۔" ایک بھاری آشنا آواز ابھری۔

"بب .... بڑے مہاراج!" کویتا کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

وہ چندر موہن ہی تھا جو مجھے اپنی گرفت میں لئے دائیں جانب مڑا۔ میں اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے مچلنے لگی۔ اپنے ساتھ محافظ سانپوں کو نہ لا کر یقیناً میں نے غلطی کی تھی۔ انہیں میں نے کمرے ہی میں رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری مدد کرنے وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔

"میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس سے تیرے ساتھ ناگ دیوتا کے ہرکارے نہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے مجھے خود سے مزید قریب کر لیا۔

اچانک دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ پھر میں نے کویتا کی آواز سنی۔ "بڑے مہاراج بڑے مہاراج۔ آپ کہاں ہیں؟" ....

"کیا ہے؟ تُو واپس کیوں آ گئی یہاں؟" چندر موہن کی آواز میں برہمی تھی۔

"چمپا جی کی طبیعت اچانک زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ وہ الٹے سیدھے سانس لے رہی ہیں۔" کویتا نے جلدی جلدی بتایا۔

"لیکن تُو اس کے پاس کیوں گئی تھی؟" چندر موہن بدستور سخت لہجے میں بولا۔

"میں نہیں، وہاں سیتا مائی گئی تھیں، چمپا جی کو دودھ پلانے۔ میں نے جب چمپا جی کے بارے میں جان کر سیتامائی کو بتایا کہ آپ باغ میں ہیں تو انہوں نے کہا، میں آپ کو خبر کر دوں۔ سو میں چلی آئی۔" کویتا نے جواب دیا۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی جسے چندر موہن نظرانداز کر دیتا۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہو چکا تھا۔ چمپا بہرحال چندر موہن کی دست راست تھی۔ ایسی حالت میں چندر موہن کا اس کے پاس پہنچنا ضروری تھا۔

"راجکماری جی!" کویتا نے مجھے آواز دی۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

کویتا میری آواز سن کر قریب آ گئی۔ اس نے ایک بار پھر مجھے مخاطب کیا۔ "چلیں نا راجکماری جی! بڑے مہاراج نے آپ کو کیوں روک لیا تھا؟"

"وہ کمینہ میری آبرو لوٹنا چاہتا ہے۔ اگر اس وقت تم نہ آ گئی ہوتیں تو شاید وہ اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔"

"مگر بڑے مہاراج تو آپ سے وواہ (شادی) کو کہہ رہے تھے اور جس سے وواہ کیا جاتا ہے، اسے پہلے.........."

"جھوٹا ہے وہ!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم اس عیار کی باتوں میں آ رہی ہو۔"

میں، کویتا کے ساتھ چلتی ہوئی باغ سے باہر آ گئی۔ سیڑھیوں پر چڑھنے سے پہلے معاً کویتا رک گئی اور دھیمی آواز میں مجھ سے کہنے لگی۔ "راجکماری جی! مجھے ڈر ہے کہ بڑے مہاراج نے ہماری باتیں نہ سن لی ہوں، وہ پہلے ہی باغ میں موجود تھے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ کچھ نہیں سن سکا ہوگا۔" میں نے اسے دلاسا دیا حالانکہ خود میرے ذہن میں

بھی یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا۔ "ہم نے باغ میں کوئی ایسی بات بھی تو نہیں کی تھی جس سے اسے ہمارے ارادے کا علم ہو جاتا۔ تم بالکل نہ ڈرو۔"

کویتا مجھے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ چلتے چلتے میں نے نصف شب کے بعد اسے آنے کی تاکید کر دی تھی۔ کمرے کے دروازے میں مجھے اپنے ساتوں محافظ منتظر ملے۔ انہوں نے میرے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ شاید مجھ سے اظہارِ عقیدت کی خاطر وہ میرے جسم سے لپٹ گئے۔ ان میں سے کوئی بھی میری ٹانگوں سے نہیں لپٹا تھا۔

مسہری تک پہنچ جانے کے بعد میں نے انہیں مخاطب کیا۔

"اب نیچے اتر جاؤ۔"

انہوں نے فوراً تعمیل حکم کی اور اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ گئے۔ میں مسہری پر لیٹ گئی۔ چلنے پھرنے کی وجہ سے میری جسمانی نقاہت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ کویتا نے مقررہ وقت پر آنے کا وعدہ تو کر لیا تھا مگر وہ جس طرح خوفزدہ نظر آ رہی تھی، اسے مدنظر رکھتے ہوئے مجھے خدشہ تھا کہ اس کا ارادہ بدل نہ جائے۔ میں اس وقت کویتا کے بارے ہی میں سوچ رہی تھی۔ اگر کویتا اب اپنا ارادہ بدل بھی دیتی تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ میں نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر ضرور عمل کرتی کیونکہ مجھے اس آشرم سے فرار ہونے کا راستہ معلوم ہو گیا تھا۔ راستہ زیادہ الجھا ہوا بھی نہیں تھا کہ میرے ذہن میں نہ رہتا۔

جانے کتنی دیر تک میں اپنے خیالوں میں کھوئی رہی اور پھر مجھے رادھا آتی دکھائی دی۔

"آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں راجکماری جی!" رادھا مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں، کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"میں بڑی بتی بجھا کر نیلا بلب جلانے آئی تھی، ٹھیک ہے، پھر آ جاؤں گی۔" وہ جانے کے لیے مڑنے لگی۔

"ٹھہرو!" میں نے اسے روک لیا۔ "میرا ارادہ اب سونے ہی کا ہے۔ تم نیلا بلب جلا دو۔"

رادھا نے دروازے کے قریب موجود سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"چمپا کا اب کیا حال ہے؟" میں نے معلوم کیا۔

"پہلے سے تو ٹھیک ہیں مگر ابھی ان کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔" رادھا نے بتایا۔

مجھے اپنی دشمن کے بارے میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ابھی وہ خطرے کی حدود سے نہیں نکلی۔

رادھا چلی گئی تو میں نے ایک طرف کروٹ لے لی۔

وقت تو خیر اپنی مقررہ رفتار ہی سے گزر رہا تھا البتہ مجھے اس کی رفتار سست معلوم ہو رہی تھی۔ بار بار میری نگاہ دیوار پر موجود گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر میرا جسم دکھنے لگا تھا۔ جیسے تیسے آدھی رات گزر ہی گئی۔ میں نے صرف ساڑھے بارہ بجے تک کویتا کے انتظار کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر بھی کویتا نہ آتی تو میں اکیلی ہی روانہ ہو جاتی۔ میں اب اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ معاً میری نگاہ سانپوں پر پڑی تو

میں سوچنے لگی انہیں وہیں چھوڑ جاؤں کہ ساتھ لے چلوں۔ انہوں نے اب تک میرا بہت ساتھ دیا تھا اور کئی مرتبہ مجھے چندر موہن کے مجرمانہ حملوں سے بچایا تھا۔ میں اگر ان سے وہیں رکنے کو کہہ دیتی تو وہ میرے پیچھے نہ آتے۔ پھر مجھے آج رات کے ابتدائی حصہ میں پیش آنے والا واقعہ یاد آیا۔ جب باغ میں چندر موہن نے پکڑ لیا تھا اور دست درازی کرنا چاہی تھی۔ اس عمارت کی حد تک تو کم از کم مجھے ان کی ضرورت تھی۔ عمارت سے باہر نکلنے کے بعد دیکھا جاتا کہ انہیں اپنے ساتھ رکھا جائے یا نہیں۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ آشرم کس جگہ واقع تھا۔ ذرا ہی دیر گزری تھی کہ وہ آ ہی گئی جس کا مجھے انتظار تھا۔ وہ اس طرح دبے پاؤں آئی تھی کہ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے مجھے اس کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دی تھی۔ اس بھولی بھالی لڑکی نے محض میری محبت میں اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اس کے کمرے میں قدم رکھتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں راجکماری جی۔" اس نے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔ "مجھے آنے میں دیر تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں، تم ٹھیک وقت پر آ گئی ہو۔" میں نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا۔

سانپوں نے کویتا کو میرے قریب آنے کا موقع دے دیا تھا۔ اب وہ ہم دونوں کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں چل رہے تھے۔

کمرے سے نکل کر ہم نے راہداری میں بڑھنا شروع کیا اور پھر جلد ہی باغ تک پہنچ گئے۔ کویتا نے اب اپنے ہاتھ میں موجود چھوٹی سی ٹارچ روشن کر لی تھی کیونکہ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ جب سے میں یہاں آئی تھی میرے اندر موجود کوئی بھی پراسرار قوت بیدار نہیں ہوئی تھی۔ اس کا سبب یقیناً رنگ برنگ روشنیوں کا وہ شیطانی عمل ہی تھا جس کے ذریعے چند دن کے لئے چندر موہن نے میری تمام پراسرار قوتوں کو گہری نیند سلا دیا تھا۔ خود چندر موہن ہی نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ اندھیرے میں دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو خود بہ خود یہ صلاحیت میرے اندر پیدا ہو جاتی تھی۔ اس وقت مجھے یہی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، لیکن یہ قوت میرے اندر بیدار نہیں ہوئی۔

کویتا کے ساتھ ساتھ میں نے ابھی باغ کا نصف فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ اچانک بڑے مہاراج کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے نہیں کویتا سے مخاطب تھا۔ "کویتا! آخر تو ہرجائی نکلی! معبلہ کی باتوں میں آ کے تو اپنا دھرم نشٹ کئے لے رہی تھی۔ میں نے پہلے سے تجھے اس لئے نہیں روکا کہ شاید تو خود ہی رک جائے، تجھے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس آشرم کی حدود میں ہونے والی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ تو نے جو پاپ کیا ہے اس کی سزا تجھے ضرور ملے گی۔"

"بھول ہو گئی مہاراج! اپنی داسی پر دیا کرو۔" کویتا بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ بڑے مہاراج کی آواز سنتے ہی ہم دونوں ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"تجھ پر دیا (رحم) کروں جو مجھ سے بے وفائی کر کے جا رہی تھی۔ تیرا فیصلہ میں کل صبح کروں گا۔ تو اب جا کے سو جا۔ بھگوان سے پرارتھنا کر کہ یہ رات تیرے جیون کی آخری رات ثابت نہ ہو۔" بڑے مہاراج کے لہجے سے سفاکی ظاہر ہو رہی تھی۔

"چندر موہن!" میں بول اٹھی۔ "کویتا کا اس میں کوئی قصور نہیں، اسے میں نے ورغلایا تھا، یہ بے قصور ہے۔"

"تیری محبت میں یہ دیوانی ہو گئی ہے، مجھے خبر ہے، مگر معبلہ، تجھے یہ خبر نہیں ہو گی کہ مجھ سے بے وفائی کرنے کی کیا سزا ہے۔ پھر بھی تیری سفارش پر اس کی جان بخش سکتا ہوں۔ اگر تجھے بھی اس سے پیار ہے اور تو چاہتی ہے کہ میں اسے زندہ چھوڑ دوں تو پھر اپنی ضد چھوڑ دے۔"

"تو پھر بکواس کرنے لگا۔" مجھے غصہ آ گیا۔

"اگر تو اسے بکواس سمجھ رہی ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ تجھے کویتا سے پیار نہیں۔ کل تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی کہ میں، درگا دیوی کے چرنوں میں اس کی بلی چڑھا دوں گا۔ دیوی بھی میرے اس بلیدان (قربانی) سے خوش ہو جائے گی۔"

"درندے! تو پتھر کے اس بت کی خاطر اس معصوم لڑکی کی گردن کاٹ دے گا۔ میں تجھے ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گی۔" میں چیخ اٹھی۔

"تو کیا، تیری حیثیت کیا؟" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا پھر کہنے لگا۔ "کیوں، کیا اب تو نے فرار ہونے کا ارادہ بدل دیا؟"

"میں، کویتا کو اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گی۔ تو مجھے نہیں روک سکتا۔" میں تیز آواز میں بولی۔ پھر کویتا کا بازو تھام لیا۔ "چل کویتا، میرے ساتھ چل، میں بھی دیکھتی ہوں کہ یہ کمینہ تجھے میرے ساتھ جانے سے کیسے روکتا ہے؟"

"نہیں راجکماری جی۔ میں .... آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔" کویتا لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"تو کیا تم یہاں رہ کر مرنا چاہتی ہو۔ یہ ذلیل شخص کل صبح تمہیں قتل کر دے گا۔"

"اگر بڑے مہاراج مجھے درگا دیوی کے چرنوں میں بلی کر دیں گے تو اس طرح میرے پاپ کا پرائشچت (کفارہ) تو ادا ہو جائے گا۔ راجکماری جی! اس بلیدان سے میرا اگلا جنم تو سپھل ہو جائے گا۔" کویتا نے روتے ہوئے کہا۔

"پاگل لڑکی! کوئی اگلا وگلا جنم نہیں ہوتا۔ تو بلاسبب ماری جائے گی۔" میں اسے سمجھانے لگی۔

"کویتا! یہ تو ناستک (لامذہب) ہے۔" بڑے مہاراج کی آواز پھر آئی۔ "تو نے سنا نہیں کہ یہ درگا دیوی کو پتھر کہہ رہی تھی۔" بڑے مہاراج کی صرف آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ خود باغ میں موجود نہیں تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولا۔ "تیرا یہ جنم تو نشٹ ہو ہی گیا، معبلہ چاہتی ہے کہ تیری آتما (روح) کو اگلے جنم میں بھی شانتی نہ ملے۔ تو نے اگر درگا دیوی کے چرنوں میں اپنا بلیدان نہ دیا تو تیری آتما جنم جنم بھٹکتی رہے گی۔"

"تو بہت بڑا جھوٹا اور عیار ہے۔" میں چیخ اٹھی۔ "تو ایک معصوم لڑکی کو مذہب کے نام پر بے وقوف بنا رہا ہے۔"

"میں اگر تیری بات مان بھی لوں تو مجھے ایسا کرنے سے تُو کس طرح روک سکتی ہے؟"

چندر موہن کی بات کو نظرانداز کر کے میں نے ایک بار پھر کویتا کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔

"نہیں راجکماری جی! نہیں۔ میرے بھاگ (قسمت) میں یہی لکھا تھا' آپ جایئے۔" وہ بولی اور پ
پلٹ کر جانے لگی۔

میں اس معصوم لڑکی کو مزید کیا سمجھاتی۔ وہ اپنے عقائد سے بغاوت نہیں کر سکتی تھی۔ بچپن سے جو کچھ اس کے ذہن میں بٹھا دیا گیا تھا' وہی اس کے پیروں کی زنجیر بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی موت بھی قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اپنے ساتھ وہ ٹارچ بھی لے گئی تھی۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ کم از کم اس سے ٹارچ تو لے ہی لیتی۔ بہرحال میں گھپ اندھیرے میں آگے بڑھنے لگی۔ کویتا نے بتایا تھا کہ اس راستے کا اختتام عمارت کے صدر دروازے پر ہوتا تھا۔

جب مجھے چلتے چلتے بہت دیر ہو گئی تو سوچنے لگی' چندر موہن بھلا کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ میں وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ کویتا نے مجھے غلط راستہ بتایا ہو' بس راہ بھٹکنے کی وجہ چندر موہن ہو سکتا تھا۔ اس نے یقیناً مجھے بھٹکا دیا تھا ورنہ اب تک میں صدر دروازے تک پہنچ چکی ہوتی۔ چلتے چلتے یوں بھی میں خاصی تھک گئی' لگ رہا تھا کہ اگر مزید چلی تو گر پڑوں گی' اس کے باوجود میں نے ہار نہیں مانی۔

"کیوں فضول بھٹک رہی ہے معبلہ۔" چندر موہن کی آواز پھر سنائی دی۔ "یہ میرا آشرم ہے۔ یہاں سے میری مرضی کے خلاف کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔ سن لے کہ اگر تُو صبح تک بھی چلتی رہے تو راستہ ختم نہیں ہوگا اور تُو آشرم کے صدر دروازے تک نہیں پہنچ سکے گی' جا واپس چلی جا۔ صبح سے جاپ منڈل میں بھی بیٹھنا ہے اور تیرا ورت (روزہ) بھی ہوگا۔ تجھے کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔ خود کو نہ تھکا اور جا کے سو جا۔"

میں نے سوچا کہ چندر موہن کو میرے فرار کے ارادے کا علم ہو گیا ہے' وہ اس وقت کسی قیمت مجھے فرار نہیں ہونے دے گا' پھر خود کو تھکانے سے کیا حاصل۔

"تُو ٹھیک کہتا ہے چندر موہن!" میں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سامنے ہی کچھ فاصلے پر راہداری تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ راہداری میں روشنی تھی۔ میں جلد ہی وہاں تک پہنچ گئی اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ میرے محافظ سانپ اب بھی میرے ساتھ ساتھ تھے۔

میں کمرے میں داخل ہوئی تو چندر موہن کو اپنی مسہری پر بیٹھے دیکھ کر چونک اٹھی۔

"تُو یہاں اس وقت کیوں آیا ہے؟" میں دروازے کے قریب ہی رک گئی۔

"تجھ سے ایک سودا کرنے آیا ہوں۔" اس نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

"کیسا سودا؟"

"کویتا کی زندگی کا سودا۔ مجھے معلوم ہے کہ تُو بھی اسے چاہنے لگی ہے۔ تجھے اگر اپنا کچھ خیال

تو کویتا ہی پر رحم کھا لے ورنہ یہ اس کے جیون کی آخری رات بن جائے گی۔ صبح میں تیری آنکھوں کے سامنے اس کا سر کاٹ دوں گا۔"

"تُو غلط فہمی کا شکار ہے۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔ کویتا کو اس کے ظلم سے بچانے کے لئے اب میں دوسرا راستہ اختیار کر رہی تھی۔ "میری بلا سے' تُو اسے صبح مارتا ہے تو ابھی مار دے۔ میں تو اس لڑکی کو بے وقوف بنا کر اپنا مطلب نکال رہی تھی مجھے تو خوشی ہوگی کہ تُو خود اپنی ایک حسین و نوخیز داسی کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔"

"کہیں تُو اس طرح مجھے فریب تو نہیں دے رہی۔ ویسے کویتا جیسی کسی لڑکی کو تیرے لئے بے وقوف بنانا زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔" چندر موہن کے چہرے سے تذبذب جھلکنے لگا۔

"اچھا اب تُو یہاں سے دفع ہو رہا ہے یا تیرے اوپر سانپ چھوڑ دوں۔" میں نے اسے دھمکی دی۔

"حیرت ہے کہ تُو نے ناگ دیوتا کے ہرکاروں کو کس طرح اپنے قابو میں کر لیا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تیری ساری شکتی تیرے شریر میں سو چکی ہے۔"

"تُو ایک روز اسی غلط فہمی میں میرے ہاتھوں سے مارا جائے گا۔"

"مار تو اب بھی رکھا ہے تُو نے مجھے۔ اتنا میں کبھی کسی کے لئے نہیں ترسا۔"

"جب تک تُو زندہ ہے ترستا ہی رہے گا۔"

"ایسی بددعا تو نہ دے ظالم۔"

میں نے سانپوں کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ "اسے بھگا دو کمرے سے۔"

میرا اشارہ پاتے ہی کئی سانپ پھنکاریں مارتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔

"ارے ارے' میں جا رہا ہوں۔" وہ بولا اور پھر سانپوں کے اپنے قریب پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو گیا۔

میں دراصل اسے جلد سے جلد اپنے کمرے سے نکال دینا چاہتی تھی۔ میرا ارادہ پھر ایک مرتبہ قسمت آزمائی کرنے کا تھا۔ میں بستر پر لیٹی ہی تھی کہ کمرے کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ اس عیار شخص نے دانستہ میرے فرار کا امکان ختم کر دیا تھا۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں دوبارہ بھی فرار ہونے کی کوشش کر سکتی ہوں۔

"کمینہ کہیں کا۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"ناراض ہو رہی ہے۔" چندر موہن کی آواز آئی۔ وہ خود نہیں آیا تھا۔ "میں نے تو تیرے ہی بھلے کے لئے تجھے کمرے میں بند کیا ہے۔ دروازہ کھلا رہتا تو خواہ مخواہ دوبارہ فرار ہونے کی کوشش میں خود کو تھکاتی۔ اب آرام سے سو جائے گی۔ دیکھ لے میں تیرا کتنا خیال رکھتا ہوں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے تُو کتنا عیار اور ذلیل شخص ہے۔" میں غصے میں بولی۔

جواب میں اس کے ہنسنے کی آواز ابھری جو دور ہوتی چلی گئی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں سو جاتی' سو ایسا ہی کیا۔

☆======☆======☆

صبح جب مجھے رادھا نے جگایا تو میں نے دیکھا اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ میرا منہ دھلوانے کے لئے لوٹا اور پرات لے آئی تھی۔ دونوں چیزیں اس نے مسہری سے ذرا فاصلے پر رکھ دی تھیں کیونکہ مسہری کی اطراف سانپوں کا پہرا تھا۔ رادھا کے لئے سانپ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے۔

میں انگڑائی لے کر اٹھ گئی۔ رات کو دیر سے سونے کے سبب میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ رادھا نے مجھے سات بجے سے پہلے ہی جگا دیا تھا۔ رات ہی کو سونے سے پہلے میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ گزشتہ روز کی طرح چندر موہن کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کروں گی۔ زبردستی کی بات اور تھی۔

"کیا بات ہے رادھا' تُو اتنی اداس کیوں ہو؟" میں نے مسہری سے اترتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ کو نہیں معلوم راجکماری جی!" رادھا کی آواز میں شکوہ اور دکھ تھا۔

"تم کچھ بتاؤ گی' جبھی تو پتہ چلے گا۔" میں منہ دھونے کے لئے پرات کے قریب بیٹھ گئی۔

"کویتا کو آپ سے پریم کی سزا ملنے والی ہے۔ سیتامائی اسے بڑے مہاراج کے آدیش (حکم) پر جاپ منڈل میں لے کر گئی ہیں۔ جہاں درگادیوی کے چرنوں میں اس کا بلیدان کر دیا جائے گا۔ بڑے مہاراج خود اپنے ہاتھ سے اسے بَلی چڑھائیں گے۔"

رادھا سے یہ سن کر میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ عیار چندر موہن میری باتوں میں نہیں آیا تھا۔ میں اس معصوم لڑکی کو بچانے کی آخری کوشش ضرور کرنا چاہتی تھی اسی لئے جلدی سے منہ دھو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رادھا لوٹا اور پرات اٹھا کر لے گئی۔ اسی کے پیچھے پیچھے میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

"معبلہ!" معاً مجھے چندر موہن کی آواز سنائی دی۔ "تُو بھی آجا کہ جاپ شروع کرنا ہے۔"

"کمینے! میں جاپ منڈل میں بیٹھنے نہیں آ رہی کہ تُو مجھے اپنا مطیع بنانے کے لئے جاپ شروع کر دے۔ میں تو کویتا کو تیرے ظلم سے بچانے کے لئے آ رہی ہوں۔"

"تُو نے کویتا کو بے وقوف بنایا تھا' پھر تجھے اس کی فکر کیوں ہو رہی ہے' میں اسے قتل کروں کہ زندہ چھوڑوں' تجھے اس سے کیا۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے سے نکل کر راہداری میں آ گئی۔ سانپ میرے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ سامنے ہی مجھے وہ راستہ کھلا نظر آ گیا جہاں سے گزر کر میں اس ہال میں پہنچ سکتی تھی جس کے اندر درگادیوی کا بت گزشتہ روز دیکھا تھا۔

تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی میں ہال کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ غصے کی زیادتی کے سبب احساس نقاہت بھی جیسے ختم ہو گیا تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر کویتا ہی پر پڑی۔ کویتا کے جسم پر صرف باریک گلابی لبادہ تھا اور وہ اس چبوترے کے نیچے ہاتھ جوڑے' سر جھکائے کھڑی تھی جس پر درگادیوی کی مورتی رکھی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ کویتا کے قریب ہی چندر موہن موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے بڑا سا کھانڈا (دو دھاری تلوار) نظر آ رہا تھا۔

چندر موہن نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور کہنے لگا۔ "مجھے تیرے ہی آنے کا انتظار تھا۔ اب تُو اپنی آنکھوں سے اس کے سر کو کٹ کر سیڑھیوں سے نیچے لڑھکتے ہوئے دیکھے گی۔ بہت دن سے میں نے انسانی جان کا بلیدان نہیں دیا تھا' اس بہانے آج یہ فرض بھی ادا ہو جائے گا۔"

"تُو کویتا کو قتل نہیں کر سکے گا۔" میں غصے سے چیخ اٹھی اور پھر سانپوں کو چندر موہن پر حملے کا حکم دے دیا۔

"مجھے خبر تھی معبلہ کہ تُو اپنے ساتھ ناگ دیوتا کے ہرکاروں کو یہاں لے کر ضرور آئے گی۔ میں نے اسی لئے پہلے ہی اس کا توڑ کر لیا تھا۔ ان کے راستے میں موت کی لکیر کھینچی ہوئی ہے اگر تُو چاہتی ہے کہ یہ زندہ رہیں تو انہیں روک لے ورنہ یہ سب جل کر بھسم ہو جائیں گے۔"

سانپ میرے حکم کی تعمیل میں تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ چندر موہن کی بات سن کر میں تذبذب میں پڑ گئی۔ وہ جھوٹ بول کر مجھے دھوکا بھی دے سکتا تھا اور اس کی بات سچ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں اسی لئے بولی۔ "چندر موہن! تُو فریب دے رہا ہے مجھے۔ تو یہ چاہتا ہے کہ تیرے فریب کا شکار ہو کر میں موت کے ہرکاروں کو روک لوں۔"

"تو نہ روک۔ تجھے ابھی خود ہی معلوم ہو جائے گا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

آگے آگے جو دو سانپ تھے' وہ اب چندر موہن سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اس کے باوجود چندر موہن بڑے اطمینان سے اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا۔ معاً مجھے یوں لگا جیسے دونوں سانپ کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر رک گئے ہوں۔ دوسرے ہی لمحے ان کے جسموں میں آگ لگ گئی۔

مجبوراً مجھے اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ اب میری حفاظت کے لئے صرف پانچ سانپ باقی رہ گئے تھے۔ وہ میرے حکم پر واپس آ گئے تھے۔

"دیکھ لیا تُو نے معبلہ کہ میں غلط نہیں کہہ رہا تھا۔" چندر موہن نے یہ کہہ کر کویتا کو مخاطب کیا۔ "چل' اوپر درگادیوی کے چرنوں میں چل۔"

اب تک کویتا نے ایک مرتبہ بھی میری طرف مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ چندر موہن کا حکم سنتے ہی کویتا نے آگے بڑھ کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔

"کویتا۔" میں نے اسے آواز دی۔

"اب یہ صرف میرا آدیش سنے گی' کسی اور کی آواز اسے سنائی نہیں دے گی اس لئے اسے آواز نہ دے۔" چندر موہن مجھ سے بولا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کویتا کسی سحرزدہ کی طرح سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ چندر موہن نے یقیناً اسے اپنے سحر میں لے رکھا تھا۔

"رک جا چندر موہن! اس معصوم کی جان نہ لے۔" میری آواز میں بے بسی تھی۔

"میں اب بھی تیری بات مان سکتا ہوں معبلہ!" چندر موہن سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے رک کر مڑا۔ "شرط وہی ہے میری بن جا۔"

میں نے سوچا' اگر وقتی طور پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دوں تو کویتا کی زندگی بچ سکتی ہے۔ بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا جب تک میرے محافظ موجود تھے چندر موہن میرے قریب نہیں آ سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں بول اٹھی۔ "تیری شرط مجھے منظور ہے۔ کویتا کی جان نہ لے۔"

"اتنا چاہتی ہے تُو اسے۔" چندر موہن حیرت سے بولا' پھر اس نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔ "آخر میں نے تجھے جھکا ہی لیا نا۔ مجھے اگر یہ اندازہ ہوتا تو بہت پہلے تیری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا چکا ہوتا۔ اچھا اب پہلا کام یہ کر کہ ناگ دیوتا کے ان ہرکاروں کو اپنے کمرے میں واپس بھیج دے۔"

"وہ کس لئے؟ یہ تیرا کیا بگاڑ رہے ہیں؟ یوں بھی یہ تیرے قریب نہیں آ سکتے۔" میں نے کہا۔

"مگر ان کی موجودگی میں' میں بھی تو تیرے قریب نہیں آ سکتا۔"

"تجھے قریب آنے کی ابھی کیا ضرورت ہے؟ ابھی تو تجھے جاپ شروع کرنا ہے۔"

"جاپ کل سے بھی شروع کیا جا سکتا ہے پھر جب تُو راضی ہو ہی گئی ہے تو مجھے جاپ کی کوئی اتنی جلدی نہیں رہی۔ جب میں دیکھوں گا تیری سرکشی نہیں گئی تو جاپ شروع کردوں گا۔" چندر موہن ایک اور ہی راگ الاپنے لگا۔

یہ صورت حال میرے لئے خلاف توقع تھی۔ اس طرح چندر موہن مجھے بے سر کرنا چاہتا تھا۔ میں چند لمحے سوچ کر بولی۔ "ٹھیک ہے' میں سانپوں کو یہاں سے اپنے کمرے میں بھیج دوں گی' مگر پہلے تُو کویتا کو اپنے سحر سے آزاد کر دے اور پھر اسے جانے دے۔"

"تُو اپنے وعدے سے پھر تو نہیں جائے گی۔"

"جب وعدہ کر لیا تو کر لیا' بول کیا پہلے کبھی میری زبان پر ایسی بات آئی؟"

"یہ تو خیر تُو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ پھر بھی جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا کہ تُو واقعی میری بات مان سکتی ہے۔ اچھا چل یہ بھی سہی' اگر تُو مجھے فریب دے رہی ہے تو کب تک کویتا کو میرے ہاتھوں سے بچا سکتی ہے۔" پھر اس نے کچھ پڑھ کر کویتا کی طرف پھونک ماری۔

کویتا اس دوران سیڑھیاں چڑھ کر اوپر مورتی کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ میں نے اس کے جسم کو جھٹکا سا لگتے دیکھا۔ یوں جیسے وہ گہری نیند سے جاگ اٹھی ہو۔ اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا اور پھر مڑ کر نیچے دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے جیسے وہ جو کچھ دیکھ رہی ہے اس پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"کویتا۔" چندر موہن نے اسے مخاطب کیا۔ "معبلہ تیری جگہ بلیدان دینے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ تُو.........."

"نہیں۔" کویتا چیخ اٹھی۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ بلیدان میں ہی دوں گی۔"

"دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔" چندر موہن زور سے ہنس پڑا پھر کویتا کو سمجھانے لگا۔ "تُو شاید کچھ غلط سمجھ رہی ہے۔ معبلہ اپنی جان کا نہیں' کنوارپن کا بلیدان دے گی۔ تجھے بلی نہ چڑھایا جائے گا۔ معبلہ اسی لئے بلیدان دینے پر آمادہ ہوئی ہے۔ جتنا تو اسے چاہتی ہے' یہ بھی تجھ سے اتنا ہی پیار

کرتی ہے' اب تُو جا۔"

سزائے موت کا جسے حکم سنایا جا چکا تھا' یوں اچانک رہائی ملنے پر عجیب سے انداز سے میں ہنس پڑی' مگر یہ ہنسی نارمل نہیں تھی۔ وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

"ٹھہر جا!" اچانک چندر موہن کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "تیرے راستے سے موت کی دیوار تو ہٹا دوں۔" پھر وہ کچھ پڑھنے لگا۔

چند ہی لمحے بعد میں نے چبوترے سے کچھ فاصلے پر ایک روشن لکیر کو اوپر اٹھتے دیکھا۔ غالباً یہ وہی نادیدہ لکیر تھی جس سے ٹکرا کر دو سانپ جل کر خاک ہو چکے تھے۔ اس لکیر کو میں نے کچھ بلند ہو کر فضا میں ٹوٹ کر بکھرتے دیکھا۔

"اب تُو جا سکتی ہے کویتا۔" چندر موہن بولا۔

کویتا سیڑھیاں اتر کر آگے بڑھی اور پھر میرے قریب پہنچ گئی۔ سانپوں نے اسے راستہ دے دیا تھا۔ اچانک وہ میرے قدموں میں گر گئی۔

"ارے! تم یہ کیا کر رہی ہو۔" میں نے جھک کر اسے اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"میری راجکماری! میری راجکماری!" وہ بے اختیار مجھے چومنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"لگتا ہے معبلہ کہ تیرے پیار میں یہ دیوانی ہو گئی ہے۔" چندر موہن دھیرے سے ہنسا۔

چندر موہن کی بات کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور کویتا کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی جو اب میرے سینے سے لگی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔

"جا کویتا۔" میں نے نرمی سے اسے خود سے الگ کر دیا۔ پھر میں نے سرگوشی کی۔ "جتنی جلد ہو سکے اس آشرم سے فرار ہو جا۔ چندر موہن کو میں اتنی دیر الجھائے رکھوں گی۔"

"اور آپ؟" اس نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔

"میری فکر نہ کر۔" پھر میں نے اسے سرگوشیوں میں جلدی جلدی بتایا کہ آشرم سے نکل کر کہاں جانا ہے۔ چندر موہن کو کوئی شک نہ ہو' اس خیال سے سرگوشیاں کرتے ہوئے میں نے اسے دوبارہ گلے سے لگا لیا تھا اور اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھنے لگی تھی۔

"کویتا" چندر موہن کی آواز پھر آئی۔ "مجھے تیری قسمت پر رشک آ رہا ہے۔ کاش معبلہ مجھے بھی اس طرح چاہنے لگے۔"

"تیری زندگی یہاں خطرے میں ہے' جلد سے جلد نکل جا۔" میں نے آخری سرگوشی کی۔ اس وقت میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ اس آشرم کے صدر دروازے پر دن کے وقت بڑے مہاراج کا چیلا گوپال پہرا دیتا ہے۔ اس کی موجودگی میں کویتا باہر نہیں جا سکتی تھی۔ جذبات کی شدت اور صورت حال کی نزاکت کے سبب شاید یہ بات کویتا کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ وہ بہرحال وہاں سے چلی گئی۔ میں اب مطمئن تھی کہ اس کی زندگی بچ گئی ہے۔

کویتا ہال کے دروازے سے نکل گئی تو چندر موہن ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "معبلہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ کویتا یہاں سے چلی گئی ہے۔ اب تُو اپنے وعدے کے مطابق ناگ دیوتا کے ہرکاروں کو بھی اپنے کمرے میں بھیج دے۔"

"وہ تو خیر میں بھیج دوں گی مگر چندر موہن پہلے تو مجھ سے تُو نے کچھ اور کہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اور تو میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"میں اس وقت کی بات نہیں کر رہی۔" میں دانستہ بات کو طول دے رہی تھی کہ کویتا کو فرار ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت مل جائے۔

"پھر؟" چندر موہن نے پوچھا۔ "پھر کب کی بات کر رہی ہے۔"

"یاد کر' کیا تُو نے مجھے اپنی پتنی بنانے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"اچھا تو میری پتنی بننا چاہتی ہے تُو۔" وہ ہنسا۔

"ہاں۔ میں اس سے پہلے تجھے اپنے جسم کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔" میں نے اپنی دانست میں ایک ایسی شرط رکھ دی جو فوری طور پر پوری نہیں کی جا سکتی تھی۔

"ارے پگلی' اس میں کتنی دیر لگتی ہے' میں ابھی درگا دیوی کے سامنے تیری مانگ میں سیندور بھرے دیتا ہوں۔"

"نہیں چندر موہن' اس طرح نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"پھر کس طرح؟ تُو کیا چاہتی ہے؟" وہ اب سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا تھا۔ دو دھاری تلوار ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

"تیری میری شادی باقاعدہ ہوگی۔ آگ کے پھیرے لگانا ہوں گے تجھے میرے ساتھ۔"

"ارے تجھے ناستک ہو کر بھی ان چیزوں پر وشواس (یقین) ہے' مجھے حیرت ہے کہ تُو ہندو دھرم کی اتنی جانکاری رکھتی ہے۔ اگر تیری یہی مرضی ہے تو یہ سب کچھ بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ خواہ مخواہ اس میں بہت سارا سمے بیت جائے گا۔ تیرے اقرار کے بعد اب مجھ سے صبر نہیں ہو رہا۔"

"نہیں۔ باقاعدہ شادی سے پہلے تیرا میرا ملن گناہ ہے۔ میں اس گناہ پر ہرگز آمادہ نہیں ہوں۔"

"میں درگا دیوی کے سامنے تیری مانگ میں سیندور بھر کے تجھے سویکرت (قبول) کروں گا۔ اس پر تو تجھے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے' پھیرے بعد میں ہوتے رہیں گے۔"

"پھیروں کے بغیر میں تیری کوئی بات نہیں مانوں گی۔"

"اس کے لئے تو کوئی تیسرا شخص بھی یہاں بلانا پڑے گا جو پھیروں کے بیچ اشلوک پڑھتا رہے۔ اس میں تو بڑا سمے لگے گا۔"

"اب جو بھی ہو۔" میں اپنی ضد پر اڑی رہی۔ میرا مقصد محض وقت کو ٹالنا اور اسے باتوں میں الجھائے رکھنا تھا۔ میں ہندوؤں کے تمام رسوم و رواج' عقائد اور مذہبی فرائض سے اچھی طرح واقف تھی اس لئے وہ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔

"معبلہ! ضد نہ کر اور میری بات مان لے' دیوی کے سامنے تیری مانگ بھرنے سے بھی........."

"نہیں" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ساری زندگی میرے دل پر یہ بوجھ رہے گا کہ باقاعدہ اشلوک پڑھے بغیر اور آگ کے گرد پھیرے نہ لگا کر تُو نے مجھے اپنایا تھا۔ میں اسے گناہ ہی سمجھتی رہوں گی۔ تُو آخر میری بات کیوں نہیں سمجھ رہا؟ میری زندگی کو یہ روگ کیوں لگانا چاہتا ہے؟"

"کیا تجھے میرے اوپر بھروسا نہیں کہ میں بعد میں تیرے کہنے کے مطابق........."

"بعد کا کوئی سوال نہیں۔" میں پھر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔ "تُو نے جہاں اتنے دن صبر کیا ہے' کچھ دیر اور سہی۔ اس طرح میرا دل تو مطمئن ہو جائے گا کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا اور تُو نے باقاعدہ مجھے اپنی بیوی بنایا ہے۔"

"کہہ تو ٹھیک رہی ہے تُو۔" وہ کسی قدر نرم پڑ گیا۔ "مگر اس میں ایک اور بھی اڑچن ہے۔ اس اڑچن کو دور کئے بغیر میں تیرے ساتھ پھیرے نہیں کر سکتا۔"

میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر اس سے پوچھا۔ "وہ کیا رکاوٹ ہے؟" جتنی بھی رکاوٹیں پیدا ہوتیں میرے ہی حق میں تھیں۔

"تجھے ہندو دھرم اپنانا پڑے گا۔" چندر موہن نے جواب دیا۔ "اور اس کے لئے پہلے تجھے شدھی بنانا پڑے گا۔"

"میں اس پر راضی ہوں کہ تُو مجھے شدھی کر لے۔"

"بات تو پھر وہیں کی وہیں رہی۔" اس نے طویل سانس لیا۔ "اس میں بڑا سمے بیت جائے گا۔"

"وقت تو لگے گا کیوں کہ ابھی ابھی مجھے تیرا ایک اور وعدہ یاد آ گیا ہے۔ اس خوشی کے موقع پر کانٹے کی طرح میرے دل میں چبھتا رہے گا۔" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"کون؟ تُو کس کی بات کر رہی ہے؟" میری توقع کے مطابق چندر موہن نے مجھ سے دریافت کیا۔

"میرا دشمن ژیان۔" میں نے بتایا۔ "جب تک میں اس سے انتقام نہیں لے لوں گی' میرا سینہ دھواں دیتا رہے گا۔"

"تیری اگر کوئی اور شرط بھی ہے تو وہ بھی بتا دے۔" معاً چندر موہن کا لہجہ بدل گیا۔

"یہ میری شرط نہیں بلکہ تیرا وعدہ تھا جو میں نے تجھے یاد دلایا ہے۔" میں پُرسکون آواز میں بولی۔

"میں تو پہلے بھی کسی شرط کے بغیر تیرے دشمن کو تجھ سے قتل کرانے پر آمادہ ہو گیا تھا' مگر تُو ہی نہیں مانی۔ تُو نے اسے بھی میری کوئی چال سمجھا۔ پھر اب یہ کیا ضروری ہے' میں تیرے ہاتھوں کسی بے گناہ شخص کو قتل کرا کے تجھے یہ فریب نہیں دوں گا کہ تُو نے اپنے دشمن سے انتقام لے لیا ہے۔"

چندر موہن نے مجھے میرے ہی الفاظ یاد دلائے۔ "اگر میں نے تجھے فریب نظر میں مبتلا کر دیا تو پھر؟ جب تُو نے ایک بار میرے خلوص کو فریب سمجھ کر ٹھکرا دیا تو اب کیوں ان باتوں کو دہرا رہی ہے؟"

"پچھلی باتوں کو بھول جا چندر موہن کہ اب ہم ایک نئے جیون کی ابتدا کر رہے ہیں۔"

"کاش تیری ان باتوں میں سچائی ہو۔"

"کیوں، کیا اب بھی تجھے کوئی شک ہے چندر موہن؟"

"ہاں شک ہے مجھے' اس لئے کہ تُو نے اب تک میری کوئی بات نہیں مانی' مجھ سے اپنی شرطیں منوا رہی ہو۔ تجھ سے اتنا تک تو ہوا نہیں کہ ناگ دیوتا کے ان ہرکاروں ہی کو یہاں سے میرے کہنے پر اپنے کمرے میں بھیج دیتی تاکہ میں تیرے قریب تو آ سکتا۔" اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"کیوں' تُو کس لئے میرے قریب آنا چاہتا ہے؟ میں تجھ سے کہہ تو چکی ہوں کہ اس وقت تک تیرے ارمان پورے نہیں ہوں گے جب تک میں باقاعدہ تیری پتنی.........."

"سب کچھ بھوگ (وصل) ہی تو نہیں ہے معبلہ! اس کے سوا بھی تو بہت کچھ ہے۔ پریمی ہر سمے تو بھوگ کی دشا (حالت) میں نہیں رہتے۔"

"نہ رہتے ہوں گے' مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔" میرا لہجہ بدلنے لگا کیونکہ کوبتا کو فرار کے لئے میں خاصا وقت دے چکی تھی۔ "میں نے تجھ سے جو کچھ کہہ دیا ہے' وہ اپنی جگہ اٹل ہے پھر ایک بار سن لے' پہلے تُو میرے دشمن کو مجھ سے قتل کرائے گا' پھر مجھے شدھی کرے گا' اس کے بعد باقاعدہ ہندو مذہب کے مطابق میں تیری بیوی بنوں گی۔"

اب وقت آ گیا تھا کہ میں سانپوں کو اس پر حملے کا حکم دے دیتی۔ موت کی لکیر خود اسی نے درمیان سے ہٹا دی تھی۔

"مجھے تیری سب شرطیں منظور ہیں۔" چندر موہن بولا۔ "بھوگ کے لئے میں نہیں کہتا' تُو بس ایک بار مجھے........" چندر موہن نے اپنی ایک ایسی غلیظ خواہش کا اظہار کیا جو میں ضبط تحریر میں لانے سے قاصر ہوں۔ اس سے چندر موہن کی گندی ذہنیت کا اظہار ہوتا تھا۔

میرا خون کھول اٹھا اور قوت برداشت جواب دے گئی۔ "کتے۔" میں غصے سے چیخ اٹھی۔

"معبلہ!" اس کی آواز میں بھی سختی آ گئی۔ "تُو میرا اپمان (توہین) کر رہی ہے۔ تجھے میری بے عزتی کا کوئی حق نہیں۔"

"بے عزتی تو اس کی ہوتی ہے چندر موہن جس کی کوئی عزت ہو۔"

"تو کیا میں تیری نظر میں بے عزت ہوں؟" وہ اور بھی برہم ہو گیا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تجھ جیسا بے عزت' ذلیل اور کمینہ شخص کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

"اور تُو ابھی اسی بے عزت' ذلیل اور کمینے شخص کو اپنا پتی (شوہر) بنانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ پھر تُو بھی ذلیل اور کمینی ہوئی۔"

"میں کسی ذلیل اور کمینے کی بات پر کان نہیں دھرتی۔ کتے کا کام تو بھونکنا ہی ہوتا ہے' وہ تو بھونکے گا' تُو بھی بھونکتا رہ۔" یہ کہتے ہی میں نے سانپوں کو اس پر چھوڑ دیا۔

اس کے باوجود چندر موہن غائب نہیں ہوا۔ اس مرتبہ چندر موہن نے اپنے بچاؤ کے لئے ایک اور تدبیر آزمائی تھی۔ اچانک اس کے جسم کو میں نے فضا میں بلند ہوتے دیکھا تھا۔ اب وہ فضا میں معلق تھا اور سانپ اس کے نیچے لہرا لہرا کر بل کھا رہے تھے۔

"معبلہ! تجھے نہیں معلوم کہ چندر موہن میں کتنی شکتی ہے۔ دیکھ لے' تیرے وار سے میں کتنی آسانی سے بچ گیا۔ ناگ دیوتا کے ہرکاروں نے میرا کیا بگاڑ لیا۔ اب میں تجھے اپنا ایک اور چمتکار (کمال) دکھاتا ہوں تاکہ تُو خود یہ دیکھ لے' میرے سامنے تیری کوئی حیثیت نہیں۔" چندر موہن نے یہ کہتے ہی اپنے دونوں ہاتھ مخصوص انداز میں ہلائے۔

اسی لمحے میں نے اپنے جسم کو بھی فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ پھر میں' چندر موہن کے قریب پہنچ گئی اور اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

"دیکھی میری شکتی معبلہ' تُو کس طرح میرے پاس آ گئی۔ اگر یہ استھان (مقام' جگہ) درگا دیوی کا نہ ہوتا تو میں اسی سمے تیرے غرور کو ہمیشہ کے لئے خاک میں ملا دیتا۔ نہیں .... کتیا نہ بن۔" اس نے ایک ہاتھ سے میرے سر کے بال پکڑ کر پیچھے کی طرف جھکا دیا۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر چندر موہن کے پُرگوشت سینے میں اپنے دانت اتار دینا چاہے تھے' مگر وہ عیار چوکنا تھا۔

"چل میں اسی طرح تجھے اپنی سوپن گرہ (خواب گاہ) میں لے چلتا ہوں مگر نہیں' وہاں تو چمپا ہے۔ باغ میں چلتے ہیں۔ وہاں خوشبو بھی ہو گی۔ تجھے شاید خبر نہ ہو کہ ملن کے سمے خوشبو کس طرح جذبات میں اچھل مچا دیتی ہے لیکن پہلے میں تیرا منہ باندھ دوں۔" وہ یہ کہہ کر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدانے لگا۔

پھر اس نے میرے منہ پر پھونک ماری۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنے جبڑے اکڑتے محسوس ہوئے۔ اس نے میرے سر کے بال چھوڑ دیئے۔ میرے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جم گئے تھے۔ میں نے اپنا منہ کھولنے کے لئے زور لگایا مگر ناکام رہی۔ چندر موہن کا شیطانی سحر اپنا کام کر چکا تھا۔

"میں چاہوں تو اسی طرح تیرے سارے شریر (جسم) کو مفلوج کر سکتا ہوں' مگر اس طرح تیرے ساتھ بھوگ کرتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ میں کسی پتھر کی مورتی سے بھوگ نہیں کرنا چاہتا۔ اچھا اب چل باغ میں چلتے ہیں۔" یہ کہتے ہی وہ مجھے سنبھالے ہوئے ہال کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

میرا جسم بھی چندر موہن کے ساتھ فضا میں تیرتا ہوا ہال کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

"معبلہ! اگر تُو دل سے میری بن جائے تو میرے اندر جتنی بھی شکتی ہے تجھے دان کر دوں گا۔ پھر تُو اپنا سے بھی زیادہ قوتوں کی مالک بن جائے گی۔"

میں نے نیچے کی طرف دیکھا۔ میرے محافظ سانپ بھی تیزی سے ہال کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے پھر میں نے انہیں دروازے کی چوکھٹ پر چڑھ کر لٹکتے دیکھا۔ تین سانپ دروازے کی چوکھٹ سے لٹک گئے تھے اور دو نیچے دروازے میں پھن پھیلا کر بیٹھ گئے تھے۔ چوکھٹ سے لٹکنے والے سانپوں اور نیچے موجود سانپوں کے درمیان اتنا فاصلہ نہیں تھا کہ چندر موہن مجھے ساتھ لئے دروازے سے گزر سکتا۔ سانپوں نے راہ مسدود کر دی تھی۔

معاً میں نے چندر موہن کی نگاہ دروازے کی طرف اٹھتے دیکھی۔ وہ آگے بڑھتے بڑھتے اسی جگہ فضا میں معلق ہو گیا۔

"ناگ دیوتا کے یہ ہرکارے تو عذاب جان بن گئے۔ میں انہیں جلا کر بھسم نہیں کرنا چاہتا تھا' لیکن اب ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" چندر موہن خودکلامی کے انداز میں بولا پھر اس نے نعرہ مارا۔

"جے درگا مائی۔"

میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ میرے محافظوں کا آخری وقت آ پہنچا تھا۔ چندر موہن نے میرے جسم کو چھوڑ کر ان سانپوں کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لئے تھے۔ میرا جسم نیچے گرنے کی بجائے فضا ہی میں تیرنے لگا تھا۔ میں نے بجلی کا ایک کوندا سا ان سانپوں کی طرف لپکتے دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں وہ جو میرے محافظ تھے' محسن تھے اور جنہوں نے مجھے اب تک چندر موہن کے دست ہوس سے بچائے رکھا تھا' میں انہیں زندہ جلتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جان بہرحال ان میں بھی تھی۔

اچانک جب میں نے اپنی کمر کے گرد چندر موہون کے بازو کا لمس محسوس کیا تو آنکھیں کھول دیں۔

"اب یہ دھڑکا بھی جاتا رہا۔" چندر موہن نے کہا۔

"ہم اب نیچے اتر سکتے ہیں کیونکہ خطرہ ٹل گیا ہے۔"

میرا اور چندر موہن کا جسم دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگا۔ پھر اس نے مجھے سیدھا کھڑا کر دیا۔ جہاں وہ مجھے لے کر اترا تھا وہاں سے چبوترا قریب ہی تھا۔ چبوترے کی ایک سیڑھی پر مجھے وہ دو دھاری تلوار رکھی نظر آئی جس سے چندر موہن' کویتا کی گردن کاٹنے والا تھا۔ میں نے جھپٹ کر وہ تلوار اٹھا لی۔

چندر موہن اچھل کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔ "تلوار پھینک دے ہاتھ سے معبلہ۔"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ بولنے سے تو میں پہلے ہی قاصر ہو چکی تھی۔

"تو کیوں یہ چاہتی ہے کہ میں تیرے ہاتھوں کو بھی پتھر بنا دوں۔" اس نے مجھے دھمکی دی۔

چندر موہن کی دھمکی کا کوئی اثر قبول کئے بغیر میں نے تلوار بلند کی اور اس پر جھپٹ پڑی وہ ایک بار پھر فضا میں بلند ہو گیا۔ اب وہ میری دسترس سے دور تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے مخصوص انداز میں اچانک تلوار اس کی طرف پھینکی۔ اگر چندر موہن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تلوار کے اس مخصوص وار سے بچ نہ پاتا۔ وہ انتہائی تیزی کے ساتھ نیچے آ گیا تھا اور پھر اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے میری کلائی پکڑ لی تھی۔ کلائی پر اس کے ہاتھ کی گرفت بہت سخت تھی۔

"چل۔" اس نے جھٹکا دیا۔ "تو نے بہت اچھل کود کر لی۔"

وہ مجھے گھسیٹتا ہوا ہال کے دروازے کی طرف چل دیا کیونکہ میں آگے نہ بڑھنے کے لئے مسلسل زور آزمائی کر رہی تھی۔

"اچھا۔ پھر اس طرح تو چلے گی۔" اچانک اس نے جھک کر مجھے اٹھا لیا۔

یوں بھی نقاہت کے سبب اب میری قوت مدافعت دم توڑ چکی تھی۔ چندر موہن مجھے اٹھائے ہوئے ہال سے نکلا' پھر درمیانی راستے سے گزر کر سیڑھیوں پر چڑھنے کے بعد راہداری میں آ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ راہداری سے گزرتا ہوا باغ میں پہنچ چکا تھا۔

وہ مجھے لئے ایک کنج کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسی کنج سے مجھے ایک آشنا نسوانی آواز سنائی دی۔

"نہیں' میں نے ایک بار تیری بات مان تو لی۔ مجھے تیرے پاس بہت دیر ہو گئی ہے۔ کہیں بڑے مہاراج کو خبر نہ ہو جائے۔"

جواب میں ایک اجنبی مردانہ آواز ابھری۔ "بڑے مہاراج سے نہ ڈر' انہیں پتا نہیں چلے گا۔ کیا تو بھول گئی کہ میرا نام گوپال ہے اور گوپال کے پاس بھی بڑی شکتی ہے۔"

"گوپال۔" اچانک چندر موہن پوری قوت سے چیخ اٹھا۔

"چھوڑ .... چھوڑ دے مجھے۔ بڑے مہاراج آ گئے۔" نسوانی آواز پھر آئی۔ یہ آواز رادھا کی تھی۔

"اچھا تو جا! میں دیکھتا ہوں' بڑے مہاراج مجھے کیوں پکار رہے ہیں۔" میں نے پرسکون مردانہ آواز سنی۔ کویتا نے مجھ سے اسی کا ذکر کیا تھا۔ وہ بڑے مہاراج کا خاص چیلا گوپال تھا جو دن کے وقت آشرم کے صدر دروازے پر پہرا دیتا تھا۔ چندر موہن کی وہاں خلاف توقع آمد سے وہ بالکل نہیں گھبرایا تھا۔ اس کی پرسکون آواز اس کا ثبوت تھی حالانکہ میرے خیال میں اس وقت وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔

چند ہی لمحے بعد میں نے کنج سے ایک شخص کو باہر آتے دیکھا۔ اس کے اور بڑے مہاراج کے حلئے میں زیادہ فرق نہیں تھا البتہ بڑے مہاراج سے اس کی عمر کچھ کم لگتی تھی اور جسم بھی گٹھیلا تھا۔ وہ بڑے مہاراج کے سامنے پہنچ کر جھکا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اس کا چہرہ کچھ دیکھا دیکھا سا لگا۔

"تو یہاں کیا کر رہا تھا؟" چندر موہن نے سخت لہجے میں اس سے جواب طلبی کی۔

"وہی بڑے مہاراج جو آپ یہاں کرنے آئے ہیں۔ میں بھی تو آخر آپ ہی کا چیلا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے گوپال کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ "آپ کی طرح سندر ناریوں سے بھوگ کا ارمان تو مجھے بھی رہتا ہے اور آپ کو اس کی خبر ہے۔"

"ہاں مجھے خبر ہے' میں نے اسی لئے تجھے یہ آگیا (اجازت) دی تھی کہ تو کسی بھی استری (عورت) یا ناری (لڑکی) کو آشرم میں بھوگ کرنے کو اٹھا کر لا سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو ایسا ہی کرتا بھی رہا ہے' لیکن میں نے رادھا اور کویتا کے لئے تجھ سے سختی سے ساتھ منع کر دیا تھا کہ ان سے بھوگ نہیں کرے گا۔ پھر تو نے رادھا سے بھوگ کیوں کیا؟ کیا اس طرح تو نے میرے آدیش (حکم) کو نہیں ٹھکرا دیا؟"

"غلط بات نہ کریں بڑے مہاراج۔" گوپال کی آواز میں تیزی آ گئی۔ "آپ کا آدیش یہ تھا کہ میں سویم (خود) ابھی انہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ سو میں نے آپ کے آدیش کا پالن کیا' میں رادھا کے پاس نہیں گیا تھا بلکہ وہ خود میرے پاس آئی تھی۔"

"لفظی ہیرا پھیری سے تو پاپ کو پن (ثواب) نہیں بنا سکتا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے تو میں نے تجھ پر ایک اپکار (احسان) کیا تھا۔ کیا میں نے تیرے کہنے پر تجھے چمپا کے ساتھ سم بھوگ کی انومتی (اجازت) پردان (عطا) نہیں کی؟ کیا وہ تیرے لئے کافی نہیں تھی؟"

"تھی بڑے مہاراج پر اب نہیں۔ اس کا شریر (جسم) تو اب داغدار ہو چکا ہے۔ اس سے ہٹ کر

ایک بات میں آج تک نہیں سمجھ پایا بڑے مہاراج کہ کیا میری ایک عمر کی سیوا کا یہی پھل ہے کہ میرے حصے میں وہی آئے جس سے آپ کا جی بھر جائے۔"

"گوپال! تیرے منہ سے مجھے دو دروہ (بغاوت) کی بو آ رہی ہے۔ دو دروہی (باغی) بن کر تُو سکھ نہیں پائے گا۔"

پھر وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ مجھے یوں لگا جیسے دو درندے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوں۔

اچانک بڑے مہاراج نے مجھے کھڑا کر دیا۔ میں ایک طرف ہو گئی اسی لمحے مجھے یوں لگا جیسے میرے اکڑے ہوئے جبڑے ڈھیلے پڑ گئے ہوں۔

"تُو اپنے کمرے میں جا معبلہ!" بڑے مہاراج نے مجھ سے کہا۔ "مجھے ذرا اس سے نمٹنے دے، تیرا بندھا ہوا منہ میں نے کھول دیا ہے۔"

"نہیں۔" میں نے انکار کر دیا۔ "میں تجھے تیرے ہی ایک چیلے کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھوں گی۔ شمبھو کو تو سازش کر کے تُو نے میرے ہاتھوں مروا دیا تھا۔ وہ تیرا فریب کھا گیا تھا، مگر گوپال مجھے ایسا نہیں لگتا۔ یقیناً یہ تیری ناک میں نکیل ڈال سکتا ہے۔"

"کیا؟ بڑے مہاراج! یہ سندری کیا کہہ رہی ہے۔ میرے چھوٹے بھائی شمبھو کو آپ نے مروایا تھا؟ مجھے تو آپ نے کچھ اور ہی بتایا تھا۔"

"یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے گوپال، تُو اس کی باتوں میں نہ آ۔" بڑے مہاراج کے لہجے میں کچھ نرمی آ گئی۔ "یہ ہم دونوں کو لڑانا چاہتی ہے۔"

میں اب جان چکی تھی کہ مجھے گوپال کا چہرہ کیوں دیکھا دیکھا سا لگا تھا۔ شمبھو اور اس کے چہرے میں کس قدر مشابہت تھی۔

"گوپال! چمپا بھی اس کے قتل کی سازش میں شریک تھی۔ تم اگر اس کی زبان کھلوا سکو تو تمہیں خود سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" میں پھر بول اٹھی۔ اب اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اگر دو شیطان ایک دوسرے کے خلاف ہو جاتے تو یہ میرے ہی حق میں بہتر تھا۔

"کہیں تمہارا نام معبلہ تو نہیں، بڑے مہاراج نے جس کا سودا بدیشی سرکار سے کیا ہے؟" گوپال مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہاں میرا نام معبلہ ہے۔"

"گوپال، یہ تجھے فریب دے رہی ہے۔ تیرے بھائی کو اسی نے قتل کیا ہے۔" چندر موہن درمیان میں بول اٹھا۔

"اس ناری نے آپ کے کہنے کے مطابق میرے بھائی شمبھو کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ تو کیا اسی لئے آپ اسے اپنے گلے کا ہار بنائے ہوئے تھے بڑے مہاراج؟"

"زیادہ مکت کنٹھ (بدلگام) نہ بن گوپال! تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تُو میری نظروں سے اس سے دور

ہو جا۔"

"اب اس طرح خالی ہاتھ تو نہیں جاؤں گا بڑے مہاراج۔ یا تو آپ اس ناری معبلہ کو میرے حوالے کر دیں یا پھر رادھا اور کویتا کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

بڑے مہاراج چندر موہن سے گوپال کا یہ مطالبہ میرے نزدیک اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ اس نے چاہے چندر موہن کی خدمت کر کے ہی شیطانی قوتیں حاصل کی ہوں، مگر چندر موہن سے ٹکرانے کا حوصلہ اس میں تھا۔ میں نے چندر موہن کے چہرے پر پہلے شدید غصے کے آثار دیکھے، پھر جیسے اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اس کے چہرے سے اب تذبذب جھلک رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جب وہ بولا تو یہ تذبذب بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "گوپال! آج تک تُو نے مجھ سے جو کچھ مانگا ہے، وہ میں تجھے دیتا رہا ہوں لیکن اسے تُو اپنی آخری مانگ سمجھنا۔ آج کے بعد سے تیرے لئے میرے آشرم کے دوار (دروازے) بند ہو جائیں گے جو پھر کبھی نہیں کھلیں گے، رادھا اور کویتا کو تجھے اپنے آشرم سے لے جانے کی آگیا دیتا ہوں۔"

"دھنیہ واد (شکریہ) بڑے مہاراج! لیکن میرا ایک قرض آپ پر پھر بھی باقی رہے گا جیون رہا تو وہ قرض وصول کرنے میں ضرور آؤں گا۔"

"کیسا قرض؟ تُو کیا بکواس کر رہا ہے۔" چندر موہن کو پھر غصہ آ گیا۔

"یہ میں سے آنے پر ہی بتاؤں گا۔ آپ کی انومتی سے اب میں چلتا ہوں۔" گوپال نے یہ کہہ کر کنج کی طرف دیکھا اور بولا۔ "رادھا، مجھے معلوم ہے کہ تُو ابھی یہیں چھپی ہوئی ہے، باہر آ جا اور کویتا کو بلا کر لے آ۔ بڑے مہاراج سے نہ ڈر کہ میں یہاں موجود ہوں۔"

رادھا کنج سے نکل آئی۔ اس کی حالت دیکھ کر بخوبی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ کس عالم میں ہو گی۔ اس سے قطع نظر مجھے جو غیر معمولی بات محسوس ہوئی وہ رادھا کے چہرے پر اڑنے والی ہوائیاں تھیں۔ میں حیران تھی کہ جب گوپال نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا تھا تو وہ اتنی خوفزدہ کیوں تھی۔ رادھا جب کویتا کو بلانے چلی گئی تو میں سوچنے لگی، کویتا کو میں نے ایک شیطان سے نجات دلائی تو وہ دوسرے شیطان کے ہتھے چڑھ گئی۔ میرے نزدیک یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔

خلاف توقع رادھا جلد ہی لوٹ آئی، مگر وہ اکیلی تھی۔ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی گوپال بول اٹھا۔ "تُو کویتا کو اپنے ساتھ نہیں لائی؟"

"وہ آشرم میں نہیں ہے۔" رادھا نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" بہ یک وقت گوپال اور چندر موہن دونوں نے ہی اس سے سوال کیا۔

"سیتا مائی اسے سارے آشرم میں تلاش کر چکی ہیں، وہ کہیں بھی نہیں ہے۔" رادھا بتانے لگی۔

"سیتا مائی نے بتایا ہے کہ اس کا سامان وغیرہ بھی غائب ہے۔"

"تُو نے دیکھ لیا اپنی بے پروائی کا انجام۔ کویتا یقیناً اسی سمے فرار ہوئی ہے جب تُو رادھا کے ساتھ عیش کر رہا تھا۔" چندر موہن بولا۔

گوپال چونک اٹھا‘ پھر کہنے لگا۔ ”مگر کویتا کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ میں دروازے پر موجود نہیں ہوں؟“

حالات و واقعات جس طرف اشارہ کر رہے تھے‘ وہ میرے لئے سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ راہِ فرار اختیار کرنے کے لئے یقیناً کویتا نے رادھا سے مدد حاصل کی تھی۔ رادھا نے گوپال کو اپنے جسم کی رشوت دے کر دروازے سے ہٹا دیا تھا تاکہ کویتا فرار ہو سکے۔

میں نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا‘ ان دونوں شیطانوں کو بھی اس تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔

”رادھا اپرادھی (مجرم) ہے۔“ چندر موہن نے کہا۔ ”اسی نے کویتا کو فرار ہونے کا موقع دیا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں بڑے مہاراج۔“ گوپال نے اتفاق کیا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ رادھا نے مجھ سے بھی دغا کی اور تجھے بھی فریب دیا۔ اسے سزا ملنا چاہیے۔“ چندر موہن بولا۔

”بڑے مہاراج‘ آپ میری مانگ پر رادھا اور کویتا کو مجھے سونپ چکے تھے۔ سو اب دونوں پر آپ کا ادھیکار (حق) نہیں رہا۔“

”اس طرح کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”یہ کہ رادھا کو آپ سزا نہیں دے سکتے۔ ایک تو فرار ہو گئی‘ دوسری کو آپ مجھ سے سزا کے بہانے چھین لینا چاہتے ہیں۔ یہ سراسر انیائے (ناانصافی) ہے۔“

”جے درگا مائی۔“ اچانک چندر موہن نے نعرہ لگایا۔ اس کے دونوں ہاتھ گوپال کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

بجلی کا کوندا سا میں نے گوپال کی طرف لپکتے دیکھا‘ مگر اسی لمحے وہ غائب ہو گیا۔ چندر موہن نے خلاف توقع گوپال پر وار کر دیا تھا۔ شاید اسی لئے وہ فرار ہو گیا تھا۔ اسی سے میں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ گوپال پر چندر موہن کا پلہ کچھ نہ کچھ بھاری ضرور ہے۔ گوپال‘ چندر موہن کے وار سے بچ تو گیا تھا مگر کوئی توڑ نہیں کر سکا تھا‘ نہ وار کا جواب وار سے دے پایا تھا۔ چندر موہن شاید موقع محل کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنے باغی شاگرد سے ٹکراؤ نہیں چاہتا تھا۔ غالباً گوپال کے حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے اسے آخری قدم اٹھانا پڑا تھا۔ معاً چندر موہن نے آگے بڑھ کر رادھا کی کلائی پکڑ لی۔

”کویتا کو میں بلی چڑھانے والا تھا‘ مگر وہ معبلہ کی عیاری اور فریب کے کارن (سبب) بچ گئی۔ میں اس کی جگہ اب تیرا بلیدان دوں گا۔“ چندر موہن کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ ”تُو بھی کویتا کی طرح بے وفا نکلی۔“ چندر موہن کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر وہ میری طرف پلٹا۔ ”تُو بھی چل اور دیکھ کہ مجھ سے بے وفائی کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے؟“ پھر اس نے بڑی بے رحمی سے رادھا کی کلائی کو جھٹکا دیا۔

”کمزوروں پر ظلم کر کے تُو خود کو شاید بہت بہادر سمجھ رہا ہے‘ چندر موہن۔“ میں بول اٹھی۔ ”یہ تیری بہادری نہیں بزدلی ہے۔“

”زیادہ بکواس نہ کر۔“ اس نے مجھے جھڑک دیا۔ ”یہ سب مجھے تیری ہی سازش معلوم ہوتی ہے۔ تیری ہی وجہ سے کویتا نے بے وفائی کی اور آخر کار یہاں سے فرار ہو گئی۔ پھر تُو ہی رادھا کے اپرادھ (جرم) اور گوپال کی اوگیا (نافرمانی) کا سبب بنی۔ تُو نے مجھ سے میری دو وفادار داسیوں اور ایک خاص چیلے کو جدا کر دیا۔“

”تُو اگر اسی طرح اپنی ہوس کا غلام رہا اور مجھ سے الجھتا رہا چندر موہن تو ایک دن بالکل اکیلا رہ جائے گا۔ اب بھی وقت ہے اپنے ظلم سے باز آ جا اور اس بے گناہ لڑکی کی جان نہ لے۔“ میں اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگی۔ ”کویتا تو اب فرار ہو ہی گئی‘ اسے قتل کر کے تجھے کیا مل جائے گا؟“

”تُو ناستک ہے اس لئے پاپ اور پُن کو نہیں سمجھ سکتی۔ درگا دیوی کے چرنوں میں کسی انسانی جان کا بلیدان دینا بہت بڑا پُن (ثواب) ہے۔“

چندر موہن اب راہداری سے گزر رہا تھا۔ رادھا اس کے ساتھ کسی ایسے بے زبان جانور کی طرح چل رہی تھی جسے ذبح کرنے لے جایا جا رہا ہو۔

معاً مجھے خیال آیا کہ اس وقت عمارت کے صدر دروازے پر پہرا دینے والا کوئی نہیں۔ ایسے میں مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔ اب میں اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچنے والی تھی۔ فرار کے اس موقع سے فائدہ اٹھانے ہی کی خاطر میں نے کہا۔ ”سن چندر موہن! میں اس معصوم لڑکی کو قتل ہوتے نہیں دیکھ سکوں گی‘ تُو مجھے یہیں چھوڑ جا۔“ میرے قدم رک گئے۔

مجھے رکتے دیکھ کر چندر موہن بھی رک گیا اور بولا۔ ”نہیں‘ اب میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تُو میرے ساتھ ہی رہے گی۔“

”اگر میں تیرے ساتھ چلنے سے انکار کر دوں تو؟“ یہ کہتے ہوئے میں پیچھے ہٹی۔

”تو میں تجھے زبردستی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دوں گا۔“ چندر موہن نے دوسرے ہاتھ سے جھپٹ کر میری کلائی بھی پکڑ لی۔

اس شیطان میں بلا کی طاقت تھی۔ وہ مجھے اور رادھا دونوں کو گھسیٹتا ہوا اسی ہال میں لے آیا جہاں درگا دیوی کا بت تھا۔ میری زور آزمائی لاحاصل رہی تھی۔ اس سے خود میں ہی نڈھال ہو گئی تھی۔ ہال میں داخل ہوتے ہی اس نے کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے چند لمحے بعد باری باری ہم دونوں پر پھونکیں ماریں اور پھر ہماری کلائیاں چھوڑ دیں۔ میں جہاں کھڑی تھی‘ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ چندر موہن نے رادھا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”رادھا! اب تُو وہی کرے گی جو تجھ سے کہا جائے گا۔“ چندر موہن کی آواز میں حکم تھا۔

”ہاں میں وہی کروں گی جو مجھ سے کہا جائے گا۔“ رادھا خواب کے سے عالم میں بڑبڑائی۔

چندر موہن نے رادھا کو اپنے سحر میں لے لیا تھا اور مجھے مفلوج بنا کے کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

”جا رادھا‘ ادھر پڑی ہوئی تلوار اٹھا کے لا۔“ چندر موہن نے کچھ دور پڑی ہوئی تلوار کی طرف اشارہ کیا۔

رادھا حکم کی تعمیل میں آگے بڑھی اور تلوار چندر موہن کو لا کر دے دی۔ میں بے بسی کے ساتھ یہ ہول ناک تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ معصوم لڑکی اسی تلوار سے قتل کی جانے والی تھی جو اس نے خود اپنے قاتل کو لا کے دی تھی۔ چندر موہن اسے اپنے ساتھ لے کر چبوترے پر چڑھنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ میں نے گنا' وہ تیرہ سیڑھیاں تھیں۔ پھانسی کے پھندے تک پہنچنے کے لئے بھی اتنی ہی سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔

چندر موہن نے رادھا کو درگا دیوی کی مورتی کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ رادھا بیٹھ گئی تو چندر موہن نے اس کا سر آگے کی طرف جھکایا اور پھر سر کے کھلے ہوئے بال اٹھا کر آگے ڈال دیئے۔ اب رادھا کی جھکی ہوئی گردن پوری طرح تلوار کی زد میں تھی۔ چندر موہن نے رادھا کو درگا دیوی کی مورتی کے سامنے اس طرح بٹھایا تھا کہ گردن کٹنے کی صورت میں خون کی پھوار مورتی پر پڑے۔ پھر وہ لمحہ آ ہی گیا کہ جب میں نے چندر موہن کی تلوار بلند ہوتے دیکھی۔

عین اسی لمحے جیسے کسی نادیدہ وجود نے چندر موہن کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔

"گوپال!" چندر موہن چیخا پھر تیزی سے جھک گیا۔ اگر وہ انتہائی تیزی کے ساتھ جھک نہ گیا ہوتا تو اس کی گردن کٹ کر دور جا پڑی ہوتی تلوار اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہو چکا تھا۔

معاً میں نے رادھا کو اس طرح اچھل کر کھڑے ہوتے دیکھا جیسے اس کے جسم میں برقی رو سی دوڑ گئی ہو۔ اسی کے ساتھ رادھا کا جسم فضا میں بلند ہوا اور تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ میں ابھی اسے حیرت سے دیکھ ہی رہی تھی کہ جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے میری کمر کو اپنی گرفت میں لے لیا پھر میرے قدموں نے بھی زمین چھوڑ دی۔ اسی کے ساتھ ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ میں نے اس دھویں میں اپنا دم گھٹتے محسوس کیا اور پھر میرے ذہن پر اندھیرے کی چادر پھیل گئی۔

☆======☆======☆

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک ایسی جگہ پایا جو میرے لئے قطعی اجنبی تھی۔ وہاں نیم تاریکی سی تھی۔ میں ایک پلنگ پر دراز تھی۔ وہ اوسط درجے کا ایک کمرا تھا۔ اپنے سرہانے مجھے رادھا کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اب مجھے اس کے چہرے پر مسرت و شادمانی کے آثار نظر آرہے تھے۔

"گوپال! راجکماری جی کو ہوش آگیا۔" رادھا نے بلند آواز سے کہا۔

"یہ کیا تُو نے راجکماری راجکماری کی رٹ لگا رکھی ہے۔" کمرے کے دروازے کی طرف سے گوپال کی آواز آئی۔

چند ہی لمحوں بعد کھڑاؤں کی مخصوص آواز ابھری اور کھلے ہوئے دروازے سے گوپال اندر آگیا۔ میں گویا ایک شیطان کے قبضے سے نکل کر دوسرے شیطان کے قبضے میں آگئی تھی۔

"اٹھ کر بیٹھ جاؤ معبلہ۔" گوپال نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کی آواز میں سختی نہیں تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں یہ بھولی نہیں تھی کہ گوپال کا چھوٹا بھائی شمبھو میرے ہی ہاتھوں قتل ہوا

تھا۔ خود میں نے گوپال کے سامنے اس کا اعتراف کیا تھا' مگر الزام چندر موہن پر لگا دیا تھا جسے چندر موہن نے جھوٹ بتایا تھا۔ ایسی صورت میں گوپال کا رویہ کسی بھی وقت میرے ساتھ بدل سکتا تھا۔

"معبلہ! میں اپنے بھائی شمبھو کے قتل کی سازش کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" گوپال یہ کہتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "مجھے پوری تفصیل سے بتاؤ شمبھو کن حالات میں قتل ہوا۔"

"بات یہ تھی گوپال کہ تمہارا بھائی بھی چندر موہن سے باغی ہو گیا تھا۔" میں نے محتاط انداز میں بات شروع کی۔ مجھے اس سے کچھ کہتے ہوئے یہ احساس بھی تھا کہ لعنتی چمپا بھی اس واقعے کی عینی گواہ تھی۔ گوپال اس کی زبان کھلوا سکتا تھا۔ چمپا کے متعلق بھی میں نے ہی گوپال کو بتایا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "چندر موہن جانے کیوں میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ میں اپنا ٹھکانا بدل کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے اس نئے ٹھکانے کا سراغ شمبھو نے لگایا۔ اسی رات چندر موہن' شمبھو کے ساتھ مجھ تک پہنچ گیا۔ میرے اعصاب شل ہو گئے تو چندر موہن نے شمبھو سے کہا کہ اسے باندھ لے اور ساتھ لے چل۔ ایک رات یہ اسی حالت میں تیرے پاس رہے گی۔ یہ تیری اس محنت کا پھل ہے کہ تُو نے اس کا کھوج نکال لیا۔ پھر شمبھو نے مجھ باندھ لیا اور جب وہ مجھے لے کر چلا تو میں اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکی۔ جب مجھے ہوش آیا تو ایک عورت کی دھیمی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے میرا نام لے کر پکار رہی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ عورت چمپا تھی۔ اس نے خود کو میرا ہمدرد ظاہر کیا اور بتایا کہ وہ کالی گھاٹ کے قدیم مندر کا تہہ خانہ تھا۔ میرے مزید پوچھنے پر اس نے یہ بھی بتایا کہ شمبھو اس وقت درگا مائی کو پوجا کر رہا ہے اور وہ پوجا کے بعد تمہارے پاس آئے گا۔ رہے بڑے مہاراج تو وہ سونے کے لئے اپنے آشرم میں جا چکے ہیں اور صبح سے پہلے باہر نہیں آئیں گے۔ یہاں سے فرار ہونے کے لیے یہ اچھا موقع ہے۔ چمپا نے مجھے کھولنے سے پہلے ایک عہد لیا کہ میں اگر شمبھو کو ٹھکانے لگا دوں تو وہ مجھے خاموشی کے ساتھ وہاں سے فرار کرا دے گی۔ میں سمجھ گئی کہ چمپا' شمبھو کی دشمن تھی۔ دشمنی کا سبب جاننے کا مجھے تجسس نہیں تھا۔ میرے لئے یہی جاننا کافی تھا کہ وہ شمبھو کو میرے ہاتھوں قتل کرانے کے لئے میری مدد کر رہی تھی۔ پھر چمپا نے مجھے نادیدہ گرفت سے آزاد کر دیا۔ چمپا نے مجھے تاکید کی کہ میں شمبھو پر یہی ظاہر کروں کہ بندھی ہوئی ہوں ورنہ شمبھو میرے قریب نہیں آئے گا۔ اس کے بعد شمبھو آگیا اور چمپا چلی گئی۔" اس کے بعد میں نے گوپال کو یہ بھی بتا دیا کہ میرے اندر زہر بھرا ہے اور شمبھو اسی زہر سے ہلاک ہوا۔ میں دانستہ یہ بات چھپا گئی کہ خود میں بھی شمبھو سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ "شمبھو کو میں نے محض رہائی پانے کے لیے چمپا کے فریب میں آ کر قتل کیا' لیکن چمپا اور چندر موہن دونوں کے اصل چہرے بعد میں بے نقاب ہوئے۔ چمپا اپنے وعدے سے پھر گئی تو میں نے اس سے کہا کہ تُو نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ وہ بولی کہ اسے دھوکا دینا نہیں' کام نکالنا کہتے ہیں۔ شمبھو بھی کیسا نادان تھا کہ یہاں کی ریت بھول گیا بھلا کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ کوئی ان چھوئی نار بڑے مہاراج سے پہلے کسی اور کو چھونے دی جائے۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا' چندر موہن نے شمبھو کو اسی کی سزا دی تھی کہ اس نے چندر موہن سے پہلے مجھے پانے کی تمنا کی۔"

میری پوری بات تفصیل سے سننے کے بعد گوپال نے پوچھا۔ "خود شمبھو سے تو تمہاری کوئی دشمنی نہیں تھی؟"

"نہیں۔" میں نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔ "میں نے محض چندر موہن کی قید سے نکلنے کے لئے اس بے گناہ شخص کا خون کیا جس کا دکھ مجھے آج بھی ہے۔"

"کیا تم ابھی تک کنواری ہو؟" گوپال نے عجیب سے لہجے میں دریافت کیا۔

"ہاں' ابھی تک چندر موہن اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔" میں نے جواب دیا۔

"کچھ بھی سہی معبلہ! تم یہ اعتراف تو کرو گی ہی کہ محض چندر موہن کی قید سے رہائی پانے کے لئے تم نے خودغرضی کا ثبوت دیتے ہوئے میرے بھائی کو قتل کر دیا جو بقول تمہارے بے گناہ تھا۔"

"یہ کہنے سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ چمپا نے مجھے فریب دے کر.........."

"یہ الگ بات ہے۔" گوپال میری بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھا۔ "چمپا نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا' یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے یا یہ کہ بڑے مہاراج نے سازش کر کے میرے بھائی کو مروا دیا' لیکن اس کا قتل تمہارے ہی ہاتھوں ہوا۔ تمہیں اسی لئے شمبھو کے قتل کا پرتی ہنسا (قصاص) ادا کرنا پڑے گا۔"

"قصاص؟" میں حیرت سے بولی۔ "مگر کیوں؟ میں تمہیں اپنی مجبوری بتا چکی ہوں۔"

"معبلہ! ویسے تو قتل کا بدلہ قتل ہے' لیکن جن حالات میں تمہارے ہاتھوں میرے بھائی کا قتل ہوا' انہیں مدنظر رکھتے ہوئے تم سے نرمی کی جا سکتی ہے۔ سنو! میں نے جو کچھ سوچا ہے اس سے میرے بھائی کی آتما کو بھی شانتی ملے گی۔ شمبھو نے چندر موہن سے پہلے تمہیں پانے کی تمنا کی تھی' یہ تمہی نے مجھے بتایا ہے۔ اگر اس کی یہ تمنا دوسرا بھائی پوری کر دے تو تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ میں اسے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ سمجھ کے قبول کر لوں گا۔" گوپال کے دل کی بات بھی آخر اس کی زبان پر آ ہی گئی۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ گوپال بھی قصاص کا بہانہ بنا کر مجھے بے آبرو کرنے کے درپے ہو چکا تھا۔ گویا میرا یہ قیاس غلط نہیں تھا کہ میں ایک شیطان کے چنگل سے نکل کر دوسرے شیطان کے ہتھے چڑھ چکی تھی۔ میں نے اس کے باوجود اسے سمجھانا چاہا۔ "گوپال! تمہارے بھائی کی موت پر مجھے دکھ ضرور ہے مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تم بھی چندر موہن کی طرح مجھے بے آبرو کرنا چاہو۔ پھر تم میں اور چندر موہن میں کیا فرق رہ جائے گا؟"

"میں نے تم سے یہ کب کہا کہ میں بڑے مہاراج کی طرح نہیں ہوں۔ ان کا میرا اختلاف اپنی جگہ لیکن اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ اپنے بے گناہ بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کے بعد میں تمہیں رہا کر دوں گا۔ اسی کے ساتھ اگر تم مجھ سے دوستی کرنا چاہو گی تو فائدے میں رہو گی۔ بڑے مہاراج کے خلاف میں تمہارا ساتھ دوں گا۔" گوپال نے مجھے لالچ دیا۔ "پھر میں تمہیں یہ بھی بتا دوں گا کہ بڑے مہاراج تمہارے ساتھ کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ تمہیں صرف اپنی داسی بنا کے تم سے بھوگ کرتے رہنا ان کا

مقصد نہیں ہے۔"

"یہ میں بھی جانتی ہوں اور تم بھی بتا چکے ہو کہ چندر موہن نے انگریز حکومت سے میرا سودا کیا ہے۔"

"لیکن تمہیں یہ نہیں معلوم کہ اس سودے کا مقصد کیا ہے؟" گوپال کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

یہ بات تو مجھے کلکتے کے دوران قیام ہی میں پتا چل گئی تھی کہ انگریز حکومت اور بڑے مہاراج چندر موہن کے درمیان سازباز ہے' لیکن اس کی وجہ سے بے خبر تھی۔ دہلی آنے کے بعد اب البتہ یہ نئی بات معلوم ہوئی تھی کہ میرے بارے میں حکومت اور چندر موہن کے درمیان کوئی سودا بھی ہوا تھا۔ گوپال یقیناً اس سودے کے مقصد سے آگاہ تھا' لیکن میرے نزدیک چندر موہن اور وہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ نادانستگی میں چندر موہن کے سامنے وہ جو ایک بات کہہ گیا تھا' اس کے سوا مزید کچھ معلوم ہونا محال تھا۔ میں نے اسی لئے یہ ظاہر کیا کہ مجھے انگریز حکومت اور چندر موہن کے درمیان ہونے والے سودے کا سبب جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

"نہ بتاؤ کچھ' میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" گوپال اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے بھی کچھ بتانے کا شوق نہیں۔" پھر وہ رادھا سے مخاطب ہوا۔ "اسے سجا سنوار دینا' میں اب رات ہی تک لوٹوں گا۔ مجھے بڑے مہاراج کی خبرگیری بھی رکھنا ہے۔ ہو سکا تو چمپا کو بھی باندھ لاؤں گا کہ اس کا جھوٹ سچ معلوم ہو جائے اور یہ بھی پتہ چل جائے کہ بڑے مہاراج ہی نے شمبھو کو مروایا تھا۔ آج کی رات معبلہ کی سہاگ رات ہو گی۔ اسے آج معلوم ہو جائے گا کہ بڑے مہاراج اور گوپال میں کیا انتر (فرق) ہے۔ بڑے مہاراج تو اسے جھکانے میں اب تک کامیاب نہیں ہوئے لیکن میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ میں اسے باندھے جا رہا ہوں تاکہ یہ تجھے پریشان نہ کرے۔"

"تُو اسے باندھ جائے گا تو میں بات کس سے کروں گی۔ میرا تو جی گھبرا جائے گا یہاں اکیلے۔" رادھا بولی۔

"تیری خاطر میں اس کا منہ نہیں باندھوں گا۔"

"اور تُو جو یہ کہہ رہا تھا کہ انگریز حکومت بہادر سے بھی تجھے ملنا.........."

"زیادہ بک بک نہ کیا کر۔" گوپال جلدی سے بول اٹھا۔ وہ رادھا کو گھور کر دیکھنے لگا۔

"اچھا اب یوں آنکھیں تو نہ دکھا' سمجھ گئی نا میں۔"

میرے لئے اتنا ہی جان لینا کافی تھا کہ گوپال کسی انگریز سے بھی ملنے جا رہا تھا۔ بقیہ کڑیاں جوڑ لینا مشکل نہیں تھا۔ گوپال میری اہمیت سے واقف تھا۔ میں اس کی قید میں تھی اور شاید وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا اس پر بعد میں غور کیا جا سکتا تھا' فی الحال تو مجھے یہ کوشش کرنا تھی کہ گوپال مجھے نادیدہ گرفت میں نہ لے سکے۔ چندر موہن کے آشرم سے نکل آنے کے بعد میں اس کے سحر سے بھی آزاد ہو چکی تھی۔ یہ بات میں نے اسی وقت محسوس کر لی تھی جب ہوش میں آنے کے بعد اٹھ کر بیٹھی

تھی۔ اب میرے جسم پر نقاہت طاری نہیں تھی۔ گوپال نے زیرلب کچھ پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اچانک میں نے اپنے جسم کو مخصوص انداز میں سمیٹا اور پھر کسی چیتے کی طرح اس پر جست لگا دی۔

گوپال یقیناً اس غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہیں تھا' سو میرے ساتھ ساتھ ہی زمین پر آ رہا۔ اس سے پہلے کہ گوپال سنبھل پاتا میں اس کے جسم میں اپنا زہر اتار دینا چاہتی تھی۔ اسی ارادے سے میں اس کے شانے کی طرف جھکی اور عین اسی لمحے جیسے میری آنکھوں کے آگے ستارے ناچ گئے۔ میرے سر کے پچھلے حصے پر شدید ضرب لگائی گئی تھی۔ کمرے میں گوپال کے علاوہ صرف رادھا تھی۔ اسے میں بھول ہی گئی تھی۔ یہ "کارنامہ" وہی انجام دے سکتی تھی۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر کے بعد میں عالم ہوش میں واپس آ سکی۔ کمرا وہی تھا لیکن اب میں وہاں اکیلی تھی۔ گوپال کے بارے میں تو مجھے علم تھا کہ وہ کہیں جانے والا تھا' مگر رادھا کو میرے پاس ہی رہنا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی تھی۔ گوپال کے جانے کے بعد رادھا وہاں اکیلی رہ جاتی' یہ بھی مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ کمرے کا دوروازہ کھلا ہوا تھا۔ رادھا شاید کہیں باہر تھی۔ اب یہ بات بھی واضح ہو چکی تھی کہ چندر موہن کے ممکنہ عتاب سے بچنے کے لئے رادھا نے گوپال کی پناہ لے لی تھی۔ رادھا زیادہ چالاک نہیں تھی۔ انیس بیس برس کی عمر ہونے کے باوجود اس کا بچپن جیسے ابھی رخصت نہیں ہوا تھا۔ رادھا کے مقابلے میں کویتا کم عمر ہو کر بھی اس سے زیادہ ذہین اور باشعور تھی۔

دروازہ کھلا تھا اور مجھے اپنا جسم بھی مفلوج معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ پھر میرے اندازے کے مطابق گوپال جا چکا تھا۔ ایسی صورت میں وہاں سے میرا فرار ہونا مشکل نہ ہوتا۔ اسی خیال کے تحت میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اس پر حیرت ضرور ہوئی تھی کہ گوپال نے مجھے نہیں باندھا تھا۔ پلنگ سے اترنے کے لئے جیسے ہی میں نے نیچے قدم رکھا میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا اور میں پلنگ پر گر گئی۔ اس خلاف توقع افتاد کے سبب میرے منہ سے بے اختیار ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

اسی وقت میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ رادھا دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیا ہوا؟ کہیں تم نے پلنگ سے اترنے کی کوشش تو نہیں کی تھی؟" رادھا مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں کی تھی کوشش۔" میں نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"اب ایسی کوشش نہ کرنا۔" اس نے تاکید کی۔

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ گوپال پلنگ کے چاروں طرف گھیرا ڈال گیا ہے۔" رادھا نے بتایا۔ "تم اس گھیرے سے باہر نہیں نکل سکتیں۔"

"مگر وہ تو مجھے باندھ کر جانے کو کہہ رہا تھا۔"

"ہاں' لیکن اسے جلدی جانا تھا۔ وہ تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔" رادھا نے جواب دیا۔ "اچھا ٹھہرو' میں وہ مونڈھا اٹھا لاؤں پھر تم سے باتیں ہوں گی۔" رادھا نے اسی کمرے کے

ایک طرف پڑے ہوئے مونڈھے کی طرف اشارہ کیا اور مونڈھا اٹھا لائی۔ پلنگ سے ذرا ہٹ کے وہ مونڈھے پر بیٹھ گئی تھی۔

"گوپال کو کہاں جانے کی جلدی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"بڑے مہاراج کی طرف سے بھی تو خطرہ ہے نا۔" اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے مجھے کوئی راز کی بات بتا رہی ہو۔ "پہلے وہ انہی کی طرف گیا ہے' سن گن لینے۔"

"اس کے بعد کہاں جائے گا؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گی' گوپال نے منع کر دیا ہے۔" رادھا بچوں کی طرح بولی۔

"تم نے میرے سر پر کیا مارا تھا؟ تم سے مجھے ایسی توقع نہیں تھی رادھا۔" میرا لہجہ شکایتی تھا۔

"پلنگ کے سرہانے ایک ڈنڈا پڑا ہے' وہی میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ تم بھی تو گوپال کے سینے پر چڑھ بیٹھی تھیں اور اسے کاٹنے والی تھیں۔ گوپال کہہ رہا تھا کہ جس طرح تم نے اس کے چھوٹے بھائی کو مار دیا' اسے بھی مارنے والی تھیں۔ تم خود ہی سوچو کہ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا۔"

اور یہ کیا اچھی بات ہے کہ زبردستی ایک عورت کی آبرو لوٹ لی جائے۔"

"بھگوان نے عورت کو تو بنایا ہی اس لئے ہے۔" رادھا اطمینان سے کہنے لگی۔ "اس میں لوٹ مار کی تو کوئی بات نہیں۔"

رادھا کے نزدیک شاید عورت کی آبرو کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بڑے مہاراج چندر موہن نے کچی عمر ہی میں اسے گناہ کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ اس سلسلے میں اس سے کچھ کہنا فضول ہی تھا۔ پھر مجھے کویتا کا خیال آ گیا اور اس سے بولی۔ "کویتا کی خاطر تم نے بہت بڑا خطرہ مول لیا یقیناً تمہیں اس سے محبت ہوگی۔"

"ہاں وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ بھگوان جانے کب اس سے ملنا ہو۔" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"میں تمہیں اس سے ملا سکتی ہوں۔" میں نے اس پر جال پھینکا۔

"سچ۔" وہ کھِل اٹھی۔ "کیا تمہیں خبر ہے' وہ آشرم سے فرار ہو کر کہاں گئی ہے؟"

"خبر ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کویتا کو میں نے ہی تو وہاں سے فرار ہونے کا موقع دیا تھا ورنہ تو چندر موہن اس کی گردن اڑانے والا تھا۔ تمہیں اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

"صرف اتنا بتایا تھا کہ تم نے اس کی جان بچالی ہے' لیکن اسے آشرم میں خطرہ ہے۔ بڑے مہاراج کسی بھی سمے اسے بلی چڑھا سکتے ہیں۔ پھر اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں اس کی مدد کروں تو وہ فرار ہو سکتی ہے۔ گوپال بہت دن سے میرے اور کویتا کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں بڑے مہاراج کے ڈر سے اس کی بات نہیں مانتی تھیں۔"

"چندر موہن کا ڈر نہ ہوتا تو مان جاتیں؟" میں بول اٹھی۔

"پھر نہ ماننے والی کیا بات تھی؟" رادھا نے بلاجھجک جواب دیا۔ "گوپال تو بڑے مہاراج سے بھی اچھا ہے۔ وہ بڑے مہاراج سے زیادہ اس بھید کو جانتا ہے کہ ایک استری (عورت) کو شریر (جسم) کا سکھ کس

طرح زیادہ سے زیادہ مل سکتا ہے۔ کسی استری کو مرد سے اور چاہئے بھی کیا۔"

رادھا اسی طرح کی بچگانہ باتیں کرتی رہی اور میں سوچتی رہی کہ گوپال کی قید سے کس طرح رہا حاصل کی جائے۔ پھر باتوں ہی باتوں میں رادھا کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی کہ میں چونک اٹھی۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے رادھا سے اسی کا اظہار کیا تھا۔

"مجھے بھی تمہاری حالت پر رحم آ رہا ہے مگر اس کے لیے یہ گھیرا (حصار) اٹھانا پڑے گا۔" رادھا نے کہا۔ "گوپال نے مجھے گھیرا اٹھانے سے منع کیا تھا کہ کہیں تم فرار نہ ہو جاؤ۔"

"تو کیا تم یہ حصار اٹھا سکتی ہو؟" اندھیرے میں مجھے روشنی کی ایک کرن نظر آ گئی تھی۔

"کیوں نہیں۔" اس کے لہجے سے فخر کا اظہار ہو رہا تھا۔ "تم مجھے کیا سمجھتی ہو' میں بھی تو بڑے مہاراج کی داسی رہ چکی ہوں۔ میرے پاس بھی شکتی ہے۔ جو بھی بڑے مہاراج کی داسی بن جاتی ہے' اسے وہ شکتی ضرور پردان (عطا) کرتے ہیں۔"

"تو کویتا کے پاس بھی شکتی ہوگی۔" میں نے تصدیق چاہی۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ بظاہر معصوم نظر آنے والی رادھا اور کویتا بھی پُراسرار شیطانی قوتوں کی مالک ہوں گی۔

"ہاں وہ بھی شکتی رکھتی ہے۔" رادھا نے تصدیق کر دی۔ "بس انتر (فرق) اتنا ہے کہ کسی کے پاس زیادہ شکتی ہے کسی کے پاس کم۔"

"اگر تم حصار اٹھا سکتی ہو اور تمہیں واقعی مجھ پر رحم بھی آ رہا ہے تو پھر مجھے کھانے کے لئے ضرور کچھ دے دو۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" میں پھر مطلب کی بات پر آ گئی۔

"لیکن گھیرا اٹھاتے ہی تم فرار ہو گئیں تو کون ذمہ دار ہو گا؟" وہ معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگی۔

"تمہارے پاس بھی تو شکتی ہے' تم مجھے فرار ہونے سے روک سکتی ہو۔ یہ جاننے کے بعد میں بھلا کیوں یہ فضول کوشش کروں گی۔" میں اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔

رادھا کے چہرے پر تذبذب کا اظہار ہونے لگا جیسے وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی ہو۔

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں رادھا کہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گی۔" میں نے اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر پھر مخاطب کیا۔

"ادھر تو تم بھوکی ادھر گوپال گھیرا اٹھانے سے منع کر گیا ہے۔ میں تو مشکل میں پڑ گئی' کس کی مانوں کس کی نہ مانوں۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

"میری بات مان لو رادھا' میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گی۔" میں نے اسے دوبارہ ترغیب دی۔

"تمہیں ایک بات بتا دوں مجھے ایک ایسا منتر بھی آتا ہے کہ کسی پر پڑھ کر پھونک دیا جائے تو وہ منہ سے خون اُگل اُگل کے مر جائے۔" وہ اس طرح بولی جیسے بچے ایک دوسرے کو ڈراتے ہیں۔ "تم نے میرے ساتھ فریب کیا تو سمجھ لو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ اچھا بھگوان کی سوگند (قسم) کھاؤ کہ بھاگو گی نہیں۔"

"بھگوان کی سوگند۔" میں نے فوراً کہہ دیا۔ مجھے بھلا اس کے بھگوان کی قسم کھانے پر کیا اعتراض

ہو سکتا تھا۔

"واہ خوب۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی اس کا انداز لڑاکا بچوں جیسا تھا۔ "کیا تم مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہو۔"

"آخر ہوا کیا؟ میں نے تمہارے کہنے سے قسم کھا تو لی۔" میں حیران ہو کر بولی۔ میں نہیں سمجھ سکی تھی کہ وہ اور کیا چاہتی ہے۔

"تم نے بھگوان کی سوگند تو کھالی مگر آگے کچھ کہا ہی نہیں۔"

پھر اس نے مجھ سے جو کہلوایا میں نے کہہ دیا۔ زبان سے کچھ کہہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"اچھا میں تمہارے لئے کھانا لے آؤں تبھی گھیرا اٹھاؤں گی اور یہ سمجھ لو کہ کھانا دیتے ہی پھر گھیرا ڈال دوں گی' پہلے ہی بتائے دے رہی ہوں۔ کہیں بعد میں تم شکایت کرو۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

میں تجھے یہ موقع دوں گی جب ناپاگل لڑکی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو کر بولی۔ تُو حصار اٹھا تو سہی۔

رادھا کمرے سے نکل کر چلی گئی اور جب کچھ دیر کے بعد لوٹی تو اس کے ہاتھ میں تھالی تھی۔ تھالی کو اس نے مونڈھے پر رکھ دیا اور پھر کوئی عمل پڑھنے لگی۔ چند ہی لمحے بعد میں نے پلنگ کی اطراف نیلی روشنی دیکھی جو فوراً ہی غائب ہو گئی۔ نیلی روشنی کا نادیدہ حصار ظاہر ہو کر ٹوٹ چکا تھا پھر بھی میں نے جلدی نہیں کی۔ رادھا نے مونڈھے سے کھانے کی تھالی اٹھائی اور پلنگ کے قریب آ گئی۔ وہ جھک کر میرے سامنے کھانا رکھ ہی رہی تھی کہ میں نے اس کی کنپٹی پر جچا تلا وار کیا۔ اس کا جسم لہرایا اور پلنگ کی پٹی سے ٹکرا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میں نے پلنگ سے اترنے میں دیر نہیں کی۔ پلنگ کے قریب ہی میرے سینڈل رکھے تھے میں نے جلدی سے انہیں پہن لیا۔ میرے جسم پر جو کپڑے تھے اور وہ سینڈل 'چندر موہن کے آشرم کی یادگار تھے ورنہ جس رات مجھے اغوا کیا گیا تھا' میں سلیپنگ گاؤن پہن کے سوئی تھی۔

اس کمرے سے نکل کر میں دوسرے کمرے میں پہنچی اور پھر چھوٹے سے صحن میں نکل آئی۔ صحن کی بائیں جانب مجھے ایک راستہ نظر آیا۔ میں نے ادھر قدم اٹھائے ہی تھے کہ اچھل پڑی۔ میں نے ایک مردانہ آواز سنی۔ "ابے بڑا ہی ڈرپوک ہے تُو۔ اتنی دیر سے سمجھا رہا ہوں کہ وہ گوپال مہاراج سے ہماری شکایت نہیں کرے گی۔ وہ بھلا کیوں گوپال مہاراج کو سب کچھ بتا کر ان کی نظروں سے گرنا چاہے گی۔ ویسے بھی جب عورت کسی سے ایک بار مل لے تو پھر اپنی عزت کی خاطر منہ نہیں کھولتی۔"

"اور اگر اس دوسری ناری نے بھانڈا پھوڑ دیا پھر؟" دوسری آواز ابھری۔ یہ بھی مردانہ آواز تھی۔

"وہ جو ہے نا رادھا! اسے یہاں بیٹھک میں اٹھا لائیں گے۔ اسے کیا پتہ چلے گا جو گھیرے میں ہے۔"

"اور گھیرے والی کے بارے میں کیا وچار (خیال) ہے؟ ویسے وہ رادھا سے زیادہ سندر (خوبصورت)

ہے۔"

"تیرے من میں تو بس وہی بسی ہوئی ہے۔ کیا بھول گیا کہ گوپال مہاراج اسے کتنا خطرناک بتا رہے تھے۔ ادھر گھیرا اٹھایا ہم نے ادھر جان آفت میں کر دے گی وہ۔ اس کے پاس جانا تو بعد کی بات ہے اسے بڑے مہاراج بھی سیدھا نہیں کر سکے۔"

"پھر گوپال مہاراج کیسے سیدھا کر لیں گے؟"

"یہ تو مہاراج ہی جانیں' میں تجھے یہ خطرہ مول نہ لینے کے لئے ہی کہوں گا۔"

وہ دو افراد ہی لگتے تھے جو میرے اور رادھا کے بارے میں شیطانی منصوبے بنا رہے تھے۔ میں پنجوں کے بل بے آواز چلتی ہوئی ذرا سی آگے بڑھی۔ بالکل سامنے کچھ فاصلے پر اس گھر کا دروازہ نظر آ رہا تھا جس کی کنڈی اندر سے لگی ہوئی تھی۔ دائیں جانب اس سے کچھ پہلے کھلا ہوا ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اسی بیٹھک کا دروازہ ہو سکتا تھا جس میں وہ دونوں افراد موجود تھے۔ گوپال ان دونوں کو یقیناً رادھا اور میری حفاظت و نگرانی کے لئے وہاں چھوڑ گیا تھا۔

بیٹھک کے کھلے دروازے کے سامنے سے گزر کر ہی میں بند دروازہ کھول کے باہر نکل سکتی ہوں۔ میں نے سوچا میں اگر تیزی سے دوڑتی ہوئی بند دروازے تک پہنچوں اور اسے کھول کر باہر نکل جاؤں شاید وہ دونوں مجھے نہ پکڑ سکیں۔

"تو پھر بول' کیا کہتا ہے' چلیں اندر۔" اسی پہلے شخص کی آواز آئی جو دوسرے کو ترغیب دے رہا تھا۔

اور اگر رادھا اندر گھیرے والی کے پاس ہوئی تو؟" دوسرے شخص کی آواز آئی۔

"تو اسے کسی بہانے آواز دے کر بلا لیں گے۔" پہلے شخص نے تجویز پیش کی۔ "پھر منہ دبا کر اسے بیٹھک میں اٹھا لانا کون سا مشکل ہو گا۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے اگر وہ دونوں بیٹھک کے کھلے دروازے سے اچانک نکل آتے تو میں ان کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکتی۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ پہلے شخص کی مسلسل ترغیب کے سبب دوسرا بھی رادھا پر مجرمانہ حملہ کرنے کے لئے تقریباً راضی ہو چکا تھا۔ وہ دونوں اب کسی بھی لمحے اندر آ سکتے تھے۔ میں یہی سوچ کر پنجوں کے بل دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ کر دوبارہ صحن میں پہنچ گئی۔ کمروں کی مخالف سمت میں باورچی خانے کا کھلا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں باورچی خانے میں داخل ہو کر ایک کواڑ کے پیچھے چھپ گئی۔ اب مجھے ان دونوں کے اندر آنے کا انتظار تھا۔ کواڑ کی آڑ سے میں صحن کا جائزہ لے رہی تھی۔

ان دونوں کو گھر کے اندر آنے میں میری توقع سے کچھ زیادہ ہی دیر لگ گئی۔ خاصی دیر انتظار کے بعد مجھے ان کے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ پھر قدموں کی چاپ قریب آتی گئی۔ ذرا ہی دیر بعد مجھے وہ صحن میں نظر آئے۔ ان دونوں کا حلیہ سادھوؤں جیسا تھا۔ آگے بڑھ کر وہ کمرے کے دروازے پر رک گئے۔

"رادھا اندر والے کمرے ہی میں لگتی ہے۔" ان میں سے ایک شخص آہستہ سے بولا' پھر آواز دی۔ "رادھا جی! اے رادھا جی۔"

ظاہر ہے کہ بے ہوش رادھا انہیں کیسے جواب دے سکتی تھی۔ ان دونوں کی پشت میری طرف تھی' مگر وہ ابھی صحن ہی میں تھے۔ ابھی میرا باورچی خانے سے باہر نکلنا خطرناک ہی تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد پھر اسی شخص نے رادھا کو پکارا۔

"وہ جواب کیوں نہیں دے رہی؟" دوسرا شخص دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"کوئی گڑ بڑ لگتی ہے۔ میں اندر جا کے دیکھتا ہوں۔" پہلے شخص نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

میں سمجھ رہی تھی کہ کوئی جواب نہ پا کر وہ دونوں ہی اندر جائیں گے اور مجھے فرار ہونے کا موقع مل جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک شخص اندر چلا گیا اور دوسرا وہیں صحن میں دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ پہلے شخص کو اندر پہنچتے ہی حقیقت حال کا علم ہو جاتا اور پھر شاید مجھے فرار ہونے کا موقع نہ ملتا۔ ابھی میں اسی تذبذب کا شکار تھی کہ باورچی خانے سے نکلنے کا خطرہ مول لوں نہ لوں کہ مجھے پہلا شخص کمرے سے نکلتا دکھائی دیا۔

"غضب ہو گیا' وہ گھیرے والی غائب ہے اور رادھا اندر بے ہوش پڑی ہے۔" پہلے شخص نے گھبرائی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی کو بتایا۔

"یہ .... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ گھیرے والی کہاں جا سکتی ہے؟" دوسرے شخص کی آواز میں بے یقینی سی تھی۔ "میں .... میں چل کر دیکھتا ہوں۔"

خلاف توقع دونوں پھر کمرے میں چلے گئے۔ میں تیزی کے ساتھ باورچی خانے سے نکل کر گھر کے دروازے کی طرف بھاگی۔

دروازہ کھولتے ہی میں نے باہر قدم رکھا تو میرے اعصاب پر چھناکا سا ہوا۔ سامنے ہی گوپال کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ غیر ارادی طور پر ٹھٹک کر رکتے ہی میری نظریں اس کی نظروں سے مل گئی تھیں۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا تھا۔

"واپس چل اندر۔" گوپال نے مجھے حکم دیا۔

گوپال مجھے نظریں ملتے ہی اپنے سحر میں لے چکا تھا۔ میں جیسے اب اپنے اختیار میں نہیں رہی تھی۔ میں نے یہ سوچا تو ضرور کہ مجھے اس گھر میں واپس نہیں جانا چاہئے مگر اپنے ارادے پر عمل نہیں کر سکی۔ گوپال کا حکم سن کر میں نے واپسی کے لیے قدم اٹھانا شروع کر دیئے تھے۔ میرے پیچھے گوپال تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے میں نے دروازہ بند ہونے اور کنڈی لگائے جانے کی آواز سنی تھی۔ پھر گوپال تیزی سے آگے بڑھ کر میرے قریب آ گیا تھا۔

حفاظت و نگرانی پر مامور دونوں افراد ابھی تک شاید اندرونی کمرے ہی میں تھے۔ مجھے وہ صحن میں نظر نہیں آئے تھے۔ گوپال مجھے اپنے ساتھ لئے پہلے کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو غالباً اندر موجود افراد نے اس کی کھڑاؤں کی آواز سن لی۔ وہ دونوں لپک کر اندرونی کمرے کے دروازے پر آ گئے۔

"تم .... مہاراج' آ .... آپ ...."

"تم دونوں کتنے ہوشیار اور چتر (چالاک) ہو اس کا ثبوت مل گیا۔ اگر میں سے پر نہ آ گیا ہوتا تو یہ یہاں سے فرار ہو جاتی جس کی رکھشا (حفاظت) اور دیکھ ریکھ کے لئے تمہیں یہاں چھوڑ گیا تھا۔" گوپال نے یہ کہتے ہوئے آگے قدم بڑھائے۔

دونوں افراد گوپال کے لئے راستہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ میں بھی گوپال کے ساتھ ہی اندر پہنچ گئی۔ رادھا کا جسم ابھی تک فرش پر پڑا تھا۔

"ہمیں کچھ پتا نہیں مہاراج' ہم تو جب یہاں آئے تو رادھا جی اسی طرح بے ہوش پڑی تھیں۔" ان میں سے ایک شخص نے بتایا۔

"تم دونوں بیٹھک سے اٹھ کر یہاں کیوں آئے تھے؟"

"میں پانی لینے اندر آیا تھا۔ بیٹھک میں جو ٹھلیا رکھی ہے اس میں پانی ختم ہو گیا تھا۔" ایک شخص من گھڑت کہانی بیان کرنے لگا۔ "آنگن ہی میں رک کر میں نے رادھا جی کو کئی دفعہ آوازیں دیں اور جب کوئی جواب نہ ملا تو شک پڑا کہ کوئی گڑ بڑ ہے۔ یہاں آیا تو یہ گھیرے والی ناری غائب تھی اور رادھا جی بے ہوش پڑی تھیں۔ میں بھاگا بھاگا گیا اور اسے بھی بلا لایا۔" اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

"ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں' آپ آ گئے مہاراج۔"

"ہوں۔" گوپال نے ہنکارا بھرا۔ پھر اس نے مڑ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی میرے دماغ کو ٹٹول رہا ہے۔

"میں تم دونوں کو بتاتا ہوں' کیا ہوا تھا اور یہ ناری یہاں سے کس طرح غائب ہو گئی تھی۔" گوپال کچھ دیر بعد میری طرف سے نظریں ہٹا کر ان دونوں سے مخاطب ہوا۔ اس کی آواز جیسے زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ "یہ تھالی میں پلنگ پر کھانا رکھا دیکھ رہے ہو۔"

"جی مہاراج۔" وہ دونوں بہ یک آواز بولے۔

"اس ناری نے رادھا سے بھوجن کرنے کو کہا تھا مگر یہ صرف بہانہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ رادھا کھانا دینے کے لئے گھیرا اٹھا دے۔ رادھا اس کے دھوکے میں آ گئی۔" پھر گوپال نے رادھا کے بے ہوش ہونے اور کمرے سے میرے نکلنے کے بارے میں بتایا۔ "یہ فرار ہونے کے لئے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس نے تم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی۔ تم رادھا کے ساتھ حرام کاری کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اگر کہو تو وہ باتیں بھی بتا دوں جو تم ایک دوسرے سے کہہ سن رہے تھے۔" اس کے بعد گوپال نے وہ سب کچھ بیان کر دیا جو گزرا تھا۔ آخر میں وہ کہنے لگا۔ "اگر سب کے تمہارے ہی جیسے چیلے ہوں تو گرو سکھشا (تعلیم) دینا ہی چھوڑ دیں۔"

وہ دونوں گوپال کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگے۔

"اٹھو۔" گوپال تیز آواز میں بولا۔

دونوں افراد اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے گوپال کو زیر لب کچھ پڑھتے اور پھر ان دونوں کی طرف

پھونکتے دیکھا۔

"مہاراج' مہاراج........" وہ دونوں ہی چیخ اٹھے۔ "ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔"

"میں نے ہی تمہیں اندھا کیا ہے اس لئے کہ تم نے اپنے گرو کی داسی کو بری نظروں سے دیکھا تھا۔"

"دیا (رحم) کریں مہاراج' دیا کریں۔" وہ رونے لگے۔

گوپال کو ان دونوں پر رحم نہیں آیا اور انہیں گھر سے باہر نکال دیا حالانکہ خود اس نے بھی چندر موہن کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا جس کا وہ چیلا تھا۔ ان دونوں نے تو رادھا کو بے آبرو کرنے کے بارے میں صرف منصوبہ ہی بنایا تھا' گوپال تو اس پر عمل بھی کر چکا تھا۔ جس رادھا کو اس نے اب اپنی داسی بنا لیا تھا' وہ چندر موہن ہی کی تو داسی تھی۔

جب گوپال کے چیلے چلے گئے تو اس نے رادھا کو ہوش میں لانے کے لئے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ جلد ہی رادھا کو ہوش آ گیا۔

"تُو بہت بڑی بے وقوف ہے۔" گوپال نے رادھا سے کہا جو اب اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ "تجھے گھیرا نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔"

"مگر اسے بہت زور کی بھوک لگی تھی اور اس نے بھگوان کی سوگند کھائی تھی کہ بھاگے گی نہیں۔" رادھا نے اپنی صفائی پیش کی۔

"پاگل ہے تُو۔" گوپال بولا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "چل کھانا کھا لے' بھوکی عورت کو بھوگ بلاس (لطف نفس) بھی اچھا نہیں لگتا۔"

سینڈل اتار کر میں بستر پر بیٹھ گئی اور کھانا کھانے لگی۔ مجھے واقعی بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔

گوپال مونڈھے پر بیٹھ گیا تھا اور رادھا پلنگ کے سرہانے۔

"اب کیسی بھیگی بلی بنی بیٹھی ہے۔" رادھا بول اٹھی۔

"یہ بھیگی بلی ہے نہیں' بنا دیا ہے میں نے۔" گوپال نے بتایا۔ پھر وہ رادھا کو اپنے دونوں چیلوں کی روداد سنانے لگا۔

"بڑے ہی حرامی نکلے تیرے چیلے۔" رادھا نے پوری روداد سن کر تبصرہ کیا۔

"میں نے انہیں تجھ پر بری نظر ڈالنے کی سزا بھی ایسی دی ہے کہ جیون بھر ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔"

"وہ کیسے؟ تُو نے انہیں کیا سزا دی ہے۔"

"دونوں کو اندھا کر دیا ہے۔"

"ہائے رام۔" رادھا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ذرا ہی دیر پہلے وہ جنہیں حرامی کہہ رہی تھی' انہی سے اظہار ہمدردی کرنے لگی۔ "بے چاروں کو کبھی کوئی عورت نہیں ملی ہوگی' تبھی تو مجھے دیکھ کر للچا گئے۔ بڑے مہاراج کہتے تھے' مرد کو اگر عورت نہ ملے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے' دماغ کو گرمی چڑھ جاتی ہے۔"

"یاد آنے لگے تجھے بڑے مہاراج۔" گوپال کے لہجے میں شوخی تھی۔

"اب کیوں یاد آئیں گے' تُو جو مل گیا ہے مجھے۔" رادھا ایک ادا سے بولی پھر کہنے لگی۔ "ہاں میں تجھ سے یہ پوچھنا تو بھول ہی گئی' جلدی کیسے لوٹ آیا؟"

"تیری اور اس بھیگی بلی کی طرف سے مجھے چنتا (فکر) لگی ہوئی تھی' سو بڑے مہاراج کے آشرم ہی کا پھیرا لگا کے واپس آ گیا۔" گوپال نے جواب دیا۔ "اور میرا لوٹ آنا اچھا ہی ہوا ورنہ بلی دودھ پیئے بنا ہی بھاگ جاتی۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "تُو ایسا کرنا کہ یہ کھانا کھا لے تو اسے کچھ سجا سنوار دینا۔ تھوڑا سا جیون رس بھی اسے پلا دیا جاتا تو مزہ ہی آ جاتا۔ مجھے پہلے خیال نہیں آیا ورنہ بڑے مہاراج کے آشرم سے اڑا لاتا۔"

"رات تو دور ہے' ابھی سے تجھے کیوں بے چینی لگ رہی ہے۔" رادھا بولی۔

"اس بھیگی بلی کو دیکھ کر سنتوش (صبر) نہیں ہو رہا۔ رات کا انتظار کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔" گوپال کی آواز آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے کچھ خواب ناک سی ہو گئی۔ "اس کے سہاگ کی سیج سجانے کے لئے پھول لے آتا ہوں۔ میرا نہیں تو اس کا تو یہ پہلا پہلا ملن ہے۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

گوپال کمرے سے چلا گیا تو رادھا نے ایک بڑے گلاس میں پانی لا کے تھالی میں رکھ دیا۔ میں اس وقت تک کھانا کھا چکی تھی۔ میں نے گلاس اٹھا کر پانی پی لیا۔ رادھا خالی برتن اٹھا کے لے گئی۔ میں خواب کی سی حالت میں سب کچھ سن اور دیکھ رہی تھی۔

رادھا لوٹ آئی تو اس کے ہاتھ میں تیل کی شیشی اور کنگھی تھی۔ اس کے علاوہ سنگار کا دوسرا سامان بھی تھا۔ وہ مجھے سجانے سنوارنے لگی۔ عجیب عورت تھی وہ بھی کہ اپنے مرد کے لئے ایک دوسری عورت کا سنگار کر رہی تھی۔ اس کی نظر میں رشتوں کا شاید مروجہ تصور نہیں تھا۔ وہ کسی اور ہی فضا میں پلی بڑھی تھی۔

ابھی وہ میری نوک پلک سنوار رہی تھی کہ گوپال واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے تھے۔

کچھ ہی دیر میں رادھا نے مجھے اپنی دانست میں دلہن بنا دیا۔ سیج باہر والے کمرے میں سجائی گئی۔ رادھا نے مجھے وہاں لے جا کر بٹھا دیا۔ گوپال بھی ساتھ ساتھ تھا۔

"گوپال! یہ تو مٹی کا مادھو بنی بیٹھی ہے۔" رادھا نے گوپال کی طرف مڑ کر کہا۔ "کیا اچھا لگے گا تجھے اس طرح۔"

"یہ تُو خیر ٹھیک کہہ رہی ہے' لیکن............" وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر شاید کچھ سوچنے لگا۔

"ارے سوچ کیا رہا ہے' تُو آخر مرد ہے' تجھ سے بھاگ کر یہ کہاں جائے گی؟"

"معبلہ! ادھر دیکھ میری طرف۔" گوپال مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں نے فوراً اس کی طرف نظریں اٹھا دیں۔ پھر جیسے ہی میری نظریں اس سے ملیں میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ اٹھی ہوں۔

عین اسی لمحے میں چندر موہن کی آواز گونجی اور گوپال اچھل پڑا۔ چندر موہن نے اسے اس کا نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ چندر موہن نظر نہیں آ رہا تھا' صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "سن! گرو گرو ہوتا ہے اور چیلا کتنا ہی بڑھ جائے چیلا ہی رہتا ہے۔ دیکھ لے' میں نے تجھے ڈھونڈ ہی نکالا۔ دیکھ میں تجھ سے ٹکراؤ نہیں چاہتا اور اب بھی میل کرنے پر راضی ہوں۔ بھلے تُو رادھا کو سدا کے لئے اپنے پاس رکھ لے' میں تجھ سے کچھ نہیں کہوں گا' لیکن معبلہ کو میرے آشرم میں پہنچا دے۔ میں پتا کر چکا ہوں کہ ابھی تُو نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ بول کیا کہتا ہے؟"

"اب تو میں اس کی سیج بھی سجا چکا۔ یہ ایک ہی صورت میں آپ کو مل سکتی ہے بڑے مہاراج کہ اس سے میرا بھوگ (وصال) ہو جائے۔" گوپال نے صاف جواب دے دیا۔

"تو پھر سنبھل!" بڑے مہاراج چندر موہن کی غصیلی آواز آئی۔

معلوم نہیں اچانک گوپال کو کیا ہوا کہ وہ چیخ مار کے زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔

"کیا ہوا............ کیا ہوا تجھے؟" رادھا اس کی طرف لپکی۔

معاً گوپال کا جسم نظروں سے اوجھل ہو گیا اور پھر چند ہی لمحے بعد مجھے چندر موہن کی چیخ سنائی دی۔ دونوں شیطان ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔ شاید چندر موہن خود وہاں پہنچ گیا تھا پھر اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ گوپال کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔ "بھاگ کہاں رہے ہو بڑے مہاراج' میں آ رہا ہوں۔"

میں نے اس موقع کو اپنے لئے غنیمت جانا۔ گوپال مجھے اپنے سحر سے پہلے ہی آزاد کر چکا تھا۔ میں نے رادھا کی طرف نگاہ اٹھائی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ ہو۔ اس کا سبب چندر موہن اور گوپال کا ٹکراؤ ہی ہو سکتا تھا۔ ایسے میں بھلا وہ مجھے کیا روک سکتی تھی۔ پھر میں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ بھاگتے بھاگتے میں نے سینڈل اپنے پیروں میں ڈال لئے تھے۔

صحن عبور کر کے مجھے گھر کے دروازے تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق رادھا نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دروازہ کھولتے ہی میں باہر نکلی اور پھر وہاں رکی نہیں۔ گلیوں کا ایک جال سا تھا جس سے نکل کر میں ایک سڑک پر پہنچ گئی۔ وہ کوئی پُرہجوم علاقہ تھا۔ سڑک پر خاصا ٹریفک نظر آ رہا تھا اور لوگوں کی آمدورفت بھی جاری تھی۔ میں نے ایک خالی ٹیکسی کو روک لیا۔

"جامع مسجد چلو۔" میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی کہا۔

ٹیکسی وہاں سے روانہ ہو گئی تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ میں اس علاقے میں خود کو محفوظ نہیں سمجھ رہی تھی حالانکہ اس گھر سے خاصی دور نکل آئی تھی جہاں گوپال نے مجھے قید کر رکھا تھا۔ اگر چندر موہن اور گوپال کے درمیان ٹکراؤ نہ ہو جاتا تو شاید مجھے فرار کا موقع نہ ملتا۔ وہاں سے نکل آنے کے باوجود بھی ابھی تک مجھے اپنی رہائی کا یقین سا نہیں آ رہا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ خاصی دیر یہ یاد ہی نہیں آیا کہ میرے پاس ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ شہزاد کا گھر ایسی جگہ تھا جہاں تک ٹیکسی نہیں جا سکتی تھی۔ جب مجھے یہ خیال آیا تو سوچا' ٹیکسی کو قرول باغ لے چلوں' پھر سوچنے لگی کہ یہ مناسب نہیں ہے۔ تنظیم کے کسی ٹھکانے تک ٹیکسی لے جانا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا پھر مجھے بہ مجبوری ایک اور ہی ناپسندیدہ فیصلہ کرنا پڑا' لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

جامع مسجد سے خاصے پہلے ہی ایک پارک کے قریب میں نے ٹیکسی کو رکوا لیا۔ وہاں لوگوں کی آمدورفت کم تھی۔

"سنو! تمہارے پاس سو روپے کا کھلا ہو گا؟" میں نے ٹیکسی سے اترے بغیر ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

"جی!" ٹیکسی ڈرائیور حیرت سے بولا اور پیچھے مڑنے لگا۔

میں پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ مڑتے ہوئے جیسے ہی اس کی کنپٹی میری نگاہوں کی زد میں آئی' میرا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ یہ ناروا سلوک کرتے ہوئے مجھے افسوس تو ہوا مگر کیا کرتی۔ اس کا سر ڈھلکتے ہی میں تیزی کے ساتھ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔ وہاں سے میں پیدل ہی شہزاد کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

کویتا کو میں نے شہزاد کے گھر کا پتا ہی سمجھایا تھا۔ اس سے میں نے کہا تھا کہ وہ میرے پہنچنے تک وہیں رہے' چاہے مجھے کئی دن لگ جائیں۔ کویتا ذہین تھی۔ مجھے توقع تھی کہ اس نے شہزاد کا گھر تلاش کر لیا ہو گا۔ کویتا کو صبح ہی صبح چندر موہن کے آشرم سے فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ مجھے اسی لئے امید تھی کہ شہزاد اسے گھر ہی پر مل گیا ہو گا۔ یوں بھی شہزاد کو کام ہی کیا تھا۔ پھر میں نے بھی کچھ دن گھر سے زیادہ نہ نکلنے کی اسے تاکید کر دی تھی۔ میں نے کویتا سے کہہ دیا تھا کہ صرف شہزاد کو میرے اصل نام کا حوالہ دے' گھر والوں کے سامنے میرا ذکر ہو تو مجھے رانی کہے۔ اس کے علاوہ بھی جو ممکنہ ہدایات ہو سکتی تھیں' وہ میں نے کویتا کو دے دی تھیں۔ شہزاد کے گھر والوں کے سامنے انسے خود کو میرا رشتے دار اور مسلمان ظاہر کرنا تھا۔ مختصر سے وقت میں کویتا کو میں زیادہ تفصیل کے ساتھ کچھ اور سمجھا بھی نہیں سکی تھی۔ اس کے باوجود گوپال کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا تھا کہ وہ دروازے پر پہرا دے رہا ہو گا۔ کویتا نے یہ مسئلہ خود اپنے طور پر حل کر لیا تھا جو اس کے ذہین ہونے کا ثبوت تھا۔

میں' کویتا کے بارے میں ہی میں سوچتی ہوئی شہزاد کے گھر تک پہنچ گئی۔ کویتا کو اس روز صبح شہزاد کے پاس بھیجتے ہوئے میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اسی دن شام ہوتے ہوتے خود میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔ میرے لئے دروازہ کھولنے والا شہزاد ہی تھا۔

"وہ آ گئی؟" میں نے اندر قدم رکھنے سے پہلے ہی شہزاد سے سوال کیا۔

"کون جہاں آراء؟" شہزاد بولا۔ "آپ اندر تو آئیں خاتون۔"

میں سمجھ گئی کہ کویتا نے اپنا نام جہاں آراء بتایا ہو گا۔ میں نے اسی لئے اطمینان سے کہا۔ "ہاں وہی۔" پھر میں اندر داخل ہو گئی۔

"جی ہاں خاتون' وہ تو صبح ہی آ گئی تھی اور اسی وقت سے آپ کی آمد کا انتظار تھا۔" شہزاد نے کہا۔

"میرا انتظار کیوں کر رہے تھے؟"

"اس لئے کہ جہاں آراء نے آپ کی آمد کے بارے میں بتایا تھا۔" وہ میرے ساتھ ساتھ گھر کے اندر داخل ہو کر بولا۔ "ویسے مجھ سے بھی زیادہ سنبل آپ کی منتظر تھی۔ میرے کان کھا گئی تھی کہ باجی کب آئیں گی' مجھ پر الزام لگا رہی تھی کہ میں آپ کو لے کر نہیں آتا۔" شہزاد نے اپنی چھوٹی بہن کا ذکر کیا۔

پھر سنبل نے مجھے دیکھ ہی لیا اور آ کر لپٹ گئی' کہنے لگی۔ "پتا ہے باجی' میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔"

"وہ تو اسی سے صاف ظاہر ہے جس طرح تم آ کر لپٹ گئی ہو۔" میں ہنس پڑی۔

"معلوم ہے آپ کتنے دن بعد آئی ہیں؟ آئندہ آپ روزانہ آئیں گی ہاں۔"

"اچھا چلو کوشش کروں گی۔" میں نے کہا پھر کویتا کے بارے میں پوچھا۔ "جہاں آراء کہاں ہے؟"

"اسی کمرے میں جہاں آپ ٹھہری تھیں۔" سنبل نے بتایا۔

"پھر تو کمرا مہمان خانہ بن گیا ہے' ایک مہمان گیا دوسرا آ گیا۔" میں ہنس کر بولی۔

اس کے بعد دالان میں موجود شہزاد کی امی سے کھڑے کھڑے مل کر میں' کویتا کے پاس پہنچ گئی۔ شہزاد میرے ایما پر باہر ہی رہ گیا تھا۔

مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کویتا کے چہرے پر انتہائی حیرت کے آثار نظر آئے تھے۔ اس نے یقیناً میری آواز نہیں سنی تھی۔ وہ کمرہ یوں بھی الگ تھلگ تھا۔ دیوار کے قریب بچھی ہوئی چارپائی کے سرہانے دو کرسیاں رکھی تھیں' کویتا انہی میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو بیٹھو!" میں دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔ "گھر تلاش کرنے میں تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"پریشانی تو خیر ہوئی تھی مگر پوچھتے پوچھتے پہنچ ہی گئی۔" اس نے بتایا پھر ذرا دھیمی آواز میں معلوم کیا۔ "آپ کس طرح وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئیں؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے' اطمینان سے سناؤں گی فی الحال تمہیں میرے ساتھ یہاں سے چلنا ہے۔"

"کہاں؟" اس نے دریافت کیا۔ "آپ یہاں نہیں رہتیں کیا؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "جہاں میں رہتی ہوں وہیں تمہیں لے جا رہی ہوں۔"

"وہاں کوئی اور بھی رہتا ہے آپ کے ساتھ؟" کویتا نے سوال کیا۔

"نہیں' میں اکیلی رہتی ہوں۔ گھر کے کام کاج کے لئے ایک عورت تھی مگر شاید اب اس کی بھی ضرورت نہ پڑے۔"

"ہاں وہ میں سنبھال لوں گی۔" کویتا میری بات کا مطلب سمجھ کر بولی پھر پوچھا۔ "تو پھر میں کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤں' چلنے کے لئے؟"

مر کپڑے بدلو' میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر شہزاد میرا منتظر تھا۔ میں محسوس کر چکی تھی کہ وہ مجھ سے بات کرنے کے لئے مضطرب ہے۔ میں اسے ساتھ لئے نشست گاہ میں آ گئی۔

"یہ لڑکی کون ہے خاتون؟" شہزاد نے بیٹھتے ہی دریافت کیا۔

مجھے علم تھا کہ وہ یہی پوچھے گا۔ میں نے کہا۔ "ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے جو میرے دشمنوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ بہرحال اسے میں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔"

"نیا مکان لے لیا کرائے پر؟"

"بس یوں سمجھو کہ لے بھی لیا اور نہیں بھی لیا۔ وہ مکان بھی چھوڑ کر اب کوئی اور مکان لینا پڑے گا۔ نیا مکان بھی میرے دشمنوں کی نظر میں آ گیا ہے اس لئے چھوڑنا پڑ رہا ہے جب کہیں اطمینان سے رہنا نصیب ہو جائے گا تو پھر تمہیں اپنا ٹھکانا دکھا دوں گی۔" میں نے جواب دیا اور پھر اس سے کچھ پیسے مانگے۔

شہزاد نے فوراً اپنی جیب سے پرس نکال کر اس میں جتنے بھی نوٹ تھے میرے حوالے کر دیئے اور بولا۔ "اور چاہئیں تو لاؤں؟"

مجھے قرول باغ تک پہنچنے کے لئے صرف کرائے کی ضرورت تھی' سو میں نے چند روپے لے کر بقیہ اسے واپس کر دیئے۔

اس کے بعد میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی۔ شہزاد کی بہن سنبل نے بہت روکنا چاہا تھا مگر میں نے اسے کسی اور دن آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ پھر بھی سنبل نے چائے پلائے بغیر نہیں آنے دیا تھا۔ کویتا اپنے ساتھ ایک اٹیچی بھی آشرم سے لے کر آئی تھی جس میں اس کا سامان تھا۔ شہزاد نے اس سے وہ اٹیچی لے لی تھی۔ وہ ہمیں چھوڑنے جامع مسجد تک آیا تھا۔ وہاں سے میں نے قرول باغ کے لئے ایک تانگا کر لیا اور شہزاد واپس چلا گیا۔

☆======☆======☆

میں سفر کے دوران میں گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگی۔ پہلے کی نسبت حالات اب خاصی حد تک بدل چکے تھے۔ بڑے مہاراج چندر موہن کو مجھ سے ٹکراؤ کے نتیجے میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس کا ایک خاص چیلا گوپال جو خود بھی پُراسرار شیطانی قوتوں کا مالک تھا' اس کا باغی ہو چکا تھا۔ اس کی دست راست چمپا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کے علاوہ چندر موہن اپنی دو حسین نوجوان داسیوں سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ رادھا کو گوپال لے اڑا تھا اور کویتا میرے ساتھ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چندر موہن ہی نے چمپا کو میرے پیچھے لگایا تھا مگر چمپا خود بھی مجھے نیچا دکھانے کے درپے تھی۔ اب تک پیش آنے والے واقعات سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اپنی انا اور احساس برتری کی تسکین کے لئے چمپا' چندر موہن کے احکام سے بھی تجاوز کرتی رہتی تھی اس میں چمپا کے گھٹیا کردار کو بہت دخل تھا۔ اس کے علاوہ چمپا میرے خلاف چندر موہن کو انتہائی اقدام اٹھانے کے لئے بھی شہ دیتی رہتی تھی۔ جب سے میں دہلی آئی تھی چمپا ہی نے مجھے کہیں ٹک کر سکون سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ وہ مجھے کسی نہ

کسی چکر میں الجھائے رکھتی تھی کچھ اور نہیں تو پولیس یا سی آئی ڈی والوں ہی کو میرے پیچھے لگا دیتی تھی۔ اس کا مقصد مجھے ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچانے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا تھا۔ چمپا کی انہی خبیث حرکتوں کے سبب اغوا ہونے سے پہلے میں نے کرائے پر حاصل کئے ہوئے کسی مکان کی بجائے ہوٹل میں قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک ہوٹل چھوڑ کر دوسرے ہوٹل میں قیام' مکان بدلنے سے کہیں زیادہ آسان تھا لیکن موجودہ صورت حال میں اس فیصلے پر مجھے نظرثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اب کرائے پر بھی کوئی نیا مکان لے کر رہنا ممکن ہو گیا تھا۔

کہیں اپنے قیام کے مسئلے سے قطع نظر اب میں ایک اور معاملے پر بھی غور کر رہی تھی۔ اس معاملے کا تعلق چندر موہن اور انگریز حکومت کے درمیان ہونے والی سودے بازی تھا۔ آخر اس سودے بازی کی نوعیت کیا تھی؟ یہ سوچنا تو فضول سی بات ہوتی کہ انگریز حکومت' چندر موہن کے ذریعے مجھ پر ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو میں کب کی گرفتار کر لی جاتی۔ کلکتے کے دوران قیام میں تو انٹیلی جنس کو میری کوٹھی کا علم بھی تھا۔ خود بنگال انٹیلی جنس کا سربراہ ڈیسوزا اس سے واقف تھا۔ مجھ پر ہاتھ ڈالنا تو کجا' میرے کسی بھی جارحانہ اقدام کے نتیجے میں انٹیلی جنس والے پسپائی اختیار کر لیتے تھے۔ یہ سودے بازی چندر موہن کے خاص چیلے گوپال کے علم میں بھی تھی۔ گوپال کے الفاظ میرے ذہن میں محفوظ ہو گئے تھے۔ اس نے کہا تھا' کہیں تمہارا نام معبلہ تو نہیں' بڑے مہاراج نے جس کا سودا بدیشی سرکار سے کیا ہے؟ یہ بات الجھا دینے والی ہی تھی کہ چندر موہن نے انگریز حکومت سے میرا سودا کیا تھا۔ کیسا سودا تھا یہ اور اس کا مقصد کیا تھا؟ بار بار یہی ایک سوال میرے ذہن میں ابھرتا تھا۔ میں جب گوپال کی قید میں تھی تو وہ بھی کسی انگریز سے ملنے والا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ انگریز کوئی اعلیٰ سرکاری افسر ہی ہو سکتا تھا۔ رادھا کی بے وقوفی کے سبب مجھے یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔ گوپال نے رادھا کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ وہ مجھ سے یہ بات چھپا رہا تھا۔ مجھے قید کرنے کے بعد اس کا کسی انگریز افسر سے ملنا میرے لئے معنی خیز تھا۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا تھا کہ شاید گوپال' چندر موہن کی جگہ لینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ انگریزوں کے لئے میرے سلسلے میں جو خدمات چندر موہن ادا کر رہا تھا' غالباً وہ بھی خود کو اس کا اہل تصور کر رہا تھا۔ یہ بھی میں جان چکی تھی کہ وہ ابھی اپنے اس ارادے کی تکمیل نہیں کر سکا تھا۔ اس نے خود رادھا کو بتایا تھا کہ وہ صرف چندر موہن کے آشرم کا پھیرا لگا کر لوٹ آیا تھا۔

تانگا اب قرول باغ کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے اسے کوٹھی سے خاصے پہلے ایک جگہ روک لیا۔اور کرایہ ادا کر کے اتر گئی۔ کویتا نے اپنی اٹیچی اٹھا لی اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میں نے اسے دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔ "سنو' فی الحال میں اپنے کچھ دوستوں کے یہاں چل رہی ہوں۔ دراصل میں نے جو مکان پہلے کرائے پر لیا تھا' وہ میرے دشمنوں کے علم میں آ چکا ہے۔ چندر موہن نے بھی مجھے اسی مکان سے اغوا کیا تھا۔ ان حالات میں پھر اسی مکان میں رہنا مناسب نہیں ہے نا؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں راجکماری جی!" کویتا نے میری بات سے اتفاق کیا۔

"جب تک کسی نئے ٹھکانے کا بندوبست نہیں ہو جاتا' ہم اپنے دوستوں کے ساتھ ہی رہیں گے۔"

میں نے کویتا کو بتایا پھر بولی۔ "مجھے راجکماری نہ کہو' میرے یہ دوست جن کے یہاں ہم جا رہے ہیں' مجھے کرن کہتے ہیں۔ تم بھی کرن کہہ سکتی ہو۔"

"آپ کا اصل نام معبلہ ہے' کرن ہے یا رانی؟" اس نے دریافت کیا۔

"اپنے دشمنوں کی نظروں سے بچنے کے لئے میں نے مختلف نام رکھ لئے ہیں۔ میرا اصل نام معبلہ ہی ہے۔" میں نے اس سے اپنا نام چھپانا ضروری نہیں سمجھا۔

"مگر بڑے مہاراج کو تو آپ کا اصل نام معلوم ہے۔" وہ حیرت سے بولی۔ "پھر نام بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"چندر موہن کے علاوہ بھی میرے اور بہت سے دشمن ہیں۔ ان سے بھی تو مجھے بچ کے رہنا پڑتا ہے۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔" اس نے طویل سانس لیا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ گئے۔ میں نے پھاٹک پر مخصوص انداز میں دستک دے کر جب شناختی الفاظ ادا کئے تو کویتا حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی' لیکن بولی کچھ نہیں۔ شناختی الفاظ کے تبادلے کے بعد ذیلی دروازہ کھل گیا تو میں اپنے ساتھ کویتا کو لئے اندر داخل ہو گئی۔

ذیلی دروازہ کھولنے والا رنجیت تھا۔ وہ دروازہ بند کرتے ہی میری طرف پلٹا اور کہنے لگا۔ "کرن جی! آپ کہاں چلی گئی تھیں؟ سارے شہر میں آپ کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ اس وقت بھی اجلاس والے کمرے میں آپ ہی کی تلاش کے سلسلے میں میٹنگ ہو رہی ہے۔"

"بس ایک چکر میں پھنس گئی تھی۔" میں نے گول مول جواب دیا پھر میں' کویتا کو ساتھ لئے عمارت کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ رنجیت نے کویتا کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اسے یقیناً یہ اعتماد تھا کہ میں کسی ایسے فرد کو اپنے ساتھ لے کر وہاں نہیں آ سکتی جو تنظیم کے لئے کسی خطرے کا باعث ہو۔

"کرن جی' کیا مجھے یہاں بھی اپنا نام جہاں آراء ہی ظاہر کرنا ہے؟" کویتا نے میرے ساتھ چلتے ہوئے دھیمی آواز میں معلوم کیا۔

"نہیں' یہاں اپنا نام چھپانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

عمارت کا صدر دروازہ رشیدہ نے کھولا اور وہ بھی مجھے دیکھ کر چونک اٹھی۔

اس سے پہلے کہ وہ بھی رنجیت کی طرح کوئی سوال کرتی' میں بول اٹھی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم سب لوگ میری طرف سے فکرمند ہو۔ اب فکر و تشویش کی کوئی بات نہیں۔ تم ایسا کرو کہ انہیں کسی کمرے میں پہنچا دو۔" میں نے کویتا کی طرف اشارہ کیا پھر بولی۔ "ان کا نام کویتا ہے .... اور کویتا یہ رشیدہ ہیں .... رشیدہ! اس کوٹھی میں اجلاس والا کمرا کدھر ہے؟" آخر میں رشیدہ سے میں نے دریافت کیا کیونکہ میں اس کوٹھی کے اندرونی حصے سے ٹھیک طرح واقف نہیں تھی۔

"یہاں سے سیدھی چلی جائیں۔ آگے جا کر دائیں جانب والی راہداری میں مڑ جایئے گا۔ اس کے

اختتام پر جو بڑا سا دروازہ ہے' وہی اجلاس والا کمرا ہے۔ باہر آپ کو دلاری کھڑی مل جائے گی۔" رشیدہ نے بتایا۔

کویتا کو میں رشیدہ کے پاس چھوڑ کر تیز قدمی سے آگے بڑھ گئی۔ میں جلد ہی مطلوبہ راہداری کے اختتام تک پہنچ گئی۔ بند دروازے کے سامنے مجھے دور ہی سے دلاری کھڑی ہوئی نظر آ گئی تھی مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ بھی کھل اٹھا۔ دلاری نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "نمستے کرن جی! بھگوان نے بڑی کرپا (مہربانی) کی کہ آپ خود لوٹ آئیں۔"

میں نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس نے میرے لئے دروازہ کھول دیا اور میں اندر داخل ہو گئی۔

اندر ایک بڑی سی لمبی میز کی دونوں جانب کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر تقریباً دس افراد بیٹھے تھے۔ کچھ کرسیاں خالی بھی تھیں۔ ان لوگوں کے علاوہ میز کے ایک سرے پر بالکل سامنے سالار اکبر ایک کرسی پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں جو کرسیاں تھیں' ان پر عادل اور سمیع اللہ بیٹھے تھے۔ اجلاس کی صدارت غالباً سالار اکبر ہی کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سبھی حیران رہ گئے۔

"اجلاس برخاست کیا جاتا ہے۔" معاً سالار اکبر کی آواز بلند ہوئی۔ "اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔" پھر وہ سمیع اللہ سے مخاطب ہوا۔ "جن ارکان کو کرن کی تلاش پر مامور کیا گیا ہے' تم انہیں فوری طور پر مطلع کر دو کہ مزید ہوٹلوں کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔"

سمیع اللہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی کے ساتھ دوسرے افراد بھی کرسیوں سے اٹھ گئے۔

ہر کوئی میری پُراسرار گمشدگی کے متعلق جاننے کے لئے بے چین تھا۔ میں نے مختصراً اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات سنا دیئے کہ کس طرح چندر موہن نے مجھے بے بس کر لیا تھا۔ سب حیران ہو کر میری باتیں سن رہے تھے۔

"پھر تم ان لوگوں کی قید سے نکلنے میں کس طرح کامیاب ہو گئیں؟" عادل نے سوال کیا۔

"وہاں سے فرار ہونے میں ایک لڑکی نے میری مدد کی تھی جو خود بھی ان لوگوں کے ظلم کا شکار تھی۔" میں نے بات کو مختصر کرنے کے خیال سے جواب دیا۔ اس طرح میں' کویتا کو اپنے ساتھ لانے کا جواز بھی پیدا کر سکتی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "میرے فرار کے بعد اسی لڑکی پر شبہ کیا جاتا اسی لئے میں اسے بھی اپنے ساتھ وہاں سے نکال کر لے آئی۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہاں اس لڑکی کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی اور میرا تنہا فرار ہونا خودغرضی ہوتی۔ اس لڑکی کا نام کویتا ہے۔"

"لیکن وہ ہے کہاں؟" سالار اکبر نے پوچھا۔

"میں اسے رشیدہ کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ رشیدہ نے اسے کسی کمرے میں پہنچا دیا ہو گا۔" میں نے بتایا۔

"اس لڑکی کو اپنے ساتھ لا کر آپ نے اچھا کیا۔" سالار اکبر نے کہا پھر دریافت کیا۔ "اب کیا ارادہ ہے آپ کا؟ کسی ہوٹل میں قیام کا خیال ہے جیسا کہ آپ نے پہلے پنڈت جی سے کہا تھا یا پھر کسی اور

مکان کا بندوبست کیا جائے؟"

"موجودہ حالات میں کوئی اور مکان کرائے پر حاصل کرنا ہی مناسب رہے گا۔" میں نے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اور اس وقت تک جب تک کہ مکان کا بندوبست نہ ہو؟" اس مرتبہ عادل نے مجھے مخاطب کیا۔

"فی الحال میرے یہاں رہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔"

"وہ کوٹھی خالی کر دی گئی ہے اور تمہارا تمام سامان ہم یہاں لے آئے ہیں۔" عادل بولا۔ "معاف کرنا سامان اسی طرح بے ترتیبی کی حالت میں سوٹ کیسوں کے اندر رکھ دیا گیا تھا۔ پھر اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ دلاری تمہیں بتا دے گی کہ اس نے سوٹ کیس کہاں رکھے ہیں؟"

"کوئی بات نہیں' میں خود سامان کو ترتیب سے رکھ لوں گی۔" میں نے کہا پھر سالار اکبر سے پوچھا۔ "ولیم رائٹ کے بارے میں کچھ پتا چلا کہ وہ اب کیسا ہے؟"

"خطرے کی حدود سے تو وہ نکل گیا ہے' مگر ابھی زیر علاج ہے اور اسپتال ہی میں ہے۔"

مجھے ژیان کا خیال بھی آیا' مگر فوری طور پر اس کے بارے میں کچھ پوچھنا مناسب معلوم نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سالار اکبر کی تمام تر توجہ میری تلاش پر مرکوز رہی تھی۔ وہ شاید ژیان کے معاملے کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔ اگر اس سلسلے میں کوئی سراغ ملا ہوتا تو وہ خود ذکر کر دیتا۔ ژیان کے متعلق سوال کرنے کی بجائے میں نے کہا۔ "سالار! آپ کی ٹانگ کا زخم کیسا ہے؟"

"تقریباً ٹھیک ہو چکا ہے اور میں چل پھر سکتا ہوں۔"

پھر میں وہاں سے اٹھ آئی۔ باہر دلاری موجود تھی۔ سوٹ کیسوں کے بارے میں میرے پوچھنے پر وہ بولی۔ "آپ رکئے کرن جی! میں' سالار کو بتا دوں کہ آپ کے ساتھ جا رہی ہوں۔" دلاری دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اور پھر فوراً ہی لوٹ آئی۔

"یہاں جس کمرے میں پہلے آپ رہ رہی تھیں' وہیں میں نے سوٹ کیس رکھ دیئے تھے۔" دلاری نے میرے ساتھ چلتے ہوئے بتایا۔ "وہ کمرا خالی ہی پڑا تھا۔"

"رشیدہ سے ذرا یہ بھی پوچھ لو کہ جو لڑکی میرے ساتھ آئی تھی' وہ کس کمرے میں ہے؟"

"آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں پوچھ کر ابھی آتی ہوں۔" دلاری نے کہا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی صدر دروازے کی طرف چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ لوٹ آئی اور بتایا کہ جس کمرے میں میرے سوٹ کیس رکھے تھے' وہیں رشیدہ نے کویتا کو بھی پہنچا دیا تھا۔

اس کمرے میں پہنچ کر دلاری سے بھی میں نے کویتا کا تعارف کرا دیا۔

"کرن جی! ان کے لئے میں برابر والے کمرے میں رہنے کا بندوبست کر دیتی ہوں یا پھر کہیں تو اسی کمرے میں بھی جگہ ہے' فولڈنگ بیڈ آ سکتا ہے یہاں۔" دلاری بولی۔

"فولڈنگ بیڈ ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا۔

دلاری چلی گئی اور میں نے دیوار کے قریب رکھے ہوئے سوٹ کیسوں میں سے ایک اٹھا لیا۔ تینوں

سوٹ کیسوں میں کپڑے اور دیگر سامان رکھنے کے دوران میں دلاری فولڈنگ بیڈ بھی اٹھوا لائی جس کے ساتھ بستر بھی تھا۔ اس نے بیڈ پر بستر بھی بچھا دیا۔ کویتا اور میرے بیڈز کے درمیان چھوٹی میز اور تین کرسیاں تھیں۔

"چائے پئیں کرن جی تو لے کر آؤں؟" دلاری نے دریافت کیا۔

"لے آؤ۔" میں بولی پھر کویتا سے پوچھا۔ "تم بھی پیو گی کویتا؟"

"چائے پینے کی زیادہ عادت تو نہیں ہے' لیکن آپ کہتی ہیں تو پی لیتی ہوں۔" کویتا نے جواب دیا۔ وہ میرے ہی قریب کرسی پر بیٹھی تھی۔

دلاری چائے لینے چلی گئی تو میں نے کویتا سے کہا۔ "تم پوچھ رہی تھیں کہ مجھے فرار ہونے کا موقع کیسے مل گیا تو اس کی وجہ چندر موہن اور گوپال کے درمیان ہونے والا ٹکراؤ تھا۔"

"گوپال اور بڑے مہاراج کا ٹکراؤ۔" کویتا کے لہجے میں انتہائی حیرت تھی۔ "یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ گوپال تو بڑے مہاراج کا خاص چیلا ہے۔"

پھر میں' کویتا کو گوپال اور چندر موہن کے اختلاف کی وجہ بتانے لگی۔ اسی دوران میں دلاری چائے دینے کے لئے آ گئی تو مجھے کچھ دیر کو خاموش ہونا پڑا۔

جس وقت دلاری چائے لے کر آئی تھی میں کویتا کو رادھا کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ اسی لئے دلاری کے جاتے ہی بول اٹھی۔ "تو کیا .... کیا بڑے مہاراج نے رادھا کو بلی چڑھا دیا؟" کویتا کے لہجے سے اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔

"نہیں' وہ بچ گئی۔ عین وقت پر گوپال اسے اور مجھے وہاں سے اغوا کر کے لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔" میں نے جواب دیا پھر کویتا کو اس کے بعد پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگی۔ کویتا پوری توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ اس دوران میں وہ ایک مرتبہ بھی نہیں بولی تھی۔

میں اپنی بات ختم کر چکی تو وہ بولی۔ "اس کا مطلب یہ ہوا راجکماری جی کہ.........."

"راجکماری نہیں کرن۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"چھما (معاف) کر دیئے گا کرن جی' میں بھول گئی تھی۔" اس نے معذرت کی اور پھر اپنی بات پوری کرنے لگی۔ "میں یہ کہہ رہی تھی کہ اب گوپال بھی آپ کا دشمن ہو گیا ہے حالانکہ اس کا چھوٹا بھائی آپ کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے ویسے مجھے یہی جان پڑتا ہے کہ وہ انتقام کے بہانے آپ سے ملن چاہتا ہے۔"

"تمہارا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے' میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"بہرحال جو بھی ہو' اب چندر موہن کے ساتھ گوپال سے بھی نمٹنا پڑے گا۔ یہ جگہ بہت محفوظ تھی' مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے میرے دوستوں کو بھی کوئی نقصان پہنچ جائے۔ میں اسی لئے نئے ٹھکانے کا بندوبست کر رہی ہوں۔"

"یہاں رہ کر کیا آپ کو بڑے مہاراج اور گوپال کے علاوہ بھی کسی کی طرف سے خطرہ ہے؟" کویتا

نے سوال کیا۔

"نہیں کسی اور سے یہاں خطرہ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس لئے کہ ایسا بندوبست کیا جا سکتا ہے' بڑے مہاراج اور گوپال یہ پتا نہ چلا سکیں کہ آپ کہاں ہیں۔ خود میری حفاظت کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ میرا سراغ نہ لگا سکیں۔ وہ دونوں مجھے بھی تو تلاش کر سکتے ہیں نا کرن جی!"

"یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو کویتا' مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟ میں تمہاری بات کچھ سمجھ نہیں سکی۔"

"کرن جی! میرے پاس بھی کچھ شکتی ہے۔"

"ہاں' رادھا نے بھی اس سلسلے میں مجھے بتایا تھا' لیکن تم اپنی اور میری حفاظت کے لئے کیا کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کوٹھی کو ان دونوں کی نظروں سے چھپا دوں گی۔ اس کے لئے مجھے کوٹھی کو گھیرے میں لینا پڑے گا۔" کویتا نے بتایا۔

"تم کوٹھی کے گرد حصار کھینچو گی؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ہاں کرن جی! اور اس کے لئے مجھے کوٹھی کے باہر جانا پڑے گا۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں' ابھی لوٹ آتے ہیں۔"

میں فوراً راضی ہو گئی۔ کویتا نے بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں کسی نئے ٹھکانے کی تلاش بھی ضروری نہیں رہی تھی۔ کویتا نے جو کچھ سیکھا یا حاصل کیا تھا' بڑے مہاراج چندر موہن ہی سے اس کی تعلیم لی تھی۔ یوں گویا چندر موہن ہی کی شیطانی قوتیں اس کے خلاف استعمال ہو رہی تھیں۔ یہ قوتیں کم از کم چندر موہن یا گوپال سے ٹکراؤ کی صورت میں آئندہ بھی میرے کام آ سکتی تھیں' اب میں' چندر موہن کے کسی ممکنہ حملے سے بچ کر سکون کے ساتھ اپنی تمام تر توجہ ژیان کی طرف مبذول کر سکتی تھی جس کی خاطر پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں کا رخ کیا تھا۔

کویتا کے ساتھ عمارت سے نکل کر پھاٹک کی طرف بڑھنے لگی تو عادل کو اپنے عقب سے تیز قدمی کے ساتھ قریب آتے دیکھا۔

"کیوں کرن جی! کیا پھر کچھ کہے سنے بغیر کہیں جانے کا ارادہ ہے؟" عادل مسکرا کر بولا۔ عادل سے میں' کویتا کا غائبانہ تعارف کرا چکی تھی اس لئے کویتا کے متعلق اس نے کچھ نہیں پوچھا۔

"نہیں' بس ذرا کوٹھی کے باہر تک جانے کا خیال ہے' ابھی لوٹ آؤں گی' لیکن تم کدھر چل دیئے؟"

"تمہارے ہی کام سے جا رہا ہوں۔ سالار اکبر کا حکم ہے کہ کل تک قرول باغ ہی کے علاقے میں تمہارے لئے کسی مکان کا بندوبست ہو جانا چاہئے۔" عادل نے جواب دیا۔

"اب کوئی مکان تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہی پنڈت جی۔"

"وہ کیوں؟" عادل نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"اس لئے کہ اب میں نے تم لوگوں کے ساتھ اسی کوٹھی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"لیکن پہلے تو تم کچھ اور کہہ رہی تھیں کہ تمہارے دشمن ہر جگہ تمہاری تلاش میں پہنچ سکتے ہیں اور ان سے ہمیں بھی نقصان.........."

"اب صورت حال بدل چکی ہے پنڈت جی! وہ اب میرا سراغ نہیں لگا سکیں گے اور نہ اس کوٹھی تک پہنچ پائیں گے۔" میں' عادل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

"اگر ایسا ہے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔" عادل نے اظہار مسرت کیا۔ "پھر میں' سالار اکبر کو بھی تمہارے اس فیصلے سے مطلع کر دوں؟"

"ہاں بالکل' بتا دو انہیں بھی۔ یقیناً وہ بھی اس فیصلے سے خوش ہوں گے۔" میں بولی پھر کویتا سے مخاطب ہوئی۔ "آؤ چلیں۔"

عادل وہیں سے واپس ہو گیا اور میں کچھ ہی دیر میں کویتا کو ساتھ لئے کوٹھی کے پھاٹک سے باہر آ گئی۔

اس کوٹھی کے عقب میں اور دائیں بائیں دوسری کوٹھیاں بھی تھیں۔ کویتا کو اسی لئے کوٹھی کو حصار میں لینے کی خاطر خاصا لمبا چکر کاٹنا پڑا۔ اس دوران میں وہ زیر لب کچھ پڑھتی بھی رہی تھی۔ چکر لگا کر ہم ایک بار پھر کوٹھی کے گیٹ پر واپس آ گئے۔ اب کویتا نے پڑھنا بند کر دیا تھا۔

میں نے کوٹھی کے پھاٹک پر دستک دینے سے پہلے کویتا سے معلوم کیا۔ "اس حصار کی وجہ سے کوٹھی میں لوگوں کے آنے جانے پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا؟"

"نہیں کرن جی! یہ حصار صرف بڑے مہاراج' گوپال' ان کی داسیوں اور چیلوں کے لئے ہے۔ ان کی نظروں سے یہ کوٹھی اوجھل ہو جائے گی جب تک ہم اس کوٹھی کے اندر رہیں گے' وہ ہمیں تلاش نہیں کر پائیں گے۔" کویتا نے مجھے اطمینان دلایا۔

"اور اگر مجھے کوٹھی سے باہر نکلنا پڑا تو؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"تو پھر میں آپ کے گرد بھی یہی گھیرا ڈال دوں گی۔ آپ انہیں نظر نہیں آئیں گی جب آپ انہیں دکھائی ہی نہیں دیں گی تو وہ آپ پر وار نہیں کر سکیں گے۔"

مجھے کویتا سے یہ سن کر مزید خوشی ہوئی۔ مجھے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ بظاہر غیر اہم سی نظر آنے والی لڑکی میرے لئے اتنی اہمیت اختیار کر لے گی اور اس قدر سودمند ثابت ہو گی۔ حالات اب میرے حق میں استوار ہوتے جا رہے تھے اور اس میں یقیناً نیکی کی قوتوں کو دخل تھا جنہوں نے دشمنوں کے درمیان سے میرا ایک بھی خواہ پیدا کر دیا تھا۔ شناختی الفاظ کے تبادلے کے بعد کویتا کو ساتھ لئے میں اندر داخل ہوئی تو بڑی حد تک مطمئن تھی۔

عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے کویتا مجھ سے شناختی الفاظ کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"یہ الفاظ پہچان کے لئے ہیں تاکہ کوئی دشمن یا غیر آدمی کوٹھی کے اندر داخل نہ ہو سکے۔" میں

نے بتا دیا۔

کویتا نے اظہار اطمینان میں سر ہلا دیا۔ ہم دونوں عمارت کے اندر اپنے کمرے میں پہنچے تو دلاری آ گئی اور رات کے کھانے کے لئے پوچھنے لگی۔

"ابھی زیادہ بھوک تو نہیں ہے لیکن لے ہی آؤ تاکہ تم فارغ ہو جاؤ۔" میں نے یہ اس لئے کہا تھا کہ دوپہر کو مجھے دیر سے کھانا نصیب ہوا تھا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں کرن جی! آپ کہیں تو کچھ دیر بعد کھانا لے آؤں گی یا پھر مجھے آواز دے کر بلا لیجئے گا، میں برابر والے کمرے ہی میں ہوں۔" دلاری بولی۔

"تمہیں سونے کو دیر ہو جائے گی اس لئے لے ہی آؤ۔"

"جو آپ کا حکم کرن جی!" دلاری یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

پھر کھانا کھا کر چائے پینے کے بعد کویتا کو ساتھ لئے میں کوٹھی کے لان میں چہل قدمی کی غرض سے نکل آئی۔

"کرن جی! میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ لوگ آپ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔" کویتا میرے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"ہاں یہ بہت پرخلوص لوگ ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسے لوگ ملے ہیں۔"

"ایک بات آپ سے پوچھنا تھی کرن جی!" کویتا کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں، پوچھو۔" میں نے اس کی ہمت بڑھائی تاکہ جو بھی اس کے دل میں ہو کہہ دے۔

"بڑے مہاراج نے آپ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، میں اس کے سچ اور جھوٹ کا اندازہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"چندر موہن سے تمہیں میرے متعلق کیا معلوم ہوا تھا؟" میں نے پہلے کویتا ہی سے پوچھنا مناسب سمجھا۔

"یہ کہ یہاں سے بہت دور اونچے اونچے پہاڑوں کے بیچ ایک راج ہے، وادی سبز! آپ اسی راج کی راجکماری ہیں۔ جب بڑے مہاراج نے آپ پر جادو کر رکھا تھا تو مجھ سے اپنے ہی راج کے بارے میں آپ نے پوچھا تھا کہ وادی سبز کہاں ہے؟ اس سے جان بوجھ کر میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ یہ تو بڑے مہاراج ہی جانیں۔"

"اس کی کوئی وجہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"وجہ تھی! بڑے مہاراج نے مجھ سے کچھ بتانے کو منع کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ پر جب تک جادو کا اثر ہے، پچھلے جیون کے دشے (بارے) میں پوچھنے پر بھی کچھ نہ بتایا جائے۔ ان کے وچار (خیال) میں اس طرح اگر آپ کو کچھ یاد آ گیا تو جادو ٹوٹ بھی سکتا ہے۔" کویتا نے جواب دیا۔

"چندر موہن نے یہ نہیں بتایا کہ میں اپنا راج چھوڑ کر اس دیش میں کیوں آئی ہوں؟" میں اس سے یہ سب کچھ اس لئے پوچھ رہی تھی کہ شاید اس طرح کوئی نئی بات معلوم ہو جائے۔

"انہوں نے بتایا تھا کہ آپ اپنے راج کے کسی دشمن کا پیچھا کرتی ہوئی یہاں آئی ہیں۔"

کویتا نے میرے سوالوں کے جواب میں جو کچھ بتایا تھا وہ پہلے ہی سے میرے علم تھا۔ اس سے مجھے کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ انگریزوں سے چندر موہن کی سازباز اور اس کے مقصد سے کویتا قطعی لاعلم تھی۔ میرے بارے میں کویتا کو چندر موہن سے جو کچھ معلوم ہوا تھا، اس کی تصدیق نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اگر میں یہ کہہ دیتی کہ میرے متعلق چندر موہن نے اس سے غلط بیانی کی ہے تو پھر وہ یہ ضرور پوچھتی، حقیقت کیا ہے؟ میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں۔

"کویتا! میرے بارے میں تمہیں جو کچھ چندر موہن سے پتا چلا ہے، وہ درست ہے۔" میں نے تصدیق کر دی پھر اسے تاکید کی۔ "ہاں میں تم سے اتنا ضرور کہوں گی کہ جو بھی میرے متعلق تم جان چکی ہو، اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میرے دوستوں کو بھی ان باتوں کا علم نہیں ہے۔"

"کرن جی! آپ کے بھید کی رکھشا (حفاظت) کرنا میں اپنا دھرم جانوں گی۔" کویتا نے یقین دلایا۔ "کبھی یہ بات میری زبان پر نہیں آئے گی۔"

"تم سے مجھے یہی امید بھی ہے کویتا۔" میں بولی۔

"آپ جس کارن (سبب) اپنا راج پاٹ چھوڑ کر آئی ہیں، کیا اس میں کامیابی ہوئی؟" کویتا نے دریافت کیا۔

"تمہارا مطلب شاید دشمن کی تلاش سے ہے؟"

"آپ ٹھیک سمجھیں، میں آپ کے دشمن ہی کے دشے (بارے) میں جان کاری چاہتی ہوں۔"

"اس کے بارے میں کچھ جان کر تم کیا کرو گی کویتا؟"

"شاید کرن جی، میں آپ کے کسی کام آ سکوں، اگر وہ اسی شہر میں ہے تو سمبھو (امکان) ہے میں اسے ڈھونڈ نکالوں۔"

کویتا کی بات سن کر میرے دل کی دھڑکنوں میں چند لمحے کے لئے اضافہ ہوا، پھر میں نے سوچا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، ممکن نہیں۔ اس کے باوجود ایک موہوم سی امید کے سہارے میں نے کہا۔ "وہ اسی شہر میں ہے کویتا! ایک مرتبہ میں نے اسے تلاش بھی کر لیا تھا، اس سے میرا ٹکراؤ بھی ہوا، پھر وہ نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا۔ میرے دوست اس کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ابھی تک انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔"

"لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کے متروں (دوستوں) کو پتا نہیں، آپ کسی راج کی راجکماری ہیں۔ پھر انہیں آپ کے دشمن کی جان کاری کیسے ہو گئی؟"

"خود میں نے ہی اپنے دشمن کی تلاش کے سلسلے میں ان سے مدد حاصل کی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کے سوا انہیں کچھ اور معلوم نہیں کہ دشمنی کی وجہ کیا ہے؟ جیسا کہ میں تمہیں بھی بتا چکی ہوں، وہ میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی میں بتانا چاہتی ہوں۔"

"کرن جی! کیا آپ مجھے اس جگہ لے جا سکتی ہیں جہاں آخری بار آپ نے اپنے دشمن کو دیکھا تھا یا

جہاں اس سے ٹکراؤ ہوا تھا۔"

"وہ اب وہاں نہیں ہے کویتا۔" میں نے بتایا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اب وہ وہاں ہے یا نہیں۔" کویتا نے بتایا۔

اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پہلی اور آخری بار ژیان سے میرا ٹکراؤ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ہوا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ میں' کویتا کو ساتھ لے کر اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخل ہو سکتی تھی یا نہیں' اس کی بات سمجھنا میرے لئے ضروری تھا۔ وہ آخر وہاں کیوں جانا چاہتی تھی؟ پھر یہ سوال میری زبان پر بھی آ گیا۔

جواب میں کویتا کہنے لگی۔ "کرن جی! ہر شریر (جسم) کی گندھ (بو) الگ الگ ہوتی ہے۔ منش (آدمی) ایک بار جہاں سے گزر جائے اپنی گندھ وہاں چھوڑ جاتا ہے۔ اسی گندھ سے اس کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔ شاید آپ نے سنا ہو کہ کچھ لوگ' گم ہو جانے والوں کا پتا بتا دیتے ہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ سو وہ گندھ ہی کے سادھن (ذریعے) ایسا کر پاتے ہیں۔ آپ میری بات کو سمجھ رہی ہیں نا۔"

"ابھی سمجھ تو نہیں سکی مگر سمجھنے کی کوشش ضرور کر رہی ہوں۔" میں مسکرا کر بولی پھر اس سے سوال کیا۔ "بقول تمہارے' ہر آدمی کے جسم کی بو الگ الگ ہوتی ہے۔ جہاں اپنے دشمن سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا' وہاں صرف وہی تو نہیں تھا اور لوگ بھی تھے۔ اس کے علاوہ بعد میں بھی وہاں لوگ آئے ہوں گے۔ پھر تم کس طرح الگ سے اس کے جسم کی بو کو محسوس کر لو گی؟ میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"اس کے لئے آپ کے شریر کی سوگندھ (خوشبو) میری سہایتا (مدد) کرے گی۔" کویتا نے ایک عجیب بات کہی۔

"وہ کس طرح؟" میں بول اٹھی۔

"اس بات کو یوں سمجھیں کہ کسی کا بیٹا یا بھائی کھو جاتا ہے اور وہ اس کا کھوج لگوانا چاہتا ہے تو خود اس آدمی کے جسم کی بو کھوئے ہوئے کو تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ باپ اور بیٹے کے درمیان جو ایک سمبندھ (تعلق) ہے' خون کا رشتہ ہے' وہ بیٹے کے جسم کی بو کو الگ سے پہچاننے میں سہایتا (مدد) کرتا ہے۔ شاستروں (ہندوؤں کی مذہبی کتاب) کی زبان میں اس کو پریم کنڈلی کہتے ہیں۔ یہ تو پریم کی بات۔ اسی پرکار (طرح) دشمن کی بو کو الگ سے پہچاننے کے لئے شترو کنڈلی ہوتی ہے۔ اس کا ذکر بھی شاستروں میں ہے۔ دو دشمنوں کے بیچ اگر دشمنی بہت سخت ہو تو ایک دوسرے کے جسم کی بو سے ان کا تعلق بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ سو یوں آپ کے جسم کی خوشبو' دشمن کے جسم کی بو کو الگ سے پہچان لینے میں میری مدد کرے گی۔" رادھا نے وضاحت کی۔

"پھر تم کیا کرو گی؟" میں نے اس کی بات سن کر دریافت کیا۔

"اس کے بعد مجھے ایکانت (تنہائی) میں بیٹھ کر پورے تین دن تک جاپ (وظیفہ) کرنا پڑے گا۔ اگر وہ اسی شہر میں ہوا تو اس کا کھوج مل جائے گا۔"

"کیا تم تین دن تک مسلسل جاپ میں بیٹھی رہو گی؟"

"نہیں' روز آدھی رات بیت جانے پر کسی کھلی اور اونچی جگہ پر صبح ہونے تک مجھے آسن مار کے بیٹھنا ہو گا۔" کویتا نے بتایا پھر پوچھنے لگی۔ "کیا اس کوٹھی کی چھت پر چڑھ کے جاپ کر سکتی ہوں میں؟ کیونکہ چھت کھلی بھی ہو گی اور اونچی بھی۔"

"اس سلسلے میں مجھے اپنے دوستوں سے معلوم کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ کوٹھی کی چھت پر جانے کے لئے کوئی زینہ ہو' مگر یہ تو بعد کی بات ہے' ابھی تو میں پہلے مرحلے ہی پر غور کر رہی ہوں کہ وہ بھی ممکن ہے یا نہیں۔" یہ کہہ کر میں سوچ میں پڑ گئی۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں دوبارہ داخل ہونا کوئی ہنسی کھیل نہیں تھا۔

"آپ کس سوچ میں پڑ گئیں کرن جی؟" مجھے خاموش دیکھ کر کویتا نے پوچھا۔

"بات دراصل یہ ہے کویتا کہ جس جگہ اپنے دشمن سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا' وہاں داخل ہونا آسان نہیں ہے۔"

"کیا وہ کوئی عمارت تھی؟" کویتا نے دریافت کیا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا اور پھر اسے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے بارے میں بتا دیا۔

"آپ نے کہا ہے کہ وہ اس عمارت میں ٹھہرا ہوا تھا اور اب شاید وہاں نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ عمارت میں آتا جاتا رہا ہو گا۔" یہ کہتے ہوئے کویتا کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی ہو۔ پھر وہ ایک دم بول اٹھی۔ "ہم اس عمارت کے سامنے سے تو گزر سکتے ہیں یا اس پر بھی پابندی ہے؟"

"نہیں' اس پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ عمارت ایک ایسی سڑک کے کنارے پر ہے جس پر لوگوں کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔" میں نے بتایا۔

"پھر تو کوئی سمسیا (مسئلہ) ہی نہیں رہی۔" کویتا کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہونے لگا۔

"وہ کیسے؟ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ نا۔"

"اس کے جسم کے بو عمارت کے باہر بھی موجود ہو گی۔ اس عمارت میں جانے اور باہر آنے کے لئے وہ اس جگہ سے تو گزرا ہی ہو گا نا۔"

پھر مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ ژیان مجھ سے بچنے کے لئے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی ایک کھڑکی سے اس کے عقبی میدان میں بھی کودا تھا اور پھر غائب ہو گیا تھا۔ میدان میں کود کر وہ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے عقب میں واقع سڑک سے بھی یقیناً گزرا ہو گا۔ میں نے کویتا کو یہ بات بھی بتا دی۔

"یہ بتا کر آپ نے اور آسانی پیدا کر دی۔ اس عمارت کے سامنے اور پیچھے دونوں طرف سے ہم گزر کر دیکھیں گے۔ مجھے پوری آشا (امید) ہے کرن جی کہ اس کے جسم کی بو وہاں ضرور موجود ہو گی۔" کویتا پُرامید لہجے میں بولی۔

"پھر ٹھیک ہے کویتا' میں تمہیں کل وہاں لے چلوں گی۔" میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ پھر مجھے

ایک اور بات یاد آ گئی تو میں نے اس سے سوال کیا۔ ”کویتا! تم مجھے تو چندر موہن اور گوپال کی نظروں سے چھپانے کے لئے میرے گرد حصار کھینچ دو گی، لیکن تمہارا کیا ہو گا؟ تم ان کی نظروں سے کس طرح محفوظ رہو گی؟“

”آپ کے گرد گھیرا ڈال کر خود میں بھی اپنے اوپر گھیرا ڈال لوں گی۔“ کویتا نے جواب دیا۔ ”پھر میں بھی ڈھونڈنے پر انہیں دکھائی نہیں دوں گی۔“

کویتا کے جواب سے مجھے اطمینان ہو گیا۔ مجھے اور اسے لان میں ٹہلتے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی میں اسی لئے بولی۔ ”آؤ اب اندر چلتے ہیں۔“

رنجیت کی موجودگی کو میں نے پہلے بھی محسوس کیا تھا۔ وہ پھاٹک کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ میں اور کویتا کئی بار ادھر ٹہلتے ہوئے گئے تھے۔ ہر مرتبہ اسے میں نے کویتا ہی کی طرف دیکھتے محسوس کیا تھا۔ گیٹ ہی کے قریب چھوٹی سی ایک کوٹھری بنی ہوئی تھی۔ رنجیت عموماً اسی کوٹھری میں ہوتا تھا اور اسی وقت نکلتا تھا جب کسی کے لئے پھاٹک کھولنا ہو۔ اس وقت نہ کوئی آیا تھا نہ گیا تھا، سو رنجیت کا باہر موجود رہنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کویتا یقیناً اتنی حسین و نوخیز تھی کہ کوئی بھی نوجوان اسے پانے کی تمنا کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا، کہیں رنجیت، کویتا کے تیر نظر کا تو شکار نہیں ہو گیا؟ زندگی کے اعلیٰ تر مقاصد اپنی جگہ مگر شاید آدمی اپنے فطری تقاضوں کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اسی سرفروش تنظیم میں سلیم بھی تھا جس نے دلاری سے جسمانی رشتہ استوار کر رکھا تھا پھر اگر رنجیت کے دل کی دھڑکنوں میں کویتا کو دیکھ کر اضافہ ہو گیا تو میرے نزدیک یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود رنجیت ایک مرتبہ بھی قریب نہیں آیا تھا۔ لان میں بہرحال اتنی روشنی ضرور تھی کہ ات. کویتا واضح طور پر دور سے بھی نظر آ رہی ہو گی۔ میں نے سوچا کہ صرف دور دور رہ کر دیکھنے پر مجھے فی الحال رنجیت کو نہیں ٹوکنا چاہیے۔ اگر اس نے کبھی حد سے تجاوز کرنے چاہا تو میں اسے سمجھا دوں گی۔ یہ معاملہ سلیم کے معاملے سے قطعی مختلف تھا۔ یہاں ابھی درمیان میں ہوس کا عمل دخل معلوم نہیں ہوتا۔ کسی سے محبت کرنا، اسے چاہنا اور بات ہے، اس کی عزت و آبرو سے کھیلنا قطعی دوسری بات ہے۔ مرد کی نظر کو پہچاننے میں عورت کو زیادہ دیر نہیں لگتی پھر یہ کہ کویتا بالکل اناڑی بھی نہیں تھی۔ نوجوانی ہی میں وہ ہر مرحلے سے گزر چکی تھی۔ اس کے باوجود اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کیف و سرور کی دنیا میں قدم رکھ چکی ہو گی۔ کویتا جیسی تجربہ کار لڑکی نے بھی رنجیت کی نظروں کو شاید محسوس کر لیا تھا، مگر وہ اس سلسلے میں مجھ سے کچھ نہیں بولی۔

ہم دونوں اپنے کمرے میں آ گئے تو خلاف توقع کویتا نے اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

”کویتا! دروازہ بند کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں بول اٹھی۔ ”ہم اس کوٹھی کی حدود میں بالکل محفوظ ہیں۔“

”کرن جی! میں نے کسی خطرے کی وجہ سے بند نہیں کیا۔“ وہ پلٹ کر معنی خیز لہجے میں بولی۔

”تو پھر......... پھر کیا وجہ ہے؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا کیونکہ میں اب بھی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔

”یہ کوئی اچھا تو نہیں لگے گا کہ کوئی مجھے اور آپ کو ایک ساتھ سوتے ہوئے دیکھے۔“ اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

”کیوں، دوسرا بستر کس لئے ہے؟“

”دکھاوے کے لئے۔“ وہ دھیرے سے ہنس دی۔ ”میں اس سے اس لئے چپ رہی کہ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو۔“ وہ اب میرے بستر پر بیٹھ چکی تھی۔

”کیا نہ معلوم ہو؟“ میری حیرت اب تک برقرار تھی۔

”یہی کہ میں آپ کے پاس سوؤں گی۔“ اس نے کہا اور پھر مجھے بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

”مگر کیوں؟“ اب میں کچھ کچھ اس کا مطلب سمجھنے لگی تھی۔

”اس لئے کہ مجھے اکیلے نیند نہیں آئے گی۔ بچپن سے اب تک میں کبھی اکیلی نہیں سوئی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میرے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

”لیکن اب تو تمہیں اکیلے ہی سونے کی عادت ڈالنا پڑے گی۔“

”تو کیا آپ مجھے اپنے پاس نہیں سلائیں گی؟ میں .... میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ کو مجھ سے پریم (محبت) ہے۔“ اس کی آواز بجھ سی گئی۔

”وہ تو ہے مجھے تم سے، مگر ساتھ سلانا ایک الگ بات ہے۔ جس طرح تمہیں اکیلے نیند نہیں آتی اسی طرح مجھے کسی کو اپنے ساتھ سلانے کی عادت نہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ سلا کر سو نہیں سکوں گی۔ سوچ لو، اگر تم چاہتی ہو کہ میں رات بھر جاگتی رہوں تو سو جاؤ میرے پاس۔“

میرے سمجھانے بجھانے کا اس پر اثر ہوا اور وہ اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی۔ میں نے بڑا بلب بجھا کر نیلا بلب جلا دیا۔

”کوشش کرو اکیلے نیند آ جائے، اگر نہ آئے تو پھر میرے پاس آ جانا۔“ میں نے کہا اور اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔

سونے سے پہلے میں نے کئی بار کویتا کی طرف دیکھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ شاید اس نے مجھ سے غلط نہیں کہا تھا کہ وہ تنہا سونے کی عادی نہیں تھی۔ پھر بھی میں جی کڑا کے سو ہی گئی اور اسے اپنے پاس نہیں بلایا۔

میں گہری نیند سو رہی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی اور بھی میرے بستر پر موجود تھا۔ وہ کویتا تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پہلے مجھے ایسی کسی صورت حال کا قطعی اندازہ نہیں تھا۔ مجھے اس طرح نیند آنا ممکن نہیں تھی میں سوچنے لگی کہ اس کا کیا حل ہو؟ بظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ کویتا بے خبر سو رہی ہے۔ میں بے حس و حرکت پڑی رہی کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے۔ اس مسئلے کا حل میں نے یہ سوچا تھا کہ اس کی نیند ذرا اور گہری ہو جانے دوں۔ اسے اپنے بستر پر سوتا ہوا چھوڑ کر میرا ارادہ فولڈنگ بیڈ پر جا کے سو جانے کا تھا .... جلد ہی یہ واضح ہو چکا تھا کہ وہ سو نہیں رہی، جاگ رہی ہے۔ میں نے اسی

لئے نرمی کے ساتھ کویتا کا ہاتھ اپنے جسم سے ہٹا دیا۔ اچانک اس نے آنکھیں کھول دی۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا کویتا' تم سوتے سوتے اچانک جاگ کیوں گئیں؟" میں جان کر انجان بن گئی۔

"آپ .... کیا آپ کو نہیں معلوم؟" اس کی آواز خواب ناک سی تھی۔ یہ کہتے ہی اس نے ایک بار پھر میرے گلے میں اپنا ایک بازو ڈال دیا۔

"اگر تمہیں میرے ہی پاس سونا ہے کویتا تو الگ ہٹ کر لیٹو تم اس طرح مجھے جکڑے رہیں تو مجھے نیند نہیں آئے گی۔" میری آواز میں قدرے سختی آ گئی اور خود کو اس سے چھڑا لیا۔

"کیا آپ کو یہ احساس بھی نہیں کہ .... کہ میں .... میں آپ کو چاہتی ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں اس لئے تو آپ کے ساتھ نہیں آئی تھی کہ آپ مجھے ٹھکرا دیں گی۔"

"تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو کویتا۔ تمہیں میں نے کب ٹھکرایا ہے؟؟"

"اگر نہیں ٹھکرایا تو .... تو پھر میری بانہیں کیوں جھٹک دیں؟ کیا آپ میری اور .... اور میں آپ کی نہیں ہوں؟" اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"ارے' یہ تم رونے کیوں لگیں؟" میں اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھنے لگی اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

دیر تک کویتا میرے سینے سے لگی سسکیاں بھرتی رہی اور میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ میں اس بھولی لڑکی کی مجبوری و بے بسی کو سمجھ چکی تھی۔ اسے قرب کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آنے لگا۔ اسی کے ساتھ چندر موہن پر غصہ بھی' کہ جس نے اس کی زندگی کو گناہ کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ میرے پاس اس کے دکھ کا مداوا نہیں تھا۔ میں اسی سبب اسے سینے سے لگائے جاگتی رہی جب تک وہ سسکیاں بھرتے بھرتے واقعی سو نہیں گئی۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ اس کی نیند کچھ گہری ہو گئی ہے تو میں نے ایک تکئے پر اس کا ہاتھ اور ایک پیر رکھ دیا۔ اس کے بعد میں بہت آہستگی سے اٹھی اور کویتا کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ مجھے بالکل اس بھولی بچی کی طرح لگی جو اپنی کوئی خواہش پوری نہ کئے جانے پر روتے روتے سو گئی ہو۔ میں اس فولڈنگ بیڈ پر آ گئی جس پر پہلے کویتا سو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔

وہ کسی کھٹکے کی آواز ہی تھی جس سے میں جاگ اٹھی تھی۔ آواز دروازے کی طرف سے آئی تھی' لیکن مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ پھر مجھے خود بہ خود دروازہ کھلتا دکھائی دیا تو میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا اور پھر آہستگی سے بند ہو گیا تھا۔ بے اختیار میری نگاہ مسہری کی طرف اٹھی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کویتا غائب تھی۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ اسے کہیں چندر موہن یا گوپال نے تو اغوا نہیں کر لیا؟ پھر خود ہی میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ میں نے سوچا' کوٹھی کے گرد تو حصار کھنچا ہوا ہے۔ وہ دونوں بھلا کس طرح اس حصار میں داخل ہو سکتے ہیں۔ تو کیا کویتا خود کہیں گئی ہے؟ مگر کہاں اور کیوں؟ اسی کے ساتھ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ اگر چندر

موہن یا گوپال نے کویتا کو اغوا کیا ہوتا تو میں بھی اس وقت کمرے میں موجود نہ ہوتی۔ وہ مجھے بھی اغوا کر کے لے گئے ہوتے۔

پنجوں کے بل تیزی سے چلتی ہوئی میں دروازے تک پہنچی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو راہداری میں اندھیرا تھا۔ اسی لمحے اچانک میرے اندر خوابیدہ ایک پُراسرار قوت بیدار ہو گئی۔ اندھیرے اب میرے لئے روشن ہو چکے تھے۔ اب میں اندھیرے میں دن کے اجالے کی طرح سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ دائیں جانب دور تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا' لیکن بائیں جانب راہداری کے تقریباً اختتام پر مجھے ایک ہیولا نظر آ گیا۔ پھر میں اسے اس کے اندازِ خرام سے پہچان گئی۔ وہ یقیناً کویتا ہی تھی۔ وہ راہداری میں پنجوں کے بل بے آواز چلتی ہوئی یہ جانے بغیر اس کا تعاقب کرنے لگی کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔

کویتا دائیں جانب مڑ گئی تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا رخ کدھر ہے۔ اب تک اس نے ایک مرتبہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

عمارت کے صدر دروازے کے قریب ہی چھوٹا سا ایک کمرا تھا۔ اس کمرے میں رشیدہ سوتی تھی۔ کمرے کا دروازہ وہ کھلا رکھتی تھی تاکہ رات کے وقت اگر تنظیم کا کوئی رکن آئے اور دروازے پر دستک دے تو دروازہ کھولا جا سکے۔ اپنے کمرے کے کھلے دروازے سے دستک کی آواز اس تک پہنچ سکتی تھی۔

میں خاصے فاصلے سے کویتا کا تعاقب کر رہی تھی تاکہ اسے شبہ نہ ہو' کوئی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ پھر خلاف توقع دروازہ کھلنے سے پہلے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ دروازے کی کنڈی جیسے خود بہ خود کھل گئی پھر جس طرح میرے کمرے کا ایک پٹ خود ہی کھلا اور پھر بند ہو گیا تھا' یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ عمارت سے باہر نکلنے کے لئے یقیناً کویتا اپنی پُراسرار قوتوں سے کام لے رہی تھی تاکہ اسے کوئی جاتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ دو بار اس کا جسم اسی لئے میری نظروں سے وقتی طور پر اوجھل ہوا تھا' ایک مرتبہ کمرے سے نکلتے وقت اور دوسری مرتبہ صدر دروازہ کھول کر باہر جاتے ہوئے۔

کیا کویتا مجھ سے دل برداشتہ ہو کر جا رہی ہے؟ میں سوچنے لگی پھر خیال آیا کہ اگر ایسا ہوتا وہ اپنا سامان چھوڑ کر نہ جاتی اور خالی ہاتھ نہ ہوتی۔ پھر یہ کہ اس کے جسم پر بھی صرف شب خوابی کا لباس نہ ہوتا۔ اس کے جسم پر اس وقت ویسا ہی ریشمی گلابی لبادہ تھا جو میں نے اسے چندر موہن کے آشرم میں پہنے دیکھا تھا۔ بھلا اس لباس میں وہ مجھے چھوڑ کر کس طرح کہیں جا سکتی تھی۔ یہی سوچتی ہوئی میں صدر دروازے کے قریب پہنچ گئی۔

آہستگی سے میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو وہاں اجالا تھا' مگر مجھے دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ کویتا ایک بار پھر میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں دھیرے سے دروازے کا ایک پٹ کھول کر باہر آ گئی اور پھر اسے بھیڑ دیا۔ میں نے تیزی کے ساتھ پھاٹک کی طرف نگاہ اٹھائی جو وہاں سے صاف نظر آ رہا تھا جہاں میں صدر دروازے کے قریب برآمدے میں کھڑی تھی۔ کویتا اگر اس کوٹھی سے باہر جاتی تو یقیناً اسے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھولنا پڑتا۔ پھاٹک کے قریب ہی جو کوٹھری تھی' اچانک مجھے وہاں ایک ہیولا حرکت کرتا دکھائی دیا۔ پھر اسی ہیولے کو میں نے تاریک کوٹھری کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر جاتے

دیکھا۔

مجھے علم تھا کہ اس کوٹھری میں رنجیت سوتا تھا۔ پھر مجھے وہ منظر یاد آ گیا جب میں کھانا کھانے کے بعد کویتا کے ساتھ لان میں ٹہل رہی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کویتا تو جب سے میرے ساتھ اس کوٹھی میں آئی تھی' ذرا دیر کو بھی مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ ایسی کسی ملاقات کے لئے پہلے سے معاملات طے کئے جاتے ہیں' ایک دم تو تمام مراحل سے نہیں گزرا جاتا۔ پھر کویتا' رنجیت کی کوٹھری میں کیوں گئی تھی؟ کیا آئندہ کے لئے راہ ہموار کرنے؟ میں یہی سوچتی ہوئی بے آواز قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ رنجیت سے تو میں نے کویتا کا تعارف تک نہیں کرایا تھا۔

لان کی سمت کوٹھری کی ایک کھڑکی بھی تھی جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں' کھڑکی کھلی ہوئی ہی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچ گئی۔ کوٹھری کے اندر اب بھی اندھیرا تھا۔ اندر سے مجھے کویتا کی آشنا آواز سنائی دی۔ "رنجیت اٹھو .... اٹھو رنجیت! میں آ گئی ہوں۔"

"کون؟ کون ہے؟" رنجیت کی سخت آواز ابھری۔

"مجھے نہیں پہچانتے اپنی شکنتلا کو۔ تمہارے ہی لئے تو میں نے دوسرا جنم لیا ہے۔" کویتا کی آواز پھر آئی۔

"تم .... تم اسے .... شکنتلا کو کیسے جانتی ہو؟" رنجیت بولا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس کی مرتیو (موت) کو تو پانچ ورش (برس) بیت چکے ہیں۔"

"میں نہیں جانوں گی تو پھر کون جانے گا' میں ہی تو تمہاری شکنتلا ہوں۔ پچھلے جنم میں ہمارا ملاپ نہیں ہوا تھا سو میں دوسرے جنم میں تمہاری اور (طرف) لوٹ آئی ہوں تاکہ تمہارے ملن کے بعد میری بھٹکی ہوئی آتما (روح) کو شانتی مل جائے۔" کویتا کی آواز خواب ناک ہو گئی۔ "کیا تم اپنی پریمیکا (محبوبہ) کو دوار (دروازے) سے ملن کے بنا ہی لوٹا دو گے؟"

میرے لئے یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ رنجیت کے ساتھ کویتا کیا کھیل کھیل رہی تھی۔ یقیناً اس نے اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے رنجیت کی محبوبہ کے بارے میں معلوم کر لیا تھا جو مر چکی تھی اور اب وہ رنجیت کو یہ دھوکا دے رہی تھی کہ وہی شکنتلا ہے۔ اس نے بھی میری ہی طرح رنجیت کی دلچسپی کو محسوس کر لیا تھا۔

"ہاں میں تجھے پہچان گیا شکنتلا .... تُو شکنتلا ہی ہے۔" رنجیت کی آواز بھی خواب ناک ہو گئی کویتا شاید اسے اپنے سحر میں لے چکی تھی۔

اب میرا وہاں مزید رکنا فضول ہی تھا۔ کویتا نے رنجیت کو شکار کر لیا تھا۔ اب وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ میں الٹے قدموں لوٹ آئی۔ صدر دروازہ میں نے بھیڑ دیا تھا' کنڈی البتہ نہیں لگائی تھی۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد دروازہ بھیڑ کر میں کویتا کے فولڈنگ بیڈ پر لیٹنے کی بجائے اپنی مسہری پر دراز ہو گئی پھر میں نے بہت کوشش کی کہ مجھے نیند آ جائے مگر جب تک کویتا واپس نہ آ گئی نیند نہیں آئی۔ جیسے ہی وہ کمرے میں

داخل ہوئی' میں ایسی بن گئی تھی کہ سو رہی ہوں۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور پھر مجھے مسہری پر دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار دکھائی دیئے۔ میں پلکوں کی جھری سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی حیرت کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ مجھے اپنے فولڈنگ بیڈ پر سوتا ہوا چھوڑ کر گئی تھی اور اب میں اسے مسہری پر ملی تھی۔ پھر وہ اپنے بستر کی طرف بڑھ گئی۔ ذرا ہی دیر بعد مجھے محسوس ہوا جیسے وہ گہری نیند سو چکی ہے۔

کویتا نے جو کچھ بھی کیا تھا' اس سے میں اپنے ضمیر پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہی تھی۔ میں اس کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھ رہی تھی۔ پھر میں نے تمام خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی اور مجھے اس میں ناکامی نہیں ہوئی۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے کویتا کے بیڈ کی طرف دیکھا۔ وہاں وہ نہیں تھی۔ میں اٹھی اور دلاری کو آواز دے کر بلا لیا۔

"کویتا کہاں ہے؟" میں نے دلاری سے پوچھا۔

"وہ اشنان (نہانے) کو گئی ہے۔" دلاری نے جواب دیا پھر مجھ سے چائے کے لئے معلوم کیا۔

"ہاں لے آؤ۔" میں نے کہہ دیا۔ "اور سنو! پنڈت جی کو میرے پاس بھیج دو' اگر وہ جاگ گئے ہوں۔"

"پنڈت جی تو بھور سمے ہی جاگ جاتے ہیں۔ وہ تو اب تک جل پان (ناشتہ) بھی کر چکے ہوں گے۔" دلاری بولی۔ "میں آپ کے لئے چائے کا کہہ کر پنڈت جی کو آپ کا سندیسہ (پیغام) دیتی ہوں۔ کوئی اور سیوا (خدمت) کرن جی۔"

"نہیں' بس تم جاؤ۔" میں نے کہا اور دلاری جانے کے لئے مڑ گئی۔

جب تک عادل آتا' کویتا اس سے پہلے ہی نہا کر آ گئی۔ وہ بہت کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

"چھما (معاف) کر دینا کرن جی کہ رات آپ کو میں نے بہت پریشان کیا اور چین سے نہیں سونے دیا۔ اب ایسا نہیں ہو گا۔" کویتا نے اپنے گیلے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کویتا کہ اب تم پریشان نہیں رہو گی۔" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

وہ چونک اٹھی اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر خاموش رہ گئی۔ آنے والا عادل تھا۔ اسی کے پیچھے دلاری بھی کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے چائے کی پیالی دے کر بولی۔ "جب ناشتہ کرنا ہو کرن جی تو مجھے پکار لیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

اس دوران میں عادل کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ دلاری چلی گئی تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "جی کرن جی! کیسے یاد کیا؟"

"تمہیں کہیں جانا تو نہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں جانا تو ہے' مگر تم بتاؤ کیا کام ہے؟" عادل بولا۔

"ظاہر ہے کہ تم کسی ضروری کام ہی سے جا رہے ہوگے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے تم اس کام سے فارغ ہو آؤ۔"

"واپسی میں مجھے دوپہر ہو جائے گی' کام کیا ہے' بتاؤ تو سہی۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا' اگر واپسی پر تمہیں دوپہر ہو جائے۔ ہم دوپہر کے بعد شام کو بھی وہاں چل سکتے ہیں جہاں جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے' یہ نہیں بتاؤ گی۔"

"اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا ایک پھیرا لگانا ہے۔" میں نے بتا دیا۔

عادل یہ سن کر چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ شاید اسے گذشتہ تلخ تجربہ یاد آ گیا تھا جب وہ پہلی مرتبہ مجھے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس لے گیا تھا۔ اسی روز ژیان سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے' پھر آج شام کا پروگرام رکھ لو۔"

"ہاں' تم سے ایک بات اور پوچھنا تھی۔ اس کوٹھی کی چھت پر جانے کے لئے کوئی زینہ ہے؟" میں نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔

"چھت پر جانے کے لئے زینہ؟ میں اس سے تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"زینے کا مطلب نہیں سمجھے کہ چھت کا؟" میں ہنس دی۔

"چھت اور زینے کا مطلب تو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں' ہاں یہ نہیں سمجھا کہ تمہیں کوٹھی کی چھت پر جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔"

"ہے نا ضرورت جبھی تو پوچھ رہی ہوں' شری پنڈت بال مکند جی۔" عادل کو میں نے اس کے فرضی نام سے مخاطب کیا۔

"جہاں تک میرے علم میں ہے' کوٹھی کی چھت پر جانے کے لئے زینہ تھا تو سہی مگر سالار گربچن سنگھ نے اس کا دروازہ بند کرا دیا تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ برابر والی کوٹھی کی چھت اس کوٹھی سے ملتی تھی۔ حفاظتی نقطہ نظر سے سالار گربچن سنگھ نے اسے مناسب نہیں سمجھا تھا۔" عادل نے تفصیل کے ساتھ بتایا۔

"مجھے یہ معلوم کر کے بتاؤ کہ زینے کا دروازہ کھل سکتا ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ دروازے کی جگہ دیوار چنوا دی گئی ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ دیوار نہیں چنوائی گئی۔ بہرحال معلوم کر لوں گا میں۔ اب اگر چاہو تو زینے اور چھت کا راز کھول دو' نہ چاہو تو کوئی گلہ نہیں۔" عادل نے کہا۔

"دراصل تم اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتے اس لئے کچھ بتانا فضول ہی معلوم ہو رہا ہے۔"

"میرے یقین کرنے نہ کرنے پر خاک ڈالو' تم بتاؤ بات کیا ہے؟"

"یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ جس طرح مسلمان کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر وظیفہ پڑھتے ہیں اسی طرح ہندو جاپ کرتے ہیں۔ معلوم ہے نا؟"

"ہاں جانتا ہوں' یہ الگ بات کہ مانتا نہیں۔" وہ مسکرایا۔

"تو پھر یہ بھی جانتے ہوگے کہ بعض وظائف کے لئے کچھ خاص اوقات مقرر ہوتے ہیں۔ سو کویتا کو تین روز تک کسی کھلی اور اونچی جگہ جاپ کرنا ہے' آدھی رات کے بعد سے صبح سورج طلوع ہونے تک۔ اب سمجھ گئے چھت اور زینے کی ضرورت۔"

یہ معاملہ کیونکہ میں نے کویتا سے متعلق کر دیا تھا اس لئے عادل نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں اس بہانے جاپ کے مقصد کو گول کر گئی تھی۔

"اچھا اب میں چلا' دیر ہو رہی ہے۔ شام کو کس وقت یہاں سے چلنا ہے؟"

"چار بجے تک ٹھیک رہے گا کیونکہ دوپہر کا کھانا کھا کے میں کچھ دیر آرام کروں گی۔"

"ٹھیک ہے' میں چار بجے شام کو آ جاؤں گا۔ تم تیار ملنا۔" عادل یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور زینے کے بارے میں کب بتاؤ گے؟" میں نے معلوم کیا۔

"شام ہی کو بتا دوں گا۔" عادل نے جواب دیا۔

عادل چلا گیا تو میں غسل خانے میں نہانے کے لئے چلی گئی جو کمرے کے سامنے موجود راہداری میں ہی تھا۔ نہا کر لوٹتے ہوئے میں نے دلاری سے ناشتہ لانے کو کہہ دیا۔ پھر جب دلاری کچھ دیر بعد ناشتہ دے کر چلی گئی تو کویتا نے مجھے مخاطب کیا۔ "تو آپ نے جان ہی لیا کرن جی کہ رات کو میں کہاں گئی تھی؟"

"سنو کویتا! میں تمہاری مجبوری سمجھتی ہوں' اس کے باوجود تم نے جو کچھ کیا مجھے اچھا نہیں لگا۔" میں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"لیکن آپ ہی نے تو مجھے اس پر مجبور کیا تھا' اگر آپ........."

"اس سلسلے میں اگر تم میرا ذکر نہ کرو تو زیادہ بہتر ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی' پھر بولی۔ "ذرا سوچو کہ رنجیت میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا۔"

"لیکن اس معاملے سے آپ کا کیا سمبندھ (تعلق)' رنجیت سے تو میں نے یہ کہا تھا کہ........."

"تم اس کی محبوبہ شکنتلا ہو جو پانچ برس پہلے مر چکی ہے۔" میں نے اس کی بات پوری کر دی۔ "اور یہ بھی کہ تم نے اس سے ملن کے لئے دوسرا جنم لیا ہے۔ بولو' کیا یہ دھوکا دینا نہیں ہے؟ کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ جن لوگوں کو میں اپنا دوست سمجھتی ہوں تم انہیں دھوکا دو؟ تم یہ کیوں بھول گئیں کہ تمہیں یہاں میں لے کر آئی ہوں' میرے دوستوں نے میری وجہ سے تم پر اعتماد کیا ہے۔ تمہیں اس اعتماد کو ٹھیس پہنچاتے ہوئے سوچنا چاہئے تھا۔" میرے الفاظ تو یقیناً سخت تھے مگر لہجہ نرم ہی تھا۔

ناشتہ کرتے کرتے کویتا نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔

"ناشتہ کرو۔ تمہیں جو عادت پڑ گئی ہے رفتہ رفتہ اسے چھوڑ دو کہ اسی میں تمہارا بھلا ہے۔" میری آواز میں مزید نرمی آ گئی۔

میرے کہنے پر وہ سر جھکا کے ناشتہ کرنے لگی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس پر میری بات کا اثر ہوا تھا۔

"اب تمہیں تین رات تک جاپ میں بیٹھنا ہو گا پھر تم کیا کرو گی؟"

"میں جاپ شروع کرنے سے پہلے پہلے رنجیت.........." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ مجھے یہ بات نہیں بتانا چاہیے تھی۔

"تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہیں کسی نے رنجیت کی کوٹھری میں رات کے وقت جاتے دیکھ لیا تو میری کیا عزت رہ جائے گی۔"

"تو پھر.......... پھر آپ مجھے نہ جانے دیں۔" اس نے میری طرف متوقع نظریں اٹھائیں۔ "میں تو اس پر بھی راضی ہوں۔"

"نہیں' یہ بھی ناممکن ہے۔" میرے لہجے میں سختی آ گئی کیونکہ اس طرح وہ مجھے ترغیب گناہ دے رہی تھی۔

"پھر آپ نے مجھے کیوں بچایا؟ بَلی چڑھ جانے دیا ہوتا۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"محبت صرف جسمانی تعلق کا نام نہیں کویتا' میں نے تمہیں اس لئے نہیں بچایا تھا۔ تم نے اگر یہ سمجھا تھا تو غلطی پر ہو۔ میری محبت میں کوئی غرض شامل نہیں۔" پھر میں اسے دیر تک سمجھاتی رہی' ان انسانی رشتوں کے بارے میں بتاتی رہی جن سے وہ قطعی ناآشنا تھی۔ اس دوران میں مجھے محسوس ہوا کہ کویتا کے اندر قبولیت کی صلاحیت موجود ہے۔ اصلاح کی گنجائش ہے' وہ راہ راست پر آ سکتی ہے' لیکن فوری طور پر ایسا ممکن نہیں تھا۔

"میں آپ کو وچن دیتی ہوں کہ خود کو رفتہ رفتہ بدلنے کی کوشش کروں گی۔" کویتا نے مجھ سے وعدہ کیا۔

میں نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔

اسی شام عادل کے آنے سے پہلے میں نے اپنے چہرے پر میک اپ کر لیا تھا۔ میں اس میک اپ میں ایک ادھیڑ عمر دیسی عیسائی عورت معلوم ہو رہی تھی۔ گلے میں زنجیر سے بندھی ہوئی چھوٹی سی سنہری صلیب پڑی تھی اور جسم پر اسکرٹ تھا۔

"ارے کرن جی! یہ آپ نے اچھی بھلی صورت کیوں بگاڑ لی؟" کویتا نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا نا کہ چندر موہن کے علاوہ اس شہر میں میرے اور بھی دشمن ہیں۔ مجھے ان سے بھی تو بچنا ہے۔ اور ہاں اس وقت میرا نام کرن نہیں' کیتھی ہے' مسز کیتھی گراہم۔ کیونکہ میرے ساتھ تمہیں بھی چلنا ہے اس لئے تمہارا حلیہ بھی مجھے تبدیل کرنا پڑے گا۔ تمہیں میرے ساتھ رہ کر اجنبی نہیں لگنا چاہئے۔"

پھر میں نے کویتا کے چہرے پر میک اپ کر دیا۔ میرے اور اس کے جسم میں زیادہ فرق نہیں تھا' میں نے اسی لئے اسے بھی اپنا ایک اسکرٹ پہننے کو دے دیا۔ اپنا چہرہ بدل جانے پر وہ بچوں کی طرح خوش ہونے لگی اور بولی۔ "اب میرا بھی کوئی اچھا سا نام رکھ دیں۔"

"تم میری چھوٹی سسٹر' یعنی بہن ماریا ہو' ٹھیک ہے۔ ہاں اس خوشی میں کہیں تم اپنے اور میرے گرد حصار کھینچنا نہ بھول جانا۔"

"ابھی لیں۔" وہ فوراً ہی زیر لب کچھ پڑھنے لگی اور پھر میری اطراف پھونکیں مارنے لگی۔ ایسا ہی اس نے اپنے ساتھ بھی کیا' پھر بتایا۔ "میں نے گھیرے ڈال دیئے ہیں۔"

اسی وقت معاً مجھے ایک خیال آیا۔ کویتا کو میں یہ بات بتانا ہی بھول گئی تھی کہ میرا دشمن ژیان بھی شیطانی قوتوں کا مالک ہے۔ اس وقت یہ بات مجھے حصار کھینچے جانے کی وجہ سے یاد آئی تھی۔ اسی سے میرے ذہن میں ایک تشویش ناک سوال بھی ابھرا تھا۔ میں نے کویتا کو ژیان کی شیطانی قوتوں سے آگاہ کرکے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "کویتا! جس طرح تم نے مجھے اور خود کو چندر موہن اور گوپال کی نظروں سے چھپا لیا ہے تو میرا دشمن بھی تو ایسا کر سکتا ہے۔ وہ بھی تو اپنے گرد یا اس جگہ حصار کھینچ کر بیٹھ سکتا ہے جہاں قیام پذیر ہو' ایسی صورت میں تم اس کا سراغ کیسے لگاؤ گی؟"

"یہ گھیرا ہر کوئی نہیں ڈال سکتا۔ صرف بڑے مہاراج' ان کی داسیاں اور چیلے ہی اس گھیرے کے جنتر کو جانتے ہیں کوئی اور نہیں۔" کویتا نے جواب دیا۔

"پھر چندر موہن کی نظروں سے اوجھل رہنے کے لئے گوپال نے اپنے گرد یہ حصار کیوں نہیں کھینچا؟ اور اگر کھینچا تھا تو چندر موہن نے گوپال کا سراغ کیسے لگا لیا؟"

اس کا صرف ایک ہی کارن (سبب) ہو سکتا ہے۔ گوپال کو بڑے مہاراج سے یہ پرتیاشا (توقع) نہیں ہوگی کہ وہ گوپال پروار کریں گے۔ گوپال نے اسی لئے گھیرا نہیں ڈالا ہو گا ورنہ تو بڑے مہاراج اسے نہ ڈھونڈ پاتے۔"

کویتا کے جواب سے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکی' مگر اس کا اظہار مجھے کچھ مناسب معلوم نہیں ہوا۔ گوپال میری اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ ایسی صورت میں وہ مجھے بہرحال چندر موہن کی نظروں سے چھپانے کی کوشش ضرور کرتا۔ کچھ گُر ایسے بھی ہوتے ہیں جو گرو اپنے چیلوں کو بھی نہیں سکھاتے۔ اس امکان کو بہرطور نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیا صحیح تھا اور کیا غلط' اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کر سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے ان خدشات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

کچھ ہی دیر بعد عادل بھی آ گیا۔ اس کے چہرے پر بھی میک اپ تھا۔ یہ ایک حسین اتفاق ہی تھا کہ وہ بھی میری طرح ادھیڑ عمر ہی لگ رہا تھا۔

"کیا کویتا بھی ساتھ چلیں گی؟" عادل نے حیرت سے پوچھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں تنہا اس کے ساتھ جاؤں گی۔

"جی ہاں پنڈت جی۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے اس وقت ان کا نام کویتا نہیں ماریا ہے اور میں کیتھی ہوں۔"

"اور یہ سیوک بھی اس سمے پنڈت بال مکند نہیں ست نارائن اگروال ہے۔" عادل نے مسکرا کر اپنا تعارف کروایا۔

ہم عمارت سے باہر نکل آئے اور باہر موجود کار میں آ کے بیٹھ گئے۔ کویتا کی وجہ سے میں پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھی۔

اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا ایک ہی پھیرا لگانا' کافی ہوا تھا۔ کویتا میرے دشمن ژیان کے جسم کی بو کا سراغ لگانے میں کامیاب رہی تھی۔ واپسی پر عادل سے میں نے کوٹھی کی چھت تک جانے والے زینے کے متعلق پوچھا تو وہ بولا۔ "زینے کے دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے جس کی چابی میں نے لے لی ہے' تمہیں دے دوں گا' ہاں چھت پر روشنی کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ کیا اندھیرے میں کویتا جی کو آدھی رات سے صبح ہونے تک وہاں بیٹھتے ہوئے خوف محسوس نہیں ہو گا؟"

"تم یہ بات اس لئے کہہ رہے ہو کہ ابھی کویتا سے واقف نہیں ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کویتا کیا ڈرے گی' یہ تو خود دوسروں کو ڈرا دیتی ہے۔"

"کویتا جی مجھے ڈرا کر دکھائیں تو جانوں۔"

"بحث نہ کرو ورنہ ابھی ڈر جاؤ گے۔" مجھے شرارت سوجھی۔

"میں نہیں ڈروں گا۔"

"اچھا کار سڑک کے کنارے کھڑی کر لو۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"تم خوفزدہ ہو کر کار کو اِدھر اُدھر ٹکراؤ گے نہیں۔"

پھر عادل نے کار کو سڑک کے کنارے پر روک لیا۔ مجھے گذشتہ رات یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کویتا نظروں سے اوجھل ہو جانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ میں نے عادل سے پیچھے مڑ کر دیکھنے کو کہا پھر کویتا کو غائب ہو جانے کا اشارہ کیا۔ عادل کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے کویتا کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔ پھر میرے کہنے پر کویتا دوبارہ ظاہر ہو گئی۔ عادل ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے کویتا کو دیکھے جا رہا تھا۔

"ڈرے کہ نہیں؟" میں نے عادل کو ہنستے ہوئے مخاطب کیا۔

"ڈرا تو خیر نہیں' مگر حیرت ضرور ہوئی۔" اس نے اعتراف کیا اور پھر کار اسٹارٹ کر دی۔

کوٹھی واپس آ کر میں نے عادل سے زینے کے دروازے کی چابی لی۔ زینہ خاک و دھول سے اٹا ہوا تھا' جالے بھی لگے ہوئے تھے۔ عادل نے صفائی کرا دی۔ چھت پر بھی ایک عرصے سے جھاڑو نہیں دی گئی تھی۔ وہ بھی صاف کی گئی۔ کوٹھی کے صحن میں اوپر جانے کے لئے زینہ تھا۔ میں نے اپنے کمرے سے وہاں تک کا راستہ ذہن نشین کر لیا۔

اس رات خود ہی کویتا' رنجیت کے پاس نہیں گئی۔ میں بھی نصف شب تک اس کے ساتھ جاگتی رہی اور وقت مقررہ پر اسے زینے کے دروازے تک چھوڑنے گئی۔

ابھی مجھے کمرے میں واپس آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ پوری کوٹھی کویتا کی بھیانک چیخوں سے گونج اٹھی۔ میں کمرے سے نکل کر دوڑتی ہوئی کوٹھی کے صحن تک پہنچی جہاں مجھ سے پہلے

بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں عادل بھی تھا۔ اچانک کویتا کی طویل چیخ سنائی دی اور پھر سناٹا چھا گیا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ کویتا کا کٹا ہوا سر میرے قدموں میں آ کے گرا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کے منہ سے یہ دہشت ناک منظر دیکھ کر چیخیں نکل گئیں۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا............!!!

☆======☆======☆

معلوم نہیں میں وہاں کب تک اسی طرح سناٹے کے عالم میں کھڑی رہی۔ کویتا کا اس طرح قتل ہو جانا میرے لئے کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس پھول کو جس بے رحمی سے مسل دیا گیا تھا' میں اپنے ضمیر پر اس کا بوجھ محسوس کر رہی تھی۔ میری ہی محبت میں تو چندر موہن نے اسے یہ بھیانک سزا دی تھی۔ ایک مرتبہ پہلے بھی میں نے اسے چندر موہن کے غیظ و غضب سے بچا لیا تھا مگر اس مرتبہ حملہ اچانک ہوا تھا۔ میں بے بس ہو کے رہ گئی تھی۔ مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ اس شیطان کے لمبے ہاتھ یہاں تک بھی پہنچ سکتے ہیں' شاید اس غفلت یا کسی قدر اطمینان کا سبب خود کویتا کی یقین دہانی بھی تھی۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ کوٹھی کے گرد حصار کھینچے جانے کے بعد وہ اور میں' چندر موہن کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک ایسی وحشت و بربریت کا ثبوت چندر موہن ہی دے سکتا تھا۔ وہ خود تو میرے سامنے درگا دیوی پر کویتا کی بھینٹ دینے والا تھا' کویتا کا سر اس طرح کاٹنے والا تھا کہ خون کے چھینٹے پتھر کے بت پر پڑیں۔ چندر موہن نے اس کی جاں بخشی اس بنیاد پر کی تھی کہ میں اس کے حکم سے روگردانی نہیں کروں گی۔ اس وقت چندر موہن اپنے مقصد کے حصول کی خاطر میری باتوں میں آ گیا تھا' لیکن اب تو میں اس کے آشرم میں نہیں تھی' نہ اس کے سحر میں کہ وہ کویتا کے ساتھ میری وجہ سے کوئی رعایت کرتا۔ کویتا نے تو گویا میرا ساتھ دے کر اس سے بغاوت کی تھی اور یہ کہ میرے ایما پر آشرم سے بھی فرار ہو گئی تھی۔ پھر بھلا اسے بغاوت کی سزا کیوں نہ ملتی۔

کویتا کے قتل سے قطع نظر فوری طور پر یہ خیال بھی میرے ذہن میں آیا کہ اب خود میں بھی وہاں محفوظ نہیں رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں بڑی تیزی کے ساتھ بہت سی باتیں میرے ذہن میں آئیں اور پھر میں لمحہ موجود میں لوٹ آئی۔

ایک ہی نوعیت کا واقعہ مختلف صورت حال میں میرے ذہن پر الگ الگ اثرات مرتب کرتا ہے۔ میں نے خود متعدد جنگیں لڑی تھیں' اپنے ہاتھوں سے دشمنوں کے سروں کی فصل کاٹی تھی' لاتعداد انسانوں کا خون بہتے دیکھا تھا' لیکن بات صرف کسی سے جذباتی وابستگی اور احساس کی ہے۔ ظالم کا خون بہتے دیکھ کر کسی کو کوئی رنج نہیں ہوتا مگر کسی مظلوم کے خون پر دل رونے لگتا ہے۔ کویتا بھی میری نظر میں مظلوم تھی اسی لئے اس کا کٹا ہوا سر اپنے قدموں میں گرتے دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس بھیانک منظر نے قدرتی طور پر دہشت کی فضا قائم کر دی تھی۔ اچانک جب کوئی ایسا واقعہ رونما ہوتا ہے تو کچھ ایسی ہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ میرے ارد گرد جو لوگ موجود تھے' وہ بھی کسی کے قتل پر خوفزدہ ہو

جانے والوں میں سے نہیں تھے' لیکن یہ قتل بڑے پُراسرار انداز میں ہوا تھا۔ جس بات کا علم نہ ہو' اس کا سبب نامعلوم ہو' وہ وقتی طور پر ہی سہی آدمی کو خوفزدہ کر دیتی ہے۔

مجھے خود پر قابو پانے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اسی دوران میں جانے کب عادل میرے قریب آ گیا تھا۔ اس کی نظریں بھی کویتا کے کٹے ہوئے سر پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ وہ سر میرے قدموں میں پڑا تھا۔ سو وہاں جتنے افراد بھی موجود تھے' میرے ہی گرد ہجوم کئے ہوئے تھے۔ انہی میں مجھے سمیع اللہ بھی نظر آ گیا۔

"آپ لوگ ذرا پیچھے ہٹ جائیں۔" میں نے تنظیم کے ارکان کو مخاطب کیا پھر عادل سے مخاطب ہوئی۔ "تمہیں میرے ساتھ اوپر چھت پہ چلنا ہے۔"

میرے کہنے پر لوگ پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق کویتا کی سربریدہ لاش کو چھت پر ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ وہیں تو جاپ کرنے بیٹھی تھی۔ اس کے علاوہ کٹا ہوا سر بھی اوپر ہی سے پھینکا گیا تھا۔ اگر کویتا کے ساتھ میرے لئے بھی کوئی خطرہ ہوتا تو اب تک سامنے آ جاتا۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ کویتا کو قتل کرنے والا خواہ چندر موہن تھا یا اس کا کوئی چیلا' وہاں سے جا چکا تھا۔

عادل نے دو طاقتور ٹارچیں منگوا لیں اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کرن! چلو۔" پھر اس نے سمیع اللہ کو اشارہ کرکے قریب بلا لیا۔ "تم یہیں رہو' جب تک ہم اوپر سے نہ آ جائیں۔" اس کے بعد وہ دھیمی آواز میں جلدی جلدی سمیع اللہ کو مزید ہدایات دینے لگا۔ ان ہدایات سے اس کے انداز فکر کا اظہار ہو: تھا۔

پُراسرار حالات میں کویتا کا قتل ہونے کے باوجود عادل کے ذہن نے اسے مافوق الفطرت واقعہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ سمیع اللہ کو دی جانے والی ہدایات اسی کی غمازی کر رہی تھیں پھر جب وہ میرے ساتھ زینے کی طرف بڑھا تو میں نے اسے "سائلنٹ ڈیتھ" بھی جیب سے نکالتے دیکھا۔ عادل کے ذہن کو میں سمجھ تھی۔ میں نے دوسرے افراد کی موجودگی میں اسی سبب اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ کسی قاتل کی تلاش اس کے لئے راہِ فرار مسدود کر دینا میرے نزدیک فضول کوشش ہی تھی۔

زینے کے قریب پہنچ کر اس نے مجھ سے آگے بڑھ کے ایک سوئچ آن کیا تھا۔ وہ سوئچ درواز- کی ایک طرف دیوار پر تھا۔ زینے میں روشنی ہو گئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھتی' عادل - مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ میں خاموش رہی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بہت احتیاط کے ساتھ دروازے سے اس طرح لگ کر کھڑا ہو گیا جیسے ابھی کوئی اوپر سے اترنے والا ہو۔ میری خاموشی کا سبب صحن میں لوگوں کی موجودگی تھی۔ وہ ہماری ہی طرف نگراں تھے۔ ان کے ہاتھ اب خالی نظر نہیں آر تھے' ان میں ریوالور تھے۔ وہ سرفروش تنظیم کے ارکان تھے جنہیں ہر وقت مسلح رہنے کی ہدایات تھیں۔

چند لمحوں بعد عادل کو میں نے زینے کے اندر جھانکتے دیکھا۔ پھر اس نے مطمئن انداز میں سر ہلا مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ گویا کوئی خطرہ ہو تو پہلے وہی اس کا سامنا کرے۔ میں بلا جھجک زینے دروازے میں داخل ہو گئی۔ چند سیڑھیاں چڑھتے ہی میں نے عادل کو مخاطب کیا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو"

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے دو سیڑھیاں اوپر تھا۔

"کیوں' کیا ہوا؟" اس کی آواز سرگوشی کی حد تک دھیمی تھی۔

میں لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی اور بولی "سائلنٹ ڈیتھ" کو جیب میں رکھ لو۔ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم غلط خطوط پر سوچ رہے ہو۔"

"تو پھر صحیح کیا ہے؟ کسی نے تو کویتا کو قتل کیا ہے؟"

ہم دونوں زینے کے وسط میں ایک سیڑھی پر رک گئے تھے۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" میں بولی۔ "مگر قاتل فرار ہو چکا ہے۔"

"تمہارے اس یقین کی کوئی وجہ؟" عادل نے سوال کیا۔ "ابھی قتل ہوئے دیر ہی کتنی.........."

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "رہی وجہ' تو کچھ دیر بعد تمہیں معلوم ہو جائے گی۔ اس وقت جب تمہاری ہدایات پر عمل کیا جا چکا ہو گا۔ یہ بحث بعد میں ہوتی رہے گی۔ پہلے تو میں' کویتا کی سربریدہ لاش کا جائزہ لے کر اسے نیچے لانا چاہتی ہوں۔"

عادل پھر کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر میں نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد میں نے عادل کو اتنا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ مجھے روک کر خود پہلے اوپر جا سکے۔ میں تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی اور عادل میرے پیچھے تھا۔

"ٹھہرو تو۔" اس نے مجھے آواز دی تھی' مگر میں نہیں رکی۔

"وقت ضائع نہ کرو۔" میں نے مڑے بغیر کہا۔ اپنے جذبات پر اب میں پوری طرح قابو پا چکی تھی۔

پھر عادل نے اپنی سی پوری کوشش کی تھی کہ کسی طرح مجھ سے پہلے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچ جائے لیکن کامیاب نہیں ہوا تھا۔

چھت پر قدم رکھتے ہی میں نے ٹارچ روشن کی۔ چند لمحے کے فرق سے عادل بھی چھت پر آ گیا۔ کوٹھی کی وسیع و عریض چھت پر دو ٹارچوں کے روشن دائرے حرکت کرنے لگے۔ اسی کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

ہم نے کچھ ہی دیر میں چھت کا کوئی حصہ ایسا نہیں چھوڑا جو دیکھ نہ لیا ہو۔ ہمیں کویتا کی سربریدہ لاش نہیں ملی۔ میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

"یہ کس طرح ممکن ہے کہ قاتل اپنے ساتھ لاش بھی لے گیا ہو؟" عادل کا انداز خود کلامی کا سا تھا حالانکہ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

میں نے عادل کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے ذہن میں شہزاد کی بہن سنبل کے "فرضی قتل" کا واقعہ تازہ ہو گیا تھا۔ کہیں یہ سب کچھ فریب نظر تو نہیں؟ میں سوچ میں پڑ گئی' پھر خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیا۔ یہ واقعہ اس سے قطعی مختلف تھا۔ چندر موہن کو کویتا کے معاملے میں فریب دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر کویتا کا کھینچا ہوا حصار توڑ کر وہ یہاں تک پہنچ ہی گیا تھا تو پھر رعایت کیسی اور کیوں؟ اس

کی شیطانی قوتوں کی یہاں تک رسائی کا ثبوت کویتا کا کٹا ہوا سر تھا۔ یہ فریب نظر بھی تھا تو اس نے بہرحال کویتا کا سراغ لگا لیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ہمیں فریب نظر بھی نہ دے پاتا۔ مختلف سوالوں نے جیسے میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ ان سوالوں میں سے کسی کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اسی وقت اچانک نیچے سے شور سنائی دیا اور میں چونک اٹھی۔ میں اور عادل دونوں ہی لپک کر چاردیواری تک پہنچ گئے اور نیچے صحن میں جھانک کر دیکھا۔ عادل کی ہدایات کے مطابق پہلے ہی ساری کوٹھی کی بتیاں جلا دی گئی تھیں۔ صحن میں بھی پہلے صرف ایک بلب روشن تھا اور اب چاروں بلب جلا دیئے گئے تھے۔ کسی کی تلاش کے سلسلے میں پہلا قدم یہی اٹھایا جاتا ہے کہ وہاں ہر طرف روشنی کر دی جائے۔ صحن جگمگا رہا تھا۔

میرے لئے یہ حیران کن بات ہی تھی کہ یکایک شور بلند ہونے کے بعد ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ میں نے صحن میں موجود افراد کو اوپر کی طرف منہ اٹھائے دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آدمیوں کی بجائے بے حس و حرکت مجسّمے ہوں' جیسے کسی نے ان کی قوت گویائی چھین لی ہو۔

"انہیں کیا ہوا؟" اس مرتبہ کے عادل کے لہجے میں تشویش دوڑی۔ عادل میرے پیچھے پیچھے لپکا تھا۔

جب تک ہم نیچے پہنچے وہ لوگ لمحات حیرت سے نکل چکے تھے۔ سمیع اللہ وہ حیرت ناک واقعہ بیان کر رہا تھا جس کے گواہ وہاں موجود سبھی افراد تھے۔ سمیع اللہ کے بیان کردہ واقعہ کے مطابق کویتا کا کٹا ہوا سر معاً فرش سے اٹھ کر فضا میں بلند ہونے لگا اور پھر بلند ہوتے ہوتے دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لاش بھی غائب اور پھر کٹا ہوا سر بھی۔ شمبھو کی لاش بھی تو کلکتے میں میری کوٹھی سے اسی طرح غائب ہو گئی تھی۔ فرق صرف دوست اور دشمن کا تھا۔ میں پھر انہی خطوط پر سوچنے لگی کہ یہ فریب نظر بھی ہو سکتا ہے' لیکن کویتا کہاں گئی؟ اس سوال نے ایک بار پھر مجھے متحرک کر دیا۔

کوٹھی کا ایک ایک گوشہ دیکھ لیا گیا' مگر کویتا کہیں بھی نہیں تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ خود جاپ ادھورا چھوڑ کر غائب ہو جاتی۔ میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا۔ ذہن کو الجھا دینے والی ایک بات یہ بھی تھی کہ جس جگہ کویتا کا کٹا ہوا سر صحن میں گرا تھا' وہاں خون موجود تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ چھت پر کہیں بھی خون کا ایک قطرہ نظر نہیں آیا۔ کویتا چھت پر تھی اور ظاہر ہے اس پر وہیں حملہ کیا گیا ہو گا۔ پھر وہاں خون نہ ملنے کا سبب کیا تھا؟ کٹی ہوئی گردن سے جو خون بہتے دیکھا گیا تھا' صحن کے ایک حصے میں اب تک پھیلا ہوا تھا۔ صحن میں خون کی موجودگی یہ ثابت کر رہی تھی کہ کویتا کو قتل کیا گیا ہے۔ اس کے سر کو وہاں سے غائب کرنے کا مقصد کوٹھی میں موجود افراد کو دہشت زدہ کرنا بھی ہو سکتا تھا۔

کوٹھی میں کویتا کو تلاش کرتے ہوئے یہی سارے خیالات میرے ذہن میں چکراتے رہے تھے۔ عادل اور سمیع اللہ بھی میرے ساتھ ساتھ تھے۔ ہمارے علاوہ تنظیم کے ارکان بھی اس تلاش میں مصروف رہے تھے۔ اس ہنگامے کے دوران ہی میں سالار اکبر بھی جاگ اٹھا تھا وہ چلنے پھرنے کے قابل تو ہو گیا تھا لیکن ٹانگ کا زخم ابھی مندمل نہیں ہوا تھا۔ میری درخواست پر وہ اپنے کمرے میں واپس چلا گیا تھا۔

کویتا کی تلاش میں ناکامی کے بعد کوٹھی کے حفاظتی اقدامات مزید سخت کر دیئے گئے۔ جن افراد کو جو

فرائض سونپے گئے' ان کے سوا سبھی کو سالار اکبر کی طرف سے سو جانے کا حکم ملا۔ سمیع اللہ' عادل کو اور مجھے سالار اکبر نے اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ جو مختلف سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے' انہی میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ اس کوٹھی کے اردگرد بسنے والے دوسری کوٹھیوں کے مکین اس قدر ہنگامہ ہونے کے باوجود کیوں خاموش رہے تھے؟ سالار اکبر کے کمرے میں پہنچتے ہی یہی سوال سب سے پہلے میری زبان پر آیا۔ اس سوال کا جواب سالار اکبر کی بجائے عادل نے دیا۔ "تمہیں شاید یہ علم تو ہے کہ اس ٹھکانے کو ہم اپنا سب سے محفوظ ٹھکانہ سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آس پاس جتنی کوٹھیاں اور مکانات ہیں' ان میں رہنے والے یا تو ہماری تنظیم کے کسی نہ کسی شعبے سے منسلک ہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جو رکن نہ ہونے کے باوجود ہمارے لئے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھتے ہیں مثلاً ڈاکٹر شرما' وہی ڈاکٹر شرما جس سے سالار اکبر نے ولیم رائٹ کے متعلق تصدیق کی تھی کہ ولیم اسی کے زیرعلاج ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اب تک یہاں پولیس پہنچ چکی ہوتی۔ کوئی نہ کوئی پولیس کو خبر کر ہی دیتا۔"

عادل کے جواب سے میرے اس یقین میں اور پختگی آ گئی کہ وہ لوگ مجھ سے رازداری نہیں برتتے۔ انہیں مجھ پر مکمل اعتماد تھا' ایسا ہی اعتماد کہ جیسے میں بھی انہی کی ایک رکن ہوں۔ انہی میں سے ہوں۔ اب تک وہ میرے اور میں ان کے اعتماد پر پوری اتری تھی۔

سالار اکبر نے شاید چائے کے لئے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ رحمان ہم سب کو چائے دے کر چلا گیا تو سالار اکبر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ بات تو مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ساتھ جو لڑکی آئی تھی' وہ آج رات کوئی جاپ کرنے والی تھی' مگر اس کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔" سالاراکبر کی آواز پرسکون تھی۔ وہ یقیناً مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس کے چہرے سے بھی کسی قسم کی ہیجانی کیفیت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

تنظیم کے ارکان سے میں نے اب تک یہ بات پوشیدہ رکھی تھی کہ کویتا' ژیان کی تلاش کے لئے جاپ کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں ایسی تھیں جو بہ وجوہ میں نے راز میں رکھی تھیں۔ تنظیم کو تو میرے ماضی تک کا علم نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے سالار اکبر کو مصلحتاً جاپ کا مقصد بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ میں نے بات کو ایک اور ہی رخ دے دیا۔ "کویتا نے اپنے تحفظ کے لئے وہ جاپ شروع کیا تھا۔ وہ میرے ان دشمنوں کی طرف سے خوفزدہ تھی جو پراسرار شیطانی طاقتوں کے مالک ہیں۔ وجہ آپ کے علم میں ہے کہ اس نے وہاں سے فرار ہونے میں میری مدد کی تھی۔"

"تو پھر کویتا کے قتل میں انہی لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔" سالار اکبر نے میرے جواب کی روشنی میں قطعی درست اندازہ لگایا۔

"لیکن اس کی لاش کہاں غائب ہو گئی اور کس طرح؟" عادل بول اٹھا۔ وہ سالار اکبر سے ہی مخاطب تھا۔

"پنڈت جی! تم کیوں کہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے عادی ہو اس لئے تمہیں یہ بات سمجھانا ذرا مشکل ہو جائے گا۔" سالار اکبر نے یہ کہہ کر چائے کا گھونٹ بھرا' پھر اپنی بات جاری رکھتے

ہوئے مزید کہا۔ "بات بالکل سیدھی سی ہے۔ پُراسرار شیطانی قوتیں رکھنے والوں کے لئے کسی کی لاش کا غائب کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ خود ہمارے یہاں اللہ کے برگزیدہ بندوں کے متعلق ایسی معتبر روایات موجود ہیں جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی۔ حضرت خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ نے سارے آنا ساگر کے پانی کو اپنے وضو کے لوٹے میں سمیٹ لیا تھا۔ بہت مشہور واقعہ ہے' پڑھا یا سنا ہو گا تم نے۔ ایسے بے شمار واقعات مختلف اولیائے کرام اور بزرگان دین سے منسوب ہیں۔ خواجہ اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ میں نے بطور مثال بیان کیا۔ ان بزرگوں سے شیطان کے ہرکاروں کی معرکہ آرائیوں کے تذکرے بھی عام ہیں۔ تو کھلا یہ کہ ہر سطح پر خیر کے مقابل شر بھی موجود ہے۔ یہ تصادم روزِ ازل سے اب تک جاری ہے۔ ہم شر یا بدی کے وجود سے انکار تو نہیں کرسکتے۔ اگر دن ہے تو اس کے ساتھ رات بھی ہے۔ مسئلہ صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ ہم خیر کو خیر اور شر کو شر جانیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ اپنے دشمن کو کمزور نہ سمجھیں۔ ہم چاہے اس بات کو مانیں یا نہ مانیں' شیطانی قوتیں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں..........."

"یقیناً رکھتی ہوں گی۔" عادل نے پھر گفتگو میں مداخلت کی۔ اسی کے ساتھ اسے اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا اور کہنے لگا۔ "معاف کیجئے گا سالار' شاید ابھی آپ کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ میں بول اٹھا۔"

"میری بات کو مکمل ہی سمجھو کہ فی الحال اتنا کہنا بھی کافی ہے۔ تم کہو' کیا کہہ رہے تھے۔"

"میرے عرض کرنے کا مقصد محض یہ تھا کہ پُراسرار قوتوں کے وجود یا عدم سے قطع نظر اس کوٹھی میں کسی کا قتل ہو جانا میرے خیال میں تشویش ناک بات ہے' خواہ قاتل کوئی بھی ہو۔ ہمیں یہ سوچ کر خاموش نہیں بیٹھ جانا چاہئے کہ اس قتل میں کسی شیطانی قوت کا ہاتھ تھا۔"

"پہلے میرے اس سوال کا جواب دو کہ شواہد کس طرف اشارہ کر رہے ہیں؟"

"گویا آپ مجھ سے بہرحال یہ تسلیم کرنا چاہتے ہیں کہ کویتا کا قاتل کوئی پُراسرار وجود تھا۔" عادل مسکرایا۔

"چلو یہی سمجھ لو۔" سالار اکبر بھی مسکرا دیا۔ "خیر چھوڑو' سمیع اللہ سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔"

"ہاں' یہ مناسب ہے سالار۔" عادل بولا۔ "میں یوں بھی اس وقت صحن میں موجود نہیں تھا جب کویتا کا کٹا ہوا سر غائب ہوا تھا۔"

سمیع اللہ کے مزاج میں انتہا پسندی نہیں تھی۔ وہ تصویر کے دونوں ہی رخ دیکھنے کا قائل تھا۔ اس نے کہا۔ "بظاہر تو یہ واقعہ پُراسرار ہی معلوم ہوتا ہے۔ اسے شعبدہ گری بھی کہا جا سکتا ہے۔ بہت سے شعبدہ گر اس طرح کے تماشے دکھاتے رہتے ہیں۔"

"لیکن شعبدہ گری اور کسی پُراسرار واقعے میں فرق ہوتا ہے۔" سالار اکبر بولا۔

سمیع اللہ نے سالار اکبر کی بات سے اتفاق کیا اور پھر خاموشی اختیار کر لی۔ میرا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا اور میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس مسئلے پر مزید کچھ سوچنے کے لئے تنہائی کی ضرورت تھی۔ میں اسی لئے موضوع گفتگو بدلنے کے لئے بولی۔ "میرے اغوا ہونے سے قبل آپ نے بتایا تھا سالار

کہ سرفروش تنظیم کے خلاف حکومت کوئی بڑا آپریشن شروع کرنے والی ہے۔" میں سالار اکبر سے مخاطب تھی۔ "آپ نے غالباً یہ بھی کہا تھا کہ دو ایک روز میں آپ کو دہلی سے کہیں باہر جانا پڑے۔ پھر آپ میرے معاملے میں الجھ گئے تھے۔ میری مراد ژیان کے اغوا سے ہے جس کے دوران میں آپ زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد ژیان کا معاملہ تو گویا پس منظر میں چلا گیا اور پے درپے دیگر واقعات شروع ہو گئے۔ تو میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس بڑے آپریشن کے سلسلے میں کیا صورت حال رہی؟"

"یوں سمجھیں کرن کہ اچانک خاموشی سی چھا گئی ہے۔" سالار اکبر نے طویل سانس لیا۔ "اور یہ خاموشی مجھے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہو رہی ہے۔ رہا اس سلسلے میں میرا دہلی سے باہر جانے کا معاملہ' تو تنظیم میں میرے علاوہ بھی دوسرے اہل افراد موجود ہیں۔ میری جگہ دوسرے شخص کو بھیج دیا گیا۔ نگران اعلیٰ کی طرف سے مجھے فی الحال دہلی میں رہنے کا حکم ملا ہے۔ یہاں بھی بہت سے ایسے معاملات ہیں کہ میں زخمی ہونے کے باوجود ان کی نگرانی کر سکتا ہوں۔ ویسے بھی اب مجھے زیادہ عرصے آرام کی ضرورت نہیں رہی۔ ایک خبر یہ بھی ملی ہے کہ اس بڑے آپریشن میں مرکزی کردار سیکرٹ سروس کو ادا کرنا تھا جس کا سربراہ ولیم رائٹ ہے۔ اسی نے اس بڑے آپریشن کی منصوبہ بندی کی تھی۔ ملک گیر سطح پر حکومت کی مختلف ایجنسیوں کو اسی کے احکام پر عمل کرنا تھا۔ خلاف توقع ہمارے دشمن ژیان کی جگہ وہ ہمارے چنگل میں پھنس کر شدید زخمی ہو گیا۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ وقتی طور پر اس کے غیر فعال ہونے کے سبب آپریشن روک دیا گیا ہو۔ پھر بھی ہم پوری طرح چوکنا ہیں۔ خیر یہ معاملات تو اپنی جگہ ہیں' فی الحال تو ہم موجودہ واقعے پر غور کر رہے تھے۔"

بات گھوم پھر کر دوبارہ وہیں آ گئی تو میں نے کہا۔ "میرے خیال میں یہ واقعہ افسوس ناک ضرور ہے لیکن اس پر مزید غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ کویتا کے سوا اس کوٹھی میں موجود کسی بھی شخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ پہلے میں نے اسی طرح کے واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہیں اور سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا' پھر خود ہی یہ ارادہ بدل دیا۔ میری وجہ سے میرے دشمنوں کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ فوری طور پر وہ میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکیں گے۔ کسی حد تک میرا خیال درست بھی ثابت ہوا جس کا ثبوت آج پیش آنے والا واقعہ ہے۔ میں بھی کوٹھی میں موجود تھی مگر وہ مجھ سے دور ہی رہے۔" یہ سب کچھ کہنے کا مقصد سالار اکبر کو مطمئن کرنا ہی تھا۔

"اگر ایسا ہے کرن جی تو پھر یہیں رہیں۔" سالار اکبر بولا۔ "اس طرح ہم بھی آپ کی طرف سے مطمئن رہیں گے۔ ہرچند کہ آپ ہماری تنظیم کی باقاعدہ رکن نہیں ہیں مگر ہم آپ کو خود سے جدا تصور نہیں کرتے۔ بہ حیثیت مسلمان ہم شیطانی قوتوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں آپ کو ہماری طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس پر میں نے سالار اکبر کا شکریہ ادا کیا۔ اس وقت تک سبھی چائے پی چکے تھے۔ رات بھی خاصی ہو چکی تھی اس لئے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ عادل اور سمیع اللہ بھی میرے ساتھ ہی اٹھے۔ وہ دونوں کچھ دور

ساتھ چل کر اپنے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

نیند آنے کا تو خیر سوال ہی نہیں تھا' پھر بھی میں نیلا بلب جلا کر بستر پر لیٹ گئی۔ مجھے اب تنہائی میں کچھ سوچنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں از سر نو اس واقعے پر غور کرنے لگی۔ سوچتے ہوئے معاً میرا ذہن ژیان کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہ بھی پُراسرار شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔ اس کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ کویتا نے اسی کا سراغ لگانے کے لئے تو جاپ شروع کیا تھا۔ اس معاملے میں ژیان کا ملوث ہونا بھی ممکن تھا۔ ژیان کے علاوہ مجھے گوپال کا خیال بھی آیا لیکن اس کی طرف سے مجھے کویتا کے قتل کی توقع نہیں تھی۔ وہ کویتا کو حاصل کرنے کے لئے تو کوئی قدم اٹھا سکتا تھا' قتل کی غرض سے نہیں' پھر یہ کہ کوٹھی کے کھینچے ہوئے حصار میں گوپال کا داخل ہو جانا بھی میرے نزدیک یقینی نہیں تھا۔ میرے خیال میں یہ اہلیت چندر موہن ہی میں ممکن تھی۔ وہی ان سب کا گرو گھنٹال تھا۔ ان تمام خیالات سے قطع نظر یہ بھی طے نہیں تھا کہ کویتا کو قتل ہی کیا گیا ہے۔ دیر تک میں مختلف امکانات پر غور کرتی رہی اور پھر دھیرے دھیرے میرا ذہن بوجھل ہونے لگا۔ کروٹ لے کے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میرے ذہن پر ابھی پوری غنودگی طاری نہیں ہوئی تھی کہ یوں لگا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ میں دیوار کی طرف منہ کئے ہوئے تھی' خطرہ محسوس کرتے ہی تیزی سے پلٹی پھر میں نے ہلکے نیلے بلب کی روشنی میں جو کچھ دیکھا' میرے لئے انتہائی حیران کن تھا۔ کویتا دبے پاؤں فولڈنگ بیڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"تم؟" میں ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ نہ اسے قتل کیا گیا تھا' نہ وہ اغوا ہوئی تھی۔

"آپ جاگ گئیں۔ میں نے سوچا تھا کہیں آپ کی آنکھ نہ کھل جائے اسی لئے خاموشی کے ساتھ سو جانا چاہتی تھی۔" وہ یہ کہتی ہوئی میری مسہری کی طرف بڑھ آئی۔

وہ مسہری پر آ کے بیٹھ گئی تو میں چند لمحے خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی۔ اسی دوران میں اپنے منتشر حواس پر بھی میں نے قابو پا لیا۔

"تمہیں خبر بھی ہے کہ یہاں تمہارے پیچھے کیا قیامت گزر چکی ہے۔"

"کیا ہوا؟" وہ حیرت سے بولی۔

"یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ خیر یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی' پہلے تو کہو کہ جاپ کرتے کرتے اچانک چیخنے کیوں لگی تھیں؟"

"میں چیخنے لگی تھی' نہیں تو.........." اس کے چہرے سے حیرانی ظاہر ہو رہی تھی۔

"تمہاری بھیانک چیخیں میں نے بھی سنی تھیں اور اس کوٹھی میں رہنے والے دوسرے لوگوں نے بھی۔ ممکن ہے' یہ فریب سماعت ہو لیکن تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"جیسے ہی میں نے جاپ شروع کیا' مجھے محسوس ہوا کوئی میرے جاپ میں کھنڈت ڈال رہا ہے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں جاپ ادھورا چھوڑ کر غائب ہو گئی۔"

"لیکن اس واقعے کو تو دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ اس وقت سے اب تک تم کہاں تھیں؟"

"میں یہ سراغ لگانے گئی تھی کہ جاپ میں کھنڈت ڈالنے والا کون ہو سکتا ہے۔"

"پھر کچھ پتا چلا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں۔" کویتا نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔ "مجھے بڑے مہاراج پر شک تھا' سو میں ادھر ہی گئی۔ میں بار بار یہ کوشش کرتی رہی کہ مجھے کسی طرح بڑے مہاراج کے آشرم میں گھسنے کا موقع مل جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔"

"تمہیں ادھر کا رخ کرتے ہوئے خوف محسوس نہیں ہوا کہ کہیں چندر موہن قید نہ کر لے؟"

"میں اپنے گرد گھیرا ڈال کر گئی تھی' سو انہیں کیسے دکھائی دے جاتی۔ پھر یہ کہ اب جان ہتھیلی پر رکھ ہی لی ہے تو ڈرنا کیسا؟ بہت سے بہت یہی تو ہو گا نا کہ میں آپ سے پریم کرنے کے جرم میں جیون ہار جاؤں۔ یہ بات تو میں نے تبھی سوچ لی تھی جب آپ کی اچھا اور بڑے مہاراج کی انومتی (اجازت) کے بغیر آشرم سے باہر قدم رکھا تھا۔"

مجھے اس وقت وہ بھولی بھالی سی لڑکی بہت اچھی لگی جو ایک شیطان صفت شخص کی صحبت میں رہ کر بگڑ گئی تھی۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کے لئے کہا۔ "میں تمہارے پُرخلوص جذبات کی قدر کرتی ہوں کویتا۔" پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔ "کوٹھی کے گرد کھینچے ہوئے حصار کے باوجود تمہارے جاپ میں کس طرح مداخلت کی جا سکتی ہے؟ یہ تو اسی وقت ممکن ہے کہ جب کسی کو یقین ہو کہ تم یہاں موجود ہو۔"

"یہ بھی آپ ٹھیک کہتی ہیں کرن جی۔" وہ یہ بھولی نہیں تھی کہ میں نے اسے راجکماری معبلہ کہنے سے منع کر دیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے۔

"ایک بات اور بھی تو ممکن ہے کہ چندر موہن پر تمہارا شک غلط ہو۔" میں ذرا دیر بعد بولی۔

میری بات سن کر وہ چونک اٹھی۔ "میں بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی تھی۔"

"جہاں تک مجھے یاد ہے' تم نے کہا تھا کہ کویتا کہ یہ حصار صرف بڑے مہاراج' گوپال' دوسرے چیلوں اور داسیوں کے لئے ہے۔ ان کی نظروں سے یہ کوٹھی اوجھل ہو جائے گی۔ میرا دشمن ژیان کیوں کہ خود مجھ سے چھپا چھپا پھر رہا تھا اس لئے مجھے اس کا خیال نہیں آیا۔ وہ بھی تو تمہارے جاپ میں مداخلت نہیں کر سکتا ہے تاکہ تم اس کا سراغ نہ لگا سکو۔ اس کی شیطانی قوتوں کے بارے میں تمہیں میں بتا ہی چکی ہوں۔ اسے اپنی انہی قوتوں کے ذریعے پتا چل گیا ہو گا کہ تم اس کی راہ پر لگ چکی ہو۔"

"ہاں' یہ ہو سکتا ہے کرن جی۔" کویتا نے میرے خیال کی تصدیق میں سر ہلایا۔

"اس نے یہاں جو تماشا دکھایا اس کا مقصد میرے دوستوں کو ہراساں کرنا بھی ہو سکتا ہے تاکہ وہ خوفزدہ ہو جائیں اور تمہیں یہاں نہ رہنے دیں۔" پھر میں نے مختصراً پیش آنے والے واقعے سے کویتا کو آگاہ کر دیا۔ وہ چندر موہن کی داسی تھی اس لئے یہ واقعہ اسے حیرت زدہ نہ کر سکا۔ نہ فریب سماعت اس

کے لئے کوئی نئی بات تھی' نہ فریب نظر۔

"کرن جی! وہ خون کسی جانور یا پرندے کا ہو گا جو اس گھٹنا (واقعہ) کے بعد آنگن میں دیکھا گیا۔ کیا خبر وہ کسی جانور ہی کا سر ہو' بھید نہ کھل جائے اس لئے ژیان نے اسے غائب کر دیا۔ سو یوں وہ سر تو غائب ہو گیا اور خون پڑا رہ گیا۔"

اتنا میں بھی سمجھتی تھی کہ فریب ساعت اور فریب نظر میں مبتلا کرنے کے ساتھ ساتھ کسی جانور کا کٹا ہوا سر پھینکنے اور پھر اسے غائب کرنے کے لئے اس کوٹھی میں ژیان کا آنا ضروری نہیں تھا۔ دور رہ کر بھی یہ کھیل کھیلا جا سکتا تھا۔ اب اس پُراسرار واقعے کی تمام ہی گمشدہ کڑیاں مل چکی تھیں۔ کویتا نے ژیان کا سراغ لگانے کے لئے جاپ شروع کیا' ژیان کو اس کا پتا چل گیا اور اس نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا تھا کہ ژیان بدستور میری طرف سے خوفزدہ تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی بھی طرح اس تک پہنچ سکوں۔ مجھے اپنی تو کوئی پرواہ نہیں تھی مگر دوسرے میری وجہ سے پریشان ہوں یہ منظور نہیں تھا۔ میں پھر کسی وقت پُرسکون ذہن کے ساتھ یہ سوچنا چاہتی تھی کہ ژیان کی تلاش کے سلسلے میں کیا قدم اٹھایا جائے۔ فی الحال تو میں کویتا کی زندہ و سلامت واپسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس سے مجھے بے اندازہ خوشی ہوئی تھی' اسی کے ساتھ تنظیم کے ارکان کا ردِعمل بھی میرے پیشِ نظر تھا۔

دوسروں کا کیا ذکر' خود میں بھی وقتی طور پر اسی غلط فہمی کا شکار ہو چکی تھی کہ کویتا کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں اچانک کسی کی اس پر نظر پڑ جانا میرے نزدیک مناسب نہیں تھا۔ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے کویتا کو چند باتیں سمجھائیں' پھر بولی۔ "اب تم کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لو اور اپنے بستر پر جا کے سو جاؤ۔"

"سو جاؤں؟" اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف نگاہ اٹھائی۔ اس ایک نگاہ میں بہت کچھ تھا مگر اس کے لئے جو سمجھنا چاہے۔

"ہاں۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور اپنے بستر پر جا کے لیٹ گئی۔ میں دانستہ اس کی طرف سے کروٹ لے کر لیٹ گئی تھی۔

دوسرے دن صبح کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے کویتا کے بیڈ کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اسے میں نے جگایا اور پھر آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے دلاری کھڑی تھی۔

"چھما کیجئے گا کرن جی کہ میں نے آپ کو سوتے سے اٹھا دیا۔" دلاری اندر آتے ہوئے بولی۔

"نہیں' کوئی بات نہیں' بولو۔" میرے ذہن پر ابھی تک نیند کا غبار چھایا ہوا تھا۔

"مجھے خبر تھی کہ رات کو آپ دیر سے سوئی ہیں اسی لئے جل پان (ناشتہ) کے لئے نہیں اٹھایا پر اب دس بجنے والے تھے تو سوچا.........."

"دس بج گئے۔ پتا ہی نہیں چلا' ٹھیک ہے تم رحمان سے ناشتے کو کہہ آؤ' اتنے میں باتھ روم سے آتی ہوں۔"

دلاری چلی گئی تو کویتا نے دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "پہلے آپ اشنان گرہ (باتھ روم) جائیں گی کہ میں چلی جاؤں؟"

کویتا کمرے ہی میں موجود تھی مگر میری ہدایت کے مطابق وہ دلاری کے سامنے نہیں آئی۔ اس نے خود کو دلاری کی نظروں سے اوجھل کر لیا تھا۔

"تم چلی جاؤ' مگر یہ خیال رکھنا کہ ابھی تمہارے اوپر کسی کی نظر نہ پڑے۔ خالی منہ ہاتھ دھو کر چلی آؤ۔" میں نے کویتا کے سوال کا جواب دیا۔

کویتا نے میری ہدایات پر عمل کیا اور جلد ہی کمرے میں واپس آ گئی۔ میں نے بھی تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور دلاری سے ناشتہ منگوا لیا۔ بھوک لگنے کے بہانے میں نے کچھ زیادہ ہی ناشتہ منگوایا تھا تاکہ ہم دونوں ہی کا گزارا ہو جائے۔ جب ہم ناشتہ کر چکے تو میں نے دلاری کو پھر آواز دی۔ وہ خالی برتن لے کر جا ہی رہی تھی کہ عادل آ گیا۔

"اٹھ گئیں تم؟" وہ دھیرے سے بولا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ آج شام سے پہلے تمہارا اٹھنا مشکل ہی ہے۔" وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ "دیر تک خواب خرگوش کے مزے لینے کی ہی خاطر تم نے شاید کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔"

کویتا میرے برابر والی کرسی ہی پر بیٹھی ہوئی تھی مگر عادل مجھے کمرے میں اکیلا ہی سمجھ رہا تھا۔ کویتا اس کی نظروں سے روپوش تھی۔

"دروازہ بند رکھنے کی وجہ تم جو سمجھ رہے ہو' وہ نہیں تھی۔" میں مسکرا کر بولی۔

"پھر کیا تم بھی کوئی وظیفہ کر رہی تھیں؟" وہ خوش گوار موڈ میں تھا۔

"ہاں۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تم تو خیر ان باتوں پر یقین نہیں کرتے مگر اس سے کسی کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تم ذہنی صحت کی بات کر رہی ہو یا جسمانی صحت کی؟" وہ ہنسا پھر کہنے لگا۔ "بات یہ ہے کرن کہ جو لوگ ذہنی طور پر صحت مند نہیں ہوتے وہی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں۔"

"تم تو خود کو ذہنی طور پر صحت مند سمجھتے ہوئے' حقائق پر یقین نہ کر کے۔" میں اسے ذہنی طور پر کچھ دیر بعد رونما ہونے والے لمحہ حیرت کے لئے تیار کر رہی تھی۔ "کل شام اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے لوٹتے ہوئے جو واقعہ پیش آیا تھا' یاد ہے تمہیں؟"

"کون سا واقعہ؟ وہی تو نہیں جو کویتا چند لمحوں کو کسی وجہ سے مجھے کار میں نظر نہیں آ سکی تھی؟"

"اور تم ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے اسے دیکھتے رہ گئے تھے' جب وہ تمہیں دوبارہ نظر آنے لگی تھی' یہ بھی تو کہو نا۔"

"دیکھو کرن' تمہیں پنڈت بال مکند کی ذات والا صفات کو تضحیک کا نشانہ بنانے سے گریز کرنا چاہئے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ اگر کسی پنڈت کا قہر و غضب جاگ اٹھے تو وہ جلا کے بھسم بھی کر دیتا ہے۔" وہ بدستور پُراسرار واقعات کا مذاق اڑانے پر تلا ہوا تھا۔

"معلوم ہے مجھے اور میں نے لوگوں کو جل کر بھسم ہوتے بھی دیکھا ہے' لیکن ان باتوں سے تمہارا کیا تعلق۔ تم تو جعلی پنڈت ہو۔" میں نے بھی اسے نہیں بخشا۔

"تم نے زیادہ تاؤ دلایا تو کسی دن اصلی پنڈت بن کر ایسا کرتب دکھاؤں گا کہ تمہارا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ جائے۔"

"اچھا' خیر چھوڑو' میں تمہیں تاؤ دلا کر تمہاری ناکامی پر ہنسنا نہیں چاہتی۔ تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کس لئے وظیفہ کر رہی تھی؟"

"تمہی بتا دو ویسے مجھے اس موضوع سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔"

"دلچسپی تو خیر تمہیں لینا ہی پڑے گی۔" میں ہنسی۔

"کوئی زبردستی ہے' نہیں لیتا میں دلچسپی۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "یہ تو وہی مثل ہوئی کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ رات کو بمشکل سالار اکبر سے جان چھڑائی تو اب تم گلے پڑ گئیں۔ کیا کوئی اور موضوع نہیں رہا بات کرنے کو؟"

"میں دراصل کویتا کو واپس بلانے کے لئے وظیفہ کر رہی تھی۔"

"کہاں سے واپس بلانے کے لئے؟ کیا عالم بالا سے؟"

"وہاں جا کر تو خیر کوئی واپس نہیں آتا' لیکن اگر کوئی مصلحت کے پیش نظر اِدھر اُدھر ٹل جائے تو اسے ضرور واپس بلایا جا سکتا ہے۔"

"پھر ظاہر ہے کہ تم اسی خوش فہمی کا شکار ہو کر صبح تک وظیفہ کھینچ کھانچ کے چین کی نیند سو گئی ہو گی۔ تمہاری ناکامی پر میں پُرزور الفاظ میں رنج کا اظہار کرتا ہوں۔ میری تمام تر ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ اسی کے ساتھ مؤدبانہ درخواست ہے کہ مقتولہ کویتا کی روح کو بھی چین لینے دو اور میری جان بھی بخش دو۔"

"قصہ دراصل یہ ہے پنڈت جی کہ میرے وظیفے کے نتیجے میں اس وقت بھی کویتا کی بے چین روح اس کمرے میں منڈلا رہی ہے۔"

"اگر اس طرح تمہارا مقصد مجھے ڈرانا ہے تو میں ہرگز ڈرنے پر تیار نہیں ہوں۔"

"تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو ایک منٹ ٹھہرو۔" میں کرسی سے اٹھی۔

"کہاں چلیں؟" اس نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"دروازہ بند کرنے تاکہ تم راہِ فرار اختیار نہ کر سکو۔" میں نے آگے بڑھ کر دروازہ اندر سے بند کیا اور پلٹ آئی۔ "اب کہو' بلاؤں کویتا کو؟" میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

پھر اس سے پہلے کہ عادل کچھ کہتا' میں دوبارہ بول اٹھی۔ "اے کویتا کی بے چین روح! تو یقیناً اس کمرے میں اِدھر سے اُدھر منڈلاتے ہوئے تھک چکی ہوگی۔ میں تجھ سے درخواست کرتی ہوں کہ میرے برابر والی کرسی پر آ کے بیٹھ جا۔ لو بھئی پنڈت جی! اس نے میری بات مان لی۔ اب وہ دائیں ہاتھ والی کرسی پر آ کے بیٹھ چکی ہے۔"

"اور تمہاری عقل پر ماتم کر رہی ہے۔"

"اچھا کویتا اب تم ظاہر ہو ہی جاؤ تاکہ پنڈت جی کو اپنی عقل پر ماتم کرنے کا موقع مل جائے۔"

"اندھی نہیں لگ رہی۔" عادل کے منہ سے ابھی یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ وہ اچھل پڑا۔ کویتا ظاہر ہو چکی تھی۔

"بس بس! زیادہ دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں پنڈت جی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔" اب عادل کا مذاق اڑانے کی باری میری تھی۔ بہرحال جو میرا مقصد تھا' پورا ہو چکا تھا۔ کویتا کو عادل ناقابل یقین سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں پھر بولی۔ "یہ سچ مچ کی کویتا کی روح ہے۔ یقین نہ آئے تو چھو کر دیکھ لو۔ تم نے شاید آج سے پہلے کسی روح کو چھو کر نہیں دیکھا ہو گا پنڈت جی۔" میں اسے چھیڑے جا رہی تھی۔

"یہ .... یہ روح .... نہیں۔" ذرا دیر بعد عادل رک رک کر بولا۔ اس کی نظر کویتا کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ "یہ تو کویتا جی ہیں۔" آخری الفاظ ادا ہوئے تو اس کے لہجے سے اعتماد جھلک رہا تھا۔ اس نے یقیناً خود پر قابو پا لیا تھا۔

"چلو اسی بہانے سہی' تم نے کوئی حقیقت تو تسلیم کی۔" پھر میں نے اسے زیادہ نہیں ستایا' حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ گزشتہ رات دیکھا جانے والا دہشت ناک منظر فریب نظر کے سوا کچھ نہیں تھا اور چیخیں بھی فریب ساعت تھیں۔ "تمہیں تو خود اس کا ابھی دوسری مرتبہ بھی تجربہ ہو چکا ہے کہ کویتا لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ سو گزشتہ رات کو یہ خود ہی غائب ہو گئی تھی اور پھر رات ہی کو لوٹ آئی تھی۔"

"مگر کب؟ ہم نے تو انہیں ساری کوٹھی میں دیکھ لیا تھا۔" عادل کے لہجے میں حیرت اب تک برقرار تھی۔

"جب میں' سالار اکبر کے پاس سے اپنے کمرے میں آئی تھی اور سونے کی کوشش کر رہی تھی۔" اب میں سنجیدگی سے گفتگو کر رہی تھی۔ "اچھا ہوا کہ تم خود ہی آ گئے ورنہ میں تمہیں بلواتی۔"

"کس لئے؟" اس نے پوچھا۔

"یہی سب کچھ بتانے کے لئے جو ابھی تمہیں بتایا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں یہ نہیں چاہتی کہ کوٹھی میں موجود جن افراد کو کویتا کے قتل ہو جانے پر یقین آ چکا ہے' وہ اسے اچانک دیکھ کر خوفزدہ ہو جائیں۔ تم لوگوں کے ذہنوں کو ذرا پہلے سے ہموار کر دو' جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ کچھ بھی نہیں' ایک شیطانی چکر تھا۔"

"تو اتنی دیر سے تم خواہ مخواہ مجھے گھسے جا رہی تھیں۔"

"اسی کو گھسا جاتا ہے جس میں گھسے جانے کی گنجائش ہو۔"

وہ میرے فقرے کو نظرانداز کر گیا اور بولا۔ "مگر انہیں آخر سوجھی کیا تھی غائب ہونے کی؟"

"اب زیادہ تفصیل میں نہ جاؤ' بس یہ سمجھ لو کہ کوئی اس کے جاپ میں گڑبڑ پھیلا رہا تھا۔ جاپ کی

وجہ کل رات کو میں سالار اکبر کے سامنے بھی بتا چکی ہوں اور تم بھی وہاں موجود تھے۔" میں نے بات کو مختصر کرنے کی غرض سے کہا۔ "کویتا کو خود غائب ہونے کا ایسا شوق نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی بات ہے کہ جب آئی موج فقیر کی تو دیا جھونپڑا پھونک۔"

"ویسے دہلی آ کے تم خاصی بامحاورہ اردو بولنے لگی ہو اور ضرب الامثال بھی خاصی یاد کر لی ہیں۔" عادل پھر اپنی گذشتہ روش پر لوٹ آیا۔

"غلط فہمی ہے تمہاری' جب میں کلکتے میں تھی تب بھی ایسی ہی اردو بولتی تھی۔" میں نے کہا۔

"اچھا فضول باتیں چھوڑو اور مطلب کی بات کرو۔"

"بڑی مطلبی ہو تم۔" اس نے مجھے شرارتی نظروں سے دیکھا۔

"وہ تو میں ہوں۔" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"خیر تمہارا کام ہو جائے گا۔ یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں۔ فی الحال تو میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں' دو ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔ اس وقت تک رازداری برت لو۔" عادل اب سنجیدہ ہو چکا تھا۔ پھر وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو یہ مسئلہ تو حل ہو ہی گیا۔" عادل چلا گیا تو میں نے طویل سانس لے کر کویتا کو مخاطب کیا وہ میرے ایما پر کمرے کا دروازہ بند کر کے پھر قریب آ بیٹھی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عادل سے اتنی دیر گفتگو کے دوران میں کویتا نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا کرن جی کہ میں آپ کے دوستوں سے زیادہ گھلوں ملوں نہیں۔" وہ بڑے بھولپن سے بولی۔

"ہاں یہ تو کہا تھا مگر اس کی وجہ اور تھی۔ اب ایسا بھی نہیں کہ تم کسی سے کوئی بات ہی نہ کرو۔ میں نے تم پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ جو کچھ بھی میں نے کہا اس کی وجہ رنجیت والا واقعہ تھا اور مجھے امید ہے کہ کم از کم اس کوٹھی کی حد تک اب کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آئے گا۔ یوں بھی تم مجھے وچن دے چکی ہو۔"

"میں نے خود کو رفتہ رفتہ بدلنے کا وچن دیا تھا کرن جی۔" اس نے گویا میری تصحیح کی۔

"رفتہ رفتہ سہی۔" میں نے اس کی بات کو ٹال دیا اور موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر اپنے دشمن ژیان کا ذکر چھیڑ دیا۔ "میرا خیال ہے کویتا کہ ابھی تم ژیان کا سراغ لگانے کی خاطر جاپ شروع کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لو۔ پھر وہ کسی کمینگی پر اتر سکتا ہے مجھے اپنی اور تمہاری تو خیر کوئی ایسی زیادہ فکر نہیں' ہاں اپنے ان دوستوں کا خیال ضرور ہے جو یہاں رہتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے کرن جی۔" وہ بولی۔ "اگر ہم دونوں کہیں اور کسی مکان میں ہوتے تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔"

"وہ خود کیونکہ بہت بڑا عیار اور فریبی ہے اس لئے اسے دھوکا دے کر ہی مارا جا سکتا ہے۔ فی الحال کیونکہ وہ چوکنا ہو گیا ہے اسی سبب میں تمہیں جاپ کرنے سے روک رہی ہوں۔ الگ مکان نہ لے کر

رہنے کی وجہ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔"

"مجھے یاد ہے کرن جی کہ بڑے مہاراج اور ژیان کے علاوہ آپ کے کچھ اور دشمن بھی ہیں۔ انہی کی وجہ سے آپ یہاں اپنے دوستوں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔" وہ سنبھل سنبھل کر ہندی کے مشکل الفاظ کی جگہ اردو کے لفظ بول رہی تھی۔ گذشتہ رات میں نے اسے اس سلسلے میں بھی سمجھایا تھا۔ میرے لئے تو خیر ہندی کے مشکل الفاظ سمجھنا آسان تھا لیکن اس کوٹھی میں رہنے والوں کی اکثریت اردو ہی بولتی اور سمجھتی تھی۔ انہیں اس سے الجھن ہوتی۔ یہ بات میں نے کویتا کو اس لئے بھی سمجھائی تھی کہ اسے بہرحال میرے ہی ساتھ کوٹھی میں رہنا تھا۔

اس روز دوپہر ہونے تک عادل نے مجھے آ کر بتا دیا کہ وہ مطلوبہ فضا ہموار کر چکا ہے۔ میں مطمئن ہو گئی۔ اب لوگوں کی نظر سے کویتا کا روپوش رہنا ضروری نہیں رہا تھا۔

پھر دو روز سکون و اطمینان سے گزر گئے۔ میں اس عرصے میں خوب جی بھر کے سوئی۔ مجھے طویل عرصے کے بعد آرام کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہاں مجھے اپنے دشمن ژیان کا خیال بار بار ضرور آتا تھا مگر میں اسے اپنے ذہن سے جھٹکتی رہی۔ اس خبیث کے بارے میں سوچ سوچ کر خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان کرنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ عظیم مہین کی طرف بھی میرا دھیان گیا تھا۔ ایک مدت سے مجھے اس کی سرگوشیاں سنائی نہیں دی تھیں۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ میں اسی لئے فکرمند نہیں تھی۔ پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ مجھے قدرے سکون میسر آیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے احرس کی یاد بھی آئی اور نصار کا چہرہ بھی میری آنکھوں میں گھومتا رہا۔ اس بوڑھے مہاپجاری کو بھی میں اس دوران میں نہیں بھولی تھی جو مجھے میرے دشمن کے چنگل سے نکال کر لے گیا تھا اور پھر طویل عرصے میرے ساتھ پہاڑوں میں بھٹکتا رہا تھا۔ یہ دو دن میں نے آرام کرنے کے ساتھ ساتھ گویا اپنے ماضی میں بسر کئے۔ ماضی اچھا ہو یا برا' آدمی بہرحال اس سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔ کئی بار کویتا نے مجھ سے پوچھا بھی کہ آخر میں کیوں چپ چپ ہوں اور جب بولتی بھی ہوں تو بات کرتے کرتے کہاں کھو جاتی ہوں؟ میں اسے ٹال گئی۔

تیسرے دن شام کو مجھے خلاف معمول کوٹھی میں کچھ سرگرمی سی نظر آئی۔ مجھے سمیع اللہ دکھائی دیا تو میں نے اس کی وجہ پوچھی۔

"آج ایک اہم میٹنگ ہونے والی ہے۔" سمیع اللہ نے بتایا۔

"کس سلسلے میں؟" میں نے معلوم کیا۔

"یہ مجھے بھی ابھی نہیں معلوم۔" اس نے جواب دیا۔

"پنڈت جی کو تو خبر ہوگی' وہ موصوف کہاں ہیں؟"

"صبح سے وہ نظر نہیں آئے۔ غالباً سالار گربچن سنگھ جی نے انہیں کہیں بھیجا ہے۔"

"تو سالار گربچن سنگھ بھی کوٹھی میں موجود ہیں؟"

"جی ہاں' وہ کل رات ہی سے یہاں ہیں۔" سمیع اللہ بولا۔

"اچھا خیر ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" یہ کہہ کر میں، کویتا کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ شام کی چائے پی کر بس میں یوں ہی کوٹھی کے لان میں چہل قدمی کے لئے نکل آئی تھی۔

کوٹھی میں کچھ نئے لوگوں کی آمدورفت سے میں نے خلاف توقع سرگرمی کا اندازہ لگایا تھا۔ سرفروش تنظیم کی سرگرمیوں سے اب تک میرا براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ کلکتے سے دہلی آنے کے بعد واقعات کی نہج ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں تنظیم کے قریب ہوتی چلی گئی تھی۔ میرے دشمن مجھ پر پے در پے وار کر رہے تھے اور مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی کم ہی مل رہی تھی۔ ان متواتر حملوں کا مقصد بھی شاید یہی تھا۔ تنظیم میری ممنون احسان تھی اور میں تنظیم کی شکرگزار تھی۔ اس عرصے میں صرف ایک موقع ایسا آیا تھا جب میں نے خود ایک مہم میں شرکت کے لئے کہا تھا اور سالار اکبر نے میری درخواست قبول کر لی تھی۔ تنظیم کے مقاصد مجھ پر واضح تھے۔ اس کے سرفروش غیر ملکی غاصبوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ یہی غیر ملکی جانے کیوں اور کس مقصد کے تحت میرے گرد بھی حلقہ تنگ کر رہے تھے۔ تنظیم کے اور میرے درمیان گویا یہ ایک قدر مشترک پیدا ہو گئی تھی۔ اس میں نہ تنظیم کی کسی کوشش کو دخل تھا نہ میرے ارادے کو۔ مجھے یہ تو علم ہو چکا تھا کہ سرفروشوں کی وہ تنظیم ملک گیر بنیاد پر قائم ہے مگر ان کے لائحہ عمل اور طریقہ کار سے میں بے خبر تھی۔ آدمی اگر چاہے تو اپنے اردگرد کے حالات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ یہی معاملہ کچھ میرے ساتھ بھی تھا۔

گزشتہ دو دن میں عادل سے بھی صرف ایک مرتبہ میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ملاقات بھی سرسری تھی۔ تنظیم کے جتنے افراد سے بھی دہلی آ کر میرا سابقہ پڑا تھا، ان میں عادل ہی میرے ساتھ قدرے بے تکلف تھا۔ اس میں عادل کے مزاج کو بھی دخل تھا۔ وہ سیدھا، سچا اور کھرا آدمی تھا۔ جو اس کے دل میں ہوتا کہہ دیتا، چاہے دوسرے اس کے خیالات سے متفق ہوں نہ ہوں۔ اپنے نظریات یا اصولوں پر سودے بازی یا مصالحت اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ جب وہ مجھ سے پہلی بار ملا تھا تو مجھے اس کے رویے میں ایک طرح کا اپنا پن محسوس ہوا تھا۔ اس نے مجھے یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اس سے پہلی بار مل رہی ہوں۔ لگتا تھا جیسے وہ مجھے ایک عرصے سے جانتا ہو۔ مجھے اسی لئے سمیع اللہ سے گفتگو کرتے ہوئے عادل کا دھیان آ گیا تھا۔

کویتا کے ساتھ میں اپنے کمرے میں لوٹ آئی تو رشیدہ نے مجھے سالار اکبر کا پیغام دیا۔ اس پیغام کے مطابق اب سے تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اہم میٹنگ ہونے والی تھی۔ میرے لئے تعجب خیز بات یہ تھی کہ اس میٹنگ میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

اس کوٹھی میں بھی پہاڑ گنج والی کوٹھی کی طرح اجلاس کے لئے ایک کمرا مخصوص تھا۔ بڑے مہاراج اور گوپال کی قید سے رہائی پانے کے بعد میں ایک مرتبہ وہاں جا بھی چکی تھی۔ ہر شہر کی تنظیم کے نگراں سربراہ کو وہ لوگ سالار اعلیٰ کہتے تھے۔ اس بات کا علم بھی مجھے اسی روز ہوا کیونکہ اس اہم نوعیت کے اجلاس میں سالار اعلیٰ نے بھی شرکت کی تھی۔ وہ اجلاس اسی کی صدارت میں ہوا تھا۔ میں وقت مقررہ پر اجلاس والے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس وقت تقریباً تمام ہی نشستیں پُر ہو چکی تھیں البتہ ابھی سالار اعلیٰ کی

کرسی خالی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس میٹنگ میں خاصے افراد ہوں گے، مگر ایسا نہیں تھا۔ بڑی سی ایک گول میز کی اطراف گیارہ کرسیاں پڑی تھیں۔ ان کرسیوں کے علاوہ ایک کرسی نسبتاً اونچی پشت کی تھی جو غالباً سالار اعلیٰ کے لئے خالی تھی۔ ملک گیر بنیاد پر سربراہ نگران اعلیٰ کہلاتا تھا۔ یہ بات مجھے کلکتے کے دوران قیام ہی میں معلوم ہو چکی تھی۔ بنگال کے چیف آف انٹیلی جنس ڈیسوزا کو سزائے موت دیئے جانے کا فیصلہ نگران اعلیٰ کی توثیق کے بعد حتمی قرار پایا تھا۔ نگران اعلیٰ کون تھا اور کس شہر میں تھا، نہ مجھے معلوم تھا نہ کبھی جاننے کی ضرورت محسوس تھی۔ وہ تو وہ، میں دہلی کے سالار اعلیٰ سے واقف نہیں تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس سے میری ملاقات ہونے والی تھی۔

میرے علاوہ اس میٹنگ میں تنظیم کے جو افراد موجود تھے، میں ان میں سے صرف تین کو جانتی تھی، سالار اکبر، سالار گرچن سنگھ اور عادل۔ سالار اکبر اور عادل کے درمیان جو نشست خالی تھی وہاں مجھے بٹھایا گیا۔ سالار گرچن سنگھ اور ہمارے درمیان کئی نشستیں تھیں۔ سالار اعلیٰ کی آمد کے مقررہ وقت سے پہلے ہی تمام ارکان اجلاس جمع ہو چکے تھے۔ پھر وہ گورا چٹا دراز قد شخص بھی آ گیا جس کی آمد کے سبھی منتظر تھے۔ اسے کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر ہی تمام افراد اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ شخص اپنی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے نرم آواز میں بولا۔ "تشریف رکھئے۔"

سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

"آپ حضرات یقیناً اس پر حیران ہوں گے کہ اجلاس میں ایک ایسی شخصیت بھی موجود ہے جس نے باقاعدہ ہماری تنظیم کی رکنیت اختیار نہیں کی۔" سالار اعلیٰ کا اشارہ یقیناً میری ہی طرف تھا۔ میں چوکنا ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ گفتگو کا آغاز میرے ذکر سے ہو گا۔ سالار اعلیٰ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "محترمہ معبلہ کو نگران اعلیٰ کے ایما پر اس اجلاس میں شریک کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ اجلاس کے دوران میں آپ کو معلوم ہو جائے گی۔" یہ کہہ اس نے سالار اکبر کی طرف دیکھا۔ "اب آپ فرمایئے یہ اجلاس کس لئے طلب کیا گیا ہے اور ہمیں کس صورت حال پر غور و فکر کر کے اپنے آئندہ اقدامات کی راہ متعین کرنا ہے۔"

"عرض کرتا ہوں۔" سالار اکبر بولا۔ "پہلے یہ مصدقہ اطلاعات ملی تھیں کہ ہماری تنظیم کے خلاف حکومت ملک گیر پیمانے پر کوئی بڑا آپریشن کرنے والی ہے۔ اس آپریشن کی نگرانی ایک ایسے شخص کو کرنا تھی جو وائسرائے کے بہت قریب شمار کیا جاتا ہے۔ محترمہ معبلہ کی دہلی میں آمد سے قبل ہم ایک غلط فہمی کا شکار تھے۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ شاید پولیس، سی آئی ڈی وغیرہ ہی ہمارے خلاف سرگرم عمل ہے، لیکن معلوم ہوا کہ معاملہ یہیں تک محدود نہیں تھا۔ حکومت کی دوسری ایجنسیاں بھی ہمارے مطلوبہ مقاصد کی راہ میں حائل تھیں۔"

سالار اکبر چند لمحے کو رکا ہی تھا کہ سالار اعلیٰ کی اجازت سے سالار گرچن سنگھ بول اٹھا۔ "اور یہ بھی کہ محترمہ معبلہ ہی کی وجہ سے ہمیں ان باتوں کا علم ہو سکا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سالار۔ میں بھی یہی عرض کرنے والا تھا۔ نگران اعلیٰ کی طرف سے ہمیں یہ

احکام ملے تھے کہ محترمہ معبلہ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا جائے۔ ان احکام کی مزید تفصیلات کا موقع نہیں ملا۔" سالار اکبر نے پھر بولنا شروع کیا۔ "نگران اعلیٰ کے ان احکام کی وجہ آپ سبھی کے علم میں ہے کہ انھی کے ایک جرأت مندانہ اقدام کے سبب ہمارے کتنے سرفروش زندگی کی سرحد عبور کرتے کرتے لوٹ آئے۔ بہرحال ان سے تعاون خود ہمارے لئے بھی انتہائی نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ ہمیں پہلی بار یہ علم ہوا کہ حکومت کی اعلیٰ سطح پر ہمارے خلاف سرگرمیاں جاری ہیں اور ان سرگرمیوں میں سیکرٹ سروس کے علاوہ ملٹری انٹیلی جنس بھی ملوث ہے۔ محکمہ جاتی قواعد و ضوابط سے قطع نظر' ان دونوں اداروں کے سربراہ براہِ راست وائسرائے ہند کو جواب دہ تھے۔ ان باتوں کا علم بھی ہمیں محترمہ معبلہ کی حاصل کردہ اطلاعات کی وجہ سے ہوا۔ کچھ عرصے قبل انھی سے تعاون کے سبب سیکرٹ سروس کا سربراہ ولیم رائٹ ہمارے ہتھے چڑھ گیا' مگر وہ عیار انتہائی سخت جان ثابت ہوا۔ اس نے انتہائی تشدد کے باوجود زبان نہیں کھولی۔ ممکن ہے کہ ہم اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتے لیکن وہ ہمارے چنگل سے نکل گیا۔ اس کی تفصیل سے بھی آپ سبھی آگاہ ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ولیم رائٹ نے گذشتہ روز اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا تھا۔ وہ تقریباً صحت یاب ہو چکا ہے۔ ولیم رائٹ ہی کو ہمارے خلاف ہونے والے بڑے آپریشن کی نگرانی کرنا تھی۔ اطلاع یہ تھی کہ اس آپریشن کی تمام تر منصوبہ بندی ولیم رائٹ ہی نے کی تھی۔ آج ہمارے اس ہنگامی اجلاس کا سبب اعلیٰ سطح پر حکومت کے حیرت انگیز اقدامات ہیں۔ آج ہی وائسرائے کے خصوصی احکام پر جن اعلیٰ حکام کو معزول یا معطل کیا گیا ہے' ان میں ولیم رائٹ بھی شامل ہے۔ دوسری حیران کن خبر یہ ہے کہ ملٹری انٹیلی جنس کے چیف رابرٹ ہیم کو بھی اس کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وزارت داخلہ کے جوائنٹ سیکرٹری فلپ کو نامعلوم وجوہ کی بناء پر سبکدوش کیا جا چکا ہے۔"

سالار اکبر کے ان انکشافات نے مجھے بھی گنگ سا کر دیا۔ ولیم رائٹ اور رابرٹ ہیم کا منظر سے ہٹ جانا یا ہٹا دیا جانا میرے نزدیک انتہائی معنی خیز تھا۔ اس کے علاوہ فلپ کی سبکدوشی بھی کم حیران کن نہیں تھی' میں چکرا کر رہ گئی۔

"ابھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حکومت کے ان تازہ تر اقدامات کا سبب یا اسباب کیا ہیں۔" سالار اکبر کا بیان جاری تھا۔ "عین ممکن ہے' مستقبل قریب میں ہمیں ان اقدامات کی وجہ کا علم ہو جائے' لیکن اسی کے ساتھ یہ امکان بھی ہے کہ وقت گزر چکا ہے۔ ہمیں اس سے پہلے ہی اپنے لئے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا ہے۔ حکومت کی دو اہم ایجنسیوں کے سربراہوں کی معزولی کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ یہ دونوں ہی وائسرائے کے انتہائی قریب تھے۔ یہاں میں یہ امر بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ محترمہ معبلہ نے انھی دو افراد کی نقل و حرکت سے نگرانی کے لئے تعاون طلب کیا تھا۔" یہ کہہ کر سالار اکبر خاموش ہو گیا۔

اب میں اس اہم اجلاس میں اپنی موجودگی پر حیران نہیں تھی۔ سالار اکبر کے بیان سے بہت کچھ واضح ہو گیا تھا۔

سالار اعلیٰ نے پہلی مرتبہ براہ راست مجھے مخاطب کیا۔ "محترمہ معبلہ میں پہلے آپ سے درخواست کروں گا کہ حکومت کے ان اقدامات پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔"

"محترم سالار اعلیٰ! سب سے پہلے تو میں یہ عرض کروں گی کہ مجھے محترمہ نہ کہا جائے۔ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتی۔ اس سے قطع نظر یہ کہ میں بہ لحاظ عمر بھی یہاں موجود تمام معزز ارکان سے بڑی نہیں ہوں۔ اسی کے ساتھ ایک درخواست یہ بھی ہے کہ مجھے کچھ دیر سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جائے۔ اس عرصے میں دیگر معزز ارکان اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔"

"بہتر ہے' آپ بعد میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی ہیں معبلہ۔" سالار اعلیٰ نے یہ کہہ کر گویا میری دونوں باتیں مان لیں۔

میں نے اس پر سالار اعلیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد سالار گربچن سنگھ نے گفتگو میں پہل کی۔ "میں سمجھتا ہوں کہ چہروں کی تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جن اعلیٰ حکام کو معزول یا معطل کیا گیا ہے' ان کی جگہ آنے والے بھی وہی سب کچھ کریں گے جو ان کے پیش رو کرتے آئے ہیں۔"

"آپ کا خیال درست ہے' لیکن ہم ان اقدامات کی وجہ پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ بلا سبب تو نہیں ہو سکتا۔" ایک اجنبی شخص بول اٹھا۔

"یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہو گا۔" سالار گربچن سنگھ جواب میں کہنے لگا۔ "مگر ہمارے لئے شاید سبب جاننا زیادہ ضروری نہیں ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔" ایک اور شخص نے گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ بھی میرے لئے اجنبی ہی تھا۔ "ان اقدامات کے پس پشت لازماً حکومت کی کوئی چال ہے۔ ان کے ممکنہ اسباب پر غور نہ کرنا میرے خیال میں کوئی مناسب بات نہیں۔"

"تو پھر آپ ہی کسی ممکنہ سبب پر روشنی ڈالئے۔" سالار اعلیٰ نے اس شخص کو مخاطب کیا۔

"حکومت کو کسی نہ کسی ذریعے سے علم ہو چکا ہے کہ ہم صحیح راہ پر لگ گئے ہیں۔" وہ شخص بولا۔ "اس ضمن میں ولیم رائٹ کا اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے اغوا بھی معنی خیز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس جیسے شخص کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا ہو گا' وہ کن لوگوں کے درمیان ہے۔ پھر پہاڑ گنج والی کوٹھی پر چھاپا پڑنے کے بعد وہاں سے ولیم کی بازیابی حکومت کو بہت کچھ اندازے لگانے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔"

اس اجنبی شخص کے خاموش ہوتے ہی عادل نے اس ضمن میں وضاحت کی۔ "ولیم رائٹ سے معبلہ کی ملاقات پہلے بھی ہو چکی تھی۔ معبلہ کو وہ گریٹا کی حیثیت سے جانتا پہچانتا تھا۔ تشدد کے دوران میں اسے یہ باور کرایا گیا تھا کہ گریٹا ایک جرائم پیشہ عورت ہے۔ میں اور آنجہانی رگھوویر بھی اس وقت معبلہ کے ساتھ تھے جب ولیم کی زبان کھلوانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ معبلہ کی ہدایت پر ہم نے انہیں مس گریٹا ہی کہا تھا۔ گویا مس گریٹا ہمارے جرائم پیشہ گروہ کی سرغنہ ہیں اور ہم انھی کے آدمی ہیں۔" پھر عادل

نے بقیہ تفصیلات بھی بیان کر دیں۔ سالار اعلیٰ پوری توجہ سے سب کچھ سن رہا تھا۔ دوسرے افراد بھی عادل کی طرف متوجہ تھے۔

عادل خاموش ہو گیا تو سالار گربچن سنگھ بولا۔ "ضروری نہیں کہ اس عیار شخص کو جو کچھ باور کرایا گیا ہو' اس نے یقین کر لیا ہو۔"

"اس معاملے میں کوئی کڑی ضرور ایسی ہے جو گم ہے۔" سالار اعلیٰ نے کہا پھر وہ سالار اکبر سے مخاطب ہوا۔ "ولیم کو جب اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے معبلہ کا دشمن ژیان سمجھ کر اغوا کیا گیا اور پہاڑ گنج والی کوٹھی میں لایا گیا تو میرے علم و اطلاع کے مطابق وہ بے ہوش تھا۔ آپ نے مجھے یہی رپورٹ دی تھی۔ اس کے بعد تشدد کئے جانے سے پہلے جو واقعات پیش آئے انہیں ذہن پر زور دے کر یاد کیجئے۔ ممکن ہے اس سے وہ گمشدہ کڑی مل جائے جس کی ہمیں تلاش ہے۔"

کمرے میں کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"بطور خاص جب یہ راز کھلا کہ وہ ولیم ہے' معبلہ کا دشمن ژیان نہیں' اس وقت کی صورت حال تفصیل کے ساتھ بیان کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی خلاف توقع واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس سے متعلق افراد جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے ہیجان خیز لمحات میں کوئی بھی غلطی کر سکتا ہے۔" سالار اعلیٰ پھر بولا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ سالار اعلیٰ یقیناً ایک ذہین شخص ہے۔ جب یہ بھید کھلا تھا کہ وہ ژیان نہیں ولیم رائٹ ہے تو میں بھی شدید جذباتی ہو گئی تھی۔ سالار اکبر اس واقعے کو اپنے ذہن میں تازہ کرنے کے سبب ہی غالباً اب تک خاموش تھا۔ اسی دوران میں تیزی کے ساتھ میرا ذہن بھی کام کر رہا تھا۔ قدرت نے مجھے جو حیرت انگیز صلاحیتیں عطا کی تھیں' ان میں سے ایک حافظہ بھی تھا۔ جن کا ذکر سالار اکبر نے کیا تھا' ان لمحات کی ایک ایک تفصیل میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ میں اسی لئے سالار اکبر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "اگر سالار اعلیٰ مجھے بولنے کی اجازت دیں تو شاید میں بھی وہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر سکوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سالار اکبر اس وقت زخمی حالت میں تھے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ولیم سے دور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یوں بھی اس واقعہ سے براہ راست میرا ہی تعلق تھا۔ سالار اکبر اور عادل نے میری درخواست پر ژیان کے اغوا میں میرا ساتھ دیا تھا۔"

"مجھے علم ہے۔" سالار اعلیٰ نے کہا اور پھر مجھے بولنے کی اجازت دے دی۔

"میں اپنے دشمن کو مخصوص انداز میں اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا چاہتی تھی۔" میں نے بولنا شروع کیا۔ "اس کے لئے کوٹھی کے لان کو منتخب کیا گیا۔ تمام انتظامات مکمل تھے۔ میرا دشمن کوٹھی کے تہہ خانے میں بے ہوش پڑا تھا۔ رگھوویر دو افراد کو ساتھ لے کر تہہ خانے میں گیا اور اسے بے ہوشی کی حالت ہی میں اٹھوا لایا۔ میں اس کے ہوش میں آنے کی منتظر تھی تاکہ وہ مرنے سے پہلے یہ جان سکے کہ اسے قتل کرنے والا کون ہے؟ اس پر سالار اکبر نے خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں وہ ہوش میں آنے کے بعد چیخنا چلانا شروع نہ کر دے۔ سالار اکبر کا خدشہ غلط نہیں تھا۔ اس طرح پہاڑ گنج والی کوٹھی کے ارد گرد رہنے والے

لوگ ادھر متوجہ ہو سکتے تھے۔ میں نے کہا کہ اس کے منہ پر کپڑا بندھوا دیں۔ رگھوویر نے ایک شخص کو بھیج کر کپڑا منگوا لیا۔ پھر جب وہ ژیان کے منہ پر کپڑا باندھنے اس کے قریب پہنچا تو میری طرف مڑ کر بولا' معبلہ! اسے ہوش آ چکا ہے۔ میری بجائے سالار اکبر بول اٹھے کہ جلدی کرو' اس کے منہ پر کپڑا باندھ دو۔ میں اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ اٹھ کر ژیان کی طرف لپکی تو وہ چیخ اٹھا' نو.......... نو' لسن می' یہ الفاظ میری سماعت پر بھاری پتھر کی طرح گرے تھے۔ وہ آواز ہرگز میرے دشمن ژیان کی نہیں تھی۔ میں اب اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ مجھے مس گریٹا کہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ میرا دشمن ژیان نہیں' سیکرٹ سروس کا سربراہ ولیم رائٹ تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس وقت جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے شدید غصے کے عالم میں اس کے سر پر موجود بڑے بڑے بالوں کی وگ پکڑ کر کھینچ لی۔ وگ کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر چڑھا ہوا ماسک بھی میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں اس کے پہلو میں لات مار کے چیخ اٹھی کہ بول ژیان کہاں ہے؟ تو نے اس کی جگہ کیوں لی؟ پہلو پر پڑنے والی دوسری ضرب کے نتیجے میں وہ چیخا اور پہلو کے بل گر پڑا۔ عادل اور سمیع اللہ دوڑتے ہوئے قریب آ گئے اور ان کے پوچھنے پر میں نے بتا دیا' وہ کون ہے' پھر جھک کر میں نے ولیم کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا تو وہ دوبارہ چیخنے لگا۔ سالار اکبر دور ایک کرسی پر بیٹھے تھے انہوں نے بلند آواز میں مجھے مخاطب کیا کہ یہاں اسے زدوکوب نہ کریں' اندر لے چلیں۔ مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے اور پھر.........."

"بس اتنا کافی ہے معبلہ۔" سالار اعلیٰ بول اٹھا۔ "وہ گمشدہ کڑی مل چکی ہے جس کی تلاش تھی۔"

سالار اعلیٰ کی بات سن کر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ وہاں موجود دوسرے افراد کے چہروں پر بھی حیرت نظر آ رہی تھی۔

"بعض اوقات واقعات اتنی تیزی کے ساتھ پیش آتے ہیں کہ ہماری توجہ کسی اہم نکتے پر مرکوز نہیں ہو پاتی۔ یہ واقعہ بھی اسی نوعیت کا تھا۔" سالار اعلیٰ بولا۔ اس کی روشن آنکھیں مزید روشن نظر آنے لگی تھیں۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ "اس واقعے میں وہ لمحات انتہائی اہم اور توجہ طلب ہیں جب رگھوویر' ولیم کو ژیان سمجھ کر اس کے منہ پر کپڑا باندھنے قریب پہنچا۔ اس نے مڑ کر کہا تھا' معبلہ! اسے ہوش آ چکا ہے۔ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟" سالار اعلیٰ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "اسی کے بعد آپ لپکتی ہوئی ولیم تک پہنچ گئی تھیں۔"

میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ میں نتیجہ اخذ کر چکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں سالار اعلیٰ کی ذہانت کا اعتراف کیا اور بولی۔ "ہوش میں آتے ہی ولیم رائٹ کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں گریٹا نہیں معبلہ ہوں۔ اس عیار نے مجھے گریٹا کہہ کر یقیناً دھوکا دیا تھا۔ اسی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وزارت داخلہ کے جوائنٹ سیکرٹری فلپ کو اس کے عہدے سے کیوں سبکدوش کر دیا گیا۔ فلپ ہی نے گریٹا کی حیثیت سے میری ملاقات ولیم سے کرائی تھی۔ فلپ کلکتے سے دہلی تک میرا ہم سفر رہا تھا۔ وہ بھی میری اصل شخصیت سے آگاہ نہیں تھا کیونکہ میں نے رازداری کے سبب اسے اپنا نام رانی بتایا تھا۔ سفر کے دوران میں میرے دشمنوں نے ایک اور ہم سفر راجا سکھ دیو کو قتل کرا دیا۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ

راجا سکھ دیو کے قتل کا الزام مجھ پر عائد ہو جائے۔ اس قتل کی تفصیلات اخبارات میں آپ لوگوں کی نظروں سے گزر چکی ہیں۔ فلپ کا تعلق چونکہ وزارت داخلہ سے تھا اس لئے میں اس کے توسط سے ولیم رائٹ اور رابرٹ ہیم تک پہنچنا چاہتی تھی۔" یہ بیان کرتے ہوئے میں اس بات کو مصلحتاً گول کر گئی کہ بدکردار فلپ میرے قرب کے حصول کا متمنی تھا۔ میں نے اس بات کو دوسرا رخ دے دیا۔ "خوش قسمتی سے میری ملاقات ایک رات فلپ سے ہو گئی۔ یہ اس رات کا واقعہ ہے کہ جب میں پہلی مرتبہ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا جائزہ لینے گئی تھی۔ تفصیل سے قطع نظر فلپ کو میں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گئی۔ رانی کی حیثیت سے کیونکہ میں' راجا سکھ دیو کے قتل میں مطلوب تھی اس لئے فلپ نے مصلحتاً ولیم کو میرا نام گریٹا بتایا۔ یہ راز کھلنے کے بعد کہ گریٹا اور معبلہ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں' فلپ سے پوچھ کچھ کی گئی ہوگی پھر یہ بات بھی راز نہ رہ سکی ہوگی کہ رانی بھی میرا ہی فرضی نام تھا۔"

"معبلہ! آپ کا تجزیہ درست معلوم ہوتا ہے۔" سالار اعلیٰ نے مجھ سے اتفاق کیا پھر کہنے لگا۔ "یہ معاملہ دراصل بنگال کے چیف انٹیلی جنس ڈیسوزا کے اغوا سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا قیاس ہے' نیز مصدقہ اطلاعات کے مطابق آپ ڈیسوزا کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ ڈیسوزا سے آپ کو جو معلومات حاصل ہوئیں انہی کی روشنی میں آپ نے کلکتے سے دہلی آنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں آنے کے بعد ولیم رائٹ اور رابرٹ ہیم کی نگرانی کرانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ڈیسوزا نے آپ کو انہی دو اعلیٰ حکام کے بارے میں کچھ بتایا ہوگا۔" سالار اعلیٰ خطرناک حد تک ذہین ثابت ہو رہا تھا۔ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں وہ میری اصل شخصیت تک نہ پہنچ جائے۔ اس کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ "معبلہ! انگریز حکمران آپ کی طرف سے کیوں متجسس ہیں؟ اس سوال سے قطع نظر اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کا اور ہمارا دشمن ایک ہی ہے۔ ایسی صورت میں کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گی کہ ڈیسوزا سے آپ کو کیا معلوم ہوا؟"

میں نے اس سوال کا جواب دینے میں دیر نہیں کی۔ "ڈیسوزا سے یہی پتا چلا تھا کہ مرکزی حکومت کے دو اعلیٰ حکام کے ایما پر میرے متعلق چھان بین کی جا رہی ہے۔"

"یعنی اس نے رابرٹ ہیم اور ولیم رائٹ کے نام لئے؟"

"جی ہاں۔" میں نے تصدیق کر دی۔

"اب ہم اس معاملے پر ازسرنو غور کر سکتے ہیں کیونکہ کئی باتیں واضح ہو چکی ہیں۔" سالار اعلیٰ نے کہا۔ "نمبرایک یہ کہ سیکرٹ سروس کا سربراہ ولیم رائٹ' معبلہ کے اس ٹریپ میں نہیں آ سکا کہ وہ معبلہ نہیں گریٹا ہیں' کوئی گروہ بند جرائم پیشہ عورت۔ ایسی صورت میں اس نے غالباً یہی نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ معبلہ کو دہلی میں سرفروش تنظیم کا تعاون حاصل ہے۔ کوئی حکومت دشمن زیر زمین تنظیم ہی ایسا ٹارچر سیل قائم کر سکتی ہے جیسا کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مختلف قیاسات اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس جیسی محفوظ جگہ سے ولیم کو اغوا کر کے لے جانا بھی شامل ہے۔ ایسا کسی منظم گروہ کے بغیر ممکن نہیں جو انتہائی ترتیب یافتہ ہو۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی یقینی ہے کہ حکومت کو معبلہ

کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا بھی علم ہے۔ ایسی صورت میں حکومت ہرگز یہ نہیں چاہے گی کہ اس کے خلاف سرگرم عمل دو قوتیں یک جا ہو جائیں یا کسی بھی سطح پر ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں۔ اب تک پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں ملٹری انٹیلی جنس کے چیف رابرٹ ہیم سے معبلہ کا ٹکراؤ نہیں ہو سکا۔ اس کے باوجود حکومت نے اسے بھی گویا سکرین سے آؤٹ کر دیا۔ ولیم اور فلپ کی معزولی تو سمجھ میں آتی ہے' لیکن رابرٹ ہیم کو کس قصور کی سزا ملی؟ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ معبلہ کے سلسلے میں جو دو اعلیٰ حکام سرگرم تھے یا جن کے احکام پر معبلہ کے متعلق تحقیقات جاری تھیں' انہیں منظر سے ہٹا دیا گیا۔"

"پھر تو حکومت کے تازہ تر اقدامات معبلہ تک ہی محدود نظر آتے ہیں۔" سالار اعلیٰ کے خاموش ہوتے ہی ایک شخص نے اظہار کیا۔

"جی ہاں' حکومت کا مقصد ہمیں یہی باور کرانا ہے۔" سالار اعلیٰ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "حکومت کو یقیناً یہ خبر ہے کہ ہم اس کے اقدامات پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور اس نے اسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ حکومت ہمیں اس دھوکے میں مبتلا کر کے ہم پر بھرپور ضرب لگانا چاہتی ہے۔ جو اقدامات کئے گئے ہیں' وہ محض دھوکے کی ٹٹی ہیں۔ ان کا مقصد محض یہ ہے کہ ہم اس بڑے آپریشن کی طرف سے غافل ہو جائیں جو ملک گیر سطح پر ہمارے خلاف کیا جانے والا ہے۔ حکومت کے جو مہرے کسی بھی سبب ہماری نظر میں آ چکے ہیں' بساط سیاست سے ان کی جگہ نئے مہرے ہمیں فریب دینے کے لئے لائے گئے ہیں ورنہ صورت حال بدستور وہی ہے جو پہلے تھی۔ اس طرح حکومت معبلہ کو بھی اندھیرے میں رکھنا چاہتی ہے اور ہمیں بھی۔ اسی ضمن میں حکومت نے معبلہ کے دشمن ژیان کو جو تحفظ فراہم کیا ہے' وہ بھی معنی خیز ہے۔ ژیان کے متعلق سالار اکبر کے شعبے نے یقیناً گراں قدر معلومات حاصل کی ہیں۔ میں بہ وجہ سالار اکبر سے درخواست کروں گا کہ وہ اب اس سلسلے میں رازداری سے کام نہ لیں۔"

سالار اعلیٰ کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ژیان کے بارے میں حقائق کا علم میری اصل شخصیت سے بھی پردہ اٹھا سکتا تھا۔

"میں پہلے معبلہ سے معذرت خواہ ہوں کہ سالار اعلیٰ کے حکم پر انہیں ژیان کے متعلق حاصل کردہ معلومات سے بے خبر رکھا۔" سالار اکبر بولا۔ "اس کا سبب خود معبلہ ہیں۔ کلکتے کے دوران قیام میں معبلہ کو سرفروش تنظیم کی رکنیت اختیار کرنے کی پیشکش کی گئی تھی۔ تنظیم کی رکنیت کے لئے جو شرائط ہیں' آپ سبھی حضرات ان سے واقف ہیں۔ معبلہ نے محض اپنے ماضی کے متعلق کچھ بھی ظاہر نہ کرنے کے سبب یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ اس وقت تک معبلہ کے متعلق تنظیم کو بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا۔ ہمیں صرف یہ معلوم تھا کہ وہ یقیناً کوئی اہم شخصیت ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حکومت ان کے بارے میں متجسس نہ ہوتی۔ پھر جب معبلہ کلکتے سے دہلی آئیں تو ہمیں نگران اعلیٰ کی طرف سے جو احکام ملے' ان میں یہ حکم بھی شامل تھا' معبلہ پر اس سلسلے میں کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے کہ وہ اپنے ماضی سے پردہ اٹھا دیں۔ سو معبلہ خود بھی گواہ ہیں کہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد جب معبلہ کے حریف ژیان کا معاملہ سامنے

آیا تو خود بہ خود بہت سی باتیں سامنے آتی گئیں۔ ژیان نے حکومت سے سیاسی پناہ حاصل کی تھی۔ معلوم ہوا کہ ژیان کا تعلق کوہستان ہمالیہ کی ایک خود مختار اور آزاد ریاست سے تھا جس پر اس نے ناجائز قبضہ کر لیا تھا۔ یہ قبضہ قائم رکھنے میں نامعلوم وجوہ کی بناء پر انگریز حکومت نے بھی اس کی مدد کی تھی' لیکن اسے شکست ہوئی۔ ژیان نے وہاں سے فرار ہو کر ہندوستان میں پناہ لی پھر ژیان اور معبلہ کے درمیان دشمنی کا سبب بھی سمجھ میں آنے لگا۔ ان حالات میں یہی قیاس کیا گیا کہ وہ آزاد مملکت کہ جس پر ژیان نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا' اس کا کوئی نہ کوئی تعلق معبلہ سے ضرور تھا۔ اس ضمن میں تنظیم کے مرکزی شعبہ سراغ رسانی نے بھی ہماری مدد کی۔ چند روز قبل مرکزی شعبے کی طرف سے جو رپورٹ ملی' اس سے حقیقت واضح ہو گئی پھر یہ پتا چل گیا کہ معبلہ اس خود مختار آزاد ریاست کی سربراہ ہیں جس کا ذکر ابھی میں نے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے دشمن ژیان ہی کا تعاقب کرتی ہوئی ہندوستان پہنچی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو رازداری برتی وہ بھی خلاف مصلحت نہیں تھی۔ شاید وہ اس طرح اپنے حریف کو اپنی سرگرمیوں سے لاعلم رکھنا چاہتی ہوں گی۔ ہمیں گذشتہ روز نگران اعلیٰ کی طرف سے یہ پیغام ملا' اگر ضرورت اور حالات کا تقاضا یہ ہو کہ معبلہ کو حقائق سے آگاہ کر دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ نگران اعلیٰ کو شاید اس سے بہتر نتائج کی توقع ہوگی۔" سالار اکبر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

جو بات میں نے اب تک سرفروش تنظیم سے پوشیدہ رکھی تھی' وہ ظاہر ہو گئی تھی۔ میں اسی لئے خود کو کچھ چور چور سا محسوس کر رہی تھی۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ گویا میں نے تنظیم پر اعتماد نہیں کیا تھا۔

اسی وقت سالار گرچن سنگھ بول اٹھا۔ "اس سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز حکومت بھی معبلہ کی اصل حیثیت و شخصیت سے آگاہ ہے۔"

سالار اعلیٰ نے اس سے اتفاق کیا۔

"پھر معبلہ کے متعلق چھان بین اور تحقیقات کا کیا جواز پیدا ہوتا ہے؟" سالار گرچن سنگھ نے ایک ایسا اہم سوال کیا کہ میں بھی چونک اٹھی۔

"اس کا مقصد معبلہ کو الجھائے رکھنا بھی ہو سکتا ہے۔" سالار اعلیٰ کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اظہار کیا۔ وہ بھاری بھر کم شخصیت کا مالک تھا۔ میں نے اس کے متعلق یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ سالار اعلیٰ کا نائب بھی ہو سکتا ہے۔

"نہیں۔" سالار اعلیٰ نے انکار میں سر ہلایا۔ "اس کے پس پشت یقیناً کچھ اور نامعلوم عوامل کارفرما ہیں۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ انگریز حکومت ایک بار پھر معبلہ کے حریف ژیان کو اس ریاست میں برسراقتدار لانا چاہتی ہو' اس کے کچھ مفادات مذکورہ ریاست سے وابستہ ہوں۔" سالار اکبر نے کہا۔

"اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' لیکن بہت سی باتیں اس مفروضے کے خلاف جاتی ہیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو حکومت اب تک معبلہ کو قتل کرا چکی ہوتی۔ اسی کے بعد وہ کوئی دوسرا قدم

اٹھاتی۔" سالار گرچن سنگھ نے کہا۔ "معبلہ بہرحال ایک ریاست کی سربراہ ہیں۔ وہ اگر اپنے حریف کے تعاقب میں ہندوستان آئی ہیں تو اپنے پیچھے انہوں نے ایسے انتظامات ضرور کئے ہوں گے کہ ان کی حکومت کو کوئی خطرہ نہ ہو' ان کی حریف قوتیں انہیں اقتدار سے محروم نہ کر سکیں۔ یہ علم انگریز حکومت کو بھی ہو گا۔ معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں لگتا جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ بہرحال اس تمام بحث سے قطع نظر ایک دور دراز ریاست کی سربراہ ہونے کی حیثیت سے معبلہ ہمارے لئے قابل احترام ہیں۔ ان کے مسائل کچھ اور ہیں۔ وہ ہماری مہمان ضرور ہیں لیکن تنظیم کی رکنیت ان کے لئے میرے خیال میں لازمی نہیں' نہ کسی اعزاز کا باعث ہے۔"

"اس کے باوجود میں کم از کم اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ معبلہ ہماری تنظیم کے مقاصد سے اتفاق کرتی ہیں۔" سالار اکبر کی آواز میں اعتماد تھا۔

میرے لئے اب کچھ نہ کچھ کہنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ سو مجھے بولنا ہی پڑا۔ "دولت و اقتدار میرا مسئلہ نہیں۔ نہ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں کسی ریاست کی سربراہ ہوں۔ اس کے برعکس میں آپ کی تنظیم کی رکنیت کو اپنے لئے ضرور باعث اعزاز سمجھتی ہوں۔ آپ جو ظلم کے خلاف برسرپیکار ہیں' میری نظر میں قابل تعظیم لوگ ہیں۔ جس طرح میری چھوٹی سی ریاست پر ایک ظالم شخص نے ناجائز قبضہ کر لیا تھا' اسی طرح اس ملک پر میں انگریزوں کے قبضے کو ناجائز تصور کرتی ہوں۔ جس طرح میں نے بہت چھوٹے پیمانے پر ظلم کے خلاف طویل جدوجہد کی ہے' اسی طرح آپ لوگ غیر ملکی غاصبوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے کے لئے سینہ سپر ہیں۔ میرے ماضی سے پردہ اٹھ چکا ہے جو تنظیم کی رکنیت اختیار کرنے میں حائل تھا۔ اب میں خود اس کے لئے درخواست کرتی ہوں۔ جب تک آپ کے ملک میں ہوں' آپ کی جنگ میری جنگ ہے۔" میری آواز میں جوش تھا۔

دیر تک اجلاس کا کمرا تالیوں سے گونجتا رہا۔ میرے جذبات و احساسات کی ان لوگوں نے زبردست حوصلہ افزائی کی۔

تالیوں کا شور تھما تو میں نے پھر بولنا شروع کیا۔ اس کے باوجود جن باتوں کو راز میں رکھنا اب بھی ضروری تھا' میں نے انہیں راز رکھا۔ "آپ حضرات کا قیمتی وقت تو ضرور ضائع ہو گا مگر میں اپنے بارے میں مزید چند باتیں بتا دینا چاہتی ہوں۔ میں اپنے دشمن ژیان کو جس طرح قتل کرنا چاہتی تھی' اس پر سالار اکبر اور تنظیم کے دیگر افراد کو حیرت ہوگی۔ شاید اس وقت انہوں نے سوچا ہو کہ میں کوئی انتہائی ظالم و سفاک شخصیت کی مالک ہوں۔ میں اس کی وجہ ضرور بیان کروں گی۔" میں نے اپنے بابا سردار اشم اور ماں کے بہیمانہ قتل کی روداد بیان کر دی۔ پُراسرار سرگوشیوں کا ذکر میں نے دانستہ نہیں کیا۔ اس کے بعد ژیان کے خلاف اپنی جدوجہد اور کامیابی کا مختصراً ذکر کیا' پھر میں نے واضح کیا۔ "میری اس تمام تر کاوش کا مقصد حصول اقتدار ہرگز نہیں تھا بلکہ میں اپنی بستیوں کے مظلوم عوام کو ایک ظالم سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ اسی کے ساتھ میرا مقصد اس ظالم سے انتقام لینا بھی تھا' اس ظلم کا انتقام جو اس نے حصول اقتدار کی خاطر میرے بابا اور ماں پر کیا' وہ ظلم جو اس نے میری بستیوں کے عوام پر کیا۔ میں نے اپنے جاں نثاروں

میں سے ایک معتبر ساتھی کو اپنی جگہ نائب مقرر کیا اور دانستہ تنہا اپنے دشمن کا تعاقب کرتی ہوئی اس ملک میں پہنچ گئی۔ قدرت نے مجھے کچھ ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے جن کی بناء پر عموماً میں اپنے دشمنوں پر غالب آئی۔ میرا ایمان ہے کہ شر کے مقابل آخرکار خیر ہی کو فتح نصیب ہوتی ہے' خیر ہی شر پر غالب آتا ہے۔ ہاں اس میں کچھ سخت مقام ضرور آتے ہیں' آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے' قربانیاں دینا پڑتی ہیں' آپ لوگ مجھ سے زیادہ ان باتوں کو سمجھتے ہیں' مجھ سے زیادہ تجربہ کار اور ذہین ہیں۔ اگر آپ نے مجھے بھی اپنا ایک ساتھی بنانا قبول کر لیا تو میں کوشش کروں گی کہ قدم سے قدم ملا کر چل سکوں۔ اگر کوئی سخت مقام آیا تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ .... میرا خون میرے پنجوں پر گرے گا' ایڑیوں پر نہیں.........“ میری پُرجوش آواز بلند ہو گئی۔ ایک مرتبہ پھر تالیوں کی گونج کمرے میں ابھری اور معدوم ہو گئی۔ میں دوبارہ بولنے لگی۔ اس مرتبہ میری آواز قدرے پُرسکون تھی۔ ”میں جس لئے پہاڑوں سے اتر کر آئی ہوں' آپ پر واضح ہو چکا ہے۔ میری مجبوریوں کو بھی آپ پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔ حکومت وقت کے ساتھ ساتھ کچھ شیطانی قوتیں بھی میرے خلاف برسرپیکار ہیں۔ قدرت نے مجھے ان سے نبرد آزمائی کا حوصلہ بھی عطا کیا ہے۔ میرے عرض کرنے کا مقصد ہرگز احساس برتری نہیں بلکہ اس ممکنہ کوتاہی کا اظہار ہے جو شاید مستقبل میں کبھی مجھ سے سرزد ہو جائے۔ میں نے اس ضمن میں جو کچھ عرض کیا' سالار اکبر بھی اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔ آپ کی تنظیم کی رکنیت کے لئے درخواست کے ساتھ ساتھ میں صرف اتنی رعایت کی طلب گار ہوں کہ آپ کے شانہ بشانہ ظلم کے خلاف جنگ لڑتے ہوئے ان مقاصد کے حصول کو بھی نظرانداز نہ کروں جن کی خاطر ہندوستان آئی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ حالات کے پیش نظر میرے ساتھ رعایت برتی جائے گی۔“ اس کے بعد میں خاموش ہو گئی اور متوقع نظروں سے سالار اعلیٰ کو دیکھنے لگی۔

”قابل احترام معبلہ خاتون نے ہمارے لئے اور ہماری تنظیم کے لئے جن گراں قدر خیالات اور جذبات کا اظہار کیا ہے' میں اس پر اپنے تمام ساتھیوں کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ سالار اعلیٰ نے کہا۔ ”ہمارے لئے یقیناً یہ امر باعث اعزاز ہے کہ ایک ریاست کی سربراہ ہونے کے باوجود وہ ہماری جنگ کو اپنی جنگ سمجھتی ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی تنظیم کے نگران اعلیٰ کی جانب سے پہلے ہی احکام مل چکے ہیں۔ آپ تمام حضرات کو بھی میں ان احکام سے آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ احکام معبلہ خاتون کی منظوری کے بعد ہندوستان بھر میں موجود ہر شاخ کے سالار اعلیٰ تک پہنچا دیئے جائیں گے۔ ہماری تنظیم میں شمولیت کے بعد معبلہ خاتون کسی بھی سالار' سالار اعلیٰ یا کسی اور عہدیدار کے حکم کی پابند نہیں ہوں گی۔ وہ ہندوستان بھر میں جہاں بھی جائیں گی انہیں اس شہر یا علاقے کے سالار اعلیٰ کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ یہی معاملہ تنظیم میں ان کے اختیارات کا ہے۔ اس نئے عہدے کو اعزازی سالار اعلیٰ کہا جائے گا۔“ اس کے بعد شہر دہلی کا سالار اعلیٰ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”معبلہ خاتون! نگران اعلیٰ نے مجھے آپ کی منظوری لینے کا پابند کیا ہے' اس لئے میں ملتمس ہوں کہ اپنی منظوری یا نامنظوری سے آگاہ کریں۔“

”میں آپ کی تنظیم کے نگراں اعلیٰ کی تہہ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے مجھے یہ عزت بخشی۔“ میرے ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک بار پھر تالیاں بجیں۔

سالار اعلیٰ نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مجھے مبارک باد دی۔ یہ بھی میرے لئے عزت و تکریم کا اظہار ہی تھا۔ پھر وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ”آپ کے ولولہ انگیز الفاظ نے ہمارے دلوں کو گرما دیا ہے۔ آپ نے ہماری جنگ کو اپنی جنگ کہا ہے' سو ہم بھی آپ کی جنگ کو اپنی ہی جنگ سمجھتے ہیں۔ ہمیں بھی آپ پشت دکھانے والوں میں نہیں پائیں گی۔“ پہلی مرتبہ سالار اعلیٰ کا لہجہ بھی پُرجوش ہو گیا۔

”مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔“ میں بولی۔

پھر سالار اعلیٰ نے اجلاس برخاست ہونے کا اعلان کر دیا۔ اجلاس کی باقاعدہ کارروائی ختم ہو گئی تو چائے سرو کی گئی۔ اسی دوران میں وہاں موجود تمام نئے چہروں سے میرا تعارف کرایا گیا۔ اس کی ابتداء سالار اعلیٰ نے کی۔ ”خادم کو قدیر بیگ کہتے ہیں۔“ اس کے بعد قدیر بیگ نے اپنی دائیں جانب بیٹھے ہوئے بھاری بھرکم شخص کا تعارف کرایا۔ ”اور یہ ہیں نگران اعلیٰ کے دہلی میں متعین نمائندے امرناتھ جی۔“

امرناتھ کو میں سالار اعلیٰ کا نائب سمجھی تھی مگر نائب وہ شخص تھا جو بائیں جانب بیٹھا تھا۔ نائب سالار اعلیٰ ایک دیسی عیسائی جیکسن تھا۔ ان افراد کے علاوہ سالار ہری بابو اور سالار وحید الدین بھی اپنے اپنے نائبین کے ساتھ اجلاس میں شریک تھے۔ عادل کے بارے میں پہلی بار مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ سالار اکبر کا نائب تھا۔ سالار گرچن سنگھ کا نائب بھی میرے لئے اجنبی ہی تھا۔

دہلی میں تنظیم کے جتنے بھی اہم افراد تھے' ان سبھی نے اس اجلاس میں شرکت کی تھی۔ شہر میں چار سالار تھے جن کے شعبے اور ذمے داریاں الگ الگ تھیں۔ وہ چاروں ہی نائب سالار اعلیٰ کو جواب دہ تھے اور نائب سالار اعلیٰ' شہر کے سالار اعلیٰ کو جواب دہ تھا۔ نگران اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سالار اعلیٰ کے مشیر کی سی تھی۔ مگر سالار اعلیٰ کو اس کے مشوروں کا پابند نہیں کیا گیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے مجھے ان تمام باتوں سے بھی آگہی حاصل ہو گئی۔

نگران اعلیٰ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے امرناتھ نے مجھے سونے کی ایک زنجیر بھی پہنائی۔ وہ مخصوص ساخت کی زنجیر انگریزی حرف ایس کو ایک دوسرے سے جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ یہ زنجیر سرفروش تنظیم سے میری باقاعدہ وابستگی کی علامت تھی۔ ایسی ہی زنجیر میں نے قدیر بیگ کے گلے میں پڑی ہوئی دیکھی تھی۔

سالار اکبر کے شعبے سے تو میں پہلے ہی واقف تھی۔ گرچن سنگھ کا شعبہ حرب و ضرب' ہری بابو کا شعبہ مالیات اور وحیدالدین کا شعبہ نئے ارکان کی تربیت تھا۔ اس کے علاوہ ہنگامی حالات میں کوئی بھی سالار کسی بھی شعبے کی ذمے داریاں سنبھال سکتا تھا۔ یہی صورت سالار اعلیٰ اس کے نائب اور نگران اعلیٰ کے نمائندے کے ساتھ بھی تھی۔

اعزازی سالار اعلیٰ ہونے پر اجلاس میں شریک تمام ہی افراد مجھے مبارک باد دینے کے بعد ایک ایک

کرکے رخصت ہوتے گئے۔ میں سب سے آخر میں عادل کے ساتھ باہر آئی۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد غیر رسمی گفتگو کے دوران ہی مجھے عادل کے رویے میں تبدیلی محسوس ہو گئی تھی۔ یہ تبدیلی مثبت ہی تھی منفی نہیں، لیکن مجھے قبول نہیں تھی۔ ایک ہی تو شخص تھا جس کے ساتھ میں قدرے بے تکلفی سے بات کر لیتی تھی، وہ بھی اگر میرا احترام کرنے کے چکر میں غیر ضروری طور پر سنجیدہ ہو جاتا تو یہ کچھ نامناسب ہوتا۔ میں نے دانستہ اسی لئے کمرے سے نکلنے میں جلدی نہیں کی تھی۔ عہدے اور اختیارات بھی عجیب ہوتے ہیں کہ آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتے۔ میں عقیدت و احترام کی انتہا دیکھ چکی تھی، ایسا احترام کہ مہذب دنیا میں جس کا تصور بھی محال ہے۔ مجھے آتون دیوی کہا جاتا تھا اور لوگ میرے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے تھے، لیکن میری روح نے کبھی اسے قبول نہیں کیا۔ آدمیت کی یہ تذلیل مجھے گوارا نہیں تھی۔ پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں کی طرف آنے سے پہلے ہی میں نے لوگوں کو ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ آج مجھے جو تکریم و عزت دی گئی تھی، وہ میرے ماضی کے مقابلے میں برائے نام ہی تھی۔ پھر بھی عرصہ دراز سے میں جو زندگی گزار رہی تھی، اس میں بہرحال یہ ایک نمایاں تغیر تھا۔ ایک مجھے ہی کیا، ہر آدمی کو قدرت نے یہ وصف عطا کیا ہے کہ وہ خود کو حالات کے مطابق ڈھال لینے کی اہلیت رکھتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اسی کا عادی ہو جاتا ہے۔ مہذب دنیا میں آنے کے بعد میں نے بھی خود کو حالات کے مطابق ایڈجسٹ کر لیا تھا۔

"پنڈت جی!" میں نے عادل کے ساتھ راہداری میں آگے قدم بڑھاتے ہوئے اچانک اسے مخاطب کیا۔

"جی فرمایئے۔" وہ بدلے ہوئے رویے کے مطابق ہی بولا۔

"یہ کیا بکواس شروع کر دی ہے تم نے ارمایئے فرمایئے۔ میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں چلے گا، سمجھے۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"سمجھ گیا، مگر ڈرا کیوں رہی ہیں؟"

"ہیں نہیں ہو، جس طرح پہلے انسانوں کی طرح مجھ سے بات کرتے تھے، اسی طرح اب بھی.........."

"مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ میں بھی ایک عدد انسان ہوں۔" اس کے لہجے کی شوخی واپس آنے لگی۔

"یہ بات ہوئی نا۔" میں دھیرے سے ہنس دی۔ "ظاہر ہے تم نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا ہو گا، چلو ساتھ ہی کھائیں گے۔"

"حکم حاکم مرگ مفاجات۔" اس نے آہستہ سے کہا، ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "چلئے۔" وہ میرے ساتھ ہو لیا۔

"پھر وہی، چلئے نہیں چلو۔"

"اچھا بابا چلو۔"

"بابا نہیں بے بی۔" میں نے پھر ٹوکا۔ "تمہیں میری صنف بدلنے کا کوئی اختیار نہیں پنڈت بال

کنڈ"

"اس وقت اکیلے میں زبردستی جو کہلواؤ گی کہہ دوں گا اور بعد میں مکر جاؤں گا۔" وہ ہنس دیا۔

جو فضا مجھے گراں گزر رہی تھی، وہ بدل گئی۔ عادل اپنی ڈگر پر واپس لوٹ آیا۔ میں اسے ساتھ لئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ خلاف توقع کویتا غائب تھی۔ میں نے دلاری کو بلا کر اس کے بارے میں پوچھا تو دلاری نے بتایا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تو میں نے انہیں کمرے میں دیکھا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے، تم رحمان سے کھانے کے لئے کہہ آؤ۔ پنڈت جی بھی میرے ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔"

"میں خود ہی رسوئی (باورچی خانہ) سے کھانا لے آتی ہوں۔" دلاری یہ کہہ کر چلی گئی۔

"معلوم ہوتا ہے کویتا کو غائب ہونے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔" عادل نے کہا۔

"کمرے میں تنہا پڑے پڑے تنگ آ گئی ہوگی، گھومنے پھرنے چل دی ہوگی کہیں۔" میں نے یہ کہہ کر عادل کو تو مطمئن کر دیا مگر خود کویتا کی طرف سے فکرمند ہی رہی۔ اگر اسے کہیں جانا ہی تھا تو مجھ سے پہلے کہہ دیتی۔ میری فکرمندی کی وجہ اس کے اچانک غائب ہو جانے کے علاوہ کچھ اور بھی تھی۔

جلد ہی دلاری کھانا لے کر آ گئی۔ میں سوچنے لگی کہ اگر کویتا بھی اس وقت موجود ہوتی تو ساتھ ہی کھانا کھا لیتی۔ رہ رہ کے مجھے اس کا خیال آ رہا تھا۔

کویتا کی طرف سے اپنا دھیان بٹانے کے لئے میں نے عادل سے ایک اور ذکر چھیڑ دیا۔ "آج سالار اکبر نے اجلاس میں میرے متعلق جو انکشاف کیا، تمہیں اس کا علم تھا۔"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"میں نے اس لئے یہ پوچھا کہ تم بہرحال ان کے نائب ہو۔" میں نے وضاحت کی۔

"ضروری نہیں کہ اپنے سالار کی ہر بات اس کے نائب کو معلوم ہو۔ یہ معاملہ تنظیم کی اعلیٰ سطح پر چل رہا تھا۔ میرا خیال ہے سالار اعلیٰ اور سالار اکبر کے سوا کسی کو اس کا پہلے سے علم نہیں تھا۔ سالار اکبر نے تمہارے متعلق جو کچھ کہا خود میرے لئے بھی انکشاف ہی تھا۔" عادل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں چائے پی رہے تھے تو کویتا کمرے میں داخل ہوئی۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں، کچھ بتائے بغیر؟" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ کھلے کھلے سے گیسو اور اڑی اڑی سی رنگت بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

"وہ .... اکیلے میں میرا جی کچھ گھبرانے لگا تو .... تو سوچا کہیں گھوم پھر آؤں۔" کویتا کا جواب میری توقع کے مطابق ہی تھا۔ وہ آگے بڑھ کر میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"تم کوٹھی ہی میں تھیں کہ کہیں باہر گئی تھیں؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے کا سوال کیا۔

"باہر.......... باہر ہی گئی تھی۔" وہ کچھ چور چور سی نظر آنے لگی۔

اگر وہ سچ بول رہی تھی تو میرے لئے یہ بات اطمینان بخش تھی۔ عادل کی وہاں موجودگی میں اس

سے زیادہ کچھ اور پوچھنا ممکن بھی نہیں تھا۔

"جہاں بھی جانا ہو کہہ کر جاؤ کرو۔ مجھے تمہاری طرف سے فکر ہو جاتی ہے۔" میرے لہجے میں
آ گئی۔

"جی بہتر ہے کرن جی۔" اس نے نظریں جھکالیں۔

کبھی کبھی زیادہ سختی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اس سے منفی ردعمل بھی سامنے آ جاتا ہے۔ میں نے اسی لئے معاملے کو اپنی دانست میں ختم کرنے کی غرض سے دانستہ نرم رویہ اختیار کرلیا تھا۔ پھر جب وہ خالی برتن اٹھانے آئی تو میں نے کویتا کے لئے بھی کھانا لانے کو کہہ دیا۔

چائے پینے کے بعد میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ عادل بھی چائے پی چکا تھا۔

"میں چہل قدمی کے لئے لان میں جا رہی ہوں' کھانا کھا کر تم بھی وہیں آ جانا۔" میں نے کویتا سے کہا اور عادل کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔

کچھ دور ساتھ چل کر عادل رخصت ہو گیا اور میں کوٹھی کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☆======☆======☆

اجلاس کے بعد اب تک مجھے تنہائی میں کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لان میں آ کر چہل قدمی کرتے ہوئے میں نئی صورت حال پر غور کرنے لگی۔ میں نے اجلاس میں جو کچھ کہا تھا' وہ میرے دل کی آواز تھی۔ میں اس پر مطمئن تھی کہ سرفروش تنظیم میں شمولیت کے باوجود مجھ پر کوئی پابندی نہیں کی گئی تھی۔ میں اپنے حالات کے مطابق کوئی بھی فیصلہ کرنے اور کہیں بھی رہنے کے معاملے آزاد تھی۔ تنظیم میں شمولیت تنظیم سے زیادہ خود میرے حق میں تھی۔ پہلے محدود پیمانے پر مجھے تنظیم تعاون حاصل تھا لیکن اب اس تعاون کا دائرہ انتہائی وسیع ہو چکا تھا۔ میں سارے ہندوستان میں جہاں جاتی مجھے اجنبیت محسوس نہ ہوتی۔ اسی کے ساتھ ایک اور حقیقت بھی مجھ پر واضح ہو گئی۔ عظیم مہین ژیان کو میرے راستے کا محض ایک پتھر کہا تھا۔ مجھے اس نیک روح کے الفاظ یاد تھے۔ "ابھی تو تجھے پہاڑ سے ٹکرانا ہے۔" میں موجودہ حالات کے پس منظر میں ان الفاظ پر غور کرنے لگی۔ میں نے پہاڑوں محدود پیمانے پر حق و باطل کی جنگ لڑی تھی۔ وہاں میرے مقابل ژیان تھا اور یہاں انگریز حکومت۔ اور انگریز حکومت کے درمیان واقعی بہت فرق تھا' زمین و آسمان کا فرق۔ انگریز غاصبوں کے مقابلے ژیان کی حیثیت کسی حقیر پتھر سے زیادہ نہیں تھی۔ کوہستان ہمالیہ کی بلندیوں پر آباد پہاڑی بستیاں ہندو جیسے وسیع و عریض ملک کے سامنے اپنی آبادی اور رقبے کے لحاظ سے بے معنی سی تھیں۔ پہلے سرفر تنظیم سے براہ راست میرا کوئی تعلق نہیں تھا' لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔ صورت حال کی تبدیلی میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔

میں اپنی انہی سوچوں میں گم تھی کہ عرصہ دراز کے بعد عظیم مہین کی پراسرار سرگوشیاں دینے لگیں۔ "اے معبلہ! کبھی تو نے ذاتی اور اجتماعی مفاد پر غور کیا؟ سن کہ وہی لوگ بڑے ہوتے اپنے ذاتی مفادات کو اجتماعی مفادات پر ترجیح نہیں دیتے۔ تو جن راہوں پر ڈال دی گئی ہے' ان میں

لئے بھلائی ہے۔ اپنی سوچ کو محدود نہ رکھ۔ صرف اپنے دشمن کے پیچھے بھاگتے رہنا تیری زندگی کا حاصل نہیں ہے۔ وہ تو زندگی کے کسی بھی موڑ پر خود تیرے قدموں تلے آ کر کچل جائے گا کہ اس کی بساط ہی کیا ہے۔ ظالم کی رسی دراز تو ہوتی ہے پر ایک روز وہ اس طرح منہ کے بل زمین پر گرتا ہے کہ پھر نہیں اٹھتا۔ یہ جو تو سختیوں سے گزری اور گزرے گی تو اس میں بڑی مصلحتیں ہیں۔ زندگی کے سارے بھید ایک دم نہیں کھل جاتے۔ اس میں وقت لگتا ہے اور وقت ہی سب سے بڑا منصف ہے۔ سو وقت کا انتظار کر۔ تیرے ساتھ بھی انصاف ہو گا۔ تیرے بھید بھی تجھ پر ضرور کھلیں گے' پر جلدی نہ کر' برہم ہواؤں کا رخ دیکھ' ریت پر پھول نہ بنا۔"

نیک روح' عظیم مہین کی سرگوشیاں معدوم ہو گئیں' میں اس کے باوجود اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ سرگوشیوں میں مجھ سے جو کچھ کہا گیا تھا' میں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہی تھی۔ ان الفاظ میں میرے نزدیک بنیادی بات ذاتی اور اجتماعی مفاد کی تھی۔ عظیم مہین نے ژیان کے معاملے کو پہلے بھی ثانوی قرار دیا تھا' مگر میں اپنے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کو کس طرح سرد کر دیتی۔ ابھی شاید میں اس مقام تک نہیں پہنچ سکی تھی جہاں آدمی اپنی ذات کے دائرے کو توڑ کر باہر نکل جاتا ہے۔ مجھے اسی کی تلقین کی گئی تھی اور گویا یہ بھی میرے لئے ایک مشکل مرحلہ تھا۔

میں اسی طرح کھڑی ہوئی تھی کہ پتا نہیں کب کویتا میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں چونکی اس وقت کہ جب اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"ہوں۔" میں نے طویل سانس لے کر اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ اپنا حلیہ درست کر آئی تھی۔

مجھے سنجیدہ اور متفکر دیکھ کر شاید وہ کچھ اور ہی سمجھی' کہنے لگی۔ "کرن جی! میری بات کا وشواش (یقین) کریں' میں کوٹھی سے باہر ہی گئی تھی۔"

"تو میں نے تم سے کب کہا کہ جھوٹ بول رہی ہو۔"

"پھر مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟"

"یہ غلط فہمی تمہیں کیسے ہو گئی؟" میں نے آگے قدم بڑھایا اور وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"آپ کو چنتا (فکر) میں دیکھ کر' میری طرف سے آپ چنت (فکرمند) تھیں نا؟"

"میں نے تم سے کہا تھا کہ آسان زبان میں بات کرنے کی عادت ڈالو۔ اب تم چندر موہن کے آشرم میں نہیں ہو۔"

"بھول گئی تھی۔"

"اور ہاں' اس وقت میں ایک اور مسئلے پر غور کر رہی تھی۔" میں نرمی سے بولی۔ "تمہاری طرف سے فکرمند نہیں تھی۔"

اس نے میری بات سن کر لمبا سانس کھینچا جیسے کوئی بوجھ ذہن سے اتر گیا ہو' پھر کہا۔ "ژیان کا کھوج لگانے کے لئے دوبارہ مجھے کب سے جاپ شروع کرنا ہے؟"

"ریت پر پھول نہ بنا۔" مہین کی سرگوشیوں کے آخری الفاظ میرے ذہن میں گونج اٹھے۔

"بتا دوں گی۔" میں نے اسے ٹال دیا۔ "بہرحال ابھی جاپ شروع کرنے کی ضرورت نہیں۔"

کچھ دیر مزید چہل قدمی کے بعد کویتا کے ساتھ میں اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

دوسرے دن صبح جب میں' کویتا کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی تو اس نے مجھ سے پوچھا۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بڑے مہاراج کے آشرم کا ایک چکر لگا آؤں؟ واپسی میں گوپال کی خیر خبر لیتی آؤں گی۔"

"لیکن کس لئے؟"

"دشمن کی طرف سے چوکنا تو رہنا ہی پڑتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

پہلی بار کویتا نے بڑے مہاراج چندر موہن کے لئے لفظ دشمن استعمال کیا تھا۔ شاید اس کا سبب میری خوشنودی حاصل کرنا بھی تھا۔ مجھے بہرحال اس پر خوشی ہوئی۔

"چوکنا رہنا الگ بات ہے اور دشمن کو چھیڑنا دوسری بات۔" میں نے کہا۔ "تم بھی ان دونوں کو اچھی طرح جانتی ہو اور میں بھی کہ چندر موہن اور گوپال دونوں ہی کس قدر کمینے اور خطرناک ہیں۔ جب ہم یہاں ان کی شیطانی قوتوں کے اثر سے قطعی محفوظ ہیں تو پھر خواہ مخواہ خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں کرن جی۔ میں اپنے گرد گھیرا ڈال کر جاؤں گی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ پھر بھی خطرے کی کوئی بات ہوئی تو پلٹ آؤں گی۔"

"تم پہلے بھی تو ایک بار چندر موہن کے آشرم میں داخل ہونے کی کوشش کر چکی ہو۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "جب تمہارے جاپ میں مداخلت کی گئی تھی۔"

"ہاں اس سے مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی پر ہر مرتبہ ناکام ہونا ضروری تو نہیں۔"

"اور تو خیر کوئی بات نہیں' بس اتنا خیال ہے کہ ان دونوں شیطانوں میں سے کوئی تمہیں نقصان پہنچا دے۔" پھر میں نے اسے جانے کی اجازت دے ہی دی۔ اسی وقت مجھے رادھا کا خیال آیا۔ رادھا سے کویتا کی جذباتی وابستگی میرے علم میں تھی۔ وہ دونوں ہی چندر موہن کے دہلی آشرم کی داسیاں تھیں اور ساتھ ساتھ ہی رہتی تھیں۔ کویتا کو آشرم سے فرار کرنے ہی کی خاطر رادھا نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ اگر گوپال درمیان میں نہ آگیا ہوتا تو چندر موہن' رادھا کی گردن اڑا دیتا۔ اسی کے نتیجے میں اب رادھا' گوپال کے پاس تھی۔ چندر موہن اور گوپال کے درمیان معرکہ آرائی کی وجہ ہی سے مجھے فرار ہونے کا موقع ملا تھا۔ ان دونوں کے ٹکراؤ کا کیا نتیجہ ہوا؟ میں اس سے لاعلم تھی۔ قیاس بہرحال یہی تھا کہ چندر موہن ہی گوپال پر بھاری پڑا ہو گا۔ اس وقت کویتا نے گوپال کا ذکر چھیڑا اور واپسی میں ادھر جانے کی بھی کہا تو مجھے رادھا یاد آگئی۔ کویتا شاید اس بہانے رادھا کو دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ بہ خیریت ہے یا نہیں۔ یہی بات میری زبان پر بھی آگئی کیونکہ کویتا ابھی گئی نہیں تھی۔

تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ کویتا نے خود بھی اس کا اعتراف کر لیا پھر مسکرا کر بولی۔ "آپ بڑی ہی بدھی مان ہیں۔"

"بدھی مان کی جگہ تم ذہین بھی کہہ سکتی تھیں۔" میں نے اسے ٹوکا۔

"یہ شبد .... یعنی لفظ مجھے نہیں آتا۔"

"ذہن تو جانتی ہو' اسی سے ذہین بنا ہے۔ اب سمجھ گئیں۔"

"ہاں کرن جی! اب یاد رکھوں گی۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اچھا یہ بحث چھوڑو۔ تم رادھا کی خیریت ضرور لو' مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بس ایک بات کا دھیان رکھنا کہ اس کی وجہ سے کہیں تم بھی گوپال کے چنگل میں نہ پھنس جاؤ۔" میں نے اسے تاکید کی۔ "میں ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ رادھا سے ہمدردی یا تعلق کا نتیجہ تمہارے حق میں نقصان دہ ثابت ہو۔"

کویتا نے مجھے مطمئن کر دیا کہ وہ پوری طرح چوکنا رہے گی اور دل پر دماغ کو ترجیح دے گی۔ اس کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے گرد حصار کھینچنے کے لئے مخصوص جنتر پڑھنے لگی۔ اپنے گرد پھونکیں مار کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

کویتا کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ رشیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"سالار اکبر نے پیغام بھیجا ہے کرن جی کہ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو وہ آ جائیں۔" رشیدہ نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

"کیا؟" میں حیرت سے بولی۔ "انہوں نے میرے کمرے میں آنے کی اجازت مانگی ہے؟"

"جی ہاں' انہوں نے یہی کہلوایا ہے۔" رشیدہ نے تصدیق کی۔

"اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ میں ہی سالار اکبر کے کمرے میں گئی تھی۔ خود وہ کبھی میرے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ میں اس تغیر کا سبب سمجھ گئی۔ یہ سب اعزازی سالار اعلیٰ ہونے کا "کمال" تھا۔ میں نے اس لئے رشیدہ سے کہا۔ "سالار سے کہنا کہ میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہونے آ رہی ہوں' اپنے ہی کمرے میں میرا انتظار کریں۔"

"جی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر رشیدہ واپسی کے لئے مڑ گئی۔

لباس تبدیل کر کے جلد ہی میں سالار اکبر کے کمرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اکبر نے بلاسبب مجھ سے ملنے کی خواہش نہیں کی ہو گی۔ جب میں اس کے کمرے میں پہنچی تو وہ میری تعظیم کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "تشریف لائیے۔ میں خود حاضر خدمت ہو جاتا' آپ نے کیوں زحمت کی؟"

"آپ بیٹھیں تو سہی سالار۔" میں آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ آپ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو جائیں۔" میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ہمارے لئے آپ پہلے تو قابل تعظیم تھیں ہی' اب اس میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ بیان کرنے کی ضرورت یوں نہیں کہ خود آپ.........."

"جی ہاں معلوم ہے مجھے۔" میں بول اٹھی۔ "لیکن میری درخواست بھی تو سن لیں۔"

"آپ حکم دیں کرن' درخواست کرنا ہمارا منصب ہے۔" وہ بھی اب میرے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ

چکا تھا۔

"میں یہی تو کہنا چاہتی ہوں کہ ان تکلفات کی مجھے عادت نہیں' نہ ان کی عادی بننے کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ جس طرح آپ پہلے مجھے اپنے کمرے میں بلوا لیا کرتے تھے' اب بھی ویسا ہی ہے۔ اس طرح میں الجھن کا شکار ہونے سے بچ جاؤں گی۔"

"اگر اس سے آپ الجھن محسوس کر رہی ہیں تو .... تو پھر آپ کا حکم جان کر آئندہ گریز کروں گا۔"

"شکریہ! اب فرمایئے کیسے یاد کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"گذشتہ رات ہی میں نے اپنے عملے کو ژیان کی تلاش کے سلسلے میں تاکیدی حکم جاری کر دیا تھا اس کی تلاش پہلے ہی سے جاری تھی۔" سالار اکبر بتانے لگا۔ "میرے عملے نے اس سے قبل بھی ان خدشات کا اظہار کیا تھا کہ شاید حکومت نے اسے یہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا ہے۔ آج ہی اس سلسلے میں میں جو رپورٹ موصول ہوئی ہے' وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اجلاس میں آپ نے جو صورت حال واضح کی' اس کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ آپ سے خوفزدہ ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا تنظیم کی تمام شاخوں کو اس کا حلیہ فراہم کر دیا جائے۔ اس طرح اس کا سراغ لگانے میں آسانی رہے گی۔"

سالار اکبر کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے عملے نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا' انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قیاس کے مطابق کوتا کے جاپ میں اگر ژیان ہی نے مداخلت کی تھی تو اسے چوکنا ہو جانا چاہئے تھا۔ اس سے قبل ولیم رائٹ کا اغوا بھی ژیان کے لئے باعث تشویش ہی رہا ہو گا۔ ان حالات میں دہلی سے اس کا فرار ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ اس حقیقت کے باوجود میرے ذہن کو دھچکا ضرور لگا۔

"میں آپ کے جذبات کو محسوس کر سکتا ہوں۔ آپ کے لئے یقیناً یہ خدشات پریشان کن ہیں۔"

سالار اکبر کی آواز سن کر میں چونک اٹھی اور خود کو سنبھال لیا۔ "وہ اپنی تقدیر کے فیصلے سے کہاں تک بھاگ سکے گا۔" میں نے کہا۔ "ایک نہ ایک دن تو وہ بھاگتے بھاگتے ہانپ کر گر ہی جائے گا۔" میرے لہجے میں اعتماد تھا اور یہ اعتماد مجھے عظیم مہین کی پُراسرار سرگوشیوں نے عطا کیا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد میں پھر بولی۔ "اس سلسلے میں آپ کی تجویز مناسب ہے۔"

"اس کے علاوہ آپ کی یہاں خود آمد سے فائدہ اٹھا کر مجھے ایک بات اور کہنے کا موقع مل گیا۔ اسے بھی آپ میری ایک تجویز ہی تصور کر سکتی ہیں۔"

میں نے محسوس کر لیا کہ سالار اکبر کے لہجے میں کچھ جھجک سی تھی اسی لئے بول اٹھی۔ "بلا جھجک جو بھی کہنا ہو کہہ دیں۔"

"یہ بات اس لڑکی سے متعلق ہے جو آپ کے ساتھ قیام پذیر ہے۔"

میرے ذہن میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں کوتا کے "شوق آوارگی" نے تو کوئی گل نہیں کھلا دیا

سالار اکبر کو اس کی سن گن تو نہیں ہو گئی؟ وہ لوگ جب میری اصل شخصیت پر پڑا ہوا دبیز پردہ اٹھا سکتے تو کوتا کس شمار قطار میں تھی' لیکن میرا یہ خدشہ درست ثابت نہیں ہوا۔ بات کچھ اور نکلی۔

"میری تجویز یہ ہے کرن کہ آپ کسی الگ کمرے میں قیام کریں۔ یوں بھی وہ کمرا آپ کے شایان شان نہیں۔ جیسا کہ آپ نے خود بھی اندازہ لگا لیا ہو گا' یہ کوٹھی خاصی وسیع و عریض ہے۔ اس میں بڑے کمرے بھی ہیں اور جس کمرے میں اس وقت آپ کا قیام ہے' اس سے زیادہ آرام دہ۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلے صرف آپ ہماری معزز مہمان تھیں اور اب اعزازی سالار اعلیٰ بھی ہیں۔"

میں' سالار اکبر کا اشارہ سمجھ گئی۔ کوتا کے سامنے تنظیم کے معاملات کو زیر بحث لانا' مناسب نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ کوتا اس طرح احساس تنہائی کا شکار ہو جائے گی۔ سو میں نے اس مسئلے کا ایک حل سوچ ہی لیا۔ مجھے اس بھولی بھالی لڑکی کا دل توڑنا بھی مقصود نہیں تھا جو میری خاطر سب کچھ تج کر چلی آئی تھی۔

"جہاں تک اس کمرے کے چھوٹا یا میرے شایان شان نہ ہونے کا سوال ہے سالار' تو میرے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہیں۔" میں بولی۔ "میری نظر میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ کوتا کو ہماری تنظیم کے متعلق یا اس کے اقدامات کا علم نہ ہو۔ اب تک اسے اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ میرے دوستوں کے درمیان ہے۔ اس کے سوا میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ ان معاملات میں رازداری کی اہمیت سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اس کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ کوتا کے سامنے تنظیمی امور پر گفتگو نہ کی جائے۔ یہ گفتگو کسی اور کے کمرے میں بھی ہو سکتی ہے' کوٹھی کے کسی بھی حصے میں ممکن ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اگر وہ قابل اعتبار نہ ہوتی تو میں اسے لے کر ہرگز یہاں نہ آتی۔"

سالار اکبر بھی یقیناً سمجھ گیا کہ میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی ہوں۔ غالباً وہ اس مسئلے پر اسی سبب سے کچھ نہیں بولا۔

"آپ نے میری تجویز منظور کر لی ہے۔ اس لئے ژیان کا حلیہ تنظیم کی تمام شاخوں کو میں آج ہی جاری کر دیتا ہوں۔" سالار اکبر نے کہا۔ "اس کے علاوہ دہلی میں بھی بدستور اس کی تلاش جاری رہے گی۔ اس سلسلے میں جب بھی کوئی اطلاع کہیں سے ملی فوری طور پر آپ کے علم میں لے آئی جائے گی۔"

"حکومت کی طرف سے تنظیم کے خلاف ممکنہ بڑے آپریشن سے بھی آپ مجھے بے خبر نہ رکھئے گا۔" میں کچھ سوچتے ہوئے بولی کیونکہ اسی وقت میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا تھا۔ اس خیال کا اظہار میں نے سالار اکبر سے بھی کر دیا۔ "میدان جنگ میں دشمن کے کسی بڑے حملے کو روکنے کے لئے ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا جاتا ہے کہ اسے کہیں اور الجھا دیا جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ خود حملہ کرے' اپنے بچاؤ پر مجبور ہو جائے۔ مجھے علم نہیں کہ تنظیم نے ابھی مسلح جدوجہد کا آغاز کیا ہے یا نہیں لیکن اس کے لئے میرے خیال میں یہ وقت نہایت مناسب ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے سالار؟"

"ہرچند کہ یہ معاملہ میرے دائرہ اختیار میں نہیں آتا لیکن آپ نے مجھ سے اظہار خیال کے لئے کہا تو ضرور کچھ عرض کروں گا۔ اب تک چند علاقوں کو چھوڑ کر عمومی صورت حال یہی رہی ہے کہ ہم اپنا

ہی دفاع کرتے رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمیں حکومت نے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا دوم یہ کہ ابھی ہم اپنی قوت کو یکجا کر رہے ہیں۔ سرفروشوں کی تلاش اور پھر ان کی تربیت ہمارے لئے ہمیشہ سے ایک دشوار مرحلہ رہا ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔" سالار اکبر بتانے لگا۔ "پہلی بات تو یہ کہ معاشی جدوجہد ایک عام آدمی کو ہماری طرف آنے سے روک دیتی ہے وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرے یا سر سے کفن باندھ کر ہمارے ساتھ آ جائے۔ یہ صورت حال خود حکمرانوں کی پیدا کردہ ہے۔ حکمراں اس ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس ملک کے عوام کو پیٹ بھر کر روٹی مل گئی تو ان کے ہاتھ حکمرانوں کے گریبانوں تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ یہ ملک کبھی سونے کی چڑیا کہلاتا تھا' اب رفتہ رفتہ اس چڑیا کے پر نوچ لئے گئے ہیں۔ ناخواندہ اور بھوکے غلام کس طرح سر اٹھانے کی ہمت کر سکتے ہیں۔ حکمراں یہ بات خوب جانتے ہیں۔ اس ملک کی بچی کھچی دولت سمیٹ کر باہر لے جایا جا رہی ہے۔ مانچسٹر کے کارخانوں کی چمنیاں دھواں اگل رہی ہیں اور اس ملک کے باسیوں کے چہرے دھواں دھواں ہیں۔ سینے حوصلوں سے اور آنکھیں خوابوں سے خالی ہیں۔ انہیں احساس کمتری کے مرض میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ وہ اسی حال میں جینے کے عادی بنا دیئے گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہماری جدوجہد جاری ہے۔ غربت و افلاس کی چکی میں پسنے والوں ہی کے درمیان سے ہم ان ہیروں کو چن لیتے ہیں جن کی چمک ابھی ماند نہیں پڑی۔ وہ جن میں ابھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے' وہ جو قربانیاں دینے سے دریغ نہیں کرتے' وہ جو ٹوٹ سکتے ہیں' جھک نہیں سکتے۔ وہ جو بھوکے مر سکتے ہیں' بک نہیں سکتے ہمارے ہم قدم بن جاتے ہیں۔ گھپ اندھیرے میں اپنے لہو کے چراغ روشن کرنے والے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سالار اکبر جیسے شخص کے سینے میں اتنی آگ بھری ہوئی ہوگی۔ وہ ایک ایسے انگارے کی طرح تھا کہ جس پر راکھ جمی ہو۔ ذرا سی تیز ہوا میں وہ انگارا لو دینے لگتا تھا۔ اس نے بڑی دیانت کے ساتھ اپنی قوم کا تجزیہ کیا تھا۔

"سالار!" ذرا توقف کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔ "مجھے خوشی ہے کہ مایوس کن صورت حال ہونے کے باوجود آپ کے حوصلے بلند ہیں۔ محاذ پر ہتھیار سے زیادہ حوصلہ کام آتا ہے۔ کبھی کبھی لوگ ایسے شخص کے بھی منتظر ہوتے ہیں جس میں پہلا پتھر پھینکنے کی ہمت ہو۔ چند ہی سرپھرے تو ہوتے ہیں جو مخالف ہواؤں کا رخ پھیر دیتے ہیں۔ بلاشبہ جنگ لڑتے ہوئے دشمن کی تعداد اور قوت کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں آغاز جنگ ہی نہ کیا جائے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ ابتدا میں امیر تیمور کے پاس افرادی قوت زیادہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود جب وہ اپنے دشمن پر یلغار کرتا تھا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے ساتھ بہت بڑی فوج ہو۔ ہر طرف غبار ہی غبار اڑتا نظر آتا تھا۔ اس کے سپاہی اپنے گھوڑوں کی پشت سے ریت کی بھری ہوئی بوریاں باندھ کر چلتے اور دشمن کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ان بوریوں میں سوراخ کر دیتے۔ ریت اڑنے سے دشمن یہ سمجھتا کہ تیمور ایک بڑی سپاہ کے ساتھ حملہ کرنے والا ہے۔ یوں حوصلہ ہارنے کے سبب تیمور کا دشمن پہلے سے آدھی جنگ ہار جاتا۔ ممکن ہے

آپ کی نظر سے بھی ایسے متعدد تاریخی واقعات گزرے ہوں جن میں افرادی قوت کم ہونے والے گروہوں کو فتح نصیب ہوئی۔ اسی کے ساتھ آغاز جنگ کے لئے وقت کا تعین بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ مناسب وقت پر اگر دشمن کے متوقع حملے کا تدارک نہ کیا جائے تو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس قسم کا کوئی اقدام نگران اعلیٰ کی منظوری کے بغیر شاید ممکن نہیں۔" میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

"آپ کا خیال غلط نہیں۔" سالار اکبر نے میری تائید کی پھر کہنے لگا۔ "مگر اس کے لئے پہلے ہمیں اپنے طور پر کسی فیصلے تک پہنچنا پڑے گا۔ اس کے لئے آپ محدود پیمانے پر اجلاس طلب کرنے کی مجاز ہیں۔ آپ وقت اور دن کا تعین کر دیں۔"

"میرے نقطہ نظر سے اس اجلاس میں سالار اعلیٰ' ان کے نائب' نگران اعلیٰ کے نمائندے اور سالار گربچن سنگھ کی موجودگی کافی ہوگی۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔

"تو پھر آج ہی شام کا وقت رکھ لیں۔ جتنی جلدی ہم کسی فیصلے تک پہنچ جائیں بہتر ہے۔"

"غالباً آپ اسی شہر میں مسلح جدوجہد کا آغاز کرنا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "یہ دارالحکومت ہے۔ یہاں کوئی ایسی کارروائی بڑی اہمیت کی حامل ہوگی۔ مرکز کے اثرات دور دور تک پڑتے ہیں۔"

اس کے بعد شام پانچ بجے کا وقت طے ہو گیا۔ یہ مختصر میٹنگ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی اہم تھی۔ اس کے لئے بھی قرول باغ کی اسی کوٹھی کو محفوظ سمجھا گیا جہاں خود میرا قیام تھا۔ اس میٹنگ میں شرکت کرنے والے اہم افراد کو مدعو کرنے کی ذمے داری میں نے سالار اکبر پر ڈال دی۔

"اگر آپ بھی اس میٹنگ میں شریک ہوتے تو بہتر تھا۔" میں سالار اکبر سے بولی۔

"آپ کا حکم ہے تو شریک ہو جاؤں گا۔"

"یہ میری خواہش ہے' حکم نہیں سالار۔"

"میرے لئے آپ کی خواہش بھی حکم ہی کا درجہ رکھتی ہے۔" سالار اکبر مسکرایا۔ "یوں بھی یہ میٹنگ آپ کی طرف سے طلب کی جا رہی ہے' سو حکم ہی کہلائے گی۔"

"ہاں' میں آپ سے ایک بات اور کہنے والی تھی کہ ولیم رائٹ' رابرٹ ہیم اور فلپ کے متعلق بھی سراغ لگائیں کہ یہ تینوں افراد کہاں ہیں؟" پھر میں نے ولیم اور فلپ کی کوٹھیوں کے پتے اسے بتائے جو مجھے یاد تھے۔ ولیم کی کوٹھی کا پتا پہلے ہی سالار اکبر کے پاس موجود تھا کیونکہ وہ اس کی نگرانی کرا چکا تھا البتہ فلپ کا پتا اس نے لکھ لیا۔ رابرٹ کی کوٹھی کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا تھا۔ ان تینوں افراد میں ولیم اور رابرٹ میرے لئے زیادہ اہم تھے۔

"ایک امکان یہ بھی ہے کرن کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی اپنی کوٹھیوں میں نہ ملے۔" سالار اکبر نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"اگر آپ کا اندیشہ درست نکلے تو پھر یہ پتا چلانا پڑے گا کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے' آپ نے شاید اپنے اس اندیشے کا اظہار یوں بھی کیا ہے کہ ایک مرتبہ ولیم رائٹ کو اغوا کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ

گذشتہ روز کے اجلاس میں جو نتائج اخذ کئے گئے وہ بھی آپ کے ذہن میں ہوں گے۔"

"جی ہاں' یہی بات ہے۔ غالباً آپ ایک بار پھر ولیم پر ہاتھ ڈالنا چاہتی ہیں۔"

"صرف ولیم ہی پر نہیں' رابرٹ ہیم پر بھی۔" میں نے سالار اکبر کے قیاس کی تصدیق کر دی۔ "یہ دونوں چاہے عہدوں سے معزول یا معطل کر دیئے جائیں' ہمارے لئے بہرحال اہم ہیں۔ اگر ہم اپنی کوشش میں کامیاب رہے تو اس کے دور رس نتائج نکل سکتے ہیں۔"

سالار اکبر نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور پھر میں اس کے پاس سے اٹھ آئی۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے کویتا نظر آ گئی۔ وہ خلاف توقع جلد لوٹ آئی تھی۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کویتا نے بتایا۔ "دونوں میں سے کوئی نہیں ملا۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک اٹھی۔ "تفصیل سے بتاؤ کیا ہوا؟"

"یہاں سے میں' بڑے مہاراج ہی کے آشرم گئی تھی۔ میں نے اندر گھسنے کی کوشش کی تو کامیاب ہو گئی۔ وہاں سیتامائی اور بڑے مہاراج کے چند چیلوں ہی کو میں نے دیکھا۔"

"یعنی چندر موہن اپنے ساتھ چمپا کو بھی لے گیا؟ وہ بھی تمہیں وہاں نہیں ملی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ پھر اس سے پہلے کہ کویتا کچھ کہتی' میں خود ہی بول اٹھی۔ "یہ بھی تو ممکن ہے' چندر موہن کسی سبب آشرم سے باہر گیا ہو اور چمپا بھی اس کے ساتھ ہو۔"

"میں نے آشرم میں ذرا دیر رک کر سیتامائی اور بڑے مہاراج کے چیلوں کی باتیں بھی سنی تھیں۔ ان باتوں سے مجھے یہی پتا چلا کہ بڑے مہاراج' چمپا دیوی کو اپنے ساتھ لے کر دہلی سے جا چکے ہیں۔ بڑے مہاراج جس کمرے میں سوتے تھے' میں وہاں بھی گئی۔ کمرے سے ان کا سامان بھی غائب تھا۔"

"یہ معلوم ہوا کہ چندر موہن' دہلی سے کہاں گیا ہے؟" میں نے مضطرب لہجے میں سوال کیا۔

"معلوم تو نہیں ہوا پر پتا چل سکتا ہے۔" کویتا نے جواب دیا۔ "اس کے لئے مجھے آشرم کے دو ایک چکر لگانا پڑیں گے۔ دراصل یہ جان لینے کے بعد کہ بڑے مہاراج آشرم چھوڑ کر جا چکے ہیں' میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی تھی ورنہ تو شاید سیتامائی اور چیلوں کی باتوں سے یہ معلوم ہو ہی جاتا کہ بڑے مہاراج دہلی سے کہاں گئے ہیں۔"

کویتا کے بیان میں مجھے ایک بات کھٹکی تو میں بولی۔ "مگر جب میں آشرم میں تھی تو گوپال کے سوا مجھے وہاں بڑے مہاراج کا کوئی اور چیلا دکھائی نہیں دیا تھا۔"

"کرن جی! آپ کو آشرم کے صرف ایک حصے تک ہی محدود رکھا گیا تھا۔" کویتا نے کہا۔ "جب بڑے مہاراج آشرم میں تھے تو چیلے ہی کیا' بہت سی داسیاں بھی تھیں۔ ان داسیوں کو وہ اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ پہلے ایسا بھی ہوتا رہا ہے جو داسیاں کہیں سے بھی بڑے مہاراج کے ساتھ آتی تھیں' انہی کے ساتھ واپس چلی جاتی تھیں۔ وہ بھی آشرم میں نہیں تھیں۔"

"پھر تو یقیناً وہ عیار دہلی سے جا چکا ہے۔" میں بڑبڑائی پھر میرے ذہن میں ایک سوال اور ابھرا۔ "کیا دہلی اور کلکتے کے علاوہ بھی چندر موہن کے دوسرے شہروں میں آشرم ہیں؟" کویتا سے میں ایک ایک

بات کرید کرید کر پوچھ رہی تھی۔ اس کے چند الفاظ سے مجھے یہ خیال آیا تھا کہ میں "کہیں سے بھی" اس کی وضاحت چاہتی تھی۔

"بنارس' متھرا' گیا جی اور دوسرے کئی شہروں میں بڑے مہاراج کے آشرم ہیں۔ سنا ہے کہ بنگال میں بھی کلکتے کے علاوہ کئی جگہ آشرم ہیں۔" کویتا نے جواب دیا۔

چندر موہن میرا دشمن تھا اور دشمن کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ کویتا سے میں اسی لئے یہ ساری پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کویتا' چندر موہن کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی ہوگی اور اس سے مزید سوالات کے بعد یہ خیال درست ہی ثابت ہوا۔ ہاں' اس سے مجھے یہ ایک نئی بات ضرور معلوم ہو گئی تھی کہ چندر موہن کی عیاشی کے اڈے ہندوستان کے دیگر شہروں میں بھی ہیں۔ ان معلومات کے حصول کا مقصد میرے ذہن میں ایک اور بھی تھا۔ حکومت کے علاوہ چندر موہن بھی ژیان کو اپنے کسی بھی آشرم میں پناہ دے سکتا تھا۔ ایسا خود حکومت کے ایما پر بھی ممکن تھا۔ میرے نزدیک حکومت سے چندر موہن کا تعلق محض ولیم اور رابرٹ ہی کے ذریعے نہیں تھا۔ اس کے پیچھے کچھ اور نادیدہ عوامل بھی کارفرما تھے۔ میں یہ محسوس کر چکی تھی کہ میرے خلاف کسی گہری سازش کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میں انہی کی تلاش میں تھی۔

کویتا سے چندر موہن کے متعلق جب مجھے کوئی اور نئی بات معلوم نہ ہو سکی تو میں نے گوپال کے متعلق پوچھا۔ وہ بھی اب میرے دشمنوں کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا۔

"شہر میں گوپال کے دو ہی ٹھکانے تھے' سو میں نے دونوں ہی دیکھ لئے۔" کویتا بتانے لگی۔ "نہ مجھے وہ ملا نہ رادھا۔"

"تو پھر ایک ہی صورت ممکن ہے۔"

"وہ کیا کرن جی؟"

"گوپال بھی چندر موہن کے پیچھے گیا ہو۔" میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں کہ ان دونوں کے درمیان ٹھن چکی ہے۔"

"کیسی ہی کیوں نہ ٹھن گئی ہو۔ مگر میرے وچار (خیال) میں گوپال اتنی ہمت نہیں کر سکتا۔" کویتا نے اپنی رائے ظاہر کی۔ وہ تاکید کے باوجود اب بھی ایک آدھ ہندی لفظ بول جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے ہندی الفاظ کے متبادل بھی اسے معلوم نہیں تھے۔ میں اس لئے اسے ٹوک دیتی تھی کہ وہ میرے علاوہ کسی سے بات کرے تو الجھن نہ ہو۔

گوپال کے متعلق کویتا کا یہ اپنا تجزیہ تھا۔ میں نے اس کی تائید یا تردید نہیں کی۔ میں کچھ اور ہی سوچنے لگی تھی۔ ایک ایک کر کے سارے ہی چہرے منظر سے ہٹتے جا رہے تھے۔ میرے نزدیک ایسا بلاسبب نہیں ہو سکتا تھا۔ چندر موہن کا دہلی سے کہیں چلا جانا میری نظر میں معنی خیز تھا۔ میں اس غلط فہمی کا شکار بھی نہیں تھی کہ مجھ سے خوفزدہ ہو کے اس نے راہِ فرار اختیار کر لی ہوگی۔ وہ اتنی جلدی پسپا ہونے والوں سے میں سے نہیں تھا۔ میری وجہ سے اسے تھوڑا بہت نقصان تو پہنچا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ وہ دہلی چھوڑ

کر ہی بھاگ جاتا۔

پہلے ولیم اور رابرٹ منظر سے غائب ہوئے' پھر ژیان کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ شاید کسی اور شہر کا رخ کر چکا ہے' اب چندر موہن اور گوپال' دہلی چھوڑ چکے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی میرا دوست نہیں تھا' سبھی دشمن تھے۔ میں ان تمام افراد کے دہلی سے فرار یا گمشدگی کے درمیان کوئی تعلق تلاش کرنے لگی۔ یہ سبھی کسی نہ کسی سطح پر ایک دوسرے سے تعلق رکھتے تھے' لیکن بہ یک وقت کوئی اقدام میری سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں نے ان کے متعلق انفرادی حیثیت میں سوچنا شروع کیا کہ شاید اس طرح کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔

رابرٹ اور ولیم رائٹ دو اہم سرکاری اداروں کے سربراہ تھے۔ گذشتہ روز کے اجلاس میں ان دونوں پر خاصی بحث ہو چکی تھی۔ بظاہر ان کی معزولی حکومت کا کوئی خفیہ اقدام ہو سکتا تھا۔ ژیان کا معاملہ واضح تھا۔ وہ پہلے مجھ سے چھپا چھپا پھر رہا تھا۔ دہلی میں اپنے لئے خطرہ محسوس کر کے اس کا فرار ہو جانا سمجھ میں آتا تھا۔ رہے چندر موہن اور گوپال' تو ان دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ کسی بھی ممکنہ ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ دہلی سے چلے گئے ہوں۔

میں نے اس معاملے کا کوئی بھی پہلو نظرانداز نہیں کیا' مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ کویتا نے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ میں سوچ بچار میں گم ہوں۔ وہ اسی لئے کچھ نہیں بولی اور خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچتے ہوئے میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔

"تم ایسا کرنا کویتا کہ کھانا کھانے کے بعد دوبارہ چندر موہن کے آشرم چلی جانا۔" میں نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر کویتا کو مخاطب کیا۔ "معلوم کرو کہ چندر موہن یہاں سے کہاں گیا ہے؟"

"یہ تو خیر معلوم ہو ہی جائے گا کرن جی' پر آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟" کویتا بولی۔ "وہ تو اسی طرح آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"تمہیں یہ تو پتا ہے نا کہ وہ میرا دشمن ہے۔" میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دشمن کے بارے میں بے خبر نہیں رہنا چاہیے ہے نا۔"

"ہاں یہ تو آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔" اس نے میری تائید کی۔

کویتا کو میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں بتانا چاہتی تھی۔ دوپہر ہو چکی تھی' میں نے کھانا منگوا لیا۔

میری ہدایت کے مطابق کویتا کھانا کھا کر چندر موہن کے آشرم روانہ ہو گئی۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ کوئی جلدی نہیں' وہ اطمینان سے واپس آ جائے۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن خاصا تھک گیا تھا۔ اپنے ذہن کو سکون دینے کے لئے میں کچھ دیر سو جاتی تو بہتر تھا۔ یوں بھی میں دوپہر کو سونے کی عادی تھی۔

چند گھنٹے سو کر میں نے خود کو تازہ دم محسوس کیا۔ کویتا اس دوران میں لوٹ آئی تھی مگر اس نے مجھے نہیں جگایا تھا۔

"دلاری سے چائے کے لئے کہہ دو۔" میں نے کویتا سے کہا اور انگڑائی لے کر بستر سے اٹھ گئی۔ کویتا چائے کے لئے کہہ آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "ہاں' کیا رہا؟"

"بڑے مہاراج یہاں سے بنارس گئے ہیں۔" کویتا نے جواب دیا۔ "بنارس سے وہ متھرا جائیں گے' پھر خبر نہیں کہاں جائیں۔"

بنارس میرے لئے ایک اجنبی شہر تھا۔ اب تک میں نے ہندوستان کے صرف دو شہر ہی دیکھے تھے' کلکتہ اور دہلی۔ البتہ بنارس کے بارے میں مجھے یہ ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہ شہر ہندوؤں کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ وہاں ان کی بہت سی زیارت گاہیں تھیں۔ ایسا ہی معاملہ کچھ متھرا کا بھی تھا۔ وہاں بھی ہندوؤں کے بہت سے قدیم مندر تھے۔

دہلی سے بنارس' وہاں سے متھرا اور پھر یہ خبر نہ ہونا کہ متھرا سے چندر موہن کہاں جائے گا' مجھے کہانی ہی معلوم ہوا۔ میرے اندازے کے مطابق چندر موہن نے شاید دانستہ اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ اگر کویتا کی فراہم کردہ اطلاع درست بھی تھی تو میرے لئے بے معنی تھی۔ چائے پیتے ہوئے میں اسی پر غور کرتی رہی۔ پھر چندر موہن کے خیال کو میں نے وقتی طور پر اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ مجھے آج ہی شام اس اہم اجلاس میں شرکت کرنا تھی جو گویا میں نے ہی طلب کیا تھا۔

کویتا کی دل جوئی کے لئے میں اس سے کچھ دیر باتیں کرتی رہی اور پھر تیار ہو کر وقت مقررہ پر کمرے سے نکل آئی۔ شام کے پانچ بجنے والے تھے۔

جب میں اجلاس والے کمرے میں پہنچی تو وہاں سبھی کو موجود پایا۔ بڑی گول میز کی بجائے اب وہاں ایک چھوٹی گول میز لگا دی گئی تھی جس کے گرد کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اونچی پشت کی کرسی خالی تھی۔ آج اس پر دہلی کا سالار اعلیٰ قدیر بیگ نہیں بیٹھا تھا۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ سب کرسیوں سے اٹھ گئے۔ ان میں سالار اکبر بھی موجود تھا۔

میں آگے بڑھ کر مجبوراً اونچی پشت والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چونکہ اور کوئی کرسی خالی نہیں تھی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ دانستہ میرے لئے وہی کرسی خالی رکھی گئی تھی۔ میں بیٹھ گئی تو ان لوگوں نے بھی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ میری دائیں جانب قدیر بیگ' اس کا نائب جیکسن بیٹھا تھا۔ بائیں جانب نگران اعلیٰ کا نمائندہ امرناتھ اور اس کے بعد سالار گرچن سنگھ کی نشست تھی۔ تقریباً میرے مقابل سالار اکبر تھا۔

"دوسرے ہی روز آپ لوگوں کو زحمت دینے کا سبب کیا ہے' میں اس سلسلے میں سالار اکبر سے تفصیلی گفتگو کر چکی ہوں۔" میں نے بات شروع کی۔ "میرے ہی ایما پر سالار اکبر اس اجلاس میں شریک ہیں۔ میں ان سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ میرے اور اپنے درمیان ہونے والی گفتگو سے آپ حضرات کو بھی آگاہ کر دیں۔"

سالار اکبر نے میری اجازت کے بعد بولنا شروع کیا کیونکہ وہ مختصر اجلاس میری ہی صدارت میں ہو رہا تھا۔ مختصر طور پر سالار اکبر نے سب کچھ بیان کر دیا۔

"پہلے تو ہمیں یہ جائزہ لینا پڑے گا کہ ایسا ممکن بھی ہے یا نہیں۔" قدیر بیگ سب سے پہلے بولا۔ "نگران اعلیٰ سے مسلح جدوجہد کی اجازت لینے کے معاملے پر ہم بعد میں غور کریں گے۔"

میں خاموش رہی تا کہ ان لوگوں کے خیالات جان سکوں۔

قدیر بیگ کے بعد نگران اعلیٰ کے نمائندے امرناتھ نے کہا۔ "اس شہر سے اگر مسلح جدوجہد کا آغاز ممکن ہوتا تو اب تک اس پر عمل کیا جا چکا ہوتا۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا امرناتھ جی۔" سالار اعلیٰ کے نائب جیکسن نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ "محدود پیمانے پر چھاپہ مار کارروائیاں بنگال کی طرح یہاں بھی ممکن ہیں۔"

جیکسن کی تائید گرچن سنگھ نے بھی کی۔ یوں بھی یہ شعبہ اسی کا تھا۔ "ہمارے پاس بہرحال اتنے تربیت یافتہ ارکان موجود ہیں جو ان کارروائیوں میں حصہ لے سکیں۔"

اب پانچواں فرد صرف سالار اکبر رہ گیا تھا جس نے اپنے خیال کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس موضوع پر اسی روز سالار اکبر سے میری گفتگو ہو چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دہلی میں اس طرح کی کسی کارروائی سے وہ بھی اتفاق نہیں کرے گا' مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ اس نے بھی میری تجویز سے اتفاق کیا۔ شاید میرے دلائل سے وہ قائل ہو چکا تھا۔

"ہمارے فیصلے اکثریت کی بنیاد پر ہوتے ہیں کیونکہ ہم آمریت کے حق میں نہیں۔" سالار اعلیٰ قدیر بیگ نے کہا۔ "صدائے خلق کو اسی لئے نقارہ خدا بھی کہا گیا ہے' لیکن بعض اوقات اکثریت مختلف اسباب کی بناء پر اپنے لئے کوئی صحیح راہ متعین نہیں کرپاتی۔ تو کسی ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لئے کچھ افراد کو خصوصی اختیارات دے دیئے جاتے ہیں۔ ہماری تنظیم میں بھی اسی پر عمل کیا جاتا ہے۔ معزز معلبہ خاتون کے سوا یہاں موجود تمام افراد کو اس کا علم ہے۔ انہی کے علم میں لانے کے لئے میں سب کچھ عرض کر رہا ہوں۔ کسی بھی مسئلے پر اختلاف رائے کی صورت میں صاحب اختیار شخص کے فیصلے کو حتمی تصور کیا جاتا ہے۔ اس شہر کی حد تک یہ اختیار مجھے حاصل تھا' لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے۔ میرے اور معلبہ خاتون کے اختیارات مساوی ہیں۔ سو میں تنہا کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں رہا۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ اس مسئلے پر بھی اختلاف رائے ہے۔ امرناتھ جی اس تجویز پر متفق نہیں ہیں۔ ان کے متفق نہ ہونے کی وجہ نگران اعلیٰ کے گذشتہ اقدامات ہیں۔ اب تک میں نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرکز میں حکومت اس طرح کی کسی کارروائی کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرے گی۔ ہمیں سختی کے ساتھ کچل دیا جائے گا۔"

"گویا آپ بھی امرناتھ جی کے خیال سے اتفاق کرتے ہیں۔" مجھے بولنا ہی پڑا۔

"جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔" قدیر بیگ بولا' پھر اس نے وضاحت کی۔ "لیکن یہ صرف میری رائے ہے' فیصلہ نہیں۔"

"پھر فیصلہ کیسے ہو گا؟" میں نے سوال کیا۔

"فیصلہ تو ہو چکا۔" قدیر بیگ نے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تجویز آپ کی تھی' اس کا مطلب یہی ہوا کہ آپ مسلح جدوجہد کے حق میں ہیں۔" قدیر بیگ بولا۔ "آپ کی تجویز سے میں نے اختلاف کیا۔ یعنی اس اجلاس میں جو دو صاحب اختیار افراد تھے' وہ کسی

ایک فیصلے تک نہیں پہنچ سکے۔ نہ دونوں میں سے کسی ایک کے فیصلے کو حتمی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ دونوں ہی کے اختیارات مساوی ہیں ایسی صورت میں اکثریت کی رائے ہی کو ماننا پڑے گا۔" قدیر بیگ یہ کہہ کر امرناتھ سے مخاطب ہوا۔

"کیوں امرناتھ جی' میں نے غلط تو نہیں کہا۔"

"نہیں' آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" امرناتھ نے جواب دیا۔

"مگر میں اس فیصلے سے مطمئن نہیں ہوئی۔ یہ فیصلہ دلائل کی روشنی میں بھی تو کیا جا سکتا ہے۔" میں بولی۔

"آپ کی تجویز کے حق میں جو دلائل تھے وہ سالار اکبر بیان کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تجویز کے خلاف جو ممکنہ دلائل ہیں' ان کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں یعنی یہ کہ ایسی صورت میں تنظیم کو کچل دیئے جانے کا خطرہ ہے۔ اس پر مزید بحث بے نتیجہ ہی ثابت ہوگی۔" قدیر بیگ مجھ سے مخاطب تھا۔

میں تذبذب کا شکار ہو گئی۔ کچھ دیر کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ کمرے میں ایک بوجھل سا سکوت طاری رہا۔ پھر یہ سکوت میری ہی آواز سے ٹوٹا۔ "مجھے تنظیم میں شمولیت اختیار کئے آج صرف دوسرا دن ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تنظیم کو کوئی نقصان پہنچے۔ آپ حضرات مجھ سے بہتر طور پر اس معاملے کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں اسی لئے اپنی تجویز پر اصرار نہیں کروں گی۔"

"آپ غالباً یہ بھی بھول رہی ہیں کہ ابھی سپریم کونسل بھی موجود ہے اور ہم سبھی اس کے فیصلے ماننے کے پابند ہیں۔ ممکن ہے موجودہ صورت حال میں سپریم کونسل کا فیصلہ آپ کی تجویز کے حق میں ہو۔ وہاں بھی اس تجویز پر غور و خوض ہو گا۔ اسی کے بعد نگران اعلیٰ ہمارے لئے احکام جاری کریں گے۔"

قدیر بیگ کی بات سن کر میرا تذبذب ختم ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میری تجویز سے تنظیم کو کوئی نقصان اٹھانا پڑا تو اس کی ذمے داری مجھ پر نہیں ہوگی۔ پھر میں نے اجلاس ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔

اجلاس کے بعد چائے پینے کے دوران میں جو غیر رسمی گفتگو ہوئی' اس سے مجھے اصل صورت حال کا اندازہ ہوا۔ دراصل نائب سالار اعلیٰ جیکسن اور گرچن سنگھ دونوں ہی بڑے پُرجوش اور جذباتی واقع ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو نتائج کی پرواہ کئے بغیر "ادھر یا اُدھر" کے قائل ہوتے ہیں۔ عموماً ایسے افراد دل کے فیصلوں کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔ بلاشبہ ہر تنظیم میں ایسے افراد کی بھی ضرورت ہوتی ہے بلکہ یہی اصل قوت ہوتے ہیں۔ ان کے قدم پیچھے ہٹنا نہیں جانتے۔ وہ دشمن پر بڑھ کر وار کرتے ہیں اور اسے خاک و خون میں نہلا دیتے ہیں۔ اپنے مقصد کے حصول میں انہیں اپنی جان کی پرواہ بھی نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود قوت کا بروقت اور صحیح استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ قوت ایک ایسا ہی سرمایہ ہے جسے بہت احتیاط سے خرچ کرنا چاہیے' خصوصاً کسی ایسی زیر زمین تنظیم کے لئے جس کے مقابل ایک بڑی طاقت ہو۔ اس طرح کی صورت حال میں عموماً اعتدال کی راہ اختیار کرنا ہی مناسب ہوتا ہے۔ اب تک مدافعت کے باوجود دہلی شہر کی حد تک تنظیم کی اصل قوت محفوظ تھی۔ قدیر بیگ نے اسے بچا کے رکھا تھا۔ کبھی کبھار حکومت سے چھوٹے موٹے تصادم ضرور ہوئے تھے مگر ان کی نوعیت دفاعی تھی۔

جیکسن اور گربچن سنگھ اگر تنظیم کا دل تھے تو قدیر بیگ' امرناتھ اور سالار اکبر دماغ۔ میں نے اپنے طور پر یہ محسوس کیا کہ دل و دماغ میں توازن کی ضرورت ہے۔ اب ان لوگوں کے درمیان یہ وجہ میں بھی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ میرے لئے توازن پیدا کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا کبھی کبھی پاسبان عقل کے باوجود دل کو تنہا بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ بعض اوقات حد سے زیادہ احتیاط پسندی بھی بہتر نتائج مرتب نہیں کرتی۔

تنظیم کی ہر شاخ کے پاس ایسے وسائل بھی موجود تھے کہ نگران اعلیٰ سے فوری طور پر رابطہ قائم کیا جا سکے۔ اس کے لئے کوڈ ورڈز استعمال کئے جاتے تھے۔ سو اسی روز کوڈ ورڈز کے ذریعے نگران اعلیٰ کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس کے لئے حسب ضرورت ٹیلی فون یا ٹیلی گرام کا سہارا لیتے تھے۔

مجھ سے یہ بھی نہیں چھپایا گیا کہ تنظیم کا نگران اعلیٰ ان دنوں مشرقی بنگال میں تھا۔

☆======☆======☆

اس روز بھی رات کا کھانا کھا کر میں حسب معمول کوٹھی کے لان میں ٹہلنے آ گئی۔ کویتا مجھ سے اجازت لے کر گھومنے پھرنے نکل گئی تھی۔ اس پر بہت زیادہ سختی کرنا یا پہرے بٹھانا میرے نزدیک مناسب نہیں تھا۔ میرے لئے یہ اطمینان بھی کافی تھا کہ اس کا معاملہ اسی کی حد تک تھا۔ کوٹھی کی حدود کو بہرحال میں نے اس کے لئے ممنوع قرار دے دیا تھا۔

ابھی مجھے ٹہلتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ عادل کو ادھر آتے دیکھا۔ آج دن بھر وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔

"کہاں اڑے اڑے پھر رہے ہو پنڈت جی؟" وہ قریب آ گیا تو میں نے مسکرا کر کہا اور وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔

"اڑنے کون دیتا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔ "اڑنے سے پہلے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔"

"بیٹھو۔" میں بولی۔

"کیوں' ٹہلو گی نہیں۔"

"خاصی ٹہل چکی ہوں' کافی ہے۔"

"ویسے تم نے بھی عجیب عجیب عادتیں پال رکھی ہیں۔" وہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "دوپہر کا کھانا کھا کے قیلولہ کرنا' رات کو ٹہل مچانا وغیرہ۔ تمہیں اس سے الجھن نہیں ہوتی۔"

"ٹہل مچانا اچھا کہا تم نے۔" میں ہنس پڑی۔

"صحت کے سنہری اصولوں پر عمل کرنے کے باوجود تم نے ابھی تک بوٹی نہیں پکڑی۔"

"بوٹی کا تعلق روٹی سے ہے اور میں زیادہ روٹی نہیں کھاتی ورنہ تمہاری طرح میری بھی چھوٹی سی توند نظر آنے لگتی۔"

"معاف کرنا' کسی عورت کے ساتھ چھوٹی یا بڑی کسی بھی قسم کی توند کا تصور کم از کم میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ ویسے مرد تندرست و توانا ہی اچھا لگتا ہے۔" اس نے اپنا دفاع کیا۔

"اچھا اس عورت اور مرد کی ڈبیٹ کو چھوڑو' یہ بتاؤ تم آج تھے کہاں؟"

"ایک بدبخت کا سراغ لگانے کے لئے مارا مارا پھر رہا تھا۔"

"کون بدبخت تھا وہ؟" میں نے دلچسپی لی۔

"تمہارا ہی تو سارا فساد بویا ہوا ہے' اب پوچھ رہی ہو کون تھا وہ۔ نہ تم اسے ژیان کے دھوکے میں اغوا کر کے لاتیں' نہ وہ کمبل ہوتا۔"

"ولیم رائٹ کی بات کر رہے ہو۔" میں چونک کر بولی۔

"ہاں' آج صبح بہت دن بعد میں اپنے گھر والوں کو صورت دکھانے گیا تھا کہ کہیں وہ مجھے مردہ سمجھ کر فاتحہ نہ پڑھ لیں۔ وہاں سے لوٹا تو سالار اکبر نے دوڑا دیا کہ جاؤ کہیں نہ کہیں سے ولیم کا سراغ نکال کر لاؤ۔ معلوم نہیں وہ خبیث کہاں جا کے چھپ گیا ہے۔ کوٹھی خالی پڑی ہے' اُلو بول رہے ہیں وہاں حالانکہ خود ولیم بھی ان الوؤں کی جگہ بول سکتا تھا' ہے کہ نہیں۔" عادل نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے مجھ سے اپنے خیال کی تصدیق چاہتا ہو۔

عادل تو اپنے مزاج کے مطابق چہکے جا رہا تھا مگر میں سنجیدہ ہو چکی تھی۔ سالار اکبر نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا' وہ درست ثابت ہوا تھا۔

"اس کا سراغ لگنا بہت ضروری ہے۔" میں بڑبڑائی۔

"تو میں کب اسے غیر ضروری سمجھ رہا ہوں۔ ابھی اس کی جان نہیں چھوٹی۔ ہر ممکنہ جگہ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ اس وقت بھی ہمارے شعبے کے ارکان جگہ جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ اگر وہ وائسرائے ہاؤس میں جا چھپا ہو تو دوسری بات ہے۔ وہاں تک ہمارے بندوں کی رسائی نہیں۔"

وائسرائے ہاؤس' اسی کے تعلق سے میرے ذہن میں ایک درمیانی عمر کے ایک شخص کا چہرہ گھوم گیا اور پھر مجھے بہت کچھ یاد آتا گیا۔ کلکتے سے دہلی آتے ہوئے ٹرین میں اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ملاقات بھی کیا' وہ خود ہی زبردستی مجھ سے تعارف حاصل کرنے کے درپے تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب میں' چمپا کی کمینگی سے تنگ آ کر سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئی تھی۔

اس نے کہا تھا' اگر سنگی ساتھیوں سے پریچے (تعارف) ہو جائے تو اچھا ہی ہوتا ہے شریمتی جی! اس پر میں نے اسے ڈانٹ دیا تھا کہ مجھے آپ سے پریچے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ڈھٹائی سے بولا' اگر مجھ سے آپ کا پورا پریچے ہو جاتا تو ہرگز ایسا نہ کہتیں۔ یہ سن کر میں نے اس پر طنز کیا تھا کہ کیوں کیا آپ ہندوستان کے وائسرائے لگے ہوئے ہیں؟ اس نے فخر سے گردن ٹیڑھی کر لی اور کہنے لگا' جی شریمتی! آپ کی اطلاع کے لئے یہ سیوک (خادم) وائسرائے ہاؤس میں ہی ہوتا ہے۔

اس کا نام ونود کمار شرما تھا۔ میں نے اسے لفٹ نہیں دی تھی۔ پھر ظاہر ہے پتا لینے کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنا نام بھی اس نے خود ہی بتا دیا تھا۔ اور تو کچھ نہیں اس وقت یہ واقعہ یاد آنے سے کم از کم ایک بات تو یقینی تھی کہ وائسرائے ہاؤس میں ہندوستانی بھی ملازم تھے' خواہ وہ چپراسی ہی کیوں نہ ہوں۔

"تم تنظیم کے شعبہ سراغ رسانی سے وابستہ ہو پنڈت جی!" میں نے ذرا توقف کے بعد عادل کو اس کے فرضی لقب سے مخاطب کیا۔

"اچھا یاد دلایا تم نے ' میں تو بالکل بھول ہی گیا تھا۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

میں اس کی غیر سنجیدگی کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ "سنو! اگر ولیم رائٹ' وائسرائے ہاؤس میں بھی چھپا ہوا ہے تو اس کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" عادل بھی میری بات سن کر کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

جو بات میرے ذہن میں آئی تھی' میں نے اسے بتا دی۔

"مجھے بھی اس کا علم ہے کرن' مگر ان کی وہاں موجودگی غیر موجودگی برابر ہی ہے۔ اول تو آٹے میں نمک کے برابر وہاں ہندوستانی ملازم ہیں اور ہیں بھی تو ایسی جگہوں پر لگے ہوئے ہیں جو قطعی غیر اہم ہیں۔" عادل نے جواب میں کہا۔ مثلاً کوئی جھاڑو دے رہا ہو گا' کوئی کسی انگریز افسر کا اردلی ہو گا۔"

"بظاہر غیر اہم نظر آنے والے لوگ بھی کام آ جاتے ہیں۔ جھاڑو لگانے والے کو تم اتنا غیر اہم کیوں سمجھ رہے ہو' وہ تو ایسی جگہوں پر بھی پہنچ جاتا ہے جہاں کوئی اور نہیں پہنچ سکتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' میں آج ہی سے یہ کوشش شروع کر دیتا ہوں کہ مجھے وائسرائے ہاؤس پر جھاڑو پھیرنے کا موقع مل جائے۔"

"اِدھر اُدھر کی نہ اڑاؤ' بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"سمجھ گیا نا' تم یہی تو چاہتی ہو کہ وہاں کے کسی ہندوستانی ملازم پر پٹو ڈال دیا جائے۔ یہ تو ممکن ہے مگر اس میں وقت لگے گا۔"

"تو لگنے دو وقت۔ ضروری تو نہیں کہ ہر کام پلک جھپکتے ہو جائے۔"

"اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری نہیں کہ اٹکل لگ ہی جائے۔" عادل نے مسکرا کر کہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم' مگر سراغ رسانی کی گاڑی اسی طرح قیاسات اور اندازوں پر چلتی ہے۔"

"یعنی یوں بھی ہے اور ووں بھی۔ بدھن نہ ملا تو کلن کی گردن ناپ لی کہ کہیں یہی تو شیخ فضل بیگ نہیں۔ داڑھی مونچھ بھی کھینچ کھانچ کر دیکھ لی کہ اصل ہے یا نقلی۔"

کبھی کبھی تو تم اتنی ذہانت کی باتیں کرتے ہو پنڈت جی کہ تمہاری صورت دیکھ کر پتا ہی نہیں لگتا تم اس قدر عقل مند ہو گے۔" مجھے بھی شرارت سوجھ گئی۔

"اور ایسا بھی تو ہے کہ جو صورت سے عقل مند نظر آتے ہوں' اندر سے اُلو کی دم فاختہ ہوں۔"

"تمہیں آج اُلو بہت یاد آ رہا ہے' کیا بات ہے؟ کچھ دیر پہلے تم ولیم کی کوٹھی میں اُلو بولنے کا ذکر کر رہے تھے اور اب اُلو کی دم پکڑ رہے ہو۔"

"دراصل اُلو کی اہمیت کا اندازہ مجھے انگریزوں سے ہوا جو ہندوستان میں اپنا اُلو سیدھا کرنے آئے ہیں۔ یقیناً ان کا اُلو ٹیڑھا ہو گا جبھی تو وہ اسے سیدھا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ وہ خود اتنے

بڑے اُلو ہیں کہ اُلو کو عقل و دانش کی علامت سمجھتے ہیں۔"

"جہنم میں جھونکو انہیں اور یہ بتاؤ کہ............"

"میں انہیں جہنم میں جھونکوں نہ جھونکوں' ان کے اعمال انہیں جہنم میں ضرور جھونک دیں گے۔" وہ میری بات کاٹ کر بول اٹھا۔ "ہاں تم کیا پوچھ رہی تھیں؟"

"اُلو نمبر دو اور تین' یعنی رابرٹ اور فلپ کے بارے میں پوچھنے والی تھی کہ وہ بھی ٹھونٹ پر بیٹھے ہیں کہ اڑ گئے؟" میں نے اسی کی اصطلاحوں میں بات کی۔

"پوچھنے والی تھیں کہ پوچھ رہی ہو۔ میں دلی والا ہوں میرے سامنے صحیح اردو بولا کرو۔"

"کیوں' کیا دلی والوں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے صحیح اردو بولنے کا۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے اردو کو پہلے بولے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"یہ کیا تم نے نئی چھوڑ دی؟" اس نے اپنے گول گول دیدے گھما کر میری طرف حیرت سے دیکھا۔

"اچھا اگر میں یہ ثابت کر دوں۔"

"کیا ثابت کر دو گی؟"

"یہی کہ پہلے اردو بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"اچھا کرو ثابت' کوئی لوٹ نہیں مچ رہی کہ جو چاہو گی ثابت کر دو گی۔"

"ایک شرط پر ثابت کروں گی کہ تم صحیح اردو بولنے کا دعویٰ واپس لے لو گے۔"

"چلو منظور ہے' کر کے دکھاؤ ثابت۔"

"تو سنو کہ اردو پہلے ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کیا کرتا تھا کیونکہ اس کے معنی لشکر ہیں۔ ثابت ہو گیا' میں نے جو کہا تھا۔

"ہرگز نہیں' اس لئے کہ تم اس کا صرف ایک مطلب بتا کر دوسرا گول کر رہی ہو۔ اب آیا میری سمجھ میں کہ تم مجھے کیا غچہ دے رہی تھیں۔" اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا' پھر کہنے لگا۔ "اب میں بھی تمہاری اطلاع کے لئے کچھ عرض کر دوں کہ اردو کا دوسرا مطلب لشکری بولی ہے۔ وہ زبان جو عربی' فارسی' ہندی' ترکی' انگریزی وغیرہ سے مل کر بنی ہے جسے اردوئے معلیٰ بھی کہتے ہیں چونکہ یہ زبان مغل تاجدار شاہجہاں کے لشکر میں ایجاد ہوئی تھی اس لئے یہی نام پڑ گیا۔ پنڈت بال مکند کو اتنی آسانی سے نہیں گھس سکتیں۔ کہو تو اردو بازار کا مطلب بھی بتا دوں' کیا یاد کرو گی۔ اردو بازار' لشکر کے بازار کو کہا جاتا تھا۔ صرف تمہی علم دریاؤ نہیں ہو' متعدد بار لٹنے کے باوجود اب بھی دلی میں بڑے بڑے پڑے ہیں۔ ہم جیسے فقیروں سے نہ اٹکا کرو۔ ہاں' تم لاکھ علم دریاؤ سہی مگر ایک سانس میں پچیس ایسے اردو کے لفظ بول سکتا ہوں کہ تمہیں ان کے معنی معلوم نہیں ہوں گے۔"

"پچیس لفظ تو خیر بہت ہیں' تم ایک لفظ ایسا نہیں بول سکتے جس کا مطلب مجھے معلوم نہ ہو۔"

"اچھا بتاؤ' پرپینڈوا کسے کہتے ہیں؟" اس کا لہجہ چیلنج کا سا تھا۔ "ابھی تمہاری سٹی گم ہو جائے گی۔"

میں نے اپنے حافظے کو کھنگال ڈالا مگر واقعی مجھے اس لفظ کا مطلب معلوم نہیں تھا۔

"ہار گئیں نا آخر۔" اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہار گئی۔" میں نے اعتراف کر لیا۔ "تم بتاؤ اس کا مطلب۔"

"پرپینڈوا دراصل اس بچے کو کہتے ہیں جس کا پیٹ بڑھ گیا ہو۔" وہ سنجیدگی سے بتانے لگا۔ "پینڈوا پینڈے سے بنا ہے اور پر تو تم سمجھتی ہو' یعنی جیسے پیٹ میں پر نکل آئے ہوں' مطلب یہ کہ پیٹ بڑھ گیا ہو۔ تمہیں شاید اس لئے مذکورہ لفظ کا مطلب معلوم نہیں ہو گا کہ یہ لفظ اصطلاحاً حکیم استعمال کرتے ہیں۔"

مجھے اس کی بات پر یقین آ گیا اور بولی۔ "اب میں اس لفظ کا مطلب یاد رکھوں گی۔"

پھر جب اچانک عادل زور سے ہنس پڑا تو میں حیرت سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔ معلوم نہیں اسے کس بات پر اتنی زور کی ہنسی آ گئی تھی۔

"کیسا انتقام لیا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"غنچے کا جواب غچہ .... ابتدا تم نے کی تھی' میں نے نہیں کہ پہلے اردو کو بولے جانے کی ضرورت نہیں تھی اور یہ کہ اردو کوچ کیا کرتا تھا وغیرہ۔ جوابی کارروائی کے طور پر میں نے فی الفور ایک لفظ گھڑ کر تمہیں چکریدم بنا دیا۔ اس پر لطیفہ یہ کہ تمہیں میری بات پر یقین بھی آ گیا۔"

"تو بے پر کی اڑا رہے تھے تم۔" میں نے آنکھیں نکالیں۔

جواب میں وہ ہنسنے لگا اور پھر اس کی ہنسی میں میری آواز بھی شامل ہو گئی۔

"اردو اور پرپینڈوے کے چکر میں اصل بات رہ ہی گئی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں تم سے یہ پوچھنے والی نہیں تھی بلکہ پوچھ رہی ہوں کہ رابرٹ اور فلپ کی تلاش بھی شروع ہوئی یا نہیں؟ اگر ولیم ہاتھ نہ آئے تو رابرٹ بھی ہمارے لئے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔"

"ظاہر ہے۔" وہ بولا۔ "سالار اکبر نے میرے سپرد فی الحال ولیم ہی کو کیا ہے۔ رابرٹ کی تلاش میں انہوں نے سمیع اللہ کو لگایا ہے۔"

"تو سمیع اللہ کا تعلق بھی تمہارے ہی شعبے سے ہے۔"

"ہاں' اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں' جس طرح میرے ساتھ ہیں۔ فلپ کے بارے میں البتہ مجھے نہیں معلوم کہ کس کی ڈیوٹی لگی ہے۔ سالار اکبر اپنے انداز میں کام کرتے ہیں۔ ہنگامی حالات میں بھی وہ کسی ایک آدمی پر اتنا بوجھ نہیں ڈالتے کہ اٹھ نہ سکے .... ہاں یاد آیا' سالار اکبر بتا رہے تھے کہ آج تمہاری صدارت میں ایک عدد اجلاس بھی ہوا ہے اور اس میں مسلح جدوجہد کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ مجھ سے تو باتوں باتوں میں سب کچھ پوچھ پاچھ لیا' خود کچھ نہیں بتا رہیں۔ ہوا بھی نہیں لگنے دے رہیں کہ........."

"کیا بتاؤں؟" میں بول اٹھی۔ "سالار اکبر نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے' وہی بات ہے۔"

"لیکن تم نے تو کچھ نہیں بتایا۔"

"بتاتی تو اس وقت جب تمہیں اُلو کی دم پکڑنے سے مہلت ملتی۔ تم نے تو اس طرح اُلو اُلو کی رٹ لگا رکھی تھی کہ مجھے ہر طرف اُلو ہی اُلو نظر آنے لگے اور ابھی تک نظر آنا بند نہیں ہوئے۔" یہ کہتے ہوئے میری نگاہ اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"خوب سمجھ رہا ہوں تمہارا مطلب' اتنا پگلوٹ نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔"

"ظاہر ہے کہ تم اس سے بہت زیادہ ہو۔" میں نے فقرہ لگایا اور ہنس پڑی۔

عادل میں بھی فقرہ سہنے اور انجوائے کرنے کی اہلیت تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ ہنسنے لگا۔ کچھ دیر ہنس بول کر ذہن ہلکا ہو گیا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی۔ سالار اکبر سے ملا جا سکتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اب تک اسے دن بھر کی رپورٹ مل چکی ہوگی۔

عمارت میں داخل ہونے کے بعد عادل اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا اور میں آگے بڑھ گئی۔

میں' سالار اکبر کے کمرے میں پہنچی تو خلاف توقع وہ مجھے تنہا نہیں ملا۔ سالار گربچن سنگھ بھی وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آئیے آئیے۔" وہ دونوں ہی بہ یک زبان بولے۔

میرا جی چاہا کہ جواب میں ان سے "بیٹھئے بیٹھئے" کہہ دوں۔ میری حسِ مزاح ابھی تک بیدار تھی۔ مگر ظاہر ہے اب فضا بدل چکی تھی۔

"تشریف رکھئے۔" یہ کہتی ہوئی آگے بڑھ کر میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں بھی بیٹھ گئے تو میں نے کہا۔ "معاف کیجئے گا' میں آپ حضرات کی گفتگو میں مخل ہوئی۔"

"نہیں کرن جی! ایسی کوئی بات نہیں۔" گربچن سنگھ خوش اخلاقی سے بولا۔ "ہم تو آپ ہی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔"

"میرے بارے میں؟"

"جی ہاں۔ میں ان سے کہہ رہا تھا کہ کرن جی کی وجہ سے آخر دشمن کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کا موقع مل ہی گیا۔" گربچن سنگھ مجھے میرے فرضی نام ہی سے مخاطب کر رہا تھا۔

"قبل از وقت کیا کہا جا سکتا ہے کہ میرا فیصلہ درست ہے بھی یا نہیں۔ ابھی تو سپریم کونسل کی منظوری بھی باقی ہے۔"

"مجھے تو پورا یقین ہے کرن جی کہ سپریم کونسل ہمارے حق میں فیصلہ دے گی۔" گربچن سنگھ کی آواز پرجوش تھی۔

اسی وقت سالار اکبر بول اٹھا۔ "یہ باتیں تو خیر ہوتی رہیں گی گربچن سنگھ جی' کرن جی سے تو پوچھ لو کہ انہوں نے کیسے زحمت کی۔" پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "جی؟"

"پنڈت جی سے تو میری ملاقات ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "ولیم رائٹ کے بارے میں تو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ اپنی کوٹھی سے غائب ہے اور اس کی تلاش جاری ہے' مگر ملٹری انٹیلی جنس کے چیف ٹنٹ ہیم اور وزارت داخلہ کے جوائنٹ سیکرٹری فلپ کا بھی کوئی سراغ ملا یا نہیں' یہ معلوم کرنا تھا۔" یہ

کہتے ہوئے اچانک مجھے ایک اور خیال آ گیا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں مزید بولی۔ "سالار! آپ کو یاد ہو گا کہ جب ہم ژیان کے دھوکے میں ولیم رائٹ کو اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے اغوا کر کے لائے تھے تو وہ خواب گاہ میں تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان انگریز لڑکی بھی تھی۔"

"جی ہاں یاد ہے مجھے۔" سالار اکبر نے تصدیق کی۔

"اس لڑکی کا نام ایلزبتھ تھا۔ فلپ نے جب مجھے پہلی بار ایک ہوٹل میں ولیم سے ملوایا تھا تو ایلزبتھ بھی اس کے ساتھ تھی۔ پھر وہی لڑکی اغوا والی رات کو ولیم کے ساتھ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں دیکھی گئی۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس لڑکی سے ولیم کے خصوصی مراسم رہے ہوں گے۔ ایسا نہ ہوتا تو ولیم اپنے چہرے پر ژیان کا میک اپ ہونے کے باوجود اس لڑکی کو اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں اس رات اپنے ساتھ نہ رکھتا۔"

"اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لڑکی شاید ولیم رائٹ کی حیثیت اور عہدے سے بھی واقف ہوگی۔" سالار اکبر نے میرے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

"ممکن ہے واقف ہو۔" میں بولی۔ "میرے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر اس لڑکی کا کوئی سراغ مل جائے تو شاید ولیم کی تلاش میں آسانی ہو۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' مگر اس لڑکی کا ملنا بھی محال ہی لگتا ہے۔" سالار اکبر نے کہا۔ "جب آپ نے مجھے اور پنڈت جی کو خواب گاہ میں بلایا تھا تو میں نے ٹارچ کی روشنی ڈال کر مسہری کا جائزہ لیا تھا۔ آپ اس سے پہلے ہی ولیم اور اس لڑکی کو بے ہوش کر چکی تھیں۔ میں نے بس ایک نظر اس لڑکی کے چہرے پر ڈالی تھی اور شاید پنڈت جی نے بھی اس پر زیادہ توجہ نہیں دی ہوگی۔ غالباً ہم تینوں ہی ولیم کی طرف متوجہ تھے کیونکہ اسے ژیان سمجھ رہے تھے جسے اغوا کرنے بہ وقت اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوئے تھے۔ بعد میں وہ لڑکی کوئی اہمیت اختیار کر جائے گی' اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا۔"

مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ "وہی لڑکی' فلپ کے رابطے میں بھی رہ چکی ہے۔" میں نے بتایا۔

میری اس بات پر خلاف توقع سالار اکبر چونک اٹھا۔ یہ اندازہ میں نے اس کے چہرے سے لگایا تھا میری نگاہ اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"پھر تو غالباً اس لڑکی کا سراغ لگایا جانا ممکن ہے۔" سالار اکبر بولا۔ اس کے چہرے سے اب غور فکر کا اظہار ہونے لگا تھا۔

"وہ کس طرح سالار؟" میں خاموش نہ رہ سکی۔

"اگر وہ لڑکی بہ قول آپ کے فلپ کے رابطے میں بھی رہی ہوگی تو یقیناً فلپ اس کے بارے میں جانتا ہو گا۔" سالار اکبر کا انداز اب بھی خود کلامی جیسا تھا۔

میرا ذہن سالار اکبر کے الفاظ کی روشنی میں تیزی سے ایک نتیجے تک پہنچ رہا تھا۔ میں بول اٹھی تاکہ میرے اندازے کی تصدیق ہو جائے۔ "تو کیا فلپ اپنی کوٹھی میں موجود ہے؟"

"جی ہاں کرن۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔ "اس سلسلے میں رپورٹ مل چکی ہے۔ داؤد جب

معلومات حاصل کر کے لوٹا تھا تو میں اس وقت میٹنگ میں تھا۔ میٹنگ کے بعد اس نے مجھے یہ رپورٹ دی تھی۔ فلپ کے متعلق آپ پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ وہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ میں نے اسی لئے فوری طور پر اس کے بارے میں آپ کو کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ پھر اس کا بدستور اپنی کوٹھی میں موجود رہنا بھی یہی ظاہر کر رہا تھا۔ رپورٹ کے مطابق فلپ کی کوٹھی کے اردگرد بھی ایسی نقل و حرکت نہیں دیکھی گئی جس سے پتا چلتا کہ حکومت نے اس کی حفاظت کا کوئی خصوصی بندوبست کیا ہے۔ اس کی بیوی بھی کوٹھی ہی میں تھی۔ وہ دونوں دوپہر کے بعد کناٹ پلیس میں شاپنگ کرتے ہوئے بھی دیکھے گئے تھے۔ اب بھی فلپ کی نگرانی جاری ہے۔"

سالار اکبر سے فلپ کے بارے میں تفصیلی رپورٹ سننے کے بعد میں نے کہا۔ "ولیم رائٹ تک پہنچنے کی ایک راہ بہرحال مل گئی ہے' اس پر ابھی گفتگو کریں گے۔ پہلے آپ مجھے دوسرے اہم مہرے رابرٹ ہیم کے متعلق بتایئے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ چوہا بھی کسی بل میں گھس کے بیٹھ گیا ہو گا۔" یہ کہتے ہوئے رابرٹ کے لئے میرے لہجے میں حقارت تھی۔ اب تک کے تجربات کی روشنی میں مجھے بھی غاصب حکمرانوں سے نفرت سی ہوتی جا رہی تھی جنہوں نے پورے ہندوستان کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" سالار اکبر نے بتایا۔ "ولیم ہی کی طرح رابرٹ کا بھی کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔"

"رابرٹ کیونکہ ملٹری انٹیلی جنس کا چیف تھا اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ممنوعہ علاقے میں ہو۔" گرچن سنگھ نے پہلی مرتبہ اس گفتگو میں حصہ لیا۔ "اور ولیم رائٹ کو بھی حکومت اسی علاقے میں رکھ سکتی ہے جہاں کوئی عام آدمی نہ پہنچ سکے۔ میری مراد ملٹری ایریا سے ہے۔"

گرچن سنگھ نے ایک نئی راہ سجھائی تھی' لیکن رابرٹ کی حد تک تو مجھے اس بات میں وزن معلوم ہوتا تھا' ولیم کا معاملہ میری نظر میں ذرا مختلف تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں نے ولیم کے مزاج کا کچھ کچھ اندازہ کر لیا تھا۔ اپنے فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا معاملہ کچھ یوں لگتا تھا۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی' سالار اکبر نے گرچن سنگھ کے خیال سے اتفاق کیا اور بولا۔ "اس کے باوجود ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے کیونکہ بہرحال یہ صرف ایک امکان ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "رابرٹ کے بارے میں دریافت کرنے سے پہلے آپ مزید کسی گفتگو.........."

"جی۔ فلپ کتنا بھی غیر اہم مہرہ سہی بہرحال وہ وزارت داخلہ کا جوائنٹ سیکرٹری تھا۔ اس کے علم میں بھی بہت سی ایسی باتیں ہو سکتی ہیں جو ہمارے کام آ سکیں۔ اس کے علاوہ ممکن ہے ایلزبتھ کا پتا بھی اس سے مل جائے۔" پھر میں نے مہذب الفاظ میں فلپ کی بیوی مارگریٹ سے بھی ولیم کے مراسم کا سرسری طور پر ذکر کر دیا۔

"پھر تو ولیم اور فلپ کے درمیان رقابت بھی ہو سکتی ہے۔ اگر ممکن ہوا تو ہم اس سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فلپ' ولیم کے خلاف ہی ہو گا۔ اگر اسے ولیم کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو جذبہ

رقابت کے زیر اثر بتا دے گا۔" سالار اکبر نے اپنی دانست میں ایک امید افزا بات کی۔

"چھوڑیں جی۔" گرنچن سنگھ بولا۔ "انگریز بڑی ہی بے غیرت قوم ہے۔ اس کا تو دین دھرم ہی پیسہ اور ہے۔ یہ تو رقیب سے بھی یار دوستوں کی طرح مل کے رہتے ہیں۔ کیا آپ بھول گئے کہ کرن جی کو فلپ ہی نے ولیم سے ملوایا تھا؟ رقابت یا دشمنی ہوتی تو دونوں ایک میز پر دوستوں کی طرح نہ بیٹھتے۔ انگریز کو تو اپنی قوم اور ملک کے مفاد کے سوا میں نے آج تک کسی معاملے میں وفادار نہیں دیکھا۔ انتہائی مکار' عیار' سازشی اور فریبی قوم ہے یہ۔" گرنچن سنگھ نے انگریزوں سے اپنی نفرت کا اظہار کیا اور یہ نفرت بلاسبب نہیں تھی۔

"بہرحال فلپ اور ولیم کے درمیان ایک تعلق اور نکل آیا۔" سالار اکبر' گرنچن سنگھ کی بات کو شاید اس وقت مصلحتاً نظرانداز کر گیا پھر اسے مجھ سے چائے کے لئے پوچھنے کا خیال آ گیا اور بولا۔ "معاف کیجئے گا کرن' باتوں میں یہ دھیان ہی نہیں آیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی میں کھانا کھا کے چائے پی چکی تھی۔"

"نہیں' منگواتا ہوں میں۔ گرنچن سنگھ جی بھی تو پئیں گے۔ اس کے علاوہ خود میرا بھی جی چاہ رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے سالار اکبر اٹھ کر اپنے کمرے کے دروازے تک گیا اور کسی کو آواز دے کر بلا لیا۔ جس طرح میری ضروریات کا خیال رکھنے کے لئے دلاری کا قیام میرے برابر والے کمرے میں تھا اسی طرح یہاں بھی لگتا تھا۔ اتنی جلدی کوئی قریبی کمرے ہی سے آ سکتا تھا۔ میں نے سالارر اکبر کو کہتے سنا۔ "رحمان سے تین کپ چائے بنوا کر لے آؤ۔ وہ اگر سو گیا ہو تم خود بنا لانا۔" پھر سالار اکبر واپس آ کر دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں اس دوران میں ایک فیصلہ کر چکی تھی' سو بولی۔ "موجودہ صورت حال میں فلپ پر ہاتھ ڈالنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

"تو پھر اسے آج ہی رات اٹھوا لیتے ہیں۔ حکم تو کریں آپ۔" سالار اکبر کی بجائے گرنچن سنگھ بول اٹھا۔

"جی ہاں گرنچن سنگھ جی' یہی کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

"داؤد تو اسی کوٹھی میں ہے نا؟" گرنچن سنگھ نے سالار اکبر سے معلوم کیا۔

"ہاں یہیں ہے۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔

"پھر ٹھیک ہے' وہ کوٹھی کی نشان دہی کر دے گا۔ خود میں اسے ساتھ لے کر چلا جاتا ہوں۔" گرنچن سنگھ پُرجوش نظر آنے لگا۔

"گرنچن سنگھ جی! کسی انگریز افسر کے اغوا کو اتنا ایزی نہ لیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ کچھ دنوں سے رات کے وقت پولیس کا گشت بڑھا دیا گیا ہے۔"

"ہمیں تو آپ لوگوں کی احتیاطوں نے مار رکھا ہے۔ ہاتھ باندھ رکھے ہیں ہمارے۔" گرنچن سنگھ'

سالار اکبر سے مخاطب تھا۔

"آپ کے ہاتھوں کو کھولنے کا بندوبست تو ہو رہا ہے۔" سالار اکبر مسکرایا۔ "اور کیا چاہئے آپ کو۔ اب تو یہ معاملہ سپریم کونسل تک پہنچ گیا ہے۔"

"وہ بھی صرف کرن جی کی وجہ سے' ورنہ تو سالار اعلیٰ اور امرناتھ جی کبھی اس پر راضی نہ ہوتے۔"

"مجھے تو آپ نے اپنا ہم خیال بنا لیا ہے۔"

"نا' یہ کریڈٹ بھی کرن جی کو جاتا ہے۔ انہوں نے پہلے اچھی طرح آپ کی برین واشنگ کر دی ہوگی۔" گرنچن سنگھ آہستہ سے ہنس دیا۔ پھر کہنے لگا۔ "اچھا یہ بتائیں' فلپ کو اغوا کرنے کے سلسلے میں آپ کیا احتیاط چاہتے ہیں؟"

"ایک تو یہ کہ اسے اغوا کر کے یہاں نہ لایا جائے کیونکہ اس کوٹھی میں نہ کوئی تہہ خانہ ہے' نہ ٹارچر سیل۔" سالار اکبر نے کہا۔

"چلیں مان لیا اور؟"

"اور یہ کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" سالار اکبر کے کچھ کہنے سے پہلے میں بول اٹھی۔ "اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خود میں اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ آپ کو اتنے سے کام کے لئے زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اتنی دیر میں آپ کی گفتگو سن کر سمجھ ہی چکا ہوں کہ اس سے کیا اگلوانا ہے۔" گرنچن سنگھ کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔

"کچھ باتیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں گرنچن سنگھ جی کہ جو سوال و جواب کے وقت ہی ذہن میں آتی ہیں۔"

"ہاں آپ کی یہ بات ماننے والی ہے۔" اس نے اقرار کیا' پھر بولا۔ "چلیں ایک تو آپ ہو گئیں' ایک میں' داؤد بھی ساتھ ہو گا' کافی ہے۔ کیوں جی؟" وہ سالار اکبر سے مخاطب ہوا۔

دوبارہ بھی میں نے سالار اکبر کو بولنے کا موقع نہیں دیا اور کہا۔ "میرا خیال ہے کہ پنڈت جی کو بھی ساتھ لے لیں۔"

"سارے بندے انہی کے ساتھ چلیں گے کرن جی تو میرے بندے مکھیاں مارنے کے لئے ہیں۔"

سالار اکبر اور گرنچن سنگھ کے درمیان خاصی بے تکلفی معلوم ہوتی تھی۔ پُرجوش ہونے کے باوجود گرنچن سنگھ فطرتاً خوش مزاج بھی لگتا تھا۔

"میں جو آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔" میں مسکرائی۔ "کیا مجھے آپ اپنا نہیں سمجھتے۔"

"آپ کی بات اور ہے کرن جی۔ آپ تو ہماری اعزازی سالار اعلیٰ ہیں۔ ویسے مجھے پنڈت جی کو بھی ساتھ لے چلنے پر کوئی اعتراض نہیں' بندہ وہ بھی بڑے کام کا ہے۔" گرنچن سنگھ بھی مسکرایا۔ "ویسے بھی ایک انگریز کو اغوا کرنے کا تجربہ رکھتا ہے۔" اس کا اشارہ ولیم کے اغوا کی طرف تھا۔ "پہلے وہ میرے ہی

پاس تھا' پھر انہوں نے اسے جھپٹ لیا۔"

"آپ کون سا کم ہیں۔" سالار اکبر کو خاصی دیر بعد بولنے کا موقع ملا۔ "آپ نے بھی تو جوابی کارروائی کے طور پر میرے دو بندے توڑ لئے۔"

"وہ دونوں آپ کے پاس رہ کر ٹھس ہو جاتے اس لئے میں نے یہی سوچا کہ انہیں بال کی کھال نکالنے کا عادی بننے سے بچالوں۔"

ان دونوں سالاروں میں یہ نوک جھونک جاری تھی کہ چائے آگئی۔ اسی دوران میں فلپ کے اغوا کی پوری منصوبہ بندی ہو گئی۔ کسی اہم نکتے کو نظرانداز نہیں کیا گیا تھا۔ داؤد اور عادل کو بھی سالار اکبر نے طلب کرلیا۔ انہیں ضروری ہدایات دے دی گئیں۔

"وہ اپنی "خاموش موت" مجھے ضرور دے دیجئے گا' اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ کیا خبر اس کی ضرورت پڑ جائے۔" گربچن سنگھ نے سالار اکبر کو مخاطب کیا۔

"لے لیجئے۔" سالار اکبر اٹھ کر کمرے میں موجود ایک الماری کی طرف بڑھا۔

"میں بھی تیار ہو کر آتی ہوں۔" میں بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور ہمیں نصف شب کے قریب کوٹھی سے روانہ ہونا تھا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچی تو کویتا جاگ رہی تھی۔

"تم ابھی تک سوئی نہیں؟"

"آپ کے انتظار میں نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔"

"کیوں کوئی کام تھا مجھ سے؟" میں نے آگے بڑھ کر اپنا ایک سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"کام تو خیر کوئی نہیں تھا پر جانے کیوں من کرتا ہے کہ سوتے سے آپ ہی کا درشن کرکے آنکھ لگے اور جب سو کر اٹھوں تو آپ ہی کا چہرہ دیکھوں۔" کویتا عجیب سے لہجے میں بولی۔ اس کی آواز خواب ناک سی تھی۔ میں سوٹ کیس اٹھا کر اس کی طرف پلٹی تو چہرے پر نگاہ پڑی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

"پگلی ہو تم۔" میں نے سوٹ کیس مسہری پر رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اسی سوٹ کیس میں "سائلنٹ ڈیتھ" بھی تھا اور بلٹ پروف جیکٹ بھی۔ مجھے دونوں ہی کی ضرورت تھی۔

"ہاں کرن جی' پگلی تو ہوں میں۔ پریم آدمی کو پاگل ہی تو بنا دیتا ہے۔" اچانک وہ یہ کہتے ہی اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بیٹھ گئی۔ "کہیں جا رہی ہیں آپ؟"

"ہاں' ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تم سو جاؤ۔ واپسی میں مجھے دیر بھی لگ سکتی ہے۔" میں نے کپڑوں کی تہہ کے نیچے سے "سائلنٹ ڈیتھ" نکال کر تکئے کے قریب رکھا اور پھر اس پر بلٹ پروف جیکٹ ڈال دی۔ میں اس طرح مسہری پر بیٹھی تھی کہ کویتا بھی میری نظر میں تھی۔ سامنے سوٹ کیس کھلا ہوا تھا۔ میرے اور کویتا کے بیڈ کے درمیان خاصا فاصلہ تھا' پھر بھی میں احتیاط سے کام لے رہی تھی۔

"اس سمے آپ کسی کام سے جا رہی ہیں؟" وہ حیرت سے بولی۔ "آدھی رات ہونے والی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔" یہ کہہ کر میں نے سیاہ رنگ کی ایک پینٹ اور شرٹ' سوٹ کیس سے نکال لی۔

"کوئی خطرے کی بات ہو تو میں بھی ساتھ چلوں؟" اس کی آواز سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔

"نہیں نا' ایسی کوئی بات نہیں۔ ہاں احتیاطاً تم میرے گرد حصار کھینچ دینا۔ کیونکہ ممکن ہے' چندر موہن اپنی کسی داسی یا چیلے کو مجھے تلاش کرتے رہنے کے لئے یہاں چھوڑ گیا ہو۔ دشمن تو دشمن ہی ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہئے۔" میں نے وہ سوٹ کیس بند کر دیا۔

"ٹھیک ہے' پھر تو مجھے جاگنا ہی پڑے گا۔"

"تم حصار کھینچ کر سو جاؤ نا۔ مجھے تو ابھی جانے میں دیر لگے گی۔" میں نے وہ سوٹ کیس اٹھایا اور اسے دیوار کے سہارے رکھ کر ایک اور سوٹ کیس اٹھا لائی۔ اس سوٹ کیس میں میک اپ بکس تھا۔ ابھی مجھے اپنے چہرے پر میک اپ بھی کرنا تھا۔ میں نے سوٹ کیس کھول کر میک اپ بکس نکال لیا۔

"مجھے سونے کی کوئی ایسی جلدی نہیں ہے' آپ تیار ہو جائیں۔"

میں ایک بار کویتا کے چہرے پر بھی میک اپ کر چکی تھی' اس وقت جب اسے ژیان کی تلاش کے سلسلے میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا چکر لگوانے لے گئی تھی۔

"اچھا تو آپ بھیس بدل رہی ہیں۔" وہ مجھے میک اپ بکس کھولتے دیکھ کر کسی ایسے بچے کی طرح خوشی کا اظہار کرنے لگی جو کوئی دلچسپ تماشا دیکھنے والا ہو۔ اسے میں پہلے ہی بتا چکی تھی کہ چندر موہن اور گوپال کے علاوہ بھی میرے اور بہت سے دشمن ہیں جن سے اپنا اصل چہرہ چھپانا ضروری ہے۔ میں میک اپ بکس سے سامان نکال کر باہر رکھنے لگی تو وہ پھر بول اٹھی۔ "اب کے بڑھیا مت بنئے گا' ہاں۔"

کویتا نے بچوں کی طرح ٹھنک کر کچھ اس طرح یہ جملہ ادا کیا کہ مجھے ہنسی آگئی۔ مجھے یاد آگیا کہ جب اس کے ساتھ گئی تھی تو میں نے اپنے چہرے پر ایک ادھیڑ عمر عیسائی عورت کا میک اپ کیا تھا۔ "اچھا نہیں بنوں گی بڑھیا' خوش؟" میں نے ہنستے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں اور کیا' کوئی اچھی نہیں لگتیں آپ بڑھیا بن کر۔"

"اچھا یا برا لگنے کے لئے چہرہ نہیں بدلتے پگلی کہیں کی۔ مقصد تو بس دشمن کی نظر سے خود کو چھپانا ہوتا ہے۔" میں نے اسے سمجھایا اور میک اپ کرنے لگی۔

کویتا مجھے میک اپ کرتے ہوئے بڑے شوق سے دیکھتی رہی میں کچھ دیر بعد میک اپ سے فارغ ہو گئی تو میں نے میک اپ بکس بند کرکے سوٹ کیس میں واپس رکھ دیا۔

"بولو' اب تو بڑھیا نہیں لگ رہی تمہیں؟" میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں بڑھیا تو نہیں لگ رہیں مگر..........."

"اب بھی اگر مگر کی گنجائش رہ گئی؟" میں نے وہ سوٹ کیس بھی اٹھا کر اس کی جگہ رکھ دیا۔

"اس سے آپ کا اصلی چہرہ بہت زیادہ سندر (حسین) ہے۔" اس نے "اگر مگر" والی بات کہہ ہی دی۔

"اسی اصلی چہرے کو تو چھپانا تھا نقلی چہرے کے پیچھے' ورنہ تو بھیس بدلنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

اس کے بعد میں نے تیار ہو کر کمرے سے نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ کویتا نے میرے گرد وہ حصار کھینچ دیا تھا جس کی موجودگی میں چندر موہن یا گوپال کے کسی چیلے چانٹے کو میں دکھائی نہ دیتی۔ وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی میں، سالار اکبر کے کمرے میں پہنچ گئی۔ عادل، داؤد اور گربچن سنگھ کے چہرے بھی مجھے بدلے ہوئے نظر آئے اور لباس بھی۔ وہ تینوں بھی کیل کانٹے سے لیس ہو چکے تھے۔

"ویسے تو گربچن سنگھ جی پہچاننے میں نہیں آ رہے، مگر ان کی پگڑی سارا بھید کھول رہی ہے۔" سالار اکبر نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھئے جناب، آپ میری پگ پر ہمیشہ اس وقت اعتراض کرتے ہیں جب میں میک اپ کرتا ہوں۔ آپ کو آخر کب یقین آئے گا کہ میں بہکائے میں آ کر نہ اپنے بال کٹواؤں گا، نہ داڑھی منڈواؤں گا۔" گربچن سنگھ اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں تو خیر اس لئے کہہ رہا تھا کہ آپ کی پگڑی سے ایک آدھ سفید بال باہر جھانک رہا تھا جبکہ چہرے سے جوان نظر آ رہے ہیں۔"

"یہ ہو ہی نہیں سکتا۔" گربچن سنگھ یہ کہہ کر عادل سے مخاطب ہوا۔ "دیکھ لو پنڈت جی، تمہارے گرو کو یہ خیال بھی نہیں کہ یہاں تم بچے بالے بھی موجود ہو۔"

اس سے پہلے کہ عادل کچھ کہتا، سالار اکبر بول اٹھا۔ "گربچن سنگھ جی! جلدی نکل لیں، بارہ بجنے والے ہیں۔"

سالار اکبر کے اس برجستہ فقرے پر کمرا قہقہوں سے گونجنے لگا۔ ان میں سے سب سے جاندار قہقہہ خود گربچن سنگھ کا تھا۔ وہ بڑا زندہ دل آدمی تھا۔ چلتے چلتے اس نے سکھوں اور بارہ بجے کے تعلق سے خود ہی ایک لطیفہ سنا دیا۔ "سکھوں کو معلوم نہیں کس نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ بارہ بجے ان کی عقل خبط ہو جاتی ہے۔ ہوا کیا کہ ایک مرتبہ انہوں نے سوچا، کیا خبر اس افواہ میں کوئی حقیقت ہو۔ لو جی، بڑے بڑے دانش مند قسم کے سکھ ایک کمرے میں جمع ہو گئے اور سامنے دیوار پر پنڈولم والی گھڑی لٹکا دی۔ بارہ بجنے میں اس وقت کچھ ہی دیر باقی تھی۔ سب کی نظریں گھڑی پر جمی ہوئی تھیں کہ ہم بھی تو دیکھیں، آخر ہمیں ٹھیک بارہ بجے کیا ہو جاتا ہے۔ بارہ بجنے میں چند سیکنڈ رہ گئے تھے کہ ایک سردار جی بھاگتے ہوئے دیوار تک پہنچے اور گھڑی کا پنڈولم پکڑ کر لٹک گئے، کہنے لگے۔ "میں بارہ ہی نہیں بجنے دوں گا جو کسی کی عقل خبط ہو۔" ایک بار پھر کمرے میں ہنسی کی زوردار آواز گونجی اور اسی وقت دیوار گیر گھڑی نے "ٹن ٹن" کی آواز کے ساتھ بارہ بجنے کا اعلان کر دیا اس پر اور بھی قہقہہ پڑا۔

سالار اکبر ہی کیا، کمرے میں موجود تمام افراد کی نظریں گربچن سنگھ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"اس طرح مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں آپ لوگ، کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔" گربچن سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر ذرا ہی دیر بعد ہم چاروں، سالار اکبر کے کمرے سے نکل آئے۔ گذشتہ روز اور پھر آج کے اجلاس نے جو غیر ضروری سنجیدگی کی فضا قائم کر دی تھی، وہ قطعی ختم ہو گئی۔ عمارت سے باہر آتے ہی ہم

ایک کار میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ داؤد نے سنبھال لی تھی۔ اس کے برابر اگلی سیٹ پر گربچن سنگھ بیٹھا تھا۔ میں اور عادل پیچھے بیٹھ گئے تھے۔

راستے بھر مجھ سمیت سبھی چوکنا رہے، مگر کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ داؤد نے خود ہی ایسے راستوں سے گریز کیا تھا کہ گشت کرتی ہوئی پولیس کی کسی گاڑی سے ٹکراؤ نہ ہو۔ فلپ کی کوٹھی سے کچھ پہلے ہی اس نے ایک گلی میں کار کھڑی کر دی اور ہم سب اتر گئے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

گربچن سنگھ اور داؤد دبے پاؤں آگے بڑھے۔ عادل میرے ساتھ پیچھے تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرتے ہی چھوٹا ایک پارک نظر آیا۔ داؤد کو میں نے ایک مخصوص اشارہ کرتے دیکھا۔ گھنے درختوں کے درمیان سے ایک شخص لپکتا ہوا قریب آ گیا۔ ہم رک گئے۔

"فلپ کوٹھی ہی میں ہے نا، کہیں گیا تو نہیں؟" داؤد نے دھیمی آواز میں اس شخص سے پوچھا۔

اس شخص نے تصدیق کر دی کہ فلپ کوٹھی کے اندر موجود ہے۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس شخص کا تعلق سالار اکبر کے شعبے سے ہو گا۔ سالار اکبر مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ کوٹھی کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ گربچن سنگھ اس شخص سے بولا۔

"اب تمہاری چھٹی، جاؤ۔"

سامنے ہی دائیں جانب مطلوبہ کوٹھی تھی۔ پارک سے کوٹھی کے گیٹ پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ ہم آگے بڑھ گئے اور وہ شخص دوبارہ پارک کی طرف مڑ گیا۔ شاید اس نے اپنی موٹر سائیکل وہیں کہیں چھپا رکھی ہو گی کہ بہ وقت ضرورت اسے استعمال کر سکے۔

اس علاقے میں اسٹریٹ لائٹس تو تھیں مگر خاصے خاصے فاصلے سے۔ روشنی بہرحال زیادہ نہیں تھی۔ کہیں اجالا اور کہیں نیم تاریکی سی تھی۔

فلپ کی کوٹھی کے گیٹ تک پہنچنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں گیٹ کی بائیں جانب سے باؤنڈری وال پر چڑھ گئی۔ داؤد نے بھی میری تقلید کی تھی۔ گربچن سنگھ اور عادل گیٹ سے ہٹ کر باؤنڈری وال سے لگے کھڑے تھے۔

میں نے اندر کا جائزہ لیا۔ گیٹ کے قریب ہی جو کوٹھری تھی، غالباً اس میں چوکیدار تھا۔ کوٹھری کے سامنے سے پختہ راستہ اندر جا رہا تھا۔ راستے کی دائیں طرف لان تھا۔ کچھ فاصلے پر عمارت کے برآمدے میں کم پاور کے ایک بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

معاً میری سماعت سے مخصوص قسم کی غراہٹیں ٹکرائیں اور میں چونک اٹھی۔ یہ غراہٹیں کتوں ہی کی ہو سکتی تھیں۔

خطرہ، میرے ذہن میں ایک ہی لفظ کئی بار گونجا۔

میں سمجھ گئی کہ حفاظت کی خاطر عمارت کے باہر اعلیٰ نسل کے خطرناک کتے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

یہ صورت حال غیر متوقع ہی تھی۔ چوکیدار کی کوٹھری اور چاردیواری کے درمیان تقریباً تین گز کا فاصلہ ہو گا۔ باؤنڈری وال سے کوٹھری کی چھت پر چھلانگ لگا کر پہنچنا میرے لئے تو خیر کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر داؤد

بھی اتنی لمبی جست بھر سکے گا' یہ بات یقینی نہیں تھی۔ کتوں کی وہاں موجودگی کے سبب باؤنڈری وال سے نیچے اترنا خطرے کو دعوت دینا ہوتا۔ پہلے ان کتوں کو ختم کرنا ضروری تھا۔ کوٹھری کی چھت پر پہنچ کر یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا کہ کتے کہاں ہیں۔

"تم یہاں سے کوٹھری کی چھت تک چھلانگ لگا سکتے ہو؟" میں نے داؤد سے سرگوشی کی۔

"جی ہاں۔" اس کی آواز میں اعتماد تھا۔

"سوچ لو' فاصلہ زیادہ ہے۔ اگر تمہارے لئے یہ ممکن نہیں تو یہیں باؤنڈری وال پر لیٹے رہو۔" میں پھر بولی اور اسے کتوں کی موجودگی سے آگاہ کر دیا۔

"مجھے بھی ان کی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کہیں قریب ہی موجود ہیں۔" داؤد نے دھیمی آواز میں بتایا' پھر مجھے دوبارہ یقین دہانی کرائی کہ لمبی جست بھر سکتا ہے۔

"میں کوٹھری کی چھت پر پہنچ جاؤں تو میرے اشارے کے بعد ہی تم اپنی جگہ سے حرکت کرنا۔" میں نے اسے تاکید کی۔

داؤد نے اقرار میں سرہلایا۔ میں کھڑی ہو گئی اور دوسرے ہی لمحے اپنے جسم کو مخصوص انداز میں سکیڑ کر چھلانگ لگا دی۔ میرے پیروں میں ربر کے جوتے تھے۔ "دھپ" کی ہلکی سی آواز ہوئی اور کوٹھری کی چھت پر سینے کے بل لیٹ گئی' پھر کے بغیر لپک کر چھت کے سرے تک پہنچ گئی۔ میں نے اس بات کو نظرانداز نہیں کیا تھا کہ کوٹھری میں اگر چوکیدار موجود ہے تو چھت پر میرے کودنے سے وہ جاگ سکتا ہے۔

میں نے جھانک کر نیچے دیکھا' مگر کوٹھری سے چوکیدار باہر نہیں آیا۔ اسے جاگنا ہوتا تو اب تک جاگ چکا ہوتا۔ میں مطمئن ہو کے پلٹ آئی اور ہاتھ ہلا کر داؤد کو جست بھرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اسے اٹھ کر باؤنڈری وال سے کوٹھری کی طرف چھلانگ لگاتے دیکھا۔

داؤد کی خوداعتمادی رائیگاں گئی۔ وہ کوٹھری کی چھت تک نہیں پہنچ سکا۔ باؤنڈری وال اور کوٹھری کے درمیان وہ زمین پر گرا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ عین اسی لمحے کتے بھونکے اور پھر وہ مجھے تیزی سے دوڑتے ہوئے نظر آ گئے۔ کتوں کا وہ جوڑا اسی طرف آ رہا تھا۔ ان دونوں کی جسامت غیر معمولی تھی۔ وہ بلڈ ہاؤنڈ تھے۔

میرے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں نے جیب سے "سائلنٹ ڈیتھ" نکالا اور دوڑتے ہوئے کتوں کا نشانہ لیا۔ وہ دونوں اگر داؤد تک پہنچ جاتے تو اسے شاید زندہ نہ چھوڑتے۔

"سائلنٹ ڈیتھ" سے نکلی ہوئی زہریلی سوئیاں یکے بعد دیگرے کتوں کے جسموں میں اتر گئیں۔ ادھر وہ دونوں اچھل کر کوٹھری کے سامنے گرے' ادھر کوٹھری کا دروازہ کھول کر جسیم چوکیدار باہر نکلا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ شاید داؤد کی چیخ سن کر جاگ اٹھا تھا۔ سب کچھ چند ہی لمحوں میں ہو گیا۔

چوکیدار جھک کر مردہ کتوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں چاہتی تو چوکیدار کو بھی کتوں کی طرح موت کی نیند سلا دیتی مگر مجھے یہ غیرانسانی حرکت معلوم ہوئی۔

میں نے "خاموش موت" کو جیب میں رکھ لیا۔ بلاسبب انسانی خون بہانا میری سرشت میں داخل

نہیں تھا۔ چوکیدار سے نمٹنے کے لئے دوسرا راستہ بھی ممکن تھا' سو میں نے اسی پر عمل کیا۔ کوٹھری کی چھت سے میں سیدھی اس کی پشت پر کودی۔ اس کے ساتھ ایک ہاتھ اس کے منہ جم گیا۔ اسے میں نے چیخنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے ہوش و حواس کی دنیا سے غافل کرنے کے لئے کنپٹی پر پڑنے والی ایک ہی ضرب کافی ہوئی۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

ابھی میں سیدھی کھڑی ہو رہی تھی کہ "دھم دھم" کی دو آوازیں سنائی دیں۔ میں تیزی سے پلٹی۔ اندر کودنے والے گرنجن سنگھ اور عادل تھے۔

وہ دونوں لپکتے ہوئے میرے قریب پہنچے۔ گرنجن سنگھ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ داؤد کہاں ہے؟"

"آئیں میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔ پہلے میں داؤد کو دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کس حال میں ہے۔

چند ہی لمحے بعد جب میں' داؤد کے پاس پہنچی تو وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عادل نے اسے اٹھنے میں مدد دی تو اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اس کے پیر میں موچ آ گئی تھی' سر بھی کوٹھری کی دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ اسی کے نتیجے میں اسے کچھ دیر کو چکر آ گئے تھے۔ مجموعی طور پر اس کی حالت تشویش ناک نہیں تھی۔

ہم کوٹھری کی آڑ میں تھے۔ میں نے گرنجن سنگھ اور عادل کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

"تم ہماری واپسی تک خاموشی سے یہیں پڑے رہو۔" گرنجن سنگھ نے داؤد سے کہا۔

"میں .... میں چل سکتا ہوں سالار۔" داؤد کی آواز سے شرمندگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اب اور زیادہ بہادر بننے کی ضرورت نہیں' اتنا کافی ہے۔" گرنجن یہ کہہ کر مڑا۔

"سائلنٹ ڈیتھ" داؤد کے پاس بھی تھا جسے اس نے جیب سے نکال لیا۔ عادل نے اسے سہارا دے کر دوبارہ بٹھا دیا تھا۔

خطرہ ٹل گیا تھا مگر ابھی اصل مرحلہ باقی تھا۔ چوکیدار کے منہ پر کپڑا باندھ کر اسے کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ یوں بھی وہ میرے اندازے کے مطابق جلدی ہوش میں نہ آتا۔ عادل اپنے شانے سے لٹکا ہوا کینوس کا ایک بیگ سنبھالے میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میری دوسری طرف گرنجن سنگھ تھا۔ ہم عمارت کا ایک چکر لگا چکے تھے۔ عمارت کی عقبی سمت میں سرونٹ کوارٹرز تھے۔ ادھر سے ہم بہت احتیاط کے ساتھ گزرے تھے۔ ہماری نقل و حرکت سے کسی کی آنکھ بھی کھل سکتی تھی۔

عمارت میں داخل ہونے کے لئے ہمیں ابھی تک کوئی بھی کھڑکی یا دروازہ کھلا ہوا نہیں ملا تھا۔

"اب تو دو ہی صورتیں ممکن ہیں سالار!" عادل نے سرگوشی کی۔ وہ گرنجن سنگھ سے مخاطب تھا۔

"دونوں ہی بتا دو۔" گرنجن سنگھ بھی دھیمی آواز میں بولا۔

"ایک تو یہ کہ ہم کمند ڈال کر کوٹھی کی چھت پر چڑھ جائیں' دوسرے یہ کہ.........."

"کسی کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر اسے کھول لیں۔" گرنجن سنگھ نے عادل کی بات کاٹ دی۔ "دوسری صورت میں تھوڑا سا خطرہ تو ہے' مگر یہی بہتر ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ہم کسی ایسے کمرے میں نہ پہنچ جائیں جس کا دروازہ باہر سے بند ہو۔ اس طرح ہماری محنت بیکار بھی جا سکتی ہے۔" گرنجن سنگھ نے خود ہی

خطرے کی وضاحت بھی کر دی۔

ایک بار پھر عمارت کا چکر لگایا گیا۔ کھڑکیوں پر زور آزمائی بھی کی گئی مگر صرف اس قدر کہ زیادہ آواز نہ ہو۔ مجبوراً ایک کھڑکی کا شیشہ کاٹنا پڑا اور ہم اسے کھول کر باری باری اندر کود گئے۔ گرچن سنگھ نے پنسل ٹارچ سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ کوئی اسٹور تھا۔ دروازہ کھلا ہوا ہی ملا۔ گرچن سنگھ کا خدشہ غلط ثابت ہوا تھا۔

وہاں سے نکل کے فلپ کی خواب گاہ تلاش کرنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ کمرے میں جلتے ہوئے نیلے بلب نے ہماری رہنمائی کی تھی۔ ہم دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔

فلپ اور مارگریٹ ایک ہی ڈبل بیڈ پر سو رہے تھے۔ اسی بے خبری کے عالم میں انہیں بے ہوش کر دیا گیا۔ اس کے لئے گرچن سنگھ نے کلوروفام استعمال کیا تھا۔ مجھے ان دونوں کی کنپٹیاں "سہلانے" کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ میں، فلپ کو اپنی پشت پر لادنے کے لئے آگے بڑھی تو گرچن سنگھ نے مجھے روک دیا۔

اسی وقت عادل نے کینوس کا بیگ شانے سے اتار کر گرچن سنگھ کی طرف بڑھایا۔ "سالار! یہ بیگ لے لیں۔" عادل نے کہا۔ "میری موجودگی میں آپ یہ بوجھ ڈھوتے ہوئے اچھے نہیں لگیں گے۔" عادل نے یہ کہتے ہوئے گرچن سنگھ کو بیگ تھمایا اور پھر بیڈ کی طرف بڑھا۔

"اچھا جوان تُو ہی اٹھا لے۔" گرچن سنگھ پیچھے ہٹ گیا۔

مارگریٹ کو وہیں بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر ہم کمرے سے نکل آئے پھر ہمیں اس عمارت سے باہر آنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ فلپ کے اغوا میں صرف ابتدائی مرحلہ ذرا دشوار ثابت ہوا تھا۔ داؤد کو ہم جہاں چھوڑ گئے تھے وہیں ملا۔ گرچن سنگھ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور گیٹ کا رخ کیا۔

فلپ بھاری تن و توش کا مالک نہیں تھا۔ عادل اسے اطمینان سے اٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول دیا۔

کار تک پہنچنے میں داؤد کی وجہ سے تھوڑی قباحت ہوئی۔ عادل نے بے ہوش فلپ کو اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان ڈال دیا۔

واپسی میں عادل نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ داؤد پیچھے میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ گرچن سنگھ اگلی سیٹ پر تھا۔

فلپ کے اغوا کی مہم توقع کے مطابق کامیاب رہی۔ وہ کوٹھی بھی نئی دہلی کی حدود میں تھی جہاں فلپ کو لایا گیا۔ زیادہ وقت اسی لئے نہیں لگا۔

اس کوٹھی میں تہ خانہ بھی تھا۔ تہ خانے کا نقشہ بالکل وہی تھا جو میں پہاڑ گنج والی کوٹھی میں دیکھ چکی تھی۔ ولیم رائٹ کی طرح فلپ کو بھی دو ستونوں کے درمیان زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔

"اس کے منہ پر پانی کے کچھ چھینٹے مارو پنڈت جی!" سالار گرچن سنگھ نے عادل سے کہا۔

عادل، گرچن سنگھ کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔

"گرچن سنگھ جی، آپ اوپر جا کے آرام کریں، میں اس کے لئے بہت ہوں۔" میں بولی۔ احتیاطاً اب آواز بدل کر بول رہی تھی کہ کیا خبر فلپ کو کب ہوش آ جائے۔ ولیم کے سلسلے میں ایک مرتبہ میں کھا چکی تھی۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ فلپ مجھے میری آواز سے پہچان لے۔ اس پر گرچن سنگھ بھر کو چونکا تھا، پھر شاید مصلحت سمجھ گیا تھا۔

"نا کرن جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے پیر میں تو موچ نہیں آئی، نہ سر دیوار سے ٹکرایا ہے۔" کا اشارہ داؤد کی طرف تھا جسے اوپر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ "یہ ممکن نہیں کہ آپ تو یہاں جاگتی رہیں اور جا کر سو جاؤں۔"

پھر میں نے اصرار نہیں کیا۔ فلپ کو ہوش آنے میں خاصی دیر لگی۔ یہ بے ہوشی کی دوا کا اثر تھا۔ میں آتے ہی وہ اس طرح اِدھر اُدھر نظریں گھمانے لگا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو۔ آخر کار وہ ہی اٹھا۔ "مم .... میں کہاں ہوں؟" اس کی آواز سے شدید خوف جھلک رہا تھا۔ اس نے انگریزی میں یہ الفاظ ادا کئے تھے۔

"یہ جاننے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا مسٹر فلپ!" میں چبھتے ہوئے لہجے میں بولی، ذریعہ اظہار ہی تھا اور آواز بدلی ہوئی تھی۔

"تت .... تم کون ہو؟" وہ اب بھی ہکلا رہا تھا۔

"یہ بتانے سے بھی کچھ حاصل نہیں کیونکہ تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں نکل سکو گے۔"

"نن .... نہیں۔" وہ دہشت زدہ ہو کر چیخ اٹھا اور میرا مقصد بھی یہی تھا۔ وہ بہرحال ولیم رائٹ تھا۔ ایک بیوروکریٹ سے یہی توقع کی جا سکتی تھی۔

"اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو جو پوچھا جائے بتاتے رہو۔"

کچھ دیر تک وہ غالباً اپنے حواس مجتمع کرتا رہا، پھر بولا۔ "تم لوگ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"کوئی سوال نہیں مسٹر فلپ۔" میری آواز میں سختی آ گئی۔ "تمہیں صرف جواب دینا ہے۔" پھر اسے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر پہلا سوال کیا۔ "تم ایلزبتھ کو جانتے ہو؟"

"ایلزبتھ؟" خوف کے ساتھ ساتھ اب اس کے لہجے میں حیرت بھی تھی۔ شاید اسے کسی ایسے کی توقع نہیں تھی۔

"ہاں ایلزبتھ۔" میں زور دے کر بولی۔ "وہی ایلزبتھ جسے تم نے پہلی بار ولیم رائٹ کے ساتھ دیکھا ایلزبتھ کی طرح ولیم رائٹ کے نام پر بھی تم حیرت کا اظہار کرنا چاہتے ہو تو بتا دوں، ولیم رائٹ اسروس کا سربراہ رہ چکا ہے۔"

"جانتا ہوں میں .... اسے جانتا ہوں۔"

"کسے؟ ایلزبتھ کو یا ولیم رائٹ کو؟"

"دونوں کو۔" فلپ نے بلا تامل اعتراف کر لیا۔

"ایلزبتھ کا پتا معلوم ہے تمہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس نے مجھے اپنا پتا دیا تو تھا مگر میں کبھی وہاں گیا نہیں۔"

"پتا یاد ہے؟" میں اسے کچھ سوچنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی' پے در پے سوال کئے جا رہی تھی۔

اس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا جیسے وہ پتا یاد کر رہا ہو پھر اس نے نئی دہلی ہی کا ایک پتا بتا دیا۔

میں نے اپنے ذہن میں پتا محفوظ کر لیا اور پوچھا۔ "کوٹھی نمبر یہی ہے نا؟ اگر ایلزبتھ اس پتے پر نہیں ملی تو......." میں نے دھمکی دینے کے انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے' پتا یہی ہے' لیکن وہ .... اگر اس نے غلط پتا بتایا ہو تو یہ .... میری غلطی تو نہیں ہوگی۔" وہ اس طرح بولا جیسے رو دے گا۔

گرچن سنگھ کے اشارے پر عادل نے بھی ایک نوٹ بک میں ایلزبتھ کا پتا لکھ لیا تھا۔

"تمہیں اچانک معزول کیوں کر دیا گیا؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

اس نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔ "میری بدقسمتی .... چارج شیٹ کے مطابق........."

"زیادہ معصوم یا چالاک بننے کی کوشش نہ کرو فلپ۔" میں نے سختی کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔ "تم اندر سے جتنی کتی نسل ہو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں چارج شیٹ سننے کے لئے تمہیں یہاں لے کر نہیں آئی' حقیقت بیان کرو میرے سامنے۔"

"وہی .... وہی تو بیان کر رہا ہوں۔" اس نے یقین دلایا' چہرے کا رنگ اڑنے لگا۔ "یہ زیادہ عرصے کی بات نہیں کہ صوبہ بنگال سے میرا تبادلہ یہاں ہو گیا۔"

"معلوم ہے مجھے۔" میں بول اٹھی۔ "پہلے تو وزارت اطلاعات و نشریات میں تھے اور یہاں تمہارا تبادلہ ہوم منسٹری میں ایڈیشنل یا جوائنٹ سیکرٹری کے طور پر ہوا تھا۔" میں نے یہ سب کچھ اس لئے کہا کہ وہ کسی معاملے میں ڈنڈی نہ مارے۔ اسے یقین آ جائے کہ مجھے اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہیں۔ "آگے کہو۔"

فلپ کے چہرے پر حیرت نظر آئی پھر وہ بتانے لگا۔ "کلکتے سے ٹرین میں دہلی سفر کرتے ہوئے میری ملاقات ایک جرائم پیشہ عورت رانی سے ہوئی۔"

میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا کہ وہ جھوٹ تو نہیں بول رہا' پھر دریافت کیا۔ "تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ عورت جرائم پیشہ ہی تھی؟"

"ہاں' اس نے ایک ہم سفر ہندوستانی راجا کو قتل کر دیا تھا۔" فلپ نے جواب دیا۔

میری نظریں اس کے چہرے پر ہی تھیں۔ معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں فلپ سفر کی مزید تفصیلات بیان کرنے لگے۔ راستے میں چمپا نے جو گھناؤنا کھیل کھیلا تھا' اس کا ذکر عادل اور گرچن سنگھ کے سامنے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ میں اسی لئے جلدی سے بولی۔ "پھر وہ عورت ایک رات یہاں دہلی میں مل گئی تھی۔ تمہیں اس کی بے گناہی پر یقین آ گیا ہو گا اور پھر یہ کہ مقتول راجا بہرحال

ہندوستانی تھا۔ اس کے قتل سے تمہیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔" میں تیزی سے بولے جا رہی تھی۔ "تم نے اسی لئے اس عورت کو ایک موقع پر بہ حیثیت رانی شناخت نہیں کیا اور اسے فرار ہو جانے دیا۔ میرے صرف اس سوال کا جواب دو کہ اس عورت رانی کے متعلق تمہیں ولیم رائٹ نے تو کچھ نہیں بتایا؟" میں نے اسے پابند کر دیا۔

"نہیں' ولیم سے اس سلسلے میں میری کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"تمہیں کسی دوسرے ذریعے سے بھی رانی کے متعلق مزید کچھ پتا نہیں چلا؟"

اس مرتبہ بھی فلپ کا جواب انکار ہی میں تھا پھر اس نے میرے ایک اور سوال کے جواب میں بتایا۔ "مجھے معزول نہیں' معطل کیا گیا ہے۔ چارج شیٹ میں اسی عورت رانی کی مدد کرنے پر جواب طلب کیا گیا ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ جب میں نے اس عورت کو ولیم رائٹ سے ملوایا تو حقیقت کیوں چھپا گیا؟ ولیم رائٹ کو اس عورت کا نام مس گریٹا کیوں بتایا؟"

فلپ کے جوابات سے اب تک یہی ظاہر ہوا تھا کہ وہ میری صرف ایک حیثیت سے واقف ہے۔ میں ہی معبلہ ہوں' وہ یہ نہیں جانتا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور لہجے سے میں نے یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا پھر بھی میں نے مزید یقین دہانی کی خاطر عادل کو اشارہ کیا۔ "اب تم اس سے معلوم کرو کہ واقعی اس نے سچ بولا ہے؟"

عادل نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا کہ فلپ کا بیان غلط نہیں۔ اس نے فلپ کو مزید دہشت زدہ کرنے کے لئے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ میں پیچھے ہٹ گئی۔ عادل نے اس کی کنپٹی پر ریوالور کی نال رکھ دی اور پھر سخت لہجے میں بولا۔ "تمہیں دوسری دنیا میں پہنچا دوں کہ زبان کھولنے پر تیار ہو؟ صرف تین تک گنوں گا' اس کے بعد تمہارا بھیجا اڑا دوں گا......... ایک۔" عادل نے گنتی شروع کر دی۔

میری نظر فلپ کے چہرے ہی پر جمی ہوئی تھی۔ موت کو خود سے اس قدر قریب دیکھ کر شاید اس کے حواس گم ہو گئے تھے۔

"دو۔" عادل کی تیز آواز پھر کمرے میں گونجی۔ "تین کہتے ہی میں گولی چلا دوں گا۔"

"نہیں۔" فلپ خوفزدہ آواز میں چیخ اٹھا۔ اسے جیسے ہوش آ گیا تھا۔ "مقدس کنواری مریم کی قسم' .... میں نے سچ بولا ہے۔"

"اور اس کے بعد بھی جو کچھ پوچھا جائے گا' سچ ہی بتاؤ گے؟" گرچن سنگھ پہلی مرتبہ بولا۔

"ہاں' ہاں سب .... سب کچھ سچ ہی بتاؤں گا۔" اس بار فلپ نے یقین دہانی کی خاطر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قسم کھائی تھی۔

"میرا خیال ہے فلپ کہ تم ایک بدکردار آدمی ہو۔ تمہارا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ ہم تمہارے فریب میں آ جائیں گے؟ تمہاری قسموں پر یقین کر لیں؟ تم جانتے ہو کہ تمہاری بیوی مارگریٹ اور ولیم رائٹ کے درمیان جائز مراسم نہیں ہیں' کیا تمہارا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے؟"

"نہیں مم .... میں ایک سچا عیسائی ہوں اور .... اور خدا کے بیٹے کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا۔" شدید خوفزدہ ہونے کے باوجود آخری الفاظ اس نے بڑی روانی سے ادا کئے تھے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ "میں اعتراف کرتا ہوں کہ بدکردار اور گنہگار ہوں' لیکن.........."

"بکومت۔" گرچن سنگھ نے اسے ڈانٹ دیا۔ "تم اس وقت کسی پادری کے سامنے نہیں کھڑے ہوئے کہ مرنے سے پہلے اعتراف کرکے گناہوں سے نجات پالو گے۔"

فلپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں تم لوگوں کو کیسے اور کس طرح یقین دلاؤں؟" اس کے لہجے سے بے بسی ظاہر تھی۔

"مرد ہو کر رو رہا ہے۔ ابے مرد تو ہنستے کھیلتے موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔" گرچن سنگھ بے تکلفی پر اتر آیا جو اس کے مزاج کا خاصہ تھا۔ اس کے باوجود گرچن سنگھ کے لہجے کی سفاکی برقرار تھی۔ "جواب دے کہ سرفروش تنظیم کے بارے میں تجھے کیا معلوم ہے؟"

عادل نے ابھی اس کی کنپٹی پر ریوالور کی نال نہیں ہٹائی تھی۔

"حکومت کے خلاف یہ ایک زیر زمین تنظیم ہے۔" فلپ نے فوراً جواب دیا۔

"اور؟" گرچن سنگھ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اور .... اور یہ کہ حکومت ہر قیمت پر اس تنظیم کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔"

"اس کے لئے حکومت نے کیا منصوبہ بنایا ہے؟"

"مجھے صرف اتنا .... اتنا ہی معلوم ہے کہ .... کہ کوئی بڑا آپریشن ہونے والا ہے۔ مم مجھے اس محکمے میں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے اور.........."

"اپنی صفائی پیش مت کرو۔" گرچن سنگھ نے اس طرح آنکھیں نکالیں جیسے اسے کچا چبا جائے گا۔ "جو اصل بات ہے وہ بتا؟"

"بہت سی باتیں میرے علم میں نہیں' اعلیٰ سطح تک محدود ہیں۔"

"تیرے علم میں کیا ہے؟"

"جو میں نے بتایا ہے۔"

"کیا بتایا ہے تو نے؟" گرچن سنگھ نے اس کے سینے پر گھونسا مارا۔ "مت بھول کہ تیرا تعلق اس قوم سے ہے جس نے ہندوستان کو غلام بنا رکھا ہے۔ سفید کتے! میں تجھ پر بھوکے کتے چھوڑ دوں گا۔ تجھے اپنی زبان کھولنا پڑے گی۔ بتانا پڑے گا کہ حکومت کا منصوبہ کیا ہے؟" عادل کو اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی عادل ذرا سا ہٹا' گرچن سنگھ نے فلپ کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور اس کا سر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔ "بول!" اس نے دانت پیسے اور کوٹ کے اندر دوسرا ہاتھ ڈالا۔ گرچن سنگھ کے شانے سے کرپان لٹکی ہوئی تھی۔ کرپان نکال کر اس نے فلپ کی آنکھوں کے سامنے گھمائی۔ "میں تیری دونوں آنکھیں کرپان کی نوک سے باہر نکال لوں گا۔"

دہشت کے سبب غالباً فلپ کی قوت گویائی جواب دینے لگی تھی' مگر اسے بولنا ہی پڑا۔ گرچن سنگھ

موت کے فرشتے کی طرح اس کے سر پر سوار تھا۔

"تم .... تم مجھے مار دو۔ قتل کر دو مجھے۔"

"اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا تجھے۔ کرپان سے تیری بوٹی بوٹی الگ کروں گا۔" گرچن سنگھ غرایا۔ "بتا حکومت کا منصوبہ کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم' نہیں معلوم۔" فلپ رونے لگا۔ "میں اس سے زیادہ.........."

فلپ اپنا جملہ پورا نہیں کر سکا۔ سر کے بال چھوڑ کر گرچن سنگھ نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا۔ "تیرے تو باپ کو بتانا پڑے گا۔ تجھے نہیں معلوم؟ تو جو وزارت داخلہ میں ہے۔"

پھر ہر ممکن حربہ آزما لیا گیا' مگر فلپ کچھ نہ بتا سکا۔ حکومت' سرفروش تنظیم کے خلاف جو بڑا آپریشن کرنے والی تھی' فلپ کو اس کی تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں اسے وہیں بندھا ہوا چھوڑ دیا گیا۔ ہم تینوں تہ خانے سے نکل آئے۔

گرچن سنگھ مجھے اور عادل کو ساتھ لئے ایک کمرے میں آگیا اور چائے منگوالی۔

"آپ کیا کہتی ہیں؟" گرچن سنگھ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "فلپ جھوٹ تو نہیں بول رہا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ اسے شاید منصوبے کی تفصیل کا پتہ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر اسے کچھ معلوم ہوتا تو اتنے ٹارچر کے بعد ضرور کچھ بتا دیتا۔"

عادل نے بھی مجھ سے اتفاق کیا۔

"ہوں۔" گرچن سنگھ نے ہنکارا بھرا' پھر کہنے لگا۔ "ڈیسوزا کی طرح اس کے اغوا سے بھی کیا کوئی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟"

"اس سلسلے میں سوچنا پڑے گا۔" میں بولی۔ "مگر اس کے اغوا سے حکومت چوکنا ضرور ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اسے دانستہ لاعلم رکھا گیا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ولیم اور رابرٹ کی طرح فلپ کو بھی غائب کر دیا جاتا۔ یہ صرف اوپر کی کہانی ہے جو فلپ کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ اصل کہانی سیکرٹ سروس اور ملٹری انٹیلی جنس کے اداروں تک محدود رکھی گئی ہے۔ فلپ سے بس ایک ہی کام کی بات معلوم ہو سکی ہے' ایلزبتھ کا پتا' لیکن ہمیں جلدبازی سے گریز کرنا پڑے گا۔" پھر میں نے اپنی بات کی وضاحت میں مزید کہا۔ "ایلزبتھ کی نقل و حرکت پر ہمیں کڑی نظر رکھنا ہوگی۔ اس یقین کے بعد کہ ولیم اسی کوٹھی میں چھپا ہوا ہے' ہم کوئی قدم اٹھائیں گے۔"

"فلپ کے اغوا سے کیا ولیم جیسا عیار شخص یہ نہیں سوچ سکتا کہ اس طرح ہم اس تک پہنچنے کی ہموار کر رہے ہیں؟" عادل نے ایک اہم سوال کیا۔

"یقیناً۔" میں نے تائید کی۔ "ولیم کو معلوم ہو گا کہ فلپ سے بھی ایلزبتھ ملتی رہی ہے۔ ایسے حالات میں کسی بھی امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود ہماری لائن آف ایکشن یہی رہے گی۔" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"اس وقت تین بجنے والے ہیں۔" گرچن سنگھ بولا۔ "اور صبح ہونے سے پہلے ولیم کو فلپ کے اغوا

کی خبر نہیں ہو سکتی۔"

"تو پھر؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ولیم ایلزبتھ ہی کی کوٹھی میں ہے تو ہم اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔" گربچن سنگھ نے جواب دیا۔

"یہی تو طے نہیں گربچن سنگھ جی۔ ایسی ہی کسی جلد بازی سے گریز کے لئے تو میں نے ابھی اشارہ کیا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کے فوری اقدامات بنا بنایا کھیل بھی بگاڑ دیتے ہیں۔"

"آپ کہتی ہیں تو پھر نہیں کرتے ایسا۔" گربچن سنگھ نے اپنی تجویز واپس لے لی۔

اس دوران میں ہم چائے پی چکے تھے۔

"اب چلا جائے؟" میں نے عادل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ چاہیں تو یہیں آرام کریں' صبح چلی جایئے گا۔" گربچن سنگھ نے مجھے مخاطب کیا۔ "عموماً میں بھی اسی کوٹھی میں رہتا ہوں۔"

"فی الحال بھی آپ کا یہاں رہنا مناسب ہے۔"

"اگر آپ یہ فلپ کی وجہ سے کہہ رہی ہیں تو یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔" گربچن سنگھ پُرجوش آواز میں کہنے لگا۔

"پرندہ تو خیر پہاڑ گنج والی کوٹھی میں بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔" میں مسکرائی۔ میری رگ شرارت پھڑک اٹھی۔ "مگر یہ بھی تو سوچیں گربچن سنگھ جی کہ پرندہ تو آخر پرندہ ہوتا ہے' کہیں بھی پر مار سکتا ہے۔ آپ ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔ اسی کے نتیجے میں ولیم مع پرندے کے اڑ گیا۔"

اس پر گربچن سنگھ ہنس پڑا اور میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ عادل نے بھی میری تقلید کی۔

"باقی آئندہ۔" میں نے چلتے چلتے گربچن سنگھ سے کہا۔

پھر گربچن سنگھ عمارت کے باہر تک ہمیں چھوڑنے آیا۔ ہم کار میں بیٹھ گئے تو گربچن سنگھ نے عادل کو مخاطب کیا۔ "جوان! ذرا دیکھ بھال کے جانا' کتے پیچھے نہ لگ جائیں۔ تمہارے سالار اکبر کا کہنا ہے کہ کتوں نے رات کے گشت میں اضافہ کر دیا ہے۔"

"پروا نہ کریں سالار' میں محفوظ راستوں سے جاؤں گا۔" عادل نے جواب دیا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ میں اس کے برابر ہی اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

"رب راکھا۔" گربچن سنگھ بولا اور کار کے آگے بڑھتے ہی واپسی کے لئے مڑ گیا۔

کوٹھی کی حدود سے کار باہر نکل آئی تو عادل نے کہا۔ "سالار گربچن سنگھ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔"

"یقین دلاؤ۔"

"پھر گھنے لگیں مجھے۔"

"تم ہو ہی ایسی شے کہ جسے جتنا زیادہ گھسا جائے' اتنی ہی چمکنے لگتی ہے۔"

اسی طرح ایک دوسرے پر فقرے چست کرتے ہوئے ہم قرول باغ پہنچ گئے۔

کوٹھی میں پہنچ کر کار سے اترتے ہوئے میں نے عادل سے کہا۔ "اگر سالار اکبر ہمارے انتظار میں

جاگ رہے ہوں تو تم انہیں رپورٹ دے دینا۔"

کار ایک طرف پارک کر کے عادل بھی اتر آیا۔ عمارت میں داخل ہو کر عادل کے اور میرے راستے جدا ہو گئے۔ نیند کی وجہ سے میرا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر لباس تبدیل کرنے کے بعد مجھے سونے میں زیادہ دقت نہیں لگا تھا۔ کویتا کو میں نے بدستور اپنے بیڈ پر سوتے ہوئے دیکھا تھا۔

☆======☆======☆

دوسرے روز شام تک تنظیم کے سربراہ کی طرف سے احکام مل گئے۔ اس نے گرین سگنل دے دیا تھا۔ ایک بار پھر ہنگامی میٹنگ طلب کر لی گئی۔ جیکسن اور گربچن سنگھ حسب توقع خاصے پُرجوش نظر آ رہے تھے۔ دونوں ہی نے میری تجویز قبول کئے جانے پر مجھے مبارک باد دی۔ میٹنگ میں یہ طے کیا جانا تھا کہ حکومت پر پہلی کاری ضرب کب' کہاں اور کیسے لگائی جائے۔ اس ضمن میں مختلف تجاویز زیر غور آئیں۔ طریقہ کار اور لائحہ عمل پر زوردار بحث ہوئی۔

"کسی بھی تجویز پر عمل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں انتہائی تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہوگی۔" میں نے کہا۔

"ہمارے پاس ایسے کمانڈوز ہیں جنہیں فوجی انداز میں تربیت دی گئی ہے۔" سالار وحیدالدین بولا۔ تنظیم کے ارکان کو تربیت دینے کی ذمہ داری اسی کی تھی۔

"ان کی تعداد کتنی ہوگی؟" میں نے معلوم کیا۔

"گیارہ کمانڈوز ہیں ایسے جو یقیناً آپ کے معیار پر پورے اتر سکتے ہیں۔"

"بہت کم ہیں۔" میں بولی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بہ یک وقت کئی جگہ دشمن پر ضرب نہیں لگا سکتے۔"

"لیکن اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟" سالار اعلیٰ قدیر بیگ نے سوال کیا۔ میٹنگ اسی کی صدارت میں ہو رہی تھی۔

"ایک ساتھ اگر کئی جگہ اچانک حملہ کیا جائے تو دشمن گھبرا جاتا ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"میری تجویز ہے کہ کمانڈو دستے کی سربراہی کا فرض معبلہ خاتون انجام دیں۔" نگران اعلیٰ کے ... امرناتھ نے کہا۔

متفقہ رائے سے یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس لئے خاموش رہی' ... توقف سے بولی۔ "میں کمانڈوز کے اس دستے میں چند افراد کی شمولیت اور چاہوں گی۔" پھر میں نے ... گربچن سنگھ' سالار اکبر اور عادل کے نام لئے۔ "ضروری نہیں ہوتا کہ پوری قوت ایک ہی محاذ پر لگا دی جائے یا صرف لڑاکا افراد ہی ساتھ ہوں۔ سوچنے اور بروقت حملہ کرنے والے دماغ بھی چاہئیں۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گی کہ اب تک اس سلسلے میں جتنی بھی تجاویز پیش کی گئی ہیں' میں کسی سے ... نہیں ہوں۔ شہری حدود سے ہٹ کر کوئی تجویز زیر غور نہیں آئی۔ پولیس ہیڈکوارٹر' سی آئی ڈی کے دفاتر وغیرہ پر حملہ کرنا حکومت کے لئے زیادہ تشویش ناک نہیں ہو گا۔ پہلا حملہ ایسا ہونا چاہئے کہ

حکومت بلبلا رہ جائے۔"

کچھ دیر تک اجلاس کے کمرے میں سکوت چھایا رہا۔ سبھی کے چہروں پر غور و فکر کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں پھر اچانک سالار اکبر بول اٹھا۔ "اطلاعات کے مطابق دہلی اور غازی آباد کے درمیان حکومت نے گزشتہ دنوں ایک بڑا ایمونیشن ڈپو قائم کیا ہے۔ اس سلسلے میں تمام ضروری معلومات بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ اگر اس ڈپو کو اڑا دیا جائے تو؟"

سالااکبر کی یہ تجویز مشکل اور خطرناک ہونے کے باوجود میری نظر میں بہترین تھی۔ سب سے پہلے میں نے ہی اس تجویز کی تائید میں آواز بلند کی۔ پھر اس پر بحث شروع ہو گئی۔ تجویز کے قابل عمل ہونے کے ہر پہلو پر غور کیا جانے لگا۔ اس سے سبھی کو اتفاق تھا کہ حکومت ایمونیشن ڈپو کی تباہی پر بوکھلا اٹھے گی۔

خاصی دیر غور و خوض کے بعد یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ تیاری کے لئے صرف ایک دن کی مہلت کافی سمجھی گئی۔ اس کے بعد اجلاس کی باقاعدہ کارروائی ختم ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ چائے پینے کے دوران میں جیکسن کو میں نے رک جانے کے لئے کہا۔ "ابھی ایک چار رکنی غیر رسمی میٹنگ باقی ہے۔" میں مسکرا کر بولی۔

عادل میرے قریب ہی تھا' کہنے لگا۔ "اگر اس چار رکنی میٹنگ کو پانچ رکنی بنا دیا جائے تو پنڈت مکند بہت ممنون ہو گا۔" وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ چار رکنی میٹنگ کا کیا مطلب ہے۔

"پنڈت بال مکند کی پرارتھنا سوئیکار کی جاتی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہونا چاہتا ہے۔

چائے پینے کے بعد سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ذرا ہی دیر بعد سالار اکبر کے کمرے میں وہ پانچ رکنی غیر رسمی میٹنگ شروع ہو گئی جس کی ایک رکن میں بھی تھی۔ میرے اور سالار اکبر کے علاوہ میٹنگ میں جیکسن' گرچن سنگھ اور عادل شریک تھے۔

"میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے گفتگو شروع کی۔

"دیکھیں جی' آپ کسی اور کو ساتھ لے کر چلیں کہ نہیں' میں ضرور چلوں گا۔" گرچن سنگھ بولا۔

"کیا خبر گرچن سنگھ جی' ہم میں سے یہ کسی کو ساتھ نہ لے چلیں۔" سالار اکبر نے چٹکی لی۔

"جی نہیں' وہ پہلے ہی کہہ چکی ہیں کہ سوچنے اور بروقت فیصلہ کرنے والے دماغ بھی چاہئیں۔" گرچن سنگھ نے جلدی سے کہا۔

"پھر تو گرچن سنگھ جی' آپ نے خود ہی اپنے خلاف فیصلہ دے دیا۔ انہیں سوچنے اور بروقت فیصلہ کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ آپ شاید ان کی بات سمجھے نہیں۔" سالار اکبر نے گرچن سنگھ پر ایسی چوٹ کی کہ وہ کھسیا کے رہ گیا۔

"آپ ضرور ساتھ چلیں گے گرچن سنگھ جی' چاہے سالار اکبر جائیں نہ جائیں۔" میں ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاں اور کیا جی۔ بے دولہے کی بارات کب اچھی لگتی ہے۔"

"معاف کیجئے گا گرچن سنگھ جی' آپ دولہا نہیں باراتی ہیں۔" جیکسن بھی گرچن سنگھ کو چھیڑنے میں

پیچھے نہیں رہا۔ "پھر آپ کی عمر بھی اب دولہا بننے کی نہیں رہی۔"

"چلو جی' دولہا نہ سہی باراتی سہی۔"

اس نوک جھونک کے بعد سنجیدہ گفتگو شروع ہو گئی۔ طے پایا کہ اس مہم میں میرے ساتھ سالار اکبر' گرچن سنگھ اور عادل کے علاوہ صرف پانچ کمانڈوز شریک ہوں گے۔ پھر یہ غیر رسمی میٹنگ برخاست ہو گئی۔ سالار اکبر ایمونیشن ڈپو کے محل وقوع سے پوری طرح آگاہ تھا۔

اگلے ہی روز رات کے وقت جب ہم نو افراد ایک بند وین میں تمام تر ضروری تیاریوں کے ساتھ دہلی کی حدود سے باہر نکل رہے تھے تو میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میرے ذہن میں جانے کیوں طرح طرح کے خدشات اور اندیشے جنم لے رہے تھے۔

اچانک فضا ایک دھماکے سے گونج اٹھی تو میں اچھل پڑی۔

اس دھماکے نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ وین کا پچھلا حصہ ایک طرف جھک گیا تھا مگر دھماکہ صرف ٹائر برسٹ ہونے کا نہیں تھا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ وین کو روکنے کے لئے یقیناً پچھلے ٹائر پر فائر کیا گیا تھا۔ عادل ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور اس کے ساتھ آگے سالار اکبر بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ وین کے پچھلے حصے میں گرچن سنگھ کے علاوہ پانچوں کمانڈوز تھے۔ وہ پانچوں ہی ایک دم الرٹ ہو گئے تھے۔ وین کے اگلے اور پچھلے حصے کے درمیان جو چھوٹا سا چوکور خلا تھا' مجھے اس میں لمحے بھر کو سالار اکبر کا چہرہ نظر آیا۔ پھر وین سڑک سے اتر کر کچے راستے پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھی۔ اس کے بعد ایک ساتھ کئی باتیں ہوئیں۔ جو کمانڈو' وین کے عقبی دروازے کے پاس بیٹھا تھا' اس نے جلدی سے دروازہ کھول کر چلتی وین سے باہر چھلانگ لگا دی تھی اور دور تک کچے میں لڑھکتا چلا گیا تھا۔ کمانڈوز کی تربیت اسی انداز میں ہوتی ہے کہ کسی بھی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کر سکیں۔

وین کے رکتے رکتے باقی چار کمانڈوز بھی پوزیشن لے چکے تھے۔ گرچن سنگھ اور میں نے بھی دیر نہیں کی تھی۔ سڑک کے کنارے ناہموار زمین پر سینوں کے بل لیٹ کر ہم نے اس طرف جہنم کے دہانے کھول دیئے تھے جدھر سے ہمارے اندازے کے مطابق پہلا فائر ہوا تھا۔ خاصے فاصلے پر ہمیں ایک جیپ اور ٹرک نظر آ گیا تھا۔ جوابی فائرنگ میں بھی تاخیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد باقاعدہ فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ فضا پے در پے دھماکوں سے گونجنے لگی۔

میری پشت سے جو تھیلا بندھا ہوا تھا' اس میں دستی بم بھی تھے۔ میرے قریب ہی گرچن سنگھ زمین پر لیٹا ہوا فائر کر رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "میں ابھی آتی ہوں۔"

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر سوال کیا' پھر فائرنگ کرنے لگا۔

"اسی طرح دشمن کے فائر کا جواب دیتے رہیں اور میری فکر نہ کریں۔" ذرا سا وقفہ ہوا تو میں بولی' مگر میں وہاں رکی نہیں۔

جیپ اور ٹرک' سڑک پر رک چکے تھے' یہ میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ دشمن انہی کی آڑ لے کر فائرنگ کر رہا ہو گا' یہ سمجھنا میرے لئے دشوار نہیں تھا۔

میں ایک لمبا چکر کاٹ کر دشمن کے عقب میں پہنچ گئی۔ فائرنگ اس وقت تک جاری تھی۔ میری پہلی نظر ان لوگوں کے لباس پر پڑی۔ وہ پولیس کی وردیوں میں تھے اور میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد خاصی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے پاس غالباً اسلحہ بھی خاصا تھا۔ وہ دیر تک مقابلہ کر سکتے تھے۔ میں ان کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے بہت احتیاط سے کام لیا تھا کہ وہ میری طرف متوجہ نہ ہو جائیں۔ کسی بھی قسم کی جلدبازی میری زندگی کو خطرے میں ڈال سکتی ہے' اس کا مجھے پوری طرح احساس تھا۔ لیٹے لیٹے ہی میں نے اپنی پشت سے بندھا ہوا تھیلا کھولا اور اسے اپنے قریب رکھ لیا۔ اپنی گن بھی میں نے شانے سے اتار لی۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر میں اسے نیست و نابود کر دینا چاہتی تھی۔ تھیلا کھول کر میں نے کئی دستی بم نکال لئے۔

پھر وہ لمحے بہت قیامت خیز تھے جب دشمنوں کے جسم فضا میں چیتھڑے بن کر اڑ رہے تھے۔ ایک طوفان آ کر گزر گیا اور اپنے پیچھے لاشوں کے ٹکڑے چھوڑ گیا۔ غاصب حکومت کے ٹکڑوں پر کتوں کی طرح پلنے والوں سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں تھیں جنگ خواہ بڑے پیمانے پر ہو کہ محدود سطح پر' اس میں یہی سب ہوتا ہے' مارو یا مر جاؤ۔

جو کچھ ہوا تھا' میرے ساتھیوں کے لئے سمجھنا مشکل نہیں رہا ہو گا۔ میں یہ سوچتی ہوئی وہاں سے واپس چل دی کہ گرچن سنگھ نے میری غیر موجودگی کی وضاحت کر دی ہو گی۔

میں اپنے ساتھیوں تک پہنچنے سے پہلے ایک فیصلہ کر چکی تھی۔

فوری طور پر میں نے جو قدم اٹھایا تھا' اس کی کوئی متبادل راہ میرے سامنے نہیں تھی۔ پولیس سے فائرنگ کے تبادلے کی صورت میں بلا سبب ایمونیشن ضائع ہوتا رہتا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلتا' یہ ایک الگ بات تھی۔ میں جب واپس پہنچی تو اسپیر وہیل برسٹ ہونے والے وہیل کی جگہ لگایا جا رہا تھا۔ عادل اسی میں مصروف تھا۔

سالار اکبر' گرچن سنگھ اور پانچوں کمانڈوز ابھی تک مستعد چوکنا کھڑے تھے۔ دشمنوں کے بارے میں ابھی تک انہیں شاید علم نہیں تھا کہ وہ کون تھے' یعنی حکومت کی کسی ایجنسی سے ان کا تعلق تھا۔ گرچن سنگھ اور سالار اکبر فوراً میرے قریب آ گئے تھے۔

"آپ کو اپنی زندگی اس طرح خطرے میں نہیں ڈالنا چاہئے تھی۔" گرچن سنگھ بولا۔ "ہم میں سے کوئی بھی یہ کام انجام دے سکتا تھا۔"

"لیکن اس کی زندگی بھی تو میری ہی طرح خطرے میں پڑ سکتی تھی۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "سبھی کی زندگی قیمتی ہوتی ہے۔"

"حکم کیا ہوتا آپ نے' میں تو سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ آپ کیا قدم اٹھانے والی ہیں۔" گرچن سنگھ بدستور اپنی ہی بات کہے گیا۔

"اتنی مہلت نہیں تھی۔" میں بات ختم کرنے کی خاطر بولی۔

"ہمیں جلد از جلد یہاں سے اپنی مہم پر روانہ ہو جانا چاہئے۔" گرچن سنگھ کی آواز سے فکرمندی کا

اظہار ہو رہا تھا۔ "بموں کے دھماکے دور تک سنے گئے ہوں گے۔ کوئی خطرہ پھر ہماری راہ روک سکتا ہے۔" اس نے تائید طلب نظروں سے سالار اکبر کی طرف دیکھا۔

اس معاملے میں سالار اکبر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں بول اٹھی۔ "اب کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا۔"

"یہ آپ یقینی طور پر کس طرح کہہ سکتی ہیں؟" سالار اکبر پہلی مرتبہ بولا۔

"اس لئے کہ اب ہم اپنی مہم پر روانہ نہیں ہو رہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم یہیں سے واپس چلیں گے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" گرچن سنگھ حیرت کا اظہار کرنے لگا۔ "معاف کیجئے گا' یہ .... یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"میرا خیال ہے گرچن سنگھ جی کہ کرن جی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔" سالار اکبر نے میری تائید کی۔ صرف اجلاس کی حد تک وہ لوگ مجھے میرے اصل نام سے مخاطب کرتے تھے۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔" گرچن سنگھ نے کہا۔ "راستے میں رکاوٹیں تو ہوتی ہیں مگر .... حکم پھر حکم ہے۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ "آپ کا اگر یہی حکم ہے تو........."

"اس فیصلے کی وجہ میں آپ سے چھپاؤں گی نہیں گرچن سنگھ جی! مگر یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہئے' میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں۔"

وہیل تبدیل کیا جا چکا تھا۔ واپسی میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

دہلی کی طرف لوٹتے ہوئے ہم پہلے سے زیادہ چوکنا اور محتاط رہے۔ میں اس مرتبہ بھی بند وین کے پچھلے حصے ہی میں بیٹھی تھی۔ گرچن سنگھ راستے بھر بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ اس نے دو ایک بار مجھ سے گفتگو کرنا چاہی مگر میں ٹال گئی۔ جب ہم واپس قرول باغ والی کوٹھی میں پہنچے تو میں نے اجلاس والے کمرے کا رخ کیا۔ وہ لوگ میرے پیچھے پیچھے تھے۔ وہ لوگ یقیناً سمجھ گئے تھے کہ میں کسی اہم مسئلے پر فوری طور پر گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔

آگے بڑھتے ہوئے معاً مجھے ایک خیال آیا اور میرے قدم رک گئے۔

"میں لباس تبدیل کر آؤں۔" میں نے سالار اکبر کو مخاطب کیا۔ "آپ لوگ بھی فریش ہو لیں۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے ہیں' ایک بجے سب افراد اجلاس والے کمرے میں آ جائیں اور ہاں' یہ لیں........." میں نے پشت سے تھیلا کھولتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے کہ اب ہمیں کسی مہم پر تو جانا نہیں' اسلحہ وغیرہ اسٹور ہی میں رکھوا دیں کیونکہ اب کل رات ممکن ہے کہ ہم اس مہم پر روانہ ہوں۔ اس کا فیصلہ ابھی میٹنگ میں کر لیں گے۔" اس دوران عادل میرے ہاتھ سے تھیلا لے چکا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں مسکراتے ہوئے مزید بولی۔ "چائے کے لئے کہلوا دیجئے گا' ممکن ہے بحث مباحثے میں دیر لگ جائے۔" پھر میں نے اپنی گن بھی شانے سے اتار کر عادل ہی کو تھما دی۔ "پنڈت جی! تمہیں زحمت تو ہو گی مگر........."

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ایک کمانڈو بول اٹھا۔ "لایئے پنڈت جی! مجھے دے دیں۔" اس نے تھیلا اور گن، عادل سے لے لی۔

پھر میں ہی کیا، سبھی واپسی کے لئے مڑ گئے۔ سالار اکبر کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے، مگر گرچن سنگھ کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا، خوش مزاجی بھی جیسے رخصت ہو گئی تھی۔ میں بہرحال تیز قدمی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

توقع کے مطابق کویتا مجھے سوتی ہوئی ملی۔ کمرے میں داخل ہو کر میں نے احتیاط سے کام لیا تھا کہ کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔

کپڑے تبدیل کر کے میں مقررہ وقت پر اجلاس والے کمرے میں پہنچ گئی۔ میرے ساتھ اس مہم پر جتنے بھی افراد روانہ ہوئے تھے وہاں سبھی موجود تھے۔ میری کرسی خالی تھی، میں اس پر جا کر بیٹھ گئی۔ میری دائیں جانب سالار اکبر تھا اور بائیں جانب گرچن سنگھ پھر بقیہ لوگ بیٹھے تھے۔

میں نے دائیں بائیں سب کے چہروں کا جائزہ لیا جن سے مختلف تاثرات کا اظہار ہو رہا تھا۔ انہی میں عادل بھی شامل تھا۔

"سب سے پہلے میں آپ لوگوں کو یہ بتا دوں کہ ہماری راہ کھوٹی کرنے والے پولیس والے تھے۔ اس سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔" میں نے بولنا شروع کیا۔ "پہلی بات تو یہ کہ ہمارے خلاف اٹھایا جانے والا یہ قدم کسی غیر معمولی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ حکومت کو ہمارے اصل عزائم کا علم نہیں تھا۔ اگر حکومت کو یہ خبر ہوتی کہ ہم دہلی اور غازی آباد کے درمیان قائم ایمونیشن ڈپو کو اڑانے جا رہے ہیں تو وہ ہمیں چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کرتی پھر کسی بھی صورت میں ہمیں نکلنے کا موقع نہ ملتا۔ حکومت بہرصورت ہمیں پکڑنے کی کوشش کرتی یا ہمیں ختم کرنے کے لئے اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتی، چند پولیس والے ہماری راہ میں مزاحم نہ ہوتے۔" میں نے سوالیہ انداز میں نظریں اٹھائیں۔

میرے خاموش ہوتے ہی گرچن سنگھ نے کہا۔ "یہ محض ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے کہ پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی۔ ہماری وین کو مشتبہ سمجھ کر انہوں نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا ہو گا۔"

"پنڈت جی!" میں نے عادل کو اس کے فرضی نام سے مخاطب کیا۔ "کیا تم اتنے بے خبر ہو کر ڈرائیونگ کر رہے تھے کہ تمہیں تعاقب کا علم نہ ہو سکا؟"

"شہر کی حدود تک میں یقیناً بہت محتاط اور چوکنا رہا تھا۔" عادل نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "جب ہماری وین آبادی کی حدود سے نکل آئی اور نواح شہر میں پہنچی تو میں مطمئن ہو گیا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا۔ خود سالار اکبر بھی میرے ساتھ آگے بیٹھے تھے، وہ میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

سالار اکبر نے پہلو بدلا اور بولا۔ "پنڈت جی ٹھیک کہتے ہیں۔ خود میں بھی ہوشیار تھا۔ ہماری وین کا تعاقب نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ شہر میں گشت پر موجود پولیس اپنے ساتھ اتنی نفری لے کر نہیں چلتی۔"

"اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پولیس پہلے ہی سے نواح شہر میں ہماری آمد کی منتظر تھی، ہے نا؟"

میں سالار اکبر ہی سے مخاطب تھی۔

"جی!" سالار اکبر نے طویل سانس لیا۔ "اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ پولیس کے پاس ہماری نقل و حرکت کے متعلق کوئی نہ کوئی انفارمیشن موجود تھی۔"

"لیکن شہر سے نکلنے کا واحد وہی راستہ تو نہیں جس پر ہم آگے بڑھ رہے تھے۔" گرچن سنگھ بولا۔ "اگر پولیس کے پاس انفارمیشن تھی بھی تو ایک ہی صورت ممکن ہے کہ اسے یقین ہو کہ ہم کدھر جائیں گے۔ کرن جی خود یہ کہہ چکی ہیں کہ ایسی صورت میں حکومت کوئی بڑا قدم اٹھاتی۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے گرچن سنگھ جی کہ پولیس نے انفارمیشن ملنے کے بعد شہر کی ناکہ بندی کر دی ہو۔" سالار اکبر نے اظہار خیال کیا۔

"مگر پولیس کو انفارمیشن ملی کیسے؟" گرچن سنگھ یہ کہہ کر غالباً سوچنے لگا۔

"اصل مسئلہ یہی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور ہم اسی پر غور کرنے جمع ہوئے ہیں۔ ہمیں پہلے یہ تجزیہ کرنا پڑے گا کہ ہماری اس مہم کے بارے میں کتنے لوگوں کو علم تھا۔ گزشتہ رات کے اجلاس میں اس تجویز پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا گیا جس میں مجھ سمیت مقامی تنظیم کے تمام ہی اہم ارکان موجود تھے۔ اس اجلاس میں تیاری کے لئے صرف ایک دن کی مہلت دی گئی اور بقیہ معاملات مجھ پر چھوڑ دیئے گئے۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گئی۔

"اجلاس میں روانگی کے وقت وغیرہ سے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔" سالار اکبر نے وضاحت کی۔ "یہ سب کچھ ہم نے اجلاس کے بعد طے کیا۔"

"اس غیر رسمی میٹنگ میں جو افراد شریک ہوئے ان میں سے صرف ایک فرد، یعنی نائب سالار اعلیٰ جیکسن یہاں موجود نہیں۔ بقیہ چار افراد میں سے ایک میں بھی تھی۔ میرے علاوہ سالار اکبر، پنڈت بال مکند اور گرچن سنگھ جی تھے۔ یہاں اس وقت جو پانچ کمانڈوز موجود ہیں، اگلے روز شام کو صرف یہ اطلاع دی گئی کہ انہیں کسی خاص مہم پر دہلی سے باہر جانا ہے اور وہ تمام تر تیاریوں کے ساتھ رات کو نو بجے تک قرول باغ والی کوٹھی یعنی یہاں پہنچ جائیں۔ اس وقت تک پانچوں کمانڈوز کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اصل مہم کیا ہے اور انہیں ہمارے ساتھ کہاں چلنا ہے۔" میں نے یہ کہہ کر تصدیق کی خاطر یکے بعد دیگرے کمانڈوز کی طرف دیکھا۔ "آپ کو صرف یہ خبر تھی کہ سفر ایک وین میں ہو گا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں کرن جی!" عادل کے قریب بیٹھے ہوئے ایک کمانڈو نے فوراً میری تائید کی۔ "ہمیں تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا، یہیں آ کر مہم کے متعلق علم ہوا۔"

بقیہ کمانڈوز بھی اپنی رائے کے اظہار میں بولے اور اپنے ساتھی سے اتفاق کیا۔

"اور یہ بھی کہ یہاں آنے کے بعد آپ میں سے کوئی باہر نہیں گیا۔" میں نے مزید کہا۔

"جی ہاں۔" وہ بیک آواز بولے۔

"اب میں آپ لوگوں سے چند سوالات اور کرنا چاہتی ہوں۔ میرے علم و اطلاع کے مطابق آپ مما سے تین کا قیام گرچن سنگھ جی والی کوٹھی میں ہے، بقیہ دو ایک اور ٹھکانے پر تھے۔ دونوں ٹھکانوں پر

تقریباً شام کو پانچ بجے وہ اطلاع پہنچائی گئی جس کا ابھی ذکر ہوا۔" کمانڈوز نے میری اس بات کی بھی تائید کر دی تو میں بولی۔ "پانچ بجے کے بعد سے یہاں پہنچنے تک آپ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر ہی رہے یا کہیں آئے گئے؟"

"اس سے آپ کا کیا مطلب ہے کرن جی!" عادل کے قریب بیٹھا ہوا کمانڈو بول اٹھا۔ "کیا آپ ہماری وفاداری پر شک کر رہی ہیں؟ یعنی یہ کہ ہم میں سے کوئی پولیس کا مخبر ہے؟" اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا' چہرے پر بھی تناؤ سا نظر آنے لگا تھا۔

"راجندر!" گرچن سنگھ کی سخت آواز ابھری۔ "مت بھولو کہ اس وقت تم کس سے مخاطب ہو' تم سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے صرف اس کا جواب دو۔"

"دھیرج گرچن سنگھ جی! راجندر کو جو کچھ کہنا ہے' کہنے دیں۔" میں نرمی سے بولی' پھر راجندر سے مخاطب ہوئی۔ "تم شاید یہ بھول گئے کہ اس سے پہلے میں نے تنظیم کے اس اجلاس کا بھی ذکر کیا تھا جس میں سالار اعلیٰ کے علاوہ تمام ہی اہم ارکان نے شرکت کی تھی۔ پھر اس غیر رسمی میٹنگ کا بھی تذکرہ آیا تھا جو سالار اکبر کے کمرے میں ہوئی۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم سب مل کر کسی نتیجے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ جب کسی معاملے کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو اس کے ہر پہلو کو دیکھا جاتا ہے۔ اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ نہ اس کا مقصد کسی پر کوئی الزام لگانا ہوتا ہے۔ تم اتنی جلدی اس نتیجے پر کیسے پہنچ گئے کہ میں تمہارے اوپر شک کر رہی ہوں یا تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پولیس کا انفارمر کہنا چاہتی ہوں؟ یہ بتاؤ' پولیس کو کسی نہ کسی ذریعے سے تو خبر ملی ہو گی نا؟" میری نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

"جی۔" اس مرتبہ راجندر کی آواز بلند نہیں تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"تو پھر سب سے پہلے تمہی جواب دو کہ تم پانچ بجے کے بعد سے یہاں آنے تک کہاں رہے؟"

"میں کوٹھی ہی میں تھا۔" راجندر نے جواب دیا۔ "میرے دونوں ساتھی بھی میرے اس بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں جو یہاں موجود ہیں۔"

"یعنی تم گرچن سنگھ والی کوٹھی میں تھے؟"

"جی ہاں کرن جی!"

بقیہ دونوں کمانڈوز نے بھی راجندر کے بیان کی تائید کر دی۔ اب صرف بقیہ دو کمانڈوز رہ گئے تھے جو ایک دوسرے ٹھکانے سے قرول باغ پہنچے تھے۔ جو تین کمانڈوز بائیں جانب گرچن سنگھ کے بعد بیٹھے تھے' انہی میں سے وہ دو کمانڈوز تھے جن سے اب تک پوچھ گچھ نہیں کی گئی تھی۔ میں نے ان دونوں کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"یہ وجے اطلاع ملنے کے بعد سالار وحیدالدین سے اجازت لے کر گیا تھا۔" ایک کمانڈو نے گرچن سنگھ کے برابر بیٹھتے ہوئے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "سالار نے جلد لوٹ آنے کی تاکید کی تھی۔ وجے کی ماں ان دنوں بیمار ہے۔" جس کمانڈو نے یہ بات بتائی اس کا نام طفیل تھا۔ "اس وقت شاید ساڑھے چھ بج رہے تھے۔"

میں نے براہ راست وجے سے کوئی سوال نہیں کیا' اس کے چہرے پر صرف ایک نظر ڈال کر طفیل سے پوچھا۔ "تمہیں وجے کی ماں کے علیل ہونے کا علم کس طرح ہوا؟"

"خود وجے نے مجھے بتایا تھا۔"

"کب؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس وقت جب سالار وحیدالدین سے وجے نے اپنے گھر جانے کی اجازت مانگی' میں بھی موجود تھا۔ مجھے تبھی یہ بات معلوم ہوئی۔" طفیل نے بتایا۔

"تمہیں اپنی ماں کی بیماری کا پتا کیسے چلا؟" میں نے وجے سے پہلا سوال کیا۔

"م .... میں اپنے گھر آتا .... آتا جاتا رہتا ہوں۔" وجے کچھ گھبرایا ہوا سا دکھائی دیا۔

"ماں........... ماں جی بہت .... بہت دن سے بیمار ہیں۔"

"کیا بیماری ہے انہیں؟" میں نے معلوم کیا۔

"انہیں' ٹی .... بی ہے ان کو' جی ہاں ٹی بی..........."

"آج سے پہلے آخری بار تم ان سے کب ملے تھے؟" میں سوال پر سوال کئے جا رہی تھی۔

"چار .... ہاں چار دن پہلے ملنے گیا تھا۔ اس وقت ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔" وجے اب روانی سے بولنے لگا تھا۔ شاید اس نے اپنے منتشر حواس پر قابو پا لیا تھا۔ "ماں جی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان سے ملنے آتا رہوں۔"

"اس بات کا ذکر تم نے طفیل یا اپنے دوسرے ساتھیوں سے پہلے کبھی کیوں نہیں کیا؟" میں نے دریافت کیا۔ طفیل کچھ کہنے والا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

وجے بولا۔ "میں اپنے ساتھیوں کو یہ بتا کے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

"ہوں' تم کچھ کہنا چاہتے تھے طفیل!" میں پرسکون آواز میں بولی۔

"جی!" طفیل نے کہا۔ "فراش خانے والی حویلی میں' جو نئے ارکان کی تربیت گاہ بھی ہے' وہاں مجھ سمیت چھ کمانڈوز کا قیام ہے۔ گزشتہ ایک ہفتے سے سالار وحیدالدین نے کسی بھی کمانڈو کو حویلی سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی۔"

"اس کی وجہ؟" یہ سوال میں نے طفیل ہی سے کیا تھا مگر وجے بے چینی سے پہلو بدلنے لگا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ میں نے اس سے کہا۔ "جس طرح میں نے طفیل کو تمہاری بات مکمل ہونے سے پہلے نہیں بولنے دیا اسی طرح تم بھی خاموش بیٹھو۔ جب تم سے کچھ پوچھا جائے تو بولنا۔" "ہاں طفیل! سالار وحیدالدین نے تم لوگوں کو حویلی ہی تک کیوں محدود کر دیا تھا؟"

"سالار کا کہنا تھا کہ حکومت شاید ہماری تنظیم کے خلاف کوئی بڑا قدم اٹھانے والی ہے اس لئے احتیاط ضروری ہے۔" طفیل نے وضاحت کی۔

"وجے! تمہیں بھی اس کا علم ہو گا؟"

"جی .... جی ہاں' دراصل ماں جی..........." وجے کی پیشانی پر پسینہ نظر آنے لگا۔ "م..........."

میں شاید ایک ہفتے سے پہلے .... پہلے اپنے گھر گیا تھا۔"

"پھر جب ایک خاص مہم درپیش تھی تو تمہیں خیال آیا کہ کہیں تم اس میں مارے نہ جاؤ تو سوچا کہ اپنی بیمار ماں کو ایک نظر دیکھ آؤں' یہی بات تھی نا؟"

"جی .... جی ہاں' میں .... میں..........."

"بکواس کرتے ہو تم۔" میں ایک دم چیخ اٹھی۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ یہاں بیٹھے ہوئے سب لوگ بے وقوف ہیں' میں احمق تھی جو ایک اہم مہم کو ترک کر کے راستے ہی سے لوٹ آئی؟ میں نے اسی وقت اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمارے درمیان کوئی کالی بھیڑ موجود ہے جو آئندہ بھی ہمارے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ اس مہم سے زیادہ یہ ضروری تھا کہ پہلے اس چہرے کو بے نقاب کر دیا جائے جو..........."

میرا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ وجے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ میز الٹنے میں کامیاب ہو جاتا' گرچن سنگھ نے اسے دبوچ لیا۔ وقتی طور پر تھوڑی سی افراتفری ضرور مچی لیکن جلد ہی اس پر قابو پا لیا گیا۔ وجے کو اس کے ساتھی کمانڈوز نے سنبھال لیا تھا۔ اب وہ ایک کرسی سے بندھا ہوا تھا۔

ایسی کسی زیر زمین تنظیم میں جب کوئی غدار بے نقاب ہو جائے تو دوسرے اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ کسی مقصد کے حصول کی خاطر اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر جدوجہد کرنے والے کسی کالی بھیڑ کو اپنے درمیان برداشت نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ سب اس وقت جذباتی ہو گئے تھے۔ گرچن سنگھ تو اسے فوراً گولی مار دینے کے حق میں تھا' مگر میں نے جلد ہی صورت حال کو بگڑنے سے بچا لیا۔ دشمن کے کسی مخبر سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے سوالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

وہاں موجود افراد کا وقتی جوش جب کچھ دب گیا تو میں نے وجے کو مخاطب کیا۔ "وجے کے معنی ہیں فتح۔ کتنا اچھا اور مبارک نام ہے تمہارا۔" میرے لہجے میں نرمی تھی۔ "مگر افسوس کہ تم اس وقت اپنے نام کی نسبت کے برعکس' فتح کی بجائے شکست سے دوچار ہو۔" میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "سنو وجے! تمہیں شاید اندازہ ہو چکا ہے کہ تمہارے ساتھی کسی قیمت پر تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے' میں تم سے وعدہ تو نہیں کرتی کہ تمہاری زندگی بچا لوں گی' ہاں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں' میری سفارش پر تمہارے ساتھ نرمی برتی جائے' ایسی نرمی جو کم از کم سزائے موت نہ ہو۔" میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ "تمہارا جرم یقیناً ناقابل معافی ہے۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم نے دشمن کا آلہ کار بننا بخوشی قبول نہیں کیا ہو گا۔"

وجے نے پہلی بار جھکی ہوئی گردن اوپر اٹھائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"کرن جی! یہ کتے کا بچہ ڈھونگ رچا رہا ہے' اس حرامزادے نے ہم کمانڈوز کی وفاداری کو شبے میں ڈال دیا ہے۔ اس کے ساتھ آپ کوئی رعایت نہ کریں۔"

"تم خاموش بیٹھو راجندر!" میری آواز میں سختی آ گئی۔ "اپنے جذبات پر قابو رکھو' میرے اور وجے کے درمیان ہونے والی گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔"

سالار اکبر نے بھی میری تائید میں چند الفاظ ادا کئے پھر کچھ دیر کو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

"بولو وجے!" میں نے ذرا دیر بعد پھر وجے کو مخاطب کیا۔ "خاموشی تمہارے جرم کی نوعیت میں اضافہ کر سکتی ہے' کمی نہیں۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دینا چاہتی ہوں کہ مجھے کچھ خصوصی اختیارات بھی حاصل ہیں۔ تمہارے سالار اعلیٰ قدیر بیگ بھی میری سفارش کو رد نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے انہیں تنظیم کے نگران اعلیٰ سے اجازت لینا پڑے گی۔ تمہیں اگر میری بات پر یقین نہ ہو تو یہاں موجود دونوں سالار میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ تم نے غالباً خود بھی میری حیثیت اور مرتبے کا اندازہ کر لیا ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سالار اکبر اور گرچن سنگھ کی موجودگی کے باوجود میں اس مہم کی سربراہ نہ ہوتی جو ادھوری رہ گئی۔ یہ سب کچھ تمہیں بتانے کا مقصد اپنی اہمیت اور بڑائی جتانا ہرگز نہیں بلکہ اسے تم اظہار حقیقت سمجھ سکتے ہو۔ میں تم سے یہ کہہ رہی تھی کہ میرے اندازے کے مطابق تمہیں کوئی ایسی مجبوری لاحق تھی جس کا علم شاید تم ہی کو ہے۔ میری بات کا ثبوت تمہاری آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو ہیں۔ راجندر کی طرح میں انہیں ڈھونگ نہیں سمجھتی۔ سنو وجے! کوئی بھی آدمی نہ تو مکمل طور پر فرشتہ ہوتا ہے نہ شیطان! آدمی خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ اس پر خیر بھی غالب آ سکتا ہے اور شر بھی۔ اس کے علاوہ بعض حالات میں کسی مجبوری کے تحت بھی آدمی کے خیر پر اس کا شر غالب آ جاتا ہے۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ناگزیر حالات و واقعات اسے غلط راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ سو حالات کے جبر کا شکار کوئی ایسا شخص میری نظر میں کسی سخت سزا کا مستحق نہیں۔ تمہارا معاملہ بھی مجھے کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے' بولو' کیا میرا قیاس درست ہے؟"

"مجھے مر جانے دیں کرن جی!" وجے اچانک بول اٹھا۔ "مجھ جیسے غدار کے لئے موت کی سزا بھی کم ہے۔"

اس کے الفاظ میرے لئے غیر متوقع تھے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ میرے الفاظ سن کر وہ رحم کی بھیک مانگنے لگے گا۔ میں نے اسی لئے اس کی طرف حیرت سے دیکھا کہ کہیں وہ کوئی چال تو نہیں چل رہا؟ عموماً موت کو سامنے دیکھ کر آدمی اس سے ہر ممکن بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے یہی حربہ آزمایا تھا کہ وہ زبان کھول دے۔

"اس کا مطلب یہ ہے وجے کہ تم شاید کچھ بتانا نہیں چاہتے۔"

"کرن جی! اب کچھ بتانے یا نہ بتانے سے کیا حاصل؟" اس کی آواز بھرا سی گئی۔ "جو ہونا ہے وہ تو ہو گا' اسے کون ٹال سکتا ہے۔"

"کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا کہ سزائے موت سے بچ سکتے ہو؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ مجھے اگر اپنی زندگی سے پیار ہوتا تو اس تنظیم ہی میں کیوں آتا۔" اس نے بڑی عجیب سی بات کی' پھر خود ہی اپنی بات کی وضاحت میں بولا۔ "میں تو اسی دن خود کو مردہ سمجھ چکا تھا جب اپنی .... اپنی بہن کی عزت و آبرو بچانے کی خاطر تنظیم سے غداری کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "ایک مردہ شخص کے جسم میں گولی اتار دی جائے یا اسے ٹکڑے

ٹکڑے کر دیا جائے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں .... میں تو ایک چلتی پھرتی لاش تھا۔"

"کنول سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"وہ .... وہ میری چھوٹی بہن ہے شاید .... شاید میری ہی طرح اور بھی ایسے ہوں' ایسے کمزور لوگ جو .... جو اپنی بہن کے تار تار لباس کو دیکھ .... دیکھ کر خودغرض بن جائیں اور .... اور اپنے ضمیر کو موت کی نیند سلا دیں۔" وجے کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دے رہی تھی۔ "ابھی اس کی عمر.......... عمر ہی کیا ہے' بچی ہے' چودہ سال کی ایک بچی۔"

"تمہاری بہن کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کرنے والے کیا پولیس والے تھے؟"

"نہیں' سی آئی ڈی والے۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ کب کا واقعہ ہے؟"

"زیادہ دن نہیں ہوئے۔ جب رگھوویر اور سمیع اللہ کو سی آئی ڈی والوں نے گرفتار کیا تھا' اس سے ایک ہفتے پہلے کی بات ہے۔"

"تو کیا رگھوویر اور سمیع اللہ کی نشاندہی تم ہی نے کی تھی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"صرف وہی دونوں کیوں دوسروں کے ساتھ تم نے کیوں رعایت کی؟ تم بیک وقت تنظیم کے بہت سے ارکان کو پکڑوا سکتے تھے۔ اس کے لئے تنظیم کے کسی بھی ٹھکانے کی نشاندہی ممکن تھی پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" میں نے نے ایک اہم سوال کیا۔ اسی کے ساتھ مجھے پہاڑ گنج والی کوٹھی پر چھاپے کا خیال آ گیا تھا۔ رگھوویر اسی چھاپے کے دوران مارا گیا تھا۔ مگر یہ معاملہ ذرا مختلف نوعیت کا تھا۔ اس میں ولیم رائٹ بھی ملوث تھا۔ ولیم کے اغوا کا علم صرف چند افراد کو تھا۔

میرے سوال کے جواب میں وجے نے طویل سانس لیا پھر کہنے لگا۔ "آدمی کے ضمیر کو مردہ ہونے میں بھی تو کچھ دیر لگتی ہے۔"

"اس سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"اپنی بہن کی زندگی اور آبرو خطرے میں ہونے کے باوجود میں نے چند شرائط پر ان درندوں کی بات مانی تھی۔" وہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ "جواباً مجھے بھی ان کی ایک شرط ماننا پڑی تھی۔"

کچھ دیر میں اس کے بولنے کی منتظر رہی۔ وہ کہیں کھو سا گیا تھا۔ پھر میں نے اسے ٹوک ہی دیا۔

"میں نے ان کی جو شرط مان لی' اسے بھی شرمناک کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کنول کو یرغمال بنا لیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا' اس پر قائم رہے یا نہیں۔ انہوں نے مجھے یقین دہانی کرائی تھی کہ میری بہن کی عزت و آبرو محفوظ رہے گی۔"

"تمہاری شرائط کیا تھیں؟"

"پہلی شرط یہ کہ میں تنظیم کے کسی ٹھکانے کی نشاندہی نہیں کروں گا۔ دوسری شرط یہ کہ تنظیم کے متعلق کچھ نہیں بتاؤں گا کہ اس کا طریقہ کار کیا ہے یا دہلی میں اس کے کتنے ارکان ہیں۔ تیسری شرط

یہ کہ اسی صورت میں تنظیم کے کسی رکن یا ارکان کی نشاندہی کروں گا جب وہ تنظیم کے کسی بھی ٹھکانے سے باہر ہوں' چوتھی شرط یہ کہ ایک مرتبہ کسی کی نشاندہی کے بعد جلد ہی کسی دوسرے فرد یا افراد کی نشاندہی نہیں کروں گا۔ اس سلسلے میں مجھ پر دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ آخری شرط یہ تھی کہ میری بہن کی زندگی محفوظ رہے گی اور جب چاہوں اسے زندہ و سلامت دیکھ سکوں گا۔" وجے اب کسی جھجک کے بغیر روانی سے بول رہا تھا۔

"تم اس کے بعد اپنی بہن سے ملے؟"

"ہاں صرف ایک بار۔" وجے نے بتایا۔ "اور یہی ملاقات مجھے بہت مہنگی پڑی۔ انہوں نے مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ میں' رگھوویر اور سمیع اللہ کے بعد کسی اور رکن یا بہت سے ارکان کی نشاندہی کروں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ میں دہرا کھیل کھیل رہا ہوں۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے رگھوویر اور سمیع اللہ کے بچا لئے جانے کا ذکر کیا۔ رفتہ رفتہ ان کا دباؤ بڑھتا گیا۔ انہوں نے مجھے آخری مرتبہ دھمکی دی کہ اگر میں نے مزید چند روز کوئی اطلاع فراہم نہیں کی تو وہ میرے باپ کو بھی اٹھوا لیں گے' اسی کے ساتھ میری بہن کو بے آبرو کر کے مار ڈالا جائے گا۔ میں نے ان سے بمشکل دو ہفتے کی مہلت لے لی۔ اس مہلت کو ختم ہونے میں اب صرف چار دن باقی تھے.........." وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"وجے! تم سے یہ سودے بازی کس نے کی؟"

"ایک انگریز سی آئی ڈی افسر ہارڈی اور اس کے ایک ہندوستانی ماتحت وِکرم نے۔"

"تم ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ انہیں مجھ پر کیسے شبہ ہوا' جب میں ایک مرتبہ اپنے گھر والوں سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ میری کنول کو دو روز پہلے اغوا کیا جا چکا ہے۔ اسی روز کوئی انجان شخص گھر میں ایک بند لفافہ ڈال کر چلا گیا۔ لفافے پر "اشد ضروری اور صرف وجے کے لئے" لکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ لفافہ کھول کر پڑھا تو لکھا تھا' تم اگر اپنی بہن کی زندگی بچانا چاہتے ہو تو مقررہ وقت اور مقام پر پہنچ جاؤ۔ تم نے اگر پولیس وغیرہ کو مطلع کیا تو تمہاری بہن کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی' میری بہن کو ایک صبح مندر سے پوجا کر کے لوٹتے ہوئے اغوا کیا گیا تھا۔ خط پڑھ کر میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ یہ بدمعاشوں کا کوئی گروہ ہے۔ مجھے خود پر اعتماد تھا کہ میں ان بدمعاشوں سے نمٹ لوں گا۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر اسی رات کو میں قطب مینار کے قریبی تاریخی کھنڈرات میں اس جگہ پہنچ گیا جس کی نشاندہی خط میں کی گئی تھی۔ وہاں مجھے خلاف توقع چاروں طرف سے پولیس نے گھیر لیا اور پھر ایک بند گاڑی میں سی آئی ڈی ہیڈ آفس پہنچا دیا گیا۔" وجے نے سب کچھ تفصیل سے بیان کر دیا۔

"اطلاع فراہم کرنے کے لئے انہوں نے تمہیں کوئی خاص مقام' وقت یا جگہ بتائی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"میں کسی بھی قریبی تھانے میں ڈیوٹی پر موجود کسی ذمے دار پولیس والے کو اطلاع فراہم کر سکتا تھا۔ کم از کم اس کا ہیڈ کانسٹیبل ہونا ضروری تھا۔ اس کے لئے ہارڈی نے مجھے ایک کوڈ ورڈ بتایا تھا' کلائیو!"

وجے نے بتایا۔ "میں چھپتا چھپاتا قریبی تھانے پہنچا اور اپنا کوڈ بتا کر ایک اے ایس آئی کو یہ اطلاع فراہم کر دی کہ چند حکومت دشمن افراد آج رات نو بجے کے بعد دہلی سے کہیں باہر جانے والے ہیں' وہ لوگ ایک وین میں سفر کریں گے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ اور معلوم نہیں تھا۔"

سارا معمہ حل ہو چکا تھا۔ تمام کڑیاں باآسانی ملائی جانا' ممکن تھیں۔ تمام تھانوں کو مطلع کر دیا گیا ہو گا کہ مذکورہ کوڈ بتانے والے شخص کے بیان کو مصدقہ سمجھ کر فوری کارروائی کی جائے۔ رگھوویر اور سمیع اللہ کے بارے میں بھی وجے نے ایک تھانے کو اطلاع فراہم کی تھی۔ اس روز بھی وہ ان دونوں کے ساتھ تھا اور بظاہر فرار ہو گیا تھا۔ پولیس نے خود اسے فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ جس سب انسپکٹر کو وجے نے اطلاع دی تھی خود وہ بھی رگھوویر اور سمیع اللہ کو گرفتار کرنے والوں میں شامل تھا۔ اس نے وجے کو پہچان لیا تھا۔ میں کیونکہ ان دنوں تنظیم سے براہ راست متعلق نہیں تھی اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ گرفتاری کے وقت تنظیم کا کوئی رکن' پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچ گیا تھا۔ اس وقت یوں بھی اصل مسئلہ رگھوویر اور سمیع اللہ کو رہا کرانے کا تھا۔ گرفتاری کے بعد پولیس نے احکام کے مطابق ان دونوں کو سی آئی ڈی والوں کے حوالے کر دیا ہو گا۔

وجے سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے سالار اکبر کو مخاطب کیا۔ "آپ کے ذہن میں کوئی بات ہو تو پوچھ لیں۔ ممکن ہے میں کوئی ضروری سوال نظرانداز کر گئی ہوں۔"

"میرے خیال میں ہر بات واضح ہو چکی ہے۔ آپ نے کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔" سالار اکبر نے تصدیق طلب انداز میں گربچن سنگھ کی طرف دیکھا۔

"آپ مجھ سے بہتر یہ معاملہ سمجھ سکتے ہیں کیونکہ یہ شعبہ میرا نہیں ہے۔" گربچن سنگھ سنجیدگی سے بولا۔

"پھر بھی گربچن سنگھ جی! آپ اپنی رائے کا اظہار تو کر ہی سکتے ہیں۔" میں بولی۔

"میری تو صرف ایک ہی رائے ہے جو میں پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں۔" گربچن سنگھ کے نتھنے پھولنے لگے۔ "اس غدار نے صرف اپنی بہن کی زندگی بچانے کے لئے ان بہنوں کا خیال نہیں کیا جن کے کڑیل جوان بھائی مارے گئے' ان ماؤں کا اسے خیال نہیں آیا جن کے بیٹے انہی کے سامنے خاک و خون میں نہلا دیئے گئے۔" گربچن سنگھ کی آواز بلند ہوتی گئی۔ "اس میر جعفر نے یہ نہیں سوچا کہ لال قلعے کی دیواریں اب تک مغل تاجداروں کا نوحہ پڑھتی ہیں۔ ہندوستان کا سہاگ لٹ گیا اور یہ صرف اپنا گھر بچانے کے لئے ظالموں سے سودے بازی پر تیار ہو گیا .... ہر مجرم کے پاس اپنے جرم کا کوئی نہ کوئی جواز ہوتا ہے۔ تو کیا کسی بھی مجرم کو سزا نہ دی جائے؟ ممکن ہے' یہ غدار ملک و قوم آپ کی نظر میں کسی رعایت کا مستحق ہو' آپ اس سلسلے میں اپنے اختیارات استعمال کرنے کی بھی مجاز ہیں لیکن معافی کا خواستگار ہوں کہ میری رائے کچھ اور ہے .... ظلم کا ساتھ دینے والا بھی ظالم ہے۔ اس کے پاس دوسرا راستہ بھی تھا۔ یہ تنظیم کو حقائق سے آگاہ کر سکتا تھا۔ کیا تنظیم اس کا ساتھ نہ دیتی؟ اسے اور اس کے گھر والوں کو تحفظ فراہم نہ کرتی؟ اور اگر تنظیم ایسا نہ بھی کرتی تو کیا قربانی دینا اس کے بس میں نہیں تھا؟ کیا اسی کو اپنی بہن

سے محبت ہے کسی اور کو نہیں؟ کیا اس کے سوا کسی اور کو اپنے ماں باپ پیارے نہیں؟ اگر اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا تو پھر ہمارے ساتھ ہی کیوں آیا؟ یہ تو سرفروشوں کا قافلہ ہے اس میں سرنگوں ہو جانے والوں کی کوئی گنجائش نہیں.........."

گربچن سنگھ کے پُرجوش الفاظ کی گونج کمرے میں سنائی دیتی رہی' پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اس دوران مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں' وجے سے مخاطب ہوئی۔ "تم سے ایک آخری سوال اور کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم میرے کسی مزید سوال کا جواب دے سکتے ہو؟"

وجے نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ گربچن سنگھ کی ذلت آمیز باتیں سن کر اس کا سر ایک بار پھر شرمندگی سے جھک گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں اپنی غداری کا اعتراف کر چکا ہوں اور سالار گربچن سنگھ نے جو کچھ فرمایا' اس سے پوری طرح متفق ہوں۔ مجھے اپنی پستی کا احساس ہو چکا ہے۔ سو آپ جو بھی پوچھیں گی' اس کا جواب دوں گا۔"

"اس عرصے میں کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تمہاری ہی طرح تنظیم کا کوئی اور رکن بھی پولیس' سی آئی ڈی یا حکومت کی کسی ایجنسی کے لئے مخبری کر رہا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"ہاں ایک بات اور پوچھنا رہ گئی کہ تم اپنی بہن سے کہاں ملے تھے؟"

"سی آئی ڈی ہیڈ آفس میں۔" وجے نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔

"وجے! تم خود کہہ چکے ہو کہ اپنی موت کو گلے لگانے پر بخوشی تیار ہو' اسی کے ساتھ تمہیں غالباً یہ بھی معلوم ہو گا کہ تنظیم کے فیصلے عموماً کثرت رائے کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ تم نے اعتراف جرم بھی کر لیا ہے۔ خصوصی اختیارات حاصل ہونے کے باوجود اور تم سے ہمدردی کے ساتھ ساتھ مجھے اس بات پر دکھ ہے کہ تمہارا جرم یہاں موجود افراد کی نظر میں قابل معافی نہیں' تم ہی بتاؤ' کیا میں اکثریت کی رائے کو رد کر دوں؟ میں اپنی طرف سے تمہیں فیصلے کا اختیار دیتی ہوں۔"

"انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ میں خود اپنے خلاف فیصلہ دوں۔" وجے کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "میں اپنے لئے سزائے موت کی درخواست کرتا ہوں۔"

"گربچن سنگھ جی! آپ نے وجے کا فیصلہ سن لیا۔" میں نے کہا۔ "میں آپ سے اور اس میٹنگ میں موجود دوسرے افراد سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ سزائے موت دیتے ہوئے طریقہ کار میں کوئی نرمی کی جا سکتی ہے؟"

"نرمی سے آپ کی کیا مراد ہے؟" سالار اکبر نے پوچھا۔

"فوری موت" میں نے وضاحت کر دی۔ میرا اشارہ "سائلنٹ ڈیتھ" کی طرف تھا۔

سالار اکبر میرا اشارہ سمجھ کر بولا۔ "گربچن سنگھ جی سے بھی "خاموش موت" کے بارے میں پوچھ لیتے ہیں۔"

پھر گربچن سنگھ اور دیگر افراد نے اس رعایت یا نرمی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں کسی ایسے ہی

موقع کے لئے اپنے ساتھ "سائلنٹ ڈیتھ" لے کر آئی تھی۔ میں نے اسے اپنے سامنے میز پر رکھ دیا۔ وجے نے پھر سر جھکا لیا تھا اور اب آنکھیں بھی بند کرلی تھیں۔

"وجے! میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری بہن کو تمہارے والدین تک پہنچا دوں گی۔ وہ بہرحال بے گناہ ہے۔ تم نے یقیناً دشمن کا آلہ کار بننے سے پہلے سرفروش تنظیم کے لئے کچھ خدمات بھی انجام دی ہوں گی' تم اسے ان خدمات کا صلہ بھی سمجھ سکتے ہو۔"

میری بات سن کر وجے نے اس مرتبہ نہ سر اٹھایا نہ آنکھیں کھولیں۔ میں نے بھی اسے کچھ بولنے پر مجبور نہیں کیا۔

"گربچن سنگھ جی!" میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرکے ""سائلنٹ ڈیتھ" کی طرف اشارہ کیا۔

گربچن سنگھ نے اشارہ پاتے ہی "سائلنٹ ڈیتھ" اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ دوسرے ہی لمحے وجے کا جیتا جاگتا جسم موت کی سرد بانہوں میں سو چکا تھا۔ اس کے جسم میں سائلنٹ ڈیتھ" کی نال سے نکلنے والی زہریلی فولادی سوئی پیوست ہو چکی تھی۔

وہ ایک غدار کا انجام تھا۔ اس کے باوجود ذرا دیر کو کمرے میں سوگوار سی فضا چھا گئی۔

سالار اکبر کے حکم پر کمانڈوز نے وجے کے مردہ جسم کو کرسی سے کھول کر وہیں زمین پر ڈال دیا۔ اس موقع پر گربچن سنگھ بولا۔ "اس کی لاش صبح ہونے سے پہلے اسی تھانے کے احاطے میں پھنکوا دینا چاہئے جہاں اس نے ہمارے بارے میں اطلاع دی تھی۔"

یہ محض ایک جذباتی معاملہ تھا یا زیادہ سے زیادہ بے غیرت حکومت کے لئے ایک انتباہ۔ میں اسی سبب خاموش رہی اور بقیہ کارروائی کے درمیان کچھ نہ بولی۔ میرے خیال میں اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ وجے تنظیم کا غدار تھا یا جو کچھ بھی تھا' بہرحال ایک ہندوستانی تھا۔ اس کی زندگی یا موت سے حکومت کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں تو اس وقت چونکی جب وجے کی لاش کے ساتھ چھوٹی سی ایک سلپ پن کی گئی۔ اس کاغذ پر انگریزی میں چند الفاظ ٹائپ کئے گئے تھے۔ "غاصب و عیار حکومت کے ایک کتے ہارڈی کے لئے تحفہ۔"

مجھے وہ بے گناہ لڑکی یاد آ گئی جس کی جان بچانے کا وعدہ میں نے اس کے بھائی سے کیا تھا' وہ بھائی جس نے بہن کی محبت میں اپنی زندگی کی پرواہ بھی نہیں کی تھی۔

صبح ہونے میں ابھی دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ اس دوران بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ وجے کی لاش کے ساتھ جو پرچہ پن کیا گیا تھا' اس کے ردعمل سے میں واقف تھی۔ اس کا ردعمل کنول کی لاش تھا' ایک ایسی لڑکی کی لاش جسے بے حرمت کرنے کے بعد قتل کیا گیا ہو۔

وجے کی لاش دو کمانڈوز کمرے سے اٹھا کر لے گئے تو میں نے گربچن سنگھ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "کیا آج کی رات یونہی خالی چلی جائے گی؟"

گربچن سنگھ نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور بولا۔ "میں آپ کی بات کا مطلب صحیح طرح سمجھا نہیں۔ کیا آپ.........."

"میں سمجھائے دیتی ہوں۔" میں بول اٹھی۔ "کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہئے نا' بقیہ کل دیکھیں گے۔ اب اتنا وقت تو رہا نہیں کہ ہم دوبارہ اپنی مہم پر دہلی سے باہر نکل سکیں لیکن دہلی کی حدود میں تو کوئی کارروائی ممکن ہے۔ کیوں نہ آج رات سی آئی ڈی ہیڈ آفس کو اڑا دیا جائے؟"

گربچن سنگھ کا جواب میری توقع کے مطابق تھا۔

"دین کی بجائے ہم کار میں چلیں گے۔ ہمارے ساتھ صرف ایک کمانڈو جائے گا' راجندر۔" میں نے تیزی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

فوری طور پر ہنگامی صورت حال نافذ ہو گئی۔ تیاری کے لئے میں نے بہت کم وقت دیا تھا۔ میں سوچ چکی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ سالار اکبر کچھ کہنا چاہتا ہے مگر یہ بحث و مباحثے کا وقت نہیں تھا۔ تمام تر تیاریوں کے ساتھ سالار اکبر' گربچن سنگھ' عادل' راجندر کو اور مجھے دس منٹ کے اندر کانفرنس روم میں واپس پہنچنا تھا۔

ایمونیشن ڈپو اڑانے کے لئے پہلے ہی ساری تیاریاں مکمل تھیں اسی سبب ہمیں کوٹھی سے روانگی میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

سی آئی ڈی ہیڈ آفس اس زمانے میں پرانے قلعے کے قریب تھا۔ رگھوویر اور سمیع اللہ کی بازیابی کے لئے میں پہلے بھی وہاں جا چکی تھی مگر آج رات کی صورت حال ذرا مختلف تھی۔ میں نے راستے میں اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ محدود وقت کے باوجود جلدبازی سے کام نہیں لینا۔ اس کے علاوہ کب کیا قدم اٹھانا ہے' یہ بھی انہیں بتا دیا۔

میری ہدایت کے مطابق کار کو عمارت سے خاصے فاصلے پر روک لیا گیا اور پھر سرفروش اندھیرے میں رینگ گئے۔ پروگرام کے مطابق مجھے کار ہی میں رہنا تھا۔

"اب میں بھی جاؤں کرن جی!" کویتا کی سرگوشی ابھری۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس سے کوئی اس طرح کا کام لے رہی تھی۔ اس کا وجود ابھی تک نادیدہ ہی تھا۔

"ہاں جاؤ' تمہیں جلد اس لڑکی کو لے کر لوٹنا ہے۔ اس کی عمر ذہن میں رکھنا' وہ چودہ سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا اور کویتا مجھے مطمئن کرکے روانہ ہو گئی۔

کانفرنس روم سے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے کویتا کو جگا دیا تھا۔ تیار کرتے ہوئے کنول کے سلسلے میں کویتا کو میں نے صرف یہ بتایا تھا کہ کنول ایک بے گناہ اور مظلوم لڑکی ہے' اسے ظالموں کی قید سے نکالنا ہے۔ کویتا اس پر فوراً راضی ہو گئی تھی۔ اسے تو یہ خوشی تھی کہ میرے ساتھ کہیں چل رہی تھی۔ سی آئی ڈی ہیڈ آفس کا اندرونی حصہ بھی میرا دیکھا ہوا تھا۔ رگھوویر اور سمیع اللہ کی بازیابی کے علاوہ کاملہ چند روز پہلے اس عمارت میں جا چکی تھی۔ سی آئی ڈی انسپکٹر جیک بھی جو میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا مجھے وہیں لے گیا تھا۔ میں' رشیدہ کو وہاں سے نکال لائی تھی جسے میرے ہی ساتھ مقتول جیک نے گرفتار کرلیا تھا۔ مختصراً کویتا کو میں نے سب کچھ بتا دیا تھا کہ اس عمارت میں حوالات وغیرہ کہاں اور کدھر ہیں۔ مجھے توقع تھی کہ کویتا کو کنول کی تلاش میں ناکامی نہیں ہو گی۔ محدود وقت کے سبب مجھے مجبوراً کویتا

سے یہ کام لینا پڑا تھا۔

میرے دل کی دھڑکنوں میں اس وقت فطری طور پر اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ کویتا کی واپسی تک میں انتہائی بے چین رہی۔ وہ کامیاب لوٹی تھی۔ میں نے اس خوشی میں اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ اب ظاہر ہو چکی تھی۔ میرے کہنے پر کویتا نے اس معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کو اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان لٹا دیا۔ میں پیچھے ہی بیٹھی تھی۔ کار میں اندھیرا تھا۔ کنول بے ہوش تھی۔ میں سمجھ گئی کہ کویتا ہی نے اسے بے ہوش کیا ہو گا۔

"اور کوئی حکم کرن جی!" کویتا نے مجھ سے پوچھا۔

"اب تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ تم واپس کوٹھی پہنچ کر آرام سے سو جاؤ۔" میں مسکرا کر بولی۔

"اور آپ؟" اس نے سوال کیا۔

"مجھے ابھی واپسی میں دیر لگے گی۔" میں نے جواب دیا۔ "ابھی اسے اس کے گھر والوں تک بھی تو پہنچانا ہے نا!"

میری بات ابھی ختم ہوئی تھی کہ فضا پہلے زبردست دھاکے سے گونج اٹھی۔ ڈائنامائٹ سے سی آئی ڈی ہیڈ آفس کو اڑایا جا چکا تھا۔

"یہ .... یہ کیا ہوا کرن جی!"

"تم جاؤ .... کویتا!" میں تیزی سے بولی۔ کویتا کو میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ جس عمارت میں اسے بھیج رہی ہوں' کچھ دیر بعد اس کے پرخچے اڑنے والے ہیں۔

"آپ .... آپ کو تو کوئی خطرہ.........."

"نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی کیونکہ کسی بھی لمحے سالار اکبر وغیرہ واپس آ سکتے تھے۔

پھر کویتا وہاں سے غائب ہو گئی اور میں دانستہ کار کا دروازہ کھول کر باہر کھڑی ہو گئی۔ واپسی میں بھی عادل ہی کو کار ڈرائیور کرنا تھی۔ وہ تھا بھی اچھا ڈرائیور۔ اس کے ساتھ آگے گرچن سنگھ بیٹھتا۔ راجندر اور سالار اکبر میرے ساتھ پیچھے بیٹھتے۔ اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان کنول کا بے ہوش جسم پڑا تھا۔ جلد بازی میں اس کا جسم راجندر یا سالار اکبر کے پیروں تلے آ سکتا تھا۔ میں یہی سوچ کر کار سے اتری تھی کہ انہیں احتیاط سے بیٹھنے کی تاکید کر سکوں۔

چند ہی لمحوں بعد میں نے اندھیرے میں چار ہیولوں کو کار کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا۔

☆======☆======☆

نسیم احمد طارق اینڈ برادرز

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

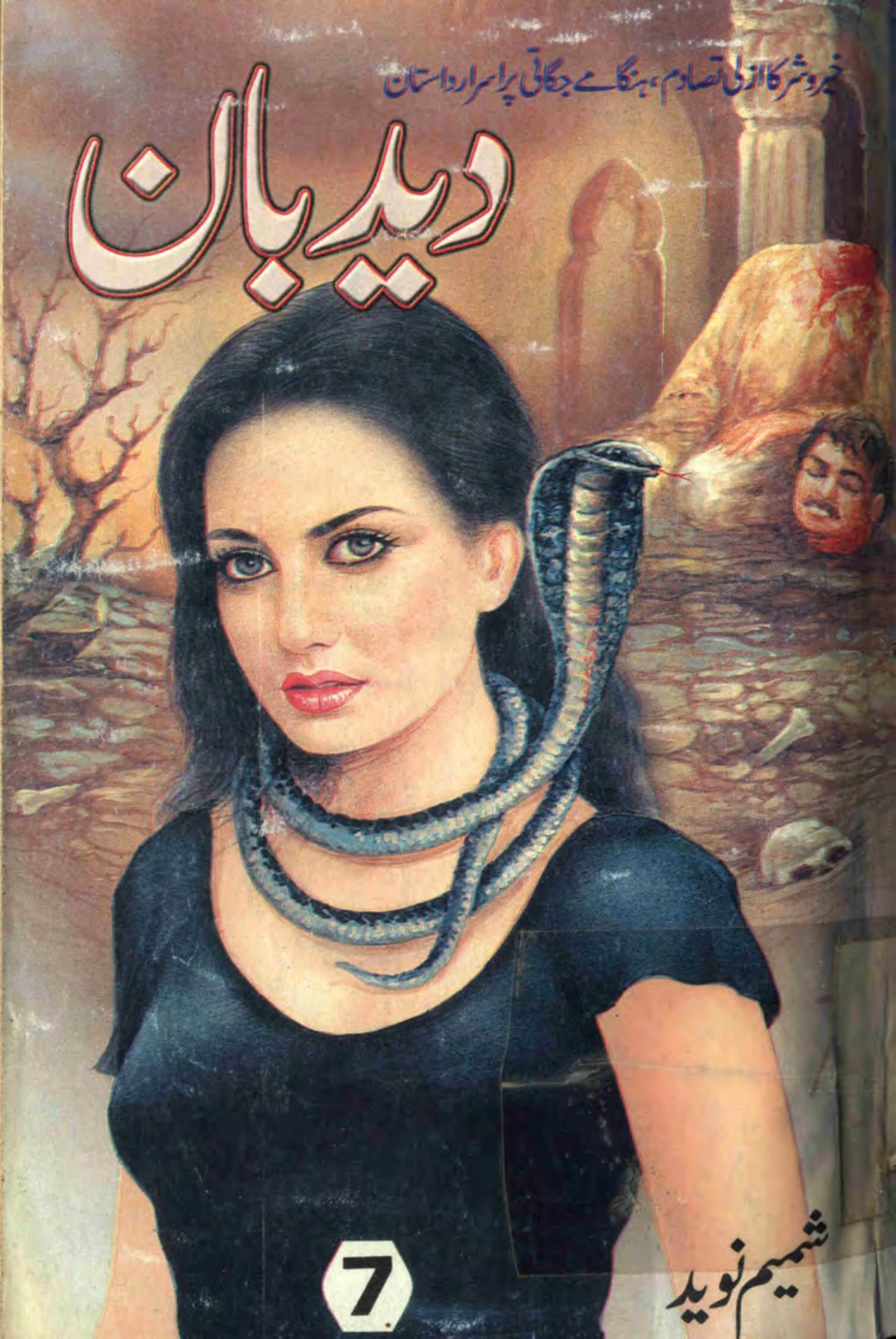
خیر و شر کا ازلی تصادم، ہنگامے جگاتی پراسرار داستان
دیدبان
7
شمیم نوید

دیدبان

وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی۔ پُراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں۔ اس کی آنکھوں میں موت کی کڑکتی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر تھی نہ موت کی۔ وہ سانپ سے زیادہ زہریلی تھی۔ وہ اپنے دشمن کی کٹی ہوئی گردن دیکھنا چاہتی تھی۔ پُراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں۔

پُراسرار قوتوں کی مالک ایک دوشیزہ کی ہنگاموں سے بھرپور داستانِ عجیب

جب وہ بھاگتے ہوئے کار کے قریب آ گئے تو میں نے سالار اکبر اور راجندر کو مخاطب کیا۔ ”اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان ایک بے ہوش لڑکی بھی پڑی ہے' سنبھل کر بیٹھیے گا۔“

یہ وقت کسی وضاحت یا سوال جواب کا نہیں تھا۔ وہ دونوں اپنے پھولے ہوئے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے میرے ساتھ کار میں بیٹھ گئے۔ موقعہ واردات سے جلد از جلد ہمارا فرار ہو جانا انتہائی ضروری تھا' باقی باتیں بعد کی تھیں۔ دھماکے دور تک سنے گئے ہوں گے' سبھی کو علم تھا۔

عادل نے تیزی سے کار موڑی اور پھر واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ سی آئی ڈی ہیڈ آفس تک جانے اور واپس آنے کے لئے محفوظ راستوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ پھر بھی خطرہ بدستور تھا۔ ایک ہی رات میں یہ دوسرا بڑا ہنگامہ تھا۔ پہلا حملہ پولیس پر کیا گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ان پولیس والوں کی تعداد پچاس سے زیادہ ہی ہو گی جو میرے پھینکے ہوئے دستی بموں کا شکار ہوئے تھے۔ سی آئی ڈی ہیڈ آفس میں محافظوں اور دیگر عملے کی تعداد کا صرف اندازہ ہی لگانا' ممکن تھا۔ مجموعی طور پر یہ دونوں کارروائیاں زیادہ اہم نہ ہونے کے باوجود وقتی طور پر ہی سہی حکومت کو بوکھلا دینے کے لئے کافی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک تھانے میں وجے کی لاش کا پھینکا جانا بھی حکومت کے اعلیٰ حکام کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کم نہیں تھا۔ اس طرح تنظیم کے لئے خطرات تو بڑھ گئے تھے مگر دشمن کو یہ ضرور باور کرا دیا گیا تھا کہ تنظیم اب صرف اپنی مدافعت ہی نہیں کر رہی' حکومت کو دندان شکن جواب بھی دے رہی ہے۔ صرف حکومت ہی بے گناہوں کی لاشیں گرانا نہیں جانتی' ظالموں کے احتساب کا وقت بھی آ گیا ہے۔

کار تیز رفتاری سے سفر کرتی ہوئی نسبتاً محفوظ راستے پر آ گئی تو سالار اکبر نے پہلی بار مجھے مخاطب کیا۔ ”یہ لڑکی کون ہے؟“

”وجے کی مظلوم بہن کنول۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”کیا آپ بھول گئے کہ میں نے

مرنے والے سے کوئی وعدہ کیا تھا؟"

"تو کیا آپ .... آپ اسے........." سالار اکبر یقیناً چکرا کے رہ گیا۔

میں اپنے ذہن کو پہلے ہی سے اس کے لئے تیار کر چکی تھی۔ گرنجن سنگھ بھی اگلی سیٹ سے پیچھے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر شدید حیرت نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی بول اٹھا۔ "آپ اسی......... کیا اسی لئے ہمارے ساتھ نہیں گئیں؟"

مصلحت کے پیش نظر مجھے وہ "کارنامہ" اپنے سر منڈھنا پڑا۔ "اگر میں پہلے سے آپ لوگوں کو یہ بتا دیتی کہ میرا ارادہ کیا ہے تو یقیناً کوئی بھی اس پر راضی نہ ہوتا۔"

"لیکن کرن جی! یہ .... یہ تو بڑا ظلم کیا آپ نے؟" گرنجن سنگھ جذباتی ہو گیا۔ "ایک غدار سے کئے ہوئے وعدے کی خاطر آپ نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ ہم اس عمارت کو اڑانے والے ہیں' یہ آپ کو معلوم تھا......... اور ہمیں آپ نے بے خبر رکھا' آپ اس عمارت میں داخل ہو گئیں۔"

"چھوڑیں بھی گرنجن سنگھ جی! موت کی گھڑی آنے سے پہلے کون مر سکتا ہے؟" میں جان بوجھ کر دھیرے سے ہنس دی۔

"معاف کیجئے گا کرن جی! اس معاملے میں مجھے بھی آپ سے اتفاق نہیں۔" سالار اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔ "خدا نخواستہ کسی بھی سبب آپ اس عمارت سے نکلنے میں کامیاب نہ ہوتیں تو .... تو کیا ہوتا؟ ہمیں تو خبر بھی نہ ہوتی کہ .... کہ........."

"تو کچھ بھی نہ ہوتا سالار!" میں مطمئن آواز میں ہنس کر بولی۔ "کچھ دنوں تک آپ لوگ مجھے تلاش کرتے اور پھر چین کی بنسری بجانے لگتے' کیوں گرنجن سنگھ جی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" اس سے میرا مقصد اس کشیدہ فضا کو ختم کرنا تھا جو اس غیر متوقع واقعے کے سبب پیدا ہو گئی تھی۔ یہ واقعہ ان لوگوں کے لئے بہرحال غیر متوقع ہی تھا۔

"ہرگز نہیں۔" گرنجن سنگھ میری بات ختم ہوتے ہی بولا۔ "ہم لوگ اتنے بھی بے حس نہیں ہیں۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں' چین کی بنسری بجانے سے میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ میرا اشارہ دشمن کی بنسری بجانے سے تھا اور آج رات خاصی بنسری بجی ہے۔" میں نے موضوع گفتگو بدلنا چاہا۔ "کیوں سالار اکبر! آپ کا کیا خیال ہے؟ خاصا کام دکھا دیا ہم نے آج رات۔"

پھر مزید دو ایک جملوں کا تبادلہ ہونے کے بعد موضوع گفتگو بدل ہی گیا۔

کار جب قرول باغ کے علاقے میں داخل ہو رہی تھی تو میں نے راجندر سے پوچھا۔ "تمہیں وجے کا گھر معلوم ہے؟"

"مجھے صرف یہ خبر ہے کرن جی کہ وہ سبزی منڈی کے علاقے میں کہیں رہتا تھا' طفیل کو یقیناً پتا ہو گا کہ........."

"ویسے تو یہ لڑکی بھی ہوش میں آ کے اپنے گھر کی نشاندہی کر سکتی ہے لیکن شاید فوری طور پر اس

کے حواس کام نہ کر سکیں۔ کیا خبر اس پر کتنے ظلم ڈھائے گئے ہوں۔" میری بات سن کر سالار اکبر متوجہ ہو گیا اور پوچھنے لگا۔ "فوری طور سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"آپ کے ذہن سے شاید یہ بات نکل گئی ہے سالار کہ صبح ہوتے ہی فتنے جاگ اٹھیں گے۔ وجے کی لاش کے ساتھ جو سلپ پن کی گئی ہے' وہ کم از کم ایک شخص کو تو طیش میں مبتلا کر ہی دے گی۔ اس سے پہلے ہی کنول اور اس کے گھر والوں کو دہلی چھوڑ دینا چاہئے۔ کھسیانی بلی کو آپ کھمبا نوچنے سے تو نہیں روک سکتے۔" میرا اشارہ ہارڈی کی طرف تھا۔ جسے کتا لکھا گیا تھا۔ حکومت اور اس کے کار پرداز غریب و مظلوم عوام پر اپنی حاکمیت کا رعب قائم رکھنے کے لئے ہر ممکنہ حربہ آزماتے ہیں' مجھے علم تھا۔

سالار اکبر میری بات سمجھ گیا اور بولا۔ "وجے کا پتا تو سالار وحیدالدین کو فون کر کے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ تنظیم کے پاس ہر رکن کے پورے کوائف موجود ہیں۔ ویسے بہتر یہی ہے کہ ان حالات میں کوئی ایسا شخص ساتھ ہو جو وجے کے گھر کو جانتا ہو۔"

اس وقت صبح کے پانچ بجنے والے تھے جب ہم واپس کوٹھی پہنچے۔ میرے اور عادل کے چہروں پر تو پہلے ہی سے میک اپ تھا البتہ طفیل کے چہرے پر ماسک چڑھانا پڑا۔ اسے وجے کے گھر کا پتا معلوم تھا اور وہ وہاں ایک بار جا بھی چکا تھا۔ دوستی کو دشمنی میں بدلتے ہوئے چند ہی لمحے لگتے ہیں۔ وجے اور طفیل بھی دوست تھے مگر جب معلوم ہوا کہ وجے دشمن کا آلہ کار بن چکا ہے تو طفیل کی نفرت قابل دید تھی۔ اپنے دوست کے خلاف پہلی گواہی اسی نے دی تھی۔ ایک مقصد کے حصول پر اشتراک ان کی دوستی کا مرکز تھا۔ وہ قدر مشترک ختم ہوتے ہی ان کی راہیں الگ الگ ہو گئی تھیں۔ خیر و شر کی کوئی ایک راہ ہو بھی نہیں سکتی۔ دوست اور دشمن کے درمیان واضح لکیر کھینچنا پڑتی ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ فریب تو دوستی ہی کے پردے میں دیا جاتا ہے' وجے کا جرم یہی تو تھا۔

کنول کو اب ہوش آ چکا تھا۔ وہ حیران حیران سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ میں اسے لئے اپنے کمرے کے سامنے والی راہداری سے گزر رہی تھی۔ میرے پیچھے عادل اور طفیل تھے۔ وہ کچھ گھبرائی اور سہمی سہمی تھی۔ ہوش آنے کے بعد میں کئی بار اسے سمجھا چکی تھی کہ اب ڈرنے کی ضرورت نہیں مگر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والی کنول کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ کم عمر ہونے کے باوجود اس کا قد لمبا تھا اور جسم چھریرا' آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں اسے سنبھالے ہوئے عمارت سے باہر آ کے کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ طفیل' عادل کے ساتھ آگے بیٹھا تھا۔ "سائلنٹ ڈیتھ" کے سوا اب ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں نے گھریلو ہندو عورتوں کی طرح ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ عادل اور طفیل بھی دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔ کار کی نمبر پلیٹ بھی احتیاطاً تبدیل کر دی گئی تھی۔ مختصر وقت میں کنول کا منہ ہاتھ دھلا کر اسے بھی باندھنے کو دوسری ساڑھی دے دی گئی تھی۔ کویتا نے ساڑھی باندھنے میں اس کی مدد کی تھی۔ ان تمام احتیاطوں کا مقصد محض یہ تھا کہ راستے میں اگر ہمیں چیک بھی کیا جائے تو کسی معزز ہندو گھرانے کے افراد سمجھا جائے۔ ایسی صورت میں ہم پر شبہ نہ کیا جاتا ان تیاریوں میں جلدبازی کے باوجود آدھا گھنٹہ لگ ہی گیا تھا۔

اب صبح کے پونے چھ بج رہے تھے۔ رات کے مقابلے میں خطرہ اب قدرے کم ہو گیا تھا' کم از کم اس حد تک کہ سڑکیں بالکل ویران نہیں تھیں۔ شہر جاگ اٹھا تھا مگر "فتنے" شاید ابھی محو خواب ہی تھے۔ وقت کے بارے میں انگریزوں کے "مرض" سے میں بے خبر نہیں تھی۔ اس دوران سالار اکبر مجھے ہارڈی کے متعلق بتا چکا تھا کہ وہ بھی سرکاری مشینری کا ایک اہم پرزہ تھا۔ سی آئی ڈی کا چیف وہی تھا۔ اب تک بظاہر پولیس اور سی آئی ڈی ہی سے تنظیم کی چھوٹی موٹی جھڑپیں رہی تھیں۔ یہ عقدہ تو میرے دہلی آنے کے بعد کھلا تھا کہ سرفروش تنظیم کے خلاف پس پردہ مہرے تو ولیم رائٹ اور رابرٹ ہیم تھے۔ سالار اکبر اسی لئے ہارڈی سے اچھی طرح واقف تھا۔ ہارڈی بھی اپنے ہم وطنوں کی طرح وقت کا پابند تھا اور اس حد تک کہ ٹھیک نو بجے دفتر پہنچنے سے قبل وہ دفتری معاملات سے قطعی لاتعلق رہتا تھا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دے رکھا تھا کہ کیسا ہی ضروری معاملہ کیوں نہ ہو اسے دفتر آنے سے پہلے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ ہارڈی کے بارے میں ان معلومات کے باوجود میں چوکنا تھی۔ اب وہ دفتر ہی نہیں رہا تھا جہاں ہارڈی سازشوں کے منصوبے بناتا ہو گا۔ یہ بہرحال ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس امکان کو نظرانداز کیا جانا' ممکن نہیں تھا کہ وقت کے معاملے میں ہارڈی کی اصول پرستی دھری کی دھری رہ جائے۔ اس کے اوپر بھی تو کچھ لوگ تھے جو اس سے جواب طلبی کر سکیں۔

قرول باغ سے کار سبزی منڈی کے لئے روانہ ہوئی تو میں نے ایک بار پھر کنول کو تسلی دی۔ "تم گھبراؤ مت' ہم تمہارے بڑے بھائی وجے کے دوست ہیں' بولو نا تم۔"

بڑی مشکل سے اس کی زبان پر پڑا ہوا قفل کھلا۔ "پر بھیا کہاں ہیں؟"

اس معصوم لڑکی کے اس سوال نے اندر ہی اندر جیسے مجھے لرزہ دیا۔ کاش میں اس سے کہہ سکتی' کنول! اب اپنے بھائی کو بھول جا۔ تُو زندگی بھر اس کی راہ تکتی رہے گی اور وہ کبھی نہیں آئے گا۔ تیرا بھائی ایک ایسے سفر پر جا چکا ہے جہاں سے کبھی کوئی پلٹ کر نہیں آتا۔

میں جانے کہاں کھو گئی تھی کہ ایک مرتبہ پھر کنول کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "آپ نے بتایا نہیں دیدی! بھیا کہاں ہیں؟"

میں چونک اٹھی۔ اس بھولی سی لڑکی نے مجھے دیدی' یعنی بڑی بہن کہا تھا۔ اس ایک لفظ نے جیسے مجھے دہلی سے کلکتے پہنچا دیا تھا۔ شانتی بھی مجھے دیدی ہی کہتی تھی' ہمایوں کی ہندو داشتہ شانتی' میرے ہی ایما پر اس نے مسلمان ہو کر ہمایوں سے شادی کر لی تھی۔ شانتی کی بڑی بہن بن کر ہی میں نے اسے اپنی کوٹھی سے رخصت کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ یادوں کے غبار میں کنول کا چہرہ کہیں گم ہو جاتا' میں نے خود کو سنبھال لیا اور جلدی سے بولی۔ "وجے بالکل ٹھیک ہے' اسی کے کہنے پر تو ہم تمہیں چھڑا کر لائے ہیں۔"

"دیدی! وہ .... وہ انگریز اب .... اب تو مجھے اپنی کوٹھی پر نہیں بلوائے گا؟" اس کی آواز سرگوشی کی حد تک دھیمی تھی۔ "اس .... کا نام ہار .... ہارڈی ہے۔"

کنول نے میرے دل پر ایک اور زخم لگایا۔ اس کے ان الفاظ نے مجھ سے ایک ان کہی کہانی بیان کر دی تھی۔ کچی کلیاں توڑ کر اگر پانی میں کھلنے کو رکھ دی جائیں تو وہ کنول ہی کی طرح مرجھا جاتی ہیں۔

وجے کا اندیشہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔

"اب تمہیں کوئی بھی کہیں نہیں بلوائے گا کنول!" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔ "اور سنو' تم نے مجھے دیدی کہا ہے نا!"

کنول نے اقرار میں سر ہلایا۔ اسے میں نے بڑی حد تک اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔ میری جگہ کسی مرد سے شاید وہ اتنی جلدی نہ کھلتی۔

"تو پھر اپنی دیدی کی لاج رکھنا' کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کرنا۔"

"ماں جی سے بھی نہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ لہجے میں بھولپن تھا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے تاکید کی۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ یہ سب کچھ سن کر اس کی ماں کے دل پر کیا قیامت گزر جائے گی۔

"جہاں تمہیں' بتا دینا' مگر ایک تو اس رات کا ذکر نہ کرنا جب پہلی مرتبہ تمہارے بھیا کو سامنے لایا گیا تھا اور.........."

"جب انہوں نے بھیا کے سامنے میرے کپڑے پھاڑ.........." وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ شرم یا شاید اس واقعے کو یاد کر کے خوف سے کنول چپ ہو گئی تھی۔

"ہاں بس یہ کپڑے پھاڑنے والی بات اور ہارڈی کی کوٹھی پر بلوائے جانے کی باتیں اپنی ماں جی یا کسی کو بھی نہ بتانا۔"

کنول نے لمبا سانس بھرا۔ "ٹھیک ہے دیدی! آپ کہتی ہیں تو نہیں کہوں گی۔" یہ کہتے ہی اس نے ایک بار پھر اپنے بھائی کا ذکر چھیڑ دیا۔ "بھیا مجھ سے بس ایک ہی بار ملنے آئے تھے۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"دوبارہ ملنے کیوں نہیں آئے دیدی! انہیں آنا چاہئے تھا نا؟" اس کے لہجہ میں شکایت تھی اور بچوں جیسی معصومیت۔

"تمہارا بھائی تمہیں دشمنوں کی قید سے رہائی دلانے میں لگا ہوا تھا۔"

"اچھا تو یہ بات تھی۔" وہ مطمئن نظر آنے لگی جیسے کوئی بڑی الجھن ختم ہو گئی۔

راستے بھر وہ مجھ سے ایسی ہی بھولی بھالی باتیں کرتی رہی اور سفر تمام ہو گیا۔ سبزی منڈی' مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ آبادی تھی۔ وہیں سبزی کی بڑی اور مشہور مارکیٹ تھیں اسی وجہ سے اس پورے علاقے کا نام سبزی منڈی پڑ گیا تھا۔ متوسط طبقے کے لوگ وہاں آباد تھے۔

میں نے راستے ہی میں کنول سے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ گھر میں صرف اس کے ماں باپ ہوں گے۔ اس کی ماں کا نام وجنتی اور باپ کا نام منوہر تھا۔

کار ایک طرف کھڑی کر کے عادل اور طفیل اتر گئے۔ میں اور کنول' کار ہی میں بیٹھے رہے۔ وہ دونوں یہ سراغ لگانے گئے تھے کہ کہیں وجے کے گھر کی نگرانی تو نہیں ہو رہی۔ میں نے روانگی سے قبل ہی اس سلسلے میں انہیں ہدایت دے دی تھی۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ طفیل' وجے کے گھر کی

نشاندہی کر سکے۔ طفیل کو یہاں سے تنہا واپس جانا تھا۔

"دیدی! وہ دونوں کہاں چلے گئے؟ اب گھر چلیں نا!" کنول چپ نہ رہ سکی۔

"ابھی چلتے ہیں' انہیں آ جانے دو۔" میں بولی۔

کسی بڑے آدمی یا عورت کی نسبت بچے کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ذہنی طور پر کنول ایک بچی ہی تھی۔ میں اسی مشکل میں گرفتار تھی۔

کچھ دیر میں وہ دونوں کار کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ طفیل دور ہی سے رخصت ہو گیا۔ عادل قریب آ گیا تو میں کنول کو ساتھ لئے کار سے اتر گئی۔ کسی گڑبڑ کی صورت میں طفیل کو عادل کے ساتھ ہی کار تک آنا تھا۔ میں اسی لئے مطمئن ہو گئی تھی۔

جہاں کار کھڑی کی گئی تھی' وہاں سے وجے کا گھر زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ہم جلد ہی وہاں تک پہنچ گئے۔ کنول میرے ساتھ تھی اور عادل پیچھے تھا۔ میں نے ہی دروازے کی کنڈی ہلائی۔ جواب میں اندر سے ایک مردانہ آواز آئی۔ "اچھا۔" پھر قدموں کی چاپ ابھری اور دروازہ کھل گیا۔

"نمستے!" میں نے ہندو عورتوں کی طرح دونوں ہاتھ جوڑ کر اس شخص کو گویا تعظیم دی جو سامنے کھڑا تھا۔ وہ وجے کا باپ منوہر ہی ہو سکتا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ منوہر نمستے کا جواب دیتا' کنول "پتا جی" کہتی ہوئی اس شخص کے سینے سے لپٹ گئی۔ اس کے بعد کنول کی ماں وجنتی بھی دوڑتی ہوئی وہاں تک آ گئی۔ بیٹی اپنی ماں کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ منوہر نے اس دوران شاید اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے مجھے اور عادل کو گھر میں بلا لیا۔ اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے گھر کا دروازہ بند کیا اور پلٹ کر بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "لگتا ہے' میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔"

دروازہ بند کرنے کا مطلب اور پھر اندر سے کنڈی بھی لگا دینا میری نظر میں بے سبب نہیں تھا۔ منوہر کو شاید ابھی اس واقعے کی تشہیر مقصود نہیں تھی۔ جس کی بیٹی اغوا کر لی جائے' وجہ کچھ بھی ہو' اس شخص کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ لوگ طرح طرح کے سوالات کر کے اس شخص کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں طرح طرح کے شکوک کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس کے علاوہ منوہر نے اپنے بیٹے وجے کے متعلق بھی کوئی نہ کوئی اندازہ ضرور قائم کیا ہو گا کہ وہ گھر سے کیوں غائب رہتا ہے۔ ایسی اولاد سے عموماً ان کے والدین خفا ہی رہتے ہیں۔ عام آدمی کے زندگی برتنے اور جھیلنے کا انداز ذرا مختلف ہوتا ہے۔ حالات کا جبر' زندگی کے ساتھ ایک عام آدمی کے رویے کو متعین کرتا ہے۔ وجے کے باپ منوہر کو دیکھ کر بہت سی باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ حالیہ غیر متوقع واقعے کے زیر اثر ہونے کے باوجود اس کی احتیاط پسندی یہی ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ "شریمان جی! کبھی کبھی سپنے بھی سچائی کا روپ دھار لیتے ہیں۔"

"ہاں .... میں دیکھ رہا ہوں لیکن .... لیکن آپ .... آپ لوگ اندر آ جائیں نا!"

منوہر غالباً یہ معلوم کرنا چاہتا ہو گا کہ میں کون ہوں یا میرے ساتھ آنے والا عادل کون ہے' مگر اس نے

ت بدل دی تھی۔ اپنی بیٹی کے ساتھ اجنبیوں کو دیکھ کر اس کا یہ رویہ فطری ہی تھا۔

مجھے اور عادل کو منوہر نے اندر ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا جس میں ایک طرف چوکی پڑی ں۔ کمرے ہی میں تین چار مونڈھے بھی تھے۔ میں اور عادل ان مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔

"میں ابھی آیا۔" منوہر یہ کہہ کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ شاید پہلے اپنی بیٹی سے ے متعلق کچھ پوچھنے جا رہا تھا۔

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے منوہر جی!" میں بولی اٹھی۔ "ہمیں آپ سے بہت ضروری بات رنا ہے۔"

میرے منہ سے اپنا نام سن کر منوہر کے قدم رک گئے۔ وہ پلٹا تو اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

"چاہیں تو کنول اور اپنی پتنی (بیوی) کو بھی یہیں بلا لیں۔" میں بولی۔ "اس طرح بات ذرا جلدی ہو ے گی۔"

منوہر کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان لگتی تھی۔ وہ بھی دھوتی ہی باندھے ہوئے تھا۔ اس نے مجھ ے کچھ کہے بغیر صدا لگائی۔ "وجے کی ماں' بٹیا کو لے کر یہیں آ جاؤ.........."

وجنتی اور کنول چوکی پر آ کے بیٹھ گئیں۔ ابھی تک ان کی آنکھوں کے آنسو خشک نہیں ہوئے ے۔ منوہر ہمارے قریب ایک اور مونڈھا گھسیٹ کر بیٹھ گیا تو میں نے بات شروع کی۔ "پہلی بات تو یہ لیں کہ کنول جیسی گئی تھی ویسی ہی پوتر (پاک) ہے۔ اس کے اغوا کا کارن (سبب) کچھ اور تھا۔ میں وہ ن بتانے سے پہلے اپنا اور اپنے ساتھی کا پریچے (تعارف) کرا دوں۔ میرا نام کرن ہے اور یہ پنڈت بال ند جی ہیں۔" میں دانستہ ہندی الفاظ میں بول رہی تھی تاکہ منوہر کو یہ شک نہ ہو کہ ہم اس کی قوم کے ں۔ "آپ ہمیں اپنے وجے کا ساتھی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم پر اس نے یہ ذمے داری ڈالی تھی کہ کنول کو پ تک پہنچا دیں۔ کیا کھبر (خبر) آپ کو پتا ہو کہ نہ ہو' وجے اس ماتر بھومی (مادر وطن) کے ان سپوتوں ں سے ایک ہے جن پر ابھیمان (فخر) کیا جا سکتا ہے۔ آپ ایک ایسے ہی سپوت کے پتا ہیں' سو آپ کا سم (تعظیم) بھی ہمارا کرتویہ (فرض) ہے۔" یہ کہتے ہوئے اپنے بیٹے سے منوہر کی ممکنہ ناراضگی میرے مد نظر ا۔ "آشا ہے کہ آپ اس تھوڑے کہے کو بہت جان کر سب کچھ سمجھ گئے ہوں گے۔ وجے اور ہم ن بھگت (وطن پرستوں) کو جھکانے کے لئے انگریز سرکار نے کنول کو اغوا کرایا تھا۔ سو جیت ہماری ہوئی پر ...... پر یہ جیت' ہار میں بھی بدل سکتی ہے۔"

میری توقع کے مطابق منوہر نے چونک کر پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

میرا مقصد اس خطرے کا احساس دلانا تھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھا ہو کہ نہ سمجھا ہو' میں نے بہرحال احت کر دی۔ "آپ اور آپ کا چھوٹا سا پریوار (خاندان) اگر دہلی ہی میں رہا تو جو کچھ ہو چکا ہے' بھگوان کرے' پھر بھی ہو سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں آپ اور آپ کی پتنی کو بھی کھترا (خطرہ) ہے۔"

"ہے بھگوان!" وجنتی بے اختیار بولی۔ غیر ارادی طور پر اس نے کنول کو اپنے قریب کر لیا تھا جیسے ے دشمنوں کی نظر سے چھپا لینا چاہتی ہو۔ اسے کیا خبر تھی کہ دشمن تو کنول کو مردہ سمجھ کر بھول جائیں

گے انہیں تو یہ گمان بھی نہ ہو گا کہ سی آئی ڈی ہیڈ آفس کے اڑنے سے پہلے ہی کنول کو نکالا جا چکا ہو گا۔ وجنتی ذرا توقف سے پھر خوفزدہ آواز میں کہنے لگی۔ "ہائے رام! اب کیا ہو گا؟"

"وجے کی ماں! تم چپ بیٹھو اور مجھے بات کرنے دو۔" منوہر نے اپنی بیوی سے کہا۔ پھر مجھ سے پوچھا۔ "وجے کہاں ہے؟"

"ابھی اس کا کھلے عام پھرنا ٹھیک نہیں۔" میں نے فوراً جواب دیا۔ "وہ ایسی جگہ چھپا ہے جہاں سرکار اس کا کھوج نہیں لگا سکتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہی کنول کو گھر چھوڑنے آتا۔ اس نے کہلوایا ہے کہ آپ ترنت (فوراً) کنول کو ساتھ لے کر دہلی سے نکل جائیں۔"

منوہر کے چہرے پر خوف کی جگہ اب غصہ نظر آنے لگا بولا۔ "اس کا کیا ہے' اسے ہماری کیا پرواہ' گھربار اور کام دھندا چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جانا کوئی ہنسی کھیل سمجھ لیا ہے اس نے۔"

اپنے بیٹے پر غصے کی وجہ سے وقتی طور پر وہ خطرے کو بھول گیا تھا۔ میں چند لمحے خاموش رہی پھر اسے دوبارہ خطرے کا احساس دلانے والی تھی کہ وجنتی بول اٹھی۔

"ہم کچھ دن کے لئے میرٹھ کیوں نہ چلے چلیں۔ آڑھت (دلالی) کا کام تو تمہیں وہاں بھی مل جائے گا۔"

"تمہیں تو بس ہر بات پہ میرٹھ یاد آنے لگتا ہے۔" منوہر نے منہ بنایا۔

"کیوں نہ یاد آئے میکا ہے میرا۔" وجنتی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "بھگوان رکھے ابھی تو میرے ماتا پتا (والدین) جندا (زندہ) ہیں۔" پھر وجنتی نے اپنے بھائیوں کا قصہ بھی چھیڑ دیا جو اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

وقت کم تھا اور ان دونوں میاں بیوی کی "مکالمہ بازی" جاری تھی اس لئے مجھے بولنا ہی پڑا۔ "دیکھیں منوہر جی! آپ شاید سمجھ نہیں رہے کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہی کیا طوفان آنے والا ہے۔ جیسے ہی سرکار کے بڑے افسروں کو پتا چلا کہ کنول کو چھڑا لیا گیا ہے' پولیس آپ کے گھر پر دھاوا بول دے گی۔ پھر پولیس والے سارے ہی گھر والوں کو باندھ کر لے جائیں گے۔ اپرادھی (مجرم) نہ ہو کر بھی وہ آپ کو اپرادھی بنا دیں گے۔ کوئی بھی آروپ (الزام) لگا دیں گے آپ پر۔ میرٹھ جائیں یا کہیں بھی دہلی سے..........."

"میں .... سمجھ گیا۔" میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی منوہر بول اٹھا۔ وہ ایک دم گھبرا گیا تھا۔ یہی میں چاہتی بھی تھی۔ "آپ .... آپ لوگ جائیں' ہم .... ہم بھی نکلتے ہیں۔"

"ہمارے پاس کار ہے' ہم آپ کو بس کے اڈے یا ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ دیں گے۔ آپ جلدی سے چلنے کی تیاری کریں' ہم بیٹھے ہیں۔ ہمیں بھی آپ اپنے وجے کے سمان (مانند) سمجھیں۔" عادل پہلی مرتبہ بولا تاکہ منوہر کچھ زیادہ ہی نہ گھبرا جائے۔ عادل کو میں یہ پہلے ہی بتا چکی تھی کہ وجے کے گھر والوں کو بس کے اڈے یا اسٹیشن تک چھوڑنا ہے۔ عادل نے اسی لئے یہ پیشکش کی تھی۔

ہنگامی حالات کے پیش نظر منوہر نے یہ پیشکش فوراً قبول کر لی۔ منوہر اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ

کمرے سے نکل گیا۔

پھر آدھا گھنٹہ مشکل سے لگا ہو گا کہ منوہر نے روانگی کی تیار کر لی۔ اس نے ٹین کے دو بکس ساتھ لئے تھے۔ ان میں سے ایک عادل نے لے لیا۔ گھر کو تالا ڈال کر وہ ہمارے ساتھ ہو لئے۔ اب صبح کے سوا ۔ات بجنے والے تھے۔ دن پوری طرح نکل آیا تھا۔ ایک آدھ محلے والے نے منوہر سے پوچھا بھی کہ صبح ی صبح کہاں جا رہا ہے' مگر وہ سنی ان سنی کر گیا۔

میں کار میں آگے بیٹھ گئی اور وہ تینوں پیچھے۔ دونوں بکس عادل نے کار کی ڈکی میں رکھ دیئے تھے۔

"کدھر چلیں شریمان جی!" عادل نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے منوہر سے پوچھا۔

"ریلوے اسٹیشن چلیں پنڈت جی!" میں نے منوہر کے جواب دینے سے پہلے کہا۔ "اس سمے انہیں ہلی سے کہیں بھی نکلنا ہے۔ اگلے کسی بھی اسٹیشن پر اتر کر جہاں من ہو گا چلے جائیں گے۔ جو بھی پہلی ۔ین ملی' اس میں بٹھا دیں گے۔ اس سمسیا (مسئلہ) کے لئے یہی سادھن (ذریعہ) ٹھیک رہے گا۔ کیوں منوہر ی!"

"آپ لوگ جو ٹھیک جانیں سو کریں' مجھے کوئی آپتی (اعتراض) نہیں۔"

منوہر کا جواب سنتے ہی عادل نے کار کو دوڑانا شروع کر دیا۔ کنول اس دوران کچھ نہیں بولی تھی۔ ہی کیا' اس کی ماں وجنتی بھی سہمی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہی زیر لب کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ایسے وقت میں ھی کو اس کی یاد آنے لگتی ہے جس نے یہ دنیا بنائی ہے۔ ورنہ تو زندگی کے بکھیڑے آدمی کو اتنی مہلت لہاں دیتے ہیں' وہ بھی شاید اپنے بھگوان کو یاد کر رہی تھیں۔ ہاں' منوہر خوفزدہ ہونے کے باوجود خود کو کچھ سنبھالے ہوئے تھا۔

ریلوے اسٹیشن پر وہی آپا دھاپی تھی جو ہوتی ہے۔ انکوائری سے عادل نے معلوم کیا' کوئی ٹرین ۔رہ منٹ بعد چلنے والی تھی۔ وہ کوئی پسنجر ٹرین تھی جو ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر رکتی ہوئی چلتی ہے۔ دل نے اس کے تین ٹکٹ لے لئے۔ وجے کے گھر والوں کو ہم ایک بنچ پر بٹھا آئے تھے۔ ٹکٹ اگلے نکشن تک کے لئے گئے تھے کہ منوہر اپنی سہولت دیکھ کر جہاں چاہے اتر جائے۔ ٹکٹ لے کر ہم اس یٹ فارم پر آ گئے جہاں ان تینوں کو بٹھا گئے تھے۔ عادل نے منوہر کو ٹکٹ دے دیئے۔

"ارے یہ کیا؟" منوہر کہنے لگا۔ "مجھ سے کہا ہوتا' میرے پاس پیسے ہیں۔"

"رکھ لیں منوہر جی! ہمارے پاس بھی آپ ہی کے پیسے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ایک بکس ھانا چاہا۔ ٹرین ایک اور پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔

عادل نے میرے ہاتھ سے بکس لے لیا۔ مطلوبہ پلیٹ فارم تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ٹرین میں عموماً زیادہ رش نہیں ہوتا' جگہ آسانی سے مل گئی۔ ٹرین کی پہلی سیٹی ہونے سے پہلے میں نے ہندوؤں کے رسم و رواج کے مطابق جھک کر منوہر اور وجنتی کے پاؤں چھوئے۔ عادل نے بھی ایسا ہی کیا۔

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔" دونوں نے ہمیں دعا دی۔ "اس بھلائی کا پھل دے۔"

اس کے بعد کنول کو میں نے گلے سے لگا لیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"دیدی!" وہ رو پڑی۔

"میں نے تمہیں جو سمجھایا تھا' اس کا دھیان رکھنا۔" میرا اشارہ اسے بے حرمت کئے جانے کی طرف تھا۔

میری سرگوشی کے جواب میں اس نے دھیرے سے "اچھا" کہا۔

ٹرین جب روانہ ہو گئی تو جانے کیوں مجھے ایک سکون سا محسوس ہوا۔ انسانی رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ مانو تو سب کچھ نہ مانو تو کچھ نہیں۔ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر میں' عادل کے ساتھ کار میں آ بیٹھی تو وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "تمہیں تو کسی ناٹک منڈلی میں ہونا چاہئے تھا۔ ذرا پتا نہیں چلا کہ تم سوانگ رچا رہی ہو۔"

"پنڈت جی! یہ جیون بھی تو ایک سوانگ ہے۔"

"پنڈت کا وچار یہ ہے شریمتی کرن جی کہ تم واپس آ جاؤ۔"

"کہاں سے؟"

"ناٹک منڈلی سے۔"

"واپسی کے پیسے ہوں گے۔"

"ابھی اسٹیشن پر تین ٹکٹ خرید کر اس غریب پنڈت کو لٹوا چکی ہو' کیا چین نہیں پڑا۔ معاف کرنا کوئی لوٹ نہیں مچ رہی۔"

ہم دونوں یونہی ہنستے بولتے قرول باغ پہنچ گئے اور کسی خطرے نے ہمارا راستہ نہیں روکا۔ ایک دوسرے پر فقرے بازی کے باوجود ہم دونوں ہی چوکنا تھے۔ نو بجے سے پہلے ہم واپس آ گئے تھے پھر بھی سالار اکبر اور گرچن سنگھ دونوں ہی ہماری طرف سے فکرمند تھے۔ رات بھر جاگنے کے باوجود وہ اب تک سوئے نہیں تھے۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی رشیدہ نے ہمیں بتا دیا تھا کہ وہ دونوں نشست گاہ میں ہمارے منتظر ہیں۔ ان کے اضطراب کا سبب مجھے معلوم تھا۔

ہم وہاں پہنچے تو وہ چائے پی رہے تھے۔ گرچن سنگھ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "آپ نے تو ڈرا ہی دیا کرن جی!"

"آپ بھی ڈرتے ہیں گرچن سنگھ جی!" میں مسکراتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"جی ہاں' آپ سے اب ڈرنا ہی پڑے گا۔"

"مگر بتائیں تو سہی کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ تو موت تک سے نہیں ڈرتیں۔ آپ جس عمارت کو ڈائنامائٹ سے اڑانے کا حکم دے کر اس میں داخل ہو سکتی ہیں تو پھر اس سے زیادہ اور کیا کوئی کرے گا۔"

"غلطی دراصل میری ہی تھی' جلدی میں پوری بات نہیں بتا سکی۔"

"کیا وجہ ہے کہ اس لڑکی کو چھوڑ کر آپ کہیں اور بھی گئی تھیں؟" سالار اکبر بھی گفتگو میں شامل

ہو گیا۔

"ان لوگوں کو اسٹیشن تک بھی تو چھوڑنا تھا۔ ورنہ دھر لئے جاتے۔" میں نے بتایا۔ "اتنا وقت نہیں ھا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔"

"کرن جی کو وجہ کے ماں باپ سے دعائیں بھی تو لینا تھیں۔" عادل نے بظاہر سنجیدگی کے ساتھ ہ پر فقرہ چست کیا۔ "مجھے بھی ان کے طفیل دعائیں مل گئیں۔"

"ہاں وہ طفیل بھی تو.........." مجھے طفیل کا خیال آ گیا جسے سبزی منڈی سے واپس کر دیا گیا تھا۔ اس نے نہیں بتایا کہ.........."

"وہ بحفاظت فراش خانے والی حویلی پہنچ چکا ہے۔ سالار وحیدالدین نے فون پر بتا دیا تھا۔" گرچن گھ میری بات کاٹ کر بولا۔ "ویسے بھی وہ ہنگامی طور پر یہاں رک گیا تھا۔ سالار اعلیٰ کا حکم ہے کہ جو لوگ ماں اور جس ٹھکانے پر رہتے ہوں' انہیں عموماً وہیں رہنا چاہئے۔"

"اور اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ اردگرد رہنے والے لوگ آئے دن نئے چہروں کو دیکھ کر کسی شک ں نہ پڑیں۔" سالار اکبر نے وضاحت کی۔

"لیکن وہ تو ہے ہی نئے ارکان کی تربیت کا مرکز۔" میں نے کہا۔ "وہ تو.........."

"اس حویلی میں داخل ہونے اور نکلنے کے کچھ خفیہ راستے بھی ہیں نئے ارکان کو انہی سے لایا لے یا جاتا ہے۔" سالار اکبر بول اٹھا۔ "بہرحال ایک درخواست ہے آپ سے کہ جب غیریقینی حالات ہوں اپنے اقدامات سے آگاہ کر دیں۔ گزشتہ رات ہم نے دشمن پر جو ضرب لگائی ہے' اس کا کوئی بھی ردعمل ن ہے۔ ایسی صورت میں آپ کی طرف سے ہمارا فکرمند ہو جانا فطری بات تھی۔ اگر ہمیں پہلے سے ہوتا کہ آپ کا کیا ارادہ ہے تو.........."

"جانے ہی نہ دیتے آپ کو۔" گرچن سنگھ نے سالار اکبر کی بات پوری نہ ہونے دی۔ "ارے کوئی اس لڑکی کو سبزی منڈی چھوڑ آتا۔ پنڈت جی اور طفیل ہی اس کے لئے کافی تھے۔ دراصل آپ کے منے کوئی کچھ بول تو سکتا نہیں۔ اس وقت بھی میں ہمت کر کے کچھ کہنے والا تھا جب آپ جانے والی ں مگر ان کے کہنے سے چپ ہو گیا۔" اس نے سالار اکبر کی طرف اشارہ کیا۔ "عمر میں یہ مجھ سے لاکھ ٹے سہی لیکن گن کے پورے ہیں۔ ماننا ہی پڑتی ہے ان کی بات۔"

"ورنہ تو گرچن سنگھ جی! بڑے ہی فرماں بردار ہیں۔" سالار اکبر نے مسکرا کر کہا۔

"اور لو' ہم تو چائے پیئے جا رہے ہیں' کرن جی سے پوچھا ہی نہیں۔" گرچن سنگھ فقرہ پی گیا اور بات چھیڑ دی۔

"اب تو ناشتے کا وقت ہو گیا ہے گرچن سنگھ جی ناشتہ ہی منگوا لیتے ہیں۔" سالار اکبر بولا۔

اس وقت تک ان دونوں نے بھی ناشتہ نہیں کیا تھا۔ سو ناشتہ وہیں منگوا لیا گیا۔ رات بھر جاگ کر ے بھی مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے روز اول ہی ولاری اور دیگر متعلقہ افراد کو ہدایت دے دی ا کہ میرے زیر استعمال برتن الگ ہی رکھے جائیں۔ ایسا ہی میں نے شہزاد کے گھر کیا تھا۔ پہاڑوں سے

اتر کر ہموار میدانوں میں آنے کے بعد بھی میں یہ نہیں بھولی تھی کہ میرے اندر کتنا زہر بھرا ہوا ہے۔ میں اسی لئے اس معاملے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیتی تھی۔ اسے اب تک میری نفاست پسندی ہی پر محمول کیا جاتا رہا تھا۔ پہلے میں ان لوگوں کی مہمان تھی' وہ میرے اس وقت قریب بھی نہیں آئے تھے لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔

اس روز بھی حسب معمول رحمان نے میرے لئے الگ ناشتہ لگایا تو عادل کو شرارت سوجھ گئی۔ وہ گرنجن سنگھ سے مخاطب ہوا۔ "ایک بات بتاؤں آپ کو۔"

"ہاں ہاں کہو۔" گرنجن سنگھ فوراً بولا۔

"کرن جی! ہم سب کو اچھوت سمجھتی ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"اِدھر اُدھر کی نہ اڑاؤ پنڈت جی! ناشتہ کرنے دو۔" گرنجن سنگھ نے ہاف فرائی انڈے کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

"اچھا یہ بتائیں' کرن جی کو آپ نے کسی کے ساتھ کچھ کھاتے پیتے دیکھا؟"

"میں یہاں رہتا ہی کب ہوں جو دیکھتا۔"

"ہم تو رہتے ہیں یہاں' ان کے تو کھانے پینے تک کے برتن الگ ہیں۔ رحمان چلا گیا ورنہ ابھی تصدیق کرا دیتا۔" عادل اپنی بات پر اڑا رہا۔

"میں نہیں مان سکتا۔" گرنجن سنگھ نے انکار میں سر ہلایا۔

میں سمجھ رہی تھی کہ عادل' گرنجن سنگھ سے لطف لے رہا ہے اس لئے چپ رہی۔ دوسری طرف وہ مجھے بھی ستانے پر تلا ہوا تھا۔ دراصل ایک مرتبہ جب وہ باتیں کرتے کرتے بھولے سے میری چائے کا کپ اٹھانے لگا تو میں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ میں چائے کا ایک گھونٹ لے چکی ہوں۔ بے دھیانی میں وہ موت کو گلے لگانے والا تھا۔ یہ کچھ ہی روز پہلے کی بات تھی۔

عادل تو شرارت پر آمادہ تھا ہی' اس نے ذرا ہی دیر میں گرنجن سنگھ کو بانس پر چڑھا دیا۔

"اچھا اگر کرن جی نے مجھے اپنے ساتھ ناشتہ کرنے دیا تو؟"

"تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ ابھی پتا لگ جاتا ہے' پنڈت جی!" گرنجن سنگھ کہہ کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"بس ایک نوالہ آپ کے.........."

"نہیں۔" میں نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہنسی ہنسی میں بات اتنی بڑھ جائے گی۔ سالار اکبر خاموش تماشائی بنا ہوا تھا' شاید دانستہ۔

"میں کہہ رہا تھا نا گرنجن سنگھ جی!" عادل نے اور شہ دی۔

میں نے عادل کو گھور کر دیکھا' مگر اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ گرنجن سنگھ نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس وقت تو خیر بات زیادہ سیریس نہیں لیکن مجھے فی الحال انہی لوگوں کے درمیان رہنا ہے۔ لاعلمی کسی بھی وقت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی ایسا حادثہ کبھی پیش آ سکتا ہے

ں کا نتیجہ کسی بے گناہ کی موت ثابت ہو۔ یوں بھی وہ لوگ میرے ماضی سے واقف ہو چکے تھے۔ ایسی رت میں ان کے لئے میری بات سمجھنا مشکل نہ ہوتا۔ متوقع حادثے سے بچانے کے لئے میں نے جس ح کے ساتھ گرنجن سنگھ کو ایک نوالہ بھی کھانے سے روک دیا تھا' مجھے اس کا بھی احساس تھا۔

"گرنجن سنگھ جی! بات سنیں۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"جی فرمایئے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ اس کا منہ اب بھی لٹکا ہوا تھا۔

"پنڈت جی کی بے تکی باتوں پر دھیان نہ دیا کریں۔ ان کی مثال تو اس اونٹ کی سی ہے جو کبھی ڑ کے نیچے نہیں آیا۔" میں نے موقع غنیمت جان کر عادل کو بھی نہیں بخشا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے سالاروں کے سامنے جوابی کارروائی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

"لیکن پنڈت جی کی بات آپ نے تو سچ کر دکھائی۔" گرنجن سنگھ کے لہجے میں شکایت کا عنصر شامل

"ایک مرتبہ پنڈت جی کو بھی میں نے مرتے مرتے بچا لیا تھا اور آج یہ آپ کو موت کے منہ میں ا دینے والے تھے۔ لگتا ہے' پنڈت جی آپ سے کوئی پرانا حساب چکانا چاہتے ہیں۔" میں نے اپنی ٹرے ، پانی بھرا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور بولی۔ "یہ پانی دیکھ رہے ہیں آپ۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں' ابھی میری نظر اتنی کمزور نہیں ہوئی۔" گرنجن سنگھ نے کہا تو سالار اکبر رانے لگا۔ وہ شاید اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ عادل کی طرح اب میں گرنجن سنگھ کا پھلکا اڑا رہی ہوں۔

"یہ پانی زہر آلود ہو چکا ہے۔" میں نے گویا انکشاف کیا۔ میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

اس پر عادل ہنس پڑا پھر گرنجن سنگھ سے کہنے لگا۔ "ابھی کرن جی کہیں گی کہ یہ پانی دیکھتے ہی ں سے غائب ہو جائے گا۔"

عادل اپنی شوخی سے باز نہیں آ رہا تھا۔ گرنجن سنگھ بولا۔ "پنڈت جی! لبی چھوڑنے کی نہیں ہو رہی' ایک وقت میں ایک ہی بندے کو بھگت سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کنکھیوں سے سالار اکبر کی ف دیکھا کہ کہیں وہ بھی "شروع" نہ ہو جائے۔

صورت حال اچانک کچھ ایسی ہو گئی کہ میری بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر سبھی ہنسنے لگے۔ فوری طور پر نے بھی اصل بات گول کر دی۔ ناشتہ کر کے چائے پیتے ہوئے میں نے ایک سنجیدہ موضوع چھیڑ دیا سے فضا بدل گئی۔

"آپ گزشتہ رات کے ردعمل پر غالباً کوئی بات کرنے والے تھے۔" میں نے سالار اکبر کو مخاطب

"میں اس سلسلے میں ایک ضروری بات کہنا چاہتی تھی۔ باقی تفصیلی گفتگو تو خیر ہم آج شام کو کریں گے ومت کے ردعمل کا علم ہو جائے گا' فی الحال کم از کم بھی دو تین روز کی مکمل خاموشی ضروری ہے۔ ام ارکان کو فوری طور پر یہ تاکید کر دیں کہ وہ مزید چوکنا اور محتاط رہیں۔ آپ کے شعبے سے متعلق افراد سرگرم ہیں' ان کے سوا دوسرے ارکان بہ حالت مجبوری تو باہر نکلیں ورنہ اپنے ٹھکانوں تک رہیں۔ یہ احتیاط بہت ضروری ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں' آپ کیا چاہتی ہیں اور اشارہ کس طرح ہے۔ حکومت ان واقعات کے بعد بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع کر دے گی۔ پولیس پر بھی دباؤ پڑے گا اور وہ اوپر والوں کی نظر میں سرخرو ہونے کے لئے نیز خانہ پری کی خاطر جو بھی ہتھے چڑھ گیا اسے پکڑ لے گی۔"

"اور ان بے گناہوں کو گرفتار کر کے اپنی روایت کے مطابق یہ انکشاف کرے گی کہ یہ بندہ پولیس کو پہلے ہی سے اتنے جرائم میں مطلوب تھا اور ڈاکے ڈالنے کے علاوہ اتنے قتل کر چکا ہے۔" گربچن سنگھ کے لہجے میں نفرت و حقارت تھی۔ "انگریزوں کے پالتو کتے' حرامزادے۔"

"کرن جی کا مقصد یہ ہے کہ گربچن سنگھ جی کہ اس افراتفری میں کہیں کوئی ہمارا رکن نہ پکڑا جائے۔" سالار اکبر نے وضاحت کی۔

"اور وہ جو ایمونیشن ڈپو اڑانے کا پروگرام تھا؟"

"وہ اپنی جگہ ہے۔ اس پر ہم شام کو بات کریں گے۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "آپ تو یہیں ہیں نا؟"

"آپ ہی کا تو کہنا ہے کہ نقل و حرکت سے فی الحال گریز کیا جائے' تو میں یہیں آرام کر لوں گا۔ ابھی مختلف ٹھکانوں تک بھی آپ کا یہ حکم پہنچانا ہے۔"

"وہ میں ابھی فون پر کوڈ ورڈز میں کرن جی کی طرف سے یہ ہدایات جاری کر دیتا ہوں۔ آپ لوگ جا کے آرام کریں۔ فون کر کے میں بھی سونے چلا جاؤں گا۔" سالار اکبر کی بات سنتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیند کی وجہ سے میری پلکیں بھی بوجھل ہو رہی تھیں۔

میں اپنے کمرے میں پہنچی تو کویتا ناشتہ کر چکی تھی اور دلاری ناشتے کے برتن اٹھا کر لے جا رہی تھی۔ میری وجہ سے رات کو کویتا کی نیند بھی پوری نہیں ہو سکی تھی۔ وہ شاید اسی لئے دیر سے سو کر اٹھی تھی۔ دلاری چلی گئی تو کویتا میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "کرن جی! مجھے معلوم ہے' آپ کو سخت نیند آ رہی ہو گی۔ میں صرف اس لڑکی کے بارے میں پوچھوں گی۔ وہ اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ گئی؟" کویتا مجھ سے کنول کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ اسے کنول کا نام معلوم نہیں تھا۔

"ہاں کویتا!" میں نے جواب دیا۔

"اب آپ آرام کریں' میں چلتی ہوں۔"

"کہاں؟" میں کھونٹی پر ٹنگے ہوئے سلیپنگ گاؤن کی طرف بڑھی۔

"کہیں بھی گھوم پھر آؤں گی۔ آپ شام تک تو سو کے اٹھ ہی جائیں گی نا' آپ اطمینان سے دروازہ بند کر کے سو جائیں میں کمرے میں موجود رہی تو آپ سکون سے نہیں سو پائیں گی۔"

"تو کیا شام تک لوٹنے کا ارادہ ہے؟" میں نے کھونٹی سے سلیپنگ گاؤن اتار لیا۔

"ہاں' دوپہر کو بھوجن (کھانا) کہیں بھی کر لوں گی۔"

میرے ہی آرام کی خاطر کویتا کہیں گھومنے پھرنے جا رہی تھی اس لئے میں کچھ نہیں بولی اور وہ چلی گئی۔ پھر لباس تبدیل کر کے میں بستر پر دراز ہوتے ہی گویا بے خبر ہو گئی۔ کمرے کا دروازہ میں لباس تبدیل

کرنے سے پہلے ہی اندر سے لگا چکی تھی۔

☆======☆======☆

اس وقت شام کے چار بج رہے تھے جب میری آنکھ کھلی۔ کمرے کا دروازہ بدستور اندر سے بند تھا۔ کسی نے مجھے جگایا نہیں تھا۔ نہانے کے بعد لباس تبدیل کر کے میں نے صرف ناشتے پر اکتفا کیا۔ اب میرا ذہن ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق سالار اکبر' گربچن سنگھ اور عادل کو بھی اٹھ جانا چاہئے تھا۔ آج صبح ملاقات کے لئے کسی وقت کا ہم نے تعین نہیں کیا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم چاروں اسی کوٹھی میں تھے۔

تنظیم میں شمولیت اختیار کرنے کے باوجود اب تک مجھے بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا جو بعد میں مجھے خود بخود رفتہ رفتہ معلوم ہوتی گئیں۔ مثلاً یہی کہ دہلی میں تنظیم کے کتنے ٹھکانے تھے۔ ایک تو وہی ٹھکانہ تھا جہاں اس وقت میں موجود تھی' یعنی قرول باغ والی کوٹھی۔ اس کے علاوہ بقیہ دو ٹھکانوں میں سے ایک نئی دہلی ہی میں وہ کوٹھی تھی جس کے تہہ خانے میں فلپ کو رکھا گیا تھا۔ وہاں بھی میں گربچن سنگھ کے ساتھ جا چکی تھی۔ دوسرے ٹھکانے کا علم مجھے گزشتہ رات ہوا تھا' سالار وحیدالدین کی سرکردگی میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ان تینوں ٹھکانوں کے علاوہ پہاڑ گنج والی کوٹھی تھی۔ وہاں بھی میں رہ چکی تھی۔ یہ کوٹھی پولیس کی نظر میں آ چکی تھی۔ تنظیم نے اسی سبب اسے چھوڑ دیا تھا۔

اپنے طور پر میں نے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ ان ٹھکانوں کے علاوہ تنظیم کے اور ٹھکانے بھی ہوں گے۔ قرول باغ والی کوٹھی میں سالار اکبر کی مستقل سکونت سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ اسی کا ٹھکانہ تھا۔ تنظیم کے چار سالار تھے جن میں سے ایک ہری بابو تھا۔ وہ بھی کسی نہ کسی ٹھکانے پر رہتا ہو گا۔ پھر تنظیم کا سالار اعلیٰ اور اس کا نائب تھا' نگران اعلیٰ کا نمائندہ امرناتھ تھا' ان کے ٹھکانے بھی کہیں نہ کہیں ہوں گے۔ میں نے یہ سب کچھ سوچا ضرور مگر اس سلسلے میں کچھ جاننے کی زیادہ جستجو نہیں کی۔

میں بھی تنظیم کی حالیہ کارروائیوں میں شریک ہی تھی۔ تنظیم سے اب براہ راست میرا تعلق تھا۔ مجھے اسی سبب حکومت کا ردعمل جاننے کی بے چینی تھی۔ اسی کے ساتھ میں آئندہ اقدامات پر بھی گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ میرے ذاتی معاملات و مسائل اور تنظیم کے اغراض و مقاصد کے درمیان ایک ربط سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس ربط کے لئے نہ میری کسی کوشش یا مصلحت کو دخل تھا' نہ تنظیم ہی نے اس سلسلے میں مجھ پر کوئی دباؤ ڈالا تھا۔ گردشِ وقت مجھے اور تنظیم کو ایک دوسرے سے رفتہ رفتہ قریب لے آئی تھی۔ کلکتے میں جب ارشاد حسین سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی تھی تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی مجھے تنظیم سے وابستہ ہونا پڑے گا۔ اس وقت بھی میں یہی سب کچھ سوچ رہی تھی کہ قدموں کی چاپ سن کر چونک اٹھی۔ میں نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی تو کویتا کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

"اچھا ہوا تم آ گئیں' میں اٹھنے ہی والی تھی۔" میں نے کویتا کو مخاطب کیا۔

"کیا آج رات بھی آپ کو اپنے کسی دشمن سے نمٹنا ہے؟" وہ آگے بڑھ کر میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"نہیں میں کہیں باہر نہیں جا رہی۔" میں نے بتایا۔ "کوٹھی ہی میں ہوں۔ تم سناؤ' چندر موہن یا گوپال کی کچھ خیر خبر ملی؟"

"میں ادھر گئی ہی نہیں۔"

"کبھی کبھار ان دونوں کی طرف چکر لگا لیا کرو۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "دشمن بہرحال دشمن ہوتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان دونوں میں سے کوئی ہمارے لئے کبھی اندھیرے کا تیر ثابت نہ ہو جائے۔ تمہیں ان کی طرف سے چوکنا رہنا ہے۔"

"آئندہ دھیان رکھوں گی کرن جی!"

پھر میں کمرے سے نکل آئی اور دلاری کو آواز دی۔ اس نے آنے میں دیر نہیں کی۔ مجھے اس سے جو کچھ پوچھنا تھا' معلوم ہو گیا۔ سالار اکبر اور گرچن سنگھ باہر کوٹھی کے لان میں تھے۔ عادل کے بارے میں پتا چلا کہ وہ کوٹھی سے باہر کہیں گیا ہوا ہے۔ اسے گئے تقریباً پون گھنٹہ ہو چکا تھا۔ عادل کا تعلق سالار اکبر کے شعبے سے تھا اس لئے اسے کسی بھی ضروری کام سے کہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ میں یہی سوچتی ہوئی باہر لان میں پہنچ گئی۔ وہاں ایک میز اور کئی کرسیاں پڑی تھیں۔ شام کے سائے پھیل رہے تھے اور لان کے ایک گوشے میں وہ دونوں سالار ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے مصروف گفتگو تھے۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر دونوں ہی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ تکلف اچھا نہیں لگتا۔" میں قریب پہنچ کر بولی۔ "بیٹھ جائیے آپ لوگ۔" یہ کہتے ہوئے میں خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ ہماری سالار اعلیٰ ہیں۔ آپ کی تعظیم لازمی ہے ہم پر۔" سالار اکبر نے کہا اور بیٹھ گیا۔ گرچن سنگھ نے بھی اس کی تقلید میں اپنی کرسی سنبھال لی تھی۔

"سالار اعلیٰ قدیر بیگ ہیں' میں نہیں۔ مجھے تو اعزازی طور پر سالار اعلیٰ کے مساوی اختیارات دیئے گئے ہیں۔"

"بات تو ایک ہی ہوئی۔" اس مرتبہ گرچن سنگھ بولا۔

"اچھا خیر.......... یہ بتائیے شہر کی کوئی رپورٹ ملی؟" میں نے سوال کیا۔

"کچھ رپورٹس مل چکی ہیں' کچھ باقی ہیں۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔ "ان رپورٹس کے مطابق آج رات بڑے پیمانے پر شہر بھر میں جگہ جگہ چھاپے مارے جائیں گے۔ کچھ افراد کو آج دن میں بھی گرفتار کیا گیا ہے لیکن وہ سبھی جرائم پیشہ افراد ہیں۔ ان سے ہماری تنظیم کا کوئی تعلق نہیں۔ جس تھانے کے احاطے میں وجے کی لاش پھنکوائی گئی تھی' اس کے تھانیدار اور رات کے وقت ڈیوٹی پر موجود ایک ہیڈ کانسٹیبل کو فرائض سے غفلت کے سبب معزول کر دیا گیا ہے۔ فلپ کے اغوا کا شبہ بھی ہم ہی پر کیا جا رہا ہے۔ اس کی بیوی مارگریٹ کو تحفظ فراہم کر دیا گیا ہے۔"

"یعنی وہ انگریز بچی ایک طرح سے ہاؤس اریسٹ ہے۔" گرچن سنگھ ہنسا۔

"گرچن سنگھ جی! میرے علم و اطلاع کے مطابق فلپ کی بیوی مارگریٹ ہرگز بچی نہیں ہو سکتی۔ اگر

آپ کو وہ بچی لگی ہو تو اسے آپ کی عمر کا تقاضا ہی کہا جا سکتا ہے۔" سالار اکبر بولا۔

اس سے پہلے کہ گرچن سنگھ کچھ کہتا' میں بول اٹھی۔ "ولیم رائٹ کی داشتہ الیزبتھ کی نگرانی کا کوئی نتیجہ برآمد ہوا؟"

"ابھی تک نہیں۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔ "یہ کنفرم ہو چکا ہے کہ ولیم اس کی کوٹھی میں نہیں۔ اس عرصے میں وہ الیزبتھ سے ملنے بھی نہیں آیا۔ ولیم اور رابرٹ دونوں ہی کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت نے دانستہ انہیں سامنے سے ہٹا دیا ہے۔"

"فلپ کے متعلق آپ نے کوئی فیصلہ کیا؟" گرچن سنگھ نے مجھ سے دریافت کیا۔

"حکومت کے خلاف ہم کسی بھی مناسب موقع پر یہ کارڈ استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ بہرحال حکمراں قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ کارروائیوں کے نتیجے میں اگر ہمارا کوئی رکن حکومت کے ہتھے چڑھ گیا تو یہ بد رنگ پتا بھی اہمیت اختیار کر جائے گا۔ ہم حکومت سے سودے بازی کی پوزیشن میں ہوں گے۔ ان حالات میں فلپ ابھی بطور یرغمال ہمارے ہی پاس رہے گا۔" میں نے گرچن سنگھ کو سمجھایا۔ "ڈیسوزا کے مقابلے میں ہرچند کہ یہ ایک کمزور کارڈ ہے' پھر بھی وقت پر کام آ سکتا ہے۔"

دونوں سالاروں نے میرے فیصلے سے اتفاق کیا' پھر سالار اکبر نے کہا۔ "ایک اور رپورٹ کے مطابق حکومت گزشتہ رات کی ہماری کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دونوں واقعات شہری آبادی سے ہٹ کر پیش آئے ہیں لیکن دھماکے دور دور تک سنے گئے ہیں۔ شہر میں اسی وجہ سے طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ پرانے قلعے کی طرف جانے والی سڑک عام ٹریفک کے لئے بند کر دی گئی ہے۔ قیاس اغلب ہے کہ وہاں سے سی آئی ڈی ہیڈ آفس کا ملبہ ہٹایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد سڑک کو عام ٹریفک کے لئے کھول دیا جائے گا۔ دہلی' غازی آباد روڈ جس پر پولیس سے ہمارا مقابلہ ہوا تھا' وہ بھی آج دوپہر تک بند تھی' پھر کھول دی گئی۔"

"گویا آج کا دن دشمن نے اپنے زخم چاٹنے میں گزار دیا۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "ردعمل کل صبح ظاہر ہو گا۔ رات کو جگہ جگہ چھاپے مارنے کا یہی مطلب ہو سکتا ہے۔"

"اور یہ بھی کہ حکومت کے پاس مشتبہ افراد کی کوئی فہرست پہلے سے موجود ہو۔" سالار اکبر نے ایک نئے خدشے کا اظہار کیا۔

"ہو بھی تو کیا اور نہ بھی ہو تو کیا۔" گرچن سنگھ بولا۔ "جو ہو گا دیکھا جائے گا' ہم بہرحال منہ توڑ جواب دیں گے' اگر کوئی چنگاری ہمارے دامن تک اڑ کر پہنچی۔ نگران اعلیٰ کی طرف سے گرین سگنل مل چکا ہے اور ہم نے اپنی کارروائیوں کا آغاز بھی کر دیا ہے۔ اب ہم صرف مدافعت نہیں کریں گے۔" اس کا لہجہ پرجوش تھا۔

"وہ تو خیر ٹھیک ہے گرچن سنگھ جی' مگر احتیاط لازم ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ بھی ان کی زبان بولنے لگی ہیں۔ میری اس جسارت کو معاف کر دیجئے گا۔" گرچن سنگھ نے سالار اکبر کی طرف اشارہ کیا۔

"میں آپ دونوں ہی کو کم از کم اس شہر کی حد تک تنظیم کا دل و دماغ سمجھتی ہوں۔"

"اور دل و دماغ کے درمیان رابطہ مضبوط ہونا چاہئے۔" سالار اکبر بولا۔ "کرن جی کی عزت افزائی ہے کہ وہ ہمیں اس قابل سمجھتی ہیں۔"

"شکرگزار تو خیر میں بھی ہوں لیکن کبھی کبھی ڈرتا ضرور ہوں کہ کہیں یہ آپ کی باتوں میں نہ آ جائیں۔" گرجن سنگھ نے یہ کہہ کر ایمونیشن ڈپو کی تباہی کے منصوبے کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے مجھے یاد دلایا۔ "آپ کہہ رہی تھیں کہ شام کو اس پر بات کریں گے۔"

"تو کریں بات، کوئی تجویز ہے آپ کے ذہن میں؟"

"تجویز سے کیا مراد ہے آپ کی، ہر بات تو پہلے طے ہو چکی تھی۔"

"اب ان طے شدہ باتوں کو بھول جائیں گرجن سنگھ جی! ہمیں ازسرنو پلاننگ کرنا پڑے گی۔ اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے۔ حکومت اب ہماری طرف سے غافل نہیں۔" میں بولی۔ "اب رات کے وقت دہلی کی حدود سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ شہر کی ناکہ بندی کو شاید آپ نے نظرانداز کر دیا ہے۔"

"اس کے علاوہ ہم غالباً ایک اور بات بھی نظرانداز کر رہے ہیں۔" سالار اکبر نے یہ کہتے ہوئے پہلو بدلا۔ "وجے نے پولیس کے ایک اے ایس آئی کو جو اطلاع فراہم کی تھی، وہ بھی خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ الفاظ.........."

"یہ تھے کہ چند حکومت دشمن افراد آج رات نو بجے کے بعد دہلی سے کہیں باہر جانے والے ہیں۔ وہ لوگ ایک وین میں سفر کریں گے۔" میں نے سالار اکبر کی بات پوری کر دی۔

"جی ہاں، اس کی فراہم کردہ اطلاع یہی تھی۔" سالار اکبر نے تصدیق کی پھر کہنے لگا۔ "میرا اندازہ یہ ہے کہ اس اطلاع کے بعد بات صرف اسی تھانے کی حد تک نہیں رہی ہو گی۔ تمام شہر کی ناکہ بندی کسی ایک تھانے کے بس کی بات نہیں۔ اس سلسلے میں پولیس کے اعلیٰ حکام سے متعلقہ تھانے کا رابطہ کرنا ضروری ہے۔ وین سے سفر کرنے کا مطلب یقیناً یہ لیا گیا ہو گا کہ بیرون دہلی جانے کے لئے جو راستے ہیں، ان سبھی پر نظر رکھی جائے۔ اس کے لئے پولیس کی بھاری نفری چاہئے۔ اس نکتے پر ہم نے غالباً کل رات بھی غور کیا تھا۔ حکومت دشمن افراد کا مطلب سمجھنا، پولیس حکام کے لئے اگر اس وقت مشکل رہا ہو گا تو اب وجے کی لاش ملنے کے بعد واضح ہو جانا چاہئے۔ وجے کے قتل کی ذمے داری ہم نے قبول کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ گزشتہ رات وین میں دہلی سے کہیں باہر جانے والے ہم ہی تھے۔ ہم ہی نے اپنی راہ روکنے والوں کو ان کے انجام تک پہنچا دیا۔" سالار اکبر نے تائید طلب انداز میں میری طرف دیکھا۔

"آپ صحیح خطوط پر سوچ رہے ہیں، اپنی بات جاری رکھیں۔" میں نے تائید کی۔

"تو کھلا یہ کہ حکومت اب پہلے سے زیادہ باخبر ہے۔ اس کے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ ہم دہلی سے کہیں باہر کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر یا تو گئے تھے یا اب جائیں گے۔ دونوں ہی امکانات ان کی نظر میں ہوں گے۔" سالار اکبر نے ممکنہ خطرے کا اظہار کیا۔

"انہوں نے ایک تیسرے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہو گا۔" میں نے دھیان دلایا۔ "حکومت

کے کارپرداز یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ ہمارا اصل ٹارگٹ سی آئی ڈی ہیڈ آفس تھا۔ ہم نے دانستہ پولیس کی توجہ دوسری طرف مبذول کر دی۔ کسی طرح ہمیں وجے کی غداری کا علم ہو گیا اور ہم نے اس کے ذریعے پہلے پولیس کو غلط راہ پر ڈال دیا، پھر اس کو قتل کر کے اسی تھانے کی حدود میں اس کی لاش پھنکوا دی جہاں حکومت دشمن افراد کے متعلق اطلاع دی گئی تھی۔"

سالار اکبر نے میری اس رائے سے اختلاف نہیں کیا اور بولا۔ "تینوں ہی امکانات پر انہوں نے غور کیا ہو گا۔ سی آئی ڈی ہیڈ آفس کا اڑا دیا جانا بھی بہرحال کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اس سے ہمیں ایک اور فائدہ بھی ہوا ہے۔ سی آئی ڈی والوں کے پاس ہماری تنظیم کے متعلق جو بھی ریکارڈ تھا، وہ تلف ہو گیا.......... خیر ہم ان امکانات پر گفتگو کر رہے تھے جو حکومت کے پیش نظر ہوں گے۔ فی الحال ہم یہ مفروضہ قائم کرتے ہیں کہ تنظیم دہلی سے کہیں باہر کوئی کارروائی کرنا چاہتی ہے اور یہ امکان حکومت کے علم میں ہے۔ ایسی صورت میں وہ کیا ممکنہ اقدامات اٹھا سکتی ہے؟ آپ بھی کچھ بولیں نا گرجن سنگھ جی!"

"میں تو بولنے سے زیادہ کچھ کر گزرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ پھر بھی آپ کی باتوں سے اتنا ضرور سمجھ گیا ہوں کہ ہمیں دہلی سے باہر نکلنے میں دشواری پیش آئے گی، خاص طور پر رات کے وقت۔ دہلی سے باہر جانے والے تمام راستوں پر کڑی نظر رکھی جا سکتی ہے۔" گرجن سنگھ نے کہا۔

"لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ ہم رات کے وقت ہی سفر کریں اور نہ ہی یہ لازمی ہے، سفر بائی روڈ ہو۔" میرے ذہن میں ایک اور نیا خیال آیا۔ "ہم سب کو ایک ساتھ سفر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ سمیت جو نو افراد گزشتہ رات یہاں سے روانہ ہوئے تھے، اب ان میں سے ایک کم ہو چکا ہے، یعنی وجے۔ اس کی جگہ کسی اور کمانڈو کو نہ لیا جائے۔ یوں گویا ہم اب آٹھ افراد ہی اس مہم میں شامل ہوں گے۔ کسی نئے شخص کو اس مہم میں شامل کر کے کوئی رسک نہیں لینا چاہئے۔ مجھے خبر نہیں کہ غازی آباد یہاں سے کتنی دور ہے اور وہاں تک پہنچنے کے لئے کتنا وقت لگے گا.......... یہ بتائیں کہ وہاں تک ٹرین کے ذریعے سفر ممکن ہے؟"

"یہاں سے غازی آباد زیادہ دور نہیں۔ ٹرین وہاں جاتی ہے۔ دہلی کے بعد اگلا ریلوے اسٹیشن وہی ہے۔" سالار اکبر نے بتایا۔

"ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ ہم آٹھوں افراد ایک ایک، دو دو کر کے دن کے وقت اور ٹرین یا بس کے ذریعے دوسرے مسافروں کے ساتھ غازی آباد پہنچیں۔ وہاں تنظیم کی کوئی شاخ ہے؟ یا ایسا بندوبست ممکن ہے کہ ہم وہاں کہیں چند گھنٹوں کے لئے ٹھہر سکیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"غازی آباد میں تنظیم کی کوئی شاخ نہیں البتہ وہاں قیام کا بندوبست ہو سکتا ہے۔" سالار اکبر نے جواب دیا۔

"دہلی کی بجائے ہم اگر غازی آباد سے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھیں تو خطرہ کم ہو جائے گا نا؟" میں، سالار اکبر ہی سے مخاطب تھی۔

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر وہاں سے ہم کسی وین کے بغیر اپنے ہدف کی طرف کس طرح

بڑھ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ہمیں اپنے ہدف یعنی ایمونیشن ڈپو تک پہنچنے کے لئے رات ہی کا کوئی وقت مقرر کرنا پڑے گا۔"

"اب اس مہم میں وین استعمال نہیں ہو گی۔" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ "اس کی جگہ ہم دو کاروں میں بھی غازی آباد سے روانہ ہو سکتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ہم دن کے وقت اپنی مہم میں شریک چاروں کمانڈوز کو دو کاروں میں غازی آباد روانہ کر دیتے ہیں۔ اب رہ جاتے ہیں چار افراد۔ دو افراد ٹرین سے غازی آباد پہنچتے ہیں' دو کسی بس کے ذریعے۔ یہ افراد کمانڈوز کے وہاں پہنچنے سے پہلے موجود ہوں۔ غازی آباد میں ہم رات کے نو بجے تک وقت گزاریں اور پھر دو کاروں میں سوار ہو کر گویا دہلی کے لئے روانہ ہو جائیں' یعنی اپنے ٹارگٹ کی طرف۔ صبح ہونے سے قبل ہم اپنی مہم سے فارغ ہو کر دوبارہ غازی آباد میں لوٹ جائیں۔ اس کے بعد دوسرے روز دن کی روشنی میں اسی طرح دو دو افراد واپس دہلی آ جائیں جس طرح یہاں سے گئے تھے تو کیا مضائقہ ہے؟" میں نے ایمونیشن ڈپو کی تباہی کے لئے حالات کو مدنظر رکھ کر ایک نئی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز اس اعتبار سے نئی تھی کہ لوکیشن بدل گئی تھی۔

"ڈائنامائٹ اور دیگر ضروری اسلحہ کس طرح غازی آباد پہنچے گا؟" گرچن سنگھ نے سوال کیا۔

"ان چار مسافروں کے ساتھ جو ٹرین اور بس میں سفر کریں گے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ان میں سے تین مسافر اس وقت یہاں بیٹھے ہیں' ایک غائب ہے' سو وہ بھی وقت پر حاضر ہو جائے گا' یعنی پنڈت بال مکند۔"

"کمانڈوز کے ساتھ کچھ نہیں جائے گا؟"

"جی نہیں' وہ صرف دو کاریں یہاں سے لے کر جائیں گے۔ کاروں کو تو ان حالات میں دن کے وقت بھی شہر کی حدود سے نکلتے وقت روک کر چیک کیا جا سکتا ہے مگر عام مسافر بسوں اور ٹرینوں کو نہیں۔" میں نے وضاحت کی۔

گرچن سنگھ نے میرے اس منصوبے کی بہت تعریف کی' پھر کہنے لگا۔ "ایسی صورت میں تو وہ چار دن ضائع کرنے کی بھی ضرورت نہیں' ہم کل رات ہی دشمن پر.........."

"ذرا دھیرج رکھیں گرچن سنگھ جی!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ ساری پلاننگ آئندہ کے لئے ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں جلدبازی کی کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی تو گزشتہ رات کی کارروائیوں کا ردعمل سامنے نہیں آیا۔ آج کی رات تو گزرنے دیں۔ فرض کریں' بڑے پیمانے پر جو چھاپے مارے جانے والے ہیں' ان میں ہمارا کوئی رکن لپیٹ میں آ گیا پھر؟ ایسی صورت میں پہلے ہم اسے چھڑانے کی کوشش کریں گے یا صبح ہوتے ہی غازی آباد روانہ ہو جائیں گے؟"

"لیکن ہمارے علاوہ بھی تو یہاں اور بندے ہیں۔ وہ ادھر حکومت سے نمٹتے رہیں گے اور ہم وہاں کام دکھا دیں گے۔" گرچن سنگھ نے دلیل پیش کی۔ "جو تنظیمیں ہماری طرح انڈر گراؤنڈ رہ کر کام نکالتی ہیں' ان کا یہ بھی طریقہ کار ہوتا ہے۔ دشمن ایک طرف حملہ کر رہا ہو اور دوسری طرف سے اس پر حملہ کر دیا جائے۔"

گرچن سنگھ کی دلیل مضبوط تھی مگر وہ دو اہم باتیں نظرانداز کر گیا تھا' سو میں نے کہا۔ "اگر انہوں نے ہمارے کسی ٹھکانے پر چھاپہ مار دیا؟" میں نے پہلی اہم بات کی۔ "کیا ہم پھر بھی ساری ذمے داری دوسروں پر ڈال کر اپنی مہم پر روانہ ہو جائیں گے؟"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ اگر حکومت کی کسی ایجنسی کو ہمارے ٹھکانے کا علم ہوتا تو کیا وہ اب تک خاموش بیٹھی رہتی؟"

"پہاڑ گنج والی کوٹھی پر کیسے چھاپہ پڑ گیا؟" میں نے پوچھا۔ "وجے نے بھی اس ضمن میں مخبری نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتا تو جہاں اس نے اپنے دوسرے جرائم کا اعتراف کر لیا تھا' یہ بھی ظاہر کر دیتا۔" پہاڑ گنج والی کوٹھی پر چھاپے کی وجہ ولیم کی بازیابی تھی' یہ بات میرے علم میں تھی۔ ولیم اور چندر موہن کے تعلقات سے بھی میں بے خبر نہیں تھی۔ میں نے ساری کڑیاں جوڑ لی تھیں اور ایک نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔ اس وقت میرا مقصد محض یہ تھا کہ گرچن سنگھ بے لگام نہ ہو۔ اسے میں کسی طرح قائل کر دوں کہ جلدبازی مناسب نہیں ہے۔

گرچن سنگھ میری توقع کے مطابق لاجواب ہو گیا۔

"دراصل بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔" میں نے مزید کہا۔ "دشمن کبھی اپنے تمام کارڈز ایک ساتھ اوپن نہیں کرتا۔ ہم قیاسات ہی کے ذریعے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ گرچن سنگھ جی! ایک اور بات بتایئے کیا یہ ممکن نہیں کہ وجے کو حکومت کی کسی ایجنسی نے اپنی نظر میں رکھا ہو' خاص طور پر سی آئی ڈی والوں نے؟ وجے کے بیان سے یہ بات تو ظاہر ہو ہی چکی ہے کہ وہ کم از کم دو مرتبہ سی آئی ڈی ہیڈ آفس گیا تھا' ایک بار اسے گرفتار کر کے وہاں لے جایا گیا' دوسری بار وہ اپنی بہن کنول سے ملنے وہاں گیا پھر وجے کے بیان ہی کے مطابق رفتہ رفتہ اس پر دباؤ بڑھایا جاتا رہا۔ اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ وہ سی آئی ڈی والوں کے رابطے میں تھا۔ اس کی نقل و حرکت پر حکومت کی نظر ہو گی۔ وجے کا مستقل قیام فراش خانے والی حویلی میں تھا۔ یہ تسلیم کہ وہاں آمدورفت کے کچھ خفیہ راستے بھی ہیں اور میں یہ بھی مان لیتی ہوں کہ وجے نے خود بھی احتیاط سے کام لیا ہو گا' اس کے باوجود کیا یقینی طور پر کچھ کہا جا سکتا ہے؟ کیا وہ ٹھکانہ حکومت کی نظر میں نہیں آ سکتا؟ رہا یہ کہ اس ٹھکانے پر اب تک چھاپہ کیوں نہیں مارا گیا تو اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ ہم اس وقت ان اسباب پر بحث سے گریز کرتے ہوئے صرف ایک امکان پر غور کر رہے ہیں۔ اس حویلی پر چھاپہ پڑ سکتا ہے یا نہیں؟"

"آپ نے جو تجزیہ کیا ہے' اس کے مطابق تو وہ ٹھکانہ محفوظ نہیں رہا۔" گرچن سنگھ نے جواب دیا۔ اب اس کی آواز میں پہلا سا جوش نہیں رہا تھا۔ پھر اچانک جیسے اسے ہوش آ گیا اور بولا۔ "پھر تو ہمیں فوری طور پر سالار وحیدالدین کو اس خطرے سے آگاہ کر دینا چاہئے۔ ابھی فون.........."

"گرچن سنگھ جی! یہ شعبہ آپ کا نہیں۔" سالار اکبر بول اٹھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"آج میں جب سو کر اٹھا تو پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا۔ بات ذرا تفصیلی تھی اس لئے ٹیلی فون کرنے کی بجائے پنڈت جی کو ضروری ہدایات دے کر میں نے سالار وحیدالدین کے پاس بھیج دیا۔ وجے

سے جو کچھ پوچھ گچھ ہوئی اس وقت پنڈت جی بھی موجود تھے۔ اس ضمن میں سالار وحیدالدین کو اگر کچھ پوچھنا ہو گا تو پنڈت جی بتانے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ اب سمجھ گئے آپ شعبے کا مطلب؟"

"سمجھ گیا بھائی سمجھ گیا' آپ سے جیتنا مشکل ہے۔ پہلے ہی بتا دیا ہوتا کہ پنڈت کو کہاں ٹھلایا ہے۔" گرچن سنگھ ہنس دیا۔

"تو پھر کیا خاک لطف آتا؟" سالار اکبر بھی ہنسنے لگا' پھر بولا۔ "ویسے بھی جس بات سے خود نمائی کا پہلو نکلتا ہو' وہ مجھے کچھ بھلی نہیں لگتی۔ پنڈت جی لوٹ آتے تو خود ہی آپ کو ساری بات کا پتا چل جاتا۔ کرن جی جب اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں تو میں اس لئے خاموشی سے سنتا رہا کہ اتنے تفصیلی تجزیے کا مجھے موقع نہیں ملا تھا۔ مجھے تو بس اتنا خیال آیا تھا کہ وجے وہیں رہتا تھا' کہیں اس کی وجہ سے ہمارا وہ ٹھکانہ حکومت کی نظر میں نہ آ گیا ہو' کچھ دن کے لئے ہم وہاں سے ہٹ جائیں تو بہتر ہے۔ ہم نے وہ حویلی خالی کر دی پھر بھی وہاں چھاپہ پڑ گیا تو تصدیق ہو جائے گی کہ ہمارا خیال غلط نہیں تھا۔ بصورت دیگر ہم پھر اس حویلی میں پہنچ جائیں گے۔"

ذرا دیر بعد جب ہم چائے پی رہے تھے تو عادل بھی آ گیا۔ اس کے لئے بھی چائے منگوا لی گئی۔

عادل نے سالار اکبر کو رپورٹ دی کہ فراش خانے والی حویلی خالی کر دی گئی ہے۔ وہاں جو ارکان قیام پذیر تھے انہیں چاندنی چوک اور پل بنگش کے ٹھکانوں پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس روز پہلی مرتبہ میرے علم میں یہ بات آئی کہ سالار ہری بابو کا قیام چاندنی چوک والے ٹھکانے پر تھا اور نائب سالار اعلیٰ جیکسن' پل بنگش والے ٹھکانے کا ذمے دار تھا۔ عادل نے یہ بھی بتایا کہ خود سالار وحیدالدین وقتی طور پر قرول باغ پہنچنے والا ہے۔

اس اطلاع پر گرچن سنگھ نے خوشی کا اظہار کیا' بولا۔ "چلو یہ اچھا ہوا پنڈت جی! ہم دو تو یہاں پہلے ہی سے موجود تھے' اب ایک تیسرا سالار بھی یہیں آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ کرن جی بھی یہاں ہیں' یعنی سالار اعلیٰ بھی ایک طرح سے موجود ہے۔ یہ بھی اچھا خاصا ہیڈ کوارٹر بن گیا ہے۔"

"لیکن گرچن سنگھ جی! یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میں تحفظ و احتیاط کے نقطہ نظر سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ وقتی یا ہنگامی طور پر تو ہم کہیں بھی اکٹھے رہ سکتے ہیں مگر ہم سب سالاروں کا کسی ایک ہی جگہ قیام مناسب نہیں ہے۔" سالار اکبر نے کہا۔

"اجی آپ تو بس رہنے ہی دیں۔ کسی بندے بشر کو گھڑی بھر خوش نہیں دیکھ سکتے۔ ہر بات میں کوئی کلی پھندنا ضرور جوڑ دیتے ہیں۔" گرچن سنگھ نے منہ بنایا۔

"آپ کی چائے میں رحمان کہیں چینی ڈالنا تو نہیں بھول گیا؟" سالار اکبر مسکرایا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"آپ نے ابھی جس طرح منہ بنایا اس سے یہی بات میری سمجھ میں آئی جو عرض کر دی۔"

"جی نہیں' چینی ہے میری چائے میں۔"

"تو پھر آج کل آپ کو قبض کی شکایت ہو گی۔"

سالار اکبر کے اس فقرے پر وہ زوردار قہقہہ پڑا کہ گرچن سنگھ بھی "قِقیانے" لگا۔ میں اور عادل ایک ساتھ ہنس پڑے تھے' پھر سالار اکبر بھی اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکا تھا۔ کچھ دیر اسی طرح کی خوش گپیاں جاری رہیں اور پھر سالار وحیدالدین بھی آ گیا۔ وہ عمر میں بھی ہم سب سے بڑا تھا اور سنجیدہ مزاج بھی اسی سبب فضا بدل گئی۔ ہم سب ایک مرتبہ پھر تنظیمی معاملات اور موجودہ حالات پر گفتگو کرنے لگے۔

اسی عرصے میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ سالار وحیدالدین کی موجودگی کے باوجود عادل اپنی حرکت سے باز نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ صبح ہونے والا موضوع بڑی سنجیدگی کے ساتھ چھیڑ دیا تھا۔ بظاہر اس سنجیدگی میں جو شرارت چھپی ہوئی تھی' میں اس سے اچھی طرح واقف تھی۔

عادل' گرچن سنگھ سے مخاطب تھا۔ "دیکھ لیں گرچن سنگھ جی! میری بات غلط تو نہیں تھی۔ اس وقت بھی کرن جی کے لئے الگ کھانا آیا ہے جب کہ ہم سب ایک ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔"

"تو میں کیا کروں؟" گرچن سنگھ چڑ کر بولا۔

سالار وحیدالدین کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ اس کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ اس نے میری طرف ایک نظر دیکھا ضرور مگر بولا کچھ نہیں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر کسی اور کی بجائے سالار وحیدالدین کو اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔ "آپ کو تو معلوم ہو گا سالار کہ جو چھوٹی یا بڑی ریاستیں ہوتی ہیں' وہ تاج و تخت کے وارثوں کی حفاظت کے لئے مختلف ذرائع استعمال کرتی ہیں۔"

"جی ہاں میں واقف ہوں۔" وحیدالدین بولا۔

"تخت کے وارثوں کو دشمنوں کی طرف سے خطرہ ہوتا ہے۔" میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ بات آگے بڑھائی۔ "آپ نے یہ بھی سنا اور پڑھا ہو گا کہ دشمن طاقتیں تخت کے وارث یا وارثوں کو عموماً زہر دے کر مار دیتی ہیں کیونکہ یہ سب سے آسان اور محفوظ راستہ ہے۔ دھوکے سے کھانے یا پینے کی کسی چیز میں زہر ملا کر دے دیا گیا اور قصہ ختم۔"

"بجا فرما رہی ہیں آپ۔" وحیدالدین بدستور مجھ سے مخاطب رہا۔

اسی وقت گرچن سنگھ نے کھانا کھاتے کھاتے ایک دم ہاتھ کھینچ لیا اور مجھ سے بولا۔ "جلدی سے بتائیں کہ یہ کھانا تو زہر آلود نہیں؟"

"گرچن سنگھ جی! مجھے تو کوئی خطرہ ہی لگتا ہے ورنہ اس وقت کرن جی کھانے میں زہر ملائے جانے کی بات کیوں کرتیں۔" سالار اکبر بھی گرچن سنگھ سے تفریح لینے لگا۔ مگر لہجے میں سنجیدگی ہی تھی۔ عادل کے ہونٹوں پر البتہ مسکراہٹ تھی۔

"لو اور سنو' میں نے تو یوں ہی ہنسی میں ایک بات کہہ دی تھی اور جناب سنجیدہ ہو گئے۔" یہ کہہ کر وہ دھیرے سے ہنسا اور بولا۔ "لو جی' میں دوبارہ کھانا کھانے لگا ہوں۔"

میں ایسی بن گئی جیسے سالار اکبر گرچن سنگھ کے درمیان ہونے والے مکالمے سنے ہی نہ ہوں اور سالار وحیدالدین کی طرف متوجہ رہی۔ یوں بھی وہ میرے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

"سالار! آپ کو تو میرے ماضی کا علم ہو ہی گیا ہے۔" میں' وحیدالدین سے پھر مخاطب ہوئی۔

"جی' جی۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"جہاں صرف تاج و تخت کا ایک ہی وارث ہو وہاں کے حکمران عموماً کچھ زیادہ ہی محتاط رہتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔"

"اچھا............ تو کیا آپ کا کوئی اور بھائی بہن نہیں تھا؟" وحیدالدین نے میری بات میں دلچسپی لی۔

"جی ہاں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔" میں نے جواب دیا' اسی کے ساتھ محسوس کیا کہ وحیدالدین کے علاوہ وہاں موجود بقیہ تینوں افراد بھی اب سنجیدگی سے میری بات سن رہے ہیں۔ انہوں نے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اپنے متعلق کوئی نئی بات بتانے والی ہوں۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ "ابھی ابھی گربچن سنگھ جی نے ہنسی ہنسی میں ایک بات کہی تھی کہ کھانا زہر آلود تو نہیں؟ تو آپ لوگ جو کھانا کھا رہے ہیں' وہ تو زہر آلود نہیں لیکن میرا کھانا زہر آلود ضرور ہو چکا ہے۔"

میں نے پوری سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی اور اس کا ردعمل بھی وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ سبھی کے چہروں پر شدید حیرت کے آثار تھے۔

پھر اس سے پہلے کہ کوئی سوال کیا جاتا' میں خود ہی بول اٹھی۔ "میری حفاظت کی خاطر بچپن ہی سے مجھے زہر کھانے کا عادی بنا دیا گیا۔" اس کے بعد رکے بغیر میں نے اس سلسلے میں مزید جو باتیں تھیں بیان کر دیں یہ کہ خطرناک سے خطرناک زہر مجھ پر اثر نہیں کر سکتا اور یہ بھی کہ میرا جوٹھا کوئی مشروب یا کھانا کسی بھی ذی روح کے لئے کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے۔ "میں نے اپنے طور پر آپ لوگوں کے درمیان رہ کر پوری احتیاط سے کام لیا۔ یہاں تک کہ اپنے زیر استعمال برتن بھی الگ کر لئے۔ رحمان کو ہدایت کر دی کہ اگر کسی روز میرا جوٹھا کھانا بچ جائے تو اسے فوراً ضائع کر دے۔ میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ سالن وغیرہ نہ بچے جو کوئی خطرہ ہو۔ ان تمام احتیاطوں کے باوجود بھی کبھی کوئی حادثہ پیش آنا' قرین قیاس تھا۔ معلوم نہیں کب تک مجھے آپ لوگوں کے درمیان اسی شہر میں رہنا پڑے۔ میں اسی خیال سے تنظیم میں شمولیت کے بعد اس خطرے سے آپ لوگوں کا آگاہ کر دینا چاہتی تھی۔ آج صبح بھی میں نے موقع دیکھ کر یہ بات کہنے کی ہمت کی تھی مگر فضا کچھ ایسی ہو گئی کہ مجھے چپ ہو جانا پڑا۔"

عادل اور گربچن سنگھ یہ سن کے معذرت کرنے لگے۔

"لاعلمی میں ہو جاتا ہے ایسا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "مجھے آپ لوگوں سے کوئی شکایت نہیں۔"

"آپ کو کوئی شکایت نہیں مگر مجھے پنڈت جی سے ضرور شکایت ہے۔" گربچن سنگھ بولا۔ "انہوں نے تو مجھے آپ کے ساتھ کھانا کھانے پر اکسا کے میرا پورا بندوبست کر دیا تھا۔"

"خود میرا بھی ایک روز بندوبست ہو جاتا' وہ تو کرن جی نے روک دیا۔ میں نے بھولے سے ان کی چائے کا کپ اٹھا لیا تھا۔" عادل نے کہا۔

"اور میں چائے کے کپ سے ایک گھونٹ لے چکی تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"شکرانے کے نفل پڑھ لینا پنڈت جی کہ جان بچ گئی۔" گربچن سنگھ ہنس کر بولا۔

"سوچ لیں سالار! آپ ایک پنڈت سے شکرانے کے نفل پڑھوا رہے ہیں۔" عادل کہنے لگا۔

اس پر گربچن سنگھ نے اردو کے ایک بڑے شاعر مرزا غالب کا ایک شعر پڑھا ۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑ و برہمن کو

شعر بڑا برجستہ تھا۔ سبھی نے اس پر داد دی اور گربچن سنگھ اس طرح ہر طرف دیکھ دیکھ کر "آداب' آداب" کہتا رہا جیسے شعر اسی کا ہو۔

"کرن جی! مرزا غالب کی روح کو شرمندگی سے بچانے کے لئے میں آپ کو ایک بات اور بتا دوں کہ گربچن سنگھ جی بھی شعر کہتے ہیں' تخلص رہبر فرماتے ہیں۔" سالار اکبر نے مجھ سے کہا۔ "رہبر اور غالب دونوں ہم وزن الفاظ ہیں۔ ہم وزن سے مطلب یہ ہے کہ غالب کی جگہ رہبر لکھ یا پڑھ دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس سے گربچن سنگھ جی کی شاعرانہ عظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کم از کم میں تو انہیں تخلص کی حد تک غالب کا ہم وزن سمجھتا ہوں۔"

سالار اکبر نے بڑی سنجیدگی سے "باریک کام" دکھایا تھا' مگر گربچن سنگھ بھی کم نہیں تھا۔ وہ فوراً بولا۔ "یہ آپ میری تعریف کر رہے ہیں یا کوئی اور چکر چلا رہے ہیں۔ اب آپ سے میرا تخلص بھی ہضم نہیں ہو رہا۔ کہیں آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ غالب کے مقطع میں' میں اپنا تخلص فٹ کر کے غالب کی غزل کو اپنی غزل بنا لیتا ہوں؟"

وحیدالدین بھی مسکرانے لگا۔ وہ یقیناً ان دونوں کی نوک جھونک سے آگاہ تھا۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی' ہم تو آپ کو اپنا رہبر سمجھتے ہیں۔" سالار اکبر نے کہا۔ "آپ ہرگز کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ رہی ہم وزن الفاظ کی بات تو رہبر کا ہم وزن رہزن بھی ہے۔ اس سے قطعی یہ نہ سمجھیں کہ رہبر و رہزن کے درمیان میں کوئی تخصیص نہیں کر رہا۔"

"رہبر نہ سہی رہزن کہہ لیں۔"

"واہ' کیا مصرع موزوں کیا ہے آپ نے' رہزن قافیہ اور "کہہ لیں" ردیف'۔ یعنی ساجن کہہ لیں' رہزن کہہ لیں۔ آپ کی اسی ذہانت کا تو میں قائل ہوں۔"

"ہاں واقعی یہ تو مصرع ہو گیا اور زمین بھی بالکل نئی ہے۔" گربچن سنگھ نے مصرع کا کریڈٹ لینے میں دیر نہیں کی۔ اسی کے ساتھ وہ کھانا بھی کھاتا رہا۔

"بس ایک دقت ہے اس میں گربچن سنگھ جی!" سالار اکبر جیسے کچھ سوچنے لگا۔

"وہ کیا؟" گربچن سنگھ نے فوراً پوچھا۔

سالار اکبر بڑی اداس آواز میں بولا۔ "اس زمین میں غالب کی کوئی غزل نہیں۔"

گربچن سنگھ پر پھر ایک ایسا فقرہ چست ہو گیا کہ سالار وحیدالدین جیسا سنجیدہ مزاج شخص بھی ہنس دیا۔

شام سے اب تک میں انہی لوگوں کے ساتھ تھی اس لئے کھانا کھا کے چائے پیتے ہی اٹھ کھڑی

ہوئی۔

"مجھے بھی اب رات کا کھانا کھا کر ٹہلنے کی عادت ہوتی جا رہی ہے۔" عادل نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں کی۔

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی۔ وہ اب اپنے سالاروں کے درمیان مزید بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسی لئے بولی۔ "آ جاؤ پنڈت جی! تمہیں بھی ٹہلا دوں۔" یہ کہہ کر میں نشست گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ عادل لپک کر میرے قریب آ گیا۔

"اس دنیا ہی سے نہ ٹہلا دینا۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ "مجھے خبر نہیں تھی کہ تم اتنی خطرناک نکلو گی۔"

"جہاں حد ادب لازم تھی وہاں سے اٹھتے ہی تم کسی بلبل کی طرح چہکنے لگے۔" میں کمرے سے نکل کر بولی۔ "یہ تو خیر تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ بلبل کو مرغ چمن بھی کہتے ہیں۔ اس سے تمہیں مرغ کہنا مقصود نہیں۔ ویسے بھی لفظ بلبل عربی اور فارسی دونوں ہی زبانوں میں بولا جاتا ہے' بس اس کے مذکر یا مؤنث ہونے میں اختلاف ہے۔ یعنی اسے چاہو تو مؤنث کہہ لو' چاہو مذکر۔" عادل کو اپنی اردو اور دلی والا ہونے پر بہت ناز تھا' میں اسی لئے اسے گھس رہی تھی۔ "فرض کرو تم بلبل ہو تو خود کو مذکر سمجھو گے یا مؤنث؟ مجھے زیادہ اردو نہیں آتی اس لئے تمہیں اہل زبان سمجھ کر پوچھ رہی ہوں۔"

"بلبل اگر تم مجھے کہہ رہی ہو تو ظاہر ہے یہ مذکر ہوا اور اگر میں تمہیں بلبل کہوں تو مؤنث۔" اس نے جوابی کارروائی کی پھر کہنے لگا۔ "جس طرح تم مجھ سے زبردستی یہ فرض کرا رہی تھیں کہ میں بلبل ہوں اسی طرح تم سے بھی میں درخواست کر سکتا ہوں اور یہ تو تم اچھی طرح جانتی ہو گی کہ گل و بلبل کے درمیان ایک عدد چونچ بھی ہوتی ہے۔ اسی چونچ پر اس وقت مجھے اردو کے ایک استاد شاعر کا شعر .... پھڑکتا ہوا شعر یاد آ گیا' مگر یہ ہرگز نہ بھولنا کہ تم خود کو بلبل فرض کر چکی ہو۔ بلبل کی چونچ پر استاد کا شعر سن لو۔ کیا خبر کب تمہارے کام آ جائے؟" پھر عادل نے شعر سنایا۔

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہید ناز کی تربت کہاں ہے

"پنڈت جی! تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ تمہیں تمہاری جملہ صفات کو مد نظر رکھتے ہوئے چونچ بھی کہا جا سکتا ہے۔" اب میں' عادل کے ساتھ لان میں آ چکی تھی۔

"بالکل نہیں۔" وہ بولا۔ "میں نے جو شعر ابھی سنایا تھا اس میں شاعر نے بلبل کو مؤنث باندھا ہے۔ تم کیونکہ مذکر نہیں مؤنث ہو اس لئے چونچ تمہاری ہوئی میری نہیں۔ یوں گویا تمہیں تو چونچ کہا جا سکتا ہے مجھے نہیں۔ پھر اس میں ایک اہم نکتہ اور بھی ہے جسے تم نظرانداز کر رہی ہو۔ چونچ بھی مؤنث ہے مذکر نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ مؤنث ہونے کے ناتے تم تو چونچ ہو سکتی ہو' میں نہیں۔"

"لگتا ہے' بہت دیر سے تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہا تھا' کچھ بولنے کے لئے۔ وہاں تمہارے تین سالار موجود تھے' جن کے سامنے تمہاری بین نہیں بج سکی' تم اب اس کی کسر پوری کر رہے ہو۔ ایک

تم ہی کو نہیں' بہت سے لوگوں کو یہ مرض لاحق ہوتا ہے۔"

"لیکن میں تمہارے سامنے کس طرح بین بجا سکتا ہوں۔ تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ ایک اردو ٭اورے کے مطابق بین کا تعلق سانپ کے علاوہ ایک چوپائے سے بھی ہے۔ اس چوپائے کو بھینس کہتے ہیں ٭س کے آگے بین بجانا لاحاصل تصور کیا جاتا ہے۔ تمہاری مادری زبان کیونکہ اردو نہیں اس لئے تمہیں یہ ٭از کی بات بتا بھی دی ورنہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں ہرگز اس راز سے پردہ نہ اٹھاتا۔ پھر یہ خیال ٭ی آ گیا کہ تم ابھی مجھے اہل زبان کہہ چکی ہو' اسی کے ساتھ یہ اعتراف بھی کیا ہے' تمہیں زیادہ اردو ٭یں آتی۔ کبھی کبھی تو تم بڑی سچائی کے ساتھ اعتراف حقیقت کر لیتی ہو۔"

جواباً میں نے بھی اسے نہیں بخشا۔ کچھ دیر ایک دوسرے پر فقرے بازی کے بعد ہمارے درمیان ٭وجودہ صورت حال پر گفتگو ہونے لگی۔ ایمونیشن ڈپو اڑانے کے متعلق اپنی نئی تجویز سے میں نے عادل کو ٭ی آگاہ کر دیا پھر پوچھا۔ "تم گئے ہو کبھی غازی آباد؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" اس نے بتایا۔ "جہاں تک میرا اندازہ ہے وہاں ہمارا قیام نواب زادہ ابراہیم ٭ا صاحب کی حویلی میں ہو گا۔ نواب زادہ صاحب سے سالار اکبر کے ذاتی مراسم بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ٭ہماری تنظیم کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔"

میں نے مدد کرنے کی وضاحت چاہی۔

"میری مراد مالی مدد سے ہے۔" عادل نے بتایا۔ "نواب زادہ صاحب اس علاقے کی با اثر شخصیت ٭ہ۔"

"پھر تو ہم وہاں ہر طرح محفوظ ہوں گے۔"

"قطعی طور پر۔" عادل نے یقین دہانی کرائی' پھر کہنے لگا۔ "وہاں تک سفر تمہارے پلان کے مطابق دو افراد کی صورت میں ہو گا اس لئے میں اور تم ساتھ رہیں گے۔"

حالانکہ میرے ذہن میں بھی یہی تھا مگر عادل کو ستانے کے لئے بولی۔ "خواہ مخواہ' میں تمہیں اپنے ٭تھ نہیں لے چلوں گی۔ تم سالار اکبر کے ساتھ جانا۔ میرے ساتھ گربچن سنگھ جی چلیں گے۔ کوئی کہیں ٭نکلے تو ڈھنگ کا آدمی ساتھ ہونا چاہئے۔"

"میں تمہیں بے ڈھنگا نظر آتا ہوں۔"

"فضول بات نہیں' آرڈر از آرڈر۔ یہ مت بھولا کرو کہ تم کس سے ہم کلام ہو۔"

"اچھا اب ہمی پر رعب بھی جماؤ گی۔ نہ تمہیں ہمایوں کے مقبرے سے لے کر آتا نہ آج یہ دن ٭ا پڑتا۔"

"تمہیں اسی لئے تو ساتھ نہیں لے جا رہی کہ تمہاری عقل گھاس چرنے لگی ہے۔ اس وقت رات ٭جسے تم دن کہہ رہے ہو۔"

"تمہارے سامنے تو کوئی محاورہ بولنا بھی جرم ہے لیکن تم بے چاری بھی کیا کرو کہ تمہیں زیادہ اردو ٭ابھی نہیں۔"

"انتقامی کارروائی نہیں چلے گی۔ اگر تم اتنے ہی گھگیا رہے ہو تو میں تمہیں ایک شرط پر اپنے ساتھ لے جا سکتی ہوں' تم راستے میں میرا مغز نہیں چاٹو گے۔"

"کچھ ہو گا تو چاٹوں گا نا۔" دھیرے سے اس نے کہہ ہی دیا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا تو جلدی سے بولا۔ "اچھا الفاظ واپس' دراصل مجھے یاد نہیں رہا کہ میں ایک ریاست کی باجبروت و مضبوط پرنسس .... سوری کوئن سے ہمکلام ہوں۔"

"اور یہ بھی یاد رکھا کرو کہ میں تمہاری سالار اعلیٰ بھی ہوں۔ چاہوں تو اس مہم سے ہی تمہارا پتا صاف کر سکتی ہوں پھر تم یہاں ٹاپتے رہ جاؤ گے۔"

"صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔"

"یہ کیا بے تکی اڑانے لگے؟"

"ٹاپتے رہ جانا اور بے تکی اڑانا دونوں ہی محاورے ہیں۔ اس خادم کے ساتھ رہ کر ملکہ وادی سبز بھی بامحاورہ اردو بولنے لگی ہیں۔"

"اسی طرح فرماں بردار رہو گے تو کبھی ہمارا قہر تم پر نازل نہیں ہو گا۔"

"فرماں برداری کے پیسے لگتے ہیں ملکہ عالیہ! یہ وادی سبز نہیں' ہندوستان ہے۔ یہاں فری میں فرماں بردار نہیں بنتے۔ اب یہاں کے حکمرانوں ہی کو دیکھ لیں' انہوں نے اپنے جتنے بھی فرماں بردار پال رکھے ہیں' سب کو مال کھلاتے ہیں' خواہ وہ پولیس کے زر خرید غلام ہوں یا پرانے وقتوں کے عزت مآب لوگ۔"

"تم اپنی قیمت بتاؤ' کتنے میں بکو گے؟"

"ملکہ عالیہ اس حقیر و فقیر کی قیمت ادا نہیں کر سکیں گی۔"

"پھر بھی بتاؤ تو سہی قیمت۔"

"اس فقیر کی قیمت ہندوستان کی آزادی ہے۔ بولیں ملکہ عالیہ' یہ قیمت آپ ادا کر سکتی ہیں؟"

"پنڈت جی! تم نے مجھے آج ہی صبح ریلوے اسٹیشن سے لوٹتے ہوئے کسی ناٹک منڈلی میں شامل ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ تمہاری پرفارمنس بھی کچھ کم نہیں' مکالمہ تم بھی خاصا زوردار بول لیتے ہو۔ آخر صحبت کا کچھ نہ کچھ اثر تو آدمی پر پڑتا ہے۔"

چہل قدمی کرتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تو میں نے عمارت کا رخ کیا۔ عادل اندر پہنچ کر اپنے کمرے کی طرف ہو لیا۔

شام کو جب میں کویتا سے جدا ہوئی تھی تو وہ کمرے میں موجود تھی۔ اسے علم تھا کہ میں کوٹھی میں ہوں۔ مجھے اسی لئے توقع تھی کہ وہ کمرے میں ملے گی مگر کمرہ خالی تھا۔ میں نے اپنی طرف سے اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ وہ جب اور جہاں چاہے آ جا سکتی تھی۔ میں یہی سوچ کے لباس تبدیل کر کے بعد بستر پر دراز ہو گئی۔

مجھے ابھی لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک عظیم و نیک روح مہین کی سرگوشیاں

کمرے میں گونجنے لگیں۔ "اے معبلہ! تُو کس دھیان میں ہے' تیرے گرد جال بنا جا رہا ہے اور تُو بے خبر ہے۔ خطرہ تیری طرف اور تیرے ساتھیوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ آدھی رات گزر جائے اور تجھے تیرے دشمن دبوچ لیں' یہاں سے نکل جا کہ یہ ٹھکانہ بھی تیرے اصل دشمن کی نظر میں آ چکا ہے۔ اپنے اصل اور بڑے دشمن کو پہچان۔ مت بھول کہ تجھے یہاں صرف ژیان کے پیچھے نہیں بھیجا گیا اور وہ تو یہاں سے چلا بھی گیا۔ کیا تُو بھول گئی کہ انہی میدانوں والوں کو تُو نے بلند پہاڑوں کے درمیان وادی سبز میں دیکھا تھا' تب کہ جب تجھے ژیان پر غلبہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اے معبلہ! کیا تُو نے سوچنا چھوڑ دیا ہے؟ سوچا کر اور اپنے ماضی کو نہ بھولا کر۔ جو کچھ گزرا' وہ بلا سبب نہیں تھا اور جو گزرنے والا ہے وہ بھی بے سبب نہیں۔ کیا تجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تُو اپنی اصل کی طرف لوٹا دی گئی ہے اور تجھ پر گہرے بھید ابھی کھلنا باقی ہیں۔ سو اٹھ جا اے معبلہ کہ یہ وقت آرام کا نہیں ہے۔"

عظیم مہین کی سرگوشیاں معدوم ہوتے ہی میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے لباس دوبارہ تبدیل کرنے میں بہت کم وقت لگایا۔

پیش آنے والے خطرے سے مجھے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ خطرے کے وقت کی نشاندہی بھی ہو گئی تھی۔ "اس سے پہلے کہ آدھی رات گزر جائے۔" یہ الفاظ وقت کے تعین کا واضح اشارہ تھے۔ جو کچھ بھی ہونا تھا' نصف شب کے بعد ہی ہونا تھا۔ ابھی پورے دو گھنٹے باقی تھے۔ ان دو گھنٹوں میں بہت کچھ ممکن تھا۔ سرگوشیوں میں خطرے کی پیشگوئی کے علاوہ بھی میرے سوچنے سمجھنے کے لئے بہت کچھ تھا لیکن موجودہ صورت حال کا تقاضا مختلف تھا۔ تازہ تر پیشگوئی کے الفاظ میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ میں دشمن کو بھی سمجھ چکی تھی کہ کس کی طرف اشارہ ہے اور مجھ سے سوچنے سمجھنے میں کچھ جہاں غلطی ہوئی تھی' اس کا اندازہ بھی ہو گیا تھا۔ وجے فراش خانے والی حویلی سے قرول باغ پر پہنچا تھا۔ اگر وہ سی آئی ڈی والوں کی نظر میں تھا تو یہ کوٹھی بھی محفوظ نہیں رہی تھی۔ جو خطرہ فراش خانے والی حویلی کو تھا' اس کوٹھی کو بھی تھا۔ مجھ سے یہی بھول ہوئی تھی۔ تبھی تو یہ کہا گیا تھا کہ اے معبلہ! کیا تُو نے سوچنا چھوڑ دیا ہے؟ ممکن تھا کہ خطرے کی پیشگوئی نہ ہوتی تو میں اتنی جلدی اس نتیجے تک نہ پہنچ سکتی۔ یہ بھی امکان تھا کہ غدار وجے پہلے بھی کبھی اس کوٹھی میں آیا ہو اور پہلے سے یہ کوٹھی حکومت کی نظر میں آ چکی ہو۔ ممکن ہے حکومت کسی مناسب وقت کے انتظار میں ہو یا پھر گزشتہ رات ہی وجے جب اس کوٹھی تک پہنچا تو پہلی بار حکومت کو تنظیم کے اس محفوظ ٹھکانے کا پتا چلا۔ میں یہ سب کچھ سوچتی ہوئی تیزی کے ساتھ سالار اکبر کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

سالار اکبر اس وقت تک سویا نہیں تھا اس کے کمرے کی بتی جلی ہوئی تھی' مگر دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے فوراً ہی پوچھا گیا۔

"سالار! میں کرن ہوں' دروازہ کھولئے۔" میں نے تیز اور بلند آواز میں جواب دیا۔

"ابھی حاضر ہوا۔" سالار اکبر کی آواز آئی۔ پھر قدموں کی چاپ ابھری اور دروازہ کھل گیا۔ میں

تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئی۔

"ہمیں فوری طور پر اس کوٹھی کو خالی کرنا ہے۔" میں کسی تمہید کے بغیر جلدی سے بولی۔

میری بات سن کر سالار اکبر کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آئے پھر شاید اس نے خود کو سنبھال لیا اور پوچھا۔ "کیا ہوا کرن جی! اچانک آپ.........."

"کسی محفوظ جگہ تک پہنچنے کے لئے ہمارے پاس بہت کم وقت ہے۔" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ سالار اکبر کو عظیم مہین کی پیشگوئی سے تو آگاہ کرنا ممکن نہیں تھا اس لئے میں نے اس غلطی کی طرف اشارہ کر دیا جو ہم سبھی سے ہو گئی تھی۔

"تعجب ہے کہ ہم نے یہ سامنے کی بات نظرانداز کر دی۔ وجے یہاں بھی تو آیا تھا۔"

"جی ہاں' عموماً آدھی رات کے بعد ایسی جگہوں پر چھاپے مارے جاتے ہیں' جب لوگ بے خبر ہوں اور ابھی آدھی رات نہیں ہوئی۔ ہمارے لئے یہاں سے فرار ہونے کا ابھی موقع ہے۔"

پھر ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کوٹھی میں قیام پذیر تمام افراد یکے بعد دیگرے نکل گئے۔ کوٹھی میں کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑا گیا تھا جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ وہاں سرفروش تنظیم کے ارکان کی سکونت تھی۔ سارا اسلحہ غائب کر دیا گیا تھا۔ سوائے فرنیچر کے اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ سب سے آخر میں تینوں سالاروں اور عادل کو ساتھ لئے میں ایک کار میں بیٹھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بدستور عادل ہی تھا اور ہم سبھی کے چہروں پر میک اپ تھا۔ تینوں سالار پچھلی نشست پر تھے اور میں عادل کے ساتھ آگے بیٹھی تھی۔ کوٹھی کے صدر دروازے کو مقفل کر دیا گیا تھا۔ کار پھاٹک سے نکل کر باہر آئی تو عادل نے کار کو روکا اور اتر کر پھاٹک پر بھی تالا ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ کار تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

غیر یقینی حالات کے باوجود میں' کویتا کی طرف سے فکرمند تھی روانگی کے وقت تک وہ لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ سالار اکبر کے سوا کسی کو اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب ہم قرول باغ کی حدود سے نکل آئے تھے۔

"کرن جی! وہ لڑکی کویتا نظر نہیں آئی' کہاں گئی وہ؟" سالار اکبر نے مجھ سے پوچھا۔

"اسے میں نے پہلے ہی نکال دیا تھا۔" میں نے بات بنا دی۔ "ان حالات میں اس کا ہمارے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں تھا۔"

پھر سالار اکبر نے کویتا کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ کویتا سے اگر ان لوگوں کا کوئی تعلق تھا تو صرف میری وجہ سے۔ نہ وہ تنظیم کی رکن تھی نہ کسی رکن سے اس کا کوئی واسطہ تھا۔ اس سے قطع نظر یہ کہ موجودہ صورت حال میں کویتا کا وجود و عدم برابر تھا۔ یہ وقت دوسرے اہم معاملات پر سوچنے اور عمل کرنے کا تھا۔ کویتا میرے سوا کسی کے لئے اہم نہیں تھی' نہ خود میں نے ہی کسی کو اس کی اہمیت کا احساس ہونے دیا تھا۔ کویتا کا معاملہ مجھی تک محدود تھا۔ یہ تو مجھ کو علم تھا کہ اگر کویتا میرے ساتھ نہ ہوتی تو اب تک میں اس کوٹھی میں قیام نہ کرتی۔ کویتا ہی نے تو اس کوٹھی کو میرے ان دشمنوں کی نظروں سے

اوجھل کر رکھا تھا جو پُراسرار شیطانی قوتوں کے مالک تھے۔ کویتا ہی کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق بڑے مہاراج چندر موہن اور گوپال نے دہلی چھوڑ دیا تھا' پھر بھی کیا خبر وہ کب واپس آ جاتے۔ چمپا عضو معطل ہو کے رہ گئی تھی۔ آخری اطلاع چمپا کے بارے میں یہ تھی کہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ چندر موہن اسے بھی اپنے ساتھ دہلی سے لے گیا تھا۔ اسی سبب مجھے چمپا کی اسفل ترین حرکتوں سے نجات مل گئی تھی۔ اس لعنتی عورت نے مجھے بہت ذلیل و رسوا کیا تھا' مگر اب میں خوش تھی کہ وہ اپنے انجام تک پہنچنے والی تھی۔ سوچتے ہوئے مجھے چمپا کا خیال آیا تو غصے کی وجہ سے میرے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی جب تک مجھے یہ خبر نہ مل جاتی کہ اس کا ناپاک وجود شعلوں کی نذر ہو چکا ہے' میرے دل کو قرار نہ آتا۔

☆======☆======☆

کار تیز رفتاری کے ساتھ فاصلے سمیٹ رہی تھی' مگر میرا ذہن اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ قرول باغ والی کوٹھی سے نکل آنے کے بعد ایک طرح سے میں دہرے خطرے میں گھر گئی تھی۔ کویتا کا اچانک غائب ہو جانا بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی خطرہ میرے اردگرد تھا جس سے میں بے خبر تھی۔ پھر مجھے مہین کی پُراسرار سرگوشیوں کے الفاظ یاد آنے لگے۔ "مت بھول کہ تجھے یہاں صرف ژیان کے پیچھے نہیں بھیجا گیا۔" یہ الفاظ بہت معنی خیز تھے۔ ان میں بڑی گہرائی تھی۔ خیر و شر کی جنگ تو یہاں ہموار میدانوں میں بھی جاری تھی۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا' ابھی میں چمپا کے بارے میں سوچ رہی تھی' کیا وہ بھی میری دشمن نہیں؟ کیا میں' چندر موہن کے ظلم و ستم کو بھول سکتی ہوں؟ سوال در سوال' کیا چندر موہن ہی کے اشارے پر لعنتی چمپا نے میری زندگی اجیرن نہیں کر دی تھی؟ شمبھو سے آخر میری کیا ذاتی دشمنی تھی؟ وہ بھی تو چندر موہن ہی کا آلہ کار تھا جو میرے ہاتھوں آخرکار مارا گیا۔ شمبھو کا بڑا بھائی گوپال کون تھا؟ بڑے مہاراج چندر موہن کا خاص چیلا۔ میرے خلاف ان شیطانی چالوں کا ذمے دار کیا چندر موہن ہی نہیں تھا؟ تو کیا وہ قابل معافی ہے؟ تو پھر ایک ژیان ہی کیا' یہاں تو میرے لئے بدی کے بہت سے ہرکارے تھے جن سے میں نبرد آزما تھی۔ ایک کڑی سے دوسری کڑی جڑی ہوئی تھی۔

"اپنے اصل اور بڑے دشمن کو پہچان۔ کیا تُو بھول گئی کہ انہی میدانوں والوں کو تُو نے بلند پہاڑوں کے درمیان وادی سبز میں دیکھا تھا.........." سرگوشیوں کی بازگشت جیسے مجھے ہموار میدانوں کی اس دنیا سے بہت دور لے گئی۔ میری چشم تصور اب ایک ایسا منظر دیکھ رہی تھی جو میری یادوں کے نہاں خانوں میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ وہ یہی تو تھے' سفید چمڑی والے۔ اب تو سب کچھ مجھ پر عیاں ہو چکا تھا کہ ہموار میدانوں میں مختلف رنگ و نسل اور قومیتوں کے لوگ آباد ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ میں اور نضار' ساحر زعیم کو موت کے گھاٹ اتار کر لوٹ رہے تھے۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہموار میدان کہاں ہیں اور ان میں کون بستا ہے۔ ہم انہیں اجنبی سرزمین کے لوگ کہتے تھے۔ مجھے ان کی زبان بھی نہیں آتی تھی۔ وہ دو مرد تھے اور ایک عورت۔ انہیں ہم نے وادی سبز کے گرداگرد پھیلے ہوئے پہاڑوں کی طرف آتے دیکھا تھا۔ نضار اور میں نے چھپ کر ان کی باتیں سنی تھیں۔ ان کی زوردار بحث کا صرف ایک لفظ میری سمجھ

میں آ سکا تھا' معبلہ۔ مجھے اس پر شدید حیرت ہوئی تھی کہ اجنبی سرزمین والے میرے نام سے کس طرح واقف ہیں؟ اس وقت تک تو میرا دشمن ژیان بھی میری طرف سے بے خبر تھا۔ میں تو آتون دیوی کہلاتی تھی۔ نضار نے مجھے یہ کہہ کر مطمئن کیا تھا کہ اجنبی سرزمین والوں نے وادی بز کے بوڑھوں سے شاید میرا نام سنا ہو گا۔ اس کے باوجود ایک خلش سی میرے دل میں رہ گئی تھی۔

سرگوشیوں سے بھی واضح ہو چکا تھا کہ میرے اصل دشمن یہی سفید چمڑی والے تھے۔ یہی انگریز حکمراں کہ جنہوں نے ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کے کروڑوں باشندوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھ۔ میرے خلاف ژیان کے مددگار بھی تو یہی تھے۔ وہاں بلند پہاڑوں کے درمیان دشمن سے ہونے والی جنگ میں سفید چمڑی والوں کا بھی تو حصہ تھا۔ میرا ذہن ماضی سے حال کا رشتہ جوڑ رہا تھا۔ اب بھی انہوں نے ژیان کو پناہ دے رکھی تھی۔

"ژیان تو تیرے راستے کا ایک پتھر ہے۔ تجھے تو ابھی پہاڑوں سے ٹکرانا ہے۔" یہ الفاظ بھی عظیم مہیمن کی سرگوشیوں ہی کے تھے۔

اب طویل عرصے کے بعد موجودہ حالات کو میں نئے تناظر میں دیکھ رہی تھی۔ میرے لئے شاید ژیان کی حیثیت ایک پتھر ہی کی تھی' راستے کا پتھر۔ پھر بھی میں اس راستے کے پتھر کو روند ڈالنا چاہتی تھی۔ پہاڑوں سے ٹکرانا ہی اگر میرا مقسوم تھا تو میں اس سے ہراساں نہیں تھی۔

اسی وقت کار ایک جھٹکے سے رکی اور میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں لمحہ موجود میں واپس آ گئی۔

وہ ایک نیم تاریک سی گلی تھی۔ ہم سبھی تیزی کے ساتھ کار سے اتر گئے۔ بائیں جانب کھلا ہوا ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جس سے کچھ روشنی باہر گلی میں بھی آڑی ترچھی لکیروں کی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اسی دروازے کی ایک جانب نگران اعلیٰ کا نمائندہ امرناتھ کھڑا تھا۔ ہم سب کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک اور بڑا سا دروازہ تھا جو بند تھا۔ دائیں جانب سیڑھیاں تھیں۔ امرناتھ ہمیں ساتھ لئے اوپری منزل پر آ گیا۔

"کار کی چابی دے دیں پنڈت جی!" امرناتھ نے عادل کو مخاطب کیا۔ عادل کے چہرے پر جو میک تھا' یقیناً امرناتھ کے لئے نیا نہیں ہو گا۔

عادل نے کار کی چابی امرناتھ کے حوالے کر دی۔ یقیناً کار کو کسی محفوظ جگہ کھڑا کرنا مقصود ہو گا۔

"آپ لوگ تشریف رکھیں' میں ابھی آیا۔" امرناتھ یہ کہہ کر چلا گیا۔

وہ ایک ہال کمرہ تھا جس میں آرام کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اب تک کسی کو بھی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ملا تھا۔ راستے میں بھی مکمل خاموشی رہی تھی۔ صرف ایک مرتبہ سالار اکبر نے مجھ سے کوٹھ کے بارے میں پوچھا تھا۔ میرا جواب سننے کے بعد پھر کوئی کچھ نہیں بولا تھا۔

ہنگامی حالات ہونے کے باوجود اس شہر میں موجود گھروں کے دروازے ہم پر بند نہیں ہوئے تھے۔ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں رات گئے تک آنے والے تو رات گئے تک ہی آتے ہیں۔ اب میرا شمار بھی

انہی رات گئے تک آنے والوں میں تھا۔ دن اور رات کا امتیاز تو اب میرے لئے بھی اٹھ چکا تھا۔ دہلی آنے کے بعد جانے کتنی راتیں یونہی جاگتے گزری تھیں۔ راستے میں مجھ پر جو کچھ منکشف ہوا' اس کا اثر اب تک میرے ذہن پر تھا۔ میں رفتہ رفتہ خود کو نارمل کر رہی تھی۔

مجھے اندازہ تھا کہ میرے علاوہ دوسرے بھی اعصابی تناؤ کا شکار رہے ہوں گے' مگر اسباب مختلف تھے۔ میرا اور ان کا بڑا دشمن ایک تھا' اس کے باوجود ان سے زیادہ دباؤ مجھ پر تھا۔ میں آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ دیگر آرام کرسیوں پر تینوں سالار اور عادل تھے۔ ان آرام کرسیوں کے علاوہ اسی ہال کمرے میں ایک طرف لمبی سی میز بھی پڑی تھیں میز کی دونوں جانب کرسیاں رکھی تھیں۔ وہ ہال کمرہ غالباً میٹنگ روم کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔

امرناتھ واپس آیا تو اس کے ساتھ میں نے ایک اجنبی کو بھی دیکھا۔ وہ ایک ٹرے اٹھائے ہوئے تھا۔ ٹرے میں چائے کی پیالیاں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ چائے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ چائے کے لئے شاید ہماری آمد سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا۔ امرناتھ نے چائے میز پر لگانے کو کہہ دیا۔

جب چائے کی پیالیاں میز پر رکھ کر وہ اجنبی دھوتی بند چلا گیا تو گویا کلوز ڈور میٹنگ شروع ہو گئی۔ امرناتھ نے ہال کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ ہم سب آرام کرسیوں سے اٹھ کر میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اب وہاں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو میری اصل شخصیت اور نام سے واقف نہ ہو۔

گفتگو میں پہل سالار وحیدالدین نے کی وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ "محترمہ معبلہ خاتون! یہ سب احتیاطی تدابیر ہیں یا اس سلسلے میں کوئی مصدقہ خبر ہے؟ ہم نے آپ کے حکم سے اپنے دو محفوظ ٹھکانے چھوڑ دیئے ہیں۔"

"وجے کے بارے میں آپ کو تمام تفصیلات کا علم ہو چکا ہے؟" میں نے سوال کے جواب میں سوال ہی کیا۔

"جی ہاں' عادل نے اور پھر قرول باغ پہنچ کر سالار اکبر نے مجھے تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔" وحیدالدین نے جواب دیا۔

"اس سے آپ نے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا؟"

"بطور احتیاط ہمیں فراش خانے والی حویلی خالی کر دینا چاہئے تھی جیسا کہ ہم نے آپ کے حکم پر کیا لیکن قرول باغ والے انتہائی محفوظ ٹھکانے کو چھوڑ دینے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ میری صاف گوئی کو معاف کر دیجئے گا۔"

"آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں؟" سالار اکبر نے میری طرف دیکھا۔

"یہ کوئی باقاعدہ میٹنگ نہیں ہے' جس کو جو کہنا ہو' میری اجازت کے بغیر بھی کہہ سکتا ہے۔"

"شکریہ!" سالار اکبر بولا' پھر وحیدالدین سے مخاطب ہو گیا۔ "سالار! آپ کیونکہ ہم سے دور رہے ہیں اور آپ کی ذمے داریاں بھی مختلف ہیں۔ بلاشبہ نئے ارکان کی تربیت انتہائی مشکل اور اہم کام ہے

لیکن ہم اب جن حالات سے گزر رہے ہیں یا گزرنے والے ہیں' ان کا تقاضا کچھ اور ہے۔ اس خطے میں پہلی بار مسلح جدوجہد کا آغاز کیا گیا ہے۔ ہم نے پہلے کسی ایسی صورت حال کا مقابلہ نہیں کیا۔ اب ہمیں اپنی پرانی روش ترک کرنا پڑے گی۔ ہمیں اپنے سائے سے بھی چوکنا رہنا ہو گا۔ ایک غدار کی وجہ سے ہم حکومت پر پہلی کاری ضرب نہ لگا سکے۔ کیا آپ اسے کوئی معمولی واقعہ سمجھ رہے ہیں؟" سالار اکبر کی آواز پُرجوش ہوتی گئی۔ "وہ غدار ہمارے درمیان موجود رہا اور ہم اس سے بے خبر رہے۔ کیا مطلب ہے اس کا؟ یہی نا کہ ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ تمام تر احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر بھی ہمیں دہلی سے نکلتے نکلتے روک لیا گیا؟ وہ غدار تو شاید اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچ کے نکل جاتا مگر شاید بقیہ آٹھ افراد خاک و خون میں نہلا دیئے جاتے۔ نہ پھر اس وقت یہاں میں ہوتا' نہ گربچن سنگھ جی' نہ معبلہ خاتون اور نہ عادل۔ اس غیر متوقع صورت حال کے باوجود معبلہ خاتون نے ہمیں اس آزمائش کی گھڑی سے نکال لیا' تن تنہا .... پھر یہ انہی کی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ ایک غدار کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ ابھی رات باقی تھی کہ انہی کے حکم پر ہم نے سی آئی ڈی ہیڈ آفس کو اڑا دیا۔ اب آپ ان سے قرول باغ والی کوٹھی کو اچانک چھوڑ دینے کی وجہ پوچھ رہے ہیں۔"

گربچن سنگھ بھی کچھ کہنے کے لئے پہلو بدل رہا تھا کہ میں بول اٹھی۔ "سالار اکبر! بس کریں۔" میری نگاہ وحیدالدین کی طرف تھی۔ براہ راست نہ سہی بالواسطہ سالار اکبر نے اس ادھیڑ عمر شخص کی غفلت اور لاعلمی پر سخت تنقید کی تھی۔ اسی کے نتیجے میں وہ نروس سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "ہم سب اپنے اپنے اختیارات سے قطع نظر ایک ہی کشتی میں سوار ہیں' ایک دوسرے کا بازو ہیں' حوصلہ ہیں۔ وہ جو کشتی میں سوراخ کرنے والے کے سب سے قریب تھا' ضروری نہیں کہ ہم اسی کو مورد الزام ٹھہرا دیں۔ کشتی کے ہر مسافر کو نہ صرف چوکنا رہنا چاہئے بلکہ ہواؤں کا رخ دیکھ کر آنے والے طوفان کا اندازہ لگا لینا چاہئے۔ ہر مسافر کی صلاحیت یکساں نہیں ہوتی' نہ ہمیں اس سے یہ توقع رکھنا چاہئے۔ کوئی پتوار سنبھالے ہوتا ہے' کسی کی نظر صرف بادبان پر ہوتی ہے۔ کوئی موجوں کے مد و جزر سے کشتی کو بچانے کی جدوجہد میں لگا ہوتا ہے تو کسی کو اس بھنور کی فکر ہوتی ہے جس میں پھنس کر کشتی ڈوب سکتی ہے۔ ایسے حالات میں کسی بھی مسافر سے اندازے کی غلطی ہو سکتی ہے اور غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس سے غلطی نہیں ہوئی۔ جب کشتی کسی طوفان سے ہمکنار ہو' کسی کو کشتی میں سوراخ کرتے پکڑ بھی لیا گیا ہو تو ایسے میں ایک دوسرے سے الجھنا کشتی کی غرقابی کا سبب بن سکتا ہے۔ مسافروں کی پہلی کوشش یہ ہونا چاہئے کہ وہ کشتی میں بھر جانے والے پانی کو نکال دیں' اسی کے ساتھ اس سوراخ کو بند کر دیں جس سے مزید پانی کشتی میں بھرنے کا امکان ہو۔" میں دانستہ علامتی زبان استعمال کر رہی تھی جسے سمجھنا وہاں موجود افراد میں سے کسی کے لئے بھی مشکل نہیں تھا۔ اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں نے سوالیہ نظروں سے امرناتھ کی طرف دیکھا۔

امرناتھ کے بولنے سے پہلے سالار وحیدالدین بول اٹھا۔ "میں' معبلہ خاتون سے اور اپنے دیگر ساتھیوں سے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ معبلہ خاتون نے جس نرمی اور خلوص

کے ساتھ اشارتی زبان میں حالات کا تجزیہ کیا ہے ہمیں سمجھایا ہے آئندہ کے لئے طریقہ کار متعین کیا ہے' میں اس پر تہہ دل سے ان کا ممنون ہوں۔ انہیں سالار اعلیٰ کے مساوی اختیارات حاصل ہیں اور وہ ہم میں سے کسی کو جواب دہ نہیں' جانے کیوں اس وقت میرے ذہن سے یہ بات محو ہو گئی تھی' مجھے اب اس پر ندامت محسوس ہو رہی ہے۔ معبلہ خاتون نے میری غلطی کو نظرانداز کر دیا تھا' شاید اسی لئے میں یہ جسارت کر بیٹھا کہ جو الفاظ میری زبان پر نہیں آنا چاہئے تھے' وہ آ گئے۔"

اس بوڑھے آدمی نے جس نیک نیتی سے یہ الفاظ ادا کئے تھے' مجھ پر ان کا اثر ہوا۔ غالباً دوسرے افراد نے بھی سالار وحیدالدین کی وسیع القلبی کو محسوس کر لیا تھا۔ اسی کا اظہار نگران اعلیٰ کے نمائندے امرناتھ نے بھی کیا جو ہمارا میزبان بھی تھا۔ پہلے اس نے ہنگامی حالات میں میرے اقدامات کو سراہا' پھر سالار وحیدالدین کے اعتراف حقیقت پر توصیفی کلمات ادا کئے۔ آخر میں وہ بولا۔ "یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں محترمہ معبلہ خاتون کی رہنمائی حاصل ہے۔ وہ بذات خود ایک بہترین اور تجربہ کار جنرل جیسی صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ ایک بیدار ذہن کی مالک بھی ہیں۔ اختیارات سے الگ ہماری صفوں میں کوئی بھی ایسی قائدانہ صلاحیتوں کا مالک نہیں جو انہیں حاصل ہیں۔ ان کے اقدامات یقیناً دوررس ہوتے ہیں جس کی تازہ ترین مثال ایک غدار کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ غاصب حکمرانوں پر لگائی جانے والی پہلی ضرب ہے۔ یہ شہر دارالحکومت ہے اور یہاں حکومت کے ایوانوں میں کھلبلی ڈال دینا بڑا دشوار کام ہے۔ عیار دشمن کے ذہین ترین دماغ یہاں موجود ہیں۔ نگران اعلیٰ نے یونہی تو گرین سگنل نہیں دے دیا' اس کی بنیادی وجہ معبلہ خاتون کی ہمارے درمیان موجودگی ہے۔" یہ کہہ کر امرناتھ خاموش ہو گیا۔

سالار اکبر' وحیدالدین اور امرناتھ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں نے کہا۔ "ذاتی طور پر میں کوئی خصوصی اہمیت نہیں رکھتی۔ خود کو میں تنظیم کے کسی بھی عام رکن کے برابر سمجھتی ہوں۔ اختیار و اقتدار میرا مسئلہ نہیں۔ میرا تجزیہ تنظیم کے ایک رکن کی حیثیت سے یہ ہے کہ آج نصف شب کے بعد فراش خانے والی حویلی اور قرول باغ والی کوٹھی کو گھیر لیا جائے گا۔ اس وقت نصف شب قریب ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سالار اکبر کے شعبے نے کوئی ایسا بندوبست کیا ہے یا نہیں جس سے تصدیق ممکن ہو۔"

"یہ بندوبست کیا جا چکا ہے۔" سالار اکبر نے کہا۔ "فون پر کوڈ ورڈز کے ذریعے ہمیں یہاں اطلاع مل جائے گی۔"

"پھر تو صبح ہونے سے پہلے ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ میرے قیاسات درست تھے بھی یا نہیں۔" میں نے دانستہ یہ بات اس لئے کہی کہ عظیم مہین کی پیشگوئی کا ذکر نامناسب تھا۔ اسی ہال کمرے میں ایک جانب چھوٹی سی تپائی پر فون رکھا ہوا تھا۔ ابھی تک میں اس سے لاعلم تھی کہ وہ کون سا علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہم وہاں ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہیں۔ میں نے اسی ضمن میں امرناتھ سے سوال کیا۔

امرناتھ نے بتایا کہ اس علاقے کو بازار سیتا رام کہا جاتا ہے۔ رام اور سیتا کی حیثیت ہندوؤں کے نزدیک مذہبی تھی۔ اس علاقے میں خال خال ہی مسلمانوں کے گھر تھے۔ اکثریت ہندو آبادی کی تھی۔ اسی علاقے میں مسلمانوں کی ایک عبادت گاہ "کالی مسجد" کے نام سے مشہور تھی۔ وہ پورا علاقہ اور اس سے

ملحقہ آبادی بازار سیتا رام کے نام سے منسوب تھی۔ دہلی کی جامع مسجد کا فاصلہ وہاں سے زیادہ نہیں تھا۔ ہم اس وقت ایک دھرم شالہ کی اوپری منزل پر تھے۔ دھرم شالہ کا یہ حصہ بالکل الگ تھلگ تھا۔ امر ناتھ ہی اس دھرم شالہ (ہندوؤں کا مسافر خانہ) کا کرتا دھرتا تھا۔ یہ اس کی ظاہری حیثیت تھی۔ بظاہر اس دھرم شالہ کی اوپری منزل میں امر ناتھ کا خاندان آباد تھا۔ یہاں کسی مسافر کو آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وسیع و عریض دھرم شالہ کی اوپری منزل پر قیام پذیر یہ "خاندان" سرفروش تنظیم کے ارکان پر مشتمل تھا۔ یہاں اتنی گنجائش تھی کہ کسی ہنگامی صورت حال میں پچاس سے زیادہ ارکان باآسانی قیام کر سکتے تھے۔ قرول باغ والی کوٹھی میں قیام پذیر ارکان کی تعداد تقریباً بیس تھی۔ وہ باآسانی یہاں کھپ گئے تھے۔ امر ناتھ اس دھرم شالہ کا نگران کہلاتا تھا۔ دھرم شالہ کے نگران کی حیثیت سے اس کا دفتر گراؤنڈ فلور پر تھا جہاں عموماً اس کے دو ماتحت بیٹھتے تھے۔ ان دونوں ماتحتوں کا تعلق بھی تنظیم ہی سے تھا۔ کلکتے میں بھی مَیں ایک مرتبہ ارشاد حسین کے ساتھ پورے ایک ہفتے امر تلہ اسٹریٹ کی دھرم شالہ میں رہ چکی تھی۔

مجموعی طور پر امر ناتھ نے مجھے جو کچھ بتایا میرے اطمینان کے لئے کافی تھا۔ ہم دھرم شالہ کے عقبی دروازے سے اوپری منزل تک پہنچے تھے۔ عقبی دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر مجھے جو ایک اور بند دروازہ نظر آیا تھا' وہ دھرم شالہ کے نچلے حصے کی طرف کھلتا تھا۔ عموماً وہ دروازہ بند ہی تھا۔ دھرم شالہ کے دفتر میں جانے کے لئے امر ناتھ صدر دروازہ ہی استعمال کرتا تھا۔ یہ صدر دروازہ بازار کے رخ پر تھا۔

قرول باغ کی طرح اسلحہ ذخیرہ کرنے کے لئے اوپری منزل پر ایک بڑا اسٹور موجود تھا۔ اس کے علاوہ چند ایسے کمرے بھی تھے جو وقت ضرورت کے لئے خالی پڑے رہتے تھے۔ انہی کمروں میں سے ایک کمرے کے اندر میرے تینوں سوٹ کیس پہنچا دیئے گئے تھے۔ یہ سوٹ کیس پہلے ہی بقیہ ضروری سامان کے ساتھ وہاں پہنچ چکے تھے۔ تینوں سالاروں اور عادل کے لئے بھی الگ الگ کمروں کا بندوبست تھا۔ اوپری منزل کے اس حصے میں بھی چند اراکین کے سوا کسی کو بلا اجازت آنے کی ممانعت تھی۔ اس کی وجہ وہاں ہال کمرے میں ہونے والے اہم اجلاس تھے۔

کلوز ڈور میٹنگ ختم ہو گئی تو امر ناتھ نے مجھے اوپری منزل کے اس مخصوص حصے کی سیر کرائی۔ اسی حصے میں اسلحہ کا بڑا اسٹور بھی تھا۔ اس حصے کے اختتام پر میں نے ایک بند دروازہ بھی دیکھا۔ دروازے کے قریب وہی کرخت چہرے والا اجنبی' گن ہاتھ میں لئے کھڑا تھا جس نے چائے سرو کی تھی۔

امر ناتھ نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ "کرن جی! یہ کلیم الدین ہے۔ اس کا تنظیمی نام راجو ہے۔ یہ اس دھرم شالہ کے محافظ دستے کا انچارج ہے۔"

"راجو! تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

"اور راجو! یہ ہماری اعزازی سالار اعلیٰ کرن جی ہیں۔" امر ناتھ نے کلیم الدین کو مخاطب کیا۔ "اس وقت کرن جی کے چہرے پر میک اپ ہے' ممکن ہے کچھ دیر میں تم ان کا اصل چہرہ دیکھ سکو۔ ہنگامی صورت حال کا تو تمہیں علم ہی ہے۔"

کلیم الدین نے اقرار میں سر ہلایا پھر فوجی انداز میں مجھے سیلوٹ کیا۔

"آیئے کرن جی! اب واپس چلتے ہیں۔" امر ناتھ واپسی کے لئے مڑا۔

میں نے وہاں کے حفاظتی انتظامات پر اطمینان کا اظہار کیا۔ تینوں سالار اور عادل اپنے اپنے کمروں میں لباس تبدیل کرنے اور چہروں سے میک اپ ختم کرنے پہلے ہی جا چکے تھے۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مجھے بھی چہرے سے میک اپ ختم کر کے انہی سب کی طرح ہال کمرے میں پہنچنا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے بھی چہرے سے میک اپ ختم کیا اور قریب ہی سامنے کے رخ پر موجود باتھ روم کے اندر داخل ہو گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر میں صاف ستھرے باتھ روم سے باہر نکل آئی۔ اب میرے جسم پر دوسرا لباس تھا۔ میں نے ایک شلوار سوٹ پہن لیا تھا اور گلے میں دوپٹہ تھا' اوپر سے ایک کشمیری شال اوڑھ لی تھی۔ ساڑھی باندھنے کی بجائے گھر کی حدود میں مجھے یہ لباس اچھا لگتا تھا۔ قرول باغ سے میں ساڑھی باندھ کر ہی آئی تھی۔

ہال کمرے میں مجھ سے پہلے ہی تمام افراد جمع ہو چکے تھے۔ ٹیلی فون سیٹ اب میز پر اٹھا کے رکھ لیا گیا تھا۔ امر ناتھ نے ہال کمرے کا دروازہ ایک بار پھر بند کر دیا تھا۔ رات کا ایک بجنے والا تھا اور اب تک قرول باغ یا فراش خانے سے کوئی ٹیلی فون کال ریسیو نہیں ہوئی تھیں نصف شب گزر چکی تھی۔

"بندوبست تو پکا ہے نا؟" میں نے سالار اکبر کو مخاطب کیا۔ ٹیلی فون سیٹ اسی کے پاس رکھا تھا۔

"جی ہاں۔" سالار اکبر کے لہجے سے اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔ "چھاپہ پڑتے ہی اطلاع مل جائے گی۔ داؤد اور سمیع اللہ غفلت نہیں برت سکتے۔ وہ دونوں ٹھکانوں کے قریب ایسی جگہوں پر ہیں جہاں سے فون پر اطلاع دے سکیں۔" سالار اکبر نے وضاحت کی۔ یہ دونوں ہی نام میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ دونوں افراد کا تعلق سالار اکبر ہی کے شعبے سے تھا۔ سمیع اللہ کو تو میں ذاتی طور پر بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

وہ لمحات کم از کم میرے لئے بہت سنسنی خیز تھے۔ عظیم میمن کی ہر پیشگوئی اب تک سچ ثابت ہوئی تھی۔

پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بج ہی اٹھی اور سالار اکبر نے فوراً ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا' اس کا ردعمل سالار اکبر کے چہرے سے ظاہر تھا۔

"ٹھیک ہے' اگر امی کی طبیعت خراب ہے تو تم وہیں رہو۔" سالار اکبر نے یہ کہہ کر ریسیور رکھا ہی تھا کہ دوبارہ گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو!"

اس کے بعد دوسری جانب سے کی جانے والی گفتگو غور سے سنتا رہا۔

"ماتا جی پر دے کا دورہ پڑ گیا' بھگوان سہایتا (مدد) کرے گا۔ تم ان کے پاس رہو۔" سالار اکبر نے کریڈل پر ریسیور رکھ کے سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ کوئی پوچھتا' وہ خود ہی بول اٹھا۔ "ہمارے دونوں ٹھکانوں کو گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔ نیم فوجی دستے بھی پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ قرول باغ اور فراش خانے پہنچ چکے ہیں۔ اردگرد جو کوٹھیاں' حویلیاں اور مکانات ہیں' انہیں بھی محاصرے میں لے لیا گیا ہے۔ کسی ممکنہ مسلح تصادم کے پیش نظر قریبی کوٹھیوں اور مکانوں کی چھتوں پر بھی نیم فوجی

دستوں نے پوزیشن لے لی ہے۔ علاقے کے لوگوں کو تاکید کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند رکھیں۔ رفتہ رفتہ پولیس والے اور نیم فوجی دستے حلقہ تنگ کرتے جا رہے ہیں۔" سالار اکبر پُرجوش انداز میں یہ سب کچھ بتا کر خاموش ہو گیا۔

چند لمحوں کو ہال کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ حکومت کی طرف سے اتنی بڑی کارروائی کی توقع شاید کسی کو نہیں تھیں سالار وحیدالدین کا چہرہ قابل دید تھا۔

پھر اس خاموشی کو گرنجن سنگھ کی آواز ہی نے توڑا۔ "معبلہ خاتون نے نہ صرف ہم سب کی زندگی بچالی ہے بلکہ سرفروشوں کی اس تنظیم کو بھی ایک ناقابل تلافی نقصان سے بچالیا ہے۔ میں ان کی ذہانت اور عظمت کو سلام کرتا ہوں۔"

"وعلیکم السلام!" یہ کہہ کر میں دانستہ ہنس دی پھر گرنجن سنگھ سے بولی۔ "آپ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے ہیں' یقین کریں نہ میں ذہین ہوں نہ عظیم۔ یہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ میرا تجزیہ درست ثابت ہو گیا۔"

"ورنہ تو شہید ہونے میں کوئی کسرباقی نہیں رہ گئی تھی۔" عادل کہنے لگا۔ اس نے یقیناً اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس غیر معمولی فضا کو بدلنا چاہتی ہوں۔ اس کے لہجے میں شوخی سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

"تمہیں غازی ہونے کی کوئی خوشی نہیں؟" میں نے بدستور ہنستے ہوئے عادل کو مخاطب کیا۔

"کیوں نہیں' مگر یہاں میرے بڑے موجود ہیں اس لئے کھل کر خوشی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ حدِ ادب اس کی اجازت نہیں دیتی۔"

"کوئی کام بغیر اجازت بھی کر لیا کرو۔ کیوں گرنجن سنگھ جی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

"آپ اور کوئی بات غلط کہہ دیں' یہ کس طرح ممکن ہے؟ اگر آپ مجھ سے اس وقت یہ کہہ دیں کہ رات نہیں، دن ہے تو میں یقین کر لوں گا۔"

"شاید اس لئے کچھ لوگوں کو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔" سالار اکبر بھی ذہین آدمی تھا۔ اس نے بھی غالباً میری گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان باتوں سے میرا اصل مقصد کیا ہے۔ وہ گرنجن سنگھ سے ہم کلام تھا۔ "گرنجن سنگھ جی! بولئے ایسا ہو سکتا ہے نا؟"

"کیسا ہو سکتا ہے؟ میں تو کچھ نہیں سمجھا' بات کچھ ہو رہی تھی' آپ جانے کہاں سے تارے توڑ لائے۔"

"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔" سالار اکبر دھیرے سے بولا۔ اس نے موقع کی مناسبت سے مرزا غالب کی غزل کا ایک مصرع پڑھا تھا۔

"لیکن میں تو سمجھنا چاہتا ہوں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ اگر معبلہ خاتون کہہ دیں کہ اس وقت دن ہے تو آپ یقین کر لیں گے؟"

"تو پھر' کیا آپ یہ چاہتے ہیں نہ کروں یقین؟ یقین کرنے سے دن میں تارے نظر آنے کا کیا تعلق؟"

"بہت گہرا تعلق ہے' اگر آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"نہیں' میں اس طرح نہیں مانوں گا' آپ مجھے سمجھائیں پہلے۔" گرنجن سنگھ بضد ہو گیا۔ "اچھی خاصی سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی' آپ نہ جانے کہاں کی اڑانے لگے۔"

"میں تو خیر سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہوں' ہاں آپ ضرور کچھ غیر سنجیدہ لگ رہے ہیں کہ میری بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔" سالار اکبر بدستور گرنجن سنگھ کو تختہ مشق بنائے رہا۔ "جس طرح معبلہ خاتون کے کہنے سے آپ رات کو دن ماننے کے لئے تیار ہیں' کیا اسی طرح دن کو رات تسلیم نہیں کر لیں گے؟"

"بالکل تسلیم کر لوں گا' اس میں آخر پوچھنے کی کیا بات ہے؟"

"جب آپ دن کو رات مان لیں گے تو کیا آپ کو دن میں تارے نظر نہیں آئیں گے؟" سالار اکبر کسی ماہر وکیل کی طرح جرح کر رہا تھا۔

"اب آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔ کیا آپ کے خیال میں مجھے اردو بالکل نہیں آتی؟ میں دن میں تارے نظر آنے کا مطلب نہیں سمجھتا؟"

"تو پھر آپ کیوں مطلب سمجھنا چاہ رہے تھے؟"

"اس لئے بندہ نواز کہ مجھے دن میں تارے نظر نہیں آتے بلکہ میں دوسروں کو دن میں تارے دکھا دیتا ہوں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے گرنجن سنگھ جی کہ آدمی کو جو خود دکھائی دے وہ دوسروں کو بھی دکھا دے۔"

"آپ سے تو بس خدا ہی سمجھے۔" گرنجن سنگھ نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔ "آپ تو اچھے بھلے آدمی کو.........."

"چکر گھنی بنا دیتے ہیں' شاید آپ یہی کہنا چاہتے ہیں۔"

"کچھ نہیں کہنا چاہتا میرے بھائی! کچھ نہیں۔ اللہ کے واسطے معاف کر دیں مجھے۔"

میں بہت دیر سے میں ہنسی روکے ہوئے تھی' اب ہنسی چھوٹ ہی گئی۔ عادل بھی ہنس پڑا۔

"لو جی جب سب ہنس رہے ہیں تو ہم بھی ہنس ہی دیتے ہیں۔" گرنجن سنگھ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

اس پر امرناتھ اور سالار وحیدالدین بھی ہنس دیئے۔ سالار اکبر تو پہلے ہی سے ہنس رہا تھا۔ یوں کچھ دیر ہنسنے بولنے سے سبھی کے چہروں پر رونق نظر آنے لگی۔ میں نے گرنجن سنگھ سے کہا۔ "اب آئندہ کے لئے یہ بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ ہرگز میری ذہانت اور عظمت کو سلام نہیں کریں گے ورنہ جواب میں ہمیشہ آپ کو وعلیکم السلام ہی سننے کو ملے گا۔ پھر ذرا ان کی موجودگی کا بھی خیال رکھا کریں' ایسے مواقع پر۔" میں نے مسکراتے ہوئے سالار اکبر کی طرف اشارہ کیا۔

"بجا فرمایا آپ نے۔" گربچن سنگھ سعادت مندی سے بولا۔ "انہیں تو میں خوب جانتا ہوں۔"

"لوگ جان کر بھی تو انجان بن جاتے ہیں۔" سالار اکبر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"جناب! ہم ان میں سے نہیں ہیں۔"

فضا قدرے بدلی تو سالار وحیدالدین مجھ سے کہنے لگا۔ "سالار اکبر کیونکہ ابتدا ہی سے آپ کے قریب رہے ہیں اس لئے یہ مجھ سے بہتر طور پر آپ کو سمجھتے ہیں۔ آپ کا تجزیہ حیرت انگیز طور پر صحیح نکلا۔ مجھے واقعی اندازہ نہیں تھا کہ جس ٹھکانے کو میں انتہائی محفوظ سمجھ رہا تھا' وہ اتنا غیر محفوظ ثابت ہو گا۔"

اس موضوع پر مزید کچھ دیر گفتگو ہوئی' پھر وہ محفل برخاست ہو گئی۔

☆======☆======☆

میں نے خود کو اس نئے ماحول سے ایڈجسٹ کر لیا۔ تین چار دن تک حکومت کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچتی رہی۔ بے گناہوں کو پکڑ پکڑ کر جیلوں میں ٹھونسا جاتا رہا اور ظلم و ستم کا بازار گرم رہا۔ پولیس' سی آئی ڈی اور حکومت کی دیگر ایجنسیوں میں تنظیم کے جو ارکان تھے' ان کے ذریعے تمام رپورٹس ملتی رہیں۔ اسی کے ساتھ خود تنظیم میں حکومت کے مخبروں کی تلاش جاری۔ رفتہ رفتہ حالات معمول پر آنے لگے۔ تنظیم کی سرگرمیاں یکسر ختم کر دی گئیں۔ جو لوگ باہر تھے' وہ بھی روپوش ہو گئے۔

تقریباً ایک ڈیڑھ ہفتہ مکمل خاموشی سے گزر گیا تو میں نے طے شدہ منصوبے کے مطابق دہلی سے باہر نکلنے کا پروگرام بنایا۔ کویتا اب تک غائب تھی۔

تمام ضروری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو میں ٹرین کے ذریعے غازی آباد پہنچ گئی۔ عادل میرے ساتھ تھا۔ بقیہ افراد ہم سے پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے۔ توقع کے مطابق ہمیں دہلی سے نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایمونیشن ڈپو کو اڑانے کے لئے میں نے جو طریقہ کار پہلے وضع کیا تھا' اس میں بھی اب خاصی تبدیلیاں کر دی تھیں۔

نواب زادہ ابراہیم خاں دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی' چالیس بیالیس کے درمیان ہو گا۔ غازی آباد میں وہی ہمارا میزبان تھا۔ ہم اسی کی حویلی میں ٹھہرے تھے۔ گربچن سنگھ کی طرح نواب زادے کو بھی وقت بے وقت اپنی مونچھوں سے کھیلنے کا شوق تھا۔ وہ تنظیم کے بہی خواہوں میں سے تھا پھر بھی اسے اصل منصوبے کی ہوا نہیں لگنے دی گئی تھی۔ خود اس کا مزاج بھی زیادہ "کرید بن" کا نہیں تھا۔ اسے تو آئے دن مرغابیوں اور کالے تیتر کے شکار سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس سلسلے میں وہ اِدھر اُدھر دھاوے بھرتا رہتا تھا۔ جب کوئی ہرن یا نیل گائے شکار کر لاتا تو سمجھتا کارنامہ سرزد ہو گیا ہے۔ ہم جس شام غازی آباد پہنچے نواب زادہ ہرن مار کے لایا تھا۔ وہ شکار سے لوٹا تھا اور ہمیں "شکار" پر جانا تھا۔ اپنا اپنا شوق جو ٹھہرا۔ رات کے کھانے پر ہماری تواضع ہرن کے کبابوں سے ہوئی۔ نواب زادہ بھی ہمارے ساتھ ہی براجمان تھا۔ اس کا موضوع گفتگو شکار ہی تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے سالار اکبر سے کہا۔

"ایک نوالہ ستر کا' برادر عزیز۔"

"برادر عزیز" بھی کم "حضرت" نہیں تھا' کہنے لگا۔ "ایک تو ہرن کے کباب یوں بھی لذیذ ہوتے ہیں پھر ہرن آپ کی گولی کھا کے گرے تو اس کا گوشت مزید خوش ذائقہ ہو جاتا ہے۔ پہلے بھی مجھے اس کا کئی بار تجربہ ہو چکا ہے۔"

"اچھا خیر یہ بتایئے' اس مرتبہ تو ہفتے دو ہفتے قیام کریں گے نا؟ یا پہلے کی طرح دو تین دن بعد ہی واپسی کے لئے کہنا شروع کر دیں گے۔ کل میں آپ کو اور آپ کے دوستوں کو تیتر کھلواؤں گا۔ یہ عزیزہ کرن بھی یقیناً لطف اندوز ہوں گی جو پہلی بار یہاں آئی ہیں۔"

"تیتر ادھار!" سالار اکبر مسکرایا۔ "کیونکہ کل ہی واپسی کا پروگرام ہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"بات ہے نا' کچھ ضروری کام ادھورے چھوڑ آیا ہوں' دہلی میں' وہ نمٹانے ہیں۔"

"کام تو خیر چلتے ہی رہتے ہیں' آدمی کو آرام بھی کرنا چاہئے۔"

"مجبوری ہے ورنہ آپ کی بات ٹالنے کی ہمت کر سکتا ہوں۔" سالار اکبر بولا۔ "آرام اور آؤٹنگ کے خیال ہی سے تو اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر ادھر آیا تھا۔"

"صرف ایک دن کے لئے؟" اچھا آرام ہے ماشاء اللہ.........

"ایک دن کہاں' دو دن ہوئے نا۔ ایک آج کا دن' ایک کل کا۔"

"زیادہ نہیں بہت ہی کم گنے دو دن' آپ کو تو اس وقت سے دنوں کا شمار کرنا چاہئے جب دہلی سے یہاں آنے کے بارے میں سوچا تھا۔"

"نواب زادہ صاحب! دنوں کے شمار میں اکثر بھائی اکبر سے غلطی ہو جاتی ہے۔" گربچن سنگھ نے موقع غنیمت جان کر "گرہ" لگائی۔

"جی ہاں' سردار جی اس معاملے میں خاصے تجربہ کار ہیں۔"

میں بھی کیونکہ وہاں موجود تھی اس لئے نواب زادے نے شکار کے قصے چھیڑ دیئے۔ کھانا کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ چائے بھی چل چکی تھی مگر شکار کے قصے ختم نہیں ہوئے تھے۔ عادل میرے قریب ہی بیٹھا تھا' دھیرے سے بولا۔ "کھانس دوں؟"

"کھانسنے کے لئے برادر عزیز کافی ہیں' تم خاموش بیٹھو۔" میں نے سرگوشی کی۔

سالار اکبر تیز آدمی تھا' سمجھ گیا کہ ہم سب بور ہو رہے ہیں۔ اس نے ان طولانی قصوں سے ہماری جان چھڑانے کی ایک ترکیب نکال ہی لی۔ ایک قصے کا "اینڈ" چل رہا تھا کہ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے نواب زادے کو دوسرا قصہ چھیڑنے کی مہلت نہ دی اور بول اٹھا۔ "اگر اجازت ہو تو شکار ہی سے متعلق ایک واقعہ میں بھی عرض کروں؟"

"نیا ہونا چاہئے۔" نواب زادہ نے شرط لگائی اور گاؤ تکیئے سے ٹیک لگا کر حقے کی نے ہونٹوں سے لگا لی۔

"بالکل نیا۔" سالار اکبر نے یقین دلایا۔ "یہ ملحوظ رکھیے گا کہ اس واقعے سے خدانخواستہ آپ کا کوئی

تعلق نہیں۔"

"قبل از وقت صفائی کی ضرورت نہیں' آپ واقعہ بیان فرمائیے۔" نواب زادہ چوکنا ہو گیا۔ وہ یقیناً سالار اکبر کی افتادِ طبع سے واقف ہو گا۔

"یہ ایک راجہ صاحب کا واقعہ.........."

"اماں لاحول پڑھیے! یہ راجہ مہا راجہ بھلا ہمارا کیا مقابلہ کریں گے۔" نواب زادہ نے بات کاٹ دی۔

"آپ سنئے تو سہی بڑا ہی دلچسپ واقعہ ہے۔" سالار اکبر نے اصرار کیا تو نواب زادہ واقعہ سننے پر راضی ہو گیا۔ "تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ راجہ صاحب کے پاس تلاش روزگار میں ایک ذہین آدمی پہنچا۔ راجہ صاحب نے اس سے پوچھا تم کیا کام جانتے ہو؟ ذہین آدمی کو معلوم تھا کہ راجہ صاحب شکار کے بہت رسیا ہیں' اسی کے ساتھ یہ کہ لپاڑیئے بھی ہیں' چھوڑتے بہت ہیں۔ سو اس نے سوال کے جواب میں کہا کہ حضور! میں باتوں کا رفوگر ہوں۔ راجہ صاحب بھانپ گئے کہ آدمی کام کا لگتا ہے' اسے اپنا مصاحب رکھ لیا۔ حسب معمول ایک رات راجہ صاحب کی محفل جمی ہوئی تھی۔ کچھ مہمان بھی آئے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب اپنے ایک شکار کا قصہ سنانے لگے۔ وہ بولے کہ میں نے چلائی جو گولی تو ہرن کے ایک پیر کو چھیدتی ہوئی' اس کے کان میں سے نکل گئی۔ یقین نہ ہو تو خاں صاحب سے پوچھ لیں۔ یہ بھی اس روز میرے ساتھ تھے۔ راجہ صاحب نے اس ذہین آدمی کی طرف اشارہ کیا جسے باتوں کی رفوگری پر ملازم رکھا تھا۔ حاضرین محفل اور مہمان' خاں صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گولی پیر پر لگے اور کان میں سے نکل جائے؟ امتحان کی گھڑی آ پہنچی تھی۔ خاں صاحب کو رفوگری کا ہنر دکھانا تھا' بولے' جی ہاں راجہ صاحب بالکل صحیح فرما رہے ہیں۔ میں تو خود اس واقعے کا چشم دید گواہ ہوں۔ ہرن اس وقت پیر سے اپنا کان کھجا رہا تھا۔ گولی پیر کو چھیدتی ہوئی کان میں سے گزر گئی۔ غرض کہ باتوں کی رفوگری جاری رہی۔ راجہ صاحب ایک سے ایک نئی چھوڑتے اور خاں صاحب غریب اپنی نوکری بچانے کی خاطر کسی نہ کسی طرح راجہ صاحب کی بات کو سچ ثابت کر دیتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر خاں صاحب بری طرح پھنس گئے۔ راجہ صاحب نے اہل محفل کے سامنے فرمایا' مرغابی بہت اونچی اڑ رہی تھی مگر مجھ سے بچ کر کیسے نکل جاتی۔ بھون ڈالا میں نے اسے۔ نیچے آتے آتے کباب ہو گئی۔ وہ کباب بڑے خوش ذائقہ تھے۔ یقین نہ ہو تو خاں صاحب سے پوچھ لیں .... انہوں نے تو کباب کھائے تھے۔ خاں صاحب کے پسینے چھوٹ گئے .... آخرکار ایک راستہ نکال ہی لیا' کہنے لگے کہ ایک چیل کہیں سے کبابوں کا دونا جھپٹ لائی تھی کیونکہ وہ بہت بلندی پر محو پرواز تھی اس لئے راجہ صاحب اسے مرغابی سمجھے۔ فائر ہوتے ہی چیل تو ہوا ہو گئی البتہ کبابوں کا دونا اس کے پنجوں سے نکل کر نیچے آ گرا۔ تنہائی میں راجہ صاحب نے خاں صاحب کی بڑی تعریف کی کہ واقعی آپ بڑے لائق و فائق آدمی ہیں۔ خاں صاحب بولے' حضور والا! میں رفوگر ہوں' کسی سوراخ کی رفوگری تو کر سکتا ہوں مگر پیوند کاری میرا منصب نہیں' سو اجازت چاہتا ہوں۔"

پھر اس سے پہلے کہ ہم لوگ اپنی ہنسی روکنے میں ناکام ہو جاتے' نواب زادہ ابراہیم خاں اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے بھی اب اجازت دیجئے۔"

ادھر نواب زادہ مہمان خانے سے نکلا ادھر گرچن سنگھ زور سے ہنس پڑا۔

ہمیں دس بجے تک حویلی سے نکل جانا تھا اور ساڑھے نو بج چکے تھے۔ سالار اکبر نے اس سے پہلے ہی نواب زادہ کو "ناک آؤٹ" کر دیا تھا۔ دہلی کی نسبت غازی آباد سے ایمونیشن ڈپو زیادہ قریب تھا۔ پوری پلاننگ دہلی ہی میں کر لی گئی تھی۔ تمام مطلوبہ اشیاء ہمارے ساتھ تھیں جب ہم ایک کار میں مقررہ وقت پر غازی آباد سے روانہ ہوئے۔ چاروں کمانڈوز کو راجندر کی رہنمائی میں ضروری سامان کے ساتھ پہلے ہی روانہ کر دیا گیا۔ وہ کھانا کھاتے ہی میرا اشارہ پا کر اٹھ گئے تھے۔ دو نقشے بنائے گئے تھے جن میں سے ایک راجندر کے پاس تھا۔

ایمونیشن ڈپو عام گزرگاہ سے ہٹ کر جنگل میں ایک مقام پر تھا۔ راجندر اور اس کی پارٹی کو جنگل میں پہنچ کر میری ہدایات پر عمل کرنا تھا۔ اس پارٹی کو اسی لئے پہلے بھیجا گیا تھا۔ ہمیں بعد میں وہاں مقررہ وقت اور نقشے کے مطابق طے شدہ مقام پر پہنچنا تھا۔

میں نے امرناتھ کی دھرم شالہ میں بیکار وقت نہیں گزارا تھا۔ سالار اکبر کے شعبے میں ایک ایسا رکن بھی تھا جو نقشہ نویسی میں مہارت رکھتا تھا۔ اسی نے سالار اکبر اور چند ارکان کی مدد سے ایمونیشن ڈپو اور گرد و نواح کے دو نقشے بنائے تھے۔ یہ چند ارکان وہ تھے جنہوں نے اس ڈپو کا سراغ لگایا تھا۔ ان نقشوں کو دیکھ کر میں نے اپنے پلان میں ضروری ترامیم کی تھیں۔ جہاں اسلحہ اور گولہ بارود ذخیرہ کیا گیا ہو' ایسی کسی جگہ کو تہہ و بالا کر دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اس کوشش میں میری پوری ٹیم کے ارکان بھی مارے جا سکتے تھے۔ یہ بہرحال انتہائی خطرناک کام تھا۔ تفصیلات کے مطابق وہاں ملٹری کا سخت پہرا تھا۔ ڈپو کے قریب کسی کا پہنچنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ترین ضرور تھا۔ اگر جان پر کھیل کر میری ٹیم کے ارکان وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں اس کے باوجود مایوس نہیں تھی۔ میری ٹیم میں جو لوگ شامل تھے' ان میں سے صرف سالار اکبر ڈپو کے محل وقوع سے واقف تھا۔ ڈرائیونگ پر عادل اور اس کے برابر سالار اکبر کار میں بیٹھا تھا۔ میں' گرچن سنگھ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر تھی۔

ہماری کار سڑک سے اتر کر کچھ دیر تک ناہموار کچے راستوں پر سفر کرتی رہی' پھر جنگل کی حدود شروع ہو گئیں۔ کار کو ایک جگہ روک دیا گیا اور ہم چاروں سامان کے تھیلے لئے اتر گئے۔ تھیلے ہماری پشت سے بندھے تھے' شانوں سے رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ بوقت ضرورت استعمال کے لئے ہماری جیبوں میں "خاموش موت" بھی تھی۔ ہم کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ صرف ایک پنسل ٹارچ جلائی گئی تھی۔ یہ ٹارچ سالار اکبر کے ہاتھ میں تھی۔ میں اسی کے ساتھ آگے تھی' گرچن سنگھ اور عادل پیچھے تھے۔ ہم ہر قدم بہت احتیاط سے اور سنبھل سنبھل کے اٹھا رہے تھے۔

میرے ترمیم شدہ پلان میں مرکزی حیثیت صرف ایک شے کو حاصل تھی۔ سب سے مشکل مرحلہ اس شے کو بحفاظت دہلی سے نکال لے جانا تھا۔ اس شے کے حصول اور تیاری میں گرچن سنگھ کا بہت بڑا

ہاتھ تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ فوجی ہونے کے علاوہ اچھا انجینئر بھی تھا۔ فوج میں وہ اسلحہ سازی کے شعبے ہی سے متعلق رہا تھا۔ گربچن سنگھ کے متعلق جب مجھے ان تفصیلات کا علم ہوا تو میرا ذہن ایک نئے راستے پر لگ گیا۔ اسی کے بعد میں نے اپنے گزشتہ پلان میں ترامیم کیں۔

جنگل میں رات کے وقت سمت کا تعین مشکل سے ہوتا ہے' سو سمت پیا بھی ساتھ تھا۔ ہم صحیح سمت میں سفر کرتے ہوئے آخرکار کمانڈوز تک پہنچ گئے۔ وہ توقع کے مطابق اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایمونیشن ڈپو وہاں سے بہت دور تھا۔ ہم چاروں بھی اپنا اپنا سامان ایک طرف رکھ کر ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔

غازی آباد سے کار میں اور پھر پیدل سفر تقریباً پون گھنٹے کا تھا۔ ہم گیارہ بجے سے کوئی بیس پچیس منٹ پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ کمانڈوز ہم سے ڈھائی گھنٹے پہلے غازی آباد سے چلے تھے۔ ہم اپنے ساتھ تھیلوں میں جو بھاری سامان مختلف پارٹس کی صورت میں وہاں تک لائے تھے' وہ بھی نکال لیا گیا۔

رات کو ایک بجے تک ہم اپنا کام ختم کر چکے تھے۔ سالار اکبر نے نقشہ زمین پر پھیلا دیا اور عادل ٹارچ سے اس پر روشنی ڈالنے لگا۔

"ہم اس وقت یہاں ہیں۔" سالار اکبر نے نقشے پر ایک جگہ کی نشاندہی کی۔ اس جگہ کو سبز رنگ کے ایک دائرے سے نمایاں کیا گیا تھا۔

"اور یہ جو سرخ دائرہ ہے' یہ ایمونیشن ڈپو ہے۔" میں بھی بول اٹھی۔ میرے دائیں بائیں راجندر اور گربچن سنگھ کھڑے تھے۔ میرا مقصد کمانڈوز کو آگاہ کرنا تھا۔ منصوبے کے اس آخری مرحلے سے انہیں پہلی بار آگاہ کیا جا رہا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ "ہمیں اس پیلے دائرے تک پہنچنا ہے۔" میں نے سرخ اور سبز دائرے کے درمیان پیلے دائرے کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم اس سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ یہاں سے ایمونیشن ڈپو کی عمارت ہماری رینج میں ہو گی۔ تم لوگ سمجھ رہے ہو؟"

"جی' کرن جی!" طفیل نے اپنے ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے میرے سوال کا جواب دیا۔

"بقیہ ہدایات وہی ہیں جو پہلے ہی دی جا چکی ہیں تم لوگوں کو یاد ہیں؟"

"جی ہاں' مجھے اور طفیل کو بائی روڈ یہاں سے بریلی کے ایک قصبے آنولہ پہنچنا ہے۔ کار ہمیں بریلی ہی میں چھوڑ دینا ہے۔" راجندر نے بتایا۔ "اپنے بقیہ دونوں ساتھیوں کو ہم راستے میں کسی ایسی جگہ اتار دیں گے جہاں سے یہ دونوں بلند شہر جا سکیں۔"

"تم میں سے کسی کو بھی دو ہفتے سے پہلے دہلی کا رخ نہیں کرنا ہے۔" میں نے یاددہانی کرائی۔ "تم چاروں ایک ساتھ دہلی میں داخل نہیں ہو گے' ایک ایک کر کے پہنچو گے۔ کوئی سوال؟"

"جی نہیں کرن جی! ہمیں ہر بات یاد ہے۔ سب کچھ حکم کے مطابق ہو گا۔"

"تو پھر چلتے ہیں۔" میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

سالار اکبر نے نقشہ لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی محنت و مشقت کے بعد ہم نشان زد "پیلے دائرے" تک پہنچ گئے۔ خطرے کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔ ہم نسبتاً ایک بلند مقام پر

تھے۔ جنگل میں وہ چھوٹا سا ایک ٹیلا تھا۔ درختوں کا سلسلہ اس ٹیلے تک آ کر ختم ہو گیا تھا۔ اس ٹیلے کے بعد بھی کبھی درخت رہے ہوں گے جو غالباً کاٹ دیئے گئے تھے۔ اس کی وجہ یہی ممکن تھی کہ دور دور تک دیکھا جا سکے۔

جنگل کے بیچوں بیچ جیسے دن نکلا ہوا تھا۔ ایمونیشن ڈپو کی عمارت ہمیں واضح نظر آ رہی تھی۔ عمارت کے گرداگرد خاصے فاصلے پر خاردار آہنی تاروں کی باڑ تھی۔ عمارت کا وہ سامنے کا رخ تھا۔ خاردار تاروں اور عمارت کے درمیان جو فاصلہ تھا وہاں کوئی فوجی نہیں تھا' لیکن وہ حصہ بھی روشن تھا۔ مسلح فوجیوں کا ایک دستہ عمارت کے سامنے مستعد و چوکنا ہو کر پہرا دے رہا تھا۔ یہی بندوبست دائیں اور بائیں پہلوؤں پر نظر آ رہا تھا۔ عمارت کی عقبی سمت ہماری نظروں سے اوجھل تھی' مگر قیاس یہی تھا کہ ادھر بھی کوئی مسلح دستہ ہو گا۔ ٹیلے تک روشنی نہیں پہنچ رہی تھی' پھر بھی ہم چوکنا اور محتاط تھے۔ فوجیوں تک ہماری آوازیں پہنچنا بھی ناممکن تھا' اس کے باوجود ہم دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ اپنے ہدف کا پوری طرح جائزہ لے کر میں نے گربچن سنگھ کو اشارہ کیا۔ اس نے کمانڈوز کو سرگوشیوں میں ہدایات دیں۔

چھوٹی سی ایک توپ کا رخ ایمونیشن ڈپو کی طرف ہو گیا۔ اسی کو مختلف پارٹس کی صورت میں دہلی سے غازی آباد اور پھر وہاں سے یہاں تک لانے کے لئے ہم نے اتنے پاپڑ بیلے تھے۔ انہی پارٹس کو جوڑنے میں ہمیں گھنٹوں لگے تھے۔ ٹیلے پر توپ کو چڑھانے اور پھر اس کے لئے ہموار جگہ بنانے میں ہمیں خاصی دشواری ہوئی تھی اور مشقت بھی کرنا پڑی تھی لیکن ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔

ایمونیشن ڈپو کی عمارت اب توپ کے نشانے پر تھی۔ گربچن سنگھ نے آخری بار جائزہ لیا۔

"آپ پوری طرح مطمئن ہیں؟" میں نے گربچن سنگھ سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" گربچن سنگھ کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"فائر۔" میں نے حکم دیا۔

توپ کے دہانے سے گولہ نکلا اور زبردست دھماکہ ہوا پھر دوسرا اور تیسرا دھماکہ۔

میں نے ایمونیشن ڈپو کی عمارت کو کسی کھلونے کی طرح ٹوٹ کر بکھرتے دیکھا۔ اس کے بعد میں بھی ٹیلے کے دامن میں سینے کے بل لیٹ گئی اور اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ میری ٹیم کے تمام افراد پہلے ہی ٹیلے سے اتر آئے تھے۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے یوں لگا جیسے زمین ہل رہی ہو اسی کے ساتھ خوفناک دھماکے سنائی دینے لگے۔ ایمونیشن ڈپو کے گولہ بارود میں آگ لگ چکی تھی اور گولے پھٹ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ جن فوجی دستوں کو میں نے عمارت کے گرد حرکت کرتے دیکھا تھا' ان کے جسم چیتھڑوں کی صورت میں بکھر گئے ہوں گے۔ انہیں تو خبر بھی نہ ہو گی کہ موت ان کے کتنے قریب پہنچ چکی ہے۔ آدمی بھی کتنا بے خبر اور کمزور ہے کہ پل بھر میں بکھر جاتا ہے' پھر بھی زمین پر اترا کے چلنے سے باز نہیں آتا۔

وہ قیامت خیز تباہی خاصی دیر تک جاری رہی' مگر ہم نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔

میں چونکی اس وقت جب تپش محسوس ہوئی۔ جنگل میں آگ لگ گئی تھی۔ ایمونیشن ڈپو تباہ ہو چکا

تھا، مگر اسی کے ساتھ اس نے دور دور تک تباہی پھیلا دی تھی۔ ابھی ایک کام اور باقی رہ گیا تھا۔ میں اپنے پیچھے کوئی سراغ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی آگ کے اور ہمارے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ سو میرے حکم پر آخری کام بھی انجام دیا جانے لگا۔ توپ کو ڈائنامائٹ سے اڑا دیا گیا۔

اگر ہمارے پاس اس علاقے کا نقشہ نہ ہوتا تو شاید جنگل میں بھٹک کر شعلوں کی نذر ہو جاتے۔ جنگل کی آگ بہت تیزی سے پھیلتی ہے لیکن ہم نے بھی سست رفتاری کا ثبوت نہیں دیا۔ واپسی میں ہمارے پاس وزن بھی نہیں تھا اس لئے ہم آگے سے بچتے بچاتے نکل ہی گئے۔ کمانڈوز کی کار بھی ہماری کار سے زیادہ دور نہیں تھی۔ انہوں نے بھی جنگل میں گھستے ہی ہدایت کے مطابق کار درختوں کے درمیان کھڑی کی تھی کہ واپسی میں دشواری نہ ہو۔

کمانڈوز کی کار کو ہم نے آگے جانے دیا۔ ان میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ ہماری منزل کون سی ہے۔ ہم غازی آباد واپس جائیں گے یا کہیں اور۔ اتنا اندازہ بہرحال انہوں نے لگا ہی لیا ہو گا کہ ہم کم از کم ابھی دہلی کا رخ نہیں کریں گے۔

صبح کے آثار ابھی نمودار نہیں ہوئے تھے کہ ہم نواب زادہ ابراہیم خاں کی حویلی میں واپس پہنچ گئے۔ تھکن اور نیند سے برا حال ہو رہا تھا، مگر ہم زیادہ دیر رکے نہیں۔ موقعہ واردات سے ہم جلد از جلد دور نکل جانا چاہتے تھے۔ مہمان خانہ حویلی کے الگ حصے میں تھا۔ نواب زادہ سے سالار اکبر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں کسی ملازم یا خدمت گار کی ضرورت نہیں۔ ہم نے لباس تبدیل کر کے اپنے چہروں پر میک اپ کئے اور پھر کار میں قریبی شہر علی گڑھ کے لئے روانہ ہو گئے۔ مہمان خانے میں سالار اکبر نے نواب زادہ کے نام مختصر سا ایک پیغام چھوڑ دیا تھا۔ "اس وقت ذرا جلدی میں رخصت ہو رہا ہوں، پھر کبھی فرصت سے آؤں گا۔ آپ کا برادر عزیز۔" یہ پیغام اس نے میرے ہی سامنے ایک کاغذ پر لکھا تھا۔ نواب زادہ کے لئے شاید یہ کوئی نئی بات نہیں ہو گی کہ سالار اکبر اس سے ملے بغیر چل دیا تھا۔ جب وہ تنظیم کی مالی امداد کرنے والوں میں سے ایک تھا تو اسے کسی ایمرجنسی کا بھی اندازہ ہو سکتا تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہم علی گڑھ کی حدود میں داخل ہوئے اور گرچن سنگھ کو ریلوے اسٹیشن کے سامنے اتار دیا۔ اسے علی گڑھ سے ٹونڈلے جانا تھا جو علی گڑھ کے بعد دوسرا ریلوے اسٹیشن ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ابھی تک عادل ہی بیٹھا تھا۔ گرچن سنگھ ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو گیا تو عادل نے کار اسٹارٹ کر دی۔

"اچل تلاؤ دیکھا ہے نا؟ رستہ یاد ہے؟" سالار اکبر نے عادل سے پوچھا۔ وہ آگے ہی بیٹھا تھا۔

"ادھر آئے عرصہ دراز ہو گیا کچھ ذہن میں نہیں۔" عادل نے جواب دیا۔

"اچھا کار ایک طرف روکو، اب میں کار ڈرائیو کروں گا۔ تم کرن جی کے ساتھ پیچھے بیٹھو۔"

عادل کار روک کر اتر گیا اور پیچھے آ بیٹھا۔ ذرا ہی دیر بعد کار چل دی۔ ایک سڑک سے کار گزر رہی تھی کہ اچانک عادل بول اٹھا۔ "یاد آ گیا' یہ کتے کی قبر ہے۔"

"کتے کی قبر؟" میں حیرت سے بولی حالانکہ عادل مجھ سے نہیں سالار اکبر سے مخاطب تھا۔

"جی ہاں' اس علاقے کا نام یہی ہے۔" سالار اکبر نے ہنستے ہوئے بتایا۔ "یہاں ایک انگریز کا کتا دفن ہے۔ آدمیوں کی جگہ اسے کتے بہت پیارے تھے۔ اس نے یہاں اپنے پیارے کتے کی قبر بنوا دی۔ کتے کی قبر ذرا عجیب سی بات تھی اس لئے جب یہاں قبر کے اردگرد آبادی ہو گئی تو اس علاقے کا نام یہی پڑ گیا۔"

"کتوں کی تو قبریں تک بنوا دیتے ہیں اور انسانوں کو مار کر کتوں کی طرح پھینکتے ہوئے انہیں شرم نہیں آتی۔" عادل نے مجھ سے کہا۔

"خود بھی کتے جو ہوئے۔ کتوں کو تو کتے ہی پیارے ہوں گے۔" سالار اکبر بولا' پھر عادل سے کہنے لگا۔ "سید صاحب سے میرا سلام ضرور کہہ دینا۔"

"تو کیا سید صاحب بھی آپ کے دوستوں میں سے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی نہیں' وہ ان موصوف کے نانا ہیں جو آپ کے پاس بیٹھے ہیں۔ ان سے بس ایک مرتبہ میری ملاقات ہوئی ہے' وہ بھی اس وقت جب جلالی سے علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ میں دہلی سے یہاں کچھ دن کو آیا تھا۔ نواب صاحب حبیب گنج کی کوٹھی میں ایک تقریب تھی' وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ پنڈت جی بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے ہی ملوایا تھا۔ انہیں آپ تنظیم کے بہی خواہوں میں شمار کر سکتی ہیں۔ بھلے آدمی ہیں۔" سالار اکبر نے تفصیل سے بتایا۔

"اچھا اب میں سمجھ گئی کہ پنڈت جی نے جلالی ہی چلنے کا مشورہ کیوں دیا تھا؟" میں مسکرائی۔ "موجودہ مہم کے دوران میں انہیں پہلے سے اندازہ ہو گا کہ نانی یاد آ جائیں گی۔"

سالار اکبر کی موجودگی میں عادل جوابی کارروائی نہیں کر سکتا تھا اس لئے میں نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا تھا۔

اچل تلاؤ پر ہمیں اتار کر سالار اکبر آگے بڑھا تو عادل نے مجھ سے کہا۔ "آیئے مسمات تمیزن! ادھر یکے کھڑے ہیں۔"

"تمیز سے بات کرو' مجھے یہ نام ہرگز پسند نہیں۔" میں اپنے سر پر چادر درست کرتے ہوئے بولی۔

"تو کوئی اور اچھا سا نام رکھ لیتے ہیں۔" وہ آگے بڑھا۔ میرا سوٹ کیس بھی اسی نے اٹھا رکھا تھا۔

"کرن ہی ٹھیک ہے۔ تم نے جو نام بدلنے کی تجویز پیش کی تھی مسترد۔"

ہماری بائیں جانب ایک تالاب تھا۔ اسی کو اچل تلاؤ کہا جاتا تھا۔ وہیں دائیں جانب ذرا آگے یکے کھڑے تھے۔ یکے والے "جلالی جلالی" کی صدائیں لگا رہے تھے۔ ہم ایک یکے میں بیٹھ گئے۔ عادل نے یکے والے سے چلنے کو کہا تو وہ بولا۔ "ابھی تو اور سواریوں کی گنجائش ہے' جلدی ہے تو کسی اور یکے میں بیٹھ جائیں۔"

یکے والا بقیہ سواریوں کے پیسے بھی ہم سے "چھیل" کر چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ سو یوں ہم جلالی کے لئے روانہ ہو گئے۔ جلالی' علی گڑھ ہی کا چھوٹا سا ایک قصبہ تھا جہاں سادات کی اکثریت تھی۔ ہمیں دہلی سے دور وہیں چند قیام کرنا تھا۔ سالار اکبر کو بھی علی گڑھ سے مراد آباد جانا تھا۔

میرے ہی ایما پر یہ احتیاطی تدبیر اختیار کی گئی تھی کہ مہم میں شامل افراد ایمونیشن ڈپو کی تباہی کے

بعد مختلف علاقوں میں نکل جائیں' پھر جب کچھ دن گزر جائیں تو واپس دہلی پہنچیں۔ سب کچھ پہلے ہی طے ہو چکا تھا جس پر عمل کیا جا رہا تھا۔

حکومت پر جو یہ کاری ضرب لگائی گئی تھی' اس کا ردعمل شدید ہوتا۔ عیار و شاطر حکمرانوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوتا کہ ایمونیشن ڈپو کو تباہ کرنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ وہ اسے ہرگز کوئی حادثہ نہ سمجھتے۔ انہیں پہلے ہی علم تھا کہ دہلی سے تنظیم کے سرفروش کہیں باہر جانے والے تھے۔ اس کے علاوہ سی آئی ڈی ہیڈ آفس اڑائے جانے کو بھی وہ نظرانداز نہ کرتے۔ ایسی صورت میں موجودہ ہولناک واقعے کے بعد حکومت چوکنا ہو جاتی۔ دہلی میں داخل ہونے کے بعد تمام ممکنہ راستوں کی سخت نگرانی ہوتی۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ایسی پلاننگ کی تھی کہ حکومت کے لمبے ہاتھ ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ دہلی کے سالار اعلیٰ قدیر بیگ کو بھی قبل از وقت صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

راستے میں عادل نے اپنے ننھیال والوں کے متعلق مجھے بتا دیا۔ وہ اپنے اہل خاندان میں سید عادل حسین کی بجائے عدی کے نام سے مشہور تھا۔ سب اسے عدی ہی کہتے تھے۔ اس کے نانا کا نام سید شرافت علی تھا جنہیں سید صاحب کہا جاتا تھا۔ خاندانی رئیس تھے اور نام کا اثر ان کی شخصیت پر بھی پڑا تھا۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک عادل کی ماں تھی۔ بیٹا صرف ایک ہی تھا' یعنی عادل کا ماموں سید سخاوت علی۔ اسی کی بیٹی قمر جہاں' عادل سے منسوب تھی۔ گویا عادل جہاں مجھے لے جا رہا تھا' وہ اس کی ننھیال ہونے کے علاوہ ہونے والی سسرال بھی تھی۔ اس پر میں نے عادل سے پوچھا۔ "پھر تو قمر جہاں تم سے پردہ کرتی ہو گی؟"

"بالکل نہیں کیونکہ اسے کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔" عادل نے بتایا۔

"حیرت ہے اسے ابھی تک اپنے ہونے والے شوہر نامدار کے بارے میں خبر نہیں کہ اس کی قسمت کس کے ساتھ پھوٹنے والی ہے۔"

"ابھی سال بھر پہلے ہی کی تو بات ہے جب نانی اماں دہلی آئی تھیں۔ یہ امی اور نانی اماں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ وہ تو مجھے بھی خبر نہ ہوتی اگر امی نے میرا عندیہ معلوم نہ کیا ہوتا۔"

"پھر تو قمر جہاں تمہیں بھائی جان ہی کہتی ہو گی۔"

"جی نہیں۔" عادل نے بُرا سا منہ بنایا۔ "بڑی شوخ اور آفت کی پڑیا ہے وہ۔ دوسروں کی طرح وہ بھی مجھے عدی کہتی ہے۔ مجھ سے دو ایک سال ہی چھوٹی ہو گی' مگر مجھے بڑا ماننے پر تیار نہیں ہوتی۔ کسی کی ٹوکا ٹاکی پر کان نہیں دھرتی۔ ممانی نے کئی دفعہ ٹوکا کہ عدی تم سے بڑا ہے' ادب سے بولا کرو لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا' بڑی ڈھیٹ ہے۔"

"پھر تو تمہاری ناک میں نکیل ڈال دے گی۔"

"نکیل ڈالنے کی نوبت تو اس وقت آئے گی جب اسے دہلی آنا نصیب ہو گا۔ کسے خبر کہ میرے اور اس کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔"

"تمہارے اہل خاندان کو علم ہے کہ تم سرفروش تنظیم سے وابستہ ہو؟" میں نے دریافت کیا' میری

آواز بہت دھیمی تھی۔

"میں نے تو خیر کبھی کچھ قبول کے نہیں دیا' لیکن اپنے طور پر انہیں اندازہ ہو گا جب پکڑا گیا تھا تو کچھ لے دے ہوئی تھی کہ یہ کیا چکر ہے۔ صرف ابا جی اور نانا جان اس حد تک واقف ہیں کہ میرا تعلق ایک محب وطن تنظیم سے ہے جو غاصب حکمرانوں کے خلاف سرگرم عمل ہے۔" عادل کی دھیمی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔

دوپہر سے پہلے پہلے ہم جلالی پہنچ گئے۔ عادل نے قصبے کی آبادی سے پہلے ہی یکے والے کو رخصت کر دیا تھا۔ وہ ایک بڑی نہر تھی جہاں سے آبادی زیادہ دور نہیں تھی۔ مقامی لوگ اسے "بڑا بمبا" کہتے تھے۔ ایک باغ میں گھس کر ہم نے اپنے چہروں سے میک اپ ختم کیا اور نہر کے پانی سے منہ دھو کر پیدل قصبے کی طرف چل دیئے۔ میں چادر اوڑھے عادل کے ساتھ ساتھ چلی رہی تھی۔ جلالی میں یہ ظاہر کرنا' مناسب نہیں تھا کہ سید صاحب کے یہاں دو اجنبی افراد آئے ہوئے ہیں۔ عادل کو لوگ سید صاحب کے نواسے کی حیثیت سے جانتے تھے۔ میرے بارے میں باہر والوں سے کچھ بھی کہا جا سکتا تھا' مثلاً یہ کہ میں اس کی چچا زاد ہوں۔ عادل کو دہلی میں تو خطرہ تھا' جلالی میں نہیں پھر یہ کہ مجھے اور اسے زیادہ باہر نکلنا بھی نہیں تھا۔

چھوٹی سے ایک پختہ گلی میں وہ بڑا سا پختہ گھر تھا۔ گھر والوں سے عادل نے میرا تعارف کرایا تو کرن ی نام بتایا' تعلق دہلی ہی کے ایک معزز گھرانے سے ظاہر کیا تھا۔ اپنے اور میرے تعلق کے بارے میں اس نے یہ کہا کہ میں اس کے ایک عزیز و بے تکلف دوست کی بہن ہوں۔ میرے گھر گویا اس کا آنا جانا ہے۔ جلالی آنے کا مقصد محرم کی مجالس میں شرکت کرنا اور سیر و تفریح تھا۔ محرم کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ سارے ضلع میں قصبہ جلالی' محرم کی مجالس اور جلوسوں کے لئے مشہور تھا۔ ان میں شریک ہونے عموماً وہ لوگ ضرور پہنچتے تھے جن کے عزیز و اقارب جلالی میں رہتے تھے۔ یہ سن کر گھر والے اور بھی خوش ہوئے کہ سادات سے میرا تعلق نہ ہونے کے باوجود میں ان ایام میں جلالی آئی تھی۔ یوں عادل کے ساتھ میرے جلالی آنے کو کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھا گیا۔ رہنے کو مجھے وہاں بھی الگ کمرہ مل گیا تھا۔

عادل کی منگیتر واقعی بہت تیز و طرار تھی مگر بدمزاج نہیں۔ میں اس سے اور وہ مجھ سے بہت جلدی مانوس ہو گئی۔ جلالی میں مجھے قیام کئے پانچ روز گزر چکے تھے۔ عادل کے ننھیال والوں نے مجھے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ جس حیثیت سے عادل نے میرا تعارف کرایا ہے' اس مفروضہ کردار کو نبھاتی رہوں۔ میں نے اس بات کو ملحوظ رکھا تھا کہ دوست کی بہن کے ساتھ زیادہ بے تکلفی کسی غلط فہمی کو بھی جنم دے سکتی ہے۔ میں اسی لئے عادل سے ریزرو رہنے کی کوشش کرتی تھی۔

قمر جہاں اور گھر کی دوسری عورتوں کے ساتھ میں امام بارگاہ بھی گئی۔ وہاں دہکتے انگاروں پر لوگوں کو ماتم کرتے بھی دیکھا اور چھریوں کا ماتم بھی۔ گھر میں ایک روز عورتوں کی مجلس بھی ہوئی۔ میں نے بھی شرکت کی۔ زندگی کا ایک نیا رخ میرے سامنے آیا۔

☆======☆======☆

ہفتے بھر سے زیادہ ہو چکا تھا کہ ایک رات اچانک سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی۔ جلالی میں بجلی نہیں تھی۔ سونے سے پہلے میں نے مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ کی لو دھیمی کر دی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میں بڑے سے پلنگ پر اکیلی نہیں ہوں۔ میں نے تیزی سے کروٹ بدلی اور حیران رہ گئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کویتا مجھے تلاش کرتی ہوئی اس دور دراز قصبے میں بھی پہنچ جائے گی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بہت دن سے میری توجہ صرف ایک طرف مرکوز رہی تھی' یعنی تنظیم کی سرگرمیوں تک۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شیطانی قوتوں کے مالک میرے دشمن چندر موہن اور گوپال کی طرف سے بھی چھیڑ چھاڑ نہیں ہوئی تھی۔ ہاں مجھے کویتا کا خیال کئی بار ضرور آیا تھا کہ کہیں وہ میرے دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو۔ انہی دشمنوں میں ژیان بھی تھا۔ کویتا نے اس کا سراغ لگانے کے لئے جاپ شروع کیا تھا۔

اس وقت کویتا کو اپنے پلنگ کے سرہانے بیٹھے دیکھ کر پہلے مجھے حیرت ہوئی' پھر خوشی کہ وہ زندہ سلامت ہے۔ اسی کے ساتھ مجھے اس پر غصہ بھی آیا کہ وہ کچھ کہے سنے بغیر کیوں غائب ہو گئی؟ اٹھ کر بیٹھتے ہی میں نے اس سے پہلا سوال یہی کیا۔

"میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا کرن جی!" اس نے جواب دیا۔ "آپ کو شاید یاد نہیں رہا کہ دہلی میں مجھ سے کہا تھا' بڑے مہاراج اور گوپال کا دھیان رکھوں۔ سو میں پہلے گوپال ہی کی طرف گئی تھی۔ اس سمے رادھا گھر میں اکیلی تھی۔ مجھ سے غلطی یہ ہو گئی کہ گھیرے سے باہر آ گئی تا کہ رادھا سے مل سکوں۔ رادھا سے باتوں میں دوسری بھول مجھ سے یہ ہوئی کہ مجھے گوپال کا دھیان نہیں رہا کہ وہ بھی آ سکتا ہے۔ رادھا نے مجھے بتا دیا تھا کہ گوپال' بڑے مہاراج کے پیچھے بنارس گیا تھا۔ رادھا بھی اس کے ساتھ تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا اندازہ آپ کر سکتی ہیں۔ رادھا کے پاس مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ گوپال آ گیا اور مجھے بے بس کر دیا۔ پھر بھلا میں کیسے آپ کو خبر کرتی۔"

رادھا سے کویتا کی جذباتی وابستگی کا مجھے علم تھا۔ گوپال نے یقیناً اسے بے خبری میں شکار کر لیا ہو گا۔ غلطی کویتا ہی کی تھی پھر بھی میں نے نرمی سے کام لیا اور پوچھا۔ "پھر تمہیں اس کی قید سے کس طرح رہائی ملی؟ اس نے تمہیں آسانی سے تو فرار نہیں ہونے دیا ہو گا؟"

"فرار ہونے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کرن جی!" وہ مسکرا کر بولی۔

"کیا مطلب؟ اس نے تمہیں اپنی مرضی سے میرے پاس آنے کی اجازت دے دی؟"

"ہاں کرن جی! اسی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ آپ سے دشمنی ختم کرنا چاہتا ہے۔ میں آپ کے لئے اس کا سندیش (پیغام) لے کر آئی ہوں۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ گوپال' بڑے مہاراج ہی کا خاص چیلا تھا۔ اس کی طرف سے میرے لئے کوئی پیغام بلا سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا بھائی شمبھو' کلکتے میں میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ بداعمالی میں بھی وہ چندر موہن ہی کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ دشمنی ختم کرنے

کے فریب میں کویتا تو آ سکتی تھی' میں نہیں۔ میں نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے کویتا سے پیغام کے بارے میں معلوم کیا۔

"گوپال نے کہلوایا ہے کہ آپ بڑے مہاراج کے خلاف اس کے ساتھ مل جایئے۔" کویتا نے بتایا۔

"تو اس وقت تم گوپال کی پیغام رساں بن کر میرے پاس آئی ہو۔" کوشش کے باوجود میں اپنے لہجے کی نرمی برقرار نہ رکھ سکی۔

"کرن جی! آپ مجھے غلط نہ جانیں۔ خود میں نے ہی گوپال کو اس پر آمادہ کیا ہے اس طرح.........."

"دھوکا دیا ہے اس نے تمہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "دشمن صرف دشمن ہوتا ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ تمہیں رہا کرنے کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ اس نے مجھے شکار کرنے کے لئے تمہیں چارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ تمہاری بری عادتوں سے بھی واقف ہے۔" میں اپنے غصے پر قابو پانے کی خاطر پلنگ سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ کویتا میرے پلنگ کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا' کسی مجرم کی طرح۔

معاً میرے گرد نارنجی شعاعوں کا حصار قائم ہو گیا اور میں چونک اٹھی۔ دوسرے ہی لمحے حصار نادیدہ ہو چکا تھا۔ کویتا کی نظر حصار پر شاید نہیں پڑی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان تو ایک فاصلہ تھا' پھر اس کی نظریں بھی نیچی تھیں۔

چند ہی ساعتیں گزری ہوں گی کہ گوپال کی آواز کمرے میں گونجی۔ "میں نے تیرا جواب سن لیا معبلہ!" ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ ظاہر ہو گیا۔ "تُو ٹھیک کہتی ہے' دشمن صرف دشمن ہوتا ہے۔ مجھے معلوم تھا' کویتا تجھے شیشے میں نہیں اتار سکے گی سو میں خود تجھے یہاں سے باندھ کر لے جانے آ گیا۔ میں اس گھر کے باہر کھڑا ہوا تیرے اور کویتا کے درمیان ہونے والی باتیں سن رہا تھا۔" یہ کہہ کر وہ آہستہ سے ہنس دیا۔ "بڑے مہاراج نے رادھا اور کویتا دونوں کو مجھے دان کر دیا تھا' مگر تُو اسے لے اڑی۔ یہ بھی تو نے ٹھیک ہی کہا کہ میں اس کی بری عادتوں کو جانتا ہوں۔ برا کیا ہے اور بھلا کیا' تُو ابھی نہیں جانتی۔ سو اس سے اچھی طرح جان لے گی جب.........."

گوپال!" کویتا ایک دم بول اٹھی۔ اس کے لہجے میں برہمی تھی۔ "تُو نے مجھے دھوکا دیا۔"

"یہ دھوکا نہیں پگلی! اسے میدھاوی (عقل مندی) کہتے ہیں۔" گوپال بولا۔ "تُو اس بیچ نہ آ۔ مجھے معبلہ سے حساب چکانے دے یہ میرے بھائی کی قاتل ہے۔"

"تُو جھوٹ بولتا ہے۔ تجھے سب کچھ معلوم ہے کہ معبلہ جی نے شمبھو کو نہیں مارا۔ اسے بڑے مہاراج نے ان کے ہاتھوں مروایا تھا۔ تجھے بدلہ لینا ہے تو بڑے مہاراج سے بدلہ لے۔"

گوپال' کویتا کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف سے غافل دیکھ کر اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ایک ہی جست میں اسے میں نے دبوچ لیا۔ گوپال کو چیخنے تک کی مہلت نہ مل سکی۔ اس کا جسم نارنجی شعاعوں کے حصار میں آتے ہی جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ اسی کے ساتھ نارنجی شعاعوں کا حصار

نمودار ہوا اور ٹوٹ کر بکھر گیا۔

میں اٹھ کر کھڑی ہوئی تو کویتا کو تھر تھر کانپتے دیکھا۔

"مم .... مجھے چھما کر دیں۔" اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ اب میں اسے بھی نہیں بخشوں گی۔

"تیرا قصور صرف اتنا ہے کہ تُو اس شیطان کے فریب میں آ گئی۔" میں اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "تیرے بھولپن اور کمزوریوں سے اس نے فائدہ اٹھانا چاہا اور بھول گیا کہ اس کی موت اسے یہاں کھینچ لائی ہے۔ جا پہلے اس کی لاش کہیں دور پھینک آ' پھر کوئی بات ہو گی۔"

میرا حکم سنتے ہی کویتا نے گوپال کی لاش اٹھائی اور غائب ہو گئی۔ آج رات میرا ایک دشمن ختم ہو گیا تھا اور اس کا سبب کویتا ہی تھی۔ گوپال کے فریب کا پردہ چاک ہونے کے بعد اسے غصہ آ گیا تھا۔ اگر گوپال اس کی باتوں میں نہ الجھ جاتا تو شاید یوں نہ مارا جاتا۔

کویتا لوٹ آئی تو میں نے اسے معاف کر دیا اور بولی۔ "تم فی الحال رادھا ہی کے پاس رہو' مگر اسے گوپال کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ چندر موہن کی طرف سے چوکنا رہنا۔ گوپال کے بارے میں رادھا سے کہہ دینا کہ وہ چندر موہن کی تلاش میں گیا ہے۔ میں کہاں اور کس حال میں ہوں' تمہارے لئے یہ پتا لگانا مشکل نہیں۔ ابھی ایسے حالات نہیں ہیں کہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ سکوں۔ موقع دیکھ کر تم مجھ سے مل سکتی ہو۔"

وہ پشیمان سی واپس چلی گئی۔

جلالی میں اب میرے لئے قیام ضروری نہیں رہا تھا۔ گیارھویں محرم کو میں' عادل کے ساتھ دہلی پہنچ گئی۔ سالار اکبر مجھ سے ایک روز پہلے مراد آباد سے وہاں آ چکا تھا۔ میرے لئے اس کے پاس ایک سنسنی خیز خبر تھی۔ اسی خبر کی روشنی میں فوری طور پر میں نے دہلی سے روانگی کا ارادہ کر لیا۔ میں' امرناتھ کی دھرم شالہ ہی میں تھی۔ گرچن سنگھ ابھی ٹونڈلے سے دہلی نہیں پہنچا تھا۔

میں اگلے روز دہلی سے روانہ ہونے کی تمام تیاریاں مکمل کر چکی تھی۔ مجھے دہلی سے صوبہ سرحد کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میں اس عرصے میں شہزاد کے گھر بھی ہو آئی تھی کہ وہ میری طرف سے فکرمند نہ ہو۔ اسے میں نے تین مہینے کی پیشگی تنخواہ بھی زبردستی دے دی تھی اور کہا تھا کہ جب ضرورت پڑی اسے کلکتے بلا لوں گی۔

مجھے اس روز شام چار بجے کی ٹرین سے ایک طویل سفر پر روانہ ہونا تھا۔ اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ سبھی مجھ سے یوں اچانک بچھڑ جانے پر اداس اداس سے تھے۔ عادل کا چہرہ کچھ زیادہ ہی اترا ہوا تھا۔ میں دانستہ اسے چھیڑ رہی تھی۔ "اچھا پنڈت جی! اب چلنے کی کرو۔ اسٹیشن تک تو تم ہی کو چھوڑنا ہے۔"

جواب میں عادل کچھ کہنے والا تھا کہ سالار اکبر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹیلی گرام تھا۔ وہ ٹیلی گرام بمبئی سے آیا تھا۔ اس ٹیلی گرام کا تعلق بھی اسی سنسنی خیز خبر سے تھا جسے سن کر میں

صوبہ سرحد کے ایک شہر پشاور کے لئے روانہ ہونے والی تھی۔ ٹیلی گرام کے الفاظ صرف یہ تھے۔ "وہ یہاں ہے' فون پر رابطہ کریں۔"

پشاور جاؤں یا بمبئی؟ میں چکرا کے رہ گئی.........!

میرے دشمن ژیان کو بیک وقت پشاور اور بمبئی میں دیکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ ناممکن بات تھی۔ ایک ہی شخص دو جگہ نہیں ہو سکتا۔

کیوں نہیں ہو سکتا؟ جیسے کوئی میرے اندر سے بولا۔ کیا پہلے ایسا نہیں ہوا؟

اسی کے ساتھ یادوں کے بند دریچے کھلتے گئے۔ یہ کھیل تو میرا دشمن پہلے بھی کھیل چکا تھا۔ مجھے جزیل یاد آ گیا' وہی جو ژیان کا سوتیلا بھائی تھا۔ وادی سبز میں اپنی جگہ اسی کو تو ژیان چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ اس وقت میرے لئے یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ژیان' وادی سبز میں بھی موجود تھا اور بستی صنعیہ کے دورے پر بھی تھا لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ یہ کھیل اسے سفید چمڑی والوں ہی نے سکھایا تھا۔ یہاں تو حکومت ہی سفید چمڑی والوں کی تھی۔ ژیان دو جگہ کیا' ایک ہی وقت میں کئی جگہ نظر آ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کلکتے میں دریائے ہگلی کے کنارے پیش آنے والا واقعہ بھی یاد آ گیا۔ ان دنوں تو وہ کلکتے میں تھا بھی نہیں' دہلی میں تھا۔ بعد میں یہ بات مجھے سرگوشیوں کے ذریعے معلوم ہوئی تھی کہ جسے میں نے ژیان سمجھا وہ شمبھو کا ایک چیلا تھا۔ شمبھو نے مجھے فریب نظر میں مبتلا کیا تھا۔ ایک طرف تو پُراسرار شیطانی قوتوں کے مالک میرے دشمن غلط راہ پر لگا سکتے تھے' دوسری جانب حکومت وقت ژیان کو تحفظ فراہم کرنے کی غرض سے وہی کھیل کھیل سکتی تھی جو اس کے نمائندوں نے وادی سبز میں کھیلا تھا۔ اسی کے ساتھ حالات میں ایک تبدیلی یہ بھی ہوئی تھی کہ وادی سبز سے فرار ہو کر میرا دشمن ساحروں کی بستی میں پہنچ گیا تھا۔ اس بستی سارزوم کی سربراہ ترفیہ تھی۔ سارزوم کے دوران قیام ہی میں عیاش طبع ترفیہ نے ژیان کو خدمت گزاری سے خوش ہو کر اسے کچھ پُراسرار شیطانی قوتیں بخش دی تھیں۔ ترفیہ نے خود مجھ سے ان باتوں کا اقرار کیا تھا' اس وقت جب میں اس کی قید میں تھی۔ بعد میں ترفیہ ماری گئی۔ میں اور نضار اس بستی سے نکل آئے تو وہ بستی زمین میں دھنس گئی۔ مجھے ایک ایک بات یاد آ گئی۔

سالار اکبر نے میری رضامندی کے بعد ہندوستان بھر میں تنظیم کی مختلف شاخوں کو ژیان کا حلیہ جاری کر دیا تھا۔ اسی کے نتیجے میں پشاور سے جو رپورٹ ملی تھی' میرے لئے سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ میں نے سوچا کہ ژیان ادھر سے کہیں ایک بار پھر بلند پہاڑوں کی طرف نکل سکتا ہے۔ جغرافیہ کے علم نے اب مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ بلند پہاڑوں ہی سے تو فرار ہو کر میرا دشمن ہموار میدانوں میں آیا تھا۔ اگر وہ ادھر کا رخ کرتا تو وہاں اسے شکار کرنا میرے لئے اور بھی آسان ہو جاتا۔ یہی سوچ کر میں نے فوری طور پر دہلی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ غلط یا صحیح' آدمی جو بھی اندازہ قائم کر لے' اسے دھچکا لگنے پر چکرا ہی جاتا ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ میں عظیم مہین کی اس تاکید کو نظرانداز کر گئی تھی کہ سوچا کر۔ وقتی طور پر اپنے دشمن کے متعلق ایک "مصدقہ" اطلاع ملتے ہی میں فوراً حرکت میں آ گئی تھی۔ میں نے اپنے ایک دشمن گوپال کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور اب ژیان کو بھی اس کے

انجام تک پہنچا دینا چاہتی تھی۔ دوسرے دشمنوں سے بعد میں بھی نمٹا جا سکتا تھا۔ ان تمام دشمنوں میں ہندوستان جیسے بڑے ملک پر قبضہ کر لینے والے غاصب حکمرانوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ان کی ہوس ملک گیری کسی بھی خاص مقصد کے حصول کی خاطر وادی سبز کو بھی نشانہ بنا سکتی ہے' اس امکان کو بھی میں نے پورے طور پر رد نہیں کیا تھا۔ کوئی مجبوری ایسی ضرور تھی کہ میرے اس بڑے دشمن نے مجھ پر اب تک براہ راست ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔

میں اب تک چوکھی لڑتی رہی تھی۔ میری توجہ کسی ایک طرف نہیں رہنے دی گئی' مجھے اس کا احساس ہو چکا تھا۔ عظیم مبین کی سرگوشیوں کے مطابق مجھے میرے اصل کی طرف لوٹا تو دیا گیا تھا مگر ابھی تک میں اندھیرے میں تھی۔

مجھے اس وقت سوچ میں گم دیکھ کر نہ تو سالار اکبر نے کچھ کہا' نہ عادل ہی بولا۔ خود مجھے ہی وہ بوجھل خاموشی کھلنے لگی تو احساس ہوا کہ سالار اکبر میرے بولنے کا منتظر ہے۔ سو میں نے کہا۔ "ممکن ہے کہ دو ایک روز میں ہندوستان کے کسی اور علاقے سے یہ خبر ملے کہ ژیان وہاں ہے۔ آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خود ژیان اور حکومت کے لئے یہ کھیل کھیلنا کوئی مشکل نہیں۔ اس میں خبر دینے والوں کی کوتاہی کو کوئی دخل نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ نہ پشاور میں ہو نہ بمبئی میں' اس ضمن میں ابھی کچھ دن مزید انتظار کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر سکوں گی۔ فی الحال آپ بمبئی سے فون پر رابطہ ضرور کریں ممکن ہے اس سلسلے میں کوئی نئی بات معلوم ہو سکے۔"

مجھ سے یہ سنتے ہی سالار اکبر کمرے سے چلا گیا تو عادل کے چہرے کی رونق بحال ہو گئی۔

"چلو اس بہانے تمہارا بندھا ہوا بستر تو کھلا۔" عادل چہکا۔

"ایک بات بتاؤ۔" میں بدستور سنجیدہ رہی۔

"دو پوچھو۔"

"کیا تمہیں میرے ساتھ یہاں سے کہیں اور چلنے کی اجازت مل سکتی ہے؟" میں نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کا فیصلہ تو خود تم بھی کر سکتی ہو۔ نگران اعلیٰ کی طرف سے تمہیں جو اختیارات حاصل ہیں' انہیں کیوں بھول جاتی ہو؟"

"مجھے معلوم ہے' مگر یہ معاملہ تنظیمی سرگرمیوں سے مختلف ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے تمہیں یا تنظیم کو کوئی پرابلم ہو۔"

"پرابلم تو اس میں کوئی نہیں۔ میری جگہ یہاں عارضی طور پر کوئی بھی کام کر سکتا ہے' مثلاً سمیع اللہ۔ جہاں تک تنظیمی سرگرمیوں کا تعلق ہے تو تم نے ان کا ایک رخ متعین کر دیا ہے۔ بنگال اور دیگر کچھ علاقوں کی طرح یہاں بھی مسلح جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے۔ رہا میرا مسئلہ تو مجھے تمہارے ساتھ کہیں بھی چلنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ پھر تم ایک بات اور بھول گئیں کہ ہندوستان میں ہماری مہمان ہو۔ ایک میں کیا' تمہارے ساتھ تو سرفروشوں کا ایک دستہ چل سکتا ہے۔"

"چاہے میں اسے کہیں بھی لے جا کر کٹوا دوں۔" یہ کہہ کر میں ہنس پڑی' پھر بولی۔ "جب تم جوش جذبات میں بولتے ہو تو اس وقت پتہ چلتا ہے کس قدر ذہین ہو ورنہ تو............"

"اس کے برعکس نظر آتا ہوں۔ اتر آئیں نا فقرے بازی پر۔ میں تو تمہیں قابل صد احترام ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا مگر تم............"

"معاف کرو' مجھے نہیں بننا قابل صد احترام۔ جانے کی ہیڑ دبڑ میں چائے تک نہیں پی۔ تمہیں یہ بھی توفیق نہیں ہوئی کہ چائے ہی پلوا دیتے۔"

"اچھا بابا بلکہ بے بی ابھی لو۔ تمہارے رک جانے کی خوشی میں تو بھر کیتلی چائے پلوائی جا سکتی ہے۔" عادل اٹھ کھڑا ہوا۔

بااختیار ہونے کے باوجود تنظیم کی طرف سے مجھ پر کوئی پابندی عائد نہیں تھیں تنظیم میں شمولیت اختیار کرتے وقت ہی میں نے واضح کر دیا تھا کہ ظلم کے خلاف جنگ لڑتے ہوئے ان مقاصد کے حصول کو بھی نظرانداز نہیں کروں گی جن کی خاطر ہندوستان آئی ہوں۔ میں تنظیم کے کسی بھی عہدیدار کو جواب دہ نہیں تھی۔ میری رکنیت بھی اعزازی تھی۔ اس کے باوجود صرف دہلی کی حد تک نہیں' ہندوستان بھر میں مجھے اختیارات حاصل تھے۔ ان حالات میں تنظیم کے مقامی ذمے دار افراد کو میرا یہ بتانا بھی کافی تھا کہ میں' دہلی سے کہیں جا رہی ہوں۔ میں نے ایسا ہی کیا بھی تھا لیکن غیر متوقع طور پر میری روانگی میں رخنہ پڑ گیا۔ میں اسی کا کوئی حل نکالنے کی جستجو میں تھی۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ ژیان فرار ہو کر کہاں گیا ہے' دہلی سے قدم باہر نکالنا میرے لئے بے سود ثابت ہوتا۔

عادل کو اپنے ساتھ کہیں بھی لے جانے کے کئی اسباب تھے۔ ضرورت پڑنے پر تنظیم سے رابطہ قائم کرنے میں وہ معاون ثابت ہوتا کیونکہ معاملہ صرف ژیان تک محدود نہیں تھا' حکومت بھی اس میں ملوث تھی۔ حالات کوئی بھی نیا رخ اختیار کر سکتے تھے۔ دشمن کے خلاف پہاڑوں میں جنگ لڑتے ہوئے بھی میں تنہا نہیں تھی' یہاں بھی رفتہ رفتہ تقریباً ویسی ہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ شر کے مقابل مجھے بے پر نہیں رکھا گیا۔ ہموار میدانوں میں بھی مجھے جاں نثار مل گئے تھے۔ عادل کا شمار بھی انہی میں تھا۔ میں کسی نئے شہر کا رخ کرتی تو عادل کی موجودگی میں اجنبیت محسوس نہ ہوتی۔ پھر یہ کہ ایسا خود عادل کے حق میں بھی مناسب تھا۔ دہلی میں رہتے ہوئے ہر وقت اس کے سر پر خطرے کی تلوار لٹکی رہتی۔ وہ ایک مرتبہ حکومت کے ہتھے چڑھ چکا تھا۔ کسی اور شہر یا علاقے میں وقتی طور پر یا طویل عرصے رہ کر وہ تنظیم کے لئے زیادہ بہتر خدمات انجام دے سکتا۔ میں نے بلاوجہ اسے اپنے ساتھ لے جانے کو نہیں کہا تھا۔

اسی روز فون پر بمبئی سے رابطہ قائم کر کے تفصیلات کا علم ہو گیا۔ پشاور سے اس سلسلے میں جو اطلاعات ایک روز قبل ملی تھیں' تقریباً وہی بمبئی سے موصول ہوئیں۔ میرا اندازہ بھی یہی تھا۔ مقامی شاخ کے سربراہ قدیر بیگ کو دہلی سے میری روانگی کے متعلق علم ہو چکا تھا اس لئے مسلح جدوجہد کی ذمے داری گربچن سنگھ نے سنبھال لی جو میرے دہلی پہنچنے کے تیسرے دن ٹونڈلے سے آ گیا تھا۔ میں اب صرف گائیڈ لائن دے رہی تھی۔ اسی عرصے میں مشرقی بنگال کے ایک شہر ڈھاکہ سے بھی ژیان کے بارے میں خبر آ گئی

کہ اسے وہاں دیکھا گیا ہے۔ بنگال سے موصول ہونے والی یہ خبر کسی حد تک میرے لئے قرین قیاس تھی لیکن حتمی نہیں۔

چند روز اور گزر گئے اور یہ میرے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا۔ میں ایک فیصلے تک پہنچ ہی گئی۔ اس الجھی ہوئی گتھی کا ایک سرا میرے ہاتھ آ گیا۔

میں ایک رات گرجن سنگھ سے گفتگو کر کے اپنے کمرے میں لوٹی تو کویتا کو موجود پایا۔ فوری طور پر میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"بیٹھ جاؤ کویتا!" میں نے دھیمی اور نرم آواز میں اسے مخاطب کیا۔

میرے کہنے پر کویتا کمرے میں موجود ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ٹھیک تو ہو تم؟" میں اس کے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "رادھا کیسی ہے؟" میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"وہ تو ساتھ چھوڑ گئی کرن جی!" اس نے طویل سانس لے کر بتایا۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس نے کچھ دن گوپال کی واپسی کا انتظار کیا' پھر ڈرنے لگی۔ آپ کے حکم پر اسے میں نے گوپال کی موت کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اسے یہی خبر تھی کہ گوپال' بڑے مہاراج کے پیچھے کہیں گیا ہے۔ ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگی کہ گوپال شاید اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس کا خیال تھا کہ بڑے مہاراج سے کسی مقابلے میں گوپال مارا جا چکا ہے ورنہ ضرور واپس آتا۔ میں نے اس کی بڑی ڈھارس بندھائی پر اس کا ڈر دور نہ ہوا۔ اس نے مجھے بھی یہی سیکھ (صلاح) دی کہ بڑے مہاراج سے معافی مانگ لیتے ہیں۔" کویتا مجھے تفصیل بتانے لگی۔ "میں نے اس کی بات نہیں مانی اور سمجھایا کہ بڑے مہاراج اب ہمیں معاف نہیں کریں گے۔ ہمیں درگا دیوی کے چرنوں میں بلی چڑھا دیا جائے گا۔ وہ نہیں سمجھی تو مجھے اپنی فکر ہوئی۔ میں اس کا ارادہ بھانپ گئی کہ وہ بڑے مہاراج کے آشرم میں واپس جانا چاہتی ہے۔ میں اس بہانے کہ گوپال کو ڈھونڈنے جا رہی ہوں' اس سے الگ ہو گئی۔ میں نے اپنے گرد گھیرا ڈال لیا کہ رادھا کو بھی نظر نہ آؤں۔ پھر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ رادھا گھیرا توڑ کر بڑے مہاراج کے آشرم پہنچی تو اسے پکڑ لیا گیا۔ میں بھی رادھا کے پیچھے پیچھے گھیرے میں رہتے ہوئے آشرم پہنچ گئی تھی۔ چیلوں کی بات چیت سے پتا چلا کہ بڑے مہاراج ان دنوں بمبئی آشرم میں ہیں۔ ان کی انومتی (اجازت) کے بعد ہی رادھا کا فیصلہ ہو گا۔ سو آج .... انومتی مل گئی۔" کویتا کی آواز بھاری ہو گئی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے اور رادھا کی قسمت کے فیصلے سے آگاہ ہو گئی۔

"بڑے مہاراج کے چیلوں نے رادھا کو درگا دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا۔" کویتا کے رخساروں پر بہنے لگے۔

جب کویتا کے دل کی بھڑاس نکل گئی اور میرے سمجھانے بجھانے پر اس نے خود پر قابو پا لیا تو میں نے پوچھا۔ "رادھا سے تمہارے بارے میں تو کچھ پوچھ گچھ نہیں ہوئی؟"

"ہوئی تھی مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔" کویتا نے جواب دیا۔

وہ بھولی سی لڑکی اب اکیلی رہ گئی تھی اور میں نے اس کی آمد کا مقصد سمجھ لیا تھا۔ وہ دکھی بھی تھی اور بے سہارا بھی۔ اسے پناہ کی ضرورت تھی۔ اس نے یقیناً میری پُراسرار قوتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ تو خود اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ چکی تھی۔ چندر موہن مجھے نہیں جھکا سکا اور گوپال مجھ سے ٹکرانے کے سبب اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ ایسی صورت میں وہ میرے پاس آنے کے سوا اور کہاں جاتی۔ اس کی آمد میرے لئے نیک شگون ثابت ہوئی تھیں کویتا کو احساس بھی نہ ہو گا کہ اس نے رادھا کو پیش آنے والا ہولناک واقعہ بیان کر کے مجھے ایک نئی راہ دکھا دی ہے۔ بمبئی میں چندر موہن کی موجودگی واضح طور پر اشارہ کر رہی تھی کہ ژیان بھی وہیں ہو گا۔

"تم اب میرے ہی ساتھ رہو گی کویتا!" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"کرن جی!" اس کے خوبصورت ہونٹ کانپے۔ اب کی بار اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسو خوشی کے تھے۔

"ابھی تمہیں میرے دوستوں کی نظروں سے اوجھل رہنا پڑے گا' جب میں کہوں ظاہر ہو جانا۔"

"مجھے کوئی چادر دے دیں' میں اسے بچھا کر ادھر سو جاؤں گی۔" اس نے آنسو پونچھ کر کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

"پگلی! تُو میرے پاس سوئے گی' چل اٹھ۔"

اس نے میری طرف حیران حیران سی نظروں سے دیکھا اور پھر کرسی سے اٹھ کر سر جھکائے ہوئے مسہری کی طرف بڑھ گئی۔

یہ بھی اسی رات کا واقعہ ہے کہ سونے سے پہلے عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ کی خوشبو کو میں نے اپنے کمرے میں محسوس کیا۔ پھر خجیرہ کی مخصوص خوشبو غائب ہو گئی۔ اس وقت تک کویتا سو چکی تھی' مگر مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ میرا ذہن اپنے آئندہ اقدامات پر غور و فکر میں پھنسا ہوا تھا۔ میرے سوا ابھی تک کسی کو علم نہیں تھا کہ میں بمبئی جانے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ کلکتے کے بعد دہلی اور اب میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہر کا رخ کرنے والی تھی۔ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہاں کیا صورت پیش آئے گی' کتنے عرصے وہاں رہنا ہو گا۔ جب پشاور جانے کا قصد کیا تھا تو میں نے جلدبازی میں کئی اہم باتیں نظرانداز کر دی تھیں۔ اس مرتبہ ہر بات کو میں پہلے سے سوچ لینا چاہتی تھی۔ ایسے موقع پر خجیرہ کی آمد معنی خیز تھی۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ مجھے وہاں کوئی شدید خطرہ ہوتا تو مجھے سرگوشیوں کے ذریعے آگاہ کر دیا جاتا۔

خجیرہ کے آنے کا سبب دوسرے دن صبح مجھے معلوم ہو سکا۔ کپڑے نکالنے کے لئے میں نے اپنا ایک سوٹ کیس کھولا ہی تھا کہ تقریباً اچھل پڑی۔ رات کو میں نے اس بارے میں بھی سوچا تھا کیوں کہ مجھے یہاں آئے خاصا عرصہ ہو چکا تھا۔ اپنے حواس پر قابو پانے کے بعد میں نے پہننے کو ایک جوڑا نکالا اور کپڑے ترتیب سے رکھ دیئے۔ پھر سوٹ کیس بند کر کے میں کھڑی ہو گئی۔

آنکھ کھلتے ہی میں' کویتا کو ضروری ہدایات دے چکی تھیں وہ کمرے میں نہیں تھی۔ ناشتہ کرتے ہوئے عادل کو میں نے اپنے کمرے میں بلوا لیا اور پوچھا۔ "شہر کے حالات کیسے ہیں' باہر نکلا جا سکتا ہے؟"

"حالات تو بدستور ہیں۔ چلنا کہاں ہے؟"

"کناٹ پلیس۔" میں نے بتایا۔

"میک اپ کرنا پڑے گا؟"

"وہ تو ظاہر ہے۔" میں نے کہا۔

"کوئی خاص بات ہے؟"

"کہہ بھی سکتے ہو کیونکہ وقت کم ہے۔ تمہیں بھی تیاری کرنا ہو گی۔ چاہو تو اپنے گھر کا بھی ایک پھیرا لگا آؤ۔ کیا خبر کب لوٹنا ہو۔"

"کیا پھر بستر باندھنے کا ارادہ کر لیا؟" عادل چونک کر بولا۔

"ہاں' اور اب کے بندھا ہوا بستر کھلنے کا امکان نہیں۔"

"دوڑو' لپکو .... بھاگو۔"

"کیوں' کیا ہوا؟ ابھی تو تم اچھے خاصے تھے اور گرمی بھی اتنی نہیں پڑ رہی۔"

"اچان چک (اچانک) اتنی بڑی خبر سن کر بندہ اور کیا کرے گا۔ دوڑے لپکے گا نہیں تو کیا ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جائے گا۔"

"تو پھر دوڑے لو۔"

"لیکن دوڑ کدھر لگانا ہے' یہ بھی تو بتاؤ۔"

"بطرف بمبئی۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"مزید تفصیل؟"

"فی الحال این او' نو!"

"نہ بتاؤ' اپنی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سالار اکبر اور گرچن سنگھ کو ابھی جا کے تمہاری طرف دوڑاتا ہوں کہ بندی تو گئی کام سے؟"

"اور یہ بھی بتا دینا کہ تمہارا کام تمام کرانے بندی تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔"

عادل چلا گیا اور پھر اس نے ہر دو حضرات کو میرا مغز چاٹنے کے لئے واقعی بھیج دیا۔ جتنی گنجائش تھی ان سے میں نے اپنا مغز چٹوایا اور پھر عادل کو ساتھ لے کر کناٹ پلیس پہنچ گئی۔ وہاں سے لوٹی تو دہلی کا سالار اعلیٰ قدیر بیگ اور ہری بابو دونوں ہی میرے منتظر تھے۔ مجھے ان کے آنے کی توقع تھی۔ وہ میرے کمرے میں آ گئے۔

"ہری بابو آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" قدیر بیگ بولا۔ ہری بابو تنظیم کے مالی معاملات سنبھالتا تھا' میں اس سے پہلے بھی مل چکی تھی۔

"جی فرمایئے ہری بابو!"

"اپنی جسارت اور گستاخی کی میں پہلے ہی معذرت چاہتا ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے بات شروع کی۔ وہ ہندو ہو کر بڑی رواں اردو بولتا تھا۔ "بات یہ ہے کہ .... اس وقت آپ اپنے وطن سے بہت دور ہیں۔ ہم .... ہم لوگ کسی قابل تو نہیں پھر بھی........"

"آپ جو کہنا چاہتے ہیں' بلا روک ٹوک کہہ دیں۔" میں اس کے جھجکنے کا مقصد سمجھ رہی تھی۔

"آپ .... آپ بھی تو کچھ بولئے نا۔" ہری بابو نے رحم طلب سی نظروں سے قدیر بیگ کو دیکھا۔

"جس بات کو کہتے ہوئے آپ دونوں حضرات جھجک رہے ہیں' اسے میں نے سمجھ لیا ہے۔ ایک منٹ۔" یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھی اور اپنا ایک سوٹ کیس اٹھا لائی۔ وہ دونوں حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے سوٹ کیس درمیانی میز پر رکھ دیا تھا۔ سوٹ کیس کھول کر میں نے کپڑے ہٹائے۔

چند لمحے بعد ہی میز پر خالص سونے کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا' سوٹ کیس کو میں نے میز سے اٹھا کے نیچے رکھ دیا۔

"آپ حضرات کے خیال میں اس سونے کی مالیت اندازاً کتنی ہو گی؟"

ہری بابو نے سونے کا ایک چوکور وزنی ٹکڑا اٹھایا اور اسے ہاتھ پر رکھ کر اندازہ لگایا' پھر کہنے لگا۔ "یہ ایک پاؤ سے کم نہیں ہو گا۔"

"بہرحال جتنا بھی ہو۔ میرا مقصد محض یہ عرض کرنا تھا کہ میرے اخراجات کے سلسلے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس سونے کے علاوہ آٹھ دس ہزار یا کچھ کم زیادہ اور بھی پڑے ہوں گے' میرے پاس .... ہاں آپ ایک کام کر دیجئے۔ اس میں سے اندازے کے مطابق اتنا سونا لے لیجئے کہ ایک لاکھ روپے تک کی رقم ہو جائے۔ جب یہ رقم خرچ ہو جائے گی تو پھر مزید سونا موجود ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے نیچے رکھے ہوئے سوٹ کیس سے اور سونا نکالا۔ "کم نہ پڑے اس لئے........"

"بس رہنے دیجئے۔" ہری بابو نے میری بات کاٹ دی۔ "یہ حساب کتاب ہوتا رہے گا' رقم آپ کو کب چاہیے؟"

"جتنی بھی جلدی ممکن ہو۔"

"تو پھر آج شام تک رقم آپ کو مل جائے گی۔"

"میں آپ لوگوں کی شکر گزار ہوں کہ میرے اخراجات کے لئے سوچا۔ یہ سونا اس لئے بھی میں نے آپ کو دکھایا کہ مطمئن ہو جائیں۔ اس سے نمود و نمائش مقصود نہیں تھی۔"

وہ دونوں کچھ دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ یہ وہی سونا تھا جسے اپنے سوٹ کیس میں اسی روز صبح دیکھ کر اچھل پڑی تھی۔ خجیرہ ہی نے گزشتہ رات میرے لئے اس کا بندوبست کیا ہو گا' مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ ہری بابو اندازے کے مطابق مطلوبہ سونا اٹھوا کر لے گیا تھا۔ شام کو رقم بھی مجھے مل گئی۔

عادل کے ساتھ کناٹ پیلس سے میں نے خاصی خریداری کی تھی۔ اس میں کپڑا' ساڑھیاں' سلے سلائے سوٹ اور تمام ہی ضروری سامان شامل تھا۔ پہلے بھی ایک مرتبہ شہزاد کے ساتھ میں نے وہیں سے کپڑے وغیرہ خریدے اور سلوائے تھے۔ اس بار کویتا کے لئے بھی مجھے ساڑھیوں اور دوسرے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ میرا اور اس کے کپڑوں کا ناپ تقریباً ایک ہی تھا۔ کچھ کپڑے ارجنٹ سلنے کو دیئے تھے جو اگلے روز دوپہر تک ملنا تھے۔ میک اپ کے لئے بھی مزید ضروری اشیاء خرید لی گئی تھیں۔

تیسرے دن کی صبح تک میں نے بمبئی پہنچنے کی تمام پلاننگ کر لی۔ پہلا مسئلہ دہلی سے نکلنے کا تھا کیونکہ ان دنوں دہلی اور اس کے نواحی علاقوں کی سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ فلپ ابھی تک تنظیم کی قید میں تھا۔ اسے رہائی نہیں ملی تھی۔ کسی آڑے وقت کے لئے حکومت سے سودے بازی کی خاطر اسے یرغمال بنا لیا گیا تھا۔ اب یہ مسئلہ قدیر بیگ کا تھا میرا نہیں۔ جس روز میں دہلی سے روانہ ہونے والی تھی' بمبئی سے ایک اور چونکا دینے والی خبر ملی۔

صوبہ بمبئی کے گورنر سے وائسرائے کا ایک نمائندہ ملا تھا۔ اس کے بارے میں یہ قیاس تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس کا سابق سربراہ رابرٹ ہیم ہے۔ وہ ابھی گورنر ہاؤس ہی میں قیام پذیر تھا۔ خبر کوڈ ورڈز میں تھی۔ ژیان' چندر موہن اور اب رابرٹ۔ میرے یہ دشمن ایک ایک کر کے بمبئی میں کیوں جمع ہو رہے تھے؟ کیا ہو رہا تھا' بمبئی میں؟ یا کیا ہونے والا تھا؟ مختلف سوالات میرے ذہن میں پیدا ہونے لگے۔ وہاں تو تنظیم نے ابھی مسلح جدوجہد کا آغاز بھی نہیں کیا تھا' میرے لئے خطرات بڑھ گئے تھے' لیکن خطرات تو میرے ساتھ ساتھ چلتے تھے' میری زندگی کا حصہ تھے۔ وہاں تو بمبئی کی رانی بھی تھی جس کے دو آدمی میری وجہ سے قتل ہو چکے تھے۔ جرائم کی زیر زمین دنیا کی اس رانی کو میں بھولی نہیں تھی جس کی مجرمانہ سرگرمیوں کے افسانے کلکتے تک مشہور تھے۔

دشمنوں سے پنجہ آزمائی کرنے میں ایک الگ ہی مزہ ہے۔ میں رفتہ رفتہ اس مزے' اس نشے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ سیدھی سپاٹ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ وہ زندگی ہی کیا جو یکسانی کا شکار ہو جائے۔ زندگی تو لحہ بہ لحہ تغیر کا نام ہے۔ زندگی حرکت میں ہے' ٹھہراؤ میں نہیں۔ آگے اور آگے ہی بڑھتے رہنا زندگی ہے۔ سو میں آگے بڑھ گئی کہ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے بدن کو زخموں سے کیسے بچاتی کہ کانٹے تو میرے لباس میں سلے تھے۔ میں نے سارے دریچے کھول دیئے تھے مگر دھواں تو جیسے میرے وجود میں اپنا گھر بنا چکا تھا' کبھی دل سے اٹھتا تو کبھی جاں سے۔

خواب خواب ساعتوں کا وہ سفر اب بھی مجھے یاد ہے۔ میں دہلی سے چلی تو اکیلی تھی۔ عادل مجھ سے پہلے روانہ ہو چکا تھا۔

ہم نے براہ راست دہلی سے بمبئی کا سفر نہیں کیا۔ کویتا ابھی تک میری ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ کاروں' بسوں اور ٹرینوں میں سفر کرتے ہوئے میں اور عادل ایک مقررہ ریلوے اسٹیشن پر مل گئے۔ ہم خطرے کی حدود سے نکل آئے تھے۔ دہلی اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ غیر ضروری میک اپ وغیرہ کی اب اتنی

اہمیت نہیں رہ گئی تھیں صرف لباس اور حلیہ بدلنا کافی تھا۔ عادل حسب سابق بال مکند تھا' صرف "پنڈت" ہٹا دیا گیا۔ میں کرن سے کرن کماری ہو گئی۔ اب ہم دونوں کا تعلق گویا شمالی ہندوستان کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ ہماری وضع قطع' حلیہ اور رکھ رکھاؤ یہی ظاہر کرتا تھا۔

"یہاں سے بمبئی تک کے لئے فرسٹ کلاس کے تین ٹکٹ لینا۔" میں نے عادل سے کہا۔ "ہم ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں تھے۔

"عادل چونک کر بولا۔ "تین کیوں؟"

"کوئی اور بھی ہمارا ہم سفر ہے۔" میں نے مسکرا کر بتایا۔ "اسے تم جانتے ہو۔" فرسٹ کلاس کے اس ویٹنگ روم میں اس وقت ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

"مگر کون؟ .... تم نے پہلے نہیں بتایا۔"

"اچھا اندازہ لگاؤ' کون ہے وہ؟"

"بھناس کی جڑ۔" عادل چڑ گیا۔ "میں کوئی جیوتشی نہیں ہوں' نہ پنڈت جی ہوں۔ کیا تمہیں پینٹ شرٹ میں' میں کوئی شریف آدمی نظر نہیں آ رہا۔"

"تو تمہاری نظر میں پنڈت شریف آدمی نہیں ہوتا؟"

"یہ تو نہیں کہا میں نے .... تم نے پہلے نہیں بتایا۔"

"جس کے لئے بھی ہو' تم ٹکٹ لے کر آؤ' تبھی اس شخصیت کے درشن ہوں گے۔"

"میں سمجھ گیا' سالار اکبر ہوں گے یا گربچن سنگھ جی۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"تم خاک نہیں سمجھے' زیادہ قابل بننے کی ضرورت نہیں۔ اندھیرے میں چلائے ہوئے تیر کبھی کبھار ہی نشانے پر بیٹھتے ہیں۔" میں نے اسے اور تپا دیا۔

وہ بھنا کر اٹھا اور ٹکٹ لینے چلا گیا۔ کویتا ہی کے معاملے میں اسے میں ایک مرتبہ پہلے بھی "گھس" چکی تھی۔ ادھر عادل ٹکٹ لینے گیا' ادھر کویتا ویٹنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کا لباس اور حلیہ بھی مجھ سے مختلف نہیں تھا۔ وہ میرے پاس آ کر بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔

"تمہارا سوٹ کیس یہ ہے۔" میں نے قریب ہی رکھے سامان کی طرف اشارہ کیا۔

"نیلے رنگ والا نا؟" اس نے تصدیق چاہی تو میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے کماری!" کویتا نے وہ سوٹ کیس اٹھا کر اپنے قریب رکھ لیا۔

دو میرے سوٹ کیس تھے اور ایک عادل کا۔ میں دہلی سے تین سوٹ کیس لے کر چلی تھی۔ انہی میں سے ایک اب میں نے کویتا کے حوالے کر دیا تھا۔

عادل ٹکٹ لے کر لوٹا تو کویتا کو خلاف توقع میرے ساتھ بیٹھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

"نمستے بال مکند جی!" کویتا نے ہندو رسم و رواج کے مطابق دونوں ہاتھ جوڑ کر عادل کو مخاطب کیا۔

"نمستے کویتا جی!" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"تم اسے پہچانے نہیں۔ ارے یہ سشما ہے۔" میں بول اٹھی۔

"بھول ہو گئی کرن کماری! اتنے دن بعد دیکھا تو پہچان نہ سکا۔"

"تم بھی عجیب ہو' رستے بھر ساتھ رہ کر بھی نہ پہچانے۔ پیلی بھیت سے سشما ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔"

"میری کھوپڑی بھی تمہارے ساتھ رہ رہ کر خالی ہوتی جا رہی ہے' بالکل تمہاری طرح۔ بھلا بتاؤ' اتنی سی بات بھول گیا۔" عادل بھی ساتھ آ بیٹھا۔

"اچھا اب یہ نہ بھول جانا کہ پیلی بھیت سے ہم یہاں اپنے ایک رشتے دار کی شادی میں شریک ہونے آئے تھے' سو بمبئی گھومنے پھرنے کا پروگرام بن گیا۔ یہ میں اس لئے یاد دلا رہی ہوں کہ تم ابھی اپنی کھوپڑی خالی ہونے کا اعتراف کر چکے ہو۔ ہاں' یہ بھی یاد ہے نا تمہیں کہ ہم تینوں ساتھ پڑھے ہیں۔"

"لو یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے۔ تم تو پہلی کلاس سے میرے ساتھ پڑھتی رہی ہوں اس سے تمہاری ناک بہت بہتی رہتی تھی۔"

"جب ہم چوتھی کلاس میں پڑھ رہے تھے تو ایک دفعہ ماسٹر جی نے تمہاری بڑی پٹائی لگائی تھی۔ وہ پنڈت جی کہلاتے اور ہندی پڑھاتے تھے۔ تمہارے پیچھے بیٹھے ہوئے کسی لڑکے نے آ آ' ای ای' او او' انگھے' پنڈت جی کا پجاما تنگ ہے' کہہ دیا تھا۔ یاد آیا تمہیں؟ مرغا بھی بنایا گیا تھا تمہیں۔" ہندی حروف تہجی کی آڑ لے کر میں' عادل کی "گھسائی" لگا رہی تھی۔ اس میں ایک رمزیہ بھی تھا کہ وہ دہلی میں "پنڈت جی" ہی کہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ دوسری وجہ باتوں باتوں میں اسے یہ بتانا بھی تھا کہ ہم تینوں ایک ہی شہر کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے درمیان دور کی رشتے داری بھی ہے اور یہ کہ ہم ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔

میں نے دہلی میں شمالی ہندوستان کے مختلف شہروں' پیلی بھیت' نینی تال' شملہ وغیرہ کے متعلق ضروری معلومات عادل ہی سے حاصل کی تھیں کہ کسی وقت کام آ سکیں۔ عادل نے یہ سارا علاقہ دیکھا تھا۔ اس وقت میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ میرا مقصد کیا ہے۔

اس اسٹیشن سے ہم تینوں بمبئی کے لئے ٹرین میں بیٹھ گئے۔ کلکتے سے ٹرین میں دہلی آتے ہوئے مجھے بڑے تلخ تجربات ہوئے تھے۔ لعنتی چمپا نے مجھے بہت تنگ کیا تھا۔ کویتا کو اپنے ساتھ بمبئی لے جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں کم از کم بڑے مہاراج چندر موہن اور اس کے گرگوں کی نظروں سے اوجھل رہ سکوں۔ ایسی صورت میں ژیان یا سفید چمڑی والوں سے نمٹنا میرے لئے قدرے آسان ہو جاتا۔

بمبئی پہنچ کر ہم ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے۔ میں اور کویتا ایک روم میں تھے۔ عادل نے ہمارے کمرے کا سامنے والا کمرہ لیا تھا۔ ہوٹل بہت پُر سکون اور آرام دہ تھا۔ تیسری منزل سے دور تک پھیلے ہوئے سمندر کا نظارہ مجھے بہت اچھا لگا۔ عقبی کھڑکیاں اسی طرف کھلتی تھیں۔ وہ ڈبل روم تھا۔ دونوں رومز کے درمیان موجود دروازے کو کھلا بھی رکھا جا سکتا تھا اور بند بھی۔ کمروں کے باتھ رومز بھی الگ الگ تھے' کمبائنڈ نہیں۔ اس کے علاوہ ڈبل روم میں داخل ہونے یا نکلنے کے لئے بھی دونوں ہی رومز میں الگ الگ دروازے تھے۔ یہ بندوبست مجھے بوجوہ پسند آیا۔ میں جب چاہتی دونوں رومز کے درمیان والا

دروازہ بند کر لیتی اور یوں مجھے خلوت میسر آ جاتی۔

پہاڑوں سے اتر کر پہلی بار میں نے سمندر دیکھا اور دیر تک کھڑکی میں کھڑی رہی۔ عادل اور کویتا بھی میرے ساتھ تھے۔ کھڑکیاں موٹے شیشے کی تھیں۔ ان کا فریم البتہ کسی چمکدار دھات کا بنا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے جنہیں میں نے دائیں بائیں ہٹا دیا تھا۔ کھڑکیوں کے علاوہ جو جگہ بچی تھی' وہاں بھی موٹا شیشہ لگا ہوا تھا جس سے باہر کا نظارہ ممکن تھا۔ سمندر دور ہونے کے باوجود بلندی سے قریب لگ رہا تھا۔ شام کا وقت تھا اور ساحل سمندر پر گہما گہمی تھی۔

"کماری! کیا کھڑکی سے چھلانگ لگانے کا ارادہ ہے؟" عادل خاموش نہ رہ سکا۔

"اس کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے' مگر پہلے میں تمہیں نیچے دھکا دوں گی۔" میں نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"تمہیں شاید اس ہوٹل کی عمارت کے نیچے سڑک نہیں ٹپی۔ ساحل سمندر کی نرم ریت ذرا فاصلے پر ہے' سڑک کے بعد ذرا دیکھ بھال کے چھلانگ لگانا۔"

میں نے نیچے نظر دوڑائی۔ عادل ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ دور تک پختہ سڑک چلی گئی تھی۔ سڑک کی دوسری جانب کاریں اور دوسری سواریاں بھی کہیں کہیں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے عادل کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "ہم دوربین لینا بھول گئے' مجھے پہلے سے اندازہ ہوتا تو.........."

"سیوک کے سوٹ کیس میں ایک عدد دوربین موجود ہے۔" عادل میری بات کاٹ کر بولا' پھر کہنے لگا۔ "مگر تمہیں نہیں دوں گا۔"

"مجھے کیوں نہیں دو گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ میں جانتا ہوں' تم دوربین سے کیا دیکھنا چاہتی ہو۔ میری نظر تم سے اچھی ہے۔ دوربین کے ذریعے تم جو کچھ دیکھو گی' مجھے اسی طرح نظر آ رہا ہے۔"

دھوپ نرم تو پڑ گئی تھی مگر ابھی سورج ڈوبنے میں خاصی دیر تھی۔ سفید چمڑی والوں کو "غسل آفتاب" یعنی سن باتھ کی بیماری لاحق ہوتی ہے۔ ان کے ملک میں یہ "عیاشی" کم کم ہی میسر آتی ہے کیونکہ ٹھنڈ خاصی پڑتی ہے اور بادل گھرے رہتے ہیں۔ میں نے یہ باتیں کتابوں میں پڑھی تھیں۔ اس کا عملی مظاہرہ اب دیکھ رہی تھی۔ نرم ریت پر کسی کسی جگہ دھوپ میں نہائے ہوئے بدن پڑے تھے اور ان میں عورت مرد کی تخصیص نہیں تھی۔ فاصلے کے سبب واضح طور پر تو وہ نظر نہیں آ رہے تھے مگر اندازہ لگانا ممکن تھا کہ ان غیر ملکی غاصبوں کو غریب ہندوستانیوں کے جذبات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاید وہ باتھنگ کاسٹیوم زیب تن کر کے اپنے غلاموں کو یہ باور کرانا چاہتے ہوں کہ بھوکے ننگے تو ہم بھی ہیں۔ عادل نے یقیناً بطور شرارت اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

دوربین کی ضرورت کا احساس مجھے کسی ایسے بیہودہ نظارے کی وجہ سے نہیں ہوا تھا۔ اس احساس کا سبب وہ حالات تھے جن کی بنا پر میں بمبئی پہنچی تھی۔ کویتا بھی وہیں تھی اس لئے کسی وضاحت کی بجائے

میں خاموش ہی رہی۔ یوں بھی عادل غبی نہیں تھا کہ وضاحت کی ضرورت پیش آتی۔

طویل سفر کی وجہ سے ہم تینوں ہی تھکے ہوئے تھے اس لئے کام کا آغاز اگلے روز سے کیا گیا۔

ناشتہ ہم نے ساتھ ہی کیا۔ پھر میں' عادل کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ روم سروس کے ذریعے فون پر کہہ کر ناشتہ میں نے اپنے کمرے ہی میں منگوا لیا تھا۔

"میں آتی ہوں ابھی۔" کویتا سے یہ کہہ کر میں سامنے والے کمرے میں چلی آئی جہاں عادل ٹھہرا تھا۔

عادل کو میں نے ضروری ہدایات دے کے روانہ کر دیا۔ اسے دوپہر تک لوٹ آنا تھا۔ ایسا ہی میں نے کویتا کے ساتھ کیا اور وہ بھی چلی گئی۔

میں بمبئی میں ابھی اجنبی تھی اس لئے ہوٹل سے نہیں نکلی۔ بمبئی پہنچنے کے بعد مجھے جو پہلا قدم اٹھانا تھا' اس کے لئے خود میرا باہر نکلنا ضروری نہیں تھا۔ عادل اور کویتا جو خبریں لاتے' انہی کی روشنی میں مجھے اپنے آئندہ اقدامات کا تعین کرنا پڑتا۔ دوپہر سے پہلے ان دونوں کا لوٹنا ممکن نہیں تھا اس لئے میں پردے ہٹا کے کھڑکی سے سمندر کا نظارہ کرنے لگی۔ مجھے کھڑکی کے پاس کھڑے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سوچا' عادل نے کسی وجہ سے ٹیلی فون کیا ہو گا۔ اطمینان سے چلتی ہوئی میں بیڈ تک آئی اور قریبی میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکا لیا۔

بیڈ پر بیٹھتے ہی میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!"

"بات کیجئے۔" آپریٹر کی آواز آئی۔

"خوش آمدید معبلہ!"

یہ تین الفاظ میرے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ پھر بھی میں نے خود پر قابو پا لیا اور آواز بدل کر بولی۔ "شاید لائن غلط مل گئی ہے میرا نام............"

"کرن کماری ہے۔" دوسری طرف سے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے میری بات کاٹ دی تھی۔ "آواز بدل کر بھی بولو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" میرے لہجے میں سختی آ گئی۔

"تمہیں اپنے شہر میں خوش آمدید کہنا' اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ رات گئی بات گئی۔ بمبئی پہنچے تمہیں آج دوسرا دن ہے اور مجھے تمہاری رپورٹ مل گئی۔ حیران نہ ہونا کہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والوں پر میرے آدمی نظر رکھتے ہیں۔ ہر کوئی تو ٹرین کے فرسٹ کلاس ڈبے میں سفر کرنا اور پھر کسی عمدہ ہوٹل میں ٹھہرنا افورڈ نہیں کر سکتا نا!"

"یہ بتا کر کیا اپنی برتری جتانا مقصود ہے؟" میری آواز کی سختی برقرار رہی۔

"بالکل نہیں' تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نے تو محض ملاقات کی غرض سے فون کیا تھا۔"

"میں تم سے بات کر رہی ہوں' اسی کو ملاقات سمجھ لو۔"

"یہ کوئی ملاقات نہیں۔ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنے کو ملاقات کہتے ہیں............ یہ ہوٹل چھوڑ

کر کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے بہت قریب ہوں۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہی مجھے موجود پاؤ گی۔ یہاں ایسی پچویشن بھی نہیں کہ تم تیسری منزل کی کھڑکی سے فرار ہو جاؤ۔"

"تو اپنی دانست میں تم نے مجھے گھیر لیا ہے؟"

"پھر وہی بات' ایسا قطعی نہیں ہے۔ مجھے ملنے کی اجازت دے دو' صرف ایک بار' پھر چاہے نہ ملنا۔"

"ٹھیک ہے آ جاؤ۔"

"گولی تو نہیں مار دو گی۔"

"تمہیں مارنا ہوتا تو دہلی میں مار چکی ہوتی۔" میں بولی۔ "دروازہ تمہیں کھلا ملے گا۔"

ریسیور رکھتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے اس خطرے کی توقع تھی مگر اتنی جلدی نہیں۔ میں پوری طرح چوکنا ہو گئی۔ ذرا ہی دیر میں کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لئے میں پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی مسلح پولیس والے بھی مجھے گھیرنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ میرے ہاتھ میں اسی لئے "سائلنٹ ڈیتھ" تھا۔

دروازہ کھولتے ہی تیزی سے میں آڑ میں ہو گئی۔ بمبئی کی رانی اندر داخل ہوئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لئے۔ وہ پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس نے مڑے بغیر مجھے مخاطب کیا۔ "مجھے ایسی ہی کسی صورت حال کا اندازہ تھا اسی لئے تمہارے کمرے میں قدم رکھتے ہی دونوں ہاتھ اٹھا لئے۔ میں اکیلی ہوں۔ تم چاہو تو باہر جھانک کے اس کی تصدیق کر سکتی ہو۔ میں اسی طرح اس وقت تک ہاتھ اٹھائے اپنی جگہ کھڑی رہوں گی جب تک تم مطمئن نہ ہو جاؤ۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دروازے کی آڑ میں کھڑی رہی۔ وہ بہرحال ایک خطرناک عورت تھی' کوئی بھی چال چل سکتی تھی۔ راہداری کا جائزہ لے کر میں نے دروازہ بند کر لیا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں ابھی مطمئن نہیں تھی۔

"تم بلٹ پروف جیکٹ پہن کر آئی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا' وہ اب تک ہاتھ اٹھائے کھڑی تھی۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر تم میرے سر کا نشانہ لے کر گولی چلا سکتی ہو۔"

"تمہارے پاس ریوالور ہے؟" میں پنجوں کے بل اس کی طرف بڑھی۔

"بالکل ہے' کیا تمہیں میری پینٹ کی پھولی ہوئی جیب نظر نہیں آ رہی؟............ کہو تو ریوالور بھی جیب سے نکال کر نیچے ڈال دوں؟"

"اپنی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہ کرنا ورنہ تمہیں چیخنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔" میں نے قریب پہنچ کر "سائلنٹ ڈیتھ" کی نال کمر سے لگا دی۔

وہ بے حس و حرکت ہو گئی اور میں نے اس کی پینٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا جو بھرا ہوا تھا۔ چیمبر خالی کر کے دوبارہ میں نے ریوالور اس کی جیب میں رکھ دیا۔ ریوالور کے سوا اس کے پاس ایک چاقو

بھی نکلا۔ اسے بھی میں نے ایک طرف ڈال دیا۔

"اب تم اسی طرح ہاتھ اٹھائے سیدھی چلتی ہوئی سامنے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ جب میں کہوں تو ہاتھ نیچے گرانا۔"

اس نے میرے دوسرے حکم کی بھی تعمیل کر دی۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ میرے اور اس کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ وہ جست بھر کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے سفر آخرت پر روانہ ہو سکتی تھی۔

"دونوں ہاتھ اب کرسی کے دائیں بائیں ہتھوں پر رکھ لو۔" میں نے لہجے کی سختی برقرار رکھی۔

"تمہارے ہاتھ ہلنے نہیں چاہئیں۔" اب اس کا چہرہ میری طرف تھا جس پر حیرت کے آثار تھے۔ اسے شاید اس قدر سختی کئے جانے کی توقع نہیں ہو گی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "یہ جو تم میرے ہاتھ میں ہتھیار دیکھ رہی ہو' انتہائی خطرناک ہے۔ یہ ریوالور نہیں "خاموش موت" ہے۔ بٹن دباتے ہی اس کی نال سے گولی نہیں' فولادی سوئی نکلے گی جو دنیا کے مہلک ترین زہر میں بجھی ہوئی ہے۔ تم نے سائنائیڈ کا نام سنا ہو گا۔ اس زہر کا ذائقہ آج تک کوئی نہیں بتا سکا' پوٹاشیم سائنائیڈ .... ممکن ہے کبھی تم نے کسی کو یہ زہر دے کر مارا ہو۔"

میں نے رانی کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں سی دیکھیں۔

"میرا ارادہ تمہیں قتل کرنے کا نہیں۔" میں پھر بولی۔ "صرف اتنا بتانا تھا کہ اگر تم نے مجھے پھانسنے کے لئے کوئی جال بچھایا ہے تو اپنے انجام سے واقف ہو جاؤ۔ اسی کے ساتھ تمہاری غلط فہمی بھی دور ہو جائے کہ یہ تمہارا شہر ہے۔ تمہاری لاش ٹھکانے لگانا بھی میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ بتاؤ کیا کھیل کھیلنے آئی ہو؟"

"میں اگر یہ کہوں گی کہ پرانی رنجشیں بھلا کر تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے آئی ہوں تو شاید تمہیں یقین نہیں آئے گا۔" رانی کی آواز سے بھی خوف جھلک رہا تھا۔ "وجہ یہ ہے کہ دلی میں تمہاری اور میری آخری ملاقات کسی خوشگوار ماحول میں نہیں ہوئی تھی۔ میں نے تمہیں یرغمال بنا کر تمہارے ساتھیوں سے بھی رقم وصول کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایک مرتبہ دوستی کی آڑ میں تمہیں ٹریپ کر کے پکڑوانا بھی چاہا تھا۔ تم دونوں مرتبہ نکل گئیں۔ آخری بار تو آج ہی کی طرح میں تمہارے نشانے پر تھی۔ مجھے قتل کر دینا تمہارے لئے بہت آسان تھا لیکن تم مجھے دانستہ زندہ چھوڑ کر فرار ہو گئیں۔ وکٹر کو قتل کر کے میں مطلوبہ ہیرے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ مجھے دہلی سے واپس بمبئی آ جانا چاہئے تھا' مگر صرف تمہیں تلاش کرنے کے لئے چند روز رک گئی۔ اس تلاش کا مقصد وہی تھا جس کی خاطر میں آج تمہارے پاس آئی تھی۔ مجھے تم سے صرف اتنا کہنا تھا کہ تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔ جرائم کی دنیا میں رحم دل سے رحم دل مجرم بھی اپنے دشمن کو زندہ نہیں چھوڑتا۔ دشمن کو زندہ چھوڑ دینے کا مطلب خود اپنی موت ہے۔ تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ تمہارا تعلق کم از کم میری دنیا سے نہیں۔ تم کون ہو' کیا ہو' تمہارے ساتھی کون لوگ ہیں' میں نہیں جانتی اور نہ اب جاننا چاہتی ہوں۔ ہاں تمہارے بارے میں اتنا اندازہ میں نے ضرور لگا لیا ہے کہ کوئی بہت اونچی شے ہو۔ میں تمہارے پاسنگ

بھی نہیں۔ اسے تم میرا اعتراف شکست بھی سمجھ سکتی ہو۔ تم جیسی عورت کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ رہے میرے وہ دو ساتھی جو تمہاری وجہ سے مارے گئے' تو کھلونے ٹوٹنے ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ خود میں نے ضرورت پڑنے پر اپنے ساتھیوں کو قتل کیا ہے اور دوسروں کے ہاتھوں بھی قتل ہو جانے دیا ہے۔ تمہیں بھاری جبڑوں والا وہ دیسی عیسائی ڈیوڈ یاد ہے جو تم سے میری پہلی ملاقات کے وقت موجود تھا؟"

"کہتی رہو' میں کچھ نہیں بولتی' ہاں اگر تم مجھے باتوں میں لگا کر بچ نکلنے کی کوئی تدبیر سوچ رہی ہو تو اسے ذہن سے جھٹک دو۔ یا تم نے اپنے ساتھیوں کو کوئی وقت دے رکھا ہے اور ان کے یہاں پہنچنے کی منتظر ہو تو بھی تمہاری دال نہیں گلے گی۔ تمہاری موت کے بعد بھی کوئی یہاں سے زندہ بچ کے نہیں جا سکے گا۔ اس کے علاوہ اگر تم نے کوئی چکر چلا کر یہاں کی پولیس کو میرے پیچھے لگا دیا ہے تو مجھ پر اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ تم باتوں میں وقت ضائع کئے بغیر مطلب کی بات کرو۔ یہ میں سن چکی کہ مجھے سمجھنے میں تم سے غلطی ہوئی۔ اب اور کیا کہنا ہے تمہیں؟"

"ڈیوڈ کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ وہ بھی میرا وفادار ساتھی تھا جسے بطور چارہ ...."

"معلوم ہے مجھے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ وکٹر کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور تم نے اس کے قتل کی پرواہ نہیں کی تھی۔ آگے کہو۔"

"میرا مقصد محض یہ تھا کہ تمہیں یقین دلا سکوں.........."

"کس بات کا یقین؟" میں پھر بول اٹھی۔

"یہ کہ اب تم سے اپنے ساتھیوں کے قتل کا انتقام لینا نہیں چاہتی۔"

"کیوں' انتقام کی آگ اب سرد کیسے ہو گئی؟" میری آواز میں چبھن تھی۔

"اس لئے معبلہ کہ تم پر میں اپنے ایسے درجنوں ساتھی قربان کر سکتی ہوں۔"

"اس کی کوئی وجہ؟" میں اس کے پُرجوش لہجے سے بالکل متاثر نہیں ہوئی۔

"وجہ میں بیان کر چکی ہوں کہ تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تھا۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"پھر اب کیا چاہتی ہو مجھ سے؟"

"صرف یہ کہ تم مجھے اپنا دشمن نہ سمجھو۔"

"اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟"

"ہر سودے میں فائدہ تو نہیں سوچا جاتا۔"

"تو کوئی سودا کرنے آئی ہو مجھ سے؟"

"ہاں' محبت کا سودا .... یہ سودا میں نے زندگی میں صرف ایک بار اور صرف ایک شخص سے کیا تھا' دوسری تم ہو۔"

"کوئی کہانی؟"

"نہیں' واقعہ۔ وہ شخص اب اس دنیا میں نہیں۔"

"کیا تم نے اسے قتل کر دیا؟" میں پے در پے سوال کرتی رہی۔

"میں نے اسے نہیں مارا۔ کیا کوئی اپنے محبوب کو بھی مار سکتا ہے؟ ہاں میں نے گنیش کے قاتل کو ضرور مار دیا۔ یہی میرے ہاتھوں ہونے والا پہلا قتل تھا۔" رانی کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ وہ جیسے کہیں بہت دور پہنچ گئی تھی۔ پھر آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

رانی کو میں نے حکم دیا تھا کہ کرسی کے ہتھوں سے اپنے ہاتھ نہ ہٹائے۔ سو وہ کسی مجسمے کی طرح اب تک بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ گنیش کون تھا' میں سمجھ چکی تھی اور یہ بھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ اس کے دل پر کبھی کوئی چوٹ ضرور لگی تھی۔ ایک سفاک قاتلہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ سکتے ہیں' یہ تجربہ یقیناً میرے لئے نیا تھا۔

"اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لو رانی!" میں نے نرمی سے کہا۔ اسی کے ساتھ "سائلنٹ ڈیتھ" کی نال جھک چکی تھی۔

وہ آنسو بھری آنکھوں سے چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پینٹ کی جیب سے رومال نکال کر آنسو پونچھ لئے۔ میں نے جھک کر قریب پڑا ہوا اس کا چاقو اٹھا لیا۔

"یہ لو رانی! اسے بھی اپنی جیب میں رکھ لو۔" میں نے چاقو اس کی طرف اچھال دیا۔

اس نے چاقو لپک کر اسے بھی پینٹ کی دوسری جیب میں رکھ لیا۔ ایک جیب میں ریوالور تھا جس کا چیمبر میں خالی کر چکی تھی۔ گولیاں میرے ہاتھ ہی میں تھیں۔ "سائلنٹ ڈیتھ" کو اپنی ساڑھی میں اڑس کر میں رانی کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھی۔

"ذرا اپنا ریوالور دو مجھے۔"

اس نے جیب سے خالی ریوالور نکال کر میز پر رکھ دیا۔ میں نے ریوالور اٹھا کر گولیاں دوبارہ چیمبر میں ڈال دیں۔ پھر ریوالور کو میز پر دانستہ اس طرح رکھا کہ رانی چاہے تو اسے جھپٹ کر اٹھا لے۔ یہ اس کا آخری امتحان تھا جس میں وہ کامیاب رہی۔ میں اس طرح مستعد بیٹھی تھی کہ اس کے جسم کی خفیف سی حرکت پر میز الٹ دیتی۔

"رانی! اب یہ ریوالور بھی اٹھا لو۔"

تیکھے نقوش والی اس حسین عورت نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں ہاں اٹھا لو اسے۔" میں مسکرا کر بولی۔

اس نے میری یہ بات بھی مان لی۔

"اب تمہارے پاس بھی پورا موقع ہے کہ مجھے گولی مار دو۔ میں تم سے محبت کا سودا کر چکی ہوں۔ یہ سودا اگر مجھے مہنگا بھی پڑا تو کوئی ملال نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ اس نے کچھ کہے بغیر ریوالور جیب میں رکھ لیا تو میں نے پوچھا۔ "کیا پیو گی؟ شراب کے سوا۔"

میرے پاس دوپہر تک وقت تھا۔ ابھی دوپہر ہونے میں بہت دیر تھی۔ میں اس دوران رانی کے اوراق زندگی الٹنے کی کوشش کر سکتی تھیں سو اس کے کہنے پر کافی منگوا لی۔ کافی پیتے ہوئے اس نے "سائلنٹ ڈیتھ" دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میرے سوا وہ ہتھیار ہر ذی روح کے لئے انتہائی خطرناک تھا۔

"دیکھ لو' مگر بہت احتیاط سے۔" میں نے "سائلنٹ ڈیتھ" اسے تھما دیا۔ "ایک تو یہ کہ اس کی نال کا رخ تمہاری طرف نہیں ہونا چاہئے' دوسرے یہ کہ بٹن پر دباؤ نہ پڑے کیوں کہ یہ لوڈ ہے۔ ذرا سی غلطی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔"

"معبلہ! یہ تم مجھے بطور گفٹ نہیں دے سکتیں؟"

"نہیں۔" میں نے واضح طور پر انکار کر دیا۔ "یہ میرے پاس ایک ہی ہے۔ ہاں اب مجھے معبلہ نہ کہنا۔"

"تو کیا کرن کماری کہوں؟" اس نے "سائلنٹ ڈیتھ" مجھے واپس کر دیا۔

"ہاں میں تمہارے شہر میں کرن کماری ہوں اور یہاں.........."

"شمالی ہندوستان کے ایک شہر پیلی بھیت سے آئی ہوں۔" وہ ہنس کر بولی۔ "کل رات ہی مجھے پوری رپورٹ مل گئی تھی۔ تمہارے دو ساتھی بھی وہیں سے آئے ہیں۔ تمہارا حلیہ معلوم ہوتے ہی میں چونک اٹھی تھی۔ کنفرمیشن کے لئے میں نے اسی فلور پر ایک کمرہ بک کرا لیا۔ آج ہی صبح اس وقت میں نے تمہاری ایک جھلک دیکھی جب تم اس ڈبل روم سے نکل کر اپنے ساتھی کے کمرے میں گئیں اور پھر کچھ دیر کے بعد واپس یہیں آ گئیں۔ اس کے بعد تمہاری ساتھی لڑکی بھی روم سے نکل کر کہیں چلی گئی۔ یہ موقع تم سے ملنے کے لئے غنیمت تھا۔ میں تو خیر ایک جرائم پیشہ عورت ہوں' نام بدلتی رہتی ہوں' ہر نئے شہر میں لیکن تم میری طرح کیوں نام بدل لیتی ہو؟"

"اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی جو میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔ ہاں اتنا ضرور بتا سکتی ہوں کہ معبلہ بھی میں صرف کلکتے کی حد تک تھی۔ وہ جو میرا ملازم تھا شہزاد اسے میرا یہی نام معلوم تھا۔ پھر پولیس چاہے اس کی کھال ادھیڑ دیتی' وہ کچھ اور نہ بتا پاتا۔" میں نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے اپنی شخصیت پر پردہ ڈال دیا۔

"یہ اندازہ کچھ کچھ مجھے بھی ہو گیا تھا کہ معبلہ بھی تمہارا اصل نام نہیں ہے .... خیر آج کی ملاقات میں یہ تو پتا چل ہی گیا کہ جہانگیر تمہارے اس حیرت انگیز ہتھیار کا شکار ہو گیا تھا۔ تم شاید اس کی کسی بات کا برا مان گئی ہو گی اور.........."

"جب تم نے یہ ذکر چھیڑ ہی دیا ہے تو تمہیں اپنے بارے میں ایک بات اور بتا دوں۔ اسے میری پارسائی کا اظہار نہ سمجھنا بلکہ یہ حقیقت ہے' میں کرپٹ نہیں ہوں۔ یہ بھی بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے میں جرائم پیشہ نہیں۔ محض تمہاری دل جوئی اور دوستی کی خاطر اسے میں اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی تھی۔ اس کا مطلب وہ کچھ اور ہی سمجھا۔ تمہاری وجہ سے میں نے ابتدا میں انتہائی قدم نہیں اٹھایا۔ اسی

کشمکش میں میرے چہرے پر چڑھا ہوا ماسک بھی پھٹ گیا اور وگ بھی ہٹ گئی۔ اسے شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ نتیجتاً مارا گیا۔" میں نے موقع ملتے ہی اپنے کردار پر لگا ہوا دھبہ دھو دیا۔

"اور تم شراب بھی نہیں پیتیں؟" وہ حیران سی ہو کر کہنے لگی۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا' پھر بولی۔ "میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے بہت کچھ پوچھ چکی ہو' اتنا کافی ہے۔ اب مجھے کچھ پوچھنے دو۔"

وہ راضی ہو گئی اور میں نے اس کے چہرے پر پڑی ہوئی ساری نقابیں ایک ایک کر کے اٹھانا شروع کر دیں۔ اس نے مختلف سوالات کے جواب میں مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ اس کا یہ جھوٹ بھی کھل گیا کہ اسے ساڑھی باندھنا نہیں آتی' نہ اس نے کبھی باندھی۔ دہلی میں اس نے محض یہ ڈھونگ رچایا تھا تاکہ اس کی اصل شخصیت چھپی رہ سکے۔ رانی ایک عام بھولی بھالی لڑکی سے "بمبئی کی رانی" کیسے بن گئی اس واقعے کا تعلق میری سرگزشت سے صرف اتنا ہے کہ یہی عورت بعد میں میری جاں نثار ثابت ہوئی۔

☆======☆======☆

ماں نے اس کا نام جلو بائی رکھا تھا' مگر وہ کئی ناموں سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ کچھ لوگ اسے جولیا' کچھ زلیخا اور کچھ جلیبی جان کہتے تھے لیکن اس نے خود اپنا نام رانی رکھا تھا۔ اس کی ماں کھار کے علاقے رانڈ پورہ میں ایک کھولی کے اندر رہتی تھی۔ اس کا باپ کون تھا' یہ رانی کو معلوم نہ تھا۔ اس کی ماں نے بھی کبھی اپنے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ نہ جانے کب سے اس کی ماں پیشہ کر رہی تھی۔ رانی نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنی ماں کے نہ جانے کتنے روپ دیکھے تھے' صبح کا روپ' دوپہر کا روپ' شام کا روپ اور رات کا روپ۔ رانی دھیرے دھیرے خود ہی اپنی ماں کی ہر بات سمجھ گئی تھی۔

رانی اچھی طرح جانتی تھی کہ ماں اس کی طرف سے پوری طرح چوکنا رہتی ہے کیونکہ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ ماں جب اسے اچھے کپڑے پہنا کر سجا بنا دیتی تو پڑوسنیں کہتیں۔ "تمہارا بڑھاپا بہت سکھ سے کٹے گا۔"

ماں کی کوئی دوسری اولاد نہیں تھی اس لئے تمام تر توجہ رانی ہی پر تھی۔ یوں بھی اس محلے میں لڑکیوں ہی کی مانی جان تھی۔ لڑکے تو وہاں اس طرح سمجھے جاتے تھے جیسے کسی بے عقیدہ کے گھر میں دیوی دیوتا کی مورت۔ یہ لڑکے اپنی ماؤں کے پاس آنے والوں کی نقلیں اتارتے' کم عمری میں دھڑلے سے بیڑی پیتے' چھرا مارنے کا کھیل کھیلتے' گالیاں بکتے' مار پیٹ کرتے' جوا کھیلتے' گرہ کٹی کرتے اور کبھی کبھی چھوٹی موٹی چوریاں بھی کر گزرتے۔

رانی کو لڑکوں کے ساتھ ہی کھیلنا پسند تھا۔ اس نے لڑکوں میں گھل مل کر ان کی ساری حرکتیں سیکھ لی تھیں۔ اس محلے میں رہنے والے دادا لوگ (غنڈے) ان لڑکوں کو یہ سارے "ہنر" سکھا دیتے تھے۔ لڑکوں کی مائیں کوئی پرواہ نہیں کرتی تھیں کہ ان کی اولاد کس راستے پر جا رہی ہے لیکن رانی لڑکا نہ تھی اس لئے ماں اسے لڑکوں کے ساتھ جانے سے منع کرتی تھی۔ رانی اپنی ماں کی بات ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے نکال دیتی اور لڑکوں کے ساتھ نکل جاتی۔

وہ بہرحال لڑکی ہی تھی۔ جب اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو لڑکے اور دادا لوگ اسے کسی اور ہی نظر سے دیکھنے لگے۔ رانی کو اس بات کا احساس ہوا تو وہ اپنے جسم کو چھپانے لگی۔ پھر جب رانی کے ساتھیوں نے اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو وہ بے پرواہ ہو گئی۔ لڑکوں میں جس طرح پیسوں کے لئے لڑائی ہوتی تھی' رانی کی خاطر بھی جھگڑا ہونے لگا۔ اس کے بعد دادا لوگوں کی باری آئی۔ رانی نے لڑکوں سے تو کسی طرح خود کو بچا لیا تھا' داداؤں سے اپنے آپ کو کس طرح بچاتی۔

دادا لوگوں کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ رانی بہت آگے بڑھ گئی۔ پھر اس کے لئے داداؤں کے درمیان بھی جھگڑا ہونے لگا۔ آخر رانی پر ایک دادا بیرو کا قبضہ ہو گیا۔ بیرو سب سے تگڑا اور نڈر دادا تھا۔ اس نے رانی کو نئے سرے سے دھندا سکھانا شروع کیا۔

بیرو نے رانی کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ ماں اور بیٹی کا دھندا مکمل طور پر بند کرا کے اس نے رانی کو انگریزی سکھانے کے لئے ایک ٹیچر رکھا۔ بیرو نے ٹیچر سے کہا کہ تم رانی کو فراٹے سے انگریزی بولنا سکھا دو۔ اسی کے ساتھ بیرو نے رانی کو لباس پہننا' سنگھار کرنا اور تہذیب سے اٹھنا بیٹھنا سکھایا' پھر پنجابی' گجراتی' مراٹھی' ہندی اور اردو بولنا بھی سکھایا۔ رانی جب یہ سب کچھ سیکھ گئی تو بیرو نے اسے اپنے ساتھ میدان میں اتارا۔

ایک دن بیرو نے رانی کو کالج گرل بنا کر چھوٹی لائن پر سفر کرنے والی ایک ٹرین میں سوار کرا دیا۔ یہ ٹرین بمبئی کے نواحی علاقوں کے لئے چلتی تھی۔ رانی اپنی دراز زلفوں کو جھٹکتی ہوئی' سبز پوری سلیپر پہنے شوخ نظروں سے بجلی گراتی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ تنگ مہری کی پینٹ اور گہرے پیلے رنگ کی جرسی پہنے ہوئے تھی۔ جرسی اچھے کپڑے کی تھی۔ کتابوں کو سنبھالے ہوئے وہ ڈبے میں گھسی تھی۔ ڈبے میں رش تھا۔ کھڑے ہوئے مسافروں نے اسے آگے بڑھنے کی جگہ دے دی۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو گئی تو سبھی مسافروں کی نظریں جیسے اس پر جم کر رہ گئیں۔ رانی نے ان لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر کھسکتی ہوئی ایک شخص کے قریب پہنچ گئی۔ رانی کو اپنے پاس کھڑے دیکھ کر اس شخص کے چہرے پر جیسے بہار آ گئی۔ اسے ایک خوبصورت لڑکی کا قریب آ کر کھڑا ہونا اچھا لگا' مگر وہ کچھ سٹپٹا بھی گیا۔ رانی نے اپنی پینٹ کی جیب سے رومال نکال کر گردن اور چہرے کا پسینہ پونچھا' پھر چشمے کو ہاتھ میں لے کر اس کے نیلے شیشوں کو بھی رومال سے صاف کیا۔ اس نے قریب کھڑے شخص کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے دوبارہ چشمہ لگا لیا۔ وہ شخص بھی چور نظروں سے رانی کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ ایک بار ان دونوں کی نظریں مل گئیں تو شرم سے اس شخص کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جیسے وہ چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔

اگلے اسٹاپ پر گاڑی رکی تو اور بھی کچھ لوگ اس ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے ڈبے میں چڑھ گئے۔ رانی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس شخص سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

گاڑی چلی تو اچانک رانی نے اس شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا جیسے سہارا لینا چاہتی ہو۔ پھر اس نے بڑی شوخی سے ایک اسٹاپ کے بارے میں پوچھا۔

اس شخص نے چونک کر رانی کی طرف دیکھا' پھر جواب دیا۔ "شاید اگلا ہی اسٹاپ ہے۔"

اگلے اسٹاپ پر رانی اتر گئی۔ اس کے پیچھے ہیرو بھی اترا جو اسی ڈبے میں تھا۔

گاڑی چلی گئی اور رانی نے ایک پرس ہیرو کی طرف بڑھا دیا۔ ہیرو نے پرس کھول کر دیکھا۔ پرس میں چھیالیس روپے ساڑھے بارہ آنے تھے۔ اس کے علاوہ ایک دھیلا بھی تھا جو ایک پیسے کا نصف ہوتا تھا۔ بٹوے میں کوئی رسید اور کچھ پرچے بھی تھے۔

ہیرو نے رانی کو شاباش دی۔ "بہت اچھے' آج کی پوری کمائی تمہاری۔"

اسی وقت گنیش قریب آ گیا۔ یہ نوجوان بھی ہیرو کا شاگرد تھا۔ اس نے کہا۔ "استاد! کچھ ہاتھ لگا ہو تو کھلاؤ پلاؤ' آج رانی کا پہلا دن تھا۔"

"بولو گنیش! رانی کی مہورت کیسی رہی؟" یہ کہہ کر ہیرو نے پرس دکھایا اور رقم بھی۔

"بہت عمدہ۔" گنیش نے تعریف کی۔

"تو پھر چلو۔" ہیرو بولا۔ "یہ ساری رقم تو میں رانی کو دینے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ تم جو کھانے پینے کو کہو گے اپنے پاس سے کھلاؤں گا' پلاؤں گا۔"

گنیش! کولھاپور سے بھاگ کر بمبئی آیا تھا۔ وہ انگریزی بول سکتا تھا۔ ہیرو کو وہ ایک ہوٹل میں پلیٹیں دھوتا ہوا ملا تھا۔ ہیرو نے اسے اپنے پاس رکھ لیا' پھر دھندا سکھانا شروع کیا۔ گنیش اس وقت بائیس سال کا تھا اور جسمانی طور پر بہت طاقتور بھی۔

اس کامیابی کے بعد رانی دوسرے دن اسی روپ میں دھندے پر جانے لگی۔ ہیرو کے دو تین گرگے اجنبی بن کر اس کے آس پاس رہتے اور رانی اطمینان سے اپنا کام کرتی۔ اسے اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں کسی طرح فکر نہ ہوتی کہ اگر کبھی معاملہ بگڑ گیا تو وہ سنبھال لیں گے اور اڑایا جانے والا پرس اس کے پاس سے برآمد نہیں ہو گا۔ جب بھی ضرورت پڑتی تو وہ رانی کی مدد کرتے۔ رانی اتنی صفائی سے ہاتھ دکھاتی کہ کسی کو اس پر ذرا بھی شبہ نہ ہوتا۔

تقریباً دو سال تک کسی کھٹکے کے بغیر یہ کام چلتا رہا۔ ہیرو کے گروہ کے لئے رانی سونے کا انڈا دینے والی مرغی بن گئی تھی۔ رانی نے ہیرو اور اس کے ساتھیوں کو مالا مال کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ رانی نے اپنے گھر کا نقشہ بھی بدل دیا تھا۔ اس کی ماں ہر وقت نشے میں جھومتی رہتی تھی اور جو بھی جی آتا تھا کھاتی پیتی تھی۔

بمبئی میں جیب کتروں کے کئی گروہ تھے۔ ان کے درمیان چلتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی مار کاٹ بھی ہو جاتی لیکن ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی مخبری نہ کرتا اور نہ دھندا خراب کرتا۔ سبھی گروہوں میں اب رانی کا نام چمک اٹھا تھا۔ ان گروہوں کے استاد عاشق بھائی' بنسی مانجھی' منور' ٹیکم' جارج اور بنواری لال تھے۔ ان سبھی کی خواہش تھی کہ رانی کسی طرح انہیں مل جائے۔ انہوں نے رانی کو پیغام بھی بھیجے اور زیادہ حصہ دینے کا لالچ بھی دیا لیکن رانی راضی نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے کوئی ایسی حرکت کی تو ہیرو اسے چین سے نہیں رہنے دے گا۔

ایک روز رانی بس اسٹاپ پر بس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک ایک ٹیکسی اس کے پاس

آ کر رک گئی۔ پھر ٹیکسی کا دروازہ کھلا اور اس میں سے تیزی سے جارج باہر نکلا۔ وہ جرسی اور پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ جارج نے بجلی کی سی تیزی سے رانی کی کلائی پکڑ لی اور پھر اسے کھینچ کر ٹیکسی میں بٹھا لیا۔ رانی اس غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے مزاحمت نہ کر سکی۔ پلک جھپکتے یہ واقعہ ہو گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ٹیکسی اسٹارٹ ہو گئی۔ اسی وقت رانی کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے ٹیکسی سے ہاتھ نکال کر اسٹاپ کے شیڈ کا کھمبا پکڑ لیا' گرفت مضبوط تھی۔ رانی کے بلاؤز میں چاقو بھی تھا' مگر وہ چاقو نکال نہ پائی تھی۔ شیڈ زور سے ہلا اور اسی کے ساتھ وہاں موجود افراد کو بھی احساس ہو گیا کہ کیا واقعہ رونما ہو رہا ہے۔ وہ "پولیس' پولیس" چلاتے ہوئے رانی کی مدد کرنے پہنچ گئے۔

اسی وقت پولیس کی ایک گشتی گاڑی ادھر آتی دکھائی دی۔ گاڑی پر نظر پڑتے ہی جارج نے رانی کو ٹیکسی سے نیچے دھکیل دیا اور خود ٹیکسی میں فرار ہو گیا۔ لوگوں نے چلا کر اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر پولیس کی گاڑی کو روکا۔ اسی دوران رانی ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے غائب ہو گئی۔ لوگ حیران رہ گئے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بجے تھے اور سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کی گاڑی کو بس اسٹاپ تک پہنچنے میں اسی سبب کئی منٹ لگ گئے۔ پولیس والوں نے رانی کو تلاش کیا ہو گا مگر وہ تو دور نکل چکی تھی۔ اس حادثے کے بعد ہیرو چوکنا ہو گیا۔ اس نے رانی کو ریوالور چلانا سکھایا اور پھر حفاظت کی خاطر ایک ریوالور اس کے حوالے کر دیا جو بغیر لائسنس کا تھا۔ اسی کے ساتھ ہیرو نے گنیش کو رانی کے ساتھ ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ اپنے گرگوں میں اسے گنیش پر سب سے زیادہ بھروسہ تھا۔ رانی مزاجاً سنسنی خیزی پسند کرتی تھی اسی لئے اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ پھر گنیش کا ساتھ بھی اسے پسند تھا۔ وہ گنیش کو دل ہی دل میں چاہنے لگی تھی' مگر اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ ہیرو بھی تھا۔ رانی اس سے بہت ڈرتی تھی۔ اسی کے خوف سے رانی' گنیش کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہ کرتی۔

دھندے کے وقت گنیش کبھی تو کھل کر رانی کے ساتھ رہتا' کبھی چھپ کر۔ گنیش کے علاوہ گروہ کے دو تین آدمی بھی سائے کی طرح رانی کے آگے پیچھے رہتے۔ گنیش جب کھل کر رانی کے ساتھ رہتا تو رانی کو ایک انجانا سا سکھ ملتا۔ کبھی وہ دونوں طالب علم بن کر سفر کرتے اور کبھی نوبیاہتا جوڑا بن کر۔ دونوں ہی صورتوں میں ان کے کردار قابل دید ہوتے۔ ان پر کوئی بھی شبہ نہ کرتا۔

ان دونوں کے یہ ظاہری کردار اصل صورت حال سے مسافروں کی توجہ مبذول کرانے کے لئے ہوتے۔ جب رانی اپنا شکار تاڑ لیتی تو قریب جا کے کام کر گزرتی۔

کبھی کبھی محبت کا سوانگ رچاتے رچاتے' سوانگ بھرنے والے اسے سچ بھی مان اور جان لیتے ہیں۔ یہی رانی اور گنیش کے ساتھ ہوا لیکن ہیرو کے خوف سے دل کی بات زبان پر نہ آئی اور وہ کسی موقع کے منتظر رہے۔

ایک دفعہ دوپہر ڈھلنے تک کوئی اچھا شکار نہ ملا تو رانی اور گنیش ٹرین سے اتر کر بس اسٹاپ کی طرف چل دیئے۔ ان کے پیچھے پیچھے اس دن ہیرو بھی تھا۔ راستے میں رانی اور گنیش کو منور کے گروہ کا ایک آدمی دکھائی دیا جو رانی کی طرف دیکھ کر کھانس رہا تھا۔ بس میں بیٹھ جانے کے بعد گنیش نے یہ بات ہیرو کو بھی

بتائی۔ بیرو اس وقت ہیرے کی انگوٹھیاں پہنے سیٹھ بنا ہوا تھا۔ بس چلی تو اس نے دیکھا' ایک ٹیکسی بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ رانی نے بس میں ہاتھ کی صفائی دکھا کر "مال" گنیش کو تھما دیا۔ اگلے اسٹاپ پر رانی' گنیش اور بیرو اتر گئے۔ وہاں سے وہ دوسرے اسٹاپ کے لئے پیدل ہی چل دیئے۔ رانی کو ابھی اور کام دکھانا تھا۔ وہاں بیرو کا ایک اور گرگا انتظار کر رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ ایک بائی پاس سے گزر رہے تھے کہ پیچھے سے اچانک ایک کار آئی اور بیرو کو کچلتی ہوئی نکل گئی۔ یہ دیکھ کر گنیش اور رانی کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ اس کار میں کون تھا۔ ان کے ہوش ٹھکانے آئے تو انہوں نے بیرو کو فوراً ہسپتال پہنچایا۔ بیرو کو ہوش نہ آ سکا۔ صبح ہوتے ہوتے اس نے دم توڑ دیا۔

بیرو مر گیا تو رانی اور گنیش نے سکون کا سانس لیا۔ انہوں نے سوچا کہ وہ اب اپنی آرزو پوری کر سکیں گے۔

کچھ دن وہ دونوں دھندے پر نہیں گئے اور گھر ہی میں رہ کر ایک دوسرے سے محبت کا خراج وصول کیا۔ وہ اس طرح پہلی بار ساتھ رہے تھے ورنہ اب تک بیرو ان کے درمیان ہجر کی دیوار بنا رہا تھا۔ وہ تو چین سے تھے مگر ان لوگوں کو کیسے چین آتا جنہوں نے رانی کو ہتھیانے کے لئے بیرو کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

پہلے جارج اور پھر منور نے براہ راست رانی سے بات کی۔ رانی نے ان دونوں ہی کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ بنواری لال نے رانی کی ماں سے رابطہ قائم کیا کہ اس کے ذریعے رانی پر دباؤ ڈلوائے۔ بنواری نے اس کے لئے بڑھیا کو لالچ دیا۔ رانی کی ماں جانتی تھی کہ لڑکی اب جوان ہو چکی ہے اور دباؤ میں نہیں آئے گی۔ اس نے یہی سوچ کر بنواری کو صاف جواب دے دیا کہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔

منور نے ایک دن گنیش کو راستے میں گھیر لیا۔ پھر گنیش کو اس شرط پر منور نے چھوڑا کہ تم یا رانی کے ساتھ رہنا ترک کر دو یا مع رانی کے میرے گروہ میں شامل ہو جاؤ۔ بنسی مانجھی اور عاشق نے رانی کو دھمکی دی کہ اگر وہ ان کے ساتھ شامل نہ ہوئی تو بیرو کی طرح اسے بھی ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ ٹیکم نے بیرو کے دو گرگوں کو ساتھ ملا لیا۔ ان کے ذریعے بھی رانی پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ ٹیکم سے مل جائے۔

آخر کار تنگ آ کر گنیش اور رانی نے کسی بھی گروہ میں شامل ہو جانے کا فیصلہ کیا' مگر دو باتیں آڑے آ گئیں ایک تو یہ کہ کوئی بھی گنیش کو اتنا حصہ دینے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا' جتنا رانی چاہتی تھی۔ دوسری یہ کہ وہ لوگ رانی کو تنہا گنیش کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ جارج تو رانی کے حسن سے زیادہ خود اسی کا دیوانہ تھا لیکن رانی پر اب گنیش کا جادو چل چکا تھا۔ وہ اسی لئے گنیش کے سوا کسی کو بھی اپنی خلوتوں کا امین بنانے پر آمادہ نہیں تھی۔ اب وہ اتنی بھولی اور معصوم نہیں رہی تھی کہ ہر کوئی اسے بہلا پھسلا کر اپنا مقصد پورا کر لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی بھی گروہ سے مصالحت نہیں ہو سکی۔

رانی کو اپنی گوری رنگت' تیکھے نقوش' سرو قد اور ہاتھ کی صفائی پر پورا بھروسہ تھا۔ گنیش کو اپنے قوت بازو اور رانی کی وفا پر مکمل یقین تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی سبب وہ کسی کے سامنے جھکنے پر تیار نہیں تھے۔

کچھ ہی دنوں میں انہوں نے بڑی بے خوفی کے ساتھ ایک بار پھر اپنا دھندا شروع کر دیا۔ رانی پہلے ہی کی طرح اپنا کام کرتی اور گنیش سائے کی طرح اس کے آس پاس موجود ہوتا۔ وہ اپنے پاس رانی کی حفاظت کے خیال سے بھرا ہوا ریوالور رکھے رہتا تھا۔

جارج نے ایک دن بس میں رانی کا ہاتھ پکڑ لیا تو گنیش اس سے بھڑ گیا۔ اس وقت رانی نے کسی کی جیب صاف نہیں کی تھی اس لئے وہ بھی نڈر ہو کر جارج کو پھٹکارنے لگی۔ مسافروں نے جارج کی بجائے ان دونوں کا ساتھ دیا۔ جارج نے یہ صورت حال دیکھی تو بس سے اتر کر کھسک گیا۔

اس واقعے کے بعد بس میں یا نواحی علاقوں کی طرف جانے والی ہر ٹرین میں رانی کو دوسرے گروہوں کا کوئی نہ کوئی آدمی دکھائی دینے لگا۔ اس سے رانی سمجھ گئی کہ اب وہ لوگ اسے پکڑوانے کے چکر میں ہیں۔ رانی نے اسی لئے وقتی طور پر اپنا دھندا ٹھپ کر لیا۔ گنیش فکرمند ہو گیا۔ اس نے ایک دن رانی سے کہا۔ "کیا ان سالوں کے ڈر سے ہم اپنا دھندا بند کر دیں گے؟ تم میرے ساتھ چلو' میں دیکھوں گا کہ وہ کیا کر لیتے ہیں۔"

گنیش کے اصرار پر رانی راضی ہو گئی۔ اس دن تو رانی نے گنیش کے دل پر قیامت ہی ڈھا دی۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ چوڑی دار پاجامہ' چکن کا کرتہ اور کامدار دوپٹہ اوڑھ کر وہ کوئی لکھنوی دوشیزہ معلوم ہو رہی تھی' ہلکی سی مخملی شال اس طرح اوڑھی تھی کہ

صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں

گنیش اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دونوں اسٹیشن پہنچ کر ایک ٹرین میں چڑھ گئے۔ وہ بھی لمبے سفر پر جانے والی کسی ٹرین میں نہیں بیٹھتے تھے کہ بمبئی لوٹنے میں آسانی رہے۔

خوش قسمتی سے پہلی ہی نظر میں رانی کو ایک موٹا آسامی نظر آ گیا۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے رانی اس کی طرف نین بان چلانے لگی۔ آسامی نے یہ دیکھا تو خود ہی کھنچا چلا آیا۔

گاڑی ایک اسٹاپ پر رک کر آگے بڑھی تو گنیش نے دیکھا' جارج ڈبے کے دروازے پر کھڑا ہوا رانی کو گھور رہا ہے۔ گنیش' رانی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رانی کو اشارہ کیا کہ خطرہ ہے۔ اس کے باوجود رانی اب اپنا شکار چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ گاڑی نے ایک موڑ پر ہچکولا کھایا' آسامی جیسے ہی رانی کی طرف جھکا' رانی نے اپنا کام کر لیا۔

عین اسی لمحے جارج چیختا ہوا رانی کی طرف لپکا۔ اس نے رانی کے ہاتھ کی صفائی دیکھ لی تھی۔ ایک طرف سے جارج نے رانی کی کلائی پکڑی دوسرے سے گنیش کا بازو' پھر چلایا۔ "دیکھو یہ جیب کترے ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے جیب کاٹی ہے۔"

رانی نے فوراً ہی پرس کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے چیخی۔ "غنڈا ...... غنڈا۔"

گنیش نے دانت پیس کر کہا۔ "سالا! شریف لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔" پھر اس نے جارج سے اپنا بازو چھڑا کے چاقو نکال لیا۔

وار بچاتے بچاتے بھی جارج کے پیٹ میں ایک ڈیڑھ انچ چاقو گھس ہی گیا۔ پھر تو جیسے جارج پر خون سوار ہو گیا۔ وہ بہرحال ایک گروہ کا سرغنہ اور مانا ہوا لڑاکا تھا۔ چاقو چلانے میں اسے مہارت حاصل تھی۔ اس نے گنیش کے منہ پر مکا مارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ گنیش لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی سے فائدہ اٹھا کے جارج نے بھی چاقو نکال کر کھول لیا۔ پھر وہ دوسرے ہی لمحے گنیش پر ٹوٹ پڑا۔

لمبے پھل والا چاقو سیدھا گنیش کے پیٹ میں گھس گیا۔ گنیش چیخ اٹھا۔ اسی کے ساتھ رانی کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی کہ .... اس کی دنیا اسی کے سامنے لٹ رہی تھی۔

جارج کا چاقو ابھی گنیش کے پیٹ ہی میں گھسا ہوا تھا اور چاقو کے دستے پر اس کی گرفت تھی۔ اس نے دانت پر دانت جما کر چاقو گھمایا اور پھر اسے باہر نکال لیا۔ گنیش منہ کے بل نیچے آ رہا۔ خون کا فوارہ چھوٹا تو مسافر خوفزدہ ہو کر دور ہٹ گئے۔

رانی کسی بت کی طرح کھڑی ہوئی جارج کو گھور رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

جارج خون آلود چاقو تھامے رانی کی طرف بڑھا اور بولا۔ "چلو میرے ساتھ۔" اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

اسی وقت رانی نے اپنے نیفے میں اڑسا ہوا ریوالور نکال کر جارج پر گولی چلا دی۔ جارج کا جسم لہرا کر گرا۔ گولی نے اس کے ماتھے میں سوراخ کر دیا تھا۔

دو قتل، دو منٹ میں ہو گئے تھے۔ مسافر سہمے ہوئے ایک طرف سمٹ گئے تھے۔ ٹرین چلتی جا رہی تھی اور اس کے جھٹکوں سے خون پھیل رہا تھا۔

اگلے اسٹاپ سے پہلے ہی گاڑی کی رفتار دھیمی ہوئی تو رانی چلتی ہوئی گاڑی سے باہر کود گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اسٹیشن پر گاڑی رکتے ہی ڈبے کے مسافر کود کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اندر گھسنے والے مسافر دروازے ہی سے اندر کا منظر دیکھ کر چیخ اٹھے۔ پولیس نے آ کر اس ڈبے کا معائنہ کیا اور پھر اسے ٹرین سے الگ کٹوا کر ٹرین کو آگے جانے کی اجازت دے دی۔

رانی بحفاظت اپنے گھر پہنچ گئی۔ اس کے بعد دس بارہ دن تک وہ گھر سے باہر نہیں نکلی۔ بیرو گروہ کے دو آدمی اس دوران رانی سے ملے۔ انہوں نے بتایا کہ پولیس نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ شاید اس نے یہ کیس فائل کر دیا ہے۔ رانی اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اسے کسی نہ گروہ کا سہارا لے ہی لینا چاہئے لیکن فی الحال اسے کوئی بھی اپنے گروہ میں شامل کرنے کو آمادہ نہیں تھا۔

کچھ دن گزرے تو رانی پھر اپنا دھندا کرنے لگی۔ دو تین دن اطمینان سے گزر گئے اور پولیس کے پیچھے نہ لگی تو وہ اور بھی مطمئن ہو گئی۔

رانی اس سے بے خبر تھی کہ سی آئی ڈی والے انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر رہے تھے۔ مشتبہ لڑکیوں کی نقل و حرکت کی نگرانی ہو رہی تھی۔ رانی کا کوئی ریکارڈ پولیس کے پاس نہیں تھا اس

صرف حلئے کی بنیاد پر اسے تلاش کیا جا رہا تھا۔

اسی عرصے میں رانی ایک دن بس میں چڑھی اور مسافروں پر نگاہ ڈالی۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک مسافر اسے دیکھ کر چونک اٹھا ہے۔ وہ رانی کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ رانی جان بوجھ کر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی اس لئے اگلے اسٹاپ ہی پر بس سے اتر گئی۔ بس اسٹاپ سے وہ ایک طرف چل دی۔ اس کے دل میں چور تھا اسی لئے کچھ دور چل کر مڑی اور پیچھے دیکھا۔ اپنے پیچھے اسی بس والے مسافر کو آتے دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ پھر وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑ گئی۔ اس نے ریلوے اسٹیشن کے صدر دروازے پر رک کر دیکھا تو ابھی تک وہ اجنبی مسافر اس کے تعاقب میں تھا۔ یہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ڈر گئی۔

ٹرین میں چڑھنے کے بعد بھی وہ سیدھی ڈبے کے اندر نہیں گئی بلکہ دروازے ہی پر رک کر اس اجنبی کو دیکھنے لگی۔ پھر جیسے ہی ٹرین حرکت میں آئی، وہ اجنبی مسافر بھی لپک کر ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ رانی نے اسے ٹرین میں سوار ہوتے دیکھ لیا۔ بیرو سے اکثر اس نے سی آئی ڈی والوں کے قصے سنے تھے کہ ان کا کیا طریقہ کار ہوتا ہے اور کس طرح مجرموں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اس اجنبی کے انداز و اطوار بالکل ویسے ہی تھے۔ اس بات نے رانی کو اور بھی ہراساں کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ بچنا اب مشکل ہے۔ رانی نے اگلے اسٹاپ پر ٹرین سے اتر جانا ہی غنیمت سمجھا، مگر جیسے ہی وہ اتری تین چار آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔ ان لوگوں میں وہ اجنبی مسافر بھی شامل تھا جو اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ رانی نے خود کو ان لوگوں کے درمیان گھرا دیکھ کر ریوالور نکالنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی اسے دبوچ لیا گیا۔ پھر سب سے پہلے رانی کا ریوالور انہوں نے اپنے قبضے میں لیا۔ رانی قطعی بے بس ہو گئی۔ اسے رنج تھا کہ وہ اپنے ریوالور سے دوسری گولی نہ چلا سکی لیکن آئندہ یہی بات اس کے حق میں بہتر ثابت ہوئی۔

رانی کے خلاف قتل کرنے، جیب کاٹنے اور بغیر لائسنس کا ریوالور رکھنے کے الزام میں مقدمات چلائے گئے مگر کوئی عینی گواہ نہ ہونے کی وجہ سے رانی کو شک کا فائدہ مل گیا۔ صرف بغیر لائسنس کا ریوالور رکھنے کے جرم میں اسے چار ماہ قید کی سزا ہوئی۔

پہلا قتل کرنے کے جرم میں وہ سزا پانے سے بچ گئی تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ جیل میں گزارے ہوئے چار مہینے اس کے لئے چار صدیوں کے برابر تھے۔ اس عرصے میں رانی کا ذہن مختلف سوالات کی آماجگاہ بن گیا۔ پھر انہی سوالوں نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ صرف جیب تراشی ہی کیوں؟ جان خطرے ہی میں ڈالنا ہے تو دولت دیگر ذرائع سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کا جسم کمزور ہے، اس کی کو کیسے پورا کیا جا سکتا ہے؟ بڑی مچھلیاں، چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں تو پھر بڑی مچھلی کیسے بنا جائے؟ جرم کی راہ میں قانون روڑے اٹکاتا ہے، تو قانون کی آنکھوں میں دھول کس طرح جھونکی جائے؟ قانون کے رکھوالے بھی تو آدمی ہی ہوتے ہیں اور ہر آدمی کے کچھ ویک پوائنٹس ہوتے ہیں، دولت اور عورت، فرض شناس کتنے ہوں گے؟ تو ایسوں سے بچ کے رہنا کون سا دشوار ہے۔

اس کے ذہن میں جو سوال پیدا ہوئے تھے، ایک ایک کر کے سبھی کے جواب مل گئے۔ وہ جیل سے

نکلی تو ایک بدلی ہوئی عورت تھی۔ اولیت اس نے قانون کے رکھوالوں کو دی کہ اس کی نظر میں سب سے بڑے "دادا" وہی تھے۔ خود کو اس نے بہت احتیاط سے اور سنبھال سنبھال کر خرچ کیا۔

رانی پر طنز کے تیر برسائے گئے کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئی اور اس نے اپنی ماں کی روش کو اپ لیا۔ جہاں کی خاک تھی آخر وہیں پہنچ گئی لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ تو حصول مقصد کی خاطر اپنی راہ ہموار کر رہی تھی۔ اس طرح دولت حاصل کرنا رانی کی منزل نہیں تھی۔ پھر اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ جو پولیس افسران اس کے تیر نظر کا شکار ہو چکے تھے' انہی میں سے ایک نے رانی کے "شوق" کو سراہا۔ اسی تجربہ کار پولیس افسر سے رانی حرب و ضرب کی باقاعدہ ٹریننگ لینے لگی۔ پولیس افسر نے غالباً یہ سوچا:

مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اس نے زینہ ذات کا سفر آغاز کیا اور دھیرے دھیرے اپنے اندر اترتی گئی۔ کچھ عرصہ اس نے بڑی خاموشی سے گزارا۔ پھر نہ منور بچا' نہ بنسی مانجھی' نہ عاشق' نہ نیکم اور نہ بنواری۔ ایک ایک کر کے جرائم کی دنیا کے سارے "دیے" بجھتے گئے۔ ان کے بعد ایک ہی "دیا" رہ گیا کہ جس میں بڑی روشنی تھی۔ رانی سب سے بڑی مچھلی بن گئی۔ اب اسے ساتھی محافظوں کو ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اپنے گروہ کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ جرائم کی دنیا کی یہ بے تاج رانی خود ہی اپنے بندوں کو پکڑوا دیتی' پھر خود ہی موقع دیکھ کر چھڑا لیتی۔ ایسا اس وقت ہوتا جب پولیس افسران پر اوپر سے دباؤ پڑتا اور انہیں اپنی "کارکردگی" ظاہر کرنا ہوتی۔ بمبئی اس کا مرکز تھا مگر وہ سارے ہندوستان میں دھاوے بھرتی تھی۔ یہ تھی بمبئی کی رانی جو اب تک اپنے گنیش کو نہیں بھولی تھی۔ وہ اپنے محبوب کے قاتل کو مار چکی تھی مگر یہ زخم اب تک تازہ تھا۔ محبت کے زخم بھی کبھی بھرتے ہیں' اب اس نے مجھ سے رشتہ محبت استوار کر لیا تھا مگر اس رشتے کی نوعیت مختلف تھی۔

بدی کے مقابل بدی آ جائے تو اس سے خیر ہی کو تقویت ملتی ہے۔ کلکتے میں راجہ استاد اور شنکر نے مجھے بمبئی کی رانی سمجھ کر تعظیم دی تھی۔ اب یہاں آ کر خود بمبئی کی رانی میرے جاں نثاروں کے حلقے میں شامل ہو گئی تھی۔ جب پرندے کسی جگہ سے کوچ کر جائیں تو اسے کسی ناگہانی آفت کا اشارہ سمجھا جا ہے۔ اسی طرح جب شر' خیر کا ہم نوا بن جائے تو یہ خیر کے غالب آنے کا اشارہ ہے۔

میں نے دہلی کے دوران قیام میں جو چاہا تھا' وہ بمبئی آ کر مجھے مل گیا تھا لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ اس وقت میرے پیچھے سرفروش تنظیم کی طاقت نہیں تھی پھر بھی میرے حلیفوں میں یہ اضافہ قطعی بے حقیقت نہیں تھا۔ اب تک مجھے زندگی کے جس محاذ پر جو فتح نصیب ہوئی' اس میں میرے ارادے کوشش اور جدوجہد کے علاوہ خیر کی قوتوں کا بڑا دخل تھا۔ مجھے خبر تھی کہ بلا سبب میرے لئے راستے ہموار نہیں ہوتے۔

☆======☆======☆

ایک خطرہ بمبئی آتے ہی ٹل گیا تھا۔ رانی کو میں دوپہر کے کھانے کے لئے روک لیتی مگر اب دوسرے خطرات سے نمٹنا تھا۔ سو وہ چلی گئی' میرے بارے میں کچھ بھی جانے بغیر چلی گئی۔ اس کے

ے اور میں نے اس سے کچھ وعدے کئے تھے جن کے ایفا کا انحصار آنے والے وقت پر تھا۔

پہلے کویتا لوٹ کر آئی اور اس نے تصدیق کر دی کہ چندر موہن ابھی بمبئی میں ہے۔ وہ یہ سراغ بھی نکال لائی تھی کہ چندر موہن بہت جلد بمبئی سے جنوبی ہند کی طرف جانے والا ہے۔ میری ہدایت کے مطابق اس نے ژیان کو نہیں چھیڑا تھا البتہ یہ پتا لگا لیا تھا کہ وہ بڑے مہاراج چندر موہن کے آشرم میں نہیں ہے۔ اپنی جان پر کھیل کر وہ آشرم میں داخل ہوئی تھی۔

"چمپا کی بھی کچھ خبر لگی کہ وہ کہاں ہے؟" میں نے کویتا سے ایک اور اہم سوال کیا۔

"بس اتنا معلوم ہوا کہ چمپا جی کو بڑے مہاراج نے بنگال بھیج دیا ہے۔"

"تو وہ لعنتی عورت ابھی زندہ ہے۔" میرا خون کھولنے لگا۔ اسی کیفیت میں کویتا سے میں نے کہا۔ "کیا چمپا اور چندر موہن ابھی تک تمہارے لئے قابل تعظیم ہیں؟"

وہ میرے تیور بھانپ گئی اور معذرت کرنے لگی۔ ایک عمر کی عادت چھوٹتے چھوٹتے ہی چھوٹتی ہے۔

"بال مکند آ جائے تو پھر کھانا کھائیں گے' جب تک اپنے کمرے میں جا کے آرام کرو۔" میں نے کویتا کو مخاطب کیا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی۔

عادل آیا تو احتیاطاً مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔

"ایک شیطان حاضر دوسرا غائب۔" عادل نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا۔

"کون سا شیطان غائب ہو گیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"شیطان نمبر ایک' یعنی رابرٹ ہیم۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پھر دہلی لوٹ گیا۔"

"نہیں۔" عادل نے جواب دیا۔ "وہ دہلی نہیں گیا۔ ہمارے آدمی اس کے تعاقب میں ہیں۔ یہاں سے وہ گزشتہ روز ہی روانہ ہوا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ وہ میسور گیا ہے' مگر ابھی اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔"

"میسور بھی تو جنوبی ہند میں ہے۔" میں بول اٹھی۔ اس وقت میرے ذہن میں کویتا کے یہ الفاظ گونج رہے تھے کہ چندر موہن بھی جلد جنوبی ہند جانے والا ہے۔

عادل کہنے لگا۔ "نقشے کے مطابق تو میسور وہیں ہے جہاں تم بتا رہی ہو۔"

معلوم نہیں میرے دشمن کیا کھیل کھیلنے والے تھے۔ پہلے وہ یہاں بمبئی میں جمع ہوئے اور اب یہاں سے جنوبی ہند کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رابرٹ ہیم کی میسور روانگی' اسی کے ساتھ چندر موہن کا بمبئی سے بوریا بستر لپیٹ کر ادھر ہی جانا میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"ژیان تو یہیں ہے؟" میں نے عادل کی بات کا نظرانداز کر کے تصدیق چاہی۔

"ہاں وہ شیطان موجود ہے۔ اس کی نگرانی بھی جاری ہے۔ سخت پہرے میں اسے کبھی کبھار گورنر ہاؤس سے نکلتے دیکھا گیا ہے۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس یہاں بھی ہے مگر ژیان کو وہاں نہیں رکھا گیا۔ اس کی

وجہ سکیورٹی کے بہتر انتظامات بھی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال‘ ہے وہ یہاں بھی سرکاری مہمان۔“

”رابرٹ ہیم بھی گورنر ہاؤس میں ٹھہرا تھا اور ژیان بھی وہیں ہے۔“ میں کڑی سے کڑی ملانے لگی‘ پھر عادل سے دریافت کیا۔ ”ژیان جب بھی گورنر ہاؤس سے نکلا تو کدھر گیا؟ اس سلسلے میں مقامی تنظیم کے ذمے داروں سے تمہاری بات ہوئی؟“

”اس خبیث کو ایک ہی شوق معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے اس کی قبر پانی میں بنے گی۔ جب بھی اپنی کابک سے نکلا سمندر ہی کی طرف گیا۔ کیا خبر ساحل سمندر پر سیپیاں جمع کرتا ہو‘ اس امید پر کہ شاید کسی سیپی میں سچا موتی نکل آئے۔“

سیر و تفریح کی غرض سے ژیان کا ساحل سمندر پر جانا سمجھ میں آتا تھا۔ پہاڑوں پر زندگی بسر کرنے والوں کے لئے سمندر میں بڑی کشش ہے‘ خصوصاً ان کے لئے جنہوں نے کبھی سمندر نہ دیکھا ہو۔ خود میرا معاملہ بھی تو کچھ ایسا ہی تھا۔

”ژیان کو اسی وقت گھیرا جا سکتا ہے جب وہ گورنر ہاؤس سے باہر نکلے۔“ میں بولی۔ ”ایسا بندوبست کرنا پڑے گا کہ ادھر وہ نکلے‘ ادھر ہمیں اطلاع مل جائے۔“

”دوسرے بندوبست سے کیا مراد ہے تمہاری؟ میں تمہیں دہلی ہی میں بتا چکی تھی کہ تنظیم کے سرفروشوں سے ایک حد تک کام لوں گی۔ ان کے لئے ژیان کی نگرانی بھی کافی ہے۔“

”یہ کون کافر کہہ رہا ہے۔ دوسرے بندوبست سے میرا مطلب دوسرا تھا۔“

”تو بات پوری کیا کرو‘ ادھوری نہیں۔“

”تم تو پٹ سے بول پڑتی ہو بیچ میں‘ بات کہاں سے پوری ہو۔ دوسرے بندوبست سے میری مراد ژیان سے تھی۔ اسے بھی تو کہیں سے درآمد کرنا پڑے گا ورنہ تو وہی قصہ ہو جائے گا کہ رات بھر روئے ایک بھی نہیں مرا۔ ژیان کے گیٹ اپ میں کوئی بھائی عبدالغفور برآمد ہو گئے تو ہم کیا بنا لیں گے اور کسی کا کیا بگاڑ لیں گے؟ دہلی میں بھی تو ہم ٹاپتے رہ گئے تھے‘ کھودا پہاڑ نکلا چوہا اور پھر وہ چوہا بھی ریس لگا گیا۔ معلوم نہیں اب کس بل میں چھپا ہو گا۔“ اس کا اشارہ ولیم کی طرف تھا۔

عادل کو میں نے چندر موہن کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا تھا البتہ رابرٹ ہیم کی بمبئی آمد ژیان کے یہاں ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کی جانا‘ ممکن تھی۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ میرا خیال تھا کہ اس دلیل سے وہ مطمئن ہو جائے گا۔

”کوئی ضروری نہیں کہ ولیم یا رابرٹ‘ ژیان کو اپنی دُم سے باندھے باندھے پھریں۔“ عادل نے میری دلیل سے اختلاف کیا‘ پھر بولا۔ ”چلو یہ مان بھی لیا جائے کہ ژیان اصلی ہی ہے‘ نقلی نہیں تو تمہاری ایک شرط بہت کڑی ہے کہ اسے اغوا ہی کرنا ہے۔ اگر اسے قتل ہی کرنا ہوتا تو سسرے کو کہیں بھی اور کسی بھی طرح ٹیں کر دیتے۔ اس کے لئے ایک ہزار ایک راستے موجود ہیں۔ بدبخت کی بگھی پر دستی بم پھینک دیتے‘ گولی سے اڑا دیتے‘ توپ دم کر دیتے‘ کچھ بھی ممکن تھا‘ مگر تمہیں تو وہ جھٹکا کرنے کے لئے زندہ سلامت چاہیے۔“ اس موضوع پر بولتے ہوئے بھی اس کے لہجے کی شوخی کم نہیں ہوئی تھی۔

”یہ تو خیر ضروری ہے‘ وجہ تم بھی جانتے ہو۔ اصلی نقلی کا پتا چلانا بھی کوئی ایسا مشکل نہیں۔“

”اس کی ترکیب مجھے بھی بتا دو‘ یقین کرو کسی سے نہیں کہوں گا۔“

”بتا دوں گی وقت آنے پر۔“

”بالکل ٹھیک ہے‘ پہلے سے کسی کو کچھ نہ بتانا تاکہ بندہ اندھیرے میں اِدھر سے اُدھر سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہوتا رہے۔“

”ابھی ذرا دیر پہلے تم چوہوں کا کچھ ذکر کر رہے تھے۔ کیا اس وقت تمہارے پیٹ میں چوہے نہیں دوڑ رہے؟“ میں نے دانستہ اس موضوع پر مزید گفتگو سے گریز کیا۔

”دوڑ تو رہے ہیں مگر ان کی بھاگ دوڑ تمہیں بھی تو دکھائی یا سنائی دے۔“

”اچھا تو پھر اٹھو‘ نیچے ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں۔“

پھر کویتا کو بھی ہم نے ساتھ لے لیا اور نیچے پہنچ گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا‘ یہ خطرہ مول لے ہی لینا چاہیے۔ اس سے پہلے ایک خطرہ تو میں مول لے ہی چکی تھی۔ دانستہ میں نے اپنا چہرہ نہیں بدلا ورنہ تو میک اپ کر کے چہرہ بدلنا آسان تھا۔

کبھی کبھی دشمن کو اس کے بل سے باہر نکالنے کے لئے حملے میں پہل کرنے کا موقع بھی دینا پڑتا ہے۔ ہندوستان پر میرے دشمنوں ہی کی تو حکمرانی تھی۔ اس ملک کا کوئی بھی شہر یا قریہ ایسا نہیں تھا جہاں میرے دشمن یا ان کے آلہ کار نہ ہوں۔ جس طرح تنظیم نے اپنی تمام شاخوں کو ژیان کا حلیہ جاری کر دیا تھا‘ اسی طرح حکومت بھی اس پر میرے باب میں عمل کر سکتی تھی۔ میں نے اسی لئے مختلف وجوہ کی بنا پر دہلی سے دور نکل آنے تک تو احتیاط برتی‘ اس کے بعد نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رانی بھی مجھ تک نہ پہنچ پاتی۔ بمبئی میں تنظیم کے افراد سے الگ تھلگ رہنا میرے نزدیک خود تنظیم کے حق میں سودمند تھا۔ چندر موہن کی طرف سے مجھے اس لئے خطرہ نہ تھا کہ کویتا نے حصار کھینچ رکھا تھا۔ اس حصار کی موجودگی میں خود کویتا اور میں‘ چندر موہن کی نظروں سے اوجھل رہتے۔ ایسی صورت میں اگر میں کسی کی نظر میں آتی تو وہ حکومت کی مختلف ایجنسیاں تھیں۔ سوانی کی طرف سے مجھے خطرہ تھا لیکن اس خطرے کو میں خاطر میں نہ لائی۔ میرا دشمن مجھے اور میں اسے اچھی طرح جانتی پہچانتی تھی۔ موجودہ صورت حال میں صرف ژیان کو چھیڑنا اس لئے خطرناک تھا کہ وہ پھر کہیں فرار نہ ہو جائے۔ میں اس پر بے خبری میں ہاتھ ڈالتی تبھی کامیابی کا امکان ہوتا۔ کویتا کو میں نے اسی لئے روکا تھا۔ ژیان کے سلسلے میں گزشتہ تلخ تجربات مجھے اب اپنے طریقہ کار پر نظرثانی کے لئے مجبور کر رہے تھے۔ کویتا کے لئے ژیان کے جسم کی بو سے اس کا سراغ لگانا مشکل نہیں تھا‘ چاہے وہ سات پردوں ہی میں کیوں نہ چھپا ہو۔ اس طرح شیطانی قوتوں کا مالک ژیان چوکنا ہو جاتا۔ یہ تجربہ مجھے دہلی میں ہو چکا تھا۔ کوئی بھی ایسا قدم اٹھانے کے لئے سوچ بچار کی ضرورت تھی۔

یہ ایسا مسئلہ تھا کہ جس پر میں‘ عادل سے بھی تبادلہ خیال نہیں کر سکتی تھی۔ تجربات سے گزرنے کے باوجود بھی وہ پُراسرار واقعات کے ظہور پذیر ہونے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کے سوچنے اور عمل

کرنے کا انداز منطقی تھا۔

کھانا کھا کر جب میں اپنے کمرے میں لوٹی اور آرام کرنے کی غرض سے لیٹی تو مجھے اپنی ایک غلطی کا مزید احساس ہوا۔ اس غلطی کا تدارک اب ممکن نہیں تھا۔ بمبئی آنے کے بعد اگر میں اب تک حکومت کی کسی ایجنسی کی نظر میں آ چکی تھی تو ژیان پر ہاتھ ڈالنا میرے لئے اور بھی مشکل ہو جاتا۔ ژیان تو حکومت ہی کی پناہ میں تھا۔ حکومت کے ذریعے اسے بمبئی میں میری آمد کا علم ہو جاتا۔

"تُو بڑی ضدی اور غافل ہے اے معبلہ!" معاً مجھے نیک روح مہین کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ "یہ جو یہاں ژیان کا ڈھونگ رچائے بیٹھا ہے وہی سفید چمڑی والا ہے جو تجھے پہلے بھی ژیان کا فریب دے چکا ہے۔ ژیان یہاں آیا ضرور تھا مگر ٹھہرنے کو نہیں۔ اس کی جگہ سفید چمڑی والے نے لے لی اور وہ جنوب کی طرف نکل گیا۔ تُو اگر اسے دیکھنا ہی چاہتی ہے تو آنکھیں بند کر لے اور دیکھ کہ ژیان جنوب میں کہاں ہے۔"

اسی کے ساتھ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ میں ایک پُراسرار تجربے سے گزر رہی تھی اور بند آنکھوں سے مجھے بہت کچھ نظر آ رہا تھا۔ میلوں تک پھیلا ہوا وہ ایک سلسلہ کوہ تھا انہی دشوار گزار پہاڑوں کے دامن میں مختلف بستیاں آباد تھیں۔

"یہ جو تُو پہاڑ دیکھ رہی ہے' سو یہ ہموار میدانوں میں بھی ہیں۔ انہیں سلسلہ کوہ کا نام جان لے۔ یہ پہاڑ اسی شہر سے شروع ہو کر جنوب میں چلے گئے ہیں۔ انہی کے دامن میں تُو جو بستیاں دیکھ رہی ہے' یہی کوڈگ ریاست ہے اور اسی کے باسی کوڈگی کہلاتے ہیں پر ان بستیوں پر ان لوگوں کی حکومت کبھی نہیں رہی اور نہ اب ہے۔ یہ بڑے ہی مظلوم لوگ ہیں جیسے کہ تیرے لوگ اس وقت تھے جب وادی سبز پر تیرا پرچم بلند نہیں ہوا تھا۔ یہیں کا راجہ چک ویر تیرے دشمن کا میزبان ہے۔ یہ گمراہ راجہ اپنے انجام سے بے خبر ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے خاندان کا نام و نشان بھی زمین سے مٹا دیا جائے گا اور ہونی کو ٹالا بھی کس نے ہے۔ ادھر دیکھ کہ اس ریاست کے ایک طرف میسور' دوسری طرف کیرل اور تیسری سمت بنگلور ہے۔ تُو دیکھ رہی ہے کہ کوڈگ ریاست کا علاقہ پہاڑی ہے۔ باہر کے لوگ اس چھوٹی سی ریاست کو اسی لئے تو کبھی فتح نہیں کر سکے اور ابھی تک سفید چمڑی والوں کا پرچم بھی یہاں بلند نہیں ہوا۔ تُو نے تاریخ پڑھنا کیوں چھوڑ دیا؟ سن اے معبلہ! علم کی کوئی تھاہ نہیں۔ پہلے جان کہ کون کیا ہے' پھر قدم بڑھا۔ تجھے بھٹکنا ہی تھا' سو بھٹکتی رہ۔ اس میں بھی مصلحت ہے۔ رستہ چلتے ٹھوکریں بھی تو لگتی ہیں' پر جان لے کہ تُو امان میں ہے اور بے سبب ادھر بھٹکتی ہوئی نہیں آ گئی۔ تیرا بڑا دشمن تجھ پر جال پھینکنے والا تھا اور تُو بچا لی گئی کہ بدی کی آنکھ پر پردہ بھی پڑ جاتا ہے اور یہ جو سفید چمڑی والے ہیں انہیں بھی ساری زمین سے گھیر گھار کر ان کی حدود میں سمیٹ دیا جائے گا کہ ہر ظالم کا آخر یہی ہے پر ابھی نہیں۔ ابھی تو ان کی رسی ڈھیلی چھوڑ دی گئی ہے۔ ایک کے بعد ایک نسلیں آتی ہیں اور مٹا دی جاتی ہیں' پھر بھی لوگ عبرت نہیں پکڑتے۔ تُو ان میں سے نہیں' تبھی تو چہیتی ہے۔ تجھے اسی لئے ایسے منظر دکھائے جاتے رہیں گے جنہیں دیکھ کر تُو سوچ اور سمجھ سکے۔"

سرگوشیاں معدوم ہو گئیں۔ اسی کے ساتھ بند آنکھوں سے میں جو مناظر اور جو چہرے دیکھ رہی تھی' وہ بھی اوجھل ہو گئے۔ وہاں بڑی ہریالی تھی' اسی کے بیچ ایک محل تھا' راجہ چک ویر کا محل۔ اسی محل میں مجھے اپنے دشمن کا چہرہ نظر آیا' پھول سے جسموں کے درمیان جیسے کوئی بھاری پتھر پڑا ہوا ہو۔ ژیان کا ایک ایسی جگہ پہنچ جانا کہ جہاں سفید چمڑی والوں کی حکومت بھی نہیں تھی میرے لئے باعث حیرت نہیں تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ژیان وہاں خود نہیں پہنچا بلکہ اسے وہاں تک پہنچایا گیا ہے' شاید اس لئے کہ میں' ژیان تک نہ پہنچ سکوں۔ میں اسے انگریزوں کی حدود مملکت میں ڈھونڈتی رہتی اور وہ کوڈگ میں چھپا رہتا۔

عظیم مہین کی سرگوشیوں سے مجھ پر بیک وقت کئی باتیں واضح ہو گئیں۔ پہلی اہم بات تو یہ کہ ولیم رائٹ بھی بمبئی میں تھا۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی ولیم نے ژیان کی جگہ لے لی تھی۔ میرا یہ قیاس درست نکلا کہ ژیان' بمبئی میں ہو گا۔ وہ یہیں سے ہو کر کوڈگ گیا تھا۔ ژیان کے پیچھے بھاگنے سے مجھے منع کیا گیا اور میں نہ مانی۔ سو مجھے ضدی اور غافل کہا گیا' اسی کے ساتھ یہ دلاسہ بھی دیا گیا کہ اب بھی میں امان میں ہوں' چہیتی ہوں۔ ایک اور اہم خبر یہ دی گئی کہ سفید چمڑی والے غیر ملکی غاصب میرے خلاف کوئی نئی چال چلنے والے تھے جس سے مجھے بچا لیا گیا۔ کسی بھی سبب دہلی سے میرا نکل آنا بہتر ہوا۔ انگریز حکومت کے انجام سے بھی مجھے آگاہ کیا گیا اور کوڈگ ریاست کے راجہ چک ویر کے مستقبل سے بھی میں واقف ہو گئی۔

میں نے جب ہموار میدانوں کا رخ نہیں کیا تھا اور مجھے مہذب دنیا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا' غالباً تب بھی میری رہنمائی کی گئی تھی۔ پہلے ہی مجھے سب کچھ دکھا دیا گیا تھا اور اب بھی میں ایسے ہی پُراسرار تجربات سے گزر رہی تھی۔ ایسا بے سبب ممکن نہیں تھا۔ جو چہرے ایک ایک کر کے دہلی سے گم ہو گئے تھے' بمبئی آنے کے بعد ان سبھی کا سراغ مل گیا تھا۔ ولیم بمبئی میں ژیان بنا ہوا تھا اور ژیان کوڈگ میں تھا۔ تنظیم کی طرف سے موصول ہونے والی اطلاع کے مطابق رابرٹ نے میسور کا رخ کیا تھا۔ کویتا یہ پتا چلا کر آئی تھی کہ چندر موہن بھی جنوبی ہند کی جانب سفر کرنے والا ہے۔ میرے قیاس کے مطابق چندر موہن کو میسور' کوڈگ یا کسی اور قریبی علاقے کی سمت جانا تھا۔

جنوبی ہند کے متعلق مجھے کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ میری معلومات صرف میسور اور حیدر آباد دکن تک محدود تھیں۔ چھوٹی سی آزاد ہندو ریاست کوڈگ کے بارے میں مجھے پہلی بار معلوم ہوا تھا۔ میرے دشمن یقیناً مجھے فریب دینے میں کامیاب رہتے اگر خیر کی قوتیں میری پشت پناہ نہ ہوتیں۔ اب میں جو بھی قدم اٹھاتی بے خبری میں نہ اٹھتا۔

عادل میری طرح دوپہر کو آرام کرنے کا عادی نہیں تھا۔ شام کو جب اس سے ملاقات ہوئی تو وہ میری ہدایت پر عمل کر چکا تھا۔ میں اسی کے کمرے میں تھی۔

"وہ ژیان اصلی ہو کہ نقلی جب بھی گورنر ہاؤس سے سیر سپاٹے کو نکلا' ہمیں اطلاع مل جائے گی۔" عادل نے بتایا۔

"تمہارا اندازہ درست تھا' وہ ژیان نہیں ولیم ہے۔" عادل کو میں نے بے خبر نہیں رکھا۔

حسب توقع عادل چونک اٹھا' پھر کہنے لگا۔ "کیا تم اپنے لامحدود ذرائع پر تھوڑی سی لائٹ ڈال سکتی ہو؟ کہیں یہ بے پر کی تمہاری ساتھی سشما نے تو نہیں چھوڑی؟ ویسے بھی آپ کو جاپ کرنے کا شوق ہے۔ آدمی کا کیا بھروسہ کبھی بھی سنک سکتا ہے۔ یہ بمبئی میں اچانک ولیم کہاں سے ٹپک پڑا؟"

"جس طرح رابرٹ ٹپکا تھا۔ دونوں ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔"

"ممکن تو ہے لیکن بات کچھ پلے نہیں پڑی۔ تم اتنے یقین سے یہ بات کیسے کہہ رہی ہو؟"

"ضروری نہیں کہ ہر بات تمہارے پلے ہی پڑ جائے۔ تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ یہ شہر میرے لئے اجنبی ضرور ہے' مگر یہاں کچھ شناسا موجود ہیں۔ وقت پڑنے پر میں ان سے بھی کام لے سکتی ہوں۔" میں نے بات بنا دی' پھر مسکرا کر بولی۔ "پروگرام اب بھی وہی ہے۔"

"یعنی تم ایک عورت ہونے کے باوجود مردوں کو اغوا کرانے سے باز نہیں آؤ گی۔"

"کیوں' کیا صرف مرد ہی عورتوں کو اٹھوا سکتے ہیں؟"

"کچھ بھی ہو' وہ ہے بہت ڈھیٹ۔ جان دینے پر تیار ہو جائے گا مگر زبان نہیں کھولے گا۔" ولیم کے بارے میں عادل گزشتہ تجربے کی بنیاد پر بولا۔

"ایک بار پھر کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

"پہلے تو یہ بتاؤ اس کار خیر کو انجام دینے کے لئے کوئی طریقہ کار سوچا ہے؟ دوسرا سوال تمہارے جواب کے بعد۔"

"تم دوسرا سوال بھی کر ہی لو تاکہ دونوں کے جواب ایک ساتھ دے سکوں۔"

"اگر وہ ہتھے چڑھ گیا تو اس کی "جوتا کاری" کے لئے کوئی جگہ بھی چاہئے ہو گی۔ تو اس کا بندوبست کر لوں؟"

"نہیں' مقامی تنظیم سے اس سلسلے میں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے میں تنظیم کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ جگہ کا بندوبست بھی ہو جائے گا اور طریقہ کار بھی سوچ لوں گی۔ تم فکر نہ کرو' بس جو کہوں کئے جاؤ۔"

"مثلاً کیا کئے جاؤں؟ اس ہوٹل میں تو مکھیاں بھی نہیں کہ خالی بیٹھا انہی کو مارتا رہوں۔"

"اچھا تو پھر کہیں گھومنے چلتے ہیں۔" میں کچھ سوچ کر بولی۔

"لو' مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ گھومنا پھرنا بھی ایک کام ہے۔"

"اب تو پتا چل گیا نا!" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سمجھ گیا میں' تم لب ساحل مٹرگشت کرنا چاہتی ہو۔"

"وہاں بھی چلیں گے مگر پھر کبھی۔" میں دروازے کی طرف بڑھی۔

پھر میں نے کویتا سے بھی ساتھ چلنے کو کہا اور وہ تیار ہو گئی۔ ہوٹل سے نکل کر ہم نے ایک ٹیکسی کی اور اسی میں دیر تک گھومتے رہے۔ راستوں میں اپنے ذہن میں محفوظ کرتی جا رہی تھی۔ ایک بازار سے

گزرتے ہوئے میں نے ٹیکسی رکوا لی۔ مجھے وہاں کتب فروشوں کی دکانیں نظر آ گئی تھیں۔

"اب اترو نا! تھوڑا بہت آدمی کو پیدل بھی چلنا چاہئے۔" یہ کہہ کر میں ٹیکسی سے اتر گئی۔ ٹیکسی والے سے میں نے رکنے کو کہہ دیا۔

کویتا اور عادل بھی ٹیکسی سے اتر آئے۔ جب میں کتب فروشوں کی دکانوں پر نظر ڈالتی ہوئی ایک دکان میں گھسنے لگی تو عادل دھیرے سے بولا۔ "علم سے تمہیں خاصا شغف معلوم ہوتا ہے کرن کماری!"

"ہاں تھوڑا بہت ہے۔" میں مسکرائی اور پھر دکاندار کی طرف متوجہ ہو گئی۔

جنوبی ہند کے متعلق مجھے کام کی دو کتابیں مل گئیں' ایک ہندی میں تھی' دوسری انگریزی میں۔ دونوں کتابیں میں نے خرید لیں۔

دکان سے نکل کر میں نے عادل سے کہا۔ "اب تم سشما کے ساتھ ہوٹل پہنچو' میں ذرا دیر اور گھوم پھر کے آؤں گی۔"

"اکیلی رستہ بھول جاؤ گی اس لئے یہی بہتر ہے کہ ساتھ چلی چلو۔" عادل کہنے لگا۔

"نہیں' تم لوگ جاؤ۔"

عادل کو میری بات ماننا ہی پڑی۔ وہ کویتا کو ساتھ لے کر چلا گیا تو میں نے دوسری ٹیکسی کی اور باندرہ پہنچ گئی۔ رانی کا بتایا ہوا پتا میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ مجھے مطلوبہ کوٹھی کو تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس اجنبی شہر کو گھوم پھر کے دیکھنے کے علاوہ میں نے جو کچھ سوچا تھا' اسی پر عمل کر رہی تھی۔

اس شاندار کوٹھی کے ڈرائنگ روم سے بھی رانی کی امارت کا اظہار ہو رہا تھا جہاں میں' رانی کی منتظر تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کوٹھی کسی جرائم پیشہ عورت کی ہو گی۔ صبح رانی سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی تھی اور آج ہی شام کو میں اسے ملنے پہنچ گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو حیرت کے ساتھ ہی اس کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔

"کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی یہاں تک پہنچنے میں؟" وہ میرے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جب تم مجھے ڈھونڈ سکتی ہو تو میں تمہیں کیسے تلاش نہ کر لیتی۔ تمہیں تو میں نے اپنا پتا بھی نہیں دیا تھا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم تو صرف چائے یا کافی پیو گی' کیا چلے گا بولو؟"

"جو چاہو منگوا لو' مگر تمہیں کہیں آنا جانا تو نہیں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت بندے ہیں آنے جانے کے لئے' میں تو کبھی کبھار ہی نکلتی ہوں۔ ویسے کہیں جانا بھی ہوتا تو تمہارے آنے کے بعد نہ جاتی۔ ہاں تمہیں فون نمبر بھی تو دیا تھا۔"

"فون کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

کچھ ہی دیر بعد کافی پیتے ہوئے میں نے وہ بات چھیڑ دی جس کے لئے آئی تھی۔ رانی نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ مجھے اس سے یہی توقع بھی تھی۔ رانی کی کوٹھی سے واپسی میں مجھے ٹیکسی نہیں کرنا پڑی۔ اس نے مجھے اپنی کار میں ہوٹل پہنچوا دیا۔

جو کتابیں خرید کے لائی تھی' میں نے اسی رات ان کا مطالعہ کر لیا۔ کوڈگ ریاست کے بارے میں مجھے تمام ضروری معلومات حاصل ہو گئیں۔ اس خطہ زمین پر مختلف راج گھرانوں کا اقتدار رہا' مثلاً کدمب' گنگ' چول' چاؤکیہ' ہوئی سیل وغیرہ۔ آخر میں اکیری راج گھرانہ برسراقتدار آیا۔ اس نے حکمران خاندان کا صفایا کر کے عوام کی مرضی سے حکومت کی۔ دو سو سال تک اسی گھرانے کی نسل چلی۔ اسی خاندان کا ایک راجہ راجندر تھا جس نے بڑی کامیابی کے ساتھ حکومت کر کے اپنے ہم عصر راجوں کا احترام حاصل کیا۔ اس کے کوئی بیٹا نہیں صرف ایک بیٹی وستو تھی۔ راجہ کی خواہش تھی کہ اس کے بعد وستو حکومت کرے۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے یہ وچن لیا کہ وستو ہی کو تخت نشین کیا جائے گا' دونوں بھائی' وستو کے وزیر ہوں گے۔ راجہ کا انتقال ہو گیا تو وستو ہی کو راج پاٹ ملا۔ دونوں چچا اس کے وزیر بنے۔ بڑا چچا تو نیک نیت تھا مگر چھوٹا سازشی۔ وہ اپنی بھتیجی وستو کے خلاف ہو گیا۔ اس نے زیادہ عرصے وستو کو حکومت نہیں کرنے دی اور خود راجہ بن بیٹھا۔ اس کا نام لنگ راج تھا۔ لنگ راج نے اپنے سب سے بڑے بھائی سے کیا ہوا عہد توڑ دیا جس نے اسے اولاد کی طرح پالا تھا۔ وستو کا بڑا چچا اسی سبب جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی سازشی لنگ راج کا بیٹا چک ویر ریاست کا موجودہ حکمراں تھا۔ اسے حکومت کرتے ہوئے خاصا عرصہ گزر چکا تھا۔ مڈکیری اس ریاست کا دارالحکومت تھا۔ میں نے اسی مڈکیری کے راج بھون میں اپنے دشمن ژیان کو دیکھا تھا' اس وقت جب ایک پُراسرار تجربے سے گزر رہی تھی۔ مجھے وہاں نہ ہونے کے باوجود سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

اس رات بھی میں ایسے ہی تجربے سے گزری۔ میں نے سونے کے لئے آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ جیسے کوڈگ ریاست کے دارالحکومت مڈکیری پہنچ گئی۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی' محسوس کر رہی تھیں اس کے ساتھ جیسے کوئی سرگوشیوں میں بتاتا جا رہا تھا کہ مجھے نظر آنے والے اجنبی چہرے کن لوگوں کے ہیں۔

میں نے مڈکیری کا راج بھون دیکھا۔ اسی راج بھون کے ایک اندرونی حصے میں کونے والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دروازے پر تالا لگا تھا۔ ایک شخص ادھر آتا دکھائی دیا جو لباس سے ملازم لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی تھالی تھی۔ وہ بند دروازے کے پاس آ کر رکا۔ اسی وقت ایک لنگڑا بھی چابیوں کا گچھا لئے وہاں آ پہنچا۔ اس نے گچھے سے ایک چابی نکال کر تالا کھول دیا۔ کمرے میں جا کر اس نے دروازے پر کھڑے ملازم کو اشارے سے اندر بلایا۔ ملازم کھانے کی تھالی اٹھائے اندر گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی نوجوان عورت کو لنگڑے نے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "کھانا آیا ہے مالکن! لے لیجئے۔"

"تُو اور تیرا کھانا دونوں جائیں بھاڑ میں' دفع ہو یہاں سے۔ تُو ادھر مت آیا کر۔" نوجوان عورت بولی۔

"تو آپ آج کھانا نہیں کھائیں گی کیا؟"

"میں کھاؤں نہ کھاؤں تجھے کیا؟ تُو اپنا کام دیکھ۔"

"دوبارہ کھانا مانگیں گی تو شاید نہ ملے۔"

"چلا جا' زیادہ بات نہ کر۔" نوجوان عورت نے غصے سے کہا' پھر بڑبڑائی۔ "میں کھانا مانگوں گی' اس حرام زادے سے۔"

اسی وقت تقریباً چودہ برس کی ایک لڑکی دروازے کے پاس آئی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ بھی اندر گھس آئی۔ لنگڑے کو شاید اس لڑکی کے وہاں آ جانے کی توقع نہیں تھی۔ وہ لڑکی سے بولا۔ "ارے بٹیا! آپ کو یہاں کس نے آنے دیا؟ چلئے' چلئے۔ آپ کے پتا جی نے دیکھ لیا تو ہم سب کو چیر ہی ڈالیں گے۔"

"بھلے ہی چیر ڈالیں' میں تو بوا جی کے پاس ہی رہوں گی۔"

لنگڑے نے ملازم کو ڈانٹا۔ "ابے میں نے کہا تھا کہ آتے ہوئے دروازہ بند کر کے آنا' تُو کھلا ہی چھوڑ آیا میری جان لینے کو اُلو کہیں کا۔" پھر وہ لڑکی سے کہنے لگا۔ "میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ اب چلئے۔ چاہیں تو پتا جی سے بات کر لیجئے اور دیر مت کیجئے۔ اگر آپ کے پتا جی نے دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔" لنگڑے کی بات چیت سے قیدی نوجوان عورت کے لئے احترام' لڑکی کے لئے شفقت' ملازم کے لئے تحکم اور سخت گیری کے جذبات ظاہر ہو رہے تھے۔

"پتا جی آ جائیں اسی لئے تو میں یہاں آئی ہوں۔ انہیں آنے دو' میں بوا جی (پھوپھی) کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" لڑکی نے کہا جو اپنے بہترین لباس سے راجکماری لگتی تھی۔ راج بھون میں اس کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ وہ اس ریاست کے راجہ چک ویر کی بیٹی تھی۔ قیدی عورت کو وہ پھوپھی کہہ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ قیدی عورت' چک ویر کی بہن تھی۔

لنگڑے نے ملازم پر غصہ اتارا۔ ملازم کے منہ پر طمانچہ مار کر اس نے اس راج کماری کو ڈرایا۔ "تو بلاؤں پتا جی کو۔"

ملازم' راجکماری سے کہنے لگا۔ "مالکن! دیکھئے آپ نے کیا کیا' میرے منع کرنے پر بھی آپ نے دروازہ بند کرنے سے روک دیا۔ آپ کی بات ماننے سے میری یہ درگت بن رہی ہے۔"

راجکماری بولی۔ "خیر جو ہوا سو ہوا۔ تم باہر جاؤ۔ پھر اس لنگڑے کے ساتھ مت آنا۔ تمہیں اس نے دوبارہ ہاتھ لگایا تو میں دیکھ لوں گی۔" پھر وہ لنگڑے سے مخاطب ہوئی۔ "جا' تُو جا کر پتا جی کو بلا لا۔"

لنگڑے کے چہرے سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ غالباً اس کا سبب اسے بار بار "لنگڑا" کہا جانا تھا۔ اس نے راجکماری کو غصے سے گھورا' پھر جانے کیا سوچ کر سٹپٹایا ہوا سا باہر کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ کمرے سے نکلا نہیں تھا کہ ایک باوقار خوبصورت عورت اندر آ گئی۔ لنگڑے نے اسے دیکھا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے عورت کے سامنے سر جھکا کر ہاتھ جوڑے اور کہا۔ "رانی ماں! مالک کا حکم ہے کہ یہاں کسی کو نہ آنے دیا جائے۔ چھوٹی مالکن آ گئیں' یہی ایک مصیبت کی بات تھی اور اب آپ خود بھی چلی آئیں تو نہ جانے کیا ہو گا؟" عاجزی کے ساتھ ساتھ لنگڑے کے چہرے سے بدحواسی ظاہر ہو رہی تھی۔

"بسودیا!" کوڈگ کی رانی کے لہجے میں سختی تھی۔ "محل میں ہمیں کہاں جانا چاہئے' کہاں نہیں' یہ بتانے والے تم ہی ہو گئے؟"

"مالک کا جو حکم تھا' میں نے وہی کیا ہے رانی ماں! وہ خفا ہو گئے تو انہیں کون روک پائے گا؟" لنگڑا بولا جسے رانی نے بسودیا کہا تھا۔

"ٹھیک ہے' انہیں میں روکوں گی' میں سمجھاؤں گی۔"

"جو حکم رانی ماں!"

رانی آگے بڑھ گئی۔ بسودیا دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ راجکماری لپک کر اپنی ماں کے پاس آئی اور ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "ماں جی! بوا جی کہتی ہیں' مجھے کھانا نہیں کھانا۔ آپ ہی انہیں سمجھایئے نا!"

کونے میں بیٹھی عورت اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ رانی اس کے پاس پہنچی اور کہا۔ "کیوں بہن! آج کیا بات ہے؟ کیا بسو نے کچھ کہا ہے؟"

قیدی عورت سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "دیکھو بھابی' کل بھیا نے کہنی ان کہنی سب کہہ دی۔ کہنے لگے کہ تُو کس کے پاپ کی گٹھری اٹھائے پھر رہی ہے؟ بتا' نہیں تو تجھے اس لنگڑے کے حوالے کر دوں گا۔ اب میرے جینے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ میرے مرنے سے سب کو تسلی ہو رہی ہے۔ پھر کھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔"

"یہ تو سب ٹھیک ہے' مگر ہزار باتوں کے بعد بھی جس گھرانے میں تم پیدا ہوئیں اسے تو بچانا ہی ہو گا۔" رانی سمجھانے لگی۔ "بدلے کی بھاؤنا رکھی تو اس گھر کی بیٹی کو مارنے کا پاپ اسی گھر کے سر ہو گا' تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ اس گھر کی بیٹی ہو؟"

"بیٹی پر اتیاچار (ظلم) کرنا تو اس گھر کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ وستو جی بھی تو اسی گھر کی بیٹی تھیں جنہیں راج پاٹ چھین کے بلی چڑھنے پر مجبور کر دیا گیا۔"

"تم اپنے پتا جی کے لئے ایسے شبد (الفاظ) منہ سے نہ نکالو جو اب زندہ بھی نہیں۔" رانی کا اشارہ لنگ راج کی طرف تھا جس نے اپنی بھتیجی کے خلاف سازش کی تھی۔

اسی وقت راجکماری بول اٹھی۔ "ماں جی! آج ہی بوا جی کو ان کی جاگیر پر بھجوا دو' نہیں تو میں کھانا چھوڑ دوں گی۔"

ادھر تو یہ گفتگو جاری تھی' ادھر لنگڑے بسو نے ملازم کو راجہ چک ویر کے پاس یہ کہہ کر دوڑا دیا۔ "بہن کے قیدخانے میں رانی اور راجکماری بات چیت کر رہی ہیں۔ آپ فوراً آئیں۔"

پھر مجھے کوڈگ ریاست کا راجہ چک ویر ادھر آتا دکھائی دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا آ رہا تھا' چہرے پر غیظ و غضب کے آثار تھے۔

چک ویر کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ چالیس سال سے کم تھا لیکن اس کا چہرہ بول رہا تھا کہ اس نے کیسی زندگی گزاری ہو گی۔ اسی کے نتیجے میں چہرے سے سختی اور درشتی ظاہر ہوتی تھی' بڑھاپے کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ جوان جسم میں بوڑھی آنکھیں تھیں جن سے بے رحمی جھلکتی تھی۔

راجکماری نے دور سے اپنے باپ کو آتے دیکھا اور اس کی طرف دوڑی اور قریب جا کر بولی۔ "پتا جی! نہ جانے بسودیا نے کیا کہہ دیا جو بوا جی کھانا نہیں کھاتیں۔ بوا جی کو آپ ان کے گھر بھجوا دیجئے۔"

چک ویر نے اپنی بیٹی کو جھڑکا۔ "مگر تُو یہاں کیوں آئی؟ تجھ سے یہاں آنے کو کس نے کہا تھا؟" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور رانی پر برس پڑا۔ "گورما! تمہیں یہاں کس نے بلایا؟ جہاں رکھا گیا ہے وہیں عزت سے رہو۔ ہماری اجازت کے بغیر کوئی بھی یہاں قدم نہ رکھے۔"

رانی گورما نے اپنے شوہر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا' ہاں ملازم اور بسو سے کہا۔ "تم لوگ دروازے کے باہر ہی ٹھہرو۔"

"اے! تم دونوں یہیں رکو!" چک ویر نے حکم دیا اور پھر رانی سے بولا۔ "باہر تمہیں اور تمہاری بیٹی کو جانا ہے۔"

"میرے سوامی مجھ سے جو کچھ کہیں گے' وہ سب سننے کے لئے کیا نوکروں کا یہاں رہنا ٹھیک ہے؟" گورما نے کہا۔

"ہاں رہنا چاہئے' جو میرا حکم نہ مانے وہ میری پتنی نہیں۔"

"ہاتھ پکڑ کر لائی ہوئی عورت غیر سہی' میں غیر ہوں' پر وہ تو اس گھر کی بیٹی ہے۔" گورما نے قیدی عورت کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ "کیا اسے بھی نوکروں کے سامنے سزا دیں گے؟"

"ہم کیا کرتے ہیں' یہ سب پوچھنے والی تم کون ہو؟ چلو باہر۔"

گورما نے غصے بھری نظر بسو اور ملازم پر ڈالی۔ ملازم دروازے تک کھسک گیا۔ بسو بھی سہم کر دروازے کی طرف سرکا اور دوسری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ گورما' چک ویر سے کہنے لگی۔ "جیوتشی نے کہا تھا' گرہ دشا ٹھیک نہیں۔ یوگ میں دیو کی والی دشا (زوال کی حالت) ہے اسی لئے میں یہاں آئی' نہیں تو میرا یہاں کیا کام۔ آپ دونوں بہن بھائی ہیں' مجھے کیا لینا دینا۔"

"بڑا جان کار ہے تمہارا جیوتشی۔" چک ویر کے لہجے میں طنز تھا۔ "اس بوڑھے نے کہہ دیا اور تم نے مان لیا۔ میری اجازت کے بغیر تم نے یہ کھیل کیوں کھیلا؟"

"میرا آنا غلط سہی' پھر بھی آپ کا اور آپ کی بیٹی کا بھلا ہو' میں اسی لئے یہاں آئی۔ میرا قصور معاف کر دیں اور اپنی بہن کو ان کے گھر بھیج دیں۔"

"اتنی زبان کیوں چلاتی ہو؟ دیوما میری بہن ہے تمہاری نہیں۔" چک ویر نے غصے میں دانت پیسے۔ "کیا کرنا ہے' کیا نہیں' یہ ہم جانتے ہیں۔ ایک سال تک یہاں قید رہنے پر بھی تمہاری نند ماں بننے والی ہے۔ صاف صاف بتاؤ' یہ گناہ کس کا ہے؟ تم ہی نے یہ گل کھلایا ہو گا اور اب اس حالت میں اسے اس کے پتی کے گھر بھیج رہی ہو۔"

اسی دوران چک ویر کی بہن دیوما اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے انگارے برساتی آنکھوں سے بھائی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "مجھے پاپی کہنے والی زبان میں کیڑے پڑیں گے۔ میں تمہاری طرح نہیں ہوں جو من مانے ڈھنگ سے زندگی گزاروں۔ تم بھائی ہو کر..........."

"مجھے بھائی نہ کہہ۔" چک ویر گرجا۔ "بتا کس کے پاپ کی گٹھری اٹھائے کھڑی ہے؟ نہیں تو تجھے بھنگیوں کے پاس.........."

"گندی باتیں مت کیجئے۔" رانی گورما بول اٹھی۔ "بیٹی اور بہن میں کیا فرق ہے' گھر کی بیٹی کی عزت اپنی عزت ہوتی ہے۔ مہینوں یہ روتی رہیں تو ایک دن میں نے ہی نندوئی جی کو بلوا دیا تھا۔ اس میں کون سا پاپ ہو گیا؟ بڑوں نے کیا اسی گھر میں ان کا بیاہ نہیں کیا تھا؟ ان کے اس سے کے آشیرواد کا پھل اب ملا۔ اسے قید خانہ کیوں کہیں' یہ تو سہاگ کا کمرہ ہے۔ اچھی اچھی باتیں کیجئے' اپنی بیٹی سمان بہن کو اس کے پتی کے گھر بھیج دیجئے۔"

"حرامزادی!" چک دیر آپے سے باہر ہو گیا۔ "تُو نے مجھے بتائے بغیر ہی اس اُلو کے پٹھے چین بسو کو یہاں آنے دیا جو میری گدی پر بیٹھنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ تجھے خبر ہے کہ وہ جنتا کو میرے خلاف بھڑکا رہا ہے' یہ آڑ لے کر کہ میں نے دیوما کو اپنی قید میں ڈال رکھا ہے۔ تُو میرے دشمنوں سے مل گئی ہے' ذلیل عورت! میں تجھے ابھی بتاتا ہوں۔ جوتے مار مار کر تیرے سر پر ایک بال نہیں رہنے دوں گا۔" چک دیر گورما کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھا کر بڑھا۔

عین اسی لمحے راجکماری اپنی ماں کو بچانے کے لئے باپ کے پیروں سے لپٹ گئی۔ چک دیر اگر چاہتا تو راجکماری کو جھٹک کے الگ کر دیتا' مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ ظالم اور سنگ دل ہونے کے باوجود شاید بیٹی اس کی زندگی کا نرم گوشہ تھی۔ اس نے راجکماری کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور سمجھانے لگا کہ وہاں سے چلی جائے۔

"نہیں' بوا جی کو جب تک ان کے گھر نہیں بھیجو گے' میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔" راجکماری ضد کرنے لگی۔

"بیٹی! کیا باتیں کرتی ہو؟" چک دیر نرمی سے کہنے لگا۔ "یہ کیسی تیری بوا ہے اور وہ کیسا تیرا پھوپھا۔ تیری بوا کا بس چلے تو مجھے مار کر' تجھے کھا کر خود رانی بن جائے۔ تُو اس ناگن کو بچانا چاہتی ہے۔"

"مجھے ناگن کہتے ہو' اپنے گریبان میں بھی جھانکا ہے تم نے کبھی۔ ایک چمار کا بیٹا بھی تم سے اچھا راجہ بن سکتا ہے۔" دیوما درمیان میں بول اٹھی۔

چک دیر اسے مارنے کو دوڑا تو پھر راجکماری آڑے آ گئی اور دیوما سے کہا۔ "بوا جی! آپ چپ رہئے۔"

"تو مجھ سے کیوں ایسی باتیں کہی جاتی ہیں؟" دیوما بولی۔ "میں نے کب کہا تھا کہ بھائی اور بھتیجی کو مار کر رانی بننا چاہتی ہوں؟ ساری جنتا کہہ رہی ہے کہ راجہ سب کو اپنا دشمن بنا رہا ہے۔ اسے ہٹا کر راجکماری کو گدی پر بٹھانا چاہئے۔ یہی بات ہم نے بھی کہہ دی تو.........."

"بڑی آئی جنتا کو سمجھنے والی۔" چک دیر نے بہن کی بات کاٹ دی۔ "تم لوگوں نے بھتیجی کو گدی پر بٹھانے کے لئے انگریز سرکار کو چٹھی نہیں لکھوائی؟"

"پتا جی! آپ اب تھک گئے ہیں' چلئے چلیں۔ یہ سب باتیں پھر ہو جائیں گی۔" راجکماری نے اپنے باپ کو مخاطب کیا۔

چک دیر نے چند لمحے اپنی بہن دیوما کو گھور کر دیکھا' پھر جانے کیا سوچ کر راجکماری کے ساتھ کمرے

سے چلا گیا۔ وہاں صرف رانی گورما اور دیوما رہ گئیں۔ بسو کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ گورما اپنی نند کو سمجھانے بجھانے لگی اور کھانا کھانے پر راضی کر لیا۔ دیوما نے کھانا کھا لیا تو ملازم تھالی اٹھا کر لے گیا۔

"بھابی! بھیا اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ ان کا پیار ختم ہو چکا ہے۔ وہ ہمیں پنپنے نہیں دیں گے۔" دیوما کہنے لگی۔

"ہم انہیں راہ پر لانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔ وہ لاکھ برے سہی پر ہیں تو تمہارے بھائی۔"

"اس سے کسے انکار ہے لیکن وہ یہ کہیں کہ لنگڑے کی گود میں ڈال دوں گا تو کیا یہ بھی سہن (برداشت) کر لینا چاہئے' کل اس لنگڑے نے مجھے بہت پریشان کیا۔ اس سے ایک بار پھر بات کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ آج رات بھی کل کی طرح وہی حرکت ہو۔" پھر مختصراً اس نے گزشتہ رات کا واقعہ بیان کر دیا۔

گورما نے اس پر اشارے سے رضامندی کا اظہار کیا اور لنگڑے کو آواز دی۔ "بسودیا! ذرا ادھر آؤ۔" لنگڑا دوڑا چلا آیا تو گورما نے اس سے کہا۔ "کل رات تم لوگوں نے بہن جی کو تکلیف دی۔ خبردار دوبارہ ایسی حرکت کی تو۔"

"کل رات مالک آپے میں نہیں تھے۔ وہ بہن جی کے چال چلن کو ٹھیک نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے اسی لئے مجھے حکم دیا جو ماننا پڑا۔" لنگڑے بسو نے صفائی پیش کی۔

"وہ نشے میں تھے۔ انہوں نے چال چلن کو غلط سمجھا تھا مگر تمہیں کیا ہوا تھا؟ تم نے ان کے کہنے پر بہن جی کو پکڑ کر کیوں گھسیٹا اور پھر.........." گورما نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میری عقل بھی ٹھکانے نہیں تھی رانی ماں! ہمیں پتا نہیں ہم نے کیا کیا۔" بسو عاجزی سے بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ تم نے بھی پی رکھی تھی مگر تھے تو ہوش میں۔" دیوما نے بسو سے کہا۔ "بھیا کی بات کے بہانے تم حد سے آگے بڑھ رہے تھے۔" اتنا کہہ کر دیوما نے رانی گورما کو سرگوشی میں بتایا۔ رانی کا منہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"مالک اپنی من چاہی بات کہہ سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ وہ ہوش میں نہیں تھے' پر نوکروں کو تو ان کی طرح نہیں چلنا چاہئے بسودیا! تم ان کے تینوں منتریوں (وزیروں) میں سب سے زیادہ قریب ہو۔ بچپن سے تمہارا اور ان کا ساتھ بھی رہا ہے۔ اب مجھے تمہاری شکایت نہ ملے۔"

"ایسا ہی ہو گا رانی ماں!" بسو نے یقین دلایا۔ "آپ چنتا مت کیجئے۔"

رانی گورما ایک بار پھر دیوما کو دلاسہ دے کر وہاں سے چلی گئی اور لنگڑے بسو نے کمرے کے دروازے پر تالا ڈال دیا۔

منظر ایک بار پھر بدلا اور میں نے اپنی بند آنکھوں سے ژیان کو دیکھا۔ وہ راج بھون سے نکل کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور ڈکیری کی قریبی پہاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ کیا ژیان یہاں سے بھی فرار ہو رہا ہے؟ میں نے اسی حالت میں سوچا اور پھر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل گیا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑائی۔ "وہ بھلا وہاں سے کیوں فرار ہو گا' اس کے لئے

کوڈگ سے زیادہ محفوظ جگہ اور کون سی ہو گی؟"

پھر مجھے جو کچھ دکھایا اور سنایا گیا تھا' اس پر غور کرنے لگی۔ ان باتوں سے میرا کیا تعلق؟ اس نیک روح عظیم مہیمن کا مقصد کیا ہے؟ انہی سوالوں پر غور کرتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی لیکن سونے سے پہلے میں چند نتائج اخذ کر چکی تھی۔ پُراسرار تجربات بے معنی ہرگز نہیں تھے۔

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح ہی صبح میرے کمرے کے دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دی گئی۔ میں اس وقت تک جاگ چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر فوراً دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی کمرے میں داخل ہونے والا شخص میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے "نمستے" کیا' پھر جیب سے کی رنگ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس سے چابیاں لے لیں۔ وہ میرے سامنے بطور تعظیم سر جھکا کر لوٹ گیا تو میں نے کمرے کا دروازہ پھر بند کر لیا۔ چابیاں میں نے ہینڈ پرس میں رکھ دیں' میرے اور کویتا کے کمروں کے درمیان جو دروازہ تھا' اسے میں نے کھولا تو کویتا جاگ گئی۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھنے لگی۔

"لیٹی رہو' تم سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔" میں آگے بڑھ کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"نہیں کماری جی! تم آؤ اور میں لیٹی رہوں' یہ کچھ اچھا تو نہیں لگے گا۔" کویتا بولی۔ اس نے میری ہی ہدایت پر مجھے بے تکلفی سے مخاطب کیا تھا۔ وہ بہرحال میری ہم جماعت کا کردار ادا کر رہی تھی۔ "کہو کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

مجھے جو کچھ کہنا تھا' اس سے کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے' ناشتے کے بعد ہی چلنا ہے؟ .... بال مکند کو پتا نہیں چلے گا' بس تم مجھے اشارہ کر دینا۔"

"ہاں ناشتہ کر کے ہی چلیں گے۔ ویسے بھی تم میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھو گی۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد میں' عادل اور کویتا' ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ناشتہ کر رہے تھے۔

"کیا آج گھومنے پھرنے کا پروگرام نہیں؟" میں نے کچھ دیر بعد چائے کا گھونٹ لے کر عادل سے پوچھا۔

"کل کی طرح نہیں۔" عادل نے جواب دیا۔ "میں ہرگز اکیلا ہوٹل نہیں لوٹوں گا۔"

"کل بھی تم اکیلے کب لوٹے تھے' سشما تمہارے ساتھ تھی۔" میں مسکرا کر بولی۔

"کیا آج بھی کتابیں خرید کر انہیں تنہائی میں کہیں پڑھنا ہے؟"

"اچھا اگر تمہیں پڑھنے لکھنے سے اتنا ہی بیر ہے تو آج کتابیں نہیں خریدوں گی۔"

"واپسی بھی ساتھ ہو گی۔"

"چلو یہ بھی منظور۔" میں نے کہا۔ "اور کوئی شرط؟"

"جی نہیں' شکریہ۔"

"ہاں یاد آیا بال مکند!" میری آواز دھیمی ہو گئی۔ "کل ہم گورنر ہاؤس کی طرف تو گئے ہی نہیں۔ مجھے بڑا شوق ہے اسے دیکھنے کا' چاہے دور ہی سے دکھا دو پلیز۔"

عادل کے لئے یقیناً میرا اصل مقصد سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ وہ چونک اٹھا اور پھر اس کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا۔

"شام کو چلیں گے۔" عادل بولا۔

میں سمجھ گئی کہ اس موضوع پر وہ مجھ سے پہلے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اسے میں نے یہ موقع نہیں دیا اور بولی۔ "میری ایک سہیلی یہاں بمبئی میں بھی رہتی ہے' بڑے گھرانے کی ہے۔ کل مل گئی تھی اتفاق سے۔ مجھے کہنے لگی' تم بمبئی گھومنے آئی ہو تو کہاں سواریوں کے چکر میں پڑو گی۔ میں نے اسے اپنے ہوٹل کا پتا دے دیا۔ اس نے آج صبح ہی صبح کار بھیج دی۔ یہ دیکھو کار کی چابیاں۔" میں نے پرس کھول کر چابیاں نکالیں۔ "اب ہمیں ٹیکسیوں وغیرہ کے لئے خوار ہونے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جب اس نے کار بھیج ہی دی ہے تو پھر ابھی گھومنے کیوں نہ چلیں۔ بولو سشما! تم کیا کہتی ہو؟" میں نے کویتا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا کرن! اب خوب سیر کریں گے۔ ابھی چلیں۔" کویتا نے میری مرضی کے مطابق جواب دیا۔

عادل پھنس ہی گیا۔ مجبوراً اسے میری بات ماننا پڑی۔ ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں مطلوبہ کار کو پہچان لینا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ اسی کار میں گزشتہ روز میں' باندرہ سے ہوٹل تک آ چکی تھی۔ کار کی چابیاں میں نے عادل کو دیں تو کہنے لگا۔ "ڈرائیونگ میرا شوق ضرور ہے' پیشہ نہیں۔ تم نے اپنی مالدار سہیلی سے ڈرائیور کے لئے بھی کہہ دیا ہوتا تو میرا احسان نہ اٹھانا پڑتا۔"

"تو کیا ہوا' کچھ دیر کے لئے میں تم ہی کو ڈرائیور سمجھ لوں گی۔ جسم پر وردی نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے اسے اور تپا دیا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہم گھوم پھر کر ہوٹل واپس آ گئے۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

"اچھا بال مکند! اب دوپہر کو کھانے پر ملیں گے۔" میں نے کویتا کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اس وقت تو عادل کچھ نہیں بولا لیکن جب میں اپنے کمرے میں پہنچ گئی تو ذرا ہی دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف عادل ہی تھا۔ "کرن! تم سے میں ایک ضروری بات کہنا بھول ہی گیا۔ تم اگر........."

"بھول گئے تو پھر چھوڑو' کبھی پھر سہی۔" میں بول اٹھی۔

"بات بہت ضروری ہے۔"

"جسے کہنے کو تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہا ہو گا۔ ہے نا یہی بات؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"پلیز کرن! سمجھا کرو۔"

"اچھا میں آ جاتی ہوں' بس!"

"تھینک یو!" اس نے کہا اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ کیوں بے چین ہے' اسے مزید ستانا ٹھیک نہیں تھا۔ میں اسی لئے اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"یہ سب کیا چکر ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔" عادل کہنے لگا۔ "یہ تمہاری پراسرار سہیلی کون ہے جس نے فی الفور کار بھیج دی؟ تم آخر مجھے کچھ بتانے سے کیوں گریز کر رہی ہو' کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟"

"اب تم اتنی سنجیدگی سے بات کرو گے تو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ تمہاری صورت پر بارہ بجتے دیکھ کر مجھے گربچن سنگھ جی یاد آ گئے۔"

"بارہ بھی تو تم ہی نے بجائے ہیں.......... گورنر ہاؤس میں گھسنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔"

"ہنسی کھیل نہیں تو اتنا زیادہ مشکل بھی نہیں۔ تم تو مجھے اس طرح ڈرا رہے ہو جیسے میں' شیر کی کچھار میں گھسنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"لیکن پہلے تو تمہارا کچھ اور پروگرام تھا۔ تم نے کہا تھا کہ ژیان کو اسی وقت گھیرا جا سکتا ہے' جب وہ گورنر ہاؤس سے باہر نکلے۔"

"اور میں غالباً تمہیں یہ بھی بتا چکی ہوں' وہ ژیان نہیں ولیم ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑ گیا' بات تو وہی رہی۔ وہ ژیان ہو کہ ولیم' ہے تو گورنر ہاؤس میں۔"

"دیکھا جائے گا۔" میں ٹال گئی۔ "کوئی نہ کوئی رستہ نکل ہی آئے گا۔"

"تو ابھی تم نے کچھ سوچا نہیں؟" اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیا۔

"دہلی کے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخل ہونا کیا آسان تھا' تمہارے خیال میں؟ پھر بھی راستہ نکل ہی آیا نا.......... ابھی تو میں نے گورنر ہاؤس کو دور سے بس ایک نظر دیکھا ہے۔ ایک آدھ چکر ادھر کا اور لگاؤں گی تو مسئلہ حل ہو ہی جائے گا۔"

"تم بہت شدید خطرہ مول لے رہی ہو۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس اور گورنر ہاؤس میں بہت فرق ہے۔"

"میرا ارادہ آج رات ادھر تنہا جانے کا ہے۔ کار تو ہے ہی پاس۔"

"اگر جانا ہی ہے تو پھر میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

"اور میں تمہیں ساتھ نہ لے جاؤں تو؟"

"صبر کر لوں گا اور کیا کر سکتا ہوں۔" عادل نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "ہاں وہ تم نے اپنی سہیلی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"بتانا کیا' اس سے تمہیں ملوا ہی جو دوں گی۔"

"یقین نہیں آ رہا؟"

"کر لو یقین کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے ورنہ بندی اپنا ارادہ بدل بھی سکتی ہے۔"

"دھمکی نہ دو' کر لیا یقین.......... تو کب ملوا رہی ہو؟"

"شاید کل ہی ملوا دوں۔" میں بولی۔ "اچھا اب تمہارے پیٹ کا مروڑ بند ہوا کہ نہیں؟ کچھ اور پوچھنا ہے۔"

"یہاں سے کیا میسور چلنے کا ارادہ ہے؟" عادل نے سوال کیا۔ "جنوبی ہند کی تاریخ کا مطالعہ بلاوجہ تو نہیں ہو سکتا۔ رابرٹ بھی تو ادھر ہی گیا ہے۔"

"ابھی کچھ نہیں معلوم' پہلے ایک کبوتر کو تو کابک میں بند ہونے دو۔ دوسرا جہاں اُڑ گیا ہے' ضروری تو نہیں کہ وہیں اپنے اڈے پر بیٹھا رہے۔"

"کبوتر' کابک' اڑا۔ لگتا ہے تم نے کبھی نہ کبھی کبوتربازی بھی ضرور کی ہے۔"

"وہ تو خیر اب بھی کرتی ہوں۔ اس وقت بھی ایک کبوتر میرے سامنے غٹرغوں' غٹرغوں کئے جا رہا ہے۔" میں یہ کہتے ہی ہنستے ہوئے اٹھی۔

"جوابی کارروائی سے بچ کر بھاگ رہی ہو۔"

عادل کی بات کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے کمرے سے نکل آئی۔ اسی رات کو میں' کویتا کو ساتھ لئے اپنے کمرے سے نکلی۔ راہداری میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی کے چہرے بدلے ہوئے تھے۔ لباس بھی چہروں کے مطابق ہی تھا۔ ہمیں کوئی دیکھتا تو دیسی عیسائی ہی سمجھتا' ایسی عیسائی عورتیں جو انگریزوں کی نقل میں کچھ زیادہ ہی ماڈرن نظر آنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں پوری تیاری سے چلی تھی۔ میرے ہینڈ پرس میں "سائلنٹ ڈیتھ" بھی موجود تھی۔

ہوٹل کی عمارت سے باہر آ کر میں پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھی۔ بظاہر میرے انداز میں لاابالی پن تھا لیکن میں اردگرد کا جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ کویتا کو میں نے ایک جگہ کھڑا کر دیا اور پارکنگ لاٹ سے کار نکال لائی۔ کویتا کو بھی میں نے اپنے ساتھ آگے ہی بٹھایا۔

اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ بمبئی شہر پوری طرح سویا نہیں تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کم ضرور تھا مگر اتنا کم بھی نہیں کہ اس وقت ہمارے کہیں جانے کو غیرمعمولی بات سمجھا جاتا۔ میں نے دانستہ اس وقت کا انتخاب کیا تھا۔ کویتا کو کیا کرنا ہے؟ میں اسے اچھی طرح سمجھا چکی تھیں میں نے ژیان اور ولیم دونوں ہی کا حلیہ اس کو ذہن نشین کرا دیا تھا۔ ہوٹل سے گورنر ہاؤس تک کا راستہ میرے ذہن میں محفوظ تھا' سو کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں صحیح سمت میں بڑھ رہی تھی کہ اچانک چونک اٹھی۔ ایک کار کو میں نے اپنے تعاقب میں دیکھ لیا تھا۔ اپنی کار کی رفتار بڑھا کر میں نے راستہ بدل دیا۔ وہ کار بھی خاصے فاصلے سے تعاقب کرتی رہی۔ اس کار کو ڈاج دیئے بغیر اب گورنر ہاؤس کا رخ کرنا لاحاصل تھا۔ تعاقب کرنے والی کار میں جو لوگ بھی رہے ہوں' خاصے ذہین اور چوکنا تھے۔ میں نے کئی مرتبہ اپنی کار کی رفتار گھٹا بڑھا کر کوشش کی کہ کسی طرح درمیانی فاصلہ کم ہو جائے' مگر ناکام رہی۔

کیا کھیل شروع ہو گیا؟ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ کار ڈرائیو کرتے ہوئے میں سوچنے لگی۔

کویتا کو بھی شاید خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ میری بے مقصد ڈرائیونگ ہی تھی۔ وہ بار

بار مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ بلا سبب وقت ضائع ہونے سے میں بھی جھنجلا گئی۔ پون گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ متعاقب کار نے اب تک جان نہیں چھوڑی تھی۔ اپنی پلاننگ میں یہ رخنہ اندازی مجھے بار گزرنے لگی تو مجبوراً انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔ میں شہر سے باہر نکل آئی تھیں۔ اپنی کار کو میں نے ایک طرف روک لیا تھا۔

میری ہدایت کے مطابق کویتا غائب ہو گئی اور جب کچھ دیر بعد لوٹی تو میں نے اس کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھی۔

"کیا ہوا' کام ہو گیا نا؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "اس کار میں چار آدمی تھے' میں نے چاروں کو بے ہوش کر دیا' مگر.........."

"کہو نا' گھبرا کیوں رہی ہو؟"

"ان میں سے ایک بال مکند تھا۔ تم نے کہا تھا کہ سبھی کو.........."

"ٹھیک کیا تم نے۔" میں بول اٹھی۔ "اب ایسا کرو' ان میں سے صرف بال مکند کو اٹھا لاؤ۔"

"کویتا پھر چلی گئی۔ مجھے اس دوران میں ایک مرتبہ کچھ شبہ تو ہوا تھا کہ کہیں وہ لوگ مقامی تنظیم کے بندے نہ ہوں' مگر ان سے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔ میری حفاظت کی خاطر انہیں اس حد تک نہیں بڑھنا چاہئے تھا۔ اس طرح تو بمبئی میں مجھے نقل و حرکت کرنا دشوار ہو جاتا۔ نیک نیتی کے باوجود کم از کم عادل کو یہ سمجھ لینا چاہئے تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ اس کی ساری ہوشیاری اور ذہانت دھری رہ گئی تھی۔ ہوٹل کے قریب ہی وہ مقامی تنظیم کے ارکان کو ساتھ لئے موجود ہو گا۔ کار کے ماڈل اور نمبر سے اس نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں اور کویتا میک اپ میں ہیں۔ مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور ان لوگوں پر ترس بھی جو اب صبح سے پہلے ہوش میں نہ آتے۔ کویتا کو میں نے یہی ہدایت دی تھی۔ اس نے میرے حکم کی تعمیل تو کر دی مگر ان لوگوں کے ساتھ عادل کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

آج کی رات رائیگاں نہیں جانا چاہئے' میں نے سوچا۔ ولیم کسی بھی وقت جُل دے کر نکل سکتا تھا۔ کویتا کی واپسی تک میں نے سوچ لیا کہ کیا کرنا ہے۔

"بال مکند کو پچھلی سیٹ پر لٹا دو۔" میں نے کویتا سے کہا۔

کویتا میری ہدایت پر عمل کرنے کے بعد آگے' آ کر بیٹھ گئی تو میں نے کار اسٹارٹ کر دی۔

متعاقب کار کو ڈاج دینے کے چکر میں راستوں پر میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ میں صرف دو ہی دن تو اس اجنبی شہر میں گھومی پھری تھی۔ مجھے اسی لئے واپسی میں خاصی مشکل ہوئی۔ تقریباً رات کے ایک بجے دوبارہ میں اس علاقے میں پہنچی جہاں سے گورنر ہاؤس زیادہ دور نہیں تھا۔

"تم وہاں تک پہنچ تو جاؤ گی نا؟" میں نے ایک ذیلی سڑک کی طرف کار موڑی۔ دور تک کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں بہت آسانی سے۔" کویتا نے اطمینان سے جواب دیا۔ "مجھے وہ عمارت نظر آ گئی ہے جو دن میں دیکھی تھی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے تم جاؤ' میں تمہیں یہیں ملوں گی۔ کوشش کرنا زیادہ دیر نہ لگے۔" میں نے کار کو بریک لگائے۔

جانے اور واپس آنے میں کویتا کو آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ وہ کامیاب لوٹی تھی۔ ولیم' ژیان کے میک اپ ہی میں تھا اسی لئے اسے کویتا نے جلد تلاش کر لیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ میں نے تصدیق کرنے کے بعد وہ ولیم ہی ہے' کوئی اور نہیں' اسے اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان ڈال دیا۔ وہیں پہلے سے چادر موجود تھی جو میں نے اسے اوڑھا دی۔ تصدیق کی خاطر مجھے وگ اور ماسک الگ کرنا پڑے تھے۔

یہ میری بہت بڑی کامیابی تھی کہ ولیم دوبارہ میرے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ میرا دل اسی لئے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسی کے ساتھ مجھے خطرے کا احساس بھی تھا۔ کار کے پچھلے حصے میں دو بے ہوش جسم پڑے تھے' ایک سیٹ پر دوسرا نیچے' گاڑی اگر کہیں چیک کر لی جاتی تو کوئی بھی خلاف توقع صورت حال پیش آ سکتی تھی۔ میں نے اسی سبب اس علاقے سے نکلنے میں دیر نہیں کی۔ اب میری کار تیز رفتاری سے فاصلہ طے کر رہی تھی۔ عادل کی وجہ سے میں نے اپنے پروگرام میں تبدیلی کر دی۔ اب مجھے ہوٹل بھی واپس پہنچنا تھا۔ میری منزل باندرہ تھی۔ وہاں تک پہنچنے میں مجھے کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ شاید قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ دو ایک جگہ پولیس کی گشتی گاڑیاں نظر بھی آئیں مگر انہوں نے میری کار پر توجہ نہیں دی۔ میں نے بھی ایسے مواقع پر دانستہ کار کی رفتار کم ہی رکھی تھی۔

رانی مجھے توقع کے مطابق منتظر ہی ملی۔ کار اب اس کی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو چکی تھی۔ اسی کے ساتھ آہنی پھاٹک بند کر دیا گیا تھا۔ سامنے ہی کوٹھی کے برآمدے میں رانی ٹہل رہی تھی۔ میں نے کار کو روک کر کویتا سے کہا۔ "تم کار ہی میں بیٹھو' میں ابھی آتی ہوں۔"

کار سے اتر کر میں نے دروازہ بند کیا اور پھر برآمدے میں پہنچ گئی۔ میک اپ کے باوجود مجھے رانی اور اس کے بندوں نے کار کی وجہ سے پہچان لیا تھا۔

"مجھے واپس بھی جانا ہے۔" میں نے رانی کے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔

"بندے کو تو اٹھا لائیں نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ بے ہوش ہے' اسے کار سے اتروا لو۔ تم کہہ رہی تھیں' اسے کہیں اور لے چلنا ہے۔ اب یہ کام تم کرو گی۔ میں کل صبح یہیں تمہاری کوٹھی پر آؤں گی۔ پھر یہاں سے تمہارے کھار والے اڈے پر چلیں گے جس کا تم ذکر کر رہی تھیں۔"

"لیکن تمہیں اتنی دیر کیسے ہو گئی؟ تم تو بارہ بجے سے ساڑھے بارہ تک یہاں پہنچنے کو کہہ کر گئی تھیں۔ اب ڈھائی بج رہے ہیں۔"

"باقی باتیں صبح۔" میں مسکرا کر بولی۔ "میں دس اور گیارہ بجے کے درمیان آ جاؤں گی۔"

اس کے بعد رانی کے آدمیوں نے بے ہوش ولیم کو کار سے نکال لیا۔ اس کی جگہ میں نے بطور احتیاط عادل کو لٹا کر چادر ڈال دی۔ رانی کار کے قریب ہی کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ کار کے اندر

اب اندھیرا نہیں تھا۔ رانی مجھ سے دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ "یہ تو تمہارا ہی آدمی ہے' یہ کیسے بے ہوش گیا؟"

میں نے کار کا پچھلا دروازہ بند کر دیا اور کہا۔ "حیرت ہے' تمہیں نہیں معلوم کہ لوگ کس طرح بے ہوش ہو جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' میں سمجھ گئی۔" وہ مسکرائی۔ "کل بات کریں گے۔"

اس دوران کویتا کار سے نہیں اتری تھی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی تو پھاٹک کھول دیا گیا۔ میں نے گاڑی ریورس میں لی اور پھر گیٹ سے نکل کر اسٹیئرنگ گھمایا۔

ولیم کے بارے میں رانی کو میں نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ ایک انگریز ہے۔ ایک معاملے میں اس کی زبان کھلوانا ہے' اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ بہت عیار و شاطر ہے' اسے فرار کا موقع نہیں دینا۔ کھار میں رانی کا پرانا اڈا تھا۔ وہاں ایسی جگہ موجود تھی جہاں ولیم پر ہر ممکن تشدد کر کے اسے بولنے پر مجبور کیا جا سکے۔ رانی کو میں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرے ساتھ تشدد یا پوچھ گچھ کے دوران میرا ہی ایک بندہ ساتھ ہو گا' وہاں سے اسے اپنے آدمی ہٹانا ہوں گے۔ ولیم کون ہے' اس کے اغوا کا مقصد کیا ہے اور میں کیا معلوم کرنا چاہتی ہوں' رانی کو میں نے نہ خود کچھ بتایا تھا' نہ اس نے پوچھا تھا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال کویتا کے ساتھ بھی تھی۔ ژیان کے متعلق اسے پہلے سے علم تھا' اسی کے ساتھ یہ بھی کہ میرے کچھ اور دشمن بھی ہیں۔ یوں بھی اب وہ میری مزاج آشنا ہو چکی تھی۔ اس نے یقیناً یہ سمجھ لیا تھا کہ میں کسی معاملے میں غیر ضروری سوالات پسند نہیں کرتی۔ میں کیا کر رہی ہوں' کن لوگوں سے میرا تعلق ہے' میری کس بات کا کیا مقصد ہے' اس سلسلے میں کبھی وہ کوئی سوال نہیں کرتی تھی۔ میں جو کچھ بتا دیتی' کویتا کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا۔ اس سے میں نے دوسری مرتبہ بہ مجبوری اس نوعیت کا کام لیا تھا' پہلی بار دہلی میں اور اب بمبئی میں۔

ولیم کو اغوا کرنے کے بعد میک اپ کی اب ضرورت نہیں رہی تھی۔ ہوٹل کی طرف واپسی میں ایک سنسان جگہ دیکھ کر میں نے کار روک لی۔ ہم دونوں پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھیں اور گلوں میں زنجیروں سے منسلک خوبصورت صلیبیں پڑی تھیں۔ لباس تبدیل کرنا تو ممکن نہیں تھا اس لئے زنجیریں اتار دیں' پھر میک اپ بھی چہروں پر نہ رہنے دیا۔ مطمئن ہو کر میں نے کار آگے بڑھائی اور اطراف کا جائزہ بھی لیا۔

عادل کو کار سے اس کے کمرے میں پہنچانے کی ذمے داری کویتا نے سنبھال لی۔ وہ عادل کے بے ہوش جسم کو لے کر پارکنگ لاٹ سے غائب ہو گئی تو میں کار سے اتری۔

میں اوپر پہنچی تو کویتا اپنے کمرے میں موجود تھی۔ میں نے درمیانی دروازہ بند کیا اور لباس تبدیل کر کے بستر پر دراز ہو گئی۔

صبح مجھے باندرہ پہنچنا تھا اس لئے جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ مجھے عادل کی خبر بھی لینا تھی جس کی وجہ سے گزشتہ رات پریشانی اٹھانا پڑی تھی۔ میں اسی سبب ناشتہ کرنے سے پہلے ہی تیار ہو کے باہر آ گئی۔ ابھی

صبح کے پونے سات ہی بجے تھے۔ عادل کے کمرے کا دروازہ کافی دیر دستک دینے کے بعد کھلا اور میں اندر داخل ہو گئی۔ میں نے عادل کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ اس کے ذہن پر اب تک غنودگی طاری ہے۔ وہ میرے کہنے پر باتھ روم میں گھس گیا میں اس دوران ناشتہ منگوا چکی تھی۔

عادل باتھ روم سے لباس تبدیل کر کے نکلا تو فریش نظر آنے لگا۔

"رات کو میں نے بڑا عجیب خواب دیکھا۔" عادل میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہمارے درمیان موجود میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔

"پہلے ناشتہ کرو' پھر یہ بتانا کہ خواب میں تم کسی چمگادڑ کی طرح رات بھر ایک درخت کی شاخ سے الٹے لٹکے رہے۔" یہ کہہ کر میں نے ایک ٹرے اپنی طرف کھسکالی۔

وہ میرا فقرہ سہہ گیا۔ اس کے چہرے سے الجھن اور کسی قدر فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتہ کر کے جب ہم چائے پی رہے تھے تو وہ بولا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ میں کسی پُراسرار قسم کی خرافات پر یقین نہیں رکھتا۔" اس کے لہجے میں سنجیدگی ظاہر ہو رہی تھی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

"میں جو کچھ کہنے والا ہوں' اس سے تمہارا گہرا تعلق ہے۔"

"ہو گا' مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ میں تو اس وقت تم سے کیا ہوا ایک وعدہ نبھانے آئی تھی۔ میں اپنی سہیلی سے ملنے جا رہی ہوں' تمہیں چلنا ہے تو چلو۔"

"وہ تو خیر میں چلوں گا لیکن رات کو تم کہاں گئی تھیں؟"

"تمہیں بتایا تو تھا میں نے۔" میں چاہتی تھی' وہ خود ہی کھل جائے۔ اسی کے بعد میں اس کی خبر لیتی۔

"گورنر ہاؤس تو نہیں گئیں تم۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟" میں نے فوراً سوال کیا۔

"تم بھی تو اپنی معلومات کے ذرائع بتانے سے گریز کرتی ہو' پھر میں کیوں بتاؤں؟"

"نہ بتاؤ' میں نہیں پوچھتی تم سے۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ آئندہ اس طرح کی حرکت میں پسند نہیں کروں گی۔" میں سنجیدگی سے بولی۔

میری بات سن کر اس نے طویل سانس لیا' پھر کہنے لگا۔ "تو تمہیں معلوم ہو ہی گیا کہ تمہارا تعاقب کرنے والے کون لوگ تھے؟" وہ آخر کھل ہی گیا۔

"اور یہ بھی کہ ان کو میرے پیچھے لگانے والا کون تھا۔" میں نے کہا۔ "دیکھو' میں تمہیں اس لئے اپنے ساتھ دہلی سے یہاں نہیں لائی کہ تم دشواریاں پیدا کرو۔ اس طرح میں تمہارے خلوص پر شک نہیں کر رہی۔ بات صرف نادانی کی ہے۔ تمہیں یقیناً علم نہیں ہو گا کہ تمہاری "پُرخلوص نادانی" کی وجہ سے مجھے ولیم کو گورنر ہاؤس سے اغوا کرنے میں کتنی مشکلات پیش آئیں۔ خاصا وقت تمہارے خلوص اور ذہانت کی وجہ سے رائیگاں ہو گیا۔"

"کیا.......... کیا کہہ رہی ہو تم .... ولیم کو گورنر ہاؤس سے اغوا کرلیا؟" عادل کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ "مگر کب.......... کیسے؟ تم تو یہاں سے کویتا کے ساتھ نکلی تھیں۔"

"صرف تمہیں ڈاج دینے کے لئے۔" میں نے بات بنا دی۔ "مجھے اندازہ تھا کہ تم خاموش نہیں بیٹھو گے اور وہی ہوا۔ تمہیں اور کویتا کو چھوڑنے مجھے ہوٹل آنا پڑا۔ تمہارے ساتھ مقامی تنظیم کے ارکان بھی خواہ مخواہ لپیٹ میں آ گئے۔ پتا نہیں' انہیں اب تک ہوش بھی آیا ہو گا کہ نہیں یا ابھی تک شہر سے باہر کار میں بے ہوش پڑے ہوں گے۔"

"لیکن تمہاری کار تو بہت آگے جا کے رکی تھی اور .... اور تم نے ہمیں بے ہوش کیسے کیا؟"

"ہوش و حواس کھونے سے پہلے خود تمہیں کیا محسوس ہوا تھا؟"

"بس اچانک ہی انتہائی نیند آنے لگی تھی اور پھر.........."

"تمہیں یاد نہیں کیا ہوا.......... تم اپنے کمرے میں کس طرح پہنچ گئے' یہی نا؟"

"ہاں' جب دروازے پر مسلسل دستک ہوئی تو میں جاگ اٹھا۔ میں اپنے کمرے میں تھا۔ پھر خود ہی میں نے تمہارے لئے دروازہ کھولا جو اندر سے بند تھا۔ یہ .... کس طرح ممکن ہے؟"

"یہ ان باتوں کا وقت نہیں۔ بہرحال میں نے کسی بھی طرح تمہیں تمہارے کمرے میں پہنچا دیا۔ کبھی عقل پر بھی زور دے لیا کرو۔ تمہارے کمرے کی کھڑکی اب بھی کھلی ہوئی ہے۔"

"مجھے بھی معلوم ہے' مگر یہ تیسری منزل ہے۔"

"تو ہوا کرے۔ تم پھر فضول باتوں میں الجھ گئے .... غلطی دراصل میری ہی تھی۔ نہ میں تمہیں یہ بتاتی کہ رات کو گورنر ہاؤس کی طرف جاؤں گی نہ یہ سب کچھ ہوتا۔"

"کیا نہ ہوتا؟"

"یہی کہ تم مقامی تنظیم کے ارکان کو اپنے ساتھ لے کر میرے پیچھے مارے مارے پھرو۔" میں بولی۔ "خیر اب چلنا ہے یا نہیں؟"

"کہاں؟"

"بتا تو چکی ہوں تمہیں' اپنی سہیلی سے ملوانے لے جا رہی ہوں۔"

"اور ولیم؟"

"اس سے بھی مل لینا۔"

ہم دونوں ہی اس وقت تک چائے پی چکے تھے۔ عادل میرے ساتھ چل دیا۔ اس کے چہرے سے ابھی تک الجھن کے آثار ختم نہیں ہوئے تھے۔ نیچے آ کر کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔ "چلنا کدھر ہے؟"

"باندرہ۔" میں نے بتا دیا۔ "اس وقت آٹھ بج رہے ہیں۔ آرام سے چلو' ابھی خاصا وقت ہے۔" میں اس کے برابر آگے ہی بیٹھی تھی۔

کار ہوٹل کے احاطے سے باہر نکل آئی تو عادل بولا۔ "کیا ولیم کو وہیں رکھا ہے؟"

"نہیں' وہاں تو میں تمہیں اپنی سہیلی سے ملوانے لے جا رہی ہوں۔ پھر ولیم کے پاس چلیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس بار بھی وہ ڈھیٹ ثابت ہوتا ہے یا.........."

"اپنی جان زار سے گزر جاتا ہے۔" عادل بول اٹھا۔

"نہیں' اب کے جلد بازی کی ضرورت نہیں۔" میں نے تاکید کی۔ "تشدد اس حد تک کرنا ہے کہ وہ برداشت کرتا رہے۔ کسی کو مسلسل جگایا جائے' بھوکا پیاسا بھی رکھا جائے اور تھوڑا بہت تشدد بھی کیا جاتا رہے تو رفتہ رفتہ اس کے اعصاب جواب دینے لگتے ہیں۔ زبان کھلوانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں دیر لگتی ہے۔ مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ دو تین روز ولیم رائٹ کے نام سہی۔ میں اسے مرنے تو نہیں دوں گی' جب تک وہ زبان نہیں کھولے گا۔"

"لیکن نہ تمہارے چہرے پر میک اپ ہے نہ میرے۔"

""اب اس سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ سیدھی سیدھی بات کرنا ہے۔ جب وہ زبان کھول دے گا تو پھر اسے زندہ چھوڑ دینے کا کیا جواز ہے؟"

"اور یہ بات اسے بھی معلوم ہو گی۔"

"ہوا کرے معلوم۔" میں بے پروائی سے بولی۔ "جب اس کی قوت ارادی ختم ہو جائے گی' اعصاب جواب دے جائیں گے تو خود ہی بول اٹھے گا۔" اس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر مجھے ایک بات یاد آ گئی اور میں نے عادل کو مخاطب کیا۔ "تمہیں وہ جرائم پیشہ عورت رانی یاد ہے جس کا ذکر تم سے دہلی میں کیا تھا؟"

"ہاں یاد ہے۔ اس نے تمہیں اپنے ایک آدمی کے قتل میں پھنسوانا چاہا تھا۔ مختصراً تم نے اس کے بارے میں بتایا بھی تھا لیکن اس وقت وہ تمہیں کیسے یاد آ گئی؟ .... کہیں اس وجہ سے تو نہیں کہ اس کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا؟ اس کی طرف سے تم کوئی خطرہ تو محسوس نہیں کر رہیں؟"

"خطرہ کیسا؟ ہم اس وقت اسی کے پاس تو چل رہے ہیں۔ باندرہ میں وہی تو رہتی ہے۔"

"اچھا تو تم نے اس کا سراغ لگا ہی لیا .... اور پہلے اسی سے نمٹ لینا چاہتی ہو۔"

"ہاں۔" میں ہنس پڑی' پھر اسے بتایا۔ "شری بال مکند جی! اس سے آپ اسی کی کار ڈرائیو کر رہے ہیں۔"

"یعنی یہ کار اسی جرائم پیشہ عورت کی ہے؟"

"ایسے لوگوں سے بھی وقت بے وقت کے لئے دوستی رکھنا پڑتی ہے۔"

"تاکہ وہ کسی قتل کے کیس میں پھنسوا دیں۔ ٹھیک ہے شریمتی کرن کماری! تم نے دہلی میں غلط نہیں کہا تھا کہ میرا کام تمام کرانے ساتھ لے جا رہی ہو۔" پھر اس نے ٹھنڈا سانس بھر کے کسی شاعر کا ایک مصرع پڑھا ؎

ہم تو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

اس وقت تک کار باندرہ کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ میں' عادل کی رہنمائی کرنے لگی۔ اسی

کے ساتھ میں نے اسے بتا دیا کہ رانی میرے سامنے ہتھیار ڈال چکی ہے اور اب دھوکہ نہیں دے گی' پھر کہا۔ "تم البتہ اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دو گے کہ اسے پہلے سے جانتے ہو' میری مراد غائبانہ طور پر جاننے سے ہے۔" میں نے عادل کو یہ بھی سمجھا دیا کہ رانی کے سامنے اسے کیا کردار ادا کرنا ہے۔

ذرا ہی دیر کے بعد کار اس کوٹھی کے پھاٹک پر رکی جہاں گزشتہ رات بھی میں آ چکی تھی۔ ہارن دینے پر پھاٹک کھول دیا گیا اور کار اندر داخل ہو گئی۔

ایک شخص کی رہنمائی میں ہم کار سے اتر کر رانی کے خوبصورت ڈرائنگ روم تک پہنچ گئے۔ عادل میرے ساتھ نہیں دور بیٹھا تھا۔ اس بڑے ڈرائنگ روم میں دو صوفہ سیٹ پڑے تھے۔ دیواروں پر مصوری کے "شاہکار" لگے تھے۔ مصوری کی بجائے وہ نیم عریانی کا اشتہار معلوم ہوتے تھے۔ ڈرائنگ روم ہی کے ایک گوشے میں بار کاؤنٹر بھی تھا۔ مجموعی طور پر وہ ڈرائنگ روم ایک ہندوستانی عورت سے زیادہ کسی پست ذہن انگریز کا لگتا تھا۔ اس کی خوبصورتی' نفاست اور صفائی کی مرہون منت تھی' دوم ان ایرانی قالینوں کی وجہ سے قائم تھی جو فرش پر بچھے ہوئے تھے۔ عادل کنکھیوں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا کہ رانی اندرونی دروازے سے داخل ہوئی۔ وہ سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے تھی' میری طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگی۔ "تم کچھ جلدی آ گئیں کرن!"

"ہاں بس جلدی چل دی ہوٹل سے۔" میں بولی۔ "تیار ہو جاؤ تم' پھر چلتے ہیں۔"

"چلنا تو خیر ہے۔" وہ میرے قریب بیٹھ گئی اور ٹھنڈا سانس بھرا اس کے چہرے سے فکرمندی ظاہر تھی۔

"کہیں وہ انگریز بچہ بھاگ تو نہیں گیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں بھاگ گیا .... بہت دور بھاگ گیا' اتنی دور کہ اب اس کا ہاتھ آنا ناممکن ہے۔"

کچھ دیر کو میں گم صم سی ہو گئی۔ میرے ذہن میں مختلف سوالات پیدا ہونے لگے۔ ولیم نے رانی سے سودے بازی تو نہیں کر لی؟ رانی یا اس کے آدمیوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے اپنی اصل شخصیت تو ظاہر نہیں کر دی؟ ولیم بہت عیار تھا۔ اس سے کچھ بھی ممکن تھا' مگر میرے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔

ہوش میں آتے ہی اس نے اپنی فطری عیاری سے کام لے کر فرار ہونا چاہا تھا۔ رانی کے آدمی یہی سمجھتے رہے کہ وہ بے ہوش ہے۔ اسی سبب اسے باندھا نہیں گیا تھا۔ انہیں علم نہیں تھا کہ ولیم کیا "آفت شے" ہے۔ ولیم کو ایک ایسے تہہ خانے میں رکھا گیا تھا جس کے اندر اور باہر رانی کے مسلح آدمی متعین تھے۔ ولیم نے رانی کے ایک مسلح آدمی پر جست لگائی تو پتا چلا کہ اسے ہوش آ چکا تھا' مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ ولیم نے اس آدمی کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ تہہ خانے میں اس وقت صرف دو آدمی تھے۔ دونوں ولیم کے ہاتھوں مارے گئے۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی باہر متعین مسلح آدمیوں نے اپنے ساتھیوں کو گولیاں کھا کر گرتے دیکھا۔ ولیم زینے کی طرف بھاگ رہا تھا کہ اوپر سے اس پر گولیوں کی بارش کر دی گئی۔ کچھ ہی دیر پہلے رانی کو یہ اطلاع ملی تھی۔ پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد رانی بولی۔ "میں نے حکم دے دیا ہے کہ تینوں لاشوں کو ابھی اسی حالت میں تہہ خانے کے اندر پڑا رہنے دیا جائے۔ میں سوچ ہی

رہی تھی کہ تمہیں جلدی بلا لوں کہ تم خود ہی آ گئیں۔ مجھے اپنے آدمیوں کی غفلت پر انتہائی شرمندگی ہے۔"

میں کچھ نہیں بولی' بولتی بھی کیا' اب کچھ کہنے نہ کہنے سے حاصل بھی کیا تھا؟ ولیم نے موت کو گلے لگا کر میری فتح کو شکست میں بدل دیا تھا۔ جلد ہی میں نے اپنے حواس پر قابو پا لیا اور کہا۔ "اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں۔ میری وجہ سے تمہارے بھی تو دو آدمی مارے گئے۔"

"اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ آدمی تو مارے ہی جاتے ہیں' مگر اس انگریز کو نہیں مرنا چاہئے تھا جس سے تمہیں کچھ معلوم کرنا تھا۔ مجھے تو افسوس یہ ہے کہ تم نے مجھ سے جس پہلے کام کے لئے کہا' میں وہی انجام نہ دے سکی۔" رانی کے لہجے میں تاسف تھا۔ پھر مجھے اس کے چہرے پر سختی کے آثار نظر آئے۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔ "کوئی شیر تو نہیں تھا وہ کہ سب کو چیر پھاڑ ڈالتا' اسے گولی مارنا ضروری ہو جاتی۔ اس نے دو ہی بندے تو گرائے تھے۔ اتنے بوکھلا جانے کی کیا ضرورت تھی؟ گولی ہی چلانا تھی تو اس کے ہاتھ پر چلائی ہوتی تاکہ ریوالور چھوٹ جاتا۔ کھار چلنا پڑے گا۔ میں آتی ہوں ابھی لباس تبدیل کر کے۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی' پھر اندر چلی گئی۔

میں خود یہ چاہتی تھی کہ ولیم کی لاش خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ شاید اس خواہش کا سبب میرا ماضی ہی تھا۔ پہاڑی بستیوں میں دشمن کا کٹا ہوا سر دیکھنے کی روایت عام تھی۔ انتقامی جذبات سے قطع نظر اس کی بڑی وجہ یہ تصدیق کرنا بھی تھا کہ واقعی دشمن مارا جا چکا ہے۔ تاریخی کتابوں میں بھی میں نے یہی پڑھا تھا کہ بادشاہوں کو دشمنوں یا باغیوں کے سر طشت میں سجا کر پیش کئے جاتے تھے یا کاٹ کر ان کے پاس روانہ کئے جاتے تھے۔ مغل تاجدار اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں اس کے بڑے بھائی دارا شکوہ کا کٹا ہوا سر پیش کیا گیا تھا۔ کیا ایک چھوٹے بھائی کے لئے یہ کوئی اچھا نظارہ ہو گا؟ مقصد صرف یہ تصدیق ہو گی کہ اقتدار کا دعویدار مارا گیا' درمیان میں کوئی سازش نہیں ہوئی۔ ایسے ہی متعدد واقعات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔

موجودہ واقعے کا پس منظر محض اتنا تھا کہ رانی یا اس کے آدمیوں کو یہ معلوم نہیں تھا' ولیم کون تھا۔ اگر انہیں یہ خبر ہوتی تو شاید ولیم کو گولی نہ مارتے۔ وہ تو ولیم کی اہمیت سے واقف ہی نہیں تھے۔ رانی کو اس سلسلے میں کچھ بتانا میرے نزدیک خلاف مصلحت تھا۔ اپنے دو ساتھیوں کو گولی کھا کے گرتے دیکھ کر رانی کے آدمی یقیناً بوکھلا گئے تھے ورنہ وہ یہی کوشش کرتے کہ ولیم کو زخمی کر کے گرا لیں۔

دور بیٹھنے کی وجہ سے عادل میرے اور رانی کے درمیان ہونے والی گفتگو یقیناً سن نہیں سکا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ لاتعلق سا بیٹھا تھا جیسے اس معاملے سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ وہ اپنا کردار بخوبی نبھاہ رہا تھا۔ رانی لباس تبدیل کرنے چلی گئی تو بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ نہ رانی نے اس سے براہ راست تعارف حاصل کرنا چاہا تھا' نہ میں نے یہ ضرورت محسوس کی تھی۔

رانی لباس تبدیل کر کے آ گئی تو ہم باندرہ سے کھار کے لئے روانہ ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی بیٹھی تھی۔ برابر والی نشست پر میں تھی اور عادل پچھلی سیٹ پر تھا۔ مجھ سے وہ عورت شرمندہ تھی اور اسی

شرمندگی کا غصہ اپنے آدمیوں پر اتارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ولیم مر چکا تھا اسی کے ساتھ رانی کے دو آدمی بھی مارے جا چکے تھے۔ میری نظر میں اب سب کچھ فضول تھا۔ رانی اگر بطور سزا اپنے دو ایک آدمیوں کو اور ٹھنڈا کر دیتی تو اس سے کیا حاصل ہوتا۔ میں اسی لئے اسے سمجھانے لگی۔ میرا مقصد تو محض ولیم کی لاش دیکھنا تھا ورنہ تو میں باندرہ ہی سے اپنے ہوٹل واپس چلی جاتی۔ رانی میرے سمجھانے پر ”ہوں‘ ہاں“ تو کرتی رہی مگر اس کا چہرہ لہجے کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

جب رانی ہمارے ساتھ کھار کے اس مخصوص حصے میں پہنچی جہاں اس کا اڈا تھا تو کھلبلی سی مچ گئی۔ کسی سے کوئی بات کئے بغیر وہ اس عمارت میں داخل ہو گئی جس پر ایک رفاہی ادارے کا بورڈ لگا تھا۔ میں نے سوچا‘ وہ بورڈ محض فراڈ ہو گا مگر ایسا نہیں تھا۔ اندر ایک ہال میں مرد‘ عورتیں اور بچے نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف بڑی سی میز ڈالے دو ڈاکٹر بیٹھے دکھائی دیئے جو مریضوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ ہال ہی میں ایک طرف ڈسپنسری تھی جہاں سے لوگ دوا لے رہے تھے۔ ہال میں خاصی گہما گہمی تھی۔ اس ہال سے گزر کر رانی کے ساتھ ہم چھوٹے سے صحن میں آ گئے۔ سامنے دائیں جانب ایک بند دروازے کے سامنے رک کر رانی نے مخصوص انداز میں دستک دی۔

دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی اور ہم رانی کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ فوراً ہی دروازہ بند کر لیا گیا اور دو مسلح افراد ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ ایک کمرے سے گزر کر راہداری تھی۔ وہاں بھی مسلح افراد نظر آئے۔ اسی راہداری کے تقریباً وسط میں ایک اور بند دروازہ دکھائی دیا۔ دروازے کے سامنے دو افراد ریوالور ہاتھ میں لئے مستعد چوکنا کھڑے تھے۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی انہوں نے دروازہ کھولا اور سامنے سے ہٹ گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی تہہ خانے میں اترنے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ خاصا بڑا تہہ خانہ تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ اس تہہ خانے کو ذخیرہ اندوزی کے لئے استعمال کیا جاتا ہو گا۔ وہاں لگے ہوئے تمام بلب جل رہے تھے۔

زینے کے اختتام پر سیڑھیوں کے قریب ہی کوئی اوندھا پڑا تھا۔ آس پاس خون پھیلا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک اور لاش پڑی تھی جس کے قریب فرش پر ریوالور گرا ہوا تھا۔ ذرا اور آگے تیسری لاش تھی۔ سیڑھیاں اترنے سے پہلے ہی میں نے پورے تہہ خانے کا جائزہ لے لیا۔ اوندھے پڑے ہوئے شخص کے بارے میں میرا قیاس تھا کہ ولیم ہو گا۔ اب تک رانی نے کسی سے پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ ہم سب دروازے کے بعد اور زینے کے درمیان جو جگہ تھی وہاں کھڑے تھے۔

”نیچے چلیں؟“ رانی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں۔“ میں نے کہا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

رانی‘ عادل اور دونوں مسلح افراد میرے پیچھے تھے۔ نیچے پہنچتے ہی میں نے اردگرد پھیلے ہوئے خون سے بچتے ہوئے اوندھی پڑی لاش کو سیدھا کر دیا۔ مرنے والا ولیم ہی تھا۔ اس کے اکڑے ہوئے ہاتھ میں ریوالور اب تک موجود تھا۔ سینہ تقریباً ادھڑا ہوا تھا‘ ایک گولی اس کی گردن پر بھی لگی تھی۔ معلوم نہیں اس کے جسم میں کتنی گولیاں پیوست تھیں‘ صرف چہرہ بچ گیا ورنہ شناخت مشکل ہو جاتی۔

میں نے طویل سانس لیا اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اب تہہ خانے میں رکنا بے سود تھا۔

رانی ہمیں ساتھ لئے اوپر ایک کمرے میں آ گئی۔ اوسط درجے کی وہ ایک نشست گاہ تھی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”جن لوگوں نے اوپر سے انگریز پر فائرنگ کی انہیں بلواؤ۔“ رانی نے ایک مسلح شخص کو حکم دیا۔ دوسرا اس کے اشارے پر نشست گاہ کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد کمرے میں چار افراد داخل ہوئے۔ ان چاروں کے بیانات وہی تھے جو رانی مجھے باندرہ میں بتا چکی تھی۔ رانی کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ وہ چاروں غیر مسلح تھے اور ان کے پیچھے ذرا فاصلے پر وہ دونوں مسلح افراد گنیں لئے کھڑے تھے جو اب تک ساتھ ساتھ رہے تھے۔

چاروں افراد کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

”تم چاروں کو بھی اگر تمہارے ساتھیوں کے پاس تہہ خانے میں پہنچا دیا جائے تو کیسا رہے؟“ رانی بظاہر پُرسکون آواز میں بولی۔

ردعمل ظاہر تھا۔ وہ گڑگڑانے لگے‘ رانی سے رحم کی بھیک مانگنے لگے۔

رانی ان پر برس پڑی‘ پھر چند لمحے توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”تم اس قابل نہیں کہ میرے ساتھی کہلاؤ‘ آج کے بعد تمہیں بمبئی میں نظر نہیں آنا چاہئے۔ کہیں بھی نظر آ گئے تو مار دیئے جاؤ گے۔ اس سے زیادہ میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کر سکتی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا فیصلہ بدل دوں‘ دفع ہو جاؤ۔“ وہ چاروں لرزتے کانپتے کمرے سے نکل گئے تو رانی مسلح افراد سے مخاطب ہوئی۔ ”آج رات تینوں لاشیں ٹھکانے لگوا دینا۔“

اسی وقت میں بول اٹھی۔ ”انگریز کی لاش کے چہرے کو مسخ کرنا پڑے گا.......... بلکہ گردن کاٹ کے چہرہ مسخ کرنے کے بعد اسے کہیں زمین میں دبا دیا جائے تو بہتر ہے‘ آبادی سے کہیں بہت دور۔ اسی طرح جسم کے مختلف حصے کاٹ کر الگ الگ دبائے جائیں۔“

”اسے ناقابل شناخت بنانا کون سا مشکل ہے۔“ رانی مجھ سے بولی‘ پھر اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”جاؤ اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دو‘ پھر پٹرول چھڑک کر لاش جلا دو۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گی۔ آدھے گھنٹے کے اندر یہ کام ہو جانا چاہئے۔ میں مسخ شدہ لاش دیکھ کر جاؤں گی۔ اتنے میں ہمارے لئے کافی بھجوا دو۔“

رانی کا حکم سن کر وہ دونوں مسلح افراد چلے گئے اور ان کی جگہ دروازے پر دو دوسرے گن مین آ کھڑے ہوئے۔ میں نے عادل کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈالی جو بائیں طرف ایک کرسی پر حیران حیران سا بیٹھا تھا۔ اسے شاید اندازہ نہیں تھا کہ جرائم کی دنیا کی رانی اتنی سفاک ہو گی۔

کافی آ گئی تو رانی پہلی مرتبہ عادل کی طرف متوجہ ہوئی اور مجھ سے پوچھا۔ ”کیا بال مکند تمہارا خاص آدمی ہے؟“ پھر اس نے عادل کو کرسی اٹھا کر قریب آنے کو کہا۔

”یس میڈم!“ عادل بولا اور قریب آ گیا۔ سامنے میز پر ایک ٹرے میں کافی کے مگ رکھے تھے۔

"ہاں تو کرن! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا.......... لو کافی پیو۔" اس نے جھک کر خود ایک مگ اٹھا کے دیا' پھر عادل کو مگ اٹھانے کا اشارہ کیا۔

"دہلی میں جب تم نے مجھے پولیس کے چکر میں پھنسوا دیا تھا تو بال مکند ہی اپنے ایک ساتھی کو لے کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ بقیہ کہانی تمہیں معلوم ہی ہے۔ تمہیں اسی ایک واقعے سے بال مکند کی مستعدی کا اندازہ ہو جانا چاہئے۔ اس کے بروقت پہنچنے ہی کی وجہ سے تمہاری چال کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"ویری گڈ!" اس نے عادل کو ستائشی نظروں سے دیکھا' پھر دوسرا سوال کیا۔ "اور وہ لڑکی سشما؟"

"اسے بھی تم میری خاص بندی کہہ سکتی ہو۔" میں نے جواب دیا۔ میرے لئے یہ بات کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں تھی کہ عادل اور کویتا کے فرضی نام اسے کس طرح معلوم ہو گئے۔ ظاہر ہے اس نے اسی ہوٹل سے یہ نام معلوم کرائے ہوں گے جہاں ہم ٹھہرے تھے۔

"میرے پاس ایسے بیدار ذہن بندے کم ہیں۔" اس نے اعتراف کیا۔

رانی مجھے اور عادل کو فرضی ناموں سے مخاطب کر رہی تھی۔ اس سے عادل کو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا ہو گا کہ رانی میری اصل شخصیت سے بے خبر ہے۔ ہاں مجھے یہ خیال ضرور تھا کہ باتوں باتوں میں کویتا کا ذکر نہ چھڑ جائے۔ عادل کو یہ معلوم نہ ہو کہ جب میں' ولیم کو اغوا کر کے باندرہ پہنچی تھی تو کویتا بھی میرے ساتھ تھی اور عادل کار میں بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اسی لئے موضوع گفتگو بدل دیا۔ میں' بمبئی میں رانی کے مزید ٹھکانوں کے متعلق پوچھنے لگی۔

"اسی رفاہی ادارے کی دو تین شاخیں شہر میں اور بھی ہیں جہاں غریب مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔" رانی نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "میری ماں تو مر چکی ہے' لیکن اس طرح میں نے اس کا نام زندہ رکھا ہے۔" پھر وہ سنجیدہ نظر آنے لگی اور بولی۔ "اسی کھار کے علاقے میں رہتے ہوئے میں نے غربت کے بہت تماشے دیکھے ہیں۔ سو اگر کسی غریب آدمی یا عورت کو میری حرام کی کمائی سے تھوڑا بہت فائدہ پہنچ جائے تو کیا بُرا ہے۔ میں اسے کوئی نیکی کا کام سمجھ کے نہیں کرتی' نہ ایشور یا اللہ سے اس کے بدلے کچھ چاہتی ہوں کہ گاڈ' ایشور یا اللہ سے کوئی سودے بازی نہیں چل سکتی۔ یہ کام سیٹھ لوگوں کا ہے جو غریبوں کا خون چوس کر اپنی تجوریاں بھر لیتے ہیں اور تیرتھ یاترا یا زیارتیں کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ حساب برابر ہو گیا۔ کوئی پیاؤ بنوا دی' اناتھ آشرم کھول دیا' کسی عبادت گاہ کی تعمیر میں پیسہ لگا دیا' پھر دو اور دو پانچ کرنے بیٹھ گئے۔ اتنے پُن اتنے پاپ۔ یہ ثواب کا کام کیا تو اس کا ڈبل اتنا ہوا۔ یہ گناہ کیا تو آدھے ثواب سے برابر ہو گیا' ڈیڑھ ثواب اس کے باوجود منافع میں رہا۔ یہ لوگ ایشور اور اللہ سے بھی دکان داری کرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ دکان داری ان کے کسی کام آئے گی یا نہیں۔ نہ میں جاننے کی تمنا رکھتی ہوں۔ مجھے تو صرف اپنی خبر ہے کہ ایسے کاموں سے میرے دل کو سکون ملتا ہے' سو یہ بہت ہے۔ اس کے علاوہ یہ میری ضرورت بھی ہے۔ کسی عام آدمی کو شک نہیں ہوتا کہ رفاہی ادارے کی آڑ میں کچھ اور بھی ہو رہا ہے۔" وہ بڑا کڑوا سچ بول رہی تھی۔ میں نے اس سے اتفاق یا اختلاف ضروری نہیں

سمجھا۔ زندگی کو برتنے کا اپنا اپنا ڈھب اور انداز نظر ہے۔

کافی پی کر اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ پھر ذرا دیر بعد اس کے کارندے واپس آ گئے۔ اس کے حکم کی تعمیل کر دی گئی تھی۔

"تم دیکھو گی اس انگریز کی جلی ہوئی لاش؟" اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا' پھر بولی۔ "لاش ناقابل شناخت سہی مگر اسے کہیں زمین میں دبوا ضرور دینا۔" میں کسی بھی امکان کو نظرانداز نہیں کر رہی تھی۔ گورنر ہاؤس سے ولیم کی پُراسرار گمشدگی کے بعد کسی مسخ شدہ لاش کا کہیں پایا جانا' عیار حکمرانوں کو کڑی سے کڑی ملانے میں معاون ثابت ہوتا۔

"کسی لاش کو ٹھکانے لگواتے ہوئے اتنی احتیاط کبھی میں نے بھی نہیں کی۔ کیا یہ کوئی بہت اہم آدمی تھا؟"

"انتہائی اہم۔" میں نے صرف اتنا ہی کہنا کافی سمجھا۔

رانی چلی گئی اور پھر اسے لوٹنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے کہا۔ "میں نے تمہاری ہدایت پر عمل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔"

میں اور عادل اٹھ کھڑے ہوئے۔ رانی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ کار کا رخ باندرہ کی بجائے جب ہوٹل کی طرف ہو گیا تو میں نے پوچھا۔ "تم رکو گی میرے پاس؟"

"نہیں' نہیں ہوٹل چھوڑ کر واپس باندرہ جاؤں گی۔ پیچھے جو کار آ رہی ہے' وہ بھی اپنی ہے۔ میں اسی کار میں.........."

"وہ تو ٹھیک ہے' تم کھار ہی سے چلی جاتیں۔"

"تو اتنی دیر تمہارے ساتھ کیسے رہتی۔" وہ دھیرے سے ہنسی' پھر پوچھنے لگیں "تم ابھی رہو گی نا بمبئی میں؟"

"کچھ خبر نہیں۔ رہ بھی سکتی ہوں کچھ دن اور نہیں بھی۔"

"تمہارے ساتھ یہ بڑا دلچسپ معاملہ ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔"

"دراصل میرے کہیں رہنے یا نہ رہنے کا تعین وقت اور حالات کرتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور خاص بات نہیں۔" میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہہ دیا۔

معلوم نہیں وہ مطمئن ہوئی یا نہیں لیکن اس نے پھر کچھ نہیں پوچھا' ہاں اتنا ضرور کہا۔ "جاؤ تو مل کر جانا' اگر تمہارے لئے یہ ممکن ہو۔"

رانی کا دل رکھنے کے لئے میں نے وعدہ کر لیا کہ مل کے جاؤں گی یا فون کر کے اسے ہوٹل بلوا لوں گی۔ اسی کے ساتھ میں بولی۔ "تمہاری کار بھی تو واپس کرنا ہے نا۔"

"اس کے لئے تو خیر تمہارا فون کر دینا بھی کافی ہو گا' ڈرائیور چابیاں لے جائے گا۔ میں تو ملنے کو کہہ رہی تھی۔"

"ٹھیک ہے' پوری کوشش کروں گی۔" میں نے یقین دہانی کرائی۔

مجھے اور عادل کو ہوٹل کے احاطے میں چھوڑ کر رانی پیچھے آنے والی کار میں بیٹھ کر واپس چلی گئی۔ دوپہر بارہ بجے تک ہم ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ عادل مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ بیٹھتے ہی اس نے موجودہ صورت حال پر گفتگو شروع کر دی۔ "میں یہ تو نہیں پوچھوں گا کہ گورنر ہاؤس سے ولیم رائٹ کو تم نے کیسے اغوا کیا اور اس کے لئے کیا پلاننگ کی' ہاں حکومت کے ردعمل پر ضرور بات کروں گا۔ کچھ نہ پوچھنے کی وجوہ کئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم کسی سبب رازداری برتنے لگی ہو جس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ سنجیدہ تھا۔ "کچھ معاملات میں رازداری بھی ضروری ہوتی ہے۔ مثلاً کسی سے یہ کہہ دیا جائے کہ تمہاری نگرانی کی جا رہی ہے تو لامحالہ اس کی توجہ دوسری طرف بٹ رہتی ہے' خواہ وہ نگرانی خود اسی کی حفاظت کے لئے ہو۔ گزشتہ رات مجھ سے جو حماقت سرزد ہوئی' اس کا سبب لاعلمی تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ تم بمبئی میں اجنبی ہو' کہیں تمہیں کوئی خطرہ پیش نہ آ جائے۔ اتنا تو میں بھی سمجھ گیا تھا کہ تمہیں تعاقب کی خبر ہو گئی ہے۔ کوئی سوال نہ کرنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ کچھ باتیں بغیر بتائے بھی سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ تم نے ولیم کے اغوا میں رانی سے کام لیا ہو گا۔ خیر جو بھی ہو' گورنر ہاؤس سے ولیم کا یوں اچانک غائب ہو جانا ہمارے لئے نئے خطرات کو جنم دے سکتا ہے۔"

"اس ضمن میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔" میں بولی۔ "پہلی اہم بات تو یہ کہ بمبئی میں موجود حکومت کے اعلیٰ حکام مثلاً گورنر وغیرہ کو بھی حقیقت کا علم تھا یا نہیں؟ یہ بات میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ جب ولیم کو اغوا کیا گیا تو وہ ژیان ہی کے گیٹ اپ میں تھا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ حقیقت سے بے خبر تھے تو بہرحال ژیان' حکومت کا مہمان تھا۔ اس کی گمشدگی اس صوبے کے حکام کے لئے تشویش ناک ہو سکتی ہے کہ وہ کیوں اور کہاں چلا گیا؟ حکومت اس بات سے باخبر ہے کہ میں' ژیان پر ہاتھ ڈالنا چاہتی ہوں۔ ایسی صورت میں حکومت مجھ پر شبہ کرے گی۔ اسی کے ساتھ بمبئی میں میری موجودگی کے امکان پر غور کیا جائے گا۔ پھر ژیان کی تلاش کے ساتھ ساتھ میری تلاش بھی شروع ہو سکتی ہے لیکن ایسا ہوا بھی تو وقتی طور پر ہو گا۔ یہاں کے اعلیٰ حکام مرکز کو ژیان کی گمشدگی سے فوری طور پر یا تلاش میں ناکامی کے بعد بہرصورت بے خبر نہیں رکھیں گے جسے یقیناً علم ہو گا کہ ژیان کہاں ہے اور یہ کہ ژیان کے گیٹ اپ میں ولیم تھا۔ ایسی صورت میں مرکزی حکومت یہاں کے اعلیٰ حکام کو ژیان کی مزید تلاش سے روک دے گی۔ بمبئی کے گورنر ہاؤس سے ولیم جیسے گھاگ شخص کا غائب ہو جانا' مرکزی حکومت کے لئے زیادہ باعثِ تشویش نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب چند روز تک ولیم کہیں بھی نظر نہ آیا اور مرکزی حکومت سے رابطہ قائم نہ کیا تو صورت حال بدل جائے گی۔ ولیم کی گمشدگی میں بھی حکومت کو میرا ہی ہاتھ نظر آئے گا۔ کیونکہ میں پہلے بھی ژیان کے گیٹ اپ میں ولیم کو دہلی کے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے اغوا کر چکی ہوں۔ ولیم کے توسط سے حکومت کے علم میں یہ بات آ چکی ہے۔ سرفروش تنظیم بھی میرے ساتھ بھرپور تعاون کر رہی ہے' اس سے بھی حکومت آگاہ ہے۔ مختصراً یہ کہ میرے یا تنظیم کے لئے جو خطرات پہلے تھے' وہ اب بھی بدستور موجود رہیں گے۔ اب ہم دوسرے مفروضے پر غور کرتے ہیں' یعنی بمبئی کے حکام ولیم کی یہاں موجودگی سے واقف تھے۔ اس طرح ہمارے لئے فوراً کوئی خطرہ نہیں۔ ولیم کی حیثیت اور

مرتبے سے آگاہی کچھ دن انہیں غفلت کا شکار رکھے گی۔ یوں ہم بمبئی سے باآسانی جنوبی ہند کا رخ کر سکتے ہیں۔ اب بمبئی میں رہنا کوئی ضروری نہیں رہا۔" میں نے تفصیل کے ساتھ پوری صورت حال واضح کر دی۔

کچھ دیر عادل کے چہرے سے غور و فکر کا اظہار ہوتا رہا' پھر اس نے بتایا۔ "گزشتہ رات تنظیم نے یہ کنفرم کر دیا ہے کہ رابرٹ ہیم یہاں سے میسور ہی گیا ہے۔ ولیم رائٹ کی موت کے بعد اب ایک یہی اہم کارڈ ہمارے سامنے ہے۔ ظاہر ہے تم یہاں سے میسور ہی چلو گی۔"

"بمبئی سے کدھر چلنا ہے' اس سوال کو فی الحال ذہن سے جھٹک دو۔"

"چلو جھٹک دیا پھر؟"

"تم یہ بتا سکتے ہو کہ وائسرائے کے دو قریب ترین اہم افراد کا پہلے بمبئی آنا اور پھر ان میں سے ایک کا میسور جانا کیا ظاہر کرتا ہے؟"

"یہ کہ اس علاقے میں کوئی اہم معاملہ درپیش ہے۔" عادل نے جواب دیا۔

"جنوبی ہند میں حکومت کے لئے کیا معاملہ اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے؟"

"اس پر غور کرنا پڑے گا۔"

"میں غور کر چکی ہوں۔"

"تو پھر تم ہی بتا دو کس نتیجے پر پہنچیں؟"

میں نے جواب میں عادل کو اخذ شدہ نتائج سے آگاہ کر دیا۔ ان نتائج کا تعلق حکومت کے آئندہ اقدامات ہی سے تھا' ممکنہ اقدامات۔

"تم جو کچھ کہہ رہی ہو' حکومت کے لئے مشکل تو ضرور ہے' ناممکن نہیں۔ جس طرح اس نے ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی ریاستوں پر رفتہ رفتہ قبضہ کر لیا یا پھر انہیں اپنا سدلیس اور ہمنوا بنا لیا اسی طرح کسی نہ کسی بہانے حکومت آئندہ ریاست کوڈگ پر بھی ہاتھ صاف کر سکتی ہے۔ اس کے لئے حکومت کو ابھی سے منصوبہ بندی اور راہ ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر جگہ انگریز نے آپس کے نفاق' اقتدار کی جنگ اور عموماً ہندوستانی حکمرانوں کی نااہلی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مذکورہ ریاست کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں' لیکن معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس خطے میں ہماری تنظیم کے جو لوگ سرگرم عمل ہیں' وہ ضروری معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ اس سے ایک اور نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ اس علاقے میں رابرٹ ہیم کا قیام طویل عرصے بھی ممکن ہے۔ یہ بات بہرحال ہمارے حق میں جاتی ہے۔ پھر تو ہمیں یہاں سے میسور ہی چلنا چاہئے۔ وہاں بھی تنظیم کی شاخ موجود ہے۔" عادل نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"نہیں' ہمیں ادھر کا رخ کرنا ہے جہاں اصل معرکہ متوقع ہے' یعنی کوڈگ۔" میں نے کہا۔ "تم یہاں کی مقامی تنظیم کے ذمے داروں سے مل کر کوڈگ کے بارے میں ممکنہ معلومات حاصل کرو اور یہ بھی کہ ہم بحفاظت کوڈگ کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟ وہ بہرحال ایک الگ ریاست ہے اور وہاں انگریزوں کا ابھی عمل دخل نہیں۔ سرفروش تنظیم غیر ملکی غاصبوں کے خلاف برسرپیکار ہے۔ کوڈگ' انگریزوں کی

حدود مملکت میں شامل نہیں اس لئے ظاہر ہے تنظیم کی کوئی شاخ وہاں ممکن نہیں۔ آج ہی تم دوپہر کے بعد ذمے دار افراد سے مل لو۔ ہم جتنی جلدی بمبئی سے نکل جائیں بہتر ہے۔"

"ظاہر ہے کہ ہم کوڈگ پہنچ کر اس ریاست کے ہندو راجہ کو آنے والے خطرات سے آگاہ کریں گے۔ اس طرح یہ ریاست غیر ملکی حکمرانوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے میدان جنگ کا کام دے سکتی ہے۔" عادل کا لہجہ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے پُرجوش ہو گیا۔

"بے خبری بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔" بے اختیار میرے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔

عادل میرا منہ دیکھتا رہ گیا' پھر کہنے لگا۔ "تمہاری بات کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"سمجھ جاؤ گے' فی الحال جو کہا ہے' وہ کرو۔"

"تم پھر بقراط بننے لگیں۔"

"چلو میں نہیں تم بقراط بن جاؤ۔ مجھے اس پر ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اچھا اب اٹھو' کھانے کا وقت ہو رہا ہے اور مجھے کھانا کھا کر سونا بھی ہے۔ کویتا بھی ہمارے انتظار میں بھوکی ہو گی۔ کہاں کھاؤ گے کھانا؟ اس کمرے میں کہ میرے روم میں یا نیچے ڈائننگ ہال میں چلیں؟"

عادل اٹھ کر میرے کمرے میں آ گیا۔ کویتا کو بھی میں نے وہیں بلوا کر کھانا منگوا لیا۔

کھانا کھا کر عادل پروگرام کے مطابق روانہ ہو گیا۔ کویتا میرے پاس اکیلی رہ گئی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تمہیں ایک بار پھر بڑے مہاراج چندر موہن کے بمبئی آشرم میں داخل ہونے کا خطرہ مول لینا ہے۔ تمہاری گزشتہ اطلاع کے مطابق وہ بمبئی سے جنوبی ہند جانے والا تھا۔ پہلی بات تو یہ معلوم کرنا ہے' وہ چلا گیا یا نہیں؟ دوسری بات یہ کہ وہ اگر جا چکا ہے تو جنوبی ہند میں کس جگہ گیا ہے؟"

"چندر موہن' بمبئی آشرم میں نہیں تو یہ معلوم کرنے میں دیر لگ سکتی ہے کہ وہ کدھر گیا ہے۔" کویتا نے جواب دیا۔ اب اس کے لہجے اور الفاظ میں چندر موہن کے لئے احترام نہیں تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ "اس کے لئے مجھے کچھ سمے آشرم میں گزارنا ہو گا۔ آشرم میں موجود چیلوں اور داسیوں کی باتیں چھپ کر سننے کے بعد ہی کچھ پتا چل سکتا ہے۔ میں نے پہلے بھی یہی کیا تھا۔"

"کوئی پرواہ نہیں۔ تم رات تک بھی لوٹ کر آ سکتی ہو۔ تم نے تو شاید سو کر اپنی نیند پوری کر لی ہو گی' مجھے ابھی سونا ہے۔ ناشتہ کب کیا تھا؟"

"صبح دس بجے آنکھ کھلی تھی تو جل پان کر لیا تھا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' تم جاؤ۔" میں بولی۔ "اگر جلد بھی لوٹ آؤ تو مجھے شام پانچ بجے تک سونے دینا۔"

کویتا چلی گئی تو میں لباس تبدیل کر کے سونے لیٹ گئی۔ نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

☆======☆======☆

شام چار بجے ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بجے گئی تو میں جاگ اٹھی۔ لیٹے لیٹے ہی میں نے کروٹ بدلی اور ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ آپریٹر نے لائن ملا دی تو عادل بولا۔ "ہیلو کرن کماری! میں بال مکند بول

ہوں۔"

"بولو کیا بات ہے؟"

"شیام بابو سے ملاقات ہو گئی۔ پہلی بھینٹ میں تمہارے پتا جی کو وہ کوئی زبانی پیغام بھجوانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا' مجھے بتا دیں پیغام تو بولے کہ کرن ہی سے مل کے بات کرنا ہو گی۔ تمہارے پتا جی کو بھی انہوں نے خط لکھا تھا پر جواب نہیں آیا۔ وہ اپنے بیٹے کا وواہ تمہاری کزن ارملا سے کرنا چاہتے ہیں۔ اس وشے میں خود تمہاری رائے سے بھی انہیں جان کاری کی آشا ہے۔ تم کہو تو ساتھ لیتا آؤں انہیں؟ آخر وہ تمہارے پتا جی کے متر ہیں۔ یہ بھی شکایت کر رہے تھے کہ بمبئی میں ان کے ہوتے ہمیں ہوٹل میں نہیں رہنا چاہیے۔" عادل نے مجھے اشارتی زبان میں بتا دیا کہ تنظیم کی بمبئی شاخ کا کوئی اہم اور ذمے دار شخص مجھ سے خود ملنا چاہتا ہے۔ میں نے عادل کو جس غرض سے بھیجا تھا' اسی سلسلے میں براہ راست تفصیلی گفتگو مقصود ہو گی۔

"ٹھیک ہے' میں جاگ تو گئی ہوں۔ چاچا جی کو ساتھ لے آؤ۔ کب تک لوٹو گے؟" میں نے کہا۔

"پانچ بجے تک۔" عادل نے جواب دیا۔

"آ جاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اب آرام کا وقت گزر چکا تھا اس لئے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ کویتا اس وقت تک لوٹ کر نہیں آئی تھی آنے والے شخص کا نام شیام بابو ہی تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ پہلے میں اسے کوئی فرضی نام سمجھی تھی۔ میں نے عادل کے کمرے میں اس سے ملاقات کی۔ دیکھنے میں وہ کوئی کاروباری آدمی لگتا تھا۔ صاف ستھری سفید دھوتی' بند گلے کا جے پوری کوٹ اور اسی کپڑے کی ٹوپی' یہ اس کا لباس تھا' سیاہ نیو کٹ جوتے پیروں میں تھے۔ چہرے پر بردباری اور سنجیدگی' رنگ سانولا مگر نقوش دیدہ زیب۔ اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ جسم نہ بھاری تھا' نہ بہت ہلکا۔ تنظیم کی بمبئی شاخ کا شعبہ تفتیش و سراغ رسانی اسی کے تحت کام کر رہا تھا۔ اس کی پوری شخصیت میں آنکھیں سب سے نمایاں تھیں۔ بڑی بڑی آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ اردو اہل زبان کی طرح بولتا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بیگ بھی نظر آیا جو اس نے درمیانی میز پر رکھ دیا۔ عادل اسی کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں ان دونوں کے سامنے بیٹھی تھی کچھ دیر رسمی گفتگو کے بعد اصل موضوع پر بات شروع ہو گئی۔

"کرن جی! آپ بہت ٹھیک وقت پر یہاں پہنچی ہیں ورنہ ہمیں خود کوڈگ کا رخ کرنا پڑتا۔ تنظیم نے بہت پہلے صورت حال کا اندازہ کر لیا تھا کہ انگریز جلد یا بدیر اس ریاست کی خودمختاری بھی چھین لیں گے۔" شیام بابو نے کہا۔ "کاویری مکل کوٹ سے ہمارا رابطہ قائم ہے۔"

"ممکن ہے' شیام بابو مزید کچھ کہتا' میں بول اٹھی۔ "اردو میں کاویری مکل کوٹ کا ترجمہ انجمن فرزندان کاویری ہونا چاہیے۔"

"جی' یہ اور بھی اچھی بات ہے کہ آپ کو کنڑ زبان بھی آتی ہے۔ کسی بھی علاقے کی زبان جاننا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے کام میں آسانی ہو جاتی ہے۔"

"دراصل جنوبی ہند میں بولی جانے والی زبانوں' مثلاً مراٹھی' گجراتی' ملیالم' تیلگو' کنڑ وغیرہ کا سورس ایک ہی ہے۔ یعنی سنسکرت' کنڑ میں بکثرت ہندی الفاظ شامل ہیں' لہجہ البتہ مختلف ہے اور تلفظ بھی۔ مجھے اسی لئے یہ زبان سیکھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔" میں نے گویا اپنی صفائی پیش کی ورنہ تو حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ "جی تو آپ انجمن فرزندان کاویری کے متعلق بتا رہے تھے کہ اس سے آپ کا رابطہ ہے۔ پہلے یہ عرض کر دوں کہ میں اس علاقے کی تاریخ کا مطالعہ بھی کر چکی ہوں البتہ موجودہ صورت حال سے واقفیت نہیں۔"

"پھر تو گفتگو اور بھی آسان ہو جائے گی۔" شیام بابو نے اظہار مسرت کیا' پھر بتانے لگا۔ "ریاست کے موجودہ راجہ چک ویر کو حکومت کرتے ہوئے یہ بارہواں سال ہے۔ راجہ عیاش' ظالم اور سنگ دل آدمی ہے۔ عوام اس سے نالاں ہیں۔ اسی کے ردعمل میں برسوں پہلے ریاست کے نوجوانوں نے یہ محب وطن انجمن بنائی تھی۔ انجمن کا مقصد موجودہ راجہ کو ہٹا کر اسی راج گھرانے کے کسی اور فرد کو برسراقتدار لانا تھا تاکہ عوام کو اعتراض نہ ہو۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد اب بھی یہی ہیں البتہ اب اس کے سربراہ سوامی جی ہیں جو عمر رسیدہ' تجربہ کار اور ذہین ہونے کے سبب پُرجوش نوجوانوں کو بے لگام نہیں ہونے دیتے۔ کوڈگ جا کر خود میں بھی ایک مرتبہ سوامی جی سے مل چکا ہوں۔ ان کا اصل نام شیو کمار ہے' مگر سب انہیں سوامی جی ہی کہتے ہیں۔ سوامی جی سے پہلے اس انجمن کا سربراہ ایک نوجوان اتیٹا تھا۔ اس سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ اتیٹا کوڈگ ہی کی ایک ذات "تک" سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسے ہم ہندوستانیوں میں ہندو دھرم کے لوگ مختلف ذاتوں کے ہیں' مثلاً برہمن' ویش' چھتری اور شودر۔ ان کے بارے میں آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ برہمن' مذہب اور سیاست دونوں پر ہمیشہ سے اپنی اجارہ داری قائم کئے ہوئے ہیں۔ ذاتی طور پر خود برہمن ہونے کے باوجود میں ان کے خلاف ہوں۔ ویش تجارت پیشہ لوگ ہیں اور چھتری لڑاکا۔ شودر' اچھوت کہلاتے ہیں۔ "تک" ذات والے دراصل چھتری ہیں۔ ریاست کی فوج انہی چھتریوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ مقامی ہیں۔ راج گھرانے سے ان کے تعلق کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ راجہ چک ویر کی رانی گورما اسی ذات کی ہے۔ رانی ہی کا ماموں زاد بوپنا اس وقت وزیر دفاع اور فوج کا کمانڈر انچیف ہے۔ اتیٹا اسی کا بھانجا ہے۔ یہی نوجوان راج محل میں ایک اہم عہدے پر فائز ہے۔ سوامی جی نے جب "فرزندان کاویری" کی ذمے داری قبول کر لی تو اتیٹا یہ عہدہ چھوڑنا چاہتا تھا' مگر سوامی جی نے منع کر دیا۔"

"کیا سوامی جی کا تعلق بھی "تک" ذات سے ہے؟" میں نے سوال کیا۔ عادل خاموشی سے ہم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

"جی نہیں۔" شیام بابو نے جواب دیا۔ "وہ کوڈگ کے نہیں ہیں' میسور سے کوڈگ آئے ہیں۔ یہ بات آپ کے علم میں بھی ہو گی کہ شہید ٹیپو سلطان کے زمانے میں کچھ عرصے کے لئے کوڈگ بھی ریاست میسور ہی کا حصہ رہا ہے۔ اس وقت بھی اکیری خاندان ہی اقتدار میں تھا۔ شہید سلطان نے جب اس علاقے کو فتح کیا تو راجہ پہاڑوں میں جا چھپا۔ سلطان کی شہادت کے بعد وہ پھر پہاڑوں سے اتر آیا۔ سو میسور

سے کوڈگ کا بہت قدیم رشتہ ہے۔ ویسے بھی میسور پڑوسی ریاست ہے۔"

"تو سوامی جی میسور کے باشندے ہیں؟" میں نے وضاحت چاہی۔

شیام بابو نے میرے اس سوال کا جواب فوراً نہیں دیا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا' وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ ذرا توقف کے بعد وہ بولا۔ "مجھے وہ میسور کے بھی نہیں لگے۔ میں نے اس سلسلے میں زیادہ جستجو نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں وہاں "فرزندان کاویری" ہی کا مہمان تھا۔ کوڈگ بہرحال ایک الگ ریاست ہے اور میں' سوامی جی کی دعوت پر اتیٹا کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔ سوامی جی نے اتیٹا ہی کو مجھے بمبئی سے لے جانے کو بھیجا تھا۔ میں' کوڈگ میں دشوار گزار پہاڑی راستوں کے ذریعے غیر قانونی طور پر داخل ہوا اور پھر بمبئی واپس آ گیا۔ میرا قیام وہاں صرف دو دن رہا۔ اس مختصر عرصے کے باوجود چند نئی باتیں میرے مشاہدے میں ضرور آئیں۔ ان کا ذکر اس لئے نامناسب ہے کہ آپ خود وہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ریاست کا نقشہ میں آپ کے مطالعے کی غرض سے ساتھ لایا ہوں۔" یہ کہہ کر شیام بابو نے میز پر رکھا ہوا چمڑے کا بیگ اٹھا کے کھولا اور تہہ کیا ہوا نقشہ میز پر پھیلا دیا۔

میں جھک کر نقشے کا جائزہ لینے لگی' پھر کچھ دیر کے بعد شیام بابو سے مخاطب ہوئی۔ "یہ پہاڑی علاقہ سلسلہ کوہ سہیادری کا حصہ لگتا ہے؟" میں نے نقشے میں ایک جگہ کی نشاندہی کی۔

"جی ہاں۔ یہ نقشہ ریاست اور اس کے گرد و نواح کو بھی ظاہر کرتا ہے۔" شیام بابو بھی آگے کو جھک آیا۔ عادل بھی اپنی کرسی کو اس جگہ سے تھوڑا ہٹا کر نقشے کو دیکھنے لگا۔ شیام بابو نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی اور بولا۔ "یہ بمبئی ہے۔ یہاں سے جنوب میں مغربی سمندر کی سمت یہ پہاڑی سلسلہ اونچا ہوتا گیا ہے اور اس جگہ جو یہ پہاڑ نیل گری ہے' اس سے جا ملا ہے۔" شیام بابو بتاتا رہا۔ "نیل گری کے اتصال سے پہلے یہی سلسلہ' کوڈگ میں شمال مغربی سمت پشپ گری اور نادل گری' پھر موروناڈ سے برہم گری تک کو گھیرتا ہے۔ عرض کے لحاظ سے جیسا کہ آپ دیکھ رہی ہیں' یہ کہیں اونچائی اور کہیں نیچائی میں کافی پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کئی مشہور دریا بھی ہیں جو نیلے رنگ سے واضح کئے گئے ہیں۔ پشپ گری میں یہ جو دو بلند چوٹیاں نظر آ رہی ہیں' یہ ریاست کے دارالحکومت مڈکیری کے عقب میں واقع ہیں۔ یہ چھوٹی کوٹے بٹیا ہے اور دوسری کا نام ڈمولو ہے۔ ادھر برہم گری کے وسط میں یہ دیو مللے اور آخر میں سومن ملے ہے۔ برہم گری ہی سے دریائے کاویری نکل کر سدا پور کی طرف بہتا دکھائی دے رہا ہے۔ سدا پور سے سرنگل تک یہ دریا' کوڈگ کی سرزمین کو سیراب کرتا ہے۔ کوڈگ والے خود کو اسی دریا کاویری کے بیٹے کہتے ہیں۔ شمال میں جو یہ پہاڑیاں ہیں' ان سے دریائے لکشمن تیرتھ بھی نکلتا ہے جو یہاں سے بہتا ہوا دریائے کاویری میں آ ملتا ہے اور بھی چھوٹے چھوٹے دس دریا ہیں جو دس اطراف سے اس بڑے دریا لگے چور میں مل کر اس پورے علاقے کو سیراب کرتے ہیں۔ مادا پور کی "ہڑے ندیاں" بھی اسی دریا لگے چور میں مل رہی ہیں۔ یہ منگلور ہے جو ریاست کا حصہ نہیں اور یہ ریاست کا سرحدی شہر کشال ہے' منگلور کی طرف' یہ کشال نگر کہلاتا ہے۔ اسی کے شمال میں دریائے لگے چور بہہ رہا ہے۔ اسے آپ منگلور اور کوڈگ کے درمیان سرحد بھی کہہ سکتی ہیں۔"

شیام بابو خاموش ہو گیا تو میں بولی۔ "یہ نقشہ آپ میرے پاس چھوڑ جایئے اور یہ بتایئے کہ ریاست میں وزیروں کی کل تعداد کتنی ہے؟"

"تین۔" شیام بابو نے جواب دیا۔ "ایک کو آپ وزیرِاعظم کے ہم رتبہ سمجھ لیں۔ وہی راجہ چک ویر کے سب سے قریب ہے۔ اس کا نام بسودیا ہے۔ مذہبی' سیاسی اور خارجہ امور کا وزیر ایک برہمن لکشمی نارائن ہے۔ تیسرے وزیر بوپنا کا ذکر میں کر ہی چکا ہوں۔"

بسودیا کا نام سن کر میں چونک اٹھی۔ یہ وہی لنگڑا تھا جسے میں نے پُراسرار تجربے کے دوران بند آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ریاست میں وہ اتنے اہم عہدے پر فائز ہو گا۔ میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ "راجہ چک ویر سے بسودیا کی اتنی قربت کا کوئی سبب؟"

"دونوں میں ایک قدر مشترک ہے' بدکرداری اور ظلم و جبر۔" شیام بابو نے جواب دیا۔

پھر میرے ایما پر شیام بابو نے راجہ چک ویر اور بسودیا کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ باتیں بیان کر دیں۔

چک ویر دشمنی کے ماحول میں پل کر جوان ہوا۔ بچپن ہی میں اس نے اپنی تایا زاد وستو کو بَلی چڑھتے اور اقتدار سے محروم ہوتے دیکھا۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ گھڑسال (جانوروں کو پالنے کی جگہ) میں رہنے والا ایک لڑکا بسودیا اس کا دوست بن گیا۔ وہ چک ویر سے کچھ برس بڑا تھا اور بہت ہی ذہین لڑکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ہی مختلف تھی' چستی کی کوئی حد نہیں تھی۔

بسودیا کون تھا' کہاں کا رہنے والا تھا؟ یہ باتیں کسی کو معلوم نہیں تھیں۔ لوگوں کو صرف اتنا علم تھا کہ وہ اناتھ (یتیم) اور راج محل کا ایک ادنیٰ خادم ہے۔ بہت کم عمری میں کوئی چوٹ لگ جانے سے اس کا دائیاں پاؤں کچھ مڑ گیا تھا۔ یہ چوٹ کب لگی' اسے خود بھی یہ بات یاد نہیں تھی۔ اس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلتا تھا۔ کوئی یتیم اور بے سہارا لڑکا لنگڑا کر چلے تو لوگ اس کا نام لینے کی بجائے لنگڑا کہنے لگتے ہیں۔ بسودیا کی عرفیت بھی یہی ہو گئی۔ کوئی بزرگ آدمی اسے لنگڑا کہتا تو پی جاتا مگر دوسروں کو منہ توڑ جواب دیتا۔

اسی زمانے میں چک ویر سے اس کی دوستی ہو گئی۔ بچوں کو کتے' ہاتھی' گھوڑے وغیرہ دیکھنے کا شوق ہوتا ہے' سو یہ شوق چک ویر کو بھی تھا۔ بسودیا اسے گھڑسال میں لے جاتا اور اس کے پسندیدہ جانور دکھاتا۔ اس طرح دونوں کی دوستی پروان چڑھی۔ چک ویر کی ماں دیوکا کی صحت زیادہ اچھی نہ تھی اس لئے وہ خاداؤں کے ہاتھوں میں پلا تھا۔ اس کا باپ لنگ راج اپنے دھندوں میں مصروف رہتا تھا۔ اگر یہ مصروفیات نہ ہوتیں تو بھی وہ چک ویر کی طرف بطور خاص دھیان دینے والا آدمی نہیں تھا۔

اسی سبب وہ چک ویر پر کوئی توجہ نہ دے سکا۔

جانوروں کے ساتھ رہ رہ کر بسودیا خود بھی ایک "جانور" بنتا گیا۔ شرم و حیا اس میں نام کو نہ رہی۔ سو یہی چک ویر کے ساتھ ہوا۔ تایا زاد وستو راستے سے ہٹ گئی اور باپ لنگ راج نے اقتدار سنبھالا تو چک ویر ولی عہد بن گیا۔ اب وہ راجکمار کہلانے لگا۔

لنگ راج عیش و عشرت میں کھو کر بیٹے کی طرف سے بالکل ہی غافل ہو گیا۔ اسی دوران دیوما پیدا ہو چکی تھی' چک ویر کی بہن۔ اپنے بچوں کی طرف دھیان نہ دینے کی وجہ اب اقتدار بھی تھا۔ جس طرح کوئی جواری کسی عزیز کے انتقال کی خبر ملنے پر بھی جوا کھیلنا نہیں چھوڑتا بالکل اسی طرح اقتدار حاصل کرنے کی دھن نشیلی بلکہ جوئے سے کہیں زیادہ نشیلی ہوتی ہے۔ جوئے میں صرف دولت داؤ پر لگتی ہے' اقتدار کے کھیل میں جان بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ذرا سی غفلت سارے خاندان کو تباہ کر دیتی ہے۔ دوسروں کے لئے جو شخص جال بچھاتا ہے' وہی جال دوسرے لوگ اس کے لئے بُن سکتے ہیں۔

جب لنگ راج نے ایوان اقتدار کے ستون مضبوط کر لئے تو اسے مستقبل کے راجہ کا خیال آیا۔ پتا چلا کہ ولی عہد' بسودیا کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ جس طرح اور سب کو یہ بات ناگوار تھی' باپ کو بھی بری لگی' مگر وہ مصلحتاً ان کی دوستی میں رکاوٹ نہیں بنا۔ اس نے بیٹے اور لنگڑے کو صرف یہ تاکید کی کہ "کھیل" میں زیادتی نہیں ہونا چاہئے۔ تاکید کرتے وقت لنگ راج لحاظ سے کام لے رہا تھا حالانکہ پہلے اس کا رویہ بسودیا کے ساتھ صرف ہمدردانہ تھا۔ اس کے بعد بسودیا نے بھی اپنی دانست میں صحیح ڈھنگ سے چلنے کی کوشش شروع کر دی تاکہ لنگ راج اسے پسند کرنے لگے۔ بسودیا اور چک ویر نے جو راستہ اختیار کیا تھا' ایسا نہ تھا کہ وہ ہمیشہ حد کے اندر رہ سکتے۔ چک ویر جس ڈھنگ سے پلا تھا اس کے کچھ اور ہی تقاضے تھے۔ "ایسا کرنے سے ویسا ہوا تو ویسا کرنے سے کیسا ہو گا؟ یہ کر کے دیکھنا چاہئے۔" جب کوئی بچہ کتے سے ڈر کے بھاگتا تو اسے لطف محسوس ہوتا۔ کھیلتی ہوئی لڑکیوں کے درمیان دور سے سانپ پھینک کر چیخ و پکار سننے میں اسے بڑا مزہ آتا۔ بھوت بن کر کسی کو ڈرانے میں اسے سکون سا ملتا۔ ایک مرتبہ کسی نڈر آدمی نے اسے بھوت بنے ہوئے پکڑ لیا۔ یہ ایک بااثر آدمی تھا۔ بات لنگ راج تک پہنچ گئی۔ اس نے بیٹے اور بسودیا دونوں کو خوب ڈانٹا۔ لوگوں کو رات بہ رات ڈرانے کے علاوہ یہ دونوں اور بھی ناشائستہ حرکت کرتے۔ رات کو جہاں عورتیں سوئی ہوتیں وہاں پہنچ کر شیطانی کرتے یا لڑکیوں کو اپنے یہاں بلا کے چھیڑخانی کرتے' مگر یہ باتیں راجہ تک نہیں پہنچتی تھیں۔ کبھی کبھی چک ویر شہر کے بدمعاشوں کے ساتھ جوئے میں بھی حصہ لیتا۔ ولی عہد ہونے کے سبب اسے دوسروں سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ دوسروں کو ہونے والے نقصانات کا اسے سامان نہ کرنا پڑتا تھا' پھر بھی تمام بدمعاش ایک سے نہ تھے۔ کبھی کبھار اسی لئے مار پیٹ کی نوبت آ جاتی۔

لنگ راج کے مرنے اور ماں کے ستی ہو جانے پر جب چک ویر کے راجہ بننے کا موقع آیا تو وہ پکا بدمعاش بن چکا تھا۔

ان سب خرابیوں کو دور کرنے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ رانی گورما تھی۔ لنگ راج اسے پہلے ہی چک ویر کی بیوی بنا کر لے آیا تھا۔

گورما کوڈگ کی رہنے والی تھی۔ اس کا باپ بے پناڑ کے کنجل گری گاؤں کا ایک بااثر آدمی پٹیشا تھا۔ اپنے علاقے کا مشہور شخص ہونے کے سبب اسے لنگ راج کی نظر میں آنا ہی تھا۔ راجہ راجندر کا وہ پسندیدہ آدمی تھا۔ لنگ راج کے راجہ بننے میں بھی اس کی حمایت شامل تھی۔ چک ویر کو بھی گدی پر

بٹھانے میں اس کا ہاتھ تھا' مگر یہ بعد کی بات ہے کہ جب چک ویر اس کا داماد بھی بن چکا تھا۔

یہی اسباب تھے کہ جب لنگ راج نے اپنے بیٹے کے لئے بہو ڈھونڈی تو پیشا کی بیٹی کا انتخاب کیا جانا بالکل فطری سی بات تھی۔

گورما' رانی بننے کے قابل لڑکی تھی۔ بیوی اور شوہر کی عمر میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی لیکن اس سے بھی بڑھ کہ لوگوں کو متوجہ کرنے والی چیز تھی اس کی سنجیدہ شخصیت' اوسط قد والی عورتوں میں اس کا قد کچھ لمبا تھا۔ ہمیشہ وہ سیدھی چلتی' سیدھا دیکھتی' کم بولتی' دل میں کیا ہے' یہ بات آسانی سے کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتی۔ انتہائی نازک لمحات ہی میں گورما کی آنکھوں کی چمک پل بھر کے لئے کوند کر' اس کے غصے' نفرت یا سکون و اطمینان کو ظاہر کرتی اور پھر فوراً ہی اس پر سنجیدگی چھا جاتی۔ یہی اس کی فطرت تھی۔

میکے میں آزاد زندگی گزارنے والی لڑکی راج محل میں آئی اور تقریباً اپنی ہی عمر کے شخص کی جیون ساتھی بنی۔ اس وقت اسے پتا چلا کہ شوہر کا دامن داغدار ہے۔ اگر یہ بات اسے شادی سے پہلے ہی معلوم ہو جاتی تب بھی وہ کیا کر سکتی تھی۔

لنگ راج ضدی اور سخت دل آدمی تھا۔ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے دشمنوں کے خلاف ناجائز ذرائع استعمال کرنے والا شخص جب کسی سے یہ کہے کہ میں تمہاری بیٹی کو اپنے بیٹے کے لئے چاہتا ہوں تو کس کی مجال ہے انکار کر سکے۔ اگر وہ لڑکی یا اس کا باپ رشتے سے انکار کر دے تو ایسا شخص انہیں سخت سزائیں دینے میں بھی نہیں ہچکچائے گا۔ بیوی بن کر زندگی گزار دینا ایسی لڑکیوں کی تقدیر ہے۔ گھر اچھا ملے تو خوش نصیبی' نہ ملے تو بدنصیبی سمجھ کے برداشت کرنا پڑتا ہے۔

شادی کے بعد شروع شروع کے دنوں میں چک ویر نے بیوی سے محبت جتائی۔ اس کے لئے عورت کوئی نئی چیز نہیں تھی لیکن اس قدر پُروقار اور سنجیدہ فکر و نظر رکھنے والی عورت سے کبھی اس قدر قریبی تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کی شخصیت میں کیا خاص بات تھی' چک ویر نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ اسے اتنا تجربہ ضرور ہوا کہ گورما کے ساتھ رہنے میں ایک خاص سکھ ملتا ہے' سکون کا احساس ہوتا ہے۔

یہ شب و روز یکساں نہ رہ سکے۔ عرصہ دراز تک من مانی زندگی گزار کر جس شخص کی فطرت بگڑ چکی ہو اسے گورما کی پاکیزہ اور سچائی سے بھرپور زندگی کس طرح مطمئن کر سکتی تھی۔ ڈھول اور نقارے کی عادی سماعت بانسری اور وینا کی دھیمی دھیمی لے کی مٹھاس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔ اگر چک ویر نے بسودیا کے چکر میں آخر خود کو بگاڑ نہ لیا ہوتا تو اس کی زندگی بن جاتی۔ وہ بدقسمت تھا کہ گورما کے ملنے سے پہلے ہی کیچڑ میں لوٹ کر سکھ پانے والی بھینس کے مانند خود اپنا ذوق تباہ کر چکا تھا۔

وہ روزانہ رات کو دیر سے واپس آتا اور نشے کی حالت میں اوٹ پٹانگ باتیں کرتا۔ یہ باتیں ناپسند کرنے والی بیوی کو گالیاں دینے اور مار پیٹ کرنے میں اسے دیر نہیں لگی۔ ابتدا میں گورما کو ایسا برتاؤ دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی' غصہ بھی آیا مگر اس نے شوہر سے جھگڑا نہیں کیا' صرف ساتھ والے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ چک ویر نے دروازہ پیٹ ڈالا' چیخا چلایا۔ سارا خاندان اکٹھا ہو گیا۔ ساری بات معلوم کرنے

لنگ راج خود وہاں پہنچ گیا۔ یہ پتہ چلنے پر کہ بہو کمرہ بند کر کے بیٹھی ہے' اس نے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا' جو بات کرنا ہو صبح کرنا۔ اب جا کے چپ چاپ سو جاؤ' شور مت کرو۔

اگلے روز لنگ راج' بہو کے پاس گیا اور بولا کہ میں تمہیں گھر کی لکشمی بنانے کے لئے ڈھونڈ کر لایا ہوں۔ تمہارے پتی کے پاس عقل نہیں ہے' سو تمہیں عقل سے کام لینا ہو گا۔ تمہیں اسی کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ یہ سوچ کر کہ پتی کا سلوک اچھا نہیں' پتنی بھی ویسی ہی بن جائے' پھر محل تو کیا جھونپڑی بھی نہیں رہے گی۔ یہ سمجھ لو کہ راج محل تمہارا ہے۔ یہ سب کچھ برقرار رکھنے کے لئے ہی پتی کو اپنا بنا لو۔ پیڑ کو بچا کر پھل کھانا ہی عقل مندی ہے۔

گورما کی ساس دیوکا نے بھی اسے تسلی دی اور کہنے لگی' راج محل میں بہوؤں کو اتنا تو سہنا ہی پڑتا ہے بیٹی۔ یہ سب میں بھگت چکی ہوں۔ تمہارے سسر نے میری آنکھوں کے سامنے دوسری عورتوں سے عیاشیاں کی ہیں۔ ان سے بیٹا ہی اچھا ہے' جو کرتا ہے باہر ہی کرتا ہے۔ گھبراؤ مت' ماں بن جاؤ گی تو بچوں ہی کو اپنا سنسار مان لینا۔ عورتوں کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی سکھ نہیں ہے۔ میں نے اسے قسم دلائی ہے کہ وہ کسی اور کو رانی کے روپ میں نہیں لائے گا' اتنا ہی کر دے تو کافی ہے۔

گورما سنجیدہ ہی نہیں ذہین بھی تھی۔ اس نے سسر کی بات بھی سنی اور ساس نے جو کہا اسے بھی توجہ سے سنتی رہی۔ دونوں کی باتوں کو اس نے ذہن نشین کر لیا۔ گزشتہ رات کے واقعے کو ذہن سے جھٹک کر وہ پُرسکون ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ شوہر کو غلط راستے سے ہٹا کر رہے گی' شوہر کی حفاظت کرے گی۔

تین سال بعد وہ ایک بچی کی ماں بن گئی۔ بچے عموماً ماں یا باپ میں سے کسی ایک کی شباہت رکھتے ہیں لیکن اس بچی میں دونوں کی چھاپ تھی۔ لنگ راج کو لڑکے کی تمنا تھی مگر اس نے لڑکی کو بھی اپنایا اور پیار سے پالا۔ وہ دادا کی لاڈلی تھی۔ چک ویر بھی بچی کے پاس آتا تو بھلا بن جاتا' کتنا بھی غصہ کیوں نہ ہو بچی کو دیکھ کر خاموش ہو جاتا' غصہ پی جاتا۔ اس بچی کی وجہ سے غیر ارادی طور پر وہ گورما کا بھی لحاظ کرنے لگا۔

لنگ راج چند سال اور زندہ رہتا تو ممکن ہے چک ویر کو برے بھلے کی پہچان ہو جاتی لیکن یہ بات گورما کے مقدر میں نہیں تھی۔ باپ دنیا سے سدھارا اور بیٹا راجہ بنا۔ جو دل میں آتا وہ کرتا اور جدھر منہ اٹھتا چل دیتا۔ اس طرح وہ اور بھی بے راہ ہو گیا۔

بسودیا' لنگ راج کے دور حکومت میں تھوڑا ڈر کر ہی رہتا تھا۔ اب اپنے ہی دوست کے اقتدار میں آ جانے پر وہ نڈر ہو گیا۔ چند ہی برسوں میں وہ راج محل کے اندرونی معاملات کا کرتا دھرتا بن گیا۔ لنگ راج کا وزیراعظم ناڈ تک پونپا تھا۔ لکشمی نارائن اور بوپنا بقیہ دو وزیر تھے۔ وزیراعظم نے جیسے تیسے چک ویر کی حماقتوں کو برداشت کیا۔ پھر اس نے چک ویر سے یہ کہہ کر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا کہ میری صحت ساتھ نہیں دے رہی' آپ کسی کو میری جگہ مقرر کر دیجئے۔ اس طرح ایک اہم عہدہ خالی ہو گیا۔ چک ویر کو موقع مل گیا کہ وہ بسودیا کو وزیراعظم مقرر کر دے۔ یہ موقع نہ بھی ملتا تو شاید وہ وزرا کی تعداد

بڑھا دیتا۔ بونپا کے خود ہٹ جانے سے نئی جگہ بنانے کی ضرورت نہیں رہی۔

کتوں کے رکھوالے کا وزیراعظم بن جانا باقی دونوں وزیروں کو اچھا نہیں لگا لیکن اس مسئلے کا کیا حل ہو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بونپا اور لکشمی نارائن نے آخرکار یہ طے کیا کہ سابق وزیراعظم، چک ویر کے سامنے بے اطمینانی کا اظہار کرے گا۔

بسودیا کے وزیراعظم بننے کے بعد پہلے بھی کئی بار دربار لگا تھا لیکن وزراء کے لئے دو ہی کرسیاں رکھی جاتی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دو کی جگہ دربار میں تین کرسیاں وزیروں کے لئے رکھی گئیں۔ بونپا اور لکشمی نارائن دربار میں پہنچے تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی لیکن دونوں ہی اس کا مطلب سمجھ گئے۔

شیام بابو سے ابھی گفتگو جاری تھی کہ میری توجہ دوسری طرف مبذول ہو گئی۔ مجھے ایک آشنا آواز کی سرگوشی سنائی دی تھی۔

"زحمت تو ہو گی آپ کو۔" میں نے شیام بابو کو مخاطب کیا۔ "کیا کل بھی تشریف لا سکیں گے؟"

عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ شیام بابو نے کہا۔ "کیوں نہیں، آپ کا حکم ہے تو ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ میں نے ریاست کے بارے میں جو کچھ عرض کیا ہے، آپ غالباً اس پر سوچ بچار کرنا چاہتی ہیں۔" اس ذہین آدمی نے یہ کہہ کر مجھے شرمندگی سے بچا لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ریاست کا نقشہ اس نے میز ہی پر چھوڑ دیا تھا۔ "جو بھی وقت ملاقات کے لئے ضروری سمجھیں، بال مکند جی سے کہہ دیجئے گا۔ یہ مجھ سے رابطہ قائم کر لیں گے۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔" پھر وہ اپنا بیگ اٹھائے آگے بڑھا تو عادل نے پہل کی۔ اس نے بطور احترام شیام بابو کے لئے کمرے کا دروازہ خود کھولا تھا۔

شیام بابو کمرے سے نکل گیا تو میں بھی اٹھی۔ عادل دروازہ بند کرنے والا تھا کہ میں نے کہا۔ "دروازہ کھلا رہنے دو، میں بھی جا رہی ہوں۔" نقشہ میرے ہاتھ میں تھا۔

عادل نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تھک گئی ہوں، کچھ دیر آرام کروں گی۔"

"تم بھی تھک جاتی ہو؟"

"کیوں، کیا میں کوئی پتھر کی بنی ہوں۔"

"بظاہر تو ایسا نہیں لگتا، لیکن تمہارا کیا بھروسہ۔"

میں ان سنی کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ میری توقع کے مطابق کویتا وہاں موجود تھی۔ میں نے عادل کے کمرے میں اسی کی سرگوشی سنی تھی۔ "میں لوٹ آئی ہوں۔" کویتا کو میں نے چندر موہن کے آشرم بھیجا تھا۔ اسے واپسی میں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ شیام بابو سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے کئی بار اس کا دھیان آیا تھا۔ اس نے اسی لئے مجھے اپنی آمد سے فوراً مطلع کیا تھا۔

چندر موہن کے متعلق اس نے خلاف توقع خبر دی۔ جس روز دوپہر کو کویتا نے مجھے یہ بتایا تھا کہ بہت جلد چندر موہن جنوبی ہند روانہ ہونے والا ہے، اسی دن شام کو وہ چلا گیا تھا۔ آج کویتا کو اس لئے واپسی میں تاخیر ہوئی کہ بمبئی آشرم تقریباً خالی پڑا تھا۔ دو چیلے بھنگ پی کر سو رہے تھے۔ ایک چیلا اور دو

داسیاں "جیون رس" کی لہر میں تھے۔ کویتا اسی لئے وہیں چھپی رہی کہ وہ لوگ ہوش میں آ جائیں تو کچھ معلوم ہو۔ کویتا اپنی دانست میں کامیاب لوٹی تھی۔ میرے قیاس کے مطابق چندر موہن کو میسور جانا چاہئے تھا لیکن کویتا یہ خبر لائی کہ وہ مدراس گیا ہے۔ مدراس بھی جنوبی ہند ہی کا ایک بڑا ساحلی شہر تھا۔ یہ فریب بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ رابرٹ ہیم کے بارے میں تصدیق ہو چکی تھی کہ وہ میسور میں ہے۔ پھر چندر موہن مدراس کیوں گیا؟ سازش کا جال تو کہیں اور بنا جا رہا تھا۔ پھر اسی رات کو بند آنکھوں سے میں نے جو کچھ دیکھا، اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ چندر موہن کا چہرہ مجھے واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو افراد تھے۔ ان میں سے ایک میرے لئے اجنبی تھا۔ آشنا چہرہ بسودیا کا تھا۔ چندر موہن کے ہمراہ جو اجنبی تھا، وہ اپنے لباس اور وضع قطع سے کوئی پنڈت معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑھاپے کے آثار تھے۔

اس اجنبی کا نام ویکشت ہے۔ کوئی جیسے مجھ سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ یہی شخص، کوڈگ کے راج بھون میں جیوتشی ہے۔ یہ بوڑھا، چندر موہن کے کرتب دیکھ کر اسے اپنا گرو مان چکا ہے۔ بسودیا اور خود راجا چک ویر بھی چندر موہن کے معتقد ہیں۔ چندر موہن اس سے پہلے بھی کوڈگ آتا جاتا رہا ہے اور آبادی سے دور اسی مندر کے ایک حصے میں ٹھہرتا ہے جہاں اس وقت نظر آ رہا ہے۔ پھر سرگوشیاں بند ہو گئیں۔ اسی کے ساتھ منظر بھی بدل گیا۔ اب مجھے ایک مندر، پہاڑی کے دامن میں بنا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اسی مندر کے دروازے سے میں نے لنگڑے بسودیا کو باہر نکلتے دیکھا۔

چندر موہن کا فریب مجھ پر کھل گیا۔ بمبئی سے وہ مدراس نہیں کوڈگ گیا تھا۔ ژیان بھی چندر موہن ہی کے ذریعے کوڈگ کے راجا چک ویر کا مہمان بنا ہو گا، یہ سمجھنا بھی اب میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ کوڈگ میں چندر موہن کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ عیار انگریز اندر اور باہر دونوں طرف سے چک ویر کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ ملٹری انٹیلی جنس کا سابق سربراہ رابرٹ ہیم باہر، یعنی میسور میں تھا اور چندر موہن اندر گھس چکا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر تھا کہ سازش کے جال بہت دن سے بُنے جا رہے ہوں گے۔ چندر موہن نے پہلے ہی سے ریاست کے دارالحکومت مڈکیری میں اپنے لئے فضا ہموار کر لی تھی۔ بمبئی آشرم میں چندر موہن کے جو چیلے اور داسیاں رہ گئی تھیں، انہیں دانستہ غلط سمت سفر بتائی گئی تھی۔

میں جس پُراسرار تجربے سے گزر رہی تھی، وہ برقرار تھا۔ واضح طور پر مجھے یہ محسوس ہوا جیسے وقت کی گردش مخالف سمت میں سفر کر رہی ہے، مگر مقام وہی تھا، یعنی مڈکیری کا۔ راج بھون، شیام بابو نے مجھے لنگڑے بسودیا کے بارے میں جہاں تک بتایا تھا، اب میں اس سے آگے کا منظر دیکھ رہی تھی۔

مڈکیری کے راج بھون میں دربار لگا ہوا تھا مجھے دو نئے چہروں کی پہچان کرائی گئی۔ یہ دونوں بونپا اور لکشمی نارائن تھے۔ راجا چک ویر ابھی دربار میں نہیں آیا تھا۔ وزیر دفاع اور ریاست کی فوج کا کمانڈر ان چیف بونپا، اپنے قریب دوسری کرسی پر بیٹھے وزیر لکشمی نارائن سے کہہ رہا تھا۔ "آج اس قصے کو ختم کر دینا چاہئے۔"

برہمن وزیر لکشمی نارائن بولا۔ "سب کے سامنے ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"یہ سبھی کی عزت کا سوال ہے۔" بونپا نے جواب دیا۔ "سب کے سامنے یہ مسئلہ اٹھائیں گے۔ اس میں کوئی غلط بات نہیں .... اچھا پنڈت جی' اس کے لئے کوئی تدبیر کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دربار کے ایک خادم کو بلایا اور تیسری خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں کون صاحب بیٹھیں گے؟"

"مجھے نہیں معلوم حضور۔ محل سے حکم دیا گیا ہے' سو یہ کرسی یہاں لگائی گئی ہے۔" خادم نے بتایا۔

"دربار کے داروغہ سے کہو کہ ہم سے ملے۔" بونپا نے خادم کو حکم دیا۔

ذرا ہی دیر بعد داروغہ آ گیا۔ اس نے احتراماً بونپا کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور کچھ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ نئی کرسی یہاں سے ہٹوایئے۔" بونپا نے اسے ہدایت کی۔

"جو حکم" کہہ کر داروغہ' محل کے اندر چلا گیا۔ کرسی کسی نے نہیں ہٹائی۔ پھر اندر سے لنگڑا بسودیا آیا۔ دونوں وزیروں کو نمسکار کرنے کے بہانے وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "مہاراج' ادھی راجا جی کے حکم سے یہ کرسی رکھی گئی ہے' ہٹائی نہیں جا سکتی۔"

بونپا کے چہرے سے غصہ ظاہر ہونے لگا۔ اس نے کہا۔ "اگر یہ کرسی یہاں سے نہیں ہٹے گی تو ہم بھی اپنی جگہ پر نہیں بیٹھیں گے۔ راجاجی کے تشریف لانے کے بعد گڑبڑ نہیں ہونا چاہئے۔ پہلے ہی جا کے عرض کر دو۔"

لنگڑا بسودیا اندر آ گیا اور جلد ہی واپس آ گیا۔ اس نے کرسی کو ہٹوا دیا۔

چک ویر آیا اور دربار معمول کے مطابق ختم ہو گیا۔ دربار سے اٹھ کر اندر جاتے وقت چک ویر نے حکم دیا کہ دونوں وزراء اندر آ کر اس سے ملیں۔

لکشمی نارائن اور بونپا اندر پہنچے تو راجا چک ویر صحن ہی میں کھڑا تھا۔ اس نے دونوں وزیروں کو وہیں روک لیا۔ غضب ناک ہو کر اس نے سخت لہجے میں بونپا سے پوچھا۔ "ہماری سبھا میں کون کہاں بیٹھے گا' یہ ذمے داری آپ کی ہے بونپا جی؟"

بونپا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسے بات کرنے کا موقع نہ دے کے لکشمی نارائن بول اٹھا۔ "اگر راجا جی مناسب سمجھیں تو یہ بات شام کے وقت کی جا سکتی ہے۔"

چک ویر کہنے لگا۔ "ہماری تھکاوٹ وکاوٹ کی فکر آپ لوگ مت کیجئے۔ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتے ہیں آپ لوگ' کوڈگ کا راجا کون ہے؟ اس بات کا ہمیں ابھی جواب دیجئے۔ آپ یا ہم؟"

"یہ بونپا جی اور میرے ماننے کی بات نہیں ہے۔" لکشمی نارائن نے جواب دیا۔ "یہ دیش کے لوگوں کے ماننے کی بات ہے۔"

"اتنا بتایئے کہ پردھان منتری کی کرسی سبھا میں رکھنے سے آپ نے بھی منع کیا تھا؟" چک ویر نے سوال کیا۔

لکشمی نارائن نے کہا۔ "بونپا جی ایسی باتوں کو میرے من کی باتیں جان کر ہی کرتے ہیں۔ لوگوں کو خلاف نہیں بنانا چاہئے۔ یہی سوچ کر میں نے اسے قبول کیا تھا۔"

بونپا اب خاموش نہ رہ سکا۔ چک ویر کے کچھ کہنے سے پہلے وہ بولا۔ "کوڈگ کا کوئی بچہ بھی ہمارے برابر ایک نیچ ذات شخص کو بیٹھے دیکھ کے برداشت نہیں کرے گا۔"

"آپ نہ مانیں' آپ کے گھر میں بھلے ہی یہ بات نہ مانی جائے لیکن راج محل میں تو مانی جائے گی۔" چک ویر نے کہا۔

اس پر لکشمی نارائن کچھ کہنے والا تھا کہ بونپا نے اسے روک دیا اور بولا۔ "میں بتاتا ہوں راجا جی! دربار راجاجی کا گھر نہیں ہے' سیٹھوں' ساہوکاروں' ہیگڈوں' منصب داروں اور ٹکوں کے ملنے کی جگہ ہے۔ کس شخص کو اپنی حیثیت کے مطابق کہاں بیٹھنا چاہئے' یہ بات بزرگوں نے پہلے سے طے کر دی ہے۔ یہ سارے دیش کی بات ہے۔ اگر راجاجی اسے بدلنا چاہتے ہیں تو پہلے جنتا کو بتانا چاہئے۔"

"بتانا چاہئے؟ یہ چاہئے کیا ہوتا ہے؟" چک ویر برہم ہو گیا۔ "کسے کہاں بیٹھنا چاہئے' یہ بات کیا راجا آپ لوگوں سے پوچھے گا۔"

"باڈی گارڈ اور محل کے نوکر' راجا کے نجی ملازم ہیں۔" بونپا نے کہا۔ "لنگڑا آپ کا باڈی گارڈ ہو سکتا ہے' اس کا نجی وزیر ہونا ممکن ہے' پر وہ سارے دیش کا وزیر ہو' یہ بات ہمیں منظور نہیں۔ راجاجی کو جو پسند ہو' وہ کر سکتے ہیں۔ اگر لنگڑا وزیر بنا تو ہم وزیر نہیں رہیں گے۔ اگر ہمیں وزیر بنائے رکھنا ہے تو لنگڑا ہمارے ساتھ نہیں رہے گا۔ راجاجی اسے چاہیں تو اپنے خاص کمرے میں لے جا سکتے ہیں' پوجا میں بھی ساتھ رکھ سکتے ہیں' ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا' لیکن دربار میں اس کا ہمارے ساتھ بیٹھنا جنتا کو منظور نہیں ہو گا۔"

معاملہ حد سے بڑھ چکا ہے' اس بات کو راجا' لکشمی نارائن اور بونپا' تینوں ہی نے یقیناً محسوس کر لیا تھا۔ لکشمی نارائن بولا۔ "بونپا جی' یہ بات یہیں تک رہنے دیجئے۔" پھر وہ چک ویر سے مخاطب ہوا۔ "میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ ان سب باتوں پر شام کو وچار کیا جائے۔ اب پھر وہی پرارتھنا کرتا ہوں اور آگے بات نہ بڑھائیں۔ راجاجی سے بھی میری یہی بنتی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" چک ویر نے کہا۔ "آپ لوگ بڑے ہیں' وزیر ہیں' سب ٹھیک ہے' لیکن ہم پر حکومت کرنے کا ادھیکار نہیں' شام کو بات کریں گے' آیئے گا۔"

"جو حکم۔" لکشمی نارائن بولا اور جھک کر نمسکار کیا۔

بونپا ناگواری کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر ذرا گھوما۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔

اندر سے نکل کر جب یہ دونوں بھون کے دروازے پر پہنچے تو بسودیا لپکتا ہوا قریب پہنچا اور اکڑ کر کہنے لگا۔ "کیوں بونپا جی' مجھے نیچ ذات کیسے کہا آپ نے؟"

بونپا بھی اتنا ہی اکڑ کر بولا۔ "ابے لنگڑے' اپنی اصلیت بھول کر سیڑھیاں چڑھتا جا رہا ہے۔ کہیں سیڑھیاں ہی ختم نہ ہو جائیں' اوپر سایہ نہیں ہے' ہوشیار رہنا.......... تو اگر نیچ ذات کہلائے جانے پر برا

مان رہا ہے تو پھر اپنی ماں کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ کیا وہ گانے بجانے والی نہیں تھی؟ پھر تو کیا ہوا؟"

بسودیئا یہ سن کر آپے سے باہر ہونے لگا۔ "میرے بارے میں جو کہا سو کہا' میری ماں کے بارے میں بھی کہہ دیا۔ اس سے بڑھ کر آپ اور کیا کہیں گے۔ مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ میں آپ کے گھمنڈ سے ڈر جاؤں گا۔ میرے پیر میں لنگ ہو سکتا ہے' عقل لنگڑی نہیں ہے۔"

"ابے جا گدھے چرانے والے' مجھ سے بات کرتا ہے۔ جا' جا کر اپنے گدھے چرا' تو راج سبھا میں بیٹھنے کے قابل نہیں۔" بونپنا نے یہ کہتے ہوئے محل کی طرف اشارہ کیا۔

"آئیں بونپنا جی' کیوں اس کے منہ لگتے ہیں؟" لکشمی نارائن نے بونپنا کو سمجھایا اور بازو پکڑ کر آگے بڑھا۔

راج بھون کے خدام' حکام اور وہاں موجود دیگر معززین نے ان دونوں کو نمسکار کیا۔ وہ سب کے نمسکار کا جواب دیتے ہوئے باہر نکل گئے۔

☆======☆======☆

یہ ماضی کا ایک منظر تھا۔ اس سے پہلے میں حال کا ایک منظر بھی دیکھ چکی تھی۔ میں نے کڑی سے کڑی جوڑ لی۔ پھر شیام بابو نے ریاست کے جو موجودہ حالات بتائے تھے' وہ بھی میرے ذہن میں تھے۔ بونپنا اور لکشمی نارائن کی بات چک ویر نے نہیں مانی ہو گی۔ اس وقتی دباؤ کو چک ویر برداشت کر گیا ہو گا۔ کچھ مصلحت کے پیش نظر دونوں وزراء نے اس مسئلے پر خاموشی اختیار کر لی ہو گی۔ دیر تک میں اس رات انہی ساری باتوں پر غور کرتی رہی۔ میری آنکھوں میں مختلف چہرے گھومتے رہے' چندر موہن' ژیان' چک ویر' رانی گورما' بسودیئا اور دیوما کے چہرے' پھر چک ویر کی بہن دیوما کا چہرہ میری چشم تصور پر محیط ہو گیا۔ یہ مظلوم چہرہ جیسے مجھ سے فریاد کر رہا تھا۔

"مجھے یہ سب کچھ کیوں دکھایا گیا؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ "اس سے عظیم مہین کا مقصد کیا ہے؟"

ان سوالوں کا جواب بہت آسان تھا' سو مجھے مل گیا اور میں مطمئن ہو کر سو گئی۔ خیر و شر کی جنگ میں مجھے خیر کا ساتھ دینا تھا۔

دوسرے دن شام کو میں پھر شیام بابو سے ملی۔ اس ملاقات کے دوران بھی عادل موجود تھا۔ ملاقات ہوٹل ہی میں ہوئی۔

"آپ نے ریاست کے نقشے کا جائزہ لے لیا؟" شیام بابو نے مجھ سے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "راستے دشوار گزار ضرور ہیں' مگر انہیں عبور کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔"

"تو پھر میں پیغام بھیج کر اتیٹا کو بمبئی بلوا لوں؟"

"مگر کس لئے؟"

"تاکہ وہ آپ کو بہ حفاظت کوڈگ تک لے جائے۔"

"میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں۔ نقشے کی مدد سے خود بھی وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے۔"

میری بات سن کر شیام بابو کے چہرے پر حیرت نظر آنے لگی پھر وہ کہنے لگا۔ "اس کی ایک اور صورت بھی ہے' اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ساتھ چلوں۔ یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ اتیٹا کے ساتھ ہی ایک بار مڈکیری جا چکا ہوں' پھر وہاں سے لوٹ کر بھی آیا ہوں۔ راستے کچھ کچھ میرے ذہن میں اب بھی ہیں۔ اس کے علاوہ فرزندان کاویری سے بھی رابطے میں آسانی ہو جائے گی۔ آپ کا ارادہ یہاں سے کب تک روانگی کا ہے؟"

"جتنی بھی جلد ممکن ہو۔ یہاں اب مجھے کوئی کام نہیں۔" میں بولی۔ "آپ ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بال مکند اور سشما تو میرے ساتھ جائیں گے ہی۔ آپ بھی چل رہے ہیں تو چار افراد ہو جائیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' میں سارا بندوبست کر لیتا ہوں۔ پہاڑوں میں سفر کرنا ہے' اس کے لئے بہترین گھوڑے' خیمے اور دیگر ضروری سامان درکار ہو گا۔ اس میں کل کا دن تو لگ ہی جائے گا۔ بمبئی سے نکل کر پہاڑوں تک پہنچنا آسان ہے' اس کے بعد بہرحال ہمیں گھوڑوں پر سفر کرنا پڑے گا۔"

"میرے اندازے کے مطابق یہ سفر کوئی زیادہ طویل نہیں ہے۔ اگر ہم کل رات بمبئی سے نکل جائیں تو پرسوں رات صبح ہوتے ہوتے ریاست کے دارالحکومت مڈکیری پہنچ سکتے ہیں۔"

"اگر ہم راستے میں رک کر کہیں آرام نہ کریں تو ایسا بھی ممکن ہے۔" شیام بابو نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کہتے ہیں تو آرام بھی کر لیں گے۔" میں نے مسکرا کر کہا پھر میں عادل کی طرف مڑ کر بولی۔ "تمہیں گھڑ سواری تو آتی ہو گی۔"

"وہ تو خیر آتی ہے۔ اگر نہ بھی آتی تو شیام بابو کے ساتھ بیٹھ جاتا۔" عادل نے مظلوم سے لہجے میں کہا۔ "ہاں کنڑ زبان بس کام چلاؤ آتی ہے۔ کوئی اگر تیزی سے میرے سامنے یہ زبان بولنے لگے تو شاید نہ سمجھ سکوں۔ جنوبی ہند میں بولی جانے والی مختلف زبانیں سن کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے بہت سے کنکر پتھر مٹکے میں ڈال کر ہلائے جا رہے ہوں۔"

عادل کی بات پر مجھے ہنسی آ گئی اور شیام بابو بھی مسکرانے لگا۔

"شیام بابو! بال مکند کی تجویز بھی مناسب ہے۔ دو گھوڑے بھی کافی ہیں۔ انہی پر ضروری سامان باندھ لیں گے۔ بال مکند کو آپ اپنے ساتھ بٹھا لیجئے گا' سشما کو میں اپنے گھوڑے پر بٹھا لوں گی۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اپنے سوٹ کیس وغیرہ ہم یہیں چھوڑ جائیں گے۔ کچھ کپڑے اور ضروری سامان ساتھ لے لیں گے' کافی ہے۔ آپ کل شام کسی آدمی کو بھیج دیں جو ہمارے سوٹ کیس ہوٹل سے لے جائے۔ ظاہر ہے ہم بمبئی ہی واپس آئیں گے تو پھر سوٹ کیس لے لیں گے۔"

میرے لئے تو خیر وہ سفر کوئی مسئلہ نہیں تھا البتہ عادل اور کویتا کا ضرور خیال تھا۔

"تو پھر مجھے اجازت ہے؟" شیام بابو نے کہا۔ "میں کل رات کو نو بجے تک یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"ہاں آپ سے ایک بات اور کہنا تھی۔" میں بولی۔ "گورنر ہاؤس کی نگرانی اب ختم کرا دیں
ژیان اب وہاں نہیں ہے۔ وہ فرار ہو چکا ہے۔"

"جی؟ مگر یہ .... یہ کس طرح ممکن ہے؟ آج دوپہر تک کی رپورٹ کے مطابق اسے گورنر ہاؤس سے نکلتے نہیں دیکھا گیا۔ شب و روز ہمارے آدمی .... "

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کے آدمیوں کی رپورٹ بھی غلط نہیں۔ اس کے باوجود وہ نکل گیا۔"

"ممکن تو ہے۔" شیام بابو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اسے وہاں سے نکالنے کے لئے میک اپ کا سہارا لیا گیا ہو گا' لیکن آپ .... آپ کو یہ علم کیسے ہوا؟؟"

"مجھے تو یہ علم بھی ہے شیام بابو کہ ژیان کے میک اپ میں سیکرٹ سروس کا سابق سربراہ ولیم رائٹ تھا۔ اب ولیم بھی گورنر ہاؤس میں نہیں۔ ایسی صورت میں گورنر ہاؤس کی نگرانی بے سود ہے۔ میری معلومات کے ذریعے سے قطع نظر مقامی تنظیم کے سالار اعلیٰ تک ایک پیغام آج ہی پہنچا دیں۔ وہ پیغام یہ ہے شیام بابو کہ دو چار ہی دن کے اندر اندر اس صوبے کی حکومت کسی بھی مشتبہ شخص پر ہاتھ ڈالنے سے گریز نہیں کرے گی۔ ممکن ہے کہ اس میں مزید دو ایک دن لگ جائیں' یعنی دو چار دن کی بجائے ہفتہ بھر گزر جائے۔ ان حالات میں آپ لوگوں کو بہت محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ حکومت کسی بھی وقت کوئی انتہائی قدم اٹھا سکتی ہے۔"

"معاف کیجئے گا کرن جی' ایک بات اور پوچھنا تھی۔" شیام بابو نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

"پوچھئے۔" میں پُرسکون آواز میں بولی۔

"یہ محض آپ کے قیاسات ہیں یا........... ؟؟"

"یقین کیجئے۔ وجہ میں عرض کئے دیتی ہوں۔ ولیم کو ژیان کے میک اپ میں گورنر ہاؤس سے اغوا کیا جا چکا ہے۔ وہاں سے اسے گذشتہ رات میں نے ہی اغوا کیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں' ولیم کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتی' فرار ہونے کی کوشش میں وہ مارا گیا۔ اس کی لاش کو ناقابل شناخت بنا کر ٹھکانے لگوایا جا چکا ہے۔ بال مکند نے بھی اس کی لاش دیکھی تھی۔ ہاں یہ اور بتا دوں کہ اسے میں ژیان کے دھوکے میں اغوا نہیں کیا تھا۔ مجھے اغوا سے پہلے ہی حقیقت پتا چل گئی تھی۔ رابرٹ ہیم اور ولیم رائٹ کی اہمیت سے واقف ہی ہوں گے' میں یہ بات آپ کو کل ہی بتا دیتی' مگر کل شام میری تمام تر توجہ ریاست کوڈگ پر تھی۔" میں نے یہ سب کچھ اس اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ عادل نے یقیناً میری اجازت کے بغیر شیام بابو کو کچھ نہیں بتایا ہو گا۔ یہی حقیقت بھی تھی جس کا اظہار شیام بابو کے چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں عادل سے میری جو گفتگو ہوئی تھی' مختصراً وہ بھی میں نے بتا دی کہ ولیم کی گمشدگی گل کھلا سکتی ہے۔

شیام بابو نے میری بات سے اختلاف نہیں کیا البتہ وہ گورنر ہاؤس سے ولیم کے اغوا کئے جانے پر ضرور حیرت زدہ تھا۔ اس کی یہ حیرت دور کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں نے تو اس سے رانی کا ذکر

بھی نہیں کیا تھا۔ کس آدمی کو اور کس حد تک کیا بات بتانا چاہئے' میں اچھی طرح جانتی تھی۔ شیام بابو میرے ساتھ کوڈگ چل رہا تھا' سو کچھ بتائے بغیر بھی اسے میرے غیر معمولی ہونے کا پتا چل جاتا۔ ابھی اسے جانے کتنی بار حیرتوں سے گزرنا تھا۔ فی الحال بات برابر کرنے کی غرض سے میں نے دہلی کے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے ولیم کے اغوا کا ذکر چھیڑ دیا تھا جس سے وہ بے خبر نہیں تھا۔ تنظیم اپنی تمام شاخوں کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ رکھتی تھی۔

"جب دہلی شاخ سے مجھے سالار اکبر نے یہ خبر دی تھی تو اس وقت میں بھی حیران رہ گیا تھا۔" شیام بابو بولا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ آپ سے کبھی پوچھوں گا' ایسا کس طرح ممکن ہوا۔"

"سالار اکبر اور بال مکند جی بھی میرے ساتھ تھے۔" میں نے مسکرا کر بتایا۔ "کبھی بال مکند سے پوچھ لیجئے گا۔ اب تو یہ آپ کے ساتھ ہی ہوں گے' ایک ہی گھوڑے پر۔"

"تو کیا یہاں بھی یہ ساتھ تھے؟"

"جی نہیں' یہ بے چارے ہوش میں نہیں تھے مجھے اس لئے اکیلے ہی سب کچھ کرنا پڑا۔ ان کی وجہ سے البتہ تھوڑی سی پریشانی ضرور ہوئی۔ انہیں بے ہوشی کی حالت میں ہوٹل پہنچانا پڑا۔" یہ کہتے ہوئے میں مسکرا کر کن انکھیوں سے عادل کو بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ "آپ کے تین کارکنوں کو بھی مجبوراً مجھے بے ہوش کرنا پڑا جو انہی حضرت کے ایماء پر تعاقب میں لگ گئے تھے۔ میری طرف سے معذرت کر لیجئے گا کہ ان غریبوں کو ناحق یہ زحمت ہوئی۔ شہر سے باہر وہ صبح تک کار میں بے ہوش پڑے رہے ہوں گے۔ دراصل وہ لوگ میرا تعاقب کرتے رہتے تو میں' ولیم کو اغوا نہ کر پاتی۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ کرن جی! میں آپ کی حیثیت اور مرتبے سے واقف ہوں۔ غلطی انہی کی تھی جس پر کل ان کی جواب طلبی کی جا چکی ہے۔ کسی کی حفاظت اس طرح نہیں کی جاتی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ بال مکند کے کہنے پر یہ غلطی ہوئی۔ وہ تو روز اول سے یہی فرض انجام دے رہے تھے جب سے آپ اس شہر میں آئی ہیں۔" شیام بابو بتانے لگا۔ "آپ نے کبھی ان کی موجودگی کو آس پاس محسوس نہیں کیا ہو گا۔ آپ ہوٹل سے نکل کر کہاں کہاں گئیں' کون آپ سے ملا' یہ سب رپورٹس مجھے ملتی رہی ہیں۔ مثلاً آپ کی بمبئی آمد کی خبر ملتے ہی اس ہوٹل کی نگرانی شروع کرا دی گئی تھی۔ انہی تینوں میں سے ایک اسی فلور پر موجود تھا۔ ہمارے آدمی ہر ٹرین کو چیک کر رہے تھے۔ دہلی سے خبر مل چکی تھی کہ آپ بمبئی روانہ ہو چکی ہیں۔ اطلاع یہ تھی کہ آپ کے ساتھ بال مکند جی بھی ہوں گے یہ پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں۔ یہاں کے کارکن انہیں پہچانتے تھے۔ اس سے آپ کی شناخت میں آسانی ہوئی۔ کچھ مشتبہ افراد کو اس ہوٹل تک آپ کے پیچھے آتے دیکھا گیا' پھر وہ لوگ چلے گئے اس کے بعد ایک مشہور زمانہ جرائم پیشہ عورت رانی نے بھی اسی فلور پر اپنے لئے کمرا بک کرایا تو ہم مزید چوکنا ہو گئے۔ دوسرے دن صبح رانی آپ سے ملی اور دوپہر ہونے کے قریب گئی۔ شام کو آپ خود اس کی کوٹھی پہنچ گئیں اور بہ خیریت ہوٹل آ گئیں تو گویا خطرہ ٹل گیا۔ ہم سمجھ گئے کہ رانی آپ کے لئے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتی۔ یہ خیال اس وقت یقین میں بدل گیا جب آپ کو رانی ہی کی فراہم کردہ کار میں گورنر ہاؤس کی اطراف دیکھا گیا۔ بال مکند جی

ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ بہرحال مختصر یہ کہ جب بال مکند جی مجھ سے ملے تو اس پر انہوں نے آپ ناراضگی کا اظہار کیا۔ میں نے اسی وقت ان تمام کارکنوں کو ہٹا دیا جو آپ کی حفاظت پر مامور تھے۔"

مجھے معلوم نہیں تھا کہ شیام بابو کو رانی سے میری ملاقات کا پتا چل گیا ہوگا۔ سو میں نے مختصراً میں رانی سے معرکہ آرائی' کلکتے میں اس کا نام بہ وجہ استعمال کرنے اور پھر یہاں بمبئی آکر خود رانی ہتھیار ڈالنے' اس سے کام لینے کو نہیں چھپایا' اسی کے ساتھ کام لینے کی وجہ اور نوعیت کا ذکر بھی کر اس سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اس پر شیام بابو میرا شکریہ ادا کرنے لگا کہ میں نے اسے قابل اعتماد سمجھا اور کچھ نہیں چھپایا درمیان سے میں یہ بات گول کر گئی تھی کہ ولیم کو گورنر ہاؤس سے کس طرح اغوا کیا اور یہ بھی کہ ولیم کو میں نے رانی کے حوالے کیا تو کویتا میرے ساتھ تھی' عادل کار میں بے ہوش پڑا تھا۔

پھر شیام بابو زیادہ دیر نہیں رکا اور چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی عادل مجھ سے بولا۔ "شیام بابو سامنے سبکی کر دی میری۔ اب تو تمہارے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی ہوگی بلکہ .... تم صنف مخالف ہو اس لئے کلیجے کی جگہ کلیجی میں ٹھنڈک پڑی ہوگی۔"

"اب زیادہ محاورے بازی نہ شروع کر دینا' مثلاً کلیجہ پھٹ جانا' کلیجے کا منہ کو آنا وغیرہ تم تو ساد میں سے ہو' تمہارے منہ سے دل' گردے' کلیجی وغیرہ کا بیان زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہر پیشہ عزت ہے۔ اسی طرح کسی کا قصائی ہونا کوئی ایسی بات نہیں۔ مجھے صرف تم پر یہ اعتراض ہے کہ تم ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

"جو چاہے بنا دو مجھے' خوب سمجھ رہا ہوں تمہارا مطلب۔"

"تو پھر سمجھتے رہو' میں چلی ...."

"مگر کہاں؟"

"گھومنے پھرنے' ابھی تو لبِ ساحل رونق ہوگی۔"

عادل مجھے بھلا کیسے اکیلا جانے دیتا۔ میں نے اسے اور کویتا کو بھی ساتھ لے لیا۔ کف در موجوں کو دیر تک میں ساحل تک آکر دم توڑتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہ نظارہ قریب سے مجھے بہت لگا۔ دنیا کے بلند ترین پہاڑی خطے سے اتر کر میں وہاں تک آ گئی تھی جہاں زمین کا یہ حصہ ختم ہو گیا کوہستان ہمالیہ کو میں بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی اور اب میرے سامنے بحیرہ عرب پھیلا ہوا تھا۔ ساحل' اور کامرانی کا استعارہ ہے اور میں اس وقت ساحل ہی پر کھڑی تھی۔

"کرن! اب چلوگی بھی کہ نہیں؟ یا اسی طرح موجوں کو دیکھتی رہوگی؟ ان کا "آواگون" ختم ہوگا۔"

عادل کی آواز سن کر میں خیالوں کی دنیا سے باہر آ گئی اور بولی۔ "تمہیں اسی لئے تو ساتھ رہی تھی کہ تم ہوگے تو تمہاری زبان میں کھجلی اٹھتی رہے گی۔ سشما بھی تو ساتھ ہے' کس طرح خا سے کھڑی ہے۔"

"سشما نے بھی شاید تمہاری طرح زندگی میں پہلی بار سمندر کے درشن کئے ہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ کلکتہ بھی تو ساحلی شہر ہے اور وہ بھی میں نے دیکھا ہے۔" میں بولی۔ سشما صرف مسکراتی رہی۔

"یہ غچہ کسی اور کو دینا کرن کماری۔" عادل نے ہنس کر کہا۔ "کلکتے میں سمندر دیکھنے کا ٹکٹ لگتا ہے۔"

میں بھی ہنس دی کیوں کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ سمندر کلکتہ شہر سے پورے 80 میل دور ہے۔ میں وہاں کبھی گئی تو نہیں تھی مگر معلوم تھا کہ سیالدہ ریلوے اسٹیشن سے "ڈائمنڈ ہاربر" کے لئے ٹرین ملتی تھی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دریائے ہگلی' خلیج بنگال میں گرتا ہے۔ کشتی رانی اور سیروسیاحت کے شوقین لوگ وہاں جاتے رہتے ہیں۔ اسی سے متصل مچھیروں کی ایک بستی ہے۔ میں نے کہیں پڑھا بھی تھا کہ دریا اور سمندر کا یہ سنگم بہت خوب صورت لگتا ہے۔ دریا کی ایک جانب انگریزوں نے ایک پختہ عمارت ذرا بلندی پر بنائی ہے۔ یہ عمارت سمندر کے مخالف رخ پر ہے۔ اس عمارت کے باہر بڑے سے پختہ چبوترے پر بڑی سی ایک توپ رکھی رہتی ہے۔ سمندر میں جب طغیانی آتی ہے تو اسی توپ سے گولے داغے جاتے ہیں کہ سرکش موجوں کا زور ٹوٹ جائے گا اور دریا طغیانی سے بچا رہے۔ جب میں نے "ڈائمنڈ ہاربر" کے بارے میں پڑھا تھا تو یہ جگہ دیکھنے کی خواہش دل میں جاگی تھی مگر پھر مہلت ہی نہیں ملی۔ یہ سچ تھا کہ میں نے بمبئی آکر پہلی بار سمندر دیکھا تھا۔

"کچھ دیر اور چہل قدمی کر لیں' پھر چلتے ہیں۔" میں نے اپنی ساڑھی کا اڑتا ہوا پلو سنبھالتے ہوئے عادل سے کہا اور آگے قدم بڑھا دیئے۔

یادوں کے جزیروں میں خواہشوں کی رنگ برنگی تتلیاں ایک بار پھر اِدھر اُدھر اڑنے لگیں۔ مجھے اترس اور نضار یاد آنے لگے۔ کیا خبر وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں کہ میں ہموار میدانوں سے کبھی پلٹوں گی بھی یا نہیں۔ وادی سبز کے مہا پجاری کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومنے لگا اور میں نے سوچا' وہ بوڑھا اب بھی زندہ ہوگا کہ نہیں جس نے بچپن سے جوانی تک میرا ساتھ دیا تھا۔ کیا میں اپنے بابا سردار اثم کے اس وفادار کو پھر کبھی دیکھ سکوں گی؟

ہم تینوں ٹہلتے ہوئے لوگوں کے ہجوم سے خاصے دور نکل آئے تھے۔ اب دھیرے دھیرے اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ میں اپنے خیالوں میں گم تھی کہ اچانک روشنی کا تیز جھماکا سا ہوا۔ اسی کے ساتھ کویتا کی چیخ سنائی دی اور وہ نرم ریت پر گر پڑی۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر چل رہی تھی۔ عادل ہمارے پیچھے تھا۔ میں اس کی طرف لپکی اور اسی لمحے تیز روشنی غائب ہوگئی۔ میں نے چندر موہن کی آواز سنی۔ وہ مجھی سے مخاطب تھا۔ "معبلہ! اگر تُو بیچ میں نہ آ گئی ہوتی تو میں اسے ابھی جلا ڈالتا۔ خیر پھر کبھی سہی۔ تُو آخر کب تک اس اناگیاری (سرکش) کو مجھ سے بچائے گی۔ اسے سزا ضرور ملے گی۔" اسی کے ساتھ چندر موہن کی آواز معدوم ہوگئی۔

اس وقت تک میں' کویتا کے قریب پہنچ چکی تھی۔ عادل بھی دوڑ کر وہاں آ گیا تھا۔

کویتا کے بے حس و حرکت جسم کو میں نے اٹھایا۔ وہ بے ہوش تھی۔ میں نے ریت پر بیٹھ کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر تھیں جس کی رنگت بدل گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چند لمحوں کو تیز اور بھڑکتی ہوئی آگ کے قریب چلی گئی ہو۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔

میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ عادل بھاگا ہوا گیا اور چلو میں پانی بھر لایا۔ پانی کے چھینٹے منہ پر پڑے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"مجھے .... مجھے بچالیں........... بچالیں مجھے راجکماری۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگی۔ اس افتاد کے سبب کویتا سب کچھ بھول گئی تھی کہ وہ سشما ہے اور میں راجکماری معبلہ نہیں کرن کماری ہوں۔

"تمہیں کچھ نہیں ہو گا' وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' ڈرومت۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔

یہ غنیمت تھا کہ وہاں دور تک کوئی موجود نہیں تھا اور رات بھی ہو چکی تھی ورنہ صورت حال مختلف ہوتی۔ میرے سمجھانے بجھانے کے سبب کویتا نے جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ اس عرصے میں عادل کچھ نہیں بولا تھا۔ یہ معاملہ ایسا تھا بھی نہیں کہ جس کی کوئی توجیہہ ممکن ہوتی۔ جو واقعہ ماورائے عقل ہو اس پر اہل دانش حیرت زدہ ہی رہ سکتے ہیں۔ عادل بھی انہی میں سے تھا جو کچھ اچانک ہوا تھا' اس نے بھی یقینا دیکھا ہو گا۔ تیز روشنی کا جھماکا ہونا' کویتا کا چیخنا اور پھر گر کر بے ہوش ہو جانا' عادل کی سمجھ میں آنے والی باتیں نہیں تھیں۔

"پیاس .... مجھے بہت زور کی پیاس لگ رہی ہے۔" کویتا مجھ سے بولی میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا تھا۔ "اندر آگ سی لگی ہوئی ہے۔"

"خود کو سنبھالو اور ہوٹل تک چلو۔" میں نے کہا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر میں نے سرگوشی کی۔ "پہلے اپنے اور میرے گرد حصار کھینچ لو تاکہ ہم اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور وہ دوبارہ حملہ نہ کر سکے۔" میرے نزدیک یہ بہت ضرردی تھا۔ باقی باتیں بعد کی تھیں۔

میری ہدایات پر کویتا نے فوراً عمل کیا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

بمشکل میں اسے ہوٹل تک لائی۔ عادل بھی میرے کمرے میں ساتھ ساتھ آ گیا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے ردم سروس کو فون کر کے ٹھنڈا ملک شیک اور برف منگوالی۔ کویتا کو میں نے اپنے بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ کویتا کی طبیعت کچھ ہی دیر میں سنبھل گئی۔ میں اس عرصے میں سوچ چکی تھی کہ کیا کرنا ہے۔ کویتا کو میں نے تکیئے کے سہارے نیم دراز کر دیا تھا اور جسم پر چادر ڈال دی تھی۔ میں اور عادل بیڈ کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

"سشما!" میں نے کویتا کو اس کے فرضی نام سے مخاطب کیا۔ "اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟ چلنے پھرنے کے قابل ہو؟"

"ہاں کرن' اب میں ٹھیک ہوں' چل کر دکھاؤں تمہیں؟"

کویتا کا یہ جملہ میرے لئے کافی تھا کہ وہ پوری طرح ہوش و حواس میں آ چکی ہے۔ میں نے کہا۔

"تو پھر اٹھ کر سہارے کے بغیر چلو۔"

میرے کہنے پر وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ میں اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

"کچھ کمزوری ضرور محسوس کر رہی ہو تم۔" میں بولی۔ "بہرحال اس وقت اتنا بھی کافی ہے۔ تم ایسا کرو کہ اپنے کمرے میں جا کے سامان سمیٹو' ہمیں یہاں سے چلنا ہے۔"

کوئی سوال کئے بغیر کویتا چلی گئی تو عادل بول اٹھا۔ "کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ یہ سب کیا چکر ہے اور چلنا کہاں ہے؟"

"وہی پرانا چکر ہے جو دہلی میں بھی چل چکا ہے۔ کویتا کے ایک دشمن کو آج اس پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔" میں نے مصلحتاً چندر موہن کا نام نہیں لیا۔

"پھر تو اسے کوڈگ تک ساتھ لے جانا بھی خطرے سے خالی نہیں۔" عادل کی آواز دھیمی تھی۔

میں اس کی لاعلمی پر مسکرائی اور بولی۔ "یہ باتیں تمہارے سمجھنے کی نہیں ہیں تم اسے اپنا دردسر نہ بناؤ۔ اپنے کمرے میں جا کے تم بھی یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ ہم جتنی جلدی یہ ہوٹل چھوڑ دیں اچھا ہے۔ رہا یہ کہ چلنا کہاں ہے تو ابھی مجھے بھی نہیں معلوم۔"

"سب کچھ معلوم ہوتا ہے تمہیں۔ بس اُلو بناتی ہو مجھے۔"

"تمہارے اندر یہ صلاحیت موجود ہے تبھی تو بناتی ہوں نا۔"

"زیادہ جی نہ جلاؤ اب ورنہ ...."

"وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔"

"ظاہر سی بات ہے۔" وہ ہنس اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

عادل کے جاتے ہی میں نے آپریٹر سے ایک فون نمبر ملوایا اور چند جملوں کے تبادلے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔ پھر ہوٹل چھوڑنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ چاروں سوٹ کیس ہوٹل کے پورٹروں نے کار کی ڈکی میں رکھ دیئے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر میں بیٹھی تھی۔ عادل آگے ہی بیٹھا تھا اور کویتا پچھلی نشست پر تھی۔

ہوٹل کے احاطے سے کار نکل آئی تو عادل بولا۔ "میں کسی اور اچھے ہوٹل کا نام بتاؤں؟"

"کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "یہ شہراب میرے لئے اتنا اجنبی نہیں رہا کہ تمہاری خدمات حاصل کرنا پڑیں۔"

"بائی دا وے تم ایک بات بھول رہی ہو' کہو تو یاد دلا دوں؟"

"یاد ہے مجھے وہ بات۔ شیام بابو کو مطلع کرنا تھا فون پر کہ ہم یہ ہوٹل چھوڑ رہے ہیں' یہی بات یاد دلانا تھی نا؟"

"غلطی میری ہی ہے' نہ آج صبح احتیاطاً تمہیں ان کا نمبر بتاتا' نہ اس وقت اپنی خدمات کو روتا۔ کبھی کبھی آدمی خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لیتا ہے۔"

"آدمی ہی تو ہے' سر کٹتے کیا دیر لگتی ہے۔" عادل پر فقرہ لگا کر میں زور سے ہنس دی۔

"بڑے برے لگتے ہیں وہ لوگ جو خود ہی اپنی بات کی ہنسی اڑانے لگیں۔"

میں جواب میں کچھ نہیں بولی اور کار ڈرائیو کرتی رہی۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی کچھ ہی دیر بعد چونک کر پوچھے گا کہ یہ کدھر جا رہی ہو؟ یہی ہوا بھی۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ یہ رستہ کدھر جاتا ہے؟" میں بولی۔

"معلوم ہے' باندرہ جاتا ہے۔"

"پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اول اس لئے کہ تصدیق ہو جائے' دوم اس لئے کہ پہلے ہی بتا دیتیں تو تمہاری صحت پر کیا اثر جاتا۔"

"اول و دوم کے بعد سوم یہ کہ پھر کیا خاک مزہ آتا۔ کھمبا نوچتے ہوئے تم بہت اچھے لگتے ہو۔ اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ میں تمہیں اس بہانے کھسیانی بلی یا بلا کہنا چاہتی ہوں۔"

انہی خوش گپیوں میں سفر طے ہو گیا۔ رانی سے میں فون پر پہلے ہی بات کر چکی تھی۔ میں نے اس سے فون پر صرف اتنا کہا تھا کہ میں کل رات بمبئی سے روانہ ہونے والی ہوں' کہو تو کل تک کے لئے تمہارے پاس آ جاؤں؟ جواب میری توقع کے مطابق ہی ملا تھا۔ رانی نے اس پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا' ابھی ہوٹل چھوڑ دو۔ یہی بات میں نے عادل کو بھی باتوں باتوں میں بتا دی تھی اور یہ بھی کہ رانی سے پہلی ملاقات میں وہ جو کردار ادا کر چکا ہے' اسے ملحوظ رکھنا ہے۔

ہوٹل چھوڑ دینے کا فوری سبب چندر موہن ہی تھا۔ اس نے اپنی شیطانی قوتوں کے ذریعے کوڈگ میں قیام کے باوجود کویتا اور میرا سراغ لگا لیا تھا۔ یہ بات کسی بھی بڑے خطرے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ چندر موہن کو یہ بات معلوم ہوتا کہ میں کہاں ہوں' حکومت کو بھی چوکنا ہونے پر مجبور کر دیتی۔ عیار حکمراں بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ گورنر ہاؤس سے ولیم کی پُراسرار گمشدگی میں میرا ہاتھ بھی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگتی کہ بمبئی میں میری موجودگی کا سبب ژیان کی تلاش کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی حکومت ہی کے دو اہم بندوں کا تعاقب کرتی ہوئی میں' بمبئی پہنچی ہوں اور یہاں سے جنوبی ہند کا رخ بھی کر سکتی ہوں۔ ایسی صورت میں حکومت بہرقیمت مجھے بمبئی سے آگے نہ بڑھنے دیتی۔ چندر موہن' میسور میں رابرٹ ہیم سے رابطہ کرتا اور پھر میسور سے دہلی اور دہلی سے بمبئی تک فون کھڑک اٹھتے۔ میرے آئندہ اقدامات کے لئے دشمن کا چوکنا ہو جانا اچھا نہیں تھا' لیکن جو ہو جائے اسے بدلنا ممکن نہیں۔ ہاں اتنا ممکن ہے کہ اسی کی روشنی میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ میں اسی سبب فوری طور پر حرکت میں آ گئی تھی۔ تنظیم کے اور میرے درمیان رابطے کا علم حکومت کو بھی تھا' سو وہ پہلے اسی کے گرد گھیرا تنگ کرتی۔ بمبئی شاخ کی صورت حال پوری طرح میرے علم میں نہیں تھی۔ یہاں بھی دہلی کی طرح کوئی غدار "وجے" بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتا تو میں کیا کر لیتی۔ میں یہی سب کچھ سوچ کر تنظیم سے دور ہی دور رہی تھی۔ رانی سے اگر مصالحت نہ ہو جاتی تو میں کوئی اور رستہ نکالتی۔

رانی نے بڑے پُرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا۔ کوٹھی خاصی بڑی تھی۔ ہم تینوں کو الگ الگ کمرے مل گئے۔ رانی اور اس کے خاص کارندوں کے سوا وہاں اور تھا بھی کون۔ وہاں پہنچتے ہی ٹہلنے کے بہانے کویتا کو ساتھ لے کر میں باہر نکل گئی۔ اس کوٹھی کو کویتا نے حصار میں لے لیا۔ میں نے اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا کہ عادل کو چندر موہن میرے ساتھ دیکھ چکا ہے۔ سو اسے خبر بھی نہ ہوئی اور کویتا نے اس کے گرد بھی حصار کھینچ دیا۔ اب میں کم از کم چندر موہن کی طرف سے بڑی حد تک مطمئن ہو چکی تھی دوسرے خطرے کا سدباب میں نے باندرہ آ کے کر لیا تھا۔ صرف دو اور اہم کام باقی تھے جن کی مجھے کوئی ایسی جلدی نہیں تھی۔

رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا' سو رانی ہمیں کوٹھی کے ڈائننگ روم میں لے آئی۔ عادل اور کویتا میز کی دوسری طرف مؤدب بیٹھے کھا کھا رہے تھے۔

"معاف کرنا کرن' کھانے کے ساتھ میں وائن ضرور پیتی ہوں۔ یہ مخصوص شراب صرف اسی وقت کے لئے ہے۔" رانی اپنے سامنے رکھی ہوئی بوتل اٹھا کر گلاس میں شراب انڈیلنے لگی۔ "تم شراب کو ہاتھ نہیں لگاتیں اس لئے معذرت کر رہی ہوں۔"

اخلاقاً مجھے کہنا پڑا۔ "کوئی بات نہیں' تم پیو۔" حالانکہ شراب کی بدبو میرے لئے ناگوار تھی۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی' تمہیں آخر بمبئی سے جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟" رانی نے یہ کہہ کر شراب کا آدھا گلاس خالی کیا اور پھر کھانا کھانے لگی۔ اس نے شراب میں پانی یا سوڈا نہیں ملایا تھا۔ اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ "وائن" کو عادی شرابی' شراب نہیں' "جو کا پانی" کہتے ہیں کیونکہ یہ جو سے ہی بنائی جاتی ہے۔

مجھ سے رواروی میں رانی نے جو سوال کیا تھا' اسے سن کر میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کیا مجھے زیادہ دن مہمان رکھنا چاہتی ہو؟"

"تم مہمان تو نہیں ہو یہاں' یہ تو تمہاری ہی کوٹھی ہے۔ جتنے دن چاہو رہو۔ میری خواہش یہ تھی کہ کم سے کم ایک ہفتے تو یہاں رہتیں۔"

"چلو مان لی تمہاری بات۔ اس بہانے مجھے چند روز آرام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ ہاں سیر سپاٹا نہیں چلے گا' آرام کا مطلب آرام ہی ہے۔"

رانی تو خیر خوش ہو گئی' مگر عادل نے کئی بار کھانس کھنکار کے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر اطمینان سے کھانا کھاتی رہی۔

کوٹھی دو منزلہ تھی۔ رانی کا قیام اوپری منزل پر تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے مجھے اپنی وسیع و عریض کوٹھی دکھائی۔ عادل اور کویتا بھی میرے ساتھ ہی تھے۔ میں نے مصلحتاً کوٹھی کی چھت پر چڑھ کر ارد گرد کا منظر دیکھنے کو کہا۔ رانی وہاں مجھے لے گئی تو میں نے چار مسلح افراد کو مستعد و چوکنا دیکھا۔ ان کے گلوں میں دوربینیں بھی لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ بہرحال "بمبئی کی رانی" تھی۔ ہر طرف سے اس کا چوکنا رہنا میرے لئے تعجب خیز نہیں تھا۔ میں نے ایک مسلح شخص سے دوربین لے کر اطراف کا جائزہ لیا اور پھر نیچے

اتر آئی۔ اس کے باوجود میں نے رانی کو یہ احساس نہ ہونے دیا تھا کہ وہاں کسی قسم کا خطرہ محسوس کر رہی ہوں یا اردگرد کا جائزہ لے کر مطمئن ہونا مقصود ہے۔ رانی سے گپ لڑاتے ہوئے بھی میرا ذہن سوچنے میں مصروف تھا۔

لان اس کوٹھی کے عقبی سمت میں تھا۔ باتوں باتوں میں رانی سے میں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ وہاں نہ وہ کسی سے "کاروباری" ملاقات کرتی ہے، نہ آسودگی جسم و جاں کی خاطر کسی کو بلواتی ہے۔ ان کاموں کے لئے اس کے دوسرے ٹھکانے تھے۔ گراؤنڈ فلور پر بھی کوٹھی کی حفاظت کا پورا بندوبست تھا۔ کوٹھی میں اس کے مسلح محافظوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ تھی۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ فون اور انہی افراد کے ذریعے قائم تھا۔ کوٹھی میں دو فون تھے۔ ایک اوپری منزل پر دوسرا نیچے۔ دونوں کی لائنیں الگ الگ تھیں۔ خود رانی ہی نے یہ پیشکش کی تھی کہ چاہوں تو وہ ٹیلی فون سیٹ میں اپنے بیڈروم میں رکھوا لوں۔

"اگر تمہارے کسی آدمی نے اس فون نمبر پر تم سے رابطہ قائم کیا تو؟" میں ہنس کر بولی۔

"اسے ایک طرح کا ون وے سمجھو۔ تمہیں میں نے جو نمبر دیا تھا، وہ بھی اوپر ہی کا تھا۔ یہ نمبر میرے کسی آدمی کے پاس نہیں۔ کبھی میں نیچے ہوتی ہوں تو اسے استعمال کر لیتی ہوں۔ اسی سہولت کے لئے یہ فون بھی لگوا لیا تھا ورنہ ایک لائن بھی کافی ہے۔" رانی نے جواب دیا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" میں نے کہا پھر رانی کے اشارے پر اس کے ایک ملازم نے ٹیلی فون سیٹ ہال کمرے سے اٹھا کر میرے بیڈ روم میں پہنچا دیا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ رانی اوپر منزل پر چلی گئی اس کے ملازمین پہلے ہی سرونٹ کوارٹرز کا رخ کر چکے تھے جو کوٹھی کے بائیں جانب بنے ہوئے تھے۔ نچلی منزل پر اب مسلح محافظوں کے سوا کوئی نہیں تھا جو عمارت کے باہر تھے۔

میرا بیڈروم خاصا بڑا تھا۔ وہاں بیڈ کے علاوہ دوسرا فرنیچر بھی تھا۔ عادل اور کویتا کو میں اپنے ساتھ وہیں لے آئی، پھر مجھے احساس ہوا کہ کویتا کی وہاں موجودگی میں عادل کچھ بے چین سا نظر آ رہا ہے۔

"تم ایسا کرو سشما کہ اپنے کمرے میں جاؤ۔ تمہیں یوں بھی آرام کی ضرورت ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں خود تمہارے پاس آ جاؤں گی یا یہاں بلا لوں گی۔" میں نے کچھ بعد کویتا کو مخاطب کیا اور وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ "جی، بال مکند جی! اب فرمایئے۔" میں عادل کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"فرمانا کیا خاک ہے۔ منہ پر تو تالا ڈال دیا ہے یہاں لا کر۔ لاکھ کھانستے رہو مگر کوئی سنتا ہی نہیں۔"

"اب تو تالا کھل گیا ہے، بولو۔"

"یہ ایک ہفتے یہاں رہنے کی بات کیوں مان لی تم نے؟"

"اس لئے کہ اب یہاں سے ایک ہفتے بعد ہی روانگی ہو گی۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟"

"بڑی پلٹو ہو تم۔ پہلے کچھ اور پروگرام بنایا تھا، اب ایک دم نٹ گئیں۔ وہ بوڑھا آدمی بے چارہ کیا سوچے گا جسے تم نے دیہاڑی سے لگا دیا ہے۔ اب تو مجھے یہ شک ہو رہا ہے کہ اسے تم نے فون کیا بھی ہو

گا یا نہیں۔" عادل کا اشارہ شیام بابو کی طرف تھا۔

"تمہارا شک درست ہے۔ میں نے صرف رانی کو فون کیا تھا۔ بہرحال، یہاں فون موجود ہے، بات کر لو بوڑھے سے، کل گیارہ بجے اسے یہاں بلوا لو۔ پتا معلوم ہے اسے اس کوٹھی کا۔ نہیں معلوم ہو گا تو اپنے بندوں سے پوچھ لے گا جو مجھے یہاں تک چھوڑنے آ چکے ہیں۔ ہاں یہ ضرور اشارہ کر دینا کہ کوٹ پینٹ پہن کے آئے، ٹائی سبز رنگ کی ہونا چاہیے۔"

"جوتوں کا رنگ بھی بتا دو، کہیں وہ غریب گرے سوٹ پر براؤن شوز نہ پہن آئے۔"

"جوتوں پر کوئی پابندی نہیں۔ ہر شخص کو تم اپنی طرح بغلول کیوں سمجھتے ہو۔ ہاں ریڈ سگنل بھی دے دینا۔ بوڑھے کو بہت محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔"

"وہ تو خیر میں ابھی سب کچھ کہہ دیتا ہوں لیکن اچانک ایسی کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے جو تم یہاں آ کر قلعہ بند ہو گئی ہو؟"

"آفت ٹوٹنے میں کون سی دیر لگتی ہے، آج شام لب ساحل جو واقعہ رونما ہوا، کیا تمہارے وہم و گمان میں تھا؟"

"اسی کو کہتے ہیں، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔" عادل بولا۔ "اس واقعے سے ہمارے آئندہ پروگرام کا کیا تعلق؟"

"تعلق بھی تمہاری سمجھ میں آ جائے گا، پہلے شیام بابو کو فون کر لو، شاباش اٹھو۔"

"پچکارے نہ مارو، میں اب اتنا بچہ بھی نہیں ہوں۔ اٹھنا تو پڑے گا۔"

عادل نے اشارتی زبان میں میرا پیغام فون پر شیام بابو کو دے دیا تو میں اٹھی اور ایک نمبر ملایا۔ لائن مصروف تھی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"اب تم کسے فون کر رہی ہو؟" عادل نے پوچھا۔

"ابھی سن لینا۔ بمبئی میں شیام بابو کے علاوہ اور لوگ بھی تو رہتے ہوں گے نا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اچھا ہوا تم نے بتا دیا ورنہ میں بے خبری کے عالم ہی میں اس عالم رنگ و بو سے کوچ کر جاتا۔"

"فی الحال کوچ کرنے کے متعلق سوچنا بھی مت ورنہ قصبہ جلالی میں تمہاری منگیتر بے چاری قمر جہاں آٹھ آٹھ آنسو بہانے پر مجبور ہو جائے گی۔ مجھ سے یہ منظر قطعی نہیں دیکھا جائے گا کیونکہ اسے دم دلاسہ دینے کے لئے مجھے کم از کم ایک بار تو جلالی جانا ہی پڑے گا۔"

"لوگوں کو بدفال منہ سے نکالتے ہوئے ذرا خیال نہیں آتا۔"

میں نے مزید کچھ کہے بغیر پھر وہی نمبر ملایا جو پہلے ملا رہی تھی۔ وہ اسی کوٹھی کی اوپری منزل پر موجود ٹیلی فون کا نمبر تھا۔ عادل ذرا دور کرسی پر بیٹھا تھا۔ میرے بیڈ کے سرہانے چھوٹی سی خوبصورت میز پر ٹیلی فون رکھا تھا، اسی کے ساتھ دوسری جانب ایک کرسی بھی پڑی تھی۔ میں اسی کرسی پر بیٹھی تھی۔

اس مرتبہ لائن مصروف نہیں ملی اور نمبر مل گیا۔ دوسری طرف ریسیور اٹھانے والی رانی ہی تھی۔

"ہیلو! کون؟" اس کا لہجہ سخت تھا۔ یقیناً اسے یہ توقع نہیں رہی ہو گی کہ فون میں نے کیا ہو گا۔ ابھی آدھے گھنٹے پہلے تو وہ مجھ سے مل کر اوپر گئی تھی۔

"کرن بول رہی ہوں۔" میں نے بتایا۔

"ہاں بولو۔" رانی کے لہجے میں نرمی آ گئی۔ "کوئی خاص بات؟"

"کل صبح گیارہ بجے میرا ایک آدمی مجھ سے ملنے آئے گا۔ وہ کسی بھی رنگ کا سوٹ پہنے ہو مگر ٹائی سبز رنگ کی ہو گی۔ یہ اس کی شناخت ہے کہ وہ میرا ہی آدمی ہے۔ اس کے سوا کسی اور شخص کو کوئی اطلاع مجھ سے نہ ملنے دیا جائے۔ تم اس سلسلے میں اپنے محافظوں کو تاکید کر دینا۔ چھت پر بھی تمہارے محافظ موجود رہتے ہیں۔ گیارہ بجے انہیں بھی چوکنا رہنا ہے۔ دوربین کے ذریعے وہ اطراف کا جائزہ لے لیں کہ میرے اس آدمی کے تعاقب میں تو کوئی نہیں۔ اس یقین دہانی کے بعد ہی اسے کوٹھی میں مجھ سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ بہ صورت دیگر تمہارے محافظ صاف انکار کر دیں کہ یہاں کوئی کرن کماری نہیں رہتی۔ ویسے اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ وہ شخص کسی کو یہاں تک اپنے پیچھے لگا لائے میں بہ طور احتیاط یہ بات کہہ رہی ہوں۔"

"کیا کل صبح ناشتے پر ملاقات کا امکان نہیں جو تم ابھی سے یہ ہدایات دے رہی ہو؟" رانی خوش مزاجی سے بولی۔

"امکان ہے بھی اور نہیں بھی۔ ممکن ہے کہ میں گیارہ بجے تک سوتی ہی رہوں۔ تم نے مجھے ہفتے بھر آرام ہی کے لئے تو روکا ہے نا۔ تو پھر آرام کا مطلب آرام ہے۔ جب جی چاہا ناشتہ کر لیا' جب چاہا کھانا کھایا نہ کھایا اور جب موڈ ہوا سو گئے۔ آرام کے معاملے میں وقت کی پابندی نہیں کی جاتی۔"

"لیکن تم آرام کہاں کر رہی ہو' صرف آرام کرنا ہوتا تو اپنے بندے کو یہاں کیوں بلواتیں۔"

"تمہی نے پروگرام میں تبدیلی کرائی ہے' مجھے اپنے پاس روک کر۔ نئی صورت حال سے اپنے بندوں کو آگاہ تو کرنا پڑے گا نا کہ ابھی میں' بمبئی میں رکوں گی۔ پہلے میرا پروگرام صرف کل تک رکنے کا تھا' فون پر تمہیں بتا بھی چکی تھی۔" میں نے بات بنا دی۔

"کرن! میری ان باتوں کا کہیں اور مقصد نہ سمجھ لینا۔ تم یہاں جو چاہو کرو' جیسے مرضی ہو' رہو اور جب بھی جس سے ملنا ہو' ملو۔ یہاں موجود تمام ملازمین اور محافظوں کو میں تاکید کردوں گی کہ وہ تمہارے ہر حکم کی پابندی کریں۔ اس طرح تمہیں کسی بھی معاملے میں مجھ سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"چلو' پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب تم آرام کرو۔" میں نے یہ کہتے ہی ریسیور رکھ دیا پھر اٹھ کر عادل کے سامنے آ بیٹھی۔

"خطرے کی نوعیت تو کم سے کم بتا دو تا کہ میں بھی محتاط ہو جاؤں۔" عادل اس بار سنجیدہ تھا۔

"کویتا کے دشمن حکومت سے بھی ملے ہوئے ہیں۔ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ژیان بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔" میں نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "حکومت یا تو اب تک بمبئی میں

میری موجودگی سے آگاہ ہو چکی ہے ورنہ کل صبح تک اسے یہ علم ہو جائے گا۔ اب سمجھے تم میرے یہاں قلعہ بند ہونے کا مقصد۔"

"بہ قول تمہارے کویتا کے دشمنوں اور حکومت کے درمیان کوئی سازباز ہے تو جس طرح انہوں نے آج کویتا کا سراغ لگا لیا' آئندہ بھی ایسا ممکن ہے۔"

"اس کا تدارک کیا جا چکا ہے۔ اب مزید اس سلسلے میں کوئی سوال نہ کرنا کہ میں نے کس طرح تدارک کیا؟ میں جواب نہیں دوں گی۔ تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ حکومت ریاست کوڈگ پر ہاتھ صاف کرنے کا منصوبہ بنا چکی ہے' یہ خبر بھی ہے کہ بمبئی میں رابرٹ اور ولیم موجود تھے۔ یہیں سے رابرٹ میسور گیا ہے۔ ایسی صورت میں یہاں میری موجودگی حکومت کے لئے کتنا بڑا خطرہ بن سکتی ہے' تم با آسانی یہ اندازہ لگا سکتے ہو۔"

"تمہارے قیاسات سو فیصدی درست ہیں۔" عادل بولا۔ "مگر اس سے تو کوئی اور ہی نتیجہ برآمد ہو رہا ہے۔ تمہارا دشمن ژیان حکومت کی پناہ میں ہے' سو وہ حکومت ہی کا آلہ کار ہوا۔ اس کے علاوہ تمہارے جو دشمن شیطانی قوتوں کے مالک ہیں' تمہارے کہنے کے مطابق وہ بھی حکومت سے مل گئے ہیں۔ انہی لوگوں نے تمہیں ایک بار دہلی میں اغوا بھی کر لیا تھا۔ کویتا تو تمہاری مدد کرنے کی وجہ سے معتوب ٹھہری' ان کا اصل ہدف تو تم ہوئیں' پھر آج انہوں نے صرف کویتا پر حملہ کیوں کیا؟ تمہیں کیوں چھوڑ دیا؟"

"اس لئے کہ کسی نامعلوم وجہ کی بناء پر میرے دشمن مجھے زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ میں آج تک اس وجہ کا سراغ نہیں لگا سکی۔" میں نے اعتراف کیا۔ "دہلی میں جب میں' ولیم کی زبان کھلوانا چاہتی تھی تو اس وقت تم بھی موجود تھے۔ میں یہی تو جاننا چاہتی ہوں۔ یہاں آ کر ولیم کو میں نے اور کس لئے اغوا کیا؟ حکومت سے میری یہ جنگ تو بہت دن سے جاری ہے۔ تم اگر گذشتہ حالات پر غور کرتے تو یہ سوال ہی تمہاری زبان پر نہ آتا۔ تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ آج کویتا اسی سبب زندہ بچ گئی کہ میں چشم زدن میں لپک کر اس تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت تمہیں یہ سب کچھ بتانے اور یاد دلانے کا مقصد ایک اور بھی ہے۔ تم میرے ساتھ کوڈگ چل رہے ہو' وہاں بھی ایسے حالات پیش آ سکتے ہیں جنہیں عقل کی کسوٹی قبول نہ کرے۔ زندگی کو پرکھنے اور برتنے کا تمہارا اپنا ایک زاویہ نظر ہے۔ اس سے مجھے کوئی اختلاف نہیں۔ زندگی کہیں بھی ختم نہیں ہے کہ ہم حتمی طور پر کہہ سکیں' بس یہی زندگی ہے۔ کسی کے کچھ ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک ارتقائی عمل ہے' سو جاری ہے۔ ہزار چہرہ زندگی کو پورا پورا سمجھ لینا' میرے نزدیک پیغمبری صفات کے سوا ممکن نہیں' سو اب ہمیشہ کے لئے یہ دروازہ بند ہو چکا۔ ہاں خیر و صداقت کی مختلف علامتیں' مختلف صورتوں میں موجود ہیں۔ انہیں تم اللہ کے نیک یا برگزیدہ بندے کہہ لو' روحانی وجود کا نام دے دو یا کچھ اور' مگر وہ ہیں اور رہیں گے۔ مصدقہ تاریخ سے اس کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں اور یہ مثالیں آئندہ بھی دی جاتی رہیں گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے دیکھا کہ عادل بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم اتنی صاحب علم ہو بلکہ صاحبہ علم کہنا چاہیے .... تو اے صاحبہ علم' یہ کیا ظلم ہے۔ چراغ تلے اندھیرا۔ اس وقت میرا دل یہ چاہ رہا ہے کہ فی الفور تمہارا مرید بن جاؤں مگر شاید ابھی تم نے لوگوں کو اپنا مرید بنانا شروع نہیں کیا۔ اگر کبھی ایسا ارادہ ہو تو مجھ فقیر کو نہ بھول جانا۔ یقین کرو کہ میں صدق دل سے تمہاری مریدی اختیار کر لوں گا۔"

"مرید تو تم اب بھی ہو' بس ذرا چکنے گھڑے ہو۔" میں نے کہا۔ "بہرحال مجھے جو کہنا تھا سو کہہ دیا' باقی تم جانو' خود بھگتو گے۔" اتنا کہنے کے بعد میں کھڑی ہو گئی۔

مجھے ابھی کویتا سے بھی کچھ باتیں کرنا تھیں۔ ان باتوں کا تعلق کویتا کے کھینچے ہوئے حصار سے تھا۔ عادل اپنے کمرے میں سونے چلا گیا اور میں' کویتا کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

"کویتا۔" میں نے بیڈ کے قریب موجود کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "تم جسے گھیرا ڈالنا کہتی ہو' اردو میں اسے حصار کھینچنا کہا جاتا ہے۔ تو میں اسی سلسلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ چندر موہن کی نظروں سے اوجھل ہونے کے لئے تم نے جو حصار اس کوٹھی کے گرد کھینچا ہے' کیا اس کی کوئی مدت مقرر ہے؟" اس کوٹھی میں رات کے وقت مجھے یہ خطرہ نہیں تھا کہ چھپ کر کوئی ہماری باتیں سن سکتا ہے۔ میں نے اسی لئے عادل سے بھی بے دھڑک باتیں کی تھیں اور اب رانی کی غیر موجودگی میں کویتا کو سشا کہنا بھی ضروری نہیں تھا۔

میرے سوال کے جواب میں کویتا بولی۔ "نہیں' اس حصار کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ جب تک اور جتنے دن بھی ہم اس کے اندر رہیں گے' محفوظ ہیں۔"

"اور باہر نکلنے کی صورت میں؟"

"ہمیں پھر حصار کھینچنا پڑے گا۔ ہاں اس کے لئے مدت ضرور ہے۔ حصار کے لئے اشلوک پڑھتے ہوئے مدت مقرر کی جاتی ہے۔ جس طرح ٹھہرے ہوئے پانی اور بہتے پانی میں فرق ہے بالکل ویسے ہی کسی خاص جگہ یا علاقے کے لئے حصار کھینچنے اور چلتے پھرتے آدمی کے گرد گھیرا ڈالنے میں فرق ہے۔ اگر ہم اس کوٹھی سے باہر نکلیں تو زیادہ سے زیادہ حصار کی مدت ایک دن' ایک رات ہو گی۔ یہ مدت کم ہو سکتی ہے' اس سے زیادہ نہیں۔ پھر بھی ضرورت ہو تو مدت گزرنے سے پہلے دوبارہ اشلوک پڑھنا ہوں گے۔" کویتا نے وضاحت کر دی۔

"اگر ایسا ہے تو پھر تمہیں آئندہ کے لئے ایک بات دھیان میں رکھنا پڑے گی۔" میرا لہجہ تاکیدی تھا۔ "ہم ہفتے بھر کے بعد یہاں سے چل دیں گے۔ جب تک ہم سفر میں رہیں اور کسی منزل تک نہ پہنچ جائیں تم حصار کی مدت ختم ہونے سے پہلے دوبارہ حصار کھینچتی رہو گی۔ یہ بھول چوک میرے لئے خطرہ بنے نہ بنے تمہاری زندگی کو ضرور خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ ہم چار افراد یہاں سے چلیں گے اور چاروں کے گرد حصار ضروری ہے۔"

کویتا اچھی طرح میری بات سمجھ گئی اور میں اس کے پاس سے اٹھ کر چلی آئی۔

رات کو جب میں سونے کے لئے لیٹی تو میرے اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔ میں خواب اور بیداری کی ملی جلی حالت میں بند آنکھوں سے ریاست کوڈگ کا راج بھون (ایوان حکومت) دیکھ رہی تھی۔ اسی کو راج محل بھی کہتے تھے کیونکہ راج چک ویر اور اس کے اہل خانہ یہیں رہتے تھے۔ یہ قدیم محل نما عمارت وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے مختلف حصے تھے جو مجھے دکھائے جا رہے تھے۔ ایک حصہ دربار اور دربار سے متعلق حکام کے لئے مخصوص تھا۔ یہاں مختلف دفاتر بھی تھے۔ دوسرا حصہ باغ اور اس سے ملحق گھڑ سال کے لئے تھا۔ تیسرا حصہ صرف راجا چک ویر کے مصرف میں تھا جہاں رانی گورما اور راجکماری پٹا کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی حصے میں وہ قید خانہ بھی تھا جس کے ایک کمرے میں چک ویر کی سگی بہن دیوما کو میں دیکھ چکی تھی۔ یہیں راجا چک ویر عیش و نشاط کی محفلیں سجاتا تھا' قید خانے سے کچھ ہی فاصلے پر یہ سامان طرب میں نے دیکھا۔ پھر مجھے ایک ادھیڑ عمر عورت کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے چہرے پر بلا کی خباثت تھی۔ اس عورت کا نام دوڈو تھا۔ سرگرشیوں میں مجھے بتا دیا گیا۔ دوڈو مجھے ایک حسین اور نازک اندام نوجوان لڑکی پر ظلم کرتی دکھائی دی۔ چمڑے کے ایک ہنٹر سے وہ اس لڑکی کو مار رہی تھی۔ لڑکی کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

"بھول جا اب اپنے ماتا پتا کو۔ تو اب ڈکیری سے کبھی نالک ناڈ نہیں جا سکے گی۔" بوڑھی دوڈو چیخ رہی تھی۔ "ضد چھوڑ دے۔ راجا جی کے رین نواس (خواب گاہ) میں تجھے جانا ہی پڑے گا۔ راجا جی تجھے ایک مہان پُرش کو سونپنا چاہتے ہیں۔ بڑے مہاراج چندر موہن تجھے نہال کر دیں گے۔"

"نہیں .... نہیں .... نہیں۔" لڑکی چیختے ہوئے زور سے بولی۔ "میری سگائی (منگنی) ہو چکی ہے۔"

بڑھیا فحش کلامی پر اتر آئی اور لڑکی رونے لگی۔ اس کے بعد دوڈو نے دوسرا حربہ آزمایا' وہ اس معصوم لڑکی کو شیشے میں اتارنے کے لئے چندر موہن کی تعریفیں کرنے لگی۔ "تُو بڑی بھاگوان ہے کہ بڑے مہاراج کی سیوا میں رہے گی۔ سیوا ہی سے میوہ ملتا ہے۔ کیا تُو نے سنا نہیں کہ سیوا کرے سو میوہ کھائے۔"

دوڈو اور اس لڑکی کے درمیان ہونے والی گفتگو سے میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ لڑکی کو ریاست ہی کے ایک شہر نالک ناڈ سے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ کچھ عرصے پہلے راجا نے وہاں کا دورہ کیا تھا۔ لڑکی بدقسمت تھی کہ اس پر چک ویر کی نظر پڑ گئی۔ اس نے بسوڈیا کو اشارہ کر دیا پھر اِدھر تو چک ویر واپس ڈکیری پہنچا' اِدھر دوسرے ہی روز لڑکی کو اٹھوا لیا گیا۔ چند روز تک اغوا کے بعد اسے نالک ناڈ کے محل میں رکھا گیا' پھر بسوڈیا کے ساتھ وہ ڈکیری پہنچ گئی۔ اس واقعے کو ایک ہفتہ ہوا تھا۔ چک ویر کی طرح بسوڈیا بھی لاکھ عیاش سہی' مگر اس نے لڑکی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ چک ویر کا مزاج آشنا بسوڈیا اس معاملے میں ڈنڈی مارنے سے ڈرتا تھا۔ مجھے سرگوشیاں سنائی دیتی رہیں۔

راج محل کے اسی تیسرے حصے میں ایک عمارت دوڈو کے تصرف میں تھی۔ اس میں تقریباً دس بارہ نوجوان لڑکیاں مجھے دکھائی دیں جو انتہائی خوبصورت تھیں۔ وہ سفاک بڑھیا' چک ویر کے لئے یہاں نئی

آنے والی لڑکیوں کو "تربیت" دیتی اور جو ذرا سرکش ہوتیں ان کے کس بل نکالنے میں کسی رعایت سے کام نہ لیتی۔ جو تربیت پا جاتیں انہیں اسی عمارت کے دوسرے بڑے حصے میں منتقل کر دیا جاتا۔ وہاں سے انہیں باری باری راجا چک ویر کے رین نواس میں بھیجا جاتا اور پھر وہ یہیں واپس آ جاتیں۔ چک ویر کی جب مرضی ہوتی ان میں سے کسی کو بلوا لیتا۔ وہ دس بارہ لڑکیاں ابھی تک "زیر تربیت" تھیں جن میں سے ایک پر میں نے ظلم ہوتے دیکھا تھا۔ "زیر تربیت" لڑکیوں کی تعداد کم نہ ہو' یہ بسودیا کی "ذمے داری" تھی۔ ان لڑکیوں میں زیادہ تعداد اغوا کی جانے والیوں کی ہوتی۔ اکثر لڑکیاں غیر شادی شدہ ہوتیں' لیکن چک ویر کسی نوبیاہتا حسین لڑکی کو بھی پسند کر لیتا تو لنگڑا بسودیا اس پر جال پھینک دیتا۔ اس کے لئے مختلف حیلوں بہانوں سے بھی گریز نہ کیا جاتا۔ کسی بھی بہانے انہیں راج محل میں بلوا کے وہاں رہنے پر مجبور کر دیا جاتا۔ یہ سب کچھ مجھے سرگرشیوں کے ذریعے بتایا جا رہا تھا۔ میں دیکھ بھی رہی تھی' سن بھی رہی تھی۔

محل کا چوتھا حصہ وہ تھا جہاں رانی گورما اپنی بیٹی راجکماری پٹما کے ساتھ رہتی تھی۔ مجھے یہ حصہ بھی دکھایا گیا۔

پھر اچانک منظر بدل گیا۔ اب میرے سامنے بسودیا اور چک ویر کے چہرے تھے۔ وہ دونوں اس وقت محل کے ایسے حصے میں تھے جہاں چک ویر محفل عیش و نشاط سجاتا تھا۔

"ابے لنگڑے! تجھے تو میں نے بڑے مہاراج کو ساتھ لانے کے لئے بھیجا تھا' پھر اکیلا کیسے آیا؟" راجا چک ویر نے بسودیا کو ڈانٹا۔

"وہ میرے ساتھ آئے ہی نہیں راجا جی۔" بسودیا نے جواب دیا۔ "کہنے لگے' تُو چل میں تیرے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔"

"پہریداروں کو بتا دیا ہے تُو نے؟"

"اے راجا! اس کا جواب میں دیتا ہوں۔" چندر موہن کی آواز گونجی۔ اسی کے ساتھ وہ ظاہر ہو گیا۔ "ہمیں کہیں آنے جانے سے بھلا کون روک سکتا ہے۔"

راجا چک ویر گھبرا کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گھبراہٹ اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔

"تجھے بھی ہم ایسی ہی شکتی پردان کریں گے' پر ابھی اس کا سمے نہیں آیا۔" چندر موہن نے راجا چک ویر کو مخاطب کیا۔

"آپ .... آپ پدھاریئے تو بڑے مہاراج۔" چک ویر نے قریب ہی پڑی ہوئی ایک چوکی کی طرف اشارہ کیا۔ چوکی پر دبیز قالین بچھا تھا اور دیوار کے سہارے تکیہ رکھا ہوا تھا۔

چندر موہن چوکی پر بیٹھ گیا۔ بسودیا کھڑا ہی رہا۔

چک ویر نے چندر موہن کے چوکی پر بیٹھتے ہی کہا۔ "بڑے مہاراج۔ آخر وہ دن کب آئے گا جب آپ مجھے بھی شکتی دیں گے؟ جب آپ پہلے مڈکیری آئے تو اس سمے بھی یہی کہا تھا۔" وہ اب اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"جلد آئے گا وہ دن۔" چندر موہن معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "اس لئے کہ تُو خطرے میں گھرنے والا ہے اور بنا شکتی کے خطرے سے بچنا تیرے لئے مشکل ہو گا۔"

"کیسا خطرہ؟" چک ویر نے چونک کر پوچھا۔

"وہ بھی بتا دوں گا' پر تُو بتا کہ مجھے کیوں اپنے راج بھون میں بلوایا ہے؟ اگر میری سیوا کے لئے کوئی کنیا دان کرنا تھی تو اسے بھجوا دیا ہوتا۔"

چک ویر کے چہرے پر ایک بار پھر حیرت نظر آئی اور بولا۔ "بڑے مہاراج! آپ تو من کا بھید بھی جانتے ہیں۔ میرا یہی ارادہ تھا۔"

"تو پھر اس بڑھیا دوڈو سے کہلوا دے کہ کنیا کو مارنے پیٹنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی ٹیڑھ میں نکال دوں گا۔ میرے پاس آ کر وہ خود سیدھی ہو جائے گی۔ نالک ناڈ ہی سے تو آئی ہے وہ۔ مجھ سے کون سا بھید چھپا ہے۔" چندر موہن کے ہونٹوں پر بہ دستور شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"میں آپ کا ابھاری (احسان مند) ہوں بڑے مہاراج کہ میرے کہنے پر خود یہاں آئے۔"

"تیرے کہنے پر تو میں یہاں نہیں آیا اے راجا۔ مجھے تو یہاں آنا ہی تھا' سو آ گیا۔ نہ آتا تو تیرے راج پاٹ کو جو خطرہ ہے تجھے کون بتاتا۔ میری سیوا کرنے کے لئے داسیوں کی کمی نہیں' ہاں تُو محبت سے دے رہا ہے کوئی داسی تو تیرا دل رکھنے کو انکار نہیں کروں گا۔" چندر موہن نے عیاری سے کہا۔

"بسودیا! جا دوڈو کے پاس اور اسے جا کر لے آ۔" چک ویر بولا۔

"ابھی نہیں' جاتے سمے ساتھ لے جاؤں گا۔ تجھ سے مجھے کچھ کہنا بھی تو ہے کہ جس کارن آیا ہوں۔ سن اے راجا! تیری پرجا تیرے ہی ساتھ ہے' وہ غداری نہیں کرے گی' پر وہ جو بدیسی ہیں' ان کی نیت خراب ہے۔ وہ سارے بھارت ورش پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ تیری ریاست الگ سہی پر ہے تو بھارت ہی سے ملی ہوئی۔ سو ان سے تجھے بنا کے رکھنا ہو گی۔ سو' چوکس رہ۔ اپنی سرحدوں کی حفاظت کر۔ ان بدیسیوں سے ٹکر لینا ٹھیک نہیں۔ بس مجھے تجھ سے یہی کہنا تھا۔"

"پر بڑے مہاراج' یہ تو بتا دیں کہ خطرہ کس طرف سے ہے؟" بسودیا پہلی بار بولا۔

"بمبئی کی طرف سے۔" چندر موہن نے جواب دیا۔

"بونپا کو بلوا' جلدی کر۔" چک ویر نے بسودیا کو حکم دیا۔ "کہلوا دے کہ ابھی اور اسی سمے ہم سے آ کر ملے۔"

بسودیا چلا گیا تو چندر موہن نے کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔"

"اس کنیا کو تو ساتھ لیتے جائیں بڑے مہاراج۔ بسودیا آ جائے تو ...."

"بسودیا کے آنے کی کیا ضرورت ہے' میں اسے خود بلوائے لیتا ہوں۔" چندر موہن بولا' پھر بلند آواز سے بولا۔ "اے نالک ناڈ سے آنے والی' حاضر ہو جا۔"

ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے وہی نوجوان لڑکی آتی دکھائی دی' جسے دوڈو کے ہاتھوں پٹتے دیکھا تھا۔ وہ اکیلی ہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خواب کے عالم میں چل رہی ہو۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کے

آثار تھے۔ وہ سیدھی چلتی ہوئی اس چوکی تک پہنچی جس پر چندر موہن بیٹھا تھا۔

"رک جا اور بتا کہ تُو کس کے چرنوں کی دھول ہے؟" چندر موہن نے لڑکی سے کہا۔

لڑکی چوکی کے نیچے بیٹھ گئی اور چندر موہن کے پیر پکڑ کر خواب آلود سی آواز میں بولی۔ "بڑے مہاراج ہی میرے دیوتا ہیں اور میں انہی کے چرنوں کی دھول ہوں۔"

"کیا تُو اپنے ماتا پتا کے پاس جانا چاہتی ہے؟" چندر موہن نے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"اور اس کے پاس جس سے تیری سگائی ہوئی ہے، تجھے تو اس سے پریم بھی تھا۔"

"اب اس سے میرا کوئی سمبندھ نہیں رہا۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"تو پھر میرے ساتھ چل۔" چندر موہن چوکی سے اٹھا اور لڑکی اس کے پیچھے چلنے لگی۔

چندر موہن آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ بسودیا سامنے سے آیا اور ایک طرف ہو گیا۔ لڑکی، چندر موہن کے ساتھ چلی گئی تو چک دیر نے پوچھا۔ "کیا رہا؟ بونپا آ رہا ہے؟"

"جی راجا جی! وہ چل چکے ہیں، ہرکارے نے لوٹ کر یہی بتایا ہے۔" بسودیا نے بتایا، پھر پوچھنے لگا۔ "میرے پیچھے بڑے مہاراج نے کس طرح اس لڑکی کو رام کر لیا؟"

"تُو بھی نرا پاگل ہی رہا۔ وہ بڑے مہاراج ہیں، بڑے مہاراج۔" پھر چک دیر نے لڑکی کی اطاعت گزاری کا واقعہ بیان کر دیا۔

"راجا جی! بڑے مہاراج ہم سے خوش رہے تو ہم راج کریں گے۔" بسودیا خوشی کا اظہار کرنے لگا۔

"اب اب راج پاٹ کس کا ہے، بس ذرا اب ان بدیسیوں سے دوستی گانٹھنا پڑے گی۔"

"ان کی عورتیں بڑی گوری اور اچھی ہوتی ہیں۔" بسودیا نے کہا۔

"میں نے بھی دیکھی ہیں بے، مگر دور سے۔"

"قریب سے دیکھنا ہوگا راجا جی!" بسودیا کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"دیکھ لیں گے، قریب سے بھی دیکھ لیں گے، تُو ابھی سے سہانے سپنے نہ دیکھ۔" چک دیر بولا۔

اسی وقت ایک خادم نے بونپا کے آنے کی خبر دی اور چک دیر نے اسے اندر بلوا لیا۔ بونپا کے چہرے سے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔ شاید اسے سوتے سے جگایا گیا تھا۔ رات کے اس پہر طلبی پر یہ ناگواری فطری امر تھی، لیکن جلد ہی غالباً اس نے خود پر قابو پا لیا اور کہا۔ "حکم ہو راجا جی! کیسے یاد کیا؟"

"بونپا جی! آپ اچنبھے میں ہوں گے کہ ہم اس سمے کیسے جاگ رہے ہیں، سو ہم خود ہی بتائے دیتے ہیں۔ جب سبھی سو رہے ہوں تو جاگنا ہی پڑتا ہے۔" چک دیر کے لہجے میں طنز کی جھلک تھی۔

"راجا جی کس کے سونے کی بات کر رہے ہیں؟ صاف صاف کہیں۔" بونپا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"سیماؤں (سرحدوں) کی رکھشا کرنا کس کا کام ہے؟ ہمارا کہ آپ کا؟"

"کیا راجا جی نے اس وقت یہی یاد دلانے کو بلایا ہے؟"

"سوال ہم نے کیا تھا، پر جواب کے لئے۔ آپ سوال کے جواب میں سوال کر رہے ہیں۔"

"یہ میرا ہی کام ہے راجا جی اور میں اپنے فرض سے کبھی غافل نہیں رہتا۔" بونپا پُراعتماد آواز میں بولا۔

"پھر تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دور دیس سے آنے والے اب کوڈگ پر بھی نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ سیماؤں پر خطرہ بڑھ رہا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں راجا جی! آپ کو کسی نے غلط خبر دی ہے۔" بونپا نے یہ کہتے ہوئے بسودیا کی طرف دیکھا۔

"یہ بھی آپ نے خوب کہا کہ ہمیں غلط خبر ملی ہے، ارے ہم تو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ خطرہ کس طرف سے دبے پاؤں بڑھتا آ رہا ہے۔"

"اگر خبر پکی ہے تو بتا دیجئے، پربندھ (بندوبست) ہو جائے گا۔ چِنتا کی کوئی بات نہیں۔ سونے والے ایسے ہی نہیں سو جاتے۔ کوئی وشواس ہوتا ہے تبھی سوتے ہیں راجا جی۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ انگریز ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ میسور نہیں کوڈگ ہے، یہاں کوئی میر صادق نہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ بونپا جی۔ اتنا وشواس تو ہمیں بھی ہے۔" اس کے بعد چک دیر نے خطرے کی سمت بتا دی۔

"آپ نچنت (بے فکر) رہیں۔ کل سینک (فوجی) ادھر بھیج دیئے جائیں گے۔ میرا مطلب مزید سینا سے ہے۔ سینا کے ساتھ ہی کھوجی بھی ہوں گے کہ خبر لائیں، بدیسیوں کی سینا اس اور بھی ہے یا نہیں۔ یہ کوئی چال بھی ہو سکتی ہے کہ ہماری سینا، بمبئی کی اور کوچ کر جائے۔ سو اگر کھوجیوں نے ادھر انگریز کی سینا کو نہ دیکھا تو ہم وہاں زیادہ دن اپنی سینا نہیں رکھیں گے۔"

"بعد کی بات بعد میں کریں گے۔"

پھر چک دیر سے اجازت لے کر بونپا واپس جانے لگا۔ اسی کے ساتھ میری آنکھیں جیسے خود بہ خود کھل گئیں۔ چندر موہن کوڈگ میں کیا کھیل کھیل رہا ہے، یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ مجھے فوری طور پر کوڈگ پہنچنے سے روکنے کے لئے اس نے وہ چال چلی تھی جس کا توڑ میں پہلے ہی سوچ چکی تھی۔ مزید ایک ہفتے بمبئی میں رکنے کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ ہفتے بھر کے بعد حالات وہ نہ ہوتے جو اب تھے۔

دوسرے دن صبح شیام بابو وقت مقررہ پر آ گیا۔ اسے چیک کر لیا گیا تھا۔ اس کے تعاقب میں کوئی نہیں آیا۔ چہرے پر میک اپ نہ ہونے کے باوجود سوٹ بوٹ میں اسے پہچاننا مشکل تھا۔ نچلی منزل پر میں نے اپنے بیڈ روم میں اس سے ملاقات کی۔ عادل بھی ہمارے درمیان موجود تھا۔

"شیام بابو! اب ہم کم سے کم ایک ہفتے بعد یہاں سے کوڈگ کے لئے روانہ ہوں گے۔" میں نے بات شروع کی۔

"کیا کوئی خطرے کی بات ہے کرن جی؟" شیام بابو نے سوال کیا۔ "کل ہی شام تو آپ سے تفصیلی بات ہوئی تھی، پھر اچانک پروگرام کیسے بدل دیا آپ نے؟"

"پروگرام میں تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا دشمن چوکنا ہو چکا ہے۔ فوری طور پر ہوٹل چھوڑ دینے کی وجہ بھی یہی ہے۔" میں نے بتایا۔ "دشمن کو یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ میں یہاں بمبئی میں ہوں اور یہاں سے کوڈگ جانے والی ہوں۔"

میری بات سن کر شیام بابو کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر وہ بولا۔ "اگر ایسا ہے تو فی الحال بمبئی سے آپ نکل جائیں اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ یہاں سے پونا زیادہ دور نہیں۔ ہم وہاں تک آپ کو بہ حفاظت پہنچا دیں گے جب یہاں کے حالات نارمل ہو جائیں گے تو آپ کو خبر کر دی جائے گی۔ ہفتے بھر بعد ہی چلنا ہے تو آپ وہاں رہ لیں۔ یہ محض میرا مشورہ ہے' آپ بہتر فیصلہ کر سکتی ہیں۔"

"نہیں شیام بابو!" میں نے انکار کر دیا۔ "بمبئی سے نکلنا اس وقت کسی طرح مناسب نہیں۔ یہاں اس کوٹھی میں مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ آرام سے ایک ہفتہ گزارا جا سکتا ہے۔ ہاں' آپ لوگوں کے لئے خطرہ بڑھ گیا ہے۔ فوری طور پر اپنی تمام سرگرمیاں بند کر دیجئے۔ بہتر یہ ہے کہ تنظیم کے ارکان روپوش ہو جائیں۔ جس خطرے کی نشان دہی میں نے پہلے کی تھی' وہ فوراً سامنے آ گیا ہے۔ آپ کو بھی میں نے رسک لے کر یہاں بلوایا ہے۔ مقصد آپ کو مطلوبہ خطرے سے آگاہ کرنا تھا۔"

"ایک ہفتے بعد صورت حال بدل جائے گی' یقینی طور پر کس طرح یہ بات کہی جا سکتی ہے؟" شیام بابو نے کہا۔

"صورت حال بدل جانے سے میری مراد کچھ اور ہے اس کا تعلق بمبئی سے نہیں ہے۔" میں نے وضاحت کی۔ "بمبئی کی حدود سے نکلنے کے لئے تو ایک ہفتے بعد بھی ہمیں بہت احتیاط برتنا پڑے گی۔ اصل مرحلہ اس کے بعد کا ہے۔ کوڈگ میں داخل ہونا اب پہلے کی طرف آسان نہیں ہو گا۔"

"ہم اس سلسلے میں "فرزندان کادیری" سے بھی تو مدد لے سکتے ہیں۔ میں نے اسی لئے پہلے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ اتیتا کو بمبئی بلا لیا جائے۔"

"اس طرح اتیتا کے لئے بھی خطرہ پیدا کر دیں گے۔ سرحدوں پر ریاست کی فوج اور جاسوس مقرر کر دیئے جائیں گے تو اتیتا بھی چھپ نہیں سکے گا۔ ریاست کا راجا چک دیر بھی اندرونی خطرات سے آگاہ ہو جائے گا۔ اس کے علم میں یہ بات آ جاتا کہ "فرزندان کادیری" کا رابطہ کسی بیرونی زیر زمین تنظیم سے بھی ہے' خطرناک ثابت ہو گا۔ پھر نہ اتیتا بچے گا نہ سوامی جی۔ ان حالات میں کوئی بھی قدم بے سوچے سمجھے اٹھانا دانش مندی نہیں ہے۔" میں نے شیام بابو کو سمجھایا۔

کچھ دیر تک شیام بابو خاموش رہا' پھر اسے میری بات سے اتفاق کرنا ہی پڑا۔

"اب یہ بتایئے کرن جی کہ موجود حالات میں آپ سے رابطے کی کیا صورت ہو گی؟" شیام بابو نے سوال کیا۔

"کسی قسم کے رابطے کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں۔ کوڈگ روانگی سے قبل میں خود ہی آپ کو مطلع کر دوں گی۔"

"تو پھر مجھے اجازت ہے' جاؤں؟"

"ہاں جایئے۔"

شیام بابو اٹھ کھڑا ہوا۔ عادل اسے کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑ آیا۔

☆======☆======☆

پورا ایک ہفتہ میں نے سکون و اطمینان کے ساتھ گزارا۔ اس عرصے میں آخری روز رات کو ایک خلاف توقع واقعہ ہوا جسے میں نے دانستہ نظرانداز کر دیا۔ اس واقعہ کا تعلق کویتا سے تھا۔ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں۔ ہر فرد میں کچھ فطری کمزوریاں ہوتی ہیں' سو کویتا میں بھی تھیں۔ ان کمزوریوں کا تعلق اس کی تربیت اور ماضی سے تھا۔ مجبور ہو کر اس نے رانی کے ایک محافظ کو "شکار" کر لیا تھا۔ شکار ہونے والے کو خود یہ خبر نہیں ہو سکی تھی کہ شکاری کون ہے؟

اگلے روز صبح میں نے شیام بابو کو فون کر کے تیاری کا سگنل دے دیا۔ رانی کو بھی بتا چکی تھی کہ جانے والی ہوں۔ شیام بابو نے اسی دن شام کو آنے کے لئے کہا تھا۔ جو وقت مقرر تھا اس پر وہ آ گیا۔ اب تک میں حکومت کے کسی بھی اقدام سے بے خبر رہی تھی' سو پہلا سوال اسی سلسلے میں تھا۔

"آپ نے بروقت آگاہ کر دیا تھا اس لئے ہمارا ایک بھی بندہ گرفتار نہیں ہوا' ہاں کچھ بے گناہ لوگ ضرور شبہے میں پکڑے گئے۔" شیام بابو نے جواب دیا۔

"پولیس کو بھی اپنی کارگزاری دکھانا پڑتی ہے۔" عادل بولا۔

"اچھا یہ بتائیں' یہاں سے ہمیں کب نکلنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رات کو نو بجے ہم چل دیں گے۔" شیام بابو نے بتایا' پھر دریافت کیا۔ "آپ نے اپنے سامان وغیرہ کے بارے میں کیا سوچا؟"

"اب اس کا کوئی مسئلہ نہیں۔ سامان اس کوٹھی میں بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ کوڈگ سے واپس آ کر لے لیا جائے گا۔ چند جوڑی کپڑے اور ضروریات کا سامان ایک ایربیگ میں آ سکتا ہے۔ بطور امانت ہمارے سوٹ کیس یہیں رہیں گے۔ میرے اور سشما کے کپڑے وغیرہ ایک بڑے ایربیگ میں آ جائیں گے۔ پنڈت جی تو ہیں آپ کے ساتھ۔ آپ جو ایربیگ لائے ہیں اسی میں یہ اپنا سامان رکھ لیں گے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر میں فون کئے دیتا ہوں کہ اس وقت کار بھیجنے کی ضرورت نہیں' میں کہہ کے آیا تھا کہ فون کروں گا۔"

اس کے بعد شیام بابو نے فون پر اپنے بندوں کو ضروری ہدایات دے دیں۔ کار اب ساڑھے آٹھ بجے تک باندرہ پہنچنا تھی۔ شیام بابو نے آدھے گھنٹے کا مارجن رکھا تھا۔ کار لے کر آنے والا تنظیم کا رکن پہلے بھی بمبئی سے جنوبی سلسلہ کوہ تک جا چکا تھا۔ یہ بات شیام بابو ہی نے بتائی تھی۔ جہاں سے ہمیں گھوڑوں پر سفر کرنا تھا' وہاں ضروری سامان پہنچ چکا تھا۔

شیام بابو کو عادل کے ساتھ اپنے کمرے میں چھوڑ کر میں نے کویتا کو روانگی کے متعلق بتایا اور پھر

اوپری منزل پر رانی کے پاس پہنچ گئی۔

"کب تک جاؤ گی؟ رات کا کھانا تو کھا کر چلو گی نا؟" رانی نے پوچھا۔

"ہاں، مگر آٹھ بجے تک کھانے وغیرہ سے فارغ ہو جانا ہے۔ نو بجے چل دوں گی۔" میں نے بتا دیا۔

"اس وقت تم سے یہ کہنے آئی تھی کہ میرا اور میرے دونوں ساتھیوں کا سامان یہیں رہے گا۔ نیچے کسی کمرے میں رکھوا دینا۔ سامان بھی کیا ہے' سوٹ کیس ہیں بس۔"

"تو اس کا مطلب ہے تم جلد لوٹ آؤ گی۔" اس نے مسکرا کر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"جلدی بھی واپس آ سکتی ہوں اور دیر بھی لگ سکتی ہے۔"

"دیر میں آؤ کہ جلدی' تمہارے سوٹ کیس میں اسی کمرے میں رکھوا کے تالا لگوا دوں گی جو تمہارا بیڈ روم ہے۔ جب بھی لوٹو گی تمہاری امانت تمہیں مل جائے گی۔ اس کے لئے بمبئی میں میرا موجود ہونا بھی ضروری نہیں۔ تمہیں تو اب میرے سبھی ملازم و محافظ اچھی طرح جان پہچان گئے ہیں۔"

میں اٹھنے لگی تو رانی بھی میرے ساتھ اٹھی۔

"رات کو تو تم چلی ہی جاؤ گی' کچھ دیر تمہارے ساتھ وقت گزاری سہی۔" رانی اپنے کمرے سے میرے ساتھ نکلتے ہوئے کہنے لگی۔ "تمہیں تو اس پر کوئی اعتراض نہیں؟"

"اس میں اعتراض کی کیا بات ہے' مجھے تو خوشی ہو گی۔" میں بولی۔ مجھے جو باتیں شیام بابو' عادل اور کویتا سے کرنی تھیں' کر چکی تھی۔ اب اگر رانی ساتھ بھی ہوتی تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ خود رانی نے بھی اب تک یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ میرا قصد کدھر کا ہے؟ وہ اگر پوچھتی بھی تو میں نہ بتاتی' رانی بھی یقیناً اس سے بے خبر نہیں تھی۔

رانی میرے ساتھ نیچے ہال کمرے میں آ بیٹھی۔ وہیں میں نے عادل' شیام بابو اور کویتا کو بلوا لیا۔ شام کی چائے ہم سب نے ساتھ پی۔ ایک بڑا ایئر بیگ بھی رانی ہی نے فراہم کر دیا۔ شیام بابو کا تعارف بھی میں نے رانی سے کرا دیا۔ تعارف سے میں نے یہی ظاہر کیا کہ عادل کی طرح وہ بھی میرا خاص آدمی ہے۔

"تمہیں ایک خاص چیز دکھاتی ہوں۔" رانی مجھ سے بولی پھر اس نے اپنے ایک ملازم کو آواز دے کر بلایا۔ "وہ تالا لے کر آؤ جو میں نے علی گڑھ سے منگوایا ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے اس تالے میں جو تم مجھے دکھا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔ رانی میرے ساتھ بیٹھی تھی اور سامنے والے صوفے پر شیام بابو' عادل اور کویتا تھے۔ درمیان میں میز تھی۔ وہ تینوں بھی ہماری باتیں سن رہے تھے۔

میرے سوال کے جواب میں رانی نے کہا۔ "تمہیں اس لئے وہ تالا دکھانا چاہتی ہوں کہ شاید تم نے ایسا تالا نہ دیکھا ہو۔ اس کے علاوہ یہ کہ یہی تالا اس کمرے میں ڈالا جائے گا جہاں تمہارا سامان رکھا جائے گا۔ اس تالے کی ماسٹر کی تم اپنے ساتھ لے جانا۔"

"مگر کس لئے؟ اس کی ضرورت کیا ہے؟" میں بولی۔

"ہے ضرورت! تالا آ جانے دو' پھر بات کرنا۔ تمہیں میں بہت ذہین سمجھتی ہوں اور تالا تمہارے لئے امتحانی پرچہ ثابت ہو گا۔" رانی یہ کہہ کر ہنسی۔ "میں تمہیں وہ تالا اور تینوں چابیاں دے دوں گی مگر تم تالا نہیں کھول سکو گی۔"

اسی وقت میری نگاہ عادل کی طرف اٹھی۔ وہ پہلو بدل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ اس کی ننھیال علی گڑھ کے ایک قصبے ہی کی ہے۔ جس طرح ہندوستان کے دوسرے شہر مختلف صنعتوں کے لئے مشہور تھے مثلاً مراد آباد برتنوں اور میرٹھ قینچی بنانے کے لئے' اسی طرح علی گڑھ قفل سازی میں شہرت رکھتا تھا۔ میں نے اسی وجہ سے رانی کی بات نظرانداز کرتے ہوئے عادل کو مخاطب کیا۔ "تم کیوں بے چین ہو بال مکند؟"

"اگر میڈم اجازت دیں تو وہ تالا میں کھول دوں۔" عادل نے مہذب لہجے میں مجھ سے کہا۔ میڈم اس نے رانی کو کہا تھا۔

رانی نے اسے چونک کر دیکھا' پھر کہنے لگی۔ "چلو تم کھول کر دکھا دو۔"

ملازم تالا لے کر آ گیا تو ہاتھ بڑھا کے تالا میں نے لے لیا۔

"نہیں۔" رانی بولی۔ "پہلے بال مکند کو کوشش کر لینے دو۔"

"دیکھ تو لوں نا میں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں دیکھ لو۔"

میں نے تالے کا جائزہ لیا۔ پیتل کا وہ تالا بڑا اور خاصا بھاری تھا۔ تین چابیاں تھیں جن میں سے ایک پر انگریزی حرف "ایم" کھدا ہوا تھا۔ تالا خوب صورت اور چمکدار تھا۔ تالے کے اوپر نیم دائرے کی صورت میں اس کا نام لکھا تھا۔ اوپر سے نیچے تک یوں لگتا تھا جیسے مختلف چوڑی پیتل کی پٹیوں کو جوڑ دیا گیا ہو۔ جہاں سے چابی داخل کی جاتی' اس حصے کو بھی پیتل کے ایک ٹکڑے سے ڈھک دیا گیا تھا تاکہ گرد وغبار اندر داخل نہ ہو۔ یہ پیتل کا ٹکڑا دائیں بائیں اور اوپر نیچے کیا جا سکتا تھا۔ اسی کے اوپر علی گڑھ کی اس فرم کا نام کھدا ہوا تھا' جس نے یہ تالا بنایا تھا۔ میں نے پڑھا۔ "ایس سلیم الدین اینڈ سنز" اسی کے نیچے انگریزی میں علی گڑھ اور میڈ ان انڈیا لکھا تھا۔ تالے کا کڑا موٹا اور پالش کیا ہوا تھا۔ میں نے کڑا کھولنا چاہا مگر نہیں کھلا۔

"یہ چابی کے بغیر نہیں کھلے گا۔" رانی نے بتایا۔ "اب تم نے تالا اچھی طرح دیکھ لیا ہے اس لئے بال مکند.........."

"لو بال مکند! کھول دو اسے۔" میں نے تالا اور تینوں چابیاں عادل کو دے دیں۔

عادل نے تالے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر پچھلے حصے پر انگوٹھے سے دباؤ ڈالا۔ "کھٹ" کی آواز کے ساتھ تالے کے اوپری حصے کی ایک پلیٹ ہٹ گئی۔ اسی کے نیچے چابی داخل کرنے کا ایک اور حصہ نظر آنے لگا۔ عادل نے اس میں چابی ڈال کر تالا کھول دیا۔

"زندہ باد۔" رانی نے فراخ دلی سے تعریف کی۔ "تمہارا یہ آدمی واقعی کمال کا ہے۔ اس نے یقیناً یہ تالا پہلے بھی کبھی دیکھا یا کھولا ہو گا۔ کوئی عام آدمی اس تالے کا میکنزم نہیں سمجھ سکتا۔ اس میں ڈبل سسٹم ہے۔ ایک سسٹم کا تعلق دو چابیوں سے ہے اور دوسرا سسٹم مزید حیران کن ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے عادل سے تالا لے لیا۔ کڑے میں دو موٹے موٹے کھانچے کچھ فاصلے سے بنے ہوئے تھے جو رانی نے مجھے دکھائے پھر بولی۔ "یہ دو چابیاں اسی وقت تک کار آمد ہیں جب تک ماسٹر کی استعمال کی نہ جائے۔ ماسٹر کی کا استعمال پہلے سسٹم کو جامد کر دیتا ہے۔ یوں سمجھو کہ اس تالے کی دو چابیاں میرے آدمیوں کے پاس ہیں۔ وہ ان دونوں چابیوں سے تالا کھول اور بند کر سکتے ہیں۔ فرض کرو' وہ آدمی بے وفائی پر اتر آتے ہیں جس کمرے میں تالا لگا ہے' وہاں کوئی قیمتی شے موجود ہے اور ماسٹر کی میرے پاس ہے تو میں ان دونوں کی چابیوں کو بے کار کر سکتی ہوں۔ وہ چاہیں تو تالا نہیں کھول سکیں گے۔ اس کے لئے ماسٹر کی سے ایک بار تالا کھول کے بند کرنا کافی ہے۔ پھر جب بھی میں چاہوں ماسٹر کی سے تالا کھول کر پہلے سسٹم کو کار آمد بنا سکتی ہوں۔ تالا خراب نہیں ہو گا۔ یہ تالا بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اوپر کے اندرونی حصے اور نیچے کے بیرونی حصے میں چوڑیاں ہیں جو کسے جانے کے بعد ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اسے کہیں سے توڑنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اس کا کڑا اندر سے ویلڈ کیا گیا ہے جو کھل سکتا ہے اور بند بھی ہو سکتا ہے مگر نوٹ نہیں سکتا۔ ماسٹر کی سے اسے بند کرنے کے بعد اس کے دونوں "ہڑکے" کڑے کے گہرے کھانچوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تالے پر ہتھوڑے برسالو مگر یہ کھلے گا نہیں۔ کڑا نکل اسٹیل کا ہے جسے کاٹنا کھیل نہیں۔ مختصراً یہ کہ دروازہ توڑنا تالا کھولنے کے مقابلے میں آسان ہے۔ لو تم اسے تینوں چابیوں سے کھول کے اور بند کر کے دیکھو۔" رانی نے وہ تالا اور چابیاں مجھے دے دیں۔

"تو یہ پہلا سوراخ دھوکا ہے۔" میں نے اس سوراخ میں چابی ڈالی لیکن چابی نہیں گھومی پھر اسی چابی کو اوپر والے سوراخ میں ڈالا تو تالا کھلنے بند ہونے لگا۔ اس کے بعد ماسٹر کی سے تالا بند کر کے دونوں چابیوں سے کھولنا چاہا تو یہ ممکن نہیں ہوا۔ چابیاں نہیں گھومیں۔

"یہ بہت قیمتی تالا ہے اور صرف آرڈر پر محدود تعداد میں بنایا جاتا ہے۔" رانی نے بتایا۔ "علی گڑھ کی اس فرم سے میں نے چھ تالے بنوائے تھے جن میں سے ایک یہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے سوٹ کیسوں میں کوئی قیمتی شے ہے یا نہیں لیکن امانت' امانت ہوتی ہے' اس کی قیمت کچھ بھی ہو۔ میں اسی لئے یہ چاہتی ہوں کہ تم اس تالے کی ماسٹر کی اپنے پاس رکھو اور خود کمرے میں تالا لگاؤ۔ بقیہ دونوں چابیاں میرے پاس رہیں گی۔"

"بالکل نہیں۔" میں نے واضح طور پر انکار کر دیا۔ "اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ میں ماسٹر کی سنبھال کر نہیں رکھ سکوں گی میرے لئے اور بہت سے جھمیلے کافی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے۔ دونوں' بلکہ تالے کی تینوں چابیاں اپنے ہی پاس رکھو۔"

"تم لوٹ کر آئیں اور اس وقت میں بمبئی میں نہ ہوئی پھر؟"

"تمہارا کوئی با اعتماد آدمی تو ہو گا یہاں۔"

"اپنے سوا میں کسی پر اعتماد نہیں کرتی۔"

مجبوراً مجھے رانی کی بات ماننا پڑی۔ "اچھا تو پھر میں آتی ہوں ابھی۔" میں نے کہا اور اٹھتے ہوئے اپنے تینوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔

تینوں سوٹ کیس میں نے اپنے کمرے میں رکھوائے۔ انہی میں وہ سوٹ کیس بھی تھا جس میں ایک لاکھ روپے تھے۔ کویتا کا اور اپنا ضروری سامان' نیز کپڑے میں نے ایربیگ میں رکھ لئے۔ شیام بابو کے ایربیگ میں عادل نے اپنے کپڑے اور سامان ٹھونس لیا۔ ٹیلی فون سیٹ بھی میں نے ایک ملازم سے کہہ کر باہر کمرے میں رکھوا دیا۔ تمام تیاری کر کے میں باہر نکل آئی۔ عادل' کویتا اور شیام بابو پہلے ہی باہر نکل چکے تھے۔ ایربیگ کے علاوہ میرے پاس ایک ہینڈ پرس بھی تھا۔ اسی ہینڈ پرس میں "خاموش موت" بھی تھی اور چند ہزار روپے بھی۔ ان روپوں کو کوڈگ کی کرنسی میں تبدیل کرنا تھا۔ یہ بات مجھے شیام بابو بتا چکا تھا کہ کوڈگ کے دارالحکومت مڈکیری میں بھی کرنسی تبدیل ہو سکتی ہے۔ میں اسی لئے مطمئن تھی۔ کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے مضبوط کھڑکیاں اندر سے بند کر دی تھیں۔ باہر آ کر میں نے ماسٹر کی سے تالا بند کر دیا اور پھر چابی اپنے ہینڈ پرس میں رکھ لی۔ تالے کی بقیہ دونوں چابیاں میں نے رانی کے پاس ہی چھوڑ دی تھیں۔ میرا ایربیگ کویتا نے اپنے شانے سے لٹکا لیا تھا۔ شیام بابو والا ایربیگ عادل کے پاس تھا۔ رانی کچھ دیر کو اوپر چلی گئی تھی۔ میں جب ہال کمرے میں پہنچی تو وہ واپس آ چکی تھی۔ میرے تینوں ساتھی بھی وہیں بیٹھے تھے۔ ایربیگ انہوں نے سنٹرل ٹیبل کے قریب رکھ لئے تھے' میں' رانی کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"ہو گئی چلنے کی تیاری؟" رانی میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"ہاں' بس اب کار کا انتظار ہے۔" یہ کہتے ہی میں نے اشارے سے دور کھڑے ایک ملازم کو بلا کر کہا۔ "محافظوں کو بتا دو کہ سلیٹی رنگ کی ایک کار ٹھیک نو بجے رات کوٹھی کے پھاٹک پر آئے گی' اسے اندر آنے دیا جائے۔ کار ڈرائیو کرنے والا شخص ہرے رنگ کی ٹائی باندھے گا۔ تصدیق کے بعد ہی کار کو اندر آنے دیا جائے گا اور پھر اس کی آمد سے مجھے مطلع کر دیا جائے۔"

ملازم میرا حکم سن کر واپس چلا گیا۔ رانی اس سلسلے میں کچھ نہیں بولی۔ سوا سات بجے ہی اس نے ڈائننگ ہال میں کھانا لگوا دیا۔ کھانا کھا کر چائے پینے کے بعد ہم سب پھر ہال کمرے میں آ بیٹھے۔ اس وقت تک رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ کار کی آمد میں ابھی پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔

کویتا میرے اشارے پر مجھ سمیت تمام افراد کے گرد حصار کھینچ چکی تھی۔ شام چھ بجے کے بعد اس نے چوبیس گھنٹے کے لئے حصار کھینچا تھا۔ اب آئندہ روز شام چھ بجے تک ہم کم از کم چندر موہن کی نظروں سے اوجھل رہتے۔ اگلے روز شام کو جو صورت حال ہوتی اس کے مطابق میں کوئی قدم اٹھاتی۔ سلسلہ کوہ سہباد میں داخل ہونے کے بعد انگریز حکومت کی طرف سے خطرہ ٹل جاتا۔ اصل خطرہ چندر موہن کی طرف سے ہوتا' سو میں نے اس کا توڑ کر لیا تھا۔

باندرہ سے سلسلہ کوہ تک کا سفر تین گھنٹے کا تھا۔ رات کو بارہ بجے کے قریب ہمیں سرحد عبور کرنا تھی۔ پہاڑوں میں پہنچ کر میں محفوظ ہو جاتی پھر ایک اور ہی کھیل شروع ہونا تھا جس کے لئے میں ذہنی طور

پر پہلے سے تیار تھی۔

ایک گھنٹے تک رانی مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ میں اس سے گفتگو تو کر رہی تھی مگر میرا ذہن کہیں اور ہی تھا۔

مقررہ وقت پر کار آ گئی۔ اطلاع ملتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ رانی مجھے باہر تک چھوڑنے آئی۔ شیام بابو آگے بیٹھا' میں' کویتا اور عادل پیچھے۔ دونوں ایربیگ کار کی ڈکی میں رکھ دیئے گئے تھے۔ میرے علاوہ عادل' شیام بابو اور کار ڈرائیور احمد کے پاس "خاموش موت" موجود تھی۔ بمبئی سے سلسلہ کوہ تک پہنچنے کے لئے اتنا کافی تھا۔ سفر شروع ہو گیا۔ اس کار میں کل پانچ افراد تھے جن میں سے چار پوری طرح چوکنا اور محتاط تھے' البتہ کویتا کچھ سہمی سہمی سی تھی۔ وہ میرے اور عادل کے درمیان بیٹھی تھی۔ کار کے اندر کی لائٹس آف تھیں۔ کویتا کی بے چینی کا اندازہ میں نے اس کے بار بار پہلو بدلنے اور آواز کی لرزش سے لگایا تھا۔ اسے میں نے خاموش رہنے کو کہا تھا۔ اس کے سپرد میں نے جو کام کیا تھا' وہ انجام دے چکی تھی۔ روانگی سے قبل میرے ایماء پر اس کار کے گرد بھی حصار کھینچ دیا گیا تھا۔ خطرہ اب صرف حکومت کے کارندوں کی طرف سے تھا' چندر موہن کی طرف سے نہیں۔

سلسلہ کوہ سہباد تک پہنچنے میں ہمیں احتیاط کے پیش نظر تین گھنٹے کی بجائے مزید آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ پہاڑوں کے درمیان پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے گھر میں آ گئی ہوں۔ ہم چاروں کو چھوڑ کر کار واپس جا چکی تھی۔ ایک ایربیگ شیام بابو کے کاندھے سے لٹکا ہوا تھا' دوسرا عادل کے پاس تھا۔ میرے اور شیام بابو کے ہاتھوں میں چھوٹی ٹارچیں تھیں۔ ہم دونوں آگے' عادل اور کویتا پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس چٹان کے نیچے پہنچ گئے جس کے سامنے وہ غار تھا جہاں شیام بابو کے دو آدمی چھپے ہوئے تھے۔ غار کا دہانہ خاصا بڑا تھا۔ شیام بابو نے ادھر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ جواباً ادھر بھی ایک ٹارچ چند لمحوں کو روشن ہو کے بجھ گئی۔

ہم جب غار میں داخل ہوئے تو اس کے اندرونی حصے میں روشنی نظر آئی۔ اسی کے ساتھ مجھے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ دونوں میں سے ایک شخص غار کے دہانے پر تھا' دوسرا اندر۔ شیام بابو نے پہلے شخص کو مخاطب کیا جو ہمارے ساتھ ساتھ چل دیا تھا۔ "کوئی خطرہ تو نہیں؟"

"اس وقت تو نہیں لیکن شام کو خطرہ تھا۔" اس شخص نے جواب دیا جو لباس سے مسلمان ہی لگتا تھا۔

"کس طرح کا خطرہ؟" شیام بابو نے وضاحت چاہی۔

"ہم نے کچھ اجنبی لوگوں کو پہاڑوں میں چکراتے دیکھا تھا۔"

میں یہ سن کر چونکی' مگر بولی کچھ نہیں۔ ہم سب اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں دوسرا شخص دیا جلائے بیٹھا تھا۔ وہ ہمیں قریب آتے دیکھ کر احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ ہی فاصلے پر چار گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ دوسرے شخص نے ہمارے لئے چٹائی بچھا دی' پھر شیام بابو سے بولا۔ "میں ابھی آیا۔"

دونوں آدمی غار کے دہانے کی طرف چلے گئے۔ ہم چاروں چٹائی پر بیٹھ گئے۔

"یہ اجنبی لوگ کون ہو سکتے ہیں؟" شیام بابو خود کلامی کے انداز میں کہنے لگا۔ "اشرف اور صادق آ جائیں تو معلوم ہو۔" پہلے شخص کا نام اشرف اور دوسرے کا نام صادق تھا' بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا۔ ان دونوں ہی کی عمریں چالیس سال سے کم نہیں لگتی تھیں۔ وہ غار کے دہانے کو پتھروں سے بند کرنے گئے تھے۔

"میں بتاتی ہوں شیام بابو کہ وہ اجنبی لوگ کون ہو سکتے ہیں؟" میں اطمینان سے بولی۔

"آپ .... آپ کرن جی ہمارے ہی ساتھ تو آئی ہیں۔" شیام بابو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا۔" میں مسکرائی۔ "آپ غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے ان اجنبیوں کو دیکھا ہی نہیں تو کس طرح ان کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہوں۔"

"جج .... جی .... جی ہاں" شیام بابو ہکلا کے رہ گیا۔

"قیاسات بھی تو کچھ اہمیت رکھتے ہیں نا۔ آپ ریاست کے جاسوسوں کو کیوں بھول رہے ہیں۔ وہ بھی تو ان اطراف میں آ سکتے ہیں۔"

"آ تو سکتے ہیں مگر اس صورت میں جب کہ انہیں ہماری آمد کا پہلے سے علم ہو۔"

"وہ تو انہیں علم ہے۔"

"مگر کس طرح؟" عادل پہلی مرتبہ بولا۔ "ہم بمبئی سے کب روانہ ہو کر یہاں پہنچیں گے' کوڈگ کے جاسوسوں کو کس طرح معلوم ہو سکتا ہے؟"

میرے کچھ کہنے سے پہلے شیام بابو بول اٹھا۔ "ان اجنبی لوگوں کا تعلق فرزندان کاویری سے بھی تو ...."

"بالکل نہیں۔" میں نے شیام بابو کی بات کاٹ دی۔ "سرحدی علاقے کی نگرانی کے لئے ریاست کی فوج کے جاسوس ہی سرگرم عمل ہیں۔ اس خطرے کی نشان دہی میں نے بمبئی ہی میں کر دی تھی۔ شاید آپ کے ذہن سے میری بات نکل گئی۔"

"ہاں آپ نے اس سلسلے میں کچھ کہا تو تھا۔" شیام بابو کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔

"جب آپ نے رہنمائی کے لئے اتیٹا کو بلانے کی بات کی تھی تو میں نے اس سے اختلاف کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ سرحدوں پر فوج اور جاسوس مقرر کر دیئے جائیں گے تو اتیٹا بھی نہیں چھپ سکے گا۔ یاد آیا آپ کو؟"

"جی ہاں۔" شیام بابو نے تصدیق کی پھر بولا۔ "مگر اس بات کو تو ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا' پھر یہ کہ یہاں ریاست کی فوج بھی نہیں۔ اگر فوج یہاں ہوتی تو ہم اتنی آسانی سے یہاں نہ پہنچ پاتے۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ فوج ہفتے بھر پہلے یہاں آ کر واپس چلی گئی ہو اور واپسی کے وقت اس نے اپنے جاسوس چھوڑ دیئے ہوں؟ انہی کو آپ کے آدمیوں نے دیکھا ہو؟" میں دانستہ اصل بات چھپا رہی تھی کیونکہ اس کا تعلق میرے پُراسرار روحانی تجربے سے تھا۔ خود اپنی آنکھوں اور کانوں سے میں سب

کچھ دیکھ اور سن چکی تھی۔ ریاست کی فوج کے وزیر دفاع بونپنا اور راجا چک ویر کو میں نے دیکھا تھا اور ان کی گفتگو پُراسرار تجربے کے دوران میں سنی تھی۔

میری بات سن کر شیام بابو نے کہا۔ "اشرف اور صادق کو آ لینے دو' ان سے مزید پوچھ گچھ کر لیتے ہیں۔ آپ کا شبہ مجھے درست معلوم ہوتا ہے۔"

میں خاموش ہوگئی۔ مضبوط جسموں والے شیام بابو کے دونوں آدمی لوٹ آئے تو بات دوبارہ شروع ہوئی۔ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔

"ان حالات میں نئی حکمت عملی یہ ہونا چاہئے کہ ہم رات کے وقت سفر کریں۔" میں نے کہا۔ "یہ صورت حال نہ بھی ہوتی تو میں ایسا ہی کرتی۔"

"اگر اس علاقے میں ریاست کی فوج کے جاسوس موجود ہیں تو رات کے وقت بھی ہم ان کی نظروں سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟" عادل بولا۔

"تم یہ بھول رہے ہو کہ آدمی بہرحال آدمی ہوتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے' وہ اپنی اس ڈیوٹی پر خوش ہوں گے؟ ان کے لئے پہاڑوں کے درمیان بھٹکنا' سختیاں جھیلنا اور شب و روز مارے مارے پھرنا زیادہ بہتر ہے یا ڈکیری' کشل نگر' نالک ناڈ وغیرہ میں رہنا؟ ایسے معاملات میں حکم حاکم مرگ مفاجات والا معاملہ ہوتا ہے۔ بونپنا جو اس ریاست کا وزیر دفاع اور فوج کا کمانڈر ان چیف بھی ہے' اسی کے حکم پر تو سرحدوں پر فوجی جاسوس مقرر کئے گئے ہوں گے۔ جس طرح آدمیوں کے چہرے ایک دوسرے سے نہیں ملتے اسی طرح ان کے ذہن بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کا انداز فکر اس کے ذہن اور حالات کا تابع ہوتا ہے۔ ہر پیشے اور ہر طبقے میں فرق شناس لوگ بھی ہوتے ہیں اور اپنے فرائض سے کوتاہی برتنے والے بھی۔ اسی کے ساتھ ریاست کے داخلی معاملات کو بھی مدنظر رکھو۔ بونپنا اس ریاست کے بدکردار راجا چک ویر کی مجبوری ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو چک ویر کبھی کا بونپنا کو الگ کر چکا ہوتا۔ اصل مسئلہ مقامی اور غیر مقامی کا ہے۔ چک ویر کا باپ لنگ راج بہت بڑا گھاگ تھا جس نے اپنے ولی عہد کی شادی ایک مقامی عورت سے کی۔" میں بولتی رہی۔ "اسے تم سیاسی شادی کہہ سکتے ہو۔ لنگ راج نے مستقبل کے ماتھے پر لکھی تحریر پڑھ لی تھی۔ وہ عیار سمجھ گیا تھا کہ جب تک مقامی باشندوں کو زیردام نہیں لایا جاتا' حکومت نہیں چلے گی۔ لنگ راج نے اسی لئے اپنے بیٹے چک ویر کے لئے ایک بااثر مقامی گھرانے سے رشتہ جوڑا۔ راجا چک ویر کی بیوی گورما جو اس ریاست کی رانی کہلاتی تھی' کمانڈر ان چیف بونپنا ہی کی رشتے دار ہے۔ رشتے میں گورما' بونپنا کی بہن لگتی ہے۔ تمہیں ایک بات اور بتا دوں کہ جنوبی ہند میں ہندو بھی مسلمانوں کی طرح اپنی رشتے کی بہنوں سے شادی کر لیتے ہیں۔ اس سے قطع نظر اب تمہاری سمجھ میں آیا کہ بونپنا کس لئے راجا چک ویر کی مجبوری بنا ہوا ہے۔ چک ویر کی ایک مجبوری تو بونپنا ہے اور دوسری مجبوری بسو دیا۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ چک ویر کی کوشش یہ ہے کہ وہ کسی بھی طرح بونپنا کی گرفت سے نکل جائے مگر ایسا ممکن نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ریاست کے محب وطن بااثر لوگ بونپنا کے حامی ہیں' عوام اس کے ساتھ ہیں۔ انگریز اسی داخلی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر ریاست پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش میں

بتا"

میرے خاموش ہوتے ہی شیام بابو بول اٹھا۔ "اور فرزندان کاویری؟"

"یہ کوئی اور کھیل معلوم ہوتا ہے۔" میں نے واضح طور پر کہہ دیا۔ "اس کا اندازہ ڈکیری جا کر ہوگا۔ ریاست میں دو اصل قوتیں ہیں' ایک برسراقتدار حکمراں خاندان جو بہرحال غیر مقامی ہے' دوسری ریاست کے مقامی لوگ ہیں اور یہی اصل قوت ہیں۔ اگر انگریزوں نے ریاست پر کسی بھی طرف سے اور کبھی بھی حملہ کیا تو یہی مقامی لوگ' یعنی کوڈگی حکمراں خاندان کو بچا سکتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ وقت پڑتے ہی ایسا ہی کریں گے۔ اس کا سبب وہ سیاسی شادی ہے جس کا ذکر میں کر چکی ہوں۔ ان کی بیٹی گورما راج محل میں ہے۔ انگریزوں کو اگر کوئی فائٹ دے سکتا ہے تو وہ یہی لوگ ہیں۔"

"پھر تو ہمیں انہی لوگوں سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔" شیام بابو نے کہا۔ "آپ نے ریاست کے سیاسی حالات کا جو تجزیہ کیا ہے' وہی درست لگتا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ ریاست کے اندرونی معاملات سے اس حد تک باخبر ہوں گی۔ اب تو یہ سوچنا پڑے گا کہ ہمیں ڈکیری پہنچ کر فرزندان کاویری سے رابطہ قائم بھی کرنا چاہئے یا نہیں۔ نوجوانوں کے جذبہ حب الوطنی کو ابھار کر انہیں کسی خاص مقصد کے لئے استعمال بھی تو کیا جا سکتا ہے۔"

"آپ بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہیں شیام بابو۔ اس کے باوجود موجودہ حالات کے پیش نظر ہمیں فرزندان کاویری ہی کی میزبانی قبول کرنا پڑے گی۔ ہمیں تو فی الحال ڈکیری میں قدم جمانے کے لئے جگہ چاہئے۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس موضوع پر مزید گفتگو سے گریز کیا' پھر بولی۔ "ہمیں یہاں سے روانگی میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔ اس وقت نصف شب گزر چکی ہے۔ آج کی رات سفر کے لئے ہمارے پاس صرف چند گھنٹے ہیں صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے ہمیں کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچنا ہے پھر جب اندھیرا پھیل جائے تو ہم دوبارہ سفر شروع کریں گے۔ کل دن بھر ہمیں آرام کرنا ہے۔"

پھر ہم نے وہاں سے روانگی میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ میری ہدایت کے مطابق ضروری سامان سفر گھوڑوں کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ غار کے دہانے سے پتھر ہٹائے جا چکے تھے۔ ایک گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے میں غار سے باہر آئی۔ میرے ساتھ کوبیتا تھی۔ دوسرا گھوڑا شیام بابو اور عادل کے لئے تھا۔ ان دونوں کا سامان انہی کے پاس تھا۔ اشرف اور صادق کو بھی ہمارے بعد اس غار سے نکل جانا تھا۔ یہ مشورہ بھی میں نے ہی دیا تھا۔ ان سے میں نے کہا تھا کہ غار میں کوئی ایسا نشان نہ چھوڑیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہاں کسی نے قیام کیا تھا۔ وہ اترتے چاند کی تاریکیاں تھیں۔ آسمان پر جگہ جگہ بادل بھی تھے۔ چاند بادلوں میں چھپ جاتا تو اندھیرا پھیل جاتا' بادلوں سے نکل آتا تو کچھ دیر کو زرد سی روشنی چٹانوں' پہاڑوں اور ناہموار راستوں پر بکھر جاتی۔ ٹارچ جلانے سے میں نے شیام بابو کو منع کر دیا تھا۔ میں نے کہا تھا۔ "ذرا دیر بعد ہماری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو جائیں گی۔"

"آپ کو تو ویسے بھی اندھیرے بھی زیادہ نظر آتا ہے۔" عادل بولا۔ شیام بابو کے ساتھ ہونے کی

وجہ سے وہ حدِ ادب میں تھا۔

اس پر میں دھیرے سے ہنس دی۔ عادل کا اشارہ میں سمجھ گئی۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے اغوا کا واقعہ مجھے یاد آ گیا تھا۔ اس رات بھی عادل میرے ساتھ تھا۔

"کیا پیدل ہی سفر کرنے کا ارادہ ہے؟" عادل نے پھر مجھے مخاطب کیا۔ دوسرے گھوڑے کی ا نے تھام رکھی تھی اور ساتھ چل رہا تھا۔ شیام بابو اس کے پیچھے تھا۔

"پہلی بات تو یہ کہ گفتگو سے اجتناب کرو۔ بہت ضروری بات ہو تو آواز دھیمی رکھو۔ مت سناٹے میں دھیمی آواز بھی دور سے سنی جا سکتی ہے۔ ہم ریاست کی حدود میں داخل ہو چکے علاقے میں ریاست کی فوج کے جاسوس موجود ہیں۔ ضروری نہیں کہ سبھی سو رہے ہوں۔ ان کوئی فرض شناس بھی ہو سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے خود میری آواز بھی دھیمی ہی تھی۔ "ہم اس سے نکلنے کے بعد ہی گھوڑوں پر سوار ہوں گے۔ سمت پیا کے مطابق ہمارا سفر صحیح سمت میں ہے۔ پہلے میں نے ریاست کا نقشہ اسی لئے دیکھا تھا کہ ہم کہیں پہاڑوں میں بھٹک نہ جائیں۔"

اس بات کو سن کر عادل خاموش ہو گیا اور کچھ نہیں بولا۔ ہمارا سفر خاموشی سے جاری تھا میرے اندر خوابیدہ ایک پُراسرار قوت جاگ اٹھی۔ اب میں اندھیرے میں دور دور تک دیکھنے تھی۔ نیک روح عظیم مہین کی عطا کردہ پُراسرار قوت مجھے گردوپیش سے بے خبر نہ رکھتی۔ میر بیدار ہونے والی یہ پُراسرار قوت کسی ممکنہ خطرے کی علامت بھی ہو سکتی ہے' میں نے سوچا ا ہو گئی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ عادل نے بھی اپنا گھوڑا روک لیا۔

شیام بابو آگے آ گیا اور سرگوشی کی۔ "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ "آپ میرے گھوڑے کی لگام تھام لیں آگے بڑھنے سے پہلے میں اردگرد کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔ یہیں بائیں جانب آپ اس پہاڑ کے دا رک جائیں۔ کوشش کریں کہ آہٹ کم سے کم ہو۔ بال مکند اور سشما کو بھی بتا دیں کہ میں ا ہوں اور میری واپسی تک یہیں رکے رہنا ہے۔"

شیام بابو نے میرے گھوڑے کی لگام تھام لی تو میں محتاط قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ میں ا پینٹ اور بوشرٹ پہنے ہوئے تھی' پیروں میں "کریپ سول" تھے۔ فیتوں والے یہ نرم شوز تھے جن یعنی تلا ربر سے ملتے جلتے میٹریل کا تھا۔ انہیں پہن کر تیزی سے حرکت کرنا اور بھاگنا ممکن تھا۔ ا علاوہ پنجوں کے بل احتیاط سے چلا جاتا تو جوتوں کی آواز بھی نہ ہوتی۔ بوشرٹ کے نیچے بلٹ پروف تھی۔ کسی بھی طرف سے فائر ہونے کی صورت میں مجھے اپنی گردن' چہرہ اور سر بچانا تھا۔ میری بوش جیب میں ایک ہتھیار تھا' خاموش موت۔ زہر میں بجھی ہوئی چوبیس فولادی سوئیاں میرے نزدیک کے فوجی جاسوسوں کے لئے کافی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد اس سے زیادہ ممکن تھی۔

میں نے کبھی کسی کا ناحق خون نہیں بہایا اور نہ اب ایسا کوئی ارادہ تھا۔ وہ جو حق و باطل کی ا

نگ سے بے خبر تھے' میری نظر میں بے قصور ہی تھے۔ آخر وہ بھی تو کسی کے باپ' بھائی' بیٹے یا شوہر ہوں گے۔ ان کے لئے بھی کوئی کہیں دعا کر رہا ہو گا کہ بہ خیریت اور زندہ سلامت گھر واپس آ جائیں۔ وہ کسی بھی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں' تھے تو اللہ ہی کے بندے۔ کوئی ماں اپنے بیٹے کی واپسی کے لئے منتظر ہو گی' کسی باپ کے لب پہ حرفِ دعا ہو گا' کوئی بہن اپنے بھائی کی راہ دیکھتی ہو گی' کسی سہاگن کے دل کی دھڑکنیں ناہموار ہوں گی' وہ بھی اس وقت شاید جاگ رہی ہو۔ کہیں وہ بچے جو اپنے باپ کے سینے سے لگ کر سونے کے عادی ہوں' کروٹیں بدل رہے ہوں گے۔ یہی سب کچھ سوچتی ہوئی میں بڑھتی جا رہی تھی۔ اطراف پر میری نظر تھی۔ اسی کے ساتھ راستے کی نشانیاں بھی میں اپنے ذہن میں محفوظ کر رہی تھی کہ لوٹ کے وہیں پہنچ سکوں جہاں سے چلی تھی۔

دشمن کی نقل و حرکت کا اندازہ کسی بلند جگہ سے لگایا جا سکتا ہے' اس خیال کے تحت چلتے چلتے میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر دائیں جانب مجھے ایک بلند چٹان دکھائی دے گئی۔ قریب پہنچ کر میں نے جائزہ لیا تو اس چٹان پر چڑھنا مشکل نہیں تھا۔ میں تو بچپن سے ایسے ہی کھیل کھیلتی آئی تھی' سو اس چٹان پر چڑھنے لگی۔ چٹان کا اوپری حصہ قدرے آگے نکلا ہوا تھا۔ میں اگر اس حصے تک پہنچ جاتی تو پھر چٹان کے اوپر جانا بہت آسان ہو جاتا۔ چٹان میں موجود دراڑوں اور ابھرے ہوئے پتھروں پر قدم جما کے میں اپنے جسم کو سمیٹتی اور جست بھر کے اوپری نکلے ہوئے حصے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتی۔ ایسی صورت میں میرا جسم چٹان سے لٹک جاتا اور جسم کا سارا وزن ہاتھوں پر ہوتا۔ پھر میں دھیرے دھیرے اوپر اٹھتی اور چٹان پر چڑھ جاتی۔ یہ سب کچھ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ اس وقت مجھے ہرگز یہ علم نہیں تھا کہ میں نے جو کچھ سوچا ہے' اس پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس کا یقین مجھے تب ہوا کہ جب میں جست بھرنے والی تھی۔ میں جست بھرتے بھرتے رک گئی۔ میری نظر میں یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ جہاں خون کے پیاسے موجود تھے' میں وہاں آ گئی تھی۔ اس میں میری کوشش کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یقیناً خیر کی قوتوں نے مجھے وہاں تک پہنچایا تھا۔

وہ آوازیں تین افراد کی تھیں جنہیں میں الگ الگ پہچان سکتی تھی۔ جنوبی ہند میں بولی جانے والی زبانوں میں سے وہ ایک زبان کنڑ میں باتیں کر رہے تھے۔

"اگوا تو چلا گیا اور ہم تینوں کو یہاں فضول ہی چھوڑ گیا۔" ایک شخص کی آواز سنائی دی۔ کنڑ زبان میں "اگوا" کے معنی رہنما یا پارٹی لیڈر کے ہیں۔

"اناجی! (بھائی صاحب) بس اب آج کی رات ہی تو گزارنا ہے۔ کل صبح ہم ڈکیری کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ آپ سو جائیں' ہم جاگ رہے ہیں۔" دوسرے شخص کی آواز ابھری۔ "ہم تو دن میں چند منٹوں کو بھی سو لئے تھے' آپ نے تو گھڑی بھر آرام نہیں کیا۔"

"بات آرام کی نہیں' یہ سوچنے کی ہے کہ ہمارا اگوا خود یہاں کیوں نہیں رکا؟"

"بونپا جی کا یہی حکم ہو گا۔" یہ قیاس آرائی تیسرے شخص کی تھی۔

"مان لیا' مگر یہ تو سوچو کہ بونپا جی کسی شخص کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم دے سکتے ہیں؟"

"یہ سوچنا ہمارا کام نہیں' بڑوں کا کام ہے۔ حکم تو حکم ہی ہوتا ہے اناجی۔" پہلے شخص کی آوا آئی۔ "ہم ٹھہرے حکم کے بندے۔ ہمیں اپنے بڑوں کا حکم ماننا ہی پڑے گا۔ آپ اسے غلط سمجھی صحیح بڑے افسر جو بھی کہہ دیں' اپنی جگہ اٹل ہے۔ اگوا کہہ دے' ہتھیار ڈال دو تو ہتھیار ڈالنا ہی گے۔ پھر یہ بھی تو سوچیں کہ دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم کیوں دیا گیا؟ یہ ہمارا سرحدی علاقہ ہے' غیر طور پر ریاست کی سرحد عبور کرکے آنے والا ہمارا دوست تو نہیں ہو سکتا' تو پھر کسی دشمن کو گولی مارنا نہیں۔"

"کون دوست ہے اور کون دشمن' اس بات کو رہنے دو۔" یہ الفاظ اس شخص کے تھے جسے یعنی بھائی صاحب کہا جا رہا تھا۔ "لوگ تو خود اپنے دشمن ہو جاتے ہیں اور انہیں خبر نہیں ہوتی۔ پھر بھی جو حکم دے کر گیا ہے' ہو گا وہی' مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ تم کہتے ہو تو میں سوچتا ہوں' کہ ادھر سے گزرتے دیکھو تو مار دینا گولی۔ سوچنے سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہمیں اسی لئے تو پالا گیا ہے آدمی کو آدمی نہیں' شکار سمجھیں۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

اس کے بعد کوئی بھی کچھ نہیں بولا اور سناٹا چھا گیا۔ میں اس چٹان سے نیچے اتر آئی۔ اس را سے گزرنا گویا موت کو دعوت دینا تھا۔ صورت حال پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ بات صرف ایک ر کی تھی۔ پھر وہ تینوں ڈکیری لوٹ جاتے۔ نقشے کے مطابق ہمیں اسی راستے سے آگے بڑھنا تھا۔ ہم لئے یہ بھی ممکن تھا کہ آج رات بھی رائیگاں نہ جانے دیتی۔ اس کے لئے ان تینوں کا خون بہانا پڑتا۔ اس پر تیار نہیں تھی' سو واپس وہیں پہنچ گئی جہاں اپنے ساتھیوں کو چھوڑا تھا۔

"ہمیں پھر اسی غار میں واپس چلنا ہے' جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔" میں نے شیام بابو سے سر کی اور اپنے گھوڑے کی لگام تھام لی۔

واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم مطلوبہ غار تک پہنچے تو وہاں نہیں تھا۔ صادق اور اشرف جا چکے تھے۔ ہم ایک چٹائی بچھا کر بیٹھ گئے۔

"کرن جی! آپ جتنی تیزی سے آگے بڑھتی ہیں اتنی ہی تیزی سے پیچھے ہٹنے میں بھی کمال ر ہیں۔" حدِادب میں رہنے کے باوجود عادل مجھ پر فقرہ چست کرنے سے باز نہ آیا۔

"اہل کمال تو اہل کمال ہوتے ہیں پنڈت جی۔ جنگ جیتنے کے لئے ہمیشہ آگے بڑھتے رہنا ہی سود نہیں ہوتا' کبھی کبھی پیچھے ہٹ کر وار کرنا پڑتا ہے' لیکن یہ بات شاید آپ کی سمجھ میں نہ آ سکے۔ ہاں ش بابو اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔"

"تو انہی کو سمجھا دیجئے۔ اس بہانے میرا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔" عادل بولا۔ وہ بہرحال واپسی سبب جاننا چاہتا تھا۔

"کل سے ہم چاہے دن کے وقت سفر کریں یا رات کو' ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔" میں نے پھر جو کچھ سنا تھا' بتا دیا۔

"ٹھیک ہے کرن جی' اس طرح ہمارا سفر بھی محفوظ ہو جائے گا اور ہم آرام بھی کر لیں گے۔" ش

بابو نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔

پھر غار کا دہانہ بند کر دیا گیا۔ اس کے لئے بڑے بڑے پتھر استعمال کئے گئے تھے۔ گھوڑوں کے ساتھ بندھا ہوا سامان کھول لیا گیا اور سونے کے لئے بستر بچھا لئے گئے۔ کویتا میری بائیں جانب اور عادل دائیں جانب تھا۔ اسی طرف ذرا فاصلے سے شیام بابو کا بستر تھا۔

بمبئی سے چل کر ریاست کوڈگ کی حدود میں داخل ہونے تک ہم سبھی خاصے تھک چکے تھے اس لئے سونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

☆======☆======☆

اگلے روز شام کے وقت ہم نے ڈکیری کی طرف سفر شروع کر دیا۔ میں اب پوری طرح مطمئن تھی۔ کویتا کو میں نے دانستہ اپنے آگے بٹھایا تھا تاکہ تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑا سکوں۔ دوسرے گھوڑے پر شیام بابو اور عادل تھے۔

عرصہ دراز کے بعد مجھے پہاڑوں کے درمیان گھڑسواری کا موقع ملا تھا' سو میرے اندر ایک عجیب سی ترنگ تھی۔ یہی ترنگ مجھے جیسے ہوا کے دوش پر اڑائے لئے جا رہی تھی۔ اپنے گھوڑے کی پسلیوں پر میرے دونوں گھٹنوں کا دباؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

میں جیسے ہوش میں آ گئی۔ شیام بابو میری ترنگ کا ساتھ نہیں دے سکا تھا۔ وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔ گھوڑا سرپٹ دوڑتے دوڑتے دلکی چال پر آ گیا۔ شیام بابو کو میرے ساتھ ساتھ رہنا تھا۔ وہ ایسا نہ کرتا تو پہاڑوں میں بھٹک جاتا۔ گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر کچھ دیر کو جیسے میں سب کچھ بھول گئی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا کہ میں بلند پہاڑوں کے درمیان محو سفر ہوں۔ کویتا نے بروقت مجھے چونکا دیا تھا۔

شیام بابو کو مجھ تک پہنچنے میں خاصی دیر لگی۔

"اتنی تیزی سے گھوڑا نہیں دوڑا سکتا کرن جی۔" شیام بابو مجھ سے بولا۔

"اور مجھے بھی اپنی ہڈی پسلیاں عزیز ہیں خاتون محترم۔" عادل نے بھی گرہ میں گرہ لگائی۔ "کسی کھڈ یا گہری کھائی میں جا گرا تو آپ ہی ڈھونڈتی پھریں گی۔"

"بھگوان نہ کرے پنڈت جی کہ ایسا ہو' ورنہ تو بے چاری جلالی والی جیتے جی مرجائے گی۔" میں ہنس کر بولی۔ "یہ سشما بھی آپ ہی کی طرح ڈر رہی تھی۔ اس لئے مجھے گھوڑے کو سرپٹ دوڑنے سے روکنا پڑا۔ خیر اب میں زیادہ تیز نہیں چلوں گی۔"

عادل موقع محل دیکھ کر میری فقرے بازی سہہ گیا۔ اگر شیام بابو ساتھ نہ ہوتا تو یقیناً وہ جوابی کارروائی سے گریز نہ کرتا۔

رات کو نو بجے کے قریب ہم نے ایک پہاڑی کے دامن میں پڑاؤ ڈالا اور پھر کھانا کھا کر دوبارہ چل پڑے۔ اب آگے آگے میرا گھوڑا تھا اور پیچھے شیام بابو چل رہا تھا۔ نصف شب تک سفر کے بعد میں نے آرام کرنے کی خاطر ایک غار تلاش کر لیا۔ یہ غار چھوٹا ہونے کے باوجود محفوظ تھا۔ اپنے گھوڑے ہمیں

دوسرے قریبی غار میں باندھنا پڑے۔

"اگر یہی حالت رہی تو شاید میں دن اور رات کا فرق بھول جاؤں گا' کرن جی۔" عادل مخاطب کیا۔ وہ اپنا بستر بچھا رہا تھا۔

"پنڈت جی! بہ ظاہر تو مجھے آپ کی حالت ٹھیک لگتی ہے۔ اندر کا حال معلوم نہیں مسکرائی۔ "کہاں دن گزارا' کہاں رات کٹی' اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ اس فرق کو بھول ہی اچھا ہے۔ کچھ باتوں کا بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ کیوں شیام بابو؟" میں نے تصدیق چاہی۔

اس سے پہلے کہ شیام بابو میری تائید میں کچھ کہتا' عادل بول اٹھا۔ "کچھ بتا تو دیجئے کہ یہ رہے گا کیا؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "شام سے آدھی رات تک سفر اور پھر آرام۔"

"یہ بالکل مناسب ہے۔" شیام بابو نے کہا۔ وہ بھی اپنا بستر بچھا چکا تھا۔

کویتا نے بمبئی سے چلتے وقت حصار کھینچا تھا جس کی مدت چوبیس گھنٹے تھی۔ یہ مدت ختم ہو پہلے ہی اس نے میرے ایماء پر دوبارہ شام کے وقت حصار کے منتر پڑھ لئے تھے۔ سفر کے دوران شام اسے یہی کرنا تھا تاکہ ہم چندر موہن کی نظروں سے اوجھل رہ سکیں۔ عادل اور شیام بابو اس خبر تھے۔

دوسرے روز دوپہر ہوتے ہوتے ہم جاگ اٹھے۔ ابھی ہمارے پاس بھنے ہوئے گوشت کے پارچے تھے جن سے پیٹ کی آگ بجھائی جا سکتی تھی۔ کویتا ایک پہاڑی چشمے سے پانی بھر لائی اور کھانا شروع کر دیا۔ شیام بابو اور کویتا دونوں ہی کو گوشت خوری پر اعتراض نہیں تھا۔ کھانا کھا کے وقت ہم نے مزید آرام کیا اور پھر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ کویتا حفاظتی حصار کھینچ چکی تھی۔ سفر کے ناشتہ ہمیں گول کرنا پڑا۔ دوپہر کا کھانا اور ناشتہ گویا ساتھ ساتھ ہی تھا۔

اس مرتبہ شیام بابو نے بھی اپنے گھوڑے کو ذرا تیزی سے بھگایا۔ نتیجتاً ہم نصف شب کے ڈکیری کے نواح میں پہنچ گئے۔ نقشے کے مطابق ڈکیری اب صرف پندرہ میل کی مسافت پر تھا۔ سمت سفر اب تک درست رہی تھی۔

جب ہم ایک غار میں پناہ لے چکے تو شیام بابو نے تجویز پیش کی۔ "کرن جی! اب ہم ریاس دارالحکومت پہنچنے والے ہیں' ہمیں فرزندان کاویری سے رابطہ قائم کر لینا چاہئے۔ ڈکیری میں ہم اجنبی ہوں گے' ہمیں راجا چک دیر اور اس کے سازشی وزیراعظم لنگڑے بسودیا کی نظروں سے چ رہنا ہو گا۔"

"آپ کی نظر میں رابطے کی کیا صورت ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سوامی جی یا اتیتا تک یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ ہم یہاں آ چکے ہیں۔" شیام بابو نے جواب د ذمے داری میں قبول کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کا حکم ہو تو میں کچھ گھنٹے آرام کرنے کے بعد تن تنہا روانہ ہو جاؤں۔ میں یہاں سے صبح پانچ بجے بھی چلا تو آدھے گھنٹے میں آنجہانی راجا راجندی کی سماد

جاؤں گا۔ انجمن فرزندان کاویری کے سربراہ سوامی جی کا قیام وہیں ہے۔"

"کیا یہ بھی ممکن ہے کہ سوامی جی کی بجائے آپ انجمن کے سابق نوجوان سربراہ اتیتا سے رابطہ قائم کر لیں؟" میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں' ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" شیام بابو نے کہا۔ "اتیتا کی سکونت ڈکیری کے راج بھون سے زیادہ دور نہیں۔ میں وہاں بھی جا چکا ہوں۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' اتیتا کے بارے میں آپ نے بتایا تھا کہ وہ راج بھون کے کسی اہم عہدے پر فائز ہے۔ دوم یہ کہ وہ وزیر دفاع بونپا کا بھانجا ہے۔ موجودہ صورت حال میں ہمارے لئے وہ نسبتاً زیادہ اہم ہے جو راج بھون سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ ہو۔"

"اتیتا راج بھون کے محافظ دستے کا نگراں ہے۔" شیام بابو نے بتایا' پھر کچھ کہنے لگا۔ "تو پھر میں سوامی جی سے نہیں ملتا' اتیتا سے رابطہ قائم کر لیتا ہوں۔"

"ڈکیری میں قدم رکھنے سے پہلے میں' اتیتا سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ اتیتا کو اپنے ساتھ یہاں تک لا سکتے ہیں؟"

"بالکل! جب وہ میری دعوت پر بمبئی آ سکتا ہے تو یہاں آنے میں اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ بڑا پرجوش و پرخلوص نوجوان ہے۔ آپ اس سے مل کر خوش ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے' آپ صبح پانچ بجے یہاں سے ڈکیری چلے جائیں۔" میں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ "آپ کو سات بجے تک واپس آ جانا چاہئے۔"

"اس سے پہلے ہی واپسی کا امکان ہے۔ ڈکیری جانے اور آنے میں گھنٹے بھر سے زیادہ نہیں لگے گا۔"

"میں نے احتیاطاً مزید ایک گھنٹے کا مارجن دے دیا ہے۔ جانے سے پہلے جگا دیجئے گا مجھے۔"

شیام بابو نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہے۔"

پھر ہم چاروں ہی اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ ڈکیری کے نواح میں پہنچنے کے بعد مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ وہاں میرا دشمن ژیان بھی موجود تھا اور پراسرار شیطانی قوتوں کا مالک چندر موہن بھی۔ پراسرار تجربات کے دوران ان دونوں ہی کو میں خود بند آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ انگریز حکومت ریاست کے خلاف سازش کا کیا جال بن رہی تھی' اس سے قطع نظر یہاں آنے میں میرے ذاتی معاملے کو زیادہ دخل تھا۔ اتیتا سے مل کر میں اپنے دشمنوں کے متعلق بہت کچھ معلوم کر سکتی تھی۔ اسے یہاں بلانے کا مقصد یہی تھا۔ میں اپنے دشمنوں کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اچانک ان پر ٹوٹ پڑنا چاہتی تھی۔

میرے تینوں ساتھی سو گئے مگر مجھے نیند جلد نہیں آئی۔ پلکیں جھپکی ہوں گی کہ شیام بابو نے مجھے جگا دیا۔ وہ روانگی کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ عادل بھی جاگ اٹھا۔ کویتا البتہ بے خبر سوتی رہی۔ میں اور عادل' شیام بابو کو رخصت کرنے غار سے باہر آ گئے۔

پہاڑوں کے درمیان صبح کا وہ منظر بہت حسین تھا۔ شیام بابو گھوڑے پر بیٹھ کر مڈکیری کی روانہ ہو گیا تو میں غار کی جانب پلٹنے کی بجائے ایک چٹان پر چڑھ گئی۔ عادل مجھے تیزی کے ساتھ چڑھتے دیکھتے رہ گیا۔ وہ چٹان کے نیچے کھڑا تھا۔

"تم بھی اوپر آ جاؤ نا۔" میں ہنس کر بولی۔ "یہاں سے بہت دور دور تک نظر آ رہا ہے۔"

"میں نے ایک سرکس میں نوکری کرنا چاہی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔" عادل نے منہ اوپر بلند آواز میں کہا۔ "پھر بھی تمہاری خوشنودی کے لئے بندر بننے کی کوشش کر سکتا ہوں۔" شیام جاتے ہی وہ پہلے کی طرح چہکنے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بھی چٹان پر چڑھ آیا۔

"تم بالکل غلط کہہ رہے تھے کہ تمہیں سرکس میں نوکری نہیں مل سکی۔ اس کے علاوہ بندر تم میں اعلیٰ تر صلاحیتیں موجود ہیں۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"میں ترقی معکوس کا قائل نہیں ہوں۔ سنتے ہیں کہ آدمی پہلے بندر ہی تھا۔"

"یہ ایک بندر ہی کا خیال یا نظریہ تھا جو مسترد کیا جا چکا ہے۔ سنی سنائی باتوں کو بطور سند نہ کرو۔ اگر کسی بندر کو یہ معلوم ہو گیا کہ تم نے بندر ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو برا مان جائے گا۔" یہ کہہ کر میں زور سے ہنس پڑی۔

ذرا دیر بعد ہم دونوں غار میں واپس آ گئے۔ کویتا اب تک سو رہی تھی۔ ساڑھے چھ بجے تک بابو واپس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ نوجوان اتیٹا کو بھی لے آیا تھا۔ اتیٹا کے سانولے سلونے چہرے سے اور دلیری کا اظہار ہوتا تھا۔ کالی روشن آنکھیں' ستواں ناک' بیضوی چہرہ اور جسم گٹھا ہوا .... اتیٹا۔ اس کی عمر پچیس سال سے کچھ کم ہی لگتی تھی۔

"یہ ہیں کرن کماری جن کے بارے میں تمہیں میں نے بتایا تھا۔" شیام بابو نے اتیٹا سے تعارف کرایا۔

اتیٹا مرعوب سا نظر آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے آگے سر جھکا دیا اور بولا۔ "پرنام جی۔"

میں نے کنڑ زبان ہی میں اتیٹا سے گفتگو شروع کی تو اس کے چہرے پر ایک خوش گوار حیرت دی۔ میں بڑی روانی سے کوڈگ میں بولی جانے والی زبان بول رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں اتیٹا کی جھجک ہو گئی۔ میں نے اس سے ریاست کی اندرونی سیاسی صورت حال پر بات کی تھی۔

"کماری جی! آپ تو بالکل اپنی لگتی ہیں۔" اتیٹا نے اظہار مسرت کیا۔ "مجھے خبر نہیں تھی کہ ہم لوگوں سے زیادہ ہمارے بارے میں جانتی ہوں گی۔"

"پھر بھی مجھے بہت سی باتوں کا علم نہیں' وہی جاننے کے لئے میں نے تمہیں بلایا ہے۔" میں نے محتاط الفاظ میں کہا' پھر سب سے پہلا سوال اپنے دشمن ژیان کے متعلق کیا۔

"وہ بڑے بڑے بالوں والا اب راج بھون میں نہیں رہتا۔" اتیٹا نے جواب دیا۔

"پھر؟ پھر وہ کہاں چلا گیا؟" میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"کئی دن ہو گئے اسے امرناتھ جی کے مندر گئے ہوئے۔ وہ اب بڑے مہاراج کے ساتھ مندر ہی کے ایک حصے میں رہتا ہے اور کم ہی باہر نکلتا ہے۔ اس بارے میں سنا یہ گیا ہے کہ خود بڑے مہاراج نے راجاجی سے بات کی تھی۔ بڑے مہاراج نے راجاجی سے کہا تھا کہ ان کا مہمان راج بھون میں محفوظ نہیں ہے' سو وہ اسے اپنے ساتھ مندر لے جا رہے ہیں۔"

"امرناتھ کا مندر کہاں ہے؟" میں نے معلوم کیا۔

"مڈکیری کے شمال میں جو پہاڑ ہے' امرناتھ جی کا مندر وہیں ہے۔ مندر ذرا بلندی پر ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے پتھروں کو کاٹ کر سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ اسی پہاڑ کے دامن میں بھگوتی نے اپنا آشرم بنا رکھا ہے۔ وہ بڑی نیک اور پارسا عورت ہے۔ مڈکیری کے لوگ اس سے آشیرواد لینے جاتے ہیں۔ وہ دعا کرتی ہے اور مریض اچھے ہو جاتے ہیں۔" اتیٹا نے ایک اور نئی بات بتائی۔ "بھگوتی کسی سے کوئی نذرانہ بھی قبول نہیں کرتی۔ مڈکیری کے عوام اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔"

میں اس وقت ژیان اور چندر موہن کے بارے میں مزید گفتگو کرنا چاہتی تھی اس لئے بھگوتی کے ذکر سے گریز کیا۔ اس کے باوجود وہ عورت مجھے پُراسرار معلوم ہوئی تھی۔ بظاہر اس کی جو شہرت تھی' عوام میں اس نے جو مقبولیت حاصل کی تھی' اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز ضرور تھا۔ سوامی جی کے بعد یہ عورت مجھے مشتبہ محسوس ہوئی تھی۔

مختلف سوالات کے نتیجے میں مجھے چندر موہن اور ژیان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا جتنا میں پہلے ہی سے جانتی تھی۔ ژیان کو اس ریاست میں بھی دہرا تحفظ حاصل تھا۔ ایک طرف تو وہ ریاست کے راجا چک ویر کا مہمان تھا' دوسری جانب چندر موہن اسے پناہ دیئے ہوئے تھا۔ مڈکیری آ کر بھی صورت حال وہی تھی جو دہلی میں تھی۔ ژیان پر ہاتھ ڈالنا یہاں بھی آسان نہیں تھا۔ اس کے باوجود میرے لئے یہ بھی بہت ضروری تھا کہ میں اپنے دشمن کا سراغ لگانے میں کامیاب رہی تھی۔ اب اتنا تو تھا کہ میں اندھیرے میں نہیں تھی۔

"شمال میں جو پہاڑ ہے جس کے بارے میں تم نے ابھی بتایا ہے کہ وہیں امرناتھ کا مندر ہے اور اسی کے دامن میں بھگوتی کا آشرم ہے' تو کیا اسی پہاڑ کے دامن میں ہماری سکونت کا بندوبست بھی ممکن ہے؟" میں نے اتیٹا سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں کماری جی! ایسا ممکن ہے' پر آپ کو وہاں زیادہ آرام نہیں مل سکے گا۔ اگر آپ مڈکیری کی آبادی میں رہیں تو زیادہ بہتر ہے۔ ہماری انجمن کے کئی محفوظ گھر ایسے ہیں جہاں آپ کو ہر طرح کا آرام بھی ملے گا اور کوئی خطرہ بھی نہیں ہو گا۔"

"اگر ہم خطروں سے ڈرتے تو پھر یہیں کیوں آتے۔ اس کی پروا نہ کرو۔" میں بولی۔ "یہ بتاؤ کہ کب تک وہاں ہماری سکونت کا بندوست ہو سکتا ہے؟"

"آج کا دن تو لگ ہی جائے گا۔" اتیٹا نے جواب دیا۔ "پہاڑی کے قریب پچھلے وقتوں میں ایک دھرم شالہ تھی جس کا بڑا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے' ایک آدھ کمرا ہی ٹھیک حالت میں ہو گا۔ وہاں ہم اپنی

انجمن کے ماہانہ اجلاس بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس جگہ کو رہنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ ماہانہ اجلار کہیں اور بھی کر سکتے ہیں۔"

میں نے وہاں رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ میرا مقصد دراصل اپنے دشمن سے قریب رہنا اس کے علاوہ میں' انجمن فرزندان کاویری سے بھی دور دور رہنا چاہتی تھی۔

"آج رات کو میں پھر آؤں گا اور آپ لوگوں کو ساتھ لے جاؤں گا۔ یہاں سے مڈکیری کی آبا میں داخل ہوئے بغیر اس شکستہ دھرم شالہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔"

اپنے دشمن کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد مجھے اس مظلوم و مجبور عورت خیال آیا جو راج بھون ہی کے ایک حصے میں قید تھی' وہی عورت دیوما جو راجا چک ویر کی بہن تھی۔ نے اتیٹا سے پوچھا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ راجا چک ویر کی بہن دیوما راج بھون میں قید ہے؟"

میرے اس سوال پر اتیٹا چونک اٹھا اور بولا۔ "یہ بات تو چند ہی لوگوں کو معلوم ہے۔ مجھے اس حیرت ہے کہ آپ دیوما کو کیسے جانتی ہیں۔ اگر دیوما کو آپ جانتی ہیں تو پھر.......... پھر چین بسو سے واقف ہوں گی۔ مڈکیری کی جنتا کو یہ تو خبر ہے کہ دیوما جی' راج محل میں ہیں' پر اسے پتا نہیں کہ راجا نے انہیں قیدی بنا رکھا ہے۔"

"یہاں آنے سے پہلے میں نے ریاست اور راج بھون کے متعلق بہت سی معلومات کی تھیر میری معلومات کے ذرائع سے قطع نظر اس میں کوئی شک نہیں کہ دیوما ایک مظلوم عورت ہے۔ میں' چیر بسو' یعنی دیوما کے شوہر اور خود دیوما کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی' پر اب جاننا ضرور چاہتی ہوں۔ کیا اس سلسلے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

"کماری جی! آپ کا یہ کہنا میرے دل کی آواز ہے کہ دیوما جی پر ظلم ہو رہا ہے۔" اتیٹا پُرجوش آو میں بولا۔ "مگر یہ معاملہ ہمارے اختیار سے باہر کی بات ہے۔ راج گھرانے کے ذاتی معاملات میں ہم مداخلہ نہیں کر سکتے۔" پھر اتیٹا مجھے چین بسو اور دیوما کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

راجا چک ویر کے عیار و عیاش اور سازشی باپ نے اپنی بیٹی دیوما کی شادی کوڈگ ہی کے ایک مقا نوجوان سے کی تھی۔ اس شادی کا پس منظر بھی سیاسی ہی تھا۔ لنگ راج مقامی لوگوں سے رشتے ناتے کر اپنے اقتدار کو مضبوط کر رہا تھا۔ اس کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی' یعنی چک ویر اور دیوما۔ چک ویر کی شادی بھی اس نے کوڈگ ہی کے مقامی لوگوں میں کی اور بیٹی دیوما کا رشتہ بھی مقامی باشندوں میں ایک کوڈگی نوجوان سے کیا۔ اس طرح گویا عیار لنگ راج نے مقامی باشندوں کو اپنے حق میں استوار کر لیا تھا۔ وہ آئندہ راج گھرانے کے لئے خطرہ ثابت نہ ہوتے۔ لنگ راج نے اپنی بیٹی دیوما کو شہر اپنگول کا راج محل بھی دے دیا تھا۔ اپنگول کے محل کا خزانہ بھرا ہوا تھا۔ اپنی بیٹی دیوما اور داماد چین بسو کو لنگ راج نے مڈکیری سے دور اپنگول میں رکھا۔ لنگ راج ہفتے میں دو تین بار خود اپنگول جاتا اور بیٹی داماد کو بھی مڈکیری بلواتا رہتا۔ اس طرح لنگ راج نے انہیں تمام تر عیش و آرام فراہم کیا۔ مرتے وقت اس نے اپنے بیٹے چک ویر سے کہا کہ چھوٹی بہن کو پیار سے رکھنا۔ پھر بہو کو پاس بلا کر بولا' بیٹی! میں نے تیرے لئے کسی چیز

ی کمی نہیں رکھی اس لئے تیری نند کو جو کچھ دیا ہے' اسے چھونے کی ضرورت نہیں۔ بہو گورما نے جواب دیا کہ آپ چنتا نہ کریں۔ آپ کی بیٹی کے سکھ کو میں اپنا سکھ جانوں گی۔

چین بسو اگر راجا لنگ راج کا داماد نہ بنتا تو شاید ایک عام آدمی کی حیثیت سے پُرسکون زندگی گزارتا' لیکن اس کی بد قسمتی کہ لنگ راج کی نگاہ اس پر پڑی اور اسے داماد بنا لیا۔ وہ خود کو اسی سبب اہم تصور کرنے لگا اور خوش فہمی کا شکار ہو گیا۔ دوسروں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے والا لنگ راج اپنی بیٹی کی وجہ سے داماد کا لحاظ کرتا تھا' اس کے برعکس اپنے بیٹے کو نالائق' کمینہ' احمق وغیرہ کہہ کر گالیاں دیتا تھا۔ کبھی وہ چک ویر سے کہتا کہ راج محل میں جنم نہ لے کر بھی چین بسو کتنی شائستگی سے رہتا ہے۔ اس کی ٹانگ کے نیچے سے نکل جا۔ شاید اس طرح تجھے کچھ عقل آ جائے۔ ایسی باتیں سن کر چین بسو یہ سمجھنے لگا کہ اس کی خوبیوں سے متاثر ہو کر تعریف ہو رہی ہے۔ اسے یہ کہتے بھی سنا گیا کہ شاید راجا لنگ راج' بیٹے کی جگہ اسے ہی راجا بنا دے' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لنگ راج کے مرنے پر چک ویر ہی راجا بنا۔

اقتدار سنبھالنے کی لیاقت و صلاحیت میرے اندر چک ویر سے زیادہ ہے۔ اختیار ہی سب کچھ نہیں' آج نہیں تو کل میں راجا ضرور بنوں گا۔ چین بسو نے کہنا شروع کر دیا۔ چین بسو اس اعتماد کے ساتھ راجا چک ویر کی مخالفت کے زہر بھرے ماحول کی طرف جھک رہا تھا۔ یہ بات اس کے برتاؤ سے بھی ظاہر ہوتی تھی۔ لنگ راج کی موت کے صرف ایک سال کے اندر چک ویر اور اس کے بہنوئی کے درمیان کشیدگی ہو گئی۔ اختلافات بڑھتے گئے اور آخرکار چک ویر ایک دن اپنی بہن دیوما کو اپنگول سے مڈکیری لے آیا اور واپس نہیں بھیجا۔ چین بسو جا کر پاؤں پڑا' رانی گورما نے بہت التجائیں کیں' راجکماری پٹا نے اپنی پھوپھی کی خاطر باپ سے منتیں کیں' تب چک ویر نے دیوما کو واپس جانے دیا۔ میسور پر پہلے ہی سے انگریزوں کا قبضہ تھا اور بنگلور بھی انہی کے پاس تھا۔ چین بسو نے انگریز حکومت کو لکھا کہ راجا چک ویر کو اقتدار سے محروم کر دیا جائے کیونکہ وہ جنتا پر ظلم توڑتا ہے۔ کوڈگ ریاست کا اقتدار دیوما کو ملنا چاہئے۔ یہ بات چک ویر تک پہنچ گئی۔ تب وہ ایک بار پھر اپنگول گیا اور چین بسو کو مارپیٹ کے بہن کو زبردستی ساتھ لے آیا اور محل میں قید کر دیا۔ اس واقعے کو تقریباً دو سال بیت چکے تھے۔ رانی اور راجکماری نے بہت منت کی مگر چک ویر نے ان کی نہیں سنی۔ چین بسو نے انگریزوں کو پھر شکایتیں بھیجیں۔ اس سے چک ویر کا دل اور بھی سخت ہو گیا۔ یوں دیوما کی رہائی کا کوئی راستہ نہ رہا۔ چین بسو نے تو اب یہ بھی کہنا شروع کر دیا تھا کہ راجا چک ویر کی جگہ اس کی بیٹی راجکماری پٹا کو اقتدار دے دیا جائے۔ کاویری کے میلے میں چین بسو ایسے بااثر افراد سے بھی ملا جو راجا چک ویر سے نالاں تھے۔ ان لوگوں کو چین بسو نے چک ویر کے خلاف ہموار کر لیا۔

حکومت کی بدنظمی جیسے جیسے بڑھتی گئی ویسے ویسے عوام میں چک ویر کے خلاف بے چینی کا اضافہ ہوتا گیا۔ ان میں وہ سب لوگ شامل تھے جو ایک بار لگان دے چکے تھے مگر انہیں دوبارہ لگان دینے کے لئے مجبور کیا جا رہا تھا۔ راجا سے وہ لوگ بھی سخت برہم تھے جنہیں اپنی مرضی کے خلاف اپنی بہو بیٹیوں کو رین نواس (راجا کا عشرت کدہ) میں بھیجنا پڑتا تھا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہیں راجا اور اس کے لنگڑے

وزیراعظم بسودیا کے ہاتھوں ذلت اٹھانا پڑتی تھی۔

اگر خفیہ طور پر راجا چک ویر کے خلاف چین بسو کی جدوجہد جاری رہتی تو شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا مگر یہ معاملہ راز نہ رہ سکا۔ بھید کھل جانے پر چین بسو میسور بھاگ گیا۔ لنگڑے بسودیا نے چک ویر کی اجازت حاصل کرکے میسور کے چیف کمشنر کے پاس اپنے ایک نمائندے کے ہاتھوں خط بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ ہمارے دیش میں بغاوت پھیلا کر چین بسو نام کا ایک اپرادھی آپ کے دیش میں آگیا ہے۔ اسے پکڑوا کر ہمارے پاس بھیجنے کی کرپا کریں۔

میسور میں جرم کرکے کوڈگ بھاگ جانا کوڈگ میں جرم کرکے میسور بھاگ جانا کوئی نیا واقعہ نہیں تھا۔ ایسے معاملات میں ریاست اور انگریز حکومت کے درمیان پہلے سے ایک معاہدہ موجود تھا۔ اس معاہدے کی رو سے دونوں حکومتیں مجرموں کو گرفتار کرکے ایک دوسرے کی مدد کرتی رہتی تھیں۔ میسور کے چیف کمشنر نے اسی لئے چین بسو کو گرفتار کر کے لنگڑے بسودیا کے بھیجے ہوئے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ مجرم چین بسو کو بھجواتے وقت اس نے دستور کے مطابق خط لکھا۔ "اس کا قصور کیا ہے اور اسے کیا سزا دی جائے گی' یہ فیصلہ کرلینے کے بعد ہمیں آگاہ کرنے کی زحمت فرمائیں۔"

چین بسو کا تعلق انجمن فرزندان کاویری سے بھی تھا۔ اس طرح چین بسو کی گرفتاری انجمن کے لئے بھی لمحہ فکریہ بن گئی' لیکن چین بسو نے ہر ممکن تشدد کے باوجود اس سلسلے میں زبان نہ کھولی۔ ان دنوں راجا چک ویر' نالک ناڈ کے راج محل کے پاس والے جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔ چین بسو کو وہیں اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ چک ویر کو بتایا گیا کہ چین بسو نے زبان نہیں کھولی۔ اس پر چک ویر نے چین بسو کو لالچ دیا کہ کم سے کم یہ بتا دو کہ کس کس نے اس کام میں تمہاری مدد کرنے کا وعدہ کیا؟ اگر تم نے اس سوال کا جواب دے دیا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔

چین بسو لالچ میں نہیں آیا اور کسی ایک شخص کا بھی نام بتانے سے انکار کر دیا۔

چک ویر نے پاس رکھی بندوق اٹھائی کہ چین بسو کو گولی مار دے' لیکن اسی وقت سارا جنگل فائروں سے گونج اٹھا۔ فائرنگ کرنے والے "فرزندان کاویری" تھے۔ راجا چک ویر گھبرا گیا اور اس نے وہاں سے کوچ کا حکم دے دیا۔ چین بسو' چک ویر کی چلائی ہوئی گولی سے زخمی تو ہو گیا مگر مرا نہیں۔ راجا چک ویر کے وہاں سے کوچ کرتے ہی فرزندان کاویری' چین بسو کو زخمی حالت میں اٹھا لے گئے۔ تب سے اب تک چین بسو روپوش تھا۔

راجا چک ویر کو علم تھا کہ چین بسو کی پشت پر کچھ ایسے لوگ ہیں جو اس کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں اس لئے چین بسو پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں۔ اسے اب اپنی جان کا خوف بھی لاحق ہو گیا تھا۔ جو لوگ جنگل میں ہر طرف سے فائرنگ کر سکتے تھے' خود اسے بھی نشانہ بنانا ان کے لئے مشکل نہیں تھا۔

جو لوگ اس وقت راجا کے ساتھ تھے' انہیں سختی سے تاکید کر دی گئی کہ اس واقعے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

کچھ مہینوں کے بعد میسور کے چیف کمشنر کی طرف سے جو خطوط آئے' ان میں یہ بھی لکھا تھا۔

"ملزم چین بسو کا معاملہ ختم ہو گیا' اس کا نتیجہ کیا رہا؟"

لنگڑے بسودیا نے اور سب باتوں کا جواب تو دے دیا مگر چین بسو کا کوئی ذکر نہ کیا۔

چیف کمشنر نے پھر خط لکھا۔ "چین بسو کے بارے میں کوئی جواب نہیں ملا۔ دیگر باتوں کا جواب دیتے وقت شاید آپ بھول گئے ہوں گے۔ کم سے کم اب تو بتانے کی مہربانی کریں۔" راجا چک ویر نے اس بات کا جواب دینے سے منع کر دیا۔ یاد دہانی کے لئے میسور سے چار خط اور آئے اور مگر ان کے جواب بھی نہیں دیئے گئے۔

آخر میں چیف کمشنر نے لکھا۔ "خطوں کے جواب میں بے پروائی سے ہمارے اور آپ کے درمیان خلیج پیدا ہو رہی ہے۔ مدراس کے گورنر صاحب نے اس بارے میں سخت بے اطمینانی ظاہر کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپ انگریز حکومت کے ساتھ تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتے ہوں گے۔ صورت حال کو بہتر بنانا اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

راجا چک ویر نے اس خط کا بھی جواب نہیں دیا۔ یوں انگریز حکومت اور ریاست کے درمیان ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔

اتیا سے تمام حالات جاننے کے بعد میں نے پہلا سوال چین بسو ہی کے متعلق کیا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

"چین بسو جی روپوشی کی زندگی اپنگول ہی میں گزار رہے ہیں اور انجمن انہیں تحفظ فراہم کر رہی ہے۔" اتیا نے بتایا۔ "خود راجا جی بھی اس بات سے واقف ہیں لیکن انجمن سے خوفزدہ ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ چین بسو جی کی گرفتاری ریاست میں بغاوت کا سبب بن جائے۔"

"تمہاری انجمن کیا چین بسو کو برسراقتدار لانے کے حق میں ہے؟" میں نے ایک اہم سوال کیا۔

اتیا کا جواب میرے لئے حیران کن تھا۔ "نہیں! ہماری انجمن راجا چک ویر کے خلاف ضرور ہے لیکن ہم اس سلسلے میں کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ ہم راج گھرانے کے خلاف نہیں' ظلم کے ضرور خلاف ہیں۔ یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ راجا چک ویر لاکھ ظالم سہی مگر کوڈگ قوم کا داماد ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ راجا جی کو معزول کرکے رانی گورما یا راجکماری پٹا کو ریاست کا سربراہ مان لیا جائے کہ ان دونوں ہی کا تعلق راج گھرانے سے ہے یا دیوما جی کو اقتدار مل جائے' لیکن جس شخص کا براہ راست کوئی تعلق راج گھرانے سے نہیں' اسے ہم تسلیم نہیں کریں گے' خواہ وہ چین بسو جی ہوں یا کوئی اور شخص۔"

ذہنی غلامی کی یہ ایک ایسی نادیدہ زنجیر ہے جسے کوئی تلوار نہیں کاٹ سکتی۔ میں نے سوچا۔ انجمن کے اغراض و مقاصد خاصی حد تک میری سمجھ میں آ گئے تھے۔ میری گفتگو اس نوجوان سے ہوئی تھی جسے "گھر کا بھیدی" کہا جا سکتا تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ میں نے اتیا سے آخری سوال دیوما کے بارے میں کیا۔ "تمہاری انجمن راجا کی مظلوم بہن کو رہائی کیوں نہیں دلا سکی؟"

"دیوما جی کو راج محل کے جس حصے میں رکھا گیا ہے' وہاں تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔ وہاں صرف اور صرف راج گھرانے کے افراد ہی آ جا سکتے ہیں یا پھر بسودیا جی اور ان کے عملے والے۔ ہم محل

کے اس حصے کے حالات سے باخبر تو رہتے ہیں مگر وہاں ہمارا عمل دخل نہیں۔" اتینا نے بتایا۔

"شکریہ اتینا! تم سے پھر گفتگو رہے گی۔ آج رات میں تمہاری آمد کا انتظار کروں گی۔ تم سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی۔" میں مسکرا کر بولی۔

"اسے میں اپنا سوبھاگیہ سمجھتا ہوں۔" اتینا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے احترام دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ چلا گیا۔

شیام بابو کنڑ زبان سمجھتا تھا مگر عادل کو اس کی زیادہ شدبد نہیں تھی' نہ کویتا کے لئے یہ زبان سمجھنا آسان تھا۔ میں نے اسی لئے مختصراً عادل کو اتینا سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔

میں نے اس دوران بطور خاص یہ بات محسوس کی کہ کویتا انتہائی خوفزدہ ہے۔ عادل اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو کو اس نے بڑی توجہ سے سنا تھا۔ اسے میرے آئندہ اقدام کا علم ہو گیا تھا۔ کویتا کے خوف کی وجہ یہی تھی' میں یہ بات سمجھ رہی تھی۔ اسے اعتماد میں لینا اور تسلی دینا ضروری تھا لیکن شیام بابو اور عادل کے سامنے یہ ممکن نہیں تھا۔ میں اسی لئے اسے چہل قدمی کے بہانے غار سے باہر لے آئی۔

میرے استفسار پر باہر آتے ہی وہ بول اٹھی۔ "کماری جی! آپ آگ سے نہ کھیلیں۔ مجھے اپنے جیون کی تو کوئی ایسی چنتا نہیں' پر آپ کو کچھ ہو گیا تو یہ سہن کرنا مجھے دوبھر ہو جائے گا۔ ڈکیری ہی میں رہنا ہے تو کہیں اور رہ لیں' اس مندر سے دور جہاں چندر موہن کا ٹھکانا ہے۔"

"میں اس سے دو دو ہاتھ کرنے تو یہاں آئی ہوں پگلی۔" میں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ "نہ وہ تمہارا کچھ بگاڑ سکتا ہے' نہ اس میں مجھے نقصان پہنچانے کی ہمت ہے۔ تمہیں اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر یہ کیوں بھول رہی ہو کہ ہم اس کی نظروں سے اوجھل رہیں گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے' کماری جی' پھر بھی میرا من بے چین ہے۔" کویتا کی آواز میں اب بھی خوف کی لرزش تھی۔

اچانک میں' چندر موہن کی آواز سن کر اچھل پڑی۔ وہ مجھی سے مخاطب تھا۔ "اے معبلہ! کویتا کی بات مان لے کہ یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔"

چندر موہن میری نظروں سے اوجھل تھا مگر میں اس کی آواز سن رہی تھی۔ غصے کی شدید لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اسی زیر اثر میں چیخ اٹھی۔ "بزدل بھگوڑے! سامنے آ' چھپ کیوں رہا ہے مجھ سے؟"

جواب میں چندر موہن کا زہریلا قہقہہ سنائی دیا' پھر اس کی آواز آئی' "تو بھی تو مجھ سے ڈر کے حصار میں چھپی بیٹھی ہے کہ تجھے دیکھ نہ سکوں۔ خیر' اب تو میرے پیچھے پیچھے یہاں تک آ ہی گئی ہے تو میں تجھے مایوس نہیں کروں گا۔ تیرے دشمن ژیان کو بھی میں نے یہاں تیری آمد سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ بھی اس پر بہت خوش ہے۔ تیرے خریدار انگریز بھی ہیں اور ژیان بھی۔ جس سے بھی تیرے دام ملے' اس کے ہاتھ میں تجھے بیچ دوں گا' لیکن کب؟ یہ شاید تجھے بھی خبر ہے۔ چمپا کو جو ضد تھی' وہ پہلے پوری ہو گی۔ تو

میرا اشارہ سمجھ گئی نا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک بار پھر چندر موہن کا زہریلا قہقہہ گونجا۔

عین اسی لمحے میں نے کویتا کے جسم کا توازن بگڑتے دیکھا۔ اس کے عقب میں گہری کھائی تھی۔ میں تیزی سے کویتا کی طرف لپکی۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔

اس عیار نے مجھے باتوں میں لگا کر اچانک کویتا پر حملہ کر دیا تھا۔ میں چندر موہن کے اس غیر متوقع حملے کا مقصد اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کویتا کو راستے سے ہٹا کر وہ گویا مجھے اپنی دانست میں بے سپر کرنا چاہتا تھا مجھے اگر کویتا تک پہنچنے میں چند لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو وہ شاید زندہ نہ بچتی۔

نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود بھی چندر موہن کی شیطانی قوتیں میرے لئے خطرہ بن گئی تھیں۔ یہ بات ہرچند کہ تشویش ناک تھی لیکن میرا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ چندر موہن نے مجھے جو دھمکی دی تھی اس کا بھی میں نے اثر قبول نہیں کیا' ایسی دھمکیاں وہ پہلے بھی دیتا آیا تھا۔

کویتا کو اپنے حواس پر قابو پانے میں زیادہ دیر نہیں لگی میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ڈکیری پہنچنے سے پہلے میں کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہتی تھی کہ وقتی طور پر ہی پر سہی چندر موہن چکرا کر رہ جائے۔ کویتا کو میں نے کچھ ہدایات دیں اور پھر چند ہی لمحے بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں نے جو قدم اٹھایا تھا اس کا ردعمل اسی روز ظاہر ہو جاتا۔ راجا چک ویر اس سلسلے میں فوری طور پر مدد حاصل کرنے کے لئے چندر موہن سے رابطہ قائم کرتا اور پھر چندر موہن کی بے بسی قابل دید ہوتی یہی سوچتی ہوئی میں غار میں واپس آ گئی۔

حسب توقع میری تنہا واپسی پر عادل نے اظہار حیرت کیا تو میں بولی۔ "سشما کو میں نے ایک کام سے بھیجا ہے۔"

"یہاں آتے ہی آپ نے کام دکھانا شروع کر دیا۔" عادل نے دھیمی آواز میں کہا تاکہ دور بیٹھا ہوا شیام بابو اس کی بات نہ سن سکے۔

"ہم یہاں کام دکھانے ہی تو آئے ہیں۔" میں مسکرائی۔

"بس مجھ غریب پر رحم کیجئے گا دنیا میں ابھی بہت کام نمٹانے میں کہیں اس سے پہلے ہی دی اینڈ نہ لگ جائے۔"

"دی اینڈ تو ایک نہ ایک روز لگنا ہے' کل نہ سہی آج سہی۔" میں ہنسی۔

"فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے آپ تن تنہا یہ شوق پورا کرلیں تو زیادہ بہتر ہے۔"

"تمہارے یا میرے ارادے سے کچھ نہیں ہو گا بلکہ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا۔"

"میں ہرگز کوئی انجارا بنجارا نہیں جو بنجارا یا بنجارن ہو وہ لاد چلے' میں بھلا کیوں ٹھاٹ پڑا چھوڑ جاؤں۔"

اسی وقت شیام بابو اٹھ کر قریب آ گیا اور عادل کا زور بیان خاموشی میں بدل گیا۔ شیام بابو نے مجھ سے کویتا کے بارے میں معلوم کیا عادل ہی کی طرح میں اسے بھی ٹال گئی یوں بھی وہ مجھ سے زیادہ کریدا

کرادی نہیں کرتا تھا۔

کویتا کو واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی اس کا وجود ابھی تک نادیدہ تھا میں ایک بار پھر غار سے باہر نکل آئی تاکہ تنہائی میں اس سے بات کر سکوں غار سے کچھ دور نکل آنے کے بعد وہ ظاہر ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ "کام ہو گیا؟"

"ہاں" اس نے جواب دیا۔

"کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں صرف چند پہریداروں کو بے ہوش کرنا پڑا آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے اسے اپنگول پہنچا دیا ہے۔"

"تم نے اسے اپنے بارے میں کیا بتایا؟"

"یہی کہ میں ایک نیک روح ہوں اور اسے ظلم سے بچانا چاہتی ہوں اسی کے ساتھ میں نے اسے یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ وہ اپنگول کے محل سے نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ محل کے گرد میں نے گھیرا ڈال دیا ہے تاکہ چندر موہن اس کا سراغ نہ لگا سکے۔" کویتا نے تفصیل بتائی۔ "اپنگول شہر کے باسی یوں بھی راجا کی بہن اور بہنوئی کے وفادار ہیں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ دیوما کا شوہر چین بسو بھی محل میں بے دھڑک آتا جاتا ہے ریاست کا باغی ہونے کے باوجود کوئی اس پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔"

"تمہیں آج ہی شام ہونے تک ایک بار پھر ڈمکیری جانا ہے۔" پھر میں اسے سمجھانے لگی کہ اس مرتبہ کیا کرنا ہے۔

راجا چک ویر کی مظلوم بہن دیوما کو میں نے قید سے رہائی دلا دی تھی میری ہدایت کے مطابق کویتا نے اسے اپنگول پہنچا دیا تھا جو گویا اس کا اصل گھر تھا یہ علاقہ باغیوں کا گڑھ کہلاتا تھا۔ راجا اور اس کے کارندے ان لوگوں کو باغی کہتے تھے اور وہ لوگ خود کو آزادی کے سپاہی سمجھتے تھے۔ وہ راجا چک ویر کے ظلم و ستم سے نجات پانے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور انہیں "فرزندان کاویری" کی حمایت حاصل تھی۔

اسی شام کویتا نے ڈمکیری کا ایک پھیرا اور لگایا وہ جو خبر لائی میری توقع کے مطابق تھی۔ سخت ترین پہرے کے باوجود راج محل سے دیوما کے پُراسرار فرار نے راجا کو بوکھلا دیا تھا اس سلسلے میں پہلے تو راجا نے لنگڑے بسودیا کی خبر لی پھر اس کے مشورے پر بذات خود چندر موہن کی خدمت میں حاضری دینے امر ناتھ کے مندر پہنچ گیا۔ چندر موہن نے شام تک دیوما کا سراغ لگانے کا دعویٰ کیا مگر ناکام رہا اس سے راجا چک ویر کے اعتماد کو دھچکا لگا اور وہ ناکام و نامراد مندر سے لوٹ آیا۔ اب وہ باغیوں کے علاقے پر یلغار کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دیوما ڈمکیری سے فرار ہو کر اپنگول ہی پہنچی ہو گی۔

کھیل شروع ہو گیا تھا مجھے معلوم تھا کہ وزیر دفاع بوپنا اپنی ہی ریاست کے ایک علاقے پر فوج کشی کے لئے ہرگز آمادہ نہیں ہو گا۔

☆=====☆=====☆

رات کو اتیتا وعدے کے مطابق آ گیا اور اس نے ہمیں پہاڑ کے دامن میں متروک دھرم شالہ تک بحفاظت پہنچا دیا۔ اس دھرم شالہ کے کھنڈرات میں ایک کمرا بہرحال اس قابل تھا جہاں ہم قیام کر سکتے۔ اتیتا ہمیں اس کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا تھا اس نے ہمارے لئے وہاں کھانے پینے کی اشیاء کا ذخیرہ بھی کر دیا تھا۔

"یہ تو بھوت نگری معلوم ہوتی ہے۔" اتیتا چلا گیا تو عادل نے سرگوشی کی اس نے اپنا بستر میرے قریب ہی بچھایا تھا۔

"خاموشی سے سو جاؤ ورنہ کوئی بھوت تم سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

پھر عادل نے میرا زیادہ مغز نہیں چاٹا طویل سفر کے بعد یہ پہلی رات تھی کہ ہم سکون سے سونے والے تھے۔ سبھی خاصے تھکے ہوئے تھے اس لئے جلد سو گئے مگر تھکن کے باوجود مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی کے ساتھ میں اس پُراسرار تجربے سے گزرنے لگی جو اب میرے لئے نیا نہیں تھا۔ یکے بعد دیگرے مجھے مختلف مناظر دکھائے جاتے رہے اور سرگوشیوں میں بہت کچھ بتایا جاتا رہا۔ ان مناظر کا تعلق ریاست کوڈگ اور راجا چک ویر سے تھا غالباً اس طرح مجھے ریاست کے ماضی اور حال سے آگاہ کیا جا رہا تھا۔ اور اس کا یقیناً کوئی نہ کوئی سبب تھا جس سے ابھی میں آگاہ نہیں تھی۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی' محسوس کر رہی تھی۔

پہلا منظر کسی میلے کا سا تھا۔ لوگ "گنگا اشنان" کر رہے تھے۔ ایک حسین و نوجوان لڑکی کا چہرہ میرے صفحہ ذہن پر ابھرا اس کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اس کی مانگ بھری ہوئی تھی یعنی وہ شادی شدہ تھی سونے کے زیورات سے لدی ہوئی اس لڑکی سے کچھ ہی فاصلے پر میں نے راجا چک ویر اور لنگڑے بسودیا کو دیکھا۔

"اس لڑکی کے بارے میں پتا لگا کہ یہ کون ہے' کس گھر کی ہے؟" راجا چک ویر نے حریص نظریں لڑکی کی طرف اٹھاتے ہوئے بسودیا کو مخاطب کیا۔

خلاف توقع بسودیا گھبرا سا گیا پھر کہنے لگا۔ "پتا لگاتا ہوں مالک!.......... مگر دو چار دن ٹھہر جائیں تو اچھا رہے گا۔"

"اچھا برا مجھے نہ سمجھا۔" راجا منہ بگاڑ کر بولا۔ "جو کہتا ہوں وہ کر زیادہ باتیں نہ بنا۔"

"مالک! یہ ساہوکار شیٹی کی بہو ہے۔ راج محل پہلے ہی شیٹی کا مقروض ہے اس کی بہو پر ہاتھ ڈالنا کچھ ٹھیک نہیں رہے گا۔" بسودیا نے بتایا۔ "شیٹی کے تعلقات بوپنا اور لکشمی نارائن دونوں ہی وزیروں سے ہیں بات کہیں بڑھ نہ جائے۔"

"تو نرا اُلو کا پٹھا ہے۔ ارے ہر کام کے لئے راستہ نکالا جاتا ہے۔ محل میں رانی کی سیوا میں لڑکی کو بھیجنے کے لئے بھی تو کہا جا سکتا ہے۔"

"سیوا کے لئے کہیں یا کچھ اور' ان کے لئے ایک ہی بات ہے مالک! وہ سمجھ جائیں گے کہ یہ آپ

کی خواہش ہے۔ شیٹی کسی طرح دب کر مان بھی جائے تو بیٹا نہیں مانے گا' بیٹا بھی اگر مان گیا تو اس کی ما نہیں مانے گی' بات بڑھ جائے گی مالک!"

"ہم نے ریاست کے خزانے کے لئے شیٹی سے کچھ رقم مانگی تھی یاد رہے تجھے کہ اس نے ہم کس طرح باتیں بنا کر بہلا دیا تھا۔ اس وقت کے حیلے بہانے کا نتیجہ اب اسے بھگتنے دے جو تجھ سے کہا اس پر عمل کر لڑکی کا مطالبہ کر اس سے' بہانہ رانی کا بنا۔"

"جو حکم میرے مالک!" بسودیا نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

منظر بدلا اور اب میں نے ایک ادھیڑ عمر شخص کے سامنے بسودیا کو بیٹھے دیکھا ادھیڑ عمر شخص کے چہرے سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔

"بسودیا جی ہمارے راجا جی تو ٹھیک ہیں نا؟"

"ٹھیک ہیں شیٹی جی!" بسودیا نے جواب دیا۔ "لیکن میں اس وقت ان کے پاس سے نہیں آر ہوں مجھے رانی ماں نے بھیجا ہے۔"

"رانی ماں نے بھیجا ہے۔" ادھیڑ عمر شیٹی حیرت سے بولا' پھر پوچھا۔ "ان کا کیا حکم ہے؟"

"ان کا حکم ہے کہ آپ کی بہو کچھ دن کے لئے راج محل میں راجکماری کے ساتھ رہے۔" بسودیا نے بتایا۔

شیٹی کے چہرے سے واضح طور پر معلوم ہونے لگا جیسے وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہے اس کے چہرے پر اب فکرمندی کے ساتھ ہی خوف کی پرچھائیاں بھی تھیں۔

"اچھی .... اچھی بات ہے بہو محل میں ضرور جائے گی .... میں اسے خود .... خود بھ دوں گا۔"

"کل بھیج دیں گے یہ کہہ دوں؟"

"مم .... میں خود .... انہیں .... بتا دوں گا۔"

بسودیا واپس چلا گیا شیٹی نے فوراً ہی اپنی بیوی کو بلایا اور اس سے کہا کہ بیٹے اور بہو کو فوراً آکل کوڈ (میسور) جانا ہے۔

پھر میں نے اسی حسین و نوجوان اٹھارہ سالہ لڑکی اور ایک نوجوان کو دو نوکروں کے ساتھ ڈیکری کی حدود سے نکلتے دیکھا اسی کے بعد مجھے شیٹی راج محل میں نظر آیا وہ باادب رانی گورما کے سامنے کھڑا تھا۔

"کہئے کیا بات ہے شیٹی جی! کیسے آئے؟" رانی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

شیٹی کہنے لگا۔ "کچھ دن بعد بنگلوں کے انگریزوں کو بھوجن دینا ہے۔ سنا ہے کہ اس کے لئے کچھ سامان چاہئے۔ انگریزوں کے لئے ضروری سامان بنگلور ہی سے منگوانا پڑتا ہے پہلے سے تفصیل پتا چل جائے تو آسانی ہو گی اسی بات کی پرارتھنا کے لئے آیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ہم بسودیا سے کہلا بھیجیں گے۔"

"ایک بات اور تھی رانی ماں۔" شیٹی کی آواز دھیمی ہو گئی۔ "سنا ہے آپ نے حکم دیا ہے کہ راج

محل میں سیوا کرنے کے لئے ہمارے گھر سے کسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ کیا کام ہے؟ کسے بھیجوں؟ یہ بھی پوچھنا تھا۔"

رانی گورما کے چہرے پر یہ سن کے ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔ "ہاں .... ہی نے کہا تھا کہ راجکماری کے ساتھ دل بہلانے کو کوئی لڑکی چاہئے وہی بات شاید آپ تک پہنچی ہو گی ہم کہلا بھیجیں گے جب ضرورت ہوئی' تب تک کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔"

"جو حکم رانی ماں!" شیٹی اجازت لے کر اٹھ کر کھڑا ہوا۔

شیٹی ہی کا چہرہ پھر مجھے ایک نئے منظر میں دکھائی دیا وہ لنگڑے بسودیا کو اپنی نشست گاہ میں بٹھا رہا تھا وہ بسودیا سے انگریزوں کو دی جانے والی دعوت کے بارے میں بات کرنے لگا تو بسودیا نے کہا۔ "ابھی راجا جی نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ آپ یہ بتائیں بہو کو کب راج محل بھیجیں گے؟"

"گاؤں سے آتے ہی بھیج دوں گا۔"

"کس گاؤں سے؟ کل تو وہ یہیں تھی نا" بسودیا حیران سا ہو کر بولا۔

"گھر میں کون سی لڑکی ہے اور کون سی نہیں کیا یہ باتیں سب کو بتانے کی ہوتی ہیں؟ رانی ماں نے بھیجنے کے لئے کہا ہے بھیج دوں گا۔ آپ یہ پوچھ رہے ہیں کہ کب بھیجوں گا تو کہہ دیجئے گاؤں سے واپس آنے کے بعد بھیج دوں گا۔"

"تو مجھے ساری بات صاف صاف بتانا پڑے گی۔" بسودیا نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "یہ راجا جی کا حکم ہے کہ وہ لڑکی ان کے خاندان کے ساتھ رہے۔"

"یہ تو بڑی عزت کی بات ہے ضرور بھجوائیں گے انہیں اطلاع دے دیجئے۔"

"شیٹی جی یہ رانی ماں کی بات نہیں ہے شاید آپ جان کر بھی انجان بن رہے ہیں' رانی ماں سے تو اس کا تذکرہ بھی نہ کریں۔"

"کل ہی بات کیوں نہیں بتائی تھی بسودیا جی! میں تو رانی ماں سے یہ تذکرہ کر بیٹھا۔"

"تو یہ کہئے کہ آپ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ راجا جی کا حکم ہے۔" بسودیا کے لہجے میں طنز تھا۔

پھر میں نے مختلف مناظر دیکھے اور پتا چلا کہ شیٹی کی بہو کا معاملہ کس حد تک طول کھینچ گیا۔ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ دونوں وزیروں بوپنا اور لکشمی نارائن نے رانی گورما سے ملنے کا فیصلہ کیا کہ راجا کی جگہ رانی ریاست کی ذمے داری قبول کر لے' وہ دونوں اسی سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے۔ لکشمی نارائن ابھی پوری طرح اس فیصلے سے متفق نہیں تھا وہ بوپنا سے کہنے لگا۔ "یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس سے بغاوت کی بو آتی ہے۔"

"بغاوت نہیں ہونا چاہئے۔ یہ سوچ سوچ کر اتنا وقت گزار دیا۔ کہا جاتا ہے شکایت راجا تک لے جانا چاہئے لیکن راجا ہی غلطی کرے تو کس سے شکایت کی جائے؟ کسی لڑکی کو پکڑ لاتے ہیں' اسے خراب کرتے ہیں اور پھر محل سے باہر نکال دیتے ہیں۔ کون سی لڑکی خود آئی' کسے زبردستی لے جایا گیا' اس پر ہم نے بھی دھیان نہیں دیا آج شیٹی کی بہو پر ہاتھ ڈالا جا رہا ہے تو پھر کل ہمارے گھر پر' پرسوں آپ کے گھر پر

ہاتھ ڈالا جائے گا اسے روکنا بغاوت نہیں ہے۔" بوپنا سخت غصے میں تھا۔

"کوڈگی لڑکیوں پر اور برہمنوں کی بیٹیوں پر کیا آج ہی انہوں نے ہاتھ ڈالا ہے؟ مگر اسے روکا جائے؟"

"میں کہہ تو چکا ہوں کہ راجا کو گدی سے ہٹا دیا جائے۔ کیا پرانوں میں نہیں کہا گیا کہ شہر کے کو پانی میں ڈبونے کی وجہ سے راج پتر کو جنگل میں بھیج دیا گیا۔ دیش کی جنتا کو تنگ کرنے کی وجہ سے بین رس کا سر نہیں اڑا دیا گیا؟ میرا خیال اب بھی یہی ہے کہ رانی ماں کاروبار حکومت چلا سکتی ہیں۔"

"اس سے بات نہیں بنے گی بوپنا جی! پتی اگر یہ کہے کہ یہ کام کرنا ہی پڑے گا تو پتنی کو کرنا ہی ہے اقتدار تو اس طرح راجا جی ہی کے ہاتھ میں رہے گا۔"

"اگر آپ سمجھتے ہیں تو راجکماری کو گدی پر بٹھایا جا سکتا ہے۔"

"یہ تو اور بھی برا ہوگا راجکماری باپ کا حکم کیسے ٹال سکے گی۔"

"یہ دونوں نہ سہی تو راجا کی بہن دیوما سہی۔"

"آپ کو عورتیں ہی نظر آ رہی ہیں بوپنا جی کوئی عورت کس طرح حکومت چلا سکتی ہے؟"

"تو پھر اس سلسلے میں رانی ماں ہی سے مشورہ کرتے ہیں ممکن ہے وہ کوئی بہتر صورت نکال سکیں۔"

دونوں اس پر متفق ہو گئے پھر میں نے انہیں راج محل میں رانی گورما سے یہی گفتگو کرتے دیکھا۔ ابھی یہ گفتگو ادھوری تھی کہ بغل کے دروازے پر کسی کا سایہ دکھائی دیا۔ آنے والا راجا چک دیر تھا۔ چہرے سے نشے میں غرق لگتا تھا اسی کے ساتھ بسودئیا تھا۔

"تُو کیا حرامی پن کر رہی ہے' یہ پتا لگانے میں خود ہی چلا آیا۔" راجا سخت برہم لہجے میں چیخا۔ "کیا کر رہی ہے حرام زادی اس برہمن کے ساتھ؟" اس نے لکشمی نارائن کی طرف ہاتھ اٹھایا پھر بوپنا کی طرف غصے سے دیکھ کر کہا۔ "یہ تیرا رشتے کا بھائی کیوں آیا ہے یہاں؟"

رانی دونوں وزیروں کی طرف رخ کر کے بولی۔ "یہ سب باتیں آپ لوگوں کے سننے کی نہیں ہیں بوپنا جی اور پنڈت جی یہ ہمارے گھر کی بات ہے۔" یہ کہہ کر وہ راجا کی طرف مڑی۔ "میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی یہاں کوئی جرم نہیں ہوا۔"

راجا چک دیر اور بھی غضب ناک ہو گیا۔ "جرم نہیں ہوا بتا دوں گی سب کچھ۔" پھر وہ کہنے لگا۔ "تُو بتائے گی مجھے .... ٹھہر جا تجھے تو میں بھنگیوں کے آگے ڈالوں گا۔ بوپنا تیرا رشتے کا بھائی ہے اور تُو اس کی رانی ماں ہے .... خوب ہے اس سے تیرا رشتہ' کیا تجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے' جی بہلانے آیا ہے تیرا یہ بھائی .... بولو تم کیوں آئے ہو یہاں؟" راجا غصے کے عالم میں بوپنا کی طرف بڑھا۔

بوپنا کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو گیا وہ جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ لکشمی نارائن نے اسے روک دیا۔ "بوپنا جی آپ کچھ نہ بولیں۔"

رانی گورما اب بھی پُرسکون معلوم ہو رہی تھی وہ راجا سے مخاطب ہوئی۔ "وزیروں کو میں نے بلایا تھا' کام تھا' یہ سب میں بعد میں بتاؤں گی۔ اس وقت آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ذرا بیٹھ جایئے بعد میں بات کریں گے۔" رانی بوپنا اور راجا کے درمیان میں آ گئی۔

"حرام زادی اپنے یار کو بچانے آ رہی ہے۔" یہ کہہ کر راجا نے رانی کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ بوپنا نے راجا کو روکنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر لکشمی نارائن نے اسے پیچھے سے کھینچ لیا۔ راجا کا ہاتھ رانی کے سر پر لگا۔ رانی نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا' اتنے میں غصے سے ہانپتے ہوئے وہ ایک طرف جھک گیا اور پھر جھکتا ہی چلا گیا۔

رانی نے ہاتھ پھیلا کر اسے گرنے سے بچایا اور بولی۔ "ادھر آؤ بسودئیا راجا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں یہاں سے لے جا کر لٹانا ہے۔"

راجا چک دیر بے ہوش ہو گیا۔ رانی اسے اٹھوا کر ملازمین کی مدد سے اندر لے گئی۔ بوپنا لکشمی نارائن کے ساتھ وہاں سے چلا آیا اور راج محل سے نکلتے ہی اس کا غصہ ابل پڑا وہ بولا۔ "آپ نے دیکھا یہ بھک منگا راجا کیا کیا بکواس کرنے لگتا ہے۔ ایک کوڈگی عورت اس کی ماں تھی اور کوڈگی عورت ہی اس کی بیوی ہے اس کے باوجود یہ ابھی تک کوڈگیوں کو سمجھ نہیں سکا۔ کیا یہ ہمیشہ ہی راجا بنا رہے گا؟ آپ بتائیں پنڈت جی کیا میں اتنی ذلت سہہ کر بھی اس کا منتری (وزیر) بنا رہوں؟"

"بوپنا جی! آپ نے ابھی تک راجا کو نہیں سمجھا' ان کی تربیت کسی اچھے ماحول میں نہیں ہوئی' مناسب تعلیم بھی نہیں ملی ایسی باتیں سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں یہ راجا کے اپنے گھر کا معاملہ ہے ہمارا آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ہم ہی بات بات پر غصہ کرتے رہیں تو دیش کا کیا ہوگا؟"

"دیش کی بات اور ہے پنڈت جی! اس کی کہانی ایک روز ختم ہونا ہی ہے ایسے راجاؤں کے ہاتھوں میں دیش کبھی نہیں پنپتا۔ یہ راجا تو بھک منگا ہے' خزانے کے لئے جب دیکھو ساہوکاروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا رہتا ہے۔ بھک منگوں میں بڑا پن کیسے آ سکتا ہے؟ راجا بننے پر بھی بڑا پن نہیں آ سکا۔ اسی سر زمین نے بڑے بڑے راجاؤں کو دیکھا ہے جنہوں نے اس کا نام روشن کیا اب ایک کیڑا پیدا ہوا ہے جو کوڈگ کی سرزمین کو بدنام کر رہا ہے کوئی نہ کوئی اس کا سر ضرور کچلے گا' اسے ختم کر دے گا۔"

زمانہ ساز پنڈت لکشمی نارائن نے بمشکل بوپنا کا غصہ ٹھنڈا کیا اور اسے کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے روک دیا۔

پھر میری بند آنکھوں نے اس رات آخری منظر دیکھا۔ بسودئیا راجا چک دیر سے مخاطب تھا۔ "میں بھگوتی کے یہاں پوجا کرانے جا رہا ہوں رانی ماں بھی اس میں شامل ہے تمام بندوبست ہو چکا ہے مالک!"

"بھاڑ میں جا اب ان باتوں اور پوجا پاٹ سے کیا فائدہ؟"

"فائدے کے لئے ہی تو جا رہا ہوں راجا جی اگر بھگوتی کی پوجا سے فائدہ ہو جائے تو گئی جوانی واپس آ جائے گی۔"

"واپس آئے گا تیرا سر' اب اس جسم میں رکھا ہی کیا ہے۔ تیرے ساتھ جوانی کا کھیل کھیل کر میں اب زندہ لاش بن گیا ہوں جسم میں نام کو طاقت نہیں رہی کتنے دن سے کمزوری کے سبب اسی طرح بستر پر پڑا ہوں۔"

"بیچ میں ایک دفعہ آپ ٹھیک ہو چلے تھے مگر وید کی بات مانے نہ میری' رین نواس سجالیا۔ راتوں کے سکھ کی خاطر کتنی راتیں جاگ کر گزارنا پڑیں۔ پھر بھی فکر کی کوئی بات نہیں وہی دن رات لوٹ آئیں گے ہر رات کو رین نواس (خواب گاہ) پہلے ہی کی طرح سجا کرے گی ابھی سے آپ کی دل لگی کے لئے میں نے انتظام کر لیا ہے۔ طبیعت کا کیا ہے آج خراب ہے تو کل ٹھیک ہو جائے گی آپ دیکھ رہیں بھگوتی کی پوجا کا کیا اثر ہوتا ہے۔"

"تجھے منع کس نے کیا ہے؟ جو کر سکتا ہے' جا کر۔"

روانگی سے قبل بسودیا نے پوجا کا سامان دس آدمیوں کے سروں پر اٹھوا کے بھیج دیا آدمی واپس گئے تو بسودیا اکیلا بھگوتی کے آشرم پہنچا۔ گھوڑے سے اتر کر وہ پیدل ہی سامنے پہاڑی کے دامن میں نظر آنے والے آشرم کی طرف بڑھا۔

آشرم کے چاروں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ اندر جانے کے لئے جھاڑیوں کے درمیان ہی ایک راستہ تھا وہاں ایک عورت کھڑی تھی وہ لنگڑے کو اشارے سے بلا کر اندر چلی گئی۔

پہاڑ تلہٹی میں واقع زمانہ قدیم کی یہ ایک گپھا تھی جسے لوگوں نے اب بھگوتی کا آشرم کہنا شروع کر دیا تھا بھگوتی نے اس گپھا کے سامنے لکڑیوں سے دیوار بنوائی تھی گپھا کے سامنے ایک دروازہ تھا دروازہ پر ایک ڈھلوان پتھر تھا اس پر بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس جگہ کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کوئی خاص اور متبرک مقام ہے۔

آشرم کے دروازے پر بھگوتی کی صورت دکھائی دی تو بسودیا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا اور آگے قدم بڑھایا۔

بسودیا لنگڑاتا ہوا دروازے کے پاس آ رہا تھا تو بھگوتی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ ادھیڑ عمر کے باوجود وہ ایک باوقار اور حسین عورت لگتی تھی۔ چہرے کے نقوش تیکھے اور پُرکشش تھے لنگڑا بھگوتی کے پُروقار حسن سے متاثر معلوم ہو رہا تھا وہ بھگوتی کے قریب پہنچا تو اندر آنے کا اشارہ کر کے بھگوتی مڑ گئی۔

بسودیا کو بھگوتی گپھا میں لے گئی۔ درمیانی حصے میں جو دروازے والا ایک کمرہ تھا وہاں دیے کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ بائیں طرف کے کمرے میں روشنی کم تھی عقبی دیوار کے ایک ہالے میں کوئی تصویر تھی جس کے سامنے دیا جل رہا تھا۔

بھگوتی نے بسودیا کو دروازے کے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اندر چلی گئی۔ کمرے کے درمیان میں دروازے کے رخ ایک مورتی رکھی تھی جو لوہے کی بنی ہوئی تھی مورتی چمکدار تھی اور عام مندروں میں پائی جانے والی مورتیوں سے مختلف تھی۔

بسودیا کے چہرے سے خوف سا جھلکنے لگا وہ فضا ہی ایسی تھی۔ بھگوتی مورتی کے سامنے ایک کتاب کھول کر بیٹھ گئی اس نے مورتی کے دونوں طرف کی بتیوں کو ٹھیک کر کے روشنی بڑھائی بسودیا کی طرف دیکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود کتاب سے منتروں کا جاپ کرنے لگی۔

یہ جاپ خاصی دیر تک چلا۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ بھگوتی مورتی کے چرنوں میں پھول چڑھاتی جاتی اور مورتی پر نظریں جما کر ہاتھ جوڑتی تھی۔

پوجا نہایت پُرسکون انداز میں ختم ہوئی اور بھگوتی اٹھی اس نے بسودیا کو بھی کھڑے ہونے کا اشارہ کیا پہلے سے تیار رکھا کافور آرتی کی تھال میں جلا کر بھگوتی نے مورتی کی آرتی اتاری' آرتی اتارتے ہوئے وہ کچھ پڑھ رہی تھی۔

آرتی اتار کر بھگوتی نے چار پانچ مٹھی پھول محل سے آئی ہوئی تھالیوں میں ڈال دیئے اور پھر انہیں کر بسودیا کے سامنے رکھ دیا۔

"آج کی پوجا ختم ہوئی۔" بھگوتی نے کہا۔ "یہ پوجا کم سے کم پانچ دن چلے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" بسودیا نے جانے کے لئے قدم اٹھایا۔

اسی لمحے بھگوتی نے تیزی سے آگے بڑھ کر بسودیا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا پھر یوں لگا جیسے بھگوتی سسک رہی ہو۔ چند ہی ساعتوں کے بعد بھگوتی کی بانہوں کا حلقہ کھل گیا اور وہ بسودیا سے دور جا کھڑی ہوئی۔

"اب یہاں مت ٹھہرو' جاؤ یہاں جو کچھ ہوا ہے کسی سے مت کہنا۔" یہ کہتے ہی بھگوتی پوجا گرہ میں چلی گئی اور بسودیا اسے حیران حیران سی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

پھر کوئی منظر میری بند آنکھوں میں نہیں جاگا میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس عورت کا رویہ میرے لئے بھی پُراسرار تھا وہ عورت کون تھی؟ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں تیر رہے تھے؟ متعدد سوالات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے مجھے یہ مناظر کیوں دکھائے گئے تھے؟ میں سوچنے لگی اور پھر مجھے سرگوشیوں میں بھگوتی کے متعلق سب کچھ بتا دیا گیا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی اور ژیان کے سوتیلے بھائی جذیل کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم گیا۔

اس کے بعد میرا ذہن پُرسکون ہو گیا اور آنکھ لگ گئی۔

☆======☆======☆

دوسرے ہی دن صبح میں عظیم مہین کی تاکید کے مطابق بھگوتی سے ملنے اس کے آشرم میں پہنچ گئی اس سے مجھے بہت کچھ معلوم ہونا تھا۔

بھگوتی اس وقت پوجا کر کے باہر آ رہی تھی مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"کون ہو تم؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔ "تمہیں میں نے پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔"

"بھگوتی! بیٹھنے کو نہیں کہو گی؟" میں نے اسے دانستہ نام لے کر مخاطب کیا۔

"تو میرا نام بھی جانتی ہو تم.......... بیٹھو۔"

فرش پر دری بچھی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور بولی۔ "تم ایک روشن ضمیر عورت مشہور ہو بھگوتی! مگر تمہارے اندر اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب ہے اس سے تمہارا؟" بھگوتی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"تمہارے اندر اتنا حوصلہ بھی نہیں کہ اپنی اولاد کو اپنا کہہ سکو' بولو کیا ایسا نہیں ہے؟" میں نے ا چہرے پر نظر ڈالی۔

"تم.......... تم کیا کہہ رہی ہو میں سمجھی نہیں۔" وہ گھبرا سی گئی۔

"شاید تم سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہتیں' ٹھیک ہے پھر میں خود ہی بسودیا کو بتا دوں گی کہ تم اس ہو۔"

"نہیں۔" وہ تقریباً چیخ اٹھی۔ "ابھی ایسا ہرگز نہ کرنا۔" بھگوتی کی آواز دھیمی ہو گئی۔ "لیکن تم... تم میرے بیٹے کو کیسے جانتی ہو؟"

"میں تو اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں بھگوتی!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "کیا راجا چک ویر لنگ راج تمہارا شوہر نہیں تھا اور اپنی جان کے خوف سے تم راج محل چھوڑ کر بھاگ نہیں گئی تھیں؟ لنگ نے تمہارے بیٹے کو بھی ایک رات نشے اور غصے کے عالم میں مارنا نہیں چاہا تھا؟ اس نے بسودیا کا پیر مو اور تم نے اپنے بیٹے کو مرنے سے بچا لیا تھا اس شرط پر کہ تم لنگ راج کی زندگی سے نکل جاؤ گی۔ لنگ را تمہیں دھمکی دی تھی کہ اگر راج محل چھوڑ کر نہ گئیں تو وہ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو قتل کر دے گا۔ محض لئے لنگ راج تمہیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ تمہارا تعلق کسی معزز گھرانے کی بجائے گانے بجانے ایک خاندان سے تھا۔ بھگوتی! تم نے ایک معمولی مغنیہ ہو کر اقتدار پر اپنے حق کا دعویٰ کیا تھا یہی تمہار ٹھہرا۔ لنگ راج تمہیں اپنی پہلی بیوی دیوکا کے برابر حق دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ لنگ راج کو مرے برسو گئے تو اب تم لوٹی ہو تاکہ جو حق تمہیں نہ مل سکا اپنے بیٹے بسودیا کو دلا سکو یہی بات ہے نا!"

میری باتیں سن کر بھگوتی پر سکتہ سا طاری ہو گیا' پھر اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگ کے خوف کی وجہ سمجھنا میرے لئے مشکل نہیں تھا میں نے اس سے جو کچھ کہا تھا اگر راجا چک ویر کے علم جاتا تو پھر اس کے بیٹے بسودیا کو قتل کر دیا جاتا اور خود اسے بھی زندہ نہ چھوڑا جاتا۔

"سنو بھگوتی!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "ذرومت میں بہت دور سے دیوتاؤں کے حکم پر تمہار کرنے آئی ہوں۔ میرا نام کرن کماری ہے اور میں دیوتاؤں کی چہیتی ہوں اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے تمہارے کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوتا۔"

"تم نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا۔" بھگوتی آخرکار بول ہی اٹھی۔ "تم واقعی چچی اور دیوتاؤ چہیتی ہو؟" بھگوتی مرعوب لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "مگر کماری یہ طرح ممکن ہے؟ لنگ راج کا بڑا بھائی بھی تو اپنے بیٹے ویرنا کو ریاست کی گدی پر بٹھانا چاہتا ہے وہ یہاں جی کا بھیس بھرے پھرتا ہے اس نے میرے سوتیلے بیٹے چک ویر کے خلاف ایک تنظیم پر بھی تو قبضہ جما اس تنظیم کا نام فرزندان کاویری ہے تمہیں پتا ہی ہو گا۔"

"ہاں معلوم ہے۔" میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ "سوامی جی" کی شخصیت سے بھی پردہ ا تھا۔

"لنگ راج کے بڑے بھائی کا نام کری اپا ہے میرا مطلب اصل نام سے ہے' اس کا بیٹا ویرنا اسی نم

بنا سی بنا پھرتا ہے۔" بھگوتی نے مزید بتایا۔ "مجھے یہاں آئے بہت دن ہو گئے ہیں اور میں بہت کچھ معلوم کر چکی ہوں۔ میں نے انگریز سرکار کو بھی اس سلسلے میں خط لکھے ہیں کہ میرا حق دلایا جائے۔"

"تمہارے سوتیلے بیٹے راجا چک ویر کا بہنوئی چین بسو بھی تو حکومت کا دعویدار ہے اس نے بھی تو انگریز حکام کو خط لکھے ہوں گے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو کماری! مجھے تو کری اپا پر بھی یہی شبہ ہے کہ وہ راج پاٹ اپنے بیٹے کو دلانے کے لئے انگریزوں سے سازباز کر رہا ہے۔ اب تمہی بتاؤ کہ ایسی صورت میں اگر چک ویر کو گدی سے کسی طرح اتار بھی دیا گیا تو مجھے میرا حق کیسے ملے گا؟"

"تم ایک بات شاید اور بھول گئیں بھگوتی کہ مقامی باشندے جنہیں کوڈگی کہا جاتا ہے' چک ویر کو گدی سے اتار کر رانی گورما یا اس کی بیٹی راجکماری پٹما کو بھی ریاست کا حکمراں بنا سکتے ہیں۔ رانی گورما بہرحال کوڈگ ہی کی ہے سو یوں راجا چک ویر کے اقتدار سے ہٹنے کے بعد بھی حکمرانی کے پانچ افراد دعویدار ہو سکتے ہیں۔ ایک تو تمہارا ہی بیٹا بسودیا' دوسرا چک ویر کا تایا زاد ویرنا' تیسرا بہنوئی چین بسو چوتھی رانی گورما اور پانچویں راجکماری پٹما۔"

"پھر یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی؟ تم کس طرح میری مدد کرو گی؟" بھگوتی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"اس کا جواب تمہیں آنے والا وقت دے گا۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کماری! تم یہاں مڈکیری میں کہاں ٹھہری ہو؟" وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

"تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "فی الحال تمہارے لئے اتنا ہی جان لینا کافی ہے۔"

"پھر کب آؤ گی؟" اس نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے معلوم کیا۔

"کچھ خبر نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تم سے جو کہنا تھا کہہ چکی اور دیوتاؤں کے حکم پر جو کرنا ہو گا اس کے لئے میرا تم سے ملتے رہنا ضروری نہیں۔"

"ہاں میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی پچھلے ہفتے مجھ سے ایک انگریز افسر بھی آ کر ملا تھا اس نے بھی مجھ سے میری مدد کا وعدہ کیا تھا' اپنا نام شاید اس نے رابرٹ بتایا تھا رابرٹ کے ساتھ کچھ اور بھی لگا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔"

آگے بڑھتے بڑھتے میرے قدم جیسے خود بخود رک گئے میں چونک کر بولی۔ "اپنا نام.......... پورا نام اس نے رابرٹ ہیم تو نہیں بتایا تھا؟"

"ہاں یہی پورا نام تھا اس کا۔ کہہ رہا تھا کہ اس نے میسور کے کمشنر کے پاس میرا خط دیکھا تھا۔"

"ایک بار مل کر پھر تو وہ نہیں آیا؟"

"نہیں۔" بھگوتی بولی۔ "کیا تم اسے بھی جانتی ہو کماری؟"

"ہاں بہت اچھی طرح۔" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

پھر میں بھگوتی کے پاس مزید رکی نہیں اور چلی آئی عظیم مہین نے بلاسبب مجھے یہ تاکید نہیں کی تھی کہ

میں بھگوتی سے ضرور ملوں۔ بھگوتی سے مجھے بہت سے حقائق کا علم ہو گیا تھا۔ "فرزندان کاویری" کے با میں میرے اندازے بڑی حد تک درست ثابت ہوئے تھے۔ اس تنظیم کی آڑ میں اقتدار کے حصول کا کھیلا جا رہا تھا۔

موجودہ صورت حال میں میرے لئے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں تھا کہ ریاست کوڈگ کا مستقبل گا۔ اقتدار کے مختلف دعویداروں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر انگریز حکمراں پورے ہندوستان کی طرح ریاست پر بھی قبضہ کر لیتے۔ یہاں تک ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ رابرٹ کے قدم پہنچ جانا اسی طرف اشا رہا تھا۔ ریاست پر انگریزوں کے قبضے سے قطع نظر مجھے اب اپنے معاملے کی فکر تھی جس کی خاطر میں طویل اور دشوار گزار سفر کیا تھا۔ مجھے چندر موہن اور ژیان سے نمٹنا تھا جو مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے۔

میں دھرم شالہ کے کھنڈرات میں واپس پہنچی تو اپنی عادت کے مطابق عادل نے مجھے چھیڑا۔ "میں بابو سے ابھی کہنے ہی والا تھا کہ باہر جا کر آپ کو دیکھوں۔"

"وہ کس لئے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کو گئے بہت دیر ہو گئی تھی اور بتا کر بھی نہیں گئی تھیں کہ کہاں جا رہی ہیں' یہ علاقہ بہرحال کے لئے اجنبی ہے۔"

"ابھی جب آپ گئیں تو انیتا سوامی جی کا پیغام لے کر آیا تھا سوامی جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں انیتا شام پھر آئے گا۔" شیام بابو نے بتایا۔

"سوامی جی کا بھید کھل ہی گیا شیام بابو!" میں دھیرے سے طنزیہ انداز میں ہنسی۔ "میں نے پہلے بھی سے اپنے شک و شبہے کا اظہار کیا تھا۔

"جی ہاں مگر ہوا کیا؟" شیام بابو نے حیرت سے پوچھا۔

"ہوا تو خیر کچھ نہیں لیکن.........." پھر میں نے شیام بابو کو "فرزندان کاویری" کے اصل اغرا مقاصد سے آگاہ کر دیا پھر بولی۔ "اس کے باوجود ان لوگوں سے بگاڑنا نہیں ہے بس اتنا ہے کہ سرفروش تنظ ان کے بارے میں جو غلط فہمی تھی وہ دور ہو گئی' وہ لوگ بھلا انگریزوں سے کیا لڑیں گے جو اپنے اپنے اقتدار حصول کی خاطر انگریزوں ہی سے مدد چاہتے ہوں۔ سارے ہندوستان میں انگریزوں کو پیر جمانے کا موقع ایسے لوگوں نے تو دیا ہے۔"

"پھر تو یہی لگتا ہے کہ یہاں غاصب انگریز آزمائی ہوئی چالیں چلے گا۔" شیام بابو نے میری رائے اتفاق کیا۔ کویتا اس دوران میں کچھ نہیں بولی یہ باتیں اس کے کرنے اور سوچنے کی تھیں بھی نہیں' ایسے مو پر عموماً وہ خاموش ہی رہتی تھی اس کا جو بھی تعلق اور واسطہ تھا مجھی تک تھا وہ کبھی متعینہ حدود سے تجاوز کرتی تھی۔

اس کے بعد میں نے شیام بابو اور عادل کو حکومت کے دوسرے دعویداروں سے آگاہ کر دیا اور بھگ کے بارے میں بھی کچھ نہیں چھپایا اسی دوران میں رابرٹ ہیم کا ذکر بھی آ گیا اس پر عادل نے کہا۔ "وہ یہاں رکا نہیں ہوگا بھگوتی سے مل کر میسور چلا گیا ہوگا۔"

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" شیام بابو کے چہرے سے الجھن ظاہر ہونے لگی۔

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"بھگوتی کو اس نے اپنا صحیح نام کیوں بتایا؟ بحیثیت انگریز افسر وہ کوئی بھی فرضی نام بتا سکتا تھا رابرٹ ہیم ایسے لوگ اتنے غافل نہیں ہوتے۔" شیام بابو نے جواب دیا۔

"ہاں یہ ایک نکتہ ضرور قابل غور ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "اسے خود یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام تو وہ اپنے کسی بھی ایجنٹ سے لے سکتا تھا۔"

عادل نے بھی مجھ سے اتفاق کیا اور بولا۔ "کماری! لگتا ہے کہ رابرٹ ہیم نے آپ کو الجھانے کے لئے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ آپ اس کی تلاش میں میسور کا رخ نہ کریں۔"

"مجھے فی الحال میسور جانے کی کیا ضرورت ہے میرا اصل شکار ژیان تو یہیں کوڈگ میں ہے۔"

پھر میں خاموش ہو گئی اور مزید گفتگو نہیں کی۔ شیام بابو یا عادل نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ میں نے بھگوتی کی زبان کیسے کھلوائی۔

وہ دن بھی میں نے رائیگاں نہیں گزارا میں نے کویتا سے کام لیا عیاش و ظالم راجا چک ویر کی قید میں جو معصوم و بے گناہ لڑکیاں تھیں انہیں رہائی دلا دی۔ ایسا کرنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ راج محل میں ان لڑکیوں کے پُراسرار فرار سے کھلبلی سی مچ گئی کویتا کے ذریعے مجھے سب کچھ معلوم ہوتا رہا لنگڑے بسودیا اور لڑکیوں کی نگراں وِدّو کی مصیبت آ گئی۔

راجا چک ویر جنون میں مبتلا ہو گیا اسی عالم میں اس نے انیتا کو بھی راج محل سے نکال دیا کیوں کہ وہی راج محل کے محافظ دستے کا نگراں تھا۔ چک ویر کا خیال یہ تھا کہ راج محل میں اس کے خلاف کوئی گہری سازش ہو رہی ہے جس میں انیتا بھی شامل ہو سکتا ہے۔

انیتا بہرحال وزیر دفاع بوپنا کا بھانجا تھا۔ اس پر سازش کا الزام یا عدم اعتماد کا اظہار معمولی بات نہیں تھی۔ مڈکیری کے باشندے اب کھلے عام راجا چک ویر کے خلاف بولنے لگے۔ پہلے وہ ایسی باتیں کرتے ہوئے ڈرتے تھے کیوں کہ ریاست پر "تک" برادری کی وجہ سے راجا کی گرفت مضبوط تھی اب اسی برادری یا ذات کے ایک نمایاں فرد کو راج محل سے نکال دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک نیچ ذات شخص کو دے دی گئی تھی یہ نیا نگراں بسودیا کا خاص آدمی تھا۔

شام ہوتے ہوئے مڈکیری میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ "تک" ذات کے لوگ اپنی اس بے عزتی پر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ یہ بھی سنا گیا کہ ریاست کا وزیر دفاع بوپنا بھی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے رہا ہے میں اس عرصے میں دھرم شالہ سے نہیں نکلی البتہ اس کمرے سے کویتا کو ساتھ لے کر باہر ضرور آ گئی جہاں عادل اور شیام بابو موجود تھے۔ دھرم شالہ کے کھنڈرات میں کئی ایسی جگہیں تھیں جہاں میں چھپی رہ سکتی تھی۔

حسب وعدہ شام کو انیتا آ گیا اسے میں نے دور ہی سے کھنڈرات کی طرف آتے دیکھ لیا تھا اور پھر میں اس کمرے میں آ گئی تھی جس کی دیوار اور چھت سلامت تھی میں نے محسوس کر لیا کہ انیتا کچھ فکر مند سا ہے لیکن اس نے پہلی بات وہی کی جس کے لئے آیا تھا۔

"تم نے پوچھا بھی سوامی جی سے کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے دریافت کیا زبان کوڈگی ہ بولی۔

"آپ اس ریاست میں بہرحال ہماری مہمان ہیں اور سوامی جی ہمارے سربراہ ہیں۔ میزبان سے مہما کی ملاقات ہی نہ ہو تو عجیب ہی سا لگے گا۔ سوامی جی نے آپ کو آج رات کھانے پر بھی مدعو کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہلوایا ہے کہ موجودہ حالات میں اگر آپ سمادھی تک نہ آنا چاہیں تو وہ خود بھی یہاں آ سکتے ہیں۔ اتیٹا نے مؤدب انداز میں اپنے سربراہ کا پیغام مجھ تک پہنچایا جس کی حقیقت سے میں باخبر ہو چکی تھی۔ اس اصل نام کری اپا تھا مگر "فرزندان کادیری" کو نہ اس نے اپنی اصلیت سے آگاہ کیا تھا نہ اصل نام بتایا تھا اتیٹا او دوسرے نوجوانوں کو بس یہی معلوم تھا کہ اس کا اصل نام شیو کمار ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

لوگ اپنی اصل شخصیت چھپانے کے لئے کتنے پردے ڈالتے ہیں۔ میں نے سوچا' مجھے علم تھا کہ لنگ راج کے دو بھائی اور تھے سب سے بڑا راجا راجندر تھا پھر کری اپا' سب سے چھوٹا لنگ راج تھا تینوں بھائیوں م سے دو مر چکے تھے یعنی راجا راجندر اور لنگ راج' ایک بھائی کری اپا زندہ تھا۔ لنگ راج ایسے عیار و سفاک شخص نے اسے کس طرح زندہ چھوڑ دیا؟ یہ سوال بہرحال جواب طلب ضرور تھا' ہرچند کہ مجھے اب ا ریاست کے سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی پھر بھی کری اپا کی دعوت قبول نہ کرنا خلاف مصلحت تھا "فرزندان کادیری" کی سمت سفر لاکھ غلط سہی میں مہمان انہی کی تھی' کچھ سوچ کر میں نے دعوت منظور ک لی۔

"سوامی جی کو یہاں آنے کی زحمت دینا ٹھیک نہیں۔" میں نے مزید کہا۔ "یوں بھی میرے اندازے کے مطابق وہ خاصے ضعیف ہوں گے۔"

"جی ہاں ان کی عمر اسّی سال سے زیادہ ہے مگر بھگوان کی کرپا سے اب بھی سیدھے چلتے ہیں۔" اتیٹا۔ بتایا پھر خود ہی کہنے لگا۔ "راجا راجندر کی سمادھی کے ساتھ ہی سادھو سنتوں اور پوجا کرنے والوں کے لئے کم زمانے میں پختہ کمرے بنوائے گئے تھے۔ جو راج کرتا ہے دراصل جنتا (عوام) اسی کو مانتی جانتی ہے گزر جا۔ والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ سنا ہے کہ جب تک راجا راجندر کی پتری (لڑکی) وستو جی راج سنگھاسن پر براجما رہیں تو سمادھی پر پوجا ہوتی رہی۔ پھر جب انہیں بلی چڑھایا گیا تو پوجا بند ہو گئی سادھو سنتوں نے بھی وہاں سے ڈیرے اٹھا لئے اس کے بعد جب سوامی جی یہاں آئے اور انہوں نے رفتہ رفتہ ہمارے دل جیت لئے تو ایک با پھر سمادھی آباد ہو گئی۔ سوامی جی نے راجا راجندر کی سمادھی پر رہنے کا فیصلہ کیا تھا بعد میں جب سوامی جی کو نے اپنی تنظیم کا سربراہ بنایا تو سادھو سنتوں کے بھیس میں ہمارے کارکن وہاں رہنے لگے جو اب بھی وہیں رہ ہیں اس طرح سوامی جی کی حفاظت بھی ہوتی رہتی ہے۔ سوامی جی اپنے ایک خاص چیلے کے ساتھ دو کمروں م رہتے ہیں ان کمروں کے درمیان ایک بڑا دروازہ ہے جسے کھول لیا جائے تو دو کمرے کا ایک کمرہ بن جاتا ہے سوامی جی کا چیلا کیوں کہ سنیاسی ہے اس لئے مستقل طور پر سوامی جی کے ساتھ نہیں رہتا سوامی جی کو بھگوا نے ایسی شکتی دی ہے کہ وہ اگلے پچھلے سب زمانوں کا حال بتا دیتے ہیں ہماری تنظیم میں بھی ان کے بہت سے چیلے بن گئے ہیں۔"

تو کری اپا نے بھی اپنے گرد روحانیت کا حصار کھینچ رکھا ہے؟ میں نے اتیٹا کی بات سن کر سوچا یہی حربہ بھگوتی نے بھی آزمایا تھا۔ میرے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ محروم اور ان پڑھ لوگ بہت جلد ایسے جعلی افراد کی باتوں میں آ جاتے ہیں سچ کی آڑ میں جھوٹ بھی تو بولا جاتا ہے۔ یہ تخصیص ہر ایک کے بس کی تو نہیں کہ روشنی دراصل کہاں ہے اور اندھیرا کدھر۔ سوامی جی کے خاص سنیاسی چیلے کے بارے میں بھی میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ انہی کا بیٹا ویرنا ہو گا جسے وہ ریاست کی مسند حکومت پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

ابھی میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ شیام بابو نے وستو کے بلی چڑھائے جانے کے متعلق پوچھ لیا۔

اتیٹا نے بتایا۔ "سوامی جی ہی نے اپنی شکتی سے کام لے کر ہمیں اس واقعہ کی تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔ یہ کہ راج محل میں ایک بڑا عہدیدار نمبیا بھی تھا۔ وستو جی سے نمبیا عمر میں دو سال بڑا ہو گا۔ نمبیا اور وستو جی کے درمیان راجا راجندر کے زمانے سے پیار کی ڈوری بندھی تھی۔ جب وستو جی نے حکومت سنبھالی تو نمبیا مارا گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ غلطی سے کسی سپاہی کی گولی نمبیا کو لگ گئی اور اس سپاہی کو دوسرے سپاہیوں نے موقع ہی پر مار ڈالا' کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ راج گھرانے ہی کے لوگوں نے بدنامی سے بچانے کے لئے نمبیا کو مروا دیا۔ جو بھی ہو بات کھل نہ سکی وستو جی کو اس پر بڑا رنج ہوا اور انہوں نے راج پاٹ میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ وستو جی کو ان کے چچاؤں نے سمجھایا اور ایک نائک سے ان کی شادی کر دی پھر بھی وہ خوشی سے کاروبار حکومت نہیں چلا رہی تھیں۔ اسی وجہ سے ریاست کا سارا نظام بگڑ رہا تھا جو بھی جس کے جی میں آتا سو کرتا۔ ایک طرف تو حکومت کے مسائل' دوسری جناب وستو جی کا ذاتی دکھ' انہی کے بیچ وہ جیسے پسی جا رہی تھیں۔ جب وہ ماں بننے والی تھیں تو ریاست کے معاملات بڑی پیچیدہ شکل اختیار کر گئے معلوم نہیں راج گھرانے میں سے کس نے وستو جی کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ وہ عورت جو ماں بننے والی ہو اگر بھیرو کی بھینٹ چڑھا دی جائے تو ریاست کے حالات درست ہو جائیں گے۔ اس کے لئے ایسی عورت کا تعلق راج گھرانے سے ہونا ضروری ہے۔ وستو جی کا دل تو پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا سو وہ خود اپنی بلی (قربانی) دینے پر آمادہ ہو گئیں ایک رات انہوں نے بھیرو کی مورتی کے سامنے اپنے دل میں خنجر اتار لیا۔ وستو جی کی قربانی کے بعد ان کے شوہر بھی پُراسرار طور پر جانے کہاں غائب ہو گئے۔"

اقتدار کی کشمکش اور ہوس میں یہی سب کچھ تو ہوتا ہے خون کے رشتوں کو بھی لوگ فراموش کر دیتے ہیں میرے خیال میں وستو نے قربانی نہیں دی تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ نہ صرف اسے بلکہ اس بچے کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا تھا جس کی وہ ماں بننے والی تھی یوں چک ویر کے ظالم باپ نے اپنے سب سے بڑے بھائی راجندر کی تو نسل ہی ختم کر دی تھی۔ رہا دوسرا بھائی کری اپا تو جانے کیسے چھوٹے بھائی کی گرفت سے بچ گیا تھا اور اب تک زندہ تھا۔ جو کچھ بھی ہوا اس میں کری اپا قطعی بے گناہ نہیں ہو سکتا میں نے سوچا اگر ایسا نہ ہوتا تو یوں باآسانی وستو کو راستے سے نہ ہٹایا جا سکتا۔ میں نے یہ سوچا تو ضرور مگر اس کا اظہار نہیں کیا اتیٹا کے سامنے کچھ کہنے سے حاصل بھی کیا تھا اس سے تو مجھے کچھ اور باتیں کرنا تھیں۔

"یہ بتاؤ اتیٹا کہ راج محل سے تمہارے نکالنے جانے کا ردعمل بوپنا جی پر کیا ہے؟ ظاہر ہے وہ تمہارے ماما ہیں انہیں یقیناً یہ ناگوار گزری ہو گی کیا یہ درست ہے کہ وہ وزارت سے استعفیٰ دے رہے ہیں؟" میں نے

سوال کیا۔

خلاف توقع اتیتا کے چہرے سے انتہائی حیرانی کا اظہار ہوا پھر اس نے جواب دیا۔ "ماما نے پہلے یہی فی
کیا تھا مگر بعد میں بدل دیا۔ انہیں..........."

"راج محل میں رانی گورما نے بلایا ہوگا۔" میں بول اٹھی۔

"جی.......... کماری جی!" اتیتا حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "رانی ماں سے مل کر آنے پر ہی ماما نے استع
نہیں دیا ان کے ساتھ پنڈت لکشمی نارائن بھی رانی ماں سے ملے تھے دراصل پنڈت جی ہی نے بردباری سے
لے کر یہ معاملہ رفع دفع کرا دیا ورنہ جانے کیا ہوتا لیکن برا نہ مانیں کماری جی تو میں کچھ پوچھ لوں' اس سے ا
کے لئے پہلے ہی معافی۔"

"ہاں ہاں ضرور پوچھو جو پوچھنا ہے میں برا نہیں مانتی۔"

"آپ کے علم میں یہ ساری باتیں کیسے آئیں؟ میری اطلاع کے مطابق تو آپ اس کھنڈر کی حدود۔
نکلی ہی نہیں' صرف آج صبح ہی صبح بھگوتی کے آشرم تک ضرور گئی تھیں۔"

میں مسکرا دی۔ "تمہاری تنظیم کے جو ارکان بھی ہماری حفاظت کی خاطر بھیس بدل کے اس دھرم ش
کی نگرانی کر رہے ہیں ان کی نظر میں آئے بغیر بھی یہاں سے نکلا جا سکتا ہے۔"

اس پر اتیتا نے طویل سانس لیا اور بولا۔ "تو وہ لوگ آپ کی نظر میں آ گئے۔"

"ہاں۔" میں نے جواب میں کہا اور میرا جواب غلط نہیں تھا۔ صبح جب میں بھگوتی سے ملنے گئی تبھی
بات محسوس کر لی تھی اور یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ کھنڈرات کی نگرانی کرنے والوں کا تعلق "فرزندان کاویری
سے ہوگا ان کے سوا وہاں ہماری موجودگی کا علم اور تھا بھی کسے' چند لمحے توقف کے بعد میں نے اتیتا۔
دریافت کیا۔ "راج محل سے لڑکیوں کی پُراسرار گمشدگی یا فرار کے بعد کیا راجا چک وری نے امرناتھ کے مند
میں قیام پذیر بڑے مہاراج چندر موہن سے رابطہ قائم نہیں کیا؟ بڑے مہاراج تو ترنت مفرور لڑکیوں کا سرا
لگا لیتے' میں نے سنا ہے کہ وہ بڑے شکتی شالی اور گنی ہیں۔"

"یہ تو خیر بڑے مہاراج کے بارے میں آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے ان کے کئی چمتکار تو خود میں نے بھی ا
آنکھوں سے دیکھے ہیں۔" اتیتا کے لہجے سے عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں پہلے ہی یہ اندازہ لگا چکی تھی ا
لئے اپنے دشمن کا ذکر اتیتا کے سامنے ذرا ادب سے کیا تھا جو لوگ ایسے افراد کو بھی پُراسرار قوتوں کا مالک
لیتے تھے جن کے پاس کوئی ایسی قوت نہیں تھی اور محض زمانہ ساز تھے وہ چندر موہن تو واقعی پُراسرار شیطا
قوتوں کا مالک تھا۔ اب اتیتا میری بات کے جواب میں کہہ رہا تھا۔ "راجا جی نے اس واقعہ کے فوراً بعد بسو دیا
کو بڑے مہاراج کے پاس امرناتھ جی کے مندر بھیجا تھا مگر بات نہیں بنی۔ بڑے مہاراج جاپ میں بیٹھے تھے ا
جاپ کے دوران میں وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرتے۔"

مجھے اتیتا سے جو معلوم کرنا تھا وہ معلوم ہو گیا اب اندھیرا بھی پھیل چکا تھا اس لئے سوامی جی سے
روانہ ہو گئی۔ کویتا کو میں نے مخصوص اشارہ کر دیا تھا کویتا' عادل اور شیام بابو کو وہیں چھوڑ کر میں تن تنہا اتیتا
ساتھ چل دی تھی۔

کھنڈرات کی حدود میں اتیتا سے میں نے کہا۔ "اب تو تمہاری یہ آرزو پوری ہو جائے گی کہ تم اپنی
تنظیم کے لئے سارا وقت دے سکو پہلے تو تمہیں سوامی جی نے راج محل کا عہدہ چھوڑنے سے منع کر دیا تھا نا اب
سوامی جی کیا کہتے ہیں؟ میرے پاس آنے سے پہلے تمہاری ملاقات تو ہوئی ہوگی ان سے۔"

"جی ہاں سوامی جی ہی سے مل کر آپ کے پاس آیا تھا' وہ کہہ رہے تھے کہ راج محل کی اندرونی خبریں
جاننے کے لئے کوئی اور بندوبست کرنا پڑے گا۔"

پھر میں نے اتیتا سے کوئی بات نہیں کی ہم کھنڈرات کی حدود سے نکل آئے تھے۔

راجا راجندر کی سادھی بھی شہری آبادی سے خاصی دور مغرب میں تھی راستے میں کسی شخص سے مڈبھیڑ
نہیں ہوئی یوں بھی میرے قیاس کے مطابق اتیتا مجھے ایسے راستوں سے لے کر آیا تھا کہ کوئی ہمیں نہ دیکھ سکے
دور ہی سے سادھی نظر آ گئی جہاں روشنی تھی۔ سادھی کی ایک جانب گھنا جنگل تھا اور ہم اسی جنگل سے گزر کر
وہاں پہنچے تھے۔

کری اپا بڑھاپے کے باوجود بارعب نظر آیا۔ اس کا قد لمبا تھا اور وہ ایک سفید دھوتی باندھے ہوئے تھا۔
رنگ جنوبی ہند کے باشندوں کی طرح سانولا اور چہرہ لمبوترا تھا سر پر گھنے سفید بال تھے اور چہرے پر بھی گھنی
داڑھی مونچھیں تھیں' آنکھیں چھوٹی مگر روشن تھیں۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ میں نے بھی بظاہر خوش اخلاقی کا
مظاہرہ کیا میں اس کے خاص کمرے میں دری پر بیٹھی تھی میرے علاوہ اتیتا اور مزید چند افراد بھی وہاں موجود
تھے۔

رسمی گفتگو کے بعد کھانا لگایا گیا مجھے دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی کہ کھانے میں گوشت بھی تھا۔ ہندوستان آ
کر بہت سے ہندوؤں سے میرا سابقہ پڑ چکا تھا جو گوشت خور تھے۔ میں نے ایسے بھی ہندو دیکھے تھے جنہوں نے
گوشت کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ کھانا بس گوارا ہی تھا۔ شمالی اور جنوبی ہند کے کھانوں میں زمین آسمان کا فرق تھا
ذاتی طور پر مجھے شمالی ہند کے کھانے خوش ذائقہ اور لذیذ معلوم ہوتے تھے۔ میں کیوں کہ "سوامی جی" ہی کے
پاس بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھی اس لئے ایک بار اس کی طرف جھک کے ہستہ سے بولی۔ "آپ تنہائی میں بھی مجھے
بات کرنے کا موقع دیں تو خوشی ہوگی۔"

"کیوں نہیں۔" اس نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا۔

سب کھانا کھا چکے تو کری اپا مجھے اپنے ساتھ برابر والے کمرے میں لے آیا' درمیانی دروازہ بھی اس نے
بند کر دیا تھا۔

"کوئی ایسی ہی بات ہوگی جس کے لئے تنہائی ضروری ہے؟" وہ دری پر میرے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے
بولا۔ "میں نے اسی لئے بیچ کا دروازہ بھی لگا دیا۔"

"اس کمرے میں شاید ویر ناجی رہتے ہیں وہ تو نہیں آ جائیں گے اس سے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ
کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

کری اپا کے لئے میرے الفاظ کسی دھماکے سے کم نہیں تھے وہ ایک دم اچھل پڑا' اس کی تیوریوں پر بل
پڑ گئے پھر میں نے اس کے دائیں ہاتھ کو تیزی سے حرکت کرتے دیکھا دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں

"خطرناک کھلونا" نظر آ رہا تھا یہ ریوالور یقیناً اس نے اپنی دھوتی میں اڑس رکھا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے ایسے ہی شدید ردعمل کی توقع تھی۔

"کون ہو تم اور ویرنا کو کیسے جانتی ہو؟" بوڑھے کری اپا کے لہجے میں سفاکی تھی' ریوالور کی نال م طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"میں تو اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں کری اپا جی!"

"تم .... تم اگر مجھے بھی جانتی ہو تو .... تو پھر تمہیں زندہ نہیں رہنا چاہئے۔" اس نے ریوالو مخصوص انداز میں میرے سینے کا نشانہ لینے کے لئے سیدھا کیا۔

عین اسی لمحے ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر فضا میں بلند ہوتا چلا گیا اور پھر ایک خاص بلندی پر رک ریوالور کی نال کا رخ بدل گیا اب کری اپا ریوالور کی زد پر تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ریوالور کی طرف رہا تھا اس کا منہ بھی حیرت کی زیادتی کے سبب کھلا رہ گیا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر مجھے واقعی ہنسی آ گئی پھر میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اپنا منہ تو بند کرلیں کری اپا ورنہ مکھی گھس جائے گی۔"

وہ اس طرح چونک اٹھا جیسے سوتے سوتے جاگا ہو ایک جھٹکے سے اس کا منہ بند ہو گیا تھا۔

"یہ ریوالور اس وقت تک آگ نہیں اگلے گا جب تک میں اشارہ نہ کروں اس لئے ڈرنے کی کوئی با نہیں۔" میں پُرسکون آواز میں بولی۔ "آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ایک مہمان پر ریوالور تان لیں' پر آپ کیا کریں' ہیں تو لنگ راج کے بھائی۔"

"یہ .... یہ کک .... کیسے .... کس طرح ہو گیا؟" کری اپا نے ریوالور کی طرف آنکھ اشارہ کیا۔

"اس طرح کہ ریوالور میرا کہنا مانتا ہے۔ آپ کو تو اس پر حیران نہیں ہونا چاہئے فرزندان کاویری تو آ کو بھی پُراسرار قوتوں کا مالک مانتے اور جانتے ہیں۔"

"تت .... تم .... تم اگر میری اصلیت جانتی ہو تو .... یہ .... یہ بھی جانتی ہو گی .... کہ میرے پاس کوئی .... کوئی شکتی نہیں۔"

"ہاں معلوم ہے کری اپا جی اور یہ بھی خبر ہے کہ آپ نے یہ ڈھونگ اپنی شخصیت چھپانے کے لئے رم ہے۔"

"تو پھر .... پھر تم شخصیت چھپانے کی وجہ بھی جان .... جانتی ہو گی۔"

"بالکل جانتی ہوں۔ آپ کو راجا چک ویر یعنی اپنے بھتیجے کی طرف سے جان کا خطرہ ہے اگر اسے پتا چ گیا کہ سوامی جی کے بھیس میں اس کا تایا کری اپا ہے تو وہ آپ کو قتل کرانے میں لمحے بھر کی تاخیر بھی نہیں کر۔ گا۔ ایسا ہی وہ تمہارے بیٹے ویرنا کے ساتھ کرے گا جو بظاہر تمہارا خاص چیلا اور سنیاسی بنا پھرتا ہے۔ وہی وی جسے تم اس ریاست کا حکمراں دیکھنا چاہتے ہو۔" میں بات کرتے کرتے "آپ سے تم" پر اتر آئی اب ا بوڑھے کا احترام مجھ پر واجب نہیں رہا تھا جو چند لمحے پہلے مجھے قتل کرنے والا تھا۔ اگر میں کوینا کو اپنے سا

آنے کا مخصوص اشارہ نہ کرتی تو شاید وہ بوڑھا مجھے ٹھنڈا کر چکا ہوتا بعد میں وہ اپنے معتقدوں کو کوئی بھی کہانی سنا کے مطمئن کر سکتا تھا مثلاً یہی کہ میں نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اس بوڑھے کی بات کو بھلا کون جھٹلاتا۔

"تم خطرناک حد تک باخبر ہو۔" بوڑھا کری اپا اب غالباً اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔

"اسی لئے تم مجھے سوچے سمجھے بغیر قتل کر دینا چاہتے تھے .... اب اگر میں تمہیں گولی مار دوں تو؟"

"تو تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکو گی۔"

"دھمکی دے رہے ہو مجھے؟"

"نہیں یہ حقیقت ہے میرے معتقد مجھ سے ایسی ہی عقیدت رکھتے ہیں۔"

"اور اگر میں انہیں تمہارا اصل چہرہ دکھا دوں؟"

"اس سے تمہیں کیا مل جائے گا؟ کیا تم ایک ظالم کے ظلم و جبر کو صحیح سمجھتی ہو؟ کیا کسی حقدار کو اس کا حق نہیں ملنا چاہئے؟" اس کا لہجہ پُراثر تھا۔

"کیسا حق' کس کا حق؟ تم احمقوں کی جنت میں ہو کری اپا' مجھ پر تمہاری جادو بیانی نہیں چلے گی' کیا وستو پر ظلم نہیں ہوا؟ اور کیا ظلم کرنے والوں میں تم شامل نہیں تھے؟ کیا لنگ راج نے تمہیں اعتماد میں لئے بغیر اسے راستے سے ہٹا دیا؟" میری آواز تیز ہوتی گئی۔

"وہ .... وہ اس نے .... وستو نے تو خود ہی اپنی بلی دی تھی۔"

"جھوٹ بولتے ہوئے تم ہکلانے کیوں لگے؟ .... گردن کیوں جھک گئی تمہاری؟ .... سنو تم اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہو کہ حقدار صرف تمہارا ہی بیٹا ہے اور اپنے ذہن سے اس خیال کو بھی جھٹک دو کہ تمہاری اصلیت سے کوئی واقف نہیں۔"

"نن .... نہیں مجھے .... مجھے کوئی .... کوئی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں؟"

"پھر میں کس طرح جان گئی؟"

"تم .... تم پُراسرار قوتوں کی مالک ہو۔"

"میری بات چھوڑو کری اپا' مڈکیری میں ایک اور ہستی ایسی موجود ہے جو تمہیں اور تمہارے بیٹے کو پہچان چکی ہے۔"

"کون .... وہ کون ہے؟"

"یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گی' ہاں یہ ضرور بتا سکتی ہوں کہ اسے بھی تمہاری طرح اپنی جان کا خطرہ ہے اگر اس کے بارے میں راجا چک ویر کو علم ہو گیا تو اسے بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ وجہ تم خود سمجھ سکتے ہو ریاست پر حکمرانی کے حق کا دعویٰ اسے بھی ہے۔"

"غلط ہے اس کا دعویٰ' وہ چاہے کوئی بھی ہو۔" کری اپا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو نا دوسرے تو تمہارا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کریں گے۔"

"کیسے تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم تین ہی بھائی تھے ایک کی نسل ختم ہو گئی دوسرے کا بیٹا حکمراں ہے اور تیسرا بھائی میں ہوں پھر حکمرانی کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔"

"پُرجوش ہونے کی ضرورت نہیں کری اپا' نہ میں اس طرح تمہارے دعوے کو غلط ثابت کرنے لئے کچھ بتاؤں گی۔ سنو' ماضی کبھی واپس نہیں آتا اور تم اسی خام خیال میں مبتلا ہو تم نے اپنے بڑے بھائی راجندر کو جو وچن دیا تھا کہ اس کی بیٹی وستو کے وفادار رہو گے سو اس عہد پر قائم نہیں رہے لنگ راج سازش کا شکار تم بھی ہو گئے۔ بولو کری اپا کیا ایسا نہیں ہوا؟ کیا تم نے اپنے مرحوم بھائی کے ساتھ کیا ہوا نہیں توڑا؟"

"ہاں.........." کری اپا جیسے خود کلامی میں مبتلا تھا۔ "مجھ سے یہ پاپ ہوا اور اسی کو دھونے کے لئے بھی اپنے بھائی کی سمادھی پر پڑا ہوں۔ لنگ راج نے مجھ سے دھوکا کیا وہ اپنے وچن سے پھر گیا کہ وستو را سے ہٹ گئی تو ہم دونوں بھائی ریاست کو آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔ اس لڑکی وستو کی وجہ سے راج گھرانے کی بھی تو بدنامی ہو رہی تھی کبھی پہلے راج گھرانے کی کسی کنیا نے پھیروں سے پہلے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا پر وستو نے یہ جرم کیا اور اپنی سزا کو پہنچ گئی۔"

"محبت کو تم لوگ جرم کہتے ہو.......... اگر وستو کی شادی نمبیا سے ہی ہو جاتی تو کون سا آسمان ٹو پڑتا۔"

بوڑھا کری اپا ایک بار پھر چونک اٹھا وہ جیسے کہیں بہت دور نکل گیا تھا میں نے قریب ہی موجود کویتا نادیدہ وجود کی طرف ہاتھ بڑھایا اس نے ریوالور مجھے تھما دیا' ریوالور کے چیمبر سے گولیاں نکال کر میں نے طرف پھینک دیں اور اسے کری اپا کے سامنے ڈال دیا۔

"اسے اٹھالو کری اپا!" میں نے پھر مخاطب کیا۔

اس نے کچھ کہے بغیر ریوالور اٹھایا اور کمر کے پاس اڑس لیا معلوم نہیں کیوں اس لمحے مجھے یوں محسو ہوا جیسے کری اپا کی تنی ہوئی کمر جھک گئی ہو اس کے چہرے کی جھریوں میں اضافہ ہو گیا ہو وہ جیسے ایک دم اور بوڑھا ہو گیا ہو میرا یہ اندازہ بعد میں غلط ثابت نہیں ہوا۔

"کری اپا! تم جن لوگوں کو اپنی مدد کے لئے پکار رہے ہو جن سے اپنے حق کے لئے مراسلت کر رہے انہیں تم نہیں جانتے۔" میں نے گویا آخری ضرب لگائی۔ "وہ غیر ملکی تمہیں تمہارا حق دلانے کی بجائے ا ریاست پر خود قبضہ کر لیں گے۔"

"جب تک کری اپا اور اس کا بیٹا ویرنا زندہ ہے اکیری راج گھرانے کے سوا کوئی کوڈگ پر قبضہ نہیں سکتا۔" بوڑھا ایک بار پھر پُرجوش نظر آنے لگا۔

"تم میں یا تمہارے بیٹے میں اتنی ہی ہمت ہوتی' تم اتنے ہی بہادر ہوتے تو یوں چھپ کر مڈکیری میں رہتے.......... صرف تم اور تمہارا بیٹا تو راجا چک ویر کا مقابلہ نہیں کر سکتے پھر ان غیر ملکی غاصبوں کے بڑھتے ہوئے قدم کیسے روک لو گے جنہوں نے حیدر آباد دکن اور اس خطے کے سوا سارے ہندوستان کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے؟"

"لیکن وہ.......... وہ ایسا کیوں کرنے لگے؟ ان کے پاس زمین کی کیا کمی ہے؟"

"زمین کی کمی نہیں تھی تو انہوں نے جنوبی ہند کی دوسری ریاستوں پر اپنا پرچم کیوں لہرا دیا؟"

کری اپا کے پاس میرے اس سوال کا شاید کوئی جواب نہیں تھا اس لئے وہ خاموش ہی رہا۔

"ہوس.......... مزید کی ہوس.......... اقتدار و حکومت کی ہوس۔ یہی ہوس تو انہیں سمندر پار سے یہاں لائی ہے۔"

"اگر.......... اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہہ رہی ہو تو.......... تو پھر چک ویر جیسا بھی برا بھلا ہے مجھے قبول ہے وہی.......... اگر وہ بھی حکمراں رہتا ہے تو حکومت ہمارے ہی خاندان میں رہے گی۔" بوڑھے کری اپا کا انداز گفتگو پھر ایسا ہو گیا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

"کری اپا! یہ بھی تم خود کو فریب ہی دے رہے ہو' سنو کری اپا ظلم کوئی بھی کرے اور اس پر کتنے ہی پردے ڈال دے ظالم کبھی بچتا نہیں۔ ساری دنیا سے بچ جائے مگر دیوتاؤں کے قہر و غضب سے نہیں بچ سکتا۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اس ظالم نے کتنے دکھی دلوں کی آہیں لی ہیں.......... جانتے ہو تم بھی جو ہونے والا ہے نہ تم اسے ٹال سکتے ہو نہ کوئی اور۔"

"تو پھر.......... پھر میں کیا کروں؟"

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے میں نے آنے والے حالات کی نشاندہی کر دی ہے تمہارا اصل دشمن انگریز ہے اپنے دشمن کو پہچانو کری اپا۔" مجھے جو کہنا تھا کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاید میں نے اس بوڑھے کے ساتھ زیادتی کی تھی اس کا احساس مجھے بنگال پہنچنے کے بعد ہوا' بوڑھے کری اپا اور اس کے بیٹے کو انگریزوں نے پہلے میسور میں قید کیا اور پھر ریاست کوڈگ پر قبضے کے بعد قتل کر دیا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ دوسرے ہی روز صبح کری اپا اپنے بیٹے ویرنا کو ساتھ لے کر مڈکیری سے نکل جائے گا۔

واپسی پر اتیٹا ہی میرے ساتھ تھا مجھ سے پوچھنے لگا۔ "کماری جی کیا کوئی ایسی بات تھی جو ہم لوگوں سے بھی آپ کو چھپانا تھی؟ اتنی دیر اکیلے میں سوامی جی کم ہی کسی سے بات کرتے ہیں بتانے کی بات ہو تو بتا دیں ورنہ گلہ نہیں کروں گا۔"

"کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔" میں مصلحت کے پیش نظر بولی۔ "ریاست ہی کی سیاست پر گفتگو ہو رہی تھی دراصل بہت سے لوگ موجود ہوں تو یکسوئی سے بات نہیں ہوتی۔"

"ہاں یہ تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔" اتیٹا میری بات سے اس وقت مطمئن ہو گیا۔

دھرم شالہ کے کھنڈرات میں مجھے چھوڑ کر اتیٹا واپس چلا گیا۔

میرے ایما پر کویتا مجھ سے پہلے ہی عادل اور شیام بابو کے پاس پہنچ چکی تھی ایسا میں نے اس لئے کیا تھا کہ ان لوگوں کو یہ شک نہ ہو کہ کویتا میرے ساتھ کہیں گئی تھی۔ میں جب تک پیدل اتیٹا کے ساتھ واپس پہنچی اور پھر مطلوبہ کمرے میں داخل ہوئی تو کویتا کھانا کھا چکی تھی۔

مڈکیری آئے یہ دوسری شب تھی اب تک میرے دشمن نے حملے میں پہل نہیں کی تھی لیکن میں پیش قدمی کا فیصلہ کر چکی تھی شیام بابو اور عادل سے کری کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں نے راز نہیں رکھی صرف یہ بات گول کر گئی کہ اس نے مجھ پر ریوالور تان لیا تھا۔ مختصراً اس گفتگو کے بعد میں نے کہا۔

"آج رات کو میں ژیان کی تلاش میں جاؤں گی۔"

"آپ کے ساتھ ہم لوگ بھی ہوں گے نا؟" عادل نے دریافت کیا۔

"نہیں سب کے جانے کی ضرورت نہیں ہے میں اپنے ساتھ صرف سشما کو لے جاؤں گی۔" میں واضح طور پر بتا دیا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید عادل کہتا' کیوں کیا سشما تمہاری زیادہ چہیتی ہے؟ مگر وہاں شیام بابو کی مو کے سبب وہ چپ ہی رہا البتہ اس کا چہرہ بہت کچھ کہہ رہا تھا۔

"کرن جی جیسی آپ کی مرضی۔" شیام بابو نے کہا۔ "آپ اس معاملے کو ہم سے بہتر طور پر سمجھ ہیں۔"

"اور تو خیر کوئی بات نہیں شیام بابو زیادہ بھیڑ بھاڑ سے کبھی کبھی نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' خود میرا بھی یہی تجربہ ہے۔" شیام بابو میری تائید میں بولا۔

اس مرتبہ عادل خاموش نہ رہ سکا مگر وہ مجھ سے نہیں شیام بابو سے مخاطب تھا۔ "مجھے تو آپ خوا ہی ساتھ لے آئے کرنے کو یہاں کوئی کام ہی نہیں۔"

"پنڈت جی تمہیں شیام بابو نہیں میں ساتھ لائی ہوں شیام بابو سے گلہ فضول ہے۔" میں نے مدا کی۔

"میں گلہ نہیں اظہار حقیقت کر رہا ہوں کرن جی اگر سب کچھ خود آپ ہی کو اور سشما کو کر تو..........."

"پنڈت جی!" شیام بابو نے عادل کی بات پوری نہ ہونے دی۔ "آپ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ جی کے کسی بھی حکم سے انکار تنظیمی قوانین کے منافی ہے' مجھے یا آپ کو کرن جی کے کسی بھی فیصلے پر اعترا کوئی حق نہیں ہے۔"

"میں آپ سے اور کرن جی سے معافی چاہتا ہوں معلوم نہیں کیوں میرے ذہن سے یہ بات نکل تھی۔"

"آئندہ خیال رکھئے گا۔" شیام بابو کے لہجے میں تاکید تھی۔

"اب چھوڑیئے بھی شیام بابو' میں اونچ نیچ کی قائل نہیں ہوں' نہ مجھے تنظیم میں اپنے اعزازی عہد پر کوئی گمان ہے۔ پنڈت جی بس رو میں بلا سوچے سمجھے ایک بات کہہ گئے کبھی کبھی جھنجلاہٹ یا بیزاری میں کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں۔" میں نے بات برابر کر دی۔

رات یوں بھی خاصی ہو چکی تھی اس لئے میں کویتا کو اپنے ساتھ لے کر کمرے میں نکل آئی' صبح سے ملنے کے لئے جاتے ہوئے میں نے دھرم شالہ کے کھنڈرات سے خاصے فاصلے پر پتھروں کو کاٹ کر بنائی وہ سیڑھیاں دیکھ لی تھیں جو اوپر بلندی پر موجود ایک مندر تک چلی گئی تھیں مجھے اسی لئے راستے کی یا رہنما کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ ڈھلتے چاند کی تاریخیں تھیں چاندنی بس برائے نام ہی تھی پھر آسمان پر بادل بھی تھے بار بار بادلوں میں چھپ جاتا تو ہر طرف اندھیرا پھیل جاتا۔ میں ان کھنڈرات میں اسی لئے کویتا کا ہاتھ تھا آگے بڑھ رہی تھی اندھیرے میں دیکھنے کی قوت جانے کیوں اس موقع پر میرے اندر بیدار نہیں ہوئی۔

"اس وقت تو تمہیں ڈر نہیں لگ رہا؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کویتا سے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں کماری!" کویتا نے بلا جھجک جواب دیا۔ "آج شام کے بعد سے میں ایک عجیب سی بات محسوس کر رہی ہوں بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"وہ کیا؟" میں نے معلوم کیا۔

"میرے اعصاب پر جو ایک ان دیکھا سا بوجھ تھا وہ ہٹ گیا ہے۔" کویتا نے بتایا۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔" یہ کہتے ہوئے مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ "کویتا تمہیں یاد ہے دہلی کے دوران قیام میں نے تم سے ایک بات اپنے بارے میں بتائی تھی جس کا دہلی میں بھی تجربہ ہوا اور پھر بمبئی میں بھی۔ ژیان کے جسم کی بُو تمہارے لئے اجنبی نہیں ہے تم ایسا کیوں نہ کرو کہ مجھ سے پہلے ژیان کے جسم کی بُو پر مندر تک پہنچ جاؤ اور یہ معلوم کر آؤ کہ وہ مندر کے کس حصے میں ہے اس سے ہمارا کام نسبتاً آسان ہو جائے گا' کیا خیال ہے تمہارا؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً راضی ہو گئی۔

"تو پھر میں اسی جگہ رک کر تمہاری واپس کا انتظار کرتی ہوں۔" میں بولی۔

"ژیان کو اگر چندر موہن نے حصار کھینچ کر میری نظروں سے چھپا بھی دیا تو میں اس کے جسم کی بو سے تلاش کر لوں گی۔"

"چندر موہن بھی شاید تمہارے جسم کی بُو ہی پر کل صبح تم تک پہنچ گیا تھا ورنہ تو ہم اس کی نظروں سے اوجھل ہی تھے۔"

کویتا نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی میں سوچنے لگی کہ اگر کویتا میرے ساتھ نہ ہوتی تو نیک روح مہین میری رہنمائی اور مدد کے لئے کوئی دوسری صورت پیدا کر دیتی اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ کویتا کا چندر موہن سے باغی ہو کر میرے ساتھ آ ملنا بھی بلا سبب نہیں تھا اس میں بھی نیکی اور خیر کی قوتوں کو دخل تھا۔

خلاف توقع کویتا کو واپسی میں دیر ہونے لگی تو میں متفکر ہو گئی۔ میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے کہ کہیں چندر موہن کسی طرح اس پر حاوی تو نہیں آ گیا؟ شیطانی قوتیں رکھنے والا وہ خبیث شخص کوئی بھی ایسی چال چل سکتا تھا جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔

اور پھر یہی ہوا ابھی معاً اندھیرے میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور چندر موہن دھویں کے ایک حصار میں نظر آیا۔ حصار کے اندر عجیب سی روشنی تھی مجھ سے وہ اتنے فاصلے پر نمودار ہوا تھا کہ اس کے پھولے پھولے منحوس چہرے کے نقوش واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔

"معلبہ!" اس نے مجھے اپنی کریہہ آواز میں مخاطب کیا۔ "اب کویتا کا انتظار نہ کر وہ لوٹ کر نہیں آئے گی۔ آج ہی شام اس پر سے میں نے اپنی نظر ہٹائی تھی کہ وہ دھوکے میں آ جائے۔ دیکھ لے کہ وہ دھوکا کھا گئی اور تو جو اتنی سیانی بن رہی تھی تیرا بھی سیان پن دھرا کا دھرا رہ گیا' میرے چیلے اس وقت کویتا کے جسم کی ایک ایک بوٹی کاٹ رہے ہیں اور وہ چیخ رہی ہے زندگی کی بھیک مانگ رہی ہے اور کبھی موت۔ اسے بے ہوش بھی

نہیں ہونے دیا جا رہا ہوش کھو بیٹھے گی تو پھر سزا کا کیا فائدہ؟ تجھے سنواتا ہوں اس کی بھیانک چیخیں جس میں تُو اتنے دن سے چھپی ہوئی تھی۔ سن اگر تجھ میں سننے کی تاب ہے۔ وہ تجھے مدد کے لئے پکار رہی ہے تُو بھی چل کب تک مجھ سے بچی بچی پھرتی رہے گی۔"

چندر موہن کے الفاظ کے ساتھ ہی روشنی بجھ گئی' اسی کے ساتھ میرے سارے جسم میں بجلیا دوڑنے لگیں پھر مجھے واقعی کویتا کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

"دیوی............ دیوی مجھے بچالو دیوی!" چیختے ہوئے وہ فریاد کر رہی تھی۔

"میں آ رہی ہوں کویتا آ رہی ہوں۔" میں بھی جواباً چیخی اور مجھے خود اپنی ہی آواز اجنبی سی لگی۔

کویتا کی دردناک چیخیں جیسے میرے وجود کو دونیم کئے دے رہی تھیں میں اپنے انجام سے بے پرواہ کھنڈرات سے نکل کے اس راستے پر دوڑی چلی جا رہی تھی جو پتھریلی سیڑھیوں تک جاتا تھا۔ مجھے اپنے تن کا ہوش نہیں تھا میں شاید اپنے حواس میں نہیں تھی۔

تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ان کے اختتام پر میری نظر پڑی اس وقت چاند بادلوں سے نکل مجھے وہاں چندر موہن کھڑا دکھائی دیا۔

"آ جا............ آ جا معبلہ! تیرا شیدائی' تیرا چندر موہن یہاں تیرے ہی سواگت کو کھڑا ہے۔" خبیث نے یوں اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے جیسے مجھے اپنی بانہوں کے حلقے میں لینا چاہتا ہو۔ اس کے جانب ذرا فاصلے پر مندر کا کلس نظر آ رہا تھا اور دائیں جانب مندر کا وہ احاطہ جس میں غالباً پجاریوں کی رہائش کے لئے چھوٹے بڑے کمرے بنائے گئے تھے۔ چاندنی میں مجھے سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا' اس چندر موہن کے گرد کوئی بھی حصار نہیں تھا۔

"چندر موہن! میں چوڑے پھل والا وہ تیر ہوں جو تیرے سینے میں ترازو ہونے والا ہے۔ مت بھو میرا نام معبلہ ہے۔" سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں چیخی۔

"یہی تو میری آرزو ہے معبلہ............ تُو کسی تیر کی طرح ہی تو اس دل میں کھبی ہوئی ہے۔" یہ وہ بے غیرتی سے ہنسا۔

میرے رگ و پے میں بجلیوں کی گردش اپنی انتہا کو پہنچنے لگی چندر موہن اور میرے درمیان اب چند سیڑھیوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

معاً چندر موہن پلٹا اور پھر مڑ کے مجھ سے بولا۔ "آ میرے پیچھے پیچھے آ............ میں نے آج تیرے اپنی خواب گاہ کو سجا لیا ہے۔ مجھے یقین تھا معبلہ کہ آج تُو ضرور آئے گی ملن کی گھڑی آ ہی گئی نا اسی کے میں نے ایک ایک دن گنا تھا۔" اس کے ساتھ ہی میں نے چندر موہن کے جسم کو فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ وہ گویا تیزی سے اڑتا ہوا مندر کے اقامتی حصے کی طرف جا رہا تھا اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے تھے۔

سیڑھیاں چڑھ کر میں اس کی طرف دوڑی اسی لمحے بجلیوں کی گردش میری دونوں آنکھوں میں سمٹ گئی۔

"آج فیصلے کا دن ہے چندر موہن تُو اپنی تقدیر سے کہاں تک بھاگے گا۔" میں نے جست بھری۔

"نہیں۔" چندر موہن خوفزدہ آواز میں چیخا اور پھر اس کا جسم فضا میں اِدھر سے اُدھر ڈولنے لگا۔ میری آنکھوں سے "موت کی روشنی" نکل رہی تھی اور چندر موہن اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے ساتھ اس کا جسم فضا سے نیچے کی طرف آتا جا رہا تھا۔

جدھر میری نظر پڑتی پتھر پگھلنے لگتے' پتھروں سے بنا ہوا اقامتی حصہ موم کی طرح پگھل کر پہاڑ کی ایک جانب بہنے لگا پھر مجھے ایک اور ہولناک منظر دکھائی دیا۔ چندر موہن کے دونوں پیر پتھروں کے بہتے ہوئے لاوے سے ٹکرائے اور وہ بری طرح چیخا۔ "ورگا............ درگا۔" میرے وجود میں بجلیوں کی گردش چند ہی لمحے پہلے تھم چکی تھی۔ "موت کی روشنی" میری آنکھوں میں سما چکی تھی مگر سنسناہٹ ابھی باقی تھی۔ اچانک اس کے جسم کو میں نے دوبارہ اٹھتے دیکھا۔ گھٹنوں تک اس کے دونوں پیر غائب تھے دوسرے ہی لمحے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا اسی وقت میری سماعت سے ایک بار پھر کویتا کی درد بھری چیخ ٹکرائی۔

کویتا کی چیخ مندر کی طرف سے آئی تھی میں ادھر دوڑی۔

مندر سے پہلے ہی مجھے سیڑھیاں نظر آئیں جو کہیں نیچے پہاڑ کے اندر جا رہی تھیں' چیخ پھر سنائی دی اور میری سمت سفر کا تعین کر گئی۔

میں تیزی کے ساتھ زینہ اترتی چلی گئی۔ اندر اندھیرا نہیں تھا ستونوں کے اندر بنے ہوئے طاقچوں میں دیے جل رہے تھے۔

بہت جلد میں اس دالان تک جا پہنچی جہاں ایک ستون سے کویتا بندھی ہوئی تھی اور دو جٹادھاری سادھو اپنے ہاتھوں میں چھریاں لئے کویتا کے جسم سے گوشت کے پارچے اتارنے میں مصروف تھے وہ لہولہان تھی چیخے جا رہی تھی مگر دونوں سادھو جیسے بہرے ہو گئے تھے وہ اس طرح درندگی کا وہ کھیل کھیلے جا رہے تھے گویا اس کے سوا انہیں دنیا میں اور کوئی کام نہ ہو۔ میرے قدموں کی دھمک غالباً ان میں سے ایک نے سن لی اور غرا کر پلٹا۔

اس لمحے مجھے سادھو کا چہرہ غیر انسانی سا محسوس ہوا وہ آدمی کی بجائے کسی درندے کا چہرہ تھا اس کے دونوں ہاتھ خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ گیروا لبادے پر بھی خون کے دھبے تھے اور دونوں آنکھوں کی جگہ جیسے انگارے دہک رہے تھے۔ فرش پر بھی خون پھیلا ہوا تھا۔

"کون ہے تُو کہ جس نے ہماری شانتی بھنگ کر دی؟" سادھو نے چھری فضا میں بلند کی اور میری طرف لپکا مگر مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔

فرش پر پھیلے ہوئے خون کو وہ شاید بھول گیا تھا اور یہی بھول اس کے لئے مہلک ثابت ہو گئی وہ پھسل کر گر گیا۔ میں اس دوران اس پر چھلانگ لگا چکی تھی اس درندے کے ہاتھ سے چھری چھیننے میں مجھے دیر نہیں لگی پھر میں نے وہی چھری اس کی گردن پر پھیر دی۔

چند ہی لمحوں میں سب کچھ ہو گیا' سادھو کا دوسرا ساتھی مجھ تک سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتا ہوا پہنچا اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا ہاتھ میں چھری تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ دوسرا درندہ جھک کر میرا کام تمام کر دیتا میں نے چھری کی نوک کو طرف سے پکڑا

اور فرش پر پڑے پڑے ہی پوری قوت سے چھری پھینکی میں نے سادھو کے سینے کو نشانہ بنایا تھا لیکن اچانک کے سبب اس کی گردن میں آر پار ہو گئی اس کے حلق سے "خرر خرر" کی آواز سی نکلی اور پھر جسم کے م اوپر گرنے لگا میں پلٹا کھا کے ایک طرف ہو گئی۔

جب میں فرش سے اٹھی تو میرا لباس بھی کویتا کے جسم سے بہنے والے خون میں تر بتر ہو چکا تھا۔

"دیوی!" کویتا کی ڈوبتی آواز مجھے جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دی۔

میں نے بہ مشکل اس کے زخم زخم جسم کو ستون سے کھولا اور جہاں خون بہہ رہا تھا وہاں سے دور جگہ لے آئی میں اسے لٹانا چاہتی تھی مگر اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اب وہ میری آغوش تھی۔

مرنے سے پہلے کویتا نے رک رک کر مجھے جو کچھ بتایا اس سے حقیقت کا علم ہوا۔ کویتا کے جسم کی بُو چندر موہن نے اس کی موجودگی کا احساس کر لیا تھا پھر اسے جان بخشی کا فریب دے کر حصار سے باہر لے تھا۔ کویتا نے اس غلطی کا اعتراف کیا جو اس کی موت پر منتج ہوئی وہ اس لالچ میں آ گئی تھی کہ چندر موہن ا لعنتی چمپا کی جگہ اپنی دست راست بنا لے گا۔ کویتا نے جو آخری بات بتائی وہ میرے لئے سوہانِ روح تھی؛ موہن نے میرے دشمن ثریان کو وہاں سے گزشتہ رات ہی فرار کرا دیا تھا۔

مجھے وہ بوسہ شاید زندگی بھر یاد رہے گا جو کویتا نے میری پیشانی پر لیا اور پھر اس کے نرم و گرم ہو ٹھنڈے پڑ گئے۔

امر ناتھ کے مندر میں اب کیا باقی بچا تھا جو میں وہاں رکتی' بوجھل قدموں سے میں دھرم شالہ کھنڈرات میں واپس آ گئی۔

شیام بابو اور عادل میرے انتظار میں جاگ رہے تھے اور چراغ روشن تھا انہوں نے مجھے دیکھا تو ان منہ سے حیرت زدہ سی چیخیں نکل گئیں انہیں یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ شاید میں لہولہان ہو کر لوٹی ہوں۔

"یہ میرا خون نہیں ایک باوفا لڑکی کا قابل احترام خون ہے۔" میں نے ان دونوں کو کویتا کے قتل آگاہ کر دیا پھر بولی۔ "مجھے دکھ ہے کہ کویتا کا اصل قاتل شدید زخمی ہونے کے باوجود فرار ہو گیا' ہاں ان دو سادھوؤں کو میں نے ٹھکانے لگا دیا جو بظاہر کویتا کے قاتل تھے۔"

"لیکن.......... لیکن کیسے؟.......... یہ سب کیسے ہو گیا؟" عادل جذباتی ہو گیا۔

"کچھ مت پوچھو مجھ سے .... کچھ نہیں۔" میں ہاتھ اٹھا کر بولی اور پھر اس طرف بڑھ گئی جدھر سے بھری ایک بالٹی اور گھڑا رکھا تھا۔

کھنڈرات میں نہا کر میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر خون آلود لباس کو جلا دیا۔ جب وہ لباس جل رہا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کویتا کی چتا جل رہی ہو۔

☆======☆======☆

دوسرے دن صبح میں سو کر اٹھی تو بڑی حد تک خود پر قابو پا چکی تھی اس کے باوجود گزری ہوئی رات بھیانک مناظر میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔

ناشتہ کرتے ہوئے میں نے خود ہی شیام بابو اور عادل کو مخاطب کیا۔ "اب ہمیں بمبئی واپس چلنا ہے آج رات ہی یہاں سے نکل چلیں گے۔"

"اور وہ ثریان؟" عادل نے سوال کیا۔

"وہ اسی رات یہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ جب ہم نے اس دھرم شالہ کے کھنڈرات میں قدم رکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" عادل اظہار افسوس کرنے لگا۔ "اس طرح تو طویل ترین سفر قطعی رائیگاں ہوا۔"

"ایسا نہیں ہے میں نے اپنے ایک بڑے دشمن کو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ سفر رائیگاں نہیں گیا۔ اس کے علاوہ یہاں اور بہت کچھ ہوا ہے جس سے صرف میں واقف ہوں اور.......... اور وہ واقف تھی جو.......... جو اب اس دنیا میں نہیں رہی۔" میری آواز بھاری ہو گئی میرا اشارہ کویتا کی طرف تھا۔ کویتا ہی تو اس راز میں میری شریک تھی کہ راجہ چک ویر کی مظلوم بہن دیوما کو قید سے کیسے رہائی ملی اور وہ مظلوم و معصوم بے گناہ لڑکیاں راجہ کے رین نواس سے کس طرح پُراسرار طور پر فرار ہو گئیں جنہیں راجہ اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانے کے درپے تھا۔ نیک روح کی یہ پیش گوئی غلط نہیں تھی کہ مجھے بلا سبب نہیں بھٹکایا گیا۔ عظیم مہین نے پہلے کب کوئی ایسی بات کی تھی جو پوری نہ ہو سکے۔

ابھی ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تھے کہ اتیٹا آ گیا اس کے چہرے سے بدحواسی کا اظہار ہو رہا تھا بیٹھتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سوامی جی اپنے خاص چیلے کے ساتھ نہ جانے کہاں چلے گئے انہوں نے رات کو آپ سے تو اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا تھا؟ میں یہی پوچھنے آیا تھا۔"

اس اطلاع پر میں چونک اٹھی میں نے یہ اندازہ تو لگا لیا تھا کہ کری اپا اپنی شکست قبول کر چکا ہے مگر یہ خیال نہیں تھا وہ مڈکیری سے جانے میں اتنی جلدی کرے گا۔

"نہیں انہوں نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"ساری ذمے داری وہ میرے کاندھوں پر ڈال گئے۔" اتیٹا نے اداس سے لہجے میں بتایا۔ "بھور سے جب سوامی جی کے سیوک حسب معمول ان کی سیوا کے لئے کمرے میں پہنچے تو بستر پر ایک خط ملا۔ اور باتوں کے ساتھ سوامی جی نے ایک عجیب سی بات خط میں لکھی ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"وہ خط ساتھ لائے ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اتیٹا نے یہ کہہ کر جیب سے خط نکالا اور مجھے دے دیا۔

میں ایک شکست خوردہ شخص کی تحریر پڑھنے لگی خط کی عبارت یہ تھی۔

میرے بیٹے سمان اتیٹا جگ جگ جیو۔

میرے بجائے کل منہ اندھیرے میرے بستر پر یہ خط ملے گا! مجھ سے پہلے تمہی "کاویری مکل کوٹ" کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے سو اب یہ پد (عہدہ) میں تمہیں واپس کر رہا ہوں اس مان کے ساتھ کہ تم اس پر کوئی حرف نہیں آنے دو گے۔ اب تک کی جدوجہد کے نتیجے میں مجھے پتا چلا کہ راج گھرانے کے آپسی جھگڑے ہمارے سب سے بڑے دشمن کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں' ہم جنہیں اب تک اپنا دوست سمجھتے آئے ہیں وہ ہمارے

اصل دشمن ہیں۔ جان لو کہ کبھی بدیسی ہمارے دوست نہیں ہو سکتے راجہ چک دیر رہے یا کوئی اور مگر اسے ر گھرانے ہی سے ہونا چاہئے اسی میں ہماری جیت ہے۔ ہمارا اصل اور بڑا دشمن انگریز ہے جو ہماری ریاست نظریں جمائے بیٹھا ہے اس کے ناپاک قدم کبھی اس دیش کی دھرتی پر نہ پڑنے دینا۔ اگر بھگوان نہ کرے کوئی سمے آ جائے تو بہادر کوڈیوں کی طرح لڑتے ہوئے جان دے دینا' میں بہت تھک گیا ہوں اور اسی لئے ڈکر سے جارہا ہوں' کہاں؟ یہ ابھی خود مجھے بھی معلوم نہیں میرے پیچھے نہ آنا بھگوان تمہیں سدا سکھی رکھے۔

تمہارا سوامی

"اتیٹا تمہیں اس خط میں کیا بات عجیب معلوم ہوئی؟" میں نے خط واپس دیتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہی کہ انگریز ہمارا اصل دشمن ہے جبکہ انگریز سرکار ہماری دوست ہے اور اس نے آج تک ہمار خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"

"یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ راج نیتی میں کوئی سدا نہ کسی کا دوست رہتا نہ دشمن' یہ دوستی یا دشمنی وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔"

میں اسے سمجھانے لگی۔ "سوامی جی تم سے زیادہ عمر کے تھے' ان کا تجربہ بھی تم سے زیادہ تھا' انہوں تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے اگر وہ اصل دشمن کی نشاندہی کر گئے ہیں تو یہ بات غلط نہیں ہو سکتی پھر یہ کہ وہ ا بزرگ ہستی تھے ان کے پاس بھگوان کی دی ہوئی وہ شکتی بھی تھی جس کے متعلق تمہی نے مجھے بتایا تھا۔ سو کچھ سوامی جی نے لکھا ہے اس پر عمل کرو۔"

"ٹھیک کہتی ہیں آپ' میں نے خود بھی یہی سوچا تھا۔ بھگوان کی کرپا رہی تو ہم اس دیش پر آنچ نہ آنے دیں گے۔" اتیٹا کے لہجے میں اب مایوسی نہیں تھی ذرا توقف کے بعد وہ کہنے لگا۔ "معلوم نہیں کیا با ہے کہ ان دنوں عجیب عجیب واقعات پیش آ رہے ہیں ابھی میں ادھر آ رہا تھا تو امرناتھ جی کے مندر سے ارتھیاں اٹھ رہی تھیں۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ کسی نے کل رات مندر کی ایک داسی اور دو بھگتوں کو قتل کر دیا ا کے علاوہ پُراسرار طور پر مندر کا وہ مضبوط حصہ بھی جانے کیسے ڈھے گیا جہاں بڑے مہاراج کا استھان تھا۔ دیکھ یوں لگتا ہے جیسے پہلے وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ لنگڑے بسودیا کو بھی میں نے ادھر ہی جاتے دیکھا تھا پر میں وہاں نہیں کہ یہاں آنا تھا۔" پھر اتیٹا کو جانے کس طرح یہ احساس ہو گیا کہ کویتا وہاں نہیں ہے سو اس نے کویتا بارے میں پوچھ لیا۔

"اسے میں نے آگے بھیج دیا اور اب ہم لوگ بھی واپس جانا چاہتے ہیں۔" میں نے جواب میں کہا۔

"کہاں کماری جی؟" وہ حیرت سے بولا۔

"وہیں جہاں سے آئے تھے یعنی بمبئی۔"

"پر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ہمیں تو ٹھیک طرح سے آپ کی میزبانی کا موقع بھی نہیں ملا۔"

"آئندہ سہی ہم لوگ آتے جاتے رہیں گے اب ٹھکانا تو دیکھ ہی لیا ہے۔" میں نے مسکرا کر بات دی۔

"وہ آپ کی ساتھی اکیلی سفر کریں گی؟"

"اسے صرف اگلے پڑاؤ تک بھیجا ہے اسی جگہ جہاں تم سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی وہ جگہ یہاں ے زیادہ دور تو نہیں ہے۔ اکیلی گئی ہے اس لئے کسی کو اس پر شبہ بھی نہیں ہو گا۔"

"ایک ایک کر کے جانے کی بجائے اگر آپ لوگ رات کو ایک ساتھ نکل جائیں تو زیادہ اچھا ہے اس رصے میں ہم آپ کے لئے رستے میں کھانے پینے کا بندوبست بھی کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے ہم رک جاتے ہیں آج دن بھر۔" میں گویا راضی ہو گئی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو دوپہر کا کھانا میں کر دوں؟" اتیٹا کے لہجے میں خلوص تھا۔

میں اس پر بھی راضی ہو گئی اور اتیٹا چلا گیا اس کے جاتے ہی میں آرام کرنے لیٹ گئی عادل اور شیام بابو کو بھی میں نے یہی مشورہ دیا تھا کیوں کہ ہمیں ایک دشوار گزار سفر درپیش تھا۔

☆======☆======☆

بمبئی آئے ہوئے مجھے دوسری رات تھی میں نے رانی کی باندرہ والی کوٹھی ہی میں قیام کیا تھا۔ پہلی رات ہے گزری تھی اور دن بھی۔ رانی کو اسی لئے مجھ سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

"وہ لڑکی کہاں گئی جو تمہارے ساتھ یہاں سے گئی تھی؟" رانی نے کویتا کے بارے میں معلوم کیا' ہم لوگ رات کا کھانا کھا کر اٹھنے ہی والے تھے۔

"اسے میں نے وہیں چھوڑ دیا جہاں گئی تھی۔" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا کوشش کے باوجود کویتا کے ذکر پر میں خود کو سمیٹ کے نہ رکھ سکی۔

رانی نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا پھر بولی۔ "میں سمجھ گئی لڑکی خرچ ہو گئی.......... لیکن تم کیوں اداس ہو گئیں؟"

رانی کے لئے اس کے کسی ساتھی کا ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانا اداسی کا سبب نہیں تھا میں اس کے مزاج سے واقف تھی سو اس کے سوال کو ٹال گئی۔

شیام بابو ظاہر ہے میرے ساتھ رانی کی کوٹھی میں نہیں رکا تھا' اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عادل البتہ اب بھی میرے ساتھ تھا وہ بھلا کہاں جاتا رانی کے سامنے اس کی حیثیت میرے ملازمین جیسی تھی اس لئے وہ سامنے والی ایک کرسی پر لاتعلق سا بیٹھا تھا۔

"آؤ چلو لان میں ٹہلتے ہیں۔" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے عادل کو مخاطب کیا۔

"یس میڈم!" عادل جواب دیتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا میں چلی' مجھے ذرا ایک کام سے کھار کے اڈے تک جانا ہے تم تو ظاہر ہے ٹہل کر سو جاؤ گی کل تفصیلی ملاقات ہو گی دن میں' ابھی تو تم رہو گی نا؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔" میں محتاط لہجے میں بولی۔ "ہاں صبح تک تو بہرحال موجود ہوں۔" کھار کے اڈے کے ذکر پر مجھے ولیم یاد آ گیا تھا اس کی زندگی کے آخری لمحات وہیں گزرے تھے۔

"ناشتے پر تو ملو گی نا یا اس کی بھی خبر نہیں؟" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

رانی ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی تو عادل کو ساتھ لئے میں چہل قدمی کی خاطر عقبی لان میں آ گئی۔ کو
عادل کی کوئی خاص وابستگی نہیں تھی یوں بھی وہ کسی روگ کو زیادہ عرصے پالنے کا قائل نہیں تھا اس لے
ملتے ہی چہکنے لگا۔ اسے بہت دنوں بعد مجھ پر فقرے بازی کا موقع ملا تھا۔ مجھے وہ ”اداس بلبل“ اور جا
القاب دیتا رہا مگر میرا موڈ بحال نہ ہو سکا۔ میں اس سے باتیں تو کر رہی تھی لیکن بے دلی کے ساتھ۔ نتیجتاً
چہکتے چہکتے تھک گیا میرے لئے یہ موقع غنیمت تھا لان سے لوٹ آئی۔

ریاست کوڈگ سے میں واپس تو آ گئی تھی، مجھے اس کے مستقبل کے بارے میں بھی اندازہ ہو گیا
بھی اس پر جی آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ میرے دشمن اسے ہضم کر جائیں۔ اس کے علاوہ مجھے ژیان کی فکر؛
میرے قیاس کے مطابق چندر موہن اگر زندہ بچ بھی گیا تھا تو طویل عرصے کے لئے بستر علالت اس کا نصیب
ایسے میں ژیان اور چمپا دونوں ہی سے میں نمٹ سکتی تھی۔ ان حالات میں جب کہ خود اسی کی زندگی
بھروسا نہیں تھا وہ میرے دشمن ژیان یا چمپا کی کیا مدد کر پاتا۔

چمپا کے بارے میں مجھے علم تھا کہ اسے چندر موہن نے اپنے مضبوط قلعے بنگال بھیج دیا تھا۔ بنگال یہ
کا مرکز کلکتہ تھا مجھے یہ بھی پتا تھا۔ ژیان کے متعلق بھی میرا یہی خیال تھا کہ چندر موہن نے اسے بھی وہیں
کیا ہو گا انہی وجوہ کی بناء پر میں کلکتے جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نجیرہ نے اونچے پہاڑوں سے ا
مجھے اسی شہر میں تو پہنچایا تھا اس شہر سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

میں اپنے کمرے میں آ کر سونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ نیک روح عظیم مہین کی سرگوشیاں سنائی
لگیں۔ ”اے معبلہ! اب تیری منزل زیادہ دور نہیں تُو نے جدھر کا ارادہ کیا ہے ٹھیک ہے تیرا دشمن وہیں
اور سن، یہ تُو کسی کی تقدیر سے لڑنے کی کوششیں کیوں کرتی ہے؟ اپنے جی کو سنبھال کے رکھا کر تیرا جی ا
آمادہ نہیں کہ ریاست کوڈگ پر تیرے دشمن قبضہ کر لیں تو کیوں؟ تُو بھلا کون ہے لکھے کو ٹالنے والی؟ تجھے بتا
تھا پھر بھی یقین نہیں آیا؟ تو پھر اپنی آنکھوں سے خود اپنے دشمن کا پرچم بلند ہوتے دیکھ سن اور محسوس
نے اب تک ماضی اور حال کو دیکھا کہ تیری آنکھوں کو یہی دکھایا گیا۔ تو بڑی ضدی ہے اور چہیتی بھی۔
مستقبل میں بھی جھانک، دیکھ کہ اس ریاست پر کیا گزرنے والی ہے جہاں سے تُو لوٹ کے آئی ہے۔“

اسی کے ساتھ میرے صفحہ ذہن پر مختلف مناظر ابھرنے لگے وہ جو ہونے والا تھا میری آنکھوں کو پ
دکھایا جا رہا تھا۔ مجھے یہ مناظر جس تسلسل اور ربط کے ساتھ دکھائے گے اسی طرح بیان کر رہی ہوں ان
کے دوران میں مجھے بار بار عظیم مہین کی سرگوشیاں بھی سنائی دیتی رہیں۔

پہلا منظر میں نے یہ دیکھا کہ ظالم و بدکردار راجہ چک ویر نے اپنگول پر اچانک شب خون مارا را
بہن دیوما اور اس کا بہنوئی چین بسو بڑی افراتفری میں راج محل سے فرار ہو کر میسور کی طرف بھاگے۔
بچے کو وہ اپنگول کی ایک غریب عورت کے پاس چھوڑ گئے تھے کہ کہیں وہ نہ مارا جائے مگر یہ راز کھل گیا وا
کدیا اپنے ماموں راجہ چک ویر کے ہتھے چڑھ گیا۔ اپنگول سے اس معصوم کو مڈکیری کے راج بھون میں لایا

اس کے بعد مستقبل کے یہ مناظر بدلتے رہے میں نے اس بچے کو رانی گورما اور راجکماری پٹما کے
دیکھا۔ چک ویر نے موقع پا کر ایک روز بھانجے کو مار دیا کہ وہ اس کے دشمن چین بسو کا بیٹا تھا یہ بات چھ

تی اور عوام تک پہنچ گئی۔ یہ ظلم عوام کے لئے ناقابل برداشت تھا اس میں ”فرزندان کاویری“ نے بھی اہم
ردار ادا کیا کہ عوام بغاوت پر کمربستہ ہو گئے۔

انگریز حکومت نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ریاست پر دباؤ بڑھا دیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک عیار
انگریز جنرل فریزر کی کمان میں بنگلور کی طرف سے ریاست پر حملے کا آغاز کر دیا گیا یہ حملہ پانچ سمتوں سے کیا گیا
انہی میں سے ایک محاذ پر میں نے اتیٹا اور اس کے ساتھیوں کو داد شجاعت دیتے اور پھر بہادری سے مرتے دیکھا۔
راجہ چک ویر کو مجبوراً مڈکیری سے بسودیا کے ساتھ فرار ہونا پڑا ورنہ مشتعل عوام اسے مار ڈالتے۔ مڈکیری سے
بھاگ کر چک ویر نالک ناڈ پہنچ گیا رانی اور راجکماری کو وہ خود غرض مڈکیری کے راج بھون ہی میں چھوڑ گیا اس کا
کہنا تھا کہ عوام ان دونوں کو قتل نہیں کریں گے کیوں کہ وہ کوڈگی ہیں۔

بے راجہ اور بغیر کسی سربراہ کے فوج کیوں اور کب تک لڑتی، محاذ جنگ پر وزیر دفاع اور افواج کے
کمانڈر انچیف بوپنا کو یہ خبر ملی کہ راجہ چک ویر دارالحکومت سے فرار ہو گیا ہے تو اس نے سفید پرچم بلند کر دیا
جواب میں جنرل فریزر نے بھی ایسا ہی کیا اور لڑائی رک گئی۔ انگریز جنرل کو بھی راجہ کے فرار کی خبر مل چکی تھی
اس شاطر نے بوپنا کو پیغام بھیجا۔ ”آپ ادھر آئیں گے یا ہم ادھر آئیں؟ جو آپ کی مرضی ہو کہلوا دیں ہم کوئی
ایسی بات نہیں کرنا چاہتے جس سے آپ کی عزت میں فرق آئے۔“

بوپنا نے کہلوایا۔ ”ہمی وہاں آ جائیں گے آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں۔“

پھر نصف گھنٹے کے بعد بوپنا انگریزوں کی چھاؤنی میں پہنچ گیا انگریز جنرل نے بڑے تپاک سے اس کا
استقبال کیا اور اسے اپنے خیمے میں لے جا کر کرسی پر بٹھایا اور پھر خود بھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ ریاست
کی فوج کے سربراہ ہیں اور ہمارے لئے قابل عزت ہیں۔ آپ کا تن تنہا یہاں آنا بلند ہمتی کی دلیل ہے۔
ریاست کے عوام اگر آپ کو عزت و احترام دیتے ہیں تو بجا ہے۔ آپ خود بتایئے کہ انگریز حکومت اور کوڈگ
کے درمیان جو یہ جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے کیسے ختم ہو؟“

”دباؤ آپ کی طرف سے بڑھایا گیا اور آپ کی حکومت نے ہماری ریاست کے اندرونی معاملات میں
مداخلت کی۔“ بوپنا دلیری سے بولا۔

”اور کیا آپ کے راجہ نے ہمارے سفارتی نمائندوں کی گرفتاری کا حکم نہیں دیا؟“ انگریز جنرل رواں
کوڈگی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔

”بلاشبہ ایسا ہوا، مگر کیوں؟ محض اس لئے کہ ہمارے معاملات میں سفارتی نمائندوں نے ہمی سے جواب
طلبی کی، آپ کے نمائندوں کا کہنا تھا کہ ہمارے راجہ نے اپنی بہن اور بہنوئی پر ظلم ڈھایا ہے ان لوگوں نے آپ
کی حکومت سے فریاد کی اور آپ نے راجہ کی بہن اور بہنوئی کے جان و مال کی حفاظت اور اپنے نمائندوں کو
چھڑانے کے لئے ہم پر فوج کشی کر دی.........؟ کیا یہ مناسب بات ہے؟“

”ہماری حکومت کے خیال میں یہی مناسب بات تھی ورنہ ایسا نہ کیا جاتا۔“ انگریز جنرل نے پُرسکون
آواز میں جواب دیا۔ ”آپ کے راجہ نے اپنے بھانجے کا خون کر دیا ہے انہیں سزا دینا اب ہمارا کام ہے انگریز
حکومت کی طرف سے کوڈگ کے روشن مستقبل اور بھلائی کے لئے مناسب اقدام کرنا ہمارا فرض ہے۔“

"کوڈگ کے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہمارے عوام جاگیرداروں اور ساہوکاروں کا فرض ہے غیر ملکیو حق نہیں دیا جا سکتا۔" بوپنا کے لہجے میں تیزی آ گئی۔

عیار انگریز جنرل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی جو اباد دھیمے اور نرم لہجے میں بولا۔ "جو بات کے لیڈروں کو پسند نہیں وہ بات ان سے ہمیں بھی منوانے کی خواہش نہیں ہے۔ ہماری حکومت اس۔ ہے کہ خود آپ لوگ اپنی ریاست کا نظم و نسق چلا سکتے ہیں لیکن ایسے مواقع پر فیصلے میں تاخیر عوام۔ عذاب بن جاتی ہے۔ ایسے ہی معاملات کو نمٹانے کے لئے باہر کے دوست کام آتے ہیں ہم یہی بات آپ کرانا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد آپ سے دوستی ہے دشمنی ہرگز نہیں۔"

"یہ تو خوشی کی بات ہے کہ آپ کی حکومت ہمیں یعنی کوڈگ عوام کو اپنا سمجھتی ہے آپ اپنی کے مطالبات بتائیں۔"

"راجہ نے انگریز حکومت کی بے عزتی کی ہے۔" انگریز جنرل کے تیور بدل گئے وہ گرگٹ کی طرح بدلتا تھا۔ "انگریز حکومت نے ان کی بہن اور بہنوئی کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا انہوں نے غصے میں آ بھانجے کا خون کر دیا اس بے عزتی کی سزا کے طور پر انہیں اقتدار سے محروم کرنا ہے خون کرنے کی سزا۔ پر انہیں سزائے موت دی جائے یا اور کوئی سزا' یہ بعد میں سوچا جائے گا۔"

"اپنے بھانجے کو قتل کرنے کے سلسلے میں آپ انہیں سزا دینے کا حق نہیں رکھتے کیوں کہ وہ حکومت کی رعایا میں نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے' ہمیں پتا چلا ہے کہ عوام خود راجہ کو اس کی سزا دینا چاہتے ہیں اور آپ ہماری نظر میں کی آواز ہیں۔ اگر آپ اس پر آمادہ نہیں تو ہم اس جھگڑے میں نہیں پڑتے۔" انگریز جنرل نے پہلو بدلا۔ صورت میں ہمارے سفارتی نمائندوں کو بلا تاخیر رہا کرنا پڑے گا' راجہ کی بہن اور بہنوئی کے لئے ان کی کے مطابق رہنے کا انتظام کرنا ہو گا اسی کے ساتھ آپ کو تاوان جنگ بھی ادا کرنا پڑے گا' آئندہ کبھی میں ایسی بے چینی نہ پھیلے اس کے لئے ہمارے بنائے ہوئے لائحہ عمل پر چلنا ہو گا۔"

"آئندہ بے چینی نہیں پھیلنا چاہئے یہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم آپ کے ترتیب دیئے ہوئے لائحہ کیوں چلیں؟"

"اس لئے کہ کوڈگ ہماری عملداری کے درمیان میں ہے یہاں جو گڑبڑ ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی ہمارے علاقوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمارے علاقے گڑبڑ سے محفوظ رہ سکیں اس لئے آپ کو ہمارا کردہ لائحہ عمل اپنانا ہو گا۔" جنرل فریزر نے بوپنا کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا پھر وہ بوپنا کو خاموش دیکھ کر سے کہنے لگا۔ "آپ جس ڈھنگ کا دستور پسند کریں گے اسی پر عمل ہو گا آپ کی مرضی کے خلاف ہم ایک بھی نہیں اٹھائیں گے۔ ہم اتنی دور صرف کوڈگی عوام کی بھلائی کی خاطر ہی آئے ہیں' آپ کے کہنے کے ہی چلیں گے' مسند اقتدار کے اصل وارث کو مقرر کر کے ہم آپ کی خدمت ہی کریں گے' نئے راجہ انتخاب اور اس کے اقتدار سنبھالنے کے لئے نیز یہ جھگڑا مکمل طور پر ختم ہونے پر ہم دوستوں کی طرح آپ اجازت لے کر یہاں سے رخصت ہوں گے۔"

"تو کیا اس کے لئے آپ مڈکیری آنا چاہتے ہیں؟"

"اگر آپ اسے بہتر نہ سمجھیں تو ہم نہیں آتے بلکہ یہیں سے واپس ہو جائیں گے پھر آپ کو ان باتوں کا معقول بندوبست کر کے ہمیں یہیں بتانا پڑے گا۔"

"اچھی بات ہے ہم سوچ بچار کے بعد اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کرتے ہیں۔"

"وراثت کے موضوع پر سوچتے وقت آپ دو ناموں پر اور غور کر لیجئے گا۔" انگریز جنرل پھر مسکرا دیا۔ "راجہ کی بیوی اور بیٹی تو آپ کی فہرست میں ہوں گی ہی شاید تیسرا نام ہے راجہ کی بہن کا' شاید کا لفظ ہم نے لئے استعمال کیا ہے کہ ممکن ہے وہ آپ کی فہرست میں نہ ہو بہرحال ابھی تک جن دو ناموں پر آپ نے غور نہیں کیا ہو گا ان میں سے ایک راجہ کا تایا زاد ہے اور دوسرا ہے راجہ کا سگا بڑا بھائی۔"

"راجہ کے تایا کا نام کری اپا ہے یہ بات تو آپ کو معلوم ہی ہو گی۔"

"وہ تو عرصہ دراز سے گم ہیں اس واقعے کو تیس برس گزر گئے لوگ تو کہتے ہیں وہ مر چکے ہیں۔"

"ممکن ہے ایسا ہو۔" انگریز جنرل بولا۔ "لیکن ہمارے ساتھ دو ایسے افراد ہیں جو خود کو کری اپا اور وریتا بتاتے ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"اس وقت گو یہاں نہیں ہیں۔" انگریز جنرل نے پھر پہلو بدلا۔ اس کے لہجے سے جھوٹ کا ذرا بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ "وہ دونوں ہماری اس فوج کے ساتھ ہیں جو ارکل گوڈ کی طرف سے پیش قدمی کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔"

"تو آپ نے صلح کا پرچم بلند ہونے کے باوجود ابھی تک اپنی افواج کو پیش قدمی سے نہیں روکا؟" بوپنا ایک اور ہی معاملے میں الجھ گیا۔

"ابھی ہمارے اور آپ کے درمیان صلح کب ہوئی ہے۔ ابھی تو صلح کے لئے مذاکرات شروع ہوئے ہیں۔" پھر بوپنا پر مزید دباؤ ڈالنے کی خاطر انگریز جنرل نے بقیہ تین محاذوں کے بارے میں بھی بتایا جہاں ریاست کی فوج پسپا ہو کر پیچھے ہٹ رہی تھی۔

صورت حال کچھ ایسی ہو گئی کہ بوپنا کو صلح ہی میں عافیت نظر آئی۔ انگریز فوج ہر طرف سے ریاست میں گھس آئی تھی راجہ کے مڈکیری سے فرار نے فوج کے حوصلے پست کر دیئے تھے پھر جب انہوں نے یہ سنا کہ عوام نے بھی بغاوت کر دی ہے تو ان کے پیر اکھڑ گئے۔ ہاری ہوئی جنگ جیتنے کے لئے صلح ضروری تھی سو بوپنا اس پر بھی راضی ہو گیا کہ فریزر اپنی فوج کے ساتھ بہ حیثیت دوست مڈکیری چل سکتا ہے۔"

اس مصالحت کے بعد پھر وراثت پر گفتگو ہونے لگی انگریز جنرل کہنے لگا۔ "آپ کے راجہ کا ایک بھائی اور ہے اس ضمن میں ہمیں بہت سے خطوط ملے ہیں وہ سب خطوط ہم ساتھ لائے ہیں۔ ثبوت فراہم کرتے وقت جب آپ کو ان خطوط کی ضرورت پڑے گی دکھا دیئے جائیں گے۔"

"ان باتوں کو طے کرنے کے لئے آپ کا مڈکیری ہی میں رہنا مناسب ہے۔"

"یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے اگر آپ ہمیں وہاں بلائیں گے تو ہماری طرف سے کوئی اعتراض

نہیں۔" شاطر انگریز بولا۔

"آپ یہی سمجھئے کہ ہمارے بلاوے پر یہاں آئے ہیں بس یہ خیال رکھئے گا کہ معاملات نمٹ جانے کے بعد جب ہماری جنتا آپ سے واپس جانے کو کہے گی آپ کو واپس جانا ہو گا۔"

واپس جانے کے لئے وہ عیار کب وہاں آیا تھا وہ ایک کے بعد ایک چالیں چلتا گیا اور اس کے ڈکیری کے بعد یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ ریاست کے عوام اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے بھگوتی بھی اس سے مل خود کو ظاہر کر دیا' بندر بانٹ شروع ہو گئی۔

عوام نے خود مطالبہ کیا کہ راجہ چک ویر کو گرفتار کر کے اس کی جگہ کسی اور کو ریاست کا سربراہ جائے۔ چک ویر کی گرفتاری کے لئے نالک ناڈ کی طرف فوجی دستے روانہ ہو گئے۔ اس سے پہلے بھگوتی نالک کے راج محل میں ایک خفیہ سرنگ کی نشاندہی کر چکی تھی جو قریبی جنگل میں نکلتی تھی وہ ایک مرتبہ لنگ کے ساتھ اس راج محل میں رہ چکی تھی۔ اس نے جنرل فریزر سے وعدہ لے لیا تھا کہ راجہ چک ویر اور اس وزیراعظم بسودیا کو ہر قیمت پر زندہ گرفتار کیا جائے گا۔ انگریز جنرل نے فوجی دستوں کو یہی ہدایت دی تھ راجہ اور بسودیا کو زندہ پکڑا جائے۔ ایک انگریز کمانڈر جیکسن ان فوجی دستوں کا انچارج بنایا گیا تھا اسے یہ ہد دی گئی تھی کہ سرنگ کا جو دہانہ جنگل میں ہے وہاں خود فوجیوں کے ساتھ موجود رہے۔ خبر یہ تھی کہ راج بسودیا کے ساتھی راج محل میں زیادہ سپاہی نہیں ہیں پسپا ہو کر وہ آخرکار سرنگ کے ذریعے فرار ہو۔ کوشش کریں گے۔

پھر میری آنکھوں نے مستقبل میں جھانک کر راجہ چک ویر اور بسودیا کا عبرت ناک انجام دیکھا۔

مجھے بدکردار عیاش راجہ چک ویر کا چہرہ نظر آیا اس پر شدید غصے کے آثار تھے' ابھی ابھی اسے بتایاً کہ ڈکیری سے کچھ فوجی دستے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور ان کا رخ نالک ناڈ کے راج محل ہی کی طرف ہے دینے والا لنگڑا بسودیا تھا۔

بسودیا نے یہ خبر ملتے ہی آس پاس کے دیہات سے کوئی دو سو آدمی یہ سوچ کر بلوا لئے تھے کہ فوج نیک ارادے سے نہیں آ رہی ہو گی اس نے ان آدمیوں کو محل کی چاردیواری پر قطار بنا کر کھڑا کر دیا۔ پھ انتظام سے راجہ کو آگاہ کیا۔ خبر سنتے ہی چک ویر کا چہرہ اتر گیا اور اس نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔ "کیا اسلح گولہ بارود ہے؟"

"فکر نہ کریں مالک ہمارے سپاہیوں کا نشانہ بہت اچھا ہے ضرورت پڑنے پر ہم دو دن تک لڑ سکتے ہیں بسودیا نے تسلی دی۔

"اچھا ٹھیک ہے دیکھیں گے' ابے لنگڑے پہلے یہ تو معلوم کر وہ کون ہیں؟"

"کرتا ہوں معلوم مالک!" بسودیا گالیاں کھا کر بے مزہ ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔

ذرا ہی دیر بعد فوجی دستے محل سے خاصے فاصلے پر آ کے رک گئے پھر ایک گھڑسوار سفید جھنڈا لہرا آگے بڑھا وہ ایک انگریز فوجی افسر تھا۔

محل کے نیچے پہنچنے کے بعد انگریز افسر نے بلند آواز میں کہا۔ "راج محل سے کسی کو بھیجو' کچھ بات

ہے۔" یہ الفاظ اس نے انگریزی ہی میں ادا کئے تھے اسے مقامی زبان نہیں آتی تھی۔

بسودیا نے محل سے ایک مترجم کو باہر بھیجا اس نے واپس آ کر بتایا۔ "یہ فوج بنگلور سے آئی ہے انگریز جنرل فریزر ڈکیری پہنچ چکا ہے انگریز فوجی افسر کہہ رہا ہے کہ راجہ جی کو چاہئے کہ وہ خود کو ان کے حوالے کر دیں ورنہ انہیں زبردستی یہاں سے گرفتار کر کے لے جایا جائے گا۔"

یہ سنتے ہی چک ویر مشتعل ہو گیا اور چیخ اٹھا۔ "لنگڑے تُو ان کا حوصلہ دیکھ رہا ہے؟ کل تک یہ اپنی عورتوں کو میرے ناز اٹھانے بھیجتے تھے' ابے تجھے تو معلوم ہے سب کچھ' آج یہی اکڑ کے بول رہے ہیں دو چار کو بھون دے' سالوں کی عقل ٹھکانے آ جائے گی۔"

"جو مالک کا حکم۔" بسودیا نے جواب دیا پھر نرمی سے سمجھانا چاہا۔ "لیکن مالک آنے والے بنگلور کے ہیں ان کے ہتھیار ہمارے ہتھیاروں سے اچھے ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم آڑ میں ہیں مگر ہم لوگ انہیں زیادہ دیر تک نہیں روک سکیں گے۔"

اس پر چک ویر مزید برہم ہو گیا۔ "ابے کہیں تُو بھی تو ان انگریزوں سے نہیں مل گیا؟ کیا مطلب ہے تیرا کیا گرفتار ہو جاؤں؟"

"نہیں مالک میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا۔"

"پھر کیا تھا تیرا مقصد؟" چک ویر تھوڑا نرم پڑ گیا۔

چک ویر کو نرم پڑتے دیکھ کر بسودیا کے دل کی بات زبان پر آ گئی' اس کا لہجہ رازدارانہ سا تھا۔ "اگر مالک کی اجازت ہو تو میں خود ان سے جا کے بات کروں' مترجم کو ساتھ لے جاؤں گا۔ میں ان سے کہوں گا کہ ہمارے مالک خود چلنے کو تیار ہیں گرفتار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس طرح چلنے میں بے عزتی کی بات نہیں عزت کے ساتھ ڈکیری پہنچ.........."

"بڑا عقلمند سمجھتا ہے تُو اپنے آپ کو لنگڑے! اب تک تجھے ہمارا حکم ماننے کی عادت نہیں پڑی۔"

"ٹھیک ہے مالک جو حکم آپ کا لیکن اب آپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں' ہو سکتا ہے کہ جو فوجی دستے ابھی خاصے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہیں کچھ دیر میں آگے بڑھ آئیں۔"

"یہاں نہ رہوں تو کہاں جاؤں؟ یہ بھی تو بھونک۔" رسی جل گئی مگر ابھی بل نہیں گئے تھے۔ چک ویر کے لہجے میں وہی پہلے جیسا تکبر اور غرور تھا۔

"لڑائی کی صورت میں دو ایک گھنٹے میں ان لوگوں کو روک سکتا ہوں انہیں شبہ نہ ہو کہ آپ کا ارادہ فرار ہونے کا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دور سے ایک آدھ بار درشن کرا دیں آپ سرنگ کے راستے نکل جائیں تو اچھا ہے۔ اگر ابھی ان کا سامنا نہیں کر سکتے جو بنگلور سے ریاست میں گھس آئے ہیں تو جنگل میں روپوش رہ سکتے ہیں' جنگلوں اور پہاڑوں میں برسوں وہ آپ کو نہیں ڈھونڈ پائیں گے' انگریز فوج کبھی تو واپس جائے گی ہی اس کی واپسی کے بعد روپوشی سے نجات مل جائے گی۔ رہا عوام کا غصہ تو وہ اس عرصے میں جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا مالک! عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے زیادہ دن وہ کسی بات کو یاد نہیں رکھتے' سب اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ پھر اگر کسی کو یہ بات یاد بھی رہ گئی کہ آپ کے ہاتھوں ایک بچے کا خون ہو گیا تھا

تو اس کا بھی ایک توڑ ہے' لگان میں تھوڑی سی رعایت سے بھی لوگ خوش ہو جائیں گے۔"

"ابے لنگڑے' مجھے خبر نہ تھی کہ تو بھی راج نیتی جانتا ہے۔ چل ہم نے تیری بات مان لی دو چار فائر کر اور میری بندوق بھی منگوا۔" چک ویر پرسکون نظر آنے لگا۔

بسودیا نے چک ویر کی بندوق لانے کو ایک ملازم سے کہہ دیا پھر وہ مترجم سے بولا۔ "جا کر اس انگریز ا سے کہو کہ راجہ جی کو اس کی بات منظور نہیں اگر وہ لوگ زبردستی کریں گے طاقت سے کام لیں گے تو لڑائی گی اس سے ان کے لوگوں کی جانیں بھی جائیں گی۔"

چار دیواری پر بسودیا نے جن دو سو مسلح افراد کو ایک قطار میں کھڑا کیا تھا انہیں بتایا کہ جب میری طر سے "تیار ہو جاؤ" سنو تو فوراً فائرنگ شروع کر دو فائر ضائع نہیں جانا چاہئے' آڑ میں سے بیٹھ کر فائرنگ کرنا. اس طرح کھڑے نہ رہنا ورنہ مارے جاؤ گے۔ ایک گولی سے کم از کم ایک آدمی تو مرنا ہی چاہئے۔ پھر اس محل میں موجود تقریباً ایک سو سپاہیوں کو بھی یہی ہدایت دی۔

ملازم نے چک ویر کو بندوق لا کر دے دی بسودیا اس کے پاس جا کر کہنے لگا۔ "مالک آپ یہیں ستونو کی آڑ لے کر فائر کیجئے گا آگے نہ بڑھئے گا۔"

"ہونہہ مجھے سمجھا رہا ہے لنگڑا بھول ہی گیا کہ میں نے جوانی میں شیروں تک کا شکار کیا ہے' یہ انگری گیدڑ ہیں۔"

اس دوران میں مترجم نے انگریز افسر کو بسودیا کا پیغام پہنچا دیا۔

"ہمیں حکم ملا ہے کہ راجہ صاحب اور ان کے وزیراعظم کو کوئی نقصان نہ پہنچے ہم انہیں کوئی گزند نہ پہنچانا چاہتے۔ اگر جنگ ہی کرنا ہے تو راجہ صاحب اور ان کے وزیراعظم کسی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے سامنے آئیں ہم ان دونوں کو صرف اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں چاہے وہ راضی بہ رضا چلیں یا انہیں گرفتار پڑے۔" انگریز افسر بولا۔

مترجم نے محل میں آ کر انگریز افسر کے کہے ہوئے الفاظ دہرا دیئے۔

"بھون دو سالوں کو۔" یہ کہتے ہوئے پہلا فائر چک ویر ہی نے کیا' اس نے واپس جاتے ہوئے انگریز اف کو نشانہ بنایا تھا گولی نشانے پر ہی بیٹھی مگر چک ویر کی بدقسمتی سے انگریز افسر صرف زخمی ہو سکا اس کا شانہ اد گیا تھا اس کے سبب دائیں ہاتھ سے سفید پرچم چھوٹ کر نیچے گر پڑا اسی پرچم کو سنبھالنے کی خاطر انگریز اف گھڑسواری کرتے ہوئے تھوڑا سا ایک طرف ہو گیا تھا چک ویر اس وقت تک فائر کر چکا تھا۔

جس کے ہاتھ میں سفید پرچم ہو اس پر گولی چلانا یا حملہ آور ہونا جنگی قواعد کے خلاف ہے مگر چک ویر جی لوگ کب کسی قاعدے سے کو مانتے ہیں۔

زخمی انگریز افسر جیسے تیسے گولیوں سے بچتا بچاتا اپنے فوجی دستوں تک پہنچ گیا۔ جیکسن کیونکہ وہاں دور جنگل میں نکلنے والی سرنگ کے دہانے پر تھا اس لئے ان فوجی دستوں کی کمان اس کا ایک ماتحت کر رہا تھا نے زخمی افسر کو پیچھے بھیج دیا تاکہ طبی امداد مل سکے پھر اپنے دستوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا ذرا ہی دیر میں دونو طرف سے شدید فائرنگ ہونے لگی۔

نتیجہ وہی نکلا جو بسودیا پہلے ہی کہہ چکا تھا' انگریز فوج حاوی آنے لگی اور چک ویر کو سرنگ کے ذریعے محل سے نکلنا پڑا۔ بسودیا نے اس سے کہا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ بھی جنگل میں مقررہ جگہ پہنچ جائے گا۔ سرنگ سے جیسے ہی چک ویر گھوڑا دوڑاتا ہوا جنگل میں نکلا اسے گھیر لیا گیا جیکسن یہاں موجود تھا راجہ چک ویر کی شناخت کے لئے وہ مڈکیری سے اپنے ساتھ کوڈگی سپاہیوں کو بھی لایا تھا۔ انہوں نے تصدیق کر دی کہ وہ راجہ چک ویر ہے تو جیکسن اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر قریب پہنچا اس نے چک ویر کو سر جھکا کر تعظیم دی پھر بولا۔ "راجہ صاحب اب آپ ہماری قید میں ہیں۔" جیکسن کو بھی مقامی زبان بولنا آتی تھی۔ "ہم آپ کو عزت و احترام کے ساتھ یہاں سے لے جائیں گے ہمیں امید ہے کہ آپ کسی جھگڑے کا موقع دیئے بغیر ہمارے ساتھ چلیں گے اس پر ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔"

"مجھے بسودیا نے گرفتار کرایا ہے نا؟" بلاارادہ چک ویر کی زبان پر یہ سوال آ گیا اسی کے ساتھ اس کا ہاتھ کمر سے بندھے ہوئے پستول پر پہنچ گیا۔

"راجہ صاحب!" جیکسن بول اٹھا۔ "پستول سے ہاتھ ہٹا لیجئے اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو مجبوراً پستول لینا پڑے گا اس طرح آپ کی بے عزتی ہو گی جو میں نہیں چاہتا۔"

چک ویر نے پستول سے ہاتھ ہٹا لیا اس کے چہرے سے غصے اور نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

جنگل سے نکل کر اس فوجی دستے نے ایک پہاڑی کا چکر کاٹا اور محل کے مقابل آ گیا۔

بسودیا نے چک ویر کو اوپر سے دیکھ لیا کہ وہ انگریز فوجی دستے کے نرغے میں ہے۔ وہ اپنے سپاہیوں کی ہمت بندھاتا ہوا اب تک لڑ رہا تھا چک ویر کو اس حال میں دیکھ کر اس کے چہرے پر سیاہی سی پھیل گئی وہ آخر جنگ ہار گیا تھا پھر معلوم نہیں اس نے کیا سوچا کہ فائرنگ بند کرا دی اور گرتا پڑتا نیچے اترا محل کا دروازہ کھلوا کر وہ بھاگتا ہوا راجہ چک ویر کے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

"ارے مالک آپ ان کے ہاتھ کیسے پڑ گئے؟" چیختا ہوا وہ ہاتھ اٹھا کر راجہ چک ویر کے سامنے آ گیا۔

چک ویر کے خیال میں سرنگ سے فرار کا علم صرف بسودیا کو تھا انگریزوں کو اس کا علم نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ بسودیا ہی ان سے نہ مل گیا ہو۔ سرگوشیوں مجھے بتایا گیا پھر میں نے چک ویر کی غصیلی آواز سنی۔

"خود مجھے گرفتار کرا کے اب بھولا بن رہا ہے لنگڑے!" چشم زدن میں اس نے پٹی سے بھرا ہوا پستول کھینچا اور نشانہ لے کر گولی چلا دی لنگڑا بسودیا سینے پر گولی کھا کر زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔

جیکسن نے تیزی کے ساتھ جھک کر چک ویر کا ہاتھ پکڑ لیا اس کا گھوڑا چک ویر کے گھوڑے کے برابر ہی کھڑا تھا۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا راجہ صاحب؟" جیکسن اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔

چک ویر نے اپنے ہاتھ چھڑانے کے لئے جھٹکا دیتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ غدار ہے اس نے مجھے گرفتار کرا دیا۔"

"آپ کا خیال غلط ہے۔"

"کیسے غلط ہے؟ اسی کے کہنے پر تو تم لوگ پہلے سے جنگل میں سرنگ کے دہانے پر موجود تھے۔"

"مجھے تو اس سرنگ کے متعلق مڈکیری ہی میں بتا دیا گیا تھا۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔" چک ویر زور سے بولا اور اسی لمحے جیکسن نے اس کے ہاتھ سے پستول چھی لیا۔

ادھر تو راجہ چک ویر گرفتار کر لیا گیا ادھر مڈکیری میں جنرل فریزر نے بساط سیاست پر ایسی چالیں چلیں ریاست کے عوام کو یہی بہتر معلوم ہوا کہ عارضی طور پر انگریز ہی کوڈگ کا نظم و نسق سنبھال لیں بوپنا اور لکشم نارائن بھی بے بس ہو کر رہ گئے کیوں کہ انگریز فوجوں نے عملاً پوری ریاست کا نظام سنبھال لیا تھا۔ نالک : سے راجہ کی گرفتاری کی خبر بھی آ چکی تھی۔ بوپنا اور ریاست کے دوسرے بہی خواہوں کو بھی یہی غنیمت معلو ہوا تھا کہ انگریز جنرل اب تک ریاست پر کوڈگیوں کے حق کو تسلیم کر رہا تھا۔ رانی گورما اس پر آمادہ نہیں ہوئی شوہر کی موجودگی میں حکمرانی کرے انگریز جنرل ہندوستانی تہذیب اور رسوم و روایات سے اچھی طرح آگاہ تھا اسی لئے مسند اقتدار پر پہلا حق رانی کا تسلیم کر چکا تھا۔ رانی کی موجودگی میں بوپنا بھلا کیسے انگریز جنرل کی یہ تجو قبول کر لیتا کہ انگریزوں کی سرپرستی میں وہ حکمران بن جائے۔ اس نے صاف انکار کر دیا جنرل فریزر نے ایک ایک کر کے تخت سلطنت کے تمام دعویداروں کو عوامی حمایت کی آڑ میں الگ کر دیا۔ راجہ چک ویر کے گرفا ہونے کی خبر ملتے ہی اس کا ایک خاص قاصد میسور روانہ ہو گیا۔ میسور میں کری اپا اور ویرنا کو قید کے دورا میں قتل کر دیا گیا بوپنا سے اس نے یہ بہانہ کر دیا کہ وہ دونوں میدان جنگ میں مارے گئے۔ چین بسو کا تعلق راج گھرانے سے نہیں تھا اس لئے عوام اور بوپنا اس کے حق میں نہ ہوئے' بہن سے زیادہ بیوی کا حق ہوتا عوام نے شاطر انگریز جنرل کی یہ بات مان لی' جب رانی گورما نے انکار کر دیا تو پھر راجکماری پٹا ہی رہ گئی وہ ابھ نابالغ تھی سو کسی عارضی بندوبست کی بات سامنے آئی کہ جب راجکماری بالغ ہو جائے گی تو اسے ریاست حکمراں بنا دیا جائے گا تب تک انگریز ہی ریاست کا کاروبار چلائیں گے اور راج گھرانے کے افراد میسور میں ا کے پاس رہیں گے۔

نالک ناڈ سے بسودیا کی لاش آئی تو عوام کو بھگوتی کے بارے میں سب کچھ پتا چل گیا' لنگ راج نے ا سے باقاعدہ شادی نہیں کی تھی بلکہ اسے صرف داشتہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔ بسودیا اس کی ناجائز اولاد تھا۔ بھگوتی فرار ہونے پر دوڈو نے بسودیا کی پرورش کی تھی۔ وہ اس راز سے واقف تھی۔ لنگ راج نے اس سے رازدار کا عہد لیا تھا بسودیا چک ویر کے ہاتھوں مارا گیا تو دوڈو عہد قائم نہ رکھ سکی اور زبان کھول دی۔

جنرل فریزر نے اس پر کہا کہ اگر بسودیا زندہ بھی بچ جاتا تو اسے حکمرانی کا حق نہیں تھا کیوں کہ وہ ا باپ کی جائز اولاد نہیں تھا۔ بیٹے کی موت کا بھگوتی پر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور وہ اسی حالت میں جنگلوں کی طرف بھاگ گئی۔

پھر میری آنکھوں نے مستقبل کا آخری منظر دیکھا' یہ ایک خودسر عیاش ظالم اور بدکردار ہندو راجہ چک ویر کا انجام تھا اسے مڈکیری لایا جا چکا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے جنرل فریزر نے بوپنا اور لکشمی نارائن ملاقات کے بعد چک ویر سے ملنے کا فیصلہ کیا وہ اکیلا ہی راج محل پہنچا تھا۔ بوپنا وغیرہ میں سے کوئی اس کے سات نہیں تھا۔ راج محل کی حیثیت اب ایک قید خانے کی سی تھی۔ چک ویر کے کہیں آنے جانے پر پابندی تھی۔

راج محل کو فوجیوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا یہاں تک کہ محل کے اندر بھی پہرا تھا۔ چک ویر جس کمرے میں تھا اس کے دروازے پر بھی ایک مسلح کوڈگی سپاہی موجود تھا۔

انگریز جنرل نے چک ویر کو اس وقت تک کئے جانے والے فیصلوں سے آگاہ کیا۔

"مجھے ہی راجہ رہنے دیں نا میں ہر طرح آپ کی حکومت کی اطاعت کروں گا۔" چک ویر کے لہجے میں بلا کی حسرت تھی۔

"یہ ناممکن ہے۔" انگریز جنرل نے انکار کر دیا۔ "زیادہ سے زیادہ راجکماری آگے چل کر یہاں کی حکمراں بن سکتی ہے یہ بات بھی ہماری حکومت کے وائسرائے کی مرضی پر منحصر ہے۔ اب آپ کو بنگلور جا کر اس سرکاری عمارت میں رہنا پڑے گا جہاں ٹیپو سلطان کے بیٹوں کو رکھا گیا تھا۔" انگریز جنرل نے بتایا پھر مزید بولا۔ "پہلے ہم آپ کو میسور میں رکھنا چاہتے تھے مگر وائسرائے بہادر کا فرمان اس سلسلے میں موصول ہو گیا ہے اس فرمان کی رو سے آپ کے ساتھ رانی اور راجکماری بھی وہیں رہیں گے۔"

چک ویر کا سر جھک گیا اور ایسا جھکا کہ پھر جتنی دیر انگریز جنرل وہاں رہا وہ سر اٹھا کے بات نہ کر سکا۔ وہ ٹیپو سلطان کے بیٹوں کا ذکر سنتے ہی سمجھ گیا تھا کہ اسے اور اس کے مختصر خاندان کو انگریزوں نے اپنا قیدی بنا لیا تھا۔

راج محل سے انگریز جنرل کی واپسی کے بعد ہی پہلے سے تیار شدہ ایک علان کی منادی کرا دی گئی اس اعلان پر بوپنا لکشمی نارائن اور کوڈگ کے اہم و باثر افراد کے دستخط تھے سب سے اوپر جنرل فریزر نے دستخط کئے تھے اعلان مندرجہ ذیل تھا۔

ارض کوڈگ کے عوام نے ایک ذہن ہو کر یہ خیال ظاہر کیا کہ اب انہیں چک ویر کے نظام حکومت سے اتفاق نہیں اس کی بجائے انگریز حکومت کو ریاست اسی طرح اپنی حدود مملکت میں لے لینا چاہئے جس طرح ہندوستان کی دوسری ریاستیں اس کی حدود میں شامل ہیں۔ ہندوستان کے وائسرائے بہادر نے کوڈگ ریاست کے عوام کی اس درخواست کو قبول کر لیا ہے۔ آج کی تاریخ سے یہ ریاست انگریز حکومت کے ماتحت رہے گی۔ حکومت اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ وہ پھر کبھی اور کسی بھی صورت میں ریاست کو سابق راجہ کے سپرد نہیں کرے گی' عوام کے مذہبی عقائد و معاملات میں دخل نہیں دے گی' حکومت عوام کی بہتری کے لئے خدمت انجام دیتی رہے گی۔

پھر مستقبل کے سارے منظر میرے صفحہ ذہن سے غائب ہو گئے عظیم مہین کی سرگوشیاں بھی معدوم ہو گئیں اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں کم پاور کا نیلا بلب بدستور جل رہا تھا میری نظر سامنے لگے ہوئے وال کلاک کی طرف اٹھی' ہندسے نظر آ رہے تھے ابھی زیادہ رات نہیں گزری تھی۔

اس وقت میرے دل میں عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کاش میں اپنا مستقبل بھی دیکھ سکتی۔ میری آنکھوں میں احرس اور نصار کے چہرے گھوم گئے مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں میں سے کون میری تنہائیوں کا امین بنے گا۔

دوسرے روز صبح ناشتے کی میز پر میں نے رانی کو بتا دیا کہ اگلے روز بمبئی سے جا رہی ہوں۔ وہ سارا دن رانی کے ساتھ گزرا اس نے مجھے بمبئی کی خوب سیر کرائی کوئی تفریحی مقام اس نے نہیں چھوڑا۔ عادل بھی ساتھ

ہی تھا اور ہم دونوں ہی میک اپ میں تھے وہ ایک طرح سے پکنک سی تھی۔

☆======☆======☆

طویل عرصے کے بعد جب میں راجہ استاد کے دروازے پر دستک دے رہی تھی تو مجھے عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے گھر سے میری بہت سی شیریں اور تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ میں اکیلی ہی تھی عادل کو میں نے بمبئی سے دہلی بھیج دیا تھا۔ میں دانستہ راجہ استاد کے یہاں بوجوہ آئی تھی مجھے اس کی اور ہمایوں کی کچھ ایسی غلط فہمیاں دور کرنا تھیں جنھوں نے میرے کردار کو ان کی نظر میں گرا دیا تھا' انہی غلط فہمیوں کی بنا پر خود میں بھی اپنی نظر میں گر سی گئی تھی حالانکہ میرا دامن بے داغ تھا۔ اس وقت صورت حال ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں ان لوگوں کو حقائق سے آگاہ نہیں کر سکی تھی' واقعات پے در پے پیش آ رہے تھے۔ لعنتی چمپا نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ وہ مجھے ذلیل و رسوا کرنے کی خاطر پستیوں کی انتہا پر پہنچ گئی تھی۔ ژیان کو زیر دام لانے کے علاوہ میں چمپا سے انتقام لینے ہی کے لئے کلکتے آئی تھی۔

وہ صبح کا وقت تھا' مجھے توقع تھی کہ راجہ استاد اور ہمایوں دونوں ہی کے علاوہ اس گھر میں ایک اور پیاری سی لڑکی بھی تھی شانتی' وہی لڑکی جو ہمایوں کو زندگی بھر کے لئے اپنانے کی خاطر میرے ایما پر مسلمان ہو گئی تھی اس کا فرضی نام صبیحہ رکھا گیا تھا جو ہمایوں سے شادی کے بعد فرضی نہیں رہا تھا۔

دروازہ کھولنے والی وہی تھی۔ "کس سے ملنا ہے جی؟" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

میرے چہرے پر میک اپ تھا اور میں ساڑھی باندھے ہوئے تھی وہ بھی ساڑھی ہی میں تھی۔

"آپ ہی سے ملنا ہے جی۔" مجھے شرارت سوجھی اپنے دونوں سوٹ کیس میں نے ہاتھ سے رکھ دیے تھے۔ میں آواز بدل کر بول رہی تھی۔

"مجھ سے؟" وہ حیران سی ہوئی۔ "پر میں.......... میں تو آپ کو نہیں جانتی۔"

"میں تو جانتی ہوں تمہیں۔" میں مزید بے تکلف ہو گئی۔ "یعنی تمہارے میکے سے آئی ہوں میں ارے تم نے مجھے نہیں پہچانا شانتی' میں تمہاری دیدی ہوں رامپور میں تمہارے گھر کے سامنے ہی تو رہتی تھی .... بڑی مشکل سے تمہارا پتا چلایا ہے' تم جس نوجوان کے ساتھ رامپور سے بھاگی تھیں اس کے بارے میں وہیں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ کلکتے کے ایک نامی گرامی دادا راجہ استاد کے ساتھ رہتا ہے یہاں آ کر راجہ استاد ٹھکانا.........."

"ارے او صبیحہ کون عورت ہے یہ؟" اندر سے راجہ استاد کی تیز و تند آواز آئی اس کے کمرے کا ایک دروازہ گھر کے صدر دروازے سے دور نہیں تھا اس نے یقیناً میری باتیں سن لی تھیں۔ "گھسیٹ لے اسے بالوں سے پکڑ کر اندر' میں ابھی آیا۔"

اب مزید شرارت مہنگی پڑ سکتی تھی اس لئے میں نے فوراً خود کو صبیحہ پر ظاہر کر دیا۔

"ارے دیدی تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" وہ میرے گلے سے لگ گئی۔ "بھیس بھرنے اور آواز بدل کے بولنے میں تو تمہارا جواب نہیں۔"

"میں نے غلط تو نہیں کہا تھا' دیدی ہونے کے ناطے میں میکے والی ہی ہوئی نا!"

اسی وقت راجہ استاد نے اپنے کمرے سے نکل آیا اس نے وہیں سے ہانک لگائی۔ "ابے او ہمایوں' ذرا دیکھ تو کون آیا ہے ارے اپنی رانی آئی ہے رانی۔"

ذرا ہی دیر بعد میں' راجہ استاد کے کمرے میں بیٹھی تھی اور ہمایوں بھی ساتھ بیٹھا تھا۔ صبیحہ ہمارے لئے چائے بنانے گئی تھی مجھ سے مل کر میرے واپس آنے کی خوشی میں ان لوگوں کے چہروں پر ایسی رونق تھی جیسے کوئی گمشدہ خزانہ مل گیا ہو۔ وہ مجھے ابھی تک بمبئی کی رانی ہی سمجھے ہوئے تھے آج یہ عقدہ بھی کھلنا تھا۔

"اب یہ اپنے چہرے سے جھلی تو اتار دو۔" راجہ استاد کہنے لگا۔ "تمہارا چہرہ دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔"

میں نے راجہ ستاد کی خواہش کو رد نہیں کیا۔

"یہ ہوئی نا بات!" ہمایوں بھی خوش ہو گیا۔

"میں تو کہہ گئی تھی استاد کہ آپ سب میری کوٹھی میں رہیں' وہاں پہنچی تو پھاٹک پر تالا پڑا تھا اس لئے سیدھی ادھر آ گئی۔"

"کوٹھی کی تعمیر کے بعد کچھ دن رہے تھے ہم وہاں۔" راجہ استاد نے بتایا۔ "مگر کسی کا دل ہی نہیں لگا وہاں پھر مجبوراً یہیں آ گئے۔ بات یہ ہے رانی کہ ایک تو ہم لوگ تمہاری طرح کوٹھیوں میں رہنے کے عادی نہیں ہیں دوسرے یہ کہ آدمی کو چاہے محل دے دو رہنے کو اپنی جھونپڑی کا سا آرام کہیں نہیں ملتا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے استاد۔" میں بولی۔

پھر صبیحہ چائے بنا کر لے آئی۔

"تمہارا کپ کہاں ہے بھئی؟ کیا تم میرے ساتھ چائے نہیں پیو گی؟"

"ابھی ہمایوں کے ساتھ پی تھی دیدی تمہارے آنے سے ذرا ہی دیر پہلے' میں تو ویسے بھی زیادہ چائے نہیں پیتی' تمہیں معلوم ہے۔"

"اچھا تو پھر تم بیٹھ تو جاؤ یہاں مجھے کچھ باتیں کرنا ہیں' تمہارا بھی یہاں ہونا ضروری ہے۔"

"کوئی بہت خاص بات ہے کیا؟" راجہ استاد نے ہنس کر کہا۔ "خاص باتیں کرنے کی عادت گئی نہیں ابھی۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

میں نے اس کے لہجے کی معنی خیزی کو نظرانداز کرتے ہوئے گفتگو شروع کر دی۔ "پہلی بات تو یہ سن لو کہ تم لوگ مجھے جو سمجھتے آئے ہو میں وہ نہیں ہوں۔"

"یعنی کیا نہیں ہو؟ بتاؤ نا صاف صاف بات کرو۔" راجہ استاد نے کہا۔

"بمبئی کی رانی' میں بمبئی کی رانی نہیں ہوں۔"

اس پر راجہ استاد کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر وہ ہنستے ہوئے ہمایوں سے مخاطب ہوا۔ "سنا تم نے' تھوڑی دیر بعد یہ معلوم ہو گا کہ میں دراصل راجہ استاد نہیں۔" وہ پھر زور سے ہنسا۔

میں سنجیدہ رہی اور راجہ استاد کو رانی کے بارے میں بتانے لگی۔ آخر میں اس سے میں نے کہا۔ "میں

اس وقت بمبئی سے آ رہی ہوں جہاں رانی کی مہمان تھی۔" پھر اسے یقین دلانے کی ایک تدبیر میری سمجھ میں گئی میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

راجہ استاد کے ساتھ ہمایوں نے بھی مجھے بے یقینی سے دیکھا۔ اس کے بعد راجہ استاد بولا۔ "کلکتے یہ ایک آدمی کو خراب ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔" وہ اپنے ہی فقرے پر خود ہنسا پھر کہنے لگا۔ "لیکن یہ سا چکر چلانے کی ضرورت کیا ہے آخر؟"

"میری بات سنیں۔" ہمایوں بول اٹھا۔ "چلیں مان لیا ہم نے تھوڑی دیر کو کہ آپ بمبئی کی رانی نہیں پھر؟ اس ماننے نہ ماننے سے ہو گا کیا؟ اور یہ کہ رانی نہیں تو کون ہیں؟"

"میرا اصل نام معبلہ ہے۔" میں نے اپنا نام بتانے میں کوئی دیر نہیں کی۔ متعدد لوگوں کو میرا نام معلو تھا اگر انہیں بھی معلوم ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ "میرا تعلق ہندوستان سے نہیں میں باہر سے ایک خاص مقصد کے تحت یہاں آئی ہوں وہ مقصد بھی بتا دوں کہ مجھے ا دشمنوں سے انتقام لینا تھا۔ میرے دشمنوں میں اس ملک کے لوگ بھی شامل ہو گئے ان میں سے کچھ پُراسر شیطانی قوتوں کے مالک تھے۔ مجھے بھی میرے خالق نے ان شیطانی قوتوں سے بچنے کے لئے چند قوتیں عطا ہیں سو میں اپنے دشمنوں سے لڑتی رہی۔ میرے انہی دشمنوں میں ایک خبیث اور بدکردار ہندو عورت چمپا تھی۔" میں نے لعنتی چمپا کی شیطانی قوتوں کے متعلق مختصراً بتایا۔

"حیرت ناک اور ناقابل یقین سی باتیں کر رہی ہو تم۔" راجہ استاد دیدے گھما کر بولا۔

"نہیں یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔" اچانک میں لعنتی چمپا کی آواز سن کر اچھل پڑی۔

میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ چمپا میری ہی شکل و صورت اختیار کر کے ظاہر ہو چکی تھی وہ ہی فاصلے پر کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔

"زندہ بچ گئی تُو؟" میری آواز میں اس کے لئے غصہ بھی تھا اور حقارت بھی۔

"ہاں معبلہ تجھے مارے بغیر میں کیسے مر سکتی ہوں۔" اب وہ میری ہی آواز میں بولنے لگی۔ راجہ اس اور ہمایوں کی ساری "دادا گیری" دھری رہ گئی' وہ تصویر حیرت بنے ہوئے چمپا کی طرف دیکھے جا رہے تھے صبیحہ انتہائی خوفزدہ ہو کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگی معاً چمپا نے اپنا ہاتھ بلند کر کے مخصوص انداز میں گھما اسی کے ساتھ ایک روشن حصار میری اطراف قائم ہو گیا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "میں نے تجھے قید کر اب تیری قوت کام نہیں کرے گی اس طرح میں تجھے یہاں سے کالی گھاٹ کے مندر لے جاؤں گی جہاں د دیوی کے چیلے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ تجھے یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ ان کے انتظار کی وجہ کیا ہو ہے' جب میں تیرا غرور خاک میں ملتا ہوا دیکھ لوں گی تو تجھے قربان گاہ کے چبوترے تک لے جاؤں گی۔ بہت د سے کسی آدمی کو بلی نہیں چڑھایا گیا' درگا دیوی خوش ہو جائے گی جب تیرے خون کے چھینٹے اس کی مورتی پڑیں گے' اچھا کیا تُو نے کہ خود ہی جادو کی اس سرزمین پر آ گئی۔"

جواب میں' میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا' نہ میں بول سکتی تھی نہ اپنے جسم کو حرکت دینے قادر تھی۔

اسی وقت معلوم نہیں راجہ استاد کو کیا سوجھی اس نے چمپا پر چھلانگ لگا دی اور دوسرے ہی لمحے منہ کے بل زمین پر گرا۔ چمپا کا کریہہ قہقہہ فضا میں بلند ہوا اور پھر وہ کہنے لگی۔ "معبلہ یہ بڑا جان دیتا ہے تجھ پر' کہے تو ٹھنڈا کر دوں اسے .... لیکن تُو بولے گی کیسے؟ یہ تو میں بھول ہی گئی تیری زبان تو میں نے تالو سے لگا دی ہے۔"

مجھے اس پر بہت ملال ہو رہا تھا کہ طویل عرصے کے بعد تو وہ لعنتی عورت مجھے ملی اور آج بھی اسی کا پلہ بھاری تھا' اس خیال کے ساتھ ہی میں نے مہین کی سرگوشی سنی۔

"مایوس نہ ہوا کر تیری ہی آسانی کے لئے تو اسے خبر دی گئی کہ تُو کہاں ہے' یہ سمجھ کہ دیوتا اس پر مہربان ہیں جو اسے باخبر کیا گیا' کیا تُو نے ساحر زعیم کا حشر بھلا دیا سو اس عورت کا بھی زعیم ہی کی طرح آخری دن آ گیا۔ اس کی ساری شیطانی قوتیں سلب ہونے والی ہیں پھر تُو کسی چوہیا کی طرح گھیر کر اسے مار دے گی۔"

مہین کی سرگوشی ختم ہوتے ہی مجھے اس کی کاہنہ خجیرہ کی مخصوص خوشبو کمرے میں محسوس ہوئی۔

صرف چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میرے گرد قائم حصار غائب ہو گیا چمپا جو میری صورت اختیار کئے ہوئے تھی اس کا داغدار چہرہ ظاہر ہو گیا۔ وہ وحشت زدہ سی نظر آنے لگی تھی۔ خجیرہ کی خوشبو غائب ہو گئی چمپا نے میرے گرد قائم حصار کو غائب ہوتے دیکھ کر جلدی جلدی کچھ پڑھنا شروع کیا۔

میں اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی اور چمپا کو مخاطب کیا۔ "اے ذلیل اور کمینی عورت اب تیرا کوئی وار کارگر نہیں ہو گا۔ تیری زندگی کے دن پورے ہو گئے' تُو نے ایک عرصے مجھے ذلت و رسوائی سے دوچار کیا مگر اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ تیرا گرو بھی آج تجھے مجھ سے نہیں بچا سکتا جس پر تجھے بڑا ناز تھا۔"

"معبلہ مجھے معاف کر دے' میں غلطی پر تھی۔" وہ ایک دم گڑگڑانے لگی۔ اسے یقیناً احساس ہو چکا تھا کہ اس کی تمام شیطانی قوتیں سلب کی جا چکی ہیں۔ "تُو عظیم ہے معبلہ' تیری شکتی کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکتا اگر تُو نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو جیون بھر تیری داسی بن کر رہوں گی۔"

"درندوں کو زندہ نہیں چھوڑا جاتا اور تُو بھی میری نظر میں کسی درندے سے کم نہیں۔" مجھے اس ذلیل عورت کا ایک ایک ظلم یاد آنے لگا میرے جسم میں شعلے سے لپکنے لگے۔

معاً مجھے اپنے اندر غیر معمولی قوت محسوس ہوئی۔ میں نے اس کی طرف قدم بڑھائے۔

"نہیں......... معبلہ نہیں" وہ ہاتھ اٹھا کر چیخی۔

میرے قدم نہیں رکے اور میں نے اسے اس طرح دبوچ لیا جیسے عقاب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

وہ چیختی رہی اور میں اس کے جسم کے ایک ایک عضو کو ادھیڑتی رہی یوں کہ وہ فوری طور پر موت کی میٹھی نیند نہ سو جائے۔ پھر مجھے ایک طرف رکھا ہوا چاقو نظر آ گیا۔ میں نے جھپٹ کر چاقو اٹھا لیا اور پھر اس کے ساتھ وہی کھیل کھیلنے لگی جو امرناتھ کے مندر میں کوبتا کے ساتھ کھیلا گیا تھا۔

چمپا کی پہلی ہی چیخ سن کر راجہ استاد نے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں تاکہ اس کی چیخیں باہر سنائی نہ دے سکیں۔ وہ بہرحال ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور غیر معمولی حالات میں بھی احتیاط کا دامن

اس نے نہیں چھوڑا تھا۔ یہ اس کی مجرمانہ فطرت وعادت کا تقاضا تھا۔

چمپا کی چیخیں آخر دم توڑ گئیں' سارے کمرے میں خون اور اس کے جسم کی بوٹیاں بکھری تھیں۔ راجہ استاد جیسے شخص نے بھی شاید اپنی زندگی میں اس طرح کسی کو قتل کئے جاتے نہ دیکھا ہو گا۔

شعلے میرے وجود میں کبھی کے سرد ہو چکے تھے اور میں جیسے ہوش میں آ چکی تھی۔

پھر میں تو غسل خانے میں کپڑے لے کر نہانے چلی گئی۔ راجہ استاد اور ہمایوں نے میرے پیچھے قتل کوئی سراغ کمرے میں نہ رہنے دیا۔ چمپا کے جسم کی ایک ایک بوٹی کو اور تقریباً ڈھانچے کو انہوں نے چادر میں لپیٹ کر گٹر میں پھینک دیا۔ گٹر عقبی گلی ہی میں تھا یہ مجھے اس وقت پتا چلا جب نہا کر نکلی۔ راجہ استاد اور ہمایوں کمرے کو دھو رہے تھے' دیواروں اور فرش سے خون کے تازہ دھبے مٹا رہے تھے۔ صبیحہ کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔

چمپا کو قتل کر کے مجھے عجیب سا روحانی سکون ملا تھا اس مجسم بدی کو میں نے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیا تھا۔

لیکن اے معبلہ ابھی تو چندر موہن باقی ہے' تیرا اصل دشمن ژیان زندہ ہے کسی نے جیسے میرے اندر سے کہا۔

"میں انہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔" میں بڑبڑانے لگی۔

اس وقت تک راجہ استاد اور ہمایوں کمرے کو دوبارہ اس کی سابقہ حالت پر واپس لا چکے تھے اور میں ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"کیا اور لوگ بھی ہیں معبلہ؟" قریب بیٹھے ہوئے راجہ استاد نے یقیناً میری بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

میں چونک اٹھی اور پھر خود پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "چھوڑیں بھی استاد' آپ تو خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے میں تو ڈرا رہی تھی آپ کو۔"

"تو کیا اب بھی ڈرانا باقی رہ گیا ہے۔" وہ بھی مسکرایا۔ "میں تو تمہیں صرف بمبئی کی رانی سمجھ رہا تھا۔ تم اس سے آگے کی چیز نکلیں۔"

"معاف کرنا استاد میں کوئی چیز ویز نہیں ہوں۔ اب اٹھو کوٹھی نہیں چلنا کیا؟"

"تو لونڈوں کو بھیج کر کوٹھی کی صفائی تو کرا لینے دو' شام کو چلی جانا۔"

میں مان گئی۔ شام تک میں راجہ استاد کے گھر میں رہی۔ اس کے آدمیوں نے میرے دونوں سوٹ کیس بھی پہنچا دیئے تھے۔ میں نے اس عرصے میں اپنے آئندہ اقدامات کے متعلق بہت سی باتیں سوچ لی تھیں۔ جانے سے پہلے میں نے راجہ استاد سے حساب کتاب کیا جس پر وہ بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ میں بہرحال اس کی مقروض تھی اور میرے پاس اتنا سونا تھا کہ قرض اتار سکوں۔ راجہ استاد نے مجھ سے ملازمین کے متعلق پوچھا میں بولی۔ "فی الحال رہنے دیں ہوٹل بھی کھانے پینے کے لئے موجود ہیں اور یہ گھر بھی' کوٹھی بھی۔ رہا صفائی کا معاملہ تو آج ہی کی طرح دو ایک روز میں اپنے لونڈوں کو بھیج کے صفائی کرا دینا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

دراصل اس مرتبہ ملازمین رکھ کر میں پہلے کی طرح مصیبت مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ کوٹھی میں میرا تنہا رہنا ہی مناسب تھا۔ راجہ استاد مجھے بتا چکا تھا کہ کوٹھی میں نیا فرنیچر وغیرہ ڈلوا دیا گیا ہے' اس سے کوٹھی کی چابیوں کا گچھا لے کر میں روانہ ہو گئی۔

"معبلہ!" عقب سے مجھے ایک آشنا آواز سنائی دی۔ اسی کے ساتھ خجیرہ کی مانوس خوشبو کا جھونکا میرے قریب سے گزر گیا۔

میں تیزی سے مڑی اور پھر جیسے تصویر حیرت بن گئی' کہیں کوئی خواب تو نہیں ہے؟ میں نے سوچا مگر ایسا نہیں تھا چند ہی لمحوں بعد مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی..........!!!

آدمی اپنے خوابوں اور خواہشوں ہی میں تو زندہ رہتا ہے' کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ خواب سچے ثابت ہو جاتے ہیں' بلند پہاڑوں سے اتر کر ہموار میدانوں میں آنے کے بعد جانے کتنی دفعہ میں نے یہ خواب دیکھے ہوں گے کہ نضار میرے روبرو ہے' آج یہی خواب حقیقت بن گیا تھا۔ ایسی حقیقت جسے جھٹلانا امکان میں نہ ہو۔

"تُو.........تُو نضار!" میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

☆======☆======☆

ابتدائی لمحات حیرت کے بعد میں نضار کو اپنے ساتھ کوٹھی میں لے آئی اپنے سرخ وسفید رنگ اور لباس سے وہ کوئی انگریز معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی پشت پر ایک بیگ لٹک رہا تھا جس طرح عموماً سیاح سفر کرتے ہیں۔ اسے دیکھ کر بھی یہی معلوم ہو رہا تھا کہ کسی سفر سے آیا ہے۔ بڑے بڑے بال خوبصورتی سے تراشے ہوئے تھے۔

مجھے ذرا ہی دیر میں پتا چل گیا کہ وہ بھی عظیم مہین کے حکم پر میری ہی طرح خجیرہ کی رہنمائی میں طویل ترین سفر کر کے کلکتے پہنچا تھا۔ مہین کی کاہنہ خجیرہ نے اسے ایسے وقت پر وہاں پہنچایا تھا کہ اس سے میری ملاقات میں تاخیر نہ ہو۔

"تُو پہاڑوں سے کب چلا تھا؟" میں نے اس سے پوچھا۔ وہ میرے ہی قریب دوسری کرسی پر بیٹھا تھا۔ میری نظریں اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اسے دیکھ کر ابھی میرا جی نہیں بھرا تھا۔ میں نضار سے اسی لب ولہجے میں بات کر رہی تھی جیسے پہاڑوں پر کرتی تھی۔

"خاصے دن ہو گئے میں نے عظیم روح مہین کی سرگوشیاں سنی تھیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تجھے میری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ سو خجیرہ مجھے تیرے پاس پہنچا دے گی۔ تُو بتا کہ ژیان تجھے ملا یا نہیں؟ تُو نے تو یہاں ڈیرا ہی جما لیا۔" نضار بولا۔ "کیا اونچے پہاڑ یاد نہیں آئے تجھے' وادی سبز کو بھول گئی تُو؟"

"چاہوں بھی تو نہیں بھول سکتی' یہ اندازہ مجھے یہیں آ کر ہوا۔" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا پھر اسے بتانے لگی۔ "ژیان ہی کی تلاش میں اب تک بھٹک رہی ہوں' یہ بہت بڑا ملک ہے' شہروں شہروں میں نے اس کا پیچھا کیا ہے۔ اس وقت بھی اسی کی تلاش میں یہاں آئی ہوں اس کی تصدیق ہو چکی ہے کہ وہ بنگال ہی میں ہے اور بنگال میں اسی شہر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے مجھے اسی لئے یہاں طویل عرصہ گزر گیا۔ جو کچھ مجھ پر یہاں آنے

کے بعد گزری اسے بیان کرنے کے لئے بہت وقت چاہئے۔ تُو مجھ سے وہاں کی باتیں کر اب تو تُو یہاں آ ہی گیا ہے' رفتہ رفتہ تجھے سب کچھ بتا دوں گی۔ احرس کیسا ہے' تُو مل کر آیا ہو گا نا؟"

"نہیں۔" نضار کے چہرے سے کسی غیر معمولی بات کا اظہار ہونے لگا۔

"کیوں کیا اس سے اَن بن ہو گئی؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔" نضار نے طویل سانس لیا۔ "احرس مجھ سے روٹھ گیا۔"

"کس بات پر؟" میں بے چین سی ہو گئی۔ "کچھ بتا تو سہی نا۔"

"وجہ اس مرتبہ بھی تُو ہے معبلہ!" نضار بے حد سنجیدہ نظر آنے لگا۔

"پاگل ہے وہ تو .... تُو جانتا ہے اسے' کس قدر جذباتی ہے۔ ایک مرتبہ تو غلط فہمی کے سبب تجھے قتل کرنے کے درپے ہو گیا تھا۔ کچھ بھی ہو نضار وہ دل کا بُرا نہیں' جب ہم وادی سبز لوٹ کر چلیں گے تو پہلے کی طرح میں اس سے تیری صلح کرا دوں گی۔"

"میں اس سے صلح نہیں کروں گا' وہ بہت بُرا ہے' اتنا بُرا کہ اس نے تیری واپسی تک کا انتظار نہیں کیا۔"

"کیا ہوا نضار تُو تو بہت بردبار تھا' معافی اور درگزر پر یقین رکھتا تھا۔"

"مگر وہ قابل معافی نہیں ہے۔" نضار کی آواز تیز ہو گئی۔ "اس بے وفا کو میں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔" جذبات کی شدت سے نضار کی آواز بھرا سی گئی۔

"لگتا ہے اس نے تجھے بہت رنج دیا ہے کوئی' دلی اذیت پہنچائی ہے۔"

"ایسا ویسا رنج' ایسی اذیت .... ایسے لوگوں کو تو .... تو........." نضار اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔

پھر نضار نے جب رک رک کر بھرائی ہوئی آواز میں احرس سے اپنی خفگی کا سبب بیان کیا تو میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

وادی سبز سے میری روانگی کے کچھ ہی عرصے کے بعد نضار کو اپنے نائب احزم کے ذریعے معلوم ہوا کہ احرس راتوں کو نہیں سوتا' اس نے کاروبار حکومت میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے۔ نضار نے احزم کو وادی سبز میں میرے ایما پر اسی لئے چھوڑا تھا کہ وہ احرس کی معاونت کرے اب معاونت کی بجائے حکومت کی تمام تر ذمے داریاں احزم ہی کے کاندھوں پر آ گئیں' پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احرس کی وحشت میں اضافہ ہوتا گیا اس نے مہا پجاری سے معلوم کیا کہ مجھے کہاں چھوڑا تھا؟ وہ یہ معلوم کر کے اپنی آبائی بستی ازیر چلا گیا' خاصے عرصے کے بعد جب دوبارہ وادی لوٹا تو اس کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ اونچے نیچے ناہموار راستوں چٹانوں اور پہاڑوں پر وہ انتہائی تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا پھرتا' اسے متعدد بار یوں جنون کے عالم میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے چیختے چلاتے سنا گیا۔

"لوٹ آ معبلہ! .... لوٹ آ! ورنہ تیرا احرس تیرے بغیر زندہ نہیں رہے گا۔" وہ چیخ چیخ کر کہتا اور اس کی آواز کی بازگشت پہاڑوں میں دیر تک سنائی دیتی رہتی۔ مہا پجاری اور نضار دونوں ہی نے اسے سمجھانا چاہا

لیکن وہ اب کچھ سوچنے سمجھنے کی حدود سے آگے نکل چکا تھا۔

ایک روز صبح ہی صبح وہ "معبلہ آ گئی" چیختا ہوا اٹھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑوں میں نکل گیا۔ اس کی نگہداشت اور حفاظت پر نضار نے جن لوگوں کو متعین کیا تھا انہوں نے بھی اپنے گھوڑے دوڑائے' اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا احرس "معبلہ معبلہ" چیختا ایک پہاڑ پر چڑھ گیا۔ محافظوں نے کچھ ہی دیر بعد احرس کے گھوڑے کو تیزی کے ساتھ پہاڑ سے اترتے دیکھا' دائیں جانب ہزاروں فٹ گہرائی تھی گھوڑا اسی طرح دوڑ رہا تھا' اچانک گھوڑے کو کسی پتھر سے ٹھوکر لگی اور احرس کا جسم گھوڑے کی پشت سے اچھل کر گہری کھائی میں محافظوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا' وہ سر کے بل گرا تھا۔

وادیٔ سبز میں کہرام مچ گیا۔ جری لوگوں کو رسیاں باندھ باندھ کر کھائی میں اتارا گیا دو دن کی تلاش کے بعد احرس کی لاش ملی۔ احرس کو اس کے لباس اور انگلیوں میں موجود انگوٹھیوں سے پہچانا گیا۔ مہا پجاری کے کہنے پر احرس کی تدفین وادی کے قدیم مندر کے احاطے میں کی گئی اور اس کی یادگار بنا دی گئی۔ احرس کا باپ اجدر بیٹے کی موت کی خبر سن کر وادی سبز آیا اور پھر کبھی نہ جا سکا۔ جوان بیٹے کی موت کے غم نے اجدر کی جان بھی لے لی۔

نضار نے اسی لئے احرس کو بے وفا کہا تھا اور اب اسے معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

ایک دیوانہ میرا فراق برداشت نہ کر سکا' میرے بغیر زندگی اسے دوبھر ہو گئی۔ وہ میرے عشق میں یوں جان گنوا دے گا' میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ نضار کے آنے کی خوشی احرس کے غم میں بدل گئی مجھے سنبھلنے میں ایک ہفتہ لگا۔ کب دن نکلا' کب رات ہوئی' مجھے پتا نہیں چلا۔ نضار میری خدمت گزاری میں لگا رہا پھر مجھے نضار کی اعلیٰ ظرفی کا احساس ہوا۔ اسے خبر تھی کہ میں اس کے رقیب کے سوگ میں ہوں اور وہ میرے ناز اٹھا رہا تھا۔ مہذب دنیا کی طرف روانگی سے قبل جس طرح مجھے پُراسرار تجربات ہوئے تھے نضار بھی ان سے گزرا تھا۔ نضار کی تربیت بھی اسی انداز میں کی گئی تھی کہ اجنبی سرزمین اس کے لئے اجنبی نہ رہے۔ اسے ہموار میدانوں میں بولی جانے والی مختلف زبانیں بھی تعلم کی گئی تھیں۔ وہ مہذب دنیا میں نووارد ہونے کے باوجود کسی بات سے بے خبر نہیں تھا ورنہ مجھے نہ سنبھال پاتا' اپنے اور میرے لئے خورد و نوش کا بندوبست اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔ راجہ استاد اور ہمایوں بھی اس عرصے میں نضار کی مدد کرتے رہے۔ مجھ پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی' دوا بھی چل رہی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ مجھے کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے' ٹھیک ہونے میں وقت لگ سکتا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے مجھے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کا مشورہ دیا تھا۔ جب میری طبیعت کچھ بہتر ہونے لگی تو معلوم ہوا نضار نے راجہ استاد اور ہمایوں سے خود ہی اپنا تعارف کرا دیا تھا اس نے خود کو میرا ہم وطن اور قریبی عزیز ظاہر کیا تھا اس کا وطن کون سا ہے؟ یہ سوال نضار نے ٹال دیا تھا اتنا کہہ کر ان لوگوں نے اس کے وطن کا نام نہیں سنا ہو گا اس لئے بتانا لاحاصل ہے۔

"کیا تُو یونہی رنج کی چادر اوڑھے پڑی رہے گی اے معبلہ!" آٹھویں دن مجھے عظیم مہین کی سرگوشیاں سنائی دیں۔ "اٹھ اور جان لے کہ وہ جس کی تجھے تلاش ہے اس شہر سے بھی چلا گیا' پر وہ ابھی بنگال ہی کی حدود میں ہے۔ ہاں اس شہر میں تُو ایک قرض ضرور اتار سکتی ہے۔ چندر موہن' بدی کا ہرکارا تو یہیں ہے نا اس تک

پہنچنے کی کوشش کر اور اپنی شخصیت کا بھید جان لے۔ وہ جانتا ہے تو کون ہے؟ تیرا تعلق ہموار میدانوں سے کیا ہے؟ بدیسی تجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ سارا کھیل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب تجھے خود ہی تلاش کرنا ہے' تجھے بہت پہلے اور اب بھی سب کچھ بتایا جا سکتا تھا مگر خود ہی جان لینے کی لذت جدوجہد اور جستجو ہی تو زندگی کی دلیل ہے۔ تو کیا تو ایسا نہ کرے گی؟ نضار بلا سبب تو تیرے پاس نہیں بھیجا گیا۔ آخری معرکے سے کیوں بچ رہی ہے اور تو کیا جانے زندگی اور موت کا بھید؟ اگر انسان چاہے بھی تو ایک ساتھ دو گھوڑوں پر سواری نہیں کر سکتا۔ سو اس رمز کو جان۔ احرس تجھ سے بچھڑ گیا تو اس میں بھی مصلحت ہے' اپنے دشمن ژیان کی تلاش سے پہلے تجھے اپنی تلاش کرنا ہے' خود کو تلاش کر معبلہ اور اپنا بھید جان لے کہ اب اس کا وقت آ چکا ہے۔ اٹھ جا بستر چھوڑ دے۔"

نیک روح مہین کی سرگوشیاں معدوم ہوتے ہی میں نے اپنے گرداگرد خجیرہ کی خوشبو کو چکراتے ہوئے دیکھا پھر جیسے میں خود بخود اٹھ کے بیٹھ گئی۔ میں نے خود کو بدلا بدلا سا محسوس کیا یوں جیسے میرے دل پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ اس طرح کہ میرے اندر ایک نیا حوصلہ جنم لے چکا ہو' ناقابل شکست حوصلہ۔

نضار نے میری طرف دیکھا وہ میری مسہری کے قریب ہی بیٹھا تھا اس کے چہرے پر مجھے چند لمحوں کو حیرت نظر آئی اور پھر وہ پرسکون دکھائی دینے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ خجیرہ کی مخصوص خوشبو کو اس نے بھی محسوس کر لیا ہو گا خود اس کے ساتھ بھی ایک مرتبہ ایسا ہو چکا تھا۔ میدان جنگ میں شدید زخمی ہونے کے بعد وہ بستر علالت پر پڑا تھا کہ خجیرہ کی آمد کے بعد اس کے سارے زخم بھر گئے تھے' وہ قطعی صحت مند ہو گیا تھا۔ یہاں معاملہ ذرا مختلف تھا میرے جسم پر نہیں روح پر زخم تھے۔ احرس کی موت نے مجھے بے حال کر دیا تھا' صبر آ جانا شاید اسی کو کہتے ہیں۔

شام ہونے والی تھی جب میں نضار کے ساتھ کوٹھی سے نکلی اپنے ہی ساتھ میں نے نضار کے چہرے پر بھی میک اپ کر دیا تھا۔ انگریزوں کے پالتو کتوں سے بچنا میرے نزدیک لازمی تھا۔ میں انہیں اپنے پیچھے لگا کر ناحق مشکلات میں گھرنا نہیں چاہتی تھی اس ضمن میں ابتدا ہی سے میں نے احتیاط برتی تھی۔ جب سے میں کلکتے آئی تھی بغیر میک اپ کے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مجھ سے ایک غلطی بہرحال ہوئی جس کا احساس بعد از وقت ہوا جہاں میں نے اس قدر احتیاط سے کام لیا تھا اپنی کوٹھی میں بھی قیام نہ کرتی' یہ کوٹھی انٹیلی جنس والوں کی نظر میں تھی اس کوٹھی کا دوبارہ آباد ہو جانا انہیں میری طرف متوجہ کر دیتا اس کوٹھی میں خاصے ہنگامے ہو چکے تھے۔

کوٹھی سے نکل کر میں کچھ ہی دور چلی ہوں گی کہ مجھے محسوس ہوا کہ دو افراد ہم دونوں کے پیچھے چل رہے ہیں۔ فٹ پاتھ پر زیادہ رش نہیں تھا۔

چلتے چلتے میں اچانک مڑی۔ تعاقب کرنے والے زیادہ دور نہیں تھے' میں نے ان دونوں کو قریب آنے کا اشارہ کیا وہ اس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگے جیسے ان کی بجائے میں نے کسی اور کو اشارہ کیا ہو۔ میرے ہی ساتھ نضار بھی رک گیا تھا وہ دونوں لاتعلقی کے ساتھ چلتے ہوئے قریب آ گئے' وہ ہندوستانی ہی تھے دونوں کی عمریں زیادہ نہیں تھیں۔

"رکو' مجھے تم دونوں سے ایک بات پوچھنا تھی۔" میں نے انہیں مخاطب کیا۔

"ہم سے؟" انہوں نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔

"ہاں تمہی سے۔" میں زور دے کر بولی۔ "تمہارے محکمے کا ڈائریکٹر جیکسن ہی ہے یا اس کی جگہ کوئی اور آ گیا ہے؟"

"کون سا محکمہ؟" ایک شخص نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں تو کلکتہ میونسپلٹی میں ملازم ہوں۔"

"اور کتا پکڑ مہم کے انچارج ہو۔" مجھے اس کے جھوٹ بولنے پر غصہ آ گیا۔

"یہ کیا فضول بات کر رہی ہیں' مطلب کیا ہے آپ کا ان باتوں سے؟"

"چوری اور سینہ زوری' تم دونوں کیوں ہمارے پیچھے دم ہلاتے ہوئے آ رہے ہو؟" میں انہیں دانستہ اشتعال دلا رہی تھی۔

"جھگڑا کرنا چاہتی ہیں کیا؟" دوسرا شخص بولا پھر دھمکی دی۔ "مہنگا پڑے گا آپ کو ہم سے الجھنا۔"

"وہ تو خیر بعد کی بات ہے پہلے میں اپنے شبہے کی تصدیق تو کر لوں۔" یہ کہتے ہی میں نے انتہائی سرعت کے ساتھ پہلے شخص کی اوپری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

"ارے ارے..........." وہ کہتا ہی رہ گیا اور میں نے کام دکھا دیا۔

کچھ کاغذات اور روپوں کے علاوہ انٹیلی جنس کے محکمے کی طرف سے جاری کردہ کارڈ بھی اس کی جیب سے نکلا تھا' کارڈ پر اس کی تصویر بھی لگی تھی اور نیچے ڈائریکٹر کے دستخط تھے بعض لوگ سیدھے سادے دستخط کرتے ہیں' جیکسن بھی انہی میں سے تھا۔

"دیکھو' میں اس محکمے اور اس ڈائریکٹر کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔" میں نے کارڈ اس کی طرف بڑھایا اور بقیہ چیزیں بھی۔ "رکھ لو اب تمہارا جھوٹ پکڑا جا چکا ہے۔ آئندہ اگر میں نے تمہیں اپنے آس پاس دیکھا تو اتنے جوتے لگاؤں گی کہ انٹیلی جنس کی نوکری سے استعفیٰ دے کر بھاگ جاؤ گے' تمہیں شاید معلوم نہیں میں کون ہوں۔"

اس نے مجھ سے اپنا کارڈ' کاغذات اور روپے لے لئے۔ اسی عرصے میں اس شخص کا ساتھی بگڑ گیا اور برہم ہو کر بولا۔ "تم کیا ہندوستان کی وائسرائے لگی ہوئی ہو کہ ہم سے جواب طلب کرو' ہم کسی بھی محکمے میں ہوں تم کون ہو پوچھنے والی' آئیں گے ہم تمہارے پیچھے' روک کر دکھاؤ تم۔"

اتنا سنتے ہی میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ جڑ دیا۔ نضار کے لئے اتنا ہی کافی تھا اس نے ٹھوکر مار کر اس شخص کو گرا دیا۔ نضار کے پیر کی ٹھوکر اس شخص کی پنڈلی پر پڑی تھی' ہڈی پر پڑنے والی چوٹ کی وجہ سے وہ چیخ اٹھا تھا پہلا شخص نضار پر جھپٹا مگر اس تک نہیں پہنچ سکا میں نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔

لوگ جمع ہو گئے اور پھر وہی تماشا ہوا جو اس شہر میں پہلے بھی میں کئی دفعہ دکھا چکی تھی۔ کسی جوان اور خوبصورت عورت کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ اسے چھیڑا گیا ہے۔ لوگوں نے ان دونوں کی پٹائی شروع کر دی' میں نضار کا ہاتھ تھامے بھیڑ سے نکل آئی۔

میں نے دانستہ ان لوگوں کو پٹیا تھا۔ انٹیلی جنس والوں کے سلسلے میں پہلے بھی میں یہ نسخہ آزما چکی تھی۔

اس طرح تعاقب کئے جانے سے میری جان چھوٹ جاتی۔ اس طرح کی صورت حال میں انٹیلی جنس کا محکمہ ہمیشہ پسپائی اختیار کرلیتا تھا' اس کے سبب سے میں ناآشنا تھی۔

دھرم تلے سے میں کالی گھاٹ کے قدیم مندر پہنچ گئی یہ سارا علاقہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں ساڑھی باندھے ہوئے تھی اور ماتھے پر بندیا کا نشان تھا۔ نضار کو دیکھ کر بھی حلئے سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ میں نے میک اپ کرتے وقت یہ خیال رکھا تھا کہ کالی گھاٹ جانا ہے۔ مندر کے قریب مجھے اس حصے کا علم بھی تھا جہاں چندر موہن کی قید سے نکل کر فرار ہوئی تھی اس کا عشرت کدہ وہیں زیر زمین تھا۔ میں اسی حصے میں اِدھر سے اُدھر گھومتی رہی مجھے جو توقع تھی جلد ہی پوری ہو گئی۔ چار چھ سادھوؤں کے ایک گروہ نے مجھے اور نضار کو گھیرلیا اور حلقہ بنا کر ہمارے گرد ناچنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں لوہے کے لمبے چمٹے تھے' جنہیں وہ بجاتے جارہے تھے۔

دشمن اگر گھر کے دروازے تک پہنچ جائے تو پھر مجبوراً ہاتھ پاؤں مارنا ہی پڑتے ہیں۔ کچھ یہی معاملہ بڑے مہاراج چندر موہن کے ساتھ تھا۔ وہ آخر کب تک برداشت سے کام لیتا۔ میرا قیاس درست ہی ثابت ہوا۔ اس نے ہم دونوں کو گھیرنے کے لئے اپنے چیلے بھیج ہی دیئے۔ میری نظر میں اس تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا' میں اس ضمن میں نضار کو بھی آگاہ کر چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نضار ان سادھوؤں کی طرف سے زیادہ فکرمند نہیں نظر آ رہا تھا۔

اچانک سادھو ہمارے گرد چمٹے بجاتے اور کوئی بھجن گاتے ہوئے دائرے کی صورت میں ذرا سے پھیل گئے۔ ہم اس دائرے کے درمیان کھڑے تھے۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ہمارے چاروں طرف دھواں ہی دھواں ہو گیا' دھویں سے میرا دم گھٹنے لگا' سر چکرایا اور میں نے نضار کو آواز دینا چاہی مگر آواز نہیں نکلی۔ پھر میں زیادہ دیر اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی اور ڈھیر ہو گئی۔ ایسا ہی غالباً نضار کے ساتھ ہوا تھا۔ ساحر زعیم سے آخری معرکے کے دوران بھی ہم دونوں ساتھ تھے اور اب بھی یہی تھا۔ مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ ہموار میدانوں کی اس دنیا میں نسار بھی میرے شانہ بہ شانہ بدی کے خلاف جنگ کرے گا لیکن ہم جانتے بھی کیا ہیں' ہاں جاننے کا دعویٰ ضرور کرتے ہیں ورنہ تو ایک عمر کے بعد عقل رکھنے والا یہی کہے گا کہ میں کچھ نہیں جانتا' اس اعتراف کے لئے بڑے ذہن اور بڑے ظرف کی ضرورت ہے' سو نہ ہر آدمی کے پاس بڑا ذہن ہوتا ہے نہ بڑا ظرف۔ ہر آدمی اپنی انا کے گنبد پر بیٹھ کر جب نیچے دیکھتا ہے تو دوسروں کے قد اسے بہت چھوٹے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ بھی بونوں کی نسل میں سے ہے۔ میں نے خود کو نہ کبھی انڈر اسٹیمیٹ کیا نہ دوسروں سے برتر سمجھا۔ اپنے دشمنوں تک کو میں نے کمزور نہ جانا شاید اسی سبب خیر کی قوتوں نے ہمیشہ مجھے ان پر غالب کیا۔ چندر موہن جو بڑے مہاراج کے نام سے مشہور تھا اس سے نفرت کے باوجود میں نے کبھی یہ گمان نہ کیا کہ وہ بالکل بے حقیقت ہے اور میں اسے چیونٹی کی طرح مسل سکتی ہوں' یہ الگ بات کہ میں نے کبھی اس کے روبرو خود کو پست ظاہر نہ کیا اور اس سے نہیں دبی۔ اگر میرے اندر یہ حوصلہ نہ ہوتا تو اس روز خود ہی جانتے بوجھتے اس کی محفوظ ترین پناہ گاہ کا رخ نہ کرتی۔ اب وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ حملے میں مجھ پر پہل کرتا اسے غالباً احساس ہو چکا تھا کہ مجھے زیر نہیں کر سکتا اور یہ کہ اس نے ایسا کیا تو زندگی خطرے میں پڑ

سکتی ہے۔ چمپا کا معاملہ اس سے ذرا مختلف تھا وہ اپنی خودسری کے سبب میرے ہاتھوں ماری گئی تھی' پہلے بھی اس نے چندر موہن کی تاکید کے باوجود حدود سے تجاوز کیا تھا۔

ہوش آنے پر خود کو میں نے جیسے کسی اندھے کنویں کی تہہ میں پایا۔ میرے ہی ساتھ نضار بھی تھا۔ وہ ابھی تک ہوش و حواس سے بیگانہ تھا۔ اس کنویں میں جانے کہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ کنواں خشک تھا۔ تاریخ کے مطالعے سے مجھے معلوم ہوا کہ صحرائے گوبی کے وحشی دشت نورد اپنے مجرموں کو اسی طرح کے کنوؤں میں قید رکھتے تھے۔

یہ وہ جگہ تو نہیں جہاں میں پہلے آئی تھی' میں نے اٹھتے ہوئے سوچا۔ شاید چندر موہن نے اس مرتبہ مجھے کسی اور جگہ قید کرایا ہے اس کی وجہ یہ بھی ممکن تھی کہ پہلے میں اس کے زیر زمین عشرت کدے سے فرار ہو چکی تھی۔

ذرا سی کوشش کے بعد میں نضار کو بھی ہوش میں لے آئی۔ اب اس کے چہرے پر میک اپ نہیں تھا' جسم پر بھی ویسا ہی لباس تھا جو وہ بلند پہاڑوں پر زیب تن کرتا تھا۔

"ارے!" ہوش میں آتے ہی اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

نضار کی حیرت کا سبب میرے چہرے سے میک اپ غائب ہونا ہی تھا' اس کے علاوہ وہ لباس بھی جو اب میرے جسم پر تھا۔ مہذب دنیا کے نقطہ نظر سے لباس کے نام پر گویا وہ ایک تہمت ہی تھی۔ وادی سبز اور اس کے گرداگرد بسنے والے قبائل کی خواتین ستر پوشی کے لئے ایسے مختصر لباس کو بھی کافی سمجھتی تھیں۔ اسے ان کی معاشی اور معاشرتی مجبوری کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس میں عریانی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ پہاڑوں پر خود میں یہی لباس پہنتی تھی۔ اس وقت تک میں نے مہذب دنیا نہیں دیکھی تھی لیکن اب صورت حال کچھ اور تھی۔ مجھے اسی لئے وہاں نضار کی موجودگی سے حجاب سا محسوس ہوا۔ ہر تہذیب اور ہر معاشرے کے اپنے تقاضے اور مجبوریاں ہوتی ہیں' معلوم نہیں کیوں چندر موہن نے ایسا کیا تھا۔ ہماری بے ہوشی کے دوران ہی میں ایسا کیا گیا تھا۔ چندر موہن کی داسیوں کے چہرے میری نظروں میں گھوم گئے وہ چندر موہن کا ہر حکم بجالانے کے لئے ہر وقت مستعد رہتی تھیں۔ ہمارے لباس تبدیل کرنا ان کے لئے کون سا مشکل رہا ہو گا۔ داسیوں کے علاوہ چندر موہن کے چیلے بھی تھے۔ بہرحال یہ امر میرے لئے باعث حیرانی ہی تھا۔

اپنے جسم کو اس مختصر لباس میں مزید چھپانے کی خاطر میں اس طرح بیٹھ گئی کہ عریاں حصوں پر نضار کی نگاہ کم ہی پڑے۔

"معبلہ! تُو نے تو مجھے کچھ اور بتایا تھا۔" نضار نے مجھے مخاطب کیا پھر کہنے لگا۔ "یہ تُو کس طرح سمٹ سمٹا کر بیٹھی ہے؟ کیا میں تیرے لئے غیر ہوں؟"

"میں نے کب کہا کہ تُو غیر ہے۔"

"کہنا ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔"

"تجھے خبر ہے کہ یہ دنیا اور ہے' ہم اجنبی سرزمین پر ہیں۔" میں اسے سمجھانے لگی۔ "تُو ابھی چند ہی روز پہلے یہاں آیا ہے۔ تجھے بہت سی باتیں نہیں معلوم۔"

"جانتا ہوں میں' تُو مجھے بے خبر نہ جان' بتایا تو تھا میں نے تجھے کہ یہاں تعلیم دے کر بھیجا گیا ہوں۔"

"پھر تو تجھے میرے اس طرح بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔"

"یہاں ہے کون تیرے میرے سوا اور اگر کوئی ہوتا بھی تو اسے سے کیا فرق پڑ جاتا' ان اجنبی سرز والوں کے لئے ہم اپنی تہذیب اور روایتیں تو نہیں چھوڑ سکتے' ایک روز تو تجھے اور مجھے وہیں لوٹنا ہے۔" نز بڑے پُریقین لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"کون جانے کہ مستقبل میں کیا ہو۔" میں ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔ "ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں قید کئے گئے ہیں اور یہاں سے رہائی کس طرح ملے گی۔"

"اب رہائی کا خیال دل سے نکال دے اے معبلہ!" یہ الفاظ چندر موہن کے تھے۔

"بزدل چوہے!" میں اپنے دشمن کی آواز سن کر کھول گئی۔ "تُو کہاں چھپا ہوا ہماری باتیں سن رہا سامنے آ' نا۔"

"تُو کچھ بھی بکتی رہ میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تجھے اور تیرے اس عاشق کو یہیں سسک سسک کے مرنا ہے۔ اس کنویں سے آج تک تو کوئی زندہ بچ کر نکلا نہیں۔ تُو شاید اس ارادے سے کالی گھاٹ کے من کی حدود میں آئی ہو گی کہ مجھ تک پہنچ جائے گی۔ کچھ دن تک میں تجھے زندہ ضرور رکھوں گا کس لئے؟ ا سوال کا جواب تجھے بھی معلوم ہے بتانے سے کیا فائدہ بس ذرا میرے زخم بھر جائیں اور میں اس قابل ہو جاؤ کہ.........." پھر چندر موہن نے جو کچھ کہا اسے سننا نہ صرف میرے لئے ناقابل برداشت تھا' نضار بھی۔ قابو ہو گیا۔

غصے میں نضار کنویں کی دیواروں پر مکے مارنے لگا اسی کے ساتھ وہ چندر موہن کو ممکنہ حد تک بُرا بھلا کہہ رہا تھا' وجہ یہ کہ میں بھی وہاں موجود تھی۔

"یہ تو ایک خارش زدہ کتا ہے اے نضار! بھونکنے دے اسے۔" میں نے نضار کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا کنویں میں چندر موہن کا قہقہہ گونجنے لگا پھر اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ "تجھے معلوم ہے معبلہ اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے' اب میں تجھے انگریزوں کے حوالے نہیں کروں گا' تُو اب میری مجرم ہے تجھ سے چمپا کی موت کا انتقام لوں گا۔ وہ انتقام صرف اور صرف تیری موت ہے۔"

میں چونک اٹھی اور دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر کے بولی۔ "اے چندر موہن کیا تُو مجھے چمپا کی جگہ نہیں دے سکتا؟" میرا لہجہ بدل چکا تھا۔

"تجھے؟" اس کی حیرت زدہ آواز آئی پھر چند لمحے خاموشی طاری رہی اس کے بعد ہنسی کی آواز ابھری "معبلہ! کیا تُو چندر موہن کو اتنا ہی بے وقوف سمجھتی ہے؟ کیا میں اب تک تجھے جان نہیں سکا' تُو مجھے فریب نہیں دے سکتی۔"

"یہ بتا کہ تُو کس طرح میری بات کا یقین کر سکتا ہے؟" میں نے اب بھی ہار نہیں مانی۔

"اس کا بھی ایک طریقہ ہے' میں تیری بات پر اعتبار کر لوں گا۔" چندر موہن کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"کیا ہے وہ طریقہ؟ بتا مجھے۔"

"طریقہ تو میں تجھے بتا دوں گا مگر تُو اس پر عمل نہیں کرے گی' چل یہ بھی سہی .... ابھی دیکھے لیتا ہوں کہ تُو کتنے پانی میں ہے۔" چندر موہن کے الفاظ کی گونج ابھی ختم ہوئی تھی کہ ایک خنجر نہ جانے کدھر سے میرے قریب آ گرا۔ "یہ خنجر اٹھا لے اور اگر تُو واقعی چمپا کی جگہ لینا چاہتی ہے تو اپنے عاشق کو قتل کر دے' بول ہے اتنی ہمت۔"

"یہ خنجر تو میں تیرے سینے میں اتاروں گی کمینے!" میں بپھر گئی اور قریب پڑا ہوا خنجر اٹھا لیا۔

"بس اسی پر چمپا کی جگہ لینے کو کہہ رہی تھی .... فریب دینے کے لئے بھی کوئی عیار ذہن چاہئے۔ مجھے معلوم ہے کہ تُو اس طرح مجھ تک پہنچنے کی راہ ہموار کر رہی تھی' سو گھبرا مت' ایک دن آئے گا ایسا بھی لیکن وہ دن تیری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ تجھے برتنے کے بعد بالکل اسی طرح موت کے گھاٹ اتاروں گا جس طرح تُو نے چمپا کو مارا ہے۔ رہا یہ خنجر تو اسے تُو اپنے عاشق کے سینے ہی میں اتارنے کی تمنا کرے گی اور میں تیری یہ تمنا ضرور پوری کروں گا۔ اب چین سے سو جا کہ رات ہو چکی ہے۔ بطور سزا تجھے اور تیرے عاشق کو ابھی بھوکا رکھا جائے گا۔" چندر موہن کے الفاظ کے ساتھ ہی روشنی غائب ہو گئی۔

"یہاں سے نکلنا ناممکن لگتا ہے معبلہ!" نضار نے کہا۔

"ہاں بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے لیکن جس نے ہمیں یہاں آنے کا حکم دیا ہے وہ ہماری طرف سے بے خبر تو نہیں ہو گا اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے ویسے بھی ہم یہاں پھنسنے کے لئے ہی آئے تھے' اس عیار تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔"

پھر نضار کچھ نہیں بولا۔ ذرا ہی دیر بعد غیر فطری سے انداز میں میرے ذہن پر نیند کا غلبہ ہونے لگا' میں سمجھ گئی کہ یہ سب کچھ چندر موہن کی پُراسرار شیطانی قوتوں کی وجہ سے ہے۔ وہ اب مجھے اور شاید نضار کو بھی سلانا چاہتا ہے آخر کار میں ایک طرف لڑھک ہی گئی خنجر میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

معلوم نہیں کیسے میں ایک دم گہری نیند سے جاگ اٹھی' کنویں میں اب بھی اندھیرا تھا۔

"جاگ گئی تُو؟" میں نے چندر موہن کی آواز سنی۔

مجھے اپنے کسی عمل سے اسی نے بیدار کیا ہو گا میں نے سوچا جو گہری نیند سلا سکتا ہے اسے جگانے میں کتنی دیر لگتی۔ دانستہ میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"تیرا عاشق تو بڑا ہی بے وفا نکلا وہ تجھ سے زیادہ ذہین لگتا ہے۔ تُو تو خیر مجھے فریب دے رہی تھی لیکن اس نے مجھ سے سودا کر لیا' اس نے شاید اندازہ لگا لیا ہو گا کہ تُو زندہ نہیں چھوڑی جائے گی' پھر بھلا وہ کیوں تیرے ساتھ مارا جاتا۔"

اس مرتبہ میں چپ نہ رہ سکی۔ "بکواس کرتا ہے تُو وہ ہرگز ایسا نہیں۔"

"ایسا نہیں تو پھر تجھے کیوں چھوڑ کر چلا گیا؟ تُو اس وقت اکیلی ہے اور وہ عیش کر رہا ہے' یقین نہیں آ رہا اپنی تنہائی پر' تو یہ دیکھ۔"

کنویں میں اچانک روشنی ہو گئی میں واقعی اکیلی تھی نضار وہاں نہیں تھا۔

"میں تیرا کھیل جان گئی تُو نے مجھ پر غفلت طاری کر کے اسے کہیں اور قید کر دیا ہے۔" میں بولی۔

"پتا نہیں کیوں تجھے میری باتوں پر یقین نہیں آتا' اسے دیکھے گی اپنی آنکھوں سے کہ وہ کہاں ہے .... لیکن ایک شرط پر تجھے میں اس جگہ تک پہنچا سکتا ہوں تُو اس سے کچھ کہے گی نہیں اور نہ اپنے ساتھ یہاں سے خنجر لے جائے گی۔ تیرے عاشق نضار کو میں زندگی کی ضمانت دے چکا ہوں وہ میری امان میں ہے میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ اسے بلند پہاڑوں تک پہنچا دوں گا۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے اس کا مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اسے اپنی بستی تک پہنچنے کا راستہ نہیں معلوم۔ بطور تحفہ میں نے اسے اپنی پانچ حسین ترین داسیاں دی ہیں جنہیں وہ اپنے ساتھ پہاڑوں پر لے جائے گا۔ وہ بھی بہرحال تیری ہی طرح ایک قبیلے کا سربراہ ہے۔ وادی سبز پر ژیان کے حق کو نضار نے تسلیم کر لیا ہے۔"

"تُو دھوکا دے رہا ہے .... جھوٹا ہے تُو' یہ ناممکن ہے۔ نضار کسی بھی صورت وادی سبز پر ژیان کے حق کو تسلیم نہیں کر سکتا۔"

"چیخنے چلانے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی معبلہ! میں نے جب اسے بتایا کہ تُو سردار اشم کی بیٹی نہیں اور نہ ہی تیرا تعلق پہاڑی بستیوں سے ہے تو وہ مان گیا' گھٹنے تو پیٹ ہی کی طرف جھکتے ہیں ژیان لاکھ برا سہی مگر اس کا تعلق تو پہاڑوں سے ہے۔ رہی یہ بات کہ اس نے سردار اشم کو قتل کرا کے اقتدار پر قبضہ کر لیا کیا غضب ہو گیا' اقتدار حاصل کرنے کے کھیل میں ہر جگہ یہی ہوتا ہے اور تجھے تو خود یہ معلوم ہونا چاہئے کہ سردار اشم کی اولاد نہیں' سو وادی سبز پر تیرا قبضہ ناجائز ہوا کہ نہیں؟"

اس موقع پر مجھے عظیم مہین کی سرگوشی یاد آ گئی۔ سرگوشی کے مطابق چندر موہن کو معلوم تھا' میں کون ہوں؟ میری شخصیت کا بھید کیا ہے؟ میرا تعلق مہذب دنیا سے کیا ہے؟ انگریز مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ یہ سارا کھیل کیا ہے؟

"تُو ٹھیک ہی کہتا ہے چندر موہن!" میں نے دانستہ شکست خوردہ انداز میں سر جھکا لیا مجھے اندازہ تھا چندر موہن وہاں نہ ہونے کے باوجود میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہو گا میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اداس لہجے میں کہنے لگی۔ "اس بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں' مجھے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم کہ میں کون ہوں .... اور شاید .... شاید کسی کو بھی خبر نہیں کہ میرے والدین کون تھے .... ان پر کیا گزری اور میں کس طرح وادی سبز پہنچ گئی۔"

"تیرا یہ سوچنا غلط ہے معبلہ! میں سب کچھ جانتا ہوں لیکن اب اس سے تجھے کیا حاصل تجھے تو مرنا ہے' سو جان کر مر کہ بے جانے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا اور اپنی آنکھوں سے آنسو بہانے کی خاطر احرس کی موت کو یاد کرنے لگی' مجھے اس میں ناکامی نہیں ہوئی۔

"ارے تُو رونے لگی .... ابھی سے رونے لگی۔"

میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا کہ وہ عیار مجھے دیکھ رہا ہے۔

"سن' رونے سے کچھ نہیں ہو گا .... میرے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہے' عورت کے آنسو اس پر اثر نہیں کرتے۔ ایک تُو کیا کتنی تجھ ایسی لڑکیوں نے مجھ سے فریادیں کی ہوں گی کہ میں انہیں ہاتھ نہ لگاؤں

اور پھر وہی بعد میں ...."

"تُو غلط سمجھ رہا ہے چندر موہن!" میں نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ "میرے رونے کا سبب اپنے متعلق لاعلمی ہے میں کسی بات سے نہیں ڈرتی' تُو مجھے جانتا ہے کہ موت کا خوف بھی مجھے رونے پر مجبور نہیں کر سکتا .... یہ .... یہ تو صرف احساس تنہائی ہے جو مجھے اندر سے توڑے دے رہا ہے۔" میں آنسو پونچھنے لگی۔

"دور کرے گی اپنا احساس تنہائی؟"

میں اس خبیث کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکی اس لئے خاموشی ہی غنیمت جانی۔

"ابھی دائیں جانب ایک دروازہ نظر آئے گا تجھے' کیا سمجھی .... تُو تنہا نہیں رہے گی۔" اس نے اپنی بات پوری کی۔

"میں عارضی تنہائی کا ذکر نہیں کر رہی۔" میں نے وضاحت کی۔

"سمجھ رہا ہوں میں تیرا مطلب کہ تُو کیا چاہتی ہے' تو سن' ساری دنیا میں تقریباً یہ دستور ہے کہ مرنے والے سے اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے' سو میں بھی تجھے قتل کرانے سے پہلے یہ موقع دوں گا۔ اس وقت اگر تُو نے اپنے بھید جاننے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں تجھے مایوس نہیں کروں گا' ٹھیک ہے نا۔"

میں کیا کہتی اندر ہی اندر بل کھا کے رہ گئی' اسی وقت ہلکی سی آواز ہوئی اس کنویں میں دائیں جانب ایک راستہ نمودار ہو گیا۔

چندر موہن اگر مجھ سے ادھر جانے کو نہ بھی کہتا تو میں ضرور جاتی۔ اس اندھے کنویں سے نکلنے کی ایک صورت تو پیدا ہو گئی تھی۔ خنجر اٹھانے کے لئے میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ چندر موہن کی آواز ابھری۔ "وعدہ خلافی نہ کر معبلہ!"

"میں نے تو تجھ سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"وعدہ نہ سہی میں نے تجھے تاکید تو کی تھی کہ خنجر ساتھ نہیں لے جائے گی یہاں سے۔"

اس وقت تک میں نے خنجر اٹھا لیا تھا معاً خنجر جیسے خود بخود میرے ہاتھ سے نکل کر فضا میں بلند ہوتا گیا۔

میں نے اس وقت یہی سوچا کہ جو کام مجھ سے نہیں ہو سکا نضار نے انجام دے دیا۔ میرے نزدیک یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ نضار مجھ سے بے وفائی کر جاتا وہ یقیناً چندر موہن کو فریب دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دائیں جانب جو دروازہ نمودار ہوا تھا وہ کسی سرنگ کا دہانہ لگتا تھا سرنگ میں بھی روشنی تھی اس میں باآسانی سیدھا کھڑا ہو کر چلنا ممکن تھا۔ میں نے اس میں قدم رکھا اور آگے بڑھنے لگی سرنگ کے اختتام پر میری سماعت سے کسی کے ہنسنے کی آواز ٹکرائی۔ کوئی عورت دھیرے سے ہنسی تھی۔ سرنگ کے بعد ایک دباری سی تھی اور سامنے ہی کسی کمرے کا دروازہ تھا۔ دروازے پر ریشمی پردہ پڑا تھا۔ عورت کے ہنسنے کی آواز اسی کمرے سے آئی تھی پھر جانے کس طرح وہ ریشمی پردہ درمیان سے غائب ہو گیا اور مجھے کمرے کا منظر نظر آنے لگا۔

"پیو نضار .... اور پیو یہ جیون رس ہے۔" عورت کی مخمور آواز سنائی دی۔

میں نے دیکھا بلاشبہ وہ ایک حسین ترین عورت تھی۔ یہ جاننے کے باوجود شاید نضار مصلحت کے تحت

دانستہ چندر موہن کا آلہ کار بن گیا ہو گا' مجھے اس کا حدود سے تجاوز کرنا اچھا نہیں لگا۔ غالباً دنیا کی ہر عورت مرد کے بارے میں میری ہی طرح تنگ نظر ہوتی ہے۔ میرا جی چاہا کہ اس عورت کو گھسیٹ کر نضار سے الگ دوں۔ میرے لئے وہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ وہ عورت یقیناً چندر موہن کی کوئی داسی تھی جو نضار کو گویا میں اتار رہی تھی۔

"نضار!" میری احتجاجی آواز بلند ہوئی۔ وہ کھیل زیادہ فاصلے پر نہیں کھیلا جا رہا تھا جس نے میرے بدن میں آگ لگا دی تھی۔

"اے معبلہ! کیوں چیخ رہی ہے؟" میں نے چندر موہن کی منحوس آواز سنی۔ "ان دونوں تک آواز نہیں پہنچ سکتی وہ ادھر نظر اٹھا بھی لیں تو انہیں تُو دکھائی نہیں دے گی۔"

وہ چندر موہن کا شیطانی طلسم کدہ تھا' یہ جاننے کے باوجود میں غصے کی حالت میں تیزی سے آگے بڑھی اور پھر میرا جیسے کسی نادیدہ دیوار سے سر ٹکرا گیا اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل گیا۔

☆======☆======☆

پھر جانے کب میں ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آئی' آنکھیں کھولتے ہی میری نظر نضار کے چہرے پر پڑی میرا سر اس کے زانو پر رکھا تھا۔

"بے وفا!" میں بڑبڑائی گزشتہ شب کا منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا تھا اس خیال کے ساتھ ہی میں اٹھ کر بیٹھ گئی نضار کی طرف سے میں نے منہ موڑ لیا تھا۔

"کیا ہوا؟ کس بات پر ناراض ہے تُو؟" نضار نے میرے شانے پر ہاتھ دھر دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور غصے میں بولی۔ "میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا تیرے ہاتھ ناپاک ہو چکے ہیں۔"

"سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تجھے کیا ہو گیا ہے' رات کو تُو اتنی مہربان تھی کہ.......... کہ.........."

"میں یا وہ ذلیل عورت جس کے حصول کی خاطر تُو نے ہر عہد توڑ دیا۔"

"کون عورت' تُو کس کی بات کر رہی ہے؟ خود بخود یہاں ایک راستہ نمودار ہوا اور تُو مجھے ایک سرنگ سے گزار کر اس کمرے میں لے گئی جس کے فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ پھر.......... پھر میں تجھے روکتا ہی رہا اور.......... اور.........." وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

فریب.......... نظری بندی' میرے اعصاب پر چھناکا سا ہوا۔ میں نضار کی طرف مڑی اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پر خجالت کے آثار تھے۔ میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔ خبیث چندر موہن نے مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کی خاطر وہ سوانگ رچایا تھا۔ نضار سے ان بقیہ باتوں کی تصدیق میرے نزدیک فضول تھی جو چندر موہن نے مجھ سے کی تھیں۔ ان باتوں کا مطلب یہی ہوتا کہ مجھے نضار پر اب اعتماد نہیں رہا اس کے باوجود نضار کو صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔

"شرمندہ نہ ہو نضار کہ تُو نے مجھ پر دست درازی نہیں کی' وہ میں نہیں چندر موہن کی ایک داسی تھی، چندر موہن نے تجھے فریب نظر میں مبتلا کر دیا تھا۔" پھر میں نے اسے اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ مختصراً کر دیا۔

"تُو نے میری روح کا ایک بوجھ ہلکا کر دیا معبلہ! میں خود کو واقعی تیرا مجرم سمجھ رہا تھا۔ یہ شخص چندر موہن تو انتہائی پست ذہن کا لگتا ہے' میں سمجھا نہیں کہ اس سے بھلا اسے کیا ملا؟ عجب کمینہ آدمی ہے۔"

"وہ آدمی نہیں شیطان ہے۔" میرے لہجے میں نفرت و حقارت تھی۔

گہرے کنویں کے اوپر کھلا آسمان نظر آ رہا تھا دن کی روشنی کنویں کے اندر تک پہنچ رہی تھی وہ کنواں شاید کسی ایسی جگہ تھا جہاں کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ کنویں کی دیواریں بالکل سپاٹ تھیں اوپر پہنچنے کی کوشش کرنا کارِ عبث ہی ثابت ہوتا۔ دن کی روشنی میں ہم دونوں نے اس کنویں کا اچھی طرح جائزہ لیا وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا دیواریں ٹھونک بجا کر دیکھیں غرض کہ ہر ممکن طریقہ آزما کر دیکھا لیکن فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔

سارا دن بھوکے پیاسے گزر گیا ادھر کوئی نہیں آیا۔ ہماری نظریں بار بار اوپر اٹھتی رہیں حیرت تو یہ کہ کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ معلوم نہیں' وہ کنواں کس جگہ تھا۔ سناٹا غیر فطری سا تھا پھر دھیرے دھیرے اندھیرا پھیلنے لگا۔ غنیمت تھا کہ اس اندھے کنویں میں چندر موہن نے مجھے تنہا نہیں رکھا تھا۔

گزشتہ روز سے ہم دونوں نے کچھ نہیں کھایا تھا ہاں نضار نے نشہ آور "جیون رس" ضرور پیا تھا۔ چندر موہن کی قید میں ایک بار مجھے بھی اس مشروب کا تجربہ ہو چکا تھا یہ مشروب آدمی کی حیوانی جبلت کو دوچند کر دیتا تھا۔ نضار کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا میرے نزدیک اس سے جو غیر اخلاقی حرکات سرزد ہوئیں ان کی ذمے داری چندر موہن پر تھی۔ اب چندر موہن کی آواز سننے سے بھی ہم محروم ہو چکے تھے اس آواز کے ذریعے چندر موہن سے کوئی رابطہ تو قائم تھا لیکن اب یہ رابطہ بھی شاید وہ برقرار رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ مجھ سے اپنی دست راست چمپا کے قتل کا انتقام لے رہا تھا اور نضار کو میرا ساتھ دینے کی سزا مل رہی تھی۔ میں اب سوچ رہی تھی کہ اسے اپنے ساتھ نہ لائی ہوتی تو بہتر تھا۔ پھر آسمان پر اکا دکا ستارے نظر آنے لگے رات ہو چکی تھی کنویں کے اندر تاریکی پھیل گئی۔

"تجھے بھوک تو لگ رہی ہو گی معبلہ!" نضار نے مجھے مخاطب کیا۔ "کل سے تجھے کچھ کھانے کو نہیں ملا۔"

"اور تُو نے کب کچھ کھایا ہے؟"

"میں بھوکا رہ سکتا ہوں بس بار بار تیرا خیال آ رہا ہے۔"

"نضار!" معاً وہی منحوس آواز کنویں میں گونجی جس سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا' چندر موہن کی آواز' اسی کے ساتھ کنویں میں روشنی ہو گئی۔

"ہاں بول اے وہ شخص کہ جسے میں نے دیکھا نہیں اور نفرت کرتا ہوں' شدید نفرت۔"

"کل رات تو میں بس یوں ہی معبلہ کو تڑپا رہا تھا کہ تُو نے مجھ سے اپنی زندگی کا سودا کر لیا ہے' سو یہ پیشکش اب کر رہا ہوں۔ تو کیوں اس کی خاطر جان دے رہا ہے؟ ویسے بھی اس کا تعلق بلند پہاڑوں سے نہیں یہ تم لوگوں میں سے نہیں ہے۔"

"تو پھر یہ کہاں سے پہاڑوں پر پہنچ گئی؟" نضار نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔ "اے اجنبی تو مجھے فر
نہیں دے سکتا کہ میں معبلہ کو بچپن سے جانتا ہوں۔"

"اور اگر میں نے یہ ثابت کر دیا کہ معبلہ کا تعلق پہاڑی بستیوں سے نہیں تو کیا اے سردار اشر کے
تو اس کی حمایت سے دستبردار ہو جائے گا؟"

"تو کہیں اس طرح ملعون ژیان کی حمایت تو مجھ سے نہیں چاہتا؟"

"ٹھیک سمجھا تو اے نضار! دراصل وادی سبز پر معبلہ کا نہیں ژیان کا حق ہے۔"

"تو بکتا ہے اپنی بکواس بند کر' سارے قبائل وادی سبز پر معبلہ کے حق کو تسلیم کر چکے ہیں۔"

"اس لئے کہ انہیں حقیقت کا علم نہیں جس روز سچ ظاہر ہو گا قبائل کو پتا چل گیا کہ معبلہ سردار اشم
بیٹی نہیں تو اسے تسلیم کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔"

"معبلہ نے کبھی اقتدار کی ہوس نہیں کی اسے تو تمام قبائل کے سرداروں نے خود وادی سبز کا حکم
بنایا تھا۔"

"تو پھر اس نے ژیان سے کس لئے جنگ کی؟"

"اپنے بابا سردار اشم کا انتقام لینے کے لئے۔" نضار بلا جھجک جواب دیئے جا رہا تھا میں خاموش
مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

"انتقام۔" چندر موہن کی زہریلی ہنسی سنائی دی پھر آواز آئی۔ "ژیان سے یہ ایک ایسے شخص کا انتقام
لینے کے درپے تھی کہ جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

"تو ان باتوں کو کیا جانے اے ہموار میدانوں میں رہنے والے۔" نضار کے لہجے میں حقارت تھی۔

"اگر میں نہ جانتا تو کیا تجھے سردار اشر کا بیٹا کہتا؟ میں ہی تو ایک ایسا ہوں کہ جانتا ہوں۔" چندر موہن
آواز سے تکبر کا اظہار ہونے لگا۔

"تو شیطانی قوتوں کا مالک ہے' سو اتنی سی بات جان لینے پر اترا رہا ہے' کوئی ایسی بات کر کہ جو میر
لئے عجب ہو یا مجھے خبر نہ ہو۔"

"میرے علم میں ایسی متعدد باتیں ہیں اور وہ میں تجھے اسی وقت بتا سکتا ہوں' ہر چند کہ معبلہ کو ابھی
یہ باتیں نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن تو یہ یقین دلا دے' ژیان سے جنگ نہیں کرے گا' وادی سبز پر اسے حکم
کرنے دے گا تو............"

"تجھے ہمارے دشمن سے کیا ہمدردی ہے؟" نضار بول اٹھا اس طرح چندر موہن کی بات پوری نہ
سکی۔

"اس لئے کہ وہ میرا دوست ہے۔" چندر موہن نے جواب دیا۔

"اور انگریز حکومت بھی ژیان کو اپنا دوست سمجھتی ہے' یہی بات ہے نا؟"

"ہاں' اس لئے کہ ژیان بہرحال ایک ریاست کا حکمران ہے جس پر معبلہ نے تیری مدد سے ناجائز ق
کر لیا ہے اور سن' میں چاہوں تو معبلہ کے ساتھ ہی تجھے بھی راستے سے ہٹا دوں مگر یہ اس مسئلے کا حل نہیں۔

دلی نائب تیری جگہ سنبھال لے گا۔"

معاً میں نے نضار کو چونکتے دیکھا' مجھے یوں لگا جیسے وہ توجہ سے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔

"کیا سوچنے لگا تو؟" چندر موہن کی آواز چند لمحوں کے بعد پھر سنائی دی۔

"یہ سوچ رہا ہوں میں کہ اگر معبلہ واقعی پہاڑی بستیوں سے تعلق نہیں رکھتی' سردار اشم کی اولاد نہیں
تو پھر اسے وادی سبز پر حکمرانی نہیں کرنا چاہئے لیکن............"

"معبلہ تو خیر اب کبھی پہاڑوں پر واپس نہیں جا سکے گی اس لئے مسئلہ معبلہ کی حکمرانی کا نہیں۔"

"تو پھر؟"

"مسئلہ ژیان کے حق کو ماننے کا ہے۔"

"اگر میں نے یہ بات مان بھی لی تو بقیہ قبائل کس طرح مان جائیں گے؟" نضار نے سوال کیا۔

"معبلہ کے بارے میں حقیقت کا علم ہونے کے بعد وادی سبز پر حکمرانی کا دعویدار ہی کون رہ جائے گا۔"

نضار کو میں نے اس طرح خاموشی اختیار کرتے دیکھا جیسے وہ لاجواب ہو گیا ہے۔

"تو ایک بات اور بھول رہا ہے اے سردار اشر کے بیٹے! پہاڑی بستیوں کے زبانی دستور کے مطابق معبلہ
تو یوں بھی حکمرانی کی اہل نہیں۔ جو شخص اس سے شادی کرتا وادی سبز کی حکمرانی اسے ملتی' تو شاید اسی امید پر
اب تک معبلہ کا ساتھ دیتا رہا ہے۔" چندر موہن کی آواز میں طنز تھا۔

"تو مجھے غلط سمجھا اے اجنبی شخص! مجھے وادی سبز پر حکمرانی کا لالچ نہیں میرے باپ کی میراث مجھے کافی
ہے' اچھا ان باتوں کو چھوڑ اور معبلہ کے بارے میں بتا اگر مجھے یقین آ گیا کہ معبلہ پہاڑوں کی رہنے والی نہیں تو
پھر کوئی بھی وادی سبز پر حکمرانی کرے میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔"

پھر چندر موہن نے میرے ماضی سے پردہ اٹھانا شروع کر دیا۔

میرا تعلق جنرل بخت خاں کی نسل سے تھا۔ برسوں پہلے میرے اجداد پہاڑوں میں جا بسے تھے۔ ان میں
سے کچھ کسی طرف اور کچھ مزید بلندیوں کی جانب نکل گئے کہ ظالم انگریزوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔ نسل در
نسل یہ لوگ بلندیوں کی طرف سفر کرتے رہے' ایک برفانی طوفان میں گھر کے میرے والدین اپنے قافلے والوں
سے بچھڑ گئے۔ میری عمر اس وقت صرف ایک ماہ تھی۔ طوفان تھما تو وہ اس غار سے نکلے جہاں پناہ لی تھی۔ کچھ
دن تو راستہ بھٹک جانے کے بعد سامان خورد و نوش چلا پھر وہ بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر ایک جگہ گر گئے۔
انہی دنوں سردار اشم اپنی بیوی کے ہمراہ اس راستے سے گزرا۔ برفانی طوفان میں گھر کے وہ بھی راہ بھول بیٹھا تھا
اس کے ساتھ محافظوں کا جو دستہ تھا بچھڑ گیا سردار اشم کے پاس خاصا خشک گوشت تھا سو وہ اور اس کی بانجھ بیوی
زندہ رہے۔ میرے والدین کو وہ مرنے سے نہ بچا سکا۔ سویوں میں سردار اشم کو قدرت کی طرف سے جیسے تحفے
میں مل گئی۔ مہینوں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد سردار اشم طویل عرصے کے بعد وادی سبز کی طرف لوٹا صحیح راستہ
تلاش کر لینے کے باوجود سردار اشم نے دانستہ دیر لگائی۔ سردار اشم اور اس کی بیوی نے راستے میں طے کر لیا تھا
کہ وہ مجھے اپنی اولاد ظاہر کریں گے اسی کے بعد مہا پجاری نے سردار اشم کے ایما پر میرے شانے کو گودا۔ میری
شناخت کے لئے سانپ کا پھن میرے شانے پر گودا گیا تھا۔ یوں میں وادی سبز میں سردار اشم کی بیٹی بن کر پروان

چڑھنے لگی۔

چندر موہن نے اعتراف کیا کہ اس نے اپنی شیطانی قوتوں کے ذریعے میرے ماضی کا سراغ لگایا تھا۔

"لیکن کیوں؟ تجھے اس کی ضرورت کیوں پڑی؟" نضار نے ایک اور سوال کیا۔

"جاپ کرتے ہوئے مجھے ایک روز اپنی شکتی سے معبلہ کے بارے میں پتا چلا۔" چندر موہن بتانے لگا۔

اس عیار کو میرے اندر موجود حیرت انگیز قوتوں کا علم ہوا' چندر موہن نے سوچا مجھے اگر وہ اپنا مطیع لے تو اس کی قوتیں لامحدود ہو جائیں گی۔ پھر اس کے شیطانی ذہن میں ایک اور منصوبے نے جنم لیا۔ ا پُراسرار قوتوں کے بل پر اس نے کئی اعلیٰ سرکاری حکام سے رسم و راہ پیدا کرلی اسی غرض سے وہ دہلی گیا۔ و رائٹ اور رابرٹ ہیم دونوں ہی اس کے شیطانی چکر میں آ گئے۔ ان دنوں انگریزوں کے خلاف بہت سی ز زمین تنظیمیں سرگرم عمل تھیں ولیم اور رابرٹ کو چندر موہن نے یہ سمجھایا کہ اگر میں قابو میں آ گئی تو مج انگریزوں کے مفادات کا غلام بنا کر زیر زمین حکومت دشمن تنظیموں سے باآسانی نمٹا جا سکتا ہے۔

انٹیلی جنس کے کچھ مہم جو افراد کو جن میں چند انگریز خواتین بھی شامل تھیں بلند پہاڑوں کی طرف بھ گیا۔ چندر موہن نے اپنی پُراسرار شیطانی قوتوں کو بروئے کار لا کر ان لوگوں کی رہنمائی کی اور آخر کار یہ لوگ وادی سبز تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت وادی سبز پر ژیان کی حکمرانی تھی یہ پہلی پارٹی ہندوستان واپس پہنچی تو اس کی رپورٹ کے نتیجے میں انگریز حکومت نے ایک اور منصوبہ بنایا۔ دور دراز بلند پہاڑوں کے درمیا وہ اپنی اسلحہ ساز فیکٹریاں قائم کر سکتے ہیں' مہذب دنیا ان اسلحہ ساز فیکٹریوں سے بے خبر ہی رہتی۔ اس کے لے پہاڑوں میں کسی ایسی ریاست کی حمایت و تعاون کی ضرورت تھی جو طاقتور بھی ہو اور اسے انگریز اپنے مقاص کے لئے استعمال کر سکیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ژیان سے انہوں نے رفتہ رفتہ اپنے تعلقات بڑھائے ان تعلقات میں خوبصورت انگریز عورتوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

انگریز ان پہاڑی بستیوں کی سیاست میں بھی دخیل ہو گئے اسی کے ساتھ وہ میری جستجو میں بھی رہے۔

پھر جب ژیان کو میں نے شکست دے دی اور کچھ عرصے کے بعد خجیرہ کی رہنمائی میں کلکتے پہنچی تو چند موہن نے آخر کار میرا سراغ لگا لیا۔ اس کے بعد چندر موہن ہی کے ایما پر مجھے نظر میں رکھا جانے لگا۔ چند موہن نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن مجھے زیر دام لے آئے گا۔ میں قابو میں آ جاتی تو پھر ژیان کو دوبار وادی سبز کا حکمراں بنانا آسان ہو جاتا۔ اس کے لئے قبائل کو صرف یہ بتانا کافی ہوتا کہ میں سردار اشم کی بیٹ نہیں تھی۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہوتا اور اس بات کو ثابت نہ کیا جا سکتا تو مجھے زیر دام لانے کے بعد ژیان کی بیو بنا دیا جاتا' یوں بھی ژیان ہی وادی سبز کا حکمران ٹھہرتا۔

ایک ایک کر کے سارے ہی عقدے کھل گئے۔ میرے لئے یہ بات بہرحال قابل فخر تھی کہ میں جنرل بخت خاں کی نسل سے ہوں۔ نیک روح مہین کی یہ پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی تھی کہ چندر موہن کی تلاش میری شخصیت کا بھید کھول دے گی۔

میں انہی خیالوں میں گم تھی کہ شیطان صفت چندر موہن کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "اور اے نضار! میں نے انگریزوں سے بہت دولت کمالی اب زیادہ کی مجھے ہوس نہیں' معبلہ کے ساتھ معرکہ آرائی مجھ

سودا لی پڑی یہاں تک کہ میں ہمیشہ کے لئے اپنی دونوں ٹانگوں سے محروم ہو گیا آج تک میں اسی لئے بستر پر پڑا ہوں۔ معلوم نہیں یہ کیسے زخم ہیں جو کسی طرح بھرتے ہی نہیں۔ جان سے زیادہ دنیا میں اور کیا ہے۔ اپنے بھگوان سے میری یہی پرارتھنا تھی کہ کسی بھی طرح معبلہ میرے قبضے میں آ جائے اور میں ایک بار اپنے دل کی حسرت نکال کر اسے نیچا دکھا کر موت کی نیند سلا دوں سو بھگوان نے میری سن لی۔ اب میں اسے انگریزوں کے مفادات کا غلام بنا کر زندہ نہیں رکھوں گا اگر میں نے ایسا کیا تو پھر میرے سینے کی آگ کیسے بجھے گی.......... انتقام کی آگ۔"

"جس میں تُو خود جل کر ختم ہو جائے گا۔" میں کافی دیر کے بعد بلند آواز میں بولی۔

"تیرا کہنا غلط نہیں اے معبلہ!" نضار نے میری تائید میں کہا۔

"اور.......... اور وہ تیرا عہد کہ تُو معبلہ کی حقیقت جاننے کے بعد ژیان.........."

"تیرے پاس ثبوت کیا ہے ان باتوں کا؟" نضار نے بحث کی۔ "کیا خبر یہ سب کچھ جو تُو نے معبلہ کے ماضی کے بارے میں بتایا ہے جھوٹ ہو۔"

"سمجھ گیا میں اے سردار اشر کے بیٹے! تُو اپنے عہد سے پھر گیا ہے۔ ٹھیک ہے تو پھر تیرا انجام بھی معبلہ سے مختلف نہیں ہو گا۔"

عین اسی لمحے مجھے اپنے گرداگرد خجیرہ کی مانوس و مخصوص خوشبو چکراتی محسوس ہوئی۔ اسی کے ساتھ کنویں میں دائیں جانب سرنگ کا دہانہ دکھائی دینے لگا۔

"جا اے معبلہ اب اسے شکار کر لے۔" نیک روح مہین کی سرگوشیاں مجھے سنائی دینے لگیں۔ "خجیرہ تم دونوں کی رہنمائی کرے گی۔"

مہین کا اشارہ یقیناً چندر موہن کی طرف تھا۔ میں خجیرہ کی خوشبو کے پیچھے چل دی۔ نضار بھی میرے ساتھ تھا مجھے اس سے کچھ کہنا نہیں پڑا اس نے بھی شاید سرگوشیاں سن لی تھیں۔ سرنگ سے نکل کر میں اس کمرے سے گزری جہاں گزشتہ شب نضار کو ایک خوبصورت داسی کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کمرے کے بعد دائیں جانب اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں میں ان سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔ خجیرہ کی خوشبو اسی طرح رہنمائی کر رہی تھی۔

وہ چوڑی سی ایک راہداری تھی جس کے اختتام پر کسی کمرے کا دروازہ کھلا دکھائی دیا اس دروازے تک مجھے چھوڑ کر خجیرہ کی خوشبو غائب ہو گئی۔

میں اس کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے ہی دیوار کے قریب ایک پلنگ پر چندر موہن آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ اس کے ہونٹ حرکت میں تھے۔ اس کے سینے سے لے کر نیچے تک جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ نضار نے میرے عقب میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"آنکھیں کھول دے چندر موہن اب تیرا کوئی جادو نہیں چلے گا۔" میں نے یہ الفاظ پورے یقین کے ساتھ ادا کئے تھے۔

چندر موہن آنکھیں کھول کر مجھے وحشت زدہ سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ "تُو.......... تُو معبلہ

یہاں تک پہنچ گئی؟" اس کی آواز مرتعش تھی۔

"موت کو کہیں پہنچنے سے کون روک سکتا ہے؟" میں نے آگے قدم بڑھائے۔

پلنگ پر وہ عیار و بدکردار شخص بے بسی کے عالم میں پڑا تھا جس نے میرا جینا حرام کر دیا تھا۔ اس نے کئی بار میری عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنا چاہا' مجھے قید رکھا اور ایسی اذیتیں پہنچائیں کہ میں چیخ اٹھی وہ حیرت انگیز پُراسرار شیطانی قوتوں کا مالک تھا مگر اب حکم ہو چکا تھا اسے شکار کرنے کا۔ اس حکم کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس کی شیطانی قوتیں چھین لی گئی ہیں۔ اب وہ ایک معذور و مجبور آدمی تھا۔ اسے مارنے کے لئے میرے وجود میں خوابیدہ کسی پُراسرار قوت کی ضرورت نہیں تھی۔

"ٹھہر جا معبلہ!" میں نے پیچھے سے نضار کی آواز سنی۔ "اسے مارنے میں جلدی نہ کر۔"

آگے بڑھتے ہوئے میرے قدم رک گئے میں نے مڑ کر نضار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اسے یقیناً معلوم ہو گا کہ ژیان کہاں ہے۔" نضار نے مجھ سے کہا۔

غصے اور شدت جذبات میں واقعی مجھے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ چندر موہن سے ژیان کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے تو پھر اس کی زبان تُو ہی کھلوا۔" میں پیچھے ہٹ گئی۔

اچانک کمرے میں چندر موہن کا قہقہہ گونج اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی پاگل شخص بہت زور سے ہنس پڑا ہو۔

"آخر پڑ ہی گیا نا چندر موہن سے کام۔" ذرا دیر بعد وہ بولا۔ "کم از کم تم لوگ مجھے اس وقت تک تو نہیں مارو گے جب تک میں زبان نہیں کھول دوں۔" یہ اس شخص کی شکست کا گویا اعتراف تھا' جو کچھ دیر پہلے تک ہمیں اپنی شیطانی قوتوں کا تماشا دکھا رہا تھا۔

"تُو شدید غلط فہمی کا شکار ہے۔" میں بول اٹھی۔ "جس طرح میں تجھ تک پہنچ گئی اور تیرے سر پر موت بن کر منڈلا رہی ہوں اسی طرح ژیان بھی مجھ سے نہیں بچ سکے گا۔"

"ممکن ہی نہیں جب تک میں نہ بتاؤں۔"

"اس طرح تُو خواہ مخواہ اپنی اہمیت جتا رہا ہے۔" نضار نے اسے مخاطب کیا۔

"تو نہ مانو میری اہمیت۔" وہ ایک ہی عیار تھا۔ "ہندوستان بھر میں تلاش کرتے پھرو اسے۔"

"سارے ہندوستان میں اسے تلاش کرنے کی مجھے کیا ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ بھی بنگال ہی میں ہے۔" میں نے کہا۔

"بنگال میں تھا کبھی' اب نہیں ہے۔" چندر موہن جلدی سے بولا۔

"مرتے وقت بھی جھوٹ بولنے اور فریب دینے سے باز نہیں آ رہا تُو۔" میں نے اسے گھور کے دیکھا۔ "وہ اس شہر سے ضرور فرار ہوا ہے بنگال سے نہیں۔ تُو مجھے غلط راستے پر نہیں ڈال سکتا۔"

چندر موہن کا چہرہ کچھ بجھ سا گیا مگر اس نے شاید اپنے حواس پر جلد قابو پا لیا پھر جب وہ بولا تو اس کی آواز میں پہلا ایسا جوش نہیں تھا۔ "بنگال بھی تو بہت بڑا ہے' تُو آخر اسے کہاں کہاں تلاش کرتی پھرے گی' مجھ سے

سودا کر لے فائدے میں رہے گی۔"

"کیا سودا کرنا چاہتا ہے تُو؟" میری آواز میں تلخی گھل گئی۔

"اپنی زندگی کا سودا۔" اس نے متوقع رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا وہ یقیناً سمجھ چکا تھا کہ اس کی کوئی پُراسرار شیطانی قوت اب کام نہیں آ سکتی۔

چندر موہن کی بات سن کر میں طنزیہ انداز میں ہنسی پھر بولی۔ "اپنی موت سے پہلے تجھ جیسا ہر بزدل ایسی ہی باتیں کرتا ہے' تجھے ژیان کا پتا بھی بتانا پڑے گا اور مرنا بھی پڑے گا۔"

میرے علم میں تھا کہ پولیس والے جب کسی پر ٹارچر کرتے ہیں اور وقت کم ہوتا ہے مجرم یا ملزم کی زبان کھلوانا ہوتی ہے تو اسے "فٹ بال" بنا لیتے ہیں' جرائم پیشہ لوگ بھی تشدد کے لئے یہی حربہ آزماتے ہیں' سو میں نے نضار کو اپنی بات سمجھائی۔ چندر موہن بھی میری بات سن رہا تھا وہ دونوں ہاتھ اٹھا کے گڑگڑایا۔ "نہیں نہیں بھگوان کے لئے ایسا نہ کرو۔"

"کمینے' بھگوان سے تیرا کیا رشتہ جو اس کی دہائی دے رہا ہے۔ تُو تو مجسم شیطان ہے۔" میں نے کہا پھر نضار کو اشارہ کیا۔ "گھسیٹ لے اسے نیچے۔"

نضار نے دیر نہیں کی اس کے دونوں پیروں پر گھٹنوں کے قریب پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے جھک کر پہلے وہ پٹیاں پھاڑ دیں۔ زخم کھل گئے اس دوران وہ خوفزدہ ہو کر چیختا رہا لیکن میں اس پر کیسے رحم کرتی' معلوم نہیں وہ کتنے بے گناہ انسانوں کا قاتل تھا' اس نے نہ جانے کتنے گھر اجاڑے تھے' کتنی زندگیاں برباد کی تھیں' کتنی دوشیزاؤں کو بے آبرو کیا تھا۔ وہ ہرگز رحم کے قابل نہیں تھا اس کی ٹانگ کے ایک زخم پر پہلی ٹھوکر میری ہی پڑی۔

میں نے اور نضار نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی پُراسرار قوت کے بغیر میں اپنے ایک دشمن سے انتقام لے رہی تھی۔ جگہ جگہ سے اس کے جسم کی کھال پھٹ گئی۔ زخموں سے خون بہنے لگا اس کا پھولا ہوا چہرہ کچھ اور پھول گیا۔ اب تک اس کے سر پر ٹھوکر مارنے سے ہم نے دانستہ گریز کیا تھا کہ کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے البتہ اس کی موٹی اور بڑی چوٹی کے بال پکڑ کر میں نے پوری قوت سے کھینچے۔

پہلے تو اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے تھے جیسے اذیت برداشت کرنا چاہتا ہو یا زبان نہ کھولنے کا ارادہ ہو پھر پٹتے پٹتے وہ چیخنے لگا۔ مجھے اس وقت تک اندازہ نہیں تھا کہ اس چیخ پکار کا کیا ردعمل ہو گا ذرا دیر بعد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ دانستہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔

مجھے خبر نہیں تھی کہ اس کمرے میں کوئی خفیہ دروازہ بھی ہو گا۔ جس دروازے سے ہم کمرے میں داخل ہوئے تھے نضار نے اندر سے بند کر دیا تھا خفیہ دروازے کا علم اس وقت ہوا جب آٹھ دس وحشی سادھو اپنے ہاتھوں میں لوہے کے لمبے لمبے ترشول (تین پھلوں والے نیزے کے مانند) اور بھاری تلواریں بلند کئے دائیں جانب سے اچانک نمودار ہوئے۔ ان کی طرف نضار کی پشت تھی میرا رخ اسی طرف تھا میں نے چیخ کر نضار کو ان کی جانب متوجہ کیا نضار تیزی سے ان کی سمت پلٹا ایک سادھو نضار سے زیادہ دور نہیں تھا' سادھو نے نضار کی پشت پر ترشول اتارنے کے لئے اسے سیدھا کر لیا تھا۔ وہ سادھو یقیناً چندر موہن کے محافظ رہے ہوں

گے۔

نضار نے سادھو کے حملے سے بچنے کے لئے تھوڑا سا ہٹ کر جھکائی دی اس کے ساتھ ہی جھپٹ کر ترشول چھین لیا۔

"کاٹ دوان دونوں کو۔" چندر موہن نے چیخ کر اپنے چیلوں کو حکم دیا۔

میں بھی اسی اثنا میں ایک سادھو کے ہاتھ سے تلوار چھین لینے میں کامیاب ہو چکی تھی پھر یکے بعد دیگرے چیخیں بلند ہوتی رہیں۔ سادھوؤں کی تعداد کم ہوتی گئی کسی کے سینے میں ترشول اترا' کسی کی گردن کٹ کے الگ جا پڑی اور کوئی اپنے جسم کے کسی حصے سے محروم ہو گیا۔

چندر موہن کا کمرہ میدان کارزار بن گیا۔ ہر طرف خون تھا اور لاشیں۔ جب آخری سادھو بھی اپنے پیٹ سے ابلتے ہوئے خون پر دونوں ہاتھ رکھے اوندھا گر پڑا تو میں نے چندر موہن کی گردن پر تلوار کی نوک رکھ دی۔ اس کی آنکھوں میں موت کے سائے ناچنے لگے۔

"جواب دے کہ ژیان کہاں ہے؟" میں نے تلوار کی نوک کا دباؤ ڈالا۔

"ڈھا.......... ڈھاکہ.......... وہ.........." چندر موہن کا جملہ پورا نہ ہو سکا۔

میں نے تلوار سے اس کی گردن چھید ڈالی پھر اس کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

وہ کمرہ کسی مقتل کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ میں اور نضار اس کمرے سے نکل آئے میرے ہاتھ میں اب تک خون آلود تلوار تھی اور نضار نے بھی ترشول تھام رکھا تھا۔ ہماری دانست میں ابھی خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ ہم بہت احتیاط سے اور چوکنا انداز میں آگے بڑھ رہے تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے اس جگہ ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہ ہو' بعد میں یہی بات درست ثابت ہوئی چندر موہن کی تمام داسیاں اور چیلے فرار ہو گئے تھے شاید انہیں چندر موہن کے انجام کا پتا چل گیا تھا۔

میرے جسم پر ناکافی لباس تھا سو میں نے ایک کمرے میں گھس کر الماری کھول لی وہ کمرہ چندر موہن کی کسی داسی کا تھا میں نے الماری سے ایک ساڑھی نکال کے باندھ لی اور پیروں میں سلیپر ڈال لئے۔ نضار کو بھی ایک دھوتی اور کرتہ مل گیا۔

خجیرہ کی خوشبو نے اس زیر زمین ٹھکانے سے نکلنے میں ہماری رہنمائی کی ہم باہر نکلے ہی تھے کہ زمین پیروں کے نیچے ہلتی محسوس ہوئی۔ میں نضار کا ہاتھ تھام کر بھاگی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ عظیم مہین کی کاہنہ خجیرہ نے ساحر زعیم کے ٹھکانے کی طرح چندر موہن کے اس مضبوط قلعے کو بھی زمین میں دھنسا دیا تھا۔

اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے جب ہم اپنی کوٹھی پہنچے۔ جو کچھ گزرا تھا کسی بھیانک خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

دوسرے روز صبح خلاف توقع ارشاد حسین مجھ سے ملنے آ گیا۔ وہ میک اپ میں تھا اپنے حلیے سے وہ کوئی مذہبی قسم کا ہندو شخص معلوم ہو رہا تھا۔ ارشاد حسین ہی سرفروش تنظیم سے میرے رابطے کا ذریعہ بنا تھا۔

ے میں نے میک اپ کرنا سیکھا تھا۔ کلکتے کے گزشتہ دوران قیام میں اس کا میرا خاصا ساتھ رہا تھا۔

میں نے اس سے نضار کا تعارف کرایا۔ ہم تینوں کوٹھی کی نشست گاہ میں بیٹھے تھے اب سبھی کچھ کھل چکا تھا۔ ارشاد حسین قابل اعتماد تھا یہی سوچ کر میں بولی۔ "میرے متعلق کہ میں کون ہوں اور میرا تعلق کہاں سے ہے یہ تو تمہیں اپنی تنظیم کے ذریعے یقیناً پتا چل ہی گیا ہو گا۔" میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔ "تمہیں تنظیم کی بمبئی شاخ نے اطلاع دی ہو گی کہ میں وہاں سے کلکتے پہنچنے والی ہوں۔" میری نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ آج میں اس سے نسبتاً بے تکلفی کے ساتھ بات کر رہی تھی۔ "آپ" کی جگہ "تم" اس کا اظہار تھا۔

اس نے میرے خیال کی تصدیق کر دی پھر بتانے لگا۔ "جس روز آپ نے کلکتے میں قدم رکھا اسی روز سے ہمارے آدمیوں کی نظر میں تھیں۔ مقصد آپ سمجھ سکتی ہیں معبلہ! پرسوں شام اس سلسلے میں مجھے جو رپورٹ ملی تشویش ناک تھی۔ پُراسرار طور پر آپ کالی گھاٹ سے غائب ہو گئیں اور پھر آپ کا سراغ نہیں ملا۔ آپ کی حفاظت بہرحال ہماری ذمے داری تھی اس لئے تب سے گزشتہ رات تک سارا شہر چھان مارا گیا۔ ہمیں شبہ یہ تھا کہ کہیں انٹیلی جنس والوں یا حکومت کی کسی اور ایجنسی کی تحویل میں نہیں ہیں۔ میری تشویش کا بڑا سبب یہ تھا کہ چند روز پہلے دہلی سے آپ کے سلسلے میں بنگال کے ڈائریکٹر انٹیلی جنس کو سخت احکام موصول ہوئے ہیں۔ ان احکام کے مطابق سابق ڈائریکٹر انٹیلی جنس بنگال ڈیسوزا کو قتل کرنے کے الزام میں آپ کو گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان احکام کے پس پشت ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ رابرٹ ہیم کا ہاتھ تھا۔ یہ احکام نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان کے ہر صوبے کو بھیجے گئے ہیں۔"

"اور تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ خود رابرٹ ہیم آج کل کہاں ہے؟" میں معنی خیز لہجے میں بولی۔

"جنوبی ہند کی ایک ریاست میسور میں بیٹھا ہوا پڑوسی آزاد ریاست کوڈگ کے خلاف چالیں چل رہا ہے۔ اطلاعات کے مطابق آپ بھی تو کوڈگ گئی تھیں وہاں کی جغرافیائی صورت حال کے پیش نظر یہ مشکل ہی معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اپنی سازش میں کامیاب ہو جائیں۔ اس سلسلے میں آپ زیادہ بہتر طور پر کچھ کہہ سکتی ہیں۔"

میں تو مستقبل میں جھانک کر اس بدقسمت ریاست کا عبرت ناک انجام بھی دیکھ چکی تھی سو اپنی حتمی رائے کا اظہار کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ وہاں انگریزوں کو فائٹ دی جا سکتی ہے۔"

"خواہش تو یہ اچھی ہے مگر ہو گا وہی جو میں کہہ چکی ہوں۔" میں نے کہا پھر اب تک کی گفتگو سے میں نے ارشاد حسین کے متعلق جو نتیجہ اخذ کیا تھا اسے زبان پر لے آئی۔

ارشاد حسین نے اعتراف کر لیا کہ وہ تنظیم کی کلکتہ شاخ کا سالار اعلیٰ تھا' ورنہ میرے بارے میں اتنا باخبر نہ ہوتا' نہ تنظیم کے دیگر معاملات سے اسے اتنی آگاہی ہوتی۔

"اس معاملے میں آپ کچھ زیادہ فکرمند معلوم نہیں ہوتیں کہ آپ کی گرفتاری بھی ممکن ہے۔"

"فکرمند اس لئے نہیں ہوں کہ اب مجھے تمہارے ملک میں زیادہ عرصے نہیں رکنا۔"

"میرا ملک؟" وہ چونک اٹھا۔ "آپ نے یہ فیصلہ اچانک کیسے کر لیا؟"

"ہاں تمہارا ملک ارشاد حسین .... اب اسے تمہارا ملک کہنا زیادہ مناسب ہے' کیوں کہ انگریز ایک نہ ایک روز اپنی حدوں میں سمیٹ دیئے جائیں گے اور پھر یہ ملک تمہی لوگوں کا ہو گا۔ تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میرے اجداد کا تعلق بھی اسی ملک سے تھا۔ جنرل بخت خاں میرے جد امجد تھے .... لیکن ا .... اب میں نے وہیں لوٹ آنے کا فیصلہ کیا ہے جہاں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔" میں کسی قدر جذباتی ہو گئی۔

"پھر.......... پھر تو آپ ہمارے ہی قبیلے سے ہیں۔ آپ ہمارے لئے مزید قابل عزت ہو گئی ہیں' کاش آپ ہمارے ساتھ ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لے سکتیں۔"

"میں تمہیں ہندوستان کے مستقبل سے آگاہ کر تو چکی ہوں۔ ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا اور انگریز یہاں سے واپس چلے جائیں گے۔" مجھے نیک روح عظیم مہمین کی سرگوشیاں اس سلسلے میں یا تھیں اور انہی کی روشنی میں یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔" ارشاد حسین پُرجوش آواز میں کہنے لگا۔

"سنو' انگریز حکومت مجھے گرفتار نہیں کرے گی کہ اسے یہی کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر چکی ہوتی' کبھی کبھ آدمی قوت برداشت کھو بیٹھتا ہے اور جھنجلاہٹ میں ایسے احکام دے دیتا ہے۔ جس طرح احکام دیئے جا ہیں' واپس بھی لئے جا سکتے ہیں۔ رابرٹ ہیم کوڈگ میں میری موجودگی کی خبر سے یقیناً جھنجلا گیا ہو گا کہ میں کہیں اس کا کھیل نہ بگاڑ دوں' اب اسے اطلاع مل گئی ہو گی کہ میں کوڈگ سے جا چکی ہوں ایسی صورت میں ا میرے معاملے میں وہی رویہ اور طریقہ کار اپنانے کا حکم دے گا جس پر پہلے عمل کیا جا رہا تھا یعنی میری نقل حرکت پر تو نظر رکھی جائے مگر براہ راست مجھے نہ چھیڑا جائے۔" میں نے تازہ تر صورت حال کے پیش نظ وضاحت کی۔

"اس کی وجہ آج تک سمجھ میں نہیں آ سکی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ ایک ریاست کی سربراہ ہیں لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے' آپ انگریزوں کے خلاف ہیں پھر انہیں کیا بات آپ کے خلاف قدم اٹھانے سے روک دی ہے؟"

"تمہیں اس کی وجہ سن کر حیرت ہو گی لیکن حقیقت ناقابل یقین ہونے کے باوجود وہی ہے جو میں تمہیں بتانے والی ہوں۔" میں نے طویل سانس لیا اور پھر ارشاد حسین کو حقائق سے آگاہ کر دیا۔ اس نے میری پوری بات بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنی اس عرصے میں نصار خاموش ہی رہا۔

"ہر چند کہ میں ایسی باتوں پر کم ہی یقین کرتا ہوں جو عقل کی کسوٹی پہ پوری نہ اتریں لیکن آپ کے ساتھ بذات خود مجھے عجیب تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ آپ سے اس کا اظہار بھی کیا تھا شاید آپ کو یاد ہو' یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ مجھے اپنے ساتھ ریس کورس لے گئی تھیں۔ یاد آیا آپ کو؟"

"ہاں یہ بھی یاد ہے کہ میں نے تمہارے خیال کی تردید کر دی تھی' دراصل کچھ باتوں کا وقت سے پہلے ظاہر ہو جانا اچھا نہیں ہوتا۔"

"ازل سے خیر و شر کا تصادم جاری ہے اور اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ پُراسرار علوم کے باب میں بھ

شاید ایسا ہی ہے۔ شیطانی اور رحمانی دونوں قوتیں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی ہیں بحیثیت مسلمان مجھے اس پر یقین تو ہے مگر اس کا کوئی عملی تجربہ نہیں ہوا۔ آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے جو باتیں بتائیں یقیناً انہیں ناقابل یقین کہا جا سکتا ہے مگر میں ذاتی طور پر انہیں قابل یقین سمجھتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور حیرت ہے کہ اعلیٰ تر انگریز حکام بڑے مہاراج چندر موہن کے جال میں پھنس گئے' شیطانی قوتوں کا مالک یہ عیار ہندو آئندہ بھی آپ کے لئے مسئلہ بن سکتا ہے۔" ارشاد حسین نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے ایک ایسے خدشے کا اظہار کیا جس کا سدباب ہو چکا تھا۔

"وہ اب مسئلہ بننے کے لئے اس دنیا میں نہیں رہا۔" میں نے بتایا۔ "بلا سبب تو میں کالی گھاٹ نہیں گئی تھی۔"

اس پر ارشاد حسین نے اظہار مسرت کیا۔

"اب تو صرف ایک ہی مسئلہ باقی رہ گیا ہے جس کی خاطر میں پہاڑوں سے اتر کر یہاں آئی تھی۔" پھر میں نے ژیان کا ذکر کیا۔

ارشاد حسین کو بھی اپنی تنظیم کے ذریعے ژیان کے متعلق تفصیلات کا علم ہو چکا تھا' وہ کہنے لگا۔ "آپ کہیں تو ژیان کا سراغ لگایا جائے تنظیم کی تمام شاخوں.........."

"نہیں چندر موہن اپنی موت سے پہلے بتا چکا تھا کہ ژیان کہاں ہے .... مجھے یہاں سے ڈھاکہ جانا پڑے گا اور جتنی جلدی چلی جاؤں' بہتر ہے۔ اسے اب میں کہیں اور فرار ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتی' ممکن ہے کہ میں آج ہی ڈھاکہ کے لئے روانہ ہو جاؤں۔"

"اگر آپ چاہیں تو ڈھاکہ میں آپ کے قیام کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔" ارشاد حسین نے پیشکش کی۔

ڈھاکہ جہاں کی ململ مشہور تھی' میرے لئے قطعی اجنبی شہر تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے نصار کی طرف دیکھا میں اس سلسلے میں نصار سے مشورہ چاہتی تھی۔

اس نے ارشاد حسین کی پیشکش قبول کر لینے کے حق میں مشورہ دیا۔

"داری' ڈھاکہ کی قدیم آبادیوں میں سے ایک ہے۔ نواب پور روڈ سے متصل ہے یہ علاقہ۔" ارشاد حسین بتانے لگا۔ "اسے تلاش کرنے میں آپ کو زیادہ دقت نہیں ہو گی۔ ڈھاکہ میں نواب پور روڈ خاصی مشہور ہے۔" پھر یوں لگا جیسے وہ کچھ سوچنے لگا ہو کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "اس کی ایک صورت اور بھی ہے آپ تلاش سے بچ جائیں گی۔ ڈھاکہ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر آپ کسی بھی ہاتھ رکشا والے سے شاہ باغ ہوٹل کا نام لیں گی تو وہاں پہنچا دے گا۔ یہ چار منزلہ اچھا ہوٹل ہے ہمارے آدمی اسی ہوٹل میں آپ سے رابطہ قائم کر لیں گے پھر جس علاقے میں آپ چاہیں گی قیام کا بندوبست کر دیا جائے گا۔"

"تم کچھ خیال نہ کرنا ارشاد! میں دراصل بوجوہ تنظیم کے ارکان سے دور رہنا چاہتی ہوں' سمجھے؟" میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا یہی میں نے بمبئی میں بھی کیا تھا۔ "تنظیم کے کسی ٹھکانے پر نہیں رہوں گی اس طرح میں کہیں بھی نقل و حرکت کرنے میں زیادہ آزاد ہوں۔"

"مجھے اس کا احساس ہے' میرا مقصد محض یہ تھا کہ ایک تو نئے شہر میں آپ کو اجنبیت محسوس نہ ہو'

دوم آپ کو تحفظ بھی حاصل رہے' سوم یہ کہ انگریزوں کے پالتو کتے اگر آپ کے پیچھے لگنے کی کوشش کریں انہیں ردکا جاسکے۔" ارشاد حسین نرمی سے بولا۔ "آپ مناسب سمجھیں تو اسی ہوٹل میں رہیں یا جیسا کہ عرض کرچکا ہوں کسی بھی علاقے میں آپ کے قیام کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

ارشاد حسین نے معقول بات کی تھی۔ اس خطرے کو یکسر نظرانداز کرنا بہتر نہ ہوتا کہ حکومت کارندے ہمارے راستے کی دیوار بن سکتے ہیں۔ ژیان میرا دشمن بہرحال انگریز حکومت کا مہمان تھا۔ میں ارشاد حسین کی بات مان لی اور بولی۔ "موجودہ حالات میں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وقتی طور پر ہم شاہ ہوٹل ہی میں قیام کریں۔ اگر ایسی کوئی صورت حال پیدا ہوگئی کہ ڈھاکہ میں زیادہ عرصے رکنا پڑا تو پھر د جائے گا۔"

"ہوٹل میں آپ دونوں کیا نام لکھوائیں گے صرف یہ بتادیں تاکہ ہمارے آدمی ضرورت پڑنے پر آ سے رابطہ قائم کرسکیں یا کسی ممکنہ خطرے کی خبر قبل از وقت دے سکیں۔"

ذرا دیر سوچ کر میں نے جواب دیا۔ "مکیش کمار اور مسز مکیش کے نام سے ہم کمرہ بک کرائیں گے مسلمان خواتین عموماً پردہ کرتی ہیں اس لئے شک وشبے سے بچنے کی خاطر یہی مناسب ہے۔ مسز مکیش کا نام کر کماری بہتر ہے۔"

"میں آج ہی ڈھاکہ شاخ کے سربراہ کو وہاں آپ کی آمد سے مطلع کردوں گا۔" ارشاد حسین بولا پھ پوچھنے لگا۔ "آپ کی واپسی تو یہیں ہوگی نا؟"

"فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتی' کیا خبر کہ حالات نیا رخ اختیار کرلیں۔"

"تو یہ ملاقات گویا آخری بھی ہوسکتی ہے؟" ارشاد حسین کے لہجے میں اداسی کا عنصر شامل ہوگیا۔

"ہاں' مجھے اب اس شہر میں کوئی کام نہیں۔" میں نے اس سے حقیقت چھپائی نہیں۔

"پھر تو میں آج آپ سے ملنے نہ آتا تو زندگی بھر افسوس رہتا۔"

چند لمحے کو نشست گاہ میں بوجھل سا سکوت طاری ہوگیا اسی عرصے میں مجھے ایک اور خیال آگیا میں۔ ارشاد حسین کو مخاطب کیا۔ "تمہیں یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے تمہاری تنظیم کو بطور نذرانہ ایک رقم دینا چاہا تھی مگر حالات نے کچھ اور ہی صورت اختیار کرلی۔ بوجوہ میں اپنے اس نیک ارادے پر عمل نہیں کرسکی۔"

"لیکن اس وقت آپ کو یہ بات کیوں یاد آگئی؟" اس نے حیران ہوکر پوچھا۔

"بات یہ ہے ارشاد کہ آج یا زیادہ سے زیادہ کل تک میں ڈھاکہ چلی جاؤں گی ٹھیک ہے نا' پھر میرا یہاں واپسی بھی ضروری نہیں رہے گی اگر ایسا ہوا بھی' مجھے یہاں آنا بھی پڑا تو عارضی طور پر کئی ٹھکانے ہیں جہاں میں رہ سکتی ہوں۔ چاندنی کے علاقے میں راجا استاد کا گھر ہے' ٹالی گنج میں شنکر دادا کا اڈا ہے اور پھر مٹیا برج میں تم ہو' ایسی صورت میں اس کوٹھی کی اب مجھے کوئی ضرورت نہیں تم چاہو تو اپنی تنظیم کے لئے اسے استعمال کرو نہیں تو فروخت کرکے رقم تنظیم کے مالی شعبے میں دے دو۔ میں قانونی طور پر یہ کوٹھی مع فرنیچر تمہارے نام کردینا چاہتی ہوں باقی معاملات تم نمٹاتے رہنا۔"

پھر میرے اصرار پر ارشاد حسین کو یہ بات ماننا ہی پڑی۔ کوٹھی کی ڈپلیکیٹ چابیاں اسی وقت میں نے

ارشاد حسین کے حوالے کردیں۔ سرفروش تنظیم نے میرے ساتھ اب تک جو تعاون کیا تھا' مجھے جو عزت دی تھی' یہ اس کا بدل تو نہیں اعتراف ضرور تھا۔ ارشاد حسین کے ساتھ اس غرض سے مجھے کچہری جانا پڑا دوپہر تک یہ معاملہ نمٹ گیا۔ اسی روز ٹالی گنج جاکر میں شنکر دادا سے بھی مل لی اور واپسی میں رات کا کھانا راجہ استاد کے گھر کھایا میں نے اگلے روز ڈھاکہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

میرا یہ قیاس درست ہی ثابت ہوا تھا کہ مجھے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ کلکتے سے ڈھاکہ روانگی میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

☆======☆======☆

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور پھر ایک کاغذ نیچے سے اندر آگیا۔ میں نے لپک کر وہ کاغذ اٹھالیا۔ بنگلہ زبان میں کاغذ پر یہ الفاظ لکھے تھے۔ "اسی فلور کے کمرہ نمبر تین سو دس میں جو شخص امین الحق کے نام سے ٹھہرا ہوا ہے' حکومت کا پالتو کتا ہے اس کی طرف سے چوکنا رہیں۔"

"کیا ہے یہ؟" نضار بھی میرے قریب آگیا۔

"شاید کوئی کھیل شروع ہوچکا ہے۔" میں نے اسے موصول ہونے والے پیغام سے آگاہ کیا۔ یہ پیغام سرفروش تنظیم کے کسی رکن ہی کی طرف سے متوقع تھا۔ ان لوگوں نے پہلی بار ہم سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ڈھاکہ آئے ہمیں یہ دوسرا ہی دن تھا۔ گزشتہ دن ہم نے آرام کرکے گزارا تھا۔ کلکتے سے ڈھاکہ تک کا سفر خاصا طویل اور تھکا دینے والا تھا۔

"مگر ابھی تو ہم اس ہوٹل میں ٹھہرنے کے بعد باہر بھی نہیں نکلے' پھر کس طرح کوئی کھیل شروع ہوسکتا ہے؟" نضار بولا۔

"کھیل شروع ہونے کے لئے ہوٹل سے ہمارا باہر نکلنا تو ضروری نہیں۔"

"ایک بات اور بھی تو ممکن ہے' یہ تو طے ہے کہ تنظیم کے لوگ اس مشتبہ شخص کو حکومت کے پالتو کتے کی حیثیت سے جانتے ہیں' کیا معلوم وہ کسی اور چکر میں یہاں ٹھہرا ہو اور ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔" نضار نے ایک اور ممکنہ صورت کی طرف توجہ دلائی۔

"ہوسکتا ہے کہ تیرا خیال درست ہو۔" میں نے اتفاق کیا۔ "پھر بھی ہمیں محتاط تو رہنا ہی چاہئے۔"

ابھی صبح کے نو ہی بجے تھے۔ ناشتہ کمرے میں بھی منگوایا جاسکتا تھا مگر میں نے نیچے ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرنے کے لئے نضار سے کہا۔ گزشتہ روز سے ہم کمرے ہی میں تھے کھانا وغیرہ کمرے ہی میں منگواتے رہے تھے۔ ارشاد حسین نے جس ہوٹل کا نام لیا تھا اسی کی تیسری منزل پر ہمیں ایک ڈبل روم مل گیا تھا۔

جب میں نضار کے ساتھ نیچے جانے کے لئے زینے کی طرف بڑھ رہی تھی تو غیرارادی طور پر کمروں کے نمبروں پر نگاہ ڈالتی جارہی تھی۔

دائیں جانب کمرہ نمبر تین سو دس کے دروازے پر مجھے ایک نوجوان لڑکی نظر آئی' وہ غالباً پہلے ہی دروازے پر دستک دے چکی تھی۔ راہداری میں آگے بڑھتے بڑھتے میں دانستہ رکی اور نضار کو مخاطب کیا۔ "مکیش میرا ہار وہیں سنگھار میز پر رہ گیا ہے لے آؤں یا......." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا میرا مقصد تو وہاں

رکنا تھا۔

"چھوڑو بھی وہاں سے کون لے جائے گا۔" نضار نے کہا۔

اسی وقت کمرہ نمبر تین سو دس کا دروازہ کھلا اور میں تقریباً اچھل پڑی' دروازہ کھولنے والے شخص کا چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ وہی تھا کلکتے میں جس کی جیب سے میں نے انٹیلی جنس کے محکمے کا کارڈ نکالا تھا۔ چند لمحوں کو اس کا چہرہ دروازے میں نظر آیا اور پھر غائب ہو گیا۔ نوجوان لڑکی کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

معلوم نہیں اس نے مجھے اور نضار کو دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ میں اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی پھر نضار نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ یقیناً نضار بھی اس شخص کو پہچان گیا تھا' کلکتے میں جب اس سے ہمارا ٹکراؤ ہوا تھا تو ہمارے چہرے میک اپ کے پیچھے چھپے ہوئے تھے مگر اب ایسا نہیں تھا۔ ہمارے چہروں پر میک اپ نہیں تھا۔

ناشتہ کر کے جب ہم واپس اپنے کمرے میں آئے تو میں نے نضار سے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پالتو کتا کلکتے ہی سے ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے۔"

"مگر راستے میں تو یہ ہمیں کہیں نظر نہیں آیا اگر دکھائی دیا ہوتا تو ہم اسے پہچان لیتے۔"

"ہاں یہ بات ذرا الجھا دینے والی ہے۔" میں سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ "کیا پتا راستے میں اس کے چہرے پر میک اپ ہو کہ ہم اسے نہ پہچان سکیں۔"

دیر تک ہم اسی شخص کے بارے میں بات کرتے رہے۔ وہ امین الحق کے نام سے ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ تنظیم کے ارکان نے اس کے بارے میں بالکل درست رپورٹ دی تھی۔

ہم ژیان کی تلاش میں ڈھاکہ آئے تھے۔ ہمارے نزدیک انٹیلی جنس کے اس آدمی کا معاملہ ضمنی تھا۔ کسی بھی وقت اس سے نمٹا جا سکتا تھا۔ مجھے توقع یہ تھی کہ ڈھاکہ پہنچنے کے بعد عظیم مہین کی طرف سے دشمن کی تلاش میں میری رہنمائی کی جائے گی لیکن ایسا اب تک نہیں ہوا تھا۔ میں نے چندر موہن کو قتل کرنے میں جلدی کی تھی وہ شاید ڈھاکہ میں اس جگہ کی بھی نشاندہی کر سکتا تھا جہاں میرا دشمن قیام پذیر تھا۔ اس ضمن میں صرف شہر کا نام جان لینا کافی نہیں تھا اس بات کا احساس مجھے ڈھاکہ آنے کے بعد ہوا وہ بھی اس وقت جب مہین کی طرف سے رہنمائی نہیں ہوئی۔

میرے اندازے کے مطابق ژیان دونوں میں سے کسی ایک جگہ ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا اگر وہ ڈھاکہ میں بھی سرکاری مہمان بنا ہوا ہے تو اسے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ہونا چاہئے اگر ایسا نہیں تو پھر وہ کسی قدیم مندر کی حدود میں ہو گا۔

ارشاد حسین نے ایسی صورت بھی بتا دی تھی کہ ضرورت پڑے تو ہم خود بھی تنظیم کے ارکان سے رابطہ قائم کر سکیں۔ میرے ذہن میں تنظیم کے ایک ٹھکانے کا پتا محفوظ تھا۔ ژیان کی تلاش کے سلسلے میں تنظیم کے ارکان سے بھی کام لیا جا سکتا تھا۔ اگر ژیان سرکاری مہمان ہی تھا تو تنظیم با آسانی اپنے ذرائع سے یہ بات معلوم کر لیتی۔ میں نے اپنے خیال کا اظہار نضار سے بھی کیا۔

"ہاں تو ٹھیک کہہ رہی ہے اس طرح وہ جلدی مل جائے گا۔ ہمیں تو ابھی اس شہر کے راستے بھی نہیں معلوم۔" نضار نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔

پھر اسی شام میں اور نضار شاہ باغ ہوٹل سے نکلے تو پوری طرح چوکنا تھے۔ میں اپنے گرد و پیش سے پوری طرح آگاہ تھی۔ ہوٹل میں ایک انٹیلی جنس والے کی موجودگی نے ہمیں خاصی حد تک محتاط رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہم نواب پور روڈ پہنچے اور پھر اس سے متصل آبادی (داری) میں داخل ہو گئے۔ وہ متوسط طبقے کے لوگوں کا علاقہ معلوم ہوتا تھا۔ مطلوبہ مکان تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ کہ ہمیں جس شخص کے یہاں پہنچنا تھا اسے سبھی جانتے تھے۔ کسی شریف آدمی کو کوئی جانے نہ جانے' علاقے کے غنڈے بدمعاشوں کو سب پہچانتے ہیں۔ وہ ساول کے نام سے مشہور تھا۔ ارشاد حسین پہلے ہی کلکتے میں ہمیں اس کے متعلق بتا چکا تھا ورنہ پتا اور نام پوچھنے پر لوگوں کے منہ بنانے سے حیرت ہوتی۔ میں ساڑھی باندھے ہوئے تھی اور ماتھے پر بندیا تھی' نضار کرتہ اور پاجامہ زیب تن کئے ہوئے تھا۔ ہم دونوں کا حلیہ صاحب حیثیت لوگوں کا سا تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی علاقے والے حیران ہوں گے کہ ہم ایک چھٹے ہوئے بدمعاش سے کیوں ملنے آئے ہیں۔

میرے اشارے پر نضار نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی' گنجے سر والا ایک شخص دروازے پر نظر آیا۔ اس کے چہرے پر چھدری سی داڑھی تھی اس نے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر بنگلہ زبان میں سوال کیا کہ کس سے ملنا ہے؟

"ساول ہے اندر؟" میں آگے بڑھ کر بولی۔

"کیا کام ہے اس سے؟" سوال کے جواب میں اس نے سوال ہی کیا' اس کی گردن تنی ہوئی تھی اور وہ ہمیں ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے ابھی جھگڑا شروع کر دے گا۔

"کہنا کہ ہم کلکتے سے آئے ہیں اور ہمیں شاہ جی نے بھیجا ہے۔" میں نے نرم اور دھیمی آواز میں بتایا۔

گنجے کی تنی ہوئی گردن ایک دم ڈھیلی پڑ گئی کہنے لگا۔ "آپ لوگ اندر آ جائیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہمیں اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔ میں بلا جھجک اندر داخل ہو گئی' نضار نے بھی میرا ساتھ دیا گنجا بولا۔ "ساول تو اس وقت گیا ہوا ہے مگر آپ بیٹھیں میں اسے بلا کر لاتا ہوں۔ صدر گھاٹ تک گیا ہے۔"

"کتنی دیر میں اسے بلا لاؤ گے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بس پندرہ بیس منٹ لگیں گے' اس عرصے میں آپ چائے پئیں۔" گنجے نے جواب دیا اس کے جسم پر صرف ایک کچھا تھا۔ بنگال میں غربت کے سبب لوگ گھروں میں عموماً باریک مخصوص کپڑے کا کچھا ہی باندھتے ہیں۔ میری مراد مردوں سے ہے۔ یہ کپڑا ناف سے گھٹنوں تک ہی ان کے جسم کو ڈھک پاتا ہے یوں بھی گرمی زیادہ پڑتی ہے اس لئے کچھا ان کی معاشرت کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے بھی گھر سے باہر لنگی (تہبند) باندھتے ہیں اور قمیض یا کرتہ پہن لیتے ہیں۔ مجھے اسی لئے باریش گنجے کے جسم پر صرف کچھا دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس عرصے میں گنجے نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا تھا جہاں

مونڈھے پڑے تھے۔ یہ گویا نشست گاہ تھی۔

گنجا ہمیں اس جگہ بٹھا کر چلا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد ایک سانولی سی لڑکی میلی ساڑھی باندھے کمرے میں اور ہمیں چائے کے کپ تھما کر چلی گئی۔ خلاف توقع چائے بہت اچھی تھی۔ ہم چائے کے آخری گھونٹ رہے تھے کہ ایک دراز قد شخص نے کمرے میں قدم رکھا' اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور چہرے کے نقوش بھدے تھے۔ اس نے ایک مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ "میرا نام ساول ہے آپ لوگوں کو شا نے بھیجا ہے مجھے معلوم ہو چکا ہے' حکم کریں۔"

"ہمیں بوڑھی گنگا کے بیٹوں سے ملنا ہے۔" میں نے عرض مدعا میں دیر نہیں لگائی۔

"کب؟" اس نے معلوم کیا۔

"آج اور ابھی' اس لئے کہ ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ جیسے کچھ سوچنے لگا پھر سر ہلا کر بولا۔ "ٹھیک ہے لیکن ان سے معلوم کرنا پڑے گا پہلے۔"

"تو کر لو معلوم۔" میں اس سے بنگلہ ہی میں بات کر رہی تھی۔

"اس میں گھنٹہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔"

"ہم انتظار کر لیں گے۔"

"یہاں بیٹھے بیٹھے آپ لوگ تنگ آ جائیں گے' اس کی ایک اور ترکیب ہے۔" پھر وہ اٹھ کھڑا "میں ابھی آتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر میں وہ اپنے ایک اور آدمی کو ساتھ لئے کمرے میں آیا اور ہمیں اس کے ہمراہ جانے کو کہ "اگر بوڑھی گنگا کے بیٹے آپ سے اسی وقت ملنے پر آمادہ ہو گئے تو وہیں دریا میں کشتی پر ملاقات جائے گی۔" ساول نے بتایا۔ "دوسری صورت میں اگر میرے آدمیوں کا ان سے رابطہ نہ ہو سکا تو پھر کل آپ لوگ یہاں آ جائیں میرا آدمی آپ کو جہاں کہیں گی چھوڑ دے گا۔"

میرے لئے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ حکومت وقت کے خلاف کام کرنے والی زیر زمین تنظیمیں ایسے ہی طریق کار وضع کرتی ہیں کہ کوئی باآسانی ان تک نہ پہنچ سکے۔ ہاں نضار اس پر کچھ حیران سا تھا۔ خانے کا سرخ و سبز تہبند باندھے ہوئے اور لمبا کھدر کا کرتہ پہنے ساول کا آدمی ہمیں اپنے ساتھ لئے گھر ہمیں اس کا گویا تعاقب کرنا تھا۔

سڑک پر پہنچ کر اس نے ایک ہاتھ رکشا روکا اور اس میں بیٹھ گیا' ہم دوسرے رکشے میں اس کے چلنے لگے۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس شخص نے بتا دیا تھا کہ ہمیں بادام تلی گھاٹ کے لئے رکشا کرنا ہے۔ آگے پیچھے چلتے رہے اور پھر ہم ایک ایسے بازار سے گزرے جہاں گھنگروؤں کی چھنک اور طبلوں کی تھاپ دی۔ وہ ڈھاکہ شہر کا بازار حسن تھا بعد میں مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ وہ "بابو بازار" کہلاتا تھا بازار کے عقب میں بوڑھی گنگا کے کنارے اقامتی علاقہ بادام تلی گھاٹ کے نام سے منسوب تھا۔

ہمارے راہبر نے گھاٹ کے کنارے رکشا رکوایا اور کرایہ دے کر اتر گیا۔ ہم نے بھی اس کی تقلید یہی کیا۔ بوڑھی گنگا کے گھاٹ پر کشتیاں موجود تھیں ساول کے بھیجے ہوئے آدمی نے ایک کشتی والے

بات کی اور ہم دور کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔

معاً اس شخص نے ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا اور زور سے بولا۔ "آشن دادو۔"

اس کے کہنے پر ہم کشتی میں بیٹھ گئے اور وہ گھاٹ پر کھڑا رہا۔ مانجھی نے کشتی کھینا شروع کی گھاٹ پر کھڑے شخص نے رخصتی کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور پلٹ کر واپس چل دیا گویا اس کا کام ختم ہو چکا تھا۔ کشتی دریا کے پانی پر ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کشتی کا درمیانی حصہ مسافروں کے بیٹھنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ نیم دائرے کی شکل میں بانسوں سے بنی ہوئی چھت بھی تھی۔ چھت کے ساتھ ایک ہک سے لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔ رات ہو چکی تھی اس لئے لالٹین جلا دی گئی تھی۔ میں اور نضار ہم دونوں ہی اونچے پہاڑوں کے باسی تھے۔ مجھے وہ منظر بہت بھلا لگ رہا تھا پہاڑوں پر پانی اور ایسی ہریالی کا تصور بھی محال تھا جو دریا کی دونوں جانب نظر آ رہی تھی۔ دریا میں اور کشتیاں بھی محو سفر تھیں۔ دور سے ان کے اندر جلتی ہوئی لالٹینیں متحرک ستاروں کی مانند معلوم ہو رہی تھیں۔ ہم دونوں ہی اس حسین منظر میں کھو سے گئے۔ نضار میرے سامنے پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔

کشتی دریا میں چلتی رہی اور میں اس منظر کو اپنے اندر اتارتی رہی۔

پھر جانے کب ایک اور کشتی ہماری کشتی کے قریب آ گئی۔ دوسری کشتی کے ملاح نے ہماری کشتی والے سے کچھ کہا۔ دونوں کشتیاں پانی میں رک گئیں ہماری کشتی والے نے مڑ کر ہم سے کہا۔ "اگر آپ لوگوں کو بوڑھی گنگا کے بیٹے سے ملنا ہے تو دوسری کشتی میں چلے جائیں۔"

ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر دوسری کشتی میں پہنچ گئے۔ دوسری کشتی میں ہمارا استقبال کرنے والا عجیب سے حلئے کا ایک شخص تھا۔ وہ پتلا دبلا پستہ قد شخص ہرے رنگ کا تہبند باندھے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر چشمہ تھا جس کی ایک کمانی ٹوٹی ہوئی تھی اور کمانی کی جگہ میلا موٹا دھاگہ فریم اور کان سے لپٹا ہوا تھا۔ چہرے پر ہلکی مونچھیں تھیں اور سر پر قدیم وضع کی جالی دار ٹوپی لگی تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ "اے کھن!" اس نے کشتی کے درمیانی حصے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

کشتی کے مانجھی اور اس عجیب ہیئت شخص کے سوا کشتی میں کوئی اور نہیں تھا۔

ہم کشتی کے اندر جا کر بیٹھ گئے کشتی چل پڑی تو اس شخص نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ تنظیم کی ڈھاکہ شاخ کا سربراہ رحمان تھا۔ اس نے دانستہ اپنی ایسی ہیئت بنا رکھی تھی کہ قطعی غیر اہم نظر آئے وہ ہمیشہ اس حلئے میں نہیں رہتا تھا۔ یہ اسی نے بتایا کہ اپنا حلیہ بدلتے رہنا اس کی ضرورت تھی۔ انگریز حکومت نے اس کے سر کی قیمت دس ہزار روپے مقرر کی تھی۔ اس زمانے میں دس ہزار روپے بڑی رقم شمار ہوتی تھی۔ میرا قیام جب دہلی میں تھا تو اسی وقت حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کیا جا چکا تھا خطہ بنگال کے اس حصے میں حکومت کو خاصا جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ ویسے تو پورے ہی بنگال میں سرفروش تنظیم نے اپنی دھاک بٹھا دی تھی لیکن ڈھاکہ اور چاٹگام کو اس سلسلے میں خاصی اہمیت حاصل تھی۔ ان میں سے کچھ باتوں کا علم مجھ پہلے سے تھا' کچھ ارشاد حسین سے معلوم ہوئیں اور اب کچھ کا پتا رحمان سے چلا۔

دبلا پتلا نظر آنے والا غیر اہم سادہ شخص غیر ملکی انگریز حکومت کے لئے مجسم دہشت ہو گا' اسے دیکھ کر قطعی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ بنگلہ زبان کے علاوہ وہ بڑی رواں انگریزی بولتا تھا۔ عمر زیادہ تھی مگر ظاہر نہیں

ہوتی تھی۔ رحمان کی غیر اہم شخصیت نے بہرحال مجھے متاثر کیا خصوصاً اس کی نرم گفتاری اور مہذب ا نے۔

غائبانہ طور پر وہ مجھ سے واقف تھا' ملاقات پہلی مرتبہ ہو رہی تھی۔

"آپ کو ہم سے ملنے کے لئے خود آنے کی کیا ضرورت تھی اپنے کسی نائب یا ماتحت کو بھیج دیا ہوتا" میں نے تفصیلی تعارف کے بعد گفتگو شروع کی۔

"اوّل تو یہ کہ آپ کی حیثیت اور مرتبے کے پیش نظر خود مجھی کو ملنے آنا چاہئے تھا' دوم میری بھی آرزو تھی کہ شرف ملاقات حاصل کر سکوں۔"

"محبت اور عزت افزائی ہے آپ کی۔" میں بولی اور پھر اصل موضوع گفتگو پر آ گئی۔ "مجھے اپنے ا دشمن کی تلاش ہے جس کے متعلق تصدیق ہو چکی ہے کہ وہ اسی شہر میں ہے۔ میں اس کی تلاش کے سلسلے آپ سے تعاون چاہتی ہوں وجہ یہ ہے کہ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔"

'تعاون کیا' آپ کا کہنا تو ہمارے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔" رحمان کے لہجے سے خلوص کا اظہار ہ تھا۔ "آپ کا دشمن اگر اس شہر میں ہے تو ہم اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ کر نکال لائیں گے۔"

میں نے مختصراً اسے ژیان کے متعلق بتا دیا۔ پھر ژیان کے مخصوص حلیے سے بھی آگاہ کر دیا میں نے میں کہا۔ "مجھے صرف یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے تو پھر میں اس سے نمٹ لوں گی۔"

اس کے بعد رحمان سے گفتگو ہونے لگی کہ ژیان کہاں کہاں ہو سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے' اگر وہ سرکاری مہمان ہے تو جلد اس کا سراغ مل جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر وہ اس شہ کسی مندر میں چھپا ہوا ہے تو بھی اسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں مندروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے کیو ہندوؤں کی آبادی کم ہے۔" رحمان پُراعتماد آواز میں بولا۔

"اس کا صرف سراغ لگانا ہے چھیڑنا نہیں ہے۔ اسے اگر ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو وہ یہاں سے فرا جائے گا۔" میرا لہجہ تاکیدی تھا۔

"آپ نے اس کا جو حلیہ بیان کیا ہے ممکن ہے یہاں آ کر اس نے وہ حلیہ بدل لیا ہو۔" رحمان نے ممکنہ خدشے کا اظہار کیا۔

"اسے کبھی یہ ضرورت ہی نہیں پڑی۔" میں نے بتایا۔

"کس لئے؟" رحمان نے وضاحت چاہی۔

"خود کو اس نے کبھی غیر محفوظ ہی نہیں سمجھا۔ انگریز حکومت کا مہمان ہونے کے سبب اسے بہترین تحفظ حاصل رہا۔ اس کے علاوہ اسے دیگر تحفظات بھی حاصل رہے اور شاید اب بھی حاصل ہیں تحفظات کی تفصیل میں جانا اس وقت ممکن نہیں۔ اس کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ ا حکومت کا مہمان نہ بھی ہوتا تو اس پر ہاتھ ڈالنا ہنسی کھیل نہیں۔ وہ کچھ سفلی علوم بھی جانتا ہے اور بڑا شیطانی قوتوں کا مالک ہے۔ میں نے اسی لئے ابھی یہ کہا تھا کہ اسے چھیڑا نہ جائے۔"

"اگر ایسا ہے کرن جی تو پھر وہ آپ کے قبضے میں کیسے آ جائے گا؟"

"تمام قوتوں سے بلند ہے اور قوت بھی تو ہے' وہی .... جو ہر شے پر قادر ہے' آپ اسے کیوں بھول گئے رحمان! وہ جو ہمیشہ مظلوموں کی داد رسی کرتا اور ظالموں کو ان کے انجام تک پہنچاتا ہے۔ اس کے یہاں دیر تو ممکن ہے اندھیر نہیں۔"

میں نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ رحمان اس ضمن میں پھر کچھ اور نہیں کہہ سکا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ "کل رات کو کسی وقت میں خود آپ کے پاس ہوٹل میں آؤں گا' میرے خیال میں اگر یہاں اس کی حیثیت سرکاری مہمان کی ہے تو یہ سراغ لگانے کے لئے ایک دن کافی ہے۔"

"رحمان! آپ کو غالباً یہ اطلاع بھی مل چکی ہو گی کہ میں جس فلور پر ٹھہری ہوں اسی کے کمرہ نمبر تین سو دس میں ایک کالی بھیڑ موجود ہے ایسی صورت میں آپ کا ہوٹل آنا............"

"اس وقت تک اس بھیڑ کو ذبح کیا جا چکا ہو گا۔" رحمان پُرسکون آواز میں بولا۔ "ڈھاکہ کی انتظامیہ کے لئے ایک لاش کا تحفہ اور سہی۔"

یہ خبر میرے لئے چونکا دینے والی تھی مگر میں نے اس پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

"دراصل میرا طریقہ کار تھوڑا سا مختلف ہے۔" رحمان مزید بولا۔ "میں زیادہ دیر کوئی روگ نہیں پالتا' دشمن کو سنبھلنے یا کچھ کر گزرنے کی مہلت دینا میرے نزدیک نامناسب ہے۔ یہ تصدیق ہونے کے بعد کہ کسی شخص کا تعلق دشمن سے ہے اور وہ ہمارے لئے خطرہ بن سکتا ہے تو ہم اسے فوری طور پر راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔"

رحمان سے مجھے جو گفتگو مقصود تھی کر چکی تھی سو اجازت چاہی پھر یہ عقدہ کھلا کہ میں جس کشتی میں بیٹھ کر گھاٹ سے چلی تھی وہ بھی اسی کی تھی۔ وہ کشتی دریا میں کچھ فاصلے سے ہماری کشتی کے پیچھے پیچھے چلتی رہی تھیں۔ یہ عقدہ بھی رحمان ہی نے کھولا۔ ہم دونوں دوبارہ اسی کشتی میں بیٹھ گئے کشتی نے ہمیں گھاٹ پر اتار دیا تھا وہاں سے ہم شاہ باغ ہوٹل پہنچ گئے۔ اب آئندہ روز تک کے لئے کوئی کام نہیں تھا جب تک کہ رحمان سے ملاقات نہ ہو جاتی' سو ہم نے ہوٹل کی حدود ہی میں رہنا مناسب سمجھا۔

اگلے روز رات کو رحمان آٹھ بجے ہی ہم سے ملنے آ گیا۔ وہ اس وقت ایک مغرب زدہ شخص معلوم ہو رہا تھا چہرے پر میک اپ بھی تھا۔ اس کی آمد سے پہلے دروازے کے نیچے سے ایک پرچہ پھینکا گیا تھا۔ پرچے پر لکھا تھا۔ "بوڑھی گنگا کا بیٹا ٹھیک آٹھ بجے پہنچ جائے گا۔" پھر ایسا ہی ہوا تھا دستک ہوتے ہی میں نے دروازہ کھول دیا تھا۔

"آپ کا دشمن یہاں سرکاری مہمان نہیں ہے اس بات کی تصدیق کر لی گئی ہے۔" رحمان نے بیٹھتے ہی بتایا۔

"پھر تو اب دوسرا ہی راستہ رہ جاتا ہے' وہ یقیناً کسی مندر میں ہو گا۔" میں پُریقین آواز میں بولی پھر مجھے ایک خیال آیا میں نے رحمان سے سوال کیا۔ "یہاں کوئی ایسا مندر ہے جس میں بطور خاص درگا دیوی کی پوجا کی جاتی ہو؟"

"مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں لیکن یہ پتا چلانا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔" رحمان نے جواب دیا۔

"ہماری تنظیم میں کچھ ہندو بھی ہیں وہ کسی ایسے مندر سے ضرور واقف ہوں گے۔"

"پھر کب تک مجھے اس بارے میں علم ہو جائے گا؟"

"اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی آپ کا حکم ہو تو میں ایک گھنٹے کے اندر اندر ایک ایسے کارکن کو آ کے پاس بھیج سکتا ہوں۔"

"تو دیر نہ کریں۔" میں جلدی سے بولی۔

رحمان چلا گیا اور پھر ٹھیک نو بجے دوبارہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اس کا نام مجھے راکیش بتایا تھا اسی کے ساتھ حلیہ بھی رحمان نے بتا دیا تھا۔ آنے والا وہی تھا۔ رحمان نے اسے بتا دیا تھا کہ مجھے کیا معلوم کر ہے وہ اسی لئے وقت ضائع کئے بغیر بتانے لگا۔ "نواب گنج کے قریب ہی غریبوں کی چھوٹی سی ایک آبادی ہزار باغ ہے۔ اسے آپ اس شہر کی ایک نواحی بستی سمجھ لیں۔ وہاں آبادی کے باہر ایک ایسا قدیم مندر ہے جس م صرف درگا دیوی کی پوجا ہوتی ہے۔ دور دور سے وہاں یاتری آتے ہیں جن کے لئے مندر کے ساتھ ہی ایک پرانی عمارت بنی ہے۔ اس عمارت کا کچھ حصہ گر بھی گیا ہے اسے مخدوش قرار دے دیا گیا ہے پھر بھی لوگ نہ مانتے' کھلے آسمان کے نیچے پڑنے سے بہتر وہ عمارت کو سمجھتے ہیں۔ میں تو خیر وہاں ایک ہی بار گیا ہوں مگر لوگ اکثر وہاں جاتے رہتے ہیں۔ مندر ہی کے احاطے میں بڑے پجاری کے رہنے کا استھان ہے۔ مندر کی حالت بھ اچھی نہیں نیم شکستہ سا ہے۔ یاتری وہاں جاتے تو ہیں مگر بڑے پجاری کے بار بار کہنے کے باوجود اتنا چندہ نہ دیتے کہ مندر کی مرمت کرائی جا سکے۔ مندر کی دیکھ ریکھ اور صفائی ستھرائی کے لئے بڑے پجاری کے صرف ا نائب اور ایک داسی ہے وہ تینوں بھی بڑے پجاری کی کوٹھری کے قریب دوسری کوٹھریوں میں رہتے ہیں۔ سنا ہے کبھی وہاں بہت سے سادھو سنت رہا کرتے تھے اور داسیاں بھی تھیں لیکن اب کوٹھریاں خالی پڑی رہتی ہیں ا میں کوئی نہیں رہتا۔ کئی کوٹھریاں ٹوٹ بھی گئی ہیں۔" راکیش نے تفصیل کے ساتھ درگا دیوی کے مندر متعلق ایک ایک بات بیان کر دی مگر محض اپنی دانست میں۔

"اس مندر میں کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ممکن ہے ہو' مجھے معلوم نہیں۔" راکیش نے جواب دیا۔

"تم وہاں تک ہمیں پہنچا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں' آپ کو کب چلنا ہے؟"

"ابھی چلنا ممکن ہے تمہارے لئے؟"

راکیش فوراً آمادہ ہو گیا جانے کیوں میرا دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ سمت سفر غلط نہیں ہے ممکن ہے یہ میری خوش گمانی ہو' میں نے سوچا۔

شاہ باغ سے ہزاری باغ کا فاصلہ خاصا تھا۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے میں اس لئے بھی دیر لگ گئی کہ سواری بندوبست جلدی نہیں ہو سکا۔ جگہ دور تھی اور ہمیں واپس بھی آنا تھا رات زیادہ ہو جاتی تو واپسی کے لئے سواری نہ ملتی۔ میں نے اسی لئے راکیش کی تجویز مان لی تھی۔ کار لے کر ہوٹل آنے میں اسے دیر ہو گئی پھر کار میں بیٹھ کر ہی ہزاری باغ روانہ ہوئے تھے۔ کار خود راکیش چلا رہا تھا۔ میں اور نضار پیچھے بیٹھے تھے۔

ہم جب ہزاری باغ پہنچے تو بستی میں چہل پہل ختم ہو چکی تھی بستی سے گزر کر ہم مندر کی طرف بڑھے دور ہی سے مندر کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔

مندر سے کچھ پہلے ہی میں نے کار کو رکوا لیا اور راکیش سے بولی۔ "تم یہیں رکو' ہم دونوں مندر سے لوٹ کر آتے ہیں۔ واپسی میں اگر ہمیں دیر بھی ہو جائے تو تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہیں ٹھہر کر ہماری واپسی کا انتظار کرنا۔"

"لل .... لیکن اس وقت تو .... تو یہاں ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا ہے۔" راکیش جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔ "آس پاس کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔ مندر کا بڑا پجاری بھی سو گیا ہو گا۔"

"تو کیا ہوا سو جانے دو۔" میں اطمینان سے بولی۔ "ضرورت پڑی تو اسے جگا لیں گے۔" یہ کہتے ہی میں نے نضار کو کار سے اترنے کا اشارہ کیا۔

نضار کے ساتھ میں آگے بڑھتی ہوئی مندر کی سیڑھیوں تک پہنچ گئی۔ اوپر چڑھتے ہوئے میں نے مندر کا بند دروازہ دیکھ لیا تھا۔ جب سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر پہنچی تو دائیں جانب بنی ہوئی کوٹھریاں خاصے فاصلے پر دکھائی دیں۔ میں نے ادھر قدم بڑھانے سے پہلے مندر پر ایک نظر ڈالی۔ وہ قدیم مندر واقعی شکستہ حالت میں تھا۔

ان کوٹھریوں کے بارے میں راکیش مجھے بتا ہی چکا تھا کہ وہاں مندر کے بڑے پجاری' اس کے دو نائب اور ایک داسی کا قیام ہے۔ نضار ہی کے سامنے یہ ساری باتیں ہوئی تھیں۔ میں ادھر بڑھی تو نضار نے اسی لئے پوچھا۔ "ژیان کے بارے میں کیا تُو بڑے پجاری سے معلوم کرے گی؟"

"پہلے میں خود خالی کوٹھریوں کا جائزہ لوں گی کہ وہاں تو وہ بزدل نہیں چھپا ہوا بعد میں پجاری کی کوٹھری اور دوسری کوٹھریاں دیکھوں گی جو آباد ہیں' پجاری سے یہاں موجود کسی تہہ خانے کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ عموماً قدیم مندروں میں تہہ خانے ضرور ہوتے ہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں نضار کے سوال کا جواب دیا۔

ہوٹل سے میں اسی لئے چھوٹی سی ایک ٹارچ لے کر چلی تھی یہ ضروری نہیں تھا کہ اندھیرے میں دیکھنے کی پُراسرار قوت بروقت بیدار ہو جاتی۔

پھر ہم نے کوئی خالی کوٹھری نہیں چھوڑی' جن کوٹھریوں کے دروازے ٹوٹ گئے تھے اور دیواریں منہدم ہو گئی تھیں انہیں بھی ہم نے دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا ہم آگے بڑھ رہے تھے کہ معاً میرے کان کھڑے ہو گئے مجھے یوں لگا تھا کہ کسی کوٹھری کی زنجیر کھڑکی ہو۔ میں نے نضار کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا' خود بھی رک گئی اور ٹارچ بجھا دی۔

کچھ ہی فاصلے پر ایک کوٹھری کا دروازہ دھیرے سے کھلا اور ایک سایہ باہر آیا۔ دروازے پر دوسرا سایہ دکھائی دیا میں نے اندازہ لگایا کہ باہر آنے والی کوئی عورت تھی اور دروازے پر کھڑا ہوا مرد تھا۔ میں اور نضار اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے کہ عورت کے سائے کو میں نے برابر والی کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر جاتے دیکھا۔

عین اسی لمحے سناٹا جیسے ایک کرخت آواز سے جاگ اٹھا۔ "کون لوگ ہو تم؟"

ہم دونوں کو دیکھ لیا گیا تھا یہ کرخت آواز کوٹھری کے دروازے پر کھڑے ہوئے مرد ہی کی تھی۔

"اس سے یہاں کیا کر رہے ہو؟........... کیوں یہاں آئے ہو؟" کرخت آواز پھر ابھری۔

پھر میں نے اسے کوٹھری کے دروازے سے نکل کر چیختے سنا وہ دو افراد کے نام لے کر انہیں پکار رہا تھا۔

اس غیر متوقع صورت حال کے لئے میرا ذہن پہلے سے تیار نہیں تھا پھر بھی میں نے خود کو سنبھال لیا! ٹارچ روشن کر کے آگے بڑھی۔ اسی اثنا میں دو کوٹھریوں کے دروازے اور کھلے' باہر آنے والوں میں سے ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔

"کیا ہوا مہاراج کیا ہوا؟" نوواردوں میں سے ایک نے بلند آواز میں معلوم کیا۔

"ارے دیکھتے نہیں' بھگوان کے مندر میں یہ سسرے رات کے سمے موج میلہ رچانے آگئے ہیں۔

کرخت آواز والے نے جواب دیا لالٹین کی روشنی میں اب وہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے' مونچھیں بھی اتنی گھنی تھیں کہ ان میں دہانہ چھپ گیا تھا' بالوں میں سیاہی سفیدی زیادہ تھی۔ وہ سفید دھوتی باندھے ہوئے تھا اور جسم کا اوپری حصہ اسی دھوتی کے ایک پلے سے ڈھک رکھا تھا۔ گلے میں جنیو تھا اس کا ہاتھ ہم دونوں کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ واضح الفاظ میں اس نے ہم دونوں پر بدکرداری کا الزام لگایا تھا۔

نضار کو اس پر غصہ آگیا۔ "ابے عیار بوڑھے! تو ہم پر تہمت لگا رہا ہے' ابھی تیری کوٹھری سے رات کے وقت کون عورت نکل کر برابر والی کوٹھری میں گئی تھی؟ بول۔" نضار بھی اپنے غصے کا اظہار بوڑھے ہی کی زبان میں کر رہا تھا۔

"مہاراج! یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا سادھنا اس سے اور اتنی رات گئے آپ کے پاس تھی؟" وہ دھوتی بند بولا جس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔

میں سمجھ گئی سادھنا اس مندر کی داسی کا نام ہوگا' بقیہ دونوں افراد پجاری کے نائب ہوں گے میں نضار کے ساتھ اب ان دونوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔

"کیوں رے پریما' تو اس ملیچھ لونڈے کی باتوں میں آگیا' تجھے مندر میں درگا دیوی کے چرنوں میں رہنا ہے کہ نہیں یا نکال باہر کروں۔" بوڑھے پجاری نے لالٹین والے کو دھونس دی جسے اس نے پریما کہا تھا۔

"بھول ہو گئی مہاراج شما کر دیں۔" لالٹین والے نے فوراً معافی مانگ لی۔

بوڑھا پجاری اب ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم دونوں نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا' دیوی کے مندر کو تم نے کیوں گندا کیا؟"

میں نے نضار کی تیوریوں پر بل پڑتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔ "مہاراج! اس سے ہم بڑی مجبوری میں آپ کے دوار تک آئے ہیں۔ یہ میرا پریمی ہے اور میں اس کی پریمکا۔ ہم نے اب تک کوئی پاپ نہیں کیا' میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ آئی ہوں کہ یہ دیوی کے سامنے میری مانگ میں سیندور بھرنا چاہتا ہے۔ اگنی کے سامنے پھیرے ہم کل دن میں لے لیں گے یہ میری مانگ بھر دے گا تو میں اسے اپنا پتی سویکار کر لوں گی۔ یہ میری مانگ نہ بھر سکا اور ہم پکڑے گئے تو پھر شاید اس جنم میں ہمارا ملن نہ ہو سکے' ہم یہی وچار کر کے ادھر آئے

تھے کہ آپ سے مندر کا دوار کھولنے کی پرارتھنا کریں گے پھر آپ کی انومتی ہو گئی تو ہم یہیں رات گزار لیں گے۔" فوراً ہی میں نے ایک کہانی گھڑ دی اس کا ایک بڑا سبب بوڑھے پجاری کو رام کرنا تھا۔

"وہ تو خیر ٹھیک ہے' پر تیرا پریمی اچھا نہیں۔" بوڑھے پجاری نے منہ بنایا۔ "پھر اس سے مندر کے دوار کھولنے کی دکھشنا دینا بھی تیرے بس کا کام نہیں لگتا۔"

"جو بھی دکھشنا ہو گی ہم دیں گے مہاراج!" میرا وار کارگر رہا' بوڑھا لالچ میں آگیا۔ میں نے بوجوہ اسے شیشے میں اتارا تھا۔ پھر بوڑھے کو مزید رام کرنے کی غرض سے میں نے ایک اور داؤ آزمایا میرے کہنے پر نضار نے اس سے معذرت کر لی۔

"اس سمے درگا دیوی کے سامنے مانگ بھروانے کی دکھشنا پچاس روپے سے کم نہیں ہو گی۔" پجاری بھاؤ تاؤ پر آگیا۔

"منظور ہے مہاراج!" میں نے فوراً ہامی بھر لی۔ "آپ کے سوا مندر میں کوئی اور نہیں ہوگا ورنہ مجھے لجا (شرم) آئے گی۔"

"نہیں ہوگا کوئی۔" پجاری نے یقین دلایا پھر کہنے لگا۔ "آدھی دکھشنا پہلے دے دو۔"

میں نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا اور وہ اپنی کوٹھری سے مندر کے دروازے پر پڑے ہوئے تالے کی چابی لینے چلا گیا۔ اس سے پہلے پجاری نے اپنے دونوں چیلوں کو ان کی کوٹھریوں میں جانے کا حکم دے دیا تھا۔ ہم دونوں اب وہاں تنہا رہ گئے تھے اس قدر ہنگامے کے باوجود داسی سادھنا اپنی کوٹھری سے نہیں نکلی تھی۔ بھانڈا پھوٹنے کے فوراً بعد شاید اسے اپنا گنہگار چہرہ دکھانے کی ہمت نہیں ہو گی۔

کچھ ہی دیر کے بعد بوڑھا پجاری ہاتھ میں لالٹین لٹکائے ہمارے آگے آگے چل رہا تھا اس کا رخ مندر ہی کی طرف تھا۔

مندر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے تالا کھولا اور پھر ہمیں اندر آنے کو کہا اندر داخل ہوتے ہی میں نے تیزی سے پلٹ کر اندر سے مندر کا دروازہ بند کر دیا پجاری ایسا کرنے پر چونکا اور دروازہ بند کرنے کی وجہ پوچھی۔

"ابھی بتاتی ہوں۔" یہ کہتے ہی میں لپک کر پجاری کے قریب پہنچ گئی۔ میں نے اسی دوران میں کمر سے بندھا لمبا خنجر کھینچ لیا تھا۔ میں پوری تیاری سے چلی تھی میرا اشارہ ملتے ہی نضار نے جھپٹ کر بوڑھے کو گرفت میں لے لیا یوں کہ وہ حرکت نہ کر سکے۔ نضار نے اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر اسے قطعی بے بس کر دیا تھا لالٹین بوڑھے کے ہاتھ سے گر گئی میں نے لالٹین کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا تاکہ وہ بجھ نہ جائے۔

اس طرح جکڑ لئے جانے پر بوڑھا پجاری خوفزدہ ہو کر چیخنے لگا اس نے یقیناً میرے ہاتھ میں خنجر بھی دیکھ لیا تھا۔

وہاں سے کچھ ہی دور ایک چبوترے پر بڑی سی مورتی رکھی تھی۔

"اے بڈھے!" میں نے پجاری کے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔ "میں نے ایک گیانی سے یہ سنا ہے کہ درگا دیوی کے سامنے جس شخص کو بھی بلی چڑھایا جاتا ہے اس کی عمر بلی چڑھانے والے کو لگ جاتی ہے۔ یعنی میں دیوی کے چرنوں میں تیری بلی دے دوں تو تیری بقیہ عمر مجھے مل جائے گی کیا یہ بات سچ ہے؟" میرا مقصد

اسے خوفزدہ کرنا تھا۔

"نہیں۔" بوڑھا چیخا۔ "یہ .... یہ کسی نے جھوٹ .... جھوٹ کہا ہے' تم سے۔ ان .... ان پتھروں میں کچھ .... کچھ نہیں رکھا۔ یہ .... یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔"

ایک مندر کا پجاری ایسی بات کر رہا تھا جو میرے لئے حیران کن تھی۔ میں نے سوچا شدید خوف کے سبب وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کی تکذیب کر رہا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے خنجر کی نوک گھمائی اور سخت لہجے میں کہا۔ "تو درگا دیوی کے مندر میں جان کے خوف سے ایسی بکواس کر رہا ہے' دیوتاؤں کو جھٹلا رہا ہے۔"

"مم .... میں ناستک (لادین) ہوں۔" اس نے ایک اور انکشاف کیا۔

"پھر بھی اس مندر کا پجاری بنا بیٹھا ہے؟"

"پاپی پیٹ کے کارن (سبب) کون کیا نہیں کرتا۔ سو میں نے چولا بدل لیا تو کیا ہوا؟" وہ بولا اس کے لہجے میں اب خود اعتمادی جھلکنے لگی تھی۔ "مجھے بلی چڑھا کر تجھے کچھ نہیں ملے گا۔"

اس کے بعد میں نے مزید وقت ضائع کئے بغیر ژیان کے بارے میں سوال کیا۔

"ہاں وہ یہیں ایک کوٹھری میں رہتا تھا۔ جب تک وہ یہاں رہا اس نے میری داسی سادھنا کو ایک رات بھی میرے پاس نہیں آنے دیا۔ جانے اس کے پاس کیا جادو تھا کہ سادھنا بھی اسی کا دم بھرنے لگی تھی پرسوں رات اسے کیا سوجھی بولا کہ میں جا رہا ہوں اور پھر چلا گیا۔" پجاری کے لہجے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

"کہاں گیا وہ' بتا کر نہیں گیا؟" اس مرتبہ نضار بول اٹھا۔

پجاری نے انکار میں سر ہلا دیا پھر کہنے لگا۔ "میں تو اس کے جانے سے خوش ہو گیا' مجھے بڑا ڈر لگتا تھا اس سے۔ زبردستی یہاں آ کر رہنے لگا تھا اور مندر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اپنی کوٹھری سے وہ کبھی کبھار رات کے سمے ہی نکلتا تھا صرف سادھنا کو اس کی کوٹھری میں جانے کی اجازت تھی۔ اس نے کہہ رکھا تھا کہ اگر میں نے یا میرے چیلوں نے کسی کو بھی اس کے بارے میں بتایا' یہاں رہتا ہے تو مار ڈالے گا۔ اسے جادو آتا تھا' کئی بار اس نے ہمیں جادو دکھایا۔"

جب پجاری یہ بات کر رہا تھا تو میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا اور میں نے نضار کو مخاطب کیا۔ "تو اسے سنبھالے رکھ میں ابھی آتی ہوں۔" نضار نے اقرار میں سر ہلا دیا تو میں مندر کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی مجھے داسی سادھنا کی کوٹھری کے دروازے تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی پھر داسی کو نام لے کر پکارا مجھے یقین تھا کہ وہ ابھی سوئی نہیں ہو گی۔

"کون ہے؟" اندر سے داسی کی ڈری ڈری سی آواز آئی۔

"سادھنا! تجھے مہاراج بلا رہے ہیں' میری مانگ میں سیندور بھرا جانا ہے اور میں مہاراج کو دکشنا بھی دے چکی ہوں' مہاراج کو سیندور نہیں مل رہا اس لئے تجھے بلایا ہے۔"

داسی میری باتوں میں آ گئی اور کوٹھری کا دروازہ کھول دیا اندر لالٹین جل رہی تھی۔

میں نے خنجر اپنے پیچھے چھپایا ہوا تھا' جیسے ہی دروازہ کھلا میں نے تیزی سے اندر گھس کر کنڈی لگا دی پھر داسی کو میں نے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا' درمیانی عمر ہونے کے باوجود اس کی سانولی رنگت' متناسب جسم اور چہرے کے نقوش میں بڑی کشش تھی۔ قد بھی لمبا تھا۔

"ذرا بھی آواز نکالی تو تیرا جسم چھید ڈالوں گی۔" میں نے خنجر کی نوک اس کے جسم پر رکھ دی۔ "تجھ سے جو سوال کروں اس کا جواب دے۔"

پھر کچھ ہی دیر میں کے خوف نے اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ ژیان پرسوں رات ہی وہاں سے چلا گیا تھا مگر سادھنا کل بھی رات کو اس سے ملی تھی۔ ژیان ہی یہاں آ کر اسے اپنے نئے ٹھکانے پر لے گیا تھا جو اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔

"اب اپنی کوٹھری کا دروازہ بند کر لے۔ میں جا رہی ہوں۔ تو نے کسی سے کچھ کہا یا شور مچایا تو پھر تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" میں نے دھمکی دی اور باہر نکل آئی احتیاطاً باہر آتے ہی میں نے کوٹھری کے دروازے کی کنڈی چڑھا دی تھی اب سادھنا چاہتی بھی تو کوٹھری سے نہیں نکل پاتی۔

پجاری کے دونوں چیلوں کی کوٹھریوں کی کنڈیاں بھی میں نے باہر سے لگا دیں اور لپکتی ہوئی مندر تک پہنچ گئی۔

"اس بڈھے کو چھوڑ دے۔" میں نے نضار کو مخاطب کیا پھر بڈھے سے بولی۔ "تجھے یہیں بند رہنا ہے صبح تک۔ کوئی نہ کوئی پوجا کرنے صبح ادھر آیا تو باہر سے مندر کا دروازہ کھول دے گا۔"

بوڑھا پجاری جان بچ جانے کی وجہ سے اس پر آمادہ ہو گیا میں اور نضار باہر آ گئے مندر کا دروازہ بند کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔

"ہوا کیا؟ کچھ بتا تو سہی۔" نضار میرے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ژیان کا پتا چل گیا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا پھر کار تک پہنچتے پہنچتے نضار کو میں نے حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ یہ معلومات میں نے سادھنا سے حاصل کی تھیں۔ ژیان اگر بدکردار اور عیاش نہ ہوتا تو شاید مجھے اس کا سراغ نہ ملتا۔ پرسوں رات شاید اس نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی تب ہی مندر سے دوسری جگہ منتقل ہو گیا تھا۔

ہزاری باغ سے آگے نواب گنج کی آبادی تھی شہر کی سمت پھر لال باغ تھا اس آبادی کے باہر پرانے وقتوں کا ایک مشہور قلعہ تھا اسے قلعہ لال باغ کہا جاتا تھا۔ قلعے ہی سے متصل ایک بڑا میدان تھا جس میں مغلیہ تاجدار جہانگیر کی بیٹی کا مقبرہ بنا ہوا تھا۔ یہیں جہانگیر کی بنوائی ہوئی ایک سرنگ بھی تھی۔ قلعے کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا تھا کھنڈرات سے کچھ فاصلے پر ایک مغل امیر شائستہ خاں کی بنوائی ہوئی مسجد بھی تھی' ژیان اسی قلعے کے منہدم حصے میں سرنگ کے قریب چھپا ہوا تھا۔ سرنگ کے دوسرے دہانے کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔

گزشتہ شب سادھنا کو وہ سرنگ کے اندر ہی لے گیا تھا اس عیار نے وہاں بھی فرار کی راہ پہلے تلاش کر

لی تھی۔

ہم کار تک پہنچے تو راکیش ہمارا ہی منتظر تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اب کہاں چلنا ہے۔ کار اسٹارٹ ہو گئی۔

قلعے سے خاصے پہلے میں نے کار کو رکوا دیا اور نضار کے ساتھ اتر گئی راکیش کو ایک بار پھر ہماری واپسی کا انتظار کرنا تھا۔

دبے پاؤں ہم قلعے کے منہدم حصے میں داخل ہوئے۔ ابھی ہم زیادہ آگے نہیں گئے تھے کہ اچانک کھنڈرات میں ژیان کا کریہہ قہقہہ گونجا اور پھر اس کی نفرت انگیز آواز سنائی دی۔

"اچھا ہوا معبلہ کہ نضار بھی پہاڑوں سے اتر آیا اب میں تم دونوں ہی کو گھیر کر ایک ساتھ مار دوں گا کہ یہ قصہ ہی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اس کے باپ سردار اشر کی گردن بھی میں نے ہی کٹوائی تھی اور یہ چوہا نکل بھاگا تھا۔ سو آج یہ پہاڑوں سے بہت دور یہاں آ کر میرے جال میں پھنس گیا۔"

"کون کس کے جال میں پھنسا ہے یہ تو تجھے ابھی معلوم ہو جائے گا اے میرے باپ کے قاتل!" نضار کی غصیلی آواز بلند ہوئی۔

"عورت ہی اب تک مرد کو پھنسواتی آئی ہے اے نضار! اے میرے دشمن ادھر دیکھ لے سب کچھ جانتے بوجھتے بھی معبلہ تجھے یہاں اپنے ساتھ لے آئی۔ پوچھ اس سے کیا اسے معلوم نہ تھا کہ ساحروں کی ساحرہ ترفیہ نے مجھے میری خدمت کے صلے میں حیرت انگیز پُراسرار قوتیں عطا کی تھیں۔" ژیان پُرغرور آواز میں کہنے لگا۔ وہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔

"اور تجھے شاید یہ خبر نہیں کہ میں نے ہی ساحروں کی اس ساحرہ ترفیہ کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا۔" نضار جواب میں بولا۔

"جھوٹ بول رہا ہے تُو بڑ ہانک رہا ہے' ترفیہ کو بھلا کون مار سکتا ہے۔" ژیان کی آواز قدرے پست ہو گئی۔

"مرنے والے کو کوئی نہیں بچا سکتا۔" میں زور سے بولی۔ "اور اے میرے دشمن! اب تیرا وقت بھی آ چکا ہے۔ سن سکے تو سن کہ چندر موہن بھی مارا گیا' وہ جو تیرا پشت پناہ تھا' اب تُو اکیلا رہ گیا ہے۔ جب تک تیری گردن کٹنے کے بعد اس پر دہکتا ہوا توا نہیں رکھ دیا جائے گا' میرے دل کو سکون نہیں ملے گا۔"

"تُو اور نضار دونوں جھوٹی خبریں دے کر مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن سن لے کہ ژیان ڈرنے والوں میں سے نہیں۔"

"بہت ہی دلیر ہے تُو۔" میری آواز میں چبھن تھی۔ "اسی لئے تو اب تک مجھ سے بچ کر شہروں بھاگتا رہا ہے۔" میری آواز اونچی ہوتی گئی۔ "تجھے میں نے رگید کر وادی سبز سے نکال دیا تو جزیل کو اپنی جگہ پھنسا کر تُو وہاں سے ساحروں کی بستی میں بھاگ گیا' پھر وہاں سے ہموار میدانوں کی اس دنیا میں آ گیا۔ بھاگنے والا بہادر نہیں بزدل ہوتا ہے اور تُو بھی بزدل ہے۔ میں نے جب دہلی میں تیرے گرد حلقہ تنگ کر دیا تو تُو بمبئی بھاگ گیا اور پھر وہاں سے جنوبی ہند کی ایک ریاست کوڈگ میں تُو نے پناہ لے لی میں تیرا پیچھا کرتی رہی۔ میں

کوڈگ پہنچی تو عیار چندر موہن نے تجھے کلکتے بھیج دیا چمپا کی حفاظت میں............ اور یہ جھوٹی خبر بھی سن لے کہ لعنتی چمپا بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی پھر جب چندر موہن اپاہج بن کر کلکتے پہنچا ہو گا تو تُو بھی دہل گیا ہو گا کہ کہیں تیرا بھی یہ حشر نہ ہو' سو تُو یہاں آ کے چھپ گیا............ سن ژیان سن اے مجسم بدی' میں دنیا کے آخری کونے تک تیرا پیچھا کروں گی۔ آج اگر تُو کسی طرح بچ کر نکل بھی گیا تو بہت جلد منہ کے بل آ رہے گا۔"

اچانک میری سماعت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ٹکرائی اور جدھر سے آواز آئی تھی میں ادھر لپکی نضار میرے پیچھے تھا۔

شاید وہ رات ژیان کی زندگی کی آخری رات نہیں تھی۔ وہ فرار ہو گیا ہم دیر تک ان کھنڈرات میں بھٹکتے رہے سرنگ کا سراغ بھی ہم نے لگا لیا اور کچھ دور تک اس کے اندر بھی گئے لیکن ژیان نہیں ملا' بوجھل قدموں سے ہم کھنڈرات سے نکل آئے۔

☆======☆======☆

ژیان کا تعاقب کرتی ہوئی میں ایک بار پھر سمندر تک آ پہنچی تھی۔ خلیج بنگال کی سرکش موجیں میرے قدموں کو چھو رہی تھیں میں اور نضار اب بنگال کے ایک ساحلی شہر چاٹگام میں تھے۔ نیک روح عظیم مہین کی سرگوشیوں نے اس شہر تک پہنچنے میں ہماری رہنمائی کی تھی چاٹگام کی ایک آبادی اسد گنج میں ہمارا قیام تھا۔ سرفروش تنظیم کے مقامی سربراہ کے توسط سے ہم نے وہ مکان کرائے پر حاصل کیا تھا۔

ہمیں چاٹگام آئے یہ تیسرا دن تھا۔ شام کے وقت ہم سمندر کے کنارے نکل آتے تھے۔ پہاڑوں پر رہنے والوں کے لئے سمندر میں بڑی کشش ہے۔ نضار پہلی دفعہ سمندر دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا اس وقت بھی وہ ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ دیکھتے ہوئے لہروں سے کھیل رہا تھا۔ میں اس کے قریب ہی ریت پر بیٹھی تھی ہمارے آس پاس اور کوئی نہیں تھا۔

"معبلہ ہموار میدانوں کی یہ اجنبی سرزمین بھی اتنی بری نہیں لیکن............" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا اے نضار!" میں نے اسے ٹوکا۔

"ہم یہاں رہ نہیں سکتے۔" اس نے اپنی بات پوری کر دی۔ "ہر چند کہ مجھے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر اپنے پہاڑ بہت یاد آتے ہیں کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے بلند پہاڑ مجھے اپنی طرف بلا رہے ہوں۔"

"اور مجھے تو دیکھ' میں کتنے دن سے بچھڑی ہوئی ہوں۔"

پھر ہم دیر تک وادی سبز اور اپنی پہاڑی بستیوں کا ذکر کرتے رہے حالانکہ میں نسلاً وہاں کی نہیں تھی مگر شاید آدمی جہاں پیدا ہوتا ہے' پروان چڑھتا ہے آخر کار اسی زمین سے اس کے رشتے استوار ہو جاتے ہیں۔ وہی اس کا وطن بن جاتا ہے اور یہ کہا بھی تو گیا ہے کہ تم جہاں بس جاؤ وہی تمہارا وطن ہے۔ ساری زمین اللہ کی ہے۔

معلوم نہیں اس شام کو مجھے کیا سوجھی کہ میں نے نضار سے کہا۔ "تیرے میرے بیچ اب بھی ایک دیوار ہے۔"

"کون سی دیوار؟" وہ حیرت زدہ سا ہو کر بولا۔

"عقائد کی دیوار۔" میں نے جواب دیا۔ "اب مجھے دیویوں اور دیو تاؤں پر یقین نہیں رہا۔"

خلاف توقع وہ میری بات سن کر دھیرے سے ہنسا۔ "تو مجھے کب یقین ہے .... کیا تُو بھول گئی کہ ایک نیک روح نے مجھے بھی تعلیم دی ہے؟ میں بھی حقیقت جان چکا ہوں۔"

"لیکن تُو نے مطالعہ تو نہیں کیا ہو گا۔"

"تو کیا ہوا اب کر لوں گا مطالعہ' اصل بات تو جان لینا ہے سو میں نے جان لیا اور اس طاقت کی عظمت کو دل سے مان لیا کہ جس کا کوئی شریک نہیں۔ پگلی کہیں کی تیرے اور میرے عقائد میں فرق کب ہے؟ تُو نے خواہ مخواہ اپنے اور میرے بیچ ایک فرضی دیوار کھڑی کر لی' کہیں ایسا تو نہیں کہ اس بہانے تُو میرے بچوں کی ماں بننے سے بچنا چاہتی ہے؟"

"تُو یہاں آ کر فضول باتیں بہت کرنے لگا ہے۔" میں نے اس کے شانے پر زور سے ہاتھ مارا۔

"اپنی طاقت اس حرامزادے کے لئے بچا کے رکھ جو ابھی تک ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔" نضار بولا۔

اسی کے ساتھ موضوع گفتگو بدل گیا اور ہم اپنے مفرور دشمن ژیان کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ ڈھاکہ کی طرح چاٹگام میں بھی سرفروش تنظیم کے ارکان ژیان کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہاں کے سربراہ مقیم نے مجھ سے ژیان کی تلاش کے لئے جو مہلت لی تھی آج رات ختم ہو رہی تھی۔ مقیم کو آج ہم سے آ کر ملنا تھا۔

اندھیرا پھیلنے لگا تو ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ عین اسی وقت نیک روح مہین کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ یہ سرگوشیاں نضار نے بھی سنیں۔ ہمیں ہدایت مل گئی تھی اور یہ بشارت بھی کہ ظالم کی رسی کھینچ لی گئی ہے' وہ اب منہ کے بل زمین پر گرنے والا ہے۔

ہم دونوں ہی کے لئے یہ ایک بڑی خوشخبری تھی ساحل سمندر سے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

تنظیم کا ایک رکن ہمارے لئے رات کا کھانا لے کر آ گیا اسی نے ہمیں پیغام دیا کہ تنظیم کا مقامی سربراہ مقیم گھنٹے بھر کے بعد ہم سے آ کر ملے گا۔

مقیم وقت مقررہ پر آ گیا' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں بول اٹھی۔ "ژیان شہر میں نہیں ہے آپ یہی بتائیں گے نا۔"

"جی ہاں میں یہی کہنے والا تھا۔" وہ حیران سا ہو کر بولا۔

"کل صبح ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔" پھر میں نے اس سے جس بندوبست کے لئے کہا اس نے ہامی بھر لی۔

اس نے ہمارے سامنے ہی اپنی تنظیم کے دو ارکان کو بلا کر ضروری احکامات دے دیئے تھے۔ یہ ارکان ہمارے مکان کی حفاظت پر مامور تھے۔ جب وہ دونوں چلے گئے تو مقیم نے کہا۔ "لیکن وہ علاقہ انتہائی خطرناک ہے' وہاں شیروں اور چیتوں کی کچھاریں بھی ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ دونوں تنہا ادھر نہ جائیں آپ اپنے ساتھ مسلح افراد کی ایک پارٹی بھی لے جائیں آپ کا حکم ہو تو میں اس کا بندوبست بھی کر دوں۔"

جواب میں مَیں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اسی کے ساتھ مقیم اچھل کر کھڑا ہو گیا اس

گھر میں بھی مقیم نے احتیاطاً اسلحہ رکھوا دیا تھا۔

ذرا دیر بعد ہی معلوم ہو گیا کہ پولیس نے اس مکان کو گھیر لیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ پولیس مقیم کی تلاش میں کسی ذریعے سے خبر ملنے پر وہاں پہنچ گئی ہو گی۔

پولیس سے ہمارا مقابلہ شروع ہو گیا۔ میں اور نضار دونوں ہی مقیم کا ساتھ دے رہے تھے۔ ہم اسلحہ لے کر اس مکان کی چھت پر چڑھ گئے تھے پولیس والے بھی دوسرے قریبی گھروں کی چھتوں سے ہم پر فائر کر رہے تھے یہ صورت حال میرے لئے خلاف توقع ہی تھی۔ مجھے اگر ذرا بھی یہ اندازہ ہو جاتا کہ مقیم سے ملنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے تو ملاقات نہ کرتی۔

پھر فائرنگ میں شدت آ گئی پولیس پارٹی پر عقب سے بھی فائرنگ ہونے لگی اس سے تنظیم کے ارکان کا پلہ بھاری ہو گیا۔

نوکر تو نوکر ہوتے ہیں' جان پر بن آئے تو انہیں بھاگنا ہی پڑتا ہے۔ بنگال سرفروش تنظیم کا مضبوط قلعہ تھا عوامی حمایت و طاقت بھی تنظیم کے ساتھ تھی' جسے عوام کی حمایت و تائید حاصل ہو اسے بھلا کون زیر کر سکتا ہے نتیجتاً پولیس والے اپنے ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے ان میں سے کم ہی کو زندہ بچ کر نکلنے دیا گیا تھا۔

ہنگامہ سرد ہوتے ہوتے مقیم ہمیں وہاں سے نکال لے گیا اب اس علاقے میں ہمارا مزید قیام خطرناک تھا۔ پولیس دوبارہ بھی اس علاقے کا محاصرہ کر سکتی تھی مقیم نے تنظیم کے تمام مسلح ارکان کو اس علاقے سے نکل جانے کا حکم دے دیا تھا۔

ساحل کے قریب ہی جھونپڑیوں کی ایک بستی ہمارا نیا ٹھکانا تھا ایک جھونپڑی میں ہمارے قیام کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ ہمیں شہر میں صرف وہی ایک رات گزارنا تھی اور صبح ہوتے ہی نکل جانا تھا۔ اپنی منزل کی طرف اور ہماری منزل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ہمیں چاٹگام ہلز جانا تھا سرگوشیوں کے مطابق ژیان نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ شاید وہ پہاڑوں میں زیادہ محفوظ رہ سکے گا لیکن غالباً یہ بھول گیا تھا کہ پہاڑوں سے ہماری دوستی بھی تھی۔

دوسرے روز سورج نکلنے سے پہلے ہی تنظیم کا ایک رکن ہمارے پاس پہنچ گیا' ہم اس وقت تک ناشتہ کر کے چلنے کی تیاری کر چکے تھے۔ اس شخص کی رہنمائی میں ہم جھونپڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ساحل کی طرف جانے والی سڑک تک آ گئے۔

سڑک کے کنارے ایک جیپ کھڑی تھی جو مجھے دور ہی سے نظر آ گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک باوردی پولیس افسر بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پولیس جیپ ہی تھی جس پر گزشتہ رات پولیس مقابلے کے دوران میں تنظیم کے ارکان نے قبضہ کر لیا تھا پولیس افسر کی وردی میں مقیم تھا۔

میں نضار کے ساتھ آگے ہی مقیم کے ساتھ بیٹھ گئی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمارے لئے صرف ایک جیپ فراہم کی جانا تھی ہم دونوں کے ساتھ کسی کو جانا نہیں تھا موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مقیم نے اس پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی تھی اس جیپ کو تحفظ دینے کی خاطر پیچھے پیچھے ایک کار میں تنظیم کے

مسلح ارکان بھی چل رہے تھے۔

"میں پہلی پہاڑی بستی تک آپ لوگوں کو چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔" مقیم نے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے بتایا پھر کہنے لگا۔ "رات کو جو بات ادھوری رہ گئی تھی کہ آپ اپنے ساتھ ایک مسلح پارٹی بھی لے جائیں ایسا اب بھی ممکن ہے یہ بھی ممکن ہے کہ تین چار مسلح افراد کو آپ اپنے ساتھ اسی جیپ میں بٹھالیں پیچھے آنے والی کار میں تنظیم کے چھ تربیت یافتہ ارکان موجود ہیں اور ان کے پاس خاصا اسلحہ بھی ہے۔"

مقیم کی یہ پیشکش میں نے قبول نہیں کی اس کی پیشکش کو میں نے ذرا نرمی سے رد کیا تھا تاکہ وہ خیال نہ کرے۔

شہر کی حدود سے نکل کر ہم چاٹگام ہلز کی طرف بڑھتے رہے۔

وعدے کے مطابق جب پہلی پہاڑی بستی قریب آ گئی تو مقیم نے جیپ روک لی پیچھے آنے والی کار بھی رک گئی تھی۔

"اللہ آپ کا حافظ و ناصر ہو۔" مقیم نے کہا اور جیپ سے اترنے لگا۔

"آمین!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور پھر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

مقیم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کار میں بیٹھ کر واپس چلا گیا تو میں نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔

پہلی پہاڑی بستی کو ایک طرف چھوڑتی ہوئی میں آگے بڑھ گئی۔

دوپہر ہوتے ہوتے اچانک میں چونک اٹھی اور نضار سے بولی۔ "تم نے کچھ محسوس کیا؟"

"ہاں۔" نضار نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔ "خجیرہ کی خوشبو آ رہی ہے۔"

ہماری بائیں جانب پہاڑ تھے اور خوشبو اسی طرف سے آ رہی تھی اس طرف جیپ لے جانا ممکن نہیں تھا سو میں نے بریک لگا دیا۔ اسی کے ساتھ نیک روح مہیمن کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں، سرگوشیاں معدوم ہوئیں تو میں بڑبڑانے لگی۔ "ہاں اے نیک اور عظیم روح ہم ایسا ہی کریں گے۔"

نضار کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ بھی تازہ ترہدایات سن چکا تھا۔

جیپ کو پہاڑ کے دامن میں کھڑا کر کے ہم دونوں اسی پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ خجیرہ کی خوشبو ہماری رہنمائی کر رہی تھی۔

معاً میری نگاہ بڑے بڑے بالوں والے اس شیطان کی طرف اٹھی جس کی شیطانی قوتیں سلب کر لی گئی تھیں وہ ایک غار سے نکل کر بھاگ رہا تھا۔

"ژیان رک جا!" میں اوپر چڑھتے ہوئے چیخی۔ "تُو ہم سے آج بچ نہیں سکے گا۔"

"معبلہ تُو ادھر سے چڑھتی رہ میں اسے دوسری طرف سے گھیرتا ہوں۔" نضار نے کہا اور پھر بائیں جانب بڑھ گیا۔

اسی وقت ژیان بھاگتے بھاگتے رکا پھر اس نے ایک بھاری پتھر میری طرف لڑھکا دیا۔ میں تیزی کے ساتھ ایک طرف ہو گئی اور پتھر میرے قریب سے لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ پُراسرار شیطانی قوتیں سلب کئے جانے کے باوجود ابھی تک اس نے اپنی شکست قبول نہیں کی تھی۔ وہ بلندی پر ہونے کا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

وہ اوپر سے پتھر لڑھکاتا رہا اور میں بچتی بچاتی پہاڑی پر چڑھتی رہی میرے لئے یہ خطرناک کھیل نیا نہیں تھا۔ میں جس قدر فاصلہ طے کر رہی تھی وہ اتنا ہی مزید اوپر چڑھتا جا رہا تھا پتھروں سے بچنے کی کوشش میں میرے اوپر چڑھنے کی رفتار نسبتاً سست تھی ژیان اور میرے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

میرے شانے سے رائفل بھی لٹک رہی تھی میں اگر چاہتی تو اسے گولی مار دیتی مگر ایسا نہیں کیا۔

ژیان کی پوری توجہ اس وقت میری طرف تھی جب نضار نے عقب سے کسی چیتے کی طرح اس پر زقند بھری، ژیان وحشی درندے کے مانند چیخا اور گرا میں نے ان دونوں کو گتھم گتھا دیکھا اور ممکنہ تیزی کے ساتھ ان تک پہنچ گئی۔

میں جھکی اور ژیان کے لمبے لمبے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے پھر پوری قوت سے جھٹکا دیا، نضار کی کمر کے گرد لپٹے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کی گرفت ختم ہو گئی نضار نے اٹھنے میں دیر نہیں کی میں اس عرصے میں ژیان کے پیٹ پر گھٹنے کی ضرب لگا چکی تھی، سر کے بال اب بھی میری مٹھی میں تھے۔

اس کے بعد ژیان زیادہ دیر تک اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا یہ اس سے میرا آخری معرکہ تھا ایک طرف سے نضار کی ٹھوکر ژیان کی کھوپڑی پر پڑی دوسری جانب سے میں نے اس کے سر کو نشانہ بنایا اور پھر وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ دیو ہیکل شیطان کا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

☆======☆======☆

نیک روح مہیمن کی ہدایت کے مطابق اس کی کاہنہ خجیرہ کی رہنمائی میں ہم بلند پہاڑوں تک پہنچ چکے تھے۔ ژیان کو ہم نے ایک گھوڑے کی پشت سے باندھ رکھا تھا۔ راستے میں ہم نے اسے بھوکا پیاسا نہیں رکھا تھا کہ کہیں وہ مر نہ جائے خجیرہ کی خوشبو اب ہم سے رخصت ہو چکی تھی۔

"تجھے معلوم ہے اے نضار کہ سامنے کس بستی کے آثار نظر آ رہے ہیں؟" میرے لہجے میں اداسی تھی۔

"ہاں اے معبلہ! مجھے خبر ہے یہ بستی ازیر ہے ایک بے وفا کی بستی، احرس کی بستی۔"

"کیا خبر احرس کی بوڑھی ماں زندہ ہو؟"

پھر ہم تعزیت کی خاطر احرس کے گھر جا پہنچے، احرس کی بوڑھی ماں تیبا زندہ تھی مگر اب وہ بڑی حد تک اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی اس کے باوجود تیبا نے مجھے پہچان لیا اور یہی غضب ہو گیا۔ وہ چیختی ہوئی مجھ پر جھپٹی۔ "معبلہ! میں تیرا خون پی جاؤں گی، تُو نے مجھ سے میرا جوان بیٹا چھین لیا.......... تُو میرے شوہر اجدر کو کھا گئی۔"

تیبا نے اپنے ہاتھوں کے بڑھے ہوئے ناخنوں سے مجھے نوچنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔ وہاں موجود لوگوں نے بمشکل مجھے تیبا سے چھڑوایا میں نے خود اس مظلوم اور دکھی عورت کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

نضار کے مشورے پر میں بستی ازیر میں زیادہ دیر نہیں رکی، ہم جب بستی کی حدود سے نکل رہے تھے تو نہ جانے تیبا کدھر سے آ گئی اور پتھر اٹھا اٹھا کے مارنے لگی ہم نے اپنے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی۔ اس وقت

بھی میری آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

جگہ جگہ پڑاؤ ڈالتے ہوئے ہم تریال پہنچ گئے۔ مقدام کی باوقار بیوی نخبہ اس عرصے میں مزید دو بچوں کی ماں بن گئی تھی۔ نخبہ کو دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی اس کے حُسن کو جیسے زوال ہی نہیں تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور جوان نظر آ رہی تھی۔ سردار صارم' نخبہ کا پہلا شوہر تھا جس سے اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی تریال ہی وہ بستی تھی جہاں میری زندگی کا ایک بڑا حصہ گزرا تھا وہاں میرا شاندار استقبال کیا گیا منع کرنے کے باوجود جوش عقیدت میں لوگ میرے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔

"آتون دیوی' ہماری دیوی واپس آ گئی۔" مجھے وہ آتون دیوی ہی کہتے تھے اور مہا پجاری نے میرا نام آتون رکھا تھا۔

میری آمد کی خوشی میں ایک بڑا جشن منایا گیا اس جشن میں شرکت کرنے کے لئے نخبہ کا سوتیلا بھائی سیمر بھی اپنی بستی سے تریال آیا۔ سیمر وہی بوڑھا تھا جس نے ایک بار مجھے اپنی بیوی بنانے کی پیشکش کی تھی۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں مزید ابھر آئی تھیں۔

چند روز تریال والوں کے اصرار پر وہاں رک کر ہم آگے بڑھ گئے۔ تریال سے ایک فوجی دستہ ہمارے ساتھ ہو لیا اس فوجی دستے کا نگران آنف تھا۔ وہی آنف جو تریال کی فوج کی سپہ سالار تھا اور ژیان کے خلاف جس نے میرے شانہ بشانہ جنگ کی تھی۔

بستی بستی گزرتے ہوئے ہم آخران حدود میں داخل ہو گئے جہاں نضار کی حکمرانی تھی۔ ادل نے بستی اشر سے نکل کر ہمارا استقبال کیا۔ نضار کی غیر موجودگی میں وہی اس علاقے کا حکمران تھا۔ بستی اشر میں ہم زیادہ نہیں رکے اور دوسرے ہی دن صبح چل دیئے۔ راستے میں قبیلہ کبیت کے سردار ہریسا نے ہماری پذیرائی کی اور ساتھ ہو لیا میں نے ہی اسے کبیت والوں کا سردار بنایا تھا۔

☆======☆======☆

وہ دن میری زندگی کا حاصل تھا۔ وادی سبز میں ایک جشن برپا تھا۔ تمام قبائل کے سردار میرے مہمان تھے۔ بستی سے باہر وسیع و عریض میدان میں ایک طرف بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا اور میں اونچی پشت والی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ میرے دائیں جانب نضار بیٹھا تھا پھر قبائل کے دوسرے سردار دونوں طرف خاموش بیٹھے تھے۔

میدان میں وادی سبز کے باسی دائرے کی صورت میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ زیادہ تر لوگوں نے بچوں کو کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ میری آنکھیں جیسے کوئی دیکھا ہوا منظر دوبارہ دیکھ رہی تھیں۔ میدان کا درمیانی حصہ خالی تھا مہا پجاری اپنے دو نائبوں کے ساتھ میرے تخت کے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔

"قیدی کو حاضر کیا جائے۔" میری آواز بدلی ہوئی تھی۔ اپنی ہی آواز اس وقت مجھے اجنبی سی لگی۔ جیسے میں کسی کے حکم پر خود بخود عمل کر رہی تھی۔

تخت کے پیچھے سے زنجیریں کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور پھر میں نے ژیان کو پابہ زنجیر دیکھا' اسے کئی محافظوں کے درمیان میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور نظریں نیچی تھیں وہ کسی طرف

بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

"اسے ہمارے قدموں میں اوندھا گرا دو۔" میں نے حکم دیا۔

میرے حکم کی تعمیل ہوئی۔ ژیان کو اوندھا گرا کر زبردستی اس کا سر میرے قدموں میں رکھ دیا گیا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اپنا دایاں پیر اٹھا کر ژیان کے سر پر رکھ دیا.......... مجمع میرے حق میں نعرے بلند کرنے لگا میں نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ میں اب بھی ژیان کے سر پر پیر رکھے کھڑی تھی۔

"رسم ادا کی جائے۔" میں نے مہا پجاری کی طرف دیکھا اور پھر میدان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ میں نیک روح عظیم مہین کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی۔ سرگوشیوں میں مجھے یہی حکم ملا تھا کہ جس طرح سردار اشم کو مارا گیا وہی سلوک ژیان سے کیا جائے' میں اسی لئے ہموار میدانوں سے باندھ کر ژیان کو یہاں لائی تھی مہین شاید اس طرح میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کو ہمیشہ کے لئے سرد کر دینا چاہتا تھا۔

پھر میدان میں آگ جلائی گئی اور شعلے بھڑکنے لگے۔ چولہے کے بھڑکتے شعلوں پر لوہے کا توا رکھ دیا گیا اس وقت مہا پجاری نے اپنے ایک نائب کو اشارہ کیا نائب نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لبادے میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑی قینچی نکالی اور ژیان کے پاس بیٹھ گیا۔ نائب نے ژیان کے شانوں پر بکھرے ہوئے بڑے بڑے بالوں کو کاٹنا شروع کر دیا ذرا سی دیر میں ژیان کی گدی صاف ہو گئی اور گردن کا پچھلا حصہ نظر آنے لگا۔ اس کے بعد پجاری آگے بڑھا اور اپنی پوشاک سے ایک ڈبیا نکال کر مہا پجاری نے چٹکی بھر سفوف نکالا اور جھک کر وہ چمکیلا سفوف ژیان کی گردن کے پچھلے حصے پر مل دیا۔ مہا پجاری اپنے کام سے فارغ ہو کر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

میں نے اب ژیان کے سر سے پیر ہٹا لیا۔ ژیان کو زمین سے اٹھا کر کھڑا کر دیا گیا سر کے بال کٹ جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ غیر مانوس اور مزید نفرت انگیز لگ رہا تھا۔

"اب آخری رسم ادا ہو گی۔" میں بلند آواز میں بولی اسی کے ساتھ محافظ ژیان کو بیچ میدان میں لے گئے۔

بریسا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے سیاہ لبادہ پیش کیا جسے میں نے اپنے لباس کے اوپر پہن لیا تو اسی نے ایک بڑا برچھا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ برچھے کا دل موٹا' دھار تیز اور چمکیلی تھی۔ دھوپ میں وہ برچھا چمک رہا تھا۔ میں تیز قدم اٹھاتی ہوئی ژیان کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ قریب ہی چولہے پر رکھا ہوا توا دہک کر سرخ ہو گیا تھا۔ اس توے کو دو محافظ دو بڑے چمٹوں سے پکڑے ہوئے تھے۔

میری نظریں ژیان کی طرف اٹھیں پھر میں نے ہاتھ بلند کر کے محافظوں کو اشارہ کیا۔

چند ہی لمحے بعد میرا دایاں ہاتھ تیزی سے گھوم کر اونچا ہوا اور پھر برچھا پوری قوت سے ژیان کی گردن کے پچھلے حصے میں اسی جگہ پڑا جہاں مہا پجاری نے چمکیلا سفوف ملا تھا' چشم زدن میں ژیان کا سر کٹ کر سامنے گرا اور زمین پر اچھلنے لگا' عین اسی لمحے دہکتے ہوئے لوہے کے توے کو ژیان کی کٹی ہوئی گردن پر رکھ دیا گیا۔ کٹی ہوئی گردن سے خون کا جو فوارہ بلند ہوا تھا' رک گیا۔ سب کچھ انتہائی تیزی کے ساتھ اور لمحوں میں ہو گیا تھا۔ ادھر ژیان کا سر کٹ کر گرا تھا ادھر کٹی ہوئی گردن پر دہکتا سرخ توا رکھ دیا گیا تھا۔ اخراج خون رک جانے کی وجہ

سے ژیان کا سربریدہ جسم رقص کے انداز میں اِدھر اُدھر حرکت کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور جسم حرکت کر رہا تھا۔ لوگ مبہوت سے وہ خونی تماشا دیکھ رہے تھے اور "رقص بسمل" جاری تھا۔ کھڑا کر کے سر کاٹنے کی وجہ یہی رقص تھا۔

کچھ ہی دیر بعد یہ رقص ختم گیا اور ژیان کا بھاری جسم زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

ایک محافظ قریب آیا تو میں نے اسے سیاہ لبادہ اتار کے دے دیا اور دوسرے محافظ کو خون آلود برچھا تھما دیا۔ اسی وقت ایک گھوڑا میرے پاس لایا گیا اور میں اس پر سوار ہو گئی۔ گھوڑا لانے والے محافظ نے ایک لمبا نیزہ بھی مجھے دیا تھا۔

میدان کے ایک سرے پر اس دوران تمام قبائل کے سردار گھوڑوں پر سوار جمع ہو چکے تھے۔ میں بھی اپنا گھوڑا دوڑاتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی۔ انہی میں نضار بھی تھا۔ اب آخری کھیل باقی تھا۔ ژیان کا بے جان جسم اور کٹا ہوا سر بیچ میدان میں پڑا تھا۔

میں نے ہاتھ بلند کیا اسی کے ساتھ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ قبائل کے سردار نیزے بلند کئے سرپٹ گھوڑوں کو بھگاتے ہوئے میرے ساتھ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ژیان کی لاش پڑی تھی۔ نضار نے تیزی سے جھک کر ژیان کے جسم کو اپنے لمبے نیزے میں پرو لیا۔ اسی وقت ایک سردار نے نضار کے نیزے پر نیزہ مارا اور پھر ژیان کے جسم کے ٹکڑے نیزوں میں پروئے جانے لگے۔ میں نے ژیان کے سر پر نیزہ مارا اور اسے نیزے میں پرو کر گھوڑا ایک طرف دوڑا دیا۔

نضار نے بھی میرے گھوڑے کے پیچھے اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ پھر ہم دونوں دیر تک اس درندے کے سر سے کسی گیند کی طرح کھیلتے رہے جس نے نہ جانے کتنے سروں کی فصل کاٹی تھی............!!!

☆====== ختم شد ======☆